سورۃ البقرہ

ایاتہا ۲۸۶ | ۲ سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ ۸۷ | رکوعاتہا ۴۰

اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کے کرم سے شروع کرتا ہوں جس کے سوا کوئی پالنہار نہیں۔

اس سورت کے آغاز میں اس سورت کا نزول، اس کی فضیلت اور جو کچھ اس کے متعلق مروی ہے اسے ذکر کیا جائے گا۔ ہم ہر سورت کے آغاز میں اسی طرح عمل کریں گے اگر ہمیں اس کے نزول اور فضیلت کے متعلق کچھ میسر آیا۔

سورۂ بقرہ مدنی سورت ہے۔ یہ مختلف اوقات میں نازل ہوئی۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ پہلی سورت ہے جو مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی۔ سوائے اس ایک ارشاد کے: وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ إِلَى اللّٰهِ کیونکہ یہ آخری آیت ہے جو آسمان سے نازل ہوئی اور یہ دسویں ذی الحجہ کے دن حجۃ الوداع میں منیٰ میں نازل ہوئی اور سود والی آیات بھی قرآن حکیم میں سے آخر میں نازل ہونے والی ہیں۔

اس سورت کی فضیلت عظیم ہے اور اس کا ثواب جسیم ہے، اسے فسطاط القرآن کہا جاتا ہے۔ یہ خالد بن معدان کا قول ہے۔ اس نام کی وجہ اس کی عظمت، بہاء، کثرت احکام اور مواعظ کی وجہ سے ہے۔ حضرت عمر نے اس سورت کو اس کی فقاہت اور معانی کے ساتھ بارہ سال میں پڑھا اور ان کے بیٹے حضرت عبداللہ نے اس سورت کو آٹھ سال میں پڑھا جیسا کہ گزر چکا ہے۔ ابن عربی نے کہا: میں نے اپنے بعض شیوخ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اس سورت میں ہزار امر، ہزار نہی، ہزار حکم اور ہزار خبر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک لشکر بھیجا، وہ کثیر تعداد میں تھا اور ایک نوجوان کو ان کا امیر بنایا گیا تھا کیونکہ اس کو سورۂ بقرہ یاد تھی۔ اسے فرمایا: ''تو جا تو ان کا امیر ہے'' (1)۔ اس حدیث کو ترمذی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور اسے صحیح کہا ہے، مسلم نے حضرت ابوامامہ باہلی سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ سورۂ بقرہ پڑھو کیونکہ اس کا حاصل کرنا برکت ہے اور اس کا چھوڑنا حسرت ہے اور بطلہ اس کے (پڑھنے کی) طاقت نہیں رکھتے (2)۔ اس حدیث کے ایک راوی معاویہ نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ البطلہ سے مراد جادوگر ہیں۔ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے گھروں کو مقابر نہ بناؤ۔ شیطان اس گھر سے بھاگ جاتا ہے جس میں سورۂ بقرہ پڑھی جاتی ہے (3)۔

دارمی نے حضرت عبداللہ سے روایت کیا ہے، کوئی گھر ایسا نہیں جس میں سورۂ بقرہ پڑھی جائے مگر اس سے شیطان نکل جاتا ہے جبکہ اس کی ہوا باآواز بلند خارج ہو رہی ہوتی ہے (4)۔ اور فرمایا: ہر چیز کی کوہان ہوتی ہے اور قرآن کی کوہان سورۂ بقرہ ہے۔ ہر چیز کا لباب ہوتا ہے اور قرآن کا لباب مفصل ہے۔ ابومحمد دارمی نے کہا: اللباب سے مراد خالص ہے۔ صحیح البستی میں ہے۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء فی فضل سورۃ البقرۃ وآیۃ الکرسی، صفحہ 111، جلد 2 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب فضل قرأۃ القرآن وسورۃ البقرۃ، صفحہ 270، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ ایضاً، کتاب صلاۃ المسافرین، باب استحباب صلاۃ النافلۃ فی بیتہ وجوازہا فی المسجد، صفحہ 265، جلد 1

4۔ سنن دارمی، صفحہ 365، جلد 2 (المدینۃ المنورہ الحجاز)

حضرت سہل بن سعد سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر چیز کی کوہان ہوتی ہے اور قرآن کی کوہان سورۂ بقرہ ہے جس نے اسے رات کے وقت اپنے گھر میں پڑھا اس کے گھر میں تین راتیں شیطان داخل نہ ہوگا اور جس نے اسے دن کے وقت پڑھا وہ شیطان اس کے گھر میں تین دن داخل نہ ہوگا (1)، اس سے مراد سرکش شیطان ہیں۔

دارمی نے اپنی مسند میں شعبی سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت عبداللہ نے فرمایا: جس نے رات کے وقت سورۂ بقرہ کی دس آیات تلاوت کیں اس گھر میں اس رات شیطان داخل نہ ہوگا حتیٰ کہ صبح ہو جائے (وہ دس آیات یہ ہیں) ابتدائی چار آیات، آیۃ الکرسی اور آیۃ الکرسی کے بعد والی دو آیات اور تین آخری آیات۔ جن کا آغاز لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ سے ہے (2)۔ شعبی سے یہ بھی مروی ہے کہ اس کے اور اس کے گھر والوں کے قریب اس دن نہ شیطان آئے گا اور نہ کوئی ایسی چیز جو اسے ناپسند ہو۔ یہ کسی مجنون پر نہیں پڑھی جائے گی مگر اسے ہوش آجائے گا۔ مغیرہ بن سبیع نے کہا: یہ عبداللہ کے شاگردوں میں سے تھے۔ وہ قرآن نہیں بھولے گا۔ اسحاق بن عیسیٰ نے کہا: جو اس نے یاد کیا ہوگا وہ نہیں بھولے گا۔ ابو محمد دارمی نے کہا: جو یہ کہتے تھے ان میں مغیرہ بن سبیع بھی تھے۔ ابن عبدالبر کی کتاب ''الاستیعاب'' میں ہے لبید بن ربیعہ (بن عامر) بن مالک بن جعفر بن کلاب بن ربیعہ بن عامر بن صعصعہ جاہلیت کے شعراء میں سے تھا اس نے اسلام کا زمانہ پایا اور اسلام قبول کر کے اسے خوب نبھایا اور اسلام کے زمانہ میں اس نے شعر کہنا ترک کر دیا تھا۔ حضرت عمر نے اپنے دور خلافت میں اس سے اس کے اشعار کے متعلق پوچھا اور اس سے شعر سننا چاہا تو لبید نے سورۂ بقرہ پڑھ دی۔ حضرت عمر نے کہا: میں نے تجھ سے تیرے اشعار کے متعلق سوال کیا ہے۔ لبید نے کہا: مجھے جب سے اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کا علم بخشا ہے اس کے بعد میں نے کبھی شعر کا ایک مصرعہ بھی نہیں کہا۔ حضرت عمر کو اس کے اس قول پر تعجب ہوا، اس کا وظیفہ دو ہزار تھا تو حضرت عمر نے مزید پانچ سو کا اضافہ کر دیا۔ بہت سے مؤرخین نے لکھا ہے کہ لبید نے جب سے اسلام قبول کیا کبھی شعر نہیں کہا۔ بعض نے فرمایا: اس نے اپنے زمانہ اسلام میں اس شعر کے علاوہ کوئی شعر نہیں کہا۔

الحمد لله اذ لم یاتنی اجلی حتی اکتسیت من الاسلام سربالاً

سب تعریفیں اللہ کے لئے کہ میری موت نہیں آئی حتیٰ کہ میں نے اسلام کا لباس زیب تن کر لیا۔

ابن عبدالبر نے کہا: بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ شعر قردہ بن نفاثہ السلولی کا ہے اور میرے نزدیک یہی صحیح ہے۔ بعض علماء نے کہا: وہ شعر یہ ہے جو اس نے اسلام کے زمانہ میں کہا تھا۔

ما عاتب المرء الکریم کنفسه والمرء یصلحه القرین الصالح

اس نے کریم شخص کو اپنے نفس کی طرح عتاب نہیں کیا اور انسان کی اصلاح اس کا نیک دوست کرتا ہے۔

مزید فضیلت کا ذکر، آیۃ الکرسی اور سورۂ بقرہ کی آخری آیات کی تفسیر کے ضمن میں آئے گا اور سورۂ آل عمران کی ابتدا میں اس سورت کی فضیلت کا مزید بیان آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

1۔ سنن دارمی، صفحہ 324، جلد 2 (المدینۃ المنورہ) 2۔ ایضاً

اے میرے رب آسان فرما اور مدد فرما۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان اور ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

الٓمّٓ ۚ ﴿۱﴾ ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ ۚۖۛ فِیۡہِ ۚۛ ہُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ۙ﴿۲﴾

''الف لام میم۔ یہ ذی شان کتاب اور ذرا شک نہیں اس میں، یہ ہدایت ہے پرہیزگاروں کے لئے''۔

علماء تاویل کا ان حروف کا مفہوم متعین کرنے میں اختلاف ہے جو سورتوں کی ابتدا میں ہیں۔ عامر شعبی، سفیان ثوری اور محدثین کی ایک جماعت نے کہا: یہ قرآن میں اللہ تعالیٰ کے راز ہیں (1) اور اللہ کی کتب میں سے ہر کتاب میں اس کے راز ہیں یہ ان متشابہات میں سے ہیں جن کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اور ان کے متعلق گفتگو کرنا واجب نہیں لیکن ہم ان پر ایمان رکھتے ہیں اور اسی طرح پڑھتے ہیں جس طرح آئے ہیں۔ یہ قول حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ ابولیث سمرقندی نے حضرت عمر، حضرت عثمان اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: حروف مقطعہ پوشیدہ حقیقت سے ہیں جن کی تفسیر نہیں کی جاسکتی۔ ابو حاتم نے کہا: ہم حروف مقطعہ صرف سورتوں کے آغاز میں پاتے ہیں اور ہم نہیں جانتے جو اللہ تعالیٰ نے ان سے مراد لیا ہے۔

میں کہتا ہوں: اسی مفہوم کو ابوبکر انباری نے ذکر کیا ہے۔ انہوں نے اپنی سند سے ربیع بن خثیم سے روایت کیا ہے، فرمایا: اللہ تعالیٰ نے یہ قرآن نازل کیا اور اس میں جتنا علم چاہا اپنے ساتھ خاص فرمایا اور جتنا چاہا اس پر تمہیں مطلع فرمایا اور جو اس نے اپنے ساتھ خاص فرمایا تم اس کو حاصل نہیں کر سکتے۔ پس تم اس کے متعلق مت پوچھو اور وہ علم جس پر اس نے تمہیں مطلع فرمایا وہ علم ہے جس کے متعلق تم پوچھتے ہو اور تجھے اس کے متعلق بتایا جاتا ہے۔ پورا قرآن تم نہیں جانتے اور وہ جو تم جانتے ہو اس پر عمل کرتے ہو۔ حضرت ابوبکر نے کہا: یہ بات وضاحت کرتی ہے کہ قرآن کے کچھ حروف کے معانی عام عالم سے چھپائے گئے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ نے بطور آزمائش و امتحان کیا ہے۔ پس جو ان پر ایمان لایا اس نے اجر پایا اور سعادت مند ہوا اور جس نے انکار اور شک کیا وہ گنہگار ہوا اور حق سے دور ہو گیا۔ ہمیں ابو یوسف بن یعقوب القاضی نے بتایا۔ انہوں نے کہا: ہمیں محمد بن ابی بکر نے بتایا، انہوں نے کہا: ہمیں عبدالرحمن بن مہدی نے بتایا۔ انہوں نے سفیان سے انہوں نے اعمش سے انہوں نے عمارہ سے انہوں نے حریث بن ظہیر سے انہوں نے حضرت عبداللہ سے روایت کیا، فرمایا: کوئی مومن ایمان بالغیب سے افضل ایمان نہیں لایا پھر یہ آیت پڑھی: الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ۔

میں کہتا ہوں: یہ قول متشابہ اور اس کے حکم کے متعلق ہے اور یہ صحیح ہے جیسا کہ اس کا بیان سورۂ آل عمران میں آئے گا۔ بہت سے علماء کبار نے فرمایا بلکہ ان کے متعلق ہم پر گفتگو کرنا واجب ہے تاکہ ہم وہ فوائد نکالیں جو ان کے ضمن میں ہیں اور وہ معانی نکالیں جو ان سے نکل سکتے ہیں، اس کے متعلق علماء کے مختلف اقوال ہیں: حضرت ابن عباس سے مروی ہے اور حضرت

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 82، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

علی بنی اللہ سے مروی ہے کہ قرآن میں حروف مقطعہ اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے مگر ہم نہیں جانتے کہ اس کی ان حروف سے تالیف کیسی ہے (1)، قطرب اور فراء وغیرہما نے کہا: یہ حروف ہجاء کی طرف اشارہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب عربوں کو چیلنج فرمایا تو انہیں ان کے ساتھ بتایا کہ یہ قرآن ان حروف سے مرکب ہے جن پر ان کے کلام کی بنیاد ہے تا کہ ان کا اس سے عجز زیادہ ظاہر ہو جائے کیونکہ اس نے ان کے کلام سے خروج نہیں کیا۔ قطرب نے کہا: وہ لوگ قرآن کو سننے سے بھاگتے تھے جب وہ سنتے تھے الم، المص۔ انہوں نے اس لفظ کو عجیب سمجھا۔ جب وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سننے کے لئے خاموش ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرکب قرآن ان پر پڑھا تا کہ قرآن کو ان کے کانوں میں ثابت کر دیں اور ان پر حجت قائم کر دیں۔ ایک قوم نے کہا: روایت ہے کہ مشرکین نے جب مکہ میں قرآن سننے سے یہ اعراض کیا تو انہوں نے کہا: لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَ الْغَوْا فِيْهِ (فصلت: 26)۔ مت سنا کرو اس قرآن کو اور شور وغل مچا دیا کرو اس کی تلاوت کے درمیان تو یہ حروف مقطعات نازل ہوئے تا کہ وہ اس پر تعجب کریں پھر اپنے کانوں کو اس کی طرف متوجہ کریں اور اس کے قرآن کو سنیں تا کہ ان پر حجت لازم ہو جائے۔ بعض علماء فرماتے ہیں: یہ حروف اسماء پر دلالت کرتے ہیں، اسماء سے یہ حروف اخذ کئے گئے ہیں اور ان کے بقیہ حروف کو حذف کیا گیا ہے جیسے حضرت ابن عباس وغیرہ کا قول ہے، الف، اللہ سے ہے، لام، جبریل سے ہے، میم، محمد سے ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الف، اسم اللہ کی چابی ہے، لام، لطیف کی چابی ہے، میم، اسم مجید کی چابی ہے۔ ابوالضحیٰ نے حضرت ابن عباس سے الٓمّٓ کے قول میں روایت کیا ہے، فرمایا: انا اللہ اعلم۔ الٓرٰ۔ انا اللہ اری۔ المص۔ انا اللہ افصل۔ (2) الف انا کے معنی کو ادا کرتا ہے، لام اللہ کے اسم کا معنی ادا کرتا ہے اور میم اعلم کا معنی ادا کرتا ہے۔ اس قول کو زجاج نے پسند کیا ہے۔ زجاج نے کہا: میرا خیال یہ ہے کہ ان حروف میں سے ہر حرف ایک معنی ادا کرتا ہے۔ عرب بھی نظماً اور فصحاً حروف مقطعات کو ان کلمات کے بدل بولتے ہیں جن سے یہ حروف مشتق ہیں۔ جیسے شاعر کا قول ہے:

فقلت لها قفي فقالت قاف

میں نے اسے کہا ٹھہر جا تو اس نے کہا: میں ٹھہر گئی۔

شاعر نے یہ ارادہ کیا ہے کہ قالت وقفت۔ زہیر نے کہا:

بالخیر خیرات وان شراً فا ولا أرید الشر اِلّا ان تا

اس سے شاعر نے یہ ارادہ کیا ہے وان شراً فشر اور اِلّا اَنْ تشاء۔ ایک اور شاعر نے کہا:

نادوهم اَلَا الجموا اَلَاتا قالوا جمیعاً کلهم اَلَافا

اس میں شاعر نے الاتر کبون مراد لیا ہے اور انہوں نے کہا: الا فار کبوا اور حدیث پاک میں ہے: من اعان علی قتل مسلم بشطر کلمة۔ (3) شقیق نے کہا: اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اقتل میں سے اُق کہتا ہے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 82، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ ایضاً

3۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 191، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الدیات، باب التغلیظ فی قتل مسلم ظلماً، حدیث 2609، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کفی بالسیف شا۔ اس کا مطلب ہے: شافیا۔

حضرت زید بن اسلم نے کہا: یہ حروف مقطعات سورتوں کے اسماء ہیں۔ کلبی نے کہا: یہ قسمیں ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے شرف اور فضل کی وجہ سے ان کے ساتھ قسمیں اٹھائی ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہیں۔ حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے۔ بعض علماء نے اس قول کو رد کیا ہے۔ فرمایا: ان کا قسم ہونا صحیح نہیں کیونکہ قسم کے لئے مخصوص حروف ہیں مثلاً ان، قد، لقد اور ما اور ان حروف میں سے کوئی حرف یہاں نہیں پایا جاتا۔ پس قسم ہونا جائز نہیں۔ اس کا جواب اس طرح دیا جاتا ہے کہ قسم کی جگہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا رَیْبَ فِیْهِ اگر کوئی انسان قسم اٹھائے تو کہے گا: واللہ ھذا الکتاب لا ریب فیہ۔ تو یہ کلام درست ہوگا اور لا جواب قسم ہوگا۔ پس کلبی کا قول اور جو حضرت ابن عباس سے مروی ہے صحیح اور درست ہے۔

اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قسم اٹھانے میں کیا حکمت ہے۔ اس وقت میں لوگ دو قسم کے تھے: ایک تصدیق کرنے والے اور دوسرے تکذیب کرنے والے۔ تصدیق کرنے والے تو بغیر قسم کے ہی تصدیق کر دیتے ہیں اور مکذب قسم کے ساتھ بھی تصدیق نہیں کرتے؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ قرآن لغت عرب میں نازل ہوا ہے۔ عربوں میں سے جب کوئی اپنے کلام کو مؤکد کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اپنے کلام پر قسم اٹھاتا ہے اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی حجت کو مؤکد کرنے کا ارادہ فرمایا تو قسم اٹھائی کہ قرآن اس کی طرف سے ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الٓمّٓ کا مطلب ہے میں نے تجھ پر یہ کتاب لوح محفوظ سے نازل کی۔ قتادہ نے الٓمّٓ کی تفہیم میں فرمایا: یہ قرآن کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ محمد بن علی ترمذی سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان سورتوں میں جو احکام اور قصص ودیعت فرمائے ہیں وہ ان حروف میں ودیعت فرما دیئے جو ان سورتوں کی ابتدا میں ذکر کئے ہیں۔ ان حقیقتوں کو سوائے نبی یا ولی کے کوئی نہیں جانتا پھر ان حقائق کو سورت میں بیان فرمایا تاکہ لوگ سمجھ سکیں (1)۔ ان اقوال کے علاوہ بھی حروف مقطعات کے بارے میں اقوال موجود ہیں۔ حقیقت حال اللہ بہتر جانتا ہے۔

ان حروف پر وقف ان کے نقصان کی وجہ سے ہے مگر جب ان کو تو مبتدا بنائے گا یا انہیں معطوف کرے گا تو ان کو اعراب دے گا۔ علماء کا اختلاف ہے کہ ان کا اعراب میں کوئی محل ہے یا نہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: ان کا کوئی اعراب نہیں کیونکہ یہ اسماء متمکنہ نہیں ہیں نہ یہ افعال مضارعہ ہیں۔ یہ حروف تہجی کے قائم مقام ہیں۔ پس یہ محکیہ ہیں یہ خلیل اور سیبویہ کا مذہب ہے اور جن علماء نے فرمایا کہ یہ سورتوں کے اسماء ہیں ان کے نزدیک ان کا اعراب مرفوع ہے اس بنا پر کہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہیں یعنی ھذہ الم۔ جیسا کہ تو کہتا ہے: ھذہ سورۃ البقرۃ یا یہ مبتدا ہیں اور ان کی خبر ذالک ہے جیسا کہ تو کہتا ہے زیدٌ ذالک الرجل۔ ابن کیسان نحوی نے کہا الٓمّٓ نصب کی جگہ میں ہے جیسا کہ تو کہتا ہے: اقرأ الم یا علیك الم۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ قسم کی بنا پر جر کی جگہ میں ہیں کیونکہ حضرت ابن عباس کا قول ہے: یہ قسمیں ہیں ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے قسمیں اٹھائی ہیں (2)۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے ھذا الکتاب۔ اور ذٰلِكَ حاضر کی طرف اشارہ کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے اگرچہ یہ وضع غائب کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کیا گیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے متعلق خبر دیتے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 82، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ ایضاً

ہوئے فرمایا: ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۞ (السجدہ) اسی طرح خفاف بن ندبہ کا قول ہے

اقول له و الرمح یاطر متنه   تامل خفافاً اننی انا ذلکا

یعنی انا ھذا۔ پس ذٰلِكَ کا اشارہ قرآن کی طرف ہے۔ یہ ھذا کی جگہ پر رکھا گیا ہے۔ اس کی تلخیص یہ ہے: الم ھذا الکتاب لاریب۔ یہ ابوعبیدہ، عکرمہ وغیرہما کا قول ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ تِلْكَ حُجَّتُنَاۤ اٰتَیْنٰهَاۤ اِبْرٰهِیْمَ (انعام:83) (اور یہ ہماری دلیل تھی جو ہم نے دی ابراہیم کو)۔ تِلْكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَیْكَ بِالْحَقِّ (بقرہ:252) (یہ سب نشانیاں ہیں اللہ کی (قدرت کی) ہم بیان کرتے ہیں انہیں آپ پر حق کے ساتھ)۔ ان آیات میں تِلْكَ بمعنی ھذہ استعمال ہوتا ہے لیکن جب یہ توڑیں گئیں تو گویا وہ دور ہوگئیں۔ بخاری میں ہے، معمر نے ذٰلِكَ الْكِتٰبُ کی تفسیر میں فرمایا: کتاب سے مراد یہ قرآن ہے۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ ۞ یہ بیان اور دلالت ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ ؕ یَحْكُمُ بَیْنَكُمْ (الممتحنہ:10) یعنی ھذا حکم اللہ۔

میں کہتا ہوں: ھذا بمعنی ذالک استعمال ہوتا ہے، مثلاً ام حرام کی حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: یرکبون ثبج ھذا البحر(1)۔ یعنی ذالک البحر، (واللہ اعلم)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ غائب کی طرف اشارہ کے باب پر ہے۔

اس غائب میں علماء کے مختلف دس اقوال ہیں: بعض علماء نے فرمایا: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ سے مراد وہ کتاب ہے جو میں نے مخلوق کی سعادت، شقاوت، عمر اور رزق کے بارے میں لکھی۔ لَا رَیْبَ ۛ فِیْهِ یعنی اس میں کوئی تبدیلی کرنے والا نہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ سے مراد وہ تحریر ہے جو ازل میں میں نے اپنے بارے میں لکھی کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے(2)۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا تو اپنی کتاب میں اپنے بارے میں لکھا اور وہ کتاب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہے کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔ (ایک روایت میں تغلب کی جگہ سبقت کے الفاظ ہیں)(3)۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ اس پر ایسی کتاب نازل کرے گا جس کو پانی نہیں مٹا سکے گا۔ پس اسی وعدہ کی طرف اشارہ فرمایا، جیسا کہ صحیح مسلم میں عیاض بن حمار مجاشعی کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اہل زمین کی طرف دیکھا اور اس کے عرب وعجم پر ناراضگی کا اظہار کیا سوائے اہل کتاب کے بقیہ لوگوں کے۔ اور فرمایا: میں نے تجھے مبعوث فرمایا تاکہ تجھے آزمائش میں ڈالوں اور تیرے ذریعے آزماؤں، میں تجھ پر ایک کتاب نازل کروں گا جس کو

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 391، جلد 1 (وزارت تعلیم)

ایضاً، کتاب الجہاد، باب الدعاء بالجہاد والشہادۃ للرجال والنساء، حدیث 2580، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب التوبہ، باب سعۃ رحمۃ اللہ تعالیٰ وانہا سبقت غضبہ، صفحہ 356، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ ایضاً

پانی صاف نہیں کر دے گا، تو اسے نیند اور بیداری کی حالت میں پڑھے گا(1)۔ (الحدیث)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ قرآن کے اس حصہ کی طرف اشارہ ہے جو مکہ میں نازل ہوا تھا۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جب نبی کریم ﷺ پر مکہ میں یہ ارشاد نازل فرمایا تھا: اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ۝ (المزمل) (بیشک ہم جلدی ہی القا کریں گے آپ پر ایک بھاری کلام)۔ رسول اللہ ﷺ اپنے رب کی طرف سے اس وعدہ کے پورا ہونے کے منتظر رہتے تھے۔ پھر جب مدینہ طیبہ میں الٓمّٓ ۚ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ ۛ فِیْهِ نازل ہوا۔ اس میں اس قرآن کا معنی ہے جو میں نے تم پر مدینہ طیبہ میں اتارا۔ یہ وہ کتاب ہے جس کا میں نے تجھ سے مکہ میں وعدہ کیا تھا کہ میں تیری طرف وحی کروں گا۔ بعض علماء نے فرمایا: ذٰلِكَ سے اس کلام کی طرف اشارہ ہے جو تورات اور انجیل میں ہے اور الٓمّٓ قرآن کا اسم ہے تقدیر کلام یہ ہوگا: یہ قرآن وہ کتاب ہے جس کی تفسیر تورات اور انجیل میں کی گئی ہے یعنی تورات اور انجیل اس کی صحت کے گواہ ہیں اور جو معانی تورات اور انجیل میں ہیں ان کا یہ جامع ہے اور جو کچھ ان میں نہیں وہ بھی اس میں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ تورات اور انجیل دونوں کی طرف اشارہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ الٓمّٓ دو کتابیں ہیں یا ان دو کتابوں کی مثل ہے یعنی یہ قرآن ان دونوں کتابوں کے معانی وحقائق کا جامع ہے، پس تثنیہ کو ذٰلِكَ سے تعبیر فرمایا اس کی مثال قرآن میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ۭ عَوَانٌۢ بَیْنَ ذٰلِكَ (البقرہ:68) (کہ وہ گائے ہے جو نہ بوڑھی ہو اور نہ بالکل بچی (بلکہ) درمیانی عمر ہو)۔ یہاں بَیْنَ ذٰلِكَ بمعنی بین تینک ہے یعنی بوڑھی اور جوان کے درمیان ہو۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ بعض علماء نے فرمایا: ذٰلِكَ لوح محفوظ کی طرف اشارہ ہے۔ کسائی نے کہا ذٰلِكَ اس قرآن کی طرف اشارہ ہے جو آسمان میں تھا اور ابھی نازل نہیں ہوا تھا۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ محمد ﷺ پر ایک کتاب نازل کرے گا۔ پس یہ اشارہ اس وعدہ کی طرف ہے(2)۔ المبرد نے کہا: معنی یہ ہے کہ یہ قرآن وہ کتاب ہے جس کے وسیلہ سے تم کفار پر فتح طلب کیا کرتے تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اشارہ ہے حروف معجمہ کی طرف، اس کے قول پر جو کہتا ہے: الٓمّٓ سے مراد وہ حروف ہیں جن پر قرآن نظم کر کے میں نے تمہیں چیلنج کیا ہے(3)۔

کتاب: کتب یکتب سے مصدر ہے۔ اس کا معنی ہے: جمع کرنا۔ اسی وجہ سے لشکر کو کتیبہ کہا جاتا ہے اس کے اجتماع کی وجہ سے۔ عرب کہتے ہیں: تکتبت الخیل جو گھوڑے چھوٹے چھوٹے لشکر ہو جائیں۔ کتبت البغلۃ کہا جاتا ہے۔ جب بغلہ کے رحم کو حلقہ یا دھاگہ کے ساتھ جمع کر دیا جائے۔ شاعر نے کہا:

لا تامنن فزاریا حللت بہ ۔۔۔ علی قلوصك واکتبها باسیار

الکتبہ (کاف کے ضمہ کے ساتھ) اس کا معنی الخرزۃ۔ سینے کا تسمہ ہے اور اس کی جمع کُتَبٌ ہے اور الکتب الخرز یعنی تسمہ۔ ذوالرمہ کا شعر ہے:

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمها واهلها، باب الصفات التی یعرف بها فی الدنیا اهل الجنۃ واهل النار، صفحہ 385، جلد 2

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 83، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

3۔ ایضاً

وفراء غرفیة اثأی خوارزھا مشلشل ضیعته بینھا الکتب

اس شعر میں یہ لفظ اسی مفہوم میں شاعر نے استعمال کیا ہے۔

کتاب کاتب کے حروف معجمہ لکھنے کو کہتے ہیں خواہ وہ حروف جمع ہوں یا جدا جدا ہوں اس کتاب کہا جاتا ہے اگرچہ مکتوب ہو، جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

تومل رجعة منی و فیھا کتابٌ مثل ما لصق الغراء

اس میں مذکورہ مفہوم میں کتاب کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

کتاب کا معنی فرض، حکم اور القدر بھی ہے۔ جعدی کا قول ہے:

یابنة عمی کتاب الله اخرجنی عنکم وھل امنعن الله ما فعلا

اس میں شاعر نے کتاب سے مراد فرض، حکم لیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَا رَیْبَ ۛ فِیْهِ۔ یہ نفی عام ہے، اسی وجہ سے رَیْبَ کو اس کے ساتھ نصب دی گئی ہے، رَیْبَ کے تین معانی ہیں۔

۱۔ شک: عبداللہ بن الزبیری نے کہا:

لیس فی الحق یا امیة ریبٌ انما الریب ما یقول الجھول

اے امیہ! حق میں کوئی شک نہیں، شک تو اس میں ہوتا ہے جو جاہل کہتا ہے۔

۲۔ تہمت: جمیل نے کہا:

بثینة قالت یا جمیل اربتنی فقلت کلانا یابثین مریب

بثینہ نے کہا: اے جمیل! تو نے مجھ پر تہمت لگائی۔ میں نے کہا: ہم میں سے ہر ایک اے بثین تہمت لگانے والا ہے۔

۳۔ حاجت: شاعر (کعب بن مالک) نے کہا:

قضینا من تھامة کل ریب و خیبر ثم اجمعنا السیوفا

ہم نے تہامہ اور خیبر سے ہر حاجت کو پورا کر لیا پھر ہم نے تلواروں کو جمع کیا۔

پس اللہ کی کتاب میں کوئی شک وارتیاب نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی ذات میں حق ہے وہ اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے اور اس کی صفات میں سے ایک صفت غیر مخلوق اور غیر حادث ہے اگرچہ کفار کے لئے شک واقع ہوا ہے۔ **بعض علماء** نے فرمایا: یہ خبر ہے اور اس کا معنی نہی ہے یعنی تم اس میں شک نہ کرو۔ کلام مکمل ہے۔ گویا فرمایا: یہ کتاب حق ہے، تو کہتا ہے: رابنی ھذا الامر۔ جب وہ امر شک اور خوف کو داخل کردے۔ اراب، شک والا ہو گیا۔ **فھو مریبٌ**، **رابنی امرہ**، **ریبُ الدھر**۔ زمانہ کی گردشیں۔

اس کے متعلق چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِيْهِ اس میں ھاء فی کی وجہ سے حالت جری میں ہے، اس میں پانچ وجوہ ہیں عمدہ ترین وجہ فیہِ ھدی اور اس کے قریب پھر فیہُ ھدی (بغیر واؤ کے ھاء کے ضمہ کے ساتھ) یہ زہری، سلام اور ابوالمنذر کی قراءت ہے۔ پھر اس کے قریب فیھی ھدی ہے یعنی (یاء کے اثبات کے ساتھ) یہ ابن کثیر کی قراءت ہے۔ اس میں فیھو ھدی (واؤ کے ساتھ) بھی جائز ہے، اس میں فیہ ھدیً مدغم کر کے پڑھنا جائز ہے، ھدی کا رفع مبتدا ہونے کی بنا پر ہے اور فِيْهِ خبر ہے، الھدیٰ عرب کلام میں الرشد اور بیان کے معنی میں ہوتا ہے یعنی اس میں اہل معرفت کے لئے کشف، رشد، بیان کی زیادتی اور رہنمائی ہے۔

مسئلہ نمبر 2: الھدیٰ، ھدیان، ھدیٰ کا معنی دلالت ہے۔ یہ وہ ہے جس پر رسول اور ان کے متبعین قادر ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝ (الرعد) (اور ہر قوم کے لئے آپ ہادی ہیں)۔ اور ارشاد ہے: وَ اِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (الشوریٰ) (اور بلاشبہ آپ رہنمائی فرماتے ہیں صراط مستقیم کی طرف)۔ اللہ تعالیٰ نے رسل کے لئے ہدایت کو ثابت فرمایا جس کا معنی ہے دلالت، دعوت اور تنبیہ۔ اور وہ ہدایت جس کا معنی تائید اور توفیق ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا: اِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (الشوریٰ: 52)۔ (بے شک آپ ہدایت نہیں دے سکتے جس کو آپ پسند کریں)۔

پس اس اعتبار سے هُدًى کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کو دل میں پیدا فرمایا۔ اس مفہوم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُولٰٓىِٕكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ (البقرہ: 5) (وہی لوگ ہدایت پر ہیں اپنے رب (کی توفیق) سے) اور ارشاد ہے يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (البقرہ: 142) ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔ الھدی اور الاھتداء اس کا معنی ارشاد کے معنی کی طرف راجع ہے، جیسے بھی تو اس کا صیغہ بنائے۔ ابوالمعالی نے کہا: کبھی ہدایۃ کا لفظ وارد ہوتا ہے اور اس سے مراد مومنین کی جنت کے راستوں اور جنت تک پہنچانے والے طرق کی طرف رہنمائی کرنا ہوتا ہے۔ اسی مفہوم میں مجاہدین کی صفت میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝ سَيَهْدِيْهِمْ (محمد: 4) اسی مفہوم میں یہ ارشاد ہے: فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ۝ (صافات) اس کا معنی ہے انہیں جحیم کے راستہ کی طرف چلاؤ۔

مسئلہ نمبر 3: الھدیٰ لفظ مونث ہے۔ فراء نے کہا: بعض بنی اسد الھدی کو مونث استعمال کرتے ہیں۔ کہتے ہیں: ھذہ ھُدی حسنۃ۔ اور لحیانی نے کہا: یہ مذکر ہے، اس پر اعراب نہیں آتا، یہ اسم مقصور ہے اور الف پر حرکت نہیں آتی۔ یہ حرف جر کے ساتھ اور بغیر حرف جر کے متعدی ہوتا ہے۔ سورۂ فاتحہ میں یہ گزر چکا ہے، تو کہتا ہے: ھدیتہ الطریق والی الطریق، والدار والی الدار (یعنی میں نے اسے راستہ کی پہچان کرائی اور گھر کی پہچان کرائی) حرف جر کے متعدی ہونا اہل حجاز کی لغت ہے اور دوسری صورت یعنی بغیر حرف جر کے متعدی ہونا، اخفش نے حکایت کیا ہے اور قرآن حکیم میں ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ (فاتحہ) (چلا ہم کو سیدھے راستے پر)۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا (الاعراف: 43)۔ ساری تعریفیں اللہ کیلئے ہیں جس نے راہ دکھائی ہمیں اس بہشت کی۔

بعض علماء نے فرمایا: الھدی دن کے اسماء میں سے ایک اسم ہے کیونکہ لوگ دن میں اپنی معیشت اور [illegible] کے لئے راستوں پر نکلتے ہیں۔ اسی سے ابن مقبل کا قول ہے:

حتی استبنت الھدی والبید ھاجمۃ   یخشعن فی الآل غلفا او یصلینا

اس شعر میں الھدی، دن کے لئے استعمال ہوا ہے۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِّلْمُتَّقِيْنَ۔ اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے ساتھ المتقین کو خاص فرمایا ہے اگرچہ قرآن ساری مخلوق کے لئے ہے یہ متقین کو شرف بخشنے کے لئے فرمایا ہے کیونکہ وہ ایمان لائے اور جو کچھ اس قرآن میں ہے اس کی تصدیق کی۔ ابوروق سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ یعنی متقین کی عزت وشرف کے لئے ہدایت کو متقین کے لئے ذکر فرمایا اور ان کی فضیلت وعظمت کے لئے یہ فرمایا۔

متقین اصل میں الموتقیین تھا یعنی دو یاؤں کے ساتھ تھا، پہلی یاء کے کسرہ کو اس کے ثقل کی وجہ سے حذف کر دیا گیا پھر التقاء ساکنین کی وجہ سے یاء کو حذف کر دیا گیا اور واو اور تاء کے اجتماع کی صورت میں واو کو تا سے بدل دیا گیا پھر تاء کو تاء میں ادغام کیا گیا، پس یہ متقین بن گیا۔

مسئلہ نمبر 5: التقویٰ اس کا اصل میں لغوی معنی قلت کلام ہے۔ ابن فارس نے یہ معنی حکایت کیا ہے۔ اسی مفہوم میں حدیث شریف ہے التقی ملجم، کم کلام کرنے والا لگام دیا گیا ہے۔ متقی، مومن اور اطاعت کرنے والے سے بلند درجہ ہے، یہ وہ شخص ہوتا ہے جو اپنے نیک عمل اور خالص دعا کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچتا ہے۔ یہ اتقاء المکروہ بما تجعلہ حاجزاً بینك و بینہ سے مشتق ہے یعنی جس کو تو اپنے اور مکروہ چیز کے درمیان آڑ بناتا ہے جیسا کہ نابغہ نے کہا تھا:

سقط النصیف و لم ترد اسقاطہ   فتناولتہٗ واتقتنا بالید

اس کی اوڑھنی گر گئی اور اس نے اس کو گرانے کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ پس اس نے اس کو پکڑ لیا اور ہاتھ سے ہمیں بچا لیا۔

ایک اور شاعر نے کہا:

فالقت قناعاً دونہ الشمس واتقت   باحسن موصولین کف و معصم

اس نے دھوپ سے بچاؤ کیلئے پردہ ڈالا اور ہاتھ اور کلائی دونوں خوبصورت ملی ہوئی چیزوں کے ساتھ بچاؤ کیا۔

ابومحمد عبدالغنی الحافظ نے سعید بن زربی ابوعبیدہ بن عاصم بن بھدلہ عن زر بن جیش عن ابن مسعود کے سلسلہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: ابن مسعود نے ایک اپنے بھتیجے سے کہا: اے میرے بھتیجے! تو کتنے زیادہ لوگ دیکھتا ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا: ان میں کوئی خیر نہیں ہے سوائے تائب توبہ کرنے والے اور گناہوں سے بچنے والے کے۔ پھر فرمایا: اے میرے بھائی کے بیٹے! تو لوگوں کو دیکھتا ہے کتنے زیادہ ہیں؟ میں نے کہا: کیوں نہیں۔ فرمایا: ان میں کوئی خیر نہیں ہے سوائے عالم یا متعلم کے۔

ابو یزید بسطامی نے کہا: متقی وہ ہے جب بات کرے تو اللہ کے لئے بات کرے اور جب عمل کرے تو اللہ کے لئے عمل

کرے، ابوسلیمان دارانی نے کہا: المتقین وہ ہیں جن کے دلوں سے اللہ تعالیٰ نے خواہشات کی محبت ختم کر دی۔ بعض علماء نے فرمایا: متقی وہ ہے جو شرک سے بچتا ہے اور نفاق سے بری ہوتا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ قول فاسد ہے کیونکہ کبھی ایک شخص شرک ونفاق سے پاک ہوتا ہے لیکن وہ فاسق ہوتا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب نے حضرت ابی سے تقویٰ کے متعلق پوچھ، تو حضرت ابی نے کہا: کیا تم نے کانٹوں والا راستہ پایا ہے؟ حضرت عمر نے کہا: ہاں۔ حضرت ابی نے کہا: پھر تم نے اس سے گزرتے ہوئے کیا کیا تھا۔ حضرت عمر نے کہا: میں نے کپڑے اوپر کر لئے اور بچ کے احتیاط سے گزرا۔ حضرت ابی نے کہا: یہ تقویٰ ہے ابن المعتز نے یہی معنی لیا ہے اور اسے نظم کیا ہے:

خل الذنوب صغيرها و كبيرها ذاك التقى

واصنع كماش فوق ار ض الشوك يحذر مايرى

لا تحقرن صغيرة ان الجبال من الحصى

ترجمہ: تو گناہ صغیرہ اور کبیرہ کو چھوڑ دے یہی تقویٰ ہے اور تو کانٹوں والی زمین کے اوپر چلنے والے کی طرح کر کہ وہ کانٹوں کو دیکھ کر احتیاط کرتا ہے۔ صغیرہ گناہ کو بھی حقیر نہ سمجھ کیونکہ پہاڑ، کنکریوں سے بنتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 6: تقویٰ میں تمام خیر کے اعمال جمع ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی اولین و آخرین میں وصیت ہے۔ یہ وہ خیر ہے جو انسان حاصل کرتا ہے جیسا کہ حضرت ابوالدرداء نے کہا، ان سے پوچھا گیا: تمہارے ساتھی شعر کہتے ہیں اور تجھ سے کوئی چیز محفوظ نہیں کی گئی۔ فرمایا:

يريد المرء ان يؤتى مناه و يابى الله الا ما ارادا

يقول المرء فائدتي و مالي و تقوى الله افضل ما استفادا

انسان ارادہ کرتا ہے کہ اس کی خواہش پوری کی جائے اور اللہ تعالیٰ عطا نہیں فرماتا مگر جس کا اللہ ارادہ فرماتا ہے۔

انسان کہتا ہے میرا فائدہ اور میرا مال حالانکہ جو اس نے فائدہ اٹھایا اس میں سے افضل اللہ تعالیٰ کا تقویٰ ہے۔

ابن ماجہ نے اپنی سنن میں حضرت ابوامامہ سے روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ فرماتے تھے: مومن تقویٰ کے بعد نیک بیوی سے بہتر کوئی خیر حاصل نہیں کرتا اگر وہ اسے حکم دے، تو اس کی اطاعت کرے اگر وہ اس کی طرف دیکھے تو اسے خوش کرے اور اس پر کوئی قسم اٹھائے تو اسے سچا کرے، اگر وہ اس سے غائب ہو تو اپنے نفس اور اس کے مال میں اس سے اخلاص کا مظاہرہ کرے (1)۔

تقویٰ اصل میں وقویٰ تھا بروزن فعلیٰ، پھر واو کو تاء سے بدلا گیا یہ وقیتہ، اقیہ سے مشتق ہے یعنی میں نے اسے بچایا رجل تقی، یعنی ڈرنے والا شخص۔ اصل میں وقی تھا اسی طرح تقاۃ اصل میں وقاۃ تھا جیسا کہ عرب کہتے ہیں تجاہ، و تراث اصل میں وُجاہ اور وارث تھا۔

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 135، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب النکاح، باب افضل النساء، حدیث نمبر 1846، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ③

''وہ جو ایمان لائے غیب پر اور صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز اور اس سے جو ہم نے انہیں روزی دی خرچ کرتے ہیں''۔

اس میں چھبیس مسائل ہیں☆۔

مسئلہ نمبر 1: الَّذِیْنَ یہ متقین کی صفت ہونے کے اعتبار سے حالت جری میں ہے اور قطع کے اعتبار سے رفع بھی جائز ہے۔ یعنی اس سے پہلے ھم ضمیر مبتدا محذوف ہوگی اور مدح کے اعتبار سے نصب بھی جائز ہے۔ **یُؤْمِنُوْنَ** کا معنی یصدقون ہے یعنی وہ تصدیق کرتے ہیں۔ الایمان کا لغوی معنی تصدیق کرنا ہے قرآن حکیم میں ہے: **وَ مَاۤ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا** (یوسف: 17) (تو ہماری تصدیق کرنے والا نہیں) ایمان کا لفظ باء اور لام کے ساتھ متعدی ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے: **وَ لَا تُؤْمِنُوْۤا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَكُمْ** (آل عمران: 73) (ایک دوسرے کو تاکید کرتے ہیں کہ مت مانو کسی کی بات، سوائے ان لوگوں کے جو پیروی کرتے ہیں تمہارے دین کی) اور فرمایا: **فَمَاۤ اٰمَنَ لِمُوْسٰۤى** (یونس: 83) (پس نہ ایمان لائے موسیٰ پر) حجاج بن حجاج احول سے مروی ہے (یہ زق العسل سے ملقب ہوتا تھا) فرمایا: میں نے حضرت قتادہ کو یہ فرماتے سنا، اے ابن آدم! اگر تو چستی کے ساتھ نیکی کرنا چاہتا ہے تو تیرا نفس اکتاہٹ، کوتاہی اور بے زاری کی طرف مائل ہوگا، لیکن مومن وہ ہوتا ہے جو تکلیف اٹھانے والا ہوتا ہے، مومن وہ ہوتا ہے جو قوت کا اظہار کرنے ولا ہوتا ہے اور مومن اپنے نفس پر سختی کرنے والا ہوتا ہے، مومنین رات دن اللہ کی بارگاہ میں آواز بلند کرنے والے ہوتے ہیں۔ اللہ کی قسم! بندہ مومن سراً اور علانیۃً ربنا، ربنا کہتا رہتا ہے حتیٰ کہ سراً اور علانیۃً اس کی دعا قبول کی جاتی ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **بِالْغَیْبِ** عرب کلام میں الغیب ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو تجھ سے غائب ہے۔ یہ لفظ اجوف یائی ہے۔ اسی سے کہا جاتا ہے: غابت الشمس تغیب۔ الغیبة معروف ہے و اَغَابَتِ المرأۃُ یعنی وہ عورت جس کا خاوند غائب ہوتا ہے۔ و وقعنالی غیبة و غیابة یعنی ہم زمین کی گہرائی میں واقع ہوئے۔ الغیابۃ کا معنی ہے: الاجنۃ، یعنی گھنے درخت جن میں چھپا جاتا ہے، ہموار زمین کو بھی الغیب کہتے ہیں کیونکہ وہ آنکھ سے غائب ہوتی ہے۔

مسئلہ نمبر 3: مفسرین نے الغیب کی تفسیر میں اختلاف کیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس آیت میں الغیب سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ابن عربی نے اس قول کو ضعیف کہا ہے۔ بعض دوسرے علماء نے کہا: الغیب سے مراد قضاء و قدر ہے۔ بعض علماء نے کہا: الغیب سے مراد قرآن اور اس میں موجود غیوب ہیں۔ بعض علماء نے کہا: اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی جس تک عقل انسانی نہیں پہنچ سکتی مثلاً قیامت کی علامات، عذاب قبر، حشر، نشر، صراط، میزان، جنت، دوزخ۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ اقوال متعارض نہیں ہیں بلکہ ان تمام پر غیب کا اطلاق ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ ایمان شرعی ہے جس کی طرف حدیث جبریل میں اشارہ کیا گیا ہے۔ جب جبریل نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: مجھے ایمان کے متعلق بتائیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو اللہ تعالیٰ، ملائکہ، کتب، رسل، آخرت کے دن پر ایمان لائے اور

1۔ متن میں اسی طرح ہے مگر تفصیل میں پچیس مسائل ہیں۔

خیر و شر کی تقدیر پر ایمان لائے۔ جبریل امین نے کہا: آپ نے سچ فرمایا۔ (آگے مکمل حدیث ذکر کی) (1)۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود نے فرمایا: کوئی مومن ایمان بالغیب سے افضل ایمان نہیں لایا۔ پھر یہ آیت پڑھی: الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ۔ (2)

میں کہتا ہوں۔ قرآن حکیم میں ہے وَّمَا كُنَّا غَآىِٕبِيْنَ ۝ (اعراف) (اور نہ تھے ہم ان سے غائب)۔

اور فرمایا: الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ (انبیاء: 49) (جو اپنے رب سے بن دیکھے ڈرتے ہیں)۔

اللہ تعالیٰ کی ذات آنکھوں سے غائب ہے، اس دنیا میں وہ دیکھی نہیں جاتی لیکن نظر و استدلال کے اعتبار سے غائب نہیں۔ یعنی وہ ایمان لاتے ہیں کہ ان کا رب قادر ہے وہ اعمال پر جزا دے گا، وہ اپنی خلوتوں میں بھی اس سے ڈرتے ہیں جہاں وہ لوگوں سے غائب ہوتے ہیں کیونکہ انہیں علم ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال پر آگاہ ہے۔ اس اعتبار سے آیات متفق ہو جاتی ہیں اور ان میں تعارض نہیں رہتا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ

بعض علماء نے فرمایا: الغیب سے مراد لوگوں کے ضمائر اور قلوب ہیں بخلاف منافقین کے۔ یہ عمدہ قول ہے۔ شاعر نے کہا:

و بالغیب آمنا وقد کان قومنا یصلون للاوثان قبل محمد

ہم دل سے ایمان لائے جبکہ ہماری قوم حضرت محمد ﷺ کی بعثت سے پہلے بتوں کی عبادت کرتی تھی۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ یہ جملہ کا جملہ پر عطف ہے۔ اقامۃ الصلوۃ کا مطلب ہے نماز کو اس کے ارکان، سنن اور اس کی ہیئت کے ساتھ اس کے اوقات میں ادا کرنا، اس کی وضاحت آگے آئے گی۔ کہا جاتا ہے: قام الشیء یعنی اس چیز کو دوام اور ثبوت ہو گیا۔ یہ القیام علی الرجل سے مشتق نہیں ہے۔ یہ تیرے اس قول سے ہے: قام الحق یعنی حق ظاہر ہو گیا اور ثابت ہو گیا۔ شاعر نے کہا:

وقامت الحرب بنا علی ساق

یعنی ہم پر جنگ قائم اور ثابت ہو گئی۔

ایک اور شاعر نے کہا:

واذا یقال أتیتم لم یبرحوا حتی تقیم الخیل سوق طعان

اور جب کہا جاتا ہے تم آ گئے وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلتے حتیٰ کہ گھوڑے نیزوں کے چلنے کو ظاہر کر دیتے ہیں۔

بعض علماء نے فرمایا: يُقِيْمُوْنَ کا معنی یدیمون ہے۔ واقامہ یعنی اس نے اسے ہمیشہ قائم کیا۔ اسی معنی کی طرف حضرت عمر نے اشارہ فرمایا: من حفظها و حافظ علیها حفظ دینہ و من ضیعها فهولما سواها اضیع۔ (جس نے نماز کی حفاظت کی اور اس پر دوام اختیار کیا تو اس نے اپنے دین کو محفوظ کر لیا اور جس نے نماز کو ضائع کیا وہ نماز کے علاوہ احکام کو زیادہ ضائع کرنے والا ہو گا)۔

1۔ صحیح بخاری، باب سوال جبریل النبی عن الایمان والاسلام والاحسان، حدیث نمبر 48، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، حدیث جبریل، صفحہ 27، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

مسئلہ نمبر 5: اقامۃ الصلاۃ معروف ہے اور جمہور کے نزدیک یہ سنت ہے کیونکہ جو اس کے سنن وغیرہ کو ترک کر دیتا ہے اس پر اعادہ نہیں ہے اور اوزاعی، عطا، مجاہد، ابن ابی لیلیٰ کے نزدیک اقامۃ الصلوٰۃ واجب ہے اور جو اقامت کو ترک کرے گا اس پر اعادہ واجب ہوگا، اہل ظواہر کا یہی مسلک ہے۔ امام مالک سے مروی ہے اور ابن عربی نے بھی اس کو اختیار کیا ہے۔ فرمایا: اعرابی والی حدیث میں ہے ''اَقِمْ'' (یعنی نماز قائم کر) یہاں اقامت کا حکم دیا ہے جس طرح تکبیر، استقبال قبلہ اور وضو کا حکم دیا ہے۔

فرمایا: اب تم حدیث پر آگاہ ہو چکے ہو تو امام مالک کی اس روایت کے مطابق قول کرنا واجب ہے وہ یہ کہ اقامت فرض ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس کی کی تحریم تکبیر ہے(1)'' دلیل ہے کہ جس نے تکبیر تحریمہ نہیں کی وہ نماز میں داخل نہیں ہوا۔ پس جو کچھ احرام سے پہلے تھا اس کا حکم یہ ہے کہ اس کی وجہ سے نماز کا اعادہ نہیں کیا جائے گا مگر یہ کہ جس چیز پر علماء کا اجماع ہو تو اسے اجماع کی وجہ سے تسلیم کیا جائے گا جیسے طہارت، قبلہ، وقت اور دوسری اس قسم کی چیزیں۔ بعض علماء نے فرمایا: جس نے جان بوجھ کر اقامت کو ترک کیا وہ نماز کا اعادہ کرے اور یہ اقامت کے وجوب کی وجہ سے نہیں ہے کیونکہ اگر یہ واجب ہوتا تو اس کا سہواً اور عمداً ترک کرنے کا حکم برابر ہوتا۔ یہ اعادہ کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ اس نے سنن کو ہلکا سمجھا۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 6: علماء نے اس شخص کے بارے اختلاف کیا ہے جو نماز کی اقامت سنے تو کیا وہ جلدی چلے یا نہیں۔ اکثر علماء کا خیال ہے کہ وہ جلدی نہ چلے اگرچہ اسے رکعت کے فوت ہونے کا اندیشہ بھی ہو کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''جب نماز کھڑی ہو جائے تو تم دوڑتے ہوئے نہ آؤ بلکہ تم اس حال میں چلتے ہوئے آؤ کہ تم پر وقار ہو پھر جو نماز جماعت کے ساتھ پالو وہ پڑھ لو اور جو فوت ہو جائے وہ مکمل کر لو(2)''۔ اس حدیث کو حضرت ابو ہریرہ نے روایت کیا ہے اور امام مسلم نے نقل کی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب نماز کے لئے تکبیر کہی جائے تو تم میں سے کوئی نماز کی طرف دوڑ کر نہ آئے بلکہ چل کر آئے جبکہ اس پر سکینت اور وقار ہو، جو تو پائے وہ امام کے ساتھ پڑھ لے اور جو وہ تجھ سے پہلے پڑھ چکا ہے اس کو بعد میں پڑھ لے(3)'' یہ (صراحۃً) نص ہے معنی کے اعتبار سے کہ جب وہ تیز چلے گا تو اس کا سانس اکھڑا ہوا ہوگا اور اس پر نماز میں داخل ہونا اس کی قراءت اور خشوع سب میں تشویش ہوگی۔ سابقین علماء کی ایک جماعت جن میں حضرات ابن عمر اور ابن مسعود بھی ہیں، مذکور نظریہ سے اختلاف کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: جب رکعت کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو وہ تیز چلے۔ اسحاق نے کہا: جب رکعت کے فوت ہونے کا خوف ہو تو تیز چلے۔ امام مالک سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ فرمایا: اس شخص کے لئے کوئی حرج نہیں جو گھوڑے پر سوار ہو تو اسے نماز کے لئے تیز چلائے۔ بعض نے پیدل چلنے والے اور سوار کے درمیان فرق کیا ہے کیونکہ سوار کا سانس اس طرح اکھڑا ہوا نہیں ہوگا جس طرح پیدل چلنے والے کا ہوگا۔

1۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 9، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الطہارۃ، باب فرض الوضوء، حدیث نمبر 56، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 124، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، باب المشی الی الجمعۃ، حدیث نمبر 857، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ موطا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ، باب ما جاء فی النداء للصلوٰۃ، صفحہ 53، جلد 1 (وزارت تعلیم)

میں کہتا ہوں: رسول اللہ ﷺ کی سنت پر عمل کرنا ہر حال میں اولیٰ ہے۔ پس وہ وقار اور سکون کے ساتھ چلے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کیونکہ وہ نماز میں ہے اور یہ محال ہے کہ آپ ﷺ کی خبر اس کے خلاف ہو جو آپ ﷺ نے خبر دی ہو۔ پس جس طرح نماز میں داخل ہونے والے پر سکینت اور وقار لازم ہے اسی طرح نماز کے لئے جانے والے پر ہے تاکہ اسے اس کے ساتھ مشابہت حاصل ہو اور اس کی صحت پر دلیل وہ حدیث ہے جو ہم نے ذکر کی ہے اور وہ حدیث ہے جو دارمی نے اپنی مسند میں روایت کی ہے۔ حضرت کعب بن عجرہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تو وضو کرے اور مسجد کی طرف جانے کا ارادہ کرے تو اپنی انگلیوں کو انگلیوں میں مت ڈال کیونکہ تو نماز میں ہے (1)''۔ اس حدیث میں آپ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ صحیح ہے کہ یہ عمل جلدی چلنے سے کم ہے نماز کی طرف جانے والے کو نماز پڑھنے والے کی طرح بنایا ہے۔ یہ تمام سنن اللہ تعالیٰ کے ارشاد فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ (الجمعہ:9) کا معنی واضح کرتی ہیں۔ اس سے مراد تیز چلنا نہیں ہے بلکہ اس سے مراد جمعہ کی تیاری کرنا ہے۔ امام مالک نے اسی طرح کی تفسیر فرمائی ہے۔

مسئلہ نمبر 7: نبی کریم ﷺ کے ارشاد و ما فاتکم فاتموا (2) (جو نماز امام کے پیچھے رہ جائے اسے مکمل کرلو) اور واقض ما سبقك (3) (جو امام تجھ سے پہلے پڑھ چکا ہے اسے ادا کرلو) کی تعبیر میں علماء کا اختلاف ہے۔ کیا یہ دونوں ہم معنی ہیں یا نہیں؟ بعض علماء نے فرمایا: یہ دونوں ہم معنی ہیں، کبھی قضاء کا لفظ بولا جاتا ہے اور مراد تمام ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ (الجمعہ:10) (جب تمام مکمل کرلو) اور فرمایا: فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ (البقرہ:200) (جب تم اپنے مناسک حج مکمل کرلو) اور بعض علماء نے فرمایا: ان دونوں جملوں کا معنی مختلف ہے اور یہی قول صحیح ہے۔ اس اختلاف کی بنا پر یہ اختلاف مرتب ہوتا ہے کہ جو شخص نماز میں شریک ہوتا ہے یہ اس کی نماز کا اول ہے یا اس کی نماز کا آخر ہے، پہلے قول کی طرف مالکیوں کی رائے گئی ہے ان میں ابن قاسم بھی ہے لیکن فوت شدہ نماز کو الحمد اور سورت کے ساتھ قضا کرے۔ پس وہ افعال میں بنا کرنے والا ہوگا اور اقوال میں قضا کرنے والا ہوگا۔

ابن عبد البر نے کہا: یہ مشہور مذہب ہے۔ ابن خویز منداد نے کہا: وہ قول جس پر ہمارے اصحاب کا نظریہ قائم ہے وہ یہی ہے اور یہی قول اوزاعی، شافعی، محمد بن حسن، احمد بن حنبل، طبری اور داؤد بن علی کا ہے۔ اشہب نے روایت کیا ہے، یہ وہی قول ہے جو ابن عبد الحکم نے مالک سے روایت کیا ہے۔ عیسیٰ نے ابن قاسم عن مالک کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ جو اس نے امام کے ساتھ نماز پائی وہ اس کی آخری نماز ہے اور وہ افعال و اقوال میں قضا کرنے والا ہے۔ یہی کوفہ کے علماء کا قول ہے۔

قاضی ابو محمد عبد الوہاب نے کہا: یہی امام مالک کا مشہور مذہب ہے۔ ابن عبد البر نے کہا: جن علماء نے امام کے ساتھ پائی جانے والی نماز کو پہلی نماز قرار دیا میرا خیال ہے انہوں نے احرام (تکبیر تحریمہ) کی رعایت کی کیونکہ احرام (تکبیر تحریمہ) نماز کے آغاز میں ہوتی ہے اور تشہد اور سلام نماز کے آخر میں ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے انہوں نے فرمایا: جو اس نے امام کے ساتھ

1۔ جامع ترمذی، صفحہ 51، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ابواب الصلوٰۃ، باب ماجاء فی کراھیۃ التشبیک بین الاصابع فی الصلوٰۃ

2۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب استحباب اتیان الصلوٰۃ بوقار و سکینۃ والنھی عن اتیانھا سعیا، صفحہ 220، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ) 3۔ ایضاً

نماز پائی وہ اس کی پہلی نماز ہے، اس کے ساتھ ساتھ سنت میں فاتموا کا ارشاد وارد ہے اور تمام آخر ہوتا ہے۔

دوسرے علماء نے فاقضوا کے ارشاد سے حجت پکڑی ہے، وہ جو قضا کرتا ہے وہ پہلی نماز کو فوت کرنے والا ہے، مگر فاتموا کی روایت زیادہ راویوں سے مروی ہے اور اس شخص کے قول پر یہ درست نہیں جس نے کہا: جو امام کے ساتھ نماز پائی وہ پہلی نماز ہے اور یہ عام ہے مگر عبدالعزیز بن ابی سلمہ، الماجشون، المزنی، اسحاق اور داؤد نے کہا: اگر امام کے ساتھ نماز پائے تو الحمد اور سورت پڑھے اور جب بقیہ نماز کو قضا کرنے کے لئے کھڑا ہو تو صرف الحمد پڑھے۔ یہ ان کی اصل قول اور فعل پر عام ہے۔

مسئلہ نمبر 8: اقامت نفلی نماز کے شروع کرنے سے مانع ہے۔ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب نماز کھڑی ہو جائے تو فرضی نماز کے علاوہ کوئی نماز نہیں (1)۔ اس حدیث کو مسلم وغیرہ نے روایت کیا ہے مگر جب کوئی پہلے نوافل شروع کر چکا ہو تو وہ انہیں نہ توڑے کیونکہ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ ۝ (محمد) (اپنے اعمال کو باطل نہ کرو) خصوصاً جبکہ ایک رکعت پڑھ چکا ہو۔ بعض علماء نے فرمایا: نوافل کو توڑ دے کیونکہ حدیث کا حکم عام ہے۔

مسئلہ نمبر 9: علماء کا اس شخص کے بارے اختلاف ہے جو مسجد میں داخل ہوا اور اس نے فجر کی دو سنتیں نہ پڑھی ہوں۔ پھر نماز کھڑی ہو جائے۔

امام مالک نے فرمایا: امام کے ساتھ نماز میں شامل ہو جائے اور سنتیں ادا نہ کرے اور اگر مسجد میں داخل نہ ہوا ہو اور اسے ایک رکعت کے فوت ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو وہ مسجد کے باہر سنتیں ادا کرے مسجد کے احاطہ میں سنتیں ادا نہ کرے۔ جہاں نماز جمعہ پڑھی جاتی ہے۔ جو مسجد سے متصل ہے۔ اگر اسے پہلی رکعت کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو امام کے ساتھ نماز میں شریک ہو جائے۔ اور پھر یہ سنتیں اگر پڑھنا پسند کرے تو سورج طلوع ہونے کے بعد ادا کرے۔ میرے نزدیک سورج طلوع ہونے کے بعد ان کا ادا کرنا ان کے ترک سے افضل ہے۔

امام ابوحنیفہ اور ان کے مقلدین کہتے ہیں: اگر نمازی کو فرضوں کی دونوں رکعتوں کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو اور دوسری رکعت کے رکوع سے سر اٹھانے سے پہلے امام کو نہ پا سکے تو امام کے ساتھ جماعت میں شامل ہو جائے۔ اگر اسے ایک رکعت فرض پانے کی امید ہو تو فجر کی سنتیں مسجد سے باہر ادا کرے پھر امام کے ساتھ شریک ہو۔ یہی قول امام اوزاعی کا بھی ہے مگر وہ کہتے ہیں: جب تک دوسری رکعت کے فوت ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو مسجد میں سنتیں ادا کرنا جائز ہے۔ ثوری نے کہا: اگر ایک رکعت کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو جماعت کے ساتھ شامل ہو جائے اور سنتیں ادا نہ کرے اور اگر رکعت کے فوت ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو سنتیں پڑھ لے اگرچہ مسجد میں داخل بھی ہو۔ حسن بن حی نے کہا: جنہیں ابن حیان کہا جاتا ہے جب مقیم اقامت سن لے تو پھر فجر کی سنتوں کے علاوہ کوئی نفل نہ پڑھے۔ امام شافعی نے فرمایا: جو مسجد میں داخل ہوا اور جماعت کھڑی ہو جائے تو وہ امام کے ساتھ شریک ہو جائے اور سنتیں ادا نہ کرے، نہ مسجد سے باہر اور نہ مسجد کے اندر۔ اسی طرح طبری نے کہا ہے اور امام احمد بن حنبل نے بھی یہی کہا ہے۔ امام مالک سے بھی یہی حکایت ہے اور یہ قول صحیح ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: ''جب نماز

1۔ صحیح مسلم، کتاب صلوۃ المسافرین وقصرها باب کراهیة الشروع فی نافلة بعد شروع المؤذن فی الاقامة الخ، صفحہ 247، جلد 1

کھڑی ہو جائے تو فرضی نماز کے علاوہ کوئی نماز جائز نہیں (1)'' اور فجر کی دو رکعتیں سنت ہیں یا فضیلت ہیں یا رغبت ہیں اور جھگڑے کے وقت حجت، سنت ہوتی ہے۔ امام مالک اور امام ابوحنیفہ کے قول کی حجت وہ روایت ہے جو حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ حضرت ابن عمر آئے جبکہ امام صبح کی نماز پڑھا رہا تھا۔ پس حضرت ابن عمر نے حضرت حفصہ کے حجرہ میں دو سنتیں ادا فرمائیں پھر امام کے ساتھ فرض نماز پڑھی اور ثوری اور اوزاعی کی حجت میں سے وہ روایت ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ وہ مسجد میں داخل ہوئے جبکہ نماز کھڑی ہو چکی تھی۔ آپ نے مسجد کے اندر ایک ستون کے پاس فجر کی دو رکعتیں ادا فرمائیں پھر نماز میں شریک ہوئے جبکہ حضرات حذیفہ اور ابو موسیٰ بھی وہاں موجود تھے۔ یہ علماء فرماتے ہیں: جب فرضی نماز کو چھوڑ کر مسجد سے باہر نوافل میں مشغول ہونا جائز ہے تو مسجد کے اندر بھی مشغول ہونا جائز ہے۔ امام مسلم نے حضرت عبداللہ بن مالک بن بحینہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: صبح کی نماز کھڑی ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو نماز پڑھتے دیکھا جبکہ مؤذن تکبیر کہہ رہا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تو صبح کی چار رکعتیں پڑھتا ہے (2) اور یہ نبی کریم ﷺ کی طرف سے اس شخص پر انکار تھا جو فجر کی سنتیں مسجد میں پڑھ رہا تھا جبکہ امام فرض پڑھا رہا تھا۔ اس سے یہ استدلال کرنا بھی ممکن ہے کہ فجر کی دو سنتیں اس حال میں ادا کی جائیں تو صحیح ہیں کیونکہ آپ ﷺ نے اس کی نماز ختم نہیں کرائی جبکہ آپ ﷺ اس پر قادر تھے۔

مسئلہ نمبر 10: صلاۃ کا لغوی معنی دعا ہے اور صَلّٰی یُصَلِّی سے مشتق ہے جس کا معنی ہے دعا کرنا۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: اذا دعی احدکم الی طعام فلیجب فان کان مفطراً فلیطعم وان کان صائماً فلیصل (3) (جب تم میں سے کسی کو کھانے کی طرف بلایا جائے تو اس کی دعوت قبول کرے اور اگر روزے سے نہ ہو تو کھانا کھائے اور اگر روزے سے ہو تو دعا کرے)۔ بعض علماء نے فرمایا: اس حدیث میں فلیصل سے مراد بھی معروف نماز ہے۔ پس وہ دعوت دینے والے کے گھر دو رکعتیں پڑھے اور واپس آ جائے لیکن پہلا معنی (دعا کرنا) مشہور ہے اور اکثر علماء کا یہی نظریہ ہے۔ جب حضرت اسماء نے حضرت عبداللہ بن زبیر کو جنم دیا تو حضرت اسماء نے اسے نبی کریم ﷺ کی طرف بھیجا۔ حضرت اسماء نے فرمایا: ثم مسحه و صلی علیه (نبی کریم ﷺ نے اس پر ہاتھ پھیرا اور اس کے لئے دعا کی) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَصَلِّ عَلَيْهِمْ** (توبہ: 103) یعنی ان کیلئے دعا کیجئے۔ اعشیٰ نے کہا:

تقول بنتی و قد قربت مرتحلاً   یا رب جنب ابی الاوصاب والوجعا
علیك مثل الذی صلیت فاغتمضی   نوماً فان لجنب المرء مضطجعا

ان اشعار میں صلاۃ کا لفظ دعا کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اور اعشیٰ نے کہا:

وقابلها الریح فی دنها   و صلی علی دنها و ارتسم

1۔ صحیح مسلم، کتاب صلوۃ المسافرین وقصرھا باب کراھیة الشروع فی نافلة بعد شروع المؤذن فی اقامة الخ، صفحہ 247، جلد 1
ایضاً، بخاری، ابواب صلاۃ الجماعۃ والامامۃ، باب اذا اقیمت الصلوۃ فلا صلوۃ الا المکتوبۃ، حدیث نمبر 623، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ ایضاً 3۔ صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب الامر باجابة الداعی الی دعوة، صفحہ 462، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

اس میں بھی صلاۃ دعا کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

ارتسم الرجل کا معنی ہے، اس نے تکبیر کہی اور دعا کی۔ صحاح میں اس کا یہی معنی درج ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ الصلا سے مشتق ہے اس سے مراد وہ رگ ہے جو پیٹھ کے وسط میں ہوتی ہے اور اس کے آخری حصہ میں جدا ہو جاتی ہے اور اسے گھیر لیتی ہے۔ اسی سے ہے: اخذ المصلی فی سبق الخیل، مصلی گھوڑ دوڑ میں شروع ہوا کیونکہ وہ دوڑ میں شریک ہوتا ہے اور اس کا سر سبقت لے جانے والے کے پچھلے حصہ کے قریب ہوتا ہے۔ پس الصلاۃ اس سے مشتق ہے یا اس لئے کہ نماز کا ایمان کے بعد دوسرا نمبر ہے۔ پس نماز کو گھوڑے سے تشبیہ دی گئی یا اس لئے کہ رکوع کرنے والا اپنے پچھلے حصہ کو دوہرا کرتا ہے۔ الصلا، گھوڑے کی دم کی جگہ کو کہتے ہیں۔ اس کا تثنیہ صلوان ہے۔ المصلی، دوسرے نمبر پر آنے والے کو کہتے ہیں کیونکہ اس کا سر اگلے گھوڑے کے پچھلے حصہ کے قریب ہوتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے نمبر پر تھے دوسرے نمبر پر حضرت ابوبکر تھے اور تیسرے نمبر پر حضرت عمر تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ لزوم سے ماخوذ ہے۔ اسی سے ہے: صَلِیَ بالنار جب وہ آگ کو لازم ہو جائے۔ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ۝ (غاشیہ)

حارث بن عباد نے کہا:

لم اکن من جناتها علم اللّٰه و انی بحرها الیوم صال

اس شعر میں صال، کا مطلب ہے کہ اس کی گرمی کو لازم پکڑنے والا ہے۔

گویا اس صورت میں معنی یہ ہے کہ اس حد پر عبادت کو لازم پکڑنا جس کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ صلیت العود بالنار سے ماخوذ ہے جب تو لکڑی کو سیدھا کرے اور آگ پر گرم کر کے اسے نرم کرے۔ الصلاء، صلاء النار صاد کے کسرہ کے ساتھ ممدود ہے اگر تو صاد کو فتحہ دے گا تو مقصور ہوگا گویا نمازی اپنے نفس کو عبادت میں لگا کر اسے سیدھا کرتا ہے اور نرم کرتا ہے۔ الخارزنجی نے کہا:

فلا تعجل بامرك واستدمه فما صلى عصاك كمستديم

اس میں صلی سیدھا کرنے کے معنی میں ہے۔

الصَّلٰوةُ کا معنی دعا ہے اور الصَّلٰوةُ کا معنی رحمت بھی ہے۔ اسی سے ہے: اللھم صلی علی محمد (1) (اے اللہ! محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر رحمت بھیج) اور الصَّلٰوةُ کا معنی عبادت بھی ہے۔ اسی سے ہے: وَ مَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ (الانفال:35) (یعنی ان کی عبادت بیت اللہ کے پاس نہ تھی) الصَّلٰوةُ کا معنی نفلی نماز بھی ہے۔ اسی معنی میں ہے: وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ (طٰہٰ:132) (اپنے گھر والوں کو نفلی نماز کا حکم دو)۔ صلاۃ کا معنی تسبیح بھی ہے، اسی سے ہے: فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ۝ (صافات) اگر وہ نمازیوں میں سے نہ ہوتا، اسی سے سبحۃ الضحیٰ ہے، چاشت کی نماز۔ بعض علماء نے نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ (بقرہ:30) کی تاویل میں فرمایا: ہم نماز پڑھتے ہیں۔ الصَّلٰوةُ کا معنی قراءت بھی ہے۔ اس معنی میں ہے: وَلَا تَجْهَرْ

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 940، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الدعوات، باب الصلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث 5880، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بِصَلَاتِكَ (الاسراء:110) (اپنی قراءت کو بلند نہ کرو)۔

الصَّلٰوةَ کالفظ مشترک ہے۔ الصَّلٰوةَ اس مکان کو بھی کہتے ہیں جس میں نماز پڑھی جاتی ہے۔ ابن فارس نے یہ معنی بیان کیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: علم ہے جو عبادت کے لئے وضع کیا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کسی زمانہ کو بھی شریعت سے خالی نہیں چھوڑا اور کوئی شرع نماز سے خالی نہیں تھی۔ یہ مفہوم ابو نصر القشیری نے حکایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: اس قول پر اس کا کوئی اشتقاق نہ ہوگا۔

مسئلہ نمبر 11: علماء اصول کا اختلاف ہے کہ کیا یہ اپنے اصلی وضعی ابتدائی لغوی معنی پر باقی ہے۔ اسی طرح ایمان، زکوۃ، صیام اور حج (اپنی اصلی معنی پر باقی ہیں) شرع نے مشروط و احکام کے ساتھ اس میں تصرف فرمایا۔ یا شرع کی طرف سے یہ زیادتی اسے شرع سے پہلے کی وضع ابتدائی کی طرح موضوعہ کر دیتی ہے یہاں بھی اختلاف ہے اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ شریعت، عربی زبان میں ثابت ہے اور قرآن عربی زبان میں نازل ہوا لیکن عربوں کے لئے اسماء میں فیصلہ کا اختیار ہے جیسے دابة پر ہر اس چیز کے لئے وضع کیا گیا ہے جو زمین پر رینگ کر چلے پھر عرف نے اسے چوپائیوں کے لئے خاص کر دیا اسی طرح شرع کے عرف کے لئے اسماء میں انہیں اختیار ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 12: اس آیت میں الصَّلٰوةَ کی مراد میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: فرائض مراد ہیں۔ بعض نے فرمایا: فرائض و نوافل سب مراد ہیں، یہی صحیح ہے کیونکہ لفظ عام ہے اور متقی فرائض و نوافل دونوں ادا کرتا ہے۔

مسئلہ نمبر 13: نماز رزق کا سبب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ (طٰہٰ:132) (اپنے اہل کو نماز کا حکم دو) جیسا کہ اس کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ سورہ طہٰ میں آئے گا اور نماز پیٹ وغیرہ کی تکلیف کے لئے شفا ہے۔ ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''ظہر کی نماز جلدی پڑھی میں نے بھی جلدی کی، نماز پڑھی اور میں بیٹھ گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: اشکمت دردہ (کیا تیرے پیٹ میں درد ہے؟) میں نے کہا: ہاں یارسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اٹھو اور نماز پڑھو کیونکہ نماز میں شفا ہے (1)''۔ ایک روایت میں ہے، اشکمت درد (یعنی تیرے پیٹ میں درد ہے) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو نماز کی طرف پناہ لیتے (2)۔

مسئلہ نمبر 14: نماز صحیح نہیں ہوتی مگر چند شرائط اور فرائض کے ساتھ۔ نماز کی شرائط میں ایک شرط، طہارت ہے جس کے احکام کا بیان سورۂ نساء اور مائدہ میں آئے گا، دوسری شرط شرمگاہ کا ڈھانپنا ہے، اس کا بیان ان شاء اللہ سورۂ اعراف میں آئے گا اور نماز کے فرائض یہ ہیں۔ قبلہ کی طرف منہ کرنا، نیت کرنا، تکبیر تحریمہ، اس کے لئے قیام کرنا، الحمد کی قراءت کرنا، قراءت کے لئے قیام کرنا، رکوع کرنا اس میں طمانیت کا ہونا، رکوع سے سر اٹھانا اور اس میں اعتدال کرنا، سجدہ کرنا اس میں طمانیت کا ہونا، سجدہ سے سر اٹھانا، دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنا اور اس جلوس (بیٹھنے) میں طمانیت کا ہونا، دوسرا سجدہ کرنا اس میں

1۔ ابن ماجہ، کتاب الطب، باب الصلوۃ شفاء، حدیث نمبر 3448، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، ابواب قیام اللیل، باب وقت قیام النبی من اللیل، حدیث نمبر 1124، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

طمانیت کا ہونا۔ ان تمام فرائض کی اصل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جو اس شخص کے بارے میں ہے جسے نبی کریم ﷺ نے نماز سکھائی تھی جب اس نے نماز صحیح ادا نہیں فرمائی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جب نماز کا تو ارادہ کرے تو مکمل وضو کر، پھر قبلہ کی طرف منہ کر پھر تکبیر کہہ پھر قرآن پڑھ جو تجھے میسر ہو، پھر رکوع کر حتیٰ کہ رکوع کرتے ہوئے مطمئن ہو جائے پھر رکوع سے سر اٹھا حتیٰ کہ سیدھا کھڑا ہو جائے پھر سجدہ کر حتیٰ کہ سجدہ کرتے ہوئے مطمئن ہو جائے پھر سجدہ سے سر اٹھا حتیٰ کہ مطمئن ہو کر بیٹھ جا، پھر پوری نماز اسی اطمینان کے ساتھ ادا کر (1)“۔ اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا ہے۔ اس کی مثل حضرت رفاعہ بن رافع کی حدیث ہے جسے دارقطنی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ ہمارے علماء (مالکی علماء) نے فرمایا: نبی کریم ﷺ نے نماز کے ارکان کو بیان فرمایا اور اقامت اور رفع یدین سے، قراءت کی حد سے انتقالات کی تکبیر سے، رکوع و سجود کی تسبیح سے، درمیانی جلسہ سے، تشہد سے، جلسہ اخیرہ سے اور سلام سے سکوت فرمایا۔ اقامت اور سورۂ فاتحہ کی تعیین پر کلام پہلے گزر چکی ہے۔ رفع یدین ہمارے علماء اور عام فقہاء کے نزدیک واجب نہیں ہے، اس کی وجہ حضرت ابو ہریرہ اور حضرت رفاعہ بن رافع کی حدیث ہے۔ داؤد اور بعض ان کے ساتھیوں نے کہا: رفع یدین تکبیر تحریمہ کے وقت واجب ہے۔ داؤد کے بعض ساتھیوں نے کہا: تکبیر تحریمہ، رکوع اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع یدین واجب ہے اور جس نے ہاتھ نہ اٹھائے اس کی نماز باطل ہے۔ یہ حمیدی کا قول ہے اور اوزاعی سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ ان علماء نے نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: صلوا کما رائیتمونی اصلی (2) (تم نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا)۔

اس حدیث کو بخاری نے نقل کیا ہے۔ یہ علماء فرماتے ہیں: ہم پر واجب ہے کہ ہم اس طرح کریں جس طرح ہم نے آپ ﷺ کو کرتے دیکھا کیونکہ آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مراد کو پہچاننے والے ہیں اور حدیث مذکور کی وجہ سے جمہور علماء کے نزدیک تکبیر تحریمہ کے علاوہ باقی تکبیریں مسنون ہیں۔ ابن قاسم جو امام مالک کے شاگرد ہیں، فرماتے ہیں: جس نے نماز میں تین یا اس سے زائد تکبیریں چھوڑ دیں تو وہ سلام سے پہلے سجدہ سہو کرے۔ اگر اس نے سجدہ سہو نہ کیا تو اس کی نماز باطل ہے۔ اگر ایک تکبیر بھول گیا یا دو تکبیریں بھول گیا تو بھی سجدہ سہو کرے لیکن اگر اس صورت میں سجدہ نہ کیا تو اس پر کوئی چیز واجب نہ ہو گی۔ ابن قاسم سے مروی ہے کہ ایک تکبیر بھول جائے تو بھولنے والے پر کچھ واجب نہیں۔ یہ دلیل ہے کہ زیادہ تکبیریں اور کل تکبیریں ان کے نزدیک فرض ہیں، لیکن تھوڑی تکبیریں اگر رہ جائیں تو معاف ہیں۔ اصبغ بن فرج اور عبداللہ بن عبدالحکم نے کہا: اگر کوئی شخص ابتدا سے لے کر انتہا تک تکبیریں نہ کہے جبکہ اس نے تکبیر تحریمہ کہی ہو تو اس پر کوئی چیز واجب نہیں ہے اور اگر تکبیر تحریمہ بھول جائے تو سجدہ سہو کرے۔ اگر سجدہ نہ کرے گا تو بھی کچھ واجب نہ ہو گا۔ پس کسی کے لئے جان بوجھ کر تکبیر کو ترک کرنا مناسب نہیں کیونکہ یہ نماز کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔ اگر اس کو کوئی چھوڑ دے گا تو وہ برا کرے گا اور اس پر کوئی چیز واجب نہ ہو گی اور اس کی نماز ہو جائے گی۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ من کل رکعۃ وانہ اذا لم یحسن الفاتحۃ الخ، صفحہ 170، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 88، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الاذان، باب الاذان للمسافر اذا کانوا جماعۃ، حدیث 595، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں کہتا ہوں: صحیح قول شافعی علماء، کوفی فقہاء اور اہل حدیث کی جماعت اور مالکیوں کا ہے نہ کہ ان علماء کا جو ابن قاسم کے قول کے پیروکار ہیں۔ امام بخاری نے ایک عنوان باندھا ہے باب اتمام التکبیر فی الرکوع والسجود اور اس میں حضرت مطرف بن عبداللہ کی حدیث ذکر کی ہے۔ انہوں نے فرمایا: میں نے اور حضرت عمران بن حصین نے حضرت علی بن ابی طالب کے پیچھے نماز پڑھی۔ حضرت علی جب سجدہ کرتے تو تکبیر کہتے، جب سجدہ سے سر اٹھاتے تو تکبیر کہتے، جب دو رکعتوں سے اٹھتے تو تکبیر کہتے، جب نماز کو حضرت علی نے مکمل فرمایا تو حضرت عمران بن حصین نے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا: اس شخص نے مجھے رسول اللہ ﷺ کی نماز یاد دلا دی ہے یا فرمایا: اس نے ہمیں حضرت محمد ﷺ کی نماز پڑھائی۔ حضرت عکرمہ کی حدیث ہے، فرمایا: میں نے ایک شخص کو مقام ابراہیم کے پاس دیکھا جو نیچے جاتے ہوئے اور اوپر اٹھتے ہوئے تکبیر کہتا تھا اور جب کھڑا ہوتا اور بیٹھتا تو تکبیر کہتا۔ میں نے حضرت ابن عباس کو یہ بتایا تو حضرت ابن عباس نے فرمایا: کیا یہی نبی کریم ﷺ کی نماز نہیں ہے (1) (تیری ماں نہ ہو)۔ امام بخاری نے تیری رہنمائی فرمائی کہ تکبیر ان کے نزدیک معمول بہ نہیں تھی۔

ابو اسحاق السبیعی نے یزید بن ابی مریم سے انہوں نے حضرت ابو موسیٰ اشعری سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت علی نے جنگ جمل کے دن نماز پڑھائی جس کے ساتھ ہمیں رسول اللہ ﷺ کی نماز یاد دلا دی۔ آپ ﷺ نیچے جاتے ہوئے، اوپر اٹھتے ہوئے، قیام کرتے ہوئے، بیٹھتے ہوئے تکبیر کہتے تھے (2)۔ حضرت ابو موسیٰ نے کہا: ہم نے یا تو ان تکبیروں کو بھول کر ترک کر دیا یا جان بوجھ کر ترک کر دیا۔ میں کہتا ہوں: کیا تو انہیں دیکھتا ہے کہ انہوں نے نماز کا اعادہ کیا۔ پس کیسے کہا جا سکتا ہے کہ جس نے تکبیر کو ترک کیا اس کی نماز باطل ہے اگر یہ ایسا ہوتا تو سنت اور فرض کے درمیان فرق نہ ہوتا۔ جب کوئی چیز انفراداً واجب نہ ہو تو وہ جمعاً بھی واجب نہیں ہوتی۔ وباللہ التوفیق

مسئلہ نمبر 15: رکوع و سجود میں تسبیح جمہور علماء کے نزدیک مذکور حدیث کی وجہ سے واجب نہیں۔ اسحاق بن راہویہ نے تسبیحات کو واجب قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک جس نے تسبیحات کو ترک کیا وہ نماز کا اعادہ کرے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''رکوع میں رب کی تعظیم بیان کرو اور سجدہ میں دعا میں اجتہاد کرو، یہ اس لائق ہے کہ تمہاری دعا قبول کی جائے'' (3)۔

مسئلہ نمبر 16: جلوس اور تشہد، اس کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک اور ان کے متبعین نے فرمایا: پہلا جلوس (قعدہ) اور اس میں تشہد سنت ہے۔ علماء کی ایک جماعت نے پہلے قعدہ کو واجب کہا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: یہ تمام فرائض سے مخصوص ہے کہ سجدہ کے قائم مقام ہو جاتا ہے جیسے بیع مزابنہ (☆) میں سے عرایا (☆☆) کی بیع جائز ہے اور اجارات میں سے قراض جائز ہے، اسی طرح تکبیر تحریمہ کے بعد اس شخص کا وقوف جائز ہے جو امام کو رکوع کی حالت میں پائے۔ یہ علماء فرماتے ہیں: اگر یہ سنت ہوتا تو جان بوجھ کر اسے ترک کرنے والے کی نماز باطل نہ ہوتی جس طرح نماز کی

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 108، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الاذان، باب اتمام التکبیر فی السجود، حدیث 745، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح ابن ماجہ، صفحہ 66، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ وسنت، باب التسلیم، حدیث 906، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب مایقال فی الرکوع والسجود، صفحہ 191، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

☆ اندازہ سے بیع کرنا جیسے درخت پر موجود پھل کی اتارے ہوئے پھل سے بیع کرنا۔ ☆☆ ہبہ کے طور پر کھجور کا پھل درخت پر ہی دے دینا۔

دوسری سنن ترک کرنے کی وجہ سے نماز باطل نہیں ہوتی اور جو علماء اسے واجب نہیں کہتے انہوں نے اس طرح حجت پکڑی ہے کہ اگر یہ نماز کے فرائض میں سے ہوتا تو بھولنے والا اس کی طرف واپس آجاتا حتیٰ کہ اسے ادا کرتا جیسا کہ اگر کوئی سجدہ ترک کردے یا رکوع ترک کردے تو وہ واپس آجاتا ہے۔ اس میں وہ اسی طرح تواتر اور رتبہ کی رعایت کرتا جس طرح رکوع و سجود میں کرتا ہے پھر وہ سجدہ سہو کرتا جس طرح رکوع یا سجدہ ترک کرنے والا کرتا ہے اور پھر انہیں ادا کرتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن بحینہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو رکعتوں کے بعد کھڑے ہو گئے اور تشہد پڑھنا بھول گئے۔ لوگوں نے تسبیح کہی تا کہ آپ بیٹھ جائیں، آپ سیدھے کھڑے ہو گئے اور پیچھے لوگ بھی کھڑے ہو گئے۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو سلام سے پہلے دو سجدے سہو کے لئے کیے (1)۔ اگر بیٹھنا فرض ہوتا تو نسیان اور سہو اسے ساقط نہ کرتے کیونکہ نماز میں فرائض کا حکم یہ ہوتا ہے۔ سہواً اور عمداً ان کا ترک برابر ہوتا ہے سوائے مقتدی کے۔ نماز کے آخری جلوس کے حکم میں بھی اختلاف ہے اور اس سے جو غرض ہے اس میں اختلاف ہے۔

مسئلہ نمبر 17: اس کے بارے علماء کے پانچ اقوال ہیں:

پہلا قول: بیٹھنا فرض ہے اور اس میں تشہد پڑھنا بھی فرض ہے اور سلام بھی فرض ہے۔ جن علماء نے یہ کہا ان میں امام شافعی، احمد بن حنبل (ایک روایت میں) ابو مصعف نے اپنی مختصر میں امام مالک اور اہل مدینہ سے یہی حکایت کیا ہے اور داؤد نے بھی یہی کہا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: جس نے پہلا تشہد ترک کیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود ترک کیا اس پر نماز کا اعادہ نہیں ہے اور ان کے ترک کی وجہ سے اس پر سجدہ سہو ہے۔ جب کوئی بھول کر یا جان بوجھ کر تشہد ترک کردے تو نماز کا اعادہ کرے اور ان علماء نے اس سے دلیل پکڑی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان نماز میں فرض ہے کیونکہ اس کے فرض کی اصل مجمل ہے جو بیان کا محتاج ہے مگر یہ کہ جو دلیل سے خارج ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا'' (2)۔

دوسرا قول: یہ ہے کہ آخری قعدہ، تشہد اور سلام واجب نہیں ہیں۔ یہ تمام سنت ہیں یہ بعض بصریوں کا قول ہے اور ابراہیم بن علیہ کا بھی یہی نظریہ ہے۔ انہوں نے آخری قعدہ کو پہلے قعدہ پر قیاس کرنے کی تصریح کی ہے۔ جمہور علماء کی اس نے مخالفت کی ہے اور ان سے جدا نظریہ قائم کیا ہے مگر وہ اس شخص پر نماز کا اعادہ لازم سمجھتے ہیں جو ان چیزوں میں سے کسی چیز کو ترک کر دے۔ ان کی حجت میں سے حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص کی حدیث ہے جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب امام اپنی نماز کے آخری سجدہ سے سر اٹھائے پھر اسے حدث لاحق ہو جائے تو اس کی نماز مکمل ہو گئی۔ یہ حدیث ابو عمرو۔ کے قول پر صحیح نہیں ہے ہم نے اسے ''کتاب المقتبس'' میں بیان کیا ہے اور یہ لفظ سلام کو ساقط کرتے ہیں جلوس (بیٹھنے) کو ساقط نہیں کرتے۔

تیسرا قول: تشہد کی مقدار بیٹھنا فرض ہے اور تشہد اور سلام بطور فرض واجب نہیں۔ یہ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا قول ہے

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 85، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً کتاب اقامۃ الصلوٰۃ والسنۃ فیہا، باب ما جاء فی الغم، حدیث 1195، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 88، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الاذان، باب الاذان للمسافر اذا کانوا جماعۃ، حدیث 595، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور کوفیوں کی جماعت کا قول ہے۔ انہوں نے حضرت عبداللہ بن مبارک کی حدیث سے حجت پکڑی ہے جو انہوں نے افریقی عبدالرحمن بن زیاد سے روایت کی ہے۔ یہ حدیث ضعیف ہے۔ اس میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی اپنی نماز کے آخر میں بیٹھے پھر سلام سے پہلے اسے حدث لاحق ہو جائے تو اس کی نماز مکمل ہو گئی (☆)۔ ابن عربی نے کہا: ہمارے شیخ فخر الاسلام درس میں یہ شعر پڑھتے تھے۔

ویری الخروج من الصلوٰۃ بضرطۃ　　این الضراط من السلام علیکم

وہ گوز کے ساتھ نماز سے نکلنا صحیح خیال کرتے ہیں، گوز، السلام علیکم کی جگہ کیسے ہو سکتا ہے۔

ابن عربی نے کہا: ہمارے بعض علماء نے اس مسئلہ کی وجہ سے دو ضعیف فرعی مسئلے نکالے ہیں۔ ایک وہ جو عبدالملک نے عبدالملک سے روایت کیا ہے کہ جس نے دل لگی کرتے ہوئے دو رکعتوں پر سلام پھیر دیا اس نے اگر چار رکعتوں کی نیت کی تھی تو یہ اس کی دو رکعتیں جائز ہو جائیں گی یہ اہل عراق کا مذہب ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ غیر مقبول کتب میں ہے کہ امام تشہد کے بعد سلام سے پہلے جب جان بوجھ کر حدث لاحق کرے تو اس کے مقتدیوں کی نماز جائز ہو جائے گی۔ یہ ایسی بات ہے جس کی طرف فتویٰ میں توجہ نہیں دی جاتی اگرچہ اس کے ساتھ یاد کے لئے مجالس آباد ہوں۔

چوتھا قول: جلوس اور سلام فرض ہے اور تشہد واجب نہیں، یہ حضرت مالک بن انس، آپ کے اصحاب اور ایک روایت کے مطابق امام احمد بن حنبل نے فرمایا ہے: اور انہوں نے یہ کہہ کر استدلال کیا ہے کہ تکبیر تحریمہ اور اُم القرآن (سورۃ فاتحہ) کے علاوہ ذکر میں سے کوئی چیز واجب نہیں۔

پانچواں قول: یہ ہے کہ تشہد اور جلوس دونوں واجب ہیں اور سلام واجب نہیں ہے۔ یہ ایک جماعت کا قول ہے جس میں اسحاق بن راہویہ بھی ہے۔ اسحاق نے حضرت ابن مسعود کی حدیث سے حجت پکڑی ہے جب رسول اللہ ﷺ نے اسے تشہد کی تعلیم دی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا تھا: "جب تو اس سے فارغ ہو جائے گا تو تیری نماز مکمل ہو جائے گی اور جو تجھ پر لازم تھا وہ تو نے ادا کر دیا" (1)۔

دارقطنی نے کہا: "آپ ﷺ کا یہ ارشاد جب تو اس سے فارغ ہو جائے گا تو تیری نماز مکمل ہو جائے گی" (2)۔ بعض روایوں نے اس جملہ کو زہیر کی طرف سے حدیث میں داخل کیا ہے اور اس نے نبی کے کلام کے ساتھ اس کو ملا دیا ہے اور شبابۃ نے زہیر سے روایت کر کے علیحدہ ذکر کیا ہے اور اس جملہ کو حضرت ابن مسعود کے کلام سے شمار کیا ہے یہ قول زیادہ درست ہے بنسبت اس کے قول کے جس نے اس کو حدیث میں داخل کر دیا ہے۔ شبابۃ ثقہ شخص ہے۔ غسان بن ربیع نے اس پر ان کی

1۔ سنن ابی داؤد، ابواب الصلوٰۃ، باب ما جاء فی وصف الصلوٰۃ، حدیث 825، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، ابواب الصلوٰۃ، باب ما جاء فی وصف الصلوٰۃ، حدیث 825، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

☆ احناف کے نزدیک صورتحال یہ نہیں۔ اگر اسے اس حالت میں حدث لاحق ہو جائے تو وہ وضو کرے گا اور بنا کرتے ہوئے سلام پھیرے گا تب نماز مکمل ہو گی جس طرح ہدایہ شریف میں اس کی تصریح ہے اور اگر وہ اس حالت میں جان بوجھ کر حدث لاحق کرے گا تو صورتحال مختلف ہو گی۔ مترجم

متابعت کی ہے حدیث کے آخر کو اس نے بھی حضرت ابن مسعود کا کلام بتایا ہے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوع روایت نہیں کی۔

مسئلہ نمبر 18: سلام کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ واجب ہے، بعض نے فرمایا: واجب نہیں ہے لیکن حضرت عائشہ اور حضرت علی کی صحیح حدیث کی وجہ سے اس کے وجوب کا قول صحیح ہے۔ حضرت علی کی حدیث ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کی ہے اور اسے سفیان ثوری نے حضرت عبداللہ بن محمد بن عقیل سے انہوں نے حضرت محمد بن حنفیہ سے انہوں نے حضرت علی (رضی اللہ عنہ) سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "نماز کی چابی طہارت ہے، اس کی تحریم تکبیر ہے اور اس کی تحلیل سلام ہے" (1)۔ یہ حدیث تکبیر اور سلام کے وجوب میں اصل ہے کوئی دوسری چیز ان کے قائم مقام نہیں ہو سکتی۔ عبدالرحمن بن مہدی نے کہا: اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے ستر اسماء کے ساتھ نماز کو شروع کرے اور تکبیر تحریمہ نہ کہے تو یہ جائز نہ ہوگا اور اگر سلام سے پہلے حدث لاحق ہو گیا تو بھی جائز نہ ہوگا۔ یہ عبدالرحمن بن مہدی کی طرف سے حضرت علی کی حدیث کی تصحیح ہے اور عبدالرحمن بن مہدی علم حدیث میں اور صحیح و سقیم کی پہچان میں امام ہیں۔ تیرے لئے یہی کافی ہے۔

علماء نے آغاز کے وقت تکبیر کے وجوب میں اختلاف کیا ہے:

مسئلہ نمبر 19: ابن شہاب زہری، سعید بن مسیب، اوزاعی، عبدالرحمن اور ایک جماعت نے کہا ہے کہ تکبیر تحریمہ واجب نہیں ہے۔ امام مالک سے مقتدی کے بارے میں ایک روایت ہے جو اس قول پر دلیل ہے لیکن امام مالک کا مذہب صحیح یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ واجب ہے۔ یہ فرض ہے اور نماز کے ارکان میں سے ایک رکن ہے اور یہی صواب ہے اور یہی جمہور کا نظریہ ہے کہ ہر وہ شخص جس نے اس قول کی مخالفت کی اس کا مقابلہ سنت سے کیا گیا۔

مسئلہ نمبر 20: علماء کا اختلاف ہے اس لفظ کے بارے میں جس کے ساتھ نمازی نماز میں داخل ہو۔ امام مالک ان کے متبعین اور جمہور علماء نے کہا: تکبیر کے بغیر نماز میں داخل ہونا جائز نہیں۔ تکبیر کی جگہ تحلیل، تسبیح، تعظیم اور تحمید جائز نہیں۔ یہ حجازیوں اور اکثر عراقیوں کا قول ہے۔ امام مالک کے نزدیک اللہ اکبر کے علاوہ کوئی کلمہ جائز نہیں۔ امام شافعی نے بھی اسی طرح کہا ہے اور انہوں نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ اللہ الاکبر اور اللہ الکبیر بھی جائز ہے۔

امام مالک کی حجت حضرت عائشہ کی حدیث ہے، فرمایا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کو تکبیر اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کی قرأت کے ساتھ شروع فرماتے تھے" (2)۔ حدیث علی میں ہے نماز کی تحریم تکبیر ہے۔ اعرابی کی حدیث میں ہے: فکبّر (3) (تکبیر کہہ)۔ سنن ابن ماجہ میں ہے: ہمیں ابوبکر بن ابی شیبہ اور علی بن محمد طنافسی نے بتایا۔ انہوں نے فرمایا: ہمیں ابو اسامہ نے بتایا انہوں نے کہا: مجھے عبدالحمید بن جعفر نے بتایا فرمایا: ہمیں محمد بن عمرو بن عطاء نے بتایا فرمایا: میں نے حضرت ابوحمید ساعدی کو یہ فرماتے ہوئے سنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو قبلہ کی طرف رخ کرتے اور اپنے ہاتھوں

1۔ جامع ترمذی، ابواب الطہارۃ، باب ماجاء مفتاح الصلوٰۃ الطہور، صفحہ 40، جلد 1 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب مایجمع صفۃ الصلوٰۃ ومایفتتح بہ ویختتم بہ وصفۃ الرکوع والاعتدال الخ، صفحہ 194، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
3۔ جامع ترمذی، ابواب الطہارۃ، باب ماجاء مفتاح الصلوٰۃ الطہور، صفحہ 3، جلد 1 (وزارت تعلیم)

کو بلند کرتے اور اللہ اکبر کہتے (1)۔ یہ صریح نص ہے صحیح حدیث ہے جو لفظ تکبیر کی تعیین کر رہی ہے۔ شاعر نے کہا:

رأیت اللہ اکبر کل شیء محاولۃً و اعظمہ جنوداً

میں نے دیکھا اللہ تعالیٰ از روئے تدبیر ہر چیز سے بڑا ہے اور از روئے لشکر عظیم ہے۔

پھر یہ قدم کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے جبکہ کبیر اور عظیم اس کو اپنے ضمن میں نہیں لیتے۔ پس یہ معنی میں زیادہ بلیغ ہو گا۔ واللہ اعلم

امام ابوحنیفہ نے کہا: اگر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ سے نماز کو شروع کرے تب بھی جائز ہے اور اگر اللھم اغفرلی کہا تو جائز نہ ہو گا محمد بن حسن کا بھی یہی قول ہے۔ ابو یوسف نے فرمایا: جب تکبیر اچھی طرح کہہ سکتا ہو تو اور کلمات جائز نہیں۔ حکم بن عتیبہ نے فرمایا: جب تکبیر کی جگہ اللہ کا ذکر کر دے تو جائز ہو گا۔ ابن منذر نے کہا: میں اس بات میں علماء کا اختلاف نہیں جانتا کہ جو قرأت اچھی طرح کر سکتا ہو وہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور تکبیر کہہ دے اور قراءت نہ کرے تو اس کی نماز فاسد ہے۔ پس جس کا یہ مذہب ہے اس کو یہ کہنا لازم ہے کہ تکبیر کی جگہ کوئی دوسرا کلمہ جائز نہ ہو جیسا کہ قراءت کی جگہ کوئی دوسرا کلمہ جائز نہیں۔

امام ابوحنیفہ نے فرمایا: فارسی میں تکبیر جائز ہے اگرچہ عربی اچھی طرح جانتا بھی ہو۔ ابن المنذر نے کہا: یہ جائز نہیں کیونکہ اس میں مسلمانوں کی جماعات سے اختلاف ہے اور اس کا خلاف ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو سکھایا۔ ہم کوئی ایسا شخص نہیں جانتے جس نے امام ابوحنیفہ کی اس قول میں موافقت کی ہو۔

مسئلہ نمبر 21: امت کا تکبیر تحریمہ کے وقت نیت کے وجوب پر اتفاق ہے۔ جو ہمارے اصحاب نے روایت کیا ہے اس پر مزید کلام آیت طہارت میں آئے گا۔ اس کی حقیقت آمر کے تقرب کا قصد کرنا ہے ایسے فعل کے ساتھ جس کا اس نے حکم دیا ہے جیسا کہ اس نے وہ فعل طلب کیا ہے۔ ابن عربی نے کہا: نیت میں اصل یہ ہے کہ اس کا عقد، اس فعل کے کرنے کے ساتھ ہو جس کی نیت کی گئی ہے یا استصحاب کی شرط کے ساتھ اس فعل سے قبل نیت ہو۔ اگر پہلے نیت کی ہو پھر غفلت طاری ہو جائے حتیٰ کہ اس حالت میں عبادت میں متلبس واقع ہو تو اس نیت کا اعتبار نہ ہو گا جس طرح اس نیت کا اعتبار نہیں ہوتا جب فعل میں متلبس کے بعد واقع ہو۔ روزے میں نیت کے مقدم کرنے کی رخصت دی گئی ہے کیونکہ اس کے آغاز میں نیت متصل کرنے میں حرج واقع ہوتی ہے۔

ابن عربی نے کہا ابوالحسن قروی نے ہمیں عسقلان کی سرحد پر کہا کہ میں نے امام الحرمین کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ انسان نماز پڑھتے وقت نیت کرے اور وہ صانع میں نظر کرے، عالم کے حدوث کو دیکھے نبوت کو دیکھے، حتیٰ کہ اس کی نظر نماز کی نیت تک پہنچ جائے۔ فرمایا: اس کے لئے اسے طویل زمانہ کی ضرورت نہیں بلکہ یہ ایک لمحہ میں ہو سکتی ہے کیونکہ جملوں کی تعلیم تو طویل زمانہ کی محتاج ہے اور ان چیزوں کو ذہن میں یاد کرنا ایک لمحہ میں ہوتا ہے۔ نیت کی تکمیل میں سے یہ ہے کہ نیت پوری نماز میں متصل ہو مگر جب یہ امر مشکل ہوا تو شریعت نے نماز کے درمیان میں نیت کے جدا ہونے کو معاف فرما دیا۔

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 58، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، ابواب اقامۃ الصلوٰۃ والسنۃ فیہا باب افتتاح الصلوٰۃ، حدیث 794، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں نے اپنے شیخ ابوبکر الفہری (☆) کو مسجد اقصیٰ میں یہ فرماتے سنا کہ محمد بن سحنون (☆☆) نے فرمایا: میں نے اپنے باپ سحنون کو دیکھا بعض دفعہ جب وہ نماز مکمل کر لیتے تو دوبارہ پڑھتے۔ میں نے ان سے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے فرمایا: نماز کے دوران میری نیت جدا ہوگئی تھی اسی وجہ سے میں نے نماز کا اعادہ کیا۔

میں کہتا ہوں: یہ نماز کے اجمالی احکام تھے اور تفصیلی احکام اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اپنے اپنے مقام پر آئیں گے۔ رکوع، جماعت کے ساتھ نماز، قبلہ، اوقات کی طرف جلدی کرنا اور نماز خوف کا ذکر تو اسی سورت میں آجائے گا۔ قصر نماز اور خوف کی نماز سورۂ نساء اور اوقات کا ذکر سورۂ ہود، سبحان اور سورۂ روم میں آئے گا اور رات کی نماز (تہجد) کا ذکر سورۂ المزمل میں آئے گا اور سجدہ تلاوت کا ذکر سورۂ اعراف میں آئے گا اور سجدہ شکر کا ذکر سورۂ ص میں آئے گا۔ ان شاء اللہ ہر ایک کا ذکر اپنی جگہ آئے گا۔

مسئلہ نمبر 22: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝

رَزَقْنٰهُمْ کا معنی ہے، ہم نے انہیں عطا کیا۔ اہل سنت کے نزدیک رزق سے مراد ہر وہ چیز ہے جس سے نفع حاصل کرنا صحیح ہو خواہ وہ حلال ہو یا حرام ہو۔ معتزلہ کا مسلک اس کے مخالف ہے۔ ان کے نزدیک حرام رزق نہیں ہے کیونکہ اس کا تملک صحیح نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ حرام عطا نہیں فرماتا بلکہ حلال عطا فرماتا ہے اور رزق ملک کے معنی میں ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں: اگر ایک بچہ چوروں کے ساتھ پرورش پائے اور اس نے کچھ نہ کھایا مگر وہ جو چوروں نے اسے کھلایا حتیٰ کہ وہ بالغ ہوا، طاقتور ہوا اور چور بن گیا پھر وہ ہمیشہ چوری کرتا رہا اور مرتے دم تک چوری کا مال کھاتا رہا تو اللہ تعالیٰ نے اسے کوئی چیز عطا نہ فرمائی کیونکہ اس کا اسے مالک نہیں بنایا تھا اور وہ مر گیا اور اس نے اللہ کے رزق سے کچھ نہ کھایا۔

یہ قول اور نظریہ فاسد ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ رزق بمعنی تملیک ہوتا تو واجب تھا کہ بچے کو رزق نہیں دیا گیا اور ان جانوروں کے بچوں کو بھی رزق نہیں ملا کیونکہ ان کی ماؤں کے دودھ کا مالک تو ان کا مالک تھا نہ کہ جانوروں کے بچے۔

جب امت کا اس پر اجماع ہے کہ بچہ اور جانوروں کے بچے اور دوسرے جانوروں کو رزق دیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ انہیں رزق دیتا ہے حالانکہ وہ مالک نہیں ہوتے۔ پس معلوم ہوا کہ رزق صرف غذا ہے کیونکہ امت کا اجماع ہے کہ غلاموں اور جانوروں کو رزق دیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ انہیں رزق دیتا ہے جبکہ وہ مالک نہیں ہوتے۔ پس معلوم ہوا رزق وہ ہے جو ہم نے بیان کیا نہ کہ وہ جو معتزلہ نے بیان کیا اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (فاطر:3)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ۝ (الذاریات) (بلاشبہ اللہ ہی (سب کو) روزی دینے والا قوت والا (اور) زور والا ہے) اور فرمایا: وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (ہود:6) (اور نہیں کوئی جاندار زمین میں مگر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے اس کا رزق)۔ یہ آیات قطعی ہیں، اللہ تعالیٰ حقیقۃً رازق ہے اور بندہ مجازاً رازق ہے کیونکہ اس کا مالک ہونا عارضی ہے جیسا کہ ہم نے سورۂ فاتحہ میں بیان کیا ہے۔ بندے کو بھی حقیقۃً ان جانوروں کی طرح رزق

☆ محمد بن ولید اندلسی طرطوشی شیخ المالکیہ، وفات 520ھ ☆☆ عبد السلام بن حبیب تنوخی حمص مالکی، قاضی قیروان صاحب المدونہ

دیا گیا ہے جن کو کوئی ملکیت حاصل نہیں ہوتی مگر جب اسے کسی چیز کے حاصل کرنے کا اذن دے دیا گیا تو وہ حکماً اس کے لئے حلال ہوگی اور جس کے استعمال کی اجازت نہیں دی گئی تو اس کا لینا حکماً حرام ہے اور یہ تمام رزق ہے۔

بعض علماء نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے استنباط کیا ہے: كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ۭ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ ۝ (سبا) (کھاؤ اپنے رب کا دیا ہوا رزق اور اس کا شکر ادا کرو اتنا پاکیزہ شہر اور ایسا رب غفور)۔

فرمایا: مغفرت کا ذکر یہ اشارہ کرتا ہے کہ رزق کبھی حرام بھی ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 23: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ، رزق مصدر ہے رزق یرزق رزقاً و رِزقاً کا اور الرزق راء کے فتح کے ساتھ مصدر ہے اور الراء کے کسرہ کے ساتھ اسم ہے اس کی جمع ارزاق ہے اور الرزاق کا مطلب ہے الرازقیہ اولی سفید کپڑوں کو کہتے ہیں۔ ارتزق الجند کا مطلب ہے دس بکریوں نے اپنا اپنا رزق حاصل کیا۔ الرزقۃ ایک مرتبہ لینا، اہل لغت نے اسی طرح کہا ہے۔ ابن سکیت نے کہا: الرزق کا معنی ازدشنوہ لغت میں شکر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں رزق کا معنی شکر ہے: وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ۝ (واقعہ) یعنی تمہارا شکر جھٹلانا ہے۔ رزقنی کا معنی ہے: شکرنی اس نے میرا شکر ادا کیا۔

مسئلہ نمبر 24: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے يُنْفِقُوْنَ اس کا معنی ہے: وہ نکالتے ہیں۔ انفاق کا معنی ہاتھ سے مال نکالنا ہے اسی سے ہے نفق البیع یعنی بیع بائع کے ہاتھ سے نکل کر خریدنے والے کے ہاتھ میں چلی گئی۔ نفقت الدابۃ یعنی جانوروں کی روح نکل گئی۔ اسی سے ہے: النافقاء اس چوہے کی بل کو کہتے ہیں جب وہ اپنی بل سے نکل جاتا ہے، جب بل کی دوسری طرف کو اختیار کرتا ہے اسی سے المنافق ہے کیونکہ وہ ایمان سے نکل جاتا ہے یا ایمان اس کے دل سے نکل جاتا ہے۔ نیفق السراویل معروف ہے۔ شلوار کا وہ حصہ جہاں سے پاؤں نکالا جاتا ہے۔ نفق الزاد کا معنی ہے زاد راہ ختم ہو گیا، مالک نے اسے خرچ کر دیا۔ انفق القوم قوم کا زاد راہ ختم ہو گیا۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ (الاسراء: 100) (سو اس وقت تم ضرور ہاتھ روک لیتے اس خوف سے کہ کہیں (سارے خزانے) ختم ہی نہ ہو جائیں)۔

مسئلہ نمبر 25: اس آیت میں نفقہ کی مراد کو متعین کرنے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد فرضی زکوٰۃ ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ اس سے مراد زکوٰۃ فرضیہ ہے کیونکہ اس کے ساتھ نماز کا ذکر ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد انسان کا اپنے اہل پر خرچ کرنا ہے۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے کہ اپنے گھر والوں پر خرچ کرنا افضل صدقہ ہے۔ مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایک دینار وہ ہے جو تو نے اللہ کے راستہ میں خرچ کیا، ایک دینار وہ ہے جو تو نے غلام آزاد کرنے میں خرچ کیا، ایک دینار وہ ہے جو تو نے مسکین پر خرچ کیا، ایک دینار وہ ہے جو تو نے اپنے اہل پر خرچ کیا، ان سب سے ازروئے اجر کے عظیم وہ دینار ہے جو تو نے اپنے اہل پر خرچ کیا(1)''۔ حضرت ثوبان سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''افضل دینار وہ ہے جو آدمی اپنے عیال پر خرچ کرتا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، باب فضل النفقۃ علی العیال والمملوک واثم من ضیعھم او حبس الخ، صفحہ 322، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

ہے اور وہ دینار جو اللہ کے راستہ میں (جہاد کے لئے) اپنی سواری پر خرچ کرتا ہے اور وہ دینار ہے جو اللہ کے راستہ میں اپنے ساتھیوں پر خرچ کرتا ہے۔ ابوقلابہ نے کہا: عیال سے آغاز فرمایا پھر ابوقلابہ نے کہا: کون سا شخص اس شخص سے زیادہ اجر والا ہے جو اپنے چھوٹے بچوں پر خرچ کرتا ہے وہ انہیں بچاتا ہے یا اللہ تعالیٰ انہیں اس کے ساتھ نفع دیتا ہے اور انہیں غنی کرتا ہے'' (1)۔

بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد نفلی صدقہ ہے۔ ضحاک سے مروی ہے کہ زکوٰۃ کا ذکر لفظ مخصوص زکوٰۃ کے ساتھ آتا ہے جب زکوٰۃ کے علاوہ خرچ کرنے کا ذکر آئے تو فرضی اور نفلی دونوں کا احتمال ہوتا ہے اور جب انفاق کے لفظ کے ساتھ آئے تو نفلی خرچ ہی مراد ہوتا ہے۔ ضحاک نے کہا: نفقہ ایک قرب تھا لوگ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا قرب اپنے اخلاص کے مطابق حاصل کرتے تھے حتیٰ کہ فرضی صدقات اور ناسخات کا حکم سورۂ براءت میں نازل ہوا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد زکوٰۃ کے علاوہ وہ واجبی حقوق ہیں جو مال کو لاحق ہوتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جب اسے نماز کے ساتھ ملایا تو یہ فرض تھا جب لفظ زکوٰۃ سے عدول فرمایا تو زکوٰۃ کے علاوہ فرض مراد ہوگا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ عام ہے اور یہی صحیح قول ہے کیونکہ یہاں جو انہیں دیا گیا ہے اس سے خرچ کرنا مدح کے طور پر ذکر کیا گیا ہے اور یہ صرف حلال مال میں ہوتا ہے یعنی وہ عطا کرتے ہیں جو شرع نے اس پر لازم کیا زکوٰۃ اور دوسرے مالی حقوق جو بعض احوال میں لاحق ہوتے ہیں جبکہ اس خرچ کی طرف انہیں رغبت بھی دی ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: ایمان بالغیب، دل کا نصیبہ ہے اور نماز قائم کرنا بدن کا حصہ ہے اور **وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ** مال کا حصہ ہے اور یہ ظاہر ہے۔ بعض متقدمین مفسرین نے **مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ** کی تاویل میں فرمایا: جو ہم نے انہیں سکھایا وہ سکھاتے ہیں۔ یہ ابونصر عبدالرحیم بن عبدالکریم القشیری نے حکایت کیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝

''اور وہ جو ایمان لائے اس پر (اے حبیب! صلی اللہ علیہ وسلم) جو اتارا گیا ہے آپ پر اور جو اتارا گیا آپ سے پہلے اور آخرت پر بھی وہ یقین رکھتے ہیں''۔

بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد اہل کتاب کے مومن ہیں جیسے حضرت عبداللہ بن سلام۔ ان کے بارے یہ آیت نازل ہوئی اور پہلی آیت عرب کے مومنین کے بارے نازل ہوئی۔ بعض نے فرمایا: دونوں آیتیں مومنین کے بارے نازل ہوئیں۔ اسی بنا پر **الَّذِيْنَ** کا اعراب عطف کی وجہ سے مجرور ہے اور استیناف کی بنا پر رفع ہونا بھی صحیح ہے یعنی اس سے پہلے **هم** ضمیر مبتدا محذوف ہوگی اور جنہوں نے دونوں آیتوں سے دونوں علیحدہ علیحدہ قسمیں مراد لی ہیں ان کے نزدیک **الَّذِيْنَ** کا اعراب مبتدا ہونے کی وجہ سے رفع ہے اور اس کی خبر **اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى** ہے اور عطف کے احتمال کی وجہ سے جر کا احتمال بھی رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد **بِمَآ اُنْزِلَ** اس سے مراد قرآن ہے **وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ** سے مراد سابقہ کتب ہیں بخلاف اس کے جو یہود و نصاریٰ نے کہا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود ان کے متعلق بتایا **وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ**

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب فضل النفقۃ علی العیال والمملوک واثم من ضیعھم او حبس الخ، صفحہ 322، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

عَلَيْنَا (البقرہ: 91) (اور جب ان سے کہا جاتا ہے ایمان لے آؤ اس پر جسے اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے تو کہتے ہیں ہم تو (صرف) اس پر ایمان لائے ہیں جو نازل کی گئی ہم پر)۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ تو یہود و نصاریٰ نے کہا ہم غیب پر ایمان لائے جب یہ آیت نازل ہوئی وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ تو انہوں نے کہا: ہم نماز پڑھتے ہیں۔ جب مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ کا حکم نازل ہوا تو کہنے لگے: ہم خرچ کرتے ہیں اور صدقہ کرتے ہیں۔ جب یہ آیت نازل ہوئی: وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ تو بدک پڑے۔ حضرت ابوذر کی حدیث میں ہے، فرمایا: میں نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کتنی کتب اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک سو چار کتب نازل فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ نے شیث علیہ السلام پر پچاس صحیفے نازل فرمائے اور اخنوخ (حضرت ادریس علیہ السلام) پر تیس صحیفے نازل فرمائے۔ حضرت ابراہیم پر دس صحائف نازل فرمائے، تورات سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ اسلام پر دس صحیفے نازل فرمائے۔ تورات، انجیل۔ زبور اور فرقان نازل فرمائیں۔ اس حدیث کو حسین آجری اور ابو حاتم البستی نے نقل کیا ہے۔

ایک مسئلہ: اگر کہنے والا کہے سابقہ تمام کتب پر ایمان لانا کیسے ممکن ہے جبکہ ان کے احکام منافی ہیں؟ اس کے دو جواب دیئے گئے ہیں: (۱) یہ ایمان لانا ضروری ہے کہ تمام کتب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہیں۔ یہ اس شخص کا قول ہے جس نے پہلی شریعتوں کی پابندی کرنے کو ساقط کر دیا ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ ان سے ایمان لانا منسوخ نہیں ہوا۔ یہ اس شخص کا قول ہے جس نے متقدمہ شرائع کے التزام کو واجب قرار دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (یعنی وہ قیامت کے دن دوبارہ اٹھنے کے متعلق جانتے ہیں)۔ الیقین اس علم کو کہتے ہیں جس میں شک نہ ہو۔ کہا جاتا ہے: یقنت الامر یقناً وایقنت واستیقنت و تیقنت ان تمام کا معنی ایک ہے میں یقین پر ہوں۔ موقن میں یا ماقبل ضمہ کی وجہ سے واؤ سے بدل گئی ہے جب تو اس کی تصغیر بنائے گا تو اصل کی طرف لوٹا دے گا۔ تو کہے گا: مُيَيْقِنٌ تصغیر اشیاء کو اپنے اصل کی طرف لوٹا دیتی ہے اسی طرح جمع بھی اشیاء کو اپنے اصل کی طرف لوٹا دیتی ہے۔ بعض اوقات ظن کو یقین کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں اس سے لغو قسم میں ہمارے علماء کا قول ہے کہ وہ اللہ کی قسم اٹھائے ایک ایسے امر پر جس کا اسے گمان ہو پھر اس کے لئے ظاہر ہو کہ معاملہ تو اس کے خلاف تھا تو اس پر کوئی چیز واجب نہ ہوگی۔

شاعر نے کہا:

تحسب هوّاس وايقن انى بها مفتد من واحدٍ لا أغامره

آخرت، تاخر سے مشتق ہے ہم سے اس کے تاخر کی وجہ سے اور ہمارے اس سے تاخر کی وجہ سے اسے آخرت کہا جاتا ہے جیسا کہ دنیا، دنو سے مشتق ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

''وہی لوگ ہدایت پر ہیں اپنے رب (کی توفیق) سے اور وہی دونوں جہان میں کامیاب ہیں''۔

نحاس نے کہا: اہل نجد کہتے ہیں: اُلاك، بعض کہتے ہیں: اُلالِك، ك خطاب کے لئے ہے۔ کسائی نے کہا: جس نے اولئك

کہا اس کا واحد ذالك ہے اور جس نے الالك کہا اس کا واحد ذاك ہے اور اُلالِك، اولئك کی مثل ہے۔ ابن سکیت نے شعر کہا ہے:

الالِك قومی لم یکونوا اشابة و ھل یعظ الضلیل الا اُلالکا

اس شعر میں الالك کا معنی اولئك ہے۔

بعض کہتے ہیں: اولئك غیر عقلاء کے لئے ہے۔ شاعر نے کہا:

ذم المنازل بعد منزلة اللوی والعیش بعد اولئك الایام

اس میں اولئك غیر عقلاء کے لئے استعمال ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ السَّمۡعَ وَ الۡبَصَرَ وَ الۡفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنۡهُ مَسۡـُٔوۡلًا ﴿۳۶﴾ (الاسراء)

ہمارے علماء نے فرمایا: مِّنۡ رَّبِّهِمۡ کے کلمات میں قدریہ کا رد ہے جو کہتے ہیں کہ وہ ایمان اور ہدایت خود گھڑتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے قول سے پاک ہے۔ اگر بات اس طرح ہوتی جس طرح قدریہ نے کہا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا: من انفسھم اس پر اور ھدیٰ پر کلام گزر چکی ہے اس کے اعادہ کا کوئی فائدہ نہیں۔

وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ، هُمۡ میں یہ بھی جائز ہے کہ یہ دوسرا مبتدا ہو اور اس کی خبر الۡمُفۡلِحُوۡنَ ہو۔ پھر یہ مبتدا خبر اُولٰٓئِكَ مبتدا کی خبر ہوں، اور یہ بھی جائز ہے کہ هُمۡ زائدہ ہو۔ بصری علماء اسے فاصلہ کہتے ہیں اور کوفی علماء اسے عماد کہتے ہیں اور الۡمُفۡلِحُوۡنَ، اُولٰٓئِكَ کی خبر ہو۔

الفلح کا لغوی معنی الشق اور القطع (پھٹنا اور کاٹنا) ہے۔ شاعر نے کہا

ان الحدید بالحدید یفلح

لوہے کے ساتھ لوہا کاٹا جاتا ہے۔

اسی سے فلاحة الارضین ہے جو زمین کو کھیتی کے لئے پھاڑتا ہے۔ یہ مفہوم ابو عبید نے بیان کیا ہے اسی وجہ سے کسان کو فلاح کہا جاتا ہے، جس کا نچلا ہونٹ کاٹا گیا ہو اسے افلح کہا جاتا ہے۔ جس کا شق ظاہر ہو۔ گویا مفلح مصائب و مشکلات کو کاٹتا جاتا ہے حتیٰ کہ اپنا مطلوب حاصل کر لیتا ہے، کبھی یہ غور و بقا میں استعمال ہوتا ہے، یہ لغت میں اس کی اصل ہے۔ اس سے مرد کو اپنی بیوی کو یہ کہنا ہے۔

استفلحی بامرك اس کا معنی ہے: اپنے امر میں کامیاب ہو جا۔ شاعر نے کہا:

لو کان حیّ مدرك الفلاح ادرکه ملاعب الرماح

اس میں فلاح کامیابی کے لئے استعمال ہوا ہے۔

اضبط بن قریع سعدی نے زمانہ جاہلیت میں کہا تھا:

لکل ھم من الھموم سعه والمسیٔ والصبح لا فلاح معه

شاعر نے یہاں بھی فلاح کو کامیابی و کامرانی کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

کسی نے کہا:

لیس مع کر اللیل والنھار بقاء

رات اور دن کی گردش کے ساتھ بقا نہیں۔

ایک اور نے کہا:

نُحِل بلاداً کلھا حل قبلنا ونر جو الفلاح بعد عاد و حمیر

ہم ان تمام شہروں میں اترے جس طرح ہمارے بزرگ اترے اور ہم عاد اور حمیر کے بعد فلاح کی امید کرتے ہیں۔

عبید نے کہا:

افلح بما شئت فقد یدرك بالض عف و قد یخدع الاریب

جس کے ساتھ چاہے کامیاب ہوجا، ضعف و کمزوری ضرور آئے گی، کبھی ذہین وفطین بھی دھوکا کھا جاتا ہے۔

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۝ کا معنی ہے جنت کی کامیابی حاصل کرنے والے اور اس میں باقی رہنے والے۔ ابن ابی اسحاق نے کہا: الْمُفْلِحُوْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے وہ سب کچھ پالیا جو انہوں نے طلب کیا اور اس شر سے بچ گئے جس سے وہ بھاگے تھے، یہ ایک معنی ہے۔ کبھی الفلاح، السحور کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی مفہوم میں یہ حدیث ہے "حتی کاد یفوتنا الفلاح مع رسول الله ﷺ قلت و ما الفلاح قال السحور" (1) حتیٰ کہ قریب تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہمارا فلاح فوت ہوجاتا۔ میں نے پوچھا: الفلاح کیا ہے؟ فرمایا: سحری کا کھانا۔ تو حدیث کا معنی یہ ہے کہ سحری کھانے کے ساتھ روزے کی بقا ہے، اسی وجہ سے سحری کے کھانے کو فلاح کہا جاتا ہے الفلاح، کرایہ پر جانور دینے والے کو کہتے ہیں۔

لھا رطل تکیل الزیت فیہ وفلاح یسوق لھا حمارا

پھر الفلاح عرف میں، مطلوب کی کامیابی اور خوفناک چیز سے نجات کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

مسئلہ: اگر کوئی کہنے والا کہے کہ حمزہ نے یہ کیسے پڑھا۔ علیھُم والیھُم ولدیھُم جبکہ، من ربھِم اور فیھِم اور جنتیھِم نہیں پڑھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ علیھم الیھم و لدیھم میں یا الف سے بدلی ہوئی ہے۔ اصل میں علاھم، لداھم اور الاھم تھے۔ پس ھا اپنے ضمہ پر قائم ہے اور فیھم، من ربھم اور جنتیھم میں ایسا نہیں ہے۔ کسائی نے علیھم الذلہ اور الیھم اثنین میں حمزہ کی موافقت کی ہے۔ ان کے متعلق قراء سے یہی معروف ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۝

"بے شک جنہوں نے کفر اختیار کرلیا ہے یکساں ہے ان کے لئے چاہے آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں گے"۔

جب پہلے مومنین اور ان کے احوال کا ذکر فرمایا تو کافروں اور ان کے انجام کا اب ذکر ہو رہا ہے۔ کفر، ایمان کی ضد ہے،

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلوۃ والسنۃ فیھا، باب ما جاء فی قیام شھر رمضان، حدیث نمبر 1316، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آیت میں یہی مراد ہے کبھی کفر کا لفظ نعمت اور احسان کی ناشکری کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، حدیث کسوف میں عورتوں کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اسی معنی میں ہے۔ فرمایا: و رایت النار فلم ار منظرا کالیوم قط افظع و رایت اکثر اھلھا النساء قیل بم یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ قال بکفرھن قیل أیکفرن باللہ۔ قال یکفرن العشیر و یکفرن الاحسان لو احسنت الی احداھن الدھر کلہ ثم رات منک شیئاً قالت ما رایت منک خیراً قط (1) (بخاری) میں نے جہنم دیکھی اور میں نے آج کی طرح کبھی خوفناک منظر نہیں دیکھا۔ میں نے دوزخ میں اکثر عورتوں کو دیکھا۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ایسا کیوں؟ فرمایا: ان کے کفر کی وجہ سے۔ عرض کی گئی: کیا یہ اللہ سے کفر کرتی ہیں؟ فرمایا: یہ خاوند کی ناشکری کرتی ہیں اور احسان کی ناشکری کرتی ہیں۔ اگر تو ان میں سے کسی سے پورا زمانہ احسان بھی کرے پھر کبھی تجھ سے کوئی تھوڑی سی کمی دیکھے گی تو کہے گی: میں نے تجھ سے کبھی خیر نہیں دیکھی۔

عرب کلام میں کفر کی اصل ڈھانپنا اور پردہ ڈالنا ہے۔ شاعر کا قول ہے: فی لیلۃ کفر النجوم غمامھا۔ (رات کے بادلوں نے ستاروں کو چھپا دیا)۔ اسی وجہ سے رات کو کافر کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنی تاریکی کے ساتھ ہر چیز کو چھپا لیتی ہے۔ شاعر نے کہا:

فتذکرا ثقلا رثیدا بعدما القت ذکاء یمینھا فی کافر

یہاں کافر ڈھانپنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

ذکاء، (ذال کے ضمہ اور مد کے ساتھ) یہ سورج کا اسم ہے۔

اسی سے شاعر کا قول ہے:

فوردت قبل انبلاج الفجر و ابن ذکاء کامن فی کفر

وہ فجر پھوٹنے سے پہلے آئی جبکہ سورج رات میں چھپا ہوا تھا۔

کافر دریا، اور بڑی نہر کو کہتے ہیں، کافر، کسان کو بھی کہتے ہیں اس کی جمع کفار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ (الحدید: 20) یعنی کسان، کیوں کہ وہ دانے کو (زمین میں) چھپاتے ہیں۔ رماد مکفور چھپائی گئی راکھ۔ سفت الریح علیہ التراب ہوا نے اس پر مٹی اڑائی۔ الکافر من الارض اس جگہ کو کہا جاتا ہے جو لوگوں سے دور ہو اور کوئی وہاں اترتا نہ ہو اور کوئی وہاں سے گزرتا نہ ہو۔ پس جو ایسی جگہوں پر اتریں انہیں اھل الکفور کہا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: الکفور یعنی دیہات۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ یعنی ان کے نزدیک آپ کا ڈرانا اور نہ ڈرانا برابر ہے یعنی ان پر یہ برابر ہے، برابری کی وجہ سے استفہام کو لایا گیا۔ اس کی مثل ہے: سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ ۝ (الشعراء: 136)

شاعر نے کہا: اسی مفہوم کو اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 144، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، ابواب الکسوف، باب صلوٰۃ الکسوف جماعۃ، حدیث نمبر 993، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

و لیل یقول الناس من ظلماتہ سواء صحیحات العیون و عورھا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ الانذار کا معنی ابلاغ اور اعلام (آگاہ کرنا) ہے اور یہ معنی صرف تخویف (ڈرانے) کی صورت میں ہوتا ہے جس سے بچنے کا زمانہ وسیع ہو۔ اگر بچنے کے لئے اس کا زمانہ وسیع نہ ہو تو اشعار ہوگا، انذار نہ ہوگا۔ شاعر نے کہا:

انذرت عمراً و ھو فی مھل قبل الصباح فقد عصی عمرو

تناذر بنو فلان ھذا الامر، بولا جاتا ہے جب بعض، بعض کو اس امر سے ڈرائیں۔

علماء نے اس آیت کی تاویل میں اختلاف کیا ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ لفظ کے اعتبار سے عام ہے اور اس کا معنی اس شخص کے حق میں خاص ہے جس پر عذاب کا کلمہ ثابت ہو چکا ہے اور اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ وہ کفر پر مرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ آگاہ کردے اس بات پر کہ لوگوں میں اس حال والے بھی کچھ لوگ ہوں گے، کسی کو متعین نہیں فرمایا۔ حضرت ابن عباس اور کلبی نے فرمایا: یہ آیت یہود کے رؤساء کے بارے نازل ہوئی جس میں حیی بن اخطب، کعب بن اشرف اور ان جیسے دوسرے یہودی تھے۔ حضرت ربیع بن انس نے کہا: یہ ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی جو کفار کے سرداروں میں بدر کے دن قتل ہوئے تھے (1)۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ پس جنہوں نے کسی کو متعین کیا اس کی مثال اس شخص کی ہے جس پر غیب کھل گیا کہ اس کی موت کفر پر ہوگی۔ یہ اس آیت کے ضمن میں داخل ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا يُؤۡمِنُوۡنَ یہ ترکیبی اعتبار سے مرفوع ہے اور ان کی خبر ہے، یعنی جنہوں نے کفر کیا وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ بعض نے فرمایا: یہ ان کی خبر ہے سَوَآءٌ اور اس کے بعد والا کلام صلہ کے قائم مقام ہے۔ یہ ابن کیسان کا قول ہے۔ محمد بن یزید نے کہا: سَوَآءٌ مبتدا کے اعتبار سے مرفوع ہے ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ خبر ہے، اور پورا جملہ ان کی خبر ہے۔ نحاس نے کہا: یعنی وہ بیوقوف ہیں انہیں ڈرانا کچھ مفید نہیں۔

ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ کی قراءت میں قراء کا اختلاف ہے۔ اہل مدینہ، ابو عمرو، اعمش اور عبداللہ بن ابی اسحاق نے پہلے ہمزہ کی تحقیق اور دوسرے ہمزہ کی تسہیل کے ساتھ پڑھا ہے، خلیل اور سیبویہ نے اسی کو پسند کیا ہے۔ یہ قریش اور سعد بن بکر کی لغت ہے، اسی کے مطابق شاعر کا قول ہے۔

ایا ظبیۃ الوعساء بین جلاجل و بین النقا آنت ام ام سالم

اس میں آنت پہلے ہمزہ کی تحقیق اور دوسرے ہمزہ کی تسہیل کے ساتھ ہے۔

اس شعر میں آنت ایک الف کے ساتھ آیا ہے۔ ایک اور شاعر نے کہا:

تطاللت فا ستشرفتہ فعرفتہ فقلت لہ آنت زید الارانب

میں نے اسے جھانک کر دیکھا اور اسے پہچان لیا میں نے اسے کہا: کیا تو خرگوشوں والا زید ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 87، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

ابن محیصن سے مروی ہے کہ انہوں نے انذرتھم ام لم تنذرھم پڑھا ہے یعنی صرف ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے اس کے بعد الف نہیں پڑھا، دو ہمزوں کے جمع ہونے کی وجہ سے ایک کو حذف کیا گیا ہے یا اس لئے کہ ام استفہام پر دلالت کرتا ہے جیسا کہ ایک شاعر نے کہا:

تروح من الحی ام تبتکر و ماذا یضیرك ولو تنتظر

اس میں شاعر نے ہمزہ کو حذف کیا ہے۔

تروح سے مراد أتروح لیا ہے اور ام پر اکتفا کیا ہے۔ ابن ابی اسحاق سے مروی ہے کہ انہوں نے (أاُنذرتھم) پڑھا ہے۔ پس انہوں نے دو ہمزوں کو قائم رکھا ہے اور ان کے درمیان الف داخل کیا ہے تا کہ دو ہمزے جمع نہ ہوں۔ ابو حاتم نے کہا: ان دو ہمزوں کے درمیان الف داخل کرنا اور دوسرے ہمزہ کو تخفیف کے ساتھ پڑھنا جائز ہے۔ ابو عمرو، اور نافع اکثر ایسا کرتے تھے۔ حمزہ، عاصم اور کسائی نے دو ہمزوں کے ثبوت کے ساتھ پڑھا ہے(1) یہ ابو عبیدہ کا پسندیدہ قول ہے اور خلیل کے نزدیک یہ بعید ہے۔ سیبویہ نے کہا: یہ ثقل میں ضَنِنُوا کے مشابہ ہے۔ اخفش نے کہا: پہلے ہمزہ کی تخفیف اولیٰ ہے۔ یہ قول ردی ہے کیونکہ عرب استثقال کے بعد اور ایک حرف کی ادائیگی کے بعد تخفیف کرتے ہیں۔ ابو حاتم نے کہا: دو ہمزوں کی تخفیف جائز ہے۔ یہ جمہور کے قول کے مخالف ہے۔ اخفش نے کہا: سعید نے ہمزہ کو ھاء سے بدلا ہے اور ھانذرتھم پڑھا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: ھیاك وایاك۔ اخفش نے کہا: ھاانتم اصل میں أاءنتم تھا۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۡ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝

''مہر لگا دی اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے''۔

اس آیت میں دس مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: خَتَمَ اللّٰهُ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے ایمان نہ لانے کو خَتَمَ اللّٰهُ کے ارشاد سے بیان فرمایا ہے۔ الختم ختمت الشیء ختماً فھو مختوم و مختم (مبالغہ کے لئے شد پڑھی گئی ہے) کا مصدر ہے۔ اس کا معنی کسی شے کو ڈھانپ دینا اور اسے باندھ دینا ہے حتیٰ کہ اس میں کوئی چیز داخل نہ ہو۔ اس سے ختم الکتاب والباب اور اس کے مشابہ چیزیں ہیں حتیٰ کہ اس کے اندر کوئی چیز نہیں پہنچ سکتی اور جو کچھ اس میں ہے اس کے علاوہ کچھ رکھا نہیں جا سکتا۔

اہل معانی نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے کفار کے دلوں کو دس اوصاف کے ساتھ موصوف فرمایا ہے۔ الختم، الطبع، الضیق، مرض، رین، الموت، القساوۃ، الانصراف، الحمیۃ، الانکار۔ انکار کا ذکر اس آیت میں فرمایا: قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ (النحل) الحمیۃ کے ذکر میں فرمایا: اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ (الفتح: 26) قساوت کے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 87، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

ذکر میں فرمایا: فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (الزمر:22) الانصراف کے ذکر میں فرمایا: ثُمَّ انْصَرَفُوْا صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ۝ (توبہ) موت کے بارے میں فرمایا: وَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ (الانعام:122) اور فرمایا: اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ وَ الْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ (الانعام:36) رین کے بارے فرمایا كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۝ (المطففین) اور مرض کے بارے فرمایا: فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ (البقرہ.10) الضیق کے بارے فرمایا: وَ مَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا (الانعام:125) الطبع کے بارے فرمایا: وَ طُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ۝ (توبہ) اور فرمایا: بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ (النساء:155) اور الختم کے بارے فرمایا: خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (البقرہ:7) ان تمام کا بیان ان شاءاللہ اپنی اپنی جگہ پر آئے گا۔

مسئلہ نمبر 2: کبھی ختم (مہر لگا دینا) حسی ہوتا ہے اور کبھی معنوی ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت میں معنوی ختم مراد ہے۔ دلوں پر مہر لگانے سے مراد اللہ تعالیٰ کے پیغام کو یاد نہ کرنا، اس کے مخاطبات کا مفہوم محفوظ نہ کرنا اور اس کی آیات میں غور وفکر نہ کرنا ہے اور کانوں پر مہر لگانے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کو نہ سمجھنا جب ان پر تلاوت کیا جاتا ہے یا انہیں اللہ کی وحدانیت کی طرف بلایا جاتا ہے اور آنکھوں پر مہر لگانے کا مفہوم یہ ہے کہ اس کی مخلوقات اور اس کی مصنوعات کے عجائب میں غور وفکر کے لئے ہدایت حاصل نہ کرنا۔ یہ مفہوم حضرات ابن عباس، ابن مسعود، قتادہ وغیرہم نے بیان کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اس آیت میں بڑی واضح دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ ہدایت وضلال، کفر وایمان کا خالق ہے۔ اے سننے والو! عبرت حاصل کرو، اے مفکرین! قدریہ فرقہ کی عقول پر تعجب کرو جو کہتے ہیں کہ ایمان وہدایت کا وہ خود خالق ہے، خَتَمَ کا معنی مہر لگانا ہے تو پھر ان کے لئے ایمان کہاں ہوگا اگرچہ وہ (بزار) کوشش بھی کریں ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا گیا ہے تو پھر وہ کب ہدایت پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے بعد انہیں کون ہدایت دے گا جب کہ اللہ نے انہیں گمراہ کر دیا اور انہیں بہرہ کر دیا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا: وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ۝ (غافر:33)۔ (اور جسے گمراہ کر دے اللہ اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں) اللہ کا فعل ان لوگوں کے بارے عدل ہے جن کو اس نے گمراہ کیا اور رسوا کیا کیونکہ اس نے انہیں حق سے نہیں روکا جو اس کے لئے واجب تھا ورنہ اس سے صفت عدل زائل ہو جائے گی انہیں اس چیز نے روکا کہ جو اس نے ان پر فضل فرمایا تھا نہ کہ اس چیز نے جو ان کے لئے ثابت تھی۔

اگر وہ کہیں کہ ختم، طبع، غشاوۃ سے مراد نام رکھنا، حکم لگانا اور خبر دینا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے، نہ کہ یہ فعل کی خبر دی گئی ہے ہم کہیں گے: یہ قول فاسد ہے کیونکہ ختم اور طبع کی حقیقت وہ فعل ہے جس کی وجہ سے دل مطبوع ومختوم ہو جاتا ہے یہ جائز نہیں ہے کہ اس کی حقیقت نام رکھنا اور حکم لگانا ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا جب کہا جاتا ہے: فلاں طبع الکتاب وختمہ۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس نے ایسا فعل کیا جس کی وجہ سے کتاب مطبوع اور مختوم ہوگئی ہے نہ کہ نام رکھنا اور حکم لگانا۔ یہ ایسا مفہوم ہے جس میں اہل لغت کا کوئی اختلاف نہیں ہے نیز امت کا اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے دلوں پر مہر لگانے کی نسبت اپنی طرف مجازاً کی ہے، یہ ان کے کفر کی وجہ سے ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا

بِكُفْرِهِمْ (النساء:155) (اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر مہر لگا دی) اور امت کا اس پر بھی اجماع ہے کہ طبع اور ختم ان کے دلوں پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، ملائکہ اور مومنین کی طرف بھی ممتنع ہے اگر ختم اور طبع نام رکھنا اور حکم لگانا ہوتا تو انبیاء اور مومنین کی طرف ممنوع نہ ہوتا کیونکہ وہ تمام کفار کا نام رکھ سکتے تھے کہ ان پر مہر لگائی گئی ہے ان کے دلوں پر ختم لگائی گئی ہے وہ گمراہی میں ہیں ایمان نہیں لائیں گے وہ تمام ان کفار پر حکم لگا سکتے تھے۔

پس ثابت ہوا کہ ختم اور طبع معنوی ہے نام رکھنا اور حکم لگانا نہیں ہے بلکہ یہ معنی ہے جو اللہ تعالیٰ دل میں پیدا فرماتا ہے جو اسے ایمان سے روکتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد بھی ہے: كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِیْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِیْنَ ۙ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ (الحجر) (اسی طرح ہم داخل کرتے ہیں گمراہی کو مجرموں کے دلوں میں وہ نہیں ایمان لائیں گے) اور فرمایا: وَ جَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ یَّفْقَهُوْهُ (الانعام:25) (اور ہم نے ڈال دیئے ہیں ان کے دلوں پر پردے تاکہ نہ سمجھیں وہ اسے)۔

مسئلہ نمبر 4: عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اس میں دلیل ہے کہ دل کو تمام اعضاء پر فضیلت حاصل ہے۔ دل انسان اور دوسری تمام چیزوں کا ہوتا ہے، ہر چیز میں سے جو خالص ہو اور جو چیز معزز ہو وہ اس کا دل ہے۔ دل، فکر کا مقام ہے اصل میں یہ مصدر ہے قلبت الشیء اقلبه قلباً۔ جب کوئی کسی چیز کو اس کے آغاز پر لوٹا دے، تو اس وقت یہ فعل استعمال کیا جاتا ہے قلبت الاناء۔ میں نے برتن کو الٹا کر دیا پھر یہ لفظ نقل کیا گیا اور اس کے ساتھ اس عضو کا نام رکھا گیا جو معزز ترین عضو ہے کیونکہ خیالات جلدی سے اس کی طرف جاتے ہیں اور اس کی طرف لوٹتے ہیں۔ جیسا کہ کہا گیا ہے:

ما سمی القلب الا من تقلبه ۔۔۔ فاحذر علی القلب من قلب و تحویل

قلب کو قلب اس کے پھرنے کی وجہ سے کہا جاتا ہے پس تو دل کی تبدیلی اور تحویل سے بچ۔

پھر جب عربوں نے اس مصدر کو اس شریف عضو کے لئے نقل کیا تو عظمت اس میں لازم ہوگئی۔ اس کے اور اس کی اصل کے درمیان فرق کرنے کے لئے یہ ہے۔

ابن ماجہ نے حضرت ابو موسیٰ سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دل کی مثال اس تنکا کی ہے ہوائیں جسے صحراء میں گھماتی رہتی ہیں'' (1)۔ اسی معنی کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کرتے تھے: اللهم یا مثبت القلوب ثبت قلوبنا علی طاعتك (اے اللہ اے دلوں کو ثابت رکھنے والے! ہمارے دلوں کو اپنی طاعت پر ثابت رکھ (2)۔) جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عظیم منصب اور جلالت شان کے باوجود یہ دعا کرتے تھے تو ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا میں یہ دعا بدرجہ اولیٰ کرنی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَ قَلْبِهٖ (الانفال:24) (اور خوب جان لو کہ اللہ (کا حکم) حائل ہو جاتا ہے انسان اور اس کے دل (کے ارادوں) کے درمیان)۔

مسئلہ نمبر 5: جوارح اگرچہ دل کے تابع ہیں لیکن کبھی دل، جوارح کے اعمال سے متاثر ہوتا ہے اس تعلق کی وجہ سے

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 10، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، مقدمہ، باب فی القدر، حدیث نمبر 84، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 18، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب فضائل صحابہ، باب فیما انکرت الجهمية، حدیث 194، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جو ظاہر اور باطن کے درمیان ہے، اگرچہ دل ان اعضاء کا رئیس اور مالک ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایک شخص سچ بولتا ہے تو اس کے دل میں ایک سفید نکتہ پیدا ہو جاتا ہے اور کوئی شخص جھوٹ بولتا ہے تو اس کا دل سیاہ ہو جاتا ہے'' (1)۔

ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے (اور اس کی سند صحیح ہے)۔ ''ایک شخص گناہ کرتا ہے تو اس کا دل سیاہ ہو جاتا ہے پھر اگر وہ توبہ کرتا ہے تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے'' (2)۔ فرمایا: یہی وہ الرین ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس آیت کے اندر کیا ہے: كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (المطففین)

مجاہد نے کہا: دل ہتھیلی کی مانند ہے ہر گناہ کی وجہ سے ایک انگلی بند ہو جاتی ہے۔ پھر مکمل بند کر دیا جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں: مجاہد کے اس قول میں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں ''جسم میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے جب وہ صحیح ہو تو پورا جسم صحیح ہوتا ہے اور جب وہ فاسد ہو تو پورا جسم فاسد ہوتا ہے۔ خبردار وہ ٹکڑا دل ہے'' (3)۔ دلیل ہے ختم حقیقی ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔ بعض علماء نے فرمایا: دل صنوبر کے مشابہ ہوتا ہے مجاہد کا قول اس کی تائید کرتا ہے۔ واللہ اعلم

مسلم نے حضرت حذیفہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو احادیث بیان فرمائیں۔ ایک تو میں دیکھ چکا ہوں جبکہ دوسری کا منتظر ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بیان فرمایا کہ امانت لوگوں کے دلوں کی جڑوں میں نازل ہوئی پھر قرآن نازل ہوا، لوگوں نے قرآن سے اس کو جانا اور حدیث سے اس کو پہچانا۔ پھر ہمیں امانت کے اٹھ جانے کے متعلق بتایا۔ فرمایا: ایک شخص سوئے گا تو اس کے دل سے امانت اٹھالی جائے گی اس کا اثر ایک جلن کی مثل باقی ہوگا پھر وہ سوئے گا تو اس دل سے امانت اٹھالی جائے گی۔ پس اس کا اثر ایک چھالے کی مثل ہوگا جیسے تیرے پاؤں پر انگارہ گر جائے تو وہ جگہ پھول جاتی ہے تو اسے پھولا ہوا دیکھتا ہے حالانکہ اس کے اندر کچھ نہیں ہوتا، پھر آپ نے کنکری اٹھائی اور اسے اپنے پاؤں پر لڑھکایا۔ لوگ بیع و شراء کرتے رہیں گے کوئی ایک بھی امانت ادا کرنے والا نہ ہوگا حتیٰ کہ کہا جائے گا: فلاں قبیلہ میں ایک امین شخص ہے حتیٰ کہ اس شخص کے متعلق کہا جائے گا وہ کتنا پختہ آدمی ہے، کتنا ہوشیار اور کتنا عقلمند آدمی ہے حالانکہ اس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان نہ ہوگا، مجھ پر ایک ایسا زمانہ بھی گزرا کہ میں پرواہ نہیں کرتا تھا کہ میں کس سے بیع کر رہا ہوں، اگر وہ مسلمان ہو تو اس کا دین مجھ پر میری امانت لوٹا دے گا اور اگر وہ نصرانی ہوگا تو اس کا سردار مجھ پر لوٹا دے گا لیکن آج میں تم سے صرف فلاں فلاں سے بیع کرتا ہوں (4)۔ حدیث میں الوکت کا لفظ ہے اس کا مطلب ہے تھوڑا سا اثر، کچی کھجور میں جب پکنے کا تھوڑا سا نشان لگتا ہے تو عرب کہتے ہیں قد وکت فھو موکت۔ اور المجل۔ اس سے مراد چھالہ ہے یعنی وہ پانی جو جلد اور گوشت کے درمیان ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر اپنے اس قول (کجمر دحرجتہ) سے فرمائی یعنی تو نے

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب باب قبح الکذب وحسن الصدق وفضلہ، صفحہ 325، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باب من سورۃ ویل للمطففین، صفحہ 169-168، جلد 2 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح بخاری، صفحہ 13، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الایمان، باب فضل من استبرا لدینہ، حدیث 50، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب رفع الامانۃ والایمان من بعض القلوب وعرض الفتن علی القلوب، صفحہ 82، جلد 1 (قدیمی)

انگارے کو اپنے پاؤں پر گھمایا تو وہ پھول گیا، تو نے اسے ابھرا ہوا دیکھا..... یہ احادیث دلالت کرتی ہیں کہ یہ سب کچھ دل میں محسوس ہوتا ہے اس میں یہ سب کچھ کہا جاتا ہے اسی طرح الختم اور الطبع ہے۔

حضرت حذیفہ کی حدیث میں ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا: دلوں کو نئے نئے فتنے لاحق ہوتے ہیں جیسے چٹائی ہوتی ہے، جس دل میں یہ فتنے راسخ ہو گئے اس میں سیاہ نکتہ پیدا ہو جاتا ہے اور جو دل ان فتنوں کا انکار کرتا ہے اس میں سفید نکتہ پیدا ہو جاتا ہے حتیٰ کہ دو دل ہو جاتے ہیں۔ ایک سفید جو صفا کی طرح ہوتا ہے اس کو کوئی فتنہ نقصان نہیں دے گا جب تک آسمان اور زمین قائم ہوں گی اور دوسرا دل سیاہ جس میں سیاہی ملی ہوتی ہے جیسے کوزہ ہوتا ہے جو ٹیڑھا ہوتا ہے وہ نیکی کو جانتا بھی نہیں وہ کسی برائی کا انکار نہیں کرتا، لیکن جو اس کے دل میں برائی راسخ ہو چکی ہوتی ہے(1) (وہ وہی کرتا ہے)۔

مسئلہ نمبر 6: دل کو فواد اور صدر سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ (فرقان: 32) اور فرمایا: اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝ (الم نشرح) یعنی دونوں جگہ قلب مراد ہے کبھی قلب سے مراد عقل لیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ (ق: 37) یہاں قلب سے مراد عقل ہے۔

اکثر علماء کے نزدیک دل، عقل کا محل ہے۔

مسئلہ نمبر 7: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ اس آیت سے کانوں کو آنکھوں پر فضیلت دینے والے نے استدلال کیا ہے، کیونکہ کانوں کو آنکھوں پر مقدم کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَ اَبْصَارَكُمْ (الانعام: 46) اور فرمایا: وَّ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ (النحل: 78)

فرمایا: کان چھ جہات، نور اور اندھیرے میں ادراک کرتے ہیں جبکہ آنکھ صرف سامنے کی جہت کا ادراک کرتی ہے اور روشنی کے ذریعہ سے ادراک کرتی ہے۔ اکثر متکلمین نے کانوں پر آنکھوں کو فضیلت دینے کا قول کیا ہے کیونکہ کان صرف آوازوں اور کلام کا ادراک کرتے ہیں جبکہ آنکھ جسموں، رنگوں اور تمام ہیئتوں کا ادراک کرتی ہے۔ جب اس کے تعلقات زیادہ ہیں تو یہ افضل ہوئی اور انہوں نے آنکھ کے ساتھ چھ جہتوں سے ادراک کو جائز قرار دیا ہے۔

مسئلہ نمبر 8: اگر کوئی کہنے والا کہے کہ ابصار تو جمع اور سمع کو مفرد کیوں ذکر فرمایا؟ اسے کہا جائے گا: سمع کو مفرد ذکر کیا کیونکہ یہ مصدر ہے قلت و کثرت کے لئے واقع ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: سمعت الشیء اسمعہ سمعاً و سماعاً۔ پس السمع، سمعت کا مصدر ہے اور السمع اس عضو کا اسم بھی ہے جس کے ساتھ سنا جاتا ہے اس کو مصدر کا نام دیا گیا ہے۔ بعض علماء نے کہا: جب سمع کی اضافت جماعت کی طرف کی جائے تو یہ اس پر دلیل ہوتی ہے اس سے مراد جماعت کے کان ہوتے ہیں۔ جیسا کہ شاعر نے کہا:

بها جيف الحسری فاما عظامها فبيض واما جلدها فصليب

یہاں جلد سے مراد جلود ہے۔ مفرد ذکر کیا کیونکہ یہ معلوم ہے کہ جماعت کے لئے ایک جلد نہیں ہوتی۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب رفع الامانۃ والایمان من بعض القلوب وعرض الفتن علی القلوب، صفحہ 82، جلد 1 (قدیمی)

اس کی مثل ایک اور شاعر نے کہا:

لا تنکر القتل و قد سُبینا فی حلقکم عظمٌ و قد شجینا

اس شعر میں حلق سے مراد حلوق ہیں۔

اس کی مثل دوسرے شاعر کا قول ہے:

کانہ وجہ ترکیین قد غضبا مستھدف لطعان غیر تذبیب

اس شعر میں وجہ سے مراد وجھین ہے۔ شاعر نے کہا: وجہ ترکیین کیونکہ معلوم تھا کہ دو شخصوں کے لئے ایک وجہ (چہرہ) نہیں ہوتا۔ اس کی مثالیں بہت سی ہیں اور وعلی اسماعھم بھی پڑھا گیا ہے، اور وعلی مواضع سمعھم کے معنی کا بھی احتمال ہے کیونکہ سمع پر مہر نہیں لگائی جاتی بلکہ سمع کی جگہ مہر لگائی جاتی ہے۔ پس مضاف کو حذف کیا گیا ہے اور مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے کبھی سمع بمعنی استماع بھی ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: سمعلت حدیثی ... ای استماعک الی حدیثی یعجبنی۔ مجھے تیرا میری بات کو غور سے سننا اچھا لگتا ہے۔ اسی مفہوم میں ذی الرمہ کا قول ہے جو ایک بیل کی تعریف کرتا ہے جو شکاریوں اور کتوں کی آواز غور سے سنتا ہے۔

وقد توجس رکزا مقفر ندس بنباۃ الصوت ما فی سمعہ کذب

یعنی اس کے استماع میں کذب نہیں یعنی وہ سچا غور سے سننے والا ہے، الندس کا معنی ہے حاذق، النباۃ خفی آواز کو کہتے ہیں۔ اسی معنی میں الرکزہے، السمع (سین کے کسرہ اور میم کے سکون کے ساتھ) سے مراد انسان کا اچھائی کے ساتھ ذکر ہے۔ کہا جاتا ہے: ذھب سمعہ فی الناس یعنی لوگوں میں اس کا ذکر پھیل گیا۔ السمع بجو سے بھیڑیئے کے بچے کو بھی کہتے ہیں ... وَعَلٰی سَمْعِهِمْ پر وقف ہے۔

غِشَاوَةٌ مبتدا ہے اور اس کا ماقبل خبر ہے۔ فی قلوبھم اور جو اس پر معطوف ہیں ان سب کی ضمیریں اس کے لئے ہیں جو اللہ کے علم میں ہیں کہ کفار قریش میں سے ایمان نہیں لائیں گے۔ بعض نے فرمایا: منافقین کے لئے ہے۔ بعض نے فرمایا: یہود کے لئے ہے۔ بعض نے فرمایا: تمام کفار کے لئے ہے۔ یہ قول زیادہ عام ہے۔ خَتَمَ (مہر) دلوں اور کانوں پر ہے اور غِشَاوَةٌ آنکھوں پر ہے۔ الغشاء کا معنی ڈھانپنا ہے۔

مسئلہ نمبر 9: اسی سے غاشیۃ السرج ہے۔ غشیت الشیء واغشیتہ۔ نابغہ نے کہا:

ھلاسالت بنی ذبیان ماحسبی اذا الدخان تغشی الاشمط البرما

تو نے بنی ذبیان سے کیوں نہیں پوچھا جو میرے لئے کافی ہے۔ دھواں ادھیڑ عمر والی قوم کے ساتھ شراب نہ پینے والے پر چھا جاتا ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

صحبتک اذ عینی علیھا غشاوۃٌ فلما انجلت قطعت نفسی الومھا

میں نے تیری سنگت اختیار کی جبکہ میری آنکھوں پر پردہ تھا جب پردہ کھلا میں نے اپنے نفس کو ملامت کیا۔

ابن کیسان نے کہا: اگر اس کی جمع بنائی جائے تو یہ غِشَاوَۃٌ کے حذف کے ساتھ ہوگا۔ فراء نے اس کی جمع غشاوی ذکر کی ہے جیسے اداوی جمع ہے۔ غشاوۃ نصب کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور اس سے پہلے جعل محذوف ہوگا اور یہ اس بات سے ہوگا علفتها تبناً و ماءً بارداً (میں نے اسے چارہ کھلایا اور ٹھنڈا پانی پلایا)۔

ایک اور شاعر کا قول ہے:

یا لیت زوجك قد غدا　　متقلدا سیفا و رمحا

کاش! تیرا خاوند تلوار لٹکائے ہوئے اور نیزہ اٹھائے ہوئے جاتا۔

معنی ہے: اسقیتها ماء میں نے اسے پانی پلایا، وحاملاً رمحاً۔ کیونکہ نیزہ گلے میں لٹکایا نہیں جاتا۔ فارسی نے کہا: تو یہ استعمال وسعت واختیار کی حالت میں نہیں پائے گا۔ غشاوہ پر رفع پڑھنا احسن ہے، واؤ عاطفہ ہوگی جملہ کا جملہ پر عطف ہوگا اور فرمایا: میں نے غشاوہ سے واؤ کے ساتھ تصرف کرنے والا فعل نہیں سنا۔ بعض مفسرین نے کہا: کانوں اور آنکھوں پر غشاوہ ہے، وقف قُلُوْبِهِمْ پر ہے۔ دوسرے مفسرین نے کہا: مہر تمام پر ہے اور غِشَاوَۃٌ کا مطلب بھی خَتَمَ (مہر) ہے۔ اس صورت میں وقف غِشَاوَۃٌ پر ہوگا۔ حسن نے غشاوۃ غین کے ضمہ کے ساتھ، ابوحیوہ نے اسے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، ابو عمرو نے غشوہ پڑھا ہے اس نے اسے مصدر کی اصل کی طرف لوٹایا ابن کیسان نے فرمایا: غَشْوَۃ اور غِشْوَۃ پڑھنا جائز ہے اور بہتر غِشَاوَۃٌ ہے اسی طرح ہر لفظ کو اسی طرح استعمال کرتے ہیں جو کسی چیز پر مشتمل ہونے پر دلالت کرے جیسے عمامہ، کنانۃ، قلادہ، عصابہ وغیرہ۔

مسئلہ نمبر 10: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَهُمْ یعنی جھٹلانے والے کفار کے لئے عَذَابٌ عَظِيمٌ عذاب عظیم ہے۔ عَظِيمٌ، عَذَابٌ کی صفت ہے۔ عذاب کی کئی صورتیں ہیں: مثلاً کوڑے مارنا، آگ کے ساتھ جلانا، لوہے سے کاٹنا وغیرہ جو بھی انسان کو تکلیف پہنچائے وہ عذاب ہے۔ قرآن میں ہے: وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (النور) اس کا معنی الحبس اور المنع (روکنا) ہے۔ لغت میں کہا جاتا ہے: اعذبه عن کذا یعنی میں نے اسے روک دیا۔ اسی سے عذوبة الماء ہے پانی کے لئے استعمال ہوتا ہے کیونکہ برتن میں پانی کو روکا جاتا ہے تاکہ صاف ہو جائے اور جو دوسرا مواد اس میں ملا ہوا ہے وہ جدا ہو جائے۔ اسی سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے: اعذبوا نساءكم عن الخروج، یعنی عورتوں کو باہر نکلنے سے روکو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، آپ رضی اللہ عنہ نے ایک لشکر تیار کیا تو آپ نے فرمایا: اعذبوا عن ذکر النساء (انفسکم) اپنے نفسوں کو عورتوں کے ذکر سے روکو کیونکہ ان کا ذکر تمہیں جہاد سے محروم کرے گا۔ ہر وہ جسے تو کسی چیز سے روکے تو اس کے لئے اعذبته استعمال کر سکتا ہے۔ ضرب المثل میں ہے: لالجمنك لجاماً معذباً۔ (میں تمہیں ایسی لگام چڑھاؤں گا جو تجھے لوگوں پر چڑھنے سے روک لے گی)۔ کہا جاتا ہے: اعذب یعنی میں رک جاتا ہوں۔ اعذب غیرہ، غیر کو روکتا ہوں۔ یہ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے عذاب کو عذاب اسی لئے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی عذاب دیئے جانے والے کو روک دیتا ہے اور جسم کے مناسب سب خیر والی چیزوں کو اس سے روک لیتا ہے۔ اس کے مخالف چیزیں اس پر ڈالتا ہے۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝

''اور کچھ لوگ ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر اور روز قیامت پر حالانکہ وہ مؤمن نہیں''۔

اس آیت میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: ابن جریج نے مجاہد سے روایت کیا ہے، فرمایا: سورۂ بقرہ میں مومنین کے بارے چار آیات نازل ہوئیں، دو آیات کافروں کے بارے نازل ہوئیں اور تیرہ آیات منافقین کے بارے نازل ہوئیں۔ اسباط نے سدی سے وَ مِنَ النَّاسِ کے تحت روایت کیا ہے، فرمایا: اس سے مراد منافقین ہیں۔ علماء صوفیاء نے فرمایا: النَّاسِ اسم جنس ہے اور اسم جنس کے ساتھ اولیاء کو مخاطب نہیں کیا جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 2: لفظ النَّاسِ کے بارے میں نحویوں کا اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ اسماء جموع میں سے ایک اسم ہے یہ بغیر لفظ کے انسان اور انسانۃ کی جمع ہے اس کی تصغیر نویس ہے۔ الناس، النوس سے مشتق ہے جس کا معنی حرکت ہے۔ کہا جاتا ہے: ناس ینوس یعنی حرکت کرنا۔ اسی سے ام زرع کی حدیث ہے أناس من حلی اذنی (1)۔ (زیورات سے میرے کانوں کو حرکت دی) بعض نے فرمایا: اس کی اصل نسی سے ہے۔ ناس کا اصل نسی ہے قلب ہوا ہے۔ پس نیس بن گیا یا مفتوح ماقبل فتح کی وجہ سے الف سے بدل گئی ہے پھر الف، لام داخل ہوا ہے، بعض نے فرمایا: اس کی اصل النَّاسِ ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: نسی آدم عهد الله فسمی انساناً۔ (آدم علیہ السلام اللہ کا عہد بھول گئے تو انہیں انسان کیا گیا)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدم علیہ السلام بھول گئے تو ان کی اولاد بھی بھولی (2)۔ قرآن میں ہے: وَ لَقَدْ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ (طٰہٰ: 115) اس صورت میں ہمزہ زائدہ ہوگا۔ شاعر نے کہا

لاتنسین تلك العهود فانما　　　سميت انسانا لانك ناسی

ان عہود کو مت بھول، تیرے بھولنے کی وجہ سے تجھے انسان کہا گیا ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

فان نسیت عهوداً منك سالفة　　　فاغفر فاول ناس اول الناس

اگر تو سابقہ عہود بھول گیا ہے تو توبہ کر۔ پہلا بھولنے والا پہلا انسان تھا۔

بعض علماء نے فرمایا: حضرت آدم کو انسان کہا گیا کیونکہ وہ حضرت حوا سے انس رکھتے تھے۔ بعض نے فرمایا: اپنے رب سے انس رکھتے تھے، اس صورت میں ہمزہ اصلی ہوگا شاعر نے کہا:

وما سمی الانسان الا لانسه　　　ولا القلب الا انه يتقلب

انسان کو انسان اس کے انس کی وجہ سے کہا جاتا ہے اور قلب کو قلب اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ پھرتا رہتا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب حسن المعاشرة مع الاھل، حدیث نمبر 4790، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر عن رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم، باب من سورة المعوذتین، صفحہ 173، جلد 2 (وزارت تعلیم)

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ نے مومنین کا پہلے ذکر فرمایا۔ ان کے شرف اور ان کی فضیلت کی وجہ سے ان سے آغاز فرمایا۔ ان کے مقابلہ میں پھر کافرین کا ذکر کیا کیونکہ کفر اور ایمان دو طرفیں ہیں۔ پھر ان کے بعد منافقین کا ذکر فرمایا اور انہیں کافرین کے ساتھ ملایا کیونکہ ان میں بھی ایمان نہیں پایا جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَاهُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ۔

اس آیت میں کرامیہ فرقہ کا رد ہے جنہوں نے کہا کہ ایمان زبان کے اقرار کا نام ہے اگرچہ دل میں اعتقاد نہ بھی ہو اور اس قول سے حجت پکڑی ہے: فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا (مائدہ:85) (تو عطا فرمائے اللہ نے بعوض اس قول کے جو وہ کہتے ہیں) اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا جو انہوں نے کہا اور دل میں تصدیق رکھی اور اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔ ''مجھے لوگوں سے جہاد کا حکم دیا گیا ہے حتیٰ کہ وہ کہیں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ جب وہ یہ کہہ دیں گے تو انہوں نے مجھ سے اپنے خون اور اپنے مال محفوظ کر لئے'' (1)۔ یہ کرامیہ کی عقل کا قصور اور فکر کا جمود ہے۔ قرآن و حدیث میں قول اور اعتقاد کے ساتھ عمل کا جو بیان ہے اس میں غور و فکر کے ترک کی وجہ سے ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ایمان دل کی معرفت، زبان کے قول اور ارکان کے عمل کا نام ہے'' (2)۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے اپنی سنن میں ذکر کیا ہے۔ محمد بن کرام سجستانی اور اس کے ساتھیوں کا جو نظریہ ہے وہ نفاق ہے اور عین شقاق ہے۔ ہم خذلان اور برے اعتقاد سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 4: ہمارے علماء نے فرمایا: مومن کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ مومن جس سے اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے اور اس سے پیار کرتا ہے اور ایک وہ مومن جس سے اللہ تعالیٰ نہ محبت کرتا ہے نہ اس سے پیار کرتا ہے بلکہ اس سے بغض رکھتا ہے اور اس سے دشمنی کرتا ہے، پس ہر وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ یہ ایمان قبول کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس سے محبت و پیار کرتا ہے اور اس سے راضی ہوتا ہے اور ہر وہ شخص جس کے بارے اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ یہ کفر اختیار کرے گا تو اللہ اس سے بغض رکھتا ہے، اس سے ناراض ہوتا ہے اور اس سے دشمنی رکھتا ہے اس کے موجودہ ایمان کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے اس کفر اور گمراہی کی وجہ سے جس کے ساتھ وہ موافقت کرے گا۔ اسی طرح کافر کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک کافر وہ جس کو اللہ تعالیٰ یقیناً عذاب دے گا اور ایک کافر وہ جس کو عذاب نہیں دے گا۔ وہ کافر جسے عذاب دیا جائے گا وہ ایسا کافر ہے جو کفر سے آخر تک موافقت کرے گا۔ پس اس پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے اس سے دشمنی کرتا ہے اور وہ کافر جس کو عذاب نہیں دیا جائے گا وہ ایسا کافر ہے جو بالآخر ایمان سے موافقت کرے گا اللہ تعالیٰ اس پر ناراض نہیں ہوتا اور اس سے بغض نہیں رکھتا، بلکہ اس سے محبت و پیار کرتا ہے، اس کے موجودہ کفر کی وجہ سے نہیں بلکہ اس ایمان کی وجہ سے جس سے بالآخر وہ موافقت کرے گا۔ پس مطلق قول کرنا جائز نہیں۔

مسئلہ نمبر 5: مومن ثواب کا مستحق ہوتا ہے اور کافر عذاب کا مستحق ہوتا ہے بلکہ اس کی موافات (ایمان پر خاتمہ، کفر پر خاتمہ) ان پر رکھنا واجب ہے۔ اسی وجہ سے ہم نے کہا: اللہ تعالیٰ حضرت عمر سے اس وقت بھی راضی تھا جب بتوں کی عبادت کرتے تھے اور اسے ثواب دینے اور اس کے جنت میں داخل ہونے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ بتوں کی

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب قول اللہ عزوجل و امرھم شوری بینھم، حدیث 935، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 8، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب المقدمہ، باب فی الایمان، حدیث نمبر 63، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عبادت کرتے تھے بلکہ اس ایمان کی وجہ سے بالآخر جس سے انہوں نے موافقت کرلی تھی اور اللہ تعالیٰ ابلیس پر ناراض تھا اس کی عبادت کی حالت میں بھی اس کے اس کفر کی وجہ سے بالآخر جس کے ساتھ اس نے موافقت کرنی تھی۔

قدریہ فرقہ والے اس مسئلہ میں مخالفت کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ ابلیس پر اس کی عبادت کے وقت ناراض نہیں تھا اور عمر کی بتوں کی عبادت کے وقت عمر سے راضی نہیں تھا۔ یہ قول فاسد ہے۔ جب ثابت ہے کہ ابلیس جس کفر سے موافقت کرنی تھی اللہ اسے جاننے والا ہے اور عمر نے جس ایمان کی موافقت کرنی تھی اسے بھی جاننے والا۔ پس ثابت ہوا کہ ابلیس پر اللہ تعالیٰ ناراض تھا اور عمر پر راضی تھا اس پر امت کا اجماع دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرنے والا نہیں جس کے متعلق وہ جانتا ہے کہ وہ دوزخی ہے بلکہ اس سے ناراض ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرنے والا ہوتا ہے جس کے متعلق اسے معلوم ہے کہ وہ جنتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایمان (کا ثواب و کمال) خاتمہ پر ہے'' (1)۔ اسی لئے صوفیاء وعلماء کہتے ہیں: ایمان وہ نہیں جس کے ساتھ بندہ قولاً اور فعلاً مزین ہے بلکہ ایمان ازل کے سوابق میں سعادت کا جاری ہونا ہے۔ رہا اس کا ہیاکل میں ظہور تو وہ کبھی عارضی ہوتا ہے اور کبھی حقیقۃً ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ ثابت ہے جس طرح کہ صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتایا جو سچے ہیں (اور) آپ سے سچ کہا گیا ہے، کہ تم میں کسی ایک کی تخلیق کو اس کی ماں کے بطن میں چالیس دن میں جمع کیا جاتا ہے پھر وہ اتنی مدت میں جما ہوا خون رہتا ہے پھر اتنی مدت میں گوشت کا ٹکڑا رہتا ہے پھر اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ بھیجتا ہے وہ اس میں روح پھونکتا ہے اور اس فرشتے کو چار کلمات کا حکم دیا جاتا ہے (یعنی) اس کا رزق، اس کی عمر، اس کا عمل اور اس کا بدبخت یا سعید ہونا لکھنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود حقیقی نہیں کہ تم میں سے کوئی جنتیوں والے عمل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ جنت اور اس کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے۔ پس اس پر نوشتہ تقدیر غالب آجاتا ہے۔ وہ دوزخیوں والا عمل کرتا ہے اور دوزخ میں داخل ہو جاتا ہے تم میں سے کوئی دوزخیوں والے اعمال کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے اس پر نوشتہ تقدیر غالب آتا ہے وہ جنتیوں والا عمل کرتا ہے اور جنت میں داخل ہو جاتا ہے (2)۔

مسئلہ نمبر 6: امام حافظ ابو محمد عبدالغنی بن سعید مصری نے محمد بن سعید شامی کی حدیث الزندقہ کے بارے میں نقل کی ہے۔ محمد بن سعید سے مراد محمد بن ابی قیس ہے، انہوں نے سلیمان بن موسیٰ سے روایت کی ہے یہ سلیمان اشدق ہے، سلیمان نے حضرت مجاہد بن جبیر سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے، فرمایا: ہمیں ابو رزین عقیلی نے بتایا، فرمایا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اور تو اے ابا رزین! ایسے دودھ سے ہیں جس کا ذائقہ نہیں بدلا۔ ابو رزین نے کہا: میں نے عرض کی: اللہ تعالیٰ مردے کیسے زندہ کرے گا؟ فرمایا: کیا تو کبھی بنجر زمین سے نہیں گزرا پھر تو سرسبز زمین سے نہیں گزرا پھر تو بنجر

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 961، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الرقاق، باب الاعمال بالخواتیم وما یخاف، حدیث 6012، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب اذا اثنی علی الصالح فھی بشری، صفحہ 332، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

مین سے نہیں گزرا پھر تو سرسبز سے نہیں گزرا؟ میں نے عرض کی: کیوں نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: بالکل اسی طرح نشور ہوگا۔ ابورزین نے کہا: میں نے عرض کی: میں کیسے جان لوں کہ مومن ہوں؟ فرمایا: کوئی اس امت کا فرد نہیں ہے جس نے کوئی نیک عمل کیا پھر اس نے جان لیا کہ یہ نیک عمل ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی بہتر جزا عطا کرنے والا ہے یا اس نے برا عمل کیا پھر اس نے جانا کہ یہ برا عمل ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی سزا دینے والا ہے یا اسے معاف کرنے والا ہے، مگر بندہ مومن کی یہ شان ہوتی ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ حدیث اگرچہ ایسی ہے کہ اس کی سند قوی نہیں ہے۔ اگر اس کا معنی صحیح بھی ہو تو پھر بھی حضرت ابن مسعود کی حدیث کے مخالف نہیں ہے کیونکہ وہ خاتمہ پر موقوف ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اعمال کا دارومدار خاتمہ پر ہے (1)۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ فی الحال مومن ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 7: علماء لغت نے فرمایا: منافق کو منافق اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ ایسی بات کا اظہار کرتا ہے جس کے مخالف وہ دل میں چھپائے ہوئے ہوتا ہے، اس کی تشبیہ جنگلی چوہا ہے اس کی ایک بل ہوتی ہے اسے نافقاء کہا جاتا ہے اور ایک اور اس کی بل ہوتی ہے جسے القاصعاء کہا جاتا ہے وہ زمین کو کریدتا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ زمین کے ظاہر تک یعنی معمولی سی مٹی تک پہنچ جاتا ہے۔ جب اسے کوئی خطرہ لاحق ہوتا ہے تو وہ اس مٹی کو دور کرتا ہے اور اپنی بل سے نکل جاتا ہے، اس کی بل کے ظاہر پر مٹی ہوتی ہے اور اس کے اندر سوراخ ہوتا ہے۔ اسی طرح منافق اس کا ظاہر ایمان ہوتا ہے اور باطن کوئی اور۔ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔

یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ ۝

”فریب دینا چاہتے ہیں اللہ کو اور ایمان والوں کو اور (حقیقت میں) نہیں فریب دے رہے مگر اپنے آپ کو اور اس حقیقت کو نہیں سمجھتے“۔

ہمارے علماء نے فرمایا: یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ کا معنی ہے: وہ اپنے گمان اور خیال کے مطابق اللہ تعالیٰ کو دھوکا دیتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اس لئے فرمایا کیونکہ ان کا عمل، ایک دھوکا دینے والے کے عمل جیسا ہوتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: کلام میں حذف ہے۔ اصل میں ہے: یخادعون رسول اللہ ﷺ۔ وہ اللہ کے رسول کو دھوکا دیتے ہیں۔ حسن وغیرہ سے مروی ہے، ان کے رسول اللہ کو دھوکا دینے کو اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے کے مترادف فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں آپ ﷺ کی رسالت کے ساتھ بلایا۔ اسی طرح جب انہوں نے مومنین کو دھوکا دیا تو یقیناً انہوں نے اللہ تعالیٰ کو دھوکا دیا۔ ان کا دھوکا یہ تھا کہ وہ ایمان ظاہر کرتے تھے جبکہ ان کے دلوں میں کفر تھا۔ یہ وہ اس لئے کرتے تھے تاکہ اپنے خون اور اپنے اموال بچا لیں اور وہ گمان کرتے تھے کہ وہ نجات پا گئے اور انہوں نے دھوکا دے دیا۔ یہ مفسرین کی ایک جماعت کا قول ہے۔ اہل لغت نے فرمایا: کلام عرب میں الخدع کا معنی ہے: فساد۔ ثعلب نے یہ ابن اعرابی سے روایت کیا ہے۔ اس نے شعر کہا ہے:

ابیض اللون لذیذ طعمه طیب الریق اذ الریق خدع

رنگ سفید ہے ذائقہ لذیذ ہے، اس کا لعاب پاک ہے جب کہ اس کا لعاب فاسد ہو جائے۔

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 961، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الرقاق، باب الاعمال بالخواتیم، حدیث 6012، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں کہتا ہوں: اس اعتبار سے یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ کا معنی ہوگا: وہ اپنے ایمان اور اعمال کو ریاکاری کی وجہ سے اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان خراب کر دیتے ہیں۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تفسیر کے ساتھ آیا ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔ اور قرآن حکیم میں ہے: یُرَآءُوْنَ النَّاسَ (النساء: 142) (وہ لوگوں کے لئے دکھاوا کرتے ہیں)۔ بعض علماء نے فرمایا: خدع کا اصل معنی الاخفاء (چھپانا ہے) ہے۔ اسی سے مخدع البیت ہے جس میں کوئی چیز چھپائی جاتی ہے۔ یہ ابن فارس وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ عرب کہتے ہیں: انخدع الضب فی جحرہ۔ یعنی گوہ اپنے بل میں چھپ گئی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ۔ اس میں نفی اور ایجاب ہے یعنی دھوکے کا انجام اپنے اوپر ہی نازل ہوگا۔ یہ عربوں کے کلام سے ہے: من خدع من لا یخدع فانما یخدع نفسه، جو ایسی ذات کو دھوکا دیتا ہے جس کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا تو وہ اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے اور یہ صحیح ہے کیونکہ دھوکا تو اسے دیا جا سکتا ہے جو بواطن کو نہ جانتا ہو، اور جو بواطن کو جانتا ہو جو اس کے ساتھ دھوکا کرتا ہے تو وہ اپنے آپ سے دھوکا کرتا ہے۔ یہ دلیل ہے کہ منافقین نے اللہ تعالیٰ کی ذات کو نہیں پہچانا کیونکہ اگر وہ اسے پہچانتے ہوتے تو وہ جان لیتے کہ اسے دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گزر چکا ہے۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ کو دھوکا نہ دو کیونکہ جو اللہ تعالیٰ کو دھوکا دیتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اس دھوکے کی سزا دیتا ہے اور وہ اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے اگر وہ سمجھے۔ تو صحابہ نے عرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ تعالیٰ کو کیسے دھوکا دیا جا سکتا ہے؟ فرمایا: تو وہ عمل کرتا ہے جس کا اللہ نے تجھے حکم دیا اور اس کے ساتھ تو غیر کی رضا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دھوکا کی حقیقت کا بیان آگے اَللّٰهُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ کے تحت آئے گا۔ نافع، ابن کثیر، ابو عمرہ نے دونوں جگہ یخادعون پڑھا ہے تاکہ دونوں لفظ متجانس ہو جائیں۔ عاصم، حمزہ، کسائی اور ابن عامر نے دوسری جگہ یخدعون پڑھا ہے اس کا مصدر خدع و خدیعۃ ہے۔ یہ ابوزید نے حکایت کیا ہے مورق العجلی یخدعون اللہ یعنی یا کے ضمہ، خا کے فتحہ اور دال کی تشدید کے ساتھ پڑھتے کثرت کا معنی لینے کے لئے۔ ابوطالوت عبدالسلام بن شداد اور جارود نے یاء کے ضمہ، خا کے سکون اور دال کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے (1) اس معنی پر ما یخدعون الاعن انفسهم، حرف جر کو حذف کیا گیا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ (الاعراف: 155) اصل میں من قومه تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا یَشْعُرُوْنَ یعنی وہ نہیں جانتے کہ ان کے دھوکے کا وبال ان کی طرف ہی لوٹنے والا ہے وہ گمان کرتے ہیں کہ وہ اپنے دھوکہ کی وجہ سے نجات پا گئے اور کامیاب ہو گئے۔ یہ دنیا میں ہے اور آخرت میں انہیں کہا جائے گا: ارجعوا وراءکم فالتمسوا نورا۔ واپس پلٹ جاؤ اور نور تلاش کرو، جیسا کہ آگے آئے گا۔

اہل لغت نے کہا: شعرت بالشیء۔ یعنی میں نے اس کو جان لیا۔ اسی سے شاعر کی فطانت کی وجہ سے اسے شاعر کہا جاتا ہے کیونکہ شاعر جو معانی پہچانتا ہے وہ دوسرے نہیں پہچانتے۔ اسی سے عربوں کا قول ہے: لیت شعری۔ یعنی کاش میں جان لیتا۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 90، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

فِيۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌۢ ۙ بِمَا كَانُوۡا يَكۡذِبُوۡنَ ۝

''ان کے دلوں میں بیماری ہے پھر بڑھادی اللہ نے ان کی بیماری اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے بوجہ اس کے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِيۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ المرض سے مراد وہ فساد ہے جو ان کے عقائد میں تھا یا تو یہ شک اور نفاق تھا یا انکار اور تکذیب تھی۔ معنی یہ ہے ان کے دل مریض ہیں کیونکہ وہ عصمت، توفیق، رعایت اور تائید سے خالی ہیں۔ ابن فارس لغوی نے کہا: مَّرَضٌ سے مراد ہر وہ چیز ہوتی ہے جو انسان کو صحت کی حد سے خارج کر دے خواہ وہ بیماری ہو یا نفاق ہو یا کسی امر میں کوتاہی ہو۔ قراء کا مرض کے راء کے فتحہ پر اجماع ہے مگر اصمعی نے ابو عمرو سے روایت کیا ہے کہ اس نے راء کو ساکن کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا بعض علماء نے فرمایا: یہ منافقین کے خلاف بددعا ہے۔ اس کلام کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے شک اور نفاق میں اضافہ فرمائے ان کے کفر پر جزا دیتے ہوئے، اور ان کی مدد کی جگہ ضعف اور قدرت کی جگہ عجز میں اضافہ فرمائے۔ جیسے شاعر نے کہا:

یا مرسل الریح جنوباً وصبا　　　اذ غضبت زید فزدها غضبا

اے جنوب کی ہوا اور باد صبا کو چلانے والے! جب بنو زید غضبناک ہوں تو ان کے غضب میں اضافہ کر۔

اس صورت میں آیت کے اندر دلیل ہے منافقین کے خلاف دعا کرنے اور انہیں دھتکارنے کی کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی بری ترین مخلوق ہیں۔ بعض علماء نے کہا: یہ ان کی مرض کی زیادتی کی اللہ تعالیٰ خبر دے رہا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی مرض میں اضافہ کر دیا۔ جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا: فَزَادَتۡهُمۡ رِجۡسًا اِلٰى رِجۡسِهِمۡ (توبہ:125)

اہل معانی نے کہا: فِيۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ ان کے دلوں میں مرض کا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا کی لذتوں سے پرسکون ہیں اور دنیا کی محبت ان کے دلوں میں ہے اور آخرت سے غافل ہیں اور آخرت سے اعراض کئے ہوئے ہیں اور فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے نفسوں کے سپرد کر دیا ہے۔ ان پر دنیا کے غموں کو جمع کر دیا ہے اس لئے وہ دین کے اہتمام کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوئے وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ یعنی دنیا فانی کے بدلے انہیں ایسا عذاب دیا جو ہمیشہ رہنے والا ہے۔

جنید نے کہا: دلوں کی بیماریاں خواہش نفس کی پیروی کی وجہ سے ہیں جیسا کہ اعضاء کی بیماریاں بدن کے مرض سے ہوتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ، اَلِيۡمٌ کا معنی عرب کلام میں مؤلم ہے یعنی درد پہنچانے والا جیسے سمیع معنی مسمع ہوتا ہے۔ ذوالرمہ اونٹوں کا وصف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

ونرفع من صدور شمردلات　　　یصك وجوهها وهج الیم

ہم لمبے اونٹوں کے سینوں کو بلند کرتے ہیں جبکہ ان کے چہروں کو تکلیف دہ گرمی لگ رہی ہوتی ہے۔

الم کا معنی ہے تکلیف دینا، الایلام کا معنی ہے تکلیف دینا۔ الالم، تکلیف کو کہتے ہیں الم یالم الما۔ التالم کا معنی تکلیف

محسوس کرنا۔ اَلِیْمٌ کی جمع اُلَمَاء ہے جیسے کریم کی جمع کرماء ہے آلام اس کی جمع اشراف کی طرح ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ، ما مصدریہ ہے یعنی رسل کی تکذیب کی وجہ سے۔ اللہ تعالیٰ کا انکار اور اس کی آیات کی تکذیب کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں دردناک عذاب دیا۔ یہ ابو حاتم نے کہا ہے۔ عاصم، حمزہ اور کسائی نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کا معنی ہے ان کے جھوٹ کی وجہ سے اور ان کے اس قول کی وجہ سے کہ ہم ایمان لائے حالانکہ وہ مومن نہ تھے۔

مسئلہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین کے نفاق کا علم تھا تو ان کے قتل سے کیوں رکے رہے، اس کے متعلق علماء کے مختلف چار اقوال ہیں۔

ا۔ بعض علماء نے فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قتل نہ فرمایا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی کو ان کی حالت کا علم نہ تھا اور اکثر علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ قاضی اپنے علم کی بنا پر قتل نہیں کر سکتا۔ باقی تمام احکام میں علماء کا اختلاف ہے، ابن عربی نے کہا: یہ قول درست نہیں کیونکہ مجذر بن زیاد کو حارث بن سوید بن الصامت نے قتل کیا تھا کیونکہ مجذر نے حارث کے باپ سوید کو جنگ بعاث میں قتل کیا تھا۔ حارث اسلام لے آیا، جنگ احد میں مجذر کو غفلت میں پایا تو اسے قتل کر دیا۔ جبریل امین نے اس کی خبر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی اور اسے اس کے بدلے میں قتل کر دیا، کیونکہ اس کا قتل دھوکے سے تھا اور دھوکے سے قتل کرنا اللہ کی حدود میں سے ایک حد ہے۔ میں کہتا ہوں: یہ ابن عربی کی غفلت ہے کیونکہ اگر اجماع مذکور ثابت ہے تو پھر اس واقعہ سے اجماع نہیں ٹوٹتا کیونکہ اجماع منعقد نہیں ہوتا اور ثابت نہیں ہوتا مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اور وحی کے انقطاع کے بعد۔ یہ واقعہ تو عین وحی کے ساتھ تھا، پس اس سے حجت نہیں پکڑی جا سکتی ہے یا یہ بالا جماع منسوخ ہے۔ واللہ اعلم

۲۔ امام شافعی کے پیروکار علماء فرماتے ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قتل نہیں فرمایا کیونکہ زندیق وہ ہوتا ہے جو کفر کو چھپاتا ہے اور ایمان ظاہر کرتا ہے۔ اس سے توبہ طلب کی جاتی ہے اور اسے قتل نہیں کیا جاتا۔ ابن عربی نے کہا: یہ وہم ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے توبہ طلب نہیں کی تھی اور نہ یہ کسی اور نے کیا تھا، کسی نے یہ نہیں کہا کہ زندیق سے توبہ طلب کرنا واجب ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق علم ہونے کے باوجود اعراض فرمایا۔ اصحاب شافعی میں سے یہ متاخر ہے۔ جس نے کہا زندیق سے توبہ طلب کرنا جائز ہے اس نے ایسی بات کہی ہے جو کسی کے لئے صحیح نہیں ہے۔

۳۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تالیف قلوب کی مصلحت کی خاطر انہیں قتل نہیں کیا تا کہ وہ آپ سے متنفر نہ ہو جائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معنی کی طرف اشارہ فرمایا جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر سے فرمایا: معاذ الله ان يتحدث الناس انی اقتل اصحابی۔ (1) اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ لوگ کہیں کہ میں اپنے ساتھیوں کو قتل کرتا ہوں۔ اس کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ مؤلفۃ قلوب کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عطا فرماتے تھے حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی بداعتقادی کا علم تھا یہ ہمارے اور دوسرے علماء کا قول ہے۔ ابن عطیہ کا قول ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منافقین کو قتل نہ کرنے کے بارے میں یہ اصحاب مالک کی دلیل

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 499، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب المناقب، باب ماینھی عنه من دعوة الجاهلية، حدیث 3257، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے: اس پر محمد بن الجہم، قاضی اسماعیل، الابہری، ابن الماجشون نے نص قائم کی ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس قول سے حجت پکڑی ہے لَئِنْ لَّمْ یَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّ الْمُرْجِفُوْنَ فِی الْمَدِیْنَةِ لَنُغْرِیَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا یُجَاوِرُوْنَكَ فِیْهَاۤ اِلَّا قَلِیْلًا ۚۖۛ مَّلْعُوْنِیْنَ ۚۛ اَیْنَمَا ثُقِفُوْۤا اُخِذُوْا وَ قُتِّلُوْا تَقْتِیْلًا ۝ (الاحزاب)

قتادہ نے کہا: اس کا معنی ہے جب انہوں نے نفاق کا اعلان کیا۔ امام مالک نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں جو نفاق تھا وہ آج زندقہ ہے۔ پس زندیق کو قتل کیا جائے گا جب اس پر گواہی قائم ہو جائے گی اور اس سے توبہ طلب نہیں کی جائے گی۔ یہ امام شافعی کا ایک قول ہے۔ امام مالک نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم منافقین کے قتل سے رک گئے تاکہ امت کو بیان کریں کہ حاکم اپنے علم کے مطابق فیصلہ نہیں کر سکتا کیونکہ منافقین کے خلاف گواہی نہیں تھی۔ قاضی اسماعیل نے کہا: عبداللہ بن ابی پر گواہی نہ دی مگر صرف زید بن ارقم نے۔ اور جلاس بن سوید پر گواہی نہ دی مگر عمیر بن سعد نے جو اس کی پرورش میں تھا۔ اگر اس میں سے کسی ایک پر دو آدمی اس کے کفر اور نفاق کی گواہی دیتے تو اسے قتل کیا جاتا۔ امام شافعی نے دوسرے قول کے لئے حجت پکڑتے ہوئے کہا کہ اس شخص کے بارے سنت یہ ہے جس پر زندیق ہونے کی گواہی دی گئی ہو پھر وہ انکار کرے اور ایمان کا اعلان کرے اور دین اسلام کا اعلان کرے اور دین اسلام کے علاوہ ہر دین سے براءت کرے تو اس کا خون بہانا ممنوع ہے۔ اصحاب الرائے، احمد، طبری وغیرہم کا یہی نظریہ ہے۔ امام شافعی اور ان کے متبعین نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کو قتل نہیں کیا کیونکہ وہ اسلام کو ظاہر کرتے تھے حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے نفاق کا علم تھا، وہ جس کو ظاہر کرتے تھے وہ ماقبل گناہوں کو ختم کر دیتا ہے۔

طبری نے کہا: اللہ تعالیٰ نے بندوں پر احکام ظاہر پر رکھے ہیں، ان کے بواطن کا معاملہ اس کے اپنے سپرد ہے۔ مخلوق میں سے کسی کو یہ اختیار نہیں کسی کے لئے اس کے ظاہر کے خلاف فیصلہ کرے کیونکہ یہ ظنون کے مطابق حکم ہوگا۔ اگر کسی فرد کے لئے یہ جائز ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے زیادہ لائق ہوتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کے ظاہر کی وجہ سے ان پر مسلمانوں والا حکم لگایا اور ان کے بواطن کو اللہ کے سپرد کیا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں وَ اللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝ (المنافقون) میں ان کے ظاہر کی تکذیب کی ہے۔ ابن عطیہ مالکی اس الزام سے اس آیت کی وجہ سے بری ہیں جو ان پر لازم آتا تھا کیونکہ آیت میں اشخاص کو متعین نہیں کیا گیا۔ اس میں ہر اس شخص کے لئے زجر و توبیخ ہے جو بھی نفاق میں گھر ہوا ہے اور ان میں سے ہر ایک کے لئے یہ کہنا باقی رہ گیا ہے اس میں سے میں مراد نہیں ہوں۔ میں مومن ہی ہوں، اگر کسی کو متعین کر دیا جاتا تو اس کا جھوٹ کسی چیز کو ختم نہ کرتا۔

میں کہتا ہوں: اس انفصال میں نظر ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں جانتے تھے یا اللہ تعالیٰ کی عطا سے ان کی شخصیات اور ان کے اسماء کو جانتے تھے۔ حضرت حذیفہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتانے کی وجہ سے منافقین کو جانتے تھے حتیٰ کہ حضرت عمر، حضرت حذیفہ کو کہتے تھے: اے حذیفہ! کیا میں ان میں سے ہوں، حذیفہ کہتے: نہیں۔

۴۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اصحاب کی حفاظت فرمائی تھی کہ منافقین انہیں خراب کر سکیں کیونکہ اللہ تعالیٰ

نے مومنین کو ثبات عطا فرمایا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اصحاب کی حفاظت فرمائی تھی کہ منافقین ان کے دین میں بگاڑ پیدا کر سکیں۔ پس ان کے باقی رکھنے میں کوئی ضرر نہ تھا، لیکن آج اس طرح نہیں ہے، ہم زنادقہ سے امن میں نہیں ہیں کہ وہ ہمارے عام اور جاہل لوگوں کے نظریات خراب نہیں کریں گے۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْۤا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ⑪

''اور جب کہا جائے انہیں کہ مت فساد پھیلاؤ زمین میں تو کہتے ہیں ہم ہی تو سنوارنے والے ہیں''۔

اِذَا ظرف کی بنا پر حالت نصبی میں ہے اور اس میں عامل قَالُوْۤا ہے، اِذَا یہ فعل منتظر کے وقوع پر دلالت کرتا ہے۔ جوہری نے کہا اِذَا اسم ہے جو زمانہ مستقبل پر دلالت کرتا ہے اور یہ جملہ کی طرف مضاف ہو کر استعمال ہوتا ہے مثلاً اجیئك اذا احمر البسر واذا قدم فلان، یعنی میں تیرے پاس آؤں گا جب کھجوریں سرخ ہو جائیں گی اور جب فلاں آ جائے گا اور جو چیز اس کے اسم ہونے پر دلالت کرتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ یوم کی جگہ واقع ہوتا ہے مثلاً آتیك یوم یقدم فلان یہ ظرف ہے اور اس میں مجازاۃ کا معنی بھی پایا جاتا ہے۔ شرط کی جزا تین چیزیں ہوتی ہیں: الفعل، الفاء اور اذا۔ فعل کی مثال ان تاتنی آتك۔ فاء کی مثال ان تاتنی فانا احسن الیك، اذا کی مثال، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ ⑯ (الروم) اور اگر پہنچتی ہے انہیں کوئی تکلیف بوجہ ان کرتوتوں کے جو آگے بھیجے ہیں ان کے ہاتھوں نے تو وہ مایوس ہو جاتے ہیں۔ مجازاۃ کے معنی میں اِذَا اس شعر میں استعمال ہوا ہے:

اذا قصرت اسیافنا کان وصلها خطانا الی اعدائنا فنضاربُ

جب ہماری تلواریں قاصر آ جائیں گی تو ہمارے قدم انہیں ہمارے دشمنوں تک پہنچائیں گے اور ہم انہیں ماریں گے۔

نضارب کا عطف کان پر ہے، اس لئے یہ مجزوم ہے۔ اگر نضارب مجزوم نہ ہوتا تو فنضارب نصب کے ساتھ ہوتا کبھی اذا پر ما تاکید اً ذکر کیا جاتا ہے پھر اس کے ساتھ جزم دی جاتی ہے۔ فرزدق کا قول ہے:

فقام ابو لیلیٰ الیه ابن ظالم وكان اذا ما یسلل السیف یضرب

ابو لیلیٰ ابن ظالم اس کی طرف اٹھا اور وہ جب تلوار سونت لیتا ہے تو مار دیتا ہے۔

سیبویہ نے کہا: کعب بن زہیر نے جو کہا وہ عمدہ ہے:

واذا ما تشاء تبعث منها مغرب الشمس ناشطاً مذعوراً

اور جب تو اس سے سورج کے غروب ہونے کے وقت چلنا طلب کرے گا تو وہ اس وقت بھی ایسی تیزی سے اٹھے گی جیسے کوئی جانور شکاری سے ڈرا ہوا ہوتا ہے۔

یعنی عمدہ یہ کہ اِذَا کے ساتھ جزم نہ دی جائے جیسے اس بیت میں جزم نہیں دی گئی۔ مبرد سے حکایت کیا گیا ہے کہ خرجت فاذا زیدٌ میں اِذَا ظرف مکان ہے کیونکہ اپنے ضمن میں جثۃ کو لئے ہوئے ہے اور یہ مردود ہے کیونکہ اس کا معنی ہے خرجت فاذا حضور زید۔ یہ مصدر کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہوتا ہے جیسے دوسرے ظرف زمان تقاضا کرتے ہیں۔ ان کا قول ہے

الیوم خمرٌ وغداً امرٌ۔ اس کا معنی ہے آج خمر کا وجود ہے اور کل امر کا وقوع ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قِیْلَ یہ قول سے مشتق ہے۔ اصل میں قُوِلَ تھا۔ واؤ کے کسرہ کو قاف کی طرف نقل کیا گیا پھر واؤ یاء سے بدل گئی۔ اور قِیْلَ لَهُمْ میں لام کو لام میں ادغام کرنا بھی جائز ہے اور دو ساکنوں کو جمع کرنا بھی جائز ہے کیونکہ یاء حرف مدولین ہے۔ اخفش نے کہا: قیل قاف اور یاء کے ضمہ کے ساتھ بھی جائز ہے۔ کسائی نے کہا: قاف کو ضمہ کی بو دے کر پڑھنا بھی جائز ہے تاکہ دلالت کرے کہ یہ مجہول کا صیغہ ہے۔ یہ قیس قبیلہ کی لغت ہے، اسی طرح جیء، غیض، حِیل، سیق، سیء اور سیئت (1) میں ہے۔ ہشام نے حضرت ابن عباس، رویس نے یعقوب سے اسی طرح روایت کیا ہے اور ان الفاظ میں سیی اور سیئت کو نافع نے خاص طور پر اشمام سے پڑھا ہے۔ ابن ذکوان نے حیل اور سیق میں بھی اشمام کیا ہے اور باقی قراء نے تمام میں کسرہ دیا ہے۔ ہذیل، بنو دبیر جو اسد اور بنی فقعس سے تھے وہ اسے قُوْلَ واؤ کے سکون کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: لَا تُفْسِدُوْا اس میں لا نہی ہے، فساد، صلاح کی ضد ہے، اور فساد کی حقیقت، سیدھے راستہ سے عدل کر کے اس کی ضد کی طرف جانا ہے فسد الشیء یفسُد فساداً و فسوداً و ھو فاسد و فسید، آیت میں اس کا معنی ہے زمین میں کفر کر کے اور اہل کفر سے محبت کر کے لوگوں کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور قرآن پر ایمان لانے میں جدائی کر کے فساد نہ کرو۔ بعض علماء نے فرمایا:۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے زمین میں فساد تھا، زمین پر ہر قسم کے گناہ کیے جاتے تھے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو فساد اٹھ گیا اور زمین کی اصلاح ہوگئی۔ جب منافقین نے پھر گناہ شروع کیے تو اس کی اصلاح کے بعد فساد کیا جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا: وَ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (الاعراف: 56) (تم زمین میں فساد برپا نہ کرو اس کی اصلاح کے بعد)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِی الْاَرْضِ، الارض مؤنث اسم جنس ہے، اس کے واحد کا حق تھا کہ ارضۃ کہا جاتا لیکن ایسا نہیں کیا۔ اس کی جمع ارضات آتی ہے کیونکہ عرب ایسی مؤنث کی جمع تاء کے ساتھ بناتے ہیں جس کے آخر میں تاء تانیث نہیں ہوتی مثلاً عرسات۔ پھر علماء کہتے ہیں ارضون۔ انہوں نے اس کی جمع واؤ، نون کے ساتھ بنائی ہے اور مؤنث کی جمع واؤ اور نون کے ساتھ نہیں آتی مگر یہ کہ وہ منقوص ہو جسے ثبۃ اور ظبۃ، لیکن انہوں نے واؤ اور نون کو الف اور تا جو حذف ہیں ان کے عوض کو ذکر کیا ہے اور را کے فتحہ کو اپنی حالت پر رکھا ہے۔ اور کبھی ساکن کر کے پڑھا ہے۔ اس کی جمع اروض بھی بنائی جاتی ہے۔ ابو الخطاب نے کہا ہے کہ وہ کہتے ہیں ارض، اراض جیسا کہ اہل کے بارے میں کہا ہے: اھل، اھال، اور الاراضی بھی بغیر قیاس کے جمع آتی ہے۔ گویا انہوں نے آرضا کی جمع بنائی۔ ہر وہ چیز جو نیچے ہو وہ ارض ہے ارض اریضۃ یعنی پاکیزہ زمین جس کی اراضت ظاہر ہے۔ قد ارُضَتْ کا معنی ہے، پاکیزہ، عمدہ ہے۔ ابو عمرو نے کہا: نزلنا ارضا اریضۃ یعنی ہم ایسی زمین میں اترے جو آنکھوں کو اچھی لگنے والی تھی۔ کہا جاتا ہے: لا ارض لک۔ جیسے کہا جاتا ہے: لا امر لک۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 93، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

الارض جانور کے نیچے والے پاؤں کو کہتے ہیں۔ حمید اپنے گھوڑے کا وصف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

ولم یقلب ارضھا البیطار　　و لا لحبلیه بھا حبار

الارض سے مراد نفضۃ (جھاڑنا ہے) اور الرعدۃ (کپکپی) کو بھی کہتے ہیں۔ حماد بن سلمہ نے قتادہ سے انہوں نے عبداللہ بن حارث سے روایت کیا ہے فرمایا: بصرہ میں زمین پر زلزلہ آیا تو حضرت ابن عباس نے کہا: أزلزلت الارض امبی ارض۔ کیا زمین لرز رہی ہے یا مجھ پر کپکپی طاری ہے۔ ذوالرمہ نے شکاری کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا:

اذا توجس رکزا من سنابکھا　　او کان صاحب ارض او به الموم

جب اس کے پاؤں کی مدہم سے آواز سنتا ہے یا اسے لرزہ ہے یا اسے برسام کی بیماری ہے۔ الأَرْض کا معنی الزکام بھی ہے قد آرضه الله ایراضًا یعنی اسے زکام لگا دیا۔ فسیلٌ مستأرِضٌ و ودیةٌ مستأرضةٌ (راء کے کسرہ کے ساتھ) جس کی زمین میں جڑ ہو۔ اور جب کھجور تنے پر اُگ آئے تو اسے راکب کہتے ہیں۔ الاراض اون اور بالوں کی بنی ہوئی بڑی قالین۔ رجل اریض، متواضع اور نیکی کرنے والا شخص۔ اصمعی نے کہا: کہا جاتا ہے: ھو آرَضُھم ان یفعل ذلک۔ یعنی اس نے انہیں پیدا کیا۔ شیء عریض۔ اریض اس کی پیروی کرنے والا۔ بعض نے اس کو علیحدہ ذکر کیا کہ جَدْیٌ اریض یعنی موٹا دنبہ یا موٹا تحفہ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نَحْنُ اس کی اصل نحْنُ ہے۔ حاء کی پیش نون کو دی گئی اور حاء کو ساکن کر دیا۔ یہ ہشام بن معاویہ نحوی کا قول ہے، الزجاج نے کہا: نحن جمع کے لئے ہے اور جمع کی علامت میں سے واؤ ہے اور ضمہ واؤ کی جنس سے ہے، جب نَحْنُ کو حرکت دینے کی طرف مجبور ہوئے تو انہوں نے ایسی حرکت دی جو جماعت کے لئے تھی۔ زجاج نے کہا: اسی وجہ سے واؤ جمع کو اس ارشاد میں ضمہ دیا ہے: أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ (البقرہ:16) (یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے گمراہی کو خریدا) محمد بن یزید نے کہا نَحْنُ، قبل اور بعد کی مثل ہے کیونکہ یہ دو یا زائد کی خبر دینے کے لئے ہے۔ انا، واحد کے لئے ہے نحن تثنیہ اور جمع کے لئے ہے۔ کبھی متکلم اس کے ساتھ اپنے متعلق خبر دیتا ہے جیسے نحن قمنا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ (الزخرف:32) ہم نے خود تقسیم کیا ہے ان کے درمیان سامان زیست کو۔ اور مؤنث اس صورت میں مذکر کے قائم مقام ہوتی ہے جبکہ وہ کلام کرنے والی ہو۔ عورت کہتی ہے: قمتُ و ذھبتُ، قمنَا و ذھبنَا۔ وانا فعلتُ ذاک۔ و نحن فعلنا یہ عربوں کا کلام ہے۔ خوب جان لو!

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مُصْلِحُوْنَ یہ اصلح سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ الصلاح فساد کی ضد ہے، صلح لام کے ضمہ اور فتحہ کے ساتھ دونوں لغتیں ہیں۔ یہ ابن سکیت نے کہا ہے۔ صلوح، صاد کے ضمہ کے ساتھ صلح (بضم اللام) کا مصدر ہے۔ شاعر نے کہا:

فکیف باطراق اذا ما شتمتنی　　و ما بعد شتم الوالدین صلوح

جب تم مجھے گالی دو گے تو میں کیسے سر جھکاؤں گا، والدین کو گالی دینے کے بعد صلح نہیں ہوتی۔

اور صلاح مکہ کے اسماء میں سے ہے، الصلح صاد کے کسرہ کے ساتھ نہر کو کہتے ہیں۔ یہ انہوں نے اپنے گمان کے مطابق کیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک ان کا فساد کرنا، اصلاح تھا۔ یعنی ہمارا کفار کی مدد کرنا اس لئے تھا کہ ہم ان کے اور مومنین کے درمیان اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ یہ ابن عباس وغیرہ کا قول ہے۔

اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲﴾

''ہوشیار وہی فسادی ہیں لیکن سمجھتے نہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ یہ منافقین کے قول کا رد ہے اور ان کو جھٹلانا ہے، ارباب المعانی نے کہا: جس نے دعویٰ ظاہر کیا اس نے جھوٹ بولا، کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ یہ صحیح ہے ان کو کسرہ دیا گیا ہے، کیونکہ یہ ابتداء کلام میں ہے۔ یہ نحاس کا قول ہے۔ علی بن سلیمان نے کہا: انّ پر فتحہ بھی جائز ہے جیسا کہ سیبویہ نے جائز قرار دیا ہے۔ حقًا انك منطلق حقًا بمعنی الا ہے، اور ''هم'' اس کا مبتدا ہونا جائز ہے۔ اور المفسدون خبر ہے پھر مبتدا اور خبر، ان کی خبر ہیں اور یہ بھی جائز ہے کہ ''هم'' انهم میں جو ہاء اور میم ہے اس کی تاکید کے لئے ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ ہم فصلہ ہو کوفی اس کو عماد کہتے ہیں اور المفسدون ان کی خبر ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے الا انهم المفسدون جیسا کہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵﴾ کے قول میں گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ابن کیسان نے کہا: کہا جاتا ہے جو جانتا نہ ہو کہ وہ مفسد ہے تو اس کی مذمت نہیں ہوتی۔ مذمت تو اس کی ہوتی ہے جو جانتا ہو کہ وہ مفسد ہے پھر علم کے باوجود فساد برپا کرے۔ ابن کیسان نے کہا: اس کے دو جواب ہیں یہ خفیۃً فساد کرتے تھے اور ظاہر صلاح کرتے تھے اور وہ یہ نہ جانتے تھے کہ ان کا یہ معاملہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ظاہر ہوگا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کا فساد ان کے نزدیک صلاح تھا اور وہ نہ جانتے تھے کہ یہ فساد ہے۔ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی، حق کو ظاہر کرنے اور اس کی اتباع کو ترک کر کے۔ وَلٰكِنْ یہ حرف تاکید اور استدراک ہے اس میں نفی اور اثبات ضروری ہے۔ اگر اس سے پہلے نفی ہو تو اس کے بعد ایجاب ہوگا۔ اگر اس سے پہلے ایجاب ہو تو اس کے بعد نفی ہو گی۔ اس کے بعد ایک اسم پر اکتفا بھی جائز ہے جب پہلے ایجاب ہو۔ لیکن تو اس کے بعد ماقبل کا مخالف جملہ ذکر کرے گا جیسا کہ اس آیت میں ہے اور تیسرا قول ہے جاء نی زیدٌ و لکن عمرو لم یجئی۔ اور یہ جائز نہیں جاء نی زیدٌ لکن عمرو پھر تو خاموش ہو جائے کیونکہ لکن کی جگہ بل کی وجہ سے اس جیسی مثال میں مستغنی ہو جاتے ہیں۔ یہ اسی صورت میں جائز ہے جب پہلے نفی ہو جیسے تیرا قول ہے ما جاء نی زیدٌ لکن عمرو۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾

''اور جب کہا جائے انہیں: ایمان لاؤ جیسے ایمان لائے (اور) لوگ تو کہتے ہیں: کیا ہم ایمان لائیں جس طرح ایمان لائے بیوقوف؟ خبردار! بے شک وہی احمق ہیں مگر وہ جانتے نہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ، ھم ضمیر سے مراد منافقین ہیں۔ یہ مقاتل وغیرہ کا قول ہے اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ یعنی تم بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی شریعت کی تصدیق کرو جیسا کہ مہاجرین نے تصدیق کی اور اہل یثرب میں سے مختلف لوگوں نے تصدیق کی۔ اٰمِنُوْا میں الف قطعی ہے۔ تو کہتا ہے یؤمن، کاف نصب کے مقام پر ہے کیونکہ یہ مصدر محذوف کی صفت ہے یعنی ایمانا کایمان الناس۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ یعنی اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ منافقین نے السُّفَهَآءُ سے اہل کتاب کے مؤمنین مراد لیے۔ یہ منافقین کا قول ہے۔ وہ پوشیدہ اور استہزاء کے طور پر یہ کہتے تھے: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کو اس پر آگاہ فرمادیا۔ اور ثابت فرمایا کہ بیوقوفی، عقلوں کا نرم ہونا، بصیرت کا فاسد ہونا، ان کی اپنی ذوات میں ہے اور ان کی صفت ہے بتایا کہ یہی بیوقوف ہیں دلوں پر چڑھی ہوئی میل کی وجہ سے جانتے نہیں ہیں، کلبی نے ابو صالح سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ یہ یہود کے بارے میں نازل ہوئی۔ یعنی جب یہود کو کہا گیا کہ ایمان لاؤ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے یعنی عبداللہ بن سلام اور اس کے ساتھی تو انہوں نے کہا: کیا ہم ایمان لائیں جیسے السُّفَهَآءُ ایمان لائے یعنی جہال اور ناسمجھ۔ کلام عرب میں السفه کا معنی ہے خفت اور رقت، کہا جاتا ہے۔ ثوب سفیه جب کپڑے کی بنائی اچھی نہ ہو یا پرانا اور باریک ہو۔ تسفهت الريح الشجر ہوا نے درخت کو جھکا دیا۔ ذوالرمہ نے کہا:

مشين كما اهتزت رماح تسفهت اعاليها مر الرياح النواسم

وہ عورتیں چلیں جیسے نیزے حرکت کر رہے ہوں ہلکی پھلکی ہوا کے چلنے نے ان کے اوپر والے حصوں کو جھکا دیا۔

تسفهت الشیء کسی چیز کو حقیر سمجھنا۔ السفه، حلم (دانشمندی) کی ضد ہے۔ کہا جاتا ہے: ان السفه ان یکثر الرجل شرب الماء فلا یروی۔ سفاہیت ہے کہ آدمی زیادہ پانی پیے اور سیر نہ ہو۔ السفہاء کے دونوں ہمزوں میں چار وجوہ جائز ہیں۔ عمدہ وجہ یہ ہے کہ پہلے ہمزہ کو ثابت کرے اور دوسرے کو واؤ سے بدل دے۔ یہ اہل مدینہ کی قرأت ہے اور ابو عمرو کی قرأت سے معروف ہے اور اگر تو چاہے تو دونوں میں تخفیف کرے۔ پہلے تو ہمزہ اور واؤ کے درمیان پڑھے اور دوسرے کو خالص واؤ کے ساتھ پڑھے۔ اگر تو چاہے تو پہلے میں تخفیف کرے اور دوسرے کو ثابت رکھے۔ اگر تو چاہے تو دونوں کو ثابت رکھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ یہ وَ لٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝ کی مثل ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ علم، معلوم کی معرفت کو کہتے ہیں جیسا کہ وہ معلوم ہے تو کہتا ہے: علمت الشیء اعلمه علماً عرفته۔ عالمتُ الرجل فَعَلَمْتُهُ اعلمه (لام کے ضمہ کے ساتھ) یعنی میں علم کے ساتھ اس پر غالب آیا۔

وَ اِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۝

”اور جب ملتے ہیں ایمان والوں سے تو کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب اکیلے ہوتے ہیں اپنے

شیطانوں کے پاس تو کہتے ہیں: ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو صرف (ان کا) مذاق اڑا رہے تھے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا یہ آیت منافقین کے ذکر میں نازل ہوئی۔ اصل میں لقوا، لقیوا تھا۔ ضمہ کو قاف کی طرف نقل کیا گیا اور یاء کو التقاء ساکنین کی وجہ سے حذف کیا گیا۔ محمد بن سمیقع یمانی نے لاقوا الذین آمنوا پڑھا ہے۔ اصل میں لاقیوا تھا۔ یاء کا ماقبل فتحہ تھا۔ اس لئے وہ الف سے بدل گئی پھر دو ساکن لام اور واو جمع ہوئے تو الف التقائے ساکنین کی وجہ سے حذف ہو گیا پھر واؤ کو ضمہ کے ساتھ حرکت دی گئی۔

اگر یہ کہا جائے کہ لاقوا میں واؤ کو کیوں ضمہ دیا گیا اور لَقُوا میں حذف کیوں کیا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ لَقُوا میں جو واؤ ہے اس سے پہلے ضمہ تھا۔ اگر واؤ کو ضمہ کی حرکت دی جاتی تو زبان پر اس کا تلفظ ثقیل ہوتا پس اس کے ثقل کی وجہ سے اسے حذف کیا گیا اور لاقوا میں حرکت دی گئی کیونکہ اس سے پہلے فتحہ تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ

اگر کہا جائے کہ خَلَوْا کا صلہ الی کیوں ذکر ہوا جبکہ معروف یہ ہے کہ اس کا صلہ باء ہوتا ہے، اس کا جواب یہ ہوگا کہ یہاں خَلَوْا بمعنی ذھبوا اور انصرفوا ہے۔ فرزدق کا قول ہے:

كيف تراني قالبا مجني اضربُ امری ظهره لبطن

قد قتل الله زياداً عني(1)

تو مجھے اپنی ڈھال پھیرنے والا کیسے دیکھتا ہے، میں اس کی پیٹھ پر اس کے بطن کے لئے مارتا ہوں

اللہ تعالیٰ نے زیاد کو میری طرف سے قتل کر دیا ہو

جب صرف کے قائم مقام رکھا تو اس کا صلہ ذکر کیا۔

بعض علماء نے کہا: الی بمعنی مع ہے۔ اس قول میں ضعف ہے۔ بعض علماء نے کہا: الی بمعنی باء ہے(2)۔ اس کا خلیل اور سیبویہ نے انکار کیا ہے۔ بعض علماء نے کہا: اس کا معنی ہے واذا خلوا من المؤمنين الی شياطينهم۔ اس صورت میں الی اپنے اصلی معنی میں ہوگا۔ الشیاطین، شیطان کی جمع مکسر ہے۔ اس کے اشتقاق اور اس کے معنی کے متعلق قول اَعُوْذُ بِاللّٰهِ کے تحت گزر چکا ہے۔

یہاں شیطان سے کون مراد ہیں؟ اس کے متعلق مفسرین کا اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس اور سدی نے کہا: یہ کفر کے سردار ہیں(3)۔ کلبی نے کہا: یہ جنوں کے شیاطین ہیں۔ اکثر مفسرین نے کہا: یہ کاہن لوگ ہیں۔ الشیطنة کا لفظ وہ ہے جس کا معنی ہے ایمان اور خیر سے دور ہونا۔ جو کچھ ذکر کیا گیا ہے یہ سب کو شامل ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ۝ یعنی ہمیں جس کی طرف بلایا جاتا ہے ہم اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ بعض علماء نے اس کا معنی کیا ہے: ہم تمسخر کرتے ہیں۔ الھزء کا معنی ہے تمسخر کرنا اور دل بہلانا۔ کہا جاتا ہے: هزء به و استهزأ۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 96، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

راجز نے کہا:

قد هزئت منی ام طیسله قالت اراه معدما لا مال له

ام طیسلہ نے مجھ سے تمسخر کیا۔ اس نے کہا: میں اسے مفلس دیکھتی ہوں، اس کے پاس کوئی مال نہیں۔

بعض علماء نے فرمایا: استہزاء کا معنی انتقام لینا ہے جیسا کہ ایک شاعر نے کہا:

قد استهزء وا منهم بالفی مدجج سراتهم وسط الصحاصح جثم

انہوں نے ان سے دو ہزار ہتھیار بندوں کے ساتھ انتقام لیا۔ ان کے سردار چٹیل زمین کے درمیان اپنے پہلو لازم پکڑے ہوئے تھے۔

اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَ يَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝

''اللہ سزا دے رہا ہے انہیں اس مذاق کی اور ڈھیل دیتا ہے انہیں تاکہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں۔''

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ یعنی اللہ تعالیٰ ان سے انتقام لے گا اور انہیں سزا دے گا اور ان سے تمسخر کرے گا اور انہیں ان کے تمسخر کی سزا دے گا۔ سزا کو گناہ کے نام سے ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ جمہور علماء کا قول ہے۔ اور عرب اپنے کلام میں اس قسم کی ترکیب کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ عمرو بن کلثوم کا قول ہے:

الا لا یجهلن احدٌ علینا فنجهل فوق جهل الجاهلینا (1)

خبردار! کوئی ہم پر (حملہ کر کے) جہالت کا مظاہرہ نہ کرے ورنہ ہم زمانہ جاہلیت کی جہالت سے زیادہ جہالت کا مظاہرہ کریں گے۔

اس نے اپنے غلبہ کو جہل سے تعبیر کیا۔ حالانکہ کوئی صاحب عقل جہالت پر فخر نہیں کرتا۔ یہ اس نے کلام کو ماننے کے لئے جہل کا لفظ استعمال کیا ہے پس یہ زبان پر خفیف ہو جائے گا حالانکہ اس کے لفظ اور اس کے اس مفہوم کے درمیان مخالفت ہے۔ عرب جب ایک لفظ کو کسی لفظ کے مقابلہ میں بطور جواب اور جزاذکر کرتے ہیں تو اس لفظ کی مثل ذکر کرتے ہیں، اگرچہ وہ لفظ اس کے معنی کے مخالف ہوتا ہے۔ اس کی مثالیں قرآن وسنت میں موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (الشوریٰ:40) اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔ اور فرمایا فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ (البقرہ:194) تو جو تم پر زیادتی کرے تو تم اس پر زیادتی کرو لیکن اسی قدر جتنی زیادتی اس نے تم پر کی ہو۔ جزاء، سیئۃٌ (برائی) نہیں ہوتی اور قصاص (بدلہ) اعتدا نہیں ہوتا ہے کیونکہ قصاص تو ثابت حق ہوتا ہے۔ اسی طرح فرمایا وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ (آل عمران:54) اور یہودیوں نے (مسیح علیہ السلام کو قتل کرنے کی) خفیہ تدبیر کی اور (مسیح کو بچانے کے لئے) اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی۔ اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ۝ وَّ اَكِيْدُ كَيْدًا ۝ (الطارق) یہ لوگ طرح طرح کی تدبیریں کر رہے ہیں اور میں بھی تدبیر فرما رہا ہوں۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 97، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

اسی طرح فرمایا: اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ۝ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ (البقرہ)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ مکر ہے نہ استہزاء ہے اور نہ کید ہے بلکہ یہ ان کے مکر اور استہزا کی جزا ہے اور ان کے کید کی جزا ہے۔ اسی طرح فرمایا: يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ (النساء:142) وہ دھوکا دے رہے ہیں اللہ کو اور اللہ تعالیٰ سزا دینے والا ہے انہیں (اس دھوکہ بازی کی) فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ۭ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ (التوبہ:79) تو یہ ان کا بھی مذاق اڑاتے ہیں اللہ تعالیٰ سزا دے گا انہیں اس مذاق کی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ان الله لا يمل حتى تملوا(1) ولا يسأم حتى تساموا(2) یعنی اللہ تعالیٰ نہیں اکتاتا حتیٰ کہ تم اکتا جاؤ گے اور وہ ملول نہیں ہوتا حتیٰ کہ تم ملول ہو جاؤ گے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس حدیث میں حتیٰ بمعنی واؤ ہے یعنی اور تم اکتا جاؤ گے۔ بعض علماء نے فرمایا: اور تم اکتا جاؤ گے۔ بعض نے فرمایا: وہ تم سے تمہارے اعمال کا ثواب ختم نہیں کرے گا حتیٰ کہ تم عمل چھوڑ دو گے۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ایسے افعال کرے گا جو انسان کے خیال میں استہزا، دھوکہ اور مکر ہوں گے۔ جیسا کہ روایت ہے کہ آگ جم جائے گی جس طرح گھی کا تلچھٹ جم جاتا ہے۔ وہ اس آگ پر چلیں گے اور وہ انہیں نجات گمان کریں گے۔ پھر وہ انہیں دھنسا دے گی(3)۔ کلبی نے ابو صالح سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا (البقرہ:14) سے مراد اہل کتاب ہیں، منافق لوگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا اور ان کے استہزا کا ذکر فرمایا ہے۔ وہ جب اپنے شیطانوں کے پاس جاتے ہیں یعنی کفر کے رؤساء کے پاس جاتے ہیں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ تو کہتے ہیں: ہم تمہارے ساتھ تمہارے دین پر ہیں۔ ہم تو محمد ﷺ کے اصحاب سے تمسخر کرنے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ آخرت میں انہیں اس تمسخر کی سزا دے گا ان کے لئے، جنت سے جہنم کا دروازہ کھولا جائے گا پھر انہیں کہا جائے گا: ادھر آؤ پس وہ آئیں گے تو وہ جہنم میں چلے جائیں گے اور مومنین اپنے پلنگوں پر بیٹھے انہیں دیکھ رہے ہوں گے۔ جب وہ دروازے پر پہنچیں گے تو اسے بند کر دیا جائے گا پھر مومنین انہیں دیکھ کر ہنسیں گے، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے یہی مراد ہے، اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ۔ یعنی آخرت میں اللہ انہیں اس استہزا کی سزا دے گا جب ان پر دروازے بند ہوں گے تو مومنین ان پر ہنسیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے یہی مراد ہے: فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ۝ عَلَى الْاَرَآئِكِ ۙ يَنْظُرُوْنَ۝ (المطففین) یعنی مومنین دوزخیوں کو دیکھ رہے ہوں گے: هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ۝ (المطففین) کیوں کچھ بدلہ ملا کفار کو (اپنے کرتوتوں کا) جو وہ کیا کرتے تھے۔

ایک قوم نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور استہزاء سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان دنیوی نعمتوں کے ذریعے آہستہ آہستہ دوزخ کی طرف لے جا رہا ہے اللہ تعالیٰ ان کے لئے دنیا میں احسان ظاہر کرتا ہے جبکہ عذاب آخرت ان سے چھپائے ہوئے ہے۔ پس وہ گمان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ ان پر حتمی عذاب کا فیصلہ کر چکا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 11، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الایمان، باب احب الدین الی اللہ عزوجل ادومہ، حدیث 41، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب صلوٰۃ المسافر وقصرھا، باب امر من نعس فی الصلوٰۃ، صفحہ 267، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 97، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

یہ انسان کی سوچ میں گویا استہزا، مکر اور دھوکا ہے۔ اس تاویل پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد دلالت کرتا ہے: اذا رأیتم الله عزوجل یعطی العبد ما یحب و هو مقیم علی معاصیه فانما ذلك منه استدراج۔ جب تم دیکھو کہ اللہ تعالیٰ بندے کو اس کی خواہش کے مطابق عطا فرما رہا ہے جبکہ وہ اس کی نافرمانی پر قائم ہے تو یہ اس کی طرف سے استدراج ہے، پھر اس آیت سے یہ مفہوم نکلتا ہے: فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ؕ حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ۝ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝ (الانعام) پھر جب انہوں نے بھلا دیں وہ نصیحتیں جو انہیں کی گئی تھیں۔ کھول دیئے ہم نے ان پر دروازے ہر چیز کے یہاں تک کہ جب وہ خوشیاں منانے لگے اس پر جو انہیں دیا گیا تو ہم نے پکڑ لیا انہیں اچانک اب وہ ناامید ہو کر رہ گئے۔ تو کاٹ کر رکھ دی گئی جڑ اس قوم کی جس نے ظلم کیا تھا اور تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جو پروردگار ہے سارے جہان والوں کا۔ بعض علماء نے سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ۝ (اعراف) کی تفسیر میں فرمایا: جب وہ کوئی گناہ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انہیں ایک نعمت عطا فرما دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَيَمُدُّهُمْ یعنی ان کے لئے مدت لمبی کر دیتا ہے اور انہیں مہلت دیتا ہے اور انہیں ڈھیل دیتا ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا: اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْۤا اِثْمًا (آل عمران: 178) (صرف اس لئے ہم انہیں مہلت دے رہے ہیں کہ وہ اور زیادہ گمراہی کریں)۔ اس کی اصل زیادت ہے۔ یونس بن حبیب نے کہا: کہا جاتا ہے شر کے لئے مدّ اور خیر کے لئے اَمَدّ استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ (الاسراء: 6) (اور ہم مسلسل تمہیں دیتے رہیں گے مال اور بیٹوں سے)۔

اور فرمایا: وَاَمْدَدْنٰهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَّلَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ۝ (الطور: 22) (اور ہم مسلسل دیتے رہیں گے انہیں (ایسے) میوے اور گوشت جو وہ پسند کریں گے)۔

اخفش سے حکایت کیا گیا ہے کہ مددت له بولا جاتا ہے جب تو اسے ترک کردے اور امددته بولا جاتا ہے جو تو اسے عطا کرے۔ فراء اور لحیانی سے مروی ہے کہ مددت اس صورت میں استعمال ہوتا ہے جس کی زیادت اس کی مثل سے ہو۔ کہا جاتا ہے: مدّ النهر اور قرآن میں ہے وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ (لقمان: 27) (اور سمندر سیاہی بن جائے اور اس کے علاوہ سات سمندر) اور امددت اس صورت میں استعمال ہوتا ہے جب اس میں زیادتی اس کے غیر سے ہو جیسے تیرا قول امددت الجیش بمدد میں نے لشکر کی کمک کے ساتھ مدد کی۔ اسی سے ہے: يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ (آل عمران: 125) (مدد کرے گا تمہاری تمہارا رب پانچ ہزار فرشتوں سے) وامدّ الجرح (زخم میں پیپ پڑ گئی) کیونکہ پیپ زخم کے علاوہ ہے یعنی اس میں پیپ پڑ گئی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِيْ طُغْيَانِهِمْ یعنی کفر و گمراہی میں۔ طغیان کی اصل حد سے تجاوز کرنا ہے۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ (الحاقہ: 11) یعنی پانی بلند ہوا اور چڑھ گیا اور فرشتوں نے جو مقدار متعین کی تھی اس سے تجاوز کر گیا اور اللہ تعالیٰ نے فرعون کے بارے فرمایا: اِنَّهٗ طَغٰى۝ (طٰہٰ) یعنی اس نے دعویٰ میں اسراف کیا کہ جب اس نے کہا:

اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ۝ (النازعات) (میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں)۔

آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں لمبی عمر کے ساتھ ڈھیل دی حتیٰ کہ ان کی سرکشی میں اضافہ ہو گیا۔ پس وہ ان کے عذاب میں اضافہ کرے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَعْمَهُوْنَ مجاہد نے فرمایا: یعنی وہ کفر میں متحیر ہیں اور بھٹک رہے ہیں۔ اہل لغت نے بیان کیا کہ عمه الرجل يعمه عموها و عمها فهو عمه و عامه کا معنی ہے آدمی حیران ہو گیا۔ کہا جاتا ہے: رجل عامه و عمه متردد اور حیران شخص۔ اس کی جمع عمه ہے۔ عرب کہتے ہیں: ذهبت ابله العمهى۔ جب معلوم نہ ہو کہ اونٹ کہاں چلا گیا۔ العمی آنکھ کے (اندھے پن) کے لئے استعمال ہوتا ہے اور العمه دل کے اندھے پن کے لئے استعمال ہوتا ہے اور قرآن حکیم میں ہے: فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ۝ (الحج) (حقیقت تو یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتی بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہوتے ہیں)۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۠ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝

''یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خرید لی گمراہی ہدایت کے بدلے مگر نفع بخش نہ ہوئی ان کی (یہ) تجارت اور وہ صحیح راہ نہ جانتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى سیبویہ نے کہا: اشْتَرَوُا میں واؤ کو ضمہ دیا گیا ہے تاکہ واؤ جمع اور واؤ اصلیہ میں فرق ہو جائے جیسے وَّاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ (الجن: 16)۔ (اور اگر وہ ثابت قدم رہیں راہ حق پر)۔

ابن کیسان نے کہا: واؤ میں ضمہ دوسری حرکات کی نسبت خفیف ہے کیونکہ ضمہ واؤ کی جنس سے ہے۔ الزجاج نے کہا: ضمہ کی حرکت دی گئی ہے جیسے نحن میں کہا گیا ہے۔ ابن ابی اسحاق، یحییٰ بن یعمر نے التقاء ساکنین کی اصل پر واؤ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے(1)۔ ابوزید انصاری نے قعنب ابی سمال عدوی سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے واؤ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ فتحہ خفیف ہے اگرچہ اس کا ماقبل مفتوح ہے۔ کسائی نے واؤ کے ہمزہ اور اس کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے جیسے ادؤر، اشتروا، شراء سے مشتق ہے اور الشراء یہاں مستعار ہے۔ معنی یہ ہے کہ انہوں نے ایمان پر کفر کو پسند کیا جیسا کہ ارشاد فرمایا: فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى (فصلت: 17)۔ یہاں شراء سے تعبیر فرمایا کیونکہ شراء اس چیز میں ہوتا ہے جس کو مشتری پسند کرتا ہے لیکن اگر شراء کا معنی معاوضۃ ہو تو پھر یہ معنی نہیں ہوگا کیونکہ منافقین مومن تھے ہی نہیں کہ وہ ایمان بیچتے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: انہوں نے گمراہی کو لیا اور ہدایت کو چھوڑ دیا۔ اس کا معنی ہے: انہوں نے ایمان کو بدلا اور کفر کو ایمان پر پسند کیا۔ وسعت

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 98، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

کی بنا پر لفظ شراء کے ساتھ ذکر فرمایا کیونکہ شرا اور تجارت، تبدیلی چاہنے کی طرف لوٹتے ہیں۔ عرب اس شخص کے لئے شرا کو استعمال کرتے ہیں جو کسی چیز کو دوسری چیز سے بدلے۔ ابوذویب نے کہا:

ان تزعمینی کنت اجھل فیکم فانی شریت الحلم بعدك بالجھل

(اگر تو مجھے گمان کرتی ہے کہ میں تم سے ناواقف ہوں تو میں نے تیرے بعد جہالت کے بدلے حلم کو اختیار کیا۔)

الضلالہ کا اصل معنی حیرت ہے، نسیان کو بھی ضلالت کہتے ہیں کیونکہ اس میں بھی کچھ حیرت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ۝ (الشعراء)

اس آیت میں ضالین بمعنی ناسین (بھولنے والے) ہے۔ ہلاکت کو بھی ضلالت کہتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ (السجدہ: 10) (اور کہنے لگے کیا جب (مرنے کے بعد) ہم گم ہو جائیں گے زمین میں)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ اللہ تعالیٰ نے عربوں کی عادت کے مطابق ربح کی نسبت تجارت کی طرف کی۔ (مثلاً) عرب کہتے ہیں: ربح بیعك و خسرت صفقتك لیلٌ و نھارٌ صائمٌ۔ (1) معنی یہ ہے کہ تو نے اپنی بیع میں نفع اٹھایا اور تو نے اپنی بیع میں خسارہ اٹھایا، تو نے رات کو قیام کیا اور دن کو روزہ رکھا یعنی انہوں نے تجارت میں نفع نہ اٹھایا۔ شاعر نے کہا:

نھارك ھائمٌ و لیلك نائمٌ کذلك فی الدنیا تعیش البھائم

تو دن بھر گھومتا رہتا ہے اور رات بھر سویا رہتا ہے، دنیا میں حیوان اسی طرح زندگی گزارتے ہیں۔

ابن کیسان نے کہا: تجارۃ و تجائر، ضلالہ و ضلائل جائز ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ (وہ گمراہی کو خریدنے میں ہدایت پانے والے نہ تھے)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کے علم ازلی کی بات ہے (2)۔

الاھتداء، گمراہی کی ضد ہے۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِىْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ۝

"ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ روشن کی پھر جب جگمگا اٹھا اس کا آس پاس تو لے گیا اللہ ان کا نور اور چھوڑ دیا انہیں گھپ اندھیروں میں کہ کچھ نہیں دیکھتے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا مثلھم مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے خبر کاف میں ہے یہ اسم ہے جیسا کہ اعشی کے قول میں ہے:

أتنتھون و لن ینھی ذوی شطط کالطعن یذھب فیہ الزیت و الفتل (3)

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 98، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، صفحہ 99، جلد 1

کیا تم روکتے ہو جبکہ ظالم لوگ پیٹ تک پہنچنے والے تیر کی طرح نہ رکیں گے جس میں تیل اور ڈیوٹ چلی جاتی ہے۔

امرء القیس کا شعر ہے:

ورحنا بکابن الماء یجنب وسطنا تصوب فیه العین طوراً و ترتقی

ان اشعار میں ک بمعنی مثل ہے یعنی مثل الطعن اور بمثل ابن الماء مراد لیا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ خبر محذوف ہو۔ تقدیر کلام یوں ہو: مثلهم مستقر کمثل۔ اس صورت میں کاف حرف ہوگا، المثل، المثل و المثیل تمام کا معنی ایک ہے اور اس کا معنی شبیہ ہے۔ متماثلان کا معنی متشابهان ہے۔ اہل لغت نے اسی طرح کہا ہے(1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد الَّذِی یہ اسم موصول واحد اور جمع کے لئے واقع ہوتا ہے۔ ابن الشجری ہبۃ اللہ بن علی نے کہا: کچھ عرب جمع کو واحد کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں۔ جیسے شاعر نے کہا:

وان الذی حانت بفلج دمائهم هم القوم کل القوم یا ام خالد

وہ لوگ جن کے خون بہنے کا وقت فلج کے مقام پر قریب آیا تو اے ام خالد! وہ قوم ہی کامل قوم تھی۔

(اس شعر میں الذی کو جمع کے لئے استعمال کیا گیا ہے)۔ بعض علماء نے اللہ تعالیٰ کے اس قول وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَ صَدَّقَ بِهٖۤ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ (الزمر) میں بھی یہی کہا ہے (یعنی الَّذِی بمعنی الذین ہے) یہ اس لغت کے اعتبار سے ہوگا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِی۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے: كَمَثَلِ الَّذِی اسْتَوْقَدَ۔ اسی لئے آگے فرمایا ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ (یعنی جمع کی ضمیر ذکر فرمائی) کلام کے آغاز کو واحد پر اور آخر کو جمع پر محمول کیا، رہا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد وَ خُضْتُمْ كَالَّذِیْ خَاضُوْا (توبہ:69) اس میں الذی مصدر محذوف کی صفت ہے تقدیر کلام اس طرح ہوگی: خضتم کالخوض الذی خاضوا۔

بعض علماء نے فرمایا: الَّذِی اور اسْتَوْقَدَ واحد ذکر فرمایا کیونکہ آگ جلانے والا ایک تھا اگر آگ جلانا اس کے سپرد تھا۔ جب روشنی ختم ہوگئی تو ان تمام کی طرف رجوع فرمایا۔ فرمایا: بِنُوْرِهِمْ۔ اسْتَوْقَدَ بمعنی اوقد ہے جیسے استجاب بمعنی اجاب ہے سین اور تا ء زائدہ ہیں۔ یہ اخفش کا قول ہے۔ شاعر کا قول ہے:

و داع دعا یا من یجیب الی الندی فلم یستجبه عند ذاک مجیب

پکارنے والے نے پکارا: اے آواز کا جواب دینے والے! اس وقت کسی جواب دینے والے نے جواب نہ دیا۔

نحویوں کا "لما" کے جواب میں اختلاف ہے اور نورھم کی ضمیر کے مرجع میں بھی اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: لما کا جواب محذوف ہے اور وہ طفئت ہے اور نورھم میں ضمیر کا مرجع منافقین ہیں۔ یہ ان کی آخرت کی حالت کی خبر دی جارہی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَضُرِبَ بَیْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ (الحدید:13) (پس کھڑی کر دی جائے گی ان کے اور اہل ایمان کے درمیان ایک دیوار جس کا ایک دروازہ ہوگا)۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 98، جلد 1

بعض علماء نے فرمایا: اس کا جواب ''ذھب'' ہے اور نورھم میں ضمیر کا مرجع الَّذِی ہے، اس قول کے مطابق منافق کی تمثیل آگ جلانے کے ساتھ مکمل ہوگی کیونکہ آگ جلانے والے کی بقا، تاریکیوں میں جو نہیں دیکھتا، اس منافق کی بقا کی طرح ہے جو حیرت وتردد میں ہوتا ہے۔ آیت کی مراد یہ ہے کہ یہ منافقین کے لئے مثال دی گئی ہے یہ اس طرح ہے کہ جو وہ ایمان ظاہر کرتے ہیں اس ایمان کی وجہ سے ان کے لئے مسلمانوں کے احکام ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً نکاح، توارث، غنائم نفوس، اولاد اور اموال پر امن وغیرہ یہ مشابہ ہے اس شخص کے جو تاریک رات میں آگ جلاتا ہے اس وجہ سے روشنی ہو جاتی ہے وہ دیکھتا ہے جس سے بچنا اور امن مناسب ہوتا ہے۔ پھر جب وہ آگ بجھ جاتی ہے یا ختم ہو جاتی ہے تو اسے اذیت پہنچتی ہے اور وہ متحیر باقی رہ جاتا ہے۔ اسی طرح منافقین جب ایمان لائے تو انہوں نے اسلام کے کلمہ کے ساتھ دھوکا کیا پھر وہ مرنے کے بعد عذاب الیم کی طرف جائیں گے جیسا کہ قرآن حکیم نے بتایا: اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (النساء: 145) (بے شک منافق سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے دوزخ (کے طبقوں) سے) اور ان کا نور چلا جائے گا، اس لئے وہ کہیں گے انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ (الحدید: 13)۔ ذرا ہمارا بھی انتظار کرو ہم بھی روشنی حاصل کریں تمہارے نور سے۔ بعض علماء نے کہا: منافقین کا مسلمانوں کی طرف متوجہ ہونا اور ان کے ساتھ ان کا کلام کرنا آگ کی طرح ہے اور ان کا ان کی مودت سے پھرنا اور ان کا ان سے منہ پھیر لینا اس آگ کے جانے کی طرح ہے (1)، اس کے علاوہ بھی علماء کے اقوال ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نَارًا، النار مؤنث ہے یہ نور سے مشتق ہے اس کا معنی بھی روشن کرنا ہے اور اس کا الف اصل میں واو کو یاء سے بدلا گیا کیونکہ ماقبل کسرہ ہے۔ ضاءت اور اضاءت دونوں لغتیں ہیں۔ کہا جاتا ہے: ضاء القمر یضوء ضوء واضاء یضیئ۔ یہ لازم اور متعدی ہوتا ہے۔ محمد بن سمیقع نے ضاءت بغیر الف کے پڑھا ہے۔ عام لوگ الف کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

اضاءت لهم احسابهم و وجوههم دُجى الليل حتى نظم الجزع ثاقبه

مَاحَوْلَهٗ۔ مَا زائدہ مؤکدہ ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ اضاءت کا مفعول ہے اور حولہ ظرف مکان ہے اور حالت جری میں ہے کیونکہ حول اس کی طرف مضاف ہے، ذھب اور اذھب دونوں لغتیں ہیں اور یہ ذھاب سے مشتق ہے۔ اس کا معنی ہے کسی شے کا زوال وَتَرَكَهُمْ یعنی انہیں باقی رکھا۔ فِيْ ظُلُمٰتٍ یہ ظلمة کی جمع ہے۔ اعمش نے لام کے سکون کے ساتھ ظلمات پڑھا ہے اور جنہوں نے لام کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے اسم اور لغت میں فرق کرنے کے لئے ایسا پڑھا ہے۔ اشہب عقیلی نے لام کے فتحہ کے ساتھ ظلمات پڑھا ہے۔ بصریوں نے کہا: ضمہ کو فتحہ سے بدلا گیا کیونکہ وہ خفیف ہے کسائی نے کہا: ظلمات، جمع الجمع ہے یہ ظلم کی جمع ہے۔ لَا يُبْصِرُوْنَ فعل مضارع حال واقع ہو رہا ہے گویا یوں فرمایا: غیر مبصرین اس معنی کے اعتبار سے ظلمات پر وقف جائز نہ ہوگا۔

صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 100، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

''یہ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں سو وہ نہیں پھریں گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ۔ صُمٌّۢ یعنی ھم صم یعنی یہ مبتدا محذوف کی خبریں ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت حفصہ کی قراءت میں صماً بکماً عمیاً میں بطور ذم نصب (1) بھی جائز ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَّلْعُوْنِيْنَ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا (الاحزاب:61) (ان پر لعنت برس رہی ہوگی جہاں وہ پائے جائیں گے)۔ اسی طرح فرمایا: وَّامْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝ (اللہب) (اور اس کی جورو بھی بدبخت ایندھن اٹھانے والی ہے)۔ شاعر نے کہا:

سقونی اتخمر ثم تکنفونی عُدَاۃَ اللہ من کذب و زور

انہوں نے مجھے شراب پلائی پھر مجھے گھیر لیا۔ اللہ! دشمنوں کی جھوٹ اور غلط بیانی پر میں مذمت کرتا ہوں۔

اس شعر میں عداۃ اللہ بطور ذم منصوب ہے۔ اس مذہب کے مطابق مبصرون پر وقف صحیح ہے اور صما کو ترکھم کی وجہ سے نصب بھی جائز ہے۔ گویا فرمایا: ترکھم صما بکما عمیا۔ انہیں بہرہ، گونگا، اندھا چھوڑ دیا۔ اس مذہب کے مطابق یبصرون پر وقف بہتر نہ ہوگا۔ الصمم کا معنی عرب کلام میں بند ہونا ہے۔ کہا جاتا ہے؟ قناۃ صماء ایسا نیزہ جو اندر سے کھوکھلا نہ ہو صممت القارورۃ میں نے بوتل کو بند کر دیا۔ فالاصم جس کے کان کے سوراخ بند ہوں۔ الابکم جو نہ بولتا ہے نہ سمجھتا ہے اور جو سمجھتا ہو بولتا نہ ہو اسے اخرس کہتے ہیں۔ بعض علماء نے کہا: اخرس اور ابکم ایک ہی ہیں۔ کہا جاتا ہے: رجل ابکم و بکیم یعنی جو پوری طرح گونگا ہو، گونگا پن بالکل ظاہر ہو۔ شاعر نے کہا:

فلیت لسانی کان نصفین منهما بکیمٌ و نصف عندی مجری الکواکب

العمی، کا معنی بینائی کا چلا جانا، عمی فھو اعمی، قوم عمیٌ، اعماہ اللہ، تعامی الرجل جو آدمی اپنے آپ کو اندھا ظاہر کرے۔ عمی علیہ الامر، جب معاملہ ملتبس ہو جائے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْۢبَآءُ يَوْمَىِٕذٍ (القصص:66) (اندھی ہو جائیں گی ان پر خبریں اس دن) جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے اس سے مقصود ان کے حواس سے جملہ ادراکات کی نفی نہیں بلکہ ایک مخصوص جہت سے ان کی نفی مقصود ہے۔ تو کہتا ہے: فلان اصمُّ عن الخنا۔ شاعر نے کتنا خوب کہا ہے:

اصم عما ساءہ سمیع۔ یعنی بری بات سننے سے بہرہ اس کے علاوہ کو خوب سننے والا ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

وعوراء الکلام صممت عنها ولو انی اشاء بها سمیع

ٹیڑھی کلام والی، اس سے میں بہرہ ہوں اگر میں چاہوں تو اسے خوب سننے والا ہوں۔

دارمی نے کہا:

اعمی اذا ما جارتی خرجت حتی یواری جارتی الجدر

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 101، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

میں اندھا ہوتا ہوں جب میری پڑوسن نکلتی ہے حتیٰ کہ میری پڑوسن کو دیواریں چھپا لیتی ہیں۔

کسی نے ایک شخص کو وصیت کی جو اکثر بادشاہوں کے پاس جاتا تھا:

اُدْخُلْ اذا ما دخلت اعمی وَاخْرُجْ اذا ما خرجت اخرس

جب تو بادشاہ کے پاس جائے تو اندھا ہو کر داخل ہو اور جب تو نکلے تو گونگا ہو کر نکل۔

قتادہ نے کہا: وہ حق سننے سے بہرے ہیں، حق کہنے سے گونگے ہیں، حق دیکھنے سے اندھے ہیں۔ میں کہتا ہوں: یہی معنی مراد ہے نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا جو آپ نے آخر زمانہ کے والیوں کے متعلق حدیث جبریل میں فرمایا۔ واذا رایت الحفاۃ العراۃ الصم البکم ملوک الارض فذاک من اشراطھا۔ (جب تو دیکھے کہ ننگے پاؤں، برہنہ بدن، (حق سننے سے) بہرے، (حق کہنے سے) گونگے زمین کے بادشاہ بن گئے ہیں تو یہ قیامت کی نشانیوں میں سے ہے (1))۔ واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ وہ حق کی طرف نہیں لوٹیں گے۔ یہ اس لئے فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے علم ازل میں تھا کہ وہ حق کی طرف نہیں لوٹیں گے۔ رجع بنفسہ رجوعاً رجعہ غیرہ کہا جاتا ہے یعنی یہ لازم اور متعدی استعمال ہوتا ہے۔ ہذیل کہتے ہیں: ارجعہ غیرہ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ الْقَوْلَ (سبا:31) یعنی آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کریں گے۔ جیسا کہ قرآن نے سورۂ سبا میں بیان فرمایا ہے۔

اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّ رَعْدٌ وَّ بَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۭ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ⑲

"یا پھر جیسے زور کا مینہ برس رہا ہو بادل سے جس میں اندھیرے ہوں اور گرج اور چمک ہو۔ ٹھونستے ہیں اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں کڑک کے باعث موت کے ڈر سے اور اللہ گھیرے ہوئے ہے کافروں کو"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ طبری نے کہا: اَوْ بمعنی واؤ ہے (2)۔ فراء نے یہی کہا ہے۔

وقد زعمت لیلی بانی فاجر لنفسی تقاھا او علیھا فجورھا

لیلیٰ نے کہا کہ میں گنہگار ہوں میرے نفس کے لئے تقویٰ ہے اور اس کے خلاف اس کا فجور ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

نال الخلافۃ اوکانت لہ قدراً کما اتی ربہ موسی علی قدر

اس نے خلافت کو پایا اور خلافت اس کا مقدر تھی جس طرح موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کی بارگاہ میں آئے جو ان کے حق میں مقدر تھا۔

ان اشعار میں او بمعنی واؤ ہے۔ بعض نے فرمایا: اَوْ تخییر کے لئے ہے۔

یعنی تم ان منافقین کو اس سے تشبیہ دو یا اس سے، کسی ایک امر پر اکتفا نہیں۔ معنی ہے: او کاصحاب صیب۔ یا وہ بارش

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، حدیث جبریل، صفحہ 29، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 101، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

والوں کی طرح ہیں۔ الصیب سے مراد بارش ہے۔ یہ صاب یصوب سے مشتق ہے جس کا معنی ہے: نازل ہونا۔ علقمہ نے کہا:

فلا تعدلی بینی و بین مغمر سقتك روایا المزن حیث تصوب

میرے اور جاہل کے درمیان برابری نہ کر بادل تجھے سیراب کرے جہاں برسے۔

صیب اصل میں صیوبٌ تھا۔ واؤ اور یا جمع ہوئے پہلا ان میں سے ساکن ہے اس لئے واؤ یا سے بدلی اور پھر مدغم ہوگئی جیسا کہ میت، ھین اور لین میں کہا گیا ہے۔ بعض کوفیوں نے کہا: اس کی اصل صوِیبٌ ہے فعیلٌ کے وزن پر۔ نحاس نے کہا: اگر اس طرح اس کی اصل ہوتی تو اس کا ادغام جائز نہ ہوتا جیسا کہ طویل میں ادغام جائز نہیں ہے۔ صیب کی جمع صیایب ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: مثلھم کمثل الذی استوقد نارا او کمثل صیب۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِّنَ السَّمَآءِ، السماء، مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے اس کی جمع اسمیة، سموات اور سمی (بروزن فعول) بنائی جاتی ہے۔ عجاج نے کہا:

تلفه الریاح والسُّمی

ہواؤں اور بارشوں نے اسے گھیر رکھا ہے۔

السَّمَآءُ ہر وہ چیز جو تیرے اوپر ہو اور تجھ پر سایہ کرے وہ سماء ہے۔ اسی وجہ سے گھر کی چھت کو سماء کہا جاتا ہے۔ بارش کو سماء کہا جاتا ہے۔ بارش کو سماء کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ آسمان سے اترتی ہے۔ حضرت حسان بن ثابت نے کہا:

دیارٌ من بنی الحسحاس قفر تعفیها الروامس والسماء

بنی حسحاس کے گھر چٹیل میدان ہیں۔ ہواؤں اور بارش نے ان کے نشانات مٹا دیے ہیں۔

ایک اور شاعر نے کہا:

اذا سقط السماء بارض قوم رعیناه وان کانوا غضابا

جب کسی قوم کی زمین پر بارش برستی ہے تو ہم اس زمین پر چراتے ہیں اگرچہ اس کے مالک ناراض بھی ہوں۔

مٹی اور گھاس کو بھی سماء کہا جاتا ہے۔ مازلنا نطأ السماء حتی اتیناکم۔

ہم گھاس اور مٹی کو روندتے رہے حتیٰ کہ ہم تمہارے پاس پہنچے۔

گھوڑے کی پیٹھ کو بھی اس کے بلند ہونے کی وجہ سے سماء کہا جاتا ہے۔

و احمر کالدیباج اما سماؤہ فریا و اما ارضه فمحول

ریشم کی طرح سرخ ہے، رہی اس کی پیٹھ تو وہ بہت عمدہ ہے اور اس کے پاؤں بڑے سخت ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِیْهِ ظُلُمٰتٌ یہ مبتدا خبر ہیں (و رعد و برق) معطوف علیہ ہے۔ ظلمات جمع ذکر فرمایا یہ اشارہ ہے رات کی تاریکی اور بادل کی تاریکی کی طرف، تہہ در تہہ تاریکی ہے اس لئے جمع ذکر فرمایا، اس کی وضاحت پہلے ذکر ہو چکی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

علماء کا رَعْدٌ کے متعلق اختلاف ہے۔ ترمذی میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے، فرمایا: یہود نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے رَعْدٌ کے متعلق پوچھا کہ یہ (کڑک) کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے (جو بادل پر مقرر ہے) اس کے پاس آگ کے کوڑے ہیں جن کے ساتھ وہ بادل کو ہانک کر لے جاتا ہے جہاں اللہ چاہتا ہے۔ یہود نے کہا: یہ آواز کیا ہے جو ہم سنتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ فرشتہ بادل کو جھڑکتا ہے جب وہ اسے جھڑکتا ہے حتی کہ وہ وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں اللہ کا حکم ہوتا ہے۔ یہود نے کہا: آپ نے سچ کہا (1)۔ الخ

اس تفسیر پر اکثر علماء کا اتفاق ہے۔ پس الرعد (کڑک) سنی جانے والی آواز کا اسم ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا۔ یہ لغت عرب میں معلوم ہے۔

لبید نے زمانہ جاہلیت میں کہا تھا:

فجعنی الرعد و الصواعق

مجھے کڑک اور بجلیوں نے ڈرایا۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے، فرمایا: الرعد ایک ہوا ہے۔ بادل کے درمیان چھا جاتی ہے تو آواز پیدا کرتی ہے (2)۔

البرق کے بارے میں اختلاف ہے، حضرات علی، ابن مسعود، ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ البرق لوہے کا کوڑا ہے جو فرشتے کے ہاتھ میں ہوتا ہے اس کے ساتھ وہ بادل کو چلاتا ہے۔

میں کہتا ہوں: ترمذی کی حدیث سے یہی ظاہر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے کہ یہ نور کا کوڑا ہے جو فرشتے کے ہاتھ میں ہوتا ہے جس کے ساتھ وہ بادل کو جھڑکتا ہے (3)۔ حضرت ابن عباس سے ہی مروی ہے کہ البرق فرشتہ ہے جو نظر آتا ہے۔

فلاسفہ کہتے ہیں: الرعد بادل کے اجرام کے ٹکراؤ سے پیدا ہونے والی آواز ہے اور اجرام کے ٹکراؤ سے جو آگ چمکتی ہے وہ البرق ہے۔ یہ قول مردود ہے اس کی نقل صحیح نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔ کہا جاتا ہے: رَعْدٌ کی اصل حرکت سے ہے۔ اسی سے الرعدید، (بزدل کی کپکپی) ہے، ارتعد کا معنی ہے: حرکت کرنا، اسی معنی میں حدیث ہے: فجئ بھما ترعد فرائصھما (4) (ان دونوں کو لایا گیا تو ان کے کندھوں کا گوشت حرکت کر رہا تھا)۔ یہ حدیث ابوداؤد نے روایت کی ہے۔

البرق کا اصل معنی چمک اور روشنی ہے۔ اسی سے البراق ہے وہ سواری جس پر معراج کی رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سوار ہوئے اور دوسرے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سوار ہوئے۔ رعدت السماء، یہ الرعد سے ہے جس کا معنی ہے: گرج، اور برقت، البرق سے ہے اور رعدت المرأۃ و برقت، عورت جب بناؤ سنگھار کر کے سامنے آئے، رعد الرجل و برق، جب

1۔ جامع ترمذی، صفحہ 140، جلد 2 (وزارت تعلیم)

ایضاً، کتاب التفسیر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب من سورۃ الرعد، حدیث 3042، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 102، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)		3۔ ایضاً		4۔ ایضاً

آدمی دھمکی دے اور ڈرائے۔

ابن احمر نے کہا:

یا جُل ما بعدت علیك بلادُنا و طلابنا فابرق بارضك وارعد

اے جل! تجھ پر ہمارے شہر اور ہمارے مطلوب تجھ سے کتنے ہی دور ہو گئے ہیں اب تو اپنی زمین کو ڈرا دھمکا دے۔

ارعد القوم و ابرقوا یعنی قوم کو کڑک اور بجلی نے آلیا۔ ابو عبیدہ اور ابو عمرو نے بیان کیا ہے: ارعدت السماء و ابرقت۔ آسمان گرجا اور بجلی چمکی۔ ارعد الرجل و ابرق فلاں نے دھمکی دی اور ڈرایا۔ اصمعی نے اس کا انکار کیا ہے اور اس پر اس کے خلاف کمیت کے قول سے حجت پکڑی گئی ہے۔

ابرق و ارعد یا یزید فما وعیدك لی بضائر

اے یزید! تو دھمکی دے تیری دھمکی مجھے کچھ مضر نہیں۔

اصمعی نے کہا کمیت حجت نہیں ہے۔

فائدہ: حضرت ابن عباس سے مروی ہے، فرمایا: ہم حضرت عمر کے ساتھ مدینہ اور شام کے درمیان ایک سفر میں تھے اور ہمارے ساتھ حضرت کعب الاحبار بھی تھے۔ فرمایا: تیز ہوا چلنے لگی، بادل گرجنے لگا اور شدید بارش اور ٹھنڈک ہو گئی۔ لوگ گھبرا گئے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: مجھے کعب الاحبار نے کہا جس نے کڑک کی آواز سن کر کہا سبحان من یسبح الرعد بحمدہ و الملٰئکۃ من خیفتہ تو اس بادل، ٹھنڈک اور بجلی میں جو مصیبت ہو گی اس سے وہ بچا لیا جائے گا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: میں نے اور کعب نے یہ کلمات پڑھے جب صبح ہوئی تو لوگ جمع ہوئے تو میں نے حضرت عمر سے کہا: اے امیر المومنین! لوگوں میں جو گھبراہٹ تھی وہ ہم میں نہ تھی۔ حضرت عمر نے پوچھا: وہ کیسے؟ حضرت ابن عباس نے کہا: میں نے حضرت عمر سے حضرت کعب کی بات کہی تو حضرت عمر نے کہا: سبحان اللہ! کیوں تم نے ہمیں نہیں بتایا کہ ہم بھی وہ کہتے جیسا تم نے کہا۔ ایک روایت میں ہے، ٹھنڈک حضرت عمر کے ناک کو لگی اور اس نے حضرت عمر پر اثر کیا۔ یہ روایت ان شاء اللہ سورۃ رعد میں آئے گی۔ ابو بکر احمد بن علی بن ثابت الخطیب نے تابعین سے صحابہ کی روایات میں دو روایتیں ذکر کی ہیں۔

حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ جب کڑک اور بجلیوں کو سنتے تو یہ دعا کرتے: اللھم لا تقتلنا بغضبك ولا تھلکنا بعذابك و عافنا قبل ذالك۔ (1) اے اللہ! تو ہمیں اپنے غضب کے ساتھ ہلاک نہ کر اور تو ہمیں اپنے عذاب سے ہلاک نہ کر اور ہمیں اس سے پہلے عافیت دے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ انگلیوں کو اپنے کانوں میں ڈالنا اس لئے تھا تا کہ وہ قرآن نہ سنیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ قرآن اور محمد ﷺ پر ایمان لے آئیں یہ ان کے نزدیک کفر ہے اور کفر موت ہے۔ الاصابع کے واحد •

1۔ جامع ترمذی، صفحہ 183، جلد 2 (وزارت تعلیم)

ایضاً، ابواب الدعوات عن رسول اللہ ﷺ، باب مایقول اذا سمع الرعد، حدیث نمبر 3372، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں پانچ لغتیں ہیں: اصبع ہمزہ کے کسرہ اور با کے فتحہ کے ساتھ۔ أصبع، ہمزہ کے فتحہ اور باء کے کسرہ کے ساتھ۔ ہمزہ اور با کے فتحہ کے ساتھ، دونوں کے ضمہ کے ساتھ، دونوں کے کسرہ کے ساتھ بھی بولا جاتا ہے۔ یہ مؤنث استعمال ہوتا ہے اسی طرح اذن (کان) مؤنث استعمال ہوتا ہے، اس میں تخفیف، تثقیل اور تصغیر بنائی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے: اذینة۔ اگر تو اذن کے ساتھ کسی کا نام رکھے تو اس کی تصغیر بنائے گا تو کہے گا: اذین، پھر یہ مؤنث استعمال نہ ہوگا کیونکہ مذکر کی طرف منتقل ہونے کی وجہ سے اس سے تانیث زائل ہوگئی۔ رہا عربوں کا قول: اذینةٌ اسم علم تو اس کے ساتھ مصغر نام رکھا گیا ہے، اذن کی جمع آذان آتی ہے۔ تو کہتا ہے: اذنتہ جب تو اسے کان پر مارے، رجلٌ أذُنٌ اس شخص کو کہا جاتا ہے جو ہر ایک کا کلام سنے اس میں واحد اور جمع برابر ہے۔ اذانی بڑے کانوں والا۔ نعجة اذناء، کبشٌ آذن (کانوں والی بھیڑ اور دنبہ) واذنت النعل وغیرھا تاذینًا جب تو جوتے وغیرہ کے کان بنائے، واذنت الصبی جب تو بچے کا کان ملے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِّنَ الصَّوَاعِقِ یعنی بجلیوں کی وجہ سے۔

الصواعق، جمع ہے صاعقةٌ کی۔ حضرات ابن عباس اور مجاہد وغیرہما نے کہا: جب الرعد فرشتہ زیادہ غضبناک ہوتا ہے تو اس کے منہ سے آگ نکلتی ہے یہی صواعق ہے۔ اسی طرح خلیل نے کہا۔ فرمایا: یہ رعد کی آواز سے شدید ہوتی ہے، اس کے ساتھ کبھی آگ کا ٹکڑا ہوتا ہے جس پر وہ گرتا ہے اسے جلا دیتا ہے۔ ابوزید نے کہا: الصاعقہ آگ ہے جو سخت کڑک میں آسمان سے گرتی ہے، خلیل نے ایک قوم سے الساعقة (سین کے ساتھ) حکایت کیا ہے۔ ابوبکر نقاش نے کہا، کہا جاتا ہے: صاعقة، صعقة و صاقعةٌ تمام کا معنی ایک ہے۔ حسن نے من الصواقع (قاف کی تقدیم کے ساتھ) پڑھا ہے۔ اسی سے ابوالنجم کا شعر ہے:

یحکون بالمصقوله القواطع تشقق البرق عن الصواقع

نحاس نے کہا: یہ بنی تمیم اور بعض بنی ربیعہ کی لغت ہے۔ کہا جاتا ہے: صعقتھم السماء، جب آسمان لوگوں پر بجلی گرا دے۔ الصاعقة، عذاب کی ایک چیخ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ (فصلت: 17) (تو پکڑ لیا انہیں اس عذاب کی کڑک نے جو رسوا کن ہے)۔ کہا جاتا ہے: صعق الرجل صعقة و تصعاقًا یعنی اس پر چھا گئی، اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا (اعراف: 143)

اصعقه غیرہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس نے اسے ہلاک کر دیا۔

ابن مقبل نے کہا:

تری النعرات الزرق تحت لبانه أحاد و مثنی اصعقتها صواهله

اس کے سینے کے نیچے نیلی آنکھوں والی مکھیاں ایک ایک، دو دو دیکھتا ہے اس کے ہنہنانے نے ان کو قتل کر دیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ (الزمر: 68) (یعنی فوت ہوگیا جو آسمانوں میں تھا اور جو زمین میں تھا)۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں منافقین کے احوال کو تشبیہ دی ہے ان چیزوں کے ساتھ جو بارش میں تاریکیاں، کڑک، چمک اور بجلیوں میں سے ہوتی ہیں۔

ظُلُمٰتٌ ان کے کفریہ اعتقادات کی مثال ہے۔ کڑک اور چمک اس کی مثال ہے جس کے ساتھ انہیں ڈرایا جاتا ہے۔ بعض نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے قرآن کو بارش سے مثال دی کیوں کہ اس میں ان پر بہت سی مشکلات تھیں۔ العمی سے مراد تاریکیاں ہیں اور جو اس میں وعید اور زجر ہے وہ کڑک ہے اور اس میں جو نور اور دلائل باہرہ ہیں جو کبھی ان پر ظاہر ہوتے ہیں وہ بجلی ہے۔ الصَّوَاعِقِ یہ مثال ہے جو قرآن میں جلدی میں جنگ کی طرف نکلنے کی دعوت دی ہے اور تاخیر میں وعید دی گئی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الصواعق شرع کی تکالیف ہیں جن کو وہ ناپسند کرتے تھے مثلاً جہاد، زکوٰۃ وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَذَرَ الْمَوْتِ، حذر اور حذار دونوں کا ایک معنی ہے اور دونوں طرح پڑھا بھی گیا ہے۔ یہ سیبویہ نے کہا: یہ منصوب ہے کیونکہ یہ مفعول لہ ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ یہ مصدر ہے۔ سیبویہ نے ایک شعر کہا ہے:

واغفر عوراء الکریم ادخارہ　　　و أَعْرِضُ عن شتم اللئیم تکرماً

میں کریم شخص کی جہالت کو اس کے تعلق کو ذخیرہ کے لئے معاف کر دیتا ہوں اور لئیم آدمی کی گالی سے تکرماً اعراض کرتا ہوں۔

فراء نے کہا: یہ تمیز کی وجہ سے منصوب ہے۔ الموت، حیاۃ کی ضد ہے، مات یموت و یمات استعمال ہوتا ہے۔ راجز نے کہا:

بنیتی سیدۃ البنات　　　عیشی ولا یؤمن ان تماتی

اے میری بچی! بیٹیوں کی سردار تھی تو زندہ رہ ہے تیری موت سے امن نہیں۔

فھو میِّت و مَیْت، وقوم موتی و اموات و میتون و میتون والمُوات۔ الموت اور الموات ایسی چیز کو کہتے ہیں جس میں روح نہ ہو۔ الموات اس زمین کو کہتے ہیں جس کا کوئی انسان مالک نہ ہو اور نہ اس سے کوئی نفع اٹھاتا ہو۔ المَوَتان، یہ حیوان کا مخالف ہے۔ کہا جاتا ہے: اشتر الموتان ولا تشتر الحیوان یعنی زمینیں اور گھر خرید، غلام اور جانور مت خرید مُوتان اس موت کو کہتے ہیں جو جانوروں میں ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے: وقع فی المال مُوتان، اماتہ اللہ و موّتہ۔ مبالغہ کے لئے تشدید ذکر کی گئی۔ شاعر نے کہا

فعروۃ مات موتا مستریحاً　　　فھا انذا اموت کل یوم

عروہ تو آرام کی موت مر گیا میں ہوں کہ ہر روز مرتا ہوں

اماتت الناقۃ، جب اونٹنی کا بچہ مر جائے، فھی ممیت و ممیۃٌ۔

ابو عبیدہ نے کہا: اسی طرح اماتت امرأۃٌ ہے جس عورت کا بچہ مر جائے۔ اس کی جمع مماویت ہے۔ ابن سکیت نے کہا: امات فلان جب کسی کا ایک یا بہت سے بیٹے فوت ہو جائیں۔ المتماوت، ریا کار عبادت کرنے والے کی صفت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ موت مائتٌ، جیسے تیرا قول ہے لیلٌ لائلٌ۔ اس لفظ سے صفت کا صیغہ بنایا جاتا ہے اور اس کے ساتھ تاکید لگائی جاتی ہے المستمیت للأمر۔ ڈھیلا کام کرنے والا۔ رؤبہ نے کہا:

و زبد البحر لہ کتیت　　　واللیل فوق الماء مستمیت

اور سمندر کی جھاگ اس کے لئے آواز ہے اور رات پانی کے اوپر سستی سے گزرنے والی ہے۔

المستميت، اس شخص کو کہا جاتا ہے جو جنگ میں موت کی پروا نہیں کرتا۔

حدیث پاک میں ہے: اری القوم مستمیتین (1) وہ لوگ جو موت پر جنگ کرتے ہیں۔ الموتة، جنون اور مرگی کی ایک جنس ہے جو انسان کو لاحق ہوتی ہے جب اسے افاقہ ہوتا ہے تو پوری عقل اس کی طرف لوٹ آتی ہے جیسے سونے والے اور نشہ والے کے ساتھ ہوتا ہے۔ مُؤتة (میم کے ضمہ اور واؤ کے ہمزہ کے ساتھ) اس زمین کو بھی کہتے ہیں جہاں حضرت جعفر بن ابی طالب شہید ہوئے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ یہ مبتدا خبر ہیں یعنی وہ اس سے فوت نہیں ہوں گے۔ کہا جاتا ہے: احاط السلطان بفلان جب بادشاہ کسی کو سختی سے پکڑ لے اور ہر جہت سے اس کا محاصرہ کر لے۔ شاعر نے کہا:

احطنا بهم حتى اذا ما تيقنوا　　بما قد رأوا مالوا جميعا الى السلم

ہم نے ان کا گھیراؤ کیا حتیٰ کہ جب انہوں نے اس کا یقین کر لیا جو انہوں نے دیکھا تو وہ تمام صلح کی طرف مائل ہوئے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ (الکہف: 42) (اور اس کا (باغ) برباد ہو گیا)۔

اصل میں مُحْيِط تھا یاء کی حرکت حا کی طرف نقل کی گئی اور یا کو ساکن کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کا احاطہ کرنے والا ہے یعنی وہ اس کے قبضہ اور اس کے غلبہ کے تحت ہے جیسا کہ فرمایا: وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (الزمر: 67) (ساری زمین اس کی مٹھی میں ہو گی قیامت کے دن)۔ بعض علماء نے فرمایا: مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ کا معنی ہے انہیں جاننے والا ہے۔ اس کی دلیل یہ آیت ہے: وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا۠ (الطلاق) (اور بے شک اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا اپنے علم سے احاطہ کر رکھا ہے)۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے وہ انہیں ہلاک کرنے والا اور انہیں جمع کرنے والا ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: اِلَّاۤ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ (یوسف: 66) (مگر یہ کہ تمہیں بے بس کر دیا جائے)۔ یعنی تم تمام ہلاک کئے جاؤ۔ کافروں کا خصوصی ذکر فرمایا کیونکہ آیت میں پہلے ان کا ذکر ہے۔

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَاۤ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَاِذَاۤ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

”قریب ہے کہ بجلی اچک لے جائے ان کی بینائی جب چمکتی ہے ان کے لئے تو چلنے لگتے ہیں اس (کی روشنی) میں اور جب اندھیرا چھا جاتا ہے ان پر تو کھڑے رہ جاتے ہیں اور اگر چاہے اللہ تو لے جائے ان کے سننے کی قوت اور ان کی بینائی۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ، یکاد بمعنی یقارب ہے۔ کہا جاتا ہے: کاد یفعل کذا جب کوئی شخص کام کرنے کے قریب ہو اور کرے نہیں۔ غیر قرآن میں جائز ہے یکاد ان یفعل، جیسا کہ رؤبة نے کہا:

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 948

قد كاد من طول البلى ان يمصحا

قریب ہے کہ لمبی آزمائش ختم ہو جائے۔

یہ المصح سے مشتق ہے جس کا معنی ہے ختم ہو جانا، مٹ جانا۔ بہتر یہ ہے کہ اس کی خبر بغیر ان کے ہو کیونکہ یہ حال کی مقاربت کے لئے آتا ہے اور ان کلام کو زمانہ مستقبل کی طرف پھیر دیتا ہے اور یہ منافات ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ یَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ﴿۴۳﴾ (النور)

عرب کلام میں ہے: کاد النعام یطیر، شتر مرغ اڑنے کے قریب ہے۔ کاد العروس ان یکون امیرا، دولہا امیر ہونے کے قریب ہے ان کے اس حالت کے قریب ہونے کی وجہ سے۔ کاد فعل متصرف ہے فَعِلَ یفعل کے وزن پر۔ اس کی خبر کبھی اسم ہوتی ہے لیکن یہ بہت قلیل ہے۔ تابط شرا نے کہا: دما کدت آئبا میں لوٹنے کے قریب نہ ہوا۔ کرب، جعل، قارب اور طفق بغیر ان کے خبر استعمال ہونے میں کاد کی طرح ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ طَفِقَا یَخْصِفٰنِ عَلَیْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ (الاعراف: 22) (اور وہ دونوں چپٹانے لگ گئے اپنے (بدن) پر جنت کے پتے)۔

یہ تمام الفاظ حال اور مقاربت کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ حال کے ساتھ ان نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ، الخطف کا معنی ہے تیزی سے اچک لینا۔ ایک پرندے کو اس کی تیزی کی وجہ سے خطاف کہا جاتا ہے۔ پس جس نے قرآن کو تخویف (ڈرانے) کے لئے بنایا ہے معنی یہ ہے کہ جو ان پر نازل ہوتا اس کی وجہ سے ڈرتے ہیں کہ ان کی آنکھیں اچک نہ لے اور جس نے قرآن کو بیان کے لئے مثال بنایا جو قرآن میں ہے تو معنی یہ ہوگا کہ ان کے پاس بیان آیا جو ان پر غالب آگیا یخطَفُ اور یخطِف دونوں لغتیں ہیں دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ خطِفه یخطَفه خطفاً یہ عمدہ لغت ہے اور دوسری لغت کو اخفش نے بیان کیا ہے خطَف یخطِفُ۔

جوہری نے کہا: یہ قلیل اور ردی لغت ہے معروف نہیں۔ یونس نے اس لغت کے ساتھ اس آیت کو پڑھا ہے: یَكَادُ الْبَرْقُ یَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ۔ نحاس نے کہا: یَخْطَفُ میں سات وجوہ ہیں: قراءت فصیحہ یخطف ہے۔ علی بن الحسین اور یحییٰ بن وثاب نے یخطف طا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ سعید اخفش نے کہا: یہ بھی ایک لغت ہے۔ حضرات حسن، قتادہ، عاصم جحدری، ابو رجاء العطاردی نے یا کے فتحہ خا اور طا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حسن سے مروی ہے کہ انہوں نے خا کے فتحہ خا اور طا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حسن سے مروی ہے کہ انہوں نے خا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ فراء نے کہا: بعض اہل مدینہ نے خا کے سکون اور طا کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ کسائی، اخفش اور فراء نے کہا: یخطف یا، خا، طا کے کسرہ کے ساتھ جائز ہے۔ یہ چھ وجوہ ہیں جو لکھنے میں موافق ہیں۔ ساتویں صورت جسے عبدالوارث نے بیان فرمایا ہے، فرمایا: مصحف ابی بن کعب میں میں نے دیکھا یتخطف لکھا ہوا تھا۔ سیبویہ اور کسائی نے کہا کہ جس نے یخِطِف خا اور طا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، اس کے نزدیک اس کی اصل یختطف ہے پھر تا کو طا میں ادغام کیا گیا۔ دو ساکن جمع ہوئے تو خا کو التقائے ساکنین کی وجہ سے کسرہ دیا گیا۔ سیبویہ نے کہا: جس نے خا کو فتحہ دیا اس نے تا کی حرکت اسے دی۔ کسائی نے کہا: جس نے یا کو کسرہ دیا اس کی وجہ یہ ہے

کہ اختطف میں الف مکسورہ ہے اور فراء نے اہل مدینہ سے جو خاء کا سکون اور ادغام حکایت کیا ہے وہ معروف نہیں اور جائز نہیں کیونکہ اس میں دو ساکنوں کو جمع کرتا ہے یہ نحاس وغیرہ نے کہا ہے۔

میں کہتا ہوں: حسن اور ابو رجاء سے یخطف مروی ہے۔ حضرت ابن مجاہد نے کہا: میں اسے غلط گمان کرتا ہوں، انہوں نے اس سے استدلال کیا ہے خطف الخطفۃ۔ کسی نے بھی اسے فتحہ کے ساتھ نہیں پڑھا۔

اَبْصَارَهُمْ یہ بصر کی جمع ہے یہ دیکھنے کا حاسہ ہے۔ معنی یہ ہے کہ قریب تھا کہ حجج قرآنیہ اور براہین ساطعہ ان پر روشن ہونے کے قریب تھے اور جنہوں نے الْبَرْقُ کو ڈرانے کے لئے مثال بنایا ہے ان کے نزدیک معنی یہ ہوگا کہ جوان پر مصیبت اتری ہے قریب ہے ان کی آنکھیں اچک لے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ، كُلَّمَآ منصوب ہے کیونکہ یہ ظرف ہے اور جب کلما بمعنی اذا ہو تو یہ موصولہ ہوتا ہے۔ اس میں عامل مشوا ہے اور مشوا ہی اس کا جواب ہے، اس میں اضاء عامل نہیں ہے کیونکہ وہ ما کے تتمہ میں ہے اور مبرد کے قول کے مطابق مفعول محذوف ہے۔ اس کے نزدیک تقدیر عبارت اس طرح ہے: کلما اضاء لھم البرق الطریق۔ (یعنی جب بجلی نے ان کے لئے راستہ روشن کر دیا۔)

بعض علماء نے فرمایا: یہ بھی جائز ہے کہ فعل اور افعل ہم معنی ہوں، جیسے سکت اور اسکت ہم معنی ہیں۔ پس اضاء اور ضاء برابر ہوں گے۔ مفعول کے حذف کی تقدیر کی ضرورت نہ رہے گی۔ فراء نے کہا: ضاء، اضاء پہلے گزر چکا ہے۔ معنی یہ ہے کہ جب وہ قرآن سنتے ہیں اور ان کے لئے حجج (دلائل) ظاہر ہوتے ہیں تو وہ مانوس ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ چلتے ہیں اور جب قرآن کا کوئی حصہ نازل ہوتا ہے جس میں وہ اندھے ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ گمراہ ہوتے ہیں یا انہیں اس کا مکلف بنایا جاتا ہے تو قَامُوْا وہ اپنے نفاق پر ٹھہر جاتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: معنی یہ ہے کہ جب کھیتوں اور مواشی میں ان کے حالات درست ہوتے ہیں، نعمتیں متواتر ملتی ہیں تو کہتے ہیں: محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین مبارک ہے اور جب ان پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے اور کسی سختی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو ناراض ہوتے ہیں اور اپنے نفاق پر ٹھہر جاتے ہیں۔ یہ حضرت ابن مسعود اور قتادہ سے مروی ہے۔ نحاس نے کہا یہ قول عمدہ ہے اور اس کی صحت پر دلیل یہ ارشاد ہے: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ (الحج: 11) اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو عبادت کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی کنارہ پر (کھڑے کھڑے) پھر اگر پہنچے اسے بھلائی (اس عبادت سے) تو مطمئن ہو جاتا ہے اور اگر پہنچے اسے کوئی آزمائش تو فوراً (دین سے) منہ موڑ لیتا ہے۔

علماء صوفیہ نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کی مثال بیان فرمائی ہے جس کے ابتداءً احوال ارادت درست نہیں ہوتے، پس وہ اپنے دعاوی کے ساتھ ان احوال سے اکابر کے احوال تک بلند ہوتا ہے، گویا اس پر ارادت کے احوال روشن ہوتے اگر وہ ارادت کے اداب کی ملازمت کے ساتھ ارادت کو صحیح کرتا۔ جب اس نے ارادت میں دعاوی کی ملاوٹ کر دی تو اللہ تعالیٰ اس سے وہ انوار لے گیا اور اسے اپنے دعوؤں کی تاریکیوں میں چھوڑ دیا۔ اب وہ ان تاریکیوں سے خروج کا راستہ نہیں دیکھتا۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ اس سے مراد یہود ہیں، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگ بدر میں مدد کی گئی تو انہوں نے طمع کیا اور کہا: اللہ کی قسم! یہی وہ نبی ہے جس کی ہمیں موسیٰ علیہ السلام نے بشارت دی تھی کہ اس کا جھنڈا سرنگوں نہ ہوگا۔ جب احد میں شکست کا سامنا ہوا تو یہ لوگ مرتد ہو گئے اور شک کرنے لگے۔ یہ قول ضعیف ہے۔ یہ آیت منافقین کے متعلق ہے۔ یہ حضرت ابن عباس سے اصح قول ہے اور معنی تمام اقوال کو شامل ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ "لو" یہ حرف تمنا ہے۔ اس میں جزا کا معنی ہے۔ اس کا جواب لام یعنی جس جملہ پر لام ہے۔ معنی یہ ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو مومنین کو ان پر مطلع کر دیتا پھر ان سے اسلام کی عزت چھین لیتا، مومنین کو ان پر غلبہ عطا فرما کر اور انہیں قتل کر کے اور انہیں مسلمانوں سے باہر نکال کر۔

یہاں سمع اور بصر کو خصوصاً ذکر فرمایا کیونکہ پہلی آیت میں ان کا ذکر ہو چکا ہے یا اس لئے کہ یہ انسان میں معزز چیزیں ہیں۔ باسماعھم بھی پڑھا گیا ہے۔ اس پر کلام پہلے اسی جز میں گزر چکی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اس میں عموم ہے متکلمین کے نزدیک جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو موصوف کرنا جائز ہے، اس پر اس کی قدرت مراد ہے۔ امت کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ کو قدیر کہا جائے۔ اللہ تعالیٰ قدیر، قادر اور مقتدر ہے۔ قدیر میں قادر کی نسبت زیادہ مبالغہ ہے۔ زجاجی نے کہا ہے: ہروی نے کہا: قدیر، قادر دونوں کا ایک معنی ہے۔ کہا جاتا ہے: قدرتُ علی الشیء اَقدِرُ قدراً و قَدَراً و مقتدرۃ و مقدُرۃ و قدراناً (یعنی قدرۃ) الاقتدار علی الشیء کا مطلب اس پر قدرت ہونا ہے۔

اللہ تعالیٰ قادر، مقتدر اور قدیر ہے۔ ہر ممکن چیز پر جو وجود اور عدم کو قبول کرتی ہے۔ ہر مکلف پر واجب ہے کہ وہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ قادر ہے، اسے قدرت ہے، اپنے علم اور اختیار سے جو چاہتا ہے کرتا ہے اور انسان پر یہ جاننا بھی واجب ہے کہ بندہ کی وہ قدرت جس کے ساتھ وہ کوئی کام کرتا ہے وہ قدرت ہے جو اللہ تعالیٰ نے عادۃً پیدا فرمائی، بندہ اس قدرت کا مختار نہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت قدرت خاص طور پر ذکر فرمائی، کیونکہ پہلے ایک ایسے فعل کا ذکر گزرا ہے جو وعید اور خوف دلانے کو متضمن ہے، پس یہاں قدرت کا ذکر ہی مناسب تھا۔

یہ بیس آیات ہیں، کوفیوں کی تعداد کے مطابق چار آیات مومنین کی شان میں پھر دو آیات کافروں کے ذکر میں ہیں اور بقیہ تمام منافقین کے بارے میں ہیں۔ اس کے متعلق روایت ابن جریج سے گزر چکی ہے۔ یہ مجاہد کا بھی قول ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾

"اے لوگو! عبادت کرو اپنے رب کی جس نے پیدا فرمایا تمہیں اور جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ علقمہ اور مجاہد نے کہا: ہر وہ آیت جس کی ابتدا میں يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ہے وہ مکہ میں نازل ہوئی ہے۔ اور ہر آیت جس کی ابتدا میں يٰٓاَيُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ہے وہ مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔ میں کہتا ہوں: اس قول کا رد اس سے ہو جاتا ہے کہ یہ سورۃ اور سورۂ نساء مدنی ہیں۔ ان میں يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ آیا ہے۔ رہا یہ کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِیْنَ

اٰمَنُوْا جس سورت میں ہے وہ مدنی ہے۔ یہ قول صحیح ہے۔ عروہ بن زبیر نے کہا: ہر حد اور ہر فرض مدینہ طیبہ میں نازل ہوا اور جہاں امم اور عذاب کا ذکر ہے وہ مکہ میں نازل ہوا۔ یہ واضح ہے۔

"یا"، یٰۤاَیُّهَا میں حرف ندا ہے۔ أی منادیٰ مفرد مبنی بر ضمہ ہے۔ کیونکہ لفظ میں وہ منادیٰ ہے اور ھا تنبیہ کے لئے ہے۔ النَّاسُ مرفوع ہے کیونکہ ای کی صفت ہے۔ یہ جمہور نحویوں کے نزدیک ہے، سوائے مازنی کے۔ انہوں نے یا ھذا الرجل میں نصب کے جواز پر قیاس کرتے ہوئے اس میں نصب کو جائز قرار دیا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: ای کو ضمہ دیا گیا ہے جس طرح مقصود مفرد کو ضمہ دیا جاتا ہے اور ھا کو دوسری یا کے عوض ذکر کیا یا کو ذکر نہیں کیا تاکہ کلام منقطع نہ ہو جائے۔ ھا کو ذکر کیا تاکہ کلام متصل رہے۔ سیبویہ نے کہا: گویا تو نے یا کو دوبارہ ذکر کیا۔ اور اسم ان دونوں کے درمیان ہو گیا جس طرح وہ کہتے ہیں: ھا ھو ذا۔ بعض علماء نے فرمایا: جب دو حرف تعریف سے خالی منادیٰ کی صورت میں ذکر کیے اور اس پر معرف باللام المقصود بالنداء کے احکام پر جاری کیے اور اس کے رفع کا التزام کیا کیونکہ وہ مقصود بالنداء ہے، پس انہوں نے ایسی حرکت کے ساتھ اس کو اعراب دیا جس کا وہ مستحق تھا اگر اس کے ساتھ حرف ندا مل ہوا ہوتا اس بات پر تنبیہ کرتے ہوئے کہ یہ منادیٰ ہے۔

علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ النَّاسُ سے کون مراد ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ کفار مراد ہیں جنہوں نے عبادت نہ کی۔ اس پر یہ قول دلالت کرتا ہے وَ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ (البقرہ:23) دوسرا قول یہ ہے کہ یہ تمام لوگوں کو شامل ہے۔ پس مومنین کے لئے خطاب ہمیشہ عبادت کرتے رہنے کے لئے ہے اور کفار کے لیے عبادت شروع کرنے کے لئے ہے۔ یہ قول عمدہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اعْبُدُوْا یہ عبادت کا حکم ہے۔ یہاں عبادت سے مراد اس کی توحید کا اقرار اور اس کے دین کی شرائع کا التزام ہے۔ عبادت کی اصل خضوع اور تذلیل ہے، کہا جاتا ہے: طریق معبدٌ، جب راستہ قدموں سے روندا گیا ہو طرفہ نے کہا: وظیفا وظیفاً فوق مورٍ معبدٍ۔ میں موٹی پنڈلیوں والی اونٹنی کے پیچھے روندے ہوئے راستہ کے اوپر چلا۔

عبادت کا معنی طاعت ہے۔ التعبد کا معنی التنسک (احکام بجالانا) عبدت فلاناً میں نے اسے غلام بنایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الَّذِیْ خَلَقَكُمْ اللہ تعالیٰ نے ان کی تخلیق کو خاص طور پر ذکر کیا ہے کیونکہ عرب اس بات کے مقر تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کا خالق ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان پر بطور حجت اس کو ذکر کیا اور انہیں متنبہ کرنے کے لئے اس صفت کو ذکر کیا۔ بعض علماء نے فرمایا تاکہ انہیں اپنی نعمت یاد دلائے جو اس نے ان پر کی ہوئی ہے۔ الخلق کی اصل میں دو وجہیں ہیں:

۱۔ تقدیر۔ کہا جاتا ہے خلقت الادیم للسقاء جب تو چمڑے کو مشکیزے کے لئے کاٹنے سے پہلے اندازہ کرے تو یہ جملہ بولے۔ شاعر نے کہا:

ولانت تفری ما خلقت و بعـ ض القوم یخلق ثم لایفری

تو وہ ہے کہ جس کا تو اندازہ کرتا ہے اسے کر گزرتا ہے اور بعض لوگ اندازہ کرتے ہیں پھر اس کام کو کر نہیں سکتے۔

حجاج نے کہا: ما خلقت الافریت ولا وعدت الاوفیت یعنی میں نے کبھی اندازہ نہیں کیا مگر اسے کر گزرا۔ اور میں نے کبھی

وعدہ نہیں کیا مگر میں نے اسے پورا کیا۔

۲۔ خلق کا دوسرا معنی انشاء، اختراع اور ابداع ہے (یعنی پیدا کرنا)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا (عنکبوت: 17) اور تم گھڑا کرتے ہو نرا جھوٹ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ کہا جاتا ہے کہ جب ان کے نزدیک ان کی تخلیق ثابت تھی تو دوسروں کی تخلیق بھی ان کے نزدیک ثابت تھی (تو پھر پہلے لوگوں کی تخلیق کا ذکر کیوں کیا)۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کلام کو تنبیہ اور تذکیر کے لئے جاری فرمایا تا کہ نصیحت میں بلیغ ہو جائے۔ انہیں پہلے لوگ یاد دلائے تا کہ وہ جان لیں کہ جس ذات نے ان سے پہلے لوگوں کو موت دی اور وہ ان کا بھی خالق ہے، انہیں بھی مارے گا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ پہلے لوگوں میں غور و فکر کریں کہ وہ کیسے تھے اور کن امور کی بناء پر ہلاک ہوئے، تا کہ وہ جان لیں کہ انہیں بھی مبتلا کیا جائے گا جیسے وہ لوگ مبتلا کیے گئے۔ واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ، لعل اعبدوا کے متعلق ہے، خَلَقَكُمْ کے متعلق نہیں ہے، کیونکہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے جہنم کے لئے پیدا فرمایا ہے اس نے انہیں تقویٰ کے لئے پیدا نہیں فرمایا۔ اس قسم کا کلام جو کلام الٰہی میں وارد ہے مثلاً لعلکم تعقلون، لعلکم تشکرون، لعلکم تذکرون، لعلکم تھتدون، تو اس میں تین تاویلات ہیں:

۱۔ لعل ترجی اور توقع کے معنی میں ہے اور ترجی اور توقع یہ بشر کی حیز میں ہے۔ گویا انہیں کہا گیا یہ کر و اس امید پر کہ تم سمجھ جاؤ، تم نصیحت حاصل کر لو اور متقی بن جاؤ۔ یہ سیبویہ اور زبان عرب کے رؤساء کا قول ہے۔ سیبویہ نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے متعلق کہا: اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝ (طٰہٰ) اس کا معنی ہے تم اپنی اس طمع اور رجا پر جاؤ کہ وہ نصیحت حاصل کرے گا یا ڈرے گا۔ اس قول کو ابو المعالی نے پسند کیا ہے۔

۲۔ عرب لعل کو شک سے پاک لام کی کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ معنی یہ ہوگا تا کہ تم سمجھ جاؤ، تا کہ تم نصیحت حاصل کرو تا کہ تم متقی بن جاؤ۔ اس پر شاعر کا قول دلالت کرتا ہے:

وقلتم لنا کفوا الحروب لعلنا نکف و وثقتم لنا کل موثق

فلما کففنا الحرب کانت عھودکم کلمع سراب فی الملاء متالق

تم نے ہمیں کہا: جنگ روک لو تا کہ ہم رک جائیں اور تم نے ہمیں ہر پختہ عہد دیا۔ جب ہم نے جنگ کو روک لیا تو تمہارے عہد صحرا میں سراب کی چمک کی طرح تھے۔

مطلب یہ ہے کہ کفوا الحروب لنکف جنگ کو روکو تا کہ ہم روک لیں۔ اگر لعل یہاں شک کے لئے ہوتا تو وہ ان کے لئے ہر پختہ عہد نہ کرتے۔ یہ قول قطرب اور طبری سے منقول ہے۔

۳۔ لعل اس معنی میں ہے کہ کسی شے سے تعرض کرنا۔ گویا کہ کہا گیا: یہ کرو تعرض کرتے ہوئے تا کہ سمجھ جاؤ یا نصیحت حاصل کر لو، یا متقی بن جاؤ۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کا معنی ہے تا کہ تم امر الٰہی کی قبولیت کو اپنے اور آگ کے درمیان بچاؤ کا ذریعہ بنا لو۔ یہ عربوں کے اس قول سے ہے اتقاہ بحقہ۔ جب تو اس کے حق کو قبول کرے گویا اس نے اسے اپنا حق دے کر اس کے مطالبہ

سے بچاؤ حاصل کر لیا، اسی سے حضرت علی کا قول ہے: کنا اذا احمر البأس اتقینا بالنبی ﷺ (1)۔ جب جنگ شدید ہو جاتی تو ہم نبی کریم ﷺ کی ذات کو دشمن سے بچاؤ کا ذریعہ بناتے، عنترہ نے کہا۔

ولقد کررت المهر یدمی نحرہ　　حتی اتقتنی الخیل یا بنی حذیم

میں نے گھوڑے کو پلٹایا حالانکہ اس کا سینہ زخمی تھا، حتیٰ کہ گھوڑوں نے مجھے میرے بیٹے حذیم کے ساتھ بچایا۔

الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

''وہ جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو عمارت اور اتارا آسمان سے پانی پھر نکالے اس سے کچھ پھل تمہارے کھانے کے لئے پس نہ ٹھہراؤ اللہ کے لئے مدمقابل حالانکہ تم جانتے ہو''۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد: الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: الَّذِیْ جَعَلَ۔ یہاں جَعَلَ بمعنی صیّر ہے۔ کیونکہ یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے، جَعَلَ، خلق کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِیْرَةٍ وَّ لَا سَآىِٕبَةٍ (المائدہ:103) نہیں مقرر کیا اللہ تعالیٰ نے بحیرہ اور سائبہ۔ اور ارشاد ہے جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ (الانعام:1) اور بنایا اندھیروں کو اور نور کو یہ سمی کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اس معنی میں یہ ارشاد ہے حٰمٓ ﴿۱﴾ وَ الْكِتٰبِ الْمُبِیْنِ ﴿۲﴾ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا یعنی ہم نے اس کا نام قرآناً عربیاً رکھا، اور ارشاد ہے وَ جَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا (الزخرف:15) اور بنا دی ہے (مشرکوں نے) اس کے لئے اس کے بندوں سے جز اور وَ جَعَلُوا الْمَلٰٓىِٕكَةَ الَّذِیْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا (الزخرف:19) اور انہوں نے ٹھہرا لیا ہے فرشتوں کو جو خداوند رحمن کے بندے ہیں عورتیں۔ ان تمام ارشادات میں جَعَلَ بمعنی سمّی ہے یعنی نام رکھنا۔

اور خلق اخذ کے معنی میں بھی آتا ہے، جیسے شاعر نے کہا:

وقد جعلت نفسی تطیب لضغمة　　لضغمهما ها یقرع العظم نابها

اس میں جَعَلَ، خلق اور اخذ کے معنی میں ہے۔

کبھی جَعَلَ زائدہ ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا:

و قد جعلت اری الاثنین اربعة　　والواحد اثنین لما هدنی الکبر

میں نے دو کو چار دیکھا اور ایک کو دو دیکھا جب مجھے بڑھاپے نے آلیا۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد: جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ (الانعام:1) میں بھی کہا گیا ہے کہ یہاں جَعَلَ زائدہ ہے۔ جَعَلَ اور اجتعل ایک معنی میں ہیں۔ شاعر نے کہا:

ناط امر الضعاف واجتعل اللیـ　　ل کحبل العادیة الممدود

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسیر، باب فی غزوۃ حنین، صفحہ 101-100، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

اس میں اجتعل بھی جعل ہے۔

فِرَاشًا وہ بچھونا جو لوگ بچھاتے ہیں اور اس پر قرار پکڑتے ہیں اور وہ جگہیں جو بچھونا نہیں ہیں جیسے پہاڑ، نشیبی علاقے، سمندر یہ بچھونے کے مصالح میں سے ہیں کیونکہ پہاڑ کیلوں کی طرح ہیں جیسے فرمایا اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۙ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۝ (النباء) کیا ہم نے نہیں بنادیا زمین کو بچھونا اور پہاڑوں کو میخیں۔ اور سمندر، منافع کے حصول کے لئے ان پر سواری کی جاتی ہے جیسے فرمایا: وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ (البقرہ: 164) اور جانوروں میں سے جو چلتے ہیں سمندر میں وہ چیزیں اٹھائیں جو نفع پہنچاتی ہیں لوگوں کو۔

مسئلہ نمبر 2: شوافع نے کہا: اگر کوئی شخص قسم اٹھائے کہ وہ بستر پر رات نہیں گزارے گا یا چراغ کی روشنی میں نہیں بیٹھے گا پھر اس نے زمین پر رات گزاری اور سورج کی دھوپ میں بیٹھا تو وہ حانث نہ ہوگا کیونکہ لفظ عرفاً ان کی طرف راجع نہیں ہوتا۔ مالکی علماء فرماتے ہیں: ایمان کی قسمیں نیت یا سبب یا بساط پر محمول ہوں گی جس پر قسم جاری ہوئی۔ اگر یہ نہ ہو تو عرف کا اعتبار ہوگا۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً آسمان زمین کے لئے ایسے ہے جیسے گھر کے لئے چھت۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ جَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا (الانبیاء: 32) (ہم نے بنایا آسمان کو ایک چھت جو (شکست و ریخت سے) محفوظ ہے ہر وہ چیز جو بلند ہو اور سایہ کرے اسے سما کہا جاتا ہے، اس کے متعلق پہلے کلام گزر چکی ہے۔ تتقون پر وقف کی نسبت بناء پر وقف زیادہ بہتر ہے کیونکہ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا۔ رب کی صفت ہے۔ کہا جاتا ہے: بنی فلان بیتا و بنی علی اهله۔ فلاں نے گھر بنایا، اپنی بیوی سے شب زفاف گزاری۔ عام لوگ کہتے ہیں: بنی باهله۔ یہ غلطی ہے۔ گویا اس میں اصل یہ ہے کہ جو اپنے گھر والوں کے پاس آتا ہے تو وہ اپنی اہلیہ پر دخول کی رات قبہ بناتا ہے پس اپنے اہل کے پاس جانے والے کو بانِ کہتے ہیں۔ بنی کثرت کے لئے تشدید ذکر کرتے ہیں۔ ابتنی دارا و بنی دونوں کا ایک معنی ہے۔ اس نے گھر بنایا۔ اسی سے بنیان الحائط ہے۔ اس کی اصل یہ ہے کہ ایک اینٹ پر دوسری اینٹ رکھنا حتیٰ کہ دیوار قائم ہو جائے۔

السماء کی اصل موۃ ہے۔ ماقبل فتحہ کی وجہ سے واؤ متحرک کو الف سے بدلا گیا تو تو نے کہا ماۃ۔ پھر دو حرف خفی ملے تو هاء کو ہمزہ سے بدل دیا گیا۔ کیونکہ وہ زیادہ پختہ ہے اور یہ الف کے زیادہ مشابہ ہے۔ تو تو نے کہا: ماءٌ۔ پہلا الف فعل کا عین کلمہ ہے اور اس کے بعد وہ ہمزہ ہے جو ھا کا بدل ہے اور ہمزہ کے بعد الف ہے جو تنوین کا بدل ہے۔ ابوالحسن نے کہا: بصریوں کے نزدیک صرف دو الف کے ساتھ لکھنا جائز ہے۔ اگر تو چاہے تو تین الف کے ساتھ لکھے۔ جب عرب اس کی جمع بناتے ہیں یا تصغیر بناتے ہیں تو اصل کی طرف لوٹاتے ہیں۔ کہتے ہیں: مُوَیْهٌ، و امواہ و میاہ جیسے جمال و اجمال۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ، الثَّمَرٰتِ ثمرۃ کی جمع ہے کہا جاتا ہے ثمر جیسے شجر۔ کہا جاتا ہے ثمر جیسے خشب، کہا جاتا ہے ثمر مثل بُدْنٌ۔ ثمار جیسے اکام یہ ثمر کی جمع ہے اس کا مزید بیان ان شاء اللہ سورۃ الانعام میں آئے گا۔ ثمار السیاط کوڑے کے اطراف کی گرہیں۔ آیت کا معنی ہے ہم نے تمہارے لئے مختلف

رنگ کے پھل اور مختلف قسم کے نبات نکالے۔ یہ رزقاً تمہارے کھانے اور تمہارے جانوروں کے لئے چارہ۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان نے اس کی وضاحت کر دی اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۙ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۙ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ۙ وَّ عِنَبًا وَّ قَضْبًا ۙ وَّ زَيْتُوْنًا وَّ نَخْلًا ۙ وَّ حَدَآئِقَ غُلْبًا ۙ وَّ فَاكِهَةً وَّ اَبًّا ۙ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ؕ (عبس)

بے شک ہم نے زور سے پانی برسایا پھر اچھی طرح پھاڑا زمین کو پھر ہم نے اگایا اس میں غلہ اور انگور اور ترکاریاں اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے باغات اور طرح طرح کے پھل اور گھاس سامان زیست تمہارے لئے اور تمہارے مویشیوں کے لئے۔ رزق پر تفصیلی کلام گزر چکا ہے۔ الحمدللہ

اگر کہا جائے کہ پھلوں میں جو اس نے نکالا اس پر تملک (مالک ہونا) سے پہلے رزق کے اسم کا اطلاق کیسے کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کیونکہ وہ اس لائق ہیں کہ ان کا مالک ہوا جائے اور ان میں انتفاع صحیح ہو۔ پس یہ رزق ہے۔

مسئلہ نمبر 5: میں کہتا ہوں: یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ہر مخلوق سے غنی کر دیا ہے۔ اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے اس معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: اللہ کی قسم! تم میں سے کوئی اپنی رسی اٹھائے پھر اپنی پیٹھ پر لکڑیاں اٹھا کر لے آئے تو اس کے لئے یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ کسی سے سوال کرے خواہ وہ اسے عطا کرے یا عطا نہ کرے (1)۔ اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا ہے۔ اس حدیث میں ''لکڑیاں اٹھائے'' کے معنی میں تمام صنعتوں میں مشغول ہونا ہے۔ پس جس نے حرص، امید اور دنیا کی چمک میں رغبت کے سبب اپنے جیسے انسان کی طرف اپنے نفس کو محتاج بنایا تو اس نے اس شخص کی طرف کو پکڑا جس نے اللہ تعالیٰ کے لئے مدمقابل بنایا۔ علماء صوفیہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فقر کا راستہ بتایا ہے وہ یہ ہے کہ تو زمین کو بچھونا بنا، آسمان کو پردہ بنا، پانی کو پاک مشروب، گھاس کو کھانا بنا۔ دنیا کے سبب مخلوق میں سے کسی کی عبادت نہ کر کیونکہ اللہ تعالیٰ نے وہ سب کچھ تجھے عطا فرمایا جو تیری زندگی کے لئے ضروری تھا۔ اس میں کسی انسان کا تجھ پر احسان نہیں ہے۔ نوف البکالی نے کہا: میں نے حضرت علی بن ابی طالب کو دیکھا، وہ باہر نکلے اور ستاروں کی طرف دیکھا۔ پھر فرمایا: اے نوف! کیا تو سویا ہوا ہے یا دیکھ رہا ہے؟ میں نے کہا: اے امیر المومنین! میں دیکھ رہا ہوں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: دنیا سے دلچسپی نہ رکھنے والوں اور آخرت میں رغبت کرنے والوں کو مبارک ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے زمین کو بساط بنایا، اس کی مٹی کو بچھونا بنایا، اس کے پانی کو پاکیزہ رزق بنایا۔ قرآن اور دعا کو اندر اور باہر کا لباس بنایا، حضرت مسیح علیہ السلام کے طریقہ پر دنیا کو ترک کر دیا۔ باقی حدیث بھی ذکر کی (2)۔ اسی سورت میں اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ (البقرہ: 186) کے تحت آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 6: فَلَا تَجْعَلُوْا۔ یہ نہی ہے۔ انداداً۔ ہم پلہ، امثال اس جیسے، اس کا واحد ندٌ ہے۔ محمد بن سمیقع نے ندا پڑھا ہے۔ شاعر نے کہا

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 199، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الزکوٰۃ، باب الاستعفاف عن المسألۃ، حدیث نمبر 1378، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ حلیۃ الاولیاء، جلد 1، صفحہ 79

نحمد　الله　ولا　ندله　عنده الخیر و ما شاء فعل

ہم اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے ہیں، اس کا کوئی مدمقابل نہیں، اسی کے پاس ساری خیر ہے، وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

حضرت حسان نے کہا:

أتهجوه　ولست　له　بندّ　فشرکما　لخیرکما　الفداء

کیا تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بکواس کرتا ہے، تو تو اس کا ہم مثل ہی نہیں۔ پس تم میں سے براتم میں سے بہتر کے لئے قربان ہو جائے۔

کہا جاتا ہے: ندٌّ و ندیدٌ و ندیدۃٌ سب کا معنی مدمقابل ہے۔ لبید نے کہا:

لکیلا یکون السندری ندیدتی　واجعل اقوامًا عمومًا عماعما

تاکہ سندری میرا مقابل نہ ہو اور میں جمع شدہ قوم کو جدا جدا نہ کردوں

ابو عبیدہ نے کہا: اَنْدَادًا کا معنی ہے: اضداداً (مدمقابل)۔ نحاس نے کہا: اَنْدَادًا پہلا مفعول ہے اور لِلّٰہِ دوسرے مفعول کی جگہ ہے۔ جوہری نے کہا: الند (بفتحہ نون) آسمان کی طرف بلند ٹیلے کو کہتے ہیں اور خوشبو میں سے النَّدّ عربی میں نہیں ہے۔ نَدّ البعیر یندّ نِداًّ و ندادًا و ندودًا، جدھر منہ آئے بھاگ جانا۔ اسی سے بعض نے یوم التناد پڑھا ہے نَدّ بہ یعنی اس نے اسے شہرت دی۔

مسئلہ نمبر 7: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ یہ مبتدا خبر ہیں اور جملہ حال واقع ہو رہا ہے، خطاب کافروں اور منافقین کو ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے، اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا وصف علم کے ساتھ کیسے بیان فرمایا اس کے برعکس ختم، طبع، الصمم اور العمی کے ساتھ پہلے ان کا وصف بیان کیا۔ اس کا جواب دو طرح سے ہے:

۱۔ وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ سے مراد علم خاص ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا، پانی کو نازل کیا، رزق کو اگایا۔ پس وہ جانتے ہیں کہ وہی انعام فرمانے والا ہے، نہ کہ اس کے مقابل (جو انہوں نے خود بنا رکھے ہیں)۔

۲۔ معنی یہ ہے کہ تم بالقوۃ اور بالامکان اس کی وحدانیت کو جان لیتے ہو اگر تم غور و فکر کرتے۔ واللہ اعلم۔ اس میں دلیل ہے عقلی دلائل کے استعمال کے امر پر اور تقلید کو باطل کرنے پر۔

ابن فورک نے کہا: یہ بھی احتمال ہے کہ آیت مومنین کو بھی شامل ہو۔ معنی یہ ہوگا: اے مومنو! مرتد نہ ہو جانا اور اللہ تعالیٰ کے مدمقابل نہ بنانا اس علم کے بعد کہ اللہ ایک ہے(1)۔

وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَ ادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۲۳

''اور اگر تمہیں شک ہو اس میں جو ہم نے نازل کیا اپنے (برگزیدہ) بندے پر تو لے آؤ ایک سورت اس جیسی اور

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 106، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

بلالو اپنے حمایتیوں کو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ یعنی اگر تم شک میں ہو، مِّمَّا نَزَّلْنَا یعنی القرآن۔ اس آیت کا مخاطب مشرک ہیں جن کو چیلنج کیا گیا کیونکہ انہوں نے جب قرآن سنا تو کہا: یہ اللہ تعالیٰ کے کلام کے مشابہ نہیں ہے۔ ہم اس میں شک کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اس آیت کا ماقبل سے اتصال اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب پہلی آیت میں اپنی وحدانیت وقدرت پر دلالت کو ذکر کیا تو اس کے بعد اپنے نبی کی نبوت پر دلالت کو ذکر کیا کہ وہ جو کچھ لے کر آیا ہے وہ اس کا اپنا گھڑا ہوا نہیں ہے۔

عَبْدِنَا: یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ عبد، تعبد سے ماخوذ ہے جس کا معنی عجز وانکساری کرنا، غلام کو عبد اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے آقا کے سامنے عجز اور خضوع کا اظہار کرتا ہے۔ طرفہ نے کہا:

الی ان تحامتنی العشیرۃ کلھا　و افردت افراد البعیر المعبد

یہاں تک کہ پورے خاندان نے مجھے روکا اور مذلل اونٹ جدا ہونے کی طرح میں جدا ہو گیا۔

بعض علماء نے کہا: جب عبادت معزز ترین خصلت ہے اس کے ساتھ نام رکھنا معزز ترین درجہ ہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو عبد کہہ کر ذکر فرمایا۔

یا قوم قلبی عند زھراء　یعرفہ السامع والرائی
لا تدعنی الا بیا عبدھا　فانہ اشرف اسمائی

اے میری قوم! میرا دل زہراء کے پاس ہے جس کو ہر سامع اور دیکھنے والا جانتا ہے۔ وہ مجھے نہیں پکارتی مگر یا عبد کہہ کر، کیونکہ یہ میرے معزز ناموں میں سے ہے۔

فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ فاء جواب شرط ہے۔ تو لے آؤ ایک سورت کیونکہ یہ مجئ کے باب سے ہے۔ یہ ابن کیسان نے کہا ہے، یہ امر کا صیغہ ہے اور یہاں اس کا معنی عاجز کرنا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو سورت لانے سے ان کا عجز معلوم تھا۔ السورۃ، السور کا واحد ہے اس کے متعلق کلام اس سورت میں اور اعجاز قرآن کی بحث میں گزر چکا ہے یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں۔ من مثلہ میں "مِنْ" زائدہ ہے جیسا کہ فاتوا بسورۃ مثلہ کہا ہے اور مثلہ کی ضمیر کا مرجع جمہور مفسرین کے نزدیک قرآن ہے جیسے حضرات قتادہ، مجاہد وغیرہما۔

بعض مفسرین نے فرمایا: اس کا مرجع تورات اور انجیل ہیں معنی یہ ہوگا کہ تم اس کی مثل کتاب سے سورت لے آؤ، کیونکہ تورات وانجیل اس کی تصدیق کرتی ہیں جو اس میں ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: ضمیر کا مرجع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ کوئی سورت لاؤ کسی ایسے بشر سے جو آپ کی مثل ہو جو نہ لکھتا ہو نہ پڑھتا ہو۔ ان دونوں تاویلوں پر من تبعیضیہ ہوگا اور مثلہ پر وقف تام نہ ہوگا کیونکہ وادعوا کا تعلق اس کے ساتھ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ، شُهَدَآءَ سے مراد مددگار اور حمایتی ہیں۔ فراء نے کہا: اس سے مراد ان کے

معبود (بت) ہیں۔ ابن کیسان نے کہا: اگر کہا جائے کہ یہاں شہداء کا ذکر کیسے کیا۔ شہداء تو اس لئے ہوتے ہیں تاکہ وہ کسی امر کی گواہی دیں یا کسی امر کی خبر دیں جو انہوں نے دیکھا ہو۔ انہیں تو کہا گیا ہے: فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا معنی ہے: اپنے علماء میں سے جو پاؤ ان سے مدد طلب کرو اور انہیں لے آؤ تاکہ وہ دیکھیں جو تم لے کر آتے ہو۔ تو یہ تمام لوگوں پر رد، حجت قائم کرنے کے اعتبار سے زیادہ مؤکد ہے۔ میں کہتا ہوں: مجاہد کے قول کا یہی معنی ہے۔ مجاہد نے کہا: ادْعُوا شُهَدَآءَكُم کا معنی ہے: لوگوں کو بلاؤ جو تمہارے لئے گواہی دیں کہ تم نے قرآن کا مقابلہ پیش کر دیا ہے۔ نحاس نے کہا: شُهَدَآءَكُم فعل کے ساتھ اس کو نصب دی گئی ہے اور یہ شہید کی جمع ہے۔ کہا جاتا ہے: شاهدٌ، وشهيدٌ، جیسے قادر و قدیرٌ۔

مِّن دُونِ اللَّهِ یعنی اللہ کے سوا دوسروں سے، دُونِ کا لفظ فوق کی نقیض (متضاد) ہے اور یہ غایت سے کمی کرتا ہے۔ یہ ظرف ہوتا ہے۔ الدون، حقیر اور خسیس کو کہتے ہیں

اذا ما علا المرء رام العلاء ویقنع بالدون من کان دونا

جب کوئی انسان بلند ہوتا ہے تو بلندی کا قصد کرتا ہے اور خسیس آدمی، پستی پر قناعت کرتا ہے۔

دُونِ کے لفظ سے فعل مشتق نہیں ہوتا۔ بعض لوگ کہتے ہیں: دان یدون دوناً اور کہا جاتا ہے: ھذا دون ذالك یعنی یہ اس کے زیادہ قریب ہے۔ کسی چیز پر برانگیختہ کرنے کے لئے کہا جاتا ہے: دُونَکه (تم اسے پکڑو)۔ تمیم نے حجاج کو کہا: اقبرنا صالحاً ہمیں اجازت دے کہ ہم صالح کی قبر کھودیں۔ حجاج نے صالح کو سولی پر لٹکایا تھا تو حجاج نے کہا: دونکموہ تم اسے لے لو اور دفن کر دو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ''اگر تم سچے ہو'' اس میں جو تم نے کہا ہے کہ تم قرآن کے مقابلہ پر قادر ہو، مشرکوں نے کہا تھا: لو نشاء لقلنا مثل ھذا (اگر ہم چاہیں تو ہم اس کی مثل کہہ سکتے ہیں)۔ صدق (سچائی) یہ کذب (جھوٹ) کا متضاد ہے۔ کہا جاتا ہے: وقد صدق فی الحدیث، اس نے بات سچی کی، الصدق، نیزوں میں سخت۔ کہا جاتا ہے: صدقوھم القتال۔ انہوں نے ان کو جنگ کے بارے سچی بات بتائی۔ الصدیق جو ہمیشہ سچ بولتا ہو۔ کہا جاتا ہے رجلٌ صدق (سچا آدمی)۔ جیسے کہا جاتا ہے: نعم الرجل (اچھا آدمی) الصداقة، یہ الصدق سے مشتق ہے جس کا معنی ہے اخلاص اور محبت میں سچا ہونا۔

فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَن تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ﴿٢٤﴾

''پھر اگر تم ایسا نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں جو تیار کی گئی ہے کافروں کے لئے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا یعنی اگر تم یہ چیلنج پورا نہ کر سکو۔ وَلَن تَفْعَلُوا یعنی تم اس کی ہرگز طاقت نہیں رکھو گے۔

اس صورت میں صٰدِقِیْنَ پر وقف، وقف تام ہوگا۔ اکثر مفسرین نے کہا: آیت کا معنی یہ ہے تم اپنے حمایتیوں کو بلاؤ اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو اور تم ایسا ہرگز نہیں کر سکو گے۔ اگر تم ایسا نہ کر سکو تو آگ سے ڈرو۔ اس تفسیر پر صٰدِقِیْنَ پر وقف مکمل نہ ہوگا۔

اگر کہا جائے کہ لم پر ان کیسے داخل ہوا حالانکہ ایک عامل، دوسرے عامل پر داخل نہیں ہوتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں اِنْ لفظ میں عاملہ نہیں ہے۔ پس یہ لم پر داخل ہو گیا جیسے کہ یہ ماضی پر داخل ہو جاتا ہے، لم میں یہ عمل نہیں کر رہا جس طرح یہ ماضی میں عمل نہیں کرتا۔ پس ان لم تفعلوا کا معنی ہے: ان ترکتم الفعل اگر تم یہ فعل چھوڑ دو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَنْ تَفْعَلُوْا۔ لن کے ساتھ فعل منصوب ہے عربوں میں سے کچھ لوگ اسے جزم دیتے ہیں۔ ابو عبیدہ نے جزم والا قول ذکر کیا ہے۔ اسی سے نابغہ کا شعر ہے

فلن اعرض ابیت اللعن بالصفد (1)

میں جناب کے فضائل عطا کی خاطر بیان نہیں کر رہا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے، جب انہیں خواب میں آگ کی طرف لے جایا گیا۔ حضرت ابن عمر نے کہا: مجھے کہا گیا: لن ترُعْ (تم نہ ڈرو) یہ اسی لغت کے مطابق ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَلَنْ تَفْعَلُوْا میں ان کے ارادوں کو ابھارنا اور ان کے نفوس کو حرکت دینا ہے تاکہ اس کے بعد ان کا عجز پھر سے ظاہر ہو جائے، یہ ان غیوب سے ہے جن کی خبر قرآن نے ان کے وقوع سے پہلے دی (2)۔ ابن کیسان نے کہا: وَلَنْ تَفْعَلُوْا ان کو اس بات سے روکتا ہے کہ یہ قرآن حق ہے اور وہ اپنے اس گمان میں سچے نہیں ہیں کہ یہ قرآن جھوٹ ہے اور یہ گھڑا گیا ہے اور یہ جادو ہے اور یہ شعر ہے اور یہ پہلے لوگوں کے قصے، کہانیاں ہے وہ علم کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن وہ اس کی مثل ایک سورت بھی پیش نہیں کر سکیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاتَّقُوا النَّارَ یہ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا کا جواب ہے یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر کے آگ سے بچو۔ التقویٰ کا معنی پہلے گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ تمیم اور اسد قبائل کی لغت فتقوا النار ہے۔ سیبویہ نے بیان کیا ہے: تقی یتقی جیسے قضی یقضی۔

النار مفعول ہے التی اس کی صفت ہے۔ التی میں تین لغات ہیں التی، اللتِ (تاء کے کسرہ کے ساتھ) اللتْ (تاء کے سکون کے ساتھ) یہ مؤنث کے لئے اسم مبہم ہے اور یہ معرفہ ہے اس کو نکرہ بنانے کے لئے اس سے الف لام ہٹانا جائز نہیں ہے اور اس کا مفہوم مکمل نہیں ہوتا مگر صلہ کے ساتھ۔ اس کے تثنیہ میں بھی تین لغات ہیں: اللتان، اللتا (نون کے حذف کے ساتھ) اللتانّ (نون کی تشدید کے ساتھ) اس کی جمع میں پانچ لغات ہیں: اللاتی، یہ قرآن کی لغت ہے، اللاتِ (تاء کے کسرہ کے ساتھ بغیر یاء کے) اللواتی، واللوات (بغیر یاء کے)

ابو عبیدہ نے کہا:

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 107، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ ایضاً

من اللواتی واللتی واللاتی　زعمن ان قد کبرت لداتی

ان سب کا گمان ہے کہ وہ سب عمر رسیدہ ہوچکی ہیں۔

اللوا، (تاء کے سقوط کے ساتھ) یہ جوہری نے حکایت کیا ہے۔ ابن شجری نے یہ زیادہ کیا ہے اللائی (ہمزہ اور یاء کے اثبات کے ساتھ) اور اللاء (ہمزہ کے کسرہ اور یاء کے حذف کے ساتھ) واللا (ہمزہ کے حذف کے ساتھ) اگر تو اس کی جمع الجمع بنائے تو اللاتی میں کہے گا: اللواتی۔ اور اللائی میں کہے گا: اللوائی۔ اور جوہری نے کہا: التی کی تصغیر اللتیا (فتح اور تشدید کے ساتھ)۔ الراجز نے کہا:

بعد اللتیا واللتیا والتی　اذا علتها انفس تردت

ان کے بعد جب وہ بلندی پر پہنچیں تو تھک ہار کر ہلاک ہوگئیں۔

بعض شعراء نے اَلَّتِیْ پر حرف ندا داخل کیا اور حرف ندا ایسے اسم پر داخل نہیں ہوتا جس پر الف لام ہوتا ہے مگر صرف یا اللہ میں۔ گویا اس نے اسے اسم جلالت سے تشبیہ دی ہے اس حیثیت سے الف لام اس سے بھی جدا نہیں ہوتا۔ شاعر نے کہا:

من اجلک یا التی تیمت قلبی　وانت بخیلۃ بالود عنی

تیری وجہ سے اے وہ محبوبہ! تو نے میرے دل کو غلام بنالیا ہے جبکہ مجھ سے محبت کرنے میں بخل کرتی ہے۔

کہا جاتا ہے: وقع فلان واللتیا والتی۔ یہ دونوں مصیبت کے اسماء میں سے ہیں یعنی فلاں مصیبت میں واقع ہوا۔

الوقود، اس کا معنی لکڑی، ایندھن ہے، جبکہ واد کے فتحہ کے ساتھ ہو اور واؤ کے ضمہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی روشن ہونا ہے۔

اَلنَّاسُ اس میں عموم ہے لیکن مراد خاص لوگ ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہو چکا ہے کہ وہ آگ کا ایندھن ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس آگ سے بچائے۔

اَلْحِجَارَةُ یہ سیاہ گندھک کا پتھر ہے۔ حضرت ابن مسعود اور فراء سے یہ مروی ہے، اس پتھر کو خاص کیا گیا ہے کیونکہ یہ عذاب دینے میں پانچ اعتبار سے دوسرے تمام پتھروں سے زیادہ ہے، جلدی جلتا ہے، بدبودار ہے، دھواں زیادہ ہوتا ہے، بدن کے ساتھ سختی سے چمٹ جاتا ہے، جب گرم ہوتا ہے تو باقی تمام پتھروں سے زیادہ گرم ہوتا ہے(1)۔ وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ میں یہ کوئی دلیل نہیں ہے انسان اور پتھر کے علاوہ اس آگ میں کچھ نہ ہوگا۔ کیونکہ دوسری آیات میں جنوں اور شیاطین کے آگ میں ہونے کا ذکر ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اَلْحِجَارَةُ سے مراد بت ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ (الانبیاء: 98) (تم اور جن کی تم عبادت کرتے ہو اللہ کو چھوڑ کر جہنم کا ایندھن ہیں)۔ اس اعتبار سے پتھر اور لوگ آگ کا ایندھن ہوں گے یہ آگ کی بڑائی کے لئے ذکر فرمایا ہے کہ وہ آگ اتنی سخت ہے کہ لوگوں کو جلانے کے ساتھ ساتھ پتھروں کو بھی جلا دیتی ہے۔ پہلی تاویل پر انہیں آگ اور پتھروں کے ساتھ عذاب دیا جائے گا۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 107، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

حدیث پاک میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر اذیت دینے والا آگ میں ہے اور اس تاویل میں دو وجہیں ہیں: (۱) جو دنیا میں لوگوں کو اذیت دے گا اللہ تعالیٰ آخرت میں اسے آگ سے عذاب دے گا۔ (۲) وہ لوگ جو دنیا میں درندوں وغیرہ کو آگ میں عذاب دیتے ہیں وہ دوزخیوں کی سزا کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ بعض اہل تاویل کا یہ خیال ہے کہ یہ آگ جو پتھروں کے ساتھ خاص ہے یہ خاص کافروں کی آگ ہے۔ واللہ اعلم

مسلم نے حضرت عباس بن عبد المطلب سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ابو طالب آپ کی حفاظت کرتے ہیں اور آپ کی مدد کرتے ہیں، کیا یہ خدمت انہیں کچھ نفع دے گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں۔ میں نے اسے آگ کی سختیوں میں پایا پھر میں نے اسے چھونے سے گڑھے کی طرف نکال دیا۔ ایک روایت میں ہے اگر میں نہ ہوتا تو وہ آگ کے نچلے درجے میں ہوتے (1)۔ وقود یہ ترکیبی اعتبار سے مبتدا ہے اور النَّاسُ اس کی خبر ہے اور الْحِجَارَةُ اس پر معطوف ہے۔ حضرات حسن، مجاہد، طلحہ بن مصرف نے اسے وقود واؤ کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے (2)۔ عبید بن عمیر نے اسے وقیدها الناس پڑھا ہے۔ کسائی اور اخفش نے کہا: الوقود واؤ کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ایندھن ہے اور واؤ کے ضمہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی جلانا ہے۔ کہا جاتا ہے: وقدت النار تقد وُقوداً ووقداً وَقِدَةً و وقیداً و وَقداً و وَقَدَاناً یعنی آگ روشن ہوئی، اوقدتها انا واستوقدتها میں نے آگ کو جلایا۔ الاتقاد، التوقد کی مثل ہے یعنی روشن ہونا۔ اسم ظرف موقد ہے جیسے مجلس، النار موقدۃٌ آگ جلائی گئی۔ الوقدۃ سخت گرمی کو کہتے ہیں یہ دس دن یا پندرہ دن ہیں۔ نحاس نے کہا: اس صورت میں اسے وقود واؤ کے فتحہ کے ساتھ پڑھنا واجب ہے کیونکہ اس کا معنی ایندھن ہے۔ لیکن اخفش نے کہا: حکایت کیا گیا ہے کہ بعض عرب وَقود اور وُقود دونوں کو ایندھن اور مصدر کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ نحاس نے کہا: اکثر علماء کا پہلا قول ہے۔ مثال دی کہ وَضوء واؤ کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی پانی ہے اور ضمہ کے ساتھ ہو تو مصدر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ اس ارشاد کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ کافروں کے علاوہ اس میں داخل نہ ہوں گے حالانکہ حقیقت ایسی نہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ دوسرے مواقع پر گنہگاروں کے لئے وعید آئی ہے اور احادیث جو شفاعت کو ثابت کرتی ہیں ان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ گنہگار مسلمان بھی آگ میں جائیں گے۔ اس آیت میں اہل حق کے قول کی دلیل ہے کہ آگ موجود ہے اور تخلیق ہو چکی ہے جبکہ معتزلہ کا قول اس کے مخالف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ ابھی تخلیق نہیں ہوئی ہے۔ اسی قول کو قاضی منذر بن سعید البلوطی الاندلسی نے بھی اختیار کیا ہے۔ مسلم نے حضرت عبد اللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اچانک آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آواز سنی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: تم جانتے ہو یہ کیا ہے؟ ہم نے عرض کی: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ ایک پتھر ہے جو ستر سال پہلے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب شفاعۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم لابی طالب والتخفیف عنہ بسببہ، صفحہ 115، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 107، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

سے دوزخ کی آگ میں پھینکا گیا ہے وہ اب تک آگ میں گرتا ہے حتیٰ کہ اس کی گہرائی تک پہنچ گیا ہے (1)۔

اری نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آگ اور جنت کا مناظرہ ہوا۔ آگ نے کہا: میرے اندر جابر اور متکبر لوگ داخل ہوں گے اور جنت نے کہا: میرے اندر ضعیف اور مسکین لوگ داخل ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے آگ کو فرمایا: تو میرا عذاب ہے تیرے ساتھ جس کو چاہوں گا عذاب دوں گا اور جنت سے فرمایا: تو میری رحمت ہے جس کو چاہوں گا تیرے ساتھ اس پر رحمت کروں گا۔ تم میں سے ہر ایک نے بھرنا ہے (2)۔ مسلم نے اس کا مفہوم نقل کیا ہے۔ کہا جاتا ہے: احتجت بمعنی تحتج ہے۔ اس کی وجہ حضرت ابن مسعود کی حدیث کا مفہوم ہے۔ نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت اور دوزخ نماز کسوف میں دکھائی گئیں۔ اسی طرح شب معراج میں جنت اور دوزخ کو دیکھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جنت میں داخل بھی ہوئے (3)۔ پس جو اس کا مخالف قول کرے اس کا کوئی اعتبار نہیں سب توفیق اللہ کی طرف سے ہے۔

اُعِدَّتْ یہ ہوسکتا ہے کہ یہ النَّارَ سے معدۃ کے معنی میں حال ہو اور قد مضمر ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ (النساء:90) اس کا معنی ہے: قد حصرت صدورھم۔ حالانکہ قد مضمر ہے قد کے اضمار کا قول اس لئے کیا ہے کیونکہ ماضی قد کے ساتھ حال ہوتا ہے۔ اس صورت میں الْحِجَارَةُ پر وقف تام نہ ہوگا اور یہ بھی جائز ہے کہ اُعِدَّتْ کا ماقبل کلام سے کوئی تعلق نہ ہو، جیسے فرمایا وَ ذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِیْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ (فصلت:23) (اور تمہارے اس گمان نے جو تم اپنے رب کے بارے میں کیا کرتے تھے انہیں ہلاک کر دیا)۔

سجستانی نے کہا: اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ، التی کے صلہ سے ہے جیسا کہ سورۂ آل عمران میں فرمایا وَ اتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْۤ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۳۱﴾ (آل عمران) (اور ڈرو اس آگ سے جو تیار کی گئی ہے کافروں کے لئے) ابن انباری نے کہا: یہ غلط ہے کیونکہ سورۂ بقرہ میں التی کا صلہ وَّقُوْدُهَا النَّاسُ موجود ہے۔ پس اسے دوسرے صلہ کے ساتھ ملانا جائز نہیں اور سورۂ آل عمران میں اُعِدَّتْ کے علاوہ کوئی صلہ ہے ہی نہیں۔

وَ بَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَ اُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَ لَهُمْ فِیْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙۗ وَّ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾

''اور خوشخبری دیجئے انہیں جو ایمان لائے اور کیے نیک عمل (کہ) یقیناً ان کے لئے باغات ہیں۔ بہتی ہیں ان کے نیچے نہریں، جب کھلایا جائے گا انہیں ان باغوں سے کوئی پھل، (تو صورت دیکھ کر) کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہمیں پہلے کھلایا گیا تھا اور دیا گیا انہیں پھل (صورت میں) ملتا جلتا اور ان کے لئے جنت میں پاکیزہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمھا واھلھا، باب جھنم اعاذنا اللہ منھا، صفحہ 381، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ) 2۔ ایضاً

3۔ صحیح بخاری، صفحہ 144، جلد 1 (و۔ت)۔ ایضاً، ابواب الکسوف، باب صلوٰۃ النساء مع الرجال فی الکسوف، حدیث 994، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بیویاں ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: جب اللہ تعالیٰ نے کفار کی جزا کا ذکر فرمایا تو مومنین کی جزا کا بھی ذکر فرمایا: تبشیر کا مطلب ہے: ایسی چیز کی خبر دینا جس کا اثر جلد پر ظاہر ہو۔ پہلی خبر جو تجھ پر وارد ہوتی ہے اس کے ساتھ جلد میں تبدیلی ظاہر ہوتی ہے پھر یہ عام طور پر خوشی کے لئے استعمال ہونے لگا ایسی خبر کی قید کے ساتھ جس کی بشارت دی گئی ہو اور کبھی غیر مقید بھی استعمال ہوتا ہے اور غم اور شر کے لئے تبشیر استعمال نہیں ہوتا مگر اس شر پر قید کے ساتھ جس کی بشارت دی گئی ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (الانشقاق) (تو انہیں خوشخبری سنا دیجئے دردناک عذاب کی)۔ کہا جاتا ہے: فابشر، واستبشر وبشر یبشر، جب کوئی خوشی ہو تو اس وقت بولا جاتا ہے۔ وجہ بشیر اس کو کہا جاتا ہے جو خوبصورت ہو اور جس کی خوبصورتی بالکل واضح ہو۔ البشری جو کچھ خوشخبری والے کو دیا جاتا ہے۔ تباشیر الشیء چیز کا ابتدائی حصہ۔

مسئلہ نمبر 2: علماء کا اس پر اجماع ہے کہ مکلف (عاقل بالغ) جب یہ کہے کہ جو میرے غلاموں میں سے اس بات کی بشارت دے گا وہ آزاد ہے۔ ایک غلام نے پہلے اسے بشارت دی پھر دوسرے غلاموں نے بشارت دی تو ان میں سے پہلا آزاد ہوگا دوسرا نہیں۔ اس میں اختلاف ہے کہ جب کوئی کہے میرے غلاموں میں سے جس نے مجھے فلاں بات کی خبر دی تو وہ آزاد ہے، تو کیا اس میں دوسرا پہلے کی مانند ہے؟ شوافع نے کہا: ہاں کیونکہ ان میں سے ہر ایک مخبر ہے۔ ہمارے علماء (مالکی) نے کہا: نہیں کیونکہ مکلف اس خبر کا قصد کرتا ہے جو بشارت ہوتی ہے اور یہ پہلے غلام کے ساتھ خاص ہے اور یہ عرفاً معلوم ہے پس قول کو عرف کی طرف پھیرنا واجب ہے۔ محمد بن الحسن نے اخبرنی اور حدثنی کے قول میں فرق کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا جب کوئی شخص کہے: جس غلام نے مجھے فلاں خبر دی یا مجھے ایسا ایسا بتایا تو وہ آزاد ہے اور اس کی کوئی نیت نہیں ہے، پس اس غلام نے اسے کتاب، یا کلام یا پیغام رسانی کے ذریعے وہ خبر دی تو وہ غلام آزاد ہو جائے گا کیونکہ یہ خبر ہے اس کے بعد اس کے کسی غلام نے بھی خبر دی تو وہ بھی آزاد ہو جائے گا کیونکہ اس نے کہا تھا جو غلام مجھے خبر دے گا وہ آزاد ہے، اگر سب غلام یہ خبر دیں گے تو سب آزاد ہو جائیں گے۔ اگر اس نے قسم اٹھاتے وقت بالمشافہ کلام کے ذریعے خبر دینے کا ارادہ کیا تھا تو ان میں سے صرف وہی آزاد ہوگا جو بالمشافہ کلام کے ساتھ وہ خبر دے گا اور جب کہے: اَیُّ غلامٍ لی حدثنی۔ تو یہ بالمشافہ گفتگو کرنے پر محمول ہوگا ان میں سے کوئی آزاد نہیں ہوگا۔

مسئلہ نمبر 3: وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اس ارشاد میں اس شخص کا رد ہے جو کہتا ہے کہ ایمان صرف طاعات کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ اگر ایمان صرف اعمال ہوتے تو دوبارہ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ذکر نہ کیا جاتا (1)۔ پس جنت ایمان اور عمل صالح کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: جنت ایمان کے ساتھ حاصل ہوگی اور درجات کا استحقاق اعمال صالحہ کے ساتھ ہوگا۔ واللہ اعلم

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 108، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

اَنَّ لَهُمْ یہ بشر کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ معنی یہ ہے کہ ایمان والوں کو بشارت دو ان کے لئے باغات ہیں الخ یعنی اس سے پہلے باء یا لام تھا۔ جب حرف جر ساقط ہو گیا تو فعل نے عمل کیا۔ کسائی اور اکثر بصری علماء نے کہا: ان باء کے اضمار کے ساتھ حالت جری میں ہے۔

جَنّٰتٍ، ان کے اسم کی حیثیت سے محل نصب میں ہے۔ ان اور اس کا معمول، مفعول ثانی ہے۔ جَنّٰتٍ سے مراد باغات ہیں، جَنّٰتٍ کہا جاتا ہے کیونکہ اپنے درختوں کے ساتھ جو کچھ ان کے اندر ہوتا ہے اسے چھپا لیتے ہیں۔ اسی سے مجن (ڈھال) الجنین (پیٹ کا بچہ) اور جنت ہے۔

تَجْرِیْ یہ جَنّٰتٍ کی صفت ہے یہ مرفوع ہے کیونکہ یہ فعل مستقبل ہے۔ یاء سے ضمہ حذف کیا گیا ہے کیونکہ ضمہ یاء پر ثقیل ہے۔ الْاَنْهٰرُ۔ اس سے مراد ماء الانہار (نہروں کا پانی) ہے چلنے کی نسبت مجازی وجہ سے نہروں کی طرف کی گئی ہے، کیونکہ چلتا صرف پانی ہے۔ ماء کا لفظ اختصار کی خاطر حذف کیا گیا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَسْـَٔلِ الْقَرْیَةَ (یوسف: 82) اصل اهل القریہ ہے۔ شاعر نے کہا:

نبئت ان النار بعدك اوقدت　　　و استب بعدك یا كلیبُ الْمجلسُ

مجھے بتایا گیا ہے کہ تیرے بعد آگ جلائی گئی۔ اے کلیب! تیرے بعد اہل مجلس نے ایک دوسرے کو گالیاں دیں۔

اس شعر میں المجلس سے مراد اہل مجلس ہیں۔ اہل کو حذف کیا گیا۔ النہر یہ أنہرت سے مشتق ہے جس کا معنی ہے: وسیع ہونا۔ اسی سے قیس ابن خطیم کا قول ہے:

ملكت بها كفی فانهرت فتقها　　　یری قائم من دونها ما وراءها (1)

میں نے اپنے نیزے کے ساتھ اپنے ہاتھ کو قوت دی۔ پس اس کا سوراخ بہت وسیع ہو گیا اس کے پیچھے کھڑا ہونے والا اس کے دوسری طرف والی چیزوں کو دیکھتا تھا۔

اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ما انہر الدم و ذکر اسم اللہ علیہ فکلوہ۔ (2) جو چیز ذبح کو کھلا کر دے حتیٰ کہ نہر کی طرح خون بنا دے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا گیا ہو اسے کھاؤ۔ نہر کی جمع نُهُرٌ اور انہار ہے۔ نهرٌ، نَهِرٌ زیادہ پانی کو کہتے ہیں۔ ابوذویب نے کہا:

اقامت به فابتنت خیمة　　　علی قصب　　وفراتٍ نهر

وہ ٹھہری اور اس نے وسیع پانیوں پر اور میٹھے پانیوں پر خیمہ لگایا۔

روایت ہے کہ جنت کی نہروں کی نالیاں نہیں ہیں بلکہ وہ جنت کی سطح پر قدرت الٰہیہ سے منضبط ہو کر چلتی ہیں (3) جہاں اہل

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 108، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الاضاحی، باب جواز الذبح بکل ما انھر الدم الا السن، صفحہ 156، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

ایضاً صحیح بخاری، کتاب الشرکۃ، باب قسمۃ الغنم، حدیث نمبر 2308، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 108، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

جنت چاہیں گے وہ چلتی رہیں گی۔ الْاَنْهٰرُ پر وقف حسن ہے لیکن تام نہیں کیونکہ کُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ، جَنّٰتٍ کے وصف سے ہے (رزقاً) مصدر ہے۔ الرزاق کی بحث پہلے گزر چکی ہے۔ مِنْ قَبْلُ سے مراد ہے دنیا میں۔ اس میں دو وجوہ ہیں: (۱) وہ کہیں گے یہ وہی ہے جس کا دنیا میں ہم سے وعدہ کیا گیا ہے (۲) یہ وہ رزق ہے جو دنیا میں ہمیں دیا گیا ہے۔ یہ وہ اس لئے کہیں گے کیونکہ جنت کے پھلوں کا رنگ دنیا کے پھلوں جیسا ہوگا۔ جب وہ انہیں کھائیں گے تو اس کا ذائقہ مختلف پائیں گے۔ بعض علماء نے فرمایا: مِنْ قَبْلُ یعنی جنت میں جو پہلے دیا گیا، کیونکہ انہیں رزق دیا جائے گا پھر دوبارہ رزق دیا جائے گا جب انہیں دن کے آغاز میں کھانے اور پھلوں کے ساتھ رزق دیئے جائیں گے تو وہ اس سے کھائیں گے پھر دن کے آخر میں اس رزق سے دیا جائے گا تو وہ کہیں گے یہ تو ہمیں پہلے دیا گیا تھا یعنی ہم دن کے آغاز میں کھا چکے ہیں کیونکہ اس کا رنگ اس کھانے کے مشابہ ہوگا لیکن جب اسے کھائیں گے تو صبح والے کھانے سے اس کا ذائقہ مختلف پائیں گے۔ وَاُتُوْا یہ اتیتہ سے مجہول کا صیغہ ہے۔ ایک جماعت نے اسے ہمزہ کے ضمہ اور تاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ہارون الاعور نے واتوا یعنی ہمزہ اور تاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ پہلی قراءت میں ضمیر اہل جنت کے لئے ہے اور دوسری میں خدام کے لئے ہے۔

بِهٖ مُتَشَابِهًا یہ بِهٖ کی ضمیر سے حال ہے یعنی دیکھنے میں بعض بعض کے مشابہ ہوں گے اور ذائقہ میں مختلف ہوں گے (1)۔ یہ حضرات ابن عباس، مجاہد اور حسن وغیرہم کا قول ہے۔

حضرت عکرمہ نے کہا: وہ پھل دنیا کے پھلوں کے مشابہ ہوں گے لیکن صفات میں ان سے مختلف ہوں گے (2)۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ وہ تعجب کی بنا پر کہیں گے دنیا میں کوئی جنت کی چیزوں کے مشابہ نہیں سوائے اسماء کے۔ گویا وہ تعجب کریں گے جب وہ پھلوں کی خوبصورتی اور ان کی عظیم تخلیق کو دیکھیں گے۔ قتادہ نے کہا: مُتَشَابِهًا کا مطلب ہے: وہ سارے عمدہ ہیں ان میں کوئی گھٹیا نہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا (الزمر: 23) اور دنیا کے پھلوں کی طرح نہیں ہیں جو مشابہ نہیں کیونکہ دنیا میں کچھ بہتر ہوتے ہیں اور کچھ بہتر نہیں ہوتے۔

وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ یہ مبتدا خبر ہے، اَزْوَاجٌ جمع ہے زوج کی۔ مرد کا زوج عورت ہے اور عورت کا زوج مرد ہے (3)۔ اصمعی نے کہا: عرب زوجۃ نہیں کہتے۔ الفراء نے بیان کیا ہے کہ کہا جاتا ہے: زوجۃٌ۔ فرزدق نے کہا:

وان الذی یسعیٰ لیفسد زوجتی   کساع الی أسد الشری یستبیلها

وہ شخص جو کوشش کرتا ہے تاکہ میری بیوی کو خراب کرے وہ اس شخص کی طرح ہے جو شیروں کی کچھار کی طرف کوشش کرتا ہے تاکہ ان کا پیشاب ہاتھ میں لے۔

حضرت عمار بن یاسر نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی شان میں کہا تھا: اللہ کی قسم! میں جانتا ہوں وہ دنیا و آخرت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ (محترمہ) ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہیں آزمائش میں ڈالا ہے (4)۔ یہ حدیث بخاری نے ذکر کی ہے۔ کسائی

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 109، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)   2۔ ایضاً   3۔ ایضاً

4۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب فضل عائشۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حدیث نمبر 3488، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نے اس کو پسند کیا ہے۔

مُّطَهَّرَةٌ۔ یہ اَزْوَاجٌ کی صفت ہے۔ مُّطَهَّرَةٌ، طاہرۃ سے زیادہ جامع اور بلیغ ہے۔ اس طہارت سے مراد حیض، تھوک اور دوسری عورتوں کی ناپسندیدہ چیزوں سے پاک ہونا ہے۔ عبدالرزاق نے ذکر کیا ہے، فرمایا: مجھے ثوری نے ابن ابی نجیح سے روایت کر کے بتایا اور ابن ابی نجیح نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ مُّطَهَّرَةٌ یعنی وہ نہ پیشاب کریں گی نہ پاخانہ، نہ بچے جنم دیں گی نہ انہیں حیض آئے گا نہ ان کو منی آئے گی نہ وہ تھوکیں گے۔ ہم نے اپنی کتاب ''التذکرہ'' میں اہل جنت کی صفات اور جنت کی صفات اور اس کی نعمتوں کے وصف کے عنوان کے تحت ان سب چیزوں کو ذکر کر دیا ہے۔ الحمد للہ

وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔ هُمْ مبتدا ہے خٰلِدُوْنَ اس کی خبر ہے۔ ظرف لغو ہے۔ غیر قرآن میں خالدین کو نصب حال کی حیثیت سے بھی جائز ہے۔ الخلود سے مراد بقا ہے، اسی سے جنة الخلد ہے یعنی ہمیشہ رہنے والی جنت کبھی یہ زیادہ مدت کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، اسی سے عربوں کا قول دعا کے بارے میں ہے: خلد اللہ ملکہ اس کی بادشاہی کو طوالت عطا فرمائی۔ زہیر نے کہا:

الا لا اری علی الحوادث باقیا ولا خالداً الا الجبال الرواسیا

خبردار! میں حوادث کو باقی رہنے والا اور لمبی مدت رہنے والا نہیں دیکھتا سوائے ان پہاڑوں کے جو زمین میں گڑھے ہوئے ہیں۔

آیت میں جو خلود کا لفظ استعمال ہوا ہے ہمیشہ رہنے کے معنی میں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿٢٦﴾

''بے شک اللہ حیا نہیں فرماتا اس سے کہ ذکر کرے کوئی مثال مچھر کی ہو یا اس سے بھی حقیر چیز کی۔ تو جو ایمان لائے وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ مثال حق ہے ان کے رب کی طرف سے (اتری ہے) اور جنہوں نے کفر کیا سو وہ کہتے ہیں کیا قصد کیا اللہ نے اس مثال کے ذکر سے۔ گمراہ کرتا ہے اللہ اس سے بہتیروں کو اور ہدایت دیتا ہے اس سے بہتیروں کو اور نہیں گمراہ کرتا ہے اس سے مگر نافرمانوں کو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا حضرت ابن عباس نے حضرت ابو صالح کی روایت میں فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے منافقین کے لئے یہ دو مثالیں دیں (یعنی مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا (البقرہ: 17) اور اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ (البقرہ: 19) تو انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ کی ذات مثالیں بیان کرنے میں بلند اور اعلیٰ ہے، اللہ تعالیٰ نے اس پر یہ آیت نازل فرمائی۔

عطا کی روایت میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے، فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے خداؤں کا ذکر کیا اور فرمایا: یَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْئًا لَّا یَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ (الحج:73) (اور اگر چھین لے ان سے مکھی بھی کوئی چیز تو وہ نہیں چھڑا سکتے اسے اس مکھی سے) اور ان کے خداؤں کے حیلہ کو ذکر کیا تو اسے مکڑی کا جالا بیان فرمایا۔ وہ کہنے لگے: کیا تو نے دیکھا اللہ تعالیٰ نے مکھی اور مکڑی کا ذکر کیا ہے اس قرآن میں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا ہے، وہ اس سے کیا چاہتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ حضرات حسن اور قتادہ نے کہا: جب اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مکھی اور مکڑی کا ذکر کیا اور اس کے ساتھ مشرکین کے لئے مثال دی تو یہودی ہنسے اور کہا: کیا یہ اللہ تعالیٰ کے کلام کے مشابہ ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

یَسْتَحِیْ اصل میں یَسْتَحْیِیُ تھا عین اور لام کلمہ حرف علت تھے تو لام کلمہ میں تعلیل کی گئی۔ ضمہ یا پر ثقیل تھا تو اسے ساکن کر دیا۔ اسم فاعل بھی اسی طرح ہے مُسْتَحٍ جمع مستحیُون مُسْتحیین۔ ابن محیصن نے یستحی حا کے کسرہ اور ایک یا ساکنہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن کثیر سے مروی ہے (یہ تمیم اور بکر بن وائل کی لغت ہے) اس میں پہلی یا کی حرکت حا کی طرف نقل کی گئی اور اسے ساکن کر دیا پھر ضمہ دوسری یا پر ثقیل تھا تو اسے بھی ساکن کر دیا پھر التقائے ساکنین کی وجہ سے ایک یا کو حذف کر دیا گیا۔ اسم فاعل مستحٍ ہے جمع مستحون اور مستحین ہے۔ یہ جوہری نے کہا ہے: اس آیت میں یستحیی کے معنی کرنے میں متاولین کا اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ لا یخشی کے معنی میں ہے (یعنی اللہ نہیں ڈرتا)۔ طبری نے اس معنی کو ترجیح دی ہے، قرآن میں ہے: تَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ (احزاب:37) یہاں تخشی بمعنی تستحیی ہے۔ دوسرے علماء نے فرمایا: یہ لا یترك کے معنی میں ہے (یعنی اللہ نہیں چھوڑتا)۔ بعض نے فرمایا لا یمتنع کے معنی میں ہے یعنی اللہ نہیں رکتا۔ استحیاء کا اصل معنی کسی شے سے رکنا ہے قبح کے مواقع کے خوف سے اور یہ معنی اللہ تعالیٰ کے لئے بیان کرنا محال ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ام سلمہ سے مروی ہے، فرمایا: حضرت ام سلیم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ان اللہ لا یستحی من الحق۔ (1) اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اس میں حیا کا حکم نہیں دیتا اور اس کے ذکر سے نہیں رکتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا، یضرب کا معنی یبین (بیان کرنا) ہے، ان اپنے فعل کے ساتھ من کے حذف کی تقدیر کے ساتھ محل نصب میں ہے (مثلا) یضرب کی وجہ سے منصوب ہے (بعوضة) کے نصب کی چار وجوہ ہیں:

۱- (ما) زائدہ ہے اور بعوضةً، مثلاً سے بدل ہے۔

۲- (ما) نکرہ ہے مثلاً سے بدل ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور بعوضةً (ما) کی صفت ہے اور ما کی صفت ہے اور جنس نکرہ کے ساتھ لگائی جاتی ہے اس کے ابہام کی وجہ سے کیونکہ وہ بمعنی قلیل ہوتا ہے یہ فراء، زجاج اور ثعلب کا قول ہے (2)۔

۳- حرف جار کے اسقاط کی تقدیر پر اسے نصب دی گئی ہے۔ اس کا معنی یہ ہوگا: ان یضرب مثلاً ما بین بعوضة۔ بین کو حذف کیا گیا اور اس کا اعراب بعوضة کو دیا گیا۔ فا بمعنی الی ہے یعنی جو اس سے بڑی چیز ہے یہ کسائی اور فراء کا قول ہے۔ ابو

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحیض، باب وجوب الغسل علی المرأۃ بخروج المنی منہا، صفحہ 146، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 111-110، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

العباس نے کہا:

یا احسن الناس ما قرنًا الی قدمٍ　　　ولا حبال محب واصل تصل

اے وہ ذات جو سر سے قدم تک تمام لوگوں سے زیادہ حسین ہے! محب واصل کا کوئی رشتہ پہنچنے والا نہیں۔

اس شعر میں ماقرنًا سے مراد ما بین قرنٍ ہے، جب بین کو ساقط کر دیا تو اس کو منصوب کر دیا۔

۴-یضرب بمعنی یجعل ہو۔ اس صورت میں بعوضۃً مفعول ثانی ہوگا۔ ضحاک، ابراہیم بن ابی عبلہ، رؤبہ بن حجاج نے بعوضہ رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ تمیم کی لغت ہے۔ ابوالفتح نے کہا: اس کی وجہ یہ ہے کہ ما اسم ہے جو الذی کے قائم مقام ہے اور بعوضۃ کو مبتدا کے اضمار پر رفع دیا گیا ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: لا یستحی ان یضرب الذی ھو بعوضۃٌ مثلاً۔ پس موصول کی طرف لوٹنے والی ضمیر کو حذف کر دیا اور وہ ھو مبتدا ہے، اس کی مثل بعض قراء کی قراءت ہے: تماما علی الذی احسن یعنی علی الذی ھو احسن۔ ھو مبتدا محذوف ہے۔ سیبویہ نے بیان کیا ہے: ما انا بالذی قائل لك شیئاً یعنی ھو قائل۔ (1) نحاس نے کہا: مّا میں حذف زیادہ قبیح ہے الذی میں حذف کی نسبت کیونکہ الذی کے لئے تو ایک ہی وجہ ہے، اس کے ساتھ زیادہ طویل ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: ضربت له مثلاً کا معنی ہے: مثلت له مثلاً میں نے اس کے لئے مثال دی ھذہ الابنیۃ علی ضربٍ واحدٍ (تمام عمارتیں ایک جیسی ہیں) علی مثالٍ واحدٍ و نوعٍ واحدٍ۔ الضرب کا معنی نوع (قسم) ہے۔ البعوضۃ یہ بَعَضَ سے فعولہ کے وزن پر ہے۔ بَعَضَ کا معنی ہے اس نے گوشت کاٹ لیا۔ کہا جاتا ہے: بضع اور بعض ہم معنی ہیں۔ قد بعضتہ تبعیضاً، میں نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کیا تو وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ البعوض سے مراد مچھر ہے۔ اس کا واحد بعوضۃٌ اس کو بعوضہ اس کے چھوٹے ہونے کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ یہ جوہری وغیرہ کا قول ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَمَا فَوْقَهَا** پہلے گزر چکا ہے کہ فَا بمعنی الی ہے اور جنہوں نے پہلے مّا کو صلہ زائدہ بنایا ہے اس نے دوسرے ما کو اس پر معطوف کیا ہے۔ کسائی اور ابو عبیدہ وغیرہما نے کہا: **فَمَا فَوْقَهَا** کا معنی اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ ما دونھا ہے (2)، یعنی جو چیز چھوٹے ہونے میں اس سے زیادہ ہو۔ کسائی نے کہا: یہ کلام میں تیرے اس قول کی مانند ہے أتراہ قصیرا؟ (کیا تو اسے چھوٹا دیکھتا ہے)۔ کہنے والا کہتا ہے: او فوق ذالك یعنی جتنا تو اسے دیکھ رہا ہے وہ اس سے بھی چھوٹا ہے۔ قتادہ اور ابن جریج نے کہا: **فَمَا فَوْقَهَا** کا مطلب ہے اس سے بڑی چیز (3)، اور (انه) کی ضمیر کا مرجع المثل ہے یعنی مثل حق ہے۔ حق، باطل کے خلاف ہوتا ہے حق کی جمع حقوق ہے۔ الحقۃ، حا کے فتحہ کے ساتھ اس سے زیادہ خاص ہے۔ کہا جاتا ہے: ھذہ حقتی یعنی یہ میرا حق ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَ اَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا** بنی تمیم اور بنی عامر کی لغت اَمَا میں ایما ہے۔ وہ تضعیف کی کراہت کی وجہ سے ایک میم کو یا سے بدل دیتے ہیں۔ اس بنا پر عمر بن ابی ربیعہ کا شعر پڑھا جاتا ہے:

رأت رجلاً ایما اذ الشمس عارضت　　　فیضحی و ایما بالعشی فیخصر

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 111، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً

اس نے ایک شخص دیکھا جب سورج چڑھتا تو وہ گرم ہوتا جب شام ہوتی تو وہ ٹھنڈا ہوتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَيَقُولُونَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا نحویوں کا مَاذَآ کے متعلق اختلاف ہے۔ یہ ایک اسم کے قائم مقام ہے۔ معنی یہ ہوگا: ای شیء اراد اللہ۔(1) (اللہ تعالیٰ کس چیز کا ارادہ فرماتا ہے)۔ اس صورت میں اَرَادَ کی وجہ سے محل نصب میں ہوگا۔ ابن کیسان نے کہا: یہ عمدہ قول ہے۔ بعض نے فرمایا: مَا اسم تام ہے مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے اور ذَآ بمعنی الذی ہے اور یہ مبتدا کی خبر ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہوگی ما الذی ارادہ اللہ بھذا مثلا۔ ان کے اس کلام کا مطلب استفہام کے لفظ کے ساتھ انکار ہے اور مَثَلًا قطع کی بنا پر منصوب ہے۔ تقدیر عبارت ہے: اراد مثلا یہ ثعلب کا قول ہے۔ ابن کیسان نے کہا: یہ اس تمیز کی بنا پر منصوب ہے جو حال کی جگہ واقع ہوتی ہے (2)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا بعض علماء نے فرمایا کہ کفار کے قول کا معنی یہ ہے کہ اس مثال سے اللہ کی مراد کیا ہے جس کے ساتھ وہ لوگوں کو گمراہی کی طرف اور ہدایت کی طرف تفریق کرتا ہے (3)۔

بعض نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر ہے۔ یہ زیادہ بہتر قول ہے کیونکہ وہ اقرار کرتے تھے کہ ہدایت اس کی طرف سے ہے۔ معنی یہ ہوگا آپ فرمایئے اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ بہتیروں کو گمراہ کرتا ہے بہتیروں کو ہدایت دیتا ہے یعنی توفیق دیتا ہے اور محروم کرتا ہے۔ اس میں معتزلہ کے قول کا رد ہے جو پہلے گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ گمراہی پیدا کرتا ہے نہ ہدایت۔ وہ کہتے ہیں: اس آیت کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ بہت سے لوگوں کا نام گمراہ رکھتا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے: فسقت فلانا یعنی میں نے اس کا نام فاسق رکھا کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کو گمراہ نہیں کرتا، یہ ان کا اضلال میں طریقہ ہے۔ یہ مفسرین کے اقوال کے خلاف ہے اور لغت میں بھی اس کا احتمال نہیں کیونکہ کہا جاتا ہے: جب کوئی کسی کا نام ضال رکھے تو کہتے ہیں ضللہ، اور جب کسی کا نام رکھے تو اَضَلہ نہیں کہا جاتا لیکن اس آیت کا معنی وہی ہے جو مفسرین نے بیان فرمایا کہ بہت سے لوگوں کو اس کے ذریعے محروم فرماتا ہے ان کے کفر کی جزا دیتے ہوئے۔ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے، الْفٰسِقِيْنَ کو نصب فعل کی وجہ سے دی گئی ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے: وما یضل احدا الا الفاسقین الذین سبق فی علمہ انہ لا یھدیھم۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ گمراہ نہیں کرتا مگر فاسقین کو جن کے متعلق پہلے ہی اس کے علم میں ہے کہ اس نے انہیں ہدایت کی توفیق نہیں دینی ہے۔ اور استثنا کی بنا پر الْفٰسِقِيْنَ کو نصب جائز نہیں کیونکہ استثنا ہمیشہ کلام کے مکمل ہونے کے بعد ہوتا ہے۔

نوف بکالی نے کہا: حضرت عزیر علیہ السلام نے اپنے رب سے عرض کیا: الٰہی! تو نے مخلوق پیدا کی ہے تو جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے تو حضرت عزیر علیہ السلام سے کہا گیا: اس سوال سے اعراض کرو تم اس سوال کو چھوڑ دو ورنہ میں تمہارا مرتبہ نبوت ختم کر دوں گا، جو میں کرتا ہوں اس کے متعلق مجھ سے سوال نہیں کیا جاتا لوگوں سے ان کے اعمال کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 111، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ ایضاً، صفحہ 112، جلد 1 3۔ ایضاً

الضلال، اس کا اصل معنی ہلاک ہونا ہے۔ کہا جاتا ہے: ضل الماء فی اللبن جب پانی دودھ میں مل کر ختم ہو جائے، اسی سے یہ ارشاد ہے: ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ (السجدہ:10) سورۂ فاتحہ میں بحث گزر چکی ہے۔ فسق کی اصل، کلام عرب میں کسی چیز سے خروج ہے۔ کہا جاتا ہے: فسقت الرطبة جب پھل اپنے پردے سے باہر آ جائے اور چوہیا اپنی بل سے باہر آ جائے۔ الفویسقة چوہیا کو کہتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے: خمس فواسق یقتلن فی الحل والحرم الحیة و الغراب الابقع والفارة والکلب العقور والحُدَیا(1)۔

پانچ چیزیں فواسق ہیں انہیں حل وحرم میں قتل کیا جائے گا: سانپ، کالا کوا، چوہا، کاٹنے والا کتا اور چیل۔ یہ حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے اور اسے مسلم نے نقل کیا ہے۔ ایک روایت میں سانپ کی جگہ بچھو کا ذکر ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اذیت کی وجہ سے ان کا نام فواسق رکھا ہے جیسا کہ آئندہ ان شاء اللہ ذکر آئے گا۔

فسق الرجل یفسِقُ و یفسُق۔ . . عن الاخفش۔ . . فسقا و فسوقا یعنی نکلا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ (الکہف:50) (یعنی اپنے رب کے حکم سے نکل گیا)۔ ابن اعرابی نے کہا ہے کہ اس نے جاہلیت کے کلام اور اشعار میں کبھی فسق کا لفظ نہیں سنا۔ فرمایا: یہ عجیب ہے۔ یہ عربی کلام ہے اس کو ابن الفارس اور جوہری نے بیان کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: ابوبکر انباری نے اپنی کتاب ''الزاھر'' میں ذکر کیا ہے جب وہ فسق کے معنی پر گفتگو کر رہے تھے۔ شاعر کا قول ہے:

یذھبن فی نجد و غورا غائراً فواسقاً عن قصدھا جوائراً

وہ نجد میں گئیں اور نشیبی علاقہ میں چلی گئیں اپنے مقصود سے نکل کر ٹیڑھے راستہ پر نکل گئیں۔

الفسیق ہمیشہ فسق کا ارتکاب کرنے والا، ندا کرنے والا وقت۔ کہا جاتا ہے: یا فسق و یا خبث۔ مراد ہوتا ہے: یایھا الفاسق و یایھا الخبیث۔ عرف شرعی میں فسق کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کی طاعت سے نکلنا۔ کبھی اس شخص پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جو کفر کے ساتھ نکلتا ہے اور اس پر بھی جو نافرمانی کیساتھ نکلتا ہے۔

الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

''وہ جو توڑتے رہتے ہیں عہد خداوندی کو اسے پختہ باندھنے کے بعد اور کاٹتے رہتے ہیں اسے حکم فرمایا اللہ نے جس کے جوڑنے کا اور فساد مچاتے رہتے ہیں زمین میں۔ وہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں''۔

اس آیت میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الَّذِيْنَ یہ فاسقین کی نعت ہونے کی بنا پر منصوب ہے اگر تو چاہے تو مبتدا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب مایندب للمحرم وغیرہ قتلہ من الدواب فی الحل والحرم، صفحہ 381، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
صحیح بخاری، کتاب بدأ الخلق، باب خمس من الدواب فواسق یقتلن فی الحرم، حدیث نمبر 3067، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

محذوف کی خبر بنا کر حالت رفع میں کر دے یعنی هم الذین۔ اس کی مزید بحث پہلے گزر چکی ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَنْقُضُوْنَ النقض کسی دیوار، یا رسی یا عہد کو توڑ دینا۔ النقاضۃ، بالوں کی رسی کو توڑ دینا۔ المناقضۃ، ایسا کلام جس کے معنی میں تناقض ہو۔ النقیضۃ فی الشعر ایسا شعر جو کسی کے جواب میں کہا جائے۔ النقض۔ توڑی ہوئی چیز۔

علماء کا اس عہد کی تعیین میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ وہ عہد ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی آدم سے لیا تھا جب انہیں آدم کی پیٹھ سے نکالا تھا۔ بعض نے فرمایا: یہ اللہ کی اپنی مخلوق کو وصیت اور اس کا امر ہے جو اس نے انہیں اپنی اطاعت کا حکم دیا ہے اور نہی ہے جو اس نے اپنے رسل کی زبان کے ذریعے اپنی کتب میں اپنی معصیت سے روکا ہے اور اس کا نقض اس کے احکام پر عمل کا ترک ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد وہ دلائل ہیں جو اس نے آسمانوں، زمین اور دوسری اپنی کرشمہ سازیوں کے ذریعے اپنی وحدانیت پر دیئے ہیں یہ عہد کے قائم مقام ہیں اور ان کا توڑنا ان میں غور وفکر کو ترک کرنا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد وہ عہد ہے جو ان لوگوں سے کیا گیا جنہیں کتاب دی گئی تھی کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو بیان کریں اور ان کے امر کو نہ چھپائیں۔ اس صورت میں یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں ہوگی۔ ابو اسحاق الزجاج نے کہا: اس عہد سے مراد وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے پہلے انبیاء اور ان کے متبعین سے لیا کہ وہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار نہ کریں۔ اس کی دلیل یہ آیت ہے وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَاۤ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ (آل عمران: 81) میں کہتا ہوں: اس آیت کے ماقبل اور مابعد کا ظاہر دلالت کرتا ہے کہ یہ آیت کفر کے بارے میں ہے۔ یہ پانچ اقوال ہیں اور دوسرا قول سب کو جامع ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ، میثاق اس عہد کو کہا جاتا ہے جس کو قسم کے ساتھ مؤکد کیا گیا ہو۔ الوثاقہ والمعاہدۃ (☆) سے مفعال کا وزن ہے۔ اس کا معنی عقد اور باندھنے میں شدت کرنا۔ اصل پر اس کی جمع المواثیق ہے کیونکہ میثاق کی اصل موثاق ہے۔ ماقبل کسرہ کی وجہ سے واو یاء سے بدل گئی، اس کی جمع میاثق اور میاثیق بھی آتی ہے۔ ابن عربی نے کہا:

حتی لا یحل الدھر الا باذننا　　　ولا نسال الأقوام عھد المیاثیق

حتیٰ کہ ہمارے اذن کے بغیر زمانہ اسے حلال نہیں کرتا اور قوموں سے عہد و پیمان کا مطالبہ نہیں کرتے۔

الموثق، المیثاق، المواثقۃ سب کا معنی معاہدہ ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مِیْثَاقَهُ الَّذِیْ وَاثَقَكُمْ بِهٖۤ (المائدہ: 7) (اور اس کے وعدہ کو جو اس نے پختہ کیا تھا تم سے)۔

مسئلہ نمبر 4: وَ یَقْطَعُوْنَ، القطع یہ معروف ہے۔ قطع تعلقی میں مصدر القطیعۃ استعمال ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: قطیعۃ فھو رجل قطع و قطعۃ جیسے ھُمَزَۃٌ۔ قطعت الحبل قطعاً میں نے رسی کو توڑ دیا۔ قطعت النھر قطوعا... قطعت

☆ یہ لفظی اعتبار سے محل نظر ہے۔

بضیر تقوعا و قصاعاً و قطاعاً جب کوئی پرندہ ایک شہر سے نکل کر دوسرے شہر میں چلا جائے۔ اصاب الناس قطعۃٌ جب لوگوں کے پانی کم ہو جائیں۔ و رجل بہ قطعٌ جب آدمی کا سانس تھکاوٹ کی وجہ سے متواتر پے در پے آنے لگے۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ اس میں (مَا) يَقْطَعُوْنَ کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور اگر تو چاہے تو اَنْ کو مَآ سے بدل بنا دے اور اگر چاہے تو بِہٖ میں جو ضمیر ہے اس سے (ان) کو بدل بنا دے۔ یہ ترکیب بہتر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ لئلا یوصل ہو یعنی کراھۃ ان یوصل۔ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس چیز کو ملانے کا حکم دیا؟ بعض نے فرمایا: صلہ رحمی۔ بعض نے فرمایا: قول کو عمل کے ساتھ ملانے کا حکم ہے۔ پس انہوں نے قول و عمل کو جدا جدا کر دیا۔ اس طرح کہ جو انہوں نے کہا اس پر عمل نہیں کیا۔ بعض نے فرمایا: تمام انبیاء کی تصدیق کو ملانے کا حکم دیا۔ پس انہوں نے بعض انبیاء کی تصدیق اور بعض کی تکذیب کر کے اس کو توڑا۔ بعض نے فرمایا: یہ اللہ کے دین اور زمین میں اس کی عبادت، شریعت کا قائم کرنا اور شرعی حدود کی حفاظت کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ یہ ہر اس صورت کو شامل ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ملانے کا حکم دیا۔ یہ جمہور علماء کا قول ہے اور الرحم اس کا ایک جز ہے۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ یعنی وہ غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور افعال میں ظلم کرتے ہیں کیونکہ ان کے افعال ان کی شہوات کے مطابق ہوتے ہیں (1)۔ یہ فساد کی حد ہے۔

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۔ یہ مبتدا خبر ہیں۔ اور هُمْ زائدہ ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ هُمْ دوسرا مبتدا ہو اور الْخٰسِرُوْنَ اس کی خبر ہو اور پھر مبتدا خبر دونوں پہلے مبتدا کی خبر ہوں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ الخاسر وہ شخص ہے جو فلاح و فوز میں سے اپنا حصہ ہی کم کر دے۔ الخسران کا مطلب نقصان ہے خواہ وہ میزان میں ہو یا کسی اور چیز میں۔ جریر نے کہا:

ان سليطا فى الخسار انه اولاد قوم خلقوا اقنه

بے شک سلیط خسارے میں ہے وہ ایک قوم کی اولاد ہے جو غلام پیدا کئے گئے ہیں۔

یعنی اپنے حظوظ اور شرف میں کمی کرنے کی وجہ سے خسارہ میں ہیں۔

جوہری نے کہا: خسرت الشیء واخسرتہ کا معنی ہے: کمی کرنا۔ الخسار و الخسارۃ و الخیسری۔ کا معنی گمراہ ہونا اور ہلاک ہونا ہے۔ ہلاک ہونے والے کو خاسر کہا جاتا ہے کیونکہ وہ قیامت کے روز اپنے آپ کو اور اپنے اہل کو خسارہ دینے والا ہے اور وہ جنت میں اپنی منزل سے روکے گئے ہیں۔

مسئلہ نمبر 7: اس آیت میں دلیل ہے کہ عہد پورا کرنا، اس کا التزام کرنا ہے اور ہر عہد جس کو انسان نے اپنے اوپر لازم کیا ہو اسے اس کے لئے توڑنا حلال نہیں ہے، خواہ وہ مسلمان کے ساتھ ہو یا کسی غیر مسلم کے ساتھ ہو اللہ تعالیٰ نے عہد توڑنے والے کی مذمت کی ہے۔ فرمایا: اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (المائدہ: 1) اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے کہا وَ اِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ (انفال: 58) پس اللہ تعالیٰ نے غدر (عہد شکنی) سے منع فرمایا ہے اور یہ نہیں ہوتا مگر عہد توڑنے کی وجہ

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 113، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

سے جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۲۸

''کیونکر تم انکار کرتے ہو اللہ کا حالانکہ تم مردہ تھے اس نے تمہیں زندہ کیا پھر تمہیں مارے گا پھر تمہیں زندہ کرے گا پھر اسی کی طرف تم پلٹائے جاؤ گے''۔

كَيْفَ حالت کے متعلق سوال ہے۔ یہ اسم ہے اور تَكْفُرُوْنَ کی وجہ سے محل نصب میں ہے یہ مبنی بر فتحہ ہے اس کو ساکن ہونا تھا کیونکہ اس میں اس استفہام کا معنی ہے جس کا معنی تعجب ہے۔ پس اس کو حروف سے مشابہت دی گئی اور فتحہ کی خفت کی وجہ سے اس کے لئے فتحہ اختیار کیا گیا یعنی یہ ان لوگوں میں سے ہیں جن پر تعجب کرنا واجب ہے جب انہوں نے کفر کیا حالانکہ ان پر حجت ثابت ہو چکی ہے۔

اگر کہا جائے کہ یہ خطاب اہل کتاب کو ہونا کیسے جائز ہے کیونکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کا انکار نہیں کرتے تھے۔ اس کا جواب پہلے گزر چکا ہے کہ جب انہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو تسلیم نہ کیا اور جو کچھ آپ احکام لے کر آئے اس کی تصدیق نہ کی تو انہوں نے شرک کیا کیونکہ انہوں نے یہ اقرار نہ کیا کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جو یہ گمان کرے کہ قرآن انسان کا کلام ہے اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا اور وہ عہد کو توڑنے والا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: كَيْفَ کا لفظ تو لفظاً استفہام ہے لیکن معنی استفہام نہیں بلکہ یہ تقریر اور توبیخ کے لئے ہے یعنی تم کیسے اس کی نعمت کا انکار کرتے ہو جبکہ اس کی قدرت یہ ہے (1)۔ الواسطی نے کہا: اس کلام کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے انہیں حد درجہ کی توبیخ فرمائی کیونکہ مردوں اور جمادات سے اس کا صانع کسی چیز میں جھگڑا نہیں کرتا۔ منازعت (جھگڑا) ہیاکل روحانیہ سے ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا یہ واؤ حالیہ ہے اور قد مضمرۃ ہے۔ زجاج نے کہا: تقدیر عبارت و قد کنتم ہے۔ پھر قد حذف ہو گیا۔ فراء نے کہا اَمْوَاتًا، كُنْتُمْ کی خبر ہے۔

فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ یہاں وقف تام ہے۔ ابو حاتم نے اسی طرح کہا پھر فرمایا: ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ اہل تاویل نے ان دو موتوں اور دو زندگیوں کی ترتیب میں اختلاف کیا ہے اور انسان کے لئے کتنی موتیں اور کتنی زندگیاں ہیں اس میں بھی علماء کا اختلاف ہے۔ حضرات ابن عباس اور ابن مسعود نے فرمایا: یعنی تم تخلیق سے پہلے معدوم تھے۔

فَاَحْيَاكُمْ اس نے تمہیں پیدا کیا۔ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ پھر تمہاری عمروں کے مکمل ہونے کے وقت تمہیں موت دے گا ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ پھر تمہیں قیامت کے روز زندہ کرے گا۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ قول اس آیت سے مراد ہے۔ کفار کو اس قول سے انکار نہیں تھا کیونکہ وہ ان دونوں چیزوں کا اقرار کرتے تھے (2)، جب کفار کے نفوس کو یقین تھا کہ وہ معدوم تھے اور پھر دنیا میں انہیں پیدا کیا پھر اس دنیا میں انہیں مارنے کا بھی یقین تھا تو ان پر دوبارہ زندہ کرنے کا لزوم قوی ہو گیا۔ اب ان کا آخرت میں اٹھنے کا

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 113، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
2۔ ایضاً، صفحہ 114، جلد 1

انکار ایسا دعویٰ تھا جس پر کوئی دلیل نہ تھی۔ دوسرے علماء نے کہا: اس تاویل پر قبر کی زندگی دنیا کی زندگی کے حکم میں ہوگی۔
بعض علماء نے فرمایا: اس زندگی کا کوئی اعتبار نہیں جس میں اس کی موت کا اعتبار نہیں کیا گیا جسے دنیا میں اللہ تعالیٰ نے مارا پھر دنیا میں ہی اللہ تعالیٰ نے اسے زندہ کیا۔

بعض علماء نے فرمایا: كُنْتُمْ اَمْوَاتًا یعنی آدم کی پیٹھ میں تم مردہ تھے پھر اس نے تمہیں اس کی پیٹھ سے چیونٹیوں کی صورت میں نکالا ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ پھر تمہیں دنیا کی موت دے گا پھر تمہیں اٹھائے گا۔ بعض نے فرمایا كُنْتُمْ اَمْوَاتًا یعنی تم مردوں کی صلبوں اور عورتوں کے رحموں میں نطفہ کی صورت میں تھے پھر اس نے تمہیں رحموں سے نقل کیا فَاَحْیَاكُمْ اور تمہیں زندگی بخشی ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ پھر تمہیں اس زندگی کے بعد موت دے گا پھر سوال کے لئے تمہیں زندہ کرے گا پھر تمہیں قبر میں موت دے گا پھر حشر کی طرف لے جانے کے لئے نشر کی زندگی دے گا۔ یہ ایسی زندگی ہے جس کے بعد موت نہیں۔

میں کہتا ہوں: اس تاویل پر تین موتیں اور تین زندگیاں ہوں گی اور ان کا آدم کی پیٹھ میں مردہ ہونا اور ان کا آدم کی پیٹھ سے نکلنا اور ان پر گواہی دینا مگر ان کے باپوں کی صلبوں اور ماؤں کی رحموں میں ان کا نطفہ نہ ہونا اس صورت میں چار موتیں اور چار زندگیاں ہو جائیں گی۔ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے لوگوں کو ذروں کی صورت میں پیدا کیا پھر انہیں موت دی۔ اس صورت میں پانچ موتیں اور پانچ زندگیاں ہو جائیں گی چھٹی موت امت محمد ﷺ کے مجرموں کے لئے جب وہ آگ میں داخل ہوں گے کیونکہ حضرت ابو سعید خدری کی حدیث میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: رہے دوزخی جو دوزخ والے ہیں وہ اس میں نہ مریں گے نہ زندہ ہوں گے لیکن کچھ لوگ جنہیں آگ لگے گی ان کے گناہوں کے سبب پھر اللہ انہیں موت دے گا حتیٰ کہ جب وہ کوئلہ بن جائیں تو اذن شفاعت ہوگا انہیں گروہوں کی صورت میں لایا جائے گا پھر جنت کی نہروں پر انہیں بکھیر دیا جائے گا۔ پھر کہا جائے گا: اے اہل جنت! ان پر پانی بہاؤ۔ پس اس طرح ان پر گوشت پیدا ہو جائے گا جیسے سیلاب کی مٹی پر بوٹی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک شخص نے کہا: گویا کہ رسول اللہ ﷺ جنگل میں بکریاں چراتے تھے (1)۔ (مسلم)

میں کہتا ہوں: آپ ﷺ کے ارشاد اماتہ اللہ اماتۃ (اللہ پھر انہیں موت دے گا) اس سے حقیقۃ موت مراد ہے کیونکہ مصدر کے ساتھ تاکید لگائی گئی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ بھی جائز ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے نیند طاری کرکے انہیں عذاب سے غائب کر دیا ہو اور یہاں حقیقی موت مراد نہ ہو لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ نحویوں کا اجماع ہے کہ جب فعل کی مصدر کے ساتھ تاکید لگائی گئی ہو تو وہاں مجاز مراد نہیں ہوتا بلکہ حقیقت مراد ہوتی ہے جیسے كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۝ (النساء) جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔ بعض علماء نے فرمایا اس آیت کا معنی یہ ہے کہ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا یعنی تم گمنام تھے فَاَحْیَاكُمْ اس نے زندگی بخشی کہ تمہارا ذکر کیا گیا اور تم اس دین اور اس نبی کریم ﷺ سے مشرف ہوئے جو تمہارے پاس آیا۔ پھر وہ تمہیں موت دے گا۔ پس تمہارا ذکر ختم ہو جائے گا پھر تمہیں بعث کے لئے زندہ کرے گا۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب اثبات الشفاعۃ واخراج الموحدین من النار، صفحہ 104، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ثُمَّ اِلَیۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ پھر اس کے عذاب کی طرف، اپنے کفر کی وجہ سے لوٹنا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ معنی ہے کہ زندگی کی طرف اور سوال کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَمَا بَدَاۡنَاۤ اَوَّلَ خَلۡقٍ نُّعِيۡدُهٗ (الانبیاء: 104) پس ان کا دوبارہ زندہ کرنا ان کے ابتدا میں زندہ کرنے کی طرح ہے اور یہی رجوع ہے اور ترجعون اکثر قراء کی قراءت ہے۔ یحییٰ بن یعمر، ابن ابی اسحٰق، مجاہد، ابن محیصن، سلام بن یعقوب نے حرف مضارع کو فتحہ اور جیم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے جہاں بھی یہ لفظ آیا ہے۔

هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ لَكُمۡ مَّا فِی الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا ثُمَّ اسۡتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰٮهُنَّ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ ‌ؕ وَهُوَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ﴿۲۹﴾

"وہی تو ہے جس نے پیدا کیا تھا تمہارے لئے جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب پھر توجہ فرمائی اوپر کی طرف تو ٹھیک ٹھیک بنا دیا انہیں سات آسمان اور وہ سب کچھ خوب جانتا ہے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ لَكُمۡ مَّا فِی الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا (وہی تو ہے جس نے پیدا کیا تمہارے لئے جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب۔)

اس میں دس مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: خَلَقَ اس کا معنی عدم سے وجود میں لانا ہے۔ کبھی انسان کے لئے خلق بولا جاتا ہے جب وہ کسی چیز کو ایجاد کرے۔ شاعر کا قول ہے:

من كان يخلق ما يقو ... لُ فحيلتي فيه قليلةٌ (1)

جو وہ کر گزرتا ہے جو وہ کہتا ہے تو میرا حیلہ اس کے بارے میں کم ہے۔

یہ معنی گزر چکا ہے۔ ابن کیسان نے کہا: خَلَقَ لَكُمۡ کا معنی ہے من اجلکم تمہارے لئے پیدا کیا۔ بعض نے فرمایا: معنی یہ ہے کہ جو کچھ زمین میں ہے تم پر وہ انعام کیا گیا ہے وہ تمہارے لئے ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ توحید اور اعتبار کی دلیل ہے۔ میں کہتا ہوں: یہ قول صحیح ہے جیسا کہ ہم بیان کریں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد وہ چیزیں ہوں جن کے وہ محتاج ہیں۔

مسئلہ نمبر 2: جن علماء کا یہ اصول ہے کہ وہ اشیاء جن سے نفع حاصل کیا جاتا ہے وہ مباح ہیں انہوں نے اسی آیت سے یہ اصول مستنبط کیا ہے اور اسی طرح کی دوسری آیات سے استدلال کیا ہے مثلاً وَسَخَّرَ لَكُمۡ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا مِّنۡهُ (الجاثیہ: 13) (یعنی نفع بخش چیزیں حلال ہیں) حتیٰ کہ منع پر دلیل آجائے۔

انہوں نے اپنے اس اصول کی تائید میں یہ کہا ہے کہ لذیذ کھانے پیدا کئے گئے ہیں ان کے پیدا کرنے کا امکان بھی موجود تھا، یہ عبث تو پیدا نہیں کئے گئے، ان کی کوئی منفعت ہوگی اور اس کی منفعت کو اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹانا تو صحیح نہیں ہے کیونکہ اس کی ذات ان چیزوں سے مستغنی ہے۔ پس یہ منفعت ہماری طرف ہی لوٹے گی اور ہماری منفعت یا تو لذت کے حاصل کرنے میں ہے یا

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 114، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

ان چیزوں سے اجتناب میں ہے تا کہ ہماری اس طرح آزمائش کی جائے یا ہم ان سے عبرت حاصل کریں ان امور سے کوئی بھی حاصل نہیں ہوسکتا مگر چکھنے کے ساتھ۔ پس یہ لازم ہوا کہ یہ مباح ہیں، یہ قول فاسد ہے کیونکہ منفعت کے بغیر تخلیق سے عبث لازم نہیں آتا بلکہ اللہ تعالیٰ نے منفعت کے لئے پیدا کیا ہے کیونکہ اس پر منفعت اصل واجب نہیں ہے بلکہ یہ منفعت اس کو پیدا کرنے کا موجب ہے۔ ہم منفعت کا حصر ان صورتوں میں تسلیم نہیں کرتے جو انہوں نے بیان کی ہیں اور ان منافع میں سے بعض کا حصول چکھنے پر موقوف نہیں ہے بلکہ ذائقہ دوسرے ذرائع سے بھی حاصل کیا جاتا ہے جیسے کہ طبائعیین کے نزدیک معروف ہے۔

پھر ان کا اصول معارض ہے ہر اس چیز سے جس کے چکھنے سے اس کے ہلاک کرنے والی زہر ہونے کا خوف ہو۔ اصحاب حظر کے شبہات سے معارض ہیں۔ بعض نے توقف فرمایا اور کہا: ہر فعل جس کا حسن اور قبح معلوم نہ ہو مگر یہ کہ وہ فی نفسہٖ حسن ہو، شرع کے ورود سے پہلے کوئی معین کرنے والا نہیں۔ وقف تو شریعت کے ورود تک موقوف ہوگا۔ یہ تینوں معتزلہ کے اقوال ہیں۔ شیخ ابوالحسن اور اس کے ساتھی اکثر مالکی اور صیرفی نے اس مسئلہ میں مطلق وقف کا قول کیا ہے۔ ان کے نزدیک اس کا معنی یہ ہے کہ اس حالت میں ان اشیاء کا کوئی حکم نہیں ہوگا شرع کے لئے ہے جب وہ آئے تو جو چاہے حکم دے۔

عقل وجوب اور غیر وجوب کے ساتھ حکم نہیں لگاتی۔ اس کا حصہ ہے امور اس کے مطابق پہنچائے جائیں گے جیسے وہ ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: ابن فورک نے ابن الصائغ سے روایت کر کے بیان کیا ہے، فرمایا: عقل کبھی سمع سے خالی نہیں ہوتی کوئی مصیبت نازل نہیں ہوتی مگر اس میں سمع (سننا) ہوتا ہے، یا اس کے ساتھ اس کا تعلق ہوگا یا اس کے لئے ایسی حالت ہوگی جس کی وجہ سے اسے کہا جائے گا۔ فرمایا: مناسب ہے کہ اس پر اعتماد کیا جائے۔ یہ حظر، اباحت اور توقف میں غور و فکر سے مستغنی کر دیتا ہے(1)۔

مسئلہ نمبر 3: خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ کے معنی میں صحیح اعتبار ہے۔ اس سے ماقبل اور مابعد عبرتوں کے دلائل اس پر دلالت کرتے ہیں (مثلاً) زندہ کرنا، مارنا، تخلیق کرنا، آسمانوں کی طرف استویٰ اور آسمانوں کا تسویہ یعنی جو ذات تمہارے زندہ کرنے پر اور تمہاری تخلیق پر، آسمانوں اور زمین کی تخلیق پر قادر ہے اس کی قدرت سے دوبارہ زندہ کرنا بعید نہیں۔

اگر کہا جائے کہ لَكُمْ کا معنی انتفاع ہے یعنی تا کہ تم ان تمام چیزوں سے نفع اٹھاؤ ہم کہیں گے انتفاع سے مراد اعتبار (عبرت حاصل کرنا) ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ اگر کہا جائے کہ بچھوؤں اور سانپوں میں کیا عبرت ہے؟ ہم کہیں گے انسان موذی چیزوں کو دیکھ کر نصیحت حاصل کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے لئے آگ میں سزائیں تیار کر رکھی ہیں۔ پس یہ چیزیں ایمان کا سبب اور گناہوں کے ترک کا سبب بنتی ہیں یہ بہت بڑی عبرت ہے۔ ابن عربی نے کہا: ان تمام چیزوں سے اس قدرت کے متعلق جو خبر دی گئی اس میں منع، اباحت اور توقف کا کوئی تقاضا نہیں۔ یہ آیت دلالت اور تنبیہ کے لئے ہے تا کہ اس کے ذریعے اس کی وحدانیت پر استدلال کیا جائے۔ ارباب معانی نے خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا کے متعلق فرمایا: یہ سب تمہارے لئے پیدا فرمایا ہے تا کہ تم اس کی اطاعت پر قوت حاصل کرو نہ کہ تم اس کی معصیت کی وجوہ میں تصرف کرو۔ ابو عثمان نے کہا: تجھے یہ سب کچھ عطا فرمایا اور تیرے لئے مسخر کر دیا تا کہ تم اس کے وجود کی وسعت پر استدلال کرو اور تو سکون

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 115، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

حاصل کر اس سے جو آخرت میں تیرے لئے بڑی بڑی نعمتیں محفوظ کر رکھی ہیں تو اپنے قلیل عمل پر کثیر نیکی کا مطالبہ نہ کر اس نے تجھے عمل سے پہلے ہی عظیم نعمت دی ہے اور وہ توحید ہے۔

مسئلہ نمبر 4: حضرت زید بن اسلم نے اپنے باپ سے انہوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے کچھ عطا کرنے کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے پاس کچھ نہیں ہے لیکن تم میرے نام پر مال خرید لو جب مال آئے گا تو ہم ادا کر دیں گے۔ حضرت عمر نے عرض کی: حضور! جو آپ کے پاس ہو وہ دے دیا کریں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا مکلف نہیں بنایا جس پر آپ قادر نہ ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کے قول کو ناپسند فرمایا۔ ایک انصاری نے کہا: یا رسول اللہ! انفق ولا تخش من ذی العرش اقلالا (آپ خرچ کریں اور آپ صاحب عرش کی طرف سے کمی کا اندیشہ نہ کریں)۔ انصاری کا یہ جملہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم فرمایا اور آپ کے چہرے سے خوشی پہچانی گئی۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے اسی چیز کا حکم دیا گیا ہے۔

ہمارے علماء نے فرمایا: اقلال کا خوف اللہ تعالیٰ کے متعلق سوئے ظن سے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے زمین اور جو کچھ اس میں ہے انسان کے لئے پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں فرمایا: خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (جس نے پیدا کیا تمہارے لئے جو کچھ زمین میں ہے) اور فرمایا: وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (الجاثیہ:13) (اور میں نے مسخر کر دیا تمہارے لئے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب اپنے حکم سے)۔ یہ تمام چیزیں انسان کے لئے مسخر کر دیں تا کہ اس کا عذر ختم ہو جائے اور اس پر حجت قائم ہو جائے تا کہ وہ اللہ کا بندہ بن جائے جس طرح اس نے اسے بندہ پیدا کیا ہے جب بندہ اللہ تعالیٰ سے حسن ظن رکھتا ہے تو اسے کمی کا اندیشہ نہیں ہوتا کیونکہ وہ اس پر مزید مہربانی فرماتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے: وَ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ وَ هُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ (سبا) (اور جو چیز تم خرچ کرتے ہو تو وہ اس کی جگہ اور دے دیتا ہے اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے)۔

اور فرمایا: فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ۝ (النمل) (بلاشبہ میرا رب غنی بھی ہے (اور) کریم بھی)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میری رحمت میرے غضب سے سبقت لے گئی۔ اے ابن آدم! تو خرچ کر میں تجھ پر خرچ کروں گا اللہ کا دایاں ہاتھ بھرا ہوا ہے ہمیشہ عطا فرما رہا ہے دن رات کے خرچ نے اس میں کچھ کمی نہیں کی ہے(1) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بندے صبح کرتے ہیں تو دو فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ ایک کہتا ہے: "اے اللہ! خرچ کرنے والے کو بہتر بدل عطا فرما اور دوسرا فرشتہ کہتا ہے: اے اللہ! کنجوس کا مال تلف فرما(2)۔" اسی طرح سورج کے غروب ہونے کے وقت وہ فرشتے ندا دیتے ہیں۔ یہ صحیح روایت ہے ائمہ حدیث نے روایت کی ہے۔ والحمد للہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، باب الحث علی النفقۃ وتبشیر المنفق بالخلف، صفحہ 322، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

ایضاً صحیح بخاری، کتاب تفسیر سورۃ ہود، باب قولہ وکان عرشہ علی الماء، حدیث نمبر 4316، 6872، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، باب الحث علی النفقۃ وتبشیر المنفق بالخلف، صفحہ 322، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

ایضاً صحیح بخاری، کتاب الزکوۃ، باب قول اللہ تعالیٰ فاما من اعطی واتقی۔۔۔ الخ، حدیث نمبر 1351، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جس شخص کا سینہ روشن ہوا اور اس نے اپنے رب کی غنا، اس کے کرم کو جان لیا اس نے خرچ کیا اور کمی کا خوف نہ کیا، اسی طرح جس کی دنیوی خواہشات ختم ہوگئیں اور قوت لایموت سے اپنی روح کے لئے طاقت حاصل کی اور اپنے نفس کی خواہش کو فنا کر دیا تو ایسا شخص خوشحالی اور تنگی میں عطا کرتا ہے اور کمی کا اندیشہ نہیں کرتا، کمی کا خوف تو وہ کرتا ہے جسے اشیاء دنیا میں خواہش ہو جب وہ آج دے گا تو کل اسے ضرورت ہوگی وہ خوف کرتا ہے کہ کل شاید اسے یہ نہ ملے تو اس پر کمی کے خوف کی وجہ سے آج خرچ کرنے میں تنگی محسوس کرتا ہے۔ مسلم نے حضرت اسماء بنت ابی بکر سے روایت کیا ہے، فرمایا: مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عطا کرو اور انڈیل دو اور خرچ کرو اور شمار نہ کرو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تم پر شمار کرے گا اور خرچ کرنے میں بخل سے کام نہ لو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی اپنی عطا روک لے گا (1)۔ نسائی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا: ایک دفعہ ایک سائل میرے پاس آیا اور میرے پاس رسول اللہ ﷺ موجود تھے۔ میں نے سائل کے لئے کسی چیز کے دینے کا حکم کیا پھر میں نے اسے بلایا اور اس مال کو دیکھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تو نہیں چاہتی کہ تیرے گھر میں کوئی چیز داخل نہ ہو اور نہ کوئی چیز خارج ہو مگر تجھے اس کا علم ہو؟ میں نے کہا: جی ہاں میں یہی چاہتی ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اے عائشہ! ٹھہر و شمار نہ کرو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تجھ پر شمار کرے گا (2)۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **ثُمَّ اسْتَوٰٓى**، ثُمَّ اخبار کی ترتیب کے لئے ہے نہ کہ فی نفسہ امر کی ترتیب کے لئے ہوتا ہے۔ الاستویٰ کا لغوی معنی، کسی شے پر بلند ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَ مَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ** (المومنون: 28) (اور پھر جب اچھی طرح بیٹھ جائیں آپ اور آپ کے ساتھی کشتی کے عرشہ پر) اور فرمایا: **لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ** (زخرف: 13) (تا کہ تم جم کر بیٹھو ان کی پیٹھوں پر)۔ شاعر نے کہا:

فاوردتهم ماء بفيفاء قفرة　　　و قد حلق النجم اليماني فاستوىٰ

اس شعر میں استویٰ بھی ارتفع و علا ہے یعنی بلند ہوا۔ استوت الشمس علی راسی، یعنی سورج میرے سر پر چڑھا، واستوت الطیر علی قمۃ راسی یعنی پرندے میرے سر پر بلند ہوئے۔ یہ آیت مشکلات میں سے ہے یہ آیت اور اس کے مشابہ دوسری آیات کے بارے علماء کے تین نظریات ہیں: بعض علماء نے فرمایا: ہم اس آیت کو پڑھتے ہیں اور ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اور ہم اس کی تفسیر بیان نہیں کرتے اکثر ائمہ کا یہی نظریہ ہے۔ یہ اس طرح ہے جیسا کہ امام مالک سے مروی ہے کہ ایک شخص نے ان سے **اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى**۝ (طٰہٰ) کے متعلق سوال کیا تو امام مالک نے فرمایا: الاستویٰ مجہول نہیں ہے اور کیفیت سمجھنے کے قابل نہیں ہے، اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کے متعلق سوال کرنا بدعت ہے، میں تجھے برا آدمی دیکھتا ہوں، اس کو باہر نکال دیا۔ بعض علماء نے فرمایا: ہم اس آیت کو پڑھتے ہیں اور اس طرح اس کی تفسیر کرتے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، باب الحث علی الانفاق و کراهة الاحصاء، صفحہ 331، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
صحیح بخاری، کتاب الہبہ، باب هبة المرأة بغير زوجها و عتقها... الخ، حدیث نمبر 2402، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن نسائی، صفحہ 254، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الزکوۃ، باب الاحصاء فی الصدقة، حدیث 2501، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہیں جس طرح ظاہر لغت احتمال رکھتی ہے یہ مشبہ فرقہ کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ہم اس کی تلاوت کرتے ہیں ہم اس کی تاویل کرتے ہیں اور اس کے ظاہر معنی پر اس کے محمل کو پھیرتے ہیں۔ فراء نے ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ کے متعلق کہا الاستوا کلام عرب میں دو طرح استعمال ہوتا ہے۔ ان یستوی الرجل و ینتھی شبابہ وقوتہ۔ او یستوی عن اعوجاج یعنی آدمی بڑا ہوا اور اس کی جوانی اور قوت انتہا کو پہنچی یا ٹیڑھی روش کو چھوڑ کر سیدھا ہو گیا (راہ راست پر آ گیا)۔ یہ دو وجہیں ہیں اور تیسری وجہ یہ ہے کہ تو کہے: کان فلان مقبلاً علی فلان ثم استوی علی والی یشاتمنی۔ (فلاں شخص فلاں کی طرف متوجہ تھا پھر میری طرف متوجہ ہوا اور مجھے گالی دینے لگا)۔ یعنی اس کا معنی ہوگا میری طرف متوجہ ہوا۔ اس آیت ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ میں یہی معنی ہے۔ واللہ اعلم۔ اور فرمایا: حضرت ابن عباس نے فرمایا: ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ کا مطلب ہے: بلند ہوا۔ یہ تیرے اس قول کی مانند ہے: کان قاعداً فاستوی وہ بیٹھا تھا پھر کھڑا ہو گیا۔ کان قائماً فاستوی قاعداً پہلے کھڑا تھا پھر بیٹھ گیا۔ یہ تمام معانی عرب کلام میں جائز ہیں۔

امام بیہقی ابوبکر احمد بن علی بن الحسن نے کہا: اسْتَوٰۤى کا معنی اقبل (متوجہ ہونا) صحیح ہے کیونکہ اقبال کا معنی آسمان کی تخلیق کی طرف قصد کرنا ہے اور قصد سے مراد ارادہ ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں جائز ہے اور ثم کا لفظ خلق سے تعلق کے لئے ہے نہ کہ ارادہ کے لئے۔ اور رہی وہ بات جو اس نے حضرت ابن عباس سے حکایت کی ہے وہ انہوں نے کلبی کی تفسیر سے لی ہے اور کلبی ضعیف ہے۔ سفیان بن عیینہ اور ابن کیسان نے ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ کے متعلق فرمایا: قصد الیھا یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمان کی تخلیق کا ارادہ فرمایا۔ یہ ایک قول ہے، بعض علماء نے فرمایا: یہ بغیر تکییف اور تحدید کے ہے۔ طبری نے اس قول کو اختیار کیا۔ ابو العالیہ الریاحی سے اس آیت کے متعلق روایت کیا جاتا ہے کہ کہا جاتا ہے: اسْتَوٰۤى بمعنی ارتفع ہے (بلند ہوا)۔ بیہقی نے کہا: اس سے مراد اس کے امر کا بلند ہونا ہے وہ پانی کے بخارات ہیں جن سے آسمان کی تخلیق واقع ہوئی۔ بعض علماء نے فرمایا: المستوی چڑھنے والا دھواں تھا۔

ابن عطیہ نے کہا: کلام کا وصف اس قول کا انکار کرتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اسْتَوٰۤى کا معنی استولی (غالب آنا) ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

قد استوی بشر علی العراق   من غیر سیف ودم مھراق (1)

بشر عراق پر غالب آیا بغیر تلوار کے اور بغیر خون بہائے۔

ابن عطیہ نے کہا: اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝ (طٰہٰ) میں یہ معنی مراد ہے (2)، میں کہتا ہوں: فراء کے قول میں پہلے گزر چکا ہے کہ علی اور الی ایک معنی میں ہیں۔ اس کے متعلق مزید معلومات سورۂ اعراف میں آئیں گی ان شاء اللہ۔ اور اس آیت اور اس جیسی دوسری آیات میں قاعدہ نقل و حرکت نہ کرنا ہے۔

مسئلہ نمبر 6: اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پہلے زمین کی تخلیق فرمائی۔ اسی طرح حم السجدہ

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 115، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
2۔ ایضاً

سورت میں ہے اور سورۃ النازعات میں فرمایا: ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۚ بَنٰهَا ۝ (کیا تمہیں پیدا کرنا مشکل ہے یا آسمان کا اس نے اسے بنایا)۔ اس میں آسمان کی تخلیق کا وصف بیان فرمایا اور اس کے بعد فرمایا: وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ۝ (النازعات) (اور زمین کو بعد ازاں بچھا دیا)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے گویا آسمان کو زمین سے پہلے تخلیق فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ (انعام: 1) (سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمینوں کو)۔ یہ قتادہ کا قول ہے کہ آسمان پہلے پیدا کیا گیا ہے۔ اس کو طبری نے قتادہ سے روایت کیا ہے مجاہد وغیرہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس پانی کو خشک کیا جس پر اس کا عرش تھا اور اسے زمین بنا دیا اس میں دھواں اٹھا اور بلند ہوا تو اس سے آسمان بنا دیا۔ پس زمین کی تخلیق آسمان کی تخلیق سے پہلے ہوئی پھر اس کے امر نے آسمانوں کا قصد کیا اور انہیں سات آسمان بنایا پھر اس کے بعد زمین کو پھیلایا۔ جب پہلے پیدا فرمایا تھا تو یہ پھیلی ہوئی نہ تھی۔

میں کہتا ہوں: قتادہ کا قول صحیح وجہ پر نکلے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے آسمان کا دھواں پیدا فرمایا پھر زمین کو پیدا فرمایا پھر آسمان کی طرف قصد کیا وہ دھواں تھا اسے سات آسمان بنایا، پھر اس کے بعد زمین کو پھیلایا، جو چیز دلیل ہے کہ دھویں کو زمین سے پہلے تخلیق کیا گیا وہ وہ روایت ہے جو سدی نے ابی مالک سے اور ابو صالح سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے مرہ الہمدانی سے انہوں نے حضرت ابن مسعود سے روایت کی ہے اور بہت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے اس ارشاد کے بارے روایت کی ہے: هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۗ ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ۔

فرمایا: اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا اور پانی سے پہلے اس نے کوئی چیز پیدا نہ کی۔ جب اس نے مخلوق کو پیدا کرنے کا قصد کیا تو پانی سے دھواں نکالا۔ پس وہ دھواں پانی پر بلند ہوا اور اوپر ہو گیا، اس کا نام سماء رکھا پھر پانی کو خشک کیا اور اس سے ایک زمین بنا دی پھر اسے پھاڑا اور دو دنوں میں (یعنی) اتوار اور سوموار میں انہیں سات زمینیں بنایا، پھر زمین کو مچھلی پر رکھا۔ الحوت سے مراد النون (مچھلی) ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں کیا: نٓ وَ الْقَلَمِ (ن: 1) مچھلی پانی میں ایک چٹان پر تھی اور وہ چٹان ایک فرشتے کی پیٹھ پر تھی اور وہ فرشتہ ایک چٹان پر تھا اور وہ چٹان ہوا میں تھی، یہ وہ (چٹان) ہے جس کا ذکر حضرت لقمان نے کیا لیست فی السماء ولا فی الارض ۔پھر مچھلی نے حرکت کی تو زمین لرزنے لگی پھر اس پر پہاڑوں کو رکھا تو وہ قرار پا گئی، پہاڑ زمین پر فخر کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَلْقٰى فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِكُمْ (لقمان: 10) (اور اللہ تعالیٰ نے گاڑ دیئے ہیں زمین میں اونچے اونچے پہاڑ تاکہ زمین لرزتی نہ رہے تمہارے ساتھ)۔ یعنی زمین میں پہاڑ پیدا کئے اور زمین والوں کی خوراک اور درخت اور جو کچھ زمین کے لئے مناسب تھا دو دنوں میں یعنی منگل اور بدھ کو پیدا فرمایا۔ یہ جب فرمایا: قُلْ اَىِٕنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ وَ جَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَ بٰرَكَ فِیْهَا وَ قَدَّرَ فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِیْۤ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآىِٕلِیْنَ ۝ (فصلت) آپ (ان سے) پوچھئے کیا تم

لوگ انکار کرتے ہو اس ذات کا جس نے پیدا فرمایا زمین کو دو دن میں اور ٹھہراتے ہو اس کے لئے مدمقابل وہ تو رب العالمین ہے (اس کا مدمقابل کون ہو سکتا ہے) اور اس نے (ہی) بنائے ہیں زمین میں کھڑے ہوئے پہاڑ اور جو اس کے اوپر (اٹھے ہوئے) ہیں اور اس نے بڑی برکتیں رکھی ہیں اس میں اور اندازے سے مقرر کر دی ہیں اس میں غذائیں (یہ نوع بہ نوع) چار دنوں میں (ان کا حصول) یکساں ہے طلبگاروں کے لئے۔

جو یہ پوچھے تو معاملہ اسی طرح ہے ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ وَ هِیَ دُخَانٌ (فصلت: 11) پھر اس نے توجہ فرمائی آسمان کی طرف وہ اس وقت محض دھواں تھا یہ دھواں پانی کے بخارات سے تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ایک آسمان بنایا پھر اسے پھاڑا اور دو دنوں میں یعنی خمیس اور جمعہ کے روز سات آسمان بنائے۔ جمعہ کو جمعہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں آسمانوں اور زمین کی تخلیق جمع ہوئی۔ اَوْحٰى فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا (فصلت: 12) فرمایا: ہر آسمان میں اس کی مخلوق پیدا فرمائی یعنی فرشتے اور سمندر اولوں کے پہاڑ اور دوسری چیزیں جن کا علم نہیں وہ پیدا فرمایا۔ پھر آسمان دنیا کو ستاروں سے مزین فرمایا اور ان ستاروں کو زینت بنایا اور شیطانوں سے حفاظت کا باعث بنایا جب اس تخلیق کو مکمل فرمایا جو پسند تھی تو عرش پر استواء فرمایا۔ یہ مراد ہے جب فرمایا: خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ (حدید: 4) (پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں)۔

فرمایا كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا (الانبیاء: 30) (آپس میں ملے ہوئے تھے پھر ہم نے الگ الگ کر دیا انہیں) حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق میں یہ سارا واقعہ ذکر فرمایا جیسا کہ ان شاء اللہ اسی سورت میں اس کا بیان آئے گا۔ وکیع نے اعمش سے انہوں نے ابوظبیان سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا فرمایا پھر اسے فرمایا: تو لکھ۔ قلم نے پوچھا: یارب! کیا لکھوں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تقدیر لکھ۔ پس وہ سب کچھ جاری ہو گیا جو اس دن سے قیامت تک ہونا تھا۔ فرمایا: پھر مچھلی کو پیدا فرمایا اس پر زمین کو پھیلایا، پانی کے بخارات اٹھے، اس سے آسمان بنے مچھلی نے حرکت کی تو زمین پھیل گئی۔ اس پر پہاڑ پیدا کئے گئے، پہاڑ قیامت تک زمین پر فخر کرتے رہیں گے(1) اس روایت میں زمین کی تخلیق پانی کے بخار کے بلند ہونے سے پہلے ہے جو بخار دھواں تھا، یہ پہلی روایت کے خلاف ہے اور پہلی روایت اس روایت سے اور دوسری روایات سے اولیٰ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ؈ (النازعات) (اور زمین کو بعد ازاں بچھا دیا)۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے جو اس نے کیا اس کے متعلق اقاویل مختلف ہیں اس میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں۔

ابونعیم نے حضرت کعب الاحبار سے ذکر کیا ہے کہ ابلیس اس مچھلی کے اندر داخل ہو جس کی پیٹھ پر ساری زمین تھی۔ اس نے اس کے دل میں وسوسہ ڈالا۔ اس نے کہا: اے لوثیا! کیا تو جانتی ہے جو تیری پیٹھ پر قومیں، درخت، جانور، لوگ اور پہاڑ ہیں اگر تو ان کو جھاڑ دے تو تو انہیں اپنی پیٹھ سے نیچے پھینک دے گی۔ حضرت کعب نے کہا: لوثیا (مچھلی) نے ایسا کرنے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ایک جانور بھیجا جو اس مچھلی کے نتھنے میں داخل ہو گیا، مچھلی نے اس سے نجات کے لئے اللہ کی بارگاہ میں التجا

1۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب السیر، باب مبتدأ الخلق، صفحہ 3، جلد 9 (دارالفکر)

گئی تو وہ جانور نکل گیا، حضرت کعب نے کہا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! وہ مچھلی سامنے اس کو دیکھ رہی تھی اور وہ اسے دیکھ رہا تھا اگر وہ کوئی ارادہ کرتی تو وہ جانور پھر اس کے ناک میں داخل ہو جاتا۔

مسئلہ نمبر 7: تمام اشیاء کی تخلیق کی اصل پانی سے ہے کیونکہ ابن ماجہ نے اپنی سنن میں اور ابو حاتم البستی نے اپنی مسند میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! جب میں آپ کو دیکھتا ہوں تو میرا نفس خوش ہوتا ہے میری آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں مجھے ہر چیز کے متعلق بتائیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر چیز پانی سے تخلیق کی گئی ہے۔ میں نے کہا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے کوئی ایسا عمل بتائیں جب میں اسے کروں تو جنت میں داخل ہو جاؤں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کھانا کھلاؤ، سلام کو پھیلاؤ، صلہ رحمی کرو، رات کو قیام کرو جبکہ لوگ سوئے ہوئے ہوں سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ گے (1)۔

ابو حاتم نے کہا: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول مجھے ہر چیز کے بارے خبر دیجئے۔ اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جو پانی سے پیدا کی گئی تھی، اس کی صحت پر دلیل مصطفیٰ علیہ السلام کا جواب ہے۔ آپ نے فرمایا: کل شی خلق من الماء۔ (ہر چیز پانی سے پیدا کی گئی ہے اگرچہ وہ ابھی مخلوق نہ تھی)۔

سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، وہ بیان فرماتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے پہلے جس چیز کو اللہ نے پیدا فرمایا وہ قلم تھا پھر اسے حکم دیا تو اس نے وہ سب کچھ لکھا جو ہونا تھا (2)۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے بھی یہ حدیث مرفوع مروی ہے۔

امام بیہقی نے کہا: یہاں پہلی چیز جو اس نے پیدا کی، سے مراد پانی اور ہوا ہے اور عرش کے بعد پہلی چیز جو پیدا کی وہ قلم تھا۔ یہ مفہوم حضرت عمران بن حصین کی حدیث میں واضح ہے۔ پھر آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا (3)۔ عبد الرزاق بن عمر بن حبیب المکی نے حمید بن قیس الاعرج سے انہوں نے طاؤس سے روایت کیا ہے، فرمایا: ایک شخص حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص کے پاس آیا اور پوچھا: یہ مخلوق کس سے پیدا کی گئی؟ حضرت عبد اللہ نے کہا: پانی، نور، ظلمت، ہوا اور مٹی سے۔ اس شخص نے کہا: یہ چیزیں کس سے پیدا کی گئیں۔ حضرت عبد اللہ نے کہا: میں نہیں جانتا۔ پھر وہ شخص حضرت عبد اللہ بن زبیر کے پاس آیا۔ ان سے یہی سوال کیا انہوں نے بھی حضرت عبد اللہ بن عمرو کے قول کی مثل جواب دیا۔ پھر وہ شخص حضرت عبد اللہ بن عباس کے پاس آیا ان سے یہی سوال کیا۔ کہا: یہ مخلوق کس چیز سے پیدا ہوئی ہے؟ حضرت ابن عباس نے کہا: پانی، نور، ظلمت، ہوا اور تاریکی سے۔ اس شخص نے پوچھا: یہ چیزیں کس سے پیدا ہوئی ہیں، تو حضرت عبد اللہ بن عباس نے یہ آیت تلاوت کی: وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (الجاثیہ: 13) (اور جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب اپنے حکم سے اس نے مسخر کر دیا تمہارے لئے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے)۔ اس شخص نے کہا یہ جواب تو صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 95، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔
ایضاً، کتاب اقامۃ الصلوٰۃ والسنۃ فیہا، باب ما جاء فی قیام اللیل، حدیث 1323، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، صفحہ 3، جلد 9 (دار الفکر)۔ جامع ترمذی، حدیث نمبر 3241، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ صحیح بخاری، باب وکان عرشہ علی الماء، حدیث نمبر 6868، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کے گھرانے کا فرد ہی دے سکتا ہے۔ امام بیہقی نے فرمایا تمام چیزوں کا مصدر اس سے ہے یعنی اس کی تخلیق، ایجاد اور اختراع سے ہے، اس نے پہلے پانی کو پیدا فرمایا یا پانی اور اس سے اس چیز کو پیدا کیا جس کو اس نے پیدا کرنا چاہا، نہ تو یہ کسی اصل سے ہیں نہ کسی سابق مثال سے ہیں پھر بعد میں جو اس نے پیدا کیا اس کی اصل بنائی، حقیقی پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں جس کے علاوہ کوئی خالق نہیں اس کی ذات ہر نقص اور عیب سے پاک ہے۔ (1)

مسئلہ نمبر 8: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا کہ آسمان سات ہیں اور زمین کے لئے کوئی صریح عدد قرآن میں ایسا نہیں آیا جو تاویل کا احتمال نہ رکھتا ہو سوائے اس ارشاد کے وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ (الطلاق: 12) (اور زمین کو بھی انہی کی مانند) اس کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ یعنی زمین میں سے تعداد میں اس کی مثل ہیں کیونکہ کیفیت اور صفت میں تو مشاہدہ اور اخبار سے معلوم ہے کہ یہ مختلف ہیں۔ پس تعداد کے اعتبار سے ہم مثل ہونا متعین ہو گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: موٹائی میں اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس میں ہم مثل ہونا مراد ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: زمینیں بھی سات ہیں لیکن یہ ایک دوسرے سے بنائی گئی ہیں، یہ داودی کا قول ہے: پہلا قول ہی صحیح ہے زمینیں، آسمانوں کی طرح سات ہیں۔ مسلم نے حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے جس نے ایک بالشت کسی کی زمین ظلماً لے لی اسے سات زمینوں تک اس کا طوق پہنایا جائے گا (2)۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی اسی طرح مروی ہے لیکن اس میں الی کی جگہ من ہے یعنی سات زمینوں سے اس کو طوق پہنایا جائے گا اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کوئی شخص ناحق کسی کی ایک بالشت زمین نہیں لے گا مگر اللہ تعالیٰ اسے (قیامت کے روز) سات زمینوں تک طوق پہنائے گا (3)۔

نسائی نے حضرت ابو سعید خدری سے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: موسیٰ علیہ السلام نے کہا: یارب! مجھے کوئی ایسی چیز سکھا جس کے ساتھ میں تجھے یاد کروں اور تجھ سے اس کے ذریعے دعا مانگوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! تو کہہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: یارب! یہ تو تیرا ہر بندہ کہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تو کہہ: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ موسیٰ علیہ السلام نے کہا لا الہ الا انت، میں ایسی چیز چاہتا ہوں جس کے ساتھ تو مجھے خاص کرے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! اگر ساتوں آسمان اور ان کو آباد کرنے والے میرے سوا اور ساتوں زمینیں ایک پلڑے میں ہوں اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دوسرے پلڑے میں ہو، لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ والا پلڑا دوسرے پلڑے سے بھاری ہو جائے گا۔

ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام بیٹھے تھے کہ ان پر ایک بادل

1۔ مستدرک حاکم، کتاب التفسیر، باب سورۃ حم الجاثیہ

2۔ صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ والمزارعۃ، باب تحریم الظلم وغصب الارض وغیرھا، صفحہ 33، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

ایضاً صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ما جاء فی سبع ارضین، حدیث نمبر 2959، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ والمزارعۃ، باب تحریم الظلم وغصب الارض وغیرھا، صفحہ 33، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

ایضاً صحیح بخاری، کتاب المظالم والغصب، باب اثم من ظلم شیئاً من الارض، حدیث نمبر 2273، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو یہ کیا ہے؟ صحابہ نے کہا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ بادل ہے یہ زمین سیراب کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے ایسی قوم کی طرف بھیجتا ہے جو شکر نہیں کرتی اور دعا نہیں مانگتی۔ فرمایا: کیا تم جانتے ہو تمہارے اوپر کیا ہے؟ صحابہ نے کہا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رفیع آسمان ہے (یہ) محفوظ چھت ہے اور روکی گئی موج ہے۔ پھر فرمایا: کیا تم جانتے ہو تمہارے اور اس آسمان کے درمیان کیا ہے؟ صحابہ نے کہا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا: تمہارے اور آسمان کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ پھر فرمایا: اسی طرح (کی مسافت ہے) حتیٰ کہ سات آسمانوں کو شمار کیا ہر دو آسمانوں کے درمیان اتنی مسافت ہے جتنی آسمان اور زمین کے درمیان مسافت ہے۔ پھر فرمایا: کیا تم جانتے ہو آسمانوں کے اوپر کیا ہے؟ صحابہ نے عرض کی: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا: اس کے اوپر عرش ہے آسمانوں اور عرش کے درمیان اتنی مسافت ہے جتنی کہ دو آسمانوں کے درمیان ہے۔ پھر فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے نیچے کیا ہے؟ صحابہ نے کہا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ زمین ہے پھر فرمایا: کیا تم جانتے ہو اس کے نیچے کیا ہے؟ صحابہ نے کہا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا: اس زمین کے نیچے دوسری زمین ہے۔ ان دونوں زمینوں کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے حتیٰ کہ آپ نے سات زمینیں شمار کیں ہر دو زمینوں کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ پھر فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے! اگر تم نچلی زمین کی طرف رسی لٹکاؤ تو وہ اللہ (کے علم) پر گرے گی۔ پھر یہ آیت پڑھی: هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ ۚ وَ هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ (الحدید) (وہی اول، وہی آخر، وہی ظاہر، وہی باطن اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے) (1)۔

ابو عیسیٰ نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس آیت کو تلاوت کرنا اس بات پر دلیل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مراد لیا کہ وہ رسی اللہ تعالیٰ کے علم، اس کی قدرت اور سلطنت پر گرے گی۔ اللہ تعالیٰ کا علم، اس کی قدرت اور اس کی سلطنت ہر جگہ ہے جبکہ وہ عرش پر ہے جیسا کہ اس نے خود اپنی کتاب میں اپنا وصف بیان کیا ہے۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث غریب ہے۔ حضرت حسن (بصری) نے حضرت ابو ہریرہ سے (حدیث) نہیں سنی اور ان آثار سے ثابت ہوتا ہے کہ زمینیں سات ہیں اور جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے وہ کافی ہے۔ ابو الضحیٰ اس کا نام مسلم ہے ... نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ (الطلاق: 12) سات زمینیں ہیں ہر زمین میں ایک نبی ہے جیسے تمہارے نبی ہیں آدم کی طرح آدم، نوح کی طرح نوح، ابراہیم کی طرح ابراہیم، عیسیٰ کی طرح عیسیٰ۔ بیہقی نے کہا: اس کی سند حضرت ابن عباس سے صحیح ہے یہ مرہ کی وجہ سے شاذ ہے۔ میں ابو الضحیٰ کے لئے اس پر کوئی متابع نہیں جانتا۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 9: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ یہ مبتدا خبر ہیں۔ مَّا محل نصب میں ہے

1۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب سورۃ الحدید، صفحہ 162، جلد 2 (وزارت تعلیم)
ایضاً، کتاب فضائل القرآن، باب ومن سورۃ الحدید، حدیث نمبر 3220، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جَمِيْعًا سیبویہ کے نزدیک یہ حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ ثُمَّ اسْتَوٰۤى اہل نجد اس میں امالہ کرتے ہیں تاکہ اس بات پر دلالت کرے کہ یاء والے الفاظ میں سے ہے اور اہل حجاز تفخیم کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ سَبْعَ یہ هن ضمیر سے بدل ہونے کی بنا پر منصوب ہے یعنی فسوّی سبع سموٰت۔ اور مفعول بھی ہوسکتا ہے اس تقدیر پر یسوی بینهن سبع سماوات، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا (الاعراف:155) اصل میں مِنْ قومه تھا۔ یہ نحاس کا قول ہے۔ اخفش نے کہا: حال کی بنا پر (سبع) منصوب ہے۔ وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ یہ مبتدا خبر ہیں (ھو) میں اصل ھا کی حرکت ہے اور اسکان تخفیف کی بنا پر ہے۔

السَّمَآءِ۔ واحد مونث استعمال ہوتا ہے جیسے عنان ہے اس کا مذکر ہونا شاذ ہے اور کبھی السماء، سماوۃ کی جمع ہوتا ہے یہ اخفش کے قول کے مطابق ہے اور زجاج کے قول میں یہ سماء کی جمع ہے اور جمع الجمع سماوات، سماءات ہے۔ سواھن بھی آیا یا تو اس لئے کہ السماء جمع ہے یا اس لئے کہ مفرد اسم جنس ہے سواھن کا معنی ہوگا: ان کی سطحوں کو ہموار کرنے کے ساتھ برابر کیا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے: انہیں برابر کیا۔

مسئلہ نمبر 10: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ جو اس نے پیدا کیا اسے جاننے والا ہے، وہ ہر چیز کا خالق ہے۔ پس ثابت ہوا کہ وہ ہر چیز کا عالم بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ (الملک:14) ((نادانو) کیا وہ نہیں جانتا (بندوں کے احوال کو) جس نے (انہیں) پیدا کیا)۔ اللہ تعالیٰ عالم ہے اور اپنے قدیم ازلی علم کے ساتھ تمام معلومات کو جاننے والا ہے وہ یکتا ہے قائم بذاتہ ہے۔ معتزلہ عالمیت میں ہمارے ساتھ موافقت کرتے ہیں عیت میں موافقت نہیں کرتے۔ جہمیہ فرقہ کا نظریہ ہے کہ وہ جاننے والا ہے علم سے قائم ہے مگر کسی محل میں نہیں۔ اللہ تعالیٰ گمراہوں کے قول سے بلند و بالا ہے۔ ان لوگوں کا رد دیانات کی کتب میں ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنا وصف علم کے ساتھ بیان فرمایا: اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ يَشْهَدُوْنَ (النساء:166) (اس نے اسے اتارا ہے اپنے علم سے اور فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں)۔ اور فرمایا: فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ (ہود:14) (پھر جان لو کہ یہ قرآن محض علم الٰہی سے اتارا گیا ہے) اور فرمایا: فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ (اعراف:7) (پھر ہم ضرور بیان کریں گے (ان کے حالات) ان پر اپنے علم سے) اور فرمایا: وَ مَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَ لَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ (فاطر:11) (اور نہ ہی حاملہ ہوتی کوئی عورت اور نہ بچہ جنتی ہے) اور فرمایا: وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ (الانعام:59) (اور اسی کے پاس ہیں کنجیاں غیب کی مگر اس کو اس کا علم ہوتا ہے نہیں جانتا سوائے اس کے)۔ ہم اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کی تمام صفات کے ثبوت پر اسی سورت میں يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ لَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرہ:185) کے تحت استدلال کریں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

کسائی اور قالون نے نافع سے (ھو اور ھی) کو ہا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے جب ان سے پہلے فا، واو، لام یا ثم ہو۔ اسی طرح ابوعمرو نے کہا ہے مگر ثم کے ساتھ اس طرح نہیں پڑھا۔ ابوعون نے حلوانی سے انہوں نے قالون سے یہ زائد نقل کیا ہے انہوں نے ان یمل ھو میں ہا کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے حرکت کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۞

''اور یاد کرو جب فرمایا تمہارے رب نے فرشتوں سے میں مقرر کرنے والا ہوں زمین میں ایک نائب۔ کہنے لگے: کیا تو مقرر کرتا ہے زمین میں جو فساد برپا کرے گا اس میں اور خونریزیاں کرے گا حالانکہ ہم تیری تسبیح کرتے ہیں تیری حمد کے ساتھ اور پاکی بیان کرتے ہیں تیرے لئے۔ فرمایا: بے شک میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً اس میں سترہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ۔ اِذْ اور اذا دونوں حرف توقیت ہیں اِذْ ماضی کے لئے ہے اور اذا مستقبل کے لئے ہے کبھی یہ ایک دوسرے کی جگہ استعمال کئے جاتے ہیں۔ المبرد نے کہا: اِذْ جب مضارع کے ساتھ آئے تو اس کا معنی ماضی ہوتا ہے جیسے وَ اِذْ یَمْكُرُ بِكَ (الانفال: 30) (واذ تقول للذی انعم اللہ علیہ) اس کا معنی اذ مکرو ہے اور واذ قلت ہے یعنی مضارع کو ماضی کے معنی میں کر دیتا ہے اور جب اذا ماضی پر داخل ہو تو اسے مستقبل کے معنی میں کر دیتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ (النازعات: 34) فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ۞ (عبس) اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ (نصر: 1) ان سب میں جَآءَ بمعنی یجیی ہو جائے گا۔ معمر بن المثنی ابوعبیدہ نے کہا: اِذْ زائدہ ہے تقدیر یہ ہے وقال ربك۔ اور اس نے اسود بن یعفر کے قول سے استشہاد کیا ہے۔

فاذ و ذالك لا مهاه لذكره   والدهر يعقب صالحاً بفساد

اس قول کا زجاج، نحاس اور تمام مفسرین نے انکار کیا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ غلطی ہے کیونکہ (اِذْ) اسم ہے اور یہ ظرف زمان ہے یہ ایسے حروف میں سے نہیں ہے جو زائد کئے جاتے ہیں۔ الزجاج نے کہا: یہ ابوعبیدہ کی طرف سے ایک جرم ہے(1)۔

اللہ تعالیٰ نے لوگوں اور دوسری چیز کی تخلیق کا ذکر فرمایا ہے۔ تقدیر یوں ہے: وابتدأ خلقکم اذ قال۔ تمہاری تخلیق کا آغاز کیا جب اس نے کہا۔ پس یہ اس محذوف سے ہے جس پر کلام دلالت کرتا ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا:

فان المنية من يخشها   فسوف تصادفه اينما

موت اس کے لئے بھی ہے جو موت سے ڈرتا ہے موت اسے ملے گی جہاں بھی چلا جائے گا۔

اس شعر میں اینما کے بعد ذهب محذوف ہے۔

یہ بھی احتمال ہے کہ (اذ) فعل مقدر کے متعلق ہو۔ تقدیر اس طرح ہو: اذ کر اذ قال۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ (البقرہ: 21) کی طرف لوٹایا گیا ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ جس نے تمہیں پیدا کیا جب

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 116، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد اور خطاب فرشتوں کے لئے ثابت ہے اور ازل سے ہے اس شرط کے ساتھ کہ ان کا وجود بھی ہو اور ان کی سمجھ بھی ہو، یہ مسئلہ تمام اللہ کے اوامر، نواہی اور مخاطبات میں ہے۔ یہ شیخ ابوالحسن اشعری کا قول ہے۔ اس کو ابوالمعالی نے پسند کیا ہے۔ ہم نے اپنی کتاب الاسنٰی فی شرح اسماء اللہ الحسنٰی و صفات اللہ العلی میں اس کا ذکر کیا ہے۔

رب مالک، سردار، مصلح اور جابر کے لئے استعمال ہوتا ہے اس کا بیان گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد لِلْمَلٰٓئِكَةِ اس کا واحد ملك ہے۔ ابن کیسان وغیرہ نے کہا: مَلَكٌ بروزن فَعَل یہ الملك سے مشتق ہے۔ ابوعبید نے کہا: یہ مفعل کے وزن پر لَاَكَ سے مشتق ہے جس کا معنی بھیجنا ہے۔ الالوكة، المألكه، المألكة ان کا معنی پیغام رسانی ہے۔ لبید نے کہا:

و غلامٍ ارسلته اُمُّهٗ بالوكٍ فبذلنا ما سأل

ابلغ النعمان عنی مألكاً اننی قد طال حبسی و انتظاری

لڑکے کو اس کی ماں نے پیغام دے کر بھیجا تو ہم نے وہ سب خرچ کیا جو اس نے مانگا۔ کہا جاتا ہے: یہ کہا جاتا ہے: اَلِكْنِیْ یعنی مجھے بھیج۔ اس بنا پر اس کی اصل مَألَكٌ ہوگی ہمزہ، فَعَل کا فا کلمہ ہے پھر لوگوں نے اسے عین کلمہ سے قلب کر دیا اور مَلْاَكٌ پھر تسہیل کی اور کہا: مَلَكٌ۔ بعض علماء نے کہا: اس کی اصل مَلْاَكٌ ہے اور یہ ملك یملك سے مشتق ہے جیسے شمأل، شمل سے مشتق ہے ہمزہ زائدہ ہے۔ یہ ابن کیسان سے بھی مروی ہے شعر میں اصل پر آیا ہے۔ شاعر نے کہا:

فلست لإنسیٍّ ولکن لملأكٍ تنزل من جو السماء یصوب

تو انسان نہیں بلکہ فرشتہ ہے جو آسمان کی فضا سے اترتا ہے جو بارش برساتا ہے۔

نضر بن شمیل نے کہا: عربوں کے ہاں الملك کا اشتقاق نہیں ہے۔ الملائكة میں ہا جمع کی تانیث کی تاکید ہے، اس کی مثل صلادمه ہے اور الصلادم ہے (سخت گھوڑے) اس کا واحد صلدم ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ۃ مبالغہ کے لئے ہے جیسے علامہ اور نسابہ کے آخر میں ۃ مبالغہ کے لئے ہے۔ ارباب معانی نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو خطاب فرمایا یہ مشورہ کے لئے نہیں تھا بلکہ ان میں جو حرکات، عبادت، تسبیح اور تقدیس کی رؤیت موجود تھی اس کا ظاہر کرنا تھا۔ پھر فرشتوں کو انسانوں کا جو قیم (باپ) تھا اس کی طرف لوٹایا اور فرمایا: اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ (اعراف: 11) (آدم کے لئے سجدہ کرو)

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً یہاں جَاعِلٌ بمعنی خالق ہے یعنی میں پیدا کرنے والا ہوں۔ طبری نے یہ ابوروق سے بیان کیا ہے اسی وجہ سے یہ ایک مفعول کی طرف متعدی ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ الْاَرْضِ سے مراد بعض علماء نے فرمایا: مکہ ہے۔ ابن سابط نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: زمین مکہ سے پھیلائی گئی اسی وجہ سے مکہ کو ام القریٰ کہا جاتا ہے۔ فرمایا: حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح اور حضرت شعیب علیہم السلام کی قبور زمزم، رکن اور مقام کے درمیان ہیں اور خَلِیْفَةً کبھی فاعل کے معنی میں ہوتا ہے یعنی جو

زمین میں ان سے پہلے فرشتوں میں تھے ان کے پیچھے آنے والا ہے، جیسا کہ مروی ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خلیفہ مفعول کے معنی میں ہو یعنی پیچھے لایا گیا، جیسے ذبیحہ بمعنی مفعولۃ (مذبوحۃ) استعمال ہوتا ہے۔ الخلف لام کے فتحہ کے ساتھ ہو تو نیکو کاروں میں سے جو پیچھے آئے اور لام کے سکون کے ساتھ ہو تو بروں میں سے جو پیچھے آئے، یہ معروف ہے۔ مزید بیان ان شاء اللہ سورۂ اعراف میں آئے گا۔

خَلِیۡفَةً فاء کے ساتھ اکثر قراء کی قراءت ہے مگر حضرت زید بن علی سے مروی ہے کہ اس نے خلیقہ قاف کے ساتھ پڑھا ہے، یہاں خلیفہ سے مراد حضرات ابن مسعود، ابن عباس اور تمام اہل تاویل کے نزدیک حضرت آدم علیہ السلام ہیں وہی اللہ تعالیٰ کے احکام اور اوامر نافذ کرنے میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ ہیں کیونکہ وہی زمین کی طرف پہلے رسول ہیں جیسا کہ حضرت ابوذر کی حدیث میں ہے، انہوں نے کہا: میں نے عرض کی: یارسول اللہ! ﷺ کیا آدم علیہ السلام نبی مرسل تھے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔ اور کہا جاتا ہے وہ کس کے لئے رسول تھے جبکہ زمین میں کوئی شخص تھا ہی نہیں تو کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی اولاد کی طرف رسول تھے، آپ کی اولاد چالیس تھے جو بیس بطنوں میں پیدا ہوئے تھے، ہر بطن میں جوڑا جوڑا پیدا ہوا، پھر ان کے بچے پیدا ہوئے حتیٰ کہ بہت سے لوگ ہو گئے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **خَلَقَكُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا وَبَثَّ مِنۡهُمَا رِجَالًا كَثِيۡرًا وَّنِسَآءً** (النساء: 1) (پیدا فرمایا تمہیں ایک جان سے اور پیدا فرمایا اسی سے جوڑا اس کا اور ان دونوں سے مرد کثیر تعداد میں اور عورتیں (کثیر تعداد میں))

ان پر اللہ تعالیٰ نے مردار، خون اور خنزیر کے گوشت کی تحریم نازل کی تھی اور آدم علیہ السلام نوسوتیس سال زندہ رہے تھے۔ اہل تورات نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ حضرت وہب بن منبہ سے مروی ہے کہ وہ ہزار سال زندہ رہے تھے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 4: یہ آیت امام اور خلیفہ قائم کرنے میں اصل ہے ایسا خلیفہ اور امام جس کی بات سنی جائے اور اس کی اطاعت کی جائے تا کہ اس کے ساتھ کلمہ مجتمع رہے اور اس کے ساتھ خلیفہ کے احکام نافذ ہوں۔ امام اور خلیفہ کے وجوب کے متعلق امت کے ائمہ کا کوئی اختلاف نہیں مگر وہ قول جو اصم (بہرہ) سے مروی ہے یہ شریعت سے بھی اصم (بہرہ) تھا۔ اسی طرح ہر وہ شخص جس نے اصم جیسا قول کیا اور اس کی رائے اور اس کے مذہب کی پیروی کی وہ شریعت میں (بہرہ) ہے۔ اصم کا قول ہے کہ دین میں خلیفہ واجب نہیں ہے بلکہ جائز ہے، جبکہ لوگ اپنا حج اور جہاد قائم کرتے ہوں، اپنے آپ میں انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوں اور حق کو اپنی طرف سے ادا کرتے ہوں، مال غنیمت، مال فے اور صدقات وغیرہ ان کے اہل اور مستحق لوگوں میں تقسیم کرتے ہوں اور جن لوگوں پر حدود واجب ہوں ان پر حدود جاری کرتے ہوں تو یہ ان کے لئے کافی ہے ان پر امام متعین کرنا واجب نہیں ہے جو ان تمام امور کا والی ہو۔ ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **اِنِّىۡ جَاعِلٌ فِى الۡاَرۡضِ خَلِيۡفَةً** (میں مقرر کرنے والا ہوں زمین میں ایک نائب)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلۡنٰكَ خَلِيۡفَةً فِى الۡاَرۡضِ** (ص: 26) (اے داؤد ہم نے مقرر کیا ہے آپ کو نائب زمین میں) اور فرمایا: **وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسۡتَخۡلِفَنَّهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ** (النور: 55) (وعدہ فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے تم میں

سے اور نیک عمل کئے کہ وہ ضرور خلیفہ بنائے گا انہیں زمین میں)۔ یہ تمام آیات اور ان کے علاوہ آیات ہمارے دلائل ہیں۔

سقیفہ بنی ساعدہ میں مہاجرین وانصار کے درمیان خلیفہ کے تعین میں اختلاف واقع ہونے کے بعد سیدنا صدیق اکبر کی تقدیم پر صحابہ کا اجماع ہوا حتی کہ انصار نے کہا: ایک امیر ہمارا ہوگا ایک امیر تمہارا ہوگا، حضرت ابو بکر اور حضرت عمر اور مہاجرین نے ان کی طرف سے یہ قول قبول نہ کیا۔ مہاجرین نے انہیں کہا: عرب صرف قریش میں سے صرف اس قبیلہ کی پیروی و اطاعت کریں گے اور مہاجرین نے انصار کے لئے حدیث بھی روایت کی، تو انصار نے اپنے قول سے رجوع کر لیا اور قریش کی اطاعت کی۔ اگر امامت کا فریضہ واجب نہ ہوتا نہ قریش میں نہ کسی دوسرے قبیلہ میں تو یہ مناظرہ اور تلخ گفتگو جائز نہ ہوتی، اور کہنے والا کہہ سکتا تھا کہ خلافت کا امر واجب نہیں ہے نہ قریش میں اور نہ کسی دوسرے قبیلہ میں، تمہارے جھگڑنے کی کیا وجہ ہے؟ اس امر میں لڑنے کا کوئی فائدہ نہیں جو واجب نہیں ہے، پھر سیدنا صدیق اکبر بنٹھنہ کے وصال کا وقت قریب ہوا تو انہوں نے حضرت عمر کو امامت کا عہدہ دیا۔ کسی نے یہ نہیں کہا کہ یہ امر ہم پر اور تم پر واجب نہیں ہے۔ پس یہ خلافت کے وجوب کی دلیل ہے اور یہ دین کے ارکان میں سے ایک رکن ہے جس کے ساتھ مسلمانوں کا قوام اور اجتماع ہے۔

رافضیوں نے کہا: خلیفہ کا قائم کرنا عقلاً واجب ہے اور نقلی دلائل، عقلی تقاضا کی تاکید کی بنا پر وارد ہیں اور رہی امام کی معرفت یہ نقل کی جہت سے پائی گئی ہے نہ کہ عقل کے تقاضا سے۔ یہ قول فاسد ہے کیونکہ عقل نہ کسی چیز کو ثابت کر سکتی ہے نہ منع کر سکتی ہے نہ اسے برا کہہ سکتی ہے۔ س کی تحسین کر سکتی ہے، جب معاملہ اس طرح ہے تو ثابت ہوا کہ یہ شرع کی طرف سے واجب ہے نہ کہ عقل کی جہت سے۔ یہ واضح ہے۔

مسئلہ نمبر 5: جب یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ امامت کے وجوب کا طریق نقلی دلائل ہیں تو ہمیں بتاؤ کہ امام کی معرفت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جہت سے نصوص کے ذریعے واجب ہے یا اہل حل وعقد کے اختیار کی طرف سے ہے یا اس شخص میں ائمہ کے خصال کے کمال کی وجہ سے ہے اور اس کا اپنی طرف سے دعویٰ کرنا کافی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس مسئلہ میں لوگوں کا اختلاف ہے۔ امامیہ وغیرہ کا نظریہ یہ ہے کہ امام کی معرفت کا راستہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے نص ہے، اس میں اختیار کا کوئی دخل نہیں، اور ہمارے نزدیک امام کی معرفت کا طریق غور وفکر اور اہل اجتہاد کا اجماع بھی اس کی معرفت کا ذریعہ ہے۔ وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ امام کی معرفت کا ذریعہ صرف نص ہے انہوں نے اپنے اس نظریہ کی بنیاد اپنے اصول پر رکھی ہے کہ قیاس، رائے اور اجتہاد باطل ہے اس کے ذریعے کسی چیز کی پہچان نہیں ہوتی۔ انہوں نے قیاس کو اصلاً اور فرعاً باطل قرار دیا ہے۔ پھر تین فرقوں کا اختلاف ہوا۔ ایک فرقہ دعویٰ کرتا ہے کہ نص حضرت ابو بکر صدیق بنٹھنہ کی خلافت پر ہے، دوسرا گروہ دعویٰ کرتا ہے کہ نص حضرت عباس بنٹھنہ کی خلافت پر ہے اور تیسرا گروہ دعویٰ کرتا ہے کہ نص حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی خلافت پر ہے۔

کسی معین امام پر نص کے مفقود ہونے پر دلیل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اگر امت پر کسی معین امام کی طاعت کو اس طرح فرض کر دیتے کہ اس سے عدول جائز نہ ہوتا تو آپ بتا دیتے کیونکہ غیر معین امام میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی پوری امت کو تکلیف دینا محال ہے اور ان کے لئے اس تکلیف کے علم کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ جب علم واجب ہو تو پھر اس علم کی یہ صورتیں ہیں یا تو عقلی

دلائل سے ہوگا یا خبر سے ہوگا۔ عقلی دلائل ایسے نہیں جو کسی شخص معین کی امامت کے ثبوت پر دلالت کریں اور خبر میں بھی کوئی ایسی خبر نہیں جو کسی معین امام کے ثبوت کے علم کو ثابت کرے کیونکہ وہ یا تو متواتر ہوگی جو علم ضروری یا استدلالی کو ثابت کرے گی یا خبر اخبار احاد میں سے ہوگی۔ اس کا طریق تواتر ہونا جائز نہیں جو علم ضروری یا علم استدلالی کا موجب ہوتا ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ہر مکلف اس معین کی اطاعت کے وجوب کا علم رکھتا اور اس کے دین سے ہوتا جیسا کہ ہر مکلف کو علم ہے کہ اللہ کے دین سے اس پر پانچ نمازیں، رمضان کے روزے اور بیت اللہ کا حج واجب ہے لیکن معین خلیفہ کی طاعت کو ضرورۃً کوئی بھی نہیں جانتا تو یہ دعویٰ باطل ہوا اور اخبار احاد کے ساتھ معلوم ہونا بھی باطل ہے کیونکہ اس کے ساتھ علم کا وقوع محال ہے۔ اگر امام پر نص کی نقل کا رجوع واجب ہو کہ خواہ نص کیسی بھی ہو تو حضرت ابو بکر اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کی امامت کا اثبات واجب ہوتا کیونکہ ان دونوں میں سے ہر ایک کے لئے ایک قوم اس کی امامت پر صریح نص نقل کرتی ہے، جب نص کے ذریعے ایک وقت میں تینوں کا اثبات باطل ہے...... جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا...... اسی طرح ایک کا اثبات بھی باطل ہے، کیونکہ کوئی گروہ نص کی وجہ سے دوسرے سے اولیٰ نہیں ہے، جب نص کا ثبوت عدم طریق کی وجہ سے باطل ہو گیا تو اختیار اور اجتہاد ثابت ہو گیا۔ اگر کوئی ہٹ دھرم ہٹ دھری کرے اور نص کے ساتھ علم ضروری اور تواتر کا دعویٰ کرے تو اسے فوراً ان لوگوں کے دعویٰ کی نقیض پیش کرنی چاہئے جو حضرت ابو بکر کے بارے نص کے دعویدار ہیں انہیں ان اخبار کا مقابلہ پیش کرنا چاہئے جو اس سے زیادہ ہیں کہ وہ نص کے قائم مقام ہو جاتی ہیں۔ پھر امامیہ فرقہ کے علاوہ نص کی نفی میں لوگوں کی پختہ رائے میں شک نہیں، اور یہ نظریہ خلق کثیر کا اور جم غفیر کا ہے اور علم ضروری ایسا علم ہوتا ہے جس کی نفی پر وہ افراد اجتماع نہیں کر سکتے جن کی تعداد امام کے مخالفین کی تعداد کے دسویں حصہ سے کم ہوں۔ اگر علم ضروری کا اس طرح ناجائز ہوتا تو ایک گروہ کا بغداد اور چین کا انکار کرنا جائز ہوتا۔

مسئلہ نمبر 6: یہ ان احادیث کے رد میں ہے جن سے امامیہ فرقہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں نص ہونے پر حجت پکڑی ہے۔

ا۔ وہ کہتے ہیں: امت اس نص کے انکار کی وجہ سے کافر ہو گئی اور مرتد ہو گئی اس نے عناد کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امر کی مخالفت کی ہے۔

ان نصوص میں سے ایک یہ ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ کنت مولاہ فعلی مولاہ اللھم والِ مَنْ والاہ و عاد من عاداہ (1)۔ وہ کہتے ہیں: اس حدیث میں مولیٰ کا لفظ آیا ہے۔ لغت میں مولیٰ بمعنی اولیٰ ہے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فَعَلِیٌ مولاہ فاء تعقیب کے ساتھ ذکر فرمایا ہے تو معلوم ہوا کہ مولیٰ سے مراد یہ ہے کہ وہ زیادہ حقدار اور زیادہ مستحق ہیں۔ پس اس سے آپ کی امامت مراد ہونا ثابت ہوا۔ اور حضرت علی کی طاعت فرض ہے۔

دوسرا ارشاد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو فرمایا: انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ الا انہ لا نبی بعدی (2)۔ تو

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 12، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب مقدمہ، باب فضل علی بن ابی طالب، حدیث 112، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 526، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب المناقب، باب مناقب علی ابن ابی طالب، حدیث 3430، 4064، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وہ کہتے ہیں: میرے نزدیک اس طرح ہے جس طرح موسیٰ علیہ السلام کے نزدیک ہارون تھے لیکن میرے بعد نبی نہیں ہے حضرت ہارون علیہ السلام کا مقام و مرتبہ معروف ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نبوت میں شریک تھے جبکہ حضرت علی کے لئے نبوت تو نہیں ہے۔ حضرت ہارون، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی تھے حضرت علی، حضور علیہ اسلام کے بھائی بھی نہیں تھے۔ حضرت ہارون، موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ تھے تو معلوم ہوا کہ اس سے مراد خلافت ہی ہے۔ اس کے علاوہ بھی اہل تشیع کے دلائل ہیں جن سے انہوں نے حجت پکڑی ہے، ان دلائل کا ذکر ان شاء اللہ اس کتاب میں آئندہ آئے گا۔

پہلی حدیث کا جواب یہ ہے کہ وہ حدیث متواتر نہیں ہے، اس کی صحت میں اختلاف ہے۔ ابو داؤد سجستانی اور ابو حاتم رازی نے اس کی سند پر جرح کی ہے۔ ان دونوں حضرات نے اس کے بطلان پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد سے استدلال کیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مزینہ و جھینہ و غفار و مسلم موالی دون الناس کلھم لیس لھم مولی دون اللہ و رسولہ (1) مزینہ، جہینہ، غفار اور اسلم قبائل میرے موالی ہیں دوسرے تمام لوگوں کو چھوڑ کر، ان کا اللہ اور اس کے رسول کے سوا کوئی مولیٰ نہیں ہے۔

ہمارے یہ علماء کہتے ہیں: اگر من کنت مولاہ فعلی مولاہ بھی فرمایا ہے تو ان دونوں خبروں میں سے ایک خبر جھوٹی ہوگی۔

دوسرا جواب: یہ ہے کہ خبر اگر صحیح ہو، ثقہ راوی نے ثقہ سے روایت کیا ہو تو پھر بھی اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر دلیل نہیں۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت پر دلالت کرتی ہے وہ اس طرح کہ المولی بمعنی الولی ہو، خبر کا معنی یہ ہوگا: من کنت ولیہ فعلی ولیہ۔ (میں جس کا ولی ہوں، علی اس کا ولی ہے)۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ (التحریم:4) یعنی اللہ تعالیٰ اس کا ولی ہے، اس حدیث سے مقصود لوگوں کو یہ بتانا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ظاہر، ان کے باطن کی طرح ہے۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عظیم فضیلت ہے۔

تیسرا جواب: یہ ہے کہ یہ خبر ایک خاص سبب پر وارد ہوئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ حضرت اسامہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کا جھگڑا ہوا۔ حضرت علی نے حضرت اسامہ سے کہا: انت مولای (تو میرا غلام ہے) حضرت اسامہ نے کہا: لستُ مولاك بل انا مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تمہارا غلام نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا غلام ہوں۔ پس یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ذکر کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: من کنت مولاہ فعلی مولاہ۔ (2) جس کا میں مولی ہوں، علی اس کا مولیٰ ہے۔

چوتھا جواب: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تہمت کے واقعہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا تھا حضور! اس کے علاوہ عورتیں بہت ہیں (3)۔ یہ بات حضرت عائشہ پر شاق گزری، منافقین کو موقع مل گیا، انہوں نے حضرت علی پر طعن کیا اور ان سے برأت کا اظہار کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے لوگوں کی بات کا رد کر کے اور انہوں نے حضرت علی سے برأت اور ان پر

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب ذکر اسلم و غفار و مزینہ و جھینہ و اشجع، حدیث نمبر 3250، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب علی ابن ابی طالب، صفحہ 213، جلد 2 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح بخاری، صفحہ 595، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ کتاب المغازی، باب حدیث الافک، حدیث نمبر 3826، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

طعن کیا تھا اس کو جھٹلاتے ہوئے یہ فرمایا۔ اسی وجہ سے صحابہ کی جماعت سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں منافقین کو حضرت علی کے بغض کی وجہ سے پہچانتے تھے(1)۔

رہی دوسری حدیث تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بمنزلہ ھارون من موسیٰ سے خلافت مراد نہیں لی کیونکہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حضرت ہارون علیہ السلام کا وصال حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے ہوا تھا جیسا کہ سورۂ مائدہ میں ان کی وفات کا بیان آئے گا۔ حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد خلیفہ نہ تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ حضرت یوشع بن نون تھے، اگر انت منی بمنزلۃ ھارون من موسٰی سے مراد خلافت ہوتی تو آپ فرماتے: انت منی بمنزلۃ یوشع من موسٰی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا تو یہ دلیل ہے کہ خلافت مراد نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مراد لیا کہ میں اپنی زندگی اور عدم موجودگی میں اپنے اہل پر خلیفہ بناؤں گا جیسا کہ حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ان کی قوم پر خلیفہ تھے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے رب سے مناجات کے لئے نکلے تھے۔

یہ کہا گیا ہے کہ یہ حدیث ایک سبب خاص پر ارشاد فرمائی۔ وہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوہ تبوک کی طرف تشریف لے گئے تو مدینہ طیبہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا۔ منافقین نے یہ افواہ پھیلائی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بغض اور ناراضگی کی بنا پر خلیفہ بنایا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور عرض کی کہ منافقین ایسا ایسا کہہ رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انہوں نے جھوٹ بولا ہے بلکہ میں نے تجھے اسی طرح اپنا خلیفہ بنایا ہے جس طرح موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کو خلیفہ بنایا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اما ترضی ان تکون منی بمنزلۃ ھارون من موسٰی۔(2) (کیا تجھے پسند نہیں کہ تو میری طرف سے ایسا ہو جیسے موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے ہارون علیہ السلام تھے)۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ آپ نے خلیفہ بنانے کا ارادہ کیا تھا تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ دوسرے کئی صحابہ بھی اس فضیلت میں شریک ہو جائیں گے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر غزوہ میں جاتے وقت کسی نہ کسی صحابی کو اپنا خلیفہ بنایا۔ ان میں سے ابن ام مکتوم اور محمد بن سلمہ وغیرہما صحابہ ہیں۔ اس خبر کا مدار حضرت سعد بن ابی وقاص پر ہے اور یہ خبر واحد ہے، اس کے مقابلہ میں حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کے لئے روایات مروی ہیں جو اس سے اولیٰ ہیں۔ روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ بن جبل کو یمن کی طرف بھیجا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی گئی: حضور! ابو بکر اور عمر کو کیوں نہیں بھیجا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے ان دونوں سے استغناء نہیں کیونکہ ان کا میرے نزدیک اسی طرح مقام ہے جس طرح سر کے لئے کانوں اور آنکھوں کا ہے۔ فرمایا: وہ اہل زمین میں میرے وزیر ہیں۔ یہ بھی مروی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابو بکر اور عمر اسی طرح ہیں جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قریب حضرت ہارون کا مرتبہ تھا(3)۔ یہ خبر ابتداءً وارد ہوئی ہے اور حضرت علی کی خبر ایک سبب پر وارد ہوئی۔ پس ثابت ہوا کہ حضرت ابو بکر حضرت علی رضی اللہ عنہما کی نسبت امامت کے زیادہ حق دار ہیں۔ واللہ اعلم

1۔ جامع ترمذی، کتاب نبی پاک کے فضائل، باب مناقب علی بن ابی طالب، حدیث نمبر 3650، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 633، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب المناقب، باب مناقب علی بن ابی طالب، حدیث 3430، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب علی بن ابی طالب، صفحہ 208، جلد 2 (وزارت تعلیم)

مسئلہ نمبر 7: اس میں اختلاف ہے کہ امام، امام کیسے ہوگا۔ اس کے تین طرق ہیں:

ا۔ نص: اس کے متعلق اختلاف گزر چکا ہے۔ حنابلہ، اہل حدیث کی ایک جماعت حضرت حسن بصری، بکر بن اخت عبد الواحد، اس کے ساتھی اور خوارج کی ایک جماعت کا یہی نظریہ ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر کی خلافت پر اشارہ کے ساتھ نص فرمائی اور حضرت ابو بکر نے حضرت عمر کی خلافت پر نص فرمائی۔ جب خلیفہ بنانے والا کسی ایک شخص کی خلافت پر نص قائم کر دے جیسا کہ حضرت صدیق اکبر نے حضرت عمر کی خلافت پر نص قائم کی تھی یا کسی جماعت کے سپرد یہ کام کر دے جس طرح حضرت عمر نے کیا تھا تو یہ امام ہونے کا دوسرا طریقہ ہے، اور اس جماعت میں سے ایک کے چننے کا اختیار اس جماعت کے سپرد ہوگا جیسا کہ صحابہ کرام نے حضرت عثمان کی تعیین میں کیا تھا۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اس کے متعلق اہل حل وعقد کا اجماع ہو جائے۔ وہ اس طرح ہے مسلمانوں کے کسی شہر میں ایک جماعت ہو جب ان کا امام فوت ہو جائے اور ان کا امام نہ ہو اور نہ مرنے والے نے کسی کو خلیفہ بنایا، پھر جس شہر میں وہ امام موجود تھا اس شہر والے اپنے لئے کسی کو امام بنا دیں اس پر اجماع ہو جائے اور وہ لوگ اس سے خوش ہوں تو آفاق میں آگے پیچھے جہاں بھی مسلمان موجود ہیں ان کو اس امام کی طاعت میں داخل ہونا واجب ہے جبکہ وہ امام اعلانیہ فسق وفساد کرنے والا نہ ہو کیونکہ یہ دعوت ان کو محیط ہے اس کا قبول کرنا واجب ہے کسی کو اس سے انکار کی گنجائش نہیں۔ کیونکہ دو اماموں کے قائم کرنے میں کلمہ کا اختلاف ہے اور واضح فساد ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین چیزوں کی وجہ سے مومن کے دل میں کھوٹ اور نفاق نہیں ہوتا: (۱) اللہ تعالیٰ کے لئے عمل میں اخلاص۔ ۲۔ جماعت کا لزوم ۳۔ اپنے حکمرانوں سے خلوص کا اظہار کیونکہ مسلمانوں کی دعوت ان کے ذریعے محفوظ ہے۔

مسئلہ نمبر 8: اگر ایک شخص اہل حل وعقد میں سے کسی کو خلیفہ نامزد کر دے تو وہ ثابت ہو جائے گا اور دوسروں پر اس کو تسلیم کرنا لازم ہو جائے گا لیکن بعض لوگ اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: یہ خلیفہ نامزد اہل حل وعقد میں سے ایک جماعت کرے گی۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر کی بیعت کی تو کسی صحابی نے اس کا انکار نہ کیا، چونکہ یہ بھی ایک عقد ہے اس لئے کسی تعداد کی ضرورت نہیں جو اس کو منعقد کریں جس طرح کہ دوسری عقود ہیں۔ امام ابو المعالی نے کہا: جس کے لئے ایک شخص کے عقد کے ساتھ امامت منعقد ہو جائے تو امامت لازم ہو جائے گی، بغیر حدث اور تغیر امر کے اس کو معزول کرنا جائز نہیں۔ انہوں نے فرمایا: اس پر اجماع ہے۔

مسئلہ نمبر 9: اگر کوئی ایسا شخص عہدہ امامت پر غلبہ کرلے جس کو امامت کی اہلیت ہو اور وہ امامت قہر اور غلبہ سے حاصل کرلے تو کہا گیا ہے کہ یہ امامت کا چوتھا طریقہ ہے۔ حضرت سہل بن عبد اللہ تستری سے پوچھا گیا: ہم پر اس شخص کے لئے کیا واجب ہے جو ہمارے شہروں پر غلبہ حاصل کرلے جبکہ وہ امام ہو؟ حضرت عبد اللہ نے فرمایا: تم اس کو تسلیم کرو اور اپنے حق میں سے جو وہ مطالبہ کرے اسے ادا کرو اور اس کے افعال کا انکار کرو اور اس سے مت بھاگو۔ جب اس نے تجھے امر دین میں سے کسی راز کا امین بنایا ہے تو تم اسے افشا نہ کرو۔

ابن خویز منداد نے کہا: جو شخص خود بخود تخت خلافت پر کود پڑے جبکہ وہ خلافت کی صلاحیت رکھتا ہو جبکہ اس نے نہ کسی سے مشورہ کیا ہو، نہ اسے اختیار کیا گیا ہو اور لوگوں نے اس کی بیعت کر لی ہو تو اس کے لئے بیعت مکمل ہوگئی۔

مسئلہ نمبر 10: امامت کی عقد پر شہادت میں اختلاف ہے۔ ہمارے بعض علماء نے کہا: گواہوں کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ شہادت تو قطعی نقلی دلیل کے ساتھ ثابت ہوتی ہے۔ یہاں کوئی قطعی نقلی دلیل نہیں ہے جو شہادت کے اثبات پر دلالت کرے۔ بعض علماء نے فرمایا: گواہوں کی ضرورت ہے۔ جس نے یہ کہا ہے انہوں نے اس طرح حجت پکڑی ہے کہ اگر امر امامت پر شہادت منعقد نہ ہوگی تو ہر شخص یہ دعویٰ کر دے گا کہ سراً اس کی امامت قائم ہوئی ہے اور یہ چیز فتنہ اور جنگ تک پہنچا دے گی۔ پس ثابت ہوا کہ شہادت معتبر ہے اس میں دو گواہ کافی ہیں، جبکہ جبائی کا قول اس کے مخالف ہے۔ اس نے کہا: چار گواہ، ایک امام بنانے والا اور ایک امام بننے والا ہو کیونکہ حضرت عمر نے چھ آدمیوں کو مشورہ سونپا تھا۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ ہمارے درمیان اور اس کے درمیان اختلاف نہیں ہے کہ دو آدمیوں کی گواہی معتبر ہے اور جو زائد ہیں ان میں اختلاف ہے اور زیادتی پر کوئی دلیل قائم نہیں ہے۔ پس زیادتی کا اعتبار نہ ہوگا۔

مسئلہ نمبر 11: امام کی شرائط۔ یہ گیارہ ہیں:

ا۔ امام کا تعلق قریش کے خاندان سے ہو کیونکہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: الائمۃ من قریش (1) (قریش میں سے ائمہ ہوں گے) اس میں اختلاف ہے۔

۲- وہ مسلمانوں کا قاضی بننے کی صلاحیت رکھتا ہو، اجتہاد کرنے والا ہو اور اسے حوادث میں دوسروں سے استفتاء کی ضرورت نہ ہو۔ یہ متفق علیہ ہے۔

۳- وہ دانشمند اور صاحب رائے ہو، جنگی امور، لشکروں کی تدبیر، سرحدوں کی حفاظت، ملت اسلامیہ کی حمایت، امت کو انتشار سے روکنے، ظالم سے انتقام لینے اور مظلوم کو اپنا حق دلانے کی قدرت رکھتا ہو۔

۴- وہ ایسا شخص ہو کہ حدود قائم کرنے میں اسے رقت لاحق نہ ہو اور گردنوں کو اڑانے اور جسم کو کاٹنے سے مت گھبرائے۔ ان سب پر دلیل صحابہ کرام کا اجماع ہے کیونکہ ان کے درمیان اختلاف نہیں ہے۔ ضروری ہے کہ یہ صفات اس شخص میں جمع ہوں کیونکہ یہ شخص قاضیوں اور دوسرے حکمرانوں کا والی ہوتا ہے اور اس کے خود فیصلہ کرنے اور حکم کرنے کی صلاحیت بھی ہو، خلفاء کے امور اور قاضیوں کے فیصلوں کی چھان بین کر سکتا ہو اور یہ امور صرف وہی بجا لا سکتا ہے جو عالم ہو اور علم میں پختہ ہو۔

۵-۶: وہ آزاد ہو۔ امام کے آزاد ہونے اور اس کے مسلمان ہونے کی شرط میں کوئی خفا نہیں، اس کا مسلمان ہونا یہ چھٹی شرط ہے۔

۷-۸: وہ مذکر ہو۔ اس کے اعضاء سلامت ہوں۔ اس پر اجماع ہے کہ عورت کا امام ہونا جائز نہیں اگرچہ اس کے قاضی ہونے کے جواز میں اختلاف ہے ان امور میں جس میں عورت کی شہادت جائز ہے۔

۹-۱۰: وہ عاقل، بالغ ہو۔ اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں۔

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 497، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب المناقب، باب مناقب قریش، حدیث 3239، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

11: وہ عادل ہو کیونکہ امت میں کوئی اختلاف نہیں کہ فاسق کے لئے امامت کی ذمہ داری جائز نہیں۔ ضروری ہے کہ وہ علم میں لوگوں سے افضل ہو کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: تمہارے ائمہ تمہارے سفارشی ہیں۔ غور کرو کس سے سفارش طلب کر رہے ہو(1)۔ قرآن حکیم میں حضرت طالوت علیہ السلام کے وصف میں فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (البقرہ: 247) (بے شک اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے اسے تمہارے مقابلہ میں اور زیادہ دی ہے کشادگی علم میں اور جسم میں)۔

اللہ تعالیٰ نے پہلے علم کا ذکر کیا ہے پھر اس چیز کا ذکر فرمایا جو قوت اور اعضاء کی سلامتی پر دلالت کرتی ہے۔ اصْطَفٰىهُ کا معنی ہے: اس نے اسے چن لیا۔ یہ نسب کی شرط پر دلیل ہے، اس کی شرائط میں گناہوں اور خطا سے معصوم ہونا نہیں ہے نہ اس کا عالم بالغیب ہونا ضروری ہے نہ اس کا افراد امت میں سب سے زیادہ بہادر اور گھوڑ سواری میں ماہر ہونا شرائط میں سے ہے اس کا صرف بنی ہاشم سے ہونا بھی شرط نہیں ہے کیونکہ حضرت ابو بکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان کی امامت پر اجماع ہے حالانکہ وہ بنی ہاشم میں سے نہ تھے۔

مسئلہ نمبر 12: فاضل کے ہوتے ہوئے فتنہ کے خوف سے مفضول کو امام بنانا جائز ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ امت کا امر درست نہ ہو۔ یہ اس لئے ہے کہ امام اسی لئے بنایا جاتا ہے تا کہ دشمن سے دفاع کرے، ملت بیضاء کی حمایت کرے، خلل کو روکے اور حقوق ادا کرے، حدود کو قائم کرے، بیت المال کے لئے مال جمع کرے اور اسے مستحق لوگوں پر تقسیم کرے۔ جب افضل شخص کو مقرر کرنے پر جنگ، فساد اور ان امور کے ضیاع کا خوف ہو جن کے لئے امام مقرر کیا جاتا ہے تو یہ فاضل سے مفضول کی طرف عدول کرنے کا ظاہر عذر ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر اور ساری امت کو مشورہ کے وقت معلوم تھا کہ ان چھ افراد میں فاضل اور مفضول موجود تھے۔

حضرت عمر نے ان میں سے ہر ایک کے لئے اس ذمہ داری کی اجازت دی تھی جب مصلحت اس کا تقاضا کرتی تھی اس پر امت کا اجماع ہوا تھا کسی نے انکار نہیں کیا تھا۔

مسئلہ نمبر 13: جب امام مقرر کیا جائے پھر تقرر کے بعد فاسق ہو جائے تو جمہور علماء کا قول ہے کہ اس کی امامت ختم ہو جائے گی اور ظاہر معلوم فسق کی وجہ سے وہ معزول کر دیا جائے گا کیونکہ یہ ثابت ہے کہ امام حدود کو قائم کرنے، حقوق ادا کرنے، یتیموں اور مجنونوں کے مال کی حفاظت کرنے اور ان دوسرے امور کی نگرانی کے لئے مقرر کیا جاتا ہے جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے اور جس شخص میں فسق ہوگا وہ ان امور کو قائم نہیں کر سکے گا، ان کے قیام سے عاجز ہوگا۔ اگر ہم فاسق کی امامت جائز قرار دیں تو ان امور کا ابطال لازم آئے گا جن کے لئے اسے مقرر کیا جاتا ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ ابتداء میں بھی فاسق کو امام بنانا جائز نہیں ہوتا کیونکہ ان امور کا ابطال لازم آتا ہے جن کے لئے وہ مقرر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح یہاں بھی ہوگا۔ دوسرے علماء نے فرمایا: امام معزول نہیں ہوگا مگر یہ کہ وہ کفر کرے یا نماز کا پڑھنا ترک کر دے یا نماز کی طرف بلانا

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب الاستسقاء، صفحہ 139، جلد 1 (وزارت تعلیم)

ترک کر دے یا شریعت کا کوئی امر ترک کر دے کیونکہ حدیث عبادہ میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''ہم امامت میں اس کے اہل لوگوں سے نہیں جھگڑیں گے۔ فرمایا: مگر یہ کہ تم اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا ظاہر کفر دیکھو جس میں دلیل ہو''(1)۔ اور حضرت عوف بن مالک کی حدیث میں ہے اس وقت تک نہیں جب تک وہ تم میں نماز کو قائم کریں(2)۔ ان دونوں حدیثوں کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت ام سلمہ سے مروی ہے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: تم پر امراء بنائے جائیں گے۔ جس نے ناپسند کیا وہ بری ہو گیا جس نے انکار کیا وہ سلامت ہو گیا لیکن جوان سے راضی ہوا اور ان کی پیروی کی .... صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! کیا ہم ان سے جنگ نہ کریں؟ فرمایا: نہیں جب تک وہ نماز پڑھیں۔ یعنی جس نے دل سے ناپسند کیا اور دل سے انکار کیا(3)، اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 14: جب امام اپنے آپ میں ایسا نقص پائے جو اس کی امامت میں موثر ہوتا ہو تو اسے معزول ہو جانا واجب ہے، اور جب ایسا نقص نہ پائے تو کیا اس کو معزول ہونا چاہئے اور کسی غیر کی بیعت کر لینی چاہئے اس میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو اس کی امامت ختم نہ ہوگی۔ بعض نے فرمایا: اسے معزول ہو جانا چاہئے۔ اس پر دلیل کہ امام جب اپنے آپ کو معزول کرے گا تو معزول ہو جائے گا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قول ہے اقیلونی اقیلونی، ''مجھ سے بیعت واپس لے لو...... مجھ سے بیعت واپس لے لو''۔ اور صحابہ نے کہا: ہم نہ تجھ سے بیعت واپس لیتے ہیں نہ ہم اس کا مطالبہ کرتے ہیں تجھے رسول اللہ ﷺ نے ہمارے دین کے لئے مقدم کیا تھا۔ پس کس کی مجال کہ تجھے ہٹائے۔ تجھ سے رسول اللہ ﷺ ہمارے دین کے لئے راضی ہوئے تو ہم آپ سے راضی نہ ہوں گے۔ اگر حضرت ابوبکر کے لئے ایسا کرنا جائز نہ ہوتا تو صحابہ کرام اس کا انکار کرتے اور حضرت ابو بکر سے کہتے تجھے یہ کہنا درست نہیں اور آپ کے لئے ایسا کرنا صحیح نہیں۔ جب صحابہ کرام اس پر قائم رہے تو معلوم ہوا کہ امام کے لئے ایسا کرنا جائز ہے چونکہ امام دوسروں کی نگرانی کرنے والا ہوتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ اس کا حکم حاکم کا حکم ہو، اور وکیل جب اپنے آپ کو معزول کر سکتا ہے امام بھی امت کا وکیل اور اس کا نائب ہوتا ہے۔ جب وکیل، حاکم اور ہر نائب کے بارے میں اتفاق ہے کہ وہ اپنے آپ کو معزول کر سکتا ہے تو امام بھی اسی طرح ہوتا ہے اس کا بھی اس کی مثل ہونا واجب ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 15: جب ارباب حل وعقد کے اتفاق سے یا ایک آدمی کے ذریعے کسی امام کی امامت منعقد ہو جائے تو تمام لوگوں پر واجب ہے کہ وہ حکم سننے اور اطاعت کرنے، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی اقامت پر بیعت کریں اور جو کسی عذر کی بناء پر بیعت سے انکار کرے تو اس کا عذر قبول کیا جائے گا اور جو بغیر عذر کے انکار کرے تو اس پر جبر کیا جائے گا، تا کہ مسلمانوں کی جمعیت کا شیرازہ بکھر نہ جائے۔ جب دو خلیفوں کی بیعت کی جائے تو پہلا خلیفہ ہوگا اور دوسرا قتل کیا جائے گا۔ اس

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب وجوب طاعۃ الامراء فی غیر معصیۃ، صفحہ 125، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ ایضاً، کتاب الامارۃ، باب بخیار الائمۃ وشرارھم، صفحہ 129، جلد 2

3۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب وجوب الانکار علی الامراء، صفحہ 128، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

کے قتل میں اختلاف ہے کیا یہ قتل حساً ہے یا معنی ہے۔ پس اس کا معزول کرنا اس کا قتل اور اس کی موت ہے۔ پہلا معنی ظاہر ہے (یعنی اسے قتل کیا جائے گا)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب دو خلیفوں کی بیعت کی جائے تو ان میں سے دوسرے کو قتل کر دو (1)۔ اس حدیث کو حضرت ابوسعید خدری نے روایت کیا ہے اور مسلم نے نقل کی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو کی حدیث میں نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ جو ایک امام کی بیعت کر لے، اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دے اور دل کا خلوص پیش کر دے تو اسے اس کی اطاعت کرنی چاہئے اگر اسے استطاعت ہے۔ اگر کوئی دوسرا امام آ جائے تو وہ اس سے لڑے اور دوسرے امام کی گردن اتار دے (2) اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت عرفجہ کی حدیث میں ہے، اس کو تلوار سے مارو خواہ کوئی بھی ہو (3)۔ یہ دو امام مقرر نہ ہونے پر بڑی واضح دلیل ہے کیونکہ یہ چیز نفاق، مخالفت، انتشار، فتنوں کے ظہور اور نعمتوں کے زوال کا باعث بنتی ہے لیکن اگر قطر بہت دور ہوں اور علاقے جدا جدا ہوں جیسے اندلس اور خراسان تو پھر ہر علاقہ کے لئے علیحدہ امام جائز ہے جیسا کہ مزید بیان آئندہ آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 16: اگر کوئی شخص عادل امام کے خلاف خروج کرے تو لوگوں پر اس سے جنگ کرنا واجب ہے۔ اگر امام فاسق ہو اور خروج کرنے والا عدل کو ظاہر کرنے والا ہو پھر بھی لوگوں کو مناسب نہیں کہ وہ اس خروج کرنے والے کی نصرت میں جلدی کریں حتیٰ کہ جو وہ عدل ظاہر کرتا ہے وہ واضح ہو جائے یا پہلے امام کے معزول کرنے پر سارے لوگ متفق ہو جائیں۔ یہ اس لئے کہ ہر شخص جو اس قسم کا معاملہ طلب کرتا ہے وہ اپنی طرف سے صلاح کا نعرہ لگاتا ہے حتیٰ کہ جب غالب آ جاتا ہے تو پھر اپنی اصل حالت کی طرف لوٹ آتا ہے جو اس کے ظاہری صلاح کے خلاف ہوتی ہے۔

مسئلہ نمبر 17: ایک زمانہ میں اور ایک شہر (ملک) میں دو یا تین اماموں کا قیام بالکل جائز نہیں جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ امام ابوالمعالی نے کہا: ہمارے اصحاب عالم کی دونوں طرفوں میں دو شخصوں کی امامت کی ذمہ داری کے عدم جواز کا نظریہ رکھتے ہیں۔ پھر انہوں نے فرمایا: اگر دو شخصوں کے لئے امامت کی عقد پر اتفاق ہو جائے تو یہ اس کے قائم مقام ہو گا کہ ایک عورت کے دو ولیوں نے دو خاوندوں سے نکاح کر دیا جبکہ ہر ایک کو دوسرے عقد کا شعور نہ تھا۔ فرمایا: میرے نزدیک اس میں یہ ہے کہ دو شخصوں کے لئے امامت کی عقد قریبی علاقوں میں تو جائز نہیں اس پر اجماع ہے ہاں جب دونوں اماموں کے درمیان بہت زیادہ دوری ہو تو پھر اس میں احتمال کی گنجائش ہے۔ استاذ ابواسحاق نے ان دو سلطنتوں میں دو اماموں کا تقرر جائز قرار دیا جو ایک دوسرے سے بہت دور ہوں تاکہ لوگوں کے حقوق اور احکام معطل نہ ہوں۔ کرامیہ فرقہ بغیر تفصیل کے دو امام مقرر کرنے کا نظریہ رکھتے ہیں۔ انہیں پھر ایک شہر میں بھی اس کی اجازت دینا لازم آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ اور

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب اذا بویع لخلیفتین، صفحہ 128، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب وجوب الوفاء ببیعۃ الخلفاء الاول، صفحہ 126، جلد 2

3۔ ایضاً، کتاب الامارۃ، باب حکم من فرق امر المسلمین، صفحہ 128، جلد 2

حضرت امیر معاویہ دونوں امام تھے۔ انہوں نے کہا: جب دو شہروں یا دو طرفوں میں دو امام ہوں گے تو ہر ایک اپنے علاقہ کے معاملات پر زیادہ کنٹرول کرے گا اور اس کے معاملات زیادہ نگرانی سے چلائے گا۔ دوسری دلیل یہ دیتے ہیں کہ جب ایک زمانہ میں دو نبیوں کی بعثت جائز ہے اور یہ چیز نبوت کے ابطال تک نہیں پہنچاتی تو امامت بدرجہ اولیٰ جائز ہوگی اور یہ چیز امامت کے ابطال تک نہیں پہنچائے گی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جائز ہوتا اگر اس سے شرع نے منع نہ کیا ہوتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: فاقتلوا الاخر منھما۔(1) "دونوں اماموں میں سے جو دوسرا ہے اسے قتل کر دو"۔ امت کا اتفاق اسی پر رہا ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا مسئلہ انہوں نے اپنے لئے امامت کا دعویٰ نہیں کیا تھا وہ شام کی ولایت کے مدعی تھے کہ پہلے ائمہ نے انہیں شام کی حکمرانی دی تھی۔ اس پر دلیل ان کے دور میں ائمہ کا اجماع ہے کہ امام ایک ہے، ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ میں امام ہوں اور میرا مخالف بھی امام ہے۔ اگر وہ کہیں عقل اسے محال قرار نہیں دیتی اور نقل میں کوئی چیز اس سے مانع نہیں تو ہم کہیں گے: نقلی دلائل میں سے قوی ترین دلیل اجماع ہے اور وہ اس کے منع کا حکم دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا ہم قطعی طور پر جانتے ہیں کہ ملائکہ وہی کچھ جانتے ہیں جو انہیں بتایا گیا، اور وہ اللہ تعالیٰ کے قول سے سبقت نہیں لے جاتے اور یہ تمام ملائکہ کے بارے میں ہے کیونکہ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ (الانبیاء: 27) کا ارشاد ان کی مدح کے لئے ذکر کیا گیا ہے، پھر انہوں نے کیسے کہا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے جب انہوں نے خلیفہ کا لفظ سنا تو وہ سمجھے کہ بنی آدم میں کچھ لوگ فساد کریں گے کیونکہ خلیفہ کا مقصود اصلاح اور ترک الفساد ہوتا ہے لیکن انہوں نے تمام لوگوں پر معصیت کا حکم لگا دیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ ان میں سے بعض فساد کریں گے اور بعض فساد نہیں کریں گے۔ پس ان کے دلوں کو خوش کرنے کے لئے فرمایا: اِنِّيْٓ اَعْلَمُ اور اس چیز کو ثابت فرمایا کہ اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو اسماء کا علم سکھایا اور ان کے لئے اپنے پوشیدہ علم سے پردہ اٹھایا۔ بعض علماء نے فرمایا: ملائکہ نے دیکھا اور جان لیا تھا جو کچھ جنوں نے فساد برپا کیا تھا اور خونریزی کی تھی۔ یہ اس طرح ہے کہ زمین میں آدم کی تخلیق سے پہلے جن رہتے تھے، انہوں نے فساد کیا اور خونریزی کی۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف ابلیس کو ملائکہ کے لشکر میں بھیجا۔ پس اس نے انہیں قتل کیا اور بعض کو سمندروں اور پہاڑوں پر بھگا دیا۔ پس اس وقت شیطان کو عزت ملی تو فرشتوں نے محض استفہام کی جہت سے اَتَجْعَلُ فِيْهَا کہا۔ کیا یہ خلیفہ پہلے جنوں کے طریقہ پر ہوگا یا نہیں؟ یہ احمد بن یحییٰ ثعلب کا قول ہے۔

ابن زید وغیرہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے انہیں بتایا کہ خلیفہ آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے کچھ لوگ زمین میں فساد کریں گے اور خون ریزی کریں گے تو انہوں نے یہ قول کیا(2)۔ انہوں نے یا تو گنہگار کو خلیفہ بنانے پر تعجب کرتے ہوئے یہ سوال کیا یا اس اعتبار سے کہ جس کو اللہ تعالیٰ اپنی زمین میں خلیفہ بنا رہا ہے اور جس پر یہ انعام کیا گیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے گا۔ بڑی تعجب کی بات ہے یا اس کام کو بہت بڑا سمجھتے ہوئے یہ سوال کیا کہ اسے خلافت بھی ملے گی اور وہ نافرمان بھی ہوگا۔ حضرت قتادہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب اذا بویع لخلیفتین، صفحہ 128، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 117، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

نے کہا: اللہ تعالیٰ نے انہیں بتایا کہ جب وہ زمین میں مخلوق پیدا کرے گا تو وہ فساد برپا کریں گے اور خونریزی کریں گے۔ انہوں نے یہ سوال کیا جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً، کیا یہ وہی ہے جس کے متعلق انہیں بتایا یا کوئی اور ہے۔ یہ قول بہتر ہے یہ عبدالرزاق نے روایت کیا ہے۔ فرمایا: ہمیں معمر نے قتادہ سے روایت کر کے اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا کی تفسیر میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بتایا کہ زمین میں جب مخلوق ہوگی تو وہ اس میں فساد برپا کرے گی اور خون ریزی کرے گی۔ اسی وجہ سے انہوں نے کہا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا کلام میں ان کے مذہب پر حذف ہے معنی یہ ہے کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں جو ایسا ایسا کرے گا تو فرشتوں نے کہا: کیا زمین میں تو اسے خلیفہ بنانے والا ہے جس کے بارے میں ہمیں بتایا تھا یا کوئی اور ہے۔ پہلا قول بہت بہتر ہے کیونکہ اس میں علم کا استخراج اور استنباط الفاظ کے مقتضیٰ سے ہے اور یہ نہیں ہو سکتا مگر علماء سے جو ان دونوں اقوال کے درمیان حسن ہے۔ اس میں غور و فکر کر۔ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرشتوں سے سوال کرنا کہ تم نے میرے بندوں کو کیسے چھوڑا (1) ... جیسا کہ مسلم وغیرہ میں ثابت ہے۔ تو یہ ان کو توبیخ کرنے کے لئے ہے جنہوں نے کہا تھا: اَتَجْعَلُ فِیْهَا، اور اپنی ازلی معلومات کا اظہار ہے کیونکہ انہیں فرمایا اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (بے شک میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا، مَنْ تجعل کا مفعول ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور فیہا دوسرے مفعول کے قائم مقام ہے۔ یفسد لفظ کے اعتبار سے ہے غیر قرآن میں معنی کے اعتبار سے یفسدون بھی جائز ہے۔ قرآن حکیم میں ہے: وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّسْتَمِعُ اِلَیْكَ (الانعام: 25) یہ لفظ کے اعتبار سے ہے معنی کے اعتبار سے یستمعون ہے۔ (ویسفك) یہ معطوف ہے اس میں دو وجہیں جائز ہیں۔ اسید نے اعرج سے روایت کیا کہ انہوں نے ویسفكَ الدماء، پڑھا ہے یعنی مضارع کو منصوب پڑھا ہے اور واؤ کے ساتھ اسے استفہام کا جواب بنایا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا

الم اك جاركم و تكون بينی و بينكم المودة والاخاء

کیا میں تمہارا پڑوسی نہ تھا اور میرے اور تمہارے درمیان محبت و بھائی چارہ نہ تھا۔

السفك کا معنی انڈیلنا (بہانا) ہے سفکت الدم اسفکہ سفکاً۔ میں نے خون کو بہایا اسی طرح آنسو بہانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یہ ابن الفارس اور جوہری کا قول ہے۔

السفاك، کا معنی السفاح ہے جو کلام پر قادر ہو۔ مہدوی نے کہا: السفك صرف خون بہانے کے لئے استعمال ہوتا ہے کبھی کلام کی نثر کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: سفك الكلام جب وہ کلام کرے۔ الدماء کا مفرد دم ہے، لام کلمہ محذوف ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کی اصل دَمْیٌ ہے۔ بعض نے فرمایا: دَمَیٌ ہے اور کوئی اسم دو حرفوں پر نہیں آتا مگر اس سے حرف حذف کیا گیا ہوتا ہے۔ دم سے محذوف یا ہے اور کبھی اصل پر بھی بولا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا:

فلو أنا على حجر ذبحنا جرى الدميان بالخبر اليقين

اگر ہم اس پتھر پر ہوتے تو ہم ذبح کئے جاتے، یقیناً دونوں طرف سے خون جاری ہوتے۔

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 457، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائکہ، حدیث 2984، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ (یعنی ہم تیری پاکیزگی بیان کرتے ہیں)۔ ان صفات سے جو تیری شان کے لائق نہیں، التسبیح کا معنی تعظیم کے طور پر ہر نقص سے پاکیزگی بیان کرنا ہے۔ اسی سے اعشیٰ کا قول ہے:

اقول لما جاء نی فخرہ　　سبحان من علقمه الفاخر

میں کہتا ہوں: جب میرے پاس اس کا فخر آیا، میں علقمہ فخر کرنے والے سے برأت کرتا ہوں۔

حضرت طلحہ بن عبید اللہ سے مروی ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سبحان اللہ کی تفسیر پوچھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی ہر نقص اور عیب سے پاکیزگی بیان کرنا، یہ السبح سے مشتق ہے جس کا معنی چلنا اور جانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۝ (المزمل) (بے شک دن میں مصروفیت ہے) پس سبحان اللہ کہنے والا اللہ کی ہر نقص اور عیب سے پاکیزگی بیان کرنے میں چلنے والا ہے نحن میں کلام گزر چکی ہے نون کو نون میں ادغام کرنا جائز نہیں تاکہ دو ساکن جمع نہ ہوں۔

مسئلہ: اہل تاویل کا فرشتوں کی تسبیح میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس نے فرمایا: فرشتوں کی تسبیح ان کی نماز ہے (1)، اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ۝ (الصافات) یعنی اگر وہ نمازیوں میں سے نہ ہوتا۔ بعض علماء نے فرمایا: ان کی تسبیح، ذکر کے ساتھ آواز کو بلند کرنا ہے۔ مفضل نے یہی کہا ہے اور جریر کے قول سے استشہاد کیا ہے

قبح الالهُ وجوه تغلب کلما　　سبح الحجیج و کبّروا اهلالا

تغلب کے چہروں کو اللہ تعالیٰ نے قبیح کیا جب حاجیوں نے بلند آواز سے ذکر کیا اور تلبیہ کہا۔

حضرت قتادہ نے کہا: ان کی تسبیح سبحان اللہ ہے (2) عرف کے مطابق لغت میں یہ صحیح ہے کیونکہ حضرت ابوذر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کون سا کلام افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جو ملائکہ کے لئے چنا ہے (یا اپنے بندوں کے لئے چنا ہے) سبحان اللہ وبحمدہ، اس کو مسلم نے نقل کیا ہے (3)۔ حضرت عبدالرحمن بن قرط سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جس رات سیر کرائی گئی آپ نے اوپر والے آسمانوں میں یہ تسبیح سنی: سبحان العلی الاعلی سبحانہ و تعالیٰ۔ اس کو بیہقی نے ذکر کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِحَمْدِكَ یعنی ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کو ملاتے ہیں۔ الحمد کا معنی ثنا (تعریف) ہے پہلے گزر چکا ہے، یہ بھی احتمال ہے کہ بِحَمْدِكَ دو کلاموں کے درمیان جملہ معترضہ ہو۔ گویا انہوں نے کہا: ہم تیری تسبیح و تقدیس بیان کرتے ہیں پھر تسلیم کی جہت پر معترض کلام ذکر کی یعنی تو اس کی طرف ہدایت میں محمود ہے (4)۔ واللہ اعلم

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 118، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)　2۔ ایضاً

3۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب فضل سبحان اللہ وبحمدہ، صفحہ 351، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

4۔ المحرر الوجیز، صفحہ 118، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَنُقَدِّسُ لَكَ یعنی ہم تیری تعظیم کرتے ہیں اور ہم تیری بزرگی بیان کرتے ہیں اور ہم تیرے ذکر کو ان خرافات سے پاک کرتے ہیں جو ملحد لوگ تیرے بارے میں کہتے ہیں۔ یہ مجاہد اور ابو صالح وغیرہما کا قول ہے۔ ضحاک وغیرہ نے کہا: ہم تیری رضا چاہتے ہوئے اپنے نفسوں کو تیرے لئے پاک کرتے ہیں۔ بعض علماء نے کہا جن میں قتادہ بھی ہیں: نقدس لک اس کا معنی ہے ہم نماز پڑھتے ہیں اور التقدیس کا معنی نماز ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ ضعیف ہے (1)۔

میں کہتا ہوں بلکہ اس کا معنی صحیح ہے کیونکہ نماز تعظیم، تقدیس اور تسبیح پر مشتمل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رکوع اور سجود میں کہتے تھے: سبوح قدوس رب الملائکہ و الروح۔ (2) یہ حضرت عائشہ نے روایت کی ہے اور مسلم نے نقل کی ہے۔ قدس کی بنا پر جیسے بھی بنائی جائے اس کا معنی پاک کرنا ہی ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ (المائدہ: 21) یعنی پاک زمین میں داخل ہو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ (الحشر: 23) یعنی طاہر۔ اس کی مثل ہے بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۞ (النازعات) بیت المقدس کو یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ یہ وہ مکان ہے جس میں انسان گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے لوٹے کو قدس کہا جاتا ہے کیونکہ اس سے وضو کیا جاتا ہے اور طہارت حاصل کی جاتی ہے۔ اسی سے القادوس ہے۔ حدیث پاک میں ہے اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو پاک نہیں فرمایا جو ضعیف کے لئے قوی سے مواخذہ نہیں کرتی (3)۔ ابن ماجہ نے اسے اپنی سنن میں نقل کیا ہے۔ القدس پاکیزگی۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ شاعر کا قول ہے:

فادرکنہ یاخذن بالساق والنسا　　　　کما شبرق الولدان ثوب المقدس

کتوں نے بیل کو پنڈلیوں اور رانوں سے اس طرح پکڑ لیا ہے جیسے نصاریٰ کے بچے اپنے راہب کے کپڑوں کو تبرک کے لئے کاٹ لیتے ہیں۔

نماز بندے کو گناہوں سے پاک کرنے والی ہے، نمازی نماز میں اکمل حالات میں داخل ہوتا ہے کیونکہ نماز افضل عمل ہے۔ واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ، أَعْلَمُ میں دو تاویلیں ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ فعل مضارع ہے۔ بعض نے فرمایا: اسم بمعنی فاعل ہے جیسے کہا جاتا ہے: اللہ اکبر بمعنی کبیر جیسا کہ شاعر نے بھی کہا ہے:

لعمرك ما ادری و انی لأوجل　　　　علی أینا تعدو المنیة اوّلُ

تیری عمر کی قسم! میں نہیں جانتا اور مجھے خوف ہے موت ہم میں سے کس پر پہلے آتی ہے۔

اگر اعلم فعل ہو تو ما اعلم کی وجہ سے محل نصب میں ہوگا اور میم کا میم میں ادغام بھی جائز ہے، اگر تو اسے عالم کے معنی میں اسم بنائے تو (ما) اضافت کی وجہ سے محل جر میں ہوگا۔

ابن عطیہ نے کہا: نحویوں کے اجماع کی وجہ سے اس کو منصرف بنانا صحیح نہیں۔ اختلاف افعل میں ہے جب اس کے ساتھ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوۃ، باب مایقول فی الرکوع والسجود، صفحہ 292، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
2۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 177، جلد 1 (وزارت تعلیم)　　3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 118، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

نام رکھا جائے اور یہ نکرہ ہو۔ سیبویہ اور خلیل اس کو غیر منصرف بناتے ہیں اخفش اسے منصرف بناتا ہے (1)۔ مہدوی نے کہا: أَعْلَمُ میں تنوین مقدر کرنا جائز ہے جب تو اسے عالم کے معنی میں مقدر کرے، اور ماکو اس کی وجہ سے نصب ہوگی۔ یہ حواج بیت اللہ کی مثل ہوگا۔ جوہری نے کہا: نسوۃ حواج بیت اللہ اضافت کے ساتھ جب وہ حج کریں اور اگر وہ حج نہ کریں تو تو کہے گا حواج بیت اللہ۔ بیت کو تو نصب دے گا کیونکہ حواج میں تنوین کا ارادہ کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَالَا تَعْلَمُوْنَ اس ارشاد کی تاویل میں علماء تاویل کا اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: ابلیس (لعنۃ اللہ علیہ) نے غرور کیا اور اس میں تکبر داخل ہوا۔ جب اللہ تعالیٰ نے اسے آسمان کا خازن بنایا اور اسے عزت بخشی تو وہ دل میں اعتقاد رکھنے لگا کہ اسے فضیلت حاصل ہے (2)۔ اس نے حضرت آدم علیہ السلام کی طرف سے معصیت اور کفر کو حقیر جانا۔ فرشتوں نے کہا: وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ فرشتے نہیں جانتے تھے کہ ابلیس کے نفس میں اس کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا: اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ قتادہ نے کہا: جب فرشتوں نے کہا: اَتَجْعَلُ فِیْهَا اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ جن کو وہ خلیفہ بنا رہا ہے ان میں انبیاء، فضلاء اور طاعت شعار بھی ہیں تو فرمایا: اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ۔ (3)

میں کہتا ہوں: اس معنی کا بھی احتمال ہے میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے، اس میں سے جو پہلے ہو چکا ہے اور جو ہو رہا ہے اور جو ہوگا۔ یہ عام ہے۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۳۱﴾

''اور اللہ تعالیٰ نے سکھا دیئے آدم کو تمام اشیاء کے نام پھر پیش کیا انہیں فرشتوں کے سامنے اور فرمایا: بتاؤ تم تو مجھے نام ان چیزوں کے اگر تم (اپنے خیال میں) سچے ہو''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا، عَلَّمَ بمعنی عرف (پہچان کرانا) ہے اور یہاں تعلیم سے مراد اپنا علم ضروری الہام کرنا ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ وہ علم فرشتے جبریل کے واسطہ سے ہو جیسا کہ آگے آئے گا۔ اس کو علم مجہول کا صیغہ بھی پڑھا گیا ہے۔ پہلا لفظ زیادہ ظاہر ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔ علماء صوفیہ نے کہا: اللہ تعالیٰ کے تعلیم حق دینے کے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام نے ان اسماء کو جانا اور اللہ تعالیٰ کے یاد کرانے کے ساتھ انہوں نے یاد کیا اور جو اللہ تعالیٰ نے آدم سے عہد کیا تھا وہ بھول گئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس میں ان کے نفس کے سپرد کر دیا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿﴾ (طٰہ)

اور ہم نے حکم دیا تھا آدم کو اس سے پہلے (کہ وہ اس درخت کے قریب نہ جائے) سو وہ بھول گیا اور نہ پایا ہم نے (اس لغزش میں) اس کا کوئی قصد۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 119، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً

ابن عطا نے کہا: اگر حضرت آدم علیہ السلام کے لئے ان اسماء کا علم منکشف نہ کیا جاتا تو ملائکہ کی نسبت حضرت آدم علیہ السلام خبر دینے سے زیادہ عاجز ہوتے۔ یہ واضح ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کی کنیت ابوالبشر ہے۔ بعض نے فرمایا: ابو محمد ہے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کنیت خاتم الانبیاء بیان کی جاتی ہے یہ سہیلی کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جنت میں حضرت آدم علیہ السلام کی کنیت ابو محمد تھی، زمین میں ابوالبشر تھی، اس کی اصل دو ہمزوں کے ساتھ ہے (أأدم) کیونکہ یہ افعل کے وزن پر ہے مگر دوسرے ہمزہ کو لین کر دیا، جب اس کو حرکت دینے کی طرف توجہت پکڑے گا تو تو اسے واؤ بنا دے گا تو جمع میں اوادم کہے گا کیونکہ یاء میں اس کی اصل معروف نہیں ہے عام طور پر اس میں واؤ رکھی جاتی ہے یہ اخفش سے مروی ہے۔

اس کے مادہ اشتقاق میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ ادمۃ الارض وادیمھا سے مشتق ہے جس کا معنی زمین کی سطح ہے، انسان اس سے پیدا ہوا اسی وجہ سے اس کا یہ نام رکھا گیا۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ الادمۃ سے مشتق ہے، جس کا معنی گندمی رنگ ہے۔ الادمۃ میں اختلاف ہے۔ ضحاک نے کہا: اس سے مراد گندمی رنگ ہے۔ نضر نے کہا: یہ سفید رنگ ہے آدم علیہ السلام سفید تھے اور یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے ناقۃٌ ادماء، جب اونٹنی سفید ہو۔ اس اشتقاق پر اس کی جمع اُدْم اور اوادم ہوگی جیسے حمر اور احامر ہے، کسی بھی طرح منصرف نہیں اور الادمۃ سے مشتق ہو تو اس کی جمع آدمون ہوگی۔ اس ... والوں پر اس کو منصرف بنانا لازم ہوگا۔

میں کہتا ہوں: صحیح یہ ہے کہ یہ ادیم الارض سے مشتق ہے۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا: آدم کو آدم اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ زمین کی سطح سے پیدا کیا گیا ہے انسان کو انسان اس لئے کہا جاتا ہے کہ کیونکہ یہ بھولا تھا۔ ابن سعد نے اسے طبقات میں ذکر کیا ہے۔

سدی نے ابو مالک سے اور ابو صالح سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، مرہ الہمدانی نے حضرت ابن مسعود سے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے قصہ میں روایت کیا ہے، فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو زمین کی طرف بھیجا تاکہ اس کی مٹی لے آئے۔ زمین نے کہا: میں تجھ سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں کہ تو مجھ سے کچھ کمی کرے یا مجھے عیب لگائے۔ جبریل واپس آگئے اور مٹی نہ لے آئے۔ جبریل نے عرض کی: یا اللہ! اس نے تیری پناہ مانگی تو میں نے اسے پناہ دے دی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے میکائیل کو بھیجا۔ زمین نے اس سے بھی پناہ چاہی تو انہوں نے پناہ دے دی۔ وہ بھی واپس آگئے اور اسی طرح کہا جس طرح جبریل نے کہا۔ پھر ملک الموت کو بھیجا۔ زمین نے اس سے پناہ مانگی تو ملک الموت نے کہا: میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں واپس جاؤں اور اس کا امر نافذ نہ کروں پس ملک الموت نے زمین کی سطح سے مٹی لی اور اسے مختلف جگہوں سے لیا کسی ایک جگہ سے نہ لیا، سرخ، سفید اور سیاہ مٹی سے لیا، اسی وجہ سے آدم علیہ السلام کی اولاد کے رنگ مختلف ہیں۔ اسی وجہ سے آدم کو آدم کہا جاتا ہے کیونکہ وہ زمین کی سطح سے لئے گئے تھے (1)۔ ملک الموت مٹی لے کر اوپر گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے فرمایا: تجھے رحم نہ آیا جب زمین نے تیری بارگاہ میں تضرع وزاری کی۔ فرمایا: میں نے تیرا معاملہ اس کے قول سے زیادہ سخت

1۔ السنن الکبری للبیہقی، صفحہ 3، جلد 9 (دارالفکر)

دیکھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تو آدم کی اولاد کی ارواح قبض کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، پھر مٹی کو تر کیا حتیٰ کہ وہ لیس دار مٹی بن گئی، اللازب اس مٹی کو کہتے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہے، پھر اس مٹی کو چھوڑ دیا گیا حتیٰ کہ اس میں بدبو پیدا ہوگئی اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ (الحجر) یعنی بدبودار سیاہ مٹی سے۔ پھر ملائکہ سے فرمایا: اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ (ص) فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ (الحجر) (میں پیدا کرنے والا ہوں بشر کو کیچڑ سے پس جب میں اس کو سنوار دوں اور پھونک ماروں اس میں اپنی (طرف سے خاص) روح تو تم گر پڑنا اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے)۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا تاکہ ابلیس ان پر بڑائی نہ جتلائے۔ فرمایا: کیا تو اس پر بڑائی جتلاتا ہے جسے میں نے اپنے دست قدرت سے پیدا کیا ہے اور میں اس کی وجہ سے فخر نہیں کرتا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اسے بشر بنایا، وہ جمعہ کے دن کی مقدار سے چالیس سال تک مٹی کا جسم رہا۔ پھر ملائکہ اس کے پاس سے گزرے تو وہ اس سے ڈر گئے، جب انہوں نے اسے دیکھا سب سے زیادہ ڈرنے والا ابلیس تھا وہ اس کے پاس سے گزرتا تھا تو اسے مارتا تھا، جسم سے آواز پیدا ہوتی تھی جس طرح ٹھیکری سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے فرمایا: مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ (الرحمٰن)

شیطان کہتا: اللہ تعالیٰ نے اسے کس امر کے لئے پیدا کیا ہے ابلیس اس آدم کے ڈھانچہ کے منہ سے داخل ہوتا اور اس کی دبر سے نکل جاتا۔ ابلیس نے ملائکہ سے کہا: اس سے مت ڈرو یہ کھوکھلا ہے۔ اگر مجھے اس پر مسلط کیا گیا تو میں اسے ہلاک کر دوں گا۔ کہا جاتا ہے: ابلیس جب فرشتوں کے ساتھ آدم کے ڈھانچہ کے پاس سے گزرتا تو کہتا: کیا تم نے ملاحظہ کیا اسے جس کے مشابہ تم نے کوئی مخلوق نہیں دیکھی۔ اگر اسے تم پر فضیلت دی جائے اور تمہیں اس کی اطاعت کا حکم دیا جائے تو تم ایسا کرو گے؟ فرشتوں نے کہا: ہم اپنے رب کے حکم کی اطاعت کریں گے۔ ابلیس نے اپنے دل میں سوچا اگر اسے مجھ پر فضیلت دی گئی تو میں اس کی اطاعت نہیں کروں گا۔ اگر مجھے اس پر فضیلت دی گئی تو میں اسے ہلاک کر دوں گا۔ جب وہ وقت آیا جب اللہ تعالیٰ نے آدم میں روح پھونکنے کا ارادہ کیا تو فرشتوں سے کہا: جب میں اس میں اپنی روح پھونکوں تو تم اس کے لئے سجدہ کرنا۔ جب اس میں روح پھونکی گئی اور روح آدم کے سر میں داخل ہوئی تو آدم نے چھینک ماری۔ فرشتوں نے اسے کہا: تم کہو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، آدم نے کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ! اللہ تعالیٰ نے فرمایا: رحمك ربك (تیرا رب تجھ پر رحم فرمائے) جب روح آدم علیہ السلام کی آنکھوں میں پہنچی تو آدم علیہ السلام نے جنت کے پھلوں کو دیکھا۔ جب روح آدم کے پیٹ میں داخل ہوئی تو آدم کو کھانے کا شوق ہوا۔ پس وہ روح کے قدموں تک پہنچنے سے پہلے جلدی کرتے ہوئے جنت کے پھلوں کی طرف لپکے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (الانبیاء: 37) فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۙ اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ؕ اَبٰۤى اَنْ یَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِیْنَ (الحجر) (پس سربسجود ہوگئے فرشتے سارے کے سارے سوائے ابلیس کے اس نے انکار کیا کہ وہ سجدہ کرنے والوں کے ساتھ ہو)۔

ترمذی نے حضرت ابوموسیٰ اشعری سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ

نے آدم علیہ السلام کو اسی (مٹی کی) مٹھی سے پیدا فرمایا جو اس نے تمام زمین سے بھری تھی، پس بنو آدم زمین کی قدر پر پیدا ہوئے، بعض سرخ، بعض سفید اور بعض سیاہ پیدا ہوئے اور بعض گندمی رنگ پیدا ہوئے، کچھ نرم مزاج، کچھ سخت مزاج، کچھ خبیث اور کچھ نیک۔ ابو عیسیٰ نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے (1)۔ ادیم جمع ہے آدم کی۔ شاعر نے کہا:

الناس اخیاف و شتی فی الشیم　　و کلھم یجمعھم وجه الادم

لوگ مختلف رنگوں میں ہیں اور خصائل میں بھی مختلف ہیں، سب کو زمین کی سطح جمع کرتی ہے۔

پس آدم، ادیم اور الآدم سے مشتق ہے نہ کہ الادمۃ سے مشتق ہے اللہ بہتر جانتا ہے۔ ہو سکتا ہے دونوں سے مشتق ہو، اس مسئلہ کی مزید وضاحت تخلیق آدم کے قصہ میں سورۂ انعام میں آئے گی۔

اٰدَمَ، یہ غیر منصرف ہے، ابو جعفر نحاس نے کہا: اٰدَمَ معرفہ ہونے کی صورت میں غیر منصرف ہے اس پر نحویوں کا اجماع ہے کیونکہ افعل کے وزن پر یہ معرفہ ہے اور بصریوں کے نزدیک اس کو منصرف ہونے سے کوئی چیز مانع نہیں مگر دو علتیں، اگر تو اسے نکرہ بنا دے اور یہ نعت نہ ہو۔ خلیل اور سیبویہ اسے غیر منصرف بناتے ہیں۔ اخفش سعید اسے منصرف بناتا ہے کہ یہ نعت ہے اور یہ فعل کے وزن پر ہے اگر نعت نہ ہو تو منصرف ہوگا۔ ابو اسحاق زجاج نے کہا: قول تو سیبویہ کا ہے۔ وہ نعت اور غیر میں فرق نہیں کرتے، کیونکہ یہ بعینہٖ وہی ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ نے فرمایا الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا، الْاَسْمَآءَ سے یہاں مراد عبارات ہیں۔ کبھی اسم بولا جاتا ہے اور مراد مسمیٰ ہوتا ہے جیسے تیرا قول زیدٌ قائم۔ الاسد شجاعٌ۔ کبھی نام سے مراد ذات ہوتی ہے جیسے تیرا قول اسد کے تین حرف میں پہلی صورت میں اسم بولا گیا ہے مراد مسمیٰ ہے، دوسری صورت میں مسمیٰ مراد نہیں ہوتا کبھی لغت میں ذات کے قائم مقام عبارت ہوتی ہے اس طرح کا استعمال اکثر ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا یہ مشہور تاویلات پر ہے۔ اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول اِن للہ تسعة و تسعین اسماً۔ (2) کبھی یہ ذات کے قائم مقام ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: ذات، نفسٌ، عینٌ اسمٌ یہ سب ہم معنی ہیں۔ اکثر اہل علم نے سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۝ (الاعلی) اور تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ (الرحمٰن: 78) اور اِنْ هِیَ اِلَّاۤ اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْهَاۤ (النجم: 23) میں اسم کو ذات پر محمول کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3: وہ اسماء جو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو سکھائے ان کے معنی میں اہل تاویل نے اختلاف کیا ہے۔ حضرات ابن عباس، عکرمہ، قتادہ، مجاہد، ابن جبیر نے کہا: علمه اسماء جمیع الاشیاء کلھا جلیلھا و حقیرھا۔ (3) اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تمام بڑی چھوٹی اشیاء کے اسماء سکھا دیئے۔

عاصم بن کلیب نے سعد مولیٰ حسن بن علی سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں حضرت ابن عباس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ پس

1۔ جامع ترمذی، کتاب ابواب التفسیر، باب من سورۃ البقرہ، صفحہ 120، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب فی اسماء اللہ تعالیٰ وفضل من احصاھا، صفحہ 342، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 2531، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 119، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

لوگوں نے برتنوں کے نام اور کوڑے کے نام کا ذکر کیا تو حضرت ابن عباس نے فرمایا: حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ نے تمام چیزوں کے اسماء سکھائے۔

میں کہتا ہوں: یہ معنی مرفوع حدیث میں بھی مروی ہے اور لفظ کلھا بھی اسی بات کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ کلھا یا احاطہ اور عموم کے لئے وضع کیا گیا ہے، بخاری میں حضرت انس کی حدیث ہے جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مومنین قیامت کے روز جمع ہوں گے اور کہیں گے: اگر ہم اپنے پروردگار کی بارگاہ میں سفارش طلب کریں۔ پس لوگ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور انہیں کہیں گے: انت ابو الناس خلقك الله بیدہ و اسجد لك ملائکته و علمك اسماء كل شیء، آپ لوگوں کے باپ ہیں اللہ تعالیٰ نے تجھے اپنے دست قدرت سے پیدا کیا، تیرے سامنے ملائکہ کو سجدہ کرایا، تجھے ہر چیز کا نام سکھایا(1)۔ الحدیث۔

ابن خویز منداد نے کہا: اس آیت میں دلیل ہے کہ لغت توقیفی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام اور تفصیلی اسماء سکھائے۔ اسی طرح حضرت ابن عباس نے کہا: اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ہر چیز کا نام بتایا حتیٰ کہ پیالے اور دودھ دوہنے کے برتن کا نام بھی بتایا۔

شیبان نے حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی مخلوق کے اسماء بتائے جبکہ ملائکہ کو نہ بتائے۔ چیز کا نام بتایا اور ہر چیز کی منفعت اس کی جنس کی طرف پھیری۔ نحاس نے کہا: یہ کچھ اس باب کے متعلق مروی ہے اس میں سے بہتر یہی قول ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اجناس کے اسماء بھی سکھائے اور ان کے منافع بھی بتائے۔ یہ چیز اس طرح اور یہ اس کام کے لئے ہے۔ طبری نے کہا: اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو فرشتوں کے اسماء اور ان کو اپنی اولاد کے اسماء سکھائے۔ طبری نے اس قول کو پسند کیا ہے اور اس قول کی وجہ سے اسے ترجیح دی ہے: ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ۔

ابن زید نے کہا: حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد کے اسماء سکھائے۔ ربیع بن خثیم نے کہا: خاص فرشتوں کے اسماء سکھائے۔ قتبی نے کہا: جو کچھ زمین میں پیدا فرمایا ان کے اسماء سکھائے۔ بعض علماء نے فرمایا: اجناس اور انواع کے اسماء سکھائے (2) میں کہتا ہوں: پہلا قول زیادہ صحیح ہے جیسا کہ ابھی ہم نے ذکر کیا ہے اور آئندہ بھی ان شاء اللہ ذکر کریں گے۔

مسئلہ نمبر 4: اہل تاویل کا اختلاف ہے کہ کیا ملائکہ پر اشخاص کے نام پیش کئے تھے یا صرف اسماء پیش کئے تھے بغیر اشخاص کے۔ حضرت ابن مسعود وغیرہ نے فرمایا: اشخاص کو پیش کیا گیا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: عَرَضَهُمْ (انہیں پیش کیا) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ (ان کے اسماء بتاؤ) عرب کہتے ہیں: عرضت الشیء فاعرض میں نے چیز کو ظاہر کیا تو وہ ظاہر ہو گئی۔ اسی سے ہے عرضت الشیء للبیع میں نے چیز کو بیع کے لئے پیش کیا۔ حدیث پاک میں ہے: انه عرضهم امثال الذر انہوں نے چیونٹیوں کی مثال میں پیش کیا(3)۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب قولہ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا، حدیث نمبر 6962، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 120-119، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 120، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

حضرت ابن عباس وغیرہ نے فرمایا: اسماء کو پیش کیا۔ حضرت ابن مسعود کے حرف میں ہے: عرضھن۔ انہوں نے ضمیر اسماء کی طرف لوٹائی اشخاص کی طرف نہیں، ھن ضمیر مؤنث کے ساتھ خاص ہے، اور حضرت ابی کے حرف میں ہے: عرضھا۔

مجاہد نے کہا: اصحاب الاسماء کو پیش کیا جنہوں نے کہا: اسماء سے مراد المسمیات ہے تو انہوں نے ابی کی قرأت عرضھا کو بنیاد بنایا۔ اور جنہوں نے عرضھم پڑھا انہوں نے کہا: لفظ اسماء اشخاص پر دلالت کرتا ہے اس لئے اسماء کے لئے عرضھم کہنا جائز ہے اور ھؤلاء میں اسماء کے اشخاص کی طرف اشارہ مراد ہے لیکن اگرچہ وہ غائب تھے پس وہ حاضر تھا جو ان میں سے تھا ایک سبب کی وجہ سے اور وہ ان کے اسماء تھے۔ ابن عطیہ نے کہا: وہ بات جو ظاہر ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اسماء سکھائے اور ان اجناس کے ساتھ ان پر اسماء پیش کئے پھر ان چیزوں کو ملائکہ پر پیش کیا اور ان سے ان چیزوں کے اسماء پوچھے، جو حضرت آدم علیہ السلام نے سیکھ لئے تھے۔ پھر حضرت آدم علیہ السلام نے انہیں بتایا اس چیز کا یہ اسم ہے اس چیز کا یہ اسم ہے۔

الماوردی نے کہا: اصح یہ ہے کہ ذوات کو پیش کیا گیا تھا پھر ان چیزوں کے پیش کرنے کے زمانہ میں دو قول ہیں۔ (۱) ان چیزوں کو تخلیق کرنے کے بعد انہیں پیش کیا۔ (۲) اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے دلوں میں ان کی تصویریں ڈال دیں پھر انہیں پیش کیا۔

مسئلہ نمبر 5: اس میں اختلاف ہے کہ سب سے پہلے عربی زبان کس نے بولی۔ حضرت کعب الاحبار سے مروی ہے کہ سب سے پہلے جس نے عربی اور سریانی کتاب اور باقی کتب جس نے وضع کیں اور تمام زبانوں کے ساتھ کلام کی وہ حضرت آدم علیہ السلام تھے۔ یہ حضرت کعب الاحبار کے علاوہ علماء کا بھی قول ہے۔

اگر کہا جائے کہ حضرت کعب احبار سے بہتر وجہ مروی ہے، فرمایا: جس نے سب سے پہلے عربی بولی وہ حضرت جبریل علیہ السلام تھے انہوں نے حضرت نوح علیہ السلام کی زبان پر عربی ڈالی تھی اور حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے سام کی زبان پر ڈالی تھی اسے ثور بن زید نے خالد بن معدان سے انہوں نے حضرت کعب سے روایت کیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، فرمایا: جس نے واضح عربی زبان سب سے پہلے بولی وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے وہ اس وقت دس سال کے تھے۔ یہ بھی مروی ہے کہ سب سے پہلے عربی یعرب بن قحطان نے بولی۔ اس کے علاوہ بھی روایات ہیں۔ ہم کہیں گے: صحیح یہ ہے کہ سب سے پہلے انسانوں میں سے عربی بولنے والے حضرت آدم علیہ السلام تھے۔ قرآن اس کی شہادت دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا۔ اور لغات ساری اسماء ہیں۔ پس یہ اس کے تحت داخل ہیں، سنت میں بھی اس طرح آیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حضرت آدم علیہ السلام کو تمام اسماء سکھائے حتیٰ کہ پلیٹ اور پیالہ کا نام بھی سکھایا اور پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے سب سے پہلے عربی بولی تو اس میں احتمال ہے کہ یہ مراد ہو کہ حضرت ابراہیم کی اولاد میں سے سب سے پہلے حضرت اسماعیل نے عربی بولی۔ اسی طرح اس قول کے علاوہ جو اقوال ہیں وہ بھی اس پر محمول ہوں گے کہ مذکور شخص نے اپنے قبیلہ سے پہلے عربی بولی۔ اس کی دلیل وہی ہے جو میں نے ذکر کر دی ہے۔ اسی طرح جبریل

نے فرشتوں میں سے سب سے پہلے عربی بولی اور اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو عربی سکھائی اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کی زبان سے یہ جاری فرمائی جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هٰٓؤُلَآءِ۔ یہ لفظ مبنی برکسرہ ہے تمیم اور بعض قیس اور اسد قبیلہ کی لغت میں هؤلاء میں قصر ہے۔

اعشیٰ نے کہا:

هؤلا ثم هؤلا كلا اعطيـ ت نعالا محذوةً بمثال (1)

یہ لوگ پھر یہ لوگ یقیناً تو نے ان کو مثال کے ساتھ سلے ہوئے جوتے دیئے۔

عربوں میں سے بعض اسے هولاء پڑھتے ہیں الف اور ہمزہ حذف کر دیتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ یہ شرط ہے اور اس کا جواب محذوف ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے: ان کنتم صادقین ان بنی آدم یفسدون فی الارض فانبئونی یعنی اگر تم سچے ہو کہ بنی آدم زمین میں فساد برپا کریں گے تو پھر مجھے بتاؤ۔ یہ مبرد کا قول ہے صٰدِقِيْنَ کا معنی عالمین ہے یعنی اگر تم جاننے والے ہو۔ اسی وجہ سے ملائکہ کیلئے اجتہاد جائز نہیں ہے۔ فرشتوں نے کہا: سبحانك۔ تیری ذات پاک ہے۔ یہ نقاش نے بیان کیا ہے۔ اس نے کہا: اگر ان پر خبر دینے میں صرف سچ شرط نہ ہوتو پھر ان کے لئے اجتہاد جائز ہوتا جس طرح اس شخص کے لئے جائز تھا جسے اللہ تعالیٰ نے سو سال موت دی پھر پوچھا کم لَبِثْتَ اس پر اصابت شرط نہیں تھی۔ فرمایا: اس نے صحیح بات نہ پائی تو اس پر سختی نہ فرمائی یہ واضح ہے اس میں کسی قسم کا خفا نہیں۔

طبری اور ابو عبید نے حکایت کیا ہے کہ بعض مفسرین نے کہا: اِنْ كُنْتُمْ کا معنی ہے اذ کنتم۔ طبری اور ابو عبید نے کہا: یہ غلط ہے (2)۔

اَنْۢبِـُٔوْنِيْ کا معنی ہے: مجھے خبر دو۔ النبأ خبر کو کہتے ہیں اسی سے النبیٔ (ہمزہ کے ساتھ) ہے اس کا بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ۔

مسئلہ نمبر 7: بعض علماء نے فرمایا: خبر دینے کے امر سے یہ مسئلہ مستنبط ہوتا ہے کہ تکلیف مالا یطاق جائز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ وہ نہیں جانتے۔ محققین اہل تاویل کہتے ہیں: یہ تکلیف کی جہت سے امر نہیں ہے یہ تقریر اور توقیف کی جہت سے ہے۔ تکلیف مالا یطاق پر تفصیلی کلام آگے آئے گا کیا تکلیف مالا یطاق واقع ہوا ہے یا نہیں۔ یہ تفصیلی گفتگو ان شاء اللہ سورت کے آخر میں آئے گی۔

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝۳۲

''عرض کرنے لگے ہر عیب سے پاک تو ہی ہے کچھ علم نہیں ہمیں مگر حقیقتاً تو نے ہمیں سکھا دیا۔ بے شک تو ہی علم و

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 121، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ ایضاً

حکمت والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے سُبْحٰنَكَ تو اس سے پاک ہے کہ تیرے سوا کوئی غیب جانے۔ یہ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ کے ارشاد کا جواب ہے۔ فرشتوں نے جواب دیا کہ وہ تو صرف وہی جانتے ہیں جو وہ انہیں سکھاتا ہے اور وہ کوئی ایسی بات نہیں کہتے جس کا انہیں علم نہیں جیسا کہ ہم میں سے جہال کہا کرتے ہیں۔ مَا عَلَّمْتَنَا میں مَا بمعنی الذی ہے یعنی وہ جو تو نے ہمیں سکھایا اور یہ بھی جائز ہے کہ مَا مصدر یہ ہو بمعنی الا تعلیمك ایانا یعنی مگر تیرے سکھانے کے ساتھ۔

مسئلہ نمبر 2: جس شخص سے کوئی علمی بات پوچھی جائے اور وہ نہ جانتا ہو تو اس پر واجب ہے کہ وہ فرشتوں، انبیاء، فضلاء علماء کی اقتداء کرتے ہوئے یہ کہے کہ اللہ جانتا ہے میں نہیں جانتا لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ علماء کی موت کے ساتھ علم اٹھالیا جائے گا، پھر جہال لوگ باقی رہ جائیں گے جن سے فتوے طلب کئے جائیں گے وہ اپنی رائے سے فتوے دیں گے، وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے (1)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام اور تابعین سے اس آیت کے معنی میں جو مروی ہے وہ البستی نے ''المسند الصحیح'' میں حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: بری جگہیں کون سی ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نہیں جانتا حتیٰ کہ میں جبریل امین علیہ السلام سے پوچھ لوں۔ جبریل امین علیہ السلام سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تو اس نے کہا: میں نہیں جانتا حتیٰ کہ میں میکائیل علیہ السلام سے پوچھ لوں، میکائیل علیہ السلام آئے اور کہا: اچھی جگہیں مساجد ہیں اور بری جگہیں بازار ہیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے دادی کے ایک مسئلہ میں کہا تھا تو لوٹ جا حتیٰ کہ میں لوگوں سے پوچھ لوں (2)۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: وَاَبْرَدَهَا علی الکبد۔ یہ تین مرتبہ فرمایا۔ لوگوں نے کہا: اے امیر المومنین! یہ کیا ہے؟ فرمایا: آدمی سے کوئی مسئلہ پوچھا جائے جو وہ نہ جانتا ہو تو وہ کہے: اللہ اعلم

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک شخص نے مسئلہ پوچھا تو آپ نے فرمایا: مجھے اس کا علم نہیں ہے۔ جب وہ شخص واپس چلا گیا تو حضرت ابن عمر نے فرمایا: ابن عمر نے ٹھیک کہا ہے ایسی بات پوچھی گئی جس کا اسے علم نہیں تھا تو کہا: مجھے اس کا علم نہیں۔ یہ دارمی نے اپنی مسند میں ذکر کیا ہے۔ صحیح مسلم میں ابی عُقیل یحییٰ بن متوکل صاحب ''بہیتہ'' نے کہا: میں قاسم بن عبید اللہ اور یحییٰ بن سعید کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ یحییٰ نے قاسم سے کہا: اے ابا محمد! تیرے جیسے شخص پر بہت بری بات ہے کہ اس دین کا کوئی مسئلہ تجھ سے پوچھا جائے پھر تیرے پاس اس کا علم نہ ہو اور نہ کوئی کشادگی کا راستہ ہو، یا کہا: نہ علم اور نہ نکلنے کا راستہ ہو۔ قاسم نے اسے کہا: یہ کس کے لئے؟ یحییٰ نے کہا کیونکہ تو ہدایت یافتہ اماموں ابو بکر اور عمر کا بیٹا ہے۔ قاسم نے اسے کہا: جس کو اللہ تعالیٰ نے عقل بخشی ہے اس کے نزدیک اس سے بھی بری بات یہ ہے کہ انسان بغیر علم کے کوئی بات کرے یا کسی غیر ثقہ سے مسئلہ

1۔ صحیح بخاری کتاب العلم، باب کیف یقبض العلم، حدیث نمبر 98، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ مسند امام احمد حدیث نمبر 6511

2۔ سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 2507۔ جامع ترمذی، حدیث نمبر 2027، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پوچھے۔ یحییٰ خاموش ہو گیا اور کوئی جواب نہ دیا۔ حضرت مالک بن انس نے فرمایا: میں نے ابن ہرمز کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ عالم کے لئے مناسب ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو لا ادری (میں نہیں جانتا) کی میراث دے تا کہ ان کے ہاتھوں میں اصل ہو۔ جب ان میں سے کسی سے وہ مسئلہ پوچھا جائے گا جو وہ نہیں جانتا ہوگا تو کہے گا: میں نہیں جانتا۔ ہیثم بن جمیل نے ذکر کیا ہے کہ میں امام مالک سے اڑتالیس مسائل پوچھنے کے لئے حاضر ہوا تو امام مالک نے بتیس مسائل میں فرمایا: میں نہیں جانتا۔

میں کہتا ہوں: صحابہ کرام، تابعین اور فقہاء مسلمین سے بہت سی ایسی مثالیں مروی ہیں۔ اس کو اس ریاست کے ترک اور علم میں انصاف نہ کرنے پر محمول کیا جائے گا۔ ابن عبد البر نے کہا: علم کی برکت اور اس کے آداب سے اس میں انصاف کرنا ہے جس نے انصاف نہیں کیا اس نے نہ سمجھا اور نہ سمجھنے کی کوشش کی۔ یونس بن عبد الاعلیٰ سے مروی ہے، فرمایا: میں نے ابن وہب کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ہمارے زمانہ میں انصاف سے کم کوئی چیز نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ صورت امام مالک کے زمانہ میں تھی تو پھر آج ہمارے زمانہ میں کیا حالت ہوگی جبکہ ہمارے اندر فساد پھیل چکا ہے اور کمینے لوگوں کی کثرت ہے اور ریاست کے لئے علم طلب کیا جاتا ہے نہ کہ شعور و آگاہی کے لئے بلکہ دنیا میں ظاہر ہونے اور اس جنگ و جدل کے ذریعے اپنے ہم عصروں پر غلبہ پانے کے لئے حاصل کیا جاتا ہے جو جنگ و جدل دل میں قساوت پیدا کرتا ہے اور کینہ چھوڑتا ہے۔ اس کو عدم تقویٰ اور اللہ تعالیٰ کا خوف نہ ہونے پر محمول کیا جائے گا۔

کہاں گئی وہ روایت جو حضرت عمر سے مروی ہے۔ انہوں نے کہا: اپنی عورتوں کے مہر چالیس اوقیہ سے زائد نہ رکھو اگرچہ عورت ذی العصبہ کی بیٹی ہو یعنی یزید بن حصین حارثی کی بیٹی ہو جو زیادہ رکھے گا زیادتی بیت المال میں رکھی جائے گی۔ ایک عورت اٹھی جو صائب الرائے عورتوں میں سے تھی۔ اس کا منہ لمبا تھا اور ناک چپٹی تھی۔ اس عورت نے کہا: تجھے اس مہر کے تعین کا حق نہیں۔ حضرت عمر نے کہا: کیوں؟ اس عورت نے کہا: اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اٰتَیْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَیْــٴًـا** (النساء: 20) دے چکے ہو تم اسے ڈھیروں مال تو نہ لو اس مال سے کوئی چیز۔

حضرت عمر نے کہا: عورت صحیح ہے اور مرد نے غلطی کی (1)۔

وکیع نے ابو معشر سے انہوں نے حضرت محمد بن کعب القرظی سے روایت کیا ہے، فرمایا: ایک شخص نے حضرت علی سے ایک مسئلہ پوچھا۔ حضرت علی نے جواب دیا تو اس شخص نے کہا: اے امیر المومنین! مسئلہ اس طرح نہیں ہے بلکہ اس طرح ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تو نے صحیح کہا اور میں نے غلطی کی ہر علم والے کے اوپر علم والا ہوتا ہے۔

ابو محمد قاسم بن اصبغ نے ذکر کیا ہے کہ جب میں مشرق کی طرف چلا تو میں قیروان میں اترا اور میں نے بکر بن حماد سے مسدد کی حدیث حاصل کی۔ پھر میں بغداد چلا گیا۔ میں لوگوں سے ملا۔ جب میں واپس آیا تو میں مسدد کی حدیث کی تکمیل کے لئے ان کی طرف لوٹا۔ ایک میں نے ان پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پڑھی "آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک قوم آئی جس کا تعلق مضر قبیلہ سے تھا انہوں نے دھاری دار قمیصیں پہنی ہوئی تھیں بکر بن حماد نے کہا: حدیث میں لفظ مجتابی النمار نہیں مجتابی

1۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، جلد 7، صفحہ 233

النثار ہے۔ میں نے کہا: مجتابی النمار ہے۔ میں نے اندلس اور عراق میں جس شخص پر بھی یہ حدیث پڑھی میں نے اسی طرح پڑھی ہے۔

بکر بن حماد نے کہا: تو عراق میں جانے کی وجہ سے ہمارا مقابلہ کرتا ہے اور ہم پر فخر کرتا ہے۔ پھر مجھے فرمایا: ہمارے ساتھ اس شیخ کی طرف چلو ..... جو مسجد میں موجود تھے...... اس کے پاس اس کا علم ہے۔ ہم ان کی طرف چلے۔ ہم نے ان سے اس حدیث کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا: ھو مجتابی النمار جیسا کہ میں نے کہا تھا۔ یہ لوگ دھاری دار کپڑے پہنتے تھے اور ان کے گریبان سامنے ہوتے تھے۔ النمار جمع ہے نِمَرَۃ کی۔ بکر بن حماد نے اپنا ناک پکڑ لیا اور کہا: حق کے لئے میری ناک خاک آلود ہو، حق کے لئے میری ناک خاک آلود ہو پھر وہ واپس چلے گئے۔ یزید بن ولید بن عبدالملک نے کتنا اچھا کہا ہے:

اذا ما تحدثت فی مجلس تناھی حدیثی الی ما علمت

ولم اعد علمی الی غیرہ و کان اذا ما تناھی سکت

جب میں کسی مجلس میں بات کرتا ہوں تو میری بات کی انتہا میرے علم تک ہوتی ہے۔ میں اپنے علم کو کسی غیر تک نہیں لے جاتا۔ جب میرے علم کی انتہا ہوتی ہے تو میں خاموش ہو جاتا ہوں۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سُبْحٰنَكَ۔ خلیل اور سیبویہ کے نزدیک سبحان مصدر ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ یہ اس معنی کو ادا کرتا ہے: نسبحُك تسبیحًا ہم تیری تسبیح بیان کرتے ہیں۔ کسائی نے کہا: یہ نداء کی وجہ سے منصوب ہے(1)۔

الْعَلِیْمُ مبالغہ کے لئے اور اللہ کی مخلوق میں معلومات میں کثرت کا معنی دینے کے لئے فعیل کے وزن پر ہے۔ الْحَكِیْمُ اس کا معنی حاکم ہے، ان دونوں اسموں کے درمیان مزید مبالغہ ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی محکم ہے اس صورت میں حکیم فعل کی صفات سے ہوگا، پھر یہ مُفعل سے فعیل کے وزن پر پھیرا گیا ہے جیسا کہ مُسمع کو سمیع کی طرف اور مُؤلم کو الیم کی طرف پھیرا گیا ہے یہ ابن انباری نے کہا ہے۔ ایک قوم نے کہا: الْحَكِیْمُ کا معنی ہے فساد سے روکنے والا۔ اسی سے حکمۃ اللجام کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی گھوڑے کو مقصد کے بغیر بھاگنے اور چلنے سے روکتی ہے۔ جریر نے کہا:

أبنِیْ حنیفہ احکموا سفہاءکم انی اخاف علیکم ان اغضبا (2)

کیا بنی حنیفہ نے اپنے نادان لوگوں کو روکا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میں تم پر غصہ کروں گا یعنی کیا بنی حنیفہ نے اپنے بیوقوف لوگوں کو فساد سے روکا ہے۔

زہیر نے کہا:

القائد الخیل منکوبا دوابرھا قد أحکمت حکمات القدّ والأبَقا

وہ گھوڑوں کو چلاتا ہے حتیٰ کہ ان کے پاؤں گھس جاتے ہیں وہ روئی اور چمڑے کی لگاموں کے ساتھ روکے گئے ہیں۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 121، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ ایضاً، صفحہ 122، جلد 1

عرب کہتے ہیں: احکم الیتیم عن کذا و کذا۔ یتیم کو اس اس کام سے روکا گیا ہے۔ السورۃ المحکمۃ ایسی سورت جس میں کسی قسم کی تبدیلی نہ ہو اور اس کے ساتھ اس کو ملایا جائے جو اس سے خارج ہو اور اس پر زائد کیا جائے جو اس سے نہ ہو ایسی حکمت ہے، وہ بھی حکمت والے کو جہالت سے روکتی ہے۔ کہا جاتا ہے: احکم الشیء جب کوئی کسی کام کو پختہ کرے اور مقصود سے خارج ہونے والی چیز کو روکے۔ فھو محکم وحکیم کثرت اور زیادتی حکمت کا معنی ہے۔

قَالَ يٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ ۚ فَلَمَّاۤ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْۤ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝۳۳

''فرمایا: اے آدم! بتادو انہیں ان چیزوں کے نام پھر جب آدم نے بتادیئے فرشتوں کو ان کے نام تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نہیں کہا تھا میں نے تم سے کہ میں خوب جانتا ہوں سب چھپی ہوئی چیزیں آسمانوں اور زمین کی اور میں جانتا ہوں جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور چھپاتے ہو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ يٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت اور بلند مرتبہ پر آگاہ کرنے کے لئے انہیں حکم دیا کہ فرشتوں کو ان چیزوں کے نام بتاؤ، اس کے بعد کہ پہلے ان پر ان چیزوں کو پیش کیا گیا تھا تاکہ فرشتے جان لیں کہ وہ زیادہ جاننے والا ہے اس کے متعلق جو ان سے پوچھی تھی۔ حضرت آدم علیہ السلام فرشتوں سے افضل تھے کہ اسے ان پر مقدم کیا اس کے لئے انہیں سجدہ کرنے کا حکم دیا اور انہیں آدم کا شاگرد بنایا اور انہیں حکم دیا کہ ان سے علم حاصل کرو۔ پس حضرت آدم علیہ السلام کو عظمت و جلال کا رتبہ حاصل ہو گیا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے مسجودلہ بنایا اور علم کے ساتھ خاص فرمایا۔

مسئلہ نمبر 2: اس آیت میں علم اور صاحب علم کی فضیلت کی دلیل ہے۔ حدیث پاک میں ہے فرشتے طالب علم کی رضا کے لئے اپنے پر بچھاتے ہیں (1) یعنی اس کے لئے تواضع و انکساری کرتے ہیں۔ فرشتے تمام لوگوں میں صرف اہل علم کے لئے ایسا کرتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ ادب و احترام ان پر حضرت آدم علیہ السلام کے لئے لازم کیا تھا۔ پس یہ ادب ان فرشتوں نے سیکھا جب بھی کسی بشر میں علم ان کے سامنے ظاہر ہوا فرشتے اس کے لئے جھک گئے اور علم کی اور صاحب علم کی تعظیم کے لئے عاجزی کرنے لگے اور علم طلب کرنے اور علم سے مشغول ہونے کی وجہ سے یہ سب تعظیم و مرتبہ انہیں ملا۔ یہ مرتبہ تو طلباء کا ہے، علماء اور جو ربانیین ہیں ان کا مقام کتنا بلند ہو گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان لوگوں میں سے کرے بے شک وہ عظیم فضل والا ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اس باب میں علماء نے اختلاف کیا ہے کہ فرشتے افضل ہیں یا انسان افضل ہے علماء کے دو قول ہیں: ایک قوم کا خیال ہے کہ انسانوں میں سے رسل، فرشتوں میں رسل پر افضل ہیں، انسانوں میں سے اولیاء فرشتوں میں سے

1۔ جامع ترمذی، ابواب العلم عن رسول اللہ ﷺ، باب ما جاء فی فضل الفقہ علی العبادۃ، صفحہ 93، جلد 2 (وزارت تعلیم)
سنن ابی داؤد، کتاب العلم، حدیث نمبر 3157، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اولیاء پر افضل ہیں۔ دوسرے علماء کا خیال ہے: ملاء اعلیٰ افضل ہے جنہوں نے فرشتوں کو فضیلت دی ہے۔ انہوں نے ان آیات اور احادیث سے حجت پکڑی ہے: عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۙ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۝ (الانبیاء) (وہ معزز بندے ہیں نہیں سبقت کرتے بات کرنے میں اور وہ اسی کے حکم پر کاربند ہیں)۔

لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝ (التحریم) لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ (النساء:172) ہرگز عار نہ سمجھے گا مسیح (علیہ السلام) کہ وہ اللہ کا بندہ ہو اور نہ ہی مقرب فرشتے (اس کو عار سمجھیں گے)

قُلْ لَّاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ (الانعام:50) (آپ فرمایئے کہ میں نہیں کہتا تم سے کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ یہ کہوں گا کہ خود جان لیتا ہوں غیب اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں)۔

اور بخاری میں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: من ذکرنی فی ملاء ذکرتہ فی ملاء خیر منھم (1) (جس نے مجھے مجمع میں یاد کیا میں نے اسے ان سے بہتر مجمع میں یاد کیا۔) یہ نص ہے۔

اور جن علماء نے بنی آدم کو ترجیح دی انہوں نے ان آیات اور احادیث سے استدلال کیا ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝ (البینہ) (یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے وہی ساری مخلوق سے بہتر ہیں)۔

اور حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے: ان الملائکۃ لتضع اجنحتھا رضی لطالب العلم (2) (بے شک فرشتے طالب علم کی رضا کے لئے اپنے پر بچھاتے ہیں۔)

یہ حدیث ابو داؤد نے ذکر کی ہے، ایسی بہت سی احادیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل عرفات کی وجہ سے فرشتوں پر مباہات فرماتا ہے اور مباہات ہمیشہ افضل کی وجہ سے کیا جاتا ہے (3)۔ واللہ اعلم بالصواب

بعض علماء نے فرمایا: کوئی قطعی دلیل نہیں ہے کہ انبیاء فرشتوں سے افضل ہیں اور نہ اس پر کوئی قطعی دلیل ہے کہ فرشتے انبیاء سے افضل ہیں کیونکہ اس کا طریق اللہ تعالیٰ کا کوئی ارشاد ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے یا اجماع امت ہے اور اس بارے میں کوئی چیز بھی موجود نہیں ہے۔ قدریہ فرقہ اور قاضی ابو بکر کا نظریہ اس کے خلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں: فرشتے افضل ہیں۔ قاضی نے کہا: ہمارے اصحاب نے اور شیعہ حضرات نے جو کہا ہے کہ انبیاء افضل ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو آدم کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ تو ان کو یہ کہا جائے گا کہ مسجود لہ، سجدہ کرنے والے سے افضل نہیں ہوتا، کیا

1۔ صحیح بخاری، باب قول اللہ تعالیٰ عزوجل ویحذرکم اللہ نفسہ، حدیث نمبر 6856، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، ابواب العلم، باب ماجاء فی فضل الفقہ علی العبادۃ، صفحہ 93، جلد 2 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب فضل یوم عرفہ، صفحہ 436، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ کعبہ مسجود لہا ہے انبیاء اور ساری مخلوق اسے سجدہ کرتی ہے، پھر انبیاء بالاتفاق کعبہ سے بہتر وافضل ہیں، اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ سجدہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتا ہے کیونکہ سجدہ عبادت ہے اور عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے۔ جب معاملہ اس طرح ہے تو سجدہ ایک جہت کی طرف ہونا اس کی دلیل نہیں ہے کہ وہ جہت سجدہ کرنے والے اور عابد سے افضل ہے اور یہ بات واضح ہے۔ مزید بیان اس کے بعد آئے گا۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنِّیْۤ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اس آیت میں دلیل ہے کہ کوئی شخص غیب نہیں جانتا مگر جن کو اللہ تعالیٰ علم عطا فرمائے جیسے انبیاء کرام یا جن کے لئے اللہ نے علم غیب عطا فرمایا وہ کسی کو کچھ غیب کا علم عطا فرمادیں۔ پس یہ نجومی اور کاہن لوگ جھوٹے ہیں۔ مزید بیان ان شاء اللہ سورۂ انعام میں آئے گا۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ۔ یعنی ان کے قول کو میں جانتا ہوں جو انہوں نے کہا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا (البقرہ: 30) یہ مکی اور ماوردی نے کہا ہے زہراوی نے کہا اور جو انہوں نے ظاہر کیا وہ ان کا حضرت آدم علیہ السلام کو جلدی سے سجدہ کرنا ہے وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ۔

حضرات ابن عباس، ابن مسعود اور سعید بن جبیر نے فرمایا: اس سے مراد وہ ہے جو ابلیس نے کبر اور معصیت اپنے نفس میں چھپائی ہوئی تھی۔ ابن عطیہ نے کہا: تکتمون جمع کا صیغہ ہے جبکہ وہ چھپانے والا اس قول کے مطابق ایک تھا تو یہ مجازاً اور وسعت کی بنا پر ہے۔ کسی قوم کو کہا جاتا ہے جبکہ ان کے ایک بیوقوف نے جنایت کی ہوتی ہے: انتم فعلتم کذا تم نے یہ کیا ہے، یعنی تم میں سے ایک ایسا کرنے والا ہے۔ یہ تخق کرنے کے ارادہ سے ہوتا ہے (1)۔

اسی سے یہ ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ۝ (الحجرات) حالانکہ ایک شخص عیینہ نے پکارا تھا یا بعض نے کہا: اقرع نے پکارا تھا۔

بعض علماء نے فرمایا: ظاہر کرنا اور چھپانا یہ تمام فرشتوں کے ظواہر اور اسرار کی معرفت کے عمومی معنی پر ہے۔ مہدی بن میمون نے کہا: ہم حضرت حسن کے پاس موجود تھے۔ ان سے حسن بن دینار نے پوچھا: فرشتوں نے کیا چھپایا تھا؟ حسن نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو فرشتوں نے ایک عجیب مخلوق دیکھی گویا ان کے دلوں میں کچھ خیال پیدا ہوا۔ فرمایا: پھر وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوئے اور آپس میں سرگوشی کرنے لگے اور کہا: تمہیں اس مخلوق سے کوئی پریشانی نہیں اللہ تعالیٰ نے کوئی مخلوق پیدا ہی نہیں فرمائی مگر ہم اس سے اس کے نزدیک افضل ہیں۔

مَا تُبْدُوْنَ سے مَا اس کو اَعْلَمُ کی وجہ سے نصب جائز ہے اس بنا پر کہ اَعْلَمُ فعل ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ اَعْلَمُ بمعنی عالم ہو اور اس کی وجہ سے مَا منصوب ہو پس یہ حواج بیت اللہ کی مثل ہوگا۔ پہلے اس کی بحث گزر چکی ہے۔

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ؕ اَبٰى وَ اسْتَكْبَرَ ٘ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ ۝۳۴

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 132، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

''جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔ اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور (داخل) ہو گیا وہ کفار (کے ٹولہ) میں''۔

اس میں دس مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اِذْ قُلْنَا اس سے پہلے اذ کر محذوف ہے اور رہا ابو عبید کا قول کہ (اذ) زائدہ ہے یہ جائز نہیں ہے کیونکہ (اذ) ظرف ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے، اور فرمایا: قلنا، قلت نہیں فرمایا، چونکہ جبار عظیم ذات اپنے بارے جماعت کے فعل کے ساتھ خبر دیتی ہے، عظمت اور ذکر کی بلندی کے اظہار کے اعتبار سے۔

ملائکۃ یہ جمع ہے ملك کی۔ اس سے پہلے اس کا ذکر گزر چکا ہے، ادم کے متعلق اور اس کے اشتقاق کے متعلق بھی بحث گزر چکی ہے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ ابو جعفر بن قعقاع سے مروی ہے کہ انہوں نے ملائکۃ کی تاء کو اسجدوا کے جیم کے ضمہ کی وجہ سے مرفوع پڑھا ہے۔ اس کی مثال الحمد للہ

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُسْجُدُوْا۔ سجود کا معنی عرب کلام میں تذلل اور خضوع (عجز و انکساری) ہے۔ شاعر نے کہا:

بجمع تضل البلق فی حجراته ترى الأكم فيها سجداً للحوافر

اس شعر میں سجدا خضوع و خشوع اور جھکنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

عین ساجدۃ، ایسی آنکھ جو دیکھنے سے جھکی ہوتی ہو۔ سجدہ کی غایت زمین پر چہرے کو رکھنا ہے۔ ابن فارس نے کہا: سجد اس وقت بولتے ہیں جب کوئی سر جھکا دے۔ جس نے سجدہ کیا اس نے عجز کا اظہار کیا۔ الاسجاد، ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا۔ ابو عمرو نے کہا: اسجد کا معنی ہے: اس نے اپنا سر جھکا دیا۔ شاعر نے کہا:

فضول ازمتها اسجدت سجود النصارى لاحبارها

ان عورتوں نے اپنے جمال کے اضافی کپڑے اپنی کلائیوں پر اس طرح جھکا دیئے جیسے نصاریٰ اپنے راہبوں کے لئے جھکتے ہیں۔

ابو عبیدہ نے کہا: ایک بنی اسد کے اعرابی نے یہ کہا:

وقلن له اسجد لليلى فاسجد

انہوں نے اسے کہا لیلیٰ کے لئے سر جھکا دے تو اس نے سر جھکا دیا۔

یعنی جب اونٹ نے سر جھکا دیا۔ دراھم الاسجاد ان سکوں کو کہتے ہیں جن کے اوپر تصویریں بنی ہوئی تھیں اور لوگ انہیں سجدہ کرتے تھے۔ شاعر کا قول ہے:

وافی بھا کدراھم الاسجاد اس نے اسے پایا دراھم الاسجاد کی طرح۔

مسئلہ نمبر 3: وہ علماء جنہوں نے حضرت آدم اور ان کی اولاد کی فضیلت پر اللہ تعالیٰ کے ارشاد سے استدلال کیا، جس

میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ۔ فرمایا: یہ ارشاد دلیل ہے کہ انسان فرشتوں سے افضل ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ کا معنی ہے: آدم کے چہرے کی طرف منہ کرتے ہوئے سجدہ کرو۔ یہ اس طرح ہے جیسے ارشاد فرمایا: اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ (الاسراء:78) یعنی سورج کے ڈھلنے کے وقت نماز قائم کرو اور اس طرح ارشاد ہے: نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝ (ص) یعنی جب میں اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم گر پڑنا اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے۔

یعنی اس کی تخلیق مکمل ہونے کے وقت تم اس کی طرف منہ کر کے سجدہ کرتے ہوئے گر جانا۔ پہلے ہم نے بیان کیا ہے کہ مسجود لہ، سجدہ کرنے والے سے افضل نہیں ہوتا جیسا کہ قبلہ سجدہ کرنے والوں سے افضل نہیں۔

اگر کہا جائے کہ اگر حضرت آدم علیہ السلام فرشتوں سے افضل نہ تھے تو پھر اس کے ان کے سجدہ کرنے کے حکم میں کیا حکمت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ملائکہ نے جب اپنی تسبیح اور تقدیس کی وجہ سے کچھ بڑائی محسوس کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں غیر کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا تا کہ انہیں دکھائے کہ وہ ان کی تسبیح و تقدیس اور ان کی عبادت سے مستغنی ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: انہوں نے حضرت آدم علیہ السلام پر عیب لگایا اور انہیں حقیر سمجھا اور ان کی صنعت کے خصائص کو نہ جان سکے تو انہیں بطور تکریم حضرت آدم کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے قول اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا (البقرہ:30) پر سزا دینے کے لئے سجدہ کرنے کا حکم دیا جب فرشتوں کو فرمایا: اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً۔ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ ان سے خطاب فرمائے گا تو وہ یہی کہیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ۝ (ص) (بے شک میں پیدا کرنے والا ہوں بشر کو کیچڑ سے اور اسے خلیفہ بنانے والا ہوں) وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝ (ص) اور جب میں پھونک دوں اس میں اپنی (طرف سے خاص) روح تو تم گر پڑنا اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے۔ مطلب یہ ہے کہ تا کہ یہ تمہارے لئے اس وقت سزا ہو گی اس قول کی جو تم نے اب کہا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ حضرت ابن عباس نے انسان کی فضیلت پر اس سے بھی استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی قسم اٹھائی ہے۔ فرمایا: لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝ (الحجر) (اے محبوب! آپ کی زندگی کی قسم! یہ (اپنی طاقت کے نشہ میں) مست ہیں اور بہکے بہکے پھر رہے ہیں) اور اپنے اس قول سے عذاب سے امن کی نوید سنائی: لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ (الفتح:2) (تا کہ دور فرما دے آپ کے لئے اللہ تعالیٰ جو الزام آپ پر (ہجرت سے) پہلے لگائے گئے اور جو ہجرت کے بعد لگائے گئے)۔

اور فرشتوں کو فرمایا: وَ مَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْۤ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ (الانبیاء:29) (اور جو ان میں سے یہ کہے کہ میں خدا ہوں اللہ تعالیٰ کے سوا تو ہم اسے سزا دیں گے جہنم کی)۔

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنی ذات کی قسم نہیں اٹھائی اسی طرح فرشتوں کی حیات کی قسم نہیں اٹھائی۔ لعمری نہیں فرمایا، اور آسمان اور زمین کی قسم اٹھائی، اس کا یہ مطلب نہیں کہ زمین اور آسمان، عرش اور ساتوں جنتوں

سے افضل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے التین اور زیتون کی قسم اٹھائی ہے۔ اور رہا یہ ارشاد: مَنۡ یَّقُلۡ مِنۡهُمۡ الخ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرمانا ہے: لَئِنۡ اَشۡرَكۡتَ لَيَحۡبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ (الزمر: 65)۔ (اور اگر (بفرض محال) آپ نے بھی شرک کیا تو ضائع ہو جائیں گے آپ کے اعمال اور آپ بھی خاسرین میں سے ہو جائیں گے)۔ پس اس میں کوئی فضیلت کی دلیل نہیں ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 4: ملائکہ کے حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرنے کی کیفیت میں اختلاف ہے جبکہ اس پر اتفاق ہے کہ یہ سجدہ عبادت نہ تھا۔ جمہور علماء نے فرمایا: فرشتوں کو اپنی پیشانیاں زمین پر رکھنے کا حکم تھا جیسا کہ نماز میں سجدہ ہوتا ہے، کیونکہ عرف وشرع میں سجدہ سے یہی ظاہر ہے۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے یہ سجدہ آدم علیہ السلام کی تکریم اور ان کی فضیلت کے اظہار کے لئے تھا اور اللہ تعالیٰ کی طاعت کے لئے تھا اور حضرت آدم علیہ السلام ان کے لئے ایسے تھے جیسے ہمارے لئے قبلہ ہے۔ لآدم کا مطلب ہے الی آدم جیسے کہا جاتا ہے: صلی للقبلة یعنی قبلہ کی طرف نماز پڑھی۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ سجدہ وہ نہیں تھا جو آج معروف ہے یعنی زمین پر پیشانی رکھنا بلکہ لغت کی اصل کے اعتبار سے تھا یعنی تذلل وانقیاد یعنی حضرت آدم کے لئے انہوں نے عجز کا اظہار کیا اور اس کی فضیلت کا اقرار کیا۔ فَسَجَدُوۡۤا یعنی جو انہیں حکم دیا گیا تھا اس کی انہوں نے پیروی کی۔ اس میں بھی اختلاف ہے کیا وہ سجدہ حضرت آدم علیہ السلام کے لئے خاص تھا۔ پس اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لئے سجدہ کرنا جائز نہیں یا حضرت یعقوب علیہ السلام کے زمانہ تک جائز تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَرَفَعَ اَبَوَيۡهِ عَلَى الۡعَرۡشِ وَخَرُّوۡا لَهٗ سُجَّدًا (یوسف: 100) (آپ نے اوپر اٹھایا اپنے والدین کو تخت پر اور وہ گر پڑے آپ کے لئے سجدہ کرتے ہوئے)۔

یہ آخری وقت تھا جب مخلوق کے لئے سجدہ مباح کیا گیا تھا اور اکثر کا قول یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو درخت اور اونٹ نے سجدہ کیا، تو صحابہ کرام نے عرض کیا: حضور! ہم درخت اور بدکے ہوئے اونٹ کی نسبت آپ کو سجدہ کرنے کے زیادہ حقدار ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ رب العالمین کے علاوہ کسی کے لئے سجدہ کرنا روا نہیں۔ ابن ماجہ نے اپنی سنن میں اور البستی نے اپنی صحیح میں ابو واقد سے روایت کیا ہے، فرمایا: جب حضرت معاذ بن جبل شام سے آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ کیا ہے؟ حضرت معاذ نے کہا: یا رسول اللہ! میں شام سے آیا ہوں میں نے لوگوں کو دیکھا وہ اپنے بزرگوں اور راہبوں کو سجدہ کرتے ہیں، میں نے آپ کے ساتھ ایسا کرنا چاہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایسا مت کرو۔ اگر میں کسی کو کسی کے لئے سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ عورت اپنے رب کا حق ادا نہیں کرسکتی حتیٰ کہ اپنے خاوند کا حق ادا کرے حتیٰ کہ اگر عورت کا خاوند اس سے خواہش پوری کرنے کا سوال کرے اور وہ کجاوے پر ہو تو اسے منع نہ کرے (1)۔ حدیث میں القتب کا لفظ آیا ہے اس کا معنی بیان کرتے ہوئے فرمایا: عربوں کے نزدیک ولادت کے لئے کرسی کا وجود باعث عزت تھا۔ وہ اپنی عورتوں کو ولادت کے وقت کجاوے پر سوار کرتے تھے۔ بعض طرق میں ہے انسان کو سجدہ سے منع فرمایا اور مصافحہ کا حکم دیا۔

1۔ سنن ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب حق الزوج علی المرأۃ، حدیث نمبر 1842، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں کہتا ہوں: یہ سجدہ جس سے منع کیا گیا ہے جاہل صوفیوں نے سماع اور مشائخ کے پاس جانے کے وقت اور ان سے دعا طلب کرنے کے وقت وہ سجدہ کرتے ہیں، ان میں سے کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ جب اس کے گمان کے مطابق اسے حال آجاتا ہے تو وہ سجدہ کرتا ہے۔ یہ اس کی جہالت ہے خواہ وہ قبلہ کی طرف ہو یا غیر قبلہ کی طرف ہو یہ ان کی جہالت ہے ان کی یہ ساری سعی و کوشش ضائع ہے اور ان کا عمل نامراد ہے۔

مسئلہ نمبر 5: اِلَّآ اِبْلِیْسَ۔ مستثنیٰ متصل کی بنا پر اسے نصب دی گئی ہے کیونکہ جمہور کے قول کے مطابق یہ فرشتوں میں سے تھا۔ یہ حضرات ابن عباس، ابن مسعود، ابن جریج، ابن مسیب اور قتادہ وغیرہم کا قول ہے۔ شیخ ابو الحسن کا اختیار بھی یہی ہے۔ طبری نے اس کو ترجیح دی ہے۔ یہی آیت کا ظاہر ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: ابلیس کا نام عزازیل تھا یہ معزز فرشتوں میں سے تھا اس کے چار پر تھے پھر بعد میں یہ مایوس کر دیا گیا۔ سماک بن حرب نے حضرت عکرمہ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: ابلیس، ملائکہ میں سے تھا جب اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی تو اللہ تعالیٰ نے اس پر غضب فرمایا اور اس پر لعنت کی تو وہ شیطان بن گیا۔ الماوردی نے حکایت کیا ہے کہ حضرت قتادہ سے مروی ہے، ملائکہ میں سے افضل صنف سے ابلیس تھا جن کو الجنۃ کہا جاتا ہے۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا: جن ملائکہ میں سے ایک قبیلہ ہے جو آگ سے پیدا کیے گئے ہیں، ابلیس ان میں سے تھا اور باقی تمام ملائکہ نور سے پیدا ہوئے ہیں۔ ابن زید، حسن اور قتادہ نے بھی یہ کہا ہے کہ ابلیس ابو الجن ہے جس طرح حضرت آدم علیہ السلام ابو البشر ہیں وہ فرشتہ نہیں تھا۔ حضرت ابن عباس سے بھی اسی طرح مروی ہے، فرمایا: اس کا نام الحارث تھا۔ شہر بن حوشب اور بعض اصولیوں نے کہا: ابلیس ان جنوں میں سے تھا جو زمین میں رہتے تھے ملائکہ نے ان کو قتل کیا تھا، ابلیس چھوٹا تھا تو اسے فرشتوں نے قید کر لیا تھا۔ پھر یہ ملائکہ کے ساتھ عبادت کرتا رہا اور اسے خطاب کیا گیا(1)۔ طبری نے یہ حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے، اس مفہوم پر یہ مستثنیٰ منقطع ہو گا۔ اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ (النساء: 157) (نہیں ان کے پاس اس امر کا کوئی صحیح علم بجز اس کے کہ وہ پیروی کرتے ہیں گمان کی) اور ارشاد ہے: اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ (المائدہ: 3) سوائے اس کے جسے تم ذبح کر لو۔ شاعر نے کہا:

لیس علیك عطش ولا جوع الا الرقاد والرقاد ممنوع

تم پر نہ پیاس ہے نہ بھوک مگر نیند اور نیند بھی ممنوع ہے۔

بعض یہ قول کرنے والے اس سے استدلال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کا وصف بیان فرمایا: لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝ (التحریم)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ (الکہف: 50)

اور جن ملائکہ کا غیر ہیں تو پہلے مقالہ والوں نے یہ جواب دیا کہ ملائکہ سے ابلیس کو خارج کرنا ممتنع نہیں ہے جبکہ پہلے ہی اس

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 124، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

کی شقاوت اللہ کے علم میں تھی۔ یہ اس کی طرف سے عدل ہے، جو اللہ تعالیٰ کرتا ہے اس سے اس کے متعلق سوال نہیں کیا جاتا۔ اس کی تخلیق میں نہ آگ شامل تھی اور نہ وہ شہوت سے مرکب تھا جب اس پر غضب ہوا۔ یہ بعید نہیں کہ وہ ملائکہ سے ہو اور جن علماء نے کہا وہ زمین کے جنوں میں سے تھا پس وہ قیدی بنایا گیا اس کے مقابلہ میں روایت کیا گیا ہے کہ ابلیس وہ ہے جس نے زمین میں ملائکہ کے لشکر کے ساتھ جنوں سے جنگ کی۔ یہ مہدی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ ثعلبی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ابلیس ملائکہ کے قبائل میں سے ایک قبیلہ سے تھا جنہیں جن کہا جاتا تھا ان کو نار السموم سے پیدا کیا گیا تھا اور ملائکہ نور سے پیدا کئے گئے ہیں۔ سریانی زبان میں اس کا نام عزازیل ہے۔ عربی میں حارث ہے یہ جنت کے دربانوں میں سے تھا اور آسمان دنیا کے ملائکہ کا رئیس تھا۔ اسے آسمان دنیا اور زمین کی سلطانی بخشی گئی تھی۔ یہ ملائکہ میں سے انتہائی محنت کرنے والا اور زیادہ علم والا تھا۔ آسمان اور زمین جو کچھ ہے سب کا انتظام چلاتا تھا، اس نے اپنا شرف اور عظمت دیکھی تو یہی چیز اس کے کفر کا باعث بنی۔ اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی تو اللہ تعالیٰ نے اسے دھتکارا ہوا شیطان بنا دیا۔ جب انسان کی خطا کبر کی وجہ سے ہو تو اس کی امید نہ رکھو اور جب خطا معصیت کی وجہ سے ہو تو پھر اس کی امید رکھو۔

آدم علیہ السلام کی خطا معصیت تھی اور ابلیس کی خطا تکبر اً تھی۔ ملائکہ کو ان کے پوشیدہ ہونے کی وجہ سے جن کہا جاتا ہے قرآن حکیم میں ہے: وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا (الصافات: 158) شاعر نے کہا:

سخر من جن الملائك تسعة — قياما لديه يعملون بلا اجر (1)

اس نے ملائکہ کے جنوں میں نو مسخر کر لیے۔ وہ اس کے سامنے بلا اجر کام کرتے رہتے ہیں۔

جب وہ جنت کے خزان (دربانوں) میں سے تھا تو اس کی طرف نسبت کی گئی، اس کا اسم جنت سے مشتق کیا گیا۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔ ابلیس کا وزن افعیل ہے، اور یہ ابلاس سے مشتق ہے۔ اس کا معنی اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا ہے اور یہ غیر منصرف ہے کیونکہ یہ معرفہ ہے۔ اسماء میں اس کی مثال نہیں ہے اسے عجمیت کے ساتھ مشابہ کیا گیا ہے۔ یہ ابو عبیدہ وغیرہ نے کہا ہے، بعض علماء نے فرمایا: یہ عجمی ہے اس کا اشتقاق نہیں ہے، عجمہ اور تعریف کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ یہ زجاج وغیرہ نے کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد اَبٰی اس کا معنی ہے جس کا اسے حکم دیا گیا تھا اس سے وہ رک گیا۔ اسی مفہوم میں صحیح حدیث حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے جو نبی کریم ﷺ سے انہوں نے روایت فرمائی ہے: اذا قرء ابن آدم السجدة (فسجد) اعتزل الشيطان يبكي يقول يا ويلة ... في رواية ... يا ويلي امر ابن آدم بالسجود فسجد فله الجنة و امرت بالسجود فابيت فلي النار (2) (مسلم) جب انسان آیت سجدہ پڑھتا ہے پھر سجدہ کرتا ہے تو شیطان جدا ہو کر رونے لگتا ہے اور کہتا ہے: ہائے افسوس! انسان کو سجدہ کا حکم دیا گیا تو اس نے سجدہ کیا۔ پس اس کے لئے جنت ہے اور مجھے سجدہ کا حکم دیا گیا تو میں نے سجدہ نہ کیا تو میرے لئے دوزخ ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 125، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان اطلاق اسم الکفر علی من ترك الصلوٰة، صفحہ 61، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

کہا جاتا ہے: اَبَی یأبٰی اباۃ یہ نادر حرف ہے جو فَعَلَ یَفْعَلُ کے وزن پر آیا ہے حالانکہ اس میں حروف حلقی میں سے کوئی حرف نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الف مضارع حروف حلقیہ کے لئے ہے۔ زجاج نے کہا: میں نے اسماعیل بن اسحاق القاضی کو یہ کہتے سنا کہ میرے نزدیک الف مضارع حروف حلقیہ کے لئے ہے۔ نحاس نے کہا: میں نہیں جانتا کہ ابواسحق نے اسماعیل سے اس حرف کے علاوہ کوئی اس طرح روایت کیا ہو۔

مسئلہ نمبر 7: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اسْتَكْبَرَ، استکبار کا معنی استعظام (اپنے آپ کو بڑا سمجھنا) ہے۔ گویا اس نے سجدہ کو اپنے حق میں ناپسند کیا اور آدم کے حق میں بڑا سمجھا۔ اس نے حضرت آدم کے سامنے سجدہ کرنے کو ترک کیا اللہ تعالیٰ کے امر اور اس کی حکمت کو نہ سمجھتے ہوئے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حالت کو کبر سے تعبیر فرمایا۔ ارشاد فرمایا: لا یدخل الجنة من کان فی قلبه مثقال حبة من خردل من کبر۔ (1) جنت میں داخل نہ ہوگا جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر تکبر ہوگا۔ ایک روایت میں ہے ایک شخص نے عرض کی: ایک آدمی اچھا لباس اور اچھا جوتا پسند کرتا ہے (کیا یہ کبر ہے؟) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان اللہ جمیلٌ یحب الجمال۔ الکبر بطر الحق وغمط الناس۔ (2) اللہ تعالیٰ خود بھی جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے تکبر یہ ہے کہ حق کو باطل قرار دے اور لوگوں کو حقیر سمجھے۔ (مسلم) غمص الناس کے الفاظ بھی مروی ہیں۔ اس کا معنی بھی حقیر سمجھنا ہے۔ جب آدمی نعمت کا شکر ادا نہ کرے تو کہتے ہیں: غمص فلان النعمة... غمصت علیه قولاً قاله یعنی میں نے اسے عیب لگایا۔ اس معنی کی شیطان لعین نے وضاحت کی تھی۔ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝ (اعراف) (میں بہتر ہوں اس سے تو نے پیدا کیا ہے مجھے آگ سے اور پیدا کیا ہے اسے کیچڑ سے)۔ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ۝ (الاسراء) (کیا میں سجدہ کروں اس (آدم) کو جس کو تو نے کیچڑ سے پیدا کیا)۔ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ (الحجر) (میں گوارا نہیں کرتا کہ سجدہ کروں اس بشر کو جسے تو نے پیدا کیا ہے بجنے والی مٹی سے جو پہلے سیاہ بدبودار تھی)۔

اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اسے کافر قرار دیا جو شخص اللہ تعالیٰ کے کسی امر یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی امر کو باطل قرار دیتا ہے۔ اس کا حکم بھی یہی ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ابن القاسم نے مالک سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ سب سے پہلا گناہ حسد اور کبر تھا، ابلیس نے حضرت آدم سے حسد کیا، درخت کھلانے میں حضرت آدم کو برانگیختہ کیا (3)۔ قتادہ نے کہا: ابلیس نے حضرت آدم سے حسد کیا اس نعمت و کرامت کی وجہ سے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو عطا فرمائی تھی۔ شیطان نے کہا: میں ناری ہوں اور تو طینی (مٹی سے بنا ہوا) ہے۔ گناہوں کا آغاز کبر سے ہوا پھر حرص

1۔ جامع ترمذی، ابواب البر والصلة، صفحہ 21، جلد 2 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تحریم الکبر وبیانه، صفحہ 65، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 125، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

سے ہوا حتیٰ کہ آدم علیہ السلام نے درخت سے کھالیا پھر آدم کے بیٹے نے اپنے بھائی سے حسد کیا۔

مسئلہ نمبر 8: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ بعض علماء نے فرمایا: یہاں كَانَ بمعنی صار ہے۔ جس طرح کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ﴿۴۳﴾ (ہود) یعنی وہ غرق ہونے والوں میں سے ہو گیا۔ شاعر نے کہا:

بِتَيهاء قفرٍ والمَطِيّ كانها قطا انحزن قد كانت فراخاً بيوضها

تیہاء کا میدان اور سواریاں غمگین کونج کی طرح ہیں جن کے انڈے بچے بن گئے ہیں۔

ابن فورک نے کہا: یہاں كَانَ کو بمعنی صار کرنا خطا ہے، اصول اس قول کا رد کرتے ہیں۔ جمہور متأولین نے کہا: اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ وہ کفر کرے گا، کیونکہ حقیقۃً کافر اور حقیقۃً مومن وہی ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ یہ آخر میں کفر اختیار کرے گا یا ایمان اختیار کرے گا(1)۔

میں کہتا ہوں: یہ قول صحیح ہے کیونکہ صحیح بخاری میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اعمال کا دارومدار خاتمہ پر ہے(2)، بعض علماء نے فرمایا: ابلیس نے اللہ تعالیٰ کی اسی ہزار سال عبادت کی اور جنت میں علی الاستدراج، ریاست اور خزانت دی گئی جس طرح کہ منافقین نے اپنی زبانوں کی اطراف پر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی شہادت دی، اور اسی طرح بلعام نے اپنی زبان کی طرف سے اسم اعظم کی گواہی دی۔ پس یہ چیز اس کی ریاست میں تھی جبکہ کبر اس کے نفس میں متمکن تھا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: شیطان سوچتا تھا کہ اس کو جو اللہ نے نعمتیں دی ہیں ان کی وجہ سے اسے فرشتوں پر فضیلت حاصل ہے، اسی وجہ سے اس نے کہا تھا اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ (اعراف:12)

اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ؕ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ ﴿۷۵﴾ (ص) (کس چیز نے باز رکھا تمہیں اس کو سجدہ کرنے سے جسے میں نے پیدا کیا اپنے دونوں ہاتھوں سے کیا تم نے تکبر کیا یا تو اپنے آپ کو اس سے عالی مرتبہ خیال کرتا ہے)۔

یعنی تو نے تکبر کیا حالانکہ تجھے کبر نہیں کرنا چاہئے۔ میں نے تکبر نہیں کیا جب میں نے اسے اپنے دست قدرت سے پیدا کیا اور کبر تو میرے لئے مناسب ہے۔ اسی لئے فرمایا: وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ شیطان کی خلقت کی اصل عزت کی آگ سے تھی اسی وجہ سے اس نے اللہ تعالیٰ کی عزت کی قسم اٹھائی اس نے کہا فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۲﴾ (ص)

عزت نے اسے کبر دیا حتیٰ کہ اس نے آدم علیہ السلام پر اپنی فضیلت دیکھی۔

ابو صالح سے مروی ہے، فرمایا: ملائکہ عزت کے نور سے پیدا کئے گئے ہیں اور ابلیس عزت کی آگ سے پیدا کیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 9: ہمارے علماء نے فرمایا: جس کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ کرامات اور خوارق للعادات امور ظاہر کرے جبکہ وہ نبی نہ ہو تو یہ چیز اس کی ولایت کی دلیل نہیں ہے، لیکن بعض صوفیاء اور رافضیوں کا نظریہ اس کے خلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں: یہ

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 125، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 961، جلد 2 (و۔ ت)۔ ایضاً، کتاب الرقاق، باب الاعمال بالخواتیم وما یخاف منہا، حدیث 6012، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کرامات دلیل ہیں کہ وہ ولی ہے اگر یہ ولی نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ پر کرامات ظاہر نہ فرماتا۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ ہم میں سے کسی کے ولی ہونے کا علم صحیح نہیں ہوتا مگر اس کے بعد کہ یہ معلوم ہو کہ وہ مومن ہو کر فوت ہوا ہے۔ جب یہ معلوم نہ ہو کہ وہ مومن ہو کر مرا ہے تو ہمارے لئے ممکن نہیں ہے کہ ہم قطعی طور پر کہیں کہ وہ اللہ کا ولی ہے کیونکہ اللہ کا ولی وہ ہوتا ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ وہ ایمان سے ہی موافقت کرے گا۔ جب ہمارا اس بات پر اتفاق ہے کہ ہمارے لئے کسی پر قطعی طور پر یہ حکم لگانا ممکن نہیں کہ وہ ایمان سے موافقت کرے گا نہ خود اپنے بارے کوئی قطعی طور پر یہ فیصلہ کرسکتا ہے کہ وہ بالآخر ایمان سے موافقت کرے گا۔ تو معلوم ہوا کہ یہ چیز اللہ کے ولی ہونے پر دلیل نہیں۔ وہ کہتے ہیں: یہ ممنوع نہیں کہ اللہ تعالیٰ بعض اولیاء کو اپنے حسن انجام اور حسن عمل کے خاتمہ کی خبر دے دے اور اس کے ساتھ دوسروں کے حسن خاتمہ کی خبر دے دے (☆)۔

یہ شیخ ابوالحسن اشعری وغیرہ کا قول ہے۔ طبری کا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ابلیس کے واقعہ سے انسان میں سے جو ابلیس کے مشابہ ہیں انہیں تنبیہ کرنا مقصود ہے اور وہ یہودی ہیں جنہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا حالانکہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو جانتے تھے اور ان نعمتوں کو جانتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے ان پر اور ان کے اسلاف (1) پر کی تھیں۔

مسئلہ نمبر 10: علماء کا اختلاف ہے کہ ابلیس کافر تھا یا نہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: کافر نہیں تھا اور ابلیس نے سب سے پہلے کفر کیا اور بعض علماء نے فرمایا، اس سے پہلے کفار تھے اور وہ جن تھے جو زمین میں آباد تھے۔ پھر اس میں اختلاف ہے کہ ابلیس نے جہالت یا عناد کی بنا پر کفر کیا تھا۔ اس میں اہل سنت و جماعت کے دو قول ہیں اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ اپنے کفر سے پہلے اللہ تعالیٰ کو جاننے والا تھا اور جس نے کہا اس نے جہالت کی وجہ سے کفر کیا تھا اس نے کہا اس کے کفر کے وقت اس سے علم چھین لیا گیا تھا اور جنہوں نے کہا عناد کی وجہ سے اس نے کفر کیا تھا اس نے کہا شیطان نے کفر کیا حالانکہ اس کے پاس علم تھا۔ ابن عطیہ نے کہا: علم کے باقی ہوتے ہوئے عناداً کفر کرنا بعید ہے مگر یہ میرے نزدیک جائز ہے اللہ تعالیٰ جس کو رسوا کرنا چاہے اس کے لئے محال نہیں ہے۔

وَ قُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۳۵

''اور ہم نے فرمایا: اے آدم! رہو تم اور تمہاری بیوی اس جنت میں اور دونوں کھاؤ اس جنت سے جتنا چاہو جہاں سے چاہو اور مت نزدیک جانا اس درخت کے ورنہ ہو جاؤ گے اپنا حق تلف کرنے والوں سے''۔

اس میں تیرہ مسائل ہیں۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 126، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

☆ اس قول میں اولیاء اللہ کے بارے حضرت مفسر نے زیادہ ہی شدت کا اظہار کیا ہے حالانکہ شرح عقائد نسفیہ میں اس پر جامع ترین گفتگو کی گئی ہے۔ ولایت کے ایمان، طاعات پر مواظبت اور معاصی سے اجتناب لازم ہے اور اولیاء اللہ سے کرامات کا وقوع حق ہے۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قُلْنَا یٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو اس کے کفر کرنے کے وقت اپنی بارگاہ سے نکال دیا اور اسے جنت سے دور کر دیا اور اس کو نکالنے کے بعد حضرت آدم علیہ السلام سے فرمایا (اسکن) یعنی ٹھہرو اور جنت کو مسکن بناؤ۔ سکن الیہ یسکن سکونا (کسی کے پاس ٹھہرنا) السکن آگ کو بھی کہتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

قد قُوِمتْ بسکن وادھان

آگ اور تیل لگانے کے ساتھ سیدھے کیے گئے۔

اور السکن ہر وہ چیز جس کی طرف سکون حاصل کیا جائے، السکین چھری کو کہتے ہیں اور چھری کو سکین کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ہر مذبوح کی حرکت کو ساکن کر دیتی ہے، اسی سے مسکین ہے جس کا تصرف کم اور حرکت قلیل ہوتی ہے، سکان السفینہ کشتی کا پچھلا حصہ وہ کشتی کو اضطراب سے سکون دیتا ہے اس لئے اسے سکان السفینۃ کہتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اسْكُنْ یہ نکلنے پر تنبیہ ہے کیونکہ سکنی ملکیت نہیں ہوتا اس لئے بعض عارفین نے کہا: سکنی ایک خاص مدت تک ہوتا ہے پھر وہ ختم ہو جاتا ہے پس جنت میں آدم وحواء کا دخول، بطور سکنی تھا نہ کہ بطور اقامت تھا۔

میں کہتا ہوں: جب یہ معنی ہو تو پھر جمہور کے قول کی اس میں دلیل ہے کہ جو کسی شخص کو اپنی کسی جگہ ٹھہرائے تو وہ ٹھہرنے کی وجہ سے مالک نہیں ہوگا۔ جب ٹھہرانے کی مدت ختم ہو جائے تو اس کے لئے اسے نکالنا جائز ہے۔ امام شعبی فرماتے تھے: جب کوئی شخص یہ کہے: داری لک سکنی حتی تموت میرا گھر تیرے لئے سکنی ہے یہاں تک کہ تو فوت ہو جائے تو وہ زندگی اور موت میں موہوب لہ (جس کو دیا گیا) کے لئے ہوگا۔ جب یہ کہا: داری ھذہ اسکنھا حتی تموت یہ میرا گھر ہے تو اس میں رہائش رکھ یہاں تک کہ تو فوت ہو جائے۔ تو مالک کی طرف لوٹے گا جب ٹھہرنے والا مر جائے گا۔ سکنی کی طرح عمریٰ ہے مگر عمریٰ میں سکنی کی نسبت اختلاف زیادہ قوی ہے۔ عمریٰ پر کلام ان شاء اللہ سورۂ ہود میں آئے گی۔ حربی نے کہا: میں نے ابن اعرابی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ عربوں کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ اشیاء مالک کی ملک میں ہوتی ہیں اور ان کے منافع اس کے لئے ہوتے ہیں جس کو عمریٰ، رقبیٰ، افقار، اخبال، منحہ، عریہ، سکنی، اطراق کے الفاظ بول کر دیئے جاتے ہیں۔

یہ امام مالک اور ان کے متبعین کی حجت ہے کہ ان چیزوں کا موہوب لہ مالک نہ ہوگا مگر منافع کا مالک ہوگا سوائے غلاموں کے۔ یہ لیث بن سعد، قاسم بن محمد اور یزید بن قسیط کا قول ہے۔

عمریٰ یہ ہے کہ تو کسی شخص کو اپنے گھر میں اپنی عمر کی مدت یا اس کی عمر کی مدت ٹھہرائے، اسی طرح رقبیٰ ہے۔ تو یہ کہے کہ اگر تو مجھ سے پہلے مر گیا تو میں تیری طرف لوٹ آؤں گا اور اگر میں تجھ سے پہلے مر گیا تو یہ تیرے لئے ہوگا۔ یہ المراقبہ سے ہے اور مراقبہ یہ ہے کہ ہر ایک دوسرے کی موت کو تاڑتا رہے۔ اسی وجہ سے اس کی اجازت اور عدم اجازت میں اختلاف ہے۔ ابو یوسف اور امام شافعی نے اس کی اجازت دی ہے گویا ان کے نزدیک یہ وصیت ہے اور امام مالک اور کوفیوں نے اس سے منع کیا ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک عوض کا قصد کرتا ہے۔ اسے معلوم نہیں ہوتا کہ کیا اسے ملے گا؟ اور ہر ایک دوسرے کی موت

کی تمنا کرتا ہے، اس کے متعلق دو احادیث ہیں جن میں اجازت اور عدم اجازت کا ذکر ہے وہ دونوں احادیث ابن ماجہ نے اپنی سنن میں ذکر کی ہیں۔ پہلی وہ ہے جسے حضرت جابر بن عبداللہ نے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: العمریٰ جائزۃٌ لمن اعمرھا والرقبیٰ جائزۃ لمن ارقبھا۔(1) یعنی عمریٰ جائز ہے جس کے لئے اسے عمر بھر دیا گیا اور رقبیٰ جائز ہے اس کے لئے جس کے لئے رقبیٰ کیا گیا۔ اس حدیث میں عمریٰ اور رقبیٰ حکم میں برابر ہیں۔ دوسری وہ حدیث ہے جو حضرت ابن عمر نے روایت کی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لا رقبی ممن ارقب شیئاً فھو لہ حیاتہ و مماتہ۔(2) ''فرمایا: رقبیٰ نہیں ہے، پس جس کے لئے رقبیٰ کیا گیا وہ حیات و موت میں اس کے لئے ہے۔'' فرمایا: رقبیٰ یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کو کہے: منی و منک موتاً میری اور تیری موت تک ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد 'لا رقبی' یہ نہی ہے جو منع پر دلیل ہے اور من ارقب شیئاً فھولہ۔ یہ جواز پر دلالت کرتا ہے۔ یہ دونوں احادیث نسائی نے بھی نقل کی ہیں۔ حضرت ابن عباس سے ذکر کیا جاتا ہے کہ انہوں نے فرمایا: عمریٰ اور رقبیٰ برابر ہیں۔ ابن منذر نے کہا: یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: العمریٰ جائزۃٌ لمن اعمرھا والرقبیٰ جائزۃٌ لمن ارقبھا۔ ابن منذر نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ یہ اس شخص کے لئے حجت ہے جس نے کہا: عمریٰ و رقبیٰ برابر ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور ثوری اور احمد نے بھی یہی کہا ہے کہ وہ پہلے کی طرف کبھی نہیں لوٹے گا۔ اسحاق کا بھی یہی قول ہے۔ طاؤس نے کہا: من ارقب شیئاً فھو سبیل المیراث جس کو کوئی چیز رقبیٰ کے طور پر دی گئی تو وہ میراث ہے۔

الافقار، یہ فقار الظھر (پیٹھ کے مہرے) سے ماخوذ ہے۔ افقرتك ناقتی یعنی میں نے تجھے عاریۃً اس کی پیٹھ سوار ہونے کے لئے دی، افقرك الصید جب وہ تجھے اس کی پیٹھ پر قدرت دے حتیٰ کہ تو اس پر تیر پھینکے۔ اس کی مثل الاخبال ہے۔ کہا جاتا ہے: اخبلت فلاناً اذا اعرتہ ناقۃ یرکبھا او فرساً یغزو علیہ۔ جب کوئی اپنی اونٹنی سوار ہونے کے لئے یا گھوڑا جہاد کے لئے پیش کرے تو کہتے ہیں: اخبلت فلاناً۔ زہیر نے کہا:

هنالك ان یستخبلو المال یخبلوا　　　وان یسئلوا یعطوا وان ییسروا یغلوا

وہاں ان سے مال عاریۃً لیا جائے تو وہ مال دیتے ہیں، اگر ان سے سوال کیا جاتا ہے تو وہ مال دیتے ہیں اور وہ جب سستے سمجھے جاتے ہیں تو وہ مہنگے ہوتے ہیں۔

المنحۃ سے مراد عطیہ ہے۔ المنحۃ، دودھ کا عطیہ، المنیحہ وہ اونٹنی یا بکری جو کوئی شخص دوسرے کو دودھ پینے کے لئے دیتا ہے پھر وہ اسے واپس کر دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: العاریۃ مؤداۃٌ والمنحۃ مردودۃ والدین مقضی و الزعیم غارمٌ(3) عاریۃً دی گئی چیز واپس پہنچائی جائے گی دودھ والا جانور واپس کیا جائے گا اور قرض ادا کیا جائے گا اور زعیم غارم ہے۔

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 173، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الاحکام، باب الرقبیٰ، حدیث نمبر 2373، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 173، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الاحکام، باب الرقبیٰ، حدیث نمبر 2372، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابی داود، کتاب البیوع، باب تضمین العاریۃ، حدیث نمبر 3094، ایضاً، جامع ترمذی، حدیث نمبر 2046، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اس حدیث کو ابو امامہ نے روایت کیا ہے۔ اسے ترمذی، دار قطنی وغیرہما نے ذکر کیا ہے۔ یہ حدیث صحیح ہے۔

الاطراق، نر جانور عاریۃً دینا۔ استطرق فلان فلاناً فحلہ فلاں نے فلاں سے نر جانور طلب کیا تا کہ وہ اپنی اونٹنی پر بٹھائے فاطرقہ ایاہ، اسے نر جانور دیا۔ کہا جاتا ہے: اطرقنی فحلك یعنی مجھے اپنا نر جانور دو تا کہ میں اپنی اونٹنی پر بٹھاؤں۔ طرق الفحل الناقۃ۔ اونٹ اونٹنی پر بیٹھا۔ طروقۃ الفحل، مادہ اونٹنی۔ کہا جاتا ہے: ناقۃ طروقۃ الفحل یہ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو جفتی کے قابل ہو۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ، اَنْتَ فعل میں مضمر ضمیر کی تاکید کے لیے ہے، اس کی مثال یہ ہے فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ (مائدہ: 24) صرف اسکن و زوجك جائز نہیں ہے اور اذھب و ربك جائز نہیں ہے مگر ضرورت کے لیے جائز ہے۔ شاعر نے کہا:

قلت اذ اقبلت و زھر تھادیٰ   کنعاج الملا تعسّفن رملا

میں نے کہا: جب وہ اور سفید چمکنے والیاں سوار ہو کر آہستہ آہستہ چل کر آئیں جیسے جنگلی گایوں کا گروہ ہو۔

اس شعر میں زھر کا عطف ضمیر مضمر پر ہے جو اقبلت میں ہے۔ اس ضمیر کی تاکید نہیں لگائی گئی اور غیر قرآن میں بعید طور پر تاکید نہ لگانا جائز ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَزَوْجُكَ یہ قرآن کی لغت ہے۔ زوج ھاء کے بغیر۔ اس پر کلام پہلے گزر چکی ہے۔ صحیح مسلم میں آتا ہے (زوجۃٌ) حضرت انس سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ایک زوجہ محترمہ کے ساتھ تھے۔ ایک شخص آپ کے پاس سے گزرا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلایا۔ وہ آیا تو فرمایا: یا فلاں ھذہ زوجتی فلانۃ۔ یہ میری فلاں بیوی ہے۔ اس شخص نے عرض کی: یا رسول اللہ! میں کون ہوں جو یہ گمان کروں میں نے آپ کے متعلق کوئی ایسا گمان نہیں کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شیطان انسان میں خون کے چلنے کی طرف چلتا ہے(1)۔ حضرت آدم کی بیوی حضرت حوا تھی سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام ہی تھے جنہوں نے ان کا یہ نام رکھا جب وہ ان کی پسلی سے پیدا ہوئی تھیں مگر حضرت آدم علیہ السلام کو ان کی تخلیق محسوس نہ ہوئی تھی۔ اگر حضرت آدم علیہ السلام کو تکلیف محسوس ہوتی تو کوئی شخص اپنی بیوی پر مہربان نہ ہوتا۔ جب آپ بیدار ہوئے تو آپ سے کہا گیا: یہ کون ہے؟ حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا: عورت ہے۔ پوچھا گیا: اس کا نام کیا ہے؟ فرمایا: حوا۔ پوچھا گیا: اس کا امراۃٌ نام کیوں رکھا گیا؟ فرمایا: کیوں کہ یہ المرء (مرد) سے ہے۔ پوچھا گیا: اس کا نام حوا کیوں رکھا گیا؟ فرمایا: کیونکہ یہ حی (زندہ) سے پیدا کی گئی ہے۔ روایت ہے کہ ملائکہ نے یہ سب سوال کئے تا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے علم کا تجربہ کر لیں، فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام سے پوچھا: اے آدم! کیا تو اس سے محبت کرتا ہے؟ حضرت آدم علیہ السلام نے کہا: ہاں۔ پھر فرشتوں نے حضرت حوا سے پوچھا: اے حواء! کیا تو حضرت آدم سے محبت کرتی ہے؟ حضرت حواء نے کہا: نہیں حالانکہ حضرت حوا کے دل میں، حضرت آدم علیہ السلام کی محبت سے کئی گنا زیادہ محبت تھی۔ فرشتوں نے کہا:

1۔ صحیح مسلم، کتاب السلام، باب بیان انہ یستحب لمن رای خالیا بامراۃ الخ، صفحہ 216، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

اگر کوئی عورت اپنے خاوند سے محبت میں سچ بولتی ہوتی تو حضرت حوا بھی سچ کہتی۔ حضرات ابن مسعود اور ابن عباس نے فرمایا: جب حضرت آدم علیہ السلام کو جنت میں ٹھہرایا گیا تو وہ اس میں وحشت سے چلے جب سو گئے تو ان کی بائیں جانب سے چھوٹی پسلی سے حضرت حوا پیدا کی گئی تا کہ آپ اس سے سکون حاصل کریں اور مانوس ہوں، جب آپ جاگے تو آپ نے اسے دیکھا۔ پوچھا: تو کون ہے؟ حضرت حواء نے کہا: ایک عورت ہوں جو تیری پسلی سے پیدا کی گئی ہوں تا کہ تو سکون پائے (1)۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا یہی معنی ہے هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا (اعراف: 189) (وہ (خدا ہے) جس نے پیدا فرمایا تمہیں ایک نفس سے اور بنایا اس سے اس کا جوڑا تا کہ اطمینان حاصل کرے اس (جوڑے) سے)۔

علماء نے فرمایا: اسی وجہ سے عورت کا مزاج ٹیڑھا ہوتا ہے کیونکہ وہ ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے (2)۔ ایک روایت میں ہے: پسلی میں سے ٹیڑھا حصہ اوپر والا حصہ ہے یہ تیرے لئے ایک طریقہ پر سیدھی نہیں ہوگی اگر تو اس سے فائدہ اٹھائے تو فائدہ اٹھالے جبکہ اس میں ٹیڑھا پن ہوگا۔ اگر تو اسے سیدھا کرنا چاہے گا تو تو اسے توڑ دے گا اور اس کا توڑنا اس کو طلاق دینا ہے (3)۔ شاعر نے کہا:

هي الضلع العوجاء لست تقيمها الا ان تقويم الضلوع انكسارها

اتجمع ضعفا و اقتداراً على الفتى أليس عجيبا ضعفا واقتدارُها

یہ ٹیڑھی پسلی ہے تو اس کو سیدھا نہیں کر سکے گا۔ خبردار! اس کا سیدھا کرنا اس کو توڑنا ہے۔ کیا تو ایک نوجوان پر ضعف اور اقتدار کو جمع کرے گا کیا اس (عورت) کا ضعف اور اس کا اقتدار عجیب نہیں ہے۔

اس سے علماء نے خنثیٰ مشکل کی میراث پر استدلال کیا ہے۔ جب اس میں عورتوں اور مردوں والی تمام صفات و علامات برابر ہوں مثلاً داڑھی بھی ہو، پستان بھی ہوں اور پیشاب کی جگہ میں بھی برابر ہو تو اعضاء کی کمی کا اعتبار ہوگا۔ اگر اس کی پسلیاں عورت کی پسلیوں سے کم ہیں تو اسے مرد والا حصہ دیا جائے گا۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے...... کیونکہ حضرت حوا آدم علیہ السلام کی ایک پسلی سے پیدا ہوئی ہے۔ ان شاء اللہ مزید تفصیل آگے میراث کی بحث میں آئے گی۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الْجَنَّةَ اس کا معنی باغ ہے۔ اس پر تفصیلی بحث پہلے گزر چکی ہے۔ معتزلہ اور قدریہ کے قول کی طرف توجہ نہیں دی جائے گی جو وہ کہتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام جنۃ الخلد میں نہیں تھے بلکہ وہ عدن کی زمین میں ایک باغ میں تھے اور انہوں نے اپنی بدعت پر اس طرح استدلال کیا ہے کہ اگر یہاں جنت سے جنۃ الخلد مراد ہوتی تو ابلیس جنت میں نہ پہنچتا کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ ﴿۲۳﴾ (الطور) اور فرمایا: لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا ﴿۳۵﴾ (النبا) اور فرمایا لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ﴿۲۵﴾ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا (الواقعہ: 25)

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 126، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب الوصیۃ بالنساء، صفحہ 475، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب الوصیۃ بالنساء، صفحہ 475، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

نیز وہ کہتے ہیں: اہل جنت تو جنت سے باہر نہیں نکلیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ۝ (الحجر) نیز جنت دارالقدس ہے گناہوں اور خطاؤں سے پاک رکھی گئی ہے۔ جبکہ ابلیس نے تو لغو بات کی اور جھوٹ بولا نیز حضرت آدم و حضرت حوا اپنی معصیت کی وجہ سے جنت سے باہر نکالے گئے۔

وہ کہتے ہیں: حضرت آدم علیہ السلام کے لئے یہ کیسے جائز تھا کہ وہ شجرۃ الخلد طلب کریں جبکہ حضرت آدم علیہ السلام اللہ کی بارگاہ میں بڑے مقرب تھے اور آپ عقل میں کمال رکھتے تھے حالانکہ وہ دارالخلد میں تھے اور ایسے ملک میں تھے جو کبھی پرانا ہونے والا نہیں تھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کو معرف باللام ذکر کیا ہے اور جو کہتا ہے: اسأل الله الجنة (میں اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کرتا ہوں) مخلوق کے عرف میں جنت سے مراد جنت الخلد ہی ہوتی ہے اور عقلاً کوئی محال نہیں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو دھوکا دینے کے لئے ابلیس جنت میں داخل ہو جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حضرت آدم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام سے کہا: تو نے اپنی اولاد کو محروم کیا اور انہیں جنت سے نکالا (1)۔ الف، لام جنت پر داخل کیا گیا ہے تاکہ یہ دلالت کرے کہ اس سے مراد جنت معروفہ ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کوئی انکار نہیں کیا اگر اس سے کوئی اور جنت مراد ہوتی تو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا رد کر دیتے۔ جب حضرت آدم علیہ السلام اس پر خاموش رہے جس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ثابت کیا تو صحیح ہوا کہ جس گھر سے اللہ تعالیٰ نے انہیں نکالا وہ جنت تھی اور وہ اس گھر کے مخالف تھی جس کی طرف وہ نکالے گئے تھے۔

اور جن آیات سے معتزلہ اور قدریہ نے حجت پکڑی ہے یہ حکم اس کے بعد ہوگا جب جنتی قیامت کے دن جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ یہ بھی ممتنع نہیں ہے کہ جنت دارالخلد اس شخص کے لئے ہو جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اسے ہمیشہ اس میں رکھنے کا ارادہ کیا ہو اور وہ جنت سے نکل جائے گا جس کے متعلق فنا کا ارادہ کیا گیا ہوگا۔

اہل تاویل کا اس بات پر اجماع ہے کہ ملائکہ جنت میں اہل جنت پر داخل ہوتے ہیں اور پھر جنت سے نکل آتے ہیں۔ جنت کی چابیاں ابلیس کے ہاتھ میں تھیں پھر معصیت کے بعد اس سے واپس لے لیں گئیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جنت میں معراج کی رات داخل ہوئے پھر اس سے باہر تشریف لے آئے اور جو کچھ اس کے اندر تھا اس کے متعلق بتایا اور یہ یقیناً جنت الخلد تھی۔ رہا معتزلہ کا یہ قول کہ جنت دارالقدس ہے اللہ تعالیٰ نے اسے گناہوں سے پاک رکھا ہے یہ ان کی جہالت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ وہ ارض مقدسہ (شام) میں داخل ہوں۔ اہل شریعت کا اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے مقدس فرمایا حالانکہ ان میں گناہ، کفر، جھوٹ سب پائے گئے ہیں اس کی تقدیس، گناہوں سے مانع نہیں۔ اسی طرح دارالقدس بھی ہے۔ ابوالحسن بن بطال نے کہا: بعض مشائخ نے بیان کیا ہے کہ اہل سنت کا اجماع ہے کہ جنت الخلد وہی ہے جس سے حضرت آدم علیہ السلام اترے، جو اس کا مخالف ہے اس کے قول کا کوئی اعتبار نہیں ان کا یہ قول کہ حضرت آدم علیہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب قولہ کلم اللہ موسیٰ تکلیماً، حدیث نمبر 6961، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

السلام کے لئے یہ کیسے جائز ہے کہ انہوں نے شجرۃ الخلد طلب کیا حالانکہ وہ عقل کے کمال کے حامل تھے اور وہ دارالخلد میں تھے، ان پر اس کا عکس پیش کیا جاتا ہے کہ کمال عقل ہونے کے باوجود حضرت آدم پر یہ کیسے جائز ہے کہ وہ دارالفناء میں شجرۃ الخلد طلب کریں یہ تو اس شخص کے لئے بھی جائز نہیں جو معمولی سی عقل رکھتا ہو، حضرت آدم پر کیسے جائز ہے جو ازروئے عقل کے تمام لوگوں سے ارجح تھے، جیسا کہ حضرت ابوامامہ نے کہا ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا جمہور قراء کی قراءت رغدا ہے۔ یعنی غین کے فتحہ کے ساتھ۔ نخعی اور ابن وثاب نے غین کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے الرغد ایسا خوشگوار گھر جس میں کوئی تھکاوٹ نہ ہو۔ شاعر نے کہا:

بینما المرء تراہ ناعما یا من الاحداث فی عیش رغد(1)

جب تو کسی کو نرم ونازک دیکھتا ہے۔ نوجوان خوشگوار زندگی میں امن میں ہوتے ہیں۔

کہا جاتا ہے: رغد عیشھم و رغد (غین کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ) ارغد القوم جب لوگ خوشحال زندگی گزار رہے ہوں۔ یہ مصدر محذوف کی صفت کی وجہ سے منصوب ہے وحیثُ وحیثَ وحیثِ وحوث وحوث وحاث اس میں یہ تمام لغات ہیں۔ یہ نحاس وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 7: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ یعنی کھانے کے لئے اس کے قریب نہ جاؤ کیونکہ باقی نفع حاصل کرنے میں اباحت تھی (2)۔ ابن عربی نے کہا: نضر بن شمیل کی مجلس میں میں نے شاشی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جب کہا جاتا ہے: لاتقرب (راء کے فتحہ کے ساتھ) تو اس کا معنی ہوتا ہے بالفعل اس کام کومت کر اور جب راء کے ضمہ کے ساتھ بولا جاتا ہے تو اس کا معنی ہوتا ہے اس کے قریب نہ جا۔ صحاح میں ہے: قَرُبَ الشیء یقرب قربا یعنی چیز قریب ہوئی۔ قربتہ (راء کے کسرہ کے ساتھ) اقربہ قربانا یعنی میں اس کے قریب ہوا۔ قربت اقرُبُ قرابۃ جیسے کتبت، اکتب کتابۃ جب تو پانی کی طرف چلے جبکہ تیرے اور اس کے درمیان ایک رات کا فاصلہ ہو، اس کا اسم القَرَب ہے۔ اصمعی نے کہا: میں نے اعرابی سے کہا: ما القرب؟ انہوں نے کہا: کل پانی پر وارد ہونے کے لئے رات کو چلنا۔ ابن عطیہ نے کہا: بعض ماہرین کا قول ہے: اللہ تعالیٰ نے جب اس درخت کے کھانے سے نہی فرمانے کا ارادہ فرمایا تو اس سے نہی فرمائی تو ایک ایسے لفظ کے ساتھ جو کھانے اور کھانے کی طرف راغب کرنے والے اقدام سے منع پر دلالت کرتا ہے اور وہ ہے: قرب۔ ابن عطیہ کہتے ہیں: یہ سد ذرائع کی واضح مثال ہے (3)۔ بعض ارباب معانی نے کہا: وَلَا تَقْرَبَا یہ خطا کے وقوع اور جنت سے خروج کا شعور دیتا ہے اور اس بات کا شعور دیتا ہے کہ ان دونوں نے جنت میں ہمیشہ نہیں رہنا ہے، کیونکہ جس نے ہمیشہ رہنا ہو اس پر کوئی چیز ممنوع نہیں ہوتی، نہ اسے حکم دیا جاتا ہے اور نہ اسے منع کیا جاتا ہے۔

اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً (البقرہ: 30) یہ جنت سے خروج کی دلیل ہے۔

1۔ تفسیر الماوردی، صفحہ 105، جلد 1 (دارالکتب العلمیہ) 2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 127، جلد 1 (دارالکتب العلمیہ) 3۔ ایضاً

مسئلہ نمبر 8: هٰذِهِ الشَّجَرَةَ، هٰذِهِ اسم مبہم ہے اس کے ساتھ ایسے اسم کو بطور صفت ذکر کیا جاتا ہے جس پر الف، لام ہو اس کے علاوہ نہیں۔ جیسے تیرا قول مررت بھذا الرجل، بھذہ المرأۃ و ھذہ الشجرۃ۔ ابن محیصن نے ات ھذی الشجرۃ یعنی یا کے ساتھ پڑھا ہے یہی اصل ہے۔ کیونکہ اس میں ھا، یا کا بدل ہے اسی وجہ سے اس کا ماقبل مکسور ہے۔ کلام میں اس لفظ کے علاوہ کوئی ایسی ھا تانیث نہیں ہے جس کا ماقبل کسرہ ہو اور اس میں ھا کا اصل یا ہے۔

والشجرۃ والشِجَرَۃ والشیرۃ۔ یہ تین لغات ہیں الشجرہ، شین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے الشِجرہ والشَجرۃ اس درخت کو کہتے ہیں جس کا زمین میں تنا ہو، ارض شجیرۃ و شجراء ایسی زمین جس میں درخت زیادہ ہوں۔ واد شجیر اور واد اشجر نہیں کہا جاتا شجراء کا واحد شجرۃ ہے اس جمع کے وزن پر بہت کم حروف کی جمع آتی ہے شجرۃ شجراء ۔ قصبۃ قصباء۔ طرفۃ طرفاء، حلفۃ حلفاء۔ اصمعی نے کہا: الحلفا مفرد حلفۃ ہے معنی دوسرے الفاظ سے مختلف ہے۔ سیبویہ نے کہا: الشجراء واحد اور جمع ہے۔ اسی طرح القصباء والطرفاء اور الحلفاء ہے۔ المشجرۃ درختوں والی جگہ۔ ارض مشجرۃ۔ کہا جاتا ہے: ھذہ الارض اشجر من ھذہ۔ یعنی یہ زمین اس زمین سے زیادہ درختوں والی ہے۔ یہ جوہری کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 9: اہل تاویل کا اس درخت کی تعیین میں اختلاف ہے جس کے کھانے سے منع کیا گیا تھا۔ حضرات ابن مسعود، ابن عباس، شعبہ بن جبیر، جعدہ بن ہبیرہ نے کہا: یہ انگور کی بیل تھی، اسی وجہ سے شراب ہم پر حرام کی گئی ہے۔

حضرت ابن عباس، ابو مالک اور قتادہ نے فرمایا: یہ سنبل کا درخت تھا اور اس کا دانہ گائے کے گردے کی طرح ہوتا ہے اور شہد سے زیادہ میٹھا اور مکھن سے زیادہ سفید ہوتا ہے۔ وہب بن منبہ کا یہی قول ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول فرمائی تو اسے حضرت آدم کی اولاد کے لئے غذا بنا دیا۔ ابن جریج نے کہا: بعض صحابہ سے مروی ہے کہ یہ انجیر کا درخت تھا (1)۔ سعید نے حضرت قتادہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ اسی وجہ سے خواب میں اس کی تعبیر ندامت کی جاتی ہے کیونکہ اس کے کھانے کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام نادم ہوئے تھے۔ یہ سہیلی نے ذکر کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: اس میں کوئی چیز متعین نہیں جس کی تائید خبر کرے۔ درست بات یہ ہے کہ یہ اعتقاد رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو درخت سے منع فرمایا اور انہوں نے اس کی مخالفت کی اور اس کے کھانے میں ان سے لغزش ہوئی۔ ابو نصر قشیری نے کہا: میرے والد صاحب فرماتے تھے معلوم ہوتا ہے بہر حال یہ جنۃ کا درخت تھا۔

مسئلہ نمبر 10: علماء کا اختلاف ہے کہ حضرت آدم نے یہ کیسے کھا لیا تھا جب کہ اس کے قریب جانے پر بھی وعید سنائی گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔

بعض علماء نے فرمایا: جس درخت کی طرف اشارہ کیا گیا تھا اس کے علاوہ کوئی درخت کھایا تھا اور انہوں نے نہی کی تاویل یہ نہ کی کہ یہ نہی پوری جنس پر واقع ہے، گویا ابلیس نے انہیں ظاہر کو لینے کا دھوکا دیا۔ ابن عربی نے کہا: یہ پہلی معصیت تھی جو اللہ تعالیٰ کی آدم نے کی (2)۔ اس قول کی بنا پر فرمایا: اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ جو قسم اٹھائے کہ وہ اس روٹی سے نہیں کھائے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 127، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
2۔ احکام القرآن لابن العربی، صفحہ 18، جلد 1 (دار الفکر)

گا پھر وہ اس جنس سے کھالے گا تو حانث ہو جائے گا اس میں تحقیق المذاہب یہ ہے کہ اکثر علماء فرماتے ہیں: اس میں وہ حانث نہیں ہوگا۔

امام مالک اور ان کے اصحاب نے کہا: اگر قسم کی بساط مشار الیہ کی تعیین کا تقاضا کرتی ہے تو اس کی جنس سے کھانے سے حانث نہ ہوگا اور اگر قسم کی بساط یا اس کا سبب یا اس کی نیت جنس کا تقاضا کرتی ہے تو پھر اس پر اسے محمول کیا جائے گا اس جنس سے کسی دوسری چیز کو کھانے سے بھی حانث ہو جائے گا، اس پر حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ کو محمول کیا گیا ہے، ان کو متعین درخت سے نہی کی گئی تھی اور اس کی جنس مراد لی گئی تھی۔ پس انہوں نے قول کو لفظ پر محمول کیا معنی پر محمول نہ کیا۔

ہمارے علماء کا اس وجہ سے فرع میں اختلاف ہے۔ وہ یہ کہ جب کوئی شخص قسم اٹھائے کہ میں یہ گندم نہیں کھاؤں گا پھر اس نے اس کی روٹی کھالی تو اس میں علماء کے دو قول ہیں: الکتاب میں فرمایا: وہ حانث ہو جائے گا، کیونکہ گندم اسی طرح روٹی بنا کر کھائی جاتی ہے۔ ابن المواز نے کہا: اس پر کوئی کفارہ نہیں کیونکہ اس نے گندم نہیں کھائی اس نے روٹی کھائی ہے۔ اس نے اسم اور صفت کا اعتبار کیا۔ اور اگر اس نے اپنی قسم میں کہا میں اس گندم سے نہیں کھاؤں گا تو اس گندم سے بنائی گئی روٹی کھانے سے بھی حانث ہو جائے گا اور جب اس گندم کی قیمت سے کوئی اور کھانا خریدے یا اسے اگالے تو اس میں اختلاف ہے۔ دوسرے علماء فرماتے ہیں: نہی ندب پر محمول تھی۔ ابن عربی نے کہا: یہ مسئلہ اصول فقہ سے تھا یہاں ساقط ہو گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔(1)

نہی کو وعید کے ساتھ ملایا گیا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى (طٰہٰ) سو (ایسا نہ ہو) کہ وہ نکال دے تمہیں جنت سے اور تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔

ابن مسیب نے فرمایا: حضرت آدم نے اس وقت کھایا جب حضرت حوا نے انہیں شراب پلادی تھی اور آپ نشہ میں ہو گئے تھے اور آپ کو سمجھ نہ تھی۔ یزید بن قسیط نے بھی اسی طرح کہا: وہ دونوں قسم اٹھاتے تھے کہ حضرت آدم نے عقل میں ہوتے ہوئے اس درخت سے نہیں کھایا تھا۔ ابن عربی نے کہا: یہ نقلاً اور عقلاً فاسد ہے۔ نقل کسی حال میں بھی صحیح نہیں ہے(2) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جنتی شراب کا یہ وصف بیان کیا ہے: لَا فِيْهَا غَوْلٌ (الصافات: 47) اور رہی عقل، تو انبیاء کرام نبوت کے بعد معصوم ہوتے ہیں ہر اس چیز سے جو فرائض میں خلل اور جرائم کے ارتکاب کا باعث بنے۔

میں کہتا ہوں: بعض علماء نے حضرت آدم علیہ السلام کی نبوت کو جنت میں ٹھہرائے جانے سے پہلے سے ثابت کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ (البقرہ: 33) اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو حکم دیا کہ فرشتوں کو وہ علم بتاؤ جو ان کے پاس نہیں ہے۔

بعض علماء نے کہا: حضرت آدم نے وہ درخت بھول کر کھایا تھا اور یہ ممکن ہے کہ وہ دونوں وعید کو بھول گئے ہوں۔

میں کہتا ہوں: یہ صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حتمی اور قطعی طور پر بتایا: وَ لَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، صفحہ 19، جلد 1 (دار الفکر) 3۔ ایضاً

فَنَسِیَ وَلَمۡ نَجِدۡ لَهٗ عَزۡمًا ﴿۱۱۵﴾ (طٰہٰ)

لیکن جب انبیاء کرام کو کثرت معارف اور علو منازل کی وجہ ہے ایسا تحفظ و تیقظ ضروری ہوتا ہے جو دوسروں کو لازم نہیں ہوتا تو حضرت آدم علیہ السلام کا نہی کو یاد نہ رکھنا اسے ضائع کرنے کے مترادف تھا تو اس وجہ سے وہ مخالفت کرنے والے ہو گئے۔ حضرت ابوامامہ نے کہا: اگر حضرت آدم کی اولاد جو اللہ تعالیٰ نے ابتدا سے لے کر قیامت تک پیدا کرنی ہے ان سب کی عقلیں ایک پلڑے میں اور حضرت آدم کی عقل دوسرے پلڑے میں رکھی جائے تو حضرت آدم علیہ السلام کی عقل ان پر غالب آ جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَمۡ نَجِدۡ لَهٗ عَزۡمًا ﴿۱۱۵﴾ (طٰہٰ)

میں کہتا ہوں: حضرت ابوامامہ کا یہ قول تمام بنی آدم کو شامل ہے اور احتمال ہے کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے خاص ہوں، کیونکہ آپ عقل و دانش کے اعتبار سے سب لوگوں سے زیادہ تھے، اور یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت ابوامامہ کے قول کا مطلب یہ ہو کہ اگر بنی آدم کی عقول جو انبیاء نہیں ہیں وہ مراد ہیں۔ واللہ اعلم

میں کہتا ہوں: پہلا قول حسن ہے۔ پس آدم و حوا نے معین درخت مراد لیا اور حقیقت میں مراد جنس تھی جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب آپ نے سونے اور ریشم کو پکڑا۔ فرمایا: ھذان حرامان علی ذکور امتی (1) یہ دونوں میری امت کے مردوں پر حرام ہیں۔ اور ایک اور جگہ فرمایا: ھذان مھلکان امتی۔ یہ دونوں میری امت کو ہلاک کرنے والی چیزیں ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے اور ریشم کی جنس مراد لی ہے نہ کہ وہ معین سونا اور ریشم۔

مسئلہ نمبر 11: کہا جاتا ہے: درخت سے پہلے حضرت حوا نے کھایا تھا اس کا سبب ابلیس کا انہیں اغوا (بھٹکانا) تھا جیسا کہ آگے آئے گا۔ شیطان نے پہلے حضرت حوا سے کلام کی کیونکہ عورت محبت کا وسوسہ ہے۔ یہ پہلا فتنہ تھا جو مردوں پر عورتوں کی طرف سے داخل ہوا۔ شیطان نے کہا: تمہیں اس درخت سے منع نہیں کیا گیا مگر اس لئے کہ یہ شجرۃ الخلد ہے کیونکہ شیطان کو معلوم تھا کہ یہ دونوں ہمیشہ رہنے کو پسند کرتے ہیں۔ پس وہ دونوں کے پاس ایسی جہت سے آیا جو انہیں پسند تھی حبك الشی یعمی ویصم ...... کسی چیز کی محبت اندھا اور بہرہ کر دیتی ہے۔ جب حضرت حوا نے حضرت آدم سے کہا تو حضرت آدم علیہ السلام نے انکار کیا اور عہد الٰہی کو یاد کیا۔ حضرت حوا پر حضرت آدم اصرار کرتے رہے (کہ نہ کھاؤ) اور حضرت حوا حضرت آدم پر کھانے کے لئے اصرار کرتی رہی حتیٰ کہ حضرت حوا نے کہا: میں تجھ سے پہلے کھاتی ہوں یہاں تک کہ اگر مجھے کوئی تکلیف پہنچے تو تم سلامت رہو گے۔ پس حضرت حوا نے وہ کھالیا اور انہیں کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ حضرت حوا حضرت آدم کے پاس آئی اور کہا: تم بھی کھالو، میں نے کھایا ہے تو مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی ہے۔ پس حضرت آدم نے وہ کھایا تو ان کا لباس اتر گیا اور گناہ کے حکم میں ہو گئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: وَلَا تَقۡرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ۔ وہ دونوں نہی میں جمع فرمائے تھے اس لئے سزا نہ اتری حتیٰ کہ دونوں کی طرف سے منہی عنہ کا ارتکاب پایا گیا۔ حضرت آدم علیہ السلام پر یہ مسئلہ مخفی تھا۔ اسی وجہ سے بعض علماء نے فرمایا: اگر کسی نے اپنی دو بیویوں یا دو لونڈیوں کو کہا: اگر تم دونوں گھر میں داخل ہوئیں تو تم دونوں کو طلاق یا تم دونوں

1۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 205، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب اللباس، باب فی الحریر للنساء، حدیث نمبر 3535، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آزاد تو طلاق اور آزادی ایک کے داخل ہونے سے واقع نہ ہوگی۔ اس میں علماء کے تین اقوال ہیں۔ ابن قاسم نے کہا: دونوں کو نہ طلاق ہوگی نہ دونوں آزاد ہوں گی حتیٰ کہ اکٹھی گھر میں داخل ہوں، انہوں نے اس اصل پر محمول کیا ہے۔ مطلق لفظ کے مقتضیٰ کو لیا ہے۔ سحنون نے بھی یہی کہا ہے۔ ابن قاسم نے دوسری مرتبہ کہا: کسی ایک کے داخل ہونے سے دونوں مطلقہ ہو جائیں گی اور آزاد ہو جائیں گی کیونکہ بعض قسم کا ٹوٹنا پوری قسم کا ٹوٹنا ہے۔ جیسے اگر کوئی قسم اٹھائے کہ یہ دو روٹیاں نہیں کھاؤں گا تو وہ ایک روٹی کھانے سے بھی حانث ہو جائے گا بلکہ ان میں سے ایک لقمہ کھانے سے بھی حانث ہو جائے گا(1)۔ اشہب نے کہا: جو داخل ہوگی وہ آزاد ہو جائے اور اسے طلاق ہو جائے گی کیونکہ ان میں سے ہر ایک اپنی طلاق یا آزادی میں شرط تھی۔ ابن عربی نے کہا: یہ بعید ہے کیونکہ بعض شرط، شرط نہیں ہوتی اس پر اجماع ہے(2)۔

میں کہتا ہوں: پہلا قول صحیح ہے۔ نہی جب دو فعلوں پر معلق ہو تو مخالفت متحقق نہ ہوگی جب تک کہ دونوں فعل نہ پائے جائیں کیونکہ جب تو کہتا ہے تم دونوں گھر میں داخل نہ ہو۔ پھر ایک داخل ہوتی ہے تو دونوں کی طرف سے مخالفت نہ پائی گئی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ۔ یہ دونوں کے لئے نہی ہے: فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔ اس کا جواب ہے۔ پس دونوں ظالم نہ ہوں گے حتیٰ کہ دونوں اس کام کو کریں جب حضرت حوا نے کھایا تو اسے کوئی تکلیف نہ پہنچی کیونکہ منہی عنہ وہ تھا جو کامل پایا گیا۔ یہ معنی حضرت آدم علیہ السلام پر مخفی ہو گیا آپ نے طمع کیا اور یہ حکم بھول گئے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا یہی معنی ہے: وَ لَقَدْ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ (طٰہٰ:115) بعض علماء نے فرمایا: حضرت آدم علیہ السلام یہ ارشاد بھول گئے: اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَ لِزَوْجِكَ فَلَا یُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى (طٰہٰ) بے شک یہ تیرا بھی دشمن ہے اور تیری زوجہ کا بھی سو (ایسا نہ ہو) کہ وہ نکال دے تمہیں جنت سے اور تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔

مسئلہ نمبر 12: علماء کا اختلاف ہے کہ کیا انبیاء کرام صلوات اللہ علیہم اجمعین سے صغیرہ گناہ سرزد ہوتا ہے اس کی وجہ سے ان سے مؤاخذہ ہوتا ہے اور ان پر انہیں عتاب کیا جاتا ہے یا نہیں۔ اس اتفاق کے بعد کہ انبیاء کرام کبیرہ گناہوں اور ہر رذیل بات سے معصوم ہوتے ہیں جس میں نقص اور عیب ہوتا ہے۔ یہ قاضی ابو بکر کے نزدیک مسئلہ اجماعاً ثابت ہے اور استاذ ابو اسحاق کے نزدیک یہ معجزہ کی دلیل کا مقتضا ہے اور معتزلہ کے نزدیک یہ عقلی دلیل کا مقتضیٰ ہے ان کے اصول پر۔ طبری وغیرہ فقہاء، متکلمین اور محدثین نے کہا: انبیاء کرام سے صغائر واقع ہوتے ہیں جبکہ رافضیوں کا قول اس کے خلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں: انبیاء کرام کبائر و صغائر سے معصوم ہیں اور انہوں نے ان آیات سے حجت پکڑی ہے جو قرآن کریم میں واقع ہوئی ہیں اور جو ان کے گناہوں سے نکلنے کے متعلق احادیث میں ثابت ہے یہ بات ظاہر ہے اس میں کوئی خفا نہیں۔ جمہور فقہاء، مالکی، ابو حنیفہ اور امام شافعی فرماتے ہیں: وہ تمام صغائر سے اسی طرح معصوم ہیں جس طرح کبائر سے معصوم ہیں کیونکہ ہمیں ان کے افعال، آثار اور سیرت میں ان کی اتباع کا بغیر کسی قرینہ کے التزام کے حکم دیا گیا ہے۔ اگر ان پر ہم صغائر کو جائز قرار دیں تو پھر ان کی اقتدا ممکن نہیں کیونکہ ان کے افعال میں ہر فعل کا مقصد، قربت، اباحت یا ممانعت یا معصیت کے اعتبار سے ممتاز نہیں

1۔ احکام القرآن لابن العربی، صفحہ 17، جلد 1 (دار الفکر) 2۔ ایضاً

ہوتا اور کسی کو کسی ایسے امر کی پیروی کا حکم دینا صحیح نہیں ہے شاید کہ وہ معصیت ہو، خصوصاً ان اصولیوں کے نزدیک جو فعل کو قول پر مقدم جانتے ہیں جب ان میں تعارض آ جائے۔

استاذ ابو اسحاق اسفرائینی نے کہا: علماء کا صغائر کے متعلق اختلاف ہے اور وہ بات جس پر اکثر علماء کا نظریہ قائم ہے وہ یہ ہے کہ انبیاء کرام پر صغائر جائز نہیں۔ پس بعض علماء نے صغائر کو جائز قرار دیا ہے اور اس مقال کی کوئی اصل نہیں ہے۔

بعض متاخرین نے کہا: جو پہلے نظریہ کے حامل ہیں: یہ کہنا مناسب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض انبیاء سے گناہ کے وقوع کی خبر دی ہے اور گناہ کی نسبت ان کی طرف کی ہے اور اس پر انہیں عتاب بھی فرمایا ہے اور خود انبیائے کرام کے اپنے نفوس سے گناہوں کے متعلق بتایا ہے اور ان سے وہ نکلے اور ان گناہوں کی وجہ سے ڈرے اور توبہ کی۔ یہ چیزیں بہت سی جگہوں پر وارد ہیں تاویل تمام کو قبول نہیں کرتی اگرچہ اخبار احاد اس کو قبول کرتی ہیں اور یہ تمام کام ایسے ہیں جو انبیاء کے منصب کے لئے معیوب ہیں۔ یہ تمام امور ان سے نادر طور پر اور خطا و نسیان کے طور پر یا ایسی تاویل کے طور پر واقع ہوئے ہیں جو تاویل اس کام کی طرف داعی تھی۔ یہ امور دوسرے لوگوں کے اعتبار سے نیکیاں ہیں اور ان کے حق میں سیئات ہیں ان کے مناصب اور بلند اقدار کی نسبت سے کیونکہ وزیر سے ایک بات پر مواخذہ ہوتا ہے جبکہ سپاہی کو اسی کام پر بدلہ دیا جاتا ہے۔ پس وہ قیامت کے موقف سے ڈرے باوجود اس کے کہ ان کو امن و امان اور سلامتی کا علم تھا۔ فرمایا: یہی حق اور ثواب ہے۔ حضرت جنید نے کتنا عمدہ کہا ہے: حسنات الابرار سیئات المقربین وہ کام جو ابرار کی نیکیاں ہوتے ہیں مقربین کے حق میں گناہ ہوتے ہیں۔ پس انبیاء کرام اگرچہ نصوص ان سے گناہ کے وقوع کی شہادت دیتی ہیں پھر بھی یہ ان کے مناصب میں خلل ثابت نہیں اور نہ ان کے رتبہ میں جرح کا موجب ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ایسے امور کی تلافی فرما دی انہیں چن لیا، انہیں ہدایت سے نوازا ان کی مدح فرمائی ان کا تزکیہ فرمایا، انہیں منتخب کیا اور انہیں چن لیا۔ صلوات اللہ علیہم

مسئلہ نمبر 13: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ظلم کا اصل معنی کسی شے کو مناسب جگہ پر نہ رکھنا۔ الارض المظلومہ اس زمین کو کہتے ہیں جو کبھی کھودی نہ گئی ہو پھر کھودی گئی۔ نابغہ نے کہا:

وقفت فیھا اصیلاً اسائلھا ۔۔۔ عیت جواباً وما بالربع من احد

الّا الاواری لأیا ما ابینھا ۔۔۔ والنُّؤی کالحوض بالمظلومة الجلد

میں عصر کے وقت ان کھنڈرات میں کھڑا ہوا۔ میں نے ان سے پوچھا تو وہ جواب دینے سے عاجز تھے اور وہاں پر کوئی شخص نہ تھا سوائے رسیوں کے اور مشقت کے میں اس کو بیان نہیں کرتا اور حوض کی طرح گڑھے کے جو اس سخت زمین میں کھودا گیا تھا۔

اس کو التراب الظلیم بھی کہتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

فاصبح فی غبراء بعد اشاحة ۔۔۔ علی العیش مردود علیھا ظلیمھا

صبح کے وقت قبر کے گڑھے میں تھا جس کی مٹی اس پر لوٹائی گئی تھی۔

جب اونٹ کو بغیر بیماری کے ذبح کیا جائے تو اس پر ظلم کیا گیا۔ ....اونٹوں کو بغیر بیماریوں کے ذبح کرنے والوں کو ظلامون

للجزر کہتے ہیں۔

کہا جاتا ہے: سَقَانا ظلیمة طیبة جب اس نے دودھ پکنے سے پہلے انہیں پلا دیا۔ وقد ظلم و طبہٗ، مکھن نکالنے سے پہلے دودھ پلایا گیا ہو تو یہ جملہ بولتے ہیں: اللبن مظلوم و ظلیمٌ، دودھ تیار نہ ہو۔ شاعر نے کہا:

و قائلۃٍ ظلمت لکم سقائی وھل یخفی علی العکد الظلیم

اور وہ کہہ رہی تھی میں نے تمہیں دودھ جمنے سے پہلے پلایا کیا زبان کی جڑ پر وہ دودھ مخفی تھا۔

رجل ظلیم، سخت ظلم کرنے والا شخص۔ الظلم سے مراد شرک بھی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝ (لقمان)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا، کلا سے نون حذف کیا گیا ہے کیونکہ یہ امر کا صیغہ ہے اور ہمزہ کثرت استعمال کی وجہ سے حذف کیا گیا ہے، اس کا حذف شاذ ہے۔ سیبویہ نے کہا: عربوں میں کچھ لوگ کہتے ہیں أُءْ كُلْ فَيْتِمْ۔ کہا جاتا ہے: اکلت الطعام اکلًا و مأکلًا۔ الاکلة (بالفتح) سیر ہو کر کھانا۔ الأُکلة (بالضم) لقمہ میں کہتے ہیں۔ تو کہتا ہے: اکلت اکلةً واحدةً یعنی میں نے ایک لقمہ کھایا، روٹی کو بھی کہتے ہیں ھذا الشی اکلة لك یعنی طعمةٌ لك (تمہاری خوراک سے) الاُکُل جو چیز کھائی جائے۔ کہا جاتا ہے: فلان ذو اُکل یعنی وہ شخص جس کو دنیا کا بہت حصہ ملا ہو اور وسیع رزق والا ہو۔ (رغدا) یہ مصدر محذوف کی صفت ہے یعنی اکلاً رغداً۔ ابن کیسان نے کہا: یہ بھی جائز ہے کہ یہ حال کی حیثیت سے مصدر ہو۔ مجاہد نے کہا: رَغَدًا کا مطلب ہے ان پر حساب نہ ہوگا۔ الرغد لغت میں اس کثیر کو کہتے ہیں جو تجھے مشقت میں نہ ڈالے۔ کہا جاتا ہے: ارغد القوم، جب لوگ خوشحالی میں ہوں۔ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔

حَيْثُ یہ مبنی بر ضمہ ہے یہ دوسرے ظروف سے مختلف ہے کہ یہ مضاف نہیں ہوتا یہ، قبل اور بعد سے مشابہ ہے جب وہ مضاف الیہ سے جدا کئے گئے ہوں۔ پس اس لئے اسے ضمہ دیا گیا۔ کسائی نے کہا: قیس اور کنانہ کی لغت ضمہ ہے اور تمیم کی لغت فتحہ ہے۔ کسائی نے کہا: بنو اسد جر کی جگہ اس کو جر دیتے ہیں اور نصب کی جگہ نصب دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (القلم) حیث پر ضمہ اور فتحہ پڑھا جاتا ہے۔ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ، هٰذِهٖ میں ھا، یا کا بدل ہے کیونکہ اصل میں ھذی تھا۔ نحاس نے کہا: میں عربی زبان میں ھا تانیث نہیں جانتا جب کہ ماقبل مکسور ہو سوائے هٰذِهٖ کے ھا کے۔ عربوں میں سے بعض کہتے ہیں: ھاتا ھند بعض کہتے ہیں: ھاتی ھند۔

سیبویہ نے حکایت کیا ہے: ھذہ ھند۔ (ھا کے سکون کے ساتھ) کسائی نے عربوں سے حکایت کیا ہے: ولا تقربا ھذی الشجرة۔ شبل بن عباد سے مروی ہے، فرمایا: ابن کثیر اور ابن محیصن قرآن میں هٰذِهٖ میں ھا کو کسی جگہ ثابت نہیں رکھتے۔ جماعت کی قراءت رغدا غین کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ ابن وثاب اور نخعی سے مروی ہے کہ وہ غین کے سکون کے ساتھ پڑھتے تھے۔ سلمہ نے فراء سے حکایت کیا ہے، فرمایا: کہا جاتا ہے: ھذہ فعلت و ھذی فعلت۔ ذال کے بعد یا کے اثبات کے ساتھ، ھذِ فعلت (ذال کے کسرہ کے ساتھ یا اور ھا کے الحاق کے بغیر)

ھاتا فعلت۔ ہشام نے کہا: کہا جاتا ہے تا فعلت۔ شعر کہا ہے:

خليلى لو لا ساكن الدار لم أقم بتا الدار الا عابر ابن سبيل

میرے دو دوست اگر اس گھر میں رہنے والے نہ ہوتے تو میں بھی اس گھر میں نہ ٹھہرتا مگر مسافر کی طرح گزر جاتا۔

ابن انباری نے کہا: ھا کے اسقاط کے ساتھ تا اس طرح ہے جس طرح ذی، ھذہ سے ھا کے اسقاط کے ساتھ ہے، اور ھذہ سے ھا کے اسقاط کے ساتھ ذہ ہے۔ فراء نے کہا: جس نے کہا: ھذ قامت وہ ھا کو ساقط نہیں کرتا کیونکہ صرف ذال پر اسم مشتمل نہیں ہوتا۔

فَتَكُوْنَا، تقربا پر اس کا عطف ہے اس وجہ سے نون کو حذف کیا گیا ہے۔ جرمی نے کہا: فا ناصبہ ہے اور دونوں جائز ہیں۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪ وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝۳۶

''پھر پھسلا دیا انہیں شیطان نے اس درخت کے باعث اور نکلوا دیا ان دونوں کو وہاں سے جہاں وہ تھے اور ہم نے فرمایا اتر جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے اور (اب) تمہارا زمین میں ٹھکانا ہے اور فائدہ اٹھانا وقت مقررہ تک''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ** اس میں دس مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: **فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا** جماعت نے فازلھا بغیر الف کے الزلۃ سے مشتق کر کے پڑھا ہے۔ الزلۃ کا معنی خطا ہے یعنی ان سے خطا کروائی اور انہیں خطا میں واقع کیا۔ حمزہ نے فازالھما یعنی الف کے ساتھ پڑھا ہے، اس کا معنی ہے: اس نے انہیں دور کر دیا۔ کہا جاتا ہے: ازلتہ فزال، میں نے اسے دور کیا تو وہ دور ہو گیا۔ ابن کیسان نے کہا: فازالھما، زوال سے مشتق ہے یعنی آدم وحوا طاعت پر تھے اس سے اس (شیطان) نے معصیت کی طرف پھیر دیا۔

میں کہتا ہوں: اس مفہوم پر دونوں قراءتوں کا معنی ایک ہو گا مگر جماعت کی قراءت معنی کے اعتبار سے زیادہ مضبوط ہے۔ کہا جاتا ہے: ازللتہ فزل۔ میں نے اسے پھسلایا تو وہ پھسل گیا۔ اس معنی پر یہ قول بھی دلیل ہے: **اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا** (آل عمران: 155) ان کے بعض کرتوتوں کے سبب شیطان نے انہیں پھسلا دیا۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ** (اعراف: 20) (شیطان نے ان دونوں کے لئے وسوسہ ڈالا) الوسوسہ کا مطلب ہے معصیت کے ساتھ اس نے انہیں خطا میں داخل کیا۔ شیطان کو یہ قدرت نہیں ہے کہ کسی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ ہٹا دے اسے زلل میں داخل کرنے کی قدرت ہے۔ پس یہ گناہ کی وجہ سے ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف زوال کا سبب ہو گا۔ بعض نے فرمایا: ازلھما یہ زل عن المکان سے مشتق ہے جب کوئی اپنی جگہ سے ہٹ جائے پھر معنی حمزہ کی قراءت کے مطابق ہو گا یعنی یہ زوال سے مشتق ہو گا۔ امرء القیس نے کہا:

يزل الغلام الخف عن صهواته و يلوى باثواب العنيف المثقل

ہلکا پھلکا غلام گھوڑے سے گر جاتا ہے اور سخت اور بھاری آدمی اسے کپڑوں کے ساتھ لے جاتا ہے۔

ایک اور شاعر کہتا ہے:

کمیت یزل اللبد عن حال متنه کما زلت الصفواء بالمتنزل

کمیت گھوڑے سے اس کا کپڑا اس طرح اس کی پیٹھ سے گر جاتا ہے جیسے صاف چٹان اپنے اوپر چڑھنے والے کو گرا دیتی ہے۔

مسئلہ نمبر 2: فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ جب ازال کو زال عن المکان سے مشتق مانا جائے تو فَأَخْرَجَهُمَا زوال کا بیان اور تاکید ہوگا، کیونکہ یہ ممکن ہے کہ وہ جنت میں ہی ایک مکان سے دوسرے مکان کی طرف منتقل ہو گئے ہوں، حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ جنت سے زمین کی طرف انہیں نکالنا تھا، کیونکہ وہ زمین سے پیدا کیے گئے تھے، تاکہ حضرت آدم علیہ السلام زمین میں خلیفہ بنیں۔ ابلیس نے حضرت آدم کو جنت سے نکالنے کا یہ قصد تو نہیں کیا تھا۔ اس نے تو حضرت آدم علیہ السلام کو ان کے مرتبہ سے گرانے کا قصد کیا تھا اور انہیں رحمت الٰہی سے دور کرنے کا قصد کیا تھا جیسا کہ وہ خود دور کیا گیا تھا، اس کا مقصد پورا نہ ہوا اور اس کو اپنی مراد نہ ملی بلکہ اس کی آنکھ کی گرمی، نفس کے غصہ اور گمان کے نقصان میں اضافہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ﴿۱۲۲﴾ (طٰہٰ)

پس حضرت آدم علیہ السلام اللہ کے گھر میں اس کے پڑوسی ہونے کے بعد اس کی زمین میں اس کا خلیفہ بن گئے خلیفہ اور پڑوسی میں بڑا فرق ہے صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس کام کو ابلیس کی طرف منسوب کیا گیا کیونکہ وہ اس کا سبب تھا اس میں مفسرین کا کوئی اختلاف نہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کا اغواء ابلیس کے ہاتھوں ہوا لیکن کیفیت میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس اور جمہور علماء نے فرمایا: اس کا اغوا بالمشافہ تھا (1)۔ اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّىْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۱﴾ (اعراف)

مقاسمہ کا ظاہر مشافہ ہوتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ قول عبدالرزاق نے حضرت وہب بن منبہ سے روایت کیا ہے۔ شیطان سانپ کے منہ میں بیٹھ کر جنت میں داخل ہوا تھا۔ یہ سانپ چار ٹانگوں والا تھا جیسے بختی اونٹ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جن جانوروں کو پیدا کیا تھا ان میں سانپ خوبصورت ترین جانور تھا، شیطان نے پہلے اپنے آپ کو تمام حیوانوں پر پیش کیا تھا کہ وہ اسے منہ میں لے کر جنت میں داخل ہو جائیں۔ سوائے سانپ کے کسی نے اسے داخل نہ کیا جب سانپ اسے جنت میں لے گیا تو ابلیس اس کے پیٹ سے نکلا اس نے اس درخت کو لیا جس سے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور ان کی زوجہ کو منع کیا تھا۔ ابلیس وہ لے کر حضرت حواء کے پاس آیا اور کہا: اس درخت کو دیکھو اس کی خوشبو کتنی عمدہ ہے، اس کا ذائقہ کتنا عمدہ ہے، اس کا رنگ کتنا پیارا ہے، وہ انہیں اغوا کرتا رہا حتیٰ کہ حضرت حوا نے وہ درخت لے لیا اور کھا لیا۔ پھر ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام کو اغوا کیا۔ حضرت حوا نے حضرت آدم سے کہا: کھا لو، میں نے کھایا ہے تو مجھے اس نے کوئی تکلیف نہیں دی۔ پس حضرت آدم علیہ السلام نے بھی اسے کھا لیا۔ ان دونوں کے لباس اتر گئے، اور گناہ کے حکم میں ہو گئے۔ حضرت آدم اس درخت کے پیٹ

1۔ تفسیر الثعلبی، صفحہ 219، جلد 1 (دار الاحیاء التراث العربی)

میں داخل ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے آواز دی: تو کہاں ہے؟ حضرت آدم نے عرض کی: میں یہاں ہوں اے رب! اللہ تعالیٰ نے پوچھا: کیا تو باہر نہیں نکلے گا؟ حضرت آدم نے کہا: یا رب! مجھے تجھ سے شرم محسوس ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس زمین کی طرف اتر جا جس سے تیری تخلیق کی گئی ہے۔ سانپ پر لعنت کی گئی اور اس کی ٹانگیں اس کے پیٹ میں لوٹا دی گئیں اور اس کے اور اولاد آدم کے درمیان عداوت و دشمنی بن گئی۔ اسی وجہ سے ہمیں ان کے قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے (جیسا کہ وضاحت آگے آئے گی)۔ حضرت حوا سے کہا گیا جس طرح تو نے اس درخت کا خون بہایا اسی طرح تجھے بھی ہر مہینے خون کی تکلیف لاحق ہوگی تو حمل اٹھائے گی اور بچہ جنم دے گی تکلیف کے ساتھ تو اس کی وجہ سے کئی مرتبہ موت کے قریب ہو جائے گی۔ طبری اور نقاش نے یہ زائد لکھا ہے کہ تو سفیہہ ہوگی حالانکہ تو سیانی تھی، ایک جماعت نے کہا: ابلیس جنت میں نکالے جانے کے بعد حضرت آدم کے پاس نہیں پہنچا تھا اس نے اپنی شیطانیت، سلطنت اور اپنے وسوسہ کے ذریعے حضرت آدم کو اغوا کیا تھا، جس کی اللہ تعالیٰ نے اسے قدرت بخشی تھی جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان الشیطان یجری من ابن آدم مجری الدم۔ (1) شیطان ابن آدم میں خون کے چلنے کی طرح چلتا ہے۔ واللہ اعلم

سورۂ اعراف میں آئے گا کہ جب حضرت آدم علیہ السلام نے وہ درخت کھایا تو آپ برہنہ ہو گئے اور انہوں نے لباس تلاش کرنے کی کوشش کی تو درخت ان سے دور ہو گئے اور معصیت کی وجہ سے انہیں رلایا اور انجیر کے درخت نے حضرت آدم پر رحم کھایا۔ پس آپ نے اس کے پتے لیے اور اپنے آپ کو ڈھانپا۔ پس آپ برہنہ ہونے کے ساتھ آزمائے گئے نہ کہ درخت سے۔ واللہ اعلم

بعض علماء نے فرمایا: حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے نکالنے میں حکمت دنیا کو آباد کرنا تھا۔

مسئلہ نمبر 3: ذکر کیا جاتا ہے کہ سانپ جنت میں حضرت آدم علیہ السلام کا خادم تھا۔ اس نے خیانت کی اس طرح کہ اس نے اللہ کے دشمن کو اپنے نفس پر قدرت دی اس وجہ سے اس کے لئے عداوت ظاہر ہو گئی۔ جب وہ نیچے اترے تو عداوت مؤکد ہو گئی اور اس کا رزق مٹی بنائی گئی۔ اسے کہا گیا: تو بنی آدم کا دشمن ہے اور وہ تیرے دشمن ہیں جہاں بھی ان میں کوئی تجھے پائے گا تیرا سر کچل دے گا۔

حضرت ابن عمر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: پانچ چیزوں کو محرم قتل کر سکتا ہے (2)۔ ان پانچ چیزوں میں سانپ بھی ہے۔ روایت ہے کہ ابلیس نے سانپ سے کہا: مجھے تو جنت میں لے جا تو میرے ذمہ ہوگا۔ حضرت ابن عباس فرمایا کرتے تھے: ابلیس کے ذمہ کو توڑو۔ ساکنہ بنت جعد نے سراء بنت نبہان غنویہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے: چھوٹے، بڑے، کالے اور سفید سانپوں کو قتل کرو۔ جو ان کو قتل کرے گا اس کے

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 1063، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔

ایضاً، کتاب الاحکام، باب الشهادة تكون عند الحاكم فی ولایته القضاء، حدیث 6636، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، صفحہ 467، جلد 1۔ ایضاً، کتاب بدأ الخلق، باب خمس من الدواب یقتلن فی الحرام، حدیث 3068، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لئے یہ آگ سے فدیہ ہوں گے اور جس کو سانپ قتل کردے گا وہ شہید ہوگا(1)۔ ہمارے علماء نے فرمایا: آگ سے فدیہ اس لئے ہوگا کیونکہ یہ ابلیس کے ساتھ شریک تھا اور حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد کو تکلیف پہنچانے میں اس کا معاون تھا۔ اسی وجہ سے جس کسی نے سانپ کو قتل کیا گویا اس نے کافر کو قتل کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کافر اور اس کا قاتل کبھی دوزخ میں جمع نہ ہوں گے(2)۔ اس حدیث کو مسلم وغیرہ نے نقل کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 4: ابن جریج نے حضرت عمرو بن دینار سے انہوں نے حضرت ابو عبیدہ بن عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منیٰ میں تھے، ایک سانپ گزرا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسے قتل کرو۔ وہ ہم سے بھاگ کر غار میں چلا گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کھجور کی شاخیں اور آگ لے آؤ اور اس پر آگ جلا دو(3)۔ ہمارے علماء نے فرمایا: یہ حدیث اسی نہی کو خاص کرتی ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مثلہ سے منع فرمایا اور اس سے منع فرمایا کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے عذاب کے ساتھ عذاب نہ دے۔ علماء نے فرمایا: اس حدیث نے اس دشمن کے لئے کوئی حرمت نہیں چھوڑی، جہاں بھی یہ چلا جائے حتیٰ کہ جہاں بھی قدرت ہو اس تک ہلاکت کو پہنچائے، اگر کہا جائے کہ ابراہیم نخعی سے مروی ہے کہ انہوں نے بچھو کو آگ کے ساتھ جلانے کو ناپسند کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: یہ مثلہ ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے: ہوسکتا ہے ان کو یہ حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے نہ پہنچی ہو اور انہوں نے اس حدیث پر عمل کیا ہو جس میں ہے اللہ کے عذاب کے ساتھ عذاب نہ دو۔ ان کے نزدیک اس پر عمل اس بنا پر ہوگا۔

اگر کہا جائے کہ مسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک غار میں تھے جبکہ وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ○ (المرسلات) سورت نازل ہوئی۔ ہم نے اسی وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ مبارک سے سنی تھی اچانک ہم پر ایک سانپ نکلا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کو قتل کرو۔ ہم اسے قتل کرنے کے لئے دوڑے تو وہ ہم سے بھاگ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اسے تمہارے شر سے بچالیا اور تمہیں اس کے شر سے بچالیا(4)، اس میں تو نہ اس پر آگ جلائی گئی اور نہ اس کے قتل کا کوئی اور حیلہ کیا گیا۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ہوسکتا ہے وہاں آگ نہ پائی ہو اس لئے اسے ترک کردیا ہو۔ یا اس کی بل ایسی نہ ہو جہاں آگ فائدہ دیتی ہو دھواں بھی نقصان نہ دیتا ہو اور حیوان تک وہ نہ پہنچتا ہو۔ واللہ اعلم حضور علیہ السلام کا ارشاد اللہ تعالیٰ نے اسے تمہارے شر سے بچالیا یعنی تم اسے قتل کردیتے اور تمہیں اس کے شر سے بچالیا یعنی اس کے ڈسنے سے تمہیں بچالیا۔

مسئلہ نمبر 5: سانپوں کو قتل کرنے کا حکم تکلیف کو دور کرنے کے ارشاد سے ہے جس نقصان کا سانپوں سے خوف ہوتا ہے۔ جس سانپ کا ضرر یقینی ہو اس کا قتل کرنے کی طرف جلدی کرنا واجب ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اقتلوا

1۔ نوادر الاصول، صفحہ 49، جلد 1 (دار الصادر بیروت)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب من قتل کافرا ثم سدد، صفحہ 137، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ نوادر الاصول، صفحہ 50، جلد 1 (دار الصادر بیروت)

4۔ صحیح مسلم، کتاب قتل الحیات وغیرھا، باب قتل الحیات، صفحہ 235، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

الحیات واقتلوا ذا الطفیتین والابتر فانھما یخطفان البصر و یسقطان الحبل (1) (یعنی سانپوں کو قتل کرو اور دو دھاریوں والے اور دم کٹے سانپ کو قتل کرو کیونکہ یہ دونوں آنکھوں کو ضائع کر دیتے ہیں اور حمل گرا دیتے ہیں) ان دو سانپوں کا خصوصی طور پر ذکر فرمایا حالانکہ یہ پہلے عموم میں داخل تھے اور ان کے ضرر کے بڑے سبب کی وجہ سے ان پر متنبہ فرمایا اور جس سانپ کا ضرر محقق نہ ہو پس ان میں سے جو گھروں کے علاوہ کسی جگہ پر ہوں تو ظاہری عمومی حکم کی وجہ سے انہیں قتل کر دو کیونکہ سانپوں کی ہر نوع میں ضرر غالب ہے۔ پس اس پر عمل کیا جائے گا، کیونکہ سانپ اپنی صورت کی وجہ سے خوف ناک ہے اور نفوس میں نفرت ہے (اس لئے اسے قتل کرنا چاہئے۔) اسی وجہ سے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الله تعالیٰ شجاعت کو پسند فرماتا ہے اگرچہ سانپ کے قتل پر ہی ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سانپ کے قتل پر تشجیع فرمائی۔ ابوداؤد کی حدیث جو حضرت عبدالله بن مسعود سے مرفوعاً مروی ہے، اس میں فرمایا: تمام سانپوں کو قتل کرو جو ان کے بدلہ لینے سے ڈرا وہ مجھ سے نہیں (یعنی میرے طریقہ پر نہیں (2))

مسئلہ نمبر 6: وہ سانپ جو گھروں میں رہتے ہیں ان کو قتل نہ کیا جائے حتیٰ کہ تین دن انہیں تنبیہ کی جائے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: مدینہ طیبہ میں جن ہیں جنہوں نے اسلام قبول کر لیا ہے جب تم ان میں سے کسی کو دیکھو تو تین دن اسے آگاہ کرو (3)۔ بعض علماء نے اس حدیث کو صرف مدینہ کے ساتھ خاص کیا ہے کیونکہ مدینہ طیبہ کے جنوں نے اسلام قبول کر لیا تھا، ہم نہیں جانتے کہ مدینہ طیبہ کے علاوہ جو جن ہیں وہ اسلام لائے ہیں یا نہیں، یہ ابن نافع کا قول ہے۔ امام مالک نے فرمایا: تمام شہروں میں گھروں کے سانپوں کو قتل کرنے سے منع ہے، یہی قول صحیح ہے، کیونکہ الله تعالیٰ نے فرمایا: وَ اِذْ صَرَفْنَاۤ اِلَیْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ یَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ (احقاف: 29)

صحیح مسلم میں حضرت عبدالله بن مسعود نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے پاس جنوں کا داعی آیا میں ان کے ساتھ گیا۔ میں نے ان پر قرآن پڑھا۔ اس حدیث میں ہے کہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے خوراک کا سوال کیا وہ جزیرہ کے جن تھے (4)۔ اس کی تفصیل سورۂ جن میں آئے گی ان شاء الله تعالیٰ۔ جب یہ ثابت ہے تو کسی سانپ کو قتل نہیں کیا جائے گا حتیٰ کہ پہلے اس پر تنگی کی جائے گی اور اسے ڈرایا جائے گا۔ مزید بیان ان شاء الله آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 7: ائمہ نے ابوالسائب مولیٰ ہشام بن زہرہ سے روایت کیا ہے کہ وہ حضرت ابوسعید خدری کے پاس ان کے گھر میں گئے۔ انہوں نے فرمایا: حضرت ابوسعید خدری کو میں نے نماز پڑھتے ہوئے پایا۔ میں انتظار میں بیٹھ گیا تاکہ وہ نماز کو مکمل کر لیں۔ میں نے گھر کی ایک طرف کھجور کی چھڑیوں میں کچھ حرکت سنی۔ میں متوجہ ہوا تو وہ سانپ تھا۔ میں اسے قتل

1۔ صحیح مسلم، کتاب قتل الحیات وغیرھا، باب قتل الحیان، صفحہ 234، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 356، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، باب فی قتل الحیات، حدیث 4569، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، قتل الحیات وغیرھا، قتل الحیات، صفحہ 235، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

4۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب الجہر بالقراۃ فی الصبح والقراۃ علی الجن، صفحہ 184، جلد 1

کرنے کے لئے دوڑا تو حضرت ابوسعید نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ فرمایا۔ میں بیٹھ گیا۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو گھر کے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا: کیا تم یہ کمرہ دیکھ رہے ہو؟ میں نے کہا: ہاں۔ انہوں نے کہا: اس میں ہمارا ایک نوجوان رہتا تھا جس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ فرمایا: ہم خندق کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے وہ نوجوان نصف النہار کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کرتا تھا اور گھر واپس آ جاتا تھا۔ ایک دن اس نے اجازت طلب کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنا ہتھیار لے لو مجھے تجھ پر قریظہ (کے حملہ) کا اندیشہ ہے۔ اس شخص نے اپنا ہتھیار لے لیا پھر لوٹ آیا وہ گھر کے قریب پہنچا تو اس کی بیوی دروازے کے درمیان کھڑی تھی۔ اس نے اسے نیزہ مارنے کے لئے نیزہ اس کی طرف جھکایا، کیونکہ اسے غیرت آ گئی تھی۔ بیوی نے کہا: اپنا نیزہ دور کر لے اور گھر کے اندر داخل ہو تاکہ تو وہ دیکھ لے جس نے مجھے گھر سے باہر نکالا۔ پس وہ اندر گیا تو زمین پر ایک بہت بڑا سانپ لپٹا پڑا تھا۔ نوجوان نے اس کی طرف نیزہ جھکایا اس میں سانپ کو پرو دیا، پھر وہ باہر نکلا اور نیزہ کو گھر کے صحن میں گاڑھ دیا۔ پس اس سانپ نے اس نیزے کے اوپر حرکت کی پھر معلوم نہ ہو سکا کہ کون پہلے مرا سانپ یا وہ نوجوان۔ حضرت ابوسعید نے فرمایا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور یہ واقعہ ذکر کیا۔ ہم نے کہا: حضور! دعا فرمائیں اسے اللہ تعالیٰ ہمارے لئے زندہ کر دے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے بھائی کے لئے استغفار کرو۔ پھر فرمایا۔ مدینہ طیبہ کے جن مسلمان ہو گئے ہیں جب تم ان میں سے کسی کو دیکھو تو تین دن اس کو تنبیہ کرو اگر پھر تمہارے لئے یہ ظاہر ہو تو اسے قتل کر دو وہ شیطان ہے۔ دوسری سند سے اس طرح مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان گھروں میں رہنے والے سانپ ہیں جب ان میں سے کسی کو دیکھو تو تین دن اس پر تنگی کرو اگر وہ چلا جائے تو فبہا ورنہ اسے قتل کر دو وہ کافر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا: جاؤ اور اپنے ساتھی کو دفن کر دو۔

ہمارے علماء نے فرمایا: اس حدیث سے یہ مفہوم نہیں ہوتا کہ وہ سانپ جس کو نوجوان نے قتل کیا تھا وہ مسلمان تھا اور جنوں نے اسے قصاصاً قتل کیا تھا کیونکہ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ قصاص ہمارے اور جنوں کے درمیان مشروع ہے تو وہ پھر قتل عمد میں ہو گا اور اس نوجوان نے قتل عمد نہیں کیا تھا کیونکہ اسے تو اس کے مسلمان ہونے کا علم نہ تھا، انہوں نے تو اس نوع کے قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا جس کا قتل کرنا شرعاً مشروع تھا۔ یہ قتل خطا ہے اور اس میں قصاص نہیں ہے۔ پس یہ کہنا بہتر ہے کہ کافر اور فاسق جنوں نے اس نوجوان کو اپنے ساتھی کا انتقام لینے کے لئے قتل کیا تھا۔ جنوں نے حضرت سعد بن عبادہ کو قتل کیا تھا وہ اپنے غسل خانہ میں مردہ پائے گئے تھے اور ان کا جسم سبز ہو چکا تھا اور لوگوں کو ان کی موت کا سبب معلوم نہیں ہو رہا تھا حتیٰ کہ انہوں نے کسی کہنے والے کو یہ کہتے ہوئے سنا جبکہ انہیں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔

قد قتلنا سید الخزرج سعد بن عبادۃ
ورمیناہ بسہمین فلم نخط فؤادہ

ترجمہ: ہم نے خزرج کے سردار سعد بن عبادہ کو قتل کیا۔ اور ہم نے انہیں دو تیر مارے اور ہم نے اس کے دل سے خطا نہیں کی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (مدینہ طیبہ کے جنوں نے اسلام قبول کر لیا ہے) تاکہ وہ راستہ بیان فرمادیں جس کے ذریعے ان

میں سے کسی مسلمان کو قتل کرنے سے بچایا جائے اور ان میں سے کسی کافر کے قتل پر غلبہ پایا جائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کئی سندوں سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک سانپ مار ڈالا، پھر انہیں خواب میں دکھایا گیا کہ کوئی انہیں کہہ رہا ہے تو نے ایک مسلمان کو قتل کر دیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: اگر وہ مسلمان ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے پاس داخل نہ ہوتا۔ اس کہنے والے نے کہا: وہ آپ کے پاس کبھی داخل نہیں ہوا مگر جب آپ باپردہ ہوتی تھیں۔ صبح ہوئی تو حضرت عائشہ نے بارہ ہزار دراہم اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرنے کا حکم دیا۔ ایک روایت میں ہے: وہ آپ پر داخل نہیں ہوا مگر جب آپ باپردہ ہوتی تھیں۔ حضرت عائشہ نے صدقہ کیا اور کئی غلام آزاد کیے۔ ربیع بن بدر نے کہا: الجان ان سانپوں میں سے ہے جن کے قتل سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ یہ وہ سانپ ہیں جو چلتے ہیں اور دوہرے نہیں ہوتے۔ علقمہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

مسئلہ نمبر 8: انذار (ڈرانے) کا طریقہ: امام مالک نے فرمایا: میرے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ تین دن انہیں ڈرایا جائے۔ عیسیٰ بن دینار کا بھی یہی قول ہے اگرچہ ایک دن میں کئی مرتبہ ظاہر ہو۔ ایک دن میں تین مرتبہ ڈرانے پر اکتفا نہیں کیا جائے گا حتیٰ کہ تین دن میں یہ ڈرانا پایا جائے۔ بعض علماء نے فرمایا: تین مرتبہ ڈرانا کافی ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فليؤذنه ثلاثا اس کو تین مرتبہ آگاہ کرو۔ اور فرمایا: حرجوا عليه ثلاثاً اور اس پر تین مرتبہ تنگی کرو۔ ثلاثاً (تین) کا عدد مؤنث کے لئے ہے پس ظاہر ہوا کہ مراد تین مرتبہ ہے امام مالک کا قول اولیٰ ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ثلاثة ايام یہ صحیح نص ہے ان مطلقات کے لئے مقید ہے اور ثلاثا کو تین ایام کی راتوں کے ارادہ پر محمول کیا جائے گا۔ عربوں کی عادت پر تاریخ کے باب میں رات غالب ہے کیونکہ ان میں تانیث غالب ہوتی ہے۔ امام مالک نے فرمایا: ڈرانے میں یہ کہنا کافی ہے: أحرج عليك بالله واليوم الآخر الا تبدو النا ولا تؤذونا یعنی میں تجھ پر اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن کے واسطہ سے تنگی کرتا ہوں کہ تم ہمارے لئے ظاہر نہ ہو اور نہ ہمیں تکلیف دو۔ ثابت بنانی نے عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ سے روایت کیا ہے کہ ان کے سامنے گھروں میں پائے جانے والے سانپوں کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: جب تم ان میں سے کوئی سانپ اپنے گھروں میں دیکھو تو کہو: انشدكم بالعهد الذي اخذ عليكم نوح عليه السلام وانشدكم بالعهد الذي اخذ عليكم سليمان عليه السلام۔ میں تمہیں اس عہد کا واسطہ دیتا ہوں جو تم سے نوح علیہ السلام نے لیا تھا اور میں تمہیں اس عہد کا واسطہ دیتا ہوں جو تم سے حضرت سلیمان علیہ السلام نے لیا تھا۔ پھر جب ان میں سے کسی کو دیکھو تو اسے قتل کر دو۔

میں کہتا ہوں: یہ بظاہر ایک دفعہ اذن کی کفایت پر دلیل ہے لیکن حدیث اس کا رد کرتی ہے۔ واللہ اعلم

ابن حبیب نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرمایا ہے آپ فرماتے ہیں: انشدكن بالعهد الذي اخذ عليكن سليمان... عليه السلام... الا تؤذيننا والا تظهرن علينا۔(1)

مسئلہ نمبر 9: جبیر نے نفیر سے انہوں نے حضرت ابوثعلبہ الخشنی سے روایت کیا ہے ابوثعلبہ کا نام جرثوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنوں کی تین قسمیں ہیں اور سب ایک تہائی ہیں: ایک قسم وہ ہے جن کے پر ہیں وہ ہوا میں

1۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 357، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، باب فی قتل الحیات، حدیث 4576، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اڑتے ہیں اور ایک قسم سانپ اور کتے ہیں اور ایک قسم وہ ہے جو کسی جگہ پڑاؤ ڈالتے ہیں اور سفر کرتے ہیں (1)۔

حضرت ابو درداء نے روایت کیا ہے..... ان کا نام عویمر ہے..... فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جن تین حصوں میں پیدا کیے گئے ہیں: ایک تہائی کتے، سانپ اور زمین کے کیڑوں کی صورت میں ہوتے ہیں اور ایک تہائی تیز چلنے والی ہوا کی طرح ہوتے ہیں اور ایک تہائی انسانوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کے لئے ثواب اور عقاب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جنوں کو تین تہائیوں میں پیدا کیا۔ ایک تہائی کے دل ہوتے ہیں جن کے ساتھ وہ سمجھتے نہیں اور آنکھیں ہوتی ہیں جن کے ساتھ دیکھتے نہیں اور کان ہوتے ہیں جن کے ساتھ سنتے نہیں وہ نہیں ہیں مگر ڈنگروں کی مانند بلکہ وہ ان سے بھی زیادہ گم کردہ راہ ہیں اور ایک تہائی جن کے جسم انسانوں کے جسم جیسے ہوتے ہیں، ان کے دل شیطانوں کے دلوں جیسے ہوتے ہیں اور ایک تہائی اللہ کے (عرش کے) سایہ میں ہوں گے جس دن اس کے سایہ کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا (2)۔

مسئلہ نمبر 10: ہر وہ جانور جس کی اصل تکلیف پہنچانا ہو تو اسے ابتداءً قتل کیا جائے گا اس کی اذیت پہنچانے کی وجہ سے، اس میں کوئی اختلاف نہیں جیسے سانپ، بچھو، چوہا، چھپکلی اور اس کے مشابہ جانور..... رسول اللہ نے فرمایا: پانچ فواسق ہیں: انہیں، حل اور حرم میں قتل کیا جائے گا (3)..... سانپ نے اپنا جوہر خبیث ظاہر کیا جب اس نے حضرت آدم علیہ السلام سے خیانت کی اس طرح کہ وہ اپنے جبڑوں کے درمیان ابلیس کو جنت میں لے گیا۔ اگر سانپ اسے ظاہر کرتا تو جنت کا دربان اسے داخل نہ ہونے دیتا۔ ابلیس نے سانپ سے کہا: تو میرے ذمہ میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سانپوں کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ فرمایا: سانپ کو قتل کرو اگرچہ تم نماز میں ہو (4) (یعنی سانپ اور بچھو کو قتل کرو)۔

الوزغة (چھپکلی) اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ کو پھونکے دیئے تھے جبکہ دوسرے حیوانوں نے ایسا نہیں کیا تھا۔ پس اس پر لعنت کی گئی۔ یہ اس نوع سے ہے جو آپ سے روایت کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، فرمایا: جس نے چھپکلی کو قتل کیا گویا اس نے ایک کافر کو قتل کیا اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، جس نے چھپکلی کو پہلی ضرب سے مارا اس کے لئے سو نیکیاں لکھی جائیں گی اور جس نے دوسری ضرب سے مارا اس کے لئے اس سے کم نیکیاں ہوں گی اور جس نے تیسری ضرب سے مارا اس کے لئے اس سے کم نیکیاں ہوں گی۔ ایک روایت میں ہے، فرمایا: پہلی ضرب پر ستر نیکیاں ہیں (5)۔

چوہیا، اس نے اپنا جوہر خبیث ظاہر کیا کہ اس نے حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کی رسیاں کاٹنے کا قصد کیا اور انہیں کاٹ دیا۔ عبد الرحمن بن ابی نعیم نے حضرت ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: محرم سانپ، بچھو، چیل

1۔ نوادر الاصول، صفحہ 51، جلد 1 (دار الصادر)　2۔ نوادر الاصول، صفحہ 51، جلد 1 (دار الصادر)

3۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب ما یندب للمحرم وغیرہ قتلہ من الدواب فی الحل والحرم، صفحہ 381، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

4۔ نوادر الاصول، صفحہ 50، جلد 1 (دار الصادر)

5۔ صحیح مسلم، کتاب قتل الحیات وغیرها، باب استحباب قتل الوزغ، صفحہ 236، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

ایسا درندہ جو حملہ کرے، کاٹنے والا کتا اور فویسقہ (چوہیا) کو قتل کرے (1)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہوئے تو چوہیا نے چراغ کی وٹ پکڑی ہوئی تھی تا کہ گھر کو آگ لگا دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قتل کرنے کا حکم دیا۔

کوا، اس نے اپنا جوہر اس وقت ظاہر کیا جب حضرت نوح علیہ السلام نے اسے کشتی سے بھیجا کہ زمین کی خبر لے آئے تو اس نے نوح علیہ السلام کے حکم کو ترک کر دیا اور مردار پر جا بیٹھا۔ یہ سب سانپ کے حکم میں ہیں۔ اسی وجہ سے ہم نے ذکر کر دیا۔ مزید وضاحت ان شاء اللہ سورۂ مائدہ میں آئے گی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا، اهْبِطُوْا سے لفظاً الف حذف کیا گیا ہے کیونکہ یہ الف وصلی ہے، اور قلنا سے لفظاً الف حذف کیا گیا ہے اس کے اور اس کے بعد ھا کے سکون کی وجہ سے۔

محمد بن مصفیٰ نے ابوحیوہ سے روایت کیا ہے کہ اھبطوا میں با پر ضمہ ہے یہ ایک لغت ہے۔ اس قول کو یہ بات تقویت دیتی ہے کہ یہ غیر متعدی ہے، اور اکثر غیر متعدی فعل یفعُلُ کے وزن پر آتا ہے۔ یہ خطاب حضرت آدم، حوا، سانپ اور شیطان کو ہے۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ حسن نے کہا: حضرت آدم، حوا اور وسوسہ کو (2)، مجاہد اور حسن نے کہا: بنو آدم اور بنو ابلیس کو ہے۔ الھبوط کا معنی اوپر سے نیچے کی طرف اترنا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام ہندوستان میں سرندیپ میں ایک پہاڑ پر اترے جسے بوذ کہا جاتا ہے۔ آپ کے ساتھ جنت کی خوشبو تھی۔ پس اس علاقہ کے درختوں اور وادیوں سے لگی ہر چیز خوشبو سے بھر گئی، اسی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کی خوشبو سے وہاں سے خوشبو لائی جاتی ہے۔ بادل آپ کے سر کو چھوتا تھا تو آپ گنجے ہو گئے تھے۔ پس گنجا پن آپ کی اولاد کو میراث میں ملا۔

بخاری میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تخلیق فرمایا تو ان کا طول ساٹھ ہاتھ تھا (3)۔ (الحدیث) مسلم نے اس حدیث کو نقل کیا ہے، آئندہ ذکر ہوگی۔ حضرت حوا جدہ میں اتریں اور ابلیس اَيْلَة میں اور سانپ جیسان میں اترا۔ بعض نے فرمایا: بجستان میں، بجستان میں تمام شہروں سے زیادہ سانپ ہیں۔ اگر عربد سانپ نہ ہوتا جو سانپوں کو کھا جاتا ہے اور اس کی وجہ سے اکثر مر جاتے ہیں بجستان سانپوں کے لئے خالی کر دیا جاتا۔ یہ ابوالحسن مسعودی نے ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ، بَعْضُكُمْ مبتدا ہے، عَدُوٌّ خبر ہے اور یہ جملہ حال کی بنا پر محل نصب میں ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی: و ھذہ حالکم۔ واو کو حذف کیا گیا ہے کیونکہ کلام میں ضمیر عائد موجود ہے جیسے کہا جاتا ہے: رایتك السماء تمطر علیك۔ میں نے تجھے دیکھا در اں حالیکہ آسمان تم پر بارش برسا رہا تھا۔

1۔ جامع ترمذی، ابواب الحج، باب ما جاء ما یقتل المحرم من الدواب، صفحہ 103، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ تفسیر ثعلبی، صفحہ 221، جلد 1 (دار الاحیاء التراث)

3۔ صحیح بخاری، صفحہ 468، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الانبیاء، باب خلق آدم و ذریتہ، حدیث 3079، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

العدو۔ دشمن، یہ صدیق (دوست) کا متضاد ہے یہ عدا سے مشتق ہے جس کا معنی ہے: ظلم کرنا۔ ذئبٌ عدوان (دشمن بھیڑیا) یعدو علی الناس جو لوگوں پر تجاوز کرتا ہے، العدوان صریح ظلم۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے: تجاوز کرنا۔ یہ تیرے اس قول سے ہے: لا یعدونك ھذا الامر یعنی یہ امر تجھ سے تجاوز نہیں کرے گا۔ عداہ، اس نے اس سے تجاوز کیا، اس کو عَدُوٌّ اس لئے کہتے ہیں اپنے ساتھی کی ناپسند میں حد سے تجاوز کرتا ہے۔ اسی سے ہے: العدو بالقدم۔ چلنے میں تجاوز کرنا۔ دونوں معانی قریب قریب ہیں کیونکہ جو ظلم کرتا ہے وہ تجاوز کرتا ہے۔

میں کہتا ہوں: بعض علماء نے بَعۡضُكُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ کو انسان پر محمول کیا ہے اگرچہ یہ معنی صحیح ہے لیکن یہ بعید ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اس کی دلیل ہے جب بندہ صبح کرتا ہے تو تمام اعضاء زبان سے کہتے ہیں ہمارے لئے اللہ سے ڈر۔ تو جب سیدھی ہوگی تو ہم سیدھے ہوں گے تو ٹیڑھی ہوگی تو ہم ٹیڑھے ہوں گے (1)۔

اگر یہ کہا جائے کہ عَدُوٌّ کیسے فرمایا اعداء نہیں فرمایا؟ اس کے دو جواب ہیں: ایک یہ کہ بعض اور کل کے لفظ کی خبر لفظ کے اعتبار سے واحد لگائی جاتی ہے اور معنی کے اعتبار سے اس کے مطابق لگائی جاتی ہے اور قرآن میں یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: كُلُّهُمۡ اٰتِيۡهِ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ فَرۡدًا ۝ (مریم) یہاں لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے مفرد خبر لگائی۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَكُلٌّ اَتَوۡهُ دٰخِرِيۡنَ ۝ (النمل) یہاں معنی کے اعتبار سے خبر جمع لگادی۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ عدو جمع کی جگہ مفرد ذکر کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهُمۡ لَكُمۡ عَدُوٌّ ؕ بِئۡسَ لِلظّٰلِمِيۡنَ بَدَلًا ۝ (الکہف) (اور وہ سب تمہارے دشمن ہیں ظالموں کے لئے بہت برا بدلہ ہے)

اسی طرح فرمایا: يَحۡسَبُوۡنَ كُلَّ صَيۡحَةٍ عَلَيۡهِمۡ ؕ هُمُ الۡعَدُوُّ (المنافقون: 4) (گمان کرتے ہیں کہ ہر گرج ان کے خلاف ہی ہے۔ یہی حقیقی دشمن ہیں) ابن فارس نے کہا: الۡعَدُوُّ، اسم ہے جو واحد، تثنیہ، جمع اور تانیث کو جامع ہے، کبھی اس کی جمع بھی بنائی جاتی ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے نکالنا اور جنت سے اتارنا بطور سزا نہیں تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کرنے کے بعد انہیں زمین پر اتارا، یا تو تادیب کی خاطر یا محنت میں سختی کی خاطر اتارا۔ اور صحیح یہ ہے کہ ان کو اتارنا اور زمین میں ٹھہرانا حکمت ازلیہ کے سبب تھا اور وہ حکمت یہ تھی کہ زمین میں ان کی نسل پھیلائی جائے تاکہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنا مکلف بنائے اور انہیں آزمائے۔ پھر اس پر ان کے ثواب اور اخروی عقاب کو مرتب فرمائے، کیونکہ جنت اور دوزخ ایسی جگہ نہیں ہیں جہاں احکام کا مکلف بنایا گیا ہو۔ پس وہ کھانا جنت سے اتارنے کا سبب بنا اور اللہ تعالیٰ کو زیبا ہے جو چاہے کرے۔ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا تھا: اِنِّىۡ جَاعِلٌ فِى الۡاَرۡضِ خَلِيۡفَةً (البقرہ: 30) یہ منقبت عظیمہ اور فضیلت کریمہ شریفہ ہے اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کے ساتھ ساتھ حضرت آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا کئے گئے تھے۔ ہم نے کہا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول کرنے کے بعد زمین پر اتارا کیونکہ دوسری مرتبہ فرمایا: قُلۡنَا اهۡبِطُوۡا۔

1۔ جامع ترمذی، ابواب الزہد، باب ما جاء فی حفظ اللسان، صفحہ 63، جلد 2 (وزارت تعلیم)

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ یہ مبتدا خبر ہیں اور مُسْتَقَرٌّ اسم ظرف ہے۔ یہ ابو العالیہ اور ابن زید کا قول ہے۔ سدی نے کہا: مُسْتَقَرٌّ سے مراد قبور ہیں۔

میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ کا ارشاد جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ قَرَارًا (غافر: 64) یہ دونوں معانی کا احتمال رکھتا ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَتَاعٌ، المتاع ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے لطف اٹھایا جائے خواہ کھانا ہو، لباس ہو، زندگی (کی کوئی اور ضرورت ہو) بات ہو، محبت وغیرہ ہو۔ اس سے منفعة النكاح کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے ذریعے لطف اٹھایا جاتا ہے۔ سلیمان بن عبد الملک جب اپنے بیٹے کو دفن کے بعد اس کی قبر پر کھڑا ہوا تو کہا:

وقفت على قبر غريب بقفرة ... متاع قليلٌ من حبيبٍ مفارق (1)

میں ایک میدان میں مسافر کی قبر پر کھڑا ہوں۔ یہ جدا ہونے والے دوست سے تھوڑا سا سامان ہے۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِلَىٰ حِينٍ، الحین کے متعلق علماء کے مختلف اقوال ہیں ایک جماعت کا کہنا ہے: اس سے مراد موت ہے (یعنی مرنے تک) یہ ان کا قول ہے جو کہتے ہیں: المستقر دنیا میں ٹھہرنا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں: اس سے مراد ہے قیامت کے قیام تک۔ یہ ان لوگوں کا قول ہے جو کہتے ہیں: المستقر سے مراد قبور ہیں۔ ربیع نے کہا: إِلَىٰ حِينٍ سے مراد الی اجلٍ یعنی موت تک۔

الحین سے مراد وقت بعید ہے اس وقت تیرے قول الآن اب سے دور کرنا ہے۔ خویلد نے کہا:

كابي الرماد عظيم القدر جفنته ... حين الشتاء كحوض المنهل اللقف

بہت زیادہ سخی ہے، اس کا پیالہ بہت بڑا ہے، سردیوں کے وقت کھلے گھاٹ والے حوض کی طرح ہے۔
کبھی حین پر تا داخل کرتے ہیں۔ ابو وجزہ نے کہا:

العاطفون تحين ما من عاطف ... والمطعمون زمان أين المطعم

وہ مہربانی کرنے والے ہوتے ہیں جبکہ کوئی مہربان نہیں ہوتا اور وہ کھلانے والے ہوتے ہیں جس وقت کہا جاتا ہے کھلانے والا کہاں ہے۔

الحین کا معنی مدت بھی ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ (الدہر: 1) الحین کا معنی ساعت بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أَوْ تَقُولَ حِينَ تَرَى الْعَذَابَ (زمر: 58)، ابن عرفہ نے کہا: الحین زمانہ کے ایک ٹکڑے کو کہتے ہیں جیسے ساعت، گھڑی اور اس سے اوپر۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَذَرْهُمْ فِي غَمْرَتِهِمْ حَتَّىٰ حِينٍ (المومنون) اے محبوب رہنے دو انہیں اپنی مدہوشی میں کچھ وقت۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ (ابراہیم: 25) وہ سارا سال پھل لاتا ہے، بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے ہر چھ ماہ بعد پھل لاتا ہے۔ بعض نے فرمایا: صبح و شام پھل دیتا ہے۔ الازہری نے کہا: الحین اسم ہے جیسے الوقت یہ تمام زمانوں کو شامل ہے خواہ وہ لمبا زمانہ ہو یا مختصر۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 129، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

مطلب یہ ہے کہ اس سے ہر وقت نفع اٹھایا جاتا ہے اور اس کا نفع کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ فرمایا: الحین سے مراد قیامت کا دن ہے۔ الحین سے مراد صبح وشام بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَ حِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ۝ (الروم) (سو پاکی بیان کرو اللہ تعالیٰ کی جب تم شام کرو اور جب تم صبح کرو) کہا جاتا ہے: عاملته محاینة یعنی میں نے اس کے ساتھ معاملہ کیا۔ احینت بالمکان میں وقت وہاں ٹھہرا۔ حان حین کذا۔ یعنی قریب ہوا۔ شیئۃ نے کہا:

وان سلوی عن جمیلٍ لساعة من الدھر ما حانت ولا حان حینھا

مسئلہ نمبر 7: جہاں الحین کے متعلق اہل زبان کا اختلاف ہے وہاں ہمارے علماء اور دوسرے علماء کے درمیان بھی اس میں اختلاف ہے۔ فراء نے کہا: الحین کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جس کی حد پر واقفیت نہیں ہوتی۔ دوسرا حین وہ جس کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا: تُؤْتِيْۤ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا (ابراہیم: 25) یہاں حین سے مراد چھ مہینے ہیں۔ ابن عربی نے کہا: الحین المجھول وہ ہوتا ہے جس کے ساتھ کوئی حکم متعلق نہیں ہوتا اور الحین المعلوم وہ ہوتا ہے جس کے ساتھ احکام متعلق ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ تکلیف کا تعلق ہوتا ہے۔ معلوم کی زیادہ سے زیادہ مدت ایک سال ہے۔ امام مالک احکام اور ایمان (قسموں) میں اس کو اسماء اور زمانوں میں اعم خیال کرتے ہیں۔ امام شافعی اقل خیال کرتے ہیں، ابوحنیفہ درمیانی مدت مراد لیتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا: چھ ماہ۔ ان کے قول کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ ان کے نزدیک مقدرات قیاساً ثابت نہیں ہوتی ہیں اور اس میں صاحب شریعت کی طرف سے کوئی نص نہیں ہے، معنی پر اعتبار کے لفظ کے مقتضیٰ پر لغوی طور پر آگاہی کے بعد ہوتا ہے۔ پس جس نے نذر مانی کہ وہ ایک حین نماز پڑھے گا تو اسے امام شافعی کے نزدیک ایک رکعت پر محمول کیا جائے گا کیونکہ ایک رکعت نفل میں سے کم از کم ہے۔ انہوں نے وتر کی ایک رکعت پر قیاس کیا ہے۔ امام مالک اور ان کے اصحاب نے کہا: نوافل کم از کم دو ہیں۔ پس زمانہ فعل کی مقدار کے ساتھ مقدر ہوگا۔ ابن خویز منداد نے ذکر کیا ہے کہ جو قسم اٹھائے الایکلم فلانا حینا اولا یفعل کذا حیناً۔ تو حین سے مراد ایک سال ہوگا اور فرمایا: احکام میں علماء کا اتفاق ہے کہ اگر کوئی قسم اٹھائے کہ وہ ایک حین ایسا نہیں کرے گا یا فلاں سے ایک حین بات نہیں کرے گا۔ سال پر زیادتی اس کی قسم میں داخل نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ اتفاق ان کے مذہب میں ہے۔ امام مالک نے فرمایا: جس نے قسم اٹھائی کہ وہ ایک حین یا زمانہ، یا دھر ایسا نہیں کرے گا تو سب سے مراد ایک سال ہوگا۔ ابن وہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے، دھر میں ایک سال ہونے میں انہیں شک ہوا۔ ابن منذر نے یعقوب اور ابن الحسن سے حکایت کیا ہے کہ دھر سے مراد چھ ماہ ہے۔ حضرت ابن عباس، اصحاب الرائے، عکرمہ، سعید بن جبیر، عامر الشعبی اور عبیدہ نے تُؤْتِيْۤ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا (ابراہیم: 25) کے تحت فرمایا کہ کل حین سے مراد چھ ماہ ہیں۔ اوزاعی اور ابو عبیدہ نے کہا: الحین سے مراد چھ ماہ ہیں۔ امام شافعی کے نزدیک الحین میں کوئی معلوم وقت نہیں ہے اور نہ حین کے لئے کوئی حد ہے کبھی ان کے نزدیک الحین سے مراد دنیا کی مدت ہوتی ہے، ہم کبھی بھی اسے حانث نہیں بنائیں گے اور تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ دن کے ختم ہونے سے پہلے ادا کر دے۔ ابو ثور وغیرہ نے کہا: الحین اور الزمان اس پر محمول ہوگا جو لغت کہتی ہے۔ کہا جاتا ہے: قد جئت من حین شاید وہ نصف دن سے نہ آیا ہو، الکیا طبری شافعی

نے کہا: وبالجملہ، الحین کے کئی مصارف ہیں۔ امام شافعی کسی محمل کی تعیین نہیں کرتے کیونکہ یہ محمل ہے لغت میں کسی معین معنی کے لئے وضع نہیں کیا گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: اِلٰى حِيْنٍ یہ حضرت آدم علیہ السلام کے لئے بشارت ہے تا کہ وہ جان لیں کہ انہوں نے ہمیشہ اس دنیا میں باقی نہیں رہنا ہے انہوں نے جنت کی طرف منتقل ہونا ہے جس کی طرف لوٹنے کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے اور یہ حضرت آدم کے علاوہ لوگوں کے لئے قیامت کے قائم ہونے پر دلیل ہے۔ یہی کافی ہے۔ واللہ اعلم

فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝

''پھر سیکھ لئے آدم نے اپنے رب سے چند کلمے تو اللہ تعالیٰ نے اس کی توبہ قبول کی۔ بے شک وہی ہے بہت توبہ قبول کرنے والا نہایت رحم کرنے والا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ بعض علماء نے فرمایا: تلقی کا معنی سمجھنا ہے۔ بعض نے فرمایا: قبول کرنا اور لینا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام یتلقی الوحی یعنی وحی حاصل کرتے تھے اسے لیتے تھے۔ تو کہتا ہے: خرجنا نتلقی الحجیج ہم نکلے تا کہ حاجیوں کا استقبال کریں۔ بعض نے فرمایا: تلقی کا معنی تلقین کرنا ہے، یہ معنی صحیح ہے لیکن اصل میں تلقی کا تلقن سے ہونا جائز نہیں کیونکہ جب دو حرف ہم جنس ہوں تو ایک کو یاء سے قلب کیا جاتا ہے مثلاً تظنی، یہ تظنن سے ہے تقضی یہ تقضض اس کی مثل ہے تسریت یہ تسررت سے ہے املیت یہ امللت سے ہے اس کی قسم کی دوسری مثالیں بھی ہیں اسی وجہ سے یہ نہیں کہا جاتا تقبی، تقبل سے ہے اور نہ یہ کہا جاتا ہے کہ تلقی، تلقن سے ہے، مکی نے حکایت کیا حضرت آدم علیہ السلام کو کلمات الہام کئے گئے۔ پس حضرت آدم علیہ السلام نے ان سے نفع اٹھایا۔ حسن نے کہا: وہ کلمات سیکھے اور ان پر عمل کیا۔

مسئلہ نمبر 2: كَلِمٰتٍ میں مفسرین کا اختلاف ہے، حضرات ابن عباس، حسن، سعید بن جبیر، ضحاک اور مجاہد نے کہا: وہ کلمات یہ تھے: رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا ٜ وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (اعراف) مجاہد سے یہ الفاظ بھی مروی ہیں: سبحانك اللھم لا الہ الا انت ربی ظلمت نفسی فاغفرلی انك انت الغفور الرحیم (1)۔ ایک جماعت نے کہا: انہوں نے عرش کے پائے پر یہ لکھا ہوا دیکھا: مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ تو انہوں نے ان کلمات سے سفارش طلب کی تو ان کی سفارش قبول کی گئی۔ کلمات سے مراد یہ کلمات ہیں۔ ایک گروہ نے کہا: كَلِمٰتٍ سے مراد رونا، حیاء کرنا اور دعا کرنا ہے۔ بعض نے فرمایا: ندامت، استغفار اور پریشان ہونا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ قول تقاضا کرتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے معہود استغفار کے علاوہ کچھ نہ کہا (2)۔ بعض نیک لوگوں سے پوچھا گیا کہ گناہگار کو کیا کہنا چاہئے تو اس نے کہا: جو اس کے والدین نے کہا تھا: رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا (اعراف: 23) موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا: رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ (القصص: 16) یونس علیہ السلام نے کہا تھا: لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖۗ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (الانبیاء) حضرت ابن عباس اور وہب

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 130، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ ایضاً، صفحہ 131، جلد 1

بن منبہ سے مروی ہے کہ یہ کلمات تھے: سبحان اللهم و بحمدك لا اله الا انت عملت سوءًا و ظلمت نفسی فتب علی انك انت التواب الرحیم۔ محمد بن کعب نے کہا: یہ کلمات تھے: لا اله الا انت سبحانك و بحمدك عملت سوءًا و ظلمت نفسی فتب علی انك انت التواب الرحیم لا اله الا انت سبحانك وبحمدك عملت سوءًا و ظلمت نفسی فارحمنی انك انت الغفور الرحیم لا اله الا انت سبحانك و بحمدك عملت سوءًا و ظلمت نفسی فارحمنی انك ارحم الراحمین۔ بعض نے فرمایا: کلمات سے مراد چھینک کے بعد الحمد للہ کہنا ہے۔

الکلمات، کلمۃٌ کی جمع ہے۔ الکلمہ کا لفظ قلیل و کثیر پر بولا جاتا ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَتَابَ عَلَيْهِ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی یا توبہ کی توفیق بخشی۔ جمعہ کے دن دس محرم الحرام کو توبہ قبول فرمائی جیسا کہ آگے اس کا بیان آئے گا۔ تاب العبد کا مطلب بندہ اپنے رب کی طاعت کی طرف لوٹ آیا۔

عبد توابٌ، طاعت کی طرف کثرت سے رجوع کرنے والا۔ توبہ کا اصل معنی لوٹنا ہے۔ کہا جاتا ہے تاب و ثاب و آب و اناب ان سب کا معنی لوٹنا ہے۔

مسئلہ نمبر 4: اگر کہا جائے کہ عَلَيْهِ کیوں فرمایا علیھما کیوں نہیں فرمایا، حضرت حوا بھی تو بالاجماع اس کام میں شریک تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کو فرمایا تھا: وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (البقرہ:35) اس درخت کے قریب نہ جانا، اور قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (اعراف:23) دونوں نے کہا ہمارے رب ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قصہ کے آغاز میں جب حضرت آدم علیہ السلام کو اُسْکُنْ کے ارشاد سے خطاب کیا گیا تو تلقی میں بھی خاص ان کا ذکر فرمایا۔ اسی وجہ سے واقعہ کی تکمیل بھی صرف ان کے ذکر سے کی۔ نیز عورت حرمت اور مستورہ ہوتی ہے اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر نہ فرما کر اس کے لئے پردہ کا ارادہ فرمایا۔ اسی وجہ سے معصیت میں بھی ان کا ذکر نہیں فرمایا وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ۝ (طٰہٰ)

نیز عمومی احکام میں عورت مرد کے تابع ہوتی ہے اس کا ذکر نہیں کیا جاتا، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو نوجوان تھا اس کا ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نہیں فرمایا: اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ (الکہف:75) (کیا میں نے تجھے کہا نہیں تھا) بعض علماء نے فرمایا: چونکہ دونوں کا امر برابر تھا حضرت آدم کی توبہ کی قبولیت کا ذکر حضرت حوا کی توبہ کی قبولیت کی دلیل ہے۔ یہ حسن کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی مثل ہے وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا (الجمعہ:11) چونکہ قوم کی مقصود تجارت تھی اس لئے ضمیر کی طرف لوٹادی اور تثنیہ کی ضمیر ذکر نہیں فرمائی، معنی قریب قریب ہے۔ شاعر نے کہا:

رمانی بامرٍ کنت منه و والدی بریئًا و من فوق الطوی رمانی

اس نے مجھ پر ایک امر کی تہمت لگائی میں اور میرا والد اس سے بری تھے اور اس نے ایک کنویں کی وجہ سے مجھ پر تہمت لگائی۔

قرآن حکیم میں ہے اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ (توبہ:62) (اللہ اور اس کا رسول زیادہ مستحق ہے کہ اسے راضی

کریں) یہاں بھی ایجاز و اختصار کی خاطر حذف کیا گیا۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت التَّوَّابُ بیان فرمائی اور قرآن حکیم میں یہ صفت معرفہ، نکرہ، اسم اور فعل کی صورت میں بار بار ذکر فرمائی، کبھی ثواب کا اطلاق بندے پر بھی کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۝ (البقرہ) (بے شک اللہ دوست رکھتا ہے بہت توبہ کرنے والوں کو اور دوست رکھتا ہے صاف ستھرا رہنے والوں کو)

ابن عربی نے کہا: اللہ تعالیٰ کا وصف ہونے میں ہمارے علماء کے تین اقوال ہیں:

ا۔ رب تعالیٰ کے حق میں یہ جائز ہے اس نام کے ساتھ اسے پکارا جائے گا جیسا کہ کتاب وسنت میں وارد ہوا ہے اور کوئی تاویل نہیں کی جائے گی۔ دوسرے علماء نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کا وصف حقیقی ہے۔ توبۃ اللہ علی العبد کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندے کو معصیت کی حالت سے طاعت کی حالت کی طرف لوٹا دیا۔ بعض دوسرے علماء نے فرمایا: توبۃ اللہ علی العبد کا مطلب اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے کی توبہ قبول کرنا یہ احتمال رکھتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد قبلت توبتك (میں نے تیری توبہ قبول کی) کی طرف لوٹے اور اس طرف لوٹنے کا احتمال رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مجرم بندے کے دل میں توبہ کرنے اور ظاہری اعضاء پر طاعات کو جاری کرنے کی توفیق بخش دے۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کے حق میں تائب کہنا جائز نہیں۔ تائب، اسم فاعل ہے تاب یتوب سے، کیونکہ ہمارے لئے جائز نہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی اسم یا صفت استعمال کریں مگر صرف وہی جو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے لئے استعمال فرمایا یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے استعمال فرمایا یا مسلمانوں کی جماعت نے استعمال فرمایا۔ اگرچہ لغت میں وہ جائز بھی ہو۔ اس باب میں یہی صحیح ہے جیسا کہ ہم نے ''الکتاب الاسنیٰ فی شرح اسماء اللہ الحسنیٰ'' میں بیان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ (توبہ: 117) (یقیناً رحمت سے توجہ فرمائی اللہ تعالیٰ نے (اپنے) نبی پر نیز مہاجرین اور انصار پر) اور فرمایا وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ (الشوریٰ: 25) (اور وہی ہے جو توبہ قبول کرتا ہے اپنے بندوں کی) اللہ تعالیٰ کو تواب کہا گیا ہے فعل کے مبالغہ کے لئے اور جو کثرت سے اس کی بارگاہ میں توبہ کرتا ہے کثرت سے اس کی توبہ قبول کرنے کی وجہ سے۔

مسئلہ نمبر 7: کسی کو توبہ تخلیق کرنے کی قدرت نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اعمال کی تخلیق میں منفرد ہے جب کہ معتزلہ اور ان کے ہم نواؤں کا مسلک اس سے مختلف ہے۔ اسی طرح کسی کے لئے مجرم کی توبہ قبول کرنا اور اسے معاف کرنا جائز نہیں۔ ہمارے علماء نے فرمایا: یہود ونصاریٰ نے دین میں اس اصل کا انکار کیا۔ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (توبہ: 31) (انہوں نے بنالیا اپنے پادریوں اور اپنے راہبوں کو (اپنے) پروردگار اللہ کو چھوڑ کر) انہوں نے مجرم، گنہگار کے لئے یہ اصول بنایا کہ وہ کسی عالم یا راہب کے پاس جائے اور اسے کوئی چیز (نذرانہ) دے دے تو اس کے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ۭ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝ (انعام) (بہتان باندھ کر اللہ پر بے شک وہ گمراہ ہو

گئے اور نہ تھے وہ ہدایت پانے والے)۔

مسئلہ نمبر 8: ابن کثیر نے فتلقی آدم من ربہ کلمٰتٌ پڑھا ہے باقی قراء نے آدم کے رفع اور کلمات کی نصب کے ساتھ پڑھا ہے(1) دونوں قرائتیں ایک ہی معنی کی طرف لوٹتی ہیں کیونکہ جب حضرت آدم علیہ السلام نے کلمات کو پایا تو کلمات انہیں مل گئے۔ بعض علماء نے فرمایا: کلمات ہی اللہ تعالیٰ کی توفیق سے حضرت آدم علیہ السلام کو ملنے والے تھے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے حضرت آدم نے وہ کلمات قبول کئے اور ان کے ساتھ دعا کی تو یہ کلمات ہی فاعل ہیں۔ گویا اصل اس قراءت پر ہے فتلقت آدمَ من ربہ کلمٰتٌ۔ لیکن جب مؤنث اور اس کے فعل کے درمیان بعد اور دوری پائی گئی تو علامت تانیث کو حذف کرنا اچھا ہوا۔ یہ اصل ہے جو قرآن اور کلام میں جاری ہوتی ہے جب مؤنث کا فعل بغیر علامت تانیث کے ہو۔ اسی سے عربوں کا قول ہے۔ حضر القاضی الیوم امرأۃٌ۔ عورت آج قاضی کے پاس حاضر ہوئی۔ بعض علماء نے فرمایا کلمات کی تانیث جب حقیقی نہ تھی تو اسے الکلم کے معنی پر محمول کیا گیا۔ پس صیغہ مذکر ذکر کیا گیا۔ اعمش نے ادمّ مِن ربہ کو مدغم کر کے پڑھا ہے۔ ابونوفل بن ابی عقرب نے (أنہ) ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے لانہ کے معنی کی بنا پر۔ باقی قراء نے نئی کلام کی بنا پر کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عمرو، عیسیٰ اور طلحہ نے ھا کو ھا میں ادغام کیا ہے۔ یہ ابو حاتم نے ابو عمرو وغیرہ سے حکایت کیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ جائز نہیں ہے بلکہ ان دونوں کے درمیان لفظاً واؤ ہے خطا نہیں۔ نحاس نے کہا: سیبویہ نے اس واؤ کو حذف کرنا جائز قرار دیا ہے اور اس نے یہ شعر پڑھا ہے:

له زجل كأنه صوت حاد اذا طلب الوسيقة او زمير

اس کیلئے مترنم آواز تھی گویا وہ کسی حدی خوان کی آواز ہے۔ جب اس نے اپنی مادہ کو طلب کیا یا اس کی آواز میں مزمار ہے۔ پس اس صورت میں ادغام جائز ہے۔ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور تواب خبر ہے پھر پورا جملہ انّ کی خبر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ھو ھاء کی تاکید ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ ھو فاصلہ ہو جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

حضرت سعید بن جبیر نے کہا: جب حضرت آدم علیہ السلام کو زمین کی طرف اتارا گیا تو زمین میں خشکی پر گدھ کے علاوہ کچھ نہ تھا اور دریا میں مچھلی کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ گدھ مچھلی کے پاس پناہ لیتی اور رات گزارتی۔ جب گدھ نے حضرت آدم علیہ السلام کو دیکھا تو کہا: اے مچھلی آج زمین کی طرف ایک چیز اتاری گئی ہے جو ٹانگوں پر چلتی ہے اور ہاتھوں سے پکڑتی ہے۔ مچھلی نے کہا: اگر تو سچی ہے تو پھر میرے لئے دریا میں نجات کی جگہ نہیں اور تیرے لئے خشکی میں اس سے خلاصی کی جگہ نہیں۔

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

''ہم نے حکم دیا اتر جاؤ اس جنت سے سب کے سب پھر اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے (پیغام) ہدایت تو جس نے پیروی کی میری ہدایت کی انہیں نہ تو کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے''۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 130، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے قُلْنَا اهْبِطُوْا تغلیظ و تاکید کے لئے امر کا تکرار فرمایا جیسے تو کسی کو کہتا ہے: اٹھ اٹھ (1)۔ بعض علماء نے فرمایا: امر کو مکرر فرمایا کیونکہ ہر امر سے نیا حکم معلق تھا جو دوسرے امر کے حکم سے مختلف تھا، پہلے امر کے ساتھ عداوت معلق تھی دوسرے کے ساتھ ہدایت کا لانا۔ بعض علماء نے فرمایا: پہلا اترنا جنت سے آسمان کی طرف تھا دوسرا اترنا آسمان سے زمین کی طرف تھا، اس قول پر یہ دلیل ہوگی کہ جنت ساتویں آسمان میں ہے جیسے کہ حدیث اسراء اس پر دلالت کرتی ہے (2) نہ جیسا کہ آگے آئے گا۔

جَمِيْعًا حال کی بنا پر منصوب ہے۔ حضرت وہب بن منبہ نے کہا: جب حضرت آدم علیہ السلام زمین کی طرف اترے تو ابلیس نے درندوں سے کہا: یہ تمہارا دشمن ہے اسے ہلاک کر دو۔ وہ سب جمع ہوئے اور انہوں نے یہ کام کتے کے سپرد کیا۔ انہوں نے کتے سے کہا: تو ہم میں سے زیادہ بہادر ہے، درندوں نے کتے کو سردار بنا دیا۔ جب حضرت آدم علیہ السلام نے کتے کو دیکھا تو متحیر ہوئے۔ جبریل امین حضرت آدم علیہ السلام کے پاس آئے اور کہا: اپنا ہاتھ کتے کے سر پر پھیرو۔ حضرت آدم نے ایسا ہی کیا۔ جب درندوں نے دیکھا کہ کتا تو آدم سے مانوس ہو گیا ہے تو درندے بھاگ گئے۔ کتے نے حضرت آدم علیہ السلام سے امان مانگی تو حضرت آدم نے اسے امان دے دی، پس وہ اور اس کی اولاد حضرت آدم کے ساتھ باقی رہی۔ حکیم ترمذی نے اسی طرح کہا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام جب زمین کی طرف اتارے گئے تو ابلیس درندوں کے پاس آیا، انہیں حضرت آدم علیہ السلام کو تکلیف پہنچانے کے لئے ابھارا، ان میں سے سخت ترین کتا تھا۔ پس اس کا دل مردہ کر دیا گیا۔ روایت ہے کہ جبریل علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام کو کہا کہ اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھو۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنا ہاتھ رکھا تو وہ مطمئن ہو گیا اور حضرت آدم سے الفت کرنے لگا۔ پس کتا حضرت آدم کی رکھوالی کرنے والوں میں سے ہو گیا۔ وہ حضرت آدم کی اور آپ کی اولاد کی حفاظت کرنے والا بن گیا اور انسانوں سے الفت کرنے والا ہو گیا، اس کے دل کے مردہ ہو جانے کی وجہ سے یہ انسان سے ڈرتا ہے، اگر اسے روڑا مارا جائے تو پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتا ہے پھر ان سے محبت کی وجہ سے لوٹ آتا ہے۔ کتے میں کچھ ابلیس کا اثر ہے اور کچھ حضرت آدم علیہ السلام کے چھونے کا اثر ہے۔ ابلیس کے اثر کی وجہ سے یہ بھونکتا ہے اور آدمی پر حملہ کرتا ہے، حضرت آدم علیہ السلام کے چھونے کی وجہ سے اس کا دل مردہ ہو گیا حتیٰ کہ یہ تابعدار ہو گیا اور حضرت آدم اور حضرت آدم کی اولاد سے محبت کرتا ہے اور ان کی حفاظت کرتا ہے۔ دل کے مردہ ہونے کی وجہ سے ہر وقت ہانپتا رہتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے برے علماء کو کتے سے تشبیہ دی ہے جیسا کہ سورۂ اعراف میں اس کا بیان آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ حضرت آدم علیہ السلام پر وہ ڈنڈا اتارا تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے معجزہ بنایا تھا، اس ڈنڈے کے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام درندوں کو اپنے سے دور کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى، هُدًى کے معنی میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 131، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملئکۃ، حدیث 2968، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کتاب اللہ ہے۔ یہ سدی کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد ہدایت کی توفیق ہے۔ ایک جماعت نے کہا: الھدیٰ سے مراد رسل ہیں جو فرشتوں میں سے حضرت آدم کی طرف آئے اور بشروں میں سے حضرت آدم کی اولاد کی طرف آئے (1)۔ جیسا کہ حضرت ابوذر کی حدیث میں آیا ہے۔ آجری نے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔

مِّنِّیْ کے قول میں اشارہ ہے کہ بندوں کے افعال اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہیں، جبکہ قدریہ وغیرہ کا قول اس سے مختلف ہے جیسا کہ پہلے گزرا ہے۔

جحدری نے ھُدَیَّ پڑھا ہے یہ ھذیل کی لغت ہے۔ وہ کہتے ہیں: ھدیّ، عصیّ، محییّ۔ نحویوں نے ابوذویب کا شعر نقل کیا ہے جو وہ اپنے بیٹے کے مرثیہ میں کہتا ہے:

سبقوا ھویّ واعنقوا لھواھم فَتُخُرِّموا ولکل جنب مصرع (2)

وہ میری خواہش سے سبقت لے گئے گویا انہوں نے موت کی خواہش کی۔ پس وہ ایک ایک کر کے پکڑے گئے، ہر پہلو کے لئے گرنا ہے۔

نحاس نے کہا: خلیل اور سیبویہ کے نزدیک اس لغت کی علت یہ ہے کہ اضافت کی یا کا ماقبل کسرہ ہونا چاہئے تھا جب وہ نہ تھی کیونکہ الف کو حرکت نہیں دی جاتی تو الف کو یا سے بدل دیا گیا پھر یا کو یا میں ادغام کر دیا گیا۔

(اما) اس میں ما زائدہ ہے، اِنْ شرط کے لئے ہے، اور جواب شرط فاشرط ثانی کے ساتھ ہے۔ جو ''فَمَنْ تَبِعَ'' میں ہے۔ من مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے اور تَبِعَ شرط کی وجہ سے محل جزم میں ہے۔ فَلَا خَوْفٌ، اس دوسری شرط کا جواب ہے، سیبویہ نے کہا دوسری شرط اور اس کا جواب دونوں پہلی شرط کا جواب ہیں، کسائی نے کہا: فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ۔ دونوں شرطوں کا اکٹھا جواب ہے (3)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۞، خَوْفٌ سے مراد پریشانی، گھبراہٹ ہے اور یہ مستقبل کے امر پر ہوتی ہے۔ خافنی فلانٌ فخفتہ۔ فلاں نے مجھے ڈرایا تو میں اس سے انتہائی خوف زدہ ہو گیا۔ التخوف کا معنی کمی ہونا ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ (النحل: 47) حضرات زہری، حسن، عیسیٰ بن عمر، ابن ابی اسحاق اور یعقوب نے (فلا خوف) فاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور نحویوں کے نزدیک پسندیدہ رفع اور تنوین ہے۔ مبتدا ہونے کے اعتبار سے۔ کیونکہ دوسرا اسم معرفہ ہے اور اس میں صرف رفع ہی ہوتا ہے کیونکہ لا معرفہ میں عمل نہیں کرتا۔ پس انہوں نے پہلے اسم میں ہی رفع کو اختیار کیا ہے تاکہ کلام ایک جیسی ہو جائے اور یہ بھی جائز ہے کہ لا خوف میں لا معنی لیس ہو۔

الحُزن اور الحَزن۔ یہ سرور کی ضد ہیں۔ یہ ماضی کے کسی امر پر ہوتا ہے۔ حزِن الرجل فھو حزِن و حزین، احزنہٗ غیرہ و حزنہ۔ جیسے اسلکہ و سلکہ۔ (یعنی حزن لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے) اس کا مجہول محزون آتا ہے۔ یزیدی نے کہا: حزنہ یہ قریش کی لغت ہے۔ احزنہ یہ تمیم کی لغت ہے۔ دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے احتزن اور تحزن کا ایک

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 131، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 132 3۔ ایضاً

معنی ہے: غمگین ہونا۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ ان پر آخرت کا کوئی خوف نہیں ہے اور دنیا میں جو فوت ہوا اس پر وہ غمگین نہیں ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس میں قیامت کے دن کی ہولناکیوں اور اطاعت شعاروں پر قیامت کے خوف کی نفی کی دلیل نہیں ہے کیونکہ قیامت کی تکلیفوں کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے بیان فرمایا ہے لیکن اطاعت شعاروں سے وہ تکلیفیں اللہ تعالیٰ کم کردے گا جب وہ اللہ کی رحمت کی طرف چلے گئے تو گویا انہیں خوف ہے ہی نہیں۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

''اور جنہوں نے کفر کیا اور جھٹلایا ہماری آیتوں کو وہ دوزخی ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا یعنی جنہوں نے شرک کیا، کیونکہ آگے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ صحبت کا مطلب ہوتا ہے ہر حالت میں اور ہر زمانہ میں کسی چیز سے ملا ہوا ہونا، اگر ملازمت اور اختلاط ہو تو یہ کمال صحبت ہے۔ اسی طرح یہ دوزخیوں کی دوزخ سے صحبت ہے، اس قول کی وجہ سے صحابہ کا نام رکھنے میں اختلاف ختم ہو جاتا ہے کیونکہ مراتب مختلف ہیں (1)۔ مزید تفصیل ہم ان شاء اللہ سورۂ برأت میں بیان کریں گے۔ اس آیت کے باقی الفاظ کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ۝

''اے اولاد یعقوب یاد کرو میرا وہ احسان جو کیا میں نے تم پر اور پورا کرو تم میرے (ساتھ کیے ہوئے) وعدہ کو میں پورا کروں گا تمہارے (ساتھ کیے ہوئے) وعدہ کو اور صرف مجھ ہی سے ڈرا کرو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ یہ ندا مضاف ہے اس میں نصب کی علامت یاء ہے۔ اضافت کی وجہ سے اس سے نون حذف کیا گیا ہے۔ بنین کا واحد ابن ہے اس میں اصل بَنَی ہے بعض نے فرمایا: بَنَوٌ ہے۔ جنہوں نے فرمایا: اس میں واؤ حذف کی گئی ہے انہوں نے بنوۃ سے حجت پکڑی ہے، اس میں کوئی حجت نہیں ہے کیونکہ انہوں نے کہا ہے: الفتوۃ میں اصل یاء ہے۔ زجاج نے کہا: میرے نزدیک یاء حذف ہے گویا یہ بنیت سے مشتق ہے۔ اخفش نے اس سے واؤ کے حذف کو پسند کیا ہے کیونکہ واؤ کے ثقل کی وجہ سے واؤ کا حذف اکثر ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: ابن بیّنٌ، البنوۃ۔ اور تصغیر بنی فراء نے کہا: یا بُنیِ یا بُنیَ دونوں لغتیں ہیں جیسے یا ابتِ و یا ابتَ دونوں طرح پڑھا گیا ہے یہ البناء سے مشتق ہے۔ یہ کسی شے کو دوسری شے پر رکھنا ہے۔ الابن یہ باپ کی فرع ہے اس پر اس کو رکھا گیا ہے۔

اِسْرَآءِيْلَ سے مراد یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہ السلام ہے۔ ابو الفرج جوزی نے کہا: حضرت یعقوب کے علاوہ انبیائے کرام میں کوئی ایسا نہیں ہے جس کے دو نام ہوں مگر ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے نام ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب ''فہوم الآثار'' میں اس کا ذکر کیا ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 132، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

میں کہتا ہوں: کہا گیا ہے کہ المسیح عیسیٰ علیہ السلام کا علم ہے غیر مشتق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام روح اور کلمہ رکھا ہے لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ابیل الأبیلین کہتے تھے۔ یہ جوہری نے ''الصحاح'' میں ذکر کیا ہے۔ بیہقی نے ''دلائل النبوۃ'' میں خلیل بن احمد سے روایت کیا ہے کہ پانچ انبیائے کرام دو دو ناموں والے تھے۔ محمد اور احمد ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم، عیسیٰ اور مسیح، اسرائیل اور یعقوب، یونس اور ذوالنون، الیاس اور ذوالکفل صلی اللہ علیہم وسلم۔ میں کہتا ہوں: ہم نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے چار نام تھے لیکن ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے اسماء تھے۔ ان کا بیان اپنی جگہ پر ہوگا۔ اِسۡرَآءِیۡلَ عجمی اسم ہے اسی وجہ سے غیر منصرف ہے یہ اضافت کی وجہ سے محل جر میں ہے، اس میں سات لغات ہیں۔ اسرائیل یہ قرآن کی لغت ہے اور اسرائیل مدہ مہموزہ مختلسہ کے ساتھ، یہ شنبوذ نے ورش سے حکایت کیا ہے۔ اسراییل بغیر ہمزہ کے یاء کے مد کے ساتھ، یہ اعمش اور عیسیٰ بن عمر کی قراءت ہے۔ حسن اور زہری نے بغیر ہمزہ اور مد کے پڑھا ہے۔ اسرائل بغیر یاء کے اور ہمزہ مکسورہ کے ساتھ، اسرأل ہمزہ مفتوحہ کے ساتھ ...... تمیم کہتے ہیں: اسرائین یعنی نون کے ساتھ۔ اسرائیل کا معنی ہے: عبداللہ۔ حضرت ابن عباس نے کہا: عبرانی زبان میں اسرا سے مراد بندہ ہے اور أیل سے مراد اللہ ہے۔ بعض نے فرمایا: اسرا سے مراد اللہ کا چنا ہوا ہے اور إیل سے مراد اللہ ہے۔ بعض نے فرمایا: اسرا کا معنی سخت ہونا ہے گویا اسرائیل وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے سخت بنایا اور اس کی تخلیق کو پختہ کیا۔ یہ مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ سہیلی نے کہا: اسرائیل اس لئے کہا گیا کہ انہیں ایک رات میں سیر کرائی گئی جب وہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔ پس ان کا نام اسرائیل رکھا گیا یعنی اس نے اللہ کی طرف سیر کی۔ پس اسم کا بعض عبرانی ہے اور بعض عرب کے موافق ہے۔ واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِىَ الَّتِىۡٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ، ذکر اسم مشترک ہے ذکر بالقلب (دل کا ذکر) یہ بھولنے کی ضد ہے۔ الذکر باللسان یہ خاموش رہنے کی ضد ہے۔ ذکرت الشیء بلسانی و قلبی ذکرا۔ میں نے زبان اور دل سے اس کا ذکر کیا۔ واجعلہ منك علی ذُکر (بضم ذال) یعنی اس کو مت بھول۔ کسائی نے کہا: جو ذکر دل سے ہو وہ ذال کے ضمہ کے ساتھ ہوتا ہے اور جو زبان کے ساتھ ہو وہ ذال مکسور کے ساتھ ہوتا ہے۔ بعض دوسرے علماء نے کہا: یہ دونوں لغتیں ہیں۔ کہا جاتا ہے: ذِکر اور ذُکر ہم معنی ہیں اور الذکر (بفتحہ ذال) مؤنث کا متضاد ...... الذِکر کا معنی شرف بھی ہے۔ اسی سے یہ ارشاد ہے: وَاِنَّهٗ لَذِكۡرٌ لَّكَ وَلِقَوۡمِكَ (زخرف: 44)

ابن انباری نے کہا: آیت کا معنی یہ ہے کہ میری نعمت کے شکر کو یاد کرو۔ نعمت کے ذکر پر اکتفا کرتے ہوئے شکر کو حذف کیا گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہاں ذکر بالقلب مراد ہے اور وہی مطلوب ہے، یعنی میری اس نعمت سے غافل نہ ہو جاؤ جو میں نے تم پر کی اور اسے بھول نہ جاؤ، یہ عمدہ قول ہے۔ النعمۃ یہاں اسم جنس ہے یہ مفرد ہے اور جمع کے معنی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ لَا تُحۡصُوۡهَا (ابراہیم: 34) یہاں بھی نعمۃ سے مراد نعمتیں ہیں۔ اللہ کی نعمتوں میں سے جو اس نے بنی اسرائیل پر فرمائیں یہ ہیں: فرعونیوں سے نجات بخشی، ان سے انبیاء بنائے، ان پر کتب اور من وسلویٰ نازل فرمایا، پتھر سے پانی نکالا، انہیں تورات عطا فرمائی جس میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت، نعت اور رسالت کا ذکر تھا، والدین

پر جو نعمتیں ہوں وہ اولاد پر بھی ہوتی ہے کیونکہ اولاد والدین کے شرف سے مشرف ہوتی ہے۔

نوٹ: ارباب معانی نے کہا: اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا نعمت کے ذکر کے ساتھ تعلق قائم فرمایا ہے، جبکہ حضرت محمد ﷺ کی امت سے نعمت کے ذکر کو ساقط کر دیا اور اپنے ذکر کی طرف انہیں بلایا ہے۔ فرمایا: فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ (البقرہ: 152) تاکہ دوسری امتوں کی نظر نعمت سے منعم کی طرف جائے اور حضرت محمد ﷺ کی امت کی نظر منعم سے نعمت کی طرف جائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ یہ امر اور جواب امر ہے۔ زہری نے تکثیر کے لئے اوف واو کے فتحہ اور فاء کی شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس عہد سے کون سا عہد مراد ہے اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ حسن نے کہا: اس عہد سے مراد یہ ہے: خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ (اعراف: 171)

اور ارشاد ہے: وَ لَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَ بَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا (المائدہ: 12) اور یقیناً لیا تھا اللہ تعالیٰ نے پختہ وعدہ بنی اسرائیل سے اور ہم نے مقرر کیے ان میں سے بارہ سردار۔

بعض علماء نے فرمایا: یہ ہے وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَ لَا تَكْتُمُوْنَهٗ (آل عمران: 187)

الزجاج نے کہا: اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ جو میں نے تم سے تورات میں حضرت محمد ﷺ کی اتباع کا عہد لیا ہے اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ جو میں نے تمہیں اس پر ضمانت دی ہے وہ میں پوری کروں گا۔ اگر تم اس عہد کو پورا کرو گے تو تمہارے لئے جنت ہوگی بعض نے فرمایا: اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ یعنی سنت اور اخلاص کے ساتھ فرائض کی ادائیگی میں اپنا عہد پورا کرو۔ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ میں تمہیں رعایات کی منازل تک پہنچاؤں گا۔ بعض نے فرمایا: اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ ظاہری آداب کی حفاظت میں میرا عہد پورا کرو۔ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ میں تمہارے باطن کی تزئین کا عہد پورا کروں گا۔ بعض نے فرمایا: یہ حکم تمام اوامر، نواہی اور وصایا کو شامل ہے اس میں محمد ﷺ کا ذکر بھی داخل ہے جو تورات وغیرہ میں ہے۔ یہ جمہور علماء کا قول ہے اور یہی صحیح ہے۔ اللہ تعالیٰ کا عہد یہ ہے کہ وہ انہیں جنت میں داخل کرے گا۔

میں کہتا ہوں: جو وفاء عہد ان سے طلب کیا گیا ہے وہ ہم سے بھی مطلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (المائدہ: 1) وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ (النحل: 91) کثرت سے اس قسم کے ارشاد ہمارے لئے بھی ذکر ہیں۔ ان کا اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کرنا، ان کے لئے اللہ کی طرف سے وفا کی علامت ہے، اس کے لئے علت نہیں بلکہ یہ اس کی طرف سے ان پر فضل اور مہربانی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ، الرُّهب، الرَّهب اور الرهبة ان سب کا معنی خوف ہے۔ یہ امر اپنے ضمن میں تہدید کا معنی رکھتا ہے نون کے بعد یا ساقط ہوگئی ہے کیونکہ یہ آیت کا سرا ہے (1)۔ ابن ابی اسحاق نے فارھبونی (یاء کے ساتھ) پڑھا ہے اسی طرح فاتقونی اصل پر پڑھا ہے۔ ایای فعل مضمر کی وجہ سے منصوب ہے۔ اسی طرح امر، نہی اور استفہام میں اختیار ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: و ایای ارھبوا فارھبون۔ اور کلام میں وانا فارھبون بھی مبتدا اور خبر

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 134، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

کے اعتبار سے جائز ہے۔ فَارْهَبُوْنِ حذف کی تقدیر پر خبر ہوگی۔ معنی یہ ہوگا: وانا ربکم فارهبون۔

وَاٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْۤا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ ۪ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۫ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾

''اور ایمان لاؤ اس کتاب پر جو نازل کی ہے میں نے۔ یہ سچا ثابت کرنے والی ہے اس کو جو تمہارے پاس ہے اور نہ بن جاؤ تم سب سے پہلے انکار کرنے والے اس کے اور نہ خریدو تم میری آیتوں کے عوض تھوڑی سی قیمت اور صرف مجھی سے ڈرا کرو''۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلْتُ یعنی قرآن کی تصدیق کرو۔ مُصَدِّقًا یہ اَنْزَلْتُ کی ضمیر سے حال ہے (1)۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے: بما انزلته مصدقا۔ اس میں عامل انزلت ہے یہ بھی جائز ہے کہ ما۔ سے حال ہو اور اس میں عامل اٰمِنُوْا ہو۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: آمنوا بالقرآن مصدقا۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ ما مصدریہ ہو۔ تقدیر عبارت آمنوا بانزال۔ لما معکم، یعنی تورات میں سے جو تمہارے پاس ہے۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَكُوْنُوْۤا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ۔ بِهٖ میں ضمیر کا مرجع نہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ ابو العالیہ نے کہا ہے اور ابن جریج نے کہا: اس کا مرجع قرآن ہے کیونکہ بما انزلت کا قول اسے اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مرجع تورات ہے کیونکہ لِمَا مَعَكُمْ کا قول اسے اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے (2)۔

اگر کہا جائے کہ كَافِرٍ کیسے فرمایا کافرین نہیں فرمایا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کی تقدیر یہ ہے: وَلَا تَكُوْنُوْۤا اَوَّلَ فَرِيْقٍ كَافِرٍۭ بِهٖ (3)۔ اخفش اور فراء نے کہا: یہ فعل کے معنی پر محمول ہے کیونکہ اس کا معنی ہے: اَوَّلُ مَنْ كَفَرَ بِهٖ۔ سیبویہ نے حکایت کیا ہے: هُوَ اَظْرَفُ الْفِتْيَانِ وَاَجْمَلُهٗ۔ ظاہر کلام هُوَ اَظْرَفُ فَتًى وَاَجْمَلُهٗ تھا۔ فرمایا: اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ حالانکہ ان سے پہلے کفار قریش نے اس کا انکار کیا تھا۔ اس کا معنی ہے: اہل کتاب میں سے پہلے تم کفر کرنے والے نہ ہو جاؤ، کیونکہ ایسی مثال میں ان کی طرف نظر کی جاتی ہے کیونکہ وہ حجت تھے ان کے متعلق علم کا گمان کیا جاتا ہے۔ سیبویہ کے نزدیک اَوَّلَ کو نصب کان کی خبر کے اعتبار سے ہے۔ یہ ان کلمات سے ہے جن کا فعل نہیں بولا جاتا یہ افعل کے وزن پر ہے اس کا عین اور فاء کلمہ واؤ ہے، اس سے فعل نہیں بولا جاتا تاکہ دونوں جہتوں (عین اور فا) سے تعلیل نہ ہو۔ یہ بصریوں کا مذہب ہے۔ کوفیوں نے کہا: یہ وأل سے مشتق ہے جس کا معنی ہے نجات پانا۔ اصل میں اَوْ أَل تھا۔ پھر ہمزہ میں تخفیف کی گئی اور واؤ سے بدل دیا گیا اور پھر ادغام کیا گیا۔ اور اَوَّل کہا گیا جس طرح خطیئة کے ہمزہ کی تخفیف کی جاتی ہے۔ جوہری نے کہا: اس کی جمع الاوائل والاوالی قلب کی صورت میں بھی آتی ہے۔ بعض نے کہا: اصل میں یہ ووّل فوعل کے وزن پر تھا پہلی واؤ ہمزہ سے بدل گئی اور اس کی جمع اوول نہیں بنائی جاتی کیونکہ دو واؤ کا جمع کرنا جن کے درمیان الف جمع ہو ثقیل ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ آل یؤول سے افعل کے وزن پر ہے اس کی اصل أأول تھا، اس میں قلب کیا گیا اعفل، افعل سے مقلوب ہو کر آیا ہے، پھر تسہیل کی گئی بدل کر ادغام کیا گیا (4)۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 134، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

مسئلہ: اس آیت میں ان علماء کے لئے کوئی حجت نہیں ہے جو دلیل خطاب کے ساتھ قول کو تسلیم نہیں کرتے۔ یہ کوفی اور ان کے موافقت کرنے والے علماء ہیں کیونکہ کلام سے مقصود اول و آخر کفر سے نہی ہے۔ اول کو ذکر کے ساتھ خاص کیا کیونکہ اس میں تقدم زیادہ شدید ہے۔ پس مذکور اور مسکوت عنہ کا حکم ایک ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا۔ اس میں چار مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَشْتَرُوْا یہ وَلَا تَكُوْنُوْٓا پر معطوف ہے اللہ تعالیٰ سے کفر کرنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ اور اللہ تعالیٰ کی آیات پر قیمت نہ لو یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات میں تبدیلی پر رشوت نہ لو۔ یہود کے علماء ایسا کرتے تھے اس لئے انہیں اس سے منع کیا گیا۔ یہ بعض مفسرین کا قول ہے ان میں سے حسن وغیرہ ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہودی علماء اپنے علم پر کھانا لیتے تھے جیسے وظیفہ اور تنخواہ ہوتی ہے۔ پس انہیں اس سے منع کیا گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: ان کے علماء لوگوں کو دین اجرت پر سکھاتے تھے اس سے انہیں منع کیا گیا، ان کی کتابوں میں ہے اے ابن آدم! علم سکھاؤ جس طرح تجھے مفت علم سکھایا گیا۔ یہ ابو العالیہ کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی یہ ہے کہ تم میرے اوامر و نواہی اور آیات کے بدلے میں تھوڑی سی قیمت نہ لو یعنی دنیا اور اس کی مدت۔ اور وہ زندگی جو تھوڑی ہو اس کا کوئی مرتبہ نہیں (1)۔ جو وہ عوض لیتے تھے اسے ثمنا (قیمت) کیا گیا کیونکہ انہوں نے اس کو عوض بنایا تھا جو چیز عوض ہو اس پر ثمن کے اسم کا اطلاق ہوتا ہے اگرچہ وہ حقیقت میں ثمن نہ بھی ہو۔ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔ شاعر نے کہا:

ان کنت حاولت ذنبا او ظفرت به فما اصبت بترك الحج من ثمن

''اگر تو گناہ کا ارادہ کرے یا گناہ کرلے تو حج کے ترک کے عوض تو نے کوئی ثمن نہیں پائی''۔

میں کہتا ہوں یہ آیت اگرچہ بنی اسرائیل کے ساتھ خاص ہے لیکن یہ اس کو بھی شامل ہے جو ان جیسا فعل کرے گا۔ پس جو حق میں تبدیلی یا اس کو باطل کرنے پر رشوت لے گا یا واجبی تعلیم کے دینے سے انکار کرے گا یا جو اس نے سیکھا اس کی ادائیگی سے رکے گا حالانکہ اس کا سکھانا اس پر متعین ہے حتیٰ کہ وہ اس پر اجرت لے تو وہ اس آیت کے مقتضیٰ میں داخل ہے۔ واللہ اعلم

ابو داؤد نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے ایسا علم سیکھا جس سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کی جاتی ہے وہ اسے نہیں سیکھتا مگر اس لئے کہ اس کے عوض دنیا کا مال حاصل کرے تو وہ قیامت کے روز جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھے گا (2)۔

مسئلہ نمبر 2: علماء کا اختلاف ہے کہ قرآن اور علم کی تعلیم پر اجرت لینا جائز ہے یا نہیں۔ زہری اور اصحاب الرائے (احناف) نے اس سے منع کیا ہے۔ یہ کہتے ہیں: قرآن کی تعلیم پر اجرت لینا جائز نہیں ہے، کیونکہ تعلیم قرآن ان واجبات میں سے ایک واجب ہے جن میں تقرب کی نیت اور اخلاص کی ضرورت ہوتی ہے۔ پس نماز، روزے کی طرح تعلیم قرآن پر بھی

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 135، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 159، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب العلم، باب فی طلب العلم لغیر اللہ تعالیٰ، حدیث 3179، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اجرت نہیں لی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا (اور نہ خریدو میری آیتوں کے عوض تھوڑی سی قیمت) حضرت ابن عباس نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: معلموا صبیانکم شرارکم اقلھم رحمة بالیتیم واغلظھم علی المسکین تمہارے بچوں کے اساتذہ تمہارے برے لوگ ہیں جو یتیم پر رحمت کم کرتے ہیں اور مسکین پر سختی زیادہ کرتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہ نے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے عرض کی: یارسول اللہ! آپ معلمین کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ان کا درہم حرام ہے، ان کا کپڑا سُحت (حرام) ہے اور ان کا کلام ریا ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت نے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے اہل صفہ میں سے بعض لوگوں کو قرآن اور کتابت سکھائی۔ ان میں ایک شخص نے مجھے ایک کمان دی۔ میں نے کہا: یہ مال نہیں ہے میں اس کے ساتھ اللہ کے راستہ میں جہاد کروں گا۔ میں نے اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تجھے پسند ہے کہ تجھے اس کے بدلے آگ کا طوق پہنایا جائے تو پھر یہ قبول کر لے (1)۔

امام مالک، امام شافعی، احمد، ابوثور اور اکثر علماء نے قرآن کی تعلیم پر اجرت کو جائز قرار دیا ہے کیونکہ حضرت ابن عباس کی حدیث۔۔ حدیث الرقیہ (دم والی حدیث) میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ان احق ما اخذتم علیہ اجراً کتاب اللہ (2)۔ جن چیزوں پر تم اجرت لیتے ہو ان میں سے سب سے زیادہ حقدار کتاب اللہ ہے۔ اس حدیث کو بخاری نے نقل کیا ہے، یہ نص ہے اختلاف کو اٹھا دیتی ہے۔ پس اس پر ہی اعتماد کرنا چاہئے۔ رہا مخالف کا نماز اور روزے پر قیاس تو یہ فاسد ہے کیونکہ یہ قیاس نص کے مقابل ہے۔ پھر ان کے درمیان فرق بھی ہے وہ یہ کہ نماز اور روزہ فاعل کے ساتھ مختص عبادات ہیں اور تعلیم القرآن معلم کے علاوہ کے لئے متعدی عبادت ہے۔ پس اس کو نقل کرنے کے ارادہ پر اجرت جائز ہے جیسے قرآن کی کتابت کی تعلیم پر اجرت جائز ہے۔

ابن منذر نے کہا: امام ابوحنیفہ اجرت کے ساتھ قرآن کی تعلیم کو مکروہ قرار دیتے ہیں اور یہ جائز قرار دیتے ہیں کہ کوئی شخص کسی کو اجرت پر لے کہ وہ اسے تختی یا شعر یا معلوم گانا معلوم اجرت پر لکھ دے گا۔ جو چیز معصیت ہے اس میں اجارہ کو جائز قرار دیتے ہیں اور جو چیز طاعت ہے اس میں اجارہ کو باطل قرار دیتے ہیں۔ آیت کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد بنو اسرائیل ہیں اور شرع من قبلنا ھل ھو شرع لنا (جو ہم سے پہلے لوگوں کی شریعت تھی کیا وہ ہمارے لئے شریعت ہے) کے اصول میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ بھی یہ نہیں کہتے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ آیت کریمہ اس شخص کے متعلق ہے جس پر تعلیم دینا متعین ہو پھر وہ انکار کرے حتیٰ کہ اس پر اجرت لے لے مگر جب متعین نہ ہو تو سنت کی دلیل کے ساتھ اس پر اجرت لینا جائز ہے۔ کبھی اس شخص پر تعلیم دینا متعین ہوتا ہے لیکن اس کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی جو وہ اپنے اوپر اور اپنے اہل وعیال پر خرچ کرے تو اس پر تعلیم دینا واجب نہیں ہوتا

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 157، (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب التجارات، باب الاجر علی تعلیم القرآن، حدیث 2147، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح بخاری، صفحہ 854، جلد 2 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الطب، باب الشرط فی الرقیۃ بقطیع من الغنم، حدیث 5296، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور اس کے لئے اپنی صنعت اور اپنے ہنر پر مال قبول کرنا جائز ہے۔ امام وقت پر واجب ہے کہ دین کی اقامت کے لئے اس کی مدد کرے ورنہ مسلمانوں پر ضروری ہے کہ اس کی مدد کریں کیونکہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جب خلافت کے والی بنے اور خلافت کے لئے آپ کو متعین کیا گیا تو آپ کے پاس اتنا مال نہ تھا جو آپ کے گھر والوں کی کفایت کرتا۔ آپ نے کپڑے اٹھائے اور بازار کی طرف نکلے۔ آپ سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا: میں اپنے عیال پر کہاں سے خرچ کروں، تو صحابہ کرام نے آپ کو واپس لوٹا دیا اور آپ کے لئے بقدر کفایت وظیفہ مقرر کیا۔

رہیں وہ احادیث جو انہوں نے پیش کی ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں جو قابل حجت ہو۔ ان میں کوئی حدیث نقل کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس کی حدیث وہ سعید بن طریف نے حضرت عکرمہ سے اور حضرت عکرمہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے اور سعید متروک راوی ہے اور حضرت ابو ہریرہ کی حدیث علی بن عاصم نے حماد بن سلمہ سے انہوں نے ابو جرہم سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی ہے، ابو جرہم مجہول غیر معروف راوی ہے۔ حماد بن سلمہ نے کسی ایسے راوی سے روایت نہیں کیا جس کو ابو جرہم کہا جاتا ہو انہوں نے ابوالمہزم سے روایت کیا ہے اور وہ بھی متروک الحدیث ہے اس حدیث کی کوئی اصل نہیں ہے۔ رہی حضرت عبادہ بن صامت کی حدیث جو ابو داؤد نے مغیرہ بن زیاد موصلی سے انہوں نے عبادہ بن نسی سے انہوں نے اسود بن ثعلبہ سے انہوں نے حضرت عبادہ بن صامت سے روایت کیا ہے مغیرہ اہل علم کے نزدیک معروف ہے لیکن اس کی بہت سی مناکیر احادیث ہیں یہ ان میں سے ایک منکر حدیث ہے۔ یہ ابو عمر نے کہا ہے، پھر فرمایا: رہی قوس (کمان) والی حدیث یہ اہل علم کے نزدیک معروف ہے کیونکہ یہ حضرت عبادہ سے دو سندوں سے روایت کی گئی ہے اور حضرت ابی بن کعب سے موسیٰ بن علی عن ابیہ عن ابی کے سلسلہ سے مروی ہے لیکن وہ منقطع ہے۔ اس بارے میں کوئی ایسی حدیث نہیں ہے نقل کی جہت سے جس پر عمل واجب ہو اور حضرت عبادہ اور حضرت ابی کی حدیث تاویل کا احتمال رکھتی ہے کیونکہ یہ جائز ہے کہ پہلے انہوں نے رضائے الٰہی کے لئے تعلیم دی ہو پھر اس پر اجر لیا ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، فرمایا: لوگوں میں سے بہتر اور جو زمین کی سطح پر چل رہے ہیں ان میں سے بہتر اساتذہ ہیں جب بھی دین بوسیدہ ہونے لگا تو انہوں نے اسے جلا بخشی تم انہیں اجرت پر نہ لو کہ تم انہیں تنگ کرو کیونکہ معلم جب بچے کو کہتا ہے: پڑھ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، بچہ کہتا ہے: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ تو اللہ تعالیٰ اس سے بچے کی برأت، معلم کی برأت اور اس کے والدین کی برأت لکھ دیتا ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اجرت پر نماز پڑھانے والے کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے۔ اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ ان سے اس شخص کے پیچھے نماز پڑھنے کے متعلق پوچھا گیا جسے نماز پڑھانے کے لئے رمضان میں اجرت پر لیا گیا ہے۔ امام مالک نے فرمایا: میں امید کرتا ہوں کہ اس میں کچھ حرج نہ ہوگی۔ فرضوں میں اس کے لئے سخت کراہت ہے۔

امام شافعی اور آپ کے اصحاب، ابو ثور نے کہا: اس میں کوئی حرج نہیں اور اس کے پیچھے نماز میں بھی کوئی حرج نہیں۔ امام اوزاعی نے فرمایا: اس کی نماز ہی نہیں ہے اور امام ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب نے اس کو ناپسند کیا ہے جیسا کہ پیچھے گزر چکا

ہے۔ ابن عبد البر نے کہا: یہ مسئلہ سابقہ مسئلہ سے متعلق ہے اور ان دونوں کی اصل ایک ہے۔

میں کہتا ہوں: سورۂ برأت میں اس کی ایک اور اصل آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ ابن قاسم نے شعر اور نحو کی تعلیم پر اجرت لی۔ ابن حبیب نے کہا: شعر، رسائل، تاریخ عرب کی تعلیم پر اجرت لینے میں کوئی حرج نہیں اور وہ اشعار جن میں شراب، غنا، ہجو کا ذکر ہو وہ مکروہ ہیں۔ ابوالحسن لخمی نے کہا: اس قول پر کتب پر اجرت لینا اور کتب کو بیچنے کا جواز لازم آتا ہے، لیکن غنا اور نوحہ ہر حال میں ممنوع ہے۔

مسئلہ نمبر 4: دارمی ابو محمد نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے کہ ہمیں یعقوب بن ابراہیم نے بتایا، انہوں نے فرمایا: ہمیں محمد بن عمر بن کمیت نے بتایا انہوں نے فرمایا: ہمیں علی بن وہب الہمدانی نے بتایا، انہوں نے فرمایا: ہمیں ضحاک بن موسیٰ نے بتایا، انہوں نے فرمایا: سلیمان بن عبد الملک مدینہ طیبہ سے گزرا وہ مکہ مکرمہ جا رہا تھا۔ وہ مدینہ طیبہ میں کچھ دن ٹھہرا۔ اس سے پوچھا گیا: مدینہ طیبہ میں کوئی ایسا شخص ہے جس نے نبی کریم ﷺ کے کسی صحابی سے ملاقات کی ہو؟ لوگوں نے کہا: ابو حازم ہے۔ سلیمان نے ابو حازم کو بلایا۔ جب وہ اس کے پاس آیا تو اس نے پوچھا: اے ابو حازم! یہ جفا کیا ہے؟ ابو حازم نے کہا: اے امیر المومنین! تو نے کون سی جفا مجھ سے دیکھی ہے؟ سلیمان نے کہا: تمام اہل مدینہ میرے پاس آئے اور تو میرے پاس نہ آیا۔ ابو حازم نے کہا: اے امیر المومنین! میں تجھ سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ تو وہ کہے جو ہوا نہیں ہے، میں نے اس دن سے پہلے نہ تجھے پہچانا ہے اور نہ میں نے تجھے دیکھا ہے۔ سلیمان، محمد بن شہاب زہری کی طرف متوجہ ہوا تو زہری نے کہا: شیخ نے صحیح کہا ہے اور تو نے غلطی کی ہے۔ سلیمان نے کہا: اے ابو حازم! کیا وجہ ہے کہ ہم موت کو ناپسند کرتے ہیں؟ ابو حازم نے کہا: کیونکہ تم نے اپنی آخرت کو خراب کر دیا ہے اور دنیا کو آباد کیا ہے۔ پس تم آبادی سے خرابی کی طرف منتقل ہونے کو ناپسند کرتے ہو۔ سلیمان نے کہا: اے ابو حازم! تو نے صحیح کہا، کل اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کیسے آئیں گے؟ ابو حازم نے کہا: جو نیکوکار ہے وہ اس غائب شخص کی طرح آئے گا جو اپنے گھر والوں کے پاس آیا ہے اور جو بدکار ہے وہ بھاگے ہوئے غلام کی طرح آئے گا جو اپنے آقا کے پاس آتا ہے۔ سلیمان رونے لگا اور کہا: کاش! میرا شعور کام کرتا۔ ہمارے لئے اللہ کی بارگاہ میں پیش کرنے کے لئے کیا ہے؟ ابو حازم نے کہا: اپنے اعمال کو کتاب اللہ پر پیش کرو۔ سلیمان نے پوچھا: میں کون سا مکان پاؤں گا؟ ابو حازم نے کہا: اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ۝ وَ اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ ۝ (انفطار) (بے شک نیک لوگ عیش و آرام میں ہوں گے اور یقیناً بدکار جہنم میں ہوں گے) سلیمان نے کہا: اے ابو حازم! اللہ تعالیٰ کی رحمت کہاں ہے؟ ابو حازم نے کہا: رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ (اعراف) (اللہ کی رحمت قریب ہے محسنین کے)۔ سلیمان نے کہا: اے ابو حازم! اللہ کے کون سے بندے معزز ہیں؟ ابو حازم نے کہا: صاحب مروت اور صاحب عقل۔ سلیمان نے کہا: کون سے اعمال افضل ہیں؟ ابو حازم نے کہا: محارم سے اجتناب کے ساتھ فرائض کا ادا کرنا۔ سلیمان نے کہا: کون سی دعا زیادہ سنی جاتی ہے؟ ابو حازم نے کہا: جو شخص اپنے محسن کے لئے کرتا ہے۔ سلیمان نے پوچھا: کون سا صدقہ افضل ہے؟ ابو حازم نے کہا: مسکین سائل کے لئے اور کم مال والے محنتی کے لئے جس میں احسان اور اذیت نہ ہو۔ سلیمان نے کہا: کون سا قول زیادہ بہتر ہے؟ ابو حازم نے

کہا: اس کے سامنے حق کا کلمہ کہنا جس سے تو ڈرتا ہے یا جس سے تو امید رکھتا ہے۔ سلیمان نے پوچھا: کون سا مومن عقلمند ہے؟ ابو حازم نے کہا: وہ جو اللہ کی طاعت کا عمل کرے اور طاعت پر لوگوں کی رہنمائی کرے۔ کون سا مومن احمق ہے؟ ابو حازم نے کہا: وہ جو اپنے بھائی کی خواہش میں گر گیا حالانکہ وہ ظالم تھا، اس نے اپنی آخرت کو غیر کی دنیا کے بدلے بیچ ڈالا۔ سلیمان نے اس سے کہا: تو نے صحیح کہا۔ ہم جس حالت میں ہیں اس کے متعلق تو کیا کہتا ہے؟ ابو حازم نے کہا: اے امیر المومنین! کیا تو مجھے معاف کر دے گا؟ سلیمان نے کہا: نہیں لیکن یہ تو نصیحت ہے جو تو مجھے پہنچائے گا۔ ابو حازم نے کہا: اے امیر المومنین! تیرے آباء نے تلوار کے ساتھ لوگوں پر جبر کیا اور مسلمانوں کی رضا اور مشورہ کے بغیر یہ ملک انہوں نے سختی سے حاصل کیا حتیٰ کہ انہوں نے بہت سے لوگوں کو قتل کیا وہ دنیا چھوڑ کر چلے گئے۔ کاش! تجھے شعور ہوتا جو انہوں نے کہا اور جوان کے بارے میں کہا گیا۔ بادشاہ سلیمان کے ایک حواری نے کہا: اے ابو حازم! تو نے بہت بری بات کی۔ ابو حازم نے کہا: تو نے جھوٹ بولا اللہ تعالیٰ نے علماء سے عہد لیا ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے حقائق بیان کریں گے اور اسے چھپائیں گے نہیں۔ سلیمان نے کہا ہم کیسے اصلاح کریں؟ ابو حازم نے کہا: ڈینگیں مارنا چھوڑو، مروت کو پکڑو اور برابر تقسیم کرو۔ سلیمان نے پوچھا: ہم ٹیکس کیسے لیں؟ ابو حازم نے کہا: جس سے لینا جائز ہے اس سے وصول کرو اور جو حقدار ہے اسے پہنچاؤ۔ سلیمان نے کہا: اے ابو حازم! کیا تیرے لئے ممکن ہے کہ تو ہمارے ساتھ رہے تو ہم سے فائدہ اٹھائے، ہم تجھ سے فائدہ اٹھائیں؟ ابو حازم نے کہا: اعوذ باللہ (میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں) سلیمان نے پوچھا: ایسا کیوں؟ ابو حازم نے کہا: مجھے اندیشہ ہے کہ میں تمہاری طرف کسی تھوڑی سی چیز کو جھکا دوں اور اللہ تعالیٰ مجھے دنیا و آخرت کا دوہرا عذاب دے۔ سلیمان نے کہا: اپنی ضروریات ہمیں پیش کرو۔ ابو حازم نے کہا: تو مجھے آگ سے بچالے اور مجھے جنت میں داخل کر دے۔ سلیمان نے کہا: یہ تو میری قدرت میں نہیں۔ ابو حازم نے اسے کہا: مجھے تجھ سے اور تو کوئی حاجت نہیں۔ سلیمان نے کہا: تم میرے لئے دعا کرو۔ ابوازم نے کہا: اے اللہ! اگر سلیمان تیرا ولی ہے تو اس کے لئے دنیا و آخرت کی خیر آسان فرما دے، اگر تیرا دشمن ہے تو اس کی پیشانی کو پکڑ لے جب تک تو پسند کرے۔ سلیمان نے کہا: یہ کافی ہے۔ ابو حازم نے کہا: میں نے مختصر دعا مانگی ہے اور اگر تو اس دعا کا اہل ہے تو میں نے زیادہ مانگ لیا ہے اور اگر تو اس کا اہل نہیں ہے تو مناسب نہیں کہ میں ایسی کمان سے مارا جاؤں جس کا وتر نہ ہو۔ سلیمان نے کہا: مجھے کوئی وصیت کیجئے۔ میں تجھے مختصر سی وصیت کروں گا، تو اپنے رب کی عظمت بیان کر اور اسے دور رکھ کہ تجھے ایسی جگہ دیکھے جہاں سے اس نے تجھے منع کیا ہے یا تجھے مفقود پائے جہاں اس نے تجھے حاضر ہونے کا حکم دیا ہے۔

جب ابو حازم باہر نکل گیا تو سلیمان نے اس کی طرف سو دینار بھیجے اور اسے لکھا کہ تو انہیں خرچ کر اور تیرے لئے میرے پاس اس کی مثل بہت سے دینار ہیں۔ راوی فرماتے ہیں: ابو حازم نے وہ دینار واپس کر دیے اور اسے خط لکھا: اے امیر المومنین! میں تجھ سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ تیرا مجھ سے سوال کرنا مذاق ہو یا میں تیری عطا کی امید رکھوں، میں ان رقوم کو تیرے لئے پسند نہیں کرتا تو میں اپنے لئے کیسے پسند کروں گا۔

حضرت موسیٰ بن عمران جب مدین کے پانی پر وارد ہوئے تو اس پانی پر چرواہوں کو اپنے جانوروں کو پانی پلاتے ہوئے پایا

اور ان کے تھوڑا دور رو دو لڑکیوں کو پایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے وہاں کھڑے ہونے کا سبب پوچھا تو انہوں نے کہا: ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلاتیں یہاں تک کہ چرواہے واپس چلے جائیں۔ ہمارا باپ بوڑھا آدمی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی بکریوں کو پانی پلایا پھر سائے کی طرف لوٹ گئے اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی۔ اے میرے رب! میں محتاج ہوں اس کا جو تو میری طرف خیر میں سے اتارے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ بھوکے بھی تھے اور خوفزدہ بھی تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے سوال کیا لوگوں سے سوال نہ کیا اور نہ آپ نے چرواہوں کو اپنا مسافر ہونا جتایا۔ وہ بچیاں آپ کی کیفیت پہچان گئی تھیں۔ جب وہ دونوں لڑکیاں اپنے باپ کے پاس آئیں تو سارا واقعہ انہیں عرض کیا اور جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا مانگی تھی وہ بھی بتائی۔ ان بچیوں کے والد، جو حضرت شعیب علیہ السلام تھے انہوں نے کہا: وہ شخص بھوکا تھا۔ حضرت شعیب نے ایک بچی سے کہا: تو جا اور اس شخص کو بلا کر لے آ۔ جب وہ بچی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئی تو اس نے ان کی عظمت کو دیکھا اور اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور کہا: میرے والد صاحب تمہیں بلا رہے ہیں تا کہ آپ کو ہمارے لئے پانی پلانے کا اجر عطا فرمائیں۔ جب اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پانی پلانے کے اجر کا ذکر کیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بہت شاق گزرا، آپ نے اس بچی کے ساتھ جانے کے سوا کوئی چارہ نہ پایا کیونکہ آپ پہاڑوں کے درمیان بھوکے اور خوفزدہ تھے۔ جب آپ اس کے پیچھے چلے تو ہوا چل پڑی، اس کے کپڑے اس کی پیٹھ کے ساتھ چپک گئے اور اس کا پچھلا حصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے ظاہر ہونے لگا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کبھی نظر اوپر اٹھاتے کبھی جھکا دیتے جب صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو آواز دی: اے اللہ کی بندی! میرے پیچھے ہو جا اور اپنی زبان سے میری رہنمائی کر۔ جب حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس پہنچے تو وہ کھانا کھانے کے لئے تیار تھے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: اے نوجوان! بیٹھ اور کھانا کھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے پوچھا: کیوں کیا تو بھوکا نہیں ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: کیوں نہیں لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ یہ میرے پانی پلانے کا عوض نہ ہو جائے۔ میں اہل بیت سے ہوں ہم اپنے دین کو زمین بھر سونے کے عوض نہیں بیچتے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے انہیں کہا: اے نوجوان! ایسا نہیں لیکن یہ میری اور میرے آباء کی عادت ہے، ہم مہمان نوازی کرتے ہیں اور کھانا کھلاتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بیٹھ گئے اور کھانا کھایا۔

ابو حازم نے کہا: یہ سو دینار میری گفتگو کا عوض ہیں تو مردار، خون اور خنزیر کا گوشت حالت اضطرار میں حلال ہوتا ہے، اور اگر یہ بیت المال میں حق کی وجہ سے ہے تو اس میں میرے جیسے اور لوگ بھی ہیں۔ اگر تو نے ہمارے درمیان برابری کی ہے تو فبہا ورنہ مجھے اس رقم کی ضرورت نہیں ہے (1)۔

میں کہتا ہوں: اس طرح کتاب اور انبیاء کرام کی اقتداء ہوتی ہے۔ اس امام فاضل عالم کو دیکھو کیسے اس نے اپنے عمل پر عوض نہیں لیا اور نہ ہی اپنی وصیت کا بدل لیا اور نہ اپنی نصیحت پر بخشش لی بلکہ انہوں نے حق کو بیان کیا اور ڈنکے کی چوٹ پر

1۔ سنن دارمی، باب فی اعظام العلم، صفحہ 125، جلد 1 (دار المحاسن قاہرہ)

بیان کیا۔ اس بارے میں اسے کوئی گھبراہٹ اور پریشانی لاحق نہ ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمہیں کسی کی ہیبت حق کہنے یا حق کو قائم کرنے سے نہ روکے جہاں بھی ہو (1)۔ قرآن حکیم میں ہے: يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ (المائدہ: 54) (جہاد کریں گے اللہ کی راہ میں اور نہ ڈریں گے کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِيَّايَ فَاتَّقُونِ تقویٰ کا معنی پہلے گزر چکا ہے، فاتقونی یا کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، سہل بن عبد اللہ نے کہا: وَإِيَّايَ فَاتَّقُونِ تمہارے بارے میں مجھے ازلی علم ہے اس لئے مجھ سے ڈرو۔ وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ ۝ یہ استدراج اور تدبیر کے مقام پر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ ۝ (اعراف) (ہم انہیں بتدریج تباہی کی طرف لے جائیں گے اس طرح کہ انہیں علم تک نہ ہوگا) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْخَاسِرُونَ ۝ (الاعراف) (پس نہیں بے خوف ہوتے اللہ کی خفیہ تدبیر سے سوائے اس قوم کے جو نقصان اٹھانے والی ہوتی ہے) کسی نبی اور صدیق کا استثنا نہیں فرمایا۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝

''اور مت ملایا کرو حق کو باطل کے ساتھ اور مت چھپاؤ حق کو حالانکہ تم (اسے) جانتے ہو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ، اللبس کا معنی خلط ملط ہونا ہے۔ لبست علیه الامر والبسه یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب تو اس کی دلیل کو اس کی مشکل کے ساتھ ملا دے اور اس کے حق کو اس کے باطل کے ساتھ ملا دے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُونَ ۝ (الانعام)

وفی الامر لبسۃ، یعنی امر واضح نہیں ہے۔ اسی مفہوم میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کا قول ہے جو آپ نے حارث بن حوط کو کہا تھا: یا حارث انه ملبوس علیك ان الحق لا یعرف بالرجال اعرف الحق تعرف اهله۔ اے حارث! معاملہ تجھ پر خلط ملط ہو گیا ہے حق مردوں کے ساتھ نہیں پہچانا جاتا میں حق کو پہچانتا ہوں تو حق والوں کو پہچانتا ہے۔

خنساء نے کہا تھا:

ترى الجليس يقول الحق تحسبه رُشداً و هيهات فانظر ما به التبسا

صدق مقالته واحذر عداوته والبس عليه اموراً مثل مالبسا

تو دوست کو دیکھتا ہے کہ وہ حق کہہ رہا ہے تو اسے ہدایت گمان کرتا ہے دیکھ اس کے ساتھ جو کچھ اس نے ملا دیا۔ اس کی بات کی تصدیق کر اور اس کی عداوت سے محتاط ہو جا اور تو بھی اس پر امور کو ملتبس کر دے جس طرح اس نے التباس کیا۔

عجاج نے کہا

لما لبسن الحق بالتجني غنين واستبدلن زيداً مني

سعید نے قتادہ سے روایت کیا ہے: وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ۔ یعنی یہودیت اور نصرانیت کو اسلام کے ساتھ ملتبس نہ

1۔ کنز العمال، حدیث 5567۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب الامر بالمعروف النہی عن المنکر، حدیث نمبر 3996، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کرو تمہیں معلوم ہے کہ اللہ کا دین وہ ہے جس کے علاوہ اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرتا اور اس کے بغیر جزا نہیں دیتا وہ دین اسلام ہے، یہودیت و نصرانیت بدعت ہے وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔ عنترہ کے قول سے یہ معنی ظاہر ہے:

وکتیبۃ لبستھا بکتیبۃ

کتنے لشکر ہیں جن کو میں نے دوسرے لشکروں کے ساتھ ملا دیا۔

یہ اسی مفہوم میں ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ لباس سے ہو۔ آیت کے معنی میں یہ کہا گیا ہے کہ تم نہ ڈھانپو۔ اسی سے لبس الثوب ہے، کپڑے کا پہننا۔ کہا جاتا ہے: لَبِستُ الثوبَ اَلْبَسُہ۔ لباس الرجل زوجتہ، مرد کا لباس اس کی بیوی ہے اور زوجھا لباسھا۔ اور مرد اپنی بیوی کا لباس ہے۔ جعدی نے کہا:

اذا ما الضجیع ثنی جیدھا تثنت علیہ فکانت لباسًا

جب سونے والے نے اپنی بیوی کی گردن کو دوہرا کیا تو وہ اس پر لپٹی اور وہ اس کا لباس تھی۔

اخطل نے کہا:

وقد لبست لھذا الامر اعصرہ حتی تجلل راس الشیب فاشتعلا

اس امر کی وجہ سے میں نے اس کا زمانہ ڈھانپ لیا حتیٰ کہ میرے سر میں بڑھاپا ظاہر ہو گیا۔

اللبوس، کپڑے اور زرہ میں سے جو پہنا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ (الانبیاء:80)

ولابست فلاناً حتی عرف باطنہ۔ میں فلاں سے چمٹا رہا حتیٰ کہ میں نے اس کا باطن پہچان لیا۔

وفی فلان ملبسٌ۔ فلاں لطف اندوز ہونے کی جگہ ہے۔ شاعر نے کہا:

اَلَا اِنَّ بعد العدم للمرء قنوۃ و بعد المشیب طول عمر و ملبسا

خبردار! آدمی کے لئے فقدان کے بعد لباس ہوتا ہے اور بڑھاپے کے بعد لمبی عمر اور لباس ہوتا ہے۔

لِبس الکعبۃ والھودج۔ کعبہ اور ہودج کا کپڑا۔ لباس

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِالْبَاطِلِ باطل کلام عرب میں حق کے خلاف کو کہتے ہیں اس کا معنی زائل کرنا ہے۔ لبید نے کہا:

الاکل شئ ما خلا اللہ باطل خبردار! ہر چیز اللہ تعالیٰ کے سوا زوال پذیر ہے۔

بطل الشیء یبطل بُطلًا و بطولًا و بطلانًا۔ چیز ضائع ہو گئی، خسارے میں چلی گئی۔ ابطلہ غیرہ، دوسری چیز نے اسے زائل کر دیا۔ کہا جاتا ہے: ذھب دمہ بطلًا یعنی اس کا خون رائیگاں گیا ... الباطل شیطان کو کہتے ہیں۔ البطل بہادر آدمی۔ اس کو البطل اس لئے کہتے ہیں کہ وہ دوسرے کی شجاعت کو زائل کر دیتا ہے۔ نابغہ نے کہا:

لھم لواء بایدی ماجد بطل لا یقطع الخرق الا طرفہ سامی

ان کا جھنڈا بہادر آدمی کے ہاتھوں میں ہے، وہ پھٹا نہیں ہے مگر اس کی بلند طرف۔

المرأۃ بطلۃٌ۔ عورت بہادر ہے۔ قد بطل الرجل (طا کے ضمہ کے ساتھ) یبطل بطولۃ و بطالۃ۔ یعنی وہ شخص بہادر ہو

گیا۔ بَطَل (بفتحہ طاء) بطالۃ یعنی معطل ہو گیا فھو بطالٌ۔

اہل تاویل کا اَلْحَقَّ بِالْبَاطِلِ کے مراد میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس وغیرہ سے مروی ہے جو تمہارے پاس کتاب میں حق ہے اسے باطل کے ساتھ نہ ملاؤ۔ یعنی اس سے مراد تغیر و تبدل کرنا ہے۔ ابو العالیہ نے کہا: یہود نے کہا: محمد ﷺ کو مبعوث کیا گیا ہے لیکن ہماری طرف نہیں ان کا نبی کریم ﷺ کی بعثت کا اقرار کرنا اور ان کی طرف بعثت کا انکار کرنا باطل ہے۔ ابن زید نے فرمایا: اَلْحَقَّ سے مراد تورات ہے اور باطل سے مراد وہ ہے جو انہوں نے حضرت محمد ﷺ کے ذکر کو بدلا۔ مجاہد نے کہا: یہودیت اور نصرانیت کو اسلام کے ساتھ نہ ملاؤ (1)۔ یہ قتادہ نے کہا ہے۔ یہ قول پہلے گزر چکا ہے۔

میں کہتا ہوں: حضرت ابن عباس کا قول زیادہ درست ہے، کیونکہ وہ عام ہے اس میں تمام اقوال جمع ہیں۔ واللہ المستعان

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ تَكْتُمُوا الْحَقَّ یہ جائز ہے کہ یہ تَلْبِسُوا پر معطوف ہو اور یہ مجزوم ہو، اور اس کا اَنْ کے اضمار کے ساتھ منصوب ہونا بھی جائز ہے۔ تقدیر یوں ہوگی: لَا يَكُنْ مِنْكُمْ لُبْسُ الْحَقِّ وَ كِتْمَانُهُ یعنی اگر تم حق کو چھپاتے ہو تو تمہاری طرف سے حق کا التباس اور چھپانا نہیں ہونا چاہیے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس سے مراد نبی کریم ﷺ کے امر کو چھپانا ہے حالانکہ وہ آپ ﷺ کو جانتے تھے۔ محمد بن سیرین نے کہا حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد سے ایک جماعت یثرب میں آکر اتری جب بنی اسرائیل کو دشمن کے غلبہ اور ذلت کا سامنا ہوا تھا۔ یہی گروہ اس وقت تورات کا حامل تھا وہ یثرب میں ٹھہر گئے اور وہ امید رکھتے تھے کہ ان کے درمیان حضرت محمد ﷺ ظاہر ہوں گے وہ آپ ﷺ کی نبوت کی تصدیق کرنے والے تھے، جب وہ بزرگ چلے گئے جو مومنین میں سے تھے پھر ان کی نسل سے لوگ آئے انہوں نے حضرت محمد ﷺ کا زمانہ پایا اور انہوں نے آپ کا انکار کیا حالانکہ وہ آپ ﷺ کو پہچانتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ (البقرہ: 89)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ یہ جملہ حال ہے یعنی تم جانتے ہو کہ حضرت محمد ﷺ حق ہیں اور ان کا کفر عناد کی وجہ سے تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے علم کی گواہی نہیں دی بلکہ انہیں اس سے منع فرمایا کہ جو وہ جانتے ہیں اسے نہ چھپائیں۔ یہ دلیل ہے کہ اسے سخت گناہ ہوتا ہے جو جانتے ہوئے گناہ کرتا ہے وہ جاہل سے زیادہ نافرمان ہوتا ہے۔ مزید بیان اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ (البقرہ: 44) کے تحت آئے گا۔

وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝

''اور صحیح ادا کرو نماز اور دیا کرو زکوٰۃ اور رکوع کرو، رکوع کرنے والوں کے ساتھ''۔

اس میں چونتیس مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ امر ہے اور وجوب کے لئے ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے اقامۃ الصلوۃ اور اس کے اشتقاق اور اس کے تفصیلی احکام پہلے گزر چکے ہیں۔ والحمدللہ۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ یہ امر بھی وجوب کے لئے ہے۔ الایتاء کا مطلب عطا کرنا ہے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 135، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

آتیتہ، کا معنی آعطیتہ میں نے اسے عطا کیا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَىِٕنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ (توبہ:75) (اگر اس نے دیا ہمیں اپنے فضل سے تو ہم دل کھول کر خیرات دیں گے)۔

آتیتہ۔ قصر کے ساتھ بغیر مد کے ہے اس کا معنی ہے میں اس کے پاس آیا۔ جب اتی استقبال کے معنی میں ہو تو مد کیساتھ ہوتا ہے۔ اسی سے حدیث پاک ہے: لاتین رسول اللہ ﷺ فلا خبرنہ میں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوں گا اور آپ کو یہ بتاؤں گا (1)۔ تفصیل سے یہ حدیث آگے آئے گی۔

مسئلہ نمبر 3: زکاۃ یہ زکا الشیء سے مشتق ہے جس کا معنی ہے چیز میں اضافہ ہوا۔ کہا جاتا ہے۔ زکا الزرع، والمال یزکو جب کھیتی زیادہ ہو اور مال بڑھ جائے۔ رجل زکی زیادہ خیر والے شخص کا مال نکالنے کو زکوٰۃ کہا جاتا ہے ظاہراً مال میں کمی ہوتی ہے لیکن برکت کے ساتھ یا اجر کے ساتھ مال بڑھاتا ہے جس اجر کے ذریعے زکوٰۃ دینے والے کو ثواب دیا جاتا ہے (2)۔ کہا جاتا ہے: زرع زاکٍ بیّن الزکاء۔

زکأت الناقۃ بولدھا تزکابہ۔ جب اونٹنی اپنا بچہ اپنی ٹانگوں کے درمیان پھینک دے۔ زکا الفرد جب طاق، جفت بن جائے۔ شاعر نے کہا:

کانوا خسًا او زکًا من دون اربعۃ لم یخلقوا وجدود الناس تعتلج

وہ طاق تھے یا جفت تھے چار سے کم تھے، انہوں نے پیدا نہیں کیا اور لوگوں کے بخت بلند تھے۔

جدوڈ جمع ہے جَدّ کی اس کا معنی حصہ اور بخت ہے تعتلج کا معنی بلند ہونا ہے۔

اعتلجت الارض جب زمین کی کھیتی بڑی ہو جائے۔ فخساً سے مراد طاق اور زکاً سے مراد جفت ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: زکاۃ کا معنی اچھی تعریف ہے۔ اسی سے ہے: زکی القاضی الشاھد قاضی نے گواہ کی تعریف کی۔ پس جو زکاۃ نکالتا ہے اسے اچھی تعریف حاصل ہوتی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: زکاۃ تطہیر کے معنی میں ہے۔ کہا جاتا ہے زکا فلان یعنی فلاں غافل کرنے اور تنقید کی میل سے پاک ہوا۔ پس گویا مال کی زکاۃ نکالنے والا اپنے آپ کو اس حق کے بوجھ سے پاک کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس مال میں مساکین کے لئے رکھا ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے زکاۃ کے مال کو لوگوں کا میل کہا ہے (3)۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا (توبہ:103) (اے حبیب وصول کیجئے ان کے مالوں سے صدقہ تاکہ آپ پاک کریں انہیں اور بابرکت فرمائیں انہیں اس ذریعے سے)۔

مسئلہ نمبر 4: یہاں زکاۃ کی مراد میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد فرض زکاۃ ہے کیونکہ یہ نماز سے متصل ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد صدقہ فطر ہے، یہ امام مالک کا قول ہے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب القراۃ فی العشاء، صفحہ 187، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

ایضاً صحیح بخاری، باب من شکی امامہ، حدیث نمبر 664، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 136، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 3۔ ایضاً

میں کہتا ہوں: پہلا قول اکثر علماء کا ہے۔ الزَّکٰوۃَ قرآن میں مجمل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بیان فرمایا ہے۔ ائمہ نے حضرت ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دانوں اور کھجوروں میں صدقہ نہیں ہے حتیٰ کہ وہ پانچ وسق تک پہنچ جائے پانچ اونٹوں سے کم میں صدقہ نہیں ہے اور پانچ اوقیہ چاندی سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ بخاری نے کہا: خمس اواق من الورق۔(1) یعنی چاندی میں سے پانچ اوقیہ سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ امام بخاری نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: جس زمین کو آسمان کا پانی یا چشموں کا پانی سیراب کرے یا وہ کھجور کے درخت جو اس بارش کے پانی سے سیراب ہوتے ہوں جو ان کے گڑھے میں جمع ہو جاتا ہو، اور وہ کھیتی جو کنوؤں سے سینچی گئی ہو اس میں بیسواں حصہ ہے (2)۔ اس کی وضاحت ان شاء اللہ سورۃ الانعام میں آئے گی اور سورہ برأت میں سونے اور جانوروں کی زکاۃ کا ذکر آئے گا، اور اس مال کا بیان جس سے زکاۃ وصول نہیں کی جاتی خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (توبہ:103) کے تحت آئے گا۔

رہی زکاۃ الفطر کتاب اللہ میں اس کے متعلق کوئی نص نہیں ہے مگر جو امام مالک نے تاویل فرمائی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۙ وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۞ (اعلیٰ) (بے شک اس نے فلاح پائی جس نے اپنے آپ کو پاک کیا اور اپنے رب کا ذکر کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا)۔

مفسرین نے اس پر کلام سورۃ الاعلیٰ میں فرمائی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس پر کلام اسی سورۂ بقرہ میں روزوں کی آیات کے تحت ہو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان میں زکاۃ الفطر فرض فرمائی اور اس حدیث کا ذکر آئندہ آئے گا اور اس زکاۃ کی نسبت رمضان کی طرف کی۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَارْكَعُوْا لغت میں رکوع کا معنی کسی شخص کا جھکنا ہے، ہر جھکنے والا رکوع کرنے والا ہے۔ لبید نے کہا:

اخبّر اخبار القرون التی مضت ادبّ کانی کلما قمت راکع (3)

مجھے گزشتہ قوموں کی خبر دی گئی تو میں رینگ کر چلنے لگا گویا میں جھکنے والا ہوں جب میں کھڑا ہوا۔

ابن درید نے کہا: الرکعۃ زمین میں گڑھے کو کہتے ہیں یہ یمنی لغت ہے۔ بعض نے فرمایا: جھکنا، رکوع اور سجود کو شامل ہے، کسی منزل میں جھکنے کے لئے عاریۃً استعمال کیا جاتا ہے۔

ولا تعاد الضعیف علك ان ترکع یومًا والدھر قد رفعه (4)

تو کسی کمزور پر زیادتی نہ کر۔ شاید کبھی تو جھک جائے اور زمانہ اسے بلند کر دے۔

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 201، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الزکاۃ، باب لیس فیما دون خمسۃ اوسق صدقۃ، حدیث 1389، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح بخاری، کتاب الزکاۃ، باب العشر فیما یسقی من ماء السماء والماء الجاری، حدیث نمبر 1388، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 136، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 4۔ ایضاً

مسئلہ نمبر 6: خصوصی طور پر رکوع کے ذکر کرنے میں علماء کا اختلاف ہے۔ ایک قوم نے فرمایا: رکوع کا ذکر فرمایا کیونکہ یہ نماز کے ارکان میں سے ہے، اس سے مراد پوری نماز ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ صرف رکوع کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ شرع نے قراءت سے نماز کو تعبیر فرمایا ہے۔ اسی طرح سجدہ سے ایک رکعت مراد لی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے: وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ (اسراء: 78) یعنی فجر کی نماز۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من ادرك سجدۃ من الصلاۃ فقد ادرك الصلاۃ۔(1) یعنی جس نے نماز کی ایک رکعت کو پالیا اس نے نماز کو پالیا، اہل حجاز رکعت پر سجدہ کا اطلاق کرتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: رکوع کو ذکر کے ساتھ خاص فرمایا کیونکہ بنی اسرائیل کی نماز میں رکوع نہیں تھا۔ بعض علماء نے فرمایا کیونکہ لوگوں پر زمانہ جاہلیت میں رکوع زیادہ بھاری تھا حتیٰ کہ بعض لوگ جنہوں نے اسلام قبول کیا ... میرا خیال ہے وہ عمران بن حصین تھا۔ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: میں جھکوں گا نہیں مگر کھڑا ہو کر، یعنی میں رکوع نہیں کروں گا جب اسلام ان کے دل میں راسخ ہو گیا اور ان کا نفس اس سے مطمئن ہو گیا تو انہوں نے رکوع کے حکم کی پیروی کی۔

مسئلہ نمبر 7: رکوع شرعی یہ ہے کہ آدمی اپنی پیٹھ کو ٹیڑھا کرے اور اپنی پیٹھ اور گردن کو لمبا کرے اور اپنی ہاتھ کی انگلیوں کو کھولے اور ان سے اپنے گھٹنوں کو پکڑے پھر اطمینان سے رکوع کرے اور سبحان ربی العظیم تین مرتبہ کہے اور یہ کم از کم مقدار ہے۔ امام مسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تکبیر کے ساتھ نماز شروع فرماتے تھے۔ قراءت اَلْحَمْدُ سے شروع کرتے تھے اور جب رکوع کرتے تھے تو سر کو نہ زیادہ اونچا رکھتے تھے اور نہ زیادہ جھکاتے تھے بلکہ درمیان میں رکھتے تھے (2)۔ بخاری نے حضرت ابوحمید ساعدی سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا جب آپ تکبیر کہتے تو اپنے ہاتھوں کو کندھوں کے برابر کرتے اور جب رکوع کرتے تو اپنے ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھتے اور اپنی پیٹھ کو ٹیڑھا کرتے (3)۔

مسئلہ نمبر 8: رکوع فرض ہے۔ یہ قرآن و سنت سے ثابت ہے اسی طرح سجدہ بھی فرض ہے کیونکہ سورۃ حج کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا (الحج: 77) سنت نے اس میں طمانیت اور ان کے درمیان فاصلہ کا اضافہ کیا اس کے متعلق کلام پہلے گزر چکی ہے اور رکوع کا طریقہ ہم نے ابھی بیان کیا ہے اور رہا سجدہ تو وہ بھی حضرت ابوحمید ساعدی کی حدیث میں وضاحت کے ساتھ آچکا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب سجدہ کرتے تھے تو اپنی پیشانی اور ناک کو زمین پر ٹکاتے تھے اپنے ہاتھوں کو اپنے پہلوؤں سے جدا رکھتے تھے اور اپنی ہتھیلیوں کو کندھوں کے برابر رکھتے تھے (4)۔ اسی حدیث کو امام ترمذی نے نقل فرمایا ہے اور فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

مسلم نے حضرت انس سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سجدہ میں اعتدال کرو اور تم میں سے کوئی

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، باب من ادرك ركعة من الصلوٰۃ فقد ادرك تلك الصلوٰۃ، صفحہ 221، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب مایجمع صفة الصلوٰۃ و مایفتتح به الخ، صفحہ 194، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ صحیح بخاری، صفحہ 114، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)۔ ایضاً، کتاب صفة الصلوٰۃ، باب سنة الجلوس فی التشهد، حدیث 785، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ جامع ترمذی، ابواب الصلوٰۃ، باب ماجاء فی السجود علی الجبهة و الانف، صفحہ 36، جلد 1 (وزارت تعلیم)

اپنے بازو کتے کی طرح نہ پھیلائے (1)۔ حضرت براء سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تو سجدہ کرے تو اپنی ہتھیلیوں کو رکھ اور اپنی کہنیوں کو بلند کر (2)۔ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ جب سجدہ کرتے تھے تو ہاتھوں کو پھیلاتے تھے حتیٰ کہ آپ ﷺ کے پیچھے سے آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آتی تھی اور جب بیٹھتے تھے تو اپنی بائیں ران پر بیٹھتے تھے (3)۔

مسئلہ نمبر 9: اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ جس نے سجدہ میں اپنی پیشانی کو رکھا اور ناک کو نہ رکھا یا ناک کو رکھا اور پیشانی کو نہ رکھا، امام مالک نے فرمایا: وہ اپنی پیشانی اور ناک پر سجدہ کرے۔ ثوری اور احمد کا یہی قول ہے۔ نخعی کا بھی یہی قول ہے۔

امام احمد نے فرمایا: صرف پیشانی یا صرف ناک پر سجدہ جائز نہیں۔ یہی قول ابو خیثمہ اور ابن ابی شیبہ کا ہے۔ اسحق نے کہا: اگر ایک چیز پر سجدہ کیا تو ایسا کرنے والے کی نماز فاسد ہے۔ امام اوزاعی، سعید بن عبد العزیز نے یہی فرمایا۔ حضرت ابن عباس، سعید بن جبیر، عکرمہ، عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ تمام نے ناک پر سجدہ کا حکم دیا ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: پیشانی پر سجدہ کافی ہے جبکہ ناک نہ بھی لگے۔ یہ قول حضرات عطا، طاؤس، عکرمہ، ابن سیرین اور حسن بصری کا ہے۔ یہی قول شافعی، ابو ثور، یعقوب اور محمد کا ہے۔ ابن منذر نے کہا: ایک کہنے والے نے کہا: اگر پیشانی کو رکھا اور ناک کو نہ رکھا یا ناک کو رکھا اور پیشانی کو نہ رکھا تو اس نے برا کیا لیکن اس کی نماز مکمل ہے۔ یہ نعمان کا قول ہے ابن منذر نے کہا: میں نہیں جانتا جس نے پہلے اس قسم کا قول کیا اور نہ بعد والے کسی کو جانتا ہوں جس نے ایسا قول کیا ہو۔

میں کہتا ہوں: سجدہ میں صحیح پیشانی اور ناک کا رکھنا ہے۔ اس کی دلیل ابو حمید کی حدیث ہے جو گزر چکی ہے۔ امام بخاری نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ سات اعضاء پر سجدہ کروں۔ پیشانی پر اپنے ہاتھ سے ناک کی طرف اشارہ کیا دونوں ہاتھوں پر، دونوں گھٹنوں پر اور دونوں پیروں کی اطراف پر۔ ہم کپڑے اور بال جمع نہیں کرتے (4)۔ یہ تمام نماز کے اجمال کی تفصیل ہے۔ پس یہ قول متعین ہو گیا۔ واللہ اعلم

امام مالک سے روایت کیا گیا ہے کہ وہ ناک لگائے بغیر صرف پیشانی پر سجدہ کو جائز قرار دیتے تھے جیسا کہ عطا اور شافعی کا قول ہے۔ ہمارے نزدیک مختار پہلا قول ہے۔ امام مالک کے نزدیک سجدہ جائز نہ ہوگا جب تک پیشانی پر سجدہ نہیں کرے گا۔

مسئلہ نمبر 10: پگڑی کے پلو پر سجدہ کرنا مکروہ ہے۔ اگر وہ ایسا کپڑا ہو جیسے وہ کپڑے ہوتے ہیں جو گھٹنوں اور قدموں کو ڈھانپ دیتے ہیں تو کوئی حرج نہیں افضل یہ ہے کہ زمین پر سجدہ کرے یا ایسی چیز پر سجدہ کرے جس پر سجدہ کیا جاتا ہے اگر وہاں کوئی ایسی چیز ہو جو اذیت دیتی ہو تو نماز میں داخل ہونے سے پہلے اسے زائل کر دے اگر پہلے ایسا نہ کیا ہو تو ایک

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب الاعتدال فی السجود ووضع الکفین علی الارض، صفحہ 193، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب مایجمع صفۃ الصلوٰۃ، صفحہ 194، جلد 1 3۔ ایضاً

4۔ صحیح بخاری، صفحہ 112، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب صفۃ الصلوٰۃ، باب السجود علی الانف، حدیث 770، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مرتبہ اسے برابر کردے۔

مسلم نے حضرت معیقیب سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کے بارے فرمایا جو سجدہ کرتے وقت مٹی برابر کرتا ہے۔ فرمایا: اگر تو نے ایسا کرنا ہے تو ایک مرتبہ کرلو (1)...... حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا: ہم سخت گرمی میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتے تھے۔ جب ہم سے کوئی زمین پر اپنی پیشانی نہیں رکھ سکتا تھا تو وہ اپنا کپڑا بچھاتا تھا اور اس پر سجدہ کرتا تھا (2)۔

مسئلہ نمبر 11: جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِرْكَعُوْا وَ اسْجُدُوْا (الحج: 77) تو ہمارے علماء نے فرمایا: رکوع و سجود میں سے وہ کافی ہے جسے رکوع و سجود کہا جائے۔ اسی طرح قیام کا حکم ہے انہوں نے اس میں طمانیت کو شرط قرار نہیں دیا، اور انہوں نے اس کم از کم کو لیا ہے جس پر رکوع و سجود کا اطلاق ہو سکے۔ گویا انہوں نے نماز کے لغو ہونے کے متعلق ثابت شدہ احادیث سنی ہی نہیں۔ ابن عبد البر نے کہا: رکوع، سجود، رکوع کے بعد وقوف، دو سجدوں کے درمیان جلوس جائز ہی نہیں حتیٰ کہ آرام سے رکوع کرے، آرام سے وقوف کرے، آرام سے سجدہ کرے اور آرام سے بیٹھے۔ حدیث میں یہی صحیح ہے۔ یہ جمہور علماء اور اہل نظر کا نظریہ ہے۔ ابن وہب اور ابو مصعب نے امام مالک سے یہی روایت کیا ہے۔ قاضی ابو بکر بن عربی نے کہا: ابن قاسم سے فصل کے وجوب اور طمانیت کے سقوط کی روایات کثرت سے ہیں اور یہ وہم عظیم ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے طمانیت سے ہر رکن کو ادا کیا اس کا حکم بھی دیا اور اس کی تعلیم بھی دی۔ اگر ابن قاسم کے لئے عذر ہو کہ وہ اس پر مطلع نہیں تھا تو تمہارے لئے کوئی عذر نہیں جبکہ علم تم تک پہنچ چکا ہے اور اس کے ساتھ تم پر حجت قائم ہوئی۔ نسائی، دار قطنی، علی بن عبد العزیز نے حضرت رفاعہ بن رافع سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ ایک شخص آیا۔ مسجد میں داخل ہوا اور نماز پڑھی۔ جب نماز پڑھ لی تو وہ آیا اور رسول اللہ ﷺ کو سلام کیا اور لوگوں کو سلام کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: واپس جاؤ، نماز پڑھو تم نے (پہلے صحیح) نماز نہیں پڑھی۔ وہ شخص دوبارہ نماز پڑھنے لگا ہم اس کی نماز کو تاڑتے رہے، ہم نہیں جانتے تھے کہ کس وجہ سے اس کی نماز معیوب ہوئی ہے۔ پھر جب وہ آیا نبی کریم ﷺ اور لوگوں پر سلام کیا تو اسے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تم واپس جاؤ اور نماز پڑھو تم نے نماز (صحیح) نہیں پڑھی۔ ہمام نے کہا: ہم نہیں جانتے یہ امر اس کے ساتھ دو دفعہ ہوا یا تین دفعہ۔ اس شخص نے عرض کی: میں نے اب تو کوئی کوتاہی نہیں کی۔ میں نہیں جانتا کہ آپ نے مجھ پر میری نماز کی وجہ سے کیوں عیب لگایا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کسی کی نماز مکمل نہیں ہوتی حتیٰ کہ وہ وضو کو مکمل کرے جس طرح اسے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، اپنے چہرے کو دھوئے اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں تک دھوئے، اپنے سر کا مسح کرے اور ٹخنوں تک اپنے پاؤں دھوئے پھر تکبیر کہے۔ اللہ تعالیٰ کی ثنا پڑھے پھر سورۃ الحمد پڑھے اور قرآن حکیم میں سے جو میسر ہو وہ پڑھے پھر تکبیر کہے اور رکوع کرے، رکوع میں اپنی ہتھیلیاں اپنے گھٹنوں پر رکھے حتیٰ کہ اس کے جوڑ مطمئن ہو جائیں اور وہ ڈھیلا ہو

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب کراھۃ مسح الحصیٰ و تسویۃ التراب فی الصلوٰۃ، صفحہ 205، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 56، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب السجود علی الثوب فی شدۃ الحر، حدیث 372، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جائے پھر سمع اللہ لمن حمدہ کہے اور سیدھا کھڑا ہو جائے حتیٰ کہ اس کی پیٹھ سیدھی ہو جائے اور ہر جوڑ اپنی جگہ پر آ جائے، پھر تکبیر کہے اور سجدہ کرے اور اپنے چہرے کو زمین پر رکھے۔ ہمام نے کہا: کبھی کہتے اپنی پیشانی کو زمین پر رکھے حتیٰ کہ اس کے مفاصل مطمئن ہو جائیں اور وہ ڈھیلا ہو جائے، پھر تکبیر کہے اور اپنی مقعد پر بیٹھ جائے اور اس کی پیٹھ سیدھی ہو۔ چاروں رکعتوں کا اس طرح وصف بیان فرمایا یہاں تک کہ فارغ ہو گئے۔ پھر فرمایا: تم میں سے کسی کی نماز مکمل نہیں ہوتی حتیٰ کہ وہ اس طرح نماز پڑھے۔ اس کی مثل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جس کو مسلم نے نقل کیا ہے۔ یہ پہلے گزر چکی ہے۔ میں کہتا ہوں: یہ کتاب اللہ میں مجمل نماز کا بیان ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دیا ہے اور ساری امت کو پہنچایا ہے۔ پس جو اس بیان سے واقف نہیں اور اس نے کمی کی جو رحمن نے اس پر فرض کیا اور اس نے پیروی نہ کی اس امر کی جو اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے پہنچا وہ ان لوگوں میں سے ہے جن کا ذکر اس آیت میں ہے **فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ** (مریم: 59) اس کا بیان ان شاء اللہ آگے آئے گا۔

بخاری نے حضرت زید بن وہب سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت حذیفہ نے ایک شخص کو دیکھا جو رکوع و سجود مکمل نہیں کر رہا تھا۔ حضرت حذیفہ نے اسے فرمایا: تو نے نماز (صحیح) نہیں پڑھی اگر تو (اسی حالت میں) مرے گا تو اس فطرت پر نہیں مرے گا جس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا فرمایا(1)۔

مسئلہ نمبر 12: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مَعَ الرّٰكِعِيۡنَ، مَعَ کا لفظ معیت اور جمعیت پر دلالت کرتا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن کے مفسرین کی ایک جماعت نے کہا: ابتدا میں نماز کا امر جماعت کے ساتھ حاضری کا تقاضا نہیں کرتا تھا تو مَعَ کے قول کے ساتھ جماعت کی حاضری کا حکم دیا۔ جماعت کے ساتھ حاضر ہونے کے متعلق علماء کے دو مختلف اقوال ہیں: جمہور کا نظریہ یہ ہے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا سنن موکدہ سے ہے اور جو بغیر کسی عذر کے جماعت سے پیچھے رہتا ہے اس پر سزا واجب ہے اور بعض اہل علم نے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا فرض کفایہ قرار دیا ہے۔ ابن عبد البر نے کہا: یہ قول صحیح ہے کیونکہ اس پر علماء کا اجماع ہے کہ تمام مساجد کا جماعت سے خالی ہونا جائز نہیں۔ جب مسجد میں جماعت کھڑی ہو جائے تو گھر میں منفرد کی نماز جائز ہو گی کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا تنہا نماز پڑھنے سے ستائیس درجے افضل ہے(2)۔ اس حدیث کو مسلم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا تنہا نماز پڑھنے سے پچیس درجے افضل ہے(3)۔ داؤد نے کہا: جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا ہر شخص پر فرض ہے جیسے جمعہ فرض ہے اور داؤد نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے دلیل پکڑی ہے: لا صلاۃ لجار المسجد الا فی المسجد مسجد کے پڑوسی کی نماز صرف مسجد میں ہی جائز ہے۔ ابو داؤد نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور ابو محمد عبد الحق نے اسے صحیح کہا ہے۔ حضرات عطا بن ابی رباح، احمد بن حنبل، ابو ثور وغیرہم کا بھی یہی قول ہے۔ امام شافعی نے فرمایا:

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 112، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب اذا لم یتم السجود، حدیث 376، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب فضل صلوٰۃ الجماعۃ، صفحہ 231، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)　3۔ ایضاً

میں کسی شخص کو جماعت ترک کرنے کی اجازت نہیں دیتا جو جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے پر قادر ہو مگر عذر کی وجہ سے جماعت چھوڑ سکتا ہے یہ ابن منذر نے ان کا قول حکایت کیا ہے۔ مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک نابینا شخص آیا اور کہا: یا رسول اللہ! میرا کوئی قائد نہیں جو مجھے مسجد میں لے آئے، اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تا کہ آپ اسے رخصت دے دیں اور وہ اپنے گھر میں نماز پڑھ لیا کرے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے رخصت دے دی۔ جب وہ واپس چلا گیا تو اسے پھر بلایا اور فرمایا: کیا تو نماز کی اذان سنتا ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر جواب دے (1) کہ (یعنی جماعت کے ساتھ نماز پڑھا کر) ابوداؤد کے الفاظ اس حدیث میں یہ ہیں ''میں تیرے لئے رخصت نہیں پاتا'' اس حدیث کو حضرت عبداللہ بن ام مکتوم سے روایت کیا، انہوں نے فرمایا: سائل عبداللہ بن ام مکتوم تھے۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اذان سنی اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے سے اسے کوئی عذر مانع نہ ہو صحابہ نے پوچھا: عذر کیا ہے؟ فرمایا خوف یا مرض اس کی نماز قبول نہ ہوئی جو اس نے پڑھی (2)۔ ابو محمد عبدالحق نے کہا: اس حدیث کو مغراء العبدی نے روایت کیا ہے۔ صحیح حضرت ابن عباس پر موقوف ہے جس نے اذان سنی اور (جماعت کے ساتھ) نہ آیا تو اس کی نماز نہیں۔ قاسم بن اصبغ نے اپنی کتاب میں اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اذان سنی اور جواب نہ دیا (یعنی جماعت کے ساتھ حاضر نہ ہوا) تو اس کی نماز نہیں مگر یہ کہ اسے عذر ہو (3)۔ اس سند کے ساتھ تیرے لئے اس کی صحت کافی ہے۔ مغراء العبدی سے ابو اسحاق نے روایت کی ہے۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا: ہم نے دیکھا کہ جماعت سے پیچھے نہیں رہتا مگر ایسا منافق جس کا نفاق معلوم ہوتا ہے (4)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہمارے اور منافقین کے درمیان فرق عشاء اور صبح کی جماعت کی حاضری ہے۔ منافقین ان نمازوں میں حاضر ہونے کی طاقت نہیں رکھتے (5)۔ ابن منذر نے کہا: ہم نے کئی اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا، انہوں نے فرمایا: جس نے اذان سنی اور بغیر عذر کے جواب نہ دیا اس کی نماز نہیں (6)۔ ان صحابہ میں حضرت ابن مسعود، حضرت ابو موسیٰ اشعری ہیں۔

ابوداؤد نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے ارادہ کیا کہ میں اپنے نوجوانوں کو حکم دوں کہ وہ لکڑیوں کے گٹھے اکٹھے کریں پھر میں ان لوگوں کے پاس آؤں جنہوں نے اپنے گھروں میں نماز پڑھی ہے انہیں کوئی بیماری بھی نہیں ہے تو میں ان پر ان کے گھر جلا دوں (7)۔ یہ ان کی دلیل ہے جنہوں نے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا فرض قرار دیا یہ وجوب میں ظاہر ہے۔ جمہور علماء نے جماعت کے ساتھ نماز کی حاضری کی تاکید پر محمول کیا ہے اور صحابہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلوٰة، باب فضل صلوٰة الجماعة وبیان التشدید فی التخلف عنہ، صفحہ 232، جلد 1

2۔ سنن دارقطنی، صفحہ 421، جلد 1 (دار المحاسن قاہرہ) 3۔ ایضاً، صفحہ 420، جلد 1

4۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلوٰة، باب فضل صلوٰة الجماعة وبیان التشدید فی التخلف عنہ، صفحہ 232، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

5۔ موطا امام مالک، صفحہ 114 6۔ سنن دارقطنی، صفحہ 420، جلد 1 (دار المحاسن)

7۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰة، باب التشدید فی ترک الجماعة، حدیث نمبر 462، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کے اقوال اور حدیث لا صلوۃ لہ (اس کی نماز نہیں) کو کمال اور فضیلت پر محمول کیا ہے۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ابن ام مکتوم کو فَاَجِبْ کا امر کرنا استحباب پر محمول کیا ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا لقد هممت (میں نے ارادہ کیا) یہ حتمی وجوب پر دلالت نہیں کرتا کیونکہ آپ نے ارادہ فرمایا لیکن ایسا کیا نہیں۔ آپ نے یہ ارشاد غافلوں کو وعید اور تہدید کے طور پر ذکر فرمایا جو جماعت اور جمعہ سے رہ جاتے ہیں۔ اس معنی کو مسلم کی روایت بھی بیان کرتی ہے جو حضرت عبداللہ نے روایت کی ہے، فرمایا: جسے یہ بات خوش کرے کہ وہ کل اللہ تعالیٰ سے مسلمان ہو کر ملے تو اسے ان نمازوں کی حفاظت کرنی چاہئے جہاں بھی ان کی ندا دی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی کے لئے سنن ہدیٰ کو مشروع کیا ہے اور یہ نمازیں (جماعت کے ساتھ پڑھنا) سنن ہدیٰ میں سے ہیں۔ اگر تم اپنے گھروں میں نماز پڑھو گے جس طرح یہ شخص اپنے گھر میں نماز پڑھتا ہے تو تم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو چھوڑ دو گے اور اگر تم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو چھوڑ دو گے تو گمراہ ہو جاؤ گے۔ جو شخص اچھی طرح طہارت کرے پھر کسی مسجد کا ارادہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے ہر قدم کے بدلے ایک نیکی لکھتا ہے اور اس کے بدلے اس کا ایک درجہ بلند فرماتا ہے اور اس کے بدلے ایک گناہ معاف فرماتا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ ہم میں سے جماعت سے ایسا منافق پیچھے رہتا تھا جس کا نفاق معلوم ہوتا تھا۔ ایک شخص کو لایا جاتا تھا جبکہ وہ دو شخصوں کے سہارے پر ہوتا تھا حتیٰ کہ اسے صف میں کھڑا کیا جاتا تھا (1)۔ حضرت عبداللہ نے اپنی حدیث میں بیان فرمایا کہ جماعت کے ساتھ شریک ہونا سنن ہدیٰ میں سے ایک سنت ہے اور اس کا ترک کرنا گمراہی ہے۔ اسی وجہ سے قاضی ابوالفضل عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: سنن کے ظاہر کے ترک پر ایک دوسرے کی مدد کرنے والوں کے بارے میں اختلاف ہے کیا ان سے جنگ کی جائے گی یا نہیں؟ صحیح یہ ہے کہ ایسے عمل پر ان سے قتال کیا جائے گا کیونکہ سنن ہدیٰ کے ترک پر ایک دوسرے کی مدد کرنا انہیں ختم کرنے کے مترادف ہے۔

میں کہتا ہوں: اس بنا پر حجت قائم اور ظاہر ہو جائے تو منفرد کی نماز جائز اور صحیح ہو گی۔ مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدمی کی نماز جماعت کے ساتھ گھر میں اور بازار میں اس کی نماز سے بیس سے زائد درجے بلند ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کوئی شخص جب وضو کرتا ہے اور اچھی طرح وضو کرتا ہے پھر وہ مسجد میں آتا ہے اور اس کا ارادہ فقط جماعت کے ساتھ نماز کی ادائیگی ہوتا ہے تو جو وہ قدم اٹھاتا ہے اس کے بدلے اس کے لئے ایک درجہ بلند کیا جاتا ہے اور اس کے بدلے اس کا ایک گناہ معاف کیا جاتا ہے حتیٰ کہ وہ مسجد میں داخل ہو جائے۔ جب وہ مسجد میں داخل ہوتا ہے جب تک اسے نماز روکے ہوئے ہوتی ہے وہ نماز میں ہی شمار ہوتا ہے اور فرشتے اس کے لئے دعا کرتے رہتے ہیں جب تک کہ وہ اس جگہ میں ہوتا ہے جہاں سے اس نے نماز پڑھی ہوتی ہے۔ فرشتے یہ کہتے رہتے ہیں: اے اللہ! اس پر رحم فرما، اے اللہ! اس کی مغفرت فرما، اے اللہ! اس پر نظر رحمت فرما، یہ دعا کا سلسلہ جاری رہتا ہے جب تک کہ وہ اس مجلس میں تکلیف نہیں دیتا (یعنی) جب تک اسے حدث لاحق نہیں ہوتا (2)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: حدث سے کیا مراد ہے؟

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، باب فضل صلوۃ الجماعۃ، صفحہ 232، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوۃ، باب فضل الصلوٰۃ المکتوبۃ فی جماعۃ و فضل انتظار الصلوٰۃ و کثیرۃ الخطا الخ، صفحہ 234، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

حضرت ابوہریرہ نے فرمایا: اس کی ہوا آہستہ خارج ہو یا بلند آواز سے خارج ہو۔

مسئلہ نمبر 13: جماعت کی طرف جو فضیلت منسوب کی گئی ہے اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ فقط جماعت کے لئے ہے جہاں بھی ہو یا یہ فضیلت اس جماعت کی ہے جو مسجد میں ہوتی ہے، کیونکہ یہ فضیلت ایسے افعال کے ساتھ لازم ہے جو مساجد کے ساتھ خاص ہے جیسا کہ حدیث پاک میں بیان ہوا ہے۔ علماء کے اس کے متعلق دو قول ہیں: پہلا زیادہ ظاہر ہے، کیونکہ جماعت وہ وصف ہے جس پر حکم معلق کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم

مسجد کی طرف زیادہ قدم چل کر جانا، مسجد کی طرف آنا، مسجد میں بیٹھنا یہ جماعت کی فضیلت کے علاوہ زیادہ ثواب ہیں۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 14: علماء کا اختلاف ہے کہ کیا ایک جماعت دوسری جماعت سے کثرت تعداد اور امام کی فضیلت کی وجہ سے فضیلت رکھتی ہے یا نہیں؟ امام مالک نے فرمایا: نہیں۔ ابن حبیب نے فرمایا: فضیلت رکھتی ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ایک آدمی کا دوسرے آدمی سے مل کر نماز پڑھنا تنہا نماز پڑھنے سے بہتر ہے اور ایک شخص کا دو آدمیوں کے ساتھ نماز پڑھنا ایک آدمی کے ساتھ نماز پڑھنے سے بہتر ہے، اور جو تعداد زیادہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے (1)۔ اس حدیث کو حضرت ابی بن کعب نے روایت کیا ہے، اور ابوداؤد نے نقل کی ہے، اس کی سند میں کمزوری ہے۔

مسئلہ نمبر 15: جس نے ایک جماعت سے نماز پڑھ لی ہو وہ وہی نماز دوسری جماعت سے دوبارہ پڑھ سکتا ہے؟ اس کے متعلق بھی علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام شافعی رحمہم اللہ اور ان کے اصحاب نے فرمایا: وہ شخص جو تنہا اپنے گھر میں یا کسی اور جگہ نماز پڑھ چکا ہو وہ امام کے ساتھ نماز دوبارہ پڑھے اور جو جماعت کے ساتھ نماز پڑھ چکا ہو اگرچہ وہ جماعت تھوڑی بھی ہو وہ زیادہ تعداد والی جماعت یا کم والی جماعت کے ساتھ نماز دوبارہ نہ پڑھے۔ امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ اور داؤد بن علی نے فرمایا: جو ایک دفعہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھ چکا ہو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ نماز اگر چاہے تو دوسری جماعت کے ساتھ پڑھ لے کیونکہ یہ نفل اور سنت ہو جائے گی۔

یہی بات حضرات حذیفہ بن یمان، ابوموسیٰ اشعری، انس بن مالک، صلہ بن زفر، شعبی اور نخعی سے مروی ہے۔ حضرت حماد بن زید اور حضرت سلیمان بن حرب کا بھی یہی قول ہے۔

امام مالک نے اس قول سے حجت پکڑی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ایک نماز ایک دن میں دو مرتبہ نہیں پڑھی جائے گی (2)۔ بعض علماء نے فرمایا: دوبارہ نماز نہ پڑھو۔ یہ قول حضرت سلیمان بن یسار نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے۔ احمد اور اسحاق نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی ایک فرض پڑھے پھر وہ کھڑا ہو اور دوبارہ اسی فرض کی نیت سے دوبارہ پڑھے، لیکن جب وہ امام کے ساتھ سنت یا نفل کی نیت سے پڑھے گا تو وہ نماز کا اعادہ نہیں ہوگا۔

1۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 82، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب فی فضل الصلوٰۃ الجماعۃ، حدیث 467، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن دارقطنی، صفحہ 416، جلد 1 (دار المحاسن)

جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے اعادہ کا جماعت کے ساتھ حکم دیا تھا انہیں فرمایا تھا یہ تمہارے لئے نفل ہے (1) جیسا کہ حضرت ابوذر وغیرہ کی حدیث میں ہے۔

مسئلہ نمبر 16: مسلم نے حضرت ابو مسعود سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: قوم کی امامت وہ کرائے جو کتاب اللہ کا اچھا قاری ہو، اگر قراءت میں برابر ہوں تو جو سنت کو زیادہ جاننے والا ہو، اگر سنت میں برابر ہوں تو جو ہجرت میں مقدم ہو، ہجرت میں بھی برابر ہوں تو جو اسلام لانے میں مقدم ہو۔ کوئی شخص دوسرے کی سلطنت میں امامت نہ کرائے اور اس کے بیٹھنے کی جگہ پر نہ بیٹھے مگر یہ کہ وہ اسے اجازت دے (2)۔ ایک روایت میں اسلام میں مقدم ہونے کی جگہ، عمر میں بڑا ہونے کا ذکر ہے، یہ حدیث ابوداؤد نے روایت کی ہے، فرمایا: شعبہ نے فرمایا: میں نے اسماعیل سے پوچھا: حدیث میں جو تکرمتہ کے الفاظ آئے ہیں اس کا کیا مطلب ہے؟ انہوں نے فرمایا: اس کا بچھونا (اس کے بیٹھنے کی جگہ) اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور فرمایا: حضرت ابو مسعود کی حدیث حسن صحیح ہے اس پر اہل علم کا عمل ہے۔

علماء نے فرمایا: امامت کا سب سے زیادہ حقدار وہ ہے جو کتاب اللہ (قرآن) کا زیادہ قاری ہو اور سنت کو زیادہ جاننے والا ہو اور علماء نے فرمایا: گھر کا مالک امامت کا زیادہ حقدار ہے۔ بعض نے فرمایا: جب گھر کا مالک دوسرے کو اجازت دے دے تو دوسرے کے امامت کرانے میں کوئی حرج نہیں، بعض نے اس کو ناپسند کیا ہے، فرمایا: سنت یہ ہے کہ گھر کا مالک امامت کرائے۔ ابن منذر نے کہا ہے کہ ہم نے اشعث بن قیس سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے ایک نوجوان کو امامت کے لئے مقدم کیا اور فرمایا: میں قرآن کو مقدم کرتا ہوں۔ جنہوں نے فرمایا کہ قوم کی امامت وہ کرائے جو قرآن کا بڑا قاری ہو، ان میں حضرات ابن سیرین، ثوری، اسحاق اور اصحاب الرائے ہیں۔ ابن منذر نے کہا: ہم بھی یہی کہتے ہیں کیونکہ یہ قول سنت کے موافق ہے۔ امام مالک نے فرمایا: وہ شخص مقدم ہو جو زیادہ علم والا ہو جبکہ اس کی حالت اچھی ہو اور عمر کا بھی حق ہے۔ امام اوزاعی نے فرمایا: وہ امامت کرائے جو زیادہ فقیہ ہو، اسی طرح امام شافعی اور ابو ثور نے فرمایا جبکہ وہ قرآن پڑھ سکتا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فقیہ نماز میں لاحق ہونے والے حوادث کو زیادہ جانتا ہے اور انہوں نے حدیث کی اس طرح تاویل کی ہے کہ صحابہ میں سے بڑا قاری بڑا فقیہ بھی ہوتا تھا کیونکہ وہ قرآن میں سمجھ حاصل کرتے تھے اور صحابہ کے عرف میں فقہاء کو قراء کہا جاتا تھا اور انہوں نے اس سے بھی استدلال کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیماری کی حالت میں حضرت ابوبکر کو ان کے فضل و علم کی وجہ سے مقدم فرمایا۔

اسحاق نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو اس لئے مقدم فرمایا تاکہ یہ دلیل بن جائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہ خلیفہ ہوں گے، یہ ابو عمر نے "التمہید" میں ذکر کیا ہے۔ ابوالبزار نے اپنی حسن سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم سفر کرو تو تم میں سے جو بڑا قاری ہو وہ تمہاری امامت کرائے اگرچہ وہ عمر میں چھوٹا بھی ہو، جب وہ تمہاری امامت کرائے گا تو وہ تمہارا امیر ہوگا (3)؟ فرمایا: ہم نہیں جانتے کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے

1۔ سنن دارقطنی، صفحہ 413، جلد 1 (دار المحاسن) 2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوۃ، باب من احق بالامامۃ، صفحہ 236، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ کنز العمال، حدیث نمبر 17501

روایت کی گئی ہے مگر حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے اس سند کے ساتھ۔

میں نے کہا: چھوٹے کی امامت جائز ہے جب وہ قاری ہو۔ صحیح بخاری میں عمرو بن سلمہ سے مروی ہے، فرمایا: ہم ایک چشمہ پر رہتے تھے جو لوگوں کی گزرگاہ پر تھا۔ ہمارے پاس سے قافلے گزرتے تھے تو ہم ان سے پوچھتے تھے کہ لوگوں کا کیا بنا، وہ شخص (جس نے نبوت کا اعلان کیا ہے) وہ کون ہے؟ لوگ کہتے ہیں: وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے مبعوث فرمایا ہے اور اس کی طرف ایسی ایسی وحی کی ہے ایسی ایسی وحی کی ہے میں وہ کلام یاد کر لیتا تھا گویا وہ میرے سینے میں کلام جم جاتا تھا۔

عرب لوگوں کے اسلام لانے کے منتظر تھے۔ وہ کہتے تھے: اس کو اور اس کی قوم کو چھوڑ دو اگر وہ اپنی قوم پر غالب آ جائے گا تو وہ سچا نبی ہوگا۔ جب مکہ فتح ہوا تو ہر قوم نے اسلام قبول کرنے میں جلدی کی۔ میرے باپ نے اپنی قوم کے اسلام کے لئے جلدی کی، جب وہ آئے تو کہا: یقیناً میں تمہارے پاس اللہ کے نبی کی طرف سے آیا ہوں۔ آپ نے فرمایا: تم اس وقت میں اس طرح نماز پڑھو۔ جب نماز کا وقت ہو جائے تو تم میں سے ایک اذان دے اور جو تم میں سے زیادہ قرآن پڑھا ہوا ہو وہ امامت کرائے۔ پس لوگوں نے دیکھا کہ مجھ سے زیادہ کوئی بھی قرآن پڑھنے والا نہیں کیونکہ میں قافلوں میں ملتا تھا (اور ان سے قرآن سن کر یاد کر لیتا تھا)۔ پس لوگوں نے مجھے امامت کے لئے آگے کیا۔ جب کہ میری عمر چھ یا سات سال تھی میرے اوپر ایک چادر ہوتی تھی جب میں سجدہ کرتا تھا تو وہ اکٹھی ہو جاتی تھی۔ قبیلہ کی ایک عورت نے آواز دی: کیا تم اپنے قاری کی شرمگاہ نہیں ڈھانپو گے؟ پس لوگوں نے میرے لئے ایک قمیص خرید دی مجھے کبھی اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی کہ مجھے اس قمیص کی وجہ سے ہوئی تھی (1)۔ جن علماء نے نابالغ بچے کی امامت جائز قرار دی ہے ان میں حسن بصری اور اسحاق بن راہویہ ہیں۔ ابن منذر نے اس کو پسند کیا ہے جب کہ بچہ نماز کو سمجھتا ہو اور نماز پڑھا سکتا ہو، کیونکہ وہ بچہ بھی اس ارشاد میں داخل ہے "قوم کی امامت بڑا قاری کرائے (2)"۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نابالغ کی استثناء نہیں فرمائی۔ ان علماء نے حجت عمرو بن سلمہ کی حدیث کو بنایا ہے۔ امام شافعی کا ایک قول ہے: وہ باقی تمام نمازوں کی امامت کرائے لیکن جمعہ کی امامت نہ کرائے، وہ اس سے پہلے فرماتے تھے: جس کی امامت فرض نماز میں جائز ہے اس کی امامت عید میں بھی جائز ہے مگر میں اس میں غیر ولی کی امامت کو ناپسند کرتا ہوں۔ امام اوزاعی نے فرمایا: فرضی نماز میں بچہ امامت نہیں کرا سکتا حتیٰ کہ اسے احتلام ہو جائے مگر یہ کہ ایسی قوم ہو جن کے پاس قرآن نہ ہو (یعنی کسی کو قرآن یاد نہ ہو) تو پھر قریب البلوغ بچہ امامت کرا سکتا ہے۔ زہری نے کہا: اگر بچے کی امامت میں اضطرار ہو تو وہ ان کی امامت کرائے۔ مالک، ثوری اور اصحاب رائے نے بچے کی امامت سے ہر صورت میں منع فرمایا ہے۔

مسئلہ نمبر 17: ہر بالغ مسلمان آزاد کا مستقل امامت کرانا جائز ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جب وہ امام نماز کی حدود کو جانتا ہو اور الحمد شریف پڑھنے میں کوئی ایسی غلطی نہ کرتا ہو جو معنی میں غلطی کا باعث ہو مثلاً وہ ایاک نعبد میں کاف پر

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب مقام النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوم الفتح، حدیث 3963، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب من احق بالامامۃ، حدیث 494، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کسرہ پڑھ دے انعمت میں تا پر ضمہ پڑھ دے اور وہ طا اور ضاد میں فرق کر سکتا ہو، جو ان میں تفریق نہ کر سکتا ہو اس کی امامت صحیح نہیں کیونکہ ان دونوں کا معنی مختلف ہے۔ ان میں سے بعض نے ان تمام صورتوں میں رخصت دی ہے جبکہ وہ قراءت سے جاہل ہو اور جاہلوں کی ہی امامت کراتا ہو۔ عورت اور خنثیٰ مشکل، کافر اور مجنون اور ان پڑھ آدمی کی امامت جائز نہیں۔ اکثر علماء کے نزدیک ان لوگوں کا کسی صورت میں امامت کرانا جائز نہیں مگر ان پڑھ اپنے جیسوں کی امامت کرا سکتا ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: اس ان پڑھ کی امامت صحیح نہیں جو قراءت اچھی طرح نہ کر سکتا ہو جبکہ کوئی قاری موجود ہو۔ امام شافعی کا یہی قول ہے۔ اگر ان پڑھ نے ان پڑھ کی امامت کرائی تو ہمارے نزدیک اور امام شافعی کے نزدیک صحیح ہے۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: جب ان پڑھ شخص کسی ایسی قوم کی امامت کرائے جن میں پڑھے ہوئے بھی ہوں اور ان پڑھ بھی ہوں تو تمام کی نماز فاسد ہے۔ امام ابو یوسف نے اس کی مخالفت کی ہے۔ انہوں نے فرمایا: امام کی نماز اور جو قرآن نہیں پڑھ سکتے ان کی نماز ہو جائے گی ایک گروہ نے فرمایا: ان سب کی نماز جائز ہے کیونکہ ہر ایک اپنا فرض ادا کرنے والا ہے اور وذلک مثل المتیمم یصلی بالمتطھرین بالماء، والمصلی قاعدا یصلی بقوم قیام صلاتھم مجزئۃ فی قول من خالفنا، لأن کلا مؤد فرض نفسہ۔

میں کہتا ہوں: اس قول کی تائید میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے بھی حجت پکڑی جاتی ہے "کیا نمازی نہیں دیکھتا جب وہ نماز پڑھتا ہے، کیسے وہ نماز پڑھتا ہے وہ اپنے لئے نماز پڑھتا ہے (1)" مسلم نے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ مقتدی کی نماز امام کی نماز کے ساتھ مربوط نہیں۔ واللہ اعلم...... عطا بن ابی رباح فرماتے تھے: جب عورت پڑھی ہوئی ہو تو امام تکبیر کہے اور عورت قراءت کرے جب وہ قراءت سے فارغ ہو تو تکبیر کہے اور رکوع اور سجدہ کرے دراں حالیکہ عورت مرد کے پیچھے ہو اسی قسم کا مفہوم حضرت قتادہ سے بھی مروی ہے۔

مسئلہ نمبر 18: اندھے، لنگڑے، اشل، ہاتھ یا پاؤں کٹے ہوئے، خصی اور غلام کی امامت میں کوئی حرج نہیں جبکہ ان میں سے ہر شخص نماز کا عالم ہو۔ ابن وہب نے فرمایا: میں نہیں دیکھتا کہ ہاتھ یا پاؤں کٹا ہوا شخص اور اشل امامت کرائے کیونکہ وہ درجہ کمال سے ناقص ہے۔ میں اس کی امامت اس کی کمی اور نقص کی وجہ سے ناپسند کرتا ہوں۔ جمہور علماء نے ان کی مخالفت کی ہے اور یہی صحیح ہے کیونکہ کسی عضو کا فقدان نماز کے فروض میں سے کسی فرض سے مانع نہیں ہے۔ پس اس عضو کے نہ ہوتے ہوئے بھی ہمیشہ کی امامت جائز ہے جیسے آنکھ نہ ہو تو امامت جائز ہوتی ہے۔ حضرت انس سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن ام مکتوم کو خلیفہ بنایا جو لوگوں کی امامت کراتے تھے حالانکہ وہ نابینا تھے (2)۔ اسی طرح لنگڑے، ہاتھ کٹے ہوئے، اشل اور خصی کا قیاساً اور نظراً یہی حکم ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے نابینے شخص کے بارے میں فرمایا انہیں اس سے کیا حاجت ہے؟ (یعنی لوگ ان کے بارے میں یہ مسئلہ کیوں پوچھتے ہیں) حضرت ابن عباس اور حضرت عتبان بن مالک دونوں امامت

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب امر بتحسین الصلوٰۃ واتمامھا والخشوع فیھا، صفحہ 180، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ

کراتے تھے اور دونوں نابینے تھے، اسی پر عام علماء کا فتویٰ ہے۔

مسئلہ نمبر 19: ولد الزنا (حرامی) کی امامت میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک نے فرمایا: میں اس کا ہمیشہ امام ہونا ناپسند کرتا ہوں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بھی اس کو ناپسند کیا ہے۔ حضرت عطا بن ابی رباح فرماتے تھے اسے امامت کرانی چاہئے جبکہ وہ پسندیدہ (نیک) شخص ہو۔ یہ حضرات حسن بصری زہری نخعی، سفیان ثوری، اوزاعی، احمد اور اسحاق کا قول ہے۔ اصحاب رائے (احناف) کے نزدیک ولد الزنا کے پیچھے نماز جائز ہے لیکن دوسرا شخص ان کے نزدیک بھی بہتر ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: میں ایسے شخص کو مستقل امام بنانا ناپسند کرتا ہوں جس کا باپ معروف نہ ہو لیکن جس نے اس کے پیچھے نماز پڑھ لی جائز ہوگی۔ عیسیٰ بن دینار نے کہا: ولد الزنا کی امامت کے بارے امام مالک کے قول کو نہیں اپناتا اس بچے پر والدین کے گناہ میں سے کچھ نہیں ہے، ابن عبدالحکم نے اسی طرح فرمایا جب کہ اس میں امامت کی اہلیت نہ ہو۔ ابن منذر نے کہا: ولد الزنا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عام ارشاد میں داخل ہے: یؤم القوم اقرءھم،(1) لوگوں میں امامت ان میں سے اچھا قاری کرائے۔ ابو عمر نے کہا: امامت کی شرط میں وارد آثار میں کوئی ایسا اثر نہیں ہے جو نسب کی رعایت پر دلالت کرے، ان سب آثار میں فقہ، قراءت اور دین کی صلاح کا ذکر ہے۔

مسئلہ نمبر 20: رہا غلام تو امام بخاری نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے، فرمایا: پہلے مہاجرین کا گروہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے قبا کے مقام پر پہنچا تو اس کی امامت سالم کراتے تھے جو ابو حذیفہ کے غلام تھے اور انہیں قرآن زیادہ یاد تھا (2)۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے، فرمایا: سالم جو ابو حذیفہ کے غلام تھے مہاجرین اولین اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی قبا کی مسجد میں امامت کراتے تھے، ان لوگوں میں حضرات ابو بکر، عمر، زید، عامر بن ربیعہ وغیرہ موجود تھے (3)۔ حضرت عائشہ کا غلام ذکوان قرآن سے دیکھ کر آپ کی امامت کراتا تھا (4)۔ ابن منذر نے کہا: ابو سعید جو ابو اسید کے غلام تھے وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی ایک جماعت کی امامت کراتے تھے ان صحابہ میں حضرات حذیفہ اور ابو مسعود بھی تھے۔

غلام کی امامت کی رخصت نخعی، شعبی، حسن بصری، حکم، ثوری، شافعی، احمد، اسحاق اور اصحاب رائے نے دی ہے۔ ابو مجلز نے اس کو ناپسند کیا ہے۔ امام مالک نے فرمایا: غلام امامت نہ کرائے مگر یہ کہ وہ قاری ہو اور اس کے ساتھ جو آزاد لوگ ہوں وہ قراءت نہ کر سکتے ہوں لیکن عید اور جمعہ کی امامت غلام نہ کرائے۔ اوزاعی کے نزدیک جائز ہے اگر وہ اس کے پیچھے نماز پڑھ لیں۔ ابن منذر نے کہا: غلام بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں داخل ہے: یؤم القوم اقرءھم امامت وہ کرائے جو ان میں سے زیادہ قراءت جانتا ہو۔

مسئلہ نمبر 21: رہی عورت تو امام بخاری نے حضرت ابو بکرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب من احق بالامامۃ، صفحہ 236، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح بخاری، باب امامۃ الاعمیٰ، کتاب الاذان ابواب صلوٰۃ الجماعۃ والامامۃ باب امامۃ العبد والمولیٰ، حدیث 651، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً، کتاب الاحکام، باب استقضاء الموالی واستعمالھم، حدیث 6640، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ ایضاً، کتاب الاذان ابواب صلوٰۃ الجماعۃ والامامۃ باب امامۃ العبد والمولیٰ، حدیث 651، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پہنچی کہ اہل فارس نے بنت کسریٰ کو اپنی ملکہ بنایا ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ قوم ہرگز کامیاب نہ ہوگی جنہوں نے اپنا والی عورت کو بنایا(1) ... ابوداؤد نے عبدالرحمٰن بن خلاد سے انہوں نے ام ورقہ بنت عبداللہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی ملاقات کے لئے ان کے گھر تشریف لے جاتے تھے۔ فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے ایک مؤذن مقرر فرمایا تھا جو اس کے لئے اذان دیتا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم دیا کہ وہ اپنے گھر والوں کی امامت کرایا کرے۔ عبدالرحمن نے کہا: میں نے اس کا مؤذن ایک بوڑھا شخص دیکھا(2)۔ ابن منذر اور شافعی نے کہا: مردوں میں سے جنہوں نے عورت کے پیچھے نماز پڑھی ان پر نماز کا اعادہ واجب ہے۔ ابوثور نے کہا: ان پر اعادہ واجب نہیں۔ یہ مزنی کے قول کا قیاس ہے۔

میں کہتا ہوں: ہمارے علماء نے فرمایا: عورت کی امامت، مردوں اور عورتوں کے لئے صحیح نہیں ہے۔ ابن ایمن نے عورتوں کے لئے عورت کی امامت کا جواز روایت کیا ہے۔

رہا خنثیٰ مشکل، تو امام شافعی نے فرمایا: وہ مردوں کی امامت نہ کرائے عورتوں کی امامت کرائے۔ امام مالک نے فرمایا: وہ کسی حال میں امام نہیں بن سکتا۔ یہ اکثر فقہاء کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 22: کافر جو شرع محمدیہ کا مخالف ہے جیسے یہودی اور نصرانی مسلمانوں کی امامت کرادے جبکہ مسلمانوں کو اس کے کفر کا علم نہ ہو تو امام شافعی اور احمد کہتے ہیں ان کی نماز جائز نہ ہوگی اور وہ نماز کا اعادہ کریں۔ یہ امام مالک اور ان کے اصحاب کا قول ہے کیونکہ وہ قربت کے اہل میں سے نہیں ہے۔ امام اوزاعی نے فرمایا: اسے سزا دی جائے گی۔ ابوثور اور مزنی نے فرمایا: جس نے ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھ لی اس پر اعادہ نہیں ہے اور وہ اپنی نماز کی وجہ سے مسلمان نہیں ہوگا۔ یہ امام شافعی اور ابوثور کے نزدیک ہے۔ امام احمد نے فرمایا: اسے اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔

مسئلہ نمبر 23: اہل بدعت جو خواہشات نفس کے پرستار ہیں جیسے معتزلہ، جہمیہ وغیرہ۔ تو امام بخاری نے حضرت حسن بصری سے روایت کیا ہے کہ تو نماز پڑھ لے، اس کی بدعت کا وبال اس پر ہے۔ امام احمد نے فرمایا: اہل ہواء میں سے کسی کے پیچھے نماز نہ پڑھے جبکہ وہ اپنی خواہش (بدعت) کی طرف دعوت دینے والا ہو۔ امام مالک نے فرمایا: ظالم ائمہ کے پیچھے نماز پڑھ لے۔ اہل بدعت قدریہ وغیرہم کے پیچھے نماز نہ پڑھے۔ ابن منذر نے کہا: ہر وہ شخص جس کی بدعت کفر کا موجب ہو اس کے پیچھے نماز جائز نہیں اور جس کی بدعت ایسی نہ ہو اس کے پیچھے نماز جائز ہے اور ایسی صفت والے کو آگے کرنا جائز نہیں۔

مسئلہ نمبر 24: اپنے اعضاء کے ساتھ فسق (گناہ) کرنے والا مثلاً زانی، شرابی اور اس جیسے شخص کی امامت میں اختلاف ہے۔ ابن حبیب نے فرمایا: جس نے شرابی کے پیچھے نماز پڑھی وہ نماز کو لوٹائے مگر یہ کہ وہ والی ہو جس کی اطاعت کی جاتی ہو۔ ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنے والے پر اعادہ نہیں ہے مگر یہ کہ وہ نشہ کی حالت میں ہو۔ یہ امام مالک کے ساتھیوں کا قول ہے جن سے میں ملا ہوں۔ حضرت جابر بن عبداللہ کی حدیث سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی عورت

1۔ صحیح بخاری، کتاب الفتن، باب الفتنۃ التی تموج کموج البحر، حدیث 6570، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب امامۃ النساء، حدیث نمبر 500، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مرد کی امامت نہ کرائے اور کوئی بدو مہاجر کی امامت نہ کرائے کوئی فاجر نیکوکار کی امامت نہ کرائے مگر یہ کہ وہ صاحب سلطنت ہو۔ ابو محمد عبد الحق نے فرمایا: یہ علی بن زید بن جدعان نے حضرت سعید بن مسیب سے روایت کیا ہے۔ اکثر علماء علی بن زید کو ضعیف کہتے ہیں۔ دار قطنی نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر تم کو اپنی نمازوں کو اچھا کرنا پسند ہے تو اپنے اچھے لوگوں کو (امامت کے لئے) آگے کرو۔ اس کی سند میں ابو الولید خالد بن اسماعیل مخزومی ہے جو ضعیف ہے۔ یہ دار قطنی کا قول ہے۔ ابو احمد بن عدی نے خالد کے بارے کہا: یہ مسلمانوں میں سے ثقہ لوگوں پر احادیث وضع کرتا تھا۔ اس کی یہ حدیث اس نے یہ ابن جریج سے انہوں نے عطا سے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی ہے۔

دار قطنی نے سلام بن سلیمان عن عمر بن محمد بن واسع عن سعید بن جبیر عن ابن عمر کے سلسلہ سے روایت کی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے امام اپنے عمدہ لوگوں کو بناؤ کیونکہ وہ تمہارے اور اللہ کے درمیان وفد ہیں (1)۔ دار قطنی نے کہا: یہ عمر میرے نزدیک عمر بن یزید مدائن کا قاضی ہے اور سلام بن سلیمان بھی مدائن کا رہنے والا ہے۔ یہ قوی نہیں ہے۔ یہ عبد الحق نے کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 25: ائمہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: امام اس لئے بنایا جاتا ہے تاکہ اس کی پیروی کی جائے۔ پس اس سے اختلاف نہ کرو جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب وہ رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو اور جب وہ سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ کہے تو تم کہو اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا وَلَکَ الْحَمْدُ اور جب وہ سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو۔ جب وہ بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو (2)۔

علماء کا اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے، جو رکوع کرے یا جھک جائے امام کے رکوع کرنے سے پہلے اور وہ یہ عمل جان بوجھ کر کرے۔ دو قول ہیں: ایک یہ ہے کہ ایسے شخص کی نماز فاسد ہے اگر اس نے یہ تمام نماز میں کیا یا اکثر نماز میں کیا۔ یہ اہل ظاہر کا قول ہے۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے، سنید نے ذکر کیا ہے، فرمایا: ہمیں ابن علیہ نے بیان کیا انہوں نے ایوب سے انہوں نے ابو قلابہ سے انہوں نے حضرت ابو الورد انصاری سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے حضرت ابن عمر کے پہلو میں نماز پڑھی۔ میں امام سے پہلے اٹھتا اور جھکتا تھا۔ جب حضرت ابن عمر نے سلام پھیرا تو حضرت ابن عمر نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے مروڑا اور اپنی طرف کھینچا۔ میں نے پوچھا: حضرت آپ کو کیا ہوا؟ حضرت عبد اللہ بن عمر نے پوچھا: تو کون ہے؟ میں نے کہا: فلاں ابن فلاں۔ پوچھا: تو سچے اہل بیت سے ہے تجھے صحیح نماز پڑھنے سے کون سی چیز مانع ہے؟ میں نے کہا: تو نے مجھے اپنے پہلو میں نماز پڑھتے دیکھا نہیں ہے۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا: میں نے تجھے دیکھا تو امام سے پہلے اٹھتا اور جھکتا ہے اور اس کی نماز نہیں ہوتی جو امام کی مخالفت کرے۔ حسن بن حی نے اس شخص کے بارے میں فرمایا جو امام سے پہلے رکوع یا سجدہ کرے پھر امام کے رکوع یا سجدہ کرنے سے پہلے سر اٹھالے، تو اس کا رکوع و سجود شمار نہیں ہوگا اور اس کی نماز جائز نہ ہوگی۔

اکثر فقہاء نے فرمایا: جس نے ایسا کیا اس نے غلط کیا اور اس کی نماز فاسد نہ ہوگی کیونکہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے اور نماز

1۔ سنن دار قطنی، صفحہ 88، جلد 2 (دار المحاسن)　　2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب ائتمام الماموم بالامام، صفحہ 177، جلد 1، قدیمی کتب خانہ

میں ائمہ کی اقتدا کرنا سنت حسنہ ہے۔ پس جس نے اس کی مخالفت کی، اس کے بعد کہ اس نے اپنی نماز کا فرض، اس کی طہارت، رکوع، سجود اور دوسرے فرائض کے ساتھ ادا کر دیا ہے تو اس پر اعادہ نہیں ہے اگرچہ اس نے اس کی بعض سنن کو ترک بھی کر دیا ہو کیونکہ اگر وہ چاہتا تو منفرد بھی ادا کر سکتا تھا۔ پس اس نے یہ نماز اپنے امام سے پہلے پڑھ لی ہے تو جائز ہو گئی اور اس نے جو جماعت کو ترک کیا ہے وہ اس نے برا کیا ہے۔ علماء نے فرمایا: جو امام کی نماز میں داخل ہوا پھر اس نے امام کے ساتھ رکوع و سجود کیے جبکہ وہ ایک رکعت میں اور امام دوسری رکعت میں نہ تھا تو اس کی اقتدا صحیح ہے اگرچہ وہ امام سے پہلے اٹھتا ہے اور امام سے پہلے جھکتا ہے کیونکہ وہ امام کے رکوع کے ساتھ رکوع کرتا ہے اور امام کے سجدہ کے ساتھ سجدہ کرتا ہے اور اوپر اٹھتا ہے جبکہ اس میں وہ اس کی تبع میں ہے مگر وہ اپنے اس فعل میں گناہگار ہے کیونکہ مقتدی کے لئے جو متفق علیہ سنت ہے اس نے اس کے خلاف کیا۔

میں کہتا ہوں: ابن عبد البر نے جو جمہور علماء سے نقل کیا ہے اس سے یہ شعور ملتا ہے کہ ان کے نزدیک مقتدی کی نماز، امام کی نماز سے مربوط نہیں ہے کیونکہ اتباع حسی اور شرعی مفقود ہے لیکن اکثر علماء کے نزدیک ایسا نہیں ہے۔ اثر و نظر کے اعتبار سے پہلا قول صحیح ہے۔ امام اس لئے بنایا جاتا ہے تاکہ اس کی پیروی کی جائے اور اس کے افعال کی اقتدا کی جائے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (البقرہ: 124) یعنی لوگ آپ کی اقتدا کریں گے، اس آیت کا بیان آگے آئے گا۔

یہ امام کی لغت اور شرع میں حقیقت ہے۔ جس نے امام کی مخالفت کی اس نے اس کی پیروی نہیں کی۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ "جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو (1)"۔ فا کے ساتھ ذکر فرمایا جو کسی کام کو پہلے کے بعد کیا جاتا ہے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے مراد کو بیان کرنے والے ہیں۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے لئے سخت وعید ذکر فرمائی جو رکوع امام سے پہلے کرتا ہے یا پہلے سر اٹھاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا وہ شخص جو امام سے پہلے سر اٹھاتا ہے وہ ڈرتا نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کا سر گدھے کی طرح پھیر دے یا اس کی صورت گدھے کی صورت میں بنا دے (2)۔ یہ حدیث مؤطا، بخاری، مسلم، ابو داؤد وغیرہ نے نقل کی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا: اس کی پیشانی شیطان کے ہاتھ میں ہے (3)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہر عمل جس پر ہمارا امر نہیں وہ مردود ہے (4)"۔ پس جس نے جان بوجھ کر امام کی مخالفت کی یہ جانتے ہوئے کہ اسے امام کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے اور اسے اس کی مخالفت سے روکا گیا ہے تو اس نے نماز کو حقیر جانا اور جو اسے حکم دیا گیا تھا اس کی اس نے مخالفت کی۔ پس واجب ہے کہ اس کی وہ نماز جائز نہ ہو۔

مسئلہ نمبر 26: اگر بھول کر امام سے پہلے سر اٹھا لیا تو امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: بھولنے والے کے لئے سنت یہ ہے کہ جس نے رکوع یا سجود میں ایسا کیا وہ رکوع یا سجدہ کی طرف لوٹ جائے اور امام کا انتظار کرے جس نے ایسا کیا اس نے غلطی کی۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: امام اس لئے بنایا جاتا ہے تاکہ اس کی اقتدا کی جائے۔ پس اس پر اختلاف نہ

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 101، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب صفۃ الصلوٰۃ، باب ایجاب التکبیر وافتتاح الصلوٰۃ، حدیث 691، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 91، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب التشدید فیمن یرفع قبل الامام، حدیث 528، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ مؤطا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ، باب ما یفعل من رفع راسہ قبل الامام، صفحہ 75 (وزارت تعلیم)

4۔ صحیح بخاری، صفحہ 371، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلح، باب اذا اصطلحوا علی صلح جور فالصلح، حدیث 2499، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کرو(1)۔ ابن عبدالبر نے کہا: امام مالک کے اس قول کا ظاہر یہ ہے کہ جو جان بوجھ کر ایسا کرے اس پر اعادہ نہیں ہے کیونکہ انہوں نے فرمایا: جس نے ایسا کیا اس کی طرف سے خطا ہے اور بھولنے والے سے گناہ اٹھالیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 27: یہ اختلاف تکبیر تحریمہ اور سلام کے علاوہ میں ہے۔ رہا سلام تو اس پر کلام پہلے گزر چکی ہے، رہی تکبیر تحریمہ تو جمہور علماء کا نظریہ یہ ہے کہ مقتدی کی تکبیر امام کی تکبیر کے بعد ہو۔ مگر امام شافعی سے ایک قول مروی ہے کہ وہ اپنے امام سے پہلے اگر تکبیر تحریمہ کہے گا تو پھر جائز ہوگی کیونکہ حضرت ابوہریرہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز کی طرف آئے جب تکبیر کہی تو واپس چلے گئے اور مقتدیوں کو اشارہ فرمایا: تم جیسے ہو اسی طرح ٹھہرے رہو۔ پھر آپ گھر چلے گئے پھر آئے جبکہ سر سے پانی کے قطرے گر رہے تھے۔ آپ ﷺ نے نماز پڑھائی، جب سلام پھیرا تو فرمایا: میں جنبی تھا میں غسل کرنا بھول گیا تھا(2) اور حضرت انس کی حدیث میں ہے پھر آپ ﷺ نے تکبیر کہی اور ہم نے آپ کے ساتھ تکبیر کہی۔ اس کا مزید بیان سورۂ نساء میں ان شاء اللہ ولا جنبا کے تحت آئے گا۔

مسئلہ نمبر 28: مسلم نے حضرت ابو مسعود سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نماز میں ہمارے کندھوں کو چھوتے تھے اور فرماتے تھے: سیدھے ہو جاؤ اور اختلاف نہ کرو ورنہ تمہارے دل مختلف ہو جائیں گے تم میں سے میرے قریب صاحب عقل و دانش لوگ ہوں پھر وہ جو عقل و فکر میں ان کے قریب ہوں پھر وہ جوان کے قریب ہوں(3)۔ حضرت ابو مسعود نے فرمایا: آج تم پہلے سے زیادہ اختلاف کرتے ہو (یعنی تمہاری صفیں درست نہیں ہوتی ہیں) اور تم بازاروں میں آوازیں اونچی کرنے سے بچو اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ''سیدھے ہو جاؤ'' یہ صفیں سیدھی کرنے کا حکم ہے خصوصاً پہلی صف جو امام کے قریب ہوتی ہے۔ اس کا بیان سورۃ الحجر میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور اس حدیث کے معنی پر بھی توفیق الٰہی سے گفتگو ہوگی۔ ان شاء اللہ

مسئلہ نمبر 29: چونکہ نماز میں بیٹھنے کے متعلق آثار مختلف ہیں اس لئے علماء کا نماز میں بیٹھنے کی کیفیت میں بھی اختلاف ہے۔ امام مالک اور ان کے اصحاب نے کہا: مصلی (نمازی) اپنی سرین زمین پر رکھے اپنے دائیں پاؤں کو کھڑا کرے اور بائیں پاؤں کو دوہرا کرے۔ اس کی وجہ وہ روایت ہے جو امام مالک نے مؤطا میں یحییٰ بن سعید سے روایت کی ہے کہ قاسم بن محمد نے انہیں تشہد میں بیٹھنے کا طریقہ دکھایا تو انہوں نے اپنے دائیں پاؤں کو کھڑا کیا اور بائیں پاؤں کو دوہرا کیا اور وہ اپنی سرین کے بائیں حصہ پر بیٹھے اور اپنے پاؤں پر نہیں بیٹھے۔ پھر فرمایا: مجھے یہ طریقہ حضرت عبداللہ بن عمر نے دکھایا اور انہوں نے مجھے بیان کیا کہ ان کے والد (حضرت عمر) ایسا کرتے تھے۔

میں کہتا ہوں: یہ معنی مسلم کی صحیح میں بھی آیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نماز کا آغاز تکبیر

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب ائتمام المأموم بالامام، صفحہ 177، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ سنن دارقطنی، صفحہ 361، جلد 1 (دار المحاسن)

3۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب تسویۃ الصفوف واقامتها وفضل الاول منها والازدحام علی الصف الاول، صفحہ 181، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

سے اور قراءت کا آغاز اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سے کرتے تھے اور جب رکوع کرتے تھے تو سر کو زیادہ بلند نہیں رکھتے تھے اور نہ زیادہ جھکاتے تھے اور جب سجدہ سے سر اٹھاتے تھے تو دوسرا سجدہ نہیں کرتے تھے حتیٰ کہ سیدھے بیٹھ جاتے تھے اور دو دو رکعتوں پر التحیات پڑھتے تھے اور اپنا بایاں پاؤں بچھاتے تھے اور دایاں پاؤں کھڑا کرتے تھے اور شیطان کی طرح ایڑیوں پر بیٹھنے سے منع فرماتے تھے اور منع فرماتے تھے کہ کوئی شخص اپنے بازو (زمین پر) پھیلائے اور نماز کا اختتام سلام سے کرتے تھے (1)۔

میں کہتا ہوں: اس حدیث کی وجہ سے ...... اللہ بہتر جانتا ہے ..... حضرت ابن عمر نے فرمایا: نماز کی سنت یہ ہے کہ دائیں پاؤں کو کھڑا کیا جائے اور بائیں کو بچھایا جائے۔ امام ثوری، امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب، حسن بن صالح بن حی نے کہا: دائیں پاؤں کو کھڑا کرے اور بائیں پاؤں پر بیٹھے ان کی دلیل حضرت وائل بن حجر کی حدیث ہے۔ اسی طرح امام شافعی، احمد اور اسحاق نے درمیانے قعدہ میں بیٹھنے کو کہا ہے اور آخری قعدہ میں ظہر، عصر، مغرب یا عشاء میں ان کا قول امام مالک کے قول کے مطابق ہے۔ اس کی وجہ حضرت ابو حمید ساعدی کی حدیث ہے جسے بخاری نے روایت کیا ہے۔ فرمایا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا جب آپ تکبیر کہتے تو اپنے ہاتھوں کو اپنے کندھوں کے برابر کرتے اور جب رکوع کرتے تو اپنے گھٹنوں کو پکڑتے پھر اپنی پیٹھ کو جھکاتے جب کھڑے ہوتے تو سیدھے کھڑے ہوتے حتیٰ کہ ریڑھ کا ہر مہرہ اپنی جگہ پر آ جاتا اور جب سجدہ کرتے تو اپنے ہاتھ زمین پر رکھتے نہ تو بازوؤں کو زمین پر پھیلاتے اور نہ بازوؤں کو اکٹھا کرتے اور اپنے قدموں کی انگلیوں کی اطراف کو قبلہ کی طرف متوجہ کرتے تھے جب (پہلی) دو رکعتوں پر بیٹھتے تو بائیں پاؤں پر بیٹھتے اور دائیں پاؤں کو کھڑا کرتے اور جب آخری رکعت میں بیٹھتے تو اپنے بائیں پاؤں کو آگے کرتے اور دائیں پاؤں کو کھڑا کرتے اور اپنی سرین کے بل بیٹھتے (2)۔ طبری نے کہا: اگر اس طرح کرے تو اچھا ہے بیٹھنے کے تمام طریقے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں۔

مسئلہ نمبر 30: مالک نے مسلم بن ابی مریم سے انہوں نے علی بن عبد الرحمٰن المعاوی سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت عبد اللہ بن عمر نے مجھے دیکھا جب میں نماز میں کنکریوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ جب انہوں نے سلام پھیرا تو مجھے منع فرمایا اور فرمایا: اس طرح کیا کر جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے۔ میں نے پوچھا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیسے کرتے تھے؟ فرمایا: جب آپ نماز میں بیٹھتے تھے تو اپنی دائیں ہتھیلی اپنی دائیں ران پر رکھتے تھے اور اپنی تمام انگلیوں کو بند کرتے تھے اور انگوٹھے سے ملی ہوئی انگلی کے ساتھ اشارہ فرماتے تھے اور اپنی بائیں ہتھیلی اور اپنی بائیں ران پر رکھتے تھے اور فرمایا: آپ اسی طرح کرتے تھے۔ ابن عبد البر نے کہا: حضرت ابن عمر نے جو یہ بیان فرمایا ہے کہ آپ اپنی دائیں ہتھیلی اپنی دائیں ران پر رکھتے تھے اور اپنے ہاتھ کی تمام انگلیوں کو بند کر دیتے تھے سوائے سبابہ کے اس کے ساتھ آپ اشارہ فرماتے تھے اور اپنی بائیں ہتھیلی اپنی بائیں ران پر رکھتے تھے ہاتھ کی انگلیاں کھلی ہوتی تھی۔ یہ نماز میں بیٹھنے کا سنت طریقہ ہے اس پر اجماع ہے۔ میری معلومات کے مطابق علماء کا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور تیرے لئے یہ کافی ہے لیکن سبابہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب ما یجمع صفۃ الصلوٰۃ وما یفتتح بہ ویختم بہ وصفۃ الرکوع الخ صفحہ 95-194، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 114، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب صفۃ الصلوٰۃ، باب سنۃ الجلوس فی التشہد، حدیث 785، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

انگلی کو حرکت دینے میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: انگلی کو حرکت دینی چاہئے اور بعض نے کہا: حرکت نہیں دینی چاہئے۔ یہ تمام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح آثار کے ذریعے مروی ہیں اور ہر صورت مباح ہے۔ الحمد للہ

سفیان بن عیینہ نے یہ حدیث مسلم بن ابی مریم سے روایت کی ہے جو اس حدیث کے ہم معنی ہے جو امام مالک نے روایت کیا ہے اس میں کچھ زائد ہے۔ سفیان نے کہا: یحییٰ بن سعید ہمیں بیان فرماتے تھے اور وہ مسلم سے روایت فرماتے تھے پھر میں ان سے ملا تو میں نے ان سے سنا اور انہوں نے مجھے یہ زائد فرمایا: یہ انگلی کا حرکت دینا شیطان کو دور کرنا ہے تم میں سے کوئی بھولے گا نہیں جب تک وہ انگلی سے اشارہ کرتا رہے گا اور وہ اس طرح کہے گا۔

میں کہتا ہوں: ابوداؤد نے حضرت ابن زبیر کی حدیث میں فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب دعا کرتے تھے تو اپنی انگلی کے ساتھ اشارہ کرتے تھے اور اسے حرکت نہیں دیتے تھے۔ یہی بعض عراقی علماء کا نظریہ ہے اور انہوں نے انگلی کو حرکت دینے سے منع کیا۔ ہمارے بعض علماء کا خیال یہ ہے کہ انگلی کو اٹھانا یہ ہمیشہ کی توحید کی طرف اشارہ ہے۔ امام مالک کے اصحاب وغیرہم میں سے اکثر کا نظریہ ہے کہ انگلی کو حرکت دے مگر علماء کا متواتر حرکت دینے میں اختلاف ہے۔ اس کے متعلق علماء کے دو اقوال ہیں: جو متواتر حرکت دینے کے قائل ہیں انہوں نے اس طرح تاویل کی ہے کہ یہ حرکت دینا نماز میں متواتر حضور کو یاد دلاتی ہے کیونکہ یہ شیطان کو بھگاتی ہے اور اسے دور کرتی ہے جیسا کہ سفیان نے روایت کیا ہے اور جو کلمہ شہادت کے تلفظ کے وقت انگلی کو متواتر حرکت دینے کے قائل نہیں ہیں وہ حرکت میں تاویل کرتے ہیں گویا وہ اپنی اس انگلی کے ساتھ توحید کی گواہی دے رہا ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 31: نماز میں عورت کے بیٹھنے کے بارے میں اختلاف ہے، امام نے فرمایا: یہ مرد کی طرح ہے، اور یہ احرام کے بعد لباس اور بلند آواز سے تہلیل کہنے کے علاوہ کسی معاملے میں مرد سے مختلف نہیں۔ امام ثوری نے کہا: عورت ایک جانب سے اپنی چادر کا سدل کرے گی۔ انہوں نے یہ حضرت ابراہیم نخعی سے روایت کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب نے فرمایا: عورت کے لیے جس طرح آسان ہو گا وہ اس طرح بیٹھے گی۔ یہ شعبی کا قول ہے: وہ بیٹھے گی جس طرح اس کے لیے آسان ہو۔ امام شافعی نے فرمایا: عورت اس طرح بیٹھے گی جس میں اس کے لیے زیادہ پردہ ہو گا۔

مسئلہ نمبر 32: مسلم نے حضرت طاؤس سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم نے حضرت ابن عباس سے قدموں پر بیٹھنے کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا: یہ سنت ہے (1)۔ ہم نے حضرت ابن عباس سے کہا: ہم تو اسے آدمی کے لئے جفا دیکھتے ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: نہیں بلکہ یہ تمہارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے پھر علماء کا اقعا کی صفت میں اختلاف ہے کہ وہ کیا ہے۔ ابوعبید نے کہا: اقعا یہ ہے کہ آدمی اپنی سرین کے بل بیٹھے جبکہ رانیں کھڑی کیے ہوئے ہو جیسے کتا اور درندہ بیٹھتا ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا: یہ اقعا مجمع علیہ ہے اس میں علماء کا اختلاف نہیں یہ اہل لغت اور فقہاء کے ایک گروہ کی تفسیر ہے۔ ابوعبید نے کہا: رہے اہل حدیث وہ اقعا یہ بتاتے ہیں کہ انسان اپنی سرین دو سجدوں کے درمیان اپنی ایڑیوں پر رکھے۔ قاضی عیاض نے کہا: میرے نزدیک بہتر اقعا کی تاویل جس کے بارے میں حضرت ابن عباس نے فرمایا یہ سنت وہ ہے جس کی تفسیر فقہاء نے

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، باب جواز الاقعاء علی العقبین، صفحہ 202، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

دوسجدوں کے درمیان ایڑیوں پر بیٹھنے سے کی ہے۔ اسی طرح حضرت ابن عباس سے اس کی تفسیر ملتی ہے کہ سنت یہ ہے کہ تیری ایڑیاں تیری سرین کو چھوئیں۔ ابراہیم بن میسرہ نے طاؤس سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے یہ روایت کی ہے۔ ابوعمر نے اس کا ذکر کیا ہے۔ قاضی نے فرمایا: سلف اور صحابہ کی ایک جماعت سے مروی ہے کہ وہ ایسا کرتے تھے مگر فقہاء نے یہ نہیں کہا ہے وہ اسے اقعا کا نام دیتے ہیں۔ عبدالرزاق نے معمر سے انہوں نے ابن طاؤس سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے حضرات ابن عمر، ابن عباس اور ابن زبیر کو دیکھا کہ وہ دوسجدوں کے درمیان اقعا کرتے تھے۔

مسئلہ نمبر 33: جن علماء نے سلام کے وجوب اور عدم وجوب کا قول کیا ہے ان کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ دوسرا سلام فرض نہیں ہے مگر حسن بن حی سے مروی ہے کہ انہوں نے دونوں سلاموں کو واجب قرار دیا ہے۔ ابوجعفر طحاوی نے فرمایا: ہم نے اہل علم میں سے کسی کو نہیں پایا کہ وہ دوسرے سلام کو نماز کے فرائض سے سمجھتے ہوں۔ ابن عبدالبر نے کہا: حسن بن حی کی دونوں سلاموں کے وجوب کی دلیل یہ ہے، فرماتے ہیں: اگر پہلے سلام کے بعد کسی کو حدث لاحق ہو جائے جبکہ ابھی دوسرا سلام نہ پھیرا ہو تو اس کی نماز فاسد ہو جاتی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: نماز کی تحلیل سلام ہے پھر سلام کی کیفیت بیان فرمائی کہ وہ دائیں اور بائیں طرف سلام پھیرے اور ایک سلام کو واجب کہنے والوں کی حجت میں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: تحلیلھا التسلیم۔ یعنی نماز کی تحلیل سلام ہے۔ علماء فرماتے ہیں: ایک سلام پر تسلیم کا اطلاق ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ مسئلہ اس اصل پر مبنی ہے کہ کم از کم اسم کو لیا جائے یا تمام کو لیا جائے۔ جب بالاجماع نماز میں داخل ہونا ایک تکبیر کے ساتھ ہے تو نماز سے نکلنا بھی ایک سلام کے ساتھ ہے مگر سنن ثابتہ وارد ہیں۔ مثلاً حضرت ابن مسعود کی حدیث، حضرت وائل بن حجر حضرمی کی حدیث، حضرت عمار کی حدیث، حضرت براء بن عازب کی حدیث، حضرت ابن عمر کی حدیث، حضرت سعد بن ابی وقاص کی حدیث کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دو سلام پھیرتے تھے(1)۔ ابن جریج، سلیمان بن بلال، عبدالعزیز ابن محمد دراوردی یہ تمام عمرو بن یحییٰ المازنی سے وہ محمد بن یحییٰ حبان سے وہ اپنے چچا واسع بن حبان سے روایت کرتے ہیں، فرمایا: میں نے حضرت ابن عمر سے کہا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا طریقہ بتائیں کہ وہ کیسے تھا؟ حضرت عبداللہ بن عمر نے تکبیر کا ذکر کیا جب آپ سر اٹھاتے تھے اور جب بھی سر کو پست کرتے تھے اور دائیں طرف السلام علیکم ورحمۃ اللہ اور بائیں طرف بھی السلام علیکم ورحمۃ اللہ کا ذکر فرمایا۔ ابن عبدالبر نے کہا: یہ اسناد مدنی صحیح ہے اور مدینہ طیبہ میں مشہور عمل ایک سلام ہے۔ اہل مدینہ یہ عمل نسل درنسل کرتے آرہے ہیں۔ اس کی مثل سے ہر شہر میں عمل کے ساتھ احتجاج صحیح ہے کیونکہ ہر روز کئی مرتبہ واقع ہونے کی وجہ سے وہ عمل مخفی نہیں رہتا۔ اسی طرح کوفہ وغیرہ میں بھی دو سلاموں پر عمل ہے اور یہ ان کے نزدیک متوارث ہے ہر عمل میں جو اس طرح جاری ہو تو وہ مباح میں اختلاف ہوتا ہے جیسے اذان۔ اسی طرح حجاز، عراق، شام اور مصر کے کسی عالم سے ایک سلام اور دو سلاموں کا انکار مروی نہیں بلکہ ان کے نزدیک سلام معروف ہے۔ ایک سلام والی حدیث کو حضرات سعد بن ابی وقاص، عائشہ، انس رضی اللہ عنہم نے روایت کیا ہے مگر وہ معلول ہے محدثین اسے صحیح قرار نہیں دیتے۔

1۔ جامع ترمذی، ابواب الصلوۃ، باب ماجاء فی التسلیم فی الصلوۃ، صفحہ 39، جلد 1 (وزارت تعلیم)

مسئلہ نمبر 34: دار قطنی نے حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے، فرمایا: سنت یہ ہے کہ التحیات آہستہ پڑھا جائے۔ حضرت امام مالک نے حضرت عمر کے تشہد کو اختیار فرمایا۔ وہ یہ ہے کہ التحیات للہ الزاکیات للہ الطیبات الصلوات للہ السلام علیك ایھا النبی و رحمۃ اللہ و برکاتہ السلام علینا و علی عباد اللہ الصالحین، اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد ان محمد أعبدہ و رسولہ (1)۔ امام شافعی اور ان کے اصحاب، لیث بن سعد نے حضرت ابن عباس کا تشہد اختیار کیا ہے۔ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں تشہد سکھاتے تھے جس طرح قرآن کی سورت سکھاتے تھے۔ آپ فرماتے تھے: التحیات المبارکات الصلوات الطیبات للہ، السلام علیك ایھا النبی و رحمۃ اللہ و برکاتہ السلام علینا و علی عباد اللہ الصالحین، اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد ان محمداً رسول اللہ (2)۔ ثوری، کوفی علماء اور اکثر اہل حدیث نے حضرت ابن مسعود کا تشہد اختیار کیا ہے جو مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا: نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے یہ کہتے تھے: السلام علی اللہ السلام علی فلان، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن فرمایا: بے شک اللہ ہی السلام ہے جب تم میں سے کوئی نماز میں بیٹھے تو اس طرح کہے: التحیات للہ و الصلوات و الطیبات السلام علیك ایھا النبی و رحمۃ اللہ و برکاتہ السلام علینا و علی عباد اللہ الصالحین...... جب یہ کہے گا تو ہر عبد صالح کو سلام پہنچ جائے گا جو بھی آسمان اور زمین میں ہوگا.. اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد ان محمد أعبدہ و رسولہ پھر اسے اختیار ہے جو چاہے اللہ تعالیٰ سے سوال کرے (3)۔

امام احمد، اسحاق اور داؤد کا یہی قول ہے۔ احمد بن خالد نے اندلس میں اسی کو اختیار فرمایا اور اسی کی طرف میلان کیا۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری سے مرفوعاً اور موقوفاً حضرت ابن مسعود کے تشہد جیسا مروی ہے۔ یہ سب اختلاف مباح میں ہے اس میں سے کوئی چیز واجب نہیں الحمد للہ وحدہ یہ تمام احکام امام اور مقتدی کے تھے جن کو وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ (البقرہ) کا ارشاد اپنے ضمن میں لئے ہوئے تھا اور نماز میں قیام کا ذکر قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿۲۳۸﴾ (البقرہ) کے تحت آئے گا۔

مریض امام کا حکم اور نماز کے دوسرے احکام بھی وہاں بیان ہوں گے اور امام کے علاوہ مریض کی نماز کا حکم سورۂ آل عمران میں آئے گا اور نفل پڑھنے والے کے پیچھے فرض پڑھنے والے کا حکم صلوٰۃ خوف کے ضمن میں آئے گا۔ اور سورۂ مریم میں اس امام کا حکم جو مقتدی سے بلند ہو کر نماز پڑھتا ہے اور اس کے علاوہ نماز کے اوقات، اذان، مساجد کے احکامات وغیرہ بیان ہوں گے۔ یہ سب وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ کے ارشاد کا بیان ہے۔ سورت کی ابتدا میں نماز کے جملہ احکام بیان ہو چکے ہیں۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾

"کیا تم حکم کرتے ہو دوسرے لوگوں کو نیکی کا اور بھلا دیتے ہو اپنے آپ کو حالانکہ تم پڑھتے ہو کتاب کیا تم اتنا بھی

1۔ موطا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ، صفحہ 72، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 142، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب التشہد، حدیث 828، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب التشہد فی الصلوٰۃ، صفحہ 173، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

نہیں سمجھتے"۔

اس میں نو مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ یہ استفہام ہے اس کا معنی زجر و توبیخ ہے(1) اور اہل تاویل کے نزدیک اس سے مراد علماء یہود ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: مدینہ طیبہ کے یہودی اپنے کسی سسرالی رشتہ والے یا کسی قرابت دار یا کسی رضاعی رشتہ دار کو کہتے جو مسلمانوں میں سے ہوتا تو اس دین پر قائم رہ جس پر تو ہے، جس کا تجھے یہ شخص حکم دیتا ہے اس سے ان کی مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے۔ کیونکہ اس کا امر حق ہے وہ لوگوں کو اس کا حکم دیتے تھے اور خود ایسا نہیں کرتے تھے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ یہود کے علماء اپنے مقلدین اور اپنے پیروکاروں کو تورات کی پیروی کا حکم دیتے تھے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کے انکار میں تورات کی مخالفت کرتے تھے(2)۔ ابن جریج نے کہا: علماء یہود لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر ابھارتے تھے اور خود گناہوں کا ارتکاب کرتے تھے۔ ایک گروہ نے کہا: وہ لوگوں کو صدقہ پر ابھارتے تھے اور خود بخل کرتے تھے(3)۔ یہ تمام معانی قریب قریب ہیں۔ بعض اہل اشارات نے فرمایا: اس کا مطلب یہ ہے کہ کیا تم لوگوں سے معانی کے حقائق کا مطالبہ کرتے ہو اور تم اس کے نقوش کے ظاہر کی مخالفت کرتے ہو۔

مسئلہ نمبر 2: جس شخص کی یہ صفت ہو وہ سخت عذاب میں ہوگا۔ حماد بن سلمہ نے علی بن زید سے انہوں نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس رات مجھے سیر کرائی گئی میں کچھ لوگوں کے اوپر سے گزرا جن کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹے جارہے تھے۔ میں نے کہا: اے جبریل! یہ کون لوگ ہیں؟ جبریل نے کہا: یہ اہل دنیا کے خطباء ہیں لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہیں اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں حالانکہ یہ کتاب کی تلاوت کرتے ہیں کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے(4) کہا جائے گا: تم کون ہو؟ وہ کہیں گے: ہم وہ لوگ ہیں جو لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے تھے اور اپنے آپ کو بھول جاتے تھے۔

میں کہتا ہوں: اس حدیث میں اگرچہ کمزوری ہے کیونکہ اس کی سند میں خصیب بن جحدر ہے امام احمد اسے ضعیف کہتے تھے۔ اسی طرح ابن معین نے یہ حدیث ابو غالب عن ابی امامہ صدی بن عجلان الباہلی کے سلسلہ سے روایت کی ہے۔ ابو غالب وہ جس کے بارے میں یحییٰ بن معین نے بیان کیا ہے کہ حزور القرشی مولیٰ خالد بن عبداللہ بن اسید ہے۔ بعض نے فرمایا: باہلہ کا غلام تھا بعض نے فرمایا: عبدالرحمن حضرمی کا غلام تھا۔ تجارت کے لئے شام میں آتا جاتا تھا۔ یحییٰ بن معین نے کہا: یہ صالح الحدیث ہے۔ مسلم نے اپنی صحیح میں اس حدیث کے ہم معنی حضرت اسامہ بن زید سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا: قیامت کے روز ایک شخص کو لایا جائیگا پھر اسے دوزخ میں ڈالا جائے گا پھر جلدی سے اس کے پیٹ سے انتڑیاں باہر آجائیں گی وہ ان کے اردگرد اس طرح گھومے گا جیسے گدھا چکی کے اردگرد گھومتا ہے، دوزخی لوگ اس پر جمع ہو جائیں گے اور کہیں گے: اے فلاں! تجھے کیا ہوا کیا تو ہمیں نیکی کا حکم نہیں دیتا تھا اور برائی سے منع نہیں کرتا تھا؟ وہ کہے گا: کیوں نہیں میں نیکی کا

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 136، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً، صفحہ 137، جلد 1
4۔ معالم التنزیل، صفحہ 75، جلد 1 (دار الفکر)

حکم دیتا تھا اور خود نیکی نہیں کرتا تھا اور برائی سے منع کرتا تھا لیکن خود برائی سے رکتا نہیں تھا (1) (آگے مصنف نے حدیث کے الفاظ کا مفہوم بیان کیا ہے میں نے وہ حدیث کے ترجمہ میں لکھ دیا ہے) میں کہتا ہوں: یہ حدیث اور آیت کریمہ کے الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ جو نیکی اور بدی کو جانتا ہے اور ہر ایک کے قیام کے وجوب سے باخبر ہے اسے بے علم سے زیادہ سزا ملے گی کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی حرمات کی اہانت کرنے والا ہے اور اس کے احکامات کو خفیف سمجھنے والا ہے اور وہ ان لوگوں سے ہے جو اپنے علم سے نفع حاصل نہیں کرتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے زیادہ سخت عذاب قیامت کے دن اس عالم کو ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ نے اس کے اپنے علم سے نفع نہیں پہنچایا۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے اپنی سنن میں ذکر کیا ہے (2)۔

مسئلہ نمبر 3: اے قاری! اللہ تجھے توفیق بخشے! جان لے کہ اس آیت میں توبیخ نیکی کے فعل کے ترک کے سبب سے ہے نہ کہ نیکی کے حکم کے سبب ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس قوم کی مذمت فرمائی ہے جو نیک اعمال کا حکم دیتے ہیں اور ان پر خود عمل نہیں کرتے انہیں سخت توبیخ فرمائی ہے جو قیامت تک سارا زمانہ پڑھی جائے گی۔ فرمایا: **اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ** منصور الفقیہ نے کہا اور خوب کہا:

ان قوماً یامرونا بالذی لا یفعلونا
لمجانین وان ھم لم یکونوا یصرعونا

بے شک ایک قوم ہمیں اس بات کا حکم دیتی ہے جسے وہ خود نہیں کرتے۔ وہ نادان ہیں اگرچہ وہ گرتے نہیں ہیں۔

ابو العتاہیہ نے کہا:

وصفت التقی حتی کانک ذوتقی و ریح الخطایا من ثیابك تسطع

تو نے تقویٰ کی اس طرح صفت بیان کی حتیٰ کہ یوں لگا کہ تو صاحب تقویٰ ہے جبکہ تیرے کپڑوں سے گناہوں کی بدبو چھائی ہوئی ہے۔

ابو الاسود الدؤلی نے کہا:

لاتنه عن خلق و تاتی مثله عارٌ علیك اذا فعلت عظیم
وابدأ بنفسك فانھا عن غیھا فان انتھت عنه فانت حکیم
فھناك یقبل ان وعظت ویقتدی بالقول منك و ینفع التعلیم

تو ایسے خلق سے منع نہ کر جبکہ خود تو ایسا کرے، جب تو ایسا کرے گا تو تجھ پر یہ بڑی عار ہوگا۔ تو اپنے نفس سے آغاز کر اسے گمراہی سے روک اگر تیرا نفس گمراہی سے رک جائے گا تو تو حکیم ہوگا۔ اس وقت تیری بات قبول کی جائے گی اگر تو وعظ کرے گا اور تیری بات کی اقتدا کی جائے گی اور تعلیم نفع دے گی۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزھد والرقاق، باب عقوبة من یامر بالمعروف ولا یفعله وینھی عن المنکر ویفعله صفحہ 412، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ کنز العمال، حدیث نمبر 28977، صفحہ 187، جلد 10 (مکتبہ التراث الاسلامی)

ابوعمرو بن مطر نے کہا: میں ابوعثمان الحیری الزاہد کی مجلس میں حاضر تھا۔ وہ گھر سے باہر آئے اور اس جگہ بیٹھ گئے جہاں وہ وعظ ونصیحت کے لئے بیٹھا کرتے تھے، وہ خاموش بیٹھے رہے حتیٰ کہ ان کی خاموشی لمبی ہوگئی۔ ایک شخص نے انہیں آواز دی جو ابوالعباس کے نام سے مشہور تھے تو اپنے سکوت میں کچھ کہنا چاہتا ہے۔ تو ابوعثمان نے یہ شعر پڑھا:

و غیر تقی یامر الناس بالتقی طبیبٌ یداوی و الطبیب مریض

جو خود غیر متقی ہے وہ لوگوں کو تقویٰ کا حکم دیتا ہے، طبیب لوگوں کا علاج کرتا ہے حالانکہ طبیب خود مریض ہے۔

ابوعمرو نے کہا: رونے اور چیخنے کے ساتھ آوازیں بلند ہوگئیں۔

مسئلہ نمبر 4: ابراہیم النخعی نے کہا: تین آیات کی وجہ سے میں وعظ ونصیحت ناپسند کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ (الایہ) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ۝ (الصف) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْھٰىكُمْ عَنْهُ (ہود: 88) (میں ارادہ نہیں کرتا کہ میں تمہاری مخالفت کروں جس سے میں تمہیں منع کرتا ہوں)۔

مسلم بن عمرو نے کہا۔

ما اقبح التزھید من واعظ یزھد الناس ولا یزھد

لوکان فی تزھیدہ صادقاً اضحی وامسیٰ بیتہ المسجد

ان رفض الدنیا فما بالہ یستمنح الناس ویسترفد

والرزق مقسوم علی من تری ینالہ الابیض والاسود

اس واعظ کا لوگوں کو زہد کی تلقین کرنا کتنا برا ہے جو لوگوں کو زہد کی تلقین کرتا ہے اور خود زہد اختیار نہیں کرتا، اگر وہ زہد کی تلقین میں سچا ہوتا تو صبح وشام اس کا گھر مسجد ہوتا۔ اگر وہ دنیا کو چھوڑ چکا ہوتا تو وہ لوگوں سے عطیہ طلب نہ کرتا اور بخشش نہ مانگتا۔ رزق تقسیم ہو چکا ہے ان لوگوں پر جنہیں تو دیکھتا ہے، سفید اور سیاہ ذات حاصل کر رہا ہے۔

حسن نے مطرف بن عبداللہ سے کہا: اپنے دوستوں کو نصیحت کرو۔ مطرف نے کہا: میں وہ کہنے سے ڈرتا ہوں جو میں کرتا نہیں۔ حسن نے کہا: اللہ تجھ پر رحم فرمائے، ہم میں سے کون ہے جو وہی کرتا ہے جو وہ کہتا ہے۔ شیطان چاہتا ہے کہ وہ اپنے اس حال کے ساتھ کامیاب ہوجائے، کوئی شخص نیکی کا حکم نہ دے اور برائی سے منع نہ کرے۔ امام مالک نے ربیعہ بن ابی عبدالرحمن سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے حضرت سعید بن جبیر کو یہ فرماتے سنا کہ اگر آدمی نیکی کا حکم نہ دے اور برائی سے منع نہ کرے تا کہ اس میں کوئی ایسی بات نہ پائی جائے تو پھر کوئی نیکی کا حکم نہ دے اور برائی سے منع نہ کرے۔ امام مالک نے فرمایا، انہوں نے سچ فرمایا، کون ہے وہ جس میں ایسی بات نہ ہو (یعنی ہر شخص نیکی کا حکم دیتا ہے اور خود پوری طرح نیکی نہیں کرتا۔)

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے بِالْبِرِّ یہاں البر سے مراد طاعت اور عمل صالح ہے۔ البر کا معنی سچائی بھی ہے۔ البر، لومڑی کے بچے کو بھی کہتے ہیں۔ البر، بکریوں کے ہانکنے کو بھی کہتے ہیں۔ عرب کہتے ہیں: لا یعرف ھراً من برٍ یعنی

بکریوں کے چرواہے نہیں جانتے کہ کون بکریوں کو ہانک کرلے گیا ہے (اور اس کا لفظی معنی ہے: وہ بلی اور چوہے میں فرق نہیں کرسکتا) یہ مشترک لفظ ہے۔ شاعر نے کہا:

لا ھم رب ان بکرا دونکا	یبرک الناس و یفجرونکا

''یبرک الناس'' سے شاعر نے یہ ارادہ کیا ہے لوگ تجھے عطیہ دیتے ہیں۔

مابعد شعر میں البرکا معنی دل ہے۔

اکون مکان البر منہ و دونہ	واجعل مالی دونہ و اوامرہ

البر با کے ضمہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی معروف ہے (یعنی گندم) اور با کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی اجلال اور تعظیم کرتا ہے۔ اسی سے ہے ولد بر و بار یعنی بچہ اپنے والدین کی تعظیم کرتا ہے اور ان کی عزت کرتا ہے۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ اپنے آپ کو ترک کرتے ہیں۔ النسیان (نون کے کسرہ کے ساتھ) اس کا معنی کبھی ترک کرنا ہوتا ہے اور یہاں یہی معنی مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ (توبہ: 67) (جب انہوں نے بھلا دیا تو اللہ نے انہیں فراموش کر دیا) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ (انعام: 44) (جب انہوں نے بھلا دیا اسے جس کے ساتھ نصیحت کی گئی تھی)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ (البقرہ: 237) اور تم آپس میں فضل کو نہ بھولو۔ یہ یاد اور حفظ کا متضاد ہے۔ اسی مفہوم میں حدیث ہے نَسِیَ آدم فنسِیت ذریتہ (1)، حضرت آدم بھولے تو آپ کی اولاد بھی بھولی۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ کہا جاتا ہے: رجل نسیان، کسی چیز کو بہت زیادہ بھولنے والا شخص۔ و قد نَسِیت الشئ نِسیانًا (بکسر نون کہے گا) تو نَسیانًا نہیں کہے گا۔ کیونکہ النَّسیان، یہ نسا کا تثنیہ ہے جس کا معنی رگ ہے۔

انفس یہ نفس کی جمع ہے اور جمع قلت ہے۔ النفس کا معنی روح بھی ہے۔ کہا جاتا ہے: خرجت نفسہ اس کی روح نکل گئی۔

ابوخراش نے کہا

نجا سالم و النفس منہ بشدقہ	و لم ینج الا جفن سیف و مئزرا

سالم نے نجات پائی جبکہ اس کی سانس اس کے ہونٹ کے کنارے پر تھی اور اس نے تلوار کی میان اور چادر کے ساتھ نجات پائی۔

النفس سے مراد روح ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے: اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا (الزمر: 42) (اللہ تعالیٰ قبض کرتا ہے روحوں کو جن کی موت کا فیصلہ کرتا ہے)۔

اکثر علماء کے نزدیک اس آیت میں الانفس سے مراد ارواح ہیں۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ومن سورۃ الاعراف، حدیث نمبر 3290.3002، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت بلال نے نبی کریم ﷺ سے کہا تھا: اخذ بنفسی یا رسول الله الذی اخذ بنفسک۔ (1) میری روح کو بھی اس نے قبض کرلیا جس نے آپ کی روح کو قبض کرلیا...... یہ ابن شہاب کی حدیث میں ہے، اور حضرت زید بن اسلم کی حدیث میں ہے: ان الله قبض ارواحنا و لو شاء لردھا الینا فی حین غیر ھذا...... (2) اللہ تعالیٰ نے ہماری روحوں کو قبض کرلیا اگر وہ چاہتا تو اس وقت کے علاوہ ہماری طرف انہیں لوٹا دیتا، یہ دونوں روایات امام مالک نے روایت کی ہیں۔ یہ معنی اولیٰ ہے جو کچھ اس کے بارے میں کہا گیا ہے۔ النفس سے مراد خون بھی ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: سالت نفسہ اس کا خون بہہ پڑا۔ شاعر نے کہا:

تسیل علی حد السیوف نفوسنا و لیست علی غیر ظبات تسیل

ہمارے خون تلواروں کی انیوں پر بہتے ہیں، تلواروں کی انیوں کے بغیر یہ بہتے ہی نہیں۔

ابراہیم نخعی نے کہا: مالیس له نفس سائلۃ وہ جانور جس کا بہنے والا خون نہیں ہوتا وہ پانی میں مرجائے تو وہ پانی ناپاک نہیں ہوتا۔ النفس سے مراد جسد بھی ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا:

نبئتُ ان بنی سحیم ادخلوا ابیاتھم تامورَ نفس المنذر

مجھے بتایا گیا ہے کہ بنی سحیم نے اپنے گھروں میں منذر کے جسم کا خون داخل کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 7: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ جو سمجھے تو اس کے لئے یہ بڑی توبیخ ہے۔ تَتْلُوْنَ کا معنی پڑھنا ہے۔ الْكِتٰبَ سے مراد تورات ہے۔ جس نے یہود کی طرح عمل کیا وہ ان کی مثل ہے تلاوت کی اصل اتباع ہے۔ اسی وجہ سے یہ قراءت (پڑھنے) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے کیونکہ بعض کلام حروف میں بعض کے تابع ہوتا ہے حتیٰ کہ وہ ترتیب پر ہو جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: تلوتہ تلواً میں نے اس کی اتباع کی۔ تلوت القرآن تلاوۃً۔ میں نے قرآن کی تلاوت کی۔ تلوت الرجل تلواً کسی کو رسوا کرنا۔ التلیۃ اور التُّلاوۃ (تاء کے ضمہ کے ساتھ) اس کا معنی بقیہ ہے۔ کہا جاتا ہے: تلیت لی من حقی تلاوۃ و تلیۃ یعنی میں نے اپنے لیے اپنے حق سے باقی رکھا۔

اتلیتُ، ابقیت (میں نے باقی چھوڑا) تتلیت حقی۔ میں نے اپنے حق کا پیچھا کیا حتیٰ کہ اسے پورا وصول کرلیا۔ ابو زید نے کہا: تلی الرجل جب انسان زندگی کے آخری سانسوں میں ہو۔

مسئلہ نمبر 8: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ یعنی تم اپنے نفسوں کو ہلاکت کی جگہوں سے نہیں روکتے۔ العقل کا معنی روکنا ہے، اسی سے عقال البعیر ہے، اونٹ کی رسی جو اسے حرکت سے روکتی ہے۔ العقل کا معنی دیت ہے کیونکہ وہ مقتول کے ولی کو قاتل کے قتل سے روکتی ہے۔ اسی سے ہے: اعتقال البطن واللسان، پیٹ اور زبان کو روکنا۔ اسی وجہ سے قلعہ کو معقل کہا جاتا ہے۔ العقل، یہ جہالت کی نقیض ہے، العقل اس کپڑے کو بھی کہتے ہیں جسے عربوں کی عورتیں بناتی تھیں اس کے ساتھ ہودج کو لپیٹا جاتا تھا۔ علقمہ نے کہا:

عقلاً و رقماً تکاد الطیر تخطفه کأنه من دم اجواف مدموم

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب وقوت الصلوٰۃ، باب النوم عن الصلوٰۃ، صفحہ 9، قدیمی کتب خانہ 2۔ ایضاً، صفحہ 10

سرخ، منقش کیڑا قریب تھا پرندے اسے اچک لیتے، گویا وہ چیتوں کے خون سے سرخ کیا گیا ہے۔

المد موم سے مراد سرخ ہے اور اس شعر میں یہی معنی مراد ہے، اور المد موم سے مراد چربی سے بھرا ہوا اونٹ وغیرہ کو بھی کہتے ہیں۔ بعض نے فرمایا: یہ دو چادریں ہیں۔ ابن فارس نے کہا: وہ کپڑا جس کا نقش طول میں ہو اسے عقل کہتے ہیں اور جس کا نقش گول ہو اسے رقم کہتے ہیں۔ زجاج نے کہا: عاقل وہ ہے جو اس پر عمل کرے جو اللہ تعالیٰ نے اس پر واجب کیا ہے اور جاہل وہ ہے جو احکام الہیہ پر عمل نہ کرے۔

مسئلہ نمبر 9: اہل حق کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عقل مخلوق اور موجود ہے نہ وہ قدیم ہے نہ معدوم ہے کیونکہ اگر معدوم ہوتی تو اس کے ساتھ متصف ہونے کے ساتھ بعض ذوات مختص نہ ہوتیں جب اس کا وجود ثابت ہے تو اس کے قدیم ہونے کا قول محال ہے کیونکہ اس بات پر دلیل قائم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی قدیم نہیں ہے جیسا کہ بیان اسی سورت میں اور دوسری سورتوں میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

فلاسفہ کا نظریہ یہ ہے کہ عقل قدیم ہے پھر بعض فلاسفہ کہتے ہیں کہ عقل بدن میں ایک جوہر لطیف ہے اس سے اس کی شعاعیں پھیلتی ہیں جس طرح گھر میں چراغ کی شعاعیں پھیلتی ہیں۔ اس کے ذریعے معلومات کے حقائق کے درمیان فرق کیا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ جوہر بسیط ہے یعنی غیر مرکب ہے پھر اس کے محل کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: عقل کا محل دماغ ہے کیونکہ دماغ حس کا محل ہے۔ بعض فرماتے ہیں: اس کا محل دل ہے کیونکہ دل حیات کا معدن اور حواس کا مادہ ہے۔ عقل کے بارے میں یہ قول کہ یہ جوہر ہے، یہ فاسد ہے اس حیثیت سے کہ جواہر ہم مثل ہوتے ہیں۔ اگر جوہر عقل ہوتا تو ہر جوہر عقل ہوتا۔ بعض علماء نے فرمایا: عقل اشیاء کا ادراک کرنے والی ہے معانی کے حقائق میں سے اشیاء جس پر قائم ہیں۔ یہ قول اگرچہ پہلے قول کے زیادہ قریب ہے، لیکن اس جہت سے درست ہونے سے دور ہے کہ ادراک زندہ کی صفات سے ہے، اور عقل عرض ہے اس سے یہ چیز محال ہے جیسا کہ اس کا ملتذ اور مشتہی ہونا محال ہے۔

شیخ ابو الحسن اشعری، استاذ ابو اسحاق اسفرائینی وغیرہما فرماتے ہیں: عقل، علم ہے اس دلیل سے کہ یہ نہیں کہا جاتا: عقلت و ما علمت او علمت و ما عقلت (میں نے سمجھا اور جانا نہیں یا میں نے جانا اور سمجھا نہیں) قاضی ابوبکر نے کہا: واجبات کے وجود، جائزات کے جواز اور مستحیلات کے استحالہ کے علوم ضروریہ کا نام عقل ہے، یہ ابو المعالی نے ''الارشاد'' میں اختیار فرمایا ہے اور ''البرہان'' میں انہوں نے یہ اختیار فرمایا کہ عقل ایک صفت ہے جس کے ذریعے علوم کا ادراک کیا جاتا ہے۔ انہوں نے قاضی کے مذہب پر اعتراض کیا اور قاضی کے مذہب کے فساد پر استدلال کیا۔ ''البرہان'' میں محاسبی سے حکایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: عقل ایک فطرت ہے، استاذ ابوبکر نے امام شافعی، ابو عبداللہ بن مجاہد سے حکایت کیا ہے کہ ان دونوں نے فرمایا: عقل تمیز کا آلہ ہے۔ ابو العباس القلانسی سے حکایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: عقل تمیز کی قوت ہے۔ محاسبی سے حکایت کی کہ انہوں نے فرمایا: عقل انوار اور بصائر ہیں پھر ان اقوال کو مرتب کیا اور چند محامل پر انہیں معمول کیا۔ فرمایا: اولیٰ یہ ہے کہ یہ نقل امام شافعی اور ابن مجاہد سے صحیح نہیں ہے کیونکہ آلہ تو مثبت چیز میں استعمال ہوتا ہے اور اعراض میں اس کا استعمال مجازاً

ہے۔ اسی طرح جنہوں نے کہا کہ یہ قوت ہے (یہ بھی صحیح نہیں ہے) کیونکہ قوت سے صرف قدرت سمجھی جاتی ہے۔
قلانسی نے جو اطلاق کیا ہے وہ عبارات میں مجاز کی بناء پر ہے، اسی طرح محاسبی کا قول ہے عقل نہ تو صورت ہے نہ نور ہے بلکہ اس کے ذریعے انوار و بصائر کو حاصل کیا جاتا ہے۔ آیت توحید کے تحت اس کے فائدہ کا بیان ان شاء اللہ اسی سورت میں آئے گا۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝

''اور مدد لو صبر اور نماز سے اور بے شک نماز ضرور بھاری ہے مگر عاجزی کرنے والوں کے لئے نہیں''۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ، الصبر کا لغوی معنی روکنا ہے۔ قتل فلان صبراً، فلاں باندھا گیا اور روکا گیا حتیٰ کہ تلف ہو گیا۔ صبرت نفسی علی الشیء میں نے اپنے آپ کو اس کام پر روکا۔ المصبورۃ۔ وہ جس سے منع کیا گیا ہو۔ حدیث میں اس سے مراد وہ جانور ہے جو موت پر روکا گیا ہو، اسی کو المجثمہ بھی کہتے ہیں۔ عنترہ نے کہا:

فصبرت عارفة لذالك حرة   ترسو اذا نفس الجبان تطلع

میں نے اس وجہ سے آزاد عارفہ سے اپنے آپ کو روکا جو ٹھہری ہوئی تھی جبکہ بزدل کا نفس جھانک رہا تھا۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ نے اطاعت پر صبر کرنے کا حکم دیا ہے اور کتاب اللہ میں مخالفت سے رکے رہنے کا حکم دیا ہے۔ فرمایا: واصبروا۔ کہا جاتا ہے: فلان صابر عن المعاصی جب کوئی گناہوں سے بچے اور طاعت پر قائم رہے، جو کچھ صبر کے بارے میں کہا گیا اس میں سے یہ قول بہتر ہے۔ نحاس نے کہا: جو مصیبت پر صبر کرے اسے صابر نہیں کہا جاتا بلکہ کہا جاتا ہے صابر علی کذا، اس پر صبر کرنے والا ہے۔ جب مطلق صابر کہا جائے تو پھر اس کا اطلاق اس پر ہوتا ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ (الزمر)

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالصَّلٰوةِ تمام عبادات میں سے الصَّلٰوةِ (نماز) کو خاص طور پر ذکر فرمایا اس کے ذکر کی بلندی کے لئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی پریشانی لاحق ہوتی تو آپ نماز کی طرف پناہ لیتے۔ اسی سے وہ روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس کو ان کے بھائی قثم کی موت کی خبر دی گئی ..... بعض نے فرمایا: ان کی بیٹی کی موت کی خبر دی گئی ..... جبکہ وہ سفر میں تھے تو انہوں نے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھا اور کہا یہ پوشیدہ چیز تھی اللہ تعالیٰ نے اسے ڈھانپ دیا۔ یہ مؤنث تھی اللہ تعالیٰ نے اس کی کفایت فرمائی یہ اجر ہے جو اللہ تعالیٰ نے بھیجا۔ پھر راستہ سے ایک طرف ہو گئے اور نماز پڑھی۔ پھر اپنی سواری کی طرف واپس آئے اور یہ پڑھ رہے تھے وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اس تاویل پر نماز سے مراد شریعت ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: لغت میں اپنے عرف پر اس کا معنی دعا ہے۔ پس اس تاویل پر یہ آیت اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مشابہ ہوگی اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ (انفال:45)

کیونکہ ثبات سے مراد صبر ہے۔ ذکر سے مراد دعا ہے اور تیسرا قول مجاہد نے کیا اس آیت میں الصبر سے مراد روزہ ہے۔ اسی

وجہ سے رمضان کو شهر الصبر کہا جاتا ہے۔ پس اس قول کی مناسبت سے روزہ اور نماز مناسب ہیں کیونکہ روزہ شہوات سے روکتا ہے اور دنیا میں عدم دلچسپی پیدا کرتا ہے نماز برائیوں اور منکرات سے روکتی ہے اس میں خشوع کا اظہار کیا جاتا ہے اور اس میں قرآن پڑھا جاتا ہے جو قرآن آخرت کی یاد دلاتا ہے (1)...... واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 4: اذیتوں پر صبر کرنا اور طاعات پر صبر کرنا یہ نفس کے جہاد سے ہے اور نفس کی شہوات کو ختم کرنے اور لالچ سے اسے روکنے کے باب سے ہے۔ یہ انبیاء کرام اور صالحین کے اخلاق میں سے ہے۔ یحییٰ بن الیمان نے کہا: صبر یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ نے تجھے عطا فرمایا اس کے علاوہ کی تمنا نہ کر اور رضا یہ ہے تو اپنی دنیا و آخرت کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر راضی ہو۔ شعبی نے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: صبر کا ایمان سے اس طرح کا تعلق ہے جو سر کا تعلق جسم سے ہے۔ طبری نے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سچ فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان دل کی معرفت، زبان کے اقرار اور عمل بالجوارح کا نام ہے جو عمل بالجوارح پر صبر نہیں کرتا وہ ایمان کے اطلاق کا مستحق نہیں ہوتا اور عمل بالشرائع پر قائم رہنا بالکل ایمان کے ساتھ اس کا وہی تعلق ہے جو سر کا جسم کے ساتھ تعلق ہے کہ انسان کا جسم مکمل نہیں ہوتا مگر یہ کہ سر موجود ہو۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ نے اعمال کی جزا کا ذکر فرمایا اور اعمال کے لئے جزا کی ایک حد ذکر فرمائی۔ فرمایا: مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشۡرُ اَمۡثَالِهَا (انعام: 160) (جو کوئی لائے گا ایک نیکی تو اس کے لئے دس ہوں گی) اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرنے کی جزا سے زیادہ بیان فرمائی۔ فرمایا: مَثَلُ الَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ (البقرہ: 261) (مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں ایسی ہے جیسے ایک دانہ) اور صبر کرنے والوں کا اجر بغیر حساب کے بنایا۔ اور صبر کرنے والوں کی مدح بیان فرمائی، فرمایا: اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوۡنَ اَجۡرَهُمۡ بِغَیۡرِ حِسَابٍ ۝ (الزمر) (صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا)۔ اور فرمایا: وَ لَمَنۡ صَبَرَ وَ غَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ ۝ (الشوریٰ) (اور جو شخص (ان مظالم پر) پر صبر کرے اور (طاقت کے باوجود) معاف کر دے تو یقیناً یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے۔)

بعض علماء نے فرمایا: اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوۡنَ (الزمر: 10) میں صابرون سے مراد روزے دار ہیں کیونکہ صحیح سنت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد مروی ہے، الصیام لی وانا اجزی به (2) (روزہ میرے لئے ہے اور میں اس کی جزا دوں گا) روزے کا ثواب ذکر نہیں فرمایا جس طرح کہ صبر کی جزا ذکر نہیں فرمائی۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 6: صبر کی فضیلت...... اللہ تعالیٰ نے اپنا وصف صبر سے بیان فرمایا جیسا کہ حضرت ابو موسیٰ کی حدیث میں ہے جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان فرمائی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لیس احدٌ اولیس شیء اصبر علی اذی سمعه من الله تعالیٰ انهم لیدعون له ولداً وانه لیعافیهم ویرزقهم (3)۔ (اللہ تعالیٰ سے کوئی اذیت پر زیادہ صبر کرنے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 137، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ صحیح بخاری، صفحہ 254، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الصوم، باب فضل الصوم، حدیث 1761، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، ایضاً صفحہ 901، جلد 2۔ ایضاً، کتاب الادب، باب الصبر علی الأذی، حدیث 5634، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

والا نہیں جسے وہ سنتا ہے، مشرک لوگ اللہ تعالیٰ کے لئے بیٹا ہونے کا قول کرتے ہیں لیکن پھر وہ انہیں عافیت بھی دیتا ہے اور انہیں رزق بھی دیتا ہے۔) اس حدیث کو بخاری نے نقل کیا ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے صبر کے ساتھ وصف بیان فرمایا تو صبر سے مراد حلم ہے اور حلم سے متصف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سزا کے مستحقین کو فوری سزا نہیں دیتا اس میں تاخیر فرماتا ہے　اور اللہ تعالیٰ کا صبر کے ساتھ موصوف ہونا قرآن میں وارد نہیں ہے بلکہ حدیث حضرت ابوموسیٰ میں وارد ہے اہل سنت نے صبر کی تاویل حلم سے کی ہے یہ ابن فورک وغیرہ کا قول ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں الصبور کا لفظ آیا ہے یہ مجرموں سے حلم میں مبالغہ کے اظہار کے لئے ہے۔

مسئلہ نمبر 7: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ ضمیر کے مرجع میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا مرجع صرف خاص طور پر نماز ہے کیونکہ یہ نفوس پر اتنی بھاری ہوتی ہے جتنا روزہ بھاری نہیں ہوتا، یہاں صبر سے مراد روزہ ہے اور نماز میں نفوس کی قید ہے اور روزہ میں شہوت کو ختم کرنا ہے۔ پس جو ایک شہوت سے یا دو شہوتوں سے رکا ہوا ہے وہ اس شخص کی مانند نہیں جو تمام شہوات سے روکا گیا ہے۔ پس روزہ دار کو عورتوں، کھانے اور پینے کی شہوت سے روکا جاتا ہے پھر تمام شہوات کلام، چلنے اور مخلوق سے ملنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں پھر ان اشیاء کی وجہ سے وہ تسلی پاتا ہے جن سے اسے روکا گیا ہوتا ہے، جبکہ نمازی ان تمام شہوات سے رکتا ہے، اس کے تمام اعضاء نماز کے ساتھ مقید ہوتے ہیں اور تمام شہوات سے دور ہوتا ہے۔ جب صورت حال یہ ہے تو نماز نفس پر زیادہ بھاری اور مشکل ہوئی، اسی وجہ سے فرمایا: یہ بہت بھاری ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اِنَّهَا کی ضمیر سے مراد دونوں (صبر اور نماز) ہیں لیکن اغلبؔ سے کنایہ فرمایا اور وہ نماز ہے جیسے ارشاد فرمایا: وَ الَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (توبہ: 34) (اور جو لوگ جوڑ کر رکھتے ہیں سونا، چاندی اور نہیں خرچ کرتے اسے اللہ کی راہ میں۔)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْۤا اِلَيْهَا (الجمعہ: 11) (جب دیکھا کسی تجارت یا تماشا کو تو اس کی طرف گئے) پہلی آیت میں ضمیر کو الفضۃ کی طرف لوٹایا کیونکہ وہ اغلب اور اعم ہے، اور دوسری آیت میں تجارت کی طرف لوٹایا کیونکہ وہ افضل اور اہم ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: صبر چونکہ نماز میں داخل ہے اس لئے ضمیر نماز کی طرف لوٹا دی جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے وَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ (توبہ: 62) اس آیت میں لم یرضوھما نہیں فرمایا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا اللہ تعالیٰ کی رضا میں داخل ہے۔ اسی طرح شاعر نے کہا:

ان شرخ الشباب والشعر الاسو　　د ما لم یعاص کان جنونا

اس شعر میں لم یعاصیا نہیں فرمایا اور ضمیر شباب کی طرف لوٹا دی کیونکہ شعر اس میں داخل ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: ضمیر ہر ایک کی طرف لوٹائی لیکن اختصاراً حذف کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ جَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗۤ اٰيَةً (مومنون: 50) اس آیت میں آیتین نہیں فرمایا اسی طرح شاعر کا قول ہے:

فمن یک أمسی بالمدینۃ رحلہ　　فانی و قیار بھا لغریب

اور ایک شاعر نے کہا:

لکل هم من الهموم سعه والصبح والمس لا فلاح معه

پہلے شعر میں لغریب سے مراد لغربیان ہے اور دوسرے شعر میں لا فلاح معھا مراد ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ضمیر کا مرجع عبادت ہے جو معنی کے اعتبار سے صبر اور صلاۃ کے ذکر کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے۔ بعض نے فرمایا: ضمیر کا مرجع مصدر ہے، اور وہ الاستعانة ہے جس کا تقاضا استعینوا ارشاد کر رہا ہے۔ بعض نے فرمایا: ضمیر کا مرجع حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اجابت ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس چیز کی طرف بلاتے تھے ان میں سے صبر اور صلاۃ بھی ہے۔ بعض نے فرمایا: ضمیر کا مرجع کعبہ ہے کیونکہ نماز کا حکم اس کی طرف ہے۔ کبیرۃٌ سے مراد بھاری اور مشکل ہے اور یہ (انّ) کی خبر ہے، غیر قرآن میں وانه لکبیرۃ بھی جائز ہے۔ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ مگر ڈرنے والوں پر نماز خفیف (ہلکی) ہے۔ ارباب المعانی نے کہا اس سے مراد یہ ہے کہ مگر جن کی ازل میں اجتباء اور ہدایت کے خصائص کے ساتھ تائید کی گئی ان پر بھاری نہیں۔

مسئلہ نمبر 8: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے عَلَى الْخٰشِعِيْنَ، خاشعون جمع ہے خاشع کی اس سے مراد تواضع کرنے والا ہے اور الخشوع نفس کی اس ہیئت کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے اعضاء میں سکون اور تواضع ظاہر ہوتی ہے۔ قتادہ نے کہا: خشوع دل میں ہوتا ہے، اور وہ نماز میں خوف اور آنکھوں کو جھکانا ہے۔ زجاج نے کہا: الخاشع وہ ہے جس پر خشوع اور ذلت کا اثر دکھائی دے جیسے خشوع الدار بعد الاقواء، یہ اصل ہے۔ نابغہ نے کہا:

رماد ککحل العین لأیا أبینه ونؤیٌ کجذم الحوض اثلم خاشع

مکان خاشعٌ ایسا مکان جس کے لئے رہنمائی نہ پائی جا سکے۔ خشعت الاصوات، یعنی آوازیں ساکن ہو گئیں۔

خشعت خراشی صدرہ۔ یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب سینہ سے لیس دار تھوک باہر پھینکے۔ خشع ببصرہ یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی اپنی نظر کو جھکا دے۔ الخشعة، زمین کا نرم ٹکڑا۔ حدیث پاک میں ہے: کانت خشعة علی الماء ثم دحیت بعد، کعبہ پانی پر ایک نرم ٹکڑا تھا پھر بعد میں اس سے زمین پھیلائی گئی۔ بلدۃ خاشعةٌ ایسا شہر جو غبار آلود ہو اس میں کوئی اترنے والا نہ ہو۔ سفیان ثوری نے کہا: میں نے اعمش سے خشوع کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا: اے ثوری! تو لوگوں کا امام بننا چاہتا ہے اور تو خشوع کو نہیں جانتا۔ میں نے ابراہیم نخعی سے خشوع کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا: اے اعمش! تو لوگوں کا امام بننا چاہتا ہے اور تو خشوع بھی نہیں جانتا۔ خشوع موٹی خوراک کھانا، موٹا لباس پہننا اور سر جھکانا نہیں ہے بلکہ خشوع یہ ہے کہ تو شریف اور گھٹیا کو حق میں برابر دیکھے اور ہر اس فرض کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرے جو تجھ پر فرض ہے۔ حضرت عمر بن خطاب نے ایک نوجوان کو دیکھا وہ سر جھکائے ہوئے تھا۔ حضرت عمر نے فرمایا: اے فلاں! اپنا سر اٹھا کیونکہ خشوع اس سے زائد نہیں ہوتا جو دل میں ہوتا ہے۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: خشوع دل میں ہوتا ہے تو اپنے ہاتھوں کو مسلم آدمی کے لئے نرم کرے اور تو نماز میں ادھر ادھر متوجہ نہ ہو۔ یہ معنی اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے تحت اچھی طرح آئے گا: قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ (مومنون) جس نے لوگوں کے لئے اس سے

زیادہ خشوع ظاہر کیا جو اس کے دل میں ہے تو اس نے نفاق پر نفاق ظاہر کیا۔ حضرت سہل بن عبد اللہ نے کہا: خاشع اس وقت تک نہیں ہو گا حتیٰ کہ ہر بال اس کے جسم پر خشوع کا اظہار کرے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ (الزمر: 23)

میں کہتا ہوں: یہ خشوع محمود ہے، کیونکہ خوف جب دل کو لاحق ہوتا ہے تو ظاہر خشوع کو ثابت کرتا ہے، ایسا شخص ظاہری خشوع کو دور کرنے کا مالک نہیں ہوتا، تو اسے دیکھے گا وہ سر جھکائے ہوئے متادب اور متذلل ہو گا۔ نیک لوگ اس قسم سے جو ان پر ظاہر ہوتا تھا اسے چھپانے کی کوشش کرتے تھے۔ مذموم خشوع وہ ہے جس میں تکلف ہوتا ہے، جان بوجھ کر رونا اور سر جھکانا ہوتا ہے جیسا کہ جہلاء کرتے ہیں تا کہ انہیں عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جائے، یہ شیطان کا دھوکا ہے اور انسان کے نفس کا فریب ہے۔ حضرت حسن نے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے حضرت عمر بن خطاب کے پاس سانس لیا گویا وہ پریشان ہے۔ حضرت عمر نے اسے مکا مارا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب بولتے تھے تو اپنی آواز سناتے تھے، جب چلتے تھے تو تیز چلتے تھے جب مارتے تھے تو سخت مارتے تھے آپ سچے احکام پر عمل کرنے والے تھے اور سچا خشوع رکھنے والے تھے۔ ابن ابی نجیح نے مجاہد سے روایت کیا ہے، فرمایا: الخاشعون سے مراد سچے مومن ہیں۔

الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝۴۶

"جو یقین کرتے ہیں کہ وہ ملاقات کرنے والے ہیں اپنے رب سے اور وہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ، الَّذِيْنَ محل جر میں ہے کیونکہ یہ خاشعین کی صفت ہے اور قطع کے اعتبار سے اس کو محل رفع میں کرنا بھی جائز ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک یہاں ظن بمعنی یقین ہے، اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ۝ (الحاقہ) (مجھے یقین تھا کہ میں اپنے حساب کو پہنچوں گا) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا (الکہف: 53) (وہ خیال کریں گے کہ وہ اس میں گرنے والے ہیں)۔

درید بن الصمہ نے کہا:

فقلت لهم ظنوا بالفی مدجج　　سراتهم فی الفارسی المسرد (1)

شاعر نے یہاں ظن بمعنی یقین استعمال کیا ہے۔

ابوداؤد نے کہا:

رُبَّ هم فرجته بغريم　　و غيوب كشفتها بظنون

یعنی میں نے کتنے ہی غیوب کو یقین کے ساتھ کھولا۔

بعض علماء نے فرمایا: اس آیت میں ظن اپنے معنی میں صحیح ہے۔ کلام میں ان کے گناہوں کو چھپایا گیا ہے گویا وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی توقع رکھتے ہیں حالانکہ وہ گنہگار ہیں۔ یہ مہدوی اور ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ تعسف ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 138، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

فراء نے کہا: ظن کبھی جھوٹ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ بصری علماء اس معنی کو نہیں جانتے۔ ظن کی اصل اور اس کا فائدہ ''شک ہونا'' ہے جبکہ اپنے معتقدات میں سے کسی ایک کی طرف میلان ہو۔ کبھی ظن یقین کے معنی میں ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت اور دوسری آیات میں ہے لیکن جوامر حس کی طرف نکلے اس کے لئے استعمال نہیں ہوتا۔ مثلاً عرب جو شخص دکھائی دے رہا ہو موجود ہو اس کے لیے یہ نہیں کہتے أظن هذا انسانا، تو اس کا استعمال اس صورت میں پائے گا جو ابھی حس کے دائرے میں نہ ہو۔ جیسا کہ اس آیت اور شعر میں ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا (الکہف:53) کبھی یقین بمعنی ظن ہوتا ہے۔ اس کا بیان سورت کے آغاز میں ہو چکا ہے۔ تو کہتا ہے: سوت به ظناً، واسأت به الظن (میں نے اسے برا گمان کیا) جب معرف باللام ہو تو الف داخل کراتے ہیں اور مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ سے مراد ہے جزاء ربهم بعض علماء نے فرمایا: یہ باب مفاعلہ ہے حالانکہ یہ عمل ایک طرف سے ہے۔ (فرمایا) یہ اس طرح ہے: عافاه الله۔ اَنَّهُمْ ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے اس کا پہلے اِنَّ پر عطف ہے اور قطع کے اعتبار سے اس پر کسرہ پڑھنا بھی جائز ہے اِلَيْهِ سے مراد الی ربهم ہے بعض نے فرمایا الی جزاءہ ہے۔ رٰجِعُوْنَ یہ دوبارہ اٹھنے، جزا اور ملک اعلیٰ کے سامنے پیش ہونے کا اقرار ہے۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿٤٧﴾

''اے اولاد یعقوب یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا اور یہ کہ میں نے فضیلت دی تھی تمہیں سارے جہان والوں پر''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ اس سے مراد ان کے اپنے زمانہ کے لوگ ہیں اور ہر زمانہ کے لوگ ایک عالم ہیں۔ بعض نے فرمایا: تمام لوگوں پر فضیلت مراد ہے کیونکہ ان میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء بنائے، یہ ان کا خاصہ ہے۔ دوسروں کے لئے یہ شرف نہیں۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿٤٨﴾

''اور ڈرو اس دن سے جب نہ بدلہ دے سکے گا کوئی شخص کسی کا کچھ بھی اور نہ قبول کی جائے گی اس کے لئے سفارش اور نہ لیا جائے گا اس سے کوئی معاوضہ اور نہ وہ مدد کیے جائیں گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا یہ امر ہے اور اس کا معنی وعید ہے، تقویٰ پر کلام پہلے گزر چکا ہے۔ يَوْمًا سے مراد اس دن کا عذاب اور ہول ہے۔ اس سے مراد قیامت کا دن ہے، يَوْمًا کی نصب اتَّقُوْا کی وجہ سے ہے، غیر قرآن میں یوم لا تجزی اضافت کے ساتھ بھی جائز ہے۔ کلام میں حذف ہے اس میں نحویوں کا اختلاف ہے۔ بصریوں نے کہا: تقدیر عبارت اس طرح ہے: یوما لا تجزی فیه نفس پھر فیه کو حذف کیا گیا۔ جیسا کہ شاعر نے کہا:

و یوما شهدناه سليماً و عامراً

اس دن سلیم اور عامر قبیلوں میں حاضر تھے۔

اصل میں شھدنا فیه تھا۔ کسائی نے کہا: یہ خطا ہے فیه کا حذف جائز نہیں لیکن تقدیر اس طرح ہے: واتقوا یوما لا تجزیه نفس تھا پھر ضمیر کو حذف کیا گیا اور ضمیر کا حذف کرنا جائز ہے کیونکہ ظروف کا ان کے نزدیک حذف کرنا جائز نہیں ہے اور فرمایا: یہ کہنا جائز نہیں ہے: ھذا رجلاً قصدت ولا رایت رجلاً ارغب۔ جبکہ تیری مراد یہ ہو قصدت الیه وارغب فیه۔ فرمایا: اگر یہ جائز ہوتا تو یہ بھی جائز ہوتا: الذی تکلمت زید۔ یعنی تکلمت فیه زید۔ فراء نے کہا: ضمیر اور فیه کا حذف کرنا جائز ہے۔ مہدوی نے حکایت کیا ہے کہ سیبویہ، اخفش اور زجاج کے نزدیک دونوں وجہیں جائز ہیں۔

لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْـًٔا کا مطلب یہ ہے کہ کسی دوسرے کے گناہ کی وجہ سے کسی سے مؤاخذہ نہ ہوگا اور کوئی نفس دوسرے کا دفاع نہیں کر سکے گا۔ جزی عنی ھذا الامر یجزی جیسے تو کہتا ہے قضی عنی۔ واجتزأت بالشیء اجتزاء کہا جاتا ہے جب تو کسی کی کفایت کرے۔ شاعر نے کہا:

فان الغدر فی الاقوام عار　　وان الحر یجزء بالکراع

اقوام میں غدر عار ہے، بے شک آزاد شخص جانور کے بازو پر کفایت کرتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: اذا اجریت الماء علی الماء جزیٰ عنك۔ جب تو پیشاب کے اوپر پانی بہا دے گا تو اس پر مکان کی طہارت کا حکم جاری ہوگا تجھے اس جگہ کو دھونے کی ضرورت نہیں اور کپڑے وغیرہ کے ساتھ پانی کو خشک کرنے کی ضرورت نہیں جیسا کہ اکثر لوگ کرتے ہیں۔ ابو بردہ بن نیار سے قربانی کے بارے میں صحیح حدیث میں ہے لن تجزی عن احد بعدك (1)۔ یعنی تیرے علاوہ کسی کے لئے بکری کا چھوٹا بچہ کفایت نہیں کرے گا۔ لَا تَجْزِیْ کا معنی لا تقضی، لا تغنی اور لا تکفی ہے۔ یعنی وہ ادا نہیں کرے گا، فائدہ نہیں دے گا اور کفایت نہیں کرے گا اگر اس پر کسی کا حق نہ ہوگا اگر اس پر کسی کا حق ہوگا تو وہ اس کی نیکیوں کے اختیار کے بغیر کفایت کرے گا اور ادا کرے گا اور فائدہ دے گا۔ جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اپنے بھائی پر اس کی عزت وغیرہ کے سلسلہ میں ظلم کیا ہو وہ آج ہی اس سے معاف کرا لے اس سے پہلے کہ نہ کوئی دینار ہوگا اور نہ درہم ہوگا، اگر اس کا عمل صالح ہوگا تو اس کے ظلم کی مقدار اس سے عمل صالح لیا جائے گا اگر اس کی نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کے گناہوں میں سے گناہ لے کر ظالم کے نامہ اعمال میں داخل کیے جائیں گے (2)۔ یہ حدیث بخاری نے نقل کی ہے اس کی مثل مفلس کے بارے میں حدیث ہے۔ ہم نے ''تذکرہ'' میں ذکر کر دی ہے۔ اسے مسلم نے تخریج کیا ہے اسے تجزئ تاء کے ضمہ اور ہمزہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ جزی اور اجزیٰ کا معنی ایک ہے۔ بعض نے ان کے درمیان فرق کیا ہے انہوں نے کہا: جزی بمعنی قضی ہے کافاً اور اجزیٰ بمعنی اغنی وکفی ہے۔ اجزانی الشی یجزئنی یعنی کفانی اس نے میری کفایت کی۔ شاعر نے کہا:

1۔ صحیح بخاری، کتاب العیدین، باب الاکل یوم النحر، حدیث نمبر 902، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، کتاب الرقاق، باب القصاص یوم القیامه، حدیث نمبر 6053، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لواجزأت امر العالمین ولم یکن بلیجزی الا کامل و ابن کامل

تو نے تمام لوگوں کے معاملات کی کفایت کی اور کوئی کفایت نہیں کرتا سوائے کامل اور ابن کامل کے۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ، شَفَاعَةٌ، شفع سے مشتق ہے جس کا معنی دو ہے۔ تو کہتا ہے: کان وترا فشفعتہ شفعا وہ طاق تھا میں نے اسے جفت بنا دیا۔ اسی سے الشفعہ ہے کیونکہ اپنے شریک کی ملک کو اپنی ملک سے ملا دیتا ہے۔

الشفیع، شفعہ کرنے والے کو کہتے ہیں اور شفاعت کرنے والے کو کہتے ہیں۔ ناقۃ شافع ایسی اونٹنی جس کا حمل اور بچہ متواتر جمع ہو جائیں۔ تو کہتا ہے: شفعت الناقۃ شفعاً۔ ناقۃ شفوع اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو ایک ہی مرتبہ دوہنے میں دو برتن بھرنے والی ہو۔ استشفعتہ الی فلانٍ یعنی میں نے اس سے سوال کیا کہ وہ میری اس کے پاس سفارش کرے۔ تشفعت الیہ لی فلانٍ فشفعنی۔ میں نے اسے فلاں کے پاس سفارش کرنے کے لئے کہا تو اس نے میری سفارش کی۔ پس شفاعت تب ہوگی جب تیرا غیر تیرے مرتبہ اور تیرے وسیلہ کے ساتھ ملے۔ یہ حقیقت میں جس کے پاس سفارش کی گئی ہے اس کے پاس شفیع کی منزلت و مرتبہ کا اظہار ہے اور اس کی منفعت مشفوع (جس کی سفارش کی گئی ہے) کو پہنچانا ہے۔

مسئلہ نمبر 4: اہل حق کا مذہب یہ ہے کہ شفاعت حق ہے۔ معتزلہ نے اس کا انکار کیا ہے وہ کہتے ہیں: گنہگار مومنین جو آگ میں داخل ہوں گے وہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے لیکن اخبار ظاہر میں ہے کہ موحدین گنہگار انبیاء کرام کی امتوں میں سے ہوں گے انہیں ملائکہ، انبیاء، شہداء اور صالحین میں سے سفارش کرنے والوں کی سفارش پہنچے گی۔ قاضی نے معتزلہ کا رد کرتے ہوئے دو چیزوں سے استدلال کیا ہے: (۱) وہ اخبار جو معنی میں متواتر ہیں۔ (۲) ان اخبار کے قبول کرنے پر سلف کا اجماع۔ کسی بھی زمانہ میں کسی شخص سے ان احادیث کا انکار ظاہر نہیں ہوا۔ شفاعت پر مبنی روایات اور ان کی صحت اور قبولیت پر علماء کا اتفاق، اہل حق کے عقیدہ کی صحت اور معتزلہ کے دین کے فساد پر قطعی دلیل ہے۔

اگر وہ کہیں کہ کتاب اللہ میں ایسی نصوص وارد ہیں جو ان اخبار کو رد کرتی ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ حَمِیْمٍ وَّلَا شَفِیْعٍ یُّطَاعُ ؁ (غافر) (نہ ہوگا ظالموں کے لئے کوئی دوست نہ ایسا سفارشی جس کی سفارش مانی جائے) وہ کہتے ہیں: گناہ کبیرہ کرنے والے ظالم ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِهٖ (النساء:123) (جو عمل کرے گا برے اسے سزا ملے گی) وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ (البقرہ:48) (اس سے شفاعت قبول نہ کی جائے گی) ہم کہتے ہیں: یہ آیات ہر ظالم کے لئے عام نہیں ہیں اور عموم کے لئے وضع نہیں ہے اور یہ آیات ہر برے عمل کرنے والے اور ہر نفس کے لئے نہیں ہیں ان سے مراد کافر لوگ ہیں نہ کہ مومنین۔ اس کی دلیل وہ اخبار ہیں جو شفاعت کے متعلق وارد ہیں، نیز اللہ تعالیٰ نے بعض اقوام کے لئے شفاعت کو ثابت کیا ہے اور بعض اقوام سے شفاعت کی نفی کی ہے۔ کافروں کی صفت میں فرمایا: فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِیْنَ ؁ (مدثر) (اور نہ نفع دے گی انہیں سفارش کرنے والوں کی سفارش) اور فرمایا: وَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی (الانبیاء:28) (اور سفارش نہیں کریں گے مگر اس کیلئے جسے وہ پسند فرمائے) اور فرمایا: وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ

عِنْدَہٗۤ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَہٗ (سبا:23) (اور نہ نفع دے گی سفارش اس کے ہاں مگر جس کے لئے اس نے اجازت دی ہو)

ہم نے ان تمام آیات سے جان لیا کہ شفاعت مومنوں کو نفع دے گی کافروں کو نفع نہ دے گی اور مفسرین کا اجماع ہے کہ وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْـًٔا وَّ لَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ سے مراد نفس کافرہ ہے نہ کہ ہر نفس، اگر ہم ہر ظالم گنہگار کے لئے عذاب کے عموم کا قول کریں بھی تو ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے۔ اس کی دلیل وہ اخبار ہیں جو ہم نے روایت کی ہیں اور دوسری دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ (النساء:48) (اور بخش دیتا ہے جو اس کے علاوہ ہے جس کو چاہتا ہے) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّهٗ لَا یَایْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (یوسف) (بلاشبہ مایوس نہیں ہوتے رحمت الٰہی سے مگر کافر لوگ۔)

اگر وہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا یَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى (الانبیاء:28) اور فاسق پر تو رضا نہیں ہوتی۔ ہم کہیں گے: اللہ تعالیٰ نے لمن لا یرضی نہیں فرمایا بلکہ لِمَنِ ارْتَضٰى (الانبیاء:28) فرمایا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جن کے لئے شفاعت کو پسند کرے گا وہ توحید پرست ہوں گے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: لَا یَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ۝ (مریم) (انہیں کوئی اختیار نہیں ہوگا شفاعت کا بجز ان کے جنہوں نے خداوند رحمٰن سے کوئی وعدہ لے لیا ہے) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوق سے کیا عہد ہے؟ فرمایا: وہ ایمان لائیں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں (1)۔ مفسرین نے کہا: مگر جس نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا۔ اگر وہ کہیں کہ جس پر اللہ راضی ہوتا ہے وہ توبہ کرنے والا ہے جس نے اللہ کی بارگاہ میں لوٹنے کا عہد کیا اس کی دلیل یہ ہے کہ فرشتے ان کے لئے مغفرت کرتے ہیں۔ اور فرمایا: فَاغْفِرْ لِلَّذِیْنَ تَابُوْا وَ اتَّبَعُوْا سَبِیْلَكَ (غافر:7) (بخش دے انہیں جنہوں نے (کفر سے) توبہ کی ہے اور پیروی کی ہے تیرے راستہ کی) اسی طرح انبیاء کرام کی شفاعت توبہ کرنے والوں کے لئے ہے اہل کبائر کے لئے نہیں ہے۔ ہم کہیں گے: تمہارے نزدیک اللہ پر توبہ قبول کرنا واجب ہے جب اللہ تعالیٰ گنہگار کی توبہ قبول کرے گا تو شفاعت اور استغفار کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔ اہل تفسیر کا اس بات پر اجماع ہے کہ فَاغْفِرْ لِلَّذِیْنَ تَابُوْا (غافر:7) سے مراد یہ ہے کہ ان کی مغفرت فرما جنہوں نے شرک سے توبہ کی وَ اتَّبَعُوْا سَبِیْلَكَ (غافر:7) یعنی مومنین کے راستہ کی اتباع کی۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ وہ ان کی مغفرت کرے ان کے گناہوں سے نہ کہ شرک سے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ (النساء:48) (اور بخش دیتا ہے جو اس کے علاوہ ہے جس کو چاہتا ہے۔) اگر وہ کہیں کہ ساری امت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت میں رغبت رکھتی ہے، اگر یہ اہل کبائر کا خاصہ تھی تو ان کا سوال باطل ہوا۔

ہم کہیں گے ہر مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت طلب کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے رغبت رکھتا ہے کہ اسے شفاعت نصیب ہو کیونکہ ہر شخص کا عقیدہ ہے کہ وہ گناہوں سے سلامت نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس پر جو فرض کیا ہے وہ اسے پوری طرح ادا کرنے والا نہیں ہے بلکہ ہر شخص اپنے بارے میں نقص کا معترف ہے اسی وجہ سے ہر شخص سزا سے ڈرتا ہے اور

1۔ صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب ارداف الرجل خلف الرجل مفہوم، حدیث نمبر 5510، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ مسند امام احمد حدیث 21991

نجات کی امید رکھتا ہے۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: کوئی شخص نجات نہیں پائے گا مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! ﷺ آپ بھی بغیر رحمت الٰہیہ کے نجات نہیں پائیں گے؟ فرمایا: ''میں بھی نجات نہیں پاؤں گا مگر مجھے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ڈھانپ دیا ہے(1)''۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ لَا يُقْبَلُ ابن کثیر اور ابو عمرو نے تقبل تاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ شفاعت مؤنث ہے۔ باقی قراء نے مذکر یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ کیونکہ شفاعت بمعنی شفیع ہے۔ اخفش نے کہا: تذکیر (مذکر کا صیغہ) بہتر ہے کیونکہ تو نے فعل اور فاعل کے درمیان فرق کیا ہے جس طرح کہ پیچھے فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ (البقرہ: 37) میں گزرا ہے۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ، عَدْلٌ سے مراد فدیہ ہے۔ العدل عین کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی الفداء ہے اور عین کے کسرہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی المثل ہے۔ کہا جاتا ہے: عَدْلٌ و عدیل اس لئے بولا جاتا ہے جو وزن اور مقدار میں تیری مثل ہو۔ کہا جاتا ہے: عدل الشیء جو چیز قدر و قیمت میں دوسری چیز کے مساوی ہو اگرچہ اس کی جنس سے نہ بھی ہو۔ العدل (عین کے کسرہ کے ساتھ) جو چیز اپنی جنس سے دوسری چیز کے مساوی ہو اور جسم میں مساوی ہو۔ طبری نے حکایت کیا ہے عرب عین کے کسرہ کے ساتھ فدیہ کے معنی میں استعمال کرتے ہیں (2) اور اعدال کا واحد عِدْلٌ ہی ہے (یعنی عین کے کسرہ کے ساتھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ۝ یعنی ان کی مدد نہیں کی جائے گی۔ النصر کا معنی العون (مدد) ہے۔ الانصار، الاعوان۔ اسی سے یہ ارشاد ہے: مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ (آل عمران: 52) یعنی کون اپنی نصرت کو میری نصرت کے ساتھ ملائے گا، انتصر الرجل، آدمی نے انتقام لیا۔ النصر کا معنی آنا بھی ہے۔ کہا جاتا ہے: نصرتُ ارض بنی فلاں، میں فلاں کی زمین میں آیا۔ شاعر نے کہا:

اذا دخل شهر الحرام فودعی   بلاد تميم وانصری ارض عامر

جب شہر حرام داخل ہو تو تمیم کے شہروں کو الوداع کہہ اور عامر قبیلہ کی زمین میں آ۔

النصر کا معنی بارش بھی ہے۔ کہا جاتا ہے: نُصِرَتِ الارضُ زمین پر بارش ہوئی۔ النصر کا معنی عطا بھی ہے۔ شاعر نے کہا:

وانی واسطار سطرن سطرا   لقائل یا نصر نصرا نصرا

ان سطور کی قسم جو لکھی گئی ہیں میں کہنے والا ہوں: اے عطا، عطا، عطا۔

اس آیت کا سبب جو علماء مفسرین نے ذکر فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے کہا: ہم اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور پیارے ہیں اور انبیاء کی اولاد ہیں، ہمارے آباء ہماری سفارش کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بتایا کہ قیامت کے روز سفارشات قبول نہیں کی

1۔ صحیح مسلم، کتاب التوبۃ، باب ان یدخل الجنۃ احد بعلمہ برحمۃ اللہ تعالیٰ، صفحہ 377، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)
ایضاً صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمداومۃ علی العمل، حدیث نمبر 5982، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 139، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

جائیں گی اور نہ فدیہ لیا جائے گا۔ شفاعت، فدیہ اور نصرت کا خاص طور پر ذکر فرمایا کیونکہ ان چیزوں کے بنی آدم دنیا میں عادی ہیں۔ تکلیف میں مبتلا خلاصی نہیں پاتا مگر اس کے ساتھ کہ اس کی سفارش کی جائے، یا اس کی مدد کی جائے یا فدیہ دیا جائے۔

وَ اِذْ نَجَّیْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ یَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ ۝

"اور یاد کرو جب نجات بخشی ہم نے تمہیں فرعونیوں سے جو پہنچاتے تھے تمہیں سخت عذاب یعنی ذبح کرتے تھے تمہارے بیٹوں کو اور زندہ رہنے دیتے تھے تمہاری عورتوں (بیٹیوں) کو اور اس میں بڑی بھاری آزمائش تھی تمہارے رب کی طرف سے"۔

اس آیت میں تیرہ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ نَجَّیْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ، اِذْ حالت نصب میں ہے۔ اس کا اُذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ پر عطف ہے۔ یہ اور بعد والی آیات میں بنی اسرائیل کو وہ بعض نعمتیں یاد دلاتا ہے جو ان پر تھیں۔ یعنی تم میری نعمت کو یاد کرو کہ میں نے تمہیں دشمن سے نجات دی اور تم میں انبیاء بنائے۔ یہ خطاب موجودہ لوگوں کو ہے اور مراد ان کے آباء ہیں۔ جیسا کہ فرمایا: اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِی الْجَارِیَةِ ۝ (الحاقہ) (یعنی ہم نے تمہارے آباء کو کشتی میں سوار کیا) بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نَجَّیْنٰكُمْ کیونکہ آباء کی نجات، موجودہ لوگوں کی نجات کا سبب تھی اور نَجَّیْنٰكُمْ کا معنی ہے ہم نے تمہیں زمین کی اونچی جگہ پر ڈالا، یہ اصل ہے پھر ہر کامیاب ہونے والے کو ناجی کہا گیا۔ پس ناجی وہ ہوتا ہے جو تنگی سے خوشحالی کی طرف نکلتا ہے اسے اذ انجیتکم بھی پڑھا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ، اٰلِ فِرْعَوْنَ سے مراد اس کی قوم، اس کے متبعین اور اس کے دین کے پیروکار ہیں۔ اسی طرح آل رسول جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دین، آپ کی ملت پر تھے کسی زمانہ میں بھی ہوں، خواہ ان کا نسبی تعلق ہو یا نہ ہو، اور جو آپ کے دین اور ملت پر نہ ہو وہ آپ کے اہل اور آل سے نہیں ہے اگرچہ اس کا نسبی اور قربت کا تعلق موجود بھی ہو۔ رافضیوں کا قول اس کے خلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں: آل رسول فقط حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم ہیں۔ ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ اَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ (البقرہ: 50) اور یہ ارشاد ہے: اَدْخِلُوْۤا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۝ (غافر) یعنی آل سے مراد اس کے دین کی آل ہیں جبکہ انہیں اس کے ساتھ بیٹا، بیٹی، چچا، بھائی اور عصبہ ہونے کا رشتہ نہ تھا اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ جو مومن، موحد نہیں وہ آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں اگرچہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قریبی بھی ہو۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ ابولہب اور ابوجہل آل نبی اور اہل نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے نہیں تھے اگرچہ ان دونوں کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ تھا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کے بارے میں فرمایا: اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ (ہود: 46)

اور صحیح مسلم میں حضرت عمرو بن عاص سے مروی ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلند آواز سے یہ کہتے ہوئے سنا:

خبردار! آل اَبی ...... یعنی فلان ...... میرے اولیاء نہیں ہیں میرا مددگار اللہ تعالیٰ اور نیک مومنین ہیں (1)۔ ایک طائفہ نے کہا: آل سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات اور آپ کی اولاد ہے۔ کیونکہ حضرت ابوحمید کی حدیث میں ہے، لوگوں نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہم آپ پر درود کیسے پڑھیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس طرح کہو: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى اَزْوَاجِهٖ وَ ذُرِّيَّتِهٖ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى آلِ اِبْرَاهِيْمَ وَ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى اَزْوَاجِهٖ وَ ذُرِّيَّتِهٖ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى آلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ (2)۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

اہل علم کے ایک گروہ نے کہا: اہل معلوم ہیں اور آل سے مراد متبعین ہیں۔

پہلا قول صحیح ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے اور حضرت عبداللہ بن ابی اوفی کی حدیث کی وجہ سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب کوئی قوم صدقہ لے کر آتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرماتے: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَيْهِمْ۔ میرا باپ صدقہ لے کر آیا تو یہ دعا دی اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى آلِ اَبِىْ اَوْفٰى (3)۔

مسئلہ نمبر 3: علمائے نحو کا اس میں اختلاف ہے کہ آل کو شہروں کی طرف مضاف کیا جائے گا یا نہیں۔ کسائی نے کہا: کہا جاتا ہے: آل فلان، آل فلانۃ، یہ نہیں کہا جاتا: ھُوَ مِنْ آلِ حِمْصَ، اور نہ یہ کہا جاتا ہے: مِنْ آلِ الْمَدِيْنَه۔ اخفش نے کہا: رئیس اعظم کے بارے میں کہا جاتا ہے، جیسے آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ آل فرعون۔ کیونکہ فرعون گمراہی میں ان کا رئیس تھا۔ اخفش نے کہا: ہم نے شہروں کے بارے میں سنا، وہ کہتے ہیں: اهل المدينه، آل المدينه۔

مسئلہ نمبر 4: نحویوں کا اختلاف ہے کہ آل کو ضمیر کی طرف مضاف کیا جائے گا یا نہیں۔ نحاس، زبیدی اور کسائی نے اس سے منع کیا ہے۔ پس صرف یہ کہا جائے گا: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ آلِ مُحَمَّدٍ (صلی اللہ علیہ وسلم) وآلہ نہیں کہا جائے گا۔ درست یہ ہے کہ یہ کہا جائے گا: اهله۔ علماء کے ایک طائفہ کا خیال ہے کہ آلہ کہا جائے گا ان علماء میں سے ابن السید بھی ہے اور یہ قول صحیح ہے کیونکہ سماع صحیح اس کی تائید کرتا ہے۔ عبدالمطلب کے قول میں ہے:

لا هُمَّ ان العبد يم نع رحله فامنع حلالك
وانصر على آل الصليب و عابديه اليوم آلك

ان اشعار میں آل کو ضمیر کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔

ندبہ نے کہا تھا:

أنا الفارس الحامی حقيقة والدی وآلی كما تحمی حقيقة آلكا

میں شہسوار ہوں اپنے والد کی عزت و جان کی حفاظت کرنے والا ہوں اور اپنی آل کی حفاظت کرنے والا ہوں جس طرح

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب موالاۃ المومنین ومقاطعۃ غیرھم، صفحہ 115، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، باب الصلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم، صفحہ 175، جلد 1۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 3118، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً، کتاب الزکوٰۃ، باب الدعاء لمن اتی بصدقتہ، صفحہ 46-345، جلد 1۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 1402، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تمہاری آل کی عزت و جان کی حفاظت کرنے والا ہوں۔

مسئلہ نمبر 5: آل کی اصل میں علمائے نحو کا اختلاف ہے۔ نحاس نے کہا: اس کی اصل اہل ہے پھر ھاء کو الف سے بدلا گیا۔ اگر تو اس کی تصغیر بنائے گا تو اس کو اصل کی طرف لوٹائے گا۔ تو کہے گا: اُھَیْل۔ مہدوی نے کہا: اس کی اصل اول ہے۔ بعض نے فرمایا: اصل اھل تھا ھاء کو ہمزہ سے قلب کیا گیا پھر ہمزہ کو الف سے بدلا گیا۔ اس کی جمع آلون ہے، اس کی تصغیر اویل ہے جیسا کہ نسائی نے بیان کیا ہے دوسرے لوگوں نے اھیل حکایت کیا ہے ہم نے نحاس سے یہ ذکر کیا ہے۔ ابوالحسن بن کیسان نے کہا: جب تو الآل کی جمع بنائے گا تو کہے گا آلون اور جب تو الآل کی جمع بنائے گا جس کا معنی سراب ہے تو تو کہے گا آوال، جیسے مال کی جمع اموال ہے۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِرْعَوْنَ بعض علماء نے فرمایا: اس بادشاہ کا نام ہی فرعون تھا۔ بعض نے فرمایا: عمالقہ کے بادشاہوں میں سے ہر بادشاہ کا اسم فرعون تھا۔ جیسے فارس کے بادشاہ کا لقب کسریٰ ہوتا ہے روم کے بادشاہ کا اسم قیصر ہوتا ہے حبشہ کے بادشاہ کا اسم نجاشی ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے فرعون کا اسم قابوس تھا۔ اہل کتاب کے قول کے مطابق وہب نے کہا: اس کا نام ولید بن مصعب بن ریان تھا اس کی کنیت ابو مرہ تھی۔ وہ بنی عملیق بن لاوذ بن ارم بن سام بن نوح علیہ السلام سے تھا۔ سہیلی نے کہا: ہر شخص جو قبطیوں اور مصر کا والی بنا وہ فرعون کہلاتا تھا۔ فرعون اہل اصطخر میں سے فارسی تھا۔ مسعودی نے کہا: فرعون کی عربی میں تفسیر معروف نہیں۔ جوہری نے کہا: فرعون، ولید بن مصعب بادشاہ مصر کا لقب ہے۔ ہر سرکش فرعون ہے، العتاۃ، فراعنہ، قد تفرعن، و ھو ذو فرعنۃ، یعنی سازشی اور انکاری۔ حدیث پاک میں ہے: اَخَذْنَا فِرْعَوْنَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ ہم نے اس امت کے فرعون کو پکڑا۔

اس آیت میں فرعون حالت جری میں ہے لیکن عجمہ ہونے کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔

مسئلہ نمبر 7: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَسُوْمُوْنَكُمْ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے: وہ تمہیں چکھاتے ہیں۔ تم پر عذاب کو لازم کرتے ہیں، ابوعبیدہ نے کہا: وہ تمہیں مستحق قرار دیتے ہیں، کہا جاتا ہے: سامہ خطة خسف۔ جب کسی ذلت کا مستحق قرار دیا جائے، اسی سے عمرو بن کلثوم کا قول ہے:

اذا ما الملك سام الناس خسفاً ابينا ان نقر الخسف فينا

جب بادشاہ نے لوگوں کو ذلیل کیا تو ہم نے اپنے اندر ذلت کے ٹھہرائے جانے کا انکار کیا۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے تمہیں ہمیشہ دیتے ہیں۔ السوم کا معنی دوام بھی ہے۔ اسی سے سائمۃ الغنم ہے جو ہمیشہ چرنے والی ہوتی ہیں۔ اخفش نے کہا: یہ محل رفع میں ہے کیونکہ یہ نیا کلام ہے۔ اگر تو چاہے تو اسے حال کی حیثیت سے محل نصب میں کردے۔ یعنی سائمین لکم۔

مسئلہ نمبر 8: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سُوْٓءَ الْعَذَابِ۔ یہ يَسُوْمُوْنَكُمْ کا مفعول ثانی ہے، اس کا معنی سخت عذاب ہے اور سوم العذاب کے معنی میں ہونا بھی جائز ہے اور اس کا سوما سیئا کے معنی میں نعت ہونا بھی جائز ہے۔ روایت ہے کہ

فرعون نے بنی اسرائیل کو خدام اور اپنے ماتحت کر دیا تھا اور ان میں اپنے کام تقسیم کر دیئے تھے۔ کچھ لوگ مکانات بناتے تھے، کچھ کھیتی باڑی کرتے تھے، کچھ خدمت کرتے تھے۔ اور فرعون کی قوم لشکر اور حکمران تھی اور بنی اسرائیل میں سے جس کا کوئی کام نہ تھا ان پر جزیہ لگایا گیا تھا اور یہی سُوْٓءَ الْعَذَابِ سے مراد ہے۔

مسئلہ نمبر 9: یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَ کُمْ یہ یَسُوْمُوْنَکُمْ سے بدل ہونے کی بنا پر بغیر واؤ عطف کے ہے۔ جیسا کہ سیبویہ نے کہا اور اس شعر سے استشہاد کیا ہے:

متی تاتنا تلمم بنا فی دیارنا تجد حطبا جزلا و ناراً تاجحا

جب ہمارے پاس آئے گا ہمارے شہروں میں اترے گا تو بہت زیادہ لکڑیاں روشن آگ پائے گی۔

فراء وغیرہ نے کہا: یُذَبِّحُوْنَ بغیر واؤ کے یَسُوْمُوْنَکُمْ کی تفسیر کے طور پر ہے جیسے تو کہتا ہے: اتانی القوم زید و عمرو۔ پس تفسیر کی بنا پر زید سے پہلے واؤ کی ضرورت نہیں۔ اس کی مثال یہ بھی ہے: وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ یَلْقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾ یُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ (فرقان)

اور سورۂ ابراہیم میں ویذبحون واؤ کے ساتھ ہے کیونکہ معنی یہ ہے کہ وہ تمہیں ذبح اور بغیر ذبح کے عذاب دیتے ہیں، پس یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَ کُمْ عذاب کی دوسری جنس ہے، ماقبل کی تفسیر نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: اس میں یہ احتمال ہے کہ اس میں واؤ زائدہ ہو۔ اس کی دلیل سورہ بقرہ کی آیت ہے کبھی واؤ زائدہ بھی ہوتی ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

فلما اجزنا ساحة الحی وانتحی

اس مصرعہ میں واؤ زائدہ ہے۔ مراد قد انتحی ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

الی الملك القرم و ابن الهمام ولیث الکتیبة فی المزدحم

یہاں بھی الملك القرم، ابن الهمام، لیث الکتیبه، سے ایک ہی مراد ہے۔ یہ اکثر ہوتا رہتا ہے۔

مسئلہ نمبر 10: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یُذَبِّحُوْنَ اکثر قراء شد کے ساتھ پڑھتے ہیں کثرت کا معنی لینے کی بنا پر۔ ابن محیصن نے یا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ الذّبح کا معنی الشق (چیرنا) ہے۔ الذِبح سے مراد مذبوح (ذبح کیا گیا) ہے۔ الذُباح، انگلیوں کی جڑوں میں پھٹن ہو جانا۔ ذبحت الدَنّ میں نے مٹکے میں سوراخ کر دیا۔ سعد الذابح ایک سعادت مند۔ المذابح۔ محاریب، المذابح، مذبح کی جمع۔ جب سیلاب آجائے اور زمین کو شق کر دے، تو جو شق بالشت بھر ہو اسے مذبح کہا جاتا ہے۔

فرعون بچوں کو ذبح کرتا تھا اور بچیوں کو باقی رکھتا تھا۔ بچیوں کو مال کے اعتبار سے نساء کے نام سے تعبیر فرمایا ہے۔ ایک جماعت نے کہا: یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَ کُمْ یعنی مردوں کو ذبح کرتے ہیں انہیں بیٹے کہا گیا جب وہ اسی طرح تھے۔ ابناء سے مراد

مرد لینے والوں نے نساء کم سے دلیل پکڑی ہے، پہلا قول اصح ہے کیونکہ یہ ظاہر ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 11: اللہ تعالیٰ نے فعل کو آل فرعون کی طرف منسوب کیا ہے کیونکہ وہ فرعون کے حکم سے یہ کرتے تھے، چونکہ یہ کام ان کے سپرد تھا، اس لئے فعل کی نسبت ان کی طرف کی۔ نیز اس لئے تاکہ معلوم ہو جائے کہ کام کرنے والا اپنے کام کی وجہ سے مؤاخذہ کا حقدار ہوگا۔ طبری نے کہا: یہ ارشاد تقاضا کرتا ہے کہ جس کو کسی ظالم نے کسی کو قتل کرنے کا حکم دیا اور اس نے اسے قتل کر دیا تو اس سے مؤاخذہ ہوگا۔ میں کہتا ہوں: علماء کے اس مسئلہ میں تین اقوال ہیں: دونوں کو قتل کیا جائے گا۔ ظالم حکم دینے کی وجہ سے اور مامور قتل کرنے کی وجہ سے۔ نخعی نے اسی طرح کہا ہے۔ امام شافعی اور امام مالک کا قول بھی یہی ہے مگر قدرے تفصیل کے ساتھ۔ امام شافعی نے فرمایا: جب سلطان کسی کو دوسرے شخص کے قتل کا حکم دے جبکہ مامور (جس کو حکم دیا گیا) جانتا ہو کہ اس نے اسے ظلماً قتل کرنے کا حکم دیا ہے، مامور اور امام دونوں پر قصاص ہوگا جیسے دونوں اکٹھا قتل کرنے والے ہوتے ہیں۔ اگر امام، مامور کو اس کے قتل پر مجبور کرے اور وہ جانتا ہو کہ وہ اسے ظلماً قتل کروا رہا ہے تو صرف امام پر قصاص ہوگا اور مامور کے بارے میں دو قول ہیں: ایک یہ کہ اس پر قصاص ہوگا اور دوسرا یہ کہ اس پر قصاص نہ ہوگا اور اس پر نصف دیت ہوگی۔ یہ ابن منذر نے بیان کیا ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: مامور کی یا تو یہ کیفیت ہوگی کہ اس پر آمر کی اطاعت لازم ہوگی اور وہ امام کے شر سے خوفزدہ ہوگا جیسے سلطان اور سردار اپنے غلام کے لئے۔ پس اس صورت میں قصاص دونوں کو لازم ہوگا یا ایسا ہوگا کہ اس پر حکم دینے والے کی اطاعت لازم نہ ہوگی، تو اس صورت میں صرف قتل کرنے والے کو قتل کیا جائے گا حکم دینے والے کو نہیں جیسے باپ اپنے بیٹے کو یا استاد کسی لڑکے کو یا کاریگر اپنے شاگرد کو حکم دے جب کہ وہ بالغ ہو۔ اگر وہ بالغ نہ ہو تو قتل حکم دینے والے پر ہوگا اور بچے کی عاقلہ پر نصف دیت ہوگی۔ ابن نافع نے کہا: مالک کو قتل نہیں کیا جائے گا جب وہ اپنے غلام کو کسی انسان کے قتل کا حکم دے اگرچہ وہ غلام عجمی بھی ہو۔ ابن حبیب نے کہا: میں ابن القاسم کے قول کے مطابق کہتا ہوں کہ دونوں کو قتل کیا جائے گا۔ اگر ایسے شخص نے حکم دیا جس کی مخالفت میں مامور پر کوئی خوف نہیں ہے تو وہ اکراہ (مجبور کرنے) کے ساتھ لاحق نہیں ہوگا بلکہ مامور کو قتل کیا جائے گا آمر کو نہیں اور آمر کو سزا دی جائے گی اور قید کیا جائے گا۔

امام احمد نے اس سردار کے بارے میں فرمایا جو اپنے غلام کو حکم دیتا ہے کہ وہ کسی کو قتل کرے، تو سردار کو قتل کیا جائے گا۔ یہ قول حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: غلام کو قید میں رکھا جائے گا۔ امام احمد نے فرمایا: غلام کو قید کیا جائے گا اور اسے مارا جائے گا اور ادب سکھایا جائے گا۔ ثوری نے کہا: سردار کو تعزیر لگائی جائے گی۔ حکم اور حماد نے کہا: غلام کو قتل کیا جائے گا۔ قتادہ نے کہا: دونوں کو قتل کیا جائے گا۔ امام شافعی نے فرمایا: اگر غلام فصیح تھا، سمجھدار تھا تو اسے قتل کیا جائے گا اور مالک کو سزا دی جائے گی اگر غلام عجمی تھا تو سردار پر قصاص ہوگا۔ سلیمان بن موسیٰ نے کہا: آمر کو قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کے ہاتھ کاٹے جائیں گے پھر اسے سزا دی جائے گی اور اسے قید کیا جائے گا۔ یہ دوسرا قول ہے۔ مامور کو قتل کیا جائے گا کیونکہ اس نے قتل کا فعل کیا ہے۔ اسی طرح عطا، حکم، حماد، شافعی، احمد اور اسحاق نے اس شخص کے بارے میں فرمایا جو کسی کو دوسرے شخص کے قتل کا حکم دیتا ہے۔ یہ ابن منذر نے ذکر کیا ہے۔ امام زفر نے کہا: ان میں سے کسی کو بھی قتل

نہیں کیا جائے گا۔ یہ تیسرا قول ہے۔ ابو المعالی نے "البرہان" میں بیان فرمایا ہے: ان کا خیال ہے کہ آمر اور مباشر ان میں سے کوئی قصاص میں مستقل نہیں ہے اسی وجہ سے ان کے نزدیک کسی کو بھی قتل نہیں کیا جائے گا۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 12: جمہور نے یُذَبِّحُوْنَ مبالغہ کے لئے شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن محیصن نے یَذْبَحُوْنَ تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ پہلا اولیٰ ہے کیونکہ ذبح میں تکرار تھا۔

فرعون نے خواب میں دیکھا کہ ایک آگ بیت المقدس سے نکلی ہے اور اس نے مصر کے گھروں کو جلا دیا ہے۔ اس کے خواب کی یہ تعبیر بتائی گئی کہ بنی اسرائیل سے ایک بچہ بڑا ہوگا، اس کے ہاتھوں فرعون کا ملک تباہ ہوگا۔ اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں جو قریب المعنی ہیں۔

مسئلہ نمبر 13: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَفِیْ ذٰلِکُمْ یہ تمام امور کی طرف اشارہ ہے کیونکہ وہ خبر ہے وہ مفرد حاضر کی طرح ہے یعنی ان کے اس فعل میں تمہارے لئے آزمائش و امتحان ہے۔ بَلَآءٌ اس سے مراد نعمت ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلِیُبْلِیَ الْمُؤْمِنِیْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا (انفال: 17) (تاکہ احسان فرمائے مومنوں پر اپنی جناب سے بہترین احسان) ابو الہیثم نے کہا: بلا کبھی اچھی ہوتی ہے کبھی بری۔ اس کا اصل معنی المحنۃ، (آزمانا) ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو اچھے عمل کے ساتھ آزماتا ہے تاکہ وہ اس کے شکر کا امتحان لے۔ کبھی کسی ناپسندیدہ مصیبت سے آزماتا ہے تاکہ اس کے صبر کا امتحان لے۔ بعض علماء نے فرمایا: اچھائی کے لئے بَلَآءٌ اور برائی کے لئے بلاء یہ ہروی نے حکایت کیا ہے۔ ایک قوم نے فرمایا: ذٰلِکُمْ کا اشارہ نجات دینے کی طرف ہے تو اس صورت میں بلا خیر میں ہوگا، یعنی تمہیں نجات دینا تم پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔ جمہور علماء نے کہا: اشارہ ذبح وغیرہ کی طرف ہے اور البلاء یہاں شر کے معنی میں ہے۔ معنی یہ ہے: ذبح میں مکروہ اور امتحان ہے۔ ابن کیسان نے کہا: خیر کے لئے فعل ابلاہ اللہ و بلاہ استعمال ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا:

جزی اللہ بالاحسان ما فعلا بکم و ابلاهما خیر البلاء الذی یبلو

اس شعر میں شاعر نے دونوں لغتوں کو جمع کیا ہے۔ اکثر خیر کے لئے ابلیتہ اور شر کیلئے بلوتہ اور آزمائش کے لئے ابتلیتہ و بلوتہ استعمال ہوتا ہے۔ یہ نحاس نے کہا ہے۔

وَاِذْ فَرَقْنَا بِکُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَیْنٰکُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝

"اور جب پھاڑ دیا ہم نے تمہارے لئے سمندر کو پھر ہم نے تم کو بچا لیا اور ڈبو دیا فرعونیوں کو اور تم کنارے پر کھڑے دیکھ رہے تھے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِذْ فَرَقْنَا بِکُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَیْنٰکُمْ، اِذْ محل نصب میں ہے اور فَرَقْنَا کا مطلب ہے ہم نے پھاڑ دیا، ہر حصہ ایک بڑے پہاڑ کی طرح۔ الفرق کا معنی جدا ہوتا ہے۔ اسی سے فرق الشعر اسی سے الفرقان ہے کیونکہ قرآن نے حق و باطل کے درمیان جدائی کی۔ اسی سے فالفارقات فرقاً ہے یعنی ملائکہ حق و باطل کے درمیان فرق کے ساتھ اترتے ہیں اسی سے یوم الفرقان ہے یعنی جنگ بدر کا دن۔ اس دن حق و باطل کے درمیان فرق ہوا۔ اسی سے وقرآنا فرقناہ یعنی

قرآن کو ہم نے بیان کیا اور اسے ہم نے پختہ کیا۔ زہری نے فَرَّقْنَا را کی شد کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی ہم نے اسے جدا جدا کر دیا۔ بِكُمُ کا معنی لکم ہے۔ با بمعنی لام ہے۔ بعض نے فرمایا: با اپنے معنی میں ہے۔ مطلب یہ ہے فَرَقْنَا الْبَحْرَ بِدُخُوْلِكُمْ اِیَّاهُ۔ ہم نے دریا کو پھاڑ دیا تمہارے اس میں داخل ہونے کے ساتھ۔ یعنی وہ دو پانیوں کے درمیان ہو گئے یعنی ان کے ساتھ جدائی ہوگئی۔ یہ اولیٰ ہے فانفلق اس معنی کو بیان کرتا ہے۔

الْبَحْرَ اس کا یہ نام اس کی وسعت کی وجہ سے ہے۔ کہا جاتا ہے: فرس بحر جبکہ گھوڑا زیادہ چلنے والا ہو۔ اسی سے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مندوب گھوڑے کے بارے میں ہے جو ابو طلحہ کا تھا۔ وَاِنْ وَجَدْنَاهُ لَبَحْرًا ہم نے اسے تیز رفتار پایا (1)۔

البحر، نمکین پانی کو بھی کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: ابحر الماء پانی نمکین ہوگیا۔ نصیب شاعر نے کہا:

وقد عاد ماء الارض بحراً فزادنی　　الی مرضی ان ابحر المشرب العذبُ

زمین کا پانی نمکین ہوگیا اس نے میری مرض میں اضافہ کیا کہ میٹھا پانی نمکین ہوگیا۔

الْبَحْرَ: شہر کو بھی کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: هذه بحرتنا یعنی یہ ہمارا شہر ہے۔ یہ اموی نے کہا ہے۔ الْبَحْرَ اس زخم کو بھی کہتے ہیں جو انسان کے گردے میں لگ جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں: لقیته صحرة بحرة یعنی میں اس سے بالکل واضح اور کھلے انداز میں ملا۔ کعب الاحبار سے ایک خبر میں مروی ہے، فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ایک فرشتہ ہے جس کا نام صندفائیل ہے۔ تمام دریا اس کے انگوٹھے کے گڑھے میں ہیں۔ ابو نعیم نے یہ روایت ثور بن یزید عن خالد بن معدان عن کعب کے سلسلہ سے روایت کی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَنْجَیْنٰكُمْ یعنی ہم نے تمہیں اس دریا سے نکالا۔ کہا جاتا ہے: نجوتُ من كذا نجاءً و نجاةً میں نے اسے اس سے نکالا۔ اس کا مصدر نجاء (ممدود) اور نجاۃ (مقصور) دونوں طرح آتا ہے۔ الصدق منجاةٌ سچ نجات دینے والا ہے۔ انجیت غیری و نجیته دونوں طرح پڑھا گیا ہے (وَاِذْ نَجَّیْنٰكُمْ اور فَاَنْجَیْنٰكُمْ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ۔ کہا جاتا ہے: غرق فی الماء غرقا فهو غریق و غارق۔ اسی سے ابو النجم کا قول ہے:

من بین مقتول و طاب غارقِ

اغرقه و غرقه فهو مغرق و غریقٌ۔ لجام مغرق بالفضةِ۔ یعنی چاندی سے مزین لگام۔ التغریق کا مطلب قتل بھی ہے۔ اعشیٰ نے کہا:

الا لیت قیسا غرقته القوابل

(کاش! قیس کو دایہ عورتیں قتل کر دیتیں)

چونکہ دایہ عورت قحط کے سال نومولود کو جھیل کے پانی میں غرق کر دیتی تھی خواہ وہ مذکر ہوتا یا مؤنث حتیٰ کہ وہ مر جاتا پھر ہر قتل کو

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب شجاعته ﷺ، صفحہ 252، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ) ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 2434، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تغریق بنایا گیا۔ اسی سے ذوالرمہ کا قول ہے:

اذا غرقت ارباضها ثنی بکرة بتیهاء لم تصبح رءوما سلوبها

یعنی جب رسیوں نے جوان اونٹنی کے دوسرے بطن کو قتل کر ڈالا تو وہ تھکاوٹ کی وجہ سے اپنے بچے پر مہربان نہ ہوئی۔

بنی اسرائیل کے نجات پانے کی کیفیت میں علماء کے مختلف اقوال

طبری نے ذکر کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی گئی کہ وہ مصر سے بنی اسرائیل کو رات کے وقت لے کر چلیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو کہا کہ وہ قبطیوں سے عاریۃً سامان اور زیورات لیں۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لئے یہ حلال کر دیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو رات کے ابتدائی حصہ میں لے کر چلے۔ فرعون کو پتا چلا تو اس نے کہا: کوئی شخص ان کا پیچھا نہ کرے حتیٰ کہ مرغ اذان دے۔ اس رات مصر میں کسی مرغ نے اذان نہ دی۔ اللہ تعالیٰ نے اس رات بہت سے قبطیوں کے بیٹوں کو موت دی، وہ ان کے دفن میں مشغول ہو گئے۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیچھے اس وقت نکلے جب سورج چڑھ چکا تھا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ۝ (الشعراء)

حضرت موسیٰ علیہ السلام دریا کی جانب چلے تھے حتیٰ کہ اس کے کنارے پر پہنچ گئے۔ بنی اسرائیل کی تعداد چھ لاکھ سے کچھ زائد تھی اور فرعونیوں کی تعداد بارہ لاکھ تھی (1)۔

بعض علماء نے فرمایا: فرعونیوں نے دس لاکھ گھوڑوں کے ساتھ ان کا پیچھا کیا۔ ان میں مؤنث گھوڑی کوئی نہیں تھی۔ بعض علماء نے فرمایا: حضرت یعقوب علیہ السلام مصر میں اپنی اولاد کے ساتھ ۷۶ افراد میں داخل ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تعداد کو بڑھایا اور ان کی اولاد میں برکت دی حتیٰ کہ فرعونیوں سے نکل کر دریا کی طرف گئے تو وہ بوڑھوں اور بچوں اور عورتوں کے علاوہ چھ لاکھ تھے۔ ابو بکر عبد اللہ بن محمد بن ابی شیبہ نے ذکر کیا ہے، فرمایا: ہمیں شبابہ بن سوار نے انہوں نے یونس بن اسحاق سے انہوں نے ابو اسحاق سے انہوں نے عمرو بن میمون سے انہوں نے حضرت عبد اللہ بن مسعود سے روایت کر کے بتایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل کو لے کر رات کو چلے تو فرعون کو خبر پہنچی۔ اس نے ایک بکری ذبح کرنے کا حکم دیا۔ وہ ذبح کی گئی۔ پھر اس نے کہا: اس کی کھال اتارنے سے فراغت سے پہلے میرے لئے چھ لاکھ قبطی جمع ہوں۔ فرمایا: حضرت موسیٰ علیہ السلام چلتے رہے حتیٰ کہ دریا تک پہنچ گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دریا سے کہا: پھٹ جا۔ دریا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: اے موسیٰ! تو نے تکبر کیا ہے، کیا میں اولاد آدم میں سے کسی کے لئے پھٹا ہوں کہ تمہارے لئے پھٹ جاؤں؟ راوی نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ایک شخص اپنے گھوڑے پر سوار تھا۔ اس شخص نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: اے اللہ کے نبی! کہاں کا حکم ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: مجھے اسی جانب جانے کا حکم دیا گیا ہے۔ پس اس شخص نے اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ وہ گھوڑا تیرتا ہوا باہر نکل گیا۔ پھر اس شخص نے پوچھا: اب کس سمت کا حکم دیا گیا ہے؟ فرمایا: اس طرف کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس شخص نے کہا: اللہ کی قسم! نہ تو نے جھوٹ بولا ہے اور نہ تجھ سے جھوٹ بولا

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 141، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

گیا ہے پھر دوبارہ اس نے گھوڑا دریا میں ڈالا وہ تیرتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس نے کہا: اے اللہ کے نبی! کہاں کا حکم دیا گیا ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: مجھے اسی طرف جانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس شخص نے کہا: اللہ کی قسم! نہ آپ نے جھوٹ بولا اور نہ آپ سے جھوٹ بولا گیا ہے۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی۔ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ (الشعراء:63) (کہ اپنا عصا دریا پر مارو) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عصا مارا تو دریا پھٹ گیا اور ہر حصہ بڑے پہاڑ کی طرح تھا اس میں بارہ راستے تھے کیونکہ بارہ قبائل تھے ہر قبیلہ کا ایک راستہ تھا وہ ایک دوسرے کو دکھائی دیتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پانی کے پہاڑوں میں کھڑکیاں اور سوراخ تھے جس سے وہ ایک دوسرے کو دیکھتے تھے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ باہر نکل گئے اور فرعونی ابھی دریا کے اندر تھے تو دریا نے انہیں طمانچے مارے اور انہیں غرق کر دیا۔

ذکر کیا جاتا ہے کہ وہ بحر قلزم تھا اور وہ شخص جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ گھوڑے پر سوار تھا وہ نوجوان یوشع بن نون تھا۔ اللہ تعالیٰ نے دریا کی طرف وحی فرمائی کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے پھٹ جائے جب وہ تجھ پر ضرب لگائیں۔ وہ دریا اس رات موجیں مارتا رہا جب صبح ہوئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دریا کو مارا اور اس کی کنیت ابو خالد رکھی۔

ابن ابی شیبہ نے بھی اس کو ذکر کیا ہے۔ اکثر مفسرین نے قصص میں یہ معنی بیان کیا ہے اور جو ہم نے ذکر کیا ہے وہ کافی ہے۔ مزید بیان ان شاء اللہ تعالیٰ سورۂ یونس اور سورۂ الشعراء میں آئے گا۔

فصل: اللہ تعالیٰ نے نجات دینے اور غرق کرنے کا ذکر فرمایا اور اس دن کا ذکر نہیں فرمایا جس میں یہ سب کچھ ہوا۔ مسلم نے حضرت ابن عباس سے روایت فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ آئے تو یہود کو پایا کہ وہ عاشوراء کا روزہ رکھتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ یہ کون سا دن ہے جس میں تم روزہ رکھتے ہو؟ یہودیوں نے کہا: یہ ایک عظیم دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو نجات عطا فرمائی اور فرعون اور اس کی قوم کو غرق کیا۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس دن بطور شکر روزہ رکھا تھا اس لئے ہم بھی روزہ رکھتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تم سے زیادہ قریبی ہیں۔ پس رسول اللہ ﷺ نے اس دن کا روزہ رکھا اور اس دن روزہ رکھنے کا حکم بھی دیا(1)۔ یہ حدیث بخاری نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام سے فرمایا: تم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیروی کرنے کے ان سے زیادہ مستحق ہو۔ پس تم روزہ رکھو۔

مسئلہ: ان احادیث کا ظاہر دلالت کرتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عاشوراء کا روزہ رکھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اقتدا میں اس دن کے روزے کا حکم دیا جیسا کہ یہود نے اس کے متعلق بتایا۔ حقیقت اس طرح نہیں کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے روایت کیا ہے، فرمایا: عاشوراء کے دن قریش زمانہ جاہلیت میں روزہ رکھتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ زمانہ جاہلیت میں عاشوراء کا روزہ رکھتے تھے جب آپ ﷺ مدینہ طیبہ آئے تو خود بھی یہ روزہ رکھا اور اس روزے کا حکم بھی فرمایا۔ جب رمضان فرض ہوا تو عاشوراء کے دن کا روزہ ترک کر دیا اور فرمایا: جو چاہے یہ روزہ رکھے اور جو چاہے یہ روزہ ترک کر

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب صوم یوم عاشوراء، صفحہ 359، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)۔ صحیح بخاری، حدیث نمبر 1865، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

دے(1)۔ بخاری اور مسلم نے یہ حدیث نقل کی ہے۔ اگر کہا جائے کہ یہ احتمال ہے کہ قریش نے یہود کے خبر دینے کی وجہ سے یہ روزہ رکھا ہو کیونکہ وہ ان سے سنتے تھے کیونکہ یہود ان کے نزدیک اہل علم تھے۔ پس نبی کریم ﷺ نے اسی طرح زمانہ جاہلیت میں مکہ میں روزہ رکھا ہو۔ جب آپ مدینہ طیبہ آئے اور یہود کو یہ روزہ رکھتے ہوئے پایا تو فرمایا: ہم تمہاری نسبت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زیادہ قریبی اور پیروی کے زیادہ مستحق ہیں(2)۔ پس آپ ﷺ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اتباع میں روزہ رکھا۔ امر بصیامہ یعنی اس دن کے روزہ کے امر کو مؤکد فرمایا حتیٰ کہ چھوٹے بچے بھی یہ روزہ رکھتے تھے۔ ہم کہیں گے: یہ اس شخص کا شبہ ہے جو کہتا ہے کہ نبی کریم ﷺ شاید حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے مکلف تھے حالانکہ حقیقت ایسی نہیں جیسا کہ سورۂ انعام آیت 90 میں فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ کے تحت مزید بیان آئے گا۔

مسئلہ: عاشوراء کے دن میں اختلاف ہے۔ کیا یہ نویں محرم الحرام کا دن ہے یا دسویں کا۔ امام شافعی کا مسلک یہ ہے کہ یہ نویں کا دن ہے۔ ان کی دلیل حکم بن اعرج کی حدیث ہے۔ انہوں نے کہا: میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس گیا وہ زمزم کے پاس اپنی چادر کو تکیہ بنائے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے کہا: مجھے عاشوراء کے روزہ کے متعلق بتاؤ۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: جب تو محرم کا چاند دیکھے تو شمار کر اور تو نویں محرم الحرام کو روزہ سے ہو۔ میں نے پوچھا: کیا حضرت محمد ﷺ اس طرح روزہ رکھتے تھے؟ انہوں نے کہا: ہاں (3)۔ یہ مسلم نے نقل کیا ہے۔ حضرات سعید بن مسیب، حسن بصری، امام مالک اور سلف کی ایک جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ وہ دسویں کا دن ہے۔ امام ترمذی نے حضرت حکم کی حدیث ذکر کی ہے اور اس پر صحت و حسن کا کوئی حکم بیان نہیں کیا پھر اس کے بعد یہ ذکر کیا: انبانا قتیبة انبأنا عبد الوارث عن یونس عن الحسن عن ابن عباس قال امر رسول الله ﷺ بصوم عاشوراء یوم العاشر۔ یعنی حضرت ابن عباس نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے دسویں کے دن عاشوراء کے روزے کا حکم دیا(4)۔ پھر فرمایا: ابو عیسیٰ نے کہا: حضرت ابن عباس کی حدیث حسن، صحیح ہے۔ امام ترمذی نے کہا: حضرت ابن عباس سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: نویں اور دسویں محرم کا روزہ رکھو اور یہود کی مخالفت کرو۔ اس حدیث کی وجہ سے امام شافعی، احمد بن حنبل اور اسحاق بھی یہی کہتے ہیں۔ دوسرے علماء نے کہا: حضرت ابن عباس کا سائل کو یہ کہنا: تو شمار کر اور نویں کے دن روزے سے ہو۔ اس میں دسویں کے روزے کے ترک پر کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ وعدہ کیا کہ وہ دسویں کے ساتھ نویں کا بھی روزہ رکھے۔ پس دونوں دن روزہ رکھنا دونوں احادیث کو جمع کرنا ہے۔ اور حضرت ابن عباس کا حکم کو جواب جب اس نے پوچھا کیا رسول اللہ ﷺ روزہ رکھتے تھے؟ حضرت ابن عباس نے فرمایا: ہاں۔ اس کا مطلب ہے اگر آپ زندہ رہتے۔ وگرنہ نبی کریم ﷺ نے کبھی نویں محرم کا روزہ نہیں رکھا تھا۔ اس کا بیان اس روایت میں ہے جو ابن ماجہ نے اپنی سنن میں اور مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لَئِنْ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب صوم یوم عاشوراء، صفحہ 358، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ) ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 1883، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، صفحہ 359، جلد 1 3۔ ایضاً

4۔ جامع ترمذی، ابواب الصوم، باب ماجاء فی عاشوراء ای یوم ھو، صفحہ 94، جلد 1 (وزارت تعلیم)

بَقِيْتُ اِلٰى قَابِلٍ لَاَصُوْمَنَّ الْيَوْمَ التَّاسِعَ (1) اگر میں آئندہ سال تک باقی رہا تو میں نویں (محرم) کا روزہ ضرور رکھوں گا۔

فضیلت: حضرت ابوقتادہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عاشوراء کے دن کا روزہ، اللہ تعالیٰ سے اس پر امید کی جاتی ہے کہ پچھلے سال کا کفارہ بن جائے (2)۔ اس روایت کو مسلم اور ترمذی نے نقل کیا ہے۔ امام ترمذی نے فرمایا: ہم کسی روایت کو نہیں جانتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو کہ عاشوراء کے دن کا روزہ سال کا کفارہ ہے (3) سوائے حضرت ابو قتادہ کی حدیث کے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ یہ جملہ حال ہے۔ اس کا معنی ہے تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ فرعونی مردہ حالت میں پانی پر تیرنے لگے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے انہیں غرق ہوتے دیکھا اور اپنی نجات کو بھی دیکھا۔ اس میں اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: فرعونیوں کو ان کے لئے نکالا گیا تھا حتیٰ کہ انہوں نے انہیں دیکھا۔ یہ احسان کے بعد دوسرا احسان ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ یعنی تم عبرت کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے، کیونکہ وہ آنکھوں کے ساتھ دیکھنے اور آگاہ ہونے سے غافل تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی یہ ہے کہ تم اس آدمی کی حالت میں تھے جو دیکھنا چاہے تو دیکھ سکے جیسے تو کہتا ہے: ھذا الامر منك لمرأى و مسمع یعنی اس حالت میں ہے کہ تو اسے دیکھ سکے اور سن سکے اگر تو چاہے۔ یہ قول اور پہلا قول بنی اسرائیل کے احوال کے زیادہ مطابق ہے کیونکہ دریا سے نکلنے کے بعد بنی اسرائیل سے جو صادر ہوا اس میں متواتر عبرت نہیں ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب انہیں نجات دی اور ان کے دشمن کو غرق کیا تو انہوں نے کہا: اے موسیٰ! ہمارے دل مطمئن نہیں ہیں کہ فرعون غرق ہو گیا ہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے دریا کو حکم دیا اس نے فرعون کو باہر پھینک دیا اور انہوں نے اسے دیکھا۔

ابوبکر بن ابی شیبہ نے قیس بن عباد سے روایت کیا ہے کہ بنی اسرائیل نے کہا: فرعون نہیں مرا اور وہ کبھی نہیں مرے گا۔ جب اللہ تعالیٰ نے سنا کہ وہ اس کے نبی کو جھٹلا رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اسے دریا کے کنارے پر پھینک دیا گویا وہ سرخ بیل ہے۔ بنی اسرائیل نے اسے دیکھا جب وہ مطمئن ہو گئے تو انہیں خشکی کے راستہ سے فرعون کے شہروں کی طرف بھیجا گیا حتیٰ کہ انہوں نے اس کے خزانے منتقل کیے اور نعمتوں میں غرق ہو گئے۔ انہوں نے ایک قوم کو دیکھا کہ وہ بتوں کے پاس معتکف ہے، تو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: اے موسیٰ! ہمارے لئے ایک معبود بنائیں جس طرح ان کے لئے معبود ہیں۔ حتیٰ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں جھڑکا اور فرمایا: کیا اللہ تعالیٰ کے علاوہ میں تمہارے لئے معبود تلاش کروں؟ اس نے تمہیں اپنے زمانہ کے لوگوں پر فضیلت دی ہے۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں ارض مقدس کی طرف چلنے کا حکم دیا جہاں ان کے آباء واجداد کے گھر تھے، تا کہ وہ فرعون کی زمین سے پاک ہو جائیں۔ ارض مقدسہ اس وقت جابر لوگوں کے ہاتھ میں تھی جو اس پر غالب تھے۔ پس انہیں اس زمین سے نکالنے کے لئے جنگ کی ضرورت تھی تو بنی اسرائیل نے کہا: (اے موسیٰ!) کیا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب صوم یوم عاشوراء، صفحہ 359، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ جامع ترمذی، ابواب الصوم، باب ما جاء فی الحث علی صوم یوم عاشوراء، صفحہ 94، جلد 1 (و، ت)

3۔ ایضاً، حدیث 683

تم ہمیں جابر لوگوں کے لئے شکار بنانا چاہتے ہو؟ اگر تم ہمیں فرعون کے ہاتھ میں رہنے دیتے تو ہمارے لئے بہتر تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: یٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ... الی قٰعِدُوْنَ۔ (المائدہ:21)، (داخل ہو جاؤ اس پاک زمین میں جسے لکھ دیا ہے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے...... الخ)

حتیٰ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے لئے بددعا فرمائی اور انہیں فاسقین کا نام دیا۔ پس وہ ''تیہ'' کے صحرا میں چالیس سال بطور سزا رہے پھر ان پر اللہ تعالیٰ نے سلویٰ اور بادل کے ذریعے احسان فرمایا...... جیسا کہ آگے آئے گا ...... پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام طور سیناء کی طرف چلے تا کہ ان کے لئے تورات لے آئیں۔ پس انہوں نے پیچھے بچھڑے کو معبود بنا لیا...... اس کا بیان آگے آئے گا ...... پھر انہیں کہا گیا: تم بیت المقدس پہنچ چکے ہو تو دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو اور حطۃٌ کہتے ہوئے داخل ہو اس کا بیان بھی آگے آئے گا...... حضرت موسیٰ علیہ السلام انتہائی حیاء دار اور پردہ پوش تھے۔ بنی اسرائیل نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خصیتین کی بیماری ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام غسل کرنے لگے تو اپنے کپڑے ایک پتھر پر رکھے تو وہ پتھر آپ کے کپڑے لے کر بنی اسرائیل کی مجالس کی طرف بھاگ گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام برہنہ اس کے پیچھے دوڑے اور کہہ رہے تھے: اے پتھر! میرے کپڑے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے یہی مراد ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا (احزاب:69) (1) اس کا بیان بھی آگے آئے گا...... پھر جب حضرت ہارون کا وصال ہو گیا تو بنی اسرائیل نے کہا: تو نے ہارون کو قتل کیا ہے اور تو نے اس سے حسد کیا ہے حتیٰ کہ ملائکہ ان کی چارپائی لے آئے اور حضرت ہارون علیہ السلام اس پر مردہ تھے۔ اس کا بیان سورۂ مائدہ میں آئے گا۔ پھر انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا کہ وہ اپنی قربانی کی قبولیت کی نشانی جان لیں۔ پس ایک آگ آسمان سے آتی (اور ان کی قربانیوں کو کھا جاتی) تو یہ ان کی قربانیوں کی قبولیت کی نشانی تھی۔ پھر بنی اسرائیل نے سوال کیا کہ ہمارے لئے آپ دنیا میں گناہوں کے کفارات کو بیان فرمائیں۔ پس جو گناہ کرتا اس کے دروازے پر لکھا جاتا عملت کذا تو نے ایسا عمل کیا اور اس کا کفارہ اپنے اعضاء میں سے عضو کا کاٹنا ہے۔ اس عضو کا نام لیا جاتا تھا، جس کو پیشاب لگ جاتا تو وہ پاک نہ ہوتا تھا حتیٰ کہ وہ کپڑے کو کاٹ دیتا تھا اور اپنے بدن سے جلد کو دور کر دیتا تھا پھر انہوں نے تورات کو بدلا اور اللہ تعالیٰ پر افترا باندھا، اپنے ہاتھوں سے تورات میں لکھا اور تورات کے عوض سامان زندگی لیا، پھر یہاں تک پہنچے کہ اپنے انبیاء اور رسل کو قتل کیا یہ ان کے معاملات اپنے رب کے ساتھ تھے اور ان میں ان کا یہ کردار تھا اور یہ ان کا برا اخلاق تھا۔ ان شاء اللہ ان میں سے ہر فصل کا پورا بیان اپنے مقام پر آئے گا۔

طبری نے کہا: ان مغیبات کا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان کے ذریعے قرآن میں بیان جن کا عربوں کو علم نہ تھا اور یہ بنی اسرائیل کے حق میں واقع ہوئے تھے۔ یہ بنی اسرائیل کے پاس حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی واضح دلیل تھے (2)۔

1۔ صحیح بخاری، صفحہ 42، جلد 1 (وزارت تعلیم)۔ ایضاً، کتاب الغسل، باب من اغتسل عریاناً وحدہ فی الخلوۃ الخ، حدیث 269، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 142، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

وَ اِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝

''اور یاد کرو جب ہم نے وعدہ فرمایا موسیٰ سے چالیس رات کا پھر بنالیا تم نے بچھڑے کو (معبود) ان کے بعد اور تم سخت ظالم تھے''۔

اس آیت میں چھ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ابو عمرو نے وعدنا بغیر الف کے پڑھا ہے۔ ابو عبید نے اسے اختیار کیا ہے اور اسے راجح قرار دیا ہے اور واعدنا کا انکار کیا ہے۔ انہوں نے کہا: مواعدہ انسان کی طرف سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ وعدہ اور وعید میں منفرد ہے۔ اسی پر ہم نے قرآن کے الفاظ کو پایا۔ جیسے ارشاد ہے: وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ (ابراہیم: 22) (جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ وعدہ سچا تھا) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (نور: 55) (وعدہ فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے تم میں سے اور نیک عمل کیے) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآىِٕفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ (انفال: 7) (اور یاد کرو جب وعدہ فرمایا تم سے اللہ نے ایک کا ان دو گروہوں سے کہ وہ تمہارے لئے ہے)۔

مکی نے کہا: الفاظ کا ظاہر بھی اس کی تائید کرتا ہے کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے وعدہ ہے اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے کوئی وعدہ نہیں ہے۔ پس اس کو واحد پر محمول کرنا واجب ہے ظاہر نص کی وجہ سے کیونکہ فعل صرف اللہ تعالیٰ کی طرف مضاف ہے۔ یہ حسن، ابو رجاء، ابو جعفر، شیبہ اور عیسیٰ بن عمر کی قراءت ہے۔ قتادہ اور ابن ابی اسحاق نے بھی اسی طرح پڑھا ہے۔ ابو حاتم نے کہا: ہمارے نزدیک عام لوگوں کی قراءت وعدنا بغیر الف کے ہے کیونکہ المواعدۃ زیادہ تر دو شخصوں اور دو بدلہ دینے والوں کے درمیان ہوتا ہے ہر ایک دوسرے سے وعدہ کرتا ہے۔ جوہری نے کہا المیعاد کا معنی باہم وعدہ کرنا، وقت اور جگہ ہے۔ مکی نے کہا: المواعدۃ اصل میں دو شخصوں کے درمیان ہوتا ہے۔ کبھی کلام عرب میں (باب) مفاعلہ کا صیغہ واحد کے لئے بھی آتا ہے۔ عرب کہتے ہیں: طَارَقْتُ النَّعْلَ، دَاوَيْتُ الْعَلِيْلَ، عَاقَبْتُ اللِّصَّ۔ ان تمام جملوں میں باب مفاعلہ کا صیغہ استعمال ہوا ہے حالانکہ ایک شخص کی طرف سے فعل ہوا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کی طرف سے مواعدہ کا لفظ خاص حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے وعدنا کے معنی کی طرح ہوگا۔ پس دونوں قراءتوں کا ایک معنی ہو جائے گا، واعدنا الف کے ساتھ اختیار کرنا اس لئے ہے کیونکہ یہ وعدنا کے معنی میں ہے اس کے دو معانی میں سے ایک معنی میں، نیز حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے وعدہ یا قبول کرنا ضروری ہے جو وعدہ کے قائم مقام ہے۔ پس مفاعلہ کا استعمال صحیح ہے۔

نحاس نے کہا: واعدنا (الف کے ساتھ) پڑھنا اجود اور احسن ہے۔ یہ مجاہد، اعرج، ابن کثیر، نافع، اعمش، حمزہ اور کسائی کی قراءت ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے کیونکہ واعدنا موسیٰ یہ باب الموافات ہے۔ وعدہ اور وعید میں سے کوئی شئے نہیں ہے، یہ تیرے اس قول سے ہے: موعدك يوم

الجمعہ موعدك موضع كذا اس میں فصیح واعدتہ کہنا ہے۔ ابو اسحاق زجاج نے کہا: یہاں واعدنا الف کے ساتھ بہتر ہے کیونکہ طاعت کا قبول کرنا مواعدہ کے قائم مقام ہے۔ پس یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے قبول اور اتباع ہے۔ یہ مواعدہ کے قائم مقام ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: ابو عبیدہ نے وعدنا کو ترجیح دی ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ کے وعدہ کو قبول کرنا اور اس کا التزام کرنا یہ مواعدہ کے مشابہ ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد مُوْسَى یہ عجمی اسم ہے۔ عجمہ اور تعریف کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ ایک روایت کے مطابق قبطی لوگ پانی کو مو اور درخت کو شا (سا) کہتے ہیں۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام تابوت میں پانی اور درخت کے پاس پائے گئے تو انہیں موسیٰ کہا گیا(1)۔ سدی نے کہا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو ان پر خوف ہوا تو اس نے انہیں ایک تابوت میں رکھ دیا اور دریا میں پھینک دیا...... جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے الہام کیا تھا...... اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو درختوں کے درمیان فرعون کے گھر کے قریب دریا میں ڈال دیا۔ فرعون کی بیوی آسیہ کی لونڈیاں غسل کرنے کے لئے نکلیں تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پایا۔ پس اس مکان کے نام سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ نام رکھا گیا(2)۔ نقاش وغیرہ نے ذکر کیا ہے کہ جس عورت نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اٹھایا تھا اس کا نام صابوت تھا۔ ابن اسحاق نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا شجرہ نسب اس طرح ہے۔ موسیٰ بن عمران بن یصہر بن قاہث بن لاوی بن یعقوب اسرائیل اللہ بن اسحاق بن ابراہیم علیہ السلام(3)۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً، اَرْبَعِيْنَ مفعول ثانی کی بنا پر منصوب ہے اور کلام میں حذف ہے۔ اخفش نے کہا: تقدیر عبارت اس طرح ہے: واذ واعدنا موسی تمام اربعین لیلۃ جیسا کہ وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ (یوسف: 82) میں مضاف حذف ہے الاربعون تمام اس وعدہ میں داخل ہیں۔

اکثر مفسرین کا قول ہے کہ یہ چالیس دن ذی القعدہ کا مہینہ اور دس دن ذی الحجہ کے تھے اور یہ اس کے بعد ہوا جب آپ نے دریا عبور کر لیا تھا اور آپ کی قوم نے آپ سے مطالبہ کیا کہ اللہ کی طرف سے ہمارے پاس کتاب لے آئیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے ستر چیدہ افراد لے کر باہر نکلے اور ایک پہاڑ پر چڑھے اور ان سے مکمل چالیس راتوں کا وعدہ فرمایا، تو مفسرین کے قول کے مطابق انہوں نے بیس دن اور بیس راتیں شمار کیں اور کہنے لگے: ہم سے وعدہ خلافی ہوئی ہے۔ پس انہوں نے ایک بچھڑے کو معبود بنا لیا۔ سامری نے انہیں کہا: یہ تمہارا خدا ہے اور موسیٰ کا خدا ہے، وہ سامری کی اس بات پر مطمئن ہو گئے۔ حضرت ہارون نے انہیں منع فرمایا اور فرمایا: يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَ اِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَ اَطِيْعُوْۤا اَمْرِيْ ۝ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ۝ (طہ) (اے میری قوم تم تو فتنہ میں مبتلا ہو گئے اس سے اور بلاشبہ تمہارا رب تو وہ ہے جو بے حد مہربان ہے پس تم میری پیروی کرو اور میرا حکم مانو تو قوم نے کہا ہم تو اسی کی عبادت پر جمے رہیں گے یہاں تک کہ لوٹ آئیں ہماری طرف موسیٰ علیہ السلام)۔ حضرت ہارون کی صرف بارہ ہزار نے بات

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 142، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ النکت والعیون، صفحہ 120، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 142، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

مانی باقیوں نے بچھڑے کی عبادت ترک کرنے میں حضرت ہارون کی اتباع نہ کی اور تمام لوگ اس بچھڑے کی عبادت میں گر گئے اور وہ دس لاکھ سے زائد تھے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس آئے تو انہیں اس حال میں پایا آپ نے تختیاں نیچے ڈال دیں۔ پس ان میں سے چھ اجزاء اٹھالئے گئے اور ایک تختی باقی رہ گئی جس میں حرام، حلال اور جن احکام کی انہیں احتیاج تھی وہ باقی رہ گئی۔ حضرت موسیٰ نے اس بچھڑے کو جلا دیا اور اس کی راکھ کو سمندر میں بکھیر دیا، بنی اسرائیل نے بچھڑے کی محبت کی وجہ سے اس دریا کا پانی پیا۔ پس ان کے ہونٹوں پر زردی ظاہر ہوئی اور ان کے پیٹ پھول گئے۔ پھر انہوں نے توبہ کی تو ان کی توبہ قبول نہ ہوئی حتیٰ کہ وہ اپنے آپ کو قتل کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (البقرہ:54) پس چاہئے کہ توبہ کرو اپنے خالق کے حضور سو قتل کرو اپنے آپ کو۔

پس انہوں نے خنجر اور تلواریں اٹھائیں اور سورج کے طلوع ہونے سے چاشت کے بلند ہونے تک ایک دوسرے کو قتل کرتے رہے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو قتل کیا کسی والد نے اپنے بیٹے کے بارے میں اور کسی بیٹے نے والد کے بارے میں، اور بھائی نے بھائی کے بارے میں نہ پوچھا جو سامنے آیا اسے تلوار سے قتل کر دیا اسی طرح ہر ایک نے اپنی مثل کو قتل کیا حتیٰ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گڑگڑا کر التجا کی: یا رب! بنی اسرائیل تو ختم ہو گئے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم فرمایا اور ان پر اپنا فضل فرمایا۔ پس جو باقی بچ گئے ان کی توبہ قبول فرمائی اور جو مارے گئے انہیں شہداء میں شمار کر دیا جیسا کہ آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 4: اگر کہا جائے کہ راتوں کو ذکر کے ساتھ خاص کیوں کیا گیا دنوں کا ذکر کیوں نہیں فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ رات دن سے پہلے ہوتی ہے، یہ رتبہ میں دن سے بلند ہے۔ اسی وجہ سے تاریخ راتوں کے ساتھ واقع ہوتی ہے۔ راتیں مہینوں کا آغاز ہیں اور دن ان کے تابع ہیں۔

مسئلہ نمبر 5: نقاش نے کہا: اس آیت میں صوم وصال کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اگر دنوں کا ذکر فرماتا تو یہ اعتقاد ممکن تھا کہ وہ رات کو افطار کرتے تھے۔ جب راتوں پر نص قائم فرما دی تو کلام کی قوت تقاضا کرتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چالیس دن، راتوں سمیت صوم وصال رکھا۔ ابن عطیہ نے کہا: میں نے اپنے باپ سے سنا، وہ فرما رہے تھے: میں نے شیخ، زاہد، امام، واعظ ابوالفضل الجوہری رحمۃ اللہ علیہ سے سنا وہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ اور نماز میں اس کے قریب ہونے کے بارے میں وعظ فرما رہے تھے کہ نماز کھانے پینے سے غافل کر دیتی ہے اور وہ فرما رہے تھے: حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا کتنا قرب نصیب ہوگا کہ انہوں نے حضرت خضر علیہ السلام کی طرف جاتے ہوئے اپنے نوجوان ساتھی کو کہا تھا: آتنا غداءنا، اس قول کی وجہ سے انہوں نے زمانہ کے اسی روزے وصال کے ساتھ رکھے (1)۔

میں کہتا ہوں: اس آیت سے علماء صوفیہ نے وصال پر استدلال کیا ہے اور ان میں افضل چالیس دن ہیں۔ مزید کلام صوم وصال پر، آیت صیام کے تحت اسی سورت میں آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اور اس آیت کے مزید احکام سورۂ اعراف میں و

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 142، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

وٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً (اعراف:142) کے تحت آئیں گے۔ اور بچھڑے کا قصہ، اس کی کیفیت کا بیان اور اس کا ذکار نا وغیرہ کا ذکر سورۂ اعراف میں اور سورۂ طٰہٰ میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ یعنی تم نے بچھڑے کو معبود بنالیا موسیٰ علیہ السلام کے بعد۔ اتَّخَذْتُمْ اصل میں ائتخذتم تھا یہ الاخذ سے مشتق ہے۔ اس کا وزن افتعلتم ہے دو ہمزوں کے امتناع کی وجہ سے دوسرے ہمزہ میں تسہیل کی گئی پھر ایتخذتم ہوا، اور یاء گردان میں مضطرب رہتی ہے یاتخذ میں الف ہوگئی موتخذ میں واؤ ہوگی۔ پس یہاں یاء کو ایک پختہ حرف سے بدلا گیا جو مابعد کی جنس سے تھا اور وہ تاء ہے پھر ادغام کیا گیا پھر الف وصل کو نطق (بولنے) کے لئے لایا گیا۔ کبھی اس الف سے استغناء کیا جاتا ہے جب کلام کا معنی تقریر ہو جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا (البقرہ:80) الف تقریر کی وجہ سے الف وصل سے استغناء کیا گیا۔ شاعر نے کہا:

استحدثَ الرکب عن اشیاعهم خبراً ام راجع القلب من اطرابه طربُ

اس شعر میں الف وصل ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ الف تقریر موجود تھا۔ اسی طرح قرآن میں ہے: اَطَّلَعَ الْغَيْبَ (مریم:78) اَصْطَفَى الْبَنَاتِ (الصافات:153) اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ (ص) ان تینوں مثالوں میں تقریر کی وجہ سے الف وصل ذکر نہیں کیا گیا۔ ابوعلی فارسی کا مذہب یہ ہے کہ اتَّخَذْتُمْ یہ تخذ سے ہے نہ کہ اخذ سے ہے۔ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ یہ جملہ حال ہے، ظلم کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

''پھر بھی درگزر فرمایا ہم نے تم سے اس (ظلم عظیم) کے بعد شاید کہ تم شکر گزار بن جاؤ''۔

اس میں چار مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ، العفو، اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوق کو معاف کرنا۔ کبھی عفو سزا کے بعد ہوتا ہے اور کبھی سزا سے پہلے، بخلاف الغفران کے کہ اس کے ساتھ یقیناً عقوبت ہوتی ہے۔ ہر وہ شخص جو عقوبت کا مستحق ہو پھر اسے سزا (عقوبت) نہ دی گئی ہو تو اسے معاف کیا گیا۔ العفو کا مطلب گناہ کو مٹانا ہے، یعنی ہم نے تمہارے گناہوں کو مٹا دیا اور تم سے تجاوز کیا۔ یہ عفت الریح الاثر سے ماخوذ ہے یعنی ہوا نے اثر مٹا دیا، عفا الشیٔ کسی شے کا کثیر ہونا یہ اضداد میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰى عَفَوْا (اعراف:95)

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ یعنی تمہاری بچھڑے کی عبادت کرنے کے بعد۔ بچھڑے کو عجل اس لئے کہا گیا کہ بنی اسرائیل نے اس کی عبادت میں جلدی کی تھی۔ واللہ اعلم

العجل گائے کے بچے کو کہتے ہیں العجول بھی اسی کو کہتے ہیں اس کی جمع العجاجیل اور مؤنث عجلۃٌ آتی ہے۔ یہ ابوالجراح سے روایت ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ تاکہ تم شکر ادا کرو اللہ تعالیٰ کے عفو کا۔ لعل کا معنی پہلے گزر چکا

ہے، رہا شکر تو لغت میں اس کا معنی ظہور (ظاہر ہونا) ہے۔
دابۃٌ شکور وہ جانور جس پر موٹاپا اس سے زیادہ ظاہر ہو جائے جتنا اسے چارہ ڈالا جاتا ہے۔ شکر کی حقیقت یہ ہے کہ کسی انسان کی اس نیکی اور اچھائی پر تعریف کرنا جو اس نے تمہارے ساتھ کی ہے جیسا کہ سورۂ فاتحہ میں گزر چکا ہے۔ جوہری نے کہا: الشکر کا مطلب محسن پر اس اچھائی کی وجہ سے تعریف کرنا جو اس نے تمہارے ساتھ کی ہے۔ کہا جاتا ہے: شکرتہٗ و شکرت لہ۔ لام صلہ افصح ہے، الشُکران، الکُفران کا متضاد ہے، تشکرت لہ یہ شکرت لہ کی مثل ہے۔

امام ترمذی اور ابوداؤد نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: لَا يَشْكُرُ اللهَ مَنْ لَا يَشْكُرُ النَّاسَ (1) جو لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا نہیں کرتا۔

خطابی نے کہا: اس کلام کے دو معانی ہیں: ایک یہ کہ وہ جس کی طبع میں لوگوں کی نعمت کی ناشکری ہے اور ان کے احسان کا شکر ادا نہیں کرتا اس کی عادت سے، اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری ہے اور اس کے شکر کا ترک ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے احسان پر بندے کا شکر قبول نہیں کرتا جب بندہ لوگوں کے احسان کا شکر ادا نہیں کرتا اور لوگوں کے احسان کی ناشکری کرتا ہے کیونکہ ہر ایک امر دوسرے سے متصل ہے۔

مسئلہ نمبر 4: شکر کے معنی میں علماء کی عبارات: حضرت سہل بن عبداللہ نے کہا: شکر کا مطلب، سرًا اور علانیۃً معصیت سے اجتناب کے ساتھ ساتھ اطاعت کی ادائیگی میں کوشش کرنا ہے۔

ایک اور گروہ نے کہا: شکر کا مطلب انعام کرنے والے کے شکر کی بجا آوری میں تقصیر کا اعتراف ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا (سبا: 13) حضرت داؤد نے کہا تھا: یارب! میں تیرا کیسے شکر ادا کروں؟ شکر بھی تو تیری طرف سے نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اب تو نے مجھے پہچان لیا اور تو نے میرا شکر ادا کیا جب تو نے پہچان لیا کہ شکر بھی میری طرف سے نعمت ہے۔ حضرت داؤد نے عرض کی: یارب! مجھے اپنی سب سے زیادہ مخفی نعمتیں دکھا جو تو نے مجھ پر فرمائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے داؤد! سانس لے۔ حضرت داؤد نے سانس لیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کون ہے جو دن رات میں اس نعمت کو شمار کر سکتا ہے (2)۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: میں تیرا کیسے شکر ادا کروں؟ چھوٹی سی نعمت جو تو نے اپنی نعمتوں میں سے میرے ہاتھ میں رکھی میرے سارے اعمال اس کا بدلہ نہیں ہو سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی فرمائی: اے موسیٰ! اب تو نے میرا شکر ادا کیا (3)۔ جنید نے کہا: شکر کی حقیقت شکر سے عجز ہے۔ حضرت جنید سے ہی مروی ہے، فرمایا: میں حضرت سری سقطی کے سامنے کھیل رہا تھا جبکہ سات سال کا تھا اور حضرت سری سقطی کے سامنے ایک جماعت شکر کے بارے گفتگو کر رہی تھی۔ حضرت سری سقطی نے مجھے فرمایا: اے لڑکے! شکر کیا ہے؟ میں نے کہا: اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی وجہ سے اس کی نافرمانی نہ کی

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی شکر المعروف، حدیث نمبر 4177، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ الشعب للبیہقی مثلہ، حدیث 4623	3۔ ایضاً، حدیث 4415

جائے۔ حضرت سری سقطی نے مجھے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ کی طرف سے تیرا حصہ تیری زبان ہو۔ جنید نے کہا: میں اس ایک کلمہ پر ہمیشہ روتا رہتا ہوں جو میرے متعلق حضرت سری سقطی نے کہا تھا۔ شبلی نے کہا: نیکیوں پر محافظت اور تواضع، شہوات کی مخالفت، طاعات میں دوام، زمین اور آسمانوں کے جبار کا مراقبہ، شکر ہے۔

حضرت ذوالنون مصری ابوالفیض نے کہا: جو تجھ سے بلند ہے اس کی اطاعت کرنا شکر ہے، ہم مثل کو بدلہ دینا شکر ہے، جو کم مرتبہ ہے اس کے ساتھ احسان اور فضل کا مظاہرہ کرنا شکر ہے۔

وَ اِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَ الْفُرْقَانَ لَعَلَّکُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾

"اور جب عطا فرمائی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور حق و باطل میں تمیز کی قوت تا کہ تم سیدھی راہ پر چلنے لگو"۔

اِذْ ماضی کے لئے اسم ہے اور اذا مستقبل کے لئے اسم ہے، اٰتَیْنَا کا مطلب ہے ہم نے عطا کیا۔ ان تمام الفاظ کے معانی پہلے گزر چکے ہیں۔ الْکِتٰبَ سے مراد بالاجماع تورات ہے اور الْفُرْقَانَ کے بارے اختلاف ہے۔ فراء اور قطرب نے کہا: اس کا معنی ہے: ہم نے موسیٰ کو تورات اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو فرقان عطا کی۔ نحاس نے کہا: یہ اعراب اور معنی میں غلطی ہے، رہا اعراب تو کسی شے پر معطوف اس کی مثل ہوتا ہے اور اس قول کے اعتبار سے کسی شے پر معطوف اس کے خلاف ہوگا۔ رہا معنی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اٰتَیْنَا مُوْسٰی وَ هٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ (الانبیاء: 48) ابو اسحاق الزجاج نے کہا: فرقان سے مراد الکتاب ہی ہے تاکید کے لئے دو اسموں کے ساتھ اس کا ذکر دوبارہ کیا گیا۔

یہ فراء سے حکایت ہے، شاعر کا قول ہے:

و قدمت الادیم لراهشیه والفی قولها کذباً و میناً

اس شعر میں کذب اور مَین ایک ہی معنی میں ہیں۔ تاکید کے لئے دو اسم ذکر کیے گئے ہیں۔

ایک اور شاعر نے کہا:

الاحبذا هندٌ وارض بها هندٌ وهندٌ اتی من دونها النأی والبعد

اس شعر میں النأی اور البعد تاکید کے لئے معطوف کیے گئے ہیں۔ عنترہ کا قول ہے:

حییت من طلل تقادم عهده اقوی واقفر بعد ام الهیثم

نحاس نے کہا: یہ شعر میں ہوتا رہتا ہے، سب سے بہتر اس کے متعلق مجاہد کا قول ہے۔ الْفُرْقَانَ سے مراد حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے کی صلاحیت ہے(1)، جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمائی تھی۔ ابن زید نے کہا: الْفُرْقَانَ سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے دریا کا پھٹنا ہے حتیٰ کہ وہ پھٹ گیا تو انہوں نے دریا عبور کر لیا۔ بعض علماء نے فرمایا: الْفُرْقَانَ سے مراد مصیبت سے چھٹکارا ہے کیونکہ وہ قبطیوں سے دور ہو گئے تھے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا (انفال: 29)

1۔ تفسیر طبری، صفحہ 327، جلد 1

بعض علماء نے فرمایا: الْفُرْقَانَ سے مراد حجت اور بیان ہے۔ یہ ابن بحر نے کہا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: واؤ زائد ہے معنی یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے کتاب فرقان عطا کی، واؤ کبھی لغت میں زائد بھی ہوتی ہے جیسے عرب کہتے ہیں: فلان حسن و طویل۔ شاعر نے کہا:

الی الملك القرم و ابن الھمام و لیث الکتیبة فی المزدحم

اس شعر میں واؤ دونوں جگہ زائدہ ہے، کیونکہ مراد الملك القرم، ابن الھمام لیث الکتیبه ہے۔ اس تاویل کی دلیل یہ ارشاد ہے: ثُمَّ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِیْۤ اَحْسَنَ وَ تَفْصِیْلًا لِّكُلِّ شَیْءٍ (انعام: 154) (پھر عطا فرمائی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب تاکہ پوری کردیں نعمت ان پر جو نیک عمل کرتے ہیں اور تاکہ تفصیل ہو جائے ہر چیز کی) یعنی حلال، حرام، کفر، ایمان، وعدہ، وعید وغیرہ سب کچھ بیان کر دیا۔

بعض علماء نے فرمایا: الْفُرْقَانَ کا مطلب ان کے اور فرعون کی قوم کے درمیان جدائی ہے۔ یعنی ان کو نجات دی اور فرعونیوں کو غرق کیا۔ اس کی مثال یوم الفرقان ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد جنگ بدر کا دن ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کی مدد فرمائی تھی اور ابوجہل اور اس کے ساتھیوں کو ہلاک کیا تھا(1)۔ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ تاکہ تم گمراہی سے ہدایت پاؤ۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْۤا اِلٰى بَارِىٕكُمْ فَاقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىٕكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَیْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ۝

"اور یاد کرو جب کہا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے اے میری قوم بے شک تم نے ظلم ڈھایا اپنے آپ پر بچھڑے کو (خدا) بنا کر پس چاہئے کہ توبہ کرو اپنے خالق کے حضور سو قتل کرو اپنے آپ کو جنہوں نے شرک کیا یہ بہتر ہے تمہارے لئے تمہارے خالق کے نزدیک پھر حق تعالیٰ نے تمہاری توبہ قبول کر لی"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ قوم، صرف مردوں کی جماعت کو کہتے ہیں جس میں عورتیں نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ (الحجرات: 11) پھر فرمایا: وَ لَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ (الحجرات: 11)

زہیر نے کہا:

وما ادری و سوف اخال ادری اقوم آل حصن ام نساء

اس شعر میں اقوم سے مراد شاعر نے مرد لئے ہیں عورتوں کا علیحدہ ذکر کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ (اعراف۔80) یہاں صرف مرد مراد ہیں عورتیں نہیں کبھی قوم کا اطلاق

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

مردوں اور عورتوں پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّآ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ (نوح:1) اسی طرح ہر نبی کو عورتوں اور مردوں دونوں کی طرف مبعوث کیا گیا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰقَوْمِ منادیٰ مضاف ہے۔ یٰقَوْمِ میں یا کو حذف کیا گیا ہے کیونکہ حذف کا مقام ہے اور کسرہ اس کے حذف پر دلالت کر رہا ہے یہ یا تنوین کے قائم مقام ہوتی ہے۔ پس تو اسے حذف کردے گا جس طرح تنوین کو مفرد اسم سے حذف کیا جاتا ہے۔ غیر قرآن میں اس کا سکون کے ساتھ اثبات بھی جائز ہے۔ تو کہے گا: یاقومْ کیونکہ یہ اسم ہے اور حالت جری میں ہے، اگر تو چاہے تو اس یا کو فتحہ دے اگر چاہے تو اس کے ساتھ ھا لاحق کردے۔ تو کہے: یا قومیَہْ اگر چاہے تو اسے الف سے بدل دے کیونکہ یہ اخف ہے اور تو کہے: یاقوما اگر چاہے تو تو کہے: یا قومُ بمعنی یا ایھا القوم، اگر تو اسے نکرہ بنائے تو تو اسے نصب دے گا اور تنوین دے گا، قوم کا واحد امرءٌ ہے جو اس کے لفظ پر نہیں ہے تو کہتا ہے: قوم، اقوام، اقاوم یہ جمع الجمع ہے، یہاں قوم سے مراد بچھڑے کے پجاری ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں اللہ تعالیٰ کے امر سے خطاب فرمایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ یہاں جمع کثرت کی جگہ پر جمع قلت کو ذکر کیا اور کبھی جمع کثرت کو جمع قلت کی جگہ رکھا جاتا ہے اور جمع قلت کو کثرت کی جگہ رکھا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ (البقرہ:228) اور ارشاد فرمایا: فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ (الزخرف:71)

ان آیات میں جمع قلت کی جگہ جمع کثرت اور کثرت کی جگہ جمع قلت کا وزن ذکر فرمایا ہے۔

جو کوئی فعل کرتا ہے اس کا ضرر (نقصان) اس کی طرف لوٹتا ہے تو کہا جاتا ہے: انما اسأت الی نفسك۔ تو نے اپنے نفس پر برا کیا۔ ظلم کا اصل معنی کسی چیز کو غیر موضوع جگہ پر رکھنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ بعض ارباب معانی نے کہا: ہر انسان نے اپنے آپ پر جلدی کی جس نے اسے ساقط کردیا اور نفس کی خواہش کی مخالفت کی وہ اس کے ظلم سے بری ہوا۔ صحیح یہ ہے کہ انہوں نے حقیقت میں بچھڑے کی عبادت کی تھی جیسا کہ قرآن حکیم نے بیان فرمایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ جب ان سے کہا گیا کہ تم اپنے پروردگار کی طرف توبہ کرو تو انہوں نے کہا: کیسے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ۔

ارباب الخواطر نے کہا: اپنے نفسوں کو اطاعات کے ساتھ مطیع کرو اور انہیں شہوات سے روکو۔ صحیح یہ ہے کہ حقیقت میں قتل کرنے کا حکم تھا اور قتل کا مطلب حرکت کو مارنا ہے۔ قتلت الخمر یعنی پانی کے ساتھ اس کی شدت کو ختم کردیا۔ سفیان بن عیینہ نے کہا: توبہ اللہ تعالیٰ کی ان خاص نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے صرف اس امت کو انعام کی، دوسری امتوں کو یہ نعمت عطا نہ فرمائی۔ بنی اسرائیل کی توبہ قتل کرنا تھا۔ اس پر اجماع ہے کہ ان بچھڑے کے پجاریوں میں سے ہر ایک کو اپنے ہاتھ سے اپنے نفس کو قتل کرنے کا حکم نہیں تھا۔

زہری نے کہا: جب انہیں کہا گیا: فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ تو وہ دو صفوں میں کھڑے ہوگئے اور ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے حتیٰ کہ انہیں کہا گیا: اب رک جاؤ۔ یہ عمل مقتول کے لئے شہادت تھا اور زندہ کے لئے توبہ تھا، جیسا کہ

پیچھے گزرا ہے۔ بعض مفسرین نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ان پر تاریکی بھیج دی تو تاریکی میں وہ ایک دوسرے کو قتل کرتے رہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جنہوں نے بچھڑے کی عبادت کی تھی وہ ایک صف میں کھڑے ہوئے اور جنہوں نے عبادت نہیں کی تھی وہ ہتھیار لے کر ان میں داخل ہوئے اور انہیں قتل کر دیا(1)۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ ستر آدمی کھڑے ہوئے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھے اور انہوں نے بچھڑے کے پجاریوں کو قتل کیا کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ والوں نے بچھڑے کی عبادت نہیں کی تھی۔

یہ بھی روایت کیا جاتا ہے کہ حضرت یوشع بن نون ان کے پاس گئے جبکہ وہ سب گھٹنے کھڑے کر کے ہاتھوں یا کپڑے سے کلاوہ مار کر بیٹھے تھے۔ حضرت یوشع نے کہا: وہ ملعون ہوگا جو اپنا کپڑا یا ہاتھ کھولے گا یا اپنے قاتل کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے گا یا اپنے ہاتھ سے بچاؤ کرے گا یا پاؤں سے بچاؤ کرے گا۔ پس ان میں سے کسی نے اپنا کپڑا نہ کھولا حتیٰ کہ ان میں قتل کیا گیا جو قتل کیا گیا اور ہر شخص نے اپنے قریب والے کو قتل کیا۔ یہ نحاس وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ پس جنہوں نے بچھڑے کی عبادت نہیں کی تھی پہلے قول کے مطابق انہیں اپنوں کو قتل کرنے کی سزا دی گئی کیونکہ انہوں نے برائی کو روکا نہیں تھا۔ جب وہ غیر اللہ کی عبادت کر رہے تھے اور وہ علیحدہ ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ ان پر واجب تھا کہ وہ بچھڑے کی عبادت کرنے والوں کو قتل کریں(2)۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے اپنے بندوں میں جب برائی پھیل جائے اور اسے روکا نہ جائے تو تمام کو سزا دی جاتی ہے۔

جریر نے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس قوم میں گناہوں کا ارتکاب کیا جاتا ہے جبکہ وہ اس برائی کو روک سکتے تھے لیکن انہوں نے روکا نہیں تو اللہ تعالیٰ تمام پر عذاب نازل فرماتا ہے(3)۔ ابن ماجہ نے اپنی سنن میں نقل فرمایا۔ اس مفہوم پر کلام آگے آئے گی۔ جب ان میں قتل کی کثرت ہوگئی اور وہ ستر ہزار تک پہنچ گئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرمایا۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے قتل کو اٹھا لیا کیونکہ انہیں اپنوں کو قتل کی مشقت دی گئی تھی اور اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ پر اسلام کے بعد توبہ سے افضل انعام نہیں فرمایا۔

قتادہ نے فاقیلوا انفسکم ... اقالہ سے مشتق کیا ہے ..... یعنی قتل کے ساتھ اپنی لغزش کا بدلہ دو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بَارِئِكُمْ، البارئ کا معنی الخالق یعنی پیدا کرنے والا ہے ان دونوں کے درمیان فرق ہے۔ البارئ نئے سرے سے پیدا کرنے والا ہوتا ہے اور الخالق ایک حال سے دوسرے حال کی طرف نقل کرنے والا ہوتا ہے۔ البریۃ کا معنی الخلق (مخلوق) ہے۔

یہ فعیل بمعنی مفعول ہے لیکن اسے ہمزہ نہیں دیا جاتا۔ ابو عمرو نے بارئکم ہمزہ کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، وہ تمہیں شعور دیتا ہے، تمہاری مدد کرتا ہے اور تمہیں حکم دیتا ہے۔

نحویوں کا اس کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض وصل میں ضمہ اور کسرہ کو ساکن کر دیتے ہیں اور یہ شعر میں ہوتا ہے، ابو العباس المبرد نے کہا: کلام اور شعر میں معرب حرف میں متواتر حرکات کے ساتھ ساکن کرنا جائز نہیں۔ ابو عمرو کی قراءت غلط ہے۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، تفسیر طبری

نحاس وغیرہ نے کہا: یہ قدماء ائمہ نحو نے جائز قرار دیا ہے انہوں نے بطور دلیل یہ اشعار ذکر کیے ہیں۔

اذا اعوججن قلت صاحبْ قومْ بالدّو امثال السفین العوم

امرؤ القیس نے کہا:

فالیوم اشربْ غیر مُستحقبٍ اثماً من اللہ ولا واغل

ایک اور شاعر نے کہا:

قالت سلیمی اِشْتَرْلَنا سویقا (1)

ایک اور نے کہا:

رحت و فی رجلیکِ مافیہما و قد بدا ھنک من المئزر (2)

جس نے معرب کے حرف میں سکون دینے کا انکار کیا اس کی حجت یہ ہے کہ یہ جائز نہیں ہے کیونکہ وہ اعراب کی علامت ہوتا ہے۔ ابوعلی نے کہا: بنا کی حرکت کو توالی الحرکات کے ساتھ ساکن کرنے کے جواز میں نحویوں کا اختلاف نہیں ہے۔

برأ، یہ تبری الشیء من الشیء سے مشتق ہے جس کا معنی ایک شے کا دوسری چیز سے جدا ہونا ہے...... الخلق عدم سے وجود کی طرف جدا ہوئی۔ اسی سے برأت من المرض برءً ا۔ تو مرض سے شفایاب ہوا دوسرے لوگ کہتے ہیں برئت من المرض برأ اور برأت منک و من الدیون، والعیوب براءۃً۔ میں تجھ سے، قرضوں سے، عیوب سے بری ہوا۔ اسی سے المبارأۃ للمرأۃ۔ عورت کو جدا کرنا ہے۔ قد بارأ شریکہ و امرأتہٗ، اپنے شریک اور اپنی بیوی کو جدا کر دیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَتَابَ عَلَيْكُمْ** اس کلام میں حذف ہے، اس تقدیر پر یہ ہے: ففعلتم فتاب علیکم یعنی تم نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ نے تم سے درگزر فرمایا۔ یعنی تم میں سے باقی لوگوں پر نظر کرم فرمائی۔ **اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ** اس کا معنی گزر چکا ہے۔ الحمد للہ

وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾

''اور یاد کرو جب تم نے کہا: اے موسیٰ! ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے تجھ پر جب تک ہم نہ دیکھ لیں اللہ کو ظاہر۔ پس اس گستاخی پر آ لیا تم کو بجلی کی کڑک نے اور تم دیکھ رہے تھے۔ پھر ہم نے جلد اٹھایا تمہیں تمہارے مرجانے کے بعد کہ کہیں تم شکر گزار بنو''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَ اِذْ قُلْتُمْ** یہ معطوف ہے۔ **يٰمُوْسٰى** ندا مفرد ہے **لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ**۔ ہم تیری تصدیق نہیں کریں گے۔ **حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً** بعض علماء نے فرمایا: یہ وہ ستر آدمی تھے جن کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

اختیار کیا تھا۔ جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کا کلام انہیں سنایا تو انہوں نے اس کے بعد کہا: لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَكَ انبیاء پر ایمان لانا ان کے معجزات کے ظہور کے بعد واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر آسمان سے آگ بھیجی اور انہیں جلا دیا۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ کر دیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ثُمَّ بَعَثۡنٰكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَوۡتِكُمۡ (پھر ہم نے جلد اٹھایا تمہیں مرجانے کے بعد) ان ستر آدمیوں کا واقعہ ان شاء اللہ سورۂ اعراف میں آئے گا۔ ابن فورک نے کہا: یہ احتمال ہے کہ ان کی سزا اس وجہ سے ہو کہ انہوں نے رؤیت کی طلب کو اس کے صحیح طریقہ سے خارج کر دیا تھا کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: ارنا اللہ جھرۃ اور یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قدرت میں نہیں تھا۔(1)

اللہ تعالیٰ کی رؤیت (دیکھنے) کے جواز میں اختلاف ہے۔ اکثر بدعتی لوگ دنیا و آخرت میں اس کا انکار کرتے ہیں اور اہل سنت و جماعت دنیا و آخرت میں اس کے جواز کے قائل ہیں اور آخرت میں اس کے وقوع کے قائل ہیں۔ اسی وجہ سے انہوں نے رؤیت کا طلب کرنا محال کا طلب کرنا نہیں بنایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رؤیت کا سوال کیا تھا، مزید کلام اس رؤیت کے متعلق سورۂ انعام اور سورۂ اعراف میں آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جَهۡرَةً یہ مصدر ہے حال کی جگہ میں اس کا معنی علانیۃ (واضح) ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی عیاناً ہے۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ الجھر کا اصل معنی ظہور (ظاہر ہونا) ہے اسی سے الجھر بالقراۃ ہے یعنی قراءت کو ظاہر کرنا المجاھر بالمعاصی۔ علانیہ گناہ کرنے والا۔ رأیت الامیر جھاراً و جھرۃ یعنی میں نے امیر کو دیکھا جبکہ وہ کسی چیز سے چھپا ہوا نہ تھا۔

حضرت ابن عباس نے جَهَرَةً ھاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا۔ یہ دونوں لغتیں ہیں مثلاً زَهۡرَةً زَهَرَةٌ۔ الجھر میں جو وجہیں ہیں ایک یہ صفت ہے ان کے خطاب کی جو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیا، انہوں نے بھی اعلانیہ یہ کہا۔ اس ترکیب کلام میں تقدیم و تاخیر ہوگی۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: واذا قلتم جھرۃ یا موسیٰ۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ صفت ہے اس کی جو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کی رویت کا سوال کیا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو سامنے دیکھ لیں۔ اس صورت میں کلام میں تقدیم و تاخیر نہ ہوگی۔ الجھر کے ساتھ مؤکد فرمایا تا کہ آنکھوں سے دیکھنے اور خواب میں دیکھنے میں فرق ہو جائے۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَخَذَتۡكُمُ الصّٰعِقَةُ۔ الصّٰعِقَةُ کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی نے اسے الصَّعۡقَة پڑھا ہے، یہ تمام قرآن میں ابن محیصن کی قراءت ہے۔ وَاَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ یہ جملہ حال ہے۔ کہا جاتا ہے: كَيۡفَ يَمُوۡتُوۡنَ وَهُمۡ يَنۡظُرُوۡنَ (وہ مرے کیسے تھے جبکہ وہ دیکھ رہے تھے) اس کا جواب یہ ہے کہ عرب کہتے ہیں: دُوۡرُ آلِ فُلَانٍ تَرَاءَىٰ یعنی آل فلاں کے گھر آمنے سامنے ہیں۔ بعض نے فرمایا: تَنۡظُرُوۡنَ کا معنی ہے: تم اپنے حال، موت اور الصّٰعِقَةُ کے آثار نازل ہوئے تم انہیں دیکھ رہے تھے۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ بَعَثۡنٰكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَوۡتِكُمۡ یعنی ہم نے زندہ کیا۔ قتادہ نے کہا: وہ مر گئے تھے

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

ان کی روحیں چلی گئی تھیں پھر وہ اپنی عمریں پوری کرنے کے لئے لوٹائے گئے (1)۔ نحاس نے کہا: یہ قریش کے اس شخص کے خلاف حجت ہے جو دوبارہ اٹھنے پر ایمان نہیں رکھتا اور اہل کتاب کے خلاف حجت ہے کیونکہ انہوں نے اس کی خود خبر دی۔ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ تا کہ تم شکر ادا کرو جو اس نے تمہارے ساتھ کیا کہ مرنے کے بعد زندہ کیا۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ ایسی موت مر گئے تھے کہ اس سے غیر عبرت حاصل کرے۔ پھر انہیں بھیجا گیا۔ البعث کا اصل معنی الارسال ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: البعث کا اصل معنی کسی شی کو اپنے محل سے اٹھانا ہے۔ کہا جاتا ہے: بعثت الناقۃ یعنی میں نے اونٹنی کو حرکت دی۔ امرؤ القیس نے کہا:

وفتیان صدق قد بعثت بسحرۃ فقاموا جیعا بین عاث و نشوان

اس شعر میں بعث بمعنی حرکت دینا، اٹھانا استعمال ہوا ہے۔ عنترہ نے کہا:

و صحابۃ شم الانوف بعثتھم لیلاً و قد مال الکری بطلاھا

اس میں بھی بعث اٹھانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ یعنی ہم نے تمہاری جہالت کے بعد تمہیں تعلیم دی۔ میں کہتا ہوں: پہلا قول اصح ہے کیونکہ اصل حقیقت ہے، وہ موت، سزا کی موت تھی اسی معنی میں یہ ارشاد ہے: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۠ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۣ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ (البقرہ: 243) جیسا کہ آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 5: الماوردی نے کہا: اس میں اختلاف ہے کہ جو مرنے کے بعد لوٹایا گیا اور وہ احوال دیکھنے کے بعد لوٹایا گیا جو معرفت پر مجبور کر دیتے ہیں کیا وہ مکلف باقی رہے گا؟ اس کے متعلق دو قول ہیں:

۱۔ ان کا مکلف ہونا باقی ہے تا کہ کوئی عاقل مکلف ہونے سے خالی نہ ہو۔

۲۔ مکلف ہونے کا سقوط استدلال کے ساتھ معتبر ہے، اضطرار کے ساتھ نہیں۔

میں کہتا ہوں: پہلا قول صحیح ہے کیونکہ بنی اسرائیل نے جب ہوا میں پہاڑ دیکھا کہ وہ ان پر گرنے والا ہے اور آگ انہیں گھیرے ہوئے تھی تو اس چیز نے انہیں ایمان کی طرف مجبور کر دیا اور ان پر تکلیف کا باقی ہونا ثابت ہے۔ اسی طرح حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کا معاملہ تھا ان کا مکلف نہ ہونا محال ہے۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۭ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۭ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ ۔

''اور ہم نے سایہ کر دیا تم پر بادل کا اور اتارا تم پر من و سلویٰ۔ کھاؤ پاکیزہ چیزوں سے جو ہم نے تمہیں عطا کر رکھی ہیں اور انہوں نے ہم پر کوئی زیادتی نہیں کی بلکہ وہ اپنی ہی جانوں پر زیادتی کرتے رہتے ہیں''۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں۔

1۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذا

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ ظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ یعنی ہم نے بادل کو تم پر چھتری کی مانند کر دیا۔ الْغَمَامَ جمع ہے غمامۃ کی جیسے سحابۃ اور سحاب۔ یہ اخفش سعید نے کہا ہے۔ فراء نے کہا: غمائم بھی جائز ہے اس سے مراد بادل ہیں کیونکہ وہ آسمان کو ڈھانپ دیتے ہیں۔ ہر وہ چیز جو ڈھانپی گئی ہو وہ مغموم ہے۔ اسی سے المغموم علی عقلہ اور غم الهلال ہے جب چاند کو بادل ڈھانپ دے۔ الغین بھی الغیم کی مثل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: انہ لیغان علی قلبی۔ میرے دل پر چھا جائے۔ صاحب العین نے کہا: غین علیہ کا مطلب اسے ڈھانپا گیا۔ الغین گھنے درختوں کو کہتے ہیں۔ سدی نے کہا: الْغَمَامَ سفید بادلوں کو کہتے ہیں (1)۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ اس لئے یہ کیا تھا تا کہ دن کے وقت انہیں سورج کی گرمی سے بچائے اور دن کے آخر میں بادل چھٹ جاتا تا کہ وہ چاند سے رات کے وقت روشنی حاصل کریں۔ مفسرین نے نقل کیا ہے کہ یہ ان پر مصر اور شام کے درمیان تیہ کے صحراء میں ہوا تھا جب انہوں نے جبار لوگوں کے شہر میں داخل ہونے اور ان سے جنگ کرنے سے انکار کیا تھا۔ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا: فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَآ (المائدہ: 24) پس انہیں اسی جگہ سزا دی گئی چالیس سال پانچ یا چھ فراسخ میں گھومتے رہے۔ روایت ہے کہ وہ دن کو چلتے تھے اور رات کو ٹھہرتے تھے۔ پس وہ وہاں ہی صبح کرتے جہاں گزشتہ کل صبح کرتے تھے، جب وہ تیہ میں جمع تھے تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: ہمارے لئے کھانا کون لائے گا، اللہ تعالیٰ نے ان پر من و سلویٰ اتارا۔ پھر انہوں نے کہا: ہمیں سورج کی گرمی سے کون بچائے گا اللہ تعالیٰ نے ان پر بادلوں کا سایہ کر دیا۔ پھر انہوں نے کہا: ہم چراغ کس کے ساتھ جلائیں گے، اللہ تعالیٰ نے ان کے محلے کے درمیان ایک نور کا ستون بنا دیا۔ مکی نے ذکر کیا ہے کہ وہ آگ کا ستون تھا۔ انہوں نے کہا: ہمارے لئے پانی کون لائے گا، اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پتھر پر عصا مارنے کا حکم دیا۔ انہوں نے کہا: ہمارے لئے لباس کون لائے گا، انہیں ایسا لباس دیا گیا جو نہ پرانا ہوتا، نہ بوسیدہ ہوتا اور نہ میلا ہوتا اور بچوں کے بڑھنے کے مطابق ان کے کپڑے بڑے ہوتے جاتے۔ واللہ اعلم (2)

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى۔ الْمَنَّ کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ کیا ہے۔ اس کی تعیین کئی اقوال پر ہے: بعض نے کہا: ترنجبین ہے۔ یہ نحاس نے ذکر کیا ہے۔ الطرنجبین (طا کے ساتھ بھی کہا جاتا ہے) یہ اکثر مفسرین کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الْمَنَّ سے مراد میٹھی گوند ہے۔ بعض نے فرمایا: شہد ہے بعض نے فرمایا: میٹھی شراب ہے۔ بعض نے فرمایا: باریک روٹی ہے۔ یہ وہب بن منبہ سے مروی ہے۔ بعض نے فرمایا: الْمَنَّ مصدر ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر بغیر کسی تھکن اور کھیتی باڑی کے احسان فرمایا اس تمام کو شامل ہے (3)۔ اسی سے سعید بن زید بن عمرو بن نفیل کی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: الکمأۃ من المن الذی انزل علی بنی اسرائیل و ماء ھا شفاء للعین (4) وفی روایۃ من المن الذی انزل اللہ علی موسٰی۔ یعنی کھمبی اس مَنّ میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا
2۔ ایضاً، والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا
3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
4۔ صحیح بخاری، باب وقولہ تعالیٰ وظللنا علیکم الغمام، حدیث 4118، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نازل کیا۔ کھمبی کا پانی آنکھ کے لئے شفا ہے۔

ایک روایت میں ہے، اس مَنّ میں سے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا۔ اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ کھمبی اس میں سے ہے جو اللہ نے بنی اسرائیل پر نازل کیا یعنی جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے تیہ کے صحرا میں پیدا فرمایا تھا۔

ابو عبیدہ نے کہا: کھمبی کو اَلْمَنّ کے ساتھ تشبیہ دی ہے کیونکہ اس میں بیج ڈالنے، پانی لگانے اور دیکھ بھال کرنے کی مشقت نہیں۔ پس یہ کھمبی بنی اسرائیل کے مَنّ سے ہے کیونکہ یہ بغیر مشقت کے ملی تھی۔ روایت ہے کہ ان پر من فجر کے طلوع ہونے سے لے کر سورج کے طلوع ہونے تک اولوں کی طرح اترتا تھا۔ ہر شخص اپنے لئے اس دن کی خوراک لے لیتا تھا، جو اس سے ذخیرہ کرتا تھا وہ خراب ہو جاتا تھا، مگر جمعہ کے دن وہ ہفتہ کے دن کے لئے ذخیرہ کرتے تھے تو وہ خراب نہیں ہوتا تھا، کیونکہ ہفتہ ان کی عبادت کا دن تھا، ہفتہ کے دن ان پر کچھ نازل نہیں ہوتا تھا۔ (1)

مسئلہ نمبر 3: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نص فرمائی کہ کھمبی کا پانی آنکھ کے لئے شفا ہے۔ بعض علمائے طب نے فرمایا: آنکھ میں جو حرارت ہوتی ہے اس کو ٹھنڈا کرنے کے لیے صرف اس کا پانی استعمال کیا جاتا ہے اور کسی اور مرض کے لئے دوسری دوا میں مرکب ہو کر استعمال ہوتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ آنکھ کی ہر مرض کے لئے خالص اس کا پانی استعمال کرنے کا نظریہ رکھتے تھے (2)۔ یہ ایسا ہے جیسا کہ ابو جزہ تمام امراض کے لئے شہد استعمال کرتے تھے حتیٰ کہ آنکھوں کی تکلیف کے لئے بھی شہد استعمال کرتے تھے۔ اس کا بیان سورۃ النحل میں ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

اہل لغت نے کہا: الکمٔ واحد ہے، اس کا تثنیہ کمآن ہے اور تین ہوتو اکمُؤ کہا جاتا ہے اور جب زیادہ ہوں تو کمأۃ (تاء کے ساتھ) آتا ہے۔ شجرۃ اور شجر کے برعکس استعمال ہوتا ہے۔ اَلْمَنّ اسم جنس ہے لفظوں میں اس کا واحد نہیں ہے جیسے الخیر اور الشر۔ یہ اخفش نے کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: السَّلْوٰی۔ السَّلْوٰی کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ بٹیر ہے۔ یہ ضحاک کا قول ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: باجماع مفسرین السَّلْوٰی پرندہ ہے۔ ہذلی نے غلطی کی ہے، اس نے کہا:

و قاسمها بالله جهداً لانتم الذ من السلوى اذا ما نشورها

اس نے اس شعر میں سلوی سے شہد مراد لیا ہے۔

میں کہتا ہوں: ابن عطیہ نے مفسرین کے اجماع کا جو دعویٰ کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ مؤرج جو لغت اور تفسیر کے علماء میں سے ہے انہوں نے کہا: السَّلْوٰی سے مراد شہد ہے اور اس نے ہذلی کے مذکور شعر سے استدلال کیا ہے۔ انہوں نے ذکر کیا ہے کہ لغت کنانہ اس طرح ہے۔ اس کو سلوی کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے تسلی ہوتی ہے۔ اسی سے عین السلوان ہے (بیت

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ جامع ترمذی، حدیث نمبر 1995، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

المقدس میں ایک چشمہ ہے جس سے برکت حاصل کی جاتی ہے۔) جیسے شعر میں ہے:

لو اشرب السلوان ما سليت　　　ما بي غنى عنك وان غنيت

اسی طرح جوہری نے کہا: السلوی۔ شہد ہے اس نے بھی ہذلی کا بیت ذکر کیا ہے۔

الذ من السلوى اذا ماتشورها

اور انہوں نے غلطی کا ذکر نہیں کیا۔ السُّلوانة، یہ ایک سپی ہے۔ لوگ کہتے ہیں جب اس پر بارش کا پانی ڈالا جائے اور پھر عاشق اس کو پی لے تو اسے تسلی ہو جاتی ہے۔

شربت على السلوانة ماء مزنة　　　فلا وجديد العيش يا مَىّ ما اسْلُو

اس پانی کا نام سدوان ہے۔ بعض نے فرمایا: السلوان ایک دوا ہے جس کو غمگین پیتا ہے تو اس کو تسلی ہوتی ہے۔ اطباء اس کو مفرح کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: سلیت و سلوت یہ دو لغتیں ہیں۔ و هوفی سلوة من العیش، وہ خوشحال زندگی میں ہے۔ یہ ابو زید سے مروی ہے۔

مسئلہ نمبر 5: السَّلْوٰی کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ جمع ہے یا مفرد ہے۔

اخفش نے کہا: یہ لفظاً جمع ہے اس کا واحد نہیں ہے جیسے الخیر اور الشر ہے اور اس کا واحد سلوی بھی جمع سلوی کے مشابہ ہے جیسے کہتے ہیں دفلی یہ واحد اور جمع کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ سمانی اور شکاعی یہ بھی واحد اور جمع کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ خلیل نے کہا: اس کا واحد سلواۃ ہے جیسے اس شعر میں ہے: (1)

انى لتعرونى لذكراك هزة　　　كما انتقص السلواة من بلل القطر

کسائی نے کہا: السلوی واحد ہے اور اس کی جمع سلاوی ہے۔ (2)

مسئلہ نمبر 6: السَّلْوٰی کا عطف، الْمَنَّ پر ہے۔ اس میں اعراب ظاہر نہیں ہے کیونکہ اسم مقصور ہے اور اسم مقصور میں اعراب ظاہر نہ کرنا واجب ہوتا ہے کیونکہ ہمیشہ اس کے آخر میں الف ہوتا ہے۔ خلیل نے کہا: الف، ہوائی حرف ہے اس کا کوئی مستقر نہیں ہے یہ حرکت کے مشابہ ہے اس کی حرکت محال ہے۔ فراء نے کہا: اگر الف کو حرکت دی جائے تو یہ ہمزہ ہو جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 7: كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ اس میں حذف سے تقدیر کلام اس طرح ہے: و قلنا کلوا۔ اختصار اظاہر کی دلالت کی وجہ سے حذف کیا گیا۔ الطیبات کا لفظ یہاں حلال اور لذیذ دونوں معانی میں ہے۔ (3)

مسئلہ نمبر 8: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَا ظَلَمُوْنَا اس سے پہلے فعصوا مقدر کیا جائے گا۔ انہوں نے نعمتوں کے مقابل شکر نہ کیا۔ وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ بلکہ انہوں نے نعمتوں کے مقابلہ میں گناہوں کا ارتکاب کر کے اپنے اوپر ظلم کیا۔

وَ اِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا

1۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذا　　2۔ ایضاً　　3۔ ایضاً

وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۚ وَ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

''اور یاد کرو جب ہم نے حکم دیا تھا کہ داخل ہو اس بستی میں پھر کھاؤ اس میں سے جہاں سے چاہو اور جتنا چاہو اور داخل ہونا دروازے سے سر جھکاتے ہوئے اور کہتے جانا بخش دے ہمیں اور ہم بخش دیں گے تمہاری خطائیں اور ہم زیادہ دیتے ہیں نیکوکاروں کو''۔

اس میں نو مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ، قُلْنَا سے الف کو حذف کیا گیا ہے اس کے سکون اور اس کے بعد دال کے سکون کی وجہ سے۔ اور وہ الف جس کے ساتھ ابتدا کی گئی ہے دال سے پہلے وہ الف وصل ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هٰذِهِ الْقَرْيَةَ یعنی شہر۔ شہر کو قریۃ اس لئے کہتے ہیں کیونکہ اس میں اجتماع ہوتا ہے۔ اسی سے ہے: قریت الماء فی الحوض میں نے حوض میں پانی جمع کیا اس پانی کا نام قِریٰ ہوتا ہے، اسی طرح جس کے ساتھ مہمان نوازی کی جائے اسے قِریٰ کہتے ہیں۔ یہ جوہری کا قول ہے۔ المِقراۃ، حوض کے لئے بولا جاتا ہے۔ القَرِیّ، پانی کی گزرگاہ کے لئے اور القَرا پیٹھ کے لئے۔ اسی سے یہ مصرعہ ہے:

لاحقُ بطنٍ بِقَراً سمینٍ

المقاری: بڑے پیالے کہا۔

کہا: عظام المقاری ضیفھم لا یُفزَّع

المقاری کا واحد مِقراۃ ہے۔ ان تمام الفاظ کا معنی جمع کرنا ہے۔ القریۃ (قاف کے کسرہ کے ساتھ) یمن کی لغت ہے۔ اس کی تعیین میں اختلاف ہے۔ جمہور علماء نے کہا: یہ بیت المقدس ہے۔ بعض نے کہا: بیت المقدس میں سے اریحا ہے۔ عمر بن شیبہ نے کہا: یہ بادشاہوں کی رہائش گاہ تھی (1)۔ ابن کیسان نے کہا: شام کا شہر ہے۔ ضحاک نے کہا: الرملہ، اردن، فلسطین اور تدمُر ہے۔ یہ دوسری نعمت ہے۔ ان کے لئے شہر میں داخل ہونا مباح کر دیا اور ان سے تیہ کی سرگردانی ختم کر دی۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَكُلُوْا یہ امر اباحت کے لئے ہے۔ رَغَدًا کثیر اور واسع، یہ مصدر محذوف کی صفت ہے یعنی اکلاً رغداً۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ رَغَدًا حال ہو جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ وہ زمین بڑی بابرکت اور زیادہ غلہ دینے والی تھی اس لئے فرمایا: رَغَدًا (2)

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا، باب کی جمع ابواب ہے اور اس کی جمع الهوبة بھی بناتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

هتاك اخبية ولاج أبوِبَة يخلط بالبر منه الجدّ واللينا

اگر اسے مفرد ذکر کرے تو پھر جائز نہیں۔ اس کی مثل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے: مرحباً بالقوم... او بالوفد... غیر

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

خزایا ولا ندامی (1)۔۔۔ تبوبت بتوابا یعنی میں نے دربان بنایا۔

ابواب مبوبة جیسے کہتے ہیں اصناف مصنفة۔ ھذا شیء من بابتك۔ یہ تمہارے لئے مناسب ہے۔ سجدہ کا معنی گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ الحمد للہ

وہ دروازہ جس سے انہیں داخل ہونے کا حکم دیا گیا تھا وہ بیت المقدس میں تھا۔ آج وہ باب حطہ کے نام سے مشہور ہے۔ مجاہد وغیرہ سے یہ مروی ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد اس قبہ کا دروازہ ہے جس کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل نماز پڑھتے تھے۔ سُجَّدًا حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس کا مطلب رکوع کی حالت میں جھکتے ہوئے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے: تواضع کرتے ہوئے، کوئی متعین ہیئت مراد نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ قُوْلُوْا اس کا عطف ادْخُلُوا پر ہے۔ حِطَّةٌ جمہور کی قراءت مرفوع ہے اس بنا پر کہ مبتدا محذوف ہے یعنی مسئلتنا حطةٌ یا اس کا یہ اعراب حکایۃً ہے اور اخفش نے کہا: حطہ کو منصوب بھی پڑھا گیا ہے اس تقدیر پر احطط عنا ذنوبنا حطةً (ہمارے گناہ معاف فرمادے۔) نحاس نے کہا: حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ انہیں کہا گیا کہ تم لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہو (2)۔ ایک اور حدیث ان سے مروی ہے کہ انہیں کہا گیا: قولوا مغفرةً نصب کی تفسیر یعنی قولوا شیئاً یحط ذنوبکم تم ایسی شے کہو جو تمہارے گناہ معاف کردے۔ جس طرح کہا جاتا ہے: قل خیراً۔ ائمہ قراء اس پر رفع ہی پڑھتے ہیں یہ لغت کے اعتبار سے اولیٰ ہے۔ اس کی وجہ وہ ہے جو عربوں سے بدل کے معنی میں حکایت کیا گیا ہے۔ احمد بن یحییٰ نے کہا: کہا جاتا ہے بدّلتہ یعنی میں نے اسے تبدیل کیا اور میں نے اس کی شخصیت کو زائل نہیں کیا ابدلتہ یعنی میں نے اس شخص اور عین کو بدل دیا۔ جیسا کہ شاعر نے کہا:

عزل الامیر للامیر المبدل

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ (یونس: 15) (اور کہنے لگتے ہیں وہ جو توقع نہیں رکھتے ہم سے ملنے کی کہ لے آیئے (دوسرا) قرآن اس (قرآن) کے علاوہ یا ردوبدل کردیجئے)۔

حضرت ابن مسعود کی حدیث ہے، انہوں نے کہا حِطَّةٌ یہ رفع کی بنا پر تفسیر ہے۔ یہ تمام نحاس کے اقوال ہیں۔ حسن اور عکرمہ نے کہا: حطة کا معنی حط ذنوبنا ہے۔ انہیں یہ کہنے کا حکم دیا گیا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہو تاکہ اس کی وجہ سے ان کے گناہ گر جائیں۔ ابن جبیر نے کہا: اس کا معنی استغفار ہے (3)۔ ابان بن تغلب نے کہا: اس کا مطلب تو یہ ہے۔ شاعر نے کہا:

فاز بالحطة التی جعل الله ہ بھا ذنب عبدہ مغفوراً

اس نے ایسی توبہ پائی جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کے گناہوں کو معاف فرمایا۔

ابن الفارس نے "المجمل" میں کہا کہ حطہ یہ ایسا کلمہ ہے جس کا بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا تھا۔ اگر وہ یہ کہتے تو ان کے گناہ

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا
2۔ صحیح بخاری، باب اداء الخمس من الایمان، حدیث 51، 85، 402، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

معاف ہو جاتے۔ جوہری نے بھی "الصحاح" میں یہی کہا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ احتمال ہے کہ انہیں بعینہٖ یہی لفظ کہنے کا مکلف کیا گیا ہو، حدیث سے بھی ظاہر ہے۔ مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنی اسرائیل کو کہا گیا: دروازے سے سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو(1) اور حِطَّةٌ کہو تمہارے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ تو انہوں نے اس حکم کو بدل ڈالا وہ دروازے سے اپنی سرینیں گھسیٹتے ہوئے داخل ہوئے اور انہوں نے کہا: حبةٌ فی شعرةٍ یعنی (جو میں دانہ)۔ یہ حدیث بخاری نے بھی نقل کی ہے۔ فرمایا: انہوں نے حکم کو بدل ڈالا۔ انہوں نے کہا: حطة حبة فی شعرة اور صحیحین کے علاوہ میں ہے: حنطة فی شعر۔ اور کہا گیا ہے: انہوں نے کہا: هطا سمهاثا۔ یہ عبرانی لفظ ہے اس کی تفسیر سرخ گندم ہے۔ یہ ابن قتیبہ نے حکایت کیا ہے اور یہ ہروی نے سدی اور مجاہد سے حکایت کیا ہے۔ ان کا مقصد اس کے خلاف کرنا تھا جو اللہ نے انہیں حکم دیا تھا۔ پس انہوں نے نافرمانی کی، سرکشی کی اور استہزاء کیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں عذاب کے ساتھ سزا دی۔ ابن زید نے کہا: یہ عذاب طاعون تھا ان کے ستر ہزار آدمی ہلاک ہو گئے تھے۔ روایت ہے کہ دروازہ چھوٹا بنایا گیا تھا تاکہ وہ جھکتے ہوئے داخل ہوں تو وہ اپنی سرینیں گھسیٹتے ہوئے داخل ہوئے۔

مسئلہ نمبر 6: بعض علماء نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ منصوص علیہا اقوال کو شریعت میں تبدیل کرنا، اس سے خالی نہیں ہوگا کہ اس لفظ کا یا اس کے معنی کا مکلف بنایا گیا ہوگا۔ اگر اس لفظ کا مکلف بنایا گیا ہو تو اس کو تبدیل کرنا جائز نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حکم کو تبدیل کرنے والے کی مذمت کی ہے، اور اگر معنی کا مکلف بنایا گیا ہو تو اس کو ایسی چیز سے تبدیل کرنا جائز ہوگا جو اس معنی کو ادا کرے، اسے ایسی چیز سے تبدیل کرنا جائز نہ ہوگا جو اس معنی سے ہی اسے خارج کردے۔(2)

علماء کا اس معنی میں اختلاف ہے۔ امام مالک، امام شافعی اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہم سے حکایت کیا گیا ہے کہ عالم کے لئے خطاب کے مواقع پر حدیث بالمعنی کا نقل کرنا جائز ہے لیکن مکمل طور پر معنی کے ساتھ مطابقت ہو، یہ جمہور کا قول ہے، بہت سے علماء نے الفاظ کو بدلنے سے منع کیا ہے۔ ان میں سے ابن سیرین، قاسم بن محمد اور رجاء بن حیوہ ہیں۔

مجاہد نے کہا: حدیث میں اگر تو چاہے تو کمی کر لیکن اس میں اضافہ نہ کر۔ حضرت مالک بن انس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں تا اور یا میں بھی سختی کرتے تھے۔ اس بنا پر ائمہ حدیث کی ایک جماعت لفظ کو تبدیل کرنا بھی جائز قرار نہیں دیتی تھی کہ وہ غلط سن لیتے تھے اور اس کو جانتے تھے لیکن اسے بدلتے نہیں تھے۔ ابو مجلز نے قیس بن عباد سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس نے کوئی حدیث سنی پھر اس نے اسے اسی طرح بیان کیا جس طرح اس نے سنی تھی تو وہ سلامت رہا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو اور حضرت زید بن ارقم سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ اس طرح تقدیم و تاخیر، کمی بیشی میں اختلاف ہے کیونکہ بعض علماء معنی کا اعتبار کرتے ہیں بعض لفظ کا اعتبار کرتے ہیں بعض اس میں سختی کرتے ہیں اور لفظ کو نہیں چھوڑتے۔ یہ

1۔ صحیح بخاری، باب حدیث الخضر مع موسیٰ علیہما السلام، حدیث نمبر 3151، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ احکام القرآن لابن العربی زیر آیت ہذا

دین میں احوط، اتقی اور اولی ہے لیکن اکثر علماء کی سیرت سے معلوم ہے وہ واقعات کو مختلف الفاظ میں بیان کرتے تھے۔ اور یہ نہیں تھا مگر اس لئے کہ وہ اپنی توجہ معانی پر رکھتے تھے اور وہ احادیث پر تکرار اور احادیث کے لکھنے کا التزام نہیں کرتے تھے۔

حضرت واثلہ بن اسقع سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: جو کچھ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہم نے تمہاری طرف اسے نقل کیا، تمہارے لئے معنی کافی ہے۔ قتادہ نے حضرت زرارہ بن اوفی سے کہا: میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی صحابہ سے ملا، انہوں نے مجھے الفاظ مختلف بیان کیے لیکن معنی ایک تھا۔ نخعی، حسن اور شعبی حدیث بالمعنی بیان کرتے تھے۔

حسن نے کہا: جب تو معنی صحیح بیان کرے تو تیرے لئے کافی ہے۔ سفیان ثوری نے کہا: جب میں تمہیں کہوں کہ میں تمہیں اسی طرح بیان کرتا ہوں جس طرح میں نے سنا تو میری تصدیق نہ کرو وہ معنی ہے۔ وکیع نے کہا: اگر معنی میں وسعت نہ ہوگی تو لوگ ہلاک ہو جائیں گے۔ علماء کا عجمیوں کے لئے ان کی زبان میں شریعت کو نقل کرنے پر اور ان کے لئے ترجمہ کرنے پر اجماع ہے۔ یہ نقل بالمعنی ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ایسا ہی کیا ہے جو اس نے گزشتہ قوموں کی خبریں بیان کی ہیں۔ پس اس نے قصص بیان کیے۔ بعض قصص کو مختلف جگہوں پر مختلف الفاظ میں بیان فرمایا جبکہ معنی ایک ہے۔ ان قصص کو ان کی زبان میں عربی زبان کی طرف منتقل کیا اور وہ تقدیم و تاخیر، حذف، الغا، کمی بیشی میں ان کے مخالف ہیں۔ جب عربی کو عجمی زبان میں بدلنا جائز ہے تو عربی میں بدلنا بدرجہ اولی جائز ہے اسی معنی سے حسن اور امام شافعی نے حجت پکڑی ہے۔ یہ اس بات میں صحیح ہے۔ اگر کہا جائے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اسے شاداب رکھے جس نے میری بات کو سنا پھر اسے آگے پہنچایا جس طرح اس کو سنا تھا (1)۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے ایک شخص کو اپنے بستر پر سونے کے وقت کی دعا سکھائی۔ آمنت بکتابك الذی أنزلت و نبیك الذی ارسلت (2)۔ اس شخص نے دوبارہ یہ الفاظ پڑھے تو اس نے کہا: و رسولك الذی ارسلت۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: و نبیك الذی ارسلت کہو۔ روایت بالمعنی کے عدم جواز کے قائل علماء کہتے ہیں: کیا آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جسے دعا سکھائی اسے لفظ کی مخالفت کی اجازت نہ دی اور فرمایا: اسی طرح ادا کرو جس طرح سنا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فَاَدَّاهَا كَمَا سَمِعَهَا کے ارشاد میں مراد اس کا حکم ہے اس کا لفظ نہیں ہے کیونکہ لفظ کا اعتبار نہیں اور تیری رہنمائی کرتا ہے یہ اصول کہ خطاب سے مراد اس کا حکم ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ غَيْرُ فَقِيْهٍ وَ رُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ اِلٰى مَنْ هُوَ اَفْقَهُ مِنْهُ یعنی بہت سے فقہ حاصل کرنے والے فقیہ نہیں ہوتے اور بہت سے فقہ حاصل کرنے والے اس کی طرف پہنچاتے ہیں جو ان سے زیادہ فقیہ ہوتا ہے۔ پھر یہ حدیث بعینہ مختلف الفاظ کے ساتھ منقول ہے جبکہ معنی ایک ہے اگرچہ تمام الفاظ کا مختلف اوقات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ہونا ممکن ہے لیکن اغلب یہی ہے کہ یہ ایک حدیث ہے جو مختلف الفاظ سے نقل کی گئی ہے یہ جواز کی واضح دلیل ہے۔ رہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس شخص کو رسولك کے لفظ سے نبیك کے لفظ کی طرف لوٹانا، اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کا لفظ زیادہ مدح کا باعث تھا ان

1۔ ابوداؤد، باب فضل نشر العلم، حدیث نمبر 3175 (مفہوم) ایضاً سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 231، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب فضل من بات علی الوضوء حدیث نمبر 239، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

دونوں صفات میں ہر صفت کا خاص موقع محل ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ رسول کا اسم تمام پر واقع ہوتا ہے اور نبی کا اسم صرف انبیاء کرام کے لئے بولا جاتا ہے۔ رسولوں کو انبیاء سے فضیلت دی گئی ہے کیونکہ وہ نبوت و رسالت کو جمع کرتے ہیں۔ جب و نبیك فرمایا تو ایسی نعت ذکر فرمائی جو زیادہ مدح کا باعث تھی پھر اسے الذی ارسلت فرما کر رسالت کے ساتھ مقید فرمایا پس رسولك کے قول سے نبیك کے قول کی طرف اگر اسے لوٹایا ہے تو یہ اس لئے ہے تا کہ نبوت و رسالت کو جمع کرے۔ یہ کلام کہنا پسندیدہ نہیں ہے کہ تو کہے: ھذا رسول فلان الذی ارسلہ ھذا قتیل زید الذی قتلہ، کیونکہ ان عبارات میں معنی کا تکرار ہے کیونکہ بعد والی کلام پہلے معنی کو ہی مفید ہے۔ یہ کہنا بہتر ہے: ھذا رسول عبد اللہ الذی ارسلہ الی عمرو و ھذا قتیل زید الذی قتلہ بالامس او فی وقعۃ کذا۔ یعنی یہ عبد اللہ کا پیغام رساں ہے جسے اس نے عمرو کی طرف بھیجا ہے یہ زید کا مقتول ہے جسے اس نے کل قتل کیا تھا یا فلاں واقعہ میں قتل کیا تھا۔

اگر کہا جائے کہ جب پہلے راوی کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ بدلنا جائز ہے تو دوسرے راوی کے لئے راوی کے الفاظ بدلنا بھی جائز ہوگا اور یہ باریک فرق اور خفا کی وجہ سے حدیث کو کلیۃً ختم کرنے کی طرف پہنچا دے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ روایت بالمعنی کا جواز معنی کی مطابقت اور مساوات کے ساتھ مشروط ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے، اگر معنی سے مطابقت نہ ہو تو جائز نہیں ہے۔ ابن عربی نے کہا: اس مسئلہ میں اختلاف صحابہ اور تابعین کے زمانہ کی طرف نظیر کرنے سے متصور ہوتا ہے کیونکہ وہ مادری زبان کی معرفت میں برابر تھے۔ رہا بعد والے لوگوں کا حکم ہم اس میں شک نہیں کرتے کہ یہ جائز نہیں ہے کیونکہ طبائع بدل چکی ہے، مفہوم مختلف ہو چکے ہیں، عادتیں تبدیل ہو چکی ہیں یہی حق ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ابن عربی نے ایک انوکھی بات کی ہے کیونکہ جب جواز معنی کی مطابقت کے ساتھ مشروط ہے تو پھر صحابہ، تابعین اور دوسرے لوگوں کے درمیان فرق نہ رہا۔ اسی وجہ سے اصولیین اور محدثین میں سے کسی نے یہ تفریق نہیں کی۔ ہاں اگر ابن عربی کہتے کہ ان کے زمانہ میں مطابقت بہت بعید ہے تو یہ بہتر ہوتا۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 7: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ نافع نے یا مضموم کے ساتھ پڑھا ہے اور ابن عامر نے تا مضموم کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ مجاہد کی قراءت ہے باقی قراء نے نون کے ساتھ پڑھا ہے اور نون پر نصب پڑھی ہے یہ زیادہ ظاہر ہے کیونکہ اس سے پہلے وَ اِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا ہے۔ پس نَّغْفِرْ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر دینے پر جاری ہے، تقدیر کلام اس طرح ہوگی: قلنا ادخلوا الباب سجدا نغفر۔ نیز بعد میں بھی سنزید نون کے ساتھ آرہا ہے۔ خَطٰيٰكُمْ یہ اکثر کے قول کے مطابق ہے۔ یہ اپنے باب پر ہے اور جن علماء نے تغفر تا کے ساتھ پڑھا ہے ان کی وجہ یہ ہے کہ لفظ خَطٰيٰكُمْ مونث ہے اس لئے صیغہ بھی مونث ہوگا، کیونکہ یہ خطیئۃ کی جمع مکسر ہے اور یا پڑھنے کی وجہ سے جب فعل اور فاعل کے درمیان فاصلہ آگیا تو فعل کا مذکر ذکر کرنا جائز ہوتا ہے جیسا کہ پیچھے فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ (البقرہ: 37) میں گزرا ہے یا اور تا بہتر ہیں، اگرچہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر دینے کا ذکر ہے وَ اِذْ قُلْنَا میں کیونکہ یہ تو معلوم ہے کہ گناہوں کو بخشنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، پس نون سے استغنا کیا اور فعل کو معاف شدہ خطاؤں کی طرف لوٹایا۔

مسئلہ نمبر 8: خطایا جو کہ خطیئۃٌ کی جمع ہے اس کی اصل میں اختلاف ہے۔ خطیئۃٌ ہمزہ کے ساتھ ہے۔ خلیل نے کہا: خطایا اصل میں خطائی تھا پھر قلب کیا گیا اور کہا گیا: خطائی یعنی ہمزہ پہلے یا بعد میں پھر یا کو الف سے بدلا گیا خطاءا ہو گیا جب دو الف جمع ہوئے جن کے درمیان ہمزہ ہے تو ہمزہ الف کی جنس سے بدل گیا پھر گویا تین الف جمع ہو گئے پھر ہمزہ کو یا سے بدلا گیا تو ہو گیا خطایا۔

سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ اصل خطایئی ہے پھر یا کو ہمزہ بنایا گیا جس طرح مدائن میں یا کو ہمزہ بنایا گیا تو خطائی ہو گیا۔ پھر ایک کلمہ میں دو ہمزے جمع نہیں ہوتے۔ پس دوسرے ہمزہ کو یا سے بدلا گیا تو خطائی ہو گیا پھر پہلی صورت کی طرح عمل کیا گیا۔

فراء نے کہا: خطایا جمع خطیه (بغیر ہمزہ کے) ہے۔ جیسے تو کہتا ہو: ھدیۃ و ھدایا۔ فراء نے کہا: اگر خطایا، خطیئۃٌ (مہموزہ) جمع ہوتا تو خطاءا کہتا۔ کسائی نے کہا: اگر اس کی جمع مہموزہ ہوتو ایک ہمزہ دوسرے ہمزہ میں ادغام ہو جائے گا جیسے تو کہتا ہے: دوابّ۔

مسئلہ نمبر 9: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ یعنی جنہوں نے بچھڑے کی عبادت نہیں کی ان کے احسان میں ہم اضافہ کر دیں گے۔ کہا جاتا ہے: دوسرے دن کے لئے من وسلویٰ جمع کرنے کی خطائیں معاف کر دیں گے اور جس نے دوسرے دن کے لئے من وسلویٰ جمع نہیں کیا ان کے احسان میں اضافہ کر دیں گے۔ کہا جاتا ہے: جو گنہگار ہے اس کی خطائیں معاف کر دیں گے اور جو محسن ہے اس کے احسان میں اضافہ کر دیں گے۔ یعنی ہم ان کے پاس سابقہ احسان پر احسان کا اضافہ کر دیں گے۔ محسنین، احسن سے اسم فاعل ہے۔ المحسن وہ ہوتا ہے جس کا توحید کا عقیدہ صحیح ہو اور اپنے آپ کو چلانے میں خوبصورت ہو اور اپنے فرائض کی ادائیگی کی طرف متوجہ ہو، مسلمانوں سے اپنے شر کو روکے۔ حدیث جبریل میں ہے، احسان کیا ہے؟ فرمایا: تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے اگر تو اسے نہ دیکھ سکے تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ جبریل نے کہا: آپ نے سچ فرمایا (1)۔ اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا ہے۔

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾

"پس بدل ڈالا ان ظالموں نے اور بات سے جو کہا گیا تھا انہیں تو ہم نے اتارا ان ستم پیشہ لوگوں پر عذاب آسمان سے بوجہ اس کے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے"۔

اس میں چار مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا، الَّذِيْنَ محل رفع میں ہے یعنی ان میں سے ظالموں نے بدلا اور بات سے جو انہیں کہا گیا تھا۔ یہ اس طرح ہے کہ انہیں کہا گیا تھا کہ تم کہو: حِطَّةٌ تو انہوں نے کہا حنطة

1۔ صحیح مسلم، حدیث نمبر 8، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 184

جس طرح کہ پہلے گزر چکا ہے۔ انہوں نے ایک حرف کلام سے زیادہ کر دیا۔ پس وہ مصیبت سے دو چار ہوئے، اس میں یہ آگاہی دی کہ دین میں زیادتی اور شریعت میں اپنی ایجاد عظیم خطرہ اور شدید نقصان کا باعث ہے۔ یہ ایک کلمہ کی تبدیلی کی وجہ سے ہوا جو توبہ سے تعبیر تھا وہ ایسے بڑے عذاب کا موجب بنا پھر تمہارا کیا خیال ہے جو معبود کی صفات میں تبدیلی کرتے ہیں۔ یہ قول کی تبدیلی کی سزا تھی حالانکہ قول، عمل سے کم ہوتا ہے، تو جو فعل میں تبدیلی کرتے ہیں ان کا کیا حشر ہوگا۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَبَدَّلَ، بدّل اور ابدل کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ عَسٰی رَبُّنَآ اَنْ یُّبْدِلَنَا دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ جوہری نے کہا: ابدلت الشیء غیرہ۔ تو نے کسی چیز کو دوسری چیز سے بدل ڈالا۔ بدلہ اللہ من الخوف امناً، اللہ تعالیٰ نے اس کے خوف کو امن سے بدل دیا، تبدیل الشیء کسی چیز کو تبدیل کرنا اگرچہ اس کا بدل نہ بھی لایا جائے۔ استبدل الشیء بغیرہ و تبدلہ بہ۔ جب ایک چیز کی جگہ دوسری چیز بدل دے، المبادلہ کا معنی تبادلہ کرنا۔ الأبدال، ایسے نیک لوگوں کو کہتے ہیں جن سے دنیا خالی نہیں ہوتی۔ جب ان میں سے کوئی ایک فوت ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ دوسرے کو ابدال بنا دیتا ہے۔

ابن درید نے کہا، واحد، بدیل ہے اور البدیل کا معنی بدل ہے۔ بدل الشیء غیرہ کسی چیز کو دوسری چیز سے بدلنا۔ کہا جاتا ہے: بَدَلٌ، بِدلٌ۔ یہ دونوں لغتیں ہیں۔ جیسے شَبَہٌ، شِبۡہٌ۔ مَثَلٌ، اور مِثۡل - نَکَلٌ، اور نِکۡلٌ۔ ابو عبید نے کہا: ان چار حروف کے علاوہ فَعَلٌ اور فِعلٌ نہیں سنا گیا۔ البدل اس تکلیف کو بھی کہتے ہیں جو دونوں ہاتھوں اور پیروں میں ہوتی ہے۔ بَدِلَ، یَبۡدَلُ بَدَلاً بھی استعمال ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَنۡزَلۡنَا عَلَى الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا معاملہ کی بڑائی کی وجہ سے ظَلَمُوۡا کے لفظ کو مکرر ذکر کیا ضمیر ذکر نہیں فرمائی۔ تکرار دو قسموں پر ہوتا ہے کلام کے مکمل ہونے کے بعد استعمال ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے اور فَوَيۡلٌ لِّلَّذِيۡنَ يَكۡتُبُوۡنَ الۡكِتٰبَ بِاَيۡدِيۡهِمۡ (البقرہ:79) پھر بعد میں فرمایا قَلِيۡلًا ۗ فَوَيۡلٌ لَّهُمۡ مِّمَّا كَتَبَتۡ اَيۡدِيۡهِمۡ (البقرہ:79) مما کتبوا نہیں فرمایا۔ ویل کا لفظ ان کے فعل کی تغلیظ کے لئے دوبارہ ذکر فرمایا۔ اسی سے خنساء کا قول ہے:

تعرقنی الدھر نھشا و حزاً   و اوجعنی الدھر قرعاً و غمزاً

یعنی زمانہ نے مجھے بڑی بڑی مصیبتوں اور چھوٹی چھوٹی تکلیفوں سے دوچار کیا۔

دوسری قسم تکرار کی یہ ہوتی ہے کہ ضمیر کی جگہ پر کلام کے مکمل ہونے سے پہلے اسم ظاہر کا تکرار کیا جاتا ہے جیسے اَلۡحَآقَّةُ ۙ مَا الۡحَآقَّةُ ۚ (الحاقہ) اَلۡقَارِعَةُ ۙ مَا الۡقَارِعَةُ ۚ (القارعہ) اگر تعظیم و تفخیم کا ارادہ نہ کیا جاتا تو قیاس کا تقاضا یہ تھا الحاقة ماھی۔ القارعة ماھی۔ اس کی مثل ہے فَاَصۡحٰبُ الۡمَيۡمَنَةِ ۙ مَاۤ اَصۡحٰبُ الۡمَيۡمَنَةِ ؕ (الواقعہ) وَ اَصۡحٰبُ الۡمَشۡـَٔمَةِ ۙ مَاۤ اَصۡحٰبُ الۡمَشۡـَٔمَةِ ؕ (الواقعہ) اَصۡحٰبُ الۡمَيۡمَنَةِ کو ان کے بڑے ثواب کو پانے کی وجہ سے اظہار شان کے لئے مکرر ذکر کیا اور اَصۡحٰبُ الۡمَشۡـَٔمَةِ کو ان کے عذاب الیم کے پانے کی وجہ سے مکرر ذکر کیا ہے۔

اسی قسم سے شاعر کا قول ہے:

لیت الغراب غداۃ ینعب دائباً کان الغراب مقطع الاوداج

اس شعر میں شاعر نے الغراب کو دو دفعہ ذکر کیا۔

عدی بن زید نے دونوں معانی کو جمع کیا ہے۔ اس نے کہا:

لا اری الموت یسبق الموت شیء نغص الموت ذا الغنی والفقیرا

شاعر نے موت کے لفظ کو تین مرتبہ ذکر کیا۔ یہ پہلی قسم سے ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

الاحبذا هندٌ و ارض بها هند و هند اتی من دونها النأی والبعد

اس میں شاعر نے محبوب کی عظمت شان کے لئے اس کا تین دفعہ ذکر کیا۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: رِجْزًا جمہور کی قرأت رجزاً را کے کسرہ کے ساتھ ہے اور ابن محیصن نے ر کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ الرجز کا معنی عذاب ہے اور سین کے ساتھ رجس ہو تو اس کا معنی بدبو اور گندگی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ (توبہ: 125) یعنی بدبو کو ان کی بدبو کی طرف زیادہ کر دیا۔ یہ کسائی کا قول ہے۔ فراء نے کہا: الرجز سے الرجس ایک چیز ہے۔ ابو عبید نے کہا: جیسے کہا جاتا ہے السدغ، الزدغ اسی طرح رجس اور رجز ہم معنی ہیں۔ فراء نے کہا: بعض نے کہا الرُّجز (را کے ضمہ کے ساتھ) ایک بت کا نام ہے جس کی وہ عبادت کرتے تھے۔ اس کے ساتھ بھی اس ارشاد میں پڑھا گیا ہے: الرُّجز فاهجر۔

اور الرجز (را اور جیم کے فتحہ کے ساتھ) یہ شعر کی ایک قسم ہے۔ خلیل نے شعر ہونے کا انکار کیا ہے۔ یہ الرَّجز سے مشتق ہے جو اونٹ کے پچھلے حصہ کو لاحق ہوتی ہے جب اسے لاحق ہوتی ہے تو اس کی رانیں کانپنے لگتی ہیں۔

بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ یعنی یفسقهم۔ الفسق کا معنی نکلنا ہے۔ یہ پیچھے گزر چکا ہے۔ ابن وثاب اور نخعی نے یفسِقون سین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَ اِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَ لَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿٦٠﴾

''اور یاد کرو جب پانی کی دعا مانگی موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے تو ہم نے فرمایا: مارو اپنا عصا فلاں چٹان پر۔ تو فوراً بہہ نکلے اس چٹان سے بارہ چشمے۔ پہچان لیا ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ۔ کھاؤ اور پیو اللہ کے دیئے ہوئے رزق سے اور نہ پھرو زمین میں فساد برپا کرتے ہوئے''۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ التقائے ساکنین کی وجہ سے ذال کو کسرہ دیا گیا ہے، سین، سوال کے لئے ہے مثلاً استعلم، استخبر، استنصر (علم طلب کرنا۔ خیر طلب کرنا، مدد چاہنا) یعنی اپنی قوم کے لئے پانی پلانا طلب کیا۔ عرب کہتے ہیں: سقیتہ و اسقیتہ یہ دونوں لغتیں ہم معنی ہیں۔ شاعر نے کہا:

سقی قومی بنی مجدٍ واسقی نمیرًا والقبائل من هلال

اور یہ بھی کہا گیا ہے: سقیتہ یہ سقی الشفۃ سے مشتق ہے۔ اسقیتہ کا مطلب ہے: میں نے پانی پر اس کی رہنمائی کی۔

مسئلہ نمبر 2: الاستسقاء، پانی کے نہ ہونے اور بارش نہ برسنے پر ہوتا ہے۔ جب صورت حال ایسی ہو تو اس وقت عبودیت، فقر، مسکنت اور ذلت کے اظہار کا حکم ہوتا ہے ساتھ ساتھ خالص توبہ کا بھی حکم ہوتا ہے۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بارش طلب کی، آپ عیدگاہ کی طرف تواضع وانکساری اور تضرع وزاری کرتے ہوئے نکلے (1)۔ یہ تیرے لئے دلیل کافی ہے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا تو ہمارے لئے کتنا ضروری ہوگا، ہماری تو توبہ بھی نہیں ہوتی مگر یہ کہ ہٹ دھرمی، اللہ تعالیٰ کی مخالفت۔ ہمیں پھر بارش کیسے دی جائے گی۔ لیکن حدیث ابن عمر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: لوگوں نے اپنے اموال کی زکوٰۃ کو نہ روکا مگر آسمان سے بارش روک دی گئی۔ اگر چوپائے نہ ہوتے تو انہیں بارش نہ دی جاتی (2)، مکمل حدیث آگے آئے گی۔

مسئلہ نمبر 3: استسقا کا طریقہ: عیدگاہ کی طرف نکلنا ہے ... جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے ... خطبہ اور نماز ہے، یہ جمہور علماء کا قول ہے۔ امام ابوحنیفہ کا نظریہ یہ ہے کہ اس کی نسبت سے نہ نماز ہے نہ عیدگاہ کی طرف نکلنا ہے یہ صرف دعا ہے اور امام ابوحنیفہ نے حضرت انس کی صحیح حدیث سے حجت پکڑی ہے جسے بخاری ومسلم نے نقل کیا ہے۔

اس حدیث میں امام ابوحنیفہ کے لئے حجت نہیں ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی جو فوراً قبول کی گئی، آپ نے اسی پر اکتفا کیا اور دوسری چیزوں کو چھوڑ دیا۔ اس میں سنت کے بیان کا ارادہ نہ کیا۔ جب سنت کے بیان کا قصد کیا تو اپنے فعل سے اسے بیان کیا جیسا کہ عبد اللہ بن زید المازنی نے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیدگاہ کی طرف نکلے بارش طلب کی اور اپنی چادر کو الٹایا اور دو رکعت نماز پڑھی (3)، اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا۔ استسقا کے مزید احکام سورۂ ہود میں آئیں گے۔ ان شاء اللہ

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ، العصا، ڈنڈا۔ یہ اسم مقصور مؤنث ہے، اس کا الف واؤ کا بدل ہے۔ شاعر نے کہا:

علی عصویها سابریٌ مُشَبرقُ

1۔ سنن ابن ماجہ، باب ما جاء فی صلاۃ الاستسقاء، حدیث نمبر 1255، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، باب العقوبات، حدیث نمبر 4008، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، ابواب الاستسقاء، باب تحویل الرداء فی الاستسقاء، حدیث نمبر 956، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

(یعنی ڈول کی لکڑیوں پر باریک پھٹا ہوا کپڑا ہے)

عصا کی جمع عُصِیّ و عِصِیّ یہ فعول کا وزن ہے عین کو مابعد کسرہ کی وجہ سے کسرہ دیا گیا اور اس کی جمع اَعْصٍ بھی آتی ہے مثلاً زمن از مُن۔ ضرب المثل ہے: العصا من العُصیة یعنی بعض امر بعض سے ہے۔ عربوں کا قول ہے: القی عصاہ۔ یعنی اس نے سفر ترک کر دیا۔ یہ مثال ہے۔ کہا:

فالقت عصاها واستقربها النوی کما قرّ عیناً بالایاب المسافرُ

قرآن حکیم میں ہے:

وَ مَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى۝ قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا (طہ)

عصا کے منافع پر کلام اسی آیت کے تحت ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

فراء نے کہا: سب سے پہلی غلطی عراق میں سنی گئی۔ وہ یہ تھی: ھذہ عصاتی۔ کبھی اجتماع وافتراق کو عصا سے تعبیر کیا جاتا ہے اسی وجہ سے خوارج کے بارے میں کہا جاتا ہے: شقوا عصا المسلمین یعنی خوارج نے مسلمانوں کے اجتماع کو پھاڑ دیا۔ وانشقت العصا، یعنی اختلاف واقع ہوگیا۔ شاعر نے کہا:

اذا کانت الهیجاء وانشقت العصا فحسبك والضحاك سیف مهنّدٌ

یعنی تجھے اور ضحاک کو تیز تلوار کفایت کرے گی جب جنگ شروع ہوجائے اور اختلاف واقع ہوجائے۔

عرب کہتے ہیں: لا ترفع عصاك عن اھلك یعنی ان کو ادب سکھاؤ۔ واللہ اعلم

حجر (پتھر) قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ تھوڑے پتھر ہوں تو اس کی جمع احجار ہو اور زیادہ ہوں تو حجار، حجارۃ ہو اور الحجارۃ بہت نادر ہے۔ یہ ہمارے اس قول کی طرح ہے: جمل و جمالہ۔ ذکر و ذکارۃٌ۔ اسی طرح ابن الفارس اور جوہری نے کہا۔

میں کہتا ہوں: قرآن میں ہے: فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ (البقرہ:74) وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ (البقرہ:74) قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً (الاسراء:50) تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ (الفیل:4) وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً (الحجر:74) قرآن میں اتنی مرتبہ حجر کی جمع حجارۃ استعمال ہوئی ہے تو پھر یہ نادر کیسے ہے۔ مگر یہ کہ یہ دونوں یہ مراد لیتے ہوں کہ قیاس میں نادر ہے استعمال میں کثیر فصیح ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَانْفَجَرَتْ اس کلام میں حذف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے: فضرب فانفجرت۔ اللہ تعالیٰ اس پر بھی قادر تھا کہ وہ پانی کو نکال دیتا اور بغیر ضرب کے پتھر کو پھاڑ دیتا لیکن اس نے اپنی حکمت کی وجہ سے مسببات کو اسباب کے ساتھ مربوط فرمایا تاکہ اس کے بدلے اپنی مراد تک پہنچ سکیں اور اس پر آخرت میں ان کا ثواب وعقاب مرتب ہو الانفجار کا معنی الانشقاق (پھٹنا) ہے۔ اسی سے ہے: انشق الفجر۔ انفجر الماء انفجاراً یعنی فجر پھوٹ پڑی، پانی کھل گیا، الفجرۃ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں سے پانی نکلے۔ الانبجاس۔ یہ انفجار سے تنگ ہوتا ہے کیونکہ پہلے انبجاس ہوتا ہے پھر انفجار ہوتا

ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: انبجس، تجبس، تفجر، تفتق تمام کا ایک معنی ہے۔ یہ ہروی وغیرہ نے بیان کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا، اثْنَتَا یہ انفجرت کی وجہ سے محل رفع میں ہے علامت رفع اس میں الف ہے اس کو اعراب دیا گیا ہے جب کہ دوسرے اسماء اعداد (یعنی ۱۱ سے ۱۹ تک کے اسماء اعداد) کو اعراب نہیں دیا جاتا (دونوں جز مبنی بر فتحہ ہوتے ہیں) کیونکہ تثنیہ ہمیشہ اپنے معنی کی صحت کی وجہ سے معرب ہوتا ہے۔

عَيْنًا اس کو بیان کی وجہ سے نصب دی گئی ہے۔ مجاہد، طلحہ اور عیسیٰ نے عَشِرَةَ شین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ بنی تمیم کی لغت ہے، یہ ان کی لغت سے نادر ہے کیونکہ ان کا طریقہ تخفیف ہے اور اہل حجاز کی لغت عشرہ ہے کیونکہ ان کا طریقہ التثقیل ہے۔ یہ تمام نحاس نے بیان کیا ہے۔ العین کا لفظ اسماء مشترکہ میں سے ہے۔ کہا جاتا ہے: عین الماء، عین الانسان، عین الرکبة، عین الشمس (پانی کا چشمہ، انسان کی آنکھ، گھٹنا، سورج کی ٹکیہ) العین اس بادل کو بھی کہتے ہیں جو قبلہ کی سمت سے آتا ہے۔ العین اس بارش کو بھی کہتے ہیں جو متواتر پانچ یا چھ دن برستی رہے اور ختم نہ ہو۔ بلدٌ قلیل العین۔ ایسا شہر جس میں لوگ کم ہوں۔ وَمَا بها عین، یا کی حرکت کے ساتھ۔ العین مشکیزہ کے سوراخ کو بھی کہتے ہیں۔ العین من الماء (پانی کا چشمہ) العین من الحیوان (حیوان کی آنکھ سے) مشابہ ہے کیونکہ اس سے پانی اس طرح نکلتا ہے جس طرح حیوان کی آنکھ سے آنسو نکلتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: چونکہ جو حیوان کی آنکھ سے نکلتا ہے وہ اس سے افضل ہے جو انسان میں ہے۔ اسے عین الماء پانی کے چشمہ سے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ زمین میں جو کچھ ہے اس سے افضل ہے۔

مسئلہ نمبر 6: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے پانی طلب کیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنا عصا پتھر پر مارنے کا حکم دیا۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ پتھر طور پہاڑ کا تھا اور مربع شکل میں تھا، بکری کے سر کے برابر تھا، بوری کے ٹکڑے میں ڈالا جاتا تھا اور اس کے ساتھ سفر کیا جاتا تھا۔ جب کسی جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم اترتی تو وہ ان کے پڑاؤ کے درمیان رکھا جاتا تھا۔ ذکر کیا جاتا ہے کہ وہ پتھر اٹھاتے نہیں تھے بلکہ ہر مقام پر وہ پتھر پا لیتے تھے۔ یہ اعجاز و معجزہ میں بہت بڑی چیز ہے (1)۔ بعض علماء نے فرمایا: چونکہ حجر مطلق ذکر کیا گیا ہے تاکہ حضرت موسیٰ علیہ اسلام جس پتھر پر چاہیں عصا مار دیں، پانی جاری ہو جائے گا، یہ معجزہ ہونے میں زیادہ بلیغ ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ایک معین پتھر پر عصا مارنے کا حکم دیا تھا جو اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے بیان کیا تھا اسی وجہ سے اسے معرفہ ذکر فرمایا۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا: یہ وہ پتھر تھا جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے غسل کرتے وقت کپڑے رکھے تھے اور وہ آپ کے کپڑے لے کر بھاگ گیا تھا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اس الزام سے آپ کو بری فرمایا جو آپ کی قوم آپ پر لگاتی تھی۔ ابن عطیہ نے کہا: (2) اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ پتھر جو مربع شکل میں تھا، ہر طرف سے تین چشمے نکلتے تھے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اس پر اپنا عصا مارتے تھے۔ جب انہیں پانی کی ضرورت نہ ہوتی تھی اور وہ چل پڑتے تھے تو چشمے خشک ہو جاتے تھے۔

میں کہتا ہوں: ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پانی اپنی انگلیوں سے اور اپنے ہاتھ سے نکالنے کا معجزہ عطا کیا گیا تھا۔ یہ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ سے بڑا معجزہ ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں صبح وشام پتھروں سے پانی نکل رہا ہے لیکن ہمارے نبی کا معجزہ ایسا تھا جو ہمارے نبی سے پہلے کسی کے لئے نہیں تھا، ہمارے نبی نے گوشت اور خون کے درمیان سے پانی نکالا۔ ائمہ ثقات اور فقہاء اثبات نے حضرت عبداللہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے۔ ہم نے پانی نہ پایا، تو ایک چھوٹا سا پتھر کا پیالہ لایا گیا آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ اس میں داخل کیا، میں نے دیکھا پانی آپ کی انگلیوں سے نکل رہا تھا اور آپ فرمارہے تھے، آؤ پاکیزہ پانی کی طرف (1)۔ اعمش نے کہا: مجھے سالم بن ابی الجعد نے بیان کیا، فرمایا: میں نے حضرت جابر سے پوچھا: اس وقت تم کتنے لوگ تھے؟ حضرت جابر نے کہا: پندرہ سو۔ یہ نسائی کے الفاظ ہیں۔

مسئلہ نمبر 7: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ یعنی ان میں سے ہر ایک قبیلہ کے لئے ایک چشمہ تھا جسے وہ قبیلہ پہچانتا تھا اور وہ کسی دوسرے چشمہ سے نہیں پیتا تھا۔ المشرب، (پینے کی جگہ)۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد مشروب ہے۔

اسباط بنی اسرائیل میں عربوں کے قبائل کی طرح تھے۔ یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں کی اولاد تھے۔ ہر سبط کے لئے ایک چشمہ تھا وہ اس سے تجاوز نہیں کرتے تھے (2)۔ عطا نے کہا: اس پتھر کے چار اطراف تھے ہر ایک طرف سے تین چشمے نکلتے تھے ہر سبط کے لئے ایک چشمہ تھا ہر ایک اپنے چشمہ کو ہی استعمال کرتا تھا اور ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ ہر سبط میں پچاس ہزار جنگجو تھے، ان کے گھوڑوں اور چوپایوں کے علاوہ، عطا نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ضرب سے پتھر پر عورت کے پستان کی مثل پہلے ابھار پیدا ہوتا پھر پانی بہنے لگتا۔

مسئلہ نمبر 8: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُلُوا وَاشْرَبُوا کلام میں حذف ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے: وقلنا لھم کلوا المن والسلوی واشربوا الماء المتفجر المنفصل۔ ہم نے انہیں کہا: من وسلویٰ کھاؤ اور پھوٹنے والا پانی پیو۔

وَلَا تَعْثَوْا یعنی فساد برپا نہ کرو۔ العیث، سخت فساد کو کہتے ہیں اس سے انہیں منع فرمایا۔ کہا جاتا ہے: عثِیَ یعثی عُثِیّاً وعثا یعثو عثوا۔ عاث یعیث عیثاً وعیوثاً، معاثاً۔ پہلی لغت قرآن ہے۔ کہا جاتا ہے: عث یعث (مضاعف) اس کا معنی بھی فساد برپا کرنا ہے۔ اس سے العثۃ ہے، اون چاٹنے والا کیڑا۔

مُفْسِدِينَ یہ حال ہے، لفظ کے اختلاف کی وجہ سے تاکیداً معنی کو مکرر ذکر کیا ہے ان کلمات میں نعمتوں کی اباحت، ان کی تعداد، معاصی کی طرف پیش قدمی اور ان سے نہی کا ذکر ہے۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يَٰمُوسَىٰ لَن نَّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَٰحِدٍ فَٱدْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنۢبِتُ ٱلْأَرْضُ مِنۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُومِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ۖ قَالَ أَتَسْتَبْدِلُونَ ٱلَّذِى

1۔ صحیح بخاری، باب علامات النبوۃ فی الاسلام، حدیث نمبر 3314، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 3807

2۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذا

هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ ۭ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ۭ وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۤ وَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝

''اور یاد کرو جب تم نے کہا: اے موسیٰ علیہ السلام! ہم صبر نہیں کر سکتے ایک ہی طرح کے کھانے پر۔ سو آپ دعا کیجئے ہمارے لئے اپنے پروردگار سے کہ نکالے ہمارے لئے وہ جن کو زمین اگاتی ہے (مثلاً) ساگ اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: کیا تم لینا چاہتے ہو وہ چیز جو ادنیٰ ہے اس کے بدلہ میں جو عمدہ ہے۔ (اچھا) جا رہو کسی شہر میں تمہیں مل جائے گا جو تم نے مانگا۔ اور مسلط کر دی گئی ان پر ذلت اور غربت اور مستحق ہو گئے غضب الٰہی کے۔ یہ (سب کچھ) اس وجہ سے تھا کہ وہ انکار کرتے رہتے تھے اللہ کی آیتوں کا اور قتل کرتے تھے انبیاء کو ناحق۔ یہ (سب کچھ) اس وجہ سے تھا کہ وہ نافرمان تھے اور حد سے بڑھ جایا کرتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ یہ انہوں نے تیہ کے صحراء میں کہا تھا جب وہ من و سلویٰ کھا کھا کر اکتا گئے تھے۔ انہوں نے اپنی پہلی شہری زندگی کو یاد کیا(1)۔ حسن نے کہا: وہ سبزیوں، پیازوں اور دالوں کے کھانے کے عادی تھے۔ پس وہ اپنی عادت کی طرف مائل ہو گئے۔ ان کی طبیعتیں، ان کی سابقہ عادت کا اشتیاق کرنے لگیں۔ انہوں نے کہا: ہم ایک جیسے کھانے پر صبر نہیں کریں گے۔ انہوں نے من وسلویٰ کو ایک کھانا کہا حالانکہ یہ دو کھانے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے ایک کھانے کو دوسرے کے ساتھ ملا کر کھاتے تھے۔ اسی وجہ سے انہوں نے کہا: ایک کھانا۔ بعض علماء نے فرمایا: ہر دن چونکہ بار بار یہی کھانا ملتا تھا اسی وجہ سے انہوں نے اسے ایک کھانا کہا جیسے تو اس شخص کے بارے میں کہتا ہے جو روزہ، نماز اور قراءت پر مداومت اختیار کرتا ہے، وہ ایک امر پر ہے کیونکہ وہ ان تمام کاموں پر ملازمت اختیار کیے ہوئے ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: لَنْ نَّصْبِرَ کا معنی یہ ہے کہ ہم تمام اغنیاء ہیں ہم میں سے کوئی دوسرے پر مدد حاصل کرنے پر قادر نہیں ہے کیونکہ ہر شخص دوسرے سے مستغنی تھا(2)۔ وہ اسی طرح تھے یہ پہلے وہ لوگ تھے جنہوں نے غلام اور خدام بنائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَلٰى طَعَامٍ طعام کا اطلاق ہر کھانے اور پینے والی چیز پر ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْۤ (البقرہ:249) (اور جس نے نہ پیا وہ یقیناً میرے ساتھیوں میں سے ہے) اور ارشاد ہے: لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْۤا (المائدہ:93) (نہیں ان لوگوں پر جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے کوئی گناہ نہیں (اس حکم سے پہلے) وہ کھا پی چکے۔) یعنی جو انہوں نے شراب پی اس کا بیان اپنے مقام پر آئے گا۔ اگر سلویٰ سے مراد شہد ہے جیسا کہ المورج نے حکایت کیا ہے تو وہ بھی مشروب ہے۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ ایضاً

بعض اوقات طعام کے ساتھ گندم اور کھجور کو خاص کیا جاتا ہے جیسا کہ حضرت ابو سعید خدری کی حدیث میں ہے۔ فرمایا: ہم رسول اللہ کے عہد میں صدقہ فطر ایک صاع طعام یا ایک صاع جو نکالتے تھے (1)۔ عرف اسی سے جاری ہے کہ جب کوئی کہتا ہے: ذهبت الی سوق الطعام تو اس سے یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ جگہ جہاں کھانے یا پینے کی چیزیں فروخت ہوتی ہیں۔ الطعم (طاء کے فتحہ کے ساتھ) جو ذائقہ دے۔ کہا جاتا ہے: طعمه مر اس کا ذائقہ کڑوا ہے۔ الطعم جس کی بدخواہی کی جائے۔ کہا جاتا ہے: لیس له طعم اس کا کوئی ذوق نہیں ہے۔ و ما فلانٌ بذی طعام، جب کوئی بیکار شخص ہو۔ الطعم (طاء کے ضمہ کے ساتھ) کھانا۔ ابو خراش نے کہا:

ارد شجاع البطن لو تعلمينهٔ و أوثر غيري من عيالك بالطعم

واغتبق الماء القراح فانتهى اذا الزاد امسى للمزلج ذا طعم

شاعر نے پہلے طعم سے کھانا مراد لیا اور دوسرے طعم سے وہ چیز مراد لی جس کا شوق کیا جاتا ہے۔ طَعِمَ یطعَمُ فهو طاعم، جب کوئی کھائے اور چکھے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ (البقرہ: 249) (یعنی جس نے نہ چکھا) فرمایا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا (احزاب: 53) (یعنی جب تم کھا چکو)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمزم کے بارے میں فرمایا: انها طعام طعم و شفاء سقم یہ کھانے کا کھانا ہے اور بیمار کے لئے شفاء ہے۔ استطعمنی فلان الحدیث یعنی اس نے مجھے بات بتائی۔ اور حدیث میں ہے: استطعمنی فلان الحدیث۔ یعنی اس نے مجھے بات بتائی۔ اور حدیث میں ہے: اذا استطعمکم الامام فاطعموه۔ جب امام تم پر اپنے خزانے کھول دے تو تم بھی اس پر کھول دو۔ فلان ما یطعم النوم الا قائماً، وہ شخص کھڑے کھڑے سو لیتا ہے۔ شاعر نے کہا:

نعامًا بوجرة صفر الخدود و ما تطعم النوم الا صياماً

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ بنی عامر کی لغت فادعِ عین کے کسرہ کے ساتھ ہے کیونکہ دو ساکنوں کا التقاء ہو گیا ہے۔ وہ معتل کو صحیح کے قائم مقام رکھتے ہیں۔ وہ محذوف کا اعتبار نہیں کرتے۔ اور يُخْرِجْ کو جزم سَلْه اور قُلْ له کے معنی کی وجہ سے ہے۔ اخرج، یخرج۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ لام کے حذف کی تقدیر کے ساتھ دعا کے معنی میں ہے۔ زجاج نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ مِمَّا میں مِنْ اخفش کے قول کے مطابق زائدہ ہے اور سیبویہ کے قول کے مطابق غیر زائدہ ہے کیونکہ کلام موجب ہے۔ نحاس نے کہا: اخفش نے یہ اس لئے کیا کیونکہ اس نے خرج کا مفعول نہیں پایا۔ اس نے ما کو مفعول بنانے کا ارادہ کیا۔ بہتر یہ ہے کہ مفعول محذوف ہو اس پر تمام کلام دلالت کر رہا ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے: یخرج لنا مما تنبت الارض ما کولاً۔ اس صورت میں پہلا من بعضیہ ہے اور دوسرا تخصیص کے لئے ہے۔ و من بقلها حرف جر کے اعادہ کے ساتھ یہ ما سے بدل ہے۔ وَقِثَّآىِٕهَا، یہ معطوف ہے اسی طرح بعد والی کلام بھی معطوف ہے، البقل۔ ہر وہ سبزی جس کا تنا نہ ہو الشجر جس کا تنا ہو۔

1۔ صحیح بخاری، باب صدقة الفطر صاع من طعام، حدیث نمبر 1412، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

القثاء یہ معروف ہے۔ کبھی اس میں قاف کو ضمہ دیا جاتا ہے یہ یحییٰ بن وثاب اور طلحہ بن مصرف کی قراءت ہے(1)۔ یہ دونوں لغتیں ہیں۔ کسرہ زیادہ ہے۔ بعض نے جمع میں قثائی کہا جیسے علباء کی جمع علابی مگر قثاء واوی ہے تو کہتا ہے: اقثأت القوم یعنی میں نے لوگوں کو کھیرے کھلائے و قثأت القدر جب ہانڈی کے پانی کا ابلنا ختم ہو جائے۔ جعدی نے کہا:

تفور علینا قدرھم فندیمھا و نفثؤھا عنا اذا حمیھا غلا

فثأت الرجل جب کسی کو کلام یا کسی اور ذریعے سے توڑ دے اور تو اس کے غصہ کو ٹھنڈا کر دے۔ عدا حتی افثا، یعنی وہ دوڑا حتیٰ کہ وہ تھک گیا، اور اس نے پوری کوشش کی۔ افثأ الحر، گری ڈھیلی پڑ گئی۔ عرب تھوڑی سی نیکی میں مثال دیتے ہیں: ان الرثیئة تفثأ الغضب۔ اس کی اصل یہ ہے کہ ایک شخص لوگوں سے ناراض ہوا اور غصہ کے ساتھ ساتھ وہ بھوکا بھی تھا۔ پس انہوں نے اسے دہی یا لسی پلائی تو اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ الرثیئة، کھٹی چیز پر دوہا گیا دودھ تا کہ وہ دہی بن جائے، رثأت اللبن رثأ جب دودھ کو کھٹی چیز پر دوہا جائے تا کہ دہی بن جائے۔ اسم الرثیئة سے ارتثأ اللبن۔ اس کا معنی ہے: دودھ دہی بن گیا۔

ابن ماجہ نے اپنی سند سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا: میری والدہ موٹاپے کے لئے میرا علاج کرتی تھی۔ آپ چاہتی تھیں کہ آپ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجیں۔ یہ ان کے لئے ممکن نہ ہوا حتیٰ کہ میں نے کھجور کے ساتھ کھیرے کھائے تو میں اچھی طرح موٹی ہو گئی (2)۔ یہ سند صحیح ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَفُوْمِهَا۔ فوم کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ تھوم ہے کیونکہ پیاز کے مشابہ ہے یہ جویبر نے ضحاک سے روایت کیا ہے۔ الثاء، فاء سے بدل جاتی ہے جیسے عرب کہتے ہیں: مغافیر اور مغاثیر۔ جدثٌ و جدفٌ (قبر) حضرت ابن مسعود نے ثاء کے ساتھ ثوم ہی پڑھا ہے۔ حضرت ابن عباس سے یہی مروی ہے۔ امیہ بن صلت نے کہا:

کانت منازلھم اذ ذاک ظاھرۃً فیھا الفرادیسُ والفومان والبصل

ان کے گھر ظاہر تھے ان میں انگور کی بیلیں، تھوم اور پیاز تھے۔

حضرت حسان نے کہا:

وانتم اناسٌ لئام الاصول طعامکم الفوم و الحوقل

تم لوگ اصل کے اعتبار سے لئیم (کمینے) ہو تمہارا کھانا تھوم اور سبزیاں ہیں۔

یعنی تھوم اور پیاز ہے۔ یہ کسائی اور نضر بن شمیل کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الفوم سے مراد گندم ہے۔ حضرت ابن عباس اور اکثر مفسرین سے یہی مروی ہے (3)۔ نحاس نے اس کو پسند کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: یہ معنی بہتر ہے، جس نے یہ معنی کیا ہے وہ اعلیٰ ہے اور اس کی اسانید صحیح ہیں اور جویبر کی روایت کے لئے کوئی مثال نہیں ہے اگرچہ کسائی اور فراء

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

2۔ سنن ابن ماجہ، باب القثاء والرطب یجمعان، حدیث نمبر 3314، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

نے بھی پہلے قول کو پسند فرمایا ہے کیونکہ عرب فا کو ثا سے بدل دیتے ہیں اور ابدال پر قیاس نہیں کیا جاتا۔ اور یہ عربوں کے کلام میں زیادہ نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس نے احیحہ بن جلاح کا شعر پڑھا اس شخص کے لئے جس نے آپ سے فوم کا مطلب پوچھا جبکہ وہ گندم ہے:

قد کنت اغنی الناس شخصا واحداً ورد المدینة عن زراعة فوم

ابن درید نے کہا: الفومة سے مراد خوشہ ہے۔ اس نے یہ شعر پڑھا:

وقال ربئیهم لما اتانا بکفه فومةٌ او فومتان

ان کے چوکیدار نے کہا: جب وہ ہمارے پاس آیا اس کی ہتھیلی میں ایک خوشہ تھا یا دو تھے۔

اور بکفه میں ھا غیر مشبعہ حرکت ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الفوم سے مراد دال ہے۔ یہ شامی لغت ہے اس کے پیچھے والے کو فامی مغیرّعن فومی۔ کیونکہ وہ نسب میں تبدیلی کرتے تھے جیسا کہ سہلی اور دہری نے کہا۔ کہا جاتا ہے: فوموا لنا، ہمارے لئے روٹی پکاؤ۔ فراء نے کہا: یہ قدیم لغت ہے۔ عطا اور قتادہ نے کہا: الفوم ہر اس دانے کو کہتے ہیں جس سے روٹی پکائی جائے۔

مسئلہ: علماء کا پیاز، تھوم اور بدبودار دوسری سبزیاں کھانے میں اختلاف ہے۔ جمہور علماء ان کی اباحت کے قائل ہیں کیونکہ ان کے بارے میں احادیث ثابت ہیں اور اہل ظواہر کا ایک گروہ جو جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا فرض خیال کرتے ہیں وہ ایسی چیزوں کے کھانے سے منع کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: ہر وہ چیز جو فرض کی طرف آنے اور فرض کے قیام سے روکے اس کا کرنا حرام ہے اور اس کے ساتھ مشغول ہونا حرام ہے۔ انہوں نے اس سے دلیل پکڑی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خبیث کہا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وصف بیان فرمایا کہ یُحَرِّمُ الخبائث کہ آپ خبیث چیزوں کو حرام کرتے ہیں اور جمہور کی حجت وہ حدیث ہے جو حضرت جابر سے ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک تھال لایا گیا جس میں سبزیاں تھیں۔ آپ نے ان سے بو محسوس کی۔ حضرت جابر نے فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سبزیوں کے متعلق بتایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان کو ان کے (صحابہ جو آپ کے پاس موجود تھے) قریب کردو۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ وہ صحابہ بھی اس کا کھانا ناپسند کر رہے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم کھاؤ کیونکہ میں ان سے باتیں کرتا ہوں جن سے تم باتیں نہیں کرتے (1)۔ اس حدیث کو مسلم اور ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔ اس حدیث میں واضح ثبوت ہے کہ یہ آپ کے لئے نہ کھانا خاص تھا اور دوسروں کے لئے مباح تھا۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوایوب سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوایوب کے پاس تشریف لائے تو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کھانا تیار کیا جس میں تھوم بھی تھا۔ جب کھانا واپس حضرت ابوایوب کے گھر بھیجا گیا تو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں کے لگنے کی جگہ پوچھی تو انہیں بتایا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کھانا کھایا ہی نہیں۔ حضرت ابوایوب پریشان ہوئے اور آپ کے پاس اوپر چڑھ گئے۔ پوچھا: حضور! کیا یہ حرام ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں لیکن میں اسے ناپسند کرتا ہوں۔ حضرت ابوایوب نے کہا میں بھی اسے ناپسند کرتا ہوں جسے آپ ناپسند کرتے

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی اکل الثوم، حدیث نمبر 3326، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہیں یا فرمایا: جسے آپ نے ناپسند کیا۔ فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی آتی تھی یہ حرام نہ ہونے پر نص ہے۔ اسی طرح حضرت ابو سعید خدری نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے جب صحابہ نے خیبر کے حملہ اور اس کی فتح کے زمانہ میں تھوم کھایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے لوگو! جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے حلال فرمایا میں اسے حرام نہیں کر سکتا لیکن یہ ایک درخت (تھوم) ہے جسے میں ناپسند کرتا ہوں۔ یہ تمام احادیث یہ شعور دیتی ہیں کہ یہ حکم آپ کے ساتھ خاص ہے کیونکہ فرشتوں کے ساتھ ہم کلام ہونے میں آپ خاص تھے لیکن حدیث میں اس حکم کو اس طرح پایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے لوگ اس میں برابر ہیں۔ جہاں فرمایا: جس نے اس سبزی تھوم سے کھایا..... کبھی فرمایا: میں نے پیاز اور تھوم اور کراث (بدبودار سبزی ہے) سے کھایا وہ ہماری مسجد کے قریب نہ آئے کیونکہ ملائکہ کو بھی اس سے تکلیف ہوتی ہے جس سے بنی آدم کو تکلیف ہوتی ہے۔ حضرت عمر بن خطاب نے ایک طویل حدیث میں فرمایا: اے لوگو! تم ان درختوں سے کھاتے ہو میں انہیں خبیث دیکھتا ہوں۔ یہ پیاز اور تھوم ہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا جب آپ مسجد میں کسی شخص سے ان دو چیزوں (پیاز، تھوم) کی بدبو محسوس کرتے تو اسے نکالنے کا حکم دیتے تو وہ بقیع کی طرف نکال دیا جاتا۔ تو جو ان دو (پیاز اور تھوم) میں سے کھائے اسے اچھی طرح پکا کر کھائے۔ (مسلم)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ عَدَسِهَا وَ بَصَلِهَا، العدس معروف ہے۔ العدسة وہ پھوڑا جو ان کو نکلتا ہے اور بعض اوقات اسے قتل کر دیتا ہے۔ عَدَسْ خچر کو جھڑکنے کے لئے بولتے ہیں۔

عَدَسْ مالعبادٍ علیكِ امارة نجوتِ و هذا تحملین طلیق

العدس۔ سختی سے روندنے کو کہتے ہیں اور کوشش کو بھی کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: عدسہ، عدس فی الارض۔ یعنی زمین میں چلا گیا۔ وعدست الیه المنیة، موت اس کی طرف چلی۔

کمیت نے کہا:

اکلفها هول الظلامِ و لم ازل اخا اللیل معدوساً الی وعادسا

یعنی میری طرف رات کے وقت اسے چلایا جاتا ہے۔

عدس ایک لغت میں حدس بھی ہے۔ یہ جوہری نے کہا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، فرمایا: دال کھاؤ کیونکہ یہ برکت والی اور مقدس ہے، یہ دل کو نرم کرتی ہے اور آنسوؤں کو زیادہ کرتی ہے، اس میں ستر انبیاء کی برکت ڈالی گئی ہے۔ ان میں آخری حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں (1)۔ یہ ثعلبی وغیرہ نے ذکر ہے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز ایک دن زیتون کے تیل کے ساتھ روٹی کھاتے تھے، ایک دن گوشت کے ساتھ اور ایک دن دال کے ساتھ۔ حلیمی نے کہا: دال اور زیتون کا تیل نیک لوگوں کا کھانا ہے، اگر دال کی فضیلت نہ ہوتی، مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ضیافت اپنے شہر میں اس سے خالی نہیں ہوتی تھی، اس میں کفایت تھی۔ اس کے فوائد میں سے یہ ہے کہ یہ جسم کو ہلکا کرتی ہے اور بدن عبادت کے

1۔ اس روایت کو ابن جوزی نے الموضوعات جلد 2، صفحہ 197 میں ذکر کیا ہے۔ شعب الایمان، جلد 5، صفحہ 103

لئے ہلکا ہو جاتا ہے۔ اس سے شہوات نہیں ابھرتیں جس طرح گوشت سے ابھرتی ہیں اور حنطۃ، دانوں میں سے دانہ ہے اور صحیح قول کے مطابق یہی فوم (گندم) ہے اور جو اس کے قریب ہے۔ اہل مدینہ کا کھانا گندم تھی جس طرح کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے شہر کا کھانا دال تھی۔ پس ان دونوں دانوں میں سے ہر ایک دانہ کے لئے کسی ایک نبی کی وجہ سے فضیلت ہے۔ روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی سیراب نہیں ہوئے درآں حالیکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے گھر والے تین دن متواتر گندم کی روٹی سے سیر نہیں ہوئے۔ یہ معمول رہا مدینہ طیبہ سے لے کر وصال تک (1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ۔ الاستبدال کا مطلب کسی چیز کو دوسری چیز کی جگہ رکھنا۔ اسی سے بدل ہے پہلے اس کا معنی گزر چکا ہے۔ ادنیٰ زجاج کے نزدیک الدنو سے مشتق ہے یعنی قیمت میں قرب۔ یہ عربوں کے اس قول سے ہے: ثوبٌ مقارب۔ کم قیمت کپڑا۔ علی بن سلیمان نے کہا: یہ مہموز ہے الدنئ البین الدناءۃ سے مشتق ہے یعنی خسیس ترین مگر اس کے ہمزہ میں تخفیف کی گئی۔ بعض نے فرمایا: الدون سے مشتق ہے۔ گرا وا۔ اس کی اصل ادون، اَفْعَلُ ہے پھر اس میں قلب ہوا فلع ہوا پھر واو کو طرف کلمہ میں ہونے کی وجہ سے الف سے بدلا گیا اور شاذ صورتوں میں ادنئ بھی پڑھا گیا ہے (2)۔ آیت کا معنی یہ ہے کیا تم سبزیوں، ککڑیوں، تھوم، دال اور پیاز جو ادنیٰ (گھٹیا) ہیں انہیں بدلنا چاہتے ہو من وسلویٰ جگہ جو من وسلویٰ ان سے بہتر ہیں۔

ان وجوہ میں اختلاف ہے جو دوسری چیزوں پر من وسلویٰ کی فضیلت کا موجب ہیں۔

۱- سبزیوں کی من وسلویٰ کی نسبت کوئی اہمیت نہ تھی وہ دونوں کھانے افضل تھے۔ یہ زجاج کا قول ہے۔

۲- جب من وسلویٰ کا کھانا اللہ تعالیٰ کا ان پر انعام تھا اور اس نے وہ انہیں کھانے کا حکم دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے امر کی ہمیشہ پیروی کرنا اور اس کی نعمت کا شکر کرنا آخرت میں اجر اور ذخر کا موجب تھا اور جو انہوں نے طلب کیا وہ ان خصائل میں عاریۃً تھا۔ پس اس وجہ سے وہ کھانا ادنیٰ تھا۔

۳- اللہ تعالیٰ نے جو ان پر احسان فرمایا وہ زیادہ پاکیزہ اور لذیذ تھا بنسبت اس کے جو انہوں نے مطالبہ کیا۔ پس اس وجہ سے لامحالہ جو انہوں نے سوال کیا وہ ادنیٰ تھا۔

۴- اللہ تعالیٰ نے جو انہیں عطا فرمایا تھا اس میں کوئی کلفت وتھکاوٹ نہ تھی اور جو انہوں نے طلب کیا وہ کھیتی باڑی اور تھکن سے ملتا تھا۔ پس یہ ادنیٰ ہوا۔

۵- جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتا تھا اس کے حلال ہونے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نزول کی وجہ سے اس کے خالص ہونے میں کوئی شک نہیں تھا اور باقی تمام دانے اور زمین جن کو بیوع اور غصب لاحق ہوتا اور ان میں شبہ داخل ہوتا ہے اس وجہ سے یہ ادنیٰ تھا۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاطعمۃ، باب ما کان النبی و اصحابہ یاکلون، حدیث نمبر 4996، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

مسئلہ: اس آیت میں طیبات اور متلذذ کھانے کے جواز پر دلیل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حلوئی اور شہد پسند فرماتے تھے (1) اور ٹھنڈا، میٹھا پانی پیتے تھے۔ یہ مفہوم سورۂ مائدہ اور سورۃ النحل میں تفصیل کے ساتھ آئے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِهْبِطُوْا مِصْرًا، ہبوط کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ یہ امر کا صیغہ انہیں عاجز کرنے کے لئے ہے جیسے یہ ہے قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ۝ (الاسراء) کیونکہ وہ تیہ میں تھے اور یہ ان کیلئے سزا تھی۔ بعض نے کہا: انہوں نے جو طلب کیا وہ انہیں دیا گیا (2) مِصْرًا تنوین کے ساتھ نکرہ یہ جمہور کی قراءت ہے اور یہی قرآن کا خط ہے (3)۔ مجاہد وغیرہ نے کہا: جنہوں نے اس کو منصرف بنایا انہوں نے غیر معین شہر مراد لیا۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: اِهْبِطُوْا مِصْرًا۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: شہروں میں سے ایک شہر۔ ایک طائفہ جنہوں نے اس کو منصرف بنایا انہوں نے معین فرعون کا شہر مراد لیا۔ پہلے قول والے علماء نے ظاہر قرآن کے مقتضیٰ سے استدلال کیا ہے کہ انہیں شہر میں داخل ہونے کا حکم ہوا تھا۔ اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ وہ تیہ کے بعد شام میں ٹھہرے تھے۔ اور دوسرے قول کے قائلین نے جو قرآن میں وارد ہے اس سے استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو آل فرعون کے شہروں اور آثار کا وارث بنایا تھا اور ان علماء نے اس کے منصرف ہونے کو جائز قرار دیا۔ اخفش اور کسائی نے کہا: اس کی خفت اور ھند اور دعد سے مشابہت کی وجہ سے اس کا منصرف ہونا جائز ہے۔ شعر ہے:

لم تتلفع بفضل مئزرها دعدٌ ولم تسق دعدُ فی العُلَب

دعد نے اپنی اضافی چادر کے ساتھ اپنے آپ کو نہ لپیٹا اور چمڑے کے پیالے میں اسے دودھ نہ پلایا گیا۔

اس شعر میں شاعر نے دونوں لغتیں (منصرف اور غیر منصرف) جمع کی ہیں۔ سیبویہ، خلیل اور فراء اس کو جائز قرار نہیں دیتے کیونکہ اگر تو کسی عورت کا نام زید رکھ دے تو وہ منصرف نہیں ہو جائے گا۔ اخفش کے علاوہ علماء نے کہا: اس سے مراد مکان ہے اس لئے منصرف ہے۔ حسن، ابان بن تغلب اور طلحہ نے اسے مِصْرَ غیر منصرف پڑھا ہے اسی طرح حضرت ابی بن کعب کے مصحف میں اور حضرت ابن مسعود کی قراءت میں ہے (4)۔ انہوں نے کہا: یہ فرعون کا مصر ہے۔ اشہب نے کہا: مجھے امام مالک نے فرمایا: میرے نزدیک مصر تمہارا شہر ہے جو فرعون کا مسکن تھا۔ یہ ابن عطیہ نے ذکر کیا ہے (5)۔ مصر کا لغوی معنی الحد ہے۔ مصر الدار (گھر کی حدود) ابن فارس نے کہا: کہا جاتا ہے کہ اہل حجر اپنی شروط میں لکھتے تھے: اشتری فلان الدار بمصورھا۔ یعنی فلاں نے گھر حدود سمیت خریدا...... عدی نے کہا:

وجاعل الشمس مصراً لا خفاء به بین النهار و بین اللیل قد فصلا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ، مَا، اِنَّ کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔ ابن وثاب اور نخعی نے سألتم

1۔ صحیح بخاری، باب الحلواء والعسل، حدیث 5011، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً

4۔ تفسیر طبری و المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 5۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

(سین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے)۔ کہا جاتا ہے: سألت و سلت بغیر ہمزہ کے، یہ واوی الفاظ میں سے ہے اس کی دلیل عربوں کا قول یتساولان ہے۔ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ یعنی وہ ذلت و مسکنت سے ملائے گئے ان پر ان دونوں کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ ضرب القباب سے مشتق ہے(1)۔ فرزدق نے جریر کے متعلق کہا تھا:

ضربت عليك العنكبوت بنسجها و قضى عليك به الكتاب المنزل

تجھ پر مکڑی نے اپنا جالا لگا دیا ہے اور اس کا تجھ پر فیصلہ نازل شدہ کتاب نے کیا ہے۔

ضرب الحاكم على اليد۔ یعنی اس سے اٹھایا اور لازم کیا، الذلۃ، رسوائی، المسكنة غربت۔ کوئی یہودی فقر اور خضوع اور ذلت سے خالی نہیں ہوگا اگرچہ وہ غنی بھی ہو۔ المسکنہ، سکون سے مشتق ہے یعنی فقر نے اس کی حرکت کو کم کر دیا۔ یہ زجاج نے کہا ہے۔

ابوعبیدہ نے کہا: الذلہ کا معنی رسوائی ہے: المسكنة، المسكين کا مصدر ہے۔ ضحاک بن مزاحم نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ فرمایا: ان سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَبَآءُوْ یعنی وہ لوٹے اور پلٹے۔ یہ ان کو لازم ہو گیا۔ اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ہے ابوء بنعمتك علي(2)۔ یعنی میں تیری نعمت کا اقرار و اعتراف کرتا ہوں اور اپنے نفس پر اسے لازم کرتا ہوں۔ لغت میں اس کا معنی رجوع ہے۔ کہا جاتا ہے: باء بكذا، یعنی اس کے ساتھ لوٹا۔ و باء الى المباءة، منزل کی طرف لوٹا۔ البواء قصاص کے ساتھ لوٹنا۔ هم فی هذا الامر بواء، یعنی وہ اس امر میں برابر ہیں۔ وہ اس امر میں ایک معنی کی طرف لوٹتے ہیں۔

شاعر نے کہا:

الا تنتهي عنا ملوك و تتقي محارمنا لايبوءُ الدم بالدم

یعنی کیا بادشاہ ہم سے رکتے نہیں ہیں اور ہماری محارم سے بچتے نہیں ہیں خود خون خون کو قصاص میں لوٹاتا نہیں

فآبوا بالنهاب و بالسبايا و ابنا بالملوك مصفدينا

یعنی وہ لوٹے اور ہم بھی لوٹے۔

الغضب کا معنی پہلے سورۂ فاتحہ میں گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ یہ علت بیان ہو رہی ہے بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ یعنی وہ جھٹلاتے ہیں بِاٰيٰتِ اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ کی کتاب کی آیات اور انبیاء کے معجزات جیسے حضرت عیسیٰ، حضرت یحییٰ، حضرت زکریا اور حضرت محمد علیہم الصلوٰۃ والسلام يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ، يَكْفُرُوْنَ پر معطوف ہے۔ حسن سے مروی ہے، یقتلون پڑھنا بھی مروی ہے اور ان سے دوسرے قراء کی طرح پڑھنا بھی مروی ہے۔ نافع نے النبیئین ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے جہاں بھی یہ لفظ قرآن میں واقع ہوا ہے مگر سورۃ الاحزاب میں اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ (الاحزاب:50) میں اور لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ (الاحزاب:53)

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ صحیح بخاری، باب افضل الاستغفار، حدیث نمبر 5831، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں بغیر مد اور بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے ان دونوں جگہوں پر ہمزہ کو ترک کیا کیونکہ دو مکسور ہمزے جمع ہو رہے تھے اور باقی قراء نے پورے قرآن میں ہمزہ کو ترک کیا ہے(1)۔ جنہوں نے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے ان کے نزدیک یہ انباء سے مشتق ہے جس کا معنی ہے خبر دینا۔ اس کا اسم فاعل مُنبئ ہے(2) نبی کی جمع انبیاء ہے اور نبی کی جمع نُبآءُ بھی آئی ہے۔ عباس بن مرداس السلمی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں کہا۔

یا خاتم النبآء انك مرسلٌ بالحق كل هدى السبيل هداكا

اے خاتم النبیین! تم حق کے ساتھ مبعوث کیے گئے ہو اور ہر ہدایت کا راستہ آپ کی ہدایت سے ہے۔

یہ ہمزہ کی قراءت کا معنی ہے۔ ہمزہ کے ترک کرنے والوں میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا: ہمزہ سے اشتقاق کیا پھر ہمزہ میں تسہیل کی۔ بعض نے فرمایا: یہ نبا ینبو (ظاہر ہونا) سے مشتق ہے۔ پس النبی، نبوۃ سے جس کا معنی بلند ہونا ہے، پس نبی کا مرتبہ بلند ہے بغیر ہمزہ کے نبی سے مراد راستہ بھی ہوتا ہے رسول کو نبی کہا جاتا ہے کہ مخلوق اس سے ہدایت حاصل کرتی ہے جیسے راستہ سے رہنمائی حاصل کرتی ہے۔ شاعر نے کہا:

لاصبح رَتْماً دقاق الحصى مكان النبى من الكاثب

رتمت الشیء میں نے اسے توڑ دیا۔ کہا جاتا ہے: رتم انفه و رثمه، یعنی تا اور ثا دونوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ الرتم کا مطلب المرتوم یعنی ٹوٹا ہوا بھی ہے، الکاثب پہاڑ کا نام ہے۔ انبیاء ہمارے زمین میں راستوں کی مانند ہیں۔ روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: السلام علیك یا نبئ الله ہمزہ ذکر کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لست بنبئ الله۔ لیکن میں نبی اللہ (بغیر ہمزہ کے) ہوں۔ ابو علی نے کہا: اس حدیث کی سند کو ضعیف قرار دیا گیا ہے، اور اس کے ضعف کو جو چیز مزید قوت دیتی ہے وہ یہ ہے کہ مدح کرنے والے نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس طرح مدح کی یا خاتم النبآء......الخ۔ اور اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار مروی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِغَیْرِ الْحَقِّ، برائی اور جو انہوں نے جرم کیا تھا اس کی بڑائی بیان کرتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ یہ دلیل ہے کہ حق کے ساتھ ان کو قتل کرنا صحیح ہوگا۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ معصوم ہوتے ہیں اس سے کہ ان سے کوئی ایسا قول یا فعل صادر ہو جس کی وجہ سے انہیں قتل کیا جائے۔ اس کا جواب یہ ہے حقیقت ایسی نہیں ہے۔ یہ کلام اس انداز میں کیا گیا ہے کہ انبیاء کا قتل ظلم ہے اور حق نہیں ہے۔ ان پر مذمت کی زیادتی کے لئے یہ فرمایا ہے یہ معلوم شدہ ہے کہ کسی نبی کو حق کی وجہ سے قتل نہیں کیا جائے گا لیکن حق کے خلاف قتل کیا جائے گا۔ بِغَیْرِ الْحَقِّ سے ان کے گناہ کی برائی اور اس کے واضح ہونے کی تصریح فرمائی۔ نبی سے کبھی ایسی بات سرزد نہیں ہوتی کہ اس کے قتل کا موجب بنے۔

اگر یہ کہا جائے کہ کافروں کو انبیاء کے قتل کی کیسے قدرت دی گئی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ انبیاء کی کرامت اور ان کے مقامات میں زیادتی کے لئے تھا جیسے مومنین میں سے جو اللہ کے راستہ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

میں شہید کیا جاتا ہے (تو اسے مرتبہ ملتا ہے) یہ انبیاء کے لئے خذلان ورسوائی نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس اور حسن نے کہا: انبیاء میں سے کبھی کوئی نبی شہید نہیں ہوا مگر وہ جسے قتال کا حکم نہیں دیا گیا تھا اور جس نبی کو قتال کا حکم دیا گیا تھا اس کی مدد کی گئی (1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ، ذٰلِكَ پہلے ذالك کی طرف لوٹ رہا ہے اور اس کی طرف اشارہ کرنے کے لئے تاکید ہے۔ بِمَا میں باسبب کے لئے ہے (2)۔ اخفش نے کہا ما مصدریہ ہے یعنی بعصیانهم۔ العصیان، طاعت کا متضاد ہے۔ اعتصت النواة (گٹھلی سخت ہوگئی) الاعتداء کا معنی ہر چیز میں حد سے تجاوز کرنا ہے۔ یہ ظلم اور معاصی میں معروف ہے۔ (3)

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

"یقین کرو اسلام کے پیروکار ہوں یا یہودی، عیسائی ہوں یا صابی جو کوئی بھی ایمان لائے اللہ پر اور دن قیامت پر اور نیک عمل کرے تو ان کے لئے ان کا اجر ہے ان کے رب کے ہاں اور نہیں کوئی اندیشہ ان کے لئے اور نہ وہ غمگین ہوں گے"۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یعنی جنہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی۔

سفیان نے کہا: اس سے مراد منافقین ہیں۔ گویا یوں فرمایا کہ جو ظاہراً ایمان لائے تھے اسی وجہ سے ان کا ذکر یہود، نصاریٰ اور صابیوں کے ساتھ کیا، پھر ان تمام کا حکم بیان فرمایا جو اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان لائے تھے۔ (4)

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ هَادُوْا اس کا معنی ہے: وہ یہودی ہو گئے وہ یہودا کی طرف منسوب ہیں جو حضرت یعقوب علیہ السلام کا بڑا بیٹا تھا۔ پھر عربوں نے ذال کو دال سے بدل دیا، جب عجمی زبان، عربی بنائی جاتی ہے تو اس کے لفظ بدل جاتے ہیں۔ بعض علماء نے کہا: بچھڑے کی عبادت سے توبہ کرنے کی وجہ سے ان کا یہ نام رکھا گیا۔ ھاد کا معنی ہے: تاب۔ (اس نے توبہ کی) الھائد، التائب توبہ کرنے والا۔ شاعر نے کہا:

انی امرؤ من حبہ ھائد (5)

میں اس کی محبت سے توبہ کرنے والا ہوں۔

قرآن حکیم میں ہے: انا هُدْنا الیک۔ یعنی ہم نے توبہ کی۔ ھاد القوم یھودون ھوداً ھیادۃً اس کا معنی ہے: قوم نے توبہ کی (6)۔ ابن عرفہ نے کہا: هُدْنا الیک کا مطلب ہے ہم نے تیرے امر کی طرف سکون حاصل کیا۔ الھوادۃ کا معنی السکون

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً 6۔ ایضاً

والموادعة ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا۔ ابو السمال نے هادَوا (دال کے فتحہ کے ساتھ) پڑھا ہے۔

مسئلہ نمبر 3: وَالنَّصٰرٰى یہ جمع ہے اس کا واحد نصرانی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا واحد نصران (یاء کے اسقاط کے ساتھ) ہے۔ یہ سیبویہ کا قول ہے۔ مؤنث نصرانۃٌ ہے جیسے ندمان کی مؤنث ندمانة ہے۔ یہ نکرہ ہے الف، لام کے ساتھ معرفہ بنایا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا:

صدّتْ کما صد عما لا یحل له ساق نصاری قبیل انفصح صوّام

وہ روکی گئی ہے جیسے روزہ دار نصرانیوں کا ساقی عید الفطر سے پہلے اس چیز سے روکا جاتا ہے جو اس کے لئے حلال نہیں ہوتی۔ یہاں نکرہ کے ساتھ اس کا وصف بیان کیا ہے۔ خلیل نے کہا: النصاریٰ کا واحد نصری ہے جیسے مھری اور مھاریٰ ہے۔ سیبویہ نے اس پر استشہاداً یہ شعر پڑھا ہے:

تراه اذا دار العشا متحنّفا ویضحی لدیه وهو نصران شامس (1)

اور ایک اور شعر لکھا ہے:

فکلتاهما خرت و اسجد راسها کما اَسْجَدَتْ نصرانة لم تحنف

دونوں اونٹنیاں گر پڑیں اور انہوں نے اس طرح سر جھکا دیئے جیسے نصرانی عورت سر جھکاتی ہے جس نے اسلام قبول نہ کیا ہو۔ کہا جاتا ہے: اسجد، یعنی جھک گیا۔ لیکن نصران اور نصرانة یائے نسبت کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں کیونکہ عرب کہتے ہیں: رجلٌ نصرانی و امراءة نصرانية ... نصره اس نے اسے نصرانی بنا دیا۔ حدیث میں ہے: ابواه یهودانه او ینصرانه (2)۔ اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی بناتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے متعلق اس امت سے کوئی نصرانی اور یہودی نہیں سنے گا پھر اس پر ایمان نہیں لائے گا جو میں دے کر بھیجا گیا ہوں مگر وہ دوزخی ہوگا ☆۔

واحد کے استعمال کے بغیر جمع استعمال ہوا ہے۔ اس کا قیاس یہ تھا کہ یہ النصرانیون ہوتا۔ پھر بعض علماء نے فرمایا: اس کو نصاریٰ اس شہر کی وجہ سے کہا جاتا ہے جس کا نام ناصرہ تھا اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اترے تھے، اس شہر کی طرف ان کی نسبت کی گئی۔ کہا جاتا ہے: عیسیٰ الناصری۔ جب ان کے شہریوں کو اس کی طرف منسوب کیا گیا تو کہا گیا: النَّصٰرٰی۔ یہ حضرت ابن عباس اور قتادہ کا قول ہے (3)۔ جوہری نے کہا: نصران شام کا شہر ہے جس کی طرف نصاریٰ منسوب ہیں اور اسے ناصرہ کہا جاتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: النَّصٰرٰی نام کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک دوسرے کے مددگار تھے۔ شاعر نے کہا:

لما رایت نبطاً انصاراً شمّرتُ من رکبتی الازارا
کنت لهم من النصاریٰ جارا (4)

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا
2۔ صحیح بخاری، باب اذا اسلم الصبی فمات هل یصلی علیه وهل، حدیث 1270، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا
4۔ ایضاً

جب میں نے ایک نبطی کو انصاری دیکھا تو میں نے اپنے گھٹنے سے ازار اوپر کر لی۔ میں نصاریٰ کا پڑوسی تھا۔

بعض علماء نے فرمایا: اس قول کی وجہ سے انہیں نصاریٰ کہا جاتا ہے: مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ (آل عمران: 52)

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الصّٰبِـِٕیْنَ یہ صابی کی جمع ہے۔ بعض نے فرمایا: صاب کی جمع ہے۔ اسی وجہ سے ہمزہ میں اختلاف ہے۔ جمہور نے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے سوائے نافع کے۔ جنہوں نے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے اسے صبأت النجوم سے مشتق کیا ہے جس کا معنی ہے ستارے طلوع ہوئے۔ صبأت ثنية الغلام۔ بچے نے دانت نکالے۔ اور جنہوں نے ہمزہ کے ساتھ نہیں پڑھا انہوں نے اسے صبا یصبو سے مشتق کیا ہے۔ جس کا معنی ہے مائل ہونا۔ لغت میں الصابی اسے کہتے ہیں جو ایک دین سے دوسرے دین کی طرف مائل ہو جائے اور نکل جائے۔ اسی وجہ سے جو شخص مسلمان ہو جائے عرب کہتے تھے: قد صبأ۔ پس الصابئون وہ لوگ ہیں جو اہل کتاب کے دین سے نکل گئے۔ (1)

مسئلہ نمبر 5: اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہود و نصاریٰ اہل کتاب ہیں اور ان کی کتاب کی وجہ سے ان کی عورتوں سے نکاح جائز ہے اور ان کا طعام کھانا حلال ہے جیسا کہ سورۂ مائدہ میں آئے گا اور ان پر جزیہ لگانا جائز ہے جیسا کہ سورۂ براءت میں آئے گا اور الصّٰبِـِٕیْنَ کے بارے میں اختلاف ہے۔ سدی نے کہا: یہ اہل کتاب کا ایک فرقہ ہے۔ یہ اسحاق بن راہویہ کا قول ہے۔ ابن منذر اور ابن اسحاق نے کہا: صابئین کے ذبیحہ میں کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ اہل کتاب کا ایک طائفہ ہے۔ امام ابو حنیفہ نے کہا: ان کے ذبائح اور ان کی عورتوں سے نکاح میں کوئی حرج نہیں۔ خلیل نے کہا: یہ قوم ایسی ہے جن کا دین نصاریٰ کے دین کے مشابہ ہے مگر ان کا قبلہ جنوب ہوا کے چلنے کی طرف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ حضرت نوح علیہ السلام کے دین پر ہیں۔ مجاہد، حسن اور ابن نجیح نے کہا: وہ ایسی قوم ہے جو اپنے دین کو یہود و مجوس کے دینوں کے درمیان سے مرکب کرتی ہے، ان کا ذبیحہ نہیں کھایا جائے گا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: ان کی عورتوں سے نکاح نہیں کیا جائے گا۔ حسن اور قتادہ نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ ایسی قوم ہے جو ملائکہ کی عبادت کرتی ہے اور قبلہ کی طرف نماز پڑھتی ہے، زبور کی تلاوت کرتی ہے اور پانچ نمازیں پڑھتی ہے۔ زیاد بن ابی سفیان نے ان کو دیکھا تو ان سے ٹیکس ختم کرنے کا ارادہ کیا۔ جب اس نے جانا کہ یہ ملائکہ کی عبادت کرتے ہیں (2) اور جو کچھ ہمارے بعض علماء نے ذکر کیا ہے ان کے مذہب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ موحد ہیں ستاروں کی تاثیر کا اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ ستارے فعال ہیں۔ اسی وجہ سے ابو سعید اصطخری نے ان کے کفر کا فتویٰ دیا جب ان سے ان کے متعلق سوال کیا گیا۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مَنْ اٰمَنَ۔ یعنی جس نے تصدیق کی۔ مَنْ اٰمَنَ میں مَنْ، الَّذِیْنَ سے بدل ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے، اور فَلَهُمْ میں فا، من میں جو ابہام تھا اس کے سبب کی وجہ سے داخل ہوئی ہے۔ فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ مبتدا خبر ہیں پھر جملہ ان کی خبر ہے۔ یہ بھی بہتر ہے کہ من حالت رفع میں ہو مبتدا کی حیثیت سے اور اس کا معنی شرط ہو اور امن شرط کی وجہ سے مجزوم ہو اور الفاء جواب ہو اور لهم اجرهم، من کی خبر ہو پھر جملہ ان کی خبر ہو۔ اور الذین کی طرف عائد

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

محذوف ہو تقدیر کلام اس طرح ہو من آمن منھم باللہ۔ اور اللہ تعالیٰ پر ایمان اور آخرت پر ایمان میں ایمان بالرسل والکتب والبعث بھی داخل ہے۔(1)

مسئلہ نمبر 7: اگر کوئی کہے کہ لھم اجرھم میں ضمیر جمع کیوں ذکر کی گئی ہے جبکہ اٰمَنَ لفظ مفرد ہے جمع نہیں ہے۔ اگر له اجرہ ہوتا تو کلام درست ہوتا۔ اس کا جواب یہ ہے مَنْ کا لفظ واحد، تثنیہ، جمع کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ پس اس کی طرف، واحد، تثنیہ اور جمع کی ضمیر لوٹانا جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ (یونس:42) یہ معنی کے اعتبار سے ہے وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ (انعام:25) لفظ کے اعتبار سے ہے۔ شاعر نے کہا:

ألما بسلمى عنكما ان عرضتما ... و قولا لها عوجى على مَنْ تخلفوا (2)

فرزدق نے کہا:

تعال فان عاهدتنى لا تخوننى ... نكن مثل من يا ذئب يصطحبان

اس میں معنی کا اعتبار کرتے ہوئے تخلفوا کہا۔

پس یہاں معنی پر محمول کرتے ہوئے یصطحبان کہا ہے۔ اگر لفظ پر محمول ہوتا تو یصطحب اور تخلف ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ (النساء:13) اس میں لفظ کا اعتبار کیا گیا۔ پھر فرمایا: خٰلِدِيْنَ۔ معنی کا اعتبار کیا گیا۔ اگر لفظ کا اعتبار ہوتا تو خالداً فیہا ہوتا۔ جب مَنْ کا مابعد لفظ پر محمول ہو تو اس کے مابعد میں معنی کے اعتبار سے مخالفت جائز ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے اور جب مَنْ کا مابعد معنی پر محمول ہو تو بعد میں لفظ کے اعتبار سے مخالفت جائز نہیں ہے کیونکہ التباس کلام میں داخل ہو جائے گا(3)۔ پہلا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۴۸﴾ (انعام) کے تحت کلام گزر چکا ہے۔ الحمد للہ

مسئلہ نمبر 8: حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا کا ارشاد وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (آل عمران:85) سے منسوخ ہے اور دوسرے علماء نے کہا: یہ منسوخ نہیں ہے یہ اس کے حق میں ثابت ہے جو مومنین میں سے نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے پر قائم ہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۴﴾

''اور یاد کرو جب ہم نے لیا تم سے پختہ وعدہ اور بلند کیا تم پر طور کو۔ (اور حکم دیا) پکڑ لو جو ہم نے تم کو دیا مضبوطی سے اور یاد رکھنا وہ (احکام) جو اس میں درج ہیں شاید کہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔ پھر منہ موڑ لیا تم نے پختہ وعدہ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا
3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

کرنے کے بعد۔ تو اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم ضرور ہو جاتے نقصان اٹھانے والوں میں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَكُمۡ وَرَفَعۡنَا فَوۡقَكُمُ الطُّوۡرَ یہ آیت واذ نتقنا الجبل فوقهم كانه ظلة کے معنی کی تفسیر ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: ہم نے پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہلایا اور ہم نے اسے اپنی جگہ سے نکالا (1)۔ فرمایا: ہر وہ چیز جسے تو اکھیڑے اور اسے پھینکے تو اس کے لئے نتقته کا لفظ استعمال کرے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: نتقناه کا معنی ہے: رفعناه۔ ابن اعرابی نے کہا: الناتق کا معنی الرافع ہے۔ الناتق الباسط، الناتق الفاتق، امرءة ناتق و منتاق ایسی عورت جس کی اولاد زیادہ ہو۔ قتبی نے کہا یہ نتق السقاء سے مشتق کیا گیا ہے جس کا معنی ہے: مشکیزہ کو ہلانا حتیٰ کہ اس سے مکھن علیحدہ ہو جائے اور واذ نتقنا الجبل فوقهم كانه ظلة کا مطلب ہے اصل سے اکھیڑا گیا۔ (2)

الطُّوۡرَ کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اس پہاڑ کا نام ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمائی تھی اور اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا فرمائی تھی۔ یہ ابن جریج نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ طور وہ پہاڑ ہے جو کچھ اگائے، نہ کہ وہ پہاڑ جو کچھ نہ اگائے۔ مجاہد اور قتادہ نے کہا: یعنی یہ پہاڑ تھا۔ مگر مجاہد نے کہا: یہ سریانی زبان میں ہر پہاڑ کو کہتے ہیں۔ یہ ابو العالیہ کا قول ہے (3)۔ کتاب کے مقدمہ میں کلام گزر چکی ہے کہ قرآن حکیم میں غیر عربی زبان کے مفرد الفاظ موجود ہیں یا نہیں۔ الحمد للہ۔ بکری نے کہا: طور بن اسماعیل علیہ السلام کی وجہ سے اسے طور کہا جاتا ہے۔

طور پہاڑ کے اٹھانے کے بارے میں علماء کے اقوال

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے تختیاں لے کر آئے جن میں تورات تھی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں کہا: اس کو لے لو اور اس کو لازم پکڑ لو۔ انہوں نے کہا: نہیں مگر یہ کہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہم سے اسی طرح کلام کرے جس طرح تجھ سے اللہ تعالیٰ نے کلام کی۔ پس ان پر بجلی گرائی گئی پھر انہیں زندہ کیا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں کہا: اس کو پکڑ لو۔ انہوں نے کہا: نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو حکم دیا تو انہوں نے فلسطین کے پہاڑوں سے ایک پہاڑ اکھیڑا جس کی لمبائی چوڑائی ایک فرسخ تھی۔ بنی اسرائیل کا لشکر اتنا ہی تھا۔ پس اسے ان پر چھتری کی مثل کر دیا گیا اور ان کے پیچھے سے سمندر اور آگے سے آگ کو لایا گیا، انہیں کہا گیا: اب اس کتاب کو پکڑو اور تم پر عہد لازم ہے کہ تم اسے ضائع نہیں کرو گے ورنہ تم پر پہاڑ آ پڑے گا۔ تو بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ سے توبہ کرتے ہوئے سجدوں میں گر گئے اور تورات کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

طبری نے بعض علماء سے روایت کیا ہے (4)۔ اگر وہ پہلی دفعہ تورات کو لے لیتے تو ان پر میثاق نہیں تھا اور بنی اسرائیل کا سجدہ پیشانی کی ایک طرف پر تھا کیونکہ وہ خوف کی وجہ سے پہاڑ کو دوسری طرف سے دیکھ رہے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم فرمایا تو انہوں نے کہا: کوئی سجدہ اس سجدہ سے افضل نہیں ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا اور جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ

1۔ تفسیر قرطبی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 4۔ ایضاً

نے اپنے بندوں پر رحم فرمایا۔ پس انہوں نے ایک طرف پر سجدہ کا حکم دیا۔ ابن عطیہ نے کہا: وہ قول جس کے سوا کوئی قول صحیح نہیں ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سجدہ کے وقت ان کے دلوں میں ایمان پیدا فرما دیا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ مجبوراً ایمان لائے تھے اور ان کے دل مطمئن نہیں تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: خُذُوْا یعنی ہم نے حکم دیا کہ اس کو پکڑلو۔ مَاۤ اٰتَیْنٰكُمْ محذوف ہے بِقُوَّةٍ یعنی کوشش اور محنت سے۔ یہ حضرت ابن عباس، حضرت قتادہ اور سدی کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے: نیت اور اخلاص کے ساتھ۔ مجاہد نے کہا: قوۃ سے مراد ہے اس میں جو احکامات ہیں ان پر عمل کرنے کے ساتھ۔ بعض نے فرمایا: بِقُوَّةٍ یعنی کثرت سے پڑھنے کے ساتھ وَّاذْكُرُوْا مَا فِیْهِ یعنی غور وفکر کرو، اس کے اوامر اور وعید کی حفاظت کرو اور یاد کرو اور اس کو بھولو نہیں اور اس کو ضائع نہ کرو۔

میں کہتا ہوں: کتب سے یہ مقصود ہے ان کے مقتضاء کے مطابق عمل کرنا، نہ صرف زبان سے تلاوت کرنا اور ترتیل سے پڑھنا، کیونکہ صرف زبان سے پڑھنا اور عمل نہ کرنا تو نبذٌ (پھینکنا) کے زمرہ میں آتا ہے جیسا کہ شعبی اور ابن عیینہ نے کہا ہے۔ ان دونوں حضرات کا قول نَبَذَ فَرِیْقٌ مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ (البقرہ: 101) کے تحت آئے گا۔ نسائی نے حضرت ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لوگوں میں سے فاسق شخص وہ ہے جو قرآن پڑھتا ہے اور اس میں سے کسی حکم کی طرف رجوع نہیں کرتا (یعنی احکام پر عمل پیرا نہیں ہوتا)۔ نبی کریم ﷺ نے بیان فرمایا کہ مقصود عمل کرنا ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، امام مالک نے فرمایا: بعض اوقات وہ شخص قرآن پڑھتا ہے جس میں خیر نہیں ہوتی (یعنی صرف پڑھتا ہے عمل نہیں کرتا)۔ پس جو ہم سے پہلے لوگوں پر لازم تھا اور ان سے مطالبہ کیا گیا تھا وہ ہم پر بھی لازم اور واجب ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّبِعُوْۤا اَحْسَنَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (الزمر: 55) اس میں اپنی کتاب کی اتباع اور اس کے مقتضاء کے مطابق عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن ہم نے بھی عمل اسی طرح ترک کر دیا ہے جس طرح یہود ونصاریٰ نے ترک کر دیا تھا۔ صرف کتابوں اور مصاحف کی ذوات باقی ہیں جو کچھ مفید نہیں کیونکہ جہالت، ریاست کی طلب اور خواہش نفس کی اتباع کا غلبہ ہے۔ ترمذی نے جبیر بن نفیر سے، انہوں نے حضرت ابو درداء سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے، آپ ﷺ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ پھر کہا: یہ وہ وقت ہے جس میں لوگوں سے علم اٹھالیا جائے گا حتیٰ کہ وہ علم میں سے کسی چیز پر قادر نہ ہوں گے۔ زیاد بن لبید انصاری نے عرض کی: ہم سے علم کیسے اٹھالیا جائے گا جبکہ ہم نے قرآن پڑھا۔ اللہ کی قسم! ہم قرآن پڑھتے رہیں گے اور ہم اپنی عورتوں اور بیٹوں کو پڑھائیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اے زیاد! تجھ پر تیری ماں روئے کہ میں تو تجھے فقہائے مدینہ سے شمار کرتا تھا۔ یہ تورات، انجیل یہود ونصاریٰ کے پاس موجود ہیں ان کو یہ کچھ فائدہ دیتی ہیں (1)۔ یہ حدیث تفصیل سے آگے آئے گی۔ نسائی نے جبیر بن نفیر عن عوف بن مالک الاشجعی کے سلسلہ صحیحہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے زیاد کو فرمایا: اے زیاد! تیری ماں تجھ پر روئے۔ یہ تورات، انجیل یہود ونصاریٰ کے پاس موجود ہیں۔ مؤطا میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے، انہوں نے ایک شخص کو فرمایا: تو ایک ایسے

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

زمانہ میں ہے جس میں فقہاء کثیر ہیں، قراء قلیل ہیں اس میں قرآن کی حدود کی حفاظت کی جاتی ہے اور حروف کی ادائیگی کا اتنا خیال نہیں رکھا جاتا، سوال کرنے والے تھوڑے ہیں، عطا کرنے والے بہت ہیں، لوگ نماز لمبی پڑھتے ہیں، خطبہ چھوٹا دیتے ہیں، اپنی خواہشات سے پہلے اعمال خیر کا آغاز کرتے ہیں۔ لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا جس میں فقہاء کم ہوں گے، قراء زیادہ ہوں گے، اس میں حروف کی حفاظت کی جائے گی اور اس کی حدود کو ضائع کیا جائے گا، سوال کرنے والے زیادہ ہوں گے اور عطا کرنے والے کم ہوں گے، خطبے لمبے دیں گے اور نمازیں مختصر کریں گے، اپنے اعمال سے پہلے خواہش نفس پر عمل کریں گے (1)۔ یہ نصوص ہماری اس بات پر دلالت کرتی ہیں جو ہم نے ذکر کی ہے۔ یحییٰ نے کہا: ابن نافع سے میں نے یبدءون اھوائھم قبل اعمالھم کا مطلب پوچھا تو انہوں نے کہا لوگ اپنی خواہش نفس پر عمل کریں گے اور اس عمل کو ترک کریں گے جو ان پر فرض ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ پر پہلے کلام گزر چکی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ، تولی باب تفعل ہے اس کا اصل معنی جسم میں سے کسی چیز سے اعراض کرنا اور پیٹھ پھیرنا ہے، پھر یہ وسعت ومجاز کی وجہ سے اوامر، ادیان اور معتقدات میں سے اعراض میں استعمال ہوتا ہے۔

مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ یعنی دلیل کے بعد۔ وہ میثاق کا لینا اور پہاڑ کو بلند کرنا ہے۔

فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ، فضل سیبویہ کے نزدیک متبدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور خبر محذوف ہے جس کا اظہار جائز نہیں کیونکہ اس کے اظہار سے مستغنی ہوتے ہیں مگر یہ کہ جب وہ اس کے اظہار کا ارادہ کرتے ہیں تو ان کے ساتھ لاتے ہیں جب وہ اَنْ کے ساتھ لاتے ہیں تو خبر کو حذف نہیں کرتے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے: فلولا فضل اللہ تدارککم۔

رَحْمَتُهٗ اس کا عطف فَضْلُ پر ہے۔ یعنی اس کا لطف اور مہلت دینا نہ ہوتا۔

لَكُنْتُمْ یہ لولا کا جواب ہے مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ، کنتم کی خبر ہے۔ الخسران کا معنی نقصان ہے یہ پہلے گزر چکا ہے۔ بعض علماء نے کہا: اس کا فضل یہ ہے کہ توبہ قبول کرنا۔ اور رَحْمَتُهٗ سے مراد العفو ہے اور الفضل سے مراد ثابت شدہ پر زیادتی ہے۔ الافضال ایسا فعل کرنا جو واجب نہ ہو۔ ابن فارس نے المجمل میں کہا: الفضل سے مراد زیادتی اور خیر ہے۔ الافضال کا مطلب الاحسان ہے۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ۝۶۵

''اور تم خوب جانتے ہو انہیں جنہوں نے نافرمانی کی تھی تم میں سے سبت کے قانون کی تو ہم نے حکم دیا انہیں کہ بن جاؤ بندر پھٹکارے ہوئے''۔

اس میں سات مسائل ہیں (☆)۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ، عَلِمْتُمْ اس کا معنی ہے: تم نے ان کے اعیان (اشخاص) کو پہچان لیا۔ بعض علماء نے فرمایا: تم ان کے احکام جان چکے ہو، ان دونوں (علم اور معرفت) میں فرق یہ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

☆ متن میں اسی طرح ہے مگر تفصیل میں تین مسائل ہیں۔

ہے کہ معرفت ذات مسمّی کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور علم مسمّی کے احوال کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ جب تو کہتا ہے کہ عرفت زیداً اس سے مراد ہے میں نے زید کی شخصیت کو پہچان لیا۔ جب تو کہتا ہے: علمت زیداً اس سے مراد اس کے احوال (فضل یا نقص) وغیرہ کو جان لیا۔ پہلی صورت میں ایک فعل کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ یہ سیبویہ کا قول ہے اور علمتم بمعنی عرفتم ہے اور دوسری صورت میں دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ اخفش نے حکایت کیا ہے: لقد علمت زیداً ولم اعلمه، اس میں ایک مفعول کی طرف متعدی ہے، قرآن حکیم میں ہے: لا تعلمونهم الله یعلمهم۔ یہ تمام معرفت کے معنی میں ہیں۔

اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ، الَّذِيْنَ کا صلہ ہے۔ الاعتداء کا معنی حد سے تجاوز کرنا ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 2: نسائی نے حضرت صفوان بن عسال سے روایت کیا ہے، فرمایا: ایک یہودی نے اپنے ساتھی سے کہا: ہم اس نبی کے پاس چلیں۔ دوسرے ساتھی نے کہا: نبی نہ کہو اگر اس نے تجھے (یہ کہتے ہوئے) سن لیا تو اس کی چار آنکھیں ہو جائیں گی۔ (یعنی بہت خوش ہوگا)۔ وہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نو آیات بینات کے بارے پوچھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا: اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، چوری نہ کرو، زنا نہ کرو، اس نفس کو قتل نہ کرو جس کا قتل کرنا اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ، کسی بری شخص کو سلطان (بادشاہ) کے پاس نہ لے جاؤ، کسی کا تمسخر نہ اڑاؤ، سود نہ کھاؤ، کسی پاکدامنہ پر بہتان نہ لگاؤ، جنگ کے دن پیٹھ نہ پھیرو اور اے یہودیو! خاص تمہارے لئے کہ تم ہفتہ کے دن (کے احکام سے) تجاوز نہ کرو۔ پس انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ اور پاؤں چومے اور انہوں نے کہا: ہم گواہی دیتے ہیں کہ تم نبی ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر تمہیں میری اتباع کرنے سے کون سی چیز مانع ہے؟ انہوں نے کہا: حضرت داؤد علیہ السلام نے دعا مانگی تھی کہ ان کی اولاد سے ہمیشہ نبی ہو۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ ہم آپ کی اتباع کریں گے تو یہود ہمیں قتل کر دیں گے۔ اس حدیث کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اس کے الفاظ سورۂ سبحان میں ان شاء اللہ آئیں گے۔

مسئلہ نمبر 3: فِي السَّبْتِ اس کا معنی فی یوم السبت ہے، (یعنی ہفتہ کے دن میں)۔ یہ بھی احتمال ہے کہ مراد ہفتہ کے دن کا حکم ہو (1)۔ پہلا قول حسن کا ہے۔ انہوں نے حلال سمجھنے کی جہت سے اس میں مچھلیاں پکڑی تھیں۔ اشہب نے مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: ابن رومان نے کہا: ایک شخص ایک دھاگہ لیتا تھا اور اس میں ایک ایسی رسی لگاتا تھا جو جانور کی گردن میں ڈالی جاتی ہے پھر اسے مچھلی کے دم میں ڈالتا تھا اور دھاگے کی دوسری طرف ایک کیل ہوتا تھا، وہ اتوار کے دن تک اسے اسی طرح چھوڑے رکھتا تھا پھر جب لوگوں نے یہ دیکھا کہ ایسا کرنے والے کو کسی مصیبت میں گرفتار نہیں کیا گیا تو عام لوگ بھی ایسا کرنے لگے۔ حتیٰ کہ مچھلی کا شکار ہفتہ کے دن میں زیادہ ہو گیا اور مچھلیاں بازار میں آنے لگیں اور فاسق لوگوں نے شکار کا اعلان کر دیا۔ ایک فرقہ اٹھا، انہوں نے ایسے لوگوں کو منع کیا اور برسر منبر انہیں منع کیا اور ایسا کرنے والوں سے جدا ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ منع کرنے والوں نے کہا: ہم تمہارے ساتھ نہیں رہیں گے۔ پس انہوں نے ایک دیوار کے ساتھ شہر کو تقسیم کر دیا۔ ایک دن منع کرنے والے اپنی مجلس میں تھے کہ حد سے تجاوز کرنے والوں میں سے کوئی باہر نہ نکلا، انہوں نے کہا: لوگوں کو کچھ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

ہوگیا ہے۔ انہوں نے دیوار پر چڑھ کر دیکھا تو وہ بندر بنے ہوئے تھے۔ انہوں نے دروازہ کھولا اور ان کے پاس گئے۔ پس بندروں کا نسب انسان سے جانا گیا ہے، لیکن انسان کا نسب بندروں سے معروف نہیں۔ وہ بندر اپنے خاندان والوں میں سے کسی انسان کے پاس آتے، اس کے کپڑے سونگھتے اور رونے لگتے۔ وہ اسے کہتا: کیا ہم نے تمہیں منع نہیں کیا تھا وہ سر سے اشارہ کر کے کہتے: ہاں (1)۔ قتادہ نے کہا: نوجوان بندر بن گئے تھے، بوڑھے خنزیر بن گئے تھے صرف منع کرنے والے بچے تھے باقی سب ہلاک ہو گئے تھے (2)۔ ان لوگوں کا قول سورۂ اعراف میں آئے گا جنہوں نے کہا تھا کہ وہ تین گروہوں میں تھے، اور یہ قول ان لوگوں کے قول سے زیادہ صحیح ہے جنہوں نے کہا: ان کے دو گروہ تھے۔ واللہ اعلم

السَّبْتِ، السبت سے ماخوذ ہے جس کا معنی کاٹنا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ہفتہ کے دن میں اشیاء جدا کی گئی تھیں اور ان کی خلقت مکمل ہوئی تھی۔ بعض نے فرمایا: یہ السبوت سے مشتق ہے جس کا معنی راحت اور سکون ہے۔ (3)

علماء کا مسخ شدہ امت کے بارے میں اختلاف ہے کہ کیا ان کی نسل چلی ہے یا نہیں۔ علماء کے دو قول ہیں: زجاج نے کہا: ایک قوم کا خیال ہے کہ یہ جائز ہے کہ یہ بندر ان لوگوں میں سے ہوں۔ قاضی ابوبکر بن عربی نے اس کو اختیار کیا ہے۔ جمہور علماء نے کہا: مسخ شدہ امت کی نسل باقی نہیں چلی۔ رہے بندر اور خنازیر وغیرہما اس سے پہلے بھی موجود تھے اور جن کو اللہ تعالیٰ نے مسخ کیا تھا وہ ہلاک ہو گئے تھے اور ان کی نسل باقی نہیں رہی تھی کیونکہ انہیں سخط اور عذاب لاحق ہوا تھا ان کے لئے دنیا میں تین دن کے بعد قرار نہیں تھا۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: کوئی قوم جو مسخ کی گئی تین دن سے زیادہ زندہ نہیں رہی، نہ اس نے کھایا، نہ پیا اور نہ ان کی نسل چلی (4)۔ ابن عطیہ نے کہا (5): نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے اور ثابت ہے کہ مسخ شدہ کی نہ نسل چلی، نہ کھایا اور نہ پیا اور نہ تین دن سے زیادہ زندہ رہے۔

میں کہتا ہوں: یہ قول دونوں قولوں میں صحیح ہے اور ابن عربی وغیرہ نے پہلے قول کی صحت پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے حجت پکڑی ہے۔ بنی اسرائیل کی ایک امت مفقود ہوگئی۔ معلوم نہیں اس کا کیا ہوا میں نے نہیں دیکھا مگر وہ چوہیا ہے کیا تم اسے دیکھتے نہیں کہ جب اس کے سامنے اونٹنی کا دودھ رکھا جائے تو یہ اسے نہیں پیتی اور اس کے سامنے بکری کا دودھ رکھا جائے تو پی لیتی ہے (6)۔ یہ مسلم نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے اور دوسری حجت گوہ والی حدیث ہے جو مسلم نے حضرت ابو سعید اور حضرت جابر سے روایت کی ہے۔ حضرت جابر نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گوہ لائی گئی تو آپ نے اسے کھانے سے انکار کر دیا اور فرمایا: میں نہیں جانتا شاید یہ ان قوموں سے ہو جو مسخ کی گئیں۔ یہ روایات منقول ہیں جیسا کہ آگے آئے گا۔

ابن عربی نے کہا: بخاری میں عمرو بن میمون سے مروی ہے، انہوں نے کہا: میں نے زمانہ جاہلیت میں ایک بندریا کو دیکھا جس نے زنا کیا تھا۔ بندروں نے اسے رجم کیا اور میں نے بھی ان کے ساتھ اسے رجم کیا۔ یہ بخاری کے بعض نسخوں میں ثابت

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 4۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا
5۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 6۔ صحیح بخاری، باب خیر مال المسلم غنم، حدیث نمبر 3360، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے اور بعض میں ساقط ہے۔ حدیث کی نص میں ثابت ہے (اس نے زنا کیا) یہ لفظ بعض سے ساقط ہے۔

ابن عربی نے کہا: اگر کہا جائے کہ چوپائیوں میں شریعت کی پہچان باقی ہے حتیٰ کہ وہ نسل در نسل ان احکام کے وارث بنتے رہے حتیٰ کہ عمرو کے زمانہ تک پہنچے؟ ہم کہیں گے: ہاں، اسی طرح تھا کیوں کہ یہود نے رجم میں تبدیلی کی تھی۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کے مسخ شدہ لوگوں میں اس کو قائم رکھا تا کہ ان لوگوں پر حجت میں مبالغہ ہو جائے جنہوں نے اس کا انکار کیا اور اسے تبدیل کیا تا کہ ان کی کتب اور ان کے علماء اور ان کی مسخ شدہ قومیں ان کے خلاف گواہی دیں تا کہ وہ جان لیں کہ اللہ تعالیٰ اسے بھی جانتا ہے جو چھپاتے ہیں اور جو اعلان کرتے ہیں اور وہ سب شمار کیا جا رہا ہے جو وہ تغیر و تبدل کرتے ہیں ان پر حجت قائم فرمائی جہاں سے اسے قیام کا انہیں تصور بھی نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی مدد فرماتا ہے اور ان کی مدد نہیں کی جاتی (1)۔

میں کہتا ہوں: یہ ابن عربی کا کلام احکام میں ہے اور اس میں کوئی حجت نہیں ہے۔ انہوں نے جو عمرو بن میمون کا قصہ ذکر کیا ہے حمیدی نے جمع صحیحین میں ذکر کیا ہے۔ ابو مسعود الدمشقی نے حکایت کیا ہے کہ عمرو بن میمون الاودی کی صحیحین میں حصین کی روایت سے حکایت ہے، عمرو نے کہا: میں نے زمانہ جاہلیت میں ایک بندریا دیکھی جس پر دوسرے بندر جمع ہوئے اور اسے رجم کیا میں نے بھی ان کے ساتھ اسے رجم کیا۔ اسی طرح حضرت ابو مسعود نے حکایت کیا ہے، اس نے ذکر نہیں کیا کہ کسی جگہ بخاری نے اپنی کتاب میں اس کو نقل کیا ہے، ہم نے اس کے متعلق کوشش کی تو ہم نے اسے بعض نسخوں میں پایا نہ کہ تمام نسخوں میں۔ امام بخاری نے اسے ''کتاب ایام الجاہلیہ'' میں ذکر کیا ہے اور نعیمی عن الفربری کی روایت میں بندروں کے بارے میں اس خبر کی کوئی اصل نہیں ہے۔ شاید یہ کتاب البخاری میں **مقحمات** (گھسیڑی گئی روایات) میں سے ہے اور وہ جو بخاری نے ''تاریخ کبیر'' میں ذکر کیا ہے مجھے نعیم بن حماد نے کہا: ہمیں ہشیم نے ابو بلج سے اور حصین نے عمرو بن میمون سے روایت کر کے بتایا کہ میں نے زمانہ جاہلیت میں ایک بندریا دیکھی جس پر بندر جمع تھے انہوں نے اسے رجم کیا اور میں نے بھی ان کے ساتھ اسے رجم کیا۔ اس روایت میں قد زنت۔ (اس نے زنا کیا) کے الفاظ نہیں ہیں اگرچہ روایت صحیح ہو تو امام بخاری نے اسے اس بات پر دلالت کرنے کے لئے روایت کیا کہ عمرو بن میمون نے زمانہ جاہلیت پایا ان کے گمان کی کوئی پرواہ نہیں جو انہوں نے زمانہ جاہلیت کے بارے میں کیا۔ ابو عمرو نے ''الاستیعاب'' میں حضرت عمرو بن میمون کا ذکر کیا ہے ان کی کنیت ابو عبد اللہ ہے کوفیوں میں سے بڑے تابعین میں شمار ہوتے تھے۔ انہوں نے زمانہ جاہلیت میں بندروں کا رجم دیکھا تھا اگر یہ صحیح ہو کیونکہ اس کے راوی مجہول ہیں۔ بخاری نے نعیم عن ہشیم عن حصین عن عمرو بن میمون الاودی کے سلسلہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے زمانہ جاہلیت میں ایک بندریا دیکھی جس نے زنا کیا تھا پھر بندروں نے اسے رجم کیا تھا میں نے بھی ان کے ساتھ اسے رجم کیا تھا۔ اس کو عباد بن العوام نے حصین سے روایت کیا جس طرح ہشیم نے مختصراً روایت کیا۔ اور رہا یہ قصہ اپنے طول کے ساتھ تو وہ عبد الملک بن مسلم عن عیسیٰ بن حطان پر گھومتا ہے جو دونوں استاد، شاگرد قابل حجت نہیں ہیں۔ یہ اہل علم کی جماعت کے نزدیک منکر ہے کہ زنا کی اضافت غیر مکلف کی طرف کی گئی ہے اور اس میں حدود کو حیوانوں پر قائم کیا گیا ہے۔ اگر یہ صحیح ہو تو یہ جنوں میں

1۔ احکام القرآن لابن العربی، زیر آیت ہذہ

سے ہوں گے دوسرے حیوان نہ ہوں گے۔ رہا حضرت ابو ہریرہ کی حدیث میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد میں نے نہیں دیکھا۔ چوہے اور گوہ کے بارے میں فرمایا: میں نہیں جانتا شاید یہ ان قوموں میں سے ہو جو مسخ کی گئی تھی اور اس کی مثل دوسری مثالیں۔ یہ ظن اور خوف کی بنا پر فرمایا کہ ہوسکتا ہے کہ گوہ اور چوہے وغیرہما مسخ شدہ سے ہوں۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی آنے سے پہلے اپنی طرف سے اظہار فرمایا، جب وحی آگئی تو یہ خوف زائل ہو گیا اور جان لیا کہ گوہ اور چوہے مسخ شدہ قوموں میں سے نہیں ہیں۔ وحی کے آنے کے بعد ہمیں اپنے ارشاد میں بتایا جب آپ سے پوچھا گیا بندروں اور خنازیر کے متعلق کہ کیا یہ مسخ شدہ قوموں میں سے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی قوم کو ہلاک نہیں کیا یا عذاب نہیں دیا پھر ان کی نسل چلائی ہو۔ بندر اور خنازیر اس سے پہلے موجود تھے۔ یہ نص صحیح صریح ہے اسے حضرت عبداللہ بن مسعود نے روایت کیا ہے اور اسے مسلم نے کتاب القدر میں نقل کیا ہے اور نصوص ثابت ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی اور آپ کے دستر خوان پر گوہ کھائی گئی اور آپ نے انکار نہیں فرمایا۔ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے یہ اس کی صحت پر دلالت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ہماری توفیق ہے۔

مجاہد سے اس آیت کی تفسیر میں مروی ہے کہ صرف ان کے دل مسخ کیے گئے اور ان کے افہام، بندروں کے افہام جیسے بنا دیئے گئے (1)، میری معلومات کے مطابق کسی اور مفسر نے یہ نہیں کہا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً، قِرَدَةً** کان کی خبر ہے۔ **خٰسِئِيْنَ** اس کی صفت ہے، اگر تو چاہے تو اسے کان کی خبر بنا دے یا کونوا میں ضمیر سے حال بنا دے اور **خٰسِئِيْنَ** کا معنی مبعدین دور کیے گئے ہے۔ کہا جاتا ہے: **فخسأ و خسئ و انخسأ** یعنی میں نے اسے دور کیا تو وہ دور ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا** (الملک: 4) (لوٹ آئے گی تیری طرف (تیری) نگاہ ناکام ہو کر) اخسئوا فیہا۔ یعنی اس میں دور چلے جاؤ۔ تباعد کا معنی ناراض ہونا ہے۔ کسائی نے کہا: خسأ الرجل خسوًا۔ وخساتہ خسأ، اس صورت میں الخاسئ کا معنی گھٹیا اور رسوا ہو گا۔ کہا جاتا ہے: قمؤ الرجل قماءً و قماءۃ صار قمیئاً یعنی ذلیل و خوار ہوا۔ اقماتہ میں نے اسے رسوا و ذلیل کیا فھو قمیئ، فعیل کے وزن پر ہے۔

فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۶۶﴾

"پس ہم نے بنا دیا اس سزا کو عبرت ان کے لئے جو اس زمانہ میں موجود تھے اور جو بعد میں آنے والے تھے اور (اسے) نصیحت بنا دیا پرہیزگاروں کے لئے"۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا** مفعول ثانی کی بنا پر **نَكَالًا** منصوب ہے اور عبرت بنانے میں کئی اقوال ہیں۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد سزا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد شہر ہے کیونکہ کلام کا معنی اس کا تقاضا کرتا ہے، بعض نے فرمایا: امت جو مسخ کی گئی، بعض نے فرمایا: مچھلیاں۔ اس قول میں بعد ہے۔ النکال کا معنی زجر اور عقاب ہے۔ النکل والانکال، اس سے مراد بیڑیاں ہیں (2)۔ بیڑیوں کو انکال کہتے ہیں کیونکہ یہ آدمی کو روکتی ہیں۔ بھاری لگام کو نَکل اور نِکل کہا جاتا ہے کیونکہ وہ جانور کو روکتی ہے نَکَل عن الامر ینکُلُ و نَکِل یَنکَل جب کوئی رک جائے۔ التنکیل، دشمن کو ایسی تکلیف پہنچانا کہ

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

دوسرے لوگوں کو وہ روک دے۔ الازہری نے کہا: النکال سے مراد عقوبت ہے۔ ابن درید نے کہا: المنکل وہ چیز جو انسان کو روک دے۔

فادمِ علی اقفائھم بمنکل۔ تو ان کو گدیوں پر روکنے والی چیز سے مار۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهَا حضرت ابن عباس اور سدی نے کہا: اس سے مراد اس قوم کے پہلے گناہ ہیں۔ وَمَا خَلْفَهَا جو ان کے بعد اس قسم کے گناہ کرے گا۔ فراء نے کہا: مسخة کو گزشتہ گناہوں کی وجہ سے عبرت اور سزا بنایا گیا اور جو ان کے بعد عمل کرنے والے ہیں تاکہ وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے مسخ سے ڈریں۔ ابن عطیہ نے کہا (1): یہ عمدہ قول ہے اور دونوں ضمیریں عقوبت کیلئے ہیں۔ حکم نے مجاہد سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ اس سے مراد جو لوگ موجود تھے اور جو بعد میں آنے والے تھے (2)۔ نحاس نے اس قول کو اختیار کیا ہے اور کہا: یہ معنی کے زیادہ قریب ہے۔ واللہ اعلم

حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهَا اور مَا خَلْفَهَا سے مراد شہر ہیں (3)۔ قتادہ نے کہا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهَا سے مراد ان کے گناہ ہیں اور مَا خَلْفَهَا سے مراد مچھلیوں کا شکار ہے۔ (4)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِیْنَ اس کا عطف نکال پر ہے اس کا وزن مفعلة ہے یہ اتعاظ سے اور انزجار سے ہے۔ الوعظ کا معنی ڈرانا ہے۔ العظة اسم ہے۔ خلیل نے کہا: الوعظ سے مراد خیر کی ایسی نصیحت کرنا جس کے لئے دل نرم ہو جائے۔

الماوردی نے کہا: المتقین کو نصیحت کے لئے خاص کیا گیا ہے اگرچہ یہ تمام لوگوں کے لئے نصیحت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کافر معاندین سے متقین نصیحت قبول کرنے میں منفرد ہوتے ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا (5): لفظ ہر امت کے ہر متقی کو شامل ہے۔ زجاج نے کہا مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِیْنَ یعنی امت محمدیہ کے لئے نصیحت ہے تاکہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں سے انہیں منع فرمایا ہے وہ ان کے ارتکاب سے بچیں کہیں ایسا نہ ہو کہ انہیں اصحاب السبت جیسا عذاب پہنچے جو انہیں ہفتہ کے دن اللہ تعالیٰ کے حرام کردہ افعال کے ارتکاب کی وجہ سے پہنچا۔

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖۤ اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ ﴿۶۷﴾

''اور یاد کرو جب کہا موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہ اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ تم ذبح کرو ایک گائے، وہ بولے کیا آپ ہمارا مذاق اڑاتے ہیں آپ نے کہا میں پناہ مانگتا ہوں خدا سے کہ میں شامل ہو جاؤں جاہلوں (کے گروہ) میں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖۤ اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً

اس میں چار مسائل ہیں۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً 5۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ ابو عمرو سے حکایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے یا مرکم راء سے ضمہ کو اس کے ثقل کی وجہ سے حذف کر کے پڑھا ہے۔ ابو العباد المبرد نے کہا: یہ جائز نہیں ہے کیونکہ را حرف اعراب ہے اور ابو عمرو سے صحیح یہ مروی ہے کہ وہ حرکت میں اختلاس کرتے تھے۔ اَنْ تَذْبَحُوْا یہ يَاْمُرُكُمْ کی وجہ سے محل نصب میں ہے یعنی بان تذبحوا۔ بَقَرَةً پر نصب تَذْبَحُوْا کی وجہ سے ہے ذبح کا معنی پہلے گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً یہ تلاوت میں مقدم ہے اور قَتَلْتُمْ نَفْسًا گائے کے متعلق جو کچھ پہلے ذکر کیا گیا ہے اس پر یہ معنی کے اعتبار سے مقدم ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ قَتَلْتُمْ نزول میں مقدم ہو اور ذبح کا امر مؤخر ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ نزول کی ترتیب تلاوت کے مطابق ہو۔ اللہ تعالیٰ نے گویا انہیں گائے کے ذبح کا حکم دیا حتیٰ کہ انہوں نے اسے ذبح کیا پھر قتل کے امر سے جو واقع ہوا وہ واقع ہوا۔ پس انہیں حکم دیا گیا کہ وہ اس کا بعض اس مقتول کو ماریں، پہلے قول کے مطابق معنی کے اعتبار سے وَاِذْ قَتَلْتُمْ مقدم ہوگا جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے کیونکہ واو ترتیب کا موجب نہیں ہوتی۔ اس کی نظیر نوح علیہ السلام کا واقعہ ہے جو طوفان اور اس کے ختم ہونے کے بعد ذکر کیا گیا ہے۔ اس قول میں حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ۭ وَمَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ (ہود) پہلے ان لوگوں کے ہلاک کرنے کا ذکر کیا جو ہلاک ہوئے پھر اس پر اس ارشاد سے عطف فرمایا: وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا (ہود: 41) خطاب میں رکوب کا ذکر متاخر کیا اور یہ معلوم شدہ ہے کہ ان کا سوار ہونا ہلاکت سے پہلے تھا۔ اسی طرح یہ ارشاد ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۜ قَيِّمًا (الکہف) اس کی تقدیر اس طرح ہے: انزل علی عبدہ الکتاب قیماً ولم یجعل لہ عوجاً۔ قرآن میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔

مسئلہ نمبر 3: علماء کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ بکری کو ذبح کرنا اور اونٹ کو نحر کرنا اولیٰ ہے اور گائے میں اختیار ہے۔ بعض نے فرمایا: ذبح اولیٰ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ذبح کا ذکر فرمایا نیز منحر کے مذبح کے قرب کی وجہ سے۔ ابن منذر نے کہا: میں کسی عالم کو نہیں جانتا جس نے اس کا کھانا حرام قرار دیا ہو جس کو ذبح کرنا تھا اس کو نحر کیا گیا یا جس کو نحر کرنا تھا اسے ذبح کیا گیا۔ امام مالک نے اس کو مکروہ کہا ہے اور کسی کا کسی شے کو مکروہ قرار دینا اسے حرام قرار دینا نہیں ہے۔ مزید ان شاء اللہ ذبح کے احکام، ذبح کرنے والا اور ان دونوں کی شرائط سورۂ مائدہ میں اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ کے تحت تفصیل سے آئیں گے۔ ماوردی نے کہا: انہیں صرف گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا کیونکہ ان کے معبود بچھڑے کی جنس سے تھے تاکہ جس چیز کی وہ تعظیم کرتے تھے ان کے نزدیک اس کی اہانت کی جائے۔ نیز اس لئے تاکہ وہ جان لے کہ ان کے نفسوں میں اس کی عبادت کی قبولیت کتنی ہے۔ یہ معنی گائے کے ذبح میں علت ہے اور سائل کے جواب میں علت نہیں ہے لیکن اس کا معنی یہ ہے کہ مقتول، زندہ کے قتل کے ساتھ زندہ ہو جائے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کو اشیاء کی ایجاد ان کی اضداد کے ساتھ کرنے میں زیادہ ظاہر کرنے والا ہے۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے بَقَرَةً یہ مؤنث کا اسم ہے، مذکر کے لئے ثور اسم ہے، جیسے اونٹنی کے لئے نَاقَةٌ اور

اونٹ کیلئے جملٌ، عورت کے لئے امرأۃ اور مرد کیلئے رجلٌ۔ البقرۃ، البقر کا واحد ہے اس میں مذکر، مؤنث برابر ہے، اس کی اصل تیرے اس قول سے ہے: بَقَرَ بطنہ، اس نے اس کا پیٹ چاک کیا۔ البقرہ (گائے) زمین کو چیرتی اور پھاڑتی ہے اسی سے ابوجعفر محمد بن علی زین العابدین کو الباقر کہا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے علم کو چیرا اور اس کی اصل کو پہچانا۔ البقیرۃ وہ کپڑا جو پھاڑا جاتا ہے پھر عورت اسے اپنی گردن میں ڈالتی ہے اس کی آستین نہیں ہوتیں۔ حضرت ابن عباس کی حدیث میں ہدہد کی شان میں ہے۔ فبقر الارض (1) اس نے زمین کو پھاڑا۔ شمر نے کہا: بقر کا مطلب ہے: اس نے پانی کی جگہ کو دیکھا اور زمین کے نیچے پانی کو دیکھا۔ الازہری نے کہا۔ البقر جنس کے لئے اسم ہے اس کی جمع باقر ہے۔ ابن عرفہ نے کہا: کہا جاتا ہے بقیر، باقر، بیقور۔ عکرمہ اور ابن یعمر نے ان الباقر پڑھا ہے۔ الثور، اس کی جمع ثیران ہے۔ الثور، مردوں میں سے سردار کو کہتے ہیں۔ الثور، پنیر کے ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ الثور کائی کو بھی کہتے ہیں۔ ثور ایک پہاڑ کو بھی کہتے ہیں ثور عربوں کا ایک قبیلہ بھی ہے۔ حدیث میں ہے: وقت العشاء مالم یغب ثور الشفق یعنی عشاء کا وقت اس وقت شروع ہوتا جب شفق کا پھیلاؤ غائب نہ ہو۔ کہا جاتا ہے: ثار یثور ثوراً و ثوراناً جب افق میں پھیل جائے۔ حدیث میں ہے: من اراد العلم فلیثوّر القرآن جو علم کا ارادہ رکھتا ہے اسے قرآن پڑھنا چاہئے۔ شمر نے کہا: اس کا مطلب ہے کہ قرآن کو پڑھنا اور اس کے ساتھ علماء سے علم تلاش کرے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوْۤا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کا جواب تھا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے۔ یہ واقعہ اس طرح ہے کہ انہوں نے اپنے درمیان ایک مقتول پایا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا نام عامیل تھا۔ ان پر قاتل کا معاملہ مشتبہ ہو گیا اور ان کے درمیان اختلاف واقع ہوا۔ انہوں نے کہا: ہم آپس میں لڑ رہے ہیں جبکہ اللہ کا رسول ہمارے درمیان موجود ہے۔ پس وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے اور ان سے اس کا بیان پوچھا۔ یہ تورات میں قسامت کے حکم کے نزول سے پہلے کا واقعہ ہے۔ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے دعا کی اور انہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا۔ جب انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ سنا جبکہ اس کے ظاہر میں ان کے سوال کا جواب نہیں تھا وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس اس مقتول کے متعلق فیصلہ طلب کرنے لگے۔ کہنے لگے: تو ہمارے ساتھ مزاح کرتا ہے۔ الھزو، کھیلنا، مزاح کرنا۔ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔

جحدری نے أیتخذنا پڑھا ہے وہ یہ ایک دوسرے سے کہنے لگے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں یہ جواب دیا: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں) کیونکہ سائل کے جواب سے خروج جہالت ہوتی ہے۔ اس وجہ سے آپ نے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ کہا کیونکہ یہ ایسی صفت ہے جو انبیاء کرام میں نہیں پائی جاتی (2)۔ جہالت، علم کی نقیض ہے۔ اس وجہ سے جہالت سے پناہ مانگی جس طرح انہوں نے جہالت کا مظاہرہ کیا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا یہ انہوں نے اسے کہا جو انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر دے رہا تھا۔ اس قول کا ظاہر ایسا کہنے والے کے اعتقاد کے فساد

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا
2۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا

پر دلالت کرتا ہے اس شخص کا ایمان صحیح نہیں ہوتا جو ایسے نبی سے ایسی بات کرے جس کے معجزات ظاہر ہو چکے تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اللہ تعالیٰ تمہیں ایسا حکم دیتا ہے، کیا تو ہم سے مزاح کرتا ہے اگر کوئی اس وقت نبی کریم ﷺ کے کسی ارشاد کے متعلق یہ کہے تو اس کی تکفیر واجب ہے۔ ایک قوم کا خیال ہے کہ یہ ان سے طبعی قساوت، جفا اور معصیت کی بنا پر تھا جیسا کہ حنین کے مال غنیمت کی تقسیم کے بارے میں کسی نے نبی کریم ﷺ سے کہا تھا کہ یہ ایسی تقسیم ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی رضا کا ارادہ نہیں کیا گیا (1)۔ اسی طرح ایک اور نے کہا تھا: اعدل یا محمد ﷺ، اے محمد! ﷺ عدل کرو (2)۔ یہ تمام جہالت کے قبیح ہونے پر واضح دلیل ہے اور جہالت مفسد دین ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ھُزُوًا یہ دوسرا مفعول ہے، ہمزہ کی تخفیف جائز ہے تو اسے واؤ اور ہمزہ کے درمیان کر دے۔ حفص نے واو کو مفتوحہ بنایا ہے کیونکہ یہ ہمزہ مفتوحہ ہے جس سے پہلے ضمہ ہے یہ بدل کے طور پر جاری ہے جیسے السفھاء ولکن ہے۔ زاء سے ضمہ کا حذف کرنا جائز ہے جس طرح عضد سے حذف کیا جاتا ہے تو کہتا ہے: ھُزْوًا جیسا کہ اہل کوفہ نے پڑھا ہے۔ اسی طرح وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ۝ (اخلاص) ہے۔

اخفش نے عیسیٰ بن عمر سے حکایت کیا ہے کہ ہر وہ اسم جس کے تین حرف ہوں پہلا حرف مضموم ہو تو اس میں دو لغتیں ہوتی ہیں، تخفیف اور تثقیل۔ جیسے عسر، یسر، ہزء۔ اس کی مثل وہ تمام جمع کے الفاظ ہیں جو فُعْلٌ کے وزن پر ہوتے ہیں جیسے کُتُبٌ، و کُتْبٌ، رُسُلٌ و رُسْلٌ، عُوُنٌ و عُوْنٌ۔

اور رہا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا (زخرف:15) یہ ھزء اور کف کی طرح نہیں ہے کیونکہ یہ اصل میں فعل کے وزن پر ہے۔ جیسا کہ ان شاء اللہ اپنی جگہ پر اس کا ذکر آئے گا۔

مسئلہ: اس آیت میں دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین سے اور مسلمانوں کے دین سے اور ایسے شخص سے جس کی تعظیم واجب ہے اس سے استہزاء کرنا منع ہے اور یہ جہالت ہے اور استہزاء کرنے والا وعید کا مستحق ہے۔ مزاح، استہزاء میں سے نہیں ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ نبی کریم ﷺ مزاح فرمایا کرتے تھے اور آپ کے بعد ائمہ بھی مزاح فرمایا کرتے تھے۔ ابن خویز منداد نے کہا: ہمیں یہ خبر پہنچی کہ ایک شخص عبید اللہ بن الحسن کی طرف گیا۔ اس وقت عبید اللہ، کوفہ کے قاضی تھے۔ عبید اللہ نے اس شخص سے مزاح کیا۔ عبید اللہ نے کہا: تیرا یہ جبہ بھیڑ کی اون کا ہے یا مینڈھے کی اون کا ہے؟ وہ شخص کہنے لگا: اے قاضی! جہالت کا مظاہرہ نہ کر۔ عبید اللہ نے کہا: تو نے مزاح کو کہاں جہالت پایا ہے؟ پھر یہ آیت اسے سنائی، عبید اللہ نے اس سے اعراض کر لیا کیونکہ اس نے اسے جاہل دیکھا کیونکہ وہ مزاح اور استہزاء میں فرق نہیں جانتا تھا حالانکہ ہر ایک کا دوسرے سے کوئی تعلق نہیں۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۭ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ۭ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ۭ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ۝۶۸

1۔ صحیح بخاری، باب حدیث الخضر مع موسیٰ علیہما السلام، حدیث 3153، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

''بولے دعا کیجئے ہمارے لئے اپنے رب سے کہ وہ بتائے ہمیں کہ کیسی ہے وہ گائے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اللہ فرماتا ہے کہ وہ گائے ہے جو نہ بوڑھی ہو اور نہ بالکل بچی (بلکہ) درمیانی عمر کی ہو۔ تو بجالاؤ جو تمہیں حکم دیا جا رہا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ یہ بنی اسرائیل کی ہٹ دھرمی اور اطاعت کی کمی کا اظہار ہے۔ اگر وہ حکم کی پیروی کرتے اور کوئی گائے ذبح کر دیتے تو مقصود حاصل ہو جاتا لیکن انہوں نے اپنے اوپر سختی کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر سختی کی۔ حضرت ابن عباس اور ابوالعالیہ وغیرہما کا یہ قول ہے(1)۔ اسی طرح حضرت حسن بصری نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے۔

بنی عامر کی لغت ادع ہے(2)۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ يُبَيِّنْ، جواب امر کی وجہ سے مجزوم ہے۔ مَا هِيَ یہ مبتدا خبر ہیں۔ ماهية الشئی، شے کی حقیقت اور اس کی ذات جس پر وہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ اس میں فعل کے وقت سے پہلے نسخ کے جواز پر دلیل ہے کیونکہ جب گائے کا حکم دیا تو وہ کوئی گائے تھی جب صفت میں زیادتی کی تو یہ پہلے حکم کو دوسرے سے منسوخ کرنا ہے جس طرح اگر کہا تیس اونٹوں میں ایک بنت مخاض پھر اسے نسخ فرمایا بنت لبون یا حقہ سے۔ اسی طرح یہاں جب صفت کو متعین کر دیا تو یہ پہلے حکم کے لئے نسخ ہو گیا۔

الفارض، المسنة، فرضت، تفرض فروضاً۔ یعنی بڑی ہوگئی پرانی چیز کو فارض کہا جاتا ہے۔ راجز نے کہا:

شيب اصداغي فرأسي ابيض   محامل فيها رجال فراض

میری کان پٹیاں سفید ہوگئیں اور میرا سر سفید ہے، اس میں بوڑھے لوگ محامل کی طرح بھاری ہیں۔

ایک اور شاعر نے کہا:

لعمرك قد اعطيت جارك فارضاً   تساق اليه ما تقوم على رجل

تیری عمر کی قسم! تو نے اپنے پڑوسی کو بوڑھی گائے دی اس کو تو وہ جانور دیا جاتا ہے جو اپنے قدموں پر چلتا ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

يا رب ذي ضغن على فارض   له قروء كقروء الحائض (3)

ہائے! مجھ پر قدیم کینہ رکھنے والا، اس کے لئے حیض ہیں جیسے حیض والی عورت کے لئے حیض ہوتے ہیں۔

لَّا فَارِضٌ، بقرۃ کی صفت کی وجہ سے مرفوع ہے۔ وَّلَا بِكْرٌ معطوف ہے۔ بعض نے فرمایا: لَّا فَارِضٌ مضمر مبتدا کی خبر ہے یعنی لاھی فارض۔ اسی طرح لا ذلول ہے اور اسی طرح لا تسقی الحرث کا حکم ہے اسی طرح مسلمة کا حکم ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: فَارِضٌ اس مادہ کو کہتے ہیں جس نے بہت سے بچے جنم دیئے ہوں اور اس کا پیٹ پھول گیا ہو۔ الفارض کا

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا   2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا   3۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا

لغوی معنی واسع (کھلا) ہے یہ بعض متاخرین کا قول ہے۔ البکر غیر حاملہ چھوٹی گائے کو کہتے ہیں۔ قتبی نے کہا: جو بچہ جنم دے چکی ہو۔ البکر پہلے بچہ کو بھی کہتے ہیں۔

یا بکرَ بکرین و یا خلب الکبد   اصبحت منی کذراع من عضد

اے دو نوجوانوں کی پہلی اولاد! اے جگر کی جھلی! تو میرے نزدیک اس طرح ہے جیسے بازو سے ہاتھ کا تعلق ہے۔

البکر جانوروں اور بنی آدم کی مؤنث کے لئے استعمال ہوتا ہے جس کو ابھی نر سے جفتی نہ کیا ہو یا با کے کسرہ کے ساتھ ہے با کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اونٹ کا جوان بچہ مراد ہوتا ہے۔

العوان، نصف ایسی مادہ جو ایک یا دو بچے جنم دے چکی ہو یہ گاؤں میں سے جو طاقتور اور خوبصورت ہوتی ہے بخلاف گھوڑوں کے، شاعر گھوڑے کی صفت بیان کرتا ہے:

کمیت بھیم اللون لیس بفارض   ولا بعوان ذات لون مخصف

سیاہ رنگ والا ہے، نہ بوڑھا ہے اور نہ چھوٹا ہے، کئی رنگوں والا چتکبرا ہے۔

فرس المصف، چتکبرا گھوڑا۔ مجاہد نے کہا: گائیوں میں سے العوان اسے کہتے ہیں جو یکے بعد دیگرے بچے جنم دے چکی ہو، یہ اہل لغت نے بیان کیا ہے (1)۔ کہا جاتا ہے: ان العوان النحلة الطویلة۔ لمبی کھجور کو عوان کہتے ہیں یہ ان کے گمان کے مطابق یمنی لغت ہے۔ حرب عوان، جب اس سے پہلے ایک جنگ ہو چکی ہو۔ زہیر نے کہا:

اذا لقحت حربٌ عوان مضرۃٌ   ضروس تھز الناس انیابھا عُصل

جب جنگ تیز ہو اور نقصان دینے والی ہو۔ داڑھوں والی ہو تو لوگ اس کے ٹیڑھے دانتوں کو ناپسند کرتے ہیں۔

یعنی وہ گائے نہ چھوٹی ہو نہ بوڑھی ہو یعنی وہ درمیانی عمر کی ہو۔ عوان کی جمع عُوْن عین کے ضمہ اور واؤ کے سکون کے ساتھ۔ عُوُن واؤ کے ضمہ کے ساتھ بھی اس کی جمع سنی گئی ہے جیسے رُسُل یہ پہلے گزر چکا ہے۔ فراء نے حکایت کیا ہے، العوان سے عونت تعویناً ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ یہ امر کی تجدید اور تاکید کے لئے ہے اور ہٹ دھرمی ترک کرنے پر تنبیہ ہے۔ پس انہوں نے اس کو نہ چھوڑا (2)۔ یہ دلیل ہے کہ امر وجوب کے لئے آتا ہے جس طرح کہ فقہاء کہتے ہیں یہ صحیح ہے جو اصول الفقہ میں مذکور ہے اور امر (حکم) فوری طور پر لازم ہوتا ہے۔ یہ اکثر فقہاء کا مذہب ہے۔ اس کی صحت پر یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف سے یہ کوتاہی سمجھی جب انہوں نے حکم کو بجا لانے میں جلدی نہ کی۔ فرمایا: فَذَبَحُوْهَا وَ مَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ۝ (البقرہ) بعض علماء نے فرمایا: نہیں بلکہ امر کا وجوب علی التراخی ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تاخیر اور خطاب میں رجوع پر سختی نہیں فرمائی۔ ابن خویز منداد نے یہ کہا ہے۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۭ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا و تفسیر طبری زیر آیت ہذا   2۔ ایضاً

لَّوۡنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيۡنَ ﴿۶۹﴾

" کہنے لگے: دعا کرو ہمارے لئے اپنے رب سے کہ بتائے ہمیں کیسا رنگ ہو اس کا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ایسی گائے جس کی رنگت خوب گہری زرد ہو جو فرحت بخشے دیکھنے والوں کو"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوا ادۡعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنۡ لَّنَا مَا لَوۡنُهَا، مَا استفہام مبتدا ہے لَوۡنُهَا خبر ہے۔ لَوۡنُهَا کو یبین کے ساتھ نصب دینا بھی جائز ہے اور اس صورت میں مَا زائدہ ہوگا۔ لون کی جمع الالوان ہے یہ ایک ہیئت ہے جیسے کالا، سفید، سرخ۔ اللون کا معنی نوع بھی ہے۔ فلان متلون، رنگین مزاج شخص جو ایک عادت پر اور ایک حال پر نہ رہتا ہو۔ شاعر نے کہا:

كل يوم تتلون غير هذا بك اجمل

ہر روز تو بدلتا رہتا ہے مگر پھر بھی یہ عمل تجھ سے خوبصورت لگتا ہے۔

لون البسر تلويناً جب کھجور میں پکنے کے اثر کا آغاز ہو۔ اللون، کھجور کی ایک قسم ہے۔

اخفش نے کہا: یہ جمع ہے اور اس کا واحد لينةٌ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: صَفۡرَآءُ۔ جمہور مفسرین نے کہا کہ زرد رنگ کی ہو۔ یہ الصفرة المعروفه سے ہے یعنی زرد رنگ جو معروف ہے۔ مکی نے بعض سے روایت کیا ہے حتیٰ کہ اس کے سینگ اور کھر بھی زرد ہوں۔ حسن اور ابن جبیر نے کہا: صرف اس کے سینگ اور کھر زرد ہوں (1)، حسن نے کہا صَفۡرَآءُ کا معنی سیاہ ہے (2)۔ شاعر نے کہا:

تلك خيلي منه و تلك ركابي هن صفر اولادها كالزبيب

یہ میرے گھوڑے اور میری سواریاں اس کی طرف سے ہیں۔ یہ سیاہ ہیں ان کی اولاد کشمش کی طرح ہے۔

میں کہتا ہوں: پہلا قول صحیح ہے کیونکہ وہ ظاہر ہے اور یہ قول شاذ ہے۔ یہ مجازاً اونٹوں کے لئے استعمال ہوتا ہے (3)۔ اگر یہاں سیاہ رنگ مراد ہوتا تو اس کی تاکید الفقوع کے ساتھ نہ ہوتی کیونکہ فقوع کی صفت کے ساتھ مختص ہے۔ سیاہ رنگ کی صفت اس کے ساتھ نہیں لگائی جاسکتی۔ عرب کہتے ہیں: اسود حالك حلكوك و حُلكوك، ودجوجي و غربيب۔ یہ سب کالے رنگ کی صفات ہیں اور سرخ رنگ کی صفت قانیٔ۔ کہا جاتا ہے: احمر قانیٔ۔ سفید رنگ کے لئے ابیض ناصع، لهق، لهاق و يقق کہا جاتا ہے اور سبز رنگ کے لئے اخضر ناضر اور زرد رنگ کے لئے اصفر فاقع کہا جاتا ہے۔ فقع لونها يفقع فقوعاً جب خالص زرد رنگ ہو۔ الافقاع بری حالت کو کہتے ہیں۔ فواقع الدهر، زمانے کی مصیبتیں، وفقع باصابعه، جب انگلیوں سے آواز نکالے۔ اسی سے حضرت ابن عباس کی حدیث ہے: نهى عن التفقيع في الصلاة (4)۔ نماز میں چٹخارے نکالنے سے منع فرمایا۔ الفرقعة انگلیوں کو موڑنا حتیٰ کہ آواز نکلے۔ صَفۡرَآءُ معرفہ اور نکرہ ہر حالت میں غیر منصرف ہے کیونکہ اس میں

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا
2۔ ایضاً
3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
4۔ سنن ابن ماجہ، باب ما یکرہ فی الصلوٰۃ، حدیث 954، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

الف تانیث ہے جو لازم ہے اور یہ ھا کے مخالف ہے کیونکہ جس اسم کے آخر میں ھا ہوتی ہے وہ نکرہ ہونے کی صورت میں منصرف ہو جاتا ہے جیسے فاطمہ، عائشہ وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاقِعٌ لَّوْنُهَا خالص رنگ مراد ہے اس کی جلد کی رنگت کے علاوہ اس میں کوئی رنگ نہ ہو۔ تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ وہب نے کہا: گویا سورج کی شعاعیں اس کی جلد سے نکل رہی ہیں۔ اسی وجہ سے حضرت ابن عباس نے فرمایا: زرد رنگ نفس کو خوش کرتا ہے۔ انہوں نے زرد جوتا پہننے پر برانگیختہ کیا۔ یہ نقاش نے ان سے حکایت کیا ہے۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا: جو زرد چمڑے کا جوتا پہنے گا اس کا غم کم ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ۔ یہ ثعلبی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حکایت کیا ہے۔ حضرت ابن الزبیر، محمد بن ابی کثیر نے سیاہ جوتا پہننے سے منع فرمایا کیونکہ یہ پریشان کرتا ہے۔ تَسُرُّ کا معنی اچھا لگنا خوش کرنا ہے۔ ابو العالیہ نے کہا: اس کا معنی ہے اسے دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ یہ گائے دو وصفوں والی تھی۔ (1)

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ۭ وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ۝

"کہنے لگے: پوچھو ہمارے لئے اپنے رب سے کہ کھول کر بیان کرے ہمارے لئے کہ گائے کیسی ہو۔ بے شک گائے مشتبہ ہوگئی ہے ہم پر اور ہم اگر اللہ نے چاہا تو ضرور اس کو تلاش کر لیں گے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا انہوں نے چوتھا سوال کیا اور بیان کے بعد بھی حکم کی پیروی نہیں کی۔ یہاں الْبَقَرَ مذکر ذکر کیا کیونکہ یہ جمع کے معنی میں ہے۔ اسی وجہ سے فرمایا اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا۔ الْبَقَرَ کے لفظ کی تذکیر کی وجہ سے فعل کا صیغہ بھی مذکر ذکر فرمایا۔ قطرب نے کہا: البقرۃ کی جمع باقر، باقور اور بقر ہ۔ اصمعی نے کہا: الباقر، جمع ہے باقرۃ کی۔ اور کہا: باقورۃ بھی بقر کی جمع بنائی جاتی ہے۔ یہ نحاس نے حکایت کیا ہے۔ زجاج نے کہا: اس کا معنی بقر کی جنس ہے۔ حسن نے اس کے مطابق پڑھا جو نحاس نے ذکر کیا ہے (2) اور اعرج نے اس کے مطابق جو ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ اِنَّ الْبَقَرَ تَشَّبَهَ (تاء اور شین کی شد کے ساتھ) انہوں نے تشابہ کو فعل مضارع اور مؤنث بنایا ہے اصل میں تتشابہ تھا۔ پھر تا کو شین میں ادغام کیا گیا ہے۔ مجاہد نے تشّبّہ جیسا کہ ان دونوں کی قراءت ہے مگر بغیر الف کے پڑھا ہے۔ حضرت ابی بن کعب کے مصحف میں تشّابہت (شین کی تشدید کے ساتھ) ہے۔ ابو حاتم نے کہا: یہ غلط ہے اس بات میں تا ادغام نہیں ہوتی مگر مضارع میں۔ یحییٰ بن یعمر نے ان الباقر یشابہ پڑھا ہے (3)۔ انہوں نے اسے فعل مستقبل بنایا ہے بقر کو مذکر تصور کیا اور ادغام کیا۔ ان البقر تشابہ، شین کی تخفیف اور ھا کے ضمہ کے ساتھ۔ یہ ثعلبی نے حسن سے حکایت کیا ہے۔ نحاس نے کہا: یشابہ شین اور یا کی تخفیف کے ساتھ جائز نہیں ہے یہ تا میں جائز ہے کیونکہ اصل تتشابہ تھا دو تا کے اجتماع کی وجہ سے ایک کو حذف کر دیا۔ البقر، الباقر، البیقور، البقیر یہ تمام لغتیں ہیں اور سب کا معنی ایک ہے عرب اس کو مذکر اور مؤنث دونوں

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

طرح استعمال کرتے ہیں۔ تشابہ میں مختلف قراءت کے معانی اس کی طرف لوٹتے ہیں۔ بعض نے فرمایا: اِنَّ الْبَقَرَ تَشَّبَهَ عَلَيْنَا انہوں نے اس لئے کہا کیونکہ گائیوں کے رنگ ایک دوسرے سے مشابہ ہوتے ہیں۔ اس سے حضرت حذیفہ بن یمان کی حدیث ہے جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرمائی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فتنے رات کے ٹکڑوں کی طرح اس طرح آئیں گے جیسے گائیوں کے چہرے۔ یعنی بعض، بعض کے مشابہ ہوں گے اور گائیوں کے چہرے متشابہ ہوتے ہیں اسی وجہ سے بنی اسرائیل نے کہا: گائے ہم پر متشابہ ہو گئی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنَّاۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ یہ ان کی طرف سے استثنا ہے۔ اس آخری میں استثنا کے ذکر کرنے میں ان کی طرف سے قبولیت اور پیروی ہے اور امر کی موافقت نہ کرنے پر شرمندگی کی دلیل ہے (1)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر وہ ان شاء اللہ نہ کہتے تو کبھی گائے کا پتا نہ پاتے (2)۔ تقدیر کلام اس طرح ہے: انا لمھتدون ان شاء اللہ۔ اھتداء کو ذکر میں اس کے اہتمام کی وجہ سے مقدم فرمایا۔ شَآءَ شرط کی جگہ میں ہونے کی وجہ سے محل جزم میں ہے۔ سیبویہ کے نزدیک اس کا جواب اِنَّ اور جس میں وہ عمل کر رہا ہے۔ اور ابو العباس المبرد کے نزدیک جزا محذوف ہے۔

قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَ لَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَ مَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۱﴾

''موسیٰ علیہ السلام بولے: اللہ فرماتا ہے وہ گائے جس سے خدمت نہ لی گئی ہو کہ ہل چلائے زمین میں اور نہ پانی دے کھیتی کو، بے عیب بے داغ۔ (عاجز ہو کر) کہنے لگے اب آپ لائے صحیح پتہ۔ پھر انہوں نے ذبح کیا اسے اور وہ ذبح کرتے معلوم نہیں ہوتے تھے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ جمہور علماء نے لَا ذَلُوْلٌ کو بَقَرَةٌ کی صفت کی بنا پر مرفوع پڑھا ہے۔ اخفش نے کہا: لَا ذَلُوْلٌ، بَقَرَةٌ کی صفت ہے اور اس پر نصب بھی جائز ہے۔ ابو عبد الرحمن السلمی نے لا ذلول کو نفی کی بنا پر منصوب پڑھا ہے اور خبر مضمر ہے اور یہ تقدیر بھی جائز ہے: لاھی ذلولٌ لاھی تسقی الحرث و ھی مسلمۃ۔ لا ذلولَ کا مطلب ہے: اسے کام نے مطیع نہ بنایا ہو۔ کہا جاتا ہے: بقرۃ مذللۃ بینۃ الذِّل، انتہائی مطیع گائے۔ رجل ذلیل بین الذُّل (3)، انتہائی مطیع شخص، یعنی وہ گائے سخت ہو اس کو کام پر نہ لگایا گیا ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تُثِيْرُ الْاَرْضَ یہ بھی بقرہ کی صفت کی وجہ سے محل رفع میں ہے یعنی ھی بقرۃ لا ذلول مثیرۃٌ (4)۔ حسن نے کہا: وہ گائے وحشی تھی (5)۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کا یہ وصف بیان فرمایا لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَ لَا تَسْقِي الْحَرْثَ یعنی کھیتی کو پانی پلانے کے لئے اس کو عادی نہ بنایا گیا ہو اور نہ اس پر پانی لایا جاتا ہو۔ اس پر وقف بہتر ہے۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

4۔ ایضاً 5۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

بعض علماء نے فرمایا: تُثِيْرُ علیحدہ فعل ہے۔ اس کا معنی ہے: زمین چیرتی ہو اور اس سے کھیتی کو پانی نہ لگایا جاتا ہو (1)۔ اس تاویل پر لَا ذَلُوْلٌ پر وقف ہوگا پہلا قول دو وجوہ سے اصح ہے۔ ایک وجہ تو وہ ہے جو نحاس نے حضرت علی بن سلیمان سے روایت کی ہے کہ تُثِيْرُ کو علیحدہ کلام بنانا جائز نہیں کیونکہ اس کے بعد لَا تَسْقِى الْحَرْثَ آرہا ہے اگر یہ مستانفہ جملہ ہوتا تو واو اور لا کے ساتھ جمع نہ کیا جاتا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر وہ زمین جوتتی ہو تو پھر وہ کام کی وجہ سے مطیع ہوگی حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَا ذَلُوْلٌ، وہ کام پر لگانے کی وجہ سے مطیع نہ ہو۔

میں کہتا ہوں: یہ احتمال ہے کہ تُثِيْرُ الْاَرْضَ عمل شمار نہ ہوتا ہو اس کے خوش ہونے اور نشاط کی وجہ سے جیسا کہ امرؤ القیس نے کہا:

یھیل و یذری تربۃ و یثیرہ ۔۔۔ اثارۃ نباث الھواجر مخمس

وہ مٹی کو پھاڑتا ہے جس طرح گرمی میں پانچ اونٹوں والا آدمی مٹی کو چیرتا ہے تاکہ گیلی مٹی تک پہنچ جائے۔

اس صورت میں تُثِيْرُ مستانفہ ہوگا۔ وَ لَا تَسْقِى الْحَرْثَ اس پر معطوف ہوگا۔ اثارۃ الارض، مٹی کو حرکت دینا، اسے کریدنا۔ اسی سے حدیث پاک ہے: اثیروا القرآن فانہ علم الاولین والاخرین، قرآن کو کھولو (پڑھو) کیونکہ یہ پہلے اور پچھلے لوگوں کا علم ہے۔

ایک روایت میں ہے: من اراد العلم فلیثور القرآن جو علم کا ارادہ رکھتا ہے وہ قرآن کی تلاوت کرے۔ پہلے یہ گزر چکی ہے۔ قرآن میں ہے: آثار والارض یعنی انہوں نے کھیتی باڑی کے لئے زمین کو الٹ پلٹ لیا، الحرث وہ زمین جس میں کھیتی باڑی کی جائے۔

مسئلہ: اس آیت میں دلیل ہے کہ حیوان کو اس کی صفات سے مقید کیا جاسکتا ہے جب اس کی صفت بیان کردی جائے اور وہ صفات سے مقید کردیا جائے تو اس میں بیع سلم جائز ہے۔ یہی قول امام مالک اور ان کے اصحاب کا ہے اور امام اوزاعی، لیث اور امام شافعی کا ہے۔ اسی طرح ہر وہ چیز جس کی صفت بیان ہوسکتی ہے اس کی بیع سلم جائز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں گائے کا وصف بیان فرمایا جو تعیین کے قائم مقام ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عورت دوسری عورت کا اپنے خاوند کے سامنے اس طرح حلیہ بیان نہ کرے حتیٰ کہ گویا وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ یہ حدیث مسلم نے نقل کی ہے (2)۔ نبی کریم ﷺ نے صفت کو دیکھنے کے قائم مقام رکھا ہے اور آپ ﷺ نے قتل خطا کی دیت کو اس کے ذمہ کیا ہے جس نے دیت کو ایک مدت تک بطور قرض، اپنے اوپر لیا ہے اور فوراً ادا کرنا ضروری قرار نہیں دیا۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ صحیح بخاری، باب لاتباشر المرأۃ المرأۃ فتنعتھا لزوجھا، حدیث 4839، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یہ کوئی علماء، امام ابوحنیفہ (ا) اور ان کے اصحاب، ثوری اور حسن بن صالح کے قول کا رد ہے جو کہتے ہیں: حیوان کی بیع سلم جائز نہیں ہے۔ حضرت ابن مسعود، حضرت حذیفہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ سے مروی ہے، حیوان کی صفت کی حقیقت پر آگاہی نہیں ہو سکتی جیسے اس کا چلنا اور حرکت کرنا کیونکہ صفات کے اعتبار سے اس کی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے۔ بیع سلم کا حکم اور اس کی شرائط اس سورت کے آخر میں آیت الدین کے ضمن میں آئیں گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مُسَلَّمَةٌ یعنی ھی مسلمۃ۔ اس کا وصف ہونا بھی جائز ہے یعنی وہ گائے لنگڑے پن اور تمام عیوب سے سلامت ہو۔ یہ قتادہ اور ابو العالیہ کا قول ہے (1)۔ مسلّمۃ من العمل، عمل سے سلامت نہیں کیا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی عمل سے نفی فرمائی ہے۔ حسن نے کہا: اس کے پاؤں سلامت ہوں ان میں کام کا کوئی اثر نہ ہو۔ (2)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَّا شِيَةَ فِيهَا اس میں ایسا رنگ نہ ہو جو اس کے کثیر رنگ کے مخالف ہو۔ یہ گائے ساری زرد ہو نہ اس میں سفیدی ہو نہ سرخی ہو اور نہ سیاہی ہو۔ جیسا کہ فرمایا: فَاقِعٌ لَّوْنُهَا۔ شِيَةَ اصل میں وشی تھا واو کو حذف کیا گیا جیسا کہ یشی سے حذف کیا گیا اصل میں یوشی تھا۔ اس کی مثال زنۃ، عدۃ اور صلۃ ہیں۔

الشیۃ، وشی الثوب سے مشتق ہے جب کپڑا دو رنگوں پر بنا گیا ہو۔ ثورٌ موشی جس بیل کے منہ میں اور پائیوں میں سیاہی ہو۔ ابن عرفہ نے کہا: الشیۃ سے مراد رنگ ہے، چغلخور کو واش نہیں کہا جاتا حتیٰ کہ وہ کلام کو تبدیل کردے اور اس میں مزید اپنی طرف سے رنگ بھر دے اور اسے مختلف اقسام پر کر دے اور اس میں سے جو چاہے مزین کر دے۔ الوشی، کا معنی کثرت بھی ہے۔ وشی بنو فلان اس کا مطلب ہے۔ وہ زیادہ ہو گئے۔ کہا جاتا ہے: فرس ابلق، کبش اخرج، تیس ابرق، غراب ابقع اور ثورٌ اشیۃ، ان میں ہر ایک کا معنی چتکبرا ہے، یہ اہل لغت کی نص ہے۔ (3)

گائے میں یہ اوصاف ذکر کرنا اس لئے تھا کہ انہوں نے سختی کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر سختی کی اللہ کا دین آسان ہے۔ انبیاء کرام اور علماء وغیرہ سے بغیر ضرورت سوال کرنا مذموم ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے عافیت کا سوال کرتے ہیں۔ اس گائے کے قصص میں بہت سی روایات مروی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کا ایک شخص تھا۔ اس کا بچہ پیدا ہوا۔ اس کی ایک بچھڑی تھی اس نے اسے ایک جنگل میں چھوڑ دیا اور کہا: اے اللہ! میں یہ بچھڑی تیری بارگاہ میں ودیعت کرتا ہوں اس بچے کے لئے۔ وہ شخص فوت ہو گیا، جب وہ بچہ بڑا ہوا تو اس کی ماں نے اسے کہا: وہ ماں کا بڑا فرمانبردار تھا، تیرے باپ نے تیرے لئے ایک بچھڑی اللہ کی بارگاہ میں ودیعت کی تھی، تم جاؤ اور وہ لے آؤ۔ وہ لڑکا گیا۔ جب گائے نے اسے دیکھا تو وہ اس کے پاس آ گئی حتیٰ کہ اس نے اس کو سینگوں سے پکڑ لیا۔ وہ گائے وحشی بنی ہوئی تھی، اس نے اسے اپنی ماں کی طرف کھینچنا شروع کیا۔ بنی اسرائیل اسے راستہ میں ملے تو انہوں نے اس گائے کو اس صفت پر پایا جس کا انہیں حکم دیا گیا تھا۔ انہوں نے اس سے سودا کیا تو اس نے ان سے بہت زیادہ قیمت مانگی۔ عکرمہ کی روایت کے مطابق اس کی قیمت تین دینار تھی۔ وہ سب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے اور کہا: یہ شخص ہم سے بہت زیادہ قیمت مانگتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً (ا) احناف کے نزدیک بیع سلم کے لیے یہ شرط ہے

کہا: اس کی ملکیت کے بارے میں اسے راضی کرو۔ پس انہوں نے وہ گائے اس سے اس کے وزن کے مطابق خریدی۔ یہ عبیدہ کا قول ہے۔ سدی نے کہا: دس مرتبہ وزن کے ساتھ خریدی۔ بعض نے کہا: اس کی کھال دنانیر سے بھر کر دینے کے بدلے میں خریدی۔ مکی نے ذکر کیا ہے کہ یہ گائے آسمان سے نازل ہوئی تھی وہ زمین کی گائیوں میں سے نہیں تھی۔ (1)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ یعنی تو نے حق کو بیان کیا۔ یہ قتادہ کا قول ہے (2)۔ اخفش نے کہا: قَالُوا الْـٰٔنَ الف وصلی کو قطعی بنایا جیسے کہا جاتا ہے: یا اللہ۔ ایک اور وجہ حکایت کی ہے: قالوا لآنَ۔ واو کے اثبات کے ساتھ اس کی مثال اہل مدینہ اور ابو عمرو کی قراءت ہے عاداً اُولیٰ کوفیوں نے قالو الآن ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اہل مدینہ کی قراءت قال لان ہمزہ کی تخفیف کے ساتھ اور التقائے ساکنین کی وجہ سے واو کے حذف کے ساتھ۔ زجاج نے کہا: الآن مبنی بر فتحہ ہے یہ باقی تمام کلمات کے مخالف ہے جن میں الف، لام ہوتا ہے کیونکہ الف اور لام غیر عہد کے لئے داخل ہوتے ہیں۔ تو کہتا ہے: انت الی الآن هنا اس کا معنی ہے: تو اس وقت تک یہاں ہے پس اس کو مبنی بنایا گیا ہے جس طرح هذا کو مبنی بنایا گیا ہے اور نون کو التقائے ساکنین کی وجہ سے فتحہ دیا گیا ہے۔ یہ زمانہ حال سے عبارت ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ سیبویہ نے کادان یفعل کو عسیٰ کی مشابہت کی وجہ سے جائز قرار دیا ہے۔ یہ بحث سورت کے آغاز میں گزر چکی ہے۔ یہ خبر ہے کہ انہوں نے گائے کے ذبح میں تاخیر کی اور اللہ تعالیٰ کے امر کو جلدی پورا نہ کیا۔ قرظی محمد بن کعب نے کہا: اس کی وجہ قیمت کا مہنگا ہونا تھا۔ بعض نے کہا: اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں خوف تھا کہ قاتل کا پتہ چل جائے گا، یہ حضرت وہب بن منبہ نے کہا ہے۔ (3)

وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ۭ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝

"اور یاد کرو جب قتل کر ڈالا تھا تم نے ایک شخص کو پھر تم ایک دوسرے پر قتل کا الزام لگانے لگے۔ اور اللہ ظاہر کرنے والا تھا جو تم چھپا رہے تھے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ یہ کلام قصہ کی ابتدا پر مقدم ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے: واذ قتلتم نفساً فادارأتم فیها، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا اللہ تعالیٰ تمہیں اس طرح کا حکم دیتا ہے، یہ اس ارشاد کی طرح ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۝ (الکہف) اس کی تقدیر اس طرح ہے: انزل علی عبدہ الکتاب قیماً ولم یجعل له عوجا۔ اس کی مثالیں بہت سی ہیں جو ہم نے قصہ کے آغاز میں بیان کر دی ہیں۔

اس شخص کے قتل کے سبب کے متعلق دو قول ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ اس شخص کی ایک خوبصورت بیٹی تھی۔ اس نے پسند کیا کہ اس کے چچا کا بیٹا اس سے نکاح کرے لیکن چچا نے اسے منع کیا۔ پس اس نے اسے قتل کر دیا اور پھر اپنے شہر سے اٹھا کر دوسرے شہر میں پھینک دیا۔ بعض نے فرمایا: دونوں شہروں کے درمیان پھینک دیا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس نے میراث طلب کرنے کی خاطر اسے قتل کیا۔ وہ فقیر تھا اس نے کسی خاندان پر اس کے قتل کا دعویٰ کر دیا۔ عکرمہ نے کہا: بنی اسرائیل کی ایک

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا
2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا
3۔ تفسیر طبری و المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

مسجد تھی اس کے بارہ دروازہ تھے۔ ہر دروازہ ایک قوم کے لئے تھا۔ وہ اس سے داخل ہوتے تھے۔ پس انہوں نے ایک خاندان میں ایک مقتول پایا، ہر قوم نے دوسری قوم پر دعویٰ کیا پھر وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جھگڑتے ہوئے آئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً (البقرہ:67)

ادارأتم کا معنی ہے: تم نے اختلاف کیا اور جھگڑا کیا۔ یہ مجاہد کا قول ہے(1)۔ تدارأتم اس کی اصل ہے تا کو دال میں ادغام کیا گیا، مدغم کے ساتھ ابتدا کرنا جائز نہیں کیونکہ وہ ساکن ہوتا ہے اس لئے الف زیادہ کیا گیا...... وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ۔ یہ مبتدا خبر ہیں۔ مَّا كُنْتُمْ یہ مُخْرِجٌ کی وجہ سے منصوب ہے۔ اضافت کی وجہ سے تنوین کا حذف کرنا بھی جائز ہے۔ تَكْتُمُوْنَ یہ کان کی خبر کی جگہ ہے اس میں عائد محذوف ہے تقدیر کلام اس طرح ہے: تکتمونہ۔

اس قول کی بنا پر کہ اس نے میراث کی خاطر قتل کیا تھا تو اس وقت جان بوجھ کر قتل کرنے والا وارث نہیں ہوتا تھا۔ یہ عبیدہ سانی نے روایت کیا ہے(2)۔ حضرت ابن عباس نے کہا: اس شخص نے اپنے چچا کو میراث کی خاطر قتل کیا تھا(3)۔ ابن عطیہ نے کہا: ہماری شریعت میں بھی اسی طرح ہے۔ امام مالک نے موطا میں بیان کیا ہے کہ احیحہ بن الجلاح کا واقعہ اس کے چچا کے بارے میں یہی قاتل کے وارث نہ ہونے کا سبب بنا تھا۔ پھر اسلام میں یہ قانون ثابت رہا جس طرح بہت سی چیزیں زمانہ جاہلیت کی ثابت رہیں (4)۔ اس میں علماء کا کوئی اختلاف نہیں کہ جان بوجھ کر قتل کرنے والا دیت اور میراث کا وارث نہ ہوگا مگر ایک فرقہ جمہور سے جدا ہوا وہ سب بدعتی ہیں۔ اور خطا قتل کرنے والا دوسری میراث سے وارث ہوگا، دیت سے وارث نہ ہوگا۔ یہ امام مالک، اوزاعی، ابوثور اور امام شافعی کا قول ہے کیونکہ ایسے شخص پر تہمت نہیں ہوتی کہ اس کو میراث کے لئے قتل کیا ہے اور مال لینے کے لئے قتل کیا ہے۔ سفیان ثوری، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: امام شافعی کا بھی دوسرا قول یہی ہے عمداً اور خطاً قتل کرنے والا نہ مال سے وارث ہوگا نہ دیت سے وارث ہوگا۔ یہی قول شریح، طاؤس، شعبی اور نخعی کا ہے۔

شعبی نے حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت زید رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: جان بوجھ کر قتل کرنے والا اور خطا قتل کرنے والا کسی چیز کا وارث نہ ہوگا۔ مجاہد سے دونوں قول مروی ہیں۔ بصریوں کے ایک طائفہ نے کہا: قتل خطا میں دیت اور باقی مال دونوں سے وارث ہوگا۔ یہ ابوعمر نے حکایت کیا ہے۔ امام مالک کا قول اصح ہے جیسا کہ آیۃ المواریث میں اس کا بیان آئے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ۭ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝

"تو ہم نے فرمایا کہ مارو اس مقتول کو گائے کے کسی ٹکڑے سے۔ (دیکھا) یوں زندہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ مردوں کو۔ اور دکھاتا ہے تمہیں اپنی (قدرت کی) نشانیاں شاید تم سمجھ جاؤ"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا بعض علماء نے فرمایا: بعض سے مراد زبان ہے کیونکہ وہ کلام کا آلہ ہے۔ بعض نے کہا: ریڑھ کی ہڈی، کیونکہ اس سے انسان کی تخلیق مرکب کی جاتی ہے۔ بعض نے فرمایا: ران ہے، بعض نے فرمایا:

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً زیر آیت ہذا 4۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

کوئی ہڈی ہے، کوئی کاٹا ہوا عضو ہے، جب اسے گائے کا کوئی ٹکڑا لگایا گیا تو وہ زندہ ہو گیا اور اس نے اپنے قاتل کے متعلق خبر دی پھر مردہ ہو گیا جس طرح پہلے تھا۔

مسئلہ: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے قسامت کے قول کی صحت پر مقتول کے قول کا (میرا خون فلاں پر ہے یا مجھے فلاں نے قتل کیا ہے) ابن وہب اور ابن قاسم کی روایت سے استدلال کیا ہے۔ امام شافعی اور جمہور علماء نے مقتول کے قول سے استدلال سے منع کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: یہی صحیح ہے کیونکہ مقتول کا قول میرا خون فلاں پر ہے یا مجھے فلاں نے قتل کیا ہے یہ ایک خبر ہے جو صدق وکذب کا احتمال رکھتی ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ مدعیٰ علیہ کا خون معصوم ہے اور اس کو مباح کرنا ممنوع ہے مگر یقین کے ساتھ اور احتمال کے ہوتے ہوئے یقین نہیں ہو سکتا۔ پس مقتول کے قول کا اعتبار باطل ہے۔ رہا بنی اسرائیل کا مقتول تو وہ معجزہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے زندہ کرنے کی خبر دی تھی۔ وہ اپنے قاتل کے متعلق پختہ سچی خبر دینے کا متضمن ہے اس میں کوئی احتمال نہیں ہے۔ پس یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ ابن عربی نے کہا: اس شخص کے زندہ کرنے میں معجزہ تھا۔ جب وہ زندہ ہو گیا تو اس کا کلام قبول ورد میں دوسرے لوگوں کے کلام کی طرح ہو گیا۔ یہ ایک دقیق علم کا فن ہے جس کو صرف امام مالک ہی سمجھ سکتے ہیں، قرآن میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جب وہ خبر دے گا تو اس کا صدق واجب ہو گا۔ ہو سکتا ہے انہیں اس کے ساتھ قسامت کا بھی حکم دیا ہو۔ امام بخاری، امام شافعی اور علماء کی ایک جماعت نے اس کو بعید سمجھا ہے۔ انہوں نے کہا: خون کے بارے اس کا قول کیسے معتبر ہو گا حالانکہ اس کا قول ایک درہم کے بارے بھی قبول نہیں کیا جائے گا۔

مسئلہ: قسامت کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے۔ سالم، ابو قلابہ، عمر بن عبد العزیز اور حکم بن عیینہ سے اس کے حکم کے بارے میں توقف مروی ہے۔ امام بخاری کا میلان بھی اسی طرف ہے کیونکہ انہوں نے قسامت کی حدیث اپنی جگہ پر ذکر نہیں کی۔ جمہور علماء نے کہا: قسامت کا حکم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے پھر اس کے حکم کی کیفیت میں اختلاف ہے۔

ایک طائفہ نے کہا: پہلے دعویٰ کرنے والے قسمیں اٹھائیں گے۔ جب وہ قسمیں اٹھا دیں گے تو وہ مستحق ہو جائیں گے اگر وہ انکار کریں گے تو مدعیٰ علیہم پچاس قسمیں اٹھائیں گے اور بری ہو جائیں گے۔ یہ اہل مدینہ، لیث، امام شافعی، امام احمد اور ابو ثور کا قول ہے۔ اس کی دلیل حویصہ اور محیصہ والی حدیث ہے۔ اس کو امام مالک وغیرہ نے تخریج کیا ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ مدعیٰ علیہم سے پہلے قسم لی جائے گی۔ پس وہ قسمیں اٹھا دیں گے تو وہ بری ہو جائیں گے۔ حضرت عمر بن خطاب، شعبی اور نخعی سے یہی مروی ہے۔ ثوری اور کوفیوں نے بھی کہا ہے اور ان علماء نے شعبہ بن عبید عن بشیر بن یسار کی حدیث سے حجت پکڑی ہے جس میں ہے مدعیٰ علیہم پہلے قسمیں اٹھائیں اور وہ یہود تھے۔ اور اس حدیث سے حجت پکڑی ہے جسے ابو داؤد نے عن الزہری عن ابی سلمہ بن عبد الرحمن عن رجال من الانصار کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے فرمایا: اور پہلے ان سے آغاز کیا، کیا تم میں سے پچاس آدمی قسمیں اٹھائیں گے؟ انہوں نے انکار کیا۔ آپ نے پھر انصار سے فرمایا: (تم قسمیں اٹھا کر) اپنا حق طلب کرو۔ انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہم غیب پر (کیسے) قسمیں اٹھائیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت یہود پر لازم فرمائی کیونکہ مقتول ان کے درمیان پایا گیا تھا، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس

ارشاد سے حجت پکڑی ہے کہ "قسم مدعیٰ علیہ پر ہے (1)"۔ پس مدعیٰ علیہ متعین کیے گئے۔ ان علماء نے فرمایا: یہ قطعی اصل ہے دعویٰ میں جس کی حکمت پر شرع نے تنبیہ فرمائی ہے "اگر لوگوں کو ان کے دعووں کے متعلق دیا جاتا تو لوگ دوسرے لوگوں کے خون اور مالوں کا دعویٰ کرتے لیکن قسم مدعیٰ علیہ پر ہے۔"

پہلے مقالہ والوں نے ان کا جواب اس طرح دیا ہے کہ سعید بن عبید کی حدیث یہود کے آغاز کرانے میں اہل حدیث کے نزدیک وہم ہے۔ اسے نسائی نے نقل کیا ہے اور انہوں نے فرمایا: اس روایت میں سعید کا متابع کوئی نہیں اور حضرت بشیر عن سہیل کی حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدعین سے آغاز فرمایا۔ حضرات یحییٰ بن سعید، ابن عیینہ، حماد بن زید، عبدالوہاب الثقفی، عیسیٰ بن حماد اور بشیر بن المفضل یہ سات افراد ہیں انہوں نے اس حدیث کو مسند ذکر کیا ہے۔ اگرچہ اس حدیث کو امام مالک نے مرسل ذکر کیا لیکن حفاظ کی ایک جماعت نے اسے متصل ذکر کیا ہے۔ یہ حدیث سعید بن عبید کی حدیث سے زیادہ صحیح ہے۔ ابو محمد الاصیلی نے کہا: خبر واحد کے ساتھ ایک جماعت کی خبر پر معارضہ کرنا جائز نہیں اس کے ساتھ ساتھ سعید بن عبید نے اپنی حدیث میں کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کے اونٹوں سے سو اونٹ اس کی دیت دی اور صدقہ دیت میں نہیں دیا جاتا اور صدقہ کے ذریعے غیر اہل سے صلح نہیں کی جاتی۔ ابوداؤد کی حدیث مرسل ہے اس کے ساتھ احادیث صحیحہ متصلہ کا معارضہ نہیں کیا جاسکتا اور اصل میں تمسک کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ حکم خونوں کی حرمت کے لئے بنفسہ اصل ہے۔ ابن منذر نے کہا: یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بینہ (دلیل) کو مدعی اور قسم کو مدعیٰ علیہ پر جاری فرمایا اور اس کے ظاہر کے ساتھ حکم لگانا واجب ہے مگر اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں یا اپنے نبی کی زبان پر کسی چیز کے بارے میں حکم کو خاص کر دے تو اس خبر سے اس کی استثناء کی جائے گی۔ ان چیزوں میں کتاب اللہ جس پر دلالت کرتی ہے مقذوف کی حد، قاذف کو لازم کرنا جب اس کے پاس چار گواہ نہ ہوں جو قاذف کی صداقت کی گواہی دیں۔ اس بارے میں جو اس نے مقذوف پر تہمت لگائی۔ اسی طرح جس نے اپنی بیوی پر تہمت لگائی تو اسے اس سے حد کو ساقط کرنے کے ساتھ خاص فرمایا جب کہ وہ چار مرتبہ شہادت دے، اور ان دلائل میں سے جس کو سنت نے خاص کیا ان میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قسامت کے ساتھ فیصلہ کرنا ہے۔ ابن جریج نے عطاء عن ابی ہریرہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دعویٰ کرنے والے پر گواہ پیش کرنا ہے اور قسم منکر پر ہے مگر قسامت میں (ایسا نہیں) اس حدیث کو دارقطنی نے نقل کیا ہے۔ امام مالک نے اس مسئلہ کے لئے مؤطا میں جس دلیل سے حجت پکڑی ہے اس میں کفایت ہے، وہاں غور کرو۔

مسئلہ: قسامت کے ساتھ قصاص کے وجوب میں بھی اختلاف ہے۔ ایک طائفہ نے اس کے ساتھ قصاص واجب کیا ہے۔ یہ امام مالک، لیث، احمد اور ابوثور کا قول ہے۔ اس کی وجہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جو آپ نے حویصہ محیصہ اور عبدالرحمٰن کو فرمایا کیا تم قسم اٹھاؤ گے اور تم اپنے ساتھی کے خون کے مستحق ہو جاؤ گے (2)۔ ابوداؤد نے عمرو بن شعیب عن

1۔ صحیح بخاری، باب اذا اختلف الراھن والمرتھن فالبینۃ علی المدعی والیمین علی المدعیٰ علیہ، حدیث 2331، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب الموادعۃ والمصالحۃ مع المشرکین بالمال وغیرہ واثم من لم یف بالعھد، حدیث 2937، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابیہ عن جدہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی نصر بن مالک کے ایک شخص کو قسامت کی وجہ سے قتل کیا۔ دارقطنی نے کہا: عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کا نسخہ صحیح ہے۔ اسی طرح ابوعمر بن عبدالبر نے عمرو بن شعیب کی حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اور اس سے حجت پکڑی ہے۔

امام بخاری نے فرمایا: میں نے علی بن مدینی، احمد بن حنبل، حمیدی، اسحاق بن راہویہ کو دیکھا وہ اس حدیث سے حجت پکڑتے تھے۔ دارقطنی نے "السنن" میں یہی کہا۔ ایک جماعت نے کہا: قسامت کے ساتھ قصاص نہیں ہے اس سے دیت واجب ہوتی ہے۔ یہ حضرت عمر اور حضرت ابن عباس سے مروی ہے یہی نخعی اور حسن کا قول ہے۔ یہی نظریہ ثوری، کوفیوں، امام شافعی اور اسحاق کا ہے۔ ان علماء نے اس روایت سے حجت پکڑی ہے جو امام مالک سے ابن ابی لیلیٰ بن عبداللہ عن سہل بن ابی حثمہ کے سلسلہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو فرمایا: تم اپنے ساتھی کی دیت دے دو یا اعلان جنگ کرو۔ ان علماء نے فرمایا: یہ دیت پر دلیل ہے نہ کہ قصاص پر اور یہ علماء فرماتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حویصہ وغیرہ کو یہ کہنا کہ تم اپنے ساتھی کے خون کے مستحق ہو جاؤ گے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ تم اپنے مقتول کے خون کی دیت کے مستحق ہو جاؤ گے کیونکہ یہود ان کے اصحاب نہیں تھے اور جو اپنے ساتھی کی دیت کا مستحق ہوگا وہی اس کے خون کا مستحق ہوگا کیونکہ کبھی دیت قتل عمد میں لی جاتی ہے۔ پس یہ خون کا استحقاق ہوگا۔

مسئلہ: قسامت کا موجب جب اللوث ہے اس کا ہونا ضروری ہے اور اللوث سے مراد ایسی علامت ہے جو قتل کے مدعی کی سچائی کو ظن پر غالب کر دے۔ مثلاً ایک عادل آدمی کا قتل کے دیکھنے پر گواہی دینا یا مقتول اپنے خون میں لت پت دیکھا گیا اور جس پر تہمت لگائی ہے وہ اسی طرف ہے یا اس کے قریب ہے اس پر قتل کے آثار ہیں۔ اللوث، اس کے متعلق قول میں اختلاف ہے۔ امام مالک نے فرمایا: وہ مقتول کا قول ہے کہ میرا خون فلاں کے پاس ہے۔

ایک عادل گواہ لوث ہے۔ اسی طرح ابن القاسم کی روایت مالک سے ہے۔ اشہب نے مالک سے روایت کیا ہے کہ ایک غیر عادل شاہد اور ایک عورت کے ساتھ قسم لی جائے گی۔ ابن وہب نے روایت کیا ہے کہ عورتوں کی گواہی لوث ہے۔ محمد نے ابن قاسم سے روایت کیا ہے کہ دو عورتوں کی گواہی لوث ہے نہ کہ ایک عورت کی گواہی۔ قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا: اللوث میں بہت زیادہ اختلاف ہے۔ مذہب مشہور یہ ہے کہ وہ عادل شاہد ہے۔ محمد نے کہا: یہی میرے نزدیک محبوب ہے۔ فرمایا: ابن القاسم اور ابن عبدالحکم نے اسی کو اختیار کیا۔ عبدالملک بن مروان سے مروی ہے کہ مجروح اور مضروب جب کہے کہ میرا خون فلاں پر ہے اور پھر وہ مر جائے تو قسامت ہے۔ امام مالک اور لیث بن سعد کا بھی یہی قول ہے۔ امام مالک نے بنی اسرائیل کے مقتول سے حجت پکڑی ہے۔ اس نے کہا تھا: مجھے فلاں نے قتل کیا۔ امام شافعی نے فرمایا: اللوث ایک گواہ ہے یا تو وہ دلیل لائے اگرچہ وہ عادل نہ بھی ہوں۔

ثوری اور کوفیوں نے صرف مقتول کے پائے جانے کے ساتھ قسامت کو ثابت کیا ہے اور انہوں نے مقتول کے قول کی رعایت اور ایک گواہ کی کوئی پروا نہیں کی۔ وہ کہتے ہیں: جب مقتول ایک قوم کے محلہ میں پایا گیا اور اس پر قتل کا اثر بھی ہے تو

اس جگہ کے لوگ حلف اٹھائیں گے کہ انہوں نے اسے قتل نہیں کیا اور دیت ان (اہل محلہ) پر ہوگی اور جب اس پر قتل کا کوئی اثر نہ ہوگا تو عاقلہ پر کچھ نہ ہوگا مگر یہ کہ کسی ایک کے خلاف بینہ (دلیل) قائم ہو جائے۔ سفیان نے کہا: ہمارے نزدیک اس پر اجماع ہے۔ یہ ضعیف قول ہے۔ انہوں نے اہل علم کی مخالفت کی ہے۔ اس میں ان سے پہلے کوئی ایسا قول کرنے والا نہیں ہے۔ یہ قول قرآن وسنت کے مخالف ہے کیونکہ اس میں عاقلہ پر بغیر دلیل اور بغیر اقرار کے مال کو لازم کرتا ہے۔ امام مالک اور امام شافعی کا نظریہ ہے کہ مقتول جب کسی قوم کے محلہ میں پایا جائے تو وہ رائیگاں ہے کسی قریبی گھر والے کو نہیں پکڑا جائے گا کیونکہ کبھی مقتول قتل کیا جاتا ہے پھر اسے کسی دوسرے قوم کے دروازے پر ڈال دیا جاتا ہے تاکہ وہ ملوث ہو جائیں۔ پس ایسی صورت میں مؤاخذہ نہیں ہوگا حتیٰ کہ وہ اسباب جو قسامت کے وجوب میں علماء نے مقرر کیے ہیں وہ پائے جائیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کہا: اس میں فیصلہ کو موخر کیا جائے گا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس میں فیصلہ فرمائے گا۔

مسئلہ: قاسم بن مسعدہ نے کہا: میں نے نسائی سے کہا امام مالک قسامت کا قول نہیں کرتے مگر لوث کے ساتھ، پھر انہوں نے قسامت کی حدیث کیوں ذکر کی ہے۔ اس میں لوث کا ذکر تو نہیں ہے۔ نسائی نے کہا: مالک نے انصار اور یہود کے درمیان جو عداوت تھی اسے لوث کے قائم مقام رکھا ہے اور لوث اور میت کے قول کو عداوت کے قائم مقام رکھا ہے۔ ابن ابی زید نے کہا: اس کی اصل بنی اسرائیل کے قصہ میں ہے جب اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو زندہ فرمایا جس کو گائے کا کوئی حصہ لگایا گیا تھا اور اس نے کہا تھا: مجھے فلاں نے قتل کیا ہے اور عداوت بھی لوث (علامت) ہے۔

امام شافعی نے فرمایا: ہم مقتول کے قول کو لوث نہیں سمجھتے جیسا کہ پیچھے گزرا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: جب دو قوموں میں عداوت ظاہر ہو جیسا کہ انصار اور یہود کے درمیان عداوت تھی اور مقتول کسی ایک فریق میں پایا گیا ہو اور ان کے درمیان اور کوئی قوم نہ ہو تو قسامت اس میں واجب ہوگی۔

مسئلہ: اس مقتول کے بارے میں اختلاف ہے جو اس محلہ میں پایا گیا جس کے باشندے کرائے دار ہیں۔ اصحاب الرائے نے کہا: قسامت مالکوں پر ہوگی، رہائشی لوگوں پر کچھ نہ ہوگا، اگر وہ مالکان اپنے مکانات بیچ دیں پھر کوئی مقتول پایا گیا تو دیت مشتری پر ہوگی رہنے والوں پر کچھ نہ ہوگا۔ اگر گھروں کے مالکان غائب ہوں اور انہوں نے اپنے گھر کرائے پر دے دیئے ہوں تو قسامت اور دیت غائب مالکان پر ہوگی، رہائشیوں پر کچھ نہ ہوگا جن کے درمیان وہ مقتول پایا گیا۔ پھر یعقوب نے اس قول سے رجوع کر لیا۔ اس نے کہا: قسامت اور دیت گھروں میں رہنے والوں پر ہوگی۔ اس قول کو ابن ابی لیلیٰ سے حکایت کیا ہے اور انہوں نے اس سے بھی حجت پکڑی ہے کہ اہل خیبر عمال تھے اور رہائشی تھے (مالکان نہیں تھے) وہ کام کرتے تھے۔ پس مقتول ان میں پایا گیا۔ ثوری نے کہا: ہم کہتے ہیں: وہ اصل مالکوں پر ہوگا۔ امام احمد نے کہا: ابن ابی لیلیٰ کا قول قسامت میں ہے نہ کہ دیت میں ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: یہ سب برابر ہیں، نہ دیت ہے نہ قصاص ہے مگر ایسی دلیل کے ساتھ جو قائم ہو جائے یا کوئی ایسی بات پائی جائے جو قسامت کو ثابت کرے تو اولیاء قسم دیں گے۔ ابن منذر نے کہا: یہ قول اصح ہے۔

مسئلہ: قسامت میں پچاس سے کم آدمی قسم نہیں اٹھائیں گے کیونکہ حویصہ اور محیصہ کی حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تم میں پچاس سے کم آدمی قسم نہیں اٹھائیں گے ان میں سے کسی ایک پر۔'' اگر مستحق پچاس ہوں تو ان میں سے ہر ایک ایک قسم اٹھائے گا۔ اگر ان کی تعداد پچاس سے کم ہو یا ان میں سے کوئی ایسا شخص قسم اٹھانے سے انکار کرے جس کا معاف کرنا جائز نہیں تو ان کی تعداد کے مطابق ان پر قسمیں لوٹائی جائیں گی اور قتل عمد میں دو مردوں سے کم قسم نہیں اٹھائیں گے۔ مردوں میں سے ایک اور عورتیں قسم نہیں اٹھائیں گی، اولیاء قسم اٹھائیں گے اور وہ قسم اٹھائیں گے جن سے اولیاء مدد طلب کرتے ہوں گے عصبہ میں سے اور یہ پچاس قسمیں اٹھائیں گے۔

یہ امام مالک، امام لیث، امام ثوری، امام اوزاعی، امام احمد اور داؤد کا مذہب ہے۔ مطرف نے مالک سے روایت کیا ہے کہ مدعی علیہ کے ساتھ کوئی قسم نہیں اٹھائے گا اور وہی خود قسمیں اٹھائیں گے جیسا کہ اگر وہ ایک ہو یا زیادہ ہوں تو پچاس قسمیں اٹھائیں گے اور اپنے آپ کو قسموں کے ذریعے بری کریں گے۔ یہ امام شافعی کا قول ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: قسم نہیں اٹھائے گا مگر وارث خواہ قتل عمد ہو یا قتل خطا ہو۔ مال پر قسم نہیں اٹھوائی جائے گی اور اس کا مستحق نہ ہوگا مگر جس کے لئے بذات خود مالک ہو یا ورثاء میں سے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے ملک بنائی ہو اور ورثاء اپنی اپنی میراث کے مطابق قسمیں اٹھائیں گے۔ یہ ابوثور کا قول ہے۔ ابن منذر نے اس کو اختیار کیا اور یہی صحیح ہے کیونکہ جس پر دعویٰ نہیں کیا گیا اس کے لئے کوئی سبب نہیں ہے کہ اس کی طرف اس میں قسم متوجہ ہو (یعنی اس سے قسم لی جائے)۔ قسم سے مقصود دعویٰ سے براءت ہے اور جس پر دعویٰ ہی نہیں کیا گیا وہ بری ہے۔ امام مالک نے قتل خطا میں فرمایا: اس میں مردوں میں سے اور عورتوں میں سے ایک قسم لی جائے گی۔ جب پچاس قسمیں ایک سے یا زیادہ سے مکمل ہو جائیں گی تو قسم اٹھانے والا میراث کا مستحق ہوگا اور جو قسم سے انکار کرے گا وہ کسی چیز کا مستحق نہ ہوگا۔ اگر وہ آ جائے جو غائب تھا اور قسم اٹھا دے جو اس پر واجب تھی تو وہ میراث کا مستحق ہو گا۔ یہ امام مالک کا مشہور قول ہے اور امام مالک سے ایک قول یہ بھی مروی ہے کہ وہ قتل خطا میں قسامت نہیں دیکھتے تھے۔

قسامت کے مسائل، اس کی فروع اور احکام اور اختلاف کتب فقہ میں موجود ہیں اور جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے اس میں کفایت ہے۔

مسئلہ: اس گائے کے قصہ میں دلیل ہے کہ ہم سے پہلے لوگوں کی شریعت ہمارے لئے بھی شریعت ہے۔ متکلمین اور فقہاء کی ایک قوم نے اسے اختیار کیا ہے۔ کرخی نے اسے اختیار کیا ہے۔ ابن بکیر قاضی جو ہمارے علماء سے ہیں انہوں نے اس پر نص قائم کی ہے۔ قاضی ابو محمد عبد الوہاب نے کہا: یہ وہ ہے جس کا تقاضا مالک کے اصول کرتے ہیں اور ان کا اختلاف ان کی کتب میں موجود ہے۔ امام شافعی کا میلان بھی اسی طرف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ (انعام: 90) (ان کی ہدایت کی اقتدا کرو)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى یعنی جس طرح اس نے اس شخص کو مرنے کے بعد زندہ کیا اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر مرنے والے کو زندہ کرے گا، اس میں کاف محل نصب میں ہے کیونکہ وہ مصدر محذوف کی صفت ہے۔ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ یعنی اپنی علامات اور اپنی قدرت لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ تاکہ تم سمجھ جاؤ۔ اس کا مفہوم پہلے گزر چکا ہے۔ یعنی تم اس کی نافرمانی سے

رک جاؤ۔ عقلت نفسی عن کذا یعنی میں نے اپنے نفس کو اس چیز سے روکا۔ المعاقل، قلعے۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ۭ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاۗءُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝

''پھر سخت ہو گئے تمہارے دل یہ منظر دیکھنے کے بعد بھی وہ تو پتھر کی طرح (سخت) ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت۔ (کیونکہ) کئی پتھر ایسے بھی ہیں جن سے بہہ نکلتی ہیں نہریں۔ اور کئی ایسے بھی ہیں کہ وہ پھٹتے ہیں تو ان سے پانی نکلنے لگتا ہے اور کوئی ایسے بھی ہیں جو گر پڑتے ہیں خوف الٰہی سے اور اللہ بے خبر نہیں ہے ان (کرتوتوں) سے جو تم کرتے ہو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ، القسوہ کا معنی صلابت، شدت اور خشکی ہے۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی آیات کا یقین اور ان کی طرف لوٹنے سے محروم ہونا ہے(1)۔ ابو العالیہ اور قتادہ وغیرہ نے کہا: اس سے مراد تمام بنی اسرائیل کے دل ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: مقتول کے ورثاء کے دل مراد ہیں کیونکہ جب وہ زندہ ہوا اور اس نے اپنے قاتل کی خبر دی اور پھر فوت ہو گیا تو انہوں نے اس کے قتل کا انکار کر دیا اور کہا کہ اس نے جھوٹ بولا ہے اس کے بعد کہ وہ اتنی بڑی نشانی دیکھ چکے تھے، پہلے کبھی ان کے دل اتنے اندھے نہ تھے اور کبھی اپنے نبی کی سخت تکذیب نہیں کی تھی لیکن اللہ تعالیٰ کا حکم اس کے قتل کے بارے میں نافذ ہو گیا(2)۔ ترمذی نے حضرت عبد اللہ بن عمر سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بغیر کلام زیادہ نہ کرو کیونکہ کلام کی کثرت، اللہ کے ذکر کے بغیر دل کو سخت کر دیتی ہے اور اللہ سے زیادہ دور سخت دل ہے۔ مسند البزار میں حضرت انس سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چار چیزیں شقاوت (بدبختی) سے ہیں: آنکھوں کا جامد ہونا (یعنی آنسو نہ آنا) دل کی سختی، لمبی امید اور دنیا کا لالچ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً بعض علماء نے فرمایا: اَوْ بمعنی واو ہے جس طرح فرمایا اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ۝ (الدہر) عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ۝ (المرسلات) ان دونوں آیتوں میں او بمعنی واو ہے۔ شاعر نے کہا:

نال الخلافة او كانت له قدراً

اس مصرعہ میں او بمعنی واو ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: او بمعنی بل ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ۝ (الصافات)

اس کا معنی بل یزیدون ہے(3)۔ شاعر نے کہا:

بدت مثل قرن الشمس فی رونق الضحی و صورتها او انت فی العین املح

1۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذا
2۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری، زیر آیت ہذا
3۔ ایضاً

اس شعر میں او بمعنی بل ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی مخاطب پر ابہام کرنا ہے۔ اسی سے ابوالاسود الدؤلی کا قول ہے:

احب محمداً حبا شدیداً　　و عباساً و حمزة او علیاً

فان یك حبهم رشداً اصبه　　ولست بمخطئ ان کان غیاً (1)

میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، عباس، حمزہ اور علی سے شدید محبت کرتا ہوں، اگر ان کی محبت رشد و ہدایت ہے تو میں اسے پالوں گا اور میں خطا کرنے والا نہیں ہوں اگر وہ بہت دور بھی ہوگی۔

ابوالاسود کو کوئی شک نہیں کہ ان نفوس قدسیہ کی محبت رشد و ہدایت ہے اس نے صرف ابہام کا قصد کیا ہے۔ ابوالاسود نے جب یہ شعر کہے تو اس سے پوچھا گیا: تجھے شک ہے؟ اس نے کہا: ہرگز نہیں۔ پھر اس نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استشہاد کیا وَ اِنَّاۤ اَوْ اِیَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ (سبا) ہم یا تم (دونوں میں سے ایک ہدایت پر ہے اور دوسرا کھلی گمراہی میں ہے) ابوالاسود نے کہا: جس نے یہ خبر دی ہے (2) کیا اسے شک تھا۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی تخییر ہے یعنی تم ان کو پتھروں کے ساتھ تشبیہ دو تب بھی تم صحیح ہو گے یا پتھروں سے سخت چیز سے تشبیہ دو تب بھی تم صحیح ہو گے۔ یہ اس طرح کا کلام ہے: جالس الحسن او ابن سیرین، تعلم الفقة او الحدیث او النحو (حسن کے پاس بیٹھ یا ابن سیرین کے پاس بیٹھ۔ فقہ حاصل کر، یا حدیث، یا نحو)

بعض علماء نے فرمایا: او شک کے معنی میں ہے۔ اس کا معنی ہے: اے مخاطبین! تمہاری نظر میں اگر تم ان کی قسوت کو دیکھتے تو تم شک میں مبتلا ہو جاتے کہ کیا یہ پتھروں کی مانند ہیں یا پتھروں سے سخت ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس آیت کا بھی یہی معنی ہے: اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ یَزِیْدُوْنَ ۝ (الصافات) ایک گروہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے یہ مراد لیا ہے کہ ان میں کچھ ایسے ہیں جن کے دل پتھر کی مانند ہیں اور ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جن کے دل پتھر سے زیادہ سخت ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ دو گروہ ہیں (3)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ اَشَدُّ، اَشَدُّ، كَالْحِجَارَةِ میں کاف کی جگہ پر عطف کی وجہ سے مرفوع ہے کیونکہ معنی یہ ہے کہ وہ پتھر کی مثل ہیں یا اس سے زیادہ سخت اور حجارۃ پر عطف کی وجہ سے اشد پر فتحہ جائز ہے اور قسوۃً تمیز کی بنا پر منصوب ہے۔ ابوحیوہ نے قساوۃ پڑھا ہے، معنی دونوں کا ایک ہی ہے۔ (4)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا یَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا یَشَّقَّقُ فَیَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ، الانفجار کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ یَشَّقَّقُ اصل میں یتشقق ہے تاء کو شین میں ادغام کیا گیا ہے۔ یہ ان چشموں سے عبارت ہے جو اتنے بڑے نہ ہوں کہ وہ نہریں بن جائیں۔ یا پتھروں سے عبارت ہے جو پھٹ جاتے ہیں اگرچہ ان میں وسیع پانی جاری نہ ہو۔ ابن مصرف نے ینشقق (نون) کے ساتھ پڑھا ہے اور دونوں جگہ لما یتفجر اور لما یتشقق میں لما کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ قراءت قابل توجہ نہیں ہے۔ مالک بن دینار نے ینفجر نون اور جیم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ قتادہ

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا　　2۔ ایضاً　　3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　　4۔ ایضاً

نے کہا: پتھر نے عذر پیش کیا اور بنی آدم میں سے شقی لوگوں نے عذر پیش نہ کیا(1)۔ ابو حاتم نے کہا: لما یتفجر تاء کے ساتھ بھی جائز ہے اور لما تتشقق تاء کے ساتھ جائز نہیں کیونکہ جب کہا: تتفجر تو الانہار کی تانیث کی وجہ سے اسے مؤنث ذکر کیا لیکن تشقق میں ایسی صورت نہیں ہے۔

نحاس نے کہا: جو ابو حاتم نے انکار کیا ہے معنی کے اعتبار سے وہ جائز ہے، کیونکہ اس کا معنی ہے: وان منہا لحجارۃ تتشقق۔ اور یشقق کو لفظ ما کے اعتبار سے مذکر ذکر کیا گیا ہے۔ الشق کی جمع الشقوق ہے۔ یہ اصل میں مصدر ہے۔ تو کہتا ہے: بید فلان و رجلیہ شقوق۔ فلاں کے ہاتھوں اور پاؤں میں دراڑیں ہیں۔ تو شقاق نہ کہہ کیونکہ الشقاق ایک بیماری ہے جو جانوروں کو لاحق ہوتی ہے وہ پھٹن ہے۔ یہ جانوروں کی کلائیوں کو لاحق ہوتی ہے اور کبھی ان کی پنڈلیوں اور ہاتھوں تک پہنچ جاتی ہے۔ یعقوب سے مروی ہے، الشق سے مراد الصبح بھی ہے اور لما یتفجر میں ما محل نصب میں ہے کیونکہ یہ اِن کا اسم ہے اور لام تاکید کے لئے ہے۔ منہ لفظ ما کے اعتبار سے اور معنی کے اعتبار سے منہا بھی جائز ہے۔ اسی طرح وان منہا لما یشقق فیخرج منہ الماء ہے۔ قتادہ نے اِن کو دونوں جگہ مخففہ من مثقلہ پڑھا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ۔ یعنی پتھروں میں کچھ ایسے ہیں جو تمہارے دلوں سے زیادہ نفع مند ہیں کیونکہ ان سے پانی نکلتا ہے وہ خشیت سے گر پڑتے ہیں۔ مجاہد نے کہا: جو پتھر پہاڑ کی چوٹی سے گرتا ہے، جو نہر پتھر سے پھوٹتی ہے اور اس سے جو پانی نکلتا ہے سب کچھ اللہ تعالیٰ کی خشیت کی وجہ سے ہوتا ہے، اسی کے متعلق قرآن نازل ہوا۔ اسی کی مثل ابن جریج سے مروی ہے(2)۔ بعض متکلمین نے وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ کے تحت فرمایا: کہ اس سے مراد وہ اولے ہیں جو بادل سے گرتے ہیں۔ بعض نے فرمایا: ھبوط (گرنا) یہ مجاز ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ پتھروں کی تخلیق سے دل عبرت حاصل کرتے ہیں ان کی طرف دیکھ کر دلوں میں تواضع پیدا ہوتی ہے۔ تو دیکھنے والے کی تواضع کو ان پتھروں کی طرف مضاف کیا گیا۔ جیسا کہ عرب کہتے ہیں: ناقۃ تاجرۃ۔ یعنی ایسی اونٹنی جو بیچی جاتی ہے جو اسے دیکھے گا خریدنے کے لئے(3)۔ طبری نے ایک گروہ سے حکایت کیا ہے کہ پتھروں کے لئے خشیت یہ استعارہ ہے جیسے یرید ان ینقض میں دیوار کے لئے استعارہ ہے۔ اسی طرح زید الخیل نے کہا:

لما اتی خبر الزبیر تواضعت سور المدینۃ والجبال الخشع

جب حضرت زبیر کی خبر پہنچی تو مدینہ کی دیواریں اور پہاڑ جھک گئے۔

ابن بحر نے ذکر کیا ہے کہ اِنَّ مِنْهَا میں ضمیر دلوں کی طرف راجع ہے نہ کہ پتھروں کی طرف یعنی دلوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو خشیت الٰہی کی وجہ سے جھک جاتے ہیں۔

میں کہتا ہوں: جو کچھ تاویلات کی گئی ہیں لفظ اس کا احتمال رکھتا ہے، پہلا قول صحیح ہے یہ کوئی ممتنع نہیں ہے کہ بعض جمادات کو معرفت عطا کی جائے اور وہ سمجھ جائیں۔ جیسے اس کھجور کے خشک تنے کی روایت ہے جس کے ساتھ نبی کریم ﷺ خطبہ

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

دینے کے لئے ٹیک لگاتے تھے۔ جب آپ ﷺ اس سے دور ہٹ گئے تو وہ رونے لگ گیا(1)۔ اور یہ ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ایک پتھر جو مجھ پر زمانہ جاہلیت میں سلام کرتا تھا میں اب بھی اسے پہچانتا ہوں (٭٭)۔ اسی طرح روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ثبیر پہاڑ نے مجھے کہا: اتر جائیں، مجھے اندیشہ ہے کہ وہ لوگ آپ کو میری پشت پر قتل کردیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ مجھے عذاب دے گا (٭٭٭)۔ غار حرا نے آپ ﷺ کو ندا دی تھی یارسول اللہ! میری طرف تشریف لے آئیں۔ قرآن حکیم میں ہے: اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ (احزاب:72) (ہم نے پیش کی یہ امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے) اور فرمایا: لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ (الحشر:21) (اگر ہم نے اتارا ہوتا اس قرآن کو کسی پہاڑ پر تو آپ اس کو دیکھتے کہ وہ جھک جاتا اور پاش پاش ہو جاتا اللہ کے خوف سے) اس کا مزید بیان سورۂ سبحان میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ اہل حجاز کی لغت پر بغافل محل نصب میں ہے اور تمیم کی لغت پر محل رفع میں ہے اور با تاکید کے لئے ہے عَمَّا تَعْمَلُوْنَ یعنی تمہارے عمل سے وہ غافل نہیں ہے ہر چھوٹا بڑا جو بھی سرزد ہوتا ہے اسے وہ تم پر شمار کرے گا۔ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (الزلزلۃ) (پس جس نے ذرہ برابر بھی نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ بھی اسے دیکھ لے گا) اس میں ما، عائد کا محتاج نہیں مگر یہ کہ اسے الذی کے معنی میں کیا جائے۔ اسم کے طول کی وجہ سے عائد کو حذف کیا گیا ہے یعنی عن الذی تعملونہ۔ ابن کثیر نے یعملون یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس صورت میں خطاب حضرت محمد ﷺ کے لئے ہوگا۔(2)

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ
يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝

"(اے مسلمانو!) کیا تم یہ امید رکھتے ہو کہ (یہ یہودی) ایمان لائیں گے تمہارے کہنے سے حالانکہ ایک گروہ ان میں ایسا تھا جو سنتا تھا کلام الٰہی کو پھر بدل دیتے تھے اسے خوب سمجھ لینے کے بعد جان بوجھ کر"۔

اس میں چار مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ یہ استفہام ہے اس میں انکار کا معنی ہے۔ گویا مومنوں کو یہود کے اس ٹولہ کے ایمان سے مایوس کرنا ہے یعنی اگر انہوں نے کفر کیا ہے تو ان کے لئے اس میں پہلے مثال موجود ہے۔ خطاب نبی کریم ﷺ کے اصحاب کو ہے۔ یہ واقعہ اس طرح ہے کہ انصار یہود کے اسلام قبول کرنے کے حریص تھے کیونکہ ان کے درمیان حلف اور معاہدہ تھا(3)۔ بعض نے فرمایا: خطاب صرف نبی کریم ﷺ کو ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے، یعنی آپ پریشان نہ ہوں اس پر کہ وہ آپ کو جھٹلا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو بتا دیا کہ یہ ان برے

1۔ صحیح بخاری، باب علامات النبوۃ فی الاسلام، حدیث نمبر 3318، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً مسند امام احمد، حدیث نمبر 5886

2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً ٭٭ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا ٭٭٭ ثبیر مکہ مکرمہ میں ایک پہاڑ ہے۔

لوگوں میں سے ہیں جو گزر چکے ہیں۔ ان محل نصب میں ہے یعنی فی ان یومنوا۔ یومنوا انْ کے ساتھ منصوب ہے۔ اسی وجہ سے نون کو اس سے حذف کیا گیا ہے۔

کہا جاتا ہے: طمع فیہ طَمَعاً و طماعیۃ (مخفف) فھو طَمِعٌ، بروزن فَعِلٌ۔ اطمعہ فیہ غیرہ، تعجب میں کہا جاتا ہے: طمُع الرجل میم کے ضمہ کے ساتھ یعنی وہ زیادہ لالچ والا ہو گیا۔ الطمع لشکر کی خوراک کو بھی کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: امرھم الامیر باطماعھم یعنی امیر نے لشکر کے رزق کا حکم دیا امرأۃ مطماع ایسی عورت جو لالچ کرتی ہے لیکن غلبہ نہیں پاتی۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ۔ الفرق اسم جمع ہے لفظاً اس کا واحد نہیں ہے اور اس کی جمع قلت افرقۃٌ اور جمع کثرت افرقاء ہے۔ يَسْمَعُونَ، کان کی خبر ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ خبر مِّنْهُمْ ہو اور يَسْمَعُونَ فریق کی صفت ہو۔ اس میں بُعد ہے۔

كَلَٰمَ اللَّهِ۔ یہ جماعت کی قراءت ہے۔ اعمش نے كَلِمَ الله پڑھا ہے یعنی کلمہ کی جمع (1)۔ سیبویہ نے کہا: میں جانتا ہوں کہ ربیعہ کے کچھ لوگ منھم کو میم کے کسرہ کی اتباع میں ھاء کو کسرہ کے ساتھ پڑھتے ہیں اور ان کے نزدیک درمیان میں ساکن اس اتباع سے روکنے والا نہیں۔

كَلَٰمَ اللَّهِ، يَسْمَعُونَ کا مفعول ہے اور اس سے مراد ستر افراد ہیں جنہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چنا تھا۔ پس انہوں نے اللہ تعالیٰ کا کلام سنا اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی نہ کی۔ انہوں نے اپنی قوم کے سامنے اپنی باتوں کو بدل ڈالا۔ یہ ربیع اور ابن اسحاق کا قول ہے اور اس قول میں ضعف ہے (2)۔ اور جنہوں نے کہا کہ ستر آدمیوں نے وہ سنا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سنا تھا۔ اس نے غلطی کی ہے۔ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت اور کلام کرنے کے ساتھ ان کی خصوصیت کو ختم کر دیا ہے (3)۔ سدی وغیرہ نے کہا: وہ سننے کی طاقت نہیں رکھتے تھے، ان کے اذہان مختلط ہو گئے۔ انہوں نے امید رکھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کلام سنیں گے اور وہ ان کے لئے لوٹائیں گے۔ جب وہ فارغ ہوئے اور باہر نکلے تو ایک گروہ نے اللہ کے کلام کو بدل ڈالا جو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے سنا تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَٰمَ اللَّهِ (توبہ: 6) (اگر کوئی شخص مشرکوں میں سے پناہ طلب کرے آپ سے تو پناہ دیجئے اسے تاکہ وہ سنے اللہ کا کلام)

اگر یہ کہا جائے کہ کلبی نے ابو صالح سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اپنے رب سے سوال کریں کہ وہ انہیں اپنا کلام سنائے۔ پس انہوں نے برق کی آواز کی طرح آواز سنی انی انا اللہ لا الہ الا اللہ الحی القیوم اخرجتکم من مصر بید رفیعۃ و ذراع شدیدۃ، میں اللہ ہوں اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو حی، قیوم ہے میں نے تمہیں مصر سے نکالا بلند ہاتھوں اور سخت بازوؤں کے ساتھ۔

میں کہتا ہوں: یہ حدیث باطل ہے صحیح نہیں ہے۔ یہ ابن مروان نے کلبی سے روایت کی ہے اور وہ دونوں ضعیف ہیں قابل

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

حجت نہیں ہے۔ تمام اولاد آدم سے کلام کے ساتھ صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خاص کیا گیا تھا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے کلام کی ہے اور انہیں بھی اپنا کلام سنایا ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ان پر فضیلت نہ رہی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور اس کا فرمانا حق ہے۔ اِنِّی اصْطَفَیْتُكَ عَلَی النَّاسِ بِرِسٰلٰتِیْ وَ بِكَلَامِیْ (اعراف:144) یہ زیادہ واضح قول ہے۔

مسئلہ نمبر3: اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے کلام کو کیسے پہچانا جبکہ انہوں نے اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کا خطاب نہیں سنا تھا بعض علماء نے فرمایا آپ نے کلام سنا جس میں حروف اور آوازیں نہ تھیں اور نہ اس میں تقطیع تھی نہ نفس۔ اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام جان گئے کہ یہ بشر کا کلام نہیں ہے یہ رب العٰلمین کا کلام ہے۔ بعض دوسرے علماء نے فرمایا: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایسا کلام سنا جو کسی جہت سے نہیں تھا، اور انسان کا کلام تو چھ جہتوں میں سے کسی جہت سے سنا جاتا ہے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام جان گئے کہ یہ بشر کا کلام نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: آپ کا پورا جسم قوت سماعت بن گیا تھا حتیٰ کہ اس کے ساتھ آپ نے اللہ تعالیٰ کا کلام سنا تو آپ جان گئے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ بعض نے فرمایا: معجزہ نے دلالت کی کہ جو انہوں نے سنا ہے وہ اللہ کا کلام ہے۔ اور یہ اس طرح ہے کہ انہیں کہا گیا: اپنا عصا ڈالو تو انہوں نے عصا ڈال دیا وہ بہت بڑا سانپ بن گیا تو یہ صدق حال پر ان کے لئے علامت تھا۔ اور وہ جس نے انہیں کہا انی انا ربك وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ بعض نے فرمایا: انہوں نے اپنے دل میں کوئی بات چھپائی ہوئی تھی جس پر صرف علام الغیوب ہی واقف ہو سکتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے خطاب میں اس پوشیدہ بات کی خبر دی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام جان گئے جو اس سے مخاطب ہے اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ مزید بیان سورہ القصص میں نُوْدِیَ مِنْ شَاطِیِٔ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ (القصص:30) کے تحت آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ یُحَرِّفُوْنَهٗ مجاہد اور سدی نے کہا: اس سے مراد یہود کے علماء ہیں جو تورات میں تحریف کرتے تھے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کرتے تھے اپنی خواہشات کے مطابق (1)۔ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ یعنی پہچاننے اور جاننے کے بعد۔ یہ ان کو توبیخ ہے یعنی یہ یہود، ان کے آباء واجداد برائی اور عناد کا اظہار کرتے ہوئے گزر گئے یہ ان کے طریقوں پر ہیں پھر تم کیسے ان کے ایمان کی طمع کرتے ہو۔

یہ کلام دلالت کرتا ہے کہ حق جاننے والا معاند، ہدایت سے دور ہوتا ہے کیونکہ وہ وعدہ اور وعید کو جان چکا ہوتا ہے لیکن پھر بھی اسے یہ علم اپنے عناد سے نہیں روکتا۔

وَ اِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۖۚ وَ اِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰی بَعْضٍ قَالُوْۤا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ لِیُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ اَوَ لَا یَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَ مَا یُعْلِنُوْنَ ۝

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

''اور جب ملتے ہیں ایمان والوں سے تو کہتے ہیں ہم بھی ایمان لائے ہیں اور جب تنہا ملتے ہیں ایک دوسرے سے تو کہتے ہیں (ارے) کیا بیان کرتے ہو ان سے جو کھولا ہے اللہ نے تم پر، یوں تو وہ دلیل قائم کریں گے تم پر ان باتوں سے تمہارے رب کے سامنے کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔ کیا وہ (یہ) نہیں جانتے کہ اللہ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا یہ منافقین کے بارے میں ہے۔ لَقُوا کی اصل لَقِیُوا ہے پہلے یہ گزر چکا ہے۔ وَ اِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ یہ آیت یہود کے بارے میں ہے۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا پھر منافقت کی تھی وہ مومنین کو بیان کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کے آباء واجداد کو عذاب دیا گیا تھا۔ یہود نے انہیں کہا: اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ یعنی تم پر اللہ تعالیٰ نے جو عذاب کا فیصلہ فرمایا تاکہ وہ کہیں کہ ہم تم سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ معزز ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس اور سدی سے مروی ہے (1)۔ بعض علماء نے فرمایا: حضرت علی رضی اللہ عنہ خیبر کی جنگ کے موقع پر قریظہ کے پاس گئے تو آپ نے سنا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بک رہے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! آپ انہیں تبلیغ نہ کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منہ پھیر لیا۔ پھر فرمایا: میں گمان کرتا ہوں تو نے ان سے میری گستاخی سنی ہے، اگر وہ مجھے دیکھ لیں گے تو رک جائیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہود کے پاس گئے۔ جب انہوں نے آپ کو دیکھا تو وہ رک گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: اے بندروں اور خنازیر کی اولاد! تم نے عہد توڑ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں رسوا کرے اور تم پر اپنا عذاب نازل کرے۔ انہوں نے کہا: آپ جاہل نہیں تھے اور ہم پر جہالت کا اظہار نہ کریں۔ یہ آپ کو کس نے بتایا ہے؟ یہ خبر ہماری طرف سے نکلی ہے یہ معنی مجاہد سے بھی مروی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا خَلَا، خَلَا اصل میں خَلَوَ تھا واو متحرک ماقبل مفتوح کی وجہ سے واو الف سے بدل گئی۔ خلاء کا معنی سورت کے آغاز میں گزر چکا ہے۔ فتح کا معنی حکم (فیصلہ کرنا) اور عربوں کے ہاں الفتح کا لفظ القضاء اور الحکم کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَ اَنْتَ خَیْرُ الْفٰتِحِیْنَ (اعراف) اس آیت میں فاتحین کا معنی حاکمین (فیصلہ کرنے والے) ہے۔ میرے اور تیرے درمیان قاضی ہے۔ قاضی کو فتاح کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ظالم کے خلاف مظلوم کی مدد کرتا ہے۔ الفتح کا معنی مدد کرنا ہی ہے۔ اسی سے ہے: یَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِیْنَ كَفَرُوْا (البقرہ:89) وہ کافروں کے خلاف مدد طلب کرتے تھے۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ (انفال:19) چیزوں کے درمیان فرق کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ (2)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِیُحَآجُّوْكُمْ لام کَیْ کی وجہ سے منصوب ہے۔ اگر تو چاہے تو اَنْ کے اضمار کے ساتھ نصب دے نصب کی علامت نون کا حذف ہے۔ یونس نے کہا: عربوں میں سے کچھ لوگ لام کَیْ کو فتحہ دیتے ہیں۔ اخفش نے کہا: کیونکہ فتحہ اصل

1۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذا
2۔ ایضاً

ہے۔ خلف الاحمر نے کہا: یہ بنی العنبر کی لغت ہے۔ لیحاجوکم کا معنی لیعیروکم ہے (وہ تمہیں عار دلائیں گے) وہ کہیں گے ہم اللہ کی بارگاہ میں تم سے زیادہ معزز ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ تم پر تمہارے قول سے حجت پکڑیں گے وہ کہیں گے تم نے اس کا انکار کیا اس کی سچائی پر واقفیت کے بعد۔

بعض علماء نے فرمایا: یہود کا ایک شخص اپنے مسلمان دوست کو یہ تلقین کرتا تھا کہ تم دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مضبوطی سے پکڑے رکھو کیونکہ وہ سچا نبی ہے: عِنْدَ رَبِّكُمْ بعض علماء نے فرمایا: یعنی آخرت میں۔ جیسا کہ فرمایا: ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ۝ (الزمر)

بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے عند ذکر ربکم، بعض نے فرمایا: عند بمعنی فی ہے یعنی وہ تم سے تمہارے رب کے بارے میں جھگڑیں گے۔ پس وہ تم سے زیادہ حقدار ہو جائیں گے تم پر اپنی حجت کے ظہور کی وجہ سے۔ حسن سے مروی ہے، الحجة مطلق سیدھی کلام کو کہتے ہیں۔ اسی سے محجة الطریق ہے (یعنی راستہ کا درمیان) حاججت فلاناً فحججتہ۔ میں نے فلاں سے جھگڑا کیا اور حجت کے ساتھ میں اس پر غالب آ گیا۔ اسی سے حدیث میں ہے: فحج آدم موسیٰ (1)۔ حضرت آدم علیہ السلام حجت کے ساتھ غالب آ گئے: اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ بعض علماء نے فرمایا: یہ احبار (علماء) کا اپنے پیروکاروں کو کلام ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مومنین کو خطاب ہے۔ یعنی تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ بنی اسرائیل ایمان نہیں لائیں گے جبکہ وہ ان احوال میں ہیں (2) پھر انہیں توبیخ فرمائی۔ اَوَ لَا يَعْلَمُوْنَ یہ استفہام، توبیخ و تقریع کے معنی میں ہے۔ جمہور علماء نے يَعْلَمُوْنَ یا کے ساتھ پڑھا ہے، ابن محیصن نے تا کے ساتھ پڑھا ہے مومنین کو خطاب ہے وہ جو انہوں نے اپنا کفر چھپا رکھا تھا اور وہ جو انہوں نے اعلانیہ انکار کیا تھا۔ (3)

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ۝

''اور ان میں کچھ ان پڑھ ہیں جو نہیں جانتے کتاب کو بجز جھوٹی امیدوں کے اور وہ تو محض وہم و گمان ہی کرتے رہتے ہیں''۔

اس میں چار مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: مِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ یعنی یہود میں سے۔ بعض نے فرمایا: یہود اور منافقین میں سے جو نہ لکھتے تھے نہ پڑھتے تھے۔ امیون کا واحد امی ہے۔ یہ الامة الامیة کی منسوب ہے یعنی جو امت اپنی ماؤں کی ولادت کی اصل پر ہوتے ہوئے لکھنا پڑھنا نہ سیکھے۔ اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: انا امة امیة لا نکتب ولا نحسب (4)۔ ہم امی امت ہیں نہ ہم لکھتے ہیں نہ حساب لگاتے ہیں۔ انہیں امیون کہا گیا کیونکہ انہوں نے ام الکتاب کی تصدیق نہیں کی یہ حضرت ابن

1۔ صحیح بخاری، باب واصطفعتک لنفسی، حدیث نمبر 4367، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً 4۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

4۔ صحیح بخاری، باب قول النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام لا نکتب ولا، حدیث 1780، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عباس سے مروی ہے (1)۔ حضرت ابو عبیدہ نے کہا: انہیں امیون کہا گیا کیونکہ کتاب کا نزول ان پر ہوا تھا گویا وہ ام الکتاب کی طرف منسوب کئے گئے ہیں۔ گویا فرمایا: ومنهم اهل الكتاب لا يعلمون الكتاب۔ ان میں سے اہل کتاب جو کتاب کو نہیں جانتے۔ عکرمہ اور ضحاک نے کہا یہ عرب کے نصاریٰ ہیں بعض نے فرمایا: یہ اہل کتاب کی ایک قوم ہے۔ ان کی کتاب ان کے گناہوں کی وجہ سے اٹھالی گئی پس وہ امیین بن گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ مجوسی ہیں۔ میں کہتا ہوں: پہلا قول اظہر ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا یَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِیَّ یہاں اِلَّا بمعنی لکن ہے یہ مستثنیٰ منقطع ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ (النساء: 157) نہیں ان کے پاس اس امر کا کوئی صحیح علم بجز اس کے کہ وہ پیروی کرتے ہیں گمان کی)۔ نابغہ نے کہا:

حلفت يميناً غير ذي مثنوية ولا علم الا حسن ظن بصاحب

میں نے قسم اٹھائی جس میں استثناء نہیں اور علم نہیں تھا مگر ساتھی پر حسن ظن کی۔

ابو جعفر، شیبہ اور اعرج نے اِلَّا امانِی یاء کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے ایک یاء کو تخفیف کی خاطر حذف کر دیا۔ ابو حاتم نے کہا: ہر لفظ جو اس طرح ہو کہ ایک مشدد ہو تو اس میں تشدید و تخفیف جائز ہے جیسے اثانی، اغانی، امانی وغیرہ۔ اخفش نے کہا: یہ اس طرح ہے جیسے مفتاح کی جمع میں کہا جاتا ہے: مفاتیح، و مفاتح۔ یہ جمع کی یاء ہے۔ نحاس نے کہا: معتل میں حذف اکثر ہوتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

وهل يرجع التسليم او يكشف العمى ثلاث الاثاني والرسوم البلاقع

کیا تین چیزیں تسلیم کو لوٹاتی ہیں یا اندھے پن کو کھولتی ہیں، چولہے کے پتھر، بقیہ بنیادیں جو کھنڈر بن چکی ہیں۔

الامانی، یہ امنیۃ کی جمع ہے اس کا معنی تلاوت ہے اصل میں امنويۃ، افعولۃ کے وزن پر تھا واو کو یا میں ادغام کیا گیا یا کی وجہ سے نون کو کسرہ دیا گیا ہے تو امنیۃ بن گیا۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤى اَلْقَى الشَّیْطٰنُ فِیْۤ اُمْنِیَّتِهٖ (الحج: 52) یعنی جب وہ تلاوت کرتا ہے تو اس کی تلاوت میں شیطان ڈالتا ہے۔ کعب بن مالک نے کہا تھا:

تمنى كتاب الله اول ليلة واخره لاقى حمام المقادر

اس نے رات کے ابتدائی حصہ اور آخری حصہ میں تلاوت کی۔

ایک اور شاعر نے کہا:

تمنى كتاب الله اخر ليلة تمنى داؤد الزبور على رسل

اس نے رات کے آخری حصہ میں کتاب اللہ کی تلاوت کی جس طرح حضرت داؤد علیہ السلام نے زبور کی تلاوت آہستہ آہستہ کی۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

الامانی کا معنی جھوٹ بھی ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ما تمنیت منذ اسلمت(1)، جب سے میں نے اسلام قبول کیا ہے جھوٹ نہیں بولا ہے۔ کسی عربی نے ابن دأب کو کہا تھا جب وہ بیان کر رہا تھا: أھذا شئ رَویتہٗ ام شیء تمنیتہٗ۔ کیا یہ وہ چیز ہے جو تم نے کسی سے روایت کی ہے یا تو نے خود گھڑی ہے۔ حضرت ابن عباس اور مجاہد نے الامانی کی تفسیر اسی مفہوم میں کی ہے (2)۔ الامانی ہر اس چیز کو بھی کہتے ہیں جس کی انسان تمنا اور خواہش کرتا ہے۔ قتادہ نے کہا: الا امانی یعنی وہ اللہ تعالیٰ پر ایسی تمنا کرتے ہیں جو ان کے لئے نہیں ہے (3)۔ بعض نے فرمایا: الامانی کا معنی التقدیر ہے کہا جاتا ہے: مُنِیَ لہ یعنی اس کے لئے مقدر کیا گیا۔ یہ جوہری کا قول ہے۔ ابن بحر نے یہ حکایت کیا ہے۔ شاعر کا قول بیان کیا ہے:

لا تامنن وان امسیت فی حرم حتی تلاقی ما یمنی لک المانی

تو امن میں نہ ہو اگرچہ تو شام حرم میں گزارے حتیٰ کہ تو وہ پالے جو تقدیر بنانے والے نے تیری تقدیر میں لکھی ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ هُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ، ان بمعنی ما نافیہ ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِیْ غُرُوْرٍ۝ (الملک) اس آیت میں اِن، ما نافیہ کے معنی میں ہے اور یَظُنُّوْنَ کا معنی ہے وہ جھوٹ بولتے ہیں کیونکہ انہیں اس چیز کی صحت کا علم ہی نہیں ہے جو وہ تلاوت کرتے ہیں۔ وہ تو اپنے علماء کے مقلد ہیں اس میں جو وہ پڑھتے ہیں۔

ابو بکر انباری نے کہا: ہمیں احمد بن یحییٰ النحوی نے بتایا کہ عرب ظن کو علم، شک اور کذب کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ فرمایا: جب علم کے دلائل قائم ہو جائیں اور وہ شک کے دلائل سے زیادہ ہوں تو ظن یقین ہوگا، اور جب یقین کے دلائل اور شک کے دلائل برابر ہوں تو ظن شک ہوگا۔ جب شک کے دلائل یقین کے دلائل سے زیادہ ہوں تو ظن کذب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاِنْ هُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ یعنی وہ جھوٹ بولتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 4: ہمارے علماء نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے علماء یہود کے بارے میں بتایا کہ وہ تحریف کرتے ہیں اور تبدیلی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور اس کا قول حق ہے: فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ یَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَیْدِیْهِمْ الآیہ (البقرہ:79) (سو ہلاکت ہو ان کے لئے جو لکھتے ہیں کتاب اپنے ہاتھوں سے)

جب معاملہ ان کی طرف متوجہ ہوا، اور علماء کی رعیت بری ہو گئی اور وہ دنیا پر حرص و لالچ کرنے لگے اور انہوں نے ایسی چیزیں طلب کیں جو لوگوں کے رخ ان کی طرف پھیر دیں تو انہوں نے اپنی شریعت میں بدعتوں کو نکالا اور شریعت کو بدل ڈالا۔ پھر انہیں تورات کے ساتھ لاحق کر دیا۔ اپنے بیوقوف لوگوں کو کہا: یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ وہ ان کی طرف سے یہ قبول کر لیں اور ان کی ریاست مستحکم ہو جائے اور اس کے ذریعے وہ دنیا کا مال و متاع حاصل کریں اور جو کچھ انہوں نے اختراع کیا تھا اس میں یہ بھی تھا کہ انہوں نے کہا پس لیس علینا فی الامیین سبیل وھم العرب یعنی ہم پر امیوں کے بارے میں کوئی گرفت نہیں ہے اور وہ عرب ہیں یعنی جو کچھ ہم ان کے مال سے لے لیں وہ ہمارے لئے حلال ہے اور ان کی

1۔ سنن ابن ماجہ، باب کراہیۃ مس الذکر بالیمین والاستنجاء بالیمین، حدیث نمبر 306، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً

اختراع میں سے یہ بھی تھا کہ انہوں نے لا یضرنا ذنب فنحن احباء ہ و ابناء ہ۔ ہمیں کوئی گناہ مضر نہیں ہم اللہ تعالیٰ کے محبوب اور اس کے بیٹے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس نازیبا بات سے بلند ہے۔

تورات میں تھا: یا احباری و یا ابناء رسلی۔ (اے میرے علماء اور میرے رسولوں کی اولاد) تو انہوں نے اسے بدل ڈالا اور یہ لکھا: یا احبابی و یا ابنائی (یعنی اے میرے محبوبو! اے میرے بیٹو!) اللہ تعالیٰ نے ان کی تکذیب کو نازل فرمایا: وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ۚ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ (المائدہ:18)

یہود نے کہا: ہمیں اللہ تعالیٰ عذاب نہیں دے گا۔ اگر وہ عذاب دے گا تو چالیس دن عذاب دے گا جتنے دن ہم نے بچھڑے کی عبادت کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نازل فرمایا: وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۚ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا (البقرہ:80) (اور انہوں نے کہا ہرگز نہ چھوئے گی ہمیں (دوزخ کی) آگ بجز گنتی کے دن۔ آپ فرمائیے کیا لے رکھا ہے تم نے اللہ سے کوئی وعدہ۔)

ابن مقسم نے کہا: عَهْدًا سے مراد توحید ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا (مریم:87) اس آیت میں عَهْدًا سے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔ فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۞ (البقرہ) تب تو خلاف ورزی نہ کرے گا اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کی یا (یونہی) بہتان باندھتے ہو اللہ پر جو تم جانتے ہی نہیں)

پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو جھوٹا ثابت کیا اور فرمایا: بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۞ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۞ (البقرہ) ہاں (ہمارا قانون یہ ہے) جس نے جان بوجھ کر برائی کی اور گھیر لیا اس کو اس کی خطا نے تو وہی دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے وہی جنتی ہیں وہ اس جنت میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ دوزخ اور جنت میں خلود کفر اور ایمان کے اعتبار سے ہے نہ کہ اس اعتبار سے جو انہوں نے کہا۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۚ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۚ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ۞

''پس ہلاکت ہو ان کے لئے جو لکھتے ہیں کتاب خود اپنے ہاتھوں سے۔ پھر کہتے ہیں: یہ نوشتہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ حاصل کرلیں اس کے عوض تھوڑے سے دام۔ سو ہلاکت ہو ان کے لئے بوجہ اس کے جو لکھا ان کے ہاتھوں نے اور ہلاکت ہو ان کے لئے بوجہ اس مال کے جو وہ (یوں) کماتے ہیں''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: فَوَيْلٌ، ویل کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ کیا ہے۔ حضرت عثمان بن عفان نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ یہ آگ کا پہاڑ ہے (1)۔ حضرت ابو سعید خدری نے روایت کیا ہے کہ ویل دو پہاڑوں کے

1۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذا

درمیان جہنم میں ایک وادی ہے جس میں گرنے والا چالیس سال گرتا جائے گا۔(1)

سفیان اور عطا بن یسار سے مروی ہے کہ اس آیت میں ویل سے مراد ایک وادی ہے جو جہنم کے فنا میں ہے اس میں دوزخیوں کی پیپ چلتی ہے(2)۔ بعض نے فرمایا: جہنم میں ایک حوض ہے۔ الزہراوی نے دوسروں سے حکایت کیا ہے کہ یہ جہنم کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے(3)، الویل، عذاب کی تکلیف ہے۔ خلیل نے کہا: اس تکلیف کی شدت ہے۔ اصمعی نے کہا: ویل سے مراد افسوس کا اظہار کرنا ہے۔ اور الویح سے مراد رحم کا اظہار کرنا ہے۔ سیبویہ نے کہا: جو ہلاکت میں واقع ہو اس کے لئے ویل اور جو ہلاکت کے قریب ہو اس کے لئے ویح استعمال ہوتا ہے۔ ابن عرفہ نے کہا ویل سے مراد غم ہے۔ کہا جاتا ہے: تویل الرجل جب وہ ویل پکارے یہ غم اور مصیبت کے وقت کہا جاتا ہے۔ اس سے ہے فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کی اصل ہلاکت ہے ہر وہ شخص جو ہلاکت میں واقع ہوا ہو وہ ویل کو پکارتا ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ (الکہف: 49) ویل اور ویلہ دونوں کا معنی ہلاکت ہے اس کی جمع ویلات ہے۔ شاعر نے کہا:

لہ الویل ان امسی ولا ام هاشم

ایک اور نے کہا:

فقالت لک الویلات انک مرجلی

ویل پر رفع ابتدا کی وجہ سے ہے۔ اس کو مبتدا بنانا جائز ہے اگرچہ نکرہ ہے کیونکہ اس میں دعا کا معنی ہے۔ اخفش نے کہا: فعل کے اضمار کی بنا پر نصب بھی جائز ہے یعنی الزمهم الله ويلا۔ فراء نے کہا: الویل اصل میں وَیْ تھا یعنی غم۔ جیسے تو کہتا ہے: وی لفلان یعنی فلاں کے لئے غم۔ عربوں نے اس کے ساتھ لام ملا دیا اور پھر اس سے اسے مقدر کیا اور اسے اعراب دیے۔ اس میں بہتر یہ ہے کہ جب یہ مضاف نہ ہو تو اس پر رفع ہو کیونکہ یہ وقوع کا تقاضا کرتی ہے اور دعا کے معنی پر نصب بھی صحیح ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔

خلیل نے کہا: صرف ان الفاظ کا مبنی ہونا سنا گیا ہے: ویح و ویس و ویہ و ویک و ویل و ویب۔ یہ تمام الفاظ قریب المعنی ہیں، بعض نے ان کے درمیان فرق کیا ہے۔ یہ مصادر ہیں ان کو عرب فعل کے ساتھ نہیں بولتے۔ الجرمی نے کہا: اور ان کلمات میں سے جن کو نصب مصادر کی نصب کی طرح دی جاتی ہے وہ ویله، عوله، ویحه اور ویسه ہیں جب ان کے ساتھ لام کو داخل کرے گا تو رفع دے گا اور کہے گا: ویلٌ لہ، وویحٌ لہ۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ کتابت معروف ہے اور سب سے پہلے جس نے قلم کے ساتھ لکھا اور قلم کے ساتھ تحریر لکھی وہ حضرت ادریس علیہ السلام تھے اور یہ بات حضرت ابوذر کی حدیث میں آئی ہے جسے الآجری وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ بعض علماء نے کہا حضرت آدم علیہ السلام کو کتاب کا فن دیا گیا تو وہ آپ کی اولاد میں وراثت ہو گیا۔

1۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذا

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِاَيْدِيْهِمْ یہ تاکید ہے کیونکہ یہ معلوم شدہ ہے کہ کتابت (لکھائی) ہمیشہ ہاتھ کے ساتھ ہوتی ہے یہ اس ارشاد کی مثل ہے: وَلَا طٰٓىِٕرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ (انعام:38) اس آیت میں جناح کا ذکر تاکید کے لئے ہے کیونکہ پرندہ اڑتا ہی پروں کے ساتھ ہے، اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ویقولون بافواھھم۔ وہ اپنے مونہوں سے بولتے ہیں تو بولنا تو ہوتا ہی منہ کے ساتھ ہے اس لئے یہاں افواھھم تاکید کے لئے ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: بِاَيْدِيْهِمْ ان کے جرم کے بیان کے لئے ہے اور ان کے اعلانیہ یہ کام کرنے کے اثبات کے لئے ہے جو خود کسی کام کو شدت سے سرانجام دیتا ہے وہ ان لوگوں سے ہوتا ہے جس کے وہ کام سپرد نہ ہوا گرچہ اس کی رائے موجود ہو۔ ابن سراج نے کہا: اَيْدِيْهِمْ یہ کنایہ ہے کہ یہ ان کی اپنی طرف سے تھا ان پر نازل نہیں کیا گیا تھا۔ اگرچہ ہاتھوں کے لکھنے میں حقیقت نہ تھی۔(1)

مسئلہ نمبر 4: اس آیت اور اس سے پہلے والی آیت میں تبدیلی، تغییر اور شرع میں زیادتی کرنے سے ڈرایا گیا ہے۔ پس جس نے اللہ کے دین میں کوئی بدعت نکالی، کوئی ایسی تبدیلی کی جو دین میں سے نہیں ہے اور دین میں وہ جائز نہ ہو تو وہ اس سخت وعید اور عذاب الیم میں داخل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو ڈرایا جب آپ نے آخر زمانہ میں جو ہونے والا ہے، اسے جان لیا　فرمایا: خبردار! تم میں سے اہل کتاب بہتر ملتوں میں جدا جدا ہوئے اور یہ امت تہتر ملتوں میں تقسیم ہوگی سوائے ایک کے سب دوزخ کی آگ میں جائیں گے　اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی طرف سے دین میں کوئی ایسی بات ایجاد کرنا جو قرآن وسنت اور اصحاب کی سنت کے مخالف ہوگی تو وہ لوگوں کو اس کے ساتھ گمراہ کریں گے۔ جس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈرایا تھا وہ واقع ہوا اور عام ہوا۔ پھیلا اور کثرت سے پھیلا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا اللہ تعالیٰ نے اس چیز کو قلت کی صفت سے بیان فرمایا جو وہ لیتے تھے۔ اس لئے کہ یا تو وہ فنا ہونے والی تھی اور اس کو ثبات نہیں تھا یا وہ حرام تھی کیونکہ حرام میں بھی برکت نہیں ہوتی اور وہ اللہ کی بارگاہ میں نہیں بڑھتا۔ ابن اسحاق اور کلبی نے کہا: تورات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ صفت ذکر تھی ربعة اسمر (درمیانہ قد اور گندمی رنگ) اور انہوں نے اسے آدم سبطاً طویلاً کے الفاظ سے بدل ڈالا یعنی گندمی سیدھے بالوں والا لمبے قد والا۔ وہ اپنے ساتھیوں اور متبعین کو کہتے: اس نبی کی صفت دیکھو جو آخر زمانہ میں مبعوث ہوگا۔ اس کی صفت تو اس کے مشابہ نہیں ہے۔ یہود کے مشائخ اور علماء کے لئے ریاست اور کمائی تھی۔ پس انہیں اندیشہ ہوا کہ اگر وہ صحیح صحیح بیان کریں گے تو ان کے کھانے بند ہو جائیں گے اور ریاست چلی جائے گی اس وجہ سے انہوں نے تحریف کی۔(2)

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ۝ بعض علماء نے فرمایا: مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ سے مراد ان کے کھانے ہیں۔ بعض نے فرمایا: گناہ ہیں اور ان کے فعل کی تغلیظ کے لئے ویل کو دوبارہ ذکر کیا۔

وَ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ المحرر الوجیز، تفسیر طبری زیر آیت ہذا

يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

''اور انہوں نے کہا: ہرگز نہ چھوئے گی ہمیں (دوزخ کی) آگ بجز گنتی کے چند دن۔ آپ فرمائیے کیا لے رکھا ہے تم نے اللہ سے کوئی وعدہ، تب تو خلاف ورزی نہ کرے گا اللہ اپنے وعدہ کی یا (یونہی) بہتان باندھتے ہو اللہ پر جو تم جانتے ہی نہیں''۔

اس میں تین مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقَالُوْا یعنی یہود نے کہا: لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً اس کے نزول کے سبب میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے پوچھا: دوزخی کون ہیں؟ انہوں نے کہا: ہم۔ پھر تم ہمارے پیچھے آؤ گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو نے جھوٹ بولا تم جانتے ہو کہ ہم تمہارے پیچھے نہیں آئیں گے۔ پس اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی (1)۔ یہ ابن زید کا قول ہے۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ آئے تو یہود کہتے تھے: یہ دنیا سات ہزار (سال) ہے۔ لوگوں کو دنیا کے ہر ہزار سال کے لئے آخرت کے دنوں میں سے ایک دن آگ میں عذاب دیا جائے گا یہ کل سات دن ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

یہ مجاہد کا قول ہے (2)۔ ایک طائفہ نے کہا: یہود نے کہا: تورات میں ہے کہ جہنم کی مسافت چالیس سال ہے وہ ہر روز ایک سال کی مسافت طے کریں گے حتیٰ کہ اس مسافت کو مکمل کرلیں گے تو جہنم ختم ہو جائے گی۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس سے یہ روایت کیا ہے (3)۔ حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ یہود نے کہا کہ انہوں نے تورات میں یہ لکھا ہوا پایا ہے کہ جہنم کے دونوں کناروں کے درمیان چالیس سال کی مسافت ہے یہاں تک کہ لوگ زقوم کے درخت تک پہنچیں گے اور یہود نے کہا: ہمیں عذاب دیا جائے گا حتیٰ کہ ہم زقوم کے درخت تک پہنچیں گے پھر جہنم ختم ہو جائے گی۔ حضرت ابن عباس اور قتادہ سے بھی مروی ہے کہ یہود نے کہا: اللہ تعالیٰ نے قسم اٹھائی ہے کہ وہ انہیں چالیس دن آگ میں داخل کرے گا جتنے دن انہوں نے بچھڑے کی عبادت کی تھی۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کو جھوٹا ثابت کیا (4) جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اس آیت میں امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا رد ہے جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد دعی الصلوۃ ایام اقرائک (5) (تو اپنے حیض کے دنوں میں نماز چھوڑ دے) سے استدلال کیا ہے کہ حیض کی مدت اتنی ہے جس کو ایام حیض کہا جاتا ہے۔ اس کی کم از کم مدت تین دن ہے اور زیادہ سے زیادہ دس دن (☆)۔ احناف کہتے ہیں: جو تین دن سے کم ہو اسے یوما اور یومین سے تعبیر کیا جاتا ہے جو دس سے زائد ہو اسے احد عشر یوما کہا جاتا ہے اس میں ایام نہیں کہا جاتا تین سے

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا۔ ایضاً صحیح بخاری، باب اذا غدر المشرکون بالمسلمین هل یعفی عنهم، حدیث 2933، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 4۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

5۔ صحیح بخاری، باب الاستحاضہ، حدیث نمبر 295، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

☆ دقت نظر سے دیکھا جائے تو احناف کے نقطہ نظر کا کوئی رد نہیں بلکہ احناف کا استدلال قوی ہے ممیز اور تمیز میں یہی ملحوظ ہوتا ہے جو احناف نے ذکر لیا ہے۔

دس تک کے اسمائے اعداد کے ساتھ ایام کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ (البقرہ: 196) پھر تین دنوں کے روزے حج میں تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ (ہود: 65) تم لطف اٹھا لو اپنے گھروں میں تین دن۔ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ (الحاقہ: 7) (مسلط کر دیا اسے ان پر سات راتیں)۔ ثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا (الحاقہ: 7) (آٹھ دن جو جڑوں سے اکھیڑنے والی تھی) تو احناف کو کہا جائے گا اللہ تعالیٰ نے روزے کے بارے میں اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ فرمایا اس سے پورا مہینہ مراد ہے۔ اور فرمایا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً (البقرہ: 80) اس اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ سے مراد چالیس دن ہیں اور جب ایام کسی عارض کی طرف مضاف ہوں تو اس سے تعداد کی تحدید مراد نہیں ہوتی بلکہ کہا جاتا ہے: ایام مشیك و سفرك و اقامتك۔ اگرچہ تیس اور بیس دن بھی ہوں، جو عدد تو چاہے مراد لے سکتا ہے۔ شاید وہ مراد لیا جو عورت کے لئے معتاد تھا اور عورت کی عادت چھ دن یا سات دن ہوتی ہے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام اس کے مطابق فرمایا۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ اَتَّخَذْتُمْ، اتخذ کے بارے میں کلام گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا کیا تم نے پہلے نیک عمل کیا ہے تم ایمان لائے تم نے اطاعت کی کہ تم آگ سے نکلنے کے مستحق ہو۔ یا تم نے اس کی وحی سے پہچانا ہے جس میں اس نے تم سے عہد کیا ہے۔ فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ یہ توبیخ اور تقریع ہے۔

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

''ہاں (ہمارا قانون یہ ہے) جس نے جان بوجھ کر برائی کی اور گھیر لیا اس کو اس کی خطا نے تو وہی دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے وہی جنتی ہیں، وہ اس جنت میں ہمیشہ رہنے والے ہیں''۔

اس میں تین مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بَلٰى یعنی معاملہ ایسا نہیں ہے جیسا تم نے ذکر کیا ہے۔

سیبویہ نے کہا بَلٰى اور نعم اسم نہیں ہیں۔ یہ بل وغیرہ کی طرح دونوں حرف ہیں۔ یہ ان کے قول لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ کا رد ہے۔ کوفیوں نے کہا: اس کی اصل بل ہے جس کا معنی پہلی کلام سے اضراب ہوتا ہے۔ اس پر یا کا اضافہ کیا گیا ہے تاکہ وقف عمدہ ہو جائے یا ایجاب اور انعام کا معنی اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے (1)۔ پس بل انکار کے رد پر دلالت کرتا ہے اور یا مابعد کے ایجاب پر دلالت کرتی ہے۔ وہ کہتے ہیں: اگر کوئی کہے: الم تاخذ دینارا؟ (کیا تو نے دینار نہیں لیا؟) تو کہے گا: نعم تو معنی لا ہو گا یعنی میں نے نہیں لیا کیونکہ تو نے نفی کو ثابت کیا اور جب تو کہے: بَلٰى تو معنی ہو گا میں نے دینار لیا۔ فراء نے کہا: جب کوئی شخص اپنے ساتھی سے کہے: مالك علی شئ (تیرے لئے مجھ پر کچھ نہیں ہے) دوسرا کہے: نعم تو یہ تصدیق ہو گی اس کے

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

لئے اس پر کچھ نہیں ہے۔ اگر وہ کہے: بلیٰ تو یہ اس کے قول کا رد ہوگا۔ تقدیر یوں ہوگی: بلی لی علیک (کیوں نہیں میرے لئے تجھ پر ہے) قرآن میں ہے: ألست بربكم قالوا بلى۔ اگر وہ نعم کہتے تو کافر ہوتے۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سَیِّئَةً اس سے مراد شرک ہے۔ ابن جریج نے کہا: میں نے عطاء سے کہا من کسب سیئة؟ سے کیا مراد ہے؟ انہوں نے کہا: شرک (1) اور پھر یہ آیت بطور دلیل پڑھی وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّیِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِی النَّارِ (النمل: 90) (جو برائی لے کر آئے گا تو ان کو منہ کے بل اوندھا پھینک دیا جائے گا، آگ میں) اسی طرح حسن اور قتادہ نے کہا: خطیئۃ کبیرہ ہے۔ (2)

مسئلہ نمبر 3: جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بَلٰی مَنْ كَسَبَ سَیِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِیْٓــٴَـتُهٗ تو یہ دلیل ہے کہ دو شرطوں پر یہ حکم معلق ہے، دونوں شرطوں سے کم کے ساتھ حکم مکمل نہیں ہوگا۔ اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (فصلت: 30) (بے شک وہ لوگ جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے پھر (اس پر) استقامت اختیار کی) اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سفیان بن عبد اللہ ثقفی کو کہا، جب انہوں نے کہا تھا یا رسول اللہ! مجھے اسلام میں کوئی ایسی بات بتائیں کہ اس کے متعلق آپ کے بعد کسی سے نہ پوچھوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قل امنت باللہ ثم استقم (تو کہہ میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا پھر اس پر قائم رہ) اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ اس مفہوم میں کلام گزر چکی ہے اور جو کچھ علماء نے وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ۝ (البقرہ: 35) کے ضمن میں فرمایا وہ بھی گزر چکا ہے۔ نافع نے خطیئاتہ، یعنی جمع پڑھا ہے باقی قراء نے مفرد پڑھا ہے اور معنی کثرت ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (ابراہیم: 34) یہاں نعمۃ مفرد ہے لیکن معنی کثرت ہے۔

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ۫ وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّ ذِی الْقُرْبٰى وَ الْیَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِیْنِ وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْكُمْ وَ اَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ۝

''اور یاد کرو جب لیا تھا ہم نے پختہ وعدہ بنی اسرائیل سے (اس بات کا) کہ نہ عبادت کرنا بجز اللہ کے اور ماں باپ سے اچھا سلوک کرنا نیز رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں سے بھی (مہربانی کرنا) اور کہنا لوگوں سے اچھی باتیں اور صحیح ادا کرنا نماز اور دیتے رہنا زکوٰۃ پھر منہ موڑ لیا تم نے مگر چند آدمی تم سے (ثابت قدم رہے) اور تم روگردانی کرنے والے ہو''۔

اس میں دس مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ان الفاظ کے بیان میں کلام گزر چکی

1۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

ہے، یہاں جس میثاق کا ذکر ہے اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ مکی نے کہا: یہ وہ میثاق ہے جو اس وقت لیا گیا جب لوگوں کو چیونٹیوں کی طرح حضرت آدم علیہ السلام کی پیٹھ سے نکالا گیا۔ بعض نے فرمایا: یہ وہ میثاق ہے جو ان سے لیا گیا جبکہ وہ زندگی میں عقلاء تھے۔ انبیاء کرام کی زبانوں کے ذریعے۔ وہ یہ ارشاد ہے: لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ (1) (تم عبادت نہیں کرتا مگر اللہ کی) اللہ تعالیٰ کی عبادت اس کی توحید کا اثبات ہے اور اس کے رسولوں کی تصدیق ہے اور جو کچھ اس نے اپنی کتب میں نازل کیا اس کے مطابق عمل کرنا ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا تَعْبُدُوْنَ سیبویہ نے کہا: لَا تَعْبُدُوْنَ، قسم کے متعلق ہے۔ معنی یہ ہے کہ جب تم نے ان سے حلف لیا اللہ کی قسم تم عبادت نہیں کرتے مگر اللہ کی۔ مبرد، کسائی اور فراء نے اس کو جائز قرار دیا۔ حضرت ابی اور حضرت ابن مسعود نے لا تعبدوا نہی کا صیغہ پڑھا ہے (2) اسی وجہ سے کلام امر کے صیغہ کے ساتھ متصل ہے۔ فرمایا: قوموا و قولوا۔ اقیموا و آتوا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ حال ہے یعنی ہم نے ان سے میثاق لیا دراں حالیکہ وہ توحید کے اظہار کرنے والے تھے یا وہ معاند نہیں تھے۔ یہ قطرب اور مبرد کا قول ہے۔ یہ ابن کثیر، حمزہ اور کسائی کی قراءت پر یعبدون (یاء کے ساتھ) پر صحیح ہوتا ہے۔

فراء، زجاج اور ایک جماعت نے کہا (3) اس کا معنی ہے اخذنا میثاقھم بالا یعبدوا الا اللہ و بان یحسنوا للوالدین و بالا یسفکوا الدماء (ہم نے ان سے میثاق لیا کہ وہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے یہ کہ وہ والدین سے حسن سلوک کریں گے، یہ کہ وہ خون ریزی نہیں کریں گے) پھر ان اور با کو حذف کیا گیا تو فعل کو رفع دیا گیا ان دونوں کے نہ ہونے کی وجہ سے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ (الزمر: 64) مبرد نے کہا: یہ خطا ہے جو عربی میں مضمر ہوتا ہے وہ ظاہر عامل کی طرح عمل کرتا ہے تو کہتا ہے: وبلد قطعت یعنی رُبّ بلد۔

میں کہتا ہوں: یہ خطا نہیں ہے بلکہ دونوں وجہیں صحیح ہیں، ان دونوں وجوہ پر سیبویہ نے یہ شعر پڑھا ہے:

الا ایھذا الزاجری احضر الوغی ۔۔۔ وان اشھد اللذات ھل انت مخلدی

اس شعر میں احضر پر نصب اور رفع دونوں پڑھے گئے ہیں۔ نصب اَنْ کے اضمار کی بنا پر اور رفع اَنْ کے حذف کی بنا پر۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا یعنی ہم نے انہیں والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے والدین کے حق کو توحید کے ساتھ ذکر کیا ہے کیونکہ انسان کی تخلیق اول اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور تخلیق ثانی (تربیت) والدین کی طرف سے ہوتی ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے شکر کو اپنے شکر کے ساتھ ملایا ہے فرمایا: اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ (لقمان: 14)

والدین سے احسان کا مطلب ان سے حسن معاشرت، ان کے لئے تواضع، ان کے حکم کی پیروی، ان کے وصال کے بعد ان کے لئے مغفرت کی دعا، ان سے محبت کرنے والوں سے تعلقات قائم کرنا وغیرہ ہے۔ تفصیلی بیان ان شاء اللہ سورۃ اسراء

1۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

میں آئے گا۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَذِي الْقُرْبٰى اس کا عطف والدین پر ہے القُرْبٰى بمعنی قرابت ہے یہ مصدر ہے جیسے الرجعیٰ، العقبیٰ (1) یعنی ہم نے اپنے قریبی رشتہ داروں سے احسان کا حکم دیا۔ تفصیلی بیان سورۃ القتال میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الْيَتٰمٰى یہ بھی معطوف ہے۔ یہ یتیمہ کی جمع ہے جیسے ندامی، ندیمہ کی جمع ہے۔ انسانوں میں الیتیم باپ کا نہ ہونا ہے اور جانوروں میں ماں کا نہ ہونا ہے (2)۔ ماوردی نے حکایت کیا ہے کہ یتیم اسے کہا جاتا ہے جس کی ماں نہ ہو۔ پہلا قول معروف ہے اس کا اصل معنی جدا ہونا ہے۔ صبی یتیم یعنی وہ بچہ جو اپنے باپ سے جدا ہو گیا۔ بیت یتیم جس کے آگے پیچھے کوئی شعر نہ ہو۔ درۃ یتیمۃٌ، ایسا موتی جس کی مثال نہ ہو۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ابطاء (تاخیر کرنا) ہے۔ یتیم کو اس لئے یتیم کہا جاتا ہے کہ نیکی اس سے مؤخر ہو جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے: یتمَ ییتمُ یتما جیسے عظم یعظم۔ اور یتمَ ییتم یُتماً ویَتماً جیسے سمع یسمع۔ فراء نے دو وجہیں ذکر کی ہیں: قد ایتمہ اللہ۔ اللہ نے اسے یتیم بنایا۔

یہ آیت یتیم پر شفقت کرنے پر اور اس کی کفالت اور اس کے مال کی حفاظت کرنے پر برانگیختہ کر رہی ہے۔ اس کا بیان سورۃ نساء میں آئے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے یتیم کی کفالت کرنے والا یا کسی غیر کے یتیم کی کفالت کرنے والا اور میں اور وہ جنت میں ان دو انگلیوں کی طرح اکٹھے ہوں گے۔ مالک نے سبابہ اور درمیانی انگلی کے ساتھ اشارہ کیا۔ مسلم نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے۔ امام حافظ ابو محمد عبدالغنی بن سعید نے حسن بن دینار ابو سعید بصری، جو حسن بن واصل ہی، کی حدیث نقل کی ہے، فرمایا: ہمیں اسود بن عبدالرحمن نے بتایا انہوں نے ہصان سے روایت کیا انہوں نے حضرت ابو موسیٰ اشعری سے روایت کیا، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جس قوم کے پیالے پر یتیم نہ بیٹھے ان کے پیالے کے قریب شیطان ہوتا ہے۔ عبدالغنی نے حسین بن قیس کی حدیث بھی نقل کی ہے اور وہ ابو علی جسی ہے۔ انہوں نے عکرمہ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے ایک یتیم مسلمان کو اپنے کھانے اور پینے میں شریک کیا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اسے سیر کر دے گا تو اس کے یقیناً سارے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے مگر یہ کہ وہ کوئی ایسا عمل کرے جو بخشا نہ جاتا ہو۔ اور اللہ تعالیٰ جس کی دو محبوب چیزیں لے لے گا اور وہ صبر کرے گا اور ثواب کی امید رکھے گا تو اس کے سارے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔ صحابہ نے پوچھا: کریمتاہ (دو محبوب چیزوں) سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: اس کی آنکھیں اور جس کی تین بیٹیاں یا تین بہنیں ہوں گی وہ ان پر خرچ کرے گا اور ان سے حسن سلوک کرے گا حتیٰ کہ ان کی شادی ہو جائے یا وہ فوت ہو جائیں تو یقیناً اس کے تمام گناہ معاف کر دیئے جائیں گے مگر یہ کہ وہ کوئی ایسا عمل کرے جو بخشا نہ جاتا ہو۔ ایک بدو جس نے ہجرت کی تھی اس نے کہا: یا رسول اللہ! جس کی دو بیٹیاں ہوں اس کا کیا حکم ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: خواہ دو بیٹیاں ہوں اس کے لئے بھی یہی حکم ہے۔ حضرت ابن عباس جب یہ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　　2۔ ایضاً

حدیث بیان کرتے تھے تو فرماتے تھے: اللہ کی قسم! یہ حدیث کے غرائب اور غرر سے ہے۔(1)

مسئلہ نمبر 6: سبابہ وہ انگلی ہوتی ہے جو انگوٹھے سے ملی ہوئی ہوتی ہے۔ زمانہ جاہلیت میں اسے سبابہ کہا جاتا تھا کیونکہ وہ اس کے ذریعے گالی دیتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کی نعمت دی تو انہوں نے اس نام کو ناپسند کیا اور انہوں نے اس کا نام المشیرہ رکھا کیونکہ وہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی توحید کا اشارہ کرتے تھے، اس کو سباحہ بھی کہا جاتا ہے اس کا یہ نام حضرت وائل بن حجر وغیرہ کی حدیث میں آیا ہے لیکن لغت زمانہ جاہلیت میں جو معروف تھا اس کے مطابق چلتی رہی اور وہ غالب رہی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں کے مطابق مروی ہے کہ ان میں سے المشیرہ، درمیانی انگلی سے بڑی تھی، اور درمیانی انگلی، امشیرہ سے چھوٹی تھی پھر بنصر درمیانی سے چھوٹی تھی۔ یزید بن ہارون نے روایت کیا ہے، فرمایا: ہمیں عبداللہ بن مقسم الطائفی نے بیان کیا۔ انہوں نے فرمایا: مجھے میری پھوپھی سارہ بنت مقسم نے بتایا کہ انہوں نے حضرت میمونہ بنت کردم کو سنا، انہوں نے فرمایا: میں اس حج کے موقع پر نکلی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی سواری پر دیکھا، میرے باپ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ چیزوں کے متعلق پوچھا۔ میں نے دیکھا میں تعجب کرتی تھی ... جب کہ میں بچی تھی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس انگلی کی لمبائی پر جو انگوٹھے کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہے وہ تمام انگلیوں سے بڑی تھی۔

پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد انا و ھو کھاتین فی الجنۃ اور دوسری حدیث میں ہے اُحْشَرُ انا و ابوبکر و عمر یوم القیامۃ ھکذا (میں، ابوبکر اور عمر قیامت کے روز اس طرح اٹھائے جائیں گے) اپنی تین انگلیوں سے اشارہ فرمایا۔ آپ نے مخلوق کی منازل اور مخلوق پر جھانکنے کا ارادہ فرمایا اور فرمایا: ہم اس طرح اٹھیں گے اور ہم اوپر سے جھانک رہے ہوں گی۔ اسی طرح یتیم کی کفالت کرنے والے کا مرتبہ بلند ہوگا۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں کی شان کو نہیں جانتا اس نے حدیث کی تاویل انضمام واقتراب سے کی ہے یعنی درجے ملے ہوئے ہوں گے اور یہ معنی بعید ہے کیونکہ رسل، انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی منازل متفرق اور مختلف ہوں گی۔

مسئلہ نمبر 7: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الْمَسٰكِيْنِ یہ بھی معطوف ہے یعنی ہم نے انہیں مساکین کے ساتھ احسان کرنے کا حکم دیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں حاجت نے ساکن کر دیا ہو اور انہیں ذلیل کر دیا ہو۔ یہ صدقہ، مواسات، مساکین کے احوال جاننے اور ضعیفوں کی خبر گیری کرنے کو متضمن ہے(2)۔ مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: بیوہ اور مسکین (کی کفالت کے لئے) کوشش کرنے والا اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے۔ میرا خیال ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اور اس قیام کرنے والے کی طرح ہے جو کمزور نہیں پڑتا اور اس روزے دار کی طرح جو افطار نہیں کرتا(3)۔ ابن منذر نے کہا: بہنوں کے لئے محنت مزدوری کرنا اللہ کے راستہ میں جہاد سے افضل ہے۔

مسئلہ نمبر 8: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا، حُسْنًا کو معنی کے اعتبار سے نصب مصدر کی بنا پر ہے

1۔ سنن ابن ماجہ، باب بر الوالد والاحسان الی البنات، حدیث نمبر 3658، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذا

3۔ صحیح بخاری، باب الساعی علی المسکین، حدیث نمبر 5548، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کیونکہ اس کا معنی ہے تمہارا قولِ اچھا ہو۔ بعض نے فرمایا: تقدیر عبارت اس طرح ہے: وقولوللناس قولاً ذاحسن، یہ مصدر ہے معنی کے اعتبار سے نہیں۔ حمزہ اور کسائی نے حَسَنًا، حاء اور سین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اخفش نے کہا: دونوں کا معنی ایک ہے، جیسے بخل اور مَخَل۔ الرشد اور الرَّشَد کا معنی ایک ہے۔ اخفش نے حکایت کیا ہے: حسنیٰ یعنی بغیر تنوین کے فعلیٰ کے وزن پر۔ نحاس نے کہا اور یہ عربی زبان میں جائز نہیں، ایسے صیغہ کو الف، لام کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے جیسے افضل، الکبریٰ، الحسنیٰ۔ یہ سیبویہ کا قول ہے۔ عیسیٰ بن عمر نے حُسُنًا حاء اور سین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

جیسے الحُلُم۔ حضرت ابن عباس نے کہا تم انہیں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہو اور انہیں اس کا حکم دو۔ ابن جریج نے کہا: یعنی تم حضرت محمد ﷺ کے معاملہ میں لوگوں سے سچی بات کہو اور آپ ﷺ کی صفات میں تبدیلی نہ کرو۔ سفیان ثوری نے کہا: لوگوں کو نیکی کا حکم دو اور انہیں برائی سے روکو۔ ابو العالیہ نے کہا: انہیں اچھی بات کہو اور اچھا بدلہ دو اس سے جو تم چاہتے ہو کہ تمہیں بدلہ دیا جائے۔ یہ تمام مکارم اخلاق پر ابھارنا ہے (1)۔ پس انسان کو چاہیے کہ لوگوں کے ساتھ اس کا کلام نرم ہو اس کا چہرہ ہر فاسق و فاجر کے لئے، سنی اور بدعتی کے لئے مسکراتا اور کھلا ہوا ہو لیکن دین میں مداہنت نہ کرے اور ایسی کلام نہ کرے کہ وہ یہ سمجھے کہ اس کے مذہب سے راضی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرمایا: فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا (طٰہٰ:44) (اس سے نرم لہجہ میں بات کرو) کوئی قائل، حضرت موسیٰ علیہ اسلام اور حضرت ہارون علیہ السلام سے افضل نہیں ہے اور کوئی فاجر فرعون سے زیادہ خبیث نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو اس کے ساتھ نرم کلام کرنے کا حکم دیا۔

طلحہ بن عمر نے کہا: میں نے عطا سے کہا تیرے پاس مختلف خواہشات کے لوگ جمع ہوتے ہیں اور میرے اندر تیزی اور سختی ہے میں ان کو سخت کلام کہتا ہوں۔ حضرت عطا نے کہا: تم ایسا مت کیا کرو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا اس آیت میں یہود و نصاریٰ بھی داخل ہیں تو پھر حنیفی (مسلمان) کا کیسا حکم ہوگا۔ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: تو فحش کلام کرنے والی نہ ہو جا، کیونکہ بے شک فحش اگر مرد ہوتا تو برا مرد ہوتا۔

بعض علماء نے فرمایا: الناس سے مراد حضرت محمد ﷺ ہیں جیسے اس ارشاد میں ہے: اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (النساء:54) گویا یوں ارشاد فرمایا: قولوا للنبی ﷺ حسنا نبی کریم ﷺ سے اچھی بات کہو۔ مہدوی نے قتادہ سے حکایت کیا ہے کہ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا کا ارشاد، آیت السیف (قتال والی آیت) سے منسوخ ہے (2)۔ ابونصر عبدالرحیم بن عباس سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ آیت ابتدا میں نازل ہوئی پھر اسے آیۃ السیف نے منسوخ کر دیا۔ ابن عطیہ نے کہا: (3) یہ آیت دلیل ہے کہ ابتداء اسلام میں اس امت کو اس جیسے الفاظ سے خطاب کیا گیا۔ بنی اسرائیل کے متعلق خبر اور جو انہیں حکم دیا گیا وہ اس میں منسوخ نہیں ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 9: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ اس کے بارے میں قول گزر چکا ہے اس میں خطاب بنی اسرائیل کے لئے ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: (4) وہ لوگ اپنی زکوٰۃ کو ایک جگہ رکھتے تھے جو قبول ہوتی اس پر آگ

1۔ المحرر الوجیز، تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

نازل ہوتی اور جو قبول نہ ہوتی اس پر آگ نازل نہ ہوتی۔ ان کی زکوٰۃ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی زکوٰۃ جیسی نہ تھی۔

میں کہتا ہوں: یہ بات نقل کی محتاج ہے جیسا کہ یہ بات ان کے مال غنیمت میں ثابت ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: زکوٰۃ جس کا انہیں حکم دیا گیا تھا وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اخلاص تھا۔ (1)

مسئلہ نمبر 10: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یہود کو خطاب ہے، ان کی طرف نسبت کی گئی ہے حالانکہ ان کے اسلاف نے پیٹھ پھیری تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سب حق سے اعراض میں ان کے راستہ پر تھے اور ان کی مثل تھے جیسا کہ کہا جاتا ہے شِنْشِنَةٌ عرفها من اخزم۔ یہ وہ خصلت ہے جو مجھے اخزم سے معلوم ہوئی۔ (یہ ابو اخزم الطائی کا قول ہے اس نے اپنے بیٹے اخزم کو عاق کر دیا تھا تو اخزم کے بیٹوں نے اپنے دادا کو مارا تو اس نے کہا: یہ خصلت میں اخزم سے ہی جانتا ہوں)

اِلَّا قَلِيْلًا جیسے عبداللہ بن سلام اور اس کے ساتھی۔ قَلِيْلًا استثناء کی بنا پر منصوب ہے اور المستثنیٰ سیبویہ کے نزدیک منصوب ہوتا ہے کیونکہ وہ مفعول کے مشابہ ہوتا ہے۔ محمد بن یزید نے کہا: یہ حقیقت میں مفعول ہے معنی یہ ہے استثنیت قلیلا میں نے چند آدمیوں کی استثنا کی۔ وَ اَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ یہ مبتدا خبر ہیں۔ الاعراض اور تولی کا ایک معنی ہے لفظ میں دونوں کے درمیان مخالفت ہے۔ بعض نے فرمایا: تولی جسم کے ساتھ ہوتا ہے اور اعراض دل کے ساتھ ہوتا ہے۔ مہدوی نے کہا: وَ اَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ حال ہے کیونکہ اس میں تولی، اعراض پر دلالت کر رہا ہے۔

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَ لَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۝

"اور یاد کرو جب لیا ہم نے تم سے پختہ وعدہ کہ تم اپنوں کا خون نہیں بہاؤ گے اور نہیں نکالو گے اپنوں کو اپنے وطن سے پھر تم نے (اس وعدہ پر ثابت رہنے کا) اقرار بھی کیا اور تم خود اس کے گواہ ہو"۔

اس میں دو مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ اس پر کلام گزر چکی ہے۔ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ اس سے مراد بنی اسرائیل ہیں اور معنی کے اعتبار سے بعد والے بھی داخل ہیں۔ لَا تَسْفِكُوْنَ، اعراف میں لا تعبدون کی طرح ہے، طلحہ بن مصرف اور شعیب بن حمزہ نے فا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ بھی ایک لغت ہے۔ ابونہیک نے تاء کے ضمہ، فاء کی تشدید اور سین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے (2)۔ السفک کا معنی انڈیلنا، بہانا ہے پہلے گزر چکا ہے۔ وَ لَا تُخْرِجُوْنَ یہ معطوف ہے اَنْفُسَكُمْ، النفس ماخوذ ہے النفاسة سے۔ انسان کا نفس انسان کی چیز سے افضل ہے۔ الدار اس منزل کو کہتے ہیں جس میں ٹھہرنے کے لئے مکان بنے ہوئے ہوں بخلاف وقتی ٹھہرنے کی منزل کے۔ خلیل نے کہا: ہر وہ جگہ جہاں کوئی قوم اترے وہ ان کے لئے دار ہے اگرچہ وہ مکانات نہ بھی ہوں۔ بعض علماء نے فرمایا: دار کو دار اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اپنے رہنے والوں پر چکر لگاتا ہے۔ اسی طرح الحائط کو حائط کہتے

1۔ [illegible]

2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

ہیں کہ وہ اسے گھیرے ہوئے ہوتی ہے جو اس کے اندر ہوتا ہے۔ اَقْرَرْتُمْ یہ اقرار سے ہے۔ یعنی تم نے اس میثاق کا اقرار کیا جو تم سے اور تمہارے پہلوں سے لیا گیا تھا۔ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ یہ الشہادت سے ہے یعنی اس پر تم اپنے دلوں سے گواہ ہو۔ بعض نے فرمایا: شہادت بھی حضور ہے یعنی تم خون ریزی کے وقت اور گھروں سے نکالنے کے وقت موجود تھے۔

مسئلہ نمبر 2: اگر کہا جائے کہ کیا کوئی اپنا خون بہاتا ہے اور اپنے آپ کو گھر سے نکالتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب ان کی ملت ایک تھی اور ان کا معاملہ ایک تھا اور وہ امم میں ایک شخص کی مانند تھے تو بعض کا بعض کو قتل کرنا اور بعض کا بعض کو نکالنا، اپنے آپ کو قتل کرنے اور اپنے آپ کو نکالنے سے بنایا۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد قصاص ہے یعنی کوئی کسی کو قتل کرتا تو اس سے قصاص لیا جاتا یا اس نے اپنا ہی خون بہایا۔ اسی طرح جو زنا کرتا اور جو مرتد ہوتا تو اس کا خون مباح ہو جاتا۔ وہ فساد برپا کرتا تو اسے جلاوطن کیا جاتا، یہ گویا اس نے اپنے آپ کو ہی اپنے گھر سے نکالا۔ یہ اسی تاویل پر ہے جس میں بہت بعد ہے اگرچہ معنی صحیح ہے۔

معاملہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے تورات میں عہد لیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو قتل نہیں کریں گے نہ ایک دوسرے کو جلاوطن کریں گے اور نہ غلام بنائیں گے۔ اسی طرح دوسری طاعات کا ان سے عہد لیا تھا۔(1)

میں کہتا ہوں: یہ سب کام ہم پر بھی حرام ہیں، یہ تمام فتنے ہم میں بھی واقع ہوئے ہیں۔ فانا للہ و انا الیہ راجعون۔

قرآن حکیم میں ہے: اَوْ یَلْبِسَكُمْ شِیَعًا وَّ یُذِیْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ (انعام:65) (خلط ملط کرے تمہیں مختلف گروہوں میں اور چکھائے تم میں سے بعض کو شدت دوسروں کی) اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ ابن خویز منداد نے کہا: جائز ہے کہ اس سے مراد ظاہر ہو، کوئی انسان خودکشی نہ کرے، اور بیوقوفی کی وجہ سے اپنے گھر سے نہ نکلے جس طرح کہ ہندو اپنے آپ کو قتل کرتے ہیں یا انسان انتہائی پریشانی اور مصیبت کے وقت خودکشی کر لیتا ہے یا صحراء میں گھومتا رہتا ہے، دین سے ناواقفی اور عقل میں کمی کی وجہ سے گھروں میں نہیں آتا۔ یہ تمام صورتوں کو حکم شامل ہے۔

روایت ہے کہ حضرت عثمان بن مظعون نے دس صحابہ کی موجودگی میں بیعت کی اور سب نے یہ عزم کیا کہ وہ بوریا کا لباس پہنیں گے، صحرا میں گھومیں گے اور گھروں میں نہیں آئیں گے، گوشت نہیں کھائیں گے اور اپنی عورتوں کے پاس نہیں جائیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عثمان بن مظعون کے گھر آئے، اسے گھر پر نہ پایا، ان کی بیوی سے فرمایا: مجھے عثمان کے بارے یہ کیا بات پہنچی ہے؟ بیوی نے اپنے خاوند کا راز افشا کرنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جھوٹ بولنا ناپسند کیا۔ اس نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ کو کوئی بات پہنچی ہے تو وہ اسی طرح ہے جس طرح آپ کو پہنچی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم عثمان کو کہنا کیا میری سنت کی مخالفت کرتے ہو یا میری ملت کے علاوہ کسی ملت پر ہو۔ میں نماز بھی پڑھتا ہوں، سوتا بھی ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں، افطار بھی کرتا ہوں، عورتوں کے پاس بھی جاتا ہوں، گھروں میں بھی پناہ لیتا ہوں، گوشت بھی کھاتا ہوں جو میری سنت سے انحراف کرے گا وہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ حضرت عثمان اور آپ کے ساتھی اپنی حالت سے واپس لوٹ آئے۔(2)

1۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذا　2۔ صحیح بخاری، باب الترغیب فی النکاح، حدیث نمبر 4675، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ تُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ۫ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ؕ وَ اِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰۤى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۸۵ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۫ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝۸۶

''پھر تم وہی ہونا (جنہوں نے یہ وعدے کیے) کہ اب قتل کر رہے ہو اپنوں کو اور نکال باہر کرتے ہو اپنے گروہ کو ان کے وطن سے۔ (نیز) مدد دیتے ہو ان کے خلاف (دشمنوں کو) گناہ اور ظلم سے۔ اور اگر آئیں تمہارے پاس قیدی بن کر (تو بڑے پاکباز بن کر) ان کا فدیہ ادا کرتے ہو، حالانکہ حرام کیا گیا تھا تم پر ان کا گھروں سے نکالنا۔ تو کیا تم ایمان لاتے ہو کتاب کے کچھ حصہ پر اور انکار کرتے ہو کچھ حصہ کا۔ (تم خود ہی کہو) کیا سزا ہے ایسے نابکار کی تم میں سے سوائے اس کے کہ رسوا ہے دنیا کی زندگی میں اور قیامت کے دن تو انہیں پھینک دیا جائے گا سخت ترین عذاب میں۔ اور اللہ بے خبر نہیں ان (کرتوتوں) سے جو تم کرتے ہو۔ یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے مول لے لی ہے دنیا کی زندگی آخرت کے عوض۔ تو نہ ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب اور نہ ہی ان کی مدد کی جائے گی''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ، اَنْتُمْ مبتدا ہے اس کو اعراب نہیں دیا جاتا کیونکہ یہ ضمیر ہے۔ اَنْتُمْ میں تا کو ضمہ دیا جاتا ہے، کیونکہ واحد مذکر مخاطب کے صیغہ میں تا مفتوح ہوتی ہے واحد مونث مخاطب میں تا مکسور ہوتی ہے۔ پس جب تثنیہ یا جمع کا صیغہ بنانے کا تو صرف ضمہ باقی ہے۔ هٰۤؤُلَآءِ قتبی نے کہا: اس کی تقدیر یا ھؤلاء ہے۔ نحاس نے کہا: یہ سیبویہ کے قول کے مطابق خطا ہے، اور ھذا اقبل جائز نہیں ہے۔ زجاج نے کہا: هٰۤؤُلَآءِ بمعنی الذین ہے، تَقْتُلُوْنَ یہ صلہ میں داخل ہے یعنی ثم انتم الذین تقتلون۔ بعض نے فرمایا: هٰۤؤُلَآءِ مبتدا ہے اور اَنْتُمْ خبر مقدم ہے اور تَقْتُلُوْنَ، هٰۤؤُلَآءِ سے حال ہے۔ بعض نے فرمایا: اعنی کے اضمار کے ساتھ هٰۤؤُلَآءِ منصوب ہے (1)۔ زہری نے تقتلون پہلی تا مضموم اور دوسری کو شد کے ساتھ پڑھا ہے اسی طرح فلم یُقتلون انبیاء اللہ میں پڑھا ہے، یہ خطاب موجودہ لوگوں کو ہے۔ یہ ان کے اسلاف کی طرف لوٹانے کا احتمال نہیں رکھتا۔ یہ بنی قینقاع، قریظہ اور نضیر یہود کے بارے میں نازل ہوئی۔ بنو قینقاع، قریظہ کے دشمن تھے اور اوس، بنی قینقاع کے حلیف تھے۔ خزرج، بنی قریظہ کے حلیف تھے۔ نضیر (2)، اوس اور خزرج بھائی تھے اور قریظہ اور نضیر آپس میں بھائی بھائی تھے۔ پھر وہ جدا جدا ہو گئے وہ ایک دوسرے کو قتل کرتے تھے پھر جنگ ختم ہوتی تو وہ اپنے قیدیوں کا فدیہ دیتے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس پر شرم دلائی اور فرمایا: وَ اِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ (3) (اور اگر آئیں

1۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

تمہارے پاس قیدی بن کر (تو بڑے پاکباز بن کر) ان کا فدیہ ادا کرتے ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَظٰهَرُوْنَ اس کا معنی تتعاونون (معاونت کرنا) ہے۔ یہ الظھر سے مشتق ہے کیونکہ بعض، بعض کو تقویت دیتا ہے تو وہ اس کے لئے پیٹھ کی طرح ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا:

تظاهرتم استاه بيت تجمعت علی واحد لازلتم قرن واحد

اس شعر میں تظاهر کا معنی مدد کرنا ہے۔

الاثم اس فعل کو کہتے ہیں جس کا کرنے والا ذمت کا مستحق ہوتا ہے۔ الْعُدْوَانِ ظلم میں زیادتی کرنا اور ظلم میں تجاوز کرنا۔ اہل مدینہ اور اہل مکہ نے تظاهرون ظا کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے وہ تا کو ظا میں ادغام کرتے ہیں ان کے قرب کی وجہ سے، اصل میں تتظاهرون تھا۔ کوفیوں نے تظاهرون تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ انہوں نے پہلی تا کی دلالت کی وجہ سے دوسری تا کو حذف کر دیا اسی طرح وان تظاهرا علیہ کو پڑھا ہے۔ قتادہ نے تظهرون علیهم پڑھا ہے، یہ سب تعاون کے معنی کی طرف راجع ہیں۔ اس سے ہے وَ كَانَ الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا (الفرقان) (اور کافر اپنے رب کے مقابلہ میں (ہمیشہ شیطان کا) مددگار ہوتا ہے) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ (التحریم) (سارے فرشتے اس کے علاوہ مدد کرنے والے ہیں)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ

اس میں چھ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى یہ شرط ہے اور اس کا جواب تُفٰدُوْهُمْ ہے اور اُسٰرٰى کی نصب حال کی بنا پر ہے۔ ابو عبید نے کہا: ابو عمرو کہتے تھے جو ان کے ہاتھوں میں تھا وہ اُسٰرٰى تھا، اور جو قیدی ہو کر آئیں وہ اسریٰ ہیں۔ اہل لغت میں یہ معروف نہیں جو ابو عمرو نے کہا ہے۔ یہ اس طرح ہے جیسے تو کہتا ہے: سکاریٰ، سکریٰ۔

اکثر کی قراءت اُساریٰ ہے۔ حمزہ نے اسے اسریٰ فعلی کے وزن پر پڑھا ہے۔ یہ اسیر کی جمع ہے، اسیر بھی ماسور ہے، فعلی، فعیل کی جمع ہے۔ جیسے تو کہتا ہے قتیل سے قتلیٰ، جریح سے جرحیٰ۔ ابو حاتم نے کہا اساریٰ جائز نہیں ہے۔ زجاج نے کہا: اساریٰ جیسے کہا جاتا ہے سکاریٰ، فعلیٰ اصل ہے اور فعالی اس پر داخل ہے۔

محمد بن یزید سے حکایت ہے، فرمایا: کہا جاتا ہے: اسیرٌ، اُسَراءُ، جیسے ظریف سے ظرفاء۔ ابن فارس نے کہا: اسیر کی جمع میں اسریٰ، اُساریٰ کہا جاتا ہے دونوں طرح پڑھا گیا ہے بعض نے فرمایا: اَساریٰ (ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ)

مسئلہ نمبر 2: الاسیر، یہ الاسار سے مشتق ہے اس سے مراد وہ چمڑے کی رسی ہے جس کے ساتھ محمل کو باندھا جاتا ہے، اس کو اسیر اس لئے کہتے ہیں کیونکہ اس کو باندھا جاتا ہے۔ عرب کہتے ہیں: قد اسَرَ قتبهٗ، اس نے پالان کو باندھا پھر ہر پکڑی گئی چیز کو اسیر کہتے ہیں اگرچہ اسے باندھا نہ بھی گیا ہو۔ اعشیٰ نے کہا:

و قیدنی الشعر فی بیته کما قید الآسرات الحمارا

مجھے شعر نے اس طرح قید کر دیا ہے جس طرح عورتیں پالان کی لکڑی کو قید کئے ہوئے ہوتی ہیں

یعنی انا فی بیتہ۔ اس سے اس کی مراد انتہا کو پہنچنا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد وَ شَدَدْنَاۤ اَسْرَهُمْ (الدہر:28) میں اسر سے مراد خلق ہے۔ اسرۃ الرجل، آدمی کا خاندان، گروہ۔ کیونکہ وہ ان سے قوت حاصل کرتا ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے تُفٰدُوْهُمْ۔ نافع، حمزہ اور کسائی نے اسی طرح پڑھا ہے اور باقی قراء نے تفدوھم پڑھا ہے یہ فداء سے ہے الفداء کا معنی قیدی کا فدیہ طلب کرنا ہے۔ جوہری نے کہا: الفِداء کو جب فا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا جائے تو یہ ممدود اور مقصور ہوتا ہے اور فتحہ کے ساتھ پڑھا جائے تو صرف مقصور ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: قم فدًی لك ابی۔ اور عربوں میں سے جو فا کو کسرہ دیتے ہیں اسے فداءٍ تنوین کے ساتھ پڑھتے ہیں خصوصاً جب اس کے ساتھ لام جارہ ہو۔ پس وہ کہتے ہیں: فداءٍ لك۔ کیونکہ یہ نکرہ ہے اس سے وہ دعا کا معنی مراد لیتے ہیں۔ اصمعی نے نابغہ کا یہ شعر پڑھا ہے:

مھلاً فداءٍ لك الاقوام کلھم وما اثمر من مال ومن ولدِ

کہا جاتا ہے: فداہ وفاداہ تو کوئی عطیہ دے پھر اسے ختم کر دے۔ فداہ بنفسہ و فداہ یفدیہ جب کہا میں نے تیرا فدیہ دیا۔ تفادوا، یعنی بعض نے بعض کو فدیہ دیا۔ الفدیۃ، الفَدَی، الفِداء تمام کا معنی ایک ہے۔ وفادیت نفسی یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب تو کوئی چیز دینے کے بعد اسے چھوڑ دے۔ یہ بمعنی فدیت ہے، اسی سے حضرت عباس کا نبی کریم ﷺ سے عرض کرنا ہے: فادیت نفسی و فادیت عقیلاً میں نے اپنا فدیہ دیا ہے اور عقیل کا فدیہ دیا ہے۔ یہ دونوں فعل دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتے ہیں، ان میں سے دوسرا حرف جر کے ساتھ ہے۔ تو کہتا ہے: فدیت نفسی بمالی و فادیتہ بمالی (1)۔ شاعر نے کہا:

قفی فادی اسیرك ان قومی و قومَكَ ما اریٰ لھم اجتماعا

تو ٹھہر جا اور اپنے قیدی کا فدیہ دے دے میری اور تیری قوم میں ان کا اجتماع میں نہیں دیکھتا۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ۔ هُوَ مبتدا ہے یہ اخراج سے کنایہ ہے، مُحَرَّمٌ خبر ہے اور اِخْرَاجُهُمْ، هُوَ سے بدل ہے، اگر تو چاہے تو هُوَ ضمیر کو الحدیث اور القصہ سے کنایہ بنا دے اور اس کا مابعد جملہ خبر ہو، یعنی والامر محرم علیکم اخراجھم، پس فاخراجھم دوسرا مبتدا ہوگا اور محرم اس کی خبر ہوگی اور پھر جملہ هُوَ کی خبر ہوگا۔ اور محرم میں جو ضمیر نائب فاعل ہے وہ الاخراج کی طرف لوٹ رہی ہے یہ بھی جائز ہے کہ محرم مبتدا ہو اور اخراجھم اس کا نائب فاعل، محرم کی خبر کے قائم مقام ہے پھر جملہ ھو کی خبر ہو۔ فراء نے کہا: هُوَ عماد ہے یہ بصریوں کے نزدیک خطا ہے اس کا کوئی معنی نہیں کیونکہ عماد اول کلام میں نہیں ہوتا اور ضمہ کے ثقل کی وجہ سے ھاء کے سکون کے ساتھ وَھْوَ بھی پڑھا جاتا ہے۔ جس طرح شاعر نے کہا:

فَھْوَ لا تنمی رمیتہ ما لہ لا عُدّ من نفرہ

اس میں فھو کو ھا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسی طرح اس سے پہلے لام اور ثم لائے تو بھی ھا ساکن کر دے۔

1۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذا

ہمارے علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان سے چار عہد لئے تھے: قتل نہ کرنا، جلاوطن نہ کرنا، مدد نہ کرنا اور قیدیوں کا فدیہ دینا۔ انہوں نے سوائے فدیہ کے حکم کے سب سے اعراض کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں توبیخ فرمائی جو پڑھی جاتی ہے۔ فرمایا: أفتؤمنون ببعض الکتاب (تورات) وتکفرون ببعض۔

میں کہتا ہوں: اللہ کی قسم! ہم نے فتنوں کی وجہ سے تمام احکام کو ترک کر دیا۔ اور ہم نے ایک دوسرے کی مدد کی مسلمانوں پر افسوس بلکہ کافروں پر افسوس۔ ہم نے اپنے بھائیوں کو ذلیل و رسوا چھوڑ دیا ان پر مشرکین کے احکام جاری ہیں۔ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

ہمارے علماء نے فرمایا: قیدیوں کا فدیہ دینا واجب ہے اگرچہ ایک درہم بھی باقی نہ ہو۔ ابن خویز منداد نے کہا: یہ آیت قیدیوں کے چھڑانے کے وجوب کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بھی اس سے متعلق وارد ہیں، آپ نے قیدیوں کو چھڑایا اور ان کو چھڑانے کا حکم دیا(1)، اسی پر مسلمان کا عمل جاری ہے اور اس پر اجماع منعقد ہے۔ بیت المال سے قیدیوں کو چھڑانا واجب ہے اگر بیت المال نہ ہو تو تمام مسلمانوں پر یہ فرض ہے۔ جس نے بھی یہ فریضہ ادا کر دیا باقی لوگوں سے ساقط ہو جائے گا۔

مسئلہ نمبر 5: فَمَا جَزَآءُ مَنۡ یَّفۡعَلُ ذٰلِکَ مِنۡکُمۡ اِلَّا خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا یہ مبتدا اور خبر ہیں۔ خزی کا معنی رسوائی ہے۔ جوہری نے کہا: خَزِیَ یخزیٰ خزیاً جب کوئی ذلیل و رسوا ہو جائے۔ ابن سکیت نے کہا: وہ مصیبت میں واقع ہوا۔ اخزاہ اللہ اللہ تعالیٰ نے اسے رسوا کیا۔ خزِیَ، یخزیٰ خزایۃ جب کوئی حیا کرے۔ فھو خزیان۔ قوم خزایا و امرأۃ خزیا۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ یُرَدُّوۡنَ عام قراء کی قراءت یردون یا کے ساتھ ہے۔ حسن نے تردون تا خطاب کے ساتھ پڑھا ہے۔

اِلٰۤی اَشَدِّ الۡعَذَابِ ؕ وَ مَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ اس سے پہلے کلام گزر چکی ہے۔ اسی طرح اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ اشۡتَرَوُا اس پر بھی کلام ہو چکی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں یوم کو نصب یردون کی وجہ سے ہے۔

وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ وَ قَفَّیۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِہٖ بِالرُّسُلِ ۫ وَ اٰتَیۡنَا عِیۡسَی ابۡنَ مَرۡیَمَ الۡبَیِّنٰتِ وَ اَیَّدۡنٰہُ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ ؕ اَفَکُلَّمَا جَآءَکُمۡ رَسُوۡلٌۢ بِمَا لَا تَہۡوٰۤی اَنۡفُسُکُمُ اسۡتَکۡبَرۡتُمۡ ۚ فَفَرِیۡقًا کَذَّبۡتُمۡ ۫ وَ فَرِیۡقًا تَقۡتُلُوۡنَ ﴿۸۷﴾

''اور بے شک ہم نے عطا فرمائی موسیٰ علیہ السلام کو کتاب اور ہم نے پے در پے ان کے پیچھے پیغمبر بھیجے۔ اور دیں ہم نے عیسیٰ بن مریم کو روشن نشانیاں اور ہم نے تقویت دی انہیں جبرئیل علیہ السلام سے تو کیا جب بھی آیا تمہارے پاس کوئی پیغمبر ایسا حکم جسے تمہارے نفس پسند نہ کرتے تو تم اکڑنے لگے بعض کو تم نے جھٹلایا اور بعض کو قتل

1۔ صحیح بخاری، باب فکاک الاسیر، حدیث نمبر 2819، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کرنے لگے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ، کتاب سے مراد تورات ہے تقفینا ہم نے پیچھے بھیجا۔ التقفیۃ پیچھا کرنا، پیچھے بٹھانا۔ یہ اتباع القفا سے ماخوذ ہے، القفا گردن کے پیچھے حصہ کو کہتے ہیں۔ تو کہتا ہے: استقفیتہ، جب تو کسی کے پیچھے آئے۔ اسی سے قافیۃ الشعر ہے کیونکہ وہ سارے کلام میں پڑھا جاتا ہے، القافیۃ کا معنی گدی ہے۔ اسی سے حدیث پاک ہے: یعقد الشیطان علی قافیۃ رأس احدکم (1)۔ شیطان تم میں سے کسی کے سر کی گدی پر گرہ لگاتا ہے۔ القفی، القفارۃ دودھ وغیرہ جو اس شخص کے لئے ذخیرہ کیا جاتا ہے جس کا تو اکرام چاہتا ہے۔ قفوت الرجل یعنی میں نے فجور کے ساتھ اسے تہمت لگائی۔ فلان قِفْوَتِی۔ فلاں میری تہمت ہے۔ وقفوتی یعنی میری خیر ہے۔ ابن درید نے کہا: گویا یہ اضداد میں سے ہے۔ علماء نے فرمایا: یہ آیت اس آیت کی مثل ہے ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا (المومنون: 44) ہر رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جو بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد آیا وہ تورات کے اثبات اور اس کے لزوم کے امر کے ساتھ آیا (2)۔ کہا جاتا ہے: رُسُلٌ وَ رُسْلٌ یہ دونوں لغتیں ہیں، پہلی لغت حجاز ہے اور دوسری لغت تمیم ہے خواہ مضاف ہو یا مضاف نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اٰتَیْنَا عِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ، بینات سے مراد دلائل و براہین ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران اور سورۂ مائدہ میں ذکر کیا ہے۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے (3)۔ وَ اَیَّدْنٰهُ یعنی ہم نے قوت دی۔ مجاہد اور ابن محیصن نے اسے آیدناہ مد کے ساتھ پڑھا ہے یہ دونوں لغتیں ہیں۔ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ابو مالک اور ابو صالح نے ابن عباس اور معمر نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ اس سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔ حضرت حسان نے کہا:

و جبریل رسول اللہ فینا و روح القدس لیس بہ خفاءُ

جبریل ہم میں اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے والے ہیں اور وہ روح القدس ہیں اس میں کوئی خفا نہیں ہے۔

نحاس نے کہا: جبریل کو روح کہا گیا اور پھر القدس کی طرف مضاف کیا گیا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی تکوین کے ساتھ روح تھا نہ اس طرح اس کی تکوین تھی جس طرح والد، اولاد کی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو روح کہا جاتا ہے۔ غالب بن عبداللہ نے مجاہد سے روایت کیا ہے، فرمایا: القدس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اسی طرح حسن نے فرمایا: القدس اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور اس کی روح جبریل ہے۔ ابو روق نے ضحاک سے روایت کیا ہے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ روح القدس سے مراد وہ اسم ہے جس کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کرتے تھے (4)۔ حضرت سعید بن جبیر اور عبید نے بھی یہی کہا یہ اسم اعظم ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد انجیل ہے اس کو روح کہا ہے جس طرح قرآن کو روح کہا ہے وَ كَذٰلِكَ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (الشوریٰ: 52) پہلا قول اظہر ہے۔ واللہ اعلم۔ القدس کا معنی طہارت بھی ہے، یہ پہلے گزر چکا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، باب عقد الشیطان علی قافیۃ الرأس اذا لم یصل باللیل، حدیث نمبر 1074، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا	3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا	4۔ ایضاً

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُكُمُ یعنی جو تمہاری خواہشات کے موافق نہیں ہوتا۔ ضمیر عائد کو اسم کے طول کی وجہ سے حذف کیا گیا ہے۔ اصل اس طرح ہے: بما لا تهواه (استکبرتم) اس کی بات قبول کرنے سے تکبر کیا رسولوں کو حقیر سمجھتے ہوئے اور رسالت کو مستبعد سمجھتے ہوئے۔ الھوی کا اصل معنی کسی چیز کی طرف مائل ہونا ہے اس کی جمع اھواء ہے جیسا کہ قرآن میں آیا ہے اس کی جمع اھویة نہیں آئی باوجود اس کے کہ عرب کہتے ہیں ندی اندِیَةُ۔

فی لیلة من جمادیٰ ذاتِ اندیة لا یبصر الکلب فی ظلمائها الطنبا

جوہری نے کہا: یہ شاذ ہے۔ اور الھوی کو ھویٰ اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے ساتھی کو آگ میں گراتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ عام طور پر ایسی بات کے لئے استعمال ہوتا ہے جو حق نہ ہو اور جس میں خیر نہ ہو۔ یہ آیت اسی سے ہے۔ کبھی یہ حق میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ حضرت عمر نے بدر کے قیدیوں کے بارے میں کہا: هوی رسول الله ﷺ ما قال ابوبکر ولم یهو ما قلت۔ رسول اللہ ﷺ کا میلان اس طرف ہوا جو ابوبکر نے کہا تھا اس طرف نہ ہوا جو میں نے کہا تھا (1)۔ حضرت عائشہ نے نبی کریم ﷺ سے کہا تھا: واللہ ما اری ربك الا یسارع فی هواك (☆)۔ اللہ تعالیٰ کی قسم! میں تیرے پروردگار کو دیکھتی ہوں کہ وہ تیری خواہش کو جلدی پورا فرما دیتا ہے۔ ان دونوں احادیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ، كَذَّبْتُمْ کی وجہ سے فریقاً منصوب ہے اور اسی طرح وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ہے۔ پس کچھ ان میں سے جنہوں نے حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد علیہما السلام کو جھٹلایا اور کچھ ان میں سے تھے جنہوں نے حضرت یحییٰ اور حضرت زکریا علیہما السلام کو قتل کیا۔ اس کا بیان سورۂ سبحان میں آگے آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾

''اور یہودی بولے ہمارے دلوں پر تو غلاف چڑھے ہیں نہیں بلکہ پھٹکار دیا ہے انہیں اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے وہ بہت ہی کم ایمان رکھتے ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقَالُوْا یعنی یہود قُلُوْبُنَا غُلْفٌ، غُلْفٌ لام کے سکون کے ساتھ ہے اس کی جمع اغلف ہے یعنی ہمارے دلوں پر پردے ہیں۔ یہ اس قول کی مثل ہے: قلوبنا فی اکنة مما تدعونا الیه۔ (ہمارے دل غلافوں میں (چھپے ہوئے) ہیں اس بات سے جس کی طرف آپ ہمیں بلاتے ہیں)۔ مجاہد نے کہا غلفٌ یعنی ان پر پردہ ہے (2)۔ عکرمہ نے کہا: یعنی ان پر مہر لگی ہوئی ہے۔ اہل لغت نے حکایت کیا ہے: غلفت السیف، میں نے تلوار کے لئے غلاف بنایا۔ فقلبٌ اغلف یعنی ایسا دل جو فہم و تمیز سے پوشیدہ ہے۔ حضرت ابن عباس، اعرج اور ابن محیصن نے غُلُف لام کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: اس کا معنی ہے ہمارے دل علم سے بھرے ہوئے ہیں انہیں حضرت محمد ﷺ اور کسی دوسرے کے علم کی ضرورت نہیں (3)۔ بعض نے فرمایا: یہ غلاف کی جمع ہے جیسے خمار، خمر۔ یعنی ہمارے دل علم کے برتن ہیں کیا وجہ ہے کہ تمہاری بات کو نہیں سمجھتے حالانکہ ہم نے بہت سا علم محفوظ کر رکھا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے: حضرت محمد ﷺ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً

کا علم ان سے کیسے پوشیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کرتے ہوئے فرمایا: بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾ (لیکن (اپنی رحمت سے) دور کر دیا انہیں اللہ نے بوجہ ان کے کفر کے پس نہیں ایمان لائیں گے مگر تھوڑے سے) پھر اس کا سبب بیان فرمایا کہ وہ ایمان سے کیوں بھاگتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے جو انہوں نے کفر کیا اور جرأت کی اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کی ہے یہ گناہ پر بڑی سزا ہے۔ اللعن کی اصل دھتکارنا اور دور کرنا ہے بھیڑیے کو لعین کہا جاتا ہے دھتکارے ہوئے شخص کو لعین کہا جاتا ہے۔ الشماخ نے کہا:

ذعرتُ به القطا و نفيتُ عنهُ　　مقام الذئب كالرجل اللعين

اس شعر میں اصل کلام اس طرح تھی: مقام الذئب اللعين كالرجل۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا۔ بعض علماء نے فرمایا: اپنی توفیق اور اپنی ہدایت سے دور کر دیا۔ بعض نے فرمایا: ہر خیر سے دور کر دیا یہ عام ہے۔ فَقَلِيْلًا مصدر محذوف کی صفت ہے۔ تقدیر اس طرح ہے: فايماناً قليلاً يومنون (1)۔ معمر نے کہا: اس کا معنی ہے وہ اس میں سے تھوڑے پر ایمان لاتے ہیں جو ان کے ہاتھوں میں ہے اور اس میں سے اکثر کا انکار کرتے ہیں (2)۔ قليلاً حرف الصفة کے نزع کے ساتھ منصوب ہے، اور ما صلة ہے یعنی فقليلاً يومنون۔ واقدی نے کہا: اس کا معنی ہے نہ وہ تھوڑے پر ایمان لاتے ہیں نہ زیادہ پر جیسے تو کہتا ہے: ما اقل ما يفعل كذا یعنی اس نے کچھ بھی نہیں کیا۔ کسائی نے کہا: عرب کہتے ہیں: مررنا بارضٍ قلَّ ما تنبت الكراث والبصل یعنی ہم ایسی زمین سے گزرے جو کچھ نہیں اگاتی تھی۔

وَ لَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚۖ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۫ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾

''اور جب آئی ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ کتاب (قرآن) جو تصدیق کرتی تھی اس (کتاب) کی جو ان کے پاس تھی اور وہ اس سے پہلے فتح مانگتے تھے کافروں پر (اس نبی کے وسیلے سے۔) تو جب تشریف فرما ہوا ان کے پاس وہ نبی جسے وہ جانتے تھے تو انکار کر دیا اس کے ماننے سے، سو پھٹکار ہو اللہ کی (دانستہ) کفر کرنے والوں پر''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَمَّا جَآءَهُمْ یعنی یہود۔ (کتاب) یعنی قرآن۔ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ یہ کتاب کی صفت ہے اور غیر قرآن میں اس کو حال کے اعتبار سے منصوب پڑھنا بھی جائز ہے جس طرح حضرت ابی کے مصحف میں نصب کے ساتھ ہے (3) لِّمَا مَعَهُمْ۔ یعنی تورات، انجیل، یعنی قرآن انہیں بتاتا ہے جو انجیل اور تورات میں ہے وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ یعنی وہ مدد طلب کرتے ہیں الاستفتاح کا معنی مدد طلب ہے۔ استفتحت، میں نے مدد طلب کی۔

حدیث پاک میں ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم محتاج، کمزور مہاجرین کے وسیلہ سے مدد طلب کرتے تھے یعنی ان کی دعاؤں اور نمازوں کے وسیلہ سے مدد طلب کرتے تھے (4)۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ (المائدہ: 52) (وہ وقت دور نہیں جب اللہ تعالیٰ (تمہیں) دے دے فتح کامل یا ظاہر کر دے کامیابی کی کوئی بات

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　4۔ الکبیر طبرانی، صفحہ 857

اپنی طرف سے) الفصر کا معنی بند چیز کو کھولنا ہے۔ یہ اس قول کی طرف لوٹتا ہے فتحت الباب میں نے دروازہ کو کھولا۔ نسائی نے حضرت ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس امت کی، ان کے ضعیف لوگوں کی دعا، نماز اور اخلاص کی وجہ سے مدد فرمائی۔ نسائی نے حضرت ابو الدرداء سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا: میرے لئے کسی ضعیف کو طلب کرو کیونکہ تمہیں تمہارے ضعیفوں کی وجہ سے رزق دیا جاتا ہے اور مدد کی جاتی ہے(1)۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: خیبر کے یہود غطفان سے جنگ کرتے تھے جب مقابلہ ہوا تو یہود کو شکست ہوئی۔ یہود پھر اس دعا کے ساتھ لوٹے۔ یا یہ معنی ہے کہ اس دعا کی انہوں نے پناہ لی۔ انا نسالك بحق النبی الامی الذی وعدتنا ان تخرجه لنا فی آخر الزمان الا تنصرنا علیهم۔ ہم تجھ سے اس امی نبی کے واسطہ سے سوال کرتے ہیں جس کا تو نے ہم سے وعدہ فرمایا ہے کہ تو ہمارے لئے اسے آخر زمانہ میں نکالے گا ان کے خلاف ہماری مدد فرما۔ حضرت ابن عباس نے کہا: جب مقابلہ ہوا تو انہوں نے یہ دعا مانگی تو انہوں نے غطفان کو شکست دے دی۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو انہوں نے انکار کیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم تیرے وسیلہ سے فتح طلب کرتے تھے۔ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلَمَّا جَآءَهُمْ، لَمَّا کا جواب فاء اور اس کا مابعد ہے جو اس قول میں ہے فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا فراء کے قول کے مطابق(2) دوسرے لَمَّا کا جواب کفروا ہے۔ اخفش سعید نے کہا: لَمَّا کا جواب محذوف ہے کیونکہ سامع کو معلوم ہے۔ یہ زجاج کا قول ہے(3)۔ مبرد نے کہا لَمَّا کا جواب کفروا ہے اور لَمَّا کو دوبارہ ذکر کیا گیا۔ کلام کے طول کی وجہ سے یہ ذنب (گناہ) کی تقریر اور تاکید کے لئے مفید ہے۔

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۗ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝۹۰

”بہت بری چیز ہے جس کے بدلے سودا چکایا انہوں نے اپنی جانوں کا وہ یہ کہ کفر کرتے ہیں اس (کتاب) کے ساتھ جو اللہ نے نازل کی، حسد کے مارے کہ نازل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنا فضل (وحی) جس پر چاہتا ہے اپنے بندوں سے پس وہ حقدار ہو گئے مسلسل ناراضگی کے۔ اور کافروں کے لئے ذلیل و رسوا کرنے والا عذاب ہے“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِئْسَمَا اشْتَرَوْا۔ بئس عرب کلام میں مذمت کے لئے ہے جسے نعم مدح کے لئے ہے ان میں سے ہر ایک کی چار لغات ہیں: بِئْسَ بَئْسَ بَيْسَ بِيْسَ، نَعِمَ نَعْمَ نِعِمَ نِعْمَ۔ سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ ما، بئس کا فاعل

1۔ صحیح بخاری، باب من استعان بالضعفاء والصالحین فی الحرب، حدیث نمبر 2681، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔
سنن ابوداؤد، باب الانتصار برذل الخیل والضعفة، حدیث نمبر 2227، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً

ہے اور یہ اسمائے اجناس اور نکرات پر داخل ہوتا ہے اسی طرح نعم ہے تو کہتا ہے: نعم الرجل زیدٌ، نعم رجلاً زیدٌ جب اس کے ساتھ اسم بغیر الف، لام کے ہوتو اسے ہمیشہ نصب دی جاتی ہے جب اس پر الف لام ہوتو ہمیشہ مرفوع ہوتا ہے رجلاً پر نصب تمیز کی بنا پر ہے اور نعم میں ضمیر تفسیر کی شرط پر مضمر ہے اور زید دو اعتبار سے مرفوع ہے۔ ایک مبتدا محذوف کی خبر کے اعتبار سے گویا پوچھا گیا ممدوح کون ہے تو تو نے کہا: وہ زید ہے۔ دوسری وجہ مبتدا کی حیثیت سے اور اس کا ماقبل خبر ہے۔ ابوعلی نے جائز قرار دیا ہے کہ اس کے ساتھ موصول اور غیر موصول ملا ہوا اس حیثیت سے کہ وہ مبہم ہو جو کثرت پر دلالت کرتا ہے۔ کسی ایک کو خاص نہیں کرتا۔ سیبویہ کے نزدیک تقدیر اس طرح ہے(1): بئس الشیء اشتروا بہ انفسھم ان یکفروا۔ پس ان یکفروا محل رفع میں مبتدا ہوگا اور اس کا ماقبل خبر ہوگا جیسے تیرا قول ہے بئس الرجل زیدٌ اور اس قول کے مطابق ماموصولہ ہوگا۔ اخفش نے کہا(2): ما تمیز کی بنا پر محل نصب میں ہے جیسے تیرا قول ہے: بئس رجلاً زیدٌ پس تقدیر عبارت اس طرح ہو گی: بئس شیئاً ان یکفروا۔ اشتروا بہ انفسم۔ اس قول کے مطابق ما کی صفت ہوگا۔

فراء نے کہا:(3) بئسما ایک شے ہے حبذا کی طرح مرکب کیا گیا ہے اس قول کے مطابق یہ معترضہ ہے۔ کیونکہ فعل بغیر فاعل کے رہ جائے گا۔ کسائی نے کہا: ما اور اشتروا، ایک اسم کے قائم مقام ہے اور یہ قائم بنفسہ ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: بئس اشتراؤھم ان یکفروا۔ یہ قول مردود ہے کیونکہ نعم اور بئس اسم معین معرف پر داخل نہیں ہوتے۔ شراء ضمیر کی طرف مضاف ہونے کی وجہ سے معرفہ بن گیا ہے۔ نحاس نے کہا: ان اقوال میں سے واضح قول اخفش اور سیبویہ کا قول ہے۔ فراء اور کسائی نے کہا: ان یکفروا اگر تو چاہے تو ان کو محل جر میں کردے بہ میں ھاء ضمیر کی طرف لوٹاتے ہوئے۔ فراء نے کہا: اس کا مطلب ہوگا اشتروا انفسم بان یکفروا بما انزل اللہ۔ فاشتری بمعنی باع اور بمعنی ابتاع ہے۔ مطلب یہ ہے: بئس الشئ الذی اختاروا لانفسم حیث استبدلوا الباطل بالحق والکفر بالایمان۔ (یعنی بری ہے وہ چیز جو انہوں نے اپنے نفسوں کے لئے اختیار کی اس حیثیت سے کہ انہوں نے حق کو باطل سے بدلا اور ایمان کو کفر سے بدلا)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بَغْيًا اس کا معنی حسد ا ہے یہ قتادہ اور سدی کا قول ہے(4)۔ یہ مفعول لاجلہ ہے۔ یہ حقیقت میں مصدر ہے، اصمعی نے کہا: یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے قد بغی الجرح، زخم خراب ہوگیا۔ بعض نے فرمایا: اس کا اصل معنی طلب کرنا ہے اسی وجہ سے زانیہ کو بغیا کہا جاتا ہے۔ اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ یہ محل نصب میں ہے یعنی لان ینزل۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر فضل نازل کرنے کی وجہ سے۔ ابن کثیر، ابوعمرو، یعقوب اور ابن محیصن نے ان ینزل تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اسی طرح پورے قرآن میں تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے سوائے ماننزلہ جو سورہ الحجر میں ہے اور سوائے علی ان ینزل آیۃ جو سورۃ الانعام میں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَبَآءُوْ وہ لوٹے۔ اکثر یہ شر میں بولا جاتا ہے یہ پہلے گزر چکا ہے بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ، غضب اللہ علیھم کا معنی گزر چکا ہے۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: پہلا غضب ان کے بچھڑے کی

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

عبادت کرنے کی وجہ سے ہے اور دوسرا غضب حضرت محمد ﷺ کا انکار کرنے کی وجہ سے ہے۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ حضرت عکرمہ نے کہا کیونکہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کفر کیا پھر حضرت محمد ﷺ کا انکار کیا یعنی یہود نے ایسا کیا۔ سعید نے قتادہ سے روایت کیا ہے، پہلا غضب ان کا انجیل کے انکار کی وجہ سے تھا، دوسرا قرآن کا انکار کرنے کی وجہ سے تھا۔ بعض نے فرمایا: مراد تاکید ہے (1) اور اس حال کی شدت کے لئے دو غضبوں کا ذکر فرمایا نہ کہ دو معصیتوں کی تعلیل کے لئے دو غضبوں کا ذکر فرمایا مُّهِيْنٌ یہ الھوان سے ہے، یہ ہمیشہ دوزخ میں رہنے کا مقتضی ہے۔ بخلاف مسلمان گنہگار کے خلود کے، کیونکہ مسلمانوں کا آگ میں جانا ان کی طہارت اور تمحیص کے لئے ہوگا جیسے زانی کو رجم کیا جاتا ہے، چور کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے، اس کا بیان سورۃ نساء میں حضرت ابوسعید خدری کی حدیث میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ يَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۗ وَ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۗ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۱﴾

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے ایمان لے آؤ اس پر جسے اللہ نے اتارا ہے تو کہتے ہیں: ہم تو (صرف) اس پر ایمان لائے ہیں جو نازل کی گئی ہم پر اور کفر کرتے ہیں اس کے علاوہ (دوسری کتابوں) کے ساتھ حالانکہ وہ بھی حق ہے تصدیق کرتا ہے اس کتاب کی جو ان کے پاس ہے۔ آپ فرمایئے پھر تم کیوں قتل کرتے رہے اللہ کے پیغمبروں کو اس سے پہلے اگر تم (اپنی کتاب پر ہی) ایمان رکھتے تھے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا تصدیق کرو بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ یعنی قرآن قَالُوْا نُؤْمِنُ یعنی ہم تصدیق کرتے ہیں۔ بِمَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا یعنی تورات۔ وَ يَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ یعنی جو تورات کے علاوہ ہے، یہ فراء کا قول ہے۔ قتادہ نے کہا: (2) جو تورات کے بعد ہے۔ یہی قول ابوعبیدہ کا ہے، معنی ایک ہے۔ جوہری نے کہا: وراء بمعنی خلف (پیچھے) ہے کبھی یہ بمعنی قدام (آگے) ہوتا ہے۔ یہ (وراء) اضداد میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ كَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ (الکہف: 79) (یعنی آگے بادشاہ تھا) وراء کی تصغیر وُرَیئۃ ہے یعنی ھاء کے ساتھ یہ شاذ ہے۔ وراء پر نصب ظرف کی بنا پر ہے۔ اخفش نے کہا: کہا جاتا ہے لقیتہ من وراءِ۔ غایت کی بنا پر اس کو رفع دیا جاتا ہے جب مضاف نہ ہو اسے اسم غیر متمکن بنائے گا، جیسے تیرا قول من قبلُ و من بعدُ میں ہے۔

اذا انا لم اُومَنْ علیك و لم یکن لقاءك الا مِنْ وراء وراءُ

جب مجھے تجھ پر امن نہ ہو تو تیری ملاقات پردے کے پیچھے ہوگی۔

میں کہتا ہوں: حدیث حضرت عائشہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول ہے: انما کنت خلیلاً من وراءَ وراءَ۔ میں پردے کے پیچھے خلیل تھا۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

الوداء، پوتے کو بھی کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهُوَ الْحَقُّ یہ مبتدا خبر ہیں۔ مُصَدِّقًا سیبویہ کے نزدیک حال مؤکدہ ہے لِمَا مَعَهُمْ، ما محل جر میں ہے لام کی وجہ سے اور مَعَهُمْ، ما کا صلہ ہے اور مَعَهُمْ کو نصب ظرف مستقر کی بنا پر ہے اور جنہوں نے اس کو ساکن کیا ہے انہوں نے اس کو حرف بنایا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ یہ یہود کا رد ہے کہ انہوں نے کہا تھا کہ وہ ایمان لاتے ہیں جو ان کی طرف نازل کیا گیا ہے۔ اس سے ان کی تکذیب ہے اور انہیں توبیخ ہے۔ معنی یہ ہے کہ تو نے کیسے قتل کیا حالانکہ تمہیں اس سے منع کیا گیا تھا۔ یہ خطاب ان لوگوں کو ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے۔ اور مراد ان کے اسلاف ہیں۔ خطاب ان کے بیٹوں کی طرف متوجہ ہے کیونکہ یہ ان کے پیروکار تھے جنہوں نے قتل کیا تھا جیسے ارشاد فرمایا: وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ (المائدہ: 91) (اور اگر وہ ایمان لائے ہوتے اللہ پر اور نبی پر اور جو اتارا گیا اس پر تو نہ بناتے ان کو اپنا دوست)

جب یہ بھی ان کے پیچھے چلے تو یہ ان کے قائم مقام ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: کیونکہ یہ ان کے فعل پر راضی اور خوش تھے اس لئے یہ فعل ان کی طرف منسوب کیا گیا۔ تَقْتُلُوْنَ فعل مضارع ہے لیکن مراد ماضی ہے کیونکہ مِنْ قَبْلُ کے قول سے اشکال اُٹھ گیا۔ جب کوئی اشکال نہ ہو تو ماضی کا مستقبل کے معنی اور مستقبل کا ماضی کے معنی میں لانا جائز ہے۔ الحطیئہ نے کہا:(1)

شهد الحطيئة يوم يلقى ربه　ان الوليد احق بالعذر

اس شعر میں شهد بمعنی يشهد ہے۔

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ اگر تم ایمان کا اعتقاد رکھتے ہو تو پھر انبیاء کے قتل پر کیوں راضی ہو۔ بعض علماء نے فرمایا اِنْ بمعنی ما ہے اور لم کی اصل لما ہے الف کو حذف کیا گیا استفہام اور خبر میں فرق کرنے کے لئے، اس پر وقف مناسب نہیں، کیونکہ اگر اس پر بغیر ھاء کے وقف کیا جائے گا تو غلطی ہوگی اور اگر اس پر ھاء کے ساتھ وقف کیا جائے گا تو تاریکی میں اضافہ ہوگا۔

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾

''اور بے شک آئے تمہارے پاس موسیٰ علیہ السلام روشن دلیلیں لے کر، پھر تم نے بنالیا بچھڑے کو (اپنا معبود) اس کے بعد اور تم جفا کار ہو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ اس میں لام، لام قسم ہے اور البینات سے مراد اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ (الاسراء: 101) ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو نو واضح نشانیاں عطا فرمائیں۔ وہ یہ تھیں: عصا، سخت قحط سالی، ید بیضا، خون، طوفان، ٹکڑی، جوئیں، مینڈک اور دریا کا پھٹنا۔

بعض نے فرمایا البینات سے مراد تورات اور اس میں موجود دلالات ہیں۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ اس میں توبیخ ہے، اور ثُمَّ تقریع میں واؤ سے زیادہ بلیغ ہے یعنی آیات میں غور وفکر کے بعد اور ان کے آنے کے بعد تم نے بچھڑے کو معبود بنایا۔ یہ آیت دلیل ہے کہ انہوں نے آیات میں غور وفکر کی مہلت کے بعد یہ جرم کیا اور یہ ان کا بہت بڑا جرم تھا۔(1)

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا ٭ وَ اُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۳﴾

"اور یاد کرو جب ہم نے تم سے پختہ وعدہ لیا اور بلند کیا تمہارے سروں پر کوہ طور (اور تمہیں حکم دیا) کہ پکڑ لو جو ہم نے تمہیں دیا مضبوطی سے اور (خوب غور سے) سنو۔ انہوں نے (زبان سے) کہا: ہم نے سن لیا اور (دل میں کہا) نہیں مانا۔ سیراب ہو چکے تھے ان کے دل بچھڑے (کے عشق) سے، یہ ان کے انکار کی نحوست تھی۔ فرمائیے: بہت برا ہے جس کا حکم کرتا ہے تمہیں (یہ) تمہارا (عجیب وغریب) ایمان اگر تم ایمان دار ہو"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اسْمَعُوْا اس پر کلام گزر چکی ہے۔ اسْمَعُوْا کا معنی ہے: اطاعت کرو اس سے مراد صرف قول کا ادراک نہیں ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ جو تم نے سنا اس پر عمل کرو اور اسے لازم پکڑو۔ اسی سے ہے سمع اللہ لمن حمدہ یعنی قبول فرمایا۔

شاعر نے کہا: (2)

دعوت الله حتى خفت الا يكون الله يسمع ما اقول

میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی حتیٰ کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ قبول نہ فرمادے جو میں کہتا ہوں۔

الراجز نے کہا:

والسمع والطاعة والتسليم خيرٌ و اعفى لبني تميم

قبول کرنا، اطاعت کرنا، تسلیم کرنا بنی تمیم کے لئے بہتر ومناسب ہے اور گناہوں کی معافی کا باعث ہے۔

قَالُوْا سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا اس میں اختلاف ہے کہ ان سے یہ الفاظ حقیقۃً زبان سے ادا ہوئے تھے یا انہوں نے ایسا فعل کیا تھا جو ان کو اس کے قول کے قائم مقام تھا۔ اس صورت میں یہ مجاز ہوگا۔ جیسے شاعر نے کہا:

امتلأ الحوض وقال قطني مهلاً رويدًا قد ملأت بطني (3)

حوض بھر گیا اور اس نے مجھے کہا: ٹھہر جاؤ میرا پیٹ تو نے بھر دیا ہے۔

انہوں نے جو کہا تھا نومن بما انزل علینا اس قول میں ان پر احتجاج (حجت) ہے۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ یعنی بچھڑے کی محبت ان کے دلوں میں راسخ ہوگئی۔ معنی یہ ہے کہ ان کے دلوں نے اس کی محبت کو پینا شروع کیا۔ یہ تشبیہ اور مجاز ہے مراد یہ ہے کہ ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت راسخ ہوگئی۔(1)

حدیث میں ہے تعرض الفتن علی القلوب کالحصیر عوداً عوداً فأیّ قلب اشربها نکت فیه نکتةٌ سوداء۔ (دلوں پر فتنے ڈالے جائیں گے چٹائی کی طرح بار بار، جو دل ان کو پیئے گا اس میں سیاہ نکتہ پیدا ہو جائے گا) اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا ہے، کہا جاتا ہے: أشرب قلبه حُبّ کذا۔ اس کی محبت اس کے دل میں راسخ ہوگئی۔ زہیر نے کہا:

فصحوت عنها بعد حب داخلٍ والحبّ تشربهٔ فؤادك داء (2)

میں نے اس کی محبت کے دل میں داخل ہونے کے بعد صحت پائی، محبت دل کے لئے بیماری ہے۔

بچھڑے کی محبت کو شرب سے تعبیر فرمایا کھانے سے تعبیر نہیں فرمایا کیونکہ پانی کا پینا اعضاء میں جلدی چلا جاتا ہے حتیٰ کہ پیٹ تک پہنچ جاتا ہے جبکہ کھانا اتنا جلدی اعضا میں نہیں پہنچتا۔ اس معنی پر ایک تابعی نے زیادتی کی ہے اس نے اپنی بیوی عثمہ سے کہا: وہ کسی معاملہ میں اس پر ناراض ہوا تو اسے طلاق دے دی حالانکہ وہ اس سے بہت محبت کرتا تھا۔

عثمہ کی محبت میرے دل میں اتر گئی اور جنگل میں خوف زدہ کے ساتھ چلتی ہے۔

وہ محبت وہاں تک سرایت کر گئی ہے جہاں تک نہ کوئی پینا پہنچتا ہے نہ کوئی غم اور نہ کوئی خوشی پہنچتی ہے۔ جب میں اس سے کیا ہوا عہد یاد کرتا ہوں تو میں اڑنے کے قریب پہنچ جاتا ہوں کاش! انسان اڑ سکتا ہوتا۔

سدی اور ابن جریج نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس بچھڑے کو توڑا اور اسے پانی میں بکھیر دیا۔ آپ نے بنی اسرائیل سے فرمایا: اس پانی سے پیو، وہ سب نے پیا۔ جو اس بچھڑے سے محبت کرتا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر سونے کا برادہ نکلا(3)، اور روایت ہے کہ کسی نے وہ پانی نہ پیا تھا مگر وہ مجنون ہو گیا تھا(4)۔ یہ قشیری نے حکایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: دریا میں اس کا بکھیرنا، اس پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد دلالت کرتا ہے: ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِی الْیَمِّ نَسْفًا (طٰہٰ) (پھر ہم بکھیر کر بہا دیں گے اس سمندر میں اس (کی راکھ) کو)۔ اور رہا پانی کا پینا اور ہونٹوں پر سونے کے برادہ کا ظہور، اس کو اللہ تعالیٰ کا قول رد کرتا ہے: وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ۔ سیراب ہو چکے تھے ان کے دل بچھڑے (کے عشق) سے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے قُلْ بِئْسَمَا یَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِیْمَانُكُمْ یعنی تمہارا وہ ایمان جو تم اپنے زعم سے کہتے ہو نُؤْمِنُ بِمَاۤ اُنْزِلَ بعض نے فرمایا: یہ کلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے۔ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ یہود کو توبیخ کرو یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ انہیں فرمائیں کہ بری ہیں تمہاری یہ اشیاء، جو تم نے کیں اور جن کا تمہارے ایمان نے تمہیں حکم دیا(5)۔ بِئْسَمَا پر کلام پہلے گزر چکا ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً
4۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا 5۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ وَ لَنْ یَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ۝

''آپ فرمایئے: اگر تمہارے لئے ہی دار آخرت (کی راحتیں) الله کے ہاں مخصوص ہیں تمام لوگوں کو چھوڑ کر تو بھلا آرزو تو کرو موت کی اگر تم سچ کہتے ہو اور وہ ہرگز کبھی بھی اس کی تمنا نہ کریں گے اپنی کارستانیوں کے خوف سے اور الله خوب جانتا ہے ظالموں کو''۔

جب یہود نے باطل دعوے کیے تو الله تعالیٰ نے ان دعووں کو اپنی کتاب میں ان کی طرف سے بیان فرمایا۔ جیسے الله تعالیٰ نے فرمایا: لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً (البقرہ:80) اور انہوں نے کہا: ہرگز نہ چھوئے گی ہمیں دوزخ کی آگ بجز گنتی کے چند دن۔ وَ قَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی (البقرہ:111) اور انہوں نے کہا: ہرگز داخل نہ ہوں گے جنت میں مگر جو یہودی یا نصرانی ہوں گے) اور انہوں نے کہا: نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ (المائدہ:18) (ہم الله کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں)

الله تعالیٰ نے انہیں جھوٹا ثابت کیا اور اس پر حجت لازم فرمائی۔ اور فرمایا: اے پیارے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم انہیں کہو۔ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ۔ دار آخرت سے مراد جنت ہے یعنی اگر تمہارے لئے جنت ہے فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ تو موت کی تمنا کرو اگر تم اپنے اقوال میں سچے ہو)۔ کیونکہ جس کا یہ اعتقاد ہو کہ وہ جنتی ہے تو اس کے نزدیک دنیوی زندگی سے موت محبوب ہوتی ہے کیونکہ اسے وہاں جنت کی نعمتیں ملیں گی اور اس سے دنیا کی تکالیف ختم ہو جائیں گی۔ پس وہ اپنے اعمال کی قباحت اور نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ (المائدہ:18) کے قول کی وجہ سے اپنے کفر کی معرفت کی وجہ سے اور دنیا پر حرص کی وجہ سے موت کی تمنا کرنے سے رک گئے (1)۔ اسی وجہ سے الله تعالیٰ نے ان کی طرف سے اپنے سچے قول کے ساتھ خبر دی وَ لَنْ یَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ۝ یہ ان کے جھوٹ کی تحقیق کے طور پر فرمایا اگر وہ تمنا کرتے تو مر جاتے اور اپنا ٹھکانا دوزخ میں دیکھ لیتے۔ بعض علماء نے فرمایا: الله تعالیٰ نے انہیں تمنا کے اظہار سے پھیر دیا اور اس سے روک دیا تا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے معجزہ بن جائے۔ یہ تین وجوہ تھیں ان کے تمنا کو ترک کرنے کی۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس سے فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ کے تحت روایت کیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ہم میں سے اور تم میں سے ایک فریق کے جھوٹا ہونے پر موت کی دعا تو کرو (2)۔ تو انہوں نے دعا نہ کی کیونکہ انہیں اپنے جھوٹا ہونے کا علم تھا۔

بعض علماء نے فرمایا: تمنا کبھی زبان سے ہوتی ہے اور کبھی دل سے ہوتی ہے پھر یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ انہوں نے دل سے تمنا نہیں کی تھی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے متعلق قرآن نے کہہ دیا وَ لَنْ یَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا وہ ہرگز تمنا نہیں کریں گے۔ اگر وہ دلوں کے ساتھ تمنا کرتے تو اسے اپنی زبانوں سے ظاہر کرتے تا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو رد کر دیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حجت کو باطل کر دیں۔ یہ بالکل واضح ہے۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: خَالِصَةً۔ اس کی نصب کان کی خبر کی بنا پر ہے۔ اگر تو چاہے تو اسے حال بنا دے۔ اور عِنْدَ اللّٰهِ خبر ہو۔ اَبَدًا ظرف زمان ہے قلیل اور کثیر پر واقع ہوتا ہے جیسے حین اور وقت قلیل اور کثیر کے لئے استعمال ہوتے ہیں، عمر کی ابتدا سے موت تک کی مدت یہاں مراد ہے۔ بِمَا میں ما بمعنی الذی ہے اور عائد محذوف ہے۔ تقدیر عبارت ہے: قدمتہ، اور ما مصدریہ ہو تو عائد کی ضرورت نہیں ہے اَیْدِیْهِمْ محل رفع میں ہے یا سے ضمہ حذف کیا گیا ہے کسرہ کے ساتھ اس کے ثقل کی وجہ سے۔ اگر یہ محل نصب میں ہو تو تو اسے نصب دے گا کیونکہ نصب خفیف ہے اور شعر میں ساکن کرنا بھی جائز ہے۔ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ یہ مبتدا خبر ہیں۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَیٰوةٍ ۚ وَ مِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا ۚ یَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ یُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَ مَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ یُّعَمَّرَ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

''اور آپ یقیناً پائیں گے انہیں سب لوگوں سے زیادہ ہوس رکھنے والے زندگی کی۔ حتیٰ کہ مشرکوں سے بھی (زیادہ جینے پر حریص ہیں) چاہتا ہے ہر ایک ان میں سے کہ زندہ رہنے دیا جائے ہزار سال اور نہیں بچا سکتا اس کو عذاب سے (اتنی مدت) جیتے رہنا اور اللہ ہر وقت دیکھ رہا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَیٰوةٍ یعنی یہود زندگی پر لوگوں سے زیادہ حریص ہیں۔ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا بعض علماء نے فرمایا مِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا سے پہلے احرص محذوف ہے کیونکہ انہیں اپنے کرتوتوں کی معرفت تھی۔ اور انہیں معلوم تھا کہ اللہ کی بارگاہ میں ان کے لئے کوئی خیر نہیں ہے اور مشرکین عرب صرف دنیوی زندگی کو جانتے تھے، آخرت کے متعلق انہیں کوئی علم نہ تھا۔ آپ نے ان کے شاعر کا قول ملاحظہ نہیں کیا:

تمتع من الدنیا فانک فان   من النشوات والنساء الحسان

تو نشہ اور حسین عورتوں سے لطف اندوز ہولے کیونکہ تو فنا ہونے والا ہے۔

اَحَدُهُمْ میں ضمیر اس قول کے مطابق یہود کی طرف لوٹ رہی ہے۔ بعض نے فرمایا: حَیٰوةٍ پر کلام مکمل ہے، پھر مشرکین کے گروہ کے متعلق نئے سرے سے خبر دی جا رہی ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد مجوسی ہیں (1) اور چھینک مارنے والے کو اپنی زبان میں دعا دیتے تھے جس کا معنی ہے: تو ہزار سال زندہ رہ۔ ہزار کا ذکر خصوصی طور پر فرمایا کیونکہ یہ حساب میں عقد کی انتہا ہے (2)۔ حسن کا نظریہ یہ ہے کہ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا سے مراد مشرکین عرب ہیں ان کو خصوصی طور پر ذکر کیا گیا ہے کیونکہ وہ دوبارہ اٹھنے پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ وہ عمر کے لمبا ہونے کی تمنا کرتے تھے (3)۔ سنة کی اصل سنهة ہے بعض نے فرمایا سنوة ہے۔ بعض نے فرمایا اس کلام میں تقدیم و تاخیر ہے معنی یہ ہے ولتجدنهم و طائفة من الذین اشرکوا احرص الناس علی حیاة۔ (تم انہیں اور مشرکین کے ایک طائفہ کو پاؤ گے زندگی پر سب لوگوں سے زیادہ حریص)

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا   2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا   3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ یُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ، یَوَدُّ اصل میں یودد تھا، دال کو دال میں ادغام کیا گیا تا کہ ایک جنس کے دو متحرک حرف جمع نہ ہو جائیں دال کی حرکت واو کو دی گئی تا کہ یہ دلالت کرے کہ ایسا کیا گیا ہے۔ کسائی نے حکایت کیا ہے وَدَدْتُ، اس صورت میں یودّ، واو کے کسرہ کے ساتھ بھی جائز ہے یودّ کا معنی تمنا کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَاهُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ یُّعَمَّرَ نحویوں کا هُوَ کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ احد جو پہلے گزر چکا اس کے لئے ضمیر ہے۔ تقدیر یوں ہوگی: ما احدهم بمزحزحه۔ اور مبتدا کی خبر مجرور ہے۔ اَنْ یُّعَمَّرَ، بمزحزح کا فاعل ہے۔ ایک فرقہ نے کہا: تعمیر کے لئے ضمیر ہے، تقدیر یوں ہوگی وما التعمیر بمزحزحه۔ اور خبر مجرور ہے اَنْ یُّعَمَّرَ، اس قول کے مطابق تعمیر کا بدل ہے۔ طبری نے ایک فرقہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا ھو عماد ہے (1)، (اسی کو فصل بھی کہتے ہیں)

میں کہتا ہوں: اس قول میں بُعد ہے کیونکہ عماد وہ ہوتی ہے جو دو متلازم چیزوں کے درمیان آجائے۔ مثلاً ان کان ھذا ھو الحق اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ولکن کانوا ھم الظالمین (پہلی آیت میں کان کے اسم اور خبر کے درمیان ہے اور اسی طرح دوسری مثال میں بھی ہے) بعض علماء نے فرمایا: ما عاملہ حجازیہ ہے، اور ھو اس کا اسم ہے اور خبر بمزحزحه ہے، ایک طائفہ نے کہا: ھو ضمیر شان ہے۔ ابن عطیہ نے کہا (2): اس میں بعد ہے کیونکہ نحویوں سے محفوظ قول یہ ہے کہ ضمیر شان وہ ہوتی ہے جس کی تفسیر ایسے جملہ کے ساتھ کی جاتی ہے جو حرف جر سے سلامت ہو۔ (بمزحزحه)، الزحزحة کا مطلب ہے دور کرنا۔ کہا جاتا ہے: زحزحته میں نے اسے دور کیا۔ فتزحزح، یعنی وہ دور ہوا، اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ یہ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ شاعر نے متعدی استعمال کیا ہے۔

یا قابض الروح من نفس اذا احتضرت وغافر الذنب زحزحني عن النار

اے نفس سے روح قبض کرنے والے! جب وہ قریب المرگ ہو جائے۔ اے گناہوں کو معاف کرنے والے! مجھے آگ سے بچا لے۔

ذوالرمہ نے کہا:

یا قابض الروح عن جسم عصی زمنا وغافر الذنب زحزحني عن النار

اے جسم سے روح قبض کرنے والے! جس نے ایک زمانہ نافرمانی کی۔ اے گناہوں کو بخشنے والے! مجھے آگ سے بچا۔

ایک اور شاعر نے لازم معنی میں استعمال کیا ہے:

خلیلی ما بال الدجی لا یتزحزح وما بال ضوء الصبح لا یتوضح

اے میرے دو دوستو! اس تاریکی کو کیا ہے یہ تو دور ہی نہیں ہوتی اور صبح کی روشنی کو کیا ہے واضح نہیں ہوتی۔

نسائی نے حضرت ابو ہریرہ سے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو اللہ تعالیٰ

1۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذا

کے راستہ میں ایک دن روزہ رکھے گا اللہ تعالیٰ اس کے چہرہ کو آگ سے ستر سال دور کر دے گا☆۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ یعنی یہ جو ہزار سال زندہ رہنے کی تمنا کرنے والے ہیں ان کے اعمال کو اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے۔ جن قراء نے تعلمون تا کے ساتھ پڑھا ہے(1) ان کے نزدیک تقدیر اس طرح ہے: قل لھم یا محمد اللہ بصیرٌ بما تعملون۔ اے پیارے محمد! تم انہیں فرماؤ کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے جو تم کرتے ہو۔ علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنا وصف بصیر فرمایا۔ اس کا یہ معنی ہے کہ وہ خفیہ امور کو جاننے والا ہے اور البصیر عرب کلام میں اسے کہتے ہیں جو کسی چیز کو جاننے والا ہو اس کے متعلق باخبر ہو۔ عربوں کا قول ہے: فلان بصیر بالطب و بصیر بالفقه و بصیر بملاقات الرجال، فلاں طب کو جاننے والا ہے فلاں فقہ کو جاننے والا ہے، مردوں سے ملاقات کو جاننے والا ہے۔

شاعر نے کہا:

فان تسألونی بالنساء فاننی بصیر بادواء النساء طبیب

اگر تم مجھ سے عورتوں کے متعلق پوچھو گے تو میں عورتوں کے امراض کو جاننے والا اور طبیب ہوں۔

خطابی نے کہا البصیر کا معنی عالم ہے۔ البصیر کا معنی دیکھنے والا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنا وصف بصیر ذکر فرمایا اس کا مطلب ہے: دیکھی جانے والی اشیاء بنانے والا ہے۔ یعنی ان اشیاء کا ادراک کیا جاتا ہے آنکھوں کے ساتھ، اللہ تعالیٰ نے جو ادراک کرنے والا آلہ اور قوت پیدا فرمائی ہے اس کے ساتھ ان کا ادراک کیا جاتا ہے وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝ (آل عمران) یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دیکھنے والا بنانے والا ہے۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَ هُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝

''آپ فرمائیے جو دشمن ہو جبریل علیہ السلام کا (اسے معلوم ہونا چاہئے) کہ اس نے اتارا قرآن آپ کے دل پر۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے (یہ) تصدیق کرنے والا ہے ان کتابوں کی جو اس سے پہلے اتریں اور سراپا ہدایت اور خوشخبری ہے ایمان والوں کے لئے''۔

اس آیت کے نزول کا سبب یہ کہ یہود نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: کوئی نبی نہیں آیا مگر اس کے پاس اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے ایک فرشتہ وحی اور رسالت کے ساتھ آیا، تمہارا ساتھی (فرشتہ) کون ہے تا کہ ہم آپ کی اتباع کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جبریل، انہوں نے کہا: وہ تو جنگ و جدل کو لاتا ہے۔ وہ ہمارا دشمن ہے، اگر آپ میکائیل کا نام لیتے جو بارش اور رحمت لاتا ہے تو ہم آپ کی اتباع کرتے۔ پس اللہ تعالیٰ نے لِّلْكٰفِرِيْنَ ۝ تک یہ آیت نازل فرمائی۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے(2)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ، انہ میں ضمیر دو معانی کا احتمال رکھتی ہے پہلا معنی یہ کہ فان اللہ نزل۔ یعنی اللہ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ صحیح بخاری، باب من کان عدو الجبریل، حدیث نمبر 4120، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تعالیٰ نے جبریل کو آپ کے دل پر اتارا۔ دوسرا معنی یہ کہ فان جبریل۔ یعنی جبریل نے قرآن کو آپ کے دل پر اتارا۔ قلب کو خصوصی طور پر ذکر فرمایا کیونکہ یہ عقل، علم اور معرف کے حصول کی جگہ ہے۔ یہ آیت جبریل کے شرف اور اس کے دشمنوں کی مذمت پر دلالت کرتی ہے۔(1)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِاِذْنِ اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور اس کے علم سے۔ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ اس سے مراد تورات ہے۔ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿٩٨﴾

''جو کوئی دشمن ہو اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبریل علیہ السلام و میکائیل علیہ السلام کا تو اللہ بھی دشمن ہے (ان) کافروں کا''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ یہ شرط ہے اور اس کا جواب فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ہے۔ یہ جبریل کے دشمن کے لیے وعید اور مذمت ہے اور یہ اعلان ہے کہ بعض کی عداوت اللہ تعالیٰ کی عداوت کا تقاضا کرتی ہے اور بندے کا اللہ تعالیٰ سے عداوت رکھنا معصیت ہے، اس کی اطاعت سے اجتناب ہے اور اس کے اولیاء سے دشمنی ہے اور اللہ تعالیٰ کا بندے کے لئے دشمنی رکھنا، اسے عذاب دینا، اور اس پر عداوت کے اثر کا اظہار کرنا ہے(2)۔ اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل اور حضرت میکائیل کا خصوصی ذکر کیوں فرمایا اگرچہ ملائکہ کا ذکر ان کو بھی شامل تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کے شرف کی وجہ سے خصوصی ذکر فرمایا۔ جیسا کہ فرمایا: فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ ﴿۰﴾ (الرحمن) فَاكِهَةٌ (پھل) میں نَخْلٌ (کھجور) اور رُمَّانٌ (انار) کا ذکر تھا لیکن ان کے شرف کے لئے علیحدہ ذکر فرمادیا۔ بعض علماء نے فرمایا: ان کا خصوصی ذکر کیا کیونکہ یہود نے ان کا ذکر کیا تھا، آیت کا نزول ان کے سبب سے تھا پس ان کا ذکر واجب تھا تا کہ یہود یہ نہ کہیں کہ ہم نے اللہ تعالیٰ اور تمام فرشتوں سے عداوت نہیں کی۔ پس اللہ تعالیٰ نے تخصیص کے ذریعے ان کی تاویل کو باطل کرنے کے لئے نص قائم فرمادی، علماء لغت نے جبریل اور میکائیل میں کئی لغات بیان کی ہیں۔ جبریل میں دس لغات ہیں:

۱- جبریل یہ اہل حجاز کی لغت ہے۔ حضرت حسان نے کہا: و جبريل رسول الله فينا (جبریل ہم میں اللہ کے رسول ہیں۔)

۲- جَبریل۔ (جیم کے فتحہ کے ساتھ) یہ حسن اور ابن کثیر کی قراءت ہے، ابن کثیر سے مروی ہے کہ اس نے کہا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا آپ جبریل اور میکائیل پڑھ رہے تھے میں ہمیشہ ان کو ایسا ہی پڑھوں گا۔

۳- جَبرَئیل (ہمزہ کے بعد یاء کے ساتھ جیسے جبرعیل) جیسا کہ اہل کوفہ نے پڑھا ہے(3) انہوں نے دلیل کے طور پر یہ شعر پڑھا ہے:

شهدنا فما تلقى لنا من كتيبة ... مدى الدهر الا جَبرَئيلُ امامُها

(ہم نے دیکھا پس ہمیں ایک زمانہ کوئی لشکر نہ ملا مگر جبریل اس کے آگے تھا) یہ تمیم اور قیس کی لغت ہے۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

۴- جَبرَئِل (علی وزن جبرعل) مقصور ہے یہ ابوبکر عن عاصم کی قراءت ہے۔(1)
۵- اس کی مثل ہے مگر لام پر شد ہے یہ یحییٰ بن یعمر کی قراءت ہے۔(2)
۶- جبرائل (را کے بعد الف پھر ہمزہ) اس طرح عکرمہ نے پڑھا ہے۔
۷- اس کی مثل ہے لیکن ہمزہ کے بعد یا ہے۔
۸- جبرٰئیل (ہمزہ کے بعد دو یا کے ساتھ) اس طرح اعمش اور یحییٰ بن یعمر نے پڑھا ہے۔(3)
۹- جبرئین۔ (جیم مفتوحہ، ہمزہ مکسورہ اور اس کے بعد یا اور نون کے ساتھ)
۱۰- جبرین (جیم کے کسرہ، یا کی تسکین اور بغیر ہمزہ کے نون کے ساتھ) یہ بنی اسد کی لغت ہے (4)۔ طبری نے کہا: اس طرح نہیں پڑھا گیا۔ نحاس نے کہا اور اس نے ابن کثیر کی قراءت ذکر کی ہے...... کلام عرب میں فَعلیل معروف نہیں ہے۔ فِعلیل ہے۔ جیسے دلہیز، قطمیر، برطیل وغیرہ۔ یہ انکار نہیں کیا جاتا کہ جو عجمی کلام میں ہو اس کی عرب کلام میں مثال نہیں اور نہ یہ انکار ہے کہ اس میں تغیر کثیر ہے جیسے عرب کہتے ہیں: ابراهیم، ابرهم، ابراهم و ابراهام۔ بعض علماء نے کہا: جبریل عجمی اسم ہے عربوں نے اسے عربی بنایا اسی وجہ سے اس میں کئی لغات ہیں اور اسی وجہ سے یہ منصرف نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: کتاب کے آغاز میں گزر چکا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ یہ الفاظ عربی ہیں ان کو جبریل واضح عربی زبان میں لے کر آئے ہیں۔ نحاس نے کہا: جبریل کی جمع مکسر جباریل بنائی جاتی ہے اور میکائیل میں چھ لغات ہیں:

۱- میکایل۔ یہ نافع کی قراءت ہے۔ میکائیل (ہمزہ کے بعد یاء کے ساتھ) یہ حمزہ کی قراءت ہے۔ میکال۔ یہ اہل حجاز کی لغت ہے اور ابو عمرو و حفص عن عاصم کی قراءت ہے۔

ابن کثیر سے تین وجوہ مروی ہیں۔ کعب بن مالک نے کہا:

و یوم بدر لقینا کم لنا مددٌ فیہ مع النصر میکالٌ و جبریل

جنگ بدر میں ہمارا تم سے مقابلہ ہوا تو ہمارے لئے مدد تھی اور اس مدد میں میکائیل و جبریل تھے۔

ایک اور شاعر نے کہا:(5)

عبدوا الصلیب و کذّبوا بمحمدٍ و بجبریل و کذبوا میکالا

انہوں نے صلیب کی عبادت کی اور محمد ﷺ کو جھٹلایا اور جبریل و میکائیل کو جھٹلایا۔

۴- میکئیل جسے میکعیل یہ ابن محیصن کی قراءت ہے۔
۵- میکائیل (دو یا) یہ اعمش کی قراءت ہے۔ (ان سے اختلاف کے ساتھ)
۶- میکاءل۔ جیسے کہا جاتا ہے اسراءل (ہمزہ مفتوحہ کے ساتھ) یہ عجمی اسم ہے اسی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ حضرت ابن

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 5۔ ایضاً

عباس نے ذکر کیا ہے کہ جبر، میکا اور اسراف یہ تمام عجمی الفاظ ہیں۔ ان کا معنی عبد، غلام ہے اور ایل اللہ تعالیٰ کا اسم ہے (1)۔ اسی سے حضرت ابو بکر صدیق کا قول ہے جب انہوں نے مسیلمہ کذاب کی سجع سنی۔ یہ ایسی کلام ہے جو اِلّ سے نہیں ہے یعنی اللہ کی طرف سے نہیں ہے (2)۔ قرآن حکیم میں ہے: لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً (توبہ:10) ایک تاویل کے مطابق اس آیت میں اِلًّا سے مراد اللہ ہے۔ تفصیل آگے آئے گی۔

ماوردی نے کہا: جبرئیل اور میکائیل دو اسم ہیں ایک کا معنی عبداللہ اور دوسرے کا معنی عبیداللہ ہے کیونکہ ایل سے مراد اللہ تعالیٰ ہے جبر کا معنی عبد ہے اور میکا کا معنی عبید ہے، گویا جبریل کا معنی عبداللہ اور میکائیل کا معنی عبیداللہ ہے۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے مفسرین میں اس کی مخالفت نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: بعض مفسرین نے یہ زیادہ کیا ہے: اسرافیل عبدالرحمٰن (3)۔ نحاس نے کہا: جس نے حدیث کی تاویل کی کہ جبر سے مراد عبد اور اٰل سے مراد اللہ ہے تو انہیں یہ کہنا واجب ہے: هذا جبريلُ، رايت جبريلَ، مررت بجبريلِ اور یہ نہیں کہا جاتا۔ تو ثابت ہوا کہ حدیث کا مطلب ہے یہ مسمّیٰ ہے۔ دوسرے علماء نے فرمایا: اگر اس طرح ہوتا جس طرح انہوں نے کہا ہے تو یہ منصرف ہوتا۔ اس کا منصرف نہ ہونا دلیل ہے کہ یہ اسم واحد، مفرد ہے، مضاف نہیں ہے۔ عبدالغنی الحافظ نے، افلت بن خلیفہ... وہ فلیت العامری ہے جو ابو احسان ہے.... عن جسرہ بنت دجاجہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے دعا کی: اللّٰهم رب جبريل و ميكائيل و اسرافيل اعوذبك من حر النار و عذاب القبر۔ اے اللہ! جبریل، میکائیل اور اسرافیل کے رب میں تجھ سے آگ کی گرمی اور عذاب قبر سے پناہ مانگتا ہوں۔

وَ لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۚ وَ مَا يَكْفُرُ بِهَاۤ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ۝۹۹

"اور یقیناً ہم نے اتارے ہیں آپ پر روشن نشان اور کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا ان کا بجز نافرمانوں کے"۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ ابن صوریا کا جواب ہے جب اس نے رسول اللہ ﷺ سے کہا آپ کوئی ایسی چیز نہیں لائے جس کو ہم پہچانتے ہوں۔ آپ پر کوئی واضح آیت نہیں اتری کہ ہم آپ کی اتباع کریں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما دی۔ یہ طبری نے ذکر کیا ہے۔ (4)

اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۰۰

"کیا (یوں نہیں) کہ جب کبھی انہوں نے وعدہ کیا تو پھر توڑ پھینکا اسے انہیں میں سے ایک گروہ نے۔ بلکہ ان کی اکثریت تو (سرے سے) ایمان ہی نہیں لائی"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا یہاں واؤ عطف کے لئے ہے اس پر الف استفہام داخل ہوا ہے، جیسے فاء پر داخل ہوتا ہے جیسے أفحكم الجاهلية۔ أفانت تسمع الصم۔ افتتخذونه و ذريته، اور جس طرح ثم پر داخل ہوتا ہے۔ أَثُمَّ إِذَا مَا وَقَعَ۔ یہ سیبویہ کا قول ہے۔ اخفش نے کہا: یہ واؤ زائدہ ہے، کسائی کا مذہب یہ ہے کہ یہ اَوْ تھا تسہیل کے لئے واؤ کو

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

حرکت دی گئی۔ ایک قوم نے اوْ واؤ ساکن کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس صورت میں یہ بل کے معنی میں ہوگا، جیسے کوئی کہتا ہے: لاضربنك پھر جواب دینے والا کہتا ہے: او یکفی اللہ۔ ابن عطیہ نے کہا(1): یہ تمام تکلف ہے۔ صحیح سیبویہ کا قول ہے کُلَّمَا ظرف کی بنا پر منصوب ہے۔ آیت میں مراد مالک بن صیف ہے، اس کو ابن صیف بھی کہا جاتا ہے۔ اس نے کہا تھا: اللہ کی قسم! ہماری کتاب میں ہم سے کوئی عہد و پیمان نہیں کیا گیا کہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں تو یہ آیت نازل ہوئی (2)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہود نے عہد کیا تھا کہ اگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوں گے تو ہم ان پر ایمان لائیں گے اور اس کے ساتھ مل کر مشرکین عرب کی مخالفت کریں گے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو انہوں نے آپ کا انکار کیا۔ عطا نے کہا: یہ وہ عہود تھے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور یہود کے درمیان تھے۔ ان کو انہوں نے توڑا۔ جیسے قریظہ اور نضیر نے کیا۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۶﴾ (انفال)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ، النبذ کا معنی پھینکنا ہے، اسی سے النبیذ، المنبوذ پھینکا ہوا۔

ابو الاسود نے کہا:

وخبرنی من کنت ارسلت انما　اخذت کتابی معرضاً بشمالکا

نظرت الی عنوانہ فنبذتہ　کنبذك نعلاً اخلقت من نعالکا

مجھے اس نے بتایا جسے میں نے بھیجا تھا تو نے میری کتاب اعراض کرتے ہوئے لی۔ اور تو نے اس کے عنوان کو دیکھا تو تو نے اسے اس طرح پھینک دیا جس طرح تو پرانی جوتی پھینکتا ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

ان الذین امرتھم ان یعدلوا　نبذوا کتابك واستحلوا المحرما

بے شک وہ لوگ جنہیں تو نے عدل کرنے کا حکم دیا انہوں نے تیری کتاب کو پھینک دیا اور حرام کو حلال کیا۔

یہ مثال اس شخص کے لئے دی جاتی ہے جو کسی شے کو حقیر سمجھے اور اس پر عمل نہ کرے۔ عرب کہتے ہیں: اجعل ھذا خلف ظھرك دبراً منك و تحت قدمك یعنی اس کام کو چھوڑ دے اور اس سے اعراض کر۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا (ہود: 92) (اور تم نے ڈال دیا ہے اسے پس پشت) فراء نے یہ شعر پڑھا ہے:

تمیم بن زید لا تکونن حاجتی　بظھر فلا یعیا علی جوابھا

اے تمیم بن زید! میری حاجت کو پشت کے پیچھے نہ ڈال مجھے اس کا جواب عاجز نہیں کرے گا۔

بَلْ اَكْثَرُهُمْ یہ مبتدا ہے لَا يُؤْمِنُوْنَ فعل مستقبل خبر ہے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

''اور جب آیا ان کے پاس رسول اللہ کی طرف سے تصدیق کرنے والا اس کتاب کی جو ان کے پاس ہے تو پھینک دیا ایک جماعت نے اہل کتاب سے اللہ کی کتاب کو اپنی پشتوں کے پیچھے جیسے وہ کچھ جانتے ہی نہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ یہ رسول کی نعت ہے اور حال کی بنا پر اسے منصوب پڑھنا جائز ہے نَبَذَ فَرِيْقٌ یہ لَمَّا کا جواب ہے مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ کتاب اللہ، نبذ کی وجہ سے منصوب ہے، مراد تورات ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار اور آپ کو جھٹلانا، یہ کتاب اللہ (تورات) کو پھینکنا ہے۔ سدی نے کہا: انہوں نے تورات کو چھوڑ دیا اور آصف کی کتاب اور ہاروت و ماروت کے جادو کو لے لیا(1)۔ بعض علماء نے فرمایا: كِتٰبَ اللّٰهِ سے قرآن مراد لینا بھی جائز ہے۔ شعبی نے کہا: قرآن ان کے ہاتھوں میں تھا اسے پڑھتے تھے لیکن اس پر عمل انہوں نے ترک کر دیا۔ سفیان بن عیینہ نے کہا: انہوں نے اسے ریشم و دیباج میں لپیٹ دیا اور اسے سونے اور چاندی سے مزین کر دیا لیکن اس کے حلال کو حلال نہ کیا اور اس کے حرام کو حرام نہ کیا۔ یہی نبذ ہے، اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ بے علموں کے ساتھ انہیں تشبیہ دی۔ جب انہوں نے جاہلوں والا فعل کیا۔ یہ لفظ بھی آئیں گے کہ انہوں نے علم کے باوجود کفر کیا۔(2)

وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَ لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَ مَاۤ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ ؕ وَ مَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَاۤ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ ؕ وَ مَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ يَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ ؕ وَ لَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۗ وَ لَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝

''اور پیروی کرنے لگے اس کی جو پڑھا کرتے تھے شیطان سلیمان علیہ السلام کے عہد حکومت میں حالانکہ سلیمان علیہ السلام نے کوئی کفر نہیں کیا بلکہ شیطانوں نے ہی کفر کیا، سکھایا کرتے تھے لوگوں کو جادو۔ نیز وہ بھی جو اتارا گیا دو فرشتوں پر (شہر) بابل میں (جن کے نام) ہاروت اور ماروت تھے۔ اور (کچھ) نہ سکھاتے تھے وہ دونوں کسی کو جب تک یہ نہ کہہ لیتے کہ ہم تو تیری آزمائش ہیں (ان پر عمل کر کے) کفر مت کرنا۔ (اس کے باوجود) لوگ سیکھتے رہے ان دونوں سے وہ منتر جس میں جدائی ڈالتے تھے خاوند اور اس کی بیوی میں اور وہ ضرر نہیں پہنچا سکتے اپنے جادو منتر سے کسی کو بغیر اللہ کے ارادہ کے اور وہ سیکھتے ہیں وہ چیز جو ضرررساں ہے ان کے لئے نہیں نفع پہنچا سکتی انہیں اور وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جس نے اس کا سودا کیا اس کے لئے آخرت میں (رحمت الٰہی سے) کوئی حصہ نہیں

1۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذا　2۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذا

اور بہت بری ہے وہ چیز بیچا ہے انہوں نے جس کے عوض اپنی جانوں (کی فلاح) کو۔ کاش! وہ کچھ جانتے"۔

اس میں چوبیس مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ عَلٰی مُلْكِ سُلَیْمٰنَ۔ یہ اس گروہ کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر ہے جنہوں نے کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا اور اس کے بدلے میں جادو کی اتباع کی، وہ یہود تھے۔ سدی نے کہا: یہود نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے تورات کے ساتھ معارضہ کیا تو تورات اور قرآن عقائد و نظریات میں متفق نکلے تو انہوں نے تورات کو چھوڑ دیا اور آصف کی کتاب اور ہاروت و ماروت کے جادو کو لے لیا۔ محمد بن اسحاق نے کہا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلیمان کا رسولوں میں ذکر کیا تو ان کے کسی عالم نے کہا: محمد کہتا ہے کہ ابن داؤد نبی تھا اللہ کی قسم! وہ تو جادوگر تھا۔

اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَمَا كَفَرَ سُلَیْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّیٰطِیْنَ كَفَرُوْا (1) یعنی شیطانوں نے بنی آدم کے دلوں میں ڈالا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جو سمندر پر سوار ہوتے ہیں، پرندوں اور جنوں کو مسخر کیے ہوئے ہیں یہ سب جادو کے عمل بوتے پر ہے۔ کلبی نے کہا: شیطانوں نے جادو اور تلبیس کا عمل لکھا آصف کی زبان پر جو حضرت سلیمان کا کاتب تھا۔ انہوں نے ان کتب کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے مصلی کے نیچے دفن کر دیا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں بادشاہی بخشی اور حضرت سلیمان کو اس کا علم نہ تھا جب حضرت سلیمان کا وصال ہوا تو انہوں نے اس جادو کو نکالا اور لوگوں کو کہا: اس علم کے ذریعے سلیمان تم پر حکومت کرتے تھے۔ پس لوگوں نے اس جادو کو سیکھا۔

بنی اسرائیل کے علماء نے کہا: معاذ اللہ! یہ حضرت سلمان علیہ السلام کا علم نہیں ہو سکتا اور بے وقوف نے کہا: یہی حضرت سلیمان علیہ السلام کا علم ہے۔ پس لوگ اس جادو کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے اور انہوں نے اپنے انبیاء کی کتب کو چھوڑ دیا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر حضرت سلیمان کا عذر نازل فرمایا اور جو ان پر تہمت لگائی گئی تھی اس کی براءت کا اظہار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ۔ عطا نے کہا تَتْلُوْا کا معنی تقرؤا ہے یعنی تلاوت کرنا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا تَتْلُوْا کا معنی تتبع اور پیروی کرنا ہے، جیسے تو کہتا ہے: جاء القوم یتلو بعضھم بعضاً بعض بعض کے پیچھے آئے۔ (2)

طبری نے کہا: اتَّبَعُوْا بمعنی فضلوا (فضلیت دینا) (3)

میں کہتا ہوں: ہر وہ شخص جو کسی کی اتباع کرتا ہے اسے اپنے آگے کرتا ہے تو وہ اسے فضلیت دیتا ہے۔ تتلوا کا معنی تلت یعنی ماضی کے معنی میں ہے۔ شاعر نے کہا:

وإذا مررت بقبره فاعقر به کوم الهجان و کل طرف سابح

وانضح جوانب قبره بدمائها فلقد یکون اخادم و ذبائح

جب تو اس کی قبر کے پاس سے گزرے تو عمدہ اور تیز رفتار اونٹنیوں کو ذبح کر اور قبر کی ہر طرف ان کا خون چھڑک دے تحقیق

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

وہ خون بہانے والا اور ذبح کرنے والا تھا۔

اس شعر میں قد یکون بمعنی کان ہے، اور (ما) اتبعوا کا مفعول ہے یعنی کچھ شیطانوں نے حضرت سلیمان کے خلاف کیا اس کی انہوں نے پیروی کی۔ بعض علماء نے فرمایا: ما نافیہ ہے لیکن یہ نظم کلام کے اعتبار سے کلام کی صحت کے اعتبار سے درست نہیں۔ یہ ابن عربی نے کہا ہے۔

عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ملک سلیمان سے مراد ان کی شرع اور ان کی نبوت ہے (1)۔ زجاج نے کہا: اس کا معنی ہے: علی عهد ملك سلیمان اور کہا گیا ہے کہ اس کا معنی فی ملك سلیمان ہے۔ یعنی ان کے قصص، صفات اور اخبار میں (2)۔ فراء نے کہا: ایسی جگہ پر علی اور فی درست ہیں۔

علی فرمایا اور بعد نہیں فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ (الحج: 52)

اس حدیث میں امنیته کا معنی ہے: اس کی تلاوت میں۔ شیطان کا معنی اور اس کا اشتقاق پہلے گزر چکا ہے۔ اعادہ کی ضرورت نہیں۔

بعض علماء نے فرمایا: یہاں شیطان سے مراد شیاطین الجن ہیں۔ اس اسم سے یہی مفہوم ہوتا ہے۔ بعض علماء نے کہا: اس سے مراد انسانوں کے شیاطین ہیں جو گمراہی میں سرکشی کرتے ہیں جیسے جریر کا قول ہے۔

ایام یدعوننی الشیطان من غزلی و کن یھویننی اذ کنت شیطاناً

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان کی برأت فرمائی کسی آیت میں یہ نہیں گزرا کہ کسی نے حضرت سلیمان کی طرف کفر کی نسبت کی ہو لیکن یہود نے آپ کی طرف جادو کی نسبت کی لیکن جب جادو کفر تھا تو یہ ایسے ہو گیا جیسے انہوں نے کفر کی طرف ان کی نسبت کی۔

پھر فرمایا: وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا اللہ تعالیٰ نے جادو کی تعلیم کی وجہ سے ان کے کفر کو ثابت کیا (3)۔ يُعَلِّمُوْنَ یہ حال کی بنا پر محل نصب میں ہے اور خبر ثانی کے اعتبار سے محل رفع میں ہونا بھی جائز ہے، عاصم کے سوا کوفیوں نے ولکن الشیاطین یعنی لکن کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور الشیاطین کے نون کو رفع دیا ہے۔ اسی طرح سورۃ انفال میں ہے لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (انفال: 17) ابن عامر نے ان سے موافقت کی ہے۔ باقی قراء نے تشدید اور نصب کے ساتھ پڑھا ہے لکن اس کے دو معانی ہیں۔ ماضی کی خبر کی نفی اور مستقبل کی خبر کا اثبات۔ یہ تین کلمات سے بنایا گیا ہے۔ لام، کاف، ان لانفی ہے۔ ك خطاب ہے اور ان اثبات وتحقیق ہے۔ استثقال کی وجہ سے ہمزہ ختم ہو گیا ہے۔ یہ کبھی مثقلہ اور مخففہ ہوتا ہے جب مثقلہ ہو تو نصب دیتا ہے جیسے ان مثقلہ نصب دیتا ہے اور جب مخففہ ہو تو رفع دیتا ہے جیسے إن مخففہ عن المثقلہ سے رفع دیا جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اَلسِّحْرَ (جادو)۔ بعض علماء نے فرمایا: سحر کا معنی حیلوں اور خیالوں سے چیز کو کچھ اور بنا کر دکھانا،

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

ساحر (جادوگر) کچھ اشیاء اور معانی کرتا ہے وہ جس کے لئے جادو کیا گیا ہوتا ہے اسے وہ اپنی حقیقت کے خلاف تصور کرتا ہے جیسے وہ شخص جو دور سے سراب کو دیکھتا ہے اور وہ اسے پانی تصور کرتا ہے۔ جیسے چلنے والی کشتی میں بیٹھا ہوا شخص یہ خیال کرتا ہے کہ درخت اور پہاڑ اس کے ساتھ چل رہے ہیں۔ بعض نے فرمایا: یہ سحرت الصبی سے مشتق ہے جب تو اسے دھوکا دے اور تو اسے کھیل میں ڈال دے۔ التسحید اس کی مثل ہے۔

لبید نے کہا:

فان تسالینا فیم نحن فاِنّنا عصا فیر من ھذا الانام المسَحّرِ

اگر تو ہمارے متعلق پوچھے کہ ہم کس حیثیت میں ہیں تو ہم اس مسحر مخلوق میں سے چڑیاں ہیں۔

ایک اور نے کہا:

اُرانا مُوضِعِین لامرِ غیبٍ و نسحَرُ بالطعام و بالشراب

عصافیر و ذبان و دودٌ اجرأ من مجلحَة الذئاب

ہم موت کے لئے جلدی کرنے والے ہیں اور ہمیں کھانے پینے کے ساتھ جادو کیا گیا ہے۔ چڑیاں مکھیاں اور کیڑے ہیں اور جری بھیڑیے سے زیادہ جری ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: انما انت من المسحرین۔ کہا جاتا ہے: المسحر وہ ہوتا ہے جو سحر والا پیدا کیا گیا ہو کبھی اس کا معنی المعتذین بھی کیا جاتا ہے یعنی ایسے لوگوں سے جو طعام کھاتے ہیں مشروب پیتے ہیں۔ بعض نے فرمایا: اس کی اصل الخفاء ہے کیونکہ جادو خفیہ عمل کرتا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا اصل معنی الصرف ہے کہا جاتا ہے: ما سحرك عن كذا یعنی کس چیز نے تجھے اس سے پھیر دیا۔

السِّحْرَ، جو اپنی جہت سے پھیرا گیا ہو۔ بعض نے فرمایا: اس کی اصل الاستمالہ ہے فقد سحرك اس نے تجھے مائل کیا۔ بعض نے فرمایا: بل نحن قوم مسحورون یعنی ہم پر جادو کیا گیا ہے تخیل کی وجہ سے ہماری معرفت زائل کر دی گئی ہے۔ جوہری نے کہا: السِّحْرَ کا معنی الأخذہ ہے۔ ہر وہ چیز جس کا ماخذ لطیف ہو اور باریک ہو وہ سحر ہے۔ سحرہ یسحرہ سحراً والساحر، سحرہ کا معنی دھوکا دینا بھی ہے۔ یہ ہم ذکر کر چکے ہیں۔ حضرت ابن مسعود نے کہا: ہم زمانہ جاہلیت میں السحر کو العضہ کہتے تھے اور عربوں کے نزدیک العضہ کا مطلب بہت زیادہ ملمع سازی کرنا اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کو کہتے ہیں۔

شاعر نے کہا:

اعوذ بربی من النافثا ت فی عِضہ العاضہ المُعضہ

میں اپنے رب سے جادو میں پھونکے مارنے والیوں سے پناہ مانگتا ہوں۔

مسئلہ نمبر 4: کیا جادو کی حقیقت ہے یا نہیں۔ غزنوی حنفی نے ''عیون المعانی'' میں ذکر کیا ہے کہ معتزلہ کے نزدیک سحر دھوکا ہے اس کی کوئی اصل نہیں۔ امام شافعی کے نزدیک یہ وسوسہ اور امراض ہیں۔ فرمایا: ہمارے نزدیک اس کی اصل طلسم

ہے جو ستاروں کی تاثیر پر مبنی ہوتا ہے جیسے فرعون کی لاٹھیوں کے بارے میں سورج کی تاثیر۔ یا اس میں شیاطین کی تعظیم ہوتی ہے تاکہ وہ اس کی مشکل کو آسان کر دیں۔

میں کہتا ہوں: ہمارے نزدیک یہ حق ہے اور اس کی حقیقت ہے۔ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ پھر جادو میں کچھ وہ ہوتا ہے جو ہاتھ کی صفائی سے ہوتا ہے جیسے الشعوذۃ (مداری کا تماشا)۔ پھرتی سے کرتب دکھانے والے کو الشعوذی کہا جاتا ہے۔ ابن فارس نے ''المجمل'' میں کہا: الشعوذۃ بادیہ نشینوں کے کلام سے نہیں ہے۔ یہ ہاتھوں میں پھرتی ہوتی ہے یہ جادو کی طرح ہے۔ اس سے کلام کچھ ہوتا ہے جو محفوظ کیا جاتا ہے اور دم ہوتے ہیں جو اللہ کے اسماء سے پڑھے جاتے ہیں کبھی یہ شیاطین کے عہود سے ہوتا ہے کبھی دواؤں سے اور دھوؤں وغیرہ سے ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 5: رسول اللہ نے کلام میں فصاحت اور زبان میں طاقت کو سحر کہا ہے۔ فرمایا: ان من البیان لسحرا (بیان میں سے بعض جادو ہوتے ہیں) اس حدیث کو امام مالک وغیرہ نے روایت کیا ہے کیونکہ اس میں بھی باطل کو درست کرنا ہوتا ہے حتیٰ کہ سامع اسے حق سمجھنے لگتا ہے۔ اس مفہوم کے اعتبار سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اِنّ من البیان لسحرا (☆)، فصاحت و بلاغت کی مدح اور بیان کی تفضیل کے لئے یہ ارشاد فرمایا ہے۔ یہ اہل علم کی ایک جماعت کا قول ہے پہلا قول اصح ہے اور اس کی دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: فلعلّ بعضکم ان یکون الحن بحجتہ من بعض (1) (شاید کوئی تم میں سے دوسرے سے اپنی حجت کو بیان کرنے میں زیادہ فصیح و بلیغ ہو) اور فرمایا: اِنّ ابغضکم الیّ الثرثارون المتفیھقون تم میں سے میرے نزدیک مبغوض لوگ زیادہ بولنے والے ہیں۔ الثرثرۃ، کلام کی کثرت اور اسے گھمانا ہے۔ کہا جاتا ہے: فھو ثرثار مھذار زیادہ باتیں کرنے والا، ہنسانے والا۔ المتفیھق بھی اسی طرح ہے۔ ابن زید نے کہا: فلان یتفیھق فی کلامہ۔ وہ اپنے کلام میں وسعت رکھتا ہے۔ اس نے کہا اس کی اصل الفھق ہے جس کا معنی بھرنا ہے۔ گویا ایسا شخص کلام کے ساتھ اپنے منہ کو بھر دیتا ہے۔

میں کہتا ہوں: وہ معنی جو ہم نے بیان کیا ہے اس کی تفسیر عامر الشعبی جو حدیث کے راوی ہیں اور صعصعہ بن صوحان نے کی ہے، دونوں حضرات نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ان من البیان لسحرا ایک شخص پر حق ہوتا تھا (2) اور وہ حقدار سے زیادہ چرب زبان ہوتا تھا وہ اپنے بیان سے قوم کو مسحور کر دیتا تھا تو وہ حق لے جاتا تھا حالانکہ اس پر حق ہوتا تھا۔ علماء نے بلاغت اور لسانت کی تعریف کی ہے جب وہ لمبی گفتگو کرنے اور باطل کو حق ثابت کرنے کی حد تک نہ پہنچے۔ یہ واضح ہے۔

مسئلہ نمبر 6: جادو کچھ ایسا ہوتا ہے جس کا کرنے والا کافر ہو جاتا ہے۔ مثلاً جو لوگوں کی صورتوں میں تبدیلی کرنے اور جانوروں کی ہیئت میں ان کو نکالنے، اور ایک مہینہ کی مسافت ایک رات میں طے کرنے، ہوا میں اڑنے کا دعویٰ کرتے ہیں، جو اس قسم کا فعل کرے تاکہ لوگوں کو وہم دلائے کہ یہ حق ہے تو اس کی طرف سے کفر ہوگا۔ یہ ابو نصر عبد الرحیم قشیری کا قول ہے۔ ابو

1۔ صحیح بخاری، باب من اقام البینۃ بعد الیمین، حدیث نمبر 2483، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، باب ما جاء فی الشعر، حدیث نمبر 4359، ضیاء القرآن پبلی کیشنز ☆ مسند امام احمد، حدیث نمبر 4651

عمرو نے کہا: جو یہ کہتا ہے کہ ساحر حیوان کو ایک صورت سے دوسری صورت کی طرف تبدیل کرتا ہے وہ انسان کو گدھا بنا دیتا ہے اور وہ اجساد کو نقل کرنے، انہیں ہلاک کرنے اور انہیں تبدیل کرنے پر قادر ہے وہ ایسے ساحر کے قتل کا نظریہ رکھتے ہیں کیونکہ وہ انبیاء سے کفر کرنے والا ہے وہ ان کی آیات اور معجزات کی مثل دعوی کرنے والا ہے اس طرح تو نبوت کی صحت کا علم درست نہیں رہے گا کیونکہ جب اس کی مثل حیلہ سے حاصل ہو جائے گا اور رہا وہ جو کہتا ہے کہ جادو، دھوکا، تمویہات، تخیلات اور جھوٹ کا نام ہے وہ جادوگر کو قتل کرنے کو واجب نہیں کہتا مگر یہ کہ اگر جادوگر اپنے فعل میں کسی کو قتل کر دے تو اسے قتل کیا جائے گا۔

مسئلہ نمبر 7: اہل سنت کا نظریہ یہ ہے کہ جادو ثابت ہے اس کی حقیقت ہے۔ عام معتزلہ اور شوافع میں سے ابو اسحاق استرآبادی کا نظریہ یہ ہے کہ جادو کی کوئی حقیقت نہیں ہے یہ تمویہ اور تخیل ہے اور وہم دلانا ہے کہ چیز اپنی حقیقت پر نہیں ہے۔ یہ شعبدہ بازی اور ہاتھوں کی پھرتی کی ایک صورت ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ (طہ) (یوں دکھائی دینے لگیں ان کے جادو کے اثر سے جیسے وہ دوڑ رہی ہوں)۔

یہ نہیں فرمایا کہ یہ حقیقت میں دوڑ رہے تھے بلکہ فرمایا: يُخَيَّلُ إِلَيْهِ (اسے خیال گزرتا تھا) اسی طرح فرمایا: سَحَرُوا أَعْيُنَ النَّاسِ (الاعراف: 116)۔ (انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا)۔ اس میں کوئی حجت نہیں ہے کیونکہ ہم اس کا انکار نہیں کرتے کہ تخیل وغیرہ جادو میں سے ہے لیکن اس کے بعد ایسے امور ثابت ہیں عقل جن کو جائز قرار دیتی ہے اور نقل بھی ان کے متعلق وارد ہے۔ اسی وجہ سے اس آیت میں جادو اور اس کی تعلیم کا ذکر آیا ہے اگر اس کی حقیقت نہ ہوتی تو اس کی تعلیم نہ ہوتی، نہ اللہ تعالیٰ خبر دیتے کہ وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ یہ چیز دلیل ہے کہ اس کی حقیقت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرعون کے جادوگروں کے واقعہ میں فرمایا: وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ (اعراف) (اور مظاہرہ کیا انہوں نے بڑے جادو کا) اور سورہ فلق میں اس کا ذکر فرمایا۔ مفسرین کا اتفاق ہے کہ اس سورت کے نزول کا سبب لبید بن اعصم کا جادو تھا۔ جس کا ذکر بخاری اور مسلم نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے، حضرت عائشہ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بنی زریق کے یہودیوں میں سے ایک یہودی نے جادو کیا جس کو لبید بن اعصم کہا جاتا تھا (1)۔ اس حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب جادو ختم ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے شفا دی شفاء علت کے ختم ہونے اور مرض کے زائل ہونے کے ساتھ ہوتی ہے۔

یہ دلیل ہے کہ اس کی حقیقت ہے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اخبار اس کے وجود اور وقوع پر قطعی ہیں۔ اور صاحب عقل لوگوں کا اس پر اجماع ہے۔ چند معتزلیوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے اور ان کی اہل حق کی مخالفت قابل اعتناء نہیں، جادو عام ہو گیا ہے اور گزشتہ زمانہ میں بھی پھیلا ہوا تھا اور لوگوں نے اس کے بارے میں کلام کیا۔ صحابہ اور تابعین میں سے کسی نے اس کی اصل کا انکار نہیں کیا۔ سفیان نے ابو الاعور سے انہوں نے عکرمہ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: مصر کے شہروں میں سے ایک شہر میں جادو سیکھا گیا جس کو الفرما کہا جاتا تھا۔ پس جس نے اس کی تکذیب کی وہ کافر ہے اللہ اور اس کے رسول کو جھٹلانے والا ہے اور ایک مشاہدہ شدہ چیز کا انکار کرنے والا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، باب صفۃ ابلیس و جنودہ، حدیث نمبر 3028، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مسئلہ نمبر 8: ہمارے علماء نے فرمایا: اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جادوگر کے ہاتھ پر خارق للعادت عمل ظاہر ہو جو انسان کی قدرت میں نہیں ہوتا مثلاً مرض میں مبتلا کر دے، مرض کو ختم کر دے، عقل زائل ہو جائے، کوئی عضو ٹیڑھا کر دے۔ اس کے علاوہ چیزیں جن کا بندوں سے سرزد ہونا محال ہوتا ہے۔ علماء نے فرمایا: جادو میں یہ بعید نہیں کہ جادوگر کا جسم اتنا باریک ہو جائے کہ وہ کسی سوراخ یا چھوٹی سی کھڑکی میں داخل ہو جائے، بانس کے سرے پر کھڑا ہو جائے، باریک دھاگے پر چلنے لگے، ہوا میں اڑنے لگے، پانی پر چلنے لگے، کتے وغیرہ پر سوار ہو جائے، لیکن اس کے باوجود جادو نہ اس کا موجب ہو گا نہ اس عمل کے وقوع کی علت ہو گا نہ سبب مولد ہو گا اور نہ جادوگر اس میں مستقل ہو گا۔ اللہ تعالیٰ ہی ان اشیاء کو پیدا فرماتا ہے اور جادو کے پائے جانے کے وقت وہ اسے تخلیق فرما دیتا ہے جس طرح کھانے کے وقت سیر ہونا پیدا فرماتا ہے پانی پینے کے وقت سیرابی پیدا فرماتا ہے۔ سفیان نے عمار ذہبی سے روایت کیا ہے کہ ایک جادوگر ولید بن عقبہ کے پاس ایک رسی پر چل رہا تھا وہ گدھے کی دبر سے داخل ہوتا اور اس کے منہ سے نکل جاتا، جندب نے اس پر تلوار سونتی اور اسے قتل کر دیا۔ یہ جندب بن کعب ازدی تھے جنہیں البجلی کہا جاتا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: (میری امت میں ایک شخص ہو گا جس کو جندب کہا جائے گا وہ تلوار مارے گا حق اور باطل کے درمیان فرق کر دے گا) اس کو جندب خیال کرتے تھے یہ جادوگر کا قاتل ہے۔ علی بن مدینی نے کہا: ان سے حارثہ بن مضرب نے روایت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 9: مسلمانوں کا اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ جادو کے وقت جو کچھ کرتا ہے جیسے مکڑی کا اتارنا، جوؤں اور مینڈک، دریا کا پھٹنا، عصا کا سانپ میں تبدیل ہونا، مردوں کو زندہ کرنا، جانوروں کو بلوانا اور اسی قسم کی دوسری آیات جو رسل سے ظاہر ہوئیں، یہ جادو میں سے نہیں ہیں۔ یہ معجزات اور ایسی دوسری چیزیں جن کا حکم قطعی ہے کہ وہ نہ ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ جادوگر کے ارادہ کے وقت ایسا نہیں کرے گا۔ قاضی ابوبکر بن طیب نے کہا: ہم اسے اجماع کی وجہ سے تسلیم نہیں کرتے اگر اجماع نہ ہوتا تو ہم جائز قرار دیتے۔

مسئلہ نمبر 10: جادو اور معجزہ کے درمیان فرق: ہمارے علماء نے فرمایا: جادو جادوگر وغیرہ سے پایا جاتا ہے کبھی اس کو ایک جماعت جانتی ہے اور ان کے لئے ایک وقت میں اس کا لانا ممکن ہوتا ہے اور معجزہ وہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی مثل اور اس کا معارض پیش کرنے کی کسی کو قدرت ہی نہیں دیتا، پھر جادوگر نبوت کا دعویٰ نہیں کرتا پس اس سے جو صادر ہوتا ہے وہ معجزہ سے مختلف ہوتا ہے کیونکہ معجزہ کے لئے نبوت کا دعویٰ اور اس کا چیلنج شرط ہے جیسا کہ کتاب کے مقدمہ میں گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 11: فقہاء کا مسلم اور ذمی جادوگر کے حکم میں اختلاف ہے۔ امام مالک کا نظریہ یہ ہے کہ مسلمان جب ایسے کلام سے جادو کرے جو کفر ہو تو اسے قتل کیا جائے گا اور اس سے توبہ طلب نہیں کی جائے گی اور نہ اس کی توبہ قبول کی جائے گی کیونکہ یہ ایسا امر ہے جس کے ساتھ وہ خوش ہوتا ہے جیسے زندیق اور زانی ہے، نیز اللہ تعالیٰ نے جادو کو کفر کہا ہے۔ فرمایا: وَ مَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَاۤ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ (البقرہ: 102) (اور (کچھ) نہ سکھاتے تھے وہ دونوں کسی کو جب تک یہ نہ کہہ لیتے کہ ہم تو تیری آزمائش ہیں (ان پر عمل کر کے) کفر مت کرنا)

یہ امام احمد بن حنبل، ابوثور، اسحاق، امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔ حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت ابن عمر، حضرت حفصہ، حضرت ابوموسیٰ، حضرت قیس بن سعد اور سات تابعین سے جادوگر کا قتل کرنا مروی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، جادوگر کی حد تلوار سے اسے مارنا ہے۔ یہ ترمذی نے نقل کی ہے اور یہ قوی نہیں ہے۔ اسماعیل بن مسلم منفرد ہے اور وہ محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔ ابن عیینہ نے اسماعیل بن مسلم عن الحسن کے سلسلہ میں مرسلاً روایت کی ہے اور بعض علماء نے عن الحسن عن الجندب کے سلسلہ سے روایت کیا ہے۔ ابن منذر نے کہا: ہم نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے آپ نے ایک جادوگرنی بیچی تھی جس نے جادو کیا تھا اور اس کی قیمت غلاموں کے آزاد کرنے میں لگائی تھی۔ ابن منذر نے کہا: جب کوئی شخص اقرار کرے کہ اس نے ایسے کلام سے جادو کیا ہے جو کفر تھا تو اس کا قتل کرنا واجب ہے اگرچہ وہ توبہ نہ بھی کرے اسی طرح اگر اس پر گواہوں سے ثابت ہو جائے اور وہ گواہ کلام کی ایسی صفت بیان کریں جس سے کفر لازم آتا ہے تو اس کا بھی یہی حکم ہے...... اگر وہ کلام جو اس نے ذکر کیا ہے، جس کے ساتھ اس نے جادو کیا ہے، وہ کفر نہیں ہے تو اس کا قتل کرنا جائز نہیں۔ اگر اس نے مسحور میں کوئی جنایت پیدا کر دی جو قصاص کا موجب ہے تو اس نے یہ عمل عمداً کیا ہے تو اس سے قصاص لیا جائے گا۔ اگر وہ ایسی جنایت ہے جس میں قصاص نہیں ہے تو اس میں اس کی دیت ہوگی...... ابن منذر نے کہا: جب کسی مسئلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا اختلاف ہو تو اس قول کی اتباع واجب ہے جو کتاب و سنت کے زیادہ موافق ہو اور یہ جائز ہے کہ جو جادو جس کے کرنے والے کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا وہ ایسا جادو ہو جو کفر ہو تو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے موافق ہے اور یہ احتمال ہے کہ حضرت عائشہ نے جس جادوگرنی کے بیچنے کا حکم فرمایا وہ جادو کفر نہ ہو اور اگر کوئی جندب کی حدیث سے حجت پکڑے جو حضرت جندب نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے جادوگر کی حد، اسے تلوار سے مارنا ہے۔ اگر یہ صحیح ہو تو احتمال ہے کہ اس جادوگر کے قتل کا حکم ہو جس کا جادو کفر ہو۔ تو یہ ان اخبار کے موافق ہوگا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی مسلمان آدمی کا خون حلال نہیں مگر تین چیزوں میں سے ایک چیز پائے جانے کے ساتھ۔ (1)

میں کہتا ہوں: یہ صحیح ہے مسلمانوں کے خون بہانا ممنوع ہیں ان کو یقین کے بغیر مباح نہیں کیا جا سکتا اور اختلاف کے ہوتے ہوئے یقین نہیں ہوا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

بعض علماء نے فرمایا کہ اہل فن نے کہا: جادو مکمل نہیں ہوتا مگر کفر اور تکبر کے ساتھ یا شیطان کی تعظیم کے ساتھ۔ پس اس تقدیر پر جادو کفر پر دال ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

امام شافعی سے مروی ہے کہ جادوگر کو قتل نہیں کیا جائے گا مگر یہ کہ وہ اپنے جادو سے کسی کو قتل کر دے اور وہ کہے کہ میں نے جان بوجھ کر قتل کیا ہے۔ اگر وہ کہے کہ میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تو اسے قتل نہیں کیا جائے گا اور اس میں قتل خطا کی طرح دیت ہوگی۔ اگر اس نے جادو کے ساتھ کسی کو نقصان پہنچایا تو اسے اس کے نقصان کی مقدار ادب سکھایا جائے گا۔ ابن عربی نے کہا: یہ دو اعتبار سے باطل ہے ایک یہ کہ اسے جادو کا علم نہیں تھا اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ یہ مؤلف کلام ہے جس کے ساتھ

1۔ صحیح بخاری، باب قول اللہ تعالیٰ ان النفس بالنفس والعین بالعین ۔۔۔ الآیۃ، حدیث نمبر 6370، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

غیر اللہ کی تعظیم کی جاتی ہے اور ان کی طرف مقادیر اور کائنات کی نسبت کی جاتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں تصریح فرمائی کہ یہ کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ یعنی حضرت سلیمان نے جادو کے قول کے ساتھ کفر نہیں کیا۔ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا یعنی شیاطین نے جادو کر کے اور اس کی تعلیم کے ساتھ کفر کیا۔ ہاروت و ماروت کہتے تھے ہم فتنہ ہیں، تو کفر نہ کر۔ یہ بیان کی تاکید ہے۔

امام مالک کے اصحاب نے حجت پکڑی ہے کہ اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی کیونکہ جادو ایک پوشیدہ عمل ہے اس کا کرنے والا اسے ظاہر نہیں کرتا۔ پس اس کی توبہ معروف نہیں ہوگی جیسے زندیق ہے۔ جو مرتد ہو کر کفر کا اظہار کرے اس سے توبہ طلب کی جائے گی۔

امام مالک نے فرمایا: اگر جادوگر یا زندیق توبہ کرے، اس سے پہلے کہ اس کے خلاف گواہی دی جائے، تو ان کی توبہ قبول ہوگی۔ اس کی حجت یہ ارشاد ہے: فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا (غافر: 85) (انہیں نفع نہ دیا ان کے ایمان نے جب انہوں نے ہمارے عذاب کو دیکھا) یہ دلیل ہے کہ عذاب کے نزول سے پہلے ان کا ایمان انہیں نفع دیتا تھا۔ اسی طرح یہ دونوں (ساحر، زندیق) ہیں۔

مسئلہ نمبر 12: رہا ذمی جادوگر، بعض علماء نے فرمایا: اسے قتل کیا جائے گا۔ امام مالک نے فرمایا: اسے قتل نہیں کیا جائے گا مگر یہ کہ وہ اپنے جادو سے کسی کو قتل کر دے، اور جو اس نے جنایت کی ہوگی اس کا ضمان دے گا۔ اگر کوئی ایسا کافر شخص جادو کرے جس کے ساتھ معاہدہ نہیں ہے تو اسے قتل کیا جائے گا(1)، ابن خویز منداد نے کہا: اگر جادوگر ذمی ہو تو امام مالک سے اس کے متعلق روایت مختلف ہے۔ کبھی فرمایا: اس سے توبہ طلب کی جائے گی اور اس کی توبہ اسلام کا اقرار ہے، کبھی فرمایا: اسے قتل کیا جائے گا اگرچہ وہ اسلام قبول کر بھی لے۔ رہا حربی تو اسے قتل نہیں کیا جائے گا جب وہ توبہ کر لے۔ اسی طرح امام مالک نے اس ذمی کے بارے فرمایا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بدزبانی کرے اس سے توبہ طلب کی جائے گی اور اس کی توبہ اسلام قبول کرنا ہے بھی فرمایا: اسے قتل کیا جائے گا اور اس سے توبہ طلب نہیں کی جائے گی جیسے مسلمان کے ساتھ ہوتا ہے۔

امام مالک نے ذمی کے بارے میں فرمایا: جب وہ جادو کرے، تو اسے سزا دی جائے گی مگر یہ کہ وہ اپنے جادو کے ساتھ کسی کو قتل کرے یا کوئی اور جنایت کر دے تو اس کے جرم کی مقدار اس سے مؤاخذہ کیا جائے گا۔ دوسرے علماء نے فرمایا: اسے قتل کیا جائے گا کیونکہ اس نے عہد کو توڑا اور جادوگر کا وارث، جادوگر کی میراث نہیں پائے گا کیونکہ جادوگر کافر ہے، مگر یہ کہ اس کا جادو کفر نہ ہو۔ امام مالک نے اس عورت کے متعلق فرمایا جو اپنے خاوند کو اپنے سے جادو کے ذریعے روک لیتی ہے یا کسی اور سے روک لیتی ہے تو اسے عبرت ناک سزا دی جائے گی اور اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔

مسئلہ نمبر 13: اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ کیا ساحر (جادوگر) سے جادو کو دور کرنے کا سوال کیا جائے گا؟ حضرت سعید بن مسیب نے اس کو جائز قرار دیا جیسا کہ امام بخاری نے ذکر کیا ہے اور اسی کی طرف مزنی کا میلان ہے۔ حضرت حسن

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

بصری نے اس کو ناپسند کیا ہے۔ شعبی نے کہا: تعویذ اور دم سے علاج کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ ابن بطال نے کہا: وہب بن منبہ کی کتاب میں ہے کہ سبز سات پتے بیری کے لے پھر اسے دو پتھروں کے درمیان پیس دے پھر اسے پانی میں ملائے اور اس پر آیۃ الکرسی پڑھے پھر اس سے تین گھونٹ پی لے اور بقیہ پانی کے ساتھ غسل کرے، اس عمل سے جو کچھ اسے ہوگا وہ دور ہو جائے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ یہ ایک عمدہ عمل ہے اس شخص کے لئے جسے اپنے اہل سے حقوق زوجیت سے روکا گیا ہو۔

مسئلہ نمبر 14: معتزلہ کے علماء نے شیاطین اور جنوں کا انکار کیا ہے۔ ان کا انکار ان کی کم فکری اور دین کی کمزوری پر دلالت کرتا ہے۔ ان کے اثبات میں کوئی عقلی محال نہیں ہے کتاب و سنت کی نصوص ان کے اثبات پر دلالت کرتی ہے اور عقلمند اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑنے والے پر حق ہے کہ جس کا عقل تقاضا کرے اس کے جواز کو ثابت کرے۔ شرع نے اس کے ثبوت پر نص قائم فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا (شیطانوں نے کفر کیا) اور فرمایا: وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ (الانبیاء: 82) (شیطانوں میں سے جو (سمندروں میں) غوطہ زنی کرے) اس کے علاوہ دوسری آیات اور سورہ جن ان کے ثبوت کا تقاضا کرتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ان الشیطان یجری من ابن آدم مجری الدم (1)۔ (شیطان ابن آدم میں خون کی طرح چلتا ہے) اس خبر کا بہت سے لوگوں نے انکار کیا ہے اور انہوں نے ایک جسم میں دو خون کا ہونا محال قرار دیا ہے جبکہ عقل انسانی میں ان کے چلنے کو محال قرار نہیں دیتی جبکہ شیطانوں کے اجسام رقیق اور بسیط ہیں جیسا کہ بعض لوگ بلکہ اکثر لوگ کہتے ہیں۔ ..... اگر ان کے جسم کثیف بھی ہوتے تو بھی صحیح تھا جیسا کہ کھانا، پینا جسم میں داخل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کیڑے بنی آدم میں ہوتے ہیں جبکہ وہ بھی زندہ ہوتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 15: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ، مانفی کے لئے ہے واو عاطفہ ہے اس کا عطف وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ پر ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ یہود نے کہا اللہ تعالیٰ نے جبریل و میکائیل کو جادو کے ساتھ اتارا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی نفی فرمائی (2)۔ کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ تقدیر اس طرح ہے: وما کفر سلیمان و ما انزل علی الملکین و لکن الشیاطین کفروا یعلمون الناس السحر ببابل ھاروت و ماروت، ہاروت اور ماروت وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا میں الشَّيٰطِيْنَ سے بدل ہے (3)۔ جن صورتوں پر یہ آیت محمول کی گئی ہے ان میں سے یہ صورت اولیٰ ہے۔ جو کچھ کہا گیا ہے اس میں سے اصح ہے اور اس کے سوا کسی قول کی طرف التفات نہیں کیا جائے گا۔ جادو، شیاطین کے جوہر کی لطافت اور ان کے افہام کی دقت کی وجہ سے ان سے حاصل کیا جاتا ہے اکثر انسانوں میں سے اسے عورتیں کرتی ہیں خصوصاً حیض کی حالت میں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ ۝ (فلق)

شاعر نے کہا:

اعوذ بربی من النافثات

1۔ صحیح بخاری، باب ھل یدرأ المعتکف من نفسہ، حدیث نمبر 1898، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

میں پھونکیں مارنے والیوں سے اپنے رب کی پناہ مانگتا ہوں۔

مسئلہ نمبر 16: اگر کوئی یہ کہے کہ جمع سے تثنیہ کیسے بدل ہو سکتا ہے حالانکہ مبدل منہ اور بدل ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اس کا جواب تین اعتبار سے ہے: (۱) تثنیہ پر جمع کے اسم کا اطلاق ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاِنْ كَانَ لَهٗۤ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ (النساء: 11) اور ماں کو ثلث (۱/۳) سے السدس (۱/۶) کی طرف صرف دو بھائی یا دو سے زیادہ ہی محجوب کرتے ہیں جیسا کہ سورہ نساء میں آئے گا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ دو جب تعلیم میں اصل تھے تو ان پر نص قائم فرما دی۔ ان کے متبعین کا ذکر نہ کیا جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ۝ (مدثر) (اس پر نو فرشتے مقرر ہیں) تیسری وجہ یہ ہے کہ ان کا خصوصی ذکر کیا ان کے تمرد و سرکشی کی وجہ سے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّ نَخْلٌ وَّ رُمَّانٌ ۝ (الرحمن) (ان باغوں میں پھل، کھجور اور انار ہیں) اور (جبریل و میکائیل) کا قول۔ یہ قرآن میں اور عرب کلام میں کثرت سے ہے کہ عموم میں سے بعض کو خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے ان کے شرف کی وجہ سے اور ان کی فضیلت کی وجہ سے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ (آل عمران: 68) (بے شک نزدیک تر لوگ ابراہیم علیہ السلام سے وہ تھے جنہوں نے ان کی پیروی کی نیز اور و جبریل و میکال ان کے ذکر کی حکمت یا تو ان کی اعلیٰ طہارت کی وجہ سے ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ ۝ (الرحمٰن) یا اکثریت کی وجہ سے جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: جعلت لی الارض مسجداً و تربتها طهوراً (1)۔ میرے لئے زمین سجدہ گاہ اور اس کی مٹی طہارت کا باعث بنائی گئی ہے یا تمرد و سرکشی کی وجہ سے ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے۔ واللہ اعلم

بعض علماء نے فرمایا: ما کا عطف السحر پر ہے اور یہ مفعول ہے اس بنا پر ما، الذی کے معنی میں ہوگا اور جادو، دو فرشتوں پر لوگوں کے فتنہ اور آزمائش کے لئے اتارا گیا تھا (2) اور اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ چاہے اپنے بندوں کو آزمائے اس کی شان کو زیبا ہے۔ جیسے اس نے طالوت کو نہر سے آزمایا تھا اسی وجہ سے وہ فرشتے کہتے: اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ (ہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش ہیں) ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ جادوگر کا عمل کفر ہے اگر تو ہماری اطاعت کرے گا تو نجات پائے گا اور اگر ہماری نافرمانی کرے گا تو ہلاک ہوگا۔

حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر، کعب احبار، سدی اور کلبی سے اس کا معنی مروی ہے۔ جب اولاد آدم میں فساد زیادہ ہو گیا تھا...... یہ حضرت ادریس علیہ السلام کے زمانہ میں تھا .. ملائکہ نے انہیں عار دلائی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر تم ان کی جگہ ہوتے اور تم میں ان عناصر کی ترکیب ہوتی جو ترکیب ان میں ہے تو تم بھی ان جیسے اعمال کرتے۔ فرشتوں نے کہا: تیری ذات پاک ہے ہمارے لئے تو یہ مناسب نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم اپنے اعلیٰ فرشتوں میں سے دو فرشتوں کا انتخاب کرو۔ انہوں نے ہاروت و ماروت کو چنا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں زمین میں اتارا اور ان میں شہوات کا عنصر رکھ دیا، ان پر ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ وہ ایک عورت کے عشق میں مبتلا ہو گئے اس عورت کا نام نبطی زبان میں (بیدخت)

1۔ صحیح بخاری، باب قول اللہ تعالی فلم تجدوا ماء فتیمموا صعیدا طیبا۔ الآیۃ، حدیث 323، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذ

فارسی میں ناھیل اور عربی میں زہرہ تھا، وہ ان کے پاس جھگڑا لے کر آئی اور ان دونوں فرشتوں نے اس سے خواہش پوری کرنی چاہی تو اس نے انکار کیا، مگر یہ کہ وہ دونوں اس کے دین میں داخل ہو جائیں، شراب پئیں اور اس نفس کو قتل کریں جس کو اللہ نے حرام کیا ہے۔ انہوں نے اس کی شرائط قبول کرلیں اور انہوں نے شراب پی۔ وہ جب اس کے پاس گئے تو انہیں ایک شخص نے دیکھ لیا انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ ان فرشتوں سے اس عورت نے اس اسم کے بارے پوچھا جس کے ذریعے وہ آسمان پر چڑھ جاتے تھے۔ وہ بھی انہوں نے اسے سکھا دیا۔ اس نے وہ کلمہ پڑھا اور اوپر چڑھ گئی۔ اسے ایک ستارہ کی شکل میں مسخ کر دیا۔

سالم نے اپنے باپ سے انہوں نے حضرت عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ مجھے کعب الحبر نے بتایا کہ ان دونوں فرشتوں نے اپنا دن مکمل نہ کیا حتیٰ کہ انہوں نے وہ سب کام کر دیئے جو اللہ تعالیٰ نے حرام کیے تھے۔ اس حدیث کے علاوہ میں ہے۔ ان فرشتوں کو دنیا کے عذاب اور آخرت کے عذاب میں اختیار دیا گیا تو انہوں نے دنیا کا عذاب اختیار کیا۔ انہیں بابل میں ایک سرنگ میں عذاب دیا جا رہا ہے۔ بعض نے کہا: بابل سے مراد بابل عراق میں ہے۔ بعض نے کہا: بابل نہاوند ہے (1)، عطا سے مروی ہے کہ حضرت ابن عمر جب زہرہ ستارہ اور سہیل ستارہ کو دیکھتے تو انہیں برا بھلا کہتے اور فرماتے: سہیل یمن میں عشر وصول کرتا تھا اور لوگوں پر ظلم کرتا تھا اور زہرہ ہاروت و ماروت کی دوست تھی۔

ہم کہتے ہیں: یہ سب حضرت ابن عمر وغیرہ سے بعید اور ضعیف ہے کوئی چیز بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ اس قول کو ان فرشتوں کے متعلق اصول رد کرتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی وحی پر امین ہیں اس کے رسولوں کے سفیر ہیں لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ ۝ (التحریم) (نافرمانی نہیں کرتے اللہ کی جس کا اس نے انہیں حکم دیا ہے اور فوراً بجالاتے ہیں جو حکم نہیں فرمایا جاتا ہے) بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝ لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَ هُمْ بِاَمْرِهٖ یَعْمَلُوْنَ ۝ (الانبیاء) (بلکہ وہ تو (اس کے) معزز بندے ہیں نہیں سبقت کرتے اس سے بات کرنے میں اور وہ اس کے حکم پر کاربند ہیں) یُسَبِّحُوْنَ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ لَا یَفْتُرُوْنَ ۝ (الانبیاء) (وہ اس کی پاکی بیان کرتے رہتے ہیں رات دن اور وہ اکتاتے نہیں)

رہی عقل تو وہ فرشتوں کے معصیت میں واقع ہونے کا انکار نہیں کرتی۔ عقلاً ان سے اس کا خلاف پایا جا سکتا ہے جن کا انہیں مکلف کیا گیا ہے ان میں شہوات پیدا کی جا سکتی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے۔ اسی وجہ سے انبیاء، اولیاء، فضلاء، علماء کا خوف تھا لیکن اس جائز کے وقوع کا ادراک نہیں ہو سکتا مگر نقل کے ساتھ۔ اور وہ نقل صحیح نہیں ہے ایک اور چیز جو اس واقعہ کی عدم صحت پر دلالت کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے۔ تاروں کو پیدا فرمایا اور ان کواکب کو پیدا فرمایا جب آسمان کو پیدا فرمایا۔ حدیث میں ہے: جب آسمان کو پیدا کیا گیا تو اس میں سات گردش کرنے والے ستارے پیدا کیے: زحل، مشتری، بہرام، عطارد، زہرہ، سورج اور چاند۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ۝ (الانبیاء) کا یہی معنی ہے اس سے ثابت ہوا کہ زہرہ اور سہیل یہ آدم کی تخلیق سے پہلے موجود تھے پھر فرشتوں کا یہ قول جو نقل کیا گیا ہے کہ "ہمارے لئے یہ مناسب نہیں" باعث عار ہے، تو ہمیں آزمانے پر قادر نہیں یہ کفر ہے، ہم اللہ تعالیٰ کی اس سے پناہ مانگتے ہیں اور معزز فرشتوں کی

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

طرف ایسی نسبت کرنے سے پناہ مانگتے ہیں ہم ان کی پاکیزگی اور طہارت بیان کرتے ہیں جو کچھ ذکر کیا گیا ہے اور جو کچھ مفسرین نے نقل کیا ہے اس سے فرشتے پاک ہیں: سبحان ربك رب العزة عما يصفون۔

مسئلہ نمبر 17: حضرت ابن عباس، ابن ابزی، ضحاک اور حسن نے الملِکین (لام کے کسرہ کے ساتھ) پڑھا ہے۔ ابن ابزی نے کہا: وہ داود اور سلیمان ہیں اس قول کے مطابق ما نافیہ ہے نے اس قول کو ضعیف قرار دیا ہے۔ حسن نے کہا: یہ دو عجمی کافر تھے بابل کے بادشاہ تھے اس قول کے مطابق ما مفعول ہوگا نافیہ نہ ہوگا۔(1)

مسئلہ نمبر 18: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِبَابِلَ یہ تانیث اور تعریف اور عجمہ کی وجہ سے غیر منصرف ہے یہ زمین کا ایک قطعہ ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد عراق اور اس کے اردگرد کا علاقہ ہے۔ حضرت ابن مسعود نے اہل کوفہ سے کہا: تم حیرہ اور بابل کے درمیان ہو۔ قتادہ نے کہا: یہ نصیبین سے راس العین تک کا علاقہ ہے۔ ایک قوم نے کہا: یہ مغرب ہے۔ ابن عطیہ نے کہا(2): یہ ضعیف ہے ایک قوم نے کہا: نہاوند کا پہاڑ ہے۔ بابل نام رکھنے کی وجہ میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا یہ نام اس لئے رکھا گیا کہ اس میں زبانیں گڈمڈ ہوتی تھیں جب نمرود کا محل گرا تھا۔ بعض نے فرمایا: یہ نام اس لئے رکھا گیا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جب ارادہ فرمایا کہ بنی آدم کی زبانوں کے درمیان اختلاف پیدا فرمائے تو اس نے ایک ہوا بھیجی تو اس نے لوگوں کو آفاق سے بابل تک جمع کر دیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کی زبانوں کو گڈمڈ کر دیا پھر اس ہوا نے انہیں شہروں میں جدا جدا کر دیا۔ البلبلة کا معنی ہے، جدا جدا کرنا۔ فرمایا: اس کا معنی الخلیل ہے۔ ابو عمر بن عبد البر نے کہا: جو کچھ البلبلہ کے بارے میں کہا گیا اس میں سے سب سے بہتر وہ روایت ہے جو داؤد بن ابی ہند نے علیاء بن احمر سے انہوں نے حضرت عکرمہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام جب جودی پہاڑ سے نیچے اترے تو انہوں نے ایک شہر بنایا جس کا نام ثمانین (اسی ۸۰) رکھا۔ ایک دن صبح کی تو اس میں اسی زبانیں بولی جا رہی تھیں ان میں سے ایک عربی زبان تھی۔ لوگ ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھ رہے تھے۔

مسئلہ نمبر 19: عبد اللہ بن بشر مازنی نے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دنیا سے بچو۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! یہ دنیا ہاروت و ماروت سے بھی زیادہ جادوگر ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: دنیا ان سے زیادہ جادوگر ہے کیونکہ دنیا تجھے اپنے دھوکے کے ساتھ مسحور کرتی ہے، اپنے فتنہ کو تجھ سے چھپاتی ہے۔ پس یہ تجھے اپنے حرص اور اپنے حصول کے لئے مقابلہ کی دعوت دیتی ہے، اس کے لئے جمع کرنا اور منع کرنا ہے حتیٰ کہ تیرے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے درمیان جدائی کر دیتی ہے تیرے اور حق تعالیٰ کی رویت اور اس کی رعایت کے درمیان فرق کر دیتی ہے۔ پس دنیا ان دونوں سے زیادہ مسحور کن ہے۔ یہ تیرے دل کو اللہ تعالیٰ اور اس کے حقوق ادا کرنے اور وعدہ اور وعید سے روک لیتی ہے دنیا کا جادو، اس کی محبت، اس کی شہوات، تیرا لذت حاصل کرنا اور جھوٹی تمناؤں کے ساتھ تیرا تمنا کرنا ہے حتیٰ کہ تیرے دل کو یہ چیزیں گھیر لیتی ہیں۔ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حبك الشئ يعمى ويصم۔ تجھے کسی شے کی محبت

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　　2۔ ایضاً

اندھا اور بہرہ کر دیتی ہے۔

مسئلہ نمبر 20: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ یہ غیر منصرف ہیں کیونکہ یہ عجمی اور معرفہ ہیں ان کی جمع ھواریت اور مواریت ہے جیسے طواغیت کہا جاتا ہے ھوارتہ و ھوار و موارتہ و موار اس کی مثل جالوت اور طالوت ہے، یہ پیچھے گزر چکا ہے کہ یہ دونوں فرشتے تھے یا اس کے علاوہ تھے۔ اس میں اختلاف ہے زجاج نے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انہوں نے فرشتوں پر جو اتارا گیا تھا اور فرشتے جادو سے ڈرانے کی تعلیم لوگوں کو دیتے تھے نہ ان کی طرف دعوت دینے کی تعلیم دیتے تھے۔ زجاج نے کہا: یہ اکثر اہل لغت اور اہل نظر لوگوں کا قول ہے، مطلب یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اس سے رکنے کی تعلیم دیتے تھے وہ انہیں کہتے تھے کہ ایسا نہ کرو ایسا حیلہ نہ کرو تاکہ تم مرد اور اس کی بیوی کے درمیان تفریق کر دو۔ اس پر نہی (روکنا) اتارا گیا تھا وہ گویا لوگوں سے کہتے ایسا عمل نہ کرو۔ یعلمان بمعنی یُعلِمان (آگاہ کرتے تھے) جیسا کہ فرمایا وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْۤ اٰدَمَ (الاسراء: 70) اس میں کرمنا بمعنی اکرمنا ہے۔

مسئلہ نمبر 21: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ، من تاکید کے لئے زائدہ ہے تقدیر اس طرح ہے: و یعلمان احداً، حَتّٰى يَقُوْلَاۤ حتیٰ کی وجہ سے نصب دی گئی ہے اسی وجہ سے نون حذف کیا گیا ہے ہذیل اور ثقیف کی لغت عتی (یعنی عین غیر معجمہ کے ساتھ) ہے اور یعلمان میں ضمیر ہاروت و ماروت کے لئے ہے(1)۔ یعلمان کے بارے میں دو قول ہیں: (۱) یہ تعلیم سے اپنے باب سے ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ اعلام سے ہے، التعلیم سے نہیں ہے۔ پس یُعَلّمان بمعنی یُعلِمان ہوگا۔ کلام عرب میں تعلّم بمعنی اعلم آیا ہے۔ ابن الاعرابی (2) اور ابن الانباری نے یہ ذکر کیا ہے۔

کعب بن مالک نے کہا:

تعلّم رسول اللہ انک مدرکی　　وان وعیداً منک کالاخذ بالید

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگاہ کیا کہ تو مجھے پانے والا ہے اور تیری وعید، ہاتھ سے پکڑنے کی طرح ہے۔

القطامی نے کہا:

تعلم ان بعد الغی رشدا　　وان لذٰلِكَ الغی انقشاعاً

اس نے آگاہ کیا کہ گمراہی کے بعد ہدایت ہے، اس گمراہی کو (ایک دن) چھٹنا ہے۔

زہیر نے کہا:

تعلمن ھا لعمر اللہ ذاقسما　　فاقدر بذرعك وانظر این تنسلك

ایک اور شاعر کا قول ہے:

تعلم انہ لا طیر الا　　علی متطیر و ھو الثبور

ان تمام اشعار میں تعلم بمعنی اعلم استعمال ہوا ہے۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ ایضاً

اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ جب فرشتوں نے اپنا فتنہ ہونا بتادیا تو دنیا ان سے زیادہ مسحور کن ہوئی جبکہ وہ اپنے فتنہ کو چھپاتی ہے۔

فَلَا تَكْفُرْ ایک جماعت نے کہا: جادو کی تعلیم کے ساتھ کفر نہ کر، ایک فرقہ نے کہا: جادو کے استعمال کے ساتھ کفر نہ کر۔ مہدوی نے کہا: یہ استہزا ہے کیونکہ وہ دونوں اسے یہ کہتے جس کی گمراہی متحقق ہوتی۔(1)

مسئلہ نمبر 22: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا سیبویہ نے کہا: تقدیر عبارت فهم يتعلمون ہے اس کی مثل فرمایا: كن فيكون۔ بعض نے فرمایا: یہ ما يعلمان کے محل پر معطوف ہے کیونکہ (وما يعلمان) اگر اس پر مانا فیہ داخل ہوا ہے تو اس کے ضمن میں تعلیم میں ایجاب ہے(2)۔ فراء نے کہا یہ قول يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ کی طرف لوٹایا گیا ہے یعنی وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے اور سیکھتے تھے۔ اور فَيَتَعَلَّمُوْنَ کا قول اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ کے قول سے متصل ہوگا۔ پس وہ آتے تھے اور سیکھتے تھے۔ سدی نے کہا: وہ دونوں کہتے تھے جو بھی ان کے پاس آتا تھا ہم آزمائش ہیں تو کفر نہ کر اگر وہ لوٹنے سے انکار کرتا تو وہ اسے کہتے راکھ لے آ اور اس میں پیشاب کر جب وہ پیشاب کرتا تو اس سے ایک نور نکلتا جو آسمان کی طرف چڑھ جاتا۔ یہ ایمان ہوتا تھا۔ پھر اس سے سیاہ دھواں نکلتا تھا وہ اس کے کان میں داخل ہوجاتا تھا یہ کفر تھا۔ جب وہ انہیں اس کے متعلق بتاتا جو اس نے دیکھا ہوتا تو وہ اسے جادو بتاتے جس کے ساتھ وہ میاں بیوی میں جدائی کرتا(3)۔ علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ جادوگر اس سے زیادہ پر قادر نہیں ہوتا جو اللہ تعالیٰ نے تفریق کے متعلق بتایا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جادو کی مذمت اور اس کی تعلیم کی غایت کا اظہار کرنے کے لیے اس کو ذکر کیا ہے، اگر وہ اس سے زیادہ پر قادر ہوتا تو اسے بھی ذکر فرماتا۔

ایک طائفہ نے کہا: یہ اغلب سے ذکر کیا ہے۔ اس کا انکار نہیں کہ جادو کی دلوں میں تاثیر ہوتی ہے، محبت، بغض اور شر پیدا کرنے کے اعتبار سے حتیٰ کہ جادوگر میاں، بیوی کے درمیان تفرقہ ڈال دیتا ہے۔ اور وہ مرد اور اس کے دل کے درمیان حائل ہوجاتا ہے۔ یہ تکالیف کے داخل کرنے اور بڑی بڑی بیماریوں میں مبتلا کرنے کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ سب مشاہدہ سے پایا گیا ہے اور اس کا انکار ہٹ دھرمی ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 23: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ، مَا هُمْ یہ جادوگروں کی طرف اشارہ ہے۔ بعض نے فرمایا: یہود کی طرف اشارہ ہے۔ بعض نے کہا: شیاطین کی طرف اشارہ ہے بِضَآرِّيْنَ بِهٖ، بِهٖ کی ضمیر جادو کی طرف لوٹ رہی ہے مِنْ اَحَدٍ میں مِنْ زائدہ ہے۔ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ اللہ کے ارادہ اور اس کی قضا سے نہ کہ اس کے امر سے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ برائیوں کا حکم نہیں دیتا اور اس کے ساتھ اپنی مخلوق پر فیصلہ فرماتا ہے۔ زجاج نے کہا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ کا مطلب ہے الا بعلم الله (یعنی اللہ کے علم سے)۔

نحاس نے کہا ابو اسحاق کا قول، اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ، الا بعلم الله کے معنی میں ہے، غلط ہے کیونکہ علم میں وقد اذنت اذنا کہا جاتا ہے، لیکن ان کے اور اس کے درمیان یہ حلال نہیں تھا وہ ایسا کرتے تھے تو گویا اس نے مجازاً مباح کر دیا۔

مسئلہ نمبر 24: وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ یعنی آخرت میں نقصان دے گی۔ اگرچہ انہوں نے دنیا میں اس کے ساتھ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

تھوڑا سا نفع حاصل کیا۔ بعض نے فرمایا: دنیا میں وہ اسے نقصان دے گا کیونکہ جادو کا نقصان اور تفریق دنیا میں جادوگر پر لوٹتی ہے جب وہ دریافت ہو جائے، کیونکہ اسے تادیب کی جاتی ہے اور اسے جھڑکا جاتا ہے اور اسے جادو کی نحوست لاحق ہوتی ہے۔

باقی آیات واضح ہیں کیونکہ ان کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ وَ لَقَدْ عَلِمُوْا میں لام تاکید ہے لَمَنِ اشْتَرٰىهُ لام قسم کے لئے ہے یہ بھی تاکید کے لئے ہے اور مَنْ محل رفع میں مبتدا ہے کیونکہ لام کا ماقبل اس کے مابعد میں عمل نہیں کرتا۔ اور مَنْ بمعنی الذی ہے۔ فراء نے کہا: یہ مجازات کے لئے ہے۔ زجاج نے کہا: یہ شرط کی جگہ نہیں ہے اور من بمعنی الذی ہے جیسے تو کہتا ہے: علمت لمن جاءك ماله عقلٌ- (من خلاق) من زائدہ ہے تقدیر اس طرح ہے ماله فی الاخرة خلاق اور مثبت کلام میں مِنْ زائدہ نہیں ہوتا۔ یہ بصریوں کا قول ہے۔ کوفیوں نے کہا: کبھی مثبت میں بھی زائدہ ہوتا ہے اور انہوں نے اس قول سے استدلال کیا ہے: وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ (آل عمران: 31)

الخلاق کا معنی حصہ ہے۔ یہ مجاہد کا قول ہے (1)۔ زجاج نے کہا: اہل لغت کے نزدیک اسی طرح ہے مگر یہ خیر کے حصہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس ارشاد کے متعلق پوچھا گیا: وَ لَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ پہلے بتایا کہ وہ جان چکے تھے پھر فرمایا وَ لَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ بتایا کہ وہ نہیں جانتے اس کا جواب وہ ہے جو قطرب اور اخفش نے دیا ہے۔ جو جانتے تھے وہ شیاطین تھے اور جنہوں نے اپنے نفسوں کو بیچا وہ انسان تھے جو نہیں جانتے تھے۔ زجاج نے کہا: علی بن سلیمان نے کہا: میرے نزدیک عمدہ یہ ہے کہ وَ لَقَدْ عَلِمُوْا یہ فرشتوں کے لئے ہو کیونکہ وہ جاننے کے زیادہ مستحق ہیں اور فرمایا عَلِمُوْا (حالانکہ وہ دو تھے) تو یہ ایسے ہے جیسے کہا جاتا ہے الزیدان قاموا۔ زجاج نے کہا: جنہوں نے جانا وہ علماء یہود ہیں۔ لیکن کہا گیا ہے: لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ پس وہ اس شخص کی جگہ داخل ہوئے جس کو کہا جاتا ہے: لست بعالم تو عالم نہیں ہے کیونکہ انہوں نے اپنے علم کے مطابق اپنا عمل ترک کر دیا اور ان سے رہنمائی حاصل کی جنہوں نے جادو کا عمل کیا تھا۔

وَ لَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

''اور اگر وہ ایمان لاتے اور پرہیزگار بنتے تو (اس کا) ثواب اللہ کے ہاں بہت اچھا ہوتا۔ کاش! وہ کچھ جانتے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا یعنی جادو سے بچتے۔ لمثوبۃ ثواب۔ یہ بعض علماء کے نزدیک لو کا جواب ہے۔ اخفش سعید نے کہا: یہاں لو کا جواب لفظاً نہیں ہے لیکن معنی ہے۔ اس کا معنی ہے لاثیبوا۔ انهم میں أن کا محل رفع ہے یعنی لو وقع ایمانهم۔ کیونکہ لو کے ساتھ ہمیشہ فعل ظاہر یا مضمر متصل ہوتا ہے کیونکہ یہ حروف شرط کے قائم مقام ہے کیونکہ اس کے لئے جواب ضروری ہے اور (ان) اس کے ساتھ فعل متصل ہوتا ہے۔ محمد بن زید نے فرمایا: لو کے ساتھ مجاز جائز نہیں کیونکہ تمام حروف مجازات ماضی کو مستقبل کے معنی میں کر دیتے ہیں جب لو میں یہ معنی نہیں ہے تو اس سے مجازات بھی جائز نہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا وَ اسْمَعُوْا ؕ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾

1۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذا

''اے ایمان والو! (میرے حبیب سے کلام کرتے وقت) مت کہا کرو ''راعِنا'' بلکہ کہو ''انظرنا'' اور (ان کی بات پہلے ہی) غور سے سنا کرو اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا یہود کی جہالتوں میں سے ایک اور چیز کو ذکر فرمایا۔ اور مقصود مسلمانوں کو اس کی مثل سے روکنا ہے۔ رَاعِنَا کی حقیقت لغت میں أَرْعِنا و لنرعك۔ کیونکہ باب مفاعلہ دو آدمیوں سے ہوتا ہے۔ پس یہ رعاك الله سے مشتق ہوگا یعنی تو ہماری حفاظت کر اور ہم تمہاری حفاظت کریں گے دارقبنا و لنرقبك۔ آپ ہمارا خیال کریں ہم تمہارا خیال کریں گے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ ارعنا سمعك سے مشتق ہو یعنی آپ ہماری کلام کے لئے اپنے سننے کو فارغ کریں۔ اس خطاب میں جفاء ہے۔ پس مومنین کو حکم دیا کہ الفاظ میں اچھے الفاظ استعمال کریں اور معانی میں سے لطیف معانی اختیار کریں (1)۔ حضرت ابن عباس نے کہا: مسلمان نبی کریم ﷺ سے عرض کرتے رَاعِنَا یعنی وہ رغبت وطلب کی جہت سے عرض کرتے کہ آپ ہماری طرف نظر التفات فرمائیں اور یہ یہود کی زبان میں بددعا تھا۔ یعنی تم سنو تو کبھی نہ سنے، پس یہود نے موقع کو غنیمت جانا اور کہا: پہلے ہم اسے مخفی طور پر بددعا دیتے تھے اب ہم اسے جہراً بددعا دیں گے وہ نبی کریم ﷺ کو اس لفظ سے مخاطب کرتے تھے اور آپس میں ہنستے تھے۔ حضرت سعد بن معاذ نے ان سے یہ کلمہ سنا، حضرت سعد ان کی لغت جانتے تھے۔ حضرت سعد نے یہود سے کہا: تم پر اللہ کی لعنت ہو اب اگر میں نے تم میں سے کسی کو نبی کریم ﷺ کو ایسے کہتے سنا تو میں اس کی گردن اتار دوں گا۔ یہود نے کہا: کیا تم یہ کلمہ نہیں کہتے ہو تو یہ آیت نازل ہوئی۔ مسلمانوں کو اس سے منع کیا گیا تاکہ لفظ میں یہود اقتدا نہ کریں اور اس سے وہ فاسد معنی کا قصد نہ کریں۔

مسئلہ نمبر 2: اس آیت میں دو دلیلیں ہیں: (۱) ایسے الفاظ استعمال کرنے سے اجتناب کرنا جس میں تنقیص شان اور عظمت میں کمی کا اشارہ ہو، اور اس سے تعریضاً قذف کا سمجھنا نکلتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ حد کا موجب ہے جبکہ امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور ان کے اصحاب کے نزدیک حد واجب نہیں۔ انہوں نے تعریض (اشارۃً کلام کرنا) قذف اور غیر قذف کا احتمال رکھتی ہے اور حد شبہات سے ساقط ہو جاتی ہے۔ تفصیلی بیان ان شاء اللہ سورۃ النور میں آئے گا۔ (۲) سد ذرائع کو مضبوطی سے پکڑنا اور آپ کی حمایت کرنا۔ یہ امام مالک اور ان کے اصحاب کا مسلک ہے اور ایک روایت امام احمد بن حنبل سے بھی یہی ہے اس اصل پر کتاب وسنت دلالت کرتی ہے ذریعہ اس امر کو کہتے ہیں جو فی نفسہ ممنوع نہیں ہوتا لیکن اس کے کرنے سے ممنوع کام میں وقوع کا اندیشہ ہوتا ہے۔ کتاب اللہ کی دلیل تو یہ آیت کریمہ ہے، اس سے تمسک کی وجہ یہ ہے کہ یہود یہ لفظ استعمال کرتے تھے ان کی لغت میں یہ بددعا تھا جب اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ جان لیا تو مطلقاً اس لفظ کے استعمال سے ہی منع فرما دیا کیونکہ یہ بددعا کا ذریعہ تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَیَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَیْرِ عِلْمٍ (انعام:108)

1۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذا

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے بتوں کو گالی دینے سے منع فرمایا اس اندیشہ سے کہ مقابلہ میں وہ اللہ تعالیٰ کو گالی دیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَسۡـَٔلۡهُمۡ عَنِ الۡقَرۡيَةِ الَّتِىۡ كَانَتۡ حَاضِرَةَ الۡبَحۡرِ الآیہ (الاعراف: 163) اللہ تعالیٰ نے ہفتہ کے دن شکار حرام کر دیا۔ ہفتہ کے دن مچھلیاں پانی کی سطح پر ظاہر ہو کر آتی تھیں وہ انہیں ہفتہ کے دن روک دیتے تھے اور اتوار کے دن پکڑ لیتے تھے۔ پس روکنا شکار کا ذریعہ تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے بندروں اور خنازیر میں انہیں مسخ کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ہمارے لئے تحذیر کے لئے ذکر فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم وحوا کو فرمایا: وَلَا تَقۡرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (البقرہ: 35) یہ پہلے گزر چکا ہے۔

رہیں احادیث، تو اس مفہوم میں بہت سی احادیث صحیحہ ثابت ہیں۔ ان میں سے ایک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ حضرت ام حبیبہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہما نے ایک کنیسہ کا ذکر کیا جو انہوں نے حبشہ میں دیکھا تھا اس میں تصاویر تھیں۔ انہوں نے اس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ وہ لوگ تھے ان میں کوئی نیک شخص ہوتا تھا پھر وہ مر جاتا تھا تو یہ اس کی قبر پر مسجد بناتے تھے اور اس میں ان نیک لوگوں کی تصویریں بناتے تھے یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک برے ترین لوگ ہیں (1)۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: ان کے پہلے لوگوں نے یہ عمل اس لئے کیا تھا تا کہ ان تصویروں کو دیکھ کر انس حاصل کریں اور ان کے احوال صالحہ کو یاد کریں اور یہ بھی ان کی طرح کوشش اور محنت کریں اور ان کی قبور کے پاس اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں۔ پس ان پر جب عرصہ دراز گزر گیا پھر ان کے بعد کے لوگ آئے جو پہلے لوگوں کی اغراض سے جاہل تھے۔ شیطان نے ان میں وسوسہ ڈالا کہ تمہارے آباء واجداد ان تصویروں کی عبادت کرتے تھے۔ پس انہوں نے ان کی عبادت شروع کر دی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی مثل سے منع فرمایا اور جو ایسا کرے اس پر سخت انکار اور وعید فرمائی اور جو کام اس عمل تک پہنچانے والے تھے ان سے بھی روک دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس قوم پر اللہ تعالیٰ کا سخت غضب ہے جس نے اپنے انبیاء اور نیک لوگوں کی قبور کو مساجد بنایا اور فرمایا: اے اللہ! میری قبر کو ایسا بت نہ بنانا جس کی عبادت کی جائے۔ مسلم نے نعمان بن بشیر سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے حلال واضح ہے اور حرام واضح ہے ان کے درمیان متشابہات امور ہیں جو ان شبہات سے بچے گا وہ اپنے دین اور اپنی عزت کو بچا لے گا اور جو شبہات میں واقع ہو گا وہ حرام میں واقع ہو گا جیسے چرواہا چراگاہ کے اردگرد (مویشی) چراتا ہے قریب ہے کہ وہ اس میں واقع ہو جائے۔ (الحدیث) (2)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شبہات کی طرف جانے سے منع فرمایا اس خوف سے کہ وہ محرمات میں واقع ہو جائے گا۔ یہ سد ذرائع ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بندہ متقین میں سے نہیں ہوتا حتیٰ کہ وہ اس چیز کو ترک نہ کر دے جس میں کوئی حرج نہیں احتیاط کرتے ہوئے کہ یہ ان چیزوں میں سے ہو جس میں حرج ہے (3)۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کبیرہ گناہوں میں سے اپنے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب بناء المسجد علی القبر، حدیث نمبر 1255، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح بخاری، باب الحلال بین والحرام بین وبینهما مشبهات، حدیث نمبر 1910، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ سنن ابن ماجہ، باب الورع والتقوی، حدیث نمبر 4204، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

والدین کو گالی دینا ہے۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! کیا کوئی شخص اپنے والدین کو گالی دیتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں۔ ایک شخص دوسرے کے والد کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کے باپ کو گالی دیتا ہے۔ وہ اس کی ماں کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کی ماں کو گالی دیتا ہے جو دوسرے کے والدین کو گالی دیتا ہے اسے اپنے والدین کو گالی دینے والا فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم بیع عینہ کرو گے اور گائیوں کے دموں کو پکڑو گے اور کھیتی پر خوش ہو گے اور جہاد کو ترک کر دو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر ذلت کو مسلط فرمائے گا اور یہ ذلت تم سے دور نہیں کرے گا حتیٰ کہ تم اپنے دین کی طرف لوٹ آؤ (1)۔ ابو عبید الہروی نے کہا: بیع عینہ یہ ہے کہ ایک آدمی دوسرے شخص کو معلوم قیمت کے ساتھ مخصوص مدت تک ایک چیز فروخت کرتا تھا پھر بیچنے والا اس خریدنے والے سے وہی چیز اس سے کم قیمت میں خرید لیتا تھا۔

فرمایا: اگر بیع عینہ طلب کرنے والے کی موجودگی میں سامان کسی دوسرے شخص سے معلوم ثمن کے ساتھ خریدے۔ پھر وہ قبضہ کرے پھر وہ عینہ طلب کرنے والے کو اس قیمت سے زیادہ پر بیچ دے، جس میں اس نے خریدی تھی ایک معین مدت تک، پھر یہ مشتری پہلے بائع کو نقد فروخت کرے کم قیمت پر تو یہ بھی بیع عینہ ہوگی۔ یہ پہلی صورت سے زیادہ آسان ہے اور بعض کے نزدیک یہ جائز ہے، اس کو بیع عینہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ صاحب عینہ کو نقدی حاصل ہوتی ہے، یہ اس لئے ہے کہ حاضر مال موجود ہے مشتری اسے خریدتا ہے تا کہ عین حاضر مال کے ساتھ اسے بیچے جو اسے جلدی مل جائے۔

ابن وہب نے مالک سے روایت کیا ہے کہ حضرت زید بن ارقم کی ام ولد نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ذکر کیا کہ اس نے زید کو ایک غلام آٹھ سو میں ادھار بیچا ہے پھر اس سے نقد چھ سو میں خرید لیا ہے۔ حضرت عائشہ نے فرمایا: برا ہے جو تو نے بیچا ہے اور برا ہے جو تو نے خریدا ہے۔ زید کو یہ پہنچاؤ کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں کیے ہوئے جہاد کو باطل کر دیا اگر اس نے اس بیع سے توبہ نہ کی۔ یہ حضرت عائشہ نے یقیناً اپنی رائے سے نہیں کہا ہوگا کیونکہ اعمال کا باطل کرنا، اس کی معرفت صرف وحی سے ہو سکتی ہے، تو ثابت ہوا کہ یہ مرفوع حدیث ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: سود اور شک (والی بیع) کو چھوڑو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے دراہم کی دراہم کے ساتھ بیع کرنے سے منع فرمایا جن کے درمیان حریزہ ہو۔

میں کہتا ہوں: یہ ہمارے سد ذرائع پر دلائل ہیں، اس پر مالکی علماء نے بیوع وغیرہ میں کتاب الآجال وغیرہ مسائل کی بنیاد رکھی ہے۔ شوافع کے نزدیک کتاب الآجال (مدت کے بارے میں مسائل) نہیں کیونکہ یہ ان کے نزدیک مختلف مستقل عقود ہیں۔ انہوں نے کہا: اشیاء کی اصل ظواہر پر ہے نہ کہ ظنون (گمان) پر ہے۔ مالکی علماء نے اس سامان کو زیادہ دراہم کے حصول کا ذریعہ بنایا ہے اور یہ عین ربا ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا۔ یہ نہی تحریمی ہے جیسا کہ پہلے گزرا ہے۔ حضرت حسن نے راعناً پڑھا یعنی تنوین کے ساتھ اور فرمایا: اس کا مطلب ہے: نامناسب بات۔ یہ مصدر ہے قول کی وجہ سے اسے نصب دی گئی ہے۔ یعنی لا تقولوا رعونۃ۔ اور زر بن حبیش اور اعمش نے راعونا پڑھا ہے، یہ پہاڑ کی چوٹی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جبل

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی النہی عن العینۃ، حدیث نمبر 3003، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ارعن چوٹی والا پہاڑ، جیش ارعن یعنی متفرق لشکر۔ اسی طرح رجل ارعن، متفرق جنوں والا جس کی عقل مجتمع نہ ہو، نحاس سے یہ مروی ہے۔ ابن فارس نے کہا رعُن الرجل یَرْعَنُ رعنا فھو أرعن، محتاج شخص، المرأۃ رعناء، بلند عورت، بصرہ کو رعناء کہتے ہیں کیونکہ وہ پہاڑ کی بلندی کے مشابہ ہے۔ ابن درید نے یہی کہا ہے۔ فرزدق نے کہا ہے:

لو لا ابن عتبہ عمرو والرجاء لہ ما کانت البصرۃ الرعناء لی وطناً

اگر ابن عتبہ عمرو نہ ہوتا اور اس کی امید نہ ہوتی تو بصرہ رعناء میرا وطن نہ ہوتا۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقُوْلُوا انْظُرْنَا مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ حضرت محمد ﷺ کو عزت و احترام سے مخاطب کرو۔ مطلب یہ ہے کہ ہماری طرف توجہ فرمائیں، ہماری طرف نظر کرم فرمائیں۔ تعدیہ کا حرف حذف کیا گیا ہے یعنی تقدیر یوں ہے: وانظر الینا

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

ظاھرات الجمال والحسن ینظر ن کما ینظر الاراك الظباء

ظاہری حسن و جمال والی دیکھی جاتی ہیں جس طرح ہرنیاں اراک بان کے درخت کو دیکھتی ہیں۔

اس شعر میں عبارت الی الاراک تھا۔ مجاہد نے کہا: اس کا معنی ہمیں سمجھائیے اور ہمارے لئے بیان فرمائیے۔ بعض نے فرمایا اس کا معنی ہے ہمارا انتظار فرمائیے اور ہمارے ساتھ آہستہ آہستہ کلام فرمائیے۔ شاعر نے کہا:

فانکما ان تنظرانی ساعۃً من الدھر ینفعنی لدی ام جندب

تم دونوں اگر ایک گھڑی میری طرف دیکھ لو تو مجھے ام جندب کے سامنے یہ نفع دے گا۔

ظاہراً اس کا مطلب آنکھ سے دیکھنے کی استدعا ہے جو دیکھنا تدبر حال سے مقترن ہو۔ یہ راعنا کا معنی ہے، مومنین کے لئے لفظ بدل دیا گیا اور یہود کا تعلق زائل ہو گیا۔ اعمش وغیرہ نے أَنْظِرْنا ہمزہ قطعی اور ظاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی ہمیں مہلت دیجئے حتیٰ کہ ہم آپ کی بات سمجھ جائیں اور آپ سے مفہوم حاصل کرلیں۔ (1)

شاعر نے کہا:

ابا ھندٍ فلا تعجل علینا وانظرنا نخبرك الیقینا

اے ابو ہند! ہم پر جلدی نہ کر اور ہمیں مہلت دے ہم تجھے یقینی خبر دیں گے۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاسْمَعُوْا پہلے نہی فرمائی اب حکم دیا۔ سننے کا حکم دیا جس کے ضمن میں اطاعت ہے۔ جان لو! جو اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کرے گا وہ کافر ہوگا عذاب الیم کا مستحق ہوگا۔ (2)

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ لَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ ایضاً

مِّنۡ رَّبِّكُمۡؕ وَاللّٰهُ يَخۡتَصُّ بِرَحۡمَتِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِيۡمِ ۞

"نہیں پسند کرتے وہ لوگ جو کافر ہیں اہل کتاب سے اور نہ مشرک کہ اتاری جائے تم پر کچھ بھلائی تمہارے رب کی طرف سے اور اللہ خاص فرمالیتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ بہت بڑا فضل (فرمانے) والا ہے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا يَوَدُّ یعنی خواہش نہیں کرتے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ وَ لَا الۡمُشۡرِكِيۡنَ، وَ لَا الۡمُشۡرِكِيۡنَ، اہل پر معطوف ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ وَ لَا الۡمُشۡرِكِيۡنَ کا عطف الَّذِيۡنَ پر ہو۔ یہ نحاس کا قول ہے۔ اَنۡ يُّنَزَّلَ عَلَيۡكُمۡ مِّنۡ خَيۡرٍ، من زائدہ ہے خیر فعل مجہول کا اسم ہے اَنۡ محل نصب میں ہے، یعنی بان ینزل - وَاللّٰهُ يَخۡتَصُّ بِرَحۡمَتِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: يَخۡتَصُّ بِرَحۡمَتِهٖ۔ یعنی بنبوتہ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کے ساتھ مختص فرمایا (1)۔ ایک قوم نے کہا: الرحمۃ سے مراد قرآن ہے (2)۔ بعض نے فرمایا: اس آیت میں رحمت عام ہے ان تمام انواع رحمت کو شامل ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر پہلے فرمائیں اور جواب فرمارہا ہے (3)۔ کہا جاتا ہے: رحِم یرحمُ جب کوئی نرم ہو جائے، الرحم والمرحمۃ والرحمۃ تمام کا ایک معنی ہے۔ ابن فارس نے یہ کہا ہے: رحمۃ اللہ لعبادہ، اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر انعام فرمانا اور انہیں معاف کرنا مراد ہے وَاللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِيۡمِ۔ ذُو بمعنی صاحب ہے۔

مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَاۤ اَوۡ مِثۡلِهَا ؕ اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ۞

"جو آیت ہم منسوخ کر دیتے ہیں یا فراموش کرا دیتے ہیں تو لاتے ہیں (دوسری) بہتر اس سے یا (کم از کم) اس جیسی کیا تجھے علم نہیں کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ کر سکتا ہے"۔

اس میں پندرہ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا، نُنۡسِهَا کا عطف ننسخ پر ہے، جزم کی وجہ سے یٰ کو حذف کیا گیا ہے اور جنہوں نے ننسأها پڑھا ہے انہوں نے جزم کی وجہ سے ہمزہ کو حذف کر دیا ہے اس کا معنی آگے آئے گا نات یہ جواب شرط ہے۔ یہ احکام میں ایک عظیم آیت ہے اس کا سبب یہ ہے کہ یہود نے جب مسلمانوں سے کعبہ کی طرف منہ کرنے میں حسد کیا اور اس کی وجہ سے اسلام پر طعن کیا اور کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پہلے اپنے اصحاب کو ایک چیز کا حکم دیتا ہے پھر اس سے منع کر دیتا ہے۔ پس قرآن ان کی طرف سے ہے اسی وجہ سے قرآن کا بعض، بعض کے مخالف ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَاِذَا بَدَّلۡنَاۤ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ (نحل: 101) اور مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ کا ارشاد نازل فرمایا۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

مسئلہ نمبر 2: اس باب کی معرفت بڑی مؤکد ہے اور اس کا عظیم فائدہ یہ ہے کہ اس کی معرفت سے علماء کو بھی استغناء نہیں اس کا انکار صرف غبی جہلاء ہی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اس پر بہت احکام مرتب ہوتے ہیں حرام سے حلال کی معرفت ہوتی ہے۔ ابوالبختری نے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت علی رضی اللہ عنہ مسجد میں داخل ہوئے جبکہ وہاں ایک شخص لوگوں کو ڈرا رہا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا: یہ اجتماع کیا ہے؟ لوگوں نے بتایا: ایک شخص لوگوں کو وعظ و نصیحت کر رہا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ شخص لوگوں کو نصیحت نہیں کر رہا بلکہ یہ کہہ رہا ہے: میں فلاں ابن فلاں ہوں مجھے پہچانو! حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے بلایا اور پوچھا: کیا تو ناسخ، منسوخ کا علم رکھتا ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہماری مسجد سے نکل جا اس میں تو وعظ و نصیحت نہ کر۔ دوسری روایت میں ہے، کیا تو ناسخ و منسوخ کو جانتا ہے؟ اس نے کہا: نہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تو خود بھی ہلاک ہوا اور دوسروں کو بھی ہلاک کیا۔

اس کی مثل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

مسئلہ نمبر 3: عرب کلام میں نسخ دو وجوہ سے ہے:

۱۔ ایک اس کا معنی نقل کرنا ہے جیسے ایک کتاب سے دوسری کتاب کو نقل کرنا، اس معنی کے اعتبار سے پورا قرآن منسوخ ہوگا یعنی یہ لوح محفوظ سے نقل ہوا ہے اور بیت العزت کی طرف آسمان دنیا میں اترا ہے۔ اس آیت میں اس کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝ (الجاثیہ) یعنی ہم اس کے لکھنے اور اس کے اثبات کا حکم دیتے ہیں۔ (1)

۲۔ نسخ کا دوسرا معنی ابطال اور زائل کرنا ہے۔ یہاں یہی مقصود ہے اور یہ لغت میں پھر دو قسموں میں منقسم ہے: (ا) کسی شے کو ختم کر دینا اور زائل کر دینا اور دوسری چیز کو اس کے قائم مقام کر دینا۔ اس سے نسخت الشمس الظل، جب سورج سائے کو مٹا دے اور اس کے قائم مقام دوسرے سائے کو کر دے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا یہی معنی ہے: مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَاۤ، اور صحیح مسلم میں ہے: لم تکن نبوۃ قط الا تناسخت یعنی نبوت ایک حال سے دوسرے حال کی طرف پھرتی رہی یعنی امت کا معاملہ پھرتا رہا۔ ابن فارس نے کہا: نسخ کا معنی کتاب کا نقل کرنا، اور النسخ کا معنی کسی ایسے امر کو ختم کر دینا جس پر پہلے عمل ہو رہا تھا پھر تو اسے کسی حادثہ کی وجہ سے ختم کر دے، جیسے کسی خاص امر کے لئے ایک آیت نازل ہوتی پھر دوسری آیت کے ساتھ وہ منسوخ ہو جاتی۔ ہر وہ چیز جو کسی شے کے قائم مقام ہو جائے تو اس نے اسے منسوخ کر دیا۔ کہا جاتا ہے: انتسخت الشمس الظل، الشیب الشباب سورج نے سائے کو ختم کر دیا، بڑھاپے نے جوانی کو ختم کر دیا۔ تناسخ الورثۃ ورثاء دوسرے ورثاء کے بعد مر گئے، اور میراث کی اصل قائم ہے۔ تقسیم نہیں ہوئی۔ اسی طرح تناسخ الازمنۃ والقرون ہے یعنی ہر زمانہ اور ہر قوم پہلے زمانہ اور پہلی قوم کو ختم کر دیتی ہے۔

دوسری قسم یہ ہے کہ چیز کو ختم کر دینا اور اس کے قائم مقام دوسری چیز نہ رکھنا۔ جیسے نسخت الریح الاثر (2) ہوا نے اثر مٹا

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

دیا۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ (الحج:52) (جو شیطان ڈالتا ہے اللہ تعالیٰ اسے ختم کر دیتا ہے) اس کی تلاوت نہیں کی جاتی اور اس کا بدل مصحف میں ثابت نہیں ہوتا۔ ابو عبید نے کہا: یہ نسخ کی دوسری قسم تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک سورت نازل ہوتی تھی پھر وہ اٹھالی جاتی تھی نہ اس کو پڑھا جاتا تھا اور نہ اس کو لکھا جاتا تھا۔

میں کہتا ہوں: اسی سے وہ روایت ہے جو حضرت ابی بن کعب اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ سورۂ احزاب، طوالت میں سورۂ بقرہ کے برابر تھی جیسا کہ سورۂ احزاب میں یہ تفصیل سے بیان ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اس پر ایک دلیل یہ بھی ہے جو ابو بکر انباری نے بیان کی۔ فرمایا: مجھے میرے باپ نے بیان کیا، انہوں نے فرمایا: ہمیں نصر بن داؤد نے بیان کیا انہوں نے کہا: ہمیں ابو عبید نے بیان کیا ہمیں عبداللہ بن صالح نے بیان کیا انہوں نے لیث سے انہوں نے یونس اور عقیل سے انہوں نے ابن شہاب سے روایت کیا، فرمایا: مجھے ابوامامۃ بن سہل بن حنیف نے حضرت سعید بن مسیب کی مجلس میں بیان کیا کہ ایک شخص رات کو اٹھا تا کہ قرآن کی سورت تلاوت کرے تو وہ اس میں سے کچھ بھی پڑھنے پر قادر نہ ہوا۔ دوسرا اٹھا تو وہ بھی کوئی آیت پڑھنے پر قادر نہ ہوا، تیسرا اٹھا تو وہ بھی اس سورت میں سے کچھ پڑھنے پر قادر نہ ہوا۔ وہ صبح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ ایک نے کہا میں یا رسول اللہ! کھڑا ہوا تا کہ قرآن کی سورت پڑھوں تو میں اس کی کوئی آیت پڑھنے پر قادر نہ ہوا، دوسرا اٹھا اس نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میری بھی یہی کیفیت تھی، تیسرا اٹھا اس نے کہا: اللہ کی قسم! یا رسول اللہ! میری بھی یہی کیفیت تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ سورت گزشتہ رات اللہ تعالیٰ نے منسوخ کر دی۔ ایک روایت میں ہے، سعید بن مسیب سنتے تھے جو ابوامامہ بیان کرتے تھے اور انکار نہیں کرتے تھے۔

مسئلہ نمبر 4: متاخرین علماء اسلام کے ایک طائفہ نے اس کے جواز کا انکار کیا ہے اور ان کے خلاف یہ حجت پیش کی گئی ہے کہ سلف صالحین کا اجماع ہے کہ شریعت میں نسخ واقع ہوا ہے۔ اسی طرح یہود کے ایک گروہ نے بھی نسخ کا انکار کیا ہے، اس کے خلاف یہ حجت پیش کی گئی ہے کہ ان کے اپنے خیال کے مطابق تورات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی سے نکلنے کے وقت فرمایا: ہر چوپایہ تمہارے لئے اور اولاد کے لئے خوراک ہے اور میں نے یہ تمہارے لئے مطلق رکھا ہے جیسے نبات تمہارے لئے حلال کی ہیں لیکن خون حلال نہیں ہے اسے نہ کھانا پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اور بنی اسرائیل پر بہت سے حیوان حرام کر دیئے۔ اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام بھائی کی بہن سے شادی کرتے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دوسرے انبیاء پر اس کو حرام کر دیا اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا بیٹا ذبح کرنے کا حکم دیا پھر فرمایا تو اسے ذبح نہ کر۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ وہ اپنے ان لوگوں کو قتل کریں جو بچھڑے کی پوجا کرتے ہیں پھر ان سے تلوار اٹھانے کا حکم دیا، پہلے وہ اپنی نبوت کے ساتھ مکلف نہ تھے پھر اس کے بعد اس کے ساتھ مکلف ہوئے۔ یہ البداء سے نہیں ہے بلکہ یہ بندوں کو ایک عبادت سے دوسری عبادت کی طرف نقل کرنا ہے اور ایک حکم کو دوسرے حکم کی طرف نقل کرنا ہے اس میں کوئی خاص حکمت ہوتی ہے، جس کا اظہار مقصود ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی مملکت کا کمال مقصود ہوتا ہے۔ اس میں عقلاء کا کوئی اختلاف نہیں کہ انبیاء کرام کی شریعتوں سے مخلوق کے دنیوی اور اخروی مصالح کا

قصد کیا گیا ہے، بدأہ تو تب لازم آتی جب وہ امور کے انجام کو جاننے والا نہ ہوتا اور جو انجام کو جاننے والا ہوتا ہے وہ مصالح کی تبدیلی کے مطابق اپنے خطابات کو تبدیل کرتا ہے، جیسے طبیب اپنے مریض کے احوال کے مطابق خطابات کو بدلتا ہے اس نے اپنی مشیت اور ارادہ سے اپنی مخلوق میں یہ تبدیلی رکھی ہے، اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اس کا خطاب بدلتا ہے۔ اس کا علم اور اس کا ارادہ تبدیل نہیں ہوتا اور یہ چیز اللہ تعالیٰ کی جہت سے محال ہے۔

یہود نے نسخ اور بداء کو ایک چیز بتایا ہے اسی وجہ سے انہوں نے نسخ کو جائز قرار نہیں دیا، پس وہ گمراہ ہوئے (1)۔ نحاس نے کہا: نسخ اور البداء کے درمیان فرق یہ ہے کہ نسخ کا مطلب ہے ایک عبادت کو دوسری عبادت کی طرف بدلنا، (مثلاً) پہلے ایک چیز حلال تھی اسے حرام کر دیا، پہلے ایک چیز حرام تھی پھر اسے حلال کر دیا اور البداء یہ ہے کہ پہلے جس چیز پر عزم کیا گیا ہے اسے ترک کر دینا جیسے تو کہتا ہے تم آج فلاں کے پاس جاؤ پھر تو کہتا ہے اس کے پاس نہ جاؤ۔ تیرے لئے پہلے قول سے عدول ظاہر ہوتا ہے یہ انسان کو لاحق ہوتا ہے ان کے نقصان اور کمی کی وجہ سے۔ اسی طرح اگر تو کہے اس سال تو یہ چیز کاشت کر پھر تو کہے یہ نہ کر، تو یہ البداء ہے۔

مسئلہ نمبر 5: ناسخ حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہے مجازاً خطاب شرعی کو ناسخ کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے ذریعے نسخ واقع ہوتا ہے (2)۔ جس طرح مجازاً المحکوم فیہ کو ناسخ کا نام دیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: رمضان کے روزوں نے عاشوراء کے روزہ کو منسوخ کر دیا۔ منسوخ وہ ہوتا ہے جو زائل کیا جاتا ہے اور منسوخ عنہ وہ ہوتا ہے جو زائل کی گئی عبادت کا مکلف ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 6: ہمارے ائمہ کی عبارات ناسخ کی تعریف میں مختلف ہیں۔ اہل سنت میں سے ماہر علماء کی رائے یہ ہے کہ پہلے حکم شرعی کو بعد میں آنے والے خطاب سے زائل کرنا ہے۔ قاضی عبدالوہاب اور قاضی ابوبکر نے بھی اسی طرح تعریف کی ہے اور انہوں نے یہ زیادہ لکھا ہے اگر یہ والا حکم نہ آتا تو پہلا حکم ہی باقی رہتا (3)۔ ان دونوں حضرات نے نسخ کے لغوی معنی کا بھی لحاظ رکھا ہے کیونکہ نسخ کا لغوی معنی اٹھا دینا اور زائل کرنا ہے اور انہوں نے حکم عقلی سے احتراز کیا ہے۔ خطاب کا لفظ ذکر کیا تاکہ وجوہ دلالت نص، ظاہر، مفہوم وغیرہ کو شامل ہو جائے۔ اور قیاس اور اجماع کو خارج کر دے کیونکہ قیاس اور اجماع میں نہ تو نسخ متصور ہو سکتا ہے نہ ان کے ساتھ نسخ ہو سکتا ہے اور تراخی کے ساتھ مقید کیا ہے کیونکہ اگر بعد والا حکم پہلے سے متصل ہو تو وہ حکم کا بیان ہوتا ہے۔ ناسخ نہیں ہوتا یا دوسرا کلام، پہلے کلام کو اٹھانے والا ہوتا ہے۔ جیسے قم لا تقم، تو کھڑا ہو تو کھڑا نہ ہو۔

مسئلہ نمبر 7: منسوخ ہمارے اہل سنت کے ائمہ کے نزدیک وہ حکم ہوتا ہے جس کی ذات ثابت ہو نہ اس کی مثل جیسا کہ معتزلہ کہتے ہیں کہ وہ خطاب، جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مستقبل میں ثابت حکم کی مثال آنے والی نص سے زائل ہونے والا ہے اور اس قول کی طرف ان کی رہنمائی ان کے مذہب نے کی ہے کہ اوامر مراد ہوتے ہیں اور حُسن، حَسَن کی ذاتی صفت ہے اور اللہ کی مراد حَسَن ہے اس کو ہمارے علماء نے اپنی کتب میں رد کیا ہے۔ (4)

مسئلہ نمبر 8: ہمارے علماء کا اختلاف ہے کہ کیا اخبار میں نسخ داخل ہوتا ہے یا نہیں؟ جمہور علماء کا قول یہ ہے کہ نسخ،

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

اوامر ونواہی کے ساتھ خاص ہے اور خبر میں نسخ داخل نہیں ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کذب محال ہے (1)۔ بعض نے فرمایا: خبر جب حکم شرعی اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہو تو اس کا نسخ جائز ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَ الْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا (النحل: 67) اس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

مسئلہ نمبر 9: عموم سے تخصیص وہم دلاتی ہے کہ یہ نسخ ہے حالانکہ ایسا نہیں ہوتا کیونکہ مخصص کو عموم شامل ہی نہیں ہوتا، اگر عموم کسی شے کو شامل ہو پھر اس شے کو عموم سے نکالا جائے تو یہ نسخ ہو گا تخصیص نہ ہو گی (2)۔ اور متقدمین علماء مجازاً تخصیص پر نسخ کا اطلاق کرتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 10: کبھی شرع میں ایسی اخبار وارد ہوتی ہے جن کا ظاہر مطلق اور استغراق ہوتا ہے اور ان کی تقیید دوسری جگہ وارد ہوتی ہے، پس وہ اطلاق اٹھ جاتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (البقرہ: 186) جب پوچھیں آپ سے (اے میرے حبیب) میرے بندے میرے متعلق تو (انہیں بتاؤ) میں (ان کے) بالکل نزدیک ہوں قبول کرتا ہوں دعا، دعا کرنے والے کی)۔

اس آیت میں حکم کا ظاہر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر دعا کرنے والے کی دعا ہر حال میں قبول فرماتا ہے لیکن دوسرے مقام پر اس کی قید آئی ہے: فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ (انعام: 41)

وہ شخص جسے بصیرت نہیں ہوتی وہ گمان کرتا ہے کہ یہ اخبار میں نسخ کے باب سے ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ اطلاق اور تقیید کے باب سے ہے۔ اس مسئلہ کا زیادہ بیان اپنے مقام پر آئے گا۔ ان شاء اللہ۔

مسئلہ نمبر 11: ہمارے علماء نے فرمایا (3): اثقل (بھاری حکم) کا نسخ اخف (ہلکے حکم) کی طرف جائز ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے دس کے مقابلہ میں ایک شخص کے ٹھہرے رہنے کے حکم کو دو کے مقابلہ میں ایک شخص کے ٹھہرے رہنے کے ساتھ منسوخ کر دیا۔ اور اخف حکم سے اثقل کی طرف نسخ بھی جائز ہے جیسے عاشوراء کے حکم کو رمضان کے روزوں سے منسوخ کر دیا۔ اس کا بیان روزوں والی آیت میں آئے گا۔ کبھی ایک حکم کو اس جیسے حکم سے منسوخ کیا جاتا ہے جیسے ایک قبلہ کو دوسرے قبلہ سے منسوخ کر دیا۔ کبھی ایک چیز کو منسوخ کیا جاتا ہے اور اس کا بدل نہیں دیا جاتا جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سرگوشی کرنے سے پہلے صدقہ کرنے کے حکم کو منسوخ کر دیا۔ قرآن کو قرآن کے ساتھ منسوخ کیا جاتا ہے اور سنت کو عبارت سے منسوخ کیا جاتا ہے اور عبارت سے مراد "الخبر المتواتر القطعی" ہے اور خبر واحد کو خبر واحد سے منسوخ کیا جاتا ہے۔

ماہرین ائمہ کا نظریہ یہ ہے کہ قرآن، سنت سے بھی منسوخ ہوتا ہے اور یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں موجود ہے: لا وصية لوارث کہ وارث کے لئے وصیت نہیں ہے (4)۔ یہ امام مالک کے ظاہر مسائل سے ہے۔ امام شافعی (5) اور ابو الفرج مالکی نے اس کا انکار کیا ہے۔ پہلا قول صحیح ہے، اس دلیل سے کہ یہ سب اللہ کا حکم ہے اور اللہ کی طرف سے ہے اگرچہ اسماء میں

1۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذا
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً
4۔ سنن ابن ماجہ، باب لا وصية لوارث، حدیث نمبر 2703، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
5۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذا

اختلاف ہے۔ مثلاً شادی شدہ زانی جس کو رجم کیا جاتا ہے اس سے کوڑوں کی سزا ساقط ہے اور یہ سنت سے نبی کریم ﷺ کے فعل سے ساقط ہے اور یہ واضح ہے۔ ماہرین علماء کا یہ بھی نظریہ ہے کہ سنت، قرآن کے ساتھ منسوخ ہوتی ہے اور یہ قبلہ کی تحویل میں موجود ہے کیونکہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا کتاب اللہ میں نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ (الممتحنہ:10) ان عورتوں کا رجوع، نبی کریم ﷺ کا قریش سے صلح کی بنا پر ہوا تھا۔

ماہرین کا یہ بھی خیال ہے کہ عقلاً خبر واحد سے قرآن کا نسخ جائز ہے۔ پھر اس میں اختلاف ہے کہ یہ شرعاً واقع ہوا ہے یا نہیں۔ ابوالمعالی وغیرہ کا خیال ہے کہ مسجد قبا کے واقعہ میں واقع ہوا تھا اس کا بیان آگے آئے گا۔ ایک قوم نے اس کا انکار کیا ہے۔ قیاس کے ساتھ نص کا نسخ صحیح نہیں ہے، کیونکہ قیاس کی شرائط میں سے ہے کہ وہ نص کے مخالف نہ ہو۔

یہ نسخ سب نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ میں تھا، لیکن نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد اور شریعت کے استقرار کے بعد، امت کا اجماع ہے کہ نسخ نہیں ہے اسی وجہ سے اجماع نہ منسوخ ہوتا ہے نہ اس کے ساتھ نسخ واقع ہوتا ہے کیونکہ اجماع کا انعقاد وحی کے ختم ہونے کے بعد واقع ہوا ہے۔ جب ہم کوئی ایسا اجماع پاتے ہیں جو نص کے مخالف ہوتا ہے تو پھر یہ جانا جائے گا کہ اجماع کسی ناسخ نص کی طرف منسوب ہے جسے ہم نہیں جانتے مخالف نص ایسی ہوتی ہے جس پر عمل چھوڑا جاتا ہے اور اس کا مقتضی منسوخ ہوتا ہے لیکن اس کی تلاوت منسوخ نہیں ہوتی جیسے قرآن میں سال کی عدت والی آیت تلاوت کی جاتی ہے، اس میں غور کرو یہ ایک نفیس گفتگو ہے۔ کبھی حکم منسوخ ہوتا ہے، تلاوت منسوخ نہیں ہوتی جیسے نبی کریم ﷺ سے سرگوشی کرنے سے پہلے صدقہ کرنے کا حکم، کبھی تلاوت منسوخ ہوتی ہے حکم منسوخ نہیں ہوتا جیسے آیت رجم۔ کبھی تلاوت اور حکم دونوں منسوخ ہوتے ہیں اور اس سے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا قول ہے ہم پڑھتے تھے: لا ترغبوا عن آبائکم فانہ کفر۔ (اپنے آباء سے انحراف نہ کرو کیونکہ یہ کفر ہے)۔ اس کی مثالیں کثیر ہیں۔

ماہرین کا یہ بھی خیال ہے کہ جس کو ناسخ کا حکم نہ پہنچا ہو وہ پہلے حکم کا مکلف ہے اس کا بیان تحویل قبلہ میں آئے گا۔

ماہرین کے نزدیک حکم عمل سے پہلے بھی منسوخ ہو سکتا ہے۔ یہ ذبیح کے واقعہ میں موجود ہے اسی طرح نمازیں پچاس فرض تھیں عمل سے پہلے پانچ نمازوں سے منسوخ کر دی گئیں جیسا کہ سورۃ الاسراء اور سورۃ الصافات میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 12: ناسخ کی پہچان کے طرق: (۱) نص کے الفاظ نسخ پر دلالت کرتے ہوں جیسے نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: کنت نھیتکم عن زیارۃ القبور، فزوروھا (1)۔ (میں نے تمہیں قبور کی زیارت سے منع کیا تھا۔ پس (اب) زیارت کیا کرو)۔ میں نے تمہیں مشروب پینے سے منع کیا تھا مگر چمڑے کے برتنوں میں۔ پس اب ہر برتن میں مشروب پیو مگر نشہ دینے والا مشروب نہ پیو۔ (۲) راوی تاریخ ذکر کر دے۔ مثلاً وہ کہے: میں نے خندق کے سال سنا تو اس سے پہلے والا حکم منسوخ معلوم ہو جائے گا یا کہے کہ فلاں فلاں حکم منسوخ ہے۔ (۳) امت کا اجماع ہو جائے کہ یہ حکم منسوخ ہے اور اس کا ناسخ بعد میں آنے والا ہے۔ یہ اصول فقہ میں تفصیلی مباحث موجود ہیں ہم نے بقدر ضرورت ذکر کر دیا ہے۔ واللہ الموفق

1۔ مسلم شریف، جلد 1 صفحہ 314 کتاب الجنائز، باب فصل فی جواز زیارۃ القبور، فی الذھاب الی زیارۃ القبور (قدیمی کتب خانہ)

للهدایة۔ اللہ تعالیٰ ہی ہدایت کی توفیق بخشنے والا ہے۔

مسئلہ نمبر 13: جمہور قراء نے ماننسخ نون کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ اس معنی پر ظاہر دلالت کرتا ہے کہ ہم کسی آیت کا حکم اٹھا دیتے ہیں اور اس کی تلاوت کو باقی رکھتے ہیں جیسا کہ پہلے گزرا ہے۔ اس معنی کا بھی احتمال رکھتا ہے کہ ہم آیت کا حکم اور تلاوت اٹھا دیتے ہیں جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے۔ ابن عامر نے ننسخ نون کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ انسخت الکتاب سے مشتق ہے اس معنی پر کہ میں نے اسے منسوخ پایا۔ ابو حاتم نے کہا: یہ غلط ہے۔ الفارسی ابوعلی نے کہا: یہ لغت نہیں ہے کیونکہ نسخ اور انسخ ایک معنی میں ہیں۔ یہ نہیں کہا جاتا مگر یہ کہ اس کا معنی ہو ہم اس کو منسوخ نہیں پاتے۔ جیسے تو کہتا ہے: احمدت الرجل وابخلتہ، یعنی میں نے اسے محمود اور بخیل پایا۔ ابو علی نے کہا: ہم اسے منسوخ نہیں پاتے مگر یہ کہ ہم اسے منسوخ کر دیں۔ معنی میں دونوں قراءتیں متفق ہیں اور لفظ میں مختلف ہیں۔ بعض نے فرمایا: مَانَنۡسَخۡ کا مطلب ہے، ہم تیرے لئے جسے نسخ کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: نسخت الکتاب جب تو کتاب کو لکھ لے۔ وانتسختہ غیری جب تو اس کے لئے لکھ دے۔ مکی نے کہا: ہمزہ کا متعدی کے لئے ہونا جائز نہیں کیونکہ اس طرح معنی تبدیل ہو جاتا ہے۔ معنی پھر یہ ہو جائے گا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ہم کوئی آیت تجھ پر اتارتے اور انساخہ ایاھا، کا مطلب ہے: انزالھا علیہ۔ معنی یہ ہوگا: ہم تجھ پر کوئی اتارتے ہیں یا ہم اسے بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس کی مثل لاتے ہیں۔ معنی یہ ہوگا کہ ہر آیت جو نازل ہوئی اس سے بہتر لائی گئی، تو اس طرح سارا قرآن منسوخ ہو جائے گا اور یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ قرآن کا تھوڑا حصہ منسوخ ہوا ہے جب افعل اور فعل کا ہم معنی ہونا ممتنع ہوا کیونکہ ایسا سنا نہیں گیا تو معنی کے فساد کی وجہ سے ہمزہ کا متعدی ہونا بھی ممتنع ہوتا۔ پس یہی صورت باقی رہتی ہے کہ یہ اس باب سے ہو: احمدتہ وابخلتہ (میں نے اسے محمود اور بخیل پایا)۔

مسئلہ نمبر 14: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوۡ نُنۡسِهَا ابوعمرو اور ابن کثیر نے نون کے فتحہ، سین اور ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت ابوعمر، حضرت ابن عباس، حضرت عطا، حضرت مجاہد، حضرت ابی بن کعب، عبید بن عمیر، النخعی، ابن محیصن وغیرہ نے اسی طرح پڑھا ہے۔ اس کا معنی تاخیر کرنا ہے۔ یعنی ہم اس کے الفاظ کے نسخ کو مؤخر کرتے ہیں یعنی ہم اسے ''ام الکتاب'' میں چھوڑ دیتے ہیں پس وہ منسوخ نہیں ہوتی۔ یہ عطا کا قول ہے اور عطا کے علاوہ کا قول ہے کہ اوننسأھا کا معنی ہے: ہم وقت معلوم تک نسخ کو مؤخر کرتے ہیں۔ یہ عربوں کے قول نسأت ھذا الامر سے مشتق ہے یعنی جب تو کام کو مؤخر کر دے۔ اس سے یہ قول ہے: بعتہ نسأ۔ جب تو اس میں تاخیر کر دے (1)۔ ابن فارس نے کہا: عرب کہتے ہیں: نسأ اللہ فی اجلك و انسأ اللہ اجلك۔ اللہ تعالیٰ تیری عمر میں اضافہ کرے، قد انتسأ القوم، جب قوم دور ہو جائے، نسأتھم، میں نے اسے پیچھے کر دیا۔ معنی یہ ہے کہ ہم اس کے نزول کو مؤخر کرتے ہیں یا اسے منسوخ کرتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: ہم تم سے اس طرح اسے لے جائیں گے کہ تم نہ پڑھو گے اور نہ یاد کرو گے۔ باقی قراء نے ننسھا نون کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، نسیان سے مشتق کیا ہے جس کا معنی ترک ہے، یعنی ہم اسے چھوڑ دیں گے نہ تبدیل کریں گے اور نہ منسوخ کریں گے۔ یہ حضرت ابن

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

عباس اور سدی کا قول ہے (1)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ (توبہ: 67) یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کو چھوڑا، پس اللہ تعالیٰ نے انہیں عذاب میں چھوڑ دیا۔ اس قراءت کو ابو عبید اور ابو حاتم نے پسند کیا۔ ابو عبید نے کہا: میں نے نعیم القاری کو یہ کہتے ہوئے سنا، میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے خواب میں ابو عمرو کی قراءت پڑھی تو آپ نے مجھ پر صرف دو حرفوں کی تبدیلی فرمائی۔ فرمایا: میں نے پڑھا اَرْنا تو آپ نے فرمایا اَرِنا۔ ابو عبید نے کہا: دوسرا حرف میں او ننسأھا خیال کرتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَوْ نُنْسِهَا۔ الازہری نے نُنْسِهَا حکایت کیا ہے۔ یعنی ہم اسے چھوڑنے کا حکم دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: انسیتہ الشیٔ یعنی میں نے اسے ترک کرنے کا حکم دیا۔ نسیتۃ، میں نے اسے ترک کر دیا۔ شاعر نے کہا:

ان علیّ عقبۃ اقضیہا لست بناسیہا ولا منسیہا

اگر میں اپنے اوپر اونٹوں کو چرانے کا فیصلہ کروں گا تو میں اسے ترک نہیں کروں گا اور نہ اسے ترک کا حکم دوں گا۔

زجاج نے کہا: نون کے ضمہ کے ساتھ قراءت اس میں ترک کے معنی کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ یہ نہیں کہا جاتا: انسی بمعنی ترک ہے اور جو علی بن ابی طلحہ بن ابن عباس سے روایت کیا ہے اَوْ نُنْسِهَا فرمایا: ہم اسے چھوڑتے ہیں اسے تبدیل نہیں کرتے (2) یہ صحیح نہیں ہے۔ شاید حضرت ابن عباس نے فرمایا ہو نترکہا اور ضبط نہ کیا گیا ہو۔ اہل لغت میں سے اکثر کا قول یہ ہے کہ اَوْ نُنْسِهَا کا معنی ہے: ہم تمہارے لئے اس کا ترک مباح کرتے ہیں۔ یہ نَسِيَ سے مشتق ہے جب کوئی کسی چیز کو چھوڑ دے پھر تعدیہ کیا گیا۔ ابو علی وغیرہ نے فرمایا: اور یہ قابل توجہ ہے۔ کیونکہ اس کا معنی ہے: ہم تجھے بنا دیں گے کہ تم اسے چھوڑ دو (3)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ نسیان سے ہے جس کا معنی ہے یاد نہ ہونا، اس معنی پر او ننسکھا یا محمد فلا تذ کرھا۔ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ہم یہ بھلا دیں گے پس آپ اسے یاد نہیں کریں گے۔ ہمزہ کے ساتھ نقل کیا گیا اور فعل کو دو مفعولوں کی طرف متعدی کیا گیا اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ھا ضمیر ہیں لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم محذوف ہے۔

مسئلہ نمبر 15: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ یہاں خیر کا لفظ تفضیل کا صیغہ ہے۔ معنی یہ ہے کہ اے لوگو! اس جلدی میں تمہارے لئے زیادہ نفع ہے اگر ناسخ اخف ہو اور تاخیر میں تمہارے لئے زیادہ نفع ہے اگر ناسخ (آیت) زیادہ مشکل ہو اور اگر ناسخ و منسوخ برابر ہوں تو اس کی مثل میں تمہارے لئے زیادہ نفع ہے (4)۔ امام مالک نے فرمایا: منسوخ کی جگہ محکم آیت تمہارے لئے زیادہ نفع بخش ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: آخرت کے اعتبار سے زیادہ نفع بخش ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا کلام ایک دوسرے پر فضیلت نہیں رکھتا۔ اس کی مثال یہ ہے: من جاء بالحسنۃ فلہ خیر منہا۔ یعنی جو نیکی کرے گا اس کے لیے اس سے بہتر نفع اور اجر ہوگا۔ اس خیر سے مراد افضل نہیں ہے اور پہلے قول کی دلیل او مثلھا کے کلمات ہیں۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝

"کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہی کیلئے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی اور تمہارا اللہ کے سوا کوئی یار و مددگار نہیں"۔

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 4۔ ایضاً

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَمْ تَعْلَمْ، لَمْ کی وجہ سے اسے جزم دی گئی ہے اور حروف استفہام عامل کے عمل میں تبدیلی نہیں کرتے۔ اَنَّ کو فتحہ دیا گیا ہے کہ یہ محل نصب میں ہے۔ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یعنی ایجاد و اختراع، ملک و سلطان، امر و ارادہ سب زمین و آسمان میں اللہ تعالیٰ کا چلتا ہے۔ ملك پر رفع مبتدا کی حیثیت سے ہے اور لہ اس کی خبر ہے اور پورا جملہ ان کی خبر ہے۔

یہاں خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد امت ہے کیونکہ آگے ارشاد ہے وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ الخ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ان سے کہہ دیجئے کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ کے لئے حکمرانی اور سلطانی ہے۔ آسمانوں اور زمین میں تمہارے لئے اللہ کے سوا کوئی مددگار نہیں ہے۔ ولی یہ ولیتُ امر فلان سے مشتق ہے یعنی میں نے فلاں کے معاملہ کی دیکھ بھال کی۔ اسی سے ولی العہد ہے یعنی مسلمانوں کے جو معاملات اس کے سپرد کئے گئے ہیں ان کی نگرانی کرنے والا۔ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کا معنی ہے اللہ کے سوا، اللہ کے بعد۔ جیسے امیہ بن الصلت نے کہا: (1)

یا نفس مالك دون الله من واق وما على حدثان الدهر من باق

اے نفس! اللہ کے سوا تجھے کوئی بچانے والا نہیں اور زمانے کے واقعات میں سے کوئی باقی رہنے والا نہیں۔

جمہور قراء نے ولا نصیر جر کے ساتھ پڑھا ہے۔ ولی پر اس کا عطف کیا ہے اور نصیرٌ ضمہ کے ساتھ بھی جائز ہے۔ ولی کے مقام پر عطف کی حیثیت سے کیونکہ اس کا معنی ہے: مالکم من دون اللہ ولیٌّ ولا نصیرٌ۔

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُىِٕلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۞

''کیا تم (یہ) چاہتے ہو کہ پوچھو اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے (ایسے سوال) جیسے پوچھے گئے موسیٰ علیہ السلام سے اس سے پہلے اور جو بدل لیتا ہے کفر کو ایمان سے وہ (قسمت کا مارا) تو بھٹک گیا سیدھے راستہ سے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَمْ تُرِيْدُوْنَ میں اَمْ منقطعہ ہے جو بمعنی ہل ہوتا ہے یعنی بل تریدون۔ کلام کا معنی توبیخ ہے۔ اَنْ تَسْـَٔلُوْا، تُرِيْدُوْنَ کی وجہ سے محل نصب میں ہے كَمَا سُىِٕلَ کاف مصدر محذوف کی نعت کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ یعنی سوالاً کما۔

مُوْسٰى نائب فاعل کی حیثیت سے محل رفع میں ہے مِنْ قَبْلُ ان کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال یہ تھا کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی ذات عیاں دکھائیں اور اس امت کے لوگوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کو سامنے لے آئیں۔ حضرت ابن عباس اور مجاہد سے مروی ہے کہ انہوں نے سوال کیا کہ ان کے لئے صفا پہاڑی کو سونا بنا دیں (2)۔ حسن نے کما سِیل پڑھا ہے، یہ ان لوگوں کی لغت ہے جو کہتے ہیں: سلت اَسَالُ۔ یہ بھی جائز ہے کہ ہمزہ کا بدل یاء ساکنہ ہو اور بغیر قیاس کے ہو۔ پھر اس سے پہلے سین کو کسرہ دیا گیا ہو۔ نحاس نے کہا: ہمزہ کا بدل بعید ہے۔

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

السواء ہر چیز کے وسط کو کہتے ہیں۔ یہ ابوعبیدہ کا قول ہے۔ اسی سے یہ ارشاد ہے: فی سواء الجحیم۔ (جحیم کے وسط میں) عیسیٰ بن عمر نے حکایت کیا ہے، فرمایا: ما زلت اکتب حتی انقطع سواتی (میں لکھتا رہا حتیٰ کہ میرا درمیان ٹوٹ گیا) حضرت حسان نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا:

یا ویح اصحاب النبی ورهطه　　بعد المغیَّب فی سواء الملحدِ (1)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب اور آپ کے گروہ پر افسوس قبر کے درمیان چھپائی گئی ذات کے بعد۔

بعض علماء نے فرمایا السواء کا معنی قصد کرنا ہے۔ فراء سے مروی ہے: ذهب عن قصد الطریق و سَمْتِهٖ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے راستہ سے ہٹ گیا۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ اس آیت کا شان نزول یہ تھا کہ رافع بن خزیمہ (2) اور وہب بن زید نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا: ہمارے پاس آسمان سے کتاب لے آؤ جسے ہم پڑھیں اور ہمارے لئے نہریں جاری کرو تو ہم آپ کی پیروی کریں گے۔

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۹﴾ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾

''دل سے چاہتے ہیں بہت سے اہل کتاب کہ کسی طرح پھر بنا دیں تمہیں ایمان لانے کے بعد کافر (ان کی آرزو) بوجہ اس حسد کے ہے جو ان کے دلوں میں ہے (یہ سب کچھ) اس کے بعد اور جب کہ خوب واضح ہو چکا ہے ان پر حق۔ پس (اے غلامانِ مصطفیٰ) معاف کرتے رہو اور درگزر کرتے ہو یہاں تک کہ بھیج دے اللہ (ان کے بارے میں) اپنا حکم۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور صحیح ادا کرو نماز اور دیا کرو زکوٰۃ اور جو کچھ آگے بھیجو گے اپنے لئے نیکیوں سے ضرور پاؤ گے اس کا ثمر اللہ کے ہاں یقیناً اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے ہو خوب دیکھ رہا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1: وَدَّ کا معنی تمنا کرنا ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ كُفَّارًا یہ يَرُدُّوْنَكُمْ کا مفعول ثانی ہے مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ بعض علماء نے فرمایا: یہ یود کے متعلق ہے۔ بعض نے فرمایا: حَسَدًا کے متعلق ہے اور كُفَّارًا پر وقف ہے اور

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　　2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

حَسَدًا، وَدَّ کا مفعول لہ ہے یا مصدر ہے اپنے ماقبل پر دلالت کرتا ہے اور مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ کا معنی ہے اپنی طرف سے، نہ وہ یہ کتاب میں پاتے ہیں اور نہ انہیں اس کا حکم دیا گیا ہوتا ہے حسد کا لفظ یہ مفہوم دیتا ہے اور عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ بطور تاکید اور الزام ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ (آل عمران:167) اسی طرح يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ (البقرہ:79) اور اسی طرح وَ لَا طٰٓىِٕرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ (انعام:38) ان تینوں آیات میں بِاَفْوَاهِهِمْ، بِاَيْدِيْهِمْ اور بِجَنَاحَيْهِ تاکید کے لئے ہے۔ یہ آیت کریمہ یہود کے متعلق ہے۔(1)

مسئلہ نمبر 2: حسد کی دو قسمیں ہیں: (۱) مذموم، (۲) محمود۔ مذموم یہ ہے کہ تو اپنے مسلمان بھائی سے اللہ تعالیٰ کی نعمت کے زوال کی تمنا کرے، خواہ تو نے یہ تمنا کی ہو کہ تیری طرف وہ نعمت لوٹ آئے یا تو نے یہ تمنا نہ کی ہو۔ اس قسم کی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ممانعت فرمائی ہے: اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (النساء:54)

یہ حسد مذموم ہے کیونکہ اس میں حق سبحانہ تعالیٰ کی تقسیم کو درست نہ سمجھنا ہے کہ اس نے (گویا) غیر مستحق پر انعام کر دیا ہے۔ اور حسد کی محمود صورت وہ ہے جس کا ذکر صحیح حدیث میں آیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حسد صرف دو شخصوں سے کرنا چاہئے: ایک وہ جسے اللہ تعالیٰ قرآن عطا فرماتا ہے اور وہ رات کے اوقات میں اور دن کے اوقات میں اس کے ساتھ قیام کرتا ہے اور دوسرا وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا اور وہ اسے رات کے اوقات میں اور دن کے اوقات میں خرچ کرتا ہے(2)۔ یہ وہ حسد ہے جس کا معنی غبطہ (رشک) ہے، اسی طرح اس پر امام بخاری نے باب باندھا ہے: باب الاغتباط فی العلم والحکمۃ۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ تو تمنا کرے کہ تیرے لئے بھی وہ خیر اور نعمت ہو جو تیرے مسلمان بھائی کے پاس ہے اور اس سے خیر زائل نہ ہو۔ اس کو منافسہ کہنا بھی جائز ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ فِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنٰفِسُوْنَ ۝ (المطففین) اس کے لئے سبقت لے جانے کی کوشش کریں سبقت لے جانے والے مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ (یعنی اس کے بعد کہ ان کے لئے حق ظاہر ہو چکا ہے)۔ حق سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور قرآن ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا اس میں دو مسئلے ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: فَاعْفُوْا اصل میں اعفووا تھا ضمہ کو اس کے ثقل کی وجہ سے حذف کیا گیا پھر واو کو التقائے ساکنین کی وجہ سے حذف کیا گیا۔ العفو سے مراد گناہ پر مؤاخذہ کو ترک کرنا ہے۔ الصفح کا معنی نفس سے گناہ کے اثر کو زائل کرنا ہے۔ صفحت عن فلان کا معنی ہے: میں نے اس کے گناہ سے اعراض کیا۔ ضربت عنہ صفحاً میں نے اس سے اعراض کیا اور اسے چھوڑ دیا۔

اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا (الزخرف:5) (کیا ہم روک لیں گے تم سے اس ذکر کو)

مسئلہ نمبر 2: یہ آیت منسوخ ہے اس ارشاد کے ساتھ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ لَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ صحیح بخاری، باب اغتباط صاحب القرآن، حدیث 4637، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾ (توبہ:29) (جنگ کرو ان لوگوں سے جو ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور نہ روز قیامت پر ..... اس حال میں کہ وہ مغلوب ہوں) یہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کی ناسخ فاقتلوا المشرکین ہے(1)۔ ابوعبیدہ نے کہا: ہر وہ آیت جس میں قتال کا ترک ہے وہ مکی ہے اور قتال کے حکم کے ساتھ منسوخ ہے(2)۔ ابن عطیہ نے کہا: اس کا یہ حکم کہ یہ آیت مکی ہے ضعیف ہے کیونکہ یہود کی مخالفتیں تو مدینہ میں تھیں۔

میں کہتا ہوں: یہ بات صحیح ہے۔ بخاری اور مسلم نے حضرت اسامہ بن زید سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گدھے پر سوار ہوئے جس کے اوپر فدک کا بنا ہوا کپڑا تھا اور حضرت اسامہ آپ کے پیچھے سوار تھے۔ آپ بنی حارث بن خزرج میں حضرت سعد بن عبادہ کی عیادت کے لئے تشریف لے جا رہے تھے۔ یہ واقعہ بدر سے پہلے کا ہے۔ پس وہ دونوں چلے حتیٰ کہ اس مجلس کے پاس سے گزرے جس میں عبداللہ بن ابی بن سلول تھا۔ یہ عبداللہ کے ظاہراً اسلام قبول کرنے سے پہلے کا واقعہ ہے۔ مجلس میں مسلمان، مشرک، بت پرست اور یہود جمع تھے۔ مسلمانوں میں سے حضرت عبداللہ بن رواحہ بھی تھے۔ جب مجلس پر گدھے کا غبار چھانے لگا تو عبداللہ بن ابی نے اپنا ناک اپنی چادر سے ڈھانپ دیا اور کہا: ہم پر غبار نہ اڑاؤ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کیا پھر آپ ٹھہرے اور گدھے سے اترے اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا اور ان پر قرآن پڑھا۔ عبداللہ بن ابی بن سلول نے کہا: اے شخص! یہ انداز اچھا نہیں جو آپ کہتے ہیں اگر حق بھی ہے تو ہمیں ہماری مجالس میں اس کے ساتھ اذیت نہ دے، اپنی منزل کی طرف لوٹ جا جو تیرے پاس آئے اسے بیان کر۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ ہماری مجالس میں تشریف لائیں ہم اس پیغام کو پسند کرتے ہیں۔ مشرکوں، مسلمانوں اور یہود کے درمیان گالی گلوچ شروع ہو گئی حتیٰ کہ ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے قریب ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں خاموش کراتے رہے حتیٰ کہ وہ خاموش ہو گئے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سواری پر سوار ہوئے اور چل پڑے حتیٰ کہ حضرت سعد بن عبادہ کے پاس پہنچے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے سعد! کیا تو نے نہیں سنا جو ابوحباب ... آپ کی مراد عبداللہ بن ابی تھا...... نے کہا ہے اس نے ایسا ایسا کہا ہے۔ حضرت سعد نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ آپ اس کو معاف کر دیں اور اس سے درگزر فرمائیں۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ پر حق کے ساتھ کتاب نازل فرمائی۔ اللہ آپ کے پاس حق لایا جو اس نے آپ پر اتارا، مدینہ طیبہ کے لوگوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ عبداللہ بن ابی کو تاج پہنائیں گے اور اس کے سر پر پگڑی باندھیں گے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس حق کے ساتھ اس معاملہ کو رد کر دیا جو آپ کو عطا فرمایا تو یہ غصہ میں ہو گیا۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے اس نے کہا جو آپ نے دیکھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے معاف کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب مشرکوں اور اہل کتاب کو معاف کر دیتے تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا تھا اور اذیت پر صبر کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْۤا اَذًى كَثِيْرًا (آل عمران:186) (اور یقیناً تم سنو گے ان سے جنہیں دی گئی کتاب تم سے پہلے اور ان لوگوں سے جنہوں نے شرک کیا اذیت

1۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذا

دینے والی بہت باتیں) اور فرمایا وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ (دل سے چاہتے ہیں بہت سے اہل کتاب)۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حکم الٰہی کے مطابق معاف فرماتے رہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان سے لڑنے کی اجازت دی۔
جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر لڑی تو اللہ تعالیٰ نے قریش کے رئیسوں اور کفار کے سرداروں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے قتل کر دیا، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ جنگ بدر سے مال غنیمت حاصل کر کے اور فتحیاب ہو کر لوٹے، ان کے ساتھ قریش کے سردار اور کفار کے رئیس قیدی تھے، عبداللہ بن ابی بن سلول اور اس کے ساتھ مشرکوں اور بت پرستوں نے کہا: یہ امر ظاہر ہو کر رہے گا۔ پس انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام کی بیعت کر لی، اور اسلام لے آئے۔ (1)
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهٖ یعنی قریظہ کا قتل اور بنی نضیر کی جلاوطنی إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۞ وَ أَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ یہ پہلے گزر چکا ہے۔
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا تُقَدِّمُوْا لِأَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ حدیث پاک میں ہے بندہ جب مرتا ہے تو لوگ کہتے ہیں: اس نے پیچھے کیا چھوڑا، فرشتے کہتے ہیں: اس نے آگے کیا بھیجا۔ بخاری اور نسائی نے حضرت عبداللہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کون ہے جسے اپنے مال سے زیادہ اپنے وارث کا مال زیادہ محبوب ہے؟ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں سے ہر شخص کو اپنے وارث کے مال سے زیادہ اپنا مال پسند ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیرا مال وہ ہے جو تو نے آگے بھیجا، اور تیرے وارث کا مال وہ ہے جو تو نے پیچھے چھوڑا۔ یہ نسائی کے الفاظ کا ترجمہ ہے اور بخاری کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کس کو اپنے وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب ہے؟ صحابہ نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں سے ہر شخص کو اپنا مال زیادہ محبوب ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کا مال وہ ہے جو اس نے آگے بھیجا اور وارث کا مال وہ ہے جو اس نے پیچھے چھوڑا (2)۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ بقیع الغرقد (مدینہ طیبہ کا قبرستان) سے گزرے اور کہا: السلام علیکم اہل القبور پھر کہا: ہمارے پاس خبریں یہ ہیں کہ تمہاری بیویوں نے نکاح کر لئے ہیں، تمہارے گھروں میں دوسرے لوگ سکون پذیر ہیں، تمہارے مال تقسیم ہو چکے ہیں۔ ہاتف نے جواب دیا: اے ابن خطاب! ہمارے پاس خبریں یہ ہیں ہم نے جو آگے بھیجا وہ ہم نے پا لیا اور جو ہم نے خرچ کیا اس کا ہم نے نفع پایا اور جو ہم نے پیچھے چھوڑا اس میں ہم نے نقصان اٹھایا ..... کسی شاعر نے کیا خوب کہا:

قدم لنفسك قبل موتك صالحاً و اعمل فليس الی الخلود سبیل

اپنے نفس کے لئے موت سے پہلے نیک اعمال بھیج اور نیک عمل کر کسی کے لئے ہمیشہ رہنا نہیں ہے۔
ایک اور شاعر نے کہا:

قدم لنفسك توبة مرجوة قبل الممات و قبل حبس الالسن

اپنے نفس کے لئے موت سے پہلے اور زبانوں کے خاموش ہونے سے پہلے توبہ کر جس کی قبولیت کی امید ہو۔

1۔ صحیح بخاری، باب کنیة المشرك، حدیث نمبر 5739، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ ایضاً، باب ما قدم من ماله فهو له، حدیث 5961

ایک اور نے کہا:

ولدتك اذ ولدتك امك باكياً والقوم حولك يضحكون سروراً

فاعمل ليوم تكون فيه اذا بكوا في يوم موتك ضاحكاً مسروراً

تیری والدہ نے تجھے جنم دیا جبکہ تو رو رہا تھا اور قوم تیرے اردگرد خوشی سے ہنس رہی تھی۔ تو اس دن کے لئے عمل کر جس میں وہ تیری موت پر رو رہے ہوں جبکہ تو اس میں خوشی سے ہنس رہا ہو۔

ایک اور نے کہا:

سابق الى الخير و بادر به فانما خلفك ماتعلم

و قدم الخير فكل امرئ على الذي قدمه يقدم

تو نیکی کی طرف سبقت کر اور اس میں جلدی کر تیرے پیچھے وہ ہوگا جس کو تو جانتا ہے۔ اور نیکی کو آگے بھیج ہر شخص اس پر ہوگا جو وہ آگے بھیجے گا۔

ان تمام سے خوبصورت ابوالعتاہیہ کا قول ہے:

اسعد بما لك في حياتك انما يبقى وراءك مصلح او مفسد

واذا تركت لمفسد لم يبقه و اخو الصلاح قليله يتزيد

وان استطعت فكن لنفسك وارثاً ان المورث نفسه لمسدد

تو اپنی زندگی میں اپنے مال سے سعادت حاصل کر لے تیرے پیچھے نیکو کار ہوگا یا فسادی ہوگا۔ جب تو اپنا مال فسادی کے لئے چھوڑے گا تو وہ اسے نہیں چھوڑے گا اور نیکو کار کا تھوڑا بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اگر تو طاقت رکھتا ہے تو اپنے لئے وارث بنا وارث بنانے والا ہی پختہ ہوتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ اس کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔

وَ قَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

"انہوں نے کہا: نہیں داخل ہوگا جنت میں (کوئی بھی) بغیر ان کے جو یہودی ہیں یا عیسائی۔ یہ ان کی من گھڑت باتیں ہیں۔ آپ (انہیں) فرمائیے لاؤ اپنی کوئی دلیل اگر تم سچے ہو۔ ہاں جس نے بھی جھکا دیا اپنے آپ کو اللہ کے لئے اور وہ مخلص بھی ہو تو اس کے لئے اس کا اجر ہے اپنے رب کے پاس۔ نہ کوئی خوف ہے انہیں اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى مطلب یہ ہے کہ یہود نے کہا: جنت میں داخل نہ ہوگا مگر وہ جو یہودی ہوگا اور نصاریٰ نے کہا: جنت میں داخل نہ ہوگا مگر جو نصرانی ہوگا۔ فراء نے جائز قرار دیا کہ هُوْدًا بمعنی یهودیًا اور یہ جمع ہے هائد کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ من کا معنی جمع ہے۔ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ اس پر کلام پہلے گزر چکی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ، هَاتُوْا اصل میں هاتِیُوا تھا، ضمہ کو اس کے ثقل کی وجہ سے حذف کیا گیا پھر یا کو التقائے ساکنین کی وجہ سے حذف کیا گیا واحد مذکر کے لئے کہا جاتا ہے: ہات جیسے رام اور مونث کے لئے ہاتی جیسے رامی۔

البرہان سے مراد وہ دلیل ہوتی ہے جو یقین کو واقع کرتی ہے یعنی جس سے یقین حاصل ہوتا ہے۔ برہان کی جمع براہین ہے جیسے قربان و قرابین، سلطان و سلاطین۔ طبری نے کہا: یہاں دلیل طلب کرنا غور و فکر کے اثبات کا تقاضا کرتا ہے(1) اور جو اس کی نفی کرتا ہے اس کا رد کرتا ہے۔ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ یعنی اگر تم اپنے ایمان میں یا اپنے قول میں سچے ہو کہ تم ہی جنت میں داخل ہو گے۔ یعنی جو تم نے کہا ہے اسے دلیل سے بیان کرو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بَلٰى یہ ان کا رد ہے اور انہیں جھٹلانا ہے یعنی ایسا نہیں ہے جیسا تم کہتے ہو۔ بعض نے فرمایا: معنی پر محمول ہے، گویا کہ کہا گیا ہے کیا کوئی جنت میں داخل نہیں ہوگا؟ تو کہا گیا: بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ، اَسْلَمَ کا معنی سرنگوں ہونا اور سر تسلیم خم کرنا ہے، بعض نے فرمایا: اپنے عمل کو خالص کرنا ہے، الوجہ (چہرہ) کا خصوصی ذکر کیا کیونکہ انسان کا جو حصہ نظر آتا ہے اس میں سے معزز ترین حصہ ہے، اور اس لئے کہ یہ جو اس کی جگہ ہے، اس میں عزت و ذلت ظاہر ہوتی ہے عرب چہرہ کا ذکر کر کے پوری چیز کی خبر دیتے ہیں اس آیت میں وجہ سے مراد مقصد ہونا بھی صحیح ہے وَ هُوَ مُحْسِنٌ یہ جملہ حال ہے، ضمیر، وَجْهَهٗ کی طرف لوٹ رہی ہے اور لہ کی ضمیر من کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اسی طرح اجرہ ہے علیهم میں ضمیر جمع معنی کے اعتبار سے ہے اسی طرح یحزنون بھی معنی کے اعتبار سے جمع ہے۔ یحزنون کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔

وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۪ وَّ قَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّ هُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝

''اور کہتے ہیں یہودی کہ نہیں ہیں عیسائی سیدھی راہ پر اور کہتے ہیں عیسائی نہیں ہیں یہودی سیدھی راہ پر حالانکہ وہ سب پڑھتے ہیں (آسمانی) کتابیں۔ اسی طرح کہی ان لوگوں نے جو کچھ نہیں جانتے ان کی سی بات تو (اب) اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے گا ان کے درمیان قیامت کے دن جن باتوں میں وہ جھگڑتے رہتے تھے''۔

یعنی ہر فریق دعویٰ کرتا ہے کہ اس کا مقابل کسی چیز (دین) پر نہیں ہے اور وہ اس سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا زیادہ مستحق ہے(2)۔ وَّ هُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ یعنی وہ تورات اور انجیل کی تلاوت کرتے ہیں۔ یہ جملہ حال ہے اور الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ سے

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

2۔ ایضاً

مراد جمہور کے نزدیک عرب کے کفار ہیں کیونکہ ان کے پاس کتاب نہ تھی۔ عطا نے کہا ہے: اس سے مراد وہ قومیں ہیں جو یہود و نصاریٰ سے پہلے تھیں (1)۔ ربیع بن انس نے کہا: مطلب یہ ہے کہ یہود نے نصاریٰ سے پہلے یہ کہا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اہل نجران نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، تو ان کے پاس یہود کے علماء بھی آئے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جھگڑنے لگے، ہر ایک گروہ نے دوسرے سے کہا: تم کسی دین پر نہیں ہو۔ پس یہ آیت نازل ہوئی۔ (2)

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ یُّذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ وَ سَعٰى فِیْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْهَاۤ اِلَّا خَآئِفِیْنَ ؕ۬ لَهُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۱۴﴾

''اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جو روک دے اللہ کی مسجدوں سے کہ ذکر کیا جائے ان میں اس کے نام (پاک) کا اور کوشاں ہو ان کی ویرانی میں ان کے لئے مناسب نہیں تھا کہ داخل ہوتے مسجدوں میں مگر ڈرتے ڈرتے۔ ان کے لئے دنیا میں (بھی بڑی) ذلت ہے اور ان کے لئے آخرت میں بھی بڑا عذاب ہے''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ یُّذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ، مَنْ مبتدا کی حیثیت سے مرفوع ہے اور اَظْلَمُ خبر ہے مطلب یہ ہے کہ لا احدَ اظلم کوئی زیادہ ظالم نہیں ہے۔ اور اَنْ محل نصب میں ہے۔ مَسٰجِدَ سے بدل کے اعتبار سے۔ اور یہ تقدیر بھی جائز ہے: کراھیۃ ان یُذکرَ پھر حذف کیا گیا۔ اور یہ تقدیر بھی جائز ہے: من ان یذکر فیھا۔ اور حرف جر کو طول کلام کی وجہ سے ان سے پہلے حذف کیا گیا اور یہاں مَسٰجِدَ سے مراد بیت المقدس اور اس کی محرابیں ہیں۔ بعض نے فرمایا: کعبہ ہے اور جمع ذکر کیا گیا ہے کیونکہ کعبہ مساجد کا قبلہ ہے یا تعظیم کے لئے جمع ذکر کیا گیا۔ بعض نے فرمایا: مَسٰجِدَ سے مراد تمام مساجد ہیں، ان کا واحد مسجِد (جیم کے کسرہ کے ساتھ۔) عربوں میں سے بعض کہتے ہیں: مسجَد (جیم کے فتحہ کے ساتھ) (3)۔ فراء نے کہا ہے: ہر فعل جو فعل یفعُلُ کے وزن پر ہو مثلاً دخل یدخل تو اس سے مَفعَل فتحہ کے ساتھ آتا ہے خواہ وہ اسم ہو یا مصدر ہو۔ اس میں فرق واقع نہیں ہوتا۔ مثلاً دخل یدخل مدخلا۔ ھذا مدْخَلُهٗ۔ مگر چند الفاظ ایسے ہیں جن پر کسرہ پڑھا جاتا ہے: مسجِد، مطلِع، المغرِب، المشرِق، المسقِط، المفرِق، المجزِر، المسکِن، المرفِق۔ (یہ رفق یرفق سے ہے) المنبِت، المنسِك (یہ نسك ینسك سے ہے) کسرہ کو اسم کی علامت بنایا ہے۔ بعض اوقات بعض عرب اسم میں فتحہ دیتے ہیں وہ المسجَد (جیم کے فتحہ کے ساتھ) انسان کی پیشانی جہاں سجدہ کے لیے پہنچتی ہے: الآراب، وہ سات اعضاء جو سجدہ میں زمین پر لگتے ہیں۔ یہ جوہری کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اس آیت سے مراد کیا ہے اس میں علماء کا اختلاف ہے اور یہ کس کے بارے میں نازل ہوئی؟ مفسرین نے نقل کیا ہے کہ یہ بخت نصر کے بارے میں نازل ہوئی کیونکہ اس نے بیت المقدس کو خراب کیا تھا۔ حضرت ابن عباس وغیرہ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

نے کہا: یہ نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی (1)۔ معنی یہ ہے کہ تم کیسے دعویٰ کرتے ہو اے نصاریٰ! کہ تم اہل جنت میں سے ہو حالانکہ تم نے بیت المقدس کو خراب کیا اور اس میں نمازیوں کو نماز پڑھنے سے روکا۔ اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا: نصاریٰ کے فعل پر تعجب کا اظہار ہے کہ انہوں نے بیت المقدس کے ساتھ یہ کیا حالانکہ وہ اس کی تعظیم بھی کرتے تھے اور انہوں نے یہود سے عداوت کی۔

سعید نے حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: یہ اللہ کے دشمن نصاریٰ ہیں، یہود کے بعض نے انہیں ابھارا کہ انہوں نے بخت نصر بابلی مجوسی کی بیت المقدس کی تخریب میں معاونت کی۔ (2)

روایت ہے کہ یہ تخریب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک باقی رہی۔ بعض نے فرمایا: یہ مشرکین کے بارے میں نازل ہوئی جب انہوں نے نمازیوں کو اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو روکا اور حدیبیہ کے ساتھ انہیں مسجد حرام میں داخل نہ ہونے دیا (3)۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد ہر وہ شخص ہے جس نے بھی قیامت تک کسی مسجد سے کسی کو روکا۔ یہ قول صحیح ہے کیونکہ لفظ عام ہے اور جمع کے صیغہ کے ساتھ وارد ہے۔ بعض مساجد کے ساتھ تخصیص اور بعض اشخاص کے ساتھ خاص کرنا ضعیف ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 3: مساجد کا خراب کرنا کبھی حقیقۃً ہوتا ہے جیسے بخت نصر اور نصاریٰ نے بیت المقدس کی تخریب کی تھی جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے۔ انہوں نے بنی اسرائیل سے اپنے کسی بادشاہ کے ساتھ مل کر جنگ کی۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا نام نطوس بن اسبیسانوس رومی تھا جیسا کہ غزنوی نے ذکر کیا ہے۔ پس انہوں نے بنی اسرائیل کو قتل کیا اور انہیں قیدی بنایا، تورات کو جلا دیا اور بیت المقدس میں غلاظت پھینکی اور اسے خراب کیا۔

اور کبھی تخریب مسجد مجازاً ہوتی ہے، جیسے مشرکین کا مسلمانوں کو منع کرنا۔ جب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد حرام سے روک دیا۔ پس نماز اور شعائر اسلام کی مساجد میں ادائیگی سے روک دینا یہ اسے خراب کرنا ہے۔

مسئلہ نمبر 4: ہمارے علماء نے فرمایا: اسی وجہ سے ہم کہتے ہیں: عورت کو حج کرنے سے روکنا جائز نہیں ہے جب اس نے حج نہ کیا ہو خواہ اس کا محرم ہو یا نہ ہو اور اسے مساجد میں نماز پڑھنے سے بھی نہ روکا جائے جب اس پر فتنہ کا خوف نہ ہو۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا تمنعوا اماء الله مساجد الله (4)۔ تم اللہ کی بندیوں کو مساجد سے نہ روکو۔ اسی وجہ سے ہم نے کہا: مسجد کو توڑنا جائز نہیں ہے اور نہ اس کا بیچ کرنا اور معطل کرنا جائز ہے اگرچہ محلہ خراب بھی ہو جائے اور مسجد بنانے سے بھی نہیں روکا جائے گا مگر یہ کہ لوگوں کا ارادہ اختلاف اور جھگڑا ہو مثلاً وہ ایک مسجد کے پہلو میں دوسری مسجد بنائیں اور ان سے مقصود پہلی مسجد کے لوگوں میں جدائی ڈالنا ہو اور خراب کرنا ہو اور اختلاف پیدا کرنا ہو۔ اگر ایسی صورت ہو تو دوسری مسجد کو توڑا جائے گا اور اس کے بنانے سے منع کیا جائے گا۔ اسی وجہ سے ہم نے کہا: ایک شہر میں دو جامع مسجد ہوئی جائز نہیں ہیں اور نہ ایک مسجد کے لئے دو امام جائز ہیں اور نہ ایک مسجد میں دو جماعتیں جائز ہیں۔ اس کا مزید بیان ان شاء اللہ سورہ براءت میں

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

4۔ صحیح بخاری، باب هل على من لم يشهد الجمعة غسل من النساء والصبيان وغيرهم، حدیث نمبر 849، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آئے گا اور سورۂ نور میں مساجد اور ان کی بنا کا حکم اللہ تعالیٰ کی توفیق سے بیان کیا جائے گا۔ یہ آیت نماز کے امر کی تعظیم پر دلالت کرتی ہے۔ جب نماز افضل عمل ہے اور اجر کے اعتبار سے عظیم ہے تو اس کا منع کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔

مسئلہ نمبر 5: ہر جگہ جہاں اللہ کی عبادت کرنا ممکن ہو اور اللہ تعالیٰ کو سجدہ کیا جاتا ہو اسے مسجد کہا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جعلت لی الارض مسجداً و طهوراً (میرے لئے زمین سجدہ گاہ اور پاکیزگی کا باعث بنائی گئی ہے) اس حدیث کو ائمہ نے تخریج کیا ہے (1)۔ امت کا اس پر اجماع ہے کہ وہ جگہ جو زبان کے ساتھ نماز کے لئے متعین کی گئی ہو تو وہ مالک کی ملکیت سے خارج ہو جاتی ہے اور وہ تمام مسلمانوں کے لئے ہو جاتی ہے اگر کوئی شخص اپنے گھر میں مسجد بنائے اور لوگوں کو اس سے روکے اور اسے اپنے لئے مختص کرے تو وہ اس کی ملکیت پر رہے گی اور وہ مسجد کی تعریف میں نہیں آئے گی۔ اگر وہ تمام لوگوں کے لئے اس میں نماز پڑھنا مباح کر دے تو پھر اس کا حکم عام مساجد جیسا ہو جائے گا اور ملکیت سے نکل جائے گی۔

مسئلہ نمبر 6: اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ، اُولٰٓئِكَ مبتدا ہے اور اس کا مابعد اس کی خبر ہے خَآئِفِيْنَ حال ہے یعنی مسلمان جب اس پر غالب آجائیں اور وہ مسلمانوں کی سلطنت کے تحت آجائے تو اس وقت ان مساجد میں کافر کا داخلہ ممکن نہ ہوگا۔ اگر کافر اس میں داخل ہوں گے تو انہیں خوف ہوگا کہ مسلمان انہیں نکال دیں گے اور اس میں داخل ہونے پر سزا دیں گے۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ کافر کے لئے مسجد میں داخل ہونا کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے جیسا کہ سورۂ برأت میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ جنہوں نے اس آیت کو نصاریٰ کے بارے تصور کیا اس نے روایت کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیت المقدس کی اسلام میں تعمیر فرمائی تو اس کے بعد ایک زمانہ گزر گیا کہ کوئی نصرانی اس میں داخل نہیں ہوتا تھا مگر اسے سزا دی جاتی تھی، اس کے بعد کہ وہ ان کی عبادت گاہ تھی (2) اور جنہوں نے اسے قریش کے بارے تصور کیا۔ اس نے کہا: نبی کریم ﷺ کے حکم سے یہ اعلان کیا گیا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور کوئی بیت اللہ کا طواف برہنہ ہو کر نہیں کرے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ خبر ہے اور اس سے مقصود امر ہے یعنی تم کافروں سے جہاد کرو اور انہیں جڑ سے اکھیڑ دو حتی کہ ان میں سے کوئی مسجد حرام میں داخل نہ ہو مگر ڈرتے ہوئے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ (احزاب: 53) یہ حقیقت میں نہی ہے جو خبر کے لفظ کے ساتھ وارد ہے۔

مسئلہ نمبر 7: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ بعض علماء نے فرمایا: یہ حربی کو قتل کرنا ہے اور ذمی کے لئے جزیہ ہے، قتادہ اور سدی سے مروی ہے، الخزی لهم فی الدنیا سے مراد مہدی کا قیام، عموریہ، رومیہ، قسطنطنیہ اور ان کے دوسرے شہروں کی فتح ہے۔ جیسا کہ ہم نے "التذکرہ" میں ذکر کیا ہے اور جنہوں نے کہا یہ قریش کے متعلق ہے انہوں نے الخزی سے مراد فتح مکہ لیا ہے اور آخرت میں عذاب ہے اس کے لئے جو کافر ہو کر مرے گا۔

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

''اور مشرق بھی اللہ کا ہے اور مغرب بھی سو جدھر بھی تم رخ کرو وہیں ذات خداوندی ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

فراخ رحمت والا خوب جاننے والا ہے"۔

اس میں پانچ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ، الْمَشْرِقُ سے مراد طلوع کی جگہ اور الْمَغْرِبُ سے مراد غروب ہونے کی جگہ ہے۔ یعنی مشرق و مغرب اور ان کے درمیان کی جہات اور مخلوق کی ایجاد و اختراع اللہ کے لئے ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ مشرق و مغرب کو خصوصی ذکر فرمایا ان کو شرف دینے کے لئے، جیسے بیت اللہ۔ ناقۃ اللہ۔ کیونکہ آیت کا سبب اس کا تقاضا کرتا ہے۔ جیسا کہ آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 2: فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا یہ شرط ہے اسی وجہ سے نون حذف کیا گیا ہے۔ این عاملہ ہے اور ما زائدہ ہے۔ اور جواب فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ہے۔ حسن نے تولوا تا، اور لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اصل میں تتولوا تھا اور ثم ظرف کی بنا پر محل نصب میں ہے اس کا معنی بعد ہے، مگر یہ مبنی بر فتحہ ہے معرب نہیں ہے کیونکہ یہ مبہم ہے۔ یہ بعد کے لئے ھنا کے قائم مقام ہے اگر تو قرب کا ارادہ کرے گا تو تو ھنا کہے گا۔

مسئلہ نمبر 3: فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا کس معنی میں نازل ہوا؟ اس میں علماء کے پانچ مختلف اقوال ہیں: حضرت عبداللہ بن عامر بن ربیعہ نے کہا: یہ آیت اس شخص کے بارے میں نازل ہوئی جس نے تاریک رات میں غیر قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔ امام ترمذی نے حضرت عبداللہ سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تاریک رات میں سفر پر تھے ہمیں معلوم نہ تھا کہ قبلہ کہاں ہے ہر شخص نے اپنی سمت پر نماز پڑھی۔ جب صبح ہوئی تو ہم نے یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ذکر کیا، تو یہ آیت نازل ہوئی: فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ابو عیسیٰ نے کہا: یہ حدیث ایسی ہے جس کی سند قابل حجت نہیں ہے ہم اس کو اشعث السمان کی حدیث سے جانتے ہیں اور اشعث بن سعید ابو الربیع حدیث میں ضعیف شمار کیا جاتا ہے۔ (1)

اکثر اہل علم کا یہی نظریہ ہے۔ وہ کہتے ہیں: جب بادل کی صورت میں غیر قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے پھر بعد میں اسے علم ہو کہ اس نے غیر قبلہ کی طرف نماز پڑھی ہے تو اس کی نماز جائز ہوگی۔ حضرات سفیان، ابن المبارک، احمد اور اسحاق کا یہی قول ہے۔

میں کہتا ہوں: امام ابو حنیفہ اور امام مالک کا یہی قول ہے مگر امام مالک فرماتے ہیں: پھر وقت میں اس نماز کا اعادہ مستحب ہے اور اس پر اعادہ واجب نہیں ہے کیونکہ اس نے فرض تو ادا کر لیا جیسا اسے حکم دیا گیا تھا اور کمال وقت میں پایا جا سکتا ہے۔ یہ امام مالک نے سنت سے استدلال کیا ہے اس شخص کے بارے میں جس نے تنہا نماز پڑھی پھر اس نے اس نماز کو وقت کے اندر جماعت کے ساتھ پایا تو وہ لوگوں کے ساتھ نماز دوبارہ پڑھے اور وقت میں استحباباً اعادہ نہ کرے مگر وہ جو قبلہ کی طرف پیٹھ کر کے نماز پڑھے یا مشرق یا مغرب کی طرف اپنی پوری کوشش کے بعد نماز پڑھے۔ اور جس نے قبلہ کی تھوڑی دائیں یا بائیں

1۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، باب من سورۃ البقرہ، جلد 2، صفحہ 120 (وزارت تعلیم)

جانب کوشش سے نماز پڑھی اس پر وقت کے اندر اور وقت کے بعد اعادہ نہیں ہے۔ مغیرہ اور امام شافعی نے کہا: نماز جائز نہیں ہے کیونکہ قبلہ کی سمت ہونا نماز کی شروط میں سے ہے (جب شرط نہ پائی گئی تو نماز ہی نہ ہوئی)۔ جو امام مالک نے کہا ہے وہ اصح ہے کیونکہ قبلہ کی جہت کو ضرورت، جنگ کی حالت میں اس کے ترک کو مباح کر دیتی ہے اور حالت سفر میں رخصت اس کو مباح کر دیتی ہے۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا: یہ آیت مسافر کے بارے نازل ہوئی وہ نفل پڑھ سکتا ہے جدھر بھی اس کی سواری کا رخ ہو۔ یہ مسلم نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ مکہ سے مدینہ کی طرف جاتے ہوئے سواری پر نفل نماز پڑھتے تھے جدھر بھی سواری کا رخ ہوتا تھا (1)۔ فرمایا: اس کے متعلق فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ نازل ہوئی۔ علماء کا سواری پر نفل پڑھنے میں اس حدیث کی وجہ سے کوئی اختلاف نہیں ہے اور کسی کے لئے جان بوجھ کر بغیر شدت خوف کے قبلہ کو ترک کرنا جائز نہیں ہے۔

مریض کے بارے میں امام مالک کا قول مختلف ہے جو محمل پر نماز پڑھتا ہے۔ کبھی فرمایا: وہ اونٹ کی پیٹھ پر فرض ادا کرے اگرچہ مرض شدید بھی ہو۔ سحنون نے کہا: اگر وہ ایسا کرے گا تو اعادہ کرے گا۔ یہ الباجی نے حکایت کیا ہے۔ کبھی کہا: اگر وہ ایسا شخص ہے جو زمین پر نماز نہیں پڑھ سکتا مگر اشارہ کے ساتھ تو وہ اونٹ کے اوپر نماز پڑھ لے اس کے بعد اس کے اونٹ کو روکا جائے اور منہ قبلہ کی طرف کیا جائے۔ اور اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ کسی صحیح آدمی کے لئے فرض ادا کرنا جائز نہیں ہیں مگر زمین پر، مگر خوف شدید ہو تو پھر سواری پر فرض نماز ادا کر سکتا ہے جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔

فقہاء کا اس مسافر کے بارے میں اختلاف ہے جو ایسا سفر کرتا ہے جس میں نماز قصر نہیں کی جاتی۔ امام مالک اور ان کے اصحاب اور ثوری نے فرمایا کہ سواری پر نفل نہ پڑھے مگر ایسے سفر میں جس میں نماز قصر کی جاتی ہے۔ انہوں نے فرمایا: وہ سفر جو رسول اللہ ﷺ سے حکایت کئے جاتے ہیں کہ ان میں آپ نوافل سواری پر پڑھتے تھے، وہ وہ سفر تھے جس میں نماز قصر کی جاتی ہے۔ امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب، حسن بن حي، اللیث بن سعد، داؤد بن علی نے کہا: شہر سے باہر ہر سفر میں سواری پر نفل نماز پڑھنا جائز ہے خواہ اس سفر میں نماز قصر کی جاتی ہو یا نہ کی جاتی ہو کیونکہ آثار ایسے ہیں جن میں کسی خاص سفر کا ذکر نہیں۔ ہر سفر میں نفلی نماز جائز ہے مگر یہ کہ کسی سفر کو ایسی روایت کے ساتھ خاص کیا گیا ہو جو واجب التسلیم ہو۔ امام ابو یوسف نے فرمایا: شہر میں بھی سواری پر اشارے سے نماز پڑھ سکتا ہے کیونکہ یحییٰ بن سعید کی حدیث حضرت انس بن مالک سے مروی ہے کہ انہوں نے مدینہ طیبہ کی گلیوں میں گدھے پر اشارے سے نماز پڑھی۔ طبری نے کہا: ہر سوار اور پیدل کے لئے جائز ہے جو وہ مقیم ہو یا مسافر ہو سواری پر اور چلتے ہوئے نفلی نماز اشارے سے پڑھے۔ بعض اصحاب شافعی سے حکایت ہے کہ ان کا مذہب سفر و حضر میں سواری پر نفل پڑھنے کے جواز کا ہے۔ الاثرم نے کہا: احمد بن حنبل سے حضر میں سواری پر نماز کے بارے پوچھا گیا تو امام احمد نے فرمایا: سفر کے بارے تو میں نے سنا ہے لیکن حضر کے بارے نہیں سنا۔ ابن القاسم نے کہا:

1۔ سنن نسائی، کتاب القبلۃ، باب الحال التی یجوز علیها استقبال غیر القبلۃ، حدیث نمبر 735، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً، صحیح بخاری، باب الوتر فی السفر، حدیث نمبر 945، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جو محمل میں نفل پڑھے تو بیٹھ کر نماز پڑھے اس کا قیام چوکڑی مار کر بیٹھنا ہے وہ اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے رکوع کرے پھر اپنے سر کو اٹھائے۔ قتادہ نے کہا: یہ نجاشی کے بارے میں نازل ہوئی۔ جب وہ فوت ہوا تو نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو اس کی نماز جنازہ پڑھنے کے لئے مدینہ طیبہ سے باہر بلایا۔ صحابہ نے عرض کی: ہم اس شخص پر کیسے نماز پڑھیں گے جو فوت ہو چکا ہے اور وہ ہمارے قبلہ کے علاوہ قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتا تھا (1)۔ نجاشی حبشہ کا بادشاہ تھا، اس کا نام اصحمہ تھا عربی میں اس کا معنی عطیہ ہے۔ وہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہوئے فوت ہوا تھا حالانکہ قبلہ تبدیل ہو چکا تھا اور قبلہ کعبہ بن چکا تھا تو یہ آیت نازل ہوئی اور اس کے بارے میں نازل ہوا: وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ (آل عمران: 199) یہ نجاشی کے لئے عذر تھا۔ (2)

نبی کریم ﷺ نے نو ہجری میں اپنے اصحاب کے ساتھ یہ نماز پڑھی تھی۔ اس سے غائب پر نماز جنازہ پڑھنے پر امام شافعی نے استدلال کیا ہے۔ ابن عربی نے کہا: میت پر نماز کے مسائل میں سے غریب ترین مسئلہ وہ ہے جو امام شافعی نے کہا کہ غائب پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔ میں بغداد میں فخر الاسلام کی مجلس میں تھا۔ ان کے پاس خراسان سے ایک شخص آیا اس سے فخر الاسلام نے پوچھا: فلاں کا کیا حال ہے؟ اس شخص نے کہا: وہ تو فوت ہو گیا ہے۔ فخر الاسلام نے کہا: اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔ پھر ہمیں فرمایا: اٹھو میں تمہیں نماز پڑھاؤں۔ پس وہ کھڑے ہوئے اور ہمیں اس کی نماز جنازہ پڑھائی۔ یہ اس کے مرنے کے چھ ماہ بعد نماز جنازہ پڑھی گئی اور درمیان میں چھ ماہ کی مدت تھی۔

شوافع کے نزدیک اس کی اصل نجاشی پر نبی کریم ﷺ کا نماز جنازہ پڑھنا ہے۔ ہمارے علماء فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ تین وجوہ کی وجہ سے اس کے ساتھ خاص تھے۔ (۱) نبی کریم ﷺ کے لئے زمین جنوباً شمالاً ہموار کر دی گئی تھی حتیٰ کہ نجاشی کا جنازہ آپ ﷺ کے سامنے تھا، جس طرح زمین شمالاً جنوباً ہموار کر دی گئی تھی حتیٰ کہ آپ نے مسجد اقصیٰ دیکھ لی۔ مخالف نے کہا: اس روایت میں کیا فائدہ ہے؟ آپ کی برکت کے لاحق ہونے کا فائدہ ہے۔ (۲) نجاشی کے لئے وہاں مومنین میں سے کوئی ولی نہ تھا جو اس کی نماز جنازہ پڑھتا۔ مخالف نے کہا: یہ عادۃً محال ہے، بادشاہ ایک دین پر ہو اور اس کا کوئی پیروکار نہ تھا، محال کے ساتھ تاویل محال ہے (۳) نبی کریم ﷺ نے نجاشی پر نماز جنازہ پڑھنے میں اس پر رحمت داخل کرنے اور اس کے بعد والے بادشاہوں کی الفت چاہنے کا ارادہ کیا تھا جب وہ زندہ اور مردہ حالت میں اس کا اہتمام دیکھیں گے۔ مخالف نے کہا: دعا کی برکت نبی کریم ﷺ سے اور دوسروں سے میت کو بالاتفاق لاحق ہوتی ہے۔ ابن عربی نے کہا: میرے نزدیک نبی کریم ﷺ کے نجاشی پر نماز جنازہ پڑھنے کی حکمت یہ تھی کہ نجاشی اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے انہیں میت پر نماز پڑھنے کا علم نہیں تھا۔ آپ کو معلوم ہوا کہ وہ بغیر نماز کے ہی اسے دفن کر دیں گے تو آپ نے اس کی نماز کی طرف جلدی کی۔

میں کہتا ہوں: پہلی تاویل احسن ہے کیونکہ جب آپ نے اسے دیکھ لیا تو غائب پر نماز نہ ہوئی بلکہ حاضر اور مرئی پر نماز جنازہ پڑھی۔ غائب وہ ہوتا ہے جو نظر نہ آئے۔ واللہ اعلم

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا
2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

چوتھا قول: ابن زید نے کہا: یہود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کو اچھا سمجھتے تھے اور کہتے تھے: ہدایت نہیں پائی مگر ہمارے ذریعے۔ جب کعبہ کو قبلہ بنایا گیا تو یہود نے کہا: کس چیز نے پھیر دیا انہیں جس پر (پہلے) وہ تھے۔ تو یہ آیت نازل ہوئی: وَ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ (1) (اللہ کے لیے ہے مشرق و مغرب) اس قول پر وجہ نظم یہ ہے کہ یہود نے جب قبلہ کے امر کا انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے اپنے بندوں کو جس قبلہ کا چاہے مکلف بنا دے۔ اگر وہ چاہے تو انہیں بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم دے دے، اگر چاہے تو کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دے دے۔ اس کے فعل کے خلاف حجت پیش نہیں کی جا سکتی۔ جو وہ کرتا ہے اس کے بارے اس سے پوچھا نہیں جاتا اور لوگوں سے ان کے افعال کے متعلق پوچھا جائے گا۔

پانچواں قول: یہ آیت، اس آیت وَ حَیْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ (البقرہ:144) سے منسوخ ہے۔ یہ حضرت ابن عباس نے ذکر کیا ہے گویا ابتداء اسلام میں جائز تھا کہ جدھر چاہے آدمی منہ کر کے نماز پڑھ لے پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ قتادہ نے کہا۔ اس آیت کا ناسخ یہ ارشاد ہے فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (البقرہ:149) (یعنی اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر لو) یہ ابو عیسیٰ ترمذی نے بیان کیا ہے۔

چھٹا قول: مجاہد اور ضحاک سے مروی ہے کہ یہ آیت محکم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم مشرق میں ہو یا مغرب میں ہو ادھر ہی اللہ تعالیٰ ہے اس نے استقبال قبلہ کا حکم دیا ہے (2)۔ مجاہد اور ابن جبیر سے مروی ہے جب ادعونی استجب لکم نازل ہوا تو لوگوں نے کہا کدھر منہ کر کے مانگیں۔ تو یہ آیت نازل ہوئی فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ۔

حضرت ابن عمر اور نخعی سے مروی ہے، تم اپنے سفروں میں اور گردشوں میں جہاں بھی ہو ادھر اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس آیت کا تعلق وَ مَنْ اَظْلَمُ الخ کے ساتھ ہے۔ معنی یہ ہے: اے مومنو! اللہ کے شہر تمہیں سما سکتے ہیں، تمہیں اس شخص کی تخریب قبلہ کی طرف منہ کرنے سے نہ روکے، جو اللہ کی مساجد کی تخریب کرتا ہے، تم زمین میں جہاں بھی ہو۔

بعض علماء نے فرمایا: یہ اس وقت آیت نازل ہوئی جب حدیبیہ کے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیت اللہ کے قریب جانے سے روکا گیا تھا، تو مسلمان اس پر مغموم ہوئے (3)۔ یہ دس اقوال ہیں۔ اور جن علماء نے اسے منسوخ کیا ہے ان پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ یہ خبر ہے اور خبر منسوخ نہیں ہوتی کیونکہ خبر، امر کے معنی کا احتمال رکھتی ہے اور اس معنی کا احتمال ہے کہ تم اپنے چہرے اللہ کی طرف کر لو۔ یہ آیت وہ ہے جو حضرت سعید بن جبیر نے تلاوت کی تھی جب حجاج نے زمین کی طرف منہ کر کے اسے ذبح کرنے کا حکم دیا تھا۔

مسئلہ نمبر 4: قرآن و حدیث میں وَجْهٌ جو اللہ کی طرف مضاف ہوتا ہے اس کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے۔ ماہرین نے کہا: یہ وجود کی طرف راجع ہے یہ کلام میں مجاز ہے ذات کو اس سے اس لئے تعبیر فرمایا کیونکہ یہ اعضاء میں ظاہر ترین عضو ہے اور قدر و منزلت میں عظیم ہے (4)۔ ابن فورک نے کہا: بعض دفعہ صفت ذکر کی جاتی ہے اور مجازاً موصوف مراد ہوتا ہے

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ ایضاً، تفسیر طبری زیر آیت ہذا　3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　4۔ ایضاً

جیسے کوئی کہنے والا کہتا ہے: میں نے آج فلاں کا علم دیکھا، میں نے فلاں کے علم کی طرف دیکھا۔ اس سے مراد ہوتا ہے کہ میں نے عالم دیکھا اور عالم کی طرف دیکھا۔ اسی طرح یہاں وَجْهُ ذکر ہے اور مراد وجود ہے۔

اسی تاویل پر یہ ارشاد ہے: اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ (الدہر: 9) اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جس کے لئے وَجْهُ ہے اس طرح یہ آیت ہے: اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝ (اللیل) یعنی وہ ذات جس کے لئے وجہ ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا وَجْهُ سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جیسا کہ ارشاد ہے: وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝ (الرحمٰن)

بعض ائمہ نے فرمایا: یہ نقل سے صفت ثابتہ ہے اور ان صفات سے زائد ہے جن کو عقول واجب قرار دیتی ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا(1): اس قول کو ابو المعالی نے ضعیف قرار دیا ہے یہ اسی طرح ضعیف ہے۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا وجود ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: یہاں الوجہ سے مراد وہ جہت ہے جس کی طرف ہمیں متوجہ کیا گیا ہے یعنی قبلہ۔ بعض نے فرمایا: الوجہ سے مراد قصد ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا:

استغفر اللہ ذنبًا لست مُحْصِيه رب العباد اليه الوجه والعمل

میں اللہ تعالیٰ سے ان گناہوں کی معافی مانگتا ہوں جو بے شمار ہیں بندوں کے رب کی طرف ہی قصد اور عمل ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: معنی ہے: فثم رضا اللہ و ثوابہ، یعنی ادھر اللہ کی رضا اور ثواب ہے جیسا کہ فرمایا: اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ (الدہر: 9) ہم اللہ کی رضا اور اس کے ثواب کی طلب میں تمہیں کھلاتے ہیں۔ اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: من بنی مسجدا یبتغی بہ وجہ اللہ بنی اللہ لہ مثلہ فی الجنۃ (2)۔ جس نے مسجد بنائی اور اس سے اس کا مقصود اللہ کی رضا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے اس کی مثل جنت میں (گھر) بنائے گا۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: قیامت کے روز مہر شدہ صحیفوں کو لایا جائے گا اور انہیں اللہ تعالیٰ کے سامنے رکھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرمائے گا: ان کو پھینک دو اور ان کی طرف توجہ کرو۔ فرشتے عرض کریں گے: اے ہمارے رب! تیری عزت کی قسم! ہم تو انہیں خیر دیکھتے تھے اللہ بہتر جانتا ہے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ان هذا کان لغیر وجهی ولا اقبل من العمل الا ما ابتغی به وجهی۔ یہ اعمال میری رضا کے لئے نہ تھے اور میں صرف وہی عمل پسند کرتا ہوں جو میری رضا کے لئے ہو۔ اس حدیث کو دارقطنی نے نقل کیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: مراد فثم اللہ ہے الوجہ زائد ہے۔ یہ اس ارشاد کی طرح ہے: وھو معکم۔ یہ کلبی، قتبی کا قول ہے۔ معتزلہ کا قول بھی اسی طرح ہے۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ یعنی وہ اپنے بندوں پر ان کے دین میں وسعت فرماتا ہے اور انہیں ایسی تکلیف نہیں دیتا جو ان کی طاقت میں نہ ہو۔ بعض علماء نے فرمایا: وَاسِعٌ کا معنی ہے: اس کا علم ہر چیز گھیرے ہوئے ہے۔ جیسے ارشاد فرمایا: وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۝ (طٰہٰ)

فراء نے کہا: الواسع اس سخی کو کہتے ہیں جس کی عطا ہر چیز کو شامل ہو، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَرَحْمَتِيْ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ صحیح بخاری، کتاب المساجد، باب من بنی مسجدا، حدیث نمبر 431، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (اعراف:156)

اور بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد مغفرت میں وسعت رکھنے والا ہے، کوئی گناہ اس مغفرت سے بڑا نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اپنے بندوں پر فضل فرمانے والا اور ان کے اعمال سے بے نیاز ہے۔ کہا جاتا ہے: فلان یسع مایسئل، یعنی فلاں عطا فرماتا ہے جو اس سے مانگا جاتا ہے یعنی بخل نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ (الطلاق:7) یعنی غنی کو اس سے خرچ کرنا چاہئے جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا فرمایا۔ ہم اپنی کتاب الاسنیٰ میں اس کا ذکر کیا ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۝

''اور یہ کہتے ہیں کہ بنا لیا ہے اللہ نے (اپنا) ایک بیٹا، پاک ہے وہ (اس تہمت سے) بلکہ اسی کی ہے جو چیز آسمانوں میں ہے اور زمین میں۔ سب اسی کے فرمانبردار ہیں''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا یہ نصاریٰ کے متعلق خبر ہے۔ انہوں نے کہا تھا: المسیح ابن اللہ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا بیٹا ہے) نعوذ باللہ من ذالک۔ بعض نے فرمایا: عرب کے کفار کے متعلق خبر ہے کہ انہوں نے کہا: الملائکۃ بنات اللہ (ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں) اسی طرح کی اخبار جاہل کفار کے متعلق ہیں کہ انہوں نے حضرت مریم اور انبیاء کرام کے بارے میں ایسا عقیدہ رکھا۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ امام بخاری نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ابن آدم نے مجھے جھٹلایا اور اسے یہ مناسب نہ تھا، ابن آدم نے مجھے گالی دی اور اسے یہ چاہیے نہیں تھا۔ اس کا مجھے جھٹلانا یہ ہے کہ اس نے کہا: میں اسے دوبارہ لوٹانے پر قادر نہیں ہوں جس طرح وہ پہلے تھا اور اس کا مجھے گالی دینا یہ ہے کہ اس نے کہا: میرا بیٹا ہے میری ذات کسی کو بیوی یا بیٹا بنانے سے پاک ہے(1)۔

مسئلہ نمبر 3: سُبْحٰنَهٗ مصدر کی حیثیت سے منصوب ہے۔ اس کا معنی ہے: پاک کرنا، بری کرنا، ہر نقص سے علیحدہ جاننا۔ لوگوں نے کہا: اللہ نے بیٹا بنایا، نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں یکتا ہے، اپنی صفات میں یگانہ ہے۔ نہ تو اس نے کسی کو پیدا کیا ہے کہ وہ بیوی کا محتاج ہو۔ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ (انعام:101) (کیونکر ہو سکتا ہے اس کا کوئی لڑکا حالانکہ نہیں ہے اس کی کوئی بیوی اور پیدا فرمایا ہے اس نے ہر چیز کو)

ولم یولد، نہ وہ پیدا کیا گیا ہے کہ اس سے پہلے کوئی ہو۔ اللہ تعالیٰ کی ذات بلند و بالا ہے اس سے جو ظالم اور منکر کہتے ہیں بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، ما مبتدا کی حیثیت سے مرفوع ہے اور خبر مجرور ہے یعنی ایجاد و اختراع کے اعتبار سے ہر چیز اس کی ملکیت میں ہے، اور جو یہ کہنے والا ہے کہ اس نے بیٹا بنایا یہ جملہ آسمانوں اور زمین میں داخل ہے(2)۔ سبحان اللہ کا معنی

1۔ صحیح بخاری، باب وقالوا اتخذ اللہ ولدا سبحانہ، حدیث نمبر 4122، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذا

اللہ تعالیٰ کو ہر نقص اور عیب سے پاک جانتا ہے۔

مسئلہ نمبر 4: بچہ، والد کی جنس سے ہوتا ہے۔ پس حق سبحانہ تعالیٰ کے لئے اپنی مخلوقات میں سے بیٹا بنانا کیسے درست ہوگا جبکہ کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّاۤ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿۹۳﴾ (مریم) (کوئی ایسی چیز نہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہے مگر وہ حاضر ہوگی رحمن کی بارگاہ میں بندہ بن کر) اسی طرح فرمایا: بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (بلکہ اسی کا ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے)۔ اولاد ہونا جنسیت اور حدوث کا تقاضا کرتا ہے اور قدیم ہونا وحدانیت اور ثبوت کا تقاضا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات قدیم، ازلی اور یکتا ہے تنہا اور بے نیاز ہے۔ وہ وہ ہے جس نے نہ کسی کو جنا ہے نہ وہ جنا گیا ہے، اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے۔ پھر بیٹا: . غلامی اور عبودیت کے منافی ہے جیسا کہ اس کا بیان سورۂ مریم میں ان شاء اللہ آئے گا۔ پس بیٹا عبد کیسے ہوگا۔ یہ محال ہے اور جو چیز محال تک پہنچائے وہ بھی محال ہے۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ یہ مبتدا خبر ہیں۔ تقدیر عبارت كلهم ہے پھر ھا اور میم کو حذف کیا گیا۔ قٰنِتُوْنَ کا معنی اطاعت کرنے والے اور عجز کا اظہار کرنے والے ہیں۔ تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتی ہے۔ جمادات کی اطاعت ان پر اور ان میں اس کی صنعت کے ظہور میں ہے۔ قنوت کا معنی اطاعت اور سکوت ہے(1)۔ اسی سے حضرت زید بن ارقم کا قول ہے ہم نماز میں کلام کرتے تھے۔ آدمی اپنے قریب والے شخص سے بات کرتا رہتا تھا، حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی: وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿۲۳۸﴾ (البقرہ: 238) ہمیں سکوت کا حکم دیا گیا اور ہمیں کلام سے منع کیا گیا۔

القنوت کا معنی نماز بھی ہے۔ شاعر کا قول ہے:

قانتاً لله يتلو كتبه و علی عمد من اعتزل

اس شعر میں قانتاً نماز پڑھنے والے کے معنی میں ہے۔

سدی وغیرہ(2) نے كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ کے تحت لکھا ہے کہ قیامت کے دن تمام اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے والے ہوں گے۔ حسن نے کہا: جو بھی اللہ تعالیٰ کی گواہی دینے والا ہے وہ اس کا عبد ہے۔ القنوت کا لغوی معنی قیام ہے۔ اسی سے حدیث پاک میں ہے: افضل الصلوٰة طول القنوت(3)۔ نماز میں سے افضل نماز وہ ہے جس کا قیام لمبا ہو۔ یہ زجاج نے کہا ہے ساری مخلوق اس کی عبودیت کو قائم کرنے والی ہے خواہ اقرار کے ساتھ یا کسی اور طریقہ سے۔ اس کی صنعت کا قرآن پر ظاہر ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کی اصل اطاعت ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ (احزاب: 35) مزید تفصیل وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿۲۳۸﴾ (البقرہ: 238) کے تحت آئے گی۔

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾

”موجد ہے آسمانوں اور زمین کا اور جب ارادہ فرماتا ہے کسی کام کا تو صرف اتنا حکم دیتا ہے اسے کہ ہو جا تو وہ ہو

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 3۔ صحیح مسلم، حدیث نمبر 164، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت

جاتا ہے"۔

اس میں چھ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ۔ مبالغہ کے لئے فعیل کا وزن ہے، مبتدا محذوف کی خبر کی حیثیت سے مرفوع ہے۔ اسم فاعل مبدع ہے جیسے بصیر سے مبصر ہے ابدعت الشیء لاعن مثال یعنی میں نے بغیر کسی مثال کے چیز کو پیدا کیا۔ اللہ تعالیٰ بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ہے یعنی ان کو پیدا کرنے والا، ان کا موجد، ان کو نئے سرے سے بنانے والا اور بغیر کسی مثال اور حد کے ایجاد کرنے والا ہے۔ ہر وہ شخص جو کوئی نئی چیز پیدا کرے جس سے پہلے وہ چیز کسی نے پیدا نہ کی ہو تو اسے مبدع کہا جاتا ہے۔ اسی سے اصحاب البدع ہیں۔ بدعت کو بدعت اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ کہنے والا اپنے امام کی کلام اور فعل کے بغیر کہتا ہے۔ بخاری میں ہے: نعمت البدعة هذه۔ یعنی رمضان کا قیام اچھی بدعت ہے۔

مسئلہ نمبر 2: ہر وہ بدعت جو مخلوق سے صادر ہو اس کی دو صورتیں ہوں گی یا تو اس کی شرع میں اصل ہوگی یا شرع میں اس کی اصل نہ ہوگی۔ اگر تو اس کی کوئی اصل ہو، وہ اس عموم کے تحت واقع ہو جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے دعوت دی ہے اور اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برانگیختہ کیا ہے تو وہ مدح کے مقام پر ہوگی اگرچہ اس کی مثال موجود نہ ہو جیسے جود و سخا کی نوع، اور نیکی کا کوئی فعل، تو یہ فعل، افعال محمودہ سے ہوگا۔ اگرچہ اس سے پہلے کوئی کرنے والا نہ بھی ہو۔ اس قول کی تائید حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول کرتا ہے: نعمت البدعة هذه (1) یہ اچھی بدعت ہے جب وہ بدعت افعال خیر میں سے تھی اور مدح کے تحت داخل تھی۔ قیام رمضان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا مگر اسے ترک کر دیا تھا اور اس پر دوام اختیار نہیں فرمایا تھا اور نہ لوگوں کو جمع کیا تھا۔ پس حضرت عمر کی اس پر محافظت اور لوگوں کو اس پر جمع کرنا اور انہیں اس کی طرف بلانا، بدعت تھا لیکن یہ بدعت محمودہ ممدوحہ تھی۔ اگر وہ کوئی ایسا عمل ہو جو اللہ اور اس کے رسول کے امر کے خلاف ہو تو وہ مذمت و انکار کے مقام میں ہوتا ہے۔ یہ معنی خطابی وغیرہ نے بیان کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد جو خطبہ میں فرمایا اس کا یہی معنی ہے: و شر الامور محدثاتها و کل بدعة ضلالة (2) برے امور بدعتیں ہیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ یعنی ایسی بدعت جو کتاب و سنت کے موافق نہ ہو یا صحابہ کے عمل کے موافق نہ ہو اور اس حقیقت کو اپنے اس ارشاد میں بیان فرمایا: مَنۡ سَنَّ فی الاسلام سُنَّةً حسنة کان له اجرها و اجر من عمل بها من بعده من غیر ان ینقص من اجورهم شیء و من سَنَّ فی الاسلام سنةً سیئةً کان علیها وزرها و وزر من عمل بها من بعده من غیر ان ینقص من اوزارهم شیءٌ (3)۔ یعنی جس نے اسلام میں کوئی اچھا کام شروع کیا تو اسے اس کا اجر اور اس کے بعد اس پر عمل کرنے والوں کا اجر ملے گا اور ان کے اجور میں بھی کچھ کمی نہ ہوگی اور جس نے اسلام میں کوئی برا

1۔ الموطا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ باب ماجاء فی قیام رمضان، صفحہ 97 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الجمعة فصل فی خطبة الجمعة، جلد 1 صفحہ 285 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب الحث علی الصدقة لو بشق تمرة او کلمة طیبة، جلد 1 صفحہ 327 (قدیمی کتب خانہ)

عمل شروع کیا تو اس پر اس کا گناہ ہوگا اور ان لوگوں کا گناہ ہوگا جو اس کے بعد اس پر عمل کریں گے، ان کے گناہوں میں کمی کئے بغیر۔ یہ اشارہ ہے جو قبیح یا حسن بدعت شروع کی جاتی ہے۔ یہ اس باب کی اصل ہے۔ اللہ تعالیٰ سے عصمت و توفیق کا سوال ہے اور اس کے علاوہ کوئی پالنے والا نہیں۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ جب کسی امر کے احکام اور اتقان کا ارادہ فرماتا ہے جیسا کہ اس کے علم میں پہلے تھا ... تو اسے کُنْ فرماتا ہے۔ ابن عرفہ نے کہا: قضاء الشئی کا مطلب اس کا احکام اور اس کا جاری کرنا اور اس سے فارغ ہونا ہے، اسی وجہ سے قاضی کو قاضی کہتے ہیں کیونکہ جب وہ فیصلہ فرماتا ہے تو جھگڑا کرنے والوں کے جھگڑا سے فارغ ہو جاتا ہے۔ الازہری نے کہا: لغت میں قضی کے کئی معانی ہیں اس کا مرجع کسی چیز کو ختم کرنا اور مکمل کرنا ہے۔ ابوذویب نے کہا:

و علیھما مسرودتان قضاھما داؤد او صنع السوابغ تبع

ان کے اوپر دو زرہیں ہیں جنہیں داؤد نے بنایا ہے یا تبع نے مکمل کی ہیں۔

شماخ نے حضرت عمر بن خطاب کے بارے میں فرمایا:

قضیت اموراً ثم غادرت بعدھا بوائق فی اکمامھا لم تفتق

تو نے کاموں کو مکمل کیا الخ۔

ہمارے علماء نے فرمایا: قضی کا لفظ مشترک ہے کبھی یہ خلق کے معنی میں ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ (فصلت: 12) یہ قضی بمعنی خلق (پیدا کرنا) ہے کبھی یہ اعلام کے معنی میں ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَضَيْنَاۤ اِلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ (الاسراء: 4) یعنی ہم نے بنی اسرائیل کو آگاہ کیا۔ کبھی یہ امر (حکم) کے معنی میں ہوتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ (الاسراء: 23) یعنی تمہارے رب نے حکم دیا ...... کبھی الزام اور احکام کو جاری کرنے کے معنی میں ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ (القصص: 29) (جب موسیٰ نے مدت پوری کردی) کبھی ارادہ کے معنی میں ہوتا ہے جیسے وَ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا الخ جب اللہ کسی شے کو پیدا کرنے کا ارادہ فرماتا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا(1): قضی بمعنی قدّر (اندازہ کرنا) اور کبھی بمعنی اَمضٰی بھی آتا ہے۔ اہل سنت کے مذہب پر اس آیت میں یہ دونوں معانی مراد ہو سکتے ہیں یعنی ازل میں مقدر فرمایا اور اپنا حکم نافذ فرمایا اور معتزلہ کے مذہب پر خلق اور ایجاد حکم نافذ فرمایا۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَمْرًا، الامر واحد ہے اس کی جمع الامور ہے یہ امر یامر کا مصدر نہیں ہے(2)۔ ہمارے علماء نے فرمایا: قرآن میں امر چودہ معانی میں استعمال ہوا ہے۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضا

(۱) دین: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ (توبہ: 48) حتیٰ کہ حق آیا اور اللہ کا دین اسلام ظاہر ہوا۔

(۲) قول: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا (المومنون: 28) یعنی جب ہمارا قول آئے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ (طہ: 62) یہاں بھی امر بمعنی قول ہے۔

(۳) عذاب: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ (ابراہیم: 22) یعنی جب دوزخیوں کے بارے عذاب کا فیصلہ ہو گیا۔

(۴) عیسیٰ علیہ السلام: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا (البقرہ: 117) یعنی عیسیٰ علیہ السلام کا فیصلہ فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ وہ بغیر باپ کے ہوں گے۔

(۵) بدر میں قتل: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ (غافر: 78) یعنی بدر میں قتل اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا (انفال: 42) اس آیت میں مکہ کے کفار کا قتل مراد ہے۔

(۶) فتح مکہ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ (توبہ: 24)۔ یہاں امر سے مراد فتح مکہ ہے۔

(۷) قریظہ کا قتل اور بنی نضیر کی جلاوطنی: فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ (البقرہ: 109) اس آیت میں امر سے مراد قتل قریظہ اور بنی نضیر کی جلاوطنی ہے۔

(۸) قیامت: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَتٰٓى اَمْرُ اللّٰهِ (النحل: 1) اللہ کا امر (قیامت) آ گیا۔

(۹) القضاء: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يُدَبِّرُ الْاَمْرَ (السجدہ: 5) اس میں امر بمعنی فیصلہ ہے۔

(۱۰) وحی: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ (السجدہ: 5) وہ آسمان سے زمین کی طرف وحی نازل فرماتا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ (طلاق: 12)

(۱۱) امر الخلق: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ ۝ (الشوریٰ) یعنی مخلوق کے امور اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹتے ہیں۔

(۱۲) النصر (مدد، نصرت): اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ (آل عمران: 154) (کہتے: کیا ہمارا بھی اس کام میں کچھ دخل ہے)

(۱۳) الذنب (گناہ): اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا (الطلاق: 9) یعنی اپنے گناہ کی سزا۔

(۱۴) شان اور فعل: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ۝ (ہود) اس میں امر سے مراد فعل اور شان ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ۔ (نور: 63) اس آیت میں بھی امر سے مراد فعل ہے۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کُنْ بعض علماء نے فرمایا: کاف، کینونہ سے ہے اور نون نور سے ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اعوذ بکلمات التامۃ من شر ما خلق سے یہی مراد ہے۔ بکلمۃ اللہ التامۃ یعنی مفرد بھی مروی ہے۔ جمع اس اعتبار سے ہے کہ جب یہ کلمہ تمام امور میں ہے، پس جب ہر امر کے لئے کُنْ کہا اور ہر شے کے لئے کُنْ کہا تو یہ بہت سے کلمات ہو گئے۔ اس پر دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت ابوذر سے مروی ہے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے

روایت کی ہے اور آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیان کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: عطائی کلام وعذابی کلام میری عطا کلام ہے اور میرا عذاب کلام ہے۔ ان الفاظ کو ایک طویل حدیث میں امام ترمذی نے نقل کیا ہے کلمہ، کلمات کے معنی میں بھی ہوتا ہے لیکن جب ایک کلمہ تمام اوقات میں تمام امور میں جدا جدا ہو یہ بہت سے کلمات ہو گئے اور ان کا مرجع ایک کلمہ ہے، اور تامۃ فرمایا کیونکہ اہل لغت کے نزدیک کم از کم کلام کے تین حروف ہوتے ہیں۔ ایک حرف جس سے آغاز کیا جاتا ہے ایک حرف جس کے ساتھ کلمہ جمع کیا جاتا ہے اور ایک حرف جس پر سکوت کیا جاتا ہے جب کسی کلمہ کے دو حرف ہوں تو وہ ان کے نزدیک ناقص ہوتا ہے جیسے ید، دم، ضم یہ علت کی وجہ سے ناقص ہیں۔ یہ کلمات آدمیوں کی طرف سے منقوصات میں سے ہیں کیونکہ یہ دو حرفوں پر مشتمل ہیں نیز کیونکہ یہ ادوات کے ساتھ تلفظ کیے گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے تامہ ہیں کیونکہ یہ بغیر ادوات کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مخلوق کی شبہ سے بلند و بالا ہے۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَيَكُونُ یہ نون کے رفع کے ساتھ پڑھا گیا ہے علیحدہ کلام کے اعتبار سے (1)۔ سیبویہ نے کہا: یہ فھو یکون ہے یا فانہٗ یکون ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: یہ یقول پر معطوف ہے (2)۔ پہلی صورت میں یہ امر کے بعد ہوگا اگرچہ پہلے معدوم ہوگا، کیونکہ یہ موجود کے قائم مقام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ معلوم ہے اس کا بیان آگے آئے گا اور دوسری صورت میں امر کے ساتھ موجود ہوگا، اس کو طبری نے پسند کیا ہے۔ فرمایا اس نے کسی شے کو کُنْ کے ساتھ حکم دیا جاتا ہے وہ حکم کے ساتھ موجود ہوتی ہے اور کوئی شے موجود نہیں ہوتی مگر وہ جسے وجود کا حکم دیا جاتا ہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ اس کی مثال، لوگوں کا قبور سے کھڑا ہونا ہے اللہ تعالیٰ کے بلاوا سے نہ مقدم ہوں گے نہ مؤخر۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ إِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً ۖ مِّنَ الْأَرْضِ ۚ إِذَا أَنتُمْ تَخْرُجُونَ ﴿٢٥﴾ (الروم)

ابن عطیہ نے اس قول کو ضعیف کہا ہے اور فرمایا: یہ معنی کی جہت سے غلط ہے کیونکہ یہ قول تقاضا کرتا ہے کہ قول، تکوین اور وجود کے ساتھ ہے۔ (3)

اس آیت میں عقیدہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ معدومات کا ہمیشہ سے آمر ہے ان کے وجود کی شرط کے ساتھ۔ مقدورات کے تاخر کے ساتھ قادر ہے۔ معلومات کے تاخر کے ساتھ عالم ہے۔ پس آیت میں ہر وہ چیز جو استقبال کا تقاضا کرتی ہے وہ مامورات کے اعتبار سے ہے کیونکہ محدثات نہ ہونے کے بعد ہوتی ہیں، ہر وہ صفت جو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتی ہے قدرت اور علم سے وہ قدیم اور ہمیشہ ہوتی ہے (4)، پس (کن) کی عبارت جس معنی کا تقاضا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قدیم اور قائم بالذات ہے۔

ابو الحسن الماوردی نے کہا: اگر کہا جائے کس حال میں وہ اسے کن کہتا ہے کہ وہ ہو جاتی ہے کیا عدم کی حالت میں یا اس کے وجود کی حالت میں۔ اگر تو وہ حالت عدم میں ہوتی ہے تو حکم کرنا محال ہے مگر مامور کو۔ جیسے محال ہوتا ہے امر ہونا مگر آمر کی طرف سے۔ اگر وہ حالت وجود میں ہے تو یہ ایسی حالت ہے جس میں وجود اور حدوث کا امر جائز ہی نہیں ہے کیونکہ وہ موجود حادث

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

ہے۔ اس سوال کے تین جوابات دیئے گئے ہیں۔

(۱) یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر ہے اس کی موجود مخلوق میں اس کے اوامر کے نفوذ کی، جیسے اس نے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ وہ دھتکارے ہوئے بندر بن جائیں اور یہ معدومات کی ایجاد میں وارد نہیں ہوتا۔

(۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ ہونے والا ہے اس کے ہونے سے پہلے اسے جانتا ہے۔ پس وہ اشیاء جو موجود نہیں وہ اس کے علم میں اپنے ہونے سے پہلے ان چیزوں کے مشابہ ہیں جو موجود ہیں۔ پس انہیں کونی کہنا جائز ہے۔ وہ انہیں حالت عدم سے حالت وجود کی طرف نکلنے کا حکم دیتا ہے کیونکہ وہ حالت عدم میں ان کو جانتا ہے۔

(۳) تیسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر ہے جس کو اس نے پیدا کرنا ہے تمام کو شامل ہے جب وہ اس کی پیدائش اور تخلیق کا ارادہ فرماتا ہے وہ پیدا ہو جاتی ہے اور پائی جاتی ہے بغیر اس کے کہ وہاں اسے قول فرمائے۔ یہ اس کا فیصلہ ہے جو وہ چاہتا ہے، اس کو قول سے تعبیر فرمایا ہے اگرچہ قول نہ بھی ہو۔ جیسے ابوالنجم کا قول ہے۔

قد قالت الانساع للبطن الحق (1)

یہ کوئی قول نہیں ہے، اس نے ارادہ کیا کہ پیٹھ پیٹ کے ساتھ لاحق ہوگئی ہے۔ جیسے عمرو بن حممہ الدوسی نے کہا:

فاصبحت مثل النسر طارت فراخهُ اذا رام تطیاراً یقال له قع

میں گدھ کی طرح ہوگیا جس کے بچے اڑ گئے۔ جب وہ اڑنے کا ارادہ کرتی ہے تو اسے قع کہا جاتا ہے۔

اسی طرح ایک اور شاعر نے کہا:

قالت جناحاہ لساقیه الحقا و نجیا لحمکما ان یمزقا

اس کے پروں نے اس کی پنڈلیوں کو کہا: مل جاؤ اور اپنے گوشت کو پھٹنے سے بچا لو۔

وَ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا یُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِیْنَاۤ اٰیَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَیَّنَّا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ۝

''اور کہتے ہیں وہ لوگ جو کچھ نہیں جانتے کہ کیوں نہیں کلام کرتا ہمارے ساتھ (خود) اللہ یا کیوں نہیں آتی ہمارے پاس کوئی نشانی۔ اسی طرح کہی تھی ان لوگوں نے جو ان سے پہلے گزرے تھے، ان کی طرح بے سروپا بات۔ ملتے جلتے ہیں ان سب کے دل بے شک ہم نے صاف صاف بیان کر دی ہیں (اپنی) نشانیاں اس قوم کے لئے جو یقین رکھتے ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس سے مراد یہود ہیں۔ مجاہد نے کہا: نصاریٰ ہیں۔ طبری نے اس کو راجح کہا ہے کیونکہ پہلی آیت میں ان کا ذکر ہے۔ ربیع، سدی اور قتادہ نے کہا: اس سے مراد عرب کے مشرک ہیں ولولا بمعنی ھلا ہے۔ یہ حرف تحضیض (2) (ابھارنا) ہے۔ جیسے اشہب بن رمیلہ نے کہا:

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

2۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

تعدون عقرالنیب افضل مجدکم　　بنی ضوطریٰ لولا الکمی المقنعا (1)

اس شعر میں لولا بمعنی ھلاّ ہے۔

یہ وہ لولا نہیں ہے جو ایک چیز کے پائے جانے کی وجہ سے دوسری چیز کے نہ پائے جانے پر دلالت کرتا ہے (یعنی شرط کے پائے جانے کی وجہ سے جزا کے نہ پائے جانے پر دلالت کرتا ہے) ان دونوں کے درمیان علماء لغت کے درمیان یہ فرق ہے کہ لولا جو تحضیض کے معنی میں ہوتا ہے، اس کے ساتھ فعل ظاہر یا فعل مقدر ملا ہوا ہوتا ہے اور جو امتناع کے لئے ہوتا ہے اس کے ساتھ مبتدا ملا ہوا ہوتا ہے اور عادت جاری ہے کہ خبر حذف ہوتی ہے (2)۔ کلام کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت محمد ﷺ کی نبوت کے متعلق ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا تا کہ ہم جان لیں کہ وہ نبی ہے پھر ہم اس پر ایمان لے آئیں یا ہمارے پاس وہ کوئی نشانی کیوں نہیں لے آتے جو ان کی نبوت کی علامت ہو۔ الایۃ کا معنی دلالت اور علامت ہے۔ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ جن علماء نے الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ سے مراد کفار قریش لئے ہیں ان کے نزدیک اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں اور جنہوں نے الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ سے مراد یہود و نصاریٰ لئے ہیں ان کے نزدیک اس سے مراد پہلی قومیں ہیں، اور جنہوں نے الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ سے مراد نصاریٰ لئے ہیں ان کے نزدیک اس سے مراد یہود ہیں۔ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ بعض علماء نے فرمایا: ان کے دل ہٹ دھرمی، اقتراح اور ترک ایمان میں ان کے مشابہ ہیں۔ فراء نے کہا: ان کے دل کفر میں متفق ہونے میں مشابہ ہیں۔ قَدْ بَیَّنَّا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ اس کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔

اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا ۙ وَّ لَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ ۝

"بے شک ہم نے بھیجا ہے آپ کو (اے حبیب! ﷺ) حق کے ساتھ (رحمت کی) خوشخبری دینے والا، (عذاب سے) ڈرانے والا اور آپ سے باز پرس نہیں ہوگی ان دوزخیوں کے متعلق"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا، بَشِیْرًا حال کی بنا پر منصوب ہے اور نَذِیْرًا اس پر معطوف ہے۔ ان کا معنی گزر چکا ہے۔

وَّ لَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ مقاتل نے کہا: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ یہود پر عذاب نازل کرتا تو یہ ایمان لے آتے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: وَّ لَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ۔ تسأل کے رفع کے ساتھ یہ جمہور کی قراءت ہے بشیرا، نذیرا پر عطف کی بنا پر محل نصب میں ہوگا۔ معنی یہ ہے کہ ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا در اں حالیکہ آپ بشارت دینے والے، ڈرانے والے اور غیر مسؤل ہیں۔ سعید اخفش نے کہا: لا تسأل (تاء کے فتحہ اور لام کے ضمہ کے ساتھ) اور بَشِیْرًا پر عطف کی بنا پر محل نصب میں ہے (3)۔ معنی یہ ہے کہ ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا در اں حالیکہ آپ بشارت دینے والے ہیں اور ڈرانے والے ہیں، دوزخیوں کے متعلق آپ پوچھنے والے نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کے متعلق ان کے ڈرانے کے بعد آپ کو آگاہ کر دیا تو آپ ان کے متعلق سوال کرنے سے مستغنی ہیں۔ غیر سائل کا یہ معنی ہے

1۔ المحرر الوجیز، تفسیر طبری، زیر آیت ہذا　　2۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذا　　3۔ ایضاً

اور غیر مسئول کا معنی یہ ہے کہ جو بشارت اور انذار کے بعد کفر کرے گا اس کے کفر کی وجہ سے آپ سے نہیں پوچھا جائے گا۔ حضرت ابن عباس اور حضرت محمد بن کعب نے فرمایا: ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کاش! معلوم ہوتا کہ میرے والدین کے ساتھ کیا ہوا، تو یہ آیت نازل ہوئی (1)۔ یہ اس شخص کی قراءت پر ہے جنہوں نے لا تسأل جزم کے ساتھ نہی کا صیغہ پڑھا ہے۔ یہ صرف نافع کی قراءت ہے اس میں دو وجہیں ہیں: اس شخص کے بارے سوال کرنے سے نہی ہے زندہ لوگوں میں سے جس نے نافرمانی کی اور کفر کیا کیونکہ حالت تبدیل ہوتی رہتی ہے، کبھی کفر سے ایمان کی طرف منتقل ہوا جاتا ہے اور معصیت سے اطاعت کی طرف منتقل ہوا جاتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے جو زیادہ واضح ہے کہ اس کے متعلق سوال سے نہی ہے جو کفر اور معصیت پر فوت ہو گیا، اس کی حالت کی بڑائی اور شان کی تغلیظ کی وجہ سے یہ اس طرح ہے جیسے کہا جاتا ہے: تو فلاں کے متعلق نہ پوچھ یعنی وہ تیرے گمان سے زیادہ تک پہنچ گیا ہے۔ حضرت ابن مسعود نے لن تسأل پڑھا ہے اور ابی نے و ما تسأل پڑھا ہے۔ ان کا معنی جمہور کی قراءت کے موافق ہے اس کی نفی کی کہ آپ سے ان کے متعلق پوچھا جائے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: آپ نے سوال کیا تھا کہ میرے والدین میں سے کون از روئے موت قریب ہے (2) تو یہ آیت نازل ہوئی، ہم نے اپنی کتاب ''التذکرہ'' میں ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے والدین کو آپ کے لئے زندہ کیا تھا اور وہ دونوں آپ پر ایمان لائے تھے، ہم نے حضور علیہ السلام کا قول بھی ذکر کیا ہے جو آپ نے ایک شخص سے فرمایا تھا کہ (میرا باپ اور تیرا باپ آگ میں ہیں) ہم نے اس کی وضاحت کی ہے۔ الحمد للہ۔

وَ لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَ لَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَ لَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ ﴿۱۲۰﴾

''اور ہرگز خوش نہیں ہوں گے آپ سے یہودی اور نہ عیسائی یہاں تک کہ آپ پیروی کرنے لگیں ان کے دین کی۔ آپ (انہیں) کہہ دیجئے کہ اللہ کا بتایا ہوا راستہ ہی سیدھا راستہ ہے اور اگر (بفرض محال) آپ پیروی کریں ان کی خواہشوں کی اس علم کے بعد بھی جو آ چکا ہے (تو پھر) نہیں ہوگا آپ کے لئے اللہ (کی گرفت) سے بچانے والا کوئی یار اور نہ کوئی مددگار''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَ لَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اس کا معنی یہ ہے کہ اے پیارے محمد! جو یہ آیات کا مطالبہ کرتے ہیں ان کی غرض ایمان لانے کی نہیں ہے بلکہ اگر آپ وہ سب کچھ لے بھی آئیں جس کا یہ مطالبہ کر رہے ہیں تو پھر بھی یہ آپ سے راضی نہ ہوں گے۔ انہیں تو صرف یہی چیز راضی کرے گی کہ آپ جس دین اسلام پر ہیں اس کی پیروی چھوڑ دیں۔ کہا جاتا ہے: رضی یرضی رِضا رُضا و رضوانا و رضوانا و مَرضاۃً۔ یہ وادی ہے، تثنیہ میں رِضوان کہا جاتا ہے۔ کسائی نے رضیان حکایت کیا ہے۔ ممدود بھی حکایت کیا گیا

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا
2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

ہے۔ گویا یہ راضی یراضی مراضاۃ و رضائی کا مصدر ہے۔ نتبع، ان کی وجہ سے منصوب ہے لیکن حتیٰ کے ساتھ انْ ظاہر نہیں ہوتا۔ یہ خلیل نے کہا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حتیٰ اسم کو جر دیتا ہے جیسے ارشاد ہے: حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ۝ (القدر) جو اسم میں عامل ہوتا ہے وہ فعل میں عامل نہیں ہوتا۔ اور جو اسم کو جر دیتا ہے وہ فعل کو نصب نہیں دیتا۔ نحاس نے کہا نتبع، حتیٰ کی وجہ سے منصوب ہے اور حتیٰ، انْ سے بدل ہے۔ الملۃ اس کا اسم ہے جو اللہ تعالیٰ اپنی کتب میں اور اپنے رسولوں کی زبان پر اپنے بندوں کے لئے مشروع فرماتا ہے۔

پس ملت اور شریعت برابر ہیں۔ رہا دین تو اس کے اور ملت و شریعت کے درمیان فرق کیا گیا ہے۔ شریعت وہ ہوتی ہے جس کے کرنے کی طرف اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو بلاتا ہے اور دین وہ ہوتا ہے جس کو بندے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ادا کرتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 2: اس آیت سے علماء کی ایک جماعت، امام ابو حنیفہ، امام شافعی، داؤد اور امام احمد بن حنبل نے دلیل پکڑی ہے کہ کفر ملت واحدہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مِلَّتَهُمْ، ملت کو واحد ذکر فرمایا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ۝ (الکافرون: 4) تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین ہے) اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا: لایتوارث اھل الملتین (1)۔ (دو مختلف ملتوں والے ایک دوسرے کے وارث نہیں بنتے)۔ یہاں ملتین سے مراد اسلام اور کفر ہیں۔ اس کی دلیل نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: لایرث المسلمُ الکافرَ۔ مسلمان، کافر کا وارث نہیں ہوتا۔

امام مالک اور ایک روایت امام احمد سے یہ ہے کہ کفر کی بہت سی ملتیں ہیں۔ پس یہودی، نصرانی کا وارث نہ ہوگا اور یہودی اور نصرانی، مجوسی کے وارث نہیں ہوں گے۔ امام مالک اور امام احمد نے نبی کریم ﷺ کے ظاہر قول لایتوارث اھل ملتین کو لیا ہے۔ رہا اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں مِلَّتَهُمْ اس سے مراد کثرت ہے اگرچہ لفظاً مفرد ہے کیونکہ کثرت کی ضمیر کی طرف مضاف ہے جیسے تو کہتا ہے: اخذت عن علماء اھل المدینہ علمھم۔ سمعت علیھم حدیثھم۔ ان مثالوں میں علومھم اور احادیثھم مراد ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى معنی یہ ہے کہ اے پیارے محمد! ﷺ جس ہدایت پر آپ ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے ہے جس کے دل میں وہ چاہتا ہے اسے رکھ دیتا ہے، وہی حقیقی ہدایت ہے نہ کہ وہ جس کا یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں۔ (2)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ، الاھواء، جمع ہے ھوی کی جیسے تو کہتا ہے: جمل و اجمال۔ جب خواہشات مختلف تھیں تو جمع اھواء ذکر کیا اگر ملت کے افراد پر محمول کیا جاتا تو ھواھم ہوتا (3)۔ اس خطاب میں دو وجہیں ہیں: (۱) یہ خطاب رسول کریم ﷺ کو ہے کیونکہ خطاب آپ کی طرف متوجہ ہے۔ (۲) خطاب رسول کریم ﷺ کے لئے ہے اور اس

1۔ سنن ابی داؤد، باب ھل یرث المسلم الکافر، حدیث 2523، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً، سنن ابن ماجہ، باب میراث اھل الاسلام من اھل الشرک، حدیث 2720، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً

سے مراد امت ہے۔ پہلی صورت میں اس میں امت کے لئے تادیب ہے کیونکہ ان کا مرتبہ، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کم ہے۔ اس آیت کا سبب یہ ہے کہ لوگ صلح و آشتی کا سوال کرتے تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام قبول کرنے کا وعدہ کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ کر دیا کہ وہ آپ سے راضی نہ ہوں گے حتیٰ کہ آپ ان کی ملت کی پیروی کریں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے ان سے جہاد کا حکم دیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنَ الْعِلْمِ امام احمد سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو کہتا ہے قرآن مخلوق ہے۔ امام احمد نے فرمایا: وہ کافر ہے، پوچھا گیا: آپ نے اسے کیسے کافر کہا۔ امام احمد نے فرمایا: کتاب اللہ کی آیات کی وجہ سے۔ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ۔ قرآن اللہ تعالیٰ کے علم سے ہے اور جو یہ کہتا ہے کہ یہ مخلوق ہے وہ کافر ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿١٢١﴾ يٰبَنِىْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٢٢﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَـيْـــًٔـا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿١٢٣﴾

''جن کو ہم نے کتاب دی وہ اس کی تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں۔ وہی ایمان لاتے ہیں اس کے ساتھ اور جو کوئی انکار کرتا ہے اس کا، تو وہی نقصان اٹھانے والے ہیں۔ اے بنی اسرائیل! یاد کرو میری وہ نعمت جو میں نے تم پر فرمائی اور (خصوصاً یہ کہ) میں نے تم کو فضیلت دی (اس زمانہ کے) سب لوگوں پر۔ اور ڈرو اس دن سے کہ نہ پکڑا جائے گا کوئی آدمی کسی کے عوض اور نہ قبول کیا جائے گا اس سے مالی تاوان اور نہ نفع دے گی اسے کوئی سفارش اور نہ ہی ان کی امداد کی جائے گی''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ قتادہ نے فرمایا: اس سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں۔ اور اس تاویل پر الْكِتٰبَ سے مراد قرآن ہے۔ ابن زید نے کہا: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو بنی اسرائیل میں سے اسلام لائے تھے۔ اس تاویل پر الْكِتٰبَ سے مراد تورات ہے۔ اور آیت عام ہے(1)۔ اَلَّذِيْنَ محل رفع میں ہے کیونکہ یہ مبتدا ہے۔ اٰتَيْنٰهُمُ اس کا صلہ ہے۔ يَتْلُوْنَهٗ مبتدا کی خبر ہے۔ اگر تو چاہے تو خبر اُولٰۗىِٕكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ کو بنا دے۔

يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ اس کے معنی میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: وہ پیروی کرتے ہیں جیسے اس کی پیروی کرنے کا حق ہے یعنی اس کے امر و نہی کی پیروی کرنے کے ساتھ، اس کے حلال کو حلال کرتے ہیں اور اس کے حرام کو حرام کرتے ہیں اور جو احکامات اس میں ہیں ان پر عمل کرتے ہیں۔ یہ عکرمہ کا قول ہے۔ عکرمہ نے کہا: کیا آپ نے اللہ تعالیٰ کا ارشاد نہیں سنا: وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا ۝ (الشمس) (جب چاند اس کے پیچھے آتا ہے)۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود کے قول کا یہی معنی

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

ہے(1)۔ شاعر نے کہا:

قد جعلت دلوی تستتلینی میرا ڈول میرے پیچھے آیا۔

نصر بن عیسیٰ نے مالک سے انہوں نے نافع سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ کے تحت روایت کیا ہے فرمایا: یتبعونہ حق اتباعہ۔ یعنی وہ اس کی پیروی کرتے ہیں جس طرح پیروی کا حق ہے اس کی سند میں بہت سے مجہول راوی ہیں جیسا کہ خطیب ابوبکر احمد نے ذکر کیا ہے، لیکن اس کا معنی صحیح ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری نے کہا: جو قرآن کی پیروی کرتا ہے وہ اس کے ساتھ جنت کے باغیچوں پر اترے گا۔ حضرت عمر بن خطاب سے مروی ہے، یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کسی رحمت والی آیت سے گزرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ سے رحمت کا سوال کرتے ہیں اور جب عذاب والی آیت سے گزرتے ہیں تو اس سے پناہ مانگتے ہیں۔ یہی معنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مروی ہے جب آپ آیت رحمت سے گزرتے تو رحمت کا سوال کرتے اور جب آیت عذاب سے گزرتے تو پناہ مانگتے۔ حسن نے کہا: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو قرآن کی محکم آیات پر عمل کرتے ہیں اور متشابہ پر ایمان لاتے ہیں اور جو مشکل ہوتا ہے وہ اس کے جاننے والے کے سپرد کرتے ہیں (2)۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جس طرح اس کی تلاوت کا حق ہے (3)۔

میں کہتا ہوں: اس میں بعد ہے مگر یہ کہ معنی یہ ہو کہ وہ اس کے الفاظ کو ترتیل سے پڑھتے ہیں اور اس کے معانی کو سمجھتے ہیں۔ معانی کا سمجھنا اتباع ہوتا ہے اس کے لئے جس کو توفیق دی گئی ہوتی ہے۔

وَ اِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۲۴﴾

”اور یاد کرو جب آزمایا ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں سے تو انہیں پورے طور پر بجالایا۔ اللہ نے فرمایا: بے شک میں بنانے والا ہوں تمہیں تمام انسانوں کا پیشوا۔ عرض کی: میری اولاد سے بھی؟ فرمایا: نہیں پہنچتا میرا وعدہ ظالموں تک“۔

اس میں بیس مسائل ہیں (☆)۔

مسئلہ نمبر 1: جب کعبہ اور قبلہ کا ذکر جاری تھا تو اس کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر فرمادیا کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کو بنایا تھا۔ یہود کا حق تھا کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین سے انحراف نہ کرتے کیونکہ وہ حضرت ابراہیم علیہ اسلام کی نسل سے تھے۔ الابتلاء کا معنی آزمائش کرنا ہے۔ اس کا معنی حکم دینا ہے اور مکلف بنانا ہے۔ ابراھیم، اس کی سریانی زبان میں تفسیر وہ ہے جو ماوردی نے ذکر کی ہے اور عربی میں وہ ہے جو ابن عطیہ نے ذکر کی ہے اب رحیم (4) (مہربان باپ)

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

☆ متن میں اسی طرح ہے حالانکہ تفصیل میں تیس مسائل ہیں۔

سہیلی نے کہا: اکثر سریانی اور عربی زبان میں اتفاق واقع ہوتا ہے یا لفظ میں ایک دوسری کے قریب واقع ہوتے ہیں۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ ابراہیم کی تفسیر اب راحم (مہربان باپ) بچوں پر ان کی شفقت کی وجہ سے ہے۔ اسی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی بیوی حضرت سارہ قیامت تک مومنوں کے ان بچوں کے کفیل ہیں جو بچپن میں فوت ہو گئے ہیں۔

میں کہتا ہوں: اس پر بخاری کی حدیث دلالت کرتی ہے، حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، یہ ایک لمبا خواب ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک باغ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا ان کے ارد گرد لوگوں کی اولاد تھی۔ ہم نے اس پر تفصیلی گفتگو کتاب ''التذکرہ'' میں کی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا شجرہ نسب یہ ہے ابراہیم بن تارخ بن تاخور۔ یہ بعض مؤرخین کے قول کے مطابق ہے(1) اور قرآن حکیم میں ہے: واذ قال ابراهيم لابيه آزر (جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا) اسی طرح صحیح بخاری میں بھی ہے۔ ان میں اختلاف اور تناقض نہیں ہے جیسا کہ اس کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ سورۂ انعام میں آئے گا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چار بیٹے تھے۔ اسماعیل، اسحاق، مدین، مدائن۔ جیسا کہ سہیلی نے ذکر کیا ہے۔ اس آیت میں مفعول کو اہتمام کی خاطر مقدم کیا گیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی حضرت ابراہیم کو آزمانے والا تھا۔ فاعل کے ساتھ ضمیر کا متصل ہونا عربی میں مفعول کی تقدیم کا موجب ہوتا ہے اس اہتمام پر کلام کی بنیاد رکھی گئی ہے(2)۔ عام قراءت ابراہیم نصب کے ساتھ ہے ربہ رفع کے ساتھ ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ جابر بن زید سے مروی ہے انہوں نے اس کا الٹ پڑھا ہے اور انہوں نے کہا کہ حضرت ابن عباس نے انہیں اسی طرح پڑھایا۔ معنی یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب سے سوال کیا دعا مانگی۔ اس میں بکلمٰت میں باء کی وجہ سے بُعد ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِكَلِمٰتٍ یہ کلمہ کی جمع ہے ان کی تحقیق اللہ تعالیٰ کے کلام کی طرف لوٹتی ہے لیکن یہاں کلمات سے مراد وہ وظائف ہیں جن کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مکلف بنایا گیا تھا جب ان وظائف کی تکلیف کلام کے ساتھ تھی اس لئے اسے کلمات سے تعبیر فرمایا جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہا گیا کیونکہ وہ کن کے کلمہ سے صادر ہوئے۔ کسی شے کا اس کے مقدمہ کے ساتھ نام رکھنا مجاز کی ایک قسم ہے۔ یہ ابن عربی کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 3: الکلمات کی مراد میں علماء کا اختلاف ہے۔ پہلا قول یہ ہے کہ اس سے مراد شرائع اسلام ہیں اور یہ تیس ہیں۔ دس کا ذکر سورہ برأت میں ہے اَلتَّآىِٕبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ...... الی اخرہ۔ دس کا ذکر سورۂ احزاب میں ہے اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ الخ۔ دس کا ذکر سورہ المومنون میں ہے قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ۝۱ ... عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ۝۹ تک اور سورۂ سال سائل میں اِلَّا الْمُصَلِّیْنَ۝۲۲ سے لے کر وَ الَّذِیْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ۝۳۴ تک ہے۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان کلمات کے ساتھ جس کو بھی آزمایا تو صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو پورا کیا۔ اسلام کے ساتھ آزمایا تو حضرت ابراہیم نے اسے مکمل کیا اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے برأت لکھی۔ فرمایا: وَ اِبْرٰهِیْمَ

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

الَّذِیْ وَفّٰۤی (النجم:37)(1)۔ بعض علماء نے فرمایا: کلمات سے مراد امر ونہی ہے، بعض نے فرمایا: اپنے بیٹے کا ذبح کرنا ہے۔ بعض نے فرمایا: رسالت کی ادائیگی ہے۔ یہ معانی قریب قریب ہیں۔ مجاہد نے کہا: اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: میں تجھے ایک امر سے آزمانے والا ہوں۔ حضرت ابراہیم نے عرض کی: تو مجھے لوگوں کے لئے امام بنادے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہاں۔

حضرت ابراہیم نے عرض کی: مِنْ ذُرِّیَّتِیْ میری اولاد سے بھی؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی: تو اپنے گھر کو لوگوں کے لوٹنے کی جگہ بنائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہاں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی: امن والا بنائے گا۔ فرمایا: ہاں۔ تو ہمیں مناسک دکھائے گا اور ہم پر نظر کرم فرمائے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہاں۔ عرض کی: اس کے باسیوں کو پھلوں سے رزق دے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہاں۔ اس قول کے مطابق اللہ تعالیٰ مکمل فرمانے والا ہوگا(2)۔ اس سے زیادہ صحیح وہ روایت ہے جو عبدالرزاق نے معمر سے انہوں نے ابن طاؤس سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے وَ اِذِ ابْتَلٰۤی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ کے تحت روایت کی۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو طہارت کے ساتھ آزمایا۔ پانچ چیزیں سر میں تھیں اور پانچ پورے جسم میں تھیں: مونچھوں کا کاٹنا، کلی کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، مسواک کرنا، مانگ نکالنا اور جسم میں یہ چیزیں تھیں: ناخن کاٹنا، زیر ناف بال صاف کرنا، ختنہ کرنا، بغلوں کے بال اکھیڑنا، پیشاب، پاخانہ کی جگہ کو پانی کے ساتھ دھونا(3)، اس قول پر حضرت ابراہیم علیہ السلام مکمل کرنے والے ہوں(4)۔ یہی قرآن کا ظاہر ہے۔ مطر نے ابوالجلد سے روایت کیا ہے کہ یہ بھی دس کلمات تھے۔ انہوں نے مانگ کی جگہ اعضاء کے جوڑوں کو دھونا، اور استنجاء کی جگہ زیر ناف بال صاف کرنے کو رکھا ہے۔ قتادہ نے کہا: یہ خاص مناسک حج ہیں۔ حسن نے کہا: یہ چھ خلال ہیں: ستارہ، چاند، سورج، آگ، ہجرت اور ختنہ کرنا۔ ابواسحاق الزجاج نے کہا: یہ اقوال ایک دوسرے کے مخالف نہیں ہیں ان تمام کے ساتھ حضرت ابراہیم کو آزمایا گیا۔ میں کہتا ہوں: مؤطا وغیرہ میں یحییٰ بن سعید سے مروی ہے کہ انہوں نے حضرت سعید بن مسیب کو یہ فرماتے سنا: ابراہیم علیہ السلام پہلے شخص ہیں جنہوں نے ختنہ کیا اور پہلے شخص ہیں جنہوں نے مہمان نوازی کی، پہلے شخص ہیں جنہوں نے زیر ناف بال صاف کئے، پہلے شخص ہیں جنہوں نے ناخن تراشے، پہلے شخص ہیں جنہوں نے مونچھیں کاٹیں، پہلے شخص ہیں جن کے بال سفید ہوئے، جب سفید بالوں کو دیکھا تو پوچھا یہ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ وقار ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی: یا رب! میرے وقار میں اضافہ فرما ..... ابوبکر بن ابی شیبہ نے سعید بن ابراہیم سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: سب سے پہلے جس نے منبر پر خطبہ دیا وہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ تھے، دوسرے علماء نے فرمایا: سب سے پہلے جس نے ثرید (سالن میں روٹی کے ٹکڑے ڈال کر کھانا) بنائی، جس نے سب سے پہلے تلوار چلائی، جس نے سب سے پہلے مسواک کیا، جس نے سب سے پہلے پانی سے استنجا کیا، جس نے سب سے پہلے شلوار پہنی وہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ تھے۔ حضرت معاذ بن جبل

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا
2۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا
3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا
4۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

سے روایت کیا ہے، فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر میں منبر بناؤں تو میرے باپ ابراہیم نے منبر بنایا تھا، اگر میں لاٹھی پکڑوں تو میرے باپ ابراہیم نے لاٹھی پکڑی تھی۔

میں کہتا ہوں: یہ ایسے احکام ہیں جن کا بیان اور جن پر آگاہی اور جن پر کلام کرنا ضروری ہے، ان میں سے پہلا ختنہ کرنا ہے اور اس کے متعلق جو روایات آئی ہیں۔ یہی مسئلہ ہے؟

مسئلہ نمبر 4: علماء کا اجماع ہے کہ سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ختنہ کیا تھا جس عمر میں آپ نے ختنہ کیا اس میں اختلاف ہے۔ مؤطا میں حضرت ابو ہریرہ سے موقوفاً مروی ہے ختنہ کرنے کے وقت آپ کی عمر ایک سو بیس سال تھی اور اس کے بعد آپ اسی سال زندہ رہے۔ اس قسم کی روایت، اپنی رائے سے نہیں ہو سکتی۔ اوزاعی نے مرفوعاً یحییٰ بن سعید سے انہوں نے حضرت سعید بن مسیب سے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ختنہ کیا تو آپ کی عمر ایک سو بیس سال تھی پھر اس کے بعد آپ اسی سال زندہ رہے۔ یہ ابو عمر نے ذکر کیا ہے۔ یحییٰ کے علاوہ کئی واسطوں سے مسند مرفوع روایت کی ہے کہ انہوں نے ختنہ کیا جب آپ کی عمر اسی سال کو پہنچ گئی تھی اور تیسے کے ساتھ آپ نے ختنہ کیا تھا۔ اسی طرح صحیح مسلم وغیرہ میں ہے کہ آپ کی عمر اسی سال تھی یہی حدیث عجلان میں اور حدیث اعرج عن ابی ہریرہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محفوظ ہے (1)۔ حضرت عکرمہ نے کہا: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ختنہ کیا تو آپ کی عمر اسی سال تھی۔ اس کے بعد ملت ابراہیم پر کسی نے بیت اللہ کا طواف نہ کیا مگر وہ مختون تھا۔ اسی طرح عکرمہ نے کہا اور مسیب بن رافع نے کہا ہے۔ مروزی نے یہ ذکر کیا ہے۔ القدوم (تیسہ) یہ دال کی تشدید اور تخفیف کے ساتھ ہے۔ ابو الزناد نے کہا: القدوم دال کی شد کے ساتھ ہو تو اس سے مراد جگہ کا نام ہے۔ (2)

مسئلہ نمبر 5: ختنہ کرنے کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ جمہور علماء کا نظریہ یہ ہے کہ یہ مؤکدہ سنن میں سے ہے اور فطرت اسلام میں سے ہے۔ مردوں کو اس کے ترک کی گنجائش نہیں ہے۔ ایک جماعت نے کہا: یہ فرض ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا (النحل: 123)

قتادہ نے کہا: اس سے مراد ختنہ کرنا ہے۔ بعض مالکیوں کا میلان بھی اسی طرف ہے۔ یہی امام شافعی کا قول ہے، ابن سریج نے اس کے وجوب پر شرمگاہ کی طرف دیکھنے کی حرمت سے استدلال کیا ہے۔ اس نے کہا: اگر ختنہ کرنا فرض نہ ہوتا تو مختون کی شرمگاہ کو دیکھنا مباح نہ ہوتا۔ اس کا یہ جواب دیا گیا ہے جسم کی مصلحت کے لئے یہ مباح ہوتا ہے جیسے طبیب کے لئے دیکھنا مباح ہوتا ہے اور طب بالاجماع واجب نہیں۔ مزید بیان ان شاء اللہ سورۃ النحل میں آئے گا۔ ہمارے بعض اصحاب نے اس روایت سے حجت پکڑی ہے جو حجاج بن ارطاۃ نے ابو الملیح سے اور انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے شداد بن اوس سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (ختنہ کرنا مردوں کے لئے سنت ہے اور عورتوں کے لئے اچھا عمل ہے) حجاج

1۔ صحیح بخاری، باب قول اللہ تعالیٰ واتخذ اللہ ابراہیم خلیلا، حدیث 3107، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب الختان بعد الکبر ونتف الابط، حدیث 5824، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

قابل حجت نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: اس میں جس حدیث سے حجت پکڑی جاتی ہے وہ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث ہے جو انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: فطرت پانچ چیزیں ہیں: ختنہ کرنا… الحدیث۔ آگے تفصیل سے آئے گی۔ ابوداؤد نے حضرت ام عطیہ سے روایت کیا ہے کہ ایک عورت مدینہ طیبہ میں عورتوں کے ختنے کرتی تھیں۔ اسے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کاٹنے میں مبالغہ نہ کیا کر کیونکہ یہ عورت کے لئے اچھا ہے اور خاوند کے لئے پسندیدہ ہے۔ ابوداؤد نے کہا: یہ حدیث ضعیف ہے اس کا راوی مجہول ہے(1)۔ وہ روایت جس کو رزین نے ذکر کیا ہے اس میں مبالغہ نہ کر کیونکہ چہرہ کے لئے زیادہ نور کا باعث ہے اور مرد کے نزدیک پسندیدہ ہے۔

مسئلہ نمبر 6: اگر بچہ مختون پیدا ہو تو دوبارہ ختنہ کی ضرورت نہیں۔ میمونی نے کہا: مجھے احمد نے کہا: یہاں ایک شخص ہے اس کا مختون بچہ پیدا ہوا ہے وہ اس وجہ سے شدید غمگین ہوا، میں نے اسے کہا جب اللہ تعالیٰ نے خود تیری اس مسئلہ میں کفایت فرمائی ہے تو تو پریشان کس لئے ہے۔

مسئلہ نمبر 7: ابو الفرج جوزی نے کہا: مجھے حضرت کعب الاحبار سے بتایا گیا ہے، فرمایا: تیرہ انبیاء کرام مختون پیدا ہوئے تھے۔ حضرت آدم، حضرت شیث، حضرت ادریس، حضرت نوح، حضرت سام، حضرت لوط، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت شعیب، حضرت سلیمان، حضرت یحییٰ، حضرت عیسیٰ اور نبی کریم ﷺ وعلیہم اجمعین۔ محمد بن حبیب ہاشمی نے کہا: وہ چودہ انبیاء کرام تھے۔ حضرت آدم، حضرت شیث، حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط، حضرت شعیب، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت سلیمان، حضرت زکریا، حضرت عیسیٰ، حضرت حنظلہ بن صفوان (یہ اصحاب الرس کے نبی تھے) اور حضرت محمد ﷺ وعلیہم اجمعین۔

میں کہتا ہوں: نبی کریم ﷺ کے متعلق روایات مختلف ہیں۔ ابو نعیم الحافظ نے اپنی کتاب "الحلیۃ" میں اپنی سند کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ مختون پیدا ہوئے تھے۔ ابو عمرو نے "التمہید" میں اس سند، حدثنا احمد بن محمد بن احمد حدثنا محمد بن عیسیٰ حدثنا یحییٰ بن ایوب بن بادی العلاف حدثنا محمد بن ابی السری العسقلانی حدثنا الولید بن مسلم عن شعیب عن عطاء الخراسانی عن عکرمہ عن ابن عباس کے ساتھ روایت کیا ہے۔ عبد المطلب نے ساتویں دن نبی کریم ﷺ کا ختنہ کیا تھا اور دستر خوان لگایا تھا اور آپ ﷺ کا نام (محمد) رکھا تھا۔ ابو عمر نے کہا: یہ حدیث مسند غریب ہے۔ یحییٰ بن ایوب نے کہا: میں نے یہ حدیث تلاش کی تو مجھے ان محدثین میں سے کسی کے پاس نہیں ملی جن سے میری ملاقات ہوئی ہے مگر ابن ابی السری کے پاس ملی۔ ابو عمر نے کہا: یہ بھی کہا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ مختون پیدا ہوئے تھے۔

مسئلہ نمبر 8: علماء کا اختلاف ہے کہ بچے کا ختنہ کب کیا جائے۔ اخبار میں علماء کی ایک جماعت سے ثابت ہے وہ کہتے ہیں: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ختنہ تیرہ سال کی عمر میں کیا تھا، اپنے بیٹے اسحاق کا ختنہ

1۔ سنن ابی داؤد، باب ماجاء فی الختان، حدیث 4587، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ساتویں روز کیا تھا۔ حضرت سیدہ فاطمہ سے مروی ہے کہ وہ اپنی اولاد کا ساتویں روز ختنہ کرتی تھی۔ امام مالک نے اس کا انکار کیا اور کہا یہ یہود کا عمل ہے۔ مالک سے ابن وہب نے یہ ذکر کیا ہے۔ لیث بن سعد نے کہا: بچے کا ختنہ سات سال سے دس سال تک کے درمیان کیا جائے۔ ابن وہب نے مالک سے اس طرح روایت کیا ہے۔ احمد نے فرمایا: اس کے متعلق میں نے کچھ نہیں سنا۔ بخاری میں سعید بن جبیر سے مروی ہے، فرمایا: حضرت ابن عباس سے پوچھا گیا: تم کتنی عمر کے تھے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تھا؟ حضرت ابن عباس نے کہا: میں اس وقت مختون تھا۔ فرمایا: اور لوگ مرد کا ختنہ نہیں کرتے تھے حتیٰ کہ وہ بالغ ہو جاتا یا قریب البلوغ ہوتا۔(1)

بڑا آدمی جو اسلام قبول کرے علماء نے اس کا ختنہ کرنا مستحب قرار دیا ہے۔ عطا کہتے تھے: اس کا اسلام مکمل نہ ہوگا حتیٰ کہ اس کا ختنہ کیا جائے اگرچہ وہ اسی سال کو پہنچ جائے۔ حسن سے مروی ہے: وہ بوڑھے شخص کو ختنہ نہ کرنے کی رخصت دیتے تھے جو مسلمان ہوتا تھا اور اس میں کوئی حرج نہیں دیکھتے تھے اور اس کی شہادت، اس کا ذبیحہ، اس کے حج اور نماز میں بھی کوئی حرج نہیں دیکھتے تھے۔ ابن عبدالبر نے کہا: اکثر اہل علم کا یہی نظریہ ہے اور غیر مختون کے حج کے بارے میں حضرت بریدہ کی حدیث ثابت نہیں۔ حضرت ابن عباس، حضرت جابر بن زید اور عکرمہ سے روایت ہے کہ غیر مختون کا ذبیحہ نہیں کھایا جائے گا اور اس کی شہادت جائز نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر9: اوّل من استحدّ کا قول۔ استحداد کا مطلب ہے زیر ناف بالوں کو صاف کرنے کے لئے لوہا استعمال کرنا۔ حضرت ام سلمہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب نورہ (چونا) استعمال کرتے تھے تو زیر ناف بالوں کے لئے اپنے ہاتھ سے نورہ استعمال کرتے تھے(2)۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے، ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نورہ لگایا حتیٰ کہ جب زیر ناف تک پہنچا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: تو یہاں سے چلا جا پھر اپنے ہاتھ سے زیر ناف نورہ لگایا۔ حضرت انس نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نورہ نہیں لگاتے تھے جب زیر ناف بال زیادہ ہوتے تو انہیں مونڈ دیتے۔ ابن خویز منداد نے کہا: یہ دلیل ہے کہ آپ کا اکثر فعل حلق تھا اور نورہ کبھی استعمال کرتے تھے، یہ اس لئے تاکہ دونوں حدیثوں کو جمع کرنا صحیح ہو۔

مسئلہ نمبر10: تقلیم الاظفار (ناخن کاٹنا)۔ قلامہ اس حصہ کو کہتے ہیں جو ناخن سے تراشا جاتا ہے۔ امام مالک نے فرمایا: میں عورتوں کے لئے ناخن کاٹنا اور زیر ناف بال صاف کرنا پسند کرتا ہوں جس طرح مردوں پر ہے۔ یہ حارث بن مسکین اور سحنون نے ابن قاسم سے روایت کیا ہے۔ حکیم ترمذی نے ''نوادر الاصول'' میں الاصل التاسع والعشرون فصل میں ذکر کیا ہے، فرمایا: ہمیں عمر بن ابی عمر نے بتایا فرمایا ہمیں ابراہیم بن العلاء زبیدی نے بتایا انہوں نے عمر بن بلال فرازی سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے حضرت عبداللہ بن بشیر مازنی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے ناخن کاٹو اور ناخنوں کے تراشوں کو دفن کرو، اپنے جوڑوں کو صاف کرو، کھانے سے اپنے مسوڑھوں کو صاف کرو، مسواک کرو

1۔ صحیح بخاری، باب الختان بعد الکبر ونتف الابط، حدیث 5825، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، باب الاطلاء بالنورۃ، حدیث 3741، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور میرے پاس پیلے دانتوں اور بدبو کے ساتھ نہ آیا کرو۔ پھر اس حدیث پر کلام فرمائی اور عمدہ کلام فرمائی۔ امام ترمذی نے فرمایا: رہا ناخن کاٹنا یہ اس لئے ہے کیونکہ اس سے خراش لگتی ہے اور نقصان ہوتا ہے اور ان میں میل جمع ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات انسان جنبی ہو جاتا ہے اور اس میل کی وجہ سے پانی جلد تک نہیں پہنچتا اور وہ ہمیشہ جنبی رہتا ہے۔ جو آدمی جنبی ہو اور غسل کرنے کے بعد سوئی کی جگہ بھی خشک رہ جائے تو وہ اپنی حالت پر جنبی ہی ہوتا ہے حتیٰ کہ پورے جسم کا غسل کر لے۔ اسی وجہ سے ناخن کاٹنے کی ترغیب دی۔ اظافیر جمع ہے اظفور کی۔ اور الاظفار جمع ہے الظفر کی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں ہے: جب آپ نماز میں بھول گئے فرمایا: مجھے کیا ہے کہ میں نہ وہم کروں جبکہ تم میں سے کسی کے ناخنوں اور پوروں کے درمیان میل ہوتی ہے تم میں سے کوئی مجھ سے آسمان کی خبر کے متعلق پوچھتا ہے جبکہ اس کے ناخنوں میں جنابت اور میل ہوتی ہے (1)۔ اس خبر کو ابوالحسن علی بن محمد الطبری المعروف الکیا نے ''احکام القرآن'' میں سلیمان بن فرح ابو واصل سے روایت کر کے ذکر کیا ہے۔ فرمایا: میں حضرت ابو ایوب کے پاس آیا میں نے ان سے مصافحہ کیا تو انہوں نے میرے لمبے ناخن دیکھے۔ حضرت ابو ایوب نے فرمایا: ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آسمان کی خبر کے متعلق پوچھنے کے لئے آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی آسمان کی خبر کے متعلق پوچھنے کے لئے آتا ہے جب کہ اس کے ناخن پرندوں کے ناخنوں کی طرح ہوتے ہیں حتیٰ کہ ان میں میل کچیل جمع ہو جاتی ہے (2)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ادفنوا اقلاماتکم ناخنوں کے تراشے دفن کر دو کیونکہ مومن کا جسم حرمت والا ہے، جو مومن کے جسم سے ساقط ہو اور زائل ہو اس کی بھی حرمت قائم ہے (3)۔ پس اسے دفن کر دینا چاہئے جیسے مومن جب مر جاتا ہے تو اسے دفن کیا جاتا ہے۔ اور جب اس کا بعض حصہ مر جائے تو دفن کر کے اس کی حرمت قائم کی جائے گی تاکہ وہ بکھر نہ جائے، آگ میں نہ گرے یا کسی گندی جگہ نہ گرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا خون دفن کرنے کا حکم دیا جب آپ نے پچھنے لگوائے تھے تاکہ اسے کتے نہ پئیں۔ اس کے متعلق میرے والد رحمۃ اللہ علیہ نے ہمیں بتایا اور کہا: ہمیں موسیٰ بن اسماعیل نے بتایا فرمایا: ہمیں مفید بن قاسم بن عبدالرحمٰن بن ماعز نے بتایا فرمایا: میں نے عامر بن عبداللہ بن زبیر کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ان کے والد نے انہیں بتایا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے جبکہ آپ پچھنے لگوا رہے تھے۔ جب فارغ ہوئے تو فرمایا: اے عبداللہ! یہ خون لے جاؤ اور ایسی جگہ انڈیل دو جہاں تجھے کوئی نہ دیکھے۔ جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اوجھل ہو گئے تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خون پی لیا، جب وہ واپس آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عبداللہ! تو نے اس خون کو کیا کیا؟ حضرت عبداللہ نے کہا: میں نے اسے مخفی جگہ رکھ دیا ہے۔ میرا گمان ہے وہ لوگوں سے مخفی رہے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لعلك شربته۔ شاید تو نے وہ پی لیا ہے۔ حضرت عبداللہ نے کہا: ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: تو نے خون کیوں پیا ہے؟ لوگوں کے لئے تجھ سے ہلاکت ہے اور تیرے لئے لوگوں سے ہلاکت ہے۔

میرے باپ نے مجھے بتایا، فرمایا: مالک بن سلیمان ہروی نے ہمیں بتایا انہوں نے کہا: ہمیں داؤد بن عبدالرحمن نے بتایا

1۔ نوادر الاصول، صفحہ 45 2۔ احکام القرآن زیر آیت ہذہ 3۔ نوادر الاصول، صفحہ 45

انہوں نے ہشام بن عروہ سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ انسان کی سات چیزوں کو دفن کرنے کا حکم دیتے تھے: بال، ناخن، خون، حیض، دانت، قلفہ (وہ حصہ جو ختنہ کرنے والا کاٹا جاتا ہے) اور قے۔

آپ ﷺ کا ارشاد ہے: نقوا براجمکم اپنے جوڑ صاف کرو جہاں میل جمع ہو جاتی ہے۔ براجم کا مفرد بُرجمۃٌ ہے ہر جوڑ کی گرہ۔ پس ہر گرہ کی پیٹھ کو بوجمہ کہا جاتا ہے اور جو دو گرہوں کے درمیان ہو اسے راجبۃ کہتے ہیں اس کی جمع رواجب ہے۔ یہ وہ حصہ ہوتا ہے جو ظاہر سے ملا ہوا ہوتا ہے یہ انگلی کا قصبہ ہے ہر انگلی کے دو برجم اور تین رواجب ہوتے ہیں سوائے انگوٹھے کے اس کا ایک برجم اور دو راجب ہیں۔ آپ ﷺ نے ان کی صفائی کا حکم دیا تا کہ میل نہ ہو اور جنابت باقی نہ رہے اور میل، پانی اور جلد کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔

آپ ﷺ کا ارشاد ہے: نظفوا لثاتکم (اپنے مسوڑوں کو صاف کرو)۔ لثۃٌ واحد ہے اور اس کی جمع لثات ہے۔ یہ وہ گوشت ہوتا ہے جو دانتوں کے اوپر اور دانتوں کے نیچے ہوتا ہے دانتوں کے نکلنے کی جگہ اور العُمُور اس تھوڑے سے گوشت کو کہتے ہیں جو دانتوں کے درمیان ہوتا ہے، اس کا مفرد عُمُر ہے۔ ان کے صاف کرنے کا حکم دیا تا کہ اس میں کھانے کا کوئی ٹکڑا باقی نہ رہے اور اس میں بدبو نہ پیدا ہو جائے اور فرشتوں کو کوئی تکلیف ہو۔ کیونکہ یہ قرآن کا راستہ ہے اور فرشتوں کے بیٹھنے کی جگہ بڑے دانتوں کے پاس ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ ۝ (ق) کے تحت خبر روایت کی گئی ہے کہ فرشتہ آدمی کے بڑے دانتوں کے پاس ہے۔ محمد بن علی الشقیقی نے ہمیں یہ بیان کیا، فرمایا: میں نے اپنے باپ کو سفیان بن عیینہ سے یہ ذکر کرتے ہوئے سنا۔ انہوں نے بہت عمدہ ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ لفظ، ہونٹوں کا عمل ہے وہ کلام کو اپنی زبان سے باہر پھینکتا ہے لدیہ سے مراد اس کے پاس ہے۔ لدی اور عند کا معنی لغت میں ایک ہے اسی طرح لدن ہے، اس میں نون زائدہ ہے۔ گویا آیت سے معلوم ہوتا ہے سخت کلام کرنے والے کے پاس تاڑنے والا سخت موجود ہے اور وہ بڑا دانت ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: تسننوا یہ السن سے ماخوذ ہے اس کا معنی ہے مسواک کرو، یعنی دانت صاف کرو۔ لا تدخلوا علی قحرا بخراً میرے نزدیک محفوظ قحلاً و قلحاً ہے۔ یعنی میرے پاس پیلے دانتوں اور منہ کی بدبو کے ساتھ نہ آؤ۔ میں نے جارود کو نضر سے روایت کرتے ہوئے سنا کہ اقلح اس شخص کو کہتے ہیں جس کے دانت پیلے ہوں حتیٰ کہ ان کے اندر سے بدبو آئے۔ میں القحر نہیں جانتا۔ البخر اس شخص کو کہتے ہیں جس کے جسم سے بدبو آئے۔ کہا جاتا ہے: رجلٌ ابخر، رجال بخرٌ۔

ہمیں جارود نے بتایا، فرمایا: ہمیں جریر نے بتایا انہوں نے منصور سے انہوں نے ابو علی سے انہوں نے ابو جعفر بن تمام بن عباس سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مسواک کرو تمہیں کیا ہے تم میرے پاس پیلے دانتوں کے ساتھ آتے ہو۔

مسئلہ نمبر 11: قص الشارب (مونچھوں کا کاٹنا) مونچھیں اتنی کاٹنا کہ ہونٹ کی طرف ظاہر ہو جائے۔ بالکل نہ مونڈ

دے کہ اپنے آپ کو مثلہ کردے (1)۔ امام مالک نے یہی فرمایا۔ ابن عبدالحکم نے مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں دیکھتا ہوں کہ جو مونچھوں کا حلق (مونڈ دے) کرائے اسے ادب سکھایا جائے۔ اشہب نے مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: مونچھیں مونڈنا بدعت ہے جو ایسا کرے اسے سزا دی جائے۔ ابن خویز منداد نے کہا: امام مالک نے فرمایا: جو مونچھوں کا حلق کرے اسے مار کر تکلیف دینی چاہئے گویا وہ اسے مثلہ دیکھتے تھے، حلق کی نسبت مونچھوں کو چھوٹا کرنا امام مالک کے نزدیک اولیٰ ہے۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ کے بال لمبے تھے۔ آپ کے صحابہ میں سے کسی کے بال لمبے ہوتے تھے اور کسی کے چھوٹے ہوتے تھے۔ عمرہ اور حج کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر کا حلق کرایا تو صحابہ نے بھی حلق کرایا۔

روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کی طرف جانے سے پہلے ناخن اور مونچھیں کاٹتے تھے۔ امام طحاوی نے فرمایا: ہم امام شافعی سے اس کے بارے میں کوئی نص نہیں پاتے اور ان کے اصحاب جن کو ہم نے دیکھا مزنی اور ربیع یہ اپنی مونچھوں کو خوب پست کرتے تھے۔ یہ دلیل ہے کہ انہوں نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ عمل لیا ہوگا۔ فرمایا: امام ابوحنیفہ، امام زفر، امام ابو یوسف اور امام محمد کا مذہب سر کے بالوں اور مونچھوں کے بارے میں یہ تھا کہ تقصیر سے احفاء افضل ہے۔ یعنی بال اور مونچھیں چھوٹی کرنے سے بالکل مونڈ دینا افضل ہے۔ ابن خویز منداد نے امام شافعی سے روایت کیا ہے کہ ان کا مذہب مونچھوں کو حلق (مونڈنے) کرنا امام ابوحنیفہ کے مذہب کے مطابق ہے۔ ابوبکر اثرم نے کہا: میں نے امام احمد بن حنبل کو دیکھا وہ مونچھوں کو انتہائی پست کرتے تھے۔ میں نے سنا کہ ان سے مونچھوں کے انتہائی پست کرنے کے سنت ہونے کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: اسی طرح انتہائی پست کی جائیں جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: احفوا الشوارب مونچھوں کو انتہائی پست کرو۔

ابوعمر نے کہا: اس باب میں دو اصل ہیں۔ ایک لفظ ہے اُحفوا مونچھوں کو انتہائی پست کرو۔ یہ لفظ تاویل کا احتمال رکھتا ہے دوسرا لفظ قص الشارب ہے یہ لفظ مفسر ہے اور مفسر، مجمل پر غالب ہوتا ہے۔ یہی اہل مدینہ کا عمل ہے یعنی (مونچھوں کو کاٹنا) اور جو کچھ اس کے متعلق کہا گیا ہے اس میں سے یہ بہتر ہے۔ ترمذی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مونچھوں کو کاٹتے تھے اور فرماتے تھے: ابراہیم خلیل الرحمن ایسا کرتے تھے (2)۔ فرمایا: یہ حدیث حسن غریب ہے۔ مسلم نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فطرت پانچ چیزیں ہیں: ختنہ کرنا، زیر ناف بال صاف کرنا، مونچھیں کاٹنا، ناخن کاٹنا، بغلوں کے بال نوچنا (3)۔ حضرت ابن عمر سے ترمذی میں مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مشرکین کی مخالفت کرو مونچھوں کو انتہائی پست کرو، داڑھیوں کو بڑھاؤ اور عجمی لوگ اپنی داڑھیوں کو کاٹتے ہیں اور مونچھوں کو بڑھاتے ہیں یا دونوں کو اکٹھا بڑھاتے ہیں۔ یہ جمال اور نظامت کے برعکس ہے۔ رزین نے نافع سے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عمر اپنی مونچھوں کو اتنا پست کرتے تھے کہ ان کی جلد نظر آتی تھی، اور مونچھوں اور داڑھی کو کاٹتے تھے۔

1۔ موطا امام مالک، کتاب الجامع، باب ما جاء فی الفطرۃ، صفحہ 712 (وزارت تعلیم)

2۔ جامع ترمذی، ابواب الاداب، باب ما جاء فی قص الشارب، جلد 2، صفحہ 100 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح مسلم، باب خصال الفطرۃ، جلد 1، صفحہ 129 (قدیمی کتب خانہ)

بخاری میں ہے حضرت ابن عمر جب حج یا عمرہ کرتے تو اپنی داڑھی جو قبضہ سے زائد ہوتی اسے کاٹ دیتے۔ ترمذی نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی داڑھی کو عرض اور طول سے کاٹتے تھے (1)۔ فرمایا: یہ حدیث غریب ہے۔

مسئلہ نمبر 12: بغلوں کے بال نوچنا سنت ہے جس طرح زیر ناف بالوں کا حلق (مونڈنا) سنت ہے اگر کوئی اس کا الٹ کردے تو بھی جائز ہوگا کیونکہ نظافت حاصل ہوگئی۔ پہلا طریقہ بہتر ہے اور آسان و معتاد ہے۔

مسئلہ نمبر 13: فرق الشعر (بالوں کی مانگ نکالنا)۔ نبی کریم ﷺ کی صفت میں ہے۔ جب آپ کے بندھے ہوئے بال بکھر جاتے تو آپ مانگ نکالتے۔ کہا جاتا ہے: فرقت الشعر افرقه فرقاً بالوں کو جدا جدا کرنا۔ کہتے ہیں: ان انفرق شعر راسه فرقه فی مفرقه۔ سر کے بال بکھر جاتے تو اسے اپنی مانگ میں علیحدہ علیحدہ کر دیتے اور اگر بکھرتے نہیں تھے تو سر پر اکٹھا رکھتے۔ نسائی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے بالوں کو پیشانی پر ڈالے رکھتے تھے جب کہ مشرک لوگ اپنے بالوں کی مانگ نکالتے تھے۔ آپ ﷺ ہر اس کام میں اہل کتاب کی موافقت پسند فرماتے تھے جس میں آپ کو کوئی حکم نہیں دیا گیا ہوتا تھا پھر اس کے بعد رسول اللہ ﷺ بالوں میں مانگ نکالتے تھے۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم نے حضرت انس سے روایت کی ہے (2)۔ قاضی عیاض نے کہا: سدل الشعر کا مطلب بالوں کو کھلا چھوڑ دینا اور اس حدیث میں علماء کے نزدیک بالوں کو پیشانی پر چھوڑنا ہے اور ان کا گچھا بنانا ہے۔ بال میں مانگ نکالنا سنت ہے کیونکہ اس طرف نبی کریم ﷺ نے رجوع کیا تھا، روایت ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز جمعہ سے واپس آتے تھے تو مسجد کے دروازے پر اپنے سپاہیوں کو کھڑا کرتے تھے اور ہر اس شخص کی پیشانی کے بال کاٹ دیتے تھے جو اپنے بالوں کی مانگ نکالے ہوئے نہ ہوتا تھا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت تھی۔

مسئلہ نمبر 14: سفید بال نور ہیں اور ان کا نکالنا مکروہ ہے۔ نسائی اور ابوداؤد میں عمرو بن شعیب عن ابیه عن جدہ کے سلسلہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سفید بال نہ نوچو، جس مسلمان کے اسلام میں بال سفید ہوتے ہیں وہ قیامت کے روز اس کے لئے نور ہوں گے، اللہ تعالیٰ اس کے لئے ایک نیکی لکھے گا اور اس سے گناہ معاف فرمائے گا۔

میں کہتا ہوں: جس طرح سفید بال نوچنا مکروہ ہے اسی طرح سفید بالوں کو سیاہی میں بدلنا بھی مکروہ ہے لیکن سیاہی کے علاوہ کسی رنگ سے بدلنا جائز ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ابو قحافہ کے حق میں فرمایا...... انہیں لایا گیا تھا جب ان کے بال ثغامہ بوٹی کی طرح سفید تھے ...اس کو کسی چیز سے تبدیل کر دو، اور سیاہ (خضاب) سے اجتناب کرو۔ کتنا خوبصورت شعر کہا ہے جس نے کہا ہے

یسود اعلاھا و یبیض اصلھا ولا عیدٰ فی الاعلٰی اذا فسد الاصل

1۔ جامع ترمذی، ابواب الادب، باب ماجاء فی الاخذ من اللحیة، جلد 2، صفحہ

2۔ صحیح بخاری، صفة النبی علیه الصلوٰة والسلام، حدیث 3284، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اوپر سے سیاہ اور اصل سفید ہے، اوپر والے رنگ میں کوئی بھلائی نہیں جب اصل بری ہو۔

ایک اور شاعر نے کہا:

یا خاضب الشیب بالحناء تسترہ سل الملیك له ستراً من النار

اے مہندی کے ساتھ سفید بالوں کو خضاب کر کے چھپانے والے! اللہ تعالیٰ سے آگ سے پردہ کا سوال کر۔

مسئلہ نمبر15: الثرید (سالن میں ٹکڑے بھگو کر چوری بنا کر کھانا) یہ عمدہ کھانا ہوتا ہے اور زیادہ برکت والا ہوتا ہے۔ یہ عربوں کا کھانا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام کھانوں پر اس کھانے کی فضیلت کی گواہی دی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت تمام عورتوں پر اس طرح ہے جس طرح ثرید کی فضیلت تمام کھانوں پر ہے (1)۔ صحیح البستی میں حضرت اسماء بنت ابی بکر سے مروی ہے کہ وہ جب ثرید بناتی تھیں تو اسے کسی چیز سے ڈھانپ دیتی تھیں حتیٰ کہ اس کی گرمی ختم ہو جائے اور فرماتی تھیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے یہ بڑی برکت والا کھانا ہے۔

مسئلہ نمبر16: میں کہتا ہوں: یہ سب اس روایت کا مفہوم تھا جو عبدالرزاق نے حضرت ابن عباس سے روایت کی اور جو سعید بن مسیب وغیرہ نے کہا، کلی، ناک میں پانی ڈالنا اور مسواک کا ذکر سورۃ النساء میں آئے گا اور استنجا کا حکم سورۂ برأت میں اور ضیافت کا حکم سورۂ ہود میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسلم نے حضرت انس سے روایت کیا ہے، فرمایا: مونچھیں کاٹنے، ناخن تراشنے، بغلوں کے بال نوچنے، زیر ناف بال مونڈنے کا ہمارے لئے وقت متعین کیا گیا ہے کہ چالیس راتوں سے زیادہ انہیں نہ چھوڑے رکھیں۔ ہمارے علماء نے فرمایا: چالیس راتیں یہ اکثر مدت کی حد ہے۔ مستحب یہ ہے کہ ہر جمعہ کو یہ صفائی کی جائے۔ یہ حدیث جعفر بن سلیمان نے روایت کی ہے۔ عقیلی نے کہا: اس کی حدیث میں نظر ہے۔ ابو عمر نے اس کے متعلق کہا: جعفر بن سلیمان اپنے حافظہ کی خرابی اور غلطیوں کی کثرت کی وجہ سے حجت نہیں ہے۔ نقل کے اعتبار سے یہ حدیث قوی نہیں ہے لیکن ایک قوم نے اس کا قول کیا ہے اور اکثر علماء کا خیال ہے کہ اس کی کوئی حد متعین نہیں ہے۔ وباللہ التوفیق۔

مسئلہ نمبر17: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا، الامام کا معنی، قُدْوَہ ہے۔ اسی سے خیط البناء کو امام کہا جاتا ہے، راستہ کو بھی امام کہا جاتا ہے کیونکہ چلنے کے لئے اس کا قصد کیا جاتا ہے۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم تجھے لوگوں کے لئے امام بنائیں گے۔ ان خصال میں وہ تیری اقتداء کریں گے، نیک لوگ تیری پیروی کریں گے اللہ تعالیٰ نے انہیں اہل اطاعت کے لئے امام بنایا۔ اسی وجہ سے تمام امتوں کا آپ کے بارے میں اجتماعی دعوی ہے کہ آپ باطل کو چھوڑ کر حق کی طرف مائل ہونے والے تھے۔ (2)

مسئلہ نمبر18: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ اللہ کی بارگاہ میں رغبت کی جہت سے دعا ہے۔ یعنی اے میرے رب! میری اولاد سے بھی امام بنا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اولاد کے متعلق استفہام کی جہت سے ہے یعنی اے میرے

1۔ جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب من فضل عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، جلد 2، صفحہ 228 (وزارت تعلیم)

2۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذا

رب! میری اولاد سے کیا ہوگا، اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ ان میں گنہگار، ظالم ہوں گے وہ امامت کے مستحق نہ ہوں گے(1)۔
حضرت ابن عباس نے فرمایا: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوال کیا کہ ان کی اولاد سے امام بنایا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو آگاہ کیا کہ اس کی اولاد میں نافرمان بھی ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔

مسئلہ نمبر 19: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ، ذریۃٌ یہ الذر سے فُعْلِیۃٌ کا وزن ہے کیونکہ انسانی مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پیٹھ سے ذروں کی طرح نکالا تھا جب انہیں ان کے نفسوں پر گواہ بنایا تھا۔ بعض نے فرمایا: یہ ذرأ اللہ الخلق یذرؤھم ذرءاً سے مشتق ہے جس کا معنی ہے: اللہ نے انہیں پیدا کیا، اسی سے الذریۃ ہے جس کا معنی ہے جن وانس کی نسل لیکن عربوں نے اس کا ہمزہ ترک کر دیا، اس کی جمع الذراری ہے(2)۔ حضرت زید بن ثابت نے ذریۃ ذال کے کسرہ کے ساتھ اور ذریۃ ذال کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن جنی ابوالفتح عثمان نے کہا: اس حرف کی اصل چار الفاظ کا احتمال رکھتی ہے: (۱) ذرأ (۲) ذرر (۳) ذرو (۴) ذری۔ ہمزہ والی صورت ہو تو یہ ذرأ اللہ الخلق سے مشتق ہوگا ذرر ہو تو الذر کے لفظ سے ماخوذ ہوگا۔ یہ اس لئے ہے کہ خبر میں وارد ہے کہ مخلوق ذروں کی مانند تھی۔ واو اور یاء سے ہو تو یہ ذروت الحب و ذریتہ سے ہوگا یہ دونوں اکٹھے بولے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ (الکہف: 45)

یہ اس کے لطاف اور خفت کی وجہ سے ہوگا یہ دانے کی حالت ہے۔ جوہری نے کہا: ذرت الریح التراب وغیرہ تذروہ و تذریہ۔ ذرواً و ذرياً یعنی ہوا نے مٹی کو اڑایا۔ اسی سے ہے: ذری الناس الحنطۃ۔ لوگوں نے دانوں کو اڑایا۔ اذریت الشیٔ۔ جب تو کسی چیز کو پھینکے جیسے تو کھیتی کے لئے دانے کو پھینکتا ہے۔ و طعنہ فاذراہ عن ظہر دابتہ۔ اس نے اسے نیزہ مارا اور سواری کی پیٹھ سے پھینک دیا۔ خلیل نے کہا: اسے ذریۃ کہتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسانی مخلوق کو زمین پر اس طرح پھینک دیا جس طرح کسان دانے پھینکتا ہے۔ بعض نے کہا ذریۃ کی اصل ذرورۃ ہے لیکن جب تضعیف زیادہ ہوئی تو ایک را کو یا سے بدل دیا گیا تو ذرویۃ ہوگیا پھر واو کو یا میں ادغام کیا گیا تو ذریۃ ہوگیا، یہاں ذریت سے مراد بیٹے ہی ہیں۔ کبھی اس کا اطلاق آباء اور ابناء، دونوں پر ہوتا ہے اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ (یٰسین: 41) یہاں ذریت سے مراد آباء ہیں۔

مسئلہ نمبر 20: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ عہد کے مراد میں علماء کا اختلاف ہے، ابوصالح نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ اس سے مراد نبوت ہے۔ سدی نے بھی یہی کہا ہے۔ مجاہد نے کہا: اس سے مراد امامت ہے۔ قتادہ نے کہا: ایمان ہے۔ عطا نے کہا: رحمت ہے۔ ضحاک نے کہا: اللہ تعالیٰ کا دین ہے، بعض نے کہا: اس کا امر ہے(3)۔ عہد کا اطلاق امر پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ (آل عمران: 183)۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا۔ فرمایا: اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ (یٰس: 60)۔ یعنی میں نے پہلے تمہیں اس کا حکم نہیں دیا تھا۔ جب عہد سے مراد اللہ تعالیٰ کا امر ہو تو لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ کا مطلب ہوگا کہ یہ جائز نہیں ہے کہ ظالم لوگ ان کی جگہ آئیں جو اللہ کے اوامر کو

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً

قبول کرتے ہیں وہ ان کو قائم نہیں کریں گے۔ اس کا بیان ابھی قریب ہی ان شاء اللہ آئے گا۔ معمر نے قتادہ سے اس ارشاد لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ کے تحت روایت کیا ہے کہ قتادہ نے فرمایا: اللہ کا عہد آخرت میں ظالموں کو نہیں ملے گا (1)۔ رہا دنیا میں تو ظالم نے اس کو پایا، اس کے ساتھ اس نے امن پایا، کھایا، زندہ رہا اور دیکھا۔

زجاج نے کہا: یہ عمدہ قول ہے لاینال امانی الظالمین یعنی میں انہیں اپنے عذاب سے امن نہیں دوں گا۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا: یہاں ظالم سے مراد مشرک ہے۔ حضرت ابن مسعود، طلحہ بن مصرف نے لاینال عھدی الظالمون پڑھا ہے یعنی ظالمون کے رفع کے ساتھ۔ اور باقی قراء نے نصب کے ساتھ پڑھا ہے، حمزہ، حفظ اور ابن محیصن نے عھدی میں یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے باقی قراء نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

مسئلہ نمبر 21: اس آیت سے علماء کی ایک جماعت نے استدلال کیا ہے کہ امام عادل، محسن اور فضل والا ہونا چاہئے ساتھ ساتھ اس کو عدل کے قیام کی قوت بھی ہو۔ اس کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الاینا زعوا الامر اھلہ۔ یعنی جو حکمرانی کے حقدار ہیں ان سے جھگڑا نہ کرو گے، اس کے متعلق گفتگو گزر چکی ہے۔ رہے فاسق، ظالم اور جابر لوگ وہ حکمرانی کے اہل نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ اسی وجہ سے حضرت ابن زبیر اور امام حسین رضی اللہ عنہما نے خروج کیا تھا، اہل عراق میں سے نیک لوگوں نے اور عراقی علماء نے حجاج بن یوسف پر خروج کیا تھا۔ اہل مدینہ نے بنی امیہ پر خروج کیا تھا اور ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ حرہ کا واقعہ جوان پر مسلم بن عقبہ نے واقع کیا تھا۔ یہی وجہ تھی اکثر علماء کا یہ خیال ہے کہ ظالم امام کی اطاعت پر صبر کرنا، خروج سے اولیٰ ہے کیونکہ اس سے لڑنے اور اس پر خروج کرنے میں امن کو خوف سے بدلنا ہے اور خون بہانا ہے اور بیوقوفوں کے ہاتھ کو کھولنا ہے اور مسلمانوں پر حملہ کا دروازہ کھولنا ہے اور زمین میں فساد کا شروع کرنا ہے۔ پہلا مسلک معتزلہ کے ایک گروہ کا ہے یہی خوارج کا مذہب ہے۔

مسئلہ نمبر 22: ابن خویز منداد نے کہا، جو ظالم ہو وہ نہ نبی ہوتا ہے نہ خلیفہ نہ حاکم ہوتا ہے نہ مفتی۔ نہ نماز کا امام ہوتا ہے اور نہ اس سے کوئی روایت قبول کی جاتی ہے جو وہ صاحب شریعت سے روایت کرتا ہے، نہ احکام میں اس کی گواہی قبول ہوتی ہے مگر وہ اپنے فسق کی وجہ سے معزول نہیں کیا جاتا حتیٰ کہ اسے دانشمند لوگ معزول کریں۔ جو اس نے پہلے احکام دیئے وہ صحیح احکام تھے تو وہ جاری و نافذ ہوں گے وہ نہیں ٹوٹیں گے۔ امام مالک نے خوارج اور باغیوں کے متعلق اس پر نص قائم کی ہے کہ ان کے احکام نہیں ٹوٹیں گے جب وہ ان میں اجتہاد کے ساتھ صحیح سمت پر پہنچے ہوں اور انہوں نے اجماع کو نہ توڑا ہو اور نصوص کی مخالفت نہ کی ہو۔ یہ ہم نے صحابہ کے اجماع کی وجہ سے کہا ہے، واقعہ یہ ہے کہ خوارج نے صحابہ کے ایام میں خروج کیا، نہ کوئی منقول ہے کہ ائمہ نے ان کے احکام کی جستجو کی تھی اور نہ ان میں سے کسی چیز کو توڑا اور نہ دوبارہ زکوۃ لی، نہ دوبارہ حدود کو قائم کیا، جو کچھ خوارج نے کہا تھا اسے ہی قائم رکھا۔ پس یہ دلیل ہے کہ اجتہاد کی وجہ کو انہوں نے صحیح پایا ہو تو ان کے احکام سے تعارض نہ کیا جائے گا۔

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

مسئلہ نمبر 23: ابن خویز منداد نے کہا: ظالم حکمرانوں سے تنخواہ لینا، اس کے تین احوال ہیں اگر جو ان کے قبضہ میں ہے وہ شریعت کے مطابق انہوں نے حاصل کیا ہے تو پھر اس کا لینا جائز ہے۔ صحابہ اور تابعین نے حجاج وغیرہ کے ہاتھ سے مال لیا تھا اگر ملا جلا مال ہو حلال بھی ہو اور حرام بھی جیسا کہ آج کے امراء کے ہاتھ میں ہے تو تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ نہ لیا جائے۔ اور محتاج کے لئے اس کا لینا جائز ہے وہ چور کی مانند ہے اس کے ہاتھ میں چوری کا مال بھی ہے اور پاکیزہ حلال مال بھی ہے ایک شخص نے اس مال کا اسے وکیل بنایا ہے۔ چور نے اس مال سے کسی انسان پر صدقہ کر دیا تو اس سے صدقہ لینا جائز ہے۔ اگرچہ جائز تھا کہ چور نے چوری شدہ سے کچھ صدقہ کیا ہو جبکہ کوئی چیز چوری شدہ مال سے معروف نہ ہو۔ اسی طرح اگر کوئی چیز بیچے یا خریدے تو عقد صحیح لازم ہوگی اگرچہ تقویٰ یہ ہے کہ اس سے بچا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اموال بذات خود حرام نہیں ہوتے بلکہ اپنی جہات کی وجہ سے حرام ہو جاتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں جو کچھ ہے اگر صراحۃ ظلماً لیا گیا ہو تو پھر ان سے لینا جائز نہیں اور اگر ان کے ہاتھوں میں غصب شدہ مال ہو مگر اس مال کا مالک اور مطالبہ کرنے والا معروف نہ ہو تو وہ اسی طرح ہے اگر وہ چوروں اور ڈاکوؤں کے ہاتھوں میں پایا جائے اسے بیت المال میں رکھا جائے گا اور بقدر اجتہاد اس کے طالب کا انتظار کیا جائے گا جب معلوم نہ ہوگا تو امام اسے مسلمانوں کے مصالح پر خرچ کر دے گا۔

وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا ؕ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآىِٕفِیْنَ وَ الْعٰكِفِیْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾

''اور یاد کرو جب ہم نے بنایا اس گھر (خانہ کعبہ) کو مرکز لوگوں کے لئے اور امن کی جگہ اور (انہیں حکم دیا کہ) بنا لو ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو جائے نماز اور ہم نے تاکید کر دی ابراہیم اور اسماعیل کو کہ خوب صاف ستھرا رکھنا میرا گھر طواف کرنے والوں، اعتکاف بیٹھنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1: جَعَلْنَا بمعنی صیرنا ہے کیونکہ یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے یہ پہلے گزر چکا ہے۔ البیت سے مراد کعبہ ہے۔ مثابۃ کا معنی ہے مرجع کہا جاتا ہے ثاب یثوب مثابا و مثابۃ و ثوؤبا و ثوبانا۔ مثابۃ مصدر ہے اس کے ساتھ صفت بیان کی گئی ہے اس سے مراد وہ جگہ ہے جس کی طرف لوٹا جاتا ہے۔ ورقہ بن نوفل نے کعبہ کے بارے میں کہا:

مثابا لافناء القبائل کلها تخب الیها الیعملات الذوامل (1)

کعبہ تمام قبائل کا مرجع ہے اس کی طرف اونٹ آہستہ چلنے والے آتے ہیں۔

اعمش نے مثابات جمع پڑھا ہے (2)۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ ثواب سے ہو یعنی لوگوں کو وہاں ثواب دیا جاتا ہے۔ مجاہد نے کہا: کوئی شخص اس سے اپنا مطلوب پورا نہیں کرتا۔ شاعر نے کہا:

جعل البیت مثابا لھم لیس منه الدھر یقضون الوطر

1۔ تفسیر طبری و المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

کعبہ کو لوگوں کے لئے لوٹنے کی جگہ بنایا گیا ہے لوگ اس سے اپنی خواہش پوری نہیں کرتے۔

اصل میں مثوبۃ تھا واو کی حرکت ثا کو دی گئی پھر واو ثاب یثوب کی اتباع میں الف سے بدل گئی اور اسے مفعول ثانی کی وجہ سے نصب دی گئی ہے، مبالغہ کے لئے ۃ کا اضافہ کیا گیا ہے کیونکہ کثرت سے لوٹنے والے ہوتے ہیں بہت کم ہے کہ کوئی بیت اللہ سے جدا ہوتا ہے مگر وہ کہتا ہے کہ ابھی اس نے اپنی حاجت پوری نہیں کی۔ یہ نسابہ اور علامۃ کی طرح ہے۔ یہ اخفش کا قول ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: یہ مصدر کی تانیث کی ھاء ہے، مبالغہ کے لئے نہیں ہے۔(1)

اگر کہا جائے کہ ہر شخص جو دوبارہ اس کی طرف نہیں آتا۔ اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ لوٹنا ایک مرتبہ آنے والے کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ لوگوں سے خالی نہیں ہوتا لوگوں سے قصد کرنے والے معدوم نہیں ہوتے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَمْنًا امام ابوحنیفہ اور فقہاء کی ایک جماعت نے اس سے استدلال کیا ہے کہ محصن اور چور پر حرم کی حدود میں حد قائم نہیں کی جائے گی جب وہ حرم میں پناہ لے گا۔ اور اپنے قول کی تائید اس آیت سے کی ہے: وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا (آل عمران: 97) گویا فرمایا: جو بیت اللہ میں داخل ہو جائے اسے امن دو۔ اور صحیح، حرم میں حدود کا قائم کرنا ہے۔ یہ منسوخ ہے کیونکہ اس میں اتفاق ہے کہ بیت اللہ میں قتل نہیں کیا جائے گا اور بیت اللہ سے باہر قتل کیا جائے گا۔ اختلاف اس میں ہے کہ حرم میں قتل کیا جائے گا یا نہیں۔ حرم پر بیت کے اسم کا اطلاق حقیقۃً نہیں ہوتا اور علماء کا اجماع ہے کہ اگر حرم میں کوئی قتل کرے گا تو اسے حرم میں قتل کیا جائے گا اگر کسی نے حد کا موجب جرم کیا تو اس سے جرم میں بدلا لیا جائے گا۔ اگر حرم میں کوئی جنگ کرے گا تو اس سے جنگ کی جائے گی اس کی جگہ اسے قتل کیا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: جو حرم کی طرف پناہ لے گا اسے حرم میں قتل نہیں کیا جائے گا نہ اس کا پیچھا کیا جائے گا اسے ہمیشہ تنگ کیا جائے گا حتیٰ کہ وہ مر جائے یا حرم سے باہر آ جائے۔

اور ہم اسے تلوار سے قتل کرتے ہیں اور وہ اسے بھوک کے ذریعے قتل کرتے ہیں۔ پس اس سے سخت قتل کون سا ہے؟ اَمْنًا یہ استقبال کعبہ کے امر کی تاکید ہے یعنی بیت المقدس میں یہ فضیلت نہیں ہے نہ لوگ اس کا حج کرتے ہیں، جو حرم میں پناہ لے تو وہ حملہ سے امن میں ہو جاتا ہے، مزید بیان سورۂ مائدہ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: وَاتَّخِذُوْا نافع اور ابن عامر نے خبر کے اعتبار سے خاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متبعین میں سے جنہوں نے مقام ابراہیم کو مصلی بنایا ان کے متعلق خبر ہے۔ اس کا عطف جَعَلْنَا پر ہے۔ یعنی جعلنہ البیت مثابۃ واتخذوہ مصلی۔ ہم نے بیت اللہ کو لوٹنے کی جگہ بنایا اور لوگوں نے اسے مصلی بنایا۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ اذ کی تقدیر پر معطوف ہے، گویا یوں فرمایا: واذ جعلنا البیت مثابۃ واذ اتخذوا۔

پہلی ترکیب پر کلام ایک جملہ ہے اور دوسری ترکیب پر دو جملے ہیں۔ جمہور قراء نے اسے اتخذوا امر کے صیغہ کے اعتبار سے

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

خاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ انہوں نے پہلے کلام سے اسے الگ کیا ہے اور انہوں نے جملہ کا جملہ پر عطف کیا ہے۔ مہدوی نے کہا: اذکروا نعمتی پر اس کا عطف جائز ہے گویا یہ یہود سے فرمایا جا رہا ہے۔ یا اس کا عطف اِذْ جَعَلْنَا کے معنی پر ہے کیونکہ اس کا معنی ہے اذکروا اذ جعلنا یا اس کا عطف مثابۃ کے معنی پر ہے کیونکہ مثابۃ کا معنی ہے ثُوبُوا۔(1) (لوٹ کر آؤ)

مسئلہ نمبر 2: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے تین باتوں میں اپنے رب کی موافقت کی ہے۔ مقام ابراہیم میں، پردے کے بارے میں اور بدر کے قیدیوں کے بارے میں۔ اس روایت کو مسلم وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ بخاری نے یہ روایت حضرت انس سے روایت کی ہے، فرمایا: حضرت عمر نے فرمایا: میں نے تین چیزوں میں اللہ تعالیٰ کی موافقت کی ہے یا فرمایا: میرے رب نے تین چیزوں میں میری موافقت کی ہے...... الحدیث ...... ابو داؤد الطیالسی نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے، فرمایا: ہمیں حماد بن سلمہ نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں علی بن زید نے بتایا انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے چار چیزوں میں اپنے رب کی موافقت کی۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! اگر آپ مقام کے پیچھے نماز پڑھیں تو یہ آیت نازل ہوگئی وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى میں نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اگر آپ اپنی ازواج مطہرات کو پردے کا حکم دے دیں کیونکہ ان کے پاس نیک اور فاجر ہر قسم کے لوگ آتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما دی: وَ اِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ (احزاب: 53) اور یہ آیت نازل ہوئی: وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ ۝ (المومنون) جب یہ نازل ہوئی تو میں نے کہا: تبارک اللہ احسن الخالقین تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ الفاظ نازل ہوئے: فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ ۝ (المومنون)

میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے پاس گیا۔ میں نے کہا: تم رک جاؤ ورنہ اللہ تعالیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تم سے بہتر دوسری عورتیں عطا فرما دے گا تو یہ آیت نازل ہوئی: عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ (التحریم: 5)(2)

میں کہتا ہوں: اس روایت میں بدر کے قیدیوں کا ذکر نہیں ورنہ پانچ چیزوں میں حضرت عمر کی موافقت ہوگی۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنْ مَّقَامِ، المقام لغت میں قدموں کی جگہ کو کہتے ہیں۔ نحاس نے کہا: مَقام، یہ قام یقوم سے ہے۔ مصدر ہوگا اور جگہ کا اسم ہوگا اور مُقام، اقام سے ہے۔ زہیر کا قول ہے:

د فیہم مقامات حسن وجوہهم وانديۃ ينتابها القول والفعل

ان میں اہل مقام ہیں جن کے چہرے خوبصورت ہیں اور مجالس ہیں جن میں قول و فعل پے در پے ہوتا ہے۔

اس شعر میں مقامات سے مراد اہل مقامات ہیں۔

المقام کی تعیین میں بہت سے مختلف اقوال ہیں۔ ان میں سے اصح یہ ہے کہ وہ پتھر آج لوگ جس کو پہچانتے ہیں جن کے پاس لوگ طواف قدوم کی دو رکعتیں پڑھتے ہیں یہ حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت ابن عباس، حضرت قتادہ وغیرہ کا قول

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب واتخذوا من مقام ابراهیم مصلی، حدیث 4123، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے(1)۔ صحیح مسلم میں حضرت جابر کی طویل حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جب بیت اللہ کو دیکھا تو رکن کو استلام کیا پھر تین چکروں میں رمل کیا، اور چار چکر آرام سے چلے پھر مقام ابراہیم کی طرف گئے اور یہ آیت پڑھی۔ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى۔ پھر رکعتیں پڑھیں ان میں سورہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اور قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ پڑھی۔ یہ دلیل ہے کہ طواف کی دو رکعتیں اور دوسری نمازیں اہل مکہ کے لئے افضل ہیں اور من وجہ یہ دلیل ہے کہ مسافروں کے لئے طواف افضل ہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ بخاری میں ہے: مقام سے مراد وہ پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام چڑھے تھے جب ان پتھروں کو اٹھانے سے کمزور پڑ گئے تھے جو کعبہ کی تعمیر میں حضرت اسماعیل علیہ السلام آپ کو پیش کرتے تھے، آپ کے قدم اس پتھر میں دھنس گئے تھے۔ حضرت انس نے کہا: میں نے المقام میں حضرت ابراہیم علیہ کی انگلیوں، ایڑھی اور قدموں کے نیچے اٹھی ہوئی جگہ کا نشان دیکھا، لیکن لوگوں کے ہاتھوں کے چھونے نے اس نشان کو ختم کر دیا ہے۔ قشیری نے یہ بیان کیا ہے(2)۔ سدی نے کہا: المقام سے مراد وہ پتھر ہے جو حضرت اسماعیل کی بیوی نے حضرت ابراہیم کے قدموں کے نیچے رکھا تھا۔ جب اس نے حضرت ابراہیم کا سر دھویا تھا(3)۔ حضرات ابن عباس، مجاہد، عکرمہ اور عطا سے مروی ہے، مقام سے مراد مکمل حج ہے۔ عطا سے مروی ہے، عرفہ، مزدلفہ اور جمار ہے۔ یہ شعبی اور نخعی کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: پورا حرم مقام ابراہیم ہے۔

میں کہتا ہوں: صحیح پہلا قول ہے جیسا کہ صحیح حدیث میں ثابت ہے۔ ابونعیم نے محمد بن سوقہ عن محمد بن المنکدر عن جابر کے سلسلہ سے روایت کیا ہے۔ حضرت جابر نے فرمایا: نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو رکن اور مقام یا دروازے اور مقام کے درمیان دیکھا وہ دعا مانگ رہا تھا اے اللہ! فلاں کو بخش دے۔ نبی کریم ﷺ نے اسے فرمایا: یہ کیا ہے؟ اس شخص نے کہا: مجھے ایک شخص نے اس مقام میں دعا کرنے کے لئے کہا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا، لوٹ جا تیرے ساتھی کی بخشش ہوگئی۔ ابونعیم نے اس سند سے بھی یہ روایت نقل کی ہے: حدثناه احمد بن محمد احمد بن ابراهيم القاضي، قال حدثنا محمد بن عاصم بن يحيى الكاتب، قال حدثنا عبد الرحمن بن القاسم القطان الكوفي، قال حدثنا الحارث بن عمران الجعفري عن محمد بن سوقه۔

ابونعیم نے کہا: اسی طرح یہ عبدالرحمن نے حارث سے انہوں نے محمد سے انہوں نے حضرت جابر سے روایت کی ہے۔ حارث کی حدیث محمد عن عکرمہ عن ابن عباس کی سند سے معروف ہے۔ مُصَلًّى کا معنی ایسی جگہ جہاں دعا کی جائے۔ یہ مجاہد کا قول ہے بعض نے فرمایا: نماز کی جگہ جس کے قریب نماز پڑھی جائے۔ یہ قتادہ کا قول ہے(4)۔ بعض نے فرمایا: قبلہ جس کے پاس امام کھڑا ہوتا ہے۔ یہ حسن کا قول ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: وَعَهِدْنَآ بعض نے فرمایا: اس کا معنی امرنا (ہم نے حکم دیا) ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی اوحینا

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

(ہم نے وحی کی) اَنْ طَهِّرَا، اَنْ حرف جر کے حذف کی تقدیر کے ساتھ محل نصب میں ہے۔

سیبویہ نے کہا: اَنْ بمعنی ای مفسرہ ہے اس کا اعراب میں کوئی محل نہیں ہے۔ کوفیوں نے کہا: عَهِدْنَآ بمعنی قلنا ہے۔ طَهِّرَا بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے: بتوں سے پاک کرو۔ یہ مجاہد اور زہری سے مروی ہے۔ حضرات عبید بن عمیر اور سعید بن جبیر نے کہا: آفات اور ریب سے پاک کرو۔ بعض نے فرمایا: کفار سے پاک کرو۔ سدی نے کہا: طہارت اور طہارت کی نیت سے اس کی بنیاد رکھو اور تعمیر کرو۔ اس قول کی مثل اُسس علی التقوی ہے۔ یمان نے کہا: اس کا معنی ہے: اسے خوشبو لگاؤ اور دھونی دو (1)۔ بَيْتِيَ، بیت کی اضافت اپنی طرف کی، یہ شرف و تکریم بخشنے کے لئے ہے، یہ مخلوق کی خالق کی طرف اور مملوک کی مالک کی طرف اضافت ہے (2)۔ حضرات حسن، ابن ابی اسحاق، اہل مدینہ، ہشام اور حفص نے بیتیَ یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، دوسرے قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِلطَّآىِٕفِيْنَ اس کا ظاہر مطلب تو یہ ہے کہ جو بیت اللہ کا طواف کرتے ہیں، یہ عطا کا قول ہے۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا: اس کا معنی ہے مسافروں کے لئے جو مکہ میں وارد ہوتے ہیں (3)۔ اس میں بعد ہے وَ الْعٰكِفِيْنَ جو اس شہر کے ہیں اور جو مسافر ہیں۔ یہ عطا سے مروی ہے۔ اسی طرح کا قول لِلطَّآىِٕفِيْنَ کے بارے میں ہے لغت میں عکوف لزوم اور کسی شے کی طرف متوجہ ہونے کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ شاعر نے کہا:

عکف النبیط یلعبون الفنزجا (4)

نبطی لوگ رقص کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔

مجاہد نے کہا: العاکفون سے مراد مجاور ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: نمازی ہیں۔ بعض نے فرمایا: جو بغیر طواف کے بیٹھنے والے ہیں۔ یہ تمام معانی قریب قریب ہیں۔ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ کعبہ کے پاس نماز پڑھنے والے۔ رکوع و سجود کو خاص طور پر ذکر فرمایا کیونکہ یہ دونوں احوال نمازی کو اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب کرنے والے ہوتے ہیں۔ رکوع و سجود کا لغوی معنی پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 3: جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ اس میں اللہ تعالیٰ کے تمام گھر شامل ہیں۔ ان کا حکم بھی تطہیر و نظافت میں اس جیسا ہوگا، کعبہ کا خاص طور پر ذکر فرمایا کیونکہ اس وقت وہاں اور کوئی گھر نہ تھا یا اس لئے کہ اس کی حرمت زیادہ ہے۔ پہلا معنی اظہر ہے۔ قرآن میں ہے: فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ (النور: 36) اس آیت کے تحت دوسری مساجد کا حکم آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے مسجد میں ایک شخص کی آواز سنی۔ حضرت عمر نے فرمایا: یہ کیا ہے؟ کیا تو جانتا ہے تو کہاں ہے؟ حضرت حذیفہ نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی فرمائی، ڈرانے والوں کے بھائی، اے رسولوں کے بھائی! اپنی قوم کو ڈراؤ کہ وہ میرے گھروں میں سے کسی گھر میں داخل نہ ہوں مگر سلیم دلوں

1۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 4۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

کے ساتھ، سچی زبانوں کے ساتھ، پاکیزہ ہاتھوں کے ساتھ، صاف شرمگاہوں کے ساتھ اور میرے گھروں میں سے کسی گھر میں داخل نہ ہوں جب تک کہ انہوں نے کسی پر ظلم کیا ہو۔ کیونکہ میں اس پر لعنت کرتا ہوں جب تک وہ میرے سامنے کھڑا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ ظلم سے چھینی ہوئی چیز مظلوم کو واپس کر دے۔ پس میں اس کے کان بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ سنتا ہے، میں اس کی بصارت بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ دیکھتا ہے اور وہ میرے اولیاء واصفیاء میں سے ہو جاتا ہے اور انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ میرا پڑوسی بن جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 4: اس آیت میں امام شافعی، امام ابوحنیفہ، ثوری اور سلف کی جماعت نے بیت اللہ کے اندر فرض نماز اور نفل نماز کے جواز پر استدلال کیا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: اگر بیت اللہ کے درمیان کسی دیوار کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے گا تو اس کی نماز جائز ہوگی۔ اگر اس نے دروازے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی جبکہ دروازہ کھلا ہوا تھا تو اس کی نماز باطل ہے۔ اسی طرح جس نے کعبہ کی چھت پر نماز پڑھی تو اس کی نماز باطل ہے کیونکہ کعبہ کا کوئی حصہ اس کے سامنے نہ تھا۔ امام مالک نے فرمایا: اس کے اندر فرض اور سنن ادا نہیں کی جائیں گی۔ اس میں نفل پڑھے جائیں گے مگر اس نے فرض کعبہ کے اندر پڑھے تو وقت میں دوبارہ پڑھے گا۔ اصبغ نے کہا: وہ ہمیشہ لوٹائے گا۔

میں کہتا ہوں: یہی صحیح ہے کیونکہ مسلم نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے(1)، فرمایا: مجھے حضرت اسامہ بن زید نے بتایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب بیت اللہ میں داخل ہوئے تو اس کی تمام اطراف میں دعا مانگی اور اس میں نماز نہ پڑھی حتیٰ کہ کعبہ سے نکل آئے۔ جب باہر آئے تو کعبہ کی طرف منہ کر کے دو رکعتیں پڑھیں اور فرمایا: یہ قبلہ ہے اور یہ نص ہے۔

اگر کہا جائے کہ بخاری میں حضرت ابن عمر سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت اسامہ بن زید، حضرت بلال، حضرت عثمان بن طلحہ حجبی بیت اللہ میں داخل ہوئے اور اپنے اوپر دروازہ بند کر لیا۔ جب دروازہ کھولا تو میں پہلا شخص تھا جو اندر داخل ہوا۔ میں حضرت بلال سے ملا۔ میں نے ان سے پوچھا: کیا اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تھی؟ حضرت بلال نے کہا: ہاں دو یمنی ستونوں کے درمیان پڑھی تھی۔ مسلم نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اس میں دو ستونوں کو اپنی بائیں جانب اور ایک ستون کو دائیں جانب اور تین ستونوں کو پیچھے رکھا، اس وقت بیت اللہ چھ ستونوں پر تھا۔

ہم کہتے ہیں: ہو سکتا ہے صلّی بمعنی دعا ہو۔ جس طرح حضرت اسامہ نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی۔ یہ بھی احتمال ہے کہ صلّی سے مراد نماز ہی ہو، جب اس میں احتمال آ گیا تو اس سے احتجاج ساقط ہو گیا۔

اگر کہا جائے کہ ابن منذر وغیرہ نے حضرت اسامہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ میں تصاویر دیکھیں تو میں ڈول میں آپ کے پاس پانی لے آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ پانی ان تصاویر پر مارا۔ اس حدیث کو ابوداؤد طیالسی نے نقل کیا ہے۔ فرمایا: ہمیں ابن ابی ذئب نے عبدالرحمٰن بن مہران سے روایت کر کے بتایا، فرمایا: ہمیں عمیر مولیٰ ابن عباس نے حضرت اسامہ بن زید سے روایت کر کے بتایا، فرمایا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کعبہ میں داخل ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

1۔ صحیح بخاری، باب قول اللہ تعالیٰ واتخذوا من مقام ابراھیم مصلی، حدیث 383، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تصاویر دیکھیں، فرمایا: آپ ﷺ نے پانی کا ڈول منگوایا۔ میں آپ کے پاس پانی لے کر آیا تو آپ ان تصاویر کو مٹانے لگے اور فرمایا: اللہ تعالیٰ اس قوم کو قتل کرے جو ان کی تصاویر بناتے ہیں جو کچھ پیدا نہیں کرتے۔

اس میں احتمال ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس وقت نماز پڑھی ہو جب حضرت اسامہ پانی لینے گئے ہوں اور حضرت بلال نے وہ عمل دیکھا ہو جو حضرت اسامہ نے نہ دیکھا۔ پس جو ثابت کرنے والا ہوتا ہے وہ نفی کرنے والے سے اولیٰ ہوتا ہے۔ حضرت اسامہ نے خود کہا: لوگوں نے حضرت بلال کے قول کو لیا اور میرے قول کو چھوڑ دیا۔ مجاہد نے حضرت عبداللہ بن صفوان سے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے حضرت عمر بن خطاب سے پوچھا رسول اللہ ﷺ جب کعبہ میں داخل ہوئے تو کیسے عمل کیا؟ حضرت عمر نے کہا: دو رکعت نماز پڑھی۔

ہم کہتے ہیں: یہ نوافل پر محمول ہے ہم کعبہ میں نوافل کی صحت میں علماء کا اختلاف نہیں جانتے۔ رہے فرض تو اس کے ہم قائل نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جہت کو اپنے ارشاد فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ میں متعین فرمایا۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد، جب آپ باہر نکلے، ھذہ القبلۃ۔ تو آپ نے اس کی تعیین فرمائی جس طرح اللہ تعالیٰ نے تعیین فرمائی تھی۔ اگر کعبہ کے اندر فرض صحیح ہوتے تو آپ ھذہ القبلۃ نہ فرماتے۔ اس طرح احادیث کو جمع کرنا صحیح ہو جاتا ہے۔ اور یہ بعض احادیث کو ساقط کرنے سے اولیٰ ہے۔ پس کوئی تعارض نہیں ہے۔ الحمد للہ

مسئلہ نمبر 5: اسی طرح کعبہ کی چھت پر نماز پڑھنے میں اختلاف ہے۔ امام شافعی نے تو وہی فرمایا ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔ امام مالک نے فرمایا: جو کعبہ کی چھت پر نماز پڑھے وہ وقت میں دوبارہ پڑھے۔ اور بعض اصحاب مالک سے مروی ہے کہ وہ ہر حال میں اعادہ کرے (خواہ وقت موجود ہو یا وقت گزر چکا ہو) امام ابو حنیفہ نے فرمایا: جس نے کعبہ کی چھت پر نماز پڑھی اس پر کچھ واجب نہیں۔

مسئلہ نمبر 6: اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ بیت اللہ کے پاس نماز پڑھنا افضل ہے یا اس کا طواف کرنا افضل ہے۔ امام مالک نے فرمایا: باہر سے آنے والوں کے لئے طواف افضل ہے اور اہل مکہ کے لئے نماز افضل ہے، یہ حضرات ابن عباس، عطا اور مجاہد سے ذکر کیا گیا ہے۔ جمہور علماء کا قول ہے کہ نماز افضل ہے، حدیث میں ہے۔ اگر خشوع کرنے والے مرد، رکوع کرنے والے بوڑھے، دودھ پینے والے بچے اور چرنے والے جانور نہ ہوتے تو ہم تم پر عذاب نازل کرتے۔

ابوبکر احمد بن علی بن ثابت الخطیب نے اپنی کتاب (السابق واللاحق) میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر تم میں خشوع کرنے والے مرد، چرنے والے جانور، دودھ پینے والے بچے نہ ہوتے تو مجرموں پر عذاب نازل کر دیا جاتا۔ اس میں بوڑھے رکوع کرنے والوں کا ذکر نہیں ہے۔ حضرت ابوذر کی حدیث میں ہے: نماز بہتر چیز ہے تو زیادہ پڑھ یا کم پڑھ (تیری مرضی) اس کو الاجری نے ذکر کیا ہے۔ نماز اور سجدہ کی فضیلت میں اخبار بہت زیادہ ہیں جو جمہور کے قول کی تائید کرتی ہیں۔ واللہ اعلم

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ

مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾

''اور یاد کرو جب عرض کی ابراہیم نے اے میرے رب! بنا دے اس شہر کو امن والا اور روزی دے اس کے باشندوں کو طرح طرح کے پھلوں سے (یعنی) جو ان میں سے ایمان لائے اللہ پر اور روز قیامت پر۔ اللہ نے فرمایا: (ان میں سے) جس نے کفر بھی کیا اسے بھی فائدہ اٹھانے دوں گا چند روز پھر مجبور کروں گا اسے دوزخ کے عذاب کی طرف اور یہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بَلَدًا اٰمِنًا اس سے مراد مکہ ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد اور دوسرے لوگوں کے لئے امن اور خوشحال زندگی کی دعا مانگی (1)۔ روایت ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے جبریل سے فرمایا: شام سے طائف کو اکھیڑ۔ پس جبریل نے طائف کے ساتھ بیت اللہ کے اردگرد سات چکر لگائے۔ طائف کو طائف اسی لئے کہا جاتا ہے (2) پھر طائف کو تہامہ میں اتارا، مکہ اور اس کے قریب کا علاقہ اس وقت چٹیل تھا۔ نہ پانی تھا نہ کوئی نبات۔ پس اللہ تعالیٰ نے مکہ کے اردگرد کے علاقہ جیسے طائف وغیرہ میں برکت ڈال دی اور اس میں قسم قسم کے پھل اگائے۔ اس کا بیان ان شاء اللہ سورۂ ابراہیم میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 2: علماء کا اختلاف ہے کہ مکہ حضرت ابراہیم کے سوال سے حرم بنا یا پہلے سے ہی حرم تھا۔ اس میں دو قول ہیں:

پہلا قول یہ ہے کہ یہ ہمیشہ جابر مسلطین سے، خسوف اور زلزلوں سے اور دوسرے تمام حوادث سے جو شہروں پر نازل ہوتے ہیں سے حرم تھا۔ اللہ تعالیٰ نے سرکش نفوس میں اس کی تعظیم اور ہیبت ڈال دی جس کی وجہ سے مکہ کے رہنے والے دوسرے لوگوں سے امن کی وجہ سے ممتاز ہو گئے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید پر ایک بہت بڑی علامت رکھ دی جس کا مشاہدہ کیا گیا ہے کہ اس میں کتا اور شکار جمع ہوتے ہیں اور کتا شکار پر حملہ نہیں کرتا اور نہ شکار اس سے ڈرتا ہے، حتیٰ کہ جب وہ دونوں حرم سے نکل جاتے ہیں تو کتا اس شکار پر حملہ کرتا ہے اور وہ بھاگنے لگتا ہے۔

حضرت ابراہیم نے دعا مانگی تھی کہ مکہ کو قحط، بنجر ہونے اور حملوں سے امن والا بنا اور اس کے رہنے والوں کو پھلوں سے رزق عطا فرما۔ اس کا یہ مطلب نہیں جیسا کہ بعض لوگوں نے گمان کیا کہ اس کا خون بہانا بھی منع ہے جس کا قتل کرنا لازم ہو چکا ہے۔ یہ حضرت ابراہیم کے مقصود سے بہت بعید ہے حتیٰ کہ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم نے دعا مانگی تھی کہ ان کی شرع میں اس شخص کا قتل کرنا حرام ہو جو حرم میں پناہ لے۔ یہ انتہائی بعید قول ہے۔

دوسرا قول۔ مکہ حضرت ابراہیم کی دعا سے پہلے دوسرے شہروں کی طرح حلال تھا اور آپ کی دعا سے حرم امنا بنا جیسا کہ مدینہ طیبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریم سے امن والا بنا اس سے پہلے حلال تھا۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

پہلے مقالہ والوں نے حضرت ابن عباس کی حدیث سے استدلال کیا، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن فرمایا: یہ شہر وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے دن حرمت والا بنایا یہ قیامت تک اللہ تعالیٰ کی حرمت کی وجہ سے حرام ہے، اس میں جنگ مجھ سے پہلے کسی کے لئے حلال نہ تھی اور نہ میرے لئے حلال ہے مگر دن کی ایک گھڑی۔ یہ قیامت تک اللہ تعالیٰ کی حرمت کے ساتھ حرام ہے، اس کا نہ کانٹا توڑا جائے گا نہ اس کا شکار ڈرایا جائے گا نہ اس کی گری پڑی چیز اٹھائی جائے گی مگر جو اس کا اعلان کرے اور نہ اس کی خشک گھاس کاٹی جائے گی۔ حضرت عباس نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اذخر گھاس کی استثنا فرمائیں کیونکہ وہ ہمارے لوہاروں کے لئے اور ہمارے گھروں کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اذخر گھاس کی استثناء فرما دی۔ (1)

اسی طرح کی حدیث ابو شریح کی ہے۔ ان دونوں حدیثوں کو مسلم نے نقل کیا ہے (2)۔ صحیح مسلم میں حضرت عبد اللہ بن زید بن عاصم سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم بنایا اور اہل مکہ کے لئے دعا کی، میں نے مدینہ کو حرم بنایا جس طرح حضرت ابراہیم نے مکہ کو حرم بنایا، میں نے اس کے صاع اور اس کے مد کے لئے اس کے دو مثل کی دعا کی جو حضرت ابراہیم نے اہل مکہ کے لئے دعا کی۔ ابن عطیہ نے کہا: ان دونوں احادیث میں کوئی تعارض نہیں۔ کیونکہ پہلی حدیث اس کے متعلق خبر دے رہی ہے جو مکہ کے متعلق اللہ تعالیٰ کے علم سابق میں تھا اور اس کے فیصلہ میں تھا اور وہ حضرت آدم علیہ السلام کی مدت ہے اور ایمان کے ساتھ افق کو آباد کرنے کے اوقات کی حرمت ہے۔

اور دوسری حدیث میں حضرت ابراہیم کا اس کی حرمت کی تجدید اور اس کے مٹنے کے بعد، اس کے اظہار کی خبر ہے۔ پہلا قول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دوسرے دن مومنوں پر مکہ کی حرمت کی تعظیم کی خبر دیتے ہوئے فرمایا اور اس کی تحریم کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی اور مدینہ طیبہ کی تحریم کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بطور مثال ذکر فرمایا۔ لامحالہ مدینہ کی تحریم بھی اللہ کی طرف سے ہوگی اور اس کی قضا کے نفاذ سے اور اس کے سابق علم سے ہوگی۔ طبری نے کہا (3): مکہ حرام تھا اس کا اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو مکلف نہ کیا حتیٰ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کا سوال کیا اور اللہ تعالیٰ نے اسے حرم بنا دیا۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّارۡزُقۡ اَهۡلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنۡ اٰمَنَ، رزق کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ ثمرات، ثمرۃ کی جمع ہے یہ بھی پہلے گزر چکا ہے مَنۡ اٰمَنَ یہ اھل سے بدل ہے اور کل سے بدل بعض ہے۔ الایمان کا معنی تصدیق ہے یہ پہلے گزر چکا ہے۔ قَالَ وَمَنۡ كَفَرَ، مَنۡ محل نصب میں ہے۔ تقدیر اس طرح ہے: وارزق من کفر۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل رفع میں ہو مبتدا کی حیثیت سے اور یہ شرط ہے اور خبر فامتعہٗ ہو اور یہ جواب ہے۔

اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ قول اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے یا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے ہے۔ حضرت ابی بن کعب اور اسحٰق وغیرہما نے کہا (4): یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور انہوں نے فامتعہ ہمزہ کے ضمہ، میم کے فتحہ اور تا کی

1۔ مسلم شریف، کتاب الحج، باب تحریم مکۃ و تحریم صیدھا و خلاھا و شجرھا، جلد 1، صفحہ 437 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح بخاری، باب لا ینفر صید الحرم، حدیث 1702، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　4۔ ایضاً

تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ ثم اضطرہ ہمزہ کے قطع اور را کے ضمہ کے ساتھ۔ ابن عامر کے سوا قراء سبعہ نے اسی طرح پڑھا ہے۔ ابن عامر نے میم کے سکون اور تا کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو اسحاق الزجاج نے حکایت کیا ہے کہ ابی کی قراءت میں فنمتعه قليلاً ثم نضطره یعنی نون کے ساتھ ہے (1)۔ حضرات ابن عباس، مجاہد اور قتادہ نے کہا: یہ قول حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے انہوں نے فامتعه کو ہمزہ کے فتحہ اور میم کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ پھر ثم اضطره کو الف کے وصل اور را کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مومنین کے حق میں دعا فرمائی اور کفار کے خلاف دعا کی (2)۔ اس صورت میں قال کی ضمیر کا مرجع حضرت ابراہیم علیہ السلام ہوں گے اور قال کو دوبارہ ذکر کیا کلام کی طوالت کی وجہ سے یا اس لئے کہ آپ مومنین کے لئے دعا مانگنے نکلے اور کفار کے خلاف دعا کرنے میں داخل ہوئے۔ جمہور کی قراءت پر قال کا فاعل اللہ تعالیٰ کا اسم ہے۔ نحاس نے اس کو اختیار کیا۔ ہمزہ کے فتحہ اور میم کے سکون اور الف کے وصل کے ساتھ قراءت شاذ ہے، نسق کلام اور تفسیر دونوں اس کے خلاف پر دلالت کرتی ہے۔ رہا نسق کلام تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق خبر دی کہ انہوں نے کہا: رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا اے میرے رب! اس کو امن والا شہر بنا۔ پھر یہ عرض کی: وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ ان دونوں کے درمیان قال کے ساتھ فاصلہ نہیں کیا پھر اس کے بعد فرمایا: قَالَ وَمَنْ كَفَرَ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب تھا۔ اس کے بعد قال ابراہیم نہیں فرمایا۔

رہی تفسیر تو حضرت ابن عباس، حضرت سعید بن جبیر اور حضرت محمد بن کعب سے صحیح مروی ہے۔ حضرت ابن عباس کے الفاظ یہ ہیں: حضرت ابراہیم نے جو لوگ ایمان لائے تھے صرف ان کے لئے دعا فرمائی کفار کے لئے نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ وہ کافروں کو بھی اسی طرح رزق دے گا جس طرح ایمان والوں کو رزق دے گا اور وہ انہیں تھوڑا عرصہ لطف اندوز کرے گا پھر انہیں آگ کے عذاب کی طرف مجبور کرے گا۔ ابو جعفر نے کہا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: كُلًّا نُّمِدُّ هٰۤؤُلَآءِ وَهٰۤؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ (اسراء: 20) (ہر ایک کی ہم امداد کرتے ہیں (جو طالب دنیا ہیں) اور ان کی بھی (جو طالب آخرت ہیں)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وامم سنمتعهم (کچھ قومیں ہوں گی ہم لطف اندوز کریں گے انہیں۔)

ابو اسحاق نے کہا: حضرت ابراہیم کو معلوم تھا کہ ان کی اولاد میں کفار بھی ہوں گے اس لئے آپ نے دعا میں مومنین کو خاص فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ (نہیں پہنچتا میرا وعدہ ظالموں تک)

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ۭ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾

"اور یاد کرو جب اٹھا رہے تھے ابراہیم (علیہ السلام) بنیادیں خانہ کعبہ کی اور اسماعیل (علیہ السلام) بھی۔ اے ہمارے پروردگار! قبول فرما ہم سے (یہ عمل) بے شک تو ہی سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ، القواعد سے مراد اس کی بنیادیں ہیں۔ یہ ابو

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

عبیدہ اور فراء کا قول ہے۔ کسائی نے کہا: اس سے مراد دیواریں ہیں، معروف بنیاد ہے۔

حدیث میں ہے: بیت اللہ کو جب گرایا گیا تو اس سے بڑے بڑے پتھر نکلے۔ ابن زبیر نے کہا: یہ وہ پتھر ہیں جن سے حضرت ابراہیم نے بیت اللہ کی تعمیر کی تھی۔ بعض نے فرمایا: وہ بنیادیں مٹ گئی تھیں پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان پر مطلع فرمایا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: بیت اللہ کو ان ارکان پر رکھا گیا تھا جو آپ نے دیکھے تھے اور دنیا کی تخلیق سے دو ہزار سال پہلے۔ پھر زمین کو اس کے نیچے سے پھیلایا گیا۔

القواعد کا واحد قاعدۃٌ ہے اور القواعد من النساء کا واحد قاعدٌ ہے(1)۔ علماء کا اختلاف ہے کہ سب سے پہلے کس نے کعبہ کی بنیاد رکھی۔ بعض نے فرمایا: ملائکہ نے سب سے پہلے اس کی بنیاد رکھی۔ جعفر بن محمد سے مروی ہے، فرمایا: میرے باپ سے بیت اللہ کی تخلیق کے آغاز کے بارے میں پوچھا گیا جب کہ میں بھی موجود تھا تو میرے والد صاحب نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جب فرمایا: اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (البقرہ:30)(میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں) تو فرشتوں نے کہا: کیا تو اس میں اسے خلیفہ بناتا ہے جو اس میں فساد برپا کرے گا اور خونریزی کرے گا جبکہ ہم تیری حمد کے ساتھ پاکی بیان کرتے ہیں اور تیری تقدیس کا اظہار کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں پر ناراض ہوا تو انہوں نے اس کے عرش کے ذریعے پناہ طلب کی۔ انہوں نے عرش کے اردگرد سات چکر لگائے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا طلب کرتے رہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا: میرے لئے زمین میں ایک گھر بناؤ۔ بنی آدم میں سے جس پر میں ناراض ہوں گا وہ اس کی پناہ لے گا اور اس کے اردگرد طواف کرے گا جس طرح تم نے میرے عرش کے اردگرد طواف کیا۔ پس میں اس سے راضی ہو جاؤں گا جس طرح میں تم سے راضی ہوا، پس فرشتوں نے بیت اللہ بنایا۔

عبدالرزاق نے ابن جریج سے انہوں نے عطا اور ابن مسیب وغیرہ سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو وحی فرمائی کہ جب تو نیچے زمین پر اترے تو میرے لئے ایک گھر بنا پھر اس کو گھیر لے جس طرح تو نے ملائکہ کو دیکھا کہ انہوں نے میرے عرش کو گھیرا تھا جو آسمان میں تھا۔

عطا نے کہا: لوگوں کا خیال ہے حضرت آدم علیہ السلام نے کعبہ کو پانچ پہاڑوں سے بنایا: حرا، طور سینا، لبنان، جودی اور طور سینا۔ اس کی ربض حرا سے تھی(2)۔ خلیل نے کہا: الربض سے یہاں مراد پتھر سے بنی ہوئی بیت اللہ کی گول بنیاد ہے۔ اسی وجہ سے مدینہ کے اردگرد کی جگہ کو ربض کہا جاتا ہے۔ ماوردی نے عطا سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام جنت سے زمین کی طرف اترے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے کہا: اے آدم! تو جا اور میرے لئے ایک گھر بنا اور اس کا طواف کر اور اس کے پاس مجھے یاد کر جس طرح تو نے ملائکہ کو میرے عرش کے اردگرد کرتے دیکھا۔ حضرت آدم علیہ السلام چلتے ہوئے آئے اور زمین ان کے لئے لپیٹی گئی تھی اور جنگل ان کے لئے سکیڑے گئے تھے آپ جہاں قدم رکھتے تھے وہ جگہ آباد ہو جاتی تھی حتیٰ کہ آپ بیت حرام کی جگہ پر پہنچے۔ جبریل نے اپنے پر زمین پر مارے اور نچلی

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

ساتویں زمین پر قائم بنیاد کو ظاہر کر دیا۔ پس ملائکہ نے حضرت آدم علیہ السلام کی طرف پتھر پھینکے۔ وہ اتنے بڑے تھے کہ تیس آدمی انہیں نہیں اٹھا سکتے تھے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے پانچ پہاڑوں سے کعبہ بنایا جس طرح ہم نے پہلے ذکر کیا ہے۔

بعض اخبار میں مروی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے لئے جنت کے خیموں سے ایک خیمہ اتارا گیا وہ کعبہ کی جگہ پر لگایا گیا تا کہ آپ اس سے سکون حاصل کریں اور اس کا طواف کریں وہ خیمہ باقی رہا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی روح قبض فرمائی تو پھر اٹھا لیا گیا۔ یہ حضرت وہب بن منبہ کے طریق سے ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ ایک بیت (گھر) اتارا گیا آپ اس کا طواف کرتے تھے اور آپ کی اولاد میں سے مومنین، غرق کے زمانہ تک طواف کرتے رہے پھر اللہ تعالیٰ نے اسے اٹھا لیا تو وہ آسمان میں ہو گیا اسی گھر کو بیت المعمور کہا جاتا ہے۔ قتادہ سے روایت ہے جسے حلیمی نے اپنی کتاب ''منہاج القرآن'' میں ذکر کیا ہے(1)۔ انہوں نے فرمایا: جو معنی قتادہ نے بیان کیا وہ جائز ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ ایک گھر اتارا گیا یعنی وہ طولاً، عرضاً اور بلندی کے اعتبار سے بیت المعمور کی مقدار کا تھا پھر حضرت آدم علیہ السلام سے کہا گیا: اتنا بناؤ اور کوشش کرو کہ یہ اس کے بالمقابل ہو، وہ کعبہ کی جگہ کے سامنے تھا۔ پس آپ نے اس میں کعبہ بنایا۔ رہا وہ خیمہ یہ جائز ہے کہ وہ اتارا گیا ہو اور کعبہ کی جگہ لگایا گیا ہو۔ جب کعبہ کی تعمیر کا حکم دیا گیا تو آپ نے کعبہ تعمیر کیا اور کعبہ کے ارد گرد حضرت آدم علیہ السلام کے دل کے لئے طمانیت تھی جب تک آپ زندہ رہے وہ خیمہ قائم رہا پھر اسے اٹھا لیا گیا۔ پس یہ اخبار اس طرح متفق ہو جاتی ہیں۔ یہ حضرت آدم علیہ السلام کی بنا ہے۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے بنایا۔ ابن جریج نے کہا: لوگوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ایک بادل بھیجا جس میں ایک سر تھا۔ اس سر نے کہا: اے ابراہیم! تیرا رب تجھے حکم دیتا ہے کہ تو اس بادل کی مقدار لے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اسے دیکھنا شروع کیا اور اس کی مقدار خط کھینچ دیا۔ پھر اس سر نے کہا: تو نے کر دیا۔ پھر آپ نے اس جگہ کی کھدائی کی اور زمین میں قائم اساس کو ظاہر کیا۔ حضرت علی بن ابی طالب بنی ﷺ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت ابراہیم کو بیت اللہ کی تعمیر کا حکم دیا تو آپ شام سے نکلے اور آپ کے ساتھ آپ کا بیٹا اسماعیل اور اس کی ماں ہاجرہ بھی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ سکینت (ہوا) کو بھیجا جس کی ایک زبان تھی جس کے ساتھ وہ کلام کرتی تھی۔ صبح کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے ساتھ چلتے جب وہ چلتی اور اس کے ساتھ آپ واپس آ جاتے جب وہ واپس آتی، حتیٰ کہ وہ سکینت حضرت آدم علیہ السلام کو لے کر مکہ تک پہنچ گئی۔ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا: میری جگہ پر بنیاد رکھو۔ پس حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے دیواریں بلند کیں حتیٰ کہ حجر اسود کی جگہ پہنچ گئے۔ حضرت ابراہیم نے حضرت اسماعیل سے کہا: اے میرے بیٹے! میرے لئے ایک پتھر تلاش کر جسے میں لوگوں کے لئے علامت بناؤں۔ حضرت اسماعیل ایک پتھر لے آئے جسے آپ نے پسند نہ فرمایا اور فرمایا اور کوئی پتھر تلاش کرو۔ آپ تلاش کرتے رہے پھر آپ خود آئے اور حجر اسود لے آئے اور اسے اپنی جگہ پر رکھ دیا۔ حضرت اسماعیل نے کہا: اے میرے ابا جان! یہ پتھر تمہارے پاس کون لایا ہے۔ حضرت ابراہیم نے کہا: وہ جو مجھے تیرے سپرد نہیں کرتا (2)۔ حضرت

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

ابن عباس نے کہا: جبل ابوقبیس نے پکارا اے ابراہیم، اے خلیل الرحمن! تیرے لئے میرے پاس ایک ودیعت ہے وہ تم لے لو۔ تو وہ جنت کے یاقوت میں سے ایک سفید پتھر تھا وہ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ جنت سے اترا تھا۔ جب حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل نے بیت اللہ کی بنیادیں بلند کیں تو چکور شکل کا ایک بادل آیا جس میں ایک سر تھا اس بادل نے آواز دی میری مقدار پر بلند (تعمیر) کرو۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر ہے۔ روایت ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہ السلام بیت اللہ کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں بیت اللہ تعمیر کرنے پر جزا عطا فرمائی۔

حکیم ترمذی نے روایت کیا ہے کہ ہمیں عمر بن ابی عمر نے بتایا انہوں نے کہا: مجھے نعیم بن حماد نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں عبدالوہاب بن ہمام نے بتایا جو عبدالرزاق کے بھائی تھے، انہوں نے ابن جریج سے انہوں نے ابن ابی ملیکہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: پہلے گھوڑے بھی دوسرے وحشی جانوروں کی طرح وحشی تھے جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل کو بنیادیں بلند کرنے کی اجازت دی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں تم دونوں کو ایک خزانہ دینے والا ہوں جو میں نے تم دونوں کے لئے ذخیرہ کر رکھا ہے پھر حضرت اسماعیل کو وحی فرمائی کہ تم اجیاد کی طرف جاؤ اور دعا مانگو تمہارے پاس خزانہ آجائے گا آپ اجیاد کی طرف گئے ...... وہاں گھوڑے رہتے تھے ...... آپ نہیں جانتے تھے کہ دعا کیا ہے اور خزانہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو الہام فرمایا۔ پس سطح زمین پر کوئی گھوڑا باقی نہ رہا جو عرب کی زمین پر رہتا تھا مگر وہ آپ کے پاس آگیا۔ تمام گھوڑوں کی اپنی پیشانیوں پر آپ کو قدرت بخشی اور ان کو آپ کا مطیع کر دیا۔ پس تم ان پر سوار ہو اور انہیں چارہ ڈالو کیونکہ یہ برکت ہیں یہ تمہارے باپ اسماعیل کی میراث ہیں۔ الفرس کو عربی اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ اسماعیل علیہ السلام کو دعا کا حکم دیا گیا تھا اور آپ نے دعا فرمائی۔

عبدالمنعم بن ادریس نے حضرت وہب بن منبہ سے روایت کیا ہے فرمایا: جس نے سب سے پہلے مٹی اور پتھر سے کعبہ بنایا وہ حضرت شیث علیہ السلام تھے، رہی قریش کی تعمیر کعبہ تو وہ مشہور ہے اور اس میں سانپ کی خبر مذکور ہے۔ سانپ انہیں کعبہ گرانے سے روکتا تھا، حتیٰ کہ تمام قریش مقام ابراہیم کے پاس جمع ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گڑگڑائے اور عرض کی: اے ہمارے پروردگار! ہمیں نہ ڈرا ہم تیرے گھر کی تشریف و تزئین کا ارادہ رکھتے ہیں اگر تو اس سے راضی ہے تو فبہا ورنہ جو تو چاہے کر۔ انہوں نے آسمان سے پرندے کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنی۔ دیکھا تو گدھ سے بڑا ایک پرندہ تھا جس کی پیٹھ سیاہ تھی پیٹ اور پاؤں سفید تھے اس نے اپنے پنجے سانپ کی گدی میں گاڑھے پھر اس کو لے کر اڑا وہ سانپ اتنی بڑی دم کھینچتا گیا حتیٰ کہ وہ پرندہ اسے اجیاد کی طرف لے گیا۔ پھر قریش نے کعبہ کو گرایا اور پھر اسے وادی کے پتھروں سے بنانے لگے جن کو قریش اپنی گردنوں پر اٹھا کر لاتے تھے۔ قریش نے اس کو آسمان کی طرف بیس ہاتھ بلند کیا، اسی اثنا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اجیاد سے پتھر اٹھا کر لا رہے تھے آپ کے اوپر ایک چادر تھی۔ چادر آپ پر تنگ ہوگئی۔ آپ نے چادر کو کندھے پر اٹھانا شروع کیا تو چادر کے چھوٹا ہونے کی وجہ سے شرمگاہ ظاہر ہوگئی، ندا آئی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اپنی شرمگاہ کو ڈھانپ لے۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی برہنہ نہ دیکھے گئے۔ کعبہ کی تعمیر اور نزول قرآن کے درمیان پانچ سال کا فاصلہ تھا۔ آپ کی ہجرت اور تعمیر کعبہ کے

درمیان پندرہ سال کا فاصلہ تھا۔

یہ عبدالرزاق نے معمر سے انہوں نے حضرت عبداللہ بن عثمان سے انہوں نے ابوالطفیل سے روایت کیا ہے۔ معمر عن الزھری سے مروی ہے حتیٰ کہ جب قریش نے کعبہ بنالیا اور حجر اسود رکھنے کی جگہ پہنچے تو قریش اس کو رکھنے میں جھگڑنے لگے کہ کون سا قبیلہ اسے اٹھا کر رکھے گا؟ حتیٰ کہ ان کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ انہوں نے کہا: آؤ ہم اس کا فیصلہ تسلیم کر لیں جو اس گلی سے سب سے پہلے ہمارے پاس آئے گا، اس پر صلح ہو گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے آپ ابھی جوان تھے آپ کے اوپر ایک دھاری دار چادر تھی۔ انہوں نے آپ کو ثالث مقرر کر دیا۔ آپ نے پتھر کو ایک کپڑے میں رکھنے کا حکم دیا پھر ہر قبیلہ کے سردار کو حکم دیا اور اسے کپڑے کی ایک طرف عطا فرمائی پھر آپ اوپر چڑھے۔ تمام سرداروں نے وہ پتھر آپ کو اٹھا کر دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنی جگہ پر لگا دیا۔

ابن اسحاق نے کہا: مجھے یہ بیان کیا گیا ہے کہ قریش نے حجر اسود میں، سریانی زبان میں لکھی ایک تحریر پائی وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ کیا ہے حتیٰ کہ ایک یہودی نے انہیں پڑھ کر سنائی۔ اس میں یہ لکھا تھا، میں اللہ ہوں، مکہ کا مالک۔ میں نے اس کو اس دن پیدا کیا تھا جس دن میں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تھا اور چاند اور سورج کو صورت بخشی تھی اور میں نے اسے سات املاک سے گھیرا ہوا ہے، یہ زائل نہ ہو گا حتیٰ کہ اس کے ابوقبیس اور احمر پہاڑ زائل ہو جائیں گے۔ اس کے رہنے والوں کے لئے پانی اور دودھ میں برکت رکھی گئی ہے۔ ابوجعفر محمد بن علی سے مروی ہے، فرمایا: کعبہ کا دروازہ عمالقہ، جرہم اور حضرت ابراہیم کے دور میں زمین پر تھا حتیٰ کہ قریش نے اسے تعمیر کیا (تو دروازہ اونچا کر دیا)۔

مسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: یہ کعبہ کے ساتھ والی دیوار کعبہ سے ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں۔ میں نے عرض کی: انہوں نے اس کو کعبہ میں داخل کیوں نہیں کیا؟ آپ نے فرمایا: تیری قوم کے پاس خرچ کم ہو گیا تھا۔ میں نے عرض کی: اس کا دروازہ بلند کیوں ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیری قوم نے یہ اس لئے کیا تھا تاکہ جنہیں چاہیں داخل کریں اور جنہیں چاہیں منع کریں اگر تمہاری قوم کا زمانہ جاہلیت قریب نہ ہوتا مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ ان کے دل انکار کریں گے تو میں اس دیوار کو کعبہ میں داخل کر دیتا، اور اس کے دروازے کو زمین سے ملا دیتا (1)۔ حضرت عبداللہ بن زبیر سے روایت کیا ہے، فرمایا: میری خالہ حضرت عائشہ نے بتایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عائشہ! اگر تیری قوم کا زمانہ شرک قریب نہ ہوتا تو میں کعبہ کو گرا دیتا اور اس کو زمین سے ملا دیتا اور اس کے دو دروازے بناتا۔ ایک مشرق سے اور ایک مغرب سے اور اس میں چھ ہاتھ حطیم سے زیادہ کرتا کیونکہ قریش نے اسے چھوٹا بنایا تھا جہاں انہوں نے کعبہ بنایا تھا۔

عروہ اپنے باپ سے اور وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں۔ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تمہاری قوم کا زمانہ کفر قریب نہ ہوتا تو میں کعبہ کو توڑ دیتا اور اسے ابراہیم علیہ السلام کی بنیادوں پر بناتا کیونکہ قریش نے جب کعبہ تعمیر کیا تو

1۔ مسلم شریف، کتاب الحج، باب نقض الکعبۃ وبناءھا، جلد 1، صفحہ 30-429 (قدیمی کتب خانہ)

چھوٹا کر دیا اور میں اس کا خلف بناتا (1)۔ بخاری میں ہشام بن عروہ نے کہا: یعنی (بابا) دروازہ بناتا۔ بخاری میں یہ بھی ہے کہ میں اس کے دو دروازے بناتا یہ قریش کی بنا ہے پھر جب اہل شام نے حضرت عبداللہ بن زبیر پر حملہ کیا اور ان کے جلاؤ نے کعبہ کو کمزور کر دیا۔ تو حضرت ابن زبیر نے اسے گرایا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کے مطابق بنایا۔ اس میں پانچ ہاتھ حطیم سے زیادہ کیا حتیٰ کہ وہ بنیاد ظاہر کر دی اور لوگوں نے اسے دیکھا اور اس پر کعبہ کی تعمیر کی۔ کعبہ کا طول اٹھارہ ہاتھ تھا جب اس میں زیادتی کی تو لمبائی کم کر دی پھر اس کی لمبائی میں دس ہاتھ کا اضافہ کیا اور اس کے دو دروازے بنائے۔ ایک میں سے لوگ داخل ہوتے دوسرے سے نکل جاتے۔ اسی طرح صحیح مسلم میں ہے۔ حدیث کے الفاظ مختلف ہیں۔

سفیان نے داؤد بن شابور عن مجاہد کے سلسلہ سے ذکر کیا ہے کہ مجاہد نے کہا: جب حضرت ابن زبیر نے کعبہ کو گرانے اور دوبارہ تعمیر کرنے کا ارادہ کیا تو آپ نے لوگوں کو کہا: کعبہ کو گرا دو۔ لوگوں نے اسے گرانے سے انکار کیا اور وہ ڈر گئے کہ کہیں عذاب نہ آجائے۔ مجاہد نے کہا: ہم منیٰ کی طرف نکل گئے اور ہم وہاں تین دن ٹھہرے رہے اور عذاب کا انتظار کرتے رہے۔ فرمایا: حضرت عبداللہ بن زبیر خود کعبہ کی دیوار پر چڑھے۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ آپ کو کچھ نہیں ہوا تو لوگوں نے حوصلہ باندھا۔ فرمایا: لوگوں نے کعبہ کو گرایا۔ جب اسے حضرت عبداللہ بن زبیر نے بنایا تو اس کے دو دروازے بنائے۔ ایک دروازے سے لوگ داخل ہوتے اور دوسرے سے نکل جاتے اور اس میں دیوار والی طرف سے چھ ہاتھ کا اضافہ کیا اور اس کے طول میں نو ہاتھ کا اضافہ کیا۔ مسلم نے اپنی حدیث میں کہا: جب حضرت عبداللہ بن زبیر شہید ہوئے تو حجاج نے عبدالملک بن مروان کو اس کے متعلق بتانے کے لئے خط لکھا اور اسے بتایا کہ ابن زبیر نے کعبہ کو اس بنیاد پر تعمیر کیا جس کی طرف اہل مکہ میں سے عادل لوگوں نے دیکھا۔ عبدالملک نے اس کی طرف لکھا کہ ہم ابن زبیر کی کسی چیز کو باقی رکھنے والے نہیں جو اس نے اس کی لمبائی میں زیادتی کی ہے اس کو برقرار رکھو اور جو اس نے حطیم سے زیادتی کی، اس کو پہلی بنا پر لوٹا دو اور جو اس نے دروازہ کھولا تھا اسے بند کر دو۔ پس حجاج نے اسے توڑا اور پہلی بنا پر لوٹا دیا۔

ایک روایت میں ہے، عبدالملک نے کہا: میں گمان نہیں کرتا کہ ابا خبیب (ابن زبیر) نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سنا ہے جو وہ کہتا ہے کہ اس نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سنا ہے۔ حارث بن عبداللہ نے کہا: کیوں نہیں میں نے یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سنا تھا، اس نے کہا: تو نے اسے کیا کہتے ہوئے سنا؟ انہوں نے کہا: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہاری قوم نے بیت اللہ کی عمارت کم کر دی ہے۔ اگر ان کے شرک کا زمانہ قریب نہ ہوتا تو میں اسے لوٹا دیتا جو انہوں نے چھوڑ دیا تھا اگر میرے بعد تیری قوم کو اسے دوبارہ تعمیر کرنے کا خیال آئے تو ادھر آؤ میں تجھے دکھاؤں جو انہوں نے کعبہ میں سے چھوڑ دیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ کو سات ہاتھ کے قریب دکھایا۔

ایک اور روایت میں ہے، عبدالملک نے کہا: اگر میں اس کے گرانے سے پہلے یہ حدیث سن لیتا تو میں اسے حضرت ابن زبیر کی بنیاد پر چھوڑ دیتا۔ یہ کعبہ کی تعمیر کے بارے میں آثار مروی ہیں۔ روایت ہے کہ رشید نے حضرت مالک بن انس کے

1۔ صحیح بخاری، باب فضل مکۃ و بنیانہا، حدیث 1482، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سامنے ذکر کیا کہ وہ حجاج کی تعمیر کعبہ کو گرانا چاہتا ہے اور اسے حضرت ابن زبیر کی تعمیر پر لوٹانا چاہتا ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے اور حضرت ابن زبیر نے اس کی پیروی کی تھی۔ امام مالک نے رشید کو کہا: اے امیر المومنین! میں تجھے اللہ کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ تم اس گھر کو بادشاہوں کے لئے کھلونا نہ بناؤ، ہر آنے والا بیت اللہ کو توڑ دے گا اور نئی تعمیر کرے گا اور اس کی ہیبت لوگوں کے دلوں سے چلی جائے گی۔

واقدی نے ذکر کیا ہے کہ ہمیں معمر نے ہمام بن منبہ سے روایت کر کے بتایا کہ انہوں نے حضرت ابو ہریرہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسعد حمیری کو گالی دینے سے منع فرمایا۔ یہ تبع تھا یہ پہلا شخص تھا جس نے بیت اللہ کو غلاف پہنایا تھا اور یہ دوسرا تبع تھا۔ ابن اسحاق نے کہا: پہلے قباطی کپڑے پہنائے جاتے تھے پھر یمنی چادریں بنائی جاتی تھیں اور جس نے سب سے پہلے دیباج (ریشم) کا کپڑا پہنایا وہ حجاج تھا۔ علماء نے فرمایا: کعبہ کے غلاف سے کوئی چیز نہیں لینی چاہئے کیونکہ وہ کعبہ کو ہدیہ کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی چیز کم نہیں کی جائے گی۔ حضرت سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ کعبہ کی خوشبو میں سے کوئی چیز لینا شفا حاصل کرنے کے لئے مکروہ ہے۔ جب وہ خادم کو کوئی چیز لیتے ہوئے دیکھتے تو اسے سر کے پیچھے طمانچہ مارتے وہ اسے تکلیف پہنچانے میں کمی نہیں کرتے تھے۔ عطا نے کہا: ہم میں سے کوئی جب اس سے شفا طلب کرنے کا ارادہ کرتا تو وہ خوشبو لے آتا اس کو پتھر کے ساتھ مس کرتا پھر اسے اٹھا لیتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا معنی ہے وہ دونوں کہہ رہے تھے: ربنا تقبل یقولان کو حذف کیا گیا ہے۔ حضرت ابی اور حضرت عبداللہ بن مسعود کی قراءت میں اسی طرح ہے: واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت و اسماعیل و یقولان ربنا تقبل منا (1)۔ اسماعیل کی تفسیر یہ ہے: اسمع یا اللہ (اے اللہ! سن لے) کیونکہ ایل، سریانی زبانی میں اللہ کو کہتے ہیں۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنے رب سے دعا مانگی تو کہا: اسمع یا ایل (اے اللہ! سن لے میری فریاد) جب اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمائی اور بچہ عطا فرمایا تو اس کا نام اپنی دعا کے ساتھ رکھا۔ یہ ماوردی نے ذکر کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے دو اسم ہیں۔ ان کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنٰی میں کر دی ہے۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝

"اے ہمارے رب! بنا دے ہم کو فرمانبردار اپنا اور ہماری اولاد سے بھی ایک ایسی جماعت پیدا کرنا جو تیری فرمانبردار ہو اور بتا دے ہمیں ہماری عبادت کے طریقے اور توجہ فرما ہم پر (اپنی رحمت سے) بے شک تو ہی بہت توبہ قبول کرنے والا ہے"۔

1۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ یہاں وَ اجْعَلْنَا بمعنی صیرنا ہے اور مُسْلِمَيْنِ مفعول ثانی ہے۔ دونوں (ابراہیم واسماعیل) نے ثبات اور دوام کی دعا مانگی۔ یہاں اسلام سے مراد ایمان اور اعمال دونوں ہیں (1)۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آل عمران:19) اس آیت میں دلیل ہے ان علماء کی جو کہتے ہیں کہ ایمان اور اسلام ایک شے ہیں۔

ایک اور آیت سے انہوں نے اپنے اس قول کو قوت دی ہے: فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِیْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۞ فَمَا وَجَدْنَا فِیْهَا غَیْرَ بَیْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۞ (الذاریات) (ہم نے نکال لیا وہاں کے تمام ایمانداروں کو پس نہ پایا ہم نے اس ساری بستی میں بجز ایک مسلم گھر کے)۔

حضرت ابن عباس اور عوف اعرابی نے مسلمین جمع کا صیغہ پڑھا ہے۔(2)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مِنْ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ یعنی ہماری اولاد سے بنا۔ کہا جاتا ہے کہ ہر نبی نے اپنے لئے اور اپنی امت کے لئے دعا مانگی لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لئے، اپنی امت کے لئے اور اس امت (محمدیہ) کے لئے دعا مانگی۔ مِنْ ذُرِّیَّتِنَاۤ میں مِنْ تبعیضیہ ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو آگاہ کر دیا تھا کہ آپ کی اولاد میں سے کچھ ظالم ہوں گے۔ طبری نے حکایت کیا ہے کہ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِنَاۤ سے خاص عرب مراد ہیں(3)۔ سہیلی نے کہا: ان دونوں کی اولاد عرب ہیں کیونکہ عرب نبت بن اسماعیل کی اولاد ہیں یا بنو تیمن بن اسماعیل کی اولاد ہیں۔ کہا جاتا ہے: قیدر بن نبت بن اسماعیل...... العدنانیہ یہ نبت کی اولاد ہیں اور قحطانیہ قیدر بن نبت بن اسماعیل کی اولاد ہیں یا ایک قول کے مطابق تیمن کی اولاد ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا(4): یہ ضعیف ہے کیونکہ آپ کی دعوت عربوں میں ظاہر ہوئی تھی اور ان لوگوں میں جو عربوں کے علاوہ تھے۔

اُمَّةً کا یہاں معنی جماعت ہے ایک شخص کو بھی امت کہا جاتا ہے خیر میں جس کی اقتدا کی جائے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ (النحل:120) (بلاشبہ ابراہیم ایک مرد کامل تھے اللہ کے مطیع تھے) نبی کریم ﷺ نے زید بن عمرو بن نفیل کے بارے میں فرمایا تھا وہ ایک امت کی حیثیت سے اٹھایا جائے گا کیونکہ کوئی دوسرا اس کے دین میں شریک نہ تھا۔ واللہ اعلم

کبھی لفظ اُمَّةً کا اطلاق دوسرے معانی میں بھی ہوتا ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ (زخرف:22) یعنی ہم نے اپنے آباء کو ایک دین اور ملت پر پایا۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً (الانبیاء:92) کبھی الحین اور الزمان کے معنی میں ہوتا ہے اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ (یوسف:45) (یعنی کچھ عرصہ کے بعد یاد آیا) کہا جاتا ہے ھذہ امۃ زید۔ یعنی یہ زید کی ماں ہے۔ اُمَّةً کا معنی قامت بھی ہے۔ کہا جاتا ہے: فلان حسن الامہ یعنی خوبصورت قامت والا ہے۔ شاعر نے کہا:

وان معاویة الاکرمیہ ن حسان الوجوہ طوال الامم

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً 4۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

بعض علماء نے فرمایا: الامة اس زخم کو بھی کہتے ہیں جو دماغ کی اصل تک پہنچ جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: رجل ماموم و امیم، ایسا شخص جسے دماغ پر زخم لگا ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا، اَرِنَا، یہ آنکھ سے دیکھنے سے ہے اور یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ رؤیت قلب سے ہے، یہ کہنے والے پر لازم ہے کہ فعل اس کی طرف سے تین مفاعیل کی طرف متعدی ہو۔ ابن عطیہ نے کہا(1): کبھی ہمزہ کے باوجود رویت قلب سے دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے جس طرح بغیر ہمزہ کے دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ حطائط بن یعفر اخو الاسود بن یعفر نے کہا:

اريني جواداً مات هزلاً لانني ارى ما ترين او بخيلاً مخلّداً

حضرت عمر بن عبد العزیز، حضرت قتادہ، حضرت ابن کثیر، حضرت ابن محیصن، سدی اور روح نے یعقوب اور رویس السوی نے ارنا قرآن میں راء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابو حاتم نے اسے پسند کیا ہے۔ ابو عمرو نے راء کے کسرہ کے اختلاس کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عبید نے اس کو اختیار کیا ہے، اصل میں اَرْئِنا ہمزہ کے ساتھ تھا، جنہوں نے راء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے کہا: ہمزہ اور اس کی حرکت ختم ہو گئی اور راء اپنی حالت پر ساکن باقی رہی اور انہوں نے شاعر کے قول سے استدلال کیا ہے:

ارنا اداوة عبدالله نملؤها من ماء زمزم ان القوم قد ظمئوا

ہمیں عبد اللہ کا لوٹا دکھاؤ ہم زمزم کے پانی سے اسے بھریں گے کیونکہ قوم پیاسی ہے۔

شاعر نے اسے ارْنا پڑھا ہے۔

اور جن علماء نے راء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے وہ ہمزہ محذوفہ کی حرکت نقل کر کے را کو دیتے ہیں۔ ابو عمرو نے خفت کو طلب کیا ہے۔ شجاع بن ابی نصر سے مروی ہے، وہ امین اور سچے تھے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تھا انہوں نے ابو عمرو کے حروف سے بہت سی اشیاء کا ذکر کیا تو صرف دو حروف کی تصحیح فرمائی۔ ایک یہ اَرْنا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَرِنا اور دوسرا ما ننسخ من آیة او ننسأها (مہموز)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَنَاسِكَنَا کہا جاتا ہے: لغت میں النسك کا معنی غسل ہے۔ کہا جاتا ہے: نسك ثوبه جب کوئی اپنے کپڑے کو دھوئے۔ یہ شرع میں عبادت کا اسم ہے کہا جاتا ہے رجل ناسك، جب کوئی شخص عابد ہو۔

علماء کا اختلاف ہے کہ المناسك سے کیا مراد ہے۔ بعض نے فرمایا مناسک حج اور اس کی علامات مراد ہیں۔ یہ قتادہ اور سدی کا قول ہے۔ مجاہد، عطا، ابن جریج نے کہا المناسك سے مراد ذبح کی جگہیں ہیں۔ بعض نے فرمایا: تمام عبادات ہیں (2) ہر وہ عمل جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جاتی ہے اسے منسك اور منسِك کہا جاتا ہے۔ الناسك سے مراد عابد ہے۔ نحاس نے کہا نَسَكَ يَنْسُكُ۔ اس صورت میں منسُك کہنا واجب ہے۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری و المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

لیکن عرب کلام میں مفعل نہیں ہے۔ زہیر بن محمد سے مروی ہے، فرمایا: جب حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت الحرام کی بناء سے فارغ ہوئے تو عرض کی: اے رب! میں فارغ ہو چکا ہوں تو ہمیں مناسک دکھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف جبریل امین کو بھیجا، پس آپ نے جبریل امین کے ساتھ حج کیا حتیٰ کہ جب عرفہ سے لوٹے اور دسویں کا دن آیا تو ابلیس آپ کے سامنے آیا جبریل امین نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا اسے کنکریاں مارو، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے سات کنکریاں ماریں پھر اگلے دن اور تیسرے دن کنکریاں ماریں۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام ثبیر پہاڑ پر چڑھے اور کہا: اے اللہ کے بندو، اجیبوا (جواب دو) پس سمندروں کے درمیان جو بھی ایسا شخص موجود تھا جس کے دل میں ذرہ برابر ایمان تھا اس نے آپ کی دعوت کو سن لیا۔ اور اس نے کہا: لبیك اللھم لبیك۔ فرمایا: سطح زمین پر ہمیشہ سات یا اس سے زائد مسلمان ہوں گے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو زمین اور اس کے رہنے والے ہلاک ہو جاتے۔ سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پکار کا جواب اہل یمن نے دیا۔ ابو مجلز سے مروی ہے، فرمایا: جب حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو جبریل امین آپ کے پاس آئے اور انہیں بیت اللہ کا طواف دکھایا۔ فرمایا: میرا خیال ہے انہوں نے فرمایا: الصفا والمروۃ پھر دونوں جمرہ عقبہ کی طرف چلے سامنے شیطان آیا، جبریل امین نے سات کنکریاں اٹھائیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سات کنکریاں دیں، پہلے جبریل امین نے کنکری ماری اور تکبیر کہی۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا، کنکری مارو اور تکبیر کہو پس دونوں نے کنکریاں ماریں اور ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہی حتیٰ کہ شیطان چلا گیا پھر جمرہ وسطیٰ کی طرف چلے۔ شیطان پھر سامنے آیا، جبریل نے سات کنکریاں لیں اور ابراہیم علیہ السلام کو بھی سات کنکریاں دیں۔ جبریل امین نے کہا: کنکری مارو اور تکبیر کہو دونوں نے کنکریاں ماریں اور ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہی۔ حتیٰ کہ شیطان چلا گیا۔ پھر جمرہ قصویٰ پر آئے، شیطان سامنے آیا، جبریل امین نے سات کنکریاں لیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سات کنکریاں دیں اور کہا: کنکری مارو اور تکبیر کہو۔ دونوں نے کنکریاں ماریں اور ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہی حتیٰ کہ شیطان چلا گیا پھر دونوں مزدلفہ میں آئے اور جبریل امین نے کہا: یہاں لوگ اپنی نمازوں کو جمع کریں گے پھر جبریل امین، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لے کر عرفات میں آئے اور کہا: عرفت (تو نے جان لیا؟) حضرت ابراہیم نے کہا: ہاں۔ اسی وجہ سے اس جگہ کو عرفات کہا جاتا ہے۔ روایت ہے، جبریل امین نے تین مرتبہ کہا عرفت، عرفت، عرفت۔ یعنی منی، مزدلفہ اور اس جگہ کو پہچان لیا۔ حضرت ابراہیم نے کہا: ہاں۔ اسی وجہ سے اس مکان کو عرفات کہا جاتا ہے۔ خصیف بن عبدالرحمن سے مروی ہے کہ مجاہد نے انہیں بتایا کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا یعنی الصفا والمروۃ۔ یہ نص قرآنی سے اللہ تعالیٰ کے شعائر میں سے ہیں پھر جبریل امین آپ کو لے کر نکلے جب جمرہ عقبہ سے گزرے تو اس پر شیطان بیٹھا تھا۔ جبریل امین نے حضرت ابراہیم سے کہا: تکبیر کہو اور اسے کنکری مارو، ابلیس، جمرہ وسطیٰ پر چڑھ گیا۔ جبریل امین نے کہا تکبیر کہو اور اسے کنکری مارو پھر جمرہ قصویٰ پر اسی طرح ہوا۔ پھر وہ اسے مشعر حرام کی طرف لے گئے۔ پھر عرفہ میں لے آئے۔ پھر جبریل امین نے حضرت ابراہیم سے کہا کیا تو نے پہچان لیا جو میں نے تجھے دکھایا؟ حضرت ابراہیم نے کہا: ہاں۔ اسی وجہ سے عرفات کو عرفات کہا جاتا ہے۔ جبریل امین نے کہا: تم لوگوں میں حج کا

اعلان کرو۔ حضرت ابراہیم نے کہا: میں کیسے کہوں؟ جبریل امین نے کہا: تم کہو: اے لوگو! اپنے رب کا حکم قبول کرو۔ یہ تین مرتبہ اعلان کرو۔ حضرت ابراہیم نے ایسا ہی کیا۔ لوگوں نے کہا: لبیک اللھم لبیک۔ فرمایا: اس دن جس نے جواب دیا وہ حج کرے گا۔ دوسری روایت میں ہے جب آپ نے آواز دی تو آپ گھومے اور ہر طرف ندا دی۔ مشرق و مغرب ہر طرف سے لوگوں نے لبیک کہا۔ پہاڑ جھک گئے حتیٰ کہ آپ کی آواز دور تک چلی گئی۔ محمد بن اسحاق نے کہا: جب حضرت ابراہیم خلیل الرحمٰن صلوات اللہ علیہ بیت الحرام کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو جبریل امین آپ کے پاس آئے اور کہا: اس کے سات چکر لگاؤ۔ حضرت ابراہیم نے اس کے سات چکر لگائے اور حضرت اسماعیل بھی آپ کے ساتھ تھے، ہر طواف میں ہر رکن کا استلام کیا جب سات چکر دونوں نے مکمل کر لئے تو مقام کے پیچھے دو رکعت نماز پڑھی۔ فرمایا: جبریل امین کھڑے ہوئے اور تمام مناسک دکھائے، صفا، مروہ، منیٰ اور مزدلفہ۔ فرمایا: جب منیٰ میں داخل ہوئے اور عقبہ سے اترے تو شیطان سامنے آیا، جیسا کہ پہلے گزرا ہے۔ ابن اسحاق نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے تمام ارکان کا استلام کرتے تھے اور فرمایا: شام سے حضرت اسحاق اور سارہ علیہما السلام نے حج کیا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہر سال براق پر حج کرتے تھے ان کے بعد انبیاء اور امم نے حج کیا۔ محمد بن سابط نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہر نبی جب اس کی امت ہلاک ہو جاتی تھی تو وہ مکہ میں آ جاتا تھا اور یہاں وہ اور اس پر ایمان لانے والے عبادت کرتے تھے، حتی کہ وہ فوت ہو جاتے تھے۔ مکہ میں حضرت نوح، حضرت ہود اور حضرت صالح علیہم السلام کا وصال ہوا اور ان کی قبور زمزم اور حطیم کے درمیان ہیں (1)۔ ابن وہب نے ذکر کیا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کے مومن ساتھی مکہ میں فوت ہوئے تھے ان کی قبور مکہ کی غربی جانب دار الندوہ اور بنی سہم کے درمیاں ہیں۔ حضرت ابن عباس نے کہا: مسجد میں صرف دو قبریں ہیں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قبر اور حضرت شعیب علیہ السلام کی قبر۔ حضرت اسماعیل کی قبر حطیم میں ہے اور حضرت شعیب علیہ السلام کی قبر حجر اسود کے مقابل ہے۔ عبداللہ بن ضمرہ السلوی نے کہا: رکن اور مقام کے درمیان ننانوے انبیاء کی قبور ہیں جو حج کے لئے آئے تھے یہاں دفن ہوئے۔ صلوات اللہ علیہم اجمعین۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتُبْ عَلَيْنَا حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل کے اس قول کے معنی میں اختلاف ہے۔ تُبْ عَلَيْنَا کہا حالانکہ انبیاء گناہ سے معصوم ہوتے ہیں۔ ایک گروہ نے کہا: انہوں نے اس دعا سے تثبیت اور دوام کو طلب کیا، نہ اس لئے کہ ان کا کوئی گناہ تھا۔ میں کہتا ہوں: یہ اچھا جواب ہے اور اس سے احسن جواب یہ ہے کہ جب ان دونوں نے مناسک کو جان لیا اور بیت اللہ کو تعمیر کر لیا تو ان دونوں نے ارادہ کیا کہ وہ لوگوں کے لئے بیان کریں اور لوگوں کو بتائیں کہ یہ جگہ اور دوسرے مناسک حج گناہوں سے طہارت اور توبہ طلب کرنے کی جگہیں ہیں (2)۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے ہم میں سے جو ظالم ہیں ان کی توبہ قبول فرما۔ عصمت انبیاء پر کلام حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ میں گزر چکی ہے اور اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ کے معنی میں بھی کلام گزر چکا ہے پس اعادہ کی ضرورت نہیں۔

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١٢٩﴾

''اے ہمارے رب! بھیج ان میں ایک برگزیدہ رسول انہیں میں سے تاکہ پڑھ کر سنائے انہیں تیری آیتیں اور سکھائے انہیں یہ کتاب اور دانائی کی باتیں اور پاک صاف کر دے انہیں۔ بے شک تو ہی بہت زبردست (اور) حکمت والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا، رسول سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حضرت ابی کی قراءت میں ہے وابعث فی آخرھم رسولا منھم حضرت خالد بن معدان نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی ایک جماعت نے آپ سے عرض کی: یارسول اللہ! ہمیں اپنی ذات کے بارے میں بتائیے۔ فرمایا: ہاں میں اپنے باپ ابراہیم کی دعوت ہوں اور عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہوں (1)۔ اور رسول بمعنی مرسل (بھیجا گیا) ہے یہ رسالت سے مفعول کا وزن ہے۔ ابن انباری نے کہا: ہوسکتا ہے کہ عربوں کے اس قول سے ہو: ناقۃٌ مِرسال و رَسْلَۃٌ۔ جب اونٹنی آرام سے چلنے والی ہو دوسری اونٹنیوں کے آگے چلنے والی ہو اور مہمل جماعت کے لئے المرسلۃ کہا جاتا ہے۔ رسل کی جمع ارسال ہے۔ کہا جاتا ہے: جاء القوم ارسالاً۔ یعنی لوگ ایک دوسرے کے پیچھے آئے، اسی سے دودھ کو رسل کہا جاتا ہے کیونکہ وہ کھیری سے متواتر نکالا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ، الْكِتَابَ سے مراد قرآن ہے اور حکمت سے مراد دین کی معرفت، اور فہم ہے جو تاویل میں سمجھ، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک خصلت اور نور ہے۔ یہ مالک نے کہا ہے۔ یہ ابن وہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے اور ابن زید نے بھی یہی کہا ہے۔ قتادہ نے کہا: حکمت سے مراد سنت اور شریعت کا بیان ہے (2)۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد حکم اور قضا ہے، سب کا معنی قریب قریب ہے۔ تعلیم کی نسبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی گئی ہے کیونکہ آپ وہ تمام امور عطا فرماتے ہیں جن میں غور و فکر کیا جاتا ہے آپ غور و فکر کے طرق کی تعلیم دیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ آپ کو وحی کے ذریعے عطا فرماتا تھا۔ (3)

وَيُزَكِّيهِمْ یعنی شرک کی میل سے انہیں پاک کرتا ہے۔ ابن جریج (4) وغیرہ سے مروی ہے، زکوٰۃ کا مطلب پاک کرنا ہے یہ پہلے گزر چکا ہے۔ بعض نے فرمایا: آیات سے مراد ظاہر الفاظ کی تلاوت ہے، کتاب سے مراد الفاظ کے معانی ہیں اور حکمت سے مراد حکم ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے خطاب کی مراد ہے کہ وہ مطلق ہے، مقید ہے، مفسر ہے، مجمل ہے، عموم و خصوص ہے۔ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

الْعَزِيزُ اس کا معنی ہے وہ محفوظ ذات جس کو نہ پایا جا سکتا ہے اور نہ مغلوب کیا جا سکتا ہے۔ ابن کیسان نے کہا: اس کا معنی ہے جس کو کوئی چیز عاجز نہ کرے۔ اس کی دلیل یہ ہے: وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعْجِزَهُ مِن شَيْءٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ (فاطر: 44)۔ الکسائی نے کہا: الْعَزِيزُ کا معنی غالب ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعَزَّنِي فِي الْخِطَابِ۔

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　2۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا　3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　4۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

ضرب المثل ہے: مَنْ عَزَّبَزَّ یعنی جو غالب آیا اس نے سلب کیا۔ بعض نے فرمایا: اَلْعَزِیْزُ وہ ہے جس کی کوئی مثال نہ ہو، اس کا بیان ہے: لیس کمثلہ شیٔ۔ ہم نے اس معنی کو اَلْعَزِیْزُ کے اسم کے تحت اپنی کتاب الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنیٰ میں زیادہ بیان کیا ہے۔ اَلْحَکِیْمُ کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ الحمد للہ

وَ مَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَ لَقَدِ اصْطَفَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَا ۚ وَ اِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۳۰﴾

''اور کون روگردانی کر سکتا ہے دین ابراہیم سے بجز اس کے جس نے احمق بنا دیا ہو اپنے آپ کو اور بے شک ہم نے چن لیا ابراہیم کو دنیا میں اور بلاشبہ وہ قیامت کے دن نیکو کاروں میں ہوں گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ، مَنْ استفہامیہ ہے۔ مبتدا کی حیثیت سے محل رفع میں ہے۔ یرغب، مَنْ کا صلہ ہے اور اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ یہ خبر کی جگہ ہے، یہ تقریع اور توبیخ ہے اس میں نفی کا معنی ہے یعنی وہ ما یرغب کا معنی ہے یہ نحاس کا قول ہے۔ یعنی دین اور شرع ابراہیمی سے دلچسپی نہیں رکھتا۔ اور اس سے پہلے نفس کو دور رکھتا ہے جس نے اپنے نفس کو بیوقوف بنایا۔

قتادہ نے کہا: اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں انہوں نے ملت ابراہیمی سے اعراض کیا اور یہودیت و نصرانیت خود ایجاد کی وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے(1)۔ زجاج نے کہا: سفہ کا معنی ہے اپنے نفس کے امر سے جاہل رہا اور اس میں غور و فکر نہ کیا۔ ابو عبیدہ نے کہا: اس کا معنی ہے اس نے اپنے نفس کو ہلاک کیا۔ ثعلب اور مبرد نے حکایت کیا ہے کہ سَفِهَ فاء کے کسرہ کے ساتھ اسی طرح متعدی ہے جس طرح سفہ فاء کے فتحہ اور تشدید کے ساتھ متعدی ہے(2)۔ یعنی اس نے اپنے نفس کے ساتھ ایسا فعل کیا کہ وہ سفیہ بن گیا۔ ان سے مروی ہے، یہ ایک لغت ہے جو بمعنی سفہ ہے۔ یہ مہدوی نے حکایت کیا ہے۔ پہلا قول ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ رہا سَفُهَ فاء کے ضمہ کے ساتھ یہ متعدی نہیں ہوتا۔ یہ مبرد اور ثعلب کا قول ہے۔ کسائی نے اخفش سے حکایت کیا ہے کہ اس کا معنی ہے: جہل فی نفسہ۔ فی کو حذف کیا گیا اور نفسہ کو منصوب پڑھا گیا۔

اخفش نے کہا: اس کی مثل عقدۃ النکاح ہے یعنی علی عقدۃ النکاح۔ (علی کو حذف کیا گیا) یہ سیبویہ کے مذہب پر جاری ہے اس سے عربوں سے حکایت کیا ہے ضرب فلان الظھر و البطن۔ اصل میں فی الظھر و البطن تھا فی کو حذف کیا گیا(3)۔ فراء نے کہا: نفسہ تمیز کی حیثیت سے منصوب ہے۔ ابن بحر نے کہا: اس کا معنی ہے کہ وہ اپنے نفس سے اور جو اس میں دلالات اور آیات ہیں ان سے غافل رہا جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اس نفس کا ایک صانع (بنانے والا) ہے جس کی مثل کوئی نہیں ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی قدرت کو جان لیتا۔

میں کہتا ہوں: یہ زجاج کے قول کا معنی ہے۔ وہ اپنے نفس میں غور و فکر کرتا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے پکڑتا ہے اور اپنے قدموں سے چلتا ہے، آنکھوں سے دیکھتا ہے، کانوں سے سنتا ہے، زبان سے بولتا ہے، دودھ سے غنی ہونے کے وقت اس کی داڑھیں

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً

پیدا فرمائیں تا کہ وہ اس سے کھانے کو چبائے، معدہ بنایا گیا وہ غذا کو پکانے کے لئے ہے، جگر ہے جس کی طرف اس غذا کو صاف مال جاتا ہے اور اس کی نسیں اور رگیں ہیں جن کے ذریعے مختلف اطراف میں خون پہنچتا ہے۔ انتڑیاں ہیں جن کی طرف غذا کا فضلہ جاتا ہے اور نیچے والے بدن سے نکل جاتا ہے، اس سے انسان استدلال کر سکتا تھا کہ اس کا کوئی خالق، قادر، علیم اور حکیم ہے۔ یہی معنی ہے اس آیت کا وَفِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۲۱﴾ (الذاریات) (تمہارے وجود میں بھی (نشانیاں ہیں) کیا تمہیں نظر نہیں آتیں)۔

اس کی طرف حطابی نے اشارہ کیا ہے اس کا مزید بیان سورۃ الذاریات میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اس آیت سے استدلال کیا ہے اس نے جس نے کہا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت ہماری شریعت ہے مگر جو اس سے منسوخ ہو گیا یہ اس قول کی مانند ہے: مِلَّةَ اَبِیۡکُمۡ اِبۡرٰهِیۡمَ (الحج:78)۔ تمہارے باپ ابراہیم کی ملت اَنِ اتَّبِعۡ مِلَّةَ اِبۡرٰهِیۡمَ (النحل:123)۔ آپ ابراہیمی ملت کی اتباع کریں۔ مزید بیان آگے آئے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدِ اصۡطَفَیۡنٰهُ فِی الدُّنۡیَا ہم نے اس کو رسالت کے لئے چن لیا اور ادناس (میل کچیل) سے صاف بنایا۔ اصطفینا اصل میں اصتفینا تھا۔ تا کو طا سے بدلا تا کہ اطباق میں صاد کے ساتھ مناسبت ہو جائے یہ لفظ الصفوۃ سے مشتق ہے۔ اس کا معنی ہے: جو زیادہ صاف ہو اس کا اختیار کرنا۔ (1)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاِنَّهٗ فِی الۡاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیۡنَ، الصالح فی الآخرۃ سے مراد کامیاب ہونے والا ہے۔ پھر یہ سوال کیا گیا ہے کہ فِی الۡاٰخِرَةِ کو مقدم کیسے کیا گیا ہے حالانکہ یہ صلہ میں داخل ہے؟ نحاس نے کہا: اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی تقدیر اس طرح نہیں ہے: انہ لمن الصالحین فی الآخرۃ کہ صلہ مقدم ہو۔

اہل عرب کے اس کے متعلق تین اقوال ہیں: (۱) یہ کہ اس کا معنی ہے وہ آخرت میں صالح ہے پھر کلام میں حذف کیا گیا۔ بعض نے فی فرمایا: فی الآخرۃ، مصدر محذوف کے متعلق ہے یعنی صلاحۃ فی الآخرۃ۔ تیسرا قول یہ ہے کہ الصالحین، الذین صلحوا کے معنی میں نہیں ہے۔ یہ اسم قائم بنفسہ ہے جیسے کہا جاتا ہے: الرجل، الغلام۔

میں کہتا ہوں: چوتھا قول یہ ہے کہ اس کا معنی ہے: انہ فی عمل الآخرۃ لمن الصالحین کلام مضاف کے حذف پر ہے (2)۔ حسین بن فضل نے کہا: کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ کلام اس طرح ہے: ولقد اصطفینا فی الدنیا و الآخرۃ و انہ لمن الصالحین۔

حجاج بن حجاج نے روایت کیا ہے، یہ حجاج بن الاسود ہے اور وہی حجاج الاحول ہے جو زق العسل (شہد کا مشکیزہ) سے معروف تھا۔ فرمایا: میں نے معاویہ بن قرۃ سے سنا۔ انہوں نے فرمایا: اللهم ان الصالحین انت اصلحتهم و رزقتهم ان عملوا بطاعتك فرضيت عنهم۔ اللهم كما اصلحتهم فاصلحنا و كما رزقتهم ان عملوا بطاعتك فرضيت عنهم فارزقنا ان نعمل بطاعتك وارض عنا۔ اے اللہ! صالحین کو تو نے صالحیت بخشی تو نے انہیں توفیق بخشی کہ وہ تیری طاعت

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

کے اعمال کریں اور تو ان سے راضی ہوا۔ اے اللہ! جس طرح تو نے انہیں صالحیت بخشی ہمیں بھی صالحیت عطا فرما اور جس طرح تو نے انہیں اپنی طاعت کی توفیق بخشی اور تو ان سے راضی ہوا ہمیں بھی اپنی طاعت کی توفیق عطا فرما اور ہم سے راضی ہو۔

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۳۱﴾

''اور یاد کرو جب فرمایا اس کو اس کے رب نے (اے ابراہیم!) گردن جھکا دو۔ عرض کی: میں نے اپنی گردن جھکا دی سارے جہانوں کے پروردگار کے سامنے''۔

اِذْ کا عامل اصْطَفَيْنٰهُ کا قول ہے۔ یہ قول اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا جب اللہ تعالیٰ نے ان کی ستارے، چاند اور سورج سے آزمائش کی (1)۔ ابن کیسان اور کلبی نے فرمایا: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی توحید کے ساتھ اپنے دین کو خالص کر۔ بعض نے فرمایا: اَسْلِمْ کا معنی ہے خضوع و خشوع کر۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا یہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس وقت فرمایا جب آپ سرنگ سے نکلے تھے۔ جیسا کہ سورۃ الانعام میں اس کا ذکر آئے گا۔ اسلام یہاں تمام وجوہ کے ساتھ ہے۔ کلام عرب میں اسلام کا معنی خضوع اور انقیاد ہے۔ ہر اسلام، ایمان نہیں ہے اور ہر ایمان، اسلام ہے کیونکہ جو اللہ پر ایمان لایا اس نے اللہ تعالیٰ کے لئے سر جھکا دیا اور اس کی اطاعت کی۔ اور ہر اسلام لانے والا ایمان لانے والا نہیں کیونکہ ہو سکتا ہے اس نے تلوار کے خوف سے کلمہ پڑھا ہو اور یہ ایمان نہیں ہوگا۔ قدریہ اور خوارج کا قول اس کے خلاف ہے (☆)۔ انہوں نے کہا: اسلام ہی ایمان ہے۔ ہر مومن، مسلم ہے اور ہر مسلم، مومن ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آل عمران: 19) یہ دلیل ہے کہ اسلام، دین ہے اور جو مسلمان نہیں وہ مومن نہیں۔

اور ہماری دلیل یہ ارشاد ہے: قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَ لٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا (الحجرات: 14)

اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ آپ فرمائیے تم ایمان تو نہیں لائے البتہ یہ کہو کہ ہم نے اطاعت اختیار کر لی۔

اللہ تعالیٰ نے اس میں بیان فرمایا کہ ہر مسلمان، مومن نہیں پس یہ دلیل ہے کہ ہر مسلمان، مومن نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن ابی وقاص کو فرمایا: جب انہوں نے عرض کی تھی: حضور! فلاں کو عطا فرمائیں وہ مومن ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا بلکہ تم کہو مسلم ہے۔ اس حدیث کو مسلم نے نقل کیا ہے۔ یہ دلیل ہے کہ ایمان اسلام نہیں ہے کیونکہ ایمان باطنی چیز ہے اور اسلام ظاہر ہے۔ یہ واضح ہے کہ کبھی ایمان، اسلام کے معنی میں ہوتا۔ اسلام بولا جاتا ہے اور مراد ایمان ہوتا ہے کیونکہ ہر ایک دوسرے کو لازم ہے۔ جیسے اسلام جو ایمان کا ثمرہ، اور ایمان کی صحت پر دلیل ہے (یہی نقطہ نظر ماتریدیہ کا ہے)۔

وَ وَصّٰى بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ بَنِیْهِ وَ یَعْقُوْبُ ؕ یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّیْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

☆۔ یہ قول قابل توجہ ہے کیونکہ شرح عقائد نسفی میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ معتزلہ اور خوارج کے نزدیک اعمال ایمان کا جز ہیں اس لیے وہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو ایمان سے خارج کرتے ہیں۔ جہاں تک ایمان اور اسلام کا تعلق ہے لغوی اعتبار سے تو فرق ہے لیکن کسی کے لیے ایک کا ثبوت اور دوسرے کی نفی ممکن نہیں اہلسنت میں سے یہ ماتریدیہ کی رائے ہے مفسر کا اس کی تعبیر کرنا درست نہیں۔

اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

''اور وصیت کی اسی دین کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے اے میرے بچو! بے شک اللہ نے پسند فرمایا ہے تمہارے لئے یہی دین سو تم ہرگز نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ وَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ، ھا ضمیر سے مراد ملت ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد یہ کلمہ ہے اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۳۱﴾ یہ زیادہ درست ہے کیونکہ یہ قریب مذکور ہے (1) یعنی تم اسلمنا کہو۔ وَ وَصّٰى اور اوصی دونوں ہم معنی قریش کی لغتیں ہیں۔ مثلاً کرمنا اور اکرمنا۔ اوصی اور وصی دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ حضرت عبد اللہ کے مصحف میں وصی تھا اور حضرت عثمان کے مصحف میں اوصی تھا۔ یہ اہل مدینہ، شام اور دوسرے قراء کی قراءت ہے۔ وصی اس میں کثرت کا معنی ہے (2)۔ لفظ ابراھیم کو اس کے فعل کی وجہ سے رفع دیا ہے اور یعقوب، ابراھیم پر معطوف ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ علیحدہ کلام ہے اس کا معنی ہے: واوصی یعقوب۔ (3) مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی اور ان کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی۔

حضرت ابراہیم کے بیٹے، ایک حضرت اسماعیل تھے۔ ان کی والدہ ہاجرہ قبطیہ تھی یہ آپ کے بڑے بیٹے تھے۔ حضرت ابراہیم نے انہیں مکہ کی طرف منتقل کیا تھا جبکہ یہ ماں کا دودھ پیتے تھے۔ بعض نے فرمایا: اس وقت ان کی عمر دو سال تھی۔ بعض نے فرمایا: چودہ سال تھی۔ پہلا قول اصح ہے جیسا کہ اس کا بیان سورۂ ابراہیم میں ان شاء اللہ آئے گا۔ حضرت اسماعیل اپنے بھائی اسحاق سے چودہ سال پہلے پیدا ہوئے تھے اور ان کا وصال ہوا تو ان کی عمر ایک سو ستر سال تھی۔ بعض نے فرمایا: ایک سو تیس سال تھی اور جب آپ کے والد حضرت ابراہیم کا وصال ہوا تو ان کی عمر ۸۹ سال تھی۔ ایک قول کے مطابق حضرت اسماعیل ذبیح تھے۔ یہ اصح قول ہے جس طرح کہ اس کا بیان سورۃ الصافات میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ آپ کی اولاد سے روم، یونان، ارمن اور جو ان کے پیچھے آئے اور بنی اسرائیل تھے۔ حضرت اسحاق ایک سو اسی سال زندہ رہے، ارض مقدسہ میں ان کا وصال ہوا اور اپنے باپ حضرت ابراہیم کے پاس دفن کئے گئے پھر جب حضرت سارہ کا وصال ہوا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قنطورا بنت یقطن کنعانیہ سے نکاح کیا اس سے آپ کی یہ اولاد ہوئی۔ مدین، مدائن، نہشان، زمران، نشیق، شبوخ۔ پھر آپ کا وصال ہوا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وصال اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے درمیان دو ہزار چھ سو سال کا فاصلہ تھا۔ یہود اس سے چار سو سال کم کرتے تھے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کا ذکر سورۂ یوسف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

عمرو بن فائد اسواری اور اسماعیل بن عبد اللہ مکی نے یعقوب، بنیہ پر عطف کی بناء پر منصوب پڑھا ہے (4)۔ اس صورت میں جن کو وصیت کی گئی ان میں حضرت یعقوب بھی داخل ہوں گے (5)۔ قشیری نے کہا: یعقوب پر بنیہ پر عطف کی بناء پر نصب پڑھی گئی ہے اور یہ بعید ہے کیونکہ جب حضرت ابراہیم نے وصیت کی تھی تو حضرت یعقوب علیہ السلام ان کی اولاد کے درمیان موجود نہ تھے۔ یہ منقول نہیں ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے دادا ابراہیم علیہ السلام کو پایا تھا۔ وہ حضرت

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً

ابراہیم کے وصال کے بعد پیدا ہوئے تھے، اور حضرت یعقوب نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی تھی جس طرح حضرت ابراہیم نے وصیت کی تھی۔ حضرت یعقوب کی اولاد کے اسماء ان شاء اللہ آئندہ آئیں گے۔

کلبی نے کہا: جب حضرت یعقوب علیہ السلام مصر میں داخل ہوئے تو آپ نے دیکھا کہ لوگ بتوں کی، آگ کی اور گائے کی عبادت کرتے ہیں آپ نے اپنی اولاد کو جمع کیا اور ان پر آپ کو اندیشہ ہوا۔ فرمایا: تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے۔

کہا جاتا ہے: یعقوب کا یہ نام اس لئے رکھا گیا تھا کہ آپ اور آپ کے بھائی عیص جڑواں پیدا ہوئے تھے اور آپ اپنے بھائی عیص کی عقب (ایڑھی) کو پکڑے ہوئے تھے۔ لیکن اس قول میں نظر ہے کیونکہ یہ عربی اشتقاق ہے اور یعقوب عجمی اسم ہے۔ اگرچہ اس کے ساتھ نام رکھنے میں عربی میں موافقت ہے جیسے حجل پرندے کا جو مذکر ہوتا ہے اسے یعقوب کہا جاتا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام ایک سو پینتالیس سال زندہ رہے تھے اور مصر میں آپ کا وصال ہوا تھا۔ آپ نے وصیت کی تھی کہ انہیں ارض مقدسہ کی طرف لے جایا جائے اور ان کے باپ حضرت اسحٰق کے قریب دفن کیا جائے، تو حضرت یوسف علیہ السلام آپ کو ادھر لے گئے تھے اور ان کے والد حضرت اسحٰق کے پہلو میں انہیں دفن کیا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یٰبَنِیَّ اس کا معنی ہے ان یا بنی، اسی طرح حضرت ابی، حضرت ابن مسعود اور حضرت ضحاک کی قراءت میں ہے (1)۔ فراء نے کہا انْ کو لغو کیا گیا ہے کیونکہ توصیۃ قول کی طرح ہے ہر کلام جو قول کے معنی کی طرف راجع ہو، اس میں ان کا دخول جائز ہوتا ہے اور اس کا لغو کرنا بھی جائز ہے۔ فراء نے کہا: نحویوں کا قول کہ (اَنْ) کا ارادہ فرمایا اور ان کو لغو کیا گیا یہ کچھ نہیں ہے۔ نحاس نے کہا: یٰبَنِیَّ نداء مضاف ہے۔ یہ یاء النفس ہے اس پر فتحہ ہی جائز ہے کیونکہ اگر اس کو ساکن کیا جائے تو دو ساکنوں کا جمع ہونا لازم آئے گا۔ اس کی مثال بصرخی ہے اِنَّ اللّٰہَ میں اِنَّ کو کسرہ دیا گیا ہے کیونکہ اوصی اور قال ایک معنی میں ہیں۔ بعض نے فرمایا: قول کے اضمار کی وجہ سے اِنَّ پر کسرہ پڑھا گیا ہے۔ اصْطَفٰی کا معنی اختیار ہے۔ راجز نے کہا:

یا بن ملوك ورثوا الاملاكا خلافة الله التى اعطاك

لك اصطفاها ولها اصطفاك

اے بادشاہوں کے بیٹے اور انہوں نے تجھے املاک کا وارث بنایا۔ اللہ کی خلافت وہ ہے جو تجھے عطا کی۔ تیرے لئے اس کو اس نے چنا ہے اور اس کے لئے تجھے اس نے چنا ہے۔

لَكُمُ الدِّيْنَ، الدِّيْنَ سے مراد اسلام ہے۔ الدِّيْنَ پر الف، لام عہد کے لئے ہے کیونکہ وہ اس دین کو جانتے تھے۔ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ اس میں ایجاز بلیغ ہے۔ اس کا معنی ہے اسلام کو لازم پکڑو اور اس پر دوام اختیار کرو اور اس سے جدا نہ ہو حتیٰ کہ تم فوت ہو جاؤ مختصر الفاظ ذکر فرمائے جن کے ضمن میں مقصود موجود ہو اور وعظ اور موت کی یاد بھی اس کے ضمن میں ہے۔ یہ اس لئے کہ ہر انسان کو یہ تو یقین ہے کہ وہ فوت ہوگا اور یہ نہیں جانتا کہ کب مرے گا۔ جب کسی کو کسی ایسے امر کا حکم دیا جائے کہ اسے موت نہ آئے مگر اسی امر پر تو خطاب امر کے وقت سے ہمیشہ کے لئے متوجہ ہوتا ہے (2)۔ لا نہی ہے اور

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 213، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

تَمُوْتُنَّ نہی کی وجہ سے محل جزم میں ہے نون ثقیلہ کے ساتھ مؤکد کیا گیا ہے اور واؤ کو التقائے ساکنین کی وجہ سے حذف کیا گیا ہے اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ یہ مبتدا اور خبر محل حال میں ہیں یعنی تم اپنے رب پر اچھا گمان کرنے والے ہو۔ بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے: مخلصون (یعنی تم مخلص ہو)۔ بعض نے فرمایا: مفوضون (تم اپنا آپ اپنے رب کے سپرد کرنے والے ہو) بعض نے فرمایا: مومنون (تم ایمان لانے والے ہو)۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ۭ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآىِٕكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝۱۳۳

''بھلا کیا تم (اس وقت) موجود تھے جب آپہنچی یعقوب کو موت۔ جب پوچھا اس نے اپنے بیٹوں سے کہ تم کس کی عبادت کرو گے میرے (انتقال کر جانے کے) بعد۔ انہوں نے عرض کی: ہم عبادت کریں گے آپ کے خدا کی اور آپ کے بزرگ ابراہیم و اسماعیل اور اسحق کے خدا کی جو خدائے وحدہ لاشریک ہے اور ہم اسی کے فرمانبردار رہیں گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ، شُهَدَآءَ، کان کی خبر ہے غیر منصرف ہے کیونکہ اس میں الف تانیث ہے اور یہ الف جمع کی تانیث کے لئے داخل ہوتی ہے جس طرح ھا داخل ہوتی ہے۔ خطاب، یہود و نصاریٰ کو ہے جو حضرت ابراہیم کی طرف منسوب کرتے تھے کہ انہوں نے اپنے بیٹوں کو وصیت نہیں کی تھی اور وہ یہودیت اور نصرانیت پر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول کا رد فرمایا۔ یہ ارشاد توبیخ کی جہت سے ہے: تم یعقوب کے پاس موجود تھے اور جو انہوں نے وصیت کی تھی تمہیں اس کا علم تھا جس کی بنا پر تم یہ دعویٰ کرتے ہو۔ یعنی تم اس وقت موجود نہ تھے بلکہ تم یہ جھوٹ گھڑ رہے ہو۔ اور ام بمعنی بل ہے۔ یعنی بلکہ کیا تمہارے اسلاف یعقوب کے پاس موجود تھے۔ پہلے اِذْ کا عامل شہادت کا معنی ہے اور دوسرا اِذْ پہلے کا بدل ہے شُهَدَآءَ، شاھد کی جمع ہے۔ جس کا معنی ہے حاضر اور حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ کا معنی ہے حضرت یعقوب پر موت کے مقدمات اور اسباب موجود تھے وگرنہ آگے موت آجاتی تو اس کے لئے یہ کہنا ممکن نہ ہوتا۔ المعبود کو ما کے ساتھ تعبیر فرمایا۔ مَنْ نہیں فرمایا کیونکہ انہیں آزمانے کا ارادہ کیا تھا۔ اگر مَنْ فرماتے تو اس کا مقصود یہ ہوتا کہ آپ ان میں ہدایت یافتہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ کا مقصود ان کا تجربہ تھا آپ نے ما ذکر فرمایا اللہ تعالیٰ کے علاوہ متعارف معبودان باطلہ جمادات تھے جیسے بت، آگ، سورج، اور پتھر پس آپ نے پوچھا کہ کس کی عبادت کرو گے؟ اور مِنْۢ بَعْدِيْ کا معنی ہے میرے وصال کے بعد۔ حکایت کیا گیا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو اختیار دیا گیا جس طرح انبیاء کو اختیار دیا جاتا ہے تو آپ نے موت کو اختیار فرمایا اور فرمایا: مجھے مہلت دو حتیٰ کہ میں اپنے بیٹوں اور اپنے گھر والوں کو وصیت کردوں۔ آپ نے اپنے بیٹوں کو جمع فرمایا اور انہیں یہ فرمایا۔ پس وہ ہدایت یافتہ تھے انہوں نے کہا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ الآیۃ اور بیٹوں نے دین پر اپنے ثبوت اور اللہ تعالیٰ کی معرفت دکھائی (1)۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 214، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآىِٕكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ، ابرہیم، اسماعیل اور اسحاق یہ بدل کی حیثیت سے محل جر میں ہیں یہ غیر منصرف ہیں کیونکہ یہ عجمی ہیں۔ کسائی نے کہا: اگر تو چاہے تو اسحاق کو منصرف بنا دے اور تو اسے السحق سے مشتق کرے اور یعقوب کو منصرف کرے اور تو اسے پرندوں سے بنائے۔

اللہ تعالیٰ نے چچا اور دادا تمام کو اباء سے تعبیر فرمایا اور دادا کا ذکر پہلے فرمایا پھر اسماعیل چچا کا ذکر فرمایا کیونکہ یہ اسحاق سے بڑے تھے۔ اِلٰهًا یہ الهك سے بدل ہے اور یہ معرفہ سے نکرہ بدل ہے اس کو وحدانیت کی صفت کے فائدہ کے لئے اس کا تکرار فرمایا، بعض نے فرمایا اِلٰهًا حال ہے۔ ابن عطیہ نے کہا یہ حسن کا قول ہے کیونکہ غرض وحدانیت کی حالت کا اثبات ہے۔ حسن یعمر، جحدری اور ابورجاء عطاردی نے والہ ابیك پڑھا ہے۔ اس کی دو وجوہ ہیں:

(۱) مفرد ذکر کیا اور مراد صرف حضرت ابراہیم لئے اور اسماعیل کو اب بنانا پسند نہ کیا کیونکہ وہ چچا تھے۔ نحاس نے کہا: یہ واجب نہیں ہے کیونکہ عرب چچا کو اب کہتے ہیں۔

(۲) سیبویہ کے مذہب کے مطابق ابیك جمع سالم ہوگی۔ سیبویہ نے اب کی جمع ابون اور ابین حکایت کی ہے۔ شاعر نے کہا:

فقلنا اسلموا انا اخوکم

اس میں اصل اخون تھا اضافت کی وجہ سے نون گر گیا ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا

فلما تبین اصواتنا بکین و فدیننا بالابینا (1)

اس میں ابین، اَب کی جمع ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ یہ مبتدا خبر ہیں۔ اور یہ حال ہونے کا احتمال رکھتا ہے۔ اس میں عامل نعبد ہے (2)۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَ لَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۳۴

"یہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی انہیں فائدہ دے گا جو (نیک عمل) انہوں نے کمایا اور تمہیں نفع دیں گے جو (نیک اعمال) تم نے کمائے اور نہ پوچھے جاؤ گے تم اس سے جو وہ کیا کرتے تھے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ، تِلْكَ مبتدا ہے اور اُمَّةٌ خبر ہے اور قَدْ خَلَتْ، اُمَّةٌ کی صفت ہے اگر تو چاہے تو قَدْ خَلَتْ کو خبر بنا دے اور اُمَّةٌ، تِلْكَ سے بدل ہوگا۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ، مَا محل رفع میں ہے یا کوفیوں کے ایک قول کے مطابق صفت ہے وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ یہ لَهَا مَا كَسَبَتْ کی مثل ہے۔ خیر اور شر کا ارادہ فرمایا ہے (3)۔ اس میں دلیل

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 214، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ ایضاً 3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

ہے کہ اعمال اور اکساب کی نسبت بندے کی طرف کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر اسے قدرت دی ہے اگر وہ اچھے اعمال پر اچھی جزا دے تو یہ اس کا فضل ہوتا ہے اور برے اعمال پر سزا دے تو یہ اس کا عدل ہے۔ یہ اہل سنت کا مذہب ہے قرآن میں اس مفہوم کی آیات کثیر ہیں۔ بندہ اپنے افعال کا مکتسب ہے اس معنی پر کہ فعل کے متصل اللہ تعالیٰ اس کے لئے قدرت پیدا فرما دیتا ہے اس کے ساتھ حرکت اختیاری اور حرکت رعشہ کے درمیان فرق پایا جاتا ہے۔ یہی قدرت اور تکلیف کا مدار ہے۔ جبریہ فرقہ نے بندے کے اکتساب کی نفی کی ہے وہ کہتے ہیں: بندہ نبات کی طرح ہے ہوائیں اسے گردش دیتی رہتی ہیں قدریہ اور معتزلہ کا قول ان دونوں قولوں کے خلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں: بندہ اپنے افعال کا خالق ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ یعنی کسی کے گناہ کی وجہ سے دوسرے سے مؤاخذہ نہ ہوگا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (انعام: 164) یعنی کوئی دوسرے کا بوجھ اٹھانے والا نہیں۔

وَ قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِیْفًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝۱۳۵

”اور (یہودی) کہتے ہیں یہودی بن جاؤ (عیسائی کہتے ہیں) عیسائی بن جاؤ (تب) ہدایت پالو گے۔ آپ فرمائیے میرا دین تو دین ابراہیم ہے جو باطل سے منہ موڑنے والا حق پسند تھا اور وہ نہیں تھا شرک کرنے والوں سے“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی تَهْتَدُوْا ہر فرقہ نے اس کی طرف بلایا جس پر وہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا، فرمایا: بَلْ مِلَّةَ یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم کہو ہم ملت ابراہیم کی اتباع کریں گے اسی وجہ سے مِلَّةَ کو نصب دی گئی ہے۔ بعض نے فرمایا اس کا معنی ہے بل نهتدى بملة ابراهيم جب حرف جر حذف کیا گیا تو مِلَّةَ منصوب ہو گیا اعرج اور ابن ابی عبلہ نے بل ملةُ رفع کے ساتھ پڑھا ہے (1)۔ تقدیر عبارت بل الهدى ملة یا ملتنا دين ابراهيم۔ (یعنی ہدایت تو ملت ابراہیمی ہے یا ہماری ملت دین ابراہیم ہے) حَنِیْفًا تمام ناپسندیدہ دینوں سے انحراف کر کے دین حق، دین ابراہیم کی طرف مائل ہونے والا۔ یہ حال کی بنا پر محل نصب میں ہے۔ زجاج نے کہا: یعنی بل نتبع ملة ابراهيم فى هذه الحالةِ یعنی اس حال میں ہم ملت ابراہیمی کی اتباع کرتے ہیں۔ علی بن سلیمان نے کہا: یہ اعنی کی بنا پر منصوب ہے اور حال بنانا خطا ہے۔ یہ جائز نہیں ہے: جاءنى غلام هند مسرعة۔ حضرت ابراہیم کو حنیف کہا گیا کیونکہ وہ اللہ کے دین اسلام کی طرف مائل ہوئے تھے۔ الحنف کا معنی مائل ہونا ہے۔ اسی سے ہے رجلٌ حنفاء، رجل احنف۔ یہ اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کے قدموں میں سے ہر ایک دوسرے کی طرف انگلیوں کے ذریعے مائل ہوتا ہے۔

ام الاحنف نے کہا:

واللّٰه لولا حنفٌ برجله ما كان فى فتيانكم من مثله

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

اللہ کی قسم! اگر اس کے پاؤں میں میلان نہ ہوتا تو تمہارے بچوں میں اس کی مثل نہ ہوتا۔

شاعر نے کہا:

اذا حول الظل العشی رأیتہ حنیفا و فی قرن الضحی یتنصر

الحرباء سورج ڈھلنے کے وقت قبلہ کی طرف منہ کرتی ہے اور صبح کے وقت مشرق کی طرف منہ کرتی ہے۔ یہ نصاریٰ کا قبلہ ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الحنف کا معنی استقامت ہے۔ دین ابراہیم کو اس کی استقامت کی وجہ سے حنیف کہا جاتا ہے۔ ٹیڑھی ٹانگوں والے کو استقامت سے فال پکڑتے ہوئے احنف کہا جاتا ہے جس طرح سانپ کے ڈسے ہوئے کو سلیم کہا جاتا ہے اور ہلاکت کی جگہ کو مفازۃ کہا جاتا ہے۔ یہ اکثر کا قول ہے۔

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَ مَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

''کہہ دو ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر اور اس پر جو نازل کیا گیا ہماری طرف اور جو اتارا گیا ابراہیم و اسماعیل و اسحق و یعقوب اور ان کی اولاد کی طرف اور جو عطا کیا گیا موسیٰ اور عیسیٰ کو اور جو عنایت کیا گیا دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے۔ ہم فرق نہیں کرتے ان میں سے کسی پر ایمان لانے میں اور ہم تو اللہ کے فرماں بردار ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ بخاری نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: اہل کتاب عبرانی زبان میں تورات پڑھتے تھے اور اہل اسلام کے لئے عربی میں تفسیر بیان کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب کرو بلکہ تم کہو: ہم اللہ پر ایمان لائے اور جو نازل کیا گیا(1)۔ محمد بن سیرین نے کہا: جب تجھے کہا جائے تو مومن ہے؟ تو تو کہہ: اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ الآیہ۔

اکثر سلف نے کسی کے لئے یہ کہنا ناپسند کیا: انا مؤمن حقاً میں یقیناً مومن ہوں (2)۔ اس کا بیان سورۃ الانفال میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ متقدمین میں سے کسی سے پوچھا گیا: کسی شخص سے پوچھا جائے کیا تو فلاں نبی پر ایمان لاتا ہے، اس نے اس نبی کا نام لیا جسے وہ شخص جانتا نہیں تھا۔ اب اگر وہ ہاں کہہ دے ہوسکتا ہے وہ نبی نہ ہو، تو وہ غیر نبی کی نبوت کی شہادت دینے والا ہوگا اور اگر وہ نہیں کہہ دے تو ہوسکتا ہے وہ نبی ہو تو وہ ایک نبی کا انکار کرنے والا ہوگا۔ اب وہ شخص کیا کرے؟ اس عالم نے فرمایا: اسے یوں کہنا چاہئے کہ اگر وہ نبی تھا تو میں اس پر ایمان لایا۔ اس آیت میں خطاب اس امت کو ہے جنہیں ایمان سکھایا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہود کا ایک گروہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور سوال کیا کہ انبیاء میں سے کس پر

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب قول اللہ تعالیٰ قولوا امنا باللہ، حدیث 4125، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ یہ قول محل نظر ہے کیونکہ شرح عقائد نسفی میں ہے جب بندے سے تصدیق اور اقرار پایا جائے تو اس کے لیے یہ کہنا صحیح ہے انا مؤمن حقا

ایمان لایا جائے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہوا تو انہوں نے کہا ہم حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پر اور جو اس پر ایمان لایا اس پر ایمان نہیں لاتے (1)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنۡزِلَ اِلَيۡنَا وَمَآ اُنۡزِلَ اِلٰٓى اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطِ،

ابراھیم کی جمع براھیم ہے۔ اسماعیل کی جمع سماعیل ہے۔ یہ خلیل اور سیبویہ کا قول ہے۔ کوفیوں نے بھی یہی کہا ہے۔ انہوں نے براھمہ اور سماعلۃ جمع بھی حکایت کی ہے اور انہوں نے براہم اور سماعل بھی حکایت کیا ہے۔ محمد بن زید نے کہا یہ غلط ہے کیونکہ ہمزہ زیادت کی جگہ نہیں ہے لیکن میں کہتا ہوں: اباره اور اسامع جمع ہے اور اباریہ و اسامیع جمع بھی جائز ہے۔ احمد بن یحییٰ نے براہ کو جائز قرار دیا ہے جیسے تصغیر میں کہا جاتا ہے بُریہ۔ اسحاق کی جمع اساحیق ہے۔ کوفیوں نے اساحقہ اور اساحق حکایت کیا ہے۔ اسی طرح یعقوب کی جمع یعاقیب و یعاقبہ و یعاقب حکایت کی ہے۔ نحاس نے کہا: رہا اسرائیل۔ ہم کوئی ایسا عالم نہیں جانتے جس نے اس کی ابتدا سے ہمزہ حذف کیا ہو۔ کہا جاتا ہے اساریل۔ کوفیوں نے اسارلہ اور اسارل حکایت کیا ہے ان تمام میں جمع سالم بنائی جائے اور کہا جائے: ابراھیمون، اسحاقون، یعقوبون اور جمع سالم میں عمل نہیں ہے۔

الۡاَسۡبَاطِ سے مراد حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہے، آپ کے بارہ بیٹے تھے، ان میں سے ہر ایک کی بہت سی اولاد تھی، اس میں سے ہر ایک سبط تھا۔ بنی اسرائیل میں سبط حضرت اسماعیل کی اولاد میں سے قبیلہ کے قائم مقام تھا ان کو الۡاَسۡبَاطِ کہا جاتا تھا۔ یہ سبط سے ہے جس کا معنی ہے درپے ہونا وہ جماعت جو ایک دوسرے کی متابعت کرے۔ بعض نے فرمایا: اس کی اصل السبَط سے ہے۔ اس سے مراد درخت ہے یعنی وہ کثرت میں درخت کے قائم مقام تھے۔ اس کا مفرد سبطۃٌ ہے۔ ابواسحق زجاج نے کہا: تیرے اس چیز کو یہ سند بیان کرتی ہو، جو ہمیں محمد بن جعفر انباری نے بیان کی، فرمایا: ہمیں ابونجید الدقاق نے بیان کی فرمایا: ہمیں اسود بن عامر نے بیان کیا۔ فرمایا: ہمیں اسرائیل نے بیان کیا انہوں نے سماک سے انہوں نے عکرمہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا، فرمایا: تمام انبیاء بنی اسرائیل سے تھے سوائے دس کے۔ حضرت نوح، حضرت شعیب، حضرت ھود، حضرت صالح، حضرت لوط، حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت اسماعیل اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور کسی کے دو نام نہ تھے سوائے حضرت عیسیٰ اور حضرت یعقوب کے۔ السبط کا مطلب جماعت اور قبیلہ ہے۔ ایک اصل کی طرف لوٹنے والے۔ شعر سَبِطٌ و سبطٌ۔ سیدھے بال جو گھنگھریالے نہ ہوں لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ۔ فراء نے کہا: اس کا مطلب ہے: ہم بعض پر ایمان نہیں لاتے اور نہ بعض کا انکار کرتے ہیں جیسے یہود ونصاریٰ نے کیا ہے۔

فَاِنۡ اٰمَنُوۡا بِمِثۡلِ مَآ اٰمَنۡتُمۡ بِهٖ فَقَدِ اهۡتَدَوْا ۚ وَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا هُمۡ فِىۡ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكۡفِيۡكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ؕ﴿۱۳۷﴾

1۔ تفسیر طبری، صفحہ 657، جلد 1 (دار احیاء التراث العربی)

''تو اگر یہ بھی ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تب تو ہدایت پا ئیں گے اور اگر وہ منہ پھیریں تو (معلوم ہو گیا کہ) وہی مخالفت پر کمر بستہ ہیں۔ تو کافی ہو جائے گا آپ کو ان کے مقابلے میں اللہ اور وہ سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَاۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا یہ خطاب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کو ہے۔ اس کا معنی ہے: اگر وہ ایمان لائیں تمہارے ایمان کی مثل اور تصدیق کریں تمہاری تصدیق کی طرح تو وہ ہدایت یافتہ ہیں۔ دونوں ایمانوں کے درمیان مماثلت ہے۔ بعض نے فرمایا: باء زائدہ مؤکدہ ہے۔ ابن عبس اس طرح پڑھتے تھے جس طرح طبری نے حکایت کیا ہے۔ فان آمنوا بالذی آمنتم بہ فقد اھتدوا۔ یہ قراءت کا معنی ہے اگرچہ مصحف کے مخالف ہے۔ مثل کا لفظ زائدہ ہے جیسے اس قول میں ہے: لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (الشوریٰ: 11) (یعنی لیس کھوشئ) میں مثل زائدہ ہے(1)۔ شاعر نے کہا:

فصیروا مثل کعصف ماکول

اس مصرعہ میں بھی مثل زائدہ ہے۔

بقیہ نے روایت کیا ہے کہ ہمیں شعبہ نے ابوحمزہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: تم یہ نہ کہو: فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَاۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی کوئی مثال نہیں ہے بلکہ تم کہو: بالذی آمنتم بہ(2)۔ علی بن نصر جہضمی نے شعبہ سے روایت کرنے میں بقیہ کی متابعت کی ہے۔ یہ بیہقی نے ذکر کیا ہے۔ معنی یہ ہے: اگر وہ تمہارے نبی پر اور تمام انبیاء پر ایمان لائیں اور ان کے درمیان تفریق نہ کریں جس طرح تم نے تفریق نہیں کی تو وہ ہدایت پا جائیں گے اگر وہ اس کا انکار کریں سوائے تفریق کے وہ دین سے منہ پھیر کر شقاق کی طرف جانے والے ہیں فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ اہل نظر میں سے ایک جماعت نے حکایت کیا ہے۔ فرمایا لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (الشوریٰ: 11) میں کاف زائدہ ہے۔ فرمایا: اور حضرت ابن عباس سے جو قراءت عامہ سے نہی مذکور ہے وہ اللہ تعالیٰ کی تشبیہ کی نفی میں مبالغہ کے لئے ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ حضرت ابن عباس سے تفسیر کے طور پر ہے یعنی اس طرح تاویل کرنی چاہئے۔

بعض نے فرمایا: مثل اپنے معنی پر ہے یعنی نازل شدہ کی مثل اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: وقل آمنت بما انزل اللہ من کتاب اور یہ ارشاد ہے: وَقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا بِالَّذِيْۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ (العنکبوت: 46) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنْ تَوَلَّوْا یعنی اگر وہ ایمان سے اعراض کریں فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ (وہ مخالفت پر کمر بستہ ہیں) زید بن اسلم نے فرمایا شقاق کا معنی جھگڑا ہے۔ بعض نے فرمایا: شقاق کا معنی جھگڑا کرنا ہے، مخالفت کرنا اور دشمنی کرنا ہے۔ اس کی اصل الشق سے ہے جس کا معنی جانب ہے۔ گویا ہر فریق اپنے مخالف کی دوسری شق (طرف) میں ہوتا ہے(3)۔ شاعر نے کہا:

1۔ تفسیر معالم التنزیل، صفحہ 163، جلد 1 (دار الفکر)
2۔ تفسیر طبری، صفحہ 659، جلد 1 (دار احیاء التراث العربی)
3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

الی کم تقتل العلماء قسراً و تفجر بالشقاق و بالنفاق

ایک اور شاعر نے کہا:

و الّا فاعلموا انا وانتم بغاةٌ ما بقينا في شقاقٍ

بعض نے فرمایا: شقاق، مشکل کام سے ماخوذ ہے، دونوں فریقوں میں سے ہر فریق دوسرے پر مشکل پیدا کرنے کا حریص ہوتا ہے۔(1)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی طرف سے اس کے دشمن کو کافی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے نبی سے وعدہ ہے کہ وہ ہر معاند و مخالف کی طرف سے مومنین کے ذریعے کفایت کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا فرمایا۔ یہ بنی قینقاع، بنی قریظہ کے قتل اور بنی نضیر کی جلاوطنی میں پورا ہوا(2)۔ کاف، ہا، میم محل نصب میں، دونوں مفعول ہیں، اور غیر قرآن میں فسيكفيك اياهم بھی جائز ہے۔ اس حرف فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا خون گرا تھا جب وہ شہید ہوئے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شہادت کی خبر دی تھی۔ السَّمِيْعُ وہ کہنے والے کی بات کو سننے والا ہے الْعَلِيْمُ اپنے بندوں میں جو نافذ کرتا ہے اور ان پر جاری کرتا ہے، حکایت ہے کہ ابودلامہ، منصور کے پاس گیا، اس کے اوپر ایک لمبی ٹوپی تھی اور ان کے کندھوں کے درمیان جبہ کے اوپر فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ لکھا ہوا تھا اور اس کی کمر میں تلوار لٹک رہی تھی۔ منصور نے لشکر کو اس لباس کا حکم دیا تھا۔ منصور نے کہا: اے ابودلامہ تیرا کیا حال ہے؟ ابودلامہ نے کہا اے امیر المومنین! بری حالت ہے۔ اس نے کہا: یہ کیسے؟ اس نے کہا: تیرا اس شخص کے بارے میں کیا خیال ہے جس کا چہرہ اس کے وسط میں ہو، جس کی تلوار اس کی سرین میں ہو اور کتاب اللہ کو پیٹھ کے پیچھے ڈالا ہوا ہو...... منصور اس پر ہنسا اور اس لباس کو اسی وقت تبدیل کرنے کا حکم دیا۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۚ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

''(ہم پر) اللہ کا رنگ (چڑھا ہے) اور کس کا رنگ خوبصورت ہے اللہ کے رنگ سے۔ ہم تو اسی کے عبادت گزار ہیں''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: صِبْغَةَ اللّٰهِ اخفش وغیرہ نے کہا: اس سے مراد اللہ کا دین ہے یہ ملة سے بدل ہے۔ کسائی نے کہا: یہ اتبعوا کی تقدیر پر منصوب ہے یا اغراء کی بناء پر منصوب ہے یعنی الزموا صبغة الله۔ اللہ کے دین کو لازم پکڑو۔ اگر اسے مرفوع پڑھا جائے تب بھی جائز ہے۔ یعنی ھی صبغة الله۔ شیبان نے قتادہ سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: یہود اپنے بیٹوں کو یہودا رنگ کرتے تھے اور نصاریٰ اپنے بیٹوں کو نصاریٰ رنگ چڑھاتے تھے۔ اور اللہ کا رنگ اسلام ہے(3)۔ زجاج نے کہا: یہ دلیل ہے کہ صبغة، ملة سے بدل ہے۔

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ تفسیر طبری، صفحہ 660، جلد 1 (دار احیاء التراث العربی)

مجاہد نے کہا: اس سے مراد فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا۔ ابو اسحٰق نے کہا: مجاہد کا یہ قول اسلام کی طرف راجع ہے کیونکہ فطرۃ مخلوق کی ابتدا ہے، اور جس پر وہ ابتداً پیدا کئے گئے ہیں وہ اسلام ہے۔ مجاہد، حسن، ابو العالیہ اور قتادہ سے مروی ہے کہ الصبغۃ سے مراد دین ہے۔ اس کی اصل یہ ہے کہ نصاریٰ اپنے بچوں کو پانی میں رنگتے تھے اسے وہ معمور یہ کہتے تھے اور کہتے: یہ ان کے لئے تطہیر ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: نصاریٰ کا جب کوئی بچہ پیدا ہوتا اور اس پر سات دن گزر جاتے تو وہ اسے پانی میں داخل کرتے جسے وہ اس کے لئے معمودیہ کا پانی کہتے تھے وہ اس پانی میں بچے کو رنگتے تاکہ اس کے ساتھ اس کے ختنہ کی جگہ کو پاک کریں کیونکہ ختنہ کرنا تطہیر ہے۔ جب وہ ایسا کر دیتے تو کہتے اب یہ پکا نصرانی ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا اس پر رد فرمایا۔

ارشاد ہوا: صِبْغَةَ اللّٰهِ یعنی اللہ کا رنگ بہتر رنگ ہے اور وہ اسلام ہے۔ دین کو استعارۃً اور مجازاً صبغۃ کہا گیا ہے کیونکہ اس کے اعمال ظاہر ہوتے ہیں اور دیندار پر اس کی نشانی واضح ہوتی ہے جس طرح کپڑے پر رنگ کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ بعض شعراء ملوک ہمدان نے کہا:

و کل أناس لھم صبغۃ	و صبغۃ ھمدان خیر الصبغ

صبغنا علی ذاک ابناءنا	فاکرم بصبغتنا فی الصبغ

تمام لوگوں کا اپنا اپنا رنگ ہوتا ہے اور ہمدان کا رنگ بہتر رنگ ہے۔ ہم نے اس پر اپنے بیٹوں کو رنگ کیا اور رنگوں میں کتنا بہتر ہمارا رنگ ہے۔

بعض نے فرمایا: الصبغۃ سے مراد غسل کرنا ہے اس کے لئے جو اسلام میں داخل ہونے کا ارادہ کرے۔ نصاریٰ کے معمودیہ کا یہ بدل ہے۔ یہ ماوردی نے ذکر کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: اس تاویل پر کافر کا غسل کرنا واجب ہوگا۔

مسئلہ نمبر 2: صِبْغَةَ اللّٰهِ کا معنی ہے: تم اسلام قبول کرنے کے وقت وہ غسل کرو جو اللہ تعالیٰ نے تم پر واجب کیا ہے۔ اس معنی میں قیس بن عاصم اور ثمامہ بن آثال کی احادیث بھی آئی ہیں جب انہوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ ابو حاتم بستی نے اپنی مسند صحیح میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی ہے کہ ثمامہ حنفی کو قید کیا گیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن اس کے پاس سے گزرے تو اس نے اسلام قبول کیا۔ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو طلحہ کے باغ کی طرف بھیجا اور اسے غسل کا حکم دیا۔ پس اس نے غسل کیا اور دو رکعت نماز پڑھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارے ساتھی کا اسلام خوبصورت ہے (1)۔

حضرت قیس بن عاصم سے مروی ہے کہ انہوں نے اسلام قبول کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی اور بیری کے پتوں سے غسل کرنے کا حکم دیا (2)۔ یہ حدیث نسائی نے ذکر کی ہے اور ابو محمد عبد الحق نے اسے صحیح کہا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ کی قربت

1۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب الطہارت، باب الکافر فیغتسل، صفحہ 171، جلد 1 (دار الفکر)

2۔ سنن نسائی، کتاب الطہارت، ذکر ما یوجب الغسل وما لا یوجبہ، حدیث نمبر 188، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کو صبغہ کہا جاتا ہے۔ ابن فارس نے ''المجمل'' میں یہ حکایت کیا ہے۔ جوہری نے کہا: صِبْغَةَ اللّٰهِ سے مراد اللہ کا دین ہے۔ بعض نے فرمایا: صبغۃ سے مراد ختنہ کرنا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ختنہ کیا تو ختنہ پر صبغہ جاری ہوا کیونکہ بچوں کو پانی میں رنگا جاتا تھا۔ یہ فراء کا قول ہے: وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ یہ مبتدا خبر ہیں۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾

''آپ فرمائیے کیا تم جھگڑتے ہو ہمارے ساتھ اللہ کے بارے میں حالانکہ وہ ہمارا بھی مالک ہے اور تمہارا بھی مالک، اور ہمیں ہمارے اعمال اور تمہیں تمہارے اعمال فائدہ پہنچائیں گے ہم تو اسی کی اخلاص سے عبادت کرتے ہیں''۔

حسن نے کہا: ان کا جھگڑنا یہ تھا کہ انہوں نے کہا: ہم تم سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے قریبی ہیں کیونکہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا ہم تم سے زیادہ اللہ کے قریبی ہیں کیونکہ ہمارے آباء اور ہماری کتب مقدم ہیں۔ اور اس لئے کہ ہم نے بتوں کی عبادت نہیں کی۔ آیت کا معنی یہ ہے: اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سے کہو: یعنی ان یہود و نصاریٰ کو کہو جو یہ کہتے ہیں کہ وہ اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ تم سے اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریبی ہیں اپنے آباء اور اپنی کتب کے مقدم ہونے کی وجہ سے، اس میں دین کی تقدیم کی کیا تاثیر ہے (1)۔ فِي اللّٰهِ کا معنی ہے: اللہ کے دین میں، اس کے قرب میں۔ اکثر قراء کی قراءت اتحاجوننا ہے ایک جنس کے دو متحرک حروف کا اجتماع جائز ہے۔ کیونکہ دوسرا حرف منفصل کی طرح ہے۔ ابن محیصن نے اتحاجونا ایک جیسے حروف کے اجتماع کو ادغام کے ساتھ پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ جائز ہے لیکن اکثر علماء کے قول کے مخالف ہے۔ اتحاجون دوسرے نون کے حذف کے ساتھ بھی جائز ہے جس طرح نافع نے فبم تبشرون پڑھا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ یعنی عبادت میں مخلص ہیں۔ اس میں توبیخ کا معنی ہے یعنی تم مخلص نہیں ہو پھر تم کیسے دعویٰ کرتے ہو کہ ہم تم سے زیادہ اللہ کے قریبی ہیں۔ اخلاص کا معنی ہے مخلوق کے ملاحظہ سے فعل کو پاک اور صاف کرنا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں بہتر شریک ہوں۔ پس جس نے میرے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا (کسی عمل میں) تو وہ عمل میرے شریک کے لئے ہے۔ اے لوگو! اپنے اعمال خالص اللہ تعالیٰ کے لئے کرو۔ اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتا مگر وہ جو اس کے لئے خالص ہو، اور یہ نہ کہو کہ یہ اللہ کے لئے ہے اور رحم کے لئے ہے۔ پس وہ رحم (صلہ رحمی) کے لئے ہے اس میں سے اللہ کے لئے کچھ نہیں ہے اور یہ نہ کہو: یہ اللہ کے لئے اور تمہارے مونہوں کے لئے ہے۔ وہ تمہارے مونہوں کے لئے ہے، اس میں سے اللہ کے لئے کچھ نہیں ہے (2)۔ یہ حضرت ضحاک بن قیس الفہری نے روایت کی ہے۔ اس کو دارقطنی نے نقل کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: آگے یہ حدیث ذکر کی ہے۔ رویم نے کہا: اخلاص یہ ہے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 216، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ سنن دارقطنی، باب النیہ، صفحہ 51، جلد 1 (دار المحاسن)

کہ آدمی اس عمل پر دارین میں عوض نہ چاہتا ہو نہ فرشتوں سے کوئی حصہ چاہتا ہو۔

جنید نے کہا: اخلاص بندے اور الله کے درمیان راز ہے جسے فرشتہ بھی نہیں جانتا کہ وہ اسے لکھ لے اور نہ شیطان جانتا ہے کہ وہ اسے خراب کر دے۔ اور نہ خواہش جانتی ہے کہ وہ اسے مائل کر دے۔ ابو القاسم قشیری وغیرہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے جبریل امین سے پوچھا: اخلاص کیا ہے؟ اس نے کہا: میں نے الله رب العزت سے اخلاص کے متعلق پوچھا کہ وہ کیا ہے؟ فرمایا: یہ میرے رازوں میں سے ایک راز ہے میں اسے اپنے بندوں میں سے اس کے دل میں رکھتا ہوں جسے میں پسند کرتا ہوں (1)۔

اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝

”کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم و اسماعیل و اسحق و یعقوب اور ان کے بیٹے یہودی تھے یا عیسائی۔ فرمایئے: کیا تم زیادہ جانتے ہو یا الله اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جو چھپاتا ہے گواہی جو الله کی طرف سے اس کے پاس ہے اور الله بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو“۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَمْ تَقُوْلُوْنَ یہ بمعنی قالوا ہے۔ حمزہ، کسائی اور عاصم نے اور ایک روایت میں حفص نے تقولون تاء کے ساتھ پڑھا ہے یہ عمدہ قراءت ہے کیونکہ کلام متصل ہے۔ گویا معنی ہے: کیا تم الله کے دین کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو یا تم کہتے ہو انبیاء کرام تمہارے دین پر تھے۔ یہ ام متصلہ ہے اور جنہوں نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے ان کی قراءت پر ام منقطعہ ہے، پس یہ دو کلام ہوں گے۔ اور ام بمعنی بل ہوگا۔

هُوْدًا یہ کان کی خبر ہے اور ان کی خبر جملہ میں ہے اور غیر قرآن میں هُوْدًا کو رفع اِنَّ کی خبر کی حیثیت سے جائز ہے اور کان ملغہ ہوگا۔ یہ نحاس نے ذکر کیا ہے۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ یہ تقریر اور ان کے دعویٰ پر توبیخ ہے کیونکہ وہ یہود یا نصاریٰ تھے۔ پس الله تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا کہ وہ انہیں تم سے زیادہ جانتا ہے یعنی تم یہود و نصاریٰ نہ تھے۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مَنْ اَظْلَمُ یہ لفظاً استفہام ہے اور معنی ہے زیادہ ظالم نہیں ہے۔ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً مطلب یہ ہے کہ یہ جانتے تھے کہ انبیاء کرام اسلام پر تھے۔ بعض علماء نے فرمایا: جو انہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت سے چھپایا تھا۔ یہ قتادہ کا قول ہے۔

سیاق کلام کے اعتبار سے پہلا معنی زیادہ درست ہے۔ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ یہ وعید ہے اور آگاہ کرنا ہے کہ اس

1۔ اتحاف السادۃ المتقین، صفحہ 104، جلد 13 (دار الکتب العلمیہ)

کا معاملہ اللہ تعالیٰ رائیگاں نہیں چھوڑے گا بلکہ انہیں ان کے اعمال پر جزا دے گا۔ غافل وہ ہوتا ہے جو امور کو جانتا نہیں ہے ان سے غفلت کی وجہ سے۔ یہ الارض الغفل سے ماخوذ ہے۔ یہ وہ زمین ہوتی ہے جس میں کوئی علامت نہیں ہوتی اور عمارت کا کوئی اثر نہیں ہوتا (1)۔ ناقۃ غفل ایسی اونٹنی جس کی علامت نہ ہو۔ رجل غفل جو امور کا تجربہ نہ رکھتا ہو۔ کسائی نے کہا: ارض غفل، جس پر بارش نہ ہو۔ غفلت عن الشئ غفلۃ وغفولاً و اغفلت الشئ۔ میں نے اسے چھوڑ دیا ہے۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

''وہ ایک امت تھی جو گزر چکی اسے ملے گا جو اس نے کمایا اور تمہیں ملے گا جو تم نے کمایا۔ اور تم سے نہ پوچھا جائے گا اس سے جو وہ کیا کرتے تھے''۔

اس آیت کو دوبارہ ذکر فرمایا کیونکہ یہ تہدید و تخویف کا معنی ضمن میں لئے ہوئے ہے یعنی جب یہ انبیاء اپنی امامت اور فضل کے باوجود اپنے کسب کی جزا پائیں گے تو تم اس کے زیادہ لائق ہو۔ پس تاکید واجب تھی اس لئے اس کا تکرار فرمایا (2)۔

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ۭ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۭ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

''اب کہیں گے بے وقوف لوگ کہ کس چیز نے پھیر دیا ان (مسلمانوں) کو اپنے قبلہ سے جس پر وہ اب تک تھے۔ آپ فرمائیے: اللہ ہی کا ہے مشرق بھی اور مغرب بھی۔ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے سیدھے راستہ کی طرف''۔

اس آیت میں گیارہ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ اللہ تعالیٰ نے آگاہ فرمایا کہ مومنین کے شام سے کعبہ کی طرف پھرنے میں وہ کہیں گے کہ انہیں کس چیز نے پھیرا ہے (3)۔ اور سَيَقُوْلُ بمعنی قال ہے اور ماضی کی جگہ مضارع کو رکھا تا کہ اس کی ہمیشگی پر دلالت کرے اور وہ اس قول پر ہمیشہ رہیں گے۔ مِنَ النَّاسِ کے قول کے ساتھ خاص فرمایا کیونکہ بے وقوف جمادات و حیوانات میں بھی ہوتے ہیں اور السُّفَهَآءُ سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جنہوں نے ما ولاھم کہا۔ السُّفَهَآءُ جمع ہے اس کا واحد سفیہ ہے جس کی عقل کم ہو۔ یہ عربوں کے اس قول سے ہے ثوبٌ سفیہ جب کپڑا کمزور بنا ہوا ہو۔ یہ پہلے گزر چکا ہے اور النساء سفانہ استعمال ہوتا ہے۔ المورج نے کہا: السفیہ وہ ہوتا ہے جو بہت زیادہ بہتان لگانے والا ہو، جھوٹ بولنے والا ہو اور اپنے علم کے خلاف کا ارادہ کرنے والا ہو۔ قطرب نے کہا: السفیہ سے مراد بہت زیادہ ظلم کرنے والا، جاہل ہے۔ السُّفَهَآءُ سے مراد یہاں مدینہ طیبہ کے یہود ہیں۔ یہ مجاہد کا قول ہے۔ سدی نے کہا منافقون ہیں۔ زجاج نے کہا: قریش کے کفار ہیں جب انہوں نے تحویل قبلہ کا انکار کیا تو کہا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی پیدائش کی جگہ کا اشتیاق رکھتا

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 217، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، صفحہ 218، جلد 1

ہے۔ عن قریب تمہارے دین کی طرف لوٹ آئے گا، یہود نے کہا: اس پر معاملہ ملتبس ہو گیا ہے اور یہ حیران ہے۔ منافقوں نے کہا: مَاوَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ اور مسلمانوں سے استہزاء کیا۔ وَلّٰىهُمْ کا معنی ہے: انہیں پھیر دیا۔

مسئلہ نمبر 2: ائمہ نے روایت کیا ہے اور یہ لفظ امام مالک کے ہیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے لوگ صبح کی نماز میں قباء میں تھے اچانک ایک آنے والا آیا اور کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آج رات قرآن نازل ہوا ہے اور انہیں کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پس تم کعبہ کی طرف منہ کر لو۔ ان صحابہ کے چہرے پہلے شام کی طرف تھے تو وہ کعبہ کی طرف پھر گئے (1)۔ امام بخاری نے حضرت براء سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سولہ ماہ یا سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی اور آپ پسند فرماتے تھے کہ آپ کا قبلہ بیت اللہ ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی نماز جو کعبہ کی طرف منہ کر کے پڑھی وہ عصر کی نماز تھی اور صحابہ کرام نے آپ کے ساتھ نماز پڑھی پھر جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی تھی ان میں ایک کسی اور مسجد والوں کے پاس سے گزرا جبکہ وہ رکوع میں تھے تو اس نے کہا: میں اللہ کی گواہی دیتا ہوں میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی ہے تو وہ صحابہ اسی حالت میں بیت اللہ کی طرف گھوم گئے اور جو تحویل قبلہ سے پہلے فوت ہو گئے تھے اور شہید ہو گئے تھے ہم نہیں جانتے کہ ان کے بارے میں کیا کہیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ (البقرہ: 143) (2) اس روایت میں نماز عصر کا ذکر ہے۔

امام مالک کی روایت میں صبح کی نماز کا ذکر ہے، بعض علماء نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر تحویل قبلہ کا حکم بنی سلمہ کی مسجد میں نازل ہوا تھا جبکہ آپ ظہر کی نماز میں دو رکعت پڑھ چکے تھے تو آپ نماز میں ہی پھر گئے تھے اس مسجد کو مسجد قبلتین کہا جاتا ہے (3)۔ ابو الفرج نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عباد بن نہیک نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ نماز پڑھی تھی۔ ابو عمر نے ''التمہید'' میں حضرت نویلہ بنت اسلم رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے اور یہ مبایعات (بیعت کرنے والیوں) میں سے تھیں فرماتی ہیں: ہم ظہر کی نماز میں تھے۔ عباد بن بشر بن قیظی آیا اور کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبلہ کی طرف منہ کر لیا ہے یا کہا: بیت حرام کی طرف منہ کر لیا ہے۔ پس مرد عورتوں کی جگہ پھر گئے اور عورتیں، مردوں کی جگہ پھر گئیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت نماز کے علاوہ حالت میں نازل ہوئی۔ یہ اکثر کا قول ہے۔ کعبہ کی طرف پہلی نماز، نماز عصر پڑھی گئی۔ واللہ اعلم

روایت ہے کہ جب قبلہ کی تحویل ہوئی تو پہلی نماز جس نے کعبہ کی طرف پڑھی وہ ابو سعید بن معلی تھے۔ حضرت ابو سعید مسجد سے گزر رہے تھے، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ آپ منبر پر لوگوں کو تحویل قبلہ کے بارے خطبہ دے رہے تھے اور آپ یہ آیت تلاوت کر رہے تھے: قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ (البقرہ: 144) حتیٰ کہ آپ آیت سے فارغ ہوئے تو میں (ابو سعید) نے اپنے ساتھی سے کہا: آؤ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر سے اترنے سے پہلے دو رکعتیں پڑھ لیں۔ پس ہم پہلے کعبہ

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب القبلۃ، باب ما جاء فی القبلہ، صفحہ 182 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب قول اللہ تعالیٰ سیقول السفہاء من الناس، حدیث 4126، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ معالم التنزیل، صفحہ 172، جلد 1 (دار الفکر)

کی طرف نماز پڑھنے والے ہوں گے۔ پس ہم نے جانوروں کو چھپا دیا اور ہم نے دو رکعت نماز پڑھی۔ پھر رسول اللہ ﷺ اترے اور اس دن آپ نے لوگوں کو ظہر کی نماز پڑھائی۔ ابو عمر نے کہا ابو سعید بن معلی کے لئے اس حدیث کے علاوہ کوئی حدیث نہیں ہے حالانکہ سورۂ فاتحہ کی فضیلت میں کنت اصلی والی حدیث موجود ہے (1) جو بخاری نے نقل کی ہے، یہ پہلے گزر چکی ہے۔

مسئلہ نمبر 3: مدینہ طیبہ تشریف لانے کے کتنے عرصہ بعد تحویل قبلہ ہوا؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: سولہ ماہ بعد یا سترہ ماہ بعد قبلہ تبدیل ہوا (2)۔ جیسا کہ بخاری میں ہے۔ دار قطنی نے بھی یہ حدیث حضرت براء سے نقل کی ہے۔ فرمایا: ہم نے رسول اللہ ﷺ کے مدینہ طیبہ آنے کے بعد سولہ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی خواہش دیکھی تو یہ آیت نازل ہوئی: قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ (البقرہ: 144) (3) اس روایت میں بغیر شک کے سولہ ماہ کا ذکر ہے۔ مالک نے یحییٰ بن سعید عن سعید بن مسیب کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ تحویل قبلہ غزوہ بدر سے دو ماہ پہلے ہوا تھا۔ ابراہیم بن اسحاق نے کہا ہجرت کے دوسرے سال رجب میں قبلہ کی تبدیلی ہوئی تھی۔ ابو حاتم بستی نے کہا: مسلمانوں نے بیت المقدس کی طرف سترہ ماہ اور تین دن متواتر نماز پڑھی۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ آپ ﷺ مدینہ طیبہ بارہ ربیع الاول کو آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے استقبال کعبہ کا حکم منگل کے دن پندرہ شعبان کو دیا تھا

مسئلہ نمبر 4: علماء کا بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کی کیفیت میں تین مختلف اقوال ہیں:

۱۔ حسن نے کہا کہ یہ رائے اور اجتہاد سے تھا۔ عکرمہ اور ابو العالیہ کا یہ قول ہے۔

۲۔ دوسرا قول یہ ہے کہ آپ کو بیت المقدس اور کعبہ کے درمیان اختیار دیا گیا تھا تو آپ نے یہود کے ایمان لانے اور ان کے مائل کرنے کے لئے بیت المقدس کو اختیار فرمایا۔ یہ طبری کا قول ہے۔ زجاج نے کہا: مشرکین کی آزمائش کے لئے بیت المقدس کی طرف منہ کیا کیونکہ وہ کعبہ سے الفت رکھتے تھے۔

۳۔ تیسرا قول یہ ہے، یہ جمہور کا قول ہے اور حضرت ابن عباس وغیرہ کا قول ہے۔ اللہ تعالیٰ کے امر اور اس کی وحی کے ساتھ بیت المقدس کی طرف منہ کیا تھا پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو منسوخ کر دیا اور کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا۔ اور جمہور نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ الآیۃ (اور نہیں مقرر کیا ہم نے بیت المقدس کو قبلہ جس پر آپ (اب تک) رہے مگر اس لئے کہ ہم دیکھ لیں کہ کون پیروی کرتا ہے (ہمارے) رسول کی (اور) کون مڑتا ہے الٹے پاؤں)۔

مسئلہ نمبر 5: اس میں اختلاف ہے کہ جب ابتدا میں نماز مکہ میں فرض ہوئی تو کیا بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم تھا یا مکہ کی طرف منہ کرنے کا حکم تھا؟ علماء کی ایک جماعت نے کہا: بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم تھا اور مدینہ طیبہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب فضل الفاتحہ، حدیث نمبر 4114، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، کتاب التفسیر، ولکل وجهة هو موليها، حدیث نمبر 4132، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن دار قطنی، باب تحویل الی الکعبہ، صفحہ 273، جلد 1 (دار صادر)

میں بھی سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے کعبہ کی طرف قبلہ پھیر دیا۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: ابتدا میں نماز کعبہ کی طرف منہ کر کے پڑھنا فرض کی گئی تھی آپ مکہ میں رہائش کے درمیان کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے، جس پر حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی نماز تھی۔

جب آپ مدینہ طیبہ آئے تو سولہ یا سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو کعبہ کی طرف پھیر دیا۔ ابو عمر نے کہا: یہ میرے نزدیک اصح قول ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مدینہ طیبہ آئے تو آپ نے یہود کی الفت چاہی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے قبلہ کی طرف متوجہ ہوئے تاکہ یہ چیز ان کو اسلام کی طرف بلانے کا باعث ہو جب ان کا عناد ظاہر ہوا اور آپ ان سے مایوس ہو گئے تو آپ نے کعبہ کی طرف پھرنا پسند کیا۔ آپ آسمان کی طرف دیکھتے تھے اور آپ کی محبت کعبہ کی طرف تھی کیونکہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ تھا، یہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: کیونکہ یہ عربوں کو اسلام کی طرف بلانے کا زیادہ باعث تھا۔ بعض نے فرمایا: اس میں یہود کی مخالفت تھی، یہ مجاہد سے مروی ہے (1)۔ ابو العالیہ الریاحی سے مروی ہے، فرمایا: حضرت صالح علیہ السلام کی مسجد اور ان کا قبلہ کعبہ تھا، فرمایا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کعبہ کی طرف صخرہ کی جانب نماز پڑھتے تھے (2) یہ تمام انبیاء کا قبلہ تھا۔ صلوات اللہ علیہم اجمعین۔

مسئلہ نمبر 6: اس آیت میں واضح دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ناسخ و منسوخ ہیں۔ اس پر امت کا اجماع ہے مگر جس نے علیحدہ راہ اختیار کی۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور علماء کا اجماع ہے کہ قبلہ اول قرآن سے منسوخ کیا گیا اور یہ دو مرتبہ منسوخ ہوا۔ ایک قول کے مطابق جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 7: یہ آیت قرآن کے ساتھ سنت کے منسوخ ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی، جبکہ یہ قرآن میں حکم نہیں تھا اور یہ حکم سنت کی جہت سے تھا پھر یہ قرآن کے ساتھ منسوخ ہوا اور اس اعتبار سے کنت علیھا کا معنی انت علیھا ہوگا۔

مسئلہ نمبر 8: اس میں خبر واحد کے ساتھ قطعی علم کے جواز پر دلیل ہے، کیونکہ بیت المقدس کی طرف منہ کرنا صحابہ کے نزدیک قطعی تھا پھر اہل قباء کے پاس آنے والا آیا اور انہیں بتایا کہ قبلہ مسجد حرام کی طرف پھر گیا ہے، تو انہوں نے اس کا قول قبول کیا اور وہ کعبہ کی طرف پھر گئے پس خبر واحد کے ساتھ انہوں نے متواتر کو ترک کر دیا حالانکہ خبر واحد ظنی ہوتی ہے۔

علماء کا اس کے عقلاً جواز میں اور اس کے وقوع میں اختلاف ہے۔ ابو حاتم نے کہا: مختار اس کا عقلاً جواز ہے اگر اس کے ساتھ شرع مکلف کرے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں قباء کے قصہ کی دلیل کے ساتھ اس کا وقوع بھی ہوا۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک شخص کو کسی علاقہ کا والی بنا کر بھیجتے تھے اور وہ ناسخ و منسوخ کا حکم پہنچاتے تھے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد ممنوع ہے کیونکہ صحابہ کرام کا اس پر اجماع ہے کہ قرآن اور متواتر معلوم، خبر واحد کے ساتھ نہیں اٹھایا جائے گا۔ سلف و خلف میں سے کوئی بھی اس کے جواز کا قائل نہیں ہے اور جو منع کرتے ہیں انہوں نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ یہ چیز

1۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

محال تک پہنچاتی ہے اور وہ ہے ظن کے ساتھ قطعی امر کو اٹھانا۔ رہا اہل قبا کا قصہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا والی بھیجنا وہ علم کے افادہ کے قرائن پر یا تو نقلاً اور تحقیقاً محمول ہے یا احتمالاً اور تقدیراً اس سوال و جواب کی مکمل تفصیل اصول فقہ میں موجود ہے۔

مسئلہ نمبر 9: اس میں دلیل ہے کہ جس کو ناسخ نہ پہنچا ہو تو وہ پہلے حکم کا مکلف ہے، بخلاف اس کے جس نے کہا کہ پہلا حکم ناسخ کے وجود کے ساتھ ساتھ اٹھ جاتا ہے نہ کہ علم کے ساتھ۔ پہلا قول اصح ہے کیونکہ اہل قبا بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے یہاں تک کہ آنے والا آیا اور اس نے انہیں ناسخ کے متعلق بتایا تو وہ کعبہ کی طرف پھر گئے۔ پس ناسخ کا وجود پایا گیا تو وہ لامحالہ اٹھانے والا ہے لیکن اس کے علم کی شرط کے ساتھ۔ لیکن ناسخ خطاب ہے اور وہ اس کے حق میں خطاب نہیں ہوتا جسے خطاب نہ پہنچا ہو۔ اس اختلاف کا فائدہ عبادات میں ظاہر ہوتا ہے جو نسخ کے بعد ادا کی گئیں اور نسخ کے پہنچنے سے پہلے ادا کی گئیں، کیا ان کا اعادہ ہوگا یا نہیں؟ اسی پر مبنی ہے وکیل کے تصرف کا مسئلہ جو مؤکل کے معزول کرنے کے بعد تصرف کرتا ہے یا مؤکل کے مرنے کے بعد تصرف کرتا ہے یا اسے علم پہنچنے سے پہلے تصرف کرتا ہے۔ اس کے متعلق دو قول ہیں: اسی طرح مضاربت کا مسئلہ ہے اور حاکم جس کو والی بنائے جب وہ مر جائے یا معزول کیا گیا ہو تو صحیح یہ ہے کہ ان لوگوں میں سے ہر ایک کا فعل نافذ ہوگا اور اس کا حکم رد کیا جائے گا۔ قاضی عیاض نے کہا: اس شخص کے احکام میں کوئی اختلاف نہیں جس کو آزاد کیا گیا ہو اور اسے آزادی کا علم نہ ہو اس کے اور لوگوں کے درمیان احکام آزاد والے ہوں گے اور اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان اس کے احکام جائز ہوں گے۔ اور اس میں اختلاف نہیں کہ آزاد کی گئی عورت آزادی کے بعد پڑھی گئی نماز جو اس نے بغیر ستر کے، آزادی کے علم سے پہلے پڑھی تھی اس کا اعادہ نہیں کرے گی۔ انہوں نے اختلاف کیا ہے اس شخص کے بارے میں جس پر کوئی ایسا موجب طاری ہو جو اس کی عبادت کے حکم کو تبدیل کردے جب کہ وہ اس کی عبادت میں ہو، قبا کے مسئلہ پر قیاس کرتے ہوئے۔ پس جس نے ایک حال پر نماز پڑھی پھر نماز مکمل کرنے سے پہلے اس کی وہ حالت بدل گئی تو وہ اپنی نماز کو مکمل کرے اور توڑے نہیں اور اس کی پہلی نماز ہو چکی ہے۔ اسی طرح جس نے برہنہ نماز پڑھی پھر نماز کے اندر ہی اسے کپڑا مل گیا یا حالت صحت میں نماز شروع کی پھر وہ مریض ہو گیا یا مریض تھا پھر صحیح ہو گیا یا بیٹھا تھا پھر قیام پر قادر ہو گیا یا لونڈی نماز کے اندر ہی آزاد ہو گئی تو وہ اپنا پردہ لے لے اور سابقہ نماز پر بناء کرے۔

میں کہتا ہوں: جیسے کوئی تیمم کر کے نماز میں داخل ہوا پھر اس نے پانی پالیا تو وہ نماز کو نہ توڑے جیسا کہ امام مالک اور امام شافعی نے کہا ہے۔ بعض نے فرمایا: وہ نماز توڑ دے یہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 10: اس میں خبر واحد کے قبول پر دلیل ہے اور اس پر سلف کا اجماع ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت سے تواتر کے ساتھ معلوم ہے کیونکہ آپ والیوں کو اور مبلغین کو بھیجتے تھے جو ایک ایک ہوتے تھے تا کہ وہ لوگوں کو دین سکھائیں اور انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر و نواہی بتائیں۔

مسئلہ نمبر 11: اس میں دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن تھوڑا تھوڑا اترتا رہا اور ایک حال کے بعد دوسرے حال میں ضرورت کے مطابق اترتا رہا حتی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا دین مکمل کیا جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ**

لَكُمْ دِيْنَكُمْ (مائدہ:3)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ حجت قائم فرمائی یعنی مشارق و مغارب کی ملکیت اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ پس اس کے لائق ہے جس جہت کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ یہ اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قبلہ کی طرف ہدایت دی۔ الصراط سے مراد راستہ ہے المستقیم جس میں ٹیڑھا پن نہ ہو۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَاۤ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَ اِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾

''اور اسی طرح ہم نے بنا دیا تمہیں (اے مسلمانو!) بہترین امت تا کہ تم گواہ بنو لوگوں پر اور (ہمارا) رسول تم پر گواہ ہو اور نہیں مقرر کیا ہم نے (بیت المقدس کو) قبلہ جس پر آپ (اب تک) رہے مگر اس لئے کہ ہم دیکھ لیں کہ کون پیروی کرتا ہے (ہمارے) رسول کی (اور) کون مڑتا ہے الٹے پاؤں۔ بے شک یہ (حکم) بہت بھاری ہے مگر ان پر (بھاری نہیں) جنہیں اللہ نے ہدایت فرمائی اور نہیں اللہ کی یہ شان کہ ضائع کر دے تمہارا ایمان۔ بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں پر بہت ہی مہربان اور رحم فرمانے والا ہے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کعبہ زمین کے درمیان ہے اسی طرح تمہیں امت وسط بنایا یعنی تمہیں انبیاء سے کم درجہ اور دوسری امتوں سے بلند درجہ بنایا۔ الوسط کا مطلب العدل ہے۔ اس کی اصل یہ ہے کہ اچھی چیز درمیانی چیز ہوتی ہے۔ ترمذی نے حضرت ابو سعید خدری سے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا کے تحت روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عدلاً یعنی وسط سے مراد عدل ہے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے (1)۔ قرآن میں ہے: قال اوسطهم یعنی درمیان والے اور بہتر شخص نے کہا۔ زہیر نے کہا:

هم وسط يرضى الانام بحكمهم　　اذا نزلت احدى الليالى بمعظم (2)

ایک اور شاعر نے کہا:

انتم اوسط حى علموا　　بصغير الامر او احدى الكبر

ایک اور شاعر نے کہا:

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، باب سورۃ بقرہ، صفحہ 120، جلد 2 (وزارت تعلیم)

2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

لا تذھبنّ فی الامور فرطا لا تسألنّ ان سألت شططا
و کن من الناس جمیعاً وسطاً

ان تمام اشعار میں وَّسَطًا بہتر اور عمدہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

وسط الوادی وادی کی بہتر جگہ کو کہتے ہیں جس میں گھاس اور پانی زیادہ ہو۔ جب وسط میں نہ کمی ہوتی ہے نہ زیادتی تو وہ محمود ہوتا ہے۔ یعنی اس امت میں نہ تو نصاریٰ کا غلو ہے جو وہ انبیاء کرام کے بارے کرتے تھے اور نہ یہود کی طرح کوتاہی ہے جو وہ انبیاء کی شان میں کرتے تھے۔ حدیث پاک میں ہے: خیر الامور اوسطھا۔(1) بہتر کام اچھا کام ہوتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: علیکم بالنمط الاوسط۔ تم پر بہتر جماعت کو پکڑنا لازم ہے۔ بہتر جماعت وہ ہوتی ہے، بلند جس کی طرف اترتا ہے اور نیچے والا اس کی طرف بلند ہوتا ہے۔ فلان من اوسط قومه، فلاں اپنی قوم سے بہتر ہے۔ وانه لواسطة قومه ووسط قومه۔ یعنی وہ اپنی قوم سے بہتر ہے ان میں سے اہل حسب میں سے ہے۔ قد وسط وساطة وسطه۔ الوسط سے نہیں ہے جو دو چیزوں کے درمیان ہوتا ہے الوسط (سین کے سکون کے ساتھ) ظرف ہے تو کہتا ہے: صلیت وسط القوم، جلست وسط الدار کیونکہ یہ اسم ہے۔ جوہری نے کہا: ہر وہ جگہ جہاں بین رکھنا صحیح ہو وہاں وسط ہوگا اور اگر جہاں بین رکھنا صحیح نہ ہو تو وہ وسط (حرکت کے ساتھ) ہوگا اور کبھی سین کو ساکن کیا جاتا ہے اس کی کوئی وجہ نہیں۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِّتَكُوْنُوْا لام کئی کی وجہ سے منصوب ہے یعنی لان تکونوا۔ شھداء، کان کی خبر ہے۔ عَلَى النَّاسِ یعنی محشر میں امتوں کے خلاف انبیاء کے گواہ بنو، جیسا کہ بخاری میں حضرت ابو سعید خدری سے ثابت ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے روز حضرت نوح علیہ السلام کو پکارا جائے گا۔ وہ کہیں گے: لبیک و سعدیک یا رب۔ اے رب! میں حاضر ہوں، تیری سعادت سے سعادت حاصل کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تو نے پیغام پہنچایا تھا؟ وہ کہیں گے: ہاں۔ پھر ان کی امت سے پوچھا جائے گا، کیا اس نے تمہیں پیغام پہنچایا تھا؟ وہ کہیں گے: ہمارے پاس تو کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تیری گواہی کون دے گا۔ حضرت نوح علیہ السلام کہیں گے: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت۔ پس یہ گواہی دیں گے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے تبلیغ کی تھی۔ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم پر گواہی دیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا یہی مطلب ہے: وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔(2)

ابن مبارک نے اس حدیث کو طویل ذکر کیا ہے۔ اس حدیث میں ہے: امتیں کہیں گی وہ ہمارے خلاف کیسے گواہی دیں گے جنہوں نے ہمیں پایا ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ پوچھیں گے: تم ان کے خلاف کیسے گواہی دو گے جن کو تم نے پایا ہی نہیں۔ امت محمدیہ کے لوگ کہیں گے: اے ہمارے رب! ہماری طرف تو نے رسول مبعوث فرمایا، ہماری طرف تو نے اپنا عہد اور اپنی

1۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب صلاۃ الخوف، صفحہ 273، جلد 3 (دار الفکر)

2۔ صحیح بخاری، باب و کذالک جعلناکم امۃ وسطاً، صفحہ 645، جلد 2 (وزارت تعلیم)

کتاب نازل فرمائی، تو نے خود ہم پر بیان کیا کہ انہوں نے پیغام پہنچایا تھا۔ پس جو تو نے ہمیں عہد دیا تھا اس کی بنا پر ہم نے گواہی دی۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: انہوں نے سچ کہا۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے یہی مراد ہے: وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا... الوسط سے مراد عدل ہے۔ لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔

ابن انعم نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ قیامت کے روز حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت گواہی دے گی مگر وہ گواہی نہیں دے گا جس کے دل میں اپنے بھائی کے بارے میں عداوت ہوگی (1)۔ ایک طائفہ نے کہا آیت کا معنی ہے: بعض بعض کے مرنے بعد گواہی دیں گے جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت انس سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب آپ کے پاس سے ایک جنازہ گزرا تو اس پر خیر سے تعریف کی گئی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس پر واجب ہوگئی، واجب ہوگئی، واجب ہوگئی۔ پھر ایک جنازہ گزرا جس کی برائی بیان کی گئی تو آپ نے فرمایا: واجب ہوگئی، واجب ہوگئی، واجب ہوگئی۔ حضرت عمر نے عرض کی: میرا باپ اور میری ماں آپ پر قربان ہوں۔ جنازہ گزرا اس کی خیر کے ساتھ تعریف کی گئی تو آپ نے فرمایا: واجب ہوگئی، واجب ہوگئی، واجب ہوگئی۔ پھر ایک جنازہ گزرا جس کی برائی بیان کی گئی تو آپ نے فرمایا: واجب ہوگئی، واجب ہوگئی، واجب ہوگئی؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کی تم نے خیر کے ساتھ تعریف کی اس کے لئے جنت واجب ہوگئی اور جس کی تم نے برائی بیان کی اس کے لئے آگ واجب ہوگئی۔ تم زمین میں اللہ تعالیٰ کے گواہ ہو، تم زمین میں اللہ تعالیٰ کے گواہ ہو، تم زمین میں اللہ تعالیٰ کے گواہ ہو (2)۔ بخاری نے اس کے ہم معنی روایت کی ہے۔ بخاری اور مسلم کے علاوہ میں کئی طرق میں ہے پھر یہ آیت تلاوت فرمائی لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔

ابان اور لیث نے شہر بن حوشب سے انہوں نے حضرت عبادہ بن صامت سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میری امت کو ایسی تین چیزیں عطا کی گئی ہیں جو سوائے انبیاء کے کسی کو عطا نہیں کی گئیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی مبعوث فرمایا تو اسے فرمایا: مجھ سے دعا مانگ میں تیری دعا قبول کروں گا اور اس (میری) امت کو فرمایا اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (غافر: 60) تم مجھ سے مانگو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ اور جب کسی نبی کو بھیجا تو اسے فرمایا: تم پر دین میں کوئی حرج نہیں اور اس امت کو بھی فرمایا: وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (الحج: 78) اور جب اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو مبعوث فرمایا تو اسے اپنی قوم پر شہید بنایا اور اس امت کو تمام لوگوں پر گواہ بنایا۔ اس حدیث کو حکیم ابو عبد اللہ نے ''نوادر الاصول'' میں نقل کیا ہے (☆)۔

مسئلہ نمبر 3: ہمارے علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ہمیں اپنے خاص فضل سے آگاہ فرمایا کہ اس نے ہمیں عدالت کے اسم سے موسوم فرمایا اور تمام مخلوق پر گواہی کا مرتبہ عطا فرمایا۔ اس نے مرتبہ کے اعتبار سے ہمیں اول بنایا اور زمانہ کے اعتبار سے آخر بنایا جس طرح فرمایا: نحن الآخرون الاولون۔ (3) ہم زمانہ کے اعتبار سے آخری ہیں اور مرتبہ کے

1۔ تفسیر طبری، صفحہ 15، جلد 1 (داراحیاء التراث العربی) 2۔ صحیح مسلم، باب فی وجوب الجنة والنار بشهادة، صفحہ 308، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
3۔ ایضاً، کتاب الجمعہ، صفحہ 282، جلد 2 ☆ نوادر الاصول، صفحہ 391

اعتبار سے اول ہیں۔ یہ دلیل ہے کہ عادل ہی صرف گواہی دیں گے غیر پر غیر کا قول نافذ نہ ہوگا مگر جب کہ وہ عادل ہو۔ عدالت کا بیان اور اس کا حکم ان شاء اللہ سورت کے آخر میں آئے گا۔

مسئلہ نمبر 4: اس میں اجماع کی صحت اور اس کے ساتھ حکم کے وجوب پر دلیل ہے کیونکہ جب وہ عادل ہوں گے وہ لوگوں پر گواہی دیں گے، ہر ہر زمانہ کے لوگ بعد والوں پر گواہ ہیں۔ صحابہ کا قول تابعین پر حجت اور شاہد ہے اور تابعین کا قول بعد والوں پر حجت ہے۔ جب امت شہداء (گواہ) ہے تو اس کا قول قبول کرنا واجب ہے۔ اس شخص کے قول کا کوئی اعتبار نہیں جس نے کہا کہ اس سے پوری امت مراد ہے کیونکہ پوری امت کا اجماع تو قیامت تک ثابت نہ ہوگا۔ اصول فقہ کی کتب میں اس کا بیان ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے قیامت کے روز رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے اعمال پر گواہ ہوں گے۔ بعض علماء نے فرمایا: عَلَيْكُمْ بمعنی لکم ہے یعنی تمہارے لئے ایمان کی گواہی دے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: تمہارے لئے تم پر تبلیغ کی گواہی دے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ بعض علماء نے فرمایا: یہاں قبلہ سے قبلہ اولیٰ مراد ہے کیونکہ فرمایا كُنْتَ عَلَيْهَآ بعض نے فرمایا: دوسرا قبلہ مراد ہے اور کاف زائدہ ہے یعنی انت الآن علیھا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران: 110) یعنی انتم خیر امۃ۔ یہ بعض علماء کا قول ہے۔ تفصیل آگے آئے گی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لِنَعْلَمَ کا معنی ہے لنری۔ (ہم دیکھ لیں) اور عرب رؤیت کی جگہ علم کو اور علم کی جگہ رؤیت کو استعمال کرتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ (الفیل: 1) اس میں اَلَمْ تَرَ بمعنی الم تعلم ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے مگر تا کہ تم جان لو کہ ہم جانتے ہیں کیونکہ منافقین شک میں تھے کہ اللہ تعالیٰ اشیاء کے پائے جانے سے پہلے انہیں جانتا ہے۔ بعض نے فرمایا اس کا معنی ہے ہم یقین والوں کو شک کرنے والوں سے ممتاز کر دیں۔ یہ ابن فورک نے بیان کیا ہے اور طبری نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، بعض نے فرمایا: اس کا معنی ہے تا کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین جان لیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی طرف کی جس طرح کہا جاتا ہے، امیر نے ایسا کیا حالانکہ وہ کام اس کے متبعین نے کیا ہوتا ہے۔ یہ مہدوی نے بیان کیا ہے اور عمدہ قول ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے تا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جان لیں۔ علم کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی تخصیص اور تفضیل کے لئے جس طرح اپنے اس ارشاد میں اپنی ذات کی طرف اشارہ فرمایا: اے ابن آدم! میں مریض تھا تو نے میری عیادت نہیں کی (1)۔ پہلا قول زیادہ واضح ہے کیونکہ اس کا معنی معاینۃ کا علم ہے جو جزا کا موجب ہے۔ اللہ تعالیٰ غیب اور شہادت کو جاننے والا ہے وہ کسی چیز کے پائے جانے سے پہلے بھی اسے جانتا ہے۔ معلومات پر احوال مختلف ہوتے ہیں اور اس

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب عیادۃ المریض، صفحہ 318، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

کا علم مختلف نہیں ہوتا بلکہ تمام کے ساتھ ایک تعلق کے ساتھ معلق ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں جو اس معنی کی آیات موجود ہیں ان کا یہی معنی ہے مثلاً وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ (آل عمران:140)، وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ (محمد:31)۔ (یہ اس لئے کہ دیکھ لے اللہ تعالیٰ ان کو جو ایمان لائے اور بنائے تم میں سے کچھ شہید اور ہم ضرور آزمائیں گے تمہیں تاکہ ہم دیکھ لیں تم میں سے جو مصروف جہاد رہتے ہیں اور صبر کرنے والے ہیں) اور اس کے مشابہ آیات۔

یہ آیت قریش کے قول مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا کا جواب ہے قریش کعبہ سے محبت کرتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں غیر مالوف سے آزمایا تاکہ ظاہر ہو جائے جو رسول کی اتباع کرتا ہے اس سے جو اتباع نہیں کرتا۔ زہری نے الا لِيُعْلَمَ پڑھا ہے۔ اس قراءت میں مَنْ محل رفع میں ہوگا کیونکہ فعل مجہول کا نائب فاعل ہے اور جمہور کی قراءت پر مفعول کی حیثیت سے منصوب ہے يَتَّبِعُ الرَّسُوْلَ یعنی استقبال قبلہ کا جو حکم دیا گیا ہے اس میں رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتا ہے۔ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ یعنی جو اس کے دین سے مرتد ہوتا ہے۔ کیونکہ قبلہ جب تبدیل ہوا تو مسلمانوں میں سے کچھ مرتد ہو گئے تھے اور ایک قوم منافق ہو گئی تھی۔ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً یعنی قبلہ تبدیل ہونا بہت بڑا تھا۔ حضرت ابن عباس، مجاہد اور قتادہ کا یہ قول ہے۔ عربی میں تقدیر یوں ہوگی۔ وان کانت التحویلۃ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً۔ فراء کا خیال ہے: اِنْ اور لام، بمعنی ما اور الا ہے۔ بصری کہتے ہیں: ان ثقیلہ کو مخففہ کیا گیا ہے۔ اخفش نے کہا: یعنی قبلہ، یا تحویلہ یا تولیہ بھاری ہے۔ اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ یعنی اس نے ہدایت کو پیدا کیا۔ اس سے مراد دلوں میں ایمان ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ (مجادلہ:22)۔ یہ وہ لوگ ہیں نقش کر دیا ہے اللہ نے ان کے دلوں میں ایمان۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ علماء کا اتفاق ہے یہ ان کے متعلق نازل ہوئی جو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہوئے فوت ہو گئے تھے جیسا کہ بخاری میں حضرت براء بن عازب کی حدیث سے ثابت ہے۔ یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے۔ ترمذی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قبلہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا گیا تو صحابہ نے کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہمارے ان بھائیوں کا کیا ہوگا جو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہوئے فوت ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ امام ترمذی نے فرمایا یہ حدیث حسن (1)، صحیح ہے۔ نماز کو ایمان کہا گیا ہے کیونکہ یہ نیت، قول اور عمل پر مشتمل ہے۔

امام مالک نے فرمایا میں اس آیت کے ساتھ مرجئۃ کا قول ذکر کرتا ہوں کہ جو کہتے ہیں کہ نماز، ایمان میں سے نہیں ہے۔ محمد بن اسحاق نے کہا وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ یعنی قبلہ کی طرف متوجہ ہونے اور اپنے نبی کی تصدیق کی وجہ سے تمہارے ایمان کو ضائع نہیں کرے گا۔ مسلمانوں کی اکثریت اور اصولیین کا نظریہ یہی ہے۔

1۔ جامع ترمذی، باب سورۂ بقرہ، صفحہ 121، جلد 2 (وزارت تعلیم)

ابن وہب، ابن قاسم، ابن عبد الحکم اور اشہب نے مالک سے روایت کیا ہے وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ اِيْمَانَكُمْ فرمایا: ایمان سے مراد نماز ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔ الرأفة، رحمت سے زیادہ ہوتی ہے۔ ابو عمرو بن العلاء نے کہا: الرأفة اکثر من الرحمة۔ ہم نے اپنی کتاب الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنی میں اس کا لغوی معنی، اس کے اشعار اور معانی کا ذکر کیا ہے۔ کوفیوں اور ابو عمرو نے لَرَؤُف، فَعُل کے وزن پر پڑھا ہے یہ بنی اسد کی لغت ہے۔ اسی سے ولید بن عقبہ کا قول ہے:

و شر الطالبين فلا تكنه يقاتل عمه الرؤف الرحيم

کسائی نے حکایت کیا ہے کہ بنی اسد کی لغت فَعْل کے وزن پر لَرَأْف ہے۔ ابو جعفر بن القعقاع نے لروف بغیر ہمزہ کے ثقیل پڑھا ہے۔ اسی طرح کتاب اللہ میں ہر ہمزہ کو تسہیل کے ساتھ پڑھا ہے جو ساکن ہے یا متحرک ہے۔

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾

''ہم دیکھ رہے ہیں بار بار آپ کا منہ کرنا آسمان کی طرف تو ہم ضرور پھیر دیں گے آپ کو اس قبلہ کی طرف جسے آپ پسند کرتے ہیں۔ (لو) اب پھیر لو اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف (اے مسلمانو!) جہاں کہیں تم ہو پھیر لیا کرو اپنے منہ اس کی طرف اور بے شک وہ جنہیں کتاب دی گئی ضرور جانتے ہیں کہ یہ حکم برحق ہے ان کے رب کی طرف سے اور نہیں اللہ تعالیٰ بے خبر ان کاموں سے جو وہ کرتے ہیں''۔

علماء نے فرمایا: یہ آیت، سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ کے قول پر نزول کے اعتبار سے مقدم ہے۔ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ کا معنی ہے: تیرا آسمان کی طرف اپنا چہرہ پھیرنا۔ یہ طبری کا قول ہے۔ زجاج نے کہا: آسمان کی طرف آپ کا نظریں پھیرنا۔ دونوں معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ السماء کو ذکر کے ساتھ خاص فرمایا کیونکہ یہ جو چیز اس کی طرف منسوب ہوتی ہے اس کی تعظیم کے ساتھ مختص ہے اور آسمان سے نازل ہوتی ہے مثلاً بارش، رحمت اور وحی۔ ترضاها یعنی آپ جس کو پسند کرتے ہیں۔ آپ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کو پسند فرماتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ۔

ابو اسحاق نے حضرت براء سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سولہ یا سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کی طرف منہ کرنا پسند کرتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ (البقرہ: 144) (1) اس کا معنی اور اس پر کلام گزر چکا ہے۔ الحمد للہ۔

1۔ صحیح بخاری، باب سیقول السفهاء من الناس، صفحہ 644، جلد 2 (وزارت تعلیم)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد فَوَلِّ یہ امر کا صیغہ ہے۔ شَطْرَ سے مراد طرف ہے الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ سے مراد کعبہ ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: پورے کعبہ کے سامنے...... یہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا: کعبہ کے پرنالہ کے سامنے۔ یہ ابن عطیہ کا قول ہے۔ اور میزاب یہ مدینہ طیبہ اور اہل شام کا قبلہ ہے اور اہل اندلس کا قبلہ ہے (1)۔

میں کہتا ہوں: ابن جریج نے عطا سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بیت اللہ اہل مسجد کے لئے قبلہ ہے اور مسجد اہل حرم کے لئے قبلہ ہے اور حرم، میری امت کے مشرق و مغرب میں رہنے والے اہل زمین کا قبلہ ہے (2)۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، الشطر کے کئی محمل ہیں۔ طرف، جہت جیسا کہ اس آیت میں ہے۔ یہ ظرف مکان ہے جیسے تو کہتا ہے: تلقاءہ وجهته۔ ظرف کی حیثیت سے نصب دی گئی ہے یہ مفعول بہ کے قائم مقام ہے، فعل اس میں واقع ہوا ہے۔ داؤد بن ابی ہند نے فرمایا: حضرت ابن مسعود کے مصحف میں اس طرح ہے: فول وجهك تلقاء المسجد الحرام شاعر نے کہا:

اقول لام زنباع اقيمي صدور العيس شطر بني تميم

ایک اور شاعر نے کہا:

و قد اظلكم من شطرِ ثغركم هول له ظلم يغشا كم قطعاً

ایک اور شاعر نے کہا

الا من مبلغ عمراً رسولاً و ما تغني الرسالة شطر عمرو

اور شطر الشی کا معنی ہے: اس کا نصف۔ اسی سے حدیث ہے: الطهور شطر الايمان (3)۔ طہارت ایمان کا نصف ہے۔ یہ اضداد میں سے ہے۔ کہا جاتا ہے: شطر الی کذا جب کوئی کسی چیز کی طرف متوجہ ہو۔ شطر عن کذا جب کسی سے اعراض کیا گیا ہو۔ شاطر اس شخص کو کہتے ہیں جو ٹیڑھی راہ اختیار کرے اور وہ اپنے اہل کو خست کی وجہ سے عاجز کر دے۔ شطَرَ و شطُرَ شطارۃً۔ بعض علماء سے شاطر کا معنی پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: جو اس کام کو اختیار کرے جس سے اللہ نے منع کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اس میں علماء کا اختلاف نہیں کہ ہر افق میں کعبہ قبلہ ہے اور اس پر اجماع ہے جو کعبہ کو دیکھ رہا ہو اس پر عین قبلہ کی طرف منہ کرنا فرض ہے۔ اگر اس نے اس کا استقبال ترک کر دیا جبکہ وہ کعبہ کو دیکھنے والا تھا اور اس کی جہت کا عالم تھا تو اس کی نماز نہ ہوگی جو اس نے نماز پڑھی ہوگی اس کا اعادہ لازم ہوگا۔ ابو عمرو نے ذکر کیا ہے اور علماء کا اجماع ہے کہ جو کعبہ سے غائب

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 222، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، صفحہ 10، جلد 2 (دار الفکر)
3۔ صحیح مسلم، باب فضل الوضوء، صفحہ 118، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

ہے وہ کعبہ کی طرف منہ کرے، اگر اس پر کعبہ کی جہت مخفی ہو تو ستاروں، ہواؤں، پہاڑوں وغیرہ سے استدلال کرے اور جو مسجد حرام میں بیٹھا ہو اس کا چہرہ کعبہ کی طرف ہونا چاہئے اور اس کی طرف ایمان اور ثواب کی نیت سے دیکھے۔ روایت ہے کہ کعبہ کی طرف دیکھنا عبادت ہے (1)۔ عطا اور مجاہد کا یہ قول ہے۔

مسئلہ نمبر 4: اس میں اختلاف ہے غائب کا عین کعبہ کی طرف منہ کرنا فرض ہے یا جہت کعبہ کی طرف منہ کرنا فرض ہے؟ بعض علماء کا پہلا قول ہے۔ ابن عربی نے کہا: یہ ضعیف ہے کیونکہ یہ ایسی تکلیف ہے جس تک پہنچنا ممکن نہیں۔ بعض نے جہت کا قول کیا ہے۔ یہ تین وجوہ سے صحیح ہے: (۱) ممکن وہ ہے جس کے ساتھ تکلیف مرتب ہو۔ (۲) قرآن میں اس کا حکم ہے فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ۔ یعنی زمین کے مشرق یا مغرب میں ہو فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ۔ (۳) علماء نے لمبی صف سے حجت پکڑی ہے جو قطعی طور پر معلوم ہوتی ہے کہ وہ بیت اللہ کی عرض سے دگنی ہے۔

مسئلہ نمبر 5: اس آیت میں امام مالک اور ان کے موافق قول کرنے والوں کے نظریہ کی واضح حجت ہے کہ نمازی سامنے دیکھے، سجدہ کی جگہ نہ دیکھے۔ ثوری، امام ابوحنیفہ، امام شافعی، حسن بن حی نے کہا: اپنے سجدہ کی جگہ کی طرف دیکھے۔ شریک قاضی نے کہا: قیام میں سجدہ کی طرف دیکھے اور رکوع میں قدموں کی طرف دیکھے اور سجدہ میں اپنے ناک کی جگہ کی طرف دیکھے اور قعدہ میں اپنی گود کی طرف دیکھے۔ ابن عربی نے کہا: سامنے دیکھے کیونکہ اگر وہ اپنے سر کو ٹیڑھا کرے گا تو اس کا سر میں جو قیام فرض تھا وہ ضائع ہو گیا، حالانکہ سر تمام اعضاء سے معزز عضو ہے اگر سر کو سیدھا کرے گا اور تکلیف سے زمین کی طرف دیکھے گا تو اسے بہت زیادہ مشقت اور حرج لاحق ہوگی اور دین میں ہم پر حرج نہیں رکھی گئی، لیکن جو اس پر قادر ہو اس کے لئے یہ افضل ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ یعنی بیت المقدس سے قبلہ کا پھرنا حق ہے۔ اگر کہا جائے کہ وہ کیسے جانتے تھے جبکہ یہ نہ ان کے دین میں تھا اور نہ ان کی کتاب میں تھا؟ اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ جب انہوں نے اپنی کتاب سے جان لیا تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی ہیں تو انہوں نے یہ بھی جان لیا تھا کہ وہ حق کہتے ہیں اور حق کا حکم دیتے ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے: انہوں نے اپنے دین سے نسخ کا جواز جان لیا تھا اگرچہ بعض نے اس کا انکار کیا ہے۔ پس وہ قبلہ کے جواز کو جاننے والے ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ اس کا معنی گزر چکا ہے۔ ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے تعلمون تا کے ساتھ پڑھا ہے یہ اہل کتاب یا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو خطاب ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف آگاہ کیا گیا ہے کہ وہ بندوں کے اعمال کو مہمل نہیں چھوڑے گا اور ان سے غافل نہیں ہوگا اور اس کے ضمن میں وعید ہے۔ باقی قراء نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَلَئِنْ أَتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَا أَنْتَ بِتَابِعٍ

1۔ الہندی فی کنز العمال، صفحہ 212، جلد 12 حدیث نمبر 34714 (التراث الاسلامی)

قِبْلَتَهُمْ ۚ وَ مَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۗ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَآءَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ إِنَّكَ إِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

''اور اگر آپ لے آئیں اہل کتاب کے پاس ہر ایک دلیل (پھر بھی) نہیں پیروی کریں گے آپ کے قبلہ کی اور نہ آپ پیروی کرنے والے ہیں ان کے قبلہ کی اور نہ وہ ایک دوسرے کے قبلہ کو ماننے والے ہیں اور اگر (بفرض محال) آپ پیروی کریں ان کی خواہشوں کی اس کے بعد کہ آچکا آپ کے پاس علم تو یقیناً آپ اس وقت ظالموں میں (شمار) ہوں گے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَئِنْ أَتَيْتَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ کیونکہ انہوں نے کفر کیا ہے حالانکہ ان کے لئے حق واضح ہو چکا ہے، انہیں آیات وعلامات نفع نہیں دیں گی۔ قبلہ کی جمع مکسر قبَلٌ ہے اور جمع سالم قبلات ہے اور کسرہ کو فتحہ سے بدلنا جائز ہے اور تو کہے قِبلات اور کسرہ کو حذف کرنا اور با کو ساکن کرنا جائز ہے اور لئن کا جواب لو کے جواب کے ساتھ دیا گیا ہے۔ یہ اس کی ضد ہے کیونکہ لو اپنے جواب میں ماضی اور وقوع کو طلب کرتا ہے اور لئن استقبال کو طلب کرتا ہے۔

فراء اور اخفش نے کہا: لو کے جواب کے ساتھ جواب دیا گیا ہے کیونکہ ان کا معنی ہے لو اتیت۔ اسی طرح لئن کے جواب کے ساتھ لو کا جواب دیا جاتا ہے تو کہتا ہے لو احسنت احسن الیك اسی کی مثل قرآن میں ہے: وَلَئِنْ أَرْسَلْنَا رِيْحًا فَرَأَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا (روم:51) یعنی لو ارسلنا ریحاً۔ سیبویہ نے اس کی مخالفت کی ہے۔ اس نے کہا: لئن کا معنی لو کے مخالف ہے ایک دوسرے پر داخل نہیں ہوتا۔ اس کا معنی یہ کہ اگر آپ اہل کتاب کے پاس کوئی بھی نشانی لے آئیں وہ تمہارے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے۔ سیبویہ نے کہا: وَلَئِنْ أَرْسَلْنَا رِيْحًا فَرَأَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا (روم:51) کا معنی لیظلّنّ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا أَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ یہ لفظاً خبر ہے لیکن اپنے ضمن میں امر کو لئے ہوئے ہے یعنی ان میں سے کسی شے کی طرف مائل نہ ہوں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ یہود، نصاریٰ کے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں اور نصاریٰ، یہود کے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں۔ یہ سدی اور ابن زید سے مروی ہے۔ یہ ان کے اختلاف، تدابر اور گمراہی کے متعلق آگاہ کیا گیا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کا یہ معنی ہے کہ جو ان میں سے اسلام لے آئے ہیں وہ ان کے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں جو اسلام نہیں لائے۔ اور جو اسلام نہیں لائے وہ اسلام لانے والوں کے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں (1) اور پہلا معنی زیادہ واضح ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَآءَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ إِنَّكَ إِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ اس آیت میں خطاب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے وہ لوگ ہیں جن کا خواہش کی پیروی کرنا جائز ہے اور خواہش کی پیروی کرنے سے ظالم ہو جاتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایسا عمل کرنا جائز ہی نہیں ہے جس کی وجہ سے آپ ظالم ہو جائیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عصمت اور آپ سے ایسے اعمال سرزد نہ ہونے کی قطعیت کی وجہ سے امت کے ارادہ پر

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 223، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

محمول ہے۔ معاملہ کی بڑائی کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کیا گیا، نیز اس لئے کہ آپ پر یہ حکم نازل ہوا۔ الاهواء جمع ہے هوی کی۔ یہ پہلے گزر چکا ہے اسی طرح علم کی تفسیر بھی گزر چکی ہے اعادہ کا فائدہ نہیں۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَ اِنَّ فَرِیْقًا مِّنْهُمْ لَیَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۶﴾

''جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ پہچانتے ہیں انہیں جیسے وہ پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو اور بے شک ان میں سے ایک گروہ چھپاتا ہے حق کو جان بوجھ کر''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ، اَلَّذِیْنَ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور یَعْرِفُوْنَهٗ خبر ہے۔ الظّٰلِمِیْنَ کی صفت ہونے کی بنا پر محل جر میں ہونا بھی صحیح ہے اور یَعْرِفُوْنَ کا حال ہونا صحیح ہے یعنی وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور آپ کی رسالت کی صداقت کو جانتے ہیں۔ ضمیر کا مرجع حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ مجاہد اور قتادہ وغیرہما کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کا مطلب ہے وہ بیت المقدس سے کعبہ کی طرف قبلہ کا پھرنا جانتے تھے کہ وہ حق ہے۔ یہ حضرت ابن عباس، ابن جریج، ربیع اور قتادہ کا قول ہے۔ (1)

معرفت میں اَبْنَآءَ (بیٹوں) کو ذکر کیا ہے ان کے نفسوں کا ذکر نہیں کیا اگرچہ نفس زیادہ قریب ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان پر ایک ایسا وقت گزرتا ہے کہ وہ اپنے نفس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور کوئی ایسا وقت انسان پر نہیں گزرتا جس میں وہ اپنے بیٹے کو نہ جانتا ہو۔ روایت ہے کہ حضرت عمر نے عبداللہ بن سلام سے کہا کیا تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح جانتا ہے جس طرح اپنے بیٹے کو جانتا ہے؟ عبداللہ بن سلام نے کہا: ہاں میں آپ کو اپنے بیٹے سے زیادہ جانتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے آسمان میں امین کو اپنی زمین میں اپنے امین کی طرف اس کی نعت کے ساتھ بھیجا پس میں اسے جان گیا۔ اور میرا بیٹا میں نہیں جانتا اس کی ماں سے کیا ہوا۔ (2)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنَّ فَرِیْقًا مِّنْهُمْ لَیَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہ مجاہد، قتادہ اور خصیف کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: اَلْحَقَّ سے مراد استقبال کعبہ ہے جیسا کہ ابھی ہم نے ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ یہ عناداً ان کے انکار کی صحت میں ظاہر ہے (3)۔ اسی طرح ہے: وَ جَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَیْقَنَتْهَاۤ اَنْفُسُهُمْ (النمل: 14)

اور ارشاد ہے: فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ (البقرہ: 89)

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ ﴿۱۴۷﴾

''یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے تو ہرگز نہ بن جانا شک کرنے والوں سے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ، اَلْحَقُّ سے مراد استقبال کعبہ ہے۔ نہ وہ جو یہود نے آپ کو اپنا قبلہ بنایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے الحق کو منصوب پڑھا، یَعْلَمُوْنَ کی وجہ سے یعنی وہ حق کو جانتے ہیں اور الزم

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً

الحق کی تقدیر پر بھی اس کی نصب صحیح ہے اور رفع مبتدا ہونے کے اعتبار سے ہے یا مبتدا کے اضمار کی بنا پر ہے۔ تقدیر عبارت ہوگی ھو الحق، یا فعل کے اضمار پر ہوگا یعنی جاء الحقُ... نحاس نے کہا: سورۃ الانبیاء میں اَلْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ ہم کسی کو نہیں جانتے کہ اس نے منصوب کے علاوہ پڑھا ہو۔ ان کے درمیان فرق یہ ہے کہ سورہ بقرہ میں آیت کے آغاز میں جبکہ سورہ انبیاء میں ایسا نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝ ۔ اَلْمُمْتَرِيْنَ کا معنی ہے: شک کرنے والے۔ خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد امت ہے، کہا جاتا ہے: امتریٰ فلان فی کذا جب کسی کو کبھی یقین حاصل ہو اور کبھی شک لاحق ہو، اور وہ ان میں سے ہر ایک کو دوسرے سے دور کرے، اس سے المراء (جھگڑنا) ہے، ہر شخص اپنے مقابل کے قول میں شک کرتا ہے۔ الامتراء فی الشی، کسی شی میں شک کرنا، اسی طرح التماری ہے۔ طبری نے استشہاد کے طور پر اعشی کا قول ذکر کیا ہے کہ ممترین کا معنی شاکون ہے۔

تدر علی أسْوُق الممترین رکضاً اذا ما السراب ارجحنّ

ابن عطیہ نے کہا: اس میں اسے وہم ہوا ہے کیونکہ ابوعبیدہ وغیرہ نے کہا: الممتردن۔ شعر میں جو استعمال ہوا اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے پیروں کے ساتھ گھوڑوں کو تیز چلاتے ہیں۔ شعر میں شک کے معنی میں نہیں ہے جیسا کہ طبری نے کہا ہے (1)۔

میں کہتا ہوں: اس میں شک کا معنی موجود ہے کیونکہ مالک اپنے گھوڑے کو آزماتا ہے کہ یہ چلنے کی عادت پر قائم ہے یا نہیں تاکہ اسے کوئی مصیبت لاحق نہ ہو، یا یہ ابتدا میں خریدنے کے وقت ہوتا ہے وہ اسے چلاتا ہے تاکہ اس کے چلنے کی مقدار جان لے۔ جوہری نے کہا مریت الفرس جب تو کوڑے وغیرہ کے ساتھ اس کا چلنا نکالے۔ اسم المریۃ ہے یہ میم کے کسرہ کے ساتھ ہے کبھی میم کو ضمہ دیا جاتا ہے، مریتُ الناقۃ مَرْياً جب تو اس کی کھیری کو مس کرے تاکہ دودھ دوہے، اَمْرَتْ جب اس کا دودھ اتر آئے۔ اسم المِریۃُ ہے میم کے کسرہ کے ساتھ اور میم کو ضمہ دینا غلط ہے۔ المریۃ کا معنی شک ہے کبھی اس کو ضمہ دیا جاتا ہے یہ ضمہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۗ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ۗ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

"اور ہر قوم کے لئے ایک سمت (مقرر) ہے وہ اسی کی طرف منہ کرتی ہے۔ پس آگے بڑھ جاؤ دوسروں سے نیکیوں میں تم کہیں بھی ہو، لے آئے گا اللہ تعالیٰ تم سب کو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے"۔

اس میں چار مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ، الوجهة کا وزن فِعلةٌ ہے اور یہ المواجهة سے ہے۔ الوجهة، الجهة اور الوجه کا ایک معنی ہے۔ اس سے مراد قبلہ ہے یعنی وہ تمہارے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے اور آپ ان کے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 224، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے ہر ایک کے لئے ایک سمت ہے خواہ حق ہے یا خواہش نفس ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هُوَ مُوَلِّيهَا، هُوَ ضمیر لفظ کل کی طرف لوٹ رہی ہے نہ کہ اس کے معنی کی طرف کیونکہ اگر معنی کی طرف راجع ہوتی تو هم مولوها ہوتا۔ ھا ضمیر مفعول اول ہے اور دوسرا مفعول مولی کا محذوف ہے۔ عبارت یوں ہوتی ھو مولیھا وجھه و نفسه، مطلب یہ ہے کہ ہر صاحب ملت کا ایک قبلہ ہے۔ صاحب قبلہ اپنا چہرہ ادھر پھیرنے والا ہے۔ یہ واحد کا صیغہ لفظ کل کے اعتبار سے ہے۔ یہ ربیع، عطا اور حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ حضرت علی بن سلیمان نے کہا: مولیھا کا معنی ہے: متولیھا۔ ابن عبس اور ابن عامر نے مولاھا مجہول پڑھا ہے (1)۔ اس قرأت پر ضمیر واحد کی طرف لوٹے گی یعنی لوگوں میں سے ہر ایک کے لئے قبلہ ہے۔ الواحد مولاھا یعنی ہر ایک اس کی طرف پھیرا گیا ہے۔ یہ زجاج کا قول ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جمہور کی قراءت پر هُوَ ضمیر اللہ تعالیٰ کا اسم ہو، اگرچہ پہلے اس کا ذکر نہیں ہے کیونکہ یہ معلوم ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کرنے والا ہے معنی یہ ہوگا کہ ہر صاحب ملت کا ایک قبلہ ہے اللہ تعالیٰ اسے اس کی طرف پھیرنے والا ہے۔

طبری نے حکایت کیا ہے کہ ایک قوم نے ولکل وجھة پڑھا ہے یعنی کل کو وجھة کی طرف مضاف کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: طبری نے غلطی کی ہے (2)، جبکہ یہ تعبیر قابل توجہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر جہت کی نیکی میں سبقت کر جس کی طرف تمہیں اس نے پھیرا ہے اور اپنے معاملہ میں اس اور اس کے چکر میں نہ پڑو۔ یعنی تم پر تمام امور میں اطاعت لازم ہے۔ لکل وجھة کو فاستبقوا پر مقدم کیا گیا ہے الوجھه کے اہتمام کی وجہ سے جیسا کہ مفعول کو مقدم کیا جاتا ہے۔ ابو عمرو دانی نے یہ قرأت حضرت ابن عباس سے ذکر کی ہے وجھة میں واو سلامت رہی ہے عدۃ اور زنۃ اور اس کے درمیان فرق کرنے کے لئے کیونکہ جھة ظرف ہے اور یہ مصادر ہیں۔ ابو علی نے کہا ایک قوم کا خیال ہے کہ یہ بھی مصدر ہے اور خلاف قیاس ہے۔ ایک قوم کا خیال ہے کہ یہ اسم ہے مصدر نہیں ہے۔ ابو علی کے علاوہ علماء نے کہا جب تو اس سے مصدر مراد لے تو توجھة کہے گا اور ظرف میں بھی کبھی الجھة کہا جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ یعنی الی الخیرات حرف جر کو حذف کیا گیا یعنی اللہ تعالیٰ نے البیت الحرام کی طرف منہ کرنے کا جو تمہیں حکم دیا ہے اس میں جلدی کرو۔ اگرچہ یہ اپنے ضمن میں تمام طاعات کی طرف جلدی کرنے کا معنی لئے ہوئے ہے۔ آیات کے سیاق کی وجہ سے استقبال قبلہ مراد لیا گیا ہے۔ معنی یہ ہے کہ نماز کو اول وقت میں پڑھنے کے لئے جلدی کرو۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ نسائی نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نماز کی طرف جلدی جانے والا اس شخص کی مثل ہے جو اونٹ قربانی دیتا ہے پھر اس کے پیچھے آنے والا اس کی مانند ہے جو گائے قربانی دیتا ہے پھر اس کے پیچھے آنے والا اس شخص کی مانند ہے جو مینڈھا قربانی دیتا ہے پھر وہ جو اس کے پیچھے آنے والا ہے وہ اس کی طرح ہے جو مرغی قربانی دیتا ہے پھر جو اس کے پیچھے آنے والا ہے اس کی طرح ہے جو انڈا قربانی دیتا ہے (3)۔ دار قطنی نے

1۔ معالم التنزیل، صفحہ 175، جلد 1 (دار الفکر) 2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 224، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

3۔ سنن نسائی، کتاب الامامۃ والجماعۃ، صفحہ 138، جلد 1 (وزارت تعلیم)

حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی نماز کو اپنے وقت پر پڑھتا ہے حالانکہ اس نے پہلے وقت میں اس کو ترک کر دیا تھا جو اس کے اہل اور مال سے بہتر تھا(1)۔ مالک نے یحییٰ بن سعید سے ان کا قول نقل کیا ہے۔ دارقطنی نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: الصلاۃ فی اول وقتہا(2) بہتر عمل نماز کو وقت پر ادا کرنا ہے۔ حضرت ابن مسعود کی حدیث میں اول وقتہا ہے۔ اس میں پہلے فی حرف جر نہیں ہے۔

ابراہیم بن عبدالملک نے حضرت ابومحذورہ سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے ان کے دادا سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اول وقت اللہ کی رضا ہے اور درمیانی وقت اللہ کی رحمت ہے اور آخر وقت اللہ کا عفو ہے(3)، ابن عربی نے زائد ذکر کیا ہے۔ ابوبکر نے کہا: اللہ کی رضا ہمیں اللہ تعالیٰ کی عفو سے زیادہ محبوب ہے، کیونکہ اس کی رضا محسنین کے لئے ہے اور اس کا عفو کوتاہی کرنے والوں کے لئے ہے یہ امام شافعی کا اختیار ہے۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا آخری وقت افضل ہے کیونکہ یہ وجوب کا وقت ہے، امام مالک کے قول میں تفصیل ہے۔ صبح اور مغرب میں پہلا وقت افضل ہے۔ صبح میں افضیلت حضرت عائشہ کی حدیث کی وجہ سے ہے کہ فرمایا: رسول اللہ ﷺ صبح کی نماز پڑھتے تھے عورتیں اپنی چادروں میں لپٹی ہوئی لوٹتی تھیں وہ اندھیرے کی وجہ سے پہچانی نہیں جاتی تھیں(4)۔ اور رہی مغرب کی پہلے وقت میں افضیلت تو وہ حضرت سلمہ بن اکوع کی حدیث کی وجہ سے ہے۔ آپ مغرب کی نماز پڑھتے تھے جب سورج غروب ہوتا تھا اور پردے میں چھپ جاتا تھا(5)۔ ان دونوں حدیثوں کو مسلم نے نقل کیا ہے اور نماز عشاء میں تاخیر افضل ہے جو دیر سے پڑھنے پر قادر ہو۔ حضرت ابن عمر نے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم ایک رات عشاء کی نماز کے لئے رسول اللہ ﷺ کا انتظار کرتے رہے، آپ ہمارے پاس تشریف لائے جب کہ رات کا تیسرا حصہ یا اس کے بعد کا وقت گزر چکا تھا۔ ہمیں معلوم نہیں آپ اپنے گھر والوں میں مشغول رہے یا کسی اور وجہ سے مشغول رہے۔ آپ جب باہر نکلے تو فرمایا: تم نماز کا انتظار کر رہے ہو تمہارے علاوہ کوئی اہل دین اس کا انتظار نہیں کر رہا۔ اگر میری امت پر شاق نہ ہوتا تو میں انہیں اس وقت نماز پڑھاتا(6)۔ بخاری میں حضرت انس سے مروی ہے، فرمایا: نبی کریم ﷺ نے عشاء کی نماز کو نصف رات تک مؤخر فرمایا پھر نماز پڑھی(7)۔ حضرت ابوبرزہ نے کہا: نبی کریم ﷺ عشاء کی نماز میں تاخیر کو پسند فرماتے تھے، اور رہی ظہر کی نماز کیونکہ یہ لوگوں کی غفلت کے وقت آتی ہے۔ پس اس میں تھوڑی تاخیر مستحب ہے تاکہ لوگ تیار ہو جائیں اور جمع ہو جائیں۔ ابوالفرج نے کہا امام مالک نے فرمایا ہر نماز میں افضل وقت پہلا وقت ہے مگر سخت گرمی میں ظہر کی نماز کے لئے تاخیر افضل ہے۔ ابن ابی اویس

1۔ سنن دارقطنی، النہی عن الصلاۃ بعد صلاۃ الفجر و بعد صلاۃ العصر، صفحہ 248، جلد 1 (دار المحاسن) 2۔ ایضاً، صفحہ 247، جلد 1 (دار المحاسن)
3۔ ایضاً، صفحہ 250، جلد 1 4۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، صفحہ 230، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
5۔ ایضاً، صفحہ 228، جلد 1 6۔ ایضاً، صفحہ 229، جلد 1
7۔ صحیح بخاری، کتاب مواقیت الصلوٰۃ، باب وقت العشاء الی نصف اللیل، صفحہ 81، جلد 1 (وزارت تعلیم)

نے کہا امام مالک زوال کے وقت ظہر کی نماز پڑھنا ناپسند فرماتے تھے۔ لیکن اس کے بعد پڑھتے اور فرماتے وہ خوارج کی نماز ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح ترمذی میں حضرت ابوذر غفاری سے مروی ہے، فرمایا: ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں تھے، مؤذن نے ظہر کی اذان دینے کا ارادہ کیا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا ٹھنڈا کرو۔ پھر اس نے اذان دینے کا ارادہ کیا تو پھر آپ نے فرمایا: ٹھنڈا کرو حتیٰ کہ ہم نے ٹیلوں کا سایہ دیکھا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: گرمی کی شدت جہنم کی بھڑک سے ہے جب گرمی شدید ہو تو نماز کو ٹھنڈے وقت میں پڑھو (1)۔

صحیح مسلم میں حضرت انس سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ ظہر کی نماز پڑھتے تھے جب سورج ڈھل جاتا تھا (2) اور دونوں حدیثوں کو حضرت انس کی روایت جمع کرتی ہے کہ جب گرمی شدید ہوتی تو نماز ٹھنڈی کر کے پڑھتے تھے اور جب سردی ہوتی تو جلدی پڑھتے۔

ابوعیسیٰ ترمذی نے کہا: اہل علم کی ایک جماعت نے سخت گرمی میں ظہر کی نماز میں تاخیر کو پسند کیا ہے۔ یہ ابن مبارک، احمد اور اسحاق کا قول ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: ظہر کی نماز کو ٹھنڈا کرنا چاہیے جب مسجد کے نمازی دور سے آتے ہوں، جو تنہا نماز پڑھنے والا ہے اور وہ جو اپنی قوم کی مسجد میں نماز پڑھنے والا ہے میں اس کے لئے پسند کرتا ہوں کہ وہ سخت گرمی میں بھی نماز کو مؤخر نہ کرے۔ ابوعیسیٰ نے کہا: جن علماء کا سخت گرمی میں ظہر کو مؤخر کرنے کا نظریہ ہے وہ اتباع کے زیادہ قریب ہے اور رہا امام شافعی کا قول کہ دور سے آنے والوں کے لئے اور لوگوں پر مشقت کی وجہ سے رخصت ہے کیونکہ حضرت ابوذر کی حدیث امام شافعی کے قول کے خلاف پر دلالت کرتی ہے۔ حضرت ابوذر نے کہا: ہم ایک سفر میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے حضرت بلال نے ظہر کی اذان دینے کا ارادہ فرمایا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے بلال! ٹھنڈا کرو، ٹھنڈا کرو، اگر معاملہ اس طرح ہوتا جس طرح امام شافعی نے کہا ہے تو یہاں وقت کو ٹھنڈا کرنے کا کوئی معنی نہیں تھا کیونکہ سفر میں سب لوگ جمع تھے، وہ دور سے آنے کے محتاج نہ تھے (3) اور رہی عصر کی نماز تو اس کو جلدی پڑھنا افضل ہے۔ ہمارے مذہب میں کوئی اختلاف نہیں کہ جماعت کی امید کرتے ہوئے نماز کو مؤخر کرنا اس کو مقدم کرنے سے افضل ہے۔ اور جماعت کی فضیلت معلوم ہے، اول وقت کی فضیلت مجہول ہے اور معلوم کی تحصیل اولیٰ ہے اور یہ ابن عربی کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اَیْنَ مَا تَكُوْنُوْا** یہ شرط ہے اور اس کا جواب **یَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِیْعًا** ہے۔ یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تم سب کو لے آئے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنا وصف ہر چیز پر قدرت کے ساتھ بیان فرمایا تاکہ مرنے کے بعد اور بوسیدگی کے بعد اعادہ کا جو ذکر کیا گیا ہے اس کے ساتھ صفت مناسب ہو جائے۔

وَ مِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ اِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ

1۔ صحیح بخاری، کتاب مواقیت الصلوٰۃ، صفحہ 77، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب اوقات الصلوٰۃ، صفحہ 223، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ جامع ترمذی، کتاب الصلوٰۃ، باب ما جاء فی تاخیر الظهر، صفحہ 23، جلد 1 (وزارت تعلیم)

رَّبِّكَ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۹﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۤ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۤ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ ۤ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾

''اور جہاں سے بھی آپ (باہر) نکلیں تو موڑ لیا کریں (نماز کے وقت) اپنا رخ مسجد حرام کی طرف اور بے شک یہی حق ہے آپ کے رب کی طرف سے اور نہیں اللہ تعالیٰ بے خبر جو کچھ تم کرتے ہو۔ اور جہاں سے آپ (باہر) نکلیں تو موڑ لیا کریں اپنا رخ (نماز کے وقت) مسجد حرام کی طرف اور (اے مسلمانو!) جہاں کہیں تم ہو پھیر لیا کرو اپنے منہ اس کی طرف تاکہ نہ رہے لوگوں کو تم پر اعتراض (کی گنجائش) بجز ان لوگوں کے جو ناانصافی کریں ان میں سے۔ سو نہ ڈرو تم ان سے (بلکہ صرف) مجھ سے ڈرا کرو تاکہ میں پورا کر دوں اپنا انعام تم پر تاکہ راہ راست پر ثابت قدم رہو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ بعض علماء نے فرمایا: یہ استقبال کعبہ کے امر کی تاکید اور اس کے اہتمام کے لئے ہے کیونکہ تحویل کا موقع لوگوں کے نفوس میں مشکل تھا تو معاملہ کو مؤکد فرمایا تاکہ لوگ اس کے اہتمام کو دیکھیں اور ان پر تخفیف ہو جائے اور ان کے نفوس کو تسکین حاصل ہو جائے۔ بعض علماء نے فرمایا: پہلے فَوَلِّ وَجْهَكَ سے مراد کعبہ کی سمت ہے یعنی جب اسے دیکھ رہا ہو تو عین اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے پھر فرمایا حَيْثُ مَا كُنْتُمْ مسلمان جو دوسری تمام مساجد میں ہیں مدینہ طیبہ وغیرہ میں وہ کعبہ کی سمت منہ کریں۔ پھر فرمایا: وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ یعنی سفر میں استقبال کعبہ واجب ہے۔ پس زمین کی تمام اطراف میں تمام جگہوں میں کعبہ کی طرف منہ کرنے کا یہ حکم تھا۔ یہ قول پہلے قول سے بہتر ہے کیونکہ اس میں ہر آیت کو ایک فائدہ پر محمول کیا گیا ہے۔ دارقطنی نے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: نبی کریم ﷺ جب سفر میں ہوتے اور اپنی سواری پر نماز پڑھنے کا ارادہ کرتے تو قبلہ کی طرف منہ کرتے اور تکبیر کہتے پھر نماز پڑھتے رہتے خواہ جدھر بھی سواری کا رخ ہوتا (1)۔ ابوداؤد نے بھی اسے روایت کیا ہے (2)۔ امام شافعی، امام احمد اور ابوثور کا یہی قول ہے۔ امام مالک کا نظریہ یہ ہے کہ استقبال کعبہ لازم نہیں۔ کیونکہ حضرت ابن عمر کی حدیث میں ہے فرمایا، رسول اللہ ﷺ مکہ میں مدینہ طیبہ آتے ہوئے سواری پر نماز پڑھتے تھے۔ فرمایا: اس کے متعلق نازل ہوا: فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (البقرہ: 115) (3) یہ پہلے گزر چکا ہے۔

میں کہتا ہوں: ان احادیث کے درمیان تعارض نہیں ہے کیونکہ یہ مطلق اور مقید کے باب سے ہیں۔ امام شافعی کا قول اولیٰ

1۔ سنن دارقطنی، صفۃ صلاۃ التطوع فی السفر، صفحہ 396، جلد 1 (دار المحاسن)

2۔ سنن ابی داؤد، باب التطوع علی الراحلۃ والوتر، صفحہ 173، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح بخاری، باب وما جعلنا القبلۃ، صفحہ 645، جلد 2 (وزارت تعلیم)

ہے اور اس کے متعلق حضرت انس کی حدیث صحیح ہے۔ روایت ہے کہ جعفر بن محمد سے قرآن میں تکرار کے بارے پوچھا گیا؟ تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ تمام لوگ سارا قرآن یاد نہیں کریں گے: اگر قصص مکرر نہ ہوتے تو یہ بعض کے پاس ہوتے اور بعض کے پاس نہ ہوتے تکرار کیا گیا تا کہ جو کچھ حصہ یاد کرے اس کے پاس بھی یہ قصص ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مجاہد نے کہا(1): اس سے مراد عرب کے مشرک ہیں ان کی حجت سے مراد ان کا قول ہے کہ آپ نے ہمارے قبلہ کی طرف رجوع کر لیا تو انہیں اس ارشاد قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ (البقرہ:42) سے جواب دیا گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ کا معنی ہے تا کہ تم نہ کہو کہ تمہیں استقبال کعبہ کا حکم دیا گیا تھا حالانکہ تم اسے خیال نہیں کرتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ (البقرہ:144) تو پہلے حکم کو زائل کر دیا۔ ابو عبیدہ نے کہا الا یہاں واؤ کے معنی میں ہے یعنی والذین ظلموا۔ یہ استثناء واو کے معنی میں ہے۔ اسی سے شاعر کا قول ہے:

ما بالمدينة دارٌ غير واحدة　　　دار الخليفة الا دار مروانا

گویا اس شعر میں کہا: الا دار الخليفة و دار مروان۔

اسی طرح یہ ارشاد ہے: إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۝ (التین) یعنی والذین آمنوا زجاج نے اس قول کو باطل قرار دیا ہے(2)۔ اس نے کہا یہ حذاق نحویوں کے نزدیک غلط ہے اور اس میں معانی کا بطلان ہے اور اِلَّا اور اس کا مابعد، اپنے ذکر سے مستغنی ہو جائیں گے۔ نحویوں کے نزدیک قول یہ ہے کہ یہ پہلے کلام سے استثناء نہیں ہے، یعنی جن لوگوں نے ان میں سے ظلم کیا وہ حجت پکڑتے ہیں۔ ابو اسحاق زجاج نے کہا: یعنی اللہ تعالیٰ نے قبلہ کے متعلق احتجاج کا امر اپنے فرمان وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا میں بتایا تا کہ لوگوں کے لئے تم پر حجت نہ رہے مگر جو ایک واضح امر میں احتجاج کر کے ظلم کرے۔ جیسے تو کہتا ہے: مالك على حجة الا الظلم او الا ان تظلمنى، یعنی مجھ پر تیرے لئے یقیناً کوئی حجت نہیں۔ لیکن تو مجھ پر ظلم کرتا ہے۔ اس کے ظلم کو حجت کہا کیونکہ اس ظالم سے حجت پکڑنے والے نے اسے حجت کہا ہے۔ اگرچہ زائل ہونے والی حجت ہے۔ قطرب نے کہا یہ بھی جائز ہے کہ معنی یہ ہو کہ تم پر لوگوں کے لئے حجت نہ ہو مگر ان پر جنہوں نے ظلم کیا، الذين، عليكم میں کم ضمیر سے بدل ہوگا۔ ایک گروہ نے کہا الا الذين مستثنیٰ متصل ہے۔ اس کا معنی حضرت ابن عباس وغیرہ سے مروی ہے۔ طبری نے اس کو اختیار کیا ہے اور کہا اللہ تعالیٰ نے نفی فرمائی کہ کسی کے لئے استقبال قبلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ پر حجت ہو۔ معنی یہ ہے کہ تم پر کسی کے لئے حجت نہیں ہے مگر باطل حجت...... اس حیثیت سے کہ انہوں نے کہا: انہیں کس چیز نے پھیر دیا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دین میں متحیر ہے۔ وہ ہمارے قبلہ کی طرف متوجہ نہیں ہوا مگر اس لئے کہ ہم اس سے زیادہ ہدایت یافتہ ہیں، اس کے علاوہ وہ اقوال جو بت پرستوں، یہودیوں یا منافقوں سے صادر ہوتے تھے۔ حجت سے مراد مخاصمت اور جھگڑنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو حجت کہا اور اس کے فساد کا حکم لگایا کیونکہ یہ ظالموں کی طرف سے

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　　2۔ ایضاً

تھی۔ ابن عطیہ نے کہا: بعض علماء نے کہا(1): یہ مستثنیٰ منقطع ہے۔ یہ اس صورت میں ہوگا کہ الناس سے مراد یہود ہوں۔ پھر عرب کے کفار کی استثناء کی گویا فرمایا: لیکن جنہوں نے ظلم کیا جو تم سے جھگڑتے ہیں۔ لیکن مِنْهُمْ کا قول اس تاویل کو رد کرتا ہے معنی یہ ہے کہ: لیکن جنہوں نے ظلم کیا یعنی کفار قریش نے اپنے اس قول میں ظلم کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے قبلہ کی طرف لوٹ آیا ہے وہ ہمارے پورے دین کی طرف لوٹ آئے گا۔ اور اس میں ہر وہ شخص داخل ہوگا جس نے بھی یہود کے علاوہ نازل ہونے والی آیت میں کلام کیا۔ حضرت ابن عباس، زید بن علی اور ابن زید نے الا الذین ظلموا پڑھا ہے یعنی ہمزہ کے فتحہ اور لام کی تخفیف کے ساتھ۔ اس معنی پر کہ یہ نیا کلام ہے اس صورت میں الذین ظلموا مبتدا ہوگا یا اغراء کے معنی پر ہوگا۔ اس صورت میں الذین فعل مقدر کے ساتھ منصوب ہوگا(2)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا تَخْشَوْهُمْ۔ یعنی لوگوں سے نہ ڈرو وَاخْشَوْنِي، خشیت کا اصل معنی وہ طمانیت ہے جو کسی تکلیف سے بچنے پر دل میں پیدا ہوتی ہے اور خوف کا مطلب دل کا گھبرانا ہے اعضاء ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ اعضاء کی خفت کی وجہ سے اسے خوف کہا جاتا ہے۔ آیت کا معنی اللہ تعالیٰ کے سوا ئی تحقیر کرنا ہے، اللہ کے سوا ہر ایک کے امر کو چھوڑنا ہے اور اللہ تعالیٰ کے امر کی رعایت کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ یہ لِئَلَّا يَكُونَ پر معطوف ہے۔ یعنی لان اتم۔ یہ اخفش کا قول ہے بعض نے فرمایا: یہ مبتدا کی حیثیت سے محل رفع میں ہے اور اس کی خبر مضمر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے: ولا تم نعمتی علیکم عرفتکم قبلتی۔ یعنی میں تمہیں اپنے قبلہ کی معرفت عطا کر کے اپنی نعمت کو مکمل کردوں۔ یہ زجاج کا قول ہے، نعمت کے مکمل کرنے سے مراد قبلہ کی طرف رہنمائی کرنا ہے۔ بعض نے فرمایا: اتمام نعمت سے مراد جنت کا دخول ہے۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا: بندے پر اللہ تعالیٰ کی نعمت مکمل نہ ہوگی حتیٰ کہ اسے جنت میں داخل کردے گا۔ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾

”جیسا کہ بھیجا ہم نے تمہارے پاس رسول تم میں سے، پڑھ کر سناتا ہے تمہیں ہماری آیتیں اور پاک کرتا ہے تمہیں اور سکھاتا ہے تمہیں کتاب وحکمت اور تعلیم دیتا ہے تمہیں ایسی باتوں کی جنہیں تم جانتے ہی نہیں تھے“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَمَآ اَرْسَلْنَا کاف مصدر محذوف کی صفت کے اعتبار سے محل نصب میں ہے۔ معنی یہ ہے لا تم نعمتی علیکم اتماماً مثل ما ارسلنا۔ یہ فراء کا قول ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ تمام اقوال میں سے بہتر قول ہے۔ یعنی تم پر ابراہیم کی سنت کے بیان میں اپنی نعمت مکمل کردوں جس طرح ہم نے رسول مبعوث کیا(3)۔ بعض نے فرمایا اس کا معنی ہے لعلکم تهتدون اهتداء مثل ما ارسلنا، تاکہ تم ہدایت پاؤ ایسی ہدایت جو ہمارے رسول بھیجنے کی طرح تھی۔ بعض نے فرمایا: یہ محل نصب میں بحیثیت حال ہے۔ معنی ہے میں تم پر اس حال میں اپنی نعمت مکمل کردوں۔ تشبیہ اس طرح واقع ہے کہ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 225، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 3۔ ایضاً، صفحہ 226، جلد 1

قبلہ میں نعمت، رسالت میں نعمت کی طرح ہے۔ ذکر جس کا حکم دیا گیا ہے وہ بڑائی میں نعمت کی بڑائی کی طرح ہے۔ بعض نے فرمایا: کلام کے معنی میں تقدیم و تاخیر ہے یعنی مجھے یاد کرو جس طرح ہم نے رسول بھیجا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اسے زجاج نے پسند کیا ہے یعنی جس طرح ہم نے تم میں رسول بھیجا جسے تم سچائی کے ساتھ پہچانتے ہو۔ پس تم مجھے توحید کے ساتھ اور اسے تصدیق کے ساتھ یاد کرو۔ اس قول پر تھتدون پر وقف جائز ہوگا۔

میں کہتا ہوں: اسی کو حکیم ترمذی نے اپنی کتاب میں اختیار کیا ہے، یعنی جس طرح میں نے تم پہ احسان کیے ہیں جن کو میں نے تم پر شمار کیا ہے۔ پس تم شکر کے ساتھ مجھے یاد کرو میں مزید نعمت کے ساتھ تجھے یاد کروں گا کیونکہ تمہارے اس ذکر میں میرے لئے شکر ہے اور میں نے شکر پر تم سے مزید کا وعدہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ (ابراہیم: 7) یہاں کما میں کاف اور سورت انفال میں كَمَاۤ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ (انفال: 5) میں کاف اور سورہ حجر کے آخر میں كَمَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ۝ (الحجر) میں کاف، اپنے مابعد کے متعلق ہے اس کا بیان آگے آئے گا۔

فَاذْكُرُوْنِيْۤ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ۝ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝

''سو تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا اور شکر ادا کیا کرو میرا اور میری ناشکری نہ کیا کرو۔ اے ایمان والو! مدد طلب کیا کرو صبر اور نماز (کے ذریعہ) سے بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاذْكُرُوْنِيْۤ اَذْكُرْكُمْ یہ امر اور جواب امر ہے۔ اس میں مجازاۃ کا معنی ہے۔ اس وجہ سے اسے جزم دی گئی ہے۔ ذکر کی اصل مذکور کے لئے دل کا متنبہ ہونا اور اس کے لئے دل کا بیدار ہونا۔ ذکر باللسان کو ذکر کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ذکر قلبی پر دلالت کرتا ہے لیکن جب زبانی ذکر پر کثرت سے ذکر کا اطلاق ہوا تو یہی ذکر سمجھا جانے لگا۔ آیت کا معنی ہے: تم اطاعت کے ساتھ میرا ذکر کرو میں تمہارا ثواب اور مغفرت کے ساتھ ذکر کروں گا۔ یہ حضرت سعید بن جبیر کا قول ہے اور اسی طرح فرمایا: ذکر، اللہ کی اطاعت ہے جس نے اس کی اطاعت نہ کی اس نے اس کا ذکر نہیں کیا، اگرچہ وہ کثرت سے تسبیح، تہلیل اور قرآن کی تلاوت کرے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اس نے اللہ کا ذکر کیا اگرچہ اس کی نماز اور روزہ کم بھی ہوں اور خیر کے اعمال تھوڑے بھی ہوں اور جس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی وہ اللہ تعالیٰ کو بھول گیا، اگرچہ نماز، روزہ اور خیر کے کام زیادہ بھی ہوں۔ ابو عبید اللہ محمد بن خویز منداد نے ''احکام القرآن'' میں اس کو ذکر کیا ہے...... ابو عثمان نہدی نے کہا: میں اس گھڑی کو جانتا ہوں جب اللہ تعالیٰ ہمارا ذکر کرتا ہے، ان سے پوچھا گیا تم یہ کیسے جان لیتے ہو؟ ابو عثمان نے کہا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَاذْكُرُوْنِيْۤ اَذْكُرْكُمْ (تم میرا ذکر کرو میں تمہارا ذکر کروں گا) سدی نے کہا: جو بندہ اللہ کا ذکر کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا ذکر کرتا ہے، جو مومن اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اپنی رحمت سے یاد کرتا ہے اور کوئی کافر اسے یاد نہیں کرتا مگر اللہ تعالیٰ اسے عذاب سے یاد کرتا ہے (1)۔ ابو عثمان سے پوچھا گیا کہ ہم اللہ کا ذکر کرتے ہیں لیکن ہم اپنے دلوں

1۔ تفسیر طبری، صفحہ 46، جلد 2 (دار احیاء التراث العربی)

میں کوئی مٹھاس اور ذوق نہیں پاتے؟ ابو عثمان نے کہا: تم اللہ تعالیٰ کی اس پر حمد کرو کہ اس نے تمہارے ظاہری اعضاء کو اطاعت کے ساتھ مزین کیا۔ حضرت ذوالنون مصری نے کہا: جس نے حقیقۃً اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا وہ اپنے پہلو میں ہر چیز کو بھول گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر ہر چیز کی حفاظت کی اور اللہ تعالیٰ اس کے لئے ہر چیز سے عوض ہوگا۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے کہا: ابن آدم نے کوئی ایسا عمل نہیں کیا جو اسے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے، اللہ تعالیٰ کے ذکر سے زیادہ نجات دینے والا ہو۔

ذکر کی فضیلت اور اس کے ثواب میں احادیث کثیر ہیں جن کو ائمہ حدیث نے ذکر کیا ہے۔ ابن ماجہ نے حضرت عبداللہ بن بسر سے روایت کیا ہے کہ ایک اعرابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: اسلام کی شرائع (احکام) بہت سے ہیں مجھے ان میں سے کوئی ایسی چیز بتائیں جس کو میں مضبوطی سے پکڑ لوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیری زبان ہر وقت اللہ تعالیٰ کے ذکر سے تر ہو(1)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ میرا ذکر کرتا ہے، اور اس کے ہونٹ میرے ذکر کے ساتھ متحرک ہوتے ہیں (2)۔ اس عنوان کی احادیث اور ذکر کا مزید بیان يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا (احزاب) کے تحت آئے گا ذکر سے مراد دل کا ذکر ہے جو عمومی حالات میں ہمیشہ رہنا واجب ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ فراء نے کہا: کہا جاتا ہے: شكرتك و شكرت لك نصحتك و نصحت لك۔ پہلا فصیح ہے۔ شکر کا مطلب احسان کو جاننا اور اس کو بیان کرنا ہے اس کا لغوی معنی ظاہر ہونا ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ بندے کا اللہ تعالیٰ کا شکر یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احسان کو یاد کر کے اس کی ثنا کرے اور اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے کا شکر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی اطاعت پر اپنے بندے کی تعریف فرماتا ہے مگر بندے کا شکر زبان سے اور دل سے طاعات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے انعام کو یاد کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَكْفُرُوْنِ یہ نہی ہے اسی وجہ سے جمع کا نون حذف کیا گیا ہے اور یہ نون متکلم کا ہے اور یا کو حذف کیا گیا کیونکہ یہ آیت کا سرا ہے اور غیر قرآن میں اس کا اثبات احسن ہے، یعنی میری نعمت اور میرے احسان کا انکار نہ کرو۔ یہاں کفر سے مراد جھٹلانا نہیں بلکہ نعمت کا چھپانا ہے۔ کفر کے لغوی معنی کی تحقیق گزر چکی ہے اور صبر اور نماز سے استعانت کا معنی بھی گزر چکا ہے۔ اس لئے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝۱۵۴

''اور نہ کہا کرو انہیں جو قتل کئے جاتے ہیں اللہ کی راہ میں کہ وہ مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم (اسے) سمجھ نہیں سکتے''۔

یہ اس آیت کی مثل ہے: وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝۱۶۹ (آل عمران) اس آیت کے تحت شہید اور شہداء کے احکام کا بیان آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

جب اللہ تعالیٰ شہداء کو ان کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے تاکہ انہیں رزق دے تو جائز ہے کہ وہ کفار کو زندہ کرے تاکہ

1۔ سنن ابن ماجہ، باب فضل الذکر، صفحہ 277، (وزارت تعلیم) 2۔ ایضاً

انہیں عذاب دے۔ اس آیت میں عذاب قبر پر دلیل ہے۔ شہداء زندہ ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ اس کا یہ معنی نہیں کہ وہ زندہ ہوں گے۔ اگر یہ معنی ہوتا تو شہداء اور دوسرے لوگوں میں فرق نہ ہوتا کیونکہ آئندہ تو ہر ایک زندہ ہوگا۔ اور اس پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ بھی دلالت کرتا ہے۔ مومنین جانتے ہیں کہ وہ زندہ ہوں گے۔ اموات کو مبتدا کے اضمار کی بنا پر رفع دیا گیا ہے اسی طرح بَلْ اَحْيَآءٌ کی ترکیب ہے، یعنی ھم اموات و ھم احیاءٌ۔ ان میں قول کو عمل کرانا صحیح نہیں کیونکہ قول اور اس کے درمیان مناسبت نہیں ہے۔ جس طرح تیرے اس قول میں صحیح ہے: قلت کلاماً وحجةً۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾

''اور ہم ضرور آزمائیں گے تمہیں کسی ایک چیز کے ساتھ یعنی خوف اور بھوک اور کمی کرنے سے (تمہارے) مالوں اور جانوں اور پھلوں میں اور خوشخبری سنایئے ان صبر کرنے والوں کو''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ یہ واؤ مفتوحہ ہے۔ سیبویہ کے نزدیک کیونکہ التقائے ساکنین پایا گیا ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: جب واؤ نون ثقیلہ کے ساتھ ملائی گئی تو فعل مبنی ہو گیا۔ پس یہ خمسة عشر کے قائم مقام ہو گیا۔ بلاء کبھی اچھی ہوتی ہے کبھی بری۔ اس کا اصل معنی محبت ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم تمہیں آزمائیں گے تاکہ ہم مجاہد اور صابر کو آنکھوں سے دیکھنے والے کے علم کی طرح علم حاصل کر لیں تاکہ اس پر جزا واقع ہو جیسا کہ گزر چکا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کے ساتھ آزمائے گئے تاکہ بعد والوں کے لئے نشانی بن جائیں اور وہ جان لیں کہ انہوں نے اس پر صبر کیا جب ان کے لئے حق واضح ہو گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: انہیں اس سے آگاہ کیا تاکہ انہیں یقین ہو جائے کہ انہیں مصائب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ پس اس پر وہ اپنے نفسوں کو تسکین دیں اور جزع وفزع سے دور رہیں۔ اس آیت میں عزم اور نفس کو تسکین دینے میں جلدی ثواب ملنے کا مژدہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِشَيْءٍ یہ لفظاً مفرد ہے اور اس کا معنی جمع ہے۔ ضحاک نے باشیاء جمع پڑھا ہے جمہور نے مفرد پڑھا ہے یعنی کچھ خوف سے کچھ بھوک سے۔ پہلے کے ساتھ شے کے ذکر پر اختصار کی وجہ سے اکتفا کیا۔ مِّنَ الْخَوْفِ یعنی دشمن کا خوف اور جنگ کی گھبراہٹ۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ امام شافعی نے فرمایا اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا خوف ہے۔ وَالْجُوْعِ یعنی قحط سالی کے ساتھ۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ امام شافعی نے فرمایا رمضان کے مہینہ کی بھوک مراد ہے۔ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ کفار سے جنگ لڑنے کے ساتھ۔ بعض نے فرمایا: مال کے ضیاع کے ساتھ۔ امام شافعی نے فرمایا فرضی زکوٰۃ کے ساتھ۔ الْاَنْفُسِ حضرت ابن عباس نے فرمایا: جہاد میں قتل اور موت کے ساتھ ہم جانوں میں کمی کر کے آزمائیں گے۔ امام شافعی نے فرمایا: امراض کے ساتھ الثَّمَرٰتِ امام شافعی نے فرمایا اس سے مراد بچوں کی موت ہے۔ انسان کی اولاد اس کے دل کا ثمرہ ہوتی ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس سے مراد نباتات کی قلت اور برکات کا انقطاع ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ صبر پر ثواب کی بشارت دو۔ الصبر کا اصل معنی روکنا ہے۔ صبر کا ثواب غیر مقدر ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے لیکن صبر، پہلے صدمہ کے وقت ہوتا ہے جیسا کہ بخاری نے حضرت انس سے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: صبر پہلے صدمہ کے وقت ہے(1)۔ مسلم نے اس سے مکمل ذکر کی ہے۔ صبر جو نفس پر شاق ہوتا ہے اور اس پر بہت بڑا ثواب ہوتا ہے وہ مصائب کے ہجوم اور ان کی حرارت کے وقت ہے یہ دل کی قوت اور صبر کے مقام پر ثابت قدم رہنے پر دلالت کرتا ہے۔ جب مصیبت کی حرارت ٹھنڈی ہو جاتی ہے تو اس وقت ہر ایک صبر کرتا ہے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے، عقلمند پر واجب ہے کہ وہ مصیبت کے وقت اس کیفیت کو لازم پکڑے جو احمق کی تین دن کے بعد ہوتی ہے۔ سہل بن عبداللہ تستری نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ تو صبر زندگی بن گیا۔ صبر کی دو قسمیں ہیں: ایک اللہ تعالیٰ کی معصیت (نافرمانی) سے صبر کرنا، یہ مجاہد ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر صبر کرنا(2)، یہ عابد ہے۔ جب آدمی اللہ تعالیٰ کی معصیت سے صبر کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر صبر کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے اپنی قضا پر رضا کا وارث بنا دیتا ہے۔ رضا کی علامت، نفس پر مکروہات اور محبوبات وارد ہونے پر دل اپنی جگہ سکون میں رہے۔ خواص نے کہا: صبر، کتاب و سنت کے احکام پر ثابت رہنا ہے۔ رویم نے کہا: صبر، شکوہ کا ترک کرنا ہے۔ حضرت ذوالنون مصری نے کہا: صبر، اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنا ہے۔ استاذ ابو علی نے کہا: صبر کی تعریف یہ ہے کہ تقدیر پر معترض نہ ہو۔ رہا شکوہ کے بغیر مصیبت کا اظہار، یہ صبر کے منافی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب کے قصہ میں فرمایا: اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ۭ نِعْمَ الْعَبْدُ (ص: 44) (بے شک ہم نے پایا انہیں صبر کرنے والا بڑا خوبیوں والا بندہ) اس کے ساتھ یہ بھی ان کے متعلق خبر دی کہ انہوں نے کہا: مَسَّنِيَ الضُّرُّ (الانبیاء: 83)

الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝۱۵۶ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۣ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝۱۵۷

"جو کہ جب پہنچتی ہے انہیں کوئی مصیبت تو کہتے ہیں: بے شک ہم صرف اللہ ہی کے ہیں اور یقیناً ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ یہی وہ (خوش نصیب) ہیں جن پر ان کے رب کی طرح طرح کی نوازشیں اور رحمت ہے اور یہی لوگ سیدھی راہ پر ثابت قدم ہیں"۔

اس میں چھ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مُّصِيْبَةٌ ہر وہ چیز جو مومن کو اذیت اور تکلیف دیتی ہے وہ مصیبت ہے۔ کہا جاتا ہے: اصابہ، اصابۃ و مصابۃ و مصاباً۔ اور مُّصِيْبَةٌ کی جمع مصائب ہے۔

المصُوبۃ (صاد کے ضمہ کے ساتھ) مصیبت کی مثل ہے۔ عرب ہمزہ کے ساتھ جمع بناتے ہیں۔ المصائب اس کی اصل واؤ ہے گویا انہوں نے اصلی کو زائد کے ساتھ مشابہت دی۔ اس کی جمع مصاوب بھی آتی ہے یہ اصل ہے۔ المصاب الاصابۃ۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، صفحہ 301، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب الصبر عند الصدمۃ الاولیٰ، صفحہ 174، جلد 1 (وزارت تعلیم)

شاعر نے کہا:

أسليم ان مصابكم رَجلاً اهدى السلام تحيةً ظلمُ

وصاب السهم القرطاس، يصيب صيباً به، اصاب کے معنی میں ہے۔ المصيبة۔ النكبة ينكبها الانسان۔ اور یہ شر میں استعمال ہوتا ہے۔ حضرت عکرمہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک رات چراغ بجھ گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا: اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ عرض کی گئی: یارسول اللہ! کیا یہ بھی مصیبت ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں ہر وہ چیز جو مومن کو اذیت دے وہ مصیبت ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ معنی صحیح حدیث میں ثابت ہے جو مسلم نے حضرت ابوسعید اور حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے، ان دونوں حضرات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ مومن کو جو مصیبت، تھکن، بیماری، غم، حتیٰ کہ دل کا روگ جو اسے پریشان کرتا ہے، لاحق ہوتا ہے تو اس کے ساتھ اس کے گناہ مٹائے جاتے ہیں (1)۔

مسئلہ نمبر 2: ابن ماجہ نے اپنی سنن میں اپنی سند کے ساتھ حضرت فاطمہ بنت حسین سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کو کوئی مصیبت لاحق ہوئی ہو پھر اس نے اپنی مصیبت کو یاد کیا اور پھر اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھا ہو اگرچہ اس مصیبت کو بہت سا عرصہ گزر چکا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے اسی طرح کا اجر لکھ دیتا ہے جس دن اسے مصیبت پہنچی تھی (2)۔

مسئلہ نمبر 3: مصائب میں سے بڑی مصیبت دین کی مصیبت ہے۔ ابوعمر نے فریابی سے ذکر کیا ہے، فرمایا: ہمیں فطر بن خلیفہ نے بیان کیا، فرمایا: ہمیں حضرت عطا بن ابی رباح نے بیان کیا، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کسی کو مصیبت پہنچے تو میری وجہ سے جو اسے مصیبت پہنچی ہے اسے یاد کرنا چاہئے کیونکہ یہ بہت بڑی مصیبت ہے (3)۔ یہ سمرقندی ابو محمد نے اپنی مسند میں نقل کی ہے۔ ابونعیم نے ہمیں بتایا، ہمیں فطر نے بتایا...... پھر اسی طرح حدیث بیان کی ہے۔ اسی طرح مکحول سے مرسلاً روایت کی ہے۔ حضرت ابوعمر نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا کیونکہ آپ سے جدائی کی مصیبت ہر مصیبت سے بڑی ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک بندہ مومن کو پہنچنے والی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانے سے وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا، نبوت کا دروازہ بند ہو گیا۔ سب سے پہلا شر جو ظاہر ہوا وہ عربوں وغیرہ کا ارتداد تھا۔

یہ خیر کا پہلا انقطاع اور پہلا نقصان تھا۔ حضرت ابوسعید نے کہا ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی مٹی سے ہاتھ نہیں جھاڑے تھے حتیٰ کہ ہمارے دلوں نے انکار کیا۔ ابوالعتاہیہ نے اپنی نظم میں اس حدیث کے معنی کو کتنا حسین انداز میں پیش کیا ہے۔

اصبر لكل مصيبة و تجلد و اعلم بان المرء غير مخلد

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب ثواب المومن، صفحہ 319، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ سنن ابن ماجہ، ما جاء في الصبر على المصيبة، صفحہ 116 (وزارت تعلیم)

3۔ سنن دارمی، باب وفاة النبي صلی اللہ علیہ وسلم، صفحہ 40، جلد 1 (دار المحاسن)

اوما تری اِن المصائب جمة　　و تری المنية للعباد بمرصد
من لم يصب ممن تری بمصيبة　　هذا سبيل لست فيه باوحد
فاذا ذکرت محمد و مصابه　　فا ذکر مصابك بالنبی محمد ﷺ

تو ہر مصیبت اور تکلیف پر صبر کر اور جان لے کہ انسان ہمیشہ رہنے والا نہیں۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ مصیبتیں بہت سی ہیں اور موت بندوں کی تاڑ میں ہے۔ کون ہے جن کو مصیبت نہیں پہنچی، تو اس راستہ میں اکیلا نہیں ہے۔ جب تو حضرت محمد ﷺ اور آپ کی مصیبت کو ذکر کرے تو اپنی مصیبت کو نبی محمد ﷺ کے ساتھ یاد کرو۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ اللہ تعالیٰ نے ان کلمات کو مصیبت زدہ کے لئے پناہ گاہ بنایا ہے اور آزمائش میں مبتلا کیے گئے لوگوں کے لئے حفاظت کا باعث بنایا ہے، کیونکہ یہ مبارک معانی کا جامع ہے کیونکہ اِنَّا لِلّٰهِ کا قول توحید اور عبودیت کا اقرار ہے اور اللہ تعالیٰ کی بادشاہی کا اقرار ہے اور وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کا ارشاد اپنے نفسوں پر ہلاکت کا اقرار ہے اور قبور سے اٹھنے کا اقرار ہے اور اس پر یقین کا اظہار ہے کیونکہ تمام امور کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا یہ کلمات، ہمارے نبی سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں کیے گئے۔ اگر حضرت یعقوب علیہ السلام اس کو پہچان لیتے تو یہ نہ کہتے یا اسفی علی یوسف۔

مسئلہ نمبر 5: ابوسفیان نے کہا: میں نے اپنے بیٹے سنان کو دفن کیا جبکہ ابوطلحہ خولانی قبر کے کنارہ پر کھڑے تھے۔ جب میں نے قبر سے نکلنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے میرے ہاتھ سے پکڑا اور مجھ سے محبت کا اظہار کیا اور کہا: اے ابوسنان! کیا میں تجھے بشارت نہ دوں۔ محمد ضحاک نے حضرت ابوموسیٰ سے روایت کر کے بتایا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب بندے کا بیٹا فوت ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے پوچھتا ہے: کیا تم نے میرے بندے کے بیٹے کی روح قبض کر لی ہے؟ فرشتے کہتے ہیں: ہاں۔ اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے: کیا تم نے اس کے دل کا پھل توڑ لیا ہے؟ وہ کہتے ہیں: ہاں۔ اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے: میرے بندے نے (اس صدمہ پر) کیا کہا؟ فرشتے کہتے ہیں: اس نے تیری حمد کی اور اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے کے لئے جنت میں ایک گھر بناؤ اور اس کا نام بیت الحمد رکھو (1)۔

مسلم نے حضرت ام سلمہ سے روایت کیا ہے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ مسلمان کو جو مصیبت پہنچتی ہے پھر وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ اللهم اجرنی فی مصيبتی و اخلف لی خيراً منها، کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے اس سے بہتر بدلا دیتا ہے (2)۔ یہی تنبیہ ہے وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿﴾ کے ارشاد پر۔ یا تو نعم البدل مل جائے گا جیسے اللہ تعالیٰ نے حضرت ام سلمہ کو رسول اللہ ﷺ کی ذات عطا فرمائی تھی، جب ان کا خاوند ابوسلمہ فوت ہوا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے نکاح کر لیا تھا۔ یا بڑا ثواب عطا فرماتا ہے جیسا کہ حضرت ابوموسیٰ کی حدیث میں ہے اور کبھی یہ

1۔ جامع ترمذی، کتاب الجنائز، باب فضل المصيبة، صفحہ 121، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، صفحہ 300، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

دونوں چیزیں ملتی ہیں۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ یہ صبر کرنے والوں اور اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کہنے والوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی بندے پر صلاۃ کا مطلب، اس کا عفو، رحمت، برکت اور دنیا و آخرت میں شرف بخشنا ہے۔ زجاج نے کہا: اللہ تعالیٰ کی طرف سے صلاۃ کا مطلب بخشنا اور اچھی تعریف ہے۔ اسی سے میت پر صلاۃ ہے۔ یہ اس کی تعریف اور اس کے لئے دعا ہے۔ رحمت کا لفظ دوبارہ ذکر فرمایا۔ اس کی وجہ تاکید اور معنی کا اشباع ہے کیونکہ لفظ مختلف ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا من البینات و الھدیٰ۔ اور ارشاد ہے: اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ (زخرف:80) شاعر نے کہا:

صلی علی یحیی و اشیاعه　　　رب کریم و شفیع مطاع

یحییٰ اور اس کے گروہ پر رب کریم اور شفیع مطاع نے صلاۃ بھیجی۔

بعض علماء نے فرمایا: رحمت سے مراد مصیبت کا دور کرنا اور حاجت کو پورا کرنا ہے۔

بخاری میں ہے، حضرت عمر نے فرمایا: نعم العدلان و نعم العلاوۃ: الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۣ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝ (بقرہ)(1) عدلان سے مراد الصلاۃ اور رحمت ہے اور علاوہ سے مراد اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ہے۔ (عدلان، اونٹ کے دونوں طرفوں کے بوجھ کو کہتے ہیں اور علاوہ وہ بوجھ ہوتا ہے جو اونٹ کی پیٹھ پر ہوتا ہے) بعض علماء نے فرمایا: رحمت سے مراد ثواب کا استحقاق اور اجر کا بڑا کرنا ہے۔ بعض نے فرمایا: مصائب کا آسان کرنا اور حزن میں تخفیف کرنا ہے۔

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۭ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ۝

"بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ پس جو حج کرے اس گھر کا یا عمرہ کرے تو کچھ حرج نہیں اسے کہ چکر لگائے ان دونوں کے درمیان اور جو کوئی خوشی سے نیکی کرے تو اللہ تعالیٰ بڑا قدردان خوب جاننے والا ہے"۔

اس میں نو مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: بخاری نے عاصم بن سلیمان سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے حضرت انس بن مالک سے صفا و مروہ کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: ہم دیکھتے تھے کہ صفا و مروہ زمانہ جاہلیت کے امور سے ہیں۔ جب اسلام آیا تو ہم ان کے طواف سے رک گئے، اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل کیا: اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ...... الخ (2)۔

ترمذی نے حضرت عروہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے حضرت عائشہ سے کہا: میں کسی پر کوئی گناہ نہیں دیکھتا جو صفا و

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب الصبر عند الصدمة الاولیٰ، صفحہ 174، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ ایضاً، کتاب التفسیر، سورۂ بقرہ، صفحہ 646، جلد 1

مروہ کے درمیان طواف نہ کرے اور میں بھی کوئی پروا نہیں کرتا کہ میں ان کے درمیان طواف نہ کروں۔ حضرت عائشہ نے کہا: اے میرے بھانجے! تو نے بری بات کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے صفا و مروہ کا طواف کیا اور مسلمانوں نے طواف کیا جو منات بت کے لئے احرام باندھتا تھا، جو مشلل میں تھا تو صفا و مروہ کے درمیان طواف نہیں کرتا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا۔ اگر بات اس طرح ہوتی جس طرح تو نے کہا ہے تو عبارت اس طرح ہوتی۔ فلا جناح علیہ الایطوف بھما۔ زہری نے کہا: میں نے روایت ابوبکر بن عبدالرحمن بن حارث کے سامنے ذکر کی تو انہوں نے اسے ناپسند کیا اور فرمایا: یہ علم ہے۔

میں نے بہت سے اہل علم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جو عربوں میں سے صفا و مروہ کا طواف نہیں کرتے تھے وہ کہتے تھے: ہمارا طواف ان دو پہاڑوں کے درمیان امر جاہلیت سے تھا اور انصار میں سے کچھ لوگوں نے کہا: ہمیں بیت اللہ کے طواف کا حکم دیا گیا ہے، صفا و مروہ کے طواف کا حکم نہیں دیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ابوبکر بن عبدالرحمٰن نے کہا: میرا خیال ہے یہ آیت ان لوگوں اور ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور فرمایا یہ حدیث حسن صحیح ہے (1)۔ بخاری نے اس کا معنی نقل کیا ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ۔ کے الفاظ کے بعد یہ ہے، حضرت عائشہ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے صفا و مروہ کے درمیان طواف کی سنت قائم فرمائی، اور کسی کے لئے جائز نہیں کہ وہ ان کا طواف چھوڑ دے۔ پھر میں نے ابوبکر بن عبدالرحمن کو بتایا تو انہوں نے کہا: جو تو نے سنا ہے یہ علم ہے۔ میں نے اہل علم سے سنا ہے وہ ذکر کرتے تھے کہ لوگ ... مگر جن کا حضرت عائشہ نے ذکر کیا، منات بت کے لئے احرام باندھتے تھے وہ تمام صفا و مروہ کے درمیان طواف کرتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کے طواف کا ذکر کیا اور قرآن میں صفا و مروہ کا ذکر نہیں کیا۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ ہم صفا و مروہ کا طواف کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کے طواف کا ذکر نازل کیا ہے اور صفا کا ذکر نہیں کیا۔ کیا ہم پر کوئی حرج ہے کہ ہم صفا و مروہ کا طواف کریں؟ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ الایة، ابوبکر نے کہا یہ آیت دونوں فریقوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان کے بارے میں بھی جو زمانہ جاہلیت میں صفا و مروہ کے درمیان طواف کرنے سے اجتناب کرتے تھے اور ان کے بارے میں جو پہلے طواف کرتے تھے پھر دور اسلام میں ان کا طواف کرنے سے اجتناب کرتے تھے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کے طواف کا حکم دیا ہے اور صفا کا ذکر نہیں کیا ہے حتیٰ کہ بیت اللہ کے طواف کے بعد اس کا ذکر کیا (2)۔

ترمذی نے عاصم بن سلیمان الاحول سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے حضرت انس بن مالک سے صفا و مروہ کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا: یہ دونوں جاہلیت کے شعائر سے تھیں جب اسلام آیا تو ہم ان کے طواف سے رک گئے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ بقرہ، صفحہ 121، جلد 2 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، باب وجوب الصفا و المروۃ، صفحہ 222، جلد 1 (وزارت تعلیم)

فرمایا یہ تطوع ہے...... وَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِیْمٌ...... فرمایا یہ حدیث حسن صحیح ہے (1)۔ یہ بخاری نے نقل کی ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے فرمایا: زمانہ جاہلیت میں شیاطین ساری رات صفا و مروہ کے درمیان طواف کرتے رہتے تھے اور صفا و مروہ کے درمیان بت رکھے ہوئے تھے۔ جب اسلام ظاہر ہوا تو مسلمانوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہم صفا و مروہ کے درمیان طواف نہیں کرتے کیونکہ یہ شرک ہے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ شعبی نے کہا: زمانہ جاہلیت میں صفا پر ایک بت تھا جس کو اساف کہا جاتا تھا۔ اور مروہ پر ایک بت تھا جسے نائلہ کہا جاتا تھا (2)۔ جب لوگ طواف کرتے تو ان بتوں کو چھوتے تھے۔ مسلمان اس وجہ سے ان کے درمیان طواف کرنے سے رک گئے تو یہ آیت نازل ہوئی۔

مسئلہ نمبر 2: لغت میں الصفا، صاف پتھر کو کہتے ہیں۔ مکہ میں یہ ایک معروف پہاڑ ہے اسی طرح مروہ بھی ایک پہاڑی ہے، اسی وجہ سے دونوں کو معرف باللام ذکر کیا۔ الصفا ذکر کیا ہے کیونکہ اس پر حضرت آدم علیہ السلام ٹھہرے تھے تو ان کے نام سے اسے موسوم کیا گیا اور حضرت حوا مروہ پر ٹھہری تھیں تو اسے عورت کے اسم سے تعبیر کیا۔ اس وجہ سے اسے مؤنث ذکر کیا۔ شعبی نے کہا: صفا پر ایک بت تھا جس کو اساف کہا جاتا تھا اور مروہ پر ایک بت تھا جس کو نائلہ کہا جاتا تھا، اسی اعتبار سے ان کی تذکیر و تانیث جاری ہوئی (3)۔ مذکر کو مقدم کیا۔ یہ عمدہ ہے کیونکہ احادیث اس معنی پر دلالت کرتی ہیں اور جو لوگ ان میں طواف ناپسند کرتے تھے اس کی وجہ بھی یہی تھی حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں حرج کو اٹھا دیا۔ اہل کتاب کا خیال ہے کہ اساف اور نائلہ نے کعبہ میں زنا کیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں پتھروں میں مسخ کر دیا۔ انہیں صفا و مروہ پر رکھا گیا تا کہ لوگ ان سے عبرت حاصل کریں جب عرصہ زیادہ گزر گیا تو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ان کی عبادت ہونے لگی۔ واللہ اعلم

الصَّفَا (مقصور ہے) یہ صفاۃ کی جمع ہے اس سے مراد صاف پتھر ہے۔ بعض نے فرمایا: الصفا، مفرد اسم ہے اس کی جمع صُفِیّ اور اصفاء ہے جیسے اَرْجَاء جمع ہے۔ راجز نے کہا:

كأن مَتْنَيْه من النفي مواقع الطير على الصُّفِي (4)

بعض علماء نے فرمایا: صفا کی شروط میں سے سفیدی اور صلابت ہے اور یہ صفا یصفو سے مشتق ہے یعنی مٹی سے پاک۔ المروۃ یہ المرو کا واحد ہے، یہ چھوٹے چھوٹے پتھر جن میں نرمی ہوتی ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ سخت پتھر ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ مروہ پتھر ہے۔

شاعر نے کہا:

و تولی الارض خفا ذابلاً فاذا ما صادف المرو رضخ (5)

شاعر نے مرو کو پتھر کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، باب سورۂ بقرہ، صفحہ 121، جلد 2 (وزارت تعلیم)

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 229، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 3۔ ایضاً

4۔ تفسیر طبری، صفحہ 54، جلد 2 (دار احیاء التراث العربی) 5۔ ایضاً

ابوذویب نے کہا:

حتی کان للحوادث مروۃ　　بصفا المشقر کل یوم تقرع

شاعر نے یہاں بھی پتھر کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

بعض نے فرمایا: یہ کالے پتھر ہیں۔ بعض نے فرمایا: یہ سفید چمکدار پتھر ہیں جن میں آگ ہوتی ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ یہ عبادت کی جگہوں میں سے ہے اور اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے۔ یہ شعیرۃ کی جمع ہے۔ الشعائر وہ جگہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لیے علامات بنایا۔ جیسے موقف، سعی اور نحر۔ شعار کا مطلب علامت ہے۔ کہا جاتا ہے: اشعر الھدی۔ لوہے کی نوک سے اونٹ کی کوہان میں علامت بنانا، یہ تیرے قول اشعرت سے ہے میں نے علامت بنائی۔ کمیت نے کہا:

نقتلھم جیلاً فجیلاً تراھم　　شعائر قربانٍ بھم یتقربُ (1)

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ حَجَّ الْبَیْتَ۔ حَجَّ کا معنی قَصَدَ ہے الحج کا معنی قصد کرنا ہے۔ شاعر نے کہا:

فاشھد من ء ` حلولاً کثیرۃً　　یحجون سب الزبرقان المزعفرا

السب، یہ مشترک لفظ ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا: السب (کسرہ کے ساتھ) بہت زیادہ گالی دینے والا۔ سِبُّکَ، جو تجھے گالی دے۔ شاعر نے کہا:

لا تسبّنّنی فلست بسبی　　ان سبی من الرجال الکریم (2)

السب کا معنی دوپٹہ بھی ہے اسی طرح عمامہ بھی اس کا معنی ہے۔ مخبل سعدی نے کہا:

یحجون سِب الزبرقان المزعفرا

وہ زعفران سے رنگے ہوئے عمامے باندھے ہوئے حج کرتے ہیں۔

لغت ہزیل میں السب، رسی کو بھی کہتے ہیں۔ ابوذویب نے کہا:

تدلی علیھا بین سِبٍ و خیطۃ　　بجرداء مثل الوکف یکبو غرابُھا

السبوب، رسیاں۔ روئی کا باریک دھاگہ۔ السبیبۃ اس کی مثل ہے جمع السبوب و السبائب۔ یہ جوہری کا قول ہے۔ حج الطبیب الشجۃ، جب طبیب سرچو کے ساتھ زخم کی پیائش کا قصد کرے۔

شاعر نے کہا:

یحج مأمومۃً فی قعرھا لجف

وہ دماغ کے زخم کا علاج کرتا ہے جس کی گہرائی خوفناک ہے۔ اللجف، دھنسنے کو کہتے ہیں تلجفت البئر کنویں کا نچلا حصہ

1۔ تفسیر طبری، صفحہ 54، جلد 1 (داراحیاء التراث العربی)　　2۔ ایضاً، صفحہ 55، جلد 1

دھنس گیا۔ پھر یہ اسم بیت اللہ کی طرف افعال مخصوصہ کے ساتھ قصد کرنے کے لئے خاص ہو گیا۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوِ اعۡتَمَرَ یعنی زیارت کرنا۔ العمرۃ کا معنی زیارت ہے۔ شاعر نے کہا:

لقد سما ابن معمر حین اعتمر مغزًی بعیداً من بعید و ضبَر

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡہِ یعنی اس پر گناہ نہیں ہے۔ اس کی اصل جنوح سے ہے۔ اس کا معنی مائل ہونا ہے اسی سے الجوانح ہے۔ اعضاء کو ان کے ٹیڑھے ہونے کی وجہ سے جوانح کہا جاتا ہے۔ حضرت عائشہ کی تاویل اس آیت کے ضمن میں گزر چکی ہے۔ ابن عربی نے کہا: اس میں قول کی تحقیق یہ ہے کہ کہنے والے کا قول لا جناح علیك ان تفعل کا مطلب فعل کا مباح کرنا ہے اور لا جناح علیك الا تفعل کا مطلب ہے فعل کے ترک کی اباحت۔ جب عروہ نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سنا: فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡہِ اَنۡ یَّطَّوَّفَ بِہِمَا۔ فرمایا: یہ دلیل ہے کہ طواف کا ترک کرنا جائز ہے۔ پھر شریعت کو اس پر پایا کہ طواف چھوڑنے میں رخصت نہیں پھر ان دو متعارض کو جمع کرنا طلب کیا۔ حضرت عائشہ نے عروہ سے کہا: فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡہِ اَنۡ یَّطَّوَّفَ بِہِمَا۔ طواف کے ترک کی دلیل نہیں ہے۔ یہ ترک کی دلیل تب ہوتا اگر عبارت اس طرح ہوتی: فلا جناح علیہ الا یطوف بھما۔

پس یہ لفظ طواف کے ترک کی اباحت کے لئے نہیں آیا، اس میں اس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ یہ طواف کی اباحت کے افادہ کے لئے آیا ہے اس شخص کے لئے جو جاہلیت میں اجتناب کرتے تھے یا جو جاہلیت میں ان کا طواف کرتے تھے ان بتوں کا قصد کرتے ہوئے جو ان پہاڑوں کے اوپر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بتایا کہ طواف ممنوع نہیں ہے جب طواف کرنے والا باطل کا قصد نہ کرے۔

اگر کہا جائے کہ عطا نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فلا جناح علیہ الا یطوف بھما پڑھا ہے اور یہی حضرت ابن مسعود کی قراءت ہے اور روایت ہے کہ حضرت ابی کے مصحف میں بھی اسی طرح ہے۔ حضرت انس سے اس کی مثل مروی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سب اس کے خلاف ہے جو مصحف میں ہے اس لئے ایک قراءت کی وجہ سے اس کو نہیں چھوڑا جاسکتا جو مصحف میں ہے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ قراءت صحیح ہے یا نہیں ہے۔ عطا بغیر سماع کے حضرت ابن عباس سے مرسل روایات نقل کرتے ہیں اور حضرت انس سے جو روایت ہے وہ بھی ثقہ نہیں ہے یا (لا) تاکید کے لئے زائدہ ہوگا۔ جیسا کہ شاعر نے کہا:

وما ألوم البیض الا تسخرا لما راین الشمط القفندرا

اس شعر میں ألا تاکید کے لئے زائدہ ہے۔

مسئلہ نمبر 7: ترمذی نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ میں آئے تو بیت اللہ کے سات چکر لگائے اور پھر یہ آیت پڑھی: وَاتَّخِذُوۡا مِنۡ مَّقَامِ اِبۡرٰہٖمَ مُصَلًّی (البقرہ: 125) پھر مقام کے پیچھے نماز پڑھی پھر حجر اسود کے پاس آئے اسے استلام کیا پھر فرمایا: ہم وہاں سے شروع کرتے ہیں جہاں سے اللہ تعالیٰ نے آغاز فرمایا آپ نے صفا سے

شروع فرمایا اور فرمایا: صفا اور مروہ شعائر اللہ سے ہیں۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے (1)۔ اس پر اہل علم کے نزدیک عمل ہے صفا سے آغاز کرے۔ اگر مروہ سے پہلے شروع کیا تو یہ جائز نہ ہوگا پھر صفا سے شروع کرے۔

مسئلہ نمبر 8: صفا و مروہ کے درمیان سعی کے وجوب میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام شافعی اور امام احمد بن حنبل نے فرمایا: یہ رکن ہے۔ یہ امام مالک کا مشہور مذہب ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: سعی کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تم پر سعی فرض کی ہے (2)۔ اس حدیث کو دار قطنی نے نقل کیا ہے۔ اور کتب بمعنی اوجب ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ (البقرہ: 183) تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے پانچ نمازیں اللہ تعالیٰ نے بندوں پر فرض کی ہیں (3)۔ ابن ماجہ نے شیبہ کی ام ولد سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے دیکھا آپ فرما رہے تھے: ''درمیانی وادی کو تیز چل کر طے کیا جائے گا (4)''۔ جو سعی کو چھوڑ دے یا ایک چکر بھول کر یا جان بوجھ کر چھوڑ دے تو وہ اپنے شہر سے لوٹ آئے یا جہاں سے اسے یاد آئے مکہ کی طرف لوٹ آئے طواف کرے اور سعی کرے کیونکہ سعی ہمیشہ طواف کے ساتھ متصل ہوتی ہے۔ امام مالک کے نزدیک یہ برابر ہے خواہ حج میں ہو یا عمرہ میں ہو۔ اگرچہ عمرہ میں فرض نہیں۔ اگر اس نے حقوق زوجیت ادا کر لئے ہوں تو اس پر امام مالک کے نزدیک تمام مناسک پورے کرنے کے باوجود اس پر عمرہ اور ہدی ہوگی۔

امام شافعی نے فرمایا: اس پر ہدی ہوگی عمرہ کا کوئی معنی نہیں جب وہ لوٹ آئے طواف کرے اور سعی کرے۔ امام ابو حنیفہ نے اور ان کے اصحاب، ثوری اور شعبی نے کہا: سعی واجب نہیں ہے اگر کوئی حاجی سعی چھوڑ دے حتیٰ کہ وہ اپنے شہر چلا جائے تو اس کا نقصان دم سے پورا کیا جائے گا کیونکہ سعی حج کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔ یہ امام مالک کا قول العتبیۃ میں ہے۔

حضرت ابن عباس، حضرت ابن زبیر، حضرت انس بن مالک اور ابن سیرین سے روایت ہے کہ سعی تطوع (نفل) ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا حمزہ اور کسائی نے یطوع مضارع مجزوم پڑھا ہے اسی طرح فمن تطوع خیراً فھو خیرلہ میں پڑھا ہے۔ باقی قراء نے ماضی کا صیغہ تطوع پڑھا ہے۔ تطوع سے مراد وہ نیک عمل ہوتا ہے جو مومن اپنی طرف سے کرتا ہے پس جو نوافل ادا کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی قدر دانی فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بندے کے لئے شکر یہ ہے کہ وہ اسے اپنی اطاعت پر ثابت رکھتا ہے۔ صحیح وہ ہے جو امام شافعی کا نظریہ ہے۔ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: مجھ سے اپنے مناسک (حج) سیکھ لو (5)۔

پس یہ حج کے مجمل کا بیان ہو گیا۔ پس فرض ہونا واجب ہے جس طرح نماز کی رکعات تعداد بیان فرمائی۔ جو اس طرح ہو تو

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ بقرہ، صفحہ 121، جلد 2 (وزارت تعلیم)
2۔ مسند امام احمد بن حنبل، صفحہ 421، جلد 6 (دار صادر)
3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، صفحہ 201، جلد 1 (وزارت تعلیم)
4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المناسک، باب السعی بین الصفا والمروۃ، صفحہ 221 (وزارت تعلیم)
5۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب الحج، صفحہ 125، جلد 5 (دار الفکر)

اتفاق نہیں ہوتا کہ سنت ہے یا نفل ہے۔

طلیب نے کہا: حضرت ابن عباس نے ایک قوم کو صفا و مروہ کے درمیان طواف کرتے دیکھا تو فرمایا: یہ تمہیں تمہاری ماں ام اسماعیل نے وراثت میں دیا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ صحیح بخاری میں ثابت ہے جیسا کہ اس کا بیان سورۂ ابراہیم میں آئے گا۔

مسئلہ نمبر 9: کسی کے لئے بیت اللہ کا طواف اور صفا و مروہ کے درمیان سعی سوار ہو کر نی جائز نہیں مگر عذر ہو تو جائز ہے۔ اگر عذر کی بناء پر سوار ہو کر طواف کیا تو اس پر دم ہوگا اور اگر غیر معذور نے سوار ہو کر طواف کیا تو وہ دوبارہ ادا کرے اگر بیت اللہ کے قریب ہو اور اگر دور جا چکا ہو تو ہدی دے۔ یہ ہم نے اس لئے کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خود طواف کیا اور فرمایا: خذوا عنی مناسکم۔ مجھ سے مناسک حج سیکھ لو۔ اور عذر کی بناء پر ہم نے جائز قرار دیا کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اونٹ پر سوار ہو کر کیا تھا اور اپنی کھونٹی سے حجر اسود کو استلام کیا تھا۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا: جب انہوں نے اپنی تکلیف کی شکایت کی: لوگوں کے پیچھے طواف کر دراں حالیکہ تو سوار ہو (1)۔

ہمارے اصحاب نے اونٹ پر طواف کرنے اور انسان کی پیٹھ پر طواف کرنے کے درمیان فرق کیا ہے اگر انسان کی پیٹھ پر طواف کرے گا تو جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ اس وقت وہ طواف کرنے والا نہ ہوگا بلکہ اٹھانے والا طواف کرنے والا ہوگا جب اونٹ پر طواف کرے گا تو وہ خود طواف کرنے والا ہوگا۔ ابن خویز منداد نے کہا: یہ اختیار کا تفرقہ ہے۔ رہا کفایت کرنا تو یہ کفایت کر جائے گا۔ جیسے اگر کسی پر غشی طاری ہو اور اسے اٹھا کر طواف کرایا جائے یا اٹھا کر عرفات میں اسے وقوف کرایا گیا تو اس کی طرف سے جائز ہو جائے گا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

''بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں ان چیزوں کو جو ہم نے نازل کیں روشن دلیلوں اور ہدایت سے اس کے بعد بھی کہ ہم نے کھول کر بیان کر دیا انہیں لوگوں کے واسطے (اپنی) کتاب میں، یہی وہ لوگ ہیں کہ دور کرتا ہے انہیں اللہ تعالیٰ (اپنی رحمت سے) اور لعنت کرتے ہیں انہیں لعنت کرنے والے''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ جو نازل شدہ بینات اور ہدایت کو چھپاتا ہے وہ ملعون ہے۔ اس کی مراد میں اختلاف ہے بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد یہود اور عیسائی راہب ہیں جو حضرت محمد ﷺ کے امر کو چھپاتے تھے۔ یہود نے رجم کے امر کو چھپایا۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد ہر وہ شخص ہے جس نے حق کو چھپایا یہ ہر شخص میں عام ہے (خواہ) جس نے دین کے علم کو چھپایا جبکہ اس کے پھیلانے کی ضرورت تھی۔ نبی کریم ﷺ کے ارشاد میں اس کی تفسیر کی گئی ہے جس سے

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناسك، باب المريض يطوف راكباً، صفحہ 221، جلد 1 (وزارت تعلیم)

کوئی علمی بات پوچھی گئی جس کو وہ جانتا تھا پھر اس نے اسے چھپایا تو اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے روز آگ کی لگام سے لگام دے گا۔ اس حدیث کو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو بن العاص نے روایت کیا ہے (1)۔ اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کا قول اس کے معارض ہے: تو کسی قوم کے سامنے ایسی حدیث بیان کرے جن تک ان کی عقول نہیں پہنچیں گی تو وہ بعض لوگوں کے لئے فتنہ کا باعث ہوگی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگوں کو وہ بیان کرو جس کو وہ سمجھتے ہوں کیا تم پسند کرتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول کو جھٹلایا جائے (2)۔ یہ بعض علوم پر محمول ہے۔ جس طرح علم کلام ہے یا ایسا علم جس کے سمجھنے میں تمام لوگ برابر نہ ہوں۔ عالم کا حکم یہ ہے کہ وہ وہ چیز بیان کرے جو سمجھی جائے اور ہر انسان کو اس کے مرتبہ کے مطابق ڈیل کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

مسئلہ نمبر 2: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے اسی آیت کا ارادہ فرمایا تھا جب آپ نے فرمایا تھا: اگر اللہ تعالیٰ کی کتاب میں آیت نہ ہوتی تو میں تمہیں کوئی حدیث بیان نہ کرتا (3)۔ اس سے علماء نے علم حق کی تبلیغ کے وجوب پر استدلال کیا ہے۔ عمومی طور پر علم کو بیان کرنا اس پر اجرت لئے بغیر کیونکہ اس پر اجرت لینے کا مستحق نہیں ہوتا جس کا اس پر کرنا لازم ہو۔ جس طرح اسلام پر اجرت کا مستحق نہیں ہوتا۔ اس پر کلام گزر چکی ہے۔

آیت کی تحقیق یہ ہے کہ عالم جب علم کو چھپانے کا قصد کرے گا تو نافرمان ہوگا اور جب علم چھپانے کا قصد نہ کرے تو تبلیغ لازم نہیں۔ جب اسے معلوم ہو کہ غیر کے پاس یہ علم ہے اور جس سے کوئی بات پوچھی جائے تو اس آیت اور حدیث کی وجہ سے اس پر تبلیغ کرنا واجب ہے اور کافر کو قرآن اور علم سکھانا جائز نہیں حتیٰ کہ وہ مسلمان ہو جائے۔ اسی طرح جھگڑالو بدعتی اور جھگڑالو آدمی کو تعلیم دینا جائز نہیں تاکہ اہل حق سے جھگڑے۔ اور کسی خصم کو ایسی حجت نہ سکھائی جائے جس کے ذریعے مال ظلماً لے لے۔ اور بادشاہ کو ایسی تاویل نہ سکھائے جس کے ذریعے وہ رعیت کو تکلیف دے اور بے وقوف لوگوں میں ایسی رخصت نہ پھیلائے کہ وہ اس کو ممنوعات کے ارتکاب اور واجبات کے ترک کا راستہ بنائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حکمت کو اس کے اہل سے مت روکو ورنہ تم ان پر ظلم کرو گے اور غیر اہل لوگوں کو حکمت نہ سکھاؤ ورنہ تم حکمت پر ظلم کرو گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے، فرمایا: (موتیوں کو خنازیر کی گردنوں میں نہ لٹکاؤ (4)) یعنی فقہ کی تعلیم ایسے شخص کو نہ دو جو اس کا اہل نہیں۔ سحنون نے کہا: حضرت ابوہریرہ اور حضرت عمرو بن العاص کی حدیث شہادت کے بارے میں ہے۔ ابن عربی نے کہا: اس کے خلاف ہے کیونکہ حدیث میں ہے ''جس سے علم کے متعلق پوچھا گیا (5)'' یہ نہیں فرمایا جس نے شہادت کو بیان نہیں کیا۔ ظاہر پر باقی رکھا جاتا ہے حتیٰ کہ اس پر کوئی ایسی چیز وارد ہو جو اس کو زائل کر دے۔

1۔ سنن ابن ماجہ، باب من سئل عن علم فکتمہ، صفحہ 23 (وزارت تعلیم)　　2۔ صحیح بخاری، کتاب العلم، صفحہ 24، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، باب فضل الوضوء، صفحہ 121، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب حفظ العلم، صفحہ 22، جلد 1 (وزارت تعلیم)　　4۔ تاریخ بغداد، صفحہ 350، جلد 9 (دار الکتب المصریہ)

5۔ جامع ترمذی، کتاب العلم، باب فی کتمان العلم، صفحہ 89، جلد 2 (وزارت تعلیم)

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى یہ منصوص علیہ اور مستنبط کو شامل ہے کیونکہ ھدی کا اسم تمام کو شامل ہے۔ اس میں ایک شخص کے قول کے عمل کے وجوب پر دلیل ہے کیونکہ اس پر بیان واجب نہیں مگر اس کے قول کا قبول کرنا واجب ہے۔ فرمایا: اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا (البقرہ:160) ان کی خبر کے ساتھ بیان کے وقوع کا حکم لگایا۔

اگر کہا جائے کہ یہ جائز ہے کہ ہر ایک کو علم چھپانے سے منع کیا گیا ہو اور بیان کا حکم دیا گیا ہو تا کہ خبر دینے والے کثیر ہوں اور ان کی خبر متواتر ہو۔ ہم کہتے ہیں: یہ غلط ہے کیونکہ کتمان سے منع نہیں کیا گیا مگر انہیں جن پر اتفاق جائز ہو اور جن کا کتمان پر اتفاق جائز ہے ان کی خبر علم کا موجب نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

مسئلہ نمبر 4: جب مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى فرمایا: تو یہ دلیل ہے کہ بینات اور ہدایت کے علاوہ جو علم ہے اس کا چھپانا جائز ہے، خصوصاً جب اس کے اظہار میں خوف ہو تو اس کا چھپانا مزید مؤکد ہوگا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس کو ترک فرمایا جب انہیں خوف تھا۔ فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو برتن (علم کے) یاد کیے۔ ایک برتن کو میں نے پھیلا دیا اور دوسرا برتن اگر میں اسے پھیلاؤں تو میرا گلا کاٹ دیا جائے۔ اس روایت کو بخاری نے روایت کیا ہے (1)۔ حضرت ابو عبداللہ نے فرمایا: بلعوم، کھانے والی نالی کو کہتے ہیں۔ ہمارے علماء نے فرمایا: یہ وہ علم تھا جس کو حضرت ابو ہریرہ نے نہیں پھیلایا اور انہیں اس کے پھیلانے میں فتنہ اور قتل کا خوف تھا۔ یہ علم فتنوں کے امر کے متعلق تھا منافقین اور مرتدین کی شخصیات پر نص کے متعلق تھا۔ ہر وہ علم کہ بینات اور ھدی کے متعلق نہ ہو اس کا یہی حکم ہے۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ، بَيَّنّٰهُ میں ضمیر کا مرجع بینات اور ہدایت ہیں۔ الْكِتٰبِ اسم جنس ہے اور اس سے مراد تمام کتب منزلہ ہیں۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ یعنی اللہ تعالیٰ ان سے بری ہوتا ہے اور ان کو ثواب سے دور رکھتا ہے اور انہیں کہتا ہے تم پر میری لعنت ہو جس طرح شیطان لعین کو کہا وان علیك لعنتی۔ لغت میں لعن کا معنی دور کرنا اور دھتکارنا ہے۔

مسئلہ نمبر 7: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ قتادہ اور ربیع نے کہا: اللاعنون (لعنت کرنے والے) سے مراد فرشتے اور مومنین ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ واضح اور کلام کے مقتضیٰ پر جاری ہے۔ مجاہد اور عکرمہ نے کہا: اس سے مراد حشرات الارض اور جانور ہیں جنہیں علماء سو جو علم کو چھپانے والے ہوتے ہیں ان کے گناہوں کی وجہ سے خشکی اور قحط سالی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پس وہ انہیں لعنت کرتے ہیں۔ زجاج نے کہا: درست قول ان علماء کا ہے جو کہتے ہیں کہ اللاعنون سے مراد فرشتے اور مومنین ہیں۔ اور رہا یہ کہ اس سے مراد زمین کے جانور ہیں اس کی حقیقت پر آگاہی صرف نص یا خبر لازم سے ہو سکتی ہے اور ان میں سے ہم کوئی چیز نہیں پاتے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب حفظ العلم، صفحہ 23، جلد 1 (وزارت تعلیم)

میں کہتا ہوں: اس کے متعلق ایک خبر وارد ہے جسے حضرت براء بن عازب نے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد یَلۡعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلۡعَنُهُمُ اللّٰعِنُوۡنَ کے تحت فرمایا: دواب الارض یعنی اللاعنون سے مراد زمین کے جانور ہیں (1)۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے محمد بن الصباح سے روایت کیا ہے ہمیں عمار بن محمد نے لیث سے انہوں نے ابوالمنہال سے انہوں نے زاذان سے انہوں نے حضرت براء سے روایت کی ہے۔ اس کی سند حسن ہے۔ اگر کہا جائے کہ عقول اور غیر عقول کو کیسے جمع کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ غیر عقول کی طرف عقول والوں کا فعل منسوب کیا جیسا کہ ارشاد فرمایا: رَاَيۡتُهُمۡ لِىۡ سٰجِدِيۡنَ (یوسف:4)۔ یہاں ساجدات نہیں فرمایا۔ فرمایا: لم شهدتم علينا۔ اور فرمایا: وَتَرٰىهُمۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَيۡكَ (اعراف:198) اس کی مثالیں کثیر ہیں۔ ان شاء اللہ آگے وضاحت آئے گی۔

حضرت براء بن عازب اور حضرت ابن عباس نے کہا اللّٰعِنُوۡنَ سے مراد جن وانس کے علاوہ تمام مخلوق ہے۔ یہ اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کافر کو جب قبر میں مارا جاتا ہے تو وہ چیختا ہے اس کی چیخ جن وانس کے علاوہ ہر چیز سنتی ہے اور ہر سننے والا اس کو لعنت کرتا ہے (2)۔ حضرت ابن مسعود اور سدی نے کہا: ایک شخص اپنے ساتھی کو لعنت کرتا ہے پھر وہ لعنت آسمان کی طرف بلند ہو جاتی ہے پھر وہ نیچے آتی ہے تو وہ اس شخص میں اس کی اہلیت نہیں پاتی تو وہ پھر لعنت کرنے والے کی طرف لوٹ جاتی ہے اسے بھی اس کا اہل نہیں پاتی تو وہ ان یہود پر واقع ہوتی ہے جنہوں نے نازل شدہ کلام کو چھپایا (3)، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان يَلۡعَنُهُمُ اللّٰعِنُوۡنَ سے یہی مراد ہے۔ پس ان میں سے جو مر جاتا ہے اس سے لعنت اٹھ جاتی ہے اور جو باقی یہود ہوتے ہیں ان میں موجود رہتی ہے۔

اِلَّا الَّذِيۡنَ تَابُوۡا وَاَصۡلَحُوۡا وَبَيَّنُوۡا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوۡبُ عَلَيۡهِمۡ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ ﴿۱۶۰﴾

''البتہ جو لوگ توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کر لیں (جو اب تک چھپاتے رہے) تو ایسے لوگوں کی توبہ قبول کرتا ہوں اور میں بہت توبہ قبول کرنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہوں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّا الَّذِيۡنَ تَابُوۡا اللہ تعالیٰ نے توبہ کرنے والوں، اچھے اعمال کرنے والوں اور توبہ کی طرف لوٹنے والوں کی استثنا فرمائی۔ ہمارے علماء کے نزدیک توبہ میں صرف یہ کہنا (میں نے توبہ کی) کافی نہیں ہے حتیٰ کہ اس سے پہلے قول و عمل کے خلاف دوسرا قول و فعل ظاہر ہو اگر وہ مرتد تھا تو وہ اسلام کی طرف لوٹ آئے۔ شرائع اسلام کو ظاہر کرنے والا ہو۔ اگر وہ گنہگاروں سے ہو تو اس سے نیک عمل ظاہر ہو اور اہل فساد اور ان احوال سے کنارہ کش ہو جس پر پہلے وہ تھا اگر وہ بت پرستوں میں سے تھا تو وہ بت پرستوں سے علیحدہ ہو جائے اور اہل اسلام سے مل جائے۔ اسی طرح پہلے جس حالت پر تھا اس کا عکس ظاہر کرے۔ توبہ کا بیان اور اس کے احکام ان شاء اللہ سورۂ نساء میں آئیں گے۔ بعض علماء نے فرمایا: وَبَيَّنُوۡا سے مراد شراب

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب لعقوبات، صفحہ 300 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب جاء فی عذاب القبر، صفحہ 184، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب فی اللعن، صفحہ 316، جلد 2 (وزارت تعلیم)

کے مٹکے توڑ دینا اور شراب کو بہا دینا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد تورات میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت اور آپ کی اتباع کا وجوب جو موجود ہے اسے بیان کرنا ہے۔ عموم اولیٰ ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے یعنی جس حالت پر تھے اس کے خلاف ظاہر کرنا۔ فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

''بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور مرے اس حال پر کہ وہ کافر تھے یہی وہ لوگ ہیں جن پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں کی اور سب لوگوں کی۔ ہمیشہ رہیں گے اس میں نہ ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهُمْ كُفَّارٌ واو حالیہ ہے۔ ابن عربی نے کہا: مجھے میرے اکثر مشائخ نے بتایا کہ معین کافر پر لعنت جائز نہیں کیونکہ اس کی وفات کی حالت معلوم نہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے لعنت کے اطلاق میں کفر پر وفات شرط رکھی ہے۔ اور وہ روایت جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متعین کفار پر لعنت کی (1)۔ تو یہ اس لئے تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے انجام کا علم تھا۔ ابن عربی نے کہا: میرے نزدیک ظاہر حال کی وجہ سے لعنت کرنا اور اسے قتل کرنا اور اس سے قتال کرنا جائز ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے اللہ! عمرو بن العاص نے میری ہجو کی اسے معلوم ہے کہ میں شاعر نہیں ہوں تو اس پر لعنت کر اور اس کی ہجو کر جتنی اس نے میری ہجو کی (2)، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمرو بن العاص پر لعنت کی، اگرچہ ایمان، دین اور اسلام اس کا انجام تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انصاف فرمایا کہ عرض کی: جتنی اس نے میری ہجو کی ہے اتنی اس کی ہجو فرما، زیادتی نہیں کی تا کہ وہ عدل و انصاف کو جان لے اور ہجو کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا یہ باب الجزاء سے ہے۔ اس وصف سے ابتدا نہیں کی۔ جس طرح مکر، استہزا اور خدیعہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات بلند و بالا ہے اس سے جو ظالم کہتے ہیں۔

میں کہتا ہوں: بغیر تعیین کے تمام کفار پر لعنت کرنے میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ امام مالک نے داؤد بن حصین کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے اعرج کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے لوگوں کو پایا کہ وہ رمضان میں کفار پر لعنت کرتے تھے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: خواہ کفار ذمی ہوں یا ذمی نہ ہوں یہ واجب نہیں۔ لیکن جو کفار پر لعنت کرے اس کے لئے مباح ہے کیونکہ انہوں نے حق کا انکار کیا اور دین اور دینداروں سے عداوت کی۔ اسی طرح جو سر عام گناہ کرے جیسے شراب پینے والے، سود کھانے والے اور جو عورتوں میں سے مردوں کی مشابہت اختیار کرتی ہیں اور مردوں میں سے جو عورتوں کی مشابہت

1۔ احکام القرآن لابن عربی، صفحہ 50، جلد 1 (دار الفکر)

2۔ الہندی فی کنز العمال، صفحہ 548، جلد 13، حدیث نمبر 37431 (مکتبۃ التراث الاسلامی)

اختیار کرتے ہیں ان کے علاوہ جن کے متعلق احادیث میں لعنت وارد ہے۔

مسئلہ نمبر 2: کافر کو لعنت کرنا کفر پر زجر کے اعتبار سے نہیں بلکہ وہ کفر پر جزا اور اس کے کفر کے قبح کے اظہار کے طور پر ہے کافر مردہ ہو یا مجنون ہو۔ سلف کی ایک قوم نے کہا: جو کافر مجنون ہے یا جو کافر مر چکا ہے اس کو لعنت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں یہ بطریق جزا جائز ہے اور نہ بطریق زجر کیونکہ وہ اس سے متاثر نہیں ہوتا۔

اس معنی کے اعتبار سے آیت سے مراد یہ ہوگا کہ لوگ قیامت کے دن اسے لعنت کریں گے تا کہ وہ اس سے متاثر ہو اسے نقصان پہنچے اور اس کا دل دکھے تو یہ اس کے کفر پر جزا ہوگی۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا (عنکبوت:25)

اس قول پر دلیل ہے کہ یہ آیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر دینا ہے کہ وہ ان پر لعنت کرتا ہے یہ بطور امر نہیں ہے۔ ابن عربی نے کہا: معین گنہگار کو لعنت کرنا بالاتفاق جائز نہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ ایک بار شراب پینے والے کو لایا گیا تو ما حود لوگوں میں سے کسی نے کہا اللہ اس پر لعنت کرے اسے کتنی بار لایا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اپنے بھائی کے خلاف شیطان کے معاون نہ ہو۔ آپ نے اس کے لئے اخوت کی حرمت کا ذکر کیا، یہ شفقت کا موجب ہے، یہ حدیث صحیح ہے (1)۔

میں کہتا ہوں: بخاری اور مسلم نے اس حدیث کو ذکر کیا ہے۔ بعض علماء نے معین گنہگار کو لعنت کرنے میں جواز کا قول کیا ہے۔ انہوں نے کہا: نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد نعیمان کے حق میں فرمایا جبکہ اس پر حد قائم ہو چکی تھی۔ اور جس پر اللہ تعالیٰ کی حد قائم ہو جائے اسے لعنت کرنا مناسب نہیں اور جس پر حد قائم نہ ہوا سے لعنت کرنا جائز ہے۔ خواہ اس کا نام لیا گیا ہو یا متعین کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو کیونکہ نبی کریم ﷺ لعنت نہیں فرماتے تھے مگر اس پر جس پر لعنت واجب ہوتی ہے جب تک وہ اس لعنت کی موجب حالت پر باقی رہتا، جب وہ اس جرم سے توبہ کر لیتا اور اس کو ختم کر دیتا، اور حد اسے پاک کر دیتی تو لعنت اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتی۔ اس کو نبی کریم ﷺ کے اس فرمان نے واضح کیا ہے: جب تم میں سے کسی کی لونڈی زنا کرے تو اسے حد لگاؤ اور اسے برا نہ کہو (2)...... یہ حدیث اپنی صحت کے ساتھ اس بات پر دلیل ہے کہ تثریب (برا بھلا کہنا) اور لعنت کرنا حد لگنے سے پہلے اور توبہ کرنے سے پہلے ہے۔ اللہ تعالیٰ اعلم

ابن عربی نے کہا: گنہگار پر مطلقاً لعنت کرنا بالاجماع جائز ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ چور پر لعنت کرے جو انڈا چوری کرتا ہے پھر اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے (3)۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ یعنی اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت سے دور کرتا ہے۔ اللعن کا اصل معنی دھتکارنا اور دور کرنا ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ بندوں کی طرف سے لعنت، دھتکارنا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے لعنت عذاب ہے۔ حسن بصری نے والملائكة والناس اجمعون حالت رفعی میں پڑھا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، صفحہ 50، جلد 1 (دار الفکر) 2۔ صحیح مسلم، کتاب الحدود، باب حد الزنا، صفحہ 70، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)
3۔ صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب لعن السارق، صفحہ 1003، جلد 2 (وزارت تعلیم)

ہے(1) اس کی تاویل یہ ہے: اولئك جزاء هم ان یلعنهم الله و یلعنهم الملائكة و یلعنهم الناس اجمعون۔ جیسے تو کہتا ہے: کرهت قیام زیدٍ وعمروٌ و خالدٌ کیونکہ اس کا معنی ہے کرهت انْ قام زیدٌ۔ حسن کی قراءت مصاحف کے مخالف ہے۔

اگر کہا جائے: تمام لوگ تو لعنت نہیں کرتے کیونکہ ان کی قوم تو انہیں لعنت نہیں کرتی۔ اس کے تین جواب دیئے گئے ہیں: (۱) اکثر لوگوں کی طرف سے لعنت ہوتی ہے اس لئے تمام لوگوں کی لعنت کا اطلاق کیا گیا۔ اکثر کو اقل پر غلبہ دیا گیا۔ (۲) سدی نے کہا: ہر ایک ظالم پر لعنت کرتا ہے جب کافر ظالم پر لعنت کرتا ہے تو وہ اپنے آپ پر لعنت کرتا ہے۔ (۳) ابو العالیہ نے کہا: اس سے مراد قیامت کے دن کی لعنت ہے تمام لوگوں کے ساتھ ان کی قوم بھی انہیں لعنت کرے گی۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا (عنکبوت: 25)

پھر فرمایا: خٰلِدِيْنَ فِيْهَا یعنی لعنت میں ہمیشہ رہیں گے یعنی لعنت کی جزا میں۔ بعض نے فرمایا ان کا لعنت میں خلود ہمیشہ ہے۔ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ یعنی کسی وقت بھی عذاب سے مؤخر نہیں کئے جائیں گے خٰلِدِيْنَ، علیهم میں ہا اور میم سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اس میں عامل علیهم کا قول ظرف ہے۔ کیونکہ اس میں لعنت کے استقرار کا معنی ہے۔

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾

''اور تمہارا خدا ایک خدا ہے نہیں کوئی خدا بجز اس کے بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ جب اللہ تعالیٰ نے حق کو چھپانے سے ڈرایا تو یہ بیان فرمایا کہ سب سے پہلی چیز جس کا اظہار واجب ہے اور جس کا چھپانا جائز نہیں وہ توحید کا امر ہے اور اس کو برہان کے ذکر سے ملایا، نظر وفکر کا طریقہ سکھایا اور وہ کائنات کے عجائب میں غور وفکر ہے تاکہ وہ جان لے کہ اس کائنات کے لئے کوئی فاعل ہونا ضروری ہے جس کے مشابہ کوئی شی نہ ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا قریش کفار نے کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے لئے اپنے رب کا نسب بیان کرو تو اللہ تعالیٰ نے سورہ اخلاص اور یہ آیت نازل فرمائی۔ اور مشرکین کے لئے تین سو ساٹھ بت تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ وہ ایک ذات ہے(2)۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یہ نفی اور اثبات ہے اس کا اول کفر ہے اور اس کا آخر ایمان ہے۔ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

شبلی سے حکایت ہے کہ وہ فرماتے تھے: اللہ اللہ کہتے اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ نہیں کہتے تھے، اس کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: مجھے ڈر رہتا ہے کہ میں نفی کا کلمہ کہوں اور اقرار کا کلمہ نہ کہہ سکوں۔

میں کہتا ہوں: یہ ان علوم دقیقہ میں سے ہے جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس معنی کو اپنی کتاب میں نفی اور اثبات میں ذکر فرمایا اور اس کا تکرار فرمایا اور اپنے نبی کی زبان کے ذریعے اس کے کہنے والے کے لئے بہت بڑے ثواب

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 232، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ اخلاص، صفحہ 172، جلد 2 (وزارت تعلیم)

کا وعدہ فرمایا۔ موطا، بخاری اور مسلم وغیرہم نے نقل فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کا آخری کلام لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہوگا وہ جنت میں داخل ہوگا(1) اور اس سے مقصود دل سے یہ تسلیم کرنا ہے، زبان سے کہنا نہیں ہے۔ اگر کسی نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا اور وہ فوت ہوا جبکہ اس کا اعتقاد اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور ان تمام صفات پر تھا جو اللہ تعالیٰ کے لئے واجب ہیں تو اہل سنت کا اتفاق ہے کہ وہ جنتی ہے۔ ہم نے اللہ تعالیٰ کے اسم واحد اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اور الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ کا معنی اپنی کتاب الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنی میں بیان کر دیا ہے۔ والحمد للہ

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝

”بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کی گردش میں اور جہازوں میں جو چلتے ہیں سمندر میں وہ چیزیں اٹھائے جو نفع پہنچاتی ہیں لوگوں کو اور جو اتارا اللہ تعالیٰ نے بادلوں سے پانی پھر زندہ کیا اس کے ساتھ زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد اور پھیلا رہے ہیں اس میں ہر قسم کے جانور اور ہواؤں کے بدلتے رہنے میں اور بادل میں، جو حکم کا پابند ہو کہ آسمان اور زمین کے درمیان (لٹکتا رہتا) ہے۔ (ان سب میں) نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل رکھتے ہیں“۔

اس میں چودہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: عطا نے کہا: جب وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ کا ارشاد نازل ہوا تو کفار قریش نے کہا: ایک خدا سب لوگوں کی باتیں کیسے سنتا ہے تو یہ آیت نازل ہوئی اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یہ سفیان نے اپنے باپ سے انہوں نے ابو الضحیٰ سے روایت کیا ہے فرمایا: جب وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ کا ارشاد نازل ہوا تو انہوں نے کہا اس پر کوئی دلیل بھی ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ،(2) گویا انہوں نے نشانی طلب کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے توحید کی دلیل بیان فرمائی کہ یہ عالم اور اس کی عجیب تخلیق کا ضرور کوئی بانی اور صانع ہے۔ اور سمٰوٰت کو جمع ذکر فرمایا کیونکہ یہ مختلف اجناس ہیں اور ہر آسمان کی جنس، دوسرے سے مختلف ہے اور زمین کو مفرد ذکر فرمایا کیونکہ تمام مٹی ہی ہیں۔ واللہ اعلم

آسمانوں کا نشانی ہونا اس اعتبار سے ہے کہ یہ بلند ہیں اور نہ تو ان کے نیچے کوئی ستون ہے اور نہ ان کے اوپر رسی ہے، تو یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور خرق عادت پر دلیل ہے۔ اگر ایک نبی آئے وہ ہوا میں ایک پہاڑ کو بغیر کسی سہارا کے ٹھہرانے کا چیلنج کرے تو یہ معجزہ ہوگا۔ پھر آسمان میں سورج، چاند اور چلنے والے ستارے اور مشرق و مغرب میں چمکتے اور روشن ستارے اور

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، باب التلقین، صفحہ 88، جلد 2 (وزارت تعلیم)

2۔ تفسیر طبری، صفحہ 75، جلد 2 (دار احیاء التراث العربیۃ)

چھپے ہوئے ستارے دوسری نشانی ہیں۔

اور زمین کا نشانی ہونا اس اعتبار سے ہے کہ اس کے دریا، اس کی نہریں، اس کی معدنیات، اس کے درخت، اس کا ہموار ہونا اور اس کے نشیبی علاقے یہ سب صانع کی قدرت کی دلیل ہیں۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد ایک کا آنا اور دوسرے کا جانا ہے اس حیثیت سے کہ معلوم نہیں کہاں جاتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: ان کا اوصاف میں مختلف ہونا ہے جیسے نور و ظلمت میں، طول و قصر میں۔ اللیل یہ لیلة کی جمع ہے۔ جیسے تمرة و تمر، نخلة و نخل اور لیلة کی جمع لیالی اور لیالٍ بھی آتی ہے دونوں کا معنی ایک ہے۔ یہ جمع کے قیاس سے جدا ہے، جسے شبه و مشابه، حاجة و حوائج، ذكر و مذاكر، گویا قیاساً لیالی کی جمع لیلاۃ ہوتی۔ لیلاۃ کو شعر میں استعمال کیا گیا ہے۔ فرمایا:

فی کل یوم وکل لیلاۃ

ایک اور شاعر نے کہا:

فی کل یوم ما وکل لیلاہ حتی یقول کل راءٍ اذا رأہ

یا ویحة من جمل ما اشقاہ

ابن فارس نے ''المجمل'' میں کہا: کہا جاتا ہے کہ کسی پرندے کو بھی لیلاً کہا جاتا ہے اور میں اسے نہیں جانتا۔ النہار کی جمع نُهُرٌ و أنهِرَةٌ۔ احمد بن یحییٰ ثعلب نے کہا: نہر کی جمع نُهُر ہے اور یہ نہار کی جمع الجمع ہے۔ بعض نے فرمایا: النہار ایسا اسم مفرد ہے جس کی جمع نہیں بنائی جاتی کیونکہ یہ مصدر کے معنی میں ہے۔ جس طرح تیرا قول الضیاء ہے یہ قلیل و کثیر پر واقع ہوتا ہے۔ پہلا اکثر ہے۔ شاعر نے کہا:

لولا الثریدان هلکنا بالضمر ثرید لیل و ثریدٌ بالنهر (1)

ابن الفارس نے کہ النہار معروف ہے اور اس کی جمع نہر اور انہار ہے اور کہا جاتا ہے النہار کی جمع نہر بنائی جاتی ہے۔ النہار سے مراد طلوع فجر اور غروب شمس کے درمیان کی روشنی ہے۔ رجل نَهِرٌ، صاحب نہار کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: النہار، حباریٰ (چکور) پرندے کے بچے کو کہتے ہیں۔ نضر بن شمیل نے کہا: نہار کا آغاز سورج کے طلوع سے ہے اور سورج کے طلوع ہونے سے پہلے وقت کو نہار سے شمار نہیں کیا جاتا۔ ثعلب نے کہا: عربوں کے نزدیک اس کا اول سورج کا طلوع ہونا ہے اور اس نے امیہ بن ابی الصلت کے شعر سے استشہاد کیا ہے۔

والشمس تطلع کل آخر لیله حمراء یصبح لونها یتورّد

اور عدی بن زید کا شعر ہے:

و جاعل الشمس مصراً لا خفاء به بین النهار و بین اللیل قد فصلا

1۔ تفسیر طبری، صفحہ 77، جلد 2 (دار احیاء التراث العربیۃ)

اور کسائی نے یہ شعر لکھا ہے:

اذا طلعت شمس النهار فانها أمارة تسليمي عليك فسلمي

اور زجاج نے ''کتاب الانواء'' میں کہا ہے: دن کا آغاز سورج کے بلند ہونے کے ساتھ ہے(1)۔

ابن انباری نے زمانے کی تین اقسام بنائی ہیں: ایک کو اس نے محض رات بنایا ہے اور وہ سورج کے غروب ہونے سے لے کر فجر کے طلوع ہونے تک کا وقت ہے اور دوسری قسم کو محض دن بنایا ہے اور وہ سورج کے طلوع ہونے سے اس کے غروب ہونے تک کا وقت ہے ایک اور قسم دن اور رات کے درمیان مشترک بنائی ہے اور وہ فجر کے طلوع ہونے اور سورج کے طلوع ہونے کے درمیان کا وقت ہے یہ رات کی تاریکی کا بقایا ہے اور دن کی روشنی کا آغاز ہے۔

میں کہتا ہوں: صحیح یہ ہے کہ دن فجر کے طلوع ہونے سے لے کر سورج کے غروب ہونے تک کا وقت ہے، جس طرح کہ ابن فارس نے المجمل میں روایت کیا ہے اور اس پر دلیل صحیح مسلم میں حضرت عدی بن حاتم کی روایت ہے، فرمایا: جب یہ ارشاد حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ (البقرہ:187) نازل ہوا تو عدی نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! میں اپنے تکیہ کے نیچے دو دھاگے رکھتا ہوں ایک دھاگہ سفید اور ایک دھاگہ سیاہ، ان کے ساتھ دن سے رات کی پہچان کرتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک تمہارا تکیہ بڑا چوڑا ہے اس سے مراد رات کی تاریکی اور دن کی سفیدی ہے(2)۔ یہ حدیث تقاضا کرتی ہے کہ دن فجر کے طلوع ہونے سے سورج کے غروب ہونے تک کا وقت ہے۔ قسموں میں فقہ کا مقتضا بھی یہی ہے اور اسی پر احکام مرتب ہوتے ہیں۔ پس جو قسم اٹھائے کہ لا یکلم فلانا نہارا میں فلاں سے پورا دن کلام نہیں کروں گا تو وہ سورج کے طلوع ہونے سے پہلے بھی کلام کرے گا تو حانث ہوگا، اور پہلے قول کے مطابق حانث نہ ہوگا۔ اور نبی کریم ﷺ کا قول اس میں فیصل اور حکم ہے۔ اور رہا لغت کے ظاہر اور سنت کے اعتبار سے تو روشنی کے وقت کو کہتے ہیں جب دن کا وقت وسیع ہو۔ جیسا کہ شاعر نے کہا:

ملكت بها كفي فانهرت فتقها يرى قائم من دونها ما وراءها

اور حضرت حذیفہ سے مروی حدیث بھی اسی قول پر دلالت کرتی ہے جس کو نسائی نے نقل فرمایا ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ روزوں کی آیات کے ضمن میں آئے گی۔

مسئلہ نمبر3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ، الْفُلْكِ سے مراد کشتیاں ہیں۔ مفرد اور جمع کے لئے ایک ہی لفظ استعمال ہوتا ہے اور مذکر اور مونث کے لئے یہی لفظ استعمال ہوتا ہے(3)۔ لیکن مفرد اور جمع کی حرکات ایک جیسی نہیں ہیں بلکہ ایسی ہیں کہ گویا جمع کی دوسری بنا ہے۔ اور اس پر دلیل تثنیہ کا درمیانی حرف ہے۔ عرب کہتے ہیں: فُلْكان، الفلك مفرد مذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۞ (یاسین) یہاں مذکر استعمال ہوا ہے اور فرمایا:

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 233، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ صحیح مسلم، کتاب الصیام، صفحہ 349، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ تفسیر طبری، صفحہ 77، جلد 1 (دار احیاء التراث العربیہ)

وَ الْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ۔ یہاں مونث ہے۔ یہ واحد اور جمع دونوں کا احتمال رکھتا ہے اور فرمایا: اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَ جَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ (یونس:22) اس آیت میں جمع استعمال ہوا ہے گویا جب یہ واحد ہو اور مرکب کے معنی میں ہو تو مذکر ہوتا ہے اور سفینۃ کے معنی میں ہو تو مونث ہوتا ہے۔ فلك السماء۔ جس پر ستارے گردش کرتے ہیں۔ فلكت الجارية جب بچی کے پستان گول ہو جائیں۔ اسی سے ہے فلكة المغزل، چرخہ کا پرتلہ۔ کشتی کو فلک کہا جاتا ہے کیونکہ وہ پانی کے ساتھ آہستہ آہستہ گھومتی ہے۔ آیت میں الْفُلْكِ کو بطور قدرت کی نشانی پیش کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے مسخر کر دیا ہے حتیٰ کہ پانی کی سطح پر چلتی ہے اور اتنی بوجھل ہونے کے باوجود پانی کے اوپر ٹھہرتی ہے سب سے پہلے کشتی حضرت نوح علیہ السلام نے بنائی جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے اور جبریل امین نے انہیں کہا: پرندے کے سینہ پر بنا تو حضرت نوح علیہ السلام نے اسے بنایا جس طرح جبریل امین نے آپ کو دکھایا جبکہ یہ عالمین میں وراثت ہے، کشتی ایک الٹا پرندہ ہے پانی اس کے نیچے ہے جس طرح ہوا اس کے اوپر ہے۔ یہ ابن عربی کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 4: یہ آیت اور اس کی مثل آیات سمندر پر سوار ہونے کے جواز کی دلیل ہیں خواہ وہ سوار ہونا تجارت کے لئے ہو یا عبادت کے لئے ہو جیسے حج اور جہاد۔ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث ہے، انہوں نے کہا: ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہم سمندر پر سوار ہوتے ہیں اور ہمارے پاس تھوڑا سا پانی ہوتا ہے (1)۔ اور حضرت انس بن مالک کی حدیث ام حرام کے واقعہ کے متعلق ہے۔ ان دونوں احادیث کو امام مالک وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت انس کی حدیث کو ان میں سے ایک جماعت نے روایت کیا ہے اور انہوں نے اسحاق بن عبد اللہ بن ابی طلحہ سے انہوں نے حضرت انس سے روایت کیا ہے۔

اس حدیث کو بشر بن عمر نے امام مالک سے انہوں نے اسحاق سے انہوں نے حضرت انس سے انہوں نے حضرت ام حرام سے روایت کیا ہے، انہوں نے اسے مسند ام حرام میں شامل کیا ہے نہ کہ حضرت انس کی مسند میں۔ اسی طرح حضرت انس سے بندار محمد بن بشار نے اس کو بیان کیا ہے اس میں جہاد کے لئے مردوں اور عورتوں کے لئے سمندر پر سوار ہونے کی واضح دلیل ہے۔ جب جہاد کے لئے سوار ہونا جائز ہے تو فرض حج کے لئے سوار ہونا بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا۔ حضرت عمر بن خطاب اور حضرت عمر بن عبد العزیز سے سمندر پر سوار ہونے سے منع کرنا مروی ہے جبکہ قرآن و حدیث اس قول کا رد کرتے ہیں۔ اگر اس کا سوار ہونا مکروہ ہوتا یا جائز نہ ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کو منع فرما دیتے جنہوں نے کہا تھا: ہم سمندر پر سوار ہوتے ہیں (2)۔ یہ آیت اور اس کی مثل آیات اس غرض سے نص ہیں۔ ان کی طرف ہی رجوع کرنا ہوگا اور اس کی تاویل کی جائے گی جو حضرت عمر بن خطاب اور حضرت عمر بن عبد العزیز نے کہا ہے وہ احتیاط اور طلب دنیا اور کثرت دنیا کی طلب کے لئے سوار ہونے پر محمول

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطہارۃ، باب الوضوء بماء البحر، صفحہ 11، جلد 1 (وزارت تعلیم)
جامع ترمذی، کتاب الطہارۃ، باب ما جاء فی ماء البحر، صفحہ 11، جلد 1 (وزارت تعلیم)
2۔ جامع ترمذی، کتاب الطہارۃ، ما جاء فی ماء البحر، صفحہ 11، جلد 1 (وزارت تعلیم)

ہوگا، فرائض کی ادائیگی پر محمول نہیں ہوگا۔ اور معنی کی جہت سے اس کے اوپر سوار ہونے کے جواز پر دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سمندر کو زمین کے درمیان رکھا اور باقی مخلوق کو زمین کے کناروں پر رکھا۔ اور منافع کو دونوں جہتوں کے درمیان تقسیم فرمایا اور ان منافع کو حاصل نہیں کیا جا سکتا مگر سمندر عبور کرنے کے بعد۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس کا راستہ کشتی کے ذریعے آسان فرمایا۔ یہ ابن عربی کا قول ہے۔ ابو عمر نے کہا: امام مالک عورت کے لئے حج کی خاطر سمندری سفر کو ناپسند کرتے تھے اور جہاد کے لئے زیادہ مکروہ ہوگا۔ قرآن وسنت اس قول کو رد کرتے ہیں مگر بعض اہل بصرہ نے کہا: امام مالک نے اس لئے مکروہ فرمایا کیونکہ حجاز میں کشتیاں چھوٹی تھیں، عورتیں اس میں پردہ نہیں کر سکتی تھیں کیونکہ وہ تنگ ہوتی تھیں اور لوگوں کی ان میں بھیڑ ہوتی تھی اور مدینہ سے مکہ کی طرف جانے کا خشکی کا راستہ بھی موجود تھا، اس لئے امام مالک نے اس کو ناپسند فرمایا۔ بڑی کشتیاں جیسے اہل بصرہ کی کشتیاں ہیں ان میں کوئی حرج نہیں اور فرمایا: اصل یہ ہے کہ حج آزاد، بالغ آدمیوں میں سے حج کی استطاعت رکھنے والے پر فرض ہے خواہ وہ عورتیں ہوں یا مرد ہوں، جبکہ راستہ امن والا ہو۔ اس میں سمندری یا بری راستہ کی تخصیص نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: کتاب وسنت اور معنی ان دونوں سفروں کے لئے اس پر سوار ہونے کی اباحت پر دلالت کرتا ہے خواہ وہ عبادت ہو یا تجارت ہو پس یہ حجت ہے اور اس میں نمونہ ہے مگر سمندر پر سوار ہونے میں لوگوں کے احوال مختلف ہیں، بہت سے سواروں پر اس پر سوار ہونا آسان ہوتا ہے اور ان کے لئے دشوار نہیں ہوتا، جبکہ بعض دوسروں پر اس کا عبور کرنا دشوار ہوتا ہے اور اس مسئلہ میں کمزور ہوتے ہیں جیسا کہ بعض لوگ جو سمندر پر سوار ہوتے ہیں تو ان پر غشی طاری ہو جاتی ہے اور جو ایک حالت میں فرائض ادا کرنے پر قادر نہیں ہوتے، پس پہلے لوگوں کے لئے جائز ہے اور دوسرے لوگوں پر حرام ہے اور ممنوع ہے اور اہل علم کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

مسئلہ نمبر 5: سمندر جب طغیانی میں ہو تو کسی کے لئے بھی اس پر سوار ہونا جائز نہیں اور اس زمانہ میں بھی سوار ہونا جائز نہیں جبکہ غالب گمان عدم سلامتی کا ہو۔ ان کے نزدیک ایسے زمانہ میں سوار ہونا جائز ہے جس میں غالب گمان سلامتی کا ہو وہ لوگ جو سلامتی کی حالت میں سمندر پر سوار ہوتے ہیں اور نجات پاتے ہیں ان کو کوئی روکنے والا نہیں اور وہ جو اس میں ہلاک ہوتے ہیں وہ روکے جاتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ یعنی تجارت اور دوسرے مقاصد جس کے ساتھ لوگوں کے احوال درست ہوتے ہیں وغیرہ منافع کے ساتھ چلتی ہے۔ سمندر پر سوار ہونے کے ساتھ نفع حاصل کیا جاتا ہے اور جو اس میں سامان اٹھاتا ہے وہ نفع اٹھاتا ہے اور جنہوں نے دین میں طعن کیا ہے انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ تمہاری کتاب میں فرماتا ہے مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ (انعام: 38)

پس جو کھانے کی مصلحت کی چیزیں ہیں مثلاً نمک، کالی مرچ وغیرہ میں ان کا ذکر کہاں ہے تو اس کو بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ کے ساتھ جواب دیا گیا۔

مسئلہ نمبر 7: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ یعنی بارشیں جن کے ساتھ عالم کی

بڑھوتری ہے، نباتات اور خوراک کا پیدائش ہے (1) اور اس سے کچھ جمع کیا جاتا ہے تاکہ بارشوں کے نہ ہونے کے وقت فائدہ اٹھایا جائے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ (المومنون: 18)

مسئلہ نمبر 8: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ، بَثَّ کا معنی تفریق کرنا اور پھیلانا ہے۔ اسی سے كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۝ (القارعۃ) ہے۔ دَآبَّةٍ کا لفظ تمام حیوانوں کو جامع ہے۔ بعض نے ان سے پرندوں کو نکالا ہے وہ مردود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (ہود: 6)

پرندہ بعض حالات میں اپنے پیروں پر چلتا ہے۔ اعشیٰ نے کہا:

دبيب تطا البطحاء فی کل منهل

علقمہ بن عبدہ نے کہا:

صواعقها لطيرهن دبيب

مسئلہ نمبر 9: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ ہواؤں کا چلنا۔ تصریف سے مراد انہیں عقیم اور باربردار کر کے چلانا ہے اور کچھ کو مدد کرنے والی اور ہلاک کرنے والی بنا کر چلانا ہے، کچھ کو ٹھنڈی اور کچھ کو گرم بنا کر چلانا ہے، کچھ کو نرم اور کچھ کو سخت بنا کر چلانا ہے۔ بعض نے فرمایا: تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ سے مراد ان کا جنوباً شمالاً (مشرق و مغرب) چلانا ہے۔ نقصان دہ اور فائدہ مند بنا کر چلانا ہے اور یکبارگی ہوا کا چلانا ہے اس سے مراد وہ ہوا ہے جو ان دونوں ہواؤں کے درمیان ہوتی ہے۔

بعض نے فرمایا: تَصْرِيْفِ سے مراد ان ہواؤں کا اتنی مقدار میں چلانا ہے جتنی کہ وہ کشتیاں سامان اٹھائے ہوئے ہوتی ہیں، ان کو برداشت کرلیں۔ اسی طرح چھوٹی کشتیوں کے لئے ان کے مطابق ہواؤں کو چلاتا ہے اور ان سے ان ہواؤں کو روکتا ہے جو انہیں نقصان دیتی ہیں۔ ان کے بادبانوں کے بڑے اور چھوٹے ہونے کا کوئی اعتبار نہیں اگر ہوا ایک جسم بن کر آتی تو اس کے بادبانوں کو پھاڑ دیتی اور انہیں غرق کر دیتی۔

الرِّيٰحِ، یہ ریح کی جمع ہے، اس کا یہ نام اس لئے ہے کہ عام طور پر رحمت کو لاتی ہیں۔ ابوداؤد نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ الریح من روح اللہ تاتی بالرحمۃ و تاتی بالعذاب فاذا رایتموها فلا تسبوها واسالوا اللہ خیرها واستعیذوا باللہ من شرها۔ (2) (یعنی ہوا اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہے، کبھی یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو لاتی ہے اور کبھی عذاب کو لاتی ہے، جب تم ہوا کو دیکھو تو اسے برا مت کہو اور اس کی خیر کا سوال کرو اور اس کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو)۔ اسی حدیث کو ابن ماجہ نے اپنی سنن میں اپنی سند سے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہوا کو برا مت کہو کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہے، کبھی یہ رحمت لاتی ہے اور کبھی عذاب لاتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ سے اس کی خیر کا سوال کرو اور اس کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو (3)۔ نبی کریم

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، صفحہ 339، جلد 2 (وزارت تعلیم)
3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الادب، صفحہ 273 (وزارت تعلیم)

ﷺ سے مروی ہے، فرمایا: ہوا کو برا مت کہو کیونکہ یہ رحمن کے نفس سے ہے(1)۔ معنی یہ ہے: اس نے ہواؤں میں تفریج، تنفیس اور ترویح رکھی اور ارواور اضافت، فعل کے طریق سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ایسا بنایا۔ صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: نصرت بالصبا و أهلكت عادٌ بالدبور۔(2) (صبا کے ساتھ میری مدد کی گئی اور عاد کو دبور کے ساتھ ہلاک کیا گیا)۔ حدیث میں جو آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے جنگ احزاب میں ہوا کے ذریعے تکلیف کو دور فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَجُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا (احزاب:9) (پس ہم نے بھیج دی ان پر آندھی اور ایسی فوجیں جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے تھے) کہا جاتا ہے: اللہ تعالیٰ نے فلاں سے دنیا کی مصیبتوں سے ایک مصیبت کو دور فرمایا۔ صحیح مسلم میں ابوہریرہ کی حدیث ہے کہ جس نے کسی مسلمان سے دنیا کی مصیبتوں میں سے کسی مصیبت کو دور کیا اللہ تعالیٰ قیامت کی مصیبتوں میں اس کی ایک مصیبت کو دور کرے گا(3)۔ شاعر نے کہا:

كأن الصبا ريح اذا ما تنسمت　　على كبد مهموم تجلت همومها

ابن عربی نے کہا: النسیم ہوا کے چلنے کی ابتدا کو کہتے ہیں۔ الریح کی اصل روح ہے اسی وجہ سے جمع قلت ارواح آتی ہے ارياح نہیں کہا جاتا کیونکہ یہ واوی ہے کثرت کی جہت سے اور یا کی مناسبت کی طلب کی وجہ سے ریاح کہا جاتا ہے اور حضرت حفصہ کے مصحف میں و تصریف ارواح ہے۔

مسئلہ نمبر 10: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ حمزہ اور کسائی نے الریح مفرد پڑھا ہے۔ اسی طرح سورہ اعراف، کہف، ابراہیم، النمل، الروم، فاطر، شوری اور جاثیہ میں پڑھا ہے ان کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور حمزہ اور کسائی کی ابن کثیر نے سورہ اعراف، النمل، الروم، فاطر اور شوریٰ میں موافقت کی ہے اور حمزہ نے الریح لواقح کو مفرد پڑھا ہے۔ ابن کثیر نے هو الذی ارسل الریح کو سورۃ الفرقان میں مفرد پڑھا ہے۔ باقی قراء نے تمام جگہوں پر جمع کا صیغہ پڑھا ہے سوائے ان الفاظ کے جو سورہ ابراہیم اور شوریٰ میں ہیں۔ ان کو نافع کے سوا کسی نے جمع نہیں پڑھا۔ ان مواقع کے علاوہ میں ساتوں قراء کا کوئی اختلاف نہیں ہے اور جو سورہ روم میں ہم نے ذکر کیا ہے وہ دوسرا مقام ہے۔ اللّٰهُ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيٰحَ (روم:48) اور الرياح مبشرات میں ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ ابوجعفر یزید بن القعقاع نے پورے قرآن میں الریاح کو جمع پڑھا ہے جب اس پر الف لام آیا ہے، سوائے ان مقامات کے تهوى به الريح۔ الريح العقيم اور اگر الف، لام اس پر نہ ہو تو مفرد پڑھا ہے۔ اور جنہوں نے الریاح کو مفرد پڑھا ہے ان کی وجہ یہ ہے کہ وہ اسم جنس ہے، قلیل و کثیر پر دلالت کرتا ہے اور جنہوں نے جمع پڑھا ہے وہ اس اعتبار سے ہے کہ ہوائیں مختلف جہات سے چلتی ہیں اور بعض نے رحمت والی ہواؤں کو جمع پڑھا ہے اور عذاب والی ہوا کو واحد پڑھا ہے۔ انہوں نے اس میں قرآن کے اغلب قول کا اعتبار کیا ہے جیسے

1۔ المستدرک للحاکم، کتاب التفسیر، صفحہ 298، جلد 2 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ صحیح بخاری، کتاب الاستسقاء، صفحہ 141، جلد 1 (وزارت تعلیم) و صحیح مسلم، کتاب الاستسقاء، صفحہ 295، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب فضل الاجتماع علی تلاوۃ القرآن، صفحہ 345، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

الریاح مبشرات ۔ الریح العقیم۔ قرآن میں رحمت کے ساتھ جمع اور عذاب کے ساتھ مفرد کا ذکر ہے سوائے سورہ یونس کے ان الفاظ کے ۔ وجرین بھم بریح طیبۃ۔

روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب ہوا چلتی تو آپ یہ دعا پڑھتے: اللھم اجعلھا ریاحا ولا تجعلھا ریحا(1) ۔ (یا اللہ! اسے رحمت بنا اور اسے ریح نہ بنا)۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عذاب کی ہوا سخت ہوتی ہے، اس کے اجزاء ملے ہوئے ہوتے ہیں گویا وہ ایک جسم ہے جبکہ رحمت کی ہوا نرم اور جدا جدا ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ان ہواؤں کو الریاح کہا جاتا ہے اور سورۂ یونس میں الفلك کے ساتھ مفرد آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کشتیوں کو چلانے والی ہوا یہ ایک متصل ہوا ہوتی ہے پھر طیب کے ساتھ اس کا وصف بیان کیا جاتا ہے تو ان کے درمیان اور عذاب کی ریح (ہوا) کے درمیان اشتراک زائل ہو گیا۔

مسئلہ نمبر 11: علماء نے فرمایا: الریح تو ہوا کو حرکت دیتی ہے کبھی وہ سخت ہوتی ہے اور کبھی کمزور ہوتی ہے، جب ہوا کی حرکت قبلہ کے سامنے سے ظاہر ہوتی ہے قبلہ کی سمت جاتی ہے تو اس ہوا کو صبا کہا جاتا ہے۔ جب ہوا کی حرکت قبلہ کے پیچھے سے ظاہر ہوتی ہے اور قبلہ کی سمت جاتی ہے تو اسے دبور کہا جاتا ہے۔ جب ہوا کی حرکت قبلہ کی دائیں طرف سے ظاہر ہوتی ہے اور وہ قبلہ کی بائیں جانب کو چلتی ہے تو اسے ریح الجنوب کہا جاتا ہے۔ جب ہوا کی حرکت قبلہ کی بائیں جانب سے ظاہر ہوتی ہے اور اس کی دائیں طرف کو چلتی ہے تو اسے ریح الشمال کہا جاتا ہے، ان میں سے ہر ہوا کی ایک خاص طبع ہے، اس کی منفعت اس کی طبع کے مطابق ہوتی ہے۔ صبا گرم خشک ہوتی ہے دبور ٹھنڈی تر ہوتی ہے۔ جنوب گرم تر ہوتی ہے اور شمال ٹھنڈی خشک ہوتی ہے۔ ان کی طبع کا اختلاف سال کے موسموں کے طبائع کے اختلاف کی طرح ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمانہ کے لئے چار موسم بنائے۔ ان کا مرجع ہوا کے احوال کی تبدیلی کی طرف ہے۔ موسم ربیع بنایا جو موسموں کا آغاز ہے اسے گرم تر بنایا اور اس میں نمو اور بڑھوتری ہوتی ہے، اس میں بارشیں نازل ہوتی ہیں اور زمین اپنا نکھار نکالتی ہے اور اس کا سبزہ ظاہر ہوتا ہے لوگ درخت لگاتے ہیں اور کھیتی باڑی کرتے ہیں، اس میں حیوان پیدا ہوتے ہیں اور دودھ زیادہ ہوتے ہیں۔ جب موسم ربیع ختم ہوتا ہے تو اس کے پیچھے موسم گرما ہوتا ہے یہ ایک طبع میں موسم ربیع کے مشابہ ہے اور وہ حرارت ہے اور رطوبت میں اس کے مخالف ہے کیونکہ گرمیوں میں ہوا گرم اور خشک ہوتی ہے اس میں پھل پکتے ہیں اور موسم ربیع میں کھیتوں کے دانے خشک ہوتے ہیں۔ جب موسم گرما ختم ہوتا ہے تو موسم خزاں اس کے پیچھے آتا ہے وہ ایک طبع میں موسم گرما کے مشابہ ہوتا ہے اور وہ ہے خشکی اور حرارت میں مختلف ہوتا ہے کیونکہ موسم خزاں میں ہوا ٹھنڈی اور خشک ہوتی ہے۔ اس میں پھلوں کی صلاح اپنی انتہا کو پہنچتی ہے اور وہ خشک ہوتے ہیں اور سوکھ جاتے ہیں اور ذخیرہ کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں، پھل اس موسم میں توڑے جاتے ہیں اور انگور کاٹے جاتے ہیں اور تمام درختوں سے فراغت حاصل کی جاتی ہے۔ جب موسم خریف ختم ہوتا ہے تو موسم سرما پیچھے آتا ہے وہ ایک طبع یعنی برودت میں موسم خریف کے موافق ہوتا ہے اور دوسری طبع خشکی میں مخالف ہوتا ہے کیونکہ ہوا سردیوں میں ٹھنڈی اور تر ہوتی ہے۔ پس اس میں بارشیں اور اولے زیادہ ہوتے ہیں۔ زمین آرام پانے والے جسم

1۔ المعجم الکبیر للطبرانی، صفحہ 214، جلد 11، حدیث نمبر 11533 (العلوم والحکم)

کی طرح ہوتی ہے اور حرکت نہیں کرتی مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کی طرف موسم ربیع کی حرارت کو لوٹا دے، جب وہ رطوبت کے ساتھ جمع ہوتی ہے تو اس وقت بھی اللہ تعالیٰ کے اذن سے نمو اور بڑھوتری ہوتی ہے۔ کبھی کبھی ہوائیں زیادہ چلتی ہیں جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے مگر اصول یہی چار ہیں۔ ہر ہوا، دو ہواؤں کے درمیان چلتی ہے۔ پس اس کا حکم اس ہوا والا ہوتا ہے جو اس کے مکان کے قریب ہوتی ہے اس ہوا کو النکباء کہا جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 12: السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ، السَّحَابِ کو یہ نام اس لئے دیا جاتا ہے کیونکہ ہوا میں یہ چلتا ہے۔ عرب کہتے ہیں: سحبت ذیلی سحباً، تسحّب فلان علی فلان جرأت کرنا۔ السحب کا مطلب زیادہ کھانا، پینا ہے۔ المسخر، مطیع۔ بادل کی تسخیر کا مطلب: اسے ایک مکان سے دوسرے مکان کی طرف چلانا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: بادل کی تسخیر کا مطلب بغیر کسی سہارا کے آسمان اور زمین کے درمیان اس کا ٹھہرنا ہے (1)۔ پہلا معنی اظہر ہے کبھی بادل پانی کے ساتھ اور کبھی عذاب کے ساتھ ہوتا ہے۔

مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک شخص صحرا میں اپنی زمین میں تھا۔ اس نے بادل میں ایک آواز سنی کہ فلاں کے باغ کو سیراب کر، پس وہ بادل چلا اور اپنا پانی ایک ٹیلے پر بہایا وہاں ایک نالی تھی، وہ پانی سے بھر گئی۔ متواتر پانی چلتا رہا وہ شخص اپنے باغ میں اپنی کسی کے ساتھ پانی ادھر ادھر پھیر رہا تھا۔ اس نے کہا: اے اللہ کے بندے! تیرا کیا نام ہے؟ اس نے کہا: فلاں۔ اس نے وہ نام بتایا جو اس نے بادل میں سنا تھا۔ اس نے اسے کہا: اے اللہ کے بندے! تو نے میرا نام کیوں پوچھا؟ اس نے کہا: میں نے اس بادل میں آواز سنی جس کا یہ پانی ہے۔ وہ کہہ رہا تھا: فلاں کے باغ کو سیراب کر تیرا نام لیا۔ تو اس باغ میں کیا کرتا ہے؟ اس نے کہا: جب تو نے یہ کہا ہے تو میں اس کی پیداوار کا انتظار کرتا ہوں میں اس کی تہائی صدقہ کرتا ہوں اور تہائی خود اور اپنے عیال کو کھلاتا ہوں اور تہائی پھر اسی زمین میں کاشت کرتا ہوں (2)۔ ایک روایت میں ہے: میں تہائی مساکین، سائلین اور مسافروں کے لئے رکھوں گا (3)۔ قرآن حکیم میں ہے: وَاللّٰهُ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ (فاطر: 9) (اللہ تعالیٰ وہ ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو وہ اٹھالاتی ہیں بادل کو پھر ہم لے جاتے ہیں بادل کو مردہ شہر کی طرف) اور فرمایا حَتّٰٓى اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ (اعراف: 57) (یہاں تک کہ جب وہ اٹھالاتی ہیں بھاری بادل تو ہم لے جاتے ہیں اسے کسی ویران شہر کی طرف)

ابن ماجہ نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب آفاق میں سے کسی افق میں سے بادل کو آتا ہوا دیکھتے تو اپنا کام چھوڑ دیتے تھے اگرچہ نماز میں ہی ہوتے حتیٰ کہ آپ اس کی طرف متوجہ ہو کر یہ دعا مانگتے: اے اللہ! ہم اس شر سے پناہ مانگتے ہیں جس کے ساتھ اس (بادل) کو بھیجا گیا ہے۔ اگر بارش نازل ہوتی تو آپ یہ دعا کرتے: اللھم سیباً نافعاً (نفع بخش بارش دے) دو یا تین مرتبہ کہتے اگر اللہ تعالیٰ اس بادل کو ختم کر دیتا تو اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے (4)۔ مسلم

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ صحیح مسلم، کتاب الزھد، باب فضل الانفاق علی المسکین، صفحہ 411، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)
3۔ ایضاً
4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الدعاء، صفحہ 286 (وزارت تعلیم)

نے اس حدیث کے ہم معنی حدیث حضرت عائشہ سے نقل کی ہے، فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ جب ہوا اور بادل والا دن ہوتا تو آپ کے چہرہ سے پریشانی معلوم ہوجاتی آپ آگے پیچھے آتے جاتے۔ جب بارش ہوجاتی تو آپ خوش ہوجاتے اور آپ کی پریشانی دور ہوجاتی۔ حضرت عائشہ نے کہا: میں نے آپ سے پریشانی کی وجہ پوچھی تو آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہیں یہ عذاب نہ ہو جو میری امت پر مسلط کیا گیا ہو۔ اور جب آپ بارش کو دیکھتے تو کہتے: رحمت (1)۔ ایک روایت میں ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: اے عائشہ! شاید جس طرح قوم عاد نے کہا تھا: فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا (احقاف: 24) (2)

یہ احادیث اور آیات پہلے قول کی صحت پر دلیل ہیں اور تسخیر السحاب سے مراد بادل کا زمین و آسمان کے درمیان ثبوت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کیونکہ ثبوت تو عدم انتقال پر دلالت کرتا ہے۔ اگر ثبوت سے مراد اس کا ہوا میں ہونا مراد لیا گیا ہوتا نہ کہ آسمان اور زمین میں تو یہ صحیح تھا کیونکہ بین استعمال ہوا ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہ مسخرہ محمولہ ہے۔ یہ قدرت کی عظیم نشانی ہے جیسے پرندہ ہوا میں ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَآءِ ؕ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ (النحل: 79) (کیا انہوں نے کبھی نہیں دیکھا پرندوں کی طرف کہ وہ مطیع اور فرمانبردار بن کر اڑ رہے ہیں فضاء آسمانی میں کوئی چیز انہیں تھامے ہوئے نہیں بجز اللہ کے)۔

اور فرمایا: اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّيَقْبِضْنَ ؕ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ (الملک: 19) (کیا انہوں نے پرندوں کو اپنے اوپر (اڑتے) کبھی نہیں دیکھا پر پھیلاتے ہوئے اور کبھی پر سمیٹ بھی لیتے ہیں نہیں روکے ہوئے انہیں کوئی (فضا میں) بجز رحمن کے۔)

مسئلہ نمبر 13: کعب الاحبار نے کہا: بادل، بارش کی چھلنی ہے۔ اگر بادل نہ ہوتا تو جب آسمان سے پانی نازل ہوتا تو زمین کے جس حصہ پر گرتا اسے خراب کردیتا۔ یہ کعب نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا۔ خطیب ابوبکر احمد بن علی نے معاذ بن عبداللہ بن خبیب الجہنی سے کہا: میں نے حضرت ابن عباس کو دیکھا وہ خچر پر گزرے جبکہ میں بنی سلمہ میں تھا۔ ان کے پاس سے کعب کی بیوی کا بیٹا تبیع گزرا۔ اس نے حضرت ابن عباس کو سلام کیا۔ حضرت ابن عباس نے اس سے پوچھا: کیا تو نے کعب احبار سے بادل کے بارے کچھ کہتے سنا ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ اس نے کہا: بادل بارش کے لئے چھانی ہے۔ اگر بادل نہ ہوتا جب آسمان سے پانی نازل ہوتا ہے تو زمین کے جس حصہ پر گرتا اسے خراب کردیتا۔ انہوں نے کہا: کیا تو نے کعب کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ زمین ایک سال ایک نبات اگاتی ہے اور دوسرے سال دوسری نبات اگاتی ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں، میں نے ان کو یہ کہتے سنا ہے کہ بیج آسمان سے اترتا ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: میں نے یہ کعب سے سنا ہے۔

مسئلہ نمبر 14: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَاٰيٰتٍ ایسی دلالات ہیں جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی قدرت پر

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب الاستسقاء، صفحہ 294، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
2۔ ایضاً

دلالت کرتی ہیں اسی وجہ سے ان امور کو وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ کے بعد ذکر کیا ہے تا کہ ان سے پہلے جو اللہ کی وحدانیت، اس کی رحمت کے ذکر اور اس کی مخلوق پر رأفت، ذکر کی ہے اس کی سچائی پر دلالت کرے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: اس شخص کے لئے ہلاکت ہے جس نے اس آیت کو پڑھا اور اس میں غور و فکر نہیں کیا(1)۔ اگر کہا جائے کہ اس میں انکار نہیں ہے کہ یہ چیزیں خود بخود پیدا ہوتی ہیں۔ کہا جائے گا: یہ محال ہے اگر یہ خود پیدا ہوئی ہیں تو پھر ان کا دو حالتوں سے خالی ہونا جائز نہیں یا تو یہ موجود ہوں گی یا موجود نہیں ہوں گی۔ اگر یہ بعد میں پیدا ہوئی ہیں پہلے موجود نہیں تھیں تو یہ محال ہے کیونکہ کسی چیز کے عدم سے وجود میں آنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ حی، عالم، قادر اور مرید ذات کی تخلیق سے ہو اور جو پہلے موجود نہ ہو اس کا اس سے وصف صحیح نہیں۔ اگر یہ پہلے موجود تھیں تو پھر ان کا موجود ہونا ان کے پیدا کرنے سے انہیں غنی کر دے گا۔ پس جو کچھ انہوں نے کہا جائز ہو تو خود بخود پیدا ہونا جاری ہوگا۔ اسی طرح چیرنا اور بننا ہے، یہ محال ہے اور جو چیز محال تک پہنچائے وہ محال ہوتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت میں صرف اخبار پر اکتفا نہیں فرمایا حتیٰ کہ اس نے قرآن کی آیات میں غور و فکر کے ساتھ اس کو ملایا۔ اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا: قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (یونس: 101) (فرمائیے غور سے دیکھو کیا (عجائبات) ہیں آسمانوں اور زمین میں) اور یہ کفار کو خطاب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (یونس) (اور فائدہ نہیں پہنچا تیں آیتیں اور ڈرانے والے اس قوم کو جو ایمان نہیں لانا چاہتے اور فرمایا۔ اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اعراف: 185) (کیا انہوں نے غور سے نہیں دیکھا آسمانوں اور زمین کی وسیع مملکت میں) یعنی ملکوتی آیات میں غور و فکر نہیں کرتے۔ اور فرمایا: وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ (الذاریات) (اور تمہارے وجود میں بھی نشانیاں ہیں کیا تمہیں نظر نہیں آتیں) فرمایا کیا انہوں نے تفکر و تدبر کی نظر سے نہیں دیکھا حتیٰ کہ یہ استدلال کرتے کہ یہ چونکہ حوادث و تغیرات کا محل ہیں تو یہ حادث ہیں اور حادث چیز اپنے صانع سے مستغنی نہیں ہوتی اور وہ صانع حکیم، عالم، قدیر، مرید، سمیع، بصیر اور متکلم ہے کیونکہ اگر اس میں یہ صفات نہ ہوں تو انسان اس سے کامل ہوگا، یہ محال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ (المومنون) یعنی حضرت آدم علیہ السلام کو ہم نے پیدا فرمایا پھر ہم نے اس کی نسل اور اولاد بنائی نطفۃ فی قرار مکین

تبعثون، انسان جب اس تنبیہ کے ساتھ غور و فکر کرے گا اس عقل کے ساتھ جو اسے عطا کی گئی ہے تو وہ اسے غور و فکر کرنے والا پائے گا اور مختلف احوال پر پھرتا ہوا پائے گا۔ وہ پہلے نطفہ تھا پھر جما ہوا خون تھا پھر گوشت کا لوتھڑا پھر گوشت اور ہڈیاں تھا، تو وہ جان لے گا کہ حالت نقص سے حالت کمال کی طرف خود بخود پھرنے والا نہیں کیونکہ وہ خود اس پر قادر نہیں کہ وہ اس افضل حالت میں پیدا ہو جو اس کی عقل کا کمال ہے اور اس کے اعضاء کامل اور مضبوط ہوں۔ انسان اس پر قدرت نہیں رکھتا کہ وہ اپنے اعضاء میں کسی عضو کا اضافہ کرے۔ پس یہ اس پر دلیل ہے کہ وہ اپنی حالت نقص میں اور اپنے ضعف کے وقت میں کسی فعل سے زیادہ عاجز ہے۔ کبھی اپنے آپ کو جوان دیکھتا ہے، کبھی ادھیڑ عمر میں دیکھتا ہے، کبھی بوڑھا دیکھتا ہے۔ وہ خود بخو،

1۔ الفردوس بماثور الخطاب، صفحہ 400، جلد 4، حدیث نمبر 7158 (دار الباز)

حالت شباب اور قوت سے بڑھاپے کی حالت کو نہیں پہنچتا۔ نہ وہ خود اختیار کرتا ہے اور نہ اس کی وسعت میں ہے کہ وہ بڑھاپے کی حالت کو زائل کر کے پھر جوانی کی قوت کو لوٹا لے۔ پس وہ جان لے گا کہ وہ ایسا نہیں ہے جو ان افعال کو خود کر سکے، اس کا کوئی صانع ہے اور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف نقل کرنے والا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کے احوال بلا ناقل و مدبر تبدیل نہ ہوتے۔ بعض حکماء نے کہا: اس عالم کبیر میں جو چیز بھی ہے اس کی عالم صغیر میں ایک مثال ہے اور عالم صغیر سے مراد انسان کا بدن ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ (التین)

بے شک ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے (عقل و شکل کے اعتبار سے) بہترین اعتدال پر۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَفِیْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ (الذاریات) (اور تمہارے وجود میں بھی نشانیاں ہیں کیا تمہیں نظر نہیں آتیں) انسان کے حواس چمکنے والے ستاروں سے اشرف ہیں، سمع اور بصر مدرکات کے ادراک میں سورج اور چاند کے قائم مقام ہیں اور اس کے اعضاء بوسیدگی کی حالت میں زمین کی جنس سے مٹی ہو جاتے ہیں۔ اس میں پانی کی جنس سے رگیں اور دوسری بدن کی رطوبات ہیں اور ہوا کی جنس سے اس میں روح اور نفس ہے اور آگ کی جنس سے اس میں زرد پتہ ہے اور اس کی رگیں زمین کی نہروں کے قائم مقام ہیں اور اس کا جگر ان چشموں کی مانند ہے نہریں جن سے مدد حاصل کرتی ہیں اور رگیں جگر سے مدد حاصل کرتی ہیں۔ اس کا مثانہ دریا کے مقائم مقام ہے۔ بدن کے برتن میں جو کچھ ہوتا ہے وہ اس میں جاتا ہے جس طرح نہریں دریا میں جاتی ہیں اور اس کی ہڈیاں پہاڑوں کی طرح ہیں جو زمین کے کیل ہیں اور اس کے اعضاء، درختوں کی طرح ہیں جس طرح ہر درخت کے پتے ہوتے ہیں یا پھل ہوتے ہیں اسی طرح ہر عضو کا فعل یا اثر ہوتا ہے اور بال بدن پر نباتات اور گھاس کی مانند ہیں پھر انسان اپنی زبان سے ہر حیوان کی آواز کو حکایت کرتا ہے اور اپنے اعضاء کے ساتھ ہر حیوان کے کام کو حکایت کرتا ہے۔ یہ عالم صغیر، عالم کبیر کے ساتھ مخلوق ہے صانع واحد کا پیدا کردہ ہے۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ۝

''اور کچھ لوگ وہ ہیں جو بناتے ہیں اوروں کو اللہ کا مدمقابل محبت کرتے ہیں ان سے جیسے اللہ سے محبت کرنا چاہئے اور جو ایمان لائے وہ سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں اللہ سے اور کاش! (اب) جان لیتے جنہوں نے ظلم کیا (جو وہ اس وقت جانیں گے) جب (آنکھوں سے) دیکھ لیں گے عذاب کہ ساری قوتوں کا مالک اللہ ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے''۔

جب اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلی آیت میں ایسی چیز کی خبر دی جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور قدرت اور عظیم سلطانی پر دلیل تھی۔ تو آپ نے بتایا کہ ان آیات قاہرہ کے باوجود ذوی عقول میں سے کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کا مدمقابل بناتے ہیں۔ انداد کا

واحد ند ہے یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اس سے مراد وہ بت اور مورتیاں ہیں جن کی وہ اس طرح عبادت کرتے تھے جس طرح اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جاتی ہے حالانکہ وہ عاجز ہیں۔ یہ مجاہد کا قول ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ یعنی وہ اپنے بتوں سے اس طرح محبت کرتے ہیں جس طرح مومنین اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس اور سدی نے کہا: انداد سے مراد وہ رؤساء ہیں جن کی پیروی کی جاتی تھی وہ اللہ کی نافرمانی میں ان کی اطاعت کرتے تھے۔ یُحِبُّوْنَهُمْ میں ضمیر اس قول کے مطابق اصل پر ہے اور پہلے قول کے مطابق ضمیر بتوں کے لئے ہے۔ یہ غیر اصل پر ہے۔ ابن کیسان اور زجاج نے کہا: اس کا مطلب ہے وہ محبت میں بتوں اور اللہ تعالیٰ کے درمیان برابری کرتے ہیں (1)۔ ابو اسحٰق نے کہا یہ صحیح قول ہے اور اس کی صحت پر دلیل وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ہے۔

ابورجاء نے یحبونھم یاء کی فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، اس طرح جہاں بھی قرآن میں آیا ہے یہ بھی ایک لغت ہے۔ کہا جاتا ہے۔ حببت الرجل فھو محبوبٌ۔ فراء نے کہا: ابوتراب نے کہا:

احب لحبھا السودان حتی حببت لحبھا سود الکلاب

میں اس کی محبت کی وجہ سے کالے لوگوں سے محبت کرتا ہوں حتیٰ کہ اس کی محبت کی وجہ سے کالے کتوں سے بھی محبت کرتا ہوں۔

اور مَنْ، من یتخذ میں مبتدا کی حیثیت سے محل رفع میں ہے اور یتخذ واحد کا صیغہ من کے لفظ کے اعتبار سے ہے۔ اور غیر قرآن میں معنی کے اعتبار سے یتخذون بھی جائز ہے اور یُحِبُّوْنَهُمْ معنی کے اعتبار سے ہے اور یحبھم لفظ کے اعتبار سے ہوگا اور یہ یتخذ میں جو ضمیر ہے اس سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یعنی محبین کے معنی میں ہے۔ اگر تو چاہے تو انداد کی نعت بنادے یعنی محبوبۃ کے معنی میں۔ کحب میں کاف محذوف کی صفت ہے یعنی یحبونھم حبا کحب اللہ۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ یعنی بت پرست جتنی اپنے بتوں اور تابعین اپنے متبوعین سے محبت کرتے ہیں مومنین اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس سے کہیں زیادہ محبت کرتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ کیونکہ اللہ تعالیٰ پہلے ان سے محبت کرتا ہے پھر وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں۔ پس جو محبت کی وجہ سے اس کی محبت کی گواہی دیتا ہے اس کی محبت اتم ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یُّحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗۤ (المائدہ:54) مومنین کی اللہ تعالیٰ سے محبت اور اللہ تعالیٰ کی مومنین سے محبت کا بیان سورہ آل عمران میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَوْ یَرَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْۤا اِذْ یَرَوْنَ الْعَذَابَ۔ اہل مدینہ اور اہل شام کی قراءت تا کے ساتھ ہے۔ اہل مکہ، اہل کوفہ اور ابوعمرو نے یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ ابوعبید کا اختیار ہے۔ اس آیت میں اشکال اور حذف ہے۔ ابوعبید نے کہا: اس کا معنی ہے اگر ظالم دنیا میں آخرت کا عذاب دیکھ لیتے تو جان لیتے جب وہ اسے دیکھتے کہ ساری قوت اللہ کے لئے ہے۔ اور اس بنا پر یری بصر کی رؤیت پر محمول ہوگا۔ (2)

نحاس نے معانی قرآن میں کہا ہے: یہ قول وہ ہے جس پر اہل تفسیر کا نظریہ ہے اور اعراب القرآن میں فرمایا: محمد بن یزید

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 235، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: یہ تفسیر جو ابو عبید نے کی ہے بعید ہے۔ اس کی عبارت اس میں عمدہ نہیں ہے کیونکہ کلام مقدر کی جاتی ہے۔ وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ۔ گویا اس نے اس کو مشکوک بنایا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو واجب کیا ہے۔ لیکن تقدیر عبارت اس طرح ہے اور یہی اخفش کا قول ہے...... ولویری الذین ظلموا ان القوۃ للّٰہ۔ اور یری بمعنی یعلم ہے یعنی اگر وہ اللہ تعالیٰ کی قوت کی حقیقت اور اس کے عذاب کی شدت کی حقیقت کو جان لیتے تو حقیقۃً وہ جان لیتے کہ قوت اللہ کے لئے ہے اور یہ دو مفعولوں کے قائم مقام ہیں۔ والذین، یریٰ کا فاعل ہے۔ اور لو کا جواب محذوف ہے تاکہ انہیں خدا بنانے کا نقصان واضح ہو جائے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ (انعام: 30) وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ (انعام: 27) اور لو کا جواب نہیں ہے۔

زہری اور قتادہ نے کہا: اضمار، وعید کے لئے سخت ہے اس کی مثال، قائل کا قول ہے: لو رایت فلاناً والسیاط تاخذہ!۔ اور جنہوں نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے ان کی تقدیر یہ ہے: ولو تری یا محمد الذین ظلموا۔ یعنی اے پیارے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اگر تم ظالموں کو اس حال میں دیکھتے جب وہ عذاب کو دیکھتے اور اس سے گھبراہٹ کے وقت انہیں دیکھتے اور اس کی عظمت کو دیکھتے تو یہ اقرار کرتے کہ قوت اللہ کے لئے ہے۔ پس جواب اس طریق پر مضمر ہے اور وہی ان کا عامل ہے۔ دوسری تقدیر یہ ہے کہ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ ظالموں کو اس کے عذاب دیکھنے اور اس سے گھبراہٹ کی حالت میں دیکھتے تو آپ جان لیتے کہ ساری قوت اللہ کے لئے ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جان لیا تھا لیکن خطاب آپ کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے کیونکہ ان میں سے ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنے علم کی تقویت کے لئے اس قسم کا مشاہدہ کے محتاج ہوتے ہیں اور یہ معنی ہونا بھی جائز ہے۔ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اس ظالم کو فرمایئے۔ بعض نے فرمایا: انّ مفعول لاجلہ کی حیثیت سے منصوب ہے یعنی اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا سیبویہ نے استشہاداً یہ شعر پڑھا ہے۔

واغفر عوراء الکریم ادخارہ　　　و اعرض عن شتم اللئیم تکرماً

یہ ادخار، لادخار کے معنی میں ہے۔ معنی ہے کہ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ ظالموں کو عذاب دیکھنے کی حالت میں دیکھتے کیونکہ قوت اللہ کے لئے ہے تو آپ ان کی سزا کا مبلغ جان لیتے اور جو عذاب ان پر نازل ہوا اس کو عظیم جانتے۔ اذ، داخل ہوا ہے جب کہ ماضی میں امر ثابت کرنے کے لئے آتا ہے مقصود امر کو قریب ثابت کرنا اور اس کے وقوع کی تصحیح ہے۔ ابن عامر نے یُرون یاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حسن، یعقوب، شیبہ، سلام اور ابو جعفر نے اِنَّ القوۃ اور اِنَّ اللہ کو ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ نئے کلام کے اعتبار سے یا قول کی تقدیر پر۔ یعنی اگر تو ظالموں کو دیکھے جب وہ عذاب کو دیکھیں گے تو وہ کہیں گے: ساری قوت اللہ کے لئے ہے۔ اس آیت سے ثابت ہے کہ قوت اللہ کے لئے ہے بخلاف معتزلہ کے قول کے وہ صفات قدیمہ کے معانی کی نفی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے قول سے بلند و بالا ہے۔

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾

''(خیال کرو) جب بیزار ہو جائیں گے وہ جن کی تابعداری کی گئی ان سے جو تابعداری کرتے رہے اور دیکھ لیں

گے عذاب کو اور ٹوٹ جائیں گے ان کے تعلقات"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا اس سے مراد سردار اور رؤساء ہیں وہ کفر پر اپنے متبعین سے براءت کریں گے۔ حضرت قتادہ، عطا اور ربیع سے مروی ہے۔ قتادہ اور سدی کا یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد گمراہ کرنے والے شیاطین ہیں جو انسانوں سے براءت کریں گے (1)۔ بعض نے فرمایا: یہ ہر متبوع میں عام ہے وَ رَاَوُا الْعَذَابَ یعنی اتباع کرنے والے اور جن کی اتباع کی گئی۔ بعض نے فرمایا: دنیا میں عذاب کو آنکھوں سے دیکھنے کے وقت۔ بعض نے فرمایا: آخرت میں پیشی اور سوال کے وقت۔

میں کہتا ہوں: یہ دونوں ہوں گے۔ وہ موت کے وقت اس ذلت کو دیکھیں گے جس کی طرف وہ لوٹائے جائیں گے اور آخرت میں عذاب الیم کا مزہ چکھیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ تَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ اسباب سے مراد وہ تمام تعلقات ہیں جن کے ذریعے وہ دنیا سے ملتے ہیں خواہ وہ رشتہ داری کے تعلقات ہیں یا کوئی اور۔ یہ مجاہد وغیرہ سے مروی ہے۔ اسباب کا واحد سبب ہے اور اس کا معنی حلق ہے۔ السبب کا اصل معنی وہ رسی ہے جس کے ساتھ کسی شے کو باندھا جاتا ہے اور پھر اسے کھینچا جاتا ہے۔ پھر ہر اس چیز کے لئے استعمال ہونے لگا جو کسی چیز کو کھینچے۔

سدی اور ابن زید نے کہا: اسباب سے مراد اعمال ہیں اور سبب کا معنی کنارہ بھی ہے۔ اس سے زہیر کا قول ہے:

و من هاب اسباب المنايا ينلنهٗ و لو رام اسباب السماء يُسَلَّم

جو موت کے اسباب سے ڈرا انہوں نے اسے پالیا۔ اگر وہ آسمانی اسباب کا قصد کرتا تو سلامت رہتا۔

وَ قَالَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ یُرِیْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَیْهِمْ ؕ وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنَ النَّارِ ۟

"اور کہیں گے تابعداری کرنے والے کاش! ہمیں لوٹ کر جانا ہوتا (دنیا میں) تو ہم بھی بیزار ہو جاتے ان سے جیسے وہ (آج) بیزار ہو گئے ہیں ہم سے۔ یونہی دکھائے گا اللہ تعالیٰ انہیں ان کے (برے) اعمال کہ باعث پشیمانی ہوں گے ان کے لئے اور وہ (کسی صورت میں) نہ نکل پائیں گے آگ (کے عذاب) سے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَالَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً، ان محل رفع میں ہے یعنی اگر ہمارے لئے لوٹنا ہوتا۔ فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ یہ تمنا کا جواب ہے۔

الکرۃ، سے مراد ایک حالت کی طرف لوٹنا ہے یعنی اتباع کرنے والے کہیں گے: اگر ہمیں دنیا کی طرف لوٹایا جاتا حتی کہ ہم نیک عمل کرتے اور ان سے بری ہو جاتے۔ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا کاف مصدر محذوف کی صفت کے اعتبار سے محل نصب میں ہے۔ اس کا حال کے اعتبار سے منصوب ہونا بھی جائز ہے۔ متبرئین اس کی تقدیر ہوگی۔ التبرء کا معنی ہے: جدا ہونا۔

1۔ تفسیر معالم التنزیل، صفحہ 193، جلد 1 (دار الفکر)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ کاف محل رفع میں ہے یعنی امر اسی طرح ہے یعنی جس طرح اللہ انہیں عذاب دکھائے گا اسی طرح اللہ انہیں ان کے اعمال دکھائے گا یُرِیْهِمُ اللّٰهُ بعض علماء نے فرمایا یہ آنکھ سے دیکھنا ہے۔ یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے پہلا مفعول هم ضمیر ہے اور دوسرا اَعْمَالَهُمْ ہے اور حَسَرٰتٍ حال ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ رویۃ قلب سے ہو اس صورت میں حَسَرٰتٍ تیسرا مفعول ہوگا۔ اَعْمَالَهُمْ۔ ربیع نے کہا: اس سے مراد ان کے برے اعمال ہیں جن کا انہوں نے ارتکاب کیا پس ان کے لئے ان اعمال کی وجہ سے دوزخ واجب ہے، حضرت ابن مسعود اور سدی نے کہا: اس سے مراد اعمال صالحہ ہیں جن کو انہوں نے چھوڑ دیا، پس وہ جنت سے محروم ہو گئے۔ اس قول میں احادیث روایت کی گئی ہیں۔ سدی نے کہا: ان کے لئے جنت بلند کی جائے گی۔ پس وہ اسے دیکھیں گے اور جنت میں اپنے گھروں کو دیکھیں گے (1)۔ اگر وہ اللہ کی اطاعت کرتے تو انہیں وہ گھر ملتے، پھر ان کے گھر مومنین کے درمیان تقسیم کئے جائیں گے تو اس وقت وہ شرمندہ ہوں گے۔ یہ اعمال ان کی طرف مضاف کئے گئے ہیں کیوں کہ انہیں ان کا حکم دیا گیا تھا اور اعمال فاسدہ کی ان کی طرف نسبت اس اعتبار سے ہے کہ انہوں نے ان کا ارتکاب کیا۔ الحسرۃ کی جمع الحسرات ہے جیسے تمرۃ اور تمرات، جفنة اور جفنات، شهوۃ اور شهوات۔ یہ اس صورت میں ہے جب اسم ہو۔ جب تو اسے نعت بنائے گا تو تو اس کو ساکن کرے گا جیسے ضخمة و ضخمات، عبلةٌ و عبلات۔ الحسرۃ فوت شدہ چیز پر اعلیٰ درجہ کی ندامت کو کہتے ہیں۔ التحسر کا معنی افسوس کا اظہار کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے: حسرت علیه، سین کے کسرہ کے ساتھ۔ احسر حسرا أو حسرۃً۔ یہ اس چیز کے لئے استعمال ہوتا ہے جو تھک جائے اور اس کی قوت ختم ہو جائے جیسے اونٹ تھک جائے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ حسر سے مشتق ہے جس کا معنی ہے: کھل جانا، اسی سے الحاسر فی الحرب ہے وہ شخص جنگ میں جس کے پاس زرہ نہ ہو۔ الانحسار کا معنی انکشاف ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ یہ کفار کے ہمیشہ دوزخ میں رہنے کی دلیل ہے، کفار دوزخ سے کبھی نہیں نکلیں گے۔ یہ اہل سنت کے علماء کا قول ہے اور ان کی دلیل یہ آیت ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ (اعراف: 40) (اور نہ داخل ہوں گے جنت میں جب تک نہ داخل ہو اونٹ سوئی کے ناکہ میں)۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾

"اے انسانو! کھاؤ اس سے جو زمین میں ہے حلال (اور) پاکیزہ (چیزیں) اور شیطان کے قدموں پر قدم نہ رکھو۔ بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے"۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت ثقیف، خزاعہ اور بنی مدلج کے بارے میں نازل ہوئی کیونکہ انہوں نے اپنے اوپر جانوروں میں سے کچھ حرام کئے تھے۔ لفظ عام ہے اور یہاں طیب سے

1۔ تفسیر معالم التنزیل، صفحہ 194، جلد 1 (دار الفکر)

مراد حلال ہے یہ لفظ کے اختلاف کی وجہ سے تاکید ہے۔ یہ طیب کے بارے میں امام مالک کا قول ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: طیب سے مراد ہے جس سے لذت حاصل کی جائے۔ یہ تنویع ہے اسی وجہ سے گندے حیوان کے کھانے سے منع کیا گیا ہے(1)۔ اس کا بیان سورۂ انعام اور سورۂ اعراف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَلٰلًا طَيِّبًا، حَلٰلًا حال ہے۔ بعض نے فرمایا: مفعول ہے حلال کو حلال کہنے کی وجہ یہ ہے اس سے منع کی گرہ کھل جاتی ہے۔ حضرت سہل بن عبداللہ نے کہا: نجات تین چیزوں میں ہے: حلال کھانا، فرائض ادا کرنا اور نبی کریم ﷺ کی پیروی کرنا، ابو عبداللہ ساجی نے کہا اس کا نام سعید بن زید تھا پانچ خصائل کے ساتھ علم مکمل ہوتا ہے: (۱) اللہ تعالیٰ کی معرفت (۲) حق کی معرفت (۳) اللہ تعالیٰ کے لئے عمل میں اخلاص (۴) سنت پر عمل (۵) حلال کھانا۔ اگر ان میں سے ایک خصلت بھی نہ پائی جائے تو عمل بلند نہیں ہوتا۔ حضرت سہل نے کہا: حلال کھانا ہو ہی نہیں سکتا مگر علم کے ساتھ۔ اور مال حلال نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ وہ چھ چیزوں سے پاک ہو: سود، حرام، السحت یہ مجمل اسم ہے خیانت، مکروہ اور شبہ۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَتَّبِعُوْا یہ نہی ہے۔ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ، خُطُوٰتِ جمع ہے خَطوۃ اور خُطوۃ کی، دونوں کا معنی ایک ہے۔ فراء نے کہا الخطوات خطوۃ کی (خاء کے فتحہ کے ساتھ) جمع ہے خُطوۃ (خاء کے ضمہ کے ساتھ) دو قدموں کے درمیان کے فاصلہ کو کہتے ہیں۔ جوہری نے کہا: جمع قلت خُطوات، خُطُوات اور خَطَوات ہے اور جمع کثرت خطا ہے اور الخطوۃ (خاء کے فتحہ کے ساتھ) مصدر ہے۔ جمع خطوات اور خطاء ہے جیسے رکوۃ اور رکاء ہے۔ امرء القیس نے کہا:

لها وثبات كوثب الظباء فواد خطاء و واد مطر

ابو السماء العدوی اور عبید بن عمیر نے خطوات (خا اور طا کے فتحہ کے ساتھ) پڑھا ہے۔ حضرت علی بن ابی طالب، قتادہ، اعرج، عمرو بن میمون اور اعمش نے خطؤات خا اور طا کے ضمہ اور واو پر ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اخفش نے کہا: قراءت کرنے والوں کا نظریہ یہ ہے کہ یہ خطیئۃ کی جمع ہے یہ الخطاء سے ہے الخطو سے نہیں ہے۔ جمہور کی قراءت پر معنی یہ ہوگا: شیطان کے پیچھے نہ چلو اور اس کے اعمال پر نہ چلو۔ اور جس عمل کے بارے شرع کا حکم وارد نہیں وہ شیطان کی طرف منسوب ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: خطوات الشیاطین سے مراد شیطانی اعمال ہیں۔ مجاہد نے کہا: شیطان کی خطائیں ہیں (2)۔ سدی نے کہا: اس سے مراد شیطان کی اطاعت ہے۔ ابو مجلز نے کہا: یہ گناہوں کی نذریں ہیں۔

میں کہتا ہوں: صحیح یہ ہے کہ یہ لفظ عام ہے۔ سنن اور شرائع کے علاوہ تمام بدعات اور گناہوں کو شامل ہے۔ شیطان کے بارے تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ شیطان دشمن ہے اور اللہ تعالیٰ کی خبر حق اور سچ ہے۔ عقلمند پر واجب ہے کہ وہ اس دشمن سے بچے جس کی عداوت حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ سے ظاہر ہے۔ اس نے اپنی پوری عمر انسان کے احوال کے خراب کرنے میں خرچ کر دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے بچنے کا حکم فرمایا۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

2۔ تفسیر طبری، صفحہ 92، جلد 2 (دار احیاء التراث العربیۃ)

ارشاد فرمایا: وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ۔ اور نہ پیروی کرو شیطان کے قدموں کی بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

اِنَّمَا یَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ الْفَحْشَآءِ وَ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (البقرہ) ''وہ تو حکم دیتا ہے تمہیں فقط برائی اور بے حیائی کا اور یہ کہ بہتان باندھو اللہ پر جو تم جانتے ہی نہیں''۔

اور فرمایا: اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَ یَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ (البقرہ:268)

شیطان ڈراتا ہے تمہیں تنگ دستی سے اور حکم کرتا ہے تم کو بے حیائی کا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا ۝ (النساء)

''چاہتا ہے شیطان کہ بہکا دے انہیں بہت دور تک''۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ وَ یَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝ (المائدہ)

''یہی تو چاہتا ہے شیطان کہ ڈال دے تمہارے درمیان عداوت اور بغض شراب اور جوئے کے ذریعے اور روک دے تمہیں یادِ الٰہی سے اور نماز سے''۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِیْنٌ ۝ (القصص) ''وہ دشمن کھلا گمراہ کرنے والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ؕ اِنَّمَا یَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِیَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ ۝ (فاطر)

''یقیناً شیطان تمہارا دشمن ہے تم بھی اسے (اپنا) دشمن سمجھا کرو وہ فقط اس لئے (سرکشی کی) دعوت دیتا ہے اپنے گروہ کو تاکہ وہ جہنمی بن جائیں''۔

یہ ڈرانے میں حد ہے۔ اس کی مثالیں قرآن میں کثیر ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے فرمایا: شیطان نچلی زمین میں باندھا ہوا ہے جب وہ حرکت کرتا ہے تو زمین میں ہر دو شخصوں یا زیادہ کے درمیان شر اس کے تحرک سے ہوتا ہے۔ ترمذی نے حضرت ابو مالک اشعری کی حدیث نقل کی ہے، اس میں ہے: میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم اللہ تعالیٰ کو یاد کرو کیونکہ اس کی مثال اس شخص کی مثل ہے جس کے پیچھے دشمن جلدی سے نکلتا ہے حتیٰ کہ وہ شخص ایک محفوظ قلعہ میں آتا ہے اور دشمنوں سے اپنے آپ کو بچالیتا ہے۔ اسی طرح بندہ شیطان سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا مگر اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ (1)۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔

اِنَّمَا یَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ الْفَحْشَآءِ وَ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

''وہ تو حکم دیتا ہے فقط تمہیں برائی اور بے حیائی کا اور یہ کہ بہتان باندھو اللہ پر جو تم جانتے ہی نہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّمَا یَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ الْفَحْشَآءِ، سؤ کو سؤ اس لئے کہا جاتا ہے: آدمی اپنے مقابل کو برے

1۔ جامع ترمذی، ابواب الامثال، باب ماجاء فی مثل الصلوٰۃ والصیام، صفحہ 110-109، جلد 2 (وزارت تعلیم)

انجام سے پریشان کرتا ہے۔ سوء، ساء یسوٗ سوءً ااور مساءۃً کا مصدر ہے، جب کوئی کسی کو پریشان کرے۔ سؤتہ فسیئ جب اس نے اسے پریشان کیا تو وہ پریشان ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سِیْٓـَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا (الملک: 27)

شاعر نے کہا:

ان یك هذا الدهر قد ساءنی فطالما قد سرنی الدهر

الامر عندی فیهما واحد لذاك شكر و لذاك صبر

اگر اس زمانہ نے مجھے پریشان کیا ہے تو اس نے مجھے خوش بھی کیا تھا۔ میرے نزدیک دونوں حالتوں میں معاملہ ایک ہے۔ خوشی کے لئے شکر ہے اور تکلیف اور پریشانی کے لئے صبر ہے۔

الفحشاء برے منظر کو کہتے ہیں۔ جیسے شاعر نے کہا:

و جید کجید الریم لیس بفاحش

(اور اس کی گردن، ہرن کی گردن کی طرح ہے وہ بری نہیں ہے۔)

پھر یہ لفظ برے معانی کے لئے استعمال ہونے لگا۔ شرع ہی کسی چیز کو حسین اور قبیح بناتی ہے، ہر وہ چیز جس سے شریعت نے منع فرمایا وہ فحشاء میں سے ہے۔ مقاتل نے کہا: قرآن میں فحشاء کا ذکر جہاں بھی آیا ہے اس سے مراد زنا ہے سوائے اس ارشاد کے اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَ یَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ (البقرہ: 268) یہاں فحشاء سے مراد زکاۃ نہ دینا ہے۔ میں کہتا ہوں: اس بناء پر بعض علماء نے کہا السوٗ وہ جرم ہے جس میں حد نہیں اور الْفَحْشَآءِ وہ گناہ ہے جس میں حد ہے۔ حضرت ابن عباس وغیرہ سے یہ مروی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ طبری نے کہا: کہ اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جو انہوں نے بحیرہ اور سائبہ میں سے حرام کی تھیں اور انہیں اپنی طرف سے شرع بنایا تھا(1)۔ وَ اَنْ تَقُوْلُوْا، بِالسُّوْٓءِ وَ الْفَحْشَآءِ پر عطف کی بنا پر محل جر میں ہے۔

وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَاۤ اَلْفَیْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْـًٔا وَّ لَا یَهْتَدُوْنَ ۝

"اور جب کہا جاتا ہے ان سے پیروی کرو اس کی جو نازل فرمایا ہے اللہ نے تو کہتے ہیں: (نہیں) بلکہ ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر پایا ہم نے اپنے باپ دادوں کو اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھ سکتے ہوں اور نہ ہدایت یافتہ ہوں"۔

اس میں سات مسائل ہیں:

1۔ تفسیر طبری، صفحہ 93، جلد 2 (دار احیاء التراث العربیۃ)

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ، ھم ضمیر سے مراد کفار عرب ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ یہ یہود کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ طبری کا قول ہے: لَهُمُ میں ضمیر، یا ایھا الناس میں جو الناس ہے اس کی طرف راجع ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: من یتخذ من دون اللہ میں جو مَنْ ہے اس کی طرف راجع ہے(1) اور اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ یعنی قول وعمل میں قرآن کی اتباع کرو۔ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا، اَلْفَيْنَا کا معنی ہے ہم نے پایا۔

شاعر نے کہا:

فالفيته غير مستعتب ولا ذاكر الله الا قليلاً(2)

میں نے اسے نہ تو بہ کرنے والا اور نہ اللہ کا ذکر کرنے والا پایا مگر تھوڑا۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ الف استفہام کے لئے ہے اور واو کو فتحہ دیا گیا ہے کیونکہ یہ واو عاطفہ ہے، جملہ کا عطف جملہ پر ہے کیونکہ فساد کی غایت التزام میں یہ ہے کہ وہ کہیں ہم اپنے آباء کی پیروی کریں گے اگرچہ وہ نہ بھی سمجھتے تھے۔ پس انہوں نے اپنے نظریہ سے چمٹے رہنے اور اس کے التزام کو ثابت کیا کیونکہ یہی ان کے آباء کی حالت تھی۔

مسئلہ: ہمارے علماء نے فرمایا: اس آیت کے الفاظ کی قوت، تقلید کے ابطال کا تقاضا کرتی ہے اس کی مثل یہ آیت بھی ہے۔ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (المائدہ: 104) (جب کہا جاتا ہے انہیں کہ آؤ اس کی طرف جو نازل کیا ہے اللہ نے اور آؤ (اس کے) رسول کی طرف تو کہتے ہیں: کافی ہے ہمیں جس پر پایا ہم نے اپنے باپ دادا کو)۔

یہ آیت اور اس سے پہلے والی آیت اپنے ماقبل سے متصل ہیں۔ یہ اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عربوں کی جہالت کے متعلق خبر دی کہ انہوں نے اپنی بیوقوفانہ آراء سے بحیرہ، سائبہ اور وصیلہ جانوروں کی حرمت کا فیصلہ کیا۔ اور انہوں نے حجت اس سے پکڑی کہ یہ ایک ایسا امر ہے جس پر انہوں نے اپنے آباء کو پایا اور اس میں ان کی اتباع کی اور اس کو چھوڑ دیا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر نازل کیا اور جس کا اس نے اپنے دین میں حکم دیا۔ پس لھم میں ضمیر دونوں آیتوں میں کفار عرب کی طرف لوٹے گی۔

مسئلہ نمبر 3: بعض علماء نے اس آیت کی وجہ سے تقلید کی مذمت کی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کفار کی مذمت فرمائی کیونکہ انہوں نے باطل میں اپنے آباء کی اتباع کی تھی اور کفر و معصیت میں ان کی پیروی کی تھی۔ یہ مذمت تقلید باطل میں تو صحیح ہے لیکن حق میں تقلید کرنا اصول دین میں سے ایک اصل ہے اور مسلمانوں کی عصمتوں میں سے ایک عصمت (حفاظت) ہے۔ جاہل جو خود غور و فکر سے قاصر ہوتا ہے وہ اس کی طرف پناہ لیتا ہے۔ علماء کا اصول کے مسائل میں اس کے جواز میں اختلاف ہے جیسا کہ آگے آئے گا اور فروعی مسائل میں اس کا جواز صحیح ہے۔

مسئلہ نمبر 4: علماء کے نزدیک تقلید کی حقیقت یہ ہے کہ کسی کے قول کو بغیر دلیل کے قبول کرنا۔ اس معنی کے اعتبار سے

1۔ تفسیر طبری، صفحہ 94، جلد 2 (داراحیاء التراث العربیۃ) 2۔ ایضاً، صفحہ 95، جلد 2

جس نے نبی کریم ﷺ کے معجزات میں غور و فکر کے بغیر نبی کریم ﷺ کا قول قبول کیا وہ مقلد ہے اور جس نے معجزات میں غور و فکر کر کے آپ کے قول کو قبول کیا وہ مقلد نہیں ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جو کسی کے قول کی صحت کو نہیں جانتا اس کے فتوی کی صحت کا اعتقاد کرنا تقلید ہے۔ لغت میں یہ قلادۃ البعیر (اونٹ کا ہار) سے ماخوذ ہے۔ عرب کہتے ہیں: قلدت البعیر، جب تو اس کے گلے میں ایسی رسی ڈالے جس کے ساتھ اس کو چلایا جائے۔ گویا مقلد اپنے تمام امور اپنے قائد کے سپرد کر دیتا ہے۔ اسی وجہ سے شاعر نے کہا:

و قلدوا امرکم للہ درکم　　ثبت الجنان بامر الحرب مضطلعاً

مسئلہ نمبر 5: تقلید یہ تو علم کا طریق ہے، نہ علم تک یہ پہنچانے والی ہے، نہ اصول میں ہے، نہ فروع میں ہے۔ یہ جمہور عقلاء اور علماء کا قول ہے جبکہ حشویہ اور ثعلبیہ جہال سے حکایت ہے کہ یہ (تقلید) حق کی معرفت کا ذریعہ ہے اور یہ واجب ہے اور غور و فکر حرام ہے۔ اور ان پر ہمارے علماء نے جو حجت پیش کی ہے وہ کتب اصول میں ہے۔

مسئلہ نمبر 6: عام آدمی پر فرض ہے کہ وہ احکام کے استنباط میں احکام کے اصول میں مشغول نہ ہو کیونکہ اسے اس کی اہلیت نہیں ہے اور یہ حکم اس کے لئے ہر اس دینی معاملہ میں ہے جس کو وہ خود نہیں جانتا اور وہ محتاج ہوتا ہے اپنے زمانہ اور اپنے شہر کے بڑے عالم کی طرف جانے کا۔ پس وہ ہر نئے مسئلہ کو اس سے پوچھے اور اس کے فتویٰ کی پیروی کرے۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۝ (النحل) (پوچھو اہل علم سے اگر تم (خود حقیقت حال کو) نہیں جانتے)۔

اس شخص پر لازم ہے کہ وہ اپنے وقت کے بڑے عالم سے پوچھنے کی کوشش کرے تاکہ اکثر لوگوں کا اس پر اتفاق واقع ہو اور عالم پر بھی فرض ہے کہ وہ کسی بھی جدید مسئلہ میں کسی دوسرے عالم کی تقلید کرے جس میں دلیل و نظر کی وجہ اس پر مخفی ہو گئی ہے وہ اس میں غور و فکر کرنے کا ارادہ کرے حتیٰ کہ وہ مطلوب تک پہنچ جائے۔ پس اس کے پاس وقت تنگ ہو اور اسے عبادت کے فوت ہونے کا خوف ہو یا حکم کے ضیاع کا خوف ہو، خواہ وہ دوسرا مجتہد صحابی ہو یا کوئی اور ہو۔ قاضی ابو بکر اور محققین کی جماعت کا یہی قول ہے۔

مسئلہ نمبر 7: ابن عطیہ نے کہا: عقائد میں تقلید کے ابطال پر امت کا اجماع ہے (1)۔ قاضی ابو بکر بن عربی، ابو عمرو عثمان بن عیسیٰ بن درباس الشافعی جیسے علماء کا قول اس کے خلاف ذکر کیا ہے۔ ابن درباس نے اپنی کتاب ''الانتصار'' میں کہا ہے کہ بعض علماء نے کہا: توحید کے امر میں تقلید جائز ہے۔ یہ غلط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ (زخرف: 22) اللہ تعالیٰ نے ان کی اپنے آباء کی تقلید پر اور رسل کی اتباع ترک کرنے پر ان کی مذمت کی ہے جیسے اہل بدعت نے اپنے بڑوں کی تقلید کی اور دین میں حضرت محمد ﷺ کی اتباع کو ترک کیا کیونکہ ہر مکلف پر توحید کے امر کا سیکھنا فرض ہے اور ضروری ہے اور یہ کتاب و سنت سے ہی حاصل ہوتا ہے جس طرح آیت توحید میں ہم نے بیان کیا تھا۔ اَللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ۝ (الحج)

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 238، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

ابن درباس نے کہا: اکثر اہل زیغ کا قول یہ ہے کہ جو کتاب وسنت کو مضبوطی سے پکڑتا ہے وہ مقلد ہے۔ یہ ان کی خطا ہے بلکہ یہ ان کے زیادہ لائق ہے ان کے مذہب کے مناسب ہے، کیونکہ انہوں نے اپنے رہنماؤں اور بڑوں کے قول کو قبول کیا جن میں انہوں نے اللہ کی کتاب اور رسول اللہ کی سنت اور اجماع صحابہ کی مخالفت کی ہے۔ پس یہ ان میں داخل ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد سے مذمت کی ہے۔ رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ كُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ۝ رَبَّنَاۤ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَ الْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ۝ (سورۂ احزاب) (اے ہمارے رب ہم نے پیروی کی اپنے سرداروں کی اور اپنے بڑے لوگوں کی پس ان ظالموں نے ہمیں بہکا دیا سیدھی راہ سے الخ)۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰۤى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ (زخرف) پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے فرمایا۔ قٰلَ اَوَ لَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ؕ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ (زخرف) (اس نبی نے فرمایا: اگر میں لے آؤں تمہارے پاس زیادہ درست چیز اس سے جس پر پایا ہے تم نے اپنے باپ دادا کو (تب بھی؟) انہوں نے جواب دیا: ہم جو دے کر تمہیں بھیجا گیا ہے اس کو نہیں مانتے۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا: فانتقمنا منھم پس ہم نے انتقام لیا ان سے۔ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ ہدایت ان احکام میں ہے جو رسل علیہم السلام لے کر آئے۔

اہل اثر کا قول ان کے عقائد کے بارے میں نہیں ہے کہ ہم نے اپنے ائمہ اور آباء اور لوگوں کو کتاب وسنت اور صالحین کے اجماع پر پایا۔ اور کفار نے کہا: ہم نے اپنے آباء کو پایا اور ہم نے اپنے سادات اور بڑوں کی ایک راستہ میں اطاعت کی۔ چونکہ مسلمانوں نے اپنی اطاعت کو قرآن اور متابعت رسول کی طرف منسوب کیا جبکہ کافروں نے اپنے جھوٹ کو اہل باطل کی طرف منسوب کیا پس وہ گمراہی میں زیادہ ہو گئے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں حضرت یوسف علیہ السلام کی تعریف فرمائی۔ ارشاد فرمایا: اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ وَ اتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَ عَلَى النَّاسِ (یوسف) (میں نے چھوڑ دیا ہے دین اس قوم کا جو نہیں ایمان لاتے اللہ پر نیز وہ آخرت کا انکار کرنے والے ہیں اور میں تو پیروکار بن گیا اپنے باپ دادا ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب کے دین کا، نہیں روا ہمارے لئے کہ ہم شریک ٹھہرائیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو (توحید پر ایمان) تو اللہ تعالیٰ کا خاص احسان ہے)۔

جبکہ حضرت یوسف علیہ السلام کے آباء وحی کے متبعین تھے اور یہی دین خالص ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے پسند کیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنے آباء کی پیروی کرنا ان کی مدح کی صفات سے ہے۔ اور آپ وہ نہیں لائے جو وہ لائے تھے، اعراض کا ذکر اور اعراض کا جواہر کے ساتھ تعلق اور ان کا ان سے بدلنا پس یہ دلیل ہے کہ ان میں ہدایت نہیں اور نہ ان کے وضع کرنے والوں میں ہدایت ہے۔

ابن حصار نے کہا: ان کے ساتھ تلفظ دو سو سال بعد مامون کے زمانہ میں ظاہر ہوا تھا جب پہلی کتب کے ترجمے کئے گئے اور ان میں عالم کے قدم اور حدوث میں اختلاف ظاہر ہوا اور جوہر اور اس کا ثبوت، عرض اور اس کی ماہیت میں اختلاف ظاہر ہوا۔

پس بدعتیوں اور ان لوگوں نے جن کے دلوں میں کجی تھی، انہوں نے ان اصطلاحات کی حفاظت کی طرف جلدی کی اور ان کے ذریعے اہل سنت پر اغراب کا قصد کیا اور اہل ملت میں سے کمزور لوگوں پر شبہات کو داخل کرنے کا ارادہ کیا۔ معاملہ اسی طرح چلتا رہا حتیٰ کہ بدعت غالب آئی اور بدعتی ایک گروہ بن گیا اور سلطان پر معاملہ ملتبس ہو گیا حتیٰ کہ امیر نے خلق قرآن کا قول کیا اور لوگوں کو اس پر مجبور کیا اور امام احمد بن حنبل کو اس کی مخالفت پر سزا دی۔ اہل سنت کے علماء شیخ ابوالحسن اشعری، عبداللہ بن کلاب اور ابن مجاہد، محاسبی اور دوسرے ان جیسے علماء نے ان کو جواب دینے کا بیڑا اٹھایا اور بدعتیوں کے ساتھ ان کی اصطلاحات میں غور وخوض کیا پھر ان کے ساتھ جنگ کی اور ان کے ہتھیاروں کے ساتھ انہیں قتل کیا جو مسلمان کتاب وسنت کو پکڑنے والے تھے اور ملحدین کے شبہات سے اعراض کرنے والے تھے۔ انہوں نے جوہر اور عرض میں غور نہ کیا اور اسی پر سلف صالحین تھے۔

میں کہتا ہوں: جس نے اب متکلمین کی اصطلاح میں غور وفکر کیا حتیٰ کہ اس کے ساتھ دین کا دفاع کیا اس کا مرتبہ انبیاء کے مرتبہ کے قریب ہے۔ اور جو غالی متکلمین میں سے ان لوگوں کے راستہ پر چلا جنہوں نے اثر کو مضبوطی سے پکڑا اور علم کلام کی کتب کے درس پر برانگیختہ کیا اور وہ حق کو صرف ان اصطلاحات کے واسطہ سے پہچانتا تھا تو وہ مذموم ہو گیا کیونکہ انہوں نے سابقہ ائمہ کے راستہ کو چھوڑ دیا۔ دلیل اور حجت کے ساتھ جھگڑنا یہ تو قرآن میں واضح ہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔

وَ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝

"اور مثال ان کی جنہوں نے کفر (اختیار) کیا ایسی ہے جیسے کوئی چلا رہا ہو ایسے (جانوروں) کے پیچھے جو نہیں سنتے سوائے خالی پکار اور آواز کے یہ لوگ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں سو وہ کچھ نہیں سمجھتے"۔

اللہ تعالیٰ نے کفار کو وعظ کرنے والے اور ان کو دعوت دینے والے کو اس چرواہے کے ساتھ تشبیہ دی جو بکریوں اور اونٹوں کو آواز دیتا ہے ..... وہ داعی حضرت محمد ﷺ تھے۔ اور وہ جانور صرف اس کی آواز اور ندا کو سنتے ہیں اور جو وہ کہتا ہے اس کو سمجھتے نہیں ہیں اسی طرح حضرت ابن عباس، مجاہد، عکرمہ، سدی، زجاج، فراء اور سیبویہ نے اس کی اسی طرح تفسیر کی ہے۔ یہ انتہائی ایجاز کے ساتھ کلام ہے (1)۔ سیبویہ نے کہا: ان کفار کو پکارنے والے سے تشبیہ نہیں دی بلکہ جانوروں سے تشبیہ دی ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اے محمد! ﷺ تیری مثال اور کفار کی مثال ان جانوروں کو آواز دینے والے اور ان جانوروں کی ہے جو سمجھتے نہیں ہیں۔ پس معنی کی دلالت کو حذف کیا گیا ہے۔ ابن زید نے کہا: اس کا معنی ہے کہ کفار کی اپنے پتھر کے خداؤں کو پکارنے کی مثال رات کے درمیان میں چیخنے والے کی ہے۔ پس صدیٰ اس کو جواب دیتی ہے وہ ان کو آواز دیتا ہے جو سنتے نہیں ہیں اور وہ ایسا جواب دیتا ہے جس کی حقیقت نہیں ہے اور نفع بخش نہیں ہے (2)۔ قطرب نے کہا: اس کا معنی ہے کفار کا انہیں پکارنا جو ان کی بات سمجھتے ہی نہیں ہیں جس طرح چرواہا اپنی بکریوں کو آواز دیتا ہے وہ نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہیں۔ طبری نے کہا: اس سے مراد کافروں کا اپنے بتوں کو پکارنے کی مثال اس شخص کی ہے جو دور سے کسی چیز کو پکارتا ہے اور دوری کی وجہ سے

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری آیت ہذا 2۔ ایضاً

اس کی آواز نہیں سنی جاتی۔ پس پکارنے والے کے لئے صرف پکار اور ندا ہے جو اسے مشقت اور تھکن میں ڈالتی ہے۔ ان تینوں تاویلات میں کفار کو پکارنے والے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور بتوں کو جانوروں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ النعیق کا معنی بکریوں کو جھڑکنا اور ان کو آواز دینا ہے۔ کہا جاتا ہے: نعق الراعی بغنمہ ینعق نعیقاً و نعاقاً و نعقاناً۔ یعنی چرواہا اپنی بکریوں پر چلایا اور انہیں جھڑکا۔ اخطل نے کہا:

انعق بضانك یا جریر فانما منتك نفسك فی الخلاء ضلالاً

شاعر نے یہاں آواز دینے کے معنی میں یہ لفظ استعمال کیا۔ یعنی اے جریر! اپنی بکریوں کو آواز دے۔

قتبی نے کہا: جریر بھیڑیں چرانے والا نہیں تھا۔ اس نے یہ ارادہ کیا کہ بنی کلیب کو بھیڑیں چرانے کی وجہ سے عار دلائی جاتی تھی اور جریر ان میں سے تھا، وہ ان کی جہالت میں تھا۔ عرب جہالت میں بکریوں کے چرواہے سے مثال دیتے تھے وہ کہتے تھے: اجهل من راعی الضان، وہ بھیڑیں چرانے والے سے بھی زیادہ جاہل ہے۔ قتبی نے کہا: جو اس آیت کا یہ معنی بیان کرتا ہے یہ اس کا اپنا مذہب ہے مگر ہماری معلومات کے مطابق علماء میں سے کسی کا یہ نظریہ نہیں۔

ندا بعید کے لئے اور دعا قریب کے لئے ہوتی ہے اسی وجہ سے نماز کی اذان کو ندا کہا جاتا ہے کیونکہ وہ دور والوں کے لئے ہوتی ہے۔ ندا کو کبھی نون کے ضمہ کے ساتھ بولا جاتا ہے جبکہ اصل نون پر کسرہ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے کفار کو تشبیہ دی کہ وہ گونگے، بہرے اور اندھے ہیں۔ یہ سورت کی ابتدا میں گزر چکا ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ اشْكُرُوا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿١٧٢﴾

''اے ایمان والو! کھاؤ پاک چیزیں جو ہم نے تم کو دی ہیں اور شکر ادا کرو اللہ تعالیٰ کا اگر تم صرف اسی کی عبادت کرتے ہو''۔

یہ پہلے امر کی تاکید ہے اور یہاں تفضیل کے لئے مومن کو ذکر کے ساتھ خاص فرمایا اور کھانے سے مراد ہر اعتبار سے انتفاع ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اکل سے مراد معروف کھانا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے لوگو! اللہ تعالیٰ پاک ہے اور وہ قبول نہیں فرماتا مگر پاک کو اور اللہ تعالیٰ نے مومنین کو اسی بات کا حکم فرمایا جو اس نے رسولوں کو فرمایا تھا۔ ارشاد فرمایا يَاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَ اعْمَلُوا صَالِحًا ۭ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿﴾ (المومنون) اے میرے پیغمبرو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور اچھے کام کرو بے شک میں جو اعمال تم کر رہے ہو ان سے خوب واقف ہوں۔ اور ارشاد فرمایا: يَاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ۔ اے ایمان والو! کھاؤ ان پاک چیزوں کو جو ہم نے دی ہیں تمہیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک شخص لمبا سفر کرتا ہے، پراگندہ بال ہے، غبار آلود ہے وہ ہاتھوں کو آسمان کی طرف بلند کرتا ہے اور کہتا ہے: یارب یارب! جبکہ اس کا کھانا حرام ہے اور مشروب حرام ہے اور اس کا لباس

حرام ہے اور حرام کی غذا دی گئی ہے تو اس کی دعا کیسے قبول ہوگی (1)۔ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ شکر کا معنی گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۷۳﴾

''اس نے حرام کیا تم پر صرف مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور بلند کیا گیا ہو جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام۔ لیکن جو مجبور ہو جائے درآنحالیکہ وہ نہ سرکش ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا تو اس پر (بقدر ضرورت کھا لینے میں) کوئی گناہ نہیں۔ بے شک اللہ بہت گناہ بخشنے والا ہمیشہ رحم کرنے والا ہے''۔

اس میں چونتیس مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ، اِنَّمَا کا کلمہ حصر کے لئے وضع کیا گیا ہے نفی اور اثبات کو متضمن ہے، خطاب جس کو شامل ہوتا ہے اسے ثابت کرتا ہے اور ماعدا کی نفی کرتا ہے یہاں تحریم کی حصر کی گئی ہے خصوصاً تحلیل کے بعد آئی ہے۔ پہلے فرمایا: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ۔ اس میں مطلقاً اباحت ہے پھر حرام کا ذکر اِنَّمَا کے کلمہ کے ساتھ کیا۔ پس یہ دونوں قسموں کے ایجاب کا تقاضا ہے۔ پس کوئی حرام اس آیت سے خارج نہیں۔ یہ آیت مدنی ہے، اس کو دوسری آیت کے ساتھ مؤکد کیا۔ روایت ہے کہ یہ عرفہ میں نازل ہوئی۔ قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِيْ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗۤ ... الآیۃ (انعام: 45) آپ فرمائیے میں نہیں پاتا اس (کتاب) میں جو وحی کی گئی ہے میری طرف کوئی چیز حرام کھانے والے پر جو کھاتا ہے اسے۔ پس اول و آخر بیان مکمل ہوا۔ یہ ابن عربی کا قول ہے اس پر مزید کلام سورۃ الانعام میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

مسئلہ نمبر 2: الْمَيْتَةَ اس کو حرم کی وجہ سے نصب دی گئی ہے اور ما کافہ ہے اور اسے الذی کے معنی میں کرنا بھی جائز ہے جو لکھنے میں جدا ہوتا ہے اور ان کی خبر کی حیثیت سے المیتۃ، الدم اور لحم الخنزیر کو رفع دیا جائے گا۔ یہ ابن ابی عبلہ کی قراءت ہے اور حرم میں ضمیر الذی کی طرف لوٹے گی ... اور اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ (طہ: 69) ابو جعفر نے حُرِمَ حاء کے ضمہ اور راء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور بعد والے اسماء کو رفع دیا گیا ہے یا نائب فاعل کی حیثیت سے یا ان کی خبر کی حیثیت سے۔ ابو جعفر بن قعقاع نے المیتۃ (2) تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ طبری نے کہا ہے: لغوی علماء کی جماعت نے کہا: میت اور میت تشدید اور تخفیف دونوں لغتیں ہیں۔ ابو حاتم وغیرہ نے کہا: جو فوت ہو چکا ہو اس میں میت اور میت کہا جاتا ہے اور جو ابھی تک فوت نہ ہوا ہو اس کے لئے میت تخفیف کے ساتھ نہیں بولا جاتا اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ (زمر: 30)۔ شاعر نے کہا:

لیس من مات فاستراح بمیت ... انما المیت میت الاحیاء

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، صفحہ 326، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 239، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

جوفوت ہو گیا اور راحت پا گیا وہ میت نہیں میت تو زندوں کا میت ہے۔

جب تک فوت نہ ہوا ہو اس کے لئے کسی نے تخفیف کے ساتھ نہیں پڑھا، مگر جوبزی نے ابن کثیر سے روایت کیا ہے وما ھو بمیتٍ اس سے مشہور تثقیل ہے۔ رہا شاعر کا قول:

اذا ما مات میت من تمیم فسرك ان یعیش فجئ بزاد

جب تمیم میں سے کوئی میت مرتا ہے تو تجھے خوش کرتا ہے کہ وہ زندہ رہے اور زاد راہ لایا جائے۔

میں مکمل ہجو نہیں کر سکتا کیونکہ اس نے حقیقتاً میت کا ارادہ کیا اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے شارف الموت (قریب الموت) کا ارادہ کیا ہے۔ پہلا معنی اشہر ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اَلْمَیْتَةَ جو چیز ذبح کی جاتی ہے اگر ذبح کے بغیر اس کی روح نکل جائے تو اسے المیتۃ کہتے ہیں اور جو چیز کھائی نہیں جاتی اس کی ذبح اس کی موت کی طرح ہے جس طرح درندے وغیرہ ہیں۔ اس کا بیان آگے آئے گا اور سورۂ انعام میں بھی آئے گا۔

مسئلہ نمبر 4: یہ آیت عام ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد کے ساتھ تخصیص داخل ہوئی ہے۔ ہمارے لیے دو مردے حلال کئے گئے ہیں: مچھلی اور مکڑی اور دو خون حلال کیے گئے ہیں: جگر اور تلی (1)۔ اس حدیث کو دارقطنی نے نقل کیا ہے۔ اسی طرح عنبر (مچھلی) کے بارے میں حضرت جابر کی حدیث ہے۔ قرآن کا عموم اس کی سند کی صحت کی وجہ سے خاص کیا گیا ہے۔ بخاری اور مسلم نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد اُحِلَّ لَكُمْ صَیْدُ الْبَحْرِ (المائدہ: 96) (2) کے ساتھ اس حدیث کو روایت کیا ہے اس کا بیان ان شاء اللہ آئندہ آئے گا۔

اکثر اہل علم سمندر کے تمام جانور زندہ اور مردے کھانے کے جواز کے قائل ہیں یہ امام مالک کا مذہب ہے اور پانی کے خنزیر کے بارے میں جواب دینے سے توقف کیا ہے اور فرمایا: تم کہتے ہو: خنزیر۔ ابن القاسم نے کہا: میں اس سے بچتا ہوں اور میں اسے حرام خیال نہیں کرتا۔

مسئلہ نمبر 5: علماء کا کتاب کی تخصیص سنت (حدیث) سے کرنے میں اختلاف ہے۔ اس اختلاف کے باوجود اس پر اتفاق ہے کہ ضعیف حدیث کے ساتھ قرآن کی تخصیص جائز نہیں۔ یہ ابن عربی کا قول ہے۔ کبھی اس آیت کی تخصیص پر صحیح مسلم کی روایت سے استدلال کیا جاتا ہے جو حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ سے مروی ہے (3)، فرمایا: ہم نے رسول اللہ ﷺ کی معیت میں سات غزوات میں شرکت کی، ہم آپ ﷺ کے ساتھ مکڑی کھاتے تھے۔ اس کا ظاہر معنی یہ ہے کہ اسے کھایا جائے جیسے بھی وہ مرے پکڑنے سے یا خود بخود ابن نافع، ابن عبدالحکم اور اکثر علماء کا یہی قول ہے۔ امام شافعی اور امام ابو

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الاطعمہ، صفحہ 246 (وزارت تعلیم) صحیح بخاری، حدیث نمبر 4013، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب الذبائح والصید، صفحہ 826، جلد 2 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح مسلم، کتاب الذبائح والصید، صفحہ 152، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

صحیح بخاری، کتاب الذبائح والصید، باب اکل الجراد، حدیث 5071، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حنیفہ(ل) وغیرہما کا یہی مسلک ہے۔ امام مالک اور ان کے اصحاب میں سے اکثر نے اس دریائی جانور کو کھانے سے منع کیا ہے جو طبعی موت مرجائے کیونکہ وہ خشکی کے شکار سے ہے، کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ محرم جب اسے قتل کرے گا تو اس کی جزا دے گا۔ پس وہ ہرن کے مشابہ ہے۔ اشہب نے کہا: اگر وہ پاؤں یا پر کے کاٹنے کی وجہ سے مرجائے تو اسے نہیں کھایا جائے گا کیونکہ یہ ایسی حالت تھی جس کے ساتھ وہ زندہ رہ سکتا تھا اور اس کی نسل جاری ہو سکتی تھی۔ مکڑی کے حکم کا مزید بیان سورہ اعراف میں اس کے ذکر کے وقت آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

مسئلہ نمبر 6: علماء کا اختلاف ہے کیا میت سے نفع حاصل کرنا اور نجاسات میں سے کوئی فائدہ اٹھانا جائز ہے یا نہیں۔ امام مالک کے اس مسئلہ میں مختلف اقوال ہیں۔ کبھی فرمایا: ان سے نفع اٹھانا جائز ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت میمونہ کی (مردہ) بکری کے پاس سے گزرے تو فرمایا تم نے اس کی کھال کیوں حاصل نہیں کی (1) (الحدیث) اور کبھی فرمایا: مردہ چیز ساری کی ساری حرام ہے، کسی اعتبار سے بھی اس سے نفع اٹھانا جائز نہیں اور نہ نجاستوں میں سے کسی نجاست سے نفع اٹھانا جائز ہے۔ حتیٰ کہ ناپاک پانی سے کھیتی کو سیراب کرنا اور کسی حیوان کو پلانا جائز نہیں اور جانوروں کو نجاستوں کا چارہ نہیں کھلایا جائے گا، مردار کتوں اور درندوں کو بھی نہیں کھلایا جائے گا۔ اگر حیوان ناپاک چیز کھائیں تو انہیں منع کیا جائے گا۔ اس قول کی وجہ کو خاص نہیں فرمایا۔ یہ کہنا جائز نہیں ہے کہ یہ خطاب مجمل ہے، کیونکہ مجمل وہ ہوتا ہے جس کے ظاہر سے مراد سمجھی نہیں جاتی۔ عربوں نے اس فرمان حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ (مائدہ: 3) کا مراد سمجھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مردار کی کسی چیز سے نفع نہ اٹھاؤ۔ حضرت عبد اللہ بن عکیم کی حدیث میں ہے "مردار کی کھال اور پٹھوں سے نفع نہ اٹھاؤ (2)"۔ اور یہ ارشاد آپ نے وصال سے ایک ماہ قبل فرمایا تھا۔ ان اخبار کا بیان اور ان پر کلام سورۃ النحل میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

مسئلہ نمبر 7: رہی وہ اونٹنی یا گائے یا بکری جو ذبح کی گئی اور اس میں مردہ بچہ تھا تو بغیر ذبح کیے اس کا کھانا جائز ہے مگر یہ کہ وہ زندہ نکلے تو اسے ذبح کیا جائے گا۔ اس کے لیے اس کے نفس کا حکم ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مردہ بچہ جب ذبح کے بعد مردہ نکلا تو وہ اس جانور کے اعضاء میں سے ایک عضو کے قائم مقام ہے۔ اور اس کی وضاحت اس سے بھی ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص بکری بیچے اور اس کے پیٹ کی چیز کا استثناء کرے تو جائز نہیں ہے جس طرح اگر کوئی جانور کے کسی عضو کی استثناء کرے تو جائز نہیں ہوتا۔ جو کچھ جانور کے پیٹ میں ہوتا ہے وہ دوسرے تمام اعضاء کی طرح اس کا تابع ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی لونڈی کو آزاد کرے جبکہ اس کے پیٹ والی چیز پر آزادی کو واقع نہ کرے تو بھی وہ آزاد ہو جائے گا لیکن اگر بچہ ماں سے جدا ہو تو وہ بیع، عتق (آزادی) میں تابع نہ ہوگا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گائے اور بکری کے بارے پوچھا گیا جنہیں ذبح کیا جاتا ہے اور اونٹنی جسے نحر کیا جاتا ہے اور اس کے پیٹ میں مردہ بچہ ہوتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الذبائح والصید، صفحہ 158، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ) صحیح بخاری، حدیث نمبر 1397، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، کتاب اللباس، صفحہ 206، جلد 1 (وزارت تعلیم)

ایضاً، سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب روی ان لا ینتفع باھاب المیتۃ، حدیث 3598، ضیاء القرآن پبلی کیشنز (ل) امام ابو حنیفہ کی یہ رائے نہیں

فرمایا: اگر تم چاہو تو اس مردہ بچے کو کھاؤ کیونکہ اس کا ذبح اس کی ماں کا ذبح ہے۔ ابوداؤد نے اس کا معنی حضرت ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے(1)، یہ نص ہے جو احتمال نہیں رکھتی ہے اس کا مزید بیان سورۃ المائدہ میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

مسئلہ نمبر 8: امام مالک سے مردار کی کھال کے متعلق روایات مختلف ہیں، کیا اس کو دباغت کے ساتھ پاک کیا جائے گا یا نہیں؟ امام مالک سے ایک روایت یہ ہے کہ اسے پاک نہیں کیا جائے گا یہ ان کا ظاہر مذہب ہے۔ اور ایک روایت یہ ہے کہ اسے پاک کیا جائے گا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کھال کی دباغت کی جائے گی وہ پاک ہو جائے گی(2)۔ اور پاک نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ مردار کا جز ہے اگر بحالت حیات اس کی کھال اتاری جاتی تو وہ نجس ہوتی۔ پس واجب ہے کہ دباغت بھی اسے پاک نہ کرے جس طرح گوشت دباغت سے پاک نہیں ہوتا اور جو اخبار طہارت کے متعلق ہیں انہیں اس پر محمول کیا جائے گا کہ جلد سے دباغت میل کچیل کو زائل کر دیتی ہے حتیٰ کہ اس سے خشک چیزوں میں اور اس پہ بیٹھنے کا نفع اٹھایا جا سکتا ہے اور مشکیزہ بنا کر پانی میں بھی اس سے نفع اٹھایا جا سکتا ہے کیونکہ پانی طہارت کی اصل پر ہے جب تک اس کا وصف نہ بدلے۔ اس کا حکم سورۂ فرقان میں آئے گا۔ طہارت لغت میں میل کچیل کو دور کرنے کی طرف متوجہ ہوتی ہے جس طرح طہارت شرعیہ کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔

مسئلہ نمبر 9: مردار کے بال اور اس کی اون پاک ہے، کیونکہ حضرت ام سلمہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: مردار کی کھال میں کوئی حرج نہیں جب اس کی دباغت کی جائے اور اس کی صوف اور بالوں میں کوئی حرج نہیں جب وہ دھوئے جائیں(3) کیونکہ وہ طاہر تھے اگر وہ زندہ حالت میں جانور سے لئے جاتے پس واجب ہے کہ موت کے بعد بھی اسی طرح ہوں مگر گوشت جب حالت حیات میں نجس تھا تو موت کے بعد بھی اسی طرح ہوگا۔ پس اون کا حکم موت کی حالت میں گوشت کے خلاف ہوگا جیسا کہ حالت حیات میں اس کا حکم گوشت سے مختلف تھا۔ یہ استدلال بالعکس کے اعتبار سے ہے۔ اس پر دودھ اور مردہ مرغی سے نکلنے والے انڈے کا حرام ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ ہمارے نزدیک موت کے بعد بھی دودھ پاک ہے اسی طرح انڈا بھی پاک ہے لیکن وہ ناپاک برتن سے حاصل ہوئے تو برتن کی مجاورت کی وجہ سے ناپاک ہو گئے نہ کہ وہ موت سے نجس ہوئے۔ مزید تفصیل اس مسئلہ کی اور اس سے پہلے والے مسئلہ کی اور علماء کا اختلاف ان شاء اللہ سورۃ النحل میں آئے گا۔

مسئلہ نمبر 10: وہ چیز جس میں چوہا گر جائے اس کی دو حالتیں ہیں: ایک حالت یہ ہے کہ چوہا زندہ نکل آئے گا تو وہ پاک ہوگا اور اگر اس میں چوہا مر جائے تو اس کی دو حالتیں ہیں۔ ایک حالت یہ کہ وہ چیز مائع ہوگی تو وہ ساری ناپاک ہو جائے گی۔ ایک حالت یہ کہ وہ چیز جامد ہوگی تو جو حصہ اس چوہے کے ساتھ متصل ہوگا وہ ناپاک ہوگا پس جو اس کے قریب ہوگا اسے پھینک دیا جائے گا اور باقی سے نفع اٹھایا جائے گا وہ پاک ہوگا۔ روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ سے چوہے کے متعلق پوچھا

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الضحایا، صفحہ 35، جلد 2 (وزارت تعلیم)

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب اللباس، صفحہ 266 (وزارت تعلیم) و جامع ترمذی، کتاب اللباس، صفحہ 208، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ سنن دارقطنی، صفحہ 47، جلد 1 (دار المحاسن)

گیا جو گھی میں گر کر مرجاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر وہ گھی جامد ہو تو اسے اور اس کے ارد گرد کے گھی کو پھینک دو اور اگر وہ مائع ہو تو اسے بہا دو (1)''۔ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ جب اسے دھویا جائے؟ بعض علماء نے فرمایا: وہ دھونے سے پاک نہ ہوگا کیونکہ نجس مائع ہے وہ خون، شراب، پیشاب اور دوسری نجاستوں کے مشابہ ہے۔

ابن قاسم نے فرمایا: دھونے کے ساتھ پاک ہو جائے گا کیونکہ وہ جسم تھا جو نجاست کی مجاورت کی وجہ سے ناپاک ہو گیا۔ پس وہ کپڑے کے مشابہ ہے، اس سے خون کا پاک ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ وہ نجس عین ہے اور شراب اور پیشاب، ان کو دھونا ان کو ہلاک کر دیتا ہے انہیں دھویا نہیں جاسکتا۔

مسئلہ نمبر 11: جب ہم غسل کے ساتھ طہارت کا حکم کریں گے تو وہ طہارت میں اور تمام وجوہ انتفاع میں پہلی حالت کی طرف لوٹ آئے گا لیکن اسے بیچے گا نہیں حتیٰ کہ اسے بیان کرے کیونکہ یہ لوگوں کے نزدیک عیب ہے اور نفوس اس سے نفرت کرتے ہیں۔ اور بعض علماء اس کی تحریم اور نجاست کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ اس کا بیچنا جائز نہیں حتیٰ کہ عیب کو بیان کرے جس طرح کہ دوسری معیوب اشیاء ہیں اور غسل سے پہلے اس کا بیچنا کسی حال میں جائز نہیں کیونکہ ان کے نزدیک نجاسات کا بیچنا جائز نہیں۔ نیز یہ نجس مائع ہے یہ شراب کے مشابہ ہے۔ نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شراب کی قیمت کے بارے پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ یہود پر لعنت کرے ان پر چربی حرام کی گئی تھی پھر انہوں نے اسے پگھلایا اور اسے بیچا اور اس کی اثمان کو کھایا (2)''۔ اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کو حرام کرتا ہے تو اس کی ثمن کو حرام کرتا ہے۔ یہ مائع نجاست کی وجہ سے حرام کی گئی تھی پس اس کی ثمن کا ظاہر حکم کی وجہ سے حرام کرنا واجب ہے۔

مسئلہ نمبر 12: جب ہانڈی میں کوئی حیوان پرندہ وغیرہ گر جائے اور مر جائے تو ابن وہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہانڈی میں جو کچھ تھا اسے نہیں کھایا جائے گا۔ مردار کی مخالطت سے وہ ناپاک ہو چکا ہے۔ ابن قاسم نے مالک سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: گوشت کو دھویا جائے گا اور شوربہ انڈیل دیا جائے گا۔ حضرت ابن عباس سے اس مسئلہ کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: گوشت کو دھویا جائے گا اور اسے کھایا جائے گا اور شوربے کے متعلق ان کے شاگردوں میں سے کوئی مخالف نہیں یعنی اسے انڈیل دیا جائے گا۔ یہ ابن خویز منداد نے ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 13: رہا مردار کے معدہ کا پنیر اور مردار کا دودھ، تو امام شافعی نے فرمایا یہ نجس ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ** (المائدہ: 3) عام ہے۔ امام ابوحنیفہ نے ان دونوں چیزوں کی طہارت کا کہا ہے۔ انہوں نے فرمایا۔ خلقت کی جگہ کا اس چیز کے پلید کرنے میں کوئی اثر نہیں جس میں خلقت کا عمل ہوا ہے اسی وجہ سے وہ گوشت کھایا جاتا ہے جس میں رگیں ہوتی ہیں حالانکہ ان رگوں میں خون داخل ہوتا ہے اور نہ اس کو دھویا جاتا ہے اور نہ اس کی تطہیر کی جاتی ہے۔ امام مالک کا قول بھی امام ابوحنیفہ کے قول کی طرح ہے۔ یہ موت کے ساتھ ناپاک نہیں ہوتا بلکہ ناپاک برتن کی مجاورت کی وجہ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمۃ، صفحہ 181، جلد 2 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب تحریم بیع الخمر والمیتۃ، صفحہ 23، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

سے ناپاک ہوتا ہے اور ان چیزوں میں سے ہے جس کو دھویا نہیں جاسکتا۔ اسی طرح مرغی سے جو انڈا اس کے مرنے کے بعد نکلتا ہے اس کا بھی یہی حکم ہے کیونکہ انڈا مرغی سے نکلنے سے پہلے مائع کے حکم میں ہوتا ہے یہ ہوا کے ساتھ سخت ہو جاتا ہے۔

ابن خویز منداد نے کہا: اگر کہا جائے کہ تمہارا قول اجماع کے خلاف تک پہنچا تا ہے۔ وہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد مسلمان پنیر کھاتے تھے جو ان کے پاس عجمیوں کی زمین سے لایا جاتا تھا اور یہ معلوم ہے کہ عجمی مجوسی تھے ان کا ذبیحہ مردار ہے۔ صحابہ کرام یہ خیال نہیں کرتے تھے کہ یہ مردار جانور کے معدہ کا پنیر ہے یا ذبح کیا گیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے: خشک دودھ میں جو پنیر کی مقدار واقع ہوتی تھی وہ تھوڑی ہوتی تھی اور تھوڑی نجاست معاف ہے جبکہ وہ کثیر مائع میں مل جائے۔ یہ ایک روایت کے مطابق جواب ہے اور دوسری روایت پر یہ جواب ہے کہ یہ حکم ابتدائے اسلام میں تھا اور یہ کسی کے لئے نقل کرنا ممکن نہیں کہ صحابہ کرام نے عجمیوں کی زمین سے لایا گیا پنیر کھایا تھا بلکہ پنیر عربوں کے طعام سے نہیں تھا جب مسلمان عجم کی زمین میں فتوحات کے ذریعے پھیل گئے تو ذبائح ان کے لئے ہو گئے پھر ہمارے لئے کہاں سے ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے پنیر کھایا تھا چہ جائیکہ وہ عجم کی زمین سے لایا گیا ہو اور وہ ان کے ذبائح کے معدہ سے بنایا گیا ہو۔

ابو عمر نے کہا: بت پرستوں، مجوسیوں کے کھانے کو کھانے میں کوئی حرج نہیں اور باقی تمام کفار کے کھانے میں کوئی حرج نہیں جبکہ وہ کھانا ان کے ذبائح سے نہ ہو اور نہ اسے ذبح کی احتیاج ہو مگر وہ پنیر جس میں مردار کے معدہ کا پنیر ہو۔ سنن ابن ماجہ میں ہے: پنیر اور گھی۔

حضرت سلمان فارسی سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گھی، پنیر اور فراء (ایسی پوستین جس کا اندرونی حصہ لومڑی بلی وغیرہ کی کھال سے تیار کیا جاتا ہے) کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: حلال وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حلال کیا اور حرام وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حرام کیا اور جس سے سکوت اختیار کیا گیا وہ معاف ہے (1)۔

مسئلہ نمبر 14: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الدَّمَ علماء کا اتفاق ہے کہ خون حرام نجس ہے نہ اسے کھایا جائے گا اور نہ اس سے نفع اٹھایا جائے گا، ابن خویز منداد نے کہا: خون حرام ہے جب تک اس میں عموم بلوی نہ ہو اور عوم بلوی معاف ہے اور عموم بلوی کی وجہ سے جو خون معاف ہوتا ہے اس سے مراد وہ خون ہے جو گوشت اور رگوں میں ہوتا ہے یہ بدن میں اور کپڑے میں تھوڑا ہو اس میں نماز پڑھی جاتی ہے۔ ہم نے یہ اس وجہ سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ (المائدہ:3)

دوسری جگہ فرمایا: قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِيْ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا (انعام:145)

(آپ فرمایئے میں نہیں پاتا اس کتاب میں جو وحی کی گئی ہے میری طرف کوئی چیز حرام کھانے والے پر جو کھاتا ہے اسے مگر یہ کہ مردار ہو یا رگوں کا بہتا ہوا خون)۔

پس بہنے والا خون حرام ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرمایا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہانڈی پکاتے

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الاطعمۃ، باب اکل الجبن والسمن، صفحہ 249 (وزارت تعلیم)

تھے خون کی وجہ سے زردی بلند ہوتی تھی ہم کھاتے تھے اور ہم اسے ناپسند نہیں کرتے تھے (1)۔ اس سے بچنا بوجھ ہے اور اس میں مشقت ہے اور دین میں بوجھ اور مشقت اٹھالی گئی ہے۔ یہ شرع میں اصل ہے۔ جب عبادت کی ادائیگی میں امت کو حرج لاحق ہوا اور اس پر بوجھ ہوا تو عبادت ساقط کر دی۔ آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ مضطر مردار کھاتا ہے، مریض افطار کرتا ہے اور مرض میں تیمم کرتا ہے۔

میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ نے یہاں مطلقاً خون کا ذکر کیا اور سورۃ الانعام میں مَّسۡفُوۡحًا کے ساتھ مقید فرمایا۔ علماء نے یہاں مطلق کو مقید پر محمول فرمایا ہے یہاں خون سے مراد بہنے والا خون ہے کیونکہ جو گوشت کے ساتھ متصل ہوتا ہے وہ بالاجماع حرام نہیں ہے اسی طرح جگر اور تلی کی حلت پر بھی اجماع ہے اور مچھلی کے خون میں اختلاف ہے۔ قابسی سے مروی ہے کہ یہ پاک ہے۔ اس کی طہارت سے لازم آتا ہے کہ یہ حرام نہیں ہے (2)۔ یہ ابن عربی کا اختیار ہے۔ فرمایا: اگر مچھلی کا خون نجس ہوتا تو اس کی زکاۃ (ذبح کرنا) مشروع ہوتی۔

میں کہتا ہوں: یہ مچھلی کے خون کے بارے میں امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے۔ میں نے بعض حنفیوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ اس کے پاک ہونے کی دلیل یہ ہے کہ جب اس کا خون خشک ہوتا ہے تو سفید ہو جاتا ہے بخلاف دوسرے خونوں کے، وہ سیاہ ہو جاتے ہیں یہ نکتہ شوافع پر احناف کی طرف سے حجت ہے۔

مسئلہ نمبر 15: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَحۡمَ الۡخِنۡزِیۡرِ اللہ تعالیٰ نے خنزیر کے گوشت کا ذکر کیا تاکہ اس کے عین کی تحریم پر دلالت کرے خواہ ذبح کیا گیا ہو یا ذبح نہ کیا گیا ہو، تاکہ چربی اور دوسری بھربھری ہڈیوں وغیرہ کو شامل ہو جائے۔ (3)

مسئلہ نمبر 16: خنزیر کی چربی کی تحریم پر امت کا اجماع ہے۔ امام مالک اور ان کے اصحاب نے استدلال کیا ہے کہ جس نے چربی نہ کھانے کی قسم اٹھائی پھر اس نے گوشت کھایا تو وہ گوشت کھانے کی وجہ سے حانث نہ ہوگا۔ اگر کوئی قسم اٹھائے کہ وہ گوشت نہیں کھائے گا پھر اس نے چربی کھائی تو حانث ہوگا کیونکہ چربی کے ساتھ گوشت ہو تو اس پر گوشت کے اسم کا اطلاق ہوتا ہے۔ گوشت کے اسم میں چربی داخل ہے اور گوشت، چربی کے اسم میں داخل نہیں اللہ تعالیٰ نے خنزیر کے گوشت کو حرام کیا اور گوشت کا ذکر کیا اور چربی کا ذکر نہ کیا کیونکہ یہ گوشت کے تحت داخل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر چربی کو حرام کیا اپنے اس ارشاد کے ساتھ حَرَّمۡنَا عَلَیۡہِمۡ شُحُوۡمَہُمَاۤ (انعام: 146) اس سے ان پر گوشت کی حرمت واقع نہیں ہوئی اور چربی کے اسم میں گوشت داخل نہیں۔ اسی وجہ سے امام مالک نے چربی کی قسم اٹھانے والے اور گوشت کی قسم اٹھانے والے میں فرق کیا ہے مگر یہ کہ قسم اٹھانے والے کی نیت گوشت کی ہو، چربی کی نیت نہ ہو تو وہ حانث نہ ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

امام شافعی، ابوثور اور اصحاب الرائے کے قول میں حانث نہ ہوگا جب وہ قسم اٹھائے کہ وہ گوشت نہیں کھائے گا پھر وہ چربی کھالے۔ امام احمد نے کہا: جب قسم اٹھائے کہ وہ گوشت نہیں کھائے گا پھر اس نے چربی کھالی تو کوئی حرج نہیں مگر اس نے چربی سے اجتناب کا ارادہ کیا ہو۔

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً

مسئلہ نمبر 17: اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ خنزیر سارا حرام ہے سوائے بالوں کے۔ اس کے بالوں کے ساتھ جوتی سینا جائز ہے۔ روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے خنزیر کے بالوں کے ساتھ جوتا سینے کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں۔ ابن خویز منداد نے اس کو ذکر کیا ہے۔ فرمایا: کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں اس کے ساتھ جوتیاں سی جاتی تھیں، اس کے بعد بھی یہ عمل موجود تھا، ہمیں معلوم نہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے بعد کسی امام نے اس کا انکار کیا ہو۔ اور رسول اللہ ﷺ نے جس کو جائز قرار دیا وہ ابتداء الشرع کی طرح ہے۔

مسئلہ نمبر 18: خشکی کے خنزیر کی حرمت میں کوئی اختلاف نہیں جیسا کہ ہم نے ذکر کیا اور پانی کے خنزیر میں اختلاف ہے۔ امام مالک نے اس کے بارے میں کچھ جواب دینے سے انکار کیا اور فرمایا: تم خنزیر کہتے ہو۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اس کا بیان سورۂ مائدہ میں ہوگا۔

مسئلہ نمبر 19: اکثر لغوی علماء کا خیال ہے کہ خنزیر کا لفظ رباعی ہے۔ ابن سیدہ نے بعض سے روایت کیا ہے کہ یہ خزر العین سے مشتق ہے کیونکہ وہ اس طرح دیکھتا ہے، اس صورت میں لفظ ثلاثی ہوگا (1) اور ''الصحاح'' میں ہے تخازر الرجل، اپنی پلک کو تنگ کرنا تاکہ نظر کو تیز کرے۔ الخزر، آنکھ کا تنگ ہونا اور چھوٹا ہونا۔ رجل اخزر بین الخزر۔ اور کہا جاتا ہے: گویا وہ انسان آنکھ کے آخری حصہ سے دیکھتا ہے۔ خنزیر کی جمع خنازیر ہے۔ خنازیر ایک معروف بیماری بھی ہے یہ ایک سخت زخم ہوتا ہے جو گردن میں ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 20: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ۔ یعنی جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ اس سے مراد مجوسی، بت پرست اور معطل کا ذبیحہ ہے کیونکہ بت پرست بت کے لئے ذبح کرتا ہے مجوسی آگ کے لئے ذبح کرتا ہے اور معطل، وہ کسی ذات کا اعتقاد نہیں رکھتا وہ اپنے لئے ذبح کرتا ہے۔ علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے مجوسی جسے آگ کے لئے ذبح کرتا ہے، بت پرست جو اپنے بت کے لئے ذبح کرتا ہے اسے نہیں کھایا جائے گا اور ان کا ذبیحہ امام مالک، اور امام شافعی وغیرہما کے نزدیک نہیں کھایا جائے گا اگرچہ وہ آگ اور بت کے لئے نہ بھی ہو۔ ابن مسیب اور ابوثور نے ان کا ذبیحہ جائز قرار دیا ہے جو وہ مسلمان کے لئے اس کے حکم سے ذبح کرے۔ اس کا مزید بیان سورۂ مائدہ میں آئے گا۔ الاھلال کا معنی آواز کو بلند کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے: اھل بکذا یعنی اس نے اپنی آواز کو بلند کیا۔ ابن احمر صحرا کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:

یھل بالفرقد رکبانھا کما یھل الراکب المعتمر

قافلہ والے فرقد میں اس طرح آواز بلند کرتے ہیں جس طرح عمرہ کرنے والا سوار آواز نکالتا ہے۔

نابغہ نے کہا:

او درۃ صدفیۃ غواصھا بھج متی یرھا یھل و یسجد

یا صدف والا موتی جس کا غواص خوش ہوتا ہے جب اسے دیکھتا ہے آواز نکالتا ہے اور جھکتا ہے۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

اسی سے اھلال الصبی ہو استھلالہ ہے ولادت کے وقت بچے کا چیخنا۔ حضرت ابن عباس وغیرہ نے کہا: اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جو بتوں اور تھانوں کے لئے ذبح کی جاتی ہیں (1)۔ اس سے مراد وہ نہیں ہے جس پر مسیح کا نام ذکر کیا جاتا ہے اس کا بیان سورۂ مائدہ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور عربوں کی عادت تھی کہ ذبیحہ سے مقصود اسم کا اعتبار کرتے ہیں اور اس استعمال میں یہ غالب ہو گیا نیت کا اعتبار ہی نہیں کیا جو تحریم کی علت ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان اونٹوں میں نیت کا اعتبار کیا جن کو غالب ابو فرزدق نے نحر کیا تھا۔ آپ نے فرمایا یہ ان جانوروں سے ہے جو غیر اللہ کے لئے ذبح کئے جاتے ہیں۔ پس لوگوں نے اس کو ترک کر دیا۔ ابن عطیہ نے کہا، میں نے حسن بن ابی حسن کی اخبار میں دیکھا، ان سے ایک مالدار عورت کے متعلق پوچھا گیا جس نے اپنی دل لگی کے لئے ایک شادی کا اہتمام کیا اور اس نے کئی اونٹ ذبح کئے۔ حضرت حسن نے فرمایا اس کا کھانا حلال نہیں یہ بت کے لئے ذبح کئے گئے ہیں۔

میں کہتا ہوں: اس معنی میں وہ روایت ہے جو ہم نے یحییٰ بن یحییٰ تمیمی مسلم کے شیخ سے روایت کی ہے فرمایا: ہمیں جریر نے قابوس سے روایت کر کے بتایا، کہ میرے باپ نے ایک عورت کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھیجا اور اسے کہا کہ پہلے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس کی طرف سے سلام کہنا اور پھر ان سے پوچھنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کون سی نماز زیادہ پسند تھی اور کس نماز پر آپ دوام اختیار فرماتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ظہر سے پہلے چار رکعت پڑھتے تھے جن میں قیام لمبا فرماتے تھے اور رکوع و سجود خوب اچھا کرتے تھے اور رہی وہ نماز جس کو آپ صحت، مرض، سفر و حضر میں کبھی نہیں چھوڑتے تھے وہ صبح کی نماز سے پہلے دو رکعتیں ہیں۔ ایک عورت نے عرض کی: اے ام المومنین! ہمارے لئے عجمیوں میں سے کچھ مہربان ہیں ان کی ایک عید ہوتی ہے اس موقع پر وہ ہمیں تحائف بھیجتے ہیں کیا اس میں سے ہم کچھ کھا سکتے ہیں؟ حضرت عائشہ نے فرمایا: جو اس دن کے لئے ذبح کیا گیا ہے اسے نہ کھاؤ اور ان کے درختوں کے پھلوں سے کھاؤ۔

مسئلہ نمبر 21: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنِ اضْطُرَّ یہ اتباع کی وجہ سے نون کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور کسرہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور یہ کسرہ اصل ہے کیونکہ التقاء ساکنین ہوا ہے۔ اس میں اضمار ہے یعنی ان محرمات میں سے کسی چیز کی طرف کوئی مجبور ہے۔ اضطر۔ یہ ضرورۃ سے باب افتعال ہے۔ ابن محیصن نے فمن اطّر ضاد کو طا میں ادغام کر کے پڑھا ہے اور ابو السمال نے طا کے کسرہ کے ساتھ فمن اضطِر پڑھا ہے اور اس کی اصل اضطر رہے جب ادغام کیا گیا تو را کی حرکت طا کی طرف نقل کی گئی۔

مسئلہ نمبر 22: اضطرار یا تو ظالم کے مجبور کرنے کی وجہ سے ہوتا ہے یا بھوک کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جمہور فقہاء اور علماء کا اس آیت میں اس معنی پر اتفاق ہے کہ وہ بھوک کی وجہ سے مجبور ہو۔ اور یہی صحیح ہے۔ بعض نے فرمایا اس کا معنی ہے جو ان محرمات کے کھانے پر مجبور کیا گیا ہو۔ مجاہد نے کہا یعنی کسی کو مجبور کیا گیا ہو مثلاً ایک شخص کو دشمن پکڑ لیتا ہے اور وہ اسے خنزیر وغیرہ کا گوشت

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 240، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

کھانے پر مجبور کرتا ہے مگر یہ اکراہ مجبور کرنا اس کے کھانے کو اس وقت مباح کرے گا جب وہ اکراہ مجبور کرنا انتہا کو پہنچ جائے۔

وہ بھوک یا تو وہ دائمی ہوگی یا دائمی نہیں ہوگی۔ اگر بھوک دائمی ہو تو مردار سے بھوک مٹانے کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں مگر مردار کا کھانا اس کے لئے حلال نہیں جبکہ وہ کسی مسلمان کا مال پاتا ہو جس میں اس کو قطع ید کا خوف نہ ہو مثلاً لٹکی ہوئی کھجوریں اور حریسۃ الجبل (پہاڑ کی چھوڑی گئی بکری) اور اس قسم کی چیزیں جن میں ہاتھ نہیں کاٹے جاتے اور اذیت نہیں دی جاتی، اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث میں ہے، فرمایا: ہم ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے ہم نے ایک اونٹنی دیکھی جس کی کھیری درخت کے کانٹوں سے باندھی گئی تھی تو ہم اس کی طرف لوٹے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں پکارا تو ہم آپ کی طرف لوٹ آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ اونٹ مسلمانوں کے گھر والوں کے لئے ہیں یہ ان کی خوراک ہیں اور ان کی برکت ہیں... کیا تمہیں اچھا لگے گا اگر تم اپنے مشکیزوں کی طرف جاؤ اور تم دیکھو کہ جو کچھ ان میں تھا وہ ختم ہو چکا ہے کیا تم اس کو عدل سمجھتے ہو۔ صحابہ نے عرض کی: نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ اسی طرح حرام ہے۔ ہم نے کہا: آپ فرمائیے اگر ہمیں کھانے پینے کی ضرورت ہو تو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم کھاؤ اور ساتھ نہ لے جاؤ، پیو اور ساتھ نہ لے جاؤ (1)۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور فرمایا: یہ میرے نزدیک اصل ہے، ابن منذر نے اس کو ذکر کیا ہے۔ فرمایا: ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! جب ہم سے کوئی شخص مجبور ہو جائے تو اس کے لئے اپنے بھائی کے مال سے کیا حلال ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ کھائے اور ساتھ نہ لے جائے، پیئے اور ساتھ نہ لے جائے (2)۔ ابن منذر نے کہا: تمام چیزیں جن میں اس کے بعد اختلاف ہوگا وہ تحریم کی طرف لوٹائی جائیں گی۔

ابو عمر نے کہا: اس کے متعلق قول یہ ہے کہ مسلمان پر جب کھانا کھلانا متعین ہو جائے تو وہ اتنی مقدار میں کھلائے جس سے اس کی روح لوٹ آئے اور اس مسلمان پر کھانا کھلانا فرض ہوگا۔ مگر یہ اس صورت میں ہے جبکہ وہاں کوئی اور نہ ہو، تو اس پر آدمی کی روح کو لوٹانے کا فیصلہ کیا جائے گا اور جس کو ایسی حالت میں کھانے سے روکا گیا ہو اس کے لئے اس سے لڑنا جائز ہے جو اسے کھانے سے منع کرے، اگرچہ یہ چیز اس کے اپنے خلاف ہی چلی جائے۔ اہل علم کے نزدیک اس صورت میں ہے جب صرف ایک شخص وہاں موجود ہو اس پر فرض کا تعین ہو جائے گا۔ اگر بہت سے لوگ ہوں پھر ان پر کھانا کھلانا فرض کفایہ ہوگا اور اس میں پانی اور دوسری چیز جو مسلمان کے نفس لوٹاتی اور قائم رکھتی ہیں برابر ہیں، مگر اس شے کی قیمت کے وجوب میں اختلاف ہے، جس کے ساتھ اس کی روح لوٹ آئی ہے، بعض نے قیمت کو واجب قرار دیا ہے اور بعض نے اس کا انکار کیا ہے۔ ہمارے مذہب میں دو قول ہیں: متقدمین اور متاخرین علماء کے درمیان مسلمان کی روح لوٹانے کے وجوب میں کوئی اختلاف نہیں جب کہ اس کے تلف ہونے کا اندیشہ ہو، کسی تھوڑی سی چیز کے ساتھ جس میں اس کے مالک کا نقصان نہ ہو اور اس میں گزارہ ہو۔

مسئلہ نمبر 23: ابن ماجہ نے دو سندوں کے ساتھ حضرت عباد بن شرحبیل سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہمیں ایک سال بھوک کا سامنا کرنا پڑا تو میں مدینہ طیبہ آیا پھر میں ایک باغ میں آیا۔ میں نے ایک خوشہ پایا، میں نے اسے توڑا اور اسے کھایا

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب التجارۃ، صفحہ 68-167 (وزارت تعلیم) 2۔ ایضاً، صفحہ 167

اور میں نے اسے اپنی چادر میں رکھ دیا۔ باغ کا مالک آیا، اس نے مجھے مارا اور مجھ سے میرا کپڑا چھین لیا۔ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور سارا واقعہ عرض کیا۔ آپ ﷺ نے اس شخص کو فرمایا: تو نے اسے نہ کھلایا جب یہ بھوکا تھا اور تو نے اسے نہ سکھایا جب وہ جاہل تھا۔ نبی کریم ﷺ نے اسے حکم دیا کہ وہ اسے کپڑا لوٹا دے اور اسے طعام کا ایک وسق یا نصف دے (1)۔

میں کہتا ہوں: یہ حدیث صحیح ہے اور بخاری و مسلم اس کے رجال پر متفق ہیں مگر ابن ابی شیبہ، وہ صرف مسلم کا راوی ہے عباد بن شرحبیل الغبری یشکری بخاری اور مسلم نے اس سے کوئی چیز نقل نہیں کی، اس کے لئے نبی کریم ﷺ سے اس واقعہ کے علاوہ کوئی چیز مروی نہیں ہے۔ ابو عمر نے جو ذکر کیا ہے یہ حدیث بھوک کی حالت میں قطع ید اور تنبیہ کرنے کی نفی کرتی ہے۔ ابو داؤد نے حسن سے انہوں نے حضرت سمرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی کسی جانور کے پاس آئے اگر اس کے پاس اس کا مالک ہو تو وہ اس سے اجازت لے پھر وہ اگر اسے اجازت دے تو وہ دودھ دوہ لے اور پی لے۔ اگر مالک نہ ہو تو تین دفعہ آواز دے اگر تو مالک جواب دے تو اس سے اجازت طلب کرے۔ اگر وہ اسے اجازت دے تو فبہا ورنہ وہ دودھ دوہے اور پی لے لیکن اٹھا کر ساتھ نہ لے جائے (2)۔

ترمذی نے یحییٰ بن سلیم سے انہوں نے عبید اللہ سے انہوں نے نافع سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے، فرمایا: جو کسی باغ میں داخل ہو تو کھالے اور جھولی میں نہ ڈال لے۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث غریب ہے ہم اسے نہیں جانتے مگر یحییٰ بن سلیم کی حدیث سے۔ اور امام ترمذی نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے لٹکے ہوئے پھلوں کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: کسی ضرورت مند نے ان پھلوں میں سے کچھ لے لیا جبکہ وہ جھولی میں ڈالنے والا نہ ہو تو اس پر کچھ نہیں ہے۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن ہے اور حضرت عمر کی حدیث میں ہے جب تم میں سے کوئی باغ سے گزرے تو اسے ضرورت کے مطابق کھالینا چاہئے اور کپڑے میں نہیں ڈالنا چاہئے (یعنی ساتھ نہ لے جائے)۔ ابو عبید نے کہا: ابو عمرو نے کہا ثبانا اس برتن کو کہتے ہیں جس میں کوئی چیز ڈالی جاتی ہے اگر تو اسے اپنے آگے اٹھائے تو وہ ثبان ہے۔ کہا جاتا ہے: قد تثبنت ثبانا، اگر تو اسے اپنی پیٹھ پر اٹھائے تو ابھی اس کا وہی ثبان نام ہے۔ اسی سے جب چادر کو لپیٹ کر اس میں کوئی چیز ڈالی جائے اور پیٹھ پر اٹھائی جائے تو ثبانا کہا جاتا ہے۔ اگر تو اسے اپنی جھولی میں ڈال لے تو اسے خبنۃ کہا جاتا ہے، اسی سے عمرو بن شعیب کی مرفوع حدیث ہے۔ ولا یتخذ خبنۃ، (3) جھولی میں نہ ڈالے۔ کہا جاتا ہے: خبنت اخبن خبنا۔ ابو عبید نے کہا: اس حدیث میں بھوکے مجبور کے لئے رخصت ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو جس کے ساتھ وہ کچھ خرید سکے اور وہ نہ اٹھائے مگر اتنی مقدار جتنی اس کے پیٹ میں طاقت ہے۔

میں کہتا ہوں: وہ اصل جس پر اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ غیر کا مال حرام ہے مگر یہ کہ غیر خوشی سے دے۔ اگر معاشرہ میں اس عمل کی عادت ہو جس طرح اسلام کے ابتدائی دور میں تھا یا اب بعض شہروں میں ہے تو یہ جائز ہے اور کبھی اسے بھوک اور ضرورت

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب التجارۃ، صفحہ 167 (وزارت تعلیم) 2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، صفحہ 352، جلد 1 (وزارت تعلیم)
3۔ جامع ترمذی، کتاب البیوع، صفحہ 154، جلد 1 (وزارت تعلیم)

کے اوقات پر محمول کیا جاتا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور اگر بھوک دائمی نہ ہو کسی وقت میں ہو تو اس میں علماء کے دو قول ہیں: ایک یہ کہ وہ کھائے حتیٰ کہ سیر ہو جائے اور خوب سیر ہو جائے، اور اگر آئندہ اس صحرا اور جنگل میں ضرورت کا خدشہ ہو تو ساتھ لے جائے، جب اس سے مستغنی ہو جائے تو اسے پھینک دے۔ یہی معنی امام مالک نے اپنے مؤطا میں بیان کیا اور یہی قول امام شافعی اور کثیر علماء کا ہے۔ حجت یہ ہے کہ ضرورت، حرمت کو اٹھا دیتی ہے۔ پس اباحت لوٹ آتی ہے اور ضرورت کی مقدار، خوراک نہ ہونے کی حالت میں خوراک کے موجود ہونے تک ہوتی ہے۔ العنبر (مچھلی) والی حدیث اس میں نص ہے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب جب سفر سے لوٹ کر آئے تو ان کا زادِ راہ ختم ہو چکا تھا۔ وہ ساحل سمندر تک چلے تو ان کے لئے ساحل سمندر پر ایک بہت بڑے ٹیلے کی طرح (مچھلی) ظاہر ہوئی۔ جب وہ اس کے پاس آئے تو وہ ایک جانور تھا جس کو عنبر کہا جاتا تھا۔ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ جو لشکر کے امیر تھے، انہوں نے کہا: مردار ہے۔ پھر فرمایا: نہیں بلکہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام رساں ہیں اور اللہ کے راستہ میں ہیں اور تم بھوک کی وجہ سے مجبور ہو۔ پس تم اسے کھاؤ۔ راوی فرماتے ہیں: ہم ایک مہینہ اسے کھاتے رہے اور ہم تین سو آدمی تھے حتیٰ کہ ہم موٹے ہو گئے۔ (الحدیث)

صحابہ نے اسے کھایا اور سیر ہوئے (رضی اللہ عنہم) اس کے باوجود کہ وہ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ یہ مردار ہے اور وہ اس میں سے مدینہ طیبہ کی طرف بھی لے گئے۔ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ حلال ہے اور فرمایا: اس کے گوشت میں سے کچھ تمہارے پاس ہے تو ہمیں بھی کھلاؤ۔ صحابہ نے اس میں سے گوشت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کھایا (1)۔ علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ وہ اتنی مقدار کھائے کہ اس کی زندگی بچ جائے۔ ابن ماجشون اور ابن حبیب کا بھی یہی قول ہے۔ امام شافعی کے اصحاب نے مسافر اور مقیم کے درمیان فرق کیا ہے وہ فرماتے ہیں: مقیم اتنا کھائے جس سے اس کی زندگی بچ جائے اور مسافر سیر ہو کر کھائے اور ساتھ بھی لے جائے جب اس سے غنا پائے تو اسے پھینک دے، اگر کوئی مجبور پائے تو اسے دے دے اور اس سے عوض نہ لے کیونکہ مردار کو بیچنا جائز نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 24: اگر کوئی شراب پینے پر مجبور ہو۔ اگر شراب پینے پر مجبور کیا گیا ہو تو اس میں کوئی اختلاف نہیں وہ شراب پی لے۔ اگر بھوک یا پیاس کی وجہ سے مجبور ہو تو نہ پیئے۔ یہ امام مالک کا العتبیۃ میں قول ہے۔ فرمایا: شراب، پیاس میں اضافہ کرتی ہے۔ یہی امام شافعی کا قول ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے شراب کو مطلقاً حرام فرمادیا اور مردار کو ضرورت نہ ہونے کی شرط کے ساتھ حرام کیا۔ ابہری نے کہا: اگر شراب اس کی بھوک یا پیاس کو مٹائے تو اسے پی لے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خنزیر کے بارے فرمایا: یہ ناپاک ہے پھر ضرورت کے لئے مباح کیا اور شراب کے بارے فرمایا: یہ ناپاک ہے۔ پس خنزیر اباحت میں ضرورت کی وجہ سے داخل ہوگا اس جلی معنی کی وجہ سے جو قیاس سے زیادہ قوی ہے۔ ضروری ہے کہ وہ سیر کرے گا اگرچہ ایک گھڑی کے لئے ہی سیر کرے گا اور بھوک کو مٹائے گا اگرچہ تھوڑی سی مدت کے لئے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصید والذبائح، صفحہ 147، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

مسئلہ نمبر 25: اصبغ نے ابن القاسم سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: مجبور خون پی لے اور شراب نہ پیئے۔ مردار کھالے اور کسی کے گم شدہ اونٹوں کے قریب نہ جائے یہ ابن وہب کا قول ہے پیشاب پی لے اور شراب نہ پیئے، کیونکہ شراب میں حد لازم ہوتی ہے۔ معلوم ہوا یہ زیادہ سخت ہے۔ اس پر امام شافعی کے اصحاب کی نص ہے۔

مسئلہ نمبر 26: اگر کسی کو لقمہ پھنس جائے تو کیا وہ شراب کے ساتھ اسے نگلے یا نہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: نہیں۔ اس خوف سے کہیں وہ عادی نہ ہو جائے۔ اور ابن حبیب نے اس کی اجازت دی ہے کیونکہ یہ ضرورت کی حالت ہے۔ ابن عربی نے کہا: جس کو لقمہ پھنس جائے اس کے اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان جو معاملہ ہے اس کے اعتبار سے جائز ہے اور رہا ہمارے درمیان کا مسئلہ تو ہم اسے دیکھیں گے اور اگر ہم پر قرائن کی وجہ سے پھنسنے کی صورت مخفی نہیں ہوگی تو ہم اس کی تصدیق کریں گے جب یہ ظاہر ہو جائے گا اور اگر پھنسنے کی صورت ظاہر نہ ہوگی تو ہم ظاہر کی بنا پر اسے حد لگائیں گے اور اللہ کی بارگاہ میں باطناً عقوبت سے محفوظ رہے گا۔ پھر جب مجبور شخص مردار، خنزیر اور آدمی کا گوشت پائے تو وہ مردار کھالے کیونکہ وہ حلال ہے، جبکہ خنزیر اور آدمی کسی حالت میں حلال نہیں ہیں۔ بلکی تحریم کو اختیار کرنا بہتر ہے بنسبت بھاری تحریم میں داخل ہونے کے۔ اسی طرح اگر کسی کو اپنی بہن یا کسی اجنبی عورت سے وطی کرنے پر مجبور کیا جائے تو وہ اجنبی عورت سے وطی کرلے کیونکہ بہن کسی صورت میں حلال نہیں۔ یہی ان احکام میں ضابطہ ہے۔ انسان کا گوشت نہ کھائے اگرچہ مر بھی جائے۔ یہ ہمارے علماء کا قول ہے اور یہی امام احمد اور داؤد نے کہا ہے۔ امام احمد نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے حجت پکڑی ہے کہ "مردہ آدمی کی ہڈی توڑنا، زندہ کی ہڈی توڑنے کی طرح ہے(1)"۔ امام شافعی نے فرمایا: آدمی کا گوشت کھالے اور اس کے لئے کسی ذمی کو قتل کرنا جائز نہیں کیونکہ وہ محترم الدم ہے اور نہ کسی مسلمان اور نہ قیدی کو قتل کرے کیونکہ وہ غیر کا مال ہے۔ اگر حربی یا زانی شادی شدہ ہو تو اس کا قتل کرنا اور اس سے کھانا جائز ہے۔ ابوداؤد نے مزنی پر سخت تنقید کی ہے کیونکہ انہوں نے کہا ہے: انبیاء کرام کا گوشت کھانا مباح ہے۔

ابن شریح نے بھی اس پر سخت جرح کی ہے کہ تو انبیاء کرام کے قتل تک پہنچ گیا ہے جبکہ تو نے کافر کے کھانے سے منع کیا ہے۔ ابن عربی نے کہا: میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ وہ آدمی کا گوشت نہ کھائے مگر جب اسے یقین ہو کہ یہ اسے مرنے سے بچا لے گا اور زندگی کا باعث بنے گا۔

مسئلہ نمبر 27: امام مالک سے پوچھا گیا کہ مجبور مردار کھا سکتا ہے جبکہ وہ غیر کا مال کھجور، کھیتی یا بکریاں پائے۔ امام مالک نے فرمایا: اگر اسے اپنے بدن پر ضرر کا اندیشہ نہ ہو مثلاً اسے چور شمار نہیں کیا جائے گا اور اس کے قول کی تصدیق کی جائے گی تو وہ جو چیز پائے اس سے کھالے جو اس کی بھوک کو مٹائے لیکن اس میں سے ساتھ نہ لے جائے۔ میرے نزدیک مردار کھانے سے یہ کھانا بہتر ہے۔ یہ مفہوم پہلے تفصیل سے گزر چکا ہے اور اگر اسے اندیشہ ہو کہ لوگ اس کی تصدیق نہیں کریں گے اور اسے چور شمار کریں گے اگر وہ مردار کھالے تو میرے نزدیک جائز ہے۔ اس مقام پر مردار کھانے میں اس کے لئے وسعت ہے۔

مسئلہ نمبر 28: ابوداؤد نے اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ حضرت جابر بن سمرہ سے مروی ہے، ایک شخص پتھر یلے

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، صفحہ 102، جلد 2 (وزارت تعلیم)

ٹیلے پر اترا اور اس کے ساتھ اس کے گھر والے اور بچے بھی تھے۔ ایک شخص نے کہا: میری اونٹنی گم ہوگئی ہے اگر تو اسے پائے تو اسے روک لینا۔ پس اسے اونٹنی مل گئی لیکن اس کا مالک اسے نہ ملا۔ وہ اونٹنی مریض ہوگئی۔ بیوی نے اسے کہا: تو اسے نحر کردے لیکن اس شخص نے انکار کیا حتیٰ کہ وہ مرگئی۔ بیوی نے کہا: اس کی کھال اتار لے تاکہ ہم اس کے گوشت اور چربی کو خشک کریں اور اسے کھائیں۔ اس شخص نے کہا: نہیں حتیٰ کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ پوچھ لوں۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تیرے پاس اتنی غذا ہے جو تجھے مستغنی کردے۔ اس نے کہا: نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر تم اسے کھالو۔ فرمایا: پھر اس کا مالک آیا تو اس نے اسے پورا قصہ بتایا، اس نے کہا: تو نے اسے نحر کیوں نہیں کیا تھا؟ اس نے کہا: مجھے تجھ سے حیا آ گیا تھا۔ ابن خویز منداد نے کہا: اس حدیث میں دو دلیلیں ہیں: ایک یہ کہ مجبور، مردار میں سے کھالے اگرچہ اسے تلف (ضائع) ہونے کا اندیشہ نہ بھی ہو کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے غنا کے متعلق پوچھا تھا، اس سے اپنے نفس پر خوف کے متعلق نہیں پوچھا تھا۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ وہ کھائے، سیر ہو کر کھائے، ذخیرہ بھی کرے اور ساتھ بھی لے جائے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادخار (ذخیرہ کرنا) کو مباح کیا اور اس پر سیر نہ ہونے کی شرط بھی نہیں لگائی۔ ابو داؤد نے اپنی سند سے فجیع عامری سے روایت کیا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور پوچھا: ہمارے لئے کون سا مردار حلال ہے؟ فرمایا: جو تمہارا کھانا ہے۔ ہم نے کہا: نغتبق و نصطبح۔ ابو نعیم نے کہا: اس کا مطلب ہے: ہم ایک پیالہ صبح پیتے ہیں اور ایک شام کو پیتے ہیں۔ فرمایا: میرے باپ کی قسم! یہ بھوک ہے۔ فرمایا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حالت میں مردار کو ان کے لئے حلال کیا(1)۔

ابو داؤد نے کہا: الغبوق سے مراد دن کا آخری حصہ ہے اور الصبوح سے مراد دن کا ابتدائی حصہ ہے۔ خطابی نے کہا: الغبوق سے مراد شام کا کھانا ہے اور الصبوح سے مراد صبح کا کھانا ہے یعنی صبح کے وقت ایک دودھ کا پیالہ اور شام کے وقت دودھ کا پیالہ زندگی کو باقی رکھتا ہے اور نفس کو قائم رکھتا ہے اگرچہ جسم کو مکمل غذا اور تام سیرابی نہ دے، ان کے لئے اس کے ہوتے ہوئے مردار کھانے کو مباح کیا۔ یہ دلالت ہے کہ مردار کا کھانا مباح ہے یہاں تک کہ وہ نفس خوراک سے اپنی ضرورت حاصل کرلے۔ یہی امام مالک کا نظریہ ہے، یہی امام شافعی کا ایک قول ہے۔ ابن خویز منداد نے کہا: جب صبح و شام دودھ کا پیالہ پینا جائز ہے تو سیر ہونا اور زادراہ ساتھ لے جانا بھی جائز ہے۔ امام ابو حنیفہ کا قول اور امام شافعی کا دوسرا قول یہ ہے کہ اس کے لئے مردار کا کھانا جائز نہیں ہے مگر جو اس کی زندگی بچالے۔ مزنی کا بھی یہی نظریہ ہے۔ انہوں نے فرمایا: اگر ابتدا میں یہ حالت ہو تو اس سے کھانا جائز نہیں اسی طرح جب اس کو کھانے کے بعد اس حال پر پہنچ جائے اسی طرح حسن سے مروی ہے قتادہ نے فرمایا: سیر ہو کر نہ کھائے۔ مقاتل بن حبان نے کہا: تین لقموں سے زیادہ نہ کھائے، صحیح اس کے خلاف ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 29: ان چیزوں کے ساتھ علاج کرنا، ان کے استعمال کی دو صورتیں ہیں: یا تو ان کے عین کو باقی رکھ کر انہیں استعمال کیا جائے گا یا جلا کر استعمال کیا جائے گا۔ اگر جلانے کے ساتھ بدل جائیں تو ابن حبیب نے کہا: ان کے ساتھ علاج کرنا اور نماز پڑھنا جائز ہے۔ ابن ماجشون نے اس کی تخفیف کی اس بنا پر کہ جلانا، صفات کی تبدیلی کے لئے تطہیر ہے۔ اور **العتبیۃ**

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمۃ، صفحہ 178، جلد 2 (وزارت تعلیم)

میں امام مالک نے کہا: مَرْتَكَ (دواء) دوا جو مردار کی ہڈیوں سے بنائی جاتی ہے جب اسے زخم پر رکھا جائے تو اس کے ساتھ نماز نہ پڑھے حتیٰ کہ اسے دھو لے۔ اگر مردار قائم بعینہ ہو تو سحنون نے کہا: اس کے ساتھ اور خنزیر کے ساتھ کسی حالت میں علاج نہ کیا جائے کیونکہ ان کا بدل حلال موجود ہوتا ہے بخلاف بھوک کے۔ اگر ان کا بھوک میں بھی عوض پایا جائے تو پھر مردار کو نہیں کھایا جائے گا۔ اسی طرح شراب سے علاج نہیں کیا جائے گا۔ یہ امام مالک کا قول ہے اور امام شافعی کا ظاہر بھی یہی ہے۔ یہ ابن ابی ہریرہ جو امام شافعی کے اصحاب میں سے ہیں ان کا بھی یہی مختار ہے۔ امام ابو حنیفہ نے کہا: دوا کے طور پر پینا جائز ہے، پیاس کے لئے پینا جائز نہیں۔ یہ اصحاب شافعی میں قاضی طبری کا مختار مذہب ہے اور یہی ثوری کا قول ہے۔ شوافع میں سے بعض بغدادیوں نے کہا: پیاس کے لئے پینا جائز ہے، دواء کے لئے جائز نہیں کیونکہ پیاس کا نقصان جلدی پہنچنے والا ہے بخلاف علاج کے۔

بعض علماء نے فرمایا: دونوں کے لئے پینا جائز ہے۔ بعض اصحاب شافعی نے ہر حرام چیز سے علاج کرنے سے منع کیا ہے سوائے اونٹوں کے پیشاب کے۔ کیونکہ اس کے متعلق عرنیین والی حدیث موجود ہے۔ بعض علماء نے ہر حرام چیز سے علاج کرنے سے منع کیا ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: اللہ تعالیٰ نے میری امت کی شفا اس چیز میں نہیں رکھی جو ان پر حرام کی گئی ہے (1) اور نبی کریم ﷺ نے حضرت طارق بن سوید سے کہا: جب انہوں نے شراب کے متعلق پوچھا تو آپ نے اسے منع فرمایا تھا یا شراب بنانے کا ناپسند فرمایا تھا۔ اس نے کہا: میں اسے دواء کے لئے بناتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ دوا نہیں ہے بلکہ یہ بیماری ہے (2)۔ مسلم نے اس حدیث کو اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔ یہ احتمال ہے کہ یہ حالت اضطرار کے ساتھ مقید ہو۔ کیونکہ زہر کے ساتھ علاج کرنا جائز ہے اور اس کا پینا جائز نہیں ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 30: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: غَيْرَ بَاغٍ، غَيْرَ کو نصب حال کی بنا پر ہے۔ بعض نے فرمایا: استثنا کی بنا پر ہے، جب تو غَيْرَ کو دیکھے کہ اس کی جگہ فی صحیح ہوتا ہے تو یہ حال ہوتا ہے اور جب اس کی جگہ الا رکھنا صحیح ہو تو یہ استثنا ہوتا ہے۔ اس پر قیاس کرلو۔ بَاغٍ اصل میں باغی تھا ضمہ یا پر دشوار تھا اسے ساکن کر دیا گیا پھر تنوین اور یا ساکن جمع ہوئے تو یا کو حذف کیا گیا اور کسرہ یا کے حذف پر دلالت کرتا ہے۔ قتادہ، حسن، ربیع، ابن زید اور عکرمہ نے کہا غَيْرَ بَاغٍ کا معنی ہے وہ حاجت سے زیادہ کھانے والا نہ ہو وَّلَا عَادٍ۔

اور سدی نے کہا غَيْرَ بَاغٍ کا مطلب ہے: وہ شہوت ولذت کے لئے کھانے والا نہ ہو اور وَّلَا عَادٍ سیر ہونے کی حد تک پورا کھانے والا نہ ہو۔ مجاہد، ابن جبیر وغیر ہما نے کہا غَيْرَ بَاغٍ کا معنی ہے: مسلمانوں پر بغاوت کرنے والا نہ ہو وَّلَا عَادٍ اور ان پر تجاوز کرنے والا نہ ہو۔ باغی اور عادی میں ڈاکو، سلطان پر خروج کرنے والا، قطع رحمی میں سفر کرنے والا، اور مسلمانوں پر حملہ کرنے والا داخل ہے۔ یہ صحیح ہے، کیونکہ لغت میں البغی کا معنی فساد کا قصد کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے: بغت المرأة تبغی بغاءً، جب عورت بدکاری کرے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ (النور: 33)

کبھی البغی فساد کے علاوہ کسی چیز کو طلب کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ عرب کہتے ہیں: تو کہتا ہے: خرج الرجل فی

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاشربہ، صفحہ 840، جلد 2 (وزارت تعلیم)　2۔ صحیح مسلم، کتاب الاشربہ، صفحہ 163، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

بغاء ابل لہ، وہ اونٹوں کی تلاش میں نکلا۔ شاعر کا قول ہے:

لا یمنعک من بغاء الخیر تعقاد الرتائم

ان الأشائم کالایامن والأیامن کالأشائم

خیر کی تلاش تجھے نہ روکے۔ دھاگے باندھے جاتے ہیں۔ بائیں، دائیں کی طرح ہیں اور دائیں بائیں کی طرح ہیں۔

مسئلہ نمبر 31: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا عَادٍ، عاد کی اصل عائد ہے اور یہ مقلوب سے ہے جیسے شاکی السلاح، ھارٍ اور لاثٍ(1)۔ اصل میں شائك، ھائر، لائث یہ لثت العمامۃ سے مشتق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اضطراری حالت میں تمام محرمات کو مباح قرار دیا کیونکہ یہ تمام مباحات سے عاجز تھا۔ پس مباح چیز کا نہ ہونا حرام چیز کی اباحت کے لئے شرط ہے۔

مسئلہ نمبر 32: علماء کا اختلاف ہے جب اس کی ضرورت کے ساتھ معصیت متصل ہو مثلاً ڈاکہ ڈالنے والا ہو، یا مسافروں کو خوف دلانے والا ہو۔ امام مالک اور امام شافعی نے ایک قول میں معصیت کی وجہ سے منع کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو مباح کیا بطور مدد اور گنہگار کی مدد کرنا حلال نہیں۔ اگر کھانے کا ارادہ کرے تو اسے توبہ کرنا چاہئے اور کھانا چاہئے۔ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی نے دوسرے قول میں ان کے لئے بھی مباح کیا ہے۔ انہوں نے معصیت اور اطاعت کے درمیان مباحت میں برابری کی ہے۔ ابن عربی نے کہا: عجب ہے ان کے لئے جو گنہگار کے لئے بھی اس کو مباح کرتا ہے میں کسی کو یہ کہنے والا خیال نہیں کرتا۔ اگر کوئی ایسا کہے تو وہ قطعاً غلطی کرنے والا ہے۔

میں کہتا ہوں: اس کا خلاف صحیح ہے کیونکہ سفر معصیت میں اپنے آپ کو ضائع کرنا اس معصیت سے زیادہ ہے جس میں وہ مبتلا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (النساء:29) یہ عام ہے۔ شاید وہ دوسری حالت میں توبہ کرے اور توبہ اس کے گناہ کو مٹا دے۔ مسروق نے کہا: جو مردار، خون اور خنزیر کا گوشت کھانے کی طرف مجبور ہو اور وہ نہ کھائے حتیٰ کہ مر جائے تو وہ دوزخ میں داخل ہوگا مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دے۔ ابو الحسن طبری المعروف بالکیا نے کہا: ضرورت کے وقت مردار کھانا رخصت نہیں بلکہ عزیمت واجبہ ہے۔ اگر کوئی مردار کے کھانے سے رک جائے گا تو وہ گنہگار ہوگا۔ مردار کا کھانا سفر کی رخصت نہیں ہے یا سفر سے متعلق نہیں ہے بلکہ یہ ضرورت کے نتائج سے ہے خواہ وہ سفر میں ہو یا حضر میں ہو۔ مقیم گنہگار کے افطار کی طرح ہے جب وہ مریض ہوتا ہے اور اسی طرح گنہگار مسافر کا تیمم کرنا پانی کے نہ ہونے کے وقت۔ فرمایا: ہمارے نزدیک یہ صحیح ہے۔ میں کہتا ہوں: اس کے بارے میں امام مالک سے روایات مختلف ہیں ان کا مشہور مذہب جو الباجی نے ''المنتقی'' میں ذکر کیا ہے۔ سفر معصیت میں اس کے لئے کھانا جائز ہے اور سفر معصیت میں نماز قصر کرنا اور روزہ افطار کرنا جائز نہیں۔ ابن خویز منداد نے کہا: اضطرار کی حالت میں کھانا، اس میں اطاعت شعار اور گنہگار برابر ہیں، کیونکہ سفر و حضر میں مردار کا کھانا جائز ہے۔ گناہوں کی طرف نکلنے والوں سے مقیم کا حکم اس سے ساقط نہیں ہوتا بلکہ مقیم ہونے سے بھی بری حالت میں ہوتا ہے، یہ فطر اور قصر اس طرح نہیں ہیں کیونکہ یہ دونوں رخصتیں سفر سے متعلق ہیں۔ جب سفر، سفر معصیت ہو تو اس میں قصر

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

کرنا جائز نہیں کیونکہ یہ رخصت سفر کے ساتھ مختص ہے۔ اسی وجہ سے ہم نے کہا: وہ سفر معصیت میں پانی کے نہ ہونے کے وقت تیمم کرے کیونکہ تیمم سفر وحضر میں برابر ہے اس کو مردار کھانے اور تیمم کرنے سے معصیت کی وجہ سے یہ منع کرنا جائز ہے جس معصیت کا اس نے ارتکاب کیا ہے۔ مردار کو نہ کھانے میں جان کا ضیاع ہے اور یہ سب سے بڑا گناہ ہے اور تیمم کے ترک میں نماز کو ضائع کرنا ہے کیا یہ کہنا جائز ہے؟ تو نے ایک گناہ کا ارتکاب کیا ہے اب دوسرا گناہ کر۔ کیا شراب پینے والے کو یہ کہنا جائز ہے کہ تو زنا کر، اور زانی کو کیا کہنا جائز ہے کہ تو کفر کر یا دونوں کو کہا جا سکتا ہے کہ تم دونوں نماز ضائع کرو؟ یہ تمام مسائل انہوں نے اپنی کتاب ''احکام القرآن'' میں بیان کئے ہیں۔ امام مالک اور ان کے اصحاب میں سے کسی کا خلاف ذکر نہیں کیا۔

الباجی نے کہا: زیاد بن عبدالرحمن اندلسی نے روایت کیا ہے کہ گنہگار اپنے سفر میں نماز کو قصر کرے اور رمضان میں افطار کرے اور یہ حکم تمام لوگوں میں برابر ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ کسی کو اپنی جان کو مردار کے کھانے سے رک کر تلف کرنا جائز نہیں کیونکہ اسے وجوب کے طور پر مردار کے کھانے کا حکم دیا گیا ہے اور جو معصیت کے سفر میں ہو اس سے فرائض واجبات، روزہ، نماز ساقط نہیں ہوتے بلکہ ان کا ادا کرنا اس پر لازم ہوتا ہے۔ اسی طرح ہم نے ذکر کیا ہے۔ پہلے قول کی وجہ یہ ہے کہ یہ معانی سفروں میں لوگوں کی حاجت کے لئے مباح ہیں۔ اس کے لئے ان سے گناہوں پر مدد حاصل کرنا مباح نہیں تھا اور اس کو اپنے نفس کو قتل کرنے کی حاجت نہیں۔ ابن حبیب نے کہا: وہ پہلے گناہ سے توبہ کرے پھر توبہ کے بعد مردار کا گوشت کھائے۔ ابن حبیب نے اس مسئلہ میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے تعلق جوڑا ہے: فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ ضرورت کے لئے مردار کی اباحت میں شرط رکھی ہے کہ وہ باغی نہ ہو اور حرابۃ، ڈاکہ، قطع رحمی، گناہ کا طالب باغی اور حد سے تجاوز کرنے والا ہے۔ ان میں اباحت کی شرائط نہیں پائی جاتی ہیں۔ واللہ اعلم

میں کہتا ہوں: یہ استدلال خطاب کے مفہوم سے ہے اور اس میں اصولی علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ آیت کا نظم یہ ہے کہ مضطر باغی نہیں ہے اور حد سے تجاوز کرنے والا نہیں اور اس پر گناہ نہیں ہے اور اس کے علاوہ سے خاموشی کی گئی ہے۔ اصل عموم خطاب ہے۔ جس نے کسی امر کے لئے اس کے زوال کا دعویٰ کیا اس پر دلیل لانا لازم ہے۔

(☆) **مسئلہ نمبر** 34: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ یعنی اللہ تعالیٰ گناہوں کو معاف فرماتا ہے۔ پس جس میں رخصت دی گئی ہے اس سے مؤاخذہ نہ ہونا بدرجہ اولیٰ ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہے کہ اس نے رخصت دی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

''بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور خرید لیتے ہیں اس کے بدلے حقیر سا معاوضہ۔ سو وہ نہیں کھا رہے اپنے پیٹوں میں سوائے آگ کے اور بات تک نہ کرے گا ان سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اور

☆ متن میں اسی طرح ہے جب کہ تفصیل میں (33) مسائل ہیں۔

نہ (ان کے گناہ بخش کر) انہیں پاک کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ الۡکِتٰبِ اس سے مراد علماء یہود ہیں۔ تورات میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت اور رسالت کی صحت کے متعلق جو اللہ نے نازل کیا تھا اسے انہوں نے چھپایا۔ اَنۡزَلَ بمعنی اظھر ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مَنۡ قَالَ سَاُنۡزِلُ مِثۡلَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ اس آیت میں ساُنزل بمعنی ساُظھر ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ نزول کے معنی میں ہی ہے۔ یعنی جو ملائکہ نے اس کے رسل پر اتارا۔ وَ یَشۡتَرُوۡنَ بِہٖ، بِہٖ میں ضمیر کا مرجع چھپائی گئی بات ہے۔ ثَمَنًا قَلِیۡلًا یعنی رشوت لیتے ہیں۔ اس کو قلیل فرمایا کیونکہ اس کی مدت ختم ہونے والی ہے اور اس کا انجام برا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جو وہ رشوت لیتے تھے وہ تھوڑی ہوتی تھی۔

میں کہتا ہوں: یہ آیت اگرچہ علماء یہود کے متعلق ہے یہ مسلمانوں کو بھی شامل ہے جو دنیا کے حصول کی خاطر حق کو چھپاتے ہیں۔ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِیۡ بُطُوۡنِہِمۡ یہ بطون کا ذکر کھانے کی حقیقت پر تاکید اور دلالت کے لئے ہے، کبھی یہ مجازاً استعمال ہوتا ہے مثلاً اکل فلان ارضی و نحوہ (فلاں نے میری زمین کو کھایا) اور بطون کے ذکر میں ان کی نادانی پر تنبیہ ہے۔ انہوں نے اپنی آخرت کو اپنے اس کھانے کے بدلے فروخت کیا جس کا کوئی مقام نہیں (1)۔ اِلَّا النَّارَ کا معنی یہ ہے کہ وہ حرام ہے اللہ تعالیٰ اس پر انہیں آگ کا عذاب دے گا۔ جو انہوں نے رشوت کھائی اسے آگ فرمایا کیونکہ وہ انہیں آگ تک پہنچانے والا تھا۔ اکثر مفسرین نے اسی طرح کہا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اللہ تعالیٰ انہیں حق کو چھپانے کی وجہ سے جہنم میں حقیقۃً آگ کھانے کے ساتھ عذاب دے گا۔ اس نے مآل کے مطابق حال کے ساتھ خبر دی (2)۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ الَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ اَمۡوَالَ الۡیَتٰمٰی ظُلۡمًا اِنَّمَا یَاۡکُلُوۡنَ فِیۡ بُطُوۡنِہِمۡ نَارًا (النساء:10) یعنی ان کا انجام اسی کی طرف پھیرا جائے گا۔ اسی سے عربوں کا قول ہے:

لدوا للموت وابنوا للخراب موت کے لئے پیدا کرو اور خرابی کے لئے بناؤ۔

ایک اور نے کہا:

فللموت ما تلد الوالدۃ جو ماں جنم دیتی ہے وہ موت کے لئے ہے۔

ایک اور نے کہا:

ودورنا لخراب الدھر نبنیھا ہم اپنے گھر زمانے کی خرابی کے لئے بناتے ہیں۔

اس قسم کی مثالیں قرآن اور اشعار میں کثیر ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا یُکَلِّمُہُمُ اللّٰہُ یہ ان پر ناراضگی اور رضا کے زوال سے عبارت ہے۔ کہا جاتا ہے: فلان لا یکلم فلاناً، جب تو کسی سے ناراض ہو۔ طبری نے کہا: لَا یُکَلِّمُہُمۡ یعنی ایسی کلام نہیں فرمائے گا جس کو وہ پسند کرتے ہوں گے۔ قرآن

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ ایضاً

حکیم میں ہے: اخْسَـُٔوْا فِیْهَا وَ لَا تُكَلِّمُوْنِ ﴿۱۰۸﴾ (المومنون) (پھٹکارے ہوئے پڑے رہو اس میں اور مت بولو میرے ساتھ) بعض علماء نے فرمایا: وہ فرشتوں کو ان کی طرف سلام کے ساتھ نہیں بھیجے گا۔ وَ لَا یُزَكِّیْهِمْ یعنی ان کے برے اعمال کی اصلاح نہیں فرمائے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا۔ زجاج نے کہا: وہ ان کی خیر کے ساتھ تعریف نہیں فرمائے گا اور نہ ان کو از کیاء کہے گا۔ اَلِیْمٌ یہ بمعنی مؤلم (دردناک) ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین شخصوں سے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز کلام نہیں فرمائے گا اور نہ ان کا تزکیہ کرے گا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا: (۱) بوڑھا زانی (۲) جھوٹا بادشاہ (۳) متکبر غریب (1)۔ ان کو عذاب الیم اور سخت سزا کے ساتھ خاص فرمایا محض مخالفت کی وجہ سے اور اس استخفاف کی وجہ سے جس نے انہیں ان جرموں پر برانگیختہ کیا کیونکہ اس پر انہیں کسی حاجت نے نہیں ابھارا اور نہ کسی ضرورت نے اس کی طرف انہیں بلایا جس طرح ضرورت انہیں بلاتی ہے جو ان کی مثل نہ ہوں لا ینظر الیہم کا معنی ہے وہ ان پر نہ رحم کرے گا اور نہ مہربانی کرے گا۔ مزید بیان سورۂ آل عمران میں آئے گا۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰی وَ الْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَاۤ اَصْبَرَهُمْ عَلَی النَّارِ ﴿۱۷۵﴾

''یہ وہ (بدنصیب) ہیں جنہوں نے خرید لی گمراہی ہدایت کے عوض اور عذاب کو نجات کے بدلے (تعجب ہے) کس چیز نے صابر بنادیا ہے انہیں آگ (کے عذاب) پر''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰی وَ الْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ اس پر کلام گزر چکی ہے۔ جب عذاب ضلالت کے تابع ہے اور مغفرت اس ہدایت کے تابع ہے جس کو انہوں نے ترک کردیا تو یہ دونوں شراء کے مجاز میں داخل ہوئیں۔(2)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَاۤ اَصْبَرَهُمْ عَلَی النَّارِ جمہور کا مذہب ... جن میں حسن اور مجاہد بھی ہیں کہ اس کا معنی تعجب ہے۔ یہ مخلوق کی طرف راجع ہے۔ گویا فرمایا: انہوں نے ان کے آگ پر صبر کرنے پر اور آگ پر ٹھہرے رہنے پر تعجب کیا۔ قرآن حکیم میں ہے: قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَاۤ اَكْفَرَهٗ ﴿۱۷﴾ (عبس) غارت ہو (منکر) انسان! وہ کتنا احسان فراموش ہے۔ واسمع بهم وابصر (اس دن) یہ خوب سننے لگیں گے اور خوب دیکھنے لگیں گے۔ اس معنی کی بنا پر ابوعلی نے لکھا ہے کہ حسن، قتادہ، ابن جبیر اور ربیع نے کہا: اللہ کی قسم! آگ پر انہیں صبر نہیں ہے لیکن وہ کتنے آگ پر جرأت کرنے والے ہیں (3)۔ یہ یمنی لغت ہے۔ فراء نے کہا: مجھے کسائی نے بتایا، فرمایا: مجھے یمن کے قاضی نے بتایا کہ دو جھگڑے والے ان کے پاس جھگڑا لے کر آئے تو ان میں سے ایک پر قسم واجب ہوئی تو اس نے قسم اٹھا دی۔ دوسرے مخالف نے اسے کہا: تو اللہ تعالیٰ پر کتنا جرأت کرنے والا ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ آگ پر کتنے بہادر ہیں کیونکہ وہ ایسے اعمال کرتے ہیں جو انہیں آگ تک پہنچاتے ہیں۔ زجاج نے کہا:

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب غلظ تحریم اسبال الازار، صفحہ 71، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

اس کا معنی ہے وہ آگ پر کتنے باقی رہنے والے ہیں۔ یہ عربوں کے اس قول سے مشتق ہے: ما اصبر فلاناً علی الحبس، یعنی وہ کتنا حبس (قید) میں باقی رہنے والا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ان کا آگ سے جزع فزع کتنا کم ہے۔ جزع کی قلت کو صبر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کسائی اور قطرب نے کہا: اس کا معنی ہے وہ دوزخیوں کے عمل پر کتنا دوام اختیار کرنے والے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: ما استفہام ہے اس کا معنی توبیخ ہے۔ یہ حضرت ابن عباس (1)، سدی، عطا، ابوعبیدہ، معمر بن مثنی کا قول ہے۔ اس کا معنی ہے: کس چیز نے انہیں دوزخیوں کے عمل پر صبر دیا ہے (2)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ ان کی استہانت اور ان کے امر کے استخفاف (ہلکا سمجھنا) کی بناء پر ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ لَفِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ۝

''یہ سزا اس وجہ سے ہوگی کہ اللہ نے تو اتاری کتاب حق کے ساتھ اور بے شک جو لوگ اختلاف ڈال رہے ہیں کتاب میں وہ دور دراز کے جھگڑوں میں پھنسے ہوئے ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ یہ محل رفع میں ہے اور حکم کی طرف اشارہ ہے۔ گویا فرمایا: ذالك الحکم بالنار۔ زجاج نے کہا: تقدیر عبارت ہے: الامر ذالك یا ذالك الامر یا ذالك العذاب لھم۔ اور ذٰلِكَ کی خبر مضمر ہے اس کا معنی ہے: یہ ان کو معلوم ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: ذٰلِكَ محل نصب میں ہے۔ اس کا معنی ہے: فعلنا ذالكِ بھم (ہم نے یہ ان کے ساتھ کیا) بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ یہاں الْكِتٰبَ سے مراد قرآن ہے۔ بِالْحَقِّ سے مراد سچ ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد حجت ہے۔ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ یہاں الْكِتٰبِ سے مراد تورات ہے۔ نصاریٰ نے دعویٰ کیا کہ اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صفت ہے اور یہود نے آپ کی صفت سے انکار کیا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: انہوں نے اپنے آباء اور سلف کی مخالفت کی تورات سے حجت پکڑنے میں۔ بعض نے فرمایا: جو تورات میں حضرت محمد ﷺ کی صفت تھی اس میں مخالفت کی اور اس میں اختلاف کیا۔ بعض نے فرمایا: الْكِتٰبِ سے مراد قرآن ہے اور جنہوں نے اختلاف کیا وہ کفار قریش تھے۔ ان میں سے بعض نے کہا: یہ قرآن جادو ہے۔ بعض نے کہا یہ پہلے لوگوں کے قصے ہیں۔ بعض نے کہا: یہ گھڑا ہوا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور شِقَاقٍ کے معنی پر گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰي حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّاۗىِٕلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰھَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا
2۔ ایضاً

''نیکی (بس یہی) نہیں کہ (نماز میں) تم پھیر لو اپنے رخ مشرق کی طرف اور مغرب کی طرف بلکہ نیکی (کا کمال) تو یہ ہے کہ کوئی شخص ایمان لائے اللہ پر اور روز قیامت پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور سب نبیوں پر اور دے اپنا مال اللہ کی محبت سے رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو اور (خرچ کرے) غلام آزاد کرنے میں اور صحیح صحیح ادا کیا کرے نماز اور دیا کرے زکوۃ اور جو پورا کرنے والے ہیں اپنے وعدوں کو جب کسی سے وعدہ کرتے ہیں اور کمال نیک ہیں جو صبر کرتے ہیں مصیبت میں اور سختی میں اور جہاد کے وقت۔ یہی لوگ ہیں جو راست باز ہیں اور یہی لوگ حقیقی پرہیز گار ہیں''۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَیۡسَ الۡبِرَّ اس خطاب کی مراد میں اختلاف ہے۔ قتادہ نے کہا: ہمیں بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نیکی کے متعلق پوچھا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور فرائض کے نزول ہونے سے پہلے جو ان لا الہ الا اللہ اور ان محمدا عبدہ ورسولہ کی گواہی دیتا اور پھر فوت ہو جاتا تو اس کے لئے جنت واجب تھی۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ ربیع اور قتادہ نے یہ بھی کہا کہ یہ خطاب یہود و نصاریٰ کے لئے ہے کیونکہ وہ قبلہ کی طرف منہ پھیرنے میں اختلاف کرتے تھے۔ یہود کہتے تھے: قبلہ مغرب کی طرف بیت المقدس ہے اور نصاریٰ کہتے تھے مشرق کی طرف سورج کے طلوع ہونے کی جگہ ہے اور انہوں نے قبلہ کی تبدیلی میں بھی کلام کیا، ہر فرقہ نے اپنے قبلہ کی فضیلت بیان کی۔ ان سے کہا گیا یہ نیکی نہیں ہے جس میں تم ہو بلکہ نیکی تو یہ ہے: مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ... الخ۔(1)

مسئلہ نمبر 2: حمزہ اور حفص نے البر کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ لیس، کان کے اخوات سے ہے۔ اس کے بعد دو معرفے واقع ہوں تو تو جس کو چاہے اسم بنادے یا خبر بنادے۔ اور جب لیس کے بعد البر واقع ہوا تو اسے تو نے نصب دی اور اَنۡ تُوَلُّوۡا کو اسم بنایا اور مصدر کا اسم ہونا اولیٰ ہے کیونکہ وہ نکرہ نہیں بنتا۔ اور البر کبھی نکرہ بن جاتا ہے اور فعل تعریف میں قوی ہوتا ہے۔ باقی قراء نے البر کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ لیس کا اسم ہے اور اس کی خبر اَنۡ تُوَلُّوۡا ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے: لیس البر تولیتکم وجوھکم۔ یعنی نیکی تمہارا اپنے قبلہ کی طرف مونہوں کو پھیرنا نہیں۔ اور پہلی ترکیب کے اعتبار سے معنی ہوگا تمہارا منہ پھیرنا نیکی نہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا کَانَ حُجَّتَہُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوا (الجاثیہ: 25) ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی بجز اس کے کہ وہ کہتے ہیں: ثُمَّ کَانَ عَاقِبَۃَ الَّذِیۡنَ اَسَآءُوا السُّوۡٓاٰۤی اَنۡ کَذَّبُوۡا (روم: 10) (آخر کار ان کا انجام جنہوں نے برائی کی تھی بہت برا ہوا کیونکہ انہوں نے جھٹلایا) فَکَانَ عَاقِبَتَہُمَاۤ اَنَّہُمَا فِی النَّارِ (الحشر: 17) (ان دونوں کا انجام یہ ہوگا کہ دونوں آگ میں ڈالے جائیں گے)

یہ رفع کی قرأت قوی ہے کیونکہ دوسری آیت میں بالاجماع خبر پر باآئی ہوئی ہے لَیۡسَ الۡبِرُّ بِاَنۡ تَاۡتُوا الۡبُیُوۡتَ مِنۡ ظُہُوۡرِہَا (البقرہ: 189) اس آیت میں صرف البر پر رفع جائز ہے۔ پہلی آیت کو دوسری پر محمول کرنا اولیٰ ہے بنسبت مخالفت

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

کے۔ اسی طرح حضرت ابی کے مصحف میں با کے ساتھ ہے لیس البربان تولوا۔ اسی طرح حضرت ابن مسعود کے مصحف میں بھی ہے۔ اکثر قراء کا نظریہ بھی یہی ہے۔ یہ دونوں قراءتیں بہتر ہیں۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ، الْبِرَّ یہاں خیر کے لئے اسم جامع ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے: ولکن البربر من آمن۔ مضاف کو حذف کیا گیا ہے۔ جیسے اس آیت میں مضاف حذف ہے وَسْـَٔلِ الْقَرْیَةَ (یوسف:82) اصل میں اهل القریہ تھا۔ وَ اُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ (البقرہ:93) اس میں بھی مضاف محذوف ہے۔ یہ فراء، قطرب اور زجاج کا قول ہے۔ شاعر نے کہا:

فانما هی اقبال و ادبارٌ

یہ اصل میں ذات اقبال و ذات ادبار ہے۔

نابغہ نے کہا:

و کیف تواصل من اصبحت　　خلالته کابی مرحب

اس شعر میں اصل کخلالۃ ابی مرحب ہے۔ پس اس میں حذف کیا گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے: لکن ذالبر۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ (آل عمران:163) یہ اصل میں ذو درجات ہے۔ یہ واقعہ اس طرح ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جب مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی اور فرائض، فرض کئے گئے اور قبلہ، کعبہ کو بنایا گیا اور حدود مقرر کی گئیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ فرمایا: کامل نیکی یہ نہیں کہ تم نماز پڑھو اور اس کے علاوہ عمل نہ کرو بلکہ نیکی والا وہ ہے جو اللہ پر ایمان لائے...... الخ۔ یہ حضرت ابن عباس، مجاہد، ضحاک، عطا، سفیان اور زجاج کا قول ہے(1)۔ یہ بھی احتمال ہے کہ البرّ، البارّ اور البَرّ کے معنی میں ہو۔ فاعل کو کبھی مصدر کے معنی کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے جیسے کہا جاتا ہے: رجل عدل، رجل صوم و فطر قرآن حکیم میں ہے: اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا (الملک:30) اس میں غوراً بمعنی غائراً ہے۔ یہ ابو عبیدہ کا اختیار ہے(2)۔ مبرد نے کہا: اگر میں قرآن کے قاریوں میں سے ہوتا تو میں ولکن البر۔ یعنی با کے فتحہ کے ساتھ پڑھتا۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِیْنَ بعض علماء نے فرمایا: الموفون کا عطف مَنْ پر ہے کیونکہ من جمع کے معنی میں اور محل رفع میں ہے گویا اس طرح فرمایا ولکن البر المومنون والموفون۔ یہ فراء اور اخفش کا قول ہے۔ الصابرین پر نصب مدح کی بنا پر یا فعل کے اضمار کے ساتھ ہے عرب مدح اور ذم کی بنا پر نصب دیتے ہیں۔ گویا وہ اس سے ممدوح اور مذموم کے افراد کا ارادہ کرتے ہیں اور وہ اسے پہلے کلام کا تابع نہیں کرتے بلکہ اسے نصب دیتے ہیں۔ مدح کی مثال یہ ارشاد ہے: وَالْمُقِیْمِیْنَ الصَّلٰوةَ (3) (النساء:162) نسائی نے یہ اشعار پڑھے ہیں

وکل قوم اطاعوا امر مرشد هم　　الا نمیرا اطاعت امرغاویها
الظاعنین ولما یظعنوا احداً　　والقائلون لمن دارٌ نخلیها

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　　2۔ ایضاً　　3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

ہر قوم نے اپنے مرشد کے حکم کی اطاعت کی سوائے نمیر کے۔ انہوں نے اپنے گمراہ کرنے والے کے امر کی اطاعت کی۔ وہ کوچ کرنے والے ہیں انہوں نے کسی کو کوچ نہیں کرایا اور جس کا گھر اس کے کہنے والے ہیں کہ ہم اسے خالی کرتے ہیں۔

ابو عبیدہ نے یہ شعر پڑھے ہیں:

لا یبعدن قومی الذین هم سم العداة وآفة الجزر

النازلین بکل معترك والطیبون معاقد الأزر

ان اشعار میں النازلین کو بطور مدح نصب دی گئی ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

نحن بنی ضبة اصحاب الجمل

اس میں بھی بنی ضبہ کو نصب مدح کے طور پر ہے۔ ذم کی مثالیں یہ ہیں: مَّلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا (احزاب: 61) (ان پر لعنت برس رہی ہوگی جہاں پائے جائیں گے)۔

عروہ بن الورد نے کہا:

سقونی الخمرثم تکنفونی عداة الله من کذب وزور

اس میں عداۃ اللہ کو نصب بطور ذم دی گئی ہے۔

یہ سلسلہ نعوت میں عام ہے، اعراب کی جہت سے اس میں طعن نہیں کیا جاتا۔ کلام عرب میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ وہ لوگ جو کلام میں ہٹ دھرمی کرتے ہیں انہوں نے کہا: لکھنے میں کاتبوں سے غلطی ہوئی ہے جب انہوں نے قرآن کا نسخہ لکھا تھا اور کہا کہ اس پر وہ روایت ہے جو حضرت عثمان (1) سے مروی ہے کہ انہوں نے قرآن کا نسخہ دیکھا تو انہوں نے کہا اس میں غلطی ہے عرب اپنی زبانوں کے ساتھ اس کو درست کرلیں گے۔ اسی طرح سورہ النساء میں وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ (النساء: 162) اور سورہ المائدہ میں الصائبون کے بارے میں کہا۔ اس کا جواب وہی ہے جو ہم نے ذکر کیا (کہ عرب کلام میں بطور مدح یا ذم، صفت کو اعراب میں جدا کردیا جاتا ہے جیسا کہ مثالوں سے واضح کیا گیا ہے)۔

بعض علماء نے فرمایا: الموفون کو رفع مبتدا کی حیثیت سے دیا گیا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ تقدیر عبارت و هم الموفون ہے۔ کسائی نے کہا والصابرین کا عطف ذوی القربیٰ پر ہے گویا فرمایا وآتی الصابرین۔ نحاس نے کہا: یہ قول غلط ہے اور خطا واضح ہے۔ کیونکہ جب تو الصابرین کو نصب دے گا اور اس کا عطف ذوی القربیٰ پر کریگا تو یہ (من) کے صلہ میں داخل ہو جائے گا۔ اور جب تو الموفون کو من پر عطف کی وجہ سے رفع دے گا تو تو نے صلہ کے مکمل ہونے سے پہلے من پر عطف کر دیا اور تو نے معطوف کے ساتھ صلہ اور موصول کے درمیان فرق کر دیا۔ کسائی نے کہا: حضرت عبداللہ کی قراءت میں الموفین

1۔ حضرت عثمان کے قول کی صحت کا محققین علماء نے انکار کیا ہے۔ علامہ زمخشری، ابو حیان اور آلوسی وغیرہ نے اس قول کی حضرت عثمان کی طرف نسبت کا شد و مد سے انکار کیا ہے۔ یہ واضعین کی کارستانی ہے۔

والصابرین ہے۔ نحاس نے کہا: دونوں ذوالقربیٰ پر معطوف ہیں یا بطور مدح منصوب ہیں۔ فراء نے کہا: عبداللہ کی قراءت میں سورہ النساء میں وَالْمُقِیْمِیْنَ الصَّلٰوةَ وَ الْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ (النساء:162) ہے۔ یعقوب اور اعمش نے الموفون والصابرون پڑھا ہے یعنی دونوں کو رفع کے ساتھ (1)۔ جحدری نے بعهودهم پڑھا ہے (2)۔ بعض علماء نے فرمایا: الموفون کا عطف اس ضمیر پر ہے جو آمن میں ہے۔ ابو علی نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا کہ معنی اس پر نہیں ہے کیونکہ اس سے مراد ان البر برمن آمن باللہ ھو والموفون۔ یعنی ہم تمام پر ایمان لائے جیسے تو کہتا ہے: الشجاع مَنْ اقدم ھو وعمرو۔ اور من آمن کے قول کے بعد جو کچھ ہے وہ من آمن کے افعال کو اور ان کے اوصاف کو شمار کرنا ہے۔

مسئلہ نمبر 5: ہمارے علماء نے کہا: یہ آیت عظیمہ امہات الاحکام میں سے ہے کیونکہ یہ سولہ قواعد اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے۔ اللہ تعالیٰ، اس کے اسماء اور صفات پر ایمان...... ہم نے اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات کی وضاحت اپنی کتاب ''الاسنیٰ'' میں کردی ہے۔ نشر، حشر، میزان، صراط، حوض، شفاعت، جنت، دوزخ ان کا ذکر ہم نے اپنی کتاب ''التذکرہ'' میں کردیا ہے۔ ملائکہ، نازل شدہ کتب یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق ہیں..... جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے..... انبیاء کرام، مال خرچ کرنا، واجبی طور پر اور نفلی طور پر قریبی رشتہ داروں سے صلہ رحمی کرنا۔ ان سے قطع تعلقی کو ترک کرنا، یتیم کی دیکھ بھال کرنا ان کو بے یار و مددگار نہ چھوڑنا اسی طرح مساکین کی خیر خواہی کرنا، مسافروں کی رعایت کرنا۔ ابن السبیل سے مراد بعض نے فرمایا: جو راستہ سے پیچھے رہ جانے والے ہوں۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد مہمان ہے..... سوال کرنا، غلاموں کو آزاد کرانا..... اس کا بیان آیت الصدقات میں آئے گا۔ نماز کی حفاظت کرنا، زکوٰۃ دینا، عہد کو پورا کرنا، تکلیف میں صبر کرنا، ان قواعد میں سے ہر قاعدہ ایک کتاب کا محتاج ہے، اکثر پر تنبیہ پہلے گزر چکی ہے۔ باقی کا بیان ان شاء اللہ ان کے مواقع پر آئے گا۔

علماء کا اختلاف ہے کہ کیا نفلی صدقہ سے یتیم کو صلہ رحمی کے طور پر یتیم ہونے کی وجہ سے صدقہ دیا جائے گا اگرچہ وہ غنی بھی ہو یا نہیں دیا جائے گا حتیٰ کہ وہ فقیر ہو۔ اس کے متعلق عطا کے دو قول ہیں: یہ واجب زکوٰۃ کے علاوہ مال دینے کی بنا پر ہے، جیسا کہ ابھی ہم بیان کریں گے۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ جنہوں نے یہ کہا کہ مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے، انہوں نے اس سے استدلال کیا ہے اور نیکی کا کمال اسی کے ساتھ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی اللہ کے راستہ میں دیا جائے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد فرض زکوٰۃ ہے (3)۔ پہلا قول اصح ہے کیونکہ دار قطنی نے فاطمہ بنت قیس سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے پھر یہ آیت تلاوت کی لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ الخ ابن ماجہ نے اپنی سنن میں، ترمذی نے اپنی جامع میں اس حدیث کو نقل کیا ہے اور فرمایا یہ حدیث ایسی ہے کہ اس کی سند ایسی نہیں ہے۔

ابو حمزہ میمون اعور کو ضعیف کہا گیا ہے، بیان اور اسماعیل بن سالم نے شعبی سے یہ قول روایت کیا ہے اور یہ اصح ہے۔

میں کہتا ہوں: حدیث میں اگرچہ کلام کیا گیا ہے اس کی صحت پر آیت کا معنی ہی دلالت کرتا ہے۔ فرمایا: وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ ایضاً　3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ۔ نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا ذکر کر دیا ہے۔ یہ دلیل ہے کہ وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ سے مراد فرضی زکوٰۃ نہیں ہے (کیونکہ زکوٰۃ کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) ورنہ تکرار ہو جائے گا (1) واللہ اعلم۔ علماء کا اتفاق ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے بعد مسلمانوں کو کوئی ضرورت پڑ جائے تو اس میں مال کا خرچ کرنا واجب ہے۔ امام مالک نے فرمایا: لوگوں پر اپنے قیدیوں کا فدیہ دینا واجب ہے اگرچہ ان کا سارا مال بھی اس میں غرق ہو جائے۔ اس پر اجماع بھی ہے اور یہ اس قول کو تقویت دیتا ہے جو ہم نے اختیار کیا۔ اللہ تعالیٰ ہی توفیق دینے والا ہے۔

مسئلہ نمبر 7: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَلٰی حُبِّهٖ، حُبِّهٖ میں ضمیر کے مرجع میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: مال دینے والے کی طرف راجع ہے۔ مفعول کو حذف کیا گیا ہے اور وہ مال ہے۔ ذوی القربیٰ کو حُبِّهٖ کی وجہ سے نصب دینا جائز ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: علی حب المعطی ذوی القربی۔ بعض نے فرمایا: یہ ضمیر مال کی طرف لوٹ رہی ہے مصدر مفعول کی طرف مضاف ہوگا۔ ابن عطیہ نے کہا (2): اور عَلٰی حُبِّهٖ کا قول، کلام کے درمیان اعتراض بلیغ ہے۔

میں کہتا ہوں: اس کی مثال یہ ارشاد ہے: وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا (الدھر: 8) یہ دونوں معانی کو جامع ہے الاعتراض اور مصدر کو مفعول کی طرف مضاف کرنا۔ یعنی علی حب الطعام۔ اعتراض کی مثال یہ ہے: وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ (النساء: 124) اس کو تتمیم کہا جاتا ہے اور یہ بلاغت کی ایک قسم ہے احتراس واحتیاط کہا جاتا ہے۔ پس عَلٰی حُبِّهٖ کے قول کے ساتھ تتمیم کی اور وھو مومنٌ کے قول کے ساتھ تتمیم کی۔ اسی سے زہیر کا قول ہے:

من یلق یوماً علی عِلّاتِہ ہرماً یلق السماحة منه والندی خلقاً

اس شعر میں علی علاتہ تتمیم حسن ہے۔

اور امرء القیس نے کہا:

علی ہیکل یعطیك قبل سؤاله افانین جريٍ غیر کزّ و لا وان

اس شعر میں قبل سوالہ، تتمیم حسن ہے۔

اسی طرح عنترہ کا قول ہے:

اثنی علیّ بما علمت فاننی سهلٌ مخالفتی اذا لم أُظلم

اس شعر میں لم أُظلم، تتمیم حسن ہے۔

طرفہ نے کہا:

فسقی دیارك غیر مفسدها صوب الربيع و ديمة تهمی

اس میں غیر مفسدھا تتمیم اور احتراس ہے۔

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

ربیع بن ضبع الفزاری نے کہا:

فنیت و ما یفنی صنیعی و منطقی و کل امرئٍ الا احادیثہ فان

اس شعر میں الا احادیثہ تمیم اور احتراس ہے۔

ابو بفان نے کہا:

فأفنی الردی ارواحنا غیر ظالم وأفنی الندی اموالنا غیر عائب

اس میں غیر ظالم اور غیر عائب تمیم اور احتیاط ہے۔ شعر میں یہ کثیر ہوتا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: حُبِّهٖ کی ضمیر کا مرجع الایتاء ہے کیونکہ فعل اپنے مصدر پر دلالت کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ بِمَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَیْرًا لَّهُمْ (آل عمران: 80) یعنی بخل ان کے لئے بہتر ہے جب کوئی حاجت لاحق ہو یا فاقہ لاحق ہو تو مال کا عطا کرنا انہیں محبوب ہے(1)۔ بعض نے فرمایا: حبہ کی ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ کا اسم ہے جو مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ میں ہے۔ مقصود یہ ہے کہ انسان ان وجوہ میں خرچ کرے جبکہ وہ صحیح ہو (اس مال پر) بخیل ہو فقر کا اندیشہ ہو اور بقا کی امید رکھتا ہو۔

مسئلہ نمبر 8: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا یعنی وہ اللہ تعالیٰ اور بندوں سے کیے ہوئے وعدوں کو پورا کرتے ہیں۔

وَ الصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ، الْبَاْسَآءِ سے مراد شدت اور فقر ہے اور الضَّرَّآءِ سے مراد مرض اور اپاہج پن ہے۔ یہ حضرت ابن مسعود کا قول ہے(2)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندوں میں سے کوئی بندہ جسے میں اس کے بستر میں بیماری میں مبتلا کرتا ہوں اور وہ اپنے تیمارداروں سے شکوہ نہیں کرتا تو میں اس کے گوشت سے بہتر گوشت اور اس کے خون سے بہتر خون عطا کرتا ہوں، اگر میں اس کی روح قبض کر لیتا ہوں تو اپنی رحمت میں داخل کرتا ہوں، اگر میں اسے عافیت دیتا ہوں تو اسے عافیت دیتا ہوں جبکہ اس کا کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! اس کے گوشت سے کون سا گوشت بہتر ہے؟ فرمایا: وہ گوشت جس نے گناہ نہیں کیا ہوتا۔ عرض کی گئی: اس کے خون سے بہتر خون کون سا ہے؟ فرمایا: ایسا خون جس نے گناہ نہیں کیا الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ۔ دونوں فعلاء کے وزن پر ہیں۔ ان کا فعل نہیں ہے کیونکہ یہ اسم ہیں اور صفت نہیں ہیں وَ حِیْنَ الْبَاْسِ اس سے مراد جنگ کا وقت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ؕ وَ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ یعنی وہ اپنے امور میں سچ اور تقویٰ کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اپنے امور کو پورا کرتے ہیں۔ وہ دین میں کوشش کرنے والے ہیں یہ انتہائی تعریف اور ثناء ہے۔ صدق کا متضاد کذب ہے۔ کہا جاتا ہے: صدقوھم القتال انہوں نے قتال کی تصدیق کی۔ الصدیق جو صدق کو لازم پکڑتا ہے اور حدیث میں ہے: علیکم بالصدق فان الصدق یھدی الی البر و ان البر یھدی الی الجنۃ و ما یزال الرجل یصدق و

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

یتحری الصدق حتی یکتب عند اللہ صدیقا ☆۔ (تم پر سچ بولنا لازم ہے۔ سچ، نیکی کی طرف ہدایت دیتا ہے نیکی جنت کی طرف ہدایت دیتی ہے انسان سچ بولتا ہے اور سچ کی کوشش کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ اللہ کی بارگاہ میں سچا لکھا جاتا ہے)۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَیْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِیْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝

''اے ایمان والو! فرض کیا گیا ہے تم پر قصاص جو (ناحق) مارے جائیں۔ آزاد کے بدلے آزاد اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت۔ پس جس کو معاف کیا جائے اس کے بھائی (مقتول کے وارث) کی طرف سے کچھ چیز تو چاہیے کہ طلب کرے (مقتول کا وارث) خون بہا دستور کے مطابق اور (قاتل کو چاہیے) کہ اسے ادا کرے اچھی طرح۔ یہ رعایت ہے تمہارے رب کی طرف سے اور رحمت ہے۔ تو جس نے زیادتی کی تو اس کے لئے دردناک عذاب ہے''۔

اس میں سترہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: بخاری (1)، نسائی اور دارقطنی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: بنی اسرائیل میں صرف قصاص (بدلہ) تھا ان میں دیت نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو کہا: كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ، العفو سے مراد قتل عمد میں دیت کو قبول کرنا ہے۔ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَیْهِ بِاِحْسَانٍ وہ معروف طریقہ سے طلب کرے اور وہ احسان کے ساتھ ادا کرے۔ تَخْفِیْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌ جو تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا۔ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ جس نے دیت کی قبولیت کے بعد قتل کیا تو اس پر عذاب الیم ہے۔ یہ بخاری کے الفاظ ہیں۔ حمیدی نے ہمیں بیان کیا انہوں نے کہا: ہمیں سفیان نے بیان کیا انہوں نے کہا: ہمیں عمرو نے بیان کیا، فرمایا: میں نے مجاہد کو یہ کہتے ہوئے سنا انہوں نے کہا: میں نے حضرت ابن عباس کو یہ کہتے ہوئے سنا۔ شعبی نے اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى کے تحت فرمایا: یہ عربوں کے دو قبائل کے بارے اتری جو آپس میں لڑے تھے۔ انہوں نے کہا ہم اپنے غلام کے بدلے میں فلاں بن فلاں کو قتل کریں گے اور ہم اپنی لونڈی کے بدلے میں فلانہ بنت فلاں کو قتل کریں گے۔ اسی طرح قتادہ سے مروی ہے۔ (2)

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِصَاصُ، كُتِبَ کا معنی فُرِضَ اور اثبت ہے۔ اسی سے عمر بن

1۔ صحیح بخاری، باب یایها الذین امنوا کتب علیکم القصاص۔۔۔ الآیہ، حدیث نمبر 4138، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

ابی ربیعۃ کا قول ہے:

كتب القتل والقتال علينا　و　على الغانيات جر الذيول

ہم پر قتل اور قتال فرض کیا گیا ہے اور گانے والیوں پر دامنوں کو گھسیٹنا۔

بعض علماء نے فرمایا: کُتِبَ یہاں خبر دینا ہے اس کے متعلق جو لوح محفوظ پر رکھا گیا ہے اور جس کے متعلق فیصلہ ہو چکا ہے القصاص۔ یہ قص الاثر سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے پیچھا کرنا۔ اسی سے القاص ہے کیونکہ وہ آثار اور اخبار کی اتباع کرتا ہے۔ قص الشعر اس کے اثر کی اتباع کرنا۔ گویا قاتل قتل کے راستہ پر چلتا ہے تو اس میں اس کا پیچھا کیا جاتا ہے اور اس میں اس کے راستہ پر چلا جاتا ہے (1)۔ اسی سے ہے: فارتدا علی اثارھما قصصا، وہ اپنے قدموں کے نشانوں پر پیچھے آئے۔ بعض علماء نے فرمایا: القص کا معنی کاٹنا ہے۔ کہا جاتا ہے: قصصت مابینهما۔ اسی سے قصاص لینا ہے کیونکہ اسے اس کی مثل زخم لگایا جاتا ہے جو اس نے لگایا تھا یا اسے قتل کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: اقصّ الحاکم فلاناً من فلان و أباء ه به فامثله فامتثل به یعنی حاکم نے فلاں سے قصاص لیا۔

مسئلہ نمبر 3: قصاص کی صورت یہ ہے کہ قاتل پر فرض ہے کہ جب ولی قتل کا ارادہ کرے تو وہ اللہ تعالیٰ کے امر کو تسلیم کرے اور قصاص شرعی کی پیروی کرے اور ولی پر فرض ہے کہ وہ قاتل کو ہی قتل کرے، اس کے ولی کو قتل نہ کرے اور غیر پر تعدی نہ کرے جیسا کہ عرب تعدی کرتے تھے وہ غیر قاتل کو قتل کرتے تھے (2)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا یہی معنی ہے کہ لوگوں میں سے اللہ کی بارگاہ میں قیامت کے روز تین شخص زیادہ نافرمان ہوں گے: ایک وہ جس نے غیر قاتل کو قتل کیا، وہ جس نے حرم میں قتل کیا، وہ جس نے جاہلیت کی دشمنی کا بدلہ لیا۔ شعبی اور قتادہ وغیرہما نے کہا: اہل جاہلیت میں برائی اور شیطان کی اطاعت تھی۔ ایک قبیلہ جس میں عزت اور قوت ہوتی تھی پھر اس کا غلام قتل کیا جاتا تھا تو اس کے مقابل والے کہتے: ہم اس کے بدلے میں آزاد کو قتل کریں گے۔ جب ان کی عورت قتل ہوتی تو کہتے: ہم اس کے بدلے میں مرد کو قتل کریں گے جب ان کا کوئی کم مرتبہ شخص قتل ہوتا تو وہ کہتے: ہم اس کے بدلے میں شریف کو قتل کریں گے اور کہتے: قتل، قتل سے بچانے والا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں حد سے تجاوز کرنے سے منع کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى ۖ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ۔ اور فرمایا: وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ فصاحت و بلاغت میں ان دونوں کے کلاموں کے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔

مسئلہ نمبر 4: اس میں کوئی اختلاف نہیں قتل کا فیصلہ اولی الامر حاکم کرے گا۔ ان پر قصاص کا قائم کرنا اور حدود کا قائم کرنا فرض کیا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام مومنین کو قصاص کے ساتھ خطاب فرمایا۔ پھر تمام مسلمان تو قصاص پر جمع نہیں ہو سکتے تو انہوں نے سب کے قائم مقام سلطان کو کیا کہ وہ قصاص اور حدود کو قائم کرے۔ القصاص لازم نہیں ہے بلکہ لازم یہ ہے کہ قصاص اور دوسری حدود زیادتی تک تجاوز نہ کریں (3)۔ جب قصاص کے بدلے میں دیت یا معافی کے ساتھ مقتول کے

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً

اولیاء راضی ہو جائیں تو یہ مباح ہے۔ جیسا کہ آگے آئے گا۔

اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کُتِبَ عَلَیۡکُمُ کا معنی ہے: تم پر فرض کیا گیا اور لازم کیا گیا ہے تو پھر قصاص کیسے واجب ہوگا؟ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے جب تم ارادہ کرو جان لو کہ قصاص جھگڑے کے وقت غایت ہے۔ القتلی، قتیل کی جمع ہے اور مونث کا لفظ، جماعت کی تانیث ہے یہ ان افعال میں سے ہیں جو لوگوں پر کرھاً (ناپسندیدگی) داخل ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس بنا پر یہ الفاظ آئے ہیں جیسے جرحی، زمنی، حمقی، صرعی، غرقی، اور اس کے مشابہ الفاظ۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلۡحُرُّ بِالۡحُرِّ وَ الۡعَبۡدُ بِالۡعَبۡدِ وَ الۡاُنۡثٰی بِالۡاُنۡثٰی اس کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے۔ ایک طائفہ نے کہا یہ آیت نوع کے حکم کو بیان کر رہی ہے جب کوئی اپنی نوع کو قتل کرے۔ اس آیت سے آزاد کا حکم بیان کیا جب وہ آزاد کو قتل کرے، غلام جب غلام کو قتل کرے، عورت جب عورت کو قتل کرے، ایک نوع جب دوسری نوع کو قتل کر دے تو اس سے تعرض نہیں کیا۔ یہ آیت محکم ہے اور اس میں اجمال ہے جس کو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بیان کر رہا ہے: وَ كَتَبۡنَا عَلَیۡهِمۡ فِیۡهَاۤ اَنَّ النَّفۡسَ بِالنَّفۡسِ الخ۔ (المائدہ:45) اور نبی کریم ﷺ نے اپنی سنت سے بیان فرمایا جب ایک یہودی نے ایک عورت کو قتل کر دیا تھا(1)۔ یہ مجاہد کا قول ہے۔ یہ ابو عبید نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے یہ آیت سورۂ مائدہ کی آیت سے منسوخ ہے۔ یہ اہل عراق کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 6: کوفیوں اور ثوری نے کہا: آزاد کو غلام کے بدلے، مسلم کو ذمی کے بدلے قتل کیا جائے گا اور انہوں نے اس آیت سے استدلال کیا: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا كُتِبَ عَلَیۡكُمُ الۡقِصَاصُ فِی الۡقَتۡلٰی۔ یہ حکم عام ہے اور اس آیت سے بھی استدلال کیا ہے وَ كَتَبۡنَا عَلَیۡهِمۡ فِیۡهَاۤ اَنَّ النَّفۡسَ بِالنَّفۡسِ (المائدہ:45) وہ فرماتے ہیں: حرمت میں مسلمان اور ذمی برابر ہیں۔ جس میں قصاص ہوتا ہے وہ ہے خون کی حرمت جو ہمیشہ کے لئے ثابت ہے۔ ذمی بھی ہمیشہ محفوظ الدم ہوتا ہے اور اسی طرح مسلمان بھی۔ دونوں دارالاسلام کے اہل سے ہو گئے اور اس چیز کو یہ امر بھی ثابت کرتا ہے کہ ذمی کا مال مسلمان کے مال کے برابر ہے۔ پس خون کی مساوات کی یہ دلیل ہے کیونکہ مال کی حرمت، مالک کی حرمت کے ساتھ ہوتی ہے، امام ابوحنیفہ اور ان کے ساتھی، ثوری، ابن ابی لیلیٰ کا اتفاق ہے کہ آزاد کو غلام کے بدلے قتل کیا جائے گا جس طرح غلام کے بدلے غلام کو قتل کیا جاتا ہے۔ یہ داؤد کا قول ہے اور یہ حضرت علی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ سعید بن مسیب، قتادہ، ابراہیم نخعی اور حکم بن عیینہ کا قول ہے۔ جمہور علماء غلام کے بدلے آزاد کو قتل نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں: آیت میں تنویع و تقسیم کے لئے حکم ہے۔ ابو ثور نے کہا: جب تمام علماء کا اتفاق ہے کہ نفوس سے کم میں غلاموں اور آزاد لوگوں میں قصاص نہیں ہے تو نفوس اس کے زیادہ لائق ہیں اور جنہوں نے ان کے درمیان فرق کیا ان کے کلام میں تناقض ہے۔ اس شخص کے بارے میں اجماع ہے جو غلام کو خطاً قتل کر دے تو اس پر غلام کی قیمت واجب ہے۔ پس جس طرح غلام قتل خطا میں آزاد کے مشابہ نہیں ہے قتل عمد میں بھی مشابہ نہیں ہے۔ اسی طرح غلام سامانوں میں سے ایک سامان ہے اور بیچا جاتا ہے اور خریدا جاتا ہے اور اس میں مرضی سے تصرف کیا جاتا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، باب ما یذکر فی الاشخاص والخصومۃ بین المسلم، حدیث 2236، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پس غلام اور آزاد کے درمیان کوئی مساوات نہیں ہے اور کوئی برابری نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں: یہ اجماع صحیح ہے۔ رہا پہلا قول (جب تمام علماء کا اتفاق ہے اس کی کلام میں تناقص ہے) ابن ابی لیلیٰ اور داؤد نے نفس میں اور تمام اعضاء میں آزاد اور غلام کے درمیان قصاص کا قول کیا ہے اور داؤد نے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: المسلمون تتکافأ دماؤھم (1) (مسلمانوں کے خون برابر ہیں) اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آزاد اور غلام کی کوئی تفریق نہیں کی۔ اس کا بیان سورۃ النساء میں آئے گا۔

مسئلہ نمبر 7: جمہور علماء کا نظریہ ہے کہ مسلمان کو کافر کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: مسلمان کو کافر کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا۔ یہ بخاری نے حضرت علی بن ابی طالب سے روایت نقل کی ہے (2) اور اس کے مخالف جو حدیث ربیعہ سے روایت کی گئی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ اس میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے دن ایک مسلمان کو کافر کے بدلے قتل کیا۔ یہ حدیث اس لئے صحیح نہیں کیونکہ یہ منقطع ہے اور ابن البیلمانی کی حدیث جو حضرت ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوع مروی ہے یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ ابن البیلمانی ضعیف ہے۔ دارقطنی نے کہا: ابراہیم بن ابی یحییٰ کے علاوہ کسی نے اس کو مسند نہیں بنایا اور ابراہیم متروک الحدیث ہے۔ صحیح یہ ہے کہ عن ربیعہ عن ابن البیلمانی مرسل ہے ابن البیلمانی ضعیف الحدیث ہے۔ جب وہ حدیث کو متصل بیان کرے تب بھی اس کی حدیث حجت نہیں ہوتی تو پھر اس کی مرسل کیسے حجت ہوگی۔

میں کہتا ہوں: اس باب میں بخاری کی حدیث کے علاوہ کوئی حدیث صحیح نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے عموم کی تخصیص کرتی ہے یعنی کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِصَاصُ فِی الۡقَتۡلٰی اور النفس بالنفس کے عموم کو خاص کرتی ہے۔

مسئلہ نمبر 8: حضرت علی بن ابی طالب، حسن بن ابی حسن بصری سے روایت ہے کہ یہ آیت مذکورین کے حکم کو بیان کرتی ہے تاکہ ان کے درمیان اور ان کے درمیان جو آزاد، غلام کو قتل کردے یا غلام، آزاد کو قتل کردے یا مذکر، مونث کو قتل کر دے، مونث، مذکر کو قتل کردے فرق پر دلالت کرے۔ ان دونوں حضرات نے فرمایا: جب کوئی مرد، عورت کو قتل کردے اگر اس عورت کے اولیاء اس کو قتل کرنا چاہیں تو اس کے ورثاء کو نصف دیت دے دیں اور اگر اس عورت کے اولیاء اسے زندہ رکھنے کا ارادہ کریں تو اس سے نصف دیت لے لیں۔ اور اگر کوئی عورت مرد کو قتل کردے پھر اگر اس مرد کے اولیاء اس عورت کو قتل کرنا چاہیں تو اسے قتل کردیں اور نصف دیت لے لیں۔ ورنہ اپنے ساتھی کی دیت لے لیں اور عورت کو زندہ چھوڑ دیں (3)۔ شعبی نے حضرت علی بن... سے روایت کیا ہے اور یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ امام شعبی نے حضرت علی سے ملاقات نہیں کی تھی۔ حضرت حکم نے حضرت علی اور حضرت عبد اللہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: جب مرد، عورت کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کا قصاص ہوگا۔ یہ روایت شعبی کی حضرت علی سے روایت کے مخالف ہے۔ علماء کا اجماع ہے کہ کانا اور ایک ہاتھ جس کا شل ہو جب وہ کسی سلامت اعضاء والے کو قتل کردے تو اس کے ولی کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ کانے شخص کو قتل کردے اور نصف دیت لے لے۔ اس وجہ سے کہ اس نے دو آنکھوں والے کو قتل کیا تھا اور یہ کانا تھا اور اس نے دو ہاتھوں والے کو قتل کیا جب کہ اس کا

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی السریۃ تردعلی اھل العسکر، حدیث نمبر 2371، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب کتابۃ العلم، حدیث نمبر 108، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

ایک ہاتھ ہے۔ یہ دلیل ہے کہ نفس، نفس کا مقابل ہے بچے کا نفس بڑے کے نفس کا مقابل ہے۔

اور یہ کہنے والے کو کہا جائے گا کہ آدمی، عورت کا مقابل نہیں ہوتی اور نہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد (مسلمانوں کے خون برابر ہیں) کے تحت داخل ہے۔ پھر تم نے اس عورت کے بدلے میں مرد کو کیوں قتل کر دیا جبکہ وہ مرد کے برابر نہیں ہے؟ پھر تم نصف دیت بھی لیتے ہو۔ علماء کا اجماع ہے کہ دیت قصاص کے ساتھ جمع نہیں ہوتی۔ جب دیت قبول کی جائے گی تو خون حرام ہو جائے گا اور قصاص اٹھ جائے گا۔ پس تیرا یہ قول اس کی نہ اصل ہے نہ قیاس۔ یہ ابو عمر کا قول ہے جب آزاد غلام کو قتل کرے گا تو پھر اگر غلام کا مالک چاہے تو آزاد کو قتل کرے اور آزاد کی دیت دے دے مگر غلام (مقتول) کی قیمت منہا کر لے اگر چاہے تو آزاد کو زندہ چھوڑ دے اور غلام کی قیمت لے لے۔ یہ حضرت علی اور حضرت حسن رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اس روایت نے بھی پہلے لوگوں کا انکار کیا۔(1)

مسئلہ نمبر 9: علماء کا اجماع ہے کہ عورت کے بدلے مرد کو اور مرد کے بدلے عورت کو قتل کیا جائے گا اور جمہور علماء کسی شے کے ساتھ رجوع کا نظریہ نہیں رکھتے۔ ایک فرقہ اضافی دیتوں کا نظریہ رکھتا ہے۔ امام مالک، امام شافعی، امام احمد، اسحاق، ثوری اور ابو ثور نے کہا: اسی طرح نفس سے کم میں بھی ان کے درمیان قصاص ہوگا۔ حماد بن ابی سلیمان اور امام ابو حنیفہ نے کہا: نفس سے کم میں مرد اور عورت کے درمیان قصاص نہیں ہے۔ قصاص نفس کے بدلے نفس کا ہے ان پر حجت اس طرح پیش کی گئی ہے کہ جب نفس کے بدلے نفس ہے تو اس سے کم میں بدلہ بدرجہ اولیٰ ہوگا جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 10: ابن عربی نے کہا: لوگوں میں جہالت اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ لوگوں نے کہا: آزاد کو اپنے غلام کے بدلے قتل کیا جائے گا اور اس کے متعلق انہوں نے حسن عن سمرہ کے سلسلے سے حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو اپنے غلام کو قتل کرے گا ہم اسے قتل کریں گے (2)۔ یہ حدیث ضعیف ہے اور ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **مَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ** (اسراء: 33)۔ یہاں ولی سے مراد سردار اور مالک ہے اس کے لئے اپنے نفس پر سلطان کیسے ہوگی؟ علماء کا اتفاق ہے کہ مالک اگر خطا اپنے غلام کو قتل کر دے تو مالک سے غلام کی قیمت بیت المال کے لئے نہیں لی جائے گی۔ عمرو بن شعیب سے اپنے باپ سے انہوں نے ان کے دادا سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے جان بوجھ کر اپنے غلام کو قتل کر دیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کوڑے لگائے اور ایک سال تک اسے جلاوطن کیا مسلمانوں سے اس کا حصہ ختم کر دیا اور اس غلام کے بدلے میں اس سے قصاص نہ لیا۔(3)

اگر کہا جائے کہ جب مرد اپنی بیوی کو قتل کر دے تو پھر تم کیوں کہتے ہو کہ خاوند سے قصاص دور کرنے میں شبہ نکاح ہے کیونکہ نکاح غلامی کی ایک قسم ہے۔ یہ لیث بن سعید نے کہا ہے۔ ہم کہتے ہیں: نکاح عورت کے لئے خاوند پر منعقد ہوتا ہے، جس طرح مرد کے لئے عورت پر منعقد ہوتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ خاوند نہ تو اپنی بیوی کی بہن سے نکاح کر سکتا ہے اور نہ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ سنن ابن ماجہ۔ باب هل یقتل الحر بالعبد، حدیث نمبر 2652، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ ایضاً، حدیث نمبر 2653

چار عورتوں سے زائد سے نکاح کر سکتا ہے۔ عورت خاوند سے وطی کے حق کا مطالبہ کر سکتی ہے جس طرح مرد اس سے مطالبہ کر سکتا ہے لیکن مرد کو عورت پر قوامت کی فضیلت حاصل ہے جو اللہ تعالیٰ نے مرد کے لئے بنائی ہے کیونکہ وہ اپنے مال سے اس پر خرچ کرتا ہے یعنی اس پر مہر اور نفقہ واجب ہوتا ہے اگر شبہ ہوگا تو دونوں طرف سے ہوگا۔

میں کہتا ہوں: یہ حدیث جس کو ابن عربی نے ضعیف کہا ہے وہ صحیح ہے۔ نسائی اور ابو داؤد نے اس کو نقل کیا ہے۔ اس کا مکمل متن یہ ہے: جو غلام کا ناک کاٹے گا ہم اس کا ناک کاٹیں گے اور جو اس کو خصی کرے گا ہم اسے خصی کریں گے۔ بخاری نے علی بن مدینی سے روایت کیا ہے کہ حسن کا سمرہ سے سماع صحیح ہے اور انہوں نے اس حدیث کو لیا ہے۔ بخاری نے کہا: میں اسی کی طرف جاتا ہوں (یعنی میرا مذہب یہی ہے) اگر یہ حدیث صحیح نہ ہوتی تو یہ دونوں امام اس کو اپنا مذہب نہ بناتے۔ تیرے یہ دونوں امام کافی ہیں۔ آزاد کو اپنے غلام کے بدلے قتل کیا جائے گا۔ نخعی اور ثوری نے ایک قول میں یہی کہا۔ بعض محدثین نے کہا: حسن نے حضرت سمرہ سے نہیں سنا سوائے عقیقہ کی حدیث کے۔ واللہ اعلم۔ غلاموں کے درمیان نفس سے کم میں قصاص کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے یہ عمر بن عبد العزیز، سالم بن عبد اللہ زہری، قران، امام مالک، امام شافعی اور ابو ثور کا قول ہے شعبی، نخعی، ثوری اور امام ابو حنیفہ نے کہا: ان کے درمیان قصاص نہیں ہے۔ ابن منذر نے کہا: پہلا قول اصح ہے۔

مسئلہ نمبر 11: دار قطنی، ابو عیسیٰ ترمذی نے سراقہ بن مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: باپ بیٹے سے قصاص لے گا اور بیٹا باپ سے قصاص لے گا۔ ابو عیسیٰ نے کہا: اس حدیث کو ہم سراقہ کی حدیث سے نہیں جانتے مگر اس طریق سے۔ اس کی سند صحیح نہیں ہے۔ اس کو اسماعیل بن عیاش سے مثنی بن صباح سے روایت کیا ہے اور مثنی حدیث میں ضعیف ہے۔ اس حدیث کو ابو خالد احمر نے حجاج سے انہوں نے عمرو بن شعیب سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے اس کے دادا سے انہوں نے حضرت عمر سے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے، یہ حدیث عمرو بن شعیب سے مرسلاً بھی مروی ہے۔ اس حدیث میں اضطراب ہے اہل علم کے نزدیک علم اس پر ہے کہ باپ جب بیٹے کو قتل کر دے گا تو اس کے بدلے میں باپ کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ جب باپ بیٹے پر تہمت لگائے گا تو اسے حد نہیں لگائی جائے گی۔ ابن منذر نے کہا: اہل علم کا اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جو جان بوجھ کر اپنے بیٹے کو قتل کرتا ہے۔ ایک جماعت نے کہا: اس پر قصاص نہیں ہے اور اس پر دیت ہے۔ یہ امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور اصحاب الرائے کا قول ہے۔ عطا اور مجاہد سے بھی یہی مروی ہے۔ امام مالک، ابن نافع، ابن عبد الحکم نے کہا: باپ کو بیٹے کے بدلے قتل کیا جائے گا۔ ابن منذر نے کہا: ہم کتاب و سنت کے ظاہر کی وجہ سے یہی کہتے ہیں: ظاہر کتاب یہ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ اور رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے المومنون تتکافأ دمائهم "مومنوں کے خون برابر ہیں" اور ہم کوئی خبر ایسی نہیں جانتے جس میں باپ کی استثناء ثابت ہو۔ اس کے متعلق ہم نے جو اخبار روایت کی ہیں وہ ثابت نہیں ہیں۔ الکیا طبری نے عثمان البتی سے حکایت کیا ہے کہ والد کو بیٹے کے بدلے میں قتل کیا جائے گا۔ قرآن میں قصاص کے متعلق عام حکم ہے۔ اس کی مثل امام مالک سے مروی ہے۔ شاید وہ قرآن کی عمومات کے مقابلہ میں اخبار احاد کو قبول نہیں کرتے۔

میں کہتا ہوں: امام مالک کے مذہب میں کوئی اختلاف نہیں کہ جب کوئی جان بوجھ کر اپنے بیٹے کو قتل کر دے مثلاً اسے لٹائے اور ذبح کر دے یا اسے باندھ دے جبکہ اس کے لئے اس میں کوئی عذر نہ ہو اور اس کے خطا کے دعوی میں کوئی شبہ نہ ہو تو اس کے بدلے میں باپ کو قتل کیا جائے گا۔ یہ ایک قول ہے۔ رہا وہ شخص جو ادب سکھانے کے لئے اسے ہتھیار سے مارے یا دبا کر اسے قتل کر دے تو اس میں دو قول ہیں: اس کو اس کے بدلے میں قتل کیا جائے گا۔ اسے قتل نہیں کیا جائے گا (1)۔ ابن عربی نے کہا: میں نے اپنے شیخ فخر الاسلام الشاشی سے سنا وہ فرما رہے تھے: باپ کو بیٹے کے بدلے میں قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ وہ اس کے وجود کا سبب تھا پس بیٹا اس کے عدم کا سبب کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ قول اسی سے باطل ہو جاتا ہے کہ جب کوئی اپنی بیٹی سے بدکاری کرے تو اسے رجم کیا جاتا ہے حالانکہ وہ اس بچی کے وجود کا سبب تھا اور یہ اس کے عدم کا سبب ہوتی ہے۔ پھر یہ کس فقہ کے تحت ہے، وہ اس کے عدم کا سبب کیوں نہ ہو۔ جب اس کے متعلق اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: والد سے بیٹے کا قصاص نہیں لیا جائے گا۔ یہ حدیث باطل ہے (2)۔ ان کے متعلق ہے کہ حضرت عمر نے بیٹے کے قاتل کے بارے میں دیت مغلظہ کا فیصلہ فرمایا اور کسی صحابی نے ان پر انکار نہیں کیا۔ تمام فقہاء نے مطلق مسئلہ کو لیا اور کہا کہ والد کو بیٹے کے بدلے میں قتل نہیں کیا جائے گا اور امام مالک نے مسئلہ کو محکمہ مفصلہ لیا اور فرمایا: اگر اس نے اس پر تلوار سونتی تو یہ حالت قتل کے قصد کا بھی احتمال رکھتی ہے اور عدم قصد کا بھی احتمال رکھتی ہے۔ ابوہ کی شفقت ایک قائم شبہ ہے۔ قتل کے قصد کے نہ ہونے کا شاہد شبہ ہے۔ پس قصاص ساقط کیا جائے گا۔ اور جب وہ اپنے بیٹے کو لٹا دے تو اس کے قصد سے پردہ اٹھ گیا پس وہ اصل کے ساتھ لاحق ہو جائے گا۔ ابن منذر نے کہا: امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور اسحاق کہتے ہیں بیٹا باپ کو قتل کر دے تو اس کے بدلے میں بیٹے کو قتل کیا جائے گا۔

مسئلہ نمبر 12: امام احمد بن حنبل نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ ایک شخص کے بدلے میں پوری جماعت کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مساوات کی شرط رکھی ہے اور جماعت اور ایک آدمی کے درمیان کوئی مساوات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ (المائدہ: 45) اس کا جواب یہ ہے کہ قصاص سے مراد آیت میں جس نے کسی کو قتل کیا ہے اسے قتل کرنا ہے۔ اس میں عربوں کا رد ہے جو اس کو قتل کرنے کا ارادہ کرتے تھے جس نے قتل کیا ہوتا تھا اور ایک کے مقابلہ میں سو کو قتل کرتے تھے، اپنی جاہ وحشمت کا اظہار اور فخر کرنے کے لئے ایسا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے عدل اور مساوات کا حکم دیا کہ جو قتل کرے صرف اسے قتل کیا جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صنعا میں ایک شخص کے بدلے میں سات شخصوں کو قتل کیا اور فرمایا: اگر اہل صنعا اس کو قتل کرنے میں شریک ہوتے تو میں سب کو قتل کر دیتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن خباب کے بدلے میں خارجیوں کو قتل کیا۔ حضرت عبداللہ بن خباب کو انہوں نے بکری کی طرح ذبح کیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر دی گئی تو آپ نے کہا: اللہ اکبر۔ آپ نے فرمایا: انہیں کہو کہ حضرت عبداللہ بن خباب کے قاتل کو ہمارے سامنے نکالو۔ انہوں نے کہا: ہم سب نے قتل کیا ہے۔ تین مرتبہ یہ کہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

2۔ سنن ابن ماجہ، باب لایقتل الوالد بولدہ، حدیث نمبر 2650، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نے اپنے اصحاب سے کہا: اس قوم کو پکڑو۔ تھوڑی ہی دیر میں حضرت علی اور ان کے ساتھیوں نے خارجیوں کو قتل کر دیا۔ یہ دونوں حدیثیں دار قطنی نے اپنی سنن میں نقل کی ہیں اور ترمذی میں حضرت ابو سعید اور حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر سارے آسمان والے اور سارے زمین والے ایک مومن کے خون میں شریک ہوں تو اللہ تعالیٰ سب کو آگ میں اوندھا گرائے گا۔ اس حدیث کے متعلق فرمایا یہ حدیث غریب ہے اگر ایک جماعت کو معلوم ہوگا کہ جب وہ ایک شخص کو قتل کریں گے تو انہیں قتل نہیں کیا جائے گا۔

اس قاعدہ کی رعایت کرنا، الفاظ کی رعایت کرنے سے اولیٰ ہے۔ ابن منذر نے کہا: زہری، حبیب بن ابی ثابت اور ابن سیرین نے کہا: دو شخصوں کو ایک کے بدلے میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ ہم نے یہ حضرت معاذ بن جبل، ابن زبیر اور عبد الملک سے روایت کیا ہے۔ ابن منذر نے کہا: یہ اصح ہے۔ جس نے ایک کے بدلے میں جماعت کو قتل کرنا مباح کیا ہے اس کے پاس کوئی حجت نہیں حالانکہ حضرت ابن زبیر سے ثابت ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 13: ائمہ نے ابو شریح کعبی سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خبردار! اے خزاعہ کے گروہ! تم نے ہذیل کا یہ شخص قتل کیا ہے اور میں اس کی دیت دینے والا ہوں۔ پس میری اس گفتگو کے بعد جس کا کوئی شخص قتل کیا جائے گا اس کے ورثا کو دو چیزوں میں اختیار ہوگا یا تو وہ دیت لے لیں یا قاتل کو قتل کریں۔ یہ ابو داؤد کے لفظ ہیں (1)۔ ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ ابو شریح خزاعی سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کا کوئی شخص قتل ہو جائے تو اسے قتل کرنے یا معاف کرنے یا دیت لینے کا اختیار ہے۔ بعض اہل علم کا یہی نظریہ ہے اور یہ امام احمد اور اسحاق کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 14: جان بوجھ کر قتل کرنے والے کے بارے میں دیت لینے میں علماء کا اختلاف ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: مقتول کے ولی کو اختیار ہے اگر چاہے تو قصاص لے لے اگر چاہے تو دیت لے لے۔ اگرچہ قاتل راضی نہ بھی ہو۔ یہ سعید بن مسیب، عطاء، حسن سے مروی ہے اس کو اشہب نے مالک سے روایت کیا ہے۔ لیث، امام اوزاعی، امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور ابو ثور نے بھی یہی فرمایا ہے۔ ان کی حجت ابو شریح کی حدیث ہے اور جو اس کے ہم معنی احادیث ہیں یہ اختلاف کی جگہ میں نص ہے۔ نیز نظر کے طریق سے اس کی رضا کے بغیر اس پر دیت لازم ہے کیونکہ اس پر فرض نفس کا احیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (النساء: 29) نہ قتل کرو اپنے نفسوں کو اور ارشاد ہے: فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ۔ یعنی جو اپنا خون ترک کر دے۔ (یہ تاویل کے مطابق) اور اس سے دیت لینے میں راضی ہو۔ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ یعنی جس نے دیت لینی ہے وہ معروف طریقہ سے مطالبہ کرے اور قاتل پر ضروری ہے کہ وہ عمدہ طریقہ سے ادا کرے۔ ٹال مٹول نہ کرے اور ادائیگی کے وقت سے تاخیر نہ کرے۔ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ہم سے پہلے لوگوں پر قصاص کے علاوہ کچھ فرض نہ تھا اس امت پر دیت کے ساتھ فضل فرمایا جبکہ مقتول کا وارث راضی ہو۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ دوسرے علماء نے فرمایا: مقتول کے ولی کے لئے صرف قصاص ہے وہ دیت نہیں لے گا مگر جب قاتل راضی ہو۔ ابن القاسم نے مالک سے یہ روایت کیا

1۔ سنن ابی داؤد، باب ولی العمد یرضی بالدیۃ، حدیث نمبر 3905، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے۔ ان کا مشہور قول یہی ہے۔ ثوری اور کوفیوں نے یہی کہا ہے۔ اور انہوں نے حضرت انس کی حدیث سے حجت پکڑی ہے جو ربیع کے واقعہ کے متعلق ہے جب اس نے ایک عورت کا دانت توڑ دیا تھا۔ اس حدیث کو ائمہ نے روایت کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قصاص کا فیصلہ فرمایا اور فرمایا: کتاب اللہ کا فیصلہ قصاص ہے، کتاب اللہ کا فیصلہ قصاص ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو اختیار نہیں دیا جس پر جنایت کی گئی تھی کہ وہ قصاص لے یا دیت لے۔ اس سے ثابت ہوا کہ کتاب اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے عمد (جان بوجھ کر جنایت کرنے) میں قصاص ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے ابو شریح کی مذکور حدیث کی وجہ سے۔ ربیع نے امام شافعی سے روایت کیا ہے، فرمایا: مجھے ابوحنیفہ بن سماک بن فضل شہابی نے بتایا، فرمایا: اور مجھے ابن ابی ذئب نے بتایا، انہوں نے مقبری سے انہوں نے ابوشریح کعبی سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے سال فرمایا: جس کا کوئی آدمی قتل ہو جائے اسے دو چیزوں میں اختیار ہے اگر پسند کرے تو دیت لے، اگر پسند کرے تو اس کے لیے قصاص (بدلہ) ہے۔ ابوحنیفہ نے کہا: میں نے ابن ابی ذئب سے کہا۔ اے ابوالحارث! تو اس پر عمل کرتا ہے۔ اس نے میرے سینہ پر ہاتھ مارا اور بلند آواز سے مجھے کہا: میں تجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کر رہا ہوں اور تو کہتا ہے: تو اس پر عمل کرتا ہے۔ ہاں میں اس پر عمل کرتا ہوں۔ یہ مجھ پر اور سننے والے پر فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں سے منتخب فرمایا اور آپ کے ذریعے ہدایت دی اور آپ کے ہاتھوں پر ہدایت دی اور لوگوں کے لئے وہ پسند کیا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے پسند کیا اور آپ کی زبان پر پسند کیا۔ مخلوق پر لازم ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی سے یا ذلیل ہو کر اطاعت کریں۔ مسلمان کے لئے اس سے خروج کا کوئی ذریعہ نہیں۔ ابوحنیفہ نے کہا: ابن ابی ذئب مجھ سے خاموش نہ ہوئے حتیٰ کہ میں نے خواہش کی کہ وہ خاموش ہو جائیں۔

مسئلہ نمبر 15: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ۔

مَنْ اور عفی کی تاویلات میں پانچ اقوال ہیں:

۱- مَنْ سے مراد قاتل ہے اور عُفِيَ۔ عافیا کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے اور وہ مقتول کا ولی ہے۔ اخیہ سے مراد مقتول ہے اور شیءٌ سے مراد وہ خون ہے جو اس کو معاف کیا گیا ہے اور دیت لینے کی طرف رجوع کیا گیا ہے۔ یہ حضرت ابن عباس، قتادہ، مجاہد اور علماء کی ایک جماعت کا قول ہے اور العفو اس قول میں اپنے معنی پر ہے اور وہ ہے: ترک کرنا۔ معنی یہ ہے کہ قاتل کو جب مقتول کا ولی خون معاف کر دے اور قصاص ساقط کر دے تو وہ دیت لے، وہ معروف طریقہ سے مطالبہ کرے اور قاتل اچھے طریقہ سے دیت ادا کرے۔

۲- یہ امام مالک کا قول ہے۔ مَنْ سے مراد ولی ہے اور عُفِيَ کا معنی آسانی کرنا ہے یہ العفو کے معنی میں نہیں ہے اور اخیہ سے مراد قاتل ہے اور شیء سے مراد دیت ہے یعنی ولی جب قصاص معاف کر کے دیت لینے کی طرف مائل ہو تو قاتل کو اختیار ہے کہ وہ اسے دیت دے یا اپنا آپ حوالے کر دے۔ ایک مرتبہ اس پر آسانی کی گئی ہے اور ایک مرتبہ آسانی نہیں کی گئی۔ امام مالک کے علاوہ علماء فرماتے ہیں: جب اولیاء دیت پر راضی ہوں تو قاتل کو کوئی اختیار نہیں بلکہ اس پر دیت لازم ہے۔ امام مالک سے یہ قول

بھی مروی ہے ان کے اصحاب میں سے اکثر نے اس کو ترجیح دی ہے(1)۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: عُفِیَ کا معنی بُذِلَ ہے، خرچ کیا گیا اور العفو کا لغوی معنی بذل ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خذ العفو وہ لو جو آسان ہو۔ ابوالاسود الدؤلی نے کہا:

خذی العفو منی تستدیمی مودتی

تو مجھ سے جو آسان ہے وہ لے تو میری محبت کو ہمیشہ پائے گی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نماز کا پہلا وقت اللہ کی رضا ہے اور اس کا آخری وقت اللہ کی معافی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر گواہی دی۔ گویا فرمایا: دیت میں سے جو خرچ کیا گیا ہو وہ اسے قبول کرے اور معروف طریقہ سے مطالبہ کرے اور ایک قوم نے کہا: قاتل اسے اچھے طریقہ سے ادا کرے۔ اللہ تعالیٰ نے مال لینے کو کہا جب قاتل کی جہت سے یہ آسان ہو اور بتایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے جیسا کہ سورہ مائدہ میں قصاص کے ذکر کے بعد فرمایا فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ (المائدہ: 45) پس عفو اور صدقہ کی رحمت کی طرف بلایا۔ اسی طرح اس آیت میں دیت کے قبول کرنے کی طرف راہنمائی فرمائی جبکہ مجرم دیت ادا کرے۔ پھر ولی کو عمدہ طریقہ سے مطالبہ کرنے اور قاتل کو اچھے طریقہ سے ادا کرنے کا حکم دیا۔

ایک قوم نے کہا: یہ الفاظ ان کے بارے میں ہیں جن کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی اور جن کے درمیان برابری ہے ان کے درمیان دیتوں کو ساقط کر دیا۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ ان دیات میں سے کسی اعتبار سے دونوں طائفوں میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت ہو۔ اس صورت میں عُفِیَ بمعنی فُضِلَ (فضیلت دیا گیا) ہوگا۔

سفیان بن حسین بن شوعہ نے شعبی سے روایت کیا ہے، فرمایا: عربوں کے دو قبیلوں کے درمیان جنگ ہوئی تھی۔ ایک قبیلہ سے کچھ لوگ قتل ہوئے اور دوسرے قبیلہ سے بھی کچھ لوگ قتل ہوئے۔ ایک قبیلہ والوں نے کہا: ہم راضی نہ ہوں گے حتیٰ کہ عورت کے بدلے میں مرد کو قتل کیا جائے گا اور مرد کے بدلے عورت کو قتل کیا جائے گا۔ پس وہ اپنا معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب مقتول برابر ہیں۔ پس انہوں نے دیات پر صلح کی۔ ایک قبیلہ کو دوسرے قبیلہ پر زیادتی دی گئی۔ کتب سے فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ تک یہی مراد ہے یعنی جس کی اپنے بھائی پر دیت زائد ہو تو وہ اسے معروف طریقہ سے ادا کرے۔ شعبی نے آیت کے نزول کے سبب کے بارے میں بتایا اور سفیان نے یہاں عفو کا معنی زیادہ ذکر کیا ہے اور لفظ اس معنی کا احتمال رکھتا ہے۔

پانچویں تاویل- یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حسن کا قول ہے۔ مرد اور عورت کی دیت اور آزاد اور غلام کی دیت میں فرق ہے یعنی جس کے لئے دیت زیادہ ہو وہ معروف طریقہ سے طلب کرے۔ اس قول میں بھی عُفِیَ بمعنی فضل ہے۔(2)

مسئلہ نمبر 16: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دیت کا مطالبہ کرنے والے کو حسن تقاضا پر ابھارا ہے اور ادا کرنے والے کو بھی عمدہ طریقہ سے ادا کرنے پر ابھارا ہے(3)۔ کیا یہ وجوب پر ہے یا استحباب پر؟ رفع کی قراءت وجوب پر دلالت کرتی ہے کیونکہ معنی ہے فعلیہ اتباع المعروف یعنی اس پر واجب ہے کہ وہ عمدہ طریقہ سے مطالبہ کرے۔ نحاس نے کہا فَمَنْ

1۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

عُفِيَ لَهٗ شرط ہے اور فَاتِّبَاعٌ جزا ہے اس کو مبتدا کی حیثیت سے رفع دیا گیا ہے۔ تقدیر اس طرح ہے فعلیه اتباع بالمعروف اور غیر قرآن میں فاتباعاً و اداءٌ بھی جائز ہے یعنی دونوں کو مصدر بنایا جائے۔ ابن عطیہ نے کہا (1): ابراہیم بن ابی عبلہ نے فاتباعاً نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ رفع، واجبات کے لئے ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فامساک بمعروف۔ رہا مندوب تو وہ منصوب آتا ہے جیسے فضربَ الرقاب۔

مسئلہ نمبر 17: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ اہل تورات کے لئے صرف قتل کرنا تھا ان کے لئے اور کوئی صورت نہ تھی اور اہل انجیل کے لئے عفو تھا ان کے لئے قصاص اور دیت نہ تھی۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے تخفیف فرمائی پس جو چاہے قتل کرے اور جو چاہے دیت لے لے اور جو چاہے معاف کر دے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ یہ شرط اور جواب ہے یعنی دیت لینے کے بعد اور خون معاف کرنے کے بعد زیادتی کی تو اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔ حسن نے کہا: زمانہ جاہلیت میں جب کوئی شخص کسی کو قتل کرتا تو وہ اپنی قوم کی طرف بھاگ جاتا پھر اس کی قوم دیت کے ساتھ صلح کرتی اور مقتول کا ولی کہتا میں دیت قبول کرتا ہوں حتی کہ قاتل امن میں ہو جاتا اور وہ باہر نکلتا تو اسے قتل کر دیتا اور پھر دیت انہیں واپس کر دی جاتی۔

علماء کا اختلاف ہے کہ جس نے دیت لینے کے بعد قاتل کو قتل کیا۔ ایک جماعت نے کہا جن میں امام مالک اور امام شافعی بھی ہیں: وہ ابتداءً قتل کرنے والے کی طرح ہے۔ اگر اس کا ولی چاہے تو اسے قتل کر دے اگر چاہے تو معاف کر دے اور آخرت میں اس کے لئے عذاب ہوگا۔ حضرات قتادہ، عکرمہ اور سدی نے کہا: اس کا عذاب یہ ہے کہ اسے یقیناً قتل کیا جائے گا۔ حاکم ولی کو معاف کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ ابوداؤد نے حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس سے دیت لینے کے بعد قتل کیا اس کا مال زیادہ نہ ہو۔ حسن نے کہا: اس کا عذاب یہ ہے کہ صرف دیت لوٹائی جائے گی اور قتل کا گناہ آخرت کے عذاب تک اس پر رہے گا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کہا: اس کا معاملہ امام کے سپرد ہے جو دیکھے وہ کرے۔ سنن دارقطنی میں ابوشریح خزاعی سے مروی ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جس کو خون کی مصیبت پہنچائی گئی یا لنگڑا کر دیا گیا تو اسے تین باتوں میں اختیار ہے اگر وہ چوتھی کا ارادہ کرے تو اس کے ہاتھوں کو پکڑ لو۔ وہ قصاص لے۔ یا معاف کر دے یا دیت لے۔ اگر ان چیزوں میں سے جو قبول کر لی پھر اس کے بعد اس نے تجاوز کیا تو اس کے لئے دوزخ کا عذاب ہے وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

''اور تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے اے عقلمندو! تاکہ تم (قتل کرنے سے) پرہیز کرنے لگو''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ یہ بلیغ مگر مختصر کلام ہے۔ اس کا معنی ہے: بعض بعض کو

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

قتل نہ کریں۔ یہ سفیان نے سدی سے انہوں نے ابو مالک سے روایت کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قصاص جب قائم کیا جائے گا اور حکم قاتل میں ثابت ہو جائے گا تو وہ دوسرے کے قتل کے ارادہ سے باز رہے گا اس خوف سے کہ اس سے قصاص لیا جائے گا۔ پس اس سے وہ دونوں زندہ رہیں گے۔ عرب میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی شخص دوسرے کو قتل کرتا تھا تو دونوں کے قبیلے گرم ہو جاتے اور آپس میں جنگ کرتے اور یہ چیز بہت زیادہ لوگوں کے قتل کا باعث بنتی جب اللہ تعالیٰ نے قصاص مشروع فرمایا تو تمام اس پر قناعت کرنے والے ہو گئے اور جنگ ترک کر دی، پس ان کے لئے اس میں زندگی ہے۔(1)

مسئلہ نمبر 2: ائمہ فتویٰ کا اتفاق ہے کہ کسی کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ سلطان کے بغیر خود اپنے حق میں قصاص لے۔ لوگوں کے لئے ایک دوسرے سے قصاص لینا جائز نہیں۔ یہ کام سلطان کے سپرد ہے یا اس کے سپرد ہے جس کو سلطان مقرر کرے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے سلطان بنایا تا کہ وہ لوگوں کے ہاتھوں کو روکے۔

مسئلہ نمبر 3: علماء کا اجماع ہے کہ سلطان سے بھی قصاص لیا جائے گا اگر وہ اپنی رعیت میں سے کسی پر تعدی کرے گا۔ کیونکہ سلطان بھی ان میں سے ایک ہے، اسے لوگوں کی دیکھ بھال کی فضیلت ہے جیسے وصی اور وکیل ہوتا ہے۔ یہ چیز قصاص سے مانع نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام میں حاکم اور عام لوگوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى (البقرہ:178) حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ آپ نے اس شخص سے کہا جس نے شکایت کی تھی کہ عامل نے اس کا ہاتھ کاٹ دیا ہے، میں تیرا اس سے قصاص لوں گا اگر تو سچا ہوگا۔ نسائی نے حضرت ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی چیز تقسیم فرما رہے تھے۔ ایک شخص آپ کے اوپر جھکا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کی اس چھڑی سے چوک دی جو آپ کے پاس تھی، وہ شخص چیخا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: ادھر آ اور اپنا بدلہ لے لے۔ اس شخص نے کہا: یا رسول اللہ! میں نے معاف کیا۔ ابو داؤد طیالسی نے ابو فراس سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت عمر بن خطاب نے خطبہ دیا اور کہا: خبردار! امیر جس پر ظلم کرے وہ اپنا مقدمہ میرے پاس لے آئے تو میں اس کا اس امیر سے قصاص لوں گا۔ حضرت عمرو بن عاص کھڑے ہوئے اور کہا: اے امیر المومنین! اگر ہم میں سے کوئی اپنی رعیت میں سے کسی کو تادیب کرے تو آپ اس سے قصاص لیں گے؟ حضرت عمر نے کہا: میں اس سے قصاص کیسے نہیں لوں گا؟ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا آپ اپنے نفس سے لوگوں کو قصاص لیتے دیتے۔ ابو داؤد سجستانی کے لفظ یہ ہیں، فرمایا: ہمیں حضرت عمر بن خطاب نے خطاب فرمایا اور فرمایا: میں نے اپنے عمال اس لئے نہیں بھیجے کہ وہ تمہارے چمڑوں پر ضربیں لگائیں اور نہ اس لئے بھیجے کہ وہ تم سے تمہارے اموال لیں۔ جو کسی کے ساتھ ایسا کرے وہ اپنا مقدمہ میرے پاس لے آئے میں اس سے قصاص لوں گا اس کے ہم معنی حدیث ذکر کی۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ یہاں مراد ہے تم قتل سے بچ جاؤ اور قصاص سے سلامت رہو پھر یہ تقویٰ کی دوسری اقسام کی طرف داعی ہوگا۔ اللہ اطاعت پر اطاعت کے ساتھ ثواب دیتا

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

ہے۔ ابوالجوزاء اوس بن عبداللہ الربعی نے ولکم فی القصص حیاۃ پڑھا ہے (1)۔ نحاس نے کہا: ابوالجوزاء کی قراءت شاذہ ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: یہ بھی احتمال ہے کہ یہ قصاص کی طرح مصدر ہو (2)۔ بعض نے فرمایا: القصص سے مراد قرآن ہے یعنی تمہارے لئے کتاب اللہ میں حیات ہے جس میں قصص کو بیان کیا گیا ہے۔ حیاۃ سے مراد نجات ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۚ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۞

''فرض کیا گیا ہے تم پر جب قریب آ جائے تم میں سے کسی کو موت بشرطیکہ چھوڑے کچھ مال کہ وصیت کرے اپنے ماں باپ کے لئے اور قریبی رشتہ داروں کے لئے انصاف کے ساتھ۔ ایسا کرنا ضروری ہے پرہیزگاروں پر''۔

اس میں اکیس مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمْ آیت وصیت ہے۔ قرآن میں اور وصیت کا کہیں ذکر نہیں ہے مگر اس آیت میں اور سورہ النساء میں من بعد وصیۃ اور سورہ مائدہ میں حین الوصیۃ اور جو سورہ بقرہ میں ہے وہ اتم اور اکمل ہے یہ فرائض اور مواریث کے نزول سے پہلے نازل ہوئی۔ جیسا کہ آگے بیان آئے گا۔ کلام میں واو عطف کی تقدیر ہے۔ یعنی و کتب علیکم۔ جب کلام طویل ہوگئی تو واو ساقط کر دی گئی اور اس کی مثل بعض اقوال میں ہے: لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى ۙ الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۞ (اللیل)۔ یعنی والذی۔ یہاں بھی واو کو حذف کیا گیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جب ذکر کیا کہ مقتول کے ولی کے لئے قصاص لینا ہے پس جس سے قصاص لیا جاتا ہے وہ قصاص اس کی موت کا سبب ہے گویا موت اس پر حاضر ہے اور یہ وصیت کا وقت ہے اس آیت کا تعلق ماقبل آیت سے ہے اسی وجہ سے واو عطف ساقط ہوگئی ہے۔ كُتِبَ کا معنی فرض اور اثبت ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ حضور الموت سے مراد موت کے اسباب کا آنا ہے اور جب سبب موجود ہو تو عرب اسے مسبب سے تعبیر کر دیتے ہیں۔ شاعر نے کہا:

یایہا الراکب المزجی مطیتہ سائل بنی اسد ما ھذہ الصوت

و قل لھم بادروا بالعذر والتمسوا قولا یبرئکم انی انا الموت

اے سوار! جو اپنی سواری کو آہستہ آہستہ چلانے والا ہے بنی اسد سے پوچھ یہ آواز کیسی ہے۔ اور انہیں کہو کہ عذر پیش کرنے میں جلدی کرو اور کوئی ایسی بات تلاش کرو جو تمہیں بری کر دے کہ میں (تمہارے لئے) موت بنوں۔

عنترہ نے کہا:

وان الموت طوع یدی اذا ما وصلت بنانہا بالھندوان

موت میرے ہاتھوں کی خوشی ہے جب ان کے پورے ہندوان تک پہنچ جائیں۔

جریر نے فرزدق کی ہجو میں کہا:

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

انا الموت الذی حدثت عنه فلیس لهارب منی نجاء

وہ موت جس کے متعلق میں نے بتایا، مجھ سے بھاگنے والے کے لئے نجات نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اگر کہا جائے کہ کُتِبَ فرمایا، اور۔ کتبت نہیں فرمایا، حالانکہ وصیت مؤنث ہے۔ کہا جائے گا کہ یہاں وصیت سے مراد الایصاء ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: فعل اور فاعل کے درمیان فاصلہ ہے اور فاصل تاء تانیث کے عوض کی طرح ہے۔ عرب کہتے ہیں: حضر القاضی الیوم امرأۃ یہاں بھی فاصلہ کی وجہ سے فعل مذکر اور فاعل مؤنث ہے۔ سیبویہ نے حکایت کیا ہے: قام امرأۃ لیکن اس "کتب" فعل کے مذکر لانے کا حسن، حائل کے طول کے ساتھ ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۚ، اِنْ شرط ہے اس کے جواب میں ابو الحسن اور اخفش کے دو قول ہیں: اخفش نے کہا: تقدیر فالوصیۃ ہے پھر فاء کو حذف کیا گیا۔ جیسے شاعر نے کہا:

من یفعل الحسنات الله یشکرها والشر بالشر عندالله مثلان

جو نیکیاں کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی قدر دانی فرماتا ہے اور اللہ کے نزدیک شر کے بدلے شر برابر ہے۔

دوسرا جواب: ماضی کا جواب اس سے پہلے اور اس کے بعد ہونا جائز ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: الوصیۃ للوالدین والاقربین ان ترك خیراً۔ اگر تو فاء کو مقدر مانے گا تو الوصیۃ کو رفع ابتدا کی وجہ سے ہوگا۔ اگر فاء کو مقدر نہیں مانے گا تو اس کو ابتداء کی وجہ سے رفع دینا جائز ہے اور نائب الفاعل کی حیثیت سے رفع دینا بھی جائز ہے۔ یعنی کتب علیکم الوصیۃُ۔ جمہور نحویوں کے نزدیک الوصیۃ کا اذا میں عمل کرنا صحیح نہیں کیونکہ وہ مصدر کے صلہ کے حکم میں ہے جو الوصیۃ ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور اس کا اپنے سے پہلے میں عمل کرنا جائز نہیں اور یہ جائز ہے کہ اذا میں عامل کتب ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایجاب کا تمہاری طرف متوجہ ہونا اور کتاب کے مقتضیٰ کا متوجہ ہونا ہے جب موت حاضر ہو۔ ایجاب کی توجہ کو کتب سے تعبیر فرمایا تاکہ اس معنی کی طرف منظم ہو جائے کہ یہ حکم ازل میں لکھا گیا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ اذا میں عامل الایصاء مقدر ہو جو وصیت پر دلالت کر رہا ہو۔ معنی ہوگا: کتب علیکم الایصاء اذا۔ (1)

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: خَيْرًا ۚ اس آیت میں خیر سے مراد مال ہے اور اس کی مقدار میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد مال کثیر ہے۔ یہ حضرت علی، حضرت عائشہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ انہوں نے سات سو دینار میں بھی فرمایا کہ یہ قلیل ہے۔ قتادہ نے حسن سے روایت کیا ہے الخیر سے مراد ہزار دینار اور اس سے زائد مال ہے۔ شعبی نے کہا: پانچ سو دینار سے ہزار تک ہے (2)۔ الوصیۃ ہر اس چیز سے عبارت ہے جس کے کرنے کا حکم دیا جاتا ہے اور زندگی میں اور موت کے بعد اس کا خیال کیا جاتا ہے۔ عرف نے اس کو اس کے ساتھ خاص کر دیا ہے جس کے کرنے کا عہد کیا جاتا ہے اور مرنے کے بعد اس کو نافذ کیا جاتا ہے۔ وصیۃ کی جمع وصایا ہے جیسے قضیۃ کی جمع قضایا ہے۔ الوصی وصیت کرنے والا ہوتا ہے اور جس کو وصیت کی جاتی ہے اس کی اصل وَصَیٰ سے ہے۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

تواصی النبت تواصیاً، جب کھیتی متصل ہو۔ ارض واصیۃ، جس کی کھیتی متصل ہو۔ اوصیت لہ بشیء و اوصیت ایہ، جب تو کسی کو اپنا وصی مقرر کرے۔ اس کا اسم الوِصایۃ اور الوَصایۃ ہے یعنی واؤ کے کسرہ اور فتحہ کے ساتھ۔ اوصیتہ و وصیتہ توصیۃ ہم معنی ہیں، اسم، الوصاۃ ہے۔ تواصی القوم اوصٰی بعضھم بعضاً۔ بعض نے بعض کو وصیت کی۔ حدیث پاک میں ہے: استوصوا بالنساء خیراً فانھن عوان عندکم (1)۔ عورتوں کے متعلق خیر کی وصیت قبول کرو وہ تمہارے پاس قیدی ہیں۔ وصیت الشیٔ بکذا جب تو کسی چیز کو دوسری چیز سے ملا دے۔

مسئلہ نمبر 5: علماء کا وصیت کے وجوب میں اختلاف ہے جو مال چھوڑ جائے اور اس پر اجماع ہے کہ جس پر ودیعتیں ہوں اور جس پر قرض ہو اس کا وصیت کرنا واجب ہے۔ اکثر علماء فرماتے ہیں: وصیت اس پر واجب نہیں ہے جس پر ودیعت اور قرض وغیرہ نہ ہوں، یہ امام مالک، امام شافعی اور ثوری کا قول ہے خواہ وصیت کرنے والا امیر ہو یا فقیر ہو۔ ایک طائفہ نے کہا: ظاہر قرآن کے مطابق وصیت واجب ہے، یہ زہری اور ابو مجلز کا قول ہے (2) مال تھوڑا ہو یا زیادہ ہو۔ ابو ثور نے کہا: وصیت واجب نہیں ہے مگر اس پر جس پر قرض ہو یا اس کے پاس کسی قوم کا مال ہو۔ اس پر واجب ہے کہ وہ اپنی وصیت کو لکھے اور جو کچھ اس پر کسی کا حق ہے اس کے متعلق بتائے۔ رہا وہ جس پر نہ قرض ہے اور نہ ودیعت ہے، اس پر وصیت کرنا واجب نہیں مگر وہ چاہے تو۔ ابن منذر نے کہا: یہ بہتر ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے امانات کی ادائیگی فرض کی ہے اور جس پر کوئی حق نہیں ہے اور کوئی امانت نہیں ہے اس پر وصیت کرنا واجب نہیں ہے۔ پہلے نظریہ کے حاملین نے اس حدیث سے حجت پکڑی ہے جو ائمہ نے حضرت ابن عمر سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی مسلمان کا حق نہیں کہ اس کے لئے کوئی چیز ہو جس کے متعلق وہ وصیت کرنا چاہتا ہو وہ دو راتیں گزارے مگر اس کی وصیت لکھی ہوئی ہو۔ ایک روایت میں ہے، وہ تین راتیں گزارے۔ اس کے متعلق حضرت عبداللہ بن عمر نے فرمایا: جب سے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے مجھ پر ایک رات بھی نہیں گزری مگر میرے پاس میری وصیت (لکھی ہوئی) ہے اور جن علماء نے وصیت کو واجب نہیں کہا انہوں نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ اگر وصیت واجب ہوتی تو اس کو وصیت کرنے والے کے ارادہ پر نہ چھوڑا جاتا، اس پر ہر حال میں وصیت کرنا لازم ہوتا۔ پھر اگر تسلیم کیا جائے کہ اس کا ظاہر وجوب ہے تو وجوب کا قول اسے رد کرتا ہے۔ یہ اس کے متعلق ہے جس پر لوگوں کے حقوق ہوں ان کے ضیاع کا خوف ہوگا جیسا کہ ابو ثور نے کہا۔ اسی طرح جس کے لئے لوگوں کے پاس حقوق ہوں گے ورثۃ پر اس کے تلف ہونے کا خوف ہوگا، اس صورت میں اس پر وصیت کرنا واجب ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: كُتِبَ عَلَيْكُمْ، كُتِبَ بمعنی فرض ہے تو یہ وصیت کے وجوب کی دلیل ہے۔ اس کے متعلق جواب پہلے گزر چکا ہے۔ اس کا معنی ہے: جب تم وصیت کا ارادہ کرو۔ نخعی نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا اور وصیت نہیں کی اور حضرت ابوبکر نے وصیت کی۔ اگر وصیت کرے تو یہ اچھا ہے اگر وصیت نہ کرے تو اس پر کچھ نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جس مال سے وصیت کرنی ہے اس کی مقدار بیان نہیں کی۔ فرمایا: اِنْ

1۔ سنن ابن ماجہ باب حق المرأۃ علی الزوج، حدیث نمبر 1840، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

تَرَكَ خَيْرًا، الخیر سے مراد مال ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ (البقرہ: 272) وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ (العادیات: 8) ان آیات میں خیر سے مراد مال ہے۔ اس کی مقدار میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے پانچویں حصہ کی وصیت کی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا مسلمانوں کے مال غنیمت سے خمس (پانچویں حصہ) ہے۔

معمر نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر نے چوتھائی کی وصیت کی، یہ بخاری نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے (1) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: میرے نزدیک خمس کی وصیت کرنا چوتھائی وصیت کرنے سے زیادہ محبوب ہے اور چوتھائی وصیت کرنا ثلث وصیت کرنے سے زیادہ محبوب ہے۔

علماء کی ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ جس کا مال تھوڑا ہو اور اس کے ورثاء ہوں تو اس کے لئے وصیت نہ کرنا بہتر ہے۔ یہ حضرت علی، حضرت ابن عباس اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ ابن ابی شیبہ نے ابن ابی ملیکہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ ابن ابی ملیکہ نے حضرت عائشہ سے کہا: میں وصیت کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت عائشہ نے کہا: تمہارا کتنا مال ہے؟ اس نے کہا: تین ہزار۔ حضرت عائشہ نے پوچھا: تمہارے عیال کتنے ہیں؟ اس نے کہا: چار۔ حضرت عائشہ نے کہا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنْ تَرَكَ خَيْرًا اور یہ تمہارا مال تھوڑا ہے۔ یہ اپنے عیال کے لئے چھوڑ دے کیونکہ تیرے لئے یہی افضل ہے۔

مسئلہ نمبر 7: جمہور علماء کا خیال ہے کہ کسی کے لئے ثلث سے زیادہ کی وصیت کرنا جائز نہیں مگر امام ابوحنیفہ اور اس کے ساتھیوں کا خیال ہے کہ موصی اگر ورثاء نہ چھوڑے تو اس کے لئے پورے مال کی وصیت کرنا جائز ہے۔ احناف فرماتے ہیں: وصیت میں ثلث پر اکتفا اس لئے ہے کہ ورثاء کو اغنیاء چھوڑے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے تیرا اپنے ورثاء کو غنی چھوڑنا ان کو فقیر چھوڑنے سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں۔ اس حدیث کو ائمہ نے روایت کیا ہے (2)۔ اور جس کا وارث نہ ہو وہ اس حدیث میں مراد نہیں ہے۔ یہ قول حضرت ابن عباس سے بھی مروی ہے۔ ابوعبیدہ اور مسروق کا بھی یہی قول ہے۔ اسحاق اور امام مالک کا بھی ایک قول یہی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہی مروی ہے۔ اختلاف کا سبب ہم نے پہلے ذکر کر دیا ہے۔ بیت المال میں اختلاف ہے کہ کیا وہ وارث ہے یا حافظ ہے اس مال کا جو اس میں رکھا جائے۔ اس میں دو قول ہیں۔

مسئلہ نمبر 8: علماء کا اجماع ہے کہ جو فوت ہو جائے اور اس کے ورثاء ہوں تو اس کے لئے تمام مال کی وصیت کرنا جائز نہیں۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انہوں نے اپنے بیٹے عبداللہ کو فرمایا: جب ان کی موت کا وقت قریب آیا کہ میں وصیت کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت عبداللہ نے کہا: آپ وصیت فرمائیں، آپ کا مال میرے مال میں ہے۔ حضرت عمرو نے کاتب کو بلایا اور اسے وصیت لکھوائی۔ حضرت عبداللہ نے کہا میں نے انہیں کہا میں نہیں دیکھتا ہوں مگر یہ کہ آپ نے میرے اور اپنے مال کی وصیت کر دی ہے اگر میں اپنے بھائیوں کو بلاؤں تو ان سے یہ حلال کروالوں۔

1۔ صحیح بخاری، الوصیۃ بالثلث، حدیث نمبر 2538، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب قول النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اللھم امض لاصحابی ھجرتھم ومرثیتہ لمن مات مکۃ، حدیث 3643، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مسئلہ نمبر 9: علماء کا اجماع ہے کہ انسان کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی وصیت میں تبدیلی کرے اور اس میں سے جتنا چاہے رجوع کرے مگر مدبر غلام کے بارے میں اختلاف ہے۔

امام مالک نے فرمایا: ہمارے نزدیک اس پر اجماع ہے کہ وصیت کرنے والا حالت صحت میں یا حالت مرض میں ایک وصیت کرے جس میں غلاموں میں سے کسی غلام کو آزاد کرنا ہو یا اس کے علاوہ کوئی امر ہو تو جو چاہے اس میں تبدیلی کرے اور جو چاہے اس میں عمل کرے حتیٰ کہ وہ فوت ہو جائے۔ اگر وہ اس وصیت کو ختم کرنا چاہے تو ایسا کر سکتا ہے مگر یہ کہ اس کے غلام کو مدبر بنایا جائے اگر غلام کو مدبر بنائے تو اس میں اس کو تبدیلی کا کوئی اختیار نہیں۔ یہ اس لئے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی مسلمان کا حق نہیں کہ اس کے لئے کوئی چیز ہو جس میں وہ وصیت کرنا چاہتا ہو تو وہ دو راتیں گزارے مگر یہ کہ اس کی وصیت اس کے پاس لکھی ہوئی ہو۔ ابوالفرج مالکی نے کہا: قیاس میں مدبر بھی ایک مہینہ تک آزاد کئے جانے والے غلام کی طرح ہے موت لامحالہ آنے والی ہے اور علماء کا اجماع ہے کہ وہ مدت تک آزاد کرنے اور عتق کی قسم جو ایک مدت تک اس۔ نے اٹھائی ہے اس میں رجوع نہیں کر سکتا اسی طرح مدبر بھی ہے۔ امام ابوحنیفہ کا بھی یہی قول ہے امام شافعی، احمد اور اسحاق نے کہا: یہ وصیت ہے اور یہ بھی ثلث میں ہوگا جس طرح دوسرے وصایا کا حکم ہے اور مدبرہ (لونڈی) سے ان کا وطی کی اجازت دینا ان کے مدبر کو ایک مدت تک عتق پر قیاس کرنے کو توڑتا ہے ... حالانکہ یہ ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدبر غلام کو فروخت کیا(1)۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنی لونڈی کو مدبرہ بنایا پھر اسے فروخت کیا یہ تابعین کی ایک جماعت کا قول ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: انسان اپنی وصیت میں جو چاہے تبدیلی کر سکتا ہے مگر آزادی میں تبدیلی نہیں کر سکتا۔ اسی طرح شعبی، ابن سیرین، ابن شُبرمہ اور نخعی نے کہا ہے۔ یہ سفیان ثوری کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 10: اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ جو اپنے غلام کو کہتا ہے: تو میرے مرنے کے بعد آزاد ہے اور وصیت کا ارادہ کیا تو امام مالک کے نزدیک اس کو رجوع کا حق ہے اور اگر کہا: فلاں میری موت کے بعد مدبر ہے تو اس میں اس کے رجوع کا حق نہیں ہے اور اگر پہلے قول سے تدبیر کا ارادہ کیا ہوگا تو اسے اکثر اصحاب مالک کے نزدیک رجوع کا حق نہ ہوگا۔ امام شافعی، احمد، اسحاق کے نزدیک یہ وصیت ہے کیونکہ یہ ثلث میں ہے اور جو ثلث میں ہو وہ وصیت ہے مگر امام شافعی نے کہا: مدبر میں رجوع نہیں مگر یہ کہ اسے فروخت کرے یا ہبہ کے ساتھ اپنی ملکیت سے نکال دے۔ اور صرف یہ کہنا (میں نے رجوع کیا) رجوع نہیں ہے اور اگر مدبر کو اپنی ملکیت سے نہ نکالا حتیٰ کہ وہ فوت ہو گیا تو اس کے مرنے کے ساتھ غلام آزاد ہو جائے گا۔ امام شافعی کا پہلا قول یہ ہے کہ وہ مدبر میں اسی طرح رجوع کر سکتا ہے جس طرح وصیت میں رجوع کر سکتا ہے۔ مزنی نے اس کو اختیار فرمایا۔ انہوں نے علماء کی اس بات کے اجماع پر قیاس کیا ہے کہ جو عتق کی وصیت کرے وہ رجوع کر سکتا ہے۔ ابوثور نے کہا: اگر اس نے کہا: میں نے اپنے مدبر میں رجوع کیا تو اس کی تدبیر باطل ہو گئی اگر وہ مر گیا تو غلام آزاد نہ ہوگا۔ ابن القاسم اور اشہب نے اس شخص کے بارے میں کہا جس نے کہا: میرا غلام میرے مرنے کے بعد آزاد ہے اور اس نے اس قول سے وصیت اور

1۔ صحیح بخاری، بیع المدبر، حدیث نمبر 2078، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تدبیر کا ارادہ نہیں کیا۔ ابن القاسم نے کہا: یہ وصیت ہے، اشہب نے کہا: وہ مدبر ہے اگرچہ اس نے وصیت کا ارادہ نہ کیا ہو۔

مسئلہ نمبر 11: علماء کا اس آیت کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ منسوخ ہے یا محکم ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ محکم ہے اس کا ظاہر عموم ہے اور اس کا معنی ان والدین کے بارے میں خاص ہے جو وارث نہیں ہوتے جیسے والدین کافر ہوں اور غلام ہوں اور ان رشتہ داروں کے بارے میں خاص ہے جو وارث نہ ہوں (1)۔ یہ ضحاک، طاؤس اور حسن کا قول ہے۔ طبری نے اس کو اختیار کیا ہے۔ زہری سے مروی ہے کہ وصیت زیادہ اور کم ہر مال میں واجب ہے۔ ابن منذر نے کہا: اہل علم کا اجماع ہے کہ ان والدین کے لئے وصیت ہے جو وارث نہیں ہوتے اور ان قریبی رشتہ داروں کے لئے جو وارث نہیں ہوتے۔

حضرت ابن عباس، حسن اور قتادہ کا قول ہے کہ یہ آیت عامۃ ہے اس کا حکم ایک تھوڑے سے عرصہ کے لئے ثابت رہا پھر جو رشتہ دار آیت فرائض کے ذریعے وارث ہوا ان میں سے ہر ایک منسوخ ہو گیا (2)۔ بعض علماء نے فرمایا: آیت الفرائض نے اس کو مستقل منسوخ نہیں کیا بلکہ ایک دوسرے ضمیمہ کے ساتھ منسوخ ہوئی اور یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''اللہ تعالیٰ نے ہر صاحب حق کو اس کا حق عطا فرمایا، وارث کے لئے وصیت نہیں (3)''۔

اس حدیث کو حضرت ابو امامہ نے روایت کیا ہے اور اسے امام ترمذی نے نقل کیا ہے اور فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ آیت کا نسخ سنت ثابتہ سے ہے نہ کہ ارث سے۔ علماء کے اقوال میں سے صحیح قول کے مطابق اگر یہ حدیث نہ ہوتی تو ان دونوں آیتوں کو اس طرح جمع کرنا ممکن ہوتا کہ میت سے وصیت کے ذریعے مال حاصل کریں اور اگر وصیت نہ کی ہو تو میراث کے ذریعے حاصل کریں یا جو وصیت کے بعد باقی بچے لیکن اس سے مانع یہ حدیث اور اجماع ہے۔ امام شافعی اور ابو الفرج اگرچہ کتاب کا سنت کے ساتھ نسخ تسلیم نہیں کرتے، لیکن صحیح اس کا جواز ہے اس دلیل کی وجہ سے کہ ہر ایک اللہ کا حکم ہے اور اسی کی طرف سے ہے اگرچہ اسماء میں اختلاف ہے۔ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔ ہم کہتے ہیں: اگرچہ یہ خبر ہمیں احاداً پہنچی ہے لیکن اس کے ساتھ مسلمانوں کا اجماع مل گیا ہے کہ وارث کے لئے وصیت جائز نہیں۔ پس ظاہر ہوا کہ قریبی وارثوں کے لئے وصیت کا وجوب سنت کے ساتھ منسوخ ہے اور علماء کے اجماع سے اس کو تائید حاصل ہے۔ حضرت ابن عباس اور حسن نے کہا: والدین کے لئے وصیت اس فرض کے ساتھ منسوخ ہے جو سورۃ النساء میں ہے اور ان قریبی رشتہ داروں کے لئے وصیت ثابت ہے جو وارث نہیں ہوتے۔ یہ امام شافعی اور اکثر مالکیوں اور اہل علم کا مذہب ہے۔ بخاری میں حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: مال بچے کے لئے تھا اور وصیت والدین کے لئے تھی۔ پس اس نے جو پسند کیا اسے منسوخ کر دیا۔ پھر دو عورتوں کے حصہ کی مثل ایک مذکر کے لئے حصہ مقرر کیا اور والدین میں سے ہر ایک کے لئے چھٹا حصہ مقرر کیا اور عورت کے لئے آٹھواں اور چوتھا حصہ مقرر کیا، خاوند کے لئے نصف اور چوتھا حصہ مقرر کیا۔

حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس اور حضرت ابن زید نے کہا: یہ ساری آیت منسوخ ہے اور وصیت ندباً باقی ہے۔ امام

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز وتفسیر طبری زیر آیت ہذا

3۔ جامع ترمذی، کتاب الوصایا، باب ماجاء لا وصیۃ لوارث، حدیث نمبر 2046، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مالک کا قول اسی طرح ہے۔ نحاس نے یہ شعبی اور نخعی سے ذکر کیا ہے۔ ربیع بن خثیم نے کہا: وصیت نہیں ہے، عروہ بن ثابت نے کہا: میں نے ربیع بن خثیم سے کہا مجھے اپنے مصحف کی وصیت کیجئے۔ ربیع نے اپنی اولاد کی طرف دیکھا اور یہ آیت پڑھی وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ (انفال: 75) حضرت ابن عمر نے اسی طرح کیا تھا۔

مسئلہ نمبر 12: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْاَقْرَبِيْنَ یہ اقرب کی جمع ہے ایک قوم نے کہا: اقربین کے لئے وصیت کرنا، اجنبیوں کے لئے وصیت کرنے سے اولیٰ ہے کیونکہ ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے نص قائم فرمائی ہے۔ حتیٰ کہ ضحاک نے کہا: اگر کسی نے اپنے قرابتداروں کے علاوہ کے لئے وصیت کی تو معصیت کی وجہ سے اس کا عمل ختم ہو گیا۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ انہوں نے اپنی ام ولد لونڈیوں کے لئے وصیت کی، ہر ایک کے لئے چار ہزار کی وصیت کی۔ روایت ہے کہ حضرت عائشہ نے اپنی لونڈی کے لئے گھر کے سامان کی وصیت کی۔ حضرت سالم بن عبداللہ سے اس کی مثل مروی ہے (1)۔ حسن نے کہا: اگر قرابتداروں کے علاوہ کے لئے وصیت کی تو وصیت اقربین کے لئے پھیری جائے گی۔ اگر اجنبی کے لئے وصیت ہوگی تو وہ ان کے ساتھ ہوگا۔ قریبی رشتہ داروں کو چھوڑ کر غیروں کے لئے وصیت کرنا جائز نہیں۔ جب ابوالعالیہ فوت ہوئے تو لوگوں نے کہا: اس کے لئے تعجب ہے اس کو ریاح قبیلہ کی ایک عورت نے آزاد کیا تھا اور اس نے اپنے مال کی بنی ہاشم کے لئے وصیت کی۔ شعبی نے کہا: یہ اس کے لئے جائز نہیں تھا نہ کرامت تھی۔ طاؤس نے کہا: اگر قرابتداروں کے علاوہ کے لئے وصیت کی ہوگی تو اسے قرابتداروں کی طرف پھیرا جائے گا اور اس کا فعل توڑ دیا جائے گا۔ یہ حضرت جابر بن زید کا قول ہے (2) اس کی مثل حسن سے مروی ہے۔ اسحاق بن راہویہ کا بھی یہی قول ہے۔ امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور اس کے اصحاب، امام اوزاعی، امام احمد بن حنبل نے فرمایا: جس نے قرابتداروں کے علاوہ کے لئے وصیت کی اور اپنے قرابتداروں کو ترک کر دیا تو اس نے برا کیا اور اس کا فعل جائز ہوگا اور جس کے لئے اس نے وصیت کی ہوگی غنی، فقیر، قریب، بعید، مسلمان، کافر سب کے لئے نافذ ہوگی۔ یہی معنی حضرت ابن عمر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ یہی حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا قول ہے۔

میں کہتا ہوں: پہلا قول احسن ہے۔ رہا ابوالعالیہ کا فعل، شاید اس نے دیکھا کہ بنی ہاشم اس کے آزاد کرنے والوں سے زیادہ مستحق ہیں، حضرت ابن عباس کی صحبت کی وجہ سے اور حضرت ابن عباس کے تعلیم دینے کی وجہ سے اور اسے دنیا و آخرت میں علماء کے درجہ پر فائز کرنے کی وجہ سے۔ یہ ابوۃ اگرچہ معنوی ہے حقیقت میں یہی حقیقی ہے۔ اور اس کی آزاد کرنے والی نے دنیا میں اسے احرار کے ساتھ لاحق کیا تھا۔ پس اس نے اپنے عتق سے ثواب کی نیت کی تھی اس کے لئے اس کا ثواب کافی ہے۔

مسئلہ نمبر 13: جمہور علماء کا نظریہ ہے کہ مریض پر اس کے مال میں حجر کیا جائے گا اور اہل ظاہر نے اس پر سختی کی اور کہا: اس پر حجر نہیں کیا جائے گا اور یہ صحیح کی طرح ہے۔ حدیث اور معنی جمہور کا رد کرتا ہے۔ حضرت سعد نے فرمایا: حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری اس تکلیف میں بیمار پرسی کی جس میں موت کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! مجھے وہ تکلیف پہنچ چکی ہے جو آپ دیکھ رہے ہیں اور میں مالدار آدمی ہوں اور میری وارث صرف ایک بیٹی ہے۔ کیا

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا

میں اپنے مال کا دو ثلث صدقہ کر دوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں۔ میں نے عرض کی: نصف صدقہ کر دوں؟ فرمایا: نہیں۔ تیسرا حصہ صدقہ کرو اور تیسرا حصہ بھی زیادہ ہے اگر تم اپنے ورثاء کو غنی چھوڑ جاؤ تو یہ ان کے غریب چھوڑنے سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔

اہل ظاہر نے ثلث سے زیادہ وصیت کرنے سے منع کیا ہے اگرچہ ورثاء جائز بھی قرار دیں اور باقی تمام علماء نے اس کو جائز قرار دیا جب ورثاء جائز قرار دیں۔ یہ صحیح ہے کیونکہ مریض تو ثلث سے زیادہ وصیت کرنے سے، وارث کے حق کی وجہ سے منع کیا گیا ہے جب ورثاء نے اپنا حق خود ساقط کر دیا تو یہ جائز اور صحیح اور یہ ان کی طرف سے ہبہ کی طرح ہے۔ دارقطنی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی وارث کے لئے وصیت جائز نہیں ہے مگر یہ کہ ورثاء چاہیں۔ حضرت عمرو بن خارجہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وارث کے لئے وصیت نہیں مگر یہ کہ ورثاء اجازت دیں۔

مسئلہ نمبر 14: موصی کی زندگی میں وارث کے لئے وصیت کو جائز کرنے والے کے اس کے مرنے کے بعد رجوع میں اختلاف ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: یہ ان پر جائز ہے، اس میں ان کے لئے رجوع جائز نہیں۔ یہ عطاء بن ابی رباح، طاؤس، حسن، ابن سیرین، ابن ابی لیلیٰ، زہری، ربیعہ اور اوزاعی کا قول ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: اگر وہ چاہیں تو رجوع کر سکتے ہیں۔ یہ حضرت ابن مسعود، شریح، حکم، طاؤس، ثوری، حسن بن صالح، امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد اور ابو ثور کا قول ہے، ابن منذر نے اس کو پسند کیا ہے۔ امام مالک نے فرق کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: جب وہ حالت صحت میں اجازت دیں تو ان کے لئے رجوع کرنا جائز ہے اگر وہ اس کی حالت مرض میں اجازت دیں جب اسے مال میں تصرف سے روکا جاتا ہے تو یہ ان کے لئے جائز ہے۔ یہ اسحاق کا قول ہے پہلے مقالہ والوں نے حجت پیش کی ہے کہ منع ورثاء کی وجہ سے تھا، جب وہ جائز قرار دیں تو جائز ہے، علماء کا اتفاق ہے کہ جو وہ ثلث سے زیادہ اجنبی کے لئے وصیت کرے تو ورثاء کی اجازت سے جائز ہے اسی طرح یہاں ہے۔ اور دوسرے قول والوں نے یہ حجت پیش کی ہے کہ انہوں نے اس کی اجازت دی جبکہ اس وقت وہ مالک نہیں تھے۔ اس کی وفات کے بعد وہ مالک ہوں گے۔ کبھی وارث جو پہلے اجازت دینے والا تھا وہ فوت ہو جاتا ہے اور وہ وارث نہیں ہوتا ہے کبھی کوئی اور وارث ہو جاتا ہے کبھی وہ اجازت دیتا ہے جس کا اس مال میں کوئی حق نہیں ہوتا تو اس سے کوئی چیز لازم نہیں ہوتی۔ امام مالک نے اس قول سے حجت پیش کی ہے کہ ایک شخص جب صحیح ہوتا ہے تو وہ اپنے مال کا زیادہ حقدار ہوتا ہے جو چاہے اس میں تصرف کرے۔ جب انہوں نے اس کو اس کی حالت صحت میں اجازت دی تو انہوں نے ایسی چیز کو چھوڑا جو ان کے لئے واجب نہ تھی۔ اور جب انہوں نے اس کی حالت مرض میں اجازت دی تو انہوں نے ایسی چیز کو ترک کیا جو ان کے لئے ثابت تھی۔ پس ان کے لئے اس میں رجوع نہیں جب وہ کر چکا ہے کیونکہ وہ فوت ہو چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 15: اگر مریض اس کو نافذ نہ کرے تو وارث کے لئے اس میں رجوع ہے کیونکہ تنفیذ کے ساتھ فوت نہ ہوا۔ یہ ابہری کا قول ہے۔ ابن منذر نے اسحاق بن راہویہ سے روایت کیا ہے کہ اس مسئلہ میں امام مالک کا قول سنت کے زیادہ مشابہ ہے۔ ابن منذر نے کہا: امام مالک، ثوری، کوفیوں، امام شافعی اور ابو ثور کا قول متفق ہے کہ جب اس کی وفات کے

بعد جائز قرار دیں تو انہیں لازم ہو جائے گا۔

مسئلہ نمبر 16: علماء کا اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جو بعض کے لئے مال کی وصیت کرے اور اپنی وصیت میں کہے: اگر ورثاء نے اجازت دی تو یہ اس کے لئے ہوگا اگر وہ اجازت نہیں دیں گے تو وہ اللہ کے راستہ میں خرچ کیا جائے گا۔ پس ورثاء نے اجازت نہ دی۔ امام مالک نے فرمایا: اگر ورثاء اس کی اجازت نہ دیں تو ورثاء کی طرف لوٹ آئے گا۔ امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور معمر (صاحب عبدالرزاق) کے قول میں اللہ کے راستہ میں خرچ ہوگا۔

مسئلہ نمبر 17: بالغ، عاقل غیر محجور علیہ کی وصیت میں کوئی اختلاف نہیں اور دوسروں میں اختلاف ہے۔ امام مالک نے فرمایا: ہمارے نزدیک اس پر اجماع ہے کہ جس کی عقل میں ضعف ہو، سفیہ اور وہ شخص جو کبھی دماغی تکلیف میں افاقہ پاتا ہو ان کے وصایا جائز ہیں جب کہ وہ اتنی عقل رکھتے ہوں کہ جو وہ وصیت کر رہے ہوں انہیں جانتے ہوں۔ اسی طرح چھوٹا بچہ جب اس چیز کو سمجھتا ہو جس کی وصیت کر رہا ہے اور کوئی غلط نہ کرے تو اس کی وصیت جائز اور نافذ ہے۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے ساتھیوں نے کہا: بچے کی وصیت جائز نہیں۔ مزنی نے کہا: یہ امام شافعی کے قول کا قیاس ہے۔ میں نے امام شافعی کی اس کے متعلق کوئی چیز نہیں پائی جو انہوں نے ذکر کی ہو اور اس پر نص قائم ہو۔ شوافع کے اصحاب کے دو قول ہیں: ایک امام مالک کے قول کی طرح ہے اور دوسرا امام ابوحنیفہ کے قول کی طرح ہے اور ان کی حجت یہ ہے کہ اس کی طلاق اور غلام آزاد کرنا جائز نہیں ہے اور نہ جنایت میں اس سے قصاص لیا جاتا ہے اور نہ قذف میں اسے حد لگائی جاتی ہے۔ وہ بالغ محجور علیہ کی طرح نہیں ہے، اسی طرح اس کی وصیت جائز ہے اور یہ معلوم شدہ ہے کہ بچوں میں سے جو اپنی وصیت کو سمجھتا ہے اس کا حال اس کے مال میں محجور علیہ کے حال کی طرح ہے اور حجر کی علت مال میں اسراف اور اسے تلف (ضائع) کرنا ہے۔ یہ علت اس سے موت کے ساتھ اٹھ گئی ہے اور محجور علیہ اپنے مال میں اس مجنون کے مشابہ ہے جو عقل نہیں رکھتا۔ پس اس امر کے ساتھ اس کی وصیت واجب ہے جس کے متعلق حضرت عمر سے روایت مروی ہے۔ امام مالک نے فرمایا: ہمارے نزدیک مدینہ طیبہ میں اس پر اجماع ہے۔ محمد بن شریح نے کہا: جس نے وصیت کی بڑا ہو یا چھوٹا ہو اس نے حق کو پالیا اللہ تعالیٰ نے اس کی زبان پر فیصلہ فرمایا اور حق کو کوئی دور کرنے والا نہیں۔

مسئلہ نمبر 18: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **بِالْمَعْرُوْفِ** یعنی عدل کے ساتھ، نہ اس میں کمی ہو نہ اس میں زیادتی ہو۔ یہ میت کے اجتہاد اور موصی کی نظر پر منحصر ہے پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی زبان پر اس کی تقدیر بیان فرمائی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تہائی اور تہائی بھی زیادہ ہے۔ اس کے متعلق علماء کے اقوال پہلے گزر چکے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تم پر تمہاری وفات کے وقت اموال کے ثلث کو صدقہ کیا ہے یہ تمہاری نیکیوں میں زیادتی ہے تاکہ اس کو تمہارے لئے زکوۃ بنا دے۔ اس حدیث کو دارقطنی نے حضرت ابوامامہ سے روایت کیا ہے انہوں نے حضرت معاذ بن جبل سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ حسن نے کہا: وصیت جائز نہیں مگر تہائی میں۔ بخاری کا نظریہ بھی یہی ہے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں حجت پکڑی ہے۔ **وَ اَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ** (المائدہ: 49) (اور تم فیصلہ کرو ان کے درمیان اس کے مطابق جو اللہ نے نازل کیا)۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے۔ کہ ثلث (تہائی) کثیر ہے یہ وہ حکم ہے جو اللہ تعالیٰ نے

اتارا ہے اور جس نے اس حد سے تجاوز کیا جو رسول اللہ ﷺ نے مقرر فرمائی اور تہائی سے زائد وصیت کی تو اس نے وہ کام کیا جس سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ کے حکم کو وہ جاننے والا ہو تو وہ اس فعل میں گنہگار ہوگا۔ امام شافعی نے فرمایا: نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے الثلث کثیر اس سے آپ نے یہ ارادہ فرمایا ہے کہ یہ قلیل نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 19: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَقًّا اس سے مراد ثبوت ہے لیکن فرض اور وجوب کا ثبوت مراد نہیں ہے کیونکہ آگے ارشاد فرمایا عَلَى الْمُتَّقِينَ یہ دلیل ہے کہ اس کا ہونا بطور استحباب ہے اگر یہ فرض ہوتا تو تمام مسلمانوں پر ہوتا جب اللہ تعالیٰ نے متقی کو خاص فرمایا یعنی جو کوتاہی اور گناہ کا خوف کرتا ہے۔ یہ دلیل ہے کہ یہ لازم نہیں ہے مگر اس صورت میں جس میں اسے تلف ہونے کی توقع ہو۔ اگر فوت ہو جائے اس صورت میں اس پر بطور قرض لازم ہوگا وہ لکھنے اور وصیت میں جلدی کرے کیونکہ اگر وہ خاموش رہے گا تو وہ ضائع کرنے والا اور کوتاہی کرنے والا ہوگا۔ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے...... حَقًّا، مصدر مؤکد کی بنا پر منصوب ہے اور غیر قرآن میں حق بھی جائز ہے یعنی ذالك حق۔

مسئلہ نمبر 20: علماء نے فرمایا: وصیت کو جلدی لکھنا یہ آیت سے ماخوذ نہیں ہے۔ یہ حضرت ابن عمر کی حدیث سے ہے۔ اس کا فائدہ یقین کی زیادتی میں مبالغہ کرنا ہے اور اس کا لکھا ہوا ہونا اس کی گواہی دی گئی ہے اور اس وصیت پر عمل کرنے میں اتفاق ہے۔ اگر عادل آدمیوں کو گواہ بنالے اور گواہ اس شہادت کو لفظاً قائم کریں تو اس کے مطابق عمل کیا جائے گا اگرچہ لکھی نہ گئی ہو۔ اگر وہ اپنے ہاتھ سے لکھے اور گواہ نہ بنائے تو امام مالک کا قول مختلف نہیں ہے۔ اس پر عمل نہیں کیا جائے گا مگر ایسی صورت میں جس میں اس شخص کے لئے حق کا اقرار ہو جس کے بارے میں اس پر تہمت نہ ہو تو اس کا نفاذ لازم ہوگا۔

مسئلہ نمبر 22: دار قطنی نے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: لوگ اپنے وصایا کے آغاز میں یہ لکھتے تھے: هذا ما اوصى به فلان بن فلان انه يشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له، وان محمدا عبده ورسوله، وان الساعة آتية لا ريب فيها، وان الله يبعث من في القبور، واوصى من ترك بعده من اهله بتقوى الله حق تقاته وان يصلحوا ذات بينهم، ويطيعوا الله ورسوله ان كانوا مؤمنين، واوصاهم بما وصى به ابراهيم بنيه ويعقوب يا بني ان الله اصطفى لكم الدين فلا تموتن الا وانتم مسلمون۔ ترجمہ:۔ میں فلاں بن فلاں کو وصیت کرتا ہوں کہ وہ گواہی دے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اس کا کوئی شریک نہیں اور محمد ﷺ اس کے (برگزیدہ) بندے اور رسول ہیں اور (وہ گواہی دے کہ) قیامت آنے والی ہے اس میں کوئی شک نہیں اور اللہ تعالیٰ اٹھائے گا انہیں جو قبور میں ہیں اور میں اسے بھی وصیت کرتا ہوں، جو وہ اپنے گھر والوں میں سے چھوڑے، اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرنے کی جس طرح اس کے تقویٰ کا حق ہے اور میں وصیت کرتا ہوں کہ وہ لوگوں کے درمیان صلح کرائیں، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں اگر وہ مومن ہیں اور میں انہیں اس کے ساتھ وصیت کرتا ہوں جو ابراہیم علیہ السلام نے اور یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی۔ (اے میرے بچو! بے شک اللہ نے پسند فرمایا ہے تمہارے لئے یہی دین سو ہرگز نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔)

فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَاۤ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِیْنَ یُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (181)

''پھر جو بدل ڈالے اس وصیت کو سن لینے کے بعد تو اس کا گناہ انہی بدلنے والوں پر ہوگا۔ بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: فَمَنۢ بَدَّلَهٗ یہ شرط ہے اور اس کا جواب فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ہے۔ ما کافہ ہے یعنی ان کو عمل سے روکنے والا ہے۔ اثمہ کو رفع مبتدا کی حیثیت سے ہے، علی الذین یبدلونہ خبر ہے۔ بدلہ میں ضمیر کا مرجع بھی ایصاء ہے۔ یہ اس ارشاد کی طرح ہے فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ۔ اس میں مَوْعِظَةٌ بمعنی وعظ ہے۔ اور ارشاد ہے: اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ (النساء: 8) یعنی مال۔ اس کی دلیل منہ کا قول ہے..... اس کی مثل شاعر کا قول ہے: ما ھذہ الصوت، یعنی الصیحۃ۔ امرء القیس نے کہا:

برھرھة رؤدة رخصة کخرعوبة البانة المنفطر

نرم جلد، خوبصورت جوان، ملائم الحلق، نرم ٹہنی، کھلنے والا بان کا درخت۔

سَمِعَهٗ یہ احتمال رکھتا ہے اس نے وصی سے خود سنا ہو اور احتمال ہے کہ اس نے ان سے سنا ہو جن کے پاس وہ ثابت ہے۔ یہ دو عادل آدمی ہیں اثمہ میں ضمیر کا مرجع التبدیل ہے یعنی تبدیلی کا گناہ تبدیل کرنے والے پر ہے، میت پر نہیں ہے۔ کیونکہ موصی وصیت کے ساتھ ملامت سے خارج ہو گیا۔ اور ملامت وارث پر یا ولی پر متوجہ ہوئی۔

بعض علماء نے فرمایا: اس موصی نے جب تبدیلی کی اور وصیت کو ترک کر دیا یا اس نے اس طرح اس کو جاری نہ کیا جو شرع میں اس کے لئے لکھا گیا تھا اس پر گناہ ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اس آیت میں دلیل ہے کہ جب میت دین (قرض) کی وصیت کرے تو وہ ذمہ سے بری ہو گیا اور ولی سے مطالبہ کیا جائے گا اس کی ادائیگی میں اس کے لئے اجر ہوگا اور تاخیر میں گناہ بھی اس پر ہوگا۔ قاضی ابو بکر بن عربی نے کہا: یہ اس صورت میں صحیح ہے جب میت نے قرضہ کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کی ہو مگر جب وہ ادائیگی پر قادر تھا اور پھر ادائیگی کو ترک کیا پھر اس کی وصیت کی تو ولی کی کوتاہی اس کے ذمہ سے اس کو زائل نہیں کرے گی۔

مسئلہ نمبر 3: اس میں اختلاف نہیں کہ جب کسی ایسی چیز کی وصیت کرے جو جائز نہ ہو مثلاً شراب یا خنزیر یا کسی گناہ کی وصیت کرے تو اس کو تبدیل کرنا جائز ہے، اس کا پورا کرنا جائز نہیں جس طرح تہائی سے زائد کا پورا کرنا جائز نہیں۔ یہ ابو عمر کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں ان کے ہوتے ہوئے وصیت کرنے والے کا ظلم کرنا اور حد سے تجاوز کرنے والوں کا تبدیلی کرنا مخفی نہیں ہے۔

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

''اور جسے اندیشہ ہو وصیت کرنے والے سے کسی طرفداری یا گناہ کا پس وہ صلح کرا دے ان کے درمیان تو کچھ گناہ نہیں اس پر بے شک اللہ تعالیٰ غفور (اور) رحیم ہے''۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ خَافَ، مَنْ شرطیہ ہے اور خاف کا معنی ہے: ڈرنا۔ بعض نے فرمایا: خَافَ کا معنی جاننا ہے خاف اصل میں خَوِفَ تھا، واو متحرک ماقبل مفتوح کی وجہ سے الف سے بدل گئی۔ اہل کوفہ خاف میں اِمالہ کرتے ہیں تا کہ کسرہ پر دلالت کرے۔ یہ فَعِلَ سے ہے۔ مِنْ مُّوْصٍ عاصم، حمزہ اور کسائی سے ابو بکر نے تشدید کے ساتھ قرأت روایت کی ہے۔ باقی قراء نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ تخفیف زیادہ واضح ہے۔ کیونکہ اکثر نحوی کہتے ہیں: موص، تکثیر کے لئے ہے اور کبھی مرد اکہ مرکی مثل ہونا بھی جائز ہے۔ جنفاً۔ یہ جنف یجنف سے ہے جس کا معنی ظلم کرنا، اس سے اسم جنف و جانفٌ ہے۔ نحاس سے یہ مروی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: الجنف کا معنی مائل ہونا ہے۔ اعشٰی نے کہا:

تجانف عن حجر اليمامة ناقتي وما قصدت من اهلها لسوائكا (1)

میری اونٹنی یمامہ کے پتھر سے مائل ہوگئی، اس نے تیرے سوا اپنے اہل کا قصد نہ کیا۔

الصحاح میں ہے الجنف کا معنی مائل ہونا ہے۔ جنف یجنف کا معنی ہے: مائل ہونا، اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا۔

شاعر نے کہا: (2)

هم المولى وان جنفوا علينا وانا من لقائهم لزور

وہ سردار ہیں اگرچہ وہ ہم پر ظلم کریں ہم ان کی ملاقات سے قوت حاصل کرنے والے ہیں۔

ابو عبید نے کہا: یہاں المولی، موالی کی جگہ ہے۔ اس سے مراد چچا کے بیٹے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا (الحج: 5) پھر نکالا تمہیں (شکم مادر سے بچہ بنا کر)

لبید نے کہا:

انی امرء منعت ارومة عامر ضيمي و قد جنفت على خصومي

میں ایسا شخص ہوں عامر کی اصل نے مجھے میرے ظلم سے روکا اور میرے خصم میری طرف مائل ہوئے۔

ابو عبیدہ نے کہا: اسی طرح الجانئ (ہمزہ کے ساتھ) اس کا معنی بھی مائل ہونے والا ہے۔ کہا جاتا ہے: اجنف الرجل یعنی زیادتی لایا۔ جیسے کہا جاتا ہے: اَلَامَ، یعنی ایسا عمل کیا جس پر ملامت کی جاتی ہے۔ اَخَسَّ یعنی خسیس کام کیا۔ تجانف لاثم گناہ کی طرف مائل ہوا۔ رجل اجنف (پشت کوز) جنفیٰ فَعَلیٰ (فاء کے ضمہ اور عین کے فتحہ کے ساتھ) کے وزن پر ہے۔ یہ جگہ کا نام ہے اور ابن السکیت سے مروی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے حیفاً پڑھا (حاء اور یاء کے ساتھ) اس

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ تفسیر طبری، المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

کا معنی ہے ظلماً۔

مجاہد نے کہا: فَمَنْ خَافَ یعنی جسے موصی کے ظلم کرنے اور بعض لوگوں کو میراث سے محروم کرنے اور اذیت پہنچانے کا اندیشہ ہو یا بلا ارادہ اذیت دینے کا اندیشہ ہو۔ یہ جنف بغیر گناہ کے ہے۔ اگر ارادۃً ہو تو گناہ میں مائل ہونا ہے۔ معنی یہ ہے کہ جس کو نصیحت کی گئی اور وہ لوٹا اور اس نے اس کے اور ورثاء کے درمیان اصلاح کی تو اس پر کوئی گناہ نہیں اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ یعنی اللہ تعالیٰ موصی کو بخشنے والا ہے جب اس نے موعظت پر عمل کیا اور اذیت کے ارادہ سے باز آیا۔ حضرت ابن عباس، قتادہ اور ربیع وغیرہم نے بتایا کہ آیت کا معنی ہے: موصی کے مرنے کے بعد جو اسے علم تھا اسے اس نے بیان کیا کہ موصی نے بعض ورثاء کو اذیت دینے کا ارادہ کیا تھا پھر اس نے ورثاء کے درمیان جو جھگڑا تھا اس کی اصلاح کی تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ پہلے تبدیل کرنے والے کا گناہ اس کو لاحق نہ ہوگا اگرچہ اس فعل میں تبدیلی ہے اور یہ ضروری ہے لیکن یہ تبدیلی مصلحت کے لئے ہے وہ تبدیلی جس میں گناہ ہے وہ وہ ہے جو خواہش نفس سے تبدیل ہو۔(1)

مسئلہ نمبر 2: فَمَنْ خَافَ کا خطاب تمام مسلمانوں کے لئے ہے، انہیں کہا گیا: اگر تمہیں موصی سے وصیت میں حق سے میل اور عدول کا خوف ہو اور گناہ میں واقع ہونے کا اندیشہ ہو اور تمہیں خوف ہو کہ وہ معروف طریقہ سے وصیت نہیں کرے گا یہ اس طرح ہے کہ وہ اپنی بیٹی کے خاوند کے لئے مال کی وصیت کرے یا اپنی بیٹی کی اولاد کے لئے وصیت کرے تاکہ مال اس کی بیٹی کی طرف یا پوتے کی طرف لوٹ آئے اس کی غرض یہ ہے کہ مال اس کے بیٹے کی طرف لوٹ آئے یا وہ اپنے غلاموں کے لئے وصیت کرے اور قریبی رشتہ داروں کو چھوڑ دے تو ان کے درمیان اصلاح میں جلدی کرو۔ جب صلح واقع ہوگی تو مصلح سے گناہ ساقط ہو جائے گا۔ اصلاح کرنا فرض کفایہ ہے جب لوگوں میں سے کوئی اصلاح کر دے گا تو باقی لوگوں سے فرض ساقط ہو جائے گا۔ اگر سب اصلاح نہیں کریں گے تو سب گنہگار ہوں گے۔

مسئلہ نمبر 3: اس آیت میں ظن کے ساتھ حکم لگانے پر دلیل ہے کیونکہ جب فساد کے قصد کا گمان ہو تو اصلاح میں سعی واجب ہے جب فساد متحقق ہو تو صلح نہیں ہوتی بلکہ دفع کا حکم ہوتا ہے۔ فساد کو ختم کرنا ہوتا ہے اور فساد کو کاٹنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ اس کا عطف خاف پر ہے۔ ضمیر سے مراد ورثاء ہیں اور ان کا ذکر پہلے نہیں ہوا ہے کیونکہ معنی معروف ہے اور جواب شرط فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ہے۔

مسئلہ نمبر 4: اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ زندگی میں اور صحت میں صدقہ کرنا، موت کے وقت صدقہ کرنے سے افضل ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، آپ سے پوچھا گیا کون سا صدقہ افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو صدقہ کرے جب کہ تو صحیح ہو اور اس پر بخل کرنے والا ہو(2)۔ (الحدیث) بخاری و مسلم نے اسے نقل کیا ہے۔ دار قطنی نے حضرت ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انسان کا اپنی زندگی میں ایک درہم صدقہ کرنا موت کے وقت

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

2۔ صحیح بخاری، باب فضل صدقة الشحيح الصحيح، حدیث نمبر 1330، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سو درہم صدقہ کرنے سے افضل ہے (1)۔ نسائی نے حضرت ابوالدرداء سے روایت کیا ہے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جو موت کے وقت خرچ کرتا ہے یا صدقہ کرتا ہے وہ اس شخص کی مثل ہے جو سیر ہونے کے بعد ہدیہ دیتا ہے۔

مسئلہ نمبر 5: اور جو اپنی وصیت میں کسی کو نقصان نہ دے تو اس کی یہ وصیت اس کی طرف سے اس زکوۃ کا کفارہ ہوگی جو اس نے ادا نہ کی تھی۔ دارقطنی نے حضرت معاویہ بن قرۃ سے وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس پر موت آنے کا وقت قریب ہو پھر وہ وصیت کرے اور اس کی وصیت کتاب اللہ کے حکم کے مطابق ہو تو اس کی سابقہ زکوۃ جو اس نے ادا نہیں کی تھی اس کے لئے کفارہ ہوگی اور اگر وہ وصیت میں کسی کو نقصان پہنچائے تو پھر یہ صورت ہوگی۔

مسئلہ نمبر 6: دارقطنی نے حضرت ابن عباس سے انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے، فرمایا: وصیت میں کسی کو نقصان پہنچانا کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ ابوداؤد نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایک مرد یا عورت ساٹھ سال اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ عمل کرتا رہتا ہے پھر ان پر موت آتی ہے وہ وصیت میں کسی کو نقصان پہنچاتے ہیں تو ان کے لئے دوزخ واجب ہوتی ہے۔ نسائی نے باب باندھا ہے: الصلاۃ علی من جنف فی وصیتہ۔ پھر اپنی سند سے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے چھ غلام اپنی موت کے وقت آزاد کئے جبکہ اس کے پاس اور کوئی مال نہیں تھا۔ نبی کریم ﷺ کو اس بات کی خبر پہنچی تو آپ ﷺ اس سے ناراض ہوئے اور فرمایا: میں نے ارادہ کیا کہ میں اس پر نماز جنازہ نہ پڑھوں۔ پھر آپ ﷺ نے اس کے غلاموں کو بلایا ان کے تین حصے بنائے پھر ان کے درمیان قرعہ ڈالا، دو کو آزاد فرمایا اور چار کو غلام بنایا۔ مسلم نے اس حدیث کا معنی بیان کیا ہے مگر انہوں نے آخر میں فرمایا: آپ ﷺ نے اسے سخت کلام کہی جبکہ پہلی حدیث میں تھا کہ میں نے ارادہ کیا کہ میں اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھوں گا۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ كُتِبَ عَلَيْكُمُ ٱلصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى ٱلَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿١٨٣﴾ أَيَّامًا مَّعْدُودَٰتٍ ۚ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى ٱلَّذِينَ يُطِيقُونَهُۥ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ فَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُۥ ۚ وَأَن تَصُومُوا۟ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿١٨٤﴾

''اے ایمان والو! فرض کئے گئے ہیں تم پر روزے جیسے فرض کئے گئے تھے ان لوگوں پر جو تم سے پہلے تھے کہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔ یہ گنتی کے چند روز ہیں پھر جو تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اتنے روزے اور دنوں میں رکھ لے۔ اور جو لوگ اسے بہت مشکل سے ادا کر سکیں ان کے ذمہ فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا اور جو خوشی سے زیادہ

1۔ سنن ابی داؤد، باب ما جاء فی کراہیۃ الاضرار فی الوصیۃ، حدیث نمبر 2482، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نیکی کرے تو وہ اس کے لئے زیادہ بہتر ہے اور تمہارا روزہ رکھنا ہی بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم جانتے ہو"۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: الله تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ۔ جب مکلفین پر قصاص اور وصیت کے فرض ہونے کا ذکر کیا تو ان پر روزوں کے فرض ہونے کا بھی ذکر کیا اور ان پر روزوں کو بھی لازم کیا۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے: یہ گواہی دینا کہ الله کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم الله کے رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، رمضان کے روزے رکھنا اور حج کرنا (1)۔ اس حدیث کو حضرت ابن عمر نے روایت کیا ہے۔ صوم کا لغوی معنی رکنا اور ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل نہ ہونا ہے۔ خاموشی کو بھی صوم کہا جاتا ہے کیونکہ یہ کلام سے رکنا ہے۔ الله تعالیٰ نے حضرت مریم کے متعلق خبر دیتے ہوئے فرمایا: اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا (مریم: 26) یعنی کلام نہ کرنے کی میں نے نذر مانی ہے۔ الصوم کا معنی ہوا کا رک جانا بھی ہے، ہوا کا چلنے سے رک جانا، گھوڑا اپنی رسی پر ٹھہرا رہے یعنی وہ ٹھہر جائے اور چارہ نہ کھائے۔ صام النهار کا معنی ہے: دن کا معتدل ہونا۔ **مصام الشمس**، نصف النہار کے وقت میں سورج کا برابر ہونا۔ اسی سے شاعر کا قول ہے:

خيلٌ صيام و خيل غير صائمة   تحت العجاج و خيل تعلك اللجما

یعنی گھوڑے کھڑے ہوئے ہیں چلنے سے اور حرکت کرنے سے رکے ہوئے ہیں۔

امراؤ القیس نے کہا:

كان الثريا علقت في مصامها

گویا ستارے اپنی جگہوں میں ٹھہرے ہوئے ہیں منتقل نہیں ہوتے ہیں۔

ایک اور کا قول ہے:

والبكرات شرهن الصائمة

جوان اونٹنیاں ان کی برائی یہ ہے کہ وہ چلتی اور گھومتی نہیں ہیں۔

امرؤ القیس نے کہا:

فدعها و سل الهمّ عنك بجسرة   ذمولٍ اذا صام النهار و هجرا

یعنی سورج منتقل ہونے سے اور چلنے سے ست پڑ گیا۔ پس سستی کی وجہ سے وہ رکنے والے کی طرح ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا:

حتى اذا صام النهار و اعتدل   و سال للشمس لعابٌ فنزل

جب دن درمیان میں تھا اور سورج کے لئے لعاب نکلا تو وہ ڈھل گیا۔

1۔ صحیح بخاری، کیف کان بدء الوحی الی رسول الله علیه الصلوٰۃ والسلام، حدیث نمبر 7، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایک اور نے کہا:

نعاما بوجرۃ صفر الخدود ما تطعم النوم الا صیاماً

شرع میں روزہ کا معنی، طلوع فجر سے سورج کے غروب ہونے تک نیت کے ساتھ روزہ کو توڑنے والی چیزوں سے رکنا ہے اور اس کا تمام اور کمال ممنوعہ چیزوں سے اجتناب کرنا اور محرمات میں واقع نہ ہونا ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: من لم یدع قول الزور و العمل بہ فلیس للہ حاجۃ فی ان یدع طعامہ و شرابہ (1)۔ (جو جھوٹ کے قول کو اور اس پر عمل کو ترک نہ کرے تو اللہ کو اس کے کھانے، پینے کے چھوڑنے کی ضرورت نہیں)۔

مسئلہ نمبر 2: روزہ کی عظیم فضیلت اور بڑا ثواب

اس کے متعلق کثرت سے صحیح اور حسن احادیث آئی ہیں جن کا ذکر ائمہ نے اپنی اپنی مسانید میں کیا ہے بعض کا ذکر آگے آئے گا۔ تیرے لئے اب اتنا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی طرف کی ہے جس طرح نبی کریم ﷺ کی حدیث سے ثابت ہے، نبی کریم ﷺ نے رب کریم کی طرف سے خبر دیتے ہوئے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ابن آدم کا ہر عمل اس کے لئے ہے سوائے روزے کے یہ میرے لئے ہے اور میں اس کی جزا دوں گا (2)۔ (الحدیث) روزے کو خاص فرمایا کہ وہ اس کے لئے ہے اگرچہ تمام عبادات اس کے لئے ہیں۔ دو امور کی وجہ سے روزے کا مرتبہ باقی تمام عبادات سے بلند ہے۔

پہلا امر یہ ہے کہ روزہ نفس کو لذتوں اور شہوات سے روکتا ہے جبکہ ان چیزوں سے دوسری عبادات اتنا نہیں روکتی ہیں۔ دوسرا امر یہ ہے کہ روزہ بندے اور اس کے رب کے درمیان راز ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی پر ظاہر نہیں ہوتا اسی وجہ سے وہ اس کے ساتھ مختص ہے اور دوسری عبادات ظاہر ہیں۔ بعض اوقات انسان اسے تصنع اور ریاکاری کے طور پر کرتا ہے۔ اسی وجہ سے روزے کو دوسری عبادات سے خاص فرمایا۔ اس کے علاوہ بھی روزے کی عظمت کے متعلق اقوال ہیں۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کَمَا كُتِبَ کاف صفت کے اعتبار سے محل نصب میں ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے: کتابا کما یا صوما کما۔ یا یہ صیام سے حال کی بنا پر منصوب ہے یعنی روزے تم پر فرض کئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض تھے، بعض نحویوں نے فرمایا: کاف صیام کی صفت ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے کیونکہ اس کی تعریف محض نہیں ہے اس اجمال کی وجہ سے جو اس میں ہے جس کے ساتھ شریعت نے تفسیر بیان کی ہے۔ اسی وجہ سے اس کی کما کے ساتھ صفت جائز ہے کیونکہ صفت ہمیشہ نکرہ کی لگائی جاتی ہے۔ یہ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ کے قائم مقام ہے اس قول کو ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ ما محل جر میں ہے اور اس کا صلہ كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ ہے۔ اور کتب میں ضمیر ما کی طرف راجع ہے۔ اہل تاویل کا تشبیہ کے مقام پر اختلاف ہے۔

مسئلہ نمبر 4: شعبی اور قتادہ وغیرہ نے کہا: تشبیہ روزے کے وقت اور روزے کی قدر کی طرف لوٹتی ہے۔ اللہ تعالیٰ

1۔ صحیح بخاری، باب من لم یدع قول الزور و العمل بہ فی الصوم، حدیث نمبر 1770، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب ھل یقول انی صائم اذا شتم، حدیث نمبر 1771، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی قوم پر رمضان کے روزے فرض کیے پھر انہوں نے اس میں تبدیلی کی۔ ان کے علماء نے ان پر دس ایام زیادہ کر دیئے۔ پھر ایک عالم بیمار ہوا تو اس نے نذر مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اسے شفا دی تو وہ دس روزوں کا اضافہ کرے گا تو اس نے ایسا ہی کیا۔ نصاریٰ کے روزے پچاس دن ہو گئے۔ پھر گرمی میں روزے رکھنا ان پر مشکل ہوئے تو انہوں نے اپنے روزوں کو موسم بہار کی طرف منتقل کر دیا(1)۔ اس قول کو نحاس نے اختیار کیا ہے اور فرمایا: یہ آیت کے مفہوم کے مشابہ ہے۔ اس کے متعلق ایک حدیث ہے جو اس کی صحت پر دلالت کرتی ہے، حضرت دغفل بن حنظلہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نصاریٰ پر ایک مہینہ کے روزے فرض تھے، ان کا ایک شخص مریض ہوا تو لوگوں نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ اسے شفا دے گا تو ہم دس دنوں کا اضافہ کریں گے پھر دوسرا ایک شخص تھا جس نے گوشت کھایا اور اس کے منہ کو تکلیف ہوئی۔ انہوں نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ اسے شفاء دے گا تو ہم سات دنوں کا اضافہ کریں گے پھر ایک اور بادشاہ کا دور آیا۔ لوگوں نے کہا: ہم ان سات ایام کو مکمل کریں گے اور ہم روزے موسم بہار میں رکھیں گے۔ فرمایا: پس پچاس روزے ہو گئے۔

مجاہد نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ہر امت پر رمضان کے مہینہ کے روزے فرض کئے تھے۔ بعض نے فرمایا: انہوں نے عہد کیا کہ تیس دنوں سے پہلے ایک دن اور ایک دن بعد ہر سال روزہ رکھتے رہیں گے حتیٰ کہ ان کے پچاس دن مکمل ہو جائیں گے پھر گرمیوں میں ان پر مشکل ہوئی تو انہوں نے روزوں کو موسم بہار کی طرف منتقل کر دیا۔ اس کے بارے میں حضرت دغفل بن حنظلہ، حسن بصری اور سدی سے حدیث مروی ہے۔(2)

میں کہتا ہوں: اسی وجہ سے ..... حقیقت حال اللہ بہتر جانتا ہے ..... شک والے دن (انتیس شعبان کے بعد والے دن) کا روزہ اور عید الفطر کے متصل چھ روزوں کو مکروہ کیا گیا ہے۔ شعبی نے کہا: اگر میں پورا سال روزہ رکھتا تو شک والے دن پھر بھی افطار کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نصاریٰ پر رمضان کے مہینہ کے روزے فرض کئے گئے تھے جس طرح ہم پر فرض کئے گئے ہیں۔ پس انہوں نے موسم بہار کی طرف روزوں کو پھیر دیا کیونکہ یہ روزے کبھی گرمیوں میں آ جاتے تھے۔ پھر انہوں نے تیس دن شمار کئے۔ پھر اس کے بعد ان پر ایک زمانہ آیا انہوں نے اپنے آپ سے عہد کیا کہ وہ تیس دنوں سے پہلے اور بعد ایک ایک دن روزہ رکھیں گے پھر ..... حتیٰ کہ ان کے روزے پچاس ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا یہی مطلب ہے: كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بعض علماء نے فرمایا: تشبیہ اصل وجوب کی طرف راجع ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے نہ وقت میں تشبیہ ہے نہ کیفیت میں۔ بعض علماء نے فرمایا: تشبیہ اس روزے کی صفت میں واقع ہے جو ان پر فرض تھا کہ کھانا، پینا، حقوق زوجیت ادا کرنا منع تھا۔ جب افطار کا وقت ہوتا تو جو سو جاتا وہ یہ کھانا، پینا بھی نہیں کرتا تھا۔

نصاریٰ بھی ابتدا میں اسی طرح تھے اور ابتدائے اسلام میں بھی اسی طرح تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد سے پہلا

1۔ تفسیر طبری والمحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

حکم منسوخ کر دیا۔ فرمایا: اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ۔ (البقرہ: 187) جیسا کہ آگے اس کا بیان آئے گا یہ سدی، ابو العالیہ اور ربیع کا قول ہے (1)۔ حضرت معاذ بن جبل اور عطا نے کہا: تشبیہ صرف روزے پر واقع ہے نہ صفت میں ہے نہ تعداد میں ہے۔ اگرچہ دونوں روزے زیادہ اور کمی میں مختلف تھے۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ کا معنی یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں ہر مہینہ میں تین دن اور عاشوراء کے دن کا روزہ فرض تھا كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ ۔ یعنی جس طرح یہود پر روزہ فرض تھا۔ حضرت ابن عباس کے قول کے مطابق تین دن اور عاشوراء کا روزہ ان پر فرض تھا پھر اس امت میں رمضان کے مہینہ کے ساتھ یہ حکم منسوخ ہو گیا (2)۔ حضرت معاذ بن جبل نے کہا اس کو اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ کے ساتھ منسوخ کیا گیا پھر ایام کو رمضان کے ساتھ منسوخ کیا گیا۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ، لعل ان کے حق میں ترجی (امید) کے لئے ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ تَتَّقُوْنَ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی یہاں کمزور ہونا ہے کیونکہ جب کم کھایا جاتا ہے تو شہوت کم ہوتی ہے، جب شہوت کم ہوتی ہے تو گناہ کم ہوتے ہیں۔ یہ خوبصورت وجہ مجاز ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے تاکہ تم گناہوں سے بچ جاؤ۔ بعض نے فرمایا: یہ عموم پر ہے کیونکہ روزہ، نبی کریم ﷺ کے ارشاد الصیام جنۃٌ (3) ووجاءٌ (روزہ ڈھال ہے اور شہوت کو ختم کرتا ہے) کے مطابق تقویٰ کا سبب ہے کیوں یہ شہوات کو مار دیتا ہے۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ، اَيَّامًا ، كُتِبَ کا مفعول ثانی ہے یہ فراء کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: كُتِبَ کی ظرف کی بنا پر منصوب ہے یعنی تم پر روزے ایام میں فرض کئے گئے ہیں۔ اور اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ سے مراد رمضان کا روزہ ہے۔ یہ حضرت معاذ سے جو مروی ہے اس کے خلاف ہے۔ واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ

اس میں سولہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَّرِيْضًا مریض کی دو حالتیں ہیں: ایک یہ کہ وہ کسی حال میں بھی روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتا اس پر تو افطار کرنا واجب ہے دوسری حالت یہ ہے کہ وہ ضرر اور مشقت کے ساتھ روزہ پر قدرت رکھتا ہے۔ اس کے لئے افطار مستحب ہے اور ایسی صورت میں صرف جاہل ہی روزہ رکھتا ہے۔ ابن سیرین نے کہا: جب انسان کو ایسی حالت لاحق ہو جس کی وجہ سے وہ مریض کہا جا سکتا ہو تو اس کے لئے افطار کرنا صحیح ہے اس کو مسافر پر قیاس کیا گیا ہے کیونکہ اس میں سفر کی علت کی وجہ سے افطار کرنا صحیح ہے اگرچہ افطار کی ضرورت نہ بھی ہو۔ طریف بن تمام العطاردی نے کہا: میں رمضان میں محمد بن سیرین کے پاس گیا تو وہ کھانا کھا رہے تھے جب کھانے سے فارغ ہوئے تو فرمایا: میری اس انگلی میں تکلیف ہے۔ جمہور علماء نے فرمایا: جب اسے کوئی ایسی مرض ہو جو اسے تکلیف دیتی ہو یا اس کے بڑھنے کا اندیشہ ہو تو اس کے لئے افطار

1۔ تفسیر طبری، المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

3۔ صحیح بخاری، باب فضل الصوم، حدیث نمبر 1761، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کرنا صحیح ہے۔ ابن عطیہ نے کہا (1): یہ اصحاب مالک کے ماہر علماء کا مذہب ہے، اس کے ساتھ وہ مناظرے کرتے تھے۔ رہے امام مالک کے الفاظ کہ وہ مرض جو آدمی کو تکلیف دیتی ہو اور اسے انتہا تک پہنچاتی ہو۔ ابن خویز منداد نے کہا: امام مالک سے ایسی مرض کے بارے میں اختلاف ہے جو افطار کو مباح کرتی ہے۔ کبھی فرمایا: روزے سے تلف ہونے کا خوف ہو، کبھی فرمایا: شدت مرض اور مرض میں زیادتی، سخت مشقت۔ یہ صحیح مذہب ہے اور ظاہر کا مقتضا ہے کیونکہ کوئی مرض خاص نہیں ہے۔ یہ ہر مرض میں مباح ہے مگر جس کو دلیل خاص کرے جیسے سر درد، تھوڑا سا بخار یا کوئی تھوڑی سی مرض جس کے ہوتے ہوئے روزے میں تکلیف نہ ہو۔ حسن نے کہا: ایسی مرض جس میں کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھ سکتا ہو تو وہ روزہ افطار کرے۔ یہ نخعی کا قول ہے (2)۔ ایک فرقہ نے کہا: کسی مرض میں افطار نہ کرے مگر ایسی مرض جس کی ضرورت افطار کی داعی ہو، جب اس مرض کے ساتھ ضرورت کا احتمال ہو تو افطار نہ کرے۔ یہ امام شافعی کا قول ہے۔ (3)

میں کہتا ہوں: اس باب میں ابن سیرین کا قول زیادہ مناسب ہے۔ امام بخاری نے فرمایا: میں رمضان میں تھوڑا سا بیمار تھا، اسحاق بن راہویہ اپنے ساتھیوں کی معیت میں میری عیادت کے لئے آئے۔ انہوں نے مجھے فرمایا: اے ابو عبداللہ! تو نے افطار کیا ہے؟ میں نے کہا: ہاں۔ انہوں نے کہا: تجھے اندیشہ تھا کہ تو رخصت کے قبول کرنے سے کمزور ہو جائے گا۔ میں نے کہا: ہمیں عبدان نے بتایا انہوں نے ابن المبارک سے روایت کیا انہوں نے ابن جریج سے روایت کیا، فرمایا: میں نے عطا سے پوچھا میں کس مرض کی وجہ سے افطار کروں؟ انہوں نے فرمایا: جو بھی مرض ہو جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا**۔ بخاری نے فرمایا یہ حدیث اسحاق کے پاس نہ تھی۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا: جب انسان کو اپنے نفس پر خوف ہو جبکہ وہ روزہ سے ہو اگر وہ افطار نہیں کرے گا تو اس کی آنکھ کی تکلیف بڑھ جائے گی یا بخار شدید ہو جائے گا تو وہ افطار کرے۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اَوْ عَلٰى سَفَرٍ** علماء کا اس سفر کے بارے اختلاف ہے جس میں افطار اور قصر جائز ہے۔ اس پر اجماع ہے کہ وہ سفر اطاعت ہو جیسے حج اور جہاد۔ ان دونوں سفروں کے ساتھ صلہ رحمی کا سفر، ضروری معاش کی طلب کا سفر متصل ہے، رہا تجارت کا سفر اور مباحات کا سفر اس میں منع اور اجازت کا اختلاف ہے، جواز کا قول ارجح ہے اور رہا سفر گناہ اس کے متعلق بھی علماء کا جواز و منع میں اختلاف ہے۔ منع کا قول راجح ہے۔ یہ ابن عطیہ کا قول ہے (4)۔ سفر کی مسافت امام مالک کے نزدیک وہی ہے جس میں نماز قصر کی جاتی ہے۔ علماء کا اس مقدار میں اختلاف ہے۔ امام مالک نے فرمایا: ایک دن اور ایک رات کی مسافت ہے پھر انہوں نے رجوع کیا اور فرمایا: اڑتالیس میل کی مسافت ہے۔ ابن خویز منداد نے کہا: یہ امام مالک کا ظاہر مذہب ہے۔ کبھی فرمایا: بیالیس میل ہے، کبھی فرمایا: چھتیس میل ہے، کبھی فرمایا: ایک دن اور ایک رات کی مسافت ہے۔ ان سے دو دن بھی مروی ہیں۔ یہ امام شافعی کا قول ہے۔ کبھی خشکی اور سمندری سفر کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ فرمایا: سمندری راستہ میں ایک دن اور ایک رات ہے اور خشکی کے راستہ میں اڑتالیس میل ہے اور مذہب میں تیس میل ہے اور غیر مذہب میں تین دن ہیں۔ حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس اور ثوری

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　2۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا　3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　4۔ ایضاً

نے کہا: افطار تین دنوں کے سفر میں ہے۔ یہ ابن عطیہ نے حکایت کیا ہے (1)۔ میں کہتا ہوں: بخاری میں ہے حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس چار برد کے سفر میں افطار کرتے تھے اور یہ چار برد، سولہ فرسخ ہیں۔

مسئلہ نمبر 3: علماء کا اختلاف ہے کہ رمضان میں سفر کرنے والے کے لئے فطر کی نیت کرنا جائز نہیں کیونکہ مسافر نیت کے ساتھ مسافر نہیں ہوتا بخلاف مقیم کے۔ مسافر عمل کرنے اور اٹھ کر جانے کے ساتھ ہی مسافر ہو جاتا ہے اور مقیم عمل کا محتاج نہیں ہوتا کیونکہ جب وہ اقامت کی نیت کرتا ہے تو اسی وقت مقیم ہو جاتا ہے کیونکہ اقامت عمل کی محتاج نہیں ہوتی۔ پس یہ دونوں جدا جدا ہیں اس میں بھی علماء کا اختلاف نہیں کہ جو سفر کی امید رکھتا ہے تو اس کے لئے نکلنے سے پہلے افطار جائز نہیں اگر افطار کرے تو ابن حبیب نے کہا: اگر وہ سفر کے لئے تیاری کر چکا تھا اور سفر کے اسباب لے چکا تھا تو اس پر کوئی چیز واجب نہیں۔ یہ اصبغ اور ماجشون سے حکایت کیا گیا ہے۔ اگر سفر سے اسے کوئی عارضہ روک لے تو اس پر کفارہ ہوگا اور اگر سفر کرے تو کفارے سے بچ جائے گا۔ عیسیٰ نے ابن قاسم سے روایت کیا ہے: اس پر ایک دن کی قضا لازم ہے کیونکہ وہ فطر میں تاویل کرنے والا تھا۔ اشہب نے کہا: اس پر کوئی کفارہ نہیں خواہ سفر کرے یا نہ کرے۔ سحنون نے کہا: اس پر کفارہ ہے خواہ سفر کرے یا نہ کرے یہ اس عورت کی طرح ہے جو کہتی ہے کل مجھے حیض آ جائے گا اس لئے وہ افطار کر دیتی ہے۔ پھر سحنون نے عبدالملک اور اصبغ کے قول کی طرف رجوع کر لیا اور فرمایا: عورت کی طرح نہیں ہے کیونکہ مرد جب چاہتا ہے سفر کرتا ہے اور عورت حیض خود نہیں لاتی۔

میں کہتا ہوں: ابن القاسم اور اشہب کا قول کفارہ کی نفی میں بہتر ہے کیونکہ اس نے وہ فعل کیا جو اسے کرنا جائز تھا اور ذمہ بری ہے اور اس میں کوئی چیز ثابت نہیں ہوتی مگر یقین کے ساتھ اور اختلاف کے ہوتے ہوئے یقین نہیں ہوتا۔ پھر اَوْ عَلٰی سَفَرٍ کے ارشاد کا یہی مقتضا ہے۔ ابو عمر نے کہا یہ اس مسئلہ میں صحیح ترین قول ہے۔ کیونکہ وہ روزے کی حرمت کو توڑنے والا نہیں تھا اس نے اس کا قصد اور ارادہ کیا ہوا تھا۔ پس متاول تھا۔ اگر کھانا سفر کی نیت کے ساتھ ہو تو اس پر کفارہ واجب ہے کیونکہ یہ سفر کی طرف نکلنے سے پہلے تھا ابھی تک خروج نے اس سے اس کو ساقط نہیں کیا تھا۔ پس تو اس میں غور کرے گا تو تو بھی اسی طرح پائے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ دارقطنی نے روایت کیا ہے، حضرت محمد بن کعب سے مروی ہے انہوں نے کہا: میں رمضان میں حضرت انس بن مالک کے پاس آیا، وہ سفر کا ارادہ کئے ہوئے تھے اور ان کی سواری بھی تیار کر دی گئی تھی اور وہ سفر والا لباس پہن چکے تھے اور سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ انہوں نے کھانا منگوایا اور اس سے کھایا پھر سوار ہو گئے۔ میں نے پوچھا: کیا یہ سنت ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہاں۔ حضرت انس سے مروی ہے، فرمایا: مجھے حضرت ابو موسیٰ نے کہا: کیا میں تجھے نہ بتاؤں جب تو نکلے گا تو روزہ سے نکلے گا اور جب تو داخل ہوگا تو روزہ سے داخل ہوگا۔ جب تو سفر پر نکلے تو افطار کر کے نکل جب تو گھر میں داخل ہو تو افطار کرتے ہوئے داخل ہو۔ حسن نے کہا: جس دن سفر کا ارادہ ہو اس دن گھر میں اگر چاہے تو افطار کرے۔ احمد نے کہا جب وہ گھروں سے نکل جائے تو افطار کرے۔ اسحاق نے کہا: نہیں۔ بلکہ جب سواری پر کجاوہ رکھے تو افطار کرے۔ ابن منذر نے کہا: احمد کا قول صحیح ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں جو حالت صحت میں صبح کرے پھر بیمار ہوا تو وہ بقیہ دن

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

افطار کرے۔ اسی طرح جب حضر میں صبح کرے پھر سفر کی طرف نکلے تو اس کے لئے افطار کرنا جائز ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: اس دن افطار نہ کرے اگرچہ سفر شروع بھی کر دے۔ اسی طرح زہری، مکحول اور یحییٰ انصاری، امام اوزاعی، امام شافعی، ابوثور اور اصحاب رائے کا یہی قول ہے۔ اگر وہ افطار کر دے تو اس میں اختلاف ہے۔ پھر تمام کہتے ہیں کہ وہ قضا کرے گا اور کفارہ نہیں دے گا۔ امام مالک نے فرمایا: سفر چونکہ طاری عذر ہے۔ یہ مرض کی طرح ہے جو انسان کو لاحق ہو جاتی ہے۔ بعض اصحاب مالک سے مروی ہے کہ وہ قضا کرے اور کفارہ بھی دے۔ یہ ابن کنانہ اور مخزومی کا قول ہے۔ الباجی نے امام شافعی سے حکایت کیا ہے، ابن عربی نے اس کو اختیار کیا ہے اور یہی کہا ہے۔ فرمایا: سفر عذر ہے جو عبادت کے لزوم کے بعد لاحق ہوا ہے۔ یہ مرض اور حیض کے مخالف ہے کیونکہ مرض اس کے لئے افطار کو مباح کرتی ہے۔ حیض اس پر روزے کو حرام کر دیتا ہے اور سفر یہ اس کے لئے مباح نہیں کرتا اس پر روزے کی حرمت توڑنے کی وجہ سے کفارہ واجب ہے۔ ابو عمر نے کہا: یہ کچھ نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کتاب و سنت میں اس کے لئے افطار کو مباح کیا ہے۔ رہا علماء کا یہ قول کہ وہ افطار نہ کرے یہ اس کا استحباب ہے جس کا اس نے عہد کیا تھا۔ اگر وہ اللہ کی رخصت کو لے گا تو اس پر قضا ہوگی۔ رہا کفارہ تو اس کی کوئی وجہ نہیں، جس نے کفارہ واجب کیا ہے اس نے اس چیز کو واجب کیا جس کو اللہ اور اس کے رسول نے واجب نہیں کیا۔ حضرت ابن عمر سے اس مسئلہ میں مروی ہے کہ اگر وہ چاہے تو اس دن افطار کرے جب وہ سفر پر نکلے۔ یہ شعبی، امام احمد اور اسحاق کا قول ہے۔

میں کہتا ہوں: امام بخاری نے اس مسئلہ پر یہ باب باندھا ہے: من افطر فی السفر لیراہ الناس اور حضرت ابن عباس سے حدیث نقل کی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ سے مکہ کی طرف نکلے تو روزہ رکھے رہے، حتیٰ کہ عسفان تک پہنچ گئے پھر پانی منگوایا اور اپنے ہاتھوں کو بلند کیا تاکہ لوگوں کو دکھائیں کہ آپ نے افطار کیا ہے حتیٰ کہ مکہ مکرمہ آئے اور یہ رمضان کا مہینہ تھا(1)۔ مسلم نے بھی یہ حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے، اس میں فرمایا: پھر برتن منگوایا جس میں مشروب تھا دن کے وقت وہ مشروب پیا تاکہ لوگ آپ کو دیکھ لیں پھر آپ نے افطار کیا تاکہ مکہ میں داخل ہو جائیں۔ یہ اس باب میں نص ہے۔ پس مخالف قول ساقط ہوا۔ وباللہ التوفیق۔ اس میں جو یہ کہتا ہے کہ روزہ سفر میں منعقد نہیں ہوتا، حضرت عمر، حضرت ابن عباس، حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابن عمر سے مروی ہے۔ حضرت ابن عمر نے کہا: جو سفر میں روزہ رکھے تو حضر میں قضا کرے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے مروی ہے سفر میں روزہ رکھنے والا حضر میں افطار کرنے والے کی طرح ہے(2)۔

اہل ظواہر کی ایک قوم نے بھی یہی کہا ہے اور انہوں نے اس قول سے حجت پکڑی ہے فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ اس کا بیان آگے آئے گا۔ حضرت کعب بن عاصم سے روایت ہے، فرمایا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے: سفر میں روزہ رکھنا نیکی نہیں ہے۔ اس میں اس کے قول کی حجت ہے جو کہتا ہے: جو سفر میں رات کو روزہ کی نیت کرے تو اس کے لئے افطار کرنا جائز ہے اگرچہ عذر نہ بھی ہو۔ مطرف کا خیال بھی یہی ہے۔ یہ امام شافعی کا ایک قول ہے اور یہی اہل ظواہر کی ایک جماعت کا قول

1۔ صحیح بخاری، باب من افطر فی السفر لیراہ الناس، حدیث نمبر 1812، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، باب ما جاء فی الافطار فی السفر، حدیث نمبر 1655، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے۔ امام مالک ایسے شخص پر قضا اور کفارہ واجب کرتے تھے۔ امام مالک سے یہ بھی مروی ہے کہ اس پر کفارہ نہیں ہے یہ عبدالملک کے سوا اکثر اصحاب مالک کا قول ہے۔

عبدالملک نے کہا: اگر جماع کے ساتھ افطار کرے گا تو کفارہ دے گا کیونکہ اس میں سفر پر نہ قوت حاصل کرتا ہے اور نہ اسے کوئی عذر ہے، مسافر کے لئے افطار اس لئے مباح ہوتا ہے تاکہ اپنے سفر پر قوت حاصل کرے، عراق اور حجاز کے تمام فقہاء نے کہا: اس پر کفارہ نہیں۔ ان میں سے ثوری، امام اوزاعی، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور تمام کوفہ کے فقہاء ہیں۔ یہ حضرت ابوعمر کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 4: اس میں علماء کا اختلاف ہے سفر میں افطار افضل ہے یا روزہ افضل ہے؟ امام مالک اور امام شافعی نے بعض روایات میں فرمایا: روزہ افضل ہے جو روزہ کی طاقت رکھتا ہو اور امام مالک کا مذہب اختیار کا ہے۔ اسی طرح امام شافعی کا مذہب ہے۔ امام شافعی اور دوسرے ان کے متبعین علماء نے کہا: اسے اختیار ہے اور انہوں نے کوئی تفصیل بیان نہیں کی۔ اسی طرح ابن علیہ نے کہا: کیونکہ حضرت انس کی حدیث ہے، فرمایا: ہم نے رمضان میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر کیا تو روزہ دار نے افطار کرنے والے پر عیب نہیں لگایا اور افطار کرنے والے نے روزہ دار پر عیب نہیں لگایا۔(1)

اس حدیث کو بخاری، مسلم اور مالک نے روایت کیا ہے۔ حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفی اور حضرت انس بن مالک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے کہا: سفر میں روزہ افضل ہے اس کے لئے جو اس پر قدرت رکھتا ہو(2)۔ یہ امام ابوحنیفہ اور ان کے شاگردوں کا قول ہے۔ حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ رخصت افضل ہے۔ حضرت سعید بن مسیب، شعبی، عمر بن عبدالعزیز، مجاہد، قتادہ، اوزاعی، احمد اور اسحاق کا یہی قول ہے۔ یہ تمام علماء کہتے ہیں: افطار افضل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَ لَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرہ:185)

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اس کلام میں حذف ہے یعنی تم میں سے جو مریض یا مسافر ہو وہ افطار کرے اور قضا کرے۔ جمہور علماء فرماتے ہیں: اہل شہر جب انتیس دن روزے رکھیں اور شہر میں کوئی مریض آدمی ہو اور صحیح نہ ہو تو وہ انتیس دن روزے رکھے۔ ایک قوم نے کہا: ان میں سے حسن بن صالح بن حی ہے۔ انہوں نے کہا: ایک مہینہ کے بدلے میں ایک مہینہ روزے رکھے ایام کی تعداد کا اعتبار کئے بغیر۔ الکیا طبری نے کہا: یہ بعید ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ۔ یہ نہیں فرمایا کہ دوسرے ایام سے ایک مہینہ روزے رکھو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد فَعِدَّةٌ جو اس نے افطار کیا ہے اس کی تعداد پوری کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر کچھ دن رمضان کے افطار کیا ہو تو ان کی تعداد کے مطابق قضا کرنا واجب ہوتا ہے۔ اسی طرح پورا مہینہ افطار کیا ہو تو اس کا اعتبار ہوگا۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَعِدَّةٌ اس کو رفع مبتدا کی خبر کے اعتبار سے ہے اس کی تقدیر الحکم بالواجب

1۔ صحیح بخاری، باب لم یعب اصحاب النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام بعضہم بعضا فی الصوم والافطار، حدیث 1811، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

عدۃٌ ہے۔ فعلیہ عدۃٌ بھی صحیح ہے (1)۔ کسائی نے کہا: فعدۃً بھی جائز ہے یعنی فلیصم عدۃً من ایام۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے اس پر روزوں کی تعداد ہے۔ مضاف کو حذف کیا گیا ہے اور عدۃ کو اس کی جگہ رکھا گیا ہے۔ عدۃٌ۔ یہ العد سے فعلۃ کے وزن پر ہے یہ بمعنی معدود ہے جیسے طحن بمعنی مطحون ہوتا ہے تو کہتا ہے: اسمع جعجعۃ ولا اری طحنا (یہ اس شخص کی مثال دی جاتی ہے جو کثرت سے کلام کرتا ہے اور عمل نہیں کرتا) اسی سے عورت کی عدت ہے۔

مِنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ، اُخَرَ سیبویہ کے نزدیک غیر منصرف ہے کیونکہ یہ الف لام سے پھیرا گیا ہے۔ کیونکہ اس باب سے فُعَل کے وزن پر الف لام کے ساتھ آتا ہے جیسے الکبر، الفضل۔ کسائی نے کہا: یہ آخر سے معدول ہے۔ جیسے تو کہتا ہے حمراء، حمر، اسی وجہ سے یہ غیر منصرف ہے۔ بعض نے فرمایا یہ غیر منصرف ہے کیونکہ یہ جُمَع کے وزن پر ہے، یہ ایام کی صفت ہے اُخریٰ نہیں آیا تاکہ یہ شبہ نہ ہو کہ یہ عدۃ کی صفت ہے۔ بعض نے فرمایا: اخر یہ اخریٰ کی جمع ہے گویا ایام اخریٰ پھر کثرت کی وجہ سے ایام اخر کہا گیا۔ بعض نے فرمایا: اگر یہ ایام کی صفت ہوتا تو مونث ہوتا اسی وجہ سے اُخر کے ساتھ نعت لگائی گئی ہے۔

مسئلہ نمبر 7: لوگوں کا قضا روزے متواتر رکھنے کے متعلق اختلاف ہے۔ اس کے بارے میں دو قول ہیں: دونوں دارقطنی نے اپنی سنن میں ذکر کئے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرمایا فعدۃ من ایام اُخر متشابہات نازل ہوا ہے پھر متشابہات ساقط ہو گیا اور یہ فرمایا: یہ اسناد صحیح ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس پر رمضان کے روزے ہوں وہ متواتر رکھے اور ان میں انقطاع نہ کرے۔ اس کی سند میں عبدالرحمن بن ابراہیم ضعیف الحدیث ہے۔ حضرت ابن عباس سے قضا روزوں کے متعلق مروی ہے، صمہ کیف شئت۔ تو جیسے چاہے روزے رکھ۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا: صمہ کما افطرتہ۔ جیسے تو نے افطار کئے اسی طرح روزے رکھ۔ حضرت ابو عبیدہ بن جراح، حضرت ابن عباس، حضرت ابو ہریرہ، حضرت معاذ بن جبل اور حضرت عمرو بن عاص سے مسنداً مروی ہے۔ محمد بن منکدر نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رمضان کے (قضا) روزے علیحدہ علیحدہ قضا کرنے کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: یہ تجھ پر منحصر ہے تم بتاؤ اگر تم میں سے کسی پر قرض ہو ایک درہم، وہ دو درہم ادا کرے تو کیا وہ ادا ئیگی نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ معاف کرنے اور بخشنے کا زیادہ حقدار ہے۔ اس کی سند حسن ہے مگر مرسل ہے اور متصل ثابت نہیں ہے۔ مؤطا امام مالک میں نافع سے مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے تھے: رمضان کے متصل روزے رکھے جو مرض یا سفر کی وجہ سے متواتر افطار کرے۔ الباجی نے ''المنتقی'' میں فرمایا یہ احتمال ہے کہ وجوب کے متعلق خبر ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ استحباب کے متعلق خبر ہو، جمہور کا قول استحباب پر ہے۔ اگر وہ جدا جدا بھی رکھے تب بھی جائز ہے۔ امام مالک اور امام شافعی کا یہی قول ہے۔ اس قول کی صحت پر دلیل یہ ارشاد ہے **فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ**۔ یہاں متفرق اور متواتر کی کوئی تخصیص نہیں فرمائی۔ جب متفرق رکھے گا تو دوسرے دنوں کی گنتی پوری کر دی پس اس کا جائز ہونا واجب ہے۔ ابن عربی نے کہا: (رمضان کے) مہینہ میں تواتر واجب ہے کیونکہ وہ معین ہے اور قضا میں تعیین واجب نہیں۔ پس تفریق جائز ہے۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

مسئلہ نمبر 8: جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ یہ قضا کے وجوب پر بغیر زمانہ کی تعیین کی دلیل ہے کیونکہ لفظ زمانہ کے متعلق عام ہے بعض، بعض کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ صحیحین میں حضرت عائشہ سے مروی ہے، فرمایا: مجھ پر رمضان کے روزے ہوتے تھے میں شعبان سے پہلے قضا نہیں کرسکتی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشغولیت کی وجہ سے۔ ایک روایت میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ کے خیال سے (1)۔ یہ نص ہے اور آیت کا بیان ہے۔ یہ داؤد کے قول کا رد کرتی ہے۔ اس پر دو شوال سے قضا واجب ہے تو جس نے دو شوال کو روزہ نہ رکھا پھر وہ مر گیا تو ان کے نزدیک وہ گنہگار ہے اور انہوں نے اس پر بنیاد رکھی ہے کہ جس پر غلام کا آزاد کرنا واجب تھا پھر اس نے غلام پایا جو ثمن کے ساتھ بیچا جاسکتا تھا تو اس کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اس سے تجاوز کرے اور کوئی دوسرا خرید ے کیونکہ اس پر پہلا غلام آزاد کرنا واجب تھا جو اس نے پایا تھا دوسرا غلام جائز نہیں ہے۔ اگر اس کے پاس غلام ہو تو اس کے لئے دوسرا خریدنا جائز نہیں اگر وہ مر جائے جو اس کے پاس ہے تو عتق باطل نہ ہوگا جس طرح اس کے حق میں عتق باطل ہو جاتا ہے جو معین غلام کو آزاد کرنے کی نذر مانے پھر وہ مر جائے تو اس کی نذر باطل ہو جائے گی اور یہ اس کے قول کو فاسد کرتا ہے۔ بعض اصولی علماء نے کہا: جب شوال کے دوسرے دن کے گزرنے کے بعد وہ مر جائے تو عزم کی شرط پر گنہگار نہ ہوگا۔ صحیح یہ ہے کہ اس صورت میں وہ نہ تو گنہگار ہوگا اور نہ وہ کوتاہی کرنے والا شمار ہوگا۔ یہ جمہور کا قول ہے لیکن جلدی قضا کرنا مستحب ہے تاکہ کہیں اسے موت نہ آجائے اور اس پر فرض باقی ہو۔

مسئلہ نمبر 9: جس پر رمضان کے قضا روزے ہوں اور اس پر عید الفطر کے بعد اتنے ایام گزر گئے جن میں اس کا روزے رکھنا ممکن تھا اس نے روزوں کو موخر کیا پھر اس کو کوئی مانع لاحق ہوا جس نے اسے دوسرے رمضان تک قضا کرنے سے روکے رکھا تو اس پر کوئی کھانا کھلانا نہیں ہے کیونکہ وہ تاخیر کے جواز کی وجہ سے کوتاہی کرنے والا نہیں ہے۔ یہ مالکیوں میں سے بغدادی علماء کا قول ہے اور وہ ''المدونہ'' میں ابن قاسم کا قول روایت کرتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 10: اگر آئندہ شعبان تک بھی قضا روزے نہ رکھے تو کیا اس وجہ سے اس پر کوئی کفارہ واجب ہے یا نہیں؟

امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور اسحاق نے کہا: ہاں، اس پر قضا ہے۔ امام ابو حنیفہ، حسن، نخعی اور داؤد نے کہا: نہیں۔

میں کہتا ہوں: امام بخاری کا خیال بھی یہی ہے کیونکہ انہوں نے لکھا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابن عباس سے مرسلا مروی ہے کہ وہ کھانا کھلائے اور اللہ تعالیٰ نے کھانا کھلانے کا ذکر نہیں کیا بلکہ فرمایا فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ۔

میں کہتا ہوں: حضرت ابو ہریرہ سے مسنداً اس شخص کے بارے میں مروی ہے جو رمضان کے قضا روزوں میں کوتاہی کرتا ہے حتیٰ کہ دوسرا رمضان آجاتا ہے۔ فرمایا: وہ لوگوں کے ساتھ اس رمضان کے روزے رکھے اور جن روزوں میں کوتاہی کی ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائے۔ اس کو دار قطنی نے نقل کیا ہے اور فرمایا: یہ سند صحیح ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے بارے میں فرمایا جس نے رمضان کے مہینہ کے روزے کسی مرض کی وجہ سے نہیں رکھے پھر وہ صحیح ہو گیا اور پھر بھی روزے نہیں رکھے حتیٰ کہ دوسرا رمضان آگیا تو وہ اس رمضان کے روزے رکھے پھر اس

1۔ صحیح بخاری، باب متی یقضی رمضان، حدیث نمبر 1814، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مہینہ کے روزے رکھے جس کے روزے افطار کئے تھے یا یہ ہر دن کے لئے ایک مسکین کو کھانا کھلائے۔ اس کی سند میں ابن نافع اور ابن وجیہ دو ضعیف راوی ہیں۔

مسئلہ نمبر 11: اگر کسی کا مرض لمبا ہو گیا اور وہ صحیح نہ ہوا حتیٰ کہ دوسرا رمضان آ گیا تو دارقطنی نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ وہ ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو ایک مد گندم کھلائے پھر اس پر قضا نہیں ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے فرمایا: جب دو رمضانوں کے درمیان صحیح نہ ہو تو اس رمضان کے روزے رکھے اور دوسرے رمضان کی طرف سے کھانا کھلائے اور اس پر قضا نہیں ہے۔ جب صحیح ہوا اور روزہ نہ رکھا حتیٰ کہ دوسرا رمضان آ جائے تو اس رمضان کے روزے رکھے اور گزشتہ رمضان کی طرف سے کھانا کھلائے جب افطار کرے تو قضا کرے۔ اس کی سند صحیح ہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: صحابہ کے اقوال سے قیاس کے خلاف حجت پکڑی جاتی ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ ایک شخص ان کے پاس آیا اور پوچھا: میں دو رمضان بیمار رہا۔ اسے حضرت ابن عباس نے فرمایا: تمہاری مرض متواتر رہی ہے یا درمیان میں تو صحیح بھی ہوا تھا؟ اس شخص نے کہا: میں صحیح ہوا تھا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: دونوں رمضانوں کے روزے رکھ اور ساٹھ مساکین کو کھانا کھلا۔ یہ حضرت ابن عباس کے اس قول کا بدل ہے: اگر اس کے ساتھ مرض بڑھ جائے تو اس پر قضا نہیں ہے۔ یہ حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت کے بارے میں ان کے مذہب کے مشابہ ہے کہ وہ کھانا کھلائیں اور ان پر قضا نہیں ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 12: پھر جن علماء نے کھانا کھلانا واجب کیا ہے، اس کھانے کی مقدار میں اختلاف ہے۔ حضرت ابو ہریرہ، قاسم بن محمد، امام مالک، امام شافعی فرماتے ہیں: ہر دن کی طرف سے ایک مد کھلائے۔ ثوری نے کہا: ہر دن کے بدلے نصف صاع کھلائے۔

مسئلہ نمبر 13: پھر اس شخص کے بارے اختلاف ہے جو رمضان کے قضا روزوں میں افطار کرے یا جماع کرے اس پر کیا واجب ہے؟ امام مالک نے فرمایا: جس نے بھول کر رمضان کے قضا روزوں میں سے کوئی روزہ توڑ دیا تو اس پر بغیر قضا کے کچھ واجب نہیں ہے۔ اس کے لئے مستحب ہے کہ اختلاف کی وجہ سے اس روزے کو پورا کرے پھر اس کی قضا کرے اور اگر جان بوجھ کر افطار کیا تو گنہگار ہوگا اور اس پر اس دن کی قضا کے علاوہ کچھ نہ ہوگا اور اس روزہ کی پابندی نہ کرے کیونکہ اس کو ان چیزوں سے رو کنے کا اب کوئی معنی نہیں جن سے روزہ دار رکتا ہے کیونکہ جان بوجھ کر توڑنے کی وجہ سے علماء کے نزدیک وہ روزہ دار نہیں رہا۔ رہا کفارہ تو امام مالک اور ان کے اصحاب کے نزدیک اس میں کفارہ واجب نہیں ہے۔ یہی جمہور کا قول ہے۔ امام مالک نے فرمایا: جس نے بیوی سے حقوق زوجیت ادا کر کے یا اس کے علاوہ کسی طرح رمضان کا قضا روزہ توڑا تو اس پر کفارہ نہیں ہے، اس پر اس دن کی قضا ہے۔ قتادہ نے کہا: جس نے رمضان کے قضا روزے میں جماع کیا اس پر قضا اور کفارہ ہے۔

ابن القاسم نے مالک سے روایت کیا ہے کہ جس نے رمضان کا قضا روزہ توڑ دیا تو اس پر دو دن کی قضا ہے۔ ابن القاسم پہلے بھی فتویٰ دیتے تھے پھر اس سے رجوع کر لیا تھا پھر فرمایا: اگر قضا کی قضا میں جان بوجھ کر افطار کیا تو اس کی جگہ دو دنوں کے روزے رکھے گا، جیسے جس نے اپنا حج اپنی بیوی سے حقوق زوجیت ادا کرنے کے ساتھ فاسد کر دیا، پھر اس نے آئندہ سال حج

کیا پھر اسے اپنی بیوی سے جماع کرنے کے ساتھ فاسد کر دیا تو اس پر دو حج ہوں گے۔ ابو عمرو نے کہا: ابن وہب اور عبدالملک نے حج میں اس کی مخالفت کی ہے۔ مختلف فیہ میں اصل پر قیاس واجب نہیں ہے۔ میرے نزدیک ..... واللہ اعلم صحیح یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں ایک دن کی قضا واجب ہے کیونکہ یہ ایک دن تھا اس نے اسے دو مرتبہ فاسد کیا۔

میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ کے ارشاد فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ کا یہی مقتضا ہے جب اس نے قضا رمضان میں افطار کی وجہ سے ایک پورا دن روزہ رکھ لیا تو اس نے واجب ادا کر دیا اس پر اس کے علاوہ کچھ واجب نہیں ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 14: جمہور علماء کا قول ہے کہ جو کسی بیماری کی وجہ سے رمضان کا روزہ توڑ دے پھر وہ اسی بیماری کی وجہ سے مر جائے یا وہ سفر کرے اور اسی سفر میں مر جائے تو اس پر کچھ واجب نہیں۔ طاؤس اور قتادہ نے اس مریض کے بارے میں فرمایا جو صحیح ہونے سے پہلے مر جائے کہ اس کی طرف سے کھانا کھلایا جائے۔

مسئلہ نمبر 15: اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جس پر رمضان کے روزے تھے اور ابھی قضا نہیں کئے تھے۔ امام مالک، امام شافعی اور ثوری نے کہا: کوئی کسی کی طرف سے روزہ نہ رکھے۔ امام احمد، اسحاق، ابو ثور، لیث، ابو عبید اور اہل ظواہر نے کہا: اس کی طرف سے روزہ رکھا جائے مگر انہوں نے اس کو نذر کے ساتھ خاص کیا ہے۔ اسی طرح امام شافعی سے مروی ہے۔ امام احمد اور اسحاق نے رمضان کے قضا روزوں کے متعلق بتایا کہ اس کی طرف سے کھانا کھلایا جائے۔ جنہوں نے روزہ رکھنے کا قول کیا ہے انہوں نے مسلم کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مروی سے حجت پکڑی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو مر جائے اور اس پر روزہ ہو تو اس کا ولی اس کی طرف سے روزہ رکھے (1) مگر یہ ارشاد روزہ میں عام ہے اور مسلم کی حضرت ابن عباس سے روایت اس کی خاص کرتی ہے۔ فرمایا: ایک عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور عرض کی: یارسول اللہ! میری والدہ فوت ہوگئی ہے اور اس پر نذر کا روزہ تھا۔ ایک روایت میں ہے کیا میں اس کی طرف سے روزہ رکھوں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم بتاؤ اگر تیری ماں پر قرض ہوتا تو تو اسے ادا کرتی تو کیا وہ اس کی طرف سے ادا ہو جاتا؟ اس نے کہا: ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو اپنی ماں کی طرف سے روزہ رکھ۔ امام مالک اور ان کے ہم مذہب لوگوں نے اس قول سے حجت پکڑی ہے: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (فاطر: 18) (کوئی کسی دوسرے کا بوجھ اٹھانے والا نہیں) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ (النجم) (انسان کے لئے نہیں ہے مگر جو اس نے کوشش کی) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا (انعام: 164)

اور اس حدیث سے حجت پکڑی ہے جو نسائی نے حضرت ابن عباس سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے، فرمایا: کوئی کسی کی طرف سے نماز نہ پڑھے اور کوئی کسی کی طرف سے روزہ نہ رکھے بلکہ اس کی طرف سے ہر دن کے بدلے ایک مد گندم کھلائی جائے۔

میں کہتا ہوں: یہ حدیث عام ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ لا یصوم احد عن احد سے مراد رمضان کا روزہ ہو۔ رہا نذر کا روزہ

1۔ صحیح بخاری، باب من مات وعلیہ صوم، حدیث نمبر 1816، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تو وہ جائز ہے۔ حضرت ابن عباس وغیرہ کی حدیث کی دلیل کی وجہ سے۔ صحیح مسلم میں حضرت بریدہ کی حدیث حضرت ابن عباس کی حدیث کی طرح ہے اور اس کے بعض طرق میں ہے دو مہینوں کے روزے تھے۔ کیا میں اس کی طرف سے روزہ رکھوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کی طرف سے روزہ رکھو۔ پھر اس عورت نے کہا: اس نے کبھی حج نہیں کیا تھا، کیا میں اس کی طرف سے حج کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تو اس کی طرف سے حج کر۔ اس عورت کا قول کہ دو مہینے کے روزے تھے، یہ رمضان کے روزے ہونے کی نفی کرتا ہے۔ واللہ اعلم۔ سب سے قوی دلیل جو امام مالک کی طرف سے پیش کی جاتی ہے وہ اہل مدینہ کا عمل ہے اور قیاس جلی اس کی تائید کرتا ہے اور یہ عبادت بدنی ہے اس میں مال کا کوئی دخل نہیں ہے پس جس پر بدنی عبادت جیسے نماز واجب ہو تو دوسرا اس کی طرف سے ادا نہیں کرے گا اور یہ قول، حج کرنے کے قول سے نہیں ٹوٹتا کیونکہ اس میں مال کا دخل ہے (☆)۔

مسئلہ نمبر16: اس آیت میں ان علماء نے استدلال کیا ہے جو کہتے ہیں کہ سفر میں روزہ منعقد ہی نہیں ہوتا اس پر ہمیشہ قضا ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ۔ یعنی اس پر تعداد ہے کلام میں نہ حذف ہے، نہ اضمار ہے اور اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ سفر میں روزہ نیکی میں سے نہیں ہے۔ فرمایا: جو نیکی میں سے نہ ہوگا وہ گناہ ہوتا ہے۔ یہ دلیل ہے کہ رمضان کا روزہ سفر میں جائز نہیں۔

جمہور علماء کہتے ہیں: فافطر محذوف ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور یہی قول صحیح ہے کیونکہ حضرت انس کی حدیث میں ہے: ہم نے رمضان میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر کیا کسی روزہ دار نے افطار کرنے والے پر اور کسی افطار کرنے والے نے روزہ دار پر عیب نہ لگایا۔ اس کو مالک نے حمید الطویل سے انہوں نے حضرت انس سے روایت کیا ہے اس کو مسلم نے حضرت ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم نے رسول اللہ ﷺ سے مل کر ایک جنگ میں شرکت کی رمضان سے سولہ دن گزر گئے تھے ہم میں سے بعض نے روزہ رکھا تھا اور بعض نے افطار کیا تھا۔ روزہ دار نے افطار کرنے والے پر اور افطار کرنے والے نے روزہ دار پر عیب نہیں لگایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ۭ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ۭ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾

اس میں پانچ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر1: وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ جمہور علماء نے طا کے کسرہ اور یا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اس کی اصل یطوقونہ تھی کسرہ کو طا کی طرف نقل کیا گیا اور واو کو ماقبل کسرہ کی وجہ سے کسرہ سے بدلا گیا۔ حمید نے اصل پر بغیر اعلال کے پڑھا ہے اور قیاس اعلال ہے (1)۔ حضرت ابن عباس کی مشہور قراءت یطوقونہ طاء مخففہ کے فتحہ اور واو کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کا معنی ہے وہ تکلیف اٹھاتے ہیں۔ مجاہد سے یطیقونہ طاء کے بعد یاء کے ساتھ یکیلونہ کے لفظ پر پڑھا ہے۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

☆ ائمہ احناف کا نقطہ نظر بھی یہی ہے۔

یہ باطل اور محال ہے کیونکہ فعل طوق سے ماخوذ ہے اس میں واو لازم اور واجب ہے اس مثال میں یا کا کوئی دخل نہیں ہے۔

ابو بکر انباری نے کہا: احمد بن یحییٰ النحوی نے ابن ذوئب کا یہ شعر پڑھا ہے:

فقیل تحمل فوق طوقك انها مطبعة من یاتها لا یضیرها

طوق میں واو کو ظاہر کیا، اس کی وجہ سے صحیح یہ ہے کہ واو کی جگہ یا کو رکھنے والا صواب (صحیح رائے) سے دور ہے۔ ابن انباری نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، یطیقونه یا کے فتحہ، طا کی تشدید اور فتحہ کے ساتھ، پھر یا کی تشدید اور فتحہ کے ساتھ بمعنی یطیقونه کہا جاتا ہے طاق، اطاق، اَطیَق سب کا ایک معنی ہے۔ حضرت ابن عباس، حضرت عائشہ، حضرت طاؤس اور حضرت عمرو بن دینار سے یطوقونه یا مفتوحہ، طا مشددہ مفتوحہ کے ساتھ مروی ہے۔ لغت میں یہ درست ہے کیونکہ اس کی اصل لیتطوقونه ہے تا کو ساکن کر کے طا میں ادغام کیا گیا تو طا مشددہ ہو گی اور یہ قرآن سے نہیں ہے خلاف اس کے جس نے اس قراءت کو قرآن ثابت کیا ہے۔ یہ تفسیر کی بنا پر قراءت ہے۔ اہل مدینہ اور شام نے۔ فِدْیَةُ طَعَامُ مضاف کر کے پڑھا ہے اور مساکین جمع پڑھا ہے۔ حضرت ابن عباس نے طعام مسکین، مفرد پڑھا ہے جیسا کہ بخاری، ابوداؤد اور نسائی نے عطا سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے(1)۔ یہ عمدہ قراءت ہے کیونکہ اس نے ایک دن میں جو حکم تھا اس کو بیان کیا۔ ابو عبید نے اس کو اختیار کیا یہ ابو عمرو، حمزہ اور کسائی کی قرأت ہے۔ ابو عبید نے کہا اس قرأت نے بیان کیا کہ ہر دن کے لئے ایک شخص کو کھانا کھلانا ہے اور واحد جمع کی ترجمانی کرتا ہے جبکہ جمع، واحد کی ترجمانی نہیں کرتی۔ مساکین جمع ہو تو معلوم نہیں ہوتا ان میں سے کتنے ایک دن میں مگر کسی دوسری آیت سے اور مساکین میں جمع کی قراءت اس کو ظاہر کرتی ہے۔

کیونکہ الذین یطیقونه جمع اور ان میں سے ہر ایک کو ایک مسکین لازم تھا پس اس کا لفظ جمع لایا گیا جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِیْنَ جَلْدَةً (النور: 4) یعنی ہر ایک کو اسی کوڑے لگاؤ۔ اسی کوڑے ان تمام میں متفرق طور پر نہیں ہیں بلکہ ہر ایک کے لئے اسی کوڑے ہیں۔ ابو علی نے یہ معنی بیان کیا(2)۔ جمع کی قراءت نحاس نے اختیار کی۔ فرمایا: ابو عبید نے جو اختیار کیا وہ مردود ہے کیونکہ یہ دلالت سے پہچانی گئی ہے۔ اور عَلَى الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَهٗ فِدْیَةٌ طَعَامُ مِسْكِیْنٍ کا معنی یہ ہے کہ ہر دن کے لئے ایک مسکین ہے اس قراءت کا اختیار جمع پر جمع کو رد کرتا ہے۔ نحاس نے کہا: ابو عبید نے فدیةٌ طعامُ پڑھنا پسند کیا ہے فرمایا: طعام سے مراد فدیہ ہے پس طعام کا صفت ہونا جائز نہیں کیونکہ یہ جوہر ہے لیکن بطور بدل جائز ہے۔ فدیة طعامِ اضافت کے ساتھ پڑھنا اس سے زیادہ واضح ہے کیونکہ فدیة مبہم ہے طعام وغیرہ کے لئے واقع ہوتا ہے۔ پس یہ تیرے قول ھذا ثوب خزٍ کی طرح ہے۔

مسئلہ نمبر 2: آیت کی مراد میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ منسوخ ہے۔ بخاری نے روایت کیا ہے، ابن نمیر نے فرمایا: ہمیں اعمش نے بتایا انہوں نے فرمایا: ہمیں عمرو بن مرہ نے بتایا انہوں نے فرمایا: ہمیں ابن ابی لیلیٰ نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ رمضان کا حکم نازل ہوا تو لوگوں پر گراں گزرا۔ پس جس نے ہر دن

1۔ سنن ابی داؤد، باب نسخ قوله تعالیٰ و علی الذین یطیقونه فدیة، حدیث نمبر 1972، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

ایک مسکین کو کھانا کھلایا اس نے روزہ چھوڑ دیا ان لوگوں میں سے جو روزہ رکھنے کی طاقت بھی رکھتے تھے۔ پہلے ان کو اس کی رخصت دی گئی تھی پھر اس کو وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّكُمْ نے منسوخ کر دیا۔ اسی پر جمہور کی قراءت یطیقونہ ہے یعنی وہ روزہ کی طاقت رکھتے تھے۔ کیونکہ روزے کا فرض اسی طرح تھا جو چاہتا روزہ رکھتا اور جو چاہتا مسکین کو کھانا کھلاتا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ آیت شیوخ اور بوڑھے لوگوں کے لئے رخصت تھی جب کہ وہ افطار کرنا چاہیں اگرچہ وہ روزے کی طاقت بھی رکھتے ہوں۔ پھر یہ آیت اس قول فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (البقرہ:185) سے منسوخ ہو گئی۔ پس یہ رخصت ختم ہو گئی مگر اس کے لئے باقی ہے جو ان میں سے روزہ رکھنے سے عاجز ہے۔(1)

فراء نے کہا: یطیقونہ میں ضمیر کا مرجع صیام ہونا بھی جائز ہے۔ یعنی ان پر جو روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں وہ جب افطار کریں تو کھانا کھلائیں پھر یہ وَ اَنْ تَصُوْمُوْا کے ساتھ منسوخ ہو گیا اور یہ بھی جائز ہے کہ ضمیر کا مرجع فدیہ ہو یعنی جو فدیہ دینے کی طاقت رکھتے ہیں اور رہی یطوقونہ کی قراءت اس کا معنی ہے: وہ مشقت جو ان کو لاحق ہوئی ہے اس کے ساتھ روزہ رکھتے ہیں جیسے مریض اور حاملہ عورت وہ دونوں اس پر قدرت رکھتے ہیں لیکن مشقت کے ساتھ جو نہیں لاحق ہوئی ہے، اگر وہ روزہ رکھ لیں تو بھی جائز ہے اور اگر وہ فدیہ دیں تو یہ بھی ان کے لئے جائز ہے۔ حضرت ابن عباس نے یطیقونہ کی تفسیر یتکلفونہ سے بیان فرمائی ہے۔ اگر ان سے اسناد صحیح ہو۔ بعض نقل کرنے والوں نے اسے قرآن میں داخل کر دیا۔ ابوداؤد نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے(2)، وَ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فرمایا یہ حبلی (حاملہ عورت) اور دودھ پلانے والی عورت کے لئے ثابت ہے اور حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ وَ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ بوڑھے اور بوڑھی عورت کے لئے رخصت تھی حالانکہ وہ روزہ رکھ سکتے تھے وہ افطار کریں اور ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائیں اور حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت کو جب اپنی اولاد پر خوف ہو تو وہ افطار کریں اور کھانا کھلائیں (3)۔ دارقطنی نے حضرت ابن عباس سے یہ بھی روایت کیا ہے، فرمایا: بوڑھے آدمی کے لئے رخصت دی گئی ہے کہ وہ افطار کرے اور ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائے اور اس پر قضا نہیں ہے۔ یہ صحیح سند ہے۔ حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے، فرمایا: وَ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ یہ منسوخ نہیں ہے۔ اس سے مراد بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت ہیں جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے وہ ہر دن کی جگہ ایک مسکین کو کھانا کھلائیں۔ یہ صحیح ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے آپ نے اپنی ام ولد کو فرمایا جو حاملہ تھی یا دودھ پلانے والی تھی، تو ان لوگوں میں سے ہے جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے تم پر جزا ہے، قضا نہیں ہے۔ یہ اسناد صحیح ہے۔ ایک روایت میں ہے، آپ کی ام ولد دودھ پلاتی تھی (بغیر شک کے ہے) اس کو تکلیف ہوئی تھی تو آپ نے اسے افطار کرنے کا حکم دیا اور قضا نہ کرنے کا حکم دیا۔ یہ صحیح ہے۔

میں کہتا ہوں: حضرت ابن عباس سے صحیح اسانید کے ساتھ ثابت ہے کہ آیت منسوخ نہیں ہے۔ یہ جن کا ذکر کیا گیا ہے ان

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا
2۔ سنن ابی داؤد، باب من قال هی مثبتة للشیخ، حدیث 1973، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ سنن ابی داؤد، باب من قال هی مثبتة للشیخ، حدیث 1974، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کے حق میں محکم ہے۔ پہلا قول بھی صحیح ہے مگر یہ احتمال ہے کہ نسخ وہاں تخصیص کے معنی میں ہو۔ متقدمین اکثر تخصیص کے معنی میں نسخ کو استعمال کرتے ہیں۔ واللہ اعلم۔ حضرات حسن بصری، عطا بن ابی رباح، ضحاک، نخعی، زہری، ربیعہ، اوزاعی اور اصحاب رائے نے فرمایا: حاملہ اور دودھ پلانے والی دونوں روزہ افطار کریں اور ان پر کھانا نہیں ہے۔ یہ مریض کی طرح ہیں وہ افطار کرتا ہے اور قضا کرتا ہے۔ یہ ابو عبید اور ابو ثور کا قول ہے۔ یہ ابو عبید نے ابو ثور سے حکایت کیا ہے۔ ابن منذر نے اس کو اختیار کیا ہے۔ یہ امام مالک کا قول حاملہ کے بارے میں ہے اگر وہ افطار کرے۔ رہی دودھ پلانے والی اگر وہ افطار کرے تو اس پر قضا اور کھانا کھلانا ہے۔ امام شافعی اور امام احمد نے فرمایا: وہ افطار کریں گی اور کھانا کھلائیں گی اور قضا کریں گی۔ اور اس پر اجماع ہے کہ بوڑھے مرد اور عورتیں جو روزہ کی طاقت نہیں رکھتے اور سخت مشقت کے ساتھ روزہ رکھتے ہیں وہ افطار کریں اور جوان پر واجب ہے اس کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ ربیعہ اور مالک نے کہا: ان پر کچھ واجب نہیں ہے۔ لیکن امام مالک نے کہا: اگر وہ ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائیں تو میرے نزدیک محبوب ہے۔ حضرت انس، حضرت ابن عباس، حضرت قیس بن السائب اور حضرت ابو ہریرہ نے کہا: ان پر فدیہ ہوگا۔ یہ امام شافعی اور اصحاب الرائے کا مسلک ہے۔ انہوں نے تمام صحابہ کے قول کی اتباع کرتے ہوئے کہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ** پھر فرمایا **وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ** یہ لوگ نہ مریض ہیں اور نہ مسافر ہیں ان پر فدیہ واجب ہے اور امام مالک کے قول کی دلیل ہے کہ یہ عذر کی وجہ سے افطار کرنے والا ہے جو اس میں موجود ہے اور وہ بوڑھا ہونا ہے اور بڑی عمر کا ہونا ہے۔ پس کھانا کھلانا لازم نہ ہو گا جیسے مسافر اور مریض پر کھانا کھلانا نہیں ہے۔ یہ ثوری، مکحول سے مروی ہے، ابن منذر نے اس کو اختیار کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3: علماء کا فدیہ کی مقدار میں بھی اختلاف ہے۔ امام مالک نے کہا ہر دن کے بدلے ایک مد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مد کے برابر دے۔ یہی امام شافعی کا قول ہے۔ امام ابو حنیفہ نے کہا: ہر دن کا کفارہ ایک صاع کھجور یا نصف صاع گندم ہے۔ حضرت ابن عباس سے نصف صاع گندم مروی ہے۔ یہ دار قطنی نے ذکر کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرمایا: جو بوڑھا ہو اور روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اس پر ہر دن کے لئے ایک مد گندم ہے۔ حضرت انس بن مالک سے مروی ہے کہ وہ ایک سال روزہ رکھنے سے کمزور ہو گئے تو آپ نے کھانے کا ایک تھال تیار کیا پھر تیس مساکین کو بلایا اور انہیں سیر کر کے کھلایا۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ** ابن شہاب نے فرمایا: جو روزے کے ساتھ کھانا کھلانے کا ارادہ کرے اور مجاہد نے کہا: جو کھانے میں مد پر زیادتی کرے (1)۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا **فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا** دوسرے مسکین کو کھلائے تو یہ اس کے لئے بہتر ہے۔ یہ دار قطنی نے ذکر کیا ہے اور کہا: اس کی سند صحیح ثابت ہے اور دوسرا **خير**، اسم تفضیل ہے اسی طرح تیسرا اور پہلا بھی (2)۔ عیسیٰ بن عمر اور یحییٰ بن وثاب، حمزہ اور کسائی نے **يطوع خيرا** مشدد پڑھا ہے اور عین کو جزم دی ہے یتطوع کے معنی میں اور باقی قراء نے تطوع تا اور طا کی تخفیف اور عین کے فتحہ کے ساتھ ماضی کا صیغہ پڑھا ہے۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ ایضاً

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَنْ تَصُوْمُوْا یعنی روزہ تمہارے لئے بہتر ہے اسی طرح ابی نے پڑھا ہے(1) یعنی فدیہ کے ساتھ افطار سے روزہ رکھنا بہتر ہے یہ نسخ سے پہلے تھا۔ بعض نے فرمایا وَ اَنْ تَصُوْمُوْا یعنی سفر اور مرض میں بغیر تکلیف کے روزہ رکھنا، واللہ اعلم۔ یہ روزے رکھنے پر ابھارنے کا تقاضا کرتا ہے یعنی تم یہ جان لو اور روزہ رکھو۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۗ وَ مَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۗ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ لَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۫ وَ لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾

''ماہ رمضان المبارک جس میں اتارا گیا قرآن اس حال میں کہ یہ راہ حق دکھاتا ہے لوگوں کو اور (اس میں) روشن دلیلیں ہیں ہدایت کی اور حق و باطل میں تمیز کرنے کی سو جو کوئی پائے تم میں سے اس مہینہ کو تو وہ یہ مہینہ روزے رکھے اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اتنے روزے اور دنوں میں رکھ لے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تمہارے لئے سہولت اور نہیں چاہتا تمہارے لئے دشواری اور (چاہتا ہے) تم گنتی پوری کر لیا کرو اور اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کیا کرو اس پر کہ اس نے تمہیں ہدایت دی اور تاکہ تم شکر گزاری کیا کرو''۔

اس میں اکیس مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: شَهْرُ رَمَضَانَ اہل تاریخ نے کہا: سب سے پہلے رمضان کا روزہ حضرت نوح علیہ السلام نے رکھا جب وہ کشتی سے باہر نکلے تھے۔ مجاہد کا قول پہلے گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر امت پر رمضان فرض کیا تھا اور یہ معلوم ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے بھی امتیں تھیں۔ واللہ اعلم۔ الشہر یہ الاشہار سے مشتق ہے کیونکہ یہ مشہور ہوتا ہے کسی پر اس کا علم مشکل نہیں ہوتا جو اس کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسی سے کہا جاتا ہے: شهرت السيف (جب کوئی تلوار سونت لے) رمضان رمض الصائم یرمض سے مشتق ہے۔ جس کا معنی ہے: شدت پیاس کی وجہ سے روزہ دار کا پیٹ گرم ہو گیا۔ الرمضاء (ممدودۃ) سخت گرمی کو کہتے ہیں۔ اس سے حدیث ہے: صلاة الاوابين اذا رمضت الفصال۔ اوابین کی نماز اس وقت ہے جب گرمی سے پاؤں جلنے لگ جائیں۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ رمض الفصال کا مطلب ہے: گرمی اونٹوں کے پاؤں جلا دے اور وہ گرمی کی وجہ سے بیٹھ جائیں۔ رمضان گرمی میں واقع ہوا۔ یہ رمضاء سے ماخوذ ہے جوہری نے کہا: شهر رمضان اس کی جمع رمضانات اور ارمضاء آتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ لوگوں نے مہینوں کے اسماء لغت قدیمہ سے نقل کئے ہیں اور انہوں نے ان کے نام اس زمانہ کے ساتھ رکھے جس میں وہ مہینہ واقع ہوا۔ یہ مہینہ شدید گرمی میں واقع ہوا تو اس وجہ سے اس کا نام رمضان رکھا گیا۔ بعض علماء نے فرمایا: رمضان کو رمضان اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

گناہوں کو جلا دیتا ہے۔ یعنی اعمال صالحہ کے ساتھ گناہوں کو جلا دیتا ہے یہ الارماض سے ہے جس کا معنی جلانا ہے۔ اس سے رمضت قدمہ ہے۔ یہ الرمضاء سے ہے یعنی اس کا پاؤں جل گیا۔ ارمضتنی الرمضاء یعنی گرمی نے مجھے جلا دیا۔ اسی سے کہا جاتا ہے ارمضنی الامر۔ معاملہ نے مجھے جلا دیا۔ بعض علماء نے فرمایا: اس مہینہ میں دل موعظت اور آخرت کے امر میں فکر کی حرارت حاصل کرتے ہیں جس طرح ریت اور پتھر سورج کی گرمی حاصل کرتے ہیں۔ الرمضاء۔ گرم پتھر۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ رمضت النصل ارمضہ وارمُضُہٗ رمضاً سے مشتق ہے جس کا مطلب ہے دو پتھروں کے درمیان تیر کے بھالے کو کوٹنا تاکہ باریک ہو جائے۔ اسی سے نصل رمیض و مرموض ہے۔ یہ ابن السکیت سے مروی ہے۔ رمضان کو یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کہ وہ رمضان میں اپنے ہتھیاروں کو تیز کرتے تھے تاکہ ان کے ساتھ حرمت والے مہینوں کے داخل ہونے سے پہلے شوال میں جنگ کریں۔ ماوردی نے حکایت کیا ہے کہ اس کا نام زمانہ جاہلیت میں ناتق تھا۔

و فی ناتق اجلَتْ لدی حومة الوغی ودوَلَّتْ علی الادبار فرسان خثعما

اس شعر میں ناتق رمضان کے مہینہ کے لئے استعمال ہوا ہے۔

شَهۡرُ پر رفع ابتدا کی بنا پر ہے اور خبر الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ ہے یا یہ مبتدا کے اضمار کے ساتھ ہے۔ اس کا معنی ہے: المفروض علیکم صومه شهر رمضان، تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے۔ رمضان کے مہینہ کا روزہ یا یہ معنی کہ تم پر رمضان کا مہینہ فرض کیا گیا اور یہ بھی جائز ہے کہ شَهۡرُ مبتدا ہو اور الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ صفت ہو اور خبر فَمَنۡ شَهِدَ مِنۡكُمُ الشَّهۡرَ ہو(1)۔ الشَّهۡرَ کا ذکر تعظیماً لوٹایا گیا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلۡحَآقَّةُ ۙ مَا الۡحَآقَّةُ ۚ (الحاقہ) اور جائز ہے کہ جزا کا معنی اس میں داخل ہو کیونکہ شہر رمضان اگرچہ معرفہ ہے لیکن بعینہٖ معرفہ نہیں کیونکہ ہر آنے والے مہینہ میں عام ہے۔ یہ ابوعلی کا قول ہے۔ مجاہد اور شہر بن حوشب سے شہر کا نصب بھی مروی ہے۔ اس کو ہارون اعور نے حضرت ابوعمرو سے روایت کیا ہے(2)۔ اس کا معنی ہے: الزموا شهر رمضان یا صوموا، اور الذی انزل فیه القرآن اس کی نعت ہے اور تصوموا کے ساتھ اس کو نصب دینا جائز نہیں تاکہ صلہ اور موصول کے درمیان ان کی خبر کے ساتھ فاصلہ نہ ہو جائے اور وہ خیر لکم ہے۔ رمانی نے کہا اس پر ایاما معدودات کے قول سے بدل کے اعتبار سے نصب بھی جائز ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اس میں اختلاف ہے کہ کیا شہر کے بغیر رمضان کہا جائے یا نہیں۔ مجاہد نے اس کو ناپسند کیا ہے اس نے کہا: اسی طرح کہا جائے جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا(3) شَهۡرُ رَمَضَانَ اور حدیث میں ہے: رمضان نہ کہو کیونکہ اس کو منسوب کرو جس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے منسوب کیا اور فرمایا شَهۡرُ رَمَضَانَ فرماتے تھے: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے وہ اس معنی کی وجہ سے اس کے لفظ کی جمع بنانا ناپسند کرتے تھے اور اس روایت سے حجت پکڑتے تھے۔ رمضان اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ ابومعشر نجیح کی حدیث سے ہے اور یہ ضعیف ہے۔ بغیر اضافت کے رمضان کہنا بھی صحیح ہے جیسا کہ صحاح میں ثابت ہے۔ مسلم نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب رمضان آتا ہے تو رحمت کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کئے جاتے ہیں اور شیطان جکڑے جاتے ہیں۔ البستی کی صحیح میں حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب رمضان ہوتا ہے تو اس کے لئے رحمت کے دروازے کھولے جاتے ہیں، جہنم کے دروازے بند کئے جاتے ہیں اور شیاطین زنجیروں میں جکڑے جاتے ہیں (1)۔ ابن شہاب عن انس بن ابی انس کے سلسلہ سے مروی ہے کہ ان کے والد نے انہیں بتایا کہ انہوں نے حضرت ابوہریرہ کو یہ فرماتے سنا ... پھر یہ حدیث بیان کی۔ البستی نے کہا: انس بن ابی انس یہ مالک بن انس کا والد ہے۔ ابوانس کا نام مالک بن ابی عامر ہے یہ مدینہ طیبہ کے ثقہ لوگوں سے ہے ان کا سلسلہ نسب یہ ہے مالک بن ابی عامر بن عمرو بن حارث بن عثمان بن جثیل بن عمرو یمن کے قبائل میں سے ذی اصبح سے تھا۔

نسائی نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارے پاس رمضان آیا ہے، مبارک مہینہ ہے اللہ تعالیٰ نے تم پر اس کے روزے فرض کئے ہیں اس میں آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور اس میں دوزخ کے دروازے بند کئے جاتے ہیں اور اس میں سرکش شیطانوں کو جکڑ دیا جاتا ہے اس میں اللہ کی ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے جو اس کی خیر سے محروم رہا وہ محروم ہو گیا۔ ابو حاتم البستی نے بھی اس کو روایت کیا ہے اور فرمایا: سرکش شیطانوں کا جو ذکر آیا ہے پہلے جو مطلق احادیث میں ہے کہ شیطان کو باندھ دیا جاتا ہے اس کے لئے یہ تقیید ہے۔ نسائی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک انصاری عورت کو فرمایا: اذا کان رمضان فاعتمری فان عمرة فیه تعدل حجة۔ جب رمضان آئے تو تو عمرہ کر کیونکہ اس میں عمرہ کرنا حج کے برابر ہے۔ نسائی نے حضرت عبدالرحمن بن عوف سے روایت کیا ہے (2)، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تم پر رمضان کے روزے فرض کئے ہیں اور اس کا قیام تمہارے لئے سنت بنایا ہے۔ جو اس کا روزہ رکھے گا اور اس کا قیام کرے گا ایمان کی حالت میں اور ثواب کی نیت سے تو وہ اپنے گناہوں سے اس طرح نکل جائے گا جیسے جس دن بچے کو ماں جنم دیتی ہے (اور اس پر گناہ نہیں ہوتا) اس کے متعلق آثار کثیر ہیں۔ ان تمام احادیث میں رمضان کے ساتھ شہر کا لفظ نہیں ہے۔ عرب اکثر رمضان سے شہر کا ذکر ساقط کر دیتے ہیں۔

شاعر نے کہا:

جارية فی درعها الفضفاض ابیض من اخت بنی اباض

جاریةٌ فی رمضان الماضی تقطع الحدیث بالایماض

کھلی قمیص میں لڑکی تھی بنی اباض کی بہن سے سفید تھی۔ گزشتہ رمضان میں لڑکی تھی چمک کی وجہ سے بات کاٹتی تھی۔

رمضان کی فضیلت عظیم ہے اور ثواب بڑا ہے۔ اشتقاق کا معنی اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ گناہوں کو جلانے والا ہے اور اس کے علاوہ احادیث جو ہم نے ذکر کی ہیں وہ اس کی فضیلت پر دلیل ہیں۔

1۔ صحیح بخاری، باب مول یقال رمضان او شہر رمضان ومن رأی کله واسعا، حدیث نمبر 1766، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، باب ماجاء فی قیام شہر رمضان، حدیث نمبر 1317، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزے فرض کئے یعنی رمضان کے چاند کی مدت کی وجہ سے اس کو شہر بھی کہا جاتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے: فان غمّ علیکم الشھر اگر تم پر چاند ابر آلود ہو جائے۔ شاعر نے کہا:

اخوان من نجد علی ثقۃ والشھر مثل قلامۃ الظفر

حتی تکامل فی استدارتہ فی اربع زادت علی عشر

نجد سے بھائی پر اعتماد تھے چاند ناخن کے تراشے کی طرح تھا۔ حتیٰ کہ وہ گولائی میں مکمل ہوا چودھویں کی رات کو بڑھا۔ چاند ابر آلود ہو تو شعبان کے تیس دنوں کو مکمل کرنا فرض ہے اور رمضان کے تیس دن مکمل کرنا فرض ہے تا کہ ہم عبادت میں یقین سے داخل ہوں اور یقین سے خارج ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا: وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ (النحل: 44) (اور ہم نے نازل کیا آپ کی طرف یہ ذکر (قرآن) تا کہ آپ کھول کر بیان کریں لوگوں کے لئے جو نازل کیا گیا اس کی طرف)۔

ائمہ کرام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: چاند کو دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند کو دیکھ کر افطار کرو۔ اگر تم پر مطلع ابر آلود ہو تو تعداد کو مکمل کرو (1)۔ ایک روایت میں ہے، اگر تم پر مہینہ ابر آلود ہو جائے تو تیس دن شمار کرو۔ مطرف بن عبداللہ بن شخیر جو کبار تابعین میں سے تھے اور ابن قتیبہ جو لغت کے علماء میں سے تھے ان دونوں حضرات نے کہا: رمضان کے روزہ میں بادل کے وقت منازل کی تقدیر منازل کے حساب سے حساب لگایا جائے گا حتیٰ کہ اگر مطلع صاف ہوتا تو دیکھا جاتا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تم پر مطلع ابر آلود ہو تو تم اس کی منازل سے استدلال کرو (2) اور مہینہ کی تکمیل کا اندازہ اس کے حساب سے لگاؤ۔ جمہور نے کہا: فاقدروا کا معنی ہے: مقدار کو مکمل کرو۔ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث اس کی تفسیر بیان کرتی ہے: فاکملوا العدّۃ۔ داؤدی نے کہا ہے کہ فاقدروالہ کے معنی میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ منازل کا اندازہ کرو۔ ہم کسی کو نہیں جانتے جس نے یہ معنی کیا ہو۔ مگر بعض اصحاب شوافع نجومیوں کے قول کا اعتبار کرتے ہیں۔ اس پر اجماع حجت ہے۔ ابن نافع نے امام مالک سے "الامام" میں روایت کیا ہے: چاند کی رؤیت سے نہ روزہ رکھے نہ افطار کرے بلکہ حساب پر روزہ رکھے اور افطار کرے۔ اس قول کی نہ اقتداء کی جاتی ہے نہ اتباع۔ ابن عربی نے کہا: بعض اصحاب شافعی سے لغزش ہوئی ہے انہوں نے امام شافعی سے حکایت کیا ہے کہ انہوں نے حساب پر اعتماد کیا ہے یہ لغزش ہے۔ اللہ تعالیٰ ٹھوکر سے محفوظ رکھے۔

مسئلہ نمبر 4: امام مالک، امام شافعی کا اختلاف ہے کہ ایک شخص کی شہادت سے رمضان کا چاند ثابت ہوگا یا دو گواہوں سے ثابت ہوگا۔ امام مالک نے فرمایا: اس میں ایک شخص کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی کیونکہ یہ چاند پر گواہی ہے اور اس میں دو سے کم افراد کی گواہی قبول نہیں ہوتی۔ اس کی اصل شوال اور ذی الحجہ کے چاند پر شہادت ہے۔ امام شافعی اور امام ابو حنیفہ نے کہا: ایک شخص کی خبر قبول کی جائے گی کیونکہ ابو داؤد نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے (3)، فرمایا: لوگوں

1۔ صحیح بخاری، باب قول النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اذا رأیتم الھلال فصوموا فاذا رأیتموہ فافطروا، حدیث نمبر 1776، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، حدیث نمبر 1773 3۔ سنن ابی داؤد، باب فی شھادۃ الواحد علی رؤیۃ ھلال رمضان، حدیث 1995، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نے چاند دیکھا تو میں نے رسول اللہ ﷺ کو بتایا کہ میں نے چاند دیکھا ہے۔ پس آپ ﷺ نے روزہ رکھا اور لوگوں کو روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ دارقطنی نے اس کو نقل کیا ہے اور فرمایا: اس میں مروان بن محمد نے ابن وہب سے روایت کیا ہے اور وہ ثقہ ہے۔ دارقطنی نے روایت کیا ہے ایک شخص نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس رمضان کا چاند دیکھنے کی گواہی دی تو آپ نے روزہ رکھا۔ میرا خیال ہے آپ نے فرمایا: لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا اور حضرت علی نے فرمایا: شعبان کا میں ایک دن روزہ رکھوں۔ یہ میرے نزدیک رمضان کا ایک روزہ چھوڑنے سے زیادہ محبوب ہے۔ امام شافعی نے کہا: اگر عام لوگوں نے رمضان کا چاند نہ دیکھا ہو اور ایک عادل شخص نے دیکھا ہو تو میرا خیال ہے کہ میں اسے اثر اور احتیاط کی وجہ سے قبول کرلوں گا۔ امام شافعی نے اس کے بعد کہا: رمضان پر شہادت دینے کے لئے بھی دو گواہ ہیں۔ امام شافعی نے فرمایا: ہمارے بعض اصحاب نے کہا: میں اس پر دو گواہ ہی قبول کروں گا۔ یہ ہر مغیب پر قیاس ہے۔

مسئلہ نمبر 5: علماء کا اختلاف ہے اس شخص کے بارے میں جس نے صرف رمضان کا چاند دیکھا ہو یا صرف شوال کا چاند دیکھا ہو۔ ربیع نے امام شافعی سے روایت کیا ہے: جس نے تنہا رمضان کا چاند دیکھا وہ روزہ رکھے اور جس نے تنہا شوال کا چاند دیکھا وہ افطار کرے اور اس کو پوشیدہ رکھے۔ ابن وہب نے مالک سے اس شخص کے بارے روایت کیا ہے جس نے تنہا رمضان کا چاند دیکھا وہ روزہ رکھے کیونکہ اس کے لئے افطار کرنا مناسب نہیں کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ دن رمضان کے مہینہ سے ہے اور جس نے تنہا شوال کا چاند دیکھا وہ افطار نہ کرے کیونکہ لوگ تہمت لگائیں گے کہ اس نے افطار کیا جو مامون نہیں پھر جب یہ لوگ غالب آ جائیں گے تو کہیں گے ہم نے چاند دیکھا۔ ابن منذر نے کہا: یہی قول لیث بن سعد، امام احمد بن حنبل کا ہے۔ عطا اور اسحاق نے کہا: نہ وہ روزہ رکھے اور نہ افطار کرے۔ ابن منذر نے کہا: وہ روزہ رکھے اور افطار کرے۔

مسئلہ نمبر 6: اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ جب کوئی شخص کسی شہر میں چاند نظر آنے کی خبر دے پھر وہ شہر قریب ہوگا یا دور ہوگا اگر وہ شہر قریب ہے تو اس کا حکم ایک ہے اور اگر وہ شہر دور ہے تو ہر شہر والوں کے لئے اپنی رؤیت کا اعتبار ہے۔ یہ عکرمہ، قاسم اور سالم سے مروی ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے اور اسحاق نے بھی یہی کہا ہے۔ اس کی طرف بخاری نے اشارہ کیا ہے جہاں اس نے باب باندھا ہے کہ ہر شہر والوں کے لئے اپنی رؤیت کا اعتبار ہے اور دوسرے علماء نے کہا جب لوگوں کے نزدیک ثابت ہو جائے کہ فلاں شہر والوں نے چاند دیکھا تھا تو ان پر اس روزے کی قضا لازم ہے جو انہوں نے چھوڑا تھا۔ اسی طرح لیث بن سعد اور امام شافعی نے کہا: ابن منذر نے کہا: میں یہ نہیں جانتا مگر مزنی اور کوفی کا قول ہے۔

میں کہتا ہوں: الکیا طبری نے اپنی کتاب ''احکام القرآن'' میں ذکر کیا ہے: امام ابوحنیفہ کے اصحاب نے اس پر اجماع کیا ہے کہ جب کسی شہر والوں نے چاند دیکھ کر تیس دن روزے رکھے ہوں اور دوسرے شہر والوں نے انتیس روزے رکھے ہوں تو جنہوں نے انتیس روزے رکھے ہوں گے وہ ایک دن کی قضاء کریں گے۔ اصحاب شافعی کا یہ نظریہ نہیں ہے۔ کیونکہ شہروں کے مطالع کا مختلف ہونا جائز ہے۔ احناف کی دلیل یہ ارشاد ہے: وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ۔ ایک شہر والوں کی رؤیت سے ثابت ہوا کہ تعداد تیس ہے، پس ان پر ان کا مکمل کرنا واجب تھا اور ان کے مخالف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قول سے حجت پکڑتے ہیں

کہ چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر افطار کرو (الحدیث) اور یہ ہر قوم کی ان کے شہر میں عادت کے اعتبار کو ثابت کرتی ہے۔ ابو عمرو نے اجماع حکایت کیا ہے کہ دور والے شہروں کی رؤیت کی رعایت نہیں کی جائے گی۔ جیسے اندلس، خراسان سے دور ہے اور فرمایا: ہر شہر والوں کی اپنی رؤیت کا اعتبار ہے مگر جو بڑا شہر ہو اس کے قطر مسلمانوں کے دوسرے شہروں کے قریب ہوں تو پھر سب کے لئے ایک ہی رویت کافی ہوگی۔ مسلم نے کریب سے روایت کیا ہے کہ حضرت ام فضل بنت حارث نے حضرت امیر معاویہ کی طرف انہیں شام کی طرف بھیجا۔ کریب نے کہا: میں شام میں آیا اور اپنی ضرورت کو پورا کیا مجھ پر وہاں رمضان کا چاند طلوع ہوگیا جبکہ میں ابھی شام میں ہی تھا میں نے جمعہ کی رات چاند دیکھا تھا پھر میں مہینہ کے آخر میں مدینہ آیا تو مجھ سے حضرت عبداللہ ابن عباس نے پوچھا پھر چاند کا ذکر ہوا تو پوچھا: تم نے چاند کب دیکھا، میں نے کہا: ہم نے جمعہ کی رات چاند دیکھا تھا۔ حضرت عبداللہ نے پوچھا تو نے خود چاند دیکھا تھا؟ میں نے کہا: ہاں لوگوں نے چاند دیکھا، لوگوں نے روزہ رکھا اور حضرت معاویہ نے بھی روزہ رکھا۔ حضرت عبداللہ نے کہا ہم نے تو ہفتہ کی رات چاند دیکھا تھا۔ ہم روزہ رکھتے رہیں گے حتیٰ کہ ہم تیس دن مکمل کریں گے یا ہم خود چاند دیکھ لیں گے۔ میں نے کہا: تمہارے لئے حضرت معاویہ کی رویت اور اس کا روزہ کافی نہیں؟ حضرت عبداللہ بن عباس نے کہا: نہیں۔ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح حکم دیا ہے۔

ہمارے علماء نے فرمایا: حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح حکم دیا ہے، یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تصریح ہے۔ یہ حجت ہے کہ شہر جب دور ہوں جیسے شام، حجاز سے دور ہے تو ہر شہر والوں پر اپنی رؤیت پر عمل کرنا واجب ہے۔ دوسروں کی رؤیت کا اعتبار نہیں۔ اگرچہ امام اعظم کے نزدیک ثابت ہو جبکہ وہ لوگوں کو اس پر مجبور نہ کرے، اگر وہ لوگوں کو مجبور کرے تو اس کی مخالفت جائز نہیں۔ الکیا طبری نے کہا: حضرت ابن عباس کا قول کہ ''ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے۔'' یہ احتمال ہے کہ اس میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد صوموا لرؤیتہ وافطروا لرویتہ کی تاویل کی ہو۔ ابن عربی نے کہا: حضرت ابن عباس کے اس قول کی تاویل میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: انہوں نے اس کو رد کیا کیونکہ یہ خبر واحد تھی۔ بعض نے فرمایا: اس لئے رد کیا کیونکہ مطالع میں قطر مختلف تھے۔ یہ صحیح ہے کیونکہ قریب نے گواہی نہیں دی تھی۔ انہوں نے اس حکم کے متعلق بتایا تھا جو شہادت کے ساتھ ثابت تھا اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حکم ثابت میں خبر واحد بھی جائز ہیں اس کی مثال یہ ہے کہ اغمات میں چاند کا دیکھنا جمعہ کی رات ثابت ہوا اور اشبیلیہ میں ہفتہ کی رات کو نظر آئے تو ہر شہر والوں کی اپنی رؤیت کا اعتبار ہوگا کیونکہ سہل ستارہ اغمات میں نظر آتا ہے اور اشبیلیہ میں نظر نہیں آتا یہ اختلاف مطالع کی دلیل ہے۔ میں کہتا ہوں: امام مالک کا مذہب اس مسئلہ میں یہ ہے کہ ابن وہب اور ابن قاسم نے امام مالک سے ''المجموعہ'' میں روایت کیا ہے کہ جب اہل بصرہ رمضان کا چاند دیکھیں پھر کوفہ، مدینہ، یمن والوں کو یہ خبر پہنچے تو ان پر روزہ یا قضاء لازم ہے اگر ادا فوت ہو جائے۔ قاضی ابو اسحاق نے ابن ماجشون سے روایت کیا ہے کہ اگر ایک عام امر کے ساتھ بصرہ میں چاند ثابت ہو جائے جو شہادت اور تعدیل سے مستغنی ہو تو دوسرے شہر والوں پر بھی لازم ہوگی۔ اگر چاند کا ثبوت حاکم کے پاس دو آدمیوں کی شہادت سے ہو تو پھر ان شہروں پر روزہ رکھنا لازم ہوگا جو اس حاکم کی ولایت میں ہیں اور اگر چاند امیر المومنین کے پاس

ثابت ہو تو تمام مسلمانوں پر قضا لازم ہے۔ فرمایا: یہ امام مالک کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 7: جمہور لوگوں نے شہر کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ مضمر مبتدا کی خبر ہے یعنی ذلکم شھر المفترض علیکم صیامه شهر رمضان۔ یا الصوم شھرٌ یا الایام شھرٌ۔ اس کی تقدیر ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کتب کا نائب فاعل ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہے۔ یعنی کتب علیکم شھر رمضان۔ اور رمضان غیر منصرف ہے کیونکہ اس میں نون زائدہ ہے اور مبتدا کی حیثیت سے مرفوع ہونا بھی جائز ہے اور اس کی خبر الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کی خبر فمن شھد ہے الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ اس کی صفت ہے بعض نے فرمایا الصیام سے بدل کی حیثیت سے مرفوع ہے۔ جس نے کہا کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ میں الصِّیَامُ سے مراد تین روزے اور عاشورا کا روزہ ہے اس نے مبتدا ہونے کا قول کیا ہے اور جنہوں نے کہا الصِّیَامُ سے مراد رمضان ہے تو انہوں نے ابتدا یا الصیام سے بدل کی حیثیت سے مرفوع کہا ہے یعنی کتب علیکم شھر رمضان (1)۔ مجاہد، اشہر بن حوشب نے شہر کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ کسائی نے کہا۔ کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ کا معنی وان تصوموا شھر رمضان ہے۔ فراء نے کہا کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ یعنی ان تصوموا شھر رمضان۔ نحاس نے کہا: شھر رمضان کو تصوموا کے ساتھ نصب دینا جائز نہیں کیونکہ یہ صلہ میں داخل ہوگا پھر صلہ اور موصول کے درمیان تفریق کرے گا۔ اسی طرح صیام کے ساتھ نصب دینی بھی جائز نہیں لیکن اغراء کی بنا پر نصب دینا جائز ہے۔ ای الزموا شھر رمضان، و صوموا شھر رمضان۔ یہ قول بھی بعید ہے کیونکہ شہر کا ذکر پہلے نہیں ہوا تاکہ اس پر اغرا (ابھارنا) کیا جائے میں کہتا ہوں: کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ۔ یہ الشہر پر دلالت کرتا ہے پس اغرا جائز ہے۔ یہ ابو عبید کا اختیار ہے۔ اخفش نے کہا: ظرف کی بنا پر منصوب ہے۔ حسن اور ابو عمرو سے راء کا راء میں ادغام حکایت کیا ہے یہ جائز نہیں تاکہ دو ساکن جمع نہ ہوں (2) اور را کی حرکت کو ہا پر بدلنا جائز ہے ہا کو ضمہ دیا جائے گا پھر ادغام کیا جائے گا یہ کوفیوں کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 8: الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ یہ نص ہے کہ قرآن رمضان میں نازل ہوا۔ اور الله تعالیٰ کا یہ ارشاد اس کو بیان کرتا ہے: حٰمٓ ۚ وَ الۡكِتٰبِ الۡمُبِيۡنِ ۙ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ (دخان) حٰمٓ حق کو واضح کرنے والی کتاب کی قسم ہم نے اتارا ہے اسے ایک بابرکت رات میں اور الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ ۚ (القدر) ہم نے نازل کیا اسے قدر والی رات میں۔ یہ دلیل ہے کہ لیلۃ القدر رمضان میں ہے کسی اور مہینہ میں نہیں ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ قرآن لوح محفوظ سے لیلۃ القدر میں اکٹھا نازل ہوا۔ پھر آسمان دنیا میں بیت العزۃ میں رکھا گیا۔ پھر جبریل اوامر، نواہی اور اسباب کے مطابق تھوڑا تھوڑا اتارتے رہے۔ یہ بیس سال میں اترا (3)۔ حضرت ابن عباس نے کہا: قرآن لوح محفوظ سے یکبارگی آسمان دنیا میں فرشتوں کی طرف اتارا گیا پھر جبریل اسے مختلف اوقات میں اکیس سال میں اتارتے رہے۔ مقاتل نے شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ کے بارے میں فرمایا: لوح محفوظ سے ہر سال لیلۃ القدر میں آسمان دنیا کی طرف اتارا گیا پھر بیس مہینوں میں ملائکہ کی طرف اتارا گیا۔ جبریل بیس سال میں اس کو لے کر آئے۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً

میں کہتا ہوں: مقاتل کا یہ قول اجماع کے خلاف ہے قرآن اکٹھا نازل ہوا تھا۔ واللہ اعلم

حضرت واثلہ بن اسقع نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے یکم رمضان کو نازل کیے گئے تھے تورات چھ رمضان کو، انجیل تیرہ رمضان کو اور قرآن چوبیس رمضان کو نازل ہوا۔ (1)

میں کہتا ہوں: اس حدیث میں حسن کے قول کی دلیل ہے کہ لیلۃ القدر چوبیس رمضان کو ہوتی ہے۔ اس کا بیان ان شاء اللہ آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 9: اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَلْقُرْاٰنُ یہ اللہ تعالیٰ کے کلام کا اسم ہے اور یہ بمعنی المقروء (پڑھا گیا) ہے جیسے مشروب کو شراب کہا جاتا ہے، المکتوب کو کتاب کہا جاتا ہے اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ یہ قرء یقرء قراءۃ و قرانا کا مصدر ہے قراءت اور قرآن کا معنی ایک ہے۔ شاعر نے کہا:

ضحوا باشمط عنوان السجود به یقطع الليل تسبيحاً و قرآنا

اس شعر میں قرآنا بمعنی قراءت ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ سمندر میں شیطان بندھے ہوئے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان کو باندھا ہے قریب ہے وہ نکلیں اور لوگوں پر قراءت کریں، قرآن حکیم میں ہے: وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ۝ (الاسراء) یعنی فجر کی قراءت مقروکو قراءۃ کہا جاتا ہے۔ مفعول کو مصدر کا نام دینا عربوں کی عادت ہے جس طرح وہ معلوم کو علم، مضروب کو ضرب اور مشروب کو شرب کا نام دیتے ہیں جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے پھر اس میں استعمال مشہور ہوا اور اس کے ساتھ عرف شرعی متصل ہو گیا۔ پس قرآن اللہ کے کلام کا اسم بن گیا حتیٰ کہ جب کہا گیا القرآن غیر مخلوق تو اس سے مراد المقروء لیا گیا ہے نہ کہ اس کی قراءت اور وہ مصحف جس میں اللہ کا کلام لکھا جاتا ہے اس کو قرآن کہا جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دشمن کی زمین کی طرف قرآن کے ساتھ سفر نہ کرو۔ یہاں قرآن سے مراد مصحف ہے۔ یہ قرأت الشیء سے مشتق ہے جس کا معنی ہے: جمع کرنا۔ بعض علماء نے کہا: یہ اللہ کی کتاب کا علم ہے۔ یہ غیر مشتق ہے جیسے تورات اور انجیل یہ امام شافعی سے حکایت کیا اور صحیح یہ ہے کہ تمام میں اشتقاق ہے۔ مزید بیان آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 10: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هُدًى لِّلنَّاسِ، هُدًى قرآن سے حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے، یعنی لوگوں کے لئے ہدایت دینے والا ہے وَ بَيِّنٰتٍ، هُدًى پر معطوف ہے۔ الھدیٰ کا مطلب الارشاد اور البیان ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ یعنی لوگوں کے لئے بیان اور ارشاد ہے، اس سے مراد پورا قرآن ہے۔ محکم، متشابہ، ناسخ و منسوخ ذکر اور تخصیص سے شرف بخشا البینات سے مراد حلال، حرام، مواعظ اور احکام ہیں۔ بینات، بینہ کی جمع ہے یہ بان الشیء یبین سے مشتق ہے کسی چیز کا واضح ہونا۔ الْفُرْقَانِ جو حق اور باطل کے درمیان فرق کرے (2)۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 11: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ لام کی جزم کے ساتھ عام قراء کی قراءت

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا
2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

ہے۔ حسن اور اعرج نے لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے (1) یہ لام امر ہے اور اس کا حق کسرہ ہے جب علیحدہ ہو جب یہ کسی چیز کے ساتھ ملایا گیا ہو تو اس میں دو صورتیں ہوتی ہیں: جزم اور کسرہ۔ اور تین حروف کے ساتھ یہ ملایا جاتا ہے۔ فاء جیسے ارشاد ہے: فلیصمہ، فلیعبد واو جیسے ولیوفوا اور ثم، جیسے: ثم لیقضوا۔ شَهِدَ کا معنی حضر ہے۔ اس میں اضمار ہے یعنی من شهد منكم المصر فی الشهر عاقلاً بالغاً صحیحاً مقیماً فلیصمہ۔ جو تم میں سے رمضان کے مہینہ میں شہر میں موجود ہو جبکہ وہ عاقل، بالغ، صحیح، مقیم ہو تو وہ روزے رکھے۔ کہا جاتا ہے: یہ عام ہے اس کی تخصیص اس قول سے ہے فمن کان منکم مریضاً او علی سفرٍ، الشَّهْرَ مفعول بہ نہیں بلکہ ظرف زمان ہے اس کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابن عباس، حضرت سوید بن غفلہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم اور ابو مجلز لاحق بن حمید اور عبیدہ السلمانی نے کہا: جو رمضان کے مہینہ کے آغاز میں اپنے شہر میں اور اپنے گھر والوں میں موجود ہو اسے اپنے روزوں کو مکمل کرنا چاہئے۔ اس کے بعد وہ سفر کرے یا مقیم ہو اور سفر میں افطار کرے جس پر رمضان داخل ہو جبکہ وہ سفر میں ہو۔ ان علماء کے نزدیک معنی یہ ہے کہ جس نے رمضان کو سفر کی حالت میں پایا وہ افطار کرے اور اس پر دوسرے دنوں سے تعداد پوری کرنا لازم ہے اور مقیم حالت قیام میں رمضان کو پائے تو اسے روزہ رکھنا چاہئے۔ جمہور امت نے کہا: جو رمضان کے مہینہ میں آغاز اور آخر میں مقیم ہو جب تک وہ مقیم رہے تو روزہ رکھے۔ اگر سفر کرے تو افطار کرے (2)۔ یہ قول صحیح ہے۔ اس پر اخبار ثابتہ دلالت کرتی ہیں۔ امام بخاری نے پہلے کا رد کرتے ہوئے یہ باب باندھا۔ باب اذا صام ایاماً من رمضان ثم سافر۔ امام بخاری نے اس باب کے تحت اپنی سند سے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں مکہ کی طرف نکلے آپ نے روزہ رکھا حتیٰ کہ آپ کدید کے مقام پر پہنچے تو روزہ رکھنا چھوڑ دیا۔ پس لوگوں نے بھی روزہ رکھنا چھوڑ دیا حضرت ابوعبیداللہ نے کہا الکدید، عسفان اور قدید کے درمیان ہے (3)۔

میں کہتا ہوں: یہ احتمال ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے موافقین کے قول کو سفر مندوب پر محمول کیا جائے جیسے فضلاء اور صالحین کا بھائیوں کی زیارت کرنے کے لئے سفر کرنا یا سفر مباح پر محمول ہو جیسے کفایت پر زائد رزق کی طلب کے لئے سفر کرنا۔ رہا ضروری خوراک کے لئے واجب سفر کرنا یا کسی شہر کو فتح کرنے کے لئے سفر کرنا جبکہ اس کی فتح یقینی ہو۔ یا دشمن کو دور کرنے کا سفر ہو تو اس صورت میں اسے اختیار ہے اسے روزہ رکھنا واجب نہیں بلکہ قوت کے لئے اس میں افطار افضل ہے اگرچہ وہ رمضان کے مہینہ میں اپنے شہر میں موجود بھی ہو اور اس میں بعض روزے رکھ بھی لئے ہوں۔ اس کی دلیل حضرت ابن عباس وغیرہ کی حدیث ہے، اس میں ان شاء اللہ کوئی اختلاف نہ ہوگا۔ واللہ اعلم

امام ابوحنیفہ اور ان کے ساتھیوں نے کہا: مکلف ہونے کی شرط کے ساتھ جو رمضان کے مہینہ میں موجود ہو مجنون اور بیہوش بھی نہ ہو تو اسے روزہ رکھنا چاہئے اور جس پر رمضان آئے جبکہ وہ مجنون ہو اور اس کا جنون پورا مہینہ طاری رہے تو اس پر قضا

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
2۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا
3۔ صحیح بخاری، باب اذا صام ایاما من رمضان ثم سافر، حدیث نمبر 1808، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نہیں ہے کیونکہ اس نے رمضان کے مہینہ کو اس صفت پر نہیں پایا جس کے ساتھ روزے واجب ہوتے ہیں اور جس کو مہینہ کی ابتدا میں اور آخر میں جنون لاحق ہو تو وہ جنون کے دنوں کی قضا کرے۔ اس تاویل پر **شہر** کو نصب **شہِدَ** کے مفعول بہ کی حیثیت سے صریح ہے۔(1)

مسئلہ نمبر 12: یہ ثابت شدہ امر ہے کہ روزے کی فرضیت اسلام، بلوغ اور رمضان کے مہینہ کے علم کے ساتھ ثابت ہوتی ہے۔ جب فجر سے پہلے کوئی کافر مسلمان ہو یا بچہ بالغ ہو تو ان پر اس دن کا روزہ لازم ہوگا اور اگر فجر کے بعد بالغ ہو یا مسلمان ہو تو دونوں کے لئے کھانے پینے وغیرہ سے رکا رہنا مستحب ہے اور ان پر رمضان کے گزشتہ دنوں کی اور اس دن کی جس میں بچہ بالغ ہوا اور کافر مسلمان ہو، قضا لازم نہیں ہے اور علماء کا اس کافر کے بارے میں اختلاف ہے جو رمضان کے آخری دن میں مسلمان ہو گیا اس پر سارے رمضان کی قضا لازم ہے یا نہیں؟ کیا اس پر اس دن کی قضا لازم ہے جس میں وہ مسلمان ہوا؟ امام مالک اور جمہور علماء نے کہا: اس پر گزشتہ دنوں کی قضا نہیں ہے کیونکہ اس نے اپنے اسلام کے وقت رمضان کا مہینہ پایا۔ امام مالک نے فرمایا: میرے نزدیک اس دن کی قضا کرنا محبوب ہے جس دن وہ مسلمان ہوا۔ عطا اور حسن نے کہا: وہ باقی دنوں کے روزے رکھے اور گزشتہ دنوں کی قضا کرے۔

عبدالملک بن ماجشون نے کہا: اس دن کھانے سے رکا رہے اور اس کی قضا کرے۔ امام احمد اور اسحاق نے اس کی مثل کہا ہے۔ ابن منذر نے کہا: اس پر مہینہ کے گزشتہ دنوں کی اور اس دن کی قضا لازم نہیں ہے۔ الباجی نے کہا: ہمارے علماء میں سے جنہوں نے کہا کفار شرائع الاسلام کے مخاطب ہیں یہی امام مالک اور ان کے اصحاب کے قول کا مقتضا ہے۔ انہوں نے اس پر بقیہ دن کھانے پینے سے رکا رہنے کو واجب کہا ہے۔ ابن نافع نے امام مالک سے "المدونہ" میں اس کو روایت کیا ہے یہی شیخ ابوالقاسم کا قول ہے اور ہمارے علماء میں سے جنہوں نے کہا کہ کفار مخاطب نہیں ہیں، انہوں نے کہا: بقیہ دن رکا رہنا لازم نہیں ہے۔ یہ اشہب، عبدالملک بن ماجشون کے قول کا مقتضا ہے۔ یہ ابن القاسم کا قول ہے۔ میں کہتا ہوں: یہ قول صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا**۔ اس میں صرف مومنین کو خطاب فرمایا کسی اور کو خطاب نہیں فرمایا یہ واضح ہے پس بقیہ دن اس پر رکا رہنا واجب نہیں اور گزشتہ دنوں کی قضا بھی نہیں۔ پہلے **وَ مَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ** کے تحت کلام گزر چکی ہے۔

مسئلہ نمبر 13: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ**، **الْیُسْرَ** یہ جماعت کی قرأت ہے الیُسُر (سین کے ضمہ کے ساتھ) یہ دونوں لغتیں ہیں اسی طرح العسر میں دونوں لغتیں ہیں (2)۔ مجاہد اور ضحاک نے کہا(3): الیسر سے مراد سفر میں افطار اور العسر سے مراد سفر میں روزہ ہے۔ لفظ کا عموم تمام امور دینیہ کو شامل ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَ مَا جَعَلَ عَلَیْكُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ** (الحج: 78) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے دین اللہ یسر (اللہ کا دین) آسان ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یسروا ولا تعسروا۔ آسانی کرو، تنگی نہ کرو۔ الیسر، سہولت سے ہے اور اسی سے غناء کے لئے یسار

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

استعمال ہوتا ہے، بائیں ہاتھ کو الید الیسریٰ کہا جاتا ہے یا تو فال پکڑنے کے لئے یا اس لئے کہ دائیں ہاتھ کی یہ معاونت کرتا ہے تو معاملہ آسان ہو جاتا ہے۔ اور وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ کا معنی یُرِیْدُ اللّٰهُ بِکُمُ الْیُسْرَ ہے۔ تاکید کے لئے تکرار فرمایا۔

مسئلہ نمبر 14: یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے قدیم، ازلی ذات پر زائد ارادہ کے ساتھ ارادہ فرمانے والا ہے۔ یہ اہل سنت کا مذہب ہے جس طرح وہ علم کے ساتھ عالم ہے، اپنی قدرت کے ساتھ قادر ہے، حیات کے ساتھ زندہ ہے، سمع کے ساتھ سمیع ہے، بصر کے ساتھ بصیر ہے، کلام کے ساتھ متکلم ہے۔ یہ تمام معانی موجود، ازلی ذات پر زائد ہیں۔

فلاسفہ اور شیعہ اس کی نفی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ زائغین کے قول اور معطلین کے ابطال سے بلند و بالا ہے اور جو بات ان اہل تعطیل کی جڑ کاٹتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے صاحب ارادہ ہونے کی تصدیق نہ کی جائے تو صادق آئے گا کہ وہ صاحب ارادہ نہیں ہے اور اگر یہ صحیح ہو تو ہر وہ ذات جو صاحب ارادہ نہ ہو وہ اس کی نسبت ناقص ہو گی جو صاحب ارادہ ہو گی۔ بے شک جس کی صفات ارادہ یہ ہوں اس کے لئے جائز ہوتا ہے کہ کسی شے کو خاص کرے اور اس کے لئے یہ بھی جائز ہوتا ہے کہ اسے خاص نہ کرے۔ پس عقل سلیم تقاضا کرتی ہے کہ ارادہ کمال ہوتا ہے نہ کہ نقص حتیٰ کہ اگر وہم کے ساتھ اندازہ کیا گیا ہو اور اس سے یہ امر سلب کیا گیا ہو تو اس کا پہلا حال دوسرے حال کی نسبت اکمل ہوگا۔ پس یہی باقی رہ جائے گا کہ جو ارادہ سے متصف نہیں وہ ناقص ہے اس سے جو ارادہ سے متصف ہے اور اس میں جو محال ہے وہ مخفی نہیں، یہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ مخلوق خالق سے اکمل ہو اور خالق اس سے کم مرتبہ ہو؟ بداہت اس کا رد اور ابطال کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود اپنا وصف بیان کیا ہے کہ وہ مرید ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ۝ (البروج) کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے۔

یُرِیْدُ اللّٰهُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ۔ ارادہ فرماتا ہے اللہ تم سے آسانی کا اور نہیں ارادہ فرماتا تم سے تنگی کا یُرِیْدُ اللّٰهُ اَنْ یُّخَفِّفَ عَنْکُمْ (النساء: 28) اللہ تعالیٰ ارادہ فرماتا ہے تم سے تخفیف کرنے کا اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ۝ (یٰس: 82) جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو صرف اتنا ہی ہے کہ وہ فرماتا ہے اس کو: ہو جا، پس وہ ہو جاتی ہے پھر یہ عالم حکمت، پختگی، انتظام اور احکام پر مبنی ہے، اس کے باوجود اس کا ہونا اور اس کا نہ ہونا جائز ہے اور وہ ذات جس نے وجود کے ساتھ اس کو خاص کیا اس کے لئے اس کا ارادہ کرنے والا ہونا، اس پر قادر ہونا اور اس کا عالم ہونا واجب ہے اگر وہ عالم، قادر نہ ہو تو اس سے کسی شے کا صدور صحیح نہیں اور جو عالم نہ ہو اگرچہ قادر ہو اس سے حکمت و اتقان پر اشیاء کا صدور ممکن نہیں اور جو مرید نہ ہو بعض جائزات کی بعض احوال اور اوقات کے ساتھ تخصیص اولیٰ نہ ہو۔ کیونکہ ان کی نسبت ان کی طرف ایک نسبت ہے۔ علماء فرماتے ہیں: جو اس کا قادر، مرید ہونا ثابت ہوا تو اس کا زندہ ہونا بھی ثابت ہوا کیونکہ زندہ ہونا ان صفات کی شرط ہے۔ زندہ ہونے سے لازم آتا ہے کہ وہ سمیع، بصیر اور متکلم بھی ہو اگر اس کے لئے یہ صفات ثابت نہ ہوں تو لامحالہ ان صفات کی اضداد سے متصف ہوگا جیسے اندھا، بہرہ اور گونگا ہونا جیسا کہ اس عالم شہادت میں معروف ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے ان تمام صفات سے جو اس کی ذات میں نقص کا موجب ہوں۔

مسئلہ نمبر 15: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلِتُکْمِلُوا الْعِدَّةَ اس میں دو تاویلیں ہیں: (۱) جس نے سفر یا مرض میں

روزے چھوڑے ان کی تعداد پوری کرنا (۲) چاند کی تعداد پوری کرنا خواہ وہ انتیس دنوں کا ہو یا تیس دنوں کا ہو۔ حضرت جابر بن عبد اللہ نے کہا: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: مہینہ انتیس دنوں کا ہوتا ہے اس میں اس شخص کی تاویل کا رد ہے جس نے نبی کریم ﷺ کے ارشاد شهرا عيد لا ينقصان رمضان و ذوالحجة (1) کی تاویل کی کہ تیس دنوں سے یہ دو مہینے کم نہیں ہوتے۔ ابوداؤد نے اس کو نقل کیا ہے اور جمہور علماء نے اس کی یہ تاویل کی ہے کہ یہ دو مہینے اجر اور خطاؤں کی تکفیر میں کم نہیں ہوتے خواہ یہ انتیس دنوں کے ہوں یا تیس دنوں کے ہوں۔

مسئلہ نمبر 16: تیس رمضان کو دن کے وقت چاند نظر آئے تو وہ شوال کا نہیں ہوگا بلکہ وہ آئندہ رات کا ہوگا یہ صحیح قول ہے۔ حضرت عمر سے اس مسئلہ کو روایت کرنے والے مختلف ہیں، دارقطنی نے شقیق سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہمارے پاس حضرت عمر کا خط آیا جبکہ ہم خانقین میں تھے۔ حضرت عمر نے اپنے خط میں فرمایا: چاند بعض، بعض سے بڑے ہوتے ہیں۔ جب تم دن کے وقت چاند کو دیکھو تو افطار نہ کرو حتیٰ کہ دو گواہ گواہی دیں کہ انہوں نے کل چاند دیکھا تھا۔

ابوعمر نے عبد الرزاق عن معمر عن الاعمش عن ابی وائل کی سند سے روایت کیا ہے، ابووائل نے کہا: حضرت عمر نے ہماری طرف لکھا۔ آگے سابقہ کلام ذکر کیا۔ حضرت ابوعمر نے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اسی طرح مروی ہے جو عبد الرزاق نے ذکر کیا ہے۔ یہی قول حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عمر اور حضرت انس بن مالک کا ہے اور یہی قول امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ، امام محمد بن حسن، لیث اور اوزاعی کا ہے اور یہی قول امام احمد اور اسحاق کا ہے۔ سفیان ثوری اور امام ابویوسف نے کہا: اگر زوال کے بعد چاند دیکھا گیا تو وہ آئندہ رات کا ہوگا اگر زوال سے پہلے چاند دیکھا گیا تو وہ گزشتہ رات کا ہوگا۔ حضرت عمر سے اس کی مثل قول مروی ہے۔ عبد الرزاق نے ثوری سے انہوں نے مغیرہ سے انہوں نے شباک سے انہوں نے ابراہیم سے یہ روایت ذکر کی ہے، فرمایا: حضرت عمر نے عتبہ بن فرقد کو لکھا کہ جب تم دن کے وقت سورج کے زوال سے پہلے چاند کو دیکھو تو تیس دن مکمل ہونے کی وجہ سے تم افطار کر دو اور جب تم سورج کے زوال کے بعد چاند دیکھو تو افطار نہ کرو حتیٰ کہ شام ہو جائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اسی طرح مروی ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اسناد کی جہت سے اس مسئلہ میں کوئی چیز صحیح مروی نہیں ہے۔ سلیمان بن ربیعہ سے ثوری کے قول کی مثل مروی ہے۔ عبد الملک بن حبیب کا بھی یہی خیال ہے وہ قرطبہ میں اسی کے ساتھ فتویٰ دیتے تھے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز سے اس مسئلہ میں مختلف اقوال مروی ہیں۔ ابوعمر نے کہا: حضرت عمر سے جو حدیث مروی ہے جس کے مطابق امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ کا قول ہے وہ متصل ہے اور وہ حدیث جو ثوری کے مذہب کے مطابق مروی ہے وہ منقطع ہے۔ پس متصل کی طرف رجوع کرنا اولیٰ ہے۔ جن علماء نے ثوری کا مذہب اختیار کیا انہوں نے اس قول سے حجت پکڑی ہے مگر حضرت اعمش کی حدیث مجمل ہے اس میں زوال سے پہلے اور بعد کی کوئی تخصیص نہیں ہے اور حضرت ابراہیم کی حدیث مفسر ہے پس اس کے ساتھ قول کرنا اولیٰ ہے۔

میں کہتا ہوں: جو حضرت عمر سے متصلاً موقوفاً مروی ہے اسی معنی میں مرفوع بھی مروی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کو

1۔ صحیح بخاری، باب شهرا عيد لا ينقصان، حدیث نمبر 1779، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ تیس رمضان کی صبح روزے سے تھے آپ نے دن کے وقت شوال کا چاند دیکھا تو افطار نہ کیا حتیٰ کہ شام ہوگئی اس کو واقدی کی حدیث سے دار قطنی نے نقل کیا ہے۔ فرمایا: واقدی نے کہا: ہمیں معاذ بن محمد انصاری نے بیان کیا، فرمایا: میں نے زہری سے شوال کے چاند کے مطابق پوچھا جب وہ جلدی دیکھا جائے۔ انہوں نے فرمایا: میں نے حضرت سعید بن مسیب کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اگر شوال کا چاند فجر کے طلوع ہونے سے لے کر عصر تک یا سورج کے غروب ہونے کے درمیان تک دیکھا جائے تو وہ آنے والی رات کا ہوگا۔ ابو عبداللہ نے کہا اس پر اجماع ہے (1)۔

مسئلہ نمبر 17: دار قطنی نے حضرت ربعی بن خراش سے انہوں نے نبی کریم ﷺ کے ایک صحابی سے روایت کیا ہے، فرمایا: لوگوں کا رمضان کے آخری دن کے بارے میں اختلاف ہوا۔ دو دیہاتی آئے انہوں نے نبی کریم ﷺ کے پاس گزشتہ شام چاند دیکھنے کی گواہی دی۔ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو روزہ افطار کرنے کا حکم دیا اور صبح عیدگاہ کی طرف جانے کا حکم دیا۔ دار قطنی نے کہا: یہ اسناد حسن سے ثابت ہے۔ ابو عمر نے کہا: امام مالک اور اصحاب مالک سے کوئی اختلاف مروی نہیں (2)۔ عید کی نماز عید کے علاوہ کسی دن نہیں پڑھی جائے گی اور نہ عید کے دن زوال کے بعد پڑھی جائے گی۔ امام ابو حنیفہ سے یہی قول حکایت کیا گیا ہے۔ امام شافعی کا قول اس مسئلہ میں مختلف ہے کبھی امام مالک کے قول کے مطابق فرمایا اس کو مزنی نے اختیار کیا ہے اور فرمایا: جب عید کے دن زوال کے بعد عید کی نماز پڑھنی جائز نہیں تو دوسرا دن عید کے وقت سے زوال سے بھی زیادہ دور ہے اس لئے دوسرے دن بدرجہ اولیٰ نہیں پڑھی جائے گی اور امام شافعی سے دوسری روایت مروی ہے کہ دوسرے دن چاشت کے وقت عید کی نماز پڑھی جائے گی۔ بویطی نے کہا: عید کی نماز نہیں پڑھی جائے گی مگر جب اس کے بارے میں کوئی حدیث ثابت ہو۔ ابو عمر نے کہا: اگر نماز عید وقت کے بعد ادا کی جائے گی تو یہ فرائض کے مشابہ ہو جائے گی اور علماء کا سنن کے بارے میں اجماع ہے کہ ان کی قضا نہیں کی جاتی۔ اور یہ نماز عید سنن کی مثل ہے۔ امام ثوری، امام اوزاعی اور امام احمد بن حنبل نے کہا: دوسرے دن وہ نکلیں گے۔ امام ابو یوسف نے ''الاملاء'' میں اسی طرح فرمایا۔ حسن بن صالح بن حیی نے فرمایا: عید الفطر میں نہیں نکلیں گے، عید الاضحیٰ میں (دوسرے دن) نکلیں گے۔ امام ابو یوسف نے فرمایا: عید الاضحیٰ میں امام تیسرے دن نماز عید پڑھائے گا (اگر پہلے دو دنوں میں کسی وجہ سے نہ پڑھ سکے ہوں) ابو عمر نے کہا: اضحیٰ ایام عید ہیں اور یہ نماز عید ہے۔ اور فطر کی عید صرف ایک دن ہے جب پہلے دن عید الفطر نہیں پڑھی ہوگی تو دوسرے دن قضا نہیں کی جائے گی کیونکہ وہ فرض نہیں ہے کہ اسے قضا کیا جائے۔ لیث بن سعد نے کہا: دوسرے دن عید الفطر اور عید الاضحیٰ پڑھی جائے گی۔ (اگر وہ پہلے دن نہیں پڑھ سکے ہوں گے)

میں کہتا ہوں: ان شاء اللہ دوسرے دن پڑھنے کا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ اس کے متعلق سنت ثابت ہے اور شارع علیہ السلام سنن میں سے جس کو چاہیں مستثنیٰ کر دیں اور اس کے وقت کے نکلنے کے بعد اس کی قضا کا حکم دے دیں، اس میں کوئی مانع نہیں۔ امام ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے فجر کی دو رکعتیں

1۔ سنن دار قطنی، جلد 2، صفحہ 173

2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 169

(سنتیں) ادا نہیں کیں وہ انہیں سورج طلوع ہونے کے بعد ادا کرے (1)۔ ابو محمد نے اس کو صحیح کہا ہے۔ امام ترمذی نے فرمایا: بعض اہل علم کے نزدیک اس پر عمل ہے اور اس کے مطابق سفیان ثوری، امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور حضرت ابن المبارک کا قول ہے اور حضرت عمر سے مروی ہے کہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ میں کہتا ہوں: ہمارے علماء نے فرمایا: جس پر وقت تنگ ہو اور وہ صبح کی نماز (فرض) پڑھ لے اور فجر کی دو رکعتیں (سنتیں) چھوڑ دے تو وہ اگر چاہے تو سورج طلوع ہونے کے بعد ادا کرے۔ بعض علماء نے فرمایا: وہ اس وقت ادا نہ کرے پھر جب ہم نے کہا کہ وہ انہیں سورج طلوع ہونے کے بعد پڑھے تو کیا وہ یہ قضا پڑھے گا یا ان دو رکعتوں کا ثواب، فجر کی سنتوں کے ثواب کے قائم مقام ہو جائے؟ شیخ ابو بکر نے کہا: یہ اصل مذہب پر جاری ہے اور قضا کا ذکر مجازاً ہے۔

میں کہتا ہوں: کوئی بعید نہیں کہ دوسرے دن نماز عید الفطر کا حکم اسی اصل پر ہو خصوصاً جبکہ یہ نماز سال میں ایک مرتبہ ہوتی ہے نیز سنت سے بھی ثابت ہے۔ نسائی نے روایت کیا ہے، فرمایا: مجھے عمرو بن علی نے بتایا انہوں نے فرمایا: ہمیں یحییٰ نے بتایا انہوں نے فرمایا: ہمیں شعبہ نے بتایا فرمایا: مجھے ابو بشر نے بتایا انہوں نے ابو عمیر بن انس سے روایت کیا، انہوں نے اپنے چچوں سے روایت کیا کہ ایک قوم نے چاند دیکھا اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں سورج بلند ہونے کے بعد افطار کرنے کا حکم دیا اور حکم دیا کہ دوسرے دن عید کے لئے نکلیں ایک روایت میں ہے، وہ عید گاہ کی طرف دوسرے دن نکلیں۔ (1)

مسئلہ نمبر 18: ابو بکر نے عاصم سے اور ابو عمرو نے (بعض روایات میں جو ان سے مروی ہیں (2)) اور قتادہ، حسن اور اعرج نے وَلِتُكَمِّلُوا الْعِدَّةَ پڑھا ہے یعنی میم کی شد کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ کسائی نے تخفیف کو پسند کیا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ (المائدہ: 3) نحاس نے کہا: یہ دونوں لغتیں ہم معنی ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ۞ (طارق) (اس میں مهّل اور امهلهم دونوں لغتیں ہم معنی ہیں) اور ولتکملوا کو لام کے سکون کے ساتھ پڑھنا جائز نہیں اور اس کے اور اس سے پہلے والے لام میں فرق پہلے گزر چکا ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: ویرید لان تکملوا اور ان اور کسرہ کا حذف کرنا جائز نہیں۔ یہ بصریوں کا قول ہے اسی طرح کثیر ابو صخر کا قول ہے: ارید لانسی ذکرها میں اس کا ذکر بھولنا چاہتا ہوں۔

یہ اصل میں لان انسی ہے۔ یہ لام مفعول پر داخل ہوتا ہے جیسے تیرے اس قول میں ہے ضربت لزید۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ تعداد کے مکمل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے العدة رخص لکم هذه الرخصة۔ یہ کوفیوں کا قول ہے نحاس نے یہ قول فراء سے روایت کیا ہے۔ نحاس نے کہا: یہ حسن قول ہے۔ و کذالك نری ابراهیم ملکوت السموات والارض و لیکون من الموقنین، ای ولیکون من الموقنین فعلنا ذالك۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب ابواب الاذان، باب ما جاء فی اعادتهما، حدیث نمبر 388، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
[illegible] لاماه بعید من یومه یخرج من الغد، حدیث نمبر 977، ضیاء القرآن 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

بعض علماء نے فرمایا: یہ واؤ مقحمہ ہے، بعض نے فرمایا: یہ بھی احتمال ہے کہ لام، لام امر ہو اور واؤ عاطفہ ہو جملہ کلام کا جملہ کلام پر عطف ہو (1)۔ ابواسحٰق ابراہیم ابن السری نے کہا: یہ معنی پر محمول ہے۔ تقدیر اس طرح ہے: فعل الله ذالك یسھل علیکم ولتکملوا العدۃ۔ ابواسحاق نے کہا: سیبویہ نے اس کی مثل یہ شعر کہے ہیں:

بادت غیر آیھن مع البلی　　الا رواکد جمرھن ھباء

ومشجج اما سواء قذاله　　فبدا و غیب سارہ المعزاء

اس کا معنی ہے: بادت الا رواکد بھا رواکد۔ گویا یوں فرمایا: و بھا مشجج او ثم مشجج۔ یعنی شہر ہلاک ہو گئے بوسیدگی کے ساتھ ان کے نشان تبدیل ہو گئے سوائے چولہوں کے نشانات کے، ان کے انگارے غبار ہیں پھر خیموں کے کیل ان کا درمیان برابر ہے۔ پس وہ ظاہر ہوا اور پتھریلی زمین نے اس کا چلنا غائب کر دیا۔

مسئلہ نمبر 19: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلِتُكَبِّرُوا اللهَ۔ اس کا وَلِتُكْمِلُوا پر عطف ہے اس کا مطلب جمہور علماء کے قول کے مطابق رمضان کے آخر میں تکبیر پر برانگیختہ کرنا ہے اس کی حد کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام شافعی نے فرمایا سعید بن مسیب، عروہ، ابوسلمہ سے مروی ہے کہ یہ لوگ عید الفطر کی رات تکبیریں کہتے اور اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے۔ اور فرمایا: یہ لیلۃ النحر (قربانی والی رات) کے مشابہ ہے۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: مسلمانوں پر حق ہے کہ جب شوال کا چاند دیکھیں تو تکبیریں کہیں اور حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ انسان چاند دیکھنے سے لے کر خطبہ کے ختم ہونے تک تکبیریں کہے اور امام کے ظاہر ہونے کے وقت رک جائے اور اس کی تکبیر کے ساتھ تکبیر کہے۔ ایک قوم نے کہا: چاند دیکھنے سے لے کر امام کے نماز کے لئے ظاہر ہونے تک تکبیریں کہے۔ سفیان نے کہا: یہ فطر والے دن کی تکبیر ہے۔ حضرت زید بن اسلم نے کہا: لوگ جب عید گاہ کی طرف نکلتے تو تکبیریں کہتے جب نماز ختم ہو جاتی ہے تو عید ختم ہو جاتی ہے (2)۔ یہ امام مالک کا مذہب ہے۔ امام مالک نے فرمایا: یہ تکبیریں گھر سے نکلنے سے لے کر امام کے نکلنے تک ہیں۔ ابن قاسم اور علی بن زیاد نے روایت کیا ہے کہ اگر سورج طلوع ہونے سے پہلے گھر سے نکلے تو راستہ میں تکبیریں نہ کہے اور بیٹھے ہوئے تکبیر کہے حتیٰ کہ سورج طلوع ہو جائے اگر سورج طلوع ہونے کے بعد گھر سے جائے تو راستہ میں عید گاہ کی طرف جاتے ہوئے تکبیر کہے اور جب بیٹھ جائے تب بھی تکبیریں پڑھتا رہے حتیٰ کہ امام نقل کرے۔ امام مالک کے نزدیک اس مسئلہ میں عید الفطر اور عید الاضحیٰ برابر ہیں۔ امام شافعی کا بھی یہی قول ہے اور امام ابو حنیفہ نے فرمایا: عید الاضحیٰ میں تکبیریں کہے اور عید الفطر میں تکبیریں نہ کہے اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَلِتُكَبِّرُوا اللهَ کیونکہ یہ عید کا دن ہے اور سال میں اس کا تکرار نہیں ہوتا۔ پس اس کی طرف نکلنے میں تکبیر سنت ہے جس طرح عید الاضحیٰ میں جاتے ہوئے تکبیر کہنا سنت ہے۔ دارقطنی نے ابوعبدالرحمٰن سے روایت کیا ہے، فرمایا: لوگ عید الفطر میں تکبیریں، عید الاضحیٰ سے بھی زیادہ شدت سے کہتے تھے۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ عید الفطر کے دن اپنے گھر سے نکلنے سے

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا　　2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

وقت تکبیر کہتے حتیٰ کہ عیدگاہ پہنچ جاتے اور حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ جب وہ عید الاضحیٰ اور عید الفطر کی طرف جاتے تو بلند آواز سے تکبیریں کہتے حتیٰ کہ عیدگاہ میں پہنچ جاتے۔ پھر آپ تکبیر کہتے رہتے حتیٰ کہ امام آجاتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے اکثر اہل علم عید الفطر میں تکبیریں کہنے کا نظریہ رکھتے تھے۔ یہ ابن منذر نے نقل کیا ہے، فرمایا: یہ امام اوزاعی نے الیاس سے ذکر کیا ہے۔ امام شافعی فرماتے تھے: جب کسی کو شوال کا چاند نظر آجائے تو میں پسند کرتا ہوں کہ لوگ اکٹھی اور علیحدہ علیحدہ تکبیریں کہیں۔ وہ متواتر تکبیریں کہتے رہیں اور تکبیروں کو ظاہر کریں حتیٰ کہ جنازہ گاہ کو چلے جائیں اور جب امام نکل آئے تو تکبیریں کہنا بند کردیں۔ اسی طرح جس نے حج نہیں کیا اس کے لئے تکبیریں کہنا پسند ہے۔ عیدوں کی نماز کا حکم اور ان میں تکبیر کا حکم سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۝ (اعلیٰ) اور سورہ الکوثر میں آئے گا۔

مسئلہ نمبر 20: امام مالک اور علماء کی ایک جماعت کے نزدیک تکبیر کے الفاظ یہ ہیں: اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر تین مرتبہ کہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ہے، بعض علماء فرماتے ہیں: تکبیروں کے درمیان میں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور سبحان اللہ بھی کہے۔ بعض فرماتے ہیں: یہ الفاظ کہے: اللہ اکبر کبیراً، الحمد للہ کثیراً و سبحان اللہ بکرۃ واصیلاً۔ حضرت ابن مبارک جب عید الفطر کے لئے نکلتے تھے تو یہ کہتے تھے: اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر وللہ الحمد اللہ اکبر علی ما ھدانا۔ ابن منذر نے کہا: امام مالک نے اس کی کوئی حد متعین نہیں فرمائی۔ امام احمد نے فرمایا: اس میں وسعت ہے۔ ابن عربی نے فرمایا: ہمارے علماء نے مطلق تکبیر کو اختیار کیا یہی ظاہر قرآن ہے اور میرا میلان بھی اسی طرف ہے۔

مسئلہ نمبر 21: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ بعض علماء نے فرمایا: اپنے روزے میں تبدیلی کر کے نصاریٰ اس میں بھٹک گئے۔ بعض نے فرمایا: جو وہ زمانہ جاہلیت میں اپنے آباء پر فخر کرتے تھے اور اپنے حسب ظاہر کرتے تھے اور اپنے مناقب شمار کرتے تھے اس کے بدلے میں جو ہدایت دی۔ بعض علماء نے فرمایا: اس نے تمہاری شرائع کی طرف جو رہنمائی فرمائی ہے اس پر تم اس کی عظمت بیان کرو۔ یہ عام ہے (1) اور لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔

وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ۝۱۸۶

''اور جب پوچھیں آپ سے (اے میرے حبیب) میرے بندے میرے متعلق تو (انہیں بتاؤ) میں (ان کے) بالکل نزدیک ہوں قبول کرتا ہوں دعا، دعا کرنے والے کی جب وہ دعا مانگتا ہے مجھ سے پس انہیں چاہیے کہ میرے حکم مانیں اور ایمان لائیں مجھ پر تاکہ وہ کہیں ہدایت پا جائیں''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذَا سَاَلَكَ اس کا معنی ہے جب یہ آپ سے معبود کے بارے میں پوچھیں تو انہیں بتاؤ کہ وہ قریب ہے وہ اطاعت پر ثواب دیتا ہے اور دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہے اور بندہ جو صوم وصلاۃ میں

1۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذا

سے کرتا ہے اسے وہ جانتا ہے۔ اس آیت کے سبب نزول میں اختلاف ہے۔ مقاتل نے کہا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد اپنی بیوی سے حقوق زوجیت ادا کئے تو اس پر بہت شرمندہ ہوئے اور رونے لگے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور صورت حال عرض کی اور پریشان ہو کر واپس آئے اور رخصت کے نزول سے پہلے یہ مسئلہ تھا۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی: وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ۔

مسئلہ نمبر 2: بعض علماء نے فرمایا: جب ابتدا میں سونے کے بعد کھانا ترک کرنا واجب ہوا تو بعض نے سونے کے بعد کھانا کھالیا پھر پریشان ہوا تو توبہ کی قبولیت میں یہ آیت نازل ہوئی اور پہلا حکم منسوخ ہو گیا۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ کلبی نے ابو صالح عن ابن عباس کے سلسلہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: یہود نے کہا ہمارا رب ہماری دعا کیسے سنتا ہے جبکہ تمہارا خیال ہے کہ ہمارے اور آسمان کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے اور پھر ہر آسمان کی موٹائی بھی اتنی ہے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ حسن نے کہا: اس کا سبب یہ ہے کہ ایک قوم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: کیا ہمارا رب قریب ہے کہ ہم اس سے مناجات کریں یا دور ہے کہ ہم اسے پکاریں؟ تو یہ آیت نازل ہوئی۔ عطا اور قتادہ نے کہا: جب یہ آیت نازل ہوئی وَ قَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (غافر: 60) تو ایک قوم نے کہا ہم کس وقت اس سے دعا مانگیں تو یہ آیت نازل ہوئی۔ (1)

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ یعنی جو میری عبادت کرتا ہے میں اس کی عبادت قبول کرتا ہوں۔ دعا بمعنی عبادت ہے، اجابت کا معنی قبول کرنا ہے۔ اس کی دلیل وہ روایت ہے جو ابو داؤد نے حضرت نعمان بن بشیر سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے، فرمایا: دعا عبادت ہے تمہارے رب نے فرمایا: تم میری عبادت کرو میں تمہاری عبادت قبول کروں گا۔ دعا کو عبادت کہا جاتا ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ۝ (غافر) (جو لوگ میری عبادت کرنے سے تکبر کرتے ہیں وہ عنقریب جہنم میں داخل ہوں گے ذلیل و خوار ہو کر۔)

اللہ تعالیٰ نے دعا کا حکم دیا اور اس پر ابھارا اور اس کو عبادت فرمایا اور دعا مانگنے والوں کی دعا کو قبول کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ لیث نے شہر بن حوشب سے انہوں نے حضرت عبادہ بن صامت سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا: میری امت کو تین چیزیں ایسی عطا کی گئی ہیں جو کسی کو عطا نہیں کی گئیں سوائے انبیاء کرام کے۔ اللہ تعالیٰ نے جب کوئی نبی مبعوث فرمایا تو ارشاد فرمایا: تو مجھ سے دعا کر میں تیری دعا قبول کروں گا اور اس امت کو بھی یہی فرمایا: اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (غافر: 60) تم مجھ سے دعا مانگو میں تمہاری دعا قبول کروں گا، جب بھی کوئی نبی مبعوث فرمایا تو ارشاد فرمایا تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی اور اس امت کو بھی فرمایا تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی اور جب اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو مبعوث فرمایا تو اسے اپنی قوم پر گواہ بنایا اور اس امت کو تمام لوگوں پر گواہ بنایا۔ خالد الربعی فرماتے تھے اس امت کے لئے اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ میں میں تعجب کرتا ہوں۔ خود ہی اللہ نے انہیں دعا کا حکم فرمایا اور خود ہی قبولیت کا وعدہ فرمایا اور ان کے درمیان کوئی شرط نہیں ہے۔ کسی

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

کہنے والے نے ان سے کہا اس کی مثل کیا ہے۔ فرمایا: اس کی مثال یہ ارشاد ہے: وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (البقرہ: 25) یہ شرط ہے اور وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ (یونس: 2) میں عمل کی شرط نہیں ہے۔ اور فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (غافر: 14) یہاں شرط ہے اور ادْعُوْنِيْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ میں شرط نہیں ہے۔ پہلی امتیں اپنی ضروریات میں اپنے انبیاء کی بارگاہ میں پناہ لیتی تھیں حتیٰ کہ ان کے انبیاء ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے سوال کرتے تھے۔

اگر کہا جائے کہ بہت سے دعا کرنے والے دعا مانگتے ہیں لیکن دعا قبول نہیں ہوتی۔ پھر اس آیت کا کیا مطلب ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ دونوں آیات میں اللہ تعالیٰ کا فرمان اجیب اور استجب ہر دعا مانگنے والے کی دعا کو مطلقاً قبول کرنے کا تقاضا نہیں کرتا اور ہر مطلوب کو عطا کرنے کا تقاضا نہیں کرتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت میں فرمایا: اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ (اعراف) (دعا کرو اپنے رب سے گڑگڑاتے ہوئے اور آہستہ آہستہ بے شک اللہ نہیں دوست رکھتا حد سے بڑھنے والوں کو) ہر وہ شخص جو جانتے ہوئے گناہ کبیرہ پر مصر ہے یا جہالت کی وجہ سے گناہ کبیرہ کرنے والا ہے اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ وہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا، پس اس کی دعا کیسے قبول کرے گا اور حد سے تجاوز کرنے کی بہت سی اقسام ہیں۔ ان کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ سورہ اعراف میں آئے گا۔

بعض علماء نے فرمایا: اس کا مطلب ہے اگر میں چاہوں گا تو قبول کروں گا جیسے ارشاد فرمایا: فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ (انعام: 41) (تو دور کر دے گا وہ تکلیف پکارا تھا تم نے جس کے لئے اگر چاہے) پس یہ مطلق ومقید کے باب سے ہوگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دعائیں مانگیں اور دو آپ کو عطا کی گئیں اور ایک سے روکا گیا۔ اس کا بیان ان شاء اللہ سورہ انعام میں آئے گا۔ بعض علماء نے فرمایا: ان اخبار کا مقصود تمام مومنین کی تعریف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بیان میں فرمایا کہ وہ فی الجملہ دعا کرنے والوں کی دعا کو قبول فرماتا ہے، وہ اپنے بندے کے قریب ہے، اس کی دعا کو سنتا ہے اور اس کے اضطرار کو جانتا ہے اور جو چاہتا ہے قبول فرماتا ہے اور جیسے چاہتا ہے۔ وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗۤ (احقاف: 5) (اور کون زیادہ گمراہ ہے اس (بدبخت) سے جو پکارتا ہے اللہ کو چھوڑ کر ایسے معبود کو جو قیامت تک اس کی فریاد قبول نہیں کر سکتا۔)

مالک اپنے غلام کی بات کبھی قبول کرتا ہے، والد اپنے بیٹے کی بات کبھی قبول کرتا ہے پھر اس کا سوال اسے عطا نہیں کرتا۔ پس دعا کے پائے جانے کے وقت قبولیت لامحالہ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اُجیبُ اور استجب خبر ہیں اور خبر منسوخ نہیں ہوتی ورنہ مخبر جھوٹا ہو جائے گا۔ اس تاویل پر حضرت عبد اللہ کی حدیث دلالت کرتی ہے جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کے لئے دعا میں (دروازہ) کھولا گیا اس کے لئے قبولیت کے دروازے کھولے گئے (1)۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ تم میرے بندوں میں سے ظالموں کو کہو مجھ سے مت مانگو کیونکہ میں نے اپنے اوپر واجب کر رکھا ہے کہ میں اس کی دعا قبول کروں گا جو مجھ سے دعا مانگے گا اور میں جب ظالموں کی دعا قبول کروں گا تو میں ان پر لعنت کروں گا ..... ایک قوم نے کہا: اللہ تعالیٰ ہر دعا قبول فرماتا ہے یا تو اس کی قبولیت دنیا میں ظاہر

1۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، باب فی دعاء النبی، حدیث نمبر 3471، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

فرماتا ہے یا اس دعا کو گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے یا آخرت میں اس کے لئے ذخیرہ کر دیتا ہے۔ کیونکہ حضرت ابو سعید خدری نے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو مسلمان دعا مانگتا ہے جب کہ اس میں گناہ اور قطع رحمی کا سوال نہیں ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے تین چیزوں میں سے ایک چیز عطا فرماتا ہے یا تو جلدی اس کی دعا کو (قبول فرما کر) پورا کر دیتا ہے یا اس کے لئے اسے ذخیرہ فرما دیتا ہے یا اس سے اس کی مثل تکلیف کو دور کر دیتا ہے۔ صحابہ نے عرض کی: پھر تو ہم زیادہ دعا کریں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ اس سے زیادہ قبول کرنے والا ہے اور عطا کرنے والا ہے۔

ابو عمر بن عبد البر نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور ابو محمد عبد الحق نے اسے صحیح کہا ہے اور موطا میں یہ منقطع ہے۔ ابو عمر نے کہا یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے ارشاد اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (غافر:60) کی تفسیر میں نقل کی جاتی ہے۔ یہ سب اجابت (قبولیت) پر دلالت کرتی ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس کا مطلب ہے جو بندہ دعا کرتا ہے میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں۔ اگر جو دنیا میں اپنے لئے رزق کی دعا کرتا ہے تو وہ اسے عطا کیا جاتا ہے اگر اسے دنیا میں نہیں دیا جاتا تو اس کے لئے ذخیرہ کیا جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں: ابو سعید کی حدیث اگرچہ تین صورتوں میں سے ایک صورت میں قبولیت کی دلیل ہے لیکن گزر چکا ہے کہ وہ حد سے تجاوز کرنے سے اجتناب کرنے والا ہو جو قبولیت سے مانع ہے۔ ارشاد فرمایا: جب وہ گناہ یا قطع رحمی کا سوال نہ کرے۔ اور مسلم میں یہ زائد ہے کہ جب وہ جلدی نہ کرے۔ اس حدیث کو حضرت ابو ہریرہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بندے کی دعا قبول کی جاتی ہے جب تک کہ وہ گناہ اور قطع رحمی کی دعا نہ مانگے، جب تک وہ جلدی نہ کرے۔ کسی نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جلدی کرنے سے کیا مراد ہے؟ فرمایا بندہ کہے میں نے دعا کی اور میں نے دعا کی میں نے نہیں دیکھا کہ میری دعا قبول ہوئی پس وہ اس دعا کو نہیں مانگتا اور دعا چھوڑ دیتا ہے(1)۔ بخاری، مسلم اور ابوداؤد نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے ہر ایک کی دعا قبول کی جاتی ہے جب تک وہ جلدی نہ کرے۔ کہے کہ میں نے دعا کی اور میری دعا قبول نہیں ہوئی۔ ہمارے علماء نے فرمایا: حدیث کے الفاظ یستجاب لاحد کم (ہر ایک کی دعا قبول کی جاتی ہے) قبولیت کے وقوع کے وجوب کے متعلق خبر دینے اور قبولیت کے وقوع کے جواز کے متعلق خبر دینے کا احتمال رکھتے ہیں۔ جب وجوب کے متعلق خبر دینے کا معنی ہو تو قبولیت مذکورہ تین چیزوں کے مفہوم کے ساتھ ہوگی۔ جب وہ کہے: میں نے دعا مانگی اور قبول نہیں ہوئی تو ان تین چیزوں میں سے ایک کا وقوع باطل ہوا اور دعا سب چیزوں سے خالی ہوگئی اور اگر قبولیت کے جواز کے معنی میں ہو تو جو اس نے مانگا اس کے فعل کے ساتھ خاص ہوگی اور دعا کرنے والے کا یہ کہنا کہ میں نے دعا مانگی اور میری دعا قبول نہیں ہوئی اسے مانع ہے کیونکہ مایوسی ضعف، تعیین اور ناراضگی کے باب سے ہے۔

میں کہتا ہوں: اسی طرح دعا کی قبولیت سے حرام کا کھانا بھی مانع ہے اور جو چیز حرام کے مفہوم میں ہو وہ بھی دعا کی قبولیت سے مانع ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک شخص لمبا سفر کرتا ہے پراگندہ بال اور پراگندہ حال وہ اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف بلند کرتا ہے (عرض کرتا ہے) یارب یارب! حالانکہ اس کا کھانا حرام ہے اور اس کا پینا حرام ہے اور اس کا لباس حرام

1۔ صحیح بخاری، باب یستجاب للعبد مالم یعجل، حدیث نمبر 5865، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے اور اسے حرام کے ساتھ غذا دی گئی ہے پھر اس کی دعا کیسے قبول کی جائے گی؟ سوالیہ انداز میں فرمایا کہ جو اس صفت پر ہو اس کی دعا کا قبول ہونا بہت بعید ہے کیونکہ دعا کی قبولیت کے لئے داعی (دعا کرنے والا) میں، دعا میں اور جس چیز کا سوال کیا گیا ہے ان میں چند شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔ داعی (دعا کرنے والا) میں یہ شرط ہے کہ وہ جاننے والا ہو کہ اس کی حاجت پر صرف اللہ تعالیٰ ہی قادر ہے اور سارے وسائط اس کے قبضہ میں ہیں اور اس کی تسخیر کے ساتھ مسخر ہیں اور وہ سچی نیت اور حضور قلب کے ساتھ دعا مانگے کیونکہ اللہ تعالیٰ غافل دل کی دعا قبول نہیں فرماتا اور وہ حرام کھانے سے اجتناب کرنے والا ہو اور دعا سے اکتانے والا نہ ہو اور جو چیز مانگی جارہی ہے اس کی شرط سے یہ ہے کہ ایسے امور سے ہو جس کا طلب کرنا جائز ہو اور وہ فعل شرعی ہو جیسے ارشاد فرمایا جب تک وہ گناہ اور قطع رحمی کا سوال نہ کرے۔ پس گناہ میں ہر گناہ داخل ہے جس کے ساتھ انسان گنہگار ہوتا ہے اور قطع رحمی میں مسلمانوں کے تمام حقوق اور مظالم داخل ہیں۔ حضرت سہل بن عبداللہ تستری نے فرمایا: دعا کی سات شرائط ہیں (۱) تضرع (۲) خوف (۳) امید (۴) ہمیشگی (۵) خشوع (۶) عموم (۷) حلال کھانا۔

ابن عطا نے کہا: دعا کے ارکان، پر، اسباب اور اوقات ہیں اگر اس کے ارکان پائے جائیں تو وہ قوی ہو جاتی ہے۔ اگر اسے پر مل جائیں تو وہ آسمان کی طرف اڑ جاتی ہے، اگر اسے وقت سے موافقت ہو جائے تو کامیاب ہو جاتی ہے، اگر اسباب سے موافقت کر جائے تو کامیاب ہو جاتی ہے، دعا کے ارکان حضور قلب، رأفت، عجز اور خشوع ہے اس کے پر سچائی ہے، اس کا وقت سحری کا وقت ہے اس کے اسباب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کی چار شرائط ہیں (۱) تنہائی کے وقت، دل کی حفاظت کرنا مخلوق کے ساتھ ہوتے ہوئے زبان کی حفاظت کرنا اور ایسی چیزوں کی طرف دیکھنے سے آنکھ کی حفاظت کرنا جن کا دیکھنا حلال نہیں اور حرام چیز سے پیٹ کی حفاظت کرنا۔ بعض علماء نے فرمایا: دعا کی شرائط میں سے ہے کہ وہ غلطی سے سلامت ہو۔ بعض نے کہا:

ینادی ربہ باللحن لیث کذالک اذا دعاہ لا یجیب

لیث اپنے رب سے غلطی کے ساتھ دعا مانگتا ہے اس طرح جو وہ دعا مانگتا ہے تو وہ قبول نہیں کرتا ہے۔

حضرت ابراہیم بن ادہم سے پوچھا گیا: کیا وجہ ہے کہ ہم دعا مانگتے ہیں اور ہماری دعا قبول نہیں کی جاتی؟ فرمایا: اس کی وجہ یہ ہے کہ تم نے اللہ تعالیٰ کو پہچانا لیکن تم نے اس کی اطاعت نہ کی، تم نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانا اور اس کی سنت کی اتباع نہ کی، تم نے قرآن کو پہچانا اور اس کے مطابق عمل نہ کیا، تم نے اللہ کی نعمتوں کو کھایا اور ان کا شکر ادا نہیں کیا، تم نے جنت کو پہچانا اور اس کو طلب نہیں کیا، تم نے آگ کو پہچانا اور اس سے بھاگے نہیں ہو، تم نے شیطان کو پہچانا اور اس سے تم نے جنگ نہیں کی ہے بلکہ تم نے اس سے موافقت کی ہے، تم نے موت کو پہچانا اور تم نے اس کے لئے تیاری نہیں کی، تم نے مردوں کو دفن کیا اور تم نے عبرت حاصل نہیں کی، تم نے اپنے عیوب کو ترک کیا اور لوگوں کے عیوب کے ساتھ مشغول ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نوف البکالی کو کہا: اے نوف! اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو وحی کی تھی کہ بنی اسرائیل کو کہو کہ وہ میرے گھروں میں سے کسی گھر میں داخل نہ ہوں مگر پاک دلوں کے ساتھ، جھکی ہوئی نگاہوں کے ساتھ، پاک ہاتھوں کے ساتھ، میں ان میں سے

کسی کی دعا قبول نہیں کروں گا جب تک میری مخلوق میں سے کسی کے لئے ظلم موجود ہوگا۔ اے نوف! نہ تو شاعر بن، نہ تو پیغام پہنچانے والا بن، نہ سپاہی بن، نہ ٹیکس وصول کرنے والا بن اور نہ تو عشر وصول کرنے والا بن کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام رات کی ایک گھڑی میں کھڑے ہوئے اور فرمایا: یہ ایسا وقت ہے جو بندہ دعا مانگتا ہے اس کے لئے دعا قبول کی جاتی ہے مگر یہ کہ وہ بادشاہوں کو پیغام پہنچانے والا ہو یا سپاہی ہو یا ٹیکس وصول کرنے والا ہو یا عشر وصول کرنے والا ہو یا طنبور بجانے والا ہو یا طبل بجانے والا ہو۔ ہمارے علماء نے فرمایا: دعا کرنے والا یہ نہ کہے، اے اللہ! اگر تو چاہے تو مجھے عطا کر، اے اللہ! اگر تو چاہے تو میری مغفرت کر اے اللہ اگر تو چاہے تو مجھ پر رحم کر بلکہ اپنی دعا اور اپنے رسول کو چاہنے کے قول سے خالی کرے۔ اور اس شخص کے سوال کی طرح سوال کرے جو جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نہیں کرتا مگر جو چاہتا ہے (اگر تو چاہے) کے قول میں اس کی مغفرت، عطا اور رحمت سے استغنا کی ایک قسم ہے جیسے کوئی کہنے والا کہتا ہے اگر تو چاہے کہ مجھے عطا کر تو ایسا کر۔ یہ استغنا اور عدم ضرورت کے ساتھ استعمال ہوتا ہے مجبور شخص تو اپنے سوال میں عزم و یقین رکھتا ہے وہ اس فقیر کی طرح سوال کرتا ہے جو اپنے سوال کی طرف مجبور ہوتا ہے۔

ائمہ نے روایت کیا ہے، یہ بخاری کے الفاظ کا ترجمہ ہے حضرت انس بن مالک نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی دعا مانگے تو عزم کے ساتھ سوال کرے۔ یہ نہ کہے: اے اللہ! اگر تو چاہے تو مجھے عطا کر کیونکہ اللہ تعالیٰ کو کوئی مجبور کرنے والا نہیں (1)۔ مؤطا میں ہے (2) یہ نہ کہے: اے اللہ! میری مغفرت فرما اگر تو چاہے، اے اللہ! مجھ پر رحم فرما اگر تو چاہے۔ ہمارے علماء نے فرمایا: (عزم سے سوال کرے) یہ قول دلیل ہے کہ مومن کو دعا میں کوشش کرنی چاہئے اور وہ قبولیت کی امید رکھتا ہو اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو کیونکہ وہ کریم ذات سے دعا مانگ رہا ہے۔ سفیان بن عیینہ نے کہا: کسی کو کسی دعا سے منع نہیں کریں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق میں سے بدترین ابلیس کی دعا کو بھی قبول فرمایا۔ اس نے عرض کی تھی: اَنْظِرْنِیْۤ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ (اعراف:14) مہلت دے مجھے اس دن تک جب لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ (اعراف:15) بے شک تو مہلت دیئے ہوؤں میں سے ہے)

دعا کے لئے کچھ اوقات اور احوال ہیں جن میں غالب طور پر قبول ہوتی ہے جیسے سحری کا وقت، افطاری کا وقت، اذان اور اقامت کے درمیان، بدھ کے روز ظہر اور عصر کے درمیان، اضطرار کے وقت، سفر اور مرض کی حالت میں، بارش کے نزول کے وقت اور اللہ کے راستہ میں مجاہدین کی صف میں کھڑے ہونے کے وقت ان اوقات میں سے ہر وقت کے بارے میں آثار مروی ہیں ان کا بیان اپنے مقام پر آئے گا۔ حضرت شہر بن حوشب نے روایت کیا ہے کہ حضرت ام الدرداء نے انہیں کہا: اے شہر! کیا تم کپکپی محسوس نہیں کر رہے ہو؟ انہوں نے کہا: ہاں میں کپکپی محسوس کر رہا ہوں۔ فرمایا: اللہ سے دعا مانگو کیونکہ کپکپی کے وقت دعا قبول ہوتی ہے۔ (3)

1۔ صحیح بخاری، باب لیعزم المسألۃ فانہ لا مکرہ لہ، حدیث نمبر 5863، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، حدیث نمبر 5864

3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

حضرت جابر بن عبد اللہ نے فرمایا: مسجد الفتح میں تین دن دعا مانگی، سوموار، منگل اور بدھ اور بدھ کے روز دو نمازوں (ظہر اور عصر) کے درمیان آپ کی دعا قبول کی گئی میں نے آپ کے چہرہ اقدس میں خوشی دیکھی۔ حضرت جابر نے فرمایا: مجھ پر کبھی انتہائی مشکل امر نازل نہیں ہوا مگر میں نے اس گھڑی کی کوشش کی پھر میں نے اس میں دعا مانگی تو میں قبولیت کو جان گیا۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ ابو رجا خراسانی نے کہا: اس کا معنی ہے مجھ سے مانگو (1)۔ ابن عطیہ نے کہا: اس کا معنی ہے انہیں طلب کرنا چاہئے کہ میں ان کی دعا قبول کرتا ہوں۔ یہ باب استفعال سے ہے یعنی اس نے چیز کو طلب کیا مگر جو سخت تھی جیسے استغنی اللہ۔ مجاہد وغیرہ نے کہا: اس کا معنی ہے وہ قبول کریں ایمان جس کی طرف میں نے انہیں بلایا ہے یعنی اطاعت اور عمل ۔ کہا جاتا ہے اجاب اور استجاب ہم معنی ہیں۔ شاعر کا قول ہے۔

فلم يستجبه عند ذالك مجيب۔ اس وقت قبول کرنے والے نے اس کی بات قبول نہ کی۔ (2)

سین زائدہ ہے اور لام، لام امر ہے اسی طرح وَلْيُؤْمِنُوْا لام امر نے فعل کو جزم دی کیونکہ یہ فعل کو مستقبل کے معنی میں کر دیتا ہے۔ پس یہ ان شرطیہ کے مشابہ ہے۔ بعض نے فرمایا کیونکہ یہ صرف فعل پر واقع ہوتا ہے۔ الرشاد، یہ الغی (گمراہی) کا متضاد ہے۔ وقد رشُد یرشد رُشدًا اور رَشِدَ یرشَد رشدًا اس میں ایک لغت ہے اور ارشدہ اللہ، المراشد، مقاصد الطرق۔ راستوں کے مقاصد۔ الطریق الارشد جیسے الطریق الاقصد ہے۔ تو کہتا ہے ہو لرشدۃ یہ تیرے قول زِنْيَة کے خلاف ہے، ام راشد، چوہیا کی کنیت ہے۔ بنو رشدان عربوں کے قبائل۔ جوہری سے مروی ہے، ہروی نے کہا: الرُّشد، الرَّشد و الرشاد سب کا معنی ہدایت و استقامت ہے اسی سے ہے: لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ۔

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآىِٕكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَ ابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۪ وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۪ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَ لَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝۱۸۷

''حلال کر دیا گیا ہے تمہارے لئے رمضان کی راتوں میں اپنی عورت کے پاس جانا۔ وہ تمہارے لئے پردہ، زینت اور آرام ہیں اور تم ان کے لئے پردہ، زینت اور آرام ہو۔ جانتا ہے اللہ تعالیٰ کہ تم خیانت کیا کرتے تھے اپنے آپ سے۔ پس اس نے نظر کرم فرمائی تم پر اور معاف کر دیا تمہیں سو اب تم ان سے ملو ملاؤ اور طلب کرو جو (قسمت میں) لکھ دیا ہے اللہ نے تمہارے لئے اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ ظاہر ہو جائے تمہارے لئے سفید

1۔ تفسیر طبری، المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

ڈورا سیاہ ڈورے سے صبح کے وقت پھر پورا کرو روزہ کو رات تک اور نہ مباشرت کرو ان سے جب کہ تم اعتکاف بیٹھے ہو مسجدوں میں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں ان (کو توڑنے) کے قریب بھی نہ جانا۔ اسی طرح بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی آیتیں لوگوں کے لئے تا کہ وہ تقویٰ اختیار کرلیں"۔

اس میں چھتیس مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُحِلَّ لَكُمْ لفظ اُحِلَّ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس سے پہلے یہ عمل حرام تھا پھر منسوخ کیا گیا(1)۔ ابوداؤد نے ابن ابی لیلیٰ سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہمارے اصحاب نے ہمیں بیان کیا، فرمایا: ایک شخص جب روزہ افطار کرتا تھا پھر کچھ کھانے سے پہلے سو جاتا تھا تو وہ صبح تک نہیں کھاتا تھا۔ فرمایا: حضرت عمر آئے اور اپنی بیوی سے حقوق زوجیت کا ارادہ کیا تو بیوی نے کہا: میں سو چکی تھی۔ حضرت عمر نے کہا: ویسے کہہ رہی ہے۔ حضرت عمر نے اس سے حقوق زوجیت ادا کیے۔ ایک انصاری آیا اس نے کھانے کا ارادہ کیا۔ گھر والوں نے کہا: ہم تیرے لئے کھانا گرم کرتے ہیں۔ وہ شخص سو گیا جب صبح ہوئی تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اس میں ہے: اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ۔

بخاری نے حضرت براء سے روایت کیا ہے، فرمایا: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے جب کوئی روزہ رکھتا تھا پھر افطاری کے وقت افطار کرنے سے پہلے سو جاتا تو وہ اس رات اگلے دن شام تک کچھ نہ کھاتا تھا، قیس بن صرمہ انصاری روزہ دار تھا۔۔ ایک روایت میں ہے وہ دن کے وقت کھجوروں کے باغ میں کام کرتا رہتا اور وہ روزے سے تھا وہ افطار کے وقت حاضر ہوا تو وہ اپنی بیوی کے پاس آیا اور اس سے پوچھا: کیا تیرے پاس کھانا ہے؟ اس نے کہا: نہیں لیکن میں جاتی ہوں اور تیرے لئے کھانا طلب کرتی ہوں۔ وہ سارا دن کام کرتا رہا تھا پس اسے نیند آگئی اس کی بیوی آئی تو اس نے اسے سویا ہوا دیکھا تو کہا: ہائے تیرے لئے خسارہ۔ جب آدھا دن گزرا تو اس پر غشی طاری ہوگئی۔ اس چیز کا ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا گیا تو یہ آیت نازل ہوئی: اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ۔ تو صحابہ کرام بہت خوش ہوئے اور یہ ارشاد نازل ہوا: وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ۔

اور بخاری میں حضرت براء سے مروی ہے، فرمایا: جب رمضان کے روزوں کا حکم نازل ہوا تو لوگ پورا رمضان عورتوں کے قریب نہ جاتے تھے اور کچھ لوگ اپنے نفسوں سے خیانت کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا: عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ۔

کہا جاتا ہے: خان اور اختان، خیانۃ سے مشتق ہیں اور ہم معنی ہیں یعنی روزوں کی راتوں میں مباشرت کی وجہ سے اپنے نفسوں سے خیانت کرتے تھے اور جس نے اللہ کی نافرمانی کی اس نے اپنے نفس سے خیانت کی اپنے نفس کی طرف اس عذاب کو کھینچا۔ قتبی نے کہا: خیانت کی اصل یہ ہے کہ کسی کو کسی شے کا امین بنایا جائے اور وہ اس امانت کو صحیح ادا نہ کرے۔ طبری نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عمر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ سے واپس آئے اور حضرت عمر آپ کے پاس ایک رات دیر تک باتیں

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

کرتے رہے۔ واپس آئے تو بیوی کو سویا ہوا پایا۔ حضرت عمر نے بیوی سے حقوق زوجیت ادا کرنے کا ارادہ کیا تو بیوی نے حضرت عمر سے کہا: میں تو سوگئی تھی۔ حضرت عمر نے کہا: تو نہیں سوئی تھی۔ حضرت عمر نے حقوق زوجیت ادا کئے۔ حضرت کعب بن مالک نے بھی اسی طرح کیا تھا۔ حضرت عمر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: میں اللہ تعالیٰ اور آپ کی بارگاہ میں معذرت کرتا ہوں، میں نفس کے دام میں پھنس گیا اور میں نے اپنی بیوی سے حقوق زوجیت ادا کئے۔ کیا میرے لئے کوئی رخصت ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: اے عمر! تو اس کا حق نہیں رکھتا تھا جب حضرت عمر اپنے گھر پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بلا بھیجا۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے عذر کی قبولیت قرآن کی آیت کے ذریعے سنائی۔

نحاس اور مکی نے بھی یہ واقعہ ذکر کیا ہے۔ حضرت عمر سو گئے پھر اپنی بیوی سے حقوق زوجیت ادا کئے اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور اس کے متعلق خبر دی تو یہ آیت نازل ہوئی (1): عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ۔ (جانتا ہے اللہ تعالیٰ کہ تم خیانت کیا کرتے تھے اپنے آپ سے۔ پس اس نے نظر کرم فرمائی تم پر اور معاف کردیا تمہیں سو اب تم ان سے ملو ملاؤ)۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ، لَيْلَةَ کو نصب ظرف کی وجہ سے ہے۔ یہ اسم جنس ہے اسی وجہ سے مفرد ذکر کی گئی ہے۔ الرَّفَثُ، یہ جماع سے کنایہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کریم ہے کنایہ فرماتا ہے۔ یہ حضرت ابن عباس اور سدی نے کہا ہے (2) اور زجاج نے کہا: الرَّفَثُ ایک ایسا کلمہ ہے جو ہر اس عمل کا جامع ہے جس کا مرد اپنی بیوی سے ارادہ کرتا ہے۔ یہ الازہری کا قول بھی ہے۔ ابن عرفہ نے کہا: یہاں الرَّفَثُ سے مراد جماع ہے۔ الرفث صراحۃً جماع کا ذکر کرنا ہے اور اس کا واضح ذکر کرنا ہے۔ شاعر نے کہا:

و یرین من انس الحدیث زوانیا وبھن عن رفث الرجال نفارُ

یہاں رفث کو شاعر نے صراحۃً جماع کے ذکر کرنے کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا: الرفث کا اصل معنی فحش کلام ہے۔ کہا جاتا ہے: رفث، ارفث جب کوئی قبیح کلام کرے۔ اسی سے شاعر کا قول ہے:

و رب اسراب حجیج کظم عن اللغا و رفث التکلم (3)

یہاں رفث فحش کلام کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

الرَّفَثُ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں الی کے ساتھ متعدی ہے جبکہ تو رفثت الی النساء نہیں کہتا لیکن یہاں یہ الافضاء پر محمول ہے جس سے مراد ملابست لی جاتی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ (النساء: 21) (مل جل چکے ہو تم تنہائی میں ایک دوسرے سے) اسی معنی سے ہے: وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ (البقرہ: 14) جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا (توبہ: 35) یہاں یحمی، یوقد پر محمول ہے کیونکہ تو کہتا ہے: احمیت

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا 2۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً

الحدیدۃ فی النار۔ یعنی احمی کا صلہ فی استعمال ہوتا ہے جبکہ پہلی آیت میں علی استعمال ہوا ہے۔ مزید بیان آگے آئے گا۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ (النور:63) اس آیت میں یخالفون کو ینحرفون کے معنی پر محمول کیا گیا ہے جس کا صلہ عن استعمال ہوتا ہے یا یروغون عن امرہ کے معنی پر محمول ہے۔ کیونکہ تو کہتا ہے خالفت زیداً یعنی خالف کا صلہ استعمال ہی نہیں ہوتا اس کی مثل یہ ارشاد ہے: وَ كَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا۝ (احزاب) یہاں رحیم، رؤف کے معنی پر محمول ہے جیسے ارشاد ہے بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۝ (توبہ) کیا تو نے ملاحظہ نہیں کیا کہ تو کہتا ہے رؤفت بہ۔ یعنی رأف کا صلہ با استعمال ہوتا ہے تو رحمت بہ نہیں کہتا جب اس کا معنی رؤف کے موافق ہو تو متعدی ہونے میں اس کے قائم مقام ہوا۔ اسی قسم سے ابو کبیر ہذلی کا قول ہے۔

حملت بہ فی لیلۃ مزءودۃ　　کرھا و عقد نطاقھا لم یحلل

اس شعر میں حمل کو با کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے حالانکہ اس کا حق یہ ہے کہ بغیر صلہ کے متعدی ہو، جیسا کہ قرآن میں آیا ہے حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّ وَضَعَتْهُ كُرْهًا (احقاف:15) لیکن شاعر نے حملت بہ کہا کیونکہ یہ حبلت بہ کے معنی میں ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ یہ مبتدا خبر ہیں اور هُنَّ میں نون کو مشدد کیا گیا ہے کیونکہ یہ مذکر میں جو واو اور میم ہے اس کے قائم مقام ہے وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ۔ لِبَاسٌ اصل میں کپڑے میں استعمال ہوتا ہے پھر میاں، بیوی کے ملنے کو لباس کہا گیا کیونکہ ان کے جسم بھی آپس میں مل جاتے ہیں، کپڑے کے ساتھ انہیں تشبیہ دی گئی ہے۔

نابغہ جعدی نے کہا:

اذا ما الضجیع ثنی جیدھا　　تداعت فکانت علیہ لباسا (1)

جب پہلو میں سونے والے نے اس کی گردن دوہری کی اس نے اسے بلایا تو وہ اس پر لباس تھی۔ اور کہا:

لبست أناساً فافنیتھم　　و افنیتُ بعد أناسٍ أناساً

میں کئی لوگوں سے ملا اور میں نے انہیں فنا کر دیا اور کئی لوگوں کے بعد ئی لوگوں کو فنا کر دیا۔

بعض نے کہا: ہر اس چیز کو لباس کہا جاتا ہے جو کسی چیز کو ڈھانپ لے اور اس کا گھیراؤ کرلے۔ یہ بھی جائز ہے کہ میاں، بیوی میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کے لئے حرام سے پردہ بن جاتا ہے جیسا کہ خبر میں وارد ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: میاں، بیوی میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کے لئے حقوق زوجیت ادا کرنے کی صورت میں لوگوں کی آنکھوں سے پردہ ہوتا ہے۔ ابو عبیدہ وغیرہ نے کہا: عورت کو کہا جاتا ہے، یہ تیرا لباس ہے، تیرا بستر ہے اور تیرا ازار ہے، ایک شخص نے حضرت عمر بن خطاب سے کہا تھا۔

الا ابلغ ابا حفص رسولا　　فدی لک من اخی ثقۃ ازاری

ابو عبیدہ نے کہا: اس شعر میں ازار سے مراد عورتیں ہیں۔ بعض نے فرمایا: اس سے مراد نفس ہے۔

ربیع نے کہا: یہ تمہارے لئے بچھونا ہیں اور تم ان کے لحاف ہو۔ مجاہد نے کہا: تمہارے لئے سکون ہے یعنی بعض، بعض سے

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

سکون حاصل کرتے ہیں۔(1)

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ سونے کے بعد روزوں کی راتوں میں کھانے، پینے اور جماع جیسی ممنوع چیزوں میں مشورہ کرتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ (البقرہ:85) یعنی ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ مراد ہو کہ ہر ایک اپنے نفس سے خیانت کرتا ہے، اپنے نفس سے خیانت کرنے والا اس لئے کہا گیا ہے کہ اس کا نقصان اس کی اپنی طرف ہی لوٹنے والا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَتَابَ عَلَيْكُمْ یہ دو معانی کا احتمال رکھتا ہے: (۱) اپنے نفسوں سے خیانت سے ان کی توبہ قبول کرنا (۲) رخصت و اباحت کے ساتھ ان سے تخفیف کرنا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ (مزمل:20) یعنی اس نے تم سے تخفیف فرمائی۔ یعنی قتل خطا کے بعد۔ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۡ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ (النساء:92) یعنی یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تخفیف ہے۔ کیونکہ جو خطاً قتل کرنے والا ہے اس نے کوئی ایسا عمل نہیں کیا جس کی وجہ سے اسے توبہ لازم ہو اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ (توبہ:117) یہاں بھی تَابَ کا لفظ استعمال ہوا ہے اگرچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کوئی ایسی چیز واجب نہیں ہوئی تھی جو توبہ کا موجب تھی۔ وَ عَفَا عَنْكُمْ یہ گناہ کو معاف کرنے کا بھی احتمال رکھتا ہے اور توسع و تسہیل کا بھی احتمال رکھتا ہے جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اول وقت اللہ تعالیٰ کی رضا ہے اور آخر وقت اللہ تعالیٰ کا عفو ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے وسعت فرمائی اور آسانی فرمائی عَلِمَ اللّٰهُ کا معنی تم سے اس کا وقوع مشاہدۃً جان لیا فَتَابَ عَلَيْكُمْ یعنی اس میں وقوع کے بعد اس نے تم پر تخفیف فرمائی۔ وَ عَفَا یعنی آسانی فرمائی۔ تَخْتَانُوْنَ یہ خیانت سے ہے جیسے کہ پہلے گزر چکا ہے۔ ابن عربی نے کہا: علماء زہد نے فرمایا: عنایت اور شرف منزلت اس طرح ہوا کہ حضرت عمر نے اپنے نفس سے خیانت کی تو اللہ تعالیٰ نے اسے شریعت بنا دیا اور ان کی وجہ سے پوری امت سے تخفیف فرمادی۔ رضی اللہ عنہ و ارضاہ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ یہ جماع سے کنایہ ہے یعنی جو تم پر حرام تھا اسے حلال کر دیا۔ جماع کو مباشرت اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں دو جلدیں آپس میں مل جاتی ہیں۔ ابن عربی نے کہا: یہ دلیل ہے کہ اس آیت کے نزول کا سبب حضرت عمر کا حقوق زوجیت ادا کرنا ہے نہ کہ حضرت قیس کی بھوک ہے کیونکہ اگر حضرت قیس کی بھوک سبب ہوتی تو ارشاد ہوتا: فالآن کلوا یعنی اب کھاؤ۔ کلام کا آغاز اس سے فرمایا کیونکہ یہی اہم امر تھا جس کے لئے آیت نازل ہوئی۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ ابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ حضرت ابن عباس، مجاہد، حکم بن عیینہ، عکرمہ، حسن، سدی، ربیع اور ضحاک نے فرمایا: اس کا معنی ہے: اولاد طلب کرو(2)۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ کے بعد اس کا ذکر ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے لکھا وہ قرآن ہے۔ زجاج نے کہا: اس کا معنی ہے قرآن کو طلب کرو جو تمہارے لئے اس میں مباح کیا گیا ہے اور تمہیں جس کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس اور حضرت معاذ بن جبل

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

2۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

سے مروی ہے کہ اس کا معنی ہے: لیلۃ القدر کو طلب کرو۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے: رخصت اور وسعت طلب کرو۔ یہ قتادہ کا قول ہے۔ ابن عطیہ نے کہا(1): یہ قول حسن ہے۔ بعض نے فرمایا: لونڈیاں اور بیویاں طلب کرو۔ حسن بصری اور حسن بن قرۃ نے کہا: اتباع طلب کرو۔ حضرت ابن عباس نے اس کو جائز قرار دیا اور ابتغوا کو الابتغاء سے ترجیح دی۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا یہ جواب حضرت قیس کے بارے نازل ہوا اور پہلا حضرت عمر کا جواب تھا۔ پہلے حضرت عمر کا جواب نازل ہوا کیونکہ وہ زیادہ اہم تھا اور وہ مقدم تھا۔

مسئلہ نمبر 7: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ، حتی یہ تبیین کی غایت کے لئے ہے اور کسی ایک کے لئے ظہور کا وقوع صحیح نہیں ہے اور اس پر کھانا حرام نہیں ہے مگر فجر کے طلوع ہونے کی مقدار گزر چکی ہے اور اس حد میں اختلاف ہے جس کے ظہور کے ساتھ کھانے پینے سے رکنا واجب ہوجاتا ہے۔ جمہور نے کہا: وہ فجر جو افق میں دائیں بائیں پھیلتی ہے اس کے متعلق اخبار آئی ہیں اور علماء اسی پر بھروسہ کرتے رہے ہیں۔(2)

مسلم نے حضرت سمرہ بن جندب سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حضرت بلال کی اذان تمہیں سحری کھانے سے دھوکے میں نہ ڈالے اور نہ وہ افق کی لمبی سفیدی جو اس طرح اوپر نیچے پھیلتی ہے۔ حماد نے ہاتھوں سے اشارہ کر کے اس کو حکایت کیا۔ حضرت ابن مسعود کی حدیث میں ہے: فجر وہ نہیں جو اس طرح ہوتی ہے اپنی انگلیوں کو جمع کیا پھر زمین کی طرف اس کو جھکایا۔ لیکن صبح وہ ہوتی ہے جو اس طرح ہوتی ہے۔ اپنی مسبحہ انگلی کو دوسری مسبحہ انگلی پر رکھا اور اپنے ہاتھوں کو پھیلایا (☆)۔

دار قطنی نے حضرت عبدالرحمن بن عباس سے روایت کیا ہے کہ انہیں یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: فجر کی دو قسمیں ہیں وہ جو اس طرح ہوتی ہے گویا بھیڑیے کی دم ہے وہ نہ تو کسی چیز کو حلال کرتی ہے اور نہ حرام کرتی ہے۔ اور وہ جو افق میں عرضاً پھیلتی ہے اس میں نماز حلال ہوتی ہے اور کھانا (روزوں میں) حرام ہوتا ہے۔ یہ حدیث مرسل ہے۔ ایک طائفہ نے کہا: یہ فجر کے طلوع ہونے کے بعد جس کے ساتھ راستوں اور گھروں میں روشنی ہوجاتی ہے۔ حضرت عمر، حضرت حذیفہ، حضرت ابن عباس، حضرت طلق بن علی، حضرت عطا بن ابی رباح اعمش سلیمان وغیرہم سے مروی ہے۔ راستوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر فجر کے ظاہر ہونے کے ساتھ کھانے، پینے سے رکنا واجب ہوجاتا ہے۔ مسروق نے کہا: وہ تمہاری فجر کو فجر شمار نہیں کرتے تھے وہ اس فجر کو شمار کرتے تھے جو گھروں کو روشنی سے بھر دیتی ہے۔ نسائی نے عاصم سے انہوں نے زر سے روایت کیا ہے فرمایا: ہم نے حذیفہ سے کہا: تم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کس وقت سحری کھائی؟ فرمایا: وہ دن تھا مگر سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ دار قطنی سے حضرت طلق بن علی سے روایت کیا ہے کہ اللہ کے نبی نے فرمایا: کھاؤ، پیو اور تمہیں اوپر بلند ہونے والی صبح دھوکے میں نہ ڈالے۔ کھاؤ، پیو حتیٰ کہ تمہارے لئے سرخی عرضاً پھیل جائے۔ دار قطنی نے کہا قیس بن طلق

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا
2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
☆ صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب الاذان قبل الفجر، حدیث نمبر 586، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

قوی نہیں ہے۔ ابوداؤد نے کہا اس میں اہل یمامہ منفرد ہیں (1)۔ طبری نے کہا: وہ چیز جس نے اس کی طرف ان کی رہنمائی کی ہے وہ یہ ہے کہ روزہ دن کے وقت ہے اور دن ان کے نزدیک سورج طلوع ہونے سے مشروع ہوتا ہے اور اس کا آخر اس کا غروب ہوتا ہے۔ لغوی علماء کے درمیان اس میں اختلاف گزر چکا ہے (2)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر بیان فرمائی کہ وہ رات کی تاریکی اور دن کی سفیدی ہے۔ اس میں اور ایامًا معدودات میں یہی فیصل قول ہے۔ دارقطنی نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے، انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: جس نے فجر کے طلوع ہونے سے پہلے رات کو روزہ نہ رکھا اس کا روزہ نہیں۔ اس روایت میں حضرت عبد اللہ بن عباد، حضرت مفضل بن فضالہ سے روایت کرنے میں منفرد ہے۔ اس سند کے ساتھ تمام راوی ثقہ ہیں۔ حضرت حفصہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے فجر سے پہلے روزے کی نیت نہ کی اس کا روزہ نہیں۔ حضرت عبد اللہ بن ابی بکر نے اس کو مرفوع روایت کیا ہے۔ یہ ثقہ راویوں میں سے ہیں جو مرفوع روایت کرتے ہیں۔ حضرت حفصہ سے مرفوعًا مروی ہے۔ ان دو حدیثوں میں فجر کے بارے میں جمہور کے قول کی دلیل ہے اور فجر طلوع ہونے سے پہلے نیت کے بغیر روزہ نہیں ہے جبکہ امام ابوحنیفہ کا قول اس کے خلاف ہے۔

مسئلہ نمبر 8: روزہ جملہ عبادات سے ہے یہ بغیر نیت کے صحیح نہیں ہے۔ شارع علیہ السلام نے فجر سے پہلے اس کا وقت مقرر فرمایا۔ یہ کیسے کہا جائے گا کہ فجر کے بعد بھی کھانا، پینا جائز ہے؟ بخاری (3) اور مسلم نے حضرت سہل بن سعد سے روایت کیا ہے، فرمایا: پہلے وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ تک نازل ہوا اور مِنَ الْفَجْرِ کے الفاظ نازل نہ ہوئے۔ لوگ جب روزہ رکھنے کا ارادہ کرتے تو ان میں سے ایک اپنے پاؤں میں سفید اور سیاہ دھاگہ باندھ دیتا اور وہ اس وقت تک کھاتا، پیتا رہتا حتیٰ کہ ان دونوں کا دیکھنا اس کے لئے ظاہر ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد مِنَ الْفَجْرِ کے الفاظ نازل کئے تو وہ جان گئے کہ اس سے مراد دن کی سفیدی ہے۔ حضرت عدی بن حاتم سے مروی ہے، فرمایا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! خیط ابیض اور خیط اسود سے کیا مراد ہے، کیا یہ دو دھاگے مراد ہیں؟ فرمایا: اگر تو دو دھاگے دیکھے تو پھر بڑی چوڑی گدی والا ہے، پھر فرمایا: نہیں بلکہ اس سے مراد رات کی تاریکی اور دن کی سفیدی ہے۔ اس کو بخاری نے نقل کیا ہے فجر کو خیط (دھاگہ) اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ ابتدا میں سفیدی لمبے دھاگے کی طرح ظاہر ہوتی ہے۔ شاعر ابوداؤد ابادی نے کہا:

الخيط الابيض ضؤ الصبح منفلق والخيط الاسود جنح الليل مكتوم

خیط ابیض سے مراد صبح کی روشنی ہے جو پھوٹنے والی ہے اور خیط اسود سے مراد رات کا جھکاؤ ہے۔

عربوں کے کلام میں خیط سے مراد رنگ ہے۔ الفجر، فجرت الماء افجرہ، فجرا کا مصدر ہے۔ پانی کا جاری ہونا اور پھوٹنا ہے۔ اس کا اصل معنی پھٹنا ہے۔ اسی وجہ سے سورج کی روشنی جو مطلع سے ظاہر ہوتی ہے اسے فجر کہتے ہیں۔ یہ دن کی سفیدی کا آغاز ہے جو افق میں دائیں بائیں پھیلتی ہے عربی میں اس کو خیط ابیض کہا جاتا ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔

1۔ سنن ابی داؤد، باب وقت السحور، حدیث نمبر 2001، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

3۔ صحیح بخاری، باب قول اللہ تعالیٰ وکلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض ۔۔۔۔ الآیہ، حدیث نمبر 1784، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابو داؤد ابادی نے کہا:

فلما اضاءت لنا سدفة ولاح من الصبح خیط انارا (1)

جب ہمارے لئے رات کی تاریکی روشن ہوئی اور صبح سے دھاگہ ظاہر ہوا۔

ایک اور شاعر نے کہا:

قد کاد یبدو و بدت تباشرہ و سدف اللیل البھیم ساترة

قریب تھا کہ روشنی ظاہر ہو اور کالی رات کی تاریکی چھپانے والی تھی۔

فجر کو الصدیع بھی کہا جاتا ہے۔ اسی سے عرب کہتے ہیں: انصدع الفجر، فجر پھوٹی۔ بشر بن ابی خازم یا عمرو بن معدیکرب نے کہا:

تری السرحان مفترشاً یدیه کان بیاض لبته صدیع

تو نے بھیڑیئے کو دیکھا جو اپنے ہاتھوں کو پھیلائے ہوئے تھا اس کی گردن کی سفیدی دھاگے کی مانند تھی۔

شماخ نے سر کی مانگ کو فجر سے تشبیہ دی ہے:

اذا ما اللیل کان الصبح فیه اشق کمفرق الراس الدھین

جب رات میں صبح ہوتی ہے تو وہ اس طرح پھوٹتی ہے جس طرح تیل لگے ہوئے سر میں مانگ ہوتی ہے۔

واضح امر کو بھی الفجر کہتے ہیں۔ یہ صبح کے پھوٹنے کی طرح واضح ہے۔ شاعر نے کہا:

فوردت قبل انبلاج الفجر و ابن ذکاء کامن فی کفر

فجر کے طلوع ہونے سے پہلے وارد ہوئی اور صبح تاریکی میں چھپنے والی تھی۔

مسئلہ نمبر 9: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ اللہ تعالیٰ نے رات کو کھانے، سونے اور جماع کے لئے ظرف بنایا اور دن کو روزے کے لئے ظرف بنایا۔ دونوں زمانوں کے احکام بیان فرمائے اور ان دونوں کے درمیان فرق کیا۔ دن کے وقت کوئی چیز جائز نہیں ہے جس کو رات کے وقت مباح فرمایا مگر مسافر اور مریض کے لئے جائز ہے۔ جیسا کہ بیان گزر چکا ہے۔ جس نے رمضان میں روزہ افطار کیا (مسافر اور مریض کے علاوہ) تو پھر یا تو وہ جان بوجھ کر یا بھول کر توڑنے والا ہوگا۔ اگر پہلی صورت ہو تو امام مالک نے فرمایا: جس نے جان بوجھ کر کھایا، پیا یا جماع کیا تو اس پر قضا اور کفارہ ہے۔ جیسا کہ امام مالک نے مؤطا میں روایت کیا ہے اور مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے رمضان میں افطار کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو غلام آزاد کرنے یا دو ماہ کے روزے رکھنے یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کا کفارہ دینے کا حکم دیا۔ (الحدیث) یہی امام شعبی نے فرمایا: امام شافعی وغیرہ نے فرمایا: یہ کفارہ اس شخص کے ساتھ خاص ہے جو جماع کے ساتھ روزے کو توڑے کیونکہ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث میں ہے، فرمایا: ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

1۔ المحرر الوجیز و تفسیر طبری زیر آیت ہذا

کے پاس آیا اور کہا: یا رسول اللہ! میں ہلاک ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: تجھے کس چیز نے ہلاک کیا، اس نے کہا: میں نے رمضان میں اپنی بیوی سے جماع کیا ہے (1) (الحدیث) اس میں کفارہ کا بیان ترتیب سے ہے۔ یہ حدیث مسلم نے روایت کی ہے۔ یہ قضیہ پہلے قضیہ پر علماء نے محمول کیا ہے۔

انہوں نے کہا: یہ ایک واقعہ ہے اور یہ غیر مسلم ہے بلکہ یہ دو قضیے ہیں جو مختلف ہیں کیونکہ دونوں کا انداز مختلف ہے۔ جس نے افطار کیا کفارہ کو اس پر قیود سے معلق نہیں فرمایا تو مطلقاً لازم ہے۔ یہی قول امام مالک، ان کے اصحاب، اوزاعی، اسحاق، ابوثور، طبری اور ابن منذر کا ہے۔ یہ ایک روایت میں عطا سے مروی ہے۔ حسن اور زہری سے مروی ہے۔ امام شافعی کا بھی یہی قول لازم ہے۔ احوال کے تعارض کے باوجود تفصیل کا ترک کرنا حکم کے عموم پر دلالت کرتا ہے۔ امام شافعی نے اس پر قضا کے ساتھ عقوبت (سزا) کو واجب کیا کیونکہ اس نے رمضان کی حرمت کو توڑا۔

مسئلہ نمبر 10: اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ عورت جس سے خاوند رمضان میں وطی کرے، امام مالک، امام ابو یوسف اور اصحاب رائے نے فرمایا: اس عورت پر بھی خاوند کی طرح کفارہ ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: اس پر ایک کفارہ واجب ہے خواہ اس نے خوشی سے خاوند کی اطاعت کی ہو یا خاوند نے اسے مجبور کیا ہو کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کفارہ کے ساتھ سائل کا جواب دیا اور تفصیل نہیں فرمائی۔ امام ابوحنیفہ سے مروی ہے: اگر اس نے خوشی سے خاوند کی اطاعت کی ہوگی تو ہر ایک پر کفارہ ہوگا اور اگر خاوند نے اسے مجبور کیا ہو تو پھر صرف مرد پر کفارہ ہوگا۔ یہ سحنون بن سعید مالکی کا قول ہے۔ امام مالک نے فرمایا: اس پر دو کفارے ہیں۔ یہی امام مالک کے پیروکاروں کی جماعت کے نزدیک امام مالک کے مذہب کا ماحاصل ہے۔

مسئلہ نمبر 11: علماء کا اختلاف ہے جس نے روزہ کی حالت میں بھول کر جماع کیا یا بھول کر کھایا۔ امام شافعی، امام ابوحنیفہ ان کے اصحاب اور اسحاق نے فرمایا: دونوں صورتوں میں اس پر کوئی چیز واجب نہیں نہ قضا ہے نہ کفارہ ہے۔ امام مالک، لیث اور امام اوزاعی نے کہا: اس پر کفارہ نہیں ہے، قضاء ہے۔

اس کی مثل عطا سے مروی ہے۔ اور عطا سے مروی ہے، اس پر کفارہ ہے اگر جماع کرے اور انہوں نے فرمایا: ایسی بات نہیں بھولتی۔ اہل ظاہر کی ایک قوم نے کہا: خواہ بھول کر وطی کی ہو یا جان بوجھ کر اس پر قضا اور کفارہ دونوں ہیں۔ یہ ابن ماجشون عبدالملک کا قول ہے۔ امام احمد بن حنبل کا نظریہ بھی یہی ہے۔ کیونکہ حدیث کفارہ کو ثابت کرتی ہے اس میں بھولنے والے اور جان بوجھ کر توڑنے والے کے درمیان فرق نہیں ہے۔ ابن منذر نے کہا: اس پر کوئی شے نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 12: امام مالک، امام شافعی، ابوثور اور اصحاب رائے نے کہا: جب بھول کر کھائے پھر یہ خیال کرے کہ روزہ تو ٹوٹ گیا ہے پھر جان بوجھ کر جماع کر لیا تو اس پر قضا ہے کفارہ نہیں ہے۔ ابن منذر نے کہا: ہم بھی یہی کہتے ہیں۔ المذہب میں فرمایا: اس پر قضا اور کفارہ ہے اگر اس نے روزے کی حرمت کو توڑنے کا ارادہ کیا ہے۔ ابو عمر نے کہا: مالک کی اصل پر واجب ہے کہ وہ کفارہ نہ دے کیونکہ جس نے بھول کر کوئی چیز کھائی تو وہ ان کے نزدیک افطار کرنے والا ہے وہ اس دن

1۔ صحیح بخاری، باب قولہ تعالیٰ قد فرض اللہ لکم تحلۃ ایمانکم واللہ مولاکم وھو العلیم الحکیم۔۔۔، حدیث نمبر 6215، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کی قضا کرنے والا ہے۔ اس نے حرمت توڑنے کا ارادہ کیا ہے دراں حالیکہ وہ افطار کرنے والا ہے۔ امام مالک کے علاوہ علماء کے نزدیک جس نے بھول کر روزے میں کوئی چیز کھائی وہ افطار کرنے والا نہیں۔ میں کہتا ہوں: یہ صحیح ہے۔ یہی جمہور کا قول ہے جس نے بھول کر کھایا یا پیا تو اس پر قضا نہیں اور اس کا روزہ مکمل ہے کیونکہ حضرت ابوہریرہ کی حدیث ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب روزہ دار بھول کر کھائے یا بھول کر پیئے تو وہ وہ رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا کیا اور اس پر قضا نہیں ہے۔ ایک روایت میں ہے: وہ روزے کو مکمل کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے کھلایا اور پلایا۔

اس حدیث کو دارقطنی نے نقل کیا ہے۔ فرمایا: اس کی سند صحیح ہے اور اس کے راوی تمام ثقہ ہیں۔ ابوبکر اثرم نے کہا: میں نے حضرت ابوعبداللہ سے سنا ان سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو بھول کر رمضان میں کچھ کھائے۔ انہوں نے فرمایا: حضرت ابوہریرہ کی حدیث کی بنا پر اس پر کچھ نہیں ہے پھر ابوعبداللہ مالک نے فرمایا اور لوگوں نے کہا: امام مالک کہتے ہیں: اس پر قضا ہے اور ہنس پڑے۔ ابن منذر نے کہا: اس پر کوئی شے نہیں ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے بارے میں فرمایا جس نے بھول کر کھایا یا پیا، وہ اپنے روزے کو مکمل کرے اور جب فرمایا یتم صومہ (وہ روزہ مکمل کرے) پس اس نے روزہ مکمل کیا تو اس کا روزہ مکمل ہے۔

میں کہتا ہوں: جس نے بھول کر روزہ افطار کیا اس پر قضا نہیں ہے اور اس کا روزہ مکمل ہے اور جس نے جان بوجھ کر جماع کیا اس پر قضاء اور کفارہ ہے...... واللہ اعلم ... اس طرح جس نے بھول کر افطار نہیں کیا، ہمارے علماء نے قضا کے ایجاب پر اس طرح حجت پکڑی ہے کہ مطلوب پورا روزہ ہے جس میں کسی قسم کی دراڑ نہ ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ۔ رات تک روزہ مکمل کرو۔ یہ روزہ اس نے مکمل نہیں کیا۔ پس وہ اس پر باقی ہے۔ شاید یہ حدیث نفلی روزہ کے متعلق ہو کیونکہ اس میں تخفیف ہے۔ بخاری و مسلم میں ہے جو بھول گیا حالانکہ وہ روزہ سے تھا اس نے کھا، پی لیا تو وہ اپنے روزہ کو مکمل کرے (1)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قضا کا تذکرہ نہیں فرمایا بلکہ آپ نے مواخذہ کے سقوط اور روزہ پر جاری رہنے اور اسے مکمل کرنے کا ذکر فرمایا۔ یہ اگرچہ واجب تھا۔ پس یہ قضا کی دلیل ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ رہا نفلی روزہ تو اس میں قضا نہیں ہے جس نے بھول کر کھایا کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس پر قضا نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: ہمارے علماء نے جس چیز سے حجت پکڑی ہے وہ صحیح ہے اگرچہ شارع علیہ السلام سے اس کا مروی ہونا صحیح نہیں جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ نص صریح میں آیا ہے اور اس کو حضرت ابوہریرہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے فرمایا: جس نے بھول کر رمضان کے مہینہ میں روزہ افطار کیا اس پر قضا اور کفارہ نہیں ہے۔ اس کو دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا: ابن مرزوق اس میں منفرد ہے اور وہ ثقہ ہے اس نے انصاری سے روایت کیا ہے۔ پس احتمال زائل ہو گیا اور اشکال اٹھ گیا۔ الحمد للہ ذی الجلال والکمال۔

مسئلہ نمبر 13: جب اللہ تعالیٰ نے روزے میں ممنوعہ چیزوں کا ذکر کیا وہ کھانا، پینا، جماع ہیں لیکن اس مباشرت کا

1۔ صحیح بخاری، باب الصائم اذا اکل او شرب ناسیا، حدیث نمبر 1797، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ذکر نہیں فرمایا جس کا معنی ہے: جلد کا جلد سے مل جانا جیسے بوسہ دینا، چھونا وغیرہ۔ یہ دلیل ہے کہ جس نے بوسہ دیا اور جسم کے ساتھ جسم ملایا اس کا روزہ صحیح ہے کیونکہ کلام کا انداز اس چیز کی حرمت پر دلالت کرتا ہے جس کو رات نے مباح کیا اور وہ تین چیزیں ہیں۔ اس میں کسی اور چیز پر دلالت نہیں ہے بلکہ یہ دلیل پر موقوف ہے۔ اسی وجہ سے اس میں اختلاف ہے۔ علماء متقدمین کا اختلاف ہے، اسی سے مباشرت ہے۔ ہمارے علماء نے کہا: جس کو اپنے نفس پر ضبط نہ ہو اس کے لئے مکروہ ہے تاکہ روزے کے فساد کا سبب نہ بن جائے۔ مالک نے نافع سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے روزہ دار کو بوسہ اور مباشرت سے منع فرمایا۔ یہ اس خوف کی وجہ سے ہے جو ان سے فساد پیدا ہوگا۔ اگر بوسہ دے اور سلامت رہے تو اس پر کوئی حرج نہیں اسی طرح اگر مباشرت کرے۔ بخاری نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بوسہ لیتے تھے اور مباشرت (جسم سے جسم ملانا) کرتے تھے حالانکہ آپ روزے سے ہوتے تھے، جنہوں نے روزہ دار کے لئے بوسہ کو مکروہ کیا۔ ان میں حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عروہ بن زبیر بھی ہیں۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے، وہ ایک دن اس کی جگہ قضا کرے اور حدیث ان پر حجت ہے۔ ابو عمر نے فرمایا: میں کسی کو نہیں جانتا جس نے اس شخص کے لئے مباشرت اور بوسہ کی رخصت دی ہو جس پر روزے کا فساد پیدا ہوتا ہو اور جس نے بوسہ دیا اور اس کی منی نکل آئی تو اس پر قضا ہے کفارہ نہیں ہے۔ یہ امام ابو حنیفہ، اور آپ کے اصحاب، ثوری، حسن اور امام شافعی کا قول ہے۔ ابن منذر نے اس کو پسند کیا ہے۔ اور فرمایا: جس نے کفارہ واجب کیا ہے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ ابو عمر نے کہا: اگر بوسہ دیا اور مذی نکل آئی تو ان کے نزدیک اس پر کچھ نہیں ہے۔ امام احمد نے فرمایا: جس نے بوسہ دیا اور اسے مذی آگئی یا منی نکل آئی تو اس پر قضا ہے کفارہ نہیں ہے مگر جس نے جماع کیا اور بھول کر یا جان بوجھ کر آلہ تناسل کو داخل کیا تو اس پر کفارہ بھی ہے۔ ابن قاسم نے مالک سے روایت کیا ہے کہ جس شخص نے بوسہ دیا، مباشرت کی ...... اس سے کوئی پانی نہ نکلا تو اس پر قضا ہے۔ ابن وہب نے مالک سے روایت کیا ہے کہ اس پر قضا نہیں ہے حتیٰ کہ اس سے مذی نکلے۔ قاضی ابو محمد نے فرمایا: ہمارے اصحاب کا اتفاق ہے کہ ایسے شخص پر کفارہ نہیں ہے اگر منی نکلے تو کیا قضا کے ساتھ کفارہ لازم ہوگا۔ اس کی دو صورتیں ہیں: ایک: بوسہ دیا ہوگا، پھر انزال ہو گیا ہوگا یا اس نے بوسہ دیا ہوگا پھر اس نے لذت اٹھائی اور پھر دوبارہ بوسہ لیا پھر انزال ہو گیا۔ اگر اس نے ایک بوسہ دیا یا ایک مرتبہ مباشرت اور چھوا تو اشہب اور سحنون نے کہا: اس پر کفارہ نہیں ہے حتیٰ کہ وہ بار بار یہ عمل کرے۔

ابن قاسم نے کہا: وہ تمام صورتوں میں کفارہ دے گا مگر نظر کا تقاضا یہ ہے کہ اس پر کفارہ نہیں حتیٰ کہ بار بار یہ عمل کرے اور جنہوں نے کفارہ کے وجوب کا قول کیا ہے جب وہ بوسہ دے یا مباشرت کرے یا اپنی بیوی سے ملامست کرے یا فرج کے علاوہ میں جماع کرے پھر اسے منی آجائے۔ ان میں حسن بصری، عطا، ابن المبارک، ابو ثور اور اسحاق ہیں۔ یہ "مدونہ" میں امام مالک کا قول ہے اور اشہب کے قول کی حجت یہ ہے کہ چھونے، بوسہ دینے اور مباشرت فی نفسہا روزہ توڑنے والی چیزیں نہیں ہیں معاملہ کو اسی کی طرف پھیرا جائے گا جن سے افطار ہوتا ہے جب اس نے ایک مرتبہ یہ عمل کیا اور انزال اور افساد صوم کا ارادہ نہیں کیا تو اس پر کفارہ نہیں ہے جس طرح عورت کی طرف دیکھنا ہے۔ جب اس نے اس عمل کا تکرار کیا تو اس نے روزہ

کے افساد کا قصد کیا پس اس پر کفارہ لازم ہے جیسا کہ اگر بار بار دیکھے۔ لخمی نے کہا: دیکھنے سے انزال کی صورت میں علماء کا اتفاق ہے کہ اس پر کفارہ نہیں مگر یہ کہ وہ بار بار کرے۔ اصل یہ ہے کہ کفارہ واجب نہیں مگر اس پر جس نے روزہ توڑنے کا قصد کیا اور روزہ کی حرمت تا تار کرنے کا ارادہ کیا۔ جب یہ صورت ہو تو جس کو انزال ہو جاتا ہو یا اس کی عادت مختلف ہو، کبھی انزال ہوتا ہو اور کبھی انزال نہ ہوتا ہو تو میں اس پر کفارہ دیکھتا ہوں کیونکہ ایسا کرنے والا روزہ توڑنے کا ارادہ کرنے والا ہے اور اگر اس کی عادت سلامتی ہو تو اندازہ کیا جائے گا کہ عادت کے خلاف ہو تو اس پر کفارہ نہیں ہے۔ امام مالک کا قول کفارہ کے وجوب کا احتمال رکھتا ہے کیونکہ یہ جاری نہیں ہوتا مگر اس سے جس کی یہ طبع ہو اور ظاہر پر اکتفا کیا۔ اشہب نے لوگوں کے غالب امر پر محمول کیا کہ وہ اس سے سلامت ہوتے ہیں اور نظر میں ان کا قول اس پر دلیل ہے۔

میں کہتا ہوں: نظر میں جو اتفاق حکایت کیا ہے اور اس کو اصل بنایا ہے، حقیقۃً اس طرح نہیں ہے۔ باجی نے ''المنتقی'' میں حکایت کیا ہے۔ اگر ایک نظر دیکھا اس سے مقصود لذت تھی پھر اسے انزال ہو گیا تو شیخ ابوالحسن نے کہا: اس پر قضا اور کفارہ ہے۔ الباجی نے کہا: میرے نزدیک یہی صحیح ہے کیونکہ جب اس سے اس نے لطف اٹھانے کا قصد کیا تو وہ بوسہ ہے اور دوسری استمتاع کی قسموں کی طرح ہے۔ واللہ اعلم۔ جابر بن زید، ثوری، امام شافعی، ابوثور اور اصحاب رائے نے اس شخص کے بارے میں کہا جس نے عورت کی طرف بار بار دیکھا حتیٰ کہ اس سے منی نکل آئی تو اس پر قضاء و کفارہ نہیں ہے۔ یہ ابن منذر کا قول ہے۔ الباجی نے کہا: مدینہ میں ابن نافع نے مالک سے روایت کیا ہے کہ اگر برہنہ عورت کو دیکھا پھر لذت محسوس کی اور انزال ہو گیا تو اس پر قضا ہے کفارہ نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 14: جمہور علماء کا قول ہے کہ جنبی حالت میں جس پر فجر طلوع ہو اس کا روزہ صحیح ہے۔ قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا: یہ بالاجماع جائز ہے۔ صحابہ کے درمیان اس میں کلام واقع ہوئی پھر اس پر معاملہ ٹھہر گیا کہ جو جنبی ہونے کی حالت میں صبح کرے اس کا روزہ صحیح ہے۔

میں کہتا ہوں: صحابہ کے درمیان کلام کے وقوع کے متعلق جو ذکر کیا گیا ہے وہ صحیح اور مشہور ہے۔ یہ حضرت ابوہریرہ کا قول ہے: جس نے جنبی ہونے کی حالت میں صبح کی اس کا روزہ نہیں اس کو مؤطا وغیرہ نے نقل کیا ہے (1)۔ نسائی کی کتاب میں ہے جب حضرت ابوہریرہ نے رجوع کیا تو فرمایا: اللہ کی قسم! میں نے نہیں کہا یہ اللہ کی قسم! حضرت محمد ﷺ نے کہا تھا۔ اس سے حضرت ابوہریرہ کے رجوع کے متعلق اختلاف ہے اہل علم کے نزدیک حضرت ابوہریرہ کا مشہور قول یہ ہے کہ اس کا روزہ نہیں۔ یہ ابن منذر نے حکایت کیا ہے۔ حسن بن صالح سے روایت ہے۔ حضرت ابوہریرہ سے ایک تیسرا قول بھی مروی ہے، فرمایا: جب اسے جنابت کا علم ہو پھر سو جائے حتیٰ کہ صبح ہو جائے تو وہ افطار کرنے والا ہے اگر وہ نہ جانے حتیٰ کہ وہ صبح کر لے تو روزہ دار ہے۔ یہ عطا، طاؤس اور عروہ بن زبیر سے مروی ہے۔ حسن اور نخعی سے مروی ہے کہ یہ نوافل میں جائز ہو گا فرض میں قضا کرے گا۔

میں کہتا ہوں: یہ علماء کے اس شخص کے بارے میں چار اقوال ہیں جو جنبی ہونے کی حالت میں صبح کرے ان میں سے صحیح

1۔ صحیح بخاری، الصائم یصبح جنبا، حدیث نمبر 1791، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

قول جمہور علماء کا ہے حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ صبح کے وقت بغیر احتلام کے جماع سے جنبی ہوتے تھے پھر روزہ رکھتے تھے۔ حضرت عائشہ سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ رمضان میں بغیر احتلام کے جنبی ہونے کی حالت میں صبح کرتے تھے پھر غسل کرتے تھے اور روزہ رکھتے تھے۔ ان دونوں حدیثوں کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے (1) فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ کے ارشاد سے ضرورۃً یہ مفہوم ثابت ہوتا ہے کیونکہ جب طلوع فجر تک جماع کرتا رہے تو ضرورۃً معلوم ہوا کہ اس پر فجر طلوع ہوگی تو وہ جنبی ہوگا۔ غسل فجر کے بعد ہی ہوگا۔ امام شافعی نے فرمایا: اگر ذکر عورت کی شرمگاہ میں داخل ہو وہ اسے فجر طلوع ہونے کے ساتھ نکالے تو اس پر قضا نہیں ہے۔ مزنی نے کہا: اس پر قضا ہے کیونکہ یہ مکمل جماع ہے۔ پہلا قول صحیح ہے اور وہی ہمارے علماء کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 15: علماء کا حیض والی عورت کے بارے میں اختلاف ہے جو فجر سے پہلے پاک ہو اور پھر وہ غسل نہ کرے حتیٰ کہ صبح ہو جائے۔ جمہور علماء فرماتے ہیں: اس پر روزہ واجب ہے خواہ اس نے جان بوجھ کر روزہ ترک کیا ہو یا بھول کر جس طرح جنبی کا حکم ہے۔ یہ امام مالک اور ابن قاسم کا قول ہے۔ عبد الملک نے کہا: جب عورت فجر سے پہلے پاک ہو اور پھر وہ غسل کو مؤخر کرے حتیٰ کہ فجر طلوع ہو جائے تو اس کا وہ دن افطار کا دن ہے کیونکہ وہ دن کے بعض حصہ میں پاک نہیں تھی وہ جنبی کی طرح نہیں ہے کیونکہ احتلام روزے کو نہیں توڑتا جبکہ حیض کا خون روزے کو توڑ دیتا ہے۔ اسی طرح ابو الفرج نے اپنی کتاب میں عبد الملک سے روایت کیا ہے۔ اوزاعی نے کہا: اس نے چونکہ غسل کرنے میں کوتاہی کی ہے اس لئے وہ قضا کرے گی۔ ابن الجلاب نے عبد الملک سے روایت کیا ہے کہ اگر وہ فجر سے پہلے ایسے وقت میں پاک ہوتی جس میں غسل کرنا اس کے لئے ممکن تھا پھر اس نے کوتاہی کی اور غسل نہ کیا حتیٰ کہ صبح ہو گئی تو اسے کچھ ضرر نہیں جیسے جنبی کا حکم ہے۔ اگر وقت تنگ ہو جس میں وہ غسل نہیں کر سکتی تو اس کا روزہ جائز نہیں اور اس کا وہ دن افطار کا دن ہے۔ یہی قول امام مالک کا ہے۔ یہ اس عورت کی مانند ہے جس پر فجر طلوع ہو جبکہ وہ حیض سے ہو۔ حضرت محمد بن مسلمہ نے ایسی عورت کے بارے فرمایا وہ روزہ بھی رکھے اور قضا بھی کرے۔ جیسا کہ اوزاعی کا قول ہے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے اور ان کا یہ قول شاذ ہے۔ انہوں نے فجر سے پہلے پاک ہونے والی عورت پر کفارہ اور قضا کو واجب کیا ہے جبکہ اس نے سستی کی ہو اور صبح تک غسل نہ کیا ہو۔

مسئلہ نمبر 16: جب عورت رمضان میں رات کو پاک ہو اور اس کو معلوم نہ ہو کہ کیا اسے طہارت فجر سے پہلے ہوئی یا بعد تو وہ اس دن روزہ رکھے اور احتیاطاً اس دن کے روزہ کی قضا بھی کرے اور اس پر کفارہ نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 17: نبی کریم ﷺ سے مروی ہے، فرمایا: پچھنے لگانے والا اور پچھنے لگوانے والا افطار کرے۔ یہ حضرت ثوبان کی حدیث، حضرت شداد بن اوس اور حضرت رافع بن خدیج کی حدیث سے ثابت ہے۔ یہی امام احمد اور اسحاق کا قول ہے۔ احمد نے شداد کی حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اور علی بن المدینی نے حضرت رافع بن خدیج کی حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ امام مالک، امام شافعی اور ثوری نے کہا: اس پر قضا نہیں ہے مگر یہ تغریر (کمزوری کے اندیشہ) کی بنا پر اس کے لئے مکروہ

1۔ صحیح بخاری، باب اغتسال الصائم، حدیث نمبر 1795، ایضاً

ہے(1)۔ صحیح مسلم میں حضرت انس کی حدیث ہے کہ حضرت انس سے پوچھا گیا: کیا تم پچھنے لگوانے روزہ دار کے لئے مکروہ جانتے تھے؟ حضرت انس نے فرمایا: نہیں مگر ضعف کی بناء پر(2)۔ ابو عمر نے کہا: شداد اور رافع اور ثوبان کی حدیث ہمارے نزدیک منسوخ ہے اور اس کی ناسخ حضرت ابن عباس کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے روزے اور احرام کی حالت میں پچھنے لگوائے۔ کیونکہ حضرت شداد وغیرہ کی حدیث میں ہے کہ فتح مکہ کے سال رسول اللہ ﷺ ایک شخص کے پاس سے گزرے جو اٹھارہ رمضان کو پچھنے لگوا رہا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: پچھنے لگانے والا اور جس کو پچھنے لگائے گئے دونوں کا روزہ ٹوٹ گیا۔ جبکہ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے سال احرام اور روزہ کی حالت میں خود پچھنے لگوائے جب آپ ﷺ کا حج، حجۃ الوداع کا سال تھا تو یہ لامحالہ پہلی حدیث کی ناسخ ہے کیونکہ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے رمضان پایا ہی نہیں تھا کیونکہ ربیع الاول میں آپ ﷺ کا وصال ہو گیا تھا۔

مسئلہ نمبر 18: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ یہ امر ہے اور وجوب کا مقتضا ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور اِلٰی غایت کے لئے ہے جب اس کا مابعد اس کے ماقبل کی جنس سے ہو تو وہ ماقبل کے حکم میں داخل ہوتا ہے جیسے تیرا قول ہے اشتریت الفدان الی حاشیتہ (میں نے چار سو مربع زمین حاشیہ سمیت خریدی) یا اشتریت منك من هذه الشجرة الی هذه الشجرة۔ مبیع شجر ہے اور آخری درخت بھی اس مبیع میں داخل ہے۔ بخلاف تیرے اس قول کے: اشتریت الفدان الی الدار۔ اس میں دار مبیع میں داخل نہ ہوگا کیونکہ وہ زمین کی جنس سے نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رات کے ظہور تک روزہ کو مکمل کرنے کی شرط رکھی ہے جیسا کہ کھانا جائز قرار دیا حتیٰ کہ دن ظاہر ہو جائے۔(3)

مسئلہ نمبر 19: روزے کی تکمیل میں سے نیت کا متصل ہونا بھی ہے۔ اگر دن کا بعض حصہ روزے کی نیت نہ کی اور فطر کی نیت کی مگر اس نے نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ تو "مدونہ" میں اسے افطار کرنے والا بنایا ہے اور اس پر قضا لازم ہے۔ ابن حبیب کی کتاب میں ہے کہ وہ اپنے روزے پر ہے اور روزے میں اسے کوئی چیز خارج نہیں کرتی مگر بالفعل افطار کرے اور نیت بھی نہ ہو۔ بعض علماء نے فرمایا: اس پر قضا اور کفارہ ہے۔ سحنون نے کہا: جس نے رات کو افطار کی نیت کی وہ کفارہ دے اور جس نے دن میں روزے کی نیت کی اسے کوئی نقصان نہیں لیکن وہ استحساناً قضا کرے۔ میں کہتا ہوں: یہ بہتر ہے۔

مسئلہ نمبر 20: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَى الَّيْلِ جب رات ظاہر ہو جائے تو افطار کرنا شرعاً سنت ہے خواہ کچھ کھائے یا نہ کھائے۔ ابن عربی نے کہا: امام ابو اسحاق شیرازی سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جس نے تین طلاق کی قسم اٹھائی کہ وہ گرم، سرد چیز پر روزہ افطار نہیں کرے گا۔ انہوں نے جواب دیا کہ وہ سورج کے غروب ہونے کے وقت افطار کرے گا تو اس پر کچھ واجب نہ ہوگا اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے قول سے حجت پکڑی ہے۔ جب رات ادھر سے آئے اور دن ادھر سے چلا جائے تو روزہ افطار کر دے(4)۔ امام ابو نصر بن صباغ صاحب الشامل سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: اسے

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی الصائم یحتجم، حدیث نمبر 2020، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح بخاری، باب الحجامة والقیء للصائم، حدیث نمبر 1804، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا
4۔ صحیح بخاری، باب متی یحل فطر الصائم، حدیث نمبر 1818، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گرم یا سرد چیز پر افطار کرنا ضروری ہے اور امام ابو اسحاق نے جو جواب دیا وہ اولیٰ ہے کیونکہ وہ کتاب وسنت کے مطابق ہے۔

مسئلہ نمبر 21: اگر کسی نے بادل کی وجہ سے یہ گمان کیا کہ سورج غروب ہو چکا ہے، پھر اس نے روزہ افطار کر دیا پھر سورج ظاہر ہو گیا تو اکثر علماء کے قول کے مطابق اس پر قضا ہے۔ بخاری میں حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، فرمایا: ہم نے بادل والے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں روزہ افطار کر دیا، پھر سورج طلوع ہو گیا۔ ہشام سے پوچھا گیا: انہیں قضا کا حکم دیا گیا تھا؟ فرمایا: انہیں قضا لازم ہے۔ حضرت عمر نے اس مسئلہ میں فرمایا: مسئلہ آسان ہے۔ ہم نے وقت میں اجتہاد کیا۔ آپ نے قضا مراد لی۔ حضرت عمر سے مروی ہے، فرمایا: اس پر قضا نہیں ہے۔ حسن بصری کا بھی یہی قول ہے، فرمایا: اس پر بھولنے والے کی طرح قضا نہیں ہے۔ یہی قول اسحاق اور اہل ظاہر کا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَى الَّيْلِ اس قول کو رد کرتا ہے۔

مسئلہ نمبر 22: اگر روزہ افطار کیا دراں حالیکہ اسے سورج کے غروب ہونے میں شک تھا تو وہ قضا کے ساتھ کفارہ دے۔ یہ امام مالک کا قول ہے مگر یہ کہ اس کا غالب گمان سورج کے غروب ہونے کا ہو۔ اور جسے فجر کے طلوع ہونے کا شک ہو تو اسے کھانے، پینے سے رکنا لازم ہے۔ اگر اس نے شک کے ساتھ کھایا تو اس پر قضا ہو گی جیسے بھولنے والے کا حکم ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ اہل مدینہ وغیرہ کے علماء میں سے بعض اس پر کوئی چیز نہیں دیکھتے تھے حتیٰ کہ اس کے لئے فجر کا طلوع ہونا واضح ہو جائے۔ ابن منذر کا یہی قول ہے۔ الکیا طبری نے کہا: ایک قوم نے گمان کیا کہ جب اس کے لئے اول فجر تک افطار مباح ہے جب اس نے اس گمان پر کھایا کہ فجر طلوع نہیں ہوئی تو اس نے شرع کی اجازت سے کھانے کے جواز کے وقت میں کھایا۔ پس اس پر قضا نہیں ہے۔ اسی طرح مجاہد اور جابر بن زید نے کہا ہے اور قضا کے وجوب میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جب رمضان کی پہلی رات میں چاند مطلع کے ابر آلود ہونے کی وجہ سے نظر نہ آئے پھر اس نے کھایا۔ اس کے بعد ظاہر ہوا کہ آج رمضان کا دن تھا ہم بھی اس جیسے مسئلہ میں گفتگو کر رہے ہیں۔ اسی طرح دار الحرب میں قیدی نے جب شعبان کا دن گمان کرتے ہوئے کچھ کھایا پھر اس کے خلاف ظاہر ہوا۔

مسئلہ نمبر 23: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَى الَّيْلِ اس میں صوم وصال سے نہی کا تقاضا پایا جاتا ہے کیونکہ رات روزے کی غایت ہے۔ یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے (1)۔ اس میں بھی اختلاف ہے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر، ابراہیم التیمی، ابو الجوزا، ابو الحسن دینوری وغیرہم صوم وصال رکھتے تھے۔ حضرت ابن زبیر سات دن وصال کا روزہ رکھتے تھے۔ جب افطار کرتے تھے تو کبھی گھی اور مصبر پیتے تھے حتیٰ کہ انتڑیاں بھر جاتی تھیں۔ فرمایا: ان کی انتڑیاں خشک ہوتی تھیں۔ ابو الجوزاء سات دنوں اور سات راتوں کا صوم وصال رکھتے تھے، اگر وہ کسی سخت آدمی کے بازو کو پکڑتے تو اس کا بازو توڑ دیتے۔ قرآن وسنت کا ظاہر صوم وصال سے منع کا تقاضا کرتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب سورج ادھر سے غروب ہو اور رات ادھر سے آجائے تو روزہ دار افطار کر دے۔ اس کو مسلم نے حضرت عبداللہ بن اوفی کی حدیث سے نقل کیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صوم وصال سے منع فرمایا، جب انہوں نے صوم وصال سے رکنے سے انکار کیا تو کوئی دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

1۔ المحرر الوجیز وتفسیر طبری زیر آیت ہذا

ان کے ساتھ صوم وصال رکھا پھر عید الفطر کا چاند نظر آ گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر چاند نظر نہ آتا تو میں اور زیادہ تمہیں صوم وصال رکھواتا، یہ آپ ان پر انکار کے طور پر فرمار ہے تھے جب انہوں نے صوم وصال سے رکنے سے انکار کیا۔ مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ حضرت انس کی حدیث میں ہے: اگر ہمارے لئے مہینہ لمبا ہوتا تو ہم متواتر صوم وصال رکھتے رہتے تا کہ اعمال میں شدت کرنے والے شدت چھوڑ دیتے۔

اس کو مسلم نے روایت کیا ہے(1)۔ آپ ﷺ نے فرمایا: صوم وصال سے اجتناب کرو صوم وصال سے اجتناب کرو۔ یہ صوم وصال سے منع میں تاکید کے طور پر فرمایا۔ اور بخاری نے اس حدیث کو نقل فرمایا ہے۔ صوم وصال کو اس لئے ناپسند فرمایا کیونکہ اس میں قویٰ میں ضعف آ جاتا ہے اور بدن کمزور ہو جاتا ہے۔ جمہور علماء میں سے بعض نے صوم وصال کو حرام قرار دیا ہے کیونکہ اس میں ظاہر کی مخالفت ہے اور اہل کتاب سے مشابہت ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ہمارے روزے اور اہل کتاب کے روزے کے درمیان فرق سحری کا کھانا ہے۔ اس حدیث کو مسلم اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ بخاری میں حضرت ابو سعید خدری سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے کہ صوم وصال نہ رکھو جو وصال کا ارادہ کرے وہ سحری تک وصال کرے۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ تو صوم وصال رکھتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں تمہاری ہیئت کی طرح نہیں ہوں میں رات گزارتا ہوں میرا کھلانے والا ہے جو مجھے کھلاتا ہے اور میرا پلانے والا ہے جو مجھے پلاتا ہے۔ علماء نے کہا: سحری تک فطر کی تاخیر میں اباحت ہے اور یہ وصال کی غایت ہے جو وصال کرنا چاہے اور ایک دن کو دوسرے دن کے ساتھ ملانے سے منع ہے۔ یہی امام احمد، اسحاق، ابن وہب (جو مالک کے شاگرد ہیں) کا قول ہے اور جنہوں نے وصال کے جواز پر حجت پکڑی ہے۔ انہوں نے کہا: وصال سے اس لئے نہی فرمائی تھی کہ لوگوں کا زمانہ اسلام قریب قریب تھا تو رسول اللہ ﷺ کو اندیشہ ہوا کہ وہ وصال کی تکلیف اٹھائیں گے اور اعلیٰ مقامات کی کوشش کریں گے اور جہاد اور دشمن پر قوت جو اس سے زیادہ نفع بخش ہے اس میں کمزور پڑ جائیں گے اس وقت انہیں قوت و جہاد کی ضرورت ہے۔ جو نبی کریم ﷺ صوم وصال اور طاعات کے اعلیٰ مقام کو لازم پکڑتے تھے جب صحابہ نے وصال کے بارے میں پوچھا تو اپنے اور ان کے درمیان فرق ظاہر فرمایا اور انہیں بتایا کہ اس سلسلہ میں ان کی حالت، عام لوگوں کی حالت سے مختلف ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں تمہاری مثل نہیں ہوں میں رات گزارتا ہوں میرا رب مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے۔ جب صحابہ کے دلوں میں ایمان مکمل ہو گیا اور ان کے سینوں میں مستحکم و راسخ ہو گیا اور مسلمانوں کی کثرت ہو گئی اور دشمنوں پر غالب آ گئے تو اولیاء اللہ نے صوم وصال رکھا اور اپنے لئے اعلیٰ مقامات کو لازم پکڑا۔

میں کہتا ہوں: اسلام کے ظہور اور دشمنوں کے مغلوب ہونے کے باوجود صوم وصال کو ترک کرنا اولیٰ ہے اور یہ اعلیٰ درجہ اور ارفع مقام ہے۔ اس کی دلیل وہی ہے جو ہم نے ذکر کی ہے اور رات صوم شرعی کا زمانہ نہیں ہے حتیٰ کہ اگر کوئی رات کو نیت کے ساتھ روزہ رکھے تو اسے اس پر ثواب نہ ہوگا۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے متعلق خبر دی کہ آپ صوم وصال رکھتے ہیں۔ صحابہ نے

1۔ صحیح بخاری، باب مایجوز من اللو، حدیث نمبر 6700، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یہ گمان کیا تو کہا: آپ تو صوم وصال رکھتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ آپ کو کھلایا اور پلایا جاتا ہے۔ اس حقیقت کا ظاہر یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت کا کھانا، پینا دیا جاتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ ان معانی اور لطائف پر محمول ہے جو آپ کے دل پر وارد ہوتے تھے۔ جب کوئی لفظ حقیقت ومجاز کا احتمال رکھتا ہو تو اصل حقیقت ہوتی ہے حتیٰ کہ کوئی دلیل وارد ہو جو حقیقت کو زائل کر دے پھر جب صحابہ نے صوم وصال سے رکنے سے انکار کیا تو آپ نے ان کے ساتھ صوم وصال رکھا آپ کی تو عادت تھی جیسا آپ نے اپنے متعلق خود خبر دی اور صحابہ ایسی عادت پر تھے حتیٰ کہ وہ کمزور ہو جائیں گے اور ان کا صبر کم ہو گا تو وہ صوم وصال نہیں رکھیں گے۔ یہ ہے آپ کے انکار کی حقیقت تاکہ وہ تعمق (انتہائی گہرائی) کو چھوڑ دیں اور اس شدت کو ترک کر دیں جس کا انہوں نے ارادہ کیا تھا۔ اگر ہم (میں کھلایا اور پلایا جاتا ہو) کا اپنا معنی مراد لیں تو آپ حکماً افطار کرنے والے ہوں گے جیسے جس نے روزے میں چغلی کھائی یا جھوٹ کی گواہی دی تو وہ حکماً افطار کرنے والا ہے اور ان دونوں کے درمیان فرق نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا اللہ تعالیٰ کو اس کے کھانا، پینا ترک کرنے کی ضرورت نہیں۔(1)

مسئلہ نمبر 24: روزہ دار کے لئے مستحب ہے کہ جب وہ افطار کرے تو کھجوروں، چھوہاروں اور پانی کے گھونٹوں سے افطار کرے جیسا کہ ابوداؤد نے حضرت انس سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھنے سے پہلے کھجوروں سے روزہ افطار کرتے تھے۔ اگر کھجوریں نہ ہوتیں تو چھوہاروں سے افطار کرتے اگر چھوہارے بھی نہ ہوتے تو پانی کے گھونٹ بھرتے۔ اس حدیث کو دارقطنی نے نقل کیا ہے اور فرمایا: اس کی سند صحیح ہے۔ دارقطنی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب افطار کرتے تو یہ دعا مانگتے: **لَكَ صمنا و على رزقك افطرنا فتقبل منا انك انت السميع العليم**۔ ''ہم نے تیری رضا کے لئے روزہ رکھا، تیرے رزق پر افطار کیا تو ہماری طرف سے قبول فرما بے شک تو سننے والا اور جاننے والا ہے''۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب افطار کرتے تو یہ کہتے: پیاس چلی گئی، رگیں تر ہو گئیں اور ان شاء اللہ اجر ثابت ہے۔

اس حدیث کو ابوداؤد نے بھی نقل کیا ہے۔ دارقطنی نے کہا: حسین بن واقد اس میں منفرد ہیں اس کی سند حسن ہے(2)۔ ابن ماجہ نے حضرت عبداللہ بن زبیر سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن معاذ کے پاس روزہ افطار کیا تو یہ کہا: **افطر عندكم الصائمون و اكل طعامكم الابرار و صلت عليكم الملائكة** (تمہارے پاس روزہ داروں نے روزہ افطار کیا، تمہارا کھانا نیکوکاروں نے کھایا اور تم پر فرشتوں نے درود بھیجا)۔ حضرت زید بن خالد جہنی سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے روزہ دار کو روزہ افطار کرایا اسے ان جیسا اجر ملے گا اور ان کے اجروں سے بھی کچھ کم نہ ہو گا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: روزہ دار کے لئے افطار کے وقت کی دعا رد نہیں کی جاتی۔ ابن ابی ملیکہ نے کہا: میں نے حضرت عبداللہ بن عمرو کو یہ فرماتے سنا کہ جب وہ افطار کرتے تو یہ دعا

1۔ صحیح بخاری، باب من لم یدع قول الزور والعمل بہ، حدیث نمبر 1770، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، باب القول عند الافطار، حدیث نمبر 2010، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مانگتے۔ اللھم انی اسالك برحمتك التی وسعت کل شئ ان تغفرلی (اے اللہ! میں تجھ سے تیری اس رحمت کے طفیل اپنی مغفرت کا سوال کرتا ہوں جو ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے)۔ صحیح مسلم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ روزہ دار کے لئے دو خوشیاں ہیں جن سے وہ خوش ہوتا ہے جب افطار کرتا ہے تو افطاری سے خوش ہوتا ہے اور جب اپنے رب سے ملاقات کرے گا تو اپنے روزے سے خوش ہوگا۔

مسئلہ نمبر 25: شوال کے چھ روزے رکھنا مستحب ہے جیسا کہ مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ میں حضرت ابوایوب انصاری سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے رمضان کے روزے رکھے پھر اس کے پیچھے شوال کے روزے رکھے اس کے لئے پورے زمانہ کے روزوں کے ثواب کی طرح ثواب ہے۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ حضرت سعد بن سعید انصاری مدنی کی حدیث ہے اور یہ ان لوگوں میں سے ہے جن سے بخاری نے کوئی چیز نقل نہیں کی۔ اور ابو اسماء الرحبی عن ثوبان مولی النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ سے عمدہ سند کے ساتھ تفسیر سے یہ حدیث مروی ہے۔ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کے بدلے دس نیکیاں رکھی ہیں، رمضان کا مہینہ دس مہینوں کا بدل ہے اور عید الفطر کے بعد چھ ایام پورے سال کا بدل ہیں (1)۔ اس حدیث کو نسائی نے روایت کیا ہے۔ ان ایام کے روزوں میں اختلاف ہے۔ امام مالک نے مؤطا میں مکروہ کہا ہے اس خوف سے کہ جاہل لوگ رمضان کے ساتھ اس چیز کو نہ ملا دیں جو رمضان میں سے نہیں ہے اور جس کا خوف امام مالک نے کیا وہ واقع بھی ہوا حتیٰ کہ خراسان کے بعض شہروں میں رمضان کی عادت کے مطابق سحری کے وقت اٹھتے تھے۔ مطرف نے مالک سے روایت کیا ہے کہ امام مالک خود یہ روزے رکھتے تھے۔ امام شافعی نے ان روزوں کو مستحب کہا ہے، امام ابو یوسف نے ان کو مکروہ کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 26: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ جماع اعتکاف کو فاسد کر دیتا ہے۔ اہل علم کا اجماع ہے کہ جو اعتکاف کی حالت میں جان بوجھ کر جماع کرے گا وہ اپنے اعتکاف کو فاسد کرنے والا ہوگا پھر جب کوئی ایسا کرے تو اس پر جو ہوگا اس میں اختلاف ہے۔ حسن بصری اور زہری نے کہا: ایسے شخص پر وہی ہوگا جو رمضان میں اپنی اہلیہ سے جماع کرنے والے پر ہوتا ہے اور رہی بغیر جماع کے مباشرت اگر اس سے تلذذ کا قصد کیا ہوگا تو یہ مکروہ ہے۔ اگر تلذذ کا قصد نہیں کیا تو مکروہ نہیں ہے کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر کو کنگھی کرتی تھی جبکہ آپ معتکف ہوتے تھے (2) لامحالہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن کو اپنے ہاتھ سے چھوتی ہوں گی۔ یہ دلیل ہے کہ بغیر شہوت کے مباشرت ممنوع نہیں ہے۔ یہ عطاء، امام شافعی اور ابن منذر کا قول ہے۔ ابوعمر نے کہا: علماء کا اجماع ہے کہ معتکف نہ مباشرت کرے نہ بوسہ دے۔ اگر ایسا کرے تو اس پر حد ہے۔ اس میں اختلاف ہے۔ امام مالک اور امام شافعی نے کہا: اگر وہ ایسا کرے گا تو اس کا اعتکاف فاسد ہو جائے گا۔ یہ مزنی کا قول ہے۔ مسائل

1۔ سنن ابن ماجہ، باب فی ثواب من فطر صائما، حدیث نمبر 1705، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب المعتکف یدخل راسه البیت للغسل، حدیث نمبر 1905، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اعتکاف میں انہوں نے دوسری جگہ فرمایا: وطی سے اعتکاف فاسد نہیں ہوتا مگر ایسی وطی جو حد کو واجب کرتی ہے۔ مزنی نے حج اور روزے میں اس کی اصل پر قیاس کرتے ہوئے یہ اختیار کیا۔

مسئلہ نمبر 27: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ یہ جملہ حال ہے۔ لغت میں اعتکاف کا معنی ملازمت ہے۔ کہا جاتا ہے: عکف علی الشئ جب کوئی کسی چیز کو لازم پکڑ لے اور اس کی طرف متوجہ ہو۔ راجز نے کہا: عکف النبیط یلعبون الفنزجا (نبطی نے رقص، کھیل کو لازم پکڑا۔)

ایک اور شاعر نے کہا:

وظل بنات اللیل حولی عکفا عکوف البواکی بینهن (1) صریع

خیالات میرے اردگرد جمے رہے، رونے والیوں کے بیٹھنے کی طرح جن کے درمیان قبر ہو۔

جب معتکف اعتکاف کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے عمل کو لازم پکڑتا ہے تو اسے یہ اسم لازم ہوتا ہے اور عرف شرع میں اعتکاف سے مراد مخصوص جگہ میں مخصوص شرط پر مخصوص وقت میں مخصوص اطاعت کو لازم پکڑنا ہے۔ علماء کا اجماع ہے کہ اعتکاف واجب نہیں ہے۔ یہ قربتوں میں سے ایک قربت ہے اور نوافل میں سے ایک نفل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے اصحاب اور آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے اعتکاف کا عمل کیا اور اگر اپنے نفس پر لازم کرے گا تو اس پر لازم ہو جائے گا۔ اس شخص کے لئے اعتکاف کرنا مکروہ ہے جسے اعتکاف کے حقوق پورے کرنے سے عجز کا اندیشہ ہو۔

مسئلہ نمبر 28: علماء کا اجماع ہے کہ اعتکاف صرف مسجد میں ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِي الْمَسٰجِدِ پھر علماء کا مساجد کی مراد میں اختلاف ہے۔ ایک قوم کا خیال ہے کہ اس سے مراد مساجد کی ایک خاص قسم ہے اور وہ وہ ہے جسے کسی نبی نے تعمیر کیا ہو جیسے مسجد حرام، مسجد نبوی، مسجد ایلیاء (بیت المقدس) حضرت حذیفہ بن یمان اور حضرت سعید بن مسیب سے مروی ہے۔ ان کے نزدیک اعتکاف ان مساجد کے علاوہ کسی مسجد میں جائز نہیں۔ دوسرے علماء نے کہا: اعتکاف صرف جامع مسجد میں جائز ہے کیونکہ ان کے نزدیک آیت میں اس جنس کی مساجد کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت ابن مسعود سے بھی یہی مروی ہے۔ یہ عروہ، حکم، حماد، زہری، ابو جعفر محمد بن علی کا قول ہے اور امام مالک کا ایک قول ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: اعتکاف ہر مسجد میں جائز ہے۔ یہ قول سعید بن جبیر اور ابو قلابہ وغیرہم سے مروی ہے۔ یہ امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا قول ہے۔ ان کی حجت آیت کو عموم پر محمول کرنا ہے ہر اس مسجد میں اعتکاف جائز ہے جس میں امام اور مؤذن ہو۔ امام مالک کا ایک قول بھی یہی ہے۔ ابن علیہ، داؤد بن علی طبری اور ابن منذر کا قول بھی یہی ہے۔ دار قطنی نے ضحاک سے انہوں نے حضرت حذیفہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے: ہر وہ مسجد جس میں مؤذن اور امام ہو اس میں اعتکاف صحیح ہے۔ دار قطنی نے کہا: ضحاک نے حضرت حذیفہ سے نہیں سنا ہے۔

مسئلہ نمبر 29: امام مالک اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک کم از کم اعتکاف ایک دن اور ایک رات ہے۔ اگر کسی نے کہا: مجھ

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

پر اللہ کیلئے اعتکاف ہے تو اِس پر ایک دن اور ایک رات کا اعتکاف لازم ہوگا۔ اسی طرح اگر ایک دن کے اعتکاف کی نذر مانی تو ایک دن اور ایک رات کا اعتکاف لازم ہوگا۔ سحنون نے کہا: جس نے ایک رات کے اعتکاف کی نذر مانی اس پر کوئی چیز نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: اگر ایک دن کی نذر مانی تو بغیر رات کے دن کا اعتکاف لازم ہوگا اور اگر رات کی نذر مانی تو اس پر کوئی چیز واجب نہیں جیسا کہ سحنون نے کہا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: اس پر وہی ہے جو اس نے نذر مانی اگر رات کی نذر مانی تو رات کا اعتکاف ہوگا، اگر دن کی نذر مانی تو دن کا اعتکاف ہوگا۔ امام شافعی نے فرمایا: کم از کم ایک لحظہ کا اعتکاف ہے اس کے اکثر کی کوئی حد نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہ کے بعض اصحاب نے کہا: ایک ساعت (گھڑی) کا اعتکاف بھی صحیح ہے۔ اس قول کی بناء پر اعتکاف کی شرط سے روزہ نہیں ہے۔ امام احمد بن حنبل سے ایک قول مروی ہے اور یہی قول داؤد بن علی اور ابن علیہ کا ہے، ابن منذر اور ابن عربی نے اس کو اختیار کیا ہے۔ انہوں نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اعتکاف رمضان میں ہوتا تھا اور یہ محال ہے کہ رمضان کا روزہ رمضان کے لئے اور دوسرے دنوں کے لئے ہو۔ اگر معتکف نے رمضان میں اپنے روزے سے نفل اور فرض روزے کی نیت کی تو اس کا روزہ امام مالک اور ان کے اصحاب کے نزدیک فاسد ہے۔ یہ معلوم ہے کہ معتکف کو اعتکاف کی رات میں عورتوں سے مباشرت۔ اجتناب لازم ہے جس طرح دن میں اجتناب لازم ہے اور اعتکاف کی رات اس کے اعتکاف میں داخل ہے اور رات روزے کا محل نہیں ہے اسی طرح دن بھی روزے کا محتاج نہیں ہے۔ اگر وہ روزہ رکھے تو بہتر ہے۔ امام مالک، امام ابوحنیفہ اور امام احمد کا دوسرا قول یہ ہے کہ روزے کے بغیر اعتکاف صحیح نہیں ہے۔

حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور مؤطا میں قاسم بن محمد اور نافع مولیٰ حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ اعتکاف روزے کے ساتھ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۪ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ۔ اللہ تعالیٰ نے اعتکاف کا ذکر روزے کے ساتھ کیا ہے۔ یحییٰ نے کہا: امام مالک نے فرمایا: ہمارے نزدیک معاملہ اسی پر ہے اور انہوں نے اس روایت سے حجت پکڑی ہے جو عبداللہ بن بدیل نے عمرو بن دینار سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زمانہ جاہلیت میں ایک رات اور دن کے اعتکاف کی (کعبہ کے پاس) نذر مانی۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ پوچھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اعتکاف کر اور روزہ رکھ۔ اس حدیث کو ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ دار قطنی نے کہا: ابن بدیل، عمرو سے روایت کرنے میں منفرد ہے اور یہ ضعیف ہے (1)۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اعتکاف بغیر روزے کے نہیں ہے۔ دار قطنی نے کہا: سوید بن عبدالعزیز نے سفیان بن حسین سے انہوں نے زہری سے انہوں نے حضرت عروہ سے انہوں نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے اور انہوں نے کہا: ہمارے نزدیک روزے کی شرط سے نہیں ہے کہ وہ اعتکاف کے لئے ہو بلکہ اعتکاف کے لئے روزہ ہو، رمضان کے لئے ہو، نذر کے لئے ہو اور کسی اور وجہ سے ہو۔ صحیح یہ ہے کہ اگر نذر ماننے والے نے نذر مانی تو اس کی نذر کو اصل شرع میں

1۔ صحیح بخاری، باب من لم یر علیہ صوما اذا اعتکف۔ حدیث نمبر 1901، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اس کے مقتضا کی طرف پھیرا جائے گا۔ یہ اس شخص کی طرح ہے جس نے نماز کی نذر مانی تو وہ اس پر لازم ہے اس پر خاص اس نماز کے لئے پاک ہونا ضروری نہیں بلکہ جائز ہے کہ کسی دوسری چیز کے لئے کی گئی طہارت سے بھی اسے ادا کرنا جائز ہے۔

مسئلہ نمبر 30: معتکف کے لئے اپنی اعتکاف کی جگہ سے نکلنا جائز نہیں مگر وہ کام جو اس کے لئے ضروری ہو جیسا کہ ائمہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اعتکاف کرتے تھے تو اپنے سر کو میرے قریب کرتے تھے میں آپ کو کنگھی کیا کرتی تھی اور گھر میں داخل نہیں ہوتے تھے مگر حاجت انسانی کے لئے (1) (یعنی پیشاب، پاخانہ کے لئے)۔ اس مسئلہ میں ائمہ اور امت کا کوئی اختلاف نہیں جب معتکف ضرورت کے لئے باہر نکلے تو ضرورت پوری ہونے کے بعد فوراً واپس آ جائے اور اپنے سابقہ اعتکاف پر بنا کرے اور اس پر کوئی چیز لازم نہ ہوگی اور ضرورت میں سے واضح مرض اور حیض ہے۔ ان کے علاوہ امور کے لئے نکلے گا تو اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک کے مذہب کو اس کے متعلق ہم ذکر کر چکے ہیں اسی طرح امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے۔ حضرت سعید بن جبیر، حسن، نخعی مریض کی عیادت کرتے تھے اور جنازوں میں شریک ہوتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، لیکن ان سے ثابت نہیں۔ اسحاق نے واجب اعتکاف اور نفل اعتکاف میں فرق کیا ہے۔ واجب اعتکاف کے بارے میں فرمایا: اس میں مریض کی عیادت نہ کرے اور جنازوں میں شرکت نہ کرے اور نفلی اعتکاف کے بارے میں فرمایا: وہ اعتکاف کی ابتدا میں جنازوں میں حاضر ہونے، مریضوں کی عیادت کرنے اور جمعہ پڑھنے کی شرط لگا لے۔ امام شافعی نے فرمایا: مریض کی عیادت، جنازوں میں حاضری اور دوسری ضروریات کے لئے اعتکاف سے نکلنے کی شرط لگانا صحیح ہے۔ اس مسئلہ میں امام احمد نے مختلف روایات بیان کی ہیں کبھی منع فرمایا، کبھی فرمایا: مجھے امید ہے اس میں کوئی حرج نہیں۔ امام اوزاعی نے امام مالک کی طرح فرمایا ہے: اعتکاف میں شرط نہیں ہے۔ ابن منذر نے کہا: معتکف اعتکاف سے نہ نکلے مگر جس کے لئے نکلنا ضروری ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حاجات ضروریہ کے لئے نکلتے تھے۔

مسئلہ نمبر 31: معتکف کا جمعہ کے لئے نکلنا اس میں بھی اختلاف ہے۔ ایک جماعت نے کہا: جمعہ کے لئے نکلے اور سلام پھیرنے کے ساتھ ہی واپس آ جائے کیونکہ وہ ایک فرض کے لئے نکلا تھا اور اس کا اعتکاف نہیں ٹوٹتا۔ یہ ابن الجہم نے امام مالک سے روایت کیا ہے۔ یہی امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔ ابن عربی اور ابن منذر نے اس کو اختیار کیا ہے۔ امام مالک کا مشہور مذہب یہ ہے کہ جو دس دنوں کے اعتکاف کا ارادہ کرے یا دس دنوں کی نذر مانے تو وہ جامع مسجد میں اعتکاف کرے جب وہ کسی دوسری مسجد میں اعتکاف کرے تو جمعہ کے لئے جانا اس کو لازم ہے اور اس کا اعتکاف باطل ہے۔ عبد الملک نے کہا: جمعہ کے لئے نکلے، جمعہ میں حاضر ہو اور پھر اپنی جگہ واپس آ جائے اس کا اعتکاف صحیح ہوگا۔

میں کہتا ہوں: یہ قول صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ یہ ارشاد عام ہے۔ علماء کا اتفاق ہے کہ اعتکاف واجب نہیں سنت ہے اور جمہور ائمہ کا اجماع ہے کہ جمعہ ذوات پر فرض ہے۔ جب دو واجب کسی پر جمع ہو جائیں اور ان میں سے ایک دوسرے سے مؤکد ہو تو مؤکد کو مقدم کیا جاتا ہے۔ جب مندوب اور واجب جمع ہوں تو پھر کیا کیفیت ہوگی

1۔ صحیح بخاری، باب لا يدخل البيت الا لحاجة، حدیث نمبر 1889، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کسی نے بھی جمعہ کو ترک کرنے کا قول نہیں کیا۔ جمعہ کی طرف نکلنا یہ حاجت سے ہے۔

مسئلہ نمبر 32: معتکف جب کبیرہ گناہ کرے گا تو اس کا اعتکاف فاسد ہو جائے گا کیونکہ کبیرہ گناہ عبادت کی ضد ہے جس طرح کہ حدث، طہارت اور نماز کی ضد ہے۔ اور جن اعمال کو اللہ تعالیٰ نے اس پر حرام کیا ہے ان کا چھوڑنا اعتکاف کی عبادت میں اعلیٰ منازل میں سے ہے۔ یہ ابن خویز منداد نے مالک سے روایت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 33: مسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اعتکاف کرنے کا ارادہ فرماتے تو صبح کی نماز پڑھتے پھر اپنی اعتکاف کی جگہ میں داخل ہو جاتے۔ (الحدیث)

معتکف کے اعتکاف میں داخل ہونے کے وقت میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام اوزاعی نے اس حدیث کے ظاہر کے مطابق کہا ہے، ثوری اور لیث سے ایک قول یہی مروی ہے۔ ابن منذر اور تابعین کے ایک طائفہ کا یہی قول ہے۔ ابوثور نے کہا: یہ وہ شخص کرے جس نے دس دنوں کی نذر مانی ہو۔ اگر دس سے زیادہ کی نذر مانی ہو تو سورج غروب ہونے سے پہلے داخل ہو جائے۔ امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: جب اس نے ایک مہینہ کا اعتکاف اپنے اوپر واجب کیا ہو تو وہ اس دن کی رات سے سورج غروب ہونے سے پہلے مسجد میں داخل ہو جائے۔ امام مالک نے فرمایا: اسی طرح جس نے ایک دن یا زیادہ دنوں کے اعتکاف کی نیت کی ہو۔ یہی امام ابوحنیفہ، ابن ماجشون اور عبدالملک کا قول ہے کیونکہ پہلی رات اعتکاف کے دنوں میں داخل ہے وہ اعتکاف کا زمانہ ہے۔ دن کی طرح اس کا بعض حصہ چھوڑا نہیں جائے گا۔ امام شافعی نے فرمایا: جب کسی نے کہا مجھ پر اللہ کے لئے ایک دن (کا اعتکاف) ہے وہ طلوع فجر سے پہلے داخل ہو اور سورج غروب ہونے کے بعد نکلے۔ یہ ان کا قول مہینے والے اعتکاف کے بارے میں قول کے خلاف ہے۔ لیث نے ایک قول میں اور زفر نے کہا: فجر کے طلوع ہونے سے پہلے داخل ہو۔ مہینہ، اور ایک دن ان کے نزدیک حکم میں برابر ہیں اسی طرح امام ابو یوسف سے مروی ہے۔ قاضی عبدالوہاب کا بھی یہی قول ہے۔ رات اعتکاف میں تبعاً داخل ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اعتکاف بغیر روزے کے نہیں ہے اور رات روزے کا زمانہ نہیں ہے۔ ثابت ہوا کہ اعتکاف سے مقصود دن ہے رات نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں حضرت عائشہ کی حدیث ان اقوال کو رد کرتی ہے تنازع کے وقت یہ حجت ہے یہ ایسی حدیث ہے جو ثابت ہے اس کی صحت میں کوئی اختلاف نہیں۔

مسئلہ نمبر 34: امام مالک نے اس شخص کے لئے مستحب قرار دیا ہے کہ جو دس دنوں کا اعتکاف کرے وہ عیدالفطر کی رات مسجد میں گزارے حتیٰ کہ صبح یہاں سے عیدگاہ کی طرف جائے۔ یہی امام احمد کا قول ہے۔ امام شافعی اور امام اوزاعی نے کہا: جب سورج غروب ہو تو نکل جائے۔ یہ سحنون نے ابن القاسم سے روایت کیا ہے کیونکہ مہینہ کے ختم ہونے کے ساتھ دس دن بھی ختم ہو گئے اور رمضان شریف کے آخری دن کے سورج کے غروب ہونے کے ساتھ مہینہ ختم ہو جاتا ہے۔ سحنون نے کہا: یہ وجوب کے طور پر ہے۔ پس جو عیدالفطر کی رات نکلے گا تو اس کا اعتکاف باطل ہو جائے گا۔

ابن ماجشون نے کہا: ہم نے جو مہینہ کے ختم ہونے کے متعلق کہا ہے وہ اس قول کا رد کرتا ہے اگر عیدالفطر کی رات ٹھہرنا

اعتکاف کی شرط سے ہوتا تو وہ اعتکاف صحیح نہ ہوتا جو فطر کی رات سے متصل نہ ہوتا اور اس کے جواز پر اجماع ہے کہ عید الفطر کی رات ٹھہرنا معتکف کے لئے اعتکاف کی صحت کے لئے شرط نہیں ہے۔ یہ روزے کے احکام اور اعتکاف جو آیات کے متعلق تھے کافی وشافی ہیں، جو ان پر انحصار کرنے والا ہے اس کے لئے کفایت ہے اور اللہ تعالیٰ ہدایت کی توفیق دینے والا ہے۔

مسئلہ نمبر 35: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ یہ احکام اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں پس ان کی مخالفت نہ کرو۔ تِلْكَ، ان اوامر ونواہی کی طرف اشارہ ہے۔ الحدود سے مرادرکاوٹیں ہیں اور الحد سے مراد منع کرنا ہے۔ اسی وجہ سے لوہے کو حدید کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ہتھیار کو بدن تک پہنچنے سے روکتا ہے، چوکیدار اور جیل کے داروغے کو حداد کہا جاتا ہے کیونکہ جو گھر کے اندر ہوتے ہیں ان کو نکلنے سے روکتا ہے اور باہر والوں کو اندر جانے سے روکتا ہے۔ ان احکام کو اللہ کی حدود اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ ان چیزوں کو داخل ہونے سے روکتے ہیں جو ان میں سے نہیں ہوتے اور جو ان سے ہوتے ہیں ان کو خروج سے روکتے ہیں۔ اسی سے گناہوں کی حدود ہیں جو گناہ کرنے والوں کو دوبارہ گناہ کرنے سے روکتی ہیں۔ اسی طرح عدت والی عورت کو حاد کہا جاتا ہے کیونکہ وہ زیب وزینت سے رک جاتی ہے۔

مسئلہ نمبر 36: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان حدود کو بیان فرمایا اسی طرح تمام احکام کو بیان فرماتا ہے تاکہ تم ان سے تجاوز کرنے سے بچو۔ الایات سے مراد وہ علامات ہیں جو حق کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ لَعَلَّهُمْ لوگوں کے حق میں ترجی (امید) ہے اس کا ظاہر عموم ہے اور اس کا معنی اس شخص میں خاص ہے جس کیلئے اللہ تعالیٰ ہدایت کو آسان فرماتا ہے ان آیات کی دلالت کی وجہ سے جن کے ضمن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے۔(1)

وَ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَ تُدْلُوْا بِهَاۤ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

''اور نہ کھاؤ ایک دوسرے کا مال آپس میں ناجائز طریقہ سے اور نہ رسائی حاصل کرو اس مال سے (رشوت دے کر) حاکموں تک تاکہ یوں کھاؤ کچھ حصہ لوگوں کے مال کا ظلم سے حالانکہ تم جانتے ہو (کہ اللہ نے یہ حرام کیا ہے)''۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت عبدان بن اشوع حضرمی کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس نے امرء القیس کندی پر مال کا دعویٰ کیا تھا۔ دونوں اپنا مقدمہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے تھے۔ امرء القیس نے انکار کیا۔ اس نے قسم اٹھانے کا ارادہ کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ وہ قسم سے رک گیا۔ اس نے اپنی زمین کا فیصلہ عبدان کے سپرد کر دیا اور اس سے جھگڑا نہ کیا(2)۔

1۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

2۔ زاد المسیر، صفحہ 168، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

مسئلہ نمبر 2: اس آیت سے خطاب حضرت محمد ﷺ کی تمام امت کو ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بعض، بعض کا مال ناحق نہ کھائے۔ اس میں جوا، دھوکا، غصب، حقوق سے انکار اور ایسی چیز جس کے دینے پر مالک خوش نہیں ہے یا ایسی چیز جس کو شریعت نے حرام کیا ہے اگرچہ مالک خوشی سے دینے پر راضی بھی ہو جیسے زانیہ کی کمائی، کاہن کا نذرانہ، شرابوں اور خنازیر کی قیمتیں وغیرہ داخل ہیں۔ اور بیع میں غبن داخل نہیں جبکہ بائع اس چیز کی حقیقت بتا دے جو اس نے بیچی کیونکہ اس صورت میں غبن (زیادتی) گویا ہبہ ہے۔ جیسا کہ اس کا بیان سورۂ نساء میں آئے گا۔ اموال کو ان لوگوں کی ضمیر کی طرف مضاف کیا گیا ہے جن کو منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک ایسا ہے جس کو روکا گیا ہے اور جس سے روکا گیا ہے جیسا فرمایا: تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ (البقرہ: 85) ایک قوم نے کہا: اس آیت سے مراد کھیلوں میں جو مال لگائے جاتے ہیں، گانے والیوں کے مال، شراب کی قیمت اور برے لوگوں رشوت خور وغیرہ کے اموال ہیں۔

مسئلہ نمبر 3: جس نے کسی کا مال شرع کی اجازت کے بغیر لیا اس نے باطل ذریعہ سے کھایا وہ مال بھی باطل شمار ہوگا جس کا فیصلہ قاضی تیرے حق میں کر دے جبکہ تو جانتا ہے کہ تو باطل پر ہے۔ قضا قاضی سے حرام، حلال نہیں ہو جاتا کیونکہ قاضی تو ظاہر حال کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ یہ اموال کے بارے میں اجماع ہے اگرچہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک قاضی کی قضا فروج (شرمگاہوں) میں باطناً بھی نافذ ہو جاتی ہے۔ جب قضا قاضی اموال میں باطن کے حکم کو تبدیل نہیں کرتی تو فروج میں بدرجہ اولیٰ تبدیلی نہیں کرے گی (☆)۔ ائمہ نے حضرت ام سلمہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میرے پاس جھگڑا لے کر آتے ہو شاید تم میں سے کوئی دوسرے سے حجت بیان کرنے میں زیادہ فصیح ہو میں اس کے مطابق فیصلہ کر دوں جو میں نے (گواہیاں، دلائل) سنے تو میں اس کے بھائی کے مال سے کوئی چیز اس کے لئے کر دوں تو وہ نہ لے میں اس کے لئے آگ کا ایک ٹکڑا اسے دینے والا ہوں گا (1)۔ ایک روایت میں ہے: وہ اس کو اٹھا لے یا اس کو چھوڑ دے۔ اس حدیث کے مطابق جمہور علماء اور ائمہ فقہاء کا قول ہے۔ یہ نص ہے کہ حاکم کا حکم ظاہر پر ہوتا ہے باطن کے حکم کو تبدیل نہیں کرتا خواہ وہ مال، خون اور شرمگاہوں کے متعلق ہو۔ مگر امام ابو حنیفہ سے فروج کے متعلق جو قول حکایت کیا گیا ہے کہ باطن میں حکم نافذ ہو جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: اگر دو جھوٹے گواہ کسی شخص کے بارے میں گواہی دیں کہ اس نے اپنی بیوی کو طلاق دی ہے اور حاکم ان کی گواہی کے مطابق فیصلہ کر دے کیونکہ وہ گواہ اس کے نزدیک عادل ہیں تو اس عورت کی شرمگاہ مدت کے بعد نئے نکاح کرنے والے کے لئے حلال ہو جائے گی۔ جو یہ جانتا بھی ہے کہ فیصلہ غلط تھا۔ اسی طرح اگر ان گواہوں میں سے بھی ایک اس سے نکاح کر لے تو امام صاحب کے نزدیک اس کا نکاح جائز ہوگا کیونکہ جب وہ ظاہر میں تمام مردوں کے لئے حلال ہو گئی تو گواہ اور دوسرے سب برابر ہیں۔ کیونکہ قاضی کی قضا نے اس کی عصمت کو ختم کر دیا اور اس میں تحلیل و تحریم کی ظاہر و باطن میں

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاحکام، صفحہ 1062، جلد 2 (وزارت تعلیم)

☆۔ ائمہ احناف کا کہنا یہ ہے کہ جب عورت ایسی ہے جو مرد پر حرام نہیں اور اس کے عقد میں آ سکتی ہے تو قاضی کے فیصلہ سے پہلے بطور اقتضاء النص نکاح تسلیم کیا جائے گا تاکہ دونوں کا ایک دوسرے سے استمتاع درست ہو جائے۔ ہدایہ۔ کتاب النکاح۔

ایک نئی صورت پیدا کردی ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ دوسرے خاوندوں کے لئے حلال نہ ہوتی اور امام ابوحنیفہ نے لعان سے حجت پکڑی ہے۔ انہوں نے فرمایا: بیوی جھوٹے لعان کی وجہ سے اپنے خاوند سے جدائی تک پہنچ گئی۔ جس کے بارے میں اگر قاضی کو اس کے کذب کا علم ہو جاتا تو وہ اسے حد لگاتا، ان دونوں کے درمیان فرق نہیں کیا۔ اور بس یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں جس کے لئے اس کے بھائی کے حق سے کسی چیز کا فیصلہ کردوں تو وہ اسے نہ لے، کے عموم میں شامل نہیں (1)۔ (الحدیث)

مسئلہ نمبر 4: اس آیت سے ہر موافق و مخالف دلیل پکڑنے والا ہے اپنے حکم کے بارے میں جو وہ اپنے لئے دعویٰ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے: یہ جائز نہیں ہے اور اسی آیت سے استدلال کرتا ہے: وَ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اس کا جواب یہ ہے کہ اسے کہا جائے گا ہم تسلیم نہیں کرتے کہ وہ باطل ہے حتیٰ کہ دلیل کے ساتھ واضح کرے۔ اس وقت اس عموم میں داخل ہوگا۔ یہ دلیل ہے کہ معاملات میں باطل جائز نہیں۔ اس میں باطل کی تعیین نہیں۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِالْبَاطِلِ لغت میں باطل کا معنی ہے: جانے والا، زائل ہونے والا۔ کہا جاتا ہے: بطل یبطل بطولا وبطلانا۔ باطل کی جمع بواطل ہے۔ بطولۃ کی جمع اباطیل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لا یاتیہ الباطل۔ قتادہ نے کہا: اس سے مراد ابلیس ہے۔ وہ قرآن میں کمی بیشی نہیں کرتا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ھو اللہ الباطل۔ یعنی شرک۔ البطلہ، جادوگروں کو کہتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ تُدْلُوْا بِهَاۤ اِلَى الْحُكَّامِ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد ودیعت ہے اور ایسی چیز ہے جس میں دلیل نہ ہو۔ حضرت ابن عباس اور حسن سے مروی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا یہ یتیم کا مال ہے جو اوصیاء کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ وہی حکام کے پاس معاملہ لے جاتا ہے جب اس سے اس مال کا مطالبہ کیا جاتا ہے تاکہ اس کا کچھ حصہ ہتھیا لے اور ظاہراً اس کے لئے حجت بھی ہو۔ زجاج نے کہا: تم اس کے مطابق عمل کرتے ہو احکام کا ظاہر جس کو ثابت کرتا ہے اور تم اس کو ترک کرتے ہو جس کے بارے تم جانتے ہو کہ یہ حق ہے۔ کہا جاتا ہے: ادلی الرجل بحجتہ او بالامر الذی یرجو النجاح بہ (اس شخص نے اپنی حجت پیش کی یا وہ امر پیش کیا جس کے ساتھ وہ نجات کی امید رکھتا ہے) اس کو اس شخص سے تشبیہ دی گئی جو کنویں میں اپنا ڈول پھینکتا ہے (2)۔ کہا جاتا ہے: ادلی دلوہ اس نے ڈول چھوڑا دلاھا، ڈول نکالا۔ الدلو، الدلاء کی جمع ادل و دلاء و دلی۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ باطل کے ذریعے مال کھانے اور حکام تک حجج باطلہ کے ساتھ معاملات کو لے جانا جمع نہ کرو۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوا الْحَقَّ (البقرہ: 42) یہ تیرے اس قول کے قبیل سے ہے: لا تاکل السمک و تشرب اللبن مچھلی کا کھانا اور دودھ کا پینا جمع نہ کر۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے: تم اپنے اموال کے ساتھ حکام سے تعلق نہ جوڑو اور انہیں رشوت نہ دو تاکہ وہ تمہارے لئے اس سے زیادہ کا فیصلہ کریں۔ پس باء مطلق ملانے کے لئے ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ قول راجح ہے کیونکہ حکام رشوت لینے والے ہوتے ہیں مگر جسے اللہ محفوظ رکھے اور وہ بہت کم ہیں۔ دونوں الفاظ متناسب ہیں۔ تدلوا، ارسال الدلو سے مشتق ہے الرشوۃ، الرشاء سے ہے۔ وہ اس

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاحکام، صفحہ 1062، جلد 2 (وزارت تعلیم)
2۔ المحرر الوجیز زیر آیت ہذا

رسی کو لمبا کرتا ہے تا کہ حاجت کو پورا کرے (1)۔

میں کہتا ہوں: اس قول کو تدلوا بہا کا قول قوت دیتا ہے تدلوا، تاکلوا پر عطف کی بناء پر مجزوم ہے جیسا ہم نے ذکر کیا ہے۔ مصحف حضرت ابی میں ہے ولا تدلوا حرف نہی کے تکرار کے ساتھ ہے۔ یہ قراءت تدلوا کے جزم کی تائید کرتی ہے جو اکثر کی قراءت ہے۔ بعض نے فرمایا تدلوا ظرف کی بناء پر محل نصب میں ہے۔ اور سیبویہ کے نزدیک اس جیسی مثال میں ناصب ان مضمرہ ہوتا ہے اور بہا میں ضمیر کا مرجع اموال ہیں اور پہلے قول کے مطابق اس کا مرجع حجت ہے اور اس کا ذکر پہلے نہیں ہوا ہے دوسرے قول کو اموال کا ذکر بھی قوت دیتا ہے۔ واللہ اعلم۔ الصحاح میں ہے: الرشوۃ معروف ہے الرُّشوۃ بھی اس کی مثل ہے اس کی جمع رُشَی و رِشیٰ ہے۔ رشاہ یرشوہ، وارتشی کا معنی رشوت لینا ہے استرشی فی حکمہ۔ یعنی حکم پر اس نے رشوت طلب کی۔ میں کہتا ہوں: اس دور میں حکام سراپا رشوت ہیں۔ ان کے بارے رشوت لینے کا گمان نہیں بلکہ یقینا رشوت لیتے ہیں۔ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ۔

مسئلہ نمبر 7: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِتَاْكُلُوْا، لام کی کی وجہ سے منصوب ہے فَرِيْقًا ٹکڑا، جز کو کہتے ہیں۔ فریق کو قطعہ اور بعض سے تعبیر فرمایا۔ الفریق بکریوں کا چھوٹا سا ریوڑ جو بڑے ریوڑ سے جدا ہو جاتا ہے۔ بعض نے فرمایا: کلام میں تقدیم وتاخیر ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے لتاکلوا اموال فریق من الناس۔ بِالْاِثْمِ اس کا معنی ظلم اور تعدی ہے اس کو اثم اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ ظلم کرنے والے کے ساتھ گناہ متعلق ہوتا ہے اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ یعنی تم اس کا بطلان اور گناہ جانتے ہو۔ یہ جرأت ومعصیت میں مبالغہ ہے۔

مسئلہ نمبر 8: اہل سنت کا اتفاق ہے کہ جس نے وہ چیز لی جس پر مال کے اسم کا اطلاق ہوتا ہے خواہ وہ تھوڑا ہو یا زیادہ ہو، اس کی وجہ سے اسے فاسق کہا جائے گا کیونکہ اس پر اس کا لینا حرام تھا۔ لیکن بشر بن معتمر اور اس کے متبعین معتزلیوں کا قول اس کے خلاف ہے۔ انہوں نے کہا: مکلف کو فاسق نہیں کہا جائے گا مگر دو سو دراہم لینے کے ساتھ۔ اس سے کم میں فاسق نہیں کیا جائے گا۔ ابن الجبائی کا قول اس کے خلاف ہے اس نے کہا: دس دراہم لینے کے ساتھ فاسق کہا جائے گا دس سے کم میں فاسق نہیں کہا جائے گا۔ ابن ہذیل کا قول اس کے خلاف ہے۔ اس نے کہا: پانچ دراہم لینے کے ساتھ فاسق کہا جائے گا۔ اور بعض بصرہ کے قدریوں کا قول اس کے خلاف ہے۔ اس نے کہا: ایک درہم لینے کے ساتھ فاسق کہا جائے گا اس سے کم میں نہیں۔ یہ تمام اقوال قرآن وسنت سے اور امت کے علماء کے اتفاق سے مردود ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارے خون، تمہارے اموال اور تمہاری عزتیں تم پر حرام ہیں (2) (الحدیث) اس کی صحت پر اتفاق ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۭ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 260، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ صحیح مسلم، کتاب القسامۃ، باب تغلیظ تحریم الدماء، صفحہ 61، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

''دریافت کرتے ہیں آپ سے نئے چاندوں کے متعلق (کہ یہ کیونکر گھٹتے بڑھتے ہیں) فرمایئے: یہ وقت کی علامتیں ہیں لوگوں کے لئے اور حج کے لئے اور یہ کوئی نیکی نہیں کہ تم داخل ہو گھروں میں ان کے پچھواڑے سے ہاں نیکی تو یہ ہے کہ انسان تقویٰ اختیار کرے اور آیا کرو گھروں میں ان کے دروازوں سے اور ڈرتے رہو اللہ سے اس امید پر کہ کامیاب ہو جاؤ''۔

اس میں بارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ یہ ان سوالوں میں سے ہے جو یہود نے پوچھے تھے اور انہوں نے اس کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کیا تھا۔ حضرت معاذ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم یہود ہم پر غالب آ گئے وہ ہم سے چاندوں کے متعلق پوچھتے ہیں۔ چاند کو کیا ہے کہ یہ باریک سا ظاہر ہوتا ہے پھر بڑھتا جاتا ہے حتیٰ کہ برابر اور گول ہو جاتا ہے پھر گھٹنا شروع ہو جاتا ہے حتیٰ کہ پہلی حالت پر ہو جاتا ہے؟ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی (1)۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کے نزول کا سبب مسلمان قوم کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے چاند کے متعلق سوال تھا۔ اس چاند کے آخری راتوں میں چھپنے، اس کے مکمل ہونے اور سورج کی حالت سے مختلف ہونے کا سبب کیا ہے۔ یہ حضرت ابن عباس، قتادہ اور ربیع وغیرہم کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَنِ الْاَهِلَّةِ، اهلہ جمع ہے هلال کی۔ اس کو جمع ذکر کیا گیا ہے حالانکہ چاند حقیقت میں ایک ہے اس حقیقت سے کہ ایک مہینہ میں ایک ہوتا ہے اور دوسرے مہینہ میں دوسرا ہوتا ہے۔ مہینہ کے تمام احوال چاندوں سے ہوتے ہیں اور اهلہ سے مراد مہینے ہیں، کبھی شہر سے چاند مراد ہوتا ہے کیونکہ چاند مہینہ میں وارد ہوتا ہے۔ جیسے شاعر نے کہا:

اخوان من نجد علی ثقۃ والشھر مثل قلامۃ الظفر

اس شعر میں شہر سے مراد چاند ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: چاند کو شہر اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ ہاتھ اس کی رؤیت کی جگہ کی طرف اشارہ کر کے اس کو شہرت دیتے ہیں اور اس پر دلالت کرتے ہیں اور هلال کے لفظ کا اطلاق مہینہ کی آخری دو راتوں اور آغاز کی دو راتوں پر بھی ہوتا ہے۔ بعض نے کہا: پہلی تین راتوں کو کہا جاتا ہے۔ اصمعی نے کہا: ہلال وہ ہوتا ہے جو باریک دھاگے کی طرح گول ہوتا ہے۔ بعض نے کہا: ہلال وہ ہوتا ہے جو اپنی روشنی کے ساتھ آسمان کو روشن کرتا ہے اور یہ ساتویں کی رات میں ہوتا ہے (2)۔ ابو العباس نے کہا: چاند کو ہلال اس لئے کہا جاتا ہے کہ لوگ اس کے متعلق خبر دینے کے لئے اپنی آوازوں کو بلند کرتے ہیں۔ اسی سے استھل الصبی ہے جب بچے کے چیخنے کے ساتھ اس کی زندگی ظاہر ہو۔ استھلّ وجھہٗ فرحاً و تھلل جب اس میں سرور ظاہر ہو۔ ابو کبیر نے کہا:

واذا نظرت الی اسرۃ وجھہ برقت کبرق العارض المتھلل

کہا جاتا ہے: اھللنا الھلال جب ہم مہینہ میں داخل ہوں، جوہری نے کہا: أھل الھلال و استھل۔ مجہول کا صیغہ استعمال ہوتا ہے استھل بمعنی تبیّن (ظاہر ہونا) بھی بولا جاتا ہے۔ أھل نہیں کہا جاتا، کہا جاتا ہے: اھللنا عن لیلۃ کذا اور

1۔ زاد المسیر، صفحہ 169، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 281، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

اھللناہ فھلّ نہیں کہا جاتا ہے جیسے کہا جاتا ہے: ہم نے اسے داخل کیا تو وہ داخل ہو گیا۔ یہ اس کا قیاس ہے۔ ابونصر عبدالرحیم القشیری نے اپنی تفسیر میں کہا جاتا ہے: اھل الھلال واستھل واھللنا الھلال واستھللنا۔

مسئلہ نمبر 3: ہمارے علماء نے فرمایا: جس نے قسم اٹھائی کہ وہ قرضہ ادا کرے گا یا ایسا کرے گا فی الھلال اور رأس الھلال او عند الھلال۔ پھر اس نے وہ کام چاند دیکھنے کے دو دن بعد کیا یا ایک دن بعد کیا تو وہ حانث نہیں ہو گا۔ اور تمام مہینے تمام عبادات و معاملات کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ اس آیت میں چاند کے بڑھنے اور کم ہونے کی حکمت بیان ہو رہی ہے۔ مدتوں، معاملات، قسموں، حج، تعداد، روزہ، عید، مدت حمل، اجارات، کرایوں کے علاوہ دوسرے بندوں کی مصلحتوں سے اشکال کو دور کرنے کے لئے یہ گھٹتا اور بڑھتا ہے اس کی مثال اللہ تعالیٰ کے یہ ارشادات ہیں: وَ جَعَلْنَا الَّيْلَ وَ النَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَ جَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَ الْحِسَابَ (الاسراء: 12) اس آیت کی وضاحت آگے آئے گی اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَ الْحِسَابَ (یونس: 5) چاندوں کا شمار کرنا، دنوں کے شمار سے آسان ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 4: جو ہم نے ثابت کیا ہے اس پر اہل ظواہر اور ان کے ہمنواؤں کا رد ہو جاتا ہے جو کہتے ہیں کہ مساقات (درختوں کو پانی لگانا) کا عمل مجہول عدل تک غیر معلوم سالوں تک جائز ہے اور انہوں نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نصف کھیتی اور کھجوروں پر یہود کو عامل مقرر کیا جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاہیں گے بغیر کسی وقت کے تعین کے۔ اس میں اہل ظواہر کی کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کو کہا تھا: میں تمہیں ان زمینوں پر باقی رکھوں گا جب تک اللہ تعالیٰ تمہیں باقی رکھے گا (1)۔ یہ بڑی واضح دلیل ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی آپ اس فیصلہ میں اپنے رب کے منتظر تھے کسی دوسرے کے لئے جائز نہیں۔ شریعت نے اجازت اور تمام معاملات کے معانی و مطالب کو پختہ و مضبوط کر دیا ہے۔ یہی علماء امت کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَوَاقِيْتُ یہ میقات کی جمع ہے جس کا معنی ہے: وقت۔ بعض نے فرمایا: میقات، وقت کا منتہیٰ ہے اور مواقیت غیر منصرف ہے کیونکہ یہ جمع ہے جس کی احاد میں کوئی مثال نہیں یہ جمع ہے اور جمع کی نہایت ہے، کیونکہ اس کی جمع نہیں بنائی جاتی۔ پس یہ ایسی ہو گی جس میں گویا تکرار ہو چکا ہے اور قواریر منصرف ہے کیونکہ وہ آیت کے سرے پر واقع ہوا ہے اس کو تنوین دی گئی ہے جس طرح قوافی کو تنوین دی جاتی ہے۔ یہ تنوین الصرف نہیں جو کسی اسم کے معرب ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الْحَجِّ جمہور کی قراءت میں حا پر فتحہ ہے۔ ابن ابی اسحاق نے پورے قرآن میں اسے حا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اسی طرح حج البیت جو سورہ آل عمران میں ہے اس میں بھی حا کے کسرہ کے ساتھ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، صفحہ 452، جلد 1 (وزارت تعلیم)

پڑھا ہے۔ سیبویہ نے کہا: اَلْحَجّ جیسے الرد اور الشدّ۔ اور الحِج جیسے الذِ کر۔ یہ دونوں مصدر ہیں اور ہم معنی ہیں بعض نے فرمایا: حاء کے فتحہ کے ساتھ مصدر ہے اور حاء کے کسرہ کے ساتھ اسم ہے(1)۔

مسئلہ نمبر 7: اللہ تعالیٰ نے حج کا ذکر علیحدہ فرمایا کیونکہ یہ ان چیزوں میں سے ہے جس میں وقت کی معرفت کی احتیاج ہے۔ اس میں وقت سے تاخیر جائز نہیں بخلاف عربوں کے نظریہ کے وہ عدد اور مہینوں کی تبدیلی کے ساتھ حج کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے قول اور فعل کو باطل کر دیا۔ اس کا بیان سورۂ برأت میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

مسئلہ نمبر 8: امام مالک اور امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے استدلال کیا ہے کہ اس آیت کی وجہ سے حج کے مہینوں کے علاوہ کسی مہینہ میں حج کا احرام باندھنا صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام چاندوں کو اس کے لئے ظرف بنایا ہے۔ پس تمام مہینوں میں حج کا احرام باندھنا صحیح ہے۔ امام شافعی نے اس میں مخالفت کی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ (البقرہ: 197) جیسا کہ آگے آئے گا، اس آیت کا معنی ہے بعض چاند لوگوں کے لئے وقت ہیں، بعض حج کے لئے وقت ہیں یہ اس طرح ہے جیسے تو کہتا ہے: الجارية لزيد وعمرو۔ یہ لونڈی زید اور عمرو کے لئے ہے یہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ لونڈی کا بعض زید کے لئے ہے اور بعض عمرو کے لئے ہے۔ یہ کہنا جائز نہیں کہ تمام لونڈی زید کے لئے ہے اور تمام عمرو کے لئے ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ تمام چاند لوگوں کے لئے وقت ہیں اور تمام چاند حج کا وقت ہیں۔ اگر بعض مراد ہوتا تو عبارت یوں ہوتی: بعضها مواقيت للناس وبعضها مواقيت للحج۔ یہ اس طرح ہے جیسے تو کہتا ہے: ان شهر رمضان ميقات لصوم زيد وعمرو رمضان کا مہینہ زید اور عمرو کے روزے کا وقت ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ تمام رمضان ہر ایک کے روزے کے وقت ہے اور جنہوں نے لونڈی کی مثال دی تھی وہ صحیح ہے کیونکہ پوری لونڈی کا زید کے لئے ہونا اور پوری لونڈی کا عمرو کے لئے ہونا محال ہے۔ اور ہمارے مسئلہ میں ایسا نہیں ہے کیونکہ زمانہ کا زید کے لئے وقت ہونا اور عمرو کے لئے وقت ہونا صحیح ہے، پس جنہوں نے کہا: وہ باطل ہے۔

مسئلہ نمبر 9: علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ جس نے کوئی سامان بیچا معلوم سامان معلوم قیمت کے ساتھ عربوں کے مہینوں سے معلوم مدت تک یا ایسے ایام تک جن کی تعداد معروف ہو، بیع جائز ہے۔ اسی طرح معلوم مدت تک بیع سلم کے بارے میں کہا ہے۔ اس میں اختلاف ہے جس نے فصل کاٹنے تک یا گہنے تک یا عطا تک یا اس کے مشابہ کوئی غیر معین وقت تک کے لئے کوئی چیز بیچی۔ امام مالک نے فرمایا: یہ جائز ہے کیونکہ یہ معروف ہے۔ ابوثور کا بھی یہی قول ہے۔ امام احمد نے کہا: میں امید کرتا ہوں اس میں کوئی حرج نہیں ہوگی۔ اس طرح نمازیوں کے واپس آنے تک کوئی چیز بیچی تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ وہ عطا کرنے تک کوئی چیز خریدتے تھے۔ ایک طائفہ نے کہا: یہ جائز نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے وقت مقرر فرمایا ہے اور وقت کو ان کی بیوع اور مصالح میں ان کی علامت بنایا ہے۔ اسی طرح حضرت ابن عباس نے کہا: یہی امام شافعی اور نعمان کا قول ہے۔ ابن منذر نے کہا: حضرت ابن عباس کا قول صحیح ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 261، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

مسئلہ نمبر 10: جب چاند بڑا دکھائی دے تو ہمارے علماء نے کہا: اس کے بڑے یا چھوٹے ہونے کا اعتبار نہ ہوگا بلکہ وہ اسی رات کا ہوگا۔ مسلم نے ابوالبختری سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم عمرہ کے لئے نکلے۔ جب ہم نخلہ کے بطن میں اترے۔ فرمایا: ہمیں چاند نظر آیا۔ بعض لوگوں نے کہا: یہ تین راتوں کا ہے، بعض نے کہا: دوراتوں کا ہے۔ فرمایا: ہم حضرت ابن عباس سے ملے۔ ہم نے کہا: ہم نے چاند دیکھا۔ بعض نے کہا: تین راتوں کا ہے بعض نے کہا: دوراتوں کا ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا: کس رات تم نے اسے دیکھا تھا؟ ہم نے کہا: فلاں رات، حضرت ابن عباس نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے چاند کو دیکھنے کے لئے لمبا کیا وہ اسی رات کا ہے جس رات کو تم نے اسے دیکھا (1)۔

مسئلہ نمبر 11: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا اس مسئلہ کو حج کے وقت کے ذکر کے ساتھ ملایا کیونکہ چاندوں کے متعلق اور گھروں کے پیچھے سے داخل ہونے کے متعلق اکٹھے سوال ہوئے تھے۔ پس یہ آیت دونوں مسئلوں کے متعلق نازل ہوئی، انصار جب حج کرتے تھے تو وہ اپنے گھروں کو لوٹتے تھے تو ان کے دروازوں سے داخل نہیں ہوتے تھے۔ وہ جب حج یا عمرہ کا احرام باندھتے تھے وہ شرعاً التزام کرتے تھے کہ ان کے اور آسمان کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو جب ان سے کوئی شخص احرام باندھنے کے بعد گھر سے نکلتا تھا پھر کسی حاجت کے لئے لوٹ آتا تھا تو وہ حجرہ کے دروازہ سے داخل نہ ہوتا تھا بلکہ گھر کی چھت سے داخل ہوتا تھا تا کہ اس کے اور آسمان کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو وہ اپنے گھر کے پیچھے دیواروں پر ایک کوہان بناتا تھا پھر وہ اپنے حجرہ میں کھڑا ہوتا تھا اور اپنی حاجت کا حکم دیتا تھا پھر اس کے گھر سے وہ چیز اس کی طرف نکالی جاتی تھی اور وہ اس عمل کو نیکی اور عبادت سمجھتے تھے۔ اسی طرح وہ کئی چیزوں کو عبادت سمجھتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں میں ان کا رد فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ نیکی اس کے حکم کی پیروی میں ہے۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابوصالح کی روایت میں ہے فرمایا: لوگ زمانہ جاہلیت میں اور اسلام کے ابتدائی دور میں (اس طرح تھے) کہ ان میں سے کوئی جب حج کا احرام باندھتا تھا اگر وہ کچے مکانوں والوں میں سے ہوتا تھا تو وہ اپنے گھر کے پیچھے سے سوراخ کرتا تھا اس سے داخل ہوتا تھا اور اس سے خارج ہوتا تھا یا وہ سیڑھی رکھتا تھا اس سے چڑھتا تھا اور اس سے اترتا تھا اگر وہ خیمہ والوں میں سے ہوتا جو وہ خیمہ کے پیچھے سے داخل ہوتا تھا مگر جو حمس (قریش) میں سے ہوتا تھا وہ ایسا نہیں کرتا تھا (2)۔

زہری نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حدیبیہ کے زمانہ میں عمرہ کا احرام باندھا اور آپ اپنے حجرہ میں داخل ہوئے اور بنی سلمہ میں سے ایک انصاری بھی آپ کے پیچھے دروازہ سے داخل ہوگیا، اس نے اپنی قوم کی عادت کو توڑ دیا۔ نبی کریم ﷺ نے اس سے پوچھا: تو کیوں دروازہ سے داخل ہوا جبکہ تو نے احرام باندھا ہوا تھا؟ اس نے کہا: حضور! آپ داخل ہوئے تو میں بھی آپ کے داخل ہونے کے ساتھ داخل ہوگیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میں تو حمس ہوں یعنی ایسی قوم سے ہوں جو اس کو دین نہیں سمجھتے۔ اس شخص نے کہا: میں اپنے اور تمہارے دین پر ہوں تو یہ آیت نازل ہوئی (3)۔ یہ حضرات

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصیام، صفحہ 348، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ) 2۔ معالم التنزیل، صفحہ 233، جلد 1 (دارالفکر)
3۔ تفسیر طبری ملی قولہ تعالیٰ ویسئلونک عن الاهلة، صفحہ 225، جلد 2 (داراحیاء التراث العربیۃ)

ابن عباس، عطا اور قتادہ کا قول ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ شخص قطبہ بن عامر انصاری تھا۔

الحمس قریش، کنانۃ، خزاعہ، ثقیف، جشم، بنو عامر بن صعصعہ، بنو نصر بن معاویہ کو کہا جاتا ہے۔ ان کو حمس اس لئے کہا جاتا ہے: یہ اپنے دین میں بہت سخت تھے۔ الحماسہ کا معنی شدت ہے۔ حجاج نے کہا: و کم قطعنا من قفاف حمس، ہم نے حمس کی کتنی سخت جگہوں کو کاٹا؟ پھر اس کی تاویل میں اختلاف ہے۔ بعض نے وہ کہا جو ہم نے ذکر کیا ہے۔ بعض نے کہا: یہ تاخیر کرنا ہے اور حج کو مؤخر کرنا مراد ہے حتیٰ کہ وہ حلال مہینہ کو حج کی تاخیر کے لئے حرام بنا دیتے تھے اور حرام مہینہ کو حلال بنا دیتے تھے تاکہ حج کو اس سے مؤخر کریں تو بیوت کا ذکر اس بنا پر ہے حج میں واجب کی مخالفت اور حج کے مہینوں میں مخالفت کی یہ مثال ہے۔ تاخیر کرنے کا بیان ان شاء اللہ سورۂ برأت میں آئے گا۔ ابو عبیدہ نے کہا: یہ آیت ضرب المثل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نیکی یہ نہیں کہ تم جاہلوں سے پوچھو بلکہ تم اللہ سے ڈرو اور علماء سے پوچھو۔ یہ ایسے ہے جیسے تو کہتا ہے: اتیت ھذا الامر من بابہ۔ اس کام کو میں نے اس کے تقاضا کے مطابق کیا۔ مہدوی اور مکی نے ابن انباری سے، ماوردی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت عورتوں کے جماع میں مثال ہے حکم دیا کہ ان کی قبل میں وطی کرو، دبر میں وطی نہ کرو۔ عورتوں کو بیوت (گھر) کہا گیا ہے کیونکہ عورتوں کی طرف رجوع کیا جاتا ہے جس طرح گھروں کی طرف رجوع کیا جاتا ہے ابن عطیہ نے کہا: یہ بعید ہے اور کلام کے انداز کو بدلنا ہے۔ حسن نے کہا: وہ فال پکڑتے تھے، پس جو سفر کرتا اور اس کی حاجت پوری نہ ہوتی تو وہ خسارہ سے فال پکڑتے ہوئے گھر کے پیچھے سے آتا تو انہیں کہا گیا کہ بدشگونی میں نیکی نہیں ہے بلکہ نیکی تو اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور اس پر توکل کرنا ہے۔ میں کہتا ہوں: ان اقوال میں سے پہلا قول صحیح ہے کیونکہ حضرت براء نے روایت کیا ہے، فرمایا: انصار جب حج کرتے تھے تو وہ اپنے گھروں کے دروازوں سے داخل نہیں ہوتے تھے۔ انہوں نے فرمایا: ایک انصاری شخص آیا اور اپنے دروازے سے داخل ہو گیا۔ اس کو اس کے متعلق کہا گیا تو یہ آیت نازل ہوئی (1) وَ لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا۔ یہ بیوت کے بارے میں حقیقی نص ہے۔ اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔ رہے دوسرے اقوال وہ دوسری جگہ سے لئے گئے ہیں۔ آیت سے ماخوذ نہیں ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ کے طور پر ذکر کی گئی ہے کہ نیکی کو اس کے تقاضا کے مطابق کرو اور تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیا ہے اس کے مطابق کرو۔ گھروں کے دروازوں سے آنے کا ذکر بطور مثال ہے تاکہ اشارہ ہو جائے کہ ہم امور کو اس طریقہ سے ادا کریں جس طرح اللہ نے ہمیں ادائیگی کا حکم دیا ہے۔

میں کہتا ہوں: اس بنا پر جو اقوال ذکر کئے گئے ہیں سب صحیح ہیں۔ البیوت جمع ہے بیت کی۔ البُیوت کو با کے ضمہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ تقویٰ اور فلاح اور لعل کا معنی گزر چکا ہے۔ اعادہ کی ضرورت نہیں۔

مسئلہ نمبر 12: اس آیت میں بیان ہے کہ جس کام کو اللہ نے قربت نہیں بنایا اور اس کی طرف اس نے بلایا نہیں تو وہ قربت نہیں ہوتا کہ اس کے ساتھ کوئی قربت حاصل کرنے والا قربت حاصل کرے۔ ابن خویز منداد نے کہا: جب کسی کام کے قربت ہونے اور قربت نہ ہونے کا اشکال ہو تو اس عمل کو دیکھا جائے گا اگر تو اس کی فرائض و سنن میں کوئی مثال ہے تو وہ جائز ہو

1۔ صحیح مسلم، صفحہ 421، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

گا اور اگر مثال نہ ہو تو نہ وہ نیکی ہوگا نہ قربت۔ فرمایا: اس کے متعلق آثار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں۔ حضرت ابن عباس کی حدیث میں ذکر ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے جبکہ ایک شخص دھوپ میں کھڑا تھا۔ اس کے متعلق آپ نے پوچھا تو لوگوں نے بتایا کہ یہ ابو اسرائیل ہے اس نے نذر مانی ہے کہ کھڑا رہے گا، نہ بیٹھے گا، نہ سایہ حاصل کرے گا، نہ بولے گا اور روزہ رکھے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کو کہو کہ یہ کلام کرے، سایہ حاصل کرے اور بیٹھے اور اپنے روزے کو مکمل کرے(1)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام کاموں کو باطل کر دیا جو قربت نہیں تھے، جن کی شریعت میں کوئی اصل نہیں تھی اور اس قربت کو صحیح قرار دیا جس کی فرائض وسنن میں مثال تھی۔

وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ۝۱۹۰

''اور لڑو اللہ کی راہ میں ان سے جو تم سے لڑتے ہیں اور (ان پر بھی) زیادتی نہ کرنا۔ بے شک اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا زیادتی کرنے والوں کو''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قَاتِلُوْا یہ پہلی آیت ہے جو قتال کے حکم میں نازل ہوئی۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ ہجرت سے پہلے ان ارشادات کی وجہ سے قتال ممنوع تھا۔ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (المومنون:96) (دور کرو اس چیز سے جو بہت بہتر ہے) فَاعْفُ عَنْهُمْ وَ اصْفَحْ (المائدہ:13) (معاف فرماتے رہیے اور درگزر فرمایئے)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا ۝ (مزمل) (اور ان سے الگ ہو جایئے بڑی خوبصورتی سے)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَسْتَ عَلَیْهِمْ بِمُصَیْطِرٍ ۝ (الغاشیہ) (آپ ان کو جبر سے منوانے والے تو نہیں ہیں) اس قسم کے دوسرے ارشادات جو مکہ میں نازل ہوئے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی تو آپ کو قتال کا حکم دیا گیا یہ ارشاد نازل ہوا: وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ (البقرہ:190) یہ حضرت ربیع بن انس وغیرہ کا قول ہے(2)۔ حضرت ابوبکر صدیق سے مروی ہے کہ پہلی آیت قتال کے بارے میں یہ نازل ہوئی(3): اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا (الحج:39) پہلا قول زیادہ ہے۔ اذن والی آیت عام مثال کے بارے نازل ہوئی مشرکین میں سے جو قتال کرے اور جو نہ کرے ہر ایک سے جنگ کرنے کا اذن ہوا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ کی طرف عمرہ کے لئے نکلے تھے جب مکہ کے قریب حدیبیہ میں اترے...... حدیبیہ ایک کنویں کا نام ہے، اس کنویں کے نام کی وجہ سے اس جگہ کو بھی حدیبیہ کہا جاتا ہے مشرکوں نے آپ کو بیت اللہ کی طرف جانے سے روکا۔ آپ ایک مہینہ حدیبیہ میں ٹھہرے رہے پھر مشرکوں نے آپ سے صلح کی کہ آپ اس سال واپس لوٹ جائیں جس طرح آئے ہیں آئندہ سال ان کے لئے تین دن مکہ خالی کر دیا جائے گا اور اس شرط پر صلح کی کہ دس سال ان کے درمیان قتال نہ ہوگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ واپس آ گئے۔ جب اگلا سال آیا تو آپ نے عمرۃ القضاء

1۔ صحیح بخاری، باب النذر فیما لایملك ولی معصیۃ، حدیث نمبر 6210، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

3۔ ایضاً

کی تیاری کی۔ مسلمانوں کو کفار کے دھوکا کا خوف ہوا۔ مسلمانوں نے حرم میں اور حرمت والے مہینہ میں لڑنا ناپسند کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ یعنی تمہارے لئے قتال حلال ہے اگر کفار تم سے قتال کریں۔ یہ آیت حج کے ذکر اور گھروں کے پیچھے سے آنے کے گزشتہ ذکر کے ساتھ متصل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے جنگ کرتے تھے جو آپ سے جنگ کرتا تھا اور اس سے جنگ نہیں کرتے تھے جو آپ سے جنگ نہیں کرتا تھا (1) حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ (توبہ:5)

پس یہ آیت منسوخ ہو گئی۔ یہ علماء کی ایک جماعت کا قول ہے۔ ابن زید اور ربیع نے کہا اس کو قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً (توبہ:36) نے منسوخ کیا تمام کفار سے جنگ کرنے کا حکم ہوا۔ حضرت ابن عباس، حضرت عمر بن عبد العزیز اور مجاہد نے کہا: یہ آیت محکم ہے یعنی تم ان سے جہاد کرو جو تم سے لڑتے ہیں اور عورتوں اور بچوں اور راہبوں کے قتل میں حد سے تجاوز نہ کرو۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ ابو جعفر نحاس نے کہا: یہ سنت اور نظر میں اصح قول ہے۔ سنت میں ابن عربی کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جنگ میں عورت کو مقتولہ دیکھا تو آپ نے اسے ناپسند فرمایا اور عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع فرمایا (2)۔ اس حدیث کو ائمہ نے روایت کیا ہے۔ رہی نظر تو فاعل کا صیغہ عام طور پر دو شخصوں سے پایا جاتا ہے جیسے مقاتلہ، مشاتمۃ، مخاصمہ، جھگڑنا، گالی دینا، لڑنا وغیرہ۔ قتال عورتوں، بچوں اور ان کے مشابہ لوگوں میں نہیں ہوتا جیسے راہب، اپاہج، بوڑھے اور مزدور لوگ۔ پس یہ لوگ قتل نہیں کئے جائیں گے۔ حضرت ابو بکر صدیق نے حضرت یزید بن ابی سفیان کو یہی وصیت کی تھی جب اسے شام کی طرف بھیجا تھا مگر یہ کہ یہ لوگ اذیت دینے والے ہوں تو ان کو قتل کیا جائے گا۔ اس کو مالک وغیرہ نے نقل کیا ہے اور علماء کی اس میں چھ صورتیں ہیں۔

(۱) عورتیں اگر قتال کریں تو انہیں قتل کیا جائے گا۔ سحنون نے کہا: جنگ کی حالت میں اور جنگ کے بعد (3) ایسی عورتوں کو قتل کیا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد عام ہے: وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ (اللہ تعالیٰ کے راستہ میں ان سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں) وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ (ان کو قتل کرو جہاں تم انہیں پاؤ) اور عورت کے لئے جنگ میں آثار عظیمہ ہوتے ہیں مثلاً اموال سے امداد، جنگ پر ابھارنا کبھی عورتیں اپنے بال کھولے ہوئے، ندبہ کرتے ہوئے، ابھارتے ہوئے اور فرار پر عار دلاتے ہوئے نکلتی ہیں۔ اس صورت میں ان کا قتل کرنا مباح ہے مگر جب وہ قیدی ہو جائیں تو انہیں لونڈیاں بنانا زیادہ نفع بخش ہے کیونکہ وہ جلدی اسلام قبول کر لیتی ہیں اور اپنے ادیان سے رجوع کر لیتی ہیں اور ان کا اپنے اوطان کی طرف بھاگ جانا مشکل ہوتا ہے بخلاف مردوں کے۔

(۲) بچوں کو قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ بچوں کے قتل سے نہی ثابت ہے کیونکہ ان پر تکلیف نہیں یعنی وہ مکلف نہیں ہیں۔ اگر بچہ

1۔ الکشاف، صفحہ 235، جلد 1 (مکتبۃ الاعلام الاسلامی بیروت)

2۔ صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب قتل النساء فی الحرب، صفحہ 423، جلد 1 (وزارت تعلیم)

موطا امام مالک، کتاب الجهاد، النهی عن قتل النساء والولدان، صفحہ 465 (وزارت تعلیم)

3۔ احکام القرآن، صفحہ 104، جلد 1 (دار الفکر)

جنگ میں شریک ہو تو اسے قتل کیا جائے گا(1)۔

(۳) راہبوں کو نہ قتل کیا جائے گا نہ انہیں غلام بنایا جائے گا بلکہ ان کے اموال وغیرہ بھی چھوڑ دیئے جائیں گے جن سے وہ زندگی گزارتے ہیں۔ یہ اس صورت میں ہے جب وہ اہل کفر سے جدا رہیں کیونکہ حضرت ابوبکر نے حضرت یزید کو کہا تھا: اور تم ایسی قوم پاؤ گے جو کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے نفسوں کو اللہ کے لئے روک رکھا ہے۔ انہیں چھوڑ دو اور جو وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اللہ کے لئے اپنے نفسوں کو روک رکھا ہے۔ اسے بھی چھوڑ دو..... اگر وہ کفار کے ساتھ کنائس میں ہوں تو پھر قتل کئے جائیں گے۔ اگر عورت راہبہ بن چکی ہو تو اشہب نے کہا: اُسے نہیں ڈرایا جائے گا۔ سحنون نے کہا: راہبہ ہونا اس کے حکم کو نہیں بدلے گا۔ قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا کہ میرے نزدیک صحیح اشہب کی روایت ہے کیونکہ وہ اس قول کے تحت داخل ہے انہیں چھوڑ دو اور جنہوں نے اپنے نفسوں کو اللہ کے لئے روکا ہوا ہے(2)۔

(۴) اپاہج: سحنون نے کہا: ان کو قتل کیا جائے گا۔ ابن حبیب نے کہا: انہیں قتل نہیں کیا جائے گا۔ صحیح یہ ہے کہ ان کے احوال کا اعتبار کیا جائے گا، اگر وہ اذیت دینے والے ہوں تو انہیں قتل کیا جائے گا ورنہ انہیں چھوڑ دیا جائے گا اور اس کے راستہ میں بیٹھنے والے ہیں وہ ایسے لوگوں میں سے ہو جائیں گے جن کے حال پر وحشت نہیں ہے(3)۔

(۵) الشیوخ: مالک نے محمد کی کتاب میں فرمایا: شیوخ (بوڑھوں) کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ اس پر جمہور کا نظریہ ہے اگر کوئی بوڑھا شخص ہو جو قتال کی طاقت نہ رکھتا ہو نہ اس کی رائے سے نفع اٹھایا جاتا ہو اور وہ دفاع کرنے والا ہو تو اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ یہی قول امام مالک اور امام ابوحنیفہ کا ہے۔ امام شافعی کے دو قول ہیں: (۱) جمہور کے قول کی مثل ہے اور دوسرا یہ ہے کہ راہب کو قتل کیا جائے گا۔ صحیح پہلا قول ہے کیونکہ سیدنا ابوبکر نے حضرت یزید کو یہی کہا تھا اور اس قول کا کوئی مخالف نہیں ہے۔ پس ثابت ہوا کہ اس پر اجماع ہے۔ نیز یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو جنگ نہیں کرتے اور نہ دشمن کی مدد کرتے ہیں۔ پس اس کا قتل کرنا جائز نہیں جیسے عورت ہے مگر ایسا بوڑھا جس کے نقصان کا خوف ہو وہ جنگ کرتا ہو یا رائے دیتا ہے یا مال دیتا ہے پھر یہ جب قیدی ہو جائے گا تو امام کو اس میں اختیار ہوگا۔ قتل کرے، احسان کرے یا فدیہ لے یا غلام بنالے یا جزیہ کی ادائیگی پر ذمہ کا عقد کرے۔

(۶) عسفاء: مزدور لوگ اور کسان لوگ ہیں۔ مالک نے محمد کی کتاب میں فرمایا: انہیں قتل نہیں کیا جائے گا(4)۔ امام شافعی نے فرمایا: کسانوں، مزدوروں اور بوڑھے لوگوں کو قتل کیا جائے گا مگر یہ کہ وہ اسلام قبول کرلیں یا جزیہ ادا کریں۔ پہلا قول اصح ہے کیونکہ رباح بن ربیع کی حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: خالد بن ولید سے مل جاؤ اور کسی بچے اور مزدور کو قتل نہ کرنا(5)۔ حضرت عمر نے فرمایا: بچوں اور ان کسانوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو جو تمہارے لئے جنگ کھڑی نہیں کرتے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کسان کو قتل نہیں کرتے تھے۔ یہ ابن منذر نے ذکر کیا ہے۔

1۔ احکام القرآن، صفحہ 104، جلد 1 (دارالفکر)　2۔ مؤطا امام مالک، کتاب الجہاد، باب النہی عن قتل النساء و الولدان، صفحہ 465 (و، ت)
3۔ احکام القرآن، صفحہ 105، جلد 1 (دارالفکر)　4۔ ایضاً، صفحہ 106، جلد 1
5۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، فی قتل النساء، صفحہ 6، جلد 2 (و، ت)، ایضاً، حدیث 2295، سنن ابن ماجہ، حدیث 2831، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مسئلہ نمبر 2: اشہب نے مالک سے روایت کیا ہے کہ وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ سے مراد اہل مدینہ ہیں جنہیں ان سے قتال کا حکم دیا گیا تھا جو ان سے قتال کریں۔ صحیح یہ ہے کہ یہ تمام مسلمانوں کو خطاب ہے ہر ایک کو حکم دیا کہ وہ ان سے جہاد کریں جو ان سے جنگ کرے۔ جب کوئی اور صورت ممکن نہ ہو۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کیسے سورہ برأت میں بیان فرمایا قَاتِلُوا الَّذِیْنَ یَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ (توبہ: 123)

پہلا مقصود اہل مکہ تھے۔ پس ان سے آغاز متعین ہو گیا جب اللہ تعالیٰ نے مکہ کو فتح فرمایا تو پھر ان سے متصل لوگوں سے جنگ تھی جو اذیت دیتے تھے حتیٰ کہ دعوت عام ہو جائے اور کلمۃ اللہ تمام آفاق میں پہنچ جائے اور کفار میں سے کوئی باقی نہ رہے۔ یہ حکم قیامت تک جاری رہے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: گھوڑوں کی پیشانیوں میں قیامت تک خیر رکھی گئی ہے، اجر اور مال غنیمت (1)۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کی غایت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہے۔ یہ پہلی حدیث کے موافق ہے کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کا نزول قیامت کی نشانیوں میں سے ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَعْتَدُوْا اس کی تاویل میں وہی کہا گیا ہے جو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ یہ محکم آیت ہے اور رہے مرتد لوگ تو ان کے لئے قتل ہے یا توبہ ہے۔ اسی طرح گمراہ لوگوں کے لئے تلوار یا توبہ ہے۔ اور جس نے باطل اعتقاد کو چھپایا پھر ظاہر ہو گیا تو وہ زندیق کی طرح قتل کیا جائے گا اور اس سے توبہ طلب نہیں کی جائے گی۔ رہے ائمہ عدل پر خوارج سے جنگ کرنا واجب ہے حتیٰ کہ وہ حق کی طرف لوٹ آئیں۔ ایک قوم نے کہا: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی رضا کے بغیر قتال میں حد سے تجاوز نہ کرو۔ جیسے حمیت، شہرت کا حصول وغیرہ بلکہ اللہ کے راستہ میں ان سے جہاد کرو جو تم سے لڑتے ہیں اور مقصود دین کی سربلندی ہو اور اللہ تعالیٰ کے کلمہ کا اظہار ہو۔ بعض نے فرمایا: وَلَا تَعْتَدُوْا یعنی جو تم سے نہیں لڑتا اس سے نہ لڑو، اس صورت میں تمام کفار سے جنگ کرنے کے حکم کے ساتھ یہ آیت منسوخ ہوگی۔ واللہ اعلم

وَاقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَیْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى یُقٰتِلُوْكُمْ فِیْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۹۱﴾ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۹۲﴾

''اور قتل کرو انہیں جہاں بھی انہیں پاؤ اور نکال دو انہیں جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا تھا اور فتنہ انگیزی تو قتل سے بھی زیادہ سخت ہے اور نہ جنگ کرو ان سے مسجد حرام کے قریب یہاں تک کہ وہ (خود) تم سے وہاں جنگ کرنے لگیں۔ سو اگر وہ لڑیں تم سے تو پھر قتل کرو انہیں۔ یہی سزا ہے (ایسے) کافروں کی۔ پھر اگر وہ باز آ جائیں (تو جان لو کہ) اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ثَقِفْتُمُوْهُمْ کہا جاتا ہے ثقف یثقف ثقفا و ثقفۃ۔ رجل ثقف وہ شخص (2) جو

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب اثم مانع الزکوٰۃ، صفحہ 319، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 262، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

کاموں کو پختہ کرتا ہے۔ اس آیت میں قیدی کو قتل کرنے پر دلیل ہے۔ اس کا بیان سورۂ انفال میں ان شاء اللہ آئے گا۔
وَ اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَیْثُ اَخْرَجُوْكُمْ یعنی مکہ سے تم ان کو نکالو۔ طبری نے کہا: یہ خطاب مہاجرین کے لئے ہے اور ضمیر کفار قریش کے لئے ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وہ فتنہ جس پر انہوں نے تمہیں ابھارا اور انہوں نے اس کے ذریعے تمہارے کفر کی طرف لوٹنے کا ارادہ کیا وہ قتل سے زیادہ شدید ہے۔ مجاہد نے کہا: اس کا مطلب ہے مومن کو قتل کرنے سے۔ پس قتل کرنا اس پر فتنہ سے زیادہ خفیف ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: ان کا اللہ سے شریک ٹھہرانا اور اللہ تعالیٰ سے کفر کرنا اس قتل سے بڑا جرم ہے جس کی وہ تمہیں عار دلاتے ہیں (1)۔ یہ دلیل ہے کہ یہ آیت عمرو بن حضرمی کے بارے میں نازل ہوئی جب اسے واقد بن عبداللہ تیمی نے رجب (جو حرمت والا مہینہ تھا) کے آخری دن قتل کر دیا تھا جیسا کہ عبداللہ بن جحش کے سریہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ یہ طبری وغیرہ کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى یُقٰتِلُوْكُمْ فِیْهِ اس آیت کے متعلق علماء کے دو قول ہیں: (1) ایک یہ کہ یہ منسوخ ہے (۲) دوسرا یہ کہ یہ محکم ہے۔ مجاہد نے کہا: آیت محکم ہے کسی کے لئے مسجد حرام میں جنگ کرنا جائز نہیں مگر یہ کہ اس سے مسجد حرام میں جنگ کی جائے (2)۔ یہ طاؤس کا قول ہے اور آیت کی نص اس کا تقاضا کرتی ہے اور دونوں قولوں میں سے یہی قول صحیح ہے۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا نظریہ بھی یہی ہے۔ الصحیح میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن فرمایا: یہ وہ شہر ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس دن سے حرام فرمایا جس دن سے اس نے آسمانوں اور زمین کو تخلیق فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کی حرمت کے ساتھ قیامت تک حرام (حرمت والا) ہے اس میں کسی کے لئے مجھ سے پہلے قتال حلال نہ تھا اور میرے لئے صرف دن کی ایک گھڑی حلال کیا گیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حرمت سے قیامت تک کے لئے حرام ہے (3)۔ قتادہ نے کہا: یہ آیت اس آیت فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (توبہ: 5) سے منسوخ ہے (4)۔ مقاتل نے کہا: اس آیت کو اس آیت وَاقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ نے منسوخ کیا ہے پھر اس کو اس ارشاد نے منسوخ کیا فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (توبہ: 5) پس حرم میں قتال سے آغاز کرنا جائز ہے اور جس سے انہوں نے حجت پکڑی وہ یہ ہے کہ سورہ برأت، سورۂ بقرہ کے دو سال بعد نازل ہوئی۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوئے تو آپ کے سر پر خود تھا۔ کسی نے کہا: ابن خطل کعبہ کے پردوں کے ساتھ لٹکا ہوا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسے قتل کر دو (5)۔

ابن خویز منداد نے کہا: وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ منسوخ ہے کیونکہ اجماع سے ثابت ہے کہ دشمن اگر مکہ پر غالب آجائے اور کہے میں تم سے جنگ کروں گا اور میں تمہیں حج سے روکوں گا اور میں مکہ سے نہیں جاؤں گا تو اس سے جنگ کرنا

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 262، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
2۔ معالم التنزیل، صفحہ 235، جلد 1 (دار الفکر)
3۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب تحریم مکۃ، صفحہ 437، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
4۔ المحرر الوجیز، صفحہ 263، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
5۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، صفحہ 614، جلد 2 (وزارت تعلیم)

واجب ہے اگرچہ وہ قتال (جنگ) کا آغاز نہ بھی کرے مکہ اور دوسرے شہر برابر ہیں اس کی تعظیم کے لئے اسے حرام کیا گیا ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت خالد بن ولید کو فتح مکہ کے دن بھیجا اور فرمایا: تلوار سے ان کو کاٹ دے حتیٰ کہ تم مجھے صفا پر ملو۔ حتیٰ کہ حضرت عباس آئے اور کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قریش ختم ہو گئے آج کے بعد کوئی قریش نہیں۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا اس کی تعظیم کی خاطر فرمایا: اس کی گری پڑی چیز کوئی نہ اٹھائے مگر (1) وہ جو اعلان کروائے مکہ میں گری پڑی چیز اور کسی دوسرے شہر میں برابر ہے اور یہ آیت وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ کے ارشاد کے ساتھ منسوخ ہے۔

ابن عربی نے کہا: میں بیت المقدس میں...... اللہ اسے پاک کرے...... ابو عقبہ حنفی زنجانی کے مدرسہ میں آیا اور قاضی زنجانی نے ہمیں جمعہ کے دن درس دیا۔ ہم اس کیفیت میں تھے کہ ایک خوبصورت شکل والا شخص آیا، اس کی پیٹھ پر پرانے کپڑے تھے اس نے علماء کی طرف سلام کیا اور چرواہوں کے لباس کے ساتھ صدر مجلس بن کر بیٹھ گیا۔ قاضی زنجانی نے کہا: سردار کون ہے؟ اس نے کہا: وہ شخص کہ کل جس سے شاطر نے مال چھینا تھا اور میرا ارادہ اس حرم مقدس کا تھا۔ میں اہل صاغان کے طالبعلموں میں سے ہوں۔ قاضی نے جلدی سے کہا: اس سے سوال کرو...... عادت کے مطابق علمائے اکرام میں ان سے جلدی سے سوال کئے جاتے ہیں کافر کے مسئلہ پر قرعہ نکلا۔ جب وہ حرم میں پناہ لے تو کیا اسے قتل کیا جائے گا یا نہیں؟ اس نے فتویٰ دیا کہ اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ اس کی دلیل پوچھی گئی تو اس نے کہا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ اور ولا تقتلوھم ولا تقاتلوھم بھی پڑھا گیا ہے اگر ولا تقتلوھم پڑھا جائے تو مسئلہ واضح ہے اور اگر ولا تقاتلوھم پڑھا جائے تو یہ تنبیہ ہے کیونکہ جب جنگ سے منع فرمایا جو قتل کا سبب ہے تو یہ قتل سے نہی پر ظاہر، واضح دلیل ہو گی اس پر قاضی نے امام شافعی اور امام مالک کے مذہب کی تائید کرتے ہوئے اعتراض کیا اگرچہ قاضی ان کے مسلک کا قائل نہیں تھا...... عادت کے مطابق...... اس نے کہا: یہ آیت فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (توبہ: 5) سے منسوخ ہے۔ صاغانی نے کہا: یہ قاضی کے منصب اور اس کے علم کے مناسب نہیں۔ یہ آیت جو آپ نے پیش کی ہے وہ تمام جگہوں میں ہے اور جس سے تو نے حجت پکڑی ہے وہ خاص ہے، کسی کے لئے یہ کہنا جائز نہیں کہ عام، خاص کو منسوخ کرتا ہے۔ قاضی زنجانی مبہوت ہو گیا۔ یہ بدیع الکلام سے ہے (2)۔ ابن عربی نے کہا: اگر کافر حرم میں پناہ لے تو اس کو نہیں پکڑا جائے گا کیونکہ نص قرآنی اور سنت ہے اس میں قتال منع ہے۔ رہزانی اور قاتل اس پر حد قائم کرنا ضروری ہے مگر کافر جنگ کا آغاز کرے تو نص قرآنی کی وجہ سے اسے قتل کیا جائے گا (3)۔

میں کہتا ہوں: علماء نے جو ابن خطل اور اس کے ساتھیوں کے قتل سے حجت پیش کی ہے، اس میں کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ یہ اس وقت ہوا تھا جب مکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے حلال کیا گیا تھا۔ یہ دار حرب اور دار کفر تھا۔ جس گھڑی میں مکہ حلال کیا گیا تھا اس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے اہل مکہ میں سے جن کا خون بہانا چاہتے تھے جائز تھا۔ پس ثابت ہوا کہ پہلا قول صحیح ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، عام الفتح، صفحہ 617، جلد 2

2۔ احکام القرآن، صفحہ 107، جلد 1 (دار الفکر)

3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 263، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

مسئلہ نمبر 4: بعض علماء نے فرمایا: یہ آیت دلیل ہے کہ امام پر بغاوت کرنے والا الحکم میں کافر کے خلاف ہے۔ کافر جب قتال کرے تو اسے ہر حال میں قتل کیا جائے گا اور باغی جب قتال کرے تو دفاع کی نیت سے اس سے جنگ کی جائے گی۔ بھاگ جانے والے کا پیچھا نہیں کیا جائے گا اور زخمیوں پر حملہ نہیں کیا جائے گا۔ باغیوں کے احکامات سورۃ الحجرات میں آئیں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنِ انْتَهَوْا اگر وہ ایمان لانے کے ساتھ جنگ سے رک جائیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کے پچھلے سب گناہ معاف کردے گا اور ان میں سے ہر ایک پر جرموں سے عفو کے ساتھ رحم فرمائے گا۔ اس کی مثال یہ ارشاد ہے: قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ (انفال: 38) (اس کا بیان آگے آئے گا)۔

وَ قٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۭ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝

"اور لڑتے رہو ان سے یہاں تک کہ نہ رہے فتنہ (وفساد) اور ہو جائے دین صرف اللہ کے لئے پھر اگر وہ باز آجائیں تو (سمجھ لو) کہ سختی (کسی پر) جائز نہیں مگر ظالموں پر"۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ قٰتِلُوْهُمْ یہ ہر جگہ ہر مشرک سے جنگ کرنے کا حکم ہے۔ اس کے قول کے مطابق جو اسے ناسخ دیکھتا ہے اور جو اسے غیر ناسخ کہتا ہے وہ کہتا ہے: اس کا معنی ہے ان سے لڑو جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ اگر وہ تم سے لڑیں، پہلا قول اظہر ہے۔ یہ مطلق قتال کا امر ہے اس میں کفار کے آغاز کرنے کی کوئی شرط نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ (دین اللہ کے لئے ہو جائے)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں حتیٰ کہ وہ کہیں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔(1) یہ آیت اور حدیث دلالت کرتی ہیں کہ قتال کا سبب کفر ہے کیونکہ فرمایا: حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ (حتیٰ کہ فتنہ نہ رہے) یعنی کفر نہ رہے۔ جہاد کی غایت کفر کا نہ ہونا بیان فرمائی۔ اور یہ ظاہر ہے۔ حضرت ابن عباس، قتادہ، ربیع، سدی وغیرہم نے فرمایا: یہاں فتنہ سے مراد شرک اور وہ تمام چیزیں ہیں جو مسلمانوں کی اذیت کا باعث تھیں (2)۔ فتنہ کا اصل معنی اختیار اور امتحان ہے۔ یہ فتنت الفضۃ سے ماخوذ ہے جب تو چاندی کو آگ میں ڈالے تاکہ ردی، عمدہ سے علیحدہ ہو جائے، اس کے محاصل کا بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنِ انْتَهَوْا اگر وہ کفر سے رک جائیں، اسلام قبول کرنے کے ساتھ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے یا جزیہ ادا کرنے کے ساتھ، یہ اہل کتاب کے حق میں ہے۔ اس کا بیان سورۂ براءت میں آئے گا۔ کفر سے باز آجائیں تو فبہا ورنہ قتل کئے جائیں گے۔ یہ ظالم ہیں ان پر ہی تعدی ہوگی۔ ظالموں کی سزا کو عدوان (تعدی) سے تعبیر فرمایا

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، فضل استقبال القبلۃ، صفحہ 56، جلد 1 (وزارت تعلیم) ایضاً حدیث نمبر 6413، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 263، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

کیونکہ وہ ان کی تعدی (ظلم) کی سزا ہے کیونکہ ظلم اپنے ضمن میں عدوان کو لئے ہوئے ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے عدوان کی جزا کو بھی عدوان کہا گیا۔

جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا (الشوریٰ:40)، الظالمون، دونوں تاویلوں میں سے ایک تاویل پر۔ جس نے قتال سے آغاز کیا۔ اور دوسری تاویل پر جو کفر اور فتنہ پر باقی رہا۔

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَ الْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَیْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَیْكُمْ ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ ﴿۱۹۴﴾

''حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینہ کا بدلہ ہے اور ساری حرمتوں میں (فریقین کے رویہ میں) برابری چاہئے۔ تو جو تم پر زیادتی کرے تم اس پر زیادتی کرلو (لیکن) اس قدر جتنی زیادتی اس نے تم پر کی ہو۔ اور ڈرتے رہا کرو اللہ سے اور جان لو یقیناً اللہ (کی نصرت) پرہیزگاروں کے ساتھ ہے''۔

اس میں دس مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ اس سے پہلے اَلشَّهْرُ کا اشتقاق گزر چکا ہے اس کے نزول کا سبب وہ ہے جو حضرات ابن عباس، قتادہ، مجاہد، مقسم، سدی، ربیع اور ضحاک وغیرہ سے روایت کیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا: یہ عمرۃ القضاء اور حدیبیہ کے سال نازل ہوئی۔ واقعہ اس طرح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ کے لئے نکلے حتی کہ ذی القعدہ ۶ ہجری میں حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو کفار قریش نے بیت اللہ کی طرف جانے سے روک دیا۔ آپ واپس آگئے اللہ تعالیٰ نے آپ سے وعدہ فرمایا تھا کہ آپ مکہ میں ضرور داخل ہوں گے۔ پس آپ سات ہجری کو مکہ میں داخل ہوئے اور اپنے عمرہ کی قضا کی تو یہ آیت نازل ہوئی (1)۔ حسن سے مروی ہے کہ مشرکین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: کیا تجھے شہر حرام میں قتال سے منع کیا گیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں۔ پس مشرکین نے حرمت والے مہینے میں جنگ کا ارادہ کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ معنی یہ ہے کہ اگر وہ اس مہینہ میں قتال کو حلال کریں تو آپ ان سے قتال کریں (2)۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعے ان کی موافقت کو مباح کیا۔ پہلا قول مشہور ہے اور اکثر علماء کی رائے اسی پر ہے۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ، الحرمات جمع ہے حرمۃ کی جیسے الظلمۃ کی جمع الظلمات ہے۔ حجرۃ کی جمع حجرات ہے حرمات جمع ذکر فرمایا کیونکہ شہر حرام کی حرمت، بلد حرام کی حرمت، احرام کی حرمت مراد لی ہے۔ الحرمۃ کا مطلب جس کے توڑنے سے منع کیا گیا ہو۔ القصاص کا معنی المساوات ہے یعنی میں نے تمہارے لئے ان سے برابری کردی ہے۔ انہوں نے تمہیں چھ ہجری میں روکا تو تم نے سات ہجری میں عمرہ قضا کیا۔ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ۔ ما قبل سے متصل ہے اور اس کے متعلق ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ پہلی کلام سے جدا ہے۔ یہ ابتداء اسلام میں تھا جو تیری حرمت کو تار تار کرتا تو اس سے اتنا بدلہ لے سکتا تھا جتنی اس نے تجھ پر زیادتی کی ہوتی تھی پھر یہ قتال کے ساتھ منسوخ ہوگیا۔ ایک

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 263، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ احکام القرآن، صفحہ 111، جلد 1 (دار الفکر)

طائفہ نے کہا: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے درمیان تعدی اور جنایات میں سے جو اس آیت میں شامل ہیں وہ منسوخ نہیں ہیں جس کے مال میں یا زخم کے اعتبار سے ظلم کیا گیا ہو اس کے لئے اتنی تعدی (زیادتی) کرنا جائز ہے جو اس پر کی گئی ہے جب کہ اس کے لئے زیادتی ظاہر ہو جائے۔ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان اپنی زیادتی کا بدلہ لینے میں کچھ نہیں ہوگا (یعنی اسے کوئی گناہ نہیں ہوگا) یہ امام شافعی وغیرہ کا قول ہے یہ امام مالک کے مذہب کی روایت ہے۔ امام مالک کے اصحاب میں سے ایک طائفہ نے کہا: یہ اس کے لئے جائز نہیں۔ قصاص (بدلہ) کا امر حکام پر موقوف ہے اور اموال کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد شامل ہے۔ امانت اسے ادا کرو جس نے تمہیں امین بنایا اور جس نے تم سے خیانت کی تم اس سے خیانت نہ کرو (1)۔ اس حدیث کو دارقطنی وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ پس جس کو خیانت کرنے والے نے امین بنایا ہو اسے اس کے ساتھ خیانت کرنا جائز نہیں اور جس نے اسے امین بنایا ہے اس کا حق اسے پہنچائے۔ یہ مشہور مذہب ہے۔ امام ابو حنیفہ کا بھی یہی قول ہے انہوں نے اسی حدیث کو دلیل بنایا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے حجت پکڑی ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا (النساء: 58) (بے شک اللہ حکم فرماتا ہے تمہیں کہ (ان کے) سپرد کرو امانتوں کو جو ان کے اہل نہیں)۔ یہ عطا خراسانی کا قول ہے۔ قدامۃ بن الہیثم نے کہا: میں نے عطا بن میسرہ خراسانی سے سوال کیا، میں نے ان سے پوچھا: میرا ایک شخص پر حق ہے، جس کا اس نے مجھ پر انکار کیا ہے اور میرے لئے دلیل پیش کرنا بھی ممکن نہیں۔ کیا میں اس کے مال سے اپنے مال کے برابر لے لوں؟ عطا نے کہا: تم بتاؤ اگر وہ تیری لونڈی سے جماع کرتا تو تو جانتا ہے جو تو کرتا۔

میں کہتا ہوں: صحیح اس کا جواز ہے جیسے ہی اپنے حق کو حاصل کرے جبکہ تو چور شمار نہ ہو۔ یہ امام شافعی کا مذہب ہے اس کو داؤدی نے امام مالک سے حکایت کیا ہے۔ ابن منذر نے بھی یہی کہا ہے۔ ابن عربی نے اس کو اختیار کیا ہے یہ خیانت نہیں ہے یہ تو اپنے حق کو پانا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو (2)۔ ظالم سے حق لینا یہ اس کی مدد کرنا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہند بنت عتبہ، ابو سفیان کی بیوی کو کہا: جب اس نے کہا تھا۔ ابو سفیان کنجوس آدمی ہے مجھے اتنا خرچ نہیں دیتا جو میرے لئے کافی ہو اور میرے بچوں کے لئے کافی ہو مگر یہ کہ میں اس کے مال سے اس کے علم کے بغیر لے لوں، کیا مجھ پر مال لینے میں کوئی حرج ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو معروف طریقہ سے اتنا لے لے جو تجھے کافی ہو اور تیری اولاد کو کافی ہو (3)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے لینا مباح قرار دیا مگر وہ اتنی مقدار ہے جو اس کے لئے ضروری ہو۔ یہ تمام صحیح حدیث میں ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ (جو تم پر زیادتی کرے تم اس پر زیادتی کر لو لیکن اس قدر جتنی زیادتی اس نے تم پر کی)۔ یہ اختلاف کی صورت میں قطعی حکم ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اس میں اختلاف ہے کہ جو اپنے مال کی جنس کے علاوہ مال حاصل کرنے پر کامیاب ہو جائے۔ بعض

1۔ سنن ابی داؤد، باب البیوع، فی الرجل یاخذ حقہ من تحت یدہ، صفحہ 142، جلد 2 (و، ت)
ایضاً، حدیث 3968، جامع ترمذی، حدیث 1183، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، فی المظالم و القصاص، صفحہ 330، جلد 1 (وزارت تعلیم) ایضاً، حدیث نمبر 2263، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً، کتاب النفقات صفحہ 808، جلد 2

علماء نے فرمایا: وہ نہ لے مگر حاکم کے حکم سے۔ امام شافعی کے اس سلسلہ میں دو قول ہیں: اصح لے لینا ہے انہوں نے اسے اس پر قیاس کیا ہے اگر وہ اپنے مال کی جنس سے حاصل کرنے پر قادر ہو۔ دوسرا قول ہے کہ وہ نہ لے کیونکہ وہ اس کے مال کی جنس کے خلاف ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جو اس کے خصم پر ہے اس کی قیمت کا قصد کرے اور اس کی مقدار لے لے یہ صحیح ہے جیسا کہ ہم نے دلیل سے بیان کیا ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر4: ہم اس لینے پر فرعی مسائل نکالتے ہیں۔ کیا اس پر خود قرض وغیرہ ہے اس کا اعتبار کیا جائے گا؟ امام شافعی نے فرمایا: نہیں، بلکہ جو اس کا اس پر ہے وہ لے۔ امام مالک نے فرمایا: اگر مقروض کو مفلس قرار دیا گیا ہو تو اس کے لئے دوسرے غرباء کے ساتھ جو حاصل ہوگا اس کا اعتبار کیا جائے گا۔ یہی قیاس ہے۔

مسئلہ نمبر5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ یہ عموم متفق علیہ ہے، خود لینا ممکن ہو تو خود لے لے یا حکام کے ذریعے لے لے۔ لوگوں کا بدلہ لینے میں اختلاف ہے۔ کیا بدلہ کو عدوان کہا جائے گا یا نہیں جس نے کہا: قرآن میں مجاز نہیں ہے۔ فرمایا: مقابلہ عدوان ہے اور وہ مباح عدوان ہے جیسا کہ کلام عرب میں مجاز مباح کذب ہے۔ کیونکہ کہنے والے کا قول ہے: فقالت له العينان سمعاً و طاعة . . . ۔ اس کی آنکھوں نے اسے کہا ہم سنیں گی اور اطاعت کریں گی۔ اسی طرح قول ہے: امتلأ الحوض وقال قَطْنِي۔ حوض بھر گیا اور اس نے کہا مجھے کافی ہے۔ اسی طرح جملہ ہے: شكا إلىّ جملى طول السرى۔ میرے اونٹ نے مجھ سے طویل چلنے کی شکایت کی۔

یہ معلوم شدہ ہے کہ یہ اشیاء بولتی نہیں ہیں اور جھوٹ کی تعریف یہ ہے کہ کسی چیز کے متعلق اس کی حقیقت کے خلاف خبر دینا۔ اور جنہوں نے کہا: قرآن میں مجاز ہے، انہوں نے اسے مجاز کے طریق پر عدوان کا نام دیا۔ کلام کا مقابلہ اس کی مثل ہے۔ جیسے عمرو بن کلثوم نے کہا۔

الا لا يجهلن احد علينا فنجهل فوق جهل الجاهلينا

خبردار! ہم پر کوئی جہالت کا مظاہرہ نہ کرے ورنہ ہم اس کی جہالت سے زیادہ جہالت کا مظاہرہ کریں گے۔

اسی طرح ایک اور نے کہا:

ولى فرس للحلم بالحلم ملجم ولى فرس للجهل بالجهل مسرج

میرے لئے ایک گھوڑا حلم کے لئے ہے جسے حلم کی لگام دی گئی ہے اور ایک جہالت کا گھوڑا ہے جسے جہالت کی زین پہنائی گئی ہے۔

و من رام تقويمى فانى مقوم و من رام تعويجى فانى معوج

جس نے میری تقویم کا ارادہ کیا تو میں مقوم (سیدھا کیا گیا) ہوں اور جس نے میرے ٹیڑھے پن کا ارادہ کیا تو میں ٹیڑھا ہوں۔ اس کی مراد ہے: میں جاہل اور ٹیڑھے شخص کو بدلہ دیتا ہوں۔ وہ اپنی جہالت اور ٹیڑھے پن سے مدح نہیں کر رہا ہے۔

مسئلہ نمبر6: اس شخص کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے جس نے کوئی حیوان یا سامان ضائع کر دیا جس کا نہ کیل کیا

جاتا ہے نہ وزن کیا جاتا ہے۔ امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب اور علماء کی ایک جماعت نے کہا: اس پر اس کی مثل ہے قیمت کی طرف نہیں پھیرا جائے گا مگر مثل کے نہ پائے جانے کے وقت۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ (النحل: 126) (اگر تم انہیں سزا دینا چاہو تو انہیں سزا دو لیکن اس قدر جتنی تمہیں تکلیف پہنچائی گئی ہے۔)

علماء فرماتے ہیں: یہ تمام اشیاء میں عام ہے اور انہوں نے اس سے تائید حاصل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زوجہ کے گھر ٹوٹا ہوا پیالہ رکھ لیا تھا جس نے دوسری زوجہ محترمہ کا پیالہ توڑا تھا اور صحیح پیالہ واپس کیا تھا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: برتن کے بدلے برتن اور کھانے کے بدلہ کھانا ہے(1)۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔ فرمایا: ہمیں مسدد نے بتایا انہوں نے فرمایا: ہمیں یحییٰ نے بتایا دوسری سند میں ہے ہمیں محمد بن مثنی نے بتایا: انہوں نے کہا: ہمیں خالد نے بتایا انہوں نے حمید سے انہوں نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی کسی زوجہ محترمہ کے پاس تھے۔ تو دوسری امہات المومنین میں سے کسی نے اپنے خادم کے ساتھ ایک پیالہ بھیجا جس میں کوئی کھانا تھا۔ فرمایا: جس کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود تھے اس نے ہاتھ مارا اور پیالہ توڑ دیا۔ حضرت ابن مثنی نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں ٹکڑے لئے اور ایک کو دوسرے کے ساتھ ملا دیا اور اس میں کھانے کو جمع کرنا شروع کر دیا اور فرمایا: تمہاری ماں نے غیرت کی ہے۔ حضرت ابن مثنی نے یہ زائد بیان کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کھاؤ۔ پس حاضرین مجلس نے وہ کھانا کھایا حتیٰ کہ جس نے وہ پیالہ توڑا تھا وہ اپنا وہ پیالہ لے آئی جو اس کے گھر میں موجود تھا۔

پھر ہم مسدد کی حدیث کے الفاظ کی طرف لوٹتے ہیں۔ فرمایا: کھاؤ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خادم اور پیالے کو روک لیا حتی کہ لوگ کھانے سے فارغ ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح پیالہ خادم کو دیا اور ٹوٹا ہوا پیالہ اپنے گھر میں روک لیا(2)۔ ہمیں ابو داؤد نے بتایا، فرمایا: ہمیں مسدد نے بتایا، فرمایا: ہمیں یحییٰ نے بتایا انہوں نے سفیان سے روایت کیا فرمایا: ہمیں فلیت عامری نے بتایا، ابوداؤد نے کہا: یہ افلت بن خلیفہ ہے انہوں نے جسرہ بنت دجاجہ سے روایت کیا، فرمایا: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: میں نے کوئی ایسا کھانا تیار کرنے والا نہیں دیکھا جو حضرت صفیہ کی طرح کھانا تیار کرتا ہو۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کھانا تیار کیا پھر آپ کی خدمت میں بھیجا۔ شدت غیرت کی وجہ سے مجھ پر کپکپی طاری ہوگئی میں نے برتن توڑ دیا۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! اس کا کیا کفارہ ہے جو میں نے کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا برتن کی مثل برتن(3)، کھانے کی مثل کھانا۔ امام مالک اور ان کے اصحاب نے فرمایا: جس شخص پر حیوان یا سامان ہو جن کا نہ کیل کیا جاتا ہو نہ وزن کیا جاتا ہو اس کی قیمت ہوگی، مثل نہیں ہوگی ... اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو غلام کے نصف کی قیمت اپنے شریک کو دینے کو کہا جس نے غلام کا نصف آزاد کر دیا۔ آپ نے اس غلام کے نصف کی مثل کی ضمانت کا حکم نہ دیا۔ اور علماء کے درمیان کھانے، پینے والی چیزوں اور وزنی چیزوں میں مثل کی ضمانت دینے پر کوئی اختلاف نہیں کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

1۔ سنن ابی داؤد، باب فیمن افسد شیئا یغرم مثلہ، صفحہ 146، جلد 2 (وزارت تعلیم)
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً

نے فرمایا: طعام کے بدلے طعام ہے۔

مسئلہ نمبر 7: علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں کہ یہ آیت قصاص میں برابری میں اصل ہے جس نے کسی کو جس چیز سے قتل کیا ہوگا اسے اس چیز کے ساتھ قتل کیا جائے گا۔ یہ جمہور کا قول ہے جب تک کہ اس نے کسی برائی سے قتل نہ کیا ہو۔ جیسے لواطت سے قتل کیا ہو یا شراب پلا کر قتل کیا ہو تو اسے تلوار کے ساتھ قتل کیا جائے گا۔ شوافع کے دو قول ہیں: اسے اس کے ساتھ قتل کیا جائے گا۔ اس صفت پر ایک لکڑی بنائی جائے گی اور وہ اس کی دبر میں ماری جائے گی حتیٰ کہ وہ بھی مر جائے اور اسے شراب کی جگہ پانی پلایا جائے گا حتیٰ کہ وہ مر جائے۔ ابن ماجشون نے کہا: جس نے آگ یا زہر سے قتل کیا تو اس کے ساتھ قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے سوا آگ کے ساتھ کوئی عذاب نہ دے (1)۔ اور زہر پوشیدہ آگ ہے۔ جمہور علماء کا خیال ہے: وہ اس کے ساتھ قتل کیا جائے گا کیونکہ آیت میں عموم ہے۔

مسئلہ نمبر 8: لاٹھی کے ساتھ قصاص لینا: امام مالک کی ایک روایت میں ہے کہ اگر لاٹھی سے قتل کرنے میں زیادہ وقت لگتا ہو اور عذاب ہوتا ہو تو تلوار کے ساتھ قتل کیا جائے گا۔ یہ ابن وہب نے مالک سے روایت کیا ہے اور ابن قاسم کا بھی یہی قول ہے۔ اور امام مالک سے دوسری روایت یہ ہے کہ اسے لاٹھی کے ساتھ قتل کیا جائے گا اگرچہ اس میں تطویل و تعذیب بھی ہو۔ یہی امام شافعی کا قول ہے۔ اشہب اور ابن نافع نے مالک سے پتھر اور لاٹھی سے قتل کرنے والے کے متعلق روایت کیا ہے کہ ان دونوں کے ساتھ قاتل کو قتل کیا جائے گا۔ جب ایک ضرب سے اس کا کام تمام ہو جائے اور اگر بہت سی ضربوں کی ضرورت ہو تو پھر نہیں۔ پتھر اور تیر نہیں مارے جائیں گے کیونکہ اس میں تعذیب ہے۔ یہ عبدالملک کا قول ہے۔ ابن عربی نے کہا: علماء کے اقوال میں سے صحیح یہ ہے کہ مماثلت (برابری) واجب ہے، مگر یہ کہ تعذیب ہوتی ہو تو پھر تلوار سے قتل کیا جائے گا۔ اور ہمارے علماء کا اتفاق ہے کہ جب کسی نے کسی کا ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیا اور اس کی آنکھ پھوڑ دی اور اس نے اسے عذاب دینے کا قصد کیا تھا تو اس کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا جائے گا۔ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المال کے اونٹوں کے چرواہے کے قاتلوں کے ساتھ کیا تھا۔ اگر وہ مدافعت یا لڑائی میں تھا اور قتل کر دیا تو تلوار سے قتل کیا جائے گا۔ ایک جماعت کا قول اس کے خلاف ہے۔ وہ فرماتے ہیں: قصاص صرف تلوار سے لیا جائے گا (2)۔ یہ امام ابوحنیفہ، شعبی اور نخعی کا قول ہے۔ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے حجت پکڑی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قصاص نہیں ہے (3) مگر لوہے کے ساتھ اور مثلہ سے نہی کی گئی ہے۔ نیز فرمایا: آگ کے ساتھ صرف آگ کا رب ہی عذاب دے گا (4)۔

صحیح مذہب جمہور کا ہے کیونکہ ائمہ نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ ایک لونڈی کا سر دو پتھروں میں رکھ کر کچلا گیا ہے۔ انہوں نے اس سے پوچھا: تیرے ساتھ یہ کس نے کیا تھا، کیا فلاں نے کیا فلاں نے؟ حتیٰ کہ جب انہوں نے یہودی کا ذکر کیا تو اس نے سر سے (ہاں) میں اشارہ کیا۔ وہ یہودی پکڑا گیا تو اس نے اقرار کر لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس یہودی کا سر دو پتھروں

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی کراہیۃ حرق العدو بالنار، صفحہ 6، جلد 2 (وزارت تعلیم)

2۔ احکام القرآن، صفحہ 14-113، جلد 1 (دارالفکر)

3۔ سنن ابن ماجہ، باب لا قود الا بالسیف، صفحہ 195 (وزارت تعلیم)

4۔ سنن ابی داؤد، کراہیۃ حرق العدو بالنار، صفحہ 6، جلد 2 (وزارت تعلیم)

کے درمیان کچلنے کا حکم دیا۔ ایک روایت میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دو پتھروں کے درمیان قتل کیا (1)۔ یہ صریح صحیح نص ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ (النحل: 126) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ۔ اور انہوں نے حدیث جابر سے جو استدلال کیا ہے وہ حدیث محدثین کے نزدیک ضعیف ہے وہ صحیح طریق سے مروی نہیں ہے۔ اگر صحیح ہوتی تو ہم اس کے مطابق قول کرتے۔ جب لوہے کے ساتھ قتل کرے گا تو اسے لوہے کے ساتھ قتل کیا جائے گا اس پر حضرت انس کی حدیث دلالت کرتی ہے۔ ایک یہودی نے ایک بچی کا سر دو پتھروں کے درمیان کچل دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا سر دو پتھروں کے درمیان کچلنے کا حکم دیا (2)۔ رہی مثلہ کرنے سے نہی تو بھی یہی کہتے ہیں کہ جب اس قاتل نے مثلہ نہ کیا ہو تو اس کا مثلہ نہیں کیا جائے گا۔ جب وہ مثلہ کرے گا تو ہم بھی اس کا مثلہ کریں گے۔ اس پر عرنیین کی حدیث دلالت کرتی ہے۔ یہ حدیث صحیح ہے اسے ائمہ نے نقل کیا ہے۔ اور رہا یہ ارشاد کہ آگ کے ساتھ صرف آگ کا مالک عذاب دے گا۔ صحیح ہے جب اس نے نہ جلایا ہو اگر اس نے جلایا ہو گا تو اسے جلایا جائے گا۔ اس پر قرآن کا عموم دلالت کرتا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: اگر قاتل نے جان بوجھ کر مقتول کو آگ میں ڈالا ہو گا تو اسے بھی آگ میں ڈالا جائے گا حتیٰ کہ وہ مر جائے۔ وقار نے اپنی مختصر میں مالک سے یہ روایت کیا ہے۔ یہی محمد بن عبد الحکیم کا قول ہے۔ ابن منذر نے کہا: بہت سے اہل علم کا قول، اس شخص کے بارے میں جو کسی کا گلہ دبا دیتا ہے یہ ہے کہ اس پر قصاص ہو گا۔ امام محمد بن حسن نے اس میں مخالفت کی ہے۔ انہوں نے کہا: اگر اس نے گلا دبایا اور آدمی مر گیا یا اسے کنویں میں پھینکا اور وہ مر گیا یا اس نے اسے پہاڑ سے گرایا یا کسی بلند جگہ سے گرایا اور وہ مر گیا تو اس پر قصاص نہ ہو گا اور اس کے عاقلہ (خاندان) پر دیت ہو گی۔ اگر وہ شخص اس جرم میں معروف ہو اس نے کئی شخصوں کا گلا دبایا ہو تو اس پر قتل ہے۔ ابن منذر نے کہا: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس یہودی سے قصاص لیا جس نے بچی کا سر پتھروں سے کچلا تھا تو یہ بھی اس کے مفہوم میں ہے۔ پس امام محمد بن حسن کے قول کا کوئی معنی نہیں۔

میں کہتا ہوں: یہی قول امام ابوحنیفہ سے حکایت کیا گیا ہے، نقل کرنے والے نے کہا: امام ابوحنیفہ کا قول منفرد ہے۔ انہوں نے اس شخص کے بارے میں کہا جس نے گلا دبا کر قتل کیا ہو یا زہر دے کر قتل کیا ہو یا پہاڑ سے گرایا ہو یا کنویں میں گرایا ہو یا لکڑی کے ساتھ مارا ہو اسے قتل نہیں کیا جائے گا اور نہ اس سے قصاص لیا جائے گا مگر جس نے اس کو تیز دھار آلہ کے ساتھ یا پتھر کے ساتھ یا لکڑی کے ساتھ قتل کیا ہو وہ گلا دبانے میں معروف ہو یا پہاڑ سے گرانے میں معروف ہو تو اس کے عاقلہ پر دیت ہو گی۔ یہ ان کی طرف سے کتاب و سنت کو چھوڑنا ہے اور امت کا معاملہ جس پر قائم تھا اس میں بدعت نکالنا ہے اور یہ قصاص کو دور کرنے کا ذریعہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے نفوس کے لئے مشروع کیا ہے۔ اس سے بھاگنا ممکن نہیں۔

مسئلہ نمبر 9: اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جس نے کسی کو روکا اور دوسرے نے اسے قتل کر دیا۔ عطا نے کہا: قاتل کو قتل کیا جائے گا اور روکنے والے کو قید کیا جائے گا حتیٰ کہ وہ مر جائے۔ امام مالک نے کہا: اگر اس نے اسے روکا اور

1۔ صحیح مسلم، باب القسامۃ، صفحہ 58، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ احکام القرآن، صفحہ 115، جلد 1 (دار الفکر) صحیح بخاری، کتاب الخصومات باب ما یذکر فی الاشخاص والخصومۃ، حدیث 2236، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وہ بھی اسے قتل کرنا چاہتا تھا تو دونوں کو قتل کیا جائے گا۔ امام شافعی، ابو ثور، نعمان کے قول میں روکنے والے کو سزا دی جائے گی۔ ابن منذر نے اس کو اختیار کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: عطا کا قول صحیح ہے یہ نزول قرآن کا مقتضا ہے۔ دار قطنی نے حضرت ابن عمر سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: جب کوئی کسی شخص کو روک لے اور دوسرا اسے قتل کر دے تو قاتل کو قتل کیا جائے گا اور جو روکنے والا ہو گا اسے قید کیا جائے گا (1)۔ اس حدیث کو سفیان ثوری نے اسماعیل بن امیہ سے انہوں نے نافع سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے۔ اس حدیث کو معمر اور ابن جریج نے اسماعیل سے مرسلاً روایت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 10: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنِ اعْتَدٰی، الاعتداء کا معنی حد سے تجاوز کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ومن یتعدّ حدود اللہ (جو اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا۔) پس جس نے تجھ پر ظلم کیا تو اپنے ظلم کی مقدار اس سے اپنا حق وصول کر لے اور جس نے تمہیں گالی دی تو اس کو اس کی مثل قول لوٹا دے۔ جس نے تیری عزت کو تار تار کیا تو بھی اس کی عزت کے ساتھ ایسا کر۔ تو اس کے والدین تک تجاوز نہ کر نہ اس کے بیٹے اور اس کے قریبی تک تجاوز کر اور تیرے لئے اس پر جھوٹ بولنا جائز نہیں اگرچہ اس نے تجھ پر جھوٹ بولا ہے کیونکہ معصیت کا مقابلہ معصیت کے ساتھ نہیں کیا جاتا۔ اگر مثلاً اس نے تجھے کہا: اے کافر! تو بھی اسے کہہ سکتا ہے: تو کافر۔ اگر اس نے تجھے کہا: اے زانی! تو تیرا قصاص اسے یہ کہنا ہے: اے جھوٹا! جھوٹ کی گواہی دینے والا۔ اگر تو اسے اے زانی! کہے گا تو تو جھوٹا ہو گا اور جھوٹ میں تو گنہگار ہو گا۔ اگر وہ قرضہ وغیرہ کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرتا ہے حالانکہ وہ غنی ہے کوئی عذر بھی نہیں ہے تو تو اسے کہہ: اے ظالم! اے لوگوں کا مال کھانے والا! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: غنی کا ٹال مٹول کرنا اس کی عزت اور اس کی سزا کو حلال کر دیتا ہے (2)۔ عرض سے مراد وہی ہے جو ہم نے تفسیر بیان کی ہے اور عقوبت سے مراد قید خانہ ہے جس میں اسے قید کیا جائے گا۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ اسلام کے قوی ہونے سے پہلے نازل ہوا تھا۔ مسلمانوں میں سے جس کو اذیت دی جاتی تھی اسے اپنی ذات کے برابر اذیت دینے کا حکم تھا یا وہ صبر کرے یا معاف کر دے پھر اس کو اس قول کے ساتھ منسوخ کر دیا (3) وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِیْنَ كَآفَّةً (التوبہ: 36) بعض علماء نے فرمایا اس کو سلطان کی طرف لوٹانے کے ساتھ منسوخ کیا اور کسی کے لئے سلطان کی اجازت کے بغیر کسی سے قصاص لینا جائز نہیں۔

وَ اَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛۚ وَ اَحْسِنُوْا ۛۚ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۹۵﴾

''اور خرچ کیا کرو اللہ کی راہ میں اور نہ پھینکو اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی میں اور اچھے کام کیا کرو۔ بے شک اللہ

1۔ سنن دار قطنی، کتاب الحدود والدیات، حدیث 176، صفحہ 140، جلد 3 (دار المحاسن)

2۔ صحیح بخاری، کتاب الاستقراض، صفحہ 323، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 264، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

تعالیٰ محبت فرماتا ہے اچھے کام کرنے والوں سے"۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: بخاری نے حذیفہ سے روایت کیا ہے: وَ اَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ۔ کا ارشاد خرچ کے بارے میں نازل ہوا (1)۔ یزید بن ابی حبیب نے اسلم ابو عمران سے روایت کیا ہے، فرمایا: ہم نے قسطنطنیہ کی جنگ لڑی اور مسلمانوں کی جماعت کے جرنیل عبدالرحمن بن ولید تھے اور رومیوں نے اپنی پیٹھیں شہر کی دیوار سے لگائی ہوئی تھیں۔ ایک شخص نے دشمن پر حملہ کیا تو لوگوں نے کہا: رک جا رک جا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، یہ خود کو ہلاکت میں ڈال رہا ہے۔ حضرت ابو ایوب انصاری نے کہا: سبحان اللہ۔ یہ آیت انصار کے بارے میں نازل ہوئی تھی جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کی مدد فرمائی تھی اور دین کو غالب کیا تھا تو ہم نے کہا: آؤ اب ہم اپنے اموال کی دیکھ بھال کریں اور ان کی اصلاح کریں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ اَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے اموال کی طرف متوجہ ہوں ان کی اصلاح کریں اور جہاد کو چھوڑ دیں۔ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ اللہ کے راستہ میں ہمیشہ جہاد کرتے رہے حتیٰ کہ قسطنطنیہ میں دفن ہوئے ان کی قبر مبارک بھی وہاں ہے۔ حضرت ابو ایوب نے کہا: القاء بالید او التہلکۃ کا مطلب اللہ کے راستہ میں جہاد کو ترک کرنا ہے۔ آیت اس کے متعلق نازل ہوئی۔ اس کی مثل حضرات حذیفہ، حسن، قتادہ، مجاہد اور ضحاک سے مروی ہے۔

میں کہتا ہوں: ترمذی نے یزید بن ابی حبیب سے انہوں نے اسلم ابو عمران سے یہ خبر اس کے ہم معنی روایت کی ہے۔ فرمایا: ہم روم کے شہر میں تھے، رومیوں نے ہماری طرف ایک بڑا لشکر نکالا مسلمانوں میں سے ان کے مقابلہ میں اتنے ہی لوگ نکلے یا ان سے بھی زیادہ تھے۔ اور اہل مصر پر عقبہ بن عامر امیر تھے اور جماعت پر فضالہ بن عبید۔ مسلمانوں میں سے ایک شخص نے رومیوں کے لشکر پر حملہ کر دیا حتیٰ کہ وہ ان کے اندر داخل ہو گیا۔ لوگ چیخے اور کہا: سبحان اللہ۔ اس نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالا ہے۔ حضرت ابو ایوب انصاری کھڑے ہوئے اور کہا: اے لوگو! تم اس آیت کی یہ تاویل کر رہے ہو، یہ آیت تو ہم انصار کے گروہ کے بارے نازل ہوئی تھی۔ جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت بخشی اور اس کے مددگار زیادہ ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ کو بتائے بغیر ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ کہنے لگے ہمارے مال ضائع ہو گئے ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت بخشی ہے اور اس کے مددگار زیادہ ہو گئے ہیں۔ اگر اب ہم اپنے اموال کی دیکھ بھال کریں اور جو ضائع ہو چکا ہے اس کی اصلاح کریں تو بہتر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ پر ہماری بات کا رد نازل فرمایا۔ وَ اَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ۔ آیت میں التَّهْلُكَةِ سے مراد اموال کی دیکھ بھال کرنا اور ان کی اصلاح کرنا اور جہاد کو ترک کرنا ہے۔ حضرت ابو ایوب اللہ کے راستہ میں لڑتے رہے حتیٰ کہ روم کی زمین میں دفن ہوئے (2)۔ ابو عیسیٰ نے

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، صفحہ 648، جلد 2 (وزارت تعلیم)

2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ بقرہ، صفحہ 121، جلد 1 (وزارت تعلیم) ایضاً حدیث نمبر 2898، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کہا: یہ حدیث حسن غریب ہے۔ حضرت حذیفہ بن یمان، حضرت ابن عباس، عکرمہ، عطاء، مجاہد اور جمہور لوگوں کا قول ہے کہ اس آیت کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کو ترک کر دینا اور اہل وعیال کا خوف کرنا۔ ایک شخص کہتا: میرے پاس تو کوئی ایسی چیز ہی نہیں ہے (1) جسے میں خرچ کروں۔ اس معنی کی طرف امام بخاری گئے ہیں جبکہ کسی دوسرے نے ذکر نہیں کیا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: تم اللہ کے راستہ میں خرچ کرو اگرچہ تمہارے پاس تیر وغیرہ نہ بھی ہو، تم میں سے کوئی یہ نہ کہے: میں تو کوئی چیز نہیں پاتا (2)۔ سدی سے اسی طرح مروی ہے تم خرچ کرو اگرچہ رسی ہی ہو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ اور تم کہو کہ میرے پاس تو کچھ نہیں ہے (3)۔ تیسرا قول حضرت ابن عباس کا ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب لوگوں کو جہاد کی طرف نکلنے کا حکم دیا تو مدینہ طیبہ کے کچھ بدو لوگ ٹھہر گئے۔ انہوں نے کہا: ہم کیا تیاری کریں؟ اللہ کی قسم! ہمارے پاس تو نہ زادراہ ہے اور نہ ہمیں کوئی کھلائے گا تو یہ ارشاد نازل ہوا: وَ اَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ یعنی اے خوشحال لوگو! اللہ کے راستہ میں یعنی اللہ کی طاعت میں خرچ کرو۔ وَ لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ یعنی اپنے ہاتھوں کو صدقہ سے نہ روکو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔

اسی طرح مقاتل نے کہا: حضرت ابن عباس کے قول کا معنی یہ ہے کہ صدقہ سے نہ رکو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے یعنی کمزور لوگوں پر خرچ کرنے سے نہ رکو۔ کیونکہ جب وہ تم سے پیچھے رہ جائیں گے تو دشمن تم پر غالب آجائے گا اور تم ہلاک ہو جاؤ گے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ حضرت براء بن عازب سے اس آیت کے متعلق پوچھا گیا کیا اس سے مراد وہ شخص ہے جو لشکر پر تنہا حملہ کرتا ہے؟ حضرت براء نے کہا: نہیں بلکہ ایک شخص گناہ کرتا تھا پھر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتا تھا۔ وہ کہتا تھا: میں گناہوں میں حد کو پہنچ چکا ہوں توبہ کا کوئی فائدہ نہیں وہ اللہ کی رحمت سے مایوس ہو جاتا تھا اور اس کے بعد وہ گناہوں میں مستغرق ہو جاتا تھا۔ یہاں ہلاکت سے مراد اللہ تعالیٰ سے مایوس ہونا ہے۔ یہ عبیدہ سلمانی کا قول ہے۔ حضرت زید بن اسلم نے کہا: اس کا معنی ہے جہاد میں بغیر زادراہ کے سفر نہ کرو۔ کچھ لوگوں نے ایسا کیا تھا تو اس عمل نے انہیں راستہ میں ہی کاٹ دیا تھا یا وہ لوگوں پر بوجھ بن گئے تھے (4)۔ یہ پانچ اقوال ہیں:

سَبِیْلِ اللّٰهِ سے یہاں جہاد مراد ہے اور لفظ تمام راستوں کو شامل ہے۔ بِاَیْدِیْكُمْ میں با زائدہ ہے۔ تقدیر عبارت تلقوا ایدیکم ہے۔ اس کی مثال الم یعلم بان اللہ یری اس میں با زائدہ ہے۔ مبرد نے کہا: بِاَیْدِیْكُمْ سے مراد نفوس ہیں۔ بعض سے کل مراد لیا ہے۔ جیسے ارشاد ہے: فَبِمَا كَسَبَتْ اَیْدِیْكُمْ (الشوریٰ: 30) بِمَا قَدَّمَتْ یَدٰكَ (الحج: 10) ان آیات میں ایدی اور ید سے مراد پوری ذات ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: یہ ضرب المثل ہے تو کہتا ہے: فلان القی بیدہ فی امر کذا۔ جب کوئی امر کو تسلیم کرے۔ قتال میں شکست تسلیم کرنے والا اپنے ہتھیار اپنے ہاتھ سے پھینک دیتا ہے۔ اسی طرح ہر عاجز کرتا ہے خواہ وہ کسی فعل میں عاجز ہو۔ اسی سے عبدالمطلب کا قول ہے: واللہ ان القاءنا بایدینا للموت لعجز۔ اللہ کی قسم! موت کے لئے ہمارا اپنے آپ کو ڈال دینا عجز ہے۔ بعض علماء نے کہا: تقدیر عبارت اس طرح ہے: لا تلقوا انفسکم بایدیکم۔ جیسے تو کہتا ہے: لا تفسد حالک برایک۔ اپنے حال کو اپنی رائے کے ساتھ خراب نہ کر۔ التھلکۃ لام کے ضمہ کے ساتھ۔ یہ

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 265، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
2۔ تفسیر طبری، صفحہ 242، جلد 2 (دار احیاء التراث العربیہ)
3۔ معالم التنزیل، صفحہ 238، جلد 1 (دار الفکر)
4۔ المحرر الوجیز، صفحہ 265، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

هلك يهلك هلاكاً و هلكاً و تهلكة کا مصدر ہے۔ یعنی اس عمل میں نہ پڑو جو تمہیں ہلاک کردے (1)۔ یہ زجاج وغیرہ کا قول ہے یعنی اگر تم خرچ نہیں کرو گے تو تم اللہ کی نافرمانی کرو گے اور تم ہلاک ہو جاؤ گے۔

بعض علماء نے فرمایا: آیت کا معنی ہے اپنے اموال کو نہ روکو کہ تم سے تمہارے علاوہ اس کے وارث بنیں ورنہ تم اپنے اموال کی منفعت سے محرومی کے ساتھ ہلاک ہو جاؤ گے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ خرچ سے باز نہ آؤ ورنہ دنیا میں نعم البدل اور آخرت میں ثواب چلا جائے گا۔ کہا جاتا ہے لَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ یعنی حرام مال سے خرچ نہ کرو، وہ تم پر لوٹا دیا جائے گا اور تم ہلاک ہو جاؤ گے۔ اسی طرح حضرت عکرمہ سے مروی ہے، فرمایا: وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ۔ فرمایا و لا تیمموا الخبیث منہ تنفقون، اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو (یعنی) اس سے خبیث مال خرچ کرنے کا ارادہ نہ کرو۔ طبری نے کہا: وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ عام ہے، ہر صورت جو ذکر کی گئی ہے اس کو شامل ہے کیونکہ لفظ اس کا احتمال رکھتا ہے۔

مسئلہ نمبر 2: علماء کا اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جو جنگ میں گھس جاتا ہے اور اکیلا دشمن پر حملہ کر دیتا ہے، قاسم بن مخیمرہ، قاسم بن محمد اور عبد الملک (جو ہمارے علماء سے ہیں) نے فرمایا: تنہا ایک شخص کا بڑے لشکر پر حملہ کرنے میں کوئی حرج نہیں جبکہ اس میں طاقت ہو اور نیت خالص اللہ کے لئے ہو، اگر قوت نہ ہو تو یہ تہلکۃ (ہلاکت) سے ہوگا۔ بعض علماء نے فرمایا: جب اسے شہادت مطلوب ہو اور نیت خالص ہو تو اسے حملہ کرنا چاہئے کیونکہ ان میں سے ہر ایک کا یہی مقصود ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس بیان میں فرمایا: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ (البقرہ: 207)

(لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو بیچ ڈالتا ہے اپنی جان (عزیز) بھی اللہ کی خوشنودیاں حاصل کرنے کے لئے (2))

ابن خویز منداد نے کہا: جو تنہا سو آدمیوں پر یا ایک لشکر پر یا چوروں کے گروہ پر یا محاربین پر یا خوارج پر حملہ کرتا ہے اس کی دو حالتیں ہیں: اگر اسے غالب گمان ہے کہ جس پر وہ حملہ کرے گا اسے قتل کر دے گا اور خود نجات پائے گا تو یہ بہتر ہے اسی طرح اگر اسے غالب گمان ہو کہ وہ شہید ہو جائے گا لیکن وہ دشمن کو سخت نقصان پہنچائے گا یا وہ انہیں آزمائش میں ڈال دے گا یا وہ کوئی ایسا اثر چھوڑے گا جس سے مسلمان نفع پائیں گے تو یہ بھی جائز ہے۔ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ مسلمانوں کے لشکر کا جب ایرانیوں سے مقابلہ ہوا تو مسلمانوں کے گھوڑے ایرانیوں کے ہاتھیوں سے ڈر گئے۔ تو مسلمانوں میں سے ایک شخص نے مٹی کا ایک ہاتھی بنایا اور اس نے اپنے گھوڑے کو مانوس کیا حتیٰ کہ وہ اس سے مانوس ہو گیا۔ جب صبح ہوئی تو اس کا گھوڑا ہاتھی سے نہ بھاگا، اس نے اس ہاتھی پر حملہ کر دیا جو آگے آگے تھا۔ اس کو کہا گیا: یہ تجھے قتل کر دے گا، اس مسلمان نے کہا: میرا قتل ہونا کوئی نقصان نہیں جبکہ مسلمانوں کو فتح مل جائے۔ اسی طرح جنگ یمامہ میں ہوا۔ جب بنو حنیفہ ایک باغ میں محفوظ ہو گئے تو مسلمانوں میں سے ایک شخص نے کہا: تم مجھے چمڑے کی ڈھال میں رکھو اور مجھے دشمنوں کے پاس پھینکو۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اس نے تنہا ان سے جہاد کیا اور ان کے قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔

میں کہتا ہوں: اسی قسم سے ہے جو روایت کیا گیا ہے کہ ایک آدمی نے نبی کریم ﷺ سے عرض کی: آپ کی کیا رائے ہے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 65-264، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)　2۔ احکام القرآن، صفحہ 116، جلد 1 (دار الفکر)

کہ اگر میں صبر کرتے ہوئے اور ثواب کی امید رکھتے ہوئے اللہ کے راستہ میں شہید ہو جاؤں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیرے لئے جنت ہے۔ وہ دشمن کی صفوں میں گھس گیا حتیٰ کہ شہید ہو گیا۔ صحیح مسلم میں حضرت انس بن مالک سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنگ احد میں سات انصاریوں اور دو قریش میں تنہا تھے۔ جب دشمن قریب آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جوان کو ہم سے دور کرے گا اس کے لئے جنت ہے یا فرمایا: وہ جنت میں میرا ساتھی ہوگا۔ ایک انصاری آگے بڑھا اس نے جہاد کیا حتیٰ کہ وہ شہید ہو گیا پھر دشمن قریب آئے تو فرمایا: جوان کو ہم سے دور کرے گا اس کے لئے جنت ہے یا فرمایا: وہ جنت میں میرا ساتھی ہے پھر ایک انصاری آگے بڑھا جہاد کیا حتیٰ کہ وہ شہید ہو گیا۔ آپ اسی طرح فرماتے رہے حتیٰ ساتوں آدمی شہید ہو گئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما انصفنا اصحابنا(1) (ہم نے اپنے ساتھیوں کی قتال پر رہنمائی نہیں کی حتیٰ کہ وہ شہید ہو گئے) (انصَفْنَا اصحابنا) میں ایک روایت فا کے سکون اور اصحابنا با کے فتحہ کے ساتھ ہے اور دوسری روایت میں فا کے فتحہ اور با کے رفع کے ساتھ ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ روایت لوٹ جائے گی اس کی طرف جو آپ کے ساتھیوں میں سے بھاگ گیا تھا۔ محمد بن حسن نے کہا: اگر ایک مسلمان شخص ہزار مشرکوں پر حملہ کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں جبکہ اسے نجات کی غالب امید ہو یا دشمن کو قتل کرنے کی امید ہو۔ اگر ایسی صورت نہ ہو تو یہ عمل مکروہ ہے کیونکہ اس نے اپنے آپ کو ضائع کرنے کے لئے پیش کیا جبکہ اس میں مسلمانوں کا کوئی نفع نہیں ہے اور اگر اس کا مقصد مسلمانوں کو کفار پر جرأت دلانا ہے تاکہ وہ بھی اس کی طرح عمل کریں تو اس کا جواز بعید نہیں کیونکہ اس میں بعض وجوہ کے اعتبار سے مسلمانوں کا فائدہ ہے۔ اگر اس کا قصد دشمن کو ڈرانا ہے تاکہ وہ مسلمانوں کے دین میں صلابت کو جان لیں۔ پس اس کا جواز بھی بعید نہیں ہے اور جب اس میں مسلمانوں کا نفع ہو اور وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے دین کے اعزاز کے لئے اور کفر کی توہین کے لئے اپنی جان دیتا ہے تو یہ وہ مقام ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے مومنین کی مدح کی ہے۔ فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ الآیۃ (توبہ: 111) یہ آیت اور دوسری آیات جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی جان قربان کرنے والوں کی مدح فرمائی ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی اسی بنیاد پر ہونا چاہئے جب اسے دین کے نفع کی امید ہو وہ اس میں جان دے دے حتیٰ کہ وہ شہید کر دیا جائے تو وہ شہداء کے اعلیٰ درجات میں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَاۤ اَصَابَكَ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ (لقمان) (حکم دو نیکی کا اور منع کرو برائی سے اور صبر کیا کرو ہر مصیبت پر جو تمہیں پہنچے یہ بڑی ہمت کے کام ہیں)۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا: شہداء میں سے افضل حمزہ بن عبدالمطلب ہے اور وہ شخص ہے جس نے ظالم بادشاہ کے سامنے کلمہ حق ادا کیا اور اس نے اسے شہید کر دیا(2)۔ مزید تفصیل ان شاء اللہ سورۂ آل عمران میں آئے گی۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، صفحہ 107، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الملاحم، باب الامر والنہی، صفحہ 247، جلد 2 (وزارت تعلیم)

سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، الامر بالمعروف، صفحہ 299 (وزارت تعلیم)

مسئلہ نمبر3: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَحۡسِنُوۡا طاعت میں خرچ کرنے میں اور اللہ تعالیٰ کے متعلق بہتر بدل عطا کرنے میں اچھا گمان کرو بعض علماء نے فرمایا: طاعات کی پیروی کرنے کے ساتھ اپنے اعمال میں اچھائی کرو یہ مفہوم بعض صحابہ سے مروی ہے۔

وَ اَتِمُّوا الۡحَجَّ وَ الۡعُمۡرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنۡ اُحۡصِرۡتُمۡ فَمَا اسۡتَيۡسَرَ مِنَ الۡهَدۡىِ ۚ وَ لَا تَحۡلِقُوۡا رُءُوۡسَكُمۡ حَتّٰى يَبۡلُغَ الۡهَدۡىُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنۡ كَانَ مِنۡكُمۡ مَّرِيۡضًا اَوۡ بِهٖۤ اَذًى مِّنۡ رَّاۡسِهٖ فَفِدۡيَةٌ مِّنۡ صِيَامٍ اَوۡ صَدَقَةٍ اَوۡ نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ اَمِنۡتُمۡ فَمَنۡ تَمَتَّعَ بِالۡعُمۡرَةِ اِلَى الۡحَجِّ فَمَا اسۡتَيۡسَرَ مِنَ الۡهَدۡىِ ۚ فَمَنۡ لَّمۡ يَجِدۡ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الۡحَجِّ وَسَبۡعَةٍ اِذَا رَجَعۡتُمۡ ؕ تِلۡكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنۡ لَّمۡ يَكُنۡ اَهۡلُهٗ حَاضِرِى الۡمَسۡجِدِ الۡحَـرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾

''اور پورا کرو حج اور عمرہ اللہ (کی رضا) کے لئے۔ پھر اگر تم گھر جاؤ تو قربانی کا جانور جو آسانی سے مل جائے (وہ بھیج دو) اور نہ منڈاؤ اپنے سر یہاں تک کہ پہنچ جائے قربانی کا جانور اپنے ٹھکانے پر۔ پس جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا اسے کچھ تکلیف ہو سر میں (اور وہ سر منڈالے) تو وہ فدیہ دے دے روزوں سے یا خیرات سے یا قربانی سے اور جب تم امن میں ہو جاؤ (اور حج سے پہلے مکہ پہنچ جاؤ) تو جو فائدہ اٹھانا چاہے عمرہ کا حج کے ساتھ تو جو اسے میسر ہو قربانی دے پھر جسے قربانی کی طاقت نہ ہو تو وہ تین دن روزے رکھے حج کے وقت اور سات جب تم گھر لوٹ آؤ۔ یہ پورے دس (روزے) ہوئے۔ یہ رعایت اس کے لئے ہے جس کے گھر والے مسجد حرام کے قریب نہ ہوں اور ڈرا کرو اللہ سے اور جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَتِمُّوا الۡحَجَّ وَ الۡعُمۡرَةَ لِلّٰهِ

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر1: علماء کا حج و عمرہ اللہ کے لئے مکمل کرنے کے مرادی معنی میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا: حج و عمرہ کا اللہ کی رضا کے لئے ادا کرنا ہے، جیسے ارشاد ہے: فَاَتَمَّهُنَّ (انہیں ادا کیا) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيۡلِ (البقرہ: 187) پھر تم رات تک روزہ رکھو، یہ مفہوم ان علماء کے نزدیک ہے جنہوں نے عمرہ کو واجب کیا ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔ اور جنہوں نے عمرہ کو واجب نہیں کیا انہوں نے فرمایا: حج اور عمرہ شروع کرنے کے بعد انہیں مکمل کرنا مراد ہے جس نے عبادت (حج یا عمرہ) کا احرام باندھا اس پر اس کو مکمل کرنا واجب ہے وہ اسے فسخ نہ کرے۔ شعبی اور ابن زید نے یہی مفہوم بیان کیا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، حج و عمرہ کا اتمام یہ ہے کہ تم اپنے اہل کے گھر سے دونوں کا احرام باندھو۔ حضرت عمر بن خطاب اور حضرت سعد بن ابی وقاص سے یہی مروی ہے۔ حضرت عمران بن حصین نے یہی کہا ہے۔

سفیان ثوری نے کہا: حج و عمرہ کا اتمام یہ ہے کہ تو ان کا قصد کر کے نکلے، تجارت یا کوئی غرض نہ ہو۔ اس قول کو لِلّٰہِ کا قول تقویت دیتا ہے (1)۔ حضرت عمر نے کہا: ان کا اتمام یہ ہے کہ ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ کیا جائے۔ تمتع اور قران نہ کیا جائے۔ یہ ابن حبیب کا قول ہے۔ مقاتل نے کہا: اس کا اتمام یہ ہے کہ اس میں تم وہ عمل نہ کرو جو تمہارے لئے مناسب نہیں ہیں۔ یہ اس لئے فرمایا کیونکہ وہ احرام میں شرک کرتے تھے وہ تلبیہ اس طرح کہتے تھے: لبیك اللھم لبیك لا شریك لك اِلاّ شریکاً ھو لك تملکه و ما ملك (اے اللہ! میں حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں مگر وہ شرک بھی تیرے لئے ہے تو اس کا بھی مالک ہے اور جس کا وہ مالک ہے اس کا بھی مالک ہے) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: حج و عمرہ کو مکمل کرو اور ان کے ساتھ کسی اور شے کو نہ ملاؤ۔

میں کہتا ہوں: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جو مروی ہے اور جو حضرت عمران بن حصین نے احرام میں ان مواقیت سے پہلے کیا جن کو رسول اللہ نے مقرر فرمایا ہے اس کے مطابق حضرت عبداللہ بن مسعود اور متقدمین کی ایک جماعت نے کہا ہے اور ثابت ہے کہ حضرت عمر نے ایلیاء سے احرام باندھا تھا۔ حضرات اسود، علقمہ، عبدالرحمن اور ابو اسحق نے اپنے گھروں سے احرام باندھا تھا۔ امام شافعی نے اس میں رخصت دی ہے۔ ابو داؤد، دار قطنی نے حضرت ام سلمہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے بیت المقدس سے حج یا عمرہ کا احرام باندھا وہ گناہوں سے اس طرح پاک ہو گیا جس طرح وہ اس دن تھا جس دن والدہ نے اسے جنم دیا تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ اس کے پہلے اور پچھلے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے (2)۔ اس حدیث کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے، فرمایا: اللہ تعالیٰ وکیع پر رحم فرمائے انہوں نے بیت المقدس سے مکہ تک احرام باندھا تھا۔ اس میں میقات سے پہلے احرام باندھنے کی اجازت ہے۔ امام مالک نے میقات سے پہلے احرام باندھنے کو مکروہ کہا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب سے بھی یہی مروی ہے۔ انہوں نے حضرت عمران بن حصین پر انکار کیا تھا جنہوں نے بصرہ سے احرام باندھا تھا۔ حضرت عثمان نے حضرت ابن عمر پر انکار کیا تھا جبکہ انہوں نے میقات سے پہلے احرام باندھا تھا۔

امام احمد اور اسحاق نے کہا: عمل کی وجہ مواقیت ہیں۔ اس قول کی حجت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مواقیت کو متعین فرمایا اور ان کی تعیین فرمائی، پس یہ حج کے اجمال کے لئے بیان ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حج کا احرام اپنے گھر سے نہیں باندھا تھا بلکہ اس میقات سے باندھا تھا جو اپنی امت کے لئے مقرر فرمایا تھا اور جو عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا وہی افضل ہے۔ ان شاء اللہ۔ اسی طرح جمہور صحابہ اور ان کے بعد تابعین نے کہا: پہلے مقالہ والوں نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول کی وجہ سے پہلے باندھنا افضل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو چیزوں میں اختیار دیا گیا تو آپ نے آسان کو اختیار فرمایا (3)، اور حضرت ام سلمہ کی حدیث سے حجت پکڑی ہے نیز صحابہ کرام سے جو میقات سے پہلے احرام باندھنے کا ذکر کیا گیا ہے اس سے حجت پکڑی ہے حالانکہ صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے میقات سے حج کے احرام باندھنے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 265، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المناسك، من اھل بعمرۃ من بیت المقدس، صفحہ 222 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، قول النبی یسروا ولا تعسروا، صفحہ 904، جلد 2 (وزارت تعلیم)

کے وقت موجود تھے انہوں نے اس کی مراد و مقصود کو پہچانا تھا اور انہیں علم تھا کہ میقات سے احرام باندھنا امت پر آسانی کرنے کے لئے تھا۔

مسئلہ نمبر 2: ائمہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مدینہ کے لئے ذوالحلیفہ کو، اہل شام کے لئے جحفہ کو، اہل نجد کے لئے قرن کو، اہل یمن کے لئے یلملم کو میقات مقرر کیا اور یہ میقات ان لوگوں کے لئے ہیں اور جو دوسرے شہروں سے ان مواقیت پر آئے جو حج اور عمرہ کا ارادہ کرتا ہو۔ اور اس کے علاوہ علاقوں کے لوگ جہاں سے چاہیں احرام باندھ لیں حتیٰ کہ اہل مکہ، مکہ سے احرام باندھیں (1)۔ اہل علم کا اس حدیث کے ظاہر قول پر اور اس کے استعمال پر اجماع ہے اس میں سے کسی چیز پر اختلاف نہیں ہے اور اہل عراق کے میقات میں اختلاف ہے اور اس کے بارے میں اختلاف ہے جس نے اس کا میقات مقرر فرمایا۔ ابوداؤد، ترمذی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مشرق کے لئے العقیق کو میقات مقرر کیا (2)۔ ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن ہے۔ روایت ہے کہ حضرت عمر نے اہل عراق کے لئے ذات عرق کو میقات مقرر کیا۔ ابوداؤد کی کتاب میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل عراق کے لئے ذات عرق کو میقات مقرر کیا (3)۔ صحیح ہے۔ اور جنہوں نے روایت کیا کہ حضرت عمر نے عراق کے لئے میقات مقرر کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت عمر کے دور میں عراق فتح ہوا۔ یہ ان کی غفلت ہے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا میقات مقرر کیا جس طرح اہل شام کے لئے جحفہ کو مقرر کیا اور شام اس وقت دار کفر تھا جس طرح عراق اور دوسرے شہر دار کفر تھے۔ عراق اور شام حضرت عمر کے عہد میں فتح ہوئے تھے۔ اس میں سیرت نگاروں کا کوئی اختلاف نہیں۔ ابو عمر نے کہا: ہر عراقی یا مشرقی ذات عرق سے احرام باندھے گا تمام کے نزدیک وہ اپنے میقات سے احرام باندھنے والا ہوگا اور العقیق علماء کے نزدیک ذات عرق سے احوط اور اولیٰ ہے اور ذات عرق بالاجماع عراقیوں کا میقات ہے۔

مسئلہ نمبر 3: اہل علم کا اجماع ہے کہ جس نے میقات پر آنے سے پہلے احرام باندھا وہ محرم ہے اور جو علماء میقات سے احرام باندھنے کو افضل قرار دیتے ہیں وہ میقات سے پہلے احرام باندھنے سے منع کرتے ہیں تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ انسان اپنے نفس پر اس چیز میں تنگی نہ کریں جو اللہ نے اس پر وسیع فرمائی ہے اور احرام میں کوئی بدعت نہ کرے۔ لیکن تمام کے نزدیک جو میقات سے پہلے احرام باندھے گا اس پر احرام لازم ہوگا کیونکہ اس نے زیادتی کی نہ کہ کمی۔

مسئلہ نمبر 4: اس آیت میں عمرہ کے وجوب پر دلیل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اتمام کا حکم دیا ہے جس طرح حج کے اتمام کا حکم دیا ہے۔ صبی بن معبد نے کہا: میں حضرت عمر کے پاس آیا۔ میں نے کہا: میں نصرانی تھا پھر میں نے اسلام قبول کیا، میں نے حج اور عمرہ کو اپنے اوپر فرض پایا ہے۔ میں نے دونوں کا احرام باندھا ہے۔ حضرت عمر نے اسے فرمایا: تجھے اپنے

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناسک، مهل اهل مكة للحج والعمرة، صفحہ 206، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ جامع ترمذی، کتاب الحج، فی مواقیت الاحرام لاهل الآفاق، صفحہ 103، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب المناسک، فی المواقیت، صفحہ 243، جلد 1 (وزارت تعلیم)

نبی کی سنت کی ہدایت دی گئی ہے۔ ابن منذر نے کہا: حضرت عمر نے اس کے قول (میں نے اپنے اوپر حج اور عمرہ کو فرض پایا ہے) پر انکار نہ کیا۔ حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت ابن عباس نے ان کے وجوب کا قول کیا ہے۔ دار قطنی نے ابن جریج سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: مجھے نافع نے بتایا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے تھے اللہ کی مخلوق میں سے کوئی نہیں ہے مگر اس پر حج اور عمرہ واجب ہیں جو ان کی طرف جانے کے راستہ کی طاقت رکھتا ہے(1) اور تابعین میں سے جو عمرہ کے وجوب کے قائل ہیں وہ یہ ہیں۔ حضرات عطا، طاؤس، مجاہد، حسن، ابن سیرین، شعبی، سعید بن جبیر، ابو بردہ، مسروق، عبداللہ بن شداد، شافعی، احمد، اسحاق، ابو عبید، ابن الجہم (مالکیوں میں سے) ثوری نے کہا: ہم نے سنا ہے کہ وہ عمرہ واجب ہے۔ زید بن ثابت سے حج سے پہلے عمرہ کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: دو نمازیں ہوں تجھے کوئی نقصان نہیں جس سے تو آغاز کر لے۔ یہ دار قطنی نے ذکر کیا ہے۔ محمد بن سیرین عن زید بن ثابت کے سلسلہ سے مرفوع حدیث مروی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حج اور عمرہ دونوں فرض ہیں تجھے کوئی نقصان نہیں جس سے چاہے آغاز کر لے(2)۔ امام مالک فرماتے تھے، عمرہ سنت ہے اور ہم کسی کو نہیں جانتے جس نے اس کو چھوڑنے کی رخصت دی ہو۔ یہ نخعی اور اصحاب رائے کا قول ہے جو ابن منذر نے حکایت کیا ہے بعض قزوینی اور بغدادی علماء نے امام ابو حنیفہ سے روایت کیا ہے کہ وہ اسے حج کی طرح واجب کہتے تھے اور یہ سنت ثابتہ ہے(3)۔ یہ حضرت ابن مسعود اور حضرت جابر بن عبداللہ کا قول ہے۔

دار قطنی نے روایت کیا ہے، فرمایا: ہمیں محمد بن قاسم بن زکریا نے بیان کیا فرمایا ہمیں محمد بن العلاء ابو کریب نے بیان کیا فرمایا ہمیں عبدالرحیم بن سلیمان نے بیان کیا انہوں نے حجاج سے انہوں نے محمد بن منکدر سے انہوں نے حضرت جابر بن عبداللہ سے بیان کیا، فرمایا: ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز، زکوٰۃ اور حج کے بارے میں پوچھا کیا یہ واجب ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں۔ پھر اس نے عمرہ کے متعلق پوچھا کیا یہ واجب ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں اور تیرا عمرہ کرنا تیرے لئے بہتر ہے۔ اس حدیث کو یحییٰ بن ایوب نے حجاج اور ابن جریج سے انہوں نے ابن المنکدر سے انہوں نے حضرت جابر سے موقوف روایت کی ہے(4) یعنی یہ حضرت جابر کا قول ہے۔ یہ ان علماء کی حجت ہے جو عمرہ کو واجب نہیں کہتے بلکہ سنت کہتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں: اس آیت میں وجوب کی کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اتمام کے وجوب میں عمرہ کو حج کے ساتھ ملایا ہے نہ کہ آغاز کے وجوب کے اعتبار سے ملایا ہے۔ نماز اور زکوٰۃ کی ابتدا کا ذکر کیا تو فرمایا: **وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ** (البقرہ: 43) اور حج کے ایجاب کا ذکر ابتداً فرمایا **وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ** (آل عمران: 97) جب عمرہ کا ذکر فرمایا تو اس کے اتمام کا مکمل کرنا واجب ہے۔ آیت کریمہ اتمام کے الزام کے لئے ہے نہ کہ ابتدا کے الزام کے لئے آئی ہے(5)۔ واللہ اعلم۔ مخالف نے نظر کی جہت سے اس کے وجوب پر یہ دلیل دی ہے کہ حج کا رکن عرفات میں ٹھہرنا ہے اور عمرہ میں وقوف نہیں ہے اگر یہ حج کی سنت کی طرح ہوتا تو افعال میں اس کے مساوی کرنا واجب ہوتا، جس طرح نماز کی سنت

1۔ سنن دار قطنی، کتاب الحج، فی المواقیت، صفحہ 285، جلد 2 (قاہرہ)
2۔ ایضاً
3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 266، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
4۔ سنن دار قطنی، کتاب الحج، فی المواقیت، صفحہ 285، جلد 1 (قاہرہ)
5۔ احکام القرآن، صفحہ 19-118، جلد 1 (دار الفکر)

افعال میں اس کی فرضیت کے مساوی ہوتی ہے۔

مسئلہ نمبر 5: شعبی اور ابوحیوہ نے العمرۃ کو تاء کے رفع کے ساتھ پڑھا ہے، یہ بھی اس کے عدم وجوب کی دلیل ہے اور جماعت نے العمرۃ کو تا کے نصب کے ساتھ پڑھا ہے یہ وجوب کی دلیل ہے۔ حضرت ابن مسعود کے مصحف میں واتموا الحج و العمرۃ الی البیت للہ ہے اور ان سے اقیموا الحج والعمرۃ الی البیت(1) بھی مروی ہے لِلّٰہِ کا ذکر خصوصی طور پر فرمایا کیونکہ عرب حج کا قصد اجتماعیت، تعاون، مقابلہ، تنافر، قضاء حاجت اور بازاروں میں جانے کے لئے کرتے تھے۔ ان سب میں اللہ کے لئے اطاعت نہیں ہے اور اس ارادہ کا کوئی حصہ نہیں ہے اور عقیدہ کے اعتبار سے کوئی قربت نہیں ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے فرض کی ادائیگی اور اللہ کے حق کی ادائیگی کے لئے قصد کرنے کا حکم دیا پھر تجارت کی بھی اجازت فرمادی جیسا کہ آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 6: اس شخص کے بارے میں علماء کا اختلاف نہیں جو مناسک حج میں حاضر ہو جبکہ اس نے حج اور عمرہ کی نیت نہ کی ہو ... قلم اس کے حق میں اور اس کے خلاف جاری ہے۔ اس کا بغیر نیت اور قصد کے ان مقامات پر آنا اسے کچھ مفید نہیں ہے۔ ... نیت کرنا فرض ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَ اَتِمُّوا اور عبادت کے تمام سے نیت کا حضور بھی ہے یہ احرام کے وقت احرام کی طرح فرض ہے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب سواری پر سوار ہوئے تو کہا: لبیک بحجۃ و عمرۃ معاً۔(2) جیسا کہ آگے آئے گا۔

ربیع نے بویطی کی کتاب میں امام شافعی سے روایت کیا ہے، فرمایا: اگر کسی نے تلبیہ کہا اور حج اور عمرہ کی نیت نہیں کی تو وہ حج اور عمرہ کرنے والا نہ ہوگا اور اگر نیت کی اور تلبیہ نہ کہا حتیٰ کہ تمام مناسک پورے کر دیئے تو اس کا حج مکمل ہو گیا اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے حجت پکڑی ہے: انما الاعمال بالنیات۔(3) فرمایا: جس نے اس طرح کہا جس طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے کہا تھا جب انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام پر احرام باندھا تھا تو یہ نیت درست ہے کیونکہ یہ غیر کی نیت پر واقع ہوا ہے جو پہلے ہو چکی ہے بخلاف نماز کے۔

مسئلہ نمبر 7: علماء کا مراہق اور غلام کے بارے میں اختلاف ہے یہ جو حج کا احرام باندھتے ہیں پھر مراہق بالغ ہو جاتا ہے، غلام آزاد ہو جاتا ہے اور یہ وقوف عرفہ سے پہلے ہوتا ہے۔ امام مالک نے فرمایا: ان دونوں کو احرام کھولنے کی اجازت نہیں اور نہ کسی اور کو یہ اجازت ہے۔ امام مالک نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے دلیل پکڑی ہے وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ اور جس نے احرام کو کھولا اس کا حج اور عمرہ مکمل نہ ہوا۔ امام ابوحنیفہ نے کہا جب بچہ وقوف عرفات سے پہلے بالغ ہو جائے تو وہ احرام کو نئے سرے سے باندھے۔ اگر اس نے اپنے حج کو جاری رکھا تو یہ فرض حج کی طرف سے جائز نہ ہوگا اور انہوں نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ جب اس کا حج جائز نہ تھا اور نہ اس کو فرض لازم تھا۔ جب اس نے حج کا احرام باندھا تھا پھر اس کو حج لازم ہو گیا جب وہ بالغ ہوا تو اس کے لئے اس فرض کو چھوڑنا محال ہو گیا جو اس پر متعین ہو چکا ہے، نوافل کا ادا کرنا اور فرض کو

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 266، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
2۔ سنن نسائی، کتاب المناسک، باب القران، صفحہ 13، جلد 2 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، بدأ الوحی، صفحہ 2، جلد 1 (وزارت تعلیم)

چھوڑنا محال ہے، جس طرح کوئی شخص نوافل میں داخل ہوا پھر فرضوں کی جماعت کھڑی ہوگئی اور اسے فرض کے فوت ہونے کا خوف ہو تو وہ نوافل کو توڑ دے اور فرض میں داخل ہو۔ امام شافعی نے فرمایا: جب بچہ احرام باندھے پھر وقوف عرفات سے پہلے بالغ ہو جائے تو وہ اسی احرام کے ساتھ عرفات میں ٹھہرا تو اس کا یہ حج فرض ادا ہو جائے گا اور اسی طرح غلام کا حکم ہے۔ فرمایا: اگر مزدلفہ میں آزاد ہوا اور بچہ مزدلفہ میں بالغ ہوا تو وہ دونوں آزادی اور بلوغ کے بعد عرفہ کی طرف لوٹ آئیں پھر وہ طلوع فجر سے پہلے عرفہ کے وقوف کو پالیں تو ان کا فرض حج ادا ہو جائے گا اور ان پر بکری لازم نہ ہوگی اور اگر وہ احتیاطاً بکری وغیرہ دے دیں تو میرے نزدیک پسندیدہ ہے۔ یہ میرے نزدیک واضح نہیں ہے، اور احرام کی تجدید کو ساقط کرنے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث سے حجت پکڑی ہے کیونکہ جب انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب وہ یمن سے حج کا احرام باندھ کر آئے تھے تم نے کیسا احرام باندھا ہے۔؟ حضرت علی نے کہا: میں نے کہا: لبیك اللهم باهلالٍ كاهلال نبيّكَ۔ اے اللہ! میں نے تیرے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام جیسا احرام باندھا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے حج کا احرام باندھا ہے اور میں ہدی (بکری یا اونٹ) ساتھ لایا ہوں (1)۔ امام شافعی نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بات کا انکار نہ کیا اور انہیں حج مفرد یا حج تمتع یا حج قران کی نئی نیت کرنے کا حکم فرمایا۔ امام مالک نے اس نصرانی کے بارے میں فرمایا جو عرفہ کی شام کو اسلام قبول کرتا ہے پھر وہ حج کا احرام باندھتا ہے تو اس کا فرض حج ادا ہو جائے گا۔ اسی طرح غلام آزاد ہو جائے، بچہ بالغ ہو جائے جبکہ وہ احرام باندھے ہوئے نہ ہوں اور ان میں سے کسی پر بکری لازم نہ ہوگی...... بکری اس پر لازم ہوتی ہے جو حج کا ارادہ کرے اور میقات سے احرام نہ باندھے۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: غلام پر بکری لازم ہے وہ اس آزاد کی مانند ہے جو میقات سے تجاوز کر گیا۔ بخلاف بچے اور نصرانی کے ان پر دخول مکہ کے لئے احرام لازم نہ تھا کیونکہ ان پر فرض ساقط تھا جب کافر مسلمان ہوا، بچہ بالغ ہو تو ان کا حکم مکی کے حکم کی طرح ہے۔ میقات کو ترک کرنے کی وجہ سے ان پر کوئی چیز واجب نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ**

اس میں بارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: ابن عربی نے کہا یہ آیت انتہائی مشکل ہے اور علماء کو عاجز کر دینے والی آیت ہے (2)۔

میں کہتا ہوں: اس میں کوئی اشکال نہیں ہے ہم اس کو تفصیل سے بیان کریں گے۔ ہم کہتے ہیں: احصار کا معنی اس وجہ سے روکنا ہے جس کا تو قصد کئے ہوئے ہے خواہ وہ کسی عذر سے ہو، خواہ دشمن روک لے یا ظالم بادشاہ روک لے، یا مرض روک لے یا کوئی اور وجہ ہو۔ علماء کا مانع کی تعیین میں اختلاف ہے۔ علماء کے دو قول ہیں: (۱) حضرت علقمہ، حضرت عروہ بن زبیر وغیرہما نے کہا: مانع مرض ہے، دشمن نہیں ہے (3)۔ بعض نے فرمایا: صرف دشمن ہے۔ یہ حضرت ابن عباس حضرت ابن عمر، حضرت انس اور امام شافعی کا قول ہے، ابن عربی نے کہا: یہ ہمارے علماء کا مختار مذہب ہے۔ اکثر اہل لغت کی رائے یہ ہے کہ اُحْصِرَ کا

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، من اهل فی زمن النبی، صفحہ 211، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ احکام القرآن، صفحہ 119، جلد 1 (دار الفکر)

3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 266، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

معنی ہے: اس کو مرض لاحق ہوئی اور حصر کا مطلب ہے: اس پر دشمن نازل ہوا(1)۔
میں کہتا ہوں: ابن عربی نے جو حکایت کیا ہے کہ یہ ہمارے علماء کا مختار مذہب ہے، یہ صرف اشہب کا قول ہے باقی تمام اصحاب مالک نے اس میں مخالفت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں: احصار سے مراد مرض کا روک لینا ہے اور رہا دشمن اس کے بارے میں کہا جاتا ہے: حصر حصرا فهو محصور۔ یہ الباجی کا المنتقی میں قول ابواسحاق۔ زجاج نے حکایت کیا ہے کہ تمام اہل لغت کے نزدیک ہے۔ جیسا کہ آگے آئے گا۔ ابوعبیدہ اور کسائی نے کہا: احصر (مرض کے ساتھ روکا گیا) حُصِرَ (دشمن کے ذریعے روکا گیا(2)) ابن فارس کی مجمل میں اس کے برعکس ہے۔ فحصر (مرض کے ساتھ روکا گیا) احصر (دشمن کے ذریعے روکا گیا)
ایک طائفہ نے کہا: دونوں کے لئے احصر استعمال ہوتا ہے یہ ابوعمرو نے حکایت کیا ہے۔
میں کہتا ہوں: یہ امام مالک کے قول کے مشابہ ہے کہ انہوں نے مؤطا میں دونوں کے لئے احصر کا عنوان باندھا ہے۔ فراء نے کہا: مرض اور دشمن میں دونوں صیغے برابر ہیں۔ قشیری ابونصر نے کہا: شوافع نے دعویٰ کیا ہے کہ احصار دشمن کے لئے استعمال ہوتا ہے اور مرض کے لئے حصر استعمال ہوتا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ دونوں صیغے دونوں (مرض اور دشمن) کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ میں کہتا ہوں: شوافع نے جو دعویٰ کیا ہے امام خلیل بن احمد وغیرہ نے اس کے خلاف نص قائم کی ہے۔ خلیل نے کہا: حصرت الرجل حصرا (میں نے اسے روک لیا) واحصر الحاج عن بلوغ المناسك من مرض او نحوه (حاجی مرض یا اس جیسی چیز سے مناسک تک پہنچنے سے روک دیا گیا)۔ اسی طرح انہوں نے فرمایا: پہلے تو ثلاثی بنایا حصرت سے مشتق کیا اور دوسرے کو مرض میں رباعی بنایا۔ اسی پر حضرت ابن عباس کا قول ہے: لا حصر الاحصر العدو۔(3) حصر نہیں ہے مگر دشمن کا حصر۔ ابن السکیت نے کہا: احصره المرض جب مرض سفر سے یا حاجت سے روک دے جس کا اس نے ارادہ کیا تھا۔ حصره العدو يحصرونه، جب دشمن اسے روک لے اور وہ دشمن کا گھیراؤ کر لیں۔ حاصروه محاصرة و حصارا۔ انہوں نے اس کا گھیراؤ کر لیا۔ اخفش نے کہا: حصرت الرجل فهو محصور۔ یعنی میں نے اسے روک لیا۔ فرمایا: احصرني بولي و احصرني مرضي اس نے مجھے اپنے نفس کو روکنے والا بنا دیا۔ ابوعمرو شیبانی نے کہا: حصرني الشيء و احصرني۔ یعنی اس نے مجھے روک لیا۔
میں کہتا ہوں: اکثر اہل لغت کا خیال ہے کہ حصر دشمن کے روکنے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور احصر مرض کے روکنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں ہے: لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (البقرہ: 273) (فقراء کے لئے جو روکے گئے ہیں اللہ کے راستہ میں)۔ ابن عبادہ نے کہا:

و ما هجر ليلى ان تكون تباعدت عليك ولا ان احصرتك شغولُ

لیلیٰ کی جدائی نہیں کہ وہ تجھ سے دور ہو گئی نہ تجھے مشغولیت نے روکا۔
زجاج نے کہا: تمام اہل لغت کے نزدیک احصار مرض سے ہوتا ہے۔ رہا دشمن سے احصار تو اس کے لئے حصر استعمال ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: حُصِرَ حصرا۔ پہلے میں اُحصر احصارا کہا جاتا ہے۔ یہ ہمارے قول کی دلیل ہے اس کا معنی روکنا ہے۔ اس

1۔ احکام القرآن، صفحہ 119، جلد 1 (دار الفکر) 2۔ ایضاً، صفحہ 121، جلد 1 3۔ معالم التنزیل، صفحہ 244، جلد 1 (دار الفکر)

سے الحصیر ہے وہ شخص جو دل کے راز بتانے سے اپنے نفس کو روکتا ہے۔ الحصیر بادشاہ کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ حجاب کے پیچھے محبوس (قیدی) کی طرح ہوتا ہے۔ الحصیر چٹائی کو بھی کہتے ہیں جس پر بیٹھا جاتا ہے کیونکہ اس کے پتے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوتے ہیں جیسے کوئی چیز دوسری چیز کے ساتھ رکی ہوئی ہے۔

مسئلہ نمبر 2: جب الحصر کا اصل معنی روکنا ہے تو احناف نے کہا: محصر وہ ہے جو احرام کے بعد مرض یا دشمن یا کسی وجہ سے مکہ سے روکا گیا ہو اور انہوں نے مطلق احصار کے مقتضا سے حجت پکڑی ہے اور انہوں نے فرمایا: آخر آیت میں امن کا ذکر اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ وہ مرض کی وجہ سے نہ ہو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الزکام امان من الجذام زکام جزام کی مرض سے امان ہے اور فرمایا: جس نے چھینک مارنے والے سے پہلے الحمد کہا وہ دانتوں کی تکلیف، کان کی تکلیف اور پیٹ کی تکلیف سے محفوظ ہو گیا۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے اپنی سنن میں ذکر کیا ہے۔ احناف نے کہا: ہم نے دشمن کے روکنے کو مرض پر قیاس کرتے ہوئے حصار بنایا جب وہ اس کے حکم میں ہے نہ کہ ظاہر کی دلالت کے اعتبار سے حصار بنایا ہے۔ حضرت ابن عمر، حضرت ابن زبیر، حضرت ابن عباس، امام شافعی اور اہل مدینہ نے کہا: آیت سے مراد دشمن کا روکنا ہے کیونکہ آیت عمرہ حدیبیہ میں ٦ ہجری میں نازل ہوئی جب مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے روکا تھا۔ حضرت ابن عمر نے کہا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے تو کفار قریش بیت اللہ اور آپ کے درمیان حائل ہو گئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ہدی کو نحر کیا اور اپنے سر کا حلق کرایا(1)۔ اس پر فَاِذَآ اَمِنْتُمْ کا ارشاد دلالت کرتا ہے۔ یہ نہیں فرمایا: جب تم مرض سے ٹھیک ہو جاؤ۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 3: جمہور علماء کا خیال ہے کہ محصر جسے دشمن نے روک لیا ہو وہ جہاں روکا گیا ہو وہاں اپنا احرام کھول دے، اپنی ہدی کو نحر کردے اگر اس کے پاس ہدی ہو اور وہ اپنے سر کا حلق کرائے۔ قتادہ اور ابراہیم نے کہا: وہ اپنی ہدی بھیجے اگر ممکن ہو جب اس کی ہدی اپنے مقام پر پہنچ جائے تو وہ حلال ہو جائے (2) (یعنی احرام کھول دے) امام ابوحنیفہ نے کہا: احصار کا جانور، دسویں ذی الحجہ کو ذبح کرنے پر موقوف نہیں بلکہ دسویں کے دن سے پہلے بھی اس کو ذبح کرنا جائز ہے جب ہدی اپنے محل کو پہنچ جائے۔ صاحبین نے امام صاحب کی مخالفت کی ہے۔ صاحبین نے کہا: یہ دسویں کے دن ذبح کیا جائے گا، اگر دسویں کے دن سے پہلے ذبح کی تو جائز نہ ہوگی۔ اس مسئلہ کا زیادہ بیان آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 4: اکثر علماء کا نظریہ یہ ہے کہ جو دشمن کی وجہ سے روکا گیا ہو خواہ وہ دشمن کافر ہو یا مسلمان ہو یا جابر سلطان نے اسے قید خانہ میں بند کر دیا ہو اس پر ہدی واجب ہے۔ یہی امام شافعی کا قول ہے۔ اشہب کا بھی یہی قول ہے۔ ابن قاسم نے کہا: جو حج یا عمرہ میں بیت اللہ سے روکا گیا ہو اس پر ہدی نہیں ہے مگر یہ کہ وہ ہدی ساتھ لایا ہو۔ یہ امام مالک کا قول ہے اور ان کی حجت یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے روز ہدی کو نحر کیا تھا، اسے اشعار کیا تھا اور اسے ہار پہنایا تھا جب عمرہ کا احرام باندھا تھا۔ جب وہ ہدی اپنے مقام پر نہ پہنچی کفار کے روکنے کی وجہ سے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے نحر کرنے کا حکم دیا کیونکہ وہ ہدی تھی اور اس کو قلادہ پہنانا اور اشعار کرنا واجب تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے لئے نکلے تھے۔ پس اس میں رجوع

1۔ صحیح بخاری، کتاب العمرۃ، اذا احصر المعتمر، صفحہ 243، جلد 1 (وزارت تعلیم)　2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 266، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

جائز نہ تھا اور رسول اللہ ﷺ نے رکاوٹ کی وجہ سے اسے نحر نہیں کیا تھا۔ اسی وجہ سے جو بیت اللہ سے روکا گیا ہو اس پر ہدی واجب نہیں ہے۔ اور جمہور علماء نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ کے روز نہ احرام کھولا تھا اور نہ حلق کرایا تھا حتیٰ کہ ہدی کو نحر کر دیا۔ یہ دلیل ہے کہ محصر کے احرام کھولنے کی شرط ہدی کا ذبح کرنا ہے۔ اگر اس کے پاس ہدی ہو اور اگر وہ فقیر ہو تو جب وہ ہدی پائے اور اس پر قادر ہو وہ احرام نہ کھولے مگر ہدی دینے کے بعد۔ یہی ارشاد فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ کا مقتضا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جب وہ ہدی پر قادر ہو تو حلال ہو جائے اور ہدی دے۔ امام شافعی سے دو قول ہیں اسی طرح جو ہدی خریدنے کی طاقت نہیں رکھتا اس کا حکم ہے۔

مسئلہ نمبر 5: عطا وغیرہ نے کہا: مرض کی وجہ سے محصر، دشمن کی وجہ سے محصر کی طرح ہے۔ امام مالک اور شافعی اور ان کے اصحاب نے کہا: جس کو مرض نے روک لیا ہو اس کو بیت اللہ کا طواف ہی حلال کرے گا اگرچہ وہ کئی سال ہی ٹھہرا رہے حتیٰ کہ اسے تکلیف سے افاقہ ہو جائے (1)۔ اسی طرح جس کو گنتی میں غلطی ہوئی یا اس پر ذی الحج کا چاند مخفی ہوا، اس کا حکم ہے۔ امام مالک نے فرمایا: اس میں اہل مکہ اہل آفاق کی طرح ہیں۔ فرمایا: اگر مریض دواء کا محتاج ہو تو وہ اس کے ساتھ علاج کرے اور فدیہ دے اور اپنے احرام پر باقی رہے اور اسے کسی چیز سے حلال ہونا جائز نہیں حتیٰ کہ مرض سے ٹھیک ہو جائے۔ جب مرض سے ٹھیک ہو جائے تو وہ بیت اللہ کی طرف جائے اس کے سات چکر لگائے، صفا و مروہ کے درمیان سعی کرے اور اپنے حج اور عمرہ سے حلال ہو جائے۔ یہ تمام امام شافعی کا قول ہے اور ان کا نظریہ اس روایت کے مطابق ہے جو حضرت عمر، حضرت ابن عباس، حضرت عائشہ، حضرت ابن عمر، حضرت ابن الزبیر رضی اللہ عنہم کا ہے۔ انہوں نے کہا: مرض کی وجہ سے محصر یا گنتی میں غلطی کی وجہ سے محصر کے بارے میں فرمایا: اس کو طواف ہی حلال کرے گا۔ اسی طرح کوئی عضو ٹوٹ جائے یا جلاب لگ جائیں۔ اس کا بھی یہی حکم ہے امام مالک کے نزدیک جس کی یہ حالت ہو اسے اختیار ہوگا جب اسے وقوف عرفہ کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو مرض کی وجہ سے تو اگر وہ چاہے تو چلا جائے جب اس کے لئے بیت اللہ تک پہنچنا ممکن ہو تو وہ طواف کرے اور عمرہ سے حلال ہو جائے۔ اور اگر چاہے تو آئندہ سال تک احرام پر باقی رہے اگر وہ احرام پر باقی رہے گا تو کوئی ایسا کام نہیں کرے گا جو حاجی کو منع ہوتا ہے۔ پس اس پر ہدی نہ ہوگی اور اس میں حجت صحابہ کا اجماع ہے کہ جو تعداد میں غلطی کر جائے تو اس کا حکم یہ ہے کہ وہ طواف سے ہی حلال ہوگا اور مکی کے بارے میں فرمایا: جب وہ محصور باقی رہے حتیٰ کہ لوگ اپنے حج سے فارغ ہو جائیں تو وہ حل کی طرف نکل جائے، تلبیہ کہے اور وہ وہی کرے جو عمرہ کرنے والا کرتا ہے اور حلال ہو جائے جب آئندہ سال آئے تو حج کرے اور ہدی دے۔ ابن شہاب زہری نے کہا: مکہ والوں میں سے مکہ میں محصر ہو تو اسے وقوف عرفہ لازم ہے اگرچہ اسے چارپائی پر اٹھا کر لے جایا جائے۔ اس قول کو ابوبکر محمد بن احمد بن عبد اللہ بن بکیر مالکی نے اختیار کیا ہے۔ فرمایا: محصر مکی کے بارے میں امام مالک کا قول یہ ہے کہ اس پر بھی آفاقیوں کی طرح حج اور ہدی کا اعادہ ہے۔ یہ ظاہر کتاب کے خلاف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ اور فرمایا: میرے نزدیک اس مسئلہ میں زہری کا قول پسندیدہ

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 267، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

ہے۔ یہ اباحت ان لوگوں کے لئے ہے جو مسجد حرام کے رہنے والے نہیں ہیں وہ ٹھہر جائیں کیونکہ ان کی مسافت دور ہے وہ علاج کرائیں اگرچہ حج فوت بھی ہو جائے اور ایسا شخص جس کے درمیان اور مسجد حرام کے درمیان اتنی مسافت ہو جس میں نماز قصر نہیں کی جاتی تو وہ مناسک حج پر جائے اگرچہ اسے چارپائی پر ہی لے جایا جائے کیونکہ وہ بیت اللہ کے قریب ہے۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: ہر وہ شخص جو دشمن، مرض، خرچ ختم ہونے، سواری گم ہونے یا کسی موذی چیز کے ڈسنے کی وجہ سے بیت اللہ تک پہنچنے سے روکا گیا ہو تو وہ احرام کے ساتھ اپنے مکان پر ٹھہرا رہے اور اپنی ہدی بھیج دے یا ہدی کی قیمت بھیج دے، جب وہ نحر کر دے تو اپنے احرام کو کھول دے۔ اسی طرح حضرات عروہ، قتادہ، حسن، عطا، نخعی، مجاہد اور اہل عراق کا قول ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ۔ (الآیۃ)

مسئلہ نمبر 6: امام مالک اور ان کے اصحاب نے کہا: محرم کو حج میں شرط لگانا کچھ نفع نہیں دیتا جب اسے مرض یا دشمن سے محصر ہونے کا اندیشہ ہو۔ یہ امام ثوری، امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا قول ہے۔ شرط لگانا یہ ہے کہ تلبیہ کہتے وقت لبیک اللھم لبیک۔ جہاں تو مجھے روک لے گا میں اپنا احرام وہاں کھول دوں گا۔ امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ اور ابو ثور نے کہا شرط لگانے میں کوئی حرج نہیں اور اس کے لئے وہ شرط ہوگی جو وہ لگائے گا۔ دوسرے بہت سے صحابہ اور تابعین نے بھی یہی کہا ہے ان کی حجت ضباعہ بنت زبیر بن عبد المطلب کی حدیث ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہا: یا رسول اللہ! میں حج کا ارادہ رکھتی ہوں کیا میں شرط لگا دوں؟ فرمایا: ہاں۔ اس نے کہا: میں کیسے کہوں؟ فرمایا: تو یوں کہہ: لبیک اللھم لبیک و محلی من الارض حیث حبستنی (1) (جہاں تو مجھے روک لے گا میں احرام کھول دوں گی) اس حدیث کو ابو داؤد اور دار قطنی وغیرہما نے نقل کیا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: اگر ضباعہ کی حدیث ثابت ہوتی تو میں اس سے زیادتی نہ کرتا اس کا احرام کھولنا جائز ہے جہاں اسے اللہ تعالیٰ روک لے۔

میں کہتا ہوں: بہت سے محدثین نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ ان میں سے ابو حاتم بستی اور ابن منذر ہے۔ ابن منذر نے کہا: یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ضباعہ بنت زبیر سے کہا: تو حج کر اور شرط لگا لے (2)۔ یہی امام شافعی کا قول ہے جب وہ عراق میں تھے پھر مصر میں اسے توقف کیا۔ ابن منذر نے کہا: پہلا قول بہتر ہے۔ عبد الرزاق نے اس کو ذکر کیا ہے۔ فرمایا: ہمیں ابن جریج نے بتایا فرمایا مجھے ابو زبیر نے بتایا کہ طاؤس اور عکرمہ نے انہیں حضرت ابن عباس سے روایت کر کے بتایا کہ حضرت ضباعہ بنت زبیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہا: میں ایک مریض عورت ہوں، میں حج کرنا چاہتی ہوں آپ مجھے کیا حکم فرماتے ہیں اگر میں احرام باندھ لوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو احرام باندھ لے اور شرط لگا لے کہ میرے احرام کھولنے کی جگہ وہی ہوگی جہاں تو مجھے روک لے گا (3)۔ راوی فرماتے ہیں: اس عورت نے حج کر لیا تھا۔ یہ سند صحیح ہے۔

مسئلہ نمبر 7: علماء کا اختلاف ہے کہ محصر پر قضا واجب ہے یا نہیں۔ امام مالک اور امام شافعی نے فرمایا: دشمن نے

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحج، باب الاشتراط فی الحج، صفحہ 247، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ سنن دار قطنی، کتاب الحج، حدیث 82، صفحہ 235، جلد 2 (قاہرہ)

3۔ ایضاً، حدیث 83، صفحہ 235، جلد 2

جسے روک لیا ہو اس پر نہ حج کی قضا ہے نہ عمرہ کی، مگر جس نے اپنا فرض حج نہ کیا ہو تو اس پر وجوب کے مطابق حج ہے۔ اسی طرح ان علماء کے نزدیک عمرہ کرنا واجب ہے جنہوں نے عمرہ کو واجب کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ نے کہا مرض یا دشمن نے روک لیا ہو تو اس پر حج اور عمرہ ہے۔ یہ طبری کا قول ہے۔ اصحاب الرائے نے کہا: اگر وہ حج کا احرام باندھنے والا تھا تو وہ احصار کی صورت میں حج اور عمرہ قضا کرے گا کیونکہ اس کا حج اور احرام عمرہ بن گیا تھا۔ اگر وہ حج قران کرنے والا تھا تو وہ ایک حج اور دو عمرے قضا کرے گا اگر وہ عمرہ کا احرام باندھنے والا تھا وہ ایک عمرہ قضا کرے گا ان کے نزدیک ہر مرض یا دشمن کے ذریعے روکا گیا برابر ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ میمون بن مہران کی حدیث سے انہوں نے حجت پکڑی ہے۔ فرمایا: میں اس سال عمرہ کے ارادہ سے نکلا جس میں اہل شام نے حضرت ابن زبیر کا مکہ میں محاصرہ کیا ہوا تھا۔ میری قوم کے کئی لوگوں نے میرے ساتھ اپنی ہدی کے جانور بھیجے، میں اہل شام تک پہنچا تو انہوں نے مجھے حرم میں داخل ہونے سے روک لیا۔ میں نے اسی جگہ ہدی کو نحر کیا پھر میں نے احرام کھول دیا اور واپس آ گیا۔ جب آئندہ سال آیا تو میں اپنے عمرہ کی قضا کے لئے نکلا۔ میں حضرت ابن عباس کے پاس آیا۔ میں نے ان سے مسئلہ پوچھا تو انہوں نے فرمایا ہدی کا بدل دے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو اس ہدی کا بدل دینے کو کہا جو انہوں نے عمرہ قضا میں حدیبیہ کے سال نحر کی تھیں اور ان علماء نے نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد سے استدلال کیا جس کا کوئی عضو ٹوٹ گیا یا ٹانگ ٹوٹ گئی تو وہ احرام کھول دے اور اس پر دوسرا حج یا دوسرا عمرہ ہے (1)۔ اس حدیث کو عکرمہ نے حجاج بن عمرو انصاری سے روایت کیا ہے۔ فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس کی ٹانگ ٹوٹ جائے یا کوئی اور عضو ٹوٹ جائے تو وہ احرام کھول دے اور اس پر دوسرا حج ہے (2)۔ ان علماء نے فرمایا: آئندہ سال رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کا حدیبیہ کے سال عمرہ کرنا اس عمرہ کی قضا کے لئے تھا۔ اسی وجہ سے اس عمرہ کو عمرۃ القضاء کہا جاتا ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی صحابی کو اور کسی ساتھی کو کسی چیز کے قضا کرنے کا حکم دیا اور نہ وہ کوئی چیز لئے لوٹے اور کسی وجہ سے ان سے کوئی چیز محفوظ نہیں کی گئی اور نہ آئندہ سال یہ کہا کہ میرا یہ عمرہ اس عمرہ کی قضا ہے جس میں مجھے روکا گیا تھا۔ یہ کوئی آپ ﷺ سے منقول نہیں ہے۔ علماء نے فرمایا: عمرۃ القضاء اور عمرۃ القضیۃ برابر ہیں۔ یہ اس عمرہ کا نام ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قریش سے فیصلہ کیا تھا اور اس سال بیت اللہ سے واپس چلے جانے اور آئندہ سال آنے پر ان سے صلح کی تھی اسی وجہ سے اس کو عمرۃ القضیۃ کہا جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 8: فقہاء میں سے کسی نے اس شخص کے بارے میں نہیں کہا کہ جس کا کوئی عضو ٹوٹ جائے یا لنگڑا ہو جائے تو ٹوٹنے کے ساتھ ہی اسی جگہ اپنا احرام کھول دے سوائے ابوثور کے۔ انہوں نے حجاج بن عمرو کی حدیث کے ظاہر کا اعتبار کیا ہے اور اس کی متابعت داؤد بن علی اور اس کے اصحاب نے کی ہے۔ علماء کا اجماع ہے کہ وہ عضو ٹوٹنے کے ساتھ احرام کھولے گا لیکن کیسے کھولے گا۔ امام مالک وغیرہ نے کہا: بیت اللہ کے طواف کے ساتھ کھولے گا اس کے علاوہ نہیں کھولے گا اور کوفہ کے علماء نے

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المناسک، باب المحصر، صفحہ 229 (وزارت تعلیم)

2۔ جامع ترمذی، کتاب الحج، ما جاء فی الذی یهل بالحج فیکسر او یعرج، صفحہ 113، جلد 1 (وزارت تعلیم)

اس کی مخالفت کی ہے۔ انہوں نے فرمایا: وہ نیت اور اس فعل کے ساتھ کھولے گا جو اسے حلال کر دیتا ہے جیسا کہ پہلے گزرا ہے۔

مسئلہ نمبر 9: علماء کے درمیان اس میں اختلاف نہیں کہ احصار (روکنا) حج اور عمرہ میں عام ہے۔ ابن سیرین نے کہا: عمرہ میں احصار نہیں ہے کیونکہ اس کا وقت متعین نہیں ہے۔ اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ اگرچہ یہ متعین وقت میں نہیں ہے لیکن عذر کے ختم ہونے تک صبر کرنا ضرر (نقصان) ہے۔ اس کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ حضرت ابن زبیر سے حکایت ہے کہ جس کو دشمن یا مرض نے روک لیا ہو تو اس کا طواف کے بغیر احرام کھولنا جائز نہیں اور یہ حدیبیہ کے سال والی خبر جو نص ہے اس کے مخالف ہے۔

مسئلہ نمبر 10: رکاوٹ یا تو کافر کی طرف سے ہوگی یا مسلمان کی طرف سے ہوگی۔ اگر کافر کی طرف سے ہو تو قتال جائز نہیں اگرچہ اس پر غالب آنے کا وثوق بھی ہو اور وہ وہاں حلال ہو جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ** (البقرہ: 191) جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور اگر تاوان کا سوال کرے تو دینا جائز نہیں کیونکہ یہ اسلام میں کمزوری ہے اگر مسلمان نے روکا ہو تو اس سے بھی کسی حال میں قتال جائز نہیں اور احرام کھول دینا واجب ہے اگر وہ کوئی چیز طلب کرے اور راستے چھوڑ دے تو اس کو وہ چیز دینا جائز ہے اور قتال جائز نہیں کیونکہ اس میں روح کا اتلاف ہے اور عبادت کی ادائیگی میں یہ لازم نہیں کیونکہ دین آسان ہے اور رہا اس کو تاوان دینا تو اس میں دو نقصانوں میں سے آسان کا قبول کرنا ہے کیونکہ حج میں مال کو خرچ کیا جاتا ہے پس یہ اس کے خرچ میں سے شمار ہوگا۔

مسئلہ نمبر 11: روکنے والے دشمن کی دو صورتیں ہیں یا تو اس کے احصار کے بقا اور ہمیشہ ہونے کا یقین ہوگا کیونکہ اس کو قوت اور کثرت حاصل ہے یا ایسا نہیں ہوگا۔ اگر پہلی صورت ہو تو محصر اسی وقت اس کی جگہ احرام کھول دے اور اگر دوسری صورت ہو اور اس احصار کے زوال کی امید ہو تو وہ محصور نہ ہوگا حتیٰ کہ اس کے اور حج کے درمیان اتنا وقت پایا جائے کہ اسے معلوم ہو جائے کہ اب اگر دشمن چلا بھی گیا تو وہ حج کو نہیں پا سکے گا۔ اس وقت ابن قاسم اور ابن ماجشون کے نزدیک وہ احرام کھول دے۔ اشہب نے کہا: دشمن کی وجہ سے حج سے روکا جانے والا شخص احرام نہ کھولے حتیٰ کہ دسویں کا دن آ جائے اور تلبیہ کو ختم نہ کرے حتیٰ کہ لوگ عرفہ کی طرف چلے جائیں۔ ابن قاسم کے قول کی وجہ یہ ہے کہ یہ دشمن کے غلبہ کی وجہ سے اس کے حج کی تکمیل سے مایوسی کا وقت ہے۔ پس اس وقت اس کا احرام کھولنا جائز ہے۔ اس کی اصل عرفہ کا دن ہے اور اشہب کے قول کی وجہ یہ ہے کہ اس پر ممکن حد تک احرام کے حکم میں رہنا ہے اور اس کا دسویں کے دن تک التزام کرنا ہے اور حاجی کے لئے یہی وہ وقت ہے جس میں احرام کھولنا جائز ہے۔ پس اس پر دسویں کے دن احرام کھولنا جائز ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ**، ما محل رفع میں ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: **فالواجب او فعلیکم ما استیسر**۔ اور محل نصب میں ہونے کا بھی احتمال ہے یعنی **فانحروا او فاهدوا**، **ما استیسر** سے مراد جمہور اہل علم کے نزدیک بکری ہے۔ حضرت ابن عمر، حضرت عائشہ، حضرت ابن زبیر نے فرمایا: وہ اونٹ اور گائے ہے اس کے علاوہ نہیں (1)۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 267، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

حسن نے کہا: اعلیٰ ہدی اونٹ ہے، درمیانی گائے ہے اور کم از کم بکری ہے (1)۔ اس میں امام مالک کے نظریہ کی دلیل ہے: جس کو دشمن نے روکا ہو اس پر قضا واجب نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ۔ اس میں قضا کا ذکر نہیں۔

مسئلہ نمبر 12: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنَ الْهَدْيِ، الْهَدْيِ اور الھدی دونوں لغتیں ہیں جو بیت اللہ کی طرف بھیجا جاتا ہے خواہ اونٹ ہو یا کوئی اور جانور، عرب کہتے ہیں: کم ھدی بنی فلاں، بنوفلاں کے کتنے اونٹ ہیں۔ ابوبکر نے کہا: اس کو ہدی اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ ان میں سے بعض بیت اللہ کی طرف بھیجی جاتی ہیں۔ پس جو حکم بعض کو لاحق ہوتا ہے اس کے ساتھ تمام کا نام رکھ دیا جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ (النساء: 25)۔ اس سے مراد یہ ہے کہ لونڈیاں زنا کریں تو ان میں سے لونڈی پر جب وہ زنا کرے تو آزاد کنواری عورت کی سزا کا نصف ہے جب آزاد کنواری عورت زنا کرے۔ اللہ تعالیٰ نے المحصنات کا لفظ ذکر فرمایا۔ مراد کنواری عورتیں ہیں کیونکہ احصان ان میں سے اکثر میں ہوتا ہے۔ پس انہیں ایسے امر کے ساتھ ذکر کیا گیا جو ان میں سے بعض میں پایا جاتا ہے آزاد عورتوں میں سے محصنہ اسے کہا جاتا ہے جو خاوند والی ہو اس پر رجم واجب ہوتا ہے جب وہ بدکاری کرے اور رجم نصف نہیں ہوتا کہ وہ لونڈی پر نصف ہو۔ پس اس سے ظاہر ہوا کہ المحصنات سے مراد یہاں کنواری عورتیں ہیں نہ کہ خاوند والیاں۔ فراء نے کہا: اہل حجاز اور بنو اسد ہدی کو تخفیف کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ فرمایا: تمیم اور سفلی قیس شد کے ساتھ ہدی پڑھتے ہیں۔

شاعر نے کہا:

حلفت برب مكة والمصلّٰى و اعناق الهَدِىّ مقلداتِ

میں نے مکہ، مصلی اور ہار پہنائی گئی ہدیوں کے گردنوں کے مالک کی قسم اٹھائی۔

فرمایا: الھدی کا واحد ھدیہ اور الھدی کی جمع میں اھداء بھی کہا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ یہ خطاب تمام امت کو ہے خواہ محصر ہو یا محصر نہ ہو۔ علماء میں بعض یہ محصرین کے لئے خاص کرتے ہیں یعنی احرام نہ کھولیں حتیٰ کہ ہدی کو نحر کر دیا جائے۔ محل وہ جگہ ہے جس میں ذبح حلال ہوتی ہے۔ امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک دشمن کی وجہ سے روکے گئے شخص کے لئے محل احصار کی جگہ ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا اس میں ہے کہ حدیبیہ کے زمانہ میں آپ جہاں محصور ہوئے وہاں ہی احرام کھول دیا اور ہدی کو نحر کیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ (الفتح: 25) بعض علماء نے معکوفاً کا معنی محبوساً فرمایا جب بیت اللہ تک پہنچنے سے روکی گئی ہو۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک احصار میں ہدی کا محل حرم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۳۳﴾ (الحج) اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس کا مخاطب وہ امن والا شخص ہے جو بیت اللہ تک

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 267، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

پہنچ پاتا ہے۔ رہا محصر (روکا گیا) وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے خارج ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ نے حدیبیہ میں اپنی ہدی نحر کی تھیں اور حدیبیہ حرم سے نہیں ہے اور دوسری دلیل احناف کی حضرت ناجیہ بن جندب کی حدیث ہے، اس نے نبی کریم ﷺ سے کہا: حضور! آپ میرے ساتھ ہدی بھیجیں میں اسے حرم میں نحر کروں گا۔ آپ ﷺ نے اسے فرمایا: تو اسے کیسے لے جائے گا (1)؟ اس نے کہا: میں اسے وادیوں سے لے جاؤں گا مشرک اس پر قادر نہیں ہوں گے میں اسے لے جاؤں گا حتیٰ کہ میں اسے حرم میں نحر کروں گا۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے جہاں احرام کھولے وہاں ہی نحر کردے، نبی کریم ﷺ کے حدیبیہ کے مقام پر فعل کی اقتدا کرتے ہوئے۔ یہ صحیح ہے اس کو ائمہ نے روایت کیا ہے، نیز ہدی، مہدی (بھیجنے والے) کے تابع ہے۔ جب بھیجنے والا اپنے احصار کی جگہ احرام کھول دے گا تو ہدی بھی اس کے ساتھ نحر کردی جائے گی۔

مسئلہ نمبر 2: محصر (روکا گیا) کے بارے میں ہم نے جو ثابت کیا ہے اس میں اختلاف ہے کہ کیا اس کو حلق کرانا جائز ہے یا مقام حل جیسا کوئی عمل کرنا جائز ہے اس سے پہلے کہ اس نے میسر (ہدی) ذبح نہ کی ہو۔ امام مالک نے فرمایا: سنت ثابتہ جس میں ہمارے نزدیک کوئی اختلاف نہیں وہ یہ ہے کہ کسی کے لئے اپنے بال کاٹنا جائز نہیں حتیٰ کہ اپنی ہدی کو نحر کردے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: جب محصر، ہدی نحر کرنے سے پہلے احرام کھول دے گا تو اس پر بکری ہوگی اور وہ احرام میں ہوگا جیسا پہلے تھا حتیٰ کہ ہدی کو نحر کردے۔ اور اگر اس نے شکار کیا ہدی نحر کرنے سے پہلے تو اس پر جزا ہوگی۔ اس میں امیر اور غریب برابر ہیں۔ وہ کبھی احرام نہیں کھولے گا حتیٰ کہ وہ ہدی کو ذبح کردے یا اس کی طرف سے ذبح کردیا جائے۔ علماء احناف نے فرمایا: کم از کم ہدی بکری ہے جو نہ اندھی ہو، نہ اس کے کان کاٹے ہوئے ہوں اور ان کے نزدیک روزہ کا یہ مقام نہیں ہے۔ ابو عمر نے کہا: کوفیوں کے قول میں ضعف اور تناقض ہے کیونکہ وہ دشمن سے روکے گئے شخص کے لئے اور مرض سے روکے گئے شخص کے لئے احرام کھولنا جائز قرار نہیں دیتے حتیٰ کہ حرم میں اس کی ہدی نحر کردی جائے۔ اور جب وہ مرض کی وجہ سے محصر کے لئے جائز قرار دیتے ہیں کہ وہ ہدی کا بھیجنے والا اور جس کے ساتھ ہدی بھیجی گئی ہے اس سے متعین دن کا وعدہ لے جس میں وہ اس کی ہدی نحر کرے گا۔ پس اس دن کے بعد وہ احرام کھول دے اور حلق کرادے۔ پس انہوں نے اس کے لئے احرام کھولنا جائز قرار دیا جبکہ ہدی کے نحر ہونے اور اس کے حرم میں پہنچنے کا یقین نہیں ہے اور انہوں نے غالب گمان کے ساتھ احرام کھولنے پر اس کو محمول کیا جبکہ علماء کا اتفاق ہے کہ جس پر فرائض لازم ہوں اس کے لئے ان سے گمان کے ساتھ نکلنا جائز نہیں اور اس پر دلیل یہ ہے کہ ان کے قول کا گمان ہے کہ اگر وہ ہدی ہلاک ہوجائے یا گم ہوجائے یا چوری ہوجائے ادھر اس کا بھیجنے والا احرام کھول چکا ہے۔ اپنی ازواج سے حقوق زوجیت ادا کرچکا ہے یا شکار کرچکا ہے تو وہ احرام میں ہوگا اور جو اس نے شکار کیا اس پر اس کی جزا ہوگی۔ پس انہوں نے اس کے لئے حج کے فساد کو مباح کیا اور اس پر وہ لازم کیا جو احرام نہ کھولنے والے شخص پر لازم ہوتا ہے۔ اس میں تناقض اور مذاہب

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، باب نجاسۃ الدم و کیفیۃ غسلہ، صفحہ 140، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

کا ضعف ہے اس میں کوئی خفا نہیں۔ احناف نے اپنے مذہب کی بنیاد حضرت ابن مسعود کے قول پر رکھی اور انہوں نے اس کے خلاف میں نظر نہیں کی۔ امام شافعی نے فرمایا: جب محصر ہدی سے عاجز ہو تو اس میں دو قول ہیں۔ وہ کبھی احرام نہیں کھولے گا مگر ہدی دینے کے ساتھ اور دوسرا قول یہ ہے کہ اسے حکم دیا گیا ہے کہ جس پر وہ قادر ہے وہ ادا کرے۔ اگر وہ کسی چیز پر قادر نہیں تو جب وہ قادر ہو وادا کرے۔ امام شافعی نے فرمایا: جس نے یہ کہا ہے اس نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ اپنی جگہ احرام کھول دے اور جب قادر ہو ہدی ذبح کرے۔ اگر وہ مکہ میں ذبح پر قادر ہو تو اس کے لئے مکہ میں ہی ذبح کرنا ضروری ہے اگر مکہ میں ذبح کرنے پر قادر نہ ہو تو جہاں قادر ہو وذبح کردے اور فرمایا: کہا جاتا ہے اس میں جائز نہیں مگر ہدی اور کہا جاتا ہے: جب ہدی نہ پائے تو اس پر کھانا کھلانا یا روزے ہوں گے۔ اگر وہ ان تینوں میں سے کوئی بھی نہ پائے تو ان میں سے ایک ادا کرے جب قادر ہو۔ غلام کے بارے میں فرمایا: اس کے لئے صرف روزہ جائز ہے پہلے اس کے لئے بکری کی قیمت دراہم میں لگائی جائے گی پھر دراہم کا کھانا بنایا جائے گا پھر کھانے کے ہر مد کے بدلے میں ایک دن روزہ رکھے گا۔

مسئلہ نمبر 3: اس میں اختلاف ہے جب محصر اپنی ہدی کو نحر کرے کیا اس کے لئے حلق کرانا ضروری ہے یا نہیں؟ ایک گروہ نے کہا: اس پر سر کا حلق کرانا واجب نہیں کیونکہ اس سے عبادت ختم ہو چکی ہے اور انہوں نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ جب احصار کی وجہ سے باقی تمام مناسک ساقط ہو چکے ہیں مثلاً طواف، سعی وغیرہ...... حالانکہ ان کے ساتھ حاجی احرام سے حلال ہوتا ہے...... تو اس سے وہ تمام احکام ساقط ہو گئے جن کے ساتھ حاجی احرام سے حلال ہوتا ہے کیونکہ وہ محصر ہو گیا ہے۔ اور جنہوں نے اس سے حجت پکڑی ہے ان میں امام ابوحنیفہ اور امام محمد بن حسن ہیں۔ انہوں نے فرمایا: محصر پر نہ بال کٹوانا ہے نہ حلق کرانا ہے۔ امام ابو یوسف نے کہا: محصر حلق کرالے اور حلق نہیں کرائے گا تو اس پر کوئی چیز واجب بھی نہ ہوگی اور ابن ابی عمران نے ابن سماعہ سے اور انہوں نے امام ابو یوسف سے ان کی ''نوادر'' میں روایت کیا ہے کہ اس پر حلق کرانا لازم ہے اور بال کٹوانے کے بغیر تو کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ امام شافعی کے اس مسئلہ میں دو مختلف اقوال ہیں: (۱) محصر کے لئے حلق کرنا عبادت سے ہے۔ یہ امام مالک کا قول ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ عبادت میں سے نہیں ہے جیسا کہ امام ابوحنیفہ نے کہا ہے۔ امام مالک کی حجت یہ ہے کہ طواف، صفا و مروہ کے درمیان سعی وغیرہ سے محصر کو روکا گیا ہے۔ پس جن چیزوں سے اسے روکا گیا ہے وہ تو ساقط ہو جائیں گی لیکن حلق کرانا، اس کے کرنے میں تو کوئی حائل نہیں کہ وہ اس کے کرنے پر قادر ہے اور جس کے کرنے پر وہ قادر ہے وہ اس سے ساقط نہیں اور اس پر دلیل کہ محصر پر حلق کرانا باقی ہوتا ہے جس طرح بیت اللہ تک پہنچنے والے پر باقی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ۔ اور وہ حدیث ہے جو ائمہ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے محلقین (حلق کرنے والوں) کے لئے تین مرتبہ اور قصر کرانے والوں کے لئے ایک مرتبہ دعا فرمائی تھی۔ یہ قطعی حجت ہے اور اس مسئلہ میں نظر صحیح ہے۔ یہی امام مالک اور ان کے اصحاب کا مسلک ہے۔ ان کے نزدیک وہ حاجی جس نے حج کو مکمل کیا اور جس کا حج فوت ہوا، دشمن کے ذریعے روکا گیا اور مرض کے ذریعے روکا گیا تمام پر حلق کرانا عبادت ہے۔

مسئلہ نمبر 4: ائمہ نے روایت کیا ہے کہ امام مالک کے یہ الفاظ ہیں۔ نافع نے حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی: اے اللہ! حلق کرانے والوں پر رحم فرما۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! قصر کرانے والوں کے لئے بھی دعا فرمائیں۔ آپ ﷺ نے عرض کی: اے اللہ! حلق کرانے والوں پر رحم فرما۔ صحابہ نے کہا: یا رسول اللہ! قصر کرانے والوں کے لئے دعا فرمائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے عرض کی: یا اللہ! مقصرین پر رحم فرما (1)۔ ہمارے علماء نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ کا حلق کرانے والوں کے لئے تین مرتبہ دعا کرنا اور قصر کرانے والوں کے لئے ایک مرتبہ دعا کرنا دلیل ہے کہ حج اور عمرہ میں حلق کرانا، قصر کرانے سے افضل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ لَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ کا مقتضا بھی یہی ہے ولا تقصروا نہیں فرمایا اور اہل علم کا اجماع ہے کہ قصر کرانا مردوں کے لئے جائز ہے مگر ایک چیز حسن بصری سے ذکر کی گئی ہے کہ وہ پہلا حج جو انسان کرتا ہے اس میں حلق کو واجب قرار دیتے تھے۔

مسئلہ نمبر 5: عورتیں حلق میں داخل نہیں ہیں ان کے لئے سنت قصر کرانا ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے، فرمایا: عورتوں پر حلق نہیں ہے ان پر صرف قصر کرانا ہے (2)۔ اس روایت کو ابو داؤد نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ اہل علم کا اس قول پر اجماع ہے۔ ایک جماعت کی رائے ہے کہ عورت کا اپنے سر کا حلق کرانا مثلہ ہے اور عورت بالوں کو کتنا کٹوائے اس مقدار میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عمر، امام شافعی، امام احمد، اسحاق کہتے ہیں: وہ ہر مینڈھی سے پورے کی مثل کاٹے۔ عطا نے کہا: بند تین انگلیوں کی مقدار کاٹے۔ قتادہ نے کہا: تہائی یا چوتھائی کی مقدار کاٹے۔ حفصہ بن سیرین نے بوڑھی عورت اور جوان عورت کے درمیان فرق کیا ہے۔ وہ فرماتی ہیں: بوڑھی عورت چوتھائی بال کاٹ دے اور جوان عورت کے لئے انگلی کے پورے کے ساتھ اشارہ کیا وہ تھوڑے کاٹ لے۔ مالک نے فرمایا: پورے سر کے بالوں کو تھوڑا تھوڑا کاٹے جتنا وہ کاٹ لے گی وہ کافی ہوگا۔ امام مالک کے نزدیک یہ جائز نہیں کہ بعض بالوں کو کاٹے اور بعض کو چھوڑ دے۔ ابن منذر نے کہا: جس پر کاٹنے کے اسم کا اطلاق ہو وہ جائز ہوگا۔ احوط یہ ہے کہ انگلی کے پورے کی مقدار تمام بال کاٹے۔

مسئلہ نمبر 6: کسی کے لئے سر کا حلق کرانا جائز نہیں حتیٰ کہ اپنی ہدی کو نحر کرلے۔ یہ اس لئے ہے کہ ذبح کی سنت حلق سے پہلے ہے۔ اس میں اصل یہ ارشاد ہے: وَ لَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے کہا تھا پہلے آپ نے نحر کیا تھا پھر حلق کرایا تھا جس نے اس کی مخالفت کی حلق پہلے کرایا نحر بعد میں کیا اس نے یہ خطأً اور جہالت کی وجہ سے کیا ہوگا یا جان بوجھ کر کیا ہوگا۔ اگر پہلی صورت ہوگی تو اس پر کچھ واجب نہ ہوگا۔ یہ ابن حبیب نے ابن قاسم سے روایت کیا ہے اور یہ امام مالک کا مشہور مذہب ہے۔ ابن ماجشون نے کہا: اس پر ہدی ہے، یہی امام ابو حنیفہ کا قول ہے۔ اگر دوسری صورت میں ہو تو قاضی ابو الحسن نے روایت کیا ہے کہ نحر پر حلق کو مقدم کرنا جائز نہیں۔ یہی امام شافعی کا قول ہے۔ ظاہر مذہب منع ہے اور صحیح جواز ہے کیونکہ حضرت ابن عباس کی حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ سے ذبح، حلق، رمی، تقدیم و

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، باب الحلق والتقصیر عند الاحلال، صفحہ 233، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحج، باب الحلق والتقصیر، صفحہ 272، جلد 1 (وزارت تعلیم)

تاخیر کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی حرج نہیں ہے (1)۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ نے حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جس نے حلق کرانے سے پہلے ذبح کیا یا ذبح کرنے سے پہلے حلق کرایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی حرج نہیں (2)۔

مسئلہ نمبر 7: اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حج میں سر کا حلق کرانا عبادت اور مطلوب ہے اور حج کے علاوہ جائز ہے لیکن بعض علماء نے فرمایا: سر کا حلق کرانا مثلہ ہے، اگر یہ مثلہ ہوتا تو حج اور غیر حج میں جائز نہ ہوتا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مثلہ سے منع فرمایا ہے (3)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفر کی شہادت کی خبر آنے کے تین دن بعد ان کے بچوں کا حلق کرایا۔ اگر حلق جائز نہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا حلق نہ کرواتے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے سر کا حلق کراتے تھے۔ ابن عبدالبر نے کہا: علماء کا بالوں کے رکھنے اور حلق کی اباحت پر اجماع ہے یہی حجت کافی ہے۔ وباللہ التوفیق

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ

اس میں نو مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اس آیت سے بعض شوافع نے استدلال کیا ہے کہ پہلی آیت میں محصر سے مراد دشمن سے روکا گیا ہے نہ مرض سے روکا گیا ہے۔ یہ لازم نہیں ہوتا کیونکہ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ کا معنی ہے، جو مریض ہو یا اس کے سر میں اذیت ہو پھر حلق کرا دے فَفِدْيَةٌ تو اس پر فدیہ ہے۔ جب یہ بلا اختلاف مرض کے بارے میں وارد ہے تو ظاہر یہ ہے کہ آیت کا آغاز بھی اسی کے متعلق وارد ہے جس کے بارے میں اس کا وسط اور اس کا آخر وارد ہے۔ کیونکہ کلام کا بعض، بعض کے ساتھ جڑا ہوا ہوتا ہے اور بعض، بعض کے ساتھ متصل ہوتا ہے اور آخر آیت میں اضمار کو آیت کے ابتدائی مخاطب کی طرف لوٹانا ہوتا ہے۔ پس ظاہر پر محمول کرنا واجب ہوتا ہے حتیٰ کہ ظاہر سے پھیرنے کی دلیل موجود ہو۔ اور ہمارے کلام پر دلیل اس آیت کے نزول کا سبب بھی ہے۔ ائمہ نے روایت کی ہے اور یہ دارقطنی کے الفاظ میں حضرت کعب بن عجرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دیکھا جبکہ جوئیں اس کے چہرے پر گر رہی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا یہ جوئیں تجھے تکلیف دیتی ہیں؟ کعب نے کہا: ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعب کو حلق کرانے کا حکم دیا جبکہ آپ حدیبیہ میں تھے۔ اور صحابہ کے لئے واضح نہیں ہوا تھا کہ وہ یہاں احرام کھول دیں گے وہ ابھی مکہ میں داخل ہونے کی امید پر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فدیہ کو نازل فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم دیا کہ وہ چھ مساکین کو ایک فرق کھانا کھلائیں یا ایک بکری ہدی دیں یا تین دن روزے رکھیں۔ اس حدیث کو بخاری نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ یہ قول کہ (صحابہ کے لئے واضح نہ تھا کہ وہ یہاں احرام کھول دیں گے (4)) دلیل ہے کہ صحابہ کو دشمن کے روکنے کا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، جواز تقدیم الذبح علی الرمی والحلق، صفحہ 422، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المناسک، من قدم نسکا قبل نسک، صفحہ 225 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح بخاری، کتاب المظالم، صفحہ 336، جلد 1 (وزارت تعلیم)　4۔ ایضاً، کتاب المغازی، فی غزوۃ حدیبیہ، صفحہ 599، جلد 2 (وزارت تعلیم)

یقین نہ تھا۔ پس فدیہ کا موجب اذیت اور مرض کی وجہ سے حلق کرانا ہے۔) واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 2: امام اوزاعی نے اس محرم کے بارے فرمایا جس کے سر میں کوئی تکلیف ہو، وہ حلق کرانے سے پہلے فدیہ کے ساتھ کفارہ دے دے تو یہ اس کے لئے جائز ہے۔

میں کہتا ہوں: پھر اس صورت میں فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ کا معنی ہوگا جب وہ حلق کرانے کا ارادہ کرے، جو قادر تھا اور حلق کرایا تو اس پر فدیہ ہے وہ فدیہ نہ دے حتی کہ حلق کرا دے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 3: ابن عبد البر نے کہا: اس حدیث میں نُسُكٍ سے مراد بکری ہے۔ یہ ایک ایسا امر ہے جس میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن روزے اور کھانا کھلانے میں اختلاف ہے۔ جمہور فقہاء کا خیال ہے کہ روزے تین ہیں اور حضرت کعب بن عجرہ کی حدیث سے یہ صحیح محفوظ ہے۔ حضرات حسن، عکرمہ اور نافع سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں: اذیٰ کے فدیہ میں دس روزے ہیں اور دس مساکین کو کھانا کھلانا ہے۔ یہ فقہاء امصار اور ائمہ حدیث میں سے کسی کا قول نہیں ہے اور ابوزبیر کی روایت میں مجاھد عن عبد الرحمن عن کعب بن عجرہ کے سلسلہ سے مروی ہے، کعب نے بیان فرمایا کہ اس نے ذی القعدہ میں احرام باندھا ان کے سر میں جوئیں تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لے آئے وہ اپنی ہانڈی کے نیچے آگ جلا رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گویا تجھے تیرے سر کی جوئیں تکلیف دے رہی ہیں۔ حضرت کعب نے کہا: جی ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حلق کرا لو اور ہدی دے دو۔ حضرت کعب نے عرض کی: میں ہدی نہیں پاتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چھ دن روزہ رکھو (1)۔ حضرت ابو عمر نے کہا: اس حدیث کا ظاہر ترتیب پر ہے لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ اگر یہ صحیح ہوتا تو پھر اس کا معنی ہوتا کہ پہلا پھر دوسرا اختیار کرو جبکہ عام آثار جو حضرت کعب بن عجرہ سے مروی ہے وہ لفظ تخییر (اختیار) کے ساتھ وارد ہیں اور یہ نص قرآنی ہے اسی پر علماء کا فتویٰ اور عمل ہے۔ وباللہ التوفیق

مسئلہ نمبر 4: علماء کا اذیت کے فدیہ میں جو کھانے کا ذکر ہے اس میں بھی اختلاف ہے۔ امام مالک، امام شافعی اور امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: اس میں کھانا دو مد ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مد کے حساب سے ہوں۔ یہ ابوثور اور داؤد کا قول ہے۔ ثوری سے مروی ہے، فرمایا: یہ گندم سے نصف صاع (۲ کلو) اور کھجور، جو اور کشمش سے ایک صاع ہے۔ امام ابوحنیفہ سے بھی اسی کی مثل مروی ہے۔ اس نے نصف صاع گندم کو کھجور کے ایک صاع کے برابر بنایا ہے۔ ابن منذر نے کہا: یہ غلط ہے کیونکہ حضرت کعب کی بعض اخبار میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: تو کھجور کے تین صاع چھ مساکین پر صدقہ کر (2)۔ امام احمد بن حنبل نے کبھی تو اسی طرح کہا جس طرح امام مالک اور امام شافعی نے کہا ہے اور کبھی کہا: اگر وہ گندم کھلانا چاہے تو ہر مسکین کو ایک مد دے اگر کھجور کھلانا چاہئے تو نصف صاع دے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، فمن کان منکم مریضا، صفحہ 244، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ ایضاً، کتاب الحج، جواز حلق الرأس للمحرم، صفحہ 382، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

مسئلہ نمبر 5: مساکین کو اذیت کے کفارہ میں صبح وشام کا کھانا کھلانا جائز نہیں حتیٰ کہ ہر مسکین کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مد کے مطابق دو مد دے۔ یہ امام مالک، ثوری، امام شافعی اور امام محمد بن حسن کا قول ہے۔ امام ابو یوسف نے کہا: صبح وشام کا کھانا کھلانا جائز ہے۔

مسئلہ نمبر 6: اہل علم کا اجماع ہے کہ محرم کے لئے بالوں کا حلق کرنا، انہیں کاٹنا، توڑنا اور انہیں تلف کرنا جائز نہیں خواہ وہ نورہ یا کسی اور چیز کے ساتھ ہو مگر بیماری کی حالت میں جیسا کہ قرآن میں نص موجود ہے اور جس نے احرام کی حالت میں بغیر کسی بیماری کے حلق کرایا تو اس پر فدیہ واجب ہے۔ اور اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جس نے بغیر عذر کے حلق کرایا، سلا ہوا لباس پہنا یا خوشبو لگائی۔ امام مالک نے فرمایا: اس نے برا کیا ہے اور اس پر فدیہ ہے اسے اس میں اختیار ہے اور امام مالک کے نزدیک اس میں عمد، خطا، ضرورت اور عدم ضرورت برابر ہیں۔ امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور اس کے اصحاب اور ابو ثور نے کہا: اسے اختیار نہیں مگر ضرورت میں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِنْ رَأْسِهِ اور جس نے جان بوجھ کر حلق کرایا یا بغیر عذر کے جان بوجھ کر لباس پہنا تو اسے اختیا نہیں ہے اس پر صرف بکری واجب ہے۔

مسئلہ نمبر 7: جس نے بھول کر ایسا کیا اس کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک نے فرمایا: جان بوجھ کر اور بھول کر یہ عمل کرنے والا فدیہ کے وجوب میں برابر ہیں۔ یہ امام ابو حنیفہ، ثوری اور لیث کا قول ہے۔ امام شافعی کے اس مسئلہ میں دو قول ہیں: (۱) اس پر فدیہ نہیں ہے۔ یہ داؤد اور اسحاق کا قول ہے۔ دوسرا اس پر فدیہ ہے۔ اکثر علماء محرم پر لباس پہنے، سر ڈھانپنے یا بعض سر ڈھانپنے، خفین (موزے) پہنے، ناخن کاٹنے، خوشبو لگانے، اذیت کو دور کرنے کی صورت میں فدیہ کو واجب کرتے ہیں۔ اسی طرح جب اپنے جسم کے بالوں کا حلق کیا یا تیل لگایا یا پچھنے لگوانے کی جگہ کا حلق کیا تو یہی حکم ہے۔ عورت اس مسئلہ میں مرد کی طرح ہے۔ اس پر سرمہ لگانے میں فدیہ ہے اگرچہ اس میں خوشبو نہ بھی ہو اور مرد کے لئے سرمہ لگانا جائز ہے جبکہ اس میں خوشبو نہ ہو اور عورت پر فدیہ ہے جو وہ اپنے چہرے کو ڈھانپے یا دستانے پہنے۔ اس میں یہ عمل جان بوجھ کر کرنا، بھول کر کرنا اور جہالت کی وجہ سے کرنا برابر ہے۔ بعض علماء ہر چیز میں دم (بکری) واجب کرتے ہیں۔ داؤد نے کہا: جسم کے بال مونڈنے میں مرد، عورت پر کچھ نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 8: علماء کا مذکورہ فدیہ دینے کی جگہ میں بھی اختلاف ہے۔ عطا نے کہا: جو دم (بکری) ہوگا وہ مکہ میں دیا جائے گا اور جو کھانا یا روزہ ہوگا وہ جہاں چاہے دے سکتا ہے۔ اسی طرح اصحاب رائے نے کہا ہے: حسن سے مروی ہے کہ بکری، مکہ میں دی جائے گی۔ طاؤس اور امام شافعی نے کہا: کھانا اور بکری دونوں مکہ میں ہی دیئے جائیں گے روزہ جہاں چاہے رکھ سکتا ہے کیونکہ روزہ میں اہل حرم کی کوئی منفعت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ (المائدہ: 95) یہ بیت اللہ کے پڑوس میں رہنے والے مساکین پر شفقت کے لئے فرمایا ہے کھانا کھلانے میں بھی منفعت ہے جبکہ روزہ میں کوئی اہل حرم کی منفعت نہیں ہے۔ واللہ اعلم

امام مالک نے فرمایا: یہ عمل جہاں چاہے کرے اور یہ صحیح قول ہے اور یہ مجاہد کا قول ہے۔ امام مالک کے نزدیک یہاں ذبح

سے نسک مراد ہے اور نص قرآن وسنت کی وجہ سے یہ ہدی نہیں ہے اور نسک جہاں چاہے ادا ہوسکتی ہے اور ہدی صرف مکہ میں ہوتی ہے۔ امام مالک کی حجت وہ روایت ہے جو انہوں نے اپنے موطا میں حضرت یحییٰ بن سعید سے روایت کی ہے اس میں ہے حضرت علی بن ابی طالب نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سر کا حلق کرنے کا حکم دیا (آپ بیمار تھے) پھر ان کی طرف سے سقیا کے مقام پر نسک دیا ان کی طرف سے اونٹ نحر کیا۔ مالک نے فرمایا: یحییٰ بن سعید نے فرمایا: حضرت حسین رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ مکہ کی طرف سفر میں نکلے۔ اس حدیث میں واضح دلیل ہے کہ اذیت کا فدیہ مکہ کے علاوہ کسی جگہ دینا بھی جائز ہے اور مالک کے نزدیک ہدی میں جائز ہے کہ وہ حرم میں نحر کی گئی ہو تو وہ اہل حرم کے علاوہ لوگوں کو بھی دے سکتا ہے کیونکہ اس میں مقصود مسلمان مساکین کو کھانا کھلانا ہے۔ مالک نے فرمایا: جب روزہ حرم کے علاوہ کسی جگہ رکھنا جائز ہے تو اہل حرم کے علاوہ لوگوں کو کھانا کھلانا بھی جائز ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا ارشاد فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ مطلق ہے اس میں کسی جگہ کی قید نہیں ہے پس ظاہر کا تقاضا یہ ہے کہ جہاں بھی فدیہ ادا کرے گا جائز ہوگا۔ امام مالک نے فرمایا اَوْ نُسُكٍ جو ذبح کیا جاتا ہے اسے نسک کہا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا یہی نام رکھا ہے اس کو آپ نے ہدی نہیں فرمایا اور ہم پر اس کو ہدی پر قیاس کر کے ہدی کے حکم کی طرف لوٹانا لازم نہیں ہے اور ہم ہدی کا اعتبار نہیں کرتے جو اس کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کعب کو فدیہ کا حکم فرمایا تھا تو وہ حرم میں نہیں تھے۔ پس یہ سب کچھ حرم سے باہر بھی جائز ہے۔ امام شافعی سے اس کی مثل ایک بعید وجہ کے اعتبار سے مروی ہے۔

مسئلہ نمبر 9: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْ نُسُكٍ، نُسُكٍ کا اصل معنی عبادت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَرِنَا مَنَاسِكَنَا (البقرہ:128) یعنی ہمیں اپنی عبادت کی جگہیں دکھا۔ بعض نے فرمایا: لغت میں نُسُكٍ کا معنی غسل کرنا ہے۔ اسی سے ہے: نَسَكَ ثوبة، یعنی اس نے اپنے کپڑے کو دھویا گویا عبادت کرنے والا اپنے نفس کو عبادت کے ذریعے گناہوں سے دھوتا ہے۔ بعض نے فرمایا: النسك کا معنی چاندی کی پگھلی ہوئی ڈلی ہے، اس کی ہر ڈلی کو نسیکہ کہا جاتا ہے۔ گویا عابد اپنے نفس کو گناہوں کی میل اور کھوٹ سے پاک کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ٝ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ

اس میں تیرہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَآ اَمِنْتُمْ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے تم مرض سے ٹھیک ہو جاؤ۔ بعض نے فرمایا: روکنے والے دشمن کے خوف سے امن میں ہو جاؤ۔ یہ حضرت ابن عباس اور قتادہ کا قول ہے۔ یہ مفہوم الفاظ کے زیادہ قریب ہے مگر مرض کا خوف خیال کیا جائے تو پھر مرض سے امن مراد ہوگا (1) جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ علماء کا اختلاف ہے کہ اس کا مخاطب کون ہے۔ حضرت عبداللہ ابن زبیر، حضرت علقمہ اور حضرت ابراہیم نے فرمایا: اس آیت میں وہ لوگ مراد ہیں جنہیں راستہ میں حج اور عمرہ

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 268، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

سے روک دیا گیا ہو وہ لوگ مراد نہیں ہیں جن کے لئے راستہ کھلا ہوا ہو۔ ابن زبیر کے نزدیک متمتع کی صورت یہ ہے کہ آدمی کو روک دیا گیا ہو حتیٰ کہ اس کا حج فوت ہو جائے پھر وہ بیت اللہ تک پہنچے اور عمرہ کر کے حلال ہو جائے پھر آئندہ سال حج کو قضا کرے یہ عمرہ اور آئندہ حج تک کے درمیان میں متمتع ہوا اور دوسرے علماء کے نزدیک محصر متمتع وہ ہے جو روک دیا گیا ہو پھر بغیر عمرہ کئے احرام کھول دے اور اسے موخر کر دے حتیٰ کہ وہ آئندہ سال آئے حج کے مہینوں میں عمرہ کرے اور اسی سال پھر حج کرے۔

حضرت ابن عباس اور علماء کی جماعت کا قول ہے کہ آیت میں روکے گئے اور جن کے لئے راستہ کھلا ہے سب مراد ہیں (1)۔

مسئلہ نمبر 3: علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ تمتع جائز ہے جیسا کہ تفصیل آگے آئے گی اور حج افراد جائز ہے اور حج قران بھی جائز ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام صورتوں کو پسند فرمایا اور کسی صحابی کے حج پر اعتراض نہیں فرمایا بلکہ انہیں ہر حج کی اجازت دی اور ان سے راضی ہوئے۔ علماء کا اختلاف اس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کی کون سی صورت کا احرام باندھا تھا اور حج کی ان صورتوں میں افضل صورت کیا ہے؟ کیونکہ اس کے متعلق وارد احادیث مختلف ہیں، بعض علماء نے فرمایا: جن میں سے امام مالک بھی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج مفرد کیا تھا اور حج افراد، حج قران سے افضل ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرمایا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو تم میں سے حج اور عمرہ کا احرام باندھنا چاہے وہ ایسا کرے اور جو صرف حج کا احرام باندھنا چاہے وہ حج کا احرام باندھ لے اور جو عمرہ کا احرام باندھنا چاہے وہ عمرہ کا احرام باندھ لے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کا احرام باندھا اور آپ کے ساتھ دوسرے لوگوں نے بھی احرام باندھا، اور بعض لوگوں نے عمرہ اور حج دونوں کا احرام باندھا، بعض نے صرف عمرہ کا احرام باندھا اور میں ان لوگوں میں سے تھی جنہوں نے عمرہ کا احرام باندھا تھا۔ اس حدیث کو ایک جماعت نے ہشام بن عروہ عن ابیہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا کے سلسلہ سے روایت کیا ہے۔ بعض نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے حج کا احرام باندھا ہے (2)۔ یہ اختلاف کے مقام پر نص ہے یہ ان علماء کی حجت ہے جنہوں نے حج افراد کا قول کیا اور اس کو افضل فرمایا، امام محمد بن حسن نے امام مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دو مختلف احادیث مروی ہوں اور ہمیں خبر پہنچے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر نے ان میں سے ایک حدیث پر عمل کیا اور دوسری کو ترک کیا تو اس میں دلالت ہے کہ حق وہ ہے جس پر ان دونوں نے عمل کیا۔ اور ابو ثور نے افراد کو پسند کیا اور اسے حج تمتع اور حج قران پر فضیلت دی۔ یہ امام شافعی کا مشہور قول ہے اور دوسرے علماء نے حج تمتع کو پسند فرمایا۔ انہوں نے فرمایا: حج تمتع افضل ہے یہ حضرت عبد اللہ بن عمر اور حضرت عبد اللہ بن زبیر کا مذہب ہے اور یہی امام احمد کا قول ہے۔ یہ امام شافعی کا قول ہے دار قطنی نے کہا: امام شافعی نے کہا: میں نے افراد کو پسند کیا۔ تمتع بھی اچھا ہے ہم اسے ناپسند نہیں کرتے اور جنہوں نے حج تمتع کو فضیلت دی انہوں نے مسلم کی حضرت عمران بن حصین سے مروی حدیث سے حجت پکڑی ہے۔ انہوں نے فرمایا: تمتع کی آیت کتاب اللہ میں نازل ہوئی (یعنی حج تمتع کے بارے میں آیت) ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم دیا پھر کوئی آیت نازل نہ ہوئی جس نے متعۃ الحج

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 268، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، افراد الحج، صفحہ 388، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

کی آیت کو منسوخ کر دیا ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع نہیں فرمایا حتیٰ کہ آپ کا وصال ہو گیا۔ پھر ایک شخص نے اپنی رائے سے کہا جو کہا (1)۔ ترمذی نے روایت کیا ہے کہ ہمیں قتیبہ بن سعید نے بتایا انہوں نے مالک بن انس سے انہوں نے ابن شہاب سے انہوں نے محمد بن عبد اللہ بن حارث بن نوفل سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے سعید بن ابی وقاص، ضحاک بن قیس سے معاویہ بن ابی سفیان کے حج کرنے کے سال سنا ان دونوں نے حج تمتع کا ذکر کیا۔ ضحاک بن قیس نے کہا: حج تمتع نہیں کرے گا مگر وہ جو اللہ کے حکم سے جاہل ہوگا۔ سعد نے کہا: اے میرے بھتیجے! تو نے میری بات کی۔ ضحاک نے کہا: حضرت عمر بن خطاب اس سے منع کرتے ہیں۔ حضرت سعد نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج تمتع کیا تھا اور ہم نے بھی آپ کے ساتھ حج تمتع کیا تھا (2)، یہ حدیث صحیح ہے۔ ابن اسحاق نے زہری اور انہوں نے سالم سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں حضرت ابن عمر کے ساتھ مسجد میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک شامی شخص آپ کے پاس آیا اس نے حج تمتع کے بارے میں پوچھا۔ حضرت ابن عمر نے کہا: خوبصورت عمل ہے۔ اس شخص نے کہا: تمہارا باپ اس سے منع کرتا ہے۔ حضرت ابن عمر نے کہا: تجھ پر افسوس میرا باپ اس سے اگر منع کرتا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج تمتع کیا تھا اور اس کا حکم بھی فرمایا تھا۔ میں اپنے باپ کے قول پر عمل کروں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر عمل کروں؟ تو مجھ سے اٹھ جا۔ اس روایت کو دار قطنی نے نقل کیا ہے۔ یہ حدیث ابو عیسیٰ ترمذی نے صالح بن کیسان عن ابن شہاب عن سالم کے سلسلہ سے نقل کی ہے۔ لیث عن طاؤس عن ابن عباس کے سلسلہ سے روایت کی ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان نے حج تمتع کیا تھا سب سے پہلے حج تمتع سے حضرت معاویہ نے منع کیا تھا۔ یہ حدیث حسن ہے۔ ابو عمر نے کہا: لیث کی یہ حدیث منکر ہے، لیث بن ابی سلیم ضعیف ہے۔ حضرت عمر اور حضرت عثمان سے مشہور ہے کہ وہ دونوں حج تمتع سے منع کرتے تھے اگرچہ اہل علم کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ وہ تمتع جس سے حضرت عمر نے منع کیا تھا اور جس پر مارا تھا وہ حج کو فسخ کر کے عمرہ کرنا ہے۔ رہا پہلے عمرہ کرنا اور پھر حج کرنا اس سے حضرت عمر منع نہیں کرتے تھے اور جنہوں نے حضرت عمر کے حج تمتع سے منع کرنے کو صحیح کہا ہے ان کا خیال ہے کہ آپ حج تمتع سے اس لئے منع فرماتے تھے تاکہ بیت اللہ میں لوگ سال میں دو یا زیادہ مرتبہ آئیں تاکہ موسم حج کے علاوہ بھی زائرین کی اس میں کثرت رہے۔ آپ نے اہل حرم پر رفق و مہربانی داخل کرنے کا ارادہ کیا تھا تاکہ حضرت ابراہیم کی دعا ثابت ہو جائے فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْۤ اِلَيْهِمْ۔ (ابراہیم: 37)

دوسرے کئی علماء نے فرمایا: حضرت عمر نے حج تمتع سے اس لئے منع فرمایا تھا کیونکہ آپ نے دیکھا کہ لوگ آسانی اور رخصت کی وجہ سے حج تمتع کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ پس آپ کو حج افراد اور حج قران کے ضیاع کا اندیشہ ہوا جبکہ وہ دونوں حج بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہیں۔ امام احمد نے حج تمتع کے اختیار پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے حجت پکڑی ہے ''اگر مجھے اپنے معاملہ کا پہلے علم ہوتا جس کا مجھے بعد میں علم ہوا تو میں ہدی ساتھ نہ لے آتا اور میں حج کے احرام کو عمرہ بنا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، جواز التمتع، صفحہ 403، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ جامع ترمذی، کتاب الحج، ما جاء فی التمتع، صفحہ 101، جلد 1 (وزارت تعلیم)

دیتا (1)۔ اس حدیث کو ائمہ نے نقل کیا ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: حج قران افضل ہے، ان میں امام ابو حنیفہ اور ثوری ہیں۔ یہی قول مزنی کا ہے۔ انہوں نے فرمایا: کیونکہ اس میں انسان دو فرض اکٹھے ادا کرنے والا ہوتا ہے۔ یہ اسحاق کا قول ہے، اسحاق نے کہا: رسول اللہ ﷺ حج قران کرنے والے تھے۔ یہ حضرت علی بن ابی طالب کا قول بھی ہے اور حضرت علی نے حج قران کو پسند کیا ہے اور اس کو فضیلت دی ہے۔ انہوں نے اس روایت سے حجت پکڑی ہے جو بخاری نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے، فرمایا: میں نے وادی عقیق میں رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ”اس رات میرے رب کی طرف سے ایک آنے والا آیا اس نے کہا: اس مبارک وادی میں نماز پڑھو اور حج وعمرہ کرو (2)۔“ ترمذی نے حضرت انس سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے: لبیك بعمرة وحجة۔ (3) یعنی آپ نے عمرہ اور حج کی نیت سے تلبیہ کہا۔ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن ہے۔ ابو عمر نے کہا: ان شاء اللہ حج افراد افضل ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ حج مفرد کرنے والے تھے۔ اسی وجہ سے ہم نے کہا: حج افراد افضل ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کے حج افراد کے متعلق آثار زیادہ صحیح ہیں نیز حج افراد میں عمل زیادہ ہے پھر عمرہ دوسرا عمل ہے یہ سب طاعت ہیں اور جس میں عمل زیادہ ہو وہ افضل ہوتا ہے۔ ابو جعفر نحاس نے کہا: حج افراد کرنے والے کو متمتع سے زیادہ تھکاوٹ ہوتی ہے کیونکہ وہ اپنے احرام پر باقی رہتا ہے۔ اس لئے اس میں ثواب زیادہ ہے اور احادیث کے اتفاق کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب حج تمتع اور قران کا حکم دیا تو یہ کہنا جائز ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حج تمتع اور قران کیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَنَادٰی فِرْعَوْنُ فِیْ قَوْمِهٖ (زخرف: 51)۔ حضرت عمر بن خطاب نے فرمایا: ہم نے رجم کیا اور رسول اللہ ﷺ نے رجم کیا حالانکہ آپ ﷺ نے رجم کا حکم فرمایا تھا۔

میں کہتا ہوں: آپ ﷺ کے حج میں ظاہر حج قران ہے آپ قران کرنے والے تھے اس کی وجہ حضرت عمر اور حضرت انس کی مذکورہ احادیث ہیں اور صحیح مسلم میں بکر سے انہوں نے حضرت انس سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو حج اور عمرہ کا اکٹھا تلبیہ کہتے ہوئے سنا (4)۔ بکر نے کہا میں نے یہ حضرت ابن عمر سے بیان کیا تو انہوں نے فرمایا نبی کریم ﷺ نے صرف حج کا تلبیہ کہا۔ میں حضرت انس سے ملا۔ میں نے انہیں حضرت ابن عمر کا قول بیان کیا۔ حضرت انس نے کہا: تم ہمیں شمار نہیں کرتے مگر بچے! میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے: لبیك عمرة وحجة۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، فرمایا: نبی کریم ﷺ نے عمرہ کا احرام باندھا اور صحابہ کرام نے حج کا احرام باندھا اور نبی کریم ﷺ نے احرام نہ کھولا اور ان صحابہ نے بھی احرام نہ کھولا جنہوں نے ہدی ساتھ لائی تھی اور باقی لوگوں نے احرام کھول دیا تھا۔ بعض اہل علم نے کہا: رسول اللہ ﷺ حج قران کرنے والے تھے۔ جب آپ قران کرنے والے تھے تو آپ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، حجة النبی ﷺ، صفحہ 396، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
2۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، قول النبی العقیق واد مبارك، صفحہ 207، جلد 1 (وزارت تعلیم)
3۔ جامع ترمذی، کتاب الحج، فی الجمع بین الحج والعمرة، صفحہ 101، جلد 1 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، فی الأفراد والقران، صفحہ 404، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

نے حج اور عمرہ کیا تھا۔ اس طرح احادیث متفق ہوگئیں۔ نحاس نے کہا: سب سے بہتر وہ ہے جو کہا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عمرہ کا احرام باندھا تھا۔ جس نے آپ کو دیکھا اس نے کہا: آپ نے عمرہ کیا پھر حج کا احرام باندھا، بعض نے آپ کو دیکھا کہ آپ نے افراد کیا پھر کہا: لبیك بحجة وعمرة (1) جس نے آپ سے یہ سنا اس نے کہا: آپ نے قران کیا۔ پس احادیث متفق ہوگئیں اور اس پر دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ سے کسی نے یہ روایت نہیں کیا کہ آپ نے فرمایا ہو میں نے حج مفرد کیا اور تمتع نہیں کیا اور آپ سے یہ صحیح مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: میں نے حج قران کیا۔ جیسا کہ نسائی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا۔ آپ ﷺ نے مجھ سے پوچھا تو نے کیسا احرام باندھا؟ میں نے عرض کی: میں نے آپ کے احرام جیسا باندھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں ہدی ساتھ لایا ہوں اور حج قران کا احرام باندھا ہے۔ حضرت علی نے فرمایا اور آپ ﷺ نے صحابہ کرام سے فرمایا: اگر مجھے اپنے معاملہ کا پہلے علم ہوتا جس کا مجھے بعد میں علم ہوا تو میں بھی ایسا کرتا جیسا تم نے کیا ہے لیکن میں ہدی ساتھ لایا ہوں اور میں نے حج قران کا احرام باندھا ہے (2)۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے ثابت ہے، فرمایا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ لوگوں کو کیا ہے کہ انہوں نے اپنے عمرہ کا احرام کھول دیا ہے اور آپ نے احرام نہیں کھولا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے اپنے سر پر گوند لگائی ہوئی ہے اور میں ہدی ساتھ لایا ہوں میں احرام نہیں کھولوں گا حتیٰ کہ میں قربانی کرلوں گا (3)۔ یہ حدیث بیان کرتی ہے کہ آپ ﷺ حج قران کرنے والے تھے، اگر آپ حج تمتع یا حج مفرد کرنے والے ہوتے تو آپ ہدی کے نحر کی وجہ سے نہ رکتے۔

میں کہتا ہوں: نحاس نے جو یہ کہا ہے کہ کسی سے یہ مروی نہیں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہو کہ میں نے حج افراد کیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت پہلے گزر چکی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: میں حج کا احرام باندھتا ہوں اور مسلم کی حضرت ابن عمر سے روایت ہے اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پہلے عمرہ کیا پھر حج کا احرام باندھا تو میں حج کا احرام باندھتا ہوں کے ارشاد میں حج مفرد پر دلیل باقی نہ رہی اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد کہ میں نے حج قران کیا باقی رہا اور حضرت انس جو آپ ﷺ کے خادم تھے فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو لبیك بحجة وعمرة معاً کہتے ہوئے سنا۔ یہ جملہ حق قران پر نص صریح ہے کسی تاویل کا احتمال نہیں رکھتا۔ دارقطنی نے عبد اللہ بن ابی قتادہ سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے حج اور عمرہ کو جمع کیا کیونکہ آپ کو معلوم تھا کہ اس کے بعد آپ دوبارہ حج کرنے والے نہیں۔

مسئلہ نمبر 4: جب حج مفرد، تمتع اور قران کے بارے قول گزر چکا ہے کہ یہ سب بالاجماع جائز ہیں اور حج تمتع کی علماء کے نزدیک چار صورتیں ہیں: (۱) ایک صورت ایسی ہے جس پر اجماع ہے اور تین صورتیں مختلف فیہا ہیں۔ رہی وہ صورت جو مجتمع علیہ ہے وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے **فَمَنۡ تَمَتَّعَ بِالۡعُمۡرَةِ اِلَى الۡحَجِّ فَمَا اسۡتَيۡسَرَ مِنَ الۡهَدۡيِ**۔

یعنی انسان حج کے مہینوں میں عمرہ کا احرام باندھے۔ اس کا بیان آگے آئے گا اور وہ شخص آفاقی ہو، مکہ مکرمہ میں آیا ہو، عمرہ

1۔ سنن نسائی، کتاب المناسک، قران، صفحہ 13، جلد 2 (وزارت تعلیم) 2۔ ایضاً

3۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، التمتع والقران والافراد بالحج، صفحہ 213، جلد 1 (وزارت تعلیم)

سے فارغ ہو گیا ہو پھر مکہ میں اسی سال حج شروع کرنے تک بغیر احرام کے رہا ہو، اپنے گھر کی طرف واپس نہ گیا ہو یا باہر سے آنے والوں کے میقات کی طرف جانے سے پہلے اسی کیفیت میں رہا ہو۔ جب وہ اس طرح کرے گا تو وہ متمتع ہو گا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے وہ واجب کیا ہے جو متمتع پر واجب کیا ہے اور یہ میسر ہدی ہے۔ وہ اس ہدی کو ذبح کرے گا اور منیٰ یا مکہ کے مساکین کو کھلائے گا۔ اگر ہدی نہ پائے تو تین روزے رکھے گا اور سات روزے اپنے شہر واپس آکر رکھے گا۔ جیسا کہ آگے آئے گا اور مسلمانوں کا اجماع ہے کہ اس پر دسویں کا روزہ نہیں ہے اور ایام تشریق کے روزوں کے بارے میں اختلاف ہے۔ اس حج تمتع پر علماء متقدمین و متاخرین کا اجماع ہے۔ اس کی آٹھ شروط ہیں: (۱) حج و عمرہ کا جمع کرنا (۲) ایک سفر میں ہونا (۳) ایک سال میں ہونا (۴) حج کے مہینوں میں ہونا (۵) عمرہ کا پہلے کرنا (۶) دونوں کو نہ ملانا بلکہ عمرہ سے فارغ ہونے کے بعد حج کا احرام باندھنا (۷) عمرہ اور حج ایک شخص کی طرف سے ہونا (۸) اہل مکہ کے علاوہ سے ہونا۔ ان شروط میں غور کر جو ہم نے تمتع کے حکم میں بیان کی ہیں تو ان کو پالے گا۔

دوسری وجہ حج قران ہے وہ یہ ہے کہ ایک احرام میں حج اور عمرہ کو جمع کرنا، وہ دونوں کا اکٹھا احرام حج کے مہینے میں باندھے یا کسی اور مہینے میں باندھے اور وہ کہے: لبيك بحجة و عمرة معا (میں نے حج و عمرہ کا اکٹھا احرام باندھا) جب مکہ شریف میں آئے تو حج و عمرہ کے لئے ایک طواف کرے اور ایک سعی کرے۔ یہ امام مالک، امام شافعی، ان کے اصحاب، اسحاق اور ابو ثور کی رائے ہے۔ یہ حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت عطا بن ابی رباح، حسن، مجاہد اور طاؤس کا مذہب ہے۔ کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے، فرمایا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حجۃ الوداع کے لئے نکلے ہم نے عمرہ کا احرام باندھا... الحدیث (1)۔

اس حدیث میں ہے جنہوں نے حج و عمرہ کو جمع کیا تھا، انہوں نے ایک طواف کیا تھا، یہ حدیث بخاری نے نقل کی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ سے جانے کے دن فرمایا جبکہ حضرت عائشہ نے بیت اللہ کا طواف نہیں کیا تھا کیونکہ آپ کو حیض آ گیا تھا: تیرا طواف تیرے حج اور عمرہ کی طرف سے ہو گا۔ ایک روایت میں: تیرا صفا و مروہ کا طواف تیرے حج اور عمرہ کی طرف سے ہو گا (2)۔ اس کو مسلم نے روایت کیا ہے یا مکہ پہنچ کر دو طواف اور دو سعی کرے۔ یہ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب، ثوری، اوزاعی، حسن بن صالح اور ابن ابی لیلیٰ کا نظریہ ہے۔ حضرت علی اور حضرت ابن مسعود سے بھی مروی ہے۔ یہی قول شعبی اور جابر بن زید کا بھی ہے اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی احادیث سے حجت پکڑی ہے کہ انہوں نے حج اور عمرہ کو جمع کیا اور دونوں کے لئے دو طواف اور دو سعی کیں پھر فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح کرتے دیکھا ہے۔ دارقطنی نے اپنی سنن میں یہ احادیث روایت کی ہیں اور تمام کو ضعیف قرار دیا ہے اور حج قران کو تمتع کے باب سے بتایا ہے کیونکہ قارن ایک مرتبہ عمرہ اور ایک حج کے سفر کی مشقت کو ترک کرنے کے ساتھ متمتع ہوتا ہے اور دونوں سے اکٹھا متمتع ہوتا ہے اور ہر ایک کے لئے میقات سے علیحدہ احرام نہیں باندھتا اور حج کو عمرہ کے ساتھ ملاتا ہے۔ پس یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے تحت داخل

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، بیان وجوہ الاحرام، صفحہ 386، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
2۔ ایضاً، صفحہ 91-390، جلد 1

ہے: فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ۔ یہ تمتع کی ایک صورت ہے اس کے جواز میں علماء کا کوئی اختلاف نہیں اور اہل مدینہ حج اور عمرہ جمع کرنے کی اجازت صرف اس صورت میں دیتے ہیں جبکہ حاجی ہدی ساتھ لایا ہو۔ اور ان کے نزدیک اس صورت میں اونٹ دینا ہوگا اس سے کم نہیں۔ قران کے تمتع ہونے پر دلیل حضرت ابن عمر کا قول ہے۔ قران کو انہوں نے اہل آفاق کے لئے بنایا ہے اور پھر یہ آیت پڑھی۔ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

پس جو مسجد حرام والوں سے ہو اور وہ حج تمتع یا حج قران کرے تو اس پر قران اور تمتع کا دم (بکری) نہیں ہے۔ امام مالک نے فرمایا: میں نے نہیں سنا کہ کسی مکی نے حج قران کیا ہو اگر وہ کرے گا تو اس پر نہ ہدی ہے اور نہ روزہ ہے اور امام مالک کے قول پر جمہور فقہاء کا نظریہ ہے۔ عبد الملک بن ماجشون نے کہا: جب مکی حج، عمرہ کے ساتھ کرے گا تو اس پر قران کا دم (بکری) ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ سے خون اور روزہ کو تمتع میں ساقط کیا ہے۔

تیسری وجہ تمتع کی یہ ہے جس پر حضرت عمر نے دھمکی دی تھی۔ آپ نے فرمایا: دو متعے ایسے ہیں جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں تھے اور میں ان سے منع کرتا ہوں اور ان پر سزا دیتا ہوں۔ ایک عورتوں کا متعہ اور دوسرا متعۃ الحج۔ اس کے جواز میں علماء کا ابھی تک جھگڑا ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ آدمی حج کا احرام باندھے حتیٰ کہ جب مکہ میں داخل ہو تو حج کے احرام کو عمرہ میں تبدیل کر دے۔ پھر احرام کھول دے پھر بغیر احرام کے ٹھہرا رہے حتیٰ کہ آٹھویں کے دن حج کا احرام باندھے۔ یہ وہ وجہ ہے جس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے آثار وارد ہیں۔ اس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حج میں صحابہ کرام کو حکم دیا کہ جس کے پاس ہدی نہیں ہے اور وہ ہدی ساتھ نہیں لایا ہے اور وہ حج کا احرام باندھ چکا تھا تو وہ اسے عمرہ کا احرام باندھے اور ان آثار کی تصحیح پر بھی علماء کا اجماع ہے۔ ان میں سے کسی اثر کو نہیں چھوڑا ہے لیکن اس کے متعلق قول اور عمل کی وجہ سے عمل میں اختلاف ہے۔ جمہور علماء نے اس پر عمل ترک کیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک یہ عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور آپ کے صحابہ کے ساتھ خاص تھا اور اسی حج کے متعلق تھا۔

حضرت ابوذر نے کہا: حج میں تمتع ہمارے لئے خاص تھا۔ یہ مسلم نے نقل کیا ہے۔ ایک روایت میں ہے۔ حضرت ابوذر نے کہا: دو متعے صرف ہمارے ساتھ خاص تھے۔ عورتوں کے ساتھ متعہ اور متعۃ الحج (1)۔ خصوصیت کی علت اور اس میں فائدہ وہ ہے جو حضرت ابن عباس نے بیان فرمایا ہے لوگ یہ نظریہ رکھتے تھے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کرنا زمین پر بہت بڑا گناہ ہے اور وہ خود محرم کو صفر بنا دیتے تھے اور وہ کہتے تھے جب اونٹ کا زخم ٹھیک ہو جائے گا، اثر مٹ جائے گا اور صفر کا مہینہ گزر جائے گا تو عمرہ کرنے والے کے لئے عمرہ حلال ہوگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب چار ذی الحجہ کو حج کا احرام باندھے ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کو عمرہ بنانے کا حکم دیا۔ یہ حکم صحابہ کو بڑا عظیم لگا۔ انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! یہ احرام کھولنا کیسا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر پابندی سے حلال ہو گئے ہو (2)۔ یہ حدیث مسلم نے نقل فرمائی ہے۔ مسند صحیح ابو حاتم میں حضرت

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، جواز التمتع، صفحہ 402، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ ایضاً، کتاب الحج، جواز العمرۃ فی اشهر الحج، صفحہ 406، جلد 1

ابن عباس سے مروی ہے فرمایا: اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ کو ذی الحجہ میں اس لئے عمرہ کرایا تھا کہ اہل شرک کے نظریہ کا قلع قمع ہو جائے۔ قبیلہ قریش اور جوان کے دین کے پیروکار تھے وہ کہتے تھے: جب اونٹ سے اثر ختم ہو جائے گا اور اس کا زخم ٹھیک ہو جائے گا اور صفر کا مہینہ گزر جائے گا تو عمرہ کرنے والے کے لئے عمرہ حلال ہو جائے گا، وہ عمرہ کرنا حرام سمجھتے تھے حتیٰ کہ ذوالحجہ گزر جائے۔ حضرت عائشہ کو آپ ﷺ نے ان کے نظریہ کو غلط ثابت کرنے کے لئے عمرہ کرایا تھا۔ اس میں دلیل ہے کہ رسول اللہ نے حج کو عمرہ میں اس لئے تبدیل کیا تھا تا کہ آپ انہیں دکھائیں کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ آپ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کے ساتھ خاص تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو حج اور عمرہ مکمل کرنے کا حکم مطلق دیا جو بھی ان میں داخل ہو اور ظاہر کتاب اللہ کی مخالفت کرنا ثابت نہیں مگر ناسخ کتاب یا سنت مبینہ کی طرف رجوع ضروری ہے جس میں کوئی اشکال نہ ہو۔ اور ان علماء نے حضرت ابوذر کے قول اور حضرت حارث بن بلال کی حدیث سے حجت پکڑی ہے۔ حارث اپنے باپ سے روایت فرماتے ہیں، انہوں نے فرمایا: ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! حج کا فسخ کرنا ہمارے ساتھ خاص ہے یا تمام لوگوں کے لئے ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہمارے ساتھ خاص ہے (1)۔ اور فقہاء حجاز، عراق اور شام کا یہ نظریہ ہے مگر ایک چیز حضرت ابن عباس، حسن، اور سدی سے مروی ہے اور امام احمد کا بھی یہی قول ہے۔ امام احمد نے فرمایا: میں ان صحیح متواتر آثار کو جو حج کو عمرہ میں فسخ کرنے کے متعلق وارد ہیں حضرت حارث بن بلال عن ابیہ کی حدیث سے اور حضرت ابوذر کے قول سے رد نہیں کرتا۔ امام احمد نے فرمایا: جو حضرت ابوذر نے کہا ہے اس پر اجماع نہیں ہے اگر اجماع ہوتا تو حجت ہوتا۔ فرمایا: حضرت ابن عباس نے حضرت ابوذر کی مخالفت کی ہے اور اس کو خصوصیت نہیں بنایا ہے۔

امام احمد نے حضرت جابر کی صحیح حدیث سے حجت پکڑی ہے جو حج کے بارے میں ہے۔ اس میں ہے: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اگر مجھے اپنے معاملہ کا پہلے علم ہوتا جس کا مجھے بعد میں علم ہوا تو میں ہدی ساتھ نہ لاتا اور اسے عمرہ بناتا۔ حضرت سراقہ بن مالک بن جعشم اٹھے اور عرض کی: یا رسول اللہ! یہ ہمارے اس سال کے لئے ہے یا ہمیشہ کے لئے ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں داخل کیا اور فرمایا: عمرہ حج میں داخل ہوا۔ یہ دو مرتبہ فرمایا: نہیں بلکہ یہ ہمیشہ کے لئے ہے (2)۔ یہ مسلم کے لفظ ہیں اور امام بخاری کا میلان بھی اسی طرف ہے کیونکہ انہوں نے یہ باب باندھا ہے، جس نے حج کا تلبیہ کہا اور اس کا نام لیا۔ پھر حضرت جابر کی حدیث ذکر کی، ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ آئے اور ہم نے حج کا احرام باندھا ہوا تھا ہمیں رسول اللہ ﷺ نے حج کے احرام کو عمرہ کا احرام بنانے کا حکم دیا (3)۔

بعض علماء نے فرمایا: احرام کھولنے کا نبی کریم ﷺ نے جو حکم دیا تھا وہ دوسری وجہ سے تھا۔ مجاہد نے وہ وجہ ذکر کی ہے وہ یہ ہے کہ صحابہ کرام نے پہلے حج کو فرض نہیں کیا تھا بلکہ آپ ﷺ نے انہیں مطلقاً احرام باندھنے اور نئے حکم کا انتظار کرنے کا

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب المناسك، الرجل يحل بالحج ثم يجعلها عمرة، صفحہ 252، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، حجة النبی ﷺ، صفحہ 396، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

3۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، من لبّى بالحج وسماه، صفحہ 213، جلد 1 (وزارت تعلیم)

حکم دیا تھا۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یمن سے مطلق احرام باندھا تھا۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا احرام تھا اور اس پر دلیل یہ ارشاد ہے اگر مجھے اپنے معاملہ کا پہلے علم ہوتا جس کا مجھے بعد میں علم ہوا تو میں ہدی ساتھ نہ لاتا اور اس احرام کو عمرہ کا احرام بنا دیتا۔ گویا آپ حکم کے منتظر ہو کر نکلے تھے اور صحابہ کو بھی اسی کا حکم دیا تھا۔ اس پر دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: ''میرے پاس میرے رب کی طرف سے آنے والا اس مبارک وادی میں آیا اور کہا: تم کہو میں حج کو عمرہ میں بدلتا ہوں (1)''۔

متعہ کی چوتھی وجہ محصر اور جس کو بیت اللہ سے روکا گیا ہو اس کا متعہ ہے۔ یعقوب بن شیبہ نے ذکر کیا ہے، فرمایا: ہمیں ابو سلمہ تبوذکی نے بتایا انہوں نے کہا ہمیں وہب نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں اسحاق بن سوید نے بتایا فرمایا: میں نے حضرت عبداللہ بن زبیر کو یہ خطبہ دیتے ہوئے سنا: اے لوگو! اللہ کی قسم! حج تمتع اس طرح نہیں ہے جس طرح تم کرتے ہو تمتع یہ ہے کہ ایک شخص حج کے ارادہ سے نکلے پھر دشمن یا کوئی عذر اسے روک لے حتیٰ کہ ایام حج گزر جائیں پھر وہ بیت اللہ کے پاس آئے طواف کرے صفا و مروہ کی سعی کرے پھر آئندہ سال تک حلال ہونے کے ساتھ متمتع ہو، پھر حج کرے اور ہدی دے۔ محصر کا حکم اور اس کے متعلق علماء کی آراء واضح طور پر گزر چکی ہیں۔ والحمد للہ۔ اور ان (حضرت عبداللہ بن زبیر) کے مذہب سے یہ تھا کہ محصر احرام نہ کھولے بلکہ وہ اپنے احرام پر باقی رہے حتیٰ کہ دسویں کے دن اس کی طرف سے ہدی ذبح کی جائے پھر وہ حلق کرائے اور اپنے احرام پر باقی رہے حتیٰ کہ وہ مکہ میں آئے پھر عمرہ کے عمل سے اپنے حج سے حلال ہو۔ اور حضرت ابن زبیر نے جو کچھ ذکر کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے عموم کے خلاف ہے: فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ۔ اس کے بعد فرمایا وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ (اللہ کے لئے حج اور عمرہ مکمل کرو) احصار کے حکم میں حج اور عمرہ کے درمیان کوئی فرق بیان نہیں کیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ جب حدیبیہ میں روکے گئے تو صحابہ نے احرام کھولا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی احرام کھولا اور صحابہ کرام کو احرام کھولنے کا حکم دیا۔

علماء کا اختلاف ہے کہ متمتع کو متمتع کیوں کہا جاتا ہے۔ ابن قاسم نے کہا: کیونکہ وہ ہر اس چیز سے متمتع ہوتا ہے جس کا کرنا محرم کے لئے عمرہ سے حلال ہونے کے وقت سے حج شروع کرنے کے وقت تک جائز نہیں ہوتا۔ دوسرے علماء نے کہا: اس کو متمتع کہا جاتا ہے کیونکہ وہ دو سفروں میں سے ایک کے ساقط کرنے کے ساتھ متمتع ہوا کیونکہ عمرہ کا حق ہے کہ تو اس کے لئے سفر کا قصد کرے اور حج کے لئے بھی اسی طرح حق ہے جب ایک کے ساقط کرنے کے ساتھ متمتع ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس پر ہدی کو لازم کیا جیسے قارن پر لازم کیا جس نے ایک سفر میں حج اور عمرہ کو جمع کیا۔ پہلی وجہ اتم ہے کیونکہ وہ ہر اس چیز سے متمتع ہوتا ہے جو حلال کے لئے کرنا جائز ہوتا ہے اور اس سے اپنے شہر سے حج کرنے کے لئے سفر ساقط ہوتا ہے جو حلال کے لئے کرنا جائز ہوتا ہے اور اس سے اپنے شہر سے حج کرنے کے لئے سفر ساقط ہوا اور میقات سے حج کا احرام باندھنا بھی ساقط ہوا۔ اس وجہ سے حضرت عمر اور حضرت ابن مسعود نے حج تمتع کو ناپسند کیا۔ ان دونوں حضرات نے یا ان میں سے ایک نے فرمایا: تم میں سے کوئی منیٰ میں آئے گا جبکہ اس کے ذکر سے منی کے قطرے گر رہے ہوں گے جبکہ حج تمتع پر مسلمان کا اجماع ہے۔

1۔ ایضاً، کتاب الحج، قول النبی العتیق واد مبارک، صفحہ 207، جلد 1

علماء کی ایک جماعت نے کہا: حضرت عمر نے اس کو ناپسند کیا کیونکہ وہ پسند کرتے تھے کہ بیت اللہ کی سال میں دو مرتبہ زیارت کی جائے۔ ایک دفعہ حج کے لئے ایک دفعہ عمرہ کے لئے۔ حضرت عمر حج مفرد کو افضل سمجھتے تھے اور وہ حج مفرد کا حکم دیتے تھے، اس کی طرف ان کا میلان تھا اور استحباب کے طور پر حج تمتع اور قران سے منع کرتے تھے۔ اسی وجہ سے انہوں نے کہا: اپنے حج اور اپنے عمرہ کو علیحدہ علیحدہ کرو۔ یہی تمہارے لئے حج کا اتمام ہے۔ حج کے مہینوں کے علاوہ عمرہ کا احرام باندھنا، عمرہ کا اتمام ہے(1)۔

مسئلہ نمبر 5: جو شخص حج کے مہینوں میں عمرہ کرے پھر اپنے شہر کو واپس آجائے اور پھر اسی سال حج کرے، اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ جمہور علماء کا قول یہ ہے کہ وہ متمتع نہیں ہے اس پر نہ ہدی ہے اور نہ روزہ ہے۔ حسن بصری نے کہا: وہ متمتع ہے اگرچہ وہ گھر کی طرف لوٹ بھی آئے خواہ اس نے حج کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ انہوں نے فرمایا: کیونکہ کہا جاتا ہے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ متعہ ہے۔ یہ ہشیم نے یونس سے انہوں نے حسن سے روایت کیا ہے۔ یونس نے حسن سے روایت کیا ہے کہ اس پر ہدی نہیں ہے، پہلا قول صحیح ہے اسی طرح ابو عمر نے ذکر کیا ہے، اس نے حج کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ اس کو ابن منذر نے ذکر نہیں کیا۔ ابن منذر نے کہا: ان کی حجت کتاب اللہ کا ظاہر ہے ارشاد ہے: فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ۔ اس آیت میں کوئی استثناء نہیں ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کی طرف لوٹنے والا ہو یا نہ ہو۔ اگر یہ اللہ تعالیٰ کا مراد ہوتا تو اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں یا اپنے رسول کی زبان پر بیان کر دیتا۔ سعید بن مسیب سے حسن کے قول کی طرح مروی ہے۔ ابو عمر نے کہا: حسن سے اس مسئلہ میں ایسا قول مروی ہے جس کی متابعت نہیں کی گئی اور اہل علم میں سے کسی کا یہ نظریہ نہیں ہے۔ انہوں نے فرمایا: جس نے دسویں ذی الحجہ کے دن کے بعد عمرہ کیا وہ متعہ ہے۔ طاؤس سے دو قول مروی ہیں، دونوں زیادہ شاذ قول ہیں۔ اس سے بھی جو ہم نے حسن سے ذکر کیا ہے، ایک یہ ہے کہ جس نے حج کے مہینوں کے علاوہ کسی مہینہ میں عمرہ کیا پھر وہ ٹھہرا رہا حتیٰ کہ حج کا وقت داخل ہو گیا، پھر اس نے اسی سال حج کیا تو وہ متمتع ہے(2)۔ یہ طاؤس کے علاوہ کسی عالم نے نہیں کہا ہے اور فقہاء امصار میں سے کسی کا یہ نظریہ نہیں۔ یہ اس لئے کہ حج کے مہینے عمرہ کی نسبت حج کا زیادہ حق رکھتے ہیں کیونکہ عمرہ پورے سال میں سنت ہے اور حج کے لئے معلوم مہینے ہیں۔ جب کسی نے حج کے مہینوں میں عمرہ کیا تو اس نے ایسے وقت میں عمرہ کیا جس میں حج اولیٰ تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اور اپنے رسول ﷺ کی زبان پر متمتع اور قران کرنے والے کے لئے حج کے مہینوں میں عمرہ کرنے کی رخصت دی ہے اور اس کے لئے جو عمرہ کو علیحدہ کرے۔ یہ اس کی طرف سے رحمت ہے اور اس میں میسر ہدی کو اس میں مقرر کیا ہے۔ دوسری وجہ وہ ہے جو مکی نے بیان کی ہے جو کسی شہر سے حج تمتع کرے اس پر ہدی ہے۔ یہ ظاہر قرآن کے مطابق نہیں ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ تمتع علماء کے نزدیک ان شرائط کے ساتھ جائز ہے جن کا ہم نے ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 6: علماء کا اجماع ہے کہ ایک ایسا شخص جو اہل مکہ سے نہ ہو اگر وہ حج کے مہینوں میں مکہ میں ٹھہرنے کے ارادہ

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب الحج، جامع ما جاء فی العمرۃ، صفحہ 358 (وزارت تعلیم)
2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 269، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

سے عمرہ کرتے ہوئے آئے پھر اسی سال حج کرے تو وہ متمتع ہے۔ اس پر وہی کچھ ہے جو متمتع پر ہے اور مکی کے بارے میں اجماع ہے کہ وہ میقات کے پیچھے سے عمرہ کا احرام باندھتے ہوئے آئے پھر مکہ سے حج شروع کرے جبکہ اس کے گھر والے مکہ میں ہوں اور وہ مکہ کے علاوہ کسی جگہ نہ ٹھہرے تو اس پر بکری نہیں ہے۔ اسی طرح کا حکم ہے جب وہ مکہ کے علاوہ کسی جگہ ٹھہرے یا مکہ میں ٹھہرے جبکہ مکہ میں اس کے اہل ہوں اور مکہ کے علاوہ کسی شہر میں بھی اس کے اہل ہوں۔ علماء کا اجماع ہے کہ اگر وہ مکہ سے اپنے اہل کے ساتھ منتقل ہو گیا پھر وہ حج کے مہینوں میں عمرہ کرتے ہوئے آیا پھر مکہ میں ٹھہرا رہا حتیٰ کہ اسی سال حج کیا تو وہ متمتع ہے۔

مسئلہ نمبر 7: امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ، ان کے اصحاب، ثوری اور ابوثور کا اتفاق ہے۔ متمتع عمرہ کے لئے بیت اللہ کا طواف کرے گا اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کرے گا تو اس پر اس کے بعد حج کے لئے دوسرا طواف اور دوسری صفا و مروہ کے درمیان سعی ہو گی۔ عطا اور طاؤس سے مروی ہے کہ ایک سعی کافی ہے۔ پہلا قول مشہور ہے وہی جمہور کا نظریہ ہے اور قارن کے طواف کے متعلق اختلاف گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 8: اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جو حج کے مہینوں کے علاوہ کسی مہینہ میں عمرہ شروع کرے پھر حج کے مہینوں میں عمرہ کا عمل کرے۔ امام مالک نے فرمایا: اس کا عمرہ اس مہینہ میں ہوا جس میں وہ حلالی ہوا تھا اگر وہ حج کے مہینوں کے علاوہ کسی مہینہ میں اس سے حلالی ہونا چاہتا ہے تو وہ متمتع نہیں ہے۔ اگر وہ حج کے مہینوں میں عمرہ سے حلالی ہوا ہے تو وہ متمتع ہے اگر اسی سال حج کرے۔ امام شافعی نے فرمایا: جب عمرہ کے لئے حرمت والے مہینوں میں بیت اللہ کا طواف کرے تو وہ متمتع ہے اگر اسی سال حج کرے کیونکہ عمرہ بیت اللہ کے طواف کے ساتھ مکمل ہوتا ہے اور اس کے کمال کی طرف دیکھا جاتا ہے یہ حسن بصری، حکم بن عیینہ، ابن شبرمہ اور سفیان ثوری کا قول ہے اور قتادہ، احمد اور اسحق نے کہا: عمرہ اس مہینہ کے لئے ہے جس میں اس نے احرام باندھا۔ یہی معنی حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ہے۔ طاؤس نے کہا: اس کا عمرہ اس مہینہ کے لئے ہے جس میں وہ حرم میں داخل ہوا۔ اصحاب رائے کا قول ہے: اگر اس نے رمضان میں تین چکر لگائے اور چار چکر شوال میں لگائے پھر اسی سال حج کیا تو وہ متمتع ہے۔ اگر رمضان میں چار چکر لگائے اور شوال میں تین چکر لگائے تو وہ متمتع نہیں ہو گا۔ ابو ثور نے کہا: جب حج کے مہینوں کے علاوہ کسی مہینہ میں عمرہ میں داخل ہو تو برابر ہے اس نے رمضان میں طواف کیا ہو یا شوال میں طواف کیا ہو وہ اس عمرہ کی وجہ سے متمتع نہیں ہو گا۔

یہ امام احمد اور اسحاق کا قول ہے۔ اس کا عمرہ اس مہینہ کے لئے ہے جس میں اس نے احرام باندھا۔

مسئلہ نمبر 9: اہل علم کا اجماع ہے کہ جس نے حج کے مہینوں میں عمرہ کا احرام باندھا اس پر حج کو داخل کر دیا جب تک کہ بیت اللہ کا طواف ابھی شروع نہیں کیا تھا تو وہ قارن شمار ہو گا۔ اس پر وہ لازم ہو گا جو اس قارن پر لازم ہوتا ہے جو حج اور عمرہ کی اکٹھی نیت کرتا ہے۔ اور عمرہ کا طواف شروع کرنے کے بعد عمرہ پر حج کو داخل کرنے میں اختلاف ہے۔ امام مالک نے فرمایا: اس پر یہ لازم ہے اور جب تک عمرہ کا طواف مکمل نہ کیا ہو وہ قارن شمار ہو گا، اس کی مثل امام ابوحنیفہ سے مروی ہے۔ اور امام ابو حنیفہ سے مشہور یہ ہے کہ ا[illegible] کے لئے یہ جائز نہیں مگر طواف میں شروع ہونے سے پہلے نیت کر لے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس

کے لئے جائز ہے کہ وہ عمرہ پر حج کو داخل کرے جب تک طواف کی دو رکعتیں نہ پڑھی ہوں۔ یہ تمام امام مالک اور ان کے اصحاب کے قول ہیں۔ جب عمرہ کرنے والے نے عمرہ کے طواف کا ایک چکر لگا لیا ہو پھر اس نے حج کا احرام باندھا ہو تو وہ قارن ہوگا اور اس سے باقی عمرہ ساقط ہو جائے گا اور قران کا دم اس پر لازم ہوگا اسی طرح جس نے حج کا احرام باندھا اپنے عمرہ کے طواف کے نصف میں یا اس سے فارغ ہونے کے بعد رکوع سے پہلے تو اس کا یہی حکم ہے۔ بعض نے فرمایا: جب تک صفا و مروہ کے درمیان سعی مکمل نہ کی ہو اس کے لئے حج کو عمرہ پر داخل کرنا جائز ہے۔ ابو عمر نے کہا: یہ تمام اقوال اہل علم کے نزدیک شاذ ہیں۔ اشہب نے کہا: جب عمرہ کے طواف کا ایک چکر لگا لیا ہو تو اس پر حج کا احرام لازم نہیں اور وہ قارن نہ ہوگا، وہ اپنے عمرہ کو جاری رکھے حتیٰ کہ اسے مکمل کرے پھر حج کا احرام باندھے۔ یہ امام شافعی اور عطا کا قول ہے اور یہی ابو ثور کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 10: حج کو عمرہ میں داخل کرنے میں اختلاف ہے۔ امام مالک، ابو ثور اور اسحاق نے کہا: عمرہ حج پر داخل نہ ہوگا اور جس نے عمرہ کو حج کے ساتھ ملایا تو عمرہ کسی چیز کے ساتھ نہیں۔ یہ امام مالک اور امام شافعی کا ایک قول ہے اور مصر میں ان سے یہی مشہور ہے۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب اور امام شافعی کا قدیم قول یہ ہے کہ وہ قارن ہو جائے گا اور اس پر وہی ہوگا جو قارن پر ہوتا ہے جب تک کہ اس نے حج کے طواف کا ایک چکر بھی نہ لگایا ہو۔ اگر طواف کر لیا ہو تو اس پر لازم ہوگا کیونکہ اس نے حج میں عمل کیا۔ ابن منذر نے کہا: اس مسئلہ میں میں امام مالک کے قول کے مطابق کہتا ہوں۔

مسئلہ نمبر 11: امام مالک نے فرمایا: جس نے عمرہ کے لئے ہدی دی دراں حالیکہ وہ متمتع ہے تو اس کے لئے یہ کافی نہیں اور اس پر متعہ کے لئے دوسری ہدی ہے کیونکہ وہ متمتع ہو جائے گا جب عمرہ سے حلال ہونے کے بعد حج شروع کرے گا اس وقت اس پر ہدی واجب ہوگی۔ امام ابو حنیفہ، ابو ثور اور اسحاق نے کہا: وہ ہدی کو نحر نہ کرے مگر دسویں کے دن۔ امام احمد نے فرمایا: اگر متمتع دس دنوں سے پہلے آئے تو طواف کرے، سعی کرے اور اپنی ہدی کو نحر کر دے اور اگر دس دنوں میں آئے تو دسویں کے دن نحر کرے۔ یہ عطا کا قول ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: جب طواف اور سعی کر لے تو وہ عمرہ کا احرام کھول دے خواہ ہدی لایا ہو یا نہ لایا ہو۔

مسئلہ نمبر 12: امام مالک اور امام شافعی کا اس متمتع کے بارے میں اختلاف ہے جو مر جائے۔ امام شافعی نے فرمایا: جب حج کا احرام باندھ لیا تھا تو اس پر متعہ کا دم (بکری) ہے جبکہ وہ اس کو پانے والا ہو۔ زعفرانی نے امام شافعی سے یہ حکایت کیا ہے۔ ابن وہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ ان سے اس متمتع کے بارے پوچھا گیا جو حج کا احرام باندھنے کے بعد عرفہ یا اس کے علاوہ کسی جگہ فوت ہو جاتا ہے، کیا اس پر ہدی ہے؟ امام مالک نے فرمایا: جو جمرہ عقبہ پر رمی جمار کرنے سے پہلے مر جائے تو اس پر ہدی نہیں ہے اور جس نے رمی جمار کر لیا تھا پھر مر گیا تو اس پر ہدی ہے۔ امام مالک سے پوچھا گیا کل مال سے ہدی دی جائے گی یا تہائی مال سے۔ '.' م مالک نے فرمایا: کل مال سے۔

مسئلہ نمبر 13: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ اس پر کلام گزر چکی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَ سَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ

لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

اس میں دس مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ یعنی جو ہدی نہ پائے مال نہ ہونے کی وجہ سے یا حیوان نہ ہونے کی وجہ سے تو وہ حج کے دنوں میں تین روزے رکھے اور سات روزے اپنے شہر میں واپس آکر رکھے اور حج کے تین روزے اس طرح رکھے کہ آخری روزہ نویں ذی الحجہ کا ہو۔ یہ طاؤس کا قول ہے۔ شعبی، عطا، مجاہد، حسن بصری، نخعی، سعید بن جبیر، علقمہ، عمرو بن دینار اور اصحاب رائے سے مروی ہے۔ ابن منذر نے اس کو حکایت کیا ہے۔ ابوثور نے امام ابوحنیفہ سے روایت کیا ہے، وہ اپنے عمرہ کے احرام میں روزے رکھے کیونکہ وہ تمتع کا ایک احرام ہے۔ پس اس میں ان دنوں کا روزہ جائز ہے جس طرح حج کے احرام میں جائز ہے(1)۔

امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا قول ہے کہ وہ آٹھویں کے دن سے پہلے ایک دن روزہ رکھے پھر آٹھویں اور عرفہ کے دن کا روزہ رکھے۔ حضرت ابن عباس اور حضرت مالک بن انس نے کہا: اس کے لئے ہے کہ وہ روزہ رکھے جب سے اس نے حج کا احرام باندھا ہے دسویں کے دن تک (2) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: حج میں تین روزے رکھے۔ جب عمرہ میں روزہ رکھے تو وہ اپنے وقت سے پہلے ادا کرنے والا ہوگا تو وہ جائز نہیں۔ امام شافعی، امام احمد بن حنبل نے کہا: حج کا احرام باندھنے اور نویں ذی الحجہ کے درمیان روزے رکھے۔ یہ حضرت ابن عمر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے۔ یہ امام مالک سے مروی ہے، مؤطا میں ان کے قول کا یہی مقتضا ہے تاکہ وہ عرفہ کے دن افطار کرنے والا ہو۔ اس میں سنت کی اتباع ہے اور عبادت پر زیادہ قوت دینے والا ہے(3)۔ امام احمد سے مروی ہے، جائز ہے کہ وہ احرام باندھنے سے پہلے تین روزے رکھے۔ ثوری اور اوزاعی نے کہا: ذی الحجہ کے دس دنوں کے آغاز سے روزے رکھے(4)۔ یہ عطا کا قول ہے۔ عروہ نے کہا: ایام منیٰ میں مکہ میں وہ روزے رکھے۔ یہ امام مالک اور اہل مدینہ کی ایک جماعت کا قول ہے۔ ایام منیٰ یہ وہ تین دن ہیں جو دسویں کے دن سے متصل ہیں۔ امام مالک نے مؤطا میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، وہ فرماتی تھیں: روزہ اس کے لئے ہے جو حج تمتع کرے اور حج کا احرام باندھنے سے لے کر عرفہ کے دن تک ہدی نہ پائے، اگر پہلے روزے نہیں رکھے تو ایام منیٰ میں روزے رکھے(5)۔ یہ الفاظ حج تمتع کا احرام باندھنے کے وقت سے عرفہ کے دن تک روزہ کی صحت کا تقاضا کرتے ہیں۔ یہ آغاز کا وقت ہے کیونکہ یہ ادائیگی کا وقت ہے اور اس کے بعد ایام منیٰ قضا کا وقت ہے۔ جیسا کہ امام شافعی کے اصحاب کا قول ہے اور دسویں کے دن سے پہلے روزے رکھنا ذمہ سے بری ہونا ہے اور اسی کا حکم دیا گیا ہے۔ مذہب یہ ہے کہ ادا کے طور پر ہیں اگرچہ ایام منی سے پہلے روزے رکھنا افضل ہے جس طرح نماز کا وقت ہے اس میں ادائیگی کی وسعت ہے اگرچہ پہلا وقت آخری وقت سے افضل ہے۔ یہ صحیح ہے

1۔ احکام القرآن، صفحہ 130، جلد 1 (دار الفکر)
2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 270، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
3۔ احکام القرآن، صفحہ 130، جلد 1 (دار الفکر)
4۔ تفسیر طبری، صفحہ 297، جلد 2 (دار احیاء التراث العلمیہ)
5۔ مؤطا امام مالک، کتاب الحج، صیام التمتع، صفحہ 482 (وزارت تعلیم)

اور یہ ادا ہے قضا نہیں ہے کیونکہ اَیَّامٍ فِی الْحَجِّ کے کلمات یہ احتمال رکھتے ہیں کہ اس سے مراد حج کی جگہ ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ ایام حج مراد ہوں۔ اگر ایام حج مراد ہوں تو یہ قول صحیح ہے کیونکہ آخری دن ایام حج کا دسویں کا دن ہے اور یہ احتمال ہے کہ آخری دن رمی جمار کے دن ہوں کیونکہ رمی جمار کرنا خالص حج کے عمل سے ہے اگرچہ اس کے ارکان سے نہیں ہے۔ اگر حج کی جگہ مراد ہو تو وہ ایام منیٰ میں جب تک مکہ میں ہے روزے رکھ لے جیسا کہ عروہ نے کہا ہے۔ یہ بہت قوی ہے۔ بعض علماء نے کہا: وہ روزوں کو ایام تشریق تک مؤخر کرے، کیونکہ اس پر روزہ واجب نہیں ہے مگر یہ کہ دسویں کے دن ہدی نہ پائے (1)۔

مسئلہ نمبر 2: اگر کہا جائے کہ اہل مدینہ کی ایک جماعت اور امام شافعی کا جدید قول یہ ہے کہ امام شافعی کے اکثر اصحاب کا یہ نظریہ ہے کہ ایام تشریق کا روزہ جائز نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایام منیٰ کے روزوں سے منع فرمایا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر نہی ثابت ہو تو یہ عام ہوگا، اس سے متمتع خاص ہوگا اس روایت سے جو بخاری میں ہے کہ حضرت عائشہ ان دنوں میں روزہ رکھتی تھیں۔ حضرت ابن عمر اور حضرت عائشہ سے مروی ہے، فرمایا: ایام تشریق میں روزہ رکھنے کی رخصت نہیں ہے مگر اس شخص کے لئے جو ہدی نہ پائے۔ دارقطنی نے کہا: اس کی سند صحیح ہے۔ اس کو حضرت ابن عمر اور حضرت عائشہ سے تین طرف سے مرفوع روایت کیا ہے اور تینوں طرف کو ضعیف قرار دیا ہے۔ ان دنوں میں روزہ رکھنے کی رخصت دی گئی ہے کیونکہ حج کے ایام میں سے باقی صرف یہی مقدار رہ گئی ہے۔ اسی وجہ سے روزے کا وجوب متحقق ہو جاتا ہے، ہدی کے نہ پائے جانے کی وجہ سے۔ ابن منذر نے کہا: ہم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: جب روزہ فوت ہو جاتا ہے تو ایام تشریق کے بعد روزہ رکھے گا (2)۔ یہ حسن اور عطا کا قول ہے۔ ابن منذر نے کہا: اسی طرح ہم کہتے ہیں، ایک طائفہ نے کہا: جب دس دنوں میں روزہ نہ رکھے تو پھر ہدی کے سوا کوئی چیز یاد نہیں۔ یہ حضرت ابن عباس، حضرت سعید بن جبیر، طاؤس اور مجاہد سے مروی ہے۔ امام ابو عمر نے امام ابوحنیفہ سے اور آپ کے اصحاب سے روایت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3: علماء کا اجماع ہے کہ متمتع ہدی پائے تو اسے روزہ رکھنے کا اختیار نہیں اور اس میں اختلاف ہے کہ جب کوئی ہدی کو پانے والا نہ ہو تو پھر وہ روزے رکھنے شروع کر دے پھر روزے مکمل کرنے سے پہلے ہدی کو پالے۔ ابن وہب نے مالک سے روایت کیا ہے، فرمایا: جب روزہ میں داخل ہو پھر ہدی کو پالے تو میرے نزدیک ہدی دینا زیادہ پسندیدہ ہے۔ اگر اس نے ہدی نہ دی تو روزہ بھی اس کے قائم مقام ہو جائے گا۔ امام شافعی نے فرمایا: روزے کو وہ مکمل کرے جبکہ وہ فرض ہے اسی طرح ابو ثور نے کہا: یہ حسن اور قتادہ کا قول ہے، ابن منذر نے بھی اس کو پسند کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ نے کہا: جب تیسرے روزے میں ہدی میسر آ گئی تو روزہ باطل ہو جائے گا اور ہدی واجب ہو جائے گی۔ اگر حج میں تین دن روزے رکھ لے پھر اسے ہدی میسر آ گئی تو اس کے لئے جائز ہے کہ گھر واپس آ کر سات روزے رکھ لے اور ہدی کی طرف نہ لوٹے۔ یہ ثوری، ابن ابی نجیح اور حماد کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 4: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَسَبْعَةٍ جمہور کی قرأت عطف کی بنا پر مجرور ہے۔ زید بن علی نے وسبعة نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ معنی یہ ہوگا: وصوموا سبعة (سات روزے رکھو)

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 270، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ ایضاً

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذَا رَجَعْتُمْ جب تم اپنے شہروں کی طرف لوٹو۔ یہ حضرت ابن عمر، قتادہ، ربیع، مجاہد اور عطا کا قول ہے۔ مالک نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے: امام شافعی کا بھی یہی قول ہے (1)۔ قتادہ اور ربیع نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رخصت ہے اور کسی پر سات روزے واجب نہیں ہوتے مگر جب وطن واپس آ جائے مگر جو اپنے اوپر سختی کرے جس طرح جو رمضان میں سفر میں روزہ رکھتا ہے (2)۔ امام احمد اور اسحاق نے فرمایا: راستہ میں اسے روزہ جائز ہے۔ مجاہد اور عطا سے مروی ہے، مجاہد نے کہا: اگر وہ چاہے تو راستہ میں روزہ رکھے، یہ رخصت ہے۔ اسی طرح عکرمہ اور حسن نے کہا۔ بعض اہل لغت نے کہا: اس کا مطلب ہے جب تم حج سے لوٹو یعنی جب تم اس حلت کی طرف لوٹو جس پر تم احرام سے پہلے تھے۔ امام مالک نے "الکتاب" میں فرمایا: جب منیٰ سے واپس آ جائے تو روزہ رکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ ابن عربی نے کہا: اگر تخفیف اور رخصت ہو تو رخصت کو مقدم کرنا جائز ہے اور رخصت کو چھوڑ کر عزیمت کی طرف لوٹنا بالاجماع جائز ہے اگرچہ اس کا وقت متعین ہے لیکن اس میں نص نہیں ہے، نہ ظاہر ہے کہ اس سے مراد شہر کی طرف لوٹنا ہے اور اغلب یہی ہے کہ حج مراد ہے (3)۔ میں کہتا ہوں: بلکہ اس میں ظاہر نص کے قریب ہے۔

مسلم نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے حج تمتع کیا اور ہدی دی۔ آپ ﷺ ذی الحلیفہ سے ہدی لے گئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے پہلے عمرہ کا احرام باندھا پھر حج کا احرام باندھا، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ لوگوں نے بھی حج تمتع کیا لوگوں میں سے کچھ ہدی ساتھ لائے تھے اور کچھ ہدی ساتھ نہ لائے تھے جب رسول اللہ ﷺ مکہ میں آئے تو لوگوں سے فرمایا: تم میں سے جو ہدی ساتھ لایا ہے وہ کسی چیز سے حلال نہ ہو جو حج کی وجہ سے حرام ہوئی حتیٰ کہ اپنے حج کو مکمل کرے اور جس کے پاس ہدی نہیں ہے وہ بیت اللہ کا طواف کرے پھر صفا و مروہ کا طواف کرے، بال قصر کرائے اور احرام کھول دے پھر محرم احرام باندھے اور ہدی دے۔ جو ہدی کو نہ پائے وہ حج میں تین روزے رکھے اور سات روزے گھر والوں کے پاس لوٹ آئے تو رکھے (4)۔ یہ نص کی طرح ہے کہ سات روزے گھر والوں میں شہر والوں میں رکھے۔

اسی طرح بخاری میں حضرت ابن عباس کی حدیث میں ہے۔ پھر آپ ﷺ نے آٹھ ذی الحجہ کی شام ہمیں حج کا احرام باندھنے کا حکم دیا جب ہم مناسک حج سے فارغ ہوں گے تو ہم آئیں گے بیت اللہ کا طواف کریں گے، صفا و مروہ کا طواف کریں گے تو ہمارا حج مکمل ہوگا اور ہم پر ہدی واجب ہوگی جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ۔(5) (یعنی جب ہم اپنے شہروں کی طرف آئیں۔ الحدیث)

نحاس نے کہا: یہ بالاجماع ہے۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ کہا جاتا ہے: کمل یکمل بروزن نصر ینصر کمل

1۔ احکام القرآن، صفحہ 131، جلد 1 (دار الفکر)	2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 270، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)
3۔ احکام القرآن، صفحہ 131، جلد 1 (دار الفکر)	4۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، وجوب الصوم علی التمتع، صفحہ 403، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)
5۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، قول اللہ تعالیٰ ذالک لمن لم یکن اھلہ، صفحہ 241، جلد 1 (وزارت تعلیم)

یکمل بروزن عظُم یعظمُ، کمِلَ یکمل بروزن حَمِد یحمد۔ اس میں یہ تین لغات ہیں۔ تِلْكَ عَشَرَةٌ کے معنی میں اختلاف ہے۔ یہ تو معلوم ہے کہ یہ دس ہیں۔ زجاج نے کہا: جب کسی خیال کرنے والے کا یہ خیال ہو سکتا تھا کہ حج کے تین روزوں یا واپسی پر سات روزوں میں اختیار ہے اور یہ سات روزے ان تین کا بدل ہیں کیونکہ یہ نہیں فرمایا کہ سات روزے اور رکھے تو تِلْكَ عَشَرَةٌ کے قول سے اس وہم وخیال کو زائل کر دیا۔ پھر فرمایا کَامِلَةٌ حسن نے کہا: ثواب میں کامل، جس طرح اس شخص کا ثواب ہے جو ہدی دیتا ہے۔ بعض نے فرمایا: ہدی کا بدل ہونے میں کامل ہے۔ یعنی یہ پورے دس، ہدی کا بدل ہیں، بعض نے فرمایا: ثواب میں کامل ہیں جس طرح اس شخص کا ثواب ہے (1) جس نے تمتع نہیں کیا۔ بعض نے فرمایا: یہ لفظاً اخبار ہے اور اس کا معنی امر ہے یعنی یہ دس مکمل کرو یہ فرض ہیں۔ مبرد نے کہا: عَشَرَةٌ تعداد کے ختم ہونے پر دلیل ہے تاکہ کسی وہم کرنے والے کو وہم نہ ہو کہ ان سات کے بعد بھی کوئی شے ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ تاکید ہے جیسا کہ تو کہتا ہے: کتبت بیدی۔ میں نے ہاتھ سے لکھا۔ اسی سے شاعر کا قول ہے

ثلاث و اثنتان فهن خمس و سادسة تميل الى شامی

اس میں خمس تاکید ہے۔

ثلاث بالغداة فذاك حسبی وست حسين يدركنی العشاء

فذالك تسعة فی اليوم ريی و شرب المرء فوق الری داء

ان اشعار میں تسعة تاکید ہے۔

اور کَامِلَةٌ کا ارشاد دوسری تاکید ہے اس میں روزہ رکھنے کی زیادہ تاکید ہے کہ اس تعداد سے کم نہ کرے جیسے تو کسی کو اہم کام کا حکم دیتا ہے تو کہتا ہے: الله الله لا تقصر۔ الله سے ڈرو اس میں کوتاہی نہ کرو۔

مسئلہ نمبر 7: الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ یعنی وہ مسافر جو مسجد حرام کے رہنے والوں سے نہیں ہے اس پر تمتع کا دم واجب ہے۔ بخاری نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ان سے حج تمتع کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: مہاجرین، انصار اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات نے حجۃ الوداع میں احرام باندھا اور ہم نے بھی احرام باندھا۔ جب ہم مکہ مکرمہ آئے تو رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے حج کے احرام کو عمرہ کا احرام بنا دو مگر جس نے ہدی کو قلادہ پہنایا ہو۔ ہم نے بیت الله اور صفا و مروہ کا طواف کیا اور ہم عورتوں کے پاس آئے اور ہم نے سلے ہوئے کپڑے پہنے اور فرمایا: جس نے ہدی کو قلادہ پہنایا ہو وہ حلال نہ ہو حتیٰ کہ اس کی ہدی اپنے مقام پر پہنچ جائے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں آٹھویں کی شام حج کا احرام باندھنے کا حکم دیا جب ہم مناسک سے فارغ ہوں گے تو ہم آئیں گے بیت الله اور صفا و مروہ کا طواف کریں گے، پس ہمارا حج مکمل ہوگا اور ہم پر ہدی لازم ہوگی، جیسا کہ الله تعالیٰ نے فرمایا: فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ۔ ہدی

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 270، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

میں بکری کافی ہے ایک سال میں انہوں نے دو عبادتیں حج اور عمرہ جمع کیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں یہ حکم نازل کیا اور اپنے نبی کی زبان پر بیان فرمایا اور مکہ کے علاوہ لوگوں کے لئے اس کو مباح فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ اشھر حج سے مراد شوال، ذی قعدہ اور ذی الحجہ ہیں جو ان مہینوں میں حج تمتع کرے اس پر ہدی یا روزہ ہے۔ الرفث سے مراد جماع ہے اور الفسوق سے مراد گناہ ہیں الجدال سے مراد جھگڑا ہے(1)۔

مسئلہ نمبر 8: لِمَنْ میں لام بمعنی علی ہے۔ یعنی جو مکی نہیں ہے اس پر دم (بکری) واجب ہے۔ جیسے حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے: اشترطی لھم الولاء۔ اس میں لام بمعنی علی ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وان اسأتم فلھا۔ اس میں بھی لام بمعنی علی ہے۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کے نزدیک مسافر کے لئے حج تمتع اور قران کرنے کی طرف اشارہ ہے اور مکہ کے رہنے والوں کے لئے قران و تمتع نہیں ہے۔ ان میں سے جو ایسا کرے اس پر جنایت کا دم ہوگا جس سے وہ نہیں کھائے گا کیونکہ یہ دم تمتع نہیں ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: ان کے لئے دم تمتع اور قران ہے۔ اشارہ ہدی اور روزہ کی طرف ہے ان پر ہدی اور روزہ نہیں ہے۔ عبد الملک بن ماجشون نے تمتع اور قران کے درمیان فرق کیا ہے، پس قران میں خون کو واجب کیا ہے اور تمتع میں ساقط کیا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 9: اس بات پر اجماع ہونے کے بعد کہ اہل مکہ اور اس سے متصل رہنے والے لوگ مسجد حرام میں رہنے والے لوگ ہیں۔ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ طبرانی نے کہا: اہل حرم پر اجماع ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: اس طرح جس طرح اس نے کہا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: جن پر جمعہ واجب ہے وہ حضری ہے جو اس سے دور ہے وہ بدوی ہے یہ لفظ حضارۃ اور بداوۃ سے بنائے ہیں (2)۔ امام مالک اور ان کے اصحاب نے کہا: وہ اہل مکہ اور اس کے متصل رہنے والے لوگ ہیں۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا: اس سے مراد مواقیت اور اس کے اندر رہنے والے لوگ ہیں۔ پس مواقیت یا مواقیت سے اندر رہنے والے ہیں وہ حاضری المسجد الحرام میں سے ہیں۔ امام شافعی اور ان کے اصحاب نے کہا: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو ایسی جگہ پر رہتے ہیں جن پر مکہ آتے وقت نماز قصر نہیں ہوتی۔ یہ مواقیت کے قریب رہنے والے لوگ ہیں۔ آیت کی تاویل میں متقدمین کے ان اقوال پر مذاہب ہیں۔

مسئلہ نمبر 10: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّقُوا اللّٰهَ یعنی جو اللہ نے تم پر فرض کیا اس کے بارے میں اللہ سے ڈرو۔ بعض نے فرمایا: بالعموم تقویٰ کا امر ہے اور عذاب کی شدت سے ڈرانا ہے۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۫ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، قول اللہ تعالیٰ ذالک لمن لم یکن اھلہ، صفحہ 213، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 271، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

"حج کے چند مہینے ہیں جو معلوم ہیں۔ پس جو نیت کرلے ان میں حج کی تو اسے جائز نہیں بے حیائی کی بات اور نہ نافرمانی اور نہ جھگڑا حج کے دنوں میں اور جو تم نیک کام کرو اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے اور سفر کا توشہ تیار کرو اور سب سے بہتر توشہ تو پرہیزگاری ہے اور ڈرتے رہو مجھ سے اے عقلمندو!"۔

اس میں چودہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ جب اللہ تعالیٰ نے وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ میں حج اور عمرہ کا ذکر فرمایا تو وقت میں ان کے اختلاف کو بیان فرمایا۔ سارا سال عمرہ کے احرام کا وقت ہے اور عمرہ کا وقت ہے۔ رہا حج یہ سال میں ایک مرتبہ واقع ہوتا ہے، یہ ان مخصوص مہینوں کے علاوہ میں واقع نہیں ہوتا۔ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ مبتدا خبر ہیں اور کلام میں حذف ہے۔ اس کی تقدیر اشہر الحج اشھرٌ ہے یا وقت الحج اشھرٌ ہے یا وقت عمل الحج اشھرٌ ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کی تقدیر الحج فی الاشھر ہے۔ حرف جر کے سقوط کے ساتھ اشہر کی نصب لازم ہے اور کسی نے اس کی نصب کے ساتھ نہیں پڑھا مگر کلام میں ظرف کی بنا پر نصب جائز ہے۔ فراء نے کہا: اشہر مرفوع ہے کیونکہ اس کا معنی ہے: وقت الحج اشھرٌ معلومات۔ فراء نے کہا: میں نے کسائی کو یہ کہتے سنا: انما الصیف شھران، انما الطیلسان ثلاثة اشھر۔ اس سے مراد گرمیوں کا وقت اور چادر اوڑھنے کا وقت لیا ہے۔ اس میں حذف ہے۔

مسئلہ نمبر 2: الاشھر المعلومات میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عمر، عطا، ربیع، مجاہد اور زہری نے کہا: اشہر حج شوال، ذوالقعدہ اور ذی الحجہ پورا ہے۔ حضرت ابن عباس، سدی، شعبی اور نخعی نے کہا: یہ شوال، ذوالقعدہ اور ذی الحجہ کے دس دن ہیں۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے اور حضرت ابن زبیر کا یہی قول ہے۔ دونوں قول مالک سے مروی ہیں۔ آخری قول ابن حبیب نے حکایت کیا ہے (1) اور پہلا ابن منذر نے بیان کیا ہے۔ فرق کا فائدہ دم (جانور قربان کرنا) سے متعلق ہے۔ جس نے کہا: ذی الحجہ مکمل، حج کے مہینوں میں سے ہے وہ دسویں کے دن کے بعد اعمال حج میں سے جو عمل واقع ہو اس میں دم واجب نہیں کرتے کیونکہ وہ اشہر حج میں سے ہے۔ دوسرے قول پر حج دسویں کے دن ختم ہو جاتا ہے اس کے بعد جو عمل کرے گا وقت سے تاخیر کی بناء پر دم لازم ہوگا۔

مسئلہ نمبر 3: اللہ تعالیٰ نے حج کے مہینوں کا اپنی کتاب میں نام نہیں لیا کیونکہ یہ لوگوں کو معلوم تھے۔ اور الاشہر کے لفظ کا اطلاق دو مہینوں اور تیسرے مہینہ کے بعض حصہ پر ہوتا ہے کیونکہ بعض مہینہ پورے مہینہ کے قائم مقام سمجھا جاتا ہے جیسے کہا جاتا ہے: رائیتك سنة كذا۔ او على عهد فلان (یعنی میں نے تجھے فلاں سال یا فلاں کے عہد میں دیکھا) اس نے اسے دیکھا تو ایک لحہ میں تھا۔ وقت کے بعض کو کل کے ساتھ تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ جیسے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ایام منی ثلاثة۔ (2) حالانکہ یہ دو دن اور تیسرے دن کا بعض حصہ ہے۔ لوگ کہتے ہیں: رایتك الیوم، جئتك العام۔ میں نے آج

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 271، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ جامع ترمذی، کتاب الحج، ما جاء فی من ادرك الامام، صفحہ 108، جلد 1 (وزارت تعلیم)

تجھے دیکھا اور میں تیرے پاس اس سال آیا۔ بعض نے فرمایا: جب دو اور دو سے زیادہ جمع ہوتے ہیں تو اشہر فرمایا۔

مسئلہ نمبر 4: حج کے مہینوں کے علاوہ کسی مہینے میں احرام باندھنے کے بارے میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے حج کی سنت یہ ہے کہ حج کے مہینوں میں احرام باندھے۔ حضرت عطا، مجاہد، طاؤس اور اوزاعی نے کہا: جس نے حج کے مہینوں سے پہلے احرام باندھا تو وہ اس کے حج کی طرف سے نہ ہوگا..... وہ عمرہ کا ہوگا جیسے کوئی وقت سے پہلے نماز میں داخل ہو تو وہ اس کی فرض نماز نہیں ہوتی وہ نفل ہوتی ہے۔ یہ امام شافعی اور ابو ثور کا قول ہے۔ اوزاعی نے کہا: وہ عمرہ کے ساتھ احرام کھول دے گا۔ امام احمد بن حنبل نے کہا: یہ مکروہ ہے۔ امام مالک سے مروی ہے اور ان کا مشہور قول پورے سال میں حج کا احرام باندھنے کا جواب ہے۔ یہ امام ابو حنیفہ کا قول ہے، نخعی نے کہا: حج مکمل کرنے تک احرام کھولنا جائز نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ (البقرہ: 189) اس کے متعلق کلام گزر چکی ہے۔ امام شافعی کا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ یہ عام ہے اور یہ آیت خاص ہے یہ بھی احتمال ہے کہ عموم کے بعض اشخاص پر نص کے باب سے ہو کیونکہ ان مہینوں کو دوسرے مہینوں پر فضیلت ہے۔ اس پر امام مالک کا قول صحیح ہوگا۔

مسئلہ نمبر 5: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ فَرَضَ فِیْهِنَّ الْحَجَّ یعنی جس نے نیت کے ساتھ قصداً باطناً حج میں شروع ہو کر اپنے اوپر حج لازم کر دیا اور احرام کے ساتھ ظاہر فعل کے ساتھ اور تلبیہ کے ساتھ زبانی اپنے اوپر حج کو لازم کر لیا۔ یہ ابن حبیب کا قول ہے اور امام ابو حنیفہ نے کہا: جس نے تلبیہ کے ساتھ اپنے اوپر حج فرض کر لیا (1)۔ امام شافعی کے نزدیک تلبیہ ارکان حج میں سے نہیں ہے۔ یہ حسن بن حیی کا قول ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: حج کے احرام میں نیت کافی ہے اور تلبیہ کو اہل ظاہر اور دوسرے علماء نے واجب کہا ہے۔ فرض کا لغوی معنی کاٹنا ہے اسی سے فرضة القوس والنهر والجبل ہے۔ قوس کی شگاف کی جگہ، نہر سے پانی پینے کی جگہ، پہاڑ کا وہ حصہ جو اس کے وسط اور جانب سے لڑھک جائے۔ پس فرضية الحج کا مطلب آزاد آدمی پر اس کا لازم ہونا ہے جس طرح تیر کیلئے شگاف ہوتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: فرض کا معنی علیحدہ کرنا ہے۔ یہ بھی قطع کے معنی کی طرف لوٹتا ہے کیوں کہ جو کسی چیز کو کاٹتا ہے تو وہ اسے دوسری چیز سے علیحدہ کرتا ہے اور من مبتدا کی حیثیت سے مرفوع ہے۔ اس کا معنی شرط ہے اور خبر فرض ہے کیونکہ من موصولہ نہیں ہے۔ فرمایا: رجل فرض۔ اور فرمایا فیهن اور فیها نہیں فرمایا۔ بعض علماء نے فرمایا: استعمال میں دونوں برابر ہیں۔ مازنی ابو عثمان نے کہا: غیر ذوی العقول کی جمع کثیر واحد مونث کی طرف آتی ہے اور قلیل اس طرح نہیں آتی۔ تو کہتا ہے: الاجذاع انکسرن، الجذوع انکسرت۔ اس کی تائید اللہ تعالیٰ کا یہ قول کرتا ہے: ان عدة الشهور۔ پھر فرمایا: منها۔

مسئلہ نمبر 6: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا رَفَثَ حضرت ابن عباس، ابن جبیر، سدی، قتادہ، حسن، عکرمہ، زہری، مجاہد اور مالک نے کہا: الرفث سے مراد جماع ہے (2)۔ یعنی جماع نہ ہو کیونکہ یہ حج کو فاسد کر دیتا ہے۔ علماء کا اجماع ہے کہ وقوف عرفات سے پہلے جماع، حج کو فاسد کرنے والا ہے اور اس پر آئندہ سال حج اور ہدی دینا ہوگی۔ حضرت عبد اللہ بن عمر،

1۔ احکام القرآن، صفحہ 133، جلد 1 (دار الفکر)
2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 272، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

طاؤس، عطاو غیرہم نے فرمایا: الرفث سے مراد عورت کے ساتھ فحش کلام کرنا ہے۔ یہ حضرت ابن عباس
اس کا قول: جب ہم احرام کھولیں گے تو ہم تیرے ساتھ ایسا کریں گے۔ یعنی بغیر کنایہ کے کہے
کا قول ہے انہوں نے احرام کی حالت میں شعر میں کہا:

و ھن یمشین بنا ھمیسا ان تصدق الطیر ننک لمیسا

تو آپ کے ساتھی حصین بن قیس نے کہا: کیا تو احرام کی حالت میں رفث کرتا ہے؟ حضرت ابن عباس نے فرمایا: الرفث وہ ہے جو عورتوں کے پاس کیا جائے۔ ایک قوم نے کہا: عورتوں کے ذکر کے ساتھ فحش کلام کرنا ہے خواہ وہ حاضر ہوں یا نہ ہوں۔ بعض نے کہا: الرفث ایک جامع کلمہ ہے۔ یہ ہر اس کو شامل ہے جو مرد، عورت سے چاہتا ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: الرفث کا معنی لغو کلام ہے اور یہ شعر پڑھا ہے۔

و رب اسراب حجیج کظم عن اللغا و رفث التکلم

کہا جاتا ہے: رفث یرفث، فاء کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ۔ حضرت ابن مسعود نے فلا رفوث پڑھا ہے یعنی جمع کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن عربی نے کہا: فلا رفث سے مراد اس کی مشروعیت کی نفی ہے نہ کہ اس کے وجود کی نفی ہے کیونکہ ہم رفث حج میں پاتے ہیں اور اس کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی خبر غلط واقع نہیں ہوسکتی۔ نفی اس کے مشروع او جود کی طرف لوٹتی ہے، محسوساً اس کے وجود کی طرف نہیں لوٹتی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ (البقرہ:228) ہم طلاق والی عورتوں کو پاتے ہیں کہ وہ انتظار نہیں کرتی ہیں پس نفی حکم شرعی کی طرف لوٹتی ہے نہ کہ وجود حسی کی طرف، یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے لَّا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (الواقعہ) جب ہم کہتے ہیں یہ آدمیوں کے بارے میں وارد ہے اور یہ صحیح ہے ...... اس کا معنی ہے شرعاً آدمیوں میں سے اس کو بے وضو شخص نہیں چھوتا اگر چھونا پایا گیا تو وہ شرع کے حکم کے خلاف ہو گا۔ یہ نکتہ علماء سے فوت ہو گیا انہوں نے کہا: خبر، نہی کے معنی میں ہوتی ہے۔ یہ کبھی نہیں پائی جاتی ہے اور اس کا پایا جانا صحیح بھی نہیں ہے یہ دونوں حقیقۃً مختلف ہیں وصفاً متضاد ہیں۔

مسئلہ نمبر 7: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا فُسُوْقَ اس سے مراد تمام گناہ ہیں یہ حضرت ابن عباس، عطا اور حسن کا قول ہے، اسی طرح حضرت ابن عمر اور ایک جماعت نے کہا: الفسوق کا معنی حج کے احرام کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنا ہے جیسے شکار کو قتل کرنا، ناخن کاٹنا، بال نوچنا اور اس کے مشابہ گناہ کرنا ہے۔ ابن زید اور مالک نے کہا: الفسوق سے مراد بتوں کے لئے جانور ذبح کرنا ہے اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ او فسقاً اُھل لغیر اللہ بہ۔

ضحاک نے کہا: الفسوق سے مراد برے القاب سے یاد کرنا ہے اسی سے ارشاد ہے: بئس الاسم الفسوق۔ حضرت ابن عمر نے کہا: الفسوق سے مراد گالی دینا ہے۔ اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اسے قتل کرنا کفر ہے(1)''۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ وہ تمام اقوال کو شامل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے حج کیا اور

1۔ صحیح مسلم، سباب المسلم فسوق، صفحہ 58، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)۔ المحرر الوجیز، صفحہ 73-272، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

جماع اور گناہ نہ کیا تو وہ اس طرح لوٹا جیسے اس دن تھا جس میں اسے اس کی والدہ نے جنم دیا تھا(1)'' اور مقبول حج کی جزا صرف جنت ہے(2)۔ یہ مسلم وغیرہ نے نقل کی ہے اور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے آسمان اور زمین کے درمیان اللہ کے راستہ میں جہاد اور مقبول حج سے بہتر عمل کوئی نہیں جس میں جماع، فسق اور جھگڑا نہ ہو(3)۔ فقہاء نے کہا: حج مقبول وہ ہے جس کی ادائیگی کے دوران اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کی ہو۔ فراء نے کہا: وہ ہے جس کے بعد اللہ کی نافرمانی نہ کی ہو۔ یہ دونوں قول ابن عربی نے ذکر کیے ہیں۔ میں کہتا ہوں: حج مبرور وہ ہے جس میں اور جس کے بعد اللہ کی نافرمانی نہ کرے۔ حسن نے کہا: حج مبرور یہ ہے کہ وہ لوٹے تو دنیا سے دلچسپی نہ رکھتا ہو اور آخرت سے رغبت رکھتا ہو۔ اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں۔

مسئلہ نمبر 8: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ، فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ رفع اور تنوین کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور بغیر تنوین کے نصب کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور وَلَا جِدَالَ میں فتحہ پر اجماع ہے۔ یہ پہلے کلمات میں نصب کی قراءت کو تقویت دیتا ہے کیونکہ مقصود رفث، فسوق اور جدال سے عام نفی ہے تاکہ منفی کے عموم میں ایک نظام پر کلام ہو جائے۔ نصب پر اکثر قراء ہیں۔ تینوں اسماء محل رفع میں ہیں ہر ایک لا کے ساتھ ہے اور فِي الْحَجِّ تمام کی خبر ہے اور رفع کی قراءت کی وجہ یہ ہے کہ لا بمعنی لیس ہے۔ پس اس کے بعد اسم مرفوع ہوا کیونکہ وہ اس کا اسم ہے اور خبر محذوف ہے۔ تقدیر اس طرح ہے: فلیس رفثٌ ولا فسوق فی الحج۔ اور اس پر دلیل فی الحج کا قول ہے اور دوسرا ظاہر ہے وہ لاجدال کی خبر ہے۔ ابو عمرو بن العلاء نے کہا: رفع اس معنی میں ہوگا: فلا یکونن رفثٌ ولا فسوق۔ یعنی ہر ایسا عمل جو حج سے نکالتا ہے پھر نفی کی ابتدا کی۔ فرمایا: وَلَا جِدَالَ۔

میں کہتا ہوں: یہ احتمال ہے کہ کان تامہ ہو۔ جیسے اس قول میں ہے وَإِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ (بقرہ:280)۔ تو یہ خبر کا محتاج نہیں ہوتا اور یہ بھی احتمال ہے کہ کان ناقصہ ہو اور خبر محذوف ہو جیسا کہ ابھی گزرا ہے۔ اور رفث اور فسوق کو رفع دینا بھی جائز ہے مبتدا کی حیثیت سے اور لا نفی کے لئے ہو اور خبر محذوف ہو۔ ابو جعفر بن قعقاع نے تینوں میں رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور بعض طرق میں عاصم سے یہ مروی ہے۔ اس صورت میں فی الحج تینوں کی خبر ہوگا جیسا کہ ہم نے نصب کی قراءت کے بارے میں کہا اور فی الحج کا قراءت کے اختلاف کے ساتھ تمام کی خبر ہونا اچھا نہیں کیونکہ لیس کی خبر منصوب ہوتی ہے اور ولا جدال کی خبر مرفوع ہوتی ہے کیونکہ ولا جدال پہلے سے علیحدہ کیا گیا ہے یہ مبتدا کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ اور ایک اسم میں دو فاعل نہیں ہوتے اور فلا رفثٌ ولا فسوقٌ جائز ہے۔ مقام پر عطف ہے۔ نحویوں نے یہ شعر پڑھا ہے:

لا نسب الیوم ولا خلۃ اتسع الخرق علی الراقع

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، فضل الحج والعمرہ، صفحہ 436، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، فضل یوم عرفہ، صفحہ 436، جلد 1

3۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، بیان کون الایمان باللہ افضل الاعمال، صفحہ 462، جلد 1

نہ اس دن نسب کا فائدہ ہوگا نہ دوستی ہوگی چیتھڑے والے پر پھٹن زیادہ ہوگی۔

اور کلام میں فلا رفث ولا فسوقا ولا جدال فی الحج لفظ پر عطف کے اعتبار سے جو لا میں واجب تھا یہ فراء نے کہا ہے اور اس کی مثال یہ ہے:

فلا أب وابنا مثل مروان و ابنه اذا هو بالمجد ارتدى و تأزرا

نہ باپ، نہ بیٹا مروان اور اس کے بیٹے کی مثل ہے جب اس نے بزرگی کی چادر اوڑھی اور تہبند باندھا۔

ابو رجاء عطاردی نے کہا فلا رفث ولا فسوق دونوں میں نصب کے ساتھ اور ولا جدال رفع اور تنوین کے ساتھ۔ اخفش نے کہا:

هذا وجدكم الصغار بعينه لا ام لی ان كان ذاك ولا اب

یہ اور تمہارا ذلیل دادا میرے لئے نہ ماں ہو نہ باپ اگر وہ ہو۔

بعض علماء نے کہا: فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ کا معنی نہی ہے، یعنی لا ترفثوا ولا تفسقوا۔ اور ولا جدال کا معنی نفی ہے۔ جب معنی میں اختلاف ہے تو لفظ میں بھی اختلاف کیا گیا۔ قشیری نے کہا: اس میں نظر ہے کیونکہ کہا گیا ہے کہ ولا جدال بھی نہی ہے یعنی لا تجادلوا پھر ان کے درمیان کیوں فرق کیا گیا۔

مسئلہ نمبر 9: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا جِدَالَ یہ مجادلہ سے فعال کے وزن پر ہے یہ جدل سے مشتق ہے جس کا معنی قتل کرنا ہے اسی سے زمام مجدول ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ الجدالہ سے مشتق ہے جو زمین ہے۔ گویا ہر شخص اپنے مخالف کے مقابلہ میں کھڑا ہوتا ہے حتیٰ کہ اس پر غالب آتا ہے۔ پس وہ اس شخص کی مانند ہوتا ہے جس نے مخالف کو زمین پر مارا۔ شاعر نے کہا:

قد اركب الآلة بعد الآلة و اترك العاجز بالجدالة

منعفرا ليست له محالة

مسئلہ نمبر 10: علماء نے ان الفاظ کے مرادی معنی میں چھ مختلف اقوال ذکر کئے ہیں۔ حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس اور عطاء نے کہا: الجدال کا یہاں معنی یہ ہے کہ تو کسی مسلمان سے جھگڑے حتیٰ کہ تو اس پر ناراض ہو اور وہ گالی تک پہنچ جائے۔ رہا مذاکرہ علم تو اس سے نہی نہیں ہے۔ قتادہ نے کہا: الجدال سے مراد گالی دینا ہے، حضرت ابن زید اور حضرت مالک بن انس نے کہا: یہاں الجدال سے مراد لوگوں کا اختلاف ہے کہ کس نے حضرت ابراہیم کے موقف کو پایا جیسا کہ وہ زمانہ جاہلیت میں کرتے تھے جب قریش دوسرے عربوں سے مختلف جگہ پر ٹھہرتے تھے پھر اس کے بعد جھگڑتے تھے۔ اس تاویل پر معنی یہ ہوگا کہ ابراہیم کے موقف کے بارے میں نہ جھگڑو۔ ایک طائفہ نے کہا: الجدال سے مراد یہ ہے کہ ایک گروہ کہے کہ آج حج ہے اور دوسرا کہے کہ کل حج ہے۔ مجاہد اور ان کے ساتھ ایک طائفہ نے کہا: الجدال سے مراد مہینوں کے بارے میں جھگڑنا ہے جیسا نسئ (1) (ایک مہینہ کو مؤخر کرنا، دوسرے کو مقدم کرنا) میں عربوں کا معمول تھا، کبھی وہ حج کو ذی الحجہ سے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 273، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

علاوہ مہینے میں کرتے تھے۔ بعض مزدلفہ میں ٹھہرتے، بعض عرفہ میں ٹھہرتے اور درست مقام میں ٹھہرنے کے بارے میں جھگڑتے تھے (ہر ایک کہتا: میں ٹھیک ہوں)

میں کہتا ہوں: ان دو تاویلوں پر معنی ہوگا نہ وقت میں جھگڑو، نہ ٹھہرنے کی جگہ میں جھگڑو۔ یہ قول زیادہ درست ہے جو وَلَا جِدَالَ کے بارے میں بیان کئے گئے ہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: زمانہ اس دن کی ہیئت پر گھوم آیا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تھا (1) (الحدیث) مزید بیان سورہ برأت میں آئے گا۔ یعنی حج کا امر اسی جہت پر لوٹ آیا جس پر تھا یعنی اس دن اور وقت پر لوٹ آیا۔ نبی کریم ﷺ نے جب حج فرمایا تو فرمایا: ''مجھ سے مناسک حج سیکھ لو (2)'' اس کے ساتھ آپ نے حج کے مواقف اور مواضع بیان فرمائیں۔ محمد بن کعب قرظی نے بتایا کہ جدال یہ ہے کہ ایک طائفہ کہتا ہمارا حج، تمہارے حج سے زیادہ درست ہے دوسرا بھی اسی طرح کہتا (3)۔ بعض نے فرمایا: الجدال سے مراد اپنے آباء واجداد پر فخر کرنا ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 11: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ شرط اور جواب شرط ہے۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارے اعمال کی جزا دے گا کیونکہ عالم میں کسی چیز کے بدلے جزا واقع ہوتی ہے۔ بعض نے فرمایا: یہ فحش کلام کی جگہ حسن کلام پر برانگیختہ کرنا ہے اور فسوق وجدال کی جگہ اخلاق میں تقویٰ اور نیکی پر ابھارنا ہے۔ بعض نے فرمایا: خیر (نیکی) سے فعل کو ضبط نفس سے تعبیر کیا ہے تاکہ وہ عمل نہ پایا جائے جس سے انہیں منع کیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 12: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتَزَوَّدُوْا زادراہ ساتھ لینے کا حکم ہے۔ حضرت ابن عمر، عکرمہ، مجاہد، قتادہ اور ابن زید نے کہا: یہ آیت عربوں کے ایک گروہ کے بارے میں نازل ہوئی جو حج پر بغیر زادراہ کے آتے تھے۔ بعض کہتے ہیں: ہم بیت اللہ کا حج کیسے کریں گے وہ ہمیں کھانا نہیں کھلائے گا؟ وہ لوگوں پر بوجھ بن جاتے تھے۔ انہیں اس عمل سے منع کیا گیا اور انہیں زادراہ ساتھ لانے کا حکم دیا گیا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر نے کہا: لوگ زادراہ کے سلسلہ میں ایک دوسرے پر بھروسہ کرتے تھے تو انہیں زادراہ کا حکم دیا گیا (4) اور نبی کریم ﷺ کا حج کے سفر میں ایک اونٹ تھا جس پر زادراہ تھا۔ آپ کے پاس مزینہ قبیلہ کے تین سو آدمی آئے جب انہوں نے واپس جانے کا ارادہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے عمر! ان لوگوں کو زادراہ دو۔ بعض لوگوں نے کہا: تَزَوَّدُوْا کا مطلب ہے نیک صالح دوست ساتھ لو۔ ابن عطیہ نے کہا: یہ تخصیص ضعیف ہے۔ اولیٰ یہ ہے کہ تم اپنی آخرت کے لئے اعمال صالحہ کا زادراہ ساتھ لو (5)۔

میں کہتا ہوں: پہلا قول واضح ہے کیونکہ زاد سے مراد حج کے سفر میں کھانے کا سامان ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ امام بخاری نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا: اہل یمن حج کرتے تھے اور زادراہ ساتھ نہیں لاتے تھے اور کہتے

1۔ صحیح مسلم، کتاب القسامۃ، تغلیظ تحریم الدماء والاعراض، صفحہ 60، جلد 2 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ ایضاً، کتاب الحج، لتأخذوا عنی مناسککم، صفحہ 419، جلد 1

3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 273، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

4۔ المحرر الوجیز، صفحہ 273، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

5۔ ایضاً

تھے ہم توکل کرنے والے ہیں جب مکہ مکرمہ آئے تو لوگوں سے سوال کرتے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی یہ اس میں نص ہے جو ہم نے ذکر کیا۔ اکثر مفسرین کا یہی قول ہے۔ شعبی نے کہا الزاد سے مراد چھوارے اور ستو ہے۔ ابن جبیر نے کہا: کیک اور ستو ہے۔ ابن عربی نے کہا: اللہ تعالیٰ نے انہیں زادراہ کا حکم دیا جن کے پاس مال تھا اور جن کے پاس مال نہیں تھا اگر وہ کوئی پیشہ رکھتا ہے تو راستہ میں اس کو استعمال کرے یا سائل ہے تو اسے خطاب نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں خطاب فرمایا جو مال والے تھے اور مال چھوڑ جاتے تھے اور بغیر زادراہ کے نکلتے تھے اور کہتے تھے ہم توکل کرنے والے ہیں، توکل کی شرائط ہیں جو ان شرائط کو بجالائے تو وہ زادراہ کے بغیر نکلے اور وہ خطاب میں داخل نہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے عام مخلوق کے اعتبار سے حکم فرمایا عام لوگ توکل کے درجہ سے قاصر ہوتے ہیں اور اس کے حقائق سے غافل ہوتے ہیں (1)۔ ابوالفرج جوزی نے کہا: ابلیس نے اس قوم پر تلبیس کی جو توکل کا دعویٰ کرتے اور وہ بغیر زادراہ کے نکلتے اور گمان کرتے کہ یہ توکل ہے۔ وہ انتہائی خطا پر ہیں۔ ایک شخص نے امام احمد بن حنبل سے کہا: میں چاہتا ہوں کہ میں مکہ کی طرف توکل کرتے ہوئے بغیر زادراہ کے جاؤں۔ امام احمد نے اسے کہا: بغیر قافلہ کے جاؤ، اس نے کہا نہیں قافلہ کے ساتھ جاؤں گا۔ امام احمد نے فرمایا: لوگوں کے برتن پر توکل کرے گا۔

مسئلہ نمبر 13: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ بہتر زادراہ منہیات سے بچنا ہے۔ پس اللہ نے انہیں زادراہ کے ساتھ تقویٰ کو ملانے کا حکم دیا اور فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی اپنے معنی پر معمول ہے کیونکہ تَزَوَّدُوْا کا معنی ہے اس حکم کی اتباع میں اللہ سے ڈرو جو تمہیں زادراہ ساتھ لے جانے کا دیا گیا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس معنی کا احتمال رکھتا ہے کہ بہتر زاد وہ ہے جس کے ساتھ مسافر ہلاکت سے اور سوال کرنے اور ہاتھ پھیلانے کی حالت سے بچ جاتا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس آیت میں تنبیہ ہے کہ یہ دنیا، قرار کی جگہ نہیں ہے۔ اہل اشارات نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو آخرت کا سفر یاد دلایا اور انہیں تقویٰ کے زاد پر ابھارا، تقویٰ آخرت کا زاد ہے۔ اعشی نے کہا: جب تو تقویٰ کے زادراہ کے بغیر کوچ کرے گا اور مرنے کے بعد ان سے ملے گا جو زادراہ ساتھ لے گئے ہیں تو تو شرمندہ ہوگا کہ تو ان کی مثل نہیں ہے۔ تو نے اس طرح اعمال کی نگرانی نہ کی جس طرح انہوں نے کی تھی۔ ایک اور شاعر نے کہا: موت ایک موجیں مارنے والا سمندر ہے اس میں تیرنے والے کا حیلہ ختم ہو جاتا ہے۔ اے نفس! میں کہنے والا ہوں پس تو ایک مشفق ناصح سے بات سن، انسان کے ساتھ قبر میں تقویٰ اور عمل صالح کے علاوہ کچھ نہیں جاتا۔

مسئلہ نمبر 14: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّقُوْنِ یٰۤاُولِی الْاَلْبَابِ خطاب میں عقل والوں کو خاص فرمایا اگرچہ معاملہ تمام کو شامل ہے کیونکہ ان پر اللہ کی حجت قائم ہوئی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے اوامر کو پانے والے ہیں اور انہیں قائم رکھنے والے ہیں۔ الباب، جمع ہے لبّ کی اور لب ہر چیز کے خالص حصہ کو کہتے ہیں اسی وجہ سے عقل کو بھی لب کہا جاتا ہے۔ نحاس نے کہا: میں نے ابو اسحاق کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ مجھے احمد بن یحییٰ ثعلب نے کہا: کیا تو عرب کلام میں مضاعف میں سے کوئی ایسی

1۔ احکام القرآن، صفحہ 135، جلد 1 (دارالفکر)

چیز جانتا ہے جو فَعُلَ کے وزن پر آئی ہو؟ میں نے کہا: ہاں، سیبویہ نے یونس سے حکایت کیا ہے: لَبُبْتَ تلب۔ انہوں نے اس کی تحسین کی اور کہا: میں اس کی مثال نہیں جانتا۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَاۤ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۱۹۸﴾

"نہیں ہے تم پر کوئی حرج (اگر حج کے ساتھ ساتھ) تم تلاش کرو اپنے رب کا فضل (رزق) پھر جب واپس آؤ عرفات سے تو ذکر کرو اللہ کا مشعر حرام (مزدلفہ) کے پاس اور ذکر کرو اس کا جس طرح اس نے تمہیں سکھایا اور اگرچہ تم اس سے پہلے گمراہوں میں سے تھے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جُنَاحٌ اس کا مطلب ہے: گناہ۔ یہ لَيْسَ کا اسم ہے اَنْ تَبْتَغُوْا۔ لَيْسَ کی خبر کی حیثیت سے محل نصب میں ہے یعنی فی ان تبتغوا۔ خلیل اور کسائی کے قول پر محل جر میں ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حج کو رفث، فسق، جدال سے پاک رکھنے کا حکم دیا تو تجارت کی رخصت دی۔ یعنی اللہ کا فضل تلاش کرنے میں تم پر کوئی حرج نہیں۔ ابتغاء الفضل (فضل کا تلاش کرنا) قرآن میں تجارت کے معنی میں وارد ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (الجمعہ: 10) اس کی صحت پر دلیل بخاری کی حدیث ہے جو انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے، فرمایا: عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز زمانہ جاہلیت میں بازار تھے پس لوگ حج کے موسم میں تجارت کرنا گناہ سمجھتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی لیس عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ، فی مواسم الحج۔(1)

مسئلہ نمبر 2: جب یہ اس آیت میں ثابت ہے، تجارت کا قصد شرک نہیں ہوگا اور مکلف اخلاص سے نہیں نکلے گا جو اخلاص اس پر فرض تھا۔ فقراء کا قول اس کے خلاف ہے۔ حج بغیر تجارت کے افضل ہے تاکہ عبادت دنیا کی آلائشوں سے پاک رہے اور دل عبادت کے علاوہ کسی چیز سے معلق نہ ہو۔ دار قطنی نے اپنی سنن میں ابوامامہ التیمی سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نے حضرت ابن عمر سے کہا: میں اس راستہ میں کرایہ پر جانور دیتا ہوں (2) اور لوگ کہتے ہیں تیرا حج نہیں ہے۔ حضرت ابن عمر نے کہا: ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے اس کی مثل سوال کیا جو تو نے مجھ سے کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی: لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تیرا حج ہے(3)"۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، لیس علیکم جناح، صفحہ 648، جلد 2 (وزارت تعلیم) 2۔ معالم التنزیل، صفحہ 253، جلد 1 (دار الفکر)

3۔ سنن دار قطنی، کتاب الحج، المواقیت، صفحہ 292، جلد 2 (قاہرہ)

فَاِذَاۤ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ۝ اس میں سولہ مسائل ہیں (☆):

مسئلہ نمبر 1: فَاِذَاۤ اَفَضْتُمْ یعنی جب تم چلو۔ کہا جاتا ہے: فاض الاناء۔ جب برتن بھر جائے حتیٰ کہ کناروں سے چھلکنے لگے۔ رجل فیاض، بہت زیادہ عطا کرنے والا۔ زہیر نے کہا۔

وابیض فیاض یدہ غمامۃ　　علی معتفیہ ما تغبّ فواضلہ

سفید، اس کے ہاتھ طلب گاروں پر بادل کی طرح سخاوت کرتے ہیں اس کی عطاء دائمی ہے۔

اور حدیث مستفیض۔ مشہور حدیث۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِّنْ عَرَفٰتٍ قراء کی جماعت نے عَرَفٰتٍ کو تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسی طرح اگر کسی عورت کا نام مسلمات رکھا جائے تو اسے تنوین کے ساتھ پڑھا جائے گا کیونکہ تنوین منصرف اور غیر منصرف کے درمیان فرق کرنے کے لئے نہیں ہے تا کہ تو اسے حذف کرے۔ یہ تو مسلمین میں جو نون ہے اس کے قائم مقام ہے۔ نحاس نے کہا: یہ عمدہ ہے۔ سیبویہ نے عربوں سے، عرفات سے تنوین کا حذف حکایت کیا ہے۔ کہتا ہے: ھذہ عرفات یا ھذا و رایت عرفات یا ھذا۔ (تا کے کسرہ کے ساتھ اور بغیر تنوین کے) جب عربوں نے اسے معرفہ بنایا تو تنوین کو حذف کیا۔ اخفش اور کوفیوں نے تا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ فاطمہ اور طلحہ کی تا کے ساتھ تشبیہ دیتے ہوئے اور انہوں نے بطور استشہاد یہ شعر پڑھا ہے:

تنورتھا من اذرعات واھلھا　　بیثرب ادنی دارھا نظرٌ عالٍ (1)

اس میں اذرعات پر فتحہ پڑھا ہے۔

پہلا قول عمدہ ہے، اس میں تنوین وہی ہے جو مسلمات میں ہے کسرہ مسلمین میں یا کے مقابلہ میں ہے اور تنوین (2)، نون کے مقابل ہے۔ عرفات، اسم علم ہے جمع کے ساتھ نام رکھا گیا ہے جیسے اذرعات۔ بعض نے فرمایا: اس کے ارد گرد کی وجہ سے اسے عرفات کہا جاتا ہے جیسے ارض سباسب (چٹیل زمین) بعض نے فرمایا: اس جگہ کو عرفات اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ لوگ وہاں ایک دوسرے سے متعارف ہوتے ہیں۔ بعض نے فرمایا: یہ نام اس لئے رکھا کیونکہ جب ہند میں حضرت آدم علیہ السلام اترے اور حضرت حوا جدہ میں اتریں جو بہت لمبی مدت تلاش کے بعد عرفہ کے دن عرفات میں جمع ہوئے اور ایک دوسرے سے متعارف ہوئے، اس دن کو اسی وجہ سے عرفہ کہا جاتا ہے وہ جگہ عرفات کہلائی۔ یہ ضحاک کا قول ہے۔ بعض نے اس کے علاوہ اقوال کہے ہیں جو وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا (البقرہ:128) کے قول کے تحت گزر چکا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا: ظاہر یہ ہے کہ یہ اسم مرتجل (☆☆) ہے جس طرح تمام جگہوں کے نام ہیں۔ عرفۃ یہ نعمان الاراک ہے۔ اس کے متعلق شاعر نے کہا:

1۔ تفسیر طبری، صفحہ 345، جلد 2 (داراحیاء التراث العلمیہ)　2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 274، جلد 2 (دارالکتب العلمیہ)

☆ متن میں اسی طرح ہے جب کہ تفصیل میں اٹھارہ مسائل ہیں

☆☆ ایک اصطلاح ہے جو منقول کے مقابل ہے منقول اس کو کہتے ہیں جو پہلے کسی اور کے لیے وضع کیا جائے بعد میں اسم میں استعمال ہو۔ مرتجل جو ابتدا سے ہی اس کے لیے استعمال ہوا۔

تزودت من نعمان عود اراکۃ لھند ولکن من یبلغ ھندا (1)

میں نے ہند کے لئے عرفات سے سامان لیا لیکن ہند کو کون یہ پہنچائے گا۔

یہ العرف سے ماخوذ ہے جس کا مطلب خوشبو ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: عرفھالھم۔ یعنی اللہ نے اس کو ان کے لئے پاک کیا یہ پاک جگہ ہے بخلاف منیٰ کے جہاں جانوروں کی غلاظت اور خون ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کو عرفات کہا جاتا ہے اور وقوف کے دن کو یوم عرفہ کہا جاتا ہے۔ بعض نے کہا: ان دو اسموں کی اصل صبر ہے۔ کہا جاتا ہے: رجلٌ عارف جب کوئی شخص صبر کرنے والا، خشوع کرنے والا ہو۔ ضرب المثل ہے: النفس عروف وما حملتھا تتحمل۔ نفس صبر کرنے والا ہے جو تو اس کو برداشت کرائے گا یہ برداشت کرے گا۔

فصبرت عارفۃ لذلک حرۃ یعنی میرا نفس صبر کرنے والا آزاد ہے۔

ذوالرمہ نے کہا:

عروف لما خطت علیہ المقادر وہ صبر کرنے والا ہے جو اس پر تقدیر نے لکھا۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر صبر کرنے والا ہے۔ اس اسم کے ساتھ نام رکھا گیا ہے کیونکہ حاجی خضوع و خشوع کا اظہار کرتے ہیں اور دعا پر صبر کرتے ہیں، مختلف مصائب اور تکلیف برداشت کرتے ہیں تا کہ حج کی عبادت کو قائم کریں۔

مسئلہ نمبر 3: اہل علم کا اجماع ہے کہ جو عرفہ کے دن، عرفہ میں زوال سے پہلے ٹھہرا پھر وہاں سے زوال سے پہلے چلا گیا تو اس کا وقوف شمار نہیں ہوگا اور علماء کا اجماع ہے کہ اس کا حج مکمل ہے جو زوال کے بعد ٹھہرا اور رات سے پہلے دن کے وقت چلا گیا مگر امام مالک بن انس نے فرمایا کہ وہ رات کا کچھ حصہ موقف میں گزارے، رہا وہ شخص جو رات کے وقت عرفہ میں ٹھہرا اس کے حج کے مکمل ہونے میں امت کے درمیان اختلاف نہیں ہے اور جمہور کی حجت مطلق یہ ارشاد ہے فَإِذَآ أَفَضْتُم مِّنْ عَرَفٰتٍ اس ارشاد میں دن سے رات کو خاص نہیں فرمایا اور حضرت عروہ بن مضرس کی حدیث ہے فرمایا میں نبی کریم ﷺ کے پاس آیا جبکہ آپ مزدلفہ میں تھے۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! میں طی کے دو پہاڑوں سے آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں، میں نے اپنی سواری کو تھکا دیا ہے اور اپنے نفس کو بھی تھکا دیا ہے اللہ کی قسم میں نے کوئی پہاڑ نہیں چھوڑا مگر میں اس پر ٹھہرا، کیا میرے لئے حج ہے یا رسول اللہ!؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے ہمارے ساتھ صبح کی مزدلفہ میں نماز پڑھی اور اس سے پہلے وہ رات یا دن کے وقت عرفات میں آچکا تھا تو اس نے حج کے مناسک پورے کر دیئے اور اس کا حج مکمل ہوا (2)۔ اس حدیث کو بہت سے ائمہ نے نقل کیا ہے ان میں سے ابو داؤد، نسائی اور دار قطنی ہیں یہ لفظ دار قطنی کے ہیں۔ ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ ابو عمر نے کہا حضرت عروہ بن مضرس میں طائی کی حدیث ثابت صحیح ہے۔ اس کو شعبی کے اصحاب میں سے ایک جماعت نے شعبی سے اور انہوں نے عروہ بن مضرس سے روایت کیا ہے۔ ان میں سے اسماعیل بن ابی خالد،

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 274، جلد 2 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ جامع ترمذی، کتاب المناسک، ماجاء من ادرک الامام، صفحہ 109، جلد 1 (وزارت تعلیم)

داؤد بن ابی ہند، زکریا بن ابی زائدہ، عبد اللہ بن ابی السفر اور مطرف ہیں۔ ان سب نے شعبی سے انہوں نے عروہ بن مضرس بن اوس بن حارثہ بن لام سے روایت کیا ہے۔ امام مالک کی حجت، سنت ثابتہ سے حضرت جابر کی طویل حدیث ہے جس کو مسلم نے نقل کیا ہے۔ اس میں ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم ٹھہرے رہے حتیٰ کہ سورج غروب ہو گیا اور تھوڑی زردی چلی گئی حتیٰ کہ سورج کی ٹکیہ غائب ہو گئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال وجوب پر ہیں خصوصاً حج کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھ سے اپنے مناسک حج لے لو (1)۔

مسئلہ نمبر 4: جمہور کا اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جو سورج غروب ہونے سے پہلے عرفات سے چلا گیا اور واپس نہ آیا اس پر حج کی صحت کے ساتھ کیا لازم ہے؟ حضرات عطا، سفیان ثوری، شافعی، احمد، ابو ثور اور اصحاب رائے وغیرہ نے کہا: اس پر بکری ہے۔ حسن بصری نے کہا: اس پر ہدی ہے۔ ابن جریج نے کہا: اس پر اونٹ ہے۔ مالک نے کہا: اس پر آئندہ سال حج ہے اور ہدی کو وہ آئندہ نحر کرے گا وہ اس شخص کی مانند ہے جس کا حج فوت ہو گیا۔ اگر وہ عرفہ کی طرف لوٹ آیا پھر سورج غروب ہونے کے بعد نکلا تو امام شافعی نے فرمایا: اس پر کوئی چیز نہیں ہے۔ یہی احمد، اسحاق اور داؤد کا قول ہے۔ طبری نے بھی یہی کہا ہے۔ امام ابو حنیفہ، ان کے اصحاب اور ثوری نے کہا: اس سے دم ساقط نہ ہوگا اگرچہ وہ سورج غروب ہونے کے بعد لوٹ آئے یہی ابو ثور کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 5: علماء کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ جو سواری پر قادر ہو اس کے لئے سوار ہو کر عرفہ میں وقوف کرنا افضل ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفہ سے جانے تک سورج کے غروب ہونے کے بعد سواری پر وقوف کیا اور حضرت اسامہ بن زید کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیچھے بٹھایا ہوا تھا۔ یہ حضرت جابر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی حدیث میں محفوظ ہے۔ حضرت ابن عباس کی حدیث میں بھی ہے۔ حضرت جابر نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سوار ہوئے حتیٰ کہ موقف میں آئے اپنی اونٹنی قصواء کا بطن جبل رحمت کے نیچے پتھروں کی طرف کیا اور پیدل چلنے والوں کے راستہ کو سامنے رکھا اور قبلہ کی طرف منہ کیا اور آپ سورج کے غروب ہونے تک ٹھہرے رہے اور زردی تھوڑی سی چلی گئی حتیٰ کہ سورج کی ٹکیہ غائب ہو گئی اور حضرت اسامہ بن زید کو آپ نے اپنے پیچھے بٹھایا ہوا تھا (2) (الحدیث) اگر سواری پر سوار ہونے پر قادر نہ ہو تو اپنے قدموں پر دعا مانگتا ہوا کھڑا ہو جب تک طاقت رکھتا ہے اور کھڑے ہونے پر قادر نہ ہو تو بیٹھنے میں بھی کوئی حرج نہیں، سوار ہو کر وقوف کرنے میں مباہات اور حج کی تعظیم ہے۔ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ (الحج)

ابن وہب نے اپنے مؤطا میں کہا: مجھے مالک نے کہا: عرفہ میں وقوف سواری اور اونٹ پر وقوف میں نزدیک کھڑا ہو کر وقوف کرنے سے میرے نزدیک زیادہ محبوب ہے اور جو کھڑا ہو کر وقوف کرے اس کے آرام کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

مسئلہ نمبر 6: صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت اسامہ بن زید سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب عرفہ سے چلے تو تھوڑے

1۔ السنن الکبری، کتاب الحج، الایضاح فی وادی محسر، صفحہ 125، جلد 5 (دار الفکر)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، صفحہ 398، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

تیز چلتے جب کھلی جگہ پاتے تو مزید تیز چلتے (1)۔ ہشام بن عروہ نے کہا: نص، عنق سے زیادہ تیز چلنا ہے۔ اسی طرح حاجیوں کے اماموں اور دوسرے لوگوں کو چلنا چاہئے کیونکہ مزدلفہ کی طرف جلدی چلنا، نماز کی طرف جلدی چلنا ہے اور یہ مسلم ہے کہ مغرب کی نماز اس رات مزدلفہ میں عشاء کی نماز کے ساتھ پڑھی جاتی ہے، یہ سنت ہے۔ جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 7: قرآن اور سنت ثابتہ کا عموم ظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ عرفہ سارا موقف ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں یہاں ٹھہرا اور عرفہ سارا موقف ہے (2)۔ اس حدیث کو مسلم وغیرہ نے حضرت جابر کی طویل حدیث سے روایت کیا ہے۔ مؤطا امام مالک میں ہے انہیں یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عرفہ سارا موقف ہے اور بطن عرنہ سے بلند رہو۔ اور مزدلفہ سارا موقف ہے اور بطن محسر سے بلند رہو (3) (یعنی ان میں نہ ٹھہرو) اسی طرح حفاظ ثقات اور اہل حدیث میں سے اثبات لوگوں نے جعفر بن محمد کی حدیث سے نقل کیا ہے جو انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے حضرت جابر سے روایت کی ہے۔ ابو عمر نے کہا: فقہاء کا اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے جس نے وادی عرفہ میں وقوف کیا۔ ابن منذر نے مالک سے ان کا قول ذکر کیا ہے کہ وہ شخص بکری دے اور اس کا حج مکمل ہے۔ یہ روایت خالد بن نزار نے مالک سے روایت کی ہے، ابو المصعب نے کہا کہ وہ اس شخص کی مانند ہے جس نے وقوف کیا ہی نہیں اور اس کا حج فوت ہے اس پر آئندہ سال حج ہے جب وہ بطن عرنہ میں ٹھہرا ہو۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے، فرمایا: جو وادی عرنہ سے چلا اس کا حج نہیں یہ ابن قاسم اور سالم کا قول ہے ابن منذر نے یہ قول امام شافعی سے روایت کیا ہے۔ ابن منذر نے کہا: میں بھی یہی کہتا ہوں کہ وہ اس جگہ پر نہ ٹھہرے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ ٹھہرنے کا حکم دیا ہے۔ ابن عبد البر نے کہا: عرفہ سے بطن عرنہ کی استثناء ایسی نہیں ہے جس کی حجت لازم ہو، نہ نقل کی جہت سے اور نہ اجماع کی جہت سے، اور جو ابو المصعب کے مذہب پر چلتے ہیں۔ ان کی حجت یہ ہے کہ عرفہ کا وقوف فرض ہے اس پر اجماع ہے اور یہ معین جگہ میں ہے۔ پس اس کی ادائیگی یقین کے ساتھ ہی ہوگی اور اختلاف کے ہوتے ہوئے یقین نہیں ہوتا بطن عرنہ راء کے فتحہ اور راء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ یہ عرفہ کی مسجد کے مغربی جانب ہے حتیٰ کہ بعض علماء نے فرمایا: عرفہ کی مسجد کی مغربی دیوار اگر گرے گی تو وہ بطن عرنہ میں گرے گی۔ الباجی نے ابن حبیب سے روایت کیا ہے کہ عرنہ حل میں ہے اور عرفہ حرم میں ہے۔ ابو عمر نے کہا: رہی بطن محسر تو وکیع نے ذکر کیا ہے ہمیں سفیان نے بتایا انہوں نے ابو زبیر سے انہوں نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بطن محسر میں تیز چلے (4)۔

مسئلہ نمبر 8: نو ذی الحجہ کو عرفہ کے علاوہ دوسری مساجد میں اہل عرفہ سے تشبیہ اختیار کرتے ہوئے جمع ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ شعبہ نے قتادہ سے انہوں نے حسن سے روایت کیا ہے، فرمایا: سب سے پہلے حضرت ابن عباس نے یہ بصرہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، الاضافۃ من عرفات الی المزدلفۃ، صفحہ 417، جلد 1

2۔ صحیح مسلم، ایضاً، کتاب الحج، حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، صفحہ 400، جلد 1

3۔ مؤطا امام مالک، کتاب الحج، الوقوف بعرفۃ، صفحہ 410 (وزارت تعلیم)

4۔ جامع ترمذی، کتاب الحج، ما جاء فی الافاضۃ من عرفات، صفحہ 108، جلد 1 (وزارت تعلیم)

میں کیا تھا یعنی نویں ذی الحجہ کے دن لوگوں کا بصرہ کو عرفہ کے دن خطبہ دیتے ہوئے دیکھا جبکہ لوگ ان کے پاس جمع تھے۔ اثرم نے کہا: میں نے امام احمد بن حنبل سے عرفہ کے علاوہ دوسرے شہروں میں لوگوں کے جمع ہونے کے متعلق پوچھا جو عرفہ کے دن جمع ہوئے ہیں تو امام احمد بن حنبل نے فرمایا: میں امید کرتا ہوں اس میں کوئی حرج نہیں کئی لوگوں نے ایسا کیا ہے۔ حسن، بکر، ثابت اور محمد بن واسع عرفہ کے دن مسجد میں حاضر ہوتے تھے۔

مسئلہ نمبر 9: نویں ذی الحجہ کی فضیلت: نویں کے دن کی بہت بڑی فضیلت ہے اور بہت بڑا ثواب ہے۔ اس دن اللہ تعالیٰ بڑے بڑے گناہ معاف فرما دیتا ہے اور نیک اعمال کو اس میں کئی گنا کیا جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نویں کے دن کا روزہ گزشتہ اور باقی سال کے گناہوں کا کفارہ ہے (1)۔ اس کو ''الصحیح'' میں نقل کیا گیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: افضل دعا عرفہ کے دن کی دعا ہے اور اس میں سے افضل وہ ہے جو میں نے اور مجھ سے پہلے نبیوں نے کہا: لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ (2)۔ دارقطنی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عرفہ کے دن سے زیادہ اللہ تعالیٰ کسی دن میں آگ سے زیادہ لوگوں کو آزاد نہیں فرماتا۔ اللہ تعالیٰ اپنی شان کے لائق قریب ہوتا ہے پھر فرشتوں کے سامنے مباہات فرماتا ہے، جو انہوں نے ارادہ کیا اسے بیان فرماتا ہے (3)...... اور مؤطا میں عبید اللہ بن کریز سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شیطان عرفہ کے دن سے زیادہ کسی دن ذلیل وحقیر، دھتکارا ہوا اور غصہ میں نہیں دیکھا جاتا یہ نہیں ہوتا مگر اس لئے کہ جو رحمت کا نزول اور اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے گناہوں سے تجاوز دیکھتا ہے۔ مگر بدر کے دن جو اس نے (مسلمانوں کے لیے فرشتوں کی مدد) دیکھی (تو اتنا ہی پریشان و ذلیل ہوا تھا) پوچھا گیا: یا رسول اللہ! بدر کے دن شیطان نے کیا دیکھا تھا؟ فرمایا: اس نے جبریل کو دیکھا کہ وہ فرشتوں کی صفوں کو جنگ کے لئے ترتیب دے رہا ہے (4)۔ ابو عمر نے کہا: یہ حدیث ابو النضر اسماعیل بن ابراہیم عجلی نے مالک سے انہوں نے ابراہیم بن ابی عیلہ سے انہوں نے طلحہ بن عبید اللہ بن کریز سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کی ہے۔ اور اس حدیث میں عن ابیہ کسی اور نے نہیں کہا اور یہ کچھ نہیں ہے۔ صحیح وہ ہے جو مؤطا میں ہے۔ ترمذی الحکیم نے ''نوادر الاصول'' میں ذکر کیا ہے اپنی مسند سے عباس بن مرداس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے لئے عرفہ کے پچھلے پہر مغفرت اور رحمت کی دعا مانگی اور بہت زیادہ دعا مانگی اور اللہ تعالیٰ نے جواباً فرمایا: میں نے تیری دعا قبول کر لی مگر جو بعض نے بعض پر ظلم کیا۔ ان کے جو گناہ میرے اور ان کے درمیان ہیں میں نے وہ معاف کر دیئے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عرض کی: یا رب! تو قادر ہے کہ تو اس مظلوم کو اس پر جو ظلم کیا گیا ہے اس سے زیادہ بہتر جزا عطا فرمادے اور تو اس ظالم کو معاف فرمادے تو اس وقت کوئی جواب نہ دیا جب مزدلفہ کی صبح تھی تو

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصیام، استحباب صیام ثلاثۃ ایام من کل شہر، صفحہ 368، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ مؤطا امام مالک، کتاب القرآن، ما جاء فی الدعاء، صفحہ 198 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، فضل یوم عرفہ، صفحہ 436، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

4۔ مؤطا امام مالک، کتاب الحج، جامع الحج، صفحہ 457 (وزارت تعلیم)

آپ نے دعا میں مزید اجتہاد و کوشش کی۔ اللہ تعالیٰ نے جواباً فرمایا: میں نے انہیں بھی معاف کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ مسکرائے۔ پوچھا گیا یا رسول اللہ! آپ ایسے وقت میں مسکرائے ہیں جس وقت آپ پہلے کبھی نہیں مسکرائے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں اللہ کے دشمن ابلیس پر ہنسا ہوں جب اسے علم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کے بارے میری بات قبول کر لی ہے تو وہ ویل اور موت کو پکارنے لگا اور اپنے سر پر مٹی ڈالنے لگا اور بھاگنے لگا۔ ابو عبد الغنی حسن بن علی نے کہا: ہمیں عبد الرزاق نے بتایا انہوں نے کہا: ہمیں مالک نے بتایا انہوں نے ابو الزناد سے انہوں نے اعرج سے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب عرفہ کا دن ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ خالص حاجی کو معاف کر دیتا ہے اور جب مزدلفہ کی رات ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ تاجروں کو معاف فرما دیتا ہے اور جب منیٰ کا دن ہوتا ہے تو اونٹوں والوں کو معاف فرما دیتا ہے جب جمرہ عقبہ کا دن ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ سوال کرنے والوں کو معاف کر دیتا ہے اور جو مخلوق موقف میں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنے والوں میں سے موجود ہوتی ہے اسے معاف فرما دیتا ہے۔ ابو عمر نے کہا: یہ حدیث مالک کی حدیث سے غریب ہے اور محفوظ نہیں ہے مگر اسی سند سے۔ ابو عبد الغنی نے کہا: میں اسے نہیں جانتا اور اہل علم رغبت اور فضائل والی احادیث ہر ایک سے آسانی سے روایت کر لیتے ہیں اور احکامات کی احادیث میں سختی کرتے تھے۔

مسئلہ نمبر 10: اہل علم نے نویں ذی الحجہ کا روزہ مستحب قرار دیا ہے مگر عرفات کے مقام پر نہیں۔ ائمہ نے روایت کیا ہے اور یہ الفاظ ترمذی کے ہیں۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عرفہ کا روزہ نہ رکھا اور حضرت ام الفضل نے آپ کو دودھ کا پیالہ بھیجا تو آپ نے نوش فرما لیا۔ فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے، فرمایا: میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ حج کیا اور آپ نے عرفہ کے دن روزہ نہ رکھا تھا اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج کیا اور انہوں نے یہ روزہ نہ رکھا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج کیا اور انہوں نے یہ روزہ نہ رکھا تھا۔ اکثر اہل علم کا اس پر عمل ہے۔ وہ افطار کو پسند فرماتے تھے تا کہ دعا پر قوت حاصل کرے۔ بعض اہل علم نے عرفہ کا روزہ رکھا (1)۔ حضرت ابن عمر سے پہلی حدیث کی مثل مسند سے مروی ہے اور اس کے آخر میں ہے حضرت عثمان کے ساتھ میں نے حج کیا اور انہوں نے روزہ نہیں رکھا، میں نہ خود روزہ رکھتا ہوں نہ اس کا حکم دیتا ہوں نہ اس سے منع کرتا ہوں (2)۔ یہ حدیث حسن ہے۔ یہ ابن منذر نے ذکر کیا ہے۔ عطا نے عرفہ کے دن کے روزہ کے متعلق فرمایا: میں سردیوں میں روزہ رکھتا ہوں اور گرمیوں میں نہیں رکھتا ہوں۔ یحییٰ انصاری نے فرمایا: عرفہ کے دن فطر واجب ہے۔ حضرت عثمان بن ابو العاص، حضرت ابن زبیر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم عرفہ کا روزہ رکھتے تھے۔ ابن منذر نے کہا: عرفہ کے دن عرفات میں میرے نزدیک رسول اللہ ﷺ کی اتباع میں روزہ نہ رکھنا محبوب ہے اور عرفات کے علاوہ عرفہ کا روزہ رکھنا محبوب ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب عرفہ کے دن کے روزہ کے بارے پوچھا گیا، یہ "گزشتہ اور باقی سال کا کفارہ ہے (3)"۔ اور ہم نے عطا سے روایت کیا ہے، فرمایا: جس نے عرفہ

1۔ جامع ترمذی، کتاب الصوم، فی کراھیۃ صوم یوم عرفۃ، صفحہ 93، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ ایضاً، صفحہ 94، جلد 1

3۔ ایضاً، صفحہ 93، جلد 1

کے دن روزہ افطار کیا تاکہ دعا پر قوت حاصل کرے تو اس کے لئے روزہ دار کے اجر کا مثل اجر ہوگا۔

مسئلہ نمبر 11: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ یعنی مشعر حرام کے پاس دعا اور تلبیہ کے ساتھ اللہ کا ذکر کرو، اس کو جمع کیا جاتا ہے کیونکہ یہاں مغرب وعشاء کی نمازوں کو جمع کیا جاتا ہے۔ یہ قتادہ کا قول ہے۔ بعض نے فرمایا: کیونکہ اس میں حضرت آدم علیہ السلام، حضرت حواء علیہا السلام کے ساتھ ملے تھے۔ اذدلف الیہا کا مطلب ہوتا ہے وہ اس کے قریب ہوا اسی وجہ سے اس کو مزدلفہ کہا جاتا ہے اور یہ کہنا بھی جائز ہے کہ اس میں موجود لوگوں کے فعل کی وجہ سے اس کو مزدلفہ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اللہ کے قریب ہوتے ہیں۔ یعنی وہ اس میں ٹھہرنے کے ساتھ اللہ کا قرب حاصل کرتے ہیں اس کو مشعر کہا جاتا ہے۔ یہ شعار سے مشتق ہے جس کا معنی علامت ہے، کیونکہ یہ حج، نماز اور رات گزارنے کی علامت ہے اور اس کے پاس دعا حج کے شعائر میں سے ہے اور حرمت کی صفت اس کی حرمت کی وجہ سے لگائی گئی ہے۔

مسئلہ نمبر 12: یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مغرب اور عشاء کی نماز مزدلفہ میں اکٹھی پڑھی (1)۔ اہل علم کا اجماع ہے اور کوئی اختلاف نہیں ہے کہ حاجی کے لئے مغرب وعشاء کی نماز کو جمع کرنا ہے اور اس کے متعلق اختلاف ہے جس نے مزدلفہ میں پہنچنے سے پہلے نماز پڑھی۔ امام مالک نے کہا: جو امام کے ساتھ ٹھہرے اور امام کے ساتھ نکلے تو وہ نماز نہ پڑھے حتیٰ کہ مزدلفہ آئے اور یہاں دونوں نمازیں اکٹھی پڑھے اور اس پر انہوں نے اس ارشاد سے استدلال کیا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت اسامہ بن زید کو فرمایا تھا ''نماز آگے ہے''۔ ابن حبیب نے کہا: جس نے مزدلفہ میں آنے سے پہلے بغیر عذر کے نماز پڑھی تو وہ نماز کا اعادہ کرے جب اسے علم ہو، یہ اس شخص کی مانند ہے جس نے زوال سے پہلے نماز پڑھی کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: الصلاة امامك (نماز آگے ہے (2)) یہی امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔ اشہب نے کہا: اس پر اعادہ نہیں ہے مگر جب اس نے شفق کے غیب ہونے سے پہلے نماز پڑھی ہو، وہ صرف عشاء کی نماز کا اعادہ کرے۔ یہی امام شافعی کا قول ہے۔ قاضی ابوالحسن نے اس کی تائید کی ہے اور اس نے اس سے حجت پکڑی ہے کہ یہ دو نمازیں مزدلفہ میں جمع کرنا سنت ہے اور ان کی صحت کے لئے یہ شرط نہیں ہے، یہ استحباب کے معنی پر ہے جیسے ظہر اور عصر کو عرفہ میں جمع کرنا ہے۔ ابن منذر نے اس قول کو اختیار کیا ہے اور انہوں نے یہ قول عطا بن رباح، عروہ بن زبیر، قاسم بن محمد، سعید بن جبیر، احمد، اسحاق، ابوثور اور یعقوب سے حکایت کیا ہے اور امام شافعی سے حکایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: وہ نماز نہ پڑھے حتیٰ کہ مزدلفہ میں آئے اگر مزدلفہ پہنچنے سے پہلے نصف رات گزر چکی ہو تو دونوں نمازیں پڑھے۔

مسئلہ نمبر 13: جس نے جلدی کی اور شفق کے غروب ہونے سے پہلے مزدلفہ پہنچ گیا تو ابن حبیب نے کہا: جو شفق کے غروب ہونے سے پہلے جلدی مزدلفہ پہنچا اس کی نماز نہیں۔ نہ امام کی نماز ہے اور نہ کسی اور کی حتیٰ کہ شفق غائب ہو جائے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نماز آگے ہے۔ پھر شفق کے غروب ہونے کے بعد مزدلفہ میں نماز پڑھی اس اعتبار سے اس

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، من جمع بینہما ولم یتطوع، صفحہ 227، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح مسلم، الافاضۃ من عرفات الی المزدلفۃ، صفحہ 416، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

نماز کا وقت شفق کے غائب ہونے کے بعد ہے۔ پس شفق کے غائب ہونے سے پہلے اس کو ادا کرنا جائز نہیں۔ اگر اس کا وقت شفق کے غائب ہونے سے پہلے ہوتا تو اس وقت سے مؤخر نہ کی جاتی۔

مسئلہ نمبر 14: جو امام کے جانے کے بعد عرفہ میں آیا یا جس کو عذر لاحق ہوا جو امام کے ساتھ ٹھہرا تھا تو ابن المواز نے کہا: جو امام کے بعد ٹھہرا وہ ہر نماز اپنے وقت پر پڑھے۔ امام مالک نے اس شخص کے بارے فرمایا جس کو عذر امام کے ساتھ جانے سے روک لے تو وہ دونوں نمازیں اکٹھی پڑھے جب شفق غائب ہو جائے۔ ابن القاسم نے اس شخص کے بارے میں فرمایا جو امام کے بعد ٹھہرا، اگر اسے رات کے تیسرے حصہ میں مزدلفہ پہنچنے کی امید ہو تو وہ نماز کو مؤخر کرے حتیٰ کہ مزدلفہ پہنچ جائے ورنہ ہر نماز کو اپنے وقت پر پڑھے۔ ابن المواز نے مزدلفہ تک نماز کو مؤخر کرنے کو کہا جو امام کے ساتھ ٹھہرے نہ کہ کسی دوسرے شخص کے لئے۔ امام مالک نے وقت کی رعایت کی ہے، مکان کی نہیں۔ ابن القاسم نے نماز کے لئے مختار وقت اور مکان کا اعتبار کیا ہے۔ جب مختار وقت کے فوت ہونے کا خوف ہو تو مکان کا اعتبار باطل ہو جائے گا اور مختار وقت کی رعایت اولیٰ ہے۔

مسئلہ نمبر 15: علماء کا مزدلفہ میں نماز کی ہیئت میں دو اعتبار سے اختلاف ہے: (۱) اذان اور اقامت کے اعتبار سے (۲) کیا ان کا جمع کرنا متصل ہوگا یا کسی عمل سے ان کے درمیان فیصلہ کیا جائے گا یا ان کے درمیان عمل جائز ہے، مثلاً سواریوں کا اتارنا وغیرہ۔ رہی اذان اور اقامت، ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کی نماز ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ پڑھی (1)، اسی طرح ظہر اور عصر کی نمازوں میں عرفہ میں کیا مگر یہ بالا جماع ظہر کے پہلے وقت میں ادا کی جائیں گی۔ ابوعمر نے کہا: امام مالک نے جو کہا اس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی مرفوع حدیث نہیں جانتا لیکن حضرت عمر بن خطاب سے مروی ہے۔ ابن منذر نے حضرت ابن مسعود کا بھی زائد ذکر کیا ہے۔ نظر کی جہت سے اس بات میں امام مالک کی حجت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزدلفہ اور عرفہ کی نمازوں میں سنت قائم فرمائی کہ ان دونوں نمازوں کا ایک وقت ہے جب ان کا وقت ایک ہے اور ہر نماز اپنے وقت پر پڑھی جائے گی تو کوئی نماز دوسری سے اذان اور اقامت کے اعتبار سے اولیٰ نہ ہوگی کیونکہ ان میں سے کوئی ایک بھی اس کا تقاضا نہیں کرتی۔ یہ نماز اپنے وقت میں پڑھی گئی ہے اور جو نماز اپنے وقت پر پڑھی گئی ہو اس کی سنت یہ ہے کہ اس کے لئے اذان دی جائے اور جماعت کے لئے تکبیر کہی جائے اور یہ واضح ہے۔ واللہ اعلم

دوسرے علماء نے کہا: ان میں سے پہلی نماز اذان اور اقامت کے ساتھ پڑھی جائے اور دوسری نماز بغیر اذان اور اقامت کے پڑھی جائے۔ علماء نے کہا: حضرت عمر نے دوسری اذان کا حکم دیا تھا کیونکہ لوگ شام کے کھانے کے لئے جدا جدا ہو گئے تھے۔ پس آپ نے اذان دلوائی تا کہ وہ لوگوں کو جمع کریں۔ علماء نے کہا: اسی طرح ہم کہتے ہیں جب لوگ امام سے کھانے وغیرہ کے لئے جدا ہو گئے تو آپ نے مؤذنین کو حکم دیا کہ وہ اذان دیں تا کہ لوگ جمع ہو جائیں۔ جب اذان دی تو اقامت بھی کہی۔ علماء نے کہا: یہ وہ معنی ہے جو حضرت عمر سے مروی ہے۔ عبدالرحمن بن یزید کی حدیث ذکر کی۔ فرمایا: حضرت ابن مسعود عشاء کا کھانا مزدلفہ میں دو نمازوں کے درمیان میں کھاتے تھے اور دوسری سند میں ہے ہر نماز کو اذان اور اقامت کے ساتھ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، صفحہ 398، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

پڑھا۔ یہ عبدالرزاق نے ذکر کیا ہے۔ دوسرے علماء نے کہا: دونوں نمازیں ایک اذان اور ایک اقامت کے ساتھ مزدلفہ میں اکٹھی پڑھی جائیں گی اور ان کے درمیان کوئی چیز نہ ہوگی۔ حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے اور یہی ثوری کا قول ہے۔ عبدالرزاق اور عبدالمالک بن صباح نے ثوری سے انہوں نے سلمہ بن کہیل سے انہوں نے حضرت سعید بن جبیر سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کو جمع کیا مغرب کی تین رکعتیں پڑھیں اور عشاء کی دو رکعتیں پڑھیں ایک اقامت کے ساتھ۔ دوسرے علماء نے کہا: مزدلفہ میں مغرب وعشاء کی نمازیں اکٹھی ایک اذان اور ایک اقامت کے ساتھ جمع کرے۔ یہ علماء اس روایت پر عمل کرتے ہیں جو ہشیم نے یونس بن عبید سے انہوں نے سعید بن جبیر سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ ایک اذان اور ایک اقامت کے ساتھ مغرب اور عشاء کی نماز کو مزدلفہ میں جمع کرتے تھے اور ان کے درمیان کچھ نہیں کرتے تھے۔ اس کی مثل حضرت خزیمہ بن ثابت کی حدیث سے مرفوع روایت مروی ہے لیکن وہ قوی نہیں ہے۔ جوزجانی نے محمد بن حسن سے انہوں نے امام ابویوسف سے انہوں نے امام ابو حنیفہ سے حکایت کیا ہے کہ دونوں نمازیں ایک اذان اور دو اقامتوں سے ادا کی جائیں گی۔ مغرب کے لئے اذان دی جائے گی اور عشاء کے لئے صرف تکبیر کہی جائے گی۔

یہی نظریہ امام طحاوی کا ہے کیونکہ حضرت جابر کی حدیث اس کی دلیل ہے۔ یہ پہلا قول ہے اور اسی پر اعتماد ہے۔ بعض علماء نے کہا: بغیر اذان کے دونوں نمازیں دو اقامتوں کے ساتھ ادا کی جائیں گی اور یہ جن علماء نے کہا ان میں سے امام شافعی، ان کے اصحاب اور اسحاق ہیں اور امام احمد کا ایک قول یہی ہے۔ یہ سالم بن عبداللہ، قاسم بن محمد کا قول ہے۔ ان علماء نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جو عبدالرزاق نے معمر سے انہوں نے ابن شہاب سے انہوں نے سالم سے انہوں نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مزدلفہ آئے تو مغرب وعشاء کی نمازوں کو جمع کیا مغرب کی تین اور عشاء کی دو رکعتیں پڑھیں ہر ایک کے لئے ایک تکبیر کہی اور ان کے درمیان کوئی نوافل نہ پڑھے۔ ابوعمر نے کہا: حضرت ابن عمر سے آثار اس قول کے بارے میں زیادہ ثابت ہیں جو اس باب میں مروی ہیں لیکن یہ تاویل کا احتمال رکھتے ہیں اور حضرت جابر کی حدیث میں اختلاف نہیں ہے اور یہ اولیٰ ہے۔ اس مسئلہ میں نظر کو کوئی دخل نہیں ہے اس میں صرف اتباع ہے۔

مسئلہ نمبر 16: نماز کے علاوہ دونوں نمازوں کے درمیان کسی عمل کے ساتھ فاصلہ کرنا۔ حضرت اسامہ بن زید سے ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مزدلفہ میں آئے تو اترے، وضو کیا اور مکمل وضو کیا پھر نماز کے لئے تکبیر کہی گئی، آپ نے مغرب کی نماز پڑھی پھر ہر شخص نے اپنی منزل میں اپنے اونٹ کو بٹھایا پھر تکبیر کہی گئی تو پھر آپ نے عشاء کی نماز پڑھائی اور دونوں نمازوں کے درمیان کوئی نماز نہ پڑھی (1)۔ ایک روایت میں ہے ''اور صحابہ نے سامان نہ کھولا حتیٰ کہ عشاء کی تکبیر ہوئی آپ نے نماز پڑھائی پھر سامان کھولا'' ہم نے ابھی ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن مسعود سے دونوں نمازوں کے درمیان فاصلہ کرنے کا جواز ہے۔ امام مالک سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو مزدلفہ میں آیا کیا وہ پہلے نماز پڑھے یا نماز کو مؤخر

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، الافاضة من عرفات إلى المزدلفة، صفحہ 416، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

کرے حتیٰ کہ سواری سے سامان اتارے؟ امام مالک نے فرمایا: سامان خفیف ہو تو کوئی حرج نہیں کہ نماز سے پہلے اس کو اتار دے اور رہی ساز و سامان والی سواریاں ان کو بٹھانے اور ان کا سامان اتارنے کا نظریہ نہیں رکھتا، اسے چاہئے کہ پہلے نماز پڑھے پھر سواری سے سامان اتارے۔ اشہب نے اپنی کتب میں لکھا ہے کہ اس کے لئے نماز سے پہلے سواری سے اتارنا جائز ہے اور مغرب کی نماز پڑھ کر سامان اتارنا میرے نزدیک محبوب ہے جب تک کہ اس کی طرف مجبور نہ ہو۔ مثلاً سواری پر بوجھ زیادہ ہو یا عذر ہو۔ رہا دونوں نمازوں کے درمیان نفل پڑھنا تو ابن منذر نے کہا: اس میں علماء کا اختلاف نہیں جانتا کہ سنت یہ ہے کہ جمع کرنے والا دونوں نمازوں کے درمیان نفل نہیں پڑھے گا۔ حضرت اسامہ کی حدیث میں ہے ان دونوں نمازوں کے درمیان کوئی نماز نہیں پڑھی۔

مسئلہ نمبر 17: جمہور علماء کے نزدیک مزدلفہ میں رات گزارنا حج کا رکن ہے جو شخص مزدلفہ میں دسویں کی رات نہیں گزارتا اور مزدلفہ میں نہیں ٹھہرتا اس پر جو واجب ہوگا اس کے متعلق اختلاف ہے۔ امام مالک نے کہا: جس نے مزدلفہ میں رات نہیں گزاری اس پر دم ہے اور جو رات کا اکثر حصہ ٹھہرا اس پر کچھ واجب نہیں ہے کیونکہ امام مالک اور ان کے اصحاب کے نزدیک مزدلفہ میں دسویں کی رات گزارنا سنت مؤکدہ ہے فرض نہیں ہے۔ اسی طرح کا قول عطا، زہری، قتادہ، سفیان ثوری، احمد، اسحاق، ابوثور اور اصحاب الرائے کا ہے اس شخص کے بارے میں جس نے رات نہیں گزاری۔ امام شافعی نے فرمایا: اگر مزدلفہ سے نصف رات کے بعد نکل گیا تو اس پر کوئی چیز واجب نہیں اور اگر نصف رات سے پہلے نکل گیا اور واپس نہ آیا تو فدیہ دے گا (1) اور فدیہ ایک بکری ہے۔ حضرات عکرمہ، شعبی، نخعی، حسن بصری نے کہا: مزدلفہ میں وقوف فرض ہے اور جس سے مزدلفہ کا وقوف فوت ہو جائے تو اس کا حج فوت ہو جائے گا اور وہ اپنے احرام کو عمرہ کا احرام بنادے گا۔ یہ حضرت ابن زبیر سے مروی ہے اور یہ اوزاعی کا قول ہے اور ثوری سے اس کی مثل مروی ہے۔ اور ان سے اصح قول یہ مروی ہے کہ مزدلفہ کا وقوف سنت مؤکدہ ہے۔ حماد بن ابی سلیمان نے کہا: جس سے مزدلفہ سے چلنا فوت ہو گیا اس کا حج فوت ہو گیا، وہ عمرہ کر کے احرام کھول دے اور آئندہ سال حج کرے اور انہوں نے ظاہر کتاب و سنت سے حجت پکڑی ہے۔ کتاب اللہ میں ارشاد ہے:

فَاِذَاۤ اَفَضۡتُمۡ مِّنۡ عَرَفٰتٍ فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ عِنۡدَ الۡمَشۡعَرِ الۡحَرَامِ۔

اور سنت یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے مزدلفہ کا ٹھہرنا پایا پھر وہ لوگوں کے ساتھ ٹھہرا حتیٰ کہ وہ وہاں سے چلا تو اس نے حج پالیا اور جس نے مزدلفہ کا ٹھہرنا نہیں پایا اس کے لئے حج نہیں ہے (2)۔ یہ ابن منذر نے ذکر کیا ہے۔ دار قطنی نے عروہ بن مضرس سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا جبکہ آپ مزدلفہ میں تھے۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا میرے لئے حج ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے ہمارے ساتھ وقوف کیا حتیٰ کہ ہم یہاں سے چل پڑے اور اس سے پہلے وہ عرفات سے رات یا دن کے وقت نکل چکا ہے تو اس کا حج مکمل ہے اور وہ مناسک حج ادا کر چکا

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 275، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ سنن نسائی، کتاب المناسک، من لم یدرک صلاۃ الصبح مع الامام، صفحہ 47، جلد 2 (وزارت تعلیم)

ہے(1)۔ امام شعبی نے فرمایا: جو مزدلفہ میں نہیں ٹھہرا وہ اس احرام کو عمرہ کا احرام بنا دے اور جس نے جمہور کے لئے حجت پکڑی اس نے یہ جواب دیا کہ آیت میں وقوف کے وجوب اور رات گزارنے پر کوئی حجت نہیں ہے کیونکہ آیت میں یہ مذکور نہیں ہے آیت میں صرف اس کا ذکر ہے اور علماء کا اجماع ہے کہ جب سورج دسویں کے دن طلوع ہو جاتا ہے تو مزدلفہ میں وقوف کا وقت فوت ہو جاتا ہے اور جو سورج کے طلوع ہونے سے پہلے وقوف کو پالیتا ہے تو وہ وقوف کو پالیتا ہے یہ اجماع ان لوگوں کا ہے جو کہتے ہیں کہ یہ فرض ہے اور جو کہتے ہیں کہ یہ سنت ہے اور رہی حضرت عروہ بن مضرس کی حدیث اس کے بعض طرق میں عرفہ میں وقوف کا بیان ہے مزدلفہ میں رات گزارنے کا بیان نہیں ہے۔ اس کی مثل حضرت عبدالرحمٰن بن یعمر الدیلی کی حدیث ہے فرمایا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عرفہ میں حاضر تھا۔ اہل نجد میں سے کچھ لوگ آپ کے پاس آئے انہوں نے حج کے متعلق پوچھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حج عرفہ (میں وقوف ہے) جو اسے مزدلفہ کی رات سے فجر طلوع ہونے سے پہلے پالے تو اس کا حج مکمل ہوا(2)۔ اس حدیث کو نسائی نے روایت کیا ہے۔ فرمایا: ہمیں اسحاق بن ابراہیم نے بتایا فرمایا: ہمیں وکیع نے بتایا فرمایا: ہمیں سفیان ثوری نے بتایا انہوں نے بکیر سے انہوں نے عطا سے انہوں نے عبدالرحمٰن بن یعمر الدیلی سے روایت کیا، فرمایا: میں حاضر تھا، پھر انہوں نے مذکورہ حدیث ذکر کی۔ اس کو ابن عیینہ نے بکیر سے انہوں نے عبدالرحمٰن بن یعمر الدیلی سے، کہا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حج عرفات ہے جس نے فجر کے طلوع ہونے سے پہلے وقوف کو پالیا اس نے حج کو پالیا اور منیٰ کے دن تین ہیں جس نے دو دنوں میں جلدی کی اس پر کوئی گناہ نہیں اور جس نے تاخیر کی اس پر کوئی گناہ نہیں۔ اور عروہ کی حدیث میں ہے "جس نے ہماری اس نماز جیسی نماز پڑھی (3)"۔ آپ نے مزدلفہ میں نماز کا ذکر فرمایا۔ علماء کا اجماع ہے کہ اگر کوئی مزدلفہ میں رات گزارے اور امام کے ساتھ نماز پڑھے بغیر سو جائے حتیٰ کہ اس سے نماز فوت ہو جائے تو اس کا حج مکمل ہے۔ جب امام کے ساتھ نماز میں حاضر ہونا حج کی اصل میں سے نہیں ہے تو اس جگہ کا وقوف جس میں نماز ہوتی ہے وہ بدرجہ اولیٰ حج کی اصل میں سے نہیں ہوگا۔ علماء نے فرمایا: اس حدیث کی وجہ سے یہ فرض متحقق نہیں ہوتا مگر خاص عرفہ میں۔

مسئلہ نمبر 18: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاذۡكُرُوۡهُ كَمَا هَدٰٮكُمۡ تاکید کے لئے امر کو دوبارہ ذکر کیا جیسے تو کہتا ہے ارمِ ارمِ (تیر مار، تیر مار) بعض علماء نے فرمایا: پہلا حکم مشعر حرام کے پاس ذکر کرنے کا حکم ہے اور دوسرا ذکر کا حکم اخلاص کے حکم پر ذکر کا حکم ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: دوسرے سے مراد نعمت کا شمار کرنا ہے اور اس کے شکر کا حکم ہے پھر انہیں ان کی گمراہی کی حالت یاد دلائی تاکہ انعام کی قدر ظاہر ہو۔ فرمایا: وَاِنۡ كُنۡتُمۡ مِّنۡ قَبۡلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيۡنَ، کما میں کاف مصدر محذوف کی صفت ہے اور ما مصدریہ یا کافہ ہے۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عمدہ ذکر کرو جس طرح اس نے تمہیں عمدہ ہدایت دی اور اسے یاد کرو جس طرح اس نے تمہیں سکھایا کہ تم کیسے اس کا ذکر کرو، اس سے عدول نہ کرو۔ اِنۡ مخففہ من ثقیلہ ہے۔ اس کی دلیل خبر پر لام کا دخول ہے۔ یہ سیبویہ کا قول ہے۔ فراء نے کہا: ان نافیہ بمعنی ما ہے اور لام بمعنی اِلّا ہے۔ جیسے شاعر نے کہا:

1۔ سنن دار قطنی، کتاب الحج، المواقیت، صفحہ 240، جلد 2 (قاہرہ)

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المناسک، من اتی عرفۃ قبل الفجر، صفحہ 223 (وزارت تعلیم)

3۔ سنن نسائی، کتاب المناسک، فیمن لم یدرک صلاۃ الصبح مع الامام، صفحہ 47، جلد 2 (وزارت تعلیم)

ثكلتك امك ان قتلت لمسلما حلت عليك عقوبة الرحمن

تیری ماں تجھ پر روئے تو قتل نہیں کرے گا مگر کسی مسلمان کو تو تجھ پر رحمن کی سزا ہو گی۔

یا ان بمعنی قد ہے یعنی قد کنتم۔ یہ تین اقوال ہیں۔ قَبْلِهٖ میں ضمیر ھدیٰ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ بعض نے فرمایا: قرآن کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی تم قرآن کے انزال سے پہلے نہیں تھے مگر گمراہ۔ اگر تو چاہے تو اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹا دے اگرچہ پہلے آپ کا ذکر نہیں ہے۔ پہلا قول زیادہ ظاہر ہے۔ واللہ اعلم

ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۹﴾

''پھر تم بھی (اے مغروران قریش) وہاں تک (جا کر) واپس آؤ جہاں جا کر دوسرے لوگ واپس آتے ہیں اور معافی مانگو اللہ سے بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا نہایت رحم کرنے والا ہے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ بعض علماء نے فرمایا: یہ خطاب جس کو ہے وہ لوگوں کے ساتھ عرفات میں نہیں ٹھہرتے تھے بلکہ وہ مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے اور یہ حرم میں ہے۔ وہ کہتے تھے: ہم اللہ کے حرم میں رہنے والے ہیں، پس ہمارے لئے مناسب ہے کہ ہم حرم کی تعظیم کریں اور حل میں سے کسی چیز کی تعظیم نہ کریں۔ اس کے باوجود کہ وہ جانتے تھے اور اقرار کرتے تھے کہ عرفہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا موقف ہے وہ حرم سے نہیں نکلتے تھے اور وہ مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے اور اسی سے نکلتے تھے اور لوگ عرفہ میں ٹھہرتے تھے۔ تو انہیں کہا گیا کہ اکٹھے نکلو اور ثُمَّ اس آیت میں ترتیب کے لئے نہیں ہے۔ یہ جملہ کلام کے عطف کے لئے ہے۔ یہ اس آیت سے جدا ہے۔ ضحاک نے کہا: اس آیت کا مخاطب تمام امت ہے اور النَّاسُ سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں جیسے ارشاد فرمایا: الذين قال لهم الناس۔ یہاں النَّاسُ سے مراد ایک فرد ہے اور اس تاویل پر احتمال ہے کہ انہیں عرفہ سے جانے کا حکم دیا گیا تھا اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ دوسرا چلنا ہو اور یہ مزدلفہ سے چلنا ہے پھر ثُمَّ اپنے معنی پر ہوگا(1)۔ اس احتمال کی بنا پر طبری نے اعتماد کیا۔ معنی یہ ہے کہ تم چلو جہاں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام مزدلفہ سے چلے تھے یعنی پھر منیٰ کی طرف چلو کیونکہ عرفات سے نکلنا، مزدلفہ سے نکلنے سے پہلے ہے۔

میں کہتا ہوں: اس میں اس شخص کے لئے حجت ہے جس نے مزدلفہ میں وقوف کو واجب قرار دیا، اس سے نکلنے کے امر کی وجہ سے۔ واللہ اعلم۔ اس آیت کی تاویل میں دونوں اقوال میں سے پہلا قول صحیح ہے۔ ترمذی نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: قریش اور ان کے دین کے پیروکار یعنی حمس، مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے۔ کہتے تھے: ہم اللہ کے حرم میں ٹھہرنے والے ہیں اور جو ان کے علاوہ تھے وہ عرفہ میں ٹھہرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل کیا: ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ۔ (2) یہ حدیث حسن صحیح ہے اور مسلم کی صحیح میں حضرت عائشہ سے مروی ہے الحمس وہ لوگ ہیں جن کے متعلق

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 275، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ جامع الترمذی، کتاب الحج، ما جاء فی الوقوف بعرفات، صفحہ 107، جلد 1 (وزارت تعلیم)

اللہ تعالیٰ نے یہ نازل فرمایا: ثُمَّ اَفِیْضُوْا مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ النَّاسُ۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: لوگ عرفات سے نکلتے تھے اور الحمس، مزدلفہ سے نکلتے تھے وہ کہتے: ہم نہیں نکلیں گے مگر حرم سے جب یہ آیت نازل ہوئی ثُمَّ اَفِیْضُوْا مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ النَّاسُ۔ تو وہ عرفات کی طرف لوٹے۔ یہ صریح نص ہے اور اس کی مثل زیادہ صحیح ہے۔ باقی اقوال پر اعتماد نہیں کیا جائے گا۔ واللہ المستعان۔

حضرت سعید بن جبیر نے الناسی پڑھا ہے اور اس کی تاویل حضرت آدم علیہ السلام ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (طہ) بعض کے نزدیک یا کی تخفیف جائز ہے۔ وہ الناس کہتے ہیں جیسے القاض و الهادِ۔ ابن عطیہ نے کہا: عربی میں اس کا جواز سیبویہ نے ذکر کیا ہے اور اس کو پڑھنے کا جواز مجھے معلوم نہیں اللہ تعالیٰ نے استغفار کا حکم دیا کیونکہ یہ استغناء کی جگہ اور قبولیت کا مقام اور رحمت کے نزول کی جگہ ہے۔ ایک فرقہ نے کہا: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ سے اپنے اس گناہ کی معافی طلب کرو جو تم نے وقوف کے بارے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت کی مخالفت کرتے ہوئے کیا۔ تم مزدلفہ میں جبل قزح پر ٹھہرے اور عرفات میں نہ ٹھہرے (1)۔

مسئلہ نمبر 2: ابوداؤد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرمایا: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی تو آپ قزح پر ٹھہرے اور فرمایا: یہ قزح موقف ہے اور مزدلفہ سارا موقف ہے۔ میں نے یہاں نحر کیا اور منیٰ سارا نحر کرنے کی جگہ ہے تم اپنے خیموں میں نحر کرو اور حاجیوں کا حکم جب وہ عرفہ سے مزدلفہ کی طرف جائیں تو یہاں رات گزاریں پھر اندھیرے میں امام لوگوں کو صبح کی نماز پڑھائے اور مشعر حرام میں وہ وقوف کریں۔ قزح ایک پہاڑ ہے جس پر امام ٹھہرتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا ہمیشہ ذکر کرتے رہیں اور سورج کے طلوع ہونے کے قریب تک دعا مانگتے رہیں۔ پھر طلوع شمس سے پہلے چلے جائیں۔ عربوں کی مخالفت کرتے ہوئے، کیونکہ وہ سورج طلوع ہونے کے بعد جاتے تھے اور کہتے تھے: اَشْرِقْ ثَبِیْر کَیْمَا نُغِیْر ثبیر پہاڑ روشن ہوتا کہ ہم احرام کھولنے کے قریب ہوں اور ہم غارت گری تک پہنچیں۔

بخاری نے عمرو بن میمون سے روایت کیا ہے، فرمایا: میں حضرت عمر کے ساتھ موجود تھا۔ انہوں نے صبح کی نماز مزدلفہ میں پڑھی پھر ٹھہرے اور کہا: مشرکین نہیں نکلتے تھے حتیٰ کہ سورج طلوع ہو جاتا تھا اور کہتے تھے: اشرق ثبیر۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مخالفت کی اور آپ سورج طلوع ہونے سے پہلے چلے (2)۔ ابن عیینہ نے ابن جریج سے انہوں نے محمد بن قیس بن مخرمہ سے انہوں نے ابن طاؤس سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ اہل جاہلیت، عرفہ سے سورج غروب ہونے سے پہلے چلتے تھے اور مزدلفہ سے سورج طلوع ہونے کے بعد چلتے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفات سے چلنے میں تاخیر فرمائی اور مزدلفہ سے چلنے میں جلدی فرمائی، یعنی مشرکین کے طریقہ کی مخالفت کی۔

مسئلہ نمبر 3: جب سورج طلوع ہونے سے پہلے چلیں تو ان کو حکم ہے کہ وہ عرفہ سے چلنے کی ہیئت پر چلیں۔ یعنی امام

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 276، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

2۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، متی یدفع من جمع، صفحہ 228، جلد 1 (وزارت تعلیم)

لوگوں کو تھوڑا تیز چلائے جب ان میں سے کوئی کھلی جگہ پائے تو مزید تیز چلے۔ حدیث میں تیز چلنے کے لئے العنق کا لفظ استعمال ہوا ہے یہ جانوروں کی معروف چال ہے اور النص مزید تیز چلنا ہے جیسے الخبب (جس میں ہچکولے آتے ہیں) یا اس سے زیادہ تیز چلنا۔ صحیح مسلم میں حضرت اسامہ بن زید سے مروی ہے، ان سے پوچھا گیا جب رسول اللہ ﷺ عرفہ سے چلتے تھے تو کیسے چلتے تھے؟ فرمایا: تیز چلتے تھے جب کھلی جگہ پاتے تو مزید تیز چلتے تھے (1)۔ ہشام نے کہا: النص فوق العنق کہ نص عنق سے تیز رفتاری کا نام ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے اور مستحب ہے کہ بطن محسر میں پتھر پھینکنے کی مقدار اپنی سواری کو حرکت دے اگر ایسا نہ بھی کرے تو کوئی حرج نہیں۔ یہ منی سے ہے۔ ثوری وغیرہ نے ابوالزبیر سے انہوں نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ ﷺ چلے تو آپ پر سکینت تھی اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''وادی محسر میں تیز چلو (2)'' اور فرمایا: مجھ سے مناسک حج سیکھو۔ جب وہ منیٰ میں آئیں یہ دسویں کے دن کی صبح کا وقت ہے تو جمرہ عقبہ پر چاشت کے وقت سوار ہو کر رمی جمار کریں اگر قادر ہوں اور اس کے علاوہ جمروں میں سوار ہونا مستحب نہیں اور سات کنکریاں ماریں، ہر کنکری ٹھیکری کی مثل ہو۔ جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا...... جب وہ کنکریاں مارلیں گے تو جو کچھ لباس وغیرہ میں سے اور مثل میں سے حلال ہو جائیں گے مگر عورتیں، خوشبو اور شکار امام مالک اور اسحاق کے نزدیک حلال نہ ہوں گے۔ یہ ابوداؤد خفاف کی ان سے روایت ہے۔ حضرت عمر بن خطاب اور حضرت ابن عمر نے کہا: اس کے لئے ہر چیز حلال ہے سوائے عورتوں اور خوشبو کے۔ امام مالک کے نزدیک جس نے رمی جمار کے بعد اور افاضہ سے پہلے خوشبو لگائی اس پر فدیہ نہیں ہے کیونکہ اس کے متعلق ارشاد وارد ہے اور جو امام مالک کے نزدیک جمرہ عقبہ کے بعد اور طواف افاضہ سے پہلے شکار کرے اس پر جزا ہے۔ امام شافعی، امام احمد، اسحاق، ابوثور نے کہا: اس کے لئے ہر چیز حلال ہے سوائے عورتوں کے اور یہی حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔

مسئلہ نمبر 4: حاجی جمرہ عقبہ پر پہلی کنکری کے ساتھ ہی تلبیہ ختم کردے مدینہ اور دوسرے شہروں کے اکثر علماء کا یہی قول ہے اور امام مالک کے نزدیک یہ جائز اور مباح ہے اور ان کا مشہور قول یہ ہے کہ عرفہ کے دن سورج کے زوال کے وقت سے تلبیہ ختم کردے جیسا کہ انہوں نے مؤطا میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کر کے ذکر کیا ہے اور فرمایا: یہ امر ہمارے نزدیک ہے۔ میں کہتا ہوں: اس عمل میں سنت وہ ہے جو مسلم نے حضرت فضل بن عباس سے روایت کی ہے وہ رسول اللہ ﷺ کے پیچھے سوار تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: عرفہ کی شام کو اور مزدلفہ کی صبح کو جب لوگ چلے، تم پر سکینت لازم ہے۔ آپ اپنی سواری کو تیز چلا رہے تھے حتیٰ کہ آپ وادی محسر میں داخل ہوئے۔ وہ منیٰ کے علاقہ میں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم وہ کنکریاں لے کر چلو جو جمرہ پر ماری جائیں گی۔ حضرت فضل بن عباس نے کہا: رسول اللہ ﷺ تلبیہ کہتے رہے حتیٰ کہ جمرہ عقبہ پر رمی کی (3)۔ ایک روایت میں ہے نبی کریم ﷺ اپنے ہاتھ سے اشارہ کرتے جیسے انسان کسی چیز کو پھینکتا ہے (3)۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، الافاضۃ من عرفات الی المزدلفۃ، صفحہ 417، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب المناسک، التعجیل من جمع، صفحہ 268، جلد 1 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، استحباب ادامۃ الحج، صفحہ 415، جلد 1 (قدیمی کتب خانہ)

بخاری میں حضرت عبداللہ سے مروی ہے کہ وہ جمرہ کبریٰ تک پہنچے تو بیت اللہ ان کی بائیں جانب تھا اور منیٰ دائیں جانب تھا، انہوں نے سات کنکریاں ماریں اور فرمایا: اسی طرح کنکریاں ماری تھیں اس ذات نے جس پر سورہ بقرہ نازل ہوئی تھی (1)۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ دار قطنی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم رمی جمار کرلو اور حلق کرالو اور جانور ذبح کرلو تو تمہارے لئے ہر چیز حلال ہوگئی سوائے بیویوں کے اور تمہارے لئے کپڑے اور خوشبو حلال ہوگئی (2)''۔ اور بخاری میں حضرت عائشہ سے مروی ہے، فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان ہاتھوں سے خوشبو لگائی جب انہوں نے احرام باندھا اور اس وقت بھی جب طواف افاضہ سے پہلے احرام کھولا اور حضرت عائشہ نے اپنے ہاتھوں کو پھیلایا (3)۔ یہ علماء کے نزدیک چھوٹا حلال ہونا ہے اور بڑا حلال ہونا ہے طواف افاضہ کے بعد اس سے عورتیں اور تمام وہ چیزیں جو احرام کی وجہ سے حرام ہوتی ہیں حلال ہو جاتی ہیں۔ اس کا مزید ذکر ان شاء اللہ سورۂ حج میں آئے گا۔

فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ۗ فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿٢٠٠﴾

''پھر جب تم پورے کر چکو حج کے ارکان تو اللہ کو یاد کرو جس طرح اپنے باپ دادا کا ذکر کرتے ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ ذکر الٰہی کرو اور کچھ لوگ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے رب دے دے ہمیں دنیا میں ہی (سب کچھ) نہیں ہے اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ''۔

اس میں دو مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ مجاہد نے مناسک سے مراد ذبائح اور ان کا خون بہانا لیا ہے (4)۔ بعض علماء نے فرمایا: یہی حج کے شعائر ہیں کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھ سے اپنے مناسک سیکھو۔ معنی یہ ہے کہ جب تم حج کے مناسک میں سے کوئی منسک ادا کرلو تو اللہ کا ذکر کرو اور اس پر اس کی نعمتوں کی تعریف کرو۔ ابو عمرو نے کاف کو کاف میں مدغم کیا ہے اسی طرح اس نے سلککم میں کیا ہے کیونکہ دونوں ایک جیسے ہیں اور قضیتم یہاں ادیتم اور فرغتم کے معنی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فاذا قضیت الصلاۃ یعنی جب تم جمعہ ادا کرلو۔ یہاں فعل کی ادائیگی کو قضا سے تعبیر کیا ہے جس کا متعین وقت نکل چکا ہو۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ عربوں کی عادت تھی جب وہ حج ادا کر لیتے تو جمرہ کے پاس ٹھہرتے اور اپنے آباء پر فخر کرتے اور اپنے آباء کی جرأت و بہادری اور سخاوت کے کارنامے بیان کرتے۔ حتیٰ کہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناسک، رمی الجمار بسبع حصیات، صفحہ 235، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ سنن دار قطنی، کتاب الحج، المواقیت، صفحہ 276، جلد 2 (قاہرہ)

3۔ صحیح بخاری، کتاب المناسک، الطیب بعد رمی الجمار، صفحہ 236، جلد 1 (وزارت تعلیم)

4۔ المحرر الوجیز، صفحہ 270، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

ان میں سے کسی نے کہا: اے اللہ! بے شک میرا باپ عظیم قبہ اور عظیم تھال والا تھا اور کثیر مال والا تھا تو مجھے اسی طرح عطا فرما جس طرح تو نے اسے عطا فرمایا۔ پس اس نے اپنے باپ کے علاوہ کسی کا ذکر نہیں کیا تو یہ آیت نازل ہوئی کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اس سے زیادہ کریں جتنا کہ وہ زمانہ جاہلیت میں اپنے آباء کا ذکر کرتے تھے۔ یہ جمہور مفسرین کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس، عطا، ضحاک اور ربیع نے کہا: آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو جس طرح بچے اپنے والدین کا ذکر کرتے ہیں۔ ابا، اماں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے استغاثہ کرو اور اس کی بارگاہ میں پناہ لو جیسے تم اپنے بچپنے میں اپنے آباء سے کرتے تھے۔ ایک طائفہ نے کہا: آیت کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی عظمت بیان کرو اور اس کی حرمت کا دفاع کرو اور جو اس کے دین اور اس کے مشاعر میں شرک کا ارادہ کرے اسے دور کرو جیسے تم اپنے آباء کا خیر کے ساتھ ذکر کرتے ہو جب ان میں سے کسی کی شان گھٹائی جاتی اور تم ان کی طرف سے حفاظت کرتے ہو اور دفاع کرتے ہو (1)۔ ابو الجوزاء نے حضرت ابن عباس سے کہا: ایک شخص آج اپنے باپ کا ذکر نہیں کرتا، پھر اس آیت کا معنی کیا ہے؟ فرمایا: اس طرح بات نہیں ہے لیکن تو اللہ کے لئے ناراض ہو جب اس کی نافرمانی کی جائے، اس سے زیادہ جتنا کہ تو اپنے والدین کی وجہ سے غصہ کرتا ہے جب انہیں برا بھلا کہا جاتا ہے۔ کذکرکم میں کاف محل نصب میں ہے یعنی ذکرا کذکرکم۔ اَوْ اَشَدَّ زجاج نے کہا او اشد، ذکرکم پر عطف کی بنا پر محل جر میں ہے۔ معنی ہے: او کاشد ذکرا۔ اور منصرف نہیں کیونکہ افضل صفت کا صیغہ ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ او اذکروہ اشد کے معنی میں محل نصب میں ہو اور ذکرا بیان کی بنا پر منصوب ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا، مَنْ مبتدا کی حیثیت سے محل رفع میں ہے اگر تو چاہے اسے صفت بنا دے يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا، من کا صلہ ہے اور مراد مشرکین ہیں۔ ابو وائل، سدی اور ابن زید نے کہا: عرب زمانہ جاہلیت میں صرف دنیا کے مصالح کے لئے دعا مانگتے تھے (2)۔ وہ اونٹ، بکری، دشمن پر کامیابی مانگتے تھے اور آخرت کی خیر نہیں مانگتے تھے کیونکہ وہ آخرت کو جانتے نہ تھے اور نہ اس پر ایمان رکھتے تھے۔ پس انہیں صرف دنیا کے لئے دعا مانگنے سے منع کیا گیا، نہی، خبر کے صیغہ میں آئی ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ وعید مومن کو بھی شامل ہو جو صرف دنیا کے لئے دعا مانگے۔ اس بناء پر وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ۔ یعنی اس شخص کے حصہ کی طرح جو آخرت کا سوال کرتا ہے الخلاق سے مراد حصہ ہے، اور من زائدہ ہے یہ پہلے گزر چکا ہے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿٢٠١﴾

''اور بعض لوگ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب عطا فرما ہمیں دنیا میں بھی بھلائی اور آخرت میں بھی بھلائی اور بچا لے ہمیں آگ کے عذاب سے''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمِنْهُمْ یعنی لوگوں میں سے۔ اس سے مراد مسلمان ہیں جو دنیا اور آخرت کی

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 276، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ ایضاً

خیر طلب کرتے ہیں۔ اور الحسنتین کی تاویل میں مختلف اقوال ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ دنیا میں الحسنة سے مراد حسین وشکیل عورت ہے (1) اور آخرت میں آہو چشم حوریں ہیں۔ وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ اس سے مراد بری اور بدصورت عورت ہے۔ میں کہتا ہوں: اس میں بعد ہے۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے صحیح نہیں ہے کیونکہ النَّارِ سے مراد حقیقۃً جلانے والی آگ ہے اور آگ سے عورت مراد لینا تجوز ہے۔ قتادہ نے کہا: حسنة الدنیا سے مراد دنیا میں عافیت اور مال بقدر ضرورت ہے۔ حسن نے کہا: حسنة الدنیا سے مراد علم اور عبادت ہے (2)۔ اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں۔ اکثر اہل علم کا یہ قول ہے کہ الحسنتین سے مراد دنیا و آخرت کی نعمتیں ہیں اور یہ صحیح ہے کیونکہ لفظ تمام چیزوں کا تقاضا کرتا ہے۔ حسنة نکرہ ہے اور دعا کے سیاق میں ہے۔ یہ بطور بدل ہر حسنة کا احتمال رکھتا ہے اور حسنة الاخرۃ سے مراد بالا جماع جنت ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: کوئی ایک حسنة مراد نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ ہمیں دنیا میں اچھا عطیہ عطا فرما۔ پس اسم کو حذف کیا گیا۔

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ، قنا اصل میں اوقنا تھا واو کو حذف کیا گیا جس طرح یقی اور یشی میں حذف کی گئی کیونکہ واو، یا اور کسرہ کے درمیان واقع ہے جیسے یَعِدُ میں واو حذف ہے۔ یہ بصریوں کا قول ہے۔ کوفیوں نے کہا: واو کو لازم اور متعدی کے درمیان فرق کرنے کے لئے حذف کیا گیا ہے۔ محمد بن زید نے کہا: یہ غلط ہے کیونکہ عرب کہتے ہیں ورم، یرم، واو کو حذف کرتے ہیں۔ آیت سے مراد یہ دعا ہے کہ وہ ان لوگوں سے نہ ہو جو گناہوں کی وجہ سے آگ میں داخل ہوں گے اور شفاعت انہیں نکالے گی اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ دعا جنت میں داخلہ کی طلب کے لئے دعا کو مؤکد کرتا ہے تاکہ دونوں طرف سے نجات اور فوز میں رغبت ہو جیسا کہ ایک صحابی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی تھی میں اپنی دعا میں کہتا ہوں: اے اللہ! مجھے جنت میں داخل کر اور مجھے آگ سے عافیت دے اور میں آپ کی کلام اور معاذ کی کلام کو نہیں جانتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: "ہماری کلام تیری کلام کے قریب ہوتی ہے (3)"۔ ابو داؤد نے اپنی سنن میں اور ابن ماجہ نے یہ روایت کی ہے۔

مسئلہ نمبر 3: یہ آیت ایک جامع دعا ہے دنیا و آخرت کو شامل ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے کہا گیا: ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے دعائیں فرمائیں۔ آپ نے دعا کی: اللھم آتنا فی الدنیا حسنة و فی الآخرۃ حسنة و قنا عذاب النار۔ لوگوں نے کہا: ہمارے لئے مزید دعا فرمائیں۔ آپ نے فرمایا: تم کیا چاہتے ہو، میں نے دنیا و آخرت تو مانگ لی ہے؟ صحیحین میں حضرت انس سے مروی ہے، فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اس دعا کے ساتھ دعا مانگتے تھے: اللھم آتنا فی الدنیا حسنة و فی الآخرۃ حسنة و قنا عذاب النار۔ (4) حضرت انس جب دعا مانگنے کا ارادہ کرتے تو اس دعا کے ساتھ دعا مانگتے اور حضرت عمر کی حدیث میں ہے کہ وہ بیت اللہ کا طواف کرتے تو یہ دعا مانگتے: رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ اس کے علاوہ آپ کی کوئی عادت نہ تھی۔ یہ ابو عبید نے ذکر کیا ہے۔ ابن جریج نے کہا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ وہ کہتے تھے کہ

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 276، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، صفحہ 277، جلد 1
4۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم صفحہ 945، جلد 2 (وزارت تعلیم)

موقف میں مسلمان کی اکثر دعا یہ ہونی چاہیے: رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: رکن کے پاس ایک فرشتہ کھڑا ہے جب سے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا وہ آمین کہتا ہے۔ پس تم کہو: رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ عطا بن ابی رباح سے رکن یمانی کے متعلق پوچھا گیا جب کہ وہ بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے۔ عطا نے کہا: مجھے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ستر فرشتوں کو اس پر مقرر کیا گیا ہے کہ جو یہ دعا پڑھے: اللهم انی اسالك العفو والعافية فی الدنيا والآخرة ربنا آتنا فی الدنيا حسنة وفی الآخرة حسنة وقنا عذاب النار۔ تو وہ کہتے ہیں: آمین (1) (الحدیث) اس حدیث کو ابن ماجہ نے سنن میں نقل کیا ہے اور پوری حدیث مسند أ سورۃ الحج میں آئے گی۔

أُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝٢٠٢

''انہی لوگوں کو بڑا حصہ ملے گا (دونوں جہانوں میں) بسبب ان کی (نیک) کمائی کے اور اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب چکانے والا ہے''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا یہ فریق ثانی کی طرف راجع ہے۔ یعنی اسلام کے فریق کی طرف۔ یعنی ان کے لئے حج کا ثواب ہے یا دعا کا ثواب ہے۔ بے شک مومن کی دعا عبادت ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: أُولٰٓئِكَ کا مرجع دونوں فریق ہیں مومن کے لئے اس کے عمل اور دعا کا ثواب ہے اور کافر کے لئے اس کے شرک کی سزا اور دنیا پر اس کی نظر کا منحصر ہونے کا وبال ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی مثل ہے: وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (انعام:132)

مسئلہ نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ یہ سرع یسرع سرعا و سرعة سے مشتق ہے جیسے عظم یعظم، اس کا اسم فاعل سریع ہے۔ الحساب محاسبہ کی طرح مصدر ہے۔ محسوب کو حساب کا نام دیا جاتا ہے الحساب کا معنی شمار کرنا ہے: کہا جاتا ہے: حسب یحسب حسابا و حسابة و حسبانا و حسبانا و حسبا یعنی شمار کرنا۔ ابن الاعرابی نے کہا:

یاجمل اسقاك بلا حسابه سقیا ملیك حسن الربابة

قتلتنی بالدل والخلابة

اور الحسب، انسان کے مفاخر جو شمار کیے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: حسبه دینہ۔ کہا جاتا ہے: حسبه ماله، اسی سے حدیث ہے: الحسب المال والكرم التقوى۔ (2) (حسب مال ہے اور کرم تقویٰ ہے) اس حدیث کو حضرت سمرہ بن

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المناسك، فضل الطواف، صفحہ 218 (وزارت تعلیم)

2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۃ حجرات، صفحہ 160، جلد 2 (وزارت تعلیم)

جندب نے روایت کیا ہے اور اسے ابن ماجہ نے نقل کیا ہے اور یہ الشہاب میں بھی ہے۔ الرجل حسیبٌ و قد حسُب حسابة جیسے خطُبَ خطابة۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جلدی حساب لینے والا ہے۔ وہ شمار اور عقد اور فکر کو عمل میں لانے کا محتاج نہیں ہے جیسا کہ حساب لگانے والے کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے فرمایا: کفی بنا حاسبین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی: اللھم منزل الکتاب سریع الحساب (الحدیث)(1)

اللہ تعالیٰ بندوں کے لئے جو کچھ ان کے حق میں ہے اسے جانتا ہے اور جو ان کے خلاف ہے اسے بھی جانتا ہے اسے غور و فکر کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ جانتا ہے جو محاسب کے لئے ہے اور جو اس کے خلاف ہے کیونکہ حساب میں فائدہ اس کی حقیقت کا علم ہے۔ بعض علماء نے فرمایا: اس کا معنی ہے وہ بندوں کو ان کے اعمال کی بہت جلد جزا دینے والا ہے۔ بعض نے فرمایا: اس کو ایک کام دوسرے کام سے غافل نہیں کرتا۔ وہ ایک حالت میں ان کا محاسبہ کرے گا جیسا کہ فرمایا اور اس کا قول حق ہے: مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ (لقمان: 28)

حسن نے کہا: اس کا حساب آنکھ جھپکنے سے بھی زیادہ تیز ہے (2)۔ خبر میں ہے اللہ تعالیٰ بکری دوہنے کی دیر سے حساب لے لے گا۔ بعض نے فرمایا: وہ جب ایک کا حساب لے گا تو تمام مخلوق کا حساب لے چکا ہوگا۔ کسی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: اللہ تعالیٰ ایک دن میں بندوں کا کیسے محاسبہ فرمائے گا؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جیسے ایک دن میں انہیں رزق دیتا ہے۔ حساب کا معنی ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے اعمال کے مطابق جزا کی تقادیر کو جانتا ہے اور انہیں وہ چیزیں یاد دلاتا ہے جو وہ بھول چکے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ۭ اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ (المجادلہ: 6) بعض علماء نے فرمایا: آیت کا معنی ہے وہ حساب کے دن کو جلدی لانے والا ہے۔ اس آیت سے مقصود قیامت کے دن سے ڈرانا ہے (3)۔

میں کہتا ہوں: ہر مفہوم کا احتمال ہے۔ انسان اپنے لئے اعمال صالحہ کے ساتھ حساب کی تخفیف کو لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آخرت میں حساب میں تخفیف فرمائے گا اس پر جو دنیا میں اپنے نفس کا محاسبہ کرتا ہے۔

مسئلہ نمبر 3: حضرت ابن عباس نے اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا وہ شخص جو مال لیتا ہے اور کسی دوسرے کی طرف سے حج کرتا ہے تو اسے ثواب ملتا ہے۔ حضرت ابن عباس سے یہ اس آیت کے تحت مروی ہے کہ ایک شخص نے کہا: یا رسول اللہ! میرا والد فوت ہو گیا ہے اور اس نے حج نہیں کیا میں اس کی طرف سے حج کروں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تیرے والد پر قرضہ ہوتا اور تو اسے ادا کرتا تو کیا وہ جائز ہوتا؟ اس نے کہا: ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کا قرض ادا کرنے کا زیادہ حقدار ہے۔ اس شخص نے کہا: کیا اس میں میرے لئے اجر ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا۔ یعنی جو میت کی طرف سے حج کرے تو اس کے اور میت کے درمیان اجر ہوگا۔ ابو عبد اللہ محمد بن خویز منداد نے احکام

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجهاد، الدعاء علی المشرکین، صفحہ 411، جلد 1 (وزارت تعلیم)

2۔ معالم التنزیل، صفحہ 260، جلد 1 (دار الفکر) 3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 277، جلد 1 (دار الکتب العلمیہ)

میں فرمایا: حضرت ابن عباس کا قول امام مالک کے قول کی طرح ہے کیونکہ امام مالک کے مذہب کا حاصل یہ ہے کہ جس کی طرف سے حج کیا گیا ہے اس کو خرچ کا ثواب ملے گا اور حاجی کو حج کا ثواب ملے گا، گویا اسے اس کے بدن اور اعمال کا ثواب ملے گا اور جس کی طرف سے حج کیا گیا ہے اسے مال اور خرچ کا ثواب ملے گا۔ اسی وجہ سے ہم نے کہا: اس میں جس نے پہلے حج کیا ہوا ہو یا نہ کیا ہوا ہو حکم مختلف نہیں ہے۔ (یعنی پہلے جس نے حج نہ کیا ہوا ہو وہ حج بدل کر سکتا ہے) کیونکہ وہ اعمال جن میں نیابت ہو سکتی ہے ان میں جس کو نائب بنایا گیا ہے اس کا حکم مختلف نہیں ہے۔ اس نے پہلے اپنا وہ فریضہ ادا کیا ہوا ہو یا نہ کیا ہوا ہو اس میں دین و دنیا کے اعمال کا ہم نے اعتبار کیا ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ وہ شخص جس پر زکوۃ ہو یا کفارہ ہو یا کوئی اور واجب ہو وہ کسی غیر کی طرف سے ادا کر سکتا ہے اگرچہ اپنا کفارہ ادا نہ بھی کیا ہو۔ اسی طرح جس نے دنیا میں اپنے مصالح کی رعایت نہ کی ہو اس کا اس کی مثل مصالح میں غیر کا نائب بننا صحیح ہے۔ پس وہ غیر کے لئے مکمل ہو گا اگرچہ اس کے لئے مکمل نہ ہو گا۔ آدمی دوسرے کا نکاح کر سکتا ہے اگرچہ اپنا نکاح نہ بھی کیا ہو۔

تم ترجمة الجزء الثاني من تفسير القرطبي ۲۹ رمضان المبارک ۱۴۲۷ھ

الحمد لله رب العالمين والعاقبة للمتقين والصلوة والسلام على سيد المرسلين

سید محمد اقبال شاہ عفی عنہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝

''اور (خوب) یاد کرو اللہ تعالیٰ کو ان دنوں میں جو معدودے چند ہیں اور جو جلدی کر کے دو دنوں میں ہی چلا گیا تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں اور جو کچھ دیر وہاں ٹھہرا رہا تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں (بشرطیکہ) وہ ڈرتا رہتا ہو اور ڈرتے رہو اللہ سے اور خوب جان لو تمہیں اس کی بارگاہ میں اکٹھا کیا جائے گا''۔

قولہ تعالیٰ: وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ اس میں چھ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ کوفیوں نے کہا ہے کہ معدودات میں الف اور تا عدد کی قلت کو بیان کرنے کے لئے ہیں اور بصریوں کا موقف ہے کہ یہ دونوں قلیل و کثیر کے لئے آتے ہیں اور اس پر دلیل رب العالمین کا یہ ارشاد ہے وَهُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ۝ (سبا: 37) اور غرفات کثیر ہیں۔ (یعنی غرفات میں الف اور تا کثرت کے بیان کے لئے ہیں اور مَّعْدُوْدٰتٍ میں قلت کو بیان کرنے کے لئے۔ معلوم ہوا یہ دونوں قلیل و کثیر کے لئے آتے ہیں۔)

اور علماء کے مابین اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس آیت میں اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ سے مراد ایام منیٰ ہیں اور یہی ایام تشریق ہیں، اور یہ تینوں اسماء انہی پر واقع ہوتے ہیں، اور یہی رمی جمار کے ایام ہیں، اور ان کا اطلاق ان تینوں دنوں پر ہوتا ہے جن میں حاجی یوم نحر کے بعد دو دنوں میں جلدی کر کے کوچ کر سکتا ہے۔ پس تو اس پر واقف رہ۔

ثعلبی اور ابراہیم نے کہا ہے کہ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ دس دن ہیں اور ایام معلومات ایام نحر ہیں۔ اسی طرح مکی اور مہدوی نے بیان کیا ہے کہ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ سے مراد دس دن ہیں۔ ابو عمر بن عبد البر وغیرہ کے نقل کرنے کی بنا پر جو ہم نے اس بارے میں اجماع ذکر کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے کہ یہ (اجماع) یا تو کتابت کی غلطی کی بنا پر ہے یا پھر وہ دس دن مراد ہیں جو یوم نحر کے بعد ہیں اور یہ حقیقت سے بہت دور ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ میں اپنے بندوں کو اپنے ذکر کا حکم ارشاد فرمایا ہے اور یہ یوم نحر کے بعد والے تین دن ہیں، یوم نحر ان میں شامل نہیں۔ کیونکہ اس پر لوگوں کا اجماع ہے کہ یوم النفر کو کوئی بھی (وہاں سے) کوچ نہیں کر سکتا اور یوم النفر سے مراد یوم النحر کا دوسرا دن ہے (یعنی گیارہویں ذوالحجہ کا دن)۔ اگر یوم نحر اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ میں شامل ہوتا تو پھر یہ جائز ہوتا کہ جو کوئی یوم نفر کو جلدی (وہاں سے) کوچ کرنا چاہتا وہ کر سکتا کیونکہ اس طرح وہ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ میں سے دو دن وہاں ٹھہر چکا ہوتا۔ (لیکن ایسا کرنا درست نہیں لہٰذا معلوم ہوا کہ یوم نحر اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ میں شامل نہیں۔)

دارقطنی اور ترمذی وغیرہما نے عبد الرحمٰن بن یعمر الدیلی سے روایت بیان کی ہے کہ اہل نجد میں سے کچھ لوگ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے جبکہ آپ عرفات میں تھے۔ تو انہوں نے (اس کے بارے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منادی کو حکم ارشاد فرمایا۔ پس اس نے یہ اعلان کیا "حج تو عرفات میں ہے۔ پس جو کوئی مزدلفہ کی رات طلوع فجر سے پہلے پہلے یہاں آگیا اس نے حج کو پالیا۔ ایام منیٰ تین ہیں پس جو کوئی جلدی کر کے دو دنوں میں ہی چلا گیا تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور جو کچھ دیر وہاں ٹھہرا رہا تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ (1)" یعنی حاجیوں میں سے جو کوئی ایام منیٰ میں سے دو دنوں میں ہی جلدی کر کے چلا گیا تو اس کا قیام بھی منیٰ میں یوم نحر سمیت تین دن ہو گیا۔ اور اس کی مجموعی رمی انچاس کنکریاں ہو جائے گی اور تیسرے دن کی رمی اس سے ساقط ہو جائے گی اور جس کسی نے تیسرے دن کے آخر میں وہاں سے کوچ کیا تو یوم نحر کے سبب اس کے لئے چار دن منیٰ میں قیام ہو گیا اور اس نے رمی کی تعداد پوری کر لی۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ ایام منیٰ تین دن ہیں اس کے بارے جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی ایک دلیل عرجی کا یہ قول بھی ہے۔

ما نلتقی الا ثلاث منٰی　حتی یفرق بیننا النفر

ہم منیٰ کے تین دن مل کر اکٹھے ہی رہتے ہیں یہاں تک کہ وہاں سے کوچ ہمیں متفرق کر دیتی ہے۔

پس ایام رمی مَّعۡدُوۡدٰتٍ کہلاتے ہیں اور ایام نحر معلومات کہلاتے ہیں۔ حضرت نافع نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اَیَّامٍ مَّعۡدُوۡدٰتٍ اور ایام معلومات مجموعی طور پر چار دن ہیں۔ ایک یوم نحر اور تین اس کے بعد۔ ان میں سے یوم نحر (دسویں ذی الحجہ کا دن) یوم معلوم ہے معدود نہیں۔ اور بعد والے دو دن (یعنی گیارہوں اور بارہویں ذوالحجہ کا دن) معلوم بھی ہیں اور معدود بھی اور چوتھا دن (یعنی تیرہویں ذوالحجہ کا دن) فقط یوم معدود ہے معلوم نہیں۔ اور یہی حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کا مذہب ہے۔

اور بلاشبہ اسی طرح ہے کیونکہ پہلا دن ان دنوں میں سے نہیں ہے جو اس ارشاد باری تعالیٰ کے مطابق منیٰ کے ساتھ خاص ہیں وَاذۡکُرُوا اللّٰہَ فِیۡۤ اَیَّامٍ مَّعۡدُوۡدٰتٍ اور نہ ہی یہ ان میں سے ہے جنہیں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں معین فرمایا ہے کہ اَیَّامُ مِنًى ثَلَاثَةٌ کہ ایام منیٰ تین ہیں (پس اس سے معلوم ہوا کہ) پہلا دن معلوم ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَیَذۡکُرُوا اسۡمَ اللّٰہِ فِیۡۤ اَیَّامٍ مَّعۡلُوۡمٰتٍ عَلٰی مَا رَزَقَہُمۡ مِّنۡۢ بَہِیۡمَۃِ الۡاَنۡعَامِ (الحج: ۲۸) (اور وہ ذکر کریں اللہ تعالیٰ کے نام کا مقررہ دنوں میں ان بے زبان چوپائیوں پر (ذبح کے وقت) جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائے ہیں۔) اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس سے مراد قربانی ہے اور قربانی پہلے دن ہوتی ہے اور یہی یوم الاضحیٰ ہے اور پھر دوسرے اور تیسرے دن ہوتی ہے۔ (یعنی گیارہویں اور بارہویں ذوالحجہ کے دن) اور چوتھے دن قربانی نہیں ہوتی اس پر ہمارے علماء کا اجماع ہے۔ (پس اس سے معلوم ہوا کہ) ارشاد باری تعالیٰ: فِیۡۤ اَیَّامٍ مَّعۡلُوۡمٰتٍ میں چوتھا دن مراد نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں قربانی نہیں کی جاتی اور چونکہ اس میں رمی کی جاتی ہے پس وہ رمی کے سبب ایام معدودات میں سے ہے۔ اور قربانی نہ ہونے کے سبب وہ یوم معلوم نہیں ہے۔

1۔ سنن ترمذی، باب فیمن ادرک الامام بجمع الخ، حدیث نمبر 814، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اس میں حقیقت یہ ہے کہ یوم نحر رمی کے سبب یوم معدود ہے اور ذبح (قربانی) کے سبب وہ یوم معلوم ہے۔ لیکن ہمارے علماء کے نزدیک قول باری تعالیٰ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ میں یہ مراد نہیں ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے فرمایا ہے کہ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ سے مراد دس دن ہیں ان میں سے پہلا دن ذوالحجہ کا پہلا دن ہے اور آخری دن یوم نحر ہے۔ اس بارے میں ان دونوں کا قول مختلف نہیں اور دونوں نے اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔

اور امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت کیا ہے کہ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ سے مراد ایام نحر ہیں۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے اسی طرح مروی ہے۔ اور یہی میرا موقف ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ

اور امام کرخی نے امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے کہ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ سے مراد تین ایام نحر (قربانی کے دن) ہیں۔ یعنی ایک یوم الاضحیٰ اور دو دن اس کے بعد۔

الکیا طبری نے کہا ہے(1): کہ امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہما کے قول کے مطابق مَّعْلُوْمٰتٍ اور مَّعْدُوْدٰتٍ کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ کیونکہ قرآن کریم میں مذکور اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ سے مراد بلا اختلاف ایام تشریق ہیں۔ اور اس بارے میں کوئی شک نہیں کرتا کہ مَّعْدُوْدٰتٍ ایام عشر کو شامل نہیں ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ اور ایام عشر میں ایسا کوئی حکم نہیں ہے جو دو دنوں (گیارہویں، بارہویں) سے تو تعلق رکھتا ہو اور تیسرے سے نہ رکھتا ہو۔ تحقیق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ معلومات دس ہیں اور معدودات ایام تشریق ہیں اور یہی جمہور کا قول ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ ابن زید نے کہا ہے: ایام معلومات ذوالحجہ کے دس دن اور ایام تشریق ہیں اور اس میں بہت بُعد ہے، ایک تو اس بنا پر جو کچھ ہم نے ذکر کر دیا ہے اور (دوسرا) آیت کا ظاہر بھی اس کا دفاع کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ اور مَّعْلُوْمٰتٍ میں ذکر کا بیان کیا ہے وہ بھی اس قول کے خلاف پر دلالت کرتا ہے لہٰذا اس سے مشغول ہونے کا کوئی معنی نہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ (آیت میں) اس ذکر کا مخاطب حج کرنے والا (حاجی) ہے اسے ہی رمی جمار کے وقت تکبیر کہنے کے بارے خطاب کیا گیا ہے (اور یہ کہ وہ تکبیر کہیں) مقررہ دنوں میں ان بے زبان چوپائیوں پر (ذبح کے وقت) اور نمازوں کے بعد (تکبیر کہیں) نہ کہ تلبیہ۔ (اب سوال یہ ہے) کیا غیر حاجی بھی اس میں داخل ہے یا نہیں؟ تو وہ نظریہ جو فقہاء امصار اور مشاہیر صحابہ کرام اور تابعین نے اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ تکبیر کے حکم میں مراد ہر کوئی ہے (چاہے وہ حج کر رہا ہو یا نہیں) خصوصاً اوقات نماز میں، پس وہ ہر نماز کو ادا کرنے کے بعد تکبیر کہے۔ چاہے نمازی اکیلا ہو یا جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے والا ہو۔ ان ایام میں یہ تکبیر ظاہر اور بلند آواز سے کہی جائے گی اور یہی اسلاف رضی اللہ عنہم کی اقتدا ہے۔ اور

1۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 121

مختصر میں ہے: عورتیں نمازوں کے بعد تکبیر نہ کہیں۔ لیکن پہلا قول زیادہ مشہور ہے کیونکہ احرام کا حکم مردوں کی طرح انہیں بھی لازم ہے، ''مدونہ'' میں اسی طرح ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ جو کوئی نماز کے پیچھے تکبیر کہنا بھول گیا تو وہ تکبیر کہہ لے اگر وہ قریب ہو اور اگر دور چلا جائے تو اس پر کوئی شے (کفارہ وغیرہ) لازم نہیں ہوگی۔ ابن الجلاب نے یہی کہا ہے اور حضرت امام مالک نے ''المختصر'' میں کہا ہے: وہ تکبیر کہے جب تک اسی مجلس میں رہے اور جب اپنی مجلس سے اٹھ کھڑا ہوا، تو پھر اس پر کوئی شے لازم نہیں اور مدونہ میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول ہے: اگر امام تکبیر بھول جائے تو اگر وہ قریب ہی ہو تو وہ بیٹھ جائے اور تکبیر کہے اور اگر دور ہو جائے تو پھر اس پر کوئی شے نہیں اور اگر وہ چلا گیا اور اس نے تکبیر نہ کہی درآنحالیکہ لوگ بیٹھے ہوئے ہوں تو انہیں چاہیے کہ وہ تکبیر کہہ لیں۔

مسئلہ نمبر 5۔ مدت تکبیر کی دونوں طرفوں میں علماء کا اختلاف ہے۔

حضرت عمر فاروق اعظم بن خطاب، حضرت علی ابن ابی طالب اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم نے فرمایا ہے کہ (آدمی) نویں ذی الحجہ کی صبح کی نماز سے لے کر ایام تشریق میں سے آخری دن (یعنی تیرہویں ذی الحجہ کا دن) کی عصر تک تکبیر کہے گا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ وہ یوم عرفہ کی صبح سے لے کر یوم نحر کی نماز عصر تک (ہر نماز کے بعد) تکبیر کہے گا۔

صاحبین (حضرت امام ابویوسف اور حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہما) نے ان دونوں سے اختلاف کیا ہے اور دونوں نے پہلا قول یعنی حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا قول ہی لیا ہے۔ پس انہوں نے ابتدائے مدت میں تو اتفاق کیا ہے لیکن انتہا میں نہیں۔

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ (آدمی) یوم نحر کی ظہر کی نماز سے لے کر ایام تشریق میں سے آخری دن کی نماز صبح تک تکبیر کہے گا۔ امام شافعی نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ اور یہی حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا بھی قول ہے۔ اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ وہ یوم نحر کی ظہر کی نماز سے لے کر ایام تشریق کے آخر تک تکبیر کہے۔

ابن عربی نے کہا ہے کہ جنہوں نے یہ کہا ہے کہ وہ یوم عرفہ کو تکبیر کا آغاز کرے گا اور یوم نحر کی عصر کے وقت ختم کر دے گا تو ان کا یہ قول ظاہر کلام سے خارج ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: فِیۡۤ اَیَّامٍ مَّعۡدُوۡدٰتٍ اور یہ ایام تین ہیں۔ حالانکہ انہوں نے کہا ہے کہ وہ دو دنوں میں تکبیر کہے گا تو اس طرح انہوں نے ظاہر کلام کو بغیر دلیل کے چھوڑ دیا۔ اور رہے وہ جنہوں نے یہ کہا کہ (تکبیر کہنے کے ایام) یوم عرفہ اور ایام تشریق ہیں تو انہوں نے کہا: بلاشبہ رب کریم نے ارشاد فرمایا فَاِذَاۤ اَفَضۡتُمۡ مِّنۡ عَرَفٰتٍ (بقرہ: 198) تو اس میں عرفات کا ذکر ایام کے ذکر میں داخل ہے۔ یہ نظریہ صحیح ہو سکتا تھا اگر وہ یہ کہتے کہ وہ عرفہ کے دن مغرب کی نماز سے تکبیر کہے گا کیونکہ عرفات سے واپس لوٹنے کا وقت تو وہی (مغرب کا وقت) ہے اور جو وقت اس سے پہلے ہے ظاہر لفظ اس کا تقاضا نہیں کرتے۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ آٹھویں ذی الحجہ (یوم ترویہ) میں سے ہو جو کہ منیٰ میں اترنے کا وقت ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ تکبیر کے الفاظ میں اختلاف ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ وہ ہر نماز کے بعد

تین بار تکبیر کہے گا۔ اسے زیاد بن زیاد نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے۔ اور ایک مذہب میں ایک روایت یہ ہے کہ تین بار تکبیر کہنے کے بعد یہ کہا جائے گا: لا الہ الا اللہ، واللہ اکبر وللہ الحمد اور المختصر میں امام مالک سے یہ الفاظ مروی ہیں۔ اللہ اکبر اللہ اکبر، لا الہ الا اللہ، واللہ اکبر، اللہ اکبر وللہ الحمد۔

قول باری تعالیٰ: فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ میں اکیس مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اس مقام پر تعجیل (جلدی کرنا) ہمیشہ دن کے آخری حصہ میں ہوگی اور اسی طرح یہ تیسرے دن ہوگی، کیونکہ ان ایام میں رمی جمار کا وقت زوال کے بعد ہے اور اس پر اجماع ہے کہ یوم نحر کو جمرہ عقبہ کے سوا کسی پر رمی نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم نحر کو اس کے سوا کسی جمرہ پر رمی نہیں کی۔ اور اس کا وقت طلوع شمس سے لے کر زوال تک ہے۔ اور اسی طرح اس پر بھی اجماع ہے کہ ایام تشریق میں جمرات پر رمی کرنے کا وقت زوال کے بعد سے لے کر غروب آفتاب تک ہے۔ البتہ اس کے بارے اختلاف ہے جس نے جمرہ عقبہ پر رمی طلوع فجر سے پہلے کی یا طلوع فجر کے بعد سورج طلوع ہونے سے پہلے کی۔

حضرت امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام احمد اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: فجر کے بعد طلوع آفتاب سے پہلے جمرہ عقبہ کی رمی جائز ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ ہم تک ایسی کوئی خبر نہیں پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر طلوع ہونے سے پہلے کسی کو رمی کرنے کی رخصت عطا فرمائی ہو۔ لہٰذا فجر سے پہلے اس کی رمی جائز نہیں اور اگر کسی نے فجر سے پہلے وہاں رمی کی تو وہ اس کا اعادہ کرے گا۔ اسی طرح امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے کہ جمرہ عقبہ کی رمی (طلوع فجر سے پہلے) جائز نہ ہوگی اور اسی طرح امام احمد اور اسحاق نے بھی کہا ہے۔

اور ایک گروہ نے طلوع فجر سے پہلے رمی کرنے کی رخصت دی ہے۔ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ رات کے وقت رمی کرتی تھیں اور یہ کہتی تھیں: بلاشبہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مقدس میں ایسا کرتی تھیں۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے (1)۔ اور یہی قول حضرت عطا، ابن ابی ملیکہ اور عکرمہ بن خالد سے مروی ہے۔ اور اسی طرح حضرت امام شافعی نے فرمایا ہے بشرطیکہ رمی نصف رات کے بعد ہو۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: سورج طلوع ہونے سے پہلے رمی نہیں کی جائے گی۔ مجاہد، نخعی اور ثوری نے یہی کہا ہے۔ اور ابوثور نے کہا ہے: اگر کسی نے طلوع شمس سے پہلے رمی کی تو اگر (علماء نے) اس میں اختلاف کیا، تو پھر یہ جائز نہیں ہوگی۔ اور اگر انہوں نے اتفاق کرلیا یا اس میں کوئی سنت موجود ہو تو پھر یہ جائز ہوگی۔ ابوعمر نے کہا ہے: جہاں تک ثوری اور ان کی اتباع کرنے والوں کا قول ہے تو اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طلوع آفتاب کے بعد جمرہ کی رمی کی اور فرمایا: خُذُوْا عَنِّيْ مَنَاسِكَكُمْ (احکام حج مجھ سے سیکھ لو) اور ابن منذر نے کہا ہے: سنت یہ ہے کہ رمی جائز نہ ہوگی۔ اگر کسی نے رمی کی تو وہ اس کا اعادہ کرے۔

1۔ سنن ابی داؤد، باب التعجیل من جمع، حدیث نمبر 1659، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کیونکہ اس طرح کرنے والا اس طریقہ اور سنت کے خلاف کرنے والا ہے جو رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے لئے مقرر فرمایا۔ اور جس کسی نے طلوع فجر کے بعد سورج طلوع ہونے سے پہلے رمی کی، تو اس پر اعادہ نہیں ہے۔ کیونکہ میں کسی کے بارے نہیں جانتا کہ اس نے کہا ہو "یہ جائز نہیں ہے۔"

مسئلہ نمبر 2۔ معمر نے بیان کیا ہے کہ مجھے ہشام بن عروہ نے اپنے باپ سے خبر دی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ یوم نحر کو مکہ مکرمہ میں صبح کرے اور یہی اس کا دن تھا۔ ابو عمر نے کہا ہے کہ اس حدیث کے بارے میں ہشام پر اختلاف کیا گیا ہے، پس ایک گروہ نے اسے ہشام عن ابیہ سے مرسل روایت کیا ہے جیسا کہ اسے معمر نے روایت کیا ہے اور دوسروں نے اسے ہشام عن ابیہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا کی سند سے مسند روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو اسی طرح حکم ارشاد فرمایا تھا۔ اور بعض دوسروں نے اسے عن ہشام عن ابیہ عن زینب بنت ابی سلمہ عن ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی سند سے بھی مسند روایت کیا ہے۔ اور تمام راوی ثقہ ہیں۔ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ انہوں نے منیٰ میں فجر سے پہلے جمرہ پر رمی کی۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں یوم نحر کی صبح مکہ میں کرنے کا حکم ارشاد فرمایا تھا اور یہ نہیں ہو سکتا مگر تبھی جبکہ رات کے وقت منیٰ میں فجر سے پہلے جمرہ پر رمی کی ہو۔ واللہ اعلم۔

اور اسے ابو داؤد نے بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہارون بن عبد اللہ نے ہمیں بیان کیا کہ ابن ابی فدیک ضحاک بن عثمان نے ہشام بن عروہ عن ابیہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا کی سند سے ہمیں بیان کیا ہے کہ ام المومنین رضی اللہ عنہا نے ارشاد فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے دسویں ذی الحجہ کی رات حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی طرف حکم بھیجا، پس انہوں نے فجر سے پہلے جمرہ پر رمی کی، پھر چلی گئیں اور طواف افاضہ کیا۔ اور یہ دن وہی دن تھا جس میں رسول اللہ ﷺ انہی کے پاس ہوتے تھے (1)۔ اور جب یہ ثابت ہو گیا تو پھر جس کسی نے رات کے وقت رمی کی وہ جائز ہے، اور سورج طلوع ہونے سے لے کر زوال تک اختیار ہے۔

ابو عمرو نے کہا ہے: اس پر اجماع ہے کہ جمرہ عقبہ پر رمی کرنے کے بارے پسندیدہ وقت سورج طلوع ہونے سے لے کر اس کے زوال تک ہے۔ اور اس پر بھی اجماع ہے کہ اگر کسی نے نحر کے دن سورج غروب ہونے سے پہلے اس پر رمی کی، تو وہ اس کی طرف سے جائز ہوگی اور اس پر کوئی شے لازم نہ ہوگی۔

مگر حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کے لئے مستحب یہ ہے کہ اگر اس نے جمرہ عقبہ کی رمی چھوڑ دی یہاں تک کہ شام ہو گئی تو وہ خون بہائے (یعنی ایک جانور قربانی کرے) اور اسے وہ مقام حل سے لے کر آئے۔ اور ایسے آدمی کے بارے اختلاف ہے کہ جس نے جمرہ پر رمی نہ کی یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا، پھر اس نے رات کے وقت یا دوسرے دن رمی کی تو اس کے بارے حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اس پر دم واجب ہے، اور اس طرح استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رمی جمار کے لئے ایک وقت مقرر فرمایا ہے، اور وہ یوم نحر ہے (2) پس جس نے غروب شمس کے بعد رمی کی، تو اس نے

1۔ سنن ابی داؤد، باب التعجیل من جمع، حدیث نمبر 1658، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی رمی یوم النحر ضحیٰ، حدیث 818، ابن ماجہ، باب رمی الجمار ایام التشریق، حدیث 3043، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رمی کا وقت نکلنے کے بعد رمی کی۔ اور جو کوئی بھی حج کے دوران کوئی عمل اس کے وقت کے بعد کرے تو اس پر دم واجب ہوتا ہے۔

حضرت امام شافعی نے فرمایا ہے: اس پر دم لازم نہیں ہوگا، یہی قول حضرت امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہما کا بھی ہے۔ اور اسی طرح ابو ثور نے بھی کہا ہے۔ کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سائل کو فرمایا: جب اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں نے شام ہونے کے بعد رمی کی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا حرج کوئی حرج نہیں ہے۔ (1)

حضرت امام مالک نے فرمایا: جو رمی جمار بھول گیا یہاں تک کہ شام ہو گئی تو پھر رات یا دن کے وقت جس ساعت میں اسے یاد آ جائے وہ رمی کر لے جیسا کہ (بھولنے والا) نماز پڑھ لے جب اسے یاد آ جائے، اور وہ رمی نہ کرے مگر صرف وہی جو فوت ہوئی (یعنی جو رمی اپنے وقت پر نہ ہو سکی) اور اگر وہ ایک جمرہ ہو تو اس پر رمی کرے پھر اس رمی کے بعد جن جمروں پر رمی کرنی ہے وہ رمی کرے گا، کیونکہ رمی جمار میں ترتیب واجب ہے۔ اور یہ جائز نہیں کہ وہ پہلے جمرہ کی رمی مکمل کرنے سے پہلے دوسرے جمرہ کی رمی میں شروع ہو جائے جیسا کہ نماز کی رکعتوں میں ایسا کرنا جائز نہیں ہوتا۔ یہی مشہور مذہب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ رمی کے صحیح ہونے کے لئے ترتیب واجب نہیں ہے بلکہ جب مکمل رمی ادائیگی کے وقت کے دوران ہو تو وہ جائز ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ جب رمی کے ایام گزر جائیں تو پھر کوئی رمی نہیں ہے۔ پس اس کے بعد اگر وہ اسے یاد آ جائے جو اس سے صادر ہو رہا ہے درآنحالیکہ ابھی وہ مکہ میں ہی ہو یا مکہ مکرمہ سے نکلنے کے بعد، تو اس پر ہدی (قربانی) واجب ہوگی چاہے اس نے مکمل رمی جمار چھوڑ دیا ہو، یا ان میں سے ایک جمرہ کی رمی ترک کر دی ہو، یا ایک جمرہ کی کنکری چھوڑ دی ہو، یہاں تک کہ ایام منیٰ (یعنی ایام رمی) گزر گئے تو اس پر دم واجب ہوگا۔

اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: اگر اس نے مکمل رمی جمار ترک کر دیا تو اس پر دم واجب ہوگا اور اگر ایک جمرہ چھوڑ دیا تو اس پر جمرہ کی ہر کنکری کے بدلے مسکین کو نصف صاع کھانا دینا ہوگا یہاں تک کہ وہ دم کو پہنچ جائے، پھر وہ جو چاہے کھلا دے۔ مگر جمرہ عقبہ کی رمی چھوڑنے کے عوض اس پر دم واجب ہوگا۔

امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ صدقہ کرے گا اگر اس نے کنکری چھوڑ دی۔ اور امام ثوری نے کہا ہے: وہ ایک، دو اور تین کنکریوں کے عوض تو کھانا کھلائے گا اور اگر اس نے چار یا اس سے زیادہ کنکریاں چھوڑ دیں، تو پھر اس پر دم واجب ہوگا، اور فقیہ اللیث نے کہا ہے: ایک کنکری چھوڑ دینے میں دم واجب ہے، اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ایک قول یہی ہے۔ اور ان کا دوسرا مشہور قول یہ ہے کہ ایک کنکری میں ایک مد (2) طعام واجب ہے، دو کنکریوں میں دو مد اور تین کنکریوں میں دم واجب ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ رمی جمار میں سے جو ایام تشریق کے دوران رہ جائے یہاں تک کہ آخری یوم تشریق کا سورج غروب ہو جائے تو تمام کے نزدیک رمی کرنے کا کوئی ذریعہ اور جواز نہیں۔ (آخری یوم تشریق سے مراد) یوم نحر سے لے کر چوتھا دن ہے اور یہ ایام تشریق میں سے تیسرا دن ہے (یعنی تیرہویں ذی الحجہ کا دن) البتہ مذکورہ بالا طریقہ کے مطابق دم یا کھانا کھلانا

1۔ صحیح بخاری، باب الذبح قبل الحلق، حدیث نمبر 1608، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایک پیمانہ جس کی مقدار اہل حجاز کے نزدیک 1.33 رطل اور اہل عراق کے نزدیک 2 رطل ہے

اس کی طرف سے جائز ہوگا۔

مسئلہ نمبر 5۔ ایام تشریق کی راتیں منیٰ کے علاوہ مکہ مکرمہ یا کہیں اور گزارنا جائز نہیں ہے کیونکہ تمام کے نزدیک ایسا کرنا جائز نہیں ہے سوائے چرواہوں کے اور آل عباس کے ان افراد کے جنہیں پانی پلانے کی ولایت حاصل ہے۔ امام بخاری نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منیٰ کی راتیں (حاجیوں کو) پانی پلانے کے لئے مکہ مکرمہ میں گزارنے کی اجازت طلب کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اجازت عطا فرما دی (1)۔

ابن عبد البر نے کہا ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ پانی پلانے بارے نگرانی کرتے تھے اور اس کے معاملے کا اہتمام کرتے تھے اور پھر ایام حج میں حاجیوں کو اس کا پانی پلاتے تھے۔ سو اسی لئے آپ کو منیٰ کی بجائے مکہ مکرمہ میں رات گزارنے کی رخصت دی گئی، جیسا کہ اونٹ چرانے والوں کو ان کی حاجت کے پیش نظر رخصت دی گئی، کیونکہ انہیں اونٹ چرانے کے لئے چراگاہ کی طرف نکلنے کی ضرورت ہوتی تھی جو کہ منیٰ سے دور تھی۔

منیٰ کا نام منیٰ اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ اس میں خون بہایا جاتا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: بلاشبہ اس کا نام منیٰ رکھا گیا ہے کیونکہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام کو کہا: آپ تمنا اور آرزو کیجئے۔ تو آپ نے کہا: ''میں جنت کی تمنا کرتا ہوں'' پس اس کا نام منیٰ رکھ دیا گیا۔ اور فرمایا: اس کا نام جمع بھی رکھا گیا ہے کیونکہ اس میں حضرت حوا اور حضرت آدم علیہما السلام جمع اور اکٹھے ہوئے ہیں (یعنی ان دونوں کی آپس میں ملاقات ہوئی ہے۔) اور جمع مزدلفہ کا بھی نام ہے۔ اور یہ المشعر الحرام بھی ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ فقہاء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ ان لوگوں کے سوا جنہیں رخصت دی گئی ہے حاجیوں کے لئے منیٰ کی راتیں منیٰ میں گزارنا حج کے شعائر اور اس کے احکام میں سے ہے۔ حج اور اس کے تمام احکام پر قیاس کرتے ہوئے عقل (نظر وفکر) حج کے احکام میں سے کسی حکم کو ساقط کرنے والے پر دم واجب کرتی ہے۔ اور مؤطا میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: حاجیوں میں سے کوئی بھی منیٰ کی راتیں عقبہ کے پیچھے نہیں گزارے گا۔ اور وہ عقبہ جس کے پیچھے رات گزارنے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منع فرمایا ہے یہ وہی عقبہ ہے جو اس جمرہ کے پاس ہے جس پر لوگ یوم نحر کو کنکریاں مارتے ہیں، ان میں سے ہے جو مکہ کے قریب ہیں۔ ابن نافع نے حضرت مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ''المبسوط'' میں اسے روایت کیا ہے۔ اس میں ہے کہ حضرت مالک نے فرمایا: اور جس نے منیٰ کی راتوں میں سے کوئی رات اس کے پیچھے بسر کی، تو اس پر فدیہ ہوگا۔ اس لئے کہ اس نے منیٰ کی راتیں منیٰ کے سوا (دوسری جگہ) بسر کی ہیں۔ اور حج میں ایسا کرنا مشروع ہے لیکن اسے ترک کرنے کے سبب اس پر دم لازم ہوگا، جیسا کہ مزدلفہ کی رات کا حکم ہے۔ اور یہاں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک فدیہ سے مراد ہدی (قربانی کا جانور) ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: وہ ہدی ہے جسے حل سے حرم کی طرف ہانک کر لایا جائے گا (☆)۔

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 4731

☆ امام احناف کے نزدیک یہ راتیں وہاں گزارنا رمی جمار کی سہولت کے لیے ہے وہاں ہی گزارے لیکن اگر کوئی وہاں نہیں رہتا تو اس پر دم واجب نہیں، ہدایہ

مسئلہ نمبر 7۔ حضرت مالک رحمۃ اللہ علیہ نے عبداللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم کے واسطہ سے ان کے باپ سے یہ روایت بیان کی ہے کہ ابوالبداح بن عاصم بن عدی نے انہیں بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ چرانے والوں کو منیٰ سے باہر رات گزارنے کی رخصت عطا فرمائی۔ وہ یوم نحر کو رمی کرتے تھے، پھر دوسرے دن یعنی گیارہویں ذی الحجہ اور بارہویں دو دنوں کی رمی کرتے تھے، اور پھر یوم النفر (یعنی تیرہویں ذی الحجہ) کو بھی رمی کرتے تھے۔

ابوعمر نے بیان کیا ہے: حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کے مقتضا کے مطابق قول نہیں کیا۔ اور وہ کہتے تھے: وہ یوم نحر کو جمرہ عقبہ پر رمی کرتے، پھر دوسرے دن یعنی گیارہویں ذی الحجہ کو رمی نہ کرتے تھے اور جب بارہویں ذی الحجہ کا دن آتا، اور یہ ایام تشریق میں سے دوسرا دن ہے، اور یہی وہ دن ہے جس میں وہ لوگ جلدی کوچ کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو تعجیل (جلدی چلے جانے) کا ارادہ رکھتے ہیں، یا جن کے لئے تعجیل جائز ہوتی ہے، تو وہ اس دن گیارہویں اور بارہویں دو دنوں کی رمی اکٹھی کرتے تھے، کیونکہ اس طرح وہ اسے ادا کرتے تھے جو ان پر لازم تھا۔ اور آپ کے نزدیک کوئی بھی کسی شے کو ادا نہیں کرتا مگر اس کے بعد کہ وہ اس کے ذمہ واجب ہوتی ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں اس حدیث کی جو تفسیر بیان کی ہے اس کا یہی مفہوم ہے۔ اور آپ کے سوا کوئی اور کہتا ہے: جو کچھ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث میں ہے اس کی بناء پر اس تمام میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ یہ تمام کے تمام رمی کے ایام ہیں۔ البتہ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک چرواہوں کے لئے رمی کو مقدم کرنا جائز نہیں کیونکہ جو چرواہے نہیں ان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ایام تشریق میں زوال سے پہلے رمی جمار کریں۔ پس اگر کسی نے زوال سے پہلے رمی کی، تو وہ اس کا اعادہ کرے، ان کے لئے تقدیم جائز نہیں۔ بلاشبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دوسرے اور تیسرے دن (یعنی بارہویں اور تیرہویں) کی رمی کے بارے میں رخصت عطا فرمائی۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ جو کچھ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ میں کہا ہے وہ ابن جریج کی روایت میں موجود ہے۔ انہوں نے بیان کیا ہے کہ مجھے محمد بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم نے اپنے باپ کے واسطہ سے خبر دی ہے کہ ابوالبداح بن عاصم بن عدی نے بیان کیا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چرواہوں کو رخصت عطا فرمائی کہ وہ واپس چلے جائیں۔ پس وہ یوم نحر کو رمی کرتے، پھر ایک دن اور ایک رات چھوڑ دیتے، پھر دوسرے دن رمی کرتے۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: اور تیسرے جمرہ کی رمی اس سے ساقط ہو جائے گی جس نے چلے جانے میں جلدی کی۔

ابن ابی زمنین نے کہا ہے: جب کوئی جلدی چلے جانے کا ارادہ رکھتا ہو تو وہ نفر اول کے دن (یعنی بارہویں ذی الحجہ) اس پر رمی کرے گا۔ ابن المواز نے کہا ہے: جلدی کوچ کا ارادہ کرنے والا دو دنوں میں اکیس کنکریاں مارے گا، ہر جمرہ پر سات کنکریاں، تو اس طرح اس کی مجموعی رمی انچاس کنکریاں ہو جائے گی، کیونکہ اس نے دسویں ذی الحجہ کے دن جمرہ عقبہ پر سات کنکریاں پھینکیں ہیں۔ ابن منذر نے کہا ہے: اور تیسرے دن کی رمی ساقط ہو جائے گی۔

مسئلہ نمبر 8۔ مالک نے یحییٰ بن سعید کے واسطہ سے حضرت عطاء بن ابی رباح رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے یہ ذکر کرتے ہوئے سنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چرواہوں کو رخصت دی ہے کہ وہ رات کے وقت رمی جمار کریں۔ وہ کہتے

ہیں: ''زمانہ اول میں'' باجی نے کہا ہے کہ قولہ فی الزمن الاول حضور نبی مکرم ﷺ کے زمانہ پر اپنے اطلاق کا تقاضا کرتا ہے۔ کیونکہ وہی اس شریعت کا زمانہ اول ہے۔ پس اس بنا پر یہ روایت مرسل ہے اور وہ قول یہ احتمال بھی رکھتا ہے کہ اس سے مراد وہ پہلا زمانہ ہے جسے حضرت عطا نے پایا ہو تو پھر یہ روایت موقوف مسند ہو گی۔ واللہ اعلم۔

میں (مصنف) کہتا ہوں کہ یہ روایت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ عن النبی ﷺ کی حدیث سے مسند ہے، اسے دارقطنی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ اور ہم نے اسے المقتبس فی شرح موطا مالک بن انس میں ذکر کیا ہے۔ بلاشبہ ان (چرواہوں) کے لئے رات کے وقت رمی جمار کو مباح کیا گیا ہے، کیونکہ یہ ان کے ساتھ انتہائی نرم رویہ ہے، اور اس میں ان کے لئے انتہائی زیادہ احتیاط ہے جو وہ اونٹ چرانے کا قصد کرتے تھے۔ کیونکہ رات کے وقت نہ وہ چرتے ہیں اور نہ وہ منتشر ہوتے ہیں، پس وہ اس وقت میں رمی کر لیں۔

تحقیق ایسے آدمی کے بارے میں اختلاف ہے جس کی رمی رہ گئی یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا، تو اس بارے میں حضرت عطا رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: اونٹ چرانے والوں کے سوا رات کے وقت کسی کے لئے رمی جائز نہیں۔ رہے تجار، تو ان کے لئے بھی جائز نہیں۔

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: جس کی رمی فوت ہو گئی یہاں تک کہ سورج غروب ہو جائے، تو پھر اسے چاہیے کہ وہ رمی نہ کرے یہاں تک کہ دوسرے دن کا سورج طلوع ہو جائے۔ اسی طرح امام احمد اور اسحاق نے بھی کہا ہے۔

اور حضرت امام مالک نے فرمایا ہے کہ جب کوئی دن کے وقت رمی چھوڑ دے تو وہ رات کے وقت رمی کر لے اور اس پر ابن القاسم کی روایت کے مطابق دم لازم ہو گا۔ اور آپ نے موطا میں یہ ذکر نہیں کیا کہ اس پر دم ہو گا۔

امام شافعی، ابوثور، یعقوب اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: جب کوئی رمی بھول جائے یہاں تک کہ شام ہو جائے، تو وہ رمی کرے گا اور اس پر دم نہیں ہو گا۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ رات کے وقت رمی جمار کرنے کی رخصت دیتے تھے۔

امام اعظم ابوحنیفہ نے فرمایا ہے: وہ رمی کرے گا اور اس پر کوئی شے لازم نہ ہو گی، اور اگر اسے رات کے وقت بھی رمی یاد نہ آئی، یہاں تک کہ دوسرا دن آ گیا، تو اس پر لازم ہے کہ وہ رمی کرے اور اس پر دم لازم ہو گا، اور امام ثوری نے کہا ہے: جب کسی نے بھول کر یا بالارادہ رمی کو رات تک مؤخر کر دیا تو وہ خون بہائے (یعنی جانور قربانی کرے۔)

میں (مفسر) کہتا ہوں: چرواہوں میں سے یا پانی پلانے والوں میں سے کسی نے رات کے وقت رمی کی، تو اس پر دم واجب نہ ہو گا۔ (یہ حکم حدیث کے مطابق ہے۔) اور اگر ان کے علاوہ کسی اور نے ایسا کیا، تو عقل و نظر دم واجب کرے گی جبکہ یہ بالارادہ ہو۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 9۔ یہ بات ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یوم نحر کو اپنی سواری پر جمرہ عقبہ پر رمی کی۔ اور امام مالک

وغیرہ نے مستحب قرار دیا ہے کہ اس پر رمی کرنے والا سوار ہو، حالانکہ حضرت ابن عمر، حضرت ابن زبیر اور حضرت سالم رضی اللہ عنہم پیدل حالت میں رمی کرتے تھے اور چاہیے کہ ہر روز تینوں جمروں پر اکیس کنکریاں رمی کرے، اور ہر کنکری مارتے وقت تکبیر کہے، اور رمی کرتے وقت اس کا چہرہ قبلہ شریف کی طرف ہو، اور جمرات ترتیب کے ساتھ رکھے، نہ انہیں اکٹھا کرے اور نہ ہی انہیں متفرق کرے اور نہ انہیں اوندھا رکھے، وہ جمرہ اولیٰ سے ابتدا کرے اور اس پر سات کنکریاں مارے، وہ انہیں اس کے پاس رکھ نہیں دے گا۔ اسی طرح امام مالک، امام شافعی، ابوثور اور اصحاب رائے نے کہا ہے۔ پس اگر اس نے انہیں پھینک دیا تو یہ اصحاب رائے کے نزدیک جائز ہے۔

ابن قاسم نے کہا ہے: دونوں صورتوں میں تمام کنکریاں پھینک دینا جائز نہیں ہے۔ یہی صحیح ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کنکریاں مارتے تھے۔ ان کے نزدیک ایک ہی بار دو یا دو سے زیادہ کنکریاں نہیں پھینکنی چاہئے۔ پس اگر اس نے ایسا کیا، تو وہ اسے ایک کنکری شمار کرے۔ اور جب وہ ایک جمرہ سے فارغ ہو جائے تو وہ اس کے سامنے کی طرف آگے بڑھے اور طویل وقت تک دعا کے لئے کھڑا رہے اور جو میسر آئے (وہی مانگے) بعد ازاں دوسرے جمرہ پر رمی کرے اور یہ جمرہ وسطی ہے اور وہ اس سے وادی کے بطن میں شمال کی طرف پھر جائے اور اس کے پاس بھی دعا کے لئے طویل وقت تک وقوف کرے۔ پھر تیسرے جمرہ پر کنکریاں مارے اور یہ جمرہ عقبہ ہے، اس پر بھی سات کنکریاں مارے گا اور اس کے نیچے کی جانب سے اس پر کنکریاں پھینکے گا اور اس کے پاس کھڑا نہیں ہوگا۔ اگر کسی نے اس پر اس کی اوپر کی جانب سے رمی کی تو وہ بھی اس کی طرف سے جائز ہے اور وہ رمی کے دوران ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہے گا۔ رمی جمار کے دوران سنت ذکر تکبیر ہے نہ کہ اس کے علاوہ کوئی اور ذکر اور وہ پیدل رمی کرے گا بخلاف یوم نحر کے جمرہ کے۔ یہ سب کا سب (حکم) توقیفی ہے۔ نسائی اور دارقطنی نے اسے حضرت زہری سے مرفوعاً ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اس جمرہ پر رمی کرتے تھے جو مسجد منیٰ کے ساتھ متصل ہے تو آپ اس پر سات کنکریاں مارتے تھے اور جب بھی ایک کنکری پھینکتے تو ساتھ تکبیر (اللہ اکبر) کہتے تھے۔ پھر اس سے آگے بڑھتے اور قبلہ شریف کی طرف منہ کر کے کھڑے ہوتے اور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے اور آپ طویل وقت تک کھڑے رہتے تھے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے جمرہ کے پاس آتے تھے اور اسے سات کنکریاں مارتے اور ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہتے تھے۔ پھر آپ بائیں جانب اس جگہ کی طرف نیچے اترتے جو وادی کے ساتھ متصل ہے اور قبلہ شریف کی طرف منہ کر کے کھڑے ہوتے اور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس جمرہ کے پاس آتے جو عقبہ کے پاس ہے اور اس پر سات کنکریاں مارتے اور ہر کنکری مارتے وقت تکبیر کہتے، پھر واپس پھر جاتے اور اس کے پاس نہ ٹھہرتے۔ زہری نے کہا ہے: میں نے حضرت سالم بن عبداللہ کو اپنے باپ سے اور انہیں حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث بیان کرتے ہوئے سنا ہے۔ انہوں نے فرمایا: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اسی طرح کرتے تھے۔ یہ الفاظ دارقطنی کے ہیں۔ (1)

مسئلہ نمبر 10۔ کنکریوں کا حکم یہ ہے کہ وہ پاک ہوں، ناپاک نہ ہوں اور نہ ہی ان میں سے ہوں جو پہلے ماری جا چکی

1۔ بخاری شریف، باب رفع الیدین عند الجمرۃ، حدیث نمبر 1634، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہیں، سو اگر کسی نے ایسی کنکری ماری جو پہلے ماری جا چکی ہو تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ جائز نہیں۔ تحقیق ان سے ابن قاسم نے بیان کیا ہے: اگر ایسا ایک کنکری میں ہو تو آپ نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ اور میں ابن قاسم کے پاس آیا تو انہوں نے اس کے بارے فتویٰ دیا۔

مسئلہ نمبر 11۔ اہل علم نے مستحب قرار دیا ہے کہ وہ کنکریاں مزدلفہ سے اٹھائے نہ کہ وہ جو مسجد میں پڑی ہیں اور اگر کسی نے ضرورت سے زیادہ کنکریاں اٹھالیں اور رمی کرنے کے بعد وہ اس کے پاس باقی بچ رہیں تو وہ انہیں دفن کر دے، انہیں پھینکے نہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے یہی کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 12۔ جمہور کے نزدیک کنکریوں کو دھویا نہیں جائے گا۔ طاؤس نے اس میں اختلاف کیا ہے حالانکہ یہ روایت موجود ہے کہ اگر اس نے ناپاک کنکریوں کو نہ دھویا یا ایسی کنکریوں کے ساتھ رمی کی جو پہلے ماری جا چکی تھیں تو اس نے گناہ کیا اور آپ نے اس کی طرف سے رمی کو جائز قرار دیا۔

ابن منذر نے بیان کیا ہے: یہ مکروہ ہے کہ وہ ان کنکریوں کے ساتھ رمی کرے جن کے ساتھ پہلے رمی کی جا چکی ہو۔ اگر ایسی کنکریوں کے ساتھ رمی کی گئی تو وہ اس کی طرف سے جائز ہوگی، کیونکہ میں کسی ایک کو بھی نہیں جانتا جس نے ایسا کرنے والے پر رمی کا اعادہ واجب قرار دیا ہو اور نہ ہی ہم اخبار میں سے کوئی ایسی خبر جانتے ہیں جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکری کو دھویا ہو اور نہ ہی آپ نے اسے دھونے کا حکم ارشاد فرمایا۔ تحقیق ہم نے طاؤس سے روایت کیا ہے کہ وہ کنکریاں دھوتے تھے۔

مسئلہ نمبر 13۔ رمی جمار میں مٹی کا ڈھیلا پھینکنا جائز نہ ہوگا اور نہ ہی کوئی ایسی شی جو پتھر نہ ہو۔ امام شافعی، امام احمد اور اسحاق رحمہم اللہ نے یہی کہا ہے۔ اور اصحاب الرائے نے کہا ہے: خشک مٹی کا ڈھیلا جائز ہوگا۔ اسی طرح ہر وہ شے جو اس نے پھینکی اور اس کا تعلق زمین سے ہو، تو وہ جائز ہوگی۔

امام ثوری نے کہا ہے: جس نے مٹی کے ڈھیلے اور ٹھیکری کے ساتھ رمی کی تو وہ رمی کا اعادہ نہ کرے۔ ابن منذر نے کہا ہے: سنگریزوں کے سوا رمی جائز نہیں ہوگی۔ کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم پر انگلیوں سے کنکریاں پھینکنا لازم ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رمی کنکریوں کے ساتھ تھی۔

مسئلہ نمبر 14۔ کنکری کی مقدار میں اختلاف ہے۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: وہ طولاً اور عرضاً پورے سے چھوٹی ہوگی۔ اور ابو ثور اور اصحاب الرائے نے کہا ہے: ٹھیکری کی کنکری کی مثل ہوگی۔ اور ہم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ وہ بکری کی مینگنی کے برابر کنکری کے ساتھ رمی کرتے تھے۔ اور حضرت امام مالک رضی اللہ عنہ کے اس قول کا کوئی معنی نہیں ہے: اس سے بڑی میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے؛ کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹھیکری کی کنکری کی مثل کے ساتھ رمی کی سنت قائم فرمائی ہے۔ البتہ جس پر حصاۃ کا نام واقع ہو سکے اس کے ساتھ رمی کرنا جائز ہے اور سنت کی اتباع کرنا افضل ہے۔ ابن منذر نے یہی کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: وہ صحیح قول (یا عمل) جس کا خلاف کرنا اس کے لئے جائز نہیں ہوتا جو ہدایت یافتہ ہو اور اقتدا کرے (وہ یہ ہے کہ) امام نسائی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حدیث روایت کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عقبہ کی صبح ارشاد فرمایا: درآنحالیکہ آپ اپنی سواری پر تھے: میرے لئے کنکریاں چن کر لاؤ۔ چنانچہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کنکریاں چنیں، وہ ٹھیکری کی کنکریوں کی مثل تھیں۔ پس جب میں نے انہیں آپ کے دست مبارک میں دیا تو فرمایا: ہاں انہی کی مثل (یعنی رمی کے لئے اتنی مقدار ہی مناسب اور موزوں ہے۔) اور تم دین میں غلو کرنے سے بچو۔ بلاشبہ جو تم سے پہلے تھے انہیں دین میں غلو کرنے نے ہلاک کر دیا(1)۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اِیَّاکُمْ وَالْغُلُوَّ فِی الدِّیْنِ بڑی کنکریوں کے ساتھ رمی کرنے کی کراہت پر دلیل ہے۔ بلاشبہ یہ غلو میں سے ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 15۔ وہ آدمی جس کے ہاتھ میں کنکری باقی ہو، وہ نہ جانتا ہو یہ کون سی کنکریوں میں سے ہے تو وہ اسے پہلی میں سے بنائے (یعنی اسے جمرہ اولیٰ پر مارے) اور اس کے بعد پھر وسطیٰ اور آخری پر رمی کرے۔ اور اگر زیادہ وقت گزر جائے تو پھر مکمل رمی نئے سرے سے کرے۔

مسئلہ نمبر 16۔ امام مالک، امام شافعی، عبدالملک، ابوثور اور اصحاب الرائے رحمۃ اللہ علیہم نے اس کے بارے کہا ہے جس نے ایک جمرہ پر دوسرے جمرہ کو مقدم کر دیا: وہ رمی اس کی طرف سے جائز نہ ہوگی مگر یہ کہ وہ پے درپے اور لگاتار رمی کرے۔ حسن، عطا اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ وہ اس کی طرف سے جائز ہوگی اور بعض لوگوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی سے استدلال کیا ہے کہ "جس کسی نے ایک حکم کو دوسرے حکم پر (جو کہ متصل اس کے بعد ہو) مقدم کر دیا تو اس میں کوئی حرج نہیں"۔ اور فرمایا: یہ اس آدمی سے زیادہ نہیں ہوگا جس پر کئی نمازیں اور روزے جمع ہو گئے اور اس نے بعض کو بعض سے پہلے قضا کر لیا۔ پہلے قول میں احتیاط زیادہ ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 17۔ مریض کے رمی کرنے اور اس کی طرف سے رمی کیے جانے کے بارے میں اختلاف ہے۔

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا: ایسے مریض اور بچے کی جانب سے رمی کی جائے گی جو رمی کرنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں اور مریض ان کی رمی کے وقت کوشش کرے کہ وہ ہر جمرہ کے لئے سات تکبیریں کہے اور اس پر ہدی (قربانی) ہو گی، اور جب مریض رمی کے ایام میں تندرست ہو جائے اور وہ خود اپنی طرف سے رمی کر لے، اس کے باوجود اس پر امام مالک کے نزدیک دم واجب ہوگا۔

امام حسن، امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور اصحاب الرائے رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے کہ مریض کی طرف سے رمی کی جائے گی اور انہوں نے ہدی کا ذکر نہیں کیا۔ اور وہ بچہ جو رمی پر قدرت نہیں رکھتا اس کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اس کی طرف سے رمی کی جائے گی۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اسی طرح کرتے تھے۔

مسئلہ نمبر 18۔ دارقطنی نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: ہم نے عرض

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 3248

کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم یہ کنکریاں جو یہاں ہر سال پھینکی جاتی ہیں تو ہم گمان کرتے ہیں کہ یہ کم ہو جاتی ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلا شبہ ان میں سے جو قبول کر لی جاتی ہیں وہ اٹھالی جاتی ہیں، اور اگر اس طرح نہ ہو تو تو انہیں پہاڑوں کی مثل دیکھے (1)۔

مسئلہ نمبر 19۔ ابن منذر نے کہا ہے: اور اہل علم نے اس پر اجماع کیا ہے کہ حاجیوں میں سے جو منیٰ سے نفر اول کے دن اپنے شہر کی طرف واپس جانے کے لئے نکلنے کا ارادہ کرے، درآنحالیکہ وہ (شہر) حرم سے باہر ہو اور وہ مکہ مکرمہ میں مقیم نہ ہو، تو اسے چاہئے وہ زوال شمس کے بعد کوچ کرے، بشرطیکہ وہ یوم نحر سے متصل دن میں شام سے پہلے پہلے رمی کرے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ترجمہ ''اور جو جلدی کر کے دو دنوں میں ہی چلا گیا تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں'' پس جو وہاں سے کوچ کرنے کا ارادہ کرے تو اسے چاہئے کہ وہ کوچ کرے جب تک کہ ابھی دن موجود ہو۔ تحقیق ہم نے حضرت نخعی اور حضرت حسن سے روایت کیا ہے کہ ان دونوں نے کہا: ایام تشریق کے دوسرے دن جسے عصر کی نماز کا وقت منیٰ میں ہو گیا، تو وہ آنے والے دن کی صبح تک وہاں سے کوچ نہ کرے۔ ابن منذر نے کہا ہے کہ دونوں نے یہ قول بطور استحباب کیا ہے اور پہلا قول جو ہم کہتے ہیں وہ ظاہر کتاب وسنت کے مطابق ہے۔

مسئلہ نمبر 20۔ اہل مکہ کے بارے میں ائمہ کا اختلاف ہے کہ کیا نفر اول کے دن (منیٰ سے) جا سکتے ہیں؟ تو ہم نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: تمام لوگوں میں سے جو چاہے نفر اول کے دن وہ وہاں سے جا سکتا ہے سوائے آل خزیمہ کے وہ صرف نفر ثانی کے دن ہی وہاں سے کوچ کر سکتے ہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مجھے اس آدمی پر کوئی تعجب نہیں جس نے کوچ کے پہلے دن وہاں سے کوچ کیا تا کہ وہ مکہ مکرمہ میں مقیم ہو جائے۔ مزید فرمایا: اہل مکہ تو نسبتاً زیادہ جلدی کرتے ہیں۔

امام احمد اور اسحاق نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے قول الا آل خزیمۃ کا معنی یہ بیان کیا ہے کیونکہ وہ اہل حرم ہیں۔

اور حضرت امام مالک اہل مکہ کے بارے میں فرماتے ہیں: جس کے لئے کوئی عذر ہو اس کے لئے تو جلدی کر کے دو دنوں میں وہاں سے چلے جانا جائز ہے۔ اور اگر کوئی امور حج میں سے کسی کے بارے میں محض اپنے لئے تخفیف کا ارادہ کرے تو پھر اس کے لئے جائز نہیں ہے۔ تو گویا آپ نے تعجیل کا حکم ان کے لئے قرار دیا جن کا علاقہ دور ہو۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: آیت اپنے عموم پر ہے، رخصت تمام لوگوں کے لئے ہے، چاہے وہ اہل مکہ ہوں یا دوسرے، کوئی منیٰ سے نکل کر مکہ مکرمہ میں ٹھہرنے کا ارادہ کرے یا اپنے شہر کی طرف جانے کا قصد کرے۔ حضرت عطا نے کہا ہے: یہ آیت عام لوگوں کے لئے ہے۔ ابن منذر کا قول حضرت امام شافعی کے مذہب سے مشابہت رکھتا ہے، اور اسی کے مطابق ہم کہتے ہیں۔ حضرت ابن عباس، حضرت حسن، عکرمہ، مجاہد، قتادہ اور نخعی رحمہم اللہ نے ارشاد فرمایا ہے: ایام معدودات میں سے دوسرے دن جس نے منیٰ سے کوچ کیا تو اس پر کوئی حرج (گناہ) نہیں اور جو تیسرے دن تک وہاں ٹھہر گیا تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ پس آیت کا معنی یہ ہے کہ یہ سب مباح ہے۔ اور اس کی اس تقسیم کو اہتمام اور تاکید سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ

1۔ سنن دارقطنی، جلد 2، صفحہ 300

عربوں میں سے کچھ تھے جو جلدی کر کے وہاں سے چلے جانے والے کی مذمت کرتے تھے اور اس کا برعکس (یعنی کچھ ایسے تھے جو تاخیر کرنے والے کی مذمت کرتے تھے) تو ان تمام سے گناہ کو اٹھانے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی۔ (یعنی جس نے جو طریقہ بھی کیا چاہے جلدی کی یا تاخیر کی کسی کے لئے بھی کوئی گناہ نہیں ہے۔)

حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابراہیم نخعی رحمہم اللہ نے بھی کہا ہے: مَنْ تَعَجَّلَ کا معنی ہے جس نے جلدی کی تحقیق اسے بخش دیا گیا اور جس نے تاخیر کی تحقیق اسے بھی بخش دیا گیا، اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے استدلال کیا ہے: ''جس نے اس بیت اللہ شریف کا حج کیا اور اس نے رفث وفسق کا ارتکاب نہ کیا تو وہ اپنے گناہوں سے اس طرح پاک ہو گیا جیسا کہ اس دن تھا جس دن اس کی ماں نے اسے جنم دیا۔'' (1)

اور ارشاد باری ہے: فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ یہ بھی نفی عام ہے اور براءت مطلقہ ہے۔

اور مجاہد نے بھی کہا ہے: آیت کا معنی ہے جس نے جلدی کی یا جس نے تاخیر کی تو اس پر آنے والے سال تک کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور اس قول میں اثر کو بیان کیا گیا ہے۔

ابو العالیہ نے آیت کے بارے میں کہا ہے: اس پر کوئی گناہ نہیں جو اپنی بقیہ عمر متقی بن کر رہا اور حج کرنے والے کے لئے یقینی مغفرت ہے، یعنی اس کے تمام گناہ ختم ہو جاتے ہیں اگر وہ اپنی بقیہ عمر اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہا۔

ابو صالح وغیرہ نے کہا ہے: آیت کا معنی یہ ہے ''اس پر کوئی گناہ نہیں ہے جو شکار کو قتل کرنے سے بچتا رہا اور ہر اس شے سے جس سے اجتناب کرنا حج کے دوران اس پر واجب ہوتا ہے اور یہ بھی کہا: اس پر کوئی گناہ نہیں جو اپنے حج میں بچتا رہا اور اسے مکمل ادا کر دیا یہاں تک کہ وہ ہر قسم کے شبہ اور خیانت سے پاک تھا۔

مسئلہ نمبر 21۔ قول باری تعالیٰ فَمَنْ تَعَجَّلَ میں، مَنْ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ خبر ہے۔ اور قرآن کے علاوہ اسے فلا اثم علیهم پڑھنا بھی جائز ہے کیونکہ مَنْ جمع کے معنی کے لئے ہے، جیسا کہ اس ارشاد گرامی میں ہے وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّسْتَمِعُوْنَ اِلَیْكَ (یونس:42) میں من جمع کے لئے ہے۔ اور وَ مَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ میں بھی اسی طرح ہے اور لِمَنِ اتَّقٰى میں لام غفران سے متعلق ہے۔ اور تقدیر کلام اسی طرح ہے المغفرة لمن اتّقٰی یعنی مغفرت اس کے لئے ہے جو بچتا رہا۔ یہ حضرت ابن مسعود اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی تفسیر کے مطابق ہے۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بلاشبہ مغفرت اس کے لئے رکھی گئی ہے جو حج سے واپس لوٹنے کے بعد تمام گناہوں سے بچتا رہا۔

اور اخفش نے کہا ہے: تقدیر کلام ہے ذلك لمن اتقی وہ اس کے لئے ہے جو بچتا رہا۔ اور بعض نے کہا ہے: اس کے لئے (مغفرت ہے) جو حالت احرام اور حرم میں شکار کو قتل کرنے سے بچتا رہا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ تقدیر عبارت ہے الاباحة لمن اتقی اباحت اس کے لئے ہے جو بچتا رہا۔ یہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

1۔ بخاری شریف، باب قول اللہ عزوجل ولا فسوق ولا جدال فی الحج، حدیث نمبر 1691، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یہ قول بھی ہے کہ تقدیر کلام یہ ہے: السلامة لمن اتقی سلامتی اس کے لئے ہے جو بچتا رہا۔
اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ وَاذْكُرُوا کے متعلق ہے۔ یعنی الذکر لمن اتقی یعنی نصیحت اس کے لئے ہے جو بچتا رہا۔ اور سالم بن عبداللہ نے فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ میں تخفیفاً الف کو ملا کر پڑھا ہے۔ اور عرب اس طرح استعمال کرتے ہیں جیسا کہ شاعر کا قول ہے۔

ان لم اقاتل فالبسوانی برقعا

اگر میں نے قتال نہ کیا تو تم مجھے برقعہ پہنا دینا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے تقویٰ اور حشر و وقوف کو یاد رکھنے کا حکم ارشاد فرمایا:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِىْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝

''اور اے (سننے والے) لوگوں سے وہ بھی ہے کہ پسند آتی ہے تجھے اس کی گفتگو دنیاوی زندگی کے بارے میں اور وہ گواہ بناتا رہتا ہے اللہ کو اس پر جو اس کے دل میں ہے حالانکہ وہ (حق کا) سخت ترین دشمن ہے''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ جب ان لوگوں کا ذکر کیا جن کی ہمتیں اور توانائیاں دنیا پر ہی محدود و محصور ہو گئیں (یعنی ان کی صلاحیتیں اور کوششیں فقط دنیا کے لیے ہی صرف ہوئیں) (یعنی) اس ارشاد گرامی میں فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا (بقرہ: 200) اور ان مومنین کا ذکر کیا جنہوں نے دونوں جہان کی خیر اور منفعت کا سوال کیا، تو اب منافقین کا ذکر کیا، کیونکہ انہوں نے ایمان کو ظاہر کیا اور کفر کو چھپا کر رکھا۔

سدی وغیرہ مفسرین نے کہا ہے: یہ آیت اخنس بن شریق کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس کا نام ابی تھا اور اخنس اس کا لقب تھا۔ اس کا یہ لقب اس لئے تھا کیونکہ وہ غزوۂ بدر کے دن اپنے حلفاء میں سے بنی زہرہ کے تین سو افراد کو ساتھ لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ کرنے سے پیچھے ہٹ گیا تھا (اور لشکر کفار سے واپس چلا گیا تھا) جیسا کہ اس کی تفصیل سورۂ آل عمران میں آئے گی۔ وہ انتہائی شیریں بیان اور حسین المنظر آدمی تھا۔ سو اس کے بعد وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور اپنا اسلام ظاہر کیا اور یہ کہا: اللہ تعالیٰ جانتا ہے میں اپنے قول میں سچا ہوں، پھر اس کے بعد بھاگ گیا۔ اس کا گزر مسلمانوں میں سے ایک قوم کی کھیتی کے پاس سے ہوا اور وہاں ساتھ گدھے بھی تھے، تو اس نے کھیتی کو جلا دیا اور گدھوں کی کونچیں کاٹ دیں۔ مہدوی نے کہا ہے: اسی کے بارے میں یہ آیات بھی نازل ہوئیں وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۝ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ ۝ (قلم) (اور نہ بات مانیے کسی (جھوٹی) قسمیں کھانے والے ذلیل شخص کی جو بہت نکتہ چین، چغلیاں کھاتا پھرتا ہے) اور وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۝ (ہمزہ) (اور ہلاکت ہے ہر اس شخص کے لئے جو (روبرو) طعنے دیتا ہے (پیٹھ پیچھے) عیب جوئی کرتا ہے۔) ابن عطیہ نے کہا ہے: کبھی بھی یہ ثابت نہیں ہوا کہ اخنس نے اسلام قبول کیا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ آیت منافقین کی ایک قوم کے بارے نازل ہوئی، انہوں نے ان لوگوں کے بارے میں باتیں کیں جو غزوۂ رجیع میں شہید کر دیے گئے یعنی حضرت عاصم بن ثابت اور حضرت خبیب وغیرہ رضی اللہ عنہم، منافقین نے کہا: ان لوگوں پر افسوس ہے کہ نہ یہ اپنے گھروں میں بیٹھے اور نہ ہی یہ اپنے صاحب (مراد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں) کا پیغام پہنچا سکے۔ پس یہ آیت منافقین کی صفات کے بارے میں نازل ہوئی۔ پھر غزوۂ رجیع میں جام شہادت نوش کرنے والوں کا ذکر اس طرح فرمایا: وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّشۡرِیۡ نَفۡسَهُ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰهِ (بقرہ: 207) (اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو بیچ ڈالتا ہے اپنی جان (عزیز) بھی اللہ کی خوشنودیاں حاصل کرنے کے لئے۔)

حضرت قتادہ، مجاہد اور علماء کی ایک جماعت نے کہا ہے: یہ آیت ہر اس (بندے) کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس کے باطن میں کفر، نفاق، کذب یا اضرار (کسی کو نقصان اور ضرر پہنچانا) چھپا ہو اور وہ اپنی زبان سے اس کے خلاف اظہار کرتا ہو۔ پس یہ آیت عام ہے اور یہ اس حدیث سے مشابہت رکھتی ہے جو ترمذی میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بعض کتب میں ہے: بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے ایک قوم ہو گی جن کی زبانیں شہد سے زیادہ شیریں ہوں گی اور ان کے دل مصبر سے زیادہ کڑوے ہوں گے۔ وہ نرمی سے بھیڑوں کے چمڑے لوگوں کو پہنائیں گے اور وہ دین کے عوض دنیا خریدیں گے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: کیا وہ مجھے دھوکہ دیتے ہیں اور وہ مجھ پر جرأت کرتے ہیں؟ مجھے قسم ہے میں ضرور بضرور ان پر ایسا فتنہ مسلط کر دوں گا جو ان میں سے حلیم کو حیران و ششدر کر چھوڑے گا(1)۔

ارشاد باری تعالیٰ وَیُشۡهِدُ اللّٰهَ کا معنی یہ ہے کہ وہ کہتا ہے: اللہ تعالیٰ جانتا ہے بلاشبہ میں حق کہہ رہا ہوں۔ ابن محیصن نے اسے وَیَشۡهَدُ اللّٰهُ عَلٰی مَا فِیۡ قَلۡبِهٖ یعنی یشهد میں یا اور ہا کو مفتوح اور لفظ اللہ کو مرفوع پڑھا ہے۔ اور معنی یہ ہے "اس کی بات تجھے پسند آئی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ اس کے قول کے خلاف کو جانتا ہے اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَاللّٰهُ یَشۡهَدُ اِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ لَكٰذِبُوۡنَ ۝ (المنافقون) (لیکن اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ منافق قطعی جھوٹے ہیں۔)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قراءت واللّٰهُ یَشۡهَدُ عَلٰی مَا فِیۡ قَلۡبِهٖ اور جماعت کی قراءت مذمت میں زیادہ بلیغ ہے کیونکہ اس نے اپنے نفس پر اچھا کلام لازم کرنے کی قوت رکھی اور پھر اس کے باطن سے اس کے خلاف ظاہر ہوا۔ اور حضرت ابی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے وَیَسۡتَشۡهِدُ اللّٰهَ عَلٰی مَا فِیۡ قَلۡبِهٖ پڑھا ہے۔ اور یہ جمہور کی قراءت کی دلیل ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ ہمارے علماء نے کہا ہے کہ اس آیت میں ان امور کے بارے میں انتہائی احتیاط برتنے پر دلیل اور تنبیہ ہے جو دین اور دنیوی امور سے متعلق ہیں اور گواہوں اور قاضیوں کے احوال کے بارے میں طلب براءت پر دلیل ہے، بلاشبہ حاکم لوگوں کے ظاہر احوال پر اور جو کچھ ان کے ایمان اور مصالح میں سے ظاہر ہو اس پر عمل نہیں کرے گا یہاں تک کہ وہ ان کے باطن کے بارے میں بحث کر لے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے احوال بیان فرما دیے ہیں۔ اور بلاشبہ ان میں سے ایسے بھی ہیں جو بظاہر انتہائی خوبصورت اور حسین بات کرتے ہیں حالانکہ وہ نیت قبیح کرتے ہیں (یعنی ان کی نیت میں فتور اور برائی ہوتی ہے۔)

1۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذہ

پس اگر کہا جائے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد گرامی اس کے معارض آتا ہے: ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں کے ساتھ قتال کروں یہاں تک کہ وہ کہیں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، الحدیث۔(1)

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی اس کے خلاف ہے: ''پس میں اس کے لئے اسی کے مطابق فیصلہ کرتا ہوں جو میں سنتا ہوں''(2)۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس طرح ابتدائے اسلام میں تھا، جہاں ان کا اسلام ہی ان کی سلامتی کا باعث تھا لیکن جب فساد عام ہو گیا تو پھر یہ حکم نہ رہا۔ حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: صحیح بات یہ ہے کہ ظاہر کے مطابق عمل کیا جائے گا یہاں تک کہ اس کا خلاف ظاہر ہو جائے۔ کیونکہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا: صحیح بخاری میں ہے: اے لوگو! بلاشبہ وحی کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے، بلاشبہ اب ہم تمہیں تمہارے ان اعمال سے پکڑیں گے جو ہمارے لئے ظاہر ہوں گے۔ پس جس نے ہمارے لئے خیر اور بھلائی کو ظاہر کیا تو ہم اسے امن عطا کریں گے اور ہم اسے قرب عطا کریں گے۔ اس کے اسرار اور پوشیدہ چیزوں میں سے کوئی شے ہمارے لئے (باعث تشویش) نہیں ہے، اللہ تعالیٰ اس کی پوشیدہ چیزوں کے بارے میں اس کا محاسبہ فرمائے گا اور جس نے ہمارے لئے برائی کو ظاہر کیا، تو ہم نہ اسے امان دیں گے اور نہ اس کی تصدیق کریں گے، اگرچہ وہ کہے کہ اس کے دل اور ارادہ میں نیکی اور اچھائی ہے۔(3)

مسئلہ نمبر 3۔ ارشاد باری تعالیٰ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ اس میں اَلَدُّ سے مراد سخت اور شدید جھگڑا کرنے والا ہے۔ کہا جاتا ہے: ھو رجل اَلَدُّ وامراۃ لَدَّاءُ (وہ سخت جھگڑالو مرد اور وہ سخت جھگڑالو عورت ہے۔) وھم اھل لَدَد اور وہ سخت جھگڑا کرنے والے ہیں۔ وَ قَدْ لَدِدْتَ اس میں دال مکسور ہے (تو نے جھگڑا کیا) تَلَدُّ یہ عین کلمہ کے فتح کے ساتھ ہے۔ لَدَدًا (یعنی یہ باب سَمِعَ یَسْمَعُ ہے۔) یعنی تو سخت جھگڑالو ہو گیا۔ اور لددتُه اَلُدُّهُ یعنی پہلے میں دال مفتوح ہے اور دوسرے میں مرفوع ہے۔ یہ تب کہا جائے گا جب تو کسی سے جھگڑا کرے اور تو اس پر غالب آ جائے۔ اور الالدُّ یہ اللَّدِيدين سے مشتق ہے۔ اس سے مراد گردن کی دونوں سطحیں ہیں یعنی جھگڑا میں جس جانب سے بھی پکڑ لیا جائے غلبہ پا لیا جاتا ہے۔

شاعر کا قول ہے:

والدّ ذی حنق علیّ کانما	تغلی عداوۃ صدرہ فی مرجل

وہ بڑی شدت اور سختی کے ساتھ میرے گلے کو دبانے والا ہے، گویا کہ اس کے سینے کی عداوت ہنڈیا میں کھول رہی ہے۔

ایک دوسرے شاعر نے کہا:

ان تحت التراب عزما و حزماً	و خصیما ألدّ ذامغلاق

1۔ بخاری شریف، باب قتل من ابی قبول الفرائض الخ، حدیث نمبر 6413، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ بخاری شریف، باب اذا غصب جاریۃ الخ، حدیث نمبر 6452، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ بخاری شریف، باب الشھداء العدول، حدیث نمبر 2447، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اس میں بھی خصیما الد سخت جھگڑالو کے معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

آیت میں الخصام خاصم کا مصدر ہے۔ امام خلیل نے یہی کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خَصْم کی جمع ہے۔ یہ قول زجاج کا ہے، جیسا کہ کلب کی جمع کلاب، صعب کی جمع صعاب اور ضخم کی جمع ضخام ہے۔ اور اس کا معنی ہے جھگڑا کرنے والوں میں سے سخت اور شدید جھگڑا کرنے والا، یعنی سخت جھگڑالو، جب وہ تجھ سے بات کرے اور تجھ پر بات دہرائے اور تو اس کے کلام کو خوبصورت اور حسین دیکھے درآنحالیکہ اس کے باطن میں باطل ہو۔ یہ (معنی) اس پر دلالت کرتا ہے کہ جھگڑا کرنا جائز نہیں ہوتا مگر ایسے سبب سے جس کا ظاہر اور باطن برابر ہو۔ اور صحیح مسلم (1) میں ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک لوگوں میں سے مبغوض ترین آدمی سخت جھگڑا کرنے والا ہے۔"

وَ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا وَ یُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ ۝

"اور جب وہ حاکم بن جاتا ہے تو سر توڑ کوشش کرتا ہے کہ ملک میں فساد برپا کر دے اور تباہ کر دے کھیتوں کو اور نسل انسانی کو۔ اور اللہ تعالیٰ فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا"۔

ارشاد باری تعالیٰ: وَ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا کے تحت کہا گیا ہے کہ تولی اور سعی فعل قلب میں سے ہیں۔ پس تولی، ضَلَّ و غَضِبَ و انف فی نفسه کے معنی میں آتا ہے۔ یعنی وہ گمراہ ہو گیا، غصے ہو گیا اور اس نے اپنے دل میں اسے ناپسند کیا۔ اور سعی کا معنی ہے اس نے اپنے حیلہ اور ارادہ کے ساتھ اسلام اور اہل اسلام پر مصائب لانے کی کوشش کی۔ یہ ابن جریج وغیرہ سے منقول ہے۔

اور ایک قول یہ ہے کہ یہ دونوں آدمی کے فعل ہیں۔ پس تَوَلّٰی بمعنی ادبر (پیٹھ پھیرنا) آتا ہے، یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اس نے پیٹھ پھیری اور وہ آپ سے چلا گیا اور سعی کا معنی ہے: اور وہ اپنے قدموں کے ساتھ چلا اور اس نے راستہ طے کیا اور اسے پامال کیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے مروی ہے: دونوں کوششیں فساد ہیں۔ کہا جاتا ہے: سعی الرجل یسعی سعیا۔ یعنی آدمی نے دوڑ لگائی۔ اور اسی طرح جب وہ کام کرے اور کچھ کمائے تو یہ کہا جاتا ہے: فلاں یسعی علی عیاله یعنی فلاں اپنے گھر والوں کے نفع کے لئے کام کرتا ہے۔

اور ارشاد باری تعالیٰ وَ یُهْلِكَ یہ لِیُفْسِدَ پر معطوف ہے۔ اور حضرت ابی رضی اللہ عنہ کی قراءت میں وَ لِیُهْلِكَ ہے۔ حسن اور قتادہ نے اسے ویُهلِکُ رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس کے رفع کے بارے میں کئی اقوال ہیں۔ اس کا عطف یُعْجِبُكَ پر ہے (اس لئے مرفوع ہے) اور ابو حاتم نے کہا ہے: یہ سعی پر معطوف ہے، کیونکہ اس کا معنی ہے "وہ سر توڑ کوشش کرتا ہے اور

1۔ بخاری شریف، قول اللہ تعالیٰ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ، حدیث نمبر 2277، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تباہ کرتا ہے۔'' اور ابو اسحاق نے کہا ہے: یہ اصل عبارت وھو یُھْلِكُ ہے یعنی وہ تباہ کرتا ہے۔ اور ابن کثیر سے ویُھْلِكُ یعنی یاء کے فتحہ اور کاف کے ضمہ کے ساتھ مروی ہے۔

اور اَلْحَرْثُ وَالنَّسْلُ، یُھْلِكُ کے سبب دونوں مرفوع ہیں۔ اور یہی حسن، ابن ابی اسحاق، ابو حیوہ اور ابن محیصن کی قراءت ہے۔ اور عبد الوارث نے اسے ابو عمرو سے روایت کیا ہے۔

اور ایک قوم نے اسے ویَھْلَكُ یعنی یا اور لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور الحرث کو رفع دیا ہے۔ اور لغوی طور پر ھَلَكَ یَھْلَكُ یہ رَكَنَ یَرْكَنُ، أبی یأبی، سَلَی یسلی، قلی یقلی اور ان کے مشابہ افعال کی مثل ہے۔ اور آیت میں مراد اخنس کا کھیتی کو جلانا اور گدھوں کو قتل کرنا ہے۔ یہ علامہ طبری کا قول ہے۔ اور ان کے علاوہ دوسرے مفسرین نے کہا: لیکن اب یہ آیت تمام لوگوں کے لئے عام ہو گئی ہے۔ پس جو بھی اس کے عمل کی طرح عمل کرے گا وہی اس لعنت اور سزا کا مستحق ہو گا۔

بعض علماء نے کہا ہے: بے شک جو گدھے کو قتل کرتا ہے یا اناج کے ڈھیر کو جلاتا ہے وہ مستوجب ملامت ہے اور یوم قیامت تک اسے یہ عیب لاحق رہے گا۔

مجاہد نے کہا ہے: مراد یہ ہے کہ ظالم زمین میں فساد برپا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بارش کو روک لیتا ہے اور وہ کھیتی اور نسل (انسانی) کو ہلاک کر دیتا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: الحرث (کھیتی) سے مراد عورتیں ہیں اور النسل سے مراد اولاد ہے۔ اور یہ اس طرح ہے کیونکہ نفاق متفرق اور متضاد گفتگو اور قتال کے وقوع تک پہنچاتا ہے اور اسی میں مخلوق کی ہلاکت ہے۔

زجاج نے اس کا معنی بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ السعی فی الارض کا معنی ہے سرعت اور تیزی کے ساتھ چلنا۔ اور یہ لوگوں کے درمیان (فساد کی) انگیخت اور فتنہ برپا کرنے سے عبارت ہے۔ واللہ اعلم۔

اور حدیث طیبہ میں ہے: ''بے شک لوگ جب ظالم کو دیکھیں اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہے اللہ تعالیٰ تمام کو اپنی جانب سے دی جانے والی سزا میں شامل کر لے''۔ عنقریب اس کا بیان آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: اَلْحَرْثَ وَالنَّسْلَ لغۃً الحرث کا معنی شق کرنا اور پھاڑنا ہے۔ اور اسی سے المحراث ہے یعنی وہ آلہ (ہل) جس کے ساتھ زمین کو پھاڑا جاتا ہے۔ اور الحرث سے مراد مال کمانا اور اسے جمع کرنا ہے۔ اور حدیث طیبہ میں ہے۔ احرث لدنیاك كأنك تعیش ابداً تو اپنی دنیوی زندگی کے لئے مال کما اور جمع کر گویا تو ہمیشہ زندہ رہے گا۔ (یعنی ایسا نہ ہو کہ آدمی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے اور پھر بھیک مانگنے پر مجبور ہو جائے یا پھر حالات کی تلخیوں کے پیش نظر زندگی کی بازی ہار دے۔ واللہ اعلم۔

اور الحرث کا معنی کھیتی ہے اور الحراث کھیتی کاشت کرنے والے کو کہتے ہیں۔ تحقیق حرث و احترث یہ زرع اور ازدرع کی مثل ہے۔ اور کہا جاتا ہے: أحْرُثِ القرآن، ای أدْرُسه یعنی قرآن پڑھانا۔ اور حَرَثْتُ النَّاقَةَ و اَحْرَثْتُھا، یعنی میں اس پر سفر کرتا رہا یہاں تک کہ وہ کمزور ہو گئی۔ اور حرثت النار ای حرکتھا میں نے آگ کو حرکت دی اور المحراث اس

لکڑی کو کہا جاتا ہے جس کے ساتھ تنور کی آگ کو ہلایا اور حرکت دی جاتی ہے۔ جوہری سے مروی ہے۔ کہ النسل سے مراد وہ اولاد ہے جو کسی بھی مؤنث سے پیدا ہو۔ اس کا اصل معنی الخروج (نکلنا) اور السقوط (گرنا) ہے۔ اور اسی سے ہے: نسل الشعر وریش الطائر۔ یعنی بال اور پرندے کے پر گر گئے۔ اس سے مستقبل کا صیغہ یَنْسِلُ آتا ہے۔ اسی کے مطابق رب کریم کا ارشاد ہے: اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ۝ (یٰسین) (اپنے پروردگار کی طرف تیزی سے جانے لگیں گے) اسی طرح یہ ارشاد بھی ہے: مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ۝ (الانبیاء) (اور وہ ہر بلندی سے بڑی تیزی کے ساتھ نیچے اترنے لگیں گے)

اور امرؤالقیس کا قول ہے:

فسلی ثیابی من ثیابك تنسل

(پس تو میرے کپڑے اپنے کپڑوں سے نکال دے تو وہ نکل جائیں گے۔)

میں (مفسر) کہتا ہوں: آیت زمین میں ہل چلانے اور اس میں فصل کاشت کرنے پر دلالت کرتی ہے اور زمین میں درخت لگانے پر۔ یہ زراعت اور کھیتی باڑی پر ابھارنے کے لئے ہے اور طلب النسل سے مراد حیوانوں اور جانداروں کی نشوونما اور ان کا بڑھنا ہے اور اسی سے انسان کی قوت وطاقت مکمل ہوتی ہے۔ اور یہ ان کا رد ہے جنہوں نے ترک اسباب کا قول کیا ہے۔ عنقریب اسی کتاب میں اس کا بیان آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ارشاد باری تعالیٰ: وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝ عباس بن فضل نے کہا ہے کہ فساد کا معنی خرابی اور بربادی ہے۔ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قطع الدراهم من الفساد فی الارض (اس نے زمین میں فساد اور خرابی کے سبب دراہم ختم کر دیے۔)

اور حضرت عطا نے کہا ہے: ایک آدمی تھا جسے عطا بن منبہ کہا جاتا تھا۔ اس نے جبہ میں احرام باندھا تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم ارشاد فرمایا کہ وہ اسے اتار دے۔ حضرت قتادہ نے کہا: میں نے حضرت عطا سے کہا: بے شک ہم تو سنتے تھے کہ وہ اسے پھاڑ دے، تو حضرت عطا نے کہا: ان اللہ لا یحب الفساد۔ بے شک اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: آیت اپنے عموم کے سبب ہر فساد اور بربادی کو شامل ہے، چاہے وہ زمین میں ہو یا مال میں یا دین میں اور ان شاء اللہ تعالیٰ یہی صحیح ہے (1)۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ کا معنی ہے وہ اسے اہل اصلاح (اصلاح کرنے والوں) سے پسند نہیں کرتا یا وہ اسے دین کے اعتبار سے پسند نہیں کرتا۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ معنی یہ ہو کہ وہ اس کا حکم نہیں دیتا۔ واللہ اعلم

وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝

"اور جب کہا جائے اسے کہ (میاں) خدا سے تو ڈرو، تو اور اکساتا ہے اسے غرور گناہ پر، پس اس کے لئے جہنم کافی ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔"

1۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذہ

یہ کافر اور منافق کی صفت ہے جو اپنے بارے میں خود پسندی اور تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے اور مومن کے لئے یہ ناپسندیدہ اور مکروہ ہے کہ گناہ اسے ان میں سے کسی میں واقع کر دے۔

حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: کسی آدمی کے لئے بطور گناہ اتنا کافی ہے کہ اسے کوئی دوسرا بھائی کہے: ''تم اللہ سے ڈرو'' تو وہ آگے سے یہ کہہ دے: تجھ پر اپنے نفس کے بارے میں وہی لازم ہے جس کی نصیحت تو مجھے کر رہا ہے (1)۔

اور الْعِزَّةُ کا معنی قوت اور غلبہ ہے۔ یہ عزّہ یَعُزُّهُ سے مشتق ہے۔ اس کا معنی ہے: وہ اس پر غالب آ گیا۔ اور اسی سے وَعَزَّنِي فِي الْخِطَابِ (ص) ہے، یعنی وہ خطاب میں مجھ پر غالب آ گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں الْعِزَّةُ کا معنی حمیت ہے۔ اسی کے مطابق شاعر کا قول بھی ہے:

اخذته عزة من جهله فتولّى مغضبا فعل الضجر

اسے اس کی دور جاہلیت کی حمیت نے آلیا، پس اس نے حالت غضب میں تنگی اور نقصان کے فعل کا ارتکاب کیا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں الْعِزَّةُ کا معنی قوت اور شدت نفس ہے۔ یعنی اس نے اپنی ذات میں قوت و طاقت حاصل کی اور ادھر ہی جھک گیا، پس اسی قوت نے اسے گناہ میں واقع کر دیا جبکہ اس نے اسے آلیا اور گناہ کو اس پر لازم کر دیا۔

حضرت قتادہ نے کہا ہے: معنی یہ ہے کہ جب اسے کہا جائے رک جا، ٹھہر جا، تو وہ گناہ کا ارتکاب زیادہ کرتا ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ قوت و طاقت نے اسے گناہ پر ابھارا ہے۔

اور یہ قول بھی ہے: قوت و طاقت نے اسے ایسی شے سے پکڑ لیا جو اسے گناہ میں مبتلا کر دے گی۔ یعنی اس نے قوت و طاقت اور زمانہ جاہلیت کی حمیت کے سبب کفر کا ارتکاب کیا ہے۔ اور اسی کی مثل یہ بھی ہے۔ بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ (ص) (لیکن یہ کفار تکبر اور مخالفت میں (اندھے ہو گئے) ہیں۔)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ بِالْاِثْمِ میں با بمعنی لام ہے۔ یعنی عزت و حمیت نے اسے وعظ و نصیحت قبول کرنے سے پکڑ لیا، اس گناہ کے سبب جو اس کے دل میں تھا۔ اور وہ نفاق ہے۔ اسی کے مطابق عنترہ کا قول ہے جس میں وہ ناقہ کے پسینے کی صفت بیان کرتا ہے:

وكَانَّ رُبًّا او كُحَيلًا مُعْقَدًا حَشَّ الْوَقُودُ به جوانبَ قُمْقُمِ

تو یہ بمعنی حش الوقود له ہے۔ یعنی با بمعنی لام ہے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ با بمعنی مع ہے۔ یعنی حمیت نے اسے گناہ کے ساتھ پکڑ لیا۔ پس با کا معنی تاویلات کے مطابق مختلف ہوتا رہتا ہے۔

یہ ذکر کیا گیا ہے کہ کسی یہودی کا ہارون الرشید کے پاس کچھ کام تھا، وہ اس کے دروازے پر سال بھر آتا رہا لیکن وہ اپنا نہ کر سکا، پس ایک دن وہ دروازے پر کھڑا تھا، جب ہارون الرشید نکلا تو وہ دوڑ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا:

درالوجیز، زیر آیت ہذہ

اے امیر المؤمنین! اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ تو ہارون الرشید اپنی سواری سے نیچے اترا اور سجدے میں گر گیا، پس جب اس نے اپنا سر اٹھایا تو اس کے کام کے بارے حکم دیا سو وہ کر دیا گیا۔ جب وہ لوٹ کر آیا تو اسے کہا گیا: اے امیر المؤمنین! تو ایک یہودی کے کہنے پر اپنی سواری سے اترا ہے؟ اس نے جواب دیا: نہیں۔ بلکہ مجھے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد یاد آیا: وَ اِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ۝

حَسْبُهٗ کا معنی ہے کہ اسے بطور سزا اور عذاب جہنم کافی ہے۔ جیسا کہ تو کسی آدمی کو کہتا ہے کفاك ما حل بك تجھے وہی کافی ہے جو تجھے پیش آیا ہے۔ اور انت تستعظم و تُعظّم علیه ما حل تو عظمت طلب کرتا ہے اور تجھے اس پر عظمت دی جائے گی جو تجھے پیش آیا۔ اور المهاد، المهد کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ جگہ ہے جو سونے کے لئے تیار کی جائے۔ اور اسی سے مهد الصبیّ (بچے کا جھولا) بھی ہے۔ اور جہنم کو مہاد کا نام دیا گیا ہے کیونکہ وہ کفار کے ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس لئے کہ ان کے لیے مہاد کے بدلے جہنم ہے۔

جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۝ (آل عمران) اور اسی کی مثل عرب کلام میں ان کا یہ قول ہے: تحية بينهم ضرب وجيع (ان کے درمیان تحیہ دردناک ضرب لگانا ہے۔)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ۝

"اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو بیچ ڈالتا ہے اپنی جان (عزیز) بھی اللہ کی خوشنودیاں حاصل کرنے کے لئے اور اللہ نہایت مہربان ہے اپنے بندوں پر۔"

اس آیت میں ابْتِغَآءَ مفعول لاجلہ ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ جب منافقین کی کارکردگی کا ذکر کیا، تو پھر بعد میں مومنین کی کارکردگی کا ذکر فرمایا۔

کہا گیا ہے کہ یہ آیت حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، کیونکہ جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کر کے آئے تو قریش کے کچھ لوگوں نے ان کا پیچھا اور تعاقب کیا۔ تو وہ اپنی سواری سے نیچے اتر پڑے اور ترکش میں موجود تمام تیر نکال لئے، اور اپنی قوس (تیر کمان) پکڑ لی اور فرمایا: تم جانتے ہو میں تم سے زیادہ تیر چلانے میں ماہر ہوں، اللہ تعالیٰ کی قسم! تم مجھ تک نہیں پہنچ سکو گے یہاں تک کہ میں اپنے ترکش کے سارے تیر پھینک دوں۔ بعد ازاں میں اپنی تلوار سے لڑوں گا جب تک اس کی کوئی شے میرے ہاتھ میں باقی رہی پھر اس کے بعد تم جو چاہو کرو۔ تو انہوں نے کہا: ہم تجھے نہیں چھوڑ سکتے کہ تم غنا اور خوشحالی کی حالت میں ہم سے چلے جاؤ حالانکہ تم ہمارے پاس محتاج بن کر افلاس کی حالت میں آئے تھے۔ لیکن اگر تم مکہ مکرمہ میں موجود اپنے مال پر ہماری راہنمائی کرو تو ہم تمہارا راستہ چھوڑ دیں گے۔ انہوں نے اسی (مال کی) شرط پر آپ سے معاہدہ کیا، تو آپ نے اسے پورا کر دیا۔ پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے، تو یہ آیت نازل ہوئی: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ الآیہ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: اے ابویحییٰ! نفع بخش سودا کیا ہے اور ان پر یہ (مذکورہ) آیت تلاوت فرمائی۔ اسے رزین نے روایت کیا ہے اور حضرت سعید بن مسیب

رضی اللہ عنہ نے اسے بیان کیا ہے(1)۔

اور مفسرین نے کہا ہے: مشرکین نے حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کو پکڑ لیا اور انہوں نے آپ کو بہت ستایا اور اذیت دی، تو حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے انہیں فرمایا: بلاشبہ میں بوڑھا آدمی ہوں، تمہیں کوئی نقصان اور ضرر نہ پہنچے گا، میں تمہارے ساتھ رہوں یا تمہارے سوا کسی اور کے ساتھ۔ کیا تمہارے لئے (یہ بہتر نہیں) کہ تم میرا مال لے لو اور مجھے اور میرے دین کو چھوڑ دو؟ تو انہوں نے اس طرح کر لیا اور آپ نے ان پر سواری اور نفقہ کی شرط لگالی تھی (یعنی میں سواری اور اپنے روزمرہ اخراجات کے لئے مناسب اپنے مال سے لے لوں گا) پس وہ مدینہ طیبہ کی طرف نکل پڑے۔ تو حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور کچھ دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم ان سے ملے تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں فرمایا: اے ابو یحییٰ تیری بیع نفع بخش ہوئی، تو حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: ''آپ کی بیع میں تو کبھی خسارہ نہیں ہوتا، سو یہ کیسی کلام ہے؟ تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تیرے بارے میں اس طرح (آیت) نازل فرمائی ہے، پھر آپ نے ان پر یہ آیت پڑھی۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ یہ آیت کس کے بارے میں نازل ہوئی ہے؟ یہ ایک مسلمان کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جو ایک کافر سے ملا اور اسے کہا: تو کہہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، پس جب تو نے اسے کہہ لیا، تو تو نے اپنے مال اور اپنی جان کو بچا لیا، لیکن اس نے یہ کلمہ کہنے سے انکار کر دیا، تو مسلمان نے اسے کہا: قسم بخدا! میں ضرور بضرور اپنی جان اللہ تعالیٰ کے لئے بیچ دوں گا۔ چنانچہ وہ آگے بڑھا اور اس کے ساتھ قتال کرنے لگا، یہاں تک کہ شہید ہو گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت ایسے آدمی کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس نے نیکی کا حکم دیا اور منکر سے روکا۔ اسی کے مطابق حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم نے اس کی تاویل کی ہے۔ حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم نے بیان کیا ہے کہ دو آدمی باہم ایک دوسرے سے لڑے۔ یعنی مغیر (تبدیلی لانے والے) نے مفسد (فساد برپا کرنے والے) کو کہا: تو اللہ تعالیٰ سے ڈر۔ مفسد نے انکار کر دیا اور اسے حمیت نے آلیا تو مغیر نے اپنی جان اللہ تعالیٰ سے بیچ ڈالی اور اس کے ساتھ لڑنے لگا، پس دونوں نے ایک دوسرے کو قتل کر دیا۔

اور ابو خلیل نے کہا ہے: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کسی انسان کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے پڑھا: اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ۔ وہ آدمی اٹھا اور نیکی کا حکم دینے لگا اور برائی سے منع کرنے لگا اور خود شہید ہو گیا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا کہ دو آدمیوں نے قاری کی اس آیت کی قراءت کے وقت ایک دوسرے کو قتل کر دیا، پس آپ نے ان سے اس کے بارے پوچھا تو انہوں نے اس کی یہی تفسیر بیان کی، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں فرمایا: اے ابن عباس! تیرا مال اللہ تعالیٰ کے لئے ہی ہے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ یہ آیت اس کے بارے میں نازل ہوئی جو جنگ میں گھس جاتا ہے، ہشام بن عامر قسطنطنیہ میں لشکر میں داخل ہوئے اور خوب قتال کیا، یہاں تک کہ شہید کر دیئے گئے تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَ مِنَ

1۔ تفسیر طبری، جلد 3، صفحہ 591

النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ اور حضرت ابوایوب سے بھی اسی طرح مروی ہے(1)۔

اور یہ قول بھی ہے کہ یہ آیت غزوۂ رجیع کے شہداء کے بارے میں نازل ہوئی اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: وہ مہاجرین وانصار ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی جبکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس رات (ہجرت کی رات) اپنے بستر پر آرام کرنے کے لئے فرمایا جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غار (ثور) کی طرف تشریف لے گئے تھے۔ اس کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ سورۂ براءت میں آئے گا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آیت عام ہے اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں ہر جہاد کرنے والے کو شامل ہے یا اپنی ذات کے بارے شہادت کی تمنا کرنے والے کو یا برائی کو تبدیل کرنے والے کو۔ اور اس کا حکم پہلے آچکا ہے جو لشکر پر حملہ آور ہو اور منکر کو تبدیل کرنے والے کا، اس کی شرائط اور اس کے احکام کا ذکر ان شاء اللہ تعالیٰ سورۂ آل عمران میں آئے گا۔

اور یَشْرِیْ کا معنی یبیع (بیچ ڈالنا) ہے۔ اسی معنی میں یہ ارشاد بھی ہے: وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۭ بَخْسٍ (یوسف: 20) یعنی انہوں نے آپ کو کھوٹے ثمن کے عوض بیچ ڈالا۔ اور اس کا اصل معنی الاستبدال (بدلہ میں لینا) ہے۔ اور اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (توبہ: 111) (یقیناً اللہ نے خرید لی ہے ایمانداروں سے ان کی جان اور ان کے مال اس عوض میں کہ ان کے لئے جنت ہے۔)

اور اسی معنی میں شاعر کا قول بھی ہے:

وان كان ريب الدهر امضاك فى الالى   شَرَوْا هذه الدنيا بجناته الخلد

اور ایک دوسرے شاعر کا قول:

و شريت بُرداً ليتنى   من بعد بُرْدٍ كنتُ هَامَهْ

یہاں برد غلام کا نام ہے۔ ایک اور شاعر نے کہا:

يعطى بها ثمنا فيمنعها   و يقول صاحبها ألا فاشرِ

یہاں بیع النفس سے مراد اسے اللہ تعالیٰ کے اوامر (کی اطاعت) کے لئے خرچ کرنا ہے۔ اور ابتغاء مفعول من أجلہ ہے۔ کسائی نے مرضات تاء پر وقف کیا ہے، اور باقیوں نے ہاء کے ساتھ وقف کیا ہے۔ ابوعلی نے کہا ہے: کسائی نے تا کے ساتھ یا تو ان کی لغت پر وقف کیا ہے جو کہتے ہیں طلحت اور علقمت۔ اور اسی سے شاعر کا قول بھی ہے:

بل جَوْزِ تَيْهاء كظهر الحَجَفَتْ

یا پھر اس لئے کہ جب ہی مضاف الیہ کلمہ کے ضمن میں ہے تو پھر تا کو ثابت رکھنا ضروری ہے جیسا کہ وہ حالت وصل میں ثابت رہتی ہے، تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ مضاف الیہ مراد ہے(2)۔ اور مرضاۃ سے مراد رضا ہے۔ کہا جاتا ہے: رَضِيَ يَرْضَى

1۔ تفسیر طبری، جلد 3، صفحہ 593

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 282

رِضًا و مَرْضَاةً۔

ایک قوم نے یہ بیان کیا ہے کہ یہ کہا جائے: شری بمعنی اشتری ہے اور اس صورت میں آیت کو حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کے واقعہ کی طرف پھیرنے کی ضرورت ہوگی۔ کیونکہ انہوں نے اپنی جان کو اپنے مال کے عوض خریدا تھا، نہ کہ اسے بیچا تھا، مگر یہ کہا جا سکتا ہے: بلاشبہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کا ان کے ساتھ جنگ کے لئے تیار ہو جانا یا اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ سے بیچنا ہے۔ پس لفظ باع (بیچنے) کے معنی پر ہی صحیح اور درست ہوگا۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَآفَّةً ۪ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝

''اے ایمان والو! داخل ہو جاؤ اسلام میں پورے پورے اور نہ چلو شیطان کے نقش قدم پر، بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے''۔

جب اللہ تعالیٰ لوگوں کے مومن، کافر اور منافق ہونے کے بارے میں بیان کر چکا تو فرمایا: تم ایک دین پر ہو جاؤ اور اسلام پر جمع ہو جاؤ اور اسی پر ثابت قدم ہو جاؤ۔ پس اس آیت میں السِّلْمِ بمعنی اسلام ہے۔ مجاہد نے اسی طرح کہا ہے، اور اسے ابو مالک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ اور اسی کے مطابق کندی شاعر کا قول بھی ہے:

دعوت عشيرتی للسلم لما رأيتهم تولوا مدبرينا

میں نے اپنے خاندان کو اسلام کی دعوت دی جب میں نے انہیں دیکھا تو وہ پیٹھیں پھیر کر واپس چلے گئے۔

یعنی میں نے انہیں اسلام کی طرف دعوت دی جبکہ اہل کندہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اشعث بن قیس کندی کے ساتھ مرتد ہو گئے، کیونکہ مومنین کو کبھی بھی مسالمہ میں داخل ہونے کا حکم نہیں دیا گیا اور مسالمہ سے مراد صلح ہے۔ اور بلاشبہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا گیا کہ آپ صلح کے لئے مائل ہوں جبکہ وہ اس کی طرف مائل ہوں۔ اور رہا یہ کہ آپ صلح کی ابتدا کریں تو اس طرح نہیں۔ یہ قول علامہ طبری نے بیان کیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہیں حکم دیا گیا ہے جو اپنی زبانوں کے ساتھ ایمان لائے کہ وہ اپنے دلوں کے ساتھ اس میں داخل ہو جائیں۔ طاؤس اور مجاہد نے کہا ہے کہ تم امر دین میں داخل ہو جاؤ۔ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: تم نیکی کی تمام اقسام میں داخل ہو جاؤ۔ اور یہ لفظ سین کے کسرہ کے ساتھ السِّلم پڑھا گیا ہے۔ کسائی نے کہا ہے کہ السِّلم اور السَّلم دونوں ایک ہی معنی میں ہیں۔ اور اسی طرح یہ اکثر بصریوں کے نزدیک بھی ہے۔ اور یہ دونوں لفظ اکٹھے اسلام اور صلح کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔

ابو عمرو بن العلاء نے ان دونوں کے درمیان فرق کیا ہے۔ اور یہاں اسے ادخلوا فی السِّلم پڑھا ہے اور کہا ہے: اس سے مراد اسلام ہے۔ اور وہ لفظ جو سورۂ انفال اور سورۂ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ہے۔ اسے السَّلم سین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور فرمایا: فتحہ کے ساتھ اس کا معنی مسالمہ (صلح) ہے۔

اور مبرد نے اس تفریق کا انکار کیا ہے اور عاصم جحدری نے کہا ہے کہ السِّلْم کا معنی اسلام، السَّلْم کا معنی صلح اور السَّلَم کا معنی الاستسلام (تابعدار ہونا) ہے۔ محمد بن یزید نے ان تفریقات (الگ الگ تعبیروں) کا انکار کیا ہے اور کہا ہے: لغت اس طرح نہیں لی جاتی بلکہ یہ تو سماع کے ساتھ لی جاتی ہے نہ کہ قیاس کے ساتھ۔ اور جس نے (معانی میں) تفریق کی اسے دلیل کی ضرورت ہوگی۔ اور بصریوں نے بیان کیا ہے: بنوفلان سِلْمٌ و سَلْمٌ و سَلَمٌ تمام کا معنی ایک ہے۔ اور جوہری نے کہا ہے: السِّلْم کا معنی صلح ہے چاہے فتحہ کے ساتھ ہو یا کسرہ کے ساتھ اور مذکر ہو یا مؤنث۔ اور اس کا اصل معنی الاستسلام اور الانقیاد (تابعداری کرنا) سے لیا گیا ہے۔ اسی لئے صلح کے لئے سَلْم کہا گیا ہے۔ زہیر نے کہا ہے:

وقد قلتما اِنْ نُدرِكِ السِّلم واسعًا ... بمالٍ و معروفٍ من الأمر نَسْلَم

تحقیق تم دونوں نے کہا: اگر ہم نے صلح کو مال اور امر بالمعروف کے بدلے زیادہ نفع بخش پالیا تو ہم صلح کر لیں گے۔

علامہ طبری نے اس کلمہ کو اسلام کے معنی پر محمول کرنے کو ترجیح دی ہے اس وضاحت کے مطابق جو پہلے گزر چکی ہے۔

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے اس آیت کے ضمن میں بیان فرمایا ہے: اسلام کے آٹھ حصص ہیں، ایک حصہ نماز ہے، ایک حصہ زکوۃ ہے، ایک حصہ روزہ ہے، ایک حصہ حج ہے، ایک حصہ عمرہ ہے، ایک حصہ جہاد ہے، ایک حصہ امر بالمعروف ہے اور ایک حصہ نہی عن المنکر ہے۔ تحقیق وہ خائب و خاسر ہوا جس کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی اور معنی یہ ہے: اے وہ لوگو جو ایمان لائے! حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ! تم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لا کر مکمل طور پر اسلام میں داخل ہو جاؤ (1)۔

اور صحیح مسلم میں ہے: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے! اس امت میں سے کوئی یہودی اور عیسائی میرے بارے میں نہ سنے پھر وہ مر جائے اور وہ اس دین پر ایمان نہ لائے جس کے ساتھ مجھے مبعوث فرمایا گیا تو وہ اصحاب نار میں سے ہوگا۔''

كَآفَّةً کا معنی ہے مکمل طور پر، ترکیب کلام میں یہ السِّلْم سے یا مومنین کی ضمیر سے حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور یہ ان کے اس قول سے مشتق ہے: کففت ای منعت، یعنی تم میں سے کوئی بھی اسلام میں داخل ہونے سے باز نہ رہے۔ اور الکف کا معنی ہے المنع (روکنا) اور اسی سے كُفَّةُ القميص ہے (کرتے کے دامن کے اردگرد کی گوٹ) کیونکہ یہ کپڑے کو پھیلنے اور منتشر ہونے سے روکتی ہے۔ اور اسی سے كِفَّةُ الْمِيزَانِ ہے (ترازو کا پلڑا) جو کہ موزون کو جمع رکھتا ہے اور اسے بکھرنے سے روکتا ہے، اور اسی سے کف الانسان ہے (انسان کی ہتھیلی) جو کہ اس کے منافع اور نقصانات کو جمع کرتی ہے۔ اور ہر گول شے كِفَّة کہلاتی ہے، اور ہر لمبی شے كُفَّة کہلاتی ہے۔ اور آدمی مکفوف البصر ہے یعنی اسے دیکھنے سے روک دیا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 282

گیا ہے۔ اور جماعۃ کو کافۃ کا نام دیا جاتا ہے کیونکہ وہ متفرق اور تقسیم ہونے سے محفوظ ہوتے ہیں۔

وَلَا تَتَّبِعُوْا یہ فعل نہی ہے اور خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ یہ مفعول ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور حضرت مقاتل نے کہا ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے نماز میں تورات پڑھنے کی اجازت طلب کی۔ نیز یہ کہ وہ ان بعض احکام پر عمل کریں گے جو تورات میں ہیں۔ تو یہ آیت نازل ہوئی وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ کیونکہ بلاشبہ سنت کی اتباع کرنا حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبعوث ہونے کے بعد شیطان کے نقش قدم پر چلنے کی بجائے بہتر اور اولیٰ ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: (اس کا معنی ہے) تم اس راستے پر نہ چلو جس کی طرف تمہیں شیطان دعوت دیتا ہے کیونکہ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ بلاشبہ تمہارے لئے اس کی عداوت بالکل ظاہر ہے۔

فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَیِّنٰتُ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۝

''اور اگر تم پھسلنے لگو اس کے بعد کہ آچکی ہیں تمہارے پاس روشن دلیلیں، تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔''

ارشاد باری تعالیٰ فَاِنْ زَلَلْتُمْ کا معنی ہے اگر تم صراط مستقیم سے دور ہٹنے لگو۔ دراصل زلل یعنی پھسلاہٹ قدم میں ہوتی ہے، بعد ازاں یہ لفظ اعتقادات، آراء اور دیگر چیزوں میں (سیدھی راہ سے ہٹ جانے کے لئے) استعمال کیا جانے لگا ہے۔

کہا جاتا ہے: زَلَّ یَزِلُّ زَلًّا وَ زَلَلًا وَ زُلُوْلًا۔ یعنی اس کا پاؤں پھسل گیا۔

ابو السمال العدوی نے زَلِلْتُمْ لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں۔ حرف کی اصل الزلق سے ہے اور معنی ہے: ''تم حق سے بھٹک گئے اور بہک گئے۔''

ارشاد خداوندی مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَیِّنٰتُ میں الْبَیِّنٰتُ سے مراد معجزات اور آیات قرآن ہیں۔ اگر آیت میں خطاب مومنین کو ہے اور اگر خطاب اہل کتاب کو ہے تو پھر بینات سے مراد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف اور آپ کے بارے وہ علامات ہیں جو ان کی شریعت میں وارد ہوئی ہیں۔

آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ گناہ کے بارے جاننے والے کی سزا اس کی سزا کی نسبت بہت زیادہ اور شدید ہوگی جو اس سے ناواقف اور جاہل ہو اور جس تک دعوت اسلام نہ پہنچی وہ احکام شرع کو ترک کرنے کے سبب کافر نہ ہوگا۔

نقاش نے بیان کیا ہے کہ حضرت کعب الاحبار رضی اللہ عنہ جب اسلام لائے تو وہ قرآن کریم پڑھ رہے تھے، تو انہیں جو قرآن پڑھا رہا تھا۔ اس نے پڑھایا فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ تو حضرت کعب نے کہا: بلاشبہ میں یہ تسلیم نہیں کرتا کہ یہ اس طرح ہو، پھر ان دونوں کے پاس سے ایک آدمی گزرا، تو حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا: تم یہ آیت کس طرح پڑھتے ہو؟ تو اس آدمی نے کہا: فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۝ (بقرہ) تو حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: اسی طرح ہونا چاہئے (1)۔ اور عَزِیْزٌ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 282

کا معنی ہے (وہ زبردست ہے) یعنی جس کام کا وہ ارادہ کرتا ہے اس سے اسے روکا نہیں جاسکتا۔ اور حَكِيْمٌ کا مفہوم ہے کہ وہ جو فعل بھی کرتا ہے اس میں حکمت کارفرما ہوتی ہے (اس کا کوئی کام بھی حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔)

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝

”کیا وہ اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ آئے ان کے پاس اللہ کا عذاب چھائے ہوئے بادلوں (کی صورت) میں اور فرشتے اور (ان کا) فیصلہ ہی کر دیا جائے۔ اور (آخرکار) اللہ کی طرف ہی لوٹائے جائیں گے سارے معاملات۔

ارشاد باری تعالیٰ هَلْ يَنْظُرُوْنَ یعنی اسلام میں داخل نہ ہونے والے، اور هَلْ یہاں اس سے مراد انکار ہے۔ یعنی وہ انتظار نہیں کر رہے ہیں اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ، نظرته اور انتظرته ایک ہی معنی میں ہیں۔ اور النظر اور الانتظار بھی ہم معنی ہیں۔

حضرت قتادہ، ابوجعفر یزید بن قعقاع اور ضحاک نے فِي ظِلَالٍ من الغمام پڑھا ہے۔ اور ابوجعفر نے والملائکۃ کو الغمام پر عطف کرتے ہوئے مجرور پڑھا ہے۔ اور اس کی تقدیر عبارت ہے مع الملائکۃ یعنی ملائکہ کے ساتھ۔ عرب کہتے ہیں: أقبل الأمير في العسكر۔ امیر آیا لشکر کے ساتھ۔ یعنی اس میں فی بمعنی مع ہے۔ ظُلَلٍ یہ ظُلّة کی جمع مکسر ہے، جیسا کہ ظلمۃ کی جمع ظلم ہے اور اس کی جمع سالم ظُلُلَات ہے۔

سیبویہ نے یہ شعر کہا ہے:

اذا الوحش ضَمَّ الوحشَ فی ظُلُلَاتِها سَواقِطُ من حَرٍّ و قد کان أظهَرَا

اس میں ظُلُلَات ظُلّة کی جمع سالم ذکر کی گئی ہے۔

اور ظُلَات اور ظلال یہ ظل کی جمع کثرت ہے اور اس کی جمع قلت اظلال ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ ظِلال ظُلة کی جمع ہے جیسا کہ قُلّة کی جمع قِلال ہے۔ جیسا کہ شاعر نے بھی کہا ہے:

ممزوجةٌ بماء القِلال (گھڑوں کے پانی میں ملائی گئی ہے)

اخفش سعید نے کہا ہے کہ والملائکۃ مجرور ہے۔ یہ وفی الملائکۃ کے معنی میں ہے۔ فرمایا: اس میں رفع عمدہ ہے، جیسا کہ ان آیات میں ہے: هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (الانعام:158) اور وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝ (الفجر)

فراء نے کہا ہے: حضرت عبداللہ بن مسعود کی قراءت میں ہے هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ وَالْمَلَائِكَةُ فِي ظُلَلٍ مِنَ الْغَمَامِ

حضرت قتادہ بن دعامہ نے کہا ہے: ملائکہ ان کے پاس ان کی ارواح قبض کرنے کے لئے آئیں گے۔ اور کہا جاتا ہے کہ قیامت کے دن (وہ آئیں گے) اور یہی زیادہ ظاہر اور واضح ہے۔

ابوالعالیہ اور ربیع نے کہا ہے کہ ملائکہ ان کے پاس چھائے ہوئے بادلوں کی صورت میں آئیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کے

پاس آئے گا جس حالت میں چاہے گا۔

اور زجاج نے کہا ہے: تقدیر کلام اس طرح ہے فی ظلل من الغمام و من الملائکۃ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سبحانہ کے حق میں کلام اپنے ظاہر پر نہیں ہے، بلکہ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا امر اور اس کا حکم ان کے پاس آجائے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حساب و عذاب میں سے جس کا ان کے ساتھ وعدہ فرما رکھا ہے اس کے ساتھ چھائے ہوئے بادلوں میں ان کے پاس آجائے، جیسا کہ یہ ارشاد گرامی ہے: فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا (الحشر: 2) (پس آیا ان پر اللہ (کا قہر) اس جگہ سے جس کا انہیں خیال بھی نہ آیا تھا۔) یعنی اللہ نے انہیں ذلیل و رسوا کر دیا۔ یہ زجاج کا قول ہے اور پہلا اخفش سعید کا قول ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ الاتیان (یعنی آنے) کا معنی راجعا الی الجزاء (جزا کی طرف رجوع کرتے ہوئے) ہو۔ اور جزا کو اسی طرح اتیان کا نام دیا گیا ہو جیسا کہ نمرود کے قصہ میں تخویف اور تعذیب کو اتیان کا نام دیا گیا ہے اور فرمایا ہے: فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ (النحل: 26)

(پس اللہ تعالیٰ نے ان کے (فریب) کی عمارت جڑوں سے اکھیڑ کر رکھ دی۔ پس گر پڑی ان پر چھت ان کے اوپر سے۔) اور بنی نضیر کے قصہ میں فرمایا: فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۚ وَ قَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ (الحشر: 2)

اور اسی طرح فرمایا: وَ اِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا (الانبیاء: 47)

(اور اگر (کسی کا کوئی عمل) رائی کے دانے کے برابر بھی ہو گا تو ہم اسے بھی لا حاضر کریں گے۔)

بلاشبہ اتیان ان معانی کا احتمال رکھتا ہے، کیونکہ اہل لغت کے نزدیک اتیان کا اصل معنی ”کسی شے کی طرف قصد کرنا“ ہے۔ پس آیت کا معنی یہ ہے: کیا وہ انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں جزا اور بدلہ دینے کے ارادہ سے اپنی مخلوق میں سے کسی مخلوق کے ساتھ افعال میں سے کوئی فعل ظاہر فرمائے اور ان کے امور کے بارے میں فیصلہ فرمائے جو وہ فیصلہ فرما دے؟

اور جس طرح اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے کوئی فعل کیا اور اسے نزول اور استوا کا نام دیا۔ اسی طرح وہ کوئی فعل کرتا ہے اور اسے اتیان کا نام دیتا ہے اور اس کے افعال بغیر آلہ اور علت کے ہوتے ہیں کیونکہ اس کی ذات اس سے پاک ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ابو صالح کی روایت میں کہا ہے: یہ ان پوشیدہ اور مخفی چیزوں میں سے ہے جس کی تفسیر بیان نہیں کی جا سکتی۔ بعض ان کی تاویل سے خاموش رہے ہیں اور بعض نے تاویل کی ہے جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ فا بمعنی با ہے یعنی یاتیهم بظلل (یعنی وہ ان کے پاس آئے چھائے ہوئے بادلوں کے ساتھ) اور اسی کے مطابق حدیث طیبہ ہے: يَاْتِيْهِمُ اللّٰهُ فی صورة ای بصورة امتحانا لَهُمْ(1) (اللہ تعالیٰ ان کے پاس آئے گا ایک صورت میں، یعنی ایک صورت کے ساتھ ان کا امتحان لینے کے لئے)۔

یہ جائز نہیں کہ اسے اور جو کچھ اس کے مشابہ قرآن و حدیث میں مذکور ہے اسے وجہ انتقال، حرکت اور زوال پر محمول کیا جائے، کیونکہ یہ اجرام و اجسام کی صفات میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے انتہائی بلند و برتر ہے۔ وہ ذوالجلال

1۔ بخاری شریف، باب الصراط جسر جهنم، حدیث نمبر 6088، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

والا کرام ہے اور اجسام کی مماثلت سے بلند و بالا اور برتر ہے۔

الْغَمَامِ اس سے مراد ہے سفید باریک بادل، اس کا یہ نام اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ یہ ڈھانپ لیتا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

قُضِيَ الْاَمْرُ کو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے وَقَضَاءُ الْاَمْرِ پڑھا ہے۔ اور یحییٰ بن یعمر نے وَقُضِيَ الْاُمُوْرُ جمع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور جمہور نے وَقُضِيَ الْاَمْرُ پڑھا ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ جزا واقع ہو اور گناہ کرنے والوں کو عذاب دیا جائے۔

ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے تَرْجِعُ الْاُمُوْرُ صیغہ معروف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یہی اصل ہے۔ اور اس کی دلیل اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ۝ (الشوریٰ) اور اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ (المائدہ: 48) ہے۔ اور باقیوں نے تُرْجَعُ صیغہ مجہول کی صورت میں پڑھا ہے۔ اور یہ بھی قراۃ حسنہ ہے۔ اور اس کی دلیل ثُمَّ تُرَدُّوْنَ (التوبہ: 94) اور ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ (الانعام: 62) اور وَلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ (الکہف: 36) ارشادات باری تعالیٰ ہیں۔ دونوں قراءتیں معنی کے اعتبار سے حسن اور اچھی ہیں لیکن اصل پہلی قرات ہے۔ اور اسے مجہول پڑھنے میں توسع ہے اور یہ فرع ہے۔ اور تمام کے تمام امور اللہ تعالیٰ کی طرف ہی لوٹیں گے، پہلے بھی اور بعد والے بھی۔ اور قیامت کے دن میں اس کے ذکر کے سبب اس پر تنبیہ اور آگاہ کرنا ہے کہ دنیا میں جو کچھ بھی ملوک کے پاس ہے وہ زوال پذیر ہے۔

سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۭ بَيِّنَةٍ ؕ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۝

"آپ پوچھئے بنی اسرائیل سے کہ ہم نے انہیں کتنی روشن دلیلیں عنایت فرمائیں۔ اور جو (قوم) بدل ڈالے اللہ کی نعمت کو اس کے مل جانے کے بعد تو یقیناً اللہ تعالیٰ (اس قوم کو) سخت عذاب دینے والا ہے۔"

ارشاد باری تعالیٰ: سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۭ بَيِّنَةٍ اس میں سَلْ السوال سے ماخوذ ہے۔ تخفیف ہمزہ کے تحت ہمزہ کی حرکت سین کو دے کر اسے حذف کر دیا، اور جب سین متحرک ہوگئی تو پھر ہمزہ وصل کی ضرورت نہ رہی (یعنی سل دراصل اسئل تھا۔ تخفیف ہمزہ کے مذکورہ قاعدہ کے تحت یہ سل ہو گیا۔)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام عرب میں سَلْ میں ہمزہ وصل کے ساقط ہونے اور اِسْئَلْ میں اس کے ثابت رہنے کی دو وجہیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ایک میں ہمزے کو حذف کرنا اور دوسرے میں اسے ثابت رکھنا ہے۔ اور قرآن کریم میں یہ دونوں مذکور ہیں۔ پس تو ہمزے کو ثابت رکھنے اور اسے گرانے میں خط مصحف کی اتباع کر۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس میں استعمال ہونے والے کلام کے اختلاف کے ساتھ اسے ثابت رکھنا اور اسے ساقط کرنا بھی مختلف ہوتا ہے۔ لہٰذا ابتدائے کلام میں ہمزہ حذف ہو جاتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اور سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ۝ (القلم) اور حالت عطف (مراد درمیان کلام) میں ثابت رہتا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَسۡـَٔلِ الۡقَرۡیَةَ (یوسف:82) اور وَسۡـَٔلُوا اللّٰهَ مِنۡ فَضۡلِهٖ (النساء:32) علی بن عیسیٰ نے یہی کہا ہے۔ اور ابو عمرو نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت میں اِسأَل اصل کے مطابق پڑھا ہے۔ اور ایک قوم نے اِسَل ہمزہ کی حرکت کو سین کی طرف نقل کر کے اور ہمزہ وصل کو باقی رکھتے ہوئے پڑھا ہے۔ ان کی لغت کے مطابق جنہوں نے کہا ہے اَلاحمر اور کَمۡ یہ محل نصب میں ہے کیونکہ یہ اٰتَیۡنٰهُمۡ کا دوسرا مفعول ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ فعل مضمر کے سبب منصوب ہے۔ تقدیر عبارت ہے کم آتَیۡنَا اٰتَیۡنَاهم اور فعل کو اس سے مقدم لانا جائز نہیں کیونکہ اس کے لئے صدر کلام ضروری ہے۔ اور مِنۡ اٰیَةٍ تقدیر اول کے مطابق تمیز ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے اور تقدیر ثانی کی بنا پر یہ اٰتَیۡنٰهُمۡ کا مفعول ثانی ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ کَمۡ مبتدا ہونے کی بنا پر محل رفع میں ہو، اور اس کی خبر اٰتَیۡنٰهُمۡ ہو۔ اس میں کَمۡ کی طرف لوٹنے والی ضمیر ہوگی اور تقدیر کلام یہ ہوگی کم آتیناھموہ اور یہ (یعنی کم) معرب نہیں، بلکہ یہ اسم ہے کیونکہ یہ حروف کے قائم مقام ہے جب کہ اس میں استفہام کے معنی پائے جائیں۔

اور جب تو فرق کرنے لگے کم اور اسم کے درمیان، تو اختیار ہے کہ تو اسے مِنۡ کے ساتھ لائے، جیسا کہ اس آیت میں ہے اور اگر تو اسے (من کو) حذف کرے تو پھر تو اسے نصب دے، چاہے کم استفہامیہ ہو یا کم خبریہ۔ اور خبریہ کی صورت میں جر بھی جائز ہوتی ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

کم بِجودٍ مُقۡرِفٌ نَالَ العُلَا و کریم بُخۡلُه قد وَضَعه

اس میں کم خبریہ کی تمیز حرف جر باکے سبب مجرور ہے۔

اور آیت سے مراد یہ ہے کہ حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ان کے پاس کتنی آیات و علامات آئیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پہچان کراتی ہیں اور آپ پر دلالت کرتی ہیں۔ حضرت مجاہد اور حسن وغیرہما نے کہا ہے: یعنی وہ آیات و معجزات جنہیں لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام آئے جیسا سمندر کا پھٹ جانا (اور اس میں راستوں کا بن جانا) بادلوں کا سایہ، عصا مبارک اور ید موسیٰ وغیر ذلک۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ السلام کو ان کے سوال کے بارے حکم ارشاد فرمایا یہ زجر و توبیخ کی بنا پر ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَمَنۡ یُّبَدِّلۡ نِعۡمَةَ اللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُ یہ لفظ عام ہے جو تمام عوام کو شامل ہے، اگرچہ اس کا مشار الیہ بنی اسرائیل ہیں، کیونکہ انہوں نے اسے تبدیل کیا جو ان کی کتابوں میں تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو تھا اس کا انکار کیا۔ لیکن لفظ کا اطلاق تو اس پر ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی نعمت کو بدلتا ہے۔

علامہ طبری نے کہا: یہاں نعمت سے مراد اسلام ہے اور یہ پہلے (معنی) کے زیادہ قریب ہے اور لفظ میں کفار قریش بھی داخل ہیں۔ کیونکہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم ان پر بطور احسان و نعمت ان میں مبعوث فرمائے گئے۔ لیکن انہوں نے اس نعمت کی قبولیت اور اس پر شکر کرنے کو کفر کے ساتھ بدل دیا۔

ارشاد باری تعالیٰ: فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ یہ جملہ خبریہ ہے جو کہ وعید کو متضمن ہے۔ اور الۡعِقَابِ عِقۡب سے ماخوذ ہے۔ گویا کہ تعاقب کرنے والا بدلہ اور جزا دینے کے لئے اس کے نشانات قدم پر چلتا ہے۔ اسی سے عُقۡبَة الراکب (وہ جگہ جہاں

سے سوار ہوا جاتا ہے) اور عقبة القِدر (شوربے کا باقی حصہ جو ہانڈی والے کے لئے چھوڑا جائے) عقاب اور عقوبة دونوں گناہ کے بعد ہوتی ہیں۔ وقد عاقبه بذنبه ''تحقیق اس نے اسے اس کے گناہ کی سزا دی۔''

زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝

''آراستہ کر دی گئی ہے کافروں کے لئے دنیا کی (فانی) زندگی اور مذاق اڑاتے ہیں یہ ایمان والوں کا حالانکہ پرہیزگاروں کی شان بلند ہوگی ان سے قیامت کے دن اور اللہ تعالیٰ روزی تو جسے چاہے بے حساب دے دیتا ہے''۔

ارشاد باری تعالیٰ زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا میں الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مفعول ما لم یُسَمّ فاعله ہونے کی بنا پر مرفوع ہے۔ اور اس سے مراد سرداران قریش ہیں (زُيِّنَ فعل مجہول ذکر کیا گیا ہے)۔ مجاہد اور حمید بن قیس نے فعل کو معروف یعنی علی بناء الفاعل پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ قراءت سے شاذ ہے، کیونکہ فاعل کا پہلے ذکر موجود نہیں۔ ابن ابی عبلہ نے زُيِّنَتْ یعنی علامت تانیث کے اظہار کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بھی جائز ہے کیونکہ تانیث غیر حقیقی ہے۔

اور مزین کرنے والا ہی اس کا خالق اور اس کا موجد ہے اور وہی خالق الکفر بھی ہے اور اسے شیطان بھی اپنے وسوسہ اور اپنے دھوکہ کے ساتھ آراستہ کرتا ہے۔ اور یہاں خاص طور پر کافروں کا ذکر اس لئے کیا ہے کیونکہ انہوں نے تزیین (زیب و آرائش) کو مکمل طور پر قبول کر لیا ہے اور وہ دنیا کی طرف متوجہ ہو چکے ہیں اور اسی سبب سے انہوں نے آخرت سے اعراض کر لیا ہے۔ جو کچھ زمین پر ہے اللہ تعالیٰ نے اسے اس کے لئے زینت بنا دیا ہے تاکہ وہ مخلوق کو آزمائے کہ ان میں سے عمل کے اعتبار سے زیادہ حسین کون ہے؟

اور مومن وہ ہیں جو شریعت کے طریقوں پر گامزن ہیں زینت ان کے لئے باعث فتنہ نہیں۔ اور رہے کفار تو زینت ان کی مالک بن جاتی ہے کیونکہ وہ اس کے سوا کسی کا اعتقاد ہی نہیں رکھتے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس جب مال لایا گیا تو انہوں نے فرمایا: اے اللہ! بلاشبہ ہم استطاعت نہیں رکھتے مگر یہ کہ ہم اس سے خوش ہوں جسے تو نے ہمارے لئے زینت بنایا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ: وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ یہ کفار قریش کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ وہ دنیوی اعتبار سے اپنی حالت کو عظیم قرار دیتے ہیں اور وہ اس پر رشک اور اظہار مسرت کرتے تھے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلاموں کے ساتھ تمسخر کرتے تھے۔

ابن جریج نے کہا ہے: وہ اہل ایمان کے آخرت کو طلب کرنے کے سبب ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سبب مذاق ان کا فقر اور ان کی تنگدستی تھی (یعنی ان کے فقر و فاقہ کی وجہ سے کفار ان کا مذاق اڑاتے تھے۔) جب کہ حضرت بلال، حضرت صہیب اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم اور انہیں کی مثل دیگر جانثاران مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

پس اللہ تعالیٰ نے ان کے فعل کے قبیح اور برا ہونے کے سبب ان کے رتبہ اور درجہ کی پستی پر آگاہ کیا اور فرمایا: وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (یعنی وہ لوگ جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا ان کی شان اور رتبہ قیامت کے دن ان سے بلند ہوگا۔)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کسی نے کسی مومن مرد یا مومنہ عورت کو ذلیل سمجھایا اسے اس کے فقر و افلاس اور قلت مال کی وجہ سے حقیر جانا، تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے مشہور کرے گا، پھر اسے رسوا کر دے گا اور جس نے کسی مومن مرد یا عورت پر بہتان لگایا یا اس کے بارے وہ کچھ کہا جو اس میں نہیں تھا، تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے آگ کے ٹیلے پر کھڑا کرے گا، یہاں تک کہ وہ اس سے نکل جائے جو اس نے اس کے بارے میں کہا (یعنی بندۂ مومن سے اپنے قول کی معذرت کرلے اور معافی مانگ لے۔) بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بندۂ مومن کی عظمت اور عزت و اکرام مقرب فرشتے سے بھی زیادہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرنے والے مومن مرد اور توبہ کرنے والی مومنہ عورت سے زیادہ محبوب اور کوئی شے نہیں اور بلاشبہ مومن آدمی کی پہچان آسمان میں اسی طرح ہوتی ہے جس طرح ایک آدمی کی پہچان اس کے گھر والوں اور اس کی اولاد میں ہوتی ہے۔

پھر کہا گیا ہے کہ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ کا معنی یہ ہے کہ وہ درجہ میں ان سے بلند ہوں گے۔ کیونکہ وہ جنت میں ہوں گے اور کفار جہنم میں ہوں گے۔ اور یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد بلند مکان ہو۔ اس اعتبار سے کہ جنت آسمان میں ہے اور جہنم اسفل السافلین میں ہے (یعنی پرہیزگار لوگ بلند مکان یعنی جنت میں ہوں گے۔)

اور یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ یہ فضیلت اس پر ہو جو کچھ کافران کے بارے میں گمان کر رہے ہیں (یعنی قطعاً ایسا نہ ہوگا جیسا کافر گمان کرتے ہیں بلکہ ان کی شان اس سے کہیں بلند ہوگی۔)

کیونکہ کفار تو کہتے ہیں: اگر آخرت ہوئی تو اس میں ہمارے لئے حصہ (خیر و فضل) تمہاری نسبت کہیں زیادہ ہوگا۔ اسی معنی میں حضرت خباب رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی ہے کہ جو واقعہ انہیں عاص بن وائل کے ساتھ پیش آیا۔ حضرت خباب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میرا عاص بن وائل پر کچھ قرض تھا، میں اس کے پاس آیا تاکہ اس سے قرض کا مطالبہ کروں، تو اس نے مجھے کہا: میں تجھے ہرگز قرض ادا نہیں کروں گا یہاں تک کہ تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کفر اختیار کرے۔ میں نے اسے جواب دیا: بلاشبہ میں ہرگز ان سے کفر اختیار نہ کروں گا، یہاں تک کہ تو مر جائے اور پھر تجھے اٹھایا جائے۔ تو اس نے کہا: کیا مجھے موت کے بعد (دوبارہ) اٹھایا جائے گا؟ تو پھر میں تجھے قرض ادا کردوں گا جب میں مال و اولاد کی طرف لوٹ کر گیا۔ الحدیث۔ عنقریب یہ مکمل حدیث بھی آئے گی۔(1)

اور کہا جاتا ہے: سخِرت منه و سخرت به، ضحکت منه و ضحکت به، و هزئت منه و به۔ یہ سب الفاظ ایک معنی میں کہے جاتے ہیں۔ اسے اخفش نے بیان کیا ہے اور اسم السخریة، والسُّخرِیُّ اور السِخرِیُّ ہے۔ اور ان دونوں قراءتوں کے ساتھ اسے پڑھا گیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا (الزخرف: 32) اور فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا (المومنون: 110)

اور رجل سُخَرَةٌ (کا معنی ہے) وہ آدمی جس سے تمسخر کیا جاتا ہو۔ اور اگر یہی لفظ خاء کے فتحہ کے ساتھ ہو یعنی رجل سُخَرَةٌ۔ تو مراد وہ آدمی ہے جو لوگوں سے تمسخر کرتا ہو۔ اور فلان سخرة فلاں کام میں تمسخر کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے: خادمہ سُخَرَة

1۔ بخاری شریف، باب ذکر القین والحداد، حدیث نمبر 1949، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وسخرۃ تسخیرا، یعنی فلاں نے اسے بغیر اجرت کے کام کا مکلف اور پابند بنایا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ

ضحاک نے کہا ہے: مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں بغیر کسی تاوان کے عطا فرمائے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ان کمزور لوگوں کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ انہیں بلند رتبہ عطا فرمائے گا۔ پس یہ آیت متنبہ کر رہی ہے کہ ان پر عظیم انعام ہوگا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے رزق کو بغیر حساب قرار دیا ہے اس حیثیت سے کہ وہ دائمی ہے اور لامتناہی ہے، پس وہ شمار نہیں ہو سکتا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بِغَيْرِ حِسَابٍ یہ اللہ تعالیٰ کے رزق کی صفت ہے۔ وہ کیسے تصرف کرتا ہے، جبکہ اس کی قدرت اتنی عظیم ہے تو وہ کسی حد و شمار کے ساتھ خرچ نہیں کرتا۔ پس اس کا سارے کا سارا فضل ہی بغیر حساب ہے۔ اور وہ جو حساب کے ساتھ ہے وہ آدمی کے اس عمل کے مطابق ہے جو آدمی نے آگے بھیجا ہوگا (یعنی ہر عمل کی جزا تو اس کے مطابق ہوگی مگر اس کا فضل اور عطا بلا حساب ہوگی) جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا (النبا) (یہ بدلہ ہے آپ کے رب کی طرف سے بڑا کافی انعام) اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ جنہیں عطا کیا جاتا ہے (یعنی مرزوقین) وہ ان کے وہم و گمان کے بغیر ہو۔ جیسا کہ رب العالمین نے ارشاد فرمایا: وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (الطلاق: 3) (اور اسے (وہاں سے) رزق دیتا ہے جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوتا۔)

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۫ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۪ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

"(ابتدا میں) سب لوگ ایک ہی دین پر تھے (پھر جب ان میں اختلاف پیدا ہو گیا) تو بھیجے اللہ نے انبیاء خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے اور نازل فرمائی ان کے ساتھ کتاب برحق تاکہ فیصلہ کر دے لوگوں کے درمیان جن باتوں میں وہ جھگڑنے لگے تھے اور کسی نے اختلاف نہیں کیا اس میں بجز ان لوگوں کے جنہیں کتاب دی گئی تھی بعد از اس کہ آ گئی تھیں ان کے پاس روشن دلیلیں (اس کی وجہ) ایک دوسرے سے حسد تھا، پس اللہ نے ہدایت بخشی انہیں جو ایمان لائے تھے ان سچی باتوں پر جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے اپنی توفیق سے اور اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف"۔

ارشاد باری تعالیٰ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً کا معنی ہے سب لوگ ایک دین پر تھے۔

حضرت ابی بن کعب اور ابن زید نے کہا ہے کہ النَّاسُ سے مراد بنی آدم (اولاد آدم) ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں روحوں کی صورت میں حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کیا۔

حضرت مجاہد نے کہا ہے: النَّاسُ سے مراد صرف حضرت آدم علیہ السلام ہیں، (پھر اس پر یہ سوال ہوتا ہے) کہ واحد کو لفظ جمع کا نام کیوں دیا گیا ہے؟ (تو جواب یہ ہے کہ اس لئے) کیونکہ آپ ہی ساری نسل کی اصل اور بنیاد ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ النَّاسُ سے مراد حضرت آدم اور حضرت مائی حوا علیہما السلام ہیں۔

حضرت ابن عباس اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہم نے بیان کیا ہے کہ النَّاسُ سے مراد اس زمانے کے لوگ ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان تھا اور یہ دس صدیاں ہیں (ان میں) وہ لوگ حق پر تھے یہاں تک کہ ان میں اختلاف ہو گیا، تب اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے بعد والوں کو مبعوث فرمایا (1)۔

اور ابن ابی خیثمہ نے کہا ہے: جب سے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تخلیق فرمایا اس وقت سے لے کر حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک پانچ ہزار آٹھ سو سال کا عرصہ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے زیادہ ہے اور حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے مابین بارہ سو برس کی مدت ہے اور حضرت آدم علیہ السلام نو سو ساٹھ برس تک زندہ رہے اور آپ کے زمانے میں لوگ ایک ہی دین پر تھے، وہ دین کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے اور ملائکہ ان کے ساتھ مصافحہ کرتے تھے اور وہ اسی حال پر رہے یہاں تک کہ حضرت ادریس علیہ السلام (آسمانوں پر) اٹھا لئے گئے۔ پھر ان میں اختلاف پڑ گیا۔ یہ بات محل نظر ہے۔ کیونکہ صحیح روایت کے مطابق حضرت ادریس علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام کے بعد ہوئے ہیں۔ کلبی اور واقدی وغیرہ ایک جماعت نے کہا ہے کہ اس سے مراد حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی کشتی میں سوار ہونے والے لوگ ہیں، وہ مسلمان تھے پھر حضرت نوح علیہ السلام کے وصال کے بعد ان میں اختلاف ہو گیا۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ کفر پر ایک امت تھے اور اس سے مراد حضرت نوح علیہ السلام کا وہ زمانہ ہے جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو مبعوث فرمایا۔

اور آپ ہی سے یہ قول بھی مروی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں تمام لوگ ایک امت تھے اور وہ تمام کے تمام کافر تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت دور جاہلیت میں ہوئی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام مبعوث فرمائے۔

پس ان اقوال کی بنا پر کَانَ اپنے باب پر ہے یعنی زمانہ ماضی کے لئے جو کہ گزر چکا ہے اور وہ تمام جنہوں نے آیت میں النَّاسُ سے مراد مومنین لئے ہیں، انہوں نے کلام میں فاختلفوا فبعث مقدر مانا ہے۔ اور اس حذف پر دلیل یہ بیان کی ہے: وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ یعنی تمام لوگ دین حق پر تھے، پھر ان میں اختلاف ہونے لگا تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات مبعوث فرمائے، جو انہیں بشارت دینے والے ہیں جنہوں نے اطاعت و فرمانبرداری کی اور انہیں ڈرانے والے ہیں جنہوں نے نافرمانی کی۔ اور جنہوں نے النَّاسُ سے مراد کفار لئے ہیں، تو پھر انہیں کی طرف انبیاء علیہم السلام کی بعثت ہوئی۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 285

اور یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ کَانَ ثبوت کے لئے ہو (یعنی تامہ ہو) اور مراد ان لوگوں کے بارے خبر دینا ہو جو تمام کے تمام ایک جنس ہیں کہ وہ شرائع سے خالی ہونے میں اور حقائق سے جاہل اور ناواقف ہونے میں ایک امت ہوتے اگر اللہ تعالیٰ ان پر احسان نہ فرماتا اور ان کی طرف اپنے رسول بھیج کر ان پر مہربانی نہ فرماتا۔ پس اس تاویل پر کَانَ صرف ماضی کے ساتھ خاص نہیں۔ بلکہ اس کا معنی وہی ہے جو اس ارشاد میں ہے وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (النساء) اور اُمَّةً کا لفظ ان (عربوں) کے اس قول سے ماخوذ ہے: أممت كذا یعنی میں نے اس کا قصد کیا۔ پس امۃ واحدۃ کا معنی یہ ہوا کہ ان کا مقصد ایک تھا۔ اور واحد کے لئے امۃ بولا جاتا ہے یعنی مقصد ہ غیر مقصد الناس اس کا مقصد لوگوں کے مقصد کے سوا ہے۔ اسی کے مطابق حضور نبی مکرم ﷺ کا حضرت قس بن ساعدہ کے بارے میں ارشاد گرامی بھی ہے یُحْشَرُ یوم القیامۃ امۃ واحدۃ (قیامت کے دن اسے ایک امت (مقصد) پر اٹھایا جائے گا اسی طرح زید بن عمرو بن نفیل کے بارے فرمایا والامۃ القامۃ (سیدھا اور صحیح مقصد) گویا کہ تمام بدن کا مقصد یہی ہے۔

اور الامۃ اگر کسرہ کے ساتھ ہو، تو اس کا معنی نعمت ہے کیونکہ لوگ اسی (نعمت) کا ہی قصد کرتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی امام ہے کیونکہ لوگ اسی کو کرنے کا قصد کرتے ہیں جو وہ کرتا ہے۔ نحاس سے روایت ہے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کان البشر امۃ واحدۃ پڑھا ہے اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کان الناس امۃ واحدۃ فاختلفوا فبعث قراءت کی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ، حضرات انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کی مجموعی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے، اور ان میں سے تین سو تیرہ رسول ہیں اور قرآن کریم میں جن کے اسمائے گرامی مذکور ہیں وہ اٹھارہ ہیں۔ اور سب سے پہلے رسول حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ اسی طرح حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مذکور ہے، اسے آجری اور ابو حاتم البستی نے روایت کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حدیث شفاعت کے مطابق اول الرسل حضرت نوح علیہ السلام ہیں۔ کیونکہ لوگ انہیں کہیں گے انت اول الرسل آپ پہلے رسول ہیں (1)۔ بعض نے کہا ہے کہ پہلے رسول حضرت ادریس علیہ السلام ہیں۔ اس کا بیان سورۂ اعراف میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

ارشاد باری تعالیٰ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہیں اور وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ میں کتاب سے مراد اسم جنس بمعنی کتب ہے۔

علامہ طبری نے کہا ہے: الْكِتٰبَ پر الف لام عہد کے لئے ہے اور اس سے مراد تورات ہے۔ اور لِيَحْكُمَ جمہور کے قول کے مطابق الْكِتٰبَ کی طرف مسند ہے، اور یہ اَنْ مضمرہ کے ساتھ منصوب ہے یعنی لِاَنْ يَحْكُمَ اور یہ نسبت مجازی ہے، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے۔ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ (الجاثیہ: ۲۹) (یہ ہمارا نوشتہ ہے جو بولتا ہے تمہارے بارے میں سچ) اور

1۔ بخاری شریف، باب قول اللہ عزوجل ولقد ارسلنا نوحا الی قومہ، حدیث نمبر 3092، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
بخاری شریف، باب قول اللہ وعلم آدم الاسماء کلھا، حدیث نمبر 4116، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے تاکہ ہر نبی اس کی کتاب کے مطابق فیصلے کرے۔ اور جب اس نے کتاب کے مطابق فیصلہ کیا تو گویا کتاب نے ہی فیصلہ کیا۔

عاصم جحدری کی قراءت میں لِیُحْکَمَ بَیْنَ النَّاسِ ہے یعنی فعل مجہول پڑھا گیا ہے۔ اور یہ قراءت شاذ ہے، کیونکہ کتاب کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا معنی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے۔ اور پہلے فیہ کی ضمیر فِیْمَا میں ما کی طرف لوٹ رہی ہے اور دوسرے فیہ کی ضمیر الکتاب کی طرف لوٹنے کا احتمال رکھتی ہے۔ یعنی کتاب میں اختلاف نہیں کیا مگر انہی لوگوں نے جنہیں وہ عطا کی گئی تھی۔ الذین فعل کے سبب محل رفع میں ہے اور اُوْتُوْہُ بمعنی اعطوہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ضمیر منزل علیہ کی طرف لوٹتی ہے اور وہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ قول زجاج کا ہے، یعنی نبی علیہ السلام کے بارے میں کسی نے اختلاف نہیں کیا بجز ان لوگوں کے جنہیں اس کے بارے علم عطا فرمایا گیا۔

بَغْیًا بَیْنَھُمْ یہ مفعول لہٗ ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ یعنی ھم یختلفوا الا للبغی انہوں نے اختلاف نہیں کیا مگر باہمی حسد کے سبب۔ اس کا معنی ومفہوم پہلے بیان ہو چکا ہے اور اس میں ان کے فعل کی سفاہت اور اس قباحت پر تنبیہ ہے جس میں وہ واقع ہوئے۔

اور ھدی کا معنی ارشد راہنمائی کرنا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی حق کی طرف راہنمائی فرمادی، اس طرح کہ ان کے لئے وہ کچھ بیان کر دیا جس میں ان سے پہلے لوگوں نے اختلاف کیا تھا۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: آیت کا معنی یہ ہے کہ سابقہ امتوں میں سے بعض نے بعض کی کتابوں کی تکذیب کی، تو اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی ان تمام کی تصدیق کے لئے راہنمائی فرمادی۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنین کی حق کی طرف راہنمائی فرمائی ان امور میں جن میں اہل کتابین (یہود ونصاریٰ) نے اختلاف کیا۔ ان کے قول میں سے ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یا یہودی تھے یا عیسائی۔ (یعنی یہودیوں نے کہا: وہ یہودی تھے اور عیسائیوں نے کہا: وہ عیسائی تھے۔)

ابن زید اور زید بن اسلم نے کہا ہے: ان کا قبلہ کے بارے میں اختلاف ہے۔ کیونکہ یہودیوں نے بیت المقدس کی طرف اور نصاریٰ نے مشرق کی طرف (منہ کیا) اور یوم جمعہ کے بارے میں ان کا اختلاف ہوا۔ کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ وہ دن ہے جس میں انہوں نے اختلاف کیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں ہماری راہنمائی فرمادی، پس یہودیوں کے لئے ہفتے کا دن ہے اور عیسائیوں کے لئے اتوار کا (1)۔ اور ان کے روزوں کے بارے جو اختلاف ہے۔ المختصر وہ تمام امور جن میں انہوں نے اختلاف کیا (ان میں اللہ تعالیٰ نے ہماری راہنمائی فرمادی۔)

ابن زید نے کہا ہے: انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اختلاف کیا۔ پس یہودیوں نے انہیں فریہ

1۔ بخاری شریف، باب فرض الجمعۃ، حدیث نمبر 827، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

(حیرت انگیز شخصیت) قرار دیا اور عیسائیوں نے انہیں رب بنا لیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے مومنین کی راہنمائی فرمائی تو انہوں نے انہیں اللہ تعالیٰ کا بندہ قرار دیا۔

فراء نے کہا ہے: اس عبارت میں قلب کیا گیا ہے۔ علامہ طبری نے اسے پسند کیا ہے۔ انہوں نے کہا: تقدیر عبارت یہ ہے فھدی اللہ الذین آمنوا للحق لما اختلفوا فیہ (پس اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی حق کی طرف راہنمائی فرمائی جس میں وہ اختلاف کرتے تھے۔)

ابن عطیہ نے کہا ہے: اس تقدیر عبارت کی طرف انہیں اس خوف نے دعوت دی ہے کہ لفظ یہ احتمال رکھتا ہے کہ انہوں نے حق کے بارے میں اختلاف کیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے مومنین کی اس بعض کے بارے میں راہنمائی فرمائی جس میں انہوں نے اختلاف کیا اور اسی (خوف) نے فراء کو فی نفسہ غیر حق (کے مفہوم) کے قریب کر دیا۔ علامہ طبری نے بھی فراء سے اسے بیان کرنے میں اسی کا قصد کیا ہے۔ اور رہا کتاب اللہ کے لفظ پر بغیر ضرورت کے قلب کا دعویٰ کرنا، تو اس کی طرف دھکیلنے والی شے عجز اور کوتاہ نظری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کلام اپنی ذات اور وصف پر دلالت کر رہی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد فَهَدَى تقاضا کرتا ہے کہ بلاشبہ وہ حق تک پہنچ گئے اور فیہ کے کلمہ میں معنی مکمل ہو گیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے قول مِنَ الْحَقِّ سے اس جنس کی وضاحت کی ہے جس میں اختلاف واقع ہوا۔

مہدوی نے کہا ہے: لفظ اختلاف کو اہتماماً لفظ حق پر مقدم ذکر کیا گیا ہے جبکہ مقصود صرف اختلاف کا ذکر کرنا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: میرے نزدیک یہ قوی نہیں ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ہے لما اختلفوا عنہ من الحق، ای عن الاسلام۔ یعنی اسلام سے اختلاف کیا۔ اور بِاِذْنِهٖ کے بارے زجاج نے کہا ہے: اس کا معنی ہے بعلمہ۔ یعنی اس کے علم کے ساتھ۔

نحاس نے کہا ہے: یہ غلط ہے۔ اور اس کا معنی ہے بامرہ یعنی اس کے حکم کے ساتھ۔ اور جب تو نے کسی شے کے بارے اجازت دی (تو اس کا مفہوم ہے) تحقیق تو نے اس کے بارے حکم دے دیا۔

پس اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی راہنمائی فرمائی کہ انہیں ایسی چیزوں کے بارے حکم فرمایا جن کے مطابق ان کے لئے عمل کرنا واجب ہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ میں معتزلہ کے اس قول کا رد ہے کہ بندہ اپنی ذات کی ہدایت وراہنمائی کا اہتمام خود کرتا ہے (یعنی یہ بندے کے اپنے اختیار میں ہے۔)

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۭ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۗءُ وَالضَّرَّاۗءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۝

"کیا تم خیال کر رہے ہو کہ (یونہی) داخل ہو جاؤ گے جنت میں حالانکہ نہیں گزرے تم پر وہ حالات جو گزرے ان لوگوں پر جو تم سے پہلے ہوئے ہیں پہنچی انہیں سختی اور مصیبت اور وہ لرز اٹھے یہاں تک کہ کہہ اٹھا (اس زمانہ کا)

رسول اور جو ایمان لائے تھے اس کے ساتھ کب آئے گی اللہ کی مدد؟ سن لو! یقیناً اللہ کی مدد قریب ہے۔"

ارشاد باری تعالیٰ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ میں حَسِبْتُمْ بمعنی ظننتم (تم نے گمان کیا) ہے۔ حضرت قتادہ، سدی اور اکثر مفسرین نے کہا: یہ آیت غزوۂ خندق کے دوران نازل ہوئی جب کہ مسلمانوں کو مشقت، شدت، گرمی، سردی، تلخ اور تکلیف دہ زندگی اور طرح طرح کی تکالیف اور مصائب آپہنچے اور ان کی کیفیت یہ ہوگئی جیسا کہ رب العالمین نے ارشاد فرمایا وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ (الاحزاب: ۱۰) (اور کلیجے منہ کو آنے لگے۔)

اور بعض نے کہا ہے: یہ آیت جنگ احد کے دوران نازل ہوئی۔ اس کی مثل آل عمران میں بھی ہے۔ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ (آل عمران: ۱۴۲) (کیا تم گمان رکھتے ہو کہ (یونہی) داخل ہو جاؤ گے جنت میں حالانکہ ابھی دیکھا ہی نہیں اللہ نے ان لوگوں کو جنہوں نے جہاد کیا تم میں سے۔)

اور ایک جماعت نے کہا ہے: یہ آیت مہاجرین کو تسلی اور حوصلہ دینے کے لئے نازل ہوئی جبکہ انہوں نے اپنے گھر اور اپنے اموال مشرکین کے ہاتھوں چھوڑ دیئے اور اللہ تعالیٰ اور رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا اور خوشنودی کو انہوں نے ترجیح دی اور یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عداوت کا اظہار کیا اور اغنیاء اور مالدار لوگوں میں سے بعض نے اپنے باطن میں نفاق پیدا کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو پاک کرنے کے لئے یہ آیت نازل فرمائی۔

اس آیت میں اَمْ منقطعہ بمعنی بَل ہے۔ اور بعض اہل لغت نے بیان کیا ہے کہ کبھی اَمْ الف استفہام کے بدلے بھی آتا ہے تا کہ اس سے کلام کی ابتدا کی جائے اور حَسِبْتُمْ دو مفعولوں کو چاہتا ہے، لہٰذا علمائے نحو نے کہا ہے: اَنْ تَدْخُلُوا قائم مقام دو مفعولوں کے لئے ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مفعول ثانی محذوف ہے: یعنی أحسبتم دخولکم الجنّة واقعاً اور لَمَّا بمعنی لم ہے اور مَثَلُ بمعنی شبہ ہے۔ یعنی اس طرح کے امتحان میں تمہیں نہیں ڈالا گیا جس طرح انہیں آزمایا گیا جو تم سے پہلے تھے۔ پس تم صبر کرو جیسا کہ انہوں نے صبر کیا۔

نضر بن شمیل نے بیان کیا ہے کہ مَثَلُ بمعنی صفة ہوتا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ معنی اس طرح ہو: اور ابھی تک تمہیں اس طرح کی مصیبت اور شدت نہیں پہنچی، جس طرح کی آزمائش ان لوگوں پر آئی جو تم سے پہلے تھے۔

وہب نے کہا ہے: مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان ستر انبیاء علیہم السلام مردہ حالت میں پائے گئے اور ان کی موت کا سبب بھوک اور چچڑیاں تھیں۔ اسی آیت کی مثل یہ بھی ہے: الٓمّٓ ۚ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ وَ لَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (العنکبوت) (الف-لام-میم-کیا لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ انہیں صرف اتنی بات پر چھوڑ دیا جائے گا کہ وہ کہیں ہم ایمان لے آئے اور انہیں آزمایا نہیں جائے گا۔ اور بے شک ہم نے آزمایا تھا ان لوگوں کو جو ان سے پہلے گزرے۔)

پس اللہ تعالیٰ نے انہیں صبر کی دعوت دی اور اس پر ان سے نصرت و مدد کا وعدہ فرمایا اور ارشاد فرمایا: اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۝

اور الزلزلة سے مراد سخت حرکت دینا ہے۔ یہ اشخاص میں بھی ہوتی ہے اور احوال میں بھی۔ کہا جاتا ہے: زلزل الله

الارض زلزلۃ و زلزالا یعنی بالکسر - فتزلزلت۔ جب وہ حرکت کرے اور کانپنے لگے اور زُلْزِلُوْا کا معنی ہے وہ خوفزدہ کیے گئے اور حرکت دیے گئے۔ اور الزَلزال۔ فتحہ کے ساتھ اسم ہے۔ اور الزلزِل کا معنی شدائد اور سختیاں ہیں۔

زجاج نے کہا ہے: زلزلہ کا اصل معنی کسی چیز کا اپنی جگہ سے پھسل جانا، ہٹ جانا ہے اور جب تو کہے زلزلتہ تو اس کا معنی ہے: تو نے بار بار اپنی جگہ سے ہٹایا اور پھسلایا۔

اور سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ زلزل دحرج کی طرح فعل رباعی ہے۔

نافع نے حتّٰی یَقُوْلُ رفع کے ساتھ، جبکہ دوسروں نے اسے نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔

اور سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ حَتّٰی کے مابعد کلمہ پر دو اعتبار سے فتحہ اور دو اعتبار سے رفع آسکتا ہے۔ مثلاً تو کہتا ہے: سرت حتی أدخلَ المدینۃَ یہ منصوب ہے۔ اس شرط پر کہ سیر اور دخول دونوں اکٹھے ایک ساتھ گزر چکے ہوں۔ یعنی میں اس میں داخل ہونے تک چلتا رہا۔ ای سرت الی ان ادخلھا اور یہ غایت ہے اور اسی کے مطابق ان کی قراءت ہے جنہوں نے منصوب پڑھا ہے۔

اور آیت کے سوا میں نصب کی دوسری وجہ یہ ہے سرت حتّٰی ادخلھا۔ ای کَیْ ادخلھا (یعنی میں چلا تا کہ میں اس میں داخل ہو جاؤں۔)

اور رفع کی بھی دو وجہیں ہیں سرت حتّٰی ادخلُھا، ای سرت فأدخلھا یعنی میں چلا اور اس میں داخل ہو گیا۔ تحقیق یہ دونوں سیر اور دخول اکٹھے گزر چکے ہیں۔ ای کنت سرت فدخلت۔ اور یہاں (آیت میں) حَتّٰی ان مضمرہ کے ساتھ عمل نہیں کرتا، کیونکہ اس کے بعد جملہ ہے۔ جیسا کہ فرزدق نے کہا ہے: فَیَاعَجباً حتی کُلیبٌ تَسُبُّنِیْ (پس کتنی تعجب کی بات ہے کہ بنی کلیب مجھے گالیاں دیتے ہیں۔)

نحاس نے کہا ہے: اس بنا پر رفع کی قراءت زیادہ واضح اور معنی کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے۔ ای و زلزلوا حتّٰی الرسولُ یقول اور وہ لرز اٹھے یہاں تک کہ (اس زمانہ کا) رسول کہہ اٹھا۔ یعنی یہاں تک کہ یہ اس کا حال تھا۔ کیونکہ قول زلزلہ سے منقطع نہیں ہوا اور نصب معنی غایت کی بنا پر ہے اور اس میں وہ معنی نہیں ہے۔

مقاتل کے قول کے مطابق یہاں رسول سے مراد شعیا ہیں۔ اور وہی حضرت یسع علیہ السلام ہیں۔

اور کلبی نے کہا ہے: یہ ہر رسول کے بارے میں ہے جسے اپنی امت کی طرف مبعوث کیا گیا اور اس نے خوب محنت اور مشقت اٹھائی، یہاں تک کہ وہ کہہ اٹھا: اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کب آئے گی؟ اور ضحاک سے مروی ہے انہوں نے کہا: مراد حضور نبی کریم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اسی پر آیت کا نزول دلالت کرتا ہے۔ واللہ اعلم۔

اور آیت کے سوا میں رفع کی دوسری صورت یہ ہے سرت حتی ادخلُھا یہ اس بنا پر ہے کہ چلنا ماضی میں ہو اور دخول اب (یعنی زمانہ حال میں) ہو۔

اور سیبویہ نے بیان کیا ہے: مرِض حتی لا یرجونَہ، ای ھو الآن لا یرجی۔ یعنی وہ بیمار ہوا اور اب اس کے بارے کوئی

امید نہیں ہے۔ اور اسی کی مثل یہ بھی ہے سرت حتی ادخلھا لا امنع یعنی میں چلا اور اب میں داخل ہوں گا، اس سے باز نہ رہوں گا۔

مجاہد، اعرج، ابن محیصن اور شیبہ نے رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور حسن، ابوجعفر، ابن ابی اسحاق اور شبل وغیرہ نے نصب کے ساتھ قراءت کی ہے۔

مکی نے کہا ہے: یہی پسندیدہ ہے کیونکہ قراء کی ایک جماعت اسی نظریہ پر ہے۔

اور اعمش نے وزلزلوا ویقول الرسول حتی کی بجائے واؤ کے ساتھ پڑھا ہے۔

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں ہے وزلزلوا ثم زلزلوا ویقول۔

اور تاویل کرنے والوں میں سے اکثر نے کہا ہے کہ آیت کے آخر تک کلام رسول اور مومنین کے قول میں سے ہے۔ یعنی انہیں مشقت پہنچی یہاں تک کہ وہ مدد و نصرت کو موخر اور دور سمجھنے لگے، تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ اور وہ رسول کے قول میں سے ہو سکتا ہے۔ اس بنا پر کہ انہوں نے مدد و نصرت کے جلدی آنے کا مطالبہ کیا، نہ کہ کسی شک اور ارتیاب کی بنا پر اور الرسول اسم جنس ہے۔

اور ایک گروہ کا کہنا ہے: کلام میں تقدیم و تاخیر ہے، اور تقدیر کلام یہ ہے: حتّٰی یقول الَّذِیْنَ آمنوا متٰی نصر اللہ (یعنی یہاں تک کہ ایمان والے کہنے لگے اللہ تعالیٰ کی مدد کب آئے گی؟) تو اللہ کا رسول کہتا ہے: اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ، پس رسول علیہ السلام کو رتبہ میں بلندی اور حیثیت کی بنا پر مقدم ذکر کیا گیا ہے اور پھر مومنین کے قول کو مقدم لایا گیا ہے، کیونکہ وہ زمانے کے اعتبار سے متقدم ہیں۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ تو تحکم ہے۔ اور کلام کو اپنے ظاہر پر محمول کرنا متعذر نہیں ہے۔ اور یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اخبار ہو اور یہ قول کے ذکر کے مکمل ہونے کے بعد بطور استیناف ہو۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ۔ سیبویہ کے قول کے مطابق نصر اللہ مبتدا ہونے کی بنا پر مرفوع ہے۔ اور ابوالعباس کے قول کے مطابق یہ فعل کے سبب مرفوع ہے۔ یعنی حتی یقع نصر اللہ۔ اور قریبٌ۔ اِنّ کی خبر ہو۔

نحاس نے کہا ہے: غیر قرآن میں قریبًا پڑھنا بھی جائز ہے یعنی مَكَانًا قَرِيبًا اور قریبٌ کا عرب نہ تثنیہ لاتے ہیں، نہ جمع اور نہ ہی اس معنی میں مونث۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (الاعراف) اور شاعر نے کہا:

له الويلُ ان أمسٰى ولا أمُّ هاشم قريبٌ ولا بَسْبَاسةُ بنةُ يَشْكُرَا

شعر میں تثنیہ مونث کے لئے قریب لایا گیا ہے۔

اور اگر تو کہے: فلان قریب لی فلاں میرے قریب ہے، تو اس کی تثنیہ اور جمع بنانا چاہے تو پھر تو کہے گا: قریبون و اقرباء و قرباء۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۗ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۗ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾

''آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں؟ آپ فرمائیے: جو کچھ خرچ کرو (اپنے) مال سے تو اس کے مستحق تمہارے ماں باپ ہیں اور قریبی رشتہ دار ہیں اور یتیم ہیں اور مسکین ہیں اور مسافر ہیں اور جو نیکی تم کرتے ہو تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتا ہے۔''

ارشاد باری تعالیٰ ہے: يَسْـَٔلُوْنَكَ اس آیت کریمہ میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اس میں اگر ہمزہ کو مخفف کر دیا جائے تو اس کی حرکت سین کو دے کر اسے مفتوح پڑھا جائے اور ہمزہ کو حذف کر دیا جائے تو تو اسے پڑھے گا: يَسَلُوْنَكَ۔

یہ آیت حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ آپ شیخ کبیر (بہت زیادہ بوڑھے) تھے۔ تو عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ میرا مال کثیر اور بہت زیادہ ہے، تو میں اسے کیونکر صدقہ کروں اور کس پر خرچ کروں؟ تب یہ آیت نازل ہوئی: يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ۔(1)

مسئلہ نمبر 2۔ ارشاد باری تعالیٰ: مَاذَا يُنْفِقُوْنَ میں مَا مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ اور ذَا خبر ہے اور یہ بمعنی الذی ہے۔ اور اسم کی طوالت کے سبب اس سے ھا کو حذف کر دیا گیا ہے۔ یعنی اصل عبارت اس طرح ہے: ما الذی ینفقونہ اور اگر تو چاہے تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مَا يُنْفِقُوْنَ کے سبب محل نصب میں ہو۔ اور ذا، ما کے ساتھ مل کر ایک شے کے قائم مقام ہو۔ تو (اس صورت میں) ضمیر کی ضرورت نہ ہوگی۔ اور جب یہ اسم مرکب ہے تو پھر یہ محل نصب میں ہوگا۔ بخلاف شاعر کے اس قول کے:

وما ذا عسی الواشون ان یتحدثوا سوی ان یقولوا اننی لكِ عاشق

(چغلی کھانے والوں کے پاس بات کرنے کے لئے اس کے سوا کیا ہے کہ وہ کہیں: میں تیرا عاشق ہوں۔)

کیونکہ عسی اس میں عمل نہیں کر رہا۔ پس مَاذَا مرکب کلمہ ہے اور محل رفع میں ہے، کیونکہ ذَا کا کوئی صلہ نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ کہا گیا ہے کہ اس میں سوال کرنے والے مومنین ہیں۔ اور معنی یہ ہے: ''وہ آپ سے پوچھتے ہیں کونسی وہ وجوہ (اور اسباب) ہیں جن میں وہ مال خرچ کر سکتے ہیں اور جو مال خرچ کرنا لازم ہو وہ اسے کہاں رکھیں؟

سدی نے کہا ہے: یہ آیت زکوٰۃ فرض ہونے سے پہلے نازل ہوئی، پھر فرض زکوٰۃ نے اسے منسوخ کر دیا۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: مہدوی کو سدی کے بارے میں اس مسئلہ میں وہم ہوا ہے، لہٰذا ان کی طرف یہ قول منسوب کر دیا کہ انہوں نے کہا: یہ آیت فرض زکوٰۃ کے بارے میں ہے اس سے والدین کا حکم منسوخ ہو گیا۔

ابن جریج وغیرہ نے کہا ہے: یہ آیت مستحب صدقہ کے بارے ہے اور زکوٰۃ اس انفاق کے سوا ہے۔

1۔ اسباب النزول للواحدی، صفحہ 60

پس اس قول کی بنا پر اس میں کوئی نسخ نہیں ہے اور یہ نفلی صدقہ کے مصارف کو بیان کر رہی ہے۔ پس خوشحال اور غنی آدمی پر واجب ہے کہ وہ اپنے محتاج اور فقیر والدین پر اتنا مال خرچ کرے جو ان دونوں کی ان کی حالت کے مطابق اصلاح کر سکے (اور ان کے لئے نفع بخش ثابت ہو۔) مثلاً کھانا، لباس اور دیگر ضروریات حیات۔

حضرت امام مالک نے کہا ہے: بیٹے پر یہ لازم نہیں ہے کہ وہ اپنے باپ کی شادی کرائے۔ البتہ یہ اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے باپ کی بیوی کو خرچہ مہیا کرے چاہے وہ اس کی اپنی ماں ہو یا اجنبی عورت ہو۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس پر اپنے باپ کی شادی کرانا لازم نہیں کیونکہ آپ کے پیش نظر یہ ہے کہ وہ (باپ) اغلباً شادی سے مستغنی ہوتا ہے۔ ہاں اگر اسے اس کی شدید حاجت ہو تو پھر اس کی شادی کرانا بھی اس پر واجب ہے۔ اگر اس طرح نہ ہوتا تو پھر اس پر یہ واجب نہ کیا جاتا کہ وہ دونوں (یعنی باپ اور اس کی بیوی) پر خرچ کرے۔ اور عبادات میں سے وہ جو اموال سے تعلق رکھتی ہیں تو (بیٹے پر) لازم نہیں ہے کہ وہ اسے اتنا مال دے جس کے ساتھ وہ حج کر سکتا ہو، یا جہاد پر جا سکتا ہو۔ البتہ اس پر یہ لازم ہے کہ وہ باپ کی طرف سے صدقہ فطر ادا کرے، کیونکہ صدقہ فطر نفقہ اور اسلام کی شرط کے ساتھ ضروری ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: قُلْ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ۔ اس میں اَنْفَقْتُمْ کی وجہ سے مَاۤ محل نصب میں ہے۔ اور اسی طرح وَ مَا یُنْفِقُوْا میں بھی ہے۔ اور یہ شرط ہے اور جواب شرط فَلِلْوَالِدَیْنِ ہے۔ اسی طرح وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ شرط ہے اور اس کا جواب فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ۝ ہے۔ یتیم، مسکین اور ابن سبیل کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ اور اسی آیت کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے: فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَ الْمِسْكِیْنَ وَ ابْنَ السَّبِیْلِ (الروم: 38)

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے یَفْعَلُوْا یاء کے ساتھ صیغہ غائب کی صورت میں پڑھا ہے۔ آیت کا ظاہر تو خبر ہے، حالانکہ یہ جزا کے وعدہ کو متضمن ہے (1)۔

كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِتَالُ وَ هُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَ عَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْـًٔا وَّ هُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ عَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَیْـًٔا وَّ هُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۲۱۶

''فرض کیا گیا ہے تم پر جہاد اور وہ ناپسند ہے تمہیں اور ہو سکتا ہے کہ تم ناپسند کرو کسی چیز کو حالانکہ وہ تمہارے لئے بہتر ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم پسند کرو کسی چیز کو حالانکہ وہ تمہارے حق میں بری ہو اور (حقیقت حال) اللہ ہی جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔''

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ كُتِبَ اس کا معنی ہے: ''فرض کیا گیا ہے۔'' اس کی مثل پہلے گزر چکا ہے۔ ایک قوم نے اس کی قراءت كَتَبَ علیكم القتلَ کی ہے۔ اور شاعر نے کہا ہے:

كُتِبَ القتلُ والقتالُ علينا و على الغانياتِ جَرُّ الذُّيولِ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 279

ہمارے اوپر جنگ وقتال فرض کیا گیا ہے اور حسن و جمال والیوں پر (فقط کپڑوں کے) دامنوں کو کھینچنا۔

یہ جہاد کی فرضیت کا ذکر ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بیان فرمایا ہے: یہ وہی ہے جس کے ساتھ انہیں آزمایا گیا ہے اور اسے جنت تک پہنچنے کا وسیلہ اور ذریعہ بنایا گیا ہے۔ اس میں قتال سے مراد کفار دشمنوں کے ساتھ لڑنا اور جنگ کرنا ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جس کا علم انہیں قرائن احوال سے ہوا ہے۔

حضور نبی کریم ﷺ جتنی مدت مکہ مکرمہ میں قیام پذیر رہے۔ آپ ﷺ کو جہاد کی اجازت نہ دی گئی اور جب آپ ہجرت فرما ہوئے تو پھر آپ کو اجازت فرمادی گئی کہ مشرکین میں سے جو کوئی آپ کے خلاف جنگ کرے۔ آپ اس کے ساتھ مقابلہ کریں اور جنگ لڑیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا (الحج: ۳۹) (اذن دے دیا گیا ہے (جہاد کا) ان (مظلوموں) کو جن سے جنگ کی جاتی ہے اس بنا پر کہ ان پر ظلم کیا گیا) پھر آپ کو عام مشرکین کے ساتھ جنگ لڑنے کی اجازت عطا فرمادی گئی (1)۔ اور علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ اس آیت میں مراد کون ہیں۔

تو ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس میں مراد صرف حضور نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام ہیں۔ پس ان پر حضور نبی مکرم ﷺ کی معیت میں جنگ کرنا فرض عین تھا۔ پھر جب شریعت مضبوط ہو گئی اور قرار پکڑ گئی تو جہاد فرض کفایہ ہو گیا۔ حضرت عطا اور امام اوزاعی نے یہی کہا ہے۔

ابن جریج نے بیان کیا ہے کہ میں نے حضرت عطا کو کہا: کیا اس آیت کے مطابق لوگوں پر جہاد کرنا واجب (فرض عین) ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: نہیں، بلاشبہ یہ ان (صحابہ کرام) پر فرض کیا گیا تھا۔ اور امت میں سے جمہور نے کہا ہے کہ جہاد کی پہلی فرضیت ہی فرض کفایہ تھی نہ کہ فرض عین، مگر یہ کہ حضور نبی مکرم ﷺ جب انہیں جہاد کے لئے نکلنے کی دعوت دیتے تھے تو ان پر اس کے لئے نکلنا لازم ہو جاتا، کیونکہ آپ ﷺ کی اطاعت و پیروی واجب (فرض عین) ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: جس پر مسلسل اجماع رہا ہے وہ یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی امت کے ہر فرد پر جہاد فرض کفایہ ہے۔ جب مسلمانوں میں سے کچھ افراد یہ فریضہ ادا کر دیں تو باقیوں سے ساقط ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر دشمن (حملہ آور ہو کر) دارالاسلام میں داخل ہو جائے تو اس وقت جہاد فرض عین ہے۔ اس کا تفصیلی بیان سورۃ البراءۃ میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

اور مہدوی وغیرہ نے حضرت ثوری سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: جہاد تطوع ہے (یعنی نفلی عبادت ہے اس میں رضاکارانہ طور پر شامل ہونا ہوتا ہے۔) ابن عطیہ نے کہا ہے: میرے نزدیک یہ عبارت کسی سائل کے سوال کے جواب میں کہی گئی ہے۔ تحقیق اس نے جہاد کی تعیین کے بارے سوال کیا تو اسے کہا گیا: ذلك تطوع (کہ وہ ایک ایسا عمل ہے جس میں بتکلف اطاعت کی جاتی ہے۔)

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ یہ مبتدا اور خبر ہے (اور معنی ہے) اور وہ مزاجوں میں ناپسند ہے۔

ابن عرفہ نے کہا ہے: الكُرْهُ کا معنی مشقت ہے۔ اور الكَرْہ فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی وہ عمل ہے جس پر تجھے مجبور کیا

1۔ تفسیر رازی، زیر آیت ہذہ

جائے۔ یہی پسندیدہ مفہوم ہے۔ اور یہ بھی جائز کہ بالضم (الکُرہ) کا معنی بالفتح (الکَرہُ) کی مثل ہو۔ پس یہ دونوں لغتیں ہو سکتی ہیں۔ کہا جاتا ہے: کرھت الشیء کَرھًا و کُرھًا و کَراھۃ و کراھیۃ (میں نے شے کو ناپسند کیا) اور اکرھتہ علیہ اکراھاً (میں نے اسے اس پر مجبور کیا۔)

بلاشبہ جہاد ایک مشقت ہے۔ کیونکہ اس میں مال خرچ کرنا ہوتا ہے، وطن اور اہل وعیال کو چھوڑنا ہوتا ہے اور اپنے جسم کو زخم کھانے، اعضائے بدن کو کٹوانے اور اپنی جان کو قربان کرنے کے لئے پیش کرنا ہوتا ہے۔ سو ان کی ناپسندیدگی کا سبب یہی ہے نہ کہ یہ کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے فرض کو ناپسند کیا۔

حضرت عکرمہ نے اس آیت میں کہا ہے: بے شک (پہلے) انہوں نے اسے ناپسند کیا اور پھر اسے پسند کرنے لگے اور کہا: سمعنا و اطعنا، ہم نے حکم سنا اور اطاعت و پیروی کے لئے سر تسلیم خم کر لیا (1)۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کیونکہ حکم کی پیروی مشقت کو متضمن ہوتی ہے۔ لیکن جب ثواب معلوم ہو جائے تو اس کے ضمن میں مشقتوں کو برداشت کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: دنیا میں اس کی مثال اس شے کو زائل کرنا ہے جو انسان کو تکلیف دیتی ہے، درد پہنچاتی ہے، اور وہ اس سے ڈرتا ہے جیسا کہ کسی عضو کو کاٹنا، داڑھ کو نکالنا اور فصد کروانا اور پچھ لگوانا تاکہ درد اور تکلیف سے چھٹکارا حاصل ہو جائے اور صحت قائم رہ سکے۔ اور دار الخلد (جنت) میں دائمی حیات سے اور مقعد صدق میں عزت و کرامت سے افضل و اعلیٰ کوئی نعمت نہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ قول باری تعالیٰ ہے: وَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْـًٔا۔ کہا گیا ہے کہ عَسٰی بمعنی قد ہے۔ الاصم نے یہی کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے واجبۃ (یعنی ضروری اور لازم ہونا) اور پورے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے لفظ عَسٰی واجبۃ کے معنی میں ہے (یعنی جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی جانب ہوتی ہے تو پھر اس میں شک کا معنی نہیں ہوتا، بلکہ بالیقین ثابت ہونے کا معنی ہوتا ہے۔) سوائے اس ارشاد گرامی کے: عَسٰی رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ یُّبْدِلَهٗۤ (التحریم: ۵) (کچھ بعید نہیں کہ اگر نبی کریم تم سب کو طلاق دے دیں تو آپ کا رب تمہارے عوض آپ کو ایسی بیبیاں عطا فرما دے جو تم سے بہتر ہوں۔)

ابوعبیدہ نے کہا ہے: عَسٰی کا لفظ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایجاب کے لئے ہے اور معنی یہ ہے: ہو سکتا ہے کہ تم جہاد میں پائی جانے والی مشقت کو ناپسند کرو حالانکہ وہ تمہارے لئے بہتر ہو، اس اعتبار سے کہ اس میں تمہیں غلبہ دے دیا جائے، تم کامیابی سے ہمکنار ہو، تم مال غنیمت حاصل کرو اور تمہیں اجر و ثواب بھی دیا جائے گا۔ اور اس دوران جو فوت ہوا وہ شہادت کی موت فوت ہوگا۔ اور ہو سکتا ہے کہ تم جہاد چھوڑنے اور ترک کر دینے کو پسند کرو، حالانکہ وہ تمہارے حق میں برا ہو اس اعتبار سے کہ پر غلبہ پالیا جائے، تمہیں ذلت و رسوائی پر مجبور کر دیا جائے اور تمہارے اختیارات اور حکومت ختم کر دی جائے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ صحیح اور درست ہے، اس پر کوئی غبار اور شک و شبہ نہیں۔ جیسا کہ بلاد اندلس میں اتفاق ہوا ہے،

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذہ

ان لوگوں نے جہاد چھوڑ دیا، انہوں نے جنگ سے بزدلی کا مظاہرہ کیا، اور اکثر اوقات میدان جہاد سے راہ فرار اختیار کی تو نتیجۃً دشمن وہاں کے شہروں پر قابض ہو گئے، پھر وہاں کے باسیوں کے ساتھ کیا ہوا؟ انہیں قیدی بنایا گیا، قتل کیا گیا، جلا وطن کیا گیا، اور غلام بنالیا گیا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ۔ یہ سب کچھ ہمارے ہاتھوں کا کیا ہوا تھا اور ان کی کمائی تھی۔

اور حسن نے کہا ہے: آیت کا معنی ہے تم پیش آنے والی سختیوں اور مصیبتوں کو ناپسند نہ کرو کیونکہ بسا اوقات جس امر کو تو ناپسند کر رہا ہوتا ہے اسی میں تیری نجات ہوتی ہے اور بسا اوقات جس امر کو تو پسند کرتا ہے اس میں تیری ہلاکت اور بربادی ہوتی ہے۔

ابوسعید الضریر نے کہا ہے

رُبَّ أمرٍ تتّقیهِ جرّ أمرًا ترتضیهِ — خفی المحبوب منه و بدا المکروہ فیه

کئی امور ہیں جن سے تو اجتناب کرتا ہے اور بچتا ہے وہ ایسے امر کو کھینچ لاتے ہیں جن سے تو راضی ہوتا ہے۔ پسندیدہ امر ان میں مخفی ہوتا ہے اور ناپسندیدہ امر ان میں ظاہر ہوتا ہے۔

یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِیْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِیْهِ كَبِیْرٌ ؕ وَ صَدٌّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ كُفْرٌۢ بِهٖ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَ الْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَ لَا یَزَالُوْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى یَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِیْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَ مَنْ یَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَیَمُتْ وَ هُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓىِٕكَ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝

”وہ پوچھتے ہیں آپ سے کہ ماہ حرام میں جنگ کرنے کا حکم کیا ہے۔ آپ فرمائیے کہ لڑائی کرنا اس میں بڑا گناہ ہے لیکن روک دینا اللہ کی راہ سے اور کفر کرنا اس کے ساتھ اور (روک دینا) مسجد حرام سے اور نکال دینا اس میں بسنے والوں کو اس سے، اس سے بھی بڑے گناہ ہیں اللہ کے نزدیک اور فتنہ (وفساد) قتل سے بھی بڑا گناہ ہے۔ اور وہ ہمیشہ لڑتے رہیں گے تم سے یہاں تک کہ پھیر دیں تمہیں تمہارے دین سے اگر بن پڑے۔ اور جو پھرے تم میں سے اپنے دین سے پھر مر جائے حالت کفر پر یہی وہ (بدنصیب) ہیں کہ ضائع ہو گئے ان کے عمل دنیا و آخرت میں اور یہی دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں (تو) یہی لوگ امید رکھتے ہیں اللہ کی رحمت کی اور اللہ بڑا بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا ہے“۔

اس میں بارہ مسئلے ہیں:۔

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: یَسْـَٔلُوْنَكَ اس لفظ کے بارے گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ جریر بن عبدالحمید اور محمد بن فضیل نے عطا بن سائب سے، انہوں نے سعید بن جبیر سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: میں نے حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب سے زیادہ بہتر قوم کوئی نہیں دیکھی۔ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صرف تیرہ مسائل کے بارے سوال کیا اور وہ تمام کے تمام قرآن کریم میں موجود ہیں۔

مثلاً یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ، یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ اور یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى اور وہ سوال نہ کرتے تھے مگر ایسی شے سے متعلق جو ان کے لئے نفع بخش ہوتی تھی۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے: تیرہ مسئلوں میں سے سوائے تین کے حدیث طیبہ میں کوئی نہیں ہے۔

ابوالیسار نے جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک جتھہ بھیجا اور ان پر ابوعبیدہ بن حارث یا عبیدہ بن حارث کو امیر مقرر کیا۔ پس جب وہ روانہ ہونے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے، تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فرط محبت سے فریفتہ ہو کر رونے لگے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو (امیر بنا کر) بھیج دیا اور انہیں ایک خط لکھ کر عطا فرمایا اور ساتھ ہی یہ حکم ارشاد فرمایا کہ وہ اس خط کو کھول کر نہ پڑھیں یہاں تک کہ وہ فلاں فلاں جگہ تک پہنچ جائیں اور ارشاد فرمایا: اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو سفر پر مجبور نہ کرنا۔ پس جب وہ اس مقررہ جگہ پر پہنچے تو خط پڑھا اور اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھا اور کہا: سمعاً و طاعةً لله و لرسوله (کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضا اور خوشنودی کے لئے حکم کی تعمیل میں دل و جان حاضر ہے۔)

راوی کا بیان ہے: دو آدمی واپس لوٹ آئے اور باقی افراد ان کے ساتھ آگے چلے گئے۔ چنانچہ ان کی ملاقات ابن حضرمی سے ہوئی، تو انہوں نے اسے قتل کر دیا اور انہیں اس کا علم نہ تھا کہ آج رجب کا پہلا دن ہے، تو اس پر مشرکین نے کہا: تم نے شہر حرام میں قتل کیا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ الآیہ (1)۔

اس آیت کے سبب نزول میں یہ روایت بھی ہے کہ بنی کلابہ کے دو آدمی عمرو بن امیہ ضمری سے ملے اور وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ دونوں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس سے تھے اور وہ دن رجب کا پہلا دن تھا۔ چنانچہ اس نے ان دونوں کو قتل کر دیا۔ تب قریش نے کہا: اس نے ان دونوں کو شہر حرام (حرام مہینے) میں قتل کیا ہے، پس یہ آیت نازل ہوئی۔

لیکن اس آیت کے سبب نزول میں حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کا واقعہ اکثر اور زیادہ مشہور ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں نو افراد کے گروہ کے ساتھ بھیجا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آٹھ افراد کے ساتھ غزوۂ بدر سے دو ماہ پہلے جمادی الآخر میں بھیجا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ رجب میں بھیجا تھا۔

ابو عمر نے کتاب الدرر میں اس کے بارے کہا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کرز بن جابر کی تلاش سے واپس لوٹ کر آئے۔ اس خروج کو بدر اولیٰ کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جمادی الثانی کے بقیہ ایام اور رجب کا مہینہ مدینہ طیبہ میں قیام فرما

1۔ تفسیر طبری، جلد 3، صفحہ 656-655

رہے اور رجب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جحش بن رئاب الاسدی کو بھیجا اور ان کے ساتھ مہاجرین میں سے آٹھ افراد اور بھی تھے۔ اور وہ تھے ابو حذیفہ بن عتبہ، عکاشہ بن محصن، عتبہ بن غزوان، سہیل بن بیضاء فہری، سعد بن ابی وقاص، عامر بن ربیعہ، واقد بن عبداللہ تیمی اور خالد بن بکیر لیثی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے لئے ایک خط تحریر فرمایا اور انہیں حکم ارشاد فرمایا کہ وہ اسے کھول کر نہ دیکھیں یہاں تک کہ وہ دو دن سفر کر لیں، پھر اسے کھول کر پڑھیں۔ پس آپ نے وہی کچھ کیا جس طرح کرنے کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا تھا۔ اور آپ اپنے اصحاب میں سے کسی کو مجبور نہ کریں اور آپ ان کے امیر ہیں۔ پس حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے ایسے ہی کیا جیسے آپ نے حکم ارشاد فرمایا تھا۔ پس جب آپ نے خط کھولا اور اسے پڑھا، تو اس میں پایا کہ جب تو میرے اس خط میں دیکھے تو پھر اس پر عمل کرنا یہاں تک کہ تو مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان مقام نخلہ پر اترنا اور وہاں قریش کی تاک میں رہنا اور ہمیں ان کی خبروں کے بارے آگاہ کرنا۔ اذا نظرت فی کتابی هذا فامض حتی تنزل نخلة بین مكة و الطائف فَتَرَصَّدْ بها قریشا، و تعلم لنا من اخبارهم۔

پس جب آپ نے تحریر پڑھی تو کہا: سمعاً و طاعة (دل و جان سے تعمیل ارشاد کے لئے حاضر ہیں) پھر اپنے ساتھیوں کو بھی اس کے بارے آگاہ کیا اور اس کے بارے بھی کہ وہ ان میں سے کسی کو مجبور نہ کریں گے اور یہ کہ وہ آپ کی خوشنودی کے لئے انہیں کو ساتھ لے کر اٹھیں گے جنہوں نے آپ کی اطاعت کی اور یہ کہ اگر کسی نے بھی آپ کی اطاعت نہ کی تو پھر وہ اکیلے ہی آگے بڑھیں گے۔ پس جو کوئی شہادت کو پسند کرتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ (آگے بڑھنے کے لئے) اٹھے، اور جو کوئی موت کو ناپسند کرتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ واپس لوٹ جائے۔ تو ساتھیوں نے جواب دیا: ہم تمام کے تمام اس (کام) میں رغبت رکھتے ہیں جس میں آپ رغبت رکھتے ہیں۔ اور ہم میں سے ہر ایک یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی تعمیل کے لئے دل و جان سے حاضر ہے۔ اور وہ سارے آپ کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور حجاز کی طرف چل پڑے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص اور عتبہ بن غزوان کا اونٹ بھاگ گیا، وہ دونوں اس کا پیچھا کرتے رہے اور اس کی تلاش میں پیچھے رہ گئے۔ اور حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں سمیت آگے چلے گئے یہاں تک کہ مقام نخلہ پر جا کر اترے، تو وہاں سے قریش کا ایک قافلہ گزرا، جو کشمش اور دیگر سامان تجارت اٹھائے ہوئے تھا اور اس میں عمرو بن حضرمی تھا۔ حضرمی کا نام عبداللہ بن عباد ہے جو صدف سے تعلق رکھتا تھا اور صدف حضرموت کا ایک قبیلہ ہے اور عثمان بن عبداللہ بن مغیرہ اور اس کا بھائی نوفل بن عبداللہ بن مغیرہ مخزومی اور حکم بن کیسان مولیٰ بنی مغیرہ بھی شامل تھے۔ پس مسلمانوں نے باہمی مشاورت کی اور کہا: ہم شہر حرام رجب کے آخری دن میں ہیں، پس اگر ہم ان سے قتال کرتے ہیں، تو ہم شہر حرام کی حرمت کو پامال کرنے کے مرتکب ہوتے ہیں اور اگر ہم انہیں آج رات چھوڑ دیتے ہیں تو پھر وہ حرم پاک میں داخل ہو جائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے ان کے ساتھ لڑنے پر اتفاق کر لیا اور واقد بن عبداللہ تیمی نے تیر مارا اور عمرو بن حضرمی کو قتل کر دیا اور عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کیسان کو قیدی بنا لیا اور نوفل بن عبداللہ بھاگ گیا۔

پھر سامان سے لدے ہوئے اونٹ اور دو قیدیوں کو ساتھ لے آئے اور حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: جو مال غنیمت ہم نے حاصل کیا ہے اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خمس علیحدہ کر دو۔ پس انہوں نے ایسا ہی کر دیا۔ اسلام میں پہلا خمس

یہی تھا۔ پھر قرآن کریم نازل ہوا: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ الآیہ (اور جان لو کہ جو کوئی چیز تم غنیمت میں حاصل کرو تو اللہ کے لئے ہے اس کا پانچواں حصہ الخ) (الانفال: ۴۱)

پس اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے فعل کو برقرار رکھا اور اسے پسند کیا اور یوم قیامت تک اسے امت کے لئے سنت قرار دیا۔ یہی پہلی غنیمت ہے جو اسلام میں حاصل ہوئی اور (حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ) پہلے امیر ہیں اور عمرو بن حضرمی پہلا مقتول ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر حرام میں ابن حضرمی کے قتل کو ناپسند کیا اور اس معاملہ کو قوم پر چھوڑ دیا گیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِیْهِ تا قولہ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ۝ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں قیدیوں کا فدیہ قبول کر لیا۔

پھر عثمان بن عبداللہ حالت کفر میں ہی مکہ مکرمہ میں فوت ہوا اور حکم بن کیسان نے اسلام قبول کر لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں ہی رہے یہاں تک کہ انہوں نے بئر معونہ میں جام شہادت نوش کیا اور حضرت سعد اور حضرت عتبہ رضی اللہ عنہما صحیح سالم مدینہ طیبہ کی طرف واپس لوٹ آئے۔

اور کہا گیا ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عتبہ رضی اللہ عنہما کا اپنے اونٹ کی تلاش میں جانا حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کی اجازت سے تھا۔ اور عمرو بن حضرمی اور اس کے ساتھیوں نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو دیکھا تو وہ ان سے خوفزدہ ہو گئے، تو حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بے شک یہ قوم تم سے خوفزدہ ہو کر گھبرا گئی ہے، پس تم اپنے میں سے ایک آدمی کا سر مونڈ دو اور پھر اسے چاہئے کہ وہ ان کے پاس چلا جائے۔ پس جب انہوں نے اسے دیکھا جس کا سر مونڈا ہوا تھا، تو وہ امن میں ہو گئے اور کہنے لگے: یہ قوم عمار ہے تم پر کوئی حرج اور خطرہ نہیں ہے اور پھر انہوں نے ان کے قتال کے بارے میں باہمی مشاورت کی۔ الحدیث۔

یہودیوں نے فال نکالی اور کہا: واقد سے مراد وقدت الحرب ہے یعنی جنگ بھڑک اٹھی اور عمرو سے مراد عمرت الحربُ ہے یعنی جنگ قائم ہو گئی اور حضرمی سے مراد حضرت الحربُ ہے جنگ شروع ہو گئی۔

اہل مکہ نے اپنے قیدیوں کا فدیہ بھیجا تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم ان دونوں کا فدیہ قبول نہیں کریں گے یہاں تک کہ حضرت سعد اور حضرت عتبہ رضی اللہ عنہما آ جائیں اور اگر وہ دونوں نہ آئے تو ہم ان دونوں کو ان کے بدلے قتل کر دیں گے۔ پس جب وہ دونوں آ گئے تو ان دونوں نے فدیہ ادا کر دیا۔ پھر حکم نے تو اسلام قبول کر لیا اور مدینہ طیبہ میں ہی مقیم ہو گیا یہاں تک کہ غزوۂ بئر معونہ میں شہید کر دیا گیا۔ رہا عثمان! تو وہ مکہ مکرمہ کی طرف لوٹ گیا اور وہیں حالت کفر میں مر گیا اور رہا نوفل! تو اس غزوہ احزاب کے دن اپنے گھوڑے کو ایڑی لگائی تاکہ وہ خندق کو عبور کر کے مسلمانوں پر حملہ آور ہو سکے، تو وہ اپنے گھوڑے سمیت خندق میں گر گیا اور دونوں کے اعضائے بدن ٹوٹ گئے۔ پس اس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے مار ڈالا۔ مشرکین نے اس کا مردہ جسم ثمن کے عوض طلب کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "تم اسے اٹھا لو کیونکہ اس کا مردہ بدن بھی ناپاک ہے اور اس کی دیت بھی ناپاک ہے" خذوہ فانہ خبیث الجیفۃ خبیث الدیۃ پس یہی اس ارشاد باری تعالیٰ کے

نزول کا سبب ہے: یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ الآیۃ۔

ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے کہ عمرو بن حضرمی کا قتل رجب کے آخری دن میں ہوا، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور طبری نے سدی وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ وہ جمادی الثانی کے آخری دن قتل ہوا، لیکن پہلا قول زیادہ مشہور ہے، اس بنا پر کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ وہ رجب کی پہلی رات میں ہوا اور مسلمان اسے جمادی الثانی میں سے گمان کرتے تھے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے کہ صاحب بن عباد نے اپنے رسالہ المعروفہ بالاسدیہ میں ذکر کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو اس وقت امیر المومنین کا نام دیا گیا اس لئے کہ انہیں مومنین کی ایک جماعت پر امیر مقرر کیا گیا تھا۔

مسئلہ نمبر 2۔ علماء کا اس آیت کے نسخ کے بارے اختلاف ہے، پس جمہور اس کے نسخ کے قائل ہیں اور یہ کہ اشہر حرام میں مشرکین کے ساتھ قتال کرنا مباح ہے۔ البتہ اس کے ناسخ کے بارے میں ان کا اختلاف ہے۔ زہری نے کہا ہے: اسے ارشاد باری تعالیٰ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِیْنَ كَآفَّةً (التوبہ: ۳۶) (اور جنگ کرو تمام مشرکوں سے) نے منسوخ کر دیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر حرام میں بنی ثقیف کے ساتھ جنگ کرنے نے منسوخ کیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو عامر کو شہر حرام میں اوطاس کی طرف جنگ کے لئے بھیجا تھا (لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل اس حکم کے لئے ناسخ ہے۔)

اور ایک قول یہ کیا گیا ہے: ذوالقعدہ کے مہینہ میں جنگ پر بیعت رضوان لینے نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔ اور یہ ضعیف ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب مکہ مکرمہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیئے جانے کی خبر پہنچی اور یہ کہ وہ (اہل مکہ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے ان کے دفاع پر بیعت لی (کہ وہ ان کا مقابلہ پوری جرأت کے ساتھ کریں گے۔) نہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیعت ان سے جنگ کی ابتدا کرنے کے لئے لی۔

اور امام بیہقی نے عروہ بن زبیر سے محمد بن اسحاق کی حدیث کے علاوہ حضرمی کے قصہ میں بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِیْهِ الآیہ۔ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی کتاب میں یہ بیان کیا ہے کہ شہر حرام میں قتال اسی طرح حرام ہے جیسے پہلے تھا اور جس سبب سے مومنین اسے حلال سمجھتے ہیں تو وہ اس (قتال) سے بڑا جرم ہے۔ وہ یہ کہ (کفار) انہیں اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکتے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کر کے جائیں، وہ انہیں بیڑیاں پہنا دیتے ہیں، انہیں طرح طرح کی اذیتیں دیتے اور ستاتے ہیں اور انہیں محبوس کر لیتے ہیں۔ وہ خود اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور مسلمانوں کو حج وعمرہ اور نماز کے لئے مسجد حرام میں داخل ہونے سے روکتے ہیں اور وہ مسجد حرام کے باسیوں کو باہر نکالتے ہیں حالانکہ اس کے مکین مسلمان ہیں اور دین کے بارے میں انہیں طرح طرح کی آزمائشوں میں مبتلا رکھتے ہیں اور ہم تک یہ خبر بھی پہنچی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن حضرمی کے قتل کی دیت ادا فرمائی اور شہر حرام کو اسی طرح حرام قرار دیا جس طرح وہ انہیں حرام قرار دیتے تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ (التوبہ: 1) (یہ قطع تعلق (کا اعلان) ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے) (1)

1۔ دلائل النبوۃ للبیہقی، جلد 3، صفحہ 17-18

حضرت عطا کہتے ہیں کہ یہ آیت محکم ہے اور اشہر حرام میں قتال جائز نہ ہوگا اور اسی پر حلف اٹھایا جا سکتا ہے، کیونکہ اس کے بعد وارد ہونے والی آیات زمانہ کے اعتبار سے عام ہیں اور یہ خاص ہے اور بالاتفاق عام خاص کے لئے ناسخ نہیں ہو سکتا۔

اور ابوالزبیر نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہر حرام میں جنگ نہ کرتے تھے مگر یہ کہ آپ کے ساتھ جنگ کی جاتی۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: قِتَالٍ فِيْهِ۔ اس میں قِتَالٍ سیبویہ کے نزدیک بدل اشتمال ہے، کیونکہ سوال مہینے اور قتال دونوں پر مشتمل ہے۔ یعنی کفار مہینے کی حرمت کو توڑنے پر تعجب کرتے ہوئے آپ سے سوال کر رہے ہیں۔ پس ان کا سوال شہر (مہینے) کے متعلق ہوا، صرف اس لئے کہ اس میں قتال پایا گیا۔

زجاج نے کہا ہے: معنی یہ ہے کہ وہ آپ سے شہر حرام میں جنگ کے بارے سوال کرتے ہیں۔

اور قتبی نے کہا: وہ آپ سے شہر حرام میں جنگ کرنے کے بارے پوچھتے ہیں: کیا یہ جائز ہے؟ پس اسی وجہ سے انہوں نے قتال کو شہر سے بدل قرار دیا ہے اور سیبویہ نے ایک شعر بھی بیان کیا ہے:

فما كان قيسٌ هُلكُه هُلْكَ وَاحِدٍ و لكنه بُنيانُ قومٍ تهدَّما

قیس کا ہلاک ہو جانا ایک آدمی کا ہلاک ہونا نہیں ہے بلکہ اس کا ہلاک ہونا تو پوری قوم کے محل کے گر جانے کے مترادف ہے۔ (تو اس میں هُلكُه قیس سے بدل ہے۔)

عکرمہ نے اس طرح قراءت کی ہے: يَسْأَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قَتْلٍ فِيْهِ قُلْ قَتْلٌ یعنی دونوں مقامات پر (قتال کو) بغیر الف کے پڑھا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ آپ سے شہر حرام کے بارے میں اور اس میں جنگ کرنے کے بارے میں سوال کرتے ہیں (یعنی يسألونك عن الشهر الحرام و عن قتال فيه) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسی طرح قراءت کی ہے۔ پس اس صورت میں قتال، عن، مکررہ کی وجہ سے مجرور ہوگا۔ کسائی نے یہی کہا ہے۔ اور فراء نے کہا ہے کہ قتال مجرور ہے کیونکہ اس سے پہلے عن۔ نیۃً موجود ہے۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ قتال جوار کی بنا پر مجرور ہے۔ (یعنی چونکہ یہ مجرور کے پڑوس میں ہے جو کہ الشهر الحرام ہے، اس لئے اس کا اعراب اسے بھی دے دیا گیا ہے۔)

نحاس نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے کہ کتاب اللہ میں کسی لفظ کو حق جوار کی بنا پر کوئی اعراب دے دیا جائے اور نہ ہی کسی اور کلام میں ایسا کرنا جائز ہے۔ کیونکہ محض جوار کا اعتبار غلط ہے اور جہاں کہیں ایسا ہوا ہے وہ شاذ ہے۔ جیسا کہ عربوں کا یہ قول ہے: هذا جُحْرُ ضَبٍّ خَرِبٍ اور اس کے غلط ہونے پر دلیل تثنیہ میں عربوں کا یہ قول ہے: هذان جحرا ضب خربان بلاشبہ یہ اِقواء (شعر کے قافیہ کو مختلف کرنا یعنی کسی کو رفع دینا اور کسی کو جر دینا) کے قائم مقام ہے۔ لہٰذا یہ جائز نہیں ہوگا کہ کتاب اللہ میں سے کسی شے کو اس پر محمول کیا جائے اور افصح اور اصح لغات کے سوا اس طرح نہیں ہو سکتا۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: اور ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ یہ حق جوار کی بنا پر مجرور ہے، ان کا یہ قول خطا ہے۔

نحاس نے کہا ہے کہ عن کو مضمر کرنا جائز نہیں ہے اور اس بارے میں یہ قول کرنا کہ یہ بدل ہے (بھی جائز نہیں)

اعرج نے قتال کو مرفوع پڑھا ہے یعنی یسألونك عن الشهر الحرام قتالٌ فيه

نحاس نے کہا ہے: یہ عربی میں ابہام اور پیچیدگی ہے اور اس میں معنی یہ ہے کہ وہ آپ سے شہر حرام کے بارے سوال کر رہے ہیں، کیا اس میں قتال جائز ہے؟ اور ارشاد باری تعالیٰ یَسْـَٔلُوْنَكَ استفہام پر دلالت کرتا ہے۔ جیسا کہ امرؤ القیس نے کہا ہے:

أصاحِ ترى برقًا أُرِيكَ وَ مِيضَه　　كلمعِ اليدَيْن في حَبِيٍّ مُكَلَّلِ

اے میرے ساتھی! کیا تو اس بجلی کو دیکھ رہا ہے جس کی چمک تجھے دکھائی گئی اونچے بادلوں کی چمک میں دونوں ہاتھوں کی چمک (حرکت) کی طرح۔

تو اس میں تریٰ سے پہلے الف استفہام کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ أصاحِ کا الف اس پر دلالت کر رہا ہے۔ اگرچہ وہ حرف ندا ہے۔ اسی طرح ایک اور شاعر نے کہا ہے:

تَرُوحُ من الحیّ ام تَبْتَكِر

کیا تو قبیلے سے شام کے وقت جائے گا یا صبح کے وقت۔

تو اس میں بھی اصل عبارت أتروح ہے، ہمزہ استفہام کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ ام اس پر دلالت کر رہا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ۔ یہ مبتدا اور خبر ہیں۔ یعنی اس میں قتال کرنا انتہائی ناپسندیدہ اور گناہ کا عمل ہے۔ کیونکہ شہر حرام میں قتال کو حرام قرار دینا اس وقت ثابت ہے جبکہ ابتدا مسلمانوں کی طرف سے ہو۔ آیت میں لفظ الشَّهْرِ اسم جنس ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عربوں کے لئے شہر حرام کو قوام بنا دیا تھا، وہ اس دوران اعتدال برتتے تھے، وہ خون نہیں بہاتے تھے اور نہ ہی اشہر حرام میں غارتگری کرتے تھے۔ اشہر حرام سے مراد رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم ہیں۔ ان میں تین مسلسل اور لگاتار ہیں اور ایک منفرد ہے۔ اس کی مزید تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ سورۃ المائدہ میں آئے گی۔

مسئلہ نمبر 5۔ قول باری تعالیٰ: وَ صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مبتدا ہے اور وَ كُفْرٌۢ بِهٖ، صَدٌّ پر معطوف ہے۔ اور وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کا سبیل اللہ پر عطف کیا گیا ہے۔ وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ بھی صَدٌّ پر معطوف ہے۔ اور مبتدا کی خبر اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ہے۔ یعنی مذکورہ اعمال کرنا شہر حرام میں قتال کرنے سے بھی بڑھ کر گناہ ہیں۔ یہ قول مبرد وغیرہ نے کیا ہے اور یہی صحیح ہے، کیونکہ اس میں لوگوں کو طویل عرصہ تک کعبہ معظمہ کا طواف کرنے سے روکنا ہے۔ اور وَ كُفْرٌۢ بِهٖ میں ضمیر سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہو سکتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنا اور بعض نے کہا ہے: اس سے مراد ہے بالحج والمسجد الحرام۔ یعنی حج اور مسجد حرام میں کفر کا ارتکاب کرنا۔ اور وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ یعنی وہاں سے باسیوں کو نکالنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک شہر حرام میں قتال کرنے سے بھی بڑا جرم اور گناہ ہے (اور اس کی سزا زیادہ ہے۔)

فراء نے کہا ہے: صَدٌّ کا عطف كَبِيْرٌ پر کیا گیا ہے اور وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کا عطف بِهٖ کی ہا ضمیر پر کیا گیا ہے۔ پس یہ کلام عطف نسق اور متصل ہے منقطع نہیں ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ غلطی ہے کیونکہ معنی جاری رہتا ہے یہاں تک کہ او کفر بہٖ ای باللہ کا عطف بھی کَبِیْرٌ پر کردیا جائے۔ اور اس سے یہ معنی ظاہر ہوگا کہ اہل مسجد کو مسجد سے نکالنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک کفر سے بھی بڑا جرم ہے۔ اور اس معنی کا فاسد ہونا بالکل ظاہر اور بین ہے۔

جمہور کے قول کے مطابق آیت کا معنی یہ ہے: اے کفار قریش! بلاشبہ تم ہمارے بارے میں شہر حرام میں جنگ کرنے کو بہت بڑا جرم سمجھ رہے ہو، حالانکہ جو کچھ تم کر رہے ہو یعنی جو کوئی اسلام قبول کرنے کا ارادہ کرے اسے اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکنا، تمہارا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنا اور تمہارا اہل مسجد کو مسجد سے نکالنا، جیسا کہ تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب علیہم الرضوان کے ساتھ کیا، اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس سے زیادہ اور بڑا جرم ہے(1)۔

حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے کہا ہے:

تَعُدُّون قتلاً فی الحرام عظیمۃً　　واعظمُ منه لویَرَی الرُّشدَ راشِدُ

تم ماہ حرام میں قتل کو بڑا گناہ شمار کر رہے ہو حالانکہ اگر کوئی ہدایت یافتہ راہ ہدایت کو دیکھے تو اس سے بھی بڑے گناہ یہ ہیں:

صُدُودکُمْ عما یقول محمّدٌ　　وَ کُفرٌ به واللهُ راءٍ و شاهدُ

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ارشادات سے تمہاری مخالفت اور آپ سے کفر، اللہ تعالیٰ یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے اور اس کا گواہ ہے۔

واخراجکم من مسجد الله اهله　　لئلا یُرَی لله فی البیت ساجد

اور تمہارا اللہ کی مسجد سے اس میں بسنے والوں کو نکال دینا تاکہ بیت اللہ میں اللہ تعالیٰ کے حضور کوئی سجدہ کرنے والا نظر نہ آئے۔

فانّا وإن عَیّر تمونا بقتْله　　وأرجفَ بالِاسلام باغٍ و حاسدُ

اگرچہ تم نے ہمیں قتل کی عار دلائی اور سرکش اور حسد کرنے والوں نے اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کیا۔

سَقَیْنَا من ابنِ الحَضْرَمی رماحنا　　بِنَخْلَةَ لما أوقد الحربَ واقدُ

لیکن ہم نے وادیٔ نخلہ میں ابن حضرمی کے خون سے اپنے نیزوں کو سیراب کیا جب واقد نے جنگ کی آگ بھڑکائی

دَمًا وابنُ عبدالله عثمان بیننا　　یُنازعه غُلٌّ من القِدِّ عانِدُ

عثمان بن عبداللہ ہمارے پاس ہے، تسمے کے خون آلود طوق نے اسے جکڑ رکھا ہے۔

زہری اور مجاہد وغیر ہما نے کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ قُلْ قِتَالٌ فِیْهِ کَبِیْرٌ منسوخ ہے اور اس کا ناسخ یہ ارشاد ہیں وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِیْنَ كَآفَّةً اور فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ (توبہ: 5)۔

حضرت عطا نے کہا ہے: یہ منسوخ نہیں ہے اور اشہر حرام میں قتال نہیں کرنا چاہیے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ۔ مجاہد وغیرہ نے کہا ہے کہ یہاں فتنہ سے مراد کفر ہے۔ یعنی تمہارا کفر کرنا ہمارے انہیں قتل کرنے سے بڑا جرم ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1 صفحہ 290

جمہور نے کہا ہے: یہاں فتنہ سے مراد ان (کفار) کا مسلمانوں کو ان کے دین کے بارے میں فتنہ اور آزمائش میں مبتلا کرنا ہے یہاں تک کہ وہ ہلاک ہو گئے، یعنی تمہارا یہ رویہ اختیار کرنا اشہر حرام میں تمہیں قتل کرنے سے زیادہ شدید اور سخت جرم ہے (1)۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا يَزَالُوْنَ۔ یہ ابتداءً اللہ تعالیٰ کی جانب سے خبر ہے، اور اس کے ذریعہ مومنین کو کافروں کے شر سے ڈرانا ہے۔ مجاہد نے کہا ہے: مراد کفار قریش ہیں اور يَرُدُّوْكُمْ حَتّٰى کے سبب منصوب ہے، کیونکہ یہ خلاصۂ غایت ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ اور جو کوئی اسلام سے کفر کی جانب لوٹ جائے۔ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ تو ان کے عمل باطل ہو گئے اور فاسد ہو گئے۔ اسی سے الحبط بھی ہے۔ مراد وہ بیماری ہے جو جانوروں کے پیٹوں میں بہت زیادہ گھاس اور چارہ وغیرہ کھا جانے سے لگ جاتی ہے۔ اس کے سبب ان کے پیٹ پھول جاتے ہیں اور بسا اوقات اسی سبب سے ان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہ آیت مسلمانوں کے لئے بطور تہدید ہے تاکہ وہ دین اسلام پر ثابت قدم رہیں۔

مسئلہ نمبر 9۔ علماء کے مابین مرتد کے بارے یہ اختلاف ہے کہ کیا اسے توبہ کی ترغیب دی جائے گی یا نہیں؟ کیا نفس ردت کے ساتھ ہی اس کے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں یا نہیں؟ مگر یہ کہ اس کی موت کفر پر واقع ہو؟ کیا اسے وارث بنایا جائے گا یا نہیں؟ یہ تین مسائل ہیں۔

(۱) ایک گروہ نے کہا ہے: اسے توبہ کی ترغیب دی جائے گی، پس اگر وہ توبہ کر لے تو فبہا، ورنہ اسے قتل کر دیا جائے گا۔ ان میں سے بعض نے کہا ہے: ایک ساعت ترغیب دی جائے گی اور دوسروں نے کہا ہے: ایک مہینہ تک اسے توبہ کی رغبت دلائی جائے گی اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اسے تین (بار) توبہ کے لئے کہا جائے گا۔ اسی طرح حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ یہی قول حضرت امام مالک رحمہ اللہ کا ہے جسے آپ سے ابن قاسم نے روایت کیا ہے۔

حسن نے کہا ہے: اسے سو بار توبہ کی ترغیب دلائی جائے گی اور آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ اسے توبہ کی رغبت دلائے بغیر ہی قتل کر دیا جائے گا۔ امام شافعی نے بھی اپنے ایک قول میں یہی کہا ہے اور یہی طاؤس اور عبید بن عمیر کے دو قولوں میں سے ایک ہے۔

سحنون نے ذکر کیا ہے کہ عبدالعزیز بن ابی سلمہ ماجشون کہا کرتے تھے: مرتد کو قتل کیا جائے گا اور اسے توبہ کی ترغیب نہیں دی جائے گی اور انہوں نے حضرت معاذ اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ اس میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف بھیجا تو ان کے پیچھے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ جب وہ ان کے پاس پہنچے تو انہوں نے کہا: تشریف رکھیے اور ان کے لئے تکیہ وغیرہ رکھا۔ تو اس وقت ان کے پاس ایک آدمی تھا جسے بیڑیاں پہنائی گئی تھیں، تو آپ نے پوچھا: یہ کون ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: یہ یہودی تھا، اس نے اسلام قبول کیا، اس نے پھر اپنے دین کو برے دین کی طرف لوٹا دیا ہے اور یہ یہودی ہو گیا ہے، تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نہیں بیٹھوں گا یہاں تک کہ اسے قتل کر دیا جائے، یہی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ہے۔ تو حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 290۔ تفسیر طبری، جلد 3، صفحہ 659

بیٹھ جایئے۔ انہوں نے کہا: (ہاں) میں نہیں بیٹھوں گا یہاں تک کہ اسے قتل کر دیا جائے، یہی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ہے۔ تین بار آپ نے یہی کہا۔ چنانچہ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے اس کے بارے حکم دیا اور اسے قتل کر دیا گیا۔ یہ روایت امام مسلم وغیرہ نے بیان کی ہے۔(1)

حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ مرتد پر اسلام پیش کیا جائے گا، اگر وہ اسلام قبول کر لے تو فبہا، ورنہ اسی جگہ اسے قتل کر دیا جائے گا مگر اس صورت میں کہ وہ مہلت کا مطالبہ کرے۔ پس اگر اس نے مہلت کا مطالبہ کیا، تو اسے تین دن کی مہلت دی جائے گی لیکن آپ سے اور آپ کے اصحاب سے مشہور قول یہ ہے کہ مرتد کو قتل نہ کیا جائے گا یہاں تک کہ اسے توبہ کی ترغیب دی جائے، ان کے نزدیک زندیق اور مرتد برابر ہیں۔ اور امام مالک نے کہا ہے کہ زنادقہ کو قتل کیا جائے گا اور انہیں توبہ کی ترغیب نہیں دی جائے گی۔ یہ پہلے سورۃ البقرہ (ج:۱ص:۱۹۸) میں گزر چکا ہے۔

جو کوئی کفر کی ایک نوع سے نکل کر کفر کی ہی دوسری نوع میں داخل ہوا، تو اس کے بارے علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور جمہور فقہاء نے کہا ہے: اس سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا، کیونکہ اس طرح وہ اسی کفر کی طرف ہی منتقل ہوا ہے جس پر وہ ابتدا میں تھا، لہٰذا اسے اسی پر برقرار رکھا جائے گا۔ ابن عبدالحکم نے حضرت امام شافعی سے بیان کیا ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے گا۔ کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من بدّل دینہ فاقتلوہ جو کوئی اپنا دین بدل دے تم اسے قتل کر دو(2)۔ اور آپ نے کسی مسلمان کو کافر سے خاص نہیں کیا۔

امام مالک نے فرمایا ہے: حدیث کا معنی یہ ہے جو کوئی اسلام سے نکل کر کفر کی طرف جائے اور رہا وہ جو کفر سے کفر کی طرف نکلا تو وہ اس حدیث سے مراد نہیں۔ یہی فقہاء کی ایک جماعت کا قول ہے۔

امام شافعی سے مشہور قول وہ ہے جو مزنی اور ربیع نے ذکر کیا ہے کہ اہل ذمہ میں سے اپنا دین بدلنے والے کو امام وقت دارالحرب بھیج دے گا اور اسے اپنے شہر (ملک) سے نکال دے گا اور حربیوں کے اموال کے ساتھ اس کا مال بھی حلال ہو جائے گا اور دارالحرب پر غلبہ پالیا گیا۔ کیونکہ امام وقت نے اسے اس دین کی بنا پر ذمی بنایا تھا جس پر وہ عقد ذمہ کے وقت تھا۔

مرتدہ عورت کے بارے علماء کے مابین اختلاف ہے:

امام مالک، امام اوزاعی، امام شافعی اور لیث بن سعد رحمہم اللہ نے کہا ہے: مرتد ہونے والی عورت کو قتل کر دیا جائے گا جیسا کہ مرتد آدمی کو قتل کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں برابر ہیں۔ اور ان کی دلیل ظاہر حدیث ہے من بدّل دینہ فاقتلوہ اور اس میں لفظ مَن مذکر و مونث دونوں کی صلاحیت رکھتا ہے۔

امام ثوری، امام اعظم ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ مرتدہ عورت کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ یہی ابن شبرمہ کا قول ہے، اسی کو ابن علیہ نے اختیار کیا ہے اور یہی حضرت عطا اور حسن کا قول ہے اور انہوں نے استدلال اس سے کیا ہے کہ

1۔ بخاری شریف، باب حکم المرتد والمرتدۃ الخ، حدیث نمبر 6412، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ بخاری شریف، باب لا یعذب بعذاب اللہ، حدیث نمبر 2794، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضور نبی مکرم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: من بدل دینه فاقتلوه۔ پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مرتدہ عورت کو قتل نہیں کیا اور جو حدیث روایت کرتا ہے وہ اس کی تاویل اور مفہوم بہتر جانتا ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے نیز آپ ﷺ نے عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے۔

اور پہلے فریق نے آپ ﷺ کے اس ارشاد سے بھی استدلال کیا ہے: ''کسی مسلمان کا خون حلال نہیں ہوتا مگر تین میں سے ایک کے ساتھ (یعنی) ایمان کے بعد کفر اختیار کرنا ..... الحدیث۔'' پس یہ حکم ہر اس آدمی کو شامل ہوگا جس نے ایمان کے بعد کفر اختیار کیا (چاہے وہ مرد ہو یا عورت) اور یہی زیادہ صحیح ہے۔

مسئلہ نمبر 10۔ امام شافعی نے کہا ہے: بے شک وہ آدمی جو مرتد ہوا (نعوذ باللہ) پھر اسلام کی طرف واپس آگیا تو نہ اس کے اعمال ضائع ہوں گے اور نہ ہی اس کا وہ حج ضائع ہوگا جس سے وہ فارغ ہو چکا۔ بلکہ اگر وہ حالت ردت پر ہی فوت ہو گیا تب اس کے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔

امام مالک نے فرمایا ہے: مرتد ہوتے ہی اس کے اعمال ضائع ہو جائیں گے، اختلاف کا اظہار مسلمان میں ہوگا کہ جب وہ حج کرے، پھر مرتد ہو جائے اور پھر اسلام قبول کر لے۔ پس امام مالک نے فرمایا کہ اس پر حج کرنا لازم ہوگا، کیونکہ اس کا پہلا حج ردت کے سبب ضائع ہو چکا ہے۔ اور امام شافعی نے فرمایا: اس پر حج کا اعادہ لازم نہیں ہوگا، کیونکہ ابھی اس کے عمل باقی ہیں۔

ہمارے علماء نے اس ارشاد باری تعالیٰ سے استدلال کیا ہے: لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ (الزمر: 65) (کہ اگر (بفرض محال) آپ نے بھی شرک کیا تو آپ کے اعمال ضائع ہو جائیں گے)

انہوں نے کہا: یہ خطاب حضور نبی مکرم ﷺ کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے، کیونکہ آپ ﷺ سے شرعاً ردت کا پایا جانا محال ہے۔

اور امام شافعی کے اصحاب نے کہا ہے: بلکہ امت پر بطریق تغلیظ یہ خطاب حضور نبی مکرم ﷺ کو ہی ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ اپنے شرف مرتبہ کے باوجود اگر شرک کا ارتکاب کریں تو ان کے اعمال ضائع ہو جائیں گے، تو پھر تمہارا کیا حال ہوگا؟ لیکن آپ اپنے مرتبہ کے فضل و شرف کے سبب شرک نہیں کریں گے، جیسا کہ یہ ارشاد ہے: يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ (الاحزاب: ۳۰) (اے نبی کریم کی بیبیو! جس کسی نے تم میں سے کھلی بیہودگی کی تو اس کے لئے عذاب کو دو چند کر دیا جائے گا۔) اور یہ ان کے شرف مرتبہ کے سبب ہے۔ ورنہ ان سے اس قسم کے فعل کے ارتکاب کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ان کے زوج مکرم و معظم کی حفاظت و صیانت کی خاطر، یہ ابن عربی نے کہا ہے۔ (1)

ہمارے علماء نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے یہاں اس کی دونوں شرطوں کو پورا کرنے کا ذکر کیا ہے کیونکہ اس پر خلود فی النار کی جزا کو معلق کیا ہے۔ پس جو کوئی کفر پر قائم رہا اللہ تعالیٰ اس آیت کے مطابق اسے ہمیشہ کے لئے جہنم میں ڈال دے گا اور

1۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 147

جس کسی نے شرک کا ارتکاب کیا دوسری آیت کے مطابق اس کے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔ پس یہ دونوں آیتیں دو معنوں اور دو مختلف حکموں کے لئے مفید ہیں اور جو خطاب آپ ﷺ کو کیا گیا ہے تو وہی آپ کی امت کے لئے ہے تا کہ آپ کا اختصاص ثابت ہو جائے اور جو آپ ﷺ کی ازواج مطہرات کے بارے وارد ہے، تو بلاشبہ ان کے بارے میں یہ کہا گیا ہے تا کہ وہ یہ واضح کر دے کہ اگر ایسا تصور بھی کیا جائے تو یقیناً اس میں دو بے عزتیاں ہیں۔ اس میں ایک حرمت دین کی ہتک ہے اور دوسری حرمت نبی ﷺ کی ہتک ہے اور ہر حرمت کی ہتک پر عقاب اور سزا ہے۔ اور یہ اس کے قائم مقام ہو جائے گا جس نے شہر حرام میں، یا بلد حرام میں، یا مسجد حرام میں گناہ اور نافرمانی کا ارتکاب کیا اور جتنی حرمتوں کو اس نے پامال کیا ان کی تعداد کے مطابق اس پر عذاب دو چند کر دیا جائے گا۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 11۔ مرتد کی میراث میں علماء کا اختلاف ہے:

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، حسن، شعبی، حکم، لیث، ابو حنیفہ اور اسحاق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: مرتد کی میراث اس کے مسلمان ورثاء کے لئے ہے۔

امام مالک، ربیعہ، ابن ابی لیلیٰ، شافعی اور ابو ثور رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: اس کی میراث بیت المال میں جائے گی۔ ابن شبرمہ، ابو یوسف، محمد اور اوزاعی رحمۃ اللہ علیہم نے دو روایتوں میں سے ایک میں کہا ہے کہ مرتد نے ردت کے بعد جو کچھ کمایا وہ اس کے مسلمان ورثاء کے لئے ہوگا۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: مرتد نے حالت ردت میں جو کچھ کمایا وہ مال فے ہے، اور حالت اسلام میں جو کچھ اس نے کمایا پھر مرتد ہو گیا تو اس کے وارث اس کے مسلمان ورثاء ہوں گے۔

لیکن ابن شبرمہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہم دونوں امروں کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے اور حضور نبی مکرم ﷺ کا مطلق ارشاد گرامی لا وراثة بین اهل ملتین (دو دین رکھنے والوں کے درمیان کوئی وراثت نہیں) ان کے قول کے باطل ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ سوائے حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے تمام نے اس پر اجماع کیا ہے کہ اس کے کافر ورثاء اس کے وارث نہیں بنیں گے۔ لیکن آپ نے کہا ہے کہ وہ اس کے وارث بن سکتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 12۔ ارشاد باری تعالیٰ: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا الآیہ۔ جندب بن عبد اللہ اور عروہ بن زبیر وغیرہما نے کہا ہے کہ جب واقد بن عبد اللہ تمیمی رضی اللہ عنہ نے عمرو بن حضرمی کو شہر حرام میں قتل کیا تو رسول اللہ ﷺ نے اس مال کا خمس لینے سے توقف فرمایا جو آپ کے لئے مال اور دو قیدیوں کی صورت میں حضرت عبد اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو عطا کیا گیا تھا، تو مسلمانوں نے حضرت عبد اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں سخت رویہ اختیار کیا یہاں تک کہ وہ ان پر شاق گزرنے لگا، تو اللہ تعالیٰ نے شہر حرام میں اس آیت کے ساتھ ان کی تلافی فرمائی اور ان سے غم اور پریشانی کو دور فرما دیا۔ اور یہ خبر دی کہ ان کے لئے ہجرت کرنے والے اور جہاد کرنے والے کا ثواب ہے۔ انہی کی طرف اس قول میں اشارہ فرمایا اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا پھر یہ آیت ہر اس کے حق میں باقی رہی جس نے وہ عمل کیا جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگرچہ انہوں نے کسی گناہ کا ارتکاب تو نہیں کیا لیکن ان کے لئے کوئی اجر بھی نہیں ہے۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل

فرمائی: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا الی آخر الآیہ۔

اور ہجرت کا معنی ہے الانتقال من موضع الی موضع ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف منتقل ہونا اور دوسری جگہ کے لئے ایثار کرتے ہوئے پہلی کو ترک کرنے کا قصد کرنا۔ ہجر وصل کی ضد ہے۔ (کہا جاتا ہے) هَجرهٗ هَجْرا و هِجرانا (فلاں نے اسے چھوڑ دیا) اور اس کا اسم الهِجرة ہے۔ اور المهاجرة من ارض الی ارض کا معنی ہے دوسری جگہ کے لئے پہلی کو چھوڑ دینا، ترک کر دینا۔ اور التهاجُر کا معنی التقاطع (باہمی مقاطعہ کرنا، تعلق توڑ دینا) ہے۔

اور جس نے المهاجرة کی تعریف یہ کی ہے الانتقال من البادية الی الحاضرة یعنی دیہات سے شہر کی طرف منتقل ہونا تو اس نے اس سبب سے یہ وہم دلایا ہے کیوں کہ عرب میں اغلباً ایسا ہی ہوا ہے اور اس قول کے مطابق اہل مکہ مہاجرین نہیں ہیں۔

اور رہا جاهد تو یہ جَهْد سے باب مفاعلہ ہے، جب کوئی پوری کوشش اور محنت صرف کر دے (اس کا مصدر) مجاهدة و جهادا ہے۔ اور اجتہاد اور تجاہد کا معنی ہے بذل الوسع والمجهود پوری طاقت، صلاحیت اور محنت کو صرف کر دینا۔ اور الجَهاد بالفتح کا معنی ہے: سخت اور مضبوط زمین۔ اور وَيَرْجُوْنَ کا معنی ہے وہ طمع اور حرص رکھتے ہیں اور حصول قرب کے متمنی ہیں۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے يَرْجُوْنَ کا کلمہ ان کی مدح اور تعریف میں بیان فرمایا ہے کیونکہ اس دنیا میں کوئی بھی نہیں جانتا کہ وہ جنت کی طرف جائے گا اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری میں آخری حد کو پہنچا ہوا ہو، اس کے دو سبب ہیں: ایک یہ ہے کہ وہ یہ نہیں جانتا کہ اس کا خاتمہ کون سے عمل پر ہوگا اور دوسرا یہ ہے: تاکہ وہ اپنے عمل پر توکل اور بھروسہ نہ کر لے۔

اور رجا (امید) عام ہوتی ہے اور رجا کے ساتھ ہمیشہ خوف بھی ہوتا ہے اور یہ بھی ضروری ہے، جیسا کہ خوف کے ساتھ رجا (امید) ہوتی ہے۔ گویا رجا ایک طویل اور وافر امید کا نام ہے۔ کہا جاتا ہے: رجوتُ فلانا رجْوا و رجاء و رجاوة (میں فلاں سے امید باندھے ہوئے ہوں) کہا جاتا ہے: ما أتيتك الا رَجَاوَة الخير (میں تیرے پاس فقط خیر اور بھلائی کی امید لے کر آیا) اور ترجّيته وارتجيته اور رجّيته یہ سب رجوتُه کے معنی میں ہیں۔ بشر نے اپنی بیٹی کو مخاطب ہو کر کہا ہے:

فَرَجِّي الخيرَ وانتظري إيابي إذا ما القارِظُ العَنَزِيُّ آبَا

اس میں ترجی امید کے معنی میں ہی مذکور ہے، یعنی تو خیر اور بھلائی کی امید رکھ اور میرے لوٹنے کا انتظار کر۔

و مالی فی فلان رجیّة۔ ای ما ارجو، یعنی میں فلاں کے بارے میں کوئی امید نہیں رکھتا۔ اور کبھی الرجو اور الرجاء خوف کے معنی میں ہوتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ۝ (سورۂ نوح) یعنی کیا ہے تمہیں کہ تم اللہ تعالیٰ کی عظمت کے بارے میں ڈرتے نہیں۔

ابو ذویب نے کہا ہے:

إذا لسعته النحلُ لم يَرْجُ لَسْعَها و خالفَها فی بَيت نُوبٍ عواملِ

اس میں لم یرجُ خوف اور ڈر کے معنی میں مذکور ہے۔

یعنی جب شہد کی مکھی نے اسے ڈسا تو اسے اس کے ڈسنے کا کوئی خوف اور پرواہ نہ ہوئی۔

اور الرجا الف مقصورہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ہے کنوئیں کی طرف اور اس کے دونوں کنارے اور ہر طرف اور کنارہ رَجا کہلاتا ہے (1)۔ لوگوں میں سے عوام اس قول میں خطا کر جاتے ہیں: یا عظیم الرجا، کہ وہ اسے الف مقصورہ کے ساتھ پڑھتے ہیں نہ کہ الف ممدودہ کے ساتھ۔ (یعنی اسے مد اور ہمزہ کے ساتھ پڑھنا چاہئے۔)

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ؗ وَ اِثْمُهُمَاۤ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۙ(۲۱۹)

''وہ پوچھتے ہیں آپ سے شراب اور جوئے کی بابت۔ آپ فرمائیے: ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور کچھ فائدے بھی ہیں لوگوں کے لئے اور ان کا گناہ بہت بڑا ہے ان کے فائدے سے۔ اور پوچھتے ہیں آپ سے: کیا خرچ کریں؟ فرمائیے: جو ضرورت سے زیادہ ہو، اسی طرح کھول کر بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنے حکموں کو تاکہ تم غور و فکر کرو۔''

ارشاد باری تعالیٰ: يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ؗ وَ اِثْمُهُمَاۤ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا میں نو مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ يَسْـَٔلُوْنَكَ اس میں سوال کرنے والے مومنین ہیں۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور الخمر خَمَرَ سے ماخوذ ہے جبکہ وہ ڈھانپ لے، چھپالے۔ اور اسی سے خمار المراۃ عورت کی اوڑھنی اور دوپٹہ ہے۔ اور ہر وہ شے جو کسی شے کو ڈھانپ لے تو کہا جاتا ہے: فقد خَمَرَہ اور اسی سے خَمِّرُوْا آنیتکم ہے (2) (تم اپنے برتن ڈھانپ لو) اور خمر (شراب) عقل کو ڈھانپ لیتی ہے اور ماؤف کر دیتی ہے۔ اسی وجہ سے گھنے درخت کو الخَمَر کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے نیچے والی شے کو ڈھانپ لیتا ہے اور اسے چھپالیتا ہے۔ اسی سے کہا جاتا ہے: اخمرتِ الأرضُ كَثُرَ خَمَرُها (زمین نے ڈھانپ لیا اس کے درخت زیادہ ہو گئے) جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

أَلَا يَا زَيْدُ والضحاكُ سِيْرَا فقد جاوزتما خَمَرَ الطَّرِيقِ

خبردار! اے زید اور ضحاک! دونوں چلو (خوب تیز چلو) تحقیق تم راستے کے درختوں سے گزر چکے ہو۔

یعنی تم ہمت اور جرأت کے ساتھ چلو، تحقیق تم نے اس نشیبی زمین کو عبور کر لیا ہے جہاں بھیڑیے وغیرہ چھپے رہتے ہیں۔ عجاج ایک لشکر کا وصف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے جو جھنڈوں اور لشکروں کے ساتھ بغیر کسی کمزوری کے چل رہا ہے:

فی لامع العِقبان لایمشی الخَمَر يُوجّه الارضَ ويستاقُ الشجر

اسی سے ان کا یہ قول بھی ہے: دخل فی غُمار الناس و خُمارهم وہ لوگوں کی جماعت اور ان کی بھیڑ میں داخل ہوا۔ یعنی وہ خوفناک جگہ میں داخل ہو گیا۔ چونکہ شراب (خمر) عقل کو چھپالیتی ہے اور اسے ڈھانپ لیتی ہے اس وجہ سے اسے خمر کا نام دیا جاتا

1۔ الصحاح مادہ ''رجا''
2۔ بخاری شریف، باب غمس من الذباب الخ، حدیث نمبر 3069، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ خمر کو خمر کا نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ اسے چھوڑ دیا گیا یہاں تک کہ اس نے پا لیا جیسا کہ کہا جاتا ہے: اختمر العجین یعنی وہ اپنے ادراک کو پہنچ گیا۔ و خُمِر الرأی، یعنی رائے چھوڑ دی گئی یہاں تک کہ اس میں وجہ ظاہر ہو گئی۔

اور یہ قول بھی ہے کہ خمر کو خمر اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ عقل کو خلط ملط کر دیتی ہے۔ یہ المخامرہ سے ہے اس کا معنی ہے المخالطة (باہم خلط ملط ہو جانا) اسی سے ان کا یہ قول ہے: دخلتُ فی خُمار الناس یعنی میں لوگوں کے ساتھ مل جل گیا۔ نتیجتاً تینوں معانی بالکل قریب قریب ہیں۔ پس خمر کو پہلے چھوڑ دیا گیا یہاں تک کہ اس نے (نشہ کو) پالیا، پھر اس نے عقل کو خلط ملط کر دیا، پھر اسے ڈھانپ دیا تو گویا اس میں اصل معنی الستر (ڈھانپنا) ہوا۔

اور الخمر: یہ انگور کا وہ پانی ہے جو ابل جائے یا اسے پکایا جائے اور اس کے علاوہ جو شے بھی عقل کو ماؤف کر دے گی تو وہ اسی کے حکم میں ہوگی، کیونکہ اس پر علماء کا اجماع ہے کہ ہر قسم کا جوا حرام ہے۔ اور بلاشبہ ان میں سے ذکر صرف میسر کا کیا گیا ہے۔ تو حکماً تمام اقسام کو میسر پر ہی قیاس کیا گیا ہے۔ حالانکہ میسر صرف وہ جوا ہوتا ہے جو جزر (ذبح شدہ اونٹ) میں ہو۔ تو اسی طرح ہر وہ شے جو خمر کی طرح ہوگی تو وہ اسی کے قائم مقام ہوگی (یعنی حکم تمام کا ایک ہوگا۔)

مسئلہ نمبر 2۔ جمہور امت کا نظریہ یہ ہے کہ انگور کی شراب کے علاوہ ہر وہ مشروب جس کی کثیر مقدار نشہ میں مبتلا کر دے تو وہ حرام ہے چاہے اس کی مقدار قلیل ہو یا کثیر ہو۔ اور اسے پینے کی صورت میں حد واجب ہوگی۔

امام اعظم ابوحنیفہ، ثوری، ابن ابی لیلیٰ، ابن شبرمہ رحمۃ اللہ علیہم اور فقہاء کوفہ کی ایک جماعت نے کہا ہے: انگور کی شراب کے علاوہ جس مشروب کی کثیر مقدار نشہ میں مبتلا کر دے تو وہ حلال ہے، لہٰذا اس کے سبب جو کوئی نشہ میں مبتلا ہو گیا جبکہ نشے کی حد تک پہنچنے کا اس نے قصد اور ارادہ نہ کیا تو اس پر حد شرب نہ ہوگی۔ یہ قول ضعیف ہے۔ عقل وخبر (نقل) اس کی تردید کرتے ہیں۔ اس کا تفصیلی بیان سورۃ المائدۃ اور النحل میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

مسئلہ نمبر 3۔ بعض مفسرین نے کہا ہے: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے عزت وکرامت اور بر واحسان میں سے کوئی شے نہیں چھوڑی مگر وہ اس امت کو عطا فرمائی ہے، اس کے احسان اور کرامت میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے ان پر تمام احکام شرعیہ کو یکبارگی واجب نہیں کیا بلکہ ان پر تدریجاً اور یکے بعد دیگرے احکام نازل فرمائے، پس شراب کے حرام ہونے کا حکم بھی اسی طرح نازل ہوا۔ اور یہی پہلی آیت ہے جو شراب کے بارے میں سب سے پہلے نازل ہوئی، پھر اس کے بعد یہ آیات نازل ہوئیں۔ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى (النساء: 42) (تم نماز کے قریب نہ جاؤ درآنحالیکہ تم نشہ میں ہو) پھر فرمایا: اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ وَ يَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ۝ (المائدہ) (یہی تو چاہتا ہے شیطان کہ ڈال دے تمہارے درمیان عداوت اور بغض شراب اور جوئے کے ذریعہ اور روک دے تمہیں یاد الٰہی سے اور نماز سے تو کیا تم باز آنے والے ہو؟) پھر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ (المائدہ: 90) (یہ شراب اور جوا اور بت اور جوئے کے تیر سب ناپاک ہیں شیطان کی کارستانیاں ہیں سو ان سے بچو)

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَالْمَیْسِرُ اس سے مراد عرب کا جوا ہے جو تیروں کے ساتھ کھیلا جاتا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: زمانہ جاہلیت میں ایک آدمی دوسرے آدمی سے اپنی بیوی اور مال کی شرط لگا دیتا تھا پھر جو کوئی جوئے میں اپنے ساتھی پر غالب آجاتا وہ اس کا مال اور اس کی بیوی لے جاتا تھا۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی۔

حضرات مجاہد، محمد بن سیرین، حسن، ابن مسیب، عطا، قتادہ، معاویہ ابن صالح، طاؤس، حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی بیان کیا ہے: ہر وہ کھیل جس میں قمار (جوا) ہو چاہے چوسر ہو یا شطرنج وغیرہ سو وہ جوا (میسر) ہی ہے۔ یہاں تک کہ بچوں کا اخروٹ اور نرد کے مہروں کے ساتھ کھیلنا بھی۔ سوائے ان کے جن میں اس کو مباح قرار دیا گیا ہے مثلاً گھوڑ دوڑ میں مقابلہ اور حقوق کی تقسیم اور علیحدگی کے لئے قرعہ اندازی کرنا وغیرہ...... تفصیلی بیان آگے آئے گا۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: شطرنج عجم کا جوا ہے اور ہر وہ کھیل جس کے ساتھ شرط لگائی جائے وہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر علماء کے نزدیک میسر (جوا) ہے (1)۔ اس کا بیان کچھ اضافے کے ساتھ سورۂ یونس میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

المیسر یَسَرَ سے ماخوذ ہے۔ اس کا معنی ہے: کسی شے کا اپنے صاحب (جوا کھیلنے والے) کے لئے واجب اور لازم ہو جانا۔ کہا جاتا ہے: یَسَرَلی کذا جب کوئی شے کسی کے لئے واجب اور ثابت ہو جائے تب وہ یہ کہہ سکتا ہے یَسَرَلی کَذَا (میرے لئے اتنی شے ثابت ہوگئی) اس کا باب اس طرح چلتا ہے یَسَرَ یَیْسِرُ یَسْرًا و مَیْسِرًا۔ اور یاسر سے مراد تیروں کے ساتھ کھیلنے والا ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

فَأَعِنْهُمْ وَايْسِرْ بِمَا يَسَرُوا بِهٖ ۔۔۔ وَ إِذَا هُمْ نَزَلُوا بِضَنْكٍ فَانْزِلِ

اور ازہری نے کہا ہے کہ المیسر سے مراد وہ اونٹ ہیں جن پر وہ جوا میں شرط لگاتے تھے۔ ان کا نام میسر اس لئے رکھا گیا کیونکہ انہیں اجزاء کے اعتبار سے تقسیم کر دیا جاتا ہے، گویا کہ یہ محل تقسیم ہے اور ہر وہ شے جسے تو تقسیم کر دے (اس کے لئے تو کہہ سکتا ہے) یسرتہ۔ اور الیاسر کے معنی میں اصل یہی ہے۔ پھر تیروں کے ساتھ کھیلنے والوں اور اونٹوں پر شرط لگا کر جوا کھیلنے والوں کو یاسرون کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہی تقسیم کرنے والے ہیں جبکہ وہ اس تقسیم کا سبب ہیں اور الصحاح میں ہے: یَسَرَ القوم الجزورَ۔ یعنی قوم نے اونٹوں کو ذبح کیا اور ان کے اعضاء کو تقسیم کیا۔ سحیم بن وثیل یربوعی نے کہا ہے:

اقولُ لهم بالشِّعب اذ يَيْسِرُونني ۔۔۔ ألم تَيْأَسُوا أنّي ابنُ فارسِ زَهْدَمِ

میں نے انہیں گھاٹی میں جا کر کہا جبکہ وہ مجھے قیدی بنا کر لے جا رہے تھے کیا تم جانتے نہیں میں زہدم گھوڑے کے شہسوار کا بیٹا ہوں۔

اسے قیدی بنایا گیا تھا اور اسے تیر مارے گئے تھے اور جب کوئی قوم باہم شرط اور بازی لگانے لگ جائے تو کہا جاتا ہے یَسَرَ القوم اور رَجُلٌ یَسَرٌ وَیَاسِرٌ دونوں کا ایک ہی معنی ہے (یعنی شرط اور بازی لگانے والا آدمی جواباز) اور اس کی جمع ایسار

1۔ ابن ابی حاتم فی تفسیرہ، جلد 2، صفحہ 390

ہے۔ جیسا کہ نابغہ نے کہا ہے:

انی أُتمم أَیساری وامنحُھم مثنی الأَیادی وأَکسُو الجفنۃَ الأُدمَا

اور طرفہ نے کہا ہے:

و ھم أیسارُ لقمانَ إذا أغلَتِ الشَّتوَۃُ أَبداءَ الجُزُرْ

جو اونٹوں کے ذبح کرنے کو مباح قرار دیتا وہ ان کے نزدیک قابل تعریف ہوتا تھا، شاعر نے کہا ہے:

و ناجیۃ نحرتُ لقومِ صدقٍ و ما نادیتُ أیسارَ الجزور

مسئلہ نمبر 5۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں داؤد بن حصین سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اہل جاہلیت کا جوا یہ تھا کہ وہ گوشت کی بیع ایک یا دو بکریوں کے عوض کرتے تھے، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے جمہور اصحاب کے نزدیک اس کا اطلاق جنس واحد میں ہوتا ہے، (یعنی) ایک حیوان کی اس کے گوشت کے عوض بیع ہو اور یہ ان کے نزدیک بیع مزابنہ (☆)، غرر (☆☆) اور قمار کے باب سے ہے، کیونکہ یہ معلوم نہیں ہوتا کیا حیوان میں اس گوشت کے برابر گوشت ہے جو اس نے بدلے میں دیا ہے یا اس سے کم ہے یا اس سے زیادہ ہے اور گوشت کی بیع گوشت کے عوض متفاضلاً جائز نہیں ہوتی (یعنی جب مقدار برابر نہ ہو تو بیع جائز نہیں ہوتی۔)

پس حیوان کی بیع گوشت کے عوض کرنا اس گوشت کی بیع کی طرح ہے جو اس کی جلد میں چھپا ہوا ہے۔ بشرطیکہ یہ دونوں ایک جنس سے ہوں اور آپ کے نزدیک جنس واحد اونٹ، گائیں، ریوڑ (بھیڑ بکریاں) ہرن، پہاڑی بکرے اور تمام وحشی جانور اور وہ تمام چار ٹانگوں والے جانور جن کا گوشت کھایا جاتا ہے وہ آپ کے نزدیک ایک جنس ہیں۔ لہٰذا ان تمام اصناف و اجناس میں سے کسی حیوان کی بیع اس کے گوشت میں سے کسی شے کے ساتھ کسی بھی وجہ سے جائز نہ ہوگی۔ کیونکہ یہ آپ کے نزدیک بیع مزابنہ کے باب سے ہے، جیسا کہ کشمش کی بیع کرنا انگور کے ساتھ، زیتون کی بیع کرنا اس کے تیل کے ساتھ اور تلوں کے تیل کی بیع کرنا تلوں کے ساتھ اور اسی طرح کی دیگر مثالیں۔

اور آپ کے نزدیک تمام پرندے ایک جنس ہیں اور اسی طرح تمام مچھلیاں ایک ہی جنس سے ہیں اور آپ سے یہ مروی ہے کہ اکیلے مکڑی ایک صنف (قسم) ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب، حضرت لیث اور ابن سعد نے کہا ہے: گوشت کی بیع کرنا حیوان کے عوض کسی حال

☆ المزابنۃ: بیع مزابنہ سے مراد درخت پر لگی ہوئی پکی کھجوروں کی پکی کھجوروں کے عوض اندازے سے بیع کرنا ہے۔ امام مالک کے نزدیک ہر وہ اندازہ جس کا کیل، عدد اور وزن معلوم نہ ہو اس کی بیع کی جائے کسی معینہ کیلی، وزنی اور عددی شے کے ساتھ یا ایک ہی جنس میں سے معلوم شے کی مجہول کے ساتھ بیع کرنا یا مجہول کی بیع مجہول کے عوض کرنا جبکہ جنس ایک ہو۔

☆☆ الغرر: مچھلی ابھی پانی میں ہو اور پرندہ ابھی ہوا میں ہو اس کی بیع کرنا بیع الغرر ہے۔ المختصر ہر وہ بیع جس میں مشتری کے لئے دھوکے کا احتمال ہو وہ اسی زمرہ میں داخل ہوگی۔

میں جائز نہیں ہے، چاہے وہ ایک جنس سے ہوں یا دو مختلف جنسوں سے۔ کیونکہ حدیث طیبہ عام ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں اونٹ ذبح کیے گئے اور انہیں دس اجزاء میں تقسیم کر دیا گیا تو ایک آدمی نے کہا: تم ان میں سے ایک جز ایک بکری کے عوض مجھے دے دو تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ اس کی صلاحیت نہیں رکھتا (یعنی یہ درست نہیں ہے)۔ امام شافعی نے فرمایا: میں نہیں جانتا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس مسئلہ میں صحابہ کرام کی رائے کے خلاف عمل کیا ہو۔

ابو عمر نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے گوشت کے عوض بکری کی بیع کو جائز قرار دیا ہے۔ یہ روایت قوی نہیں ہے۔

عبدالرزاق نے ثوری عن یحییٰ بن سعید کی سند سے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے یہ ذکر کیا ہے کہ آپ اسے مکروہ سمجھتے تھے کہ کسی زندہ کی بیع مردہ کے عوض کی جائے، یعنی ذبح کی ہوئی بکری کی بیع زندہ کھڑی بکری کے عوض کی جائے۔

حضرت سفیان نے کہا ہے: ہم اس میں کوئی حرج نہیں دیکھتے۔ مزنی نے کہا ہے: اگر گوشت کے عوض حیوان کی بیع کے بارے میں حدیث طیبہ صحیح نہیں ہے تو پھر قیاس یہ ہے کہ وہ جائز ہے اور اگر حدیث صحیح ہے تو پھر قیاس باطل ہے اور حدیث کی اتباع کی جائے گی۔

ابو عمر نے بیان کیا ہے کہ کوفیوں کے پاس اس بارے میں قیاس اور اعتبار کی جہت سے کثیر دلائل موجود ہیں کہ حیوان کے عوض گوشت کی بیع کرنا جائز ہے، مگر یہ کہ جب حدیث صحیح ہوگی تو قیاس ونظر باطل ہوگا۔

اور مالک نے زید بن اسلم سے اور انہوں نے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے گوشت کے عوض حیوان کی بیع کرنے سے منع فرمایا ہے۔

ابو عمر نے کہا ہے: اس حدیث کے بارے میں میں نہیں جانتا کہ اس کا اتصال حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ثابت ہو اور اس کی اسانید میں سے احسن حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کی مرسل ہے جسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مؤطا میں ذکر کیا ہے۔ اور یہی موقف حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اور اصل یہ ہے کہ آپ مرسل روایات کو قبول ہی نہیں کرتے، مگر گمان یہ ہے کہ آپ نے حضرت سعید رضی اللہ عنہ کی مراسیل کو تلاش کیا اور انہیں پالیا یا ان میں سے اکثر کو صحیح قرار دیا۔ پس ظاہر حدیث اور عموم حدیث کی بنا پر انواع حیوان کی گوشت کی انواع کے ساتھ بیع کرنا مکروہ ہے کیونکہ کوئی ایسی حدیث نہیں جو اسے خاص کر رہی ہو اور نہ ہی اجماع ہے۔ اور آپ کے نزدیک نص کی تخصیص قیاس کے ساتھ کرنا جائز نہیں۔ اور ان کے نزدیک حیوان ہر اس جانور کا نام ہے جو خشکی یا پانی میں زندگی گزار رہا ہو اگرچہ اس کی اجناس مختلف ہیں، جیسا کہ طعام ہر اس شے کا نام ہے جو کھائی جاتی ہو یا پی جاتی ہو۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ فِيْهِمَآ یعنی خمر اور جوئے میں اِثْمٌ كَبِيْرٌ بہت بڑا گناہ ہے۔ شراب کا گناہ وہ ہے جو پینے والے سے صادر ہوتا ہے مثلاً باہم ایک دوسرے سے جھگڑا کرنا، گالی گلوچ دینا، فحش گوئی اور جھوٹا قول اور اس کی عقل کا زائل ہو جانا جس کے ساتھ وہ ان امور کو پہچانتا ہے جن کی ادائیگی اپنے خالق کے لئے واجب ہوتی ہے، نمازوں کو چھوڑ دینا اور اللہ

تعالیٰ کے ذکر سے رک جانا وغیرہ۔

امام نسائی نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ آپ نے فرمایا: شراب سے اجتناب کرو کیونکہ یہ ام الخبائث ہے، تم سے پہلے لوگوں میں سے ایک آدمی تھا جو بڑا عبادت گزار تھا۔ پس ایک گمراہ عورت اس سے حاملہ ہوگئی۔ اس نے اس آدمی کی طرف اپنی لونڈی کو بھیجا اور اس نے اسے کہا: بے شک ہم تجھے شہادت کے لئے بلا رہے ہیں تو وہ اس لونڈی کے ساتھ چل پڑا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئی۔ جونہی وہ دروازے کے اندر داخل ہوا، تو اس نے دروازہ بند کرلیا، یہاں تک کہ وہ ایک خوبرو عورت کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے پاس ایک بچہ تھا اور ساتھ ہی شیشہ کے برتن میں شراب پڑی تھی۔ تو اس عورت نے کہا: قسم بخدا! میں نے تجھے شہادت کے لئے نہیں بلایا، بلکہ میں نے تجھے اس لئے دعوت دی ہے تاکہ تو میرے ساتھ بدکاری کرے، یا شراب کا یہ جام پیے یا پھر اس بچے کو قتل کردے۔ اس آدمی نے کہا: تو مجھے شراب کا یہ جام پلا دے۔ چنانچہ اس نے وہ جام اسے پلا دیا۔ اس نے کہا: مجھے اور پلاؤ۔ پس وہ پیتا رہا یہاں تک کہ اس نے اس کے ساتھ بدکاری کا ارتکاب بھی کرلیا اور اس بچے کو بھی قتل کردیا۔ پس تم شراب سے بچو۔ کیونکہ قسم بخدا! ایمان اور شراب پر دوام یہ دونوں اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ بلکہ قریب ہی ان میں سے ایک دوسرے کو نکال دیتا ہے، ابو عمر نے اسے الاستیعاب میں ذکر کیا ہے۔

اور یہ بھی روایت ہے کہ اعشیٰ جب اسلام قبول کرنے کے لئے مدینہ طیبہ کی طرف جانے لگا تو کچھ مشرک لوگ اسے راستے میں ملے۔ انہوں نے اسے کہا: تو کہاں جا رہا ہے؟ تو اس نے انہیں بتایا کہ وہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہونے کا ارادہ رکھتا ہے، تو انہوں نے کہا: تو ان سے نہ مل، کیونکہ وہ تجھے نماز کے بارے حکم ارشاد فرمائیں گے۔ اس نے جواب دیا: بلاشبہ رب تعالیٰ کی عبادت کرنا واجب ہے۔ تو انہوں نے پھر کہا: بلاشبہ وہ تجھے فقراء کو مال دینے کا حکم دیں گے۔ تو اس نے جواب دیا: نیکی کا عمل کرنا واجب ہے۔ پھر اسے کہا گیا: بے شک وہ تو زنا سے منع کرتے ہیں۔ تو اس نے کہا: یہ عمل عقلاً انتہائی فحش اور قبیح ہے اور میں بوڑھا ہو چکا ہوں، مجھے اس کی کوئی حاجت نہیں۔ پھر اسے کہا گیا: بے شک وہ تو شراب پینے سے منع کرتے ہیں۔ تب اس نے کہا: کیا ایسا بھی ہے؟ میں تو اس پر صبر نہیں کرسکتا۔ پس وہ واپس لوٹ گیا اور کہا: میں ایک سال تک شراب پیوں گا پھر آپ کی طرف لوٹ جاؤں گا، لیکن وہ اپنے گھر تک نہ پہنچ سکا یہاں تک کہ وہ اونٹ سے گرا، اس کی گردن ٹوٹ گئی اور مر گیا(1)۔

قیس بن عاصم منقری دور جاہلیت میں بہت زیادہ شراب پیتا تھا پھر اس نے اپنے اوپر اسے حرام کردیا اور اس کا سبب یہ بنا کہ اس نے نشے کی حالت میں اپنی بیٹی کے پیٹ کی سلوٹوں کو ٹٹولا اور اپنے والدین کو گالیاں دیں، اس نے چاند کو دیکھا تو اس کے بارے میں بھی کچھ (نازیبا) کلمات کہے اور شراب بنانے والے کو اپنا بہت سا مال دے دیا، جب اس کا نشہ اترا اور اسے اس کے بارے خبر ہوئی تو اس نے اپنے اوپر شراب کو حرام قرار دیا اور اس کے بارے وہ کہتا ہے:

رایت الخمرَ صالحةً و فیها خصالٌ تُفسِد الرجلَ الحلیما

1۔ تفسیر ابی لیث، جلد 1، صفحہ 203

میں نے شراب کو اچھا دیکھا تھا حالانکہ اس میں ایسی خصال بھی ہیں جو حلیم آدمی کو خراب کر دیتی ہیں۔

فلا واللہ اشربها صحیحا ولا أشفی بها أبدا سقیما

قسم بخدا! میں اسے حالت صحت میں نہیں پیوں گا اور نہ ہی کبھی بیماری کی حالت میں اس سے علاج کروں گا۔

ولا أعطی بها ثمنا حیاتی ولا أدعو لها أبدا ندیما

میں اس کے عوض اپنی حیات بطور ثمن ادا نہیں کروں گا اور نہ میں اس کے لئے کبھی شراب پینے والے ساتھی کو بلاؤں گا۔

فإنّ الخمر تفضح شاربیها و تجنیهم بها الأمر العظیما

کیونکہ شراب اپنے پینے والے کو ذلیل ورسوا کر دیتی ہے اور انہیں بہت بڑے گناہ میں مبتلا کر دیتی ہے۔

ابو عمر نے کہا ہے: اور ابن عرابی نے المفضل الضبی سے روایت کیا ہے کہ یہ اشعار ابو محجن ثقفی کے ہیں اس نے شراب چھوڑنے کے وقت یہ کہے تھے اور آپ رضی اللہ عنہ یہ کہہ رہے ہیں:

اذا مُتُّ فادفِنّی إلی جَنْب کَرْمةٍ تروّی عظامی بعد موتی عُروقُها

جب میں فوت ہو جاؤں تو مجھے انگور کی بیل کے پہلو میں دفن کرنا اس کی جڑیں میری موت کے بعد میری ہڈیوں کو تراوت دیں گی۔

ولا تَدفِنِنّی بالفَلاة فاننی أخاف اذا ما مِتُّ أن لا أذُوقَها

اور تم مجھے صحرا میں دفن نہ کرنا کیونکہ مجھے یہ خوف ہے کہ جب میں مرجاؤں تو اسے نہ چکھ سکوں گا۔

حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے انہیں کئی بار حد شرب کے کوڑے لگائے اور انہیں سمندر میں ایک جزیرہ کی طرف جلا وطن کر دیا، پس وہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے ساتھ جا ملے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف انہیں قید کرنے کا حکم نامہ لکھا۔ چنانچہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے انہیں قید کر لیا اور یہ انتہائی بہادر شہسواروں میں سے ایک تھے، جب یہ جنگ قادسیہ میں آپ کے حکم سے شریک ہوئے تو معروف یہی ہے کہ آپ نے ان کی بیڑیاں کھول دیں اور فرمایا: ہم کبھی بھی تمہیں شراب پینے پر کوڑے نہیں لگائیں گے۔ تو ابو محجن نے کہا: قسم بخدا! میں کبھی بھی شراب نہیں پیوں گا، پھر اس کے بعد کبھی بھی شراب نہیں پی۔ اور ایک روایت میں ہے: میں شراب پیتا تھا جب مجھ پر حد قائم کی جاتی تو میں اس سے پاک ہو جاتا تھا اور جب تم نے مجھ سے حد ساقط کر کے مجھے ہدر چھوڑ دیا ہے تو قسم بخدا! میں کبھی شراب نہیں پیوں گا۔ ہیثم بن عدی نے بیان کیا ہے کہ اسے اس نے خبر دی ہے جس نے آذربیجان میں ابو محجن کی قبر دیکھی ہے یا کہا: جرجان کے نواح میں اس حال میں کہ اس پر بیل کی تین جڑیں اگی ہوئی ہیں۔ وہ خوب بڑھی ہوئی ہیں اور وہ پھل بھی دیتی ہیں اور وہ ان کی قبر پر بچھی ہوئی ہیں اور ان کی قبر پر یہ لکھا ہوا ہے ھذا قبر ابی محجن (یہ ابو محجن کی قبر ہے)۔ اس نے کہا کہ میں نے اس پر خوب تعجب کیا اور مجھے ان کا یہ قول یاد آ گیا اذا مت فادفنی الی جنب کرمۃ۔

بلاشبہ شراب پینے والا اہل عقل کے لئے تمسخر بن جاتا ہے اور وہ اپنے پیشاب اور نجاست کے ساتھ کھیلنے لگتا ہے اور بسا

اوقات وہ اپنے چہرے پر ملنے لگتا ہے حتیٰ کہ بعض کو اس حالت میں دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنے چہرے کو پیشاب سے دھو رہا ہوتا ہے اور یہ کہہ رہا ہوتا ہے: اللّٰھم اجعلنی من التوابین واجعلنی من المتطھرین اور بعض کو اس حال میں دیکھا گیا ہے کہ کتا اس کے چہرے کو چاٹ رہا ہوتا ہے اور وہ اسے کہہ رہا ہوتا ہے: اکرمك الله۔ اور رہا جوا! تو یہ تو عداوت اور بغض کا وارث بناتا ہے کیونکہ یہ کسی غیر کا مال باطل طریقے سے کھانے کا نام ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ۔ شراب میں تاجروں کے لئے نفع ہے کیونکہ وہ اسے شام سے سستے داموں خرید کر لاتے تھے اور حجاز میں منافع کے ساتھ اسے فروخت کرتے تھے اور وہ اس میں کوئی تنگی نہیں دیکھتے تھے کیونکہ شراب کا طالب اسے مہنگے داموں خرید لیتا ہے۔ شراب کے منافع کے بارے جو کچھ کہا گیا ہے یہی قول زیادہ صحیح ہے۔ اور اس کے منافع کے بارے یہ بھی کہا گیا ہے کہ شراب کھانے کو ہضم کرنے میں معاون ہوتی ہے، ضعف اور کمزوری کو قوت دیتی ہے، قوت مردانگی میں معاون ہوتی ہے، بخیل کو سخی بناتی ہے، بزدل کو بہادر اور دلیر بناتی ہے اور رنگ کو صاف کرتی ہے، علاوہ ازیں لذت کا کام بھی دیتی ہے۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا ہے:

و نشربھا فتترکنا ملوکا واُسُدًا ما یُنَھْنِھنا اللقاءُ

اور ہم اسے پیتے ہیں اور یہ ہمیں ایسا بادشاہ اور شیر بنا کر چھوڑتی ہے کہ حملہ آور لشکریوں کو ہم سے روک دیتی ہے۔

اس کے علاوہ بھی اس کی کئی راحتیں اور خوشیاں ہیں۔ ایک دوسرا شاعر کہتا ہے:

فاذا شربت فاننی ربُّ الخَوَرْنَقِ والسَّدیر

جب میں شراب پیتا ہوں تو میں خورنق اور سدیر (نعمان اکبر بن امرؤالقیس کا محل جو عراق میں تھا) کا مالک ہوتا ہوں۔

واذا صَحَوْتُ فانِنی ربُّ الشُّوَیْھَۃِ وَالْبَعِیْرِ

اور جب میں نشے میں افاقہ پالیتا ہوں تو میں بکریوں اور اونٹوں کا مالک ہوتا ہوں۔

اور جوئے کے منافع میں سے یہ ہے کہ اس میں بغیر کسی کدوکاوش اور محنت کے ایک چیز انسان کی طرف لوٹ آتی ہے، پس وہ اونٹ خریدتے ہیں اور اپنے تیر ڈالتے ہیں، جس کا تیر نکل آئے گوشت سے اس کا حصہ لے لیا جاتا ہے اور اس پر کوئی ثمن وغیرہ نہیں ہوتے اور جس کا تیر آخر میں باقی رہ جائے اس پر تمام اونٹوں کی قیمت ادا کرنا ہوتی ہے اور اس کے لئے گوشت میں سے کوئی حصہ نہیں ہوتا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: جوئے کی منفعت محتاج لوگوں پر وسعت وخوشحالی کا آنا ہے کیونکہ لوگوں میں سے جو جوا کھیلتا تھا وہ اونٹوں کا گوشت نہیں کھاتا تھا بلکہ اسے محتاجوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔

جوئے کے تیر گیارہ تیر ہوتے، ان میں سے سات کے لئے حصص ہوتے اور ان میں حصوں کی تعداد کے مطابق مقررہ چیز لازم ہوتی اور وہ یہ ہیں: الفذ اس میں ایک علامت ہوتی اور اس کے لئے ایک حصہ ہوتا اور ناکامی کی صورت میں اس پر ایک حصہ لازم ہوتا۔ دوسرا التوأم ہے۔ اس میں دو علامتیں ہوتی اور اس کے لئے دو حصے ہوتے اور اس پر دو حصے لازم ہوتے، تیسرا

الرقیب ہے۔ اس میں تین علامات ہوتیں اسی ترتیب پر جو ہم نے پہلے بیان کردی ہیں۔ چوتھا الحلس ہے۔ اس کے لئے چار علامات ہوتیں۔ پانچواں النافز ہے۔ اس کا نام النافس بھی ہے۔ اس کے لئے پانچ علامات ہوتیں۔ چھٹا المسبل ہے۔ اس کے لئے چھ علامات ہوتیں اور ساتواں المعلی ہے۔ اس کے لئے سات علامات ہوتیں۔ اس طرح یہ اٹھائیس حصص ہوتے اور اصمعی کے قول کے مطابق اونٹوں کے حصص بھی اسی طرح ہوتے اور تیروں میں سے ابھی چار باقی ہیں۔ ان پر کوئی علامت نہ ہوتی اور نہ ہی فروض اور انصباء میں سے کوئی ان کے لئے ہوتا اور وہ یہ ہیں: المصدّر، المضعف، المنیح اور السفیح۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: باقی تین تیر بغیر علامت کے ہیں وہ یہ ہیں السفیح، المنیح اور الوغد۔ اس پر تیروں کی کثرت کی وجہ سے ان تینوں کا اضافہ کیا جاتا جو انہیں حرکت دیتا اور کسی کی طرف میلان کا وہ کوئی راستہ نہ پاتا۔ اور تیروں کو حرکت دینے والے کو المفیض الضارب اور الضریب کا نام دیا جاتا۔ اور جمع الضرباء آتی ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حرکت دینے والے کے پیچھے ایک تاکنے والا بھی رکھا جاتا تاکہ وہ کسی کی طرفداری نہ کرے، پھر ضریب اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتا اور کپڑے کے ساتھ مکمل طور پر لپٹ جاتا اور اپنا سر باہر نکالتا اور اپنا ہاتھ ربابہ (ترکش کی مانند تیر جمع کرنے کا برتن) میں داخل کرتا اور تیر نکالتا۔ اور عربوں کی عادت تھی کہ وہ موسم سرما میں وقت کے تنگ ہونے اور فقراء پر سردی اور حالات کے سخت ہونے کی حالت میں انہی تیروں کے ساتھ اونٹوں کو تقسیم کرتے تھے۔ اونٹ خریدے جاتے تھے اور خوشحال اور امیر لوگ ان کی قیمت کے ضامن ہوتے تھے اور ان کا مالک اپنے حق سے دستبردار ہو جاتا اور وہ اس کے ساتھ فخر کرتے تھے اور جو ان میں سے اس طرح نہ کرتا وہ اس کی مذمت کرتے تھے اور وہ اسے البرَم کا نام دیتے تھے۔ متمم بن نویرہ نے کہا ہے:

ولا بَرَمًا تُهدِی النساءُ لعرسه اذا القَشْعُ من بَرْدِ الشتاء تَقَعْقَعَا

پھر اونٹ ذبح کیے جاتے اور انہیں دس اقسام پر تقسیم کر دیا جاتا۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: اونٹوں کی تقسیم میں اصمعی نے خطا کی ہے۔ انہوں نے ذکر کیا ہے کہ تیروں کے حصص کی مقدار کے مطابق ان کے بھی اٹھائیس حصے کیے جاتے، حالانکہ بات اس طرح نہیں ہے۔ پھر وہ دس پر تقسیم کرتا۔ پس جو کوئی ربابہ سے پہلے اپنا تیر نکالنے میں کامیاب ہو جاتا تو وہ اپنے حصص لے لیتا اور فقراء کو عطا کر دیتا۔ اور ربابہ سے مراد ترکش کے مشابہ (برتن) ہے جس میں جوئے کے تیر جمع کیے جاتے ہیں۔ اور بسا اوقات انہوں نے تمام تیروں کو ربابہ کا نام دیا ہے۔ ابو ذؤیب نے گدھے اور گدھیوں کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

وكأنهن رِبابَةٌ و كأنه يَسَرٌ يُفيض على القِداح و يَصْدَعُ

اور ربابہ کا معنی عہد اور میثاق بھی ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

وكنتُ امْرَأً أفضتْ اِليكَ رِبابَتِیْ وَ قَبْلَكَ رَبَّتْنِی فَضِعتُ رُبُوبُ

اور بعض قبائل میں وہ بسا اوقات اپنی ذاتوں کے لئے جوا کھیلتے پھر شمن کی چٹی اسی پر ہوتی جو اپنے تیر میں کامیاب نہ ہوتا، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور اسی طریقے پر قبیلے کے فقراء زندگی گزارتے تھے۔ اسی کے مطابق اعشیٰ کا قول ہے:

المطعمو الضيفِ اذا ماشتَوْا والجاعِلو القوتِ على الياسَرِ

اور ایک دوسرے کا قول ہے:

بايديهمْ مَقْرومةٌ و مَغالِق يعودُ بأرزاقِ العُفاةِ مَنِيحُها

اس شعر میں المنیح سے مراد المستنح (عطیہ) ہے کیونکہ وہ لوگ وہ تیر عاریۃً لے لیتے تھے جو باعث نجات ہوتا اور اس کی کامیابی وافر ہوتی۔ اس لئے یہ قابل تعریف اور پسندیدہ منیح ہے۔ اور رہا وہ منیح جو باعث ملامت تیروں میں سے ایک ہے تو استعمال کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ اور اخطل نے اپنے اس شعر میں اسی کا ارادہ کیا ہے:

و لقد عَطَفْنَ على فزارةَ عطفةً كَرَّ الْمَنِيحِ و جُلنَ ثَمَّ مَجالا

اور الصحاح میں ہے: المنیح جوئے کے ان تیروں میں سے ہے جس کے لئے کوئی حصہ نہیں ہوتا مگر یہ کہ اس کے مالک کو کوئی شے عطا کر دی جائے۔ اور جوئے سے متعلق لبید کا قول ہے:

اذا يَسَروا لم يُورِثِ اليُسْرُ بينهم فواحشَ يُنْعَى ذِكْرُها بالمصايف

یہ سب کا سب جوئے کا نفع ہے مگر یہ کہ یہ باطل طریقے سے مال کھانا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِثْمُهُمَاۤ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا۔ اللہ تعالیٰ نے آگاہ فرمایا ہے کہ ان کا گناہ نفع سے کہیں زیادہ اور بڑا ہے اور آخرت میں ضرر اور نقصان کی طرف زیادہ لوٹانے والے ہیں۔ پس گناہ کبیر ان کی تحریم کے بعد ہے اور منافع تحریم سے پہلے کے ہیں۔

حمزہ اور کسائی نے کثیر ثاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ان کی دلیل یہ ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب پر لعنت کی ہے اور اس کے ساتھ مزید دس پر لعنت کی ہے: اسے فروخت کرنے والے پر، اسے خریدنے والے پر اور اس پر جس کے لئے خریدی جائے اور اس پر جس نے اسے کشید کیا اور اس پر جس کے لئے کشید کیا گیا، اسے پلانے والے پر، اسے پینے والے پر، اسے اٹھانے والے پر، اس پر جس کے لئے شراب اٹھائی جائے اور اس کے ثمن کھانے والے پر (1) اور یہ بھی کہ منافع کو جمع ذکر کرنے کے ساتھ جمع الآثام ہی زیادہ حسین اور مناسب ہے اور لفظ کثیر یہ معنی ادا کر سکتا ہے۔

باقی قراء اور لوگوں میں سے جمہور نے کَبِیْرٌ پڑھا ہے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ جوئے اور شراب پینے میں جو گناہ ہے وہ کبائر میں سے ہے اور اسے کبیر کے ساتھ ہی بیان کرنا زیادہ مناسب ہے۔

اور یہ بھی کہ ان کا اکبر پر اتفاق کرنا کبیر کے لئے دلیل اور حجت ہے۔ اور لفظ اکثر کے چھوڑنے پر تمام نے اجماع کیا ہے سوائے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف کے، کیونکہ اس میں ہے: قُلْ فِيْهِمَاۤ اِثْمٌ كَثِيْرٌ۔ وَاِثْمُهُمَاۤ اَكْثَرُ دونوں مقامات پر باکی جگہ ثاء ہے۔

1۔ ابن ماجہ، باب لعنت الخمر على عشرة اوجه، حدیث نمبر 3370، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً ابوداؤد، باب العنب يعصر للخمر، حدیث نمبر 3189، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مسئلہ نمبر 9۔ اہل نظر میں سے ایک جماعت نے کہا ہے: شراب اس آیت کے ساتھ حرام کی گئی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ وَ الْاِثْمَ (الاعراف: ۳۳)

(آپ فرمائیے: بے شک حرام کر دیا ہے میرے رب نے سب بے حیائیوں کو جو ظاہر ہیں ان سے اور جو پوشیدہ ہیں اور (حرام کر دیا) گناہ کو۔)

اور اس آیت میں یہ خبر دی ہے کہ اس میں گناہ ہے اور وہ حرام ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ نظر و فکر عمدہ نہیں ہے کیونکہ اس میں جو گناہ ہے وہ حرام ہے نہ کہ یہ بعینہا حرام ہے۔ یہ نظر و فکر اسی کا تقاضا کرتی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور بعض نے کہا ہے: اس آیت میں شراب کے حرام ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے اثم کا نام دیا ہے اور اثم کو ایک دوسری آیت میں حرام قرار دیا ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ وَ الْاِثْمَ اور بعض نے کہا ہے: اثم سے مراد خمر (شراب) ہی ہے۔ اس پر دلیل شاعر کا یہ قول ہے:

شربتُ الاِثم حتّی ضلّ عقلی کذاکَ الاِثمُ یَذهبُ بالعقول

میں نے شراب پی یہاں تک کہ میری عقل گمراہ ہو گئی جس طرح کہ گناہ عقلوں کو ضائع کر دیتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ قول بھی عمدہ اور جید نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں خمر کو اثم کا نام نہیں دیا ہے۔ بلاشبہ اس نے کہا ہے: قُلْ فِیْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِیْرٌ (یعنی آپ فرمائیے: ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے) یہ نہیں فرمایا قُلْ هُمَا اثم کبیر (کہ یہ دونوں بہت بڑا گناہ ہیں)

اور رہی سورۃ الاعراف کی آیت اور شعر تو ان دونوں کے بارے تفصیلی گفتگو بعد میں ہو گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: بلاشبہ اس آیت میں شراب کی مذمت ہے اور رہی اس کی تحریم تو وہ دوسری آیت سے معلوم ہوتی ہے اور وہ سورۃ المائدہ کی آیت ہے۔ اکثر مفسرین نے یہی موقف اختیار کیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ۬ؕ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۙ۝ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: قُلِ الْعَفْوَ جمہور کی قراءت نصب کے ساتھ ہے اور صرف ابو عمرو نے اسے رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابن کثیر کی جانب سے اس میں اختلاف کیا گیا ہے اور حسن، قتادہ اور ابن ابی اسحاق کی قراءت رفع کے ساتھ ہے۔ نحاس وغیرہ نے کہا ہے: اگر ذا بمعنی الذی بنایا جائے تو پھر پسندیدہ رفع ہے، اس معنی کی بنا پر کہ جو وہ خرچ کرتے ہیں وہ عفو ہے اور نصب بھی جائز ہے اور اگر ما اور ذا کو ایک ہی شے قرار دیا جائے تو پھر پسندیدہ نصب ہے، اس معنی کی بنا پر کہ آپ فرما دیجئے: وہ عفو خرچ کریں۔ اور رفع بھی جائز ہے۔

اور علماء نحو نے بیان کیا ہے: ما ذا تعلمت: أنحوا أم شعرا یعنی نصب اور رفع دونوں کے ساتھ۔ اس بنا پر کہ اس میں

دونوں اعراب جید اور حسن ہیں، مگر آیت میں تفسیر نصب کی بناء پر ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ علماء نے کہا ہے: جب سابقہ آیت ارشاد باری تعالیٰ وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ میں سوال نفقہ کے بارے ہے کہ وہ کس پر خرچ کیا جائے؟ جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے اور جواب بھی اس پر دال ہے اور جواب بھی سوال کے موافق ہی ظاہر ہوا ہے۔ اس آیت میں دوسرا سوال خرچ کرنے کی مقدار کے بارے ہے اور یہ حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ کی شان میں ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ کیونکہ جب یہ آیت نازل ہوئی قُلْ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ (البقرہ:215) انہوں نے کہا: میں کتنا خرچ کروں؟ تب یہ حکم نازل ہوا قُلِ الْعَفْوَ اور عفو کا معنی یہ ہے: ما سھل و تیسر و فضل و لم یشق علی القلب اخراجہ، یعنی وہ شی جو آسان ہو، میسر ہو، اور فالتو ہو اور اس کا نکالنا دل پر شاق نہ ہو۔

اسی معنی میں شاعر کا قول بھی ہے:

خُذِی العفوَ منیّ تستدیمی مودّتی　　ولا تَنطِقی فی سَوْرَتی حین اغضبُ

تو عفو لے لے میری محبت کو ہمیشہ برقرار رکھ اور جب میں غصے میں ہوں تو میرے غصے کی حالت میں تو بات نہ کر۔

پس معنی یہ ہے کہ تم اپنی حاجات سے فالتو مال خرچ کر دو اور تم اس میں اپنے آپ کو اذیت میں مبتلا نہ کرو کہ تم محتاج اور فقیر ہو جاؤ۔ آیت کی تاویل میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں یہی معنی زیادہ مناسب اور اولیٰ ہے۔ اور حضرات حسن، قتادہ، عطا، سدی، محمد بن کعب قرظی اور ابن ابی لیلیٰ وغیرہم کے قول کا بھی یہی معنی ہے۔ انہوں نے کہا ہے: العفو ما فضل من العیال کہ عفو سے مراد وہ مال ہے جو اہل و عیال سے فالتو ہو۔ اور اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔

اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: صدقہ وہ ہے جو اس مال سے ہو جس کی حاجت نہ ہو۔ اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: ''بہترین صدقہ وہ ہے جو تو نے ضرورت سے زائد مال سے خرچ کیا اور دوسری حدیث میں ہے: ''بہترین صدقہ اس مال کا ہے جو ضرورت سے زائد ہو۔''(1)

قیس بن سعد نے کہا ہے(2): اس سے مراد فرض زکوٰۃ ہے اور جمہور علماء نے کہا ہے: نہیں بلکہ یہ نفلی صدقات ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس آیت کے نازل ہونے کے بعد جب کسی آدمی کے پاس سونا، چاندی یا اناج یا دودھ دینے والے جانور وغیرہ ہوتے تو وہ غور و فکر کرتا کہ ان میں سے کتنا مال اس کی اپنی ذات اور اس کے اہل و عیال کے خرچے کے لئے سال بھر کے لئے کافی ہوگا۔ وہ اسے اپنے پاس روک لیتا اور بقیہ تمام ساز و سامان صدقہ کر دیتا اور اگر وہ ان لوگوں میں سے ہوتا جو اپنے ہاتھ کے ساتھ کام کرتے ہیں تو وہ اپنی اور گھر والوں کی ایک دن کی ضرورت پوری کرنے کے لئے مال اپنے پاس روک لیتا اور باقی ماندہ صدقہ کر دیتا حتیٰ کہ پھر آیت زکوٰۃ نازل ہوئی اور یہ آیت منسوخ ہو گئی اور ہر وہ صدقہ منسوخ ہو گیا جس کے بارے انہیں حکم دیا گیا تھا۔

1۔ بخاری شریف، باب لا صدقة الا عن ظھر غنی الخ، حدیث نمبر 1337، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
ایضاً، بخاری شریف، باب لا صدقة الا عن ظھر غنی الخ، حدیث نمبر 1338، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ تفسیر طبری، جلد 3، صفحہ 694

ایک قوم نے کہا ہے: یہ آیت محکم ہے اور مال میں زکوٰۃ کے سوا بھی حق ہے اور ظاہر حال قول اول پر ہی دلالت کرتا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ۔ مفضل بن سلمہ نے کہا ہے: مراد نفقہ کے احکام ہیں (یعنی اسی طرح اللہ تعالیٰ نفقہ کے بارے میں اپنے احکام تمہارے لئے کھول کر بیان کرتا ہے) لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ تاکہ تم دنیا اور آخرت میں غور وفکر کرو۔ پس تم اپنے مالوں میں سے اتنے روک لو جو تمہارے لئے دنیوی معاملات میں نفع بخش اور ضروری ہوں اور باقی ماندہ ان امور میں خرچ کر دو جو آخرت میں تمہارے لئے باعث نفع ہوں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ یعنی اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لئے دنیا اور آخرت کے امور کے بارے میں اپنی آیات کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم دنیا، اس کے زوال اور اس کی فنا کے بارے میں غور وفکر کرو اور تم اس میں زہد اختیار کرو اور آخرت کے آنے اور اس کے باقی رہنے کے بارے غور وفکر کرو اور اس میں تم رغبت رکھو۔

فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۲۲۰

''دنیا اور آخرت (کے کاموں) میں اور پوچھتے ہیں آپ سے یتیموں کے بارے میں، فرمایئے: (ان سے الگ تھلگ رہنے سے) ان کی بھلائی کرنا بہتر ہے اور اگر (کاروبار میں) تم انہیں ساتھ ملا لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے بگاڑنے والے کو سنوارنے والے سے اور اگر چاہتا اللہ تو مشکل میں ڈال دیتا تمہیں، بے شک اللہ تعالیٰ بڑی قوت والا حکمت والا ہے۔''

اس آیت میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ ابوداؤد اور نسائی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (الانعام: ۱۵۲) (اور مت قریب جاؤ یتیم کے مال کے مگر اس طریقہ سے جو بہت اچھا ہو۔) اور اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا الآیہ (النساء: ۱۰) (بے شک وہ لوگ جو کھاتے ہیں یتیموں کے مال ظلم سے۔) تو وہ آدمی جس کے پاس کوئی یتیم تھا اس نے اس کا کھانا اپنے کھانے سے اور اس کا مشروب اپنے مشروب سے الگ کر دیا۔ پس وہ اپنے کھانے میں سے جو کچھ بچا تا تھا وہ اسے اس کے لئے روک کر رکھ لیتا تھا یہاں تک کہ وہ اسے کھا لیتا یا وہ فاسد اور خراب ہو جاتا۔ پس یہ چیز ان پر انتہائی شاق اور تکلیف دہ ثابت ہوئی، تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اس کا ذکر کیا۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ الآیہ۔ پس انہوں نے ان کے کھانے پینے کی اشیاء کو اپنے کھانے پینے کی اشیاء کے ساتھ ملا دیا۔ یہ ابوداؤد کے الفاظ ہیں (1)۔ اور یہ آیت ماقبل کے ساتھ متصل ہے کیونکہ اموال کے ذکر کے ساتھ یتیموں کے مالوں کی حفاظت کا امر مقترن ہے۔ اور کہا گیا

1۔ سنن ابی داود، باب مخالطۃ الیتیم فی الطعام، حدیث نمبر 2487، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے کہ اس میں سائل حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ ہیں۔

اور یہ قول بھی ہے کہ عرب اپنے کھانے پینے کی اشیاء میں یتیموں کے مالوں کو ملانے سے بدشگونی لیتے تھے۔ پس یہ آیت نازل ہوئی۔

مسئلہ نمبر 2۔ جب اللہ تعالیٰ نے یتیموں کی دیکھ بھال کے لئے خیر و بھلائی کے ارادہ سے ان کا مال اپنے مال میں ملانے کی اجازت عطا فرمادی ہے تو یہ اس پر دلیل ہے کہ یتیم کے مال میں تصرف کرنا جائز ہے اور بیع اور تقسیم وغیرہ میں وصی کا تصرف بھی جائز ہے۔ اس لئے کہ یہ آیت مطلق ہے۔ جب ایک آدمی یتیم کا کفیل بن گیا اور اس نے اسے مخصوص کر لیا اور وہ اس کی زیر نگرانی رہنے لگا تو اس کے بارے اس کا عمل جائز ہوگا اگرچہ والی نے اسے اس پر مقدم نہ بھی کیا ہو کیونکہ آیت مطلق ہے اور کفالت ولایت عامہ ہے اور خلفاء میں سے کسی سے مروی نہیں ہے کہ انہوں نے اپنے زمانے میں اپنے ہوتے ہوئے کسی کو یتیم پر مقدم کیا ہو۔ بلاشبہ وہ ان کے اپنے پاس ہونے پر ہی اقتصار کرتے تھے (یعنی ان کی جملہ ذمہ داری خود ادا کرتے تھے۔)

مسئلہ نمبر 3۔ یتیم کا مال مضاربت اور تجارت کی غرض سے دینے کے بارے میں اور اس کا مال اپنے مال کے ساتھ ملانے کے بارے میں روایات تواتر کے ساتھ موجود ہیں۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ یتیم کے مال میں بیع و شرا کے اعتبار سے تصرف کرنا جائز ہے بشرطیکہ وہ خیر و بھلائی کا موجب ہو اور اسی طرح مضاربت وغیرہ کے لئے بھی دینا جائز ہے۔ ہم عنقریب تفصیل سے بیان کریں گے۔

البتہ قرض کے طور پر دینے میں اختلاف ہے۔ اشہب نے اس سے منع کیا ہے اور اسی منع پر اسے بھی قیاس کیا ہے کہ وہ ان کے لئے اپنی طرف سے کوئی شے بیچے یا کوئی خریدے۔

اور دوسروں نے کہا ہے: جب وہ قرض لے نفع کی خاص مقدار کے عوض جو کہ قرض کے ساتھ مناسبت رکھتا ہو تو اسے دے دیا جائے گا، جیسا کہ وہ یتیم کے لئے پوری جانچ پڑتال کے ساتھ کوئی شے خریدے تو یہ یتیم کے لئے بہت زیادہ اچھا اور بہتر ہوگا۔

محمد بن عبدالحکم نے کہا ہے: آدمی کے لئے جائز ہے کہ وہ یتیم کے لئے قرض کے عوض (ادھار) بیع کرے اگر وہ اس میں بہتری اور نفع دیکھے۔

ابن کنانہ نے کہا ہے: اس کے لئے جائز ہے کہ یتیم کی شادی کے لئے اتنا مال خرچ کرے جو اس کی ضروریات اور پاکیزگی کے لئے مفید اور نفع بخش ہو اور اس کا نفع اس کے اپنے حال اور اس کے حال جس کے ساتھ وہ اس کی شادی کر رہا ہے، کے مطابق اور اس کے مال کی کثرت کی مقدار کے برابر ہو۔ مزید فرمایا: اسی طرح وہ اس کے ختنے وغیرہ میں اس کا مال خرچ کر سکتا ہے، اگر اسے یہ خوف ہو کہ اسے سلطان کے پاس پیش کرنے کا اہتمام کیا جائے گا اور وہ اسے بالقصد اس کا حکم دے گا اور ہر وہ عمل جو اس نے گہری نظر و فکر کے ساتھ کیا تو وہ جائز ہے اور جو اس نے بطور محاباۃ (کسی دوسرے شخص کی سہولت کو پیش نظر رکھنا) اور کوتاہ نظری کی بنا پر کیا تو وہ عمل جائز نہ ہوگا۔ آیت کا ظاہر اس پر دلیل ہے کہ یتیم کا ولی اسے دنیا اور آخرت کے امور کی تعلیم دے گا اور اس کے لئے ایسا معلم اجرت پر رکھے گا جو اسے کاروبار کی تعلیم دے گا۔ اور جب یتیم کو کوئی شے ہبہ کی جائے تو وصی کے لئے اس پر

قبضہ کرنا جائز ہے کیونکہ اس میں اصلاح اور بھلائی ہے۔ اس کا مزید بیان سورۃ النساء میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 4۔ جن چیزوں کے لئے وصی اور کفیل یتیم کا مال خرچ کر سکتے ہیں ان کی دو حالتیں ہیں: ایک وہ حالت ہے جس پر گواہ بنانا ممکن ہوتا ہے اور اس میں بینہ کے بغیر اس کا قول قبول نہیں کیا جائے گا اور ایک وہ حالت ہے جس پر شاہد بنانا ممکن نہیں ہوتا، تو اس پر بغیر بینہ کے اس کا قول قبول ہوگا، پس جب کسی نے زمین خریدی اور وہ جس میں توثیق کی عادت جاری ہو تو بغیر بینہ کے اس میں اس کا قول قبول نہیں کیا جائے گا۔

ابن خویز منداد نے کہا ہے: اسی وجہ سے ہمارے اصحاب نے ان کے درمیان یہ فرق بیان کیا ہے کہ یتیم وصی کے گھر میں ہو تو وہ اس پر خرچ کر سکتا ہے اور اسے اس کے نفقہ اور اس کے لباس وغیرہ مہیا کرنے پر شاہد بنانے کا پابند نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اس کے لئے ہر وقت اس پر گواہ بنانا متعذر رہو گا جو اسے کھلائے اور اسے پہنائے، بلکہ جب اس نے یہ کہا: میں نے سال بھر کے لئے یہ خرچہ کیا ہے تو یہ اس سے قبول کر لیا جائے گا۔ اور اس کے درمیان کہ وہ اپنی ماں یا اپنی دایہ (پرورش کرنے والی) کے پاس ہو اور وصی یہ دعویٰ کر رہا ہو کہ وہ اس پر خرچہ کر رہا ہے یا وہ اس کی ماں یا دایہ کو نفقہ اور کسوۃ دیتا ہے تو بینہ کے بغیر ماں یا دایہ کے خلاف اس کا قول قبول نہیں کیا جائے گا کہ وہ اس کے لئے بطور مشاہرہ یا خاطر مدارت اس پر قبضہ کرتی رہی ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ علماء کا اس آدمی کے بارے میں اختلاف ہے جو اپنی زیر نگرانی یتیم بچی سے اپنا نکاح کر لیتا ہے کیا اس کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنے زیر پرورش یتیم بچے یا بچی کے مال سے اپنے لئے خرید سکتا ہے؟

پس حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کفالت اور حضانت کے سبب نکاح کی ولایت قرابت کی نسبت زیادہ قوی ہے، حتیٰ کہ ان اعراب کے بارے میں کہا جو قحط کے دنوں میں اپنے بچوں کو دوسروں کے حوالے کر دیتے تھے: بے شک وہ انہیں ان کا نکاح کرنے کا اختیار دے دیتے تھے اور رہا کفیل اور پرورش کرنے والے کا اپنے ساتھ نکاح کرنا تو اس کا تفصیلی بیان سورۃ النساء میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور رہا اس سے خریدنا تو حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: مشہور اقوال کے مطابق وہ اس سے خرید سکتا ہے اسی طرح حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کے لئے جائز ہے کہ وہ یتیم بچے کا مال مثلی قیمت سے زیادہ کے عوض اپنے لئے خرید لے، کیونکہ یہ اصلاح اور خیر ہے جس پر ظاہر قرآن دلالت کرتا ہے۔ اور امام شافعی نے کہا ہے: نکاح اور بیع میں ایسا کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ آیت میں تصرف کا ذکر نہیں ہے، بلکہ یہ فرمایا ہے: اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ (ان کی بھلائی کرنا بہتر ہے) اس میں اس کا ذکر نہیں جس کے لئے دیکھ بھال جائز ہوتی ہے۔

اور امام اعظم ابوحنیفہ فرماتے ہیں: جب بھلائی کرنا بہتر ہے تو پھر اس کی شادی کرانا بھی جائز ہوگا اور یہ بھی جائز ہوگا کہ وہ اس سے شادی کر لے۔ اور امام شافعی شادی کرانے میں کوئی بھلائی نہیں دیکھتے سوائے اس جہت کے کہ اس سے حاجت دور ہو جاتی ہے اور بالغ ہونے سے پہلے کوئی حاجت نہیں۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ وصی کے لئے شادی کرانے کو جائز قرار دیتے ہیں کیونکہ یہ بھلائی ہے اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ دادا

کے لئے جائز ہے کہ وہ بھی وصی کے ساتھ ساتھ شادی کرادے اور باپ کے لئے بھی ایسے بچے کے حق میں (یہ اختیار ہے) جس کی ماں فوت ہو چکی ہو نہ کہ اس آیت کے حکم سے اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ قاضی کے لئے ظاہر قرآن کے مطابق یتیم کی شادی کرانے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ یہ سب مذاہب اسی آیت سے ظاہر ہوئے ہیں۔ پس اگر تزویج کا اصلاح (اور نفع بخش ہونا) ثابت ہو جائے تو پھر آیت کا ظاہر اس کے جواز کا تقاضا کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى کا یہ معنی ہونا بھی جائز ہے کہ آپ سے یتیموں کے ذمہ دار، ان کی کفالت کرنے والے سوال کرتے ہیں اور یہ مجمل ہے اس سے معین کافل (کفالت کرنے والا) اور قیم (ذمہ دار) معلوم نہیں ہو سکتا اور جو اس میں اوصاف شرط ہوتے ہیں (وہ بھی معلوم نہیں ہو سکتے۔)

اور اگر کہا جائے: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے جب آدمی کو اپنے یتیم سے مال خریدنے کی اجازت دے دی ہے تو اس سے تو ان کا تہمت اور ذرائع میں اصل کو ترک کرنا لازم آتا ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ یہ لازم نہیں آتا۔ بلاشبہ یہ ان میں ذریعہ اور وسیلہ بن سکتا ہے جو ممنوع افعال سے ایسے ممنوع تک پہنچانے والے ہوں جن کے بارے نص بیان کردی گئی ہو، لیکن یہاں تو اللہ تعالیٰ نے مال باہم ملانے کی صورت میں اجازت عطا فرمادی ہے اور اس میں پرورش کرنے والوں کو ان کی امانتوں کے حوالے کر دیا ہے جیسا کہ فرمایا: وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ اور ہر وہ امر جس کے بارے خوف ہو اللہ تعالیٰ نے مکلف کو اس کی امانت کے حوالے کر دیا ہے، اس میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ممنوع تک پہنچنے کا ذریعہ اور وسیلہ ہے، لہٰذا اس سے منع کر دیا جائے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو اپنی شرمگاہوں پر امین بنایا ہے، اگرچہ ان کا جھوٹ بولنا ممکن ہے۔

حضرت طاؤس سے جب یتیموں کے بارے میں کسی شے سے متعلق سوال کیا جاتا تو وہ یہ پڑھتے: وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ (اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے بگاڑنے والے کو سنوارنے والے سے)

ابن سیرین کے نزدیک یتیم کے مال کے بارے میں پسندیدہ عمل یہ تھا کہ وہ اس کے خیر خواہ لوگوں کو جمع کرے اور وہ اس کے بارے غور و فکر کریں جو اس کے لئے مفید اور بہتر ہو۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے اور اس میں اس پر دلیل ہے کہ اپنے لئے یتیم کے مال سے خریدنا جائز ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کر دیا ہے۔

اور دوسرا قول یہ ہے کہ ولی کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ اس مال میں سے کوئی شے خریدے جو اس کے اپنے زیر نگرانی ہو، کیونکہ اس میں اسے تہمت لگ سکتی ہے مگر یہ کہ اس میں لوگوں کی ایک جماعت میں بیع سلطان کی جانب سے ہو (یعنی نیلام عام ہو)۔

محمد بن عبدالحکیم نے کہا ہے: وہ ترکہ میں سے نہیں خرید سکتا اور اس میں کوئی حرج نہیں کہ وہ ایسے آدمی کو وسیلہ بنائے جو اس میں سے اس کے لئے خریدے، بشرطیکہ یہ معلوم نہ ہو کہ وہ اس کی طرف سے ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ یہ اختلاط اور میل جول دو ہم مثل چیزوں کے ملنے کی طرح ہے جیسا کہ کھجور کا کھجور کے ساتھ مل جانا وغیرہ۔

ابوعبید نے کہا ہے: یتیموں کو ساتھ ملانے کا مفہوم یہ ہے کہ ان میں سے کسی کا مال ہو اور اس کے کفیل کے لئے یہ امر باعث مشقت ہو کہ وہ اپنے سے اس کا کھانا وغیرہ علیحدہ کرے۔ اور وہ اسے اپنے اہل و عیال کے ساتھ ملائے بغیر کوئی چارہ نہ پائے تو وہ

یتیم کے مال سے اتنا لے لے جسے وہ غور و فکر کے بعد یہ سمجھتا ہے کہ یہ اس کے لئے کافی ہوگا اور اسے اپنے اہل خانہ کے خرچہ کے ساتھ ملا لے اور اس میں کبھی کمی بیشی بھی واقع ہو سکتی ہے۔ اور یہ آیت ناسخہ اس میں رخصت کے لئے نازل ہوئی ہے۔ ابو عبید نے کہا ہے: میرے نزدیک یہی اس کی اصل ہے جو دوران سفر دوست احباب کرتے ہیں، کیونکہ وہ اپنی جانب سے برابر برابر خرچہ نکالتے ہیں۔ حالانکہ کھانے کی قلت و کثرت میں وہ باہم متفاوت ہوتے ہیں اور ان میں سے جس کا کھانا کم ہو وہ اپنے ساتھی کے خلاف فضل (اضافی کھانے) کا دعویٰ نہیں کرتا۔ تو جب یتیموں کے مال میں یہ وسعت موجود ہے تو ان کے علاوہ میں بدرجہ اولیٰ وسعت ہوگی۔ اگر اس طرح نہ ہوتو مجھے خوف ہے کہ لوگوں پر اس بارے میں امر انتہائی شدید اور شاق ہو جائے۔

مسئلہ نمبر 7 ۔ قولہ تعالیٰ: فَاِخْوَانُكُمْ ۔ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے، یعنی فھم اخوانکم ہے۔ اور فا جواب شرط کے لئے ہے اور ارشاد باری تعالیٰ: وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ یہ تحذیر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ یتیموں کا مال خراب کرنے والے کو اسے سنوارنے والے سے خوب جانتا ہے، پس وہ ہر ایک کو اس کے سنوارنے اور اس کے بگاڑنے کے بدلے جزا دے گا۔

مسئلہ نمبر 8 ۔ قولہ تعالیٰ: وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ۔ حکم نے مقسم سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ فرمایا: اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا امر کر دیتا کہ تم یتیموں کے مال کے سبب ہلاک ہونے تک پہنچ جاتے۔ اور کہا گیا ہے کہ لَاَعْنَتَكُمْ کا معنی ہے لاھلککم (کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ تمہیں ہلاک کر دیتا۔) یہ زجاج اور ابو عبید کا بیان ہے۔ اور قتبی نے کہا ہے: (معنی یہ ہے) کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ تم پر معاملہ تنگ اور سخت کر دیتا، لیکن اس نے تم پر سہولت اور آسانی کے سوا کچھ نہیں چاہا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یعنی وہ تمہیں ایسے امر کا مکلف اور پابند بنا دیتا جس کو ادا کرنا تم پر انتہائی شدید اور سخت ہوتا اور ان کا اختلاط تمہیں گنہگار کر دیتا، جیسا کہ اس نے ان کے ساتھ کیا جو تم سے پہلے تھے، لیکن اس نے تم سے تخفیف کی ہے۔

اور العنت کا معنی مشقت ہے، وقد عَنِتَ و أعْنَتَهٗ غیرُہ۔ وہ مشقت میں پڑا اور غیر نے اسے مشقت میں ڈالا۔ اور جب ہڈی کو کوئی شے لگے اور وہ اسے توڑ دے تو ایسی جڑی ہوئی ہڈی کے لئے کہا جاتا ہے: قد اعنتہ، تحقیق اس نے اسے مشقت میں اور درد میں مبتلا کیا فھو عَنِتٌ و مُعْنِتٌ۔ اور عَنِتَت الدابۃ تعنَتُ عنتا: جب چوپائے کا پاؤں جڑنے کے بعد پھر ٹوٹ جائے اور اس کے لئے چلنا ممکن نہ ہو۔ اور اَکَمَۃٌ عنوتٌ ایسا ٹیلہ جس پر چڑھنا انتہائی دشوار ہو۔ ابن الانباری نے کہا ہے: العنت کا اصل معنی تشدید (سختی) ہے۔ جب عرب یہ کہتے ہیں: فلان یتعنَّت فلاناً و یُعْنِتہ تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ اس پر انتہائی شدت اور سختی کرتا ہے اور اسے ایسے کام کا پابند بناتا ہے جسے کرنا اس پر انتہائی مشکل اور دشوار ہوتا ہے، پھر اسے ہلاکت کے معنی کی طرف منقول کیا گیا ہے۔ اور اصل معنی وہی ہے جو ہم نے بیان کر دیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ یعنی اس پر کوئی شے رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ حَكِيْمٌ وہ اپنی ملک میں اس کے مطابق تصرف کرتا ہے جو وہ ارادہ کرتا ہے اس پر کوئی پابندی اور رکاوٹ نہیں، وہ انتہائی عظمت و شان والا اور بزرگ و برتر ہے۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۭ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ

اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَ لَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَ لَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ وَ اللّٰهُ يَدْعُوْۤا اِلَى الْجَنَّةِ وَ الْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَ يُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ۠ ﴿۲۲۱﴾

''اور نہ نکاح کرو مشرک عورتوں کے ساتھ یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں اور بے شک مسلمان لونڈی بہتر ہے (آزاد) مشرک عورت سے اگرچہ وہ بہت پسند آئے تمہیں اور نہ نکاح کر دیا کرو (اپنی عورتوں کا) مشرکوں سے یہاں تک کہ وہ ایمان لائیں۔ اور بے شک مومن غلام بہتر ہے (آزاد) مشرک سے اگرچہ وہ پسند آئے تمہیں، وہ لوگ تو بلاتے ہیں دوزخ کی طرف اور اللہ تعالیٰ بلاتا ہے جنت اور مغفرت کی طرف اپنی توفیق سے اور کھول کر بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے حکم لوگوں کے لئے تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔''

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَنْكِحُوا اس میں جمہور کی قراءت تاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ البتہ شاذ قراءت میں ضمہ (پیش) کے ساتھ بھی اسے پڑھا گیا ہے۔ گویا معنی یہ ہے کہ اس کی شادی کرنے والے نے اپنے سے اس کا نکاح کر دیا۔ اور نکح کا اصل معنی جماع ہے اور شادی کرنے کے معنی میں مجازاً اور وسعۃً استعمال ہوتا ہے۔ تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ آگے آئے گی۔

مسئلہ نمبر 2۔ جب اللہ تعالیٰ نے یتیموں کا مال اپنے مال کے ساتھ ملانے اور (اہل کتاب کے ساتھ) نکاح کا میل جول رکھنے کی اجازت عطا فرما دی تو یہ واضح کر دیا کہ مشرکین کے ساتھ باہم نکاح کرنا صحیح نہیں ہے۔

مقاتل نے کہا ہے: یہ آیت حضرت ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مرثد بن ابی مرثد کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ان کا نام کناز بن حصین غنوی تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں خفیہ طور پر مکہ مکرمہ بھیجا، تا کہ وہ آپ کے اصحاب میں سے جو لوگ وہاں ہیں انہیں نکال لائے، تو مکہ مکرمہ میں ایک عورت تھی جو زمانہ جاہلیت میں ان کے ساتھ محبت کرتی تھی۔ اسے عَناق کہا جاتا تھا۔ وہ آپ کے پاس آگئی، تو آپ نے اسے فرمایا: بے شک اسلام نے اسے حرام کر دیا ہے جو کچھ عہد جاہلیت میں تھا تو اس نے کہا: پھر تم مجھ سے شادی کر لو، تو آپ نے فرمایا: یہاں تک کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے لوں، چنانچہ وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور آپ سے اجازت طلب کی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس سے شادی کرنے سے منع فرما دیا، کیونکہ آپ مسلمان تھے اور وہ مشرکہ تھی (1)۔ اس کا بیان سورۃ النور میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس آیت کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے، پس ایک جماعت نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ میں مشرک عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے کو حرام قرار دیا ہے، پھر ان تمام سے اہل کتاب عورتوں کو نکال دیا ہے اور انہیں سورۂ

1۔ اسباب النزول للواحدی، صفحہ 67-66

مائدہ میں حلال قرار دیا ہے۔ یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اور مالک بن انس، سفیان بن سعید ثوری اور عبد الرحمٰن بن عمرو اوزاعی رحمۃ اللہ علیہم نے بھی یہی کہا ہے۔

اور حضرت قتادہ اور حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے: آیت کا لفظ تمام کافر عورتوں کو شامل ہے اور اس سے مراد خاص طور پر اہل کتاب ہیں اور اس خصوص کو سورۃ المائدہ کی آیت نے بیان کیا ہے۔ اور یہ عموم کبھی بھی اہل کتاب عورتوں کو شامل نہیں ہوا۔ یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دو قولوں میں سے ایک ہے۔ اور پہلے قول کے مطابق عموم ان کو بھی شامل ہے پھر سورۃ المائدہ کی آیت نے بعض عموم کو ختم کر دیا ہے۔ اور یہی حضرت امام مالک کا مذہب ہے، اسے ابن حبیب نے ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ یہودیہ اور نصرانیہ کا نکاح مذموم اور ثقیل ہے اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اسے حلال قرار دیا ہے۔

اسحاق بن ابراہیم حربی نے کہا ہے: ایک قوم نے کہا ہے کہ سورۃ البقرہ کی آیت ناسخ ہے اور سورۃ المائدہ کی آیت منسوخ ہے، لہٰذا انہوں نے ہر مشرک عورت کے نکاح کو حرام قرار دیا ہے، چاہے وہ کتابیہ ہو یا غیر کتابیہ ہو۔

نحاس نے کہا ہے: یہ قول کرنے والے کی دلیل وہ حدیث ہے جس کی سند صحیح ہے اور ہمیں محمد بن ریان نے وہ بیان کی ہے، انہوں نے کہا: ہمیں محمد بن رمح نے بیان کیا کہ لیث نے حضرت نافع سے ہمیں بیان کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے جب کسی آدمی کے یہودی یا نصرانی عورت سے شادی کرنے کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر مشرک عورتیں حرام قرار دی ہیں اور میں اس سے بڑا شرک کوئی نہیں جانتا کہ ایک عورت کہتی ہے: اس کا رب عیسیٰ علیہ السلام ہیں یا اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے کوئی بندہ یہ کہے۔(1)

نحاس نے کہا ہے: یہ قول اس جماعت کے قول سے خارج ہے جو اپنے ساتھ حجت قائم کرتے ہیں۔ کیونکہ صحابہ کرام اور تابعین کی ایک جماعت نے اہل کتاب کی عورتوں کے حلال ہونے کے بارے قول کیا ہے، ان میں سے حضرات عثمان، طلحہ، ابن عباس، جابر اور حذیفہ رضی اللہ عنہم ہیں۔ اور تابعین میں سے حضرات سعید بن مسیب، سعید بن جبیر، حسن، مجاہد، طاؤس، عکرمہ، شعبی اور ضحاک ہیں اور فقہائے امصار بھی اسی قول پر ہیں۔ اور یہ بھی کہ سورۃ البقرہ کی اس آیت کا سورۃ المائدہ کی اس آیت کے لئے ناسخ ہونا ممتنع ہے۔ کیونکہ سورۃ البقرہ ان سورتوں میں سے ہے جو پہلے پہلے مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں اور سورۃ المائدہ آخر میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہے۔ اور بلاشبہ آخر میں نازل ہونے والی پہلے والی کو منسوخ کرتی ہے۔ رہی حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما! تو اس میں بھی کوئی دلیل موجود نہیں ہے، کیونکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما توقف کرنے والے آدمی تھے، جب آپ نے دونوں آیتیں سنیں کہ ایک میں حلت کا ذکر ہے اور دوسری میں حرمت کا اور نسخ کی دلیل بھی آپ پر واضح نہ ہوئی، تو آپ نے توقف فرمالیا، پس آپ سے نسخ کا ذکر مروی نہیں، بلکہ صرف نسخ کی تاویل کی گئی ہے اور ناسخ و منسوخ تاویل کے ساتھ حاصل نہیں کیے جاسکتے۔

ابن عطیہ نے ذکر کیا ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ان بعض روایات میں کہا ہے جو ان سے مروی ہیں کہ یہ آیت بت

1۔ بخاری شریف، باب قول اللہ تعالیٰ ولا تنکحوا المشرکات الخ، حدیث نمبر 4877، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پرست، آتش پرست اور کتابی عورتوں کے بارے میں عام ہے اور ہر وہ عورت جو دین اسلام پر نہیں وہ حرام ہے۔ اسی بنا پر یہ سورۃ المائدہ کی آیت کے لئے ناسخ ہے اور موطا میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول اسی کی تائید کرتا ہے کہ میں اس سے بڑھ کر شرک کرنے والا کسی کو نہیں جانتا کہ ایک عورت کہے: اس کا رب عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے حضرت طلحہ بن عبید اللہ اور حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہما اور دو کتابی عورتوں کے درمیان تفریق کی اور ان دونوں نے کہا: اے امیر المومنین! آپ طلاق دلوا دیں اور آپ غصے میں نہ ہوں، تو آپ نے فرمایا: اگر تم دونوں کی طلاق جائز ہے تو یقیناً تمہارا نکاح بھی جائز ہے۔ لیکن میں تم دونوں کے درمیان انتہائی ذلت وحقارت کی تفریق کر رہا ہوں۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ سند کے اعتبار سے جید اور عمدہ نہیں ہے اور آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان دونوں کے درمیان تفریق کا ارادہ کیا تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے آپ سے کہا: کیا آپ گمان کرتے ہیں کہ یہ حرام ہے تو میں اس کا راستہ چھوڑ دیتا ہوں یا امیر المومنین؟ (یعنی میں اسے فارغ کر دیتا ہوں) تو آپ نے فرمایا: میں یہ گمان نہیں کرتا کہ یہ حرام ہے، البتہ مجھے یہ خوف ہے کہ تم ان میں سے بدکار عورتوں میں مشغول ہو جاؤ (1)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

ابن منذر نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے کتابی عورتوں کے ساتھ نکاح جائز ہونے کا ذکر کیا ہے اور ان صحابہ کرام اور تابعین سے بھی جن کا ذکر نحاس کے قول میں ہوا ہے (نکاح کا جواز ذکر کیا ہے) اور اپنے کلام کے آخر میں کہا ہے: اوائل میں سے کسی سے بھی یہ قول صحیح نہیں ہے کہ انہوں نے اسے حرام قرار دیا ہو۔

اور بعض علماء نے کہا ہے: جہاں تک دونوں آیتوں کا تعلق ہے ان کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے، کیونکہ ظاہر الفظ شرک اہل کتاب کو شامل نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ (البقرہ: 105) (نہیں پسند کرتے وہ لوگ جو کافر ہیں اہل کتاب سے اور نہ مشرک کہ اتاری جائے تم پر کچھ بھلائی تمہارے رب کی طرف سے۔) اور فرمایا: لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ (البینۃ: 1) (جن لوگوں نے اہل کتاب میں سے کفر کیا (وہ) اور مشرکین)

پس لفظ میں ان کے درمیان فرق کیا ہے اور ظاہر عطف، معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان مغائرت کا تقاضا کرتا ہے اور یہ بھی کہ اسم شرک عام ہے اور یہ نص نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ کے بعد یہ ارشاد گرامی: وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ (المائدہ: 5) (اور (حلال ہیں) پاک دامن مومن عورتیں اور پاکدامن عورتیں ان لوگوں کی جنہیں دی گئی کتاب) یہ نص ہے، پس جس میں احتمال ہے اور جس میں کوئی احتمال نہیں ان کے درمیان کوئی تعارض نہیں۔ اور اگر کہا جائے: اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ سے یہ ارادہ کیا ہے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 297-296

کہ وہ جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور وہ اسلام لے آئے، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: وَ اِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ الآیہ (آل عمران: 199) (اور بے شک بعض اہل کتاب ایسے ہیں جو ایمان لاتے ہیں اللہ تعالیٰ پر۔) اور یہ ارشاد ہے: مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآىِٕمَةٌ (آل عمران: 113) (اہل کتاب سے ایک گروہ حق پر قائم ہے۔)

تو اسے کہا جائے گا: یہ اس ارشاد میں آیت کی نص کے خلاف ہے: وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اور اس نظریہ کے خلاف ہے جو جمہور نے بیان کیا ہے کیونکہ ان میں سے جو اسلام لے آیا اس کی شادی کے جائز ہونے پر تو کسی کو کوئی اشکال نہیں ہے اور وہ مسلمانوں کی جماعت میں سے ہو گیا ہے۔

اور اگر وہ کہیں: تحقیق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اُولٰٓىِٕكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ اور ان کے نکاح کے حرام ہونے میں آگ کی طرف بلانے کو علت قرار دیا ہے۔ تو جواب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی علت ہے: وَ لَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ کیوں کہ مشرک آگ کی طرف دعوت دیتے ہیں اور یہ علت تمام کفار میں جاری ساری ہے، نتیجتاً مسلمان مطلقاً کافر سے بہتر اور اچھا ہے اور یہ بالکل ظاہر بات ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اور رہا اہل کتاب کا نکاح جب وہ حالت جنگ میں ہوں تو نکاح حلال نہیں ہوگا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: وہ حلال نہیں، اور رب العالمین کا یہ ارشاد تلاوت فرمایا: قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ لَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ ۝ (التوبہ) (جنگ کرو ان لوگوں سے جو نہیں ایمان لائے اللہ پر اور نہ روز قیامت پر اور نہیں حرام سمجھتے جسے حرام کیا ہے اللہ نے اور اس کے رسول نے اور نہ قبول کرتے ہیں سچے دین کو ان لوگوں میں سے جنہیں کتاب دی گئی ہے یہاں تک کہ دیں وہ جزیہ اپنے ہاتھ سے اس حال میں کہ وہ مغلوب ہوں)

محدث نے کہا: میں نے اس کا ذکر حضرت ابراہیم نخعی سے کیا تو انہوں نے اسے بہت پسند کیا۔ اور امام مالک نے اہل حرب کی شادی کو مکروہ قرار دیا ہے اور اس کی علت دار الحرب میں بچے کو چھوڑنا ہے اور اس وجہ سے کہ عورت وہاں شراب اور خنزیر میں تصرف کرے گی۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ یہ اس کی خبر دی جا رہی ہے کہ مومنہ لونڈی مشرکہ سے بہتر ہے، اگرچہ وہ صاحب حسب اور صاحب مال ہو۔ وَّ لَوْ اَعْجَبَتْكُمْ اگرچہ وہ تمہیں حسن و جمال وغیرہ میں بہت پسند آئے۔ یہی علامہ طبری وغیرہ کا قول ہے۔

یہ آیت حضرت خنساء رضی اللہ عنہا کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کی سیاہ رنگ کی لونڈی تھی تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اسے کہا: اے خنساء! تحقیق اس کے باوجود کہ تو سیاہ ہے اور تو بدصورت ہے تیرا ذکر ملاء اعلیٰ میں کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے تیرا ذکر اپنی کتاب میں نازل کیا ہے۔ پس حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اسے آزاد کیا اور اس سے شادی کر لی۔ اور حضرت سدی نے کہا ہے کہ یہ آیت حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان کی ایک سیاہ رنگ کی

کنیز تھی۔ انہوں نے غصے میں اسے طمانچہ دے مارا۔ پھر نادم ہوئے اور حضور نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور آپ کو صورتحال سے آگاہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے عبداللہ! وہ کیسی ہے؟ آپ نے عرض کی: وہ نماز پڑھتی ہے، روزے رکھتی ہے، اچھے طریقے سے وضو کرتی ہے اور شہادتین کی شہادت دیتی ہے۔ تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہ تو مومنہ ہے۔'' تو ابن رواحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں بالضرور اسے آزاد کروں گا اور پھر اس سے شادی کروں گا، پھر انہوں نے ایسا ہی کیا، تو مسلمانوں میں سے کچھ لوگوں نے ان پر طعن کیا اور کہا: انہوں نے لونڈی سے نکاح کیا ہے؟ اور وہ یہ خیال کرنے لگے کہ وہ مشرکین سے نکاح کریں اور وہ ان کے حسب ونسب میں رغبت رکھتے ہوئے ان سے نکاح کرتے رہیں۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 6۔ اہل کتاب کی لونڈیوں کے نکاح کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: کتابیہ لونڈی سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے اور اشہب نے کتاب محمد میں کہا ہے: وہ آدمی جس نے اسلام قبول کیا اور اس کے تحت کتابیہ لونڈی ہو تو ان دونوں کے درمیان تفریق نہیں کی جائے گی اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے کہ اہل کتاب کی لونڈیوں کا نکاح جائز ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: ہمیں شیخ ابو بکر الشاشی نے مدینۃ السلام کے بارے درس دیا اور کہا کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب نے کتابیہ لونڈی کے نکاح کے جائز ہونے پر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ اور آیت سے وجہ استدلال یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مومنہ لونڈی اور مشرکہ کے نکاح کے درمیان اختیار دیا ہے، پس اگر مشرکہ لونڈی کا نکاح جائز نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ ان دونوں کے درمیان اختیار نہ دیتا، کیونکہ بلاشبہ اختیار دو جائز چیزوں کے درمیان ہوتا ہے نہ کہ جائز اور ممتنع کے درمیان اور نہ ہی دو ضدوں کے درمیان۔

جواب یہ ہے کہ دو ضدوں کے درمیان اختیار لغۃً بھی اور قرآن کی رو سے بھی جائز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَىٕذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّ اَحْسَنُ مَقِيْلًا ۝ (الفرقان) (اہل جنت کا اس دن بہت اچھا ٹھکانا ہوگا اور دوپہر گزارنے کی جگہ بڑی آرام دہ ہوگی۔) اور حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کو اپنے خط میں کہا: حق کی طرف رجوع کرنا باطل میں سرکشی اختیار کرنے سے بہتر ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَلَاَمَةٌ سے مراد وہ غلامی نہیں جو کسی کی ملکیت ہو بلکہ اس سے مراد آدمیت ہے اور عورتیں اور مرد سب کے سب اللہ تعالیٰ کے غلام اور اس کی باندیاں ہیں، قاضی بصرہ ابو العباس جرجانی نے یہی کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ مجوسی عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے کے بارے میں ائمہ نے اختلاف کیا ہے۔ پس امام مالک، شافعی، ابو حنیفہ، اوزاعی اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہم نے اس سے منع کیا ہے۔ اور ابن حنبل نے کہا ہے: مجھے پسند نہیں ہے۔ یہ روایت ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے ایک مجوسیہ عورت سے شادی کی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: اس کو طلاق دے دو۔

ابن القصار نے کہا ہے کہ ہمارے بعض اصحاب نے کہا ہے: دو قولوں میں سے ایک کے مطابق یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کی کتاب ہے۔ لہٰذا ان کے ساتھ نکاح کرنا جائز ہے۔

ابن وہب نے حضرت مالک سے روایت کیا ہے کہ مجوسیہ لونڈی ہو تو ملک یمین کی حیثیت سے اس کے ساتھ وطی کرنا جائز

نہیں اور اسی طرح بت پرست عورتوں اور دیگر کافر عورتوں کا حکم ہے۔ یہی موقف علماء کی ایک جماعت کا ہے، مگر ایک روایت ہے جسے یحییٰ بن ایوب نے ابن جریج سے اور انہوں نے حضرت عطا اور عمرو بن دینار سے روایت کیا ہے کہ ان دونوں سے مجوسی لونڈیوں سے نکاح کرنے کے بارے پوچھا گیا، تو ان دونوں نے کہا: اس میں کوئی حرج نہیں۔ اور ان دونوں نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ کی تاویل کی ہے۔ وہ یہ کہ ان دونوں کے نزدیک اس کا اطلاق عقد نکاح پر ہے نہ کہ خریدی ہوئی لونڈی پر اور ان دونوں نے اوطاس کے قیدیوں سے استدلال کیا ہے۔ وہ یہ کہ صحابہ کرام نے ان میں سے لونڈیوں کے ساتھ ملک یمین کی حیثیت سے وطی کی۔ نحاس نے کہا ہے: یہ قول شاذ ہے، رہے اوطاس کے قیدی! تو ان میں یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی لونڈیوں نے اسلام قبول کرلیا ہو تو پھر ان کے ساتھ نکاح جائز ہے اور جہاں تک اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ سے استدلال کا تعلق ہے تو وہ غلط ہے، کیونکہ انہوں نے لفظ نکاح کو عقد کے معنی پر محمول کیا ہے، حالانکہ لغت میں نکاح کا اطلاق عقد اور وطی دونوں پر ہوتا ہے۔ پس جب فرمایا: وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ تو ہر اس نکاح کو حرام کردیا جو مشرکات پر واقع ہوتا ہے چاہے وہ عقد نکاح ہو یا وطی ہو۔

ابو عمر بن عبد البر نے کہا ہے کہ امام اوزاعی نے بیان کیا: میں نے زہری سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا جو مجوسیہ لونڈی خریدتا ہے، کیا وہ اس سے وطی کرسکتا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: جب وہ یہ شہادت دے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تو وہ اس سے وطی کرسکتا ہے۔

یونس نے ابن شہاب سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: اس کے لئے اس سے وطی کرنا حلال نہیں ہوگا یہاں تک کہ وہ اسلام قبول کرلے۔

ابو عمر نے کہا ہے کہ ابن شہاب کا قول ہے کہ اس کے لئے اس سے وطی کرنا حلال نہیں ہے یہاں تک کہ وہ اسلام قبول کرلے اور ابن شہاب مغازی اور سیر کے بارے لوگوں سے بڑھ کر عالم ہیں۔ آپ کا یہ قول اس کے قول کے فاسد ہونے پر دلیل ہے جس نے یہ گمان کیا ہے کہ اوطاس کے قیدیوں سے وطی کی گئی اور ان عورتوں نے اسلام قبول نہ کیا۔ یہ قول ایک جماعت سے مروی ہے۔ ان میں سے حضرت عطا اور عمرو بن دینار بھی ہیں۔ ان دونوں نے کہا ہے: مجوسیہ کے ساتھ وطی کرنے میں کوئی حرج نہیں اور فقہاء امصار میں سے کوئی ایک بھی اس قول کی طرف متوجہ نہیں ہوا (یعنی کسی نے اسے اہمیت نہیں دی) حالانکہ امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے بھی منقول ہے۔

اور وہ ان میں سے ہیں جن کی فارس اور پھر خراسان کے سوا نہ اپنی جنگ ہوئی اور نہ ان کے اطراف والوں کی جنگ ہوئی اور ان میں سے کوئی بھی اہل کتاب نہیں جو تیرے لئے یہ بیان کرے کہ ان کی عورتوں کی سیرت اور کردار کیا ہوتا جب وہ قیدی بنائی جاتیں۔ فرمایا: ہمیں عبد اللہ بن محمد بن اسد نے خبر دی ہے، اس نے کہا: ہمیں ابراہیم بن احمد بن فراس نے بتایا ہے، اس نے کہا: ہمیں علی بن عبد العزیز نے بیان کیا ہے، اس نے کہا: ہمیں ابو عبید نے بتایا ہے، اس نے کہا: ہمیں ہشام نے یونس سے اور انہوں نے حسن سے ہمیں بیان کیا ہے، اس نے کہا: ایک آدمی نے اسے کہا: اے ابو سعید! تم کیا طریقہ کرتے ہو جب تم

عورتوں کو قیدی بناتے ہو؟ تو انہوں نے کہا: ہم انہیں قبلہ کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور ہم انہیں حکم دیتے ہیں کہ اسلام قبول کر لو اور یہ شہادت دو لا الہ الا اللہ و ان محمدا رسول اللہ، پھر ہم انہیں حکم دیتے ہیں کہ وہ غسل کریں۔

اور جب اس کا مالک اس سے وطی کرنے کا ارادہ کرے تو وہ اس کے قریب نہیں جاتا یہاں تک کہ وہ اسے استبرا (☆) کرا لے۔ اس ارشاد باری تعالیٰ میں وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ علماء کی ایک جماعت کی تاویل اسی کے مطابق ہے کہ بلاشبہ ان سے مراد بت پرست اور مجوسی عورتیں ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کتابی عورتیں اپنے اس ارشاد کے ساتھ حلال قرار دی ہیں۔ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ یعنی پاکدامن عورتیں، نہ کہ وہ مسلمان عورتیں جن کا زنا مشہور ہے۔ اور علماء میں سے بعض نے ان کے نکاح کو مکروہ قرار دیا ہے اور اسے کہ وہ ملک یمین کی حیثیت سے اس کے ساتھ وطی کرے جب تک کہ ان کی جانب سے توبہ نہ ہو۔ کیونکہ اس میں نسب کو فاسد کرنا لازم آتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ: وَ لَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ۭ وَ لَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَكُمْ ۭ اس میں گیارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا تُنْكِحُوا کا معنی ہے تم کسی مسلمان عورت کا کسی مشرک آدمی سے نکاح نہ کرو۔ اور امت کا اس پر اجماع ہے کہ مشرک کسی بھی وجہ سے مومنہ عورت کے ساتھ وطی نہیں کر سکتا، کیونکہ اس میں اسلام کی ذلت و رسوائی ہے۔ اور قراء نے تنکحوا میں تا کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت میں نص کے ساتھ اس پر دلیل موجود ہے کہ ولی کے بغیر نکاح نہیں ہو سکتا۔

محمد بن علی بن حسین نے کہا ہے: کتاب اللہ میں ہے کہ نکاح ولی (کی اجازت) کے ساتھ ہوتا ہے، پھر انہوں نے یہ آیت پڑھی وَ لَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ۔

ابن منذر نے کہا ہے: یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لا نكاح الا بولي (1) یعنی نکاح نہیں ہوتا مگر ولی کی اجازت کے ساتھ۔

اہل علم نے بغیر ولی کے نکاح کے بارے میں اختلاف کیا ہے۔ بہت سے اہل علم نے کہا ہے: نکاح نہیں ہوتا مگر ولی کے ساتھ، یہ حدیث حضرت عمر بن خطاب، حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور اسی طرح حضرت سعید بن مسیب، حضرت حسن بصری، حضرت عمر بن عبد العزیز، حضرت جابر بن زید، حضرت سفیان ثوری، حضرت ابن ابی لیلیٰ، حضرت ابن شبرمہ، حضرت ابن مبارک، حضرت امام شافعی، حضرت عبید اللہ بن حسن، حضرت امام احمد، حضرت اسحاق اور حضرت ابو عبید رحمۃ اللہ علیہم نے بھی کہا ہے۔

☆ رحم کو مادہ منویہ سے پاک کرنے کا اہتمام کرنا اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اسے حیض آ جائے۔

1۔ ابو داؤد، باب الولی، حدیث نمبر 1785، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ابن ماجہ، باب لا نکاح الا بولی، حدیث نمبر 1870، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
جامع ترمذی، باب ما جاء لا نکاح الا بولی، حدیث نمبر 1020، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہی قول حضرت امام مالک، حضرت ابوثور اور حضرت طبری رحمۃ اللہ علیہم کا بھی ہے۔
ابوعمر نے کہا ہے: جنہوں نے یہ کہا ہے کہ "ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا" ان کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لا نکاح الا بولی۔
اس حدیث کو حضرت شعبہ اور ثوری نے ابو اسحاق سے، انہوں نے ابو بردہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مرسل روایت کیا ہے۔ پس جو مرسل روایات قبول کرتے ہیں اس کو قبول کرنا ان پر لازم ہوگا اور رہے وہ جو مرسل روایات قبول نہیں کرتے تو ان پر بھی اسے قبول کرنا لازم ہوگا، کیونکہ وہ جنہوں نے اسے متصل ذکر کیا ہے وہ اہل حفظ اور ثقہ رواۃ میں سے ہیں اور جنہوں نے اسے متصل ذکر کیا ہے ان میں سے اسرائیل اور ابوعوانہ دونوں راوی ابو اسحاق سے، وہ ابو بردہ سے، وہ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے اور وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں (1)۔ اور اسرائیل اور جنہوں نے ان کی اتباع کی ہے وہ سب حفاظ ہیں اور حافظ کی زیادتی قبول کی جاتی ہے اور اس زیادتی کو اصول تقویت دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ (البقرہ: 232) (تو نہ منع کرو انہیں کہ نکاح کرلیں اپنے خاوندوں سے) یہ آیت حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی جب انہوں نے اپنی بہن کو اپنے خاوند کی طرف رجوع کرنے سے منع کیا۔ اسے امام بخاری نے بیان کیا ہے اور اگر ان کے لئے نکاح کرنے میں کوئی حق نہ ہوتا تو انہیں رجوع سے روکنے سے منع نہ کیا جاتا۔
میں (مفسر) کہتا ہوں: کتاب اللہ میں سے بھی جو آیات اس پر دلالت کرتی ہیں وہ یہ ہیں: فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ (النساء: 25) (تو نکاح کرلو ان کے سرپرستوں کی اجازت سے) اور یہ ارشاد وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ (النور: 32) (اور نکاح کردیا کرو جو بے نکاح ہیں تم میں سے) پس اللہ تعالیٰ نے نکاح کے بارے خطاب مردوں کے سوا کسی کو نہیں کیا۔ اگر یہ خطاب عورتوں کو ہوتا تو اللہ تعالیٰ ان کا ذکر فرماتا۔ عنقریب اس کا بیان سورۃ النور میں آئے گا۔
اور اللہ تعالیٰ نے بطور حکایت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں حضرت شعیب علیہ السلام کی طرف سے کہا ہے: "بے شک میں ارادہ رکھتا ہوں کہ میں تجھے نکاح کردوں" اس کی وضاحت سورۃ القصص میں آئے گی۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (النساء: 34) (مرد محافظ و نگران ہیں عورتوں پر) پس کتاب وسنت نے اس پر قوت اور تائید فراہم کی ہے کہ ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔
علامہ طبری نے کہا ہے کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے جس وقت وہ غیر شادی شدہ تھیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کا عقد نکاح کیا (2) اور انہوں نے خود نکاح نہ کیا۔ یہ اس کے قول کا بطلان ہے جس نے کہا ہے کہ بالغہ عورت اپنے نفس کی مالک ہوتی ہے اپنے ولی کے بغیر وہ اپنی شادی کرسکتی ہے اور عقد نکاح کرسکتی ہے اور اگر یہ اختیار اسے ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

1۔ جامع ترمذی، باب ماجاء لا نکاح الا بولی، حدیث نمبر 1020، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
ابن ماجہ، باب لا نکاح الا بولی، حدیث نمبر 1870، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ بخاری شریف، باب شہود الملائکۃ بدرا، حدیث نمبر 3704، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو ان کی اپنی ذات کے بارے میں پیغام نکاح بھیجنا ترک نہ کرتے جبکہ وہ اپنی ذات کے بارے میں اپنے باپ کی نسبت زیادہ قریب تھیں اور آپ نے پیغام نکاح اس کی طرف بھیجا جو ان کے معاملے کا مالک نہیں اور نہ ان کا عقد کرنے کا مالک ہے اور اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی وضاحت بھی ہے الایم احق بنفسھا من ولیھا (1) (بیوہ عورت اپنے ولی کی نسبت اپنے بارے میں زیادہ حق رکھتی ہے۔) اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کے بارے اس میں زیادہ حق رکھتی ہے کہ وہ اس کی رضامندی کے بغیر اس پر عقد نہیں کرسکتا، یہ معنی نہیں کہ وہ اپنے بارے میں یہ زیادہ حق رکھتی ہے کہ وہ اپنے ولی کے بغیر اپنا نکاح خود کرلے۔ اور دارقطنی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی عورت کسی عورت کی شادی نہیں کرے گی اور نہ کوئی عورت اپنی شادی کرے گی کیونکہ زانیہ وہی ہوتی ہے جو اپنی شادی خود کرلیتی ہے۔'' فرمایا: یہ حدیث صحیح ہے۔(2)

اور ابوداؤد نے سفیان عن الزہری عن عروۃ کی سند سے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کسی عورت کا نکاح اس کے ولی کی اجازت کے بغیر کردیا گیا تو اس کا نکاح باطل ہے۔ آپ نے یہ جملہ تین بار فرمایا۔ پس اگر اس کے ساتھ دخول کرلیا گیا تو اس کے لئے مہر ہوگا اس عمل کے عوض جو اس نے اس کے ساتھ کیا اور اگر وہ آپس میں جھگڑ پڑیں تو سلطان اس کا ولی ہوگا جس کا کوئی ولی نہ ہو (3)۔'' یہ حدیث صحیح ہے۔

اور ابن علیہ نے جو قول ابن جریج سے نقل کیا ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں کہ انہوں نے کہا: میں نے اس کے بارے حضرت زہری سے پوچھا تو انہیں اس کی پہچان نہ تھی۔ اور ابن علیہ کے سوا کسی ایک نے بھی ابن جریج سے یہ قول نقل نہیں کیا، حالانکہ ایک جماعت نے حضرت زہری سے اس حدیث کو روایت کیا ہے اور انہوں نے اس کا ذکر نہیں کیا اور اگر زہری سے یہ ثابت ہو جائے تو بھی اس میں دلیل موجود نہیں کیونکہ آپ سے اسے ثقہ راویوں نے نقل کیا ہے، ان میں سے سلیمان بن موسیٰ ہیں اور وہ ثقہ امام ہیں اور جعفر بن ربیعہ ہیں (4) اور اگر زہری اسے بھول گئے تب بھی یہ آپ کے لئے نقصان دہ نہیں، کیونکہ نسیان سے کوئی آدمی محفوظ نہیں، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آدم علیہ السلام بھول گئے تو آپ کی ساری اولاد بھول گئی (5)'' اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نسیان لاحق ہو جاتا تھا، تو پھر آپ کے سوا کون ہے جو نسیان سے زیادہ محفوظ ہو اور جس نے یاد رکھا تو وہ اس پر حجت ہے جو بھول گیا، پس جب ثقہ راوی خبر کو روایت کرے تو جو بھول گیا اس کا نسیان اس کے لئے نقصان دہ نہیں ہوگا۔ یہ تب ہے جبکہ وہ صحیح ہو جو ابن علیہ نے ابن جریج سے بیان کیا ہے، تو کیا حال ہوگا جبکہ اہل علم نے اس حکایت کا انکار کیا ہے اور انہوں نے اس پر اعتماد نہیں کیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس حدیث کو ابو حاتم محمد بن حبان تمیمی البستی نے المسند الصحیح میں تقاسیم و انواع پر اس کی سند میں

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 1888 2۔ ابن ماجہ، باب لانکاح الابولی، حدیث نمبر 1871، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ابوداؤد، باب فی الولی، حدیث نمبر 1784، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 4۔ ایضاً

5۔ جامع ترمذی، باب ومن سورۃ الاعراف، حدیث نمبر 3002، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

انقطاع کے پائے جانے کے بغیر نقل کیا ہے اور اس کے ناقل میں کوئی جرح بھی ثابت نہیں یہ حفص بن غیاث عن ابن جریج عن سلیمان بن موسیٰ عن الزہری عن عروہ عن عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی سند سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''کوئی نکاح نہیں ہوتا مگر ولی کی اجازت کے ساتھ اور دو عادل شاہدوں کی شہادت کے ساتھ اور جو نکاح اس کے بغیر ہو وہ باطل ہے اور اگر وہ آپس میں جھگڑ پڑیں تو سلطان وقت اس کا ولی ہے جس کا کوئی ولی نہ ہو۔''

ابو حاتم نے بیان کیا ہے کہ ابن جریج عن سلیمان بن موسیٰ عن الزہری کی روایت میں سوائے تین آدمیوں کے کسی نے بھی یہ الفاظ نہیں کہے وَ شَاهِدَیْ عَدْلٍ (وہ تین افراد یہ ہیں) سوید بن یحییٰ اموی، حفص بن غیاث سے، عبداللہ بن عبدالوہاب جمحی، خالد بن حارث سے اور عبدالرحمن بن یونس الرقی، عیسیٰ بن یونس سے، شاہدین کے بارے میں اس خبر کے سوا کوئی صحیح نہیں ہے۔ اور جب یہ خبر ثابت ہوگئی تو کتاب وسنت نے اس بارے تصریح کردی کہ ولی کی اجازت کے بغیر کوئی نکاح نہیں۔ اور جو ان دونوں کے خلاف ہو اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

حضرت زہری اور شعبی کہتے ہیں کہ جب کسی عورت نے دو شاہدوں کی موجودگی میں اپنی شادی کفو میں کرلی تو وہ نکاح جائز ہے۔ اسی طرح حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی فرماتے ہیں کہ جب کسی عورت نے دو شاہدوں کی موجودگی میں اپنا نکاح کفو میں کیا تو وہ نکاح جائز ہے، یہی امام زفر کا قول ہے۔ اور اگر کسی نے اپنا نکاح غیر کفو میں کیا، تو وہ نکاح جائز ہوگا، لیکن اولیاء کو ان کے درمیان تفریق کا اختیار ہوگا۔

ابن منذر نے کہا ہے: جو کچھ حضرت نعمان نے کہا ہے وہ سنت کے مخالف ہے اور اکثر اہل علم کے قول سے باہر ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حدیث کے مطابق ہم کہہ رہے ہیں۔

اور امام ابو یوسف نے کہا ہے: نکاح جائز نہیں ہوگا مگر ولی کی اجازت کے ساتھ اور اگر ولی تسلیم کرلے تو پھر جائز ہے اور اگر وہ انکار کردے اور اسے حوالے نہ کرے اور زوج عورت کا کفو ہو تو قاضی اس کی اجازت دے دے۔ اور بلاشبہ جب قاضی اس کی اجازت دے دے گا تو وہ نکاح مکمل ہو جائے گا، یہی قول امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ اور امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے: قاضی ولی کو نکاح کی اجازت دینے کا حکم دے گا اور اگر وہ نہ دے تو (قاضی) نئے سرے سے عقد کردے۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب کے درمیان اس صورت میں کوئی اختلاف نہیں جب عورت کا ولی اسے اجازت دے دے، پس اس نے اپنا نکاح خود کرلیا تو وہ جائز ہوگا۔

امام اوزاعی نے کہا ہے: جب عورت اپنے معاملے کا کسی آدمی کو ولی بنائے اور وہ اس کا نکاح کفو میں کردے تو وہ نکاح جائز ہے، اب ولی کے لئے ان کے درمیان تفریق کرنے کا اختیار نہیں ہے، مگر یہ کہ وہ عورت عربیہ ہو اور شادی کسی مولیٰ (غلام) سے کرلے، یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کی طرح ہے جو کہ آگے آئے گا۔

اور امام زہری، امام ابو حنیفہ اور شعبی رحمہم اللہ کے مذہب کے قائلین نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد: لا نکاح الا بولی کو معنی کمال پر محمول کیا ہے نہ کہ وجوب پر، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: لا صلوٰۃ لجار المسجد الا فی المسجد (کہ

مسجد کے پڑوس میں رہنے والے کی نماز مسجد کے بغیر نہیں ہوتی۔) اور لا حَظَّ فی الاسلام لمن ترک الصلوٰۃ(1) کہ جس نے نماز چھوڑ دی اس کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں) (ان ارشادات میں کمال کی نفی ہے اسی طرح اس حدیث میں بھی کمال کی نفی ہے یعنی نکاح کامل نہیں ہوگا۔) اور انہوں نے اس پر ان ارشادات سے استدلال کیا ہے: **فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ** اور **فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ** (البقرہ: 234) (تو کوئی گناہ نہیں تم پر اس میں جو کریں وہ اپنی ذات کے بارے میں مناسب طریقے سے۔) اور اس روایت سے جو دارقطنی نے سماک بن حرب سے روایت کی ہے انہوں نے بیان کیا کہ ایک آدمی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا: ایک عورت ہے میں اس کا ولی ہوں اس نے میری اجازت کے بغیر شادی کر لی ہے؟ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جو کچھ اس نے کیا ہے اس میں غور و فکر کی جائے گی اور دیکھا جائے گا، سو اگر اس نے کفو میں شادی کی ہے تو ہم اسے اس کی اجازت دے دیں گے اور اگر اس نے ایسے آدمی سے شادی کی جو اس کا ہم کفو نہیں تو ہم اسے تیرے حوالے کر دیں گے(2)۔

اور موطا میں ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بھائی عبدالرحمن کی بیٹی کی شادی کی اور وہ غائب تھے۔ الحدیث۔

اور ابن جریج نے اسے عبدالرحمن بن قاسم بن محمد بن ابی بکر سے انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا کہ انہوں نے ایک آدمی منذر بن زبیر رضی اللہ عنہ کا نکاح اپنے بھائی کی اولاد میں سے ایک عورت کے ساتھ کیا۔ آپ نے ان کے درمیان پردہ لٹکا دیا، پھر گفتگو فرمائی۔ یہاں تک کہ جب عقد کے سوا کچھ باقی نہ بچا تو آپ نے ایک آدمی کو حکم دیا اور اس نے نکاح کر دیا، پھر آپ نے فرمایا: عورتوں کے پاس نکاح کرنے کا اختیار نہیں ہے (یعنی عورتوں کو ولایت انکاح حاصل نہیں) اور امام مالک کی حدیث میں وجہ یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے مہر اور احوال نکاح کو پختہ کیا اور اس (عورت) کے عصبہ میں سے ایک عقد کا والی بنا اور عقد کی نسبت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف کی گئی کیونکہ اسے پختہ کرنے کی نسبت آپ کی طرف ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ ابن خویز منداد نے ذکر کیا ہے: اولیاء کے بارے میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مختلف روایات ہیں کہ وہ کون ہیں؟ پس آپ نے ایک بار فرمایا: ہر وہ آدمی جس نے عورت کو اچھے اور حسین منصب میں رکھا وہی اس کا ولی ہے، چاہے وہ عصبہ ہو یا ذوی الارحام میں سے ہو یا اجنبی ہو یا امام ہو یا وصی ہو۔ اور ایک بار فرمایا: اولیاء عصبات میں سے ہوتے ہیں، پس ان میں سے جس نے عورت کو اچھے منصب میں رکھا وہ اس کا ولی ہوگا۔

ابو عمر نے کہا ہے: امام مالک نے اس بیان میں کہا ہے جو ان سے ابن قاسم نے ذکر کیا ہے کہ جب کسی عورت کی شادی ولی کے علاوہ کوئی اور اس عورت کی اجازت سے کر دے تو پھر اگر وہ عورت شریف ہو اور لوگوں میں اس کا کوئی مقام ہو تو اس کے نکاح کو فسخ کرنے اور اسے برقرار رکھنے میں اس کے ولی کو اختیار ہوگا اور اگر وہ عورت رذیل اور کمینی ہو جیسا کہ آزاد شدہ

1۔ التمہید، جلد 19، صفحہ 90-91 2۔ سنن دارقطنی، جلد 3، صفحہ 237

لونڈی، سوداء یعنی قبطی قوم سے تعلق رکھنے والی، زنا کار اور مسلمانیۃ اور وہ عورت جس کا کوئی مقام و مرتبہ نہ ہو تو اس کا نکاح جائز ہوگا اور اس کے ولی کو اختیار نہ ہوگا کیونکہ ہر کوئی اس کا کفو ہے۔

اور حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ عورت شریف ہو یا رذیل ولی یا سلطان کے علاوہ کوئی اس کی شادی نہیں کر سکتا۔ اس قول کو ابن منذر نے پسند کیا ہے اور کہا ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے مسکین عورت اور وہ جو ذی مرتبہ اور ذی قدر ہو کے درمیان تفریق کرنا جائز نہیں، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خون کے بارے میں ان کے احکام کے درمیان مساوات اختیار کی ہے۔ اور فرمایا ہے: ''تمام مسلمانوں کا خون مساوی اور برابر ہوتا ہے'' (1)۔ اور جب وہ خون میں برابر ہوئے تو وہ اس کے علاوہ دیگر احکام میں بھی ایک شے ہوں گے۔

اور اسماعیل بن اسحاق نے کہا ہے: جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے نکاح کے بارے حکم ارشاد فرمایا تو اس نے بعض مومنین کو بعض کا ولی بنا دیا۔ سو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ (التوبۃ:71) (نیز مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں) اور فی الجملہ مومنین اسی طرح بعض بعض کے وارث بنتے ہیں، پس اگر ایک آدمی مر جائے اور اس کا کوئی وارث نہ ہو تو اس کی میراث تمام مسلمانوں کے لئے ہوگی اور اگر وہ کسی جنایت (جرم) کا ارتکاب کرے تو اس کی جانب سے مسلمان ہی دیت ادا کریں گے، پھر ایک ولایت دوسری ولایت سے زیادہ قریب ہوتی ہے اور ایک قرابت دوسری قرابت سے زیادہ قریب ہوتی ہے۔

اور جب عورت ایسی جگہ میں ہو جہاں نہ سلطان ہو اور نہ اس کا ولی ہو تو وہ اپنا معاملہ پڑوسیوں میں سے اس کے حوالے کر دے گی جو قابل اعتماد ہوگا اور وہ اس کی شادی کر سکے گا اور اس حال میں وہی اس کا ولی ہوگا، کیونکہ لوگوں کے لئے شادی کرنے سے کوئی چارہ نہیں ہے۔ اور بلاشبہ اس بارے میں جتنا ممکن ہو سکے وہ اچھا عمل کرتے ہیں، اسی بنا پر امام مالک نے کمزور حالت والی عورت کے بارے میں کہا ہے کہ بلاشبہ اس کی شادی وہ کر سکتا ہے جس کی طرف وہ اپنے معاملے کو منسوب کرے گی، کیونکہ وہ عورت ان میں سے ہے جو سلطان کے پاس پہنچنے سے قاصر ہوتی ہے۔ پس اسے اس کے مشابہ قرار دیا گیا ہے جس کی موجودگی میں سلطان نہ ہو، پس فی الجملہ وہ اس طرف راجع ہوئی کہ مسلمان اس کے اولیاء ہیں۔ پس جب اس نے اپنا معاملہ ایک آدمی کے حوالے کر دیا اور اپنے اولیاء کو چھوڑ دیا تو بلاشبہ اس نے بلاوجہ ایک امر کو اختیار کیا ہے اور اس نے وہ کام کیا ہے جس کے بارے حاکم اور مسلمان اس کا انکار کرتے ہیں تو وہ نکاح فسخ کر دیا جائے گا یہ معلوم کیے بغیر کہ اس کی حقیقت حرام ہے۔

جب ہم نے یہ بیان کر دیا ہے کہ مومنین بعض بعض کے اولیاء ہیں اور یہ بھی کہ اس میں اختلاف ہے، لیکن اس کے باوجود نکاح فسخ کر دیا جائے گا کیونکہ یہ کام بلاوجہ ہوا ہے اور اس لئے بھی کہ فروج کے بارے زیادہ احتیاط ہے اور اس لئے بھی کہ ان کی حفاظت (ضروری ہے) اور جب دخول ہو جائے اور معاملہ طویل ہو جائے اور وہ اولاد کو جنم دے لے تو پھر صحیح یہی ہے کہ فسخ

1۔ ابوداود، باب السریۃ ترد علی اهل العسکر، حدیث نمبر 2371، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابن ماجہ، باب المسلمون تتکافأ دماءهم، حدیث نمبر 2674-2672، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جائز نہیں، کیونکہ امور جب متفاوت ہو جائیں تو پھر ان سے اس حرام کے سوا کسی کا ارادہ نہیں کیا جاتا جس میں کوئی شک نہ ہو۔ اور یہ اس کے مشابہ ہو جاتا ہے جو حاکم کے حکم سے فوت ہو جائے جب کہ وہ حکماً یہ فیصلہ دے کہ اسے فسخ نہ کیا جائے مگر یہ کہ وہ ایسی خطا اور غلطی ہو جس میں کوئی شک نہ ہو (تو اس صوت میں حاکم کا فیصلہ نافذ العمل نہ ہوگا۔)

اور رہے امام شافعی اور آپ کے اصحاب! تو ان کے نزدیک بغیر ولی کے کیا ہوا نکاح ہمیشہ فسخ کیا جاتا ہے اور وہ ایک دوسرے کے وارث نہیں بنیں گے اگر ان میں سے کوئی ایک مر جائے۔ اور ان کے نزدیک ولی نکاح کے فرائض میں سے ہے، اس لئے کہ ان کے نزدیک اس پر کتاب وسنت سے دلیل قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وانکحوا الایامی منکم اسی طرح فرمایا: فانکحوھن باذن اھلھن اور اولیاء کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: لا نکاح الا بولی اور انہوں نے رذیل اور شریف عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا، کیونکہ اس پر علماء کا اجماع ہے کہ ان دونوں کے درمیان خون کے احکام میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے: المسلمون تتکافؤ دماؤھم اور تمام احکام اسی طرح ہیں۔ اور ان میں سے کسی میں کتاب وسنت میں بلند مرتبہ اور گھٹیا کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اس نکاح کے بارے میں ائمہ کا اختلاف ہے جو بغیر ولی کی اجازت کے واقع ہو اور پھر ولی قبل از دخول اس کی اجازت دے دے، تو حضرت امام مالک اور عبدالملک کے سوا ان کے اصحاب نے کہا ہے: وہ نکاح جائز ہے، کیونکہ اس کے لئے اس کی اجازت قرب کے سبب ہے، چاہے دخول ہوا ہو یا دخول نہ ہوا ہو۔ یہ تب ہے جب عقد نکاح غیر ولی نے کیا ہو اور عورت نے بذات خود عقد نکاح نہ کیا ہو اور اگر عورت نے اپنی شادی خود کی اور اس نے مسلمانوں میں سے کسی قریبی یا بعیدی ولی کے بغیر عقد نکاح خود کیا ہو تو یہ نکاح کسی حال میں ہمیشہ کے لئے برقرار نہیں رکھا جائے گا اگرچہ وقت زیادہ گزر جائے اور وہ اولاد کو جنم دے لے۔ البتہ دخول کی صورت میں بچے کو اسی کے ساتھ ملحق کیا جائے گا اور حد ساقط ہو جائے گی اور ہر حال میں اس نکاح کو فسخ کرنا ضروری ہے۔ ابن نافع نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ اس صورت میں فسخ بغیر طلاق کے ہوگا۔

مسئلہ نمبر 5۔ اولیاء کے مراتب اور ان کی ترتیب میں علماء نے اختلاف کیا ہے:

حضرت امام مالک فرماتے ہیں: اولیاء میں سے سب سے اول بیٹے ہیں اگرچہ وہ کتنے ہی نیچے کی طرف ہوں، پھر باپ، پھر وہ بھائی جو باپ اور ماں دونوں جانب سے سگے ہوں، پھر وہ جو صرف باپ کی طرف سے ہوں (علاتی بھائی) پھر حقیقی بھائیوں کے بیٹے پھر علاتی بھائیوں کے بیٹے، پھر باپ کی جانب سے اجداد (دادے) اگرچہ وہ کتنے ہی اوپر ہوں، پھر چچے بھائیوں کی ترتیب پر، پھر ان کے بیٹے بھائیوں کے بیٹوں کی ترتیب پر اگرچہ وہ کتنے نیچے ہوں، پھر آقا پھر سلطان یا قاضی۔

اور وصی یتیموں کا نکاح کرنے میں اولیاء پر مقدم ہوتا ہے اور وہی باپ کا خلیفہ اور اس کا وکیل ہوتا ہے اور یہ اس حال کے مشابہ ہوتا ہے اگر باپ زندہ ہوتا۔

اور حضرت امام شافعی نے کہا ہے: باپ کے ساتھ کسی کی کوئی ولایت نہیں ہے اور اگر باپ فوت ہو جائے تو پھر دادا، پھر دادے کے باپ کا باپ، کیونکہ یہ سب کے سب آباء ہیں۔ اور دادا کے بعد ولایت بھائیوں کی ہوتی ہے، پھر اس کے لئے جو

ان کے بعد زیادہ قریبی ہو۔

مزنی نے قول جدید میں کہا ہے: وہ جو ماں کی طرف سے منفرد ہو وہ نکاح میں زیادہ اولیٰ ہوتا ہے جیسا کہ میراث میں۔ اور قدیم قول میں انہوں نے کہا ہے کہ دونوں برابر ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ اہل مدینہ نے امام مالک سے امام شافعی کے قول کی مثل روایت کیا ہے اور یہ کہ باپ بیٹے سے زیادہ اولیٰ اور قریب ہے اور یہی امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے دو قولوں میں سے ایک ہے۔ اسے الباجی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے۔ اور حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے کہا: دادا بھائیوں سے زیادہ اولیٰ ہے اور مشہور مذہب وہی ہے جو ہم نے پہلے بیان کر دیا ہے۔

امام احمد نے کہا ہے: عورت کی شادی کرنے کے لئے ان میں سے زیادہ حقدار اس کا باپ ہے، پھر بیٹا، پھر بھائی، پھر اس کا بیٹا، پھر چچا۔ اور اسحاق نے کہا ہے: بیٹا باپ سے زیادہ اولیٰ ہے: جیسا کہ حضرت امام مالک نے کہا ہے اور ابن منذر نے اسے ہی اختیار کیا ہے کیوں کہ عمرو بن ام سلمہ نے ان کی اجازت کے ساتھ ان کا نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسے نسائی نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے اور عنوان یہ ہے انکاح الابن امه۔

میں کہتا ہوں: ہمارے علماء نے کثرت کے ساتھ اس سے استدلال کیا ہے اور یہ کوئی شے نہیں ہے اور اس کی دلیل وہ روایت ہے جو صحاح میں ثابت ہے کہ عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آغوش میں بچہ تھا اور میرا ہاتھ پلیٹ میں ادھر ادھر گھومتا تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اے بچے! تو اللہ تعالیٰ کا نام لے اور دائیں ہاتھ سے کھا اور اس سے کھا جو تیرے سامنے ہے (1)۔"

اور ابو عمر نے کتاب الاستیعاب میں کہا ہے: عمر بن ابی سلمہ کی کنیت ابو حفص ہے، وہ سرزمین حبشہ میں ۲ھ میں پیدا ہوئے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا اس وقت ان کی عمر نو برس تھی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جس کی عمر اتنی ہو وہ ولی ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا، لیکن ابو عمر نے ذکر کیا ہے کہ ابو سلمہ کا ام سلمہ سے ایک دوسرا بیٹا تھا۔ اس کا نام سلمہ تھا اور یہی وہ ہے جس نے اپنی ماں ام سلمہ کا نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا اور سلمہ کی عمر اپنے بھائی عمر بن ابی سلمہ سے زیادہ تھی اور وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کے اعتبار سے زیادہ حافظ نہ تھے اور ان کے بھائی عمر نے ان سے روایت کی ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ اس آدمی کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے جو دور کے اولیاء میں سے ہو اور وہ کسی عورت کی شادی کرے۔ اسی طرح واقع ہوا ہے اور اقرب عبارت ہے کہ کہا جائے: ایسی عورت کے بارے میں اختلاف کیا گیا ہے جس کی شادی اس کے اولیاء میں سے بعیدی ولی کرتا ہے درآنحالیکہ قریبی ولی حاضر ہو۔

ابن عبد البر نے کہا ہے: اگر قریبی ولی نے اس میں سے کسی شے کا انکار نہ کیا اور نہ ہی اس نے اسے رد کیا تو وہ نکاح نافذ ہو

1۔ صحیح بخاری، حدیث نمبر 4957، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جائے گا اور اگر اس نے اس کا انکار کیا اور وہ ثیبہ ہو یا باکرہ بالغہ ہو، یتیم ہو اور اس کا کوئی وصی نہ ہو تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب اور اہل مدینہ کی جماعت کا قول اس بارے میں مختلف ہے۔ سوان میں سے کہنے والوں نے کہا ہے کہ اسے رد نہیں کیا جائے گا اور وہ نافذ ہو جائے گا، کیونکہ وہ ایسا نکاح ہے جو اصول اور خاندان میں سے ولی کی اجازت کے ساتھ منعقد ہوا ہے اور ان میں سے جنہوں نے کہا ہے کہ نافذ نہیں ہوگا۔ انہوں نے کہا ہے: بلاشبہ اولیاء میں افضل اور اولیٰ رتبہ کا ولی موجود ہے اور وہ مستحب ہے واجب نہیں ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اکثر اصحاب کے نزدیک ان کے مذہب کا ماحصل یہی ہے اور اسے ہی اسماعیل بن اسحاق اور ان کے متبعین نے اختیار کیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سلطان اس میں غور وفکر کرے گا اور وہ ولی اقرب سے اس شے کے بارے پوچھے گا جسے وہ ناپسند کر رہا ہے پھر اگر وہ اسے نافذ کرنا مناسب سمجھے تو اسے نافذ کر دے اور اگر اسے رد کرنا مناسب سمجھے تو اسے رد کر دے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ قریبی ولی ہر حال میں اسے رد کر دے گا، کیونکہ وہ اس کا حق ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے لئے رد کرنے اور اس کی اجازت دینے کا اختیار ہے جب تک کہ عرصہ طویل نہ ہو اور وہ بچوں کو جنم نہ دے۔ یہ تمام اقوال اہل مدینہ کے ہیں۔

مسئلہ نمبر 7۔ اگر ولی اقرب محبوس یا سفیہ ہو تو پھر اس کے بعد اولیاء میں سے جن کا مرتبہ ہو وہ اس کی شادی کر دے اور اسے ان میں میت کی طرح شمار کیا جائے۔ اسی طرح جب ولی اقرب غیبت بعیدہ پر غائب ہو یا اس طرح غائب ہو کہ جلدی اس کے واپس لوٹنے کی امید نہ ہو تو پھر بھی اس کے بعد والا ولی اس کی شادی کر سکتا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب اقرب ولی غائب ہو اور اس کے پیچھے اس کی شادی کرنے والا کوئی نہ ہو، تو حاکم اس کی شادی کر سکتا ہے۔ پہلا قول امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ جب دو ولی قرب میں واقع ہوں اور ان میں سے ایک غائب ہو اور عورت اپنے عقد نکاح کی ذمہ داری حاضر ولی کے سپرد کر دے تو جب غائب ولی واپس آئے تو اس کے لئے انکار کی اجازت نہیں۔ اور اگر دونوں حاضر ہوں اور عورت اپنا معاملہ ان میں سے ایک کے حوالے کرے تو وہ دوسرے ولی کی اجازت کے بغیر اس کی شادی نہیں کر سکتا اور اگر دونوں میں اختلاف ہو جائے تو پھر حاکم اس میں غور وفکر کرے اور ان دونوں میں سے جس کو عورت کے حق میں اچھا سمجھے اس کی رائے کے مطابق فیصلہ کر دے۔ اسے ابن وہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ رہی نکاح میں شہادت! تو یہ امام مالک اور ان کے اصحاب کے نزدیک رکن نہیں ہے اور اس بارے میں اس کی شہرت اور اعلان ہی کافی ہوگا اور یہ کہ وہ نکاح خفیہ اور سری ہونے سے نکل جائے۔

ابن قاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: اگر کسی نے بینہ کے ساتھ نکاح کیا اور گواہوں کو حکم دیا کہ وہ اسے چھپا کر رکھیں تو نکاح جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ نکاح سر ہے اور اگر اس نے بغیر گواہوں کے غیر سری انداز میں نکاح کیا تو وہ جائز ہے اور وہ دونوں اس میں گواہ بنالیں جس سے وہ دو چار ہوں گے۔

ابن وہب نے امام مالک سے ایک آدمی کے بارے میں روایت کیا ہے کہ وہ ایک عورت سے دو آدمیوں کی شہادت کے ساتھ شادی کرتا ہے اور ان دونوں کو چھپانے کے لئے کہتا ہے۔ آپ نے فرمایا: ان دونوں کے درمیان طلاق کے ساتھ تفریق کردی جائے گی اور نکاح جائز نہ ہوگا اور اگر آدمی نے اس کے ساتھ دخول کیا تو اس کے لئے مہر ہوگا اور دونوں گواہوں کو کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔

امام اعظم ابوحنیفہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما اور ان دونوں کے اصحاب نے کہا ہے: جب کسی نے دو شاہدوں کی موجودگی میں کسی عورت سے شادی کی اور اس نے ان دونوں کو کہا: تم اسے خفیہ رکھنا تو نکاح جائز ہوگا۔ ابو عمر نے کہا ہے: یہ ہمارے ساتھی یحییٰ بن یحییٰ لیثی اندلسی کا قول ہے۔ انہوں نے کہا: ہر وہ نکاح جس پر دو آدمی گواہ ہوں تحقیق وہ سر (خفیہ) کی حد سے نکل گیا اور میرا گمان ہے کہ اسے لیث سے ابن سعد نے بیان کیا ہے۔ امام شافعی، اہل کوفہ اور ان کے متبعین کے نزدیک سر سے مراد یہ ہے کہ ہر وہ نکاح جس پر دو یا دو سے زیادہ آدمی گواہ نہ ہوں اور اسے ہر حال میں فسخ کر دیا جائے گا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: امام شافعی کا قول اس حدیث کے مطابق زیادہ صحیح ہے جسے ہم نے ذکر کیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: دو عادل شاہدوں اور ولی مرشد کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں ہے اور اس بارے میں جو کچھ میں نے جانا ہے، صحابہ کرام میں سے کسی نے آپ کی مخالفت نہیں کی ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مذہب کے لئے اس سے استدلال کیا ہے کہ بیوع جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے کیا ہے ان میں عقد کے وقت گواہ بنانا ہے اور اس پر دلیل قائم ہے کہ گواہ بنانا بیوع کے فرائض میں سے نہیں ہے اور وہ نکاح جس میں اللہ تعالیٰ نے گواہ بنانے کا ذکر نہیں کیا ہے تو اس کے لئے زیادہ لائق اور مناسب ہے کہ گواہ بنانا اس کی شروط اور فرائض میں سے نہ ہو، بلاشبہ مقصود انساب کی حفاظت کے لئے اعلان اور ظہور ہے۔ اور اشہاد کی ضرورت عقد کے بعد تب ہوتی ہے جب دو نکاح کرنے والوں کے درمیان کوئی اختلاف یا ایک دوسرے کے خلاف کوئی دعویٰ منعقد ہو اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: اعلنوا النکاح (1) تم نکاح کا اعلان کرو۔ امام مالک کا یہ قول ابن شہاب اور اکثر اہل مدینہ کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ اور مومن غلام خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ مشرک حسب والے سے بہتر ہے۔ وَّ لَوْ اَعْجَبَكُمْ اگرچہ اس کا حسب اور اس کا مال تمہیں اچھا لگے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے: مومن آدمی اور اسی طرح لَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ سے مراد مومنہ عورت ہے، جیسا کہ ہم نے اسے بیان کیا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمہارے تمام مرد اللہ تعالیٰ کے غلام اور تمہاری تمام عورتیں اللہ تعالیٰ کی باندیاں ہیں۔'' مزید فرمایا: ''تم اللہ تعالیٰ کی باندیوں کو اللہ تعالیٰ کی مساجد سے نہ روکو (2)۔'' اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿٣٠﴾ (ص) (بڑا خوبیوں والا بندہ ہر وقت ہماری طرف متوجہ) یہی وہ اچھا اور حسین قول ہے جس پر اس آیت کو محمول کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ نزاع ختم ہو جاتا ہے اور اختلاف زائل ہو جاتا ہے۔ واللہ الموفق

1۔ ابن ماجہ، باب اعلان النکاح، حدیث نمبر 1884، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 4655

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: اُولٰٓئِكَ میں اشارہ مشرک مردوں اور مشرکہ عورتوں کی طرف ہے۔ یَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ یعنی وہ ایسے اعمال کی طرف دعوت دیتے ہیں جو آتش جہنم کا موجب ہوتے ہیں، کیونکہ ان کی صحبت اور ان کا طرز معاشرت نسل کی تربیت کے ساتھ ساتھ ان کی خواہشات میں سے کثیر میں انحطاط اور تنزل کا سبب بنتا ہے۔ وَاللّٰهُ یَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ اور اللہ تعالیٰ اہل جنت کے عمل کی طرف بلاتا ہے۔ بِاِذْنِهٖ اپنے امر سے۔ زجاج نے یہی کہا ہے۔

وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِیْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِی الْمَحِیْضِ ۙ وَ لَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى یَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَیْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَ یُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ ۝۲۲۲

"اور وہ پوچھتے ہیں آپ سے حیض کے متعلق۔ فرمایئے: وہ تکلیف دہ ہے، پس الگ رہا کرو عورتوں سے حیض کی حالت میں اور نہ نزدیک جایا کرو ان کے یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائیں۔ پھر جب وہ پاک ہو جائیں تو جاؤ ان کے پاس جیسے حکم دیا ہے تمہیں اللہ نے، بے شک اللہ دوست رکھتا ہے بہت توبہ کرنے والوں کو اور دوست رکھتا ہے صاف ستھرا رہنے والوں کو۔"

اس میں چودہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِیْضِ۔ طبری نے سدی سے ذکر کیا ہے کہ سائل حضرت ثابت بن دحداح ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ حضرت اسید بن حضیر اور حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہما ہیں اور یہی اکثر مفسرین کا قول ہے اور سوال کے سبب کے بارے میں حضرت قتادہ وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ مدینہ منورہ اور اس کے ساتھ تعلق رکھنے والے عرب لوگ حیض والی عورتوں کے ساتھ کھانے پینے اور ان کے ساتھ رہائش اختیار کرنے سے اجتناب کرنے میں بنی اسرائیل کے طریقے پر چلتے تھے، تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: وہ حالت حیض میں عورتوں سے دور رہتے تھے اور وہ زمانہ حیض کی مدت ان کی دبروں میں وطی کرتے تھے، پس یہ آیت نازل ہوئی۔

اور صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہودیوں میں جب کوئی عورت حائضہ ہوتی تھی تو وہ گھروں میں نہ اس کے ساتھ مل کر کھاتے تھے اور نہ ان کے ساتھ مجامعت کرتے تھے۔ پس حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس بارے پوچھا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِیْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِی الْمَحِیْضِ الی آخر الآیہ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اصنعوا کل شی الا النکاح (تم ان کے ساتھ وطی کے سوا ہر معاملہ کرو) یہ خبر یہودیوں کے پاس پہنچی، تو انہوں نے کہا: یہ آدمی ہمارے امور میں سے کسی شے کو چھوڑنے کا ارادہ نہیں رکھتا مگر اس نے ہر معاملے میں ہماری مخالفت کی ہے۔ پس حضرت اسید بن حضیر اور حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہما دونوں آئے اور انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلاشبہ یہودی اس اس طرح کہہ رہے ہیں، کیا ہم ان (عورتوں) سے جماع نہ کیا کریں؟ تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرہ متغیر ہو گیا، یہاں تک کہ ہمیں یہ گمان ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان دونوں پر غصے اور ناراض ہوں گے،

پس وہ دونوں نکل گئے اور پھر ان دونوں کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دودھ کا ہدیہ آیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ ان کے پیچھے بھیج دیا اور ان دونوں نے خوب سیر ہو کر پیا اور انہیں پہچان ہوگئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان پر ناراض نہیں۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: یہودی اور مجوسی حیض والی عورتوں سے دور رہتے تھے اور عیسائی حیض والی عوتوں سے مجامعت کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے درمیان کا قصد کرتے ہوئے یہ حکم ارشاد فرمایا۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: عَنِ الْمَحِیْضِ۔ الْمَحِیْضِ سے مراد حیض ہے اور یہ مصدر ہے۔ کہا جاتا ہے: حاضت المرأۃ حیضا و محاضا و محیضا فھی حائض اور یہ حائضۃ بھی ہے۔ فراء نے ایک شعر میں کہا ہے:

کحائضۃ یُزْنٰی بِھا غیرَ طاھر (جیسا کہ حیض والی عورت اس سے ناپاک حالت میں زنا کیا جاتا ہے)

اور (کہا جاتا ہے) نساء حیض و حوائض اور الحَیضۃ کا معنی ہے: ایک بار۔ اور الحِیضۃ کسرہ کے ساتھ اسم ہے اور جمع الحِیَض ہے۔ اور الحیضۃ کا معنی وہ کپڑے کا ٹکڑا بھی ہے جس کے ساتھ عورت اپنی فرج کو (حیض آنے کے وقت) باندھتی ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: لیتنی کنتُ حِیضۃ مُلْقاۃً(1) (اے کاش! میں وہ کپڑے کا ٹکڑا ہوتی جسے پھینک دیا جاتا ہے۔) اسی طرح المحیضۃ ہے اور اس کی جمع المحائض ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ المحیض زمان و مکان سے عبارت ہے اور نفس حیض کو بھی محیض کہا جاتا ہے، یہ زمان و مکان میں اصل ہے اور حیض کے معنی میں مجاز ہے۔

علامہ طبری نے کہا ہے: المحیض حیض کا اسم (نام) ہے اور اسی کی مثل رؤبہ کا عیش کے بارے قول ہے۔

الیك أشکو شدّۃ المَعِیش و مرَّ أعوام نتفن ریشی

میں زندگی کی تلخی اور شدت کی تیرے پاس شکایت کر رہا ہوں اور سال ہا سال گزر گئے، انہوں نے میرے بال و پر اکھیڑ دیے۔

اور کلمہ کی اصل سیلان (بہہ پڑنا) اور انفجار (پھوٹ پڑنا) سے ہے۔ کہا جاتا ہے: حاض السیل و فاض سیلاب پھوٹ پڑا اور بہہ گیا اور حاضت الشجرۃ یعنی درخت کی رطوبت ظاہر ہوگئی بہہ گئی۔

اور اسی طرح الحیض بمعنی الحوض ہے، کیونکہ پانی اس کی طرف بہتا ہے اور عرب یاء کی جگہ واؤ اور واؤ کی جگہ یاء داخل کرتے رہتے ہیں۔ کیونکہ دونوں ایک ہی حیز سے ہیں۔

ابن عرفہ نے کہا ہے: المحیض اور الحیض کا معنی اس کے محل کی طرف خون کا جمع ہونا ہے اور اسی سبب سے حوض کو بھی یہ نام دیا گیا ہے کیونکہ اس میں پانی جمع ہو جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: حاضت المرأۃ و تحیّضت، و درست و عرکت، و طمثت، تحیض حیضاً و مَحَاضاً وَ محیضاً جبکہ معلوم اوقات میں عورت کا خون بہہ پڑے۔ اور جب وہ غیر معلوم ایام میں جاری ہو اور حیض کی رگ کے سوا کہیں اور سے آئے تو پھر تو کہے گا: اُستحیضت فھی مستحاضۃ کہ عورت مستحاضہ ہوگئی۔ (یہ) ابن عربی نے کہا ہے۔ اور اس کے آٹھ اسماء ہیں (۱) حائض (۲) عارک (۳) فارک (۴) طامس (۵) دارس (۶) کابر (۷) ضاحک (۸) طامث۔

1۔ مصنف عبد الرزاق، 1206،16

حضرت مجاہد نے ارشاد باری تعالیٰ: فَضَحِكَتْ کا معنی بیان کیا ہے: حاضت۔ پس وہ حائضہ ہوگئی۔ اور قول باری تعالیٰ: فَلَمَّا رَاَيْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ یعنی حضن (پس جب انہوں نے آپ کو دیکھا تو وہ حائضہ ہوگئیں۔) اس کی تفصیل اپنے محل میں آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس پر علماء کا اجماع ہے کہ عورت کے لئے اپنی فرج سے ظاہر بہنے والا خون دیکھنے کی حالت میں تین احکام ہیں۔ پس ان میں سے حیض معروف ہے اور خون حیض سیاہ گاڑھا ہو اس پر سرخی غالب ہو اور یہ کہ عورت اس کی وجہ سے نماز پڑھنا اور روزہ رکھنا ترک کردے گی۔

اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور کبھی یہ خون متصل (مسلسل) آتا ہے اور کبھی منقطع ہوتا ہے (یعنی ایک دو دن کے وقفے سے آتا ہے) پس اگر یہ متصل جاری رہے تو اس کے لئے حکم ثابت ہوگا اور اگر منقطع ہو اور عورت ایک دن خون دیکھے اور ایک دن طہر یا وہ دو دن خون دیکھے اور دو دن یا ایک دن طہر تو بلاشبہ وہ خون کے دنوں میں نماز چھوڑ دے گی اور اس کے انقطاع کے وقت غسل کرے گی اور نماز پڑھ لے گی، پھر وہ خون کے ایام کو اکٹھا کرلے گی اور درمیان میں آنے والے ایام طہر کو لغو چھوڑ دے گی، اور وہ انہیں عدت اور استبرا کی صورت میں طہر شمار نہیں کرے گی۔ حیض عورتوں کی فطرت میں ہے اور ان کی معروف طبعی عادت ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ (1) نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الاضحیٰ یا عید الفطر کے دن عید گاہ کی طرف تشریف لائے اور آپ عورتوں کے پاس سے گزرے تو فرمایا: اے عورتوں کے گروہ! تم صدقہ کرو کیونکہ اہل نار میں سے اکثر تم مجھے دکھائی گئی ہو۔ تو انہوں نے عرض کی: کیوں یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم لعن طعن زیادہ کرتی ہو اور خاوندوں کی نافرمانی کرتی ہو۔ میں نے تم سے بڑھ کر ناقصات عقل و دین کسی کو نہیں دیکھا جو ایک محتاط آدمی کی عقل و فہم کو ختم کردے۔ تو انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم عقل و دین کے اعتبار سے ہم میں کون سی کمی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا عورت کی شہادت آدمی کی شہادت کے نصف کے برابر نہیں ہے؟ انہوں نے عرض کی: ہاں، کیوں نہیں، پھر آپ نے فرمایا: یہ ان کی عقل کی کمی کی وجہ سے ہے اور کہا: جب وہ حائضہ ہو جائے تو وہ نہ نماز پڑھتی ہے اور نہ روزہ رکھتی ہے، کیا اسی طرح نہیں ہے؟ انہوں نے عرض کی: ہاں، یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ ان کے دین کی کمی کی وجہ سے ہے۔"

اور علماء کا اس پر اجماع ہے کہ حائضہ عورت روزے کی قضا کرے گی اور نماز کی قضا نہیں کرے گی۔

حضرت معاذہ کی حدیث ہے انہوں نے کہا: میں نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا اور کہا: حیض والی عورت کو کیا ہے کہ وہ روزے کی قضا کرتی ہے اور نماز کی قضا نہیں کرتی؟ تو انہوں نے فرمایا: کیا تو حروریہ (☆) ہے؟ میں نے

1۔ بخاری شریف، باب ترک الحائض الصوم، حدیث نمبر 293، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

☆ حروریہ خوارج کا ایک گروہ ہے اور یہ کوفہ کے قریب ایک گاؤں حروراء کی طرف منسوب ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قتل کیا تھا۔ ان کے نزدیک دین میں انتہائی شدت اور سختی ہے جیسا کہ معروف ہے۔

کہا: میں حروریہ تو نہیں، البتہ میں پوچھ رہی ہوں۔ تو پھر انہوں نے فرمایا: چونکہ وہ ہمیں لاحق ہوتا رہتا ہے اس لئے ہمیں روزے کی قضا کا حکم دیا گیا ہے اور نماز کی قضا کا حکم نہیں دیا گیا، اسے مسلم نے روایت کیا ہے (1) اور جب عورت کا خون ختم ہو جائے تو اس کے لئے اس سے پاکیزگی اور طہارت غسل ہے اس کا بیان آگے آرہا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ علماء نے حیض کی مقدار میں اختلاف کیا ہے:

فقہائے مدینہ نے کہا ہے: بلاشبہ حیض پندرہ دنوں سے زیادہ نہیں ہوتا اور یہ جائز ہے کہ وہ پندرہ دن اور اس سے کچھ کم ہو اور جو پندرہ دنوں سے زیادہ ہوگا وہ حیض نہ ہوگا بلکہ وہ استحاضہ ہے۔ یہ مذہب امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب کا ہے۔

اور امام مالک سے یہ بھی مروی ہے کہ حیض کے قلیل ہونے اور کثیر ہونے کا کوئی وقت نہیں مگر وہی جو عورتوں میں پایا جاتا ہے (یعنی ان کی عادت ہوتی ہے)۔ گویا آپ نے اپنا پہلا قول چھوڑ دیا ہے اور عورتوں کی عادت کی طرف رجوع کر لیا ہے۔

محمد بن مسلمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: کم سے کم طہر پندرہ دن ہے، بغداد کے رہنے والے اکثر اصحاب مالک رحمۃ اللہ علیہ نے یہی اختیار کیا ہے اور یہی امام شافعی، امام اعظم ابوحنیفہ، ان دونوں کے اصحاب اور امام ثوری رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے۔ اور اس باب میں صحیح قول یہی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حیض والی عورتوں کی عدت تین حیض مقرر کی ہے اور جنہیں بڑھاپے یا صغرسنی کی وجہ سے حیض نہ آتا ہو ان کی عدت تین ماہ مقرر کی ہے، گویا کہ ہر حیض ایک مہینے کا عوض ہے اور مہینہ طہر اور حیض دونوں کو جامع ہوتا ہے۔ پس جب حیض کم ہوگا تو طہر زیادہ ہوگا اور جب حیض کے دن زیادہ ہوں گے تو طہر کے دن کم ہوں گے۔ پس جب حیض کی زیادہ سے زیادہ مدت پندرہ دن ہو تو واجب ہے کہ اس کے مقابلے میں کم سے کم طہر کی مدت پندرہ دن ہو۔ تاکہ ایک مہینے میں حیض اور طہر دونوں مکمل ہو جائیں اور قرآن وسنت کے دلائل کے ساتھ عورتوں کی خلقت اور ان کی فطرت میں اغلباً یہی متعارف ہے۔

اور امام شافعی نے فرمایا ہے: کم سے کم حیض کی مدت ایک دن اور ایک رات ہے اور اس کی اکثر مدت پندرہ دن ہے اور ان سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی مثل بھی مروی ہے کہ اسے عورتوں کے عرف اور عادت کی طرف لوٹا دیا گیا ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے کہ حیض کی کم از کم مدت تین دن ہے اور زیادہ سے زیادہ مدت دس دن ہے۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ ان کے نزدیک جو خون تین دنوں سے کم ہوگا وہ استحاضہ ہوگا، یہ نماز کے مانع نہیں ہوتا مگر جب کہ یہ پہلی بار ظاہر ہو، کیونکہ اس کی انتہائی مدت معلوم نہیں ہوتی۔ پھر عورت پر ان اوقات کی نماز قضا کرنا لازم ہے۔ اسی طرح وہ خون جو دس دنوں سے زیادہ ہو (وہ بھی) اہل کوفہ کے نزدیک استحاضہ ہے۔ اور اہل حجاز کے نزدیک جو پندرہ دنوں سے زائد ہوگا وہ دم استحاضہ ہوگا اور جو ایک دن اور ایک رات سے کم ہوگا امام شافعی کے نزدیک وہ استحاضہ ہوگا اور یہی قول امام اوزاعی اور طبری کا ہے اور جنہوں نے کہا ہے کہ حیض کی کم سے کم مدت ایک دن اور ایک رات ہے اور اس کی زیادہ سے زیادہ مدت پندرہ دن ہے ان میں سے حضرت عطا بن ابی رباح، حضرت ابوثور اور حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم ہیں۔

1۔ بخاری شریف، باب لا تقضی الحائض الصلوٰۃ، حدیث نمبر 310، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

امام اوزاعی نے کہا ہے: ہمارے پاس ایک عورت صبح کے وقت حائضہ ہوتی ہے اور شام کے وقت پاک ہو جاتی ہے۔

حیض کی اکثر اور اقل مدت، طہر کی اقل مدت، احتیاط اور اس کی حجت کے بارے میں ہم نے اس باب میں وہی کچھ ذکر کیا ہے جسے علماء نے اپنایا ہے۔

پس المقتبس فی شرح موطا مالک بن انس میں ہے کہ اگر کسی عورت کو پہلی بار حیض آئے تو امام شافعی کے قول کے مطابق جو خون وہ پہلی بار دیکھے گی وہ پندرہ دن تک بیٹھی رہے گی پھر وہ غسل کرے گی اور چودہ دن کی نماز لوٹائے گی۔

اور امام مالک نے کہا ہے: وہ نماز قضا نہیں کرے گی اور اس کے خاوند کو اس سے روکا جائے گا۔ علی بن زیاد نے ان سے روایت کیا ہے کہ وہ اپنی ہم عمر لڑکیوں کی مقدار بیٹھی رہے گی اور یہی قول حضرت عطا اور ثوری وغیرہما کا ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ ایک دن اور ایک رات بیٹھے گی، پھر وہ غسل کرے گی اور نماز پڑھے گی اور اس کا خاوند اس کے پاس نہ آئے گا۔

امام اعظم ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: وہ دس دن نماز چھوڑے رکھے گی۔ پھر غسل کرے گی اور بیس دن تک نماز پڑھتی رہے گی، پھر بیس دنوں کے بعد دس دن کے لئے نماز چھوڑ دے گی، پس اس کی یہی حالت جاری رہے گی یہاں تک کہ اس سے خون ختم ہو جائے۔ رہی وہ عورت جس کے دن معلوم ہوں تو وہ ایام معلومہ کے مطابق تین دنوں تک احتیاط کرے گی۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے: جب تک وہ پندرہ دنوں سے تجاوز نہ کرے۔ امام شافعی نے کہا ہے: جب اس کے دن گزر جائیں تو بغیر کسی احتیاط کے وہ غسل کرے گی۔

خون میں سے دوسرا دم نفاس ہے جو ولادت کے وقت ظاہر ہوتا ہے: علماء کے نزدیک اس کے لئے بھی معلوم حد ہے اور اس میں انہوں نے اختلاف کیا ہے۔

پس کہا گیا ہے کہ وہ دو مہینے ہیں۔ یہی امام مالک کا قول ہے اور بعض نے کہا ہے: وہ چالیس دن ہیں۔ یہی امام شافعی کا قول ہے۔ ان کے علاوہ بھی قول کیے گئے ہیں۔

اور اس سے طہارت اس کے ختم ہونے کے وقت حاصل ہوتی ہے اور اس کا غسل غسل جنابت کی طرح ہے۔ قاضی ابو محمد عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حیض اور نفاس کا خون گیارہ چیزوں سے روکتا ہے اور وہ نماز کا واجب ہونا، اسے پڑھنا، صحیح ہونا، روزہ رکھنا نہ کہ اس کا واجب ہونا (یعنی روزے کا وجوب برقرار رہتا ہے لیکن اسے عملاً رکھنا مؤخر ہو جاتا ہے) اور فرق کا فائدہ یہ ہے کہ روزے کی قضا لازم ہے اور نماز کی قضا لازم نہیں۔ فرج اور اس کے سوا میں جماع کرنا، عدت، طلاق، طواف، قرآن کریم کو مس کرنا، مسجد میں داخل ہونا، اس میں اعتکاف کرنا اور قرآن کی قراءت میں دو روایتیں ہیں۔

اور تیسری قسم کا خون وہ ہے جو نہ عورتوں کی عادت ہے اور نہ ان کی طبع اور خلقت میں داخل ہے۔ بلاشبہ یہ ایک رگ ہے جو کٹ جاتی ہے اور اس سے سرخ رنگ کا خون بہتا ہے اور یہ خون منقطع نہیں ہوتا مگر تبھی جبکہ وہ تندرست اور مندمل ہو جائے اور اس کا حکم یہ ہے کہ عورت اس کی موجودگی میں بھی پاک ہوتی ہے اور یہ اس کے لئے نماز، روزے سے مانع نہیں ہوتا۔ اس پر

علماء کا اجماع ہے اور آثار مرفوعہ کا اتفاق ہے بشرطیکہ یہ معلوم ہو کہ یہ رگ کا خون ہے، خون حیض نہیں ہے۔

امام مالک (1) نے ہشام بن عروہ عن ابیہ کی سند سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: فاطمہ بنت ابی حبیش نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں پاک نہیں ہوتی! کیا میں نماز چھوڑ دوں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ وہ رگ (کا خون) ہے، حیض نہیں ہے۔ جب تجھے حیض آئے تو نماز چھوڑ دے اور جب اس کی مقدار (دن) گزر جائیں تو تو اپنے آپ سے خون دھو ڈال اور نماز پڑھ لے۔'' یہ حدیث اپنے صحیح ہونے اور اپنے الفاظ قلیل ہونے کے ساتھ ساتھ حائضہ اور مستحاضہ کے احکام تفصیل سے بیان کرتی ہے۔ اس باب میں جو روایات ہیں یہ حدیث ان سے زیادہ صحیح ہے اور یہ حدیث اس کا رد کرتی ہے جو عقبہ بن عامر اور مکحول سے مروی ہے کہ حیض والی عورت ہر نماز کے وقت غسل کرے گی اور وضو کرے گی اور بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے کے لئے قبلہ شریف کی طرف متوجہ ہوگی۔ اور اس میں ہے کہ حائضہ عورت نماز نہیں پڑھے گی اور اس پر تمام علماء کا اجماع ہے سوائے خوارج کے ایک گروہ کے کہ وہ کہتے ہیں: حیض والی عورت پر نماز ہے۔ اور اس حدیث میں اس پر بھی دلیل موجود ہے کہ مستحاضہ عورت پر سوائے اس غسل کے جو وہ انقطاع حیض کے وقت کرتی ہے اور کوئی غسل لازم نہیں، اگر اس کے علاوہ بھی غسل اس پر لازم ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بارے اسے حکم ارشاد فرما دیتے اور اس میں ان کے قول کا بھی رد ہے جن کا خیال ہے کہ اس پر ہر نماز کے لئے غسل لازم ہے اور ان کے قول کا بھی جن کا خیال یہ ہے کہ وہ دن کی دو نمازوں کو ایک غسل کے ساتھ جمع کرلے اور رات کی دو نمازوں کے لئے ایک غسل کرلے اور وہ صبح کی نماز کے لئے علیحدہ غسل کرے اور ان کے قول کا جنہوں نے کہا: وہ ایک طہر سے دوسرے طہر تک غسل کرے گی اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کے اس قول کا بھی کہ وہ ایک طہر سے دوسرے طہر تک غسل کرے گی۔ اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کے اس قول کا بھی کہ وہ ایک طہر سے دوسرے طہر تک غسل کرے، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے کسی شے کا حکم اسے ارشاد نہیں فرمایا۔ اور اس میں اس کے قول کا بھی رد ہے جس نے انتظار و احتیاط کی بات کی ہے۔ کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے (فاطمہ کو) یہ حکم دیا کہ جب تجھے یقین ہو جائے کہ حیض ختم ہو چکا ہے تو تو غسل کرلے اور نماز پڑھ لے، آپ نے اسے یہ حکم نہیں دیا کہ وہ حیض آنے یا نہ آنے کے انتظار میں تین دن تک نماز چھوڑے رکھے اور احتیاط نماز پڑھنے میں ہوتی ہے نہ کہ اسے چھوڑنے میں۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ هُوَ اَذًى، یعنی یہ وہ شے ہے جس کے سبب عورت اور اس کے سوا مرد کو اذیت اور تکلیف ہوتی ہے یعنی خون حیض کی بدبو کے سبب۔ اور الاذی قذر اور نجاست سے کنایہ ہے۔ اور اس کا اطلاق قول مکروہ پر بھی ہوتا ہے اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى (البقرہ: 264) (مت ضائع کرو اپنے صدقوں کو احسان جتلا کر اور دکھ پہنچا کر) یعنی اس مکروہ اور ناپسندیدہ قول کے ساتھ جو تم اسے سناتے ہو اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَدَعْ اَذٰىهُمْ (الاحزاب: 48) (اور پرواہ نہ کر دان کی اذیت رسانی کی۔) یعنی آپ منافقین کی اذیت رسانی کی پرواہ

1۔ بخاری شریف، باب الاستحاضۃ، حدیث نمبر 295، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نہ کریں آپ انہیں جزا نہ دیں مگر یہ کہ ان میں امیر بنا دیں۔ اور حدیث طیبہ میں ہے: و أمیطوا عنہ الأذی (1) اور اس سے اذیت کو دور کرو۔ اس میں الاذی سے مراد وہ بال ہیں جو پیدائش کے وقت بچے کے سر پر ہوتے ہیں اور ساتویں دن اس سے مونڈ دیے جاتے ہیں اور یہی عقیقہ ہے اور حدیث ایمان میں ہے وادناھا اماطۃ الأذی عن الطریق راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹا دو۔ یعنی کانٹے، پتھر اور ان کی طرح کی دیگر چیزیں جن سے گزرنے والا کسی تکلیف میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ اور رب کریم کا ارشاد: وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ كَانَ بِكُمْ أَذًى مِّنْ مَّطَرٍ (النساء: 102) اس کا ذکر آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 6۔ دم استحاضہ بہنے کے سبب جنہوں نے مستحاضہ عورت سے وطی کرنے سے منع کیا ہے انہوں نے استدلال کیا اور کہا: ہر خون تکلیف دہ (نجس) ہے، اسے کپڑے اور بدن سے دھونا واجب ہوتا ہے، پس دم حیض اور استحاضہ کے درمیان مباشرت کی حالت میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ یہ مکمل طور پر ناپاکی اور نجاست ہے۔ اور رہی نماز تو اس کی رخصت کے بارے حدیث طیبہ موجود ہے جیسا کہ سلس البول کی بیماری کی حالت میں نماز پڑھی جا سکتی ہے، یہ قول ابراہیم نخعی، سلیمان بن یسار، حکم بن عیینہ، عامر شعبی، ابن سیرین اور زہری کا ہے اور حسن کی جانب سے اس میں اختلاف کیا گیا ہے۔

اور یہی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے کہ مستحاضہ کا خاوند اس کے ساتھ صحبت نہیں کرے گا اور اسی طرح ابن علیہ اور مغیرہ بن عبدالرحمٰن نے کہا ہے اور یہ اصحاب مالک رحمۃ اللہ علیہ میں سے اعلیٰ ترین افراد میں سے ہیں اور ابو مصعب نے بھی یہی کہا ہے اور اسی کے مطابق فتویٰ دیا جاتا ہے۔

اور جمہور علماء نے کہا ہے: مستحاضہ عورت روزہ رکھ سکتی ہے، نماز پڑھ سکتی ہے، طواف کعبہ کر سکتی ہے اور قرآن کریم کی تلاوت کر سکتی ہے اور اس کا خاوند بھی اس کے ساتھ مباشرت کر سکتا ہے۔

امام مالک نے کہا ہے: اہل فقہ و علم نے اسی کا حکم دیا ہے، اگرچہ اس کا خون بہت زیادہ بھی ہو اور آپ سے اسے ابن وہب نے روایت کیا ہے۔

اور امام احمد فرماتے ہیں: میرے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ خاوند اس سے وطی نہ کرے، البتہ اگر عرصہ طویل ہو جائے تو پھر وطی کر سکتا ہے۔

اور مستحاضہ کے بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے: کوئی حرج نہیں ہے کہ اس کا خاوند اس کے ساتھ جماع کرے اگرچہ اس کا خون اس کی ایڑیوں پر بہہ رہا ہو۔

اور امام مالک نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "بلاشبہ وہ رگ کا خون ہے وہ حیض نہیں ہے۔" پس جب وہ حیض نہیں ہے تو پھر کون سی شے ہے جو خاوند کو اس کے پاس جانے سے روک سکتی ہے حالانکہ وہ نماز بھی پڑھ رہی ہے۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے مستحاضہ کے خون کے بارے میں یہ حکم فرما دیا ہے کہ وہ نماز کے مانع نہیں ہے اور وہ عورت اس حالت میں حائضہ کی عبادت کے سوا بھی عبادت کر سکتی ہے تو پھر یہ ضروری ہے کہ اس کے لئے حیض کے

1۔ بخاری شریف، باب اماطۃ الأذی عن الصبی فی العقیقۃ، حدیث نمبر 5049، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

احکام میں سے کسی شے کا حکم نہ لگایا جائے مگروہی جس پر اجماع ہے (یعنی) تمام خونوں کی طرح اسے بھی دھونا لازم ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيضِ یعنی تم زمانہ حیض میں عورتوں سے علیحدہ رہو، یہ تب ہے جبکہ محیض کو مصدر بنایا جائے یا معنی یہ ہے کہ تم عورتوں سے علیحدہ رہو محل حیض میں جبکہ محیض کو اسم بنایا جائے اور اس نہی کا مقصود مجامعت ترک کرنا ہے۔

حائضہ عورت کے ساتھ مباشرت کے بارے میں اور جو کچھ اس سے مباح سمجھا جاتا ہے اس کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، پس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور عبیدہ السلمانی سے مروی ہے کہ یہ واجب ہے کہ آدمی اپنی بیوی کے بستر سے علیحدہ رہے جبکہ وہ حالت حیض میں ہو۔ یہ قول شاذ ہے اور علماء کے قول سے خارج ہے۔ اگرچہ عموم آیت اس کا تقاضا کرتی ہے لیکن سنت ثابتہ اس کے خلاف ہے اور جب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خالہ حضرت ام میمونہ رضی اللہ عنہا اس پر آگاہ ہوئیں تو آپ نے فرمایا: کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے اعراض کر رہے ہو۔

اور امام مالک، شافعی، اوزاعی، ابوحنیفہ، ابو یوسف اور علماء کی ایک بہت بڑی جماعت رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: مرد کے لئے عورت کے اس حصے سے استمتاع جائز ہے جو ازار کے اوپر ہے، کیونکہ جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک آدمی نے پوچھا تو آپ نے اسے ارشاد فرمایا: (سائل نے کہا) کیا حالت حیض میں میری بیوی میرے لئے حلال ہوتی ہے؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا: چاہیے کہ وہ اپنی ازار (چادر) مضبوطی کے ساتھ باندھ لے تو پھر اس کے اوپر سے وہ تیرے لئے مباح ہے۔

اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حالت حیض میں تھیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ارشاد فرمایا: اپنی چادر کو مضبوط باندھ لے پھر اپنے بستر کی طرف لوٹ آ۔(1)

اور امام ثوری، محمد بن حسن اور بعض اصحاب شافعی نے کہا ہے کہ وہ محل خون سے اجتناب کرے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: "تم ہر عمل کرو سوائے وطی کے۔" اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور یہی داؤد کا قول ہے اور امام شافعی کے قول سے یہی صحیح ہے۔

ابو معشر نے ابراہیم کے واسطہ سے مسروق سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کیا میری زوجہ میرے لئے حلال ہوتی ہے جبکہ وہ حالت حیض میں ہو؟ تو انہوں نے فرمایا: سوائے فرج کے ہر شے حلال ہے۔

علماء نے کہا ہے: حائضہ عورت کے ساتھ مباشرت (کا مباح ہونا) اس حال میں کہ وہ چادر باندھے ہوئے ہو احتیاط اور ذریعہ وسبب کو ختم کرنے کے لئے ہے، کیونکہ اگر اس کی رانوں سے استمتاع مباح ہو تو یہ محل خون (فرج) تک پہنچنے کا ذریعہ اور سبب ہے جو کہ بالاجماع حرام ہے، پس احتیاطاً اس کا حکم دیا گیا ہے اور فی نفسہ محل دم کو حرام قرار دیا گیا اور آثار کے معانی اس کے ساتھ متفق ہیں، کوئی تضاد نہیں ہے۔ وباللہ التوفیق۔

مسئلہ نمبر 8۔ اس کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے جو حالت حیض میں عورت کے ساتھ مجامعت کرتا ہے کہ اس پر

1۔ بخاری شریف، باب من سمی النفاس حیضا والحیض نفاسا، حدیث نمبر 289، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کیا ہوگا؟

حضرت امام مالک، شافعی اور ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہم نے فرمایا ہے: وہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے اور مزید اس پر کوئی شے لازم نہیں، یہی قول ربیعہ اور یحییٰ بن سعید کا ہے اور اسی طرح داؤد نے بھی کہا ہے اور امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ وہ نصف دینار صدقہ کرے گا۔(1)

اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: عبدالحمید کی حدیث کتنی اچھی ہے کہ وہ مقسم کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ وہ ایک دینار یا نصف دینار صدقہ کرے گا۔'' اسے ابوداؤد نے نقل کیا ہے اور کہا ہے: اسی طرح صحیح روایت ہے۔ فرمایا: دینار یا نصف دینار۔ علامہ طبری نے اسے مستحب قرار دیا ہے، پس اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اس پر کوئی شے نہ ہوگی اور بغداد میں امام شافعی کا یہی قول ہے۔

اور محدثین میں سے ایک جماعت نے کہا ہے: اگر اس نے خون کی حالت میں وطی کی تو اس پر دینار ہوگا اور اگر اس نے خون کے انقطاع کی حالت میں وطی کی تو اس کے لئے نصف دینار ہوگا۔

اور امام اوزاعی نے کہا ہے: جس نے اپنی بیوی کے ساتھ حالت حیض میں وطی کی تو وہ ایک دینار کے دو خمس صدقہ کرے۔

ان تمام کی اسناد سنن ابی داؤد اور دارقطنی وغیرہ میں ہیں۔

اور کتاب ترمذی (2) میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے: ''جب خون سرخ ہو تو ایک دینار ہوگا اور خون کا رنگ زرد ہو تو نصف دینار ہوگا۔''

ابوعمر نے کہا ہے: ان کی دلیل جنہوں نے استغفار اور توبہ کے سوا ایسے آدمی پر کوئی کفارہ واجب نہیں کیا اس حدیث کا مضطرب ہونا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس کی مثل حدیث حجت نہیں بن سکتی، کیونکہ فی الاصل ہر کوئی ذمہ داری سے بری ہے اور یہ واجب نہیں کہ اس میں کسی مسکین اور کسی دوسرے کے لئے کوئی شے ثابت ہو مگر کسی دلیل کے ساتھ جس میں نہ کوئی رد ہو اور نہ اس پر طعن ہو اور یہ اس مسئلہ میں معدوم ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: میں نے علامہ اشاشی سے مجلس النظر میں سنا ہے وہ فرماتے ہیں: جب کہا جائے لا تقرَب یعنی راء کے فتحہ کے ساتھ تو اس کا معنی ہے تو کام میں مشغول نہ ہو اور اگر راء کے ضمہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ہے تو اس کے قریب نہ ہو۔

نافع، ابوعمرو، ابن کثیر، ابن عامر اور حضرت عاصم رحمۃ اللہ علیہم نے اس روایت میں جو حفص نے ان سے نقل کی ہے یَطْهُرْنَ طا کے سکون اور ہا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

اور حمزہ، کسائی اور حضرت عاصم رحمۃ اللہ علیہم نے ابوبکر اور مفضل کی روایت میں یطهرن یعنی طا اور ہا دونوں کو شد اور فتحہ کے

1۔ ابوداؤد، باب فی کفارۃ من اتی حائضا، حدیث نمبر 1853، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، باب ماجاء فی الکفارۃ فی ذالک، حدیث نمبر 127، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ساتھ پڑھا ہے اور حضرت ابی اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہما کے مصحف میں یَتَطَهَّرنَ ہے۔ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے مصحف میں ولا تقربوا النساء فی محیضھن واعتزلوھن حتی یتطھرن ہے۔ اور علامہ طبری نے طا کی تشدید والی قراءت کو ترجیح دی ہے۔ اور کہا ہے: یہ بمعنی یغتسلن ہے، کیونکہ اس پر تمام کا اجماع ہے کہ آدمی پر حرام ہے کہ وہ اپنی زوجہ کا خون ختم ہونے کے بعد اس کے پاک ہونے سے پہلے اس کے قریب جائے۔ انہوں نے کہا: بلاشبہ طہر میں اختلاف ہے کہ وہ کیا ہے، تو ایک گروہ نے کہا ہے کہ طہر سے مراد پانی کے ساتھ غسل کرنا ہے۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: کہ اس سے مراد نماز کے وضو کی طرح وضو کرنا ہے اور ایک جماعت کا خیال ہے کہ اس سے مراد شرمگاہ کو دھونا ہے۔ اور یہ اسے اپنے خاوند کے لئے حلال کر دے گا اگرچہ اس نے غسل نہ بھی کیا۔

اور ابوعلی فارسی نے طا کی تخفیف والی قراءت کو ترجیح دی ہے، کیونکہ یہ ثلاثی ہے اور طمث کی ضد ہے اور یہ بھی ثلاثی ہے۔

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: فَاِذَا تَطَهَّرۡنَ، یعنی جب وہ پانی کے ساتھ طہارت حاصل کر لیں، یہی موقف امام مالک اور جمہور علماء کا ہے اور بلاشبہ وہ طہارت جس کے سبب حائضہ عورت سے جماع حلال ہوجاتا ہے جب اس کا خون ختم ہوجائے وہ اس کا پانی کے ساتھ طہارت حاصل کرنا ہے جیسا کہ جنبی کی طہارت (پانی کے ساتھ حاصل ہوتی ہے) اور تیمم یا کوئی اور اس کی جانب سے جائز نہ ہوگا، یہی امام مالک، امام شافعی، طبری، محمد بن مسلمہ، اہل مدینہ اور ان کے علاوہ دوسروں نے بھی کہا ہے۔ اور یحییٰ بن بکیر اور محمد بن کعب قرظی نے کہا ہے: جب حیض والی عورت پاک ہوجائے (یعنی اس کا خون ختم ہوجائے) اور اس نے ایسی جگہ تیمم کر لیا جہاں پانی نہ ہو تو وہ اپنے خاوند کے لئے حلال ہوگئی اگرچہ اس نے غسل نہ بھی کیا ہو۔

حضرت مجاہد، عکرمہ اور طاؤس رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: خون کا منقطع ہونا ہی اسے زوج کے لئے حلال کر دیتا ہے، لیکن اسے وضو کر لینا چاہئے۔

امام اعظم ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: اگر اس کا خون دس دن گزرنے کے بعد ختم ہوا تو آدمی کے لئے جائز ہے کہ وہ غسل سے پہلے اس سے وطی کرلے اور اگر خون کا انقطاع دس دنوں سے پہلے پہلے ہوگیا تو پھر جائز نہیں ہے یہاں تک کہ وہ غسل کرلے یا اس پر نماز کا وقت داخل ہوجائے۔ یہ ایسا فیصلہ ہے جس کی کوئی وجہ اور علت نہیں، تحقیق انہوں نے حائضہ عورت کے لئے اس کا خون منقطع ہونے کے بعد اس طرح فیصلہ کیا ہے جو عدت میں محبوس ہو۔ اور انہوں نے اس کے خاوند کو کہا: عورت کی طرف رجوع کرنا جائز ہے جب تک وہ تیسرے حیض سے غسل نہ کرلے، پس ان کے اس قول کے قیاس کی بنا پر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس سے وطی کی جائے یہاں تک کہ وہ غسل کرلے یہ اہل مدینہ کے ساتھ موافقت ہے۔

اور ہماری دلیل یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس میں حکم کو دو شرطوں پر معلق کیا ہے: ان میں سے ایک خون کا منقطع ہونا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: حَتّٰى يَطۡهُرۡنَ اور دوسرا پانی کے ساتھ غسل کرنا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَاِذَا تَطَهَّرۡنَ یعنی جب وہ پانی کے ساتھ غسل کرلیں اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی مثل ہے: وَابۡتَلُوا الۡيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ الآیہ (النساء: 6) (اور آزماتے رہو یتیموں کو یہاں تک کہ وہ پہنچ جائیں نکاح (کی عمر کو)۔ اس میں بھی حکم دو شرطوں پر معلق ہے اور حکم

مال دینے کا جواز ہے۔ دو شرطوں میں سے ایک مکلف کا نکاح کی عمر کو پہنچنا ہے اور دوسرا دانائی کا محسوس کرنا ہے، اسی طرح مطلقہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنۡۢ بَعۡدُ حَتّٰى تَنۡكِحَ زَوۡجًا غَيۡرَهٗ (البقرہ: 230) (تو وہ حلال نہ ہوگی اس پر اس کے بعد یہاں تک کہ نکاح کرے کسی اور خاوند کے ساتھ) پھر عسیلہ کی شرط (مراد جماع ہے) کے بارے حدیث پاک موجود ہے۔ پس حلالہ بھی مجموعی طور پر دو امروں پر موقوف ہوا اور وہ نکاح کا انعقاد اور وطی کا پایا جانا ہے۔ (1)

امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے: بے شک آیت کا معنی ہے: شرط میں غایت وہی ہے جو اس سے پہلی غایت میں مذکور ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کا ارشاد: حَتّٰى يَطۡهُرۡنَ یعنی مخفف بعینہٖ يَطَّهَّرۡنَ مشدد کے معنی میں ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آیت میں دو لغتوں کو جمع کر دیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فِيۡهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوۡنَ اَنۡ يَّتَطَهَّرُوۡا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الۡمُطَّهِّرِيۡنَ ۝ (التوبہ) (اس میں ایسے لوگ ہیں جو پسند کرتے ہیں صاف ستھرا رہنے کو اور اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے پاک صاف لوگوں سے۔) کُمیت نے کہا ہے:

وما كانت الانصارُ فيها أذِلّةً ولا غُيَّبًا فيها اذا الناسُ غُيَّبُ

اور یہ بھی کہ دو قرأتیں دو آیتوں کی طرح ہیں۔ پس ضروری ہے کہ ان دونوں کے مطابق عمل کیا جائے۔ اور ہم ان دونوں میں سے ہر ایک کو علیحدہ معنی پر محمول کرتے ہیں۔ پس ہم مخفف کو اس معنی پر محمول کرتے ہیں جبکہ اس کا خون دس دنوں سے کم میں ختم ہو جائے، تو ہم اس کے ساتھ وطی کی اجازت نہیں دیتے یہاں تک کہ وہ غسل کر لے، کیونکہ آدمی خون کے دوبارہ لوٹ آنے سے محفوظ اور امن میں نہیں ہوتا اور ہم دوسری قراءت کو اس معنی پر محمول کرتے ہیں جبکہ اس کا خون اکثر مدت پر جا کر ختم ہو تو اس صورت میں اس کے ساتھ وطی جائز ہوتی ہے اگرچہ وہ غسل نہ بھی کرے۔

حضرت ابن عربی نے کہا ہے: ان کے دلائل میں سے یہ قوی ترین ہے۔ پس پہلے (استدلال) کا جواب یہ ہے کہ وہ فصحاء کے کلام میں سے نہیں ہے اور نہ ہی بلغاء کی زبان ہے، کیونکہ وہ تعداد میں تکرار کا تقاضا کرتا ہے اور جب لفظ کو ایک الگ فائدہ پر محمول کرنا ممکن ہو تو اسے لوگوں کے کلام میں تکرار پر محمول نہیں کیا جاتا، تو پھر علیم حکیم رب کریم کے کلام میں کیسے ممکن ہو سکتا ہے اور دوسرے (استدلال) کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ معنی پر محمول ہے، تو پھر ان پر لازم ہے کہ جب خون منقطع ہو جائے تو وہ اس کے لئے غسل سے پہلے رجعت کی صورت میں حیض کا حکم نہ لگائیں اور وہ اس طرح نہیں کہتے جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے اور یہ عورت جب حائضہ ہے تو حیض والی عورت کے ساتھ وطی کرنا بالاتفاق جائز نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی جو انہوں نے کہا ہے وہ اکثر مدت پر انقطاع دم اباحت وطی کا تقاضا کرتا ہے اور جو ہم نے کہا ہے وہ ممنوع ہونے کا تقاضا کرتا ہے اور جب ایسی دو دلیلوں کے درمیان تعارض آ جائے جن میں سے ایک نہی کا تقاضا کرتی ہو اور دوسری اباحت کا تو ان دونوں کے باعث اور سبب کو غلبہ دیا جائے گا (پس) نہی کے سبب کو غلبہ دیا جائے گا، جیسا کہ حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما نے ملک یمین کی حیثیت سے دو بہنوں کو جمع کرنے کے بارے میں کہا ہے۔ ایک آیت نے دونوں کو حلال قرار دیا ہے

1۔ بخاری شریف، باب من اجاز طلاق الثلاث لقول اللہ تعالیٰ الطلاق مرتان فامساك بمعروف أو تسريح، حدیث نمبر 4856، ضیاء القرآن

اور دوسری نے دونوں کو حرام قرار دیا ہے اور تحریم اولیٰ ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 11۔ ہمارے علماء نے کتابیہ عورت کے بارے میں اختلاف کیا ہے کہ کیا اسے غسل کرنے پر مجبور کیا جائے گا یا نہیں، تو حضرت امام مالک نے ابن قاسم کی روایت میں کیا ہے: ہاں، تاکہ خاوند کے لئے اس کے ساتھ وطی حلال ہو جائے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ آپ کہتے ہیں: جب وہ پانی کے ساتھ طہارت حاصل کرلیں اور یہ صرف مسلمان عورت کے ساتھ خاص نہیں ہے۔

اور اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ اسے حیض کے سبب غسل پر مجبور نہ کیا جائے گا کیونکہ وہ اس کا اعتقاد ہی نہیں رکھتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ (البقرہ: 228) (اور جائز نہیں ان کے لئے کہ چھپائیں جو پیدا کیا ہے اللہ نے ان کے رحموں میں اگر وہ ایمان رکھتی ہوں اللہ پر اور روز آخرت پر) اور وہ حیض اور حمل ہے اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ خطاب صرف مومنہ عورتوں کو کیا ہے اور فرمایا ہے: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (البقرہ: 252) (دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے) اور اسی طرح محمود بن عبدالحکم بھی کہتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 12۔ حائضہ عورت کے غسل کا طریقہ وہی ہے جو اس کے غسل جنابت کا طریقہ ہے، اس پر اس میں اپنے بالوں کو کھولنا لازم نہیں ہے۔ اس لئے کہ مسلم نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے۔ انہوں نے بیان کیا ہے میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنے سر کی مینڈھیاں باندھے ہوئے ہوں کیا میں غسل جنابت کے لئے انہیں کھول دوں گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں بلکہ تیرے لئے اپنے سر پر تین بار پانی بہانا کافی ہوگا پھر تو اپنے سارے بدن پر پانی بہائے گی تو تو پاک ہو جائے گی۔'' اور ایک روایت میں ہے: کیا میں (1) انہیں حیض اور جنابت (کے غسل) کے لئے کھولوں گی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں''۔ ابوداؤد نے اس میں یہ اضافہ کیا ہے: ''اور تو ہر چلو ڈالتے وقت اپنے سر کو خوب ملے گی۔''

مسئلہ نمبر 13۔ قولہ تعالیٰ: فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۚ یعنی اور تم ان سے جماع کرو۔ یہ امر اباحت کے لئے ہے اور اتیان وطی سے کنایہ ہے اور یہ امر اسے مزید مضبوط اور قوی کرتا ہے جو کچھ ہم نے کہا ہے کہ تطہر سے مراد پانی کے ساتھ غسل کرنا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے صیغہ امر یقیناً اکمل وجہ پر ہی واقع ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

اور مِنْ بمعنی فی ہے، یعنی تم اس محل میں جماع کرو جس میں اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے اور وہ قُبل (فرج) ہے اور اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ (فاطر: 40) یعنی فی الارض (مجھے بھی تو دکھاؤ زمین کا وہ گوشہ جو انہوں نے بنایا ہے) اور یہ ارشاد بھی ہے: اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ (الجمعہ: 9) یعنی فی الجمعۃ (جب (تمہیں) بلایا جائے نماز کی طرف جمعہ کے دن)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی ہے یعنی اس وجہ سے جس میں تمہیں اجازت دی گئی ہے، یعنی جب تم روزے، احرام اور

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی المراۃ ھل تنقض شعرھا عند الغسل، حدیث نمبر 219، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اعتکاف کی حالت میں نہ ہو۔ اصم نے یہی کہا ہے۔ اور ابن عباس اور ابورزین نے کہا ہے: (معنی ہے) طہر کی جانب سے نہ کہ حیض کی جانب سے اور ضحاک نے بھی یہی کہا ہے۔ اور محمد بن حنفیہ نے کہا ہے: معنی ہے من قبل الحلال لا من قبل الزنی یعنی حلال طریقے سے نہ کہ زنا کے طریقے سے۔

مسئلہ نمبر 14۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ۝ اس میں اختلاف ہے۔ پس کہا گیا ہے کہ مراد ہے گناہوں اور شرک سے توبہ کرنے والے اور المتطھرون یعنی جنابت اور حدث کے لاحق ہونے کے وقت پانی سے طہارت اور پاکیزگی حاصل کرنے والے۔ حضرت عطاوغیرہ نے یہی کہا ہے اور حضرت مجاہد نے کہا: التوابین سے مراد گناہوں سے توبہ کرنے والے ہیں اور آپ ہی سے یہ بھی مروی ہے: عورتوں کے ساتھ ان کی دبروں میں جماع کرنے سے توبہ کرنے والے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: گویا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرف دیکھا ہے جو لوط علیہ السلام کی قوم کے بارے میں بطور حکایت ہے: اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ۝ (الاعراف) (باہر نکال دو انہیں اپنی بستی سے یہ لوگ تو بڑے پاکباز بنتے ہیں۔)

اور یہ بھی قول ہے: المتطھرون وہ ہیں جنہوں نے گناہ نہیں کیے اور اگر کہا جائے کہ جس نے گناہ کیے ہیں اس کا ذکر اس پر مقدم کیسے ہوسکتا ہے جس نے گناہ نہیں کیے، تو جواب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر پہلے کیا تاکہ توبہ کرنے والا رحمت سے مایوس اور ناامید نہ ہو جائے اور متطہر اپنی ذات کے بارے میں عجب اور خود پسندی میں مبتلا نہ ہو جائے، جیسا کہ دوسری آیت میں ذکر کیا ہے: فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ (فاطر: 32) اس کا بیان آگے آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۠ وَ قَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ۝

''تمہاری بیویاں تمہاری کھیتی ہیں تو تم آؤ اپنے کھیت میں جس طرح چاہو اور پہلے پہلے کرلو اپنی بھلائی کے کام اور ڈرتے رہو اللہ سے اور خوب جان لو کہ تم ملنے والے ہو اس سے اور (اے حبیب) خوشخبری دو مومنوں کو۔''

اس میں چھ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ائمہ نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے (1) اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔ فرمایا: یہودی کہتے تھے جب کوئی آدمی اپنی عورت کے ساتھ اس کی دبر کی جانب سے اس کی قبل (فرج) میں وطی کرتا ہے تو بچہ بھینگا ہوتا ہے، تب یہ آیت نازل ہوئی: نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ اور زہری سے ایک روایت میں یہ زائد ہے: اگر چاہے تو اسے اوندھا لٹائے اور اگر چاہے تو سیدھا لٹائے مگر وطی ایک سوراخ میں ہو اور

1۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، حدیث نمبر 4164، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

صمام کا لفظ سمام سین کے ساتھ بھی مروی ہے۔ ترمذی نے یہی کہا ہے۔(1)

اور امام بخاری نے حضرت نافع سے روایت کیا ہے(2) کہ انہوں نے فرمایا: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جب قرآن کریم پڑھتے تھے تو گفتگو نہ کرتے تھے یہاں تک کہ قراءت سے فارغ ہو جاتے۔ پس ایک دن میں قرآن کریم اٹھائے ہوئے تھا اور انہوں نے سورۃ البقرہ پڑھی یہاں تک کہ اس مقام (اس آیت) پر پہنچ کر رک گئے فرمایا: کیا تو جانتا ہے کیونکر یہ آیت نازل کی گئی ہے؟ میں نے عرض کی نہیں۔ فرمایا: یہ اس اس میں نازل ہوئی ہے، پھر آپ آگے پڑھنے لگے۔

اور عبدالصمد نے بیان کیا ہے کہ میرے باپ نے مجھے بتایا کہ مجھے ایوب نے نافع کے واسطہ سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث بیان کی ہے: فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ کے بارے انہوں نے کہا: یا تیہا فی۔ یعنی اس میں مجرور محذوف ہے۔ حمیدی نے کہا ہے: وہ الفرج ہے(3) یعنی وہ اس کے ساتھ فرج میں جماع کرے۔

ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: بلاشبہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو وہم ہوا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، بلاشبہ یہ انصار کا ایک قبیلہ تھا، وہ بت پرست تھے اور اس قبیلے کے ساتھ یہودی بھی تھے اور وہ اہل کتاب ہیں۔ اور وہ ان کو اپنے اوپر علم میں فضیلت دیتے تھے اور وہ بہت سے افعال میں ان کی اقتدا کرتے تھے اور اہل کتاب کے امور میں سے ایک یہ تھا کہ وہ عورتوں کے ساتھ ایک طرف پر جماع کرتے تھے اور یہ عورت کے لئے زیادہ باعث ستر ہوتا تھا۔ پس انصار کے اس قبیلے نے ان کے افعال میں سے اس فعل کو بھی اختیار کر لیا اور یہ قبیلہ قریش میں سے تھا جو عورتوں کو گدی کے بل لٹا کر ان سے وطی کرتے تھے اور ان سے لذت حاصل کرتے تھے، کبھی سامنے کی جانب سے، کبھی پیچھے کی جانب سے اور کبھی چت لٹا کر، پس جب مہاجرین مدینہ طیبہ آئے تو ان میں سے ایک آدمی نے انصار کی ایک عورت سے شادی کی اور وہ اس کے ساتھ وہی کچھ کرنے لگا، تو اس نے اسے ناپسند کیا اور ایسا کرنے سے روکا اور کہا: ہمارے ہاں عورت کے ساتھ ایک طرف سے جماع کیا جاتا ہے پس تو بھی اسی طرح کر ورنہ مجھ سے دور ہو جا، یہاں تک کہ ان دونوں کا معاملہ بڑھ گیا اور وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک جا پہنچا، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ یعنی سامنے کی جانب سے، پیچھے کی جانب سے اور چت لیٹنے کی حالت میں (محل حرث میں جماع کرو۔) اور یہی محل ولد ہے۔(4)

امام ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں ہلاک ہو گیا۔ آپ نے فرمایا: کس شے نے تمہیں ہلاک کیا ہے؟ عرض کی: آج رات میں نے اپنے پالان (مراد بیوی ہے) کو الٹا کر دیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کوئی جواب نہ دیا۔ راوی نے بیان کیا: پھر اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ آیت وحی فرمائی:

1۔ سنن ترمذی، باب سورۃ البقرہ، حدیث نمبر 2904، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، حدیث نمبر 4163، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً

4۔ سنن ابی داؤد، باب فی جامع النکاح، حدیث نمبر 1849، ایضاً

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۖ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنّٰى شِئْتُمْ، اقبل و ادبر واتق الدبر والحيضة (تو سامنے کی جانب سے اور پیچھے کی جانب سے وطی کر اور دبر اور حالت حیض میں وطی کرنے سے بچ۔) فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔(1)

اور نسائی نے ابوالنضر سے بیان کیا ہے کہ اس نے نافع مولیٰ ابن عمر رضی اللہ عنہما کو کہا: تمہارے بارے میں اکثر قول ہے کہ تم حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ روایت کرتے ہو کہ انہوں نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ عورتوں کے ساتھ ان کی دبروں میں جماع کیا جا سکتا ہے۔ تو حضرت نافع نے فرمایا: تحقیق انہوں نے میرے بارے میں جھوٹ بولا: البتہ میں تمہیں بتاؤں گا کہ معاملہ کیسے تھا۔ ایک دن حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے قرآن کریم مجھے دیا اور میں ان کے پاس تھا یہاں تک کہ وہ اس آیت پر پہنچے۔ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ۔ فرمایا: نافع! کیا تو جانتا ہے اس آیت کا حکم کیا ہے؟ بے شک ہم گروہ قریش عورتوں کو منہ کے بل اوندھا لٹاتے تھے، جب ہم مدینہ منورہ میں آئے اور ہم نے انصار کی عورتوں سے نکاح کیے تو ہم نے ان سے وہی کرنا چاہا جو ہم اپنی عورتوں سے کرتے تھے تو ان عورتوں نے اسے ناپسند کیا اور اسے بڑا معاملہ قرار دیا، کیونکہ انصار کی عورتوں کے ساتھ ان کے پہلوؤں کے بل جماع کیا جاتا تھا۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۖ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنّٰى

مسئلہ نمبر 2۔ یہ احادیث تمام کیفیات اور حالت کی اباحت میں نص ہیں بشرطیکہ وطی محل حرث میں ہو، یعنی جس کیفیت میں تم چاہو پیچھے کی جانب سے اور آگے کی جانب سے وہ سینے کے بل لیٹی ہوئی ہو یا چت یا پہلو کے بل۔ اور رہا محل حرث کے سوا کسی جگہ میں وطی کرنا تو یہ نہ مباح رہا ہے اور نہ اسے مباح کیا جائے گا اور حرث کا ذکر اس پر دلالت کرتا ہے کہ محل حرث کے سوا میں وطی کرنا حرام ہے۔ اور حرث یہ تشبیہ ہے، کیونکہ ان میں بھی بیج بویا جاتا ہے اور لفظ حرث واضح کرتا ہے کہ اباحت صرف اور صرف فرج میں واقع ہوئی ہے۔ کیونکہ وہی بیج ڈالنے کا محل ہے اور ثعلب نے کہا ہے:

انما الأرحام أرض ... لنا محترثات

بے شک ارحام زمینیں ہیں ہمارے لئے کھیتیاں بنائی گئی ہیں۔

فعلينا الزرع فيها ... و على الله النبات

پس ہمارے اوپر ان میں بیج ڈالنا ہے اور اگانا (یعنی اولاد عطا کرنا) اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہے۔

پس عورت کی فرج زمین کی طرح ہے اور نطفہ بیج کی مانند ہے اور بچہ نباتات کی طرح ہے۔ پس الحرث بمعنی المحترث ہے اور الحرث کو واحد لایا گیا ہے کیونکہ یہ مصدر ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: رَجُلٌ صومٌ، وقومٌ صومٌ۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: أَنّٰى شِئْتُمْ جمہور صحابہ کرام، تابعین عظام اور ائمہ فتویٰ کے نزدیک اس کا معنی ہے: جس طرح تم چاہو سامنے کی جانب سے اور پشت کی جانب سے جیسا کہ ابھی ہم نے ذکر کیا ہے۔ اور أَنّٰى سوال کے لئے اور کسی کام کی خبر دینے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس کی کئی جہتیں ہیں اور یہ لغوی اعتبار سے کیف، این اور متیٰ سے عام ہے۔ یہی انّی میں عربی استعمال ہے اور لوگوں نے اس آیت میں انہی الفاظ کے ساتھ انّی کی تفسیر بیان کی ہے۔

1۔ سنن ترمذی، باب من سورۃ البقرۃ، حدیث نمبر 2906، ایضاً

اور سیبویہ نے کیف اور این دونوں کے ساتھ اکٹھی اس کی تفسیر بیان کی ہے۔

اور ایک فرقہ نے این کے ساتھ اس کی تفسیر بیان کی ہے اور یہ موقف اپنایا ہے کہ دبر میں وطی مباح ہے اور جن کی طرف یہ قول منسوب ہے وہ حضرت سعید بن مسیب، حضرت نافع، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما، حضرت محمد بن کعب قرظی اور عبدالملک بن ماجشون رحمۃ اللہ علیہم ہیں اور اسے امام مالک سے ان کی جس کتاب سے بیان کیا گیا ہے اس کا نام کتاب السر ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ماہر اصحاب اور ان کے مشائخ اس کتاب کا انکار کرتے ہیں اور امام مالک کا مقام و مرتبہ اس سے کہیں بلند اور اعلیٰ ہے کہ ان کے لئے کتاب السر ہو اور یہ قول العتبیہ میں ہے۔

اور علامہ ابن عربی نے ذکر کیا ہے کہ ابن شعبان نے اس قول کے جواز کو صحابہ کرام اور تابعین میں سے بہت بڑی جماعت کی طرف منسوب کیا ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی طرف بہت سی روایات کتاب جماع النسوان و احکام القرآن میں منسوب کی ہیں اور الکیا الطبری نے کہا ہے: محمد بن کعب قرظی سے روایت ہے کہ وہ اس میں کوئی حرج نہ دیکھتے تھے اور وہ اس میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پیش کرتے تھے: اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۵﴾ وَ تَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ (الشعراء) (کیا تم بدفعلی کے لئے جاتے ہو مردوں کے پاس ساری مخلوق سے اور چھوڑ دیتے ہو جو پیدا کی ہیں تمہارے لئے تمہارے رب نے تمہاری بیویاں۔) اور فرمایا: تقدیر کلام یہ ہے تترکون مثل ذلک من ازواجکم یعنی تم اس کی مثل اپنی بیویاں چھوڑ دیتے ہو، اگر اس کی مثل بیویوں سے مباح نہ ہوتا تو یہ صحیح نہ ہوتا اور اس کی مثل کسی دوسرے محل میں مباح نہیں، یہاں تک کہ کہا جاتا ہے: تم وہ کرتے ہو اور اس کی مثل مباح کو چھوڑ دیتے ہو۔

الکیا نے کہا: یہ بات محل نظر ہے، کیونکہ اس کا معنی ہے: اور تم چھوڑ دیتے ہو جو پیدا کی ہیں تمہارے لئے تمہارے رب نے تمہاری بیویاں جن میں تمہاری شہوت کی تسکین ہے اور جماع کی لذت ہے۔ یہ دونوں ایک ساتھ حاصل ہو جاتی ہیں، پس اس معنی پر زجر و توبیخ جائز ہے، قول باری تعالیٰ: فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَیْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ اس ارشاد گرامی کے ساتھ: فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ محل جس میں واقع ہونا ہے وہ خاص ہے اور وہ اسی میں مقصور ہے جو محل ولد ہے (یعنی جس محل میں وطی کرنے سے اولاد کا ہونا ممکن ہے وہی محل حرث ہے اور اسی میں جماع جائز ہے تو چونکہ دبر میں یہ عمل کرنے سے اولاد کا امکان نہیں اس لئے نہ وہ محل حرث ہے اور نہ ہی اس میں وطی مباح ہے۔)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس مسئلہ میں یہی حق اور صحیح ہے۔

ابو عمر بن عبدالبر نے ذکر کیا ہے کہ علماء نے رتقاء میں اختلاف نہیں کیا۔ یہ ایسی عورت ہے جس سے وطی نہیں کی جاسکتی، یہ عیب ہے اس کے سبب اسے رد کیا جاسکتا ہے، مگر وہ روایت جو حضرت عمر بن عبدالعزیز سے کئی طرق سے مروی ہے وہ قوی نہیں ہے وہ یہ کہ رتقاء کو نہیں لوٹایا جائے گا اور نہ کسی اور کو، تمام کے تمام فقہاء اس کے خلاف ہیں کیونکہ مسیس (وطی) ہی نکاح کا مقصود ہے اور اس پر ان کے اجماع میں اس بات پر دلیل موجود ہے کہ دبر محل وطی نہیں ہے اور اگر یہ وطی کا محل ہوتی تو پھر اسے رد نہ کیا جاتا جس کی فرج میں وطی نہ کی جاسکتی ہو۔

اوران کے اجماع میں اس پر بھی دلیل موجود ہے کہ ایسی بانجھ عورت جو بچے نہیں جنتی اسے رد نہیں کیا جائے گا۔ اور اس مسئلہ میں صحیح وہی ہے جو ہم نے بیان کر دیا ہے اور وہ جو امام مالک اور ان کے اصحاب کی طرف منسوب ہے وہ باطل ہے اور وہ اس سے بری الذمہ ہیں، کیونکہ وطی کی اباحت محل حرث کے ساتھ مختص ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَأْتُوا حَرْثَكُمْ اور اس لئے بھی کہ بیویوں کو پیدا کرنے میں حکمت نسل کو پھیلانا ہے اور جو اس کا محل نہیں ملک نکاح اسے شامل ہی نہیں ہوتی۔ یہی بات حق ہے۔

اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب نے کہا ہے: ہمارے نزدیک وہ (یعنی دبر میں وطی کرنا) اور ذکر کو ساتھ مس کرنا حکم میں برابر ہیں۔ کیونکہ محل نجاست میں قذر (گندگی) اور اذیت دم حیض کی نسبت زیادہ ہے، پس وہ زیادہ شنیع اور برا ہے اور رہی بول کی تکلیف تو یہ رحم کی تکلیف کے سوا ہے۔

علامہ ابن عربی نے قبس میں کہا ہے کہ ہمیں الشیخ الامام فخر الاسلام ابوبکر محمد بن احمد بن حسین فقیہ وقت اور امام وقت نے کہا: فرج پینتیس چیزوں کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتی ہے اور انہوں نے اپنے ہاتھ پر گن کر بتایا اور کہا: بول کا راستہ تیس کے ماتحت ہے اور ذکر اور فرج کا راستہ وہ ہے جس پر پانچ مشتمل ہیں۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے فرج کو حالت حیض میں عارضی نجاست کی وجہ سے حرام قرار دیا ہے تو پھر دبر کو لازمی نجاست کی وجہ سے حرام قرار دیا جانا بدرجہ اولیٰ ہے۔

اور امام مالک نے ابن وہب اور علی بن زیاد کو اس وقت کہا جب ان دونوں نے انہیں یہ خبر دی کہ مصر میں لوگ آپ کے بارے میں یہ باتیں کرتے ہیں کہ وہ اسے (دبر میں وطی کو) جائز قرار دیتے ہیں تو آپ نے اس سے نفرت کی (اسے انتہائی ناپسند کیا) اور ناقل کی تکذیب بالفور کی اور فرمایا: انہوں نے میرے بارے میں جھوٹ بولا ہے، انہوں نے میری تکذیب کی ہے، انہوں نے میری طرف جھوٹی نسبت کی ہے۔ (کَذَبوا علیّ تین بار کہا) پھر فرمایا: کیا تم عرب قوم نہیں ہو؟ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ تو کیا اگانے والے محل کے سوا کوئی کھیت ہو سکتا ہے (اور وہ محل فرج ہی ہے۔)

اور جس سے مخالف نے استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے أَنَّىٰ شِئْتُمْ یہ اپنی عمومیت کے اعتبار سے تمام راستوں کو شامل ہے (یعنی قبل اور دبر دونوں کو) تو اس میں ان کے لئے کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے کیونکہ جو ہم نے اس کے بارے ذکر کیا ہے اس کے سبب یہ خاص ہو چکا ہے اور ان احادیث کے سبب جو صحیح، حسن اور مشہور ہیں اور انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بارہ صحابہ کرام نے مختلف متنوں کے ساتھ روایت کیا ہے وہ تمام کی تمام عورتوں کے ساتھ ان کی دبروں میں وطی کے حرام ہونے پر دال ہیں۔

انہیں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں، ابوداؤد، نسائی اور ترمذی رحمہم اللہ علیہم وغیرہم نے روایت کیا ہے اور انہیں ابو الفرج بن جوزی نے ان کی سندوں سمیت ایک جز میں جمع کیا ہے اور اس کا نام رکھا ہے تحریم المحل المکروہ اور ہمارے شیخ ابو العباس نے بھی ایک جز میں جمع کیا ہے اور اس کا نام رکھا اظہارُ ادبار من أجاز الوطی فی الادبار۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہی وہ حق ہے جس کی اتباع کی گئی ہے اور اس مسئلہ میں صحیح (نظریہ) ہے اور اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت کے ساتھ ایمان رکھنے والے کو نہیں چاہئے کہ وہ اس مصیبت میں پڑے کیونکہ یہ عالم کی خطا اور لغزش ہے اس کے بعد کہ اس کے بارے میں صحیح روایات موجود ہیں اور ہمیں عالم کی غلطی سے ڈرایا اور محفوظ رکھا گیا ہے۔

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اس کے خلاف مروی ہے اور جس نے ایسا کیا اس کی تکفیر مروی ہے اور یہی آپ رضی اللہ عنہ کے لائق اور شایان شان ہے۔ اسی طرح حضرت نافع رضی اللہ عنہ نے اسے جھوٹا قرار دیا ہے جس نے آپ کی طرف سے اس بارے میں بیان کیا، جیسا کہ امام نسائی نے ذکر کیا ہے اور وہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور امام مالک نے اس کا انکار کیا اور اسے بہت بڑا قدم قرار دیا اور جس نے اسے آپ کی طرف منسوب کیا اسے جھوٹا قرار دیا۔

اور الدارمی ابو محمد نے اپنی مسند میں سعید ابن یسار ابی الحباب سے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا: آپ ان عورتوں کے بارے میں کیا کہتے ہیں جن کے ساتھ تحمیض کی جائے؟ آپ نے فرمایا: تحمیض کیا ہے؟ تو میں نے عرض کیا: ''دبر''، تو آپ نے فرمایا: کیا مسلمانوں میں سے بھی کوئی ایسا کرتا ہے۔

اور حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مسند روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: ''اے لوگو! بے شک اللہ تعالیٰ حق سے حیا نہیں کرتا تم عورتوں کی دبروں میں وطی نہ کرو۔'' اور اسی کی مثل حضرت علی بن طلق سے بھی مروی ہے۔

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مسند روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے عورت کے ساتھ اس کی دبر میں وطی کی تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی طرف نظر (کرم) نہیں فرمائے گا۔''

اور ابوداؤد طیالسی نے اپنی مسند میں حضرت قتادہ سے، انہوں نے عمرو بن شعیب سے، انہوں نے اپنے باپ سے، انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''وہ لواطت صغریٰ ہے'' (1)۔ یعنی عورت کی دبر میں وطی کرنا۔

اور حضرت طاؤس سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: عورتوں کے ساتھ ان کی دبروں میں وطی کرنے سے ہی قوم لوط کا عمل شروع ہوا تھا۔

ابن منذر نے کہا ہے: جب کوئی شے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہو جائے تو پھر جو بھی اس کے سوا ہے اسے چھوڑ دیا جائے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَ قَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ، یعنی پہلے پہلے وہ عمل کر لو جو کل (یعنی آخرت میں) تمہارے لئے باعث نفع ہوں، اس میں مفعول کو حذف کر دیا گیا ہے اور اس کی تصریح اس ارشاد باری تعالیٰ میں کی گئی ہے: وَ مَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَیْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ (البقرہ:110) (اور جو کچھ آگے بھیجو گے اپنے لئے نیکیوں سے ضرور پاؤ گے اس کا ثمر اللہ کے ہاں) پس معنی یہ ہوا تم اپنے لئے طاعت اور عمل صالح آگے بھیجو (یعنی پہلے پہلے کر لو)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اولاد اور نسل کی چاہت ہے کیونکہ اولاد دنیا اور آخرت کی بھلائی ہے۔ تحقیق بیٹا شفیع بھی ہوتا ہے اور ڈھال بھی۔

اور یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد پاک دامن عورتوں سے شادی کرنا ہے تاکہ اولاد صالح اور طاہر ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد افراط کو آگے بھیجنا ہے۔ جیسا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: ''جس نے تین بچے آگے بھیجے جو ن

1۔ مسند امام احمد حدیث نمبر 6706

بلوغت کو نہ پہنچے ہوں تو آگ اسے مس نہ کرے گی مگر کفارہ قسم کے طور پر'' الحدیث (1)۔ اس کا بیان سورۂ مریم میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت ابن عباس اور حضرت عطا رحمہم اللہ نے کہا ہے: جماع کے وقت پہلے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو، جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: ''اگر تم میں سے کوئی جب اپنی بیوی کے پاس مجامعت کے لئے آیا اور اس نے یہ پڑھا بسم اللہ اللّٰھم جنبنا الشیطان و جنب الشیطان ما رزقتنا (اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں۔ اے اللہ! تو ہمیں شیطان سے دور رکھ اور شیطان کو اس سے دور رکھ جو تو نے ہمیں عطا فرمایا ہے۔) تو اگر ان دونوں کے مابین بچہ مقدر ہوا تو شیطان کبھی بھی اسے ضرر نہ پہنچائے گا'' اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: وَاتَّقُوا اللّٰهَ یہ تحذیر ہے۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ یہ خبر ہے جو تحذیر میں مبالغہ کا تقاضا کرتی ہے، یعنی وہ تمہیں نیکی اور گناہ پر جزا دے گا۔ ابن عیینہ نے عمرو بن دینار سے روایت کیا ہے اور کہا ہے: میں نے سعید بن جبیر کو سنا انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا اور انہوں نے فرمایا: میں نے سعید بن جبیر کو سنا انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا اور انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دوران خطبہ یہ فرماتے ہوئے سنا: ''بلاشبہ تم اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرو گے اس حال میں کہ تم سر اور پاؤں سے ننگے ہو گے، پیدل ہو گے اور غیر مختون ہو گے۔'' پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ۔ مسلم نے اسے اسی معنی میں روایت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ یہ نیکی کرنے والے اور ہدایت کے طریقے تلاش کرنے والے کے لئے تانیس ہے۔ (2)

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۲۴

''اور نہ بناؤ اللہ (کے نام) کو رکاوٹ اس کی قسم کھا کر کہ نیکی نہ کرو گے اور پرہیزگاری نہ کرو گے اور صلح نہ کراؤ گے لوگوں میں اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والا جاننے والا ہے۔''

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ علماء نے فرمایا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے مال خرچ کرنے اور یتیموں کے ساتھ زندگی گزارنے اور عورتوں کے ساتھ حسن معاشرت کا حکم فرمایا تو فرمایا: تم مکارم اخلاق میں سے کسی شے سے انکار نہ کرو اس علت کی بنا پر کہ ہم نے قسم کھا رکھی ہے کہ ہم اس طرح نہ کریں گے، یہ معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابراہیم نخعی، مجاہد اور ربیع رحمۃ اللہ علیہم اور ان کے سوا کئی دوسروں نے بیان کیا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، باب قول اللہ تعالیٰ واقسموا باللہ جھد ایمانھم، حدیث نمبر 6164، ایضاً

2۔ صحیح بخاری، باب کیف الحشر، حدیث نمبر 6043، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: مراد ایسا آدمی ہے جو قسم کھالیتا ہے کہ وہ نیکی نہ کرے گا اور صلہ رحمی نہ کرے گا اور نہ لوگوں کے درمیان صلح کرائے گا، پس اسے کہا جاتا ہے: تو نیکی کر تو وہ کہتا ہے: میں نے تو (نیکی نہ کرنے کی) قسم کھا رکھی ہے۔

اور بعض تاویل کرنے والوں نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تم اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ جھوٹ بولتے ہوئے قسمیں نہ کھاؤ جب تم نیکی، پرہیزگاری اور اصلاح (صلح کرانے) کا ارادہ کرو، پس اُن کے بعد لا کو مقدر ماننے کی ضرورت نہ ہوگی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے تم اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ کثرت سے قسمیں نہ کھاؤ کیونکہ یہ دلوں کو خوفزدہ کر دیتی ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ (اور تم اپنی قسموں کی حفاظت کرو) اور کثرت سے قسمیں کھانے والے کی مذمت بیان فرمائی۔ سو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۝ (القلم) (اور نہ بات مانیے کسی (جھوٹی) قسمیں کھانے والے ذلیل شخص کی۔) اور عرب کم قسمیں کھانے کے سبب تعریف کرتے ہیں، یہاں تک کہ ان میں سے کسی کہنے والے نے کہا:

قلیل الالایا حافظٌ لیمینه وان صدرت منه الالیةُ برّتِ

کم قسمیں کھانے والا اپنی قسم کی حفاظت کرتا ہے اور اگر اس سے قسم صادر ہو جائے تو وہ سچی ہو جاتی ہے۔

اس بنا پر اَنْ تَبَرُّوْا کا معنی ہے تم قسمیں کم کھاؤ کیونکہ اس میں نیکی اور پرہیزگاری ہے، کیونکہ کثیر قسموں کے ساتھ حِنث (قسم توڑنا) بھی ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حقوق کی رعایت اور پاسداری میں کمی واقع ہوتی ہے، یہ تاویل حسن اور اچھی ہے۔

حضرت امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہما نے فرمایا: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ قسم ہر شے میں رائج ہے اور کہا گیا ہے: معنی یہ ہے کہ تم ہر حق اور باطل میں تصرف کے لئے قسم نہ کھاؤ۔

اور زجاج وغیرہ نے کہا ہے: آیت کا معنی ہے کہ ایک آدمی ایسا ہوتا ہے کہ جب اس سے فعل خیر کا مطالبہ کیا جائے تو اللہ کے ساتھ عذر پیش کرتا ہے اور کہہ دیتا ہے: مجھ پر قسم ہے، حالانکہ اس نے قسم نہیں کھائی ہوتی۔ قتبی نے کہا ہے: معنی یہ ہے کہ جب تم یہ قسم کھاؤ کہ تم صلہ رحمی نہ کرو گے، صدقہ نہ کرو گے اور صلح نہیں کراؤ گے اور انہی کے مشابہ نیکی اور خیر کے کاموں سے متعلقہ قسمیں تو تم قسم کا کفارہ ادا کر دو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ (تاویل) حسن ہے اس کے لئے جو ہم نے بیان کیا ہے اور اسی پر سبب نزول بھی دلالت کرتا ہے، ہم اس کے بعد والے مسئلہ میں اسے بیان کریں گے۔

مسئلہ نمبر 2۔ کہا گیا ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وجہ سے نازل ہوئی، جب انہوں نے یہ قسم کھائی کہ وہ مسطح پر (مال) خرچ نہ کریں گے جس وقت اس نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بارے باتیں کیں (اور آپ پر تہمت لگائی) جیسا کہ حدیث الافک میں ہے، اس کا بیان سورۃ النور میں آئے گا۔ یہ ابن جریج سے مروی ہے۔ (1)

اور یہ قول بھی ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی جب انہوں نے یہ قسم کھائی کہ وہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر سورۃ النور، حدیث نمبر 4381، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مہمانوں کے ساتھ کھانا نہیں کھائیں گے۔(1)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی جب انہوں نے یہ قسم کھائی کہ وہ بشیر بن نعمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ کلام نہیں کریں گے اور وہ آپ کی بہن کی نسبت سے آپ کے داماد تھے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: عُرْضَةً لِّاَیْمَانِكُمْ یعنی کھڑی کی ہوئی علامت۔ یہ جوہری سے منقول ہے۔

اور فلان عرضة ذاك یعنی فلاں اس کے لئے علامت (رکاوٹ) ہے، یعنی وہ اس کے ساتھ ملی ہوئی ہے اور وہ اس پر قوی اور غالب ہے اور عرضہ کا معنی الھمۃ بھی ہے۔ کسی نے کہا:

هم الأنصار عرضتها اللقاء

وہ انصار ہیں ان کا ارادہ لشکر سے ملاقات ہے۔

اور فلان عرضة للناس اور فلاں لوگوں کا ٹارگٹ ہے: وہ مسلسل اس میں واقع ہوتے رہتے ہیں۔ و جعلت فلانا عرضة لكذا یعنی میں نے فلاں کو اس کے لئے علامت قرار دیا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ عرضۃ یہ شدت اور قوت سے ہے اور اسی سے عورت کے لئے ان کا قول ہے: عرضة للنكاح، جب وہ نکاح کی صلاحیت رکھے اور اس کے لئے قوی ہو جائے۔

اور لفلان عرضة: یعنی فلاں کے لئے سفر اور جنگ کی قوت وطاقت ہے۔ کعب بن زہیر نے کہا ہے:

من كل نضّاخَةِ الذّفرى اذا عرقت عُرضَتُها طامسُ الاعلامِ مجهولُ

اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

فهذى لأيام الحروب و هذه لِلَهوِى و هذى عرضةٌ لارتحالنا

پس یہ جنگ کے دنوں کے لئے ہے اور لہو ولعب کے لئے ہے اور یہ ہمارے سفر کے لئے قوت وطاقت ہے۔ یعنی تیاری ہے۔ اور ایک دوسرے نے کہا ہے:

فَلَا تجعلنى عُرضة للّوائم

اور اوس بن حجر نے کہا ہے:

وأدماء مثل الفحل يوماً عرضتُها لرحلى و فيها هِزَّةٌ و تقاذُفُ

اور معنی یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ قسم کھانے کو اپنے لئے قوت نہ بناؤ اور نیکی سے رکنے کے لئے بہانہ نہ بناؤ۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: اَنْ تَبَرُّوْا وَ تَتَّقُوْا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے، یعنی البر و التقوىٰ و الاصلاح أولى وأمثل: یعنی نیکی کرنا، تقوی اختیار کرنا اور صلح کرانا زیادہ بہتر اور زیادہ اچھا ہے۔

جیسا کہ یہ قول ہے طاعةٌ و قول معروف یہ زجاج اور نحاس سے منقول ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا محل نصب ہے،

1۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، حدیث نمبر 5675، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یعنی تمہیں اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم نیکی، تقویٰ اور صلح کرانے سے باز نہ رکھے، یہ بھی زجاج سے منقول ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مفعول من اجلہ ہے اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا معنی اَلَّا تبروا اور لا کو حذف کر دیا گیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَکُمۡ اَنۡ تَضِلُّوۡا۔ ای لئلا تضلوا (اللہ تعالیٰ تمہارے لئے بیان فرماتا ہے تاکہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ) طبری اور نحاس نے اسی طرح کہا ہے اور وجوہ نصب میں سے چوتھی وجہ یہ ہے: کراھة ان تبروا، (کہ نیکی کو ناپسند کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے نام کی قسمیں نہ کھاؤ۔) پھر اسے حذف کر دیا گیا ہے، اسے نحاس اور مہدوی نے ذکر کیا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ محل جر میں ہے۔ یہ قول خلیل اور کسائی کا ہے اور تقدیر کلام ہے: فی اَنۡ تبروا اور فی مضمر کر دیا گیا اور اس کے ساتھ اسے جر دی گئی۔

اور سَمِیۡعٌ یعنی اللہ تعالیٰ بندوں کے اقوال کو سننے والا ہے۔ عَلِیۡمٌ اور ان کی نیتوں کو جاننے والا ہے۔

لَا یُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِیۡۤ اَیۡمَانِكُمۡ وَلٰكِنۡ یُّؤَاخِذُكُمۡ بِمَا كَسَبَتۡ قُلُوۡبُكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ حَلِیۡمٌ ﴿۲۲۵﴾

''نہیں پکڑے گا تمہیں اللہ تعالیٰ تمہاری لایعنی قسموں پر لیکن پکڑے گا تمہیں ان قسموں پر جن کا ارادہ تمہارے دلوں نے کیا ہے اور اللہ بہت بخشنے والا حلم والا ہے۔''

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: بِاللَّغْوِ۔ اللغو: یہ مصدر ہے لَغَا یَلْغُوْ وَیَلْغٰی، ولَغِیَ یَلْغَی لَغًا جب کلام میں کوئی ایسی شے ذکر کی جائے جس کی حاجت اور ضرورت نہ ہو یا ایسی شے کو لانا جس میں خیر اور بھلائی نہ ہو یا ایسی شے جس کا گناہ لغو ہو جائے اور حدیث میں ہے: ''جب تو اپنے ساتھی کو کہے ''خاموش ہو جا'' اس حال میں کہ امام جمعہ کا خطبہ دے رہا ہو تو تو نے لغو عمل کیا'' (1) اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی لغت میں۔ لَغَوْتُ کی بجائے لغیت ہے۔ اور شاعر نے کہا ہے:

و رُبَّ أسراب حجیج کُظَّمِ عن اللَّغا و رَفَثِ التَّکَلُّمِ

اور ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے:

و لستَ بمأخوذ بلَغْوٍ تقولُه اذا لم تَعَمَّد عاقداتِ العزائمِ

مسئلہ نمبر 2۔ علماء کا یمین لغو کے بارے میں اختلاف ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: کسی آدمی کا وہ قول جو اس کے کلام کے درمیان میں ہو اور محاورہ میں اس کی عجلت پسندی کے سبب ہو: لا واللہ اور بلی واللہ، یہ (الفاظ) قسم کے ارادے سے نہ ہوں۔

مروزی نے کہا ہے: وہ یمین لغو جس پر علماء کا اتفاق ہے کہ یہ لغو ہے وہ آدمی کا یہ قول ہے: لا واللہ اور بلی واللہِ۔ جبکہ یہ اس کی گفتگو اور کلام میں واقع ہوں نہ ان سے قسم کا اعتقاد ہو اور نہ ہی قسم کا ارادہ ہو۔

اور ابن وہب نے یونس سے اور انہوں نے ابن شہاب سے روایت بیان کی ہے کہ حضرت عروہ رضی اللہ عنہ نے انہیں بتایا کہ ام

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجمعة، حدیث نمبر 882، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

المومنین زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: یمین لغو وہ ہے جو (محض) دکھاوا، تمسخر اور مزاح میں ہو اور وہ بات جس پر دل کا اعتقاد نہ ہو۔

اور بخاری میں ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا فرمان لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰہُ بِاللَّغْوِ فِیٓ اَیْمَانِکُمْ ایک آدمی کے اس قول کے بارے میں نازل ہوا: (یعنی) لا واللہ اور بلی واللہ۔

اور کہا گیا ہے: لغو وہ ہے جس کے بارے میں کوئی ظن کی بنا پر قسم کھاتا ہے اور وہ امر قسم کے خلاف ہوتا ہے، امام مالک نے یہی کہا ہے آپ سے اسے ابن قاسم نے بیان کیا ہے اور اسلاف میں سے ایک جماعت نے بھی اسی طرح کہا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب آدمی کسی شے کی قسم کھائے اور اس کا ظن یہی ہو کہ وہ اسی طرح ہے جبکہ (فی الحقیقت) وہ اس طرح نہ ہو تو وہ قسم لغو ہوگی اور اس میں کفارہ نہیں ہے، اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

اور روایت ہے کہ ایک قوم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گفتگو کا تبادلہ کیا اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں تہمت عائد کرنے لگے تو ان میں سے ایک نے قسم کھائی کہ میں نے درست کہا اور اے فلاں! تو نے غلط بیانی کی ہے، جبکہ معاملہ اس کے خلاف نکلا، تو اس آدمی نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وہ حانث ہو گیا ہے، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أیمان الرُّماۃ لغو لا حنث فیھا ولا کفارۃ (1) (گفتگو میں زیادتی کی قسم لغو ہے، اس میں نہ حانث ہونا ہے اور نہ کوئی کفارہ ہے۔)

اور مؤطا میں حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: اس بارے میں جو سب سے اچھا میں نے سنا ہے (وہ یہ ہے) کہ اللغو سے مراد انسان کا کسی شے کے بارے میں قسم کھانا ہے جس کے بارے وہ یقین رکھتا ہو کہ وہ اسی طرح ہے پھر وہ اس کے برعکس پائی جاتی ہے، اس میں کفارہ نہیں ہے اور وہ جو کسی شے کے بارے میں قسم کھاتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ وہ اس میں گنہگار ہے، جھوٹا ہے تاکہ وہ اس کے ساتھ کسی کو راضی کرے یا مخلوق کے لئے معذرت کرے یا وہ اس کے ذریعہ مال ہتھیا لے تو یہ اس سے بڑھ کر ہے کہ اس میں کفارہ ہو۔

اور کفارہ اس پر ہوگا جس نے یہ قسم کھائی کہ وہ یہ کام نہیں کرے گا حالانکہ اس کے لیے اس کا کرنا مباح ہے پھر وہ اسے کر گزرتا ہے یا (یہ قسم کھائے) کہ وہ اس طرح کرے گا پھر وہ ایسا نہ کرے، مثلاً اگر کسی نے قسم کھائی کہ وہ اپنا کپڑا دس درہم کے عوض نہیں بیچے گا پھر وہ اتنے کے عوض ہی فروخت کر دیتا ہے یا کسی نے قسم کھائی کہ وہ اپنے غلام کو ضرور مارے گا پھر وہ اسے نہ مارے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے ... اگر آپ سے یہ روایت صحیح ہے آپ نے فرمایا: یمین لغو یہ ہے کہ تو قسم کھائے درآنحالیکہ تو غصے میں ہو اور طاؤس نے یہی کہا ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا یمین فی غَضَبٍ (2) حالت غضب میں قسم نہیں ہوتی۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

اور حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ (اللغو سے مراد) حلال کو حرام قرار دینا ہے، پس وہ کہتا ہے: میرا مال مجھ پر حرام

1۔ تفسیر طبری، جلد 4، صفحہ 31
2۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 26

ہے اگر میں نے اس طرح کیا اور حلال مجھ پر حرام ہے۔ مکحول دمشقی نے اسی طرح کہا ہے۔ اور امام مالک نے بھی یہی کہا ہے، سوائے بیوی کے کیونکہ اس نے اس میں تحریم لازم کردی ہے مگر یہ کہ قسم کھانے والا اپنے دل کے ساتھ اسے خارج کردے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لغو سے مراد معصیت کی قسم ہے، حضرت سعید بن مسیب، ابوبکر بن عبدالرحمٰن اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے دونوں بیٹوں حضرت عروہ اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہما نے یہی کہا ہے جیسا کہ کوئی یہ قسم کھاتا ہے: ''وہ شراب ضرور پیے گا یا وہ قطع رحمی ضرور کرے گا۔''

پس اس کی نیکی اس فعل کو ترک کرنا ہے اور اس پر کوئی کفارہ نہیں ہے اور ان کی دلیل حضرت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی حدیث ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کسی کام کی قسم کھائی پھر اس کے غیر کو اس سے بہتر اور اچھا دیکھا تو اسے چاہیے کہ وہ اسے چھوڑ دے اور بے شک اس کا ترک کرنا ہی اس کا کفارہ ہے(1)۔'' اسے ابن ماجہ نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے۔ عنقریب اس کا ذکر بھی ''المائدۃ'' میں آئے گا۔

اور حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ یمین لغو یہ ہے کہ آدمی اپنے بارے میں بددعا کرے: (مثلاً) اللہ تعالیٰ اس کی بصارت کو اندھا کردے، اللہ تعالیٰ اس کا مال ضائع کردے، وہ یہودی ہے، وہ مشرک ہے، وہ ولد الزنا ہے اگر اس نے اس طرح کیا۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: دو آدمی خرید وفروخت کرتے ہیں، پس ان میں سے ایک کہتا ہے: قسم بخدا! میں تجھے اتنے کے عوض نہیں بیچوں گا اور دوسرا کہتا ہے: قسم بخدا! میں اتنے کے عوض اسے نہیں خریدوں گا۔

حضرت ابراہیم نخعی نے کہا ہے: وہ آدمی جو قسم کھاتا ہے کہ وہ یہ کام نہیں کرے گا پھر وہ بھول جاتا ہے اور اسے کر گزرتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی اور حضرت ضحاک نے کہا ہے: بے شک یمین لغو وہ ہے جس کا کفارہ ادا کیا جائے، یعنی جب قسم کا کفارہ ادا کردیا جائے تو وہ ساقط ہوجاتی ہے اور لغو ہوجاتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کا کفارہ ادا کرنے کے سبب اور اس سے بہتر کی طرف لوٹنے کے سبب مؤاخذہ نہیں فرمائے گا۔ ابن عبدالبر نے ایک قول بیان کیا ہے کہ لغو سے مراد مکرہ کی قسم ہے۔

حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ قسم جو نسیان اور بھول کے ساتھ ہو اس کے لغو ہونے میں کوئی شک نہیں، کیونکہ وہ اس کے قصد اور ارادہ کے خلاف واقع ہوئی ہے، پس وہ محض لغو ہے(2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: مُکْرَہ کی قسم اپنے انجام سمیت، جس نے بالاکراہ قسم کھائی اس کا حکم ''النحل'' میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت ابن عربی نے کہا ہے: رہا وہ جس نے کہا کہ لغو سے مراد یمین المعصیۃ ہے تو یہ باطل ہے، کیونکہ ترک معصیت پر قسم کھانے والے کی قسم عبادت ہونے کے اعتبار سے منعقد ہوجاتی ہے اور معصیت کا ارتکاب کرنے پر قسم کھانے والے کی قسم معصیت ہونے کے اعتبار سے منعقد ہوجائے گی اور اسے کہا جائے گا: تو معصیت کا ارتکاب نہ کر اور کفارہ ادا کردے اور

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 6736 2۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 635

اگر اس نے اقدام فعل کیا تو وہ اپنے اقدام میں گنہگار ہوگا اور اپنی قسم سے بری ہو جائے گا۔

اور رہا وہ جس نے یہ کہا کہ اس سے مراد انسان کا اپنے خلاف دعا کرنا ہے اگر اس طرح نہ ہوا تو اس کے عوض اس طرح آفات نازل ہوں، تو یہ قول لغو ہے کفارہ کے طریق میں، لیکن فی القصد یہ قول منعقد ہو جائے گا اور مکروہ ہے اور بسا اوقات اس کے سبب مؤاخذہ بھی کیا جاتا ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی اپنے بارے میں بددعا نہ کرے بسا اوقات اتفاقیہ ایسی ساعت ہوتی ہے کہ جو کوئی اس میں اللہ تعالیٰ سے کسی شے کے بارے سوال کرتا ہے تو وہ اسے ضرور عطا فرما دیتا ہے۔''

اور رہا وہ جس نے کہا اس سے مراد یمین الغضب ہے تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حالت غضب میں قسم کھانا اس کی تردید کرتا ہے کہ وہ اشعریین کی بوجھ اٹھانے میں مدد نہیں کریں گے اور پھر آپ نے ان کی مدد کی اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کر دیا۔ اس کا ذکر ''سورۂ براءۃ'' میں آئے گا۔

حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: رہا وہ جس نے یہ کہا کہ اس سے مراد وہ قسم ہے جس کا کفارہ ادا کر دیا گیا ہے تو یہ اس کے متعلق نہیں جو بیان کیا جا رہا ہے اور اسے ابن عطیہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ضعیف اور کمزور قرار دیا ہے اور کہا: تحقیق اللہ تعالیٰ نے مطلقاً لغو سے مؤاخذہ اٹھا لیا ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس میں نہ کوئی گناہ ہے اور نہ ہی کفارہ ہے اور قسم میں مؤاخذہ یمین غموس میں جو کہ حالف نے اپنے ذمہ لازم کر رکھی ہو اور اس میں جس کا کفارہ ادا کرنا ترک کر دیا گیا ہو حالانکہ وہ اس میں سے ہو جن میں کفارہ ہوتا ہے آخرت کی سزا ہے اور لازم کرنے میں دنیا کی سزا ہے، پس یہ قول ضعیف ہو جاتا ہے اس سبب سے کہ یہ یمین المکفرہ ہے، کیونکہ اس میں مؤاخذہ واقع ہوا ہے اور مؤاخذہ کو فقط آخرت کے ساتھ خاص کرنا یہ مرضی کا فیصلہ ہے (جس کی کوئی حقیقت نہیں)۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: فِيٓ اَيْمَانِكُمْ۔ الأيمان یمین کی جمع ہے اور الیمین کا معنی قسم ہے اور اس کی اصل یہ ہے کہ عرب لوگ جب آپس میں قسم اٹھاتے تھے یا باہم عقد کرتے تھے تو ایک آدمی اپنے دائیں ہاتھ کے ساتھ اپنے ساتھی کا دایاں ہاتھ پکڑتا پھر یہ رواج بہت زیادہ بڑھ گیا یہاں تک کہ نفس قسم اور عہد کا نام ہی یمین پڑ گیا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یمین فَعِيلٌ کے وزن پر يُمْنٌ سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی برکت ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے یہ نام اس لئے دیا ہے کیونکہ یہ حقوق کی حفاظت کرتی ہے اور يَمِيْنٌ کا لفظ مذکر و مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے، اس کی جمع ایمان اور ایمن ہے۔ زہیر نے کہا ہے:

فتجمع أيمُنٌ منا و منكم

(پس ہماری طرف سے اور تمہاری طرف سے بہت سی قسمیں جمع ہو رہی ہیں۔)

(۴) قولہ تعالیٰ: وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ یہ اس قول کی مثل ہے: وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ (المائدہ: 89) اس کے تحت اس کے بارے مکمل بحث آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ نے کہا: قولہ تعالیٰ: وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ یہ ایسے آدمی کے بارے میں ہے

جو یہ کہتا ہے: وہ مشرک ہے اگر وہ ایسا کرے، یعنی یہ لغو ہے مگر یہ کہ وہ اپنے دل سے شرک کرنے کا اعتقاد اور اس کا ارادہ کرے اور غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ یہ دونوں صفتیں ہیں جو اس کے مناسب ہیں جو مؤاخذہ چھوڑنے کا ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ یہ نرمی اور وسعت کے باب سے ہے۔ (1)

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

''ان کے لئے جو قسم اٹھاتے ہیں کہ وہ اپنی بیویوں کے قریب نہ جائیں گے مہلت ہے چار ماہ کی پھر اگر رجوع کر لیں (اس مدت میں) تو بے شک الله غفور رحیم ہے۔ اور اگر پکا ارادہ کر لیں طلاق دینے کا تو بے شک الله تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔''

اس میں چوبیس مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ۔ يُؤْلُوْنَ کا معنی ہے وہ قسم اٹھاتے ہیں (2) اور مصدر اِيلاءٌ، اَلِيَّةٌ، اَلْوَةٌ اور اِلْوَةٌ ہیں۔ حضرت ابی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے لِلَّذِيْنَ يقسمون (3) قراءت کی ہے اور یہ بات جانی پہچانی ہے کہ يقسمون، يُؤْلُوْنَ کی تفسیر ہے۔ اور لِلَّذِيْنَ آلَوْا بھی پڑھا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے: آلَى يُؤْلِي اِيلاءً اور تَأَلَّى تَأَلِّيًا اور اِئْتَلى ائتلاء یعنی اس نے قسم کھائی۔ اور اسی میں سے ہے: وَلَا يَأْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ (نور: 22) (اور تم میں سے صاحب فضل قسم نہ کھائیں)۔

اور شاعر نے کہا ہے:

فآليتُ لا أنفكُ أحذُو قصيدةً تكون و اياها بها مثلا بعدِي

اور دوسرے نے کہا:

قليل الألايا حافظٌ ليمينهِ وان سبقت منه الألية برّتِ (4)

کم قسمیں کھانے والا اپنی قسم کی پاسداری کرتا ہے اور اگر اس سے قسم صادر ہو جائے تو وہ پوری ہو جاتی ہے۔

اور ابن درید نے کہا ہے:

أليّة باليَعْمَلاتِ يَرتَمِي بها النَّجاءُ بين أجواز الفَلا

حضرت عبد الله بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ دور جاہلیت کا ایلاء ایک سال، دو سال اور اس سے زیادہ عرصہ کا تھا۔ وہ اس سے رات کے وقت عورت کو اذیت پہنچانے کا قصد کرتے تھے، پس ان کے لئے چار ماہ رکھے گئے اور جس نے اس سے کم عرصہ کے لئے ایلاء کیا تو وہ حکماً ایلاء نہ ہوگا (5)۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 302، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

4۔ الجامع لاحکام القرآن... التفسیر، جلد 1، صفحہ 215، دار الکتب العلمیہ 5۔ احکام القرآن ابن عربی، جلد 1، صفحہ 177، دار احیاء التراث العربیۃ

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضور نبی مکرم ﷺ نے ایلاء کیا اور طلاق دی اور آپ ﷺ کے ایلاء کا سبب آپ سے ازواج مطہرات کا ایسے نفقہ کا سوال تھا جو آپ ﷺ کے پاس نہ تھا، اسی طرح صحیح مسلم میں ہے اور کہا گیا ہے کیونکہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کا ہدیہ آپ پر واپس لوٹا دیا تھا، پس اس سے آپ ﷺ غصے ہو گئے اور ان سے ایلاء کر لیا(1)۔ اسے ابن ماجہ نے بیان کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ ایلاء ہر اس کے لئے ثابت ہوتا ہے جس کے لئے طلاق ثابت ہے، پس آزاد، غلام اور سکران (نشے والا) ہر ایک کو ایلاء لازم ہوتا ہے اور اسی طرح سفیہ (احمق) اور جس پر ایلاء کیا جائے بشرطیکہ وہ بالغ اور غیر مجنون ہو اور اسی طرح خصی ہے جبکہ وہ مقطوع الذکر نہ ہو اور بوڑھا آدمی جبکہ اس میں رمق اور نشاط باقی ہوں۔

مقطوع الذکر آدمی جب ایلاء کرے تو اس بارے میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول مختلف ہے۔

ایک قول میں ہے کہ اس کے لئے کوئی ایلاء نہیں ہے اور ایک قول میں ہے: اس کا ایلاء صحیح ہوتا ہے۔

پہلا قول زیادہ صحیح اور کتاب و سنت کے زیادہ قریب ہے، کیونکہ رجوع وہ ہے جو قسم کو ساقط کر دیتا ہے اور رجوع بالقول اسے ساقط نہیں کرتا تو جب حنث سے مانع قسم باقی ہے تو پھر ایلاء کا حکم بھی باقی ہوگا اور گونگے آدمی کا ایلاء ایسی تحریر یا اشارہ کے ساتھ ہوتا ہے جو سمجھا جا سکتا ہو اور وہ اس کو لازم ہو۔ اسی طرح عجمیوں کا حکم ہے جب وہ اپنی عورتوں سے ایلاء کریں۔

مسئلہ نمبر 3۔ علماء کا اس بارے اختلاف ہے جس کے ساتھ قسم میں سے ایلاء واقع ہوتا ہے۔

پس ایک قوم نے کہا ہے: ایلاء واقع نہیں ہوتا مگر اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک کی قسم کھانے کے ساتھ (2)، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: من کان حالفا فلیحلف باللہ او لیصمت (3) یعنی جو کوئی قسم اٹھانے والا ہو تو اسے چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم کھائے یا پھر وہ خاموش رہے۔)

امام شافعی نے بھی اپنے جدید قول میں یہی کہا ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: ''ہر وہ قسم جو جماع سے روکے تو وہی ایلاء ہے (4) اور اسی کے مطابق شعبی، نخعی، مالک، اہل حجاز، سفیان ثوری، اہل عراق، امام شافعی نے اپنے دوسرے قول میں، ابوثور، ابو عبید، ابن منذر اور قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا ہے۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے: ہر وہ قسم جس کے سبب حالف اپنی بیوی کے ساتھ جماع کی قدرت نہ رکھتا ہو کہ وہ حانث ہو جائے گا تو وہ اس کے سبب ایلاء کرنے والا ہوگا، بشرطیکہ اس کی قسم چار مہینوں سے زیادہ کی ہو، پس ہر وہ جس نے اللہ تعالیٰ کی ذات یا اس کی صفات اور اس کی کفالت، اس کا عہد اور اس کا ذمہ ہے کہا تو اس پر ایلاء لازم ہو جائے گا۔ اور اگر اس نے کہا: اقسم یا اعزم

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطلاق، باب الایلاء، جلد 1، صفحہ 148، وزارت تعلیم

2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 177، دار احیاء التراث العربیۃ

3۔ بخاری شریف، کتاب الایمان، باب لا تحلفوا بآبائکم، جلد 2، صفحہ 983، وزارت تعلیم

ایضاً، کتاب الشہادات، حدیث نمبر 2482، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 356، دار الکتب العربیۃ

اور ساتھ باللہ کا ذکر نہ کیا تو کہا گیا ہے: اس پر ایلاء واقع نہ ہوگا، مگر یہ کہ وہ باللہ کا ارادہ کرے اور اس کی نیت کرے۔ اور جس نے کہا ہے کہ یہ قسم ہے تو اس پر ایلاء واقع ہو جائے گا۔ اس کا تفصیلی بیان "سورۃ المائدۃ" میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

اور اگر کسی نے روزوں کے ساتھ قسم کھائی کہ وہ اپنے بیوی سے وطی نہ کرے گا اور کہا: اگر میں تجھ سے وطی کروں تو مجھ پر ایک ماہ یا ایک سال کے روزے تو وہ ایلاء کرنے والا ہو جائے گا۔ اور اسی طرح ہر وہ جو حج، طلاق، عتق، نماز یا صدقہ میں سے اپنے ذمہ لازم کرتا ہے (تو وہ مولیٰ ہو جائے گا) اور ان تمام میں بنیاد اور اصل قول باری تعالیٰ کی عمومیت ہے: لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ اور کوئی فرق نہیں ہے جب اس نے صدقہ یا معین غلام کی آزادی یا غیر معین غلام کی آزادی کے ساتھ ایلاء کیا تو ایلاء ثابت ہو جائے گا۔

مسئلہ نمبر 4۔ اگر کسی نے قسم کھائی قسم بخدا! وہ وطی نہ کرے گا اور استثنا کر دی اور کہا: ان شاء اللہ تعالیٰ، تو بلاشبہ وہ ایلاء کرنے والا ہو جائے گا اور اگر اس نے اس سے وطی کی تو اس پر کفارہ نہیں ہوگا، یہ امام مالک سے ابن قاسم کی روایت میں ہے اور ابن ماجشون نے المبسوط میں کہا ہے: وہ مولیٰ نہیں ہوگا، یہی زیادہ صحیح ہے، کیونکہ استثناء (ان شاء اللہ کہنا) قسم کو کھول دیتا ہے۔ اور حالف کو اس طرح کر دیتا ہے گویا کہ اس نے قسم کھائی ہی نہیں اور یہی فقہائے امصار کا مذہب ہے، کیونکہ ان شاء اللہ کہہ کر اس نے وضاحت کر دی ہے کہ وہ فعل کا قصد کرنے والا نہیں (1) اور اس کی وجہ جسے ابن القاسم نے روایت کیا ہے اس کی بنا اس پر ہے کہ استثنا قسم کو نہیں کھولتا، البتہ وہ کفارہ کو ساقط کرنے میں مؤثر ہوتا ہے، اس کا بیان سورۃ المائدہ میں آئے گا۔ پس جب اس کی قسم باقی ہے، منعقد ہو چکی ہے تو پھر ایلاء کا حکم اسے لازم ہوگا، اگرچہ اس پر کفارہ واجب نہیں ہوگا۔

مسئلہ نمبر 5۔ اگر کسی نے نبی علیہ السلام، ملائکہ یا کعبہ معظمہ کے ساتھ قسم کھائی کہ وہ اس سے وطی نہ کرے گا یا اس نے کہا: وہ یہودی یا نصرانی یا زانی اگر وہ اس سے وطی کرے، تو اس صورت میں وہ ایلاء کرنے والا نہ ہوگا (2)۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے۔ الباجی نے کہا ہے: میرے نزدیک اس کا معنی ہے کہ وہ اسے قسم کے طریقہ کے بغیر لایا ہے اور اگر وہ اسے اس ارادہ پر لایا کہ ان میں سے یا کوئی اور جو الفاظ اس نے اسے کہے ہیں وہ اس کے ساتھ ایلاء کرنے والا ہے، تو المبسوط میں ہے کہ ابن القاسم سے اس آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جو اپنی بیوی کو کہتا ہے: لا مرحبا اور اس سے وہ ایلاء کا ارادہ کرتا ہے وہ مولیٰ ہو جائے گا، تو انہوں نے ذکر کیا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ہر وہ کلام جس سے اس نے طلاق کی نیت کی تو وہ طلاق ہو جاتی ہے اور یہ (ایلاء) اور طلاق دونوں برابر ہیں۔

مسئلہ نمبر 6۔ قرآن کریم میں مذکور ایلاء کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: کوئی ایلاء کرنے والا نہیں ہوگا یہاں تک کہ وہ یہ قسم کھائے کہ وہ ہمیشہ عورت کو مس نہیں کرے گا۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: جب کسی نے قسم کھائی کہ وہ ایک دن یا کچھ کم یا کچھ زیادہ اپنی بیوی کے قریب نہیں آئے گا پھر اس نے چار مہینے تک وطی نہ کی تو وہ عورت ایلاء کے سبب اس سے جدا ہو جائے گی۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 178، دار احیاء التراث العربیۃ

2۔ المدونۃ الکبریٰ، کتاب الایلاء واللعان باب فمن قال علی نذر، جلد 6، صفحہ 86، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر

یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، نخعی، ابن ابی لیلیٰ، حکم، حماد بن ابی سلیمان اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہم سے مروی ہے اور یہی اسحاق نے بھی کہا ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: کثیر اہل علم نے اس قول کا انکار کیا ہے۔ (1)

اور جمہور نے کہا ہے: ایلاء یہ ہے کہ آدمی قسم کھائے کہ وہ چار مہینے سے زیادہ (عرصہ) وطی نہ کرے گا۔ پس اگر اس نے چار ماہ اور ان سے کم کی قسم کھائی تو وہ مولی نہ ہوگا اور ان کے نزدیک وہ صرف قسم ہے۔ اگر اس نے اس مدت کے دوران وطی کی تو اس پر کوئی شے نہ ہوگی جیسا کہ تمام قسموں میں ہوتا ہے یہ امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور ابوثور رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے۔

اور ثوری اور علماء کوفہ نے کہا ہے کہ ایلاء یہ ہے کہ آدمی چار مہینے اور کچھ زائد کی قسم کھائے اور یہی حضرت عطا رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے (2)۔

اہل کوفہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے ایلاء میں چار مہینے مہلت مقرر کی ہے جیسا کہ اس نے عدتِ وفات کے لئے چار ماہ دس دن اور عدت میں تین حیض مقرر کیے ہیں اور اس کے بعد کوئی مہلت اور انتظار نہیں۔ انہوں نے کہا: مدت کے بعد ایلاء کا ساقط ہونا واجب ہو جاتا ہے اور وہ ساقط نہیں ہوتا مگر فیئ (رجوع) کے ساتھ اور اس سے مراد مدت کے اندر جماع کرنا ہے (ورنہ) چار مہینے گزرنے کے بعد طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے استدلال کیا ہے اور دونوں نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے ایلاء کرنے والے کے لئے چار ماہ مدت مقرر کی ہے۔ پس یہی اس کی کامل مدت ہے، اس دوران اس کی بیوی کو اس پر کوئی اعتراض (کا حق) نہیں۔ جیسا کہ دین مؤجل کا مالک مدت مکمل ہونے کے بعد ہی اس کے بارے مطالبے کا استحقاق رکھتا ہے۔

اور حضرت اسحاق کے قول کی وجہ مدت کم ہونے کے بارے میں (یعنی چار ماہ سے کم) کہ اس کے ساتھ بھی قسم کھانے والا مولی ہو جاتا ہے بشرطیکہ وہ وطی نہ کرے۔ اس کا قیاس چار مہینے سے زیادہ کی قسم کھانے والے پر ہے کیونکہ وہ مولی ہو جاتا ہے، کیونکہ قسم سے مقصود ضرر اور اذیت پہنچانا ہے اور یہ معنی قلیل مدت میں بھی موجود ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ اس بارے اختلاف ہے کہ جس نے چار مہینے سے زیادہ مدت اپنی بیوی سے وطی نہ کرنے کی قسم کھائی اور چار ماہ گزر گئے اور عورت نے اس سے مطالبہ نہ کیا اور اسے نہ سلطان وقت کے پاس پیش کیا تا کہ وہ اسے مطلع کرے (3)، تو امام مالک، آپ کے اصحاب اور اکثر اہل مدینہ کے نزدیک اس پر کوئی شے لازم نہ ہوگی۔

اور ہمارے علماء میں سے بعض کہتے ہیں کہ چار ماہ گزرنے کے ساتھ ایک طلاق رجعیہ اس پر لازم ہو جائے گی، اور ان سے بعض اور کچھ دوسرے علماء کہتے ہیں: چار مہینے گزرنے کے ساتھ اسے ایک طلاق بائنہ لازم ہوگی اور صحیح قول وہ ہے جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے اختیار کیا ہے اور وہ یہ کہ مولی کو طلاق لازم نہیں ہوتی یہاں تک کہ حاکم وقت اسے اس کی بیوی کے مطالبہ کے بارے میں آگاہ کرے تا کہ وہ رجوع کرلے تو وہ اپنی بیوی کی طرف وطی کے ساتھ رجوع کرے اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کرے یا وہ طلاق دے دے اور (حاکم) اسے نہ چھوڑے یہاں تک کہ وہ رجوع کرلے یا طلاق دے دے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 303، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

اور فیئ (رجوع) سے مراد جماع کرنا ہے جس صورت میں اس کے ساتھ مجامعت ممکن ہو۔ سلیمان بن یسار نے کہا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں نو (یا انیس) آدمی تھے جو ایلاء میں توقف کرتے تھے۔ امام مالک نے کہا: یہ حکم ہمارے نزدیک ہے اور اسی طرح لیث، شافعی، احمد، اسحاق، ابوثور رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے اور اسے ابن منذر نے پسند کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ اور ایلاء کرنے والے کی مدت قسم کھانے کے دن سے شروع ہوگی نہ کہ اس دن سے جس دن اس کی زوجہ اس سے جھگڑے اور اسے حاکم کے پاس پیش کرے اور اگر عورت نے اس کے ساتھ جھگڑا کیا اور وہ اس کے مباشرت نہ کرنے کے ساتھ راضی نہ ہوئی تو حاکم قسم کے دن سے اس کے لئے چار مہینے کی مدت مقرر کردے، پس اگر اس نے مباشرت کی تو اس نے زوجہ کے حق کی طرف رجوع کرلیا اور وہ اپنی قسم کا کفارہ ادا کردے اور اگر اس نے رجوع نہ کیا تو وہ اس پر طلاق رجعیہ ڈال دے۔

امام مالک نے فرمایا: اگر اس نے رجوع کرلیا تو اس کا رجوع کرنا صحیح نہ ہوگا یہاں تک کہ وہ عدت میں مقاربت اختیار کرے۔

ابہری نے کہا ہے: اس میں طلاق کا واقع ہونا دفع ضرر کے لئے ہے تو جب اس نے مقاربت نہ کی تو ضرر باقی رہا، تو اس صورت میں رجعت کا کوئی معنی نہیں ہے مگر یہ کہ اس کے لئے کوئی عذر ہو جو اسے مقاربت سے روکتا ہو تو پھر اس کا رجوع صحیح ہو گا، کیونکہ ضرر زائل ہوجائے گا اور وطی سے اس کا باز رہنا ضرر پہنچانے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ تو عذر کی وجہ سے ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ حالت غضب کے سوا ایلاء کرنے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، سو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: حالت غضب کے سوا ایلاء نہیں ہوتا (1) اور اس کے بارے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے حدیث مشہور میں یہی مروی ہے اور اسی طرح لیث، شعبی، حسن اور عطار رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے، یہ سب کہتے ہیں: ایلاء نہیں ہوتا مگر اس وجہ سے کہ وہ باہم ایک دوسرے پر غصے ہوں، آپس میں جھگڑ رہے ہوں، تنگ ہوں اور تکلیف دینا مقصود ہو کہ وہ اسے ضرر پہنچانے اور اذیت دینے کے لئے اس کے ساتھ مجامعت نہیں کرے گا، چاہے اس کے ضمن میں بچے کی اصلاح مقصود ہو یا نہ ہو اور اگر یہ غضب کی وجہ سے نہ ہو تو پھر ایلا نہیں ہوگا (2)۔

اور ابن سیرین نے کہا ہے: چاہے قسم حالت غضب میں ہو یا بغیر غضب کے ہو وہ ایلاء ہے۔ یہی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، ثوری، مالک اور اہل عراق، امام شافعی اور آپ کے اصحاب اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے مگر امام مالک نے کہا ہے: جب اس نے بچے کی اصلاح کا ارادہ نہ کیا ہو (3)۔ ابن منذر نے کہا ہے: یہی اصح ہے کیونکہ انہوں نے جب اس پر اجماع کیا ہے کہ ظہار، طلاق اور تمام قسمیں حکم میں برابر ہیں، چاہے حالت غضب میں ہوں یا حالت رضا میں تو پھر ایلاء بھی انہیں کی طرح ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں اور اس پر قرآن کریم کا عام حکم دلالت کرتا ہے اور حالت غضب کی تخصیص دلیل کی محتاج ہے اور ایسی کوئی وجہ نہیں پائی جاتی جو اسے لازم قرار دے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 10۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: وہ آدمی جو بغیر ایسی قسم کے اپنی بیوی کی مقاربت سے رکا رہا جو اس نے بیوی کو ستانے کے لئے قسم کھائی ہو۔ تو اسے اس کے ساتھ مباشرت کا حکم دیا جائے اور اگر وہ انکار کردے اور اسے ضرر پہنچانے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 302، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

کے لئے امتناع وطی پر قائم رہے تو بغیر مدت مقرر کیے اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان تفریق کر دی جائے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے لئے مدت ایلاء مقرر کی جائے گی اور یہ قول بھی ہے کہ آدمی کا اپنی بیوی سے علیحدگی اختیار کرنے کی صورت میں اس پر ایلاء داخل نہ ہوگا، اگرچہ وہ کئی سال تک اس سے مقاربت نہ کرنے پر قائم رہے، لیکن اسے نصیحت کی جائے گی اور اسے اس بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حکم دیا جائے گا کہ وہ اسے ضرر اور تکلیف پہنچانے کے لئے نہ روکے رکھے۔

مسئلہ نمبر 11۔ اور اس کے بارے میں بھی اختلاف ہے جس نے یہ قسم کھائی کہ وہ اپنی بیوی سے مجامعت نہیں کرے گا یہاں تک کہ وہ اپنے بچے کو دودھ نہ چھڑا لے، تاکہ حاملہ اپنے بچے کو دودھ نہ پلائے اور وہ اسے ضرر پہنچانے کا ارادہ نہ کرے یہاں تک کہ مدت رضاع گزر گئی تو امام مالک کے نزدیک بچے کی اصلاح کا ارادہ ہونے کی بنا پر اس کی بیوی کو مطالبے کا حق حاصل نہیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے اس بارے میں پوچھ گیا تو آپ نے اسے ایلاء نہ قرار دیا (1)۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے دو قولوں میں سے ایک میں یہی کہا ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ وہ مولی ہو جائے گا اور بچے کو دودھ پلانے کا کوئی اعتبار نہ ہوگا اور یہی حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 12۔ امام مالک، امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب، اوزاعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ وہ آدمی ایلاء کرنے والا نہ ہوگا جس نے یہ قسم کھائی کہ وہ اپنی زوجہ سے اس کمرے میں یا اس گھر میں دخول نہ کرے گا کیونکہ وہ مقاربت کے لئے اس کے سوا اور جگہ بھی پا سکتا ہے۔ ابن ابی لیلیٰ اور اسحاق نے کہا ہے: اگر اس نے اسے چار ماہ تک چھوڑے رکھا تو وہ ایلاء کے ساتھ جدا ہو جائے گی۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ وہ اس سے چار ماہ تک رکا رہا ہے اور اگر اس نے یہ قسم کھائی کہ وہ اس سے اس مصر یا اس شہر میں وطی نہ کرے گا تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ مولی ہو جائے گا۔ اور ایسا بلاشبہ سفر میں ہوتا ہے کہ وہ مشقت اور کلفت برداشت کرتا ہے نہ کہ اپنے باغ یا اپنے قریبی کھیتوں میں۔

مسئلہ نمبر 13۔ قولہ تعالیٰ: مِنْ نِّسَآئِهِمْ اس میں آزاد عورتیں، ذمیہ عورتیں اور لونڈیاں سبھی داخل ہیں جب وہ شادی کر لیں اور غلام کا ایلاء بھی اپنی بیوی سے ثابت ہو جاتا ہے۔

امام شافعی، احمد اور ابو ثور رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ غلام کا ایلاء بھی آزاد آدمی کے ایلاء کی مثل ہے (2)۔ ان کی دلیل اس قول باری تعالیٰ کا ظاہر ہے: لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ کیونکہ یہ تمام ازواج کے لئے ہے۔ ابن منذر نے کہا ہے: اور یہی میں بھی کہتا ہوں۔

امام مالک، زہری، عطا بن ابی رباح اور اسحاق نے کہا ہے: اس (غلام) کی مدت دو مہینے ہے۔ اور حسن اور نخعی رحمہم اللہ نے کہا ہے: اگر غلام کی بیوی کسی کی لونڈی ہو تو اس کے ایلاء کی مدت دو مہینے ہے اور اگر وہ آزاد ہو تو اس کے ایلاء کی مدت چار مہینے ہے اور یہی امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے، اور حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: لونڈی کے ایلاء کی مدت آزاد

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب الطلاق، باب الایلاء، جلد 1، صفحہ 515، وزارت تعلیم
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 303، دار الکتب العلمیہ

عورت کے ایلاء کا نصف ہے۔

مسئلہ نمبر 14۔ امام مالک اور ان کے اصحاب، امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب، اوزاعی اور نخعی وغیرہم نے کہا ہے کہ ایلاء کے لازم ہونے میں مدخول بہا اور غیر مدخول بہا دونوں برابر ہیں۔ اور زہری، عطا اور ثوری رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے کہ ایلاء نہیں ہوتا مگر دخول کے بعد۔

اور امام مالک نے کہا ہے: صغیرہ عورت میں ایلاء نہیں ہوتا جب تک وہ بالغ نہ ہو اور اگر اس نے اس سے ایلاء کیا اور وہ بالغ ہوگئی تو اس کے بالغ ہونے کے دن سے ایلاء لازم ہو جائے گا (1)۔

مسئلہ نمبر 15۔ اور رہا ذمی تو اس کا ایلاء صحیح نہیں ہوتا، جس طرح کہ اس کی جانب سے ظہار اور طلاق درست نہیں ہوتے اور وہ اس لئے کہ ہمارے نزدیک اہل شرک کا نکاح صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ ان کے لئے نعمت اور احسان کے مشابہ ہے اور اس لئے بھی کہ وہ شریعت کے مکلف نہیں کہ ان پر قسموں کے کفارات لازم ہوں اور اگر وہ ہمارے پاس ایلاء کا مقدمہ پیش بھی کریں تو ہمارے حاکم کو نہیں چاہئے کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے اور وہ اپنے حکام کی طرف جائیں گے اور اگر ان کے درمیان ایک دوسرے پر ظلم ہونے لگے تو پھر یہ حکم اسلام کے مطابق فیصلہ کرے، جیسا کہ اگر کوئی مسلمان اپنی بیوی کو ضرر پہنچانے کے لئے بغیر قسم کے اس سے وطی چھوڑ دے۔

مسئلہ نمبر 16۔ قولہ تعالیٰ: تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ، التربص کا معنی ہے: مہلت دینا اور تاخیر کرنا۔ یہ تصبّر (مصنوعی صبر) کا الٹ (مقلوب) ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

تَرَبَّصْ بها ریبَ المَنُونِ لعلّها تُطلَّق یوما او یموتُ حلیلُها

تو اس کے ساتھ حوادثات زمانہ کا انتظار کر شاید کسی دن اسے طلاق ہو جائے گی یا اس کا خاوند فوت ہو جائے گا

اور رہا چار مہینے وقت مقرر کرنے کا فائدہ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس بارے میں اہل جاہلیت سے جو ذکر کیا ہے وہ پہلے گزر چکا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس (ایلاء) سے منع فرمادیا اور دوری اور علیحدگی کے ساتھ عورت کو ادب سکھانے کے لئے خاوند کے لئے چار مہینے مدت مقرر کردی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ (النساء: 34) (اور تم انہیں بستروں میں چھوڑ دو) اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ انہیں ادب سکھانے کے لئے ایک ماہ تک ایلاء کیا اور کہا گیا ہے کہ چار مہینے وہ ہیں جن سے زیادہ کوئی خاوند صبر کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔

روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کسی رات مدینہ طیبہ میں گشت کر رہے تھے تو آپ نے ایک عورت کی آواز سنی، وہ یہ اشعار کہہ رہی تھی:

الاطال هذا الليلُ و اسوَدَّ جانبُه وأرّقني أن لاحبيب أُلاعِبُه

فو الله لو لا الله لا شيءَ غيره لَزُعْزِعَ من هذا السرير جوانبُه

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 303، دار الکتب العلمیہ

مخافۃ ربی والحیاءُ یکفنی واکرام بعلی أن تُنال مراکبُہ

جب صبح ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس عورت کو طلب کیا اور اس سے پوچھا: تیرا خاوند کہاں ہے؟ تو اس نے جواب دیا: آپ نے اسے عراق بھیجا ہوا ہے پھر آپ نے عورتوں کو بلایا اور ان سے پوچھا: ایک عورت کتنی دیر تک اپنے خاوند کے بغیر صبر کر سکتی ہے؟ تو انہوں نے کہا: دو مہینے اور تیسرے ماہ اس کا صبر کم ہو جاتا ہے اور چوتھے ماہ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے، پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کے جہاد کی مدت چار مہینے مقرر کر دی، جب چار ماہ گزر جاتے تو آپ جہاد کرنے والے لشکر کو واپس بلا لیتے اور ان کی جگہ دوسرا لشکر بھیج دیتے اور اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے یہ بابت بھی مدت ایلاء کے چار مہینوں کے ساتھ اختصاص کو قوی کرتی ہے۔

مسئلہ نمبر 17۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ فَآءُوْ اس کا معنی ہے: پھر اگر انہوں نے رجوع کر لیا اور اس سے یہ بھی ہے (1) حَتّٰی تَفِیْٓءَ اِلٰٓی اَمْرِ اللّٰهِ اور اس معنی میں زوال کے بعد والے سایہ کو فیٔ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ مشرق کی جانب سے مغرب کی جانب لوٹ آتا ہے، کہا جاتا ہے: فَاءَ یَفِیْءُ فَیْئَۃً وَ فُیُوْءًا۔ وانہ لسریع الفیئۃ یعنی وہ رجوع میں تیز رفتار ہے۔ شاعر نے کہا:

ففاءَتْ و لم تقضِ الذی اقبلَتْ له و مِنْ حاجۃ الانسان ما لیس قاضیا

پس وہ لوٹ آئی اور اس نے اسے پورا نہ کیا جس کے لئے آئی اور انسان کی حاجت پوری ہونے والی نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 18۔ ابن منذر نے کہا ہے: اہل علم میں سے وہ سب کے سب جن سے کچھ محفوظ اور یاد کیا جاتا ہے وہ اس پر ہیں کہ فیء سے مراد اس آدمی کا جماع کرنا ہے جس کا کوئی عذر نہ ہو اور اگر اس کا کوئی عذر ہو (مثلاً) وہ بیمار ہو جائے، قید ہو جائے یا اس کے مشابہ کوئی اور عذر ہو تو بلاشبہ اس کا رجوع صحیح ہوگا اور یہ اس کی بیوی ہوگی اور جب سفر سے آنے کے سبب یا مرض سے افاقہ پانے کے سبب عذر زائل ہو جائے یا قید سے رہائی پانے کے سبب (عذر ختم ہو جائے) اور وہ وطی سے انکار کر دے تو ان دونوں کے درمیان تفریق کر دی جائے گی، بشرطیکہ مدت ایلاء گزر چکی ہو۔ امام مالک نے المدونہ میں اور المبسوط میں یہی کہا ہے۔

اور عبدالملک نے کہا ہے: وہ عورت مولی سے اس دن سے جدا ہوگی جس دن مدت ختم ہوئی، پس اگر رجوع کے ساتھ اس کا عذر سچا ہوا جبکہ عورت نے اسے قدرت دی تو گزرے ہوئے ایام میں بھی اس کے سچا ہونے کا حکم لگایا جائے گا اور اگر عورت پر قدرت حاصل ہونے کے وقت (وطی سے) انکار کے ساتھ جس رجوع کا دعویٰ کیا تھا اس کی تکذیب کر دی، تو اس کے معاملہ کو جھوٹ اور جھگڑے پر محمول کیا جائے گا اور اس وقت میں جو کچھ احکام واجب ہوتے ہیں وہ بیان کر دیئے گئے ہیں۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: جب عذر کی حالت میں گواہوں نے اس کے رجوع کے بارے شہادت دی ہے تو وہ اس کے لئے کافی ہوگی۔ حسن، عکرمہ اور نخعی نے یہی کہا ہے اور امام اوزاعی نے بھی یہی کہا ہے۔

اور نخعی نے بھی کہا ہے: صرف قول اور شہادت کے ساتھ رجوع صحیح ہوتا ہے اور ایلاء کا حکم ساقط ہو جاتا ہے، تیرا کیا خیال ہے اگر اسے وطی کے مواقع میسر نہ ہوں۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 303، دار الکتب العلمیہ

ابن عطیہ نے کہا ہے: اگر اس نے مباشرت نہ کی تو اس قول کو باب ضرر کی طرف لوٹایا جائے گا(1)۔

اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اگر وہ جماع پر قادر نہ ہو تو وہ یہ کہے: میں نے اس (بیوی) کی طرف رجوع کر لیا۔

الکیا الطبری نے کہا ہے: امام ابوحنیفہ ایسے آدمی کے بارے فرماتے ہیں جس نے ایلاء کیا درآنحالیکہ وہ مریض تھا اور اس کے اور اس کی بیوی کے مابین چار ماہ کی مسافت تھی یا یہ رتقاء تھی یا صغیرہ تھی یا آدمی مقطوع الذکر تھا تو جب اس نے اس کی طرف زبان سے رجوع کیا اور مدت گزر گئی اور عذر ابھی تک موجود تھا تو وہ رجوع صحیح ہے۔ امام شافعی اپنے دو قولوں میں سے ایک میں ان کی مخالفت کرتے ہیں۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: جماع کے بغیر رجوع نہیں ہو سکتا، چاہے حالت عذر ہو یا غیر عذر اور اسی طرح حضرت سعید بن جبیر نے بھی کہا ہے، فرمایا: اور اسی طرح حکم ہے اگر وہ سفر میں ہو یا قید میں۔

مسئلہ نمبر 19۔ امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب اور جمہور علماء رحمہم اللہ نے مولی پر کفارہ واجب کیا ہے جب وہ اپنی بیوی کی طرف جماع کے ساتھ رجوع کر لے۔ اور حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس پر کفارہ نہیں ہے(2) اسی طرح نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ حضرت نخعی نے بیان کیا ہے وہ کہا کرتے تھے: جب مولی رجوع کر لے تو اس پر کفارہ نہیں ہو گا اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد فَاِنْ فَآءُوْ میں بعض اہل تاویل نے کہا ہے: یعنی اس قسم کے لئے جس میں وہ حانث ہوئے (اگر انہوں نے رجوع کر لیا)، قسم میں بعض تابعین کا ان کے بارے میں یہی مذہب ہے جنہوں نے نیکی، تقویٰ یا کسی بھی بھلائی اور خیر کے خلاف یہ قسم کھائی کہ وہ اسے نہیں کرے گا، پھر وہ اسے کرے اس پر کوئی کفارہ نہ ہو گا اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ اس میں کفارہ کا ذکر نہیں کیا اور یہ بھی کہ یہ اس معنی پر مترتب ہوتا ہے کہ یمین لغو وہ ہے جو کسی معصیت پر قسم کھائی جائے اور زوجہ کے ساتھ وطی ترک کرنا معصیت ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: کبھی اس قول کے لئے سنت سے استدلال کیا جاتا ہے، حضرت عمرو بن شعیب نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے کسی کام پر قسم کھائی پھر اس کے غیر کو اس سے بہتر اور اچھا پایا تو اسے چاہیے کہ وہ اسے ترک کر دے کیونکہ اسے ترک کرنا ہی اس (قسم) کا کفارہ ہے(3)۔''

اسے ابن ماجہ نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے۔ اس کا مزید بیان آیۃ الایمان میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور جمہور کی دلیل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے: من حلف علی یمین فرأی غیرها خیرا منها فلیأت الذی هو خیر و لیکفر عن یمینه (4) (کہ جس نے کسی کام کی قسم کھائی پھر اس کے غیر کو اس سے بہتر اور اچھا پایا تو اسے چاہیے کہ وہ کرے جو بہتر اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 303، دار الکتب العلمیہ
2۔ جامع البیان، جلد 2، صفحہ 511، دار احیاء التراث العربیۃ
3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الکفارات، باب من قال کفارتها ترکها، جلد 1، صفحہ 154، وزارت تعلیم
4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الکفارات، باب من حلف علی یمین، جلد 1، صفحہ 153، وزارت تعلیم

اچھا ہوا اور اپنی قسم کی طرف سے کفارہ ادا کردے)

مسئلہ نمبر 20۔ جب اس نے قسم کی طرف سے کفارہ ادا کر دیا تو اس سے ایلاء ساقط ہو گیا، ہمارے علماء نے یہی کہا ہے۔ اس میں ایک مذہب کے مطابق حنث پر کفارہ کو مقدم کرنے پر دلیل ہے، ایلاء کے مسئلہ میں یہی اجماع ہے اور ایمان کے مسئلہ میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف دلیل ہے کیونکہ آپ حنث پر کفارہ کو مقدم کرنے کے جواز کے قائل نہیں (1)۔ ابن عربی نے یہی کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 21۔ میں (مفسر) کہتا ہوں: اس آیت سے امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ نے حانث ہونے سے پہلے کفارہ جائز نہ ہونے پر استدلال کیا ہے اور کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے مولی کے لئے دو فیصلوں میں سے ایک کے بارے حکم دیا ہے یعنی رجوع یا طلاق کا ارادہ، پس اگر حانث ہونے پر کفارہ کی تقدیم جائز ہو تو یقیناً رجوع یا طلاق کے ارادہ کے بغیر ہی ایلاء باطل ہو گیا، کیونکہ اگر وہ حانث ہوا تو حنث کے سبب کوئی شے اس پر لازم نہ ہوگی اور جب حانث پر قسم توڑنے کے سبب کوئی سے لازم نہیں تو وہ مولی نہ ہوا۔ اور کفارہ کو مقدم کرنے کے جواز میں ایلاء کے حکم کو اس کے بغیر ساقط کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے اور یہ کتاب اللہ کے خلاف ہے۔

مسئلہ نمبر 22۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ اِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۲۷﴾ اس میں العزیمة کا معنی ہے: کسی شے پر عقد کو مکمل کرنا، کہا جاتا ہے: عَزَمَ علیه یَعْزِمُ عُزْما و عَزِیْمَةً و عَزِیْما و عَزَمَاناً، و اعتزم اعتزاما، و عزمتُ علیك لتفعلن، یعنی میں نے تجھ پر قسم کھائی کہ تو ضرور ایسا کرے گا۔

شمر نے کہا ہے: العزیمة و العزم اس سے مراد تیرا کسی کام پر اپنے آپ کو پختہ اور مضبوط کرنا ہے کہ تو اسے کرے گا۔ اور الطلاق من طلقت المرأة تطلق (یہ نصر ینصر کے وزن پر ہے) طلاقا، (میں نے عورت کو طلاق دی وہ طلاق والی ہو گئی) فهی طالق و طالقة۔ (یعنی صفت کا صیغہ مذکر اور مونث دونوں طرح آتا ہے۔) اعشی نے کہا ہے:

أيا جارتا بيني فانكِ طالقة

اے میری زوجہ! تو مجھ سے علیحدہ ہو جا کیونکہ تو طلاق والی ہے۔

اور طلقت میں (لام کو مضموم پڑھنا بھی) جائز ہے مثلاً عظُم یعظُم اور اخفش نے اس کا انکار کیا ہے اور طلاق سے مراد ہے نکاح کی گرہ کو کھولنا اور اس کی اصل الانطلاق (جانا) ہے اور المطلقات سے مراد المخليات ہے (یعنی وہ عورتیں جنہیں آزاد چھوڑ دیا گیا) اور الطلاق کا معنی ہے: تخلية (فارغ چھوڑ دینا) کہا جاتا ہے: نعجة طالق و ناقة طالق: یعنی وہ بھیڑ یا اونٹنی جسے کھیت میں مہمل چھوڑ دیا جائے، اس پر کوئی رکاوٹ (قید) نہ ہو اور نہ ہی کوئی چرواہا ہو۔ اور بعیر طلق (طاء اور لام کے ضمہ کے ساتھ) یعنی وہ اونٹ جو بندھے ہوئے نہ ہوں۔ اور اس کی جمع اطلاق ہے۔ اور حبس فلان فی السجن طلقاً ای بغیر قید یعنی فلاں کو قید خانہ میں بغیر بیڑی اور قید کے بند کیا گیا ہے اور الطالق من الابل: یعنی وہ اونٹنی جسے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 182، دار الفکر

چرواہا اپنے لئے چھوڑ دیتا ہے وہ اسے پانی پر نہیں دوہتا ہے، کہا جاتا ہے: استطلق الراعی ناقة لنفسه۔ چرواہے نے اونٹنی اپنے لئے آزاد چھوڑ دی اور یہی نام اس عورت کو دے دیا گیا ہے جس کا راستہ چھوڑ دیا جائے جیسا کہ یہی نام اس بھیڑ یا ناقہ کو دیا گیا ہے جس کا معاملہ مہمل ہو۔

اور کہا گیا ہے کہ یہ طلق الفرس سے ماخوذ ہے، اس کا معنی ہے گھوڑے کا دور چلے جانا، اس کے لئے کوئی مانع اور رکاوٹ نہ ہو۔ پس وہ عورت جسے آزاد چھوڑ دیا جائے اس کو طالق کا نام دیا گیا ہے کیونکہ اب اس کے لئے کوئی مانع نہیں ہوتا جبکہ اس سے پہلے اس کے لئے رکاوٹ تھی۔

مسئلہ نمبر 23۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ اِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ میں اس پر دلیل ہے کہ عورت کو چار ماہ کی مدت گزرنے کے ساتھ ہی طلاق واقع ہوگی، جیسا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے جب تک کہ مدت گزرنے کے بعد طلاق دینے کا عمل واقع نہ ہو۔

اور یہ بھی کہ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: سَمِیْعٌ اور سمیع مدت گزرنے کے بعد مسموع کا تقاضا کرتا ہے اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: سَمِیْعٌ یعنی وہ اس کے ایلاء (قسم) کو سننے والا ہے، عَلِیْمٌ اور اس کے اس عزم وارادہ کو جاننے والا ہے جس پر چار ماہ کا گزرنا دلالت کرتا ہے۔

اور سہیل بن ابی صالح نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے بارہ آدمیوں سے اس آدمی کے بارے پوچھا ہے جو اپنی بیوی سے ایلاء کرتا ہے تو تمام کہتے ہیں: اس پر کوئی شے نہ ہوگی یہاں تک کہ چار ماہ گزر جائیں اور وہ (اسی حالت پر) ٹھہرا رہے، پھر اگر وہ رجوع کرلے (توفیھا) ورنہ وہ طلاق دے دے (1)۔

قاضی ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تحقیق الامر یہ ہے کہ ہمارے نزدیک آیت کی تقدیر یہ ہے: للذین یؤلون من نسائهم تربص اربعة اشهر فان فاءوا بعد انقضائها فان الله غفور رحیم وان عزموا الطلاق فان الله سمیع علیم اور ان کے نزدیک تقدیم آیت اس طرح ہے: للذین یؤلون من نسائهم تربص اربعة اشهر فان فاءوا۔ فیها۔ فان الله غفور رحیم۔ وان عزموا الطلاق۔ بترك الفیئة فیها، یرید مدة التربص فیها۔ ان الله سمیع علیم۔ یعنی اگر وہ اس مدت (چار ماہ) میں رجوع کرلیں تو بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے اور اگر وہ اس مدت میں رجوع ترک کرکے طلاق کا پختہ ارادہ کرلیں تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ سمیع علیم ہے۔

ابن عربی نے کہا ہے: یہ احتمال متساوی (برابر) ہیں، اسی مساوات کی وجہ سے صحابہ کرام نے اس میں توقف کیا ہے (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جب احتمال متساوی ہے تو پھر مہینوں اور حیضوں کے ساتھ عدت گزارنے والی عورت پر قیاس کرتے ہوئے علمائے کوفہ کا قول زیادہ قوی ہے، کیونکہ یہ سب وہ مدت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے، پس اس کے گزرنے کے ساتھ عصمت (حفاظت) منقطع ہو جاتی ہے اور بغیر کسی اختلاف کے اسے جدا اور الگ کر دیا جاتا ہے اور اس کی اجازت کے بغیر اس کے خاوند کو اس پر کوئی اختیار باقی نہیں رہتا اور ایلاء بھی اسی طرح ہے یہاں تک کہ اگر وہ رجوع بھول گیا

1۔ المنتقی والدین، جلد 1، صفحہ 289، موسسۃ الکتب الثقافۃ 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 181، دار الفکر

اور مدت گزر گئی تو طلاق واقع ہو جائے گی۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 24۔ قولہ تعالیٰ: وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ اس پر دلیل ہے کہ لونڈی ملک یمین کے ساتھ ہوتی ہے اس میں ایلاء نہیں ہوسکتا، کیونکہ اس پر طلاق واقع نہیں ہوسکتی۔ واللہ اعلم۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾

''اور طلاق دی ہوئی عورتیں رو کے رکھیں اپنے آپ کو تین حیضوں تک اور جائز نہیں ان کے لئے کہ چھپائیں جو پیدا کیا ہے اللہ نے ان کے رحموں میں اگر وہ ایمان رکھتی ہوں اللہ پر اور روز آخرت پر۔ اور ان کے خاوند زیادہ حقدار ہیں ان کو لوٹانے کے اس مدت میں اگر وہ ارادہ کرلیں اصلاح کا۔ اور ان کے بھی حقوق ہیں (مردوں پر) جیسے مردوں کے حقوق ہیں ان پر دستور کے مطابق، البتہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے اور اللہ تعالیٰ عزت والا حکمت والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَالْمُطَلَّقٰتُ جب اللہ تعالیٰ نے ایلاء کا ذکر فرمایا اور بلاشبہ اس میں طلاق واقع ہو جاتی ہے، تو اللہ تعالیٰ نے طلاق ہو جانے کے بعد عورت کے حکم کو بیان فرمایا۔

ابو داؤد اور نسائی کی کتاب میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد باری تعالیٰ: وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ الآیہ کے بارے میں فرمایا کہ آدمی جب اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو وہی اس کا زیادہ حقدار ہے اور اگر وہ اسے تین طلاقیں دے تو پس یہ منسوخ ہے (1) اور فرمایا: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ الآیہ۔

اور الْمُطَلَّقٰتُ لفظ عام ہے لیکن اس سے مراد خاص ہے اور وہ ہے مدخول بہا عورتیں اور دخول سے پہلے جس عورت کو طلاق دے دی گئی وہ سورۃ الاحزاب کی آیت کے تحت اس سے خارج ہوگئی۔ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا (الاحزاب: ۴۹) (پس تمہارے لئے ان پر عدت گزارنا ضروری نہیں جسے تم شمار کرو) اس کا بیان آگے آئے گا اور اسی طرح حاملہ عورت اس ارشاد کے ساتھ اس سے خارج ہوگئی: وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (الطلاق: 4) (اور حاملہ عورتوں کی میعاد ان کے بچے جننے تک ہے۔)

اور اَقْراء سے مقصود استبراء ہے، بخلاف عدت وفات کے کہ وہ عبادت ہے (2) اور وہ صغیرہ جسے ابھی تک حیض نہ آئے اور

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب فی نسخ المراجعۃ، جلد 1، صفحہ 297، وزارت تعلیم ایضاً، حدیث نمبر 1876، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 304، دار الکتب العلمیہ

وہ کبیرہ جو نا امیدی کی عمر کو پہنچ جائے، اللہ تعالیٰ نے ان کی عدت مہینے مقرر کی ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔

اور ایک قوم نے کہا ہے: بلاشبہ المطلقات میں عموم ان تمام کو شامل ہے پھر انہیں منسوخ کر دیا گیا ہے، یہ قول ضعیف ہے، کیونکہ یہ آیت صرف ان عورتوں کے بارے ہے جو حائضہ ہیں اور یہی عورتوں کا عرف ہے اور اسی پر ان کا بڑا حصہ ہے(1)۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: یَتَرَبَّصْنَ۔ التربص کا معنی انتظار کرنا ہے جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔ یہ (بظاہر) خبر ہے لیکن اس سے مراد أمر ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَالْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَھُنَّ (بقرہ:233) اور جمع رجل علیہ ثیابہ، (اور آدمی اپنے اوپر اپنے کپڑے لے) اور حسبك درھم یعنی تو ایک درہم پر اکتفا کر۔ یہ اہل زبان کا قول ہے۔ ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے اس میں جو ابن الشجری نے ذکر کیا ہے۔

ابن عربی نے کہا ہے: یہ باطل ہے اور بلاشبہ یہ حکم شریعت کے بارے خبر ہے، پس تو کسی مطلقہ کو پائے کہ وہ انتظار نہیں کرتی تو یہ حکم شریعت کے مطابق نہیں ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کی خبر کا مخبر کے خلاف واقع ہونا لازم نہیں آئے گا(2) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی لیتربصن (یعنی چاہئے کہ وہ انتظار کریں) اور پھر لام کو حذف کر دیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ جمہور لوگوں نے قُرُوْءٍ۔ فُعُوْلٍ کے وزن پر قراءت کی ہے، اس میں لام کلمہ ہمزہ ہے اور حضرت نافع رضی اللہ عنہ سے قُرُوٍّ روایت کیا گیا ہے یعنی واؤ کے کسرہ اور شد کے ساتھ بغیر ہمزہ کے۔ اور حسن نے قَرْءٍ قاف کے فتحہ، را کے سکون اور تنوین کے ساتھ پڑھا ہے(3)۔

اور قرءٍ، أقْرُؤ اور أقْرَاء کی جمع ہے(4) اور واحد قُرْءٌ قاف کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اصمعی نے یہی کہا ہے۔ اور ابوزید نے کہا ہے: قَرْءٌ قاف کے فتحہ کے ساتھ ہے اور ان دونوں نے کہا ہے: أقْرَأَتْ المرأۃ جب عورت حائضہ ہو جائے۔ فھی مُقْرِءٌ۔ اور أقْرَأَتْ کا معنی طہرت بھی ہے جب وہ پاک ہو جائے۔

اور اخفش نے کہا ہے: أقرأت المرأۃُ (یہ کہا جاتا ہے) جب عورت حیض والی ہو جائے اور جب اسے حیض آئے تو تو کہے گا: قَرأت، بغیر الف کے۔ کہا جاتا ہے: أقرأت المرأۃ حیضۃ أو حیضتین (عورت کو ایک حیض آیا یا دو) اور القرء کا معنی حیض کا ختم ہونا بھی ہے اور بعض نے کہا ہے: اس سے مراد وہ ایام ہیں جو دو حیضوں کے درمیان ہوتے ہیں (یعنی طہر) اور أقرأتْ حاجتك: تیری حاجت قریب آگئی۔ یہ جوہری سے منقول ہے۔ اور ابو عمرو ابن العلاء نے بیان کیا ہے کہ عربوں میں سے بعض حیض کو قرء کا نام دیتے ہیں، بعض طہر کو قرء کہتے ہیں اور ان میں سے بعض دونوں کو ایک ساتھ قرء کہتے ہیں۔ پس طہر کو حیض کے ساتھ قرء کہا جاتا ہے۔ اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اقراء کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے: اہل کوفہ نے کہا ہے: أقراء سے مراد حیض ہیں، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت ابو موسیٰ، حضرت مجاہد، حضرت قتادہ، حضرت ضحاک، حضرت عکرمہ اور حضرت سدی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 304، دار الکتب العلمیہ
2۔ احکام القرآن للماوردی، جلد 1، صفحہ 188، دار الفکر
3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 302، دار الکتب العلمیہ
4۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 302، دار الفکر

رضی اللہ عنہم نے یہی کہا ہے(1)۔

اور اہل حجاز نے کہا ہے: أقراء سے مراد اطہار ہیں، حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ، حضرت ابن عمر، حضرت زید بن ثابت، حضرت زہری، حضرت ابان بن عثمان اور حضرت امام شافعی رضی اللہ عنہم کا یہی قول ہے۔ پس جنہوں نے حیض کو قرء کا نام دیا ہے تو انہوں نے رحم میں خون جمع ہونے کی وجہ سے یہ نام رکھا ہے اور جنہوں نے اسے طہر کا اسم قرار دیا ہے تو وہ بدن میں خون جمع ہونے کی وجہ سے ہے اور وہ جو القرء میں اس اصل کو تیرے لئے ثابت کر رہا ہے وہ وقت ہے، کہا جاتا ہے: ھبت الریح لقرئھا و قارئھا ای لوقتھا (یعنی ہوا چلی اپنے وقت کے سبب)۔ شاعر نے کہا ہے:

کَرِھتُ العقرَ عقرَ بنی شلیل اذا ھبّت لقارئھا الریاح(2)

میں نے بنی شلیل کی بستی العقر کو ناپسند کیا جب کہ ہوائیں چلیں اپنے وقت پر۔

اور کہا گیا ہے کہ حیض کے لئے ایک وقت ہے اور طہر کے لئے بھی ایک وقت ہے، کیونکہ یہ دونوں ایک معین وقت کی طرف راجع ہوتے ہیں اور اعشیٰ نے الاطہار کے بارے میں کہا ہے:

أفی کل عام انتَ جاشمُ غزوۃ تشد لأقصاھا عزیم عزائکا

موَرِّثۃ عزا و فی الحیّ رفعۃ لِما ضاع فیھا من قُرُوُ نسائکا(3)

اور ایک دوسرے نے حیض کے بارے میں کہا ہے:

یا رب ذی ضِغْن علیّ فارض لہ قُرُوءٌ کَقُرُوُ الحائض (4)

یعنی اس نے اسے نیزہ مارا تو اس کا خون حیض والی عورت کے خون کی طرح تھا۔

اور ایک قوم نے کہا ہے: یہ قرء الماء فی الحوض سے ماخوذ ہے اور اس سے مراد حوض میں پانی کا جمع ہونا ہے(5) اور اسی سے القرآن ہے کیونکہ یہ معانی کو مجتمع ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اجتماع حروف کی وجہ سے قرآن کہا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے: ماقرأتِ الناقۃ سَلیً قَطُّ، یعنی کبھی اس کے پیٹ میں جیلی جمع نہیں ہوئی اور عمرو بن کلثوم نے کہا ہے:

ذِراعَیْ عَیْطَلٍ أدماء بکرٍ ھِجَان اللون لم تَقْرَأ جنِینا(6)

تو گویا رحم حیض کے وقت خون کو جمع کرتا ہے اور جسم طہر کے وقت اسے جمع کرتا ہے۔

ابو عمر بن عبد البر نے کہا ہے: اس کا قول جس نے یہ کہا کہ القرعان کے اس قول سے ماخوذ ہے: قریت الماء فی الحوض (میں نے حوض میں پانی جمع کیا) یہ کوئی شے نہیں ہے، کیونکہ القرء مہموز ہے اور یہ غیر مہموز ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 304، دار الکتب العلمیہ

2۔ النکت والعیون للماوردی، جلد 1، صفحہ 292، مؤسسۃ الکتب الثقافۃ بیروت

3۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 303، دار الفکر

4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 304، دار الکتب العلمیہ

5۔ ایضاً

6۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 1، صفحہ 365، دار الکتب العربیۃ بیروت

میں (مفسر) کہتا ہوں: اہل لغت کی نقل کے مطابق یہ صحیح ہے، یعنی جوہری وغیرہ نے یہ کہا ہے اور اس پانی کا نام قری ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ القرء کا معنی ہے الخروج (نکلنا) یا طہر سے حیض کی طرف یا حیض سے طہر کی طرف، اسی بنا پر امام شافعی نے ایک قول میں کہا ہے: القرء الانتقال من الطھر الی الحیض، یعنی القرء کا معنی طہر سے حیض کی طرف منتقل ہونا ہے اور وہ حیض سے طہر کی طرف نکلنے کو قرء نہیں کہتے۔ اور اشتقاق کے حکم کے مطابق تو لازم آتا ہے کہ وہ بھی قرء ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ کا معنی ہوگا تین ادوار یا تین انتقالات اور مطلقہ عورت صرف دو حالتوں سے متصف ہوتی ہے، پس کبھی وہ طہر سے حیض کی طرف منتقل ہوتی ہے اور کبھی حیض سے طہر کی طرف اس کلام کا معنی صحیح ہو جائے گا اور اس کی دلالت طہر اور حیض دونوں پر ہوگی اور یہ اسم مشترک ہوگا۔

اور کہا جاتا ہے: جب یہ ثابت ہو گیا کہ القرء سے مراد انتقال (تبدیل ہونا) ہے تو عورت کا طہر سے حیض کی طرف نکلنا آیت میں بالکل مراد نہیں اور اسی لئے حالت حیض میں طلاق کا ہونا طلاق سنی (سنت والی) نہیں ہے جس کا حکم دیا گیا ہے اور نہ عدت کے لئے وہ طلاق ہے، کیونکہ عدت کے لئے طلاق وہ ہے جو حالت طہر میں ہو اور یہ القرء کے انتقال سے ماخوذ ہونے پر دلالت کرتا ہے اور جب حالت طہر میں طلاق سنی ہے تو پھر تقدیر کلام یہ ہوگی: فعدتھن ثلاثۃ انتقالات، (پس ان کی عدت تین انتقالات ہیں۔) ان میں سے پہلا اس طہر سے انتقال ہے جس میں طلاق واقع ہوئی اور وہ انتقال جو حیض سے طہر کی طرف ہے اسے قرء نہیں بنایا گیا، کیونکہ لغت اس پر دلالت نہیں کرتی، لیکن ہمیں دوسری دلیل سے معلوم ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حیض سے طہر کی طرف منتقل ہونے کا ارادہ نہیں کیا ہے اور جب ان دو میں سے ایک معنی مراد بہ ہونے سے خارج ہو گیا تو دوسرا مراد بہ باقی رہ گیا اور وہ ہے طہر سے حیض کی طرف منتقل ہونا، پس اس بنا پر اس کی عدت تین انتقالات ہے، ان میں سے پہلا طہر ہے اور اس معنی کی بنا پر کامل تین اقراء کو پورا کرنا ممکن ہوتا ہے بشرطیکہ طلاق حالت طہر میں ہو اور کسی اعتبار سے اسے مجاز پر محمول کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

الکیا طبری نے کہا ہے: امام شافعی کے مذہب کی انتہائی توجیہ کے لئے یہ گہری نظر ہے اور ممکن ہے کہ ہم اس میں وہ راز ذکر کریں جسے شریعت کی حکمتوں کی باریکیوں میں سے سمجھنا بعید نہ ہوگا اور وہ ہے طہر سے حیض کی طرف منتقل ہونا۔ اسے قرء کہا گیا ہے کیونکہ یہ براءت رحم پر دلالت کرتا ہے تو چونکہ حاملہ عورت کو اغلباً حیض نہیں آتا پس اسے حیض آنا اس کے لئے براءت رحم کی علامت ہے اور حیض سے طہر کی طرف منتقل ہونا اس کے خلاف ہے اور حیض والی عورت کے لئے ممکن ہوتا ہے کہ وہ اپنے حیض کے بعد حاملہ ہو جائے اور جب حمل برقرار رہے اور بچہ قوی ہو جائے تو اس کا خون منقطع ہو جاتا ہے اسی وجہ سے عرب حالت طہر میں اپنی عورتوں کے حمل کے سبب تعریف کرتے ہیں اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کی مدح بیان کی۔ شاعر کہتا ہے:

وَ مُبَرَّءٍ مِنْ كُلِّ غُبَّرِ حَيْضَةٍ وَ فَسَادِ مُرْضِعَةٍ وَ دَاءٍ مُغْيَلِ

یعنی یہ کہ اس کی ماں اپنے حیض کے باقی ہونے کی صورت میں اس کے ساتھ حاملہ نہیں ہوئی۔

پس یہ وہ ہے جو علماء اور اہل زبان نے القراء کی تاویل میں کہا ہے۔ اور انہوں نے کہا: قرأت المرأۃ قرء ا جب وہ

(عورت) حائضہ ہو یا پاک ہو۔ اور قرأت تب بھی بولا جاتا ہے جب وہ حاملہ ہو اور اس پر انہوں نے اتفاق کیا ہے کہ القرء سے مراد الوقت ہے اور جب تو کہے: وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ اوقات، تو آیت عدد میں مفسر ہو جائے گی درآنحالیکہ معدود میں احتمال ہوگا۔ اور پھر معدود کے لئے بیان کی تلاش کسی دوسری آیت میں ضروری ہوگی، پس ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ اور انہیں طلاق دو ان کی عدت کو ملحوظ رکھتے ہوئے۔ اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اسے طہر کے وقت طلاق دینے کے بارے حکم دیا جائے گا پس ضروری ہے کہ وہی (طہر) عدت میں بھی معتبر ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: فَطَلِّقُوْهُنَّ یعنی تم انہیں ایسے وقت میں طلاق دو جس کے ساتھ عدت گزاری جاتی ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ (اور تم عدت کو شمار کرو) اس سے مراد وہ ہے جس کے ساتھ مطلقہ عدت گزارتی ہے اور وہ وہ طہر ہے جس میں طلاق دی جاتی ہے۔

اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ''اسے (یعنی اپنے بیٹے کو) حکم دو کہ وہ اس کی طرف رجوع کرلے پھر اسے چاہیے کہ وہ اسے روکے رکھے یہاں تک کہ وہ (حیض سے) پاک ہو جائے۔ پھر وہ حائضہ ہو پھر وہ پاک ہو پس یہی وہ عدت ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ عورتوں کو اس وقت طلاق دی جائے (1)۔'' اسے مسلم وغیرہ نے روایت کیا ہے (2)۔ اور یہ اس بیان میں نص ہے کہ طہر کا زمانہ ہی وہ ہے جسے عدت کا نام دیا جاتا ہے اور یہی وہ زمانہ ہے جس میں عورتوں کو طلاق دی جائے گی۔ اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ جس نے حالت حیض میں طلاق دی تو وہ اس حیض کو شمار نہ کرے گی اور جس نے حالت طہر میں طلاق دی تو جمہور کے نزدیک وہ اس طہر کو عدت میں شمار کرے گی۔ پس یہی اولیٰ اور بہتر ہے۔

ابو بکر بن عبد الرحمٰن نے کہا ہے: ہم اپنے فقہاء میں سے کسی کو نہیں جانتے مگر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے قول کے مطابق وہ یہ کہتا ہے کہ اقراء سے مراد اطہار ہیں۔ پس جب آدمی ایسے طہر میں طلاق دے جس میں اس نے وطی نہ کی تو عورت ماتقی طہر کو شمار کرلے گی اگرچہ وہ ایک ساعت اور ایک لحظہ ہو، پھر وہ حیض کے بعد دوسرے طہر کی طرف متوجہ ہوگی، پھر دوسرے حیض کے بعد تیسرے کی طرف متوجہ ہوگی۔ پس جب اس نے تیسرے حیض کا خون دیکھ لیا تو وہ ازواج کے لئے حلال ہوگئی (یعنی وہ نئی شادی کرسکتی ہے) اور عدت سے نکل گئی۔

اور اگر طلاق دینے والے نے ایسے طہر میں طلاق دی جس میں اس نے مباشرت کی تھی تو طلاق ثابت ہو جائے گی اور وہ گنہگار ہوگا اور وہ اس طہر میں سے ماتقی کے ساتھ عدت گزارے (3)۔ اور زہری نے ایسی عورت کے بارے میں کہا ہے جسے طہر کے دوران طلاق دی گئی کہ وہ اس طہر کے ماتقی دنوں کے سوا تین اطہار کے ساتھ عدت گزارے گی (☆)۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، باب تحریم طلاق الحائض، جلد 1، صفحہ 476، قدیمی کتب خانہ

2۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 4850، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 304، دار الکتب العلمیۃ بیروت

☆ عورت کی عدت حیض کے اعتبار سے یا طہر کے اعتبار، ائمہ فقہ کا اس میں اختلاف ہے ائمہ احناف کے نزدیک حیض کے اعتبار سے ہے احناف کے دلائل قوی ہیں تفصیل ''ہدایہ'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

ابوعمر نے کہا ہے: میں کسی کو نہیں جانتا جس نے یہ کہا ہو کہ الاقراء سے مراد اطہار ہیں۔ یہ ابن شہاب زہری کے علاوہ کوئی کہتا ہے، کیونکہ انہوں نے کہا ہے وہ طہر جس میں طلاق دی گئی وہ لغو ہو جائے گا پھر وہ عورت تین اطہار کے ساتھ عدت گزارے گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس قول کی بنا پر مطلقہ عورت حلال نہیں ہوتی یہاں تک کہ وہ چوتھے حیض میں داخل ہو جائے اور ابن القاسم اور امام مالک اور آپ کے جمہور اصحاب، امام شافعی اور علمائے مدینہ رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے کہ مطلقہ عورت جب تیسرے حیض کا پہلا نقطہ دیکھے گی تو وہ عصمت (پابندی) سے نکل جائے گی (1)، یہی حضرت زید بن ثابت، حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم کا مذہب ہے۔ اسی طرح امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے اور اسی کی طرف داؤد بن علی اور ان کے اصحاب گئے ہیں۔

اور زہری کے خلاف دلیل یہ ہے کہ حضور نبی کرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طاہر کی طلاق میں بغیر جماع کے اجازت عطا فرمائی اور اول طہر اور آخر طہر کا ذکر نہ فرمایا۔

اور اشہب نے کہا ہے: عصمت اور میراث منقطع نہیں ہوتیں یہاں تک کہ یہ ثابت ہو جائے کہ یہ دم حیض ہے، تاکہ ایک دفعہ خون کا آنا دم حیض کے سوا کوئی اور نہ ہو (2)۔

علمائے کوفہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ بنت ابی حبیش کو اس وقت فرمایا جب اس نے آپ کے پاس خون کی شکایت کی: ''بے شک وہ ایک رگ ہے پس تو ابھی دیکھ اور جب تجھے دم حیض آئے تو تو نماز نہ پڑھ اور جب حیض کے ایام گزر جائیں تو تو طہارت حاصل کر (غسل کر لے) پھر ایک حیض سے دوسرے حیض تک نمازیں پڑھتی رہ (3)۔''

اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ الّٰٓیِٴۡ یَئِسۡنَ مِنَ الۡمَحِیۡضِ مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ اِنِ ارۡتَبۡتُمۡ فَعِدَّتُہُنَّ ثَلٰثَةُ اَشۡہُرٍ (الطلاق: 4) (اور تمہاری (مطلقہ) عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہوں اگر تمہیں شبہ ہو تو ان کی عدت تین ماہ ہے۔) پس جس سے اسے ناامید اور مایوس قرار دیا گیا ہے وہ حیض ہے۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ وہی عدت ہے اور جو اس کا عوض بنایا گیا ہے وہ مہینے ہیں جبکہ وہ معدوم ہو (یعنی حیض نہ آنے کی صورت میں عدت مہینوں کے ساتھ ہوگی۔) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام کی موجودگی میں کہا کہ لونڈی کی عدت دو حیض ہے (یعنی) آزاد عورت کی عدت کا نصف ہے۔ اور اگر میں اس پر قدرت رکھتا کہ میں اس کی عدت ایک کامل اور ایک نصف حیض مقرر کرسکوں تو میں کر دیتا اور کسی صحابی نے بھی آپ کی بات کا انکار نہ کیا۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ یہ ان کی طرف سے اجماع ہے اور یہی دس صحابہ کرام کا قول ہے انہیں میں سے خلفائے اربعہ بھی ہیں اور تیرے لئے وہی کافی ہے جو انہوں نے کہا ہے! اور قول باری تعالیٰ: وَالۡمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِہِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوۡٓءٍ اس پر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 305، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً

3۔ سنن نسائی، کتاب الطہارۃ، باب ماء الرجل وماء المرأۃ، جلد 1، صفحہ 45، وزارت تعلیم

دلالت کرتا ہے، کیونکہ اس کا معنی یتربصن ثلاثۃ اقراء ہے اور اس سے مراد کامل تین حیض ہیں اور یہ ممکن نہیں ہو سکتا مگر ہمارے قول کے مطابق کہ اقراء سے مراد حیض ہیں کیونکہ جو کہتے ہیں کہ مراد طہر ہیں وہ جائز قرار دیتے ہیں کہ وہ دو طہر اور تیسرے کے بعض ایام عدت گزارے، کیونکہ جب اس نے حالت طہر میں طلاق دی تو وہ ان کے نزدیک اس طہر کا بقیہ حصہ عدت گزارے، یہی ایک قرء ہے اور ہمارے نزدیک وہ شروع حیض سے آغاز کرے گی تاکہ اسم (قرء) صادق آجائے اور جب آدمی نے عورت کو ایسے طہر میں طلاق دی جس میں اس نے وطی نہ کی تو وہ متوجہ ہوگی حیض کی طرف پھر حیض کی طرف پھر حیض کی طرف (یعنی وہ تین حیض عدت گزارے گی) اور جب وہ تیسرے حیض سے غسل کر لے تو وہ عدت سے نکل جائے گی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد رد کرتا ہے: سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّ ثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ (الحاقۃ: 7) (اللہ نے مسلط کر دیا اسے ان پر (مسلسل) سات رات اور آٹھ دن تک) اور ثمانیۃ ایام میں ہاء کو ثابت رکھا ہے، کیونکہ الیوم مذکر ہے اور اسی طرح القرء ہے اور یہ اس پر دلیل ہے کہ یہی مراد ہے۔

اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ہمارے ساتھ اس میں موافقت کی ہے کہ عورت کو جب حالت حیض میں طلاق دی جائے کہ وہ اس حیض کو عدت میں شمار نہ کرے گی جس میں اسے طلاق دی گئی اور نہ ہی اس طہر کو جو اس حیض کے بعد ہوگا، بلکہ وہ عدت کا آغاز اس حیض سے کرے گی جو طہر کے بعد ہوگا اور ہمارے نزدیک وہ طہر سے عدت شروع کرے گی، جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے۔

اور اہل لغت نے جائز قرار دیا ہے کہ وہ بعض کو کل کے نام سے تعبیر کریں، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ اور اس سے مراد شہران (دو مہینے) اور تیسرے کے بعض ایام ہیں (1) اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ہے۔ واللہ اعلم

اور جو یہ کہتے ہیں کہ قرء سے مراد حیض ہیں ان میں سے بعض نے کہا ہے جب وہ تیسرے حیض سے پاک ہو جائے تو غسل کے بعد اس کی عدت گزر گئی اور رجعت کا حق باطل ہو گیا (2)۔ حضرت سعید بن جبیر، طاؤس، ابن شبرمہ اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہم نے یہی کہا ہے۔

اور شریک نے کہا ہے: جب عورت غسل میں بیس برس تک کوتاہی کرے گی تو اس کے خاوند کو اس پر رجعت کا حق حاصل رہے گا جب تک وہ غسل نہ کر لے۔

اور اسحاق بن راہویہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: جب تیسرے حیض میں عورت میں عیب پڑ گیا تو وہ جدا ہو جائے گی اور خاوند کے لئے رجوع کا حق منقطع ہو جائے گا، مگر یہ کہ عورت کے لئے شادی کرنا حلال نہیں ہوگی یہاں تک کہ وہ اپنے حیض سے غسل کر لے اور اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور یہ قول ضعیف ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرہ: 234) (اور جب پہنچ جائیں اپنی (اس)

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 185، دار الفکر
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 304، دار الکتب العلمیہ

مدت کو تو کوئی گناہ نہیں تم پر اس میں جو کریں وہ اپنی ذات کے بارے میں مناسب طریقے سے) اس کا بیان آگے آئے گا۔

اور رہا وہ جو امام شافعی نے ذکر کیا ہے کہ طہر سے حیض کی طرف نفس انتقال کو قرء کا نام دیا جاتا ہے اور اس کا فائدہ عورت پر عدت کو کم کرنا ہے اور وہ اس طرح کہ جب وہ عورت کو اس کے طہر کی آخری ساعت میں طلاق دے پھر وہ حیض میں داخل ہو جائے تو وہ اسے ایک قرء شمار کر لے گی اور تیسرے طہر سے منتقل ہوتے ہی عصمت منقطع ہو گئی اور وہ حلال ہو جائے گی۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 5۔ جمہور علماء کا نظریہ یہ ہے کہ وہ لونڈی جسے حیض آتا ہے جب اس کا خاوند اسے طلاق دے تو اس کی عدت دو حیض ہوگی۔ اور ابن سیرین سے روایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں لونڈی کی عدت کو آزاد عورت کی عدت کی طرح ہی دیکھتا ہوں مگر یہ کہ اس میں کوئی سنت جاری ہو چکی ہو، کیونکہ سنت زیادہ حق رکھتی ہے کہ اس کی اتباع کی جائے۔

اور الاصم عبدالرحمٰن بن کیسان، داؤد بن علی اور اہل ظاہر کی ایک جماعت نے کہا ہے: بے شک طلاق اور وفات کی عدت مہینوں اور حیضوں کے ساتھ ہے اس سے متعلقہ آیات لونڈی اور آزاد عورت کے حق میں عام ہیں، پس آزاد اور لونڈی کی مدت برابر ہے۔

اور جمہور نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: طلاق الأمة تطلیقتان و عدتها حیضتان(1) (لونڈی کی طلاق دو طلاقیں ہیں اور اس کی عدت دو حیض ہیں) اسے ابن جریج نے عطا عن مظاہر بن اسلم عن ابیه عن القاسم بن محمد عن عائشہ رضی اللہ عنہا کی سند سے بیان کیا ہے۔ قالت: قال رسول اللہ ﷺ: طلاق الأمة تطلیقتان و قرؤها حیضتان (2) آپ نے طلاق اور عدت دونوں کی اکٹھی نسبت اس کی طرف کی ہے مگر مظاہر بن اسلم اس حدیث کے ساتھ منفرد ہے اور وہ ضعیف ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے ان دونوں میں سے جو بھی غلام ہوا اس کی طلاق کم ہوگی۔ اور علماء کی ایک جماعت نے بھی اسی طرح کہا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْۤ اَرْحَامِهِنَّ

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْۤ اَرْحَامِهِنَّ یعنی حیض میں سے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے رحموں میں پیدا کیا ہے اسے چھپانا ان کے لئے جائز نہیں۔ حضرت عکرمہ، زہری اور نخعی رحمۃ اللہ علیہم نے یہی کہا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد حمل ہے۔ حضرت عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسی طرح کہا ہے (3)۔

اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: اس سے مراد حیض اور حمل دونوں ہیں اور یہ اس بنا پر ہے کہ حاملہ عورت حائضہ ہوتی ہے اور

1۔ جامع ترمذی، کتاب الطلاق، باب ما جاء ان طلاق الأمة تطلیقتان، جلد 1، صفحہ 142، وزارت تعلیم

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب فی سنة طلاق العبد، جلد 1، صفحہ 298، وزارت تعلیم

جامع ترمذی، کتاب الطلاق، باب ما جاء ان طلاق الأمة تطلیقتان، حدیث نمبر 1102، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابن ماجہ، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 2069، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 305، دار الکتب العلمیہ

آیت سے معنی مقصود یہ ہے کہ جب عدت کا دارومدار حیض اور اطہار پر ہے اور دونوں پر اطلاع فقط عورتوں کی جانب سے ہو سکتی ہے تو پھر اس میں قول عورت کا ہی تسلیم کیا جائے گا جب وہ عدت کے گزرنے یا نہ گزرنے کا دعویٰ کرے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اس پر امین بنادیا ہے اور یہی اس ارشاد کا مقتضی ہے: وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيٓ أَرْحَامِهِنَّ۔(1)

اور سلیمان بن یسار نے کہا ہے: ہمیں حکم نہیں دیا گیا ہے کہ ہم عورتوں کو کھولیں اور ان کی شرمگاہوں کی طرف دیکھیں، بلکہ اسے ان کے سپرد کیا گیا ہے کیونکہ انہیں اپنے آپ پر امین بنایا گیا ہے۔

اور چھپانے سے منع کرنے کے معنی مرد کو نقصان پہنچانے اور اس کا حق ضائع کرنے سے منع کرنا ہے، پس جب مطلقہ نے کہا: میں حیض سے ہوں، حالانکہ وہ حیض سے نہ ہو تو اس نے مرد کے رجوع کا حق ضائع کر دیا اور جب اس نے کہا: میں حیض سے نہیں ہوں، حالانکہ وہ حالت حیض میں ہو تو اس نے مرد پر وہ نفقہ لازم کر دیا جو اس پر لازم نہیں تو اس طرح اس نے مرد کو ضرر اور نقصان پہنچایا یا وہ حیض کی نفی کے بارے اپنے جھوٹ سے یہ قصد کرتی ہے کہ اسے واپس نہ لوٹایا جا سکے یہاں تک کہ عدت گزر جائے اور شریعت اس کے حق کو ختم کر دے اور اسی طرح حاملہ عورت حمل کو چھپاتی ہے تا کہ وہ مرد رجوع کے حق کو ختم کر دے۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: دور جاہلیت میں ان کی عادت تھی کہ وہ حمل کو چھپاتی تھیں تا کہ وہ بچے کو نئے خاوند کے ساتھ ملا دیں، پس اس بارے میں آیت نازل ہوئی (2)۔

اور بیان کیا گیا ہے کہ اشجع کا ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں نے اپنی بیوی کو طلاق دی ہے اور وہ حاملہ ہے اور مجھے اس کے شادی کرنے سے امن نہیں ہے اور میرا بیٹا دوسرے کے پاس چلا جائے گا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور اشجعی کی عورت اس کے پاس لوٹا دی گئی۔

مسئلہ نمبر 2۔ ابن منذر نے بیان کیا ہے: اہل علم میں سے ہر اس نے کہا جس سے میں نے حفظ کیا: جب عورت نے دس دنوں میں کہا: میں نے تین حیض گزار لئے ہیں اور میری عدت گزر چکی ہے۔ بلاشبہ اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی اور اس سے وہ قول قبول نہیں کیا جائے گا، مگر وہ یہ کہے: میں نے کچا بچہ (سقط) گرا دیا ہے تحقیق اس کی خلقت ظاہر ہو چکی تھی (تب اس کا قول قبول کر لیا جائے گا)۔

اور اس مدت میں علماء کا اختلاف ہے جس میں عورت کے قول کی تصدیق کی جائے گی، تو حضرت امام مالک نے کہا ہے: جب اس نے کہا "میری عدت گزر چکی ہے" یہ اتنی مدت میں کہا جس کی مثل میں عدت گزر سکتی ہے تو اس کا قول قبول کیا جائے گا (3) اور اگر اس نے اتنی مدت میں عدت گزرنے کی خبر دی جس میں شاذ و نادر ایسا ہو سکتا ہے تو اس کے بارے دو قول ہیں۔ آپ نے المدونہ میں فرمایا: جب عورت نے کہا میں نے ایک مہینے میں تین حیض گزار لئے ہیں اس کی تصدیق کر لی جائے بشرطیکہ عورتیں اس کی تصدیق کر دیں (4)، اسی طرح شریح نے کہا ہے اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا قالون!

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 305، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً

3۔ المدونۃ الکبری، کتاب ارخاء الستور، باب دعوی المرأۃ انقضاء عدتھا، جلد 5، صفحہ 10، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر 4۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 12

یعنی تو نے درست کہا اور اچھا کہا۔

اور کتاب محمد میں فرمایا: اس کی تصدیق نہ کی جائے گی مگر ڈیڑھ ماہ میں۔ اور اسی طرح ابوثور کا قول ہے۔ ابوثور نے کہا ہے: کم سے کم اس کے قول کی تصدیق سینتالیس دنوں میں ہو سکتی ہے اور وہ اس طرح کہ کم سے کم طہر کی مدت پندرہ دن ہے اور کم سے کم حیض کی مدت ایک دن ہے۔ اور حضرت نعمان رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: ساٹھ دنوں سے کم مدت میں عورت کے قول کی تصدیق نہیں کی جائے گی، اسی طرح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے۔

قولہ تعالیٰ: اِنۡ كُنَّ يُؤۡمِنَّ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ، رحم میں موجود شے کو چھپانے کی حرمت کی تاکید کے لئے یہ انتہائی شدید اور عظیم وعید ہے اور فی الحقیقت رحم میں جو کچھ ہے اس کے بارے خبر دینے کی امانت کی ادائیگی کے لئے واجب ہونے کا اظہار ہے۔ یعنی مومن عورتوں کا شیوہ یہ ہے کہ وہ حق کو نہ چھپائیں، اِنۡ كُنَّ يُؤۡمِنَّ بِاللّٰهِ کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جو ایمان نہیں رکھتا اس کے لئے چھپانا مباح ہے، کیونکہ ایسا کرنا اس کے لئے بھی حلال نہیں جو ایمان نہیں رکھتا، بلاشبہ یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: ان کنت اخی فلا تظلمنی (اگر تو میرا بھائی ہے تو تو مجھ پر ظلم نہ کر)، (بلکہ مقصود یہ ہے) کہ چاہئے ایمان تجھے ایسا کرنے سے روکے، کیونکہ ایسا کرنا اہل ایمان کے فعل میں سے نہیں ہے (یعنی ان کے شایان شان نہیں ہے۔)

قولہ تعالیٰ: وَبُعُوۡلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ اس میں گیارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَبُعُوۡلَتُهُنَّ۔ البعولۃُ: البعل کی جمع ہے اور اس کا معنی زوج (خاوند) ہے(1) اور اسے بعل اس لئے نام دیا گیا ہے کیونکہ وہ زوجہ پر ان چیزوں کے بارے میں غالب اور بلند ہوتا ہے جن کا وہ اس کی زوجیت کے اعتبار سے مالک ہوتا ہے، اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اَتَدۡعُوۡنَ بَعۡلًا (الصافات: 125) ای ربًا۔ کیا تم رب کو پکارتے ہو۔ تو اسے ربوبیت میں بلند ہونے کی وجہ سے بعل کہا گیا ہے، کہا جاتا ہے: بَعۡل و بُعُولۃ۔ جیسا کہ ذکر کی جمع میں کہا جاتا ہے ذَکَرٌ و ذُکُورَۃٌ اور فحل کی جمع میں کہا جاتا ہے: فَحۡلٌ و فُحُولَۃٌ، اس کے آخر میں یہ ہا زائدہ ہے اور جمع مؤنث کی تاکید کے لئے ہے(2) اور یہ شاذ ہے، اس پر کسی اور کو قیاس نہیں کیا جا سکتا اور اس میں سماع معتبر ہوتا ہے، پس لَعۡبٌ میں لُعُوۡبَۃٌ نہیں کہا جا سکتا۔ اور کہا گیا ہے کہ یہ ہا تانیث ہے جو فُعُول پر داخل کی گئی ہے(3)۔

اور البُعُولۃ البَعل کا مصدر بھی ہے اور بَعل الرجل یَبۡعَل (مثل منع یمنع) بُعُولۃٌ، یعنی آدمی بعل ہو گیا اور المباعلۃ اور البِعال کا معنی جماع ہے۔ اسی معنی میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایام تشریق کے بارے ارشاد گرامی ہے: انها أيام أكل و شرب و بعال(4) (کہ وہ کھانے، پینے اور جماع کرنے کے دن ہیں۔) یہ پہلے گزر چکا ہے۔ پس آدمی عورت کے لئے بعل ہوتا ہے اور عورت مرد کے لئے بعلۃٌ ہوتی ہے اور بَاعل مُبَاعلۃ کہا جاتا ہے جب وہ اس سے مباشرت کرے اور فلان بعل هذا، یعنی فلاں اس کا مالک اور مربی ہے۔ اس کے کثیر محامل ہیں وہ آگے آئیں گے۔ ان شاء اللہ

1۔ البحر المحیط، جلد 1، صفحہ 305، دار الکتب العلمیہ　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً

4۔ سنن دارقطنی، کتاب طلوع الشمس بعد الافطار، جلد 3، صفحہ 212، حدیث نمبر 32، دار المحاسن القاہرہ

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ وہ انہیں واپس لوٹانے کا زیادہ حق رکھتا ہے: پس مراجعت کی دو صورتیں ہیں: ایک مراجعت عدت کے دوران اس کی بنا حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث پر ہے اور دوسری مراجعت عدت کے بعد اس کی بنا حضرت معقل کی حدیث پر ہے۔ جب صورت حال یہ ہے تو پھر آیت میں اس کی تخصیص پر دلیل ہوگی جسے مسمیات کا عموم شامل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ عام ہے ان کے بارے میں بھی جنہیں تین طلاقیں دی گئی ہوں اور ان کے بارے میں بھی جنہیں تین سے کم دی گئی ہوں۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ یہ اس کے بارے میں خاص حکم ہے جس کی طلاقیں تین سے کم ہوں۔

اور علماء کا اس پر اجماع ہے کہ آزاد آدمی جب اپنی آزاد بیوی کو طلاق دے ایک طلاق یا دو طلاقیں اور وہ مدخول بہا بھی ہو تو وہ اس کی طرف رجوع کا زیادہ حق رکھتا ہے جب تک اس کی عدت نہ گزرے اگرچہ عورت ناپسند بھی کرے اور اگر طلاق دینے والے نے اس کی طرف رجوع نہ کیا یہاں تک کہ اس کی عدت گزر گئی تو پھر وہ عورت اپنے نفس کی زیادہ حقدار ہے اور وہ اس سے اجنبیہ ہو جائے گی اور وہ اس کے لئے ولی کی اجازت اور شاہدوں کی شہادت کے ساتھ نیا نکاح کیے بغیر حلال نہیں ہوگی نہ کہ مراجعت کے طریقہ پر، اس پر علماء کا اجماع ہے۔

مہلب نے کہا ہے: ہر وہ جس نے عدت کے دوران رجوع کر لیا صرف رجوع پر گواہ بنائے بغیر احکام نکاح میں سے کوئی شے اس پر لازم نہ ہوگی۔ اس پر بھی علماء کا اجماع ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا اشاد ہے: فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ (الطلاق: 2) (تو جب پہنچنے لگیں اپنی میعاد کو تو روک لو انہیں بھلائی کے ساتھ یا جدا کر دو انہیں بھلائی کے ساتھ اور گواہ مقرر کر لو دو معتبر آدمی اپنے میں سے) پس رجعت میں تو گواہ بنانے کا ذکر کیا ہے اور نکاح اور طلاق میں اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: ہم نے کتاب اللہ میں جو مسائل اہل علم کے اجماع کے ساتھ ذکر کر دیے ہیں وہ کافی ہیں ان کے ذکر کی حاجت نہیں جو اس باب میں متقدمین سے مروی ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس کے بارے میں اختلاف ہے جس کے ساتھ ایک آدمی عدت کے دوران رجوع کر سکتا ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب آدمی عدت کے دوران عورت سے وطی کرے اور وہ رجعت کا ارادہ رکھتا ہو اور وہ شاہد بنانے سے جاہل ہو اور ناواقف ہو تو رجعت ثابت ہو جائے گی اور عورت کو چاہیے کہ وہ مرد کو مباشرت سے روکے، یہاں تک کہ وہ گواہ بنا لے۔ اسی طرح اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے: انما الاعمال بالنیات وانما لکل امرئ مانوی(1) (اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور ہر آدمی کے لئے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی۔)

اور اگر اس نے عدت میں وطی کی لیکن وہ رجعت کی نیت نہیں کرتا تو امام مالک نے فرمایا ہے: وہ عدت میں رجوع کر سکتا

1۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان باب کیف کان بدء الوحی، جلد 1، صفحہ 2، وزارت تعلیم

ہے اور وہ اس سے وطی نہیں کرے گا یہاں تک کہ وہ اسے فاسد پانی سے استبرا کرالے (1) (یعنی یہ یقین کرلے کہ پہلی وطی سے استقرار حمل نہیں ہوا)۔

ابن قاسم نے کہا ہے: اگر اس کی عدت گزر جائے تو وہ اور کوئی غیر بقیہ مدت استبرا میں اس کے ساتھ نکاح نہ کرے، اگر اس نے کیا تو اس کا نکاح فسخ کر دیا جائے گا اور عورت مرد پر ہمیشہ کے لئے حرام نہیں ہوگی کیونکہ وہ پانی بھی تو اسی کا پانی ہے۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: جب مرد نے عورت کے ساتھ مجامعت کر لی تو اس نے اس کی طرف رجوع کر لیا: اسی طرح حضرت سعید بن مسیب، حسن بصری، ابن سیرین، زہری، عطا، طاؤس اور ثوری رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔ مزید کہا: اور وہ شاہد بنالے گا، اسی طرح اصحاب الرائے، امام اوزاعی اور ابن ابی لیلیٰ رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے، اسے ابن منذر نے بیان کیا ہے۔

اور ابو عمر نے کہا ہے: تحقیق کہا گیا ہے: اس کی وطی ہر حال میں رجوع ہوگی، چاہے وہ رجعت کی نیت کرے یا نہ کرے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب میں سے ایک فریق سے اسی طرح روایت کیا جاتا ہے اور یہی موقف لیث نے اپنایا ہے۔

اور انہوں (علماء) نے اس کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں کیا جس نے اپنی لونڈی خیار کے ساتھ فروخت کی کہ اس کے لئے مدت خیار میں اس کے ساتھ وطی کرنا مباح ہے اور یہ کہ وہ اس کے ساتھ اسے اپنی ملکیت کی طرف واپس لوٹا لائے اور اسے اپنے اس فعل کے ساتھ بیع توڑنے کا اختیار ہے اور یہ حکم مطلقہ رجعیہ کے لئے ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 4۔ جس نے بوسہ لیا یا مباشرت کی اور اس سے وہ رجعت کی نیت کرتا ہے تو رجعت ثابت ہو جائے گی اور اگر اس نے بوسہ اور مباشرت سے رجعت کی نیت نہ کی تو وہ گنہگار ہوگا اور رجوع کرنے والا نہ ہوگا اور سنت یہ ہے کہ وہ وطی کرنے سے پہلے یا بوسہ لینے یا مباشرت سے پہلے گواہ بنالے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے: اگر اس نے عورت سے وطی کی یا شہوت کے ساتھ اسے مس کیا یا شہوت کے ساتھ اس کی فرج کی طرف دیکھا تو اس کی رجعت ثابت ہو جائے گی، یہی امام ثوری کا قول ہے اور اسے چاہیے کہ وہ گواہ بنالے اور امام مالک، امام شافعی، اسحاق، ابو عبید اور ابو ثور رحمۃ اللہ علیہم کے قول کے مطابق رجعت ثابت نہ ہوگی۔ ابن منذر نے یہی کہا ہے اور المنتقیٰ میں کہا ہے بالقول رجوع کے صحیح ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور رہا بالفعل جیسا کہ جماع اور بوسہ وغیرہ تو قاضی ابو محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ان کے ساتھ اور ان تمام افعال کے ساتھ جو حصول لذت کے لئے کیے جاتے ہیں رجوع صحیح ہوتا ہے۔

ابن المواز نے کہا ہے: لذت کے لئے جسم کو چھونا یا اس کی فرج کی طرف دیکھنا یا اس کے محاسن میں سے جو اس کے قریب ہیں انہیں دیکھنا جبکہ وہ اس سے رجعت کا ارادہ کرے بخلاف امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کے کہ رجعت صحیح نہیں ہوتی مگر بالقول، اسے ابن منذر نے ابو ثور، جابر بن زید اور ابو قلابہ رحمۃ اللہ علیہم سے بیان کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اگر اس نے عورت سے جماع کیا وہ رجعت کی نیت کرے یا اس کی نیت

1۔ المدونۃ الکبریٰ، کتاب العدۃ و طلاق السنۃ، باب ما جاء فی عدۃ المطلقۃ، جلد 5، صفحہ 122، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر

نہ کرے تو اس طرح رجعت ثابت نہ ہوگی اور اس کے لئے مرد پر مہر مثل ہوگا۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کے لئے کوئی شے نہ ہوگی، کیونکہ اگر وہ اسے لوٹا لیتا تو اس پر کوئی مہر نہ تھا اور بغیر رجعت کے وطی مہر کے عوض رجعت سے اولی نہیں ہوگی۔

اور ابو عمر نے کہا ہے: میں کسی کو نہیں جانتا سوائے امام شافعی کے کہ جس نے اس پر مہر مثل واجب کیا ہو اور ان کا قول قوی نہیں ہے، کیونکہ یہ عورت زوجات کے حکم میں ہے اور یہ اس مرد کی وارث بنتی ہے اور وہ اس کا وارث بنتا ہے تو کس طرح اس عورت کے ساتھ وطی کرنے میں مہر مثل واجب ہوگا جس کا حکم اپنے اکثر احکام میں زوجہ کے حکم کی مثل ہے، مگر یہ کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول میں شبہ قوی ہے، کیونکہ بغیر رجعت کے اس عورت کو اس مرد پر حرام قرار دیا گیا ہے اور اس پر علماء کا اجماع ہے کہ وہ عورت جس کے ساتھ شبہ کے سبب وطی کی جائے اس کے لئے مہر واجب ہوتا ہے اور تجھے یہی کافی ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا آدمی عورت کی طرف رجوع کرنے سے پہلے اس کے ساتھ سفر کر سکتا ہے؟ تو امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ نے کہا ہے: وہ اس کے ساتھ سفر نہیں کر سکتا یہاں تک کہ وہ اس کے ساتھ رجوع کر لے (1)۔ اسی طرح امام ابو حنیفہ اور امام زفر کے سوا آپ کے دیگر اصحاب رحمہم اللہ نے کہا ہے۔ کیونکہ امام زفر سے حسن بن زیاد نے روایت کیا ہے کہ آدمی کے لئے رجعت سے پہلے اس کے ساتھ سفر کرنا جائز ہے اور ان سے عمرو بن خالد نے روایت کیا ہے کہ وہ اس کے ساتھ سفر نہیں کر سکتا یہاں تک کہ وہ رجوع کر لے۔

مسئلہ نمبر 7۔ اس بارے میں علماء کے مابین اختلاف ہے کہ کیا آدمی کے لئے جائز ہے کہ وہ اس کے پاس داخل ہو اور اس کے محاسن میں سے کوئی شے دیکھے اور کیا وہ عورت اس کے لئے بناؤ سنگھار کرے گی اور پھر اس پر ظاہر ہوگی؟ تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: وہ اس کے ساتھ خلوت اختیار نہیں کر سکتا اور نہ ہی بغیر اجازت کے وہ اس پر داخل ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کی طرف وہ دیکھ سکتا ہے مگر یہ کہ اس پر کپڑے ہوں اور نہ ہی وہ اس کے بالوں کی طرف دیکھ سکتا ہے اور کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ اس کے ساتھ کھانا کھائے بشرطیکہ ان دونوں کے ساتھ ان کے سوا کوئی اور بھی ہو اور نہ وہ ایک کمرے میں اس کے ساتھ رات بسر کر سکتا ہے بلکہ وہ اس سے (دوسرے کمرے میں) منتقل ہو جائے گا۔

ابن قاسم نے کہا ہے: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے رجوع کر لیا ہے اور کہا ہے: نہ وہ اس پر داخل ہو سکتا ہے اور نہ اس کے بال دیکھ سکتا ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب کا اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ وہ اس کے لئے بناؤ سنگھار کر سکتی ہے، خوشبو لگا سکتی ہے، زیور پہن سکتی ہے اور اس کے سامنے بھی آ سکتی ہے۔

اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب آدمی اپنی عورت کو ایک طلاق دے دے تو وہ اس کے پاس اجازت لے کر آ سکتا ہے اور وہ لباس اور زیور میں سے جو چاہے پہن سکتی ہے اور اگر ان دونوں کے لئے ایک کمرے کے سوا اور کوئی نہ ہو تو

1۔ المدونۃ الکبری، کتاب العدۃ و طلاق السنۃ، جلد 5، صفحہ 146، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر

وہ اپنے درمیان پردہ ڈال لیں اور آدمی اس کے پاس داخل ہوتے وقت سلام کہے۔ اسی طرح حضرت قتادہ سے بھی مروی ہے اور وہ اسے کنکھارنے یا کھانسنے وغیرہ کے ساتھ اپنے آنے کا احساس دلائے جب وہ داخل ہو۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ عورت جسے ایک طلاق دی گئی ہو آدمی اس کی طرف رجوع کا مالک ہوتا ہے اور وہ طلاق دینے والے پر طلاق بائنہ والی کی طرح حرام کی گئی ہے یہاں تک کہ وہ رجوع کر لے اور وہ رجوع نہیں کرے گا مگر قول کے ساتھ، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ طلاق دینے والے نے جب عدت گزرنے کے بعد کہا: بلاشبہ میں نے عدت میں تیری طرف رجوع کر لیا تھا اور اس نے انکار کر دیا، تو اس میں عورت کا قول اس کی قسم کے ساتھ قبول کر لیا جائے گا اور آدمی کو اس پر کوئی اختیار نہ رہے گا، مگر حضرت نعمان (امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ) نکاح اور رجعت میں قسم کا نظریہ نہیں رکھتے اور صاحبین نے اس میں ان کے ساتھ اختلاف کیا ہے اور ان دونوں نے دیگر تمام اہل علم کے قول کی مثل ہی کہا ہے۔ اور اسی طرح جب بیوی لونڈی ہو اور آقا اور لونڈی کا اختلاف ہو جائے اور خاوند عدت گزرنے کے بعد عدت میں رجوع کا دعویٰ کرتا ہو اور اس (لونڈی) نے انکار کیا ہو تو اس میں قول زوجہ لونڈی کا معتبر ہوگا اگرچہ اس کا آقا اسے جھوٹا قرار دے، یہی امام شافعی، ابو ثور اور نعمان رحمہم اللہ علیہم کا قول ہے اور یعقوب اور محمد نے کہا ہے: قول آقا کا معتبر ہوگا کیونکہ وہی اس کا زیادہ حق رکھتا ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ لفظ رد عصمت کے زوال کا تقاضا کرتا ہے مگر ہمارے علماء نے کہا ہے: بے شک طلاق رجعی وطی کو حرام کر دیتی ہے اور رجوع اسے حلت کی طرف لوٹا دیتا ہے۔

اور لیث بن سعد، ابو حنیفہ اور جنہوں نے ان دونوں کے قول کے مطابق کہا ہے، ان کا بیان ہے کہ رجعت وطی کو حلال کر دیتی ہے، طلاق کا فائدہ اس عدد کو کم کرنا ہے جو صرف اس کے لئے رکھا گیا ہے اور احکام زوجیت باقی ہیں ان میں سے کوئی شے نہیں کھلی۔ انہوں نے کہا: احکام زوجیت اگرچہ باقی ہیں، لیکن جب تک عدت میں ہے وہ عدت گزرنے کے ساتھ زوال کے راستے پر چل رہی ہے۔ پس رجعت اس راستے سے واپس لوٹانے کا نام ہے جسے عورت نے اپنے چلنے کے لئے اختیار کر رکھا ہے۔ اور یہ رد مجازی ہے اور وہ رد جس کے ساتھ ہم نے حکم لگایا وہ رد حقیقی ہے کیونکہ وہاں زوال رو پذیر ہو چکا ہے اور وہ وطی کو حرام قرار دینا ہے، پس اس سے حقیقۃً رد (رجوع) واقع ہوا ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 10۔ لفظ اَحَقُّ کا اطلاق دو حقوں کے درمیان تعارض کے وقت ہوتا ہے اور ان میں سے ایک حق ترجیح پا جاتا ہے۔ پس معنی یہ ہوئے کہ انتظار کی مدت (عدت) میں خاوند کا حق عورت کے بارے میں اس کے اپنے حق سے زیادہ ہوتا ہے، کیونکہ عورت عدت گزرنے کے بعد اپنے نفس کی مالک بنتی ہے اور اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد بھی ہے: الایم احق بنفسها من ولیها (1) (بیوہ عورت اپنے بارے میں اپنے ولی کی نسبت زیادہ حق رکھتی ہے۔) یہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 11۔ آدمی کے لئے رجوع مستحب ہے لیکن جب عورت کے لئے اپنے احوال کی اصلاح کے سبب

1۔ مسند امام احمد حدیث نمبر 1888

اصلاح کا قصد کرے اور آپس میں وحشت کو زائل کرنے کا قصد کرے اور اگر عورت کو ضرر پہنچانے، عدت کو طویل کرنے اور اس کے ساتھ نکاح کے پٹے سے خلاصی پانے کو قطع کرنے کا قصد اور ارادہ کرے تو پھر اسے حرام قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ ارشاد ربانی ہے: وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا (البقرہ: 231) (اور نہ روکو انہیں تکلیف دینے کی غرض سے تاکہ زیادتی کرو) پھر جس نے ایسا کیا تو رجعت صحیح ہوگی۔ اگرچہ اس نے نہی کا ارتکاب کیا اور اپنے نفس پر ظلم کیا! اور اگر ہم نے اس مقصد کو جان لیا تو ہم اسی پر چھوڑ دیں گے۔

قولہ تعالیٰ: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ، اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَلَهُنَّ یعنی حقوق زوجیت میں سے ان کے حقوق مردوں پر ہیں جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں، اسی لئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: بلاشبہ میں اپنی بیوی کے لئے زیب و زینت کا انتظار کرتا ہوں جس طرح وہ میرے لئے بناؤ سنگھار کرتی ہے اور میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ یہی ہے کہ میں اپنے وہ تمام حقوق اچھی طرح حاصل کروں جو میرے اس پر ہیں اور وہ اپنے وہ حقوق حاصل کرے جو اس کے مجھ پر ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (اور ان کے بھی حقوق ہیں (مردوں پر) جیسے مردوں کے حقوق ہیں ان پر دستور کے مطابق) یعنی ایسی زینت جس میں گناہ نہ ہو۔ اور آپ ہی سے یہ بھی روایت ہے: یعنی ان کے لئے حسن صحبت اور حسن سلوک ان کے خاوندوں پر اسی طرح لازم ہے جس طرح اپنے خاوندوں کے۔ لئے ان پر ہر اس کام میں اطاعت واجب ہے جو وہ ان پر لازم قرار دیں۔

اور کہا گیا ہے: بے شک ان کے لئے ان کے خاوندوں پر انہیں اذیت نہ دینا اسی طرح لازم ہے جس طرح اپنے خاوندوں کے لئے مضرت کو ترک کرنا ان پر لازم ہے۔ علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے یہی کہا ہے۔

اور ابن زید نے کہا ہے: تم ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس طرح کہ ان پر لازم ہے کہ وہ تمہارے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈریں (1)۔ تمام معانی باہم قریب قریب ہیں اور یہ آیت حقوق زوجیت سے متعلقہ تمام حقوق کو شامل ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: ''بلاشبہ میں اپنی زوجہ کے لئے زیب و زینت کرتا ہوں''۔ (2)

علماء نے کہا ہے: رہی مردوں کی زینت تو اس کا انحصار ان کے مختلف احوال پر ہوتا ہے۔ بے شک وہ اس کے اعمال نرم مزاجی، خوش اخلاقی اور اتفاق کی بنا پر کرتے ہیں۔ بسا اوقات ایک طرح کی زینت ایک وقت میں مناسب ہوتی ہے اور ایک وقت میں وہی مناسب نہیں ہوتی، کبھی ایک طرح کی زینت جوانوں کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے اور ایک زینت بوڑھوں کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے اور وہ جوانی کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی۔ کیا تو دیکھتا نہیں کہ شیخ اور بوڑھا آدمی جب اپنی لبیں مونڈ دے تو یہ اس کے لئے موزوں ہے اور اس کے لئے باعث زینت ہے اور جوان جب ایسا فعل کرے تو وہ بدصورت ہو جاتا ہے اور اسے ناپسند کیا جاتا ہے، کیونکہ داڑھی ابھی بڑھی نہیں اور جب وہ اپنی لبیں مونڈ دے جونہی وہ پہلی بار ظاہر ہوں تو

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 543، دار احیاء التراث العربیۃ

2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 544

اس کا چہرہ قبیح ہو جاتا ہے اور جب اس کی داڑھی بڑھ جائے اور وہ اپنی لبوں کو مونڈ دے تو یہی اس کے لئے زینت بن جاتی ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ سے بھی مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میرے رب نے مجھے حکم ارشاد فرمایا ہے کہ میں داڑھی مبارک کو بڑھنے کے لئے چھوڑ دوں اور اپنی لبوں کو کاٹوں (1)۔'' اسی طرح لباس کی کیفیت اور حالت بھی ہے۔ اور ان تمام میں حقوق کی طلب اور چاہت ہے۔ بلاشبہ وہ نرم مزاجی اور خوش اسلوبی سے کام کرتا ہے تاکہ وہ اپنی بیوی کے نزدیک اتنا حسین اور خوبصورت ہو جائے کہ اسے خوش کردے۔ اور وہ اسے کسی بھی غیر مرد سے پاکدامن کردے۔ اسی طرح سرمہ ہے مردوں میں سے بعض کے ساتھ وہ مناسبت رکھتا ہے اور بعض کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا۔ اور جہاں تک خوشبو لگانا، مسواک کرنا، دانتوں کا خلال کرنا، میل کچیل اور فالتو بالوں کو دور کرنے، پاکیزگی و طہارت حاصل کرنے اور ناخن تراشنے کا تعلق ہے تو یہ اعمال بالکل ظاہر اور تمام کے موافق ہیں اور خضاب بوڑھوں کے لئے اور انگوٹھی جوانوں اور بوڑھوں تمام کے لئے زینت ہے اور یہ مردوں کا زیور ہے۔ اس کا بیان سورۃ النحل میں آئے گا۔ پھر اس پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ اس کی حاجت کے اوقات مقرر کرے اور اسے پاکدامن بنائے اور اسے کسی غیر کی طرف دیکھنے سے بے نیاز کردے اور اگر آدمی اپنے آپ میں بستر پر عورت کے حقوق ادا کرنے سے عجز اور کمزوری دیکھے تو وہ ایسی ادویہ استعمال کرے جو اس کی قوت باہ میں اضافہ کریں اور اس کی شہوت کو تقویت پہنچائیں یہاں تک کہ وہ اسے پاکدامن بنادے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَ لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ یعنی مردوں کے لئے عورتوں پر درجہ اور رتبہ ہے۔ اور مَدْرَجَةُ الطَّرِيقِ: اس کا معنی ہے راستے کا بلند اور بڑا حصہ۔ اس میں اصل معنی الطی لپیٹنا ہے۔ کہا جاتا ہے: دَرَجُوا، یعنی طَوَوْا عمرهم انہوں نے اپنی اپنی عمریں لپیٹ لیں اور اسی سے وہ درجہ ہے جس پر وہ ترقی کرتا ہے اور کہا جاتا ہے: رجل بین الرجلة، یعنی ایسا آدمی جس کی قوت ظاہر ہو۔ وھو أرجل الرجلین اور وہ ان دو میں سے زیادہ قوی ہے اور فرس رجیل یعنی طاقتور گھوڑا اور اسی سے الرجل ہے کیونکہ اس میں چلنے کی قوت ہوتی ہے۔ پس آدمی کے مرتبہ کی زیادتی اس کی عقل اور اس کے خرچ کرنے کی قوت کے سبب اور دیت، میراث اور جہاد کے سبب ہے۔

حمید نے کہا ہے: الدرجہ کا معنی داڑھی ہے۔ یہ اگر ان کی طرف سے صحیح بھی ہے تو بھی ضعیف ہے۔ اس کا تقاضا نہ آیت کا لفظ کرتا ہے اور نہ اس کا معنی۔ (2)

ابن عربی نے کہا ہے: بندے کے لئے اچھا اور خوبصورت یہ ہے کہ اس سے باز رہے جو وہ نہیں جانتا اور خصوصاً کتاب اللہ کے بارے میں اور مردوں کی عورتوں پر فضیلت کسی ذی عقل پر مخفی نہیں ہے اور اگر اور کچھ نہ ہو تو بھی عورت مرد سے تخلیق کی گئی ہے۔ پس مرد اس کی اصل ہے (3) اور مرد کے لئے جائز ہے کہ وہ اسے بغیر اجازت کے تصرف کرنے سے روکے اور وہ روزہ نہیں رکھ سکتی مگر مرد کی اجازت کے ساتھ اور وہ حج نہیں کر سکتی مگر محرم کے ساتھ۔ اور کہا گیا ہے کہ الدرجۃ کا معنی الصداق

1۔ کنز العمال، جلد 6، صفحہ 656، مؤسسۃ الرسالہ بیروت۔ بخاری شریف، باب تقلیم الأظفار، حدیث نمبر 5442، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 306، دار الکتب العلمیہ 3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 188-189، دار الفکر

(دوستی) بھی ہے۔ شعبی نے یہی کہا ہے اور کہا گیا ہے اس کا معنی جواز الادب (ادب کا لحاظ رکھنا) ہے۔ جملہ معانی کے اعتبار سے الدرجہ کا لفظ تفضیل کا تقاضا کرتا ہے اور یہ احساس دلاتا ہے کہ خاوند کا حق زوجہ پر اس سے زیادہ ہے جو بیوی کا حق خاوند پر ہے۔ اسی لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: ولو امرت احدا بالسجود لغیر الله لأمرت المرأة ان تسجد لزوجها(1) (اگر میں کسی کو الله تعالیٰ کے سوا کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ الدرجہ کا لفظ مردوں کو حسن معاشرت پر ابھارنے اور عورتوں کے لئے مال اور اخلاق میں وسعت ظرفی اپنانے کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی بلاشبہ افضل کو چاہئے کہ وہ اپنے اوپر بوجھ برداشت کرے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول حسین اور عمدہ ہے۔(2)

ماوردی نے کہا ہے: احتمال ہے کہ یہ حقوق نکاح میں ہو۔ اس کے لئے ان کے سوا کو عقد نے اٹھا دیا ہے اور عورت پر لازم ہوتا ہے کہ مرد کے بلانے پر اس کے بستر پر جائے اور مرد پر اس کی دعوت کو قبول کرنا لازم نہیں ہوتا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں اسی کے بارے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے: ''جس عورت کو اس کے خاوند نے اپنے بستر کی جانب بلایا اور اس نے اس سے انکار کر دیا تو ملائکہ صبح ہونے تک اس پر لعنت کرتے رہتے ہیں''(3)۔ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ یعنی وہ مضبوط سلطان ہے، اس پر کوئی اعتراض کرنے والا نہیں۔ حَكِیْمٌ یعنی وہ جاننے والا ہے اور جو وہ کرتا ہے وہی درست اور صحیح کرتا ہے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَلَا یَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّاۤ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ شَیْــًٔا اِلَّاۤ اَنْ یَّخَافَاۤ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَ مَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۲۲۹

''طلاق دو بار ہے پھر یا تو روک لینا ہے بھلائی کے ساتھ یا چھوڑ دینا ہے احسان کے ساتھ اور جائز نہیں تمہارے لئے کہ لو تم اس سے جو تم نے دیا ہے انہیں کچھ بھی بجز اس کے کہ دونوں کو اندیشہ ہو کہ وہ قائم نہ رکھ سکیں گے الله کی حدوں کو پھر اگر تمہیں خوف ہو کہ وہ دونوں قائم نہ رکھ سکیں گے الله کی حدوں کو تو کوئی حرج نہیں ان پر کہ عورت کچھ فدیہ دے کر جان چھڑا لے۔ یہ حدیں ہیں الله کی سو ان سے آگے نہ بڑھو اور جو کوئی آگے بڑھتا ہے الله کی حدوں سے سو وہی لوگ ظالم ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ اس میں سات مسائل ہیں:

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب حق الزوج علی المراۃ، جلد 1، صفحہ 134، وزارت تعلیم
جامع ترمذی، باب جاء فی حق الزوج علی المراۃ، حدیث نمبر 1079، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 306، دار الکتب العلمیہ
3۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، حدیث نمبر 4794، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ۔ یہ بات ثابت ہے کہ اہل جاہلیت کے نزدیک طلاق کے لئے کوئی عدد معین نہ تھا۔ البتہ ان کے نزدیک عدت (کی مدت) معین اور مقرر تھی اور ابتدائے اسلام میں بھی کچھ عرصہ یہی رہا۔ ایک آدمی اپنی عورت کو جو چاہتا تھا طلاق دے دیتا تھا اور جب وہ اس کی طلاق سے حلال ہونے کے قریب ہوتی تو وہ اس سے رجوع کر لیتا جب تک چاہتا، حضور نبی مکرم ﷺ کے زمانہ مقدس میں ایک آدمی نے اپنی عورت کو کہا: نہ میں تجھے گھر میں رکھوں گا اور نہ تجھے چھوڑوں گا کہ تو (کسی کے لئے) حلال ہو جائے۔ اس نے کہا: وہ کیسے ہوگا؟ اس نے کہا: میں تجھے طلاق دوں گا اور جب تیری عدت گزرنے کے قریب ہوگی تو میں تجھ سے رجوع کر لوں گا (1)۔ تو اس عورت نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس اس کی شکایت کی اور آپ رضی اللہ عنہا نے حضور نبی کریم ﷺ کے پاس اس کا ذکر کیا، سو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی جو آدمی کے لئے طلاق کی اس تعداد کو بیان کرتی ہے جس میں وہ بغیر مہر اور ولی کے رجوع کر سکتا ہے اور جو طریقہ ان میں رائج تھا اسے منسوخ کر دیا۔ اس کا یہ معنی حضرت عروہ بن زبیر، حضرت قتادہ اور حضرت ابن زید وغیرہم نے بیان کیا ہے۔ (2)

اور حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہم وغیرہ نے کہا ہے: اس آیت سے مقصود سنت طلاق کی پہچان ہے، یعنی جو دو طلاقیں دے تو اسے تیسری کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے، پس یا تو اس کے حقوق میں سے کسی شی کا ظلم کیے بغیر اسے چھوڑ دے یا پھر اسے حسن معاشرت کے ساتھ اپنے پاس روک لے اور آیت ان دونوں معنوں کو متضمن ہے (3)۔

مسئلہ نمبر 2۔ طلاق سے مراد اس بندھن اور عصمت کو کھولنا ہے جو مخصوص الفاظ کے ساتھ زوجین کے درمیان منعقد اور قائم ہوئی۔ اس آیت اور اس کے علاوہ دیگر آیات کے ساتھ ثابت ہے کہ طلاق مباح ہے اور حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد گرامی بھی ہے: فان شاء امسك وان شاء طلق (4) (پھر اگر وہ چاہے تو اسے روک لے اور اگر چاہے تو طلاق دے دے) اور رسول اللہ ﷺ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دی اور پھر ان کی طرف رجوع کر لیا (5)۔ اسے ابن ماجہ نے بیان کیا ہے۔ (6)

اور علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ جس نے اپنی عورت کو ایسے طہر کے دوران طلاق دی جس میں اس نے اس سے مقاربت نہ کی ہو تو وہ سنت کے مطابق طلاق دینے والا ہے اور اس کے لئے وہ عدت ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور جب عورت مدخول بہا ہو تو مرد کے لئے اس کی عدت گزرنے سے پہلے پہلے رجعت کا حق حاصل ہوگا اور جب عدت

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 306، دار الکتب العلمیہ

2۔ جامع ترمذی، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 1113، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 306، دار الکتب العلمیہ۔ ابن ماجہ، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 2010، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن دار قطنی، کتاب الطلاق والخلع والایلاء، جلد 4، صفحہ 10، دار المحاسن قاہرہ

بخاری شریف، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 4850، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ سنن ابن ماجہ کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 146، وزارت تعلیم

6۔ ابن ماجہ، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 2005، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گزر گئی تو وہ بھی خطاب میں سے ایک خاطب (پیغام نکاح بھیجنے والا) ہے۔ کتاب اللہ، سنت اور اجماع امت اس پر دال ہے کہ طلاق مباح ہے ممنوع نہیں ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: اس سے منع کے بارے میں کوئی خبر نہیں ہے جو ثابت ہو۔

مسئلہ نمبر 3۔ دار قطنی نے روایت کیا ہے "مجھے ابو العباس محمد بن موسیٰ بن الدولابی اور یعقوب بن ابراہیم دونوں نے حدیث بیان کی ہے اور ان دونوں نے کہا ہے: ہمیں حسن بن عرفہ، اسماعیل بن عیاش بن حمید ابن مالک اللخمی نے مکحول سے اور انہوں نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے ذکر کیا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے معاذ! روئے زمین پر اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز پیدا نہیں فرمائی جو اس کے نزدیک عتاق (آزاد کرنے) سے زیادہ پسندیدہ ہو اور اللہ تعالیٰ نے روئے زمین پر کوئی شے تخلیق نہیں فرمائی جو اس کے نزدیک طلاق سے زیادہ مبغوض اور ناپسندیدہ ہو۔ پس جب کوئی آدمی اپنے غلام کو کہے انت حر ان شاء اللہ تعالیٰ تو آزاد ہے اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا، تو وہ آزاد ہے اور اس کے لئے استثنا نہیں ہے اور اگر کوئی اپنی بیوی کو کہے انت طالق ان شاء اللہ تعالیٰ تو اس کے لئے استثنا ہے اور اسے طلاق واقع نہ ہوگی۔"

محمد بن موسیٰ بن علی، حمید بن ربیع، یزید بن ہارون نے ہمیں بیان کیا کہ اسماعیل بن عیاش نے اپنی اسناد کے ساتھ اسی طرح ہمیں خبر دی ہے۔

حمید نے کہا ہے کہ مجھے یزید بن ہارون نے کہا ہے: کون سی حدیث ہے اگر حمید ابن مالک اللخمی معروف ہوتا! میں نے کہا: وہ میرے دادا ہیں! تو یزید نے کہا: تو نے مجھے خوش کر دیا ہے، اب یہ حدیث ہوئی ہے!" (1)

ابن منذر نے بیان کیا ہے: جنہوں نے طلاق میں استثنا یعنی ان شاء اللہ کو مؤخر قرار دیا ہے ان میں سے طاؤس، حماد، امام شافعی ابو ثور اور اصحاب الرائے رحمۃ اللہ علیہم ہیں۔

امام مالک اور امام اوزاعی کے قول کے مطابق طلاق میں استثنا جائز نہیں ہے اور حسن اور قتادہ کا صرف طلاق کے بارے میں یہی قول ہے۔ فرمایا: وبالقول الاول اقول۔ میں تو پہلے قول کے مطابق کہتا ہوں۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ یہ مبتدا ہے اور خبر امثل یا احسن ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہو، یعنی فعلیکم امساك بمعروف، یا فالواجب علیکم امساك بما یعرف أنه الحق (2) (یعنی تم پر واجب ہے روک لینا ایسے طریقہ سے جس کے بارے یہ معلوم ہو کہ یہ حق اور درست ہے) اور قرآن کے علاوہ اسے مصدر ہونے کی بنا پر فَاِمْسَاكًا پڑھنا بھی جائز ہے۔

اور بِاِحْسَانٍ کا معنی یہ ہے کہ وہ بیوی کے حقوق میں سے کسی بھی شے میں اس پر ظلم نہ کرے اور نہ قول میں زیادتی اور حد سے تجاوز کرے۔ اور الامساک، الاطلاق کے خلاف ہے (یعنی امساک کا معنی روکنا اور اطلاق کا معنی چھوڑنا ہے۔) اور التسریح کا معنی ہے کسی شے کو چھوڑ دینا اور اسی سے تسریح الشعر (یعنی بالوں کو چھوڑ دینا ہے، تاکہ وہ بعض کو بعض سے علیحدہ

1۔ سنن دار قطنی، جلد 4، صفحہ 35، دار المحاسن قاہرہ
2۔ زاد المسیر، جلد 1، صفحہ 200، دار الکتب العلمیۃ

کر لے اور سَرَّحَ الماشیة: اس نے مویشی کو چھوڑ دیا اور تسریح کا لفظ دو معنوں کا احتمال رکھتا ہے۔ ان میں سے ایک ہے کہ وہ اسے چھوڑ دے یہاں تک کہ دوسری طلاق کی عدت مکمل ہو جائے اور وہ اپنے نفس کی زیادہ مالک ہو جائے۔ یہ سدی اور ضحاک کا قول ہے اور دوسرا معنی یہ ہے کہ وہ اسے تیسری طلاق دے اور اسے چھوڑ دے یہ حضرت عطا اور حضرت مجاہد وغیرہما کا قول ہے (1) اور تین وجوہ کی بناء پر یہ زیادہ صحیح ہے۔

(۱) وہ حدیث جسے دار قطنی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ (طلاق دو بار ہے) تو یہ تین کیونکر ہوئیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ۔ ایک روایت میں ہے: یہ تیسری طلاق ہے (2)۔ اسے ابن منذر نے ذکر کیا ہے۔

(۲) تَسْرِيْحٌ الفاظ طلاق میں سے ہے، کیا تو جانتا نہیں کہ ان عزموا السراح بھی پڑھا گیا ہے۔

(۳) بے شک فعل تفعیلا یعنی باب تفعیل اس پر دلالت کر رہا ہے کہ اس نے دوسری طلاق پر فعل کو مکرر کیا ہے اور ترک میں فعل کو نئے سرے سے کرنا نہیں ہے جسے تفعیل سے تعبیر کیا جاتا ہو۔ (3)

ابوعمر نے کہا ہے: اس پر علماء نے اجماع کیا ہے کہ قول باری تعالیٰ: اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ یہ دو طلاقوں کے بعد تیسری طلاق ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی یہی مراد لی گئی ہے: فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ (البقرہ: 230) (دو بار طلاق دینے کے بعد) پھر اگر وہ طلاق دے اپنی بیوی کو تو وہ حلال نہ ہوگی اس پر اس کے بعد یہاں تک کہ نکاح کرے کسی اور خاوند کے ساتھ) اور اس پر بھی علماء کا اجماع ہے کہ جس نے اپنی بیوی کو ایک یا دو طلاقیں دیں تو اس کے لئے اس کی طرف رجوع کا حق ہے اور اگر اس نے اسے تیسری طلاق دے دی تو پھر وہ اس کے لئے حلال نہیں ہوگی یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی زوج سے شادی کر لے (4)۔ اور یہ قرآن کریم کا وہ محکم حکم ہے جس کی تاویل (اور معنی) میں کوئی اختلاف نہیں، اسی کی مثل عادل راویوں کی احادیث بھی مروی ہیں۔ سعید بن نصر نے بیان کیا کہ ہمیں قاسم بن اصبغ نے بیان کیا کہ ہمیں محمد بن وضاح نے بتایا، انہوں نے کہا: ہمیں ابوبکر بن ابی شیبہ نے بیان کیا اور انہوں نے کہا: ہمیں ابومعاویہ نے اسماعیل بن سمیع کے واسطہ سے ابورزین سے حدیث بیان کی کہ انہوں نے فرمایا: ایک آدمی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے بارے آپ کا کیا خیال ہے۔ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۖ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ تو اس میں تیسری طلاق کہاں ہے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (وہ ہے) فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ اور اسے ثوری وغیرہ نے اسماعیل بن سمیع سے اور انہوں نے ابورزین سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ (5)

میں (مفسر) کہتا ہوں: الکیا الطبری نے یہ خبر ذکر کی ہے اور کہا ہے: یہ نقل کے اعتبار سے ثابت نہیں ہے اور ضحاک اور سدی کے قول کو ترجیح دی ہے اور بلاشبہ تیسری طلاق ہی اس ارشاد گرامی میں سیاق خطاب میں مذکور ہے: فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 306، دار الکتب العلمیہ 2۔ سنن دار قطنی، کتاب الطلاق، جلد 4، صفحہ 4، دار المحاسن
3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 306، دار الکتب العلمیہ 4۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 307، دار الفکر 5۔ سنن دار قطنی، جلد 4، صفحہ 4، دار المحاسن

لَهٗ مِنۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ پس تیسری طلاق اس خطاب کی صلب میں مذکور ہے اور یہ ایسی بینونت کا فائدہ دیتی ہے جو تحریم کا موجب ہے مگر زوج (ثانی) کے بعد (وہ تحریم ختم ہو جاتی ہے) پس ارشاد باری تعالیٰ: اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ کو نئے فائدہ پر محمول کرنا واجب ہے اور وہ عدت گزرنے کے ساتھ دو طلاقوں کے ساتھ بینونت کا واقع ہونا ہے اور اس پر (محمول کرنا واجب ہے) کہ آیت سے مقصود ایسی طلاق کے عدد کا بیان ہے جو تحریم کو ثابت کرتی ہے اور اسے منسوخ کرنا ہے جو ان میں بلا عدد محصور طلاق واقع کرنا جائز تھا اور اگر قول باری تعالیٰ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ہی تیسری طلاق ہو تو یہ تین کے ساتھ تحریم واقع کرنے کا مقصد ظاہر نہیں کرتی، کیونکہ اگر اس پر اقتصار کر لیا جائے تو پھر یہ اس کے لئے بینونت محرمہ کے وقوع پر دلیل نہیں مگر زوج کے بعد، بلاشبہ تحریم کا علم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہوا: فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ تو پھر یہ ضروری ہے کہ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ کا معنی تیسری طلاق نہ ہو۔ اور اگر اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ تیسری طلاق کے معنی میں ہو تو پھر اس کے پیچھے ارشاد باری تعالیٰ فَاِنْ طَلَّقَهَا چوتھی طلاق ہوگی، کیونکہ فا تعقیب کے لئے ہے اور یہ ان کے بعد نئی طلاق کا تقاضا کرتی ہے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ سو اس سے ثابت ہوا کہ قول باری تعالیٰ: اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ سے مراد عورت کو چھوڑ دینا ہے یہاں تک کہ اس کی عدت گزر جائے۔

مسئلہ نمبر 5۔ امام بخاری نے اس آیت پر یہ عنوان باندھا ہے: باب من أجاز الطلاق الثلاث بقوله تعالیٰ: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ (یعنی یہ باب اس کے بیان میں ہے جس نے مذکورہ ارشاد گرامی کے ساتھ تین طلاقوں کو جائز قرار دیا ہے) اس سے اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ یہ تعداد بلاشبہ ان کے لئے وسعت ہے۔ پس جس نے اپنے اوپر تنگی اور شدت کی تو یہ اس پر لازم ہو جائے گی۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: ائمہ فتویٰ کا اس پر اتفاق ہے کہ ایک کلمہ کے ساتھ تین طلاقیں واقع کرنے سے لازم ہو جاتی ہے اور یہی جمہور اسلاف کا قول ہے۔

اور طاؤس اور بعض اہل ظاہر نے یہ کہا ہے کہ ایک کلمہ کے ساتھ تین طلاقیں واقع کرنے سے ایک طلاق واقع ہوتی ہے اور یہ محمد بن اسحاق اور حجاج بن ارطاۃ سے روایت کیا جاتا ہے اور ان دونوں سے یہ بھی منقول ہے کہ اس سے کوئی شے لازم نہیں ہوتی اور یہ مقاتل کا قول ہے اور داؤد سے بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے کہا (کوئی شے) واقع نہ ہوگی۔ اور حجاج بن ارطاۃ اور جمہور سلف اور ائمہ سے مشہور قول یہ ہے کہ وہ تینوں لازم اور واقع ہو جاتی ہیں اور اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ وہ تین طلاقیں اکٹھی ایک کلمہ کے ساتھ واقع کرے یا تین متفرق کلمات کے ساتھ۔

اور رہے وہ جنہوں نے یہ کہا کہ اس سے کوئی شے لازم نہ ہوگی انہوں نے قول باری تعالیٰ: وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ کی دلیل سے استدلال کیا ہے۔ یہ ہر مطلقہ کو شامل ہے سوائے اس کے جسے اس سے خاص کر دیا جائے اور یہ پہلے گزر چکا ہے اور کہا: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ طلاق دو بار ہے اور تیسری فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ہے اور جس نے ایک کلمہ میں تین طلاقیں دیں پس وہ لازم نہ ہوگی، کیونکہ وہ قرآن کریم میں مذکور نہیں اور جنہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ ایک

واقع ہوئی ہے تو انہوں نے تین احادیث سے استدلال کیا ہے۔ ان میں سے ایک حضرت طاؤس، ابو صہباء اور عکرمہ کی روایت سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے اور دوسری حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے اس کی روایت کے مطابق جس نے یہ بیان کیا کہ آپ نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں رجوع کرنے کا حکم ارشاد فرمایا اور وہ آپ کے لئے ایک طلاق شمار ہوئی (1) اور تیسری حدیث یہ ہے کہ حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں رجعت کا حکم فرمایا (2) اور رجعت ایک طلاق واقع ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔

ان احادیث کا جواب وہ ہے جو امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت سعید بن جبیر، حضرت مجاہد، حضرت عطا، حضرت عمرو بن دینار، حضرت مالک بن حویرث، حضرت محمد بن ایاس بن بکیر اور حضرت نعمان ابن ابی عیاش رحمۃ اللہ علیہم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کے بارے میں یہ روایت بیان کی ہے (کہ) جس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں اس نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور اس کی بیوی اس سے جدا ہوگئی اور اب وہ اس سے نکاح نہیں کر سکتا مگر دوسرے زوج کے بعد (3) اور اس بارے میں ان ائمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو روایت کی ہے وہ جماعت (جمہور کی رائے) سے موافقت رکھتی ہے اور طاؤس وغیرہ کی روایت وہن (کمزوری) پر دلالت کرتی ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ایسے نہیں ہیں کہ وہ اپنی رائے کی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مخالفت کریں۔

ابن عبد البر نے کہا ہے کہ طاؤس کی روایت وہم اور غلط ہے۔ حجاز، شام، عراق، مشرق اور مغرب کے شہروں کے فقہاء میں سے کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے موالی میں سے ابو صہباء معروف نہیں ہیں۔

قاضی ابو الولید الباجی نے کہا ہے: میرے نزدیک ابن طاؤس سے اس بارے میں روایت صحیح ہے اور ان سے ائمہ نے روایت کی ہے: (یعنی) معمر اور ابن جریج وغیرہ اور ابن طاؤس امام ہیں اور وہ حدیث جس کی طرف وہ اشارہ کر رہے ہیں وہ ہے جسے ابن طاؤس نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابو بکر صدیق کے عہد اور حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کے زمانہ خلافت کے پہلے دو سال تک تین طلاقیں ایک طلاق تھی۔ پھر حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بے شک لوگ اس امر میں جلدی کرنے لگے ہیں جس میں ان کے لئے تاخیر تھی۔ پس اگر ہم اسے ان پر نافذ کر دیں! پھر آپ نے اسے ان پر نافذ کر دیا۔ (4)

اور حدیث کا معنی یہ ہے کہ وہ لوگ ایک طلاق واقع کرتے تھے اس کے بدلے جہاں اب لوگ تین طلاقیں واقع کرتے ہیں اور اس تاویل کے صحیح ہونے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول دلالت کرتا ہے کہ بے شک لوگ اس معاملے میں جلدی کرنے لگے

1۔ سنن دار قطنی، کتاب الطلاق، جلد 4، صفحہ 7، دار المحاسن

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 298، وزارت تعلیم۔ ایضاً، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 1877، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ شرح معانی الآثار، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 34، مکتبہ امدادیہ ملتان 4۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 477-478، وزارت تعلیم

ہیں جس میں ان کے لئے تاخیر تھی تو آپ نے انہیں ناپسند کیا کہ وہ طلاق دینے کے معاملہ میں جلدی کریں جس میں ان کے لئے تاخیر تھی پس اگر ابتدائے اسلام میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں ان کا یہی حال ہوتا جو آپ نے کہا ہے تو ان پر یہ عیب نہ ہوتا کہ انہوں نے اس معاملہ میں جلدی کی ہے جس میں ان کے لئے تاخیر تھی۔

اور اس تاویل کے صحیح ہونے پر وہ روایت بھی دلالت کرتی ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کئی سندوں سے مروی ہے کہ آپ نے اس کے لئے تین طلاقوں کے لازم ہونے کا فتوی دیا جس نے اکٹھی تین واقع کیں۔ پس اگر ابن طاؤس کی حدیث کے یہ معنی ہیں تو یہ تو ہم نے بیان کر دیے ہیں اور اگر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کو اس معنی پر محمول کیا جائے جس میں وہ تاویل کرتے ہیں جن کے قول کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی، تو بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جماعت کے قول کی طرف رجوع کر لیا ہے اور اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے اور قیاس کے اعتبار سے ہماری دلیل یہ ہے کہ یہ طلاق ہے اور اسے وہ واقع کرتا ہے جو اس کا مالک ہوتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ اسے لازم قرار دیا جائے اور اس کی اصل یہ ہے کہ جب کوئی مفرد طلاق واقع کرے (تو وہ واقع ہو جاتی ہے)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو تاویل الباجی نے بیان کی ہے وہ وہی ہے جس کا معنی الکیا الطبری نے علمائے حدیث سے ذکر کیا ہے؟ یعنی وہ ایک طلاق دیتے تھے۔ وہی اب تین طلاقیں دیتے ہیں، یعنی وہ ہر طہر میں ایک طلاق نہیں دیتے تھے بلکہ وہ پوری عدت میں ایک طلاق دیتے تھے یہاں تک کہ وہ جدا ہو جاتی اور عدت گزر جاتی۔

قاضی ابو محمد عبد الوہاب نے بیان کیا ہے: اس کا معنی ہے کہ لوگ ایک طلاق پر اقتصار کرتے تھے، پھر وہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں کثرت سے تین طلاقیں دینے لگے۔ قاضی نے کہا: یہی معنی راوی کے اس قول کے زیادہ مشابہ ہے کہ لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں تین طلاقوں میں جلدی کی تو آپ نے ان پر جلدی نافذ کر دی۔ اس کا معنی ہے کہ آپ نے ان کا حکم ان پر لازم کر دیا۔

اور رہی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث تو دار قطنی نے احمد بن صبیح عن طریف بن ناصح عن معاویہ بن عمار الدھنی عن ابی الزبیر کی سند سے روایت کیا ہے کہ ابو الزبیر نے کہا: میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اس آدمی کے بارے پوچھا جس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں درآنحالیکہ وہ حائضہ ہو۔ تو انہوں نے مجھے فرمایا: کیا تو ابن عمر رضی اللہ عنہ کو پہچانتا ہے؟ میں نے کہا: ہاں۔ پھر فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں (اور وہ حائضہ تھی) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سنت کی طرف لوٹا دیا۔ اور دار قطنی نے کہا: تمام کے تمام (راوی) شیعہ ہیں۔ اور محفوظ روایت یہ ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں ایک طلاق دی۔ (1)

عبید اللہ نے کہا ہے کہ انہوں نے اسے حالت حیض میں ایک طلاق دی تھی مگر انہوں نے سنت کے خلاف عمل کیا تھا۔

اسی طرح صالح بن کیسان، موسیٰ بن عقبہ، اسماعیل بن امیہ، لیث بن سعد، ابن ابی ذئب، ابن جریج، جابر، اسماعیل بن

1۔ سنن دار قطنی، کتاب الطلاق، جلد 4، صفحہ 7، دار المحاسن

ابراہیم بن عقبہ نے حضرت نافع سے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک طلاق دی تھی (1) اور اسی طرح زہری نے سالم عن ابیہ اور یونس ابن جبیر اور شعبی وحسن سے بیان کیا ہے۔

اور رہی حدیث رکانہ تو اس کے بارے کہا گیا ہے کہ یہ حدیث مضطرب، منقطع ہے، کسی ایسی سند سے یہ بیان نہیں کی جاسکتی جس سے استدلال ہوسکتا ہو۔ اسے ابوداؤد نے ابن جریج کی حدیث سے بیان کیا جو انہوں نے بنی رافع کے بعض افراد سے نقل کی ہے اور ان میں کوئی بھی قابل حجت نہیں ہے۔ (یعنی) عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما مروی ہے۔ اور اس میں ہے کہ رکانہ بن عبد یزید نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: "تو اسے واپس لوٹا لے۔" (2)

تحقیق اسے کئی طرق سے عن نافع بن عجیر بھی روایت کیا ہے کہ رکانۃ بن عبد یزید نے اپنی بیوی کو طلاق البتۃ دی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قسم دی کہ اس نے اس سے کیا ارادہ کیا ہے؟ تو انہوں نے قسم کھائی کہ انہوں نے صرف ایک طلاق کا ارادہ کیا ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ان کی طرف واپس لوٹا دیا (3)۔ پس یہ اسم اور فعل دونوں میں اضطراب ہے اور اس طرح کی شے سے کسی قسم کا استدلال نہیں کیا جاسکتا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس حدیث کو کئی طرق سے دارقطنی نے اپنی سنن میں بیان کیا ہے، بعض میں کہا ہے: حدثنا محمد بن یحییٰ بن مرداس حدثنا ابو داؤد السجستانی حدثنا احمد بن عمرو بن السرح و ابو ثور ابراهیم بن خالد الکلبی اور دوسروں نے کہا: حدثنا محمد بن ادریس الشافعی حدثنی عمی محمد ابن علی بن شافع عن عبداللہ بن علی بن السائب عن نافع بن عجیر بن عبد یزید کہ رکانہ ابن عبد یزید نے اپنی بیوی سہیمہ المزنیہ کو بتہ طلاق دی اور اس کے بارے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ کیا اور کہا: قسم بخدا! میں نے اس سے صرف ایک طلاق کا ارادہ کیا ہے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قسم بخدا! تو نے صرف ایک طلاق کا ارادہ کیا ہے؟ تو رکانہ نے عرض کی: قسم بخدا! میں نے اس سے صرف ایک طلاق کا ارادہ کیا ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے (بیوی کو) اس کی طرف واپس لوٹا دیا اور انہوں نے دوسری طلاق حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں دی اور تیسری حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں (4)۔ ابوداؤد نے کہا ہے: "یہ حدیث صحیح ہے"۔ پس حدیث رکانہ میں سے جو صحیح ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی بیوی کو طلاق البتہ دی نہ کہ تین طلاقیں دیں۔ اور طلاق البتۃ کے بارے میں اختلاف ہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ پس اس سے استدلال ساقط ہو گیا۔ والحمدللہ، واللہ اعلم۔

اور ابو عمر نے کہا کہ حدیث رکانہ کے بارے میں امام شافعی کی روایت اپنے چچا سے زیادہ واضح اور ظاہر ہے اور انہوں نے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 476، وزارت تعلیم
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 298، وزارت تعلیم۔ ایضاً، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 1886۔ 1887، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب فی البتۃ، جلد 1، صفحہ 300، و ت۔ ترمذی حدیث، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 1097، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب فی البتۃ، جلد 1، صفحہ 300، وزارت تعلیم۔ ایضاً، حدیث نمبر 1886، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایسی زیادتی بیان کی ہے جسے اصول رد نہیں کرتے۔ پس اس کے ناقل کے ثقہ ہونے کی وجہ سے اسے قبول کرنا واجب ہے۔
امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، ان کے چچا اور ان کے دادا رکانہ کے اہل بیت ہیں اور تمام کے تمام بنی عبدالمطلب بن عبد مناف میں سے ہیں اور وہ اس قصہ کو زیادہ بہتر جانتے ہیں جو انہیں پیش آیا۔

فصل: احمد بن محمد بن مغیث الطلیطلی نے اپنی وثائق میں یہ مسئلہ ذکر کیا ہے اور کہا ہے: طلاق دو قسموں پر منقسم ہے: طلاق سنت، طلاق بدعت، پس طلاق سنت وہ ہے جو اس طریقہ پر واقع ہو جو شریعت نے مباح قرار دیا ہے اور طلاق بدعت وہ ہے جو اس کی نقیض اور ضد ہو اور وہ یہ ہے کہ آدمی عورت کو طلاق دے حالت حیض میں یا حالت نفاس میں یا ایک کلمہ کے ساتھ تین طلاقیں دے، پس اگر اس نے ایسا کیا تو طلاق اسے لازم ہو جائے گی۔

اہل علم کے اس پر اجماع کر لینے کے بعد کہ وہ طلاق دینے والا ہے، ان کے درمیان یہ اختلاف ہے کہ کتنی طلاقیں اسے لازم ہوں گی، تو حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اسے ایک طلاق لازم ہو گی، یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی کہا ہے اور فرمایا: اس کا قول ثلاثا اس کا کوئی معنی نہیں ہے کیونکہ اس نے تین بار طلاق نہیں دی۔ البتہ اس کا قول فی ثلاث جائز ہوگا جبکہ وہ اس سے اس کے بارے خبر دے رہا ہو جو گزر چکا ہے۔ پس وہ کہتا ہے: میں نے تین طلاقیں دیں تو یہ ان تین افعال کی خبر دینے والا ہو جائے گا جو اس سے تین اوقات میں صادر ہوئے۔ جیسا کہ کوئی آدمی کہے: ''میں نے کل فلاں سورۃ تین بار پڑھی'' تو وہ صحیح ہوگا اور اگر اس نے ایک بار سورۃ پڑھی اور کہا: میں نے اسے تین بار پڑھا'' تو وہ جھوٹا ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ تین بار قسم کھائے کہ وہ قسم کو بار بار لوٹاتا رہے تو یہ تین قسمیں ہوں گی اور اگر اس نے ایک بار قسم کھائی اور کہا: أحلف باللہ ثلاثا میں اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ تین قسمیں کھاتا ہوں تو یہ صرف ایک قسم ہو گی اور طلاق بھی اسی کی مثل ہے۔

حضرت زبیر بن عوام اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما نے بھی یہی کہا ہے اور ہم نے یہ سب ابن وضاح سے روایت کیا ہے اور شیوخ قرطبہ میں سے ابن زنباع شیخ ہدی، محمد بن تقی بن مخلد، محمد بن عبدالسلام الحسنی جو اپنے وقت میں منفرد عالم دین اور فقیہ عصر تھے، اصبغ بن الحباب اور ان کے سوا ایک پوری جماعت نے اسی طرح کہا ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حجت میں سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں لفظ طلاق تفریق کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ اس سے مراد وہ اکثر طلاقیں ہیں (یعنی دو بار طلاق) جن کے بعد امساک بالمعروف ہو سکتا ہے اور اس سے مراد عدت میں رجوع کرنا ہے اور قول باری تعالیٰ: اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ کا معنی ہے کہ وہ اسے بغیر رجوع کیے اسی حالت پر چھوڑے رکھے یہاں تک کہ اس کی عدت گزر جائے (1) اور اس میں اس پر احسان ہے اگر ان دونوں کے درمیان ندامت واقع ہو، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لَا تَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰهَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا۝ (الطلاق) (تجھے کیا خبر کہ اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی اور صورت پیدا کر دے۔) اس سے مراد فرقت پر ندامت اور رجعت میں

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 307، دار الفکر

رغبت رکھنا ہے اور تین کو واقع کرنا اچھا نہیں ہے کیونکہ اس میں اس وسعت کو ترک کرنا ہے جو ان کے بارے اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی اور اس پر متنبہ کیا۔ پس اللہ تعالیٰ کا طلاق کو متفرقاً ذکر کرنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ جب انہیں جمع کیا جائے تو وہ لفظ واحد ہے (لہٰذا ایک واقع ہوگی) اور المدونہ میں موجود دیگر مسائل جو اس پر دلالت کرتے ہیں ان پر قیاس کے ذریعے اسے بیان کیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے انسان کا یہ قول ہے: مالی صدقة فی المساکین کہ میرا مال مساکین کے لئے صدقہ ہے تو ثلث مال اس کی طرف سے جائز ہوتا ہے۔ اور ابن منذر کی الاشراف میں ہے کہ حضرت سعید بن جبیر، طاؤس، ابو الشعثاء، عطا اور عمرو بن دینار رحمۃ اللہ علیہم کہتے ہیں: جس نے باکرہ عورت کو تین طلاقیں دیں تو وہ ایک واقع ہوگی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ بسا اوقات انہوں نے ہمت کی اور کہا: غیر المدخول بھا لاعدۃ علیھا، کیونکہ جب اس نے غیر مدخول بہا عورت کو کہا انت طالق ثلاثا تو وہ انت طالق سے اس کے فارغ ہونے کے ساتھ ہی بائنہ ہوگئی، تو ثلاثاً کا لفظ اس پر اس حال میں پڑ رہا ہے کہ وہ بائن ہو چکی ہے۔ لہٰذا یہ لفظ اس پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوگا، کیونکہ اس کا قول: انت طالق (معنی طلاق کو ادا کرنے میں) بنفسہ مستقل ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ غیر مدخول بہا عورت میں بینونت (جدائی) اس پر موقوف نہ ہو جو اس کے بعد وارد ہو رہا ہے جبکہ اس میں اصل ''انت طالق'' ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ امام شافعی نے قول باری تعالیٰ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ اور سَرِّحُوْهُنَّ سے اس پر استدلال کیا ہے کہ یہ لفظ طلاق کے لئے صریح ہے۔(1) حالانکہ علماء نے اس معنی میں اختلاف کیا ہے۔ قاضی ابو محمد نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ صریح وہ ہوتا ہے جو کسی بھی طریقہ پر لفظ طلاق کو متضمن ہو، مثلاً وہ کہے: أنت طالق، انت مطلقة، قد طلقتك، یا الطلاق له لازم۔ اور اس کے سوا الفاظ طلاق میں سے جو بھی اس معنی میں استعمال کیے جاتے ہیں وہ الفاظ کنایہ ہیں اور اسی طرح امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔

اور قاضی ابو الحسن نے کہا ہے: طلاق کے لئے الفاظ صریح کثیر ہیں اور ان میں سے بعض بعض کی نسبت زیادہ بین اور واضح ہیں: (مثلاً) لفظ طلاق، سراح، فراق، حرام، خلیة اور بریة وغیرھا۔

اور امام شافعی نے کہا ہے: صریح تین الفاظ ہیں اور وہ وہ ہیں جن کے بارے قرآن وارد ہو چکا ہے اور وہ ہیں لفظ طلاق، السراح اور الفراق۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ (الطلاق: 2) (یا جدا کر دو انہیں بھلائی کے ساتھ) اور فرمایا: اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ اور مزید فرمایا: فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ (الطلاق: 1) (تو انہیں طلاق دو ان کی عدت کو ملحوظ رکھتے ہوئے)

میں (مفسر) کہتا ہوں: جب یہ بات پختہ اور ثابت ہوگئی تو پھر طلاق کی دو قسمیں ہیں: صریح اور کنایہ۔

پس صریح تو وہ ہے جو ہم نے ذکر کر دیا ہے اور کنایہ وہ ہے جو اس کے سوا ہے اور ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ صریح میں آدمی نیت کا محتاج نہیں ہوتا، بلکہ صرف لفظ کے ساتھ ہی طلاق واقع ہو جاتی ہے اور کنایہ نیت کی محتاج ہوتی ہے اور ان کی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 306، دار الکتب العلمیہ

دلیل جنہوں نے کہا: بے شک (الفاظ) الحرام، الخلیۃ اور البریۃ، صریح الطلاق ہیں، طلاق کے معنی میں کثیر الاستعمال ہیں یہاں تک کہ وہ اس معنی میں معروف ہیں اور یہ ایقاع طلاق میں بین اور واضح ہو گئے، جیسا کہ جس طرح غائط کا لفظ پست زمین کے لیے وضع کیا گیا، پھر اسے بطریق مجاز قضائے حاجت کے لئے استعمال کیا جائے۔ اور وہ اس معنی میں زیادہ بین، ظاہر اور مشہور ہو جائے اس کی نسبت جس کے لئے اسے وضع کیا گیا اور ہمارے مسئلہ میں اسی طرح کی مثال ہے۔

پھر عمر بن عبدالعزیز نے کہا ہے: ''اگر طلاقیں ہزار ہوں تو (طلاق) البتۃ ان میں سے کوئی شے باقی نہیں چھوڑتی۔ پس جس نے کہا ہے: البتۃ، تو اس نے انتہائے اخیر کو چھو لیا(1)۔ اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے۔

دارقطنی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: الخلیۃ والبریۃ والبتۃ والبائن اور الحرام تین طلاقیں ہیں، اور عورت آدمی کے لئے حلال نہیں ہوتی یہاں تک کہ اس کے سوا دوسرے خاوند سے شادی کرلے۔(2) اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی روایت ہے کہ البتہ تین طلاقیں ہیں۔ انّ البتۃ ثلاث سند کے اعتبار سے اس میں ضعف ہے، اسے دارقطنی نے بیان کیا ہے اور عنقریب ارشاد خداوندی: وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا کے تحت اس کا ذکر آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 7۔ علماء نے اس کے بارے کوئی اختلاف نہیں کیا جس نے اپنی بیوی کو کہا: قد طلقتُكِ میں نے تجھے طلاق دی، کہ یہ مدخول بہا اور غیر مدخول بہا دونوں کے حق میں صریح طلاق ہے اور جس نے اپنی عورت کو کہا: انت طالق تو طلاق والی ہے تو یہ ایک طلاق ہے مگر یہ کہ وہ اس سے زیادہ کی نیت کرے۔ اور اگر اس نے دو یا تین کی نیت کر لی تو اتنی ہی لازم ہو جائیں گی جن کی اس نے نیت کی اور اگر اس نے کسی شے کی نیت نہ کی تو پھر ایک طلاق ہوگی اور آدمی رجعت کا مالک ہو گا (یعنی ایک طلاق رجعیہ ہوگی) اور اگر اس نے کہا: انت طالق اور کہا: میں نے قید (بیڑیوں) سے آزاد ہونے کا ارادہ کیا ہے تو اس کا قول قبول نہ کیا جائے گا اور طلاق اس پر لازم ہو جائے گی، مگر یہ کہ وہاں کوئی ایسا قرینہ ہو جو اس کے صدق پر دلالت کرتا ہو۔ اور جس نے کہا: انت طالق واحدۃ، لا رجعۃ لی علیك تو اس کا قول: لا رجعۃ لی علیك (مجھے تجھ پر رجوع کا حق نہیں) باطل ہوگا اور اس کے قول واحدۃ کی وجہ سے اس کے لئے رجعت ثابت ہوگی، کیونکہ واحدۃ سے مراد تین نہیں ہو سکتیں اور اگر اس نے اپنے قول: لا رجعۃ لی علیك سے تین کی نیت کی، تو امام مالک کے نزدیک یہ تین ہی ہوں گی۔

اور اس کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے جس نے اپنی بیوی کو کہا: قد فارقتك (میں نے تجھے جدا کر دیا)، سرحتكِ (میں نے تجھے چھوڑ دیا)، انت خلیۃٌ (تو فارغ ہے)، انت بریۃ (تو بری ہے) انت بائن (تو جدا ہے)، حبلك علی غاربك (تیری رسی تیرے کندھے پر)، انت علی حرام (تو مجھ پر حرام ہے)، الحقی باھلك (تو اپنے اہل سے جا مل)، قد وھبتك لأھلك (میں نے تجھے تیرے اہل کے حوالے کر دیا)، قد خلیت سبیلك (میں نے تیرا راستہ چھوڑ دیا)، لا سبیل لی علیك (مجھے تجھ پر کوئی اختیار نہیں) تو امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ نے کہا ہے: اس سے طلاق

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب الطلاق، باب ما جاء فی البتۃ، جلد 1، صفحہ 511، وزارت تعلیم
2۔ سنن دارقطنی، کتاب الطلاق، جلد 2، جز رابع، صفحہ 32، دار المحاسن

بائن واقع ہوگی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ انہوں نے فرمایا: جب آدمی نے اپنی بیوی کو کہا استقلی بأمرك (تو اپنے معاملے میں مستقل ہے) یا امْرُكِ لك (تیرا معاملہ تیرے سپرد ہے) یا الحقی باھلك۔ (تو اپنے گھر والوں سے جامل) اور انہوں نے اسے قبول کرلیا تو اس سے ایک طلاق بائن ہوگی۔

اور امام مالک سے اس کے بارے میں یہ مروی ہے جس نے اپنی عورت کو کہا: قد فارقتك یا سرحتك کہ یہ صریح طلاق میں سے ہے۔ جیسا کہ اس کا قول: انت طالق صریح ہے اور آپ ہی سے یہ بھی مروی ہے کہ یہ طلاق کنایہ ہے، لہٰذا اس میں کہنے والے کی نیت کی طرف رجوع کیا جائے گا اور اس سے پوچھا جائے گا جتنے عدد کا اس نے ارادہ کیا ہے مدخول بہا ہو یا غیر مدخول بہا۔

ابن المواز نے کہا ہے: وہ عورت جس کے ساتھ دخول نہیں کیا گیا اس کے بارے میں دو میں سے اصح قول یہ ہے کہ ایک طلاق ہوگی، مگر یہ کہ وہ اکثر کی نیت کرے۔ ابن القاسم اور ابن عبدالحکم نے یہی کہا ہے۔

اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ تین طلاقیں ہیں اور اس کی مثل یہ الفاظ بھی ہیں: خلعتك (میں نے تجھے چھوڑ دیا) یا لا ملك لی علیك (میری تجھ پر کوئی ملکیت نہیں)

اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تمام الفاظ کنایات سے مدخول بہا عورت کے حق میں تین طلاقیں ہوتی ہیں جن میں کہنے والا کوئی نیت نہ کرے اور غیر مدخول بہا کے بارے میں وہ نیت کرے اور اگر وہ حلف اٹھادے اور کہے: میں نے ایک طلاق کا ارادہ کیا ہے تو وہ خطاب میں سے ایک خاطب ہے کیونکہ مدخول بہا عورت کو اس کا خاوند نہ چھوڑ سکتا ہے نہ جدا کر سکتا ہے اور نہ ہی بری قرار دے سکتا ہے مگر تین طلاقوں کے ساتھ اور جس سے دخول نہ کیا گیا ہو اسے وہ ایک طلاق کے ساتھ چھوڑ سکتا ہے، بری کرسکتا ہے اور جدا کرسکتا ہے۔

امام مالک اور آپ کے اصحاب کے ایک طائفہ سے مروی ہے اور یہی اہل مدینہ کی ایک جماعت کا قول ہے کہ وہ ان تمام الفاظ میں نیت کرے گا اور طلاق میں سے جس کی اس نے نیت کی وہ اسے لازم ہوجائے گی۔

اور آپ سے تمام کنایات میں سے بالخصوص البتۃ کے بارے یہ مروی ہے کہ وہ اس سے نیت نہ کرے نہ مدخول بہا کے بارے میں اور نہ غیر مدخول بہا کے بارے میں۔

اور امام ثوری، ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: ان تمام میں اس کی نیت کا اعتبار ہے، پس اگر اس نے تین کی نیت کی تو یہ تین ہوں گی اور اگر ایک کی نیت کی تو وہ ایک بائنہ ہوگی اور وہ اپنے نفس کے بارے زیادہ حقدار ہوجائے گی اور اگر اس نے دو کی نیت کی تو یہ ایک ہوگی۔ اور امام زفر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: اگر اس نے دو کی نیت کی تو یہ دو ہوں گی۔

اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا: ان تمام الفاظ میں وہ طلاق دینے والا نہیں ہوگا یہاں تک کہ وہ یہ کہے: میں نے اپنے کلام سے طلاق کا ارادہ کیا ہے تو پھر اتنی ہوں گی جتنی کی اس نے نیت کی۔ پس اگر اس نے تین سے کم کی نیت کی تو وہ رجعی ہو گی۔ اور اگر اس نے اسے ایک بائن طلاق دی تو وہ ایک طلاق رجعی ہوگی۔

اور اسحاق نے کہا ہے: ہر وہ کلام جو طلاق سے مشابہت رکھتا ہو تو اس سے وہ طلاق واقع ہو جائے گی جس کی اس نے نیت کی اور ابوثور نے کہا: یہ طلاق رجعیہ ہوگی اور اس کی نیت کے بارے نہیں پوچھا جائے گا۔

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ طلاق بائن کا تصور نہیں کرتے مگر خلع یا ایلاء میں اور ان میں یہی روایت محفوظ ہے۔ ابوعبید نے بھی یہی کہا ہے۔

اور امام بخاری نے یہ عنوان باندھا ہے باب اذا قال فارقتك او سرحتك او البرية او الخلية او ما عنى به الطلاق فهو على نيته (1) (یعنی ان الفاظ سے طلاق کا انحصار اس کی نیت پر ہے۔) اور آپ نے اس سے علمائے کوفہ اور امام شافعی کے قول کی طرف اشارہ کیا ہے اور اپنے قول ما عنی به من الطلاق سے اسحاق کے قول کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس میں یہ دلیل ہے کہ ہر وہ کلمہ جو طلاق یا غیر طلاق ہونے کا احتمال رکھتا ہو تو یہ جائز نہیں کہ اس سے طلاق لازمی ہو مگر تب جبکہ متکلم یہ کہے: بلاشبہ اس نے اس سے طلاق کا ارادہ کیا ہے تو اس کے اقرار کے ساتھ اسے طلاق لازم ہو جائے گی اور نکاح کو باطل کرنا جائز نہیں ہوتا کیونکہ یقین کے ساتھ اس کے صحیح ہونے پر انہوں نے اجماع کیا ہوا ہے۔

ابوعمر نے کہا ہے: امام مالک کا قول ایسے آدمی کے قول کے بارے میں مختلف ہے جس نے اپنی بیوی کو کہا: اعتدی (تو عدت کے دن شمار کر)، قد خليتك، يا حبلك على غاربك۔

آپ نے ایک بار کہا: وہ ان میں نیت نہیں کرے گا اور یہ تین طلاقیں ہیں۔ اور ایک بار کہا: وہ ان تمام میں نیت کرے گا۔ مدخول بہا کے بارے میں بھی اور غیر مدخول بہا کے بارے میں بھی اور اسی طرح میں بھی کہتا ہوں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو موقف جمہور نے اختیار کیا ہے اور جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ وہ ان الفاظ میں نیت کرے گا اور اسی کے مطابق اس کا فیصلہ کیا جائے گا وہ صحیح ہے، ہم نے اسے دلیل سے بیان کر دیا ہے اور اس صحیح حدیث سے جسے ابوداؤد، ابن ماجہ اور دارقطنی وغیرہم نے یزید بن رکانہ سے بیان کیا ہے کہ رکانہ بن عبد یزید رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی سہیمہ کو طلاق البتة دی اور اس کے بارے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع عرض کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قسم بخدا! تو نے اس سے صرف ایک طلاق کا ارادہ کیا ہے؟ تو رکانہ نے عرض کی: قسم بخدا! میں نے اس سے صرف ایک طلاق کا ارادہ کیا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ عورت ان کی طرف لوٹا دی۔ ابن ماجہ نے کہا ہے: میں نے ابوالحسن الطنافسی کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: یہ حدیث کتنی اشرف و اعلیٰ ہے۔ (2)

اور امام مالک نے اس آدمی کے بارے میں کہا ہے جو اپنی بیوی کو کہتا ہے: انت على كالميتة والدم ولحم الخنزير کہ تو

1۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 792، وزارت تعلیم

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطلاق، باب طلاق البتة، جلد 1، صفحہ 149، وزارت تعلیم

ایضاً۔ ابوداؤد، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 1886، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ابن ماجہ، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 2040، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ترمذی، کتاب الطلاق اللعان، حدیث نمبر 1097، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مجھ پر مردار، خون اور خنزیر کے گوشت کی طرح ہے کہ میں اسے البتہ (بالکل جدا) دیکھتا ہوں اگرچہ آدمی کی نیت نہ بھی ہو اور وہ عورت اس کے لئے حلال نہ ہوگی مگر دوسرے زوج کے بعد۔

اور امام شافعی کے قول میں ہے کہ اگر اس نے طلاق کا ارادہ کیا تو وہ طلاق ہوگی جتنی بھی طلاقوں کا اس نے ارادہ کرلیا اور اگر اس نے طلاق کا ارادہ نہ کیا تو پھر اس کے حلف دینے کے بعد کوئی شے واقع نہ ہوگی۔

اور ابوعمر نے کہا ہے: ہر وہ لفظ جو کنایہ عن الطلاق ہے کے بارے میں اس باب کی اصل وہ روایت ہے جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس عورت کے لئے جس سے کسی نے شادی کی تو اس وقت اس عورت نے کہا: اعوذ باللہ منك۔ میں تجھ سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتی ہوں۔ تو اس نے کہا لقد عذت بمعاذ الحقی باھلك (1) (تجھے پناہ حاصل ہے تو اپنے گھر والوں کے ساتھ جا مل) پس وہ طلاق ہوگئی۔ اور حضرت کعب ابن مالک رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو کہا جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں اس سے علیحدہ رہنے کا حکم ارشاد فرمایا تھا الحقی باھلك اور وہ طلاق نہ ہوئی تو یہ اس پر دلیل ہے کہ یہ لفظ نیت کا محتاج ہے اور اس میں فیصلہ نہیں کیا جائے گا مگر وہی جس کی بولنے والا نیت کرے گا۔ اور اسی طرح تمام الفاظ کنایات کا حکم ہے جو فراق اور غیر فراق کے معنی کا احتمال رکھتے ہیں۔ واللہ اعلم

اور رہے وہ الفاظ جو الفاظ طلاق میں سے نہیں ہیں اور نہ انہیں فراق (جدائی) سے کنایہ قرار دیا جا سکتا ہے تو اکثر علماء ان میں سے کسی سے طلاق واقع نہیں کرتے اگرچہ کہنے والا اس کا ارادہ بھی کرے۔ اور امام مالک نے کہا ہے: ہر وہ آدمی جس نے کسی بھی لفظ سے طلاق کا ارادہ کیا تو طلاق اسے لازم ہو جائے گی، حتیٰ کہ اس قول کے ساتھ بھی کلی و اشربی و قومی و اقعدی۔ (تو کھا، تو پی، تو کھڑی ہو، تو بیٹھ جا) اس میں امام مالک کے اپنے اصحاب کے سوا کسی نے ان کی اتباع نہیں کی۔

قولہ تعالیٰ: وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ۭ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْھَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

اس میں پندرہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1 ۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اس میں ''ان'' یحل کے سبب محل رفع میں ہے۔ اور آیت میں خطاب ازواج کو ہے، انہیں منع کیا گیا ہے کہ وہ اپنی ازواج سے کوئی شے ضرر اور اذیت پہنچانے کی غرض سے لیں اور یہ وہ خلع ہے جو صحیح نہیں ہوتا مگر اس طرح کہ آدمی ضرر اور اذیت دینے میں متفرد نہ ہو۔ اور ذکر خاص کرانہی چیزوں کا کیا گیا ہے جو خاوندوں نے اپنی عورتوں کو دے رکھی ہوں، کیونکہ لوگوں میں عرف اور رواج یہی ہے کہ فساد اور ناچاکی کے وقت آدمی اس شے کا مطالبہ کرتا ہے جو مرد کے ہاتھ سے عورت کے لئے مہر اور اس کی دیگر حاجات کو پورا کرنے کے لئے

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطلاق، باب ما یقع بہ الطلاق، جلد 1، صفحہ 149۔
بخاری شریف، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 4852-4853، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً، کتاب حدیث کعب بن مالك، حدیث نمبر 4066

سامان نکلا ہو۔ اسی وجہ سے اسے ذکر کے ساتھ خاص کیا گیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ قول باری تعالیٰ وَلَا یَحِلُّ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ اور فَاِنْ طَلَّقَهَا کے درمیان بطور جملہ معترضہ کے فصل ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ جمہور کا نظریہ یہ ہے کہ طلاق پر فدیہ لینا جائز ہے اور عورت کا مال نہ لینے کی تشدید پر اجماع ہے مگر یہ کہ نافرمانی اور معاملات میں فساد عورت کی جانب سے ہو۔

ابن منذر نے حضرت عثمان سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ جب ظلم اور خصومت مرد کی جانب سے ہو اور عورت اس سے خلع لے تو اس کا مال لینا جائز ہے اور وہ گنہگار ہو گا اور جو کچھ اس نے کہا ہے وہ حلال نہ ہو گا اور جو مال اس نے لیا ہے وہ واپس لوٹانے پر اسے مجبور نہیں کیا جائے گا۔

ابن منذر نے کہا ہے: ان کے قول میں سے یہ ظاہر کتاب اللہ، حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت (1) ہونے والی خبر اور اس نظریہ کے خلاف ہے جس پر عام اہل علم کا اجماع ہے اور میں گمان نہیں کرتا کہ اگر کسی کو کہا جائے کہ تو خطا کی تلاش میں خوب محنت اور کوشش کر، تو وہ اس سے بڑھ کر کوئی امر نہیں پائے گا کہ کتاب اللہ کسی شے کی تحریم کے بارے حکم لگائے پھر کوئی مقابلہ کرنے والا اس کے مقابل ایسی شے لائے جو نص کے خلاف ہو اور وہ کہنے لگے: بلکہ وہ جائز ہے اور جو کچھ اس نے لیا ہے وہ واپس لوٹانے پر اسے مجبور نہیں کیا جائے گا۔

ابوالحسن بن بطال نے کہا ہے اور ابن قاسم نے امام مالک سے اسی کی مثل روایت کیا ہے اور یہ قول ظاہر کتاب اللہ کے خلاف ہے اور حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کی بیوی والی حدیث کے خلاف ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: اِلَّاۤ اَنْ یَّخَافَاۤ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے کہ وہ (کوئی شے) لے مگر اس اندیشہ اور خوف کے بعد کہ وہ دونوں اللہ تعالیٰ کی حدوں کو قائم نہ رکھ سکیں گے اور تحریم کو اس کے لئے وعید کے ساتھ مؤکد کیا جس نے حد سے تجاوز کیا۔

اور معنی یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک کو اپنے بارے میں یہ گمان ہو کہ وہ اپنے ساتھی کے نکاح سے متعلقہ حقوق اس طرح پورے نہ کر سکے گا جس طرح اس پر واجب ہیں۔ اس میں وہ کراہت اور ناپسندیدگی بھی ہے جس کا وہ اعتقاد رکھتا ہے تو پھر عورت پر فدیہ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے اور نہ ہی خاوند پر کچھ لینے میں حرج ہے اور خطاب زوجین (میاں بیوی دونوں) کو ہے اور اَنْ یَّخَافَاۤ میں ضمیر دونوں کے لئے ہے اور اَلَّا یُقِیْمَا مفعول بہ ہے اور خفت ایک مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے۔

پھر کہا گیا ہے کہ یہ خوف بمعنی علم ہے یعنی وہ دونوں جان لیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حدود قائم نہیں کر سکیں گے اور یہی خوف حقیقی ہے اور یہ مکروہ عمل کے واقع ہونے کا ڈر اور خوف ہے اور یہ ظن کے معنی کے قریب ہے۔

پھر کہا گیا ہے کہ اِلَّاۤ اَنْ یَّخَافَاۤ یہ استثناء منقطع ہے۔ (یعنی) لیکن اگر نافرمانی عورتوں کی جانب سے ہو تو پھر تم پر فدیہ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 302، دار الکتب العلمیہ

حمزہ نے اسے الا ان یُخافا یاء کے ضمہ کے ساتھ (1) صیغہ مجہول میں پڑھا ہے اور فاعل محذوف ہوگا اور وہ والی اور حکام ہیں۔ ابو عبید نے اسے پسند کیا ہے۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی وجہ سے ہے فَاِنْ خِفْتُمْ فرمایا: خوف زوجین کے علاوہ کسی اور کے لئے ذکر کیا ہے (یعنی والی یا حاکم کو خوف ہو) اگر زوجین کا ارادہ کرتا تو کہتا: فَاِنْ خَافَا اس میں ان کے لئے حجت اور دلیل ہے جنہوں نے خلع سلطان کے حوالے کیا ہے (یعنی حاکم وقت کے فیصلے کے بغیر خلع نہیں ہوسکتا۔)

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ حضرت سعید بن جبیر، حسن اور ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے اور شعبہ نے کہا ہے، میں نے حضرت قتادہ کو کہا: کس سے حسن نے یہ اخذ کیا ہے کہ خلع سلطان کے سپرد ہے؟ تو انہوں نے کہا: زیاد سے اور یہ حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی جانب سے والی تھے۔

نحاس نے کہا ہے: یہ قول زیاد سے معروف ہے اور اس قول کا کوئی معنی اور حقیقت نہیں ہے کیونکہ آدمی جب اپنی بیوی سے خلع کرتا ہے تو بلاشبہ وہ ایسی شے پر ہوتا ہے جس کے ساتھ وہ دونوں راضی ہوتے ہیں اور سلطان اس پر اسے مجبور نہیں کر سکتا اور اس کے قول کی کوئی اصل نہیں ہے جس نے کہا ہے: یہ سلطان کے سپرد ہے اور انہوں نے ابو عبید کے اختیار کا انکار کیا ہے اور اسے رد کیا ہے اور میں ان کے اختیار اور پسند میں اس حرف سے زیادہ بعید اور کوئی شے نہیں جانتا، کیونکہ اعراب، لفظ اور معنی میں سے کوئی بھی اسے ثابت نہیں کرتا۔ جہاں تک اعراب کا تعلق ہے تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے الا ان یخافا کو پڑھا ہے تخافوا اور یہ عربی ہے۔ جب اسے مالم یسم فاعلہ کی طرف لوٹایا گیا تو کہا گیا الا ان یخاف، اور رہا لفظ تو اگر اس کا انحصار لفظ یخافا پر ہو تو پھر ضروری ہے کہ کہا جائے: فان خیف۔ اور اگر لفظ فان خفتم پر ہو تو پھر واجب ہے کہ یہ کہا جائے: الا ان تخافوا۔

اور رہا معنی تو یہ بعید ہے کہ کہا جائے کہ تمہارے لئے حلال نہیں کہ تم اس میں سے کوئی شے لو جو تم نے انہیں دے رکھی ہے مگر یہ کہ تمہارے سوا کسی کو خوف ہو اور نہ رب العالمین نے یہ کہا ہے: فلا جناح علیکم ان تاخذوا لہ منہا فدیۃ، (کہ تم پر کوئی حرج نہیں ہے کہ تم مرد کے لئے عورت سے فدیہ لو) کہ خلع سلطان کے حوالے ہو جائے۔

امام طحاوی نے کہا ہے: حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے کہ سلطان کے بغیر خلع کا جائز ہونا صحیح ہے اور جس طرح طلاق اور نکاح بغیر سلطان کے جائز ہیں اسی طرح خلع بھی جائز ہے۔ یہی جمہور علماء کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا اگر تمہیں خوف ہو اس پر کہ وہ قائم نہ رکھ سکیں گے حُدُوْدَ اللّٰہِ کی حدیں۔ یعنی ان حقوق میں جو ان دونوں پر واجب ہیں مثلاً حسن صحبت اور خوبصورت طرز زندگی اور اس میں خطاب حکام کو اور حاکم نہ ہونے کی صورت میں اس طرح کے معاملات میں واسطہ بننے والوں کو کیا گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی حدوں کو قائم نہ کرنے کا معنی ہے عورت کا اپنے خاوند کے حق کو حقیر جاننا اور اس کا اس کی اطاعت و پیروی نہ کرنا وغیرہ حضرت ابن عباس، مالک بن انس اور جمہور فقہاء نے یہی کہا ہے۔ (2)

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 308، دار الفکر 2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 307، دار الکتب العلمیہ

اور حسن بن ابی الحسن اور ان کے ساتھ ایک جماعت نے کہا ہے: جب عورت نے یہ کہہ دیا کہ میں تیرے حکم کی اطاعت نہیں کروں گی اور میں تیرے لئے غسل جنابت نہیں کروں گی اور میں تیرے لئے قسم پوری نہیں کروں گی تو خلع حلال ہو گیا اور شعبی نے کہا ہے: اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ کا معنی ہے کہ وہ دونوں اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہ کریں گے۔ وہ یہ کہ ایک دوسرے کو غصہ دلانا اور ناراض کرنا ترک طاعت کی طرف دعوت دیتا ہے (1)۔

اور حضرت عطا بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: خلع اور مال لینا حلال ہو جاتا ہے جب کہ عورت اپنے خاوند کو کہے: میں تجھے ناپسند کرتی ہوں اور میں تجھ سے محبت نہیں کرتی اور اسی طرح کے جملے (2)۔ تو ان پر کوئی حرج نہیں ہے کہ عورت کچھ فدیہ دے کر جان چھڑا لے۔

امام بخاری نے ایوب عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کی سند سے حدیث بیان کی ہے کہ حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ثابت بن قیس کے بارے میں اخلاق و کردار اور دین کے اعتبار سے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے (اس اعتبار سے ان میں کوئی عیب اور نقص موجود نہیں) لیکن میں اس کی طاقت نہیں رکھتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”کیا تو اس پر اس کا باغ لوٹا دے گی“؟ اس نے عرض کی: جی ہاں۔ (3)

اسے ابن ماجہ نے حضرت قتادہ عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کی سند سے بیان کیا ہے کہ جمیلہ بنت سلول حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور عرض کی: قسم بخدا! میں دین اور اخلاق کے بارے میں ثابت بن قیس میں کوئی عیب نہیں پاتی، لیکن میں اسلام میں کفر (ناشکری، انکار) کو ناپسند کرتی ہوں، میں بغض کی وجہ سے اس کی طاقت نہیں رکھتی۔ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: کیا تو اس کا باغ اسے لوٹا دے گی؟ اس نے عرض کی: جی ہاں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا کہ وہ اس سے اپنا باغ لے لے اور مزید کچھ نہ لے (4)۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ان سے انتہائی شدید بغض رکھتی تھیں اور وہ اس سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کے درمیان بطریق خلع تفریق کر دی۔ اسلام میں یہی پہلا خلع تھا۔

حضرت عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: اسلام میں سب سے پہلے جس نے خلع کیا وہ عبداللہ بن ابی کی بہن ہے وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میرا سر اور اس کا سر کبھی جمع نہیں رہ سکتے۔ میں نے خیمے کی ایک طرف اٹھائی تو میں نے اسے ایک جماعت میں آتے دیکھا تو وہ ان تمام میں سب سے زیادہ سیاہ تھا، قد و قامت کے اعتبار سے ان سے چھوٹا تھا اور چہرے کے لحاظ سے سب سے زیادہ قبیح تھا! تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تو اس کا باغ اس پر واپس لوٹا دے گی؟ اس نے عرض کی: جی ہاں اور اگر وہ چاہے تو میں زائد بھی دوں گی، تو آپ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 307، دار الکتب العلمیہ　2۔ ایضاً

3۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، الخلع و کیف طلاق فیہ، جلد 2، صفحہ 794، وزارت تعلیم۔ ایضاً، حدیث نمبر 4867-4868، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطلاق، المختلعۃ یأخذ ما أعطاھا، جلد 1، صفحہ 148، وزارت تعلیم۔ ایضاً، حدیث نمبر 2045، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دونوں کے مابین تفریق کر دی۔ یہ حدیث خلع میں اصل ہے اور جمہور فقہاء اسی پر عمل پیرا ہیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا: میں اہل علم سے اس کے بارے مسلسل سنتا رہا ہوں اور یہی امر ہے جس پر ہمارے نزدیک اجماع ہے اور وہ یہ کہ آدمی جب عورت کو کوئی ضرر اور تکلیف نہ دے اور اس کی طرف برائی کی نسبت بھی نہ کرے اور مرد کی جانب سے اسے ستایا بھی نہ جائے اور عورت اس سے جدائی اور علیحدگی پسند کرے تو آدمی کے لئے حلال ہے کہ وہ اس سے ہر وہ شے لے لے جو بطور فدیہ وہ اسے دے۔ جیسا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ثابت بن قیس کی بیوی کے بارے میں کہا اور اگر ناچاکی اور اختلاف مرد کی جانب سے ہو کہ وہ اسے تنگ کرتا ہو اور اسے اذیت اور ضرر پہنچاتا ہو تو وہ اسے وہ شے واپس لوٹا دے جو اس سے لی ہے۔

عقبہ بن ابی الصہباء نے کہا ہے: میں نے بکر بن عبد اللہ مزنی سے اس آدمی کے بارے میں پوچھا جس کی عورت یہ چاہتی ہے کہ وہ اس سے خلع لے لے تو انہوں نے کہا: اس کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ اس سے کوئی شے لے۔

میں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جو اپنی کتاب میں ارشاد فرمایا ہے وہ کہاں گیا فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِهٖ؟ انہوں نے کہا: یہ منسوخ ہو چکا ہے، میں نے کہا: ناسخ آیت کہاں ہے؟ تو انہوں نے کہا: سورۃ النساء میں یہ آیت ہے: وَ اِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّ اٰتَیْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَیْـًٔا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِیْنًا ۝ (النساء) (1) (اور اگر تم ارادہ کر لو کہ بدلو اپنی بیوی کو پہلی بیوی کی جگہ اور دے چکے ہو تم اسے ڈھیروں مال تو نہ لو اس مال سے کوئی چیز، کیا تم لینا چاہتے ہو اپنا مال (زمانہ جاہلیت کی طرح) بہتان لگا کر اور کھلا گناہ کر کے۔)

نحاس نے کہا ہے: یہ قول شاذ ہے اور اپنے شاذ ہونے کی وجہ سے اجماع سے خارج ہے اور دونوں آیتوں میں سے ایک آیت دوسری کو ختم کرنے والی نہیں ہے کہ نسخ واقع ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد فَاِنْ خِفْتُمْ الآیہ اس آیت کے ساتھ زائل اور ختم ہونے والا نہیں ہے کیونکہ دونوں کو جب یہ خوف اور اندیشہ ہو تو پھر خاوند وَ اِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ (النساء: 20) میں داخل نہیں، کیونکہ یہ صرف مردوں کے لئے ہے اور علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے یہ آیت محکم ہے (2) اور بکر کے قول کی کوئی حقیقت نہیں اگر عورت دینے کا ارادہ کرے۔ تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کے لئے جائز قرار دیا کہ وہ اپنی زوجہ سے وہ کچھ لے لے جو اسے دے رکھا ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ اس آیت سے انہوں نے استدلال کیا ہے جنہوں نے خلع کو شقاق اور ضرر کی حالت کے ساتھ خاص کیا ہے اور یہ کہ خلع میں یہ شرط ہے اور یہ نظریہ اس روایت سے مزید پختہ اور مضبوط ہو جاتا ہے جو ابو داؤد نے حضرت عائشہ سے بیان کی ہے کہ حبیبہ بنت سہل حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں تو انہوں نے اسے مارا اور کندھے کے کنارے کی باریک ہڈی توڑ دی، چنانچہ صبح کے وقت وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور شکایت پیش کی تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کو بلایا اور فرمایا: ''تو اس سے کچھ مال لے لے اور اسے فارغ کر دے۔''

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 566، دار احیاء التراث العربیۃ بیروت 2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 173

انہوں نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا وہ اس سے صلح کرسکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: "ہاں"۔ حضرت ثابت نے کہا: میں اسے دو باغ دیتا ہوں اور دونوں اس کے قبضے میں ہیں۔ تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تو وہ دونوں لے لے اور اسے جدا کردے۔" چنانچہ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ نے وہ دونوں لے لئے اور اسے فارغ کردیا (1)۔ اور جس موقف پر جمہور فقہاء ہیں وہ یہ ہے کہ ضرر اور تکلیف کی شکایت کیے بغیر خلع جائز ہے۔

جیسا کہ اس پر حدیث بخاری وغیرہ دلالت کرتی ہے (2) اور رہی آیت تو اس میں کوئی حجت موجود نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے شرط کے انداز میں اس کا ذکر نہیں کیا، بلکہ اس طور پر اس کا ذکر کیا ہے کہ خلع کے احوال میں اس کا غالب امکان ہے۔ پس یہ قول غالب کے بارے ہے اور وہ ارشاد جو عذر کو ختم کرتا ہے اور علم کو واجب کرتا ہے وہ یہ ہے: فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔـا مَّرِيْٓــًٔا ۝ (النساء) (پس اگر وہ بخش دیں تمہیں کچھ اس سے خوشدلی سے تو کھاؤ اسے لذت حاصل کرتے ہوئے خوشگوار سمجھتے ہوئے۔)

مسئلہ نمبر 6۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ تو یہ اس پر دلیل ہے کہ خلع اس سے زیادہ مال کے عوض بھی جائز ہے جو آدمی نے عورت کو دے رکھا ہو (3)۔ تحقیق علماء نے اس میں اختلاف کیا ہے۔ سو امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب اور ابوثور رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے کہ یہ جائز ہے کہ عورت آدمی کو بطور فدیہ اتنا مال دے جس پر دونوں راضی ہوں، چاہے وہ اس سے کم یا زیادہ ہو جو مرد نے عورت کو دے رکھا ہے اور یہ حضرت عثمان بن عفان، ابن عمر رضی اللہ عنہم اور قبیصہ اور نخعی رحمۃ اللہ علیہما سے مروی ہے اور قبیصہ نے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ۔

اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ مکارم اخلاق میں سے نہیں ہے اور نہ ہی میں نے اہل علم میں سے کسی کو دیکھا کہ وہ اسے مکروہ جانتا ہو اور دارقطنی نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میری بہن انصار میں سے ایک آدمی کی زوجیت میں تھی اس نے اس کے ساتھ ایک باغ کے عوض شادی کی تھی، تو ان دونوں کے درمیان تلخ کلامی ہو گئی تو وہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیش ہو گئے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تو اس کا باغ اسے واپس کردے اور وہ تجھے طلاق دے دے گا۔"؟ (کیا تجھے قبول ہے) اس نے عرض کی: جی ہاں اور میں اسے زائد بھی دوں گی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو اس کا باغ اس پر واپس لوٹا دے اور اسے زائد بھی دے۔" (4)

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے: "اور اگر اس نے چاہا تو میں اسے زیادہ دوں گی اور آپ نے اس بات کا انکار نہیں کیا۔"

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب فی الخلع، جلد 1، صفحہ 303، وزارت تعلیم۔ ایضاً، حدیث نمبر 1901، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ بخاری شریف، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 4868، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ جامع البیان للطبری، جلد 1، صفحہ 565، دار احیاء التراث العربیۃ
4۔ سنن دارقطنی، کتاب النکاح، باب المہر، جلد 3، صفحہ 254، دار المحاسن قاہرہ

اور ایک گروہ نے کہا ہے: وہ اس سے اس مال سے زیادہ نہیں لے گا جو اس نے اسے دیا ہوا ہے۔ اسی طرح حضرت طاؤس، حضرت عطا اور حضرت اوزاعی رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔ امام اوزاعی نے کہا ہے: قضاۃ اس کے مال لینے کی اجازت نہیں دیتے مگر اتنا جو اس نے اسے دیا ہوا ہو۔ یہی قول امام احمد اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہما نے بھی کہا ہے۔ اور انہوں نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جسے ابن جریج نے روایت کیا ہے کہ ابو الزبیر نے مجھے خبر دی ہے کہ حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ کے نکاح میں زینب بنت عبداللہ بن ابی بن سلول تھی۔ اور انہوں نے بطور مہر ایک باغ اسے دیا تھا۔ پھر اس نے انہیں ناپسند کیا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "زیادہ تو نہیں البتہ اس کا باغ واپس کردے۔" تو اس نے عرض کی! جی ہاں۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کے لئے وہ باغ لے لیا اور اس کا راستہ چھوڑ دیا (یعنی اسے فارغ کر دیا) اور جب یہ خبر حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچی، تو انہوں نے کہا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیصلہ قبول ہے(1)۔ اسے ابو الزبیر نے کئی ایک سے سنا ہے اور دار قطنی نے اسے بیان کیا ہے اور حضرت عطا سے مرسل روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "آدمی خلع لینے والی عورت سے اس سے زیادہ مال نہیں لے گا جتنا اس نے اسے دیا ہوا ہے۔"(2)

مسئلہ نمبر 7۔ امام مالک کے نزدیک خلع جائز ہے ایسے پھل کے عوض جس کے پکنے کی صلاحیت ظاہر نہ ہو، بدکنے والے اونٹ کے عوض، بھاگ جانے والے غلام کے عوض، جنین کے عوض جو ابھی اپنی ماں کے پیٹ میں ہو یا اسی طرح کی اور چیزیں جن کی ہلاکت کا امکان ہو، بخلاف بیوع اور نکاح کے اور اس کے لئے ان تمام کا مطالبہ جائز ہے پس اگر وہ اس کے حوالے ہوگئی تو وہ اس کی ہو جائے گی اور اگر اس کے حوالے نہ ہوئی تو پھر اس کے لئے کوئی شے نہ ہوگی اور طلاق اس کے حکم پر نافذ ہو جائے گی۔

امام شافعی نے کہا ہے: خلع جائز ہوگا اور اس کے لئے مہر مثل ہوگا۔ اسے ابن خویز منداد نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے انہوں نے کہا: کیونکہ وہ عقود جن میں معاوضہ ہوتا ہے جب وہ بدل فاسد کو متضمن ہوں اور وہ ضائع ہو جائے تو ان میں بدل کی مثل واجب کی طرف رجوع کیا جاتا ہے (لہٰذا مہر مثل لوٹایا جائے گا۔)

اور ابو ثور نے کہا ہے: خلع باطل ہے، اور اصحاب الرائے نے کہا ہے: خلع جائز ہے اور اس کے لئے وہ ہوگا جو لونڈی کے پیٹ میں ہے اور اگر اس میں بچہ نہ ہو تو اس کے لئے کوئی شے نہ ہوگی۔

اور "المبسوط" میں ابن قاسم سے منقول ہے: خلع جائز ہوتا ہے اس پھل کے عوض جو اس کے درخت اس سال دیں گے اور ان کے عوض جو بچے اس کا ریوڑ اس سال دے گا، اس سے امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے اختلاف کیا ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور ابن القاسم کے موقف کی دلیل اس ارشاد کا عموم ہے: فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهٖ۔

اور قیاس کی جہت سے یہ کہ یہ ان میں سے ہیں جن کا وہ ہبہ اور وصیت کے ساتھ مالک بن جاتا ہے تو پھر جائز ہے کہ یہ معلوم کی طرح خلع میں بھی عوض ہوں اور یہ بھی کہ خلع طلاق ہے اور طلاق اصلاً بغیر عوض کے صحیح ہوتی ہے تو جب بغیر کسی شے

1۔ سنن دار قطنی، کتاب النکاح، باب المہر، جلد 3، صفحہ 255، دار المحاسن قاہرہ 2۔ ایضاً

کے عوض کے یہ صحیح ہے تو پھر فاسد عوض کے ساتھ اس کا صحیح ہونا بدرجہ اولیٰ ہوگا، کیونکہ مبذول کی سب سے بری حالت یہی ہے کہ وہ مسکوت عنہ کی طرح ہو اور جب وہ نکاح جو عقد تحلیل ہے فاسد عوض اسے فاسد نہیں کرتا تو یہ اس طلاق کو کیونکر فاسد کر سکتا ہے جو عقد کو زائل کرنے والی اور اسے کھولنے والی ہے (یعنی بدرجہ اولیٰ عوض فاسد اسے فاسد نہیں کرے گا۔)

مسئلہ نمبر 8۔ اگر کسی عورت نے اس کے عوض آدمی سے خلع کیا کہ وہ اس سے اپنے بیٹے کو دو سال تک دودھ پلائے گی تو یہ جائز ہے۔ خلع کی صورت میں دو سال کے بعد مدت معلومہ تک اس کا نفقہ بیٹے پر ہوگا اس کے بارے دو قول ہیں۔ ان میں سے ایک ہے کہ وہ جائز ہے اور یہ مخزومی کا قول ہے اور اسے سحنون نے اختیار کیا ہے اور دوسرا یہ ہے کہ وہ جائز نہیں اسے ابن قاسم نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے اور اگر خاوند نے اس کی شرط لگائی تو وہ باطل ہے اور زوجہ سے اسے اتار دیا جائے گا(1) (یعنی اس پر اسے لازم نہیں کیا جائے گا)۔

ابو عمر نے کہا ہے: جنہوں نے بدکنے والے اونٹ، بھاگ جانے والے غلام اور اسی طرح کی دوسری چیزیں جن کے نہ ہونے کا امکان ہے کہ عوض خلع کو جائز قرار دیا ہے ان کے ذمہ پر لازم ہے کہ وہ اسے بھی جائز قرار دیں۔ ان کے علاوہ قرویین نے کہا: امام مالک نے اس نفقہ کے عوض خلع سے منع نہیں کیا جو دو سال سے زائد ہو غرر کی وجہ سے۔ بلکہ اس سے منع کیا ہے کیونکہ یہ وہ حق ہے جو ہر حال میں باپ کے ساتھ خاص ہوتا ہے، پس اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ اسے کسی دوسرے کی طرف منتقل کرے اور اس میں اور دو سال کے نفقہ کے درمیان فرق یہ ہے کہ وہ نفقہ اور یہ دودھ پلانا زوجیت کی حالت میں ماں پر واجب ہوتا ہے اور طلاق کے بعد بھی جب باپ تنگ دست اور مفلس ہو تو جائز ہے کہ وہ نفقہ ماں کی طرف منتقل ہو جائے، کیونکہ یہی اس کا محل ہے۔ اور امام مالک نے اس پر المبسوط میں اس ارشاد باری تعالیٰ سے استدلال کیا ہے: وَ الْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَیْنِ كَامِلَیْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ یُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ (البقرہ: ۲۳۳) (اور مائیں دودھ پلائیں اپنی اولاد کو پورے دو سال (یہ مدت) اس کے لئے ہے جو دودھ کی مدت پوری کرنا چاہتا ہے۔)

مسئلہ نمبر 9۔ اگر بیٹے کے نفقہ کے عوض وجہ مباح پر خلع واقع ہو اور مدت مکمل ہونے سے پہلے بچہ فوت ہو جائے تو کیا بقیہ نفقہ کے لئے خاوند اس کی طرف رجوع کر سکتا ہے؟ تو ابن المواز نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ وہ کسی شے کے لئے عورت کی طرف رجوع نہیں کرے گا۔ اور ابو الفرج نے آپ سے روایت کیا ہے کہ وہ اس کی طرف رجوع کر سکتا ہے کیونکہ یہ ایسا حق ہے جو خلع کے عوض اس کے لئے عورت کے ذمہ ثابت ہے اور وہ بچے کی موت سے ساقط نہیں ہوگا، جیسا کہ اگر وہ اس سے خلع کرے ایسے مال کے عوض جو عورت کے ذمہ کے ساتھ متعلق ہو۔ اور پہلے قول کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنے لئے ایسے مال کی شرط نہیں لگائی جو اسے خوشحال بنادے گا، بلکہ اس نے اپنے بچے کی مشقت کی کفایت کرنے کی شرط لگائی ہے اور جب بچہ فوت ہو گیا تو اب اس کے لئے عورت کی طرف کسی شے کے لئے رجوع نہیں ہوگا جیسا کہ اگر کوئی آدمی ایک سال تک کسی بچے پر استحساناً اور تطوعاً خرچ کرنے کی ذمہ داری لے اور بچہ فوت ہو جائے تو اس پر کسی شے کے لئے رجوع نہیں کیا

1۔ المدونۃ الکبری، کتاب ما جاء فی الخدم، جلد 5، صفحہ 27، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر

جائے گا کیونکہ اس نے اپنے تطوع سے بچے کی مشقت برداشت کرنے کا قصد کیا ہے۔ واللہ اعلم

امام مالک نے کہا ہے: میں نے کسی کو نہیں دیکھا ہے جو اس طرح کی صورت میں رجوع کرتا ہو اور اگر وہ اس کا پیچھا کرے تو بھی اس بارے اس کے لئے آپ کا ایک قول ہے۔ اور علماء نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ اگر عورت فوت ہوگئی تو بچے کا نفقہ اس کے مال میں ہوگا کیونکہ یہ وہ حق ہے جو اس کی موت سے پہلے اس میں ثابت ہو چکا ہے، لہٰذا وہ اس کی موت کے ساتھ ساقط نہیں ہوگا۔

مسئلہ نمبر 10۔ جس کسی نے خلع کی صورت میں اپنی عورت پر اس کے حمل کے نفقہ کی شرط لگائی اور عورت کے پاس کوئی شے نہ ہو تو نفقہ اس آدمی پر ہوگا کیونکہ عورت کے پاس کوئی مال نہیں ہے جس سے وہ خرچ کر سکے اور اگر وہ اس کے بعد خوشحال ہو جائے تو آدمی اس مال کے لئے اس کی طرف رجوع کر لے جو اس نے خرچ کیا اور وہ اس سے لے لے۔

امام مالک نے کہا: حق یہ ہے کہ آدمی کو اس کے اپنے بچے کے نفقہ کا مکلف اور پابند بنایا جائے اگرچہ اس نے بچے کی ماں پر اس کے نفقہ کی شرط لگائی ہو بشرطیکہ ماں کے پاس ایسا مال نہ ہو جو وہ اس پر خرچ کر سکے۔

مسئلہ نمبر 11۔ خلع کے بارے میں علماء کا یہ اختلاف ہے کہ کیا وہ طلاق ہے یا فسخ نکاح ہے؟ پس حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم اور تابعین کی ایک جماعت سے مروی ہے کہ خلع طلاق ہے(1) اور یہی امام مالک، ثوری، اوزاعی، ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہم نے اپنے دو قولوں میں سے ایک میں کہا ہے۔ پس جس نے خلع سے دو یا تین طلاقوں کی نیت کی، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ اسے لازم ہو جائیں گی اور اصحاب الرائے نے کہا ہے: اگر خاوند نے تین طلاقوں کی نیت کی تو وہ تین ہی ہوں گی اور اگر اس نے دو کی نیت کی تو وہ ایک طلاق بائنہ ہوگی (کیونکہ یہ ایک کلمہ ہے)۔

اور امام شافعی نے اپنے دو قولوں میں سے ایک میں کہا ہے: اگر اس نے خلع سے طلاق کی نیت کی اور اس کا نام بھی لیا تو وہ طلاق ہوگی اور اگر اس نے طلاق کی نیت نہ کی اور نہ اس کا نام لیا تو فرقت واقع نہ ہوگی، آپ نے قدیمی قول میں یہی کہا ہے اور آپ کا پہلا قول میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے۔ مزنی نے کہا ہے: وہی ان کے نزدیک زیادہ صحیح ہے۔

اور ابوثور نے کہا ہے: جب وہ طلاق کا نام نہ لے تو خلع فقط فرقت ہوگی اور طلاق نہیں ہوگی اور اس نے طلاق کا نام لیا تو وہ طلاق ہوگی اور زوج رجعت کا زیادہ مالک ہوگا جب تک وہ عدت میں رہی۔

اور جنہوں نے کہا ہے کہ خلع فسخ ہے، طلاق نہیں ہے مگر یہ کہ وہ اس کی نیت کرے ان میں سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت طاؤس، حضرت عکرمہ، حضرت اسحاق اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم ہیں۔ انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جو ابن عیینہ نے عمرو سے، انہوں نے طاؤس سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ ابراہیم بن سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما نے ان سے پوچھا کہ ایک آدمی جس نے اپنی بیوی کو دو طلاقیں دیں پھر بیوی نے اس سے خلع لے لیا کیا وہ اس

1۔ المدونۃ الکبری، کتاب ماجاء فی الخلع، جلد 5، صفحہ 18، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر

سے شادی کرسکتا ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہاں چاہیے کہ وہ اس سے نکاح کر لے، خلع طلاق نہیں ہے(1)۔ اللہ تعالیٰ نے آیت کی ابتدا میں اور اس کے آخر میں طلاق کا ذکر کیا ہے اور خلع کا ذکران کے درمیان میں ہے، پس خلع کوئی شے نہیں ہے۔ پھر کہا: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ، پھر پڑھا: فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ۔ انہوں نے کہا: کیونکہ اگر خلع طلاق ہو تو پھر دو طلاقوں کے ذکر کے بعد یہ تیسری ہوگی اور اس کے بعد فَاِنْ طَلَّقَهَا چوتھی طلاق پر دال ہوگا، پس تحریم چار طلاقوں کے ساتھ متعلق ہو جائے گی۔

انہوں نے اس روایت سے بھی استدلال کیا ہے جسے امام ترمذی، ابوداؤد اور دار قطنی رحمۃ اللہ علیہم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی نے اپنے زوج سے خلع لیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ایک حیض عدت گزارنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ حدیث حسن غریب ہے(2)۔ اور حضرت ربیع بنت معوذ بن عفراء سے روایت ہے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مقدس میں خلع لیا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم دیا یا اسے حکم دیا گیا کہ وہ ایک حیض کے ساتھ عدت گزارے۔ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ربیع کی حدیث صحیح ہے کہ اسے حکم دیا گیا کہ وہ ایک حیض عدت گزارے(3)۔ انہوں نے کہا: پس یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ خلع فسخ ہے نہ کہ طلاق اور اس لئے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ اور اگر یہ (خلع لینے والی) عورت مطلقہ ہوتی تو اس کے لئے ایک حیض پر اقتصار نہ کیا جاتا (کیونکہ عدت تو تین حیض ہے)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پس جس نے اپنی بیوی کو دو طلاقیں دیں پھر اس نے اس سے خلع کر لیا، پھر وہ اس سے شادی کرنے کا ارادہ کرے تو وہ اس کے لئے صحیح ہے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا۔ اگرچہ وہ اس کے علاوہ کسی زوج سے شادی نہ کرے۔ کیونکہ اس کے لئے دو طلاقوں کے سوا کچھ نہیں ہے اور خلع لغو ہے۔

اور جنہوں نے خلع کو طلاق بنایا ہے انہوں نے کہا ہے: اس کے لئے اس عورت کی طرف رجوع کرنا جائز نہیں یہاں تک کہ وہ دوسرے زوج سے شادی کر لے، کیونکہ خلع کے ساتھ تین طلاقیں مکمل ہو گئی ہیں اور یہی صحیح ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قاضی اسماعیل بن اسحاق نے کہا ہے: اس آدمی کے بارے میں قول کیسے جائز ہو سکتا ہے جسے اس کی بیوی نے کہا: تو مجھے مال کے عوض طلاق دے دے، پس اس نے اسے طلاق دے دی، کہ یہ طلاق نہیں ہوگی اور اگر اس نے بغیر کسی شے کے عورت کا معاملہ اس کے ہاتھ دے دیا اور اس نے اپنے آپ کو طلاق دے دی تو وہ طلاق ہوگی۔ (فرمایا) رہا قول باری تعالیٰ: فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ تو یہ اس قول پر معطوف ہے: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ کیونکہ اس کا ارشاد: اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ بلاشبہ یہ مراد بہ ہے یا تطلیق ہے اور اگر خلع کا عطف دو طلاقوں پر کیا جائے تو پھر خلع اصلاً جائز ہی نہ ہوگا

1۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، باب الخلع ہل ہو فسخ او طلاق، جلد 7، صفحہ 316، دار الفکر بیروت

2۔ جامع ترمذی، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 142، وزارت تعلیم اسلام آباد۔ ابوداؤد، باب الخلع، حدیث نمبر 1902، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً۔ جامع ترمذی، باب ماجاء فی الخلع، حدیث نمبر 1105، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔

مگر دو طلاقوں کے بعد اور یہ کوئی بھی نہیں کہتا۔

اور کسی اور نے کہا ہے: آیت میں جو تاویل انہوں نے کی ہے وہ غلط ہے، کیونکہ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ نے دو طلاقوں کے حکم کا فائدہ دیا ہے جب وہ ان دونوں کو خلع کی وجہ کے سوا پر واقع کرے۔ اور ان دونوں کے ساتھ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ کے سبب رجعت بھی ثابت ہوگی۔ پھر ان دونوں کا حکم ذکر کیا جب یہ علی وجہ الخلع ہوں۔ پس خلع ان دو کی طرف لوٹ آئے گا جن کا ذکر پہلے ہو چکا، کیونکہ اس سے مقصود طلاق مطلق اور طلاق بالعوض کا بیان ہے اور تیسری طلاق چاہے بالعوض ہو یا بغیر عوض کے ہو بلاشبہ وہ حلت کو ختم کر دیتی ہے مگر زوج ثانی کے بعد۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ جواب تو آیت کا ہے اور رہی حدیث! تو ابوداؤد نے کہا ہے۔ جب انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث حیض کے بیان میں ذکر کی۔ اس حدیث کو عبدالرزاق نے معمر بن عمرو بن مسلم عن عکرمہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سند سے مرسل ذکر کیا ہے اور قعنبی نے مالک عن نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہما کی سند سے ہمیں بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: خلع والی عورت کی عدت طلاق والی عورت کی عدت کی مثل ہے (1)۔ ابوداؤد نے کہا ہے: ہمارے نزدیک عمل اسی پر ہے۔

میں کہتا ہوں: یہی امام مالک، شافعی، احمد، اسحاق، ثوری اور اہل کوفہ کا مذہب ہے۔ امام ترمذی نے کہا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے اکثر اہل علم اور دوسروں کا بھی یہی مذہب ہے۔

میں کہتا ہوں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک حیض کے بارے میں حدیث اپنی غرابت کے باوجود جیسا کہ امام ترمذی نے کہا ہے اور مرسل ہونے کے باوجود جیسا کہ ابوداؤد نے ذکر کیا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی عدت ڈیڑھ حیض مقرر فرمائی (2)، اسے دارقطنی نے معمر عن عمرو بن مسلم عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے ذکر کیا ہے کہ حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی نے اپنے زوج سے خلع لیا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی عدت ڈیڑھ حیض مقرر فرمائی۔ یہاں معمر سے ڈیڑھ حیض روایت کرنے والا وہی راوی ہے جو ان سے ایک حیض روایت کرتا ہے اور وہ ہشام بن یوسف ابو عبدالرحمٰن الصنعانی الیمانی ہے۔ اکیلے امام بخاری نے اس کی روایت نقل کی ہے۔ پس سند اور متن کے اعتبار سے حدیث مضطرب ہے، پس اس سے اس بارے میں استدلال کرنا ساقط ہو گیا کہ خلع فسخ نکاح ہے اور اس بارے میں بھی کہ مطلقہ کی عدت ایک حیض ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ہر مطلقہ مدخول بہا کے بارے میں نص باقی رہا۔ سوائے ان کے جنہیں اس سے خاص کیا گیا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ''اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اصحاب نے کہا ہے: خلع والی عورت کی عدت ایک حیض ہے (3)، اسحاق نے کہا ہے: اگر کوئی جانے والا اس طرف جائے تو وہ مذہب قوی ہے۔''

ابن منذر نے کہا ہے کہ حضرت عثمان بن عفان اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم نے فرمایا: اس کی عدت ایک حیض ہے اور یہی ابان

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 518، وزارت تعلیم 2۔ سنن دارقطنی، کتاب النکاح، جلد 3، صفحہ 255، دار المحاسن قاہرہ

3۔ جامع ترمذی، کتاب الطلاق واللعان، جلد 1، صفحہ 142، وزارت تعلیم۔ ایضاً، باب فی الخلع، حدیث نمبر 1105، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بن عثمان اور اسحاق نے بھی کہا ہے۔

اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے اس کی عدت مطلقہ کی عدت کی طرح ہے اور حضرت عثمان اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم کے قول کے بارے میں میں کہتا ہوں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث ثابت نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: تحقیق ہم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا: خلع والی عورت کی عدت طلاق والی عورت کی عدت کی طرح ہے(1) اور یہ قول صحیح ہے۔

مسئلہ نمبر 12۔ امام مالک کا قول اس کے بارے میں مختلف ہے جس نے بلاعوض خلع واقع کرنے کا قصد کیا۔ پس عبدالوہاب نے کہا ہے: امام مالک کے نزدیک وہ خلع ہے اور طلاق بائن ہے اور آپ سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ طلاق بائن نہ ہو گی مگر عوض پائے جانے کے ساتھ۔ اشہب اور امام شافعی نے بھی یہی کہا ہے، کیونکہ یہ طلاق عوض اور استیفاء عدد سے خالی ہے پس یہ رجعی ہوگی جیسا کہ اگر یہ لفظ طلاق کے ساتھ ہو۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے: میرے نزدیک اور دیگر اہل علم کے نزدیک نظر وفکر کے اعتبار سے آپ کے دو قولوں میں سے یہ زیادہ صحیح ہے اور پہلے قول کی وجہ یہ ہے کہ خلع میں عوض کا حاصل نہ ہونا اسے اپنے مقتضا سے نہیں نکالتا۔ اس کی اصل یہ ہے کہ جب وہ شراب یا خنزیر کے عوض خلع کرے۔

مسئلہ نمبر 13۔ خلع کرنے والی عورت وہ ہوتی ہے جو اپنی کل شے کے عوض خلع کرتی ہے۔ اور مفتدیہ فدیہ دینے والی وہ ہوتی ہے جو بعض مال بطور فدیہ دیتی ہے اور بعض لے لیتی ہے اور مبارئۃ مبارات کرنے والی وہ ہوتی ہے جو دخول سے پہلے ہی اپنے خاوند سے جدائی اختیار کر لے۔ پس وہ کہتی ہے: قد ابرأتك فبارئنی (میں نے تجھے جدا کیا پس تو مجھے جدا کردے۔) یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے اور عیسیٰ بن دینار نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے: مبارئۃ وہ عورت ہے جو نہ کوئی شے لیتی ہے اور نہ کچھ دیتی ہے(2) اور مختلعہ (خلع کرنے والی) وہ ہے جو وہ مال بھی دے دیتی ہے جو خاوند نے اسے دیا ہو اور اپنے مال سے اس میں اضافہ بھی کرتی ہے۔ اور مفتدیہ وہ ہے جو اس مال کے بعض سے فدیہ دیتی ہے جو مرد نے اسے دیا ہو اور بعض اپنے پاس روک لیتی ہے اور یہ سب دخول سے پہلے بھی ہو سکتا ہے اور بعد بھی۔ پس جو دخول سے پہلے ہو اس میں عدت نہیں ہے۔ اور مصالحہ (صلح کرنے والی) مبارئۃ کی مثل ہے۔

قاضی ابو محمد وغیرہ نے کہا ہے: یہ چاروں الفاظ ایک ہی معنی کی طرف راجع ہوتے ہیں(3) اگرچہ ایقاع کے اعتبار سے ان کی صفات مختلف ہیں۔ اور یہ طلاق بائنہ ہے چاہے وہ اس کا نام لے یا نام نہ لے، مرد کے لئے عدت کے دوران رجعت کا حق نہیں ہوگا اور اسے عدت میں اور اس کے بعد ولی کی رضامندی اور مہر کے ساتھ زوج ثانی سے پہلے اور بعد نکاح کا حق حاصل ہوگا، بخلاف ابو ثور کے، کیونکہ عورت نے جب عوض ادا کر دیا تو وہ اپنے نفس کی مالک ہو جائے گی اور اگر طلاق خلع رجعی ہو تو

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 518، وزارت تعلیم

2۔ المدونۃ الکبری، کتاب ما جاء فی الخلع، جلد 5، صفحہ 14، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر

3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 309، دار الکتب العلمیۃ بیروت

پھر وہ اپنے نفس کی مالک تو نہ ہوئی: پس خاوند کے لئے عوض اور معوض عنہ دونوں جمع ہو جائیں گے (اور یہ صحیح نہیں ہے۔)

مسئلہ نمبر 14۔ اور یہ عقد مطلق کے ساتھ نافذ ہے: پس اگر عورت نے مرد کے لئے عوض خرچ کر دیا اور اس نے رجعت کی شرط لگائی، تو اس میں دو روایتیں ہیں۔ ابن وہب نے دونوں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی ہیں۔ ان میں سے ایک میں اس کا ثبوت ہے اور سحنون نے بھی اسی طرح کہا ہے اور دوسری میں اس کی نفی ہے۔ سحنون نے کہا ہے: پہلی روایت کی وجہ یہ ہے کہ وہ دونوں (مرد و عورت) اس پر متفق ہو گئے کہ عوض اس کے مقابلے میں ہوگا جو عدد طلاق میں سے ساقط ہو رہا ہے اور یہ جائز ہے۔

اور دوسری روایت کی وجہ یہ ہے کہ اس نے عقد میں شرط ایسی قائم کی ہے جو مقصود کے مانع ہے، پس وہ ثابت نہ ہوگی، جیسا کہ اگر وہ عقد نکاح میں شرط رکھ لے کہ میں اس سے وطی نہ کروں گا۔

مسئلہ نمبر 15۔ قولہ تعالیٰ: تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا۔ جب اللہ تعالیٰ نے نکاح اور فراق کے احکام بیان کیے تو فرمایا: تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں جن کی پیروی کرنے کا حکم دیا گیا ہے جیسا کہ دوسری آیت میں روزے کی تحریمات کا ذکر کیا اور فرمایا: تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا (یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں سو تم ان کے قریب نہ جاؤ) اور حدود کو دو قسموں میں تقسیم کر دیا ان میں سے ایک وہ حدود الامر ہیں جن کی پیروی لازم ہے اور دوسری حدود النہی ہیں جن سے اجتناب لازم ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے خبر دی اور فرمایا: وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کی حدود سے آگے بڑھتا ہے سو وہی لوگ ظالم ہیں۔)

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝

"(دو بار طلاق دینے کے بعد) پھر اگر وہ طلاق دے اپنی بیوی کو تو وہ حلال نہ ہوگی اس پر اس کے بعد یہاں تک کہ نکاح کرے کسی اور خاوند کے ساتھ پس اگر وہ (دوسرا) طلاق دے اسے تو کوئی حرج نہیں ان دونوں پر کہ رجوع کر لیں بشرطیکہ انہیں خیال ہو کہ وہ قائم رکھ سکیں گے اللہ کی حدود کو اور یہ حدیں ہیں اللہ کی وہ بیان فرماتا ہے انہیں ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں۔"

قولہ تعالیٰ: فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ اس میں گیارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ احناف میں سے بعض مشائخ خراسان نے اس آیت سے اس پر استدلال کیا ہے کہ خلع والی عورت کو طلاق لاحق ہو سکتی ہے۔ انہوں نے کہا: ایسی طلاق جس کے عوض فدیہ دیا جاتا ہے اس کے بعد اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے صریح طلاق کا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ فا حرف تعقیب ہے (1)۔ اور یہ بعید ہے کہ اسے اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ کی طرف لوٹایا جائے، کیونکہ درمیان

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 196، دار الفکر بیروت

میں ایسا کلام ہے جو فَاِنۡ طَلَّقَهَا کی اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ پر بنا کرنے کے مانع ہے۔ بلکہ اقرب یہی ہے کہ اس کا رجوع اس پر ہو جو اس کے ساتھ متصل ہے جیسا کہ استثنا (ان شاء اللہ تعالیٰ) میں ہوتا ہے۔ اور یہ اس کی طرف راجع نہیں ہوگا جو اس سے متقدم ہے مگر دلالت کے ساتھ (یعنی جب کوئی قرینہ دال ہو تو پھر متقدم کی طرف راجع ہوسکتا ہے) جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِیۡ فِیۡ حُجُوۡرِكُمۡ مِّنۡ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِیۡ دَخَلۡتُمۡ بِهِنَّ (النساء: ۲۳) (اور تمہاری بیویوں کی بیٹیاں جو تمہاری گودوں میں (پرورش پارہی) ہیں ان بیویوں سے جن سے تم صحبت کر چکے ہو۔)

پس یہ اسی پر مقصور ہوگی جو اس کے متصل بعد ہے اور اس کی طرف عائد نہیں جو اس پر متقدم ہے یہاں تک کہ عورتوں کی ماؤں کے بارے میں دخول کی شرط نہیں ہوگی۔

علماء کا خلع کے بعد عدت میں طلاق ہونے کے بارے اختلاف ہے، پس ایک گروہ نے کہا ہے: جب آدمی نے اپنی بیوی سے خلع کرلیا پھر اسے طلاق دے دی اور وہ عورت ابھی عدت میں تھی تو جب تک وہ عدت میں ہے اسے طلاق واقع ہو جائے گی۔ اسی طرح حضرت سعید بن مسیب، شریح، طاؤس، نخعی، زہری، حکم، حماد، ثوری، اصحاب الرائے رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔

اور اس میں دوسرا قول یہ ہے کہ اسے طلاق لازم نہ ہوگی اور یہ قول حضرت ابن عباس، حضرت ابن زبیر، حضرت عکرمہ، حضرت حسن، حضرت جابر بن زید، امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور ابو ثور رضی اللہ عنہم و رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔ اور یہی امام مالک کا قول ہے، مگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اگر عورت نے اس شرط پر اسے طلاق کا فدیہ دیا کہ وہ اسے مسلسل تین طلاقیں ترتیب کے ساتھ دے گا پھر جس وقت اس نے اسے طلاق دی تو وہ اس پر ثابت ہوگئی اور اگر اس کے درمیان خاموشی ہو تو جو طلاق خاموشی اور وقفے کے بعد ہوگی وہ کوئی شے نہ ہوگی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نسق الکلام کا معنی ہے کہ وہ بعض بعض کے ساتھ متصل ہو اور یہ اس کے لئے ایک حکم ثابت کرتا ہے اسی طرح جب استثناء قسم کے متصل بعد ہو تو اس کے لئے استثنا کا حکم ثابت ہو جاتا ہے اور جب اس سے منفصل ہو تو پھر اس کا متقدم کلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: فَاِنۡ طَلَّقَهَا سے مراد تیسری طلاق ہے فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنۡۢ بَعۡدُ حَتّٰى تَنۡكِحَ زَوۡجًا غَيۡرَهٗ اس پر اجماع ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ اس بارے میں اختلاف ہے (کیا) نکاح کافی ہوتا ہے۔ اور اس بارے میں کہ کیا شے تحلیل کو مباح کرتی ہے۔ پس حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھ موافقت رکھنے والوں نے کہا ہے: صرف عقد نکاح ہی کافی ہے۔ اور حسن بن ابی الحسن نے کہا ہے: صرف وطی کافی نہیں ہے یہاں تک کہ انزال ہو جائے۔

جمہور علماء اور تمام فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ اس میں وطی کافی ہے اور اس سے مراد شرمگاہوں کا اس طرح ملنا ہے جو حد اور غسل کو واجب کردے۔ روزے اور حج کو فاسد کردے اور زوجین کو محصن بنادے اور کامل مہر لازم کردے۔

ابن عربی نے کہا ہے: فقہ میں میرے سامنے کوئی ایسا مسئلہ نہیں آیا جو اس سے زیادہ مشکل ہو اور وہ یہ کہ اصول فقہ میں سے ہے کہ کیا حکم اوائل اسماء سے متعلق ہوتا ہے یا اواخر اسماء سے؟ سو اگر ہم کہیں کہ حکم اوائل اسماء سے متعلق ہوتا ہے تو پھر ہم پر لازم

ہے کہ ہم حضرت سعید بن مسیب کے قول کے مطابق کہیں۔ اور اگر ہم کہیں کہ حکم اواخر اسماء سے متعلق ہوتا ہے تو پھر ہم پر لازم ہے کہ ہم حشفہ کو فرج میں غائب کرنے کے ساتھ انزال کی شرط بھی لگائیں، کیونکہ یہی ذوق عسیلہ کا آخر ہے (1) جیسا کہ حسن نے کہا ہے۔ ابن منذر نے کہا ہے: ذوق عسیلہ کا معنی وطی کرنا ہے۔ حضرت سعید بن مسیب کے سوا علماء کی جماعت کا یہی موقف ہے۔ آپ فرماتے ہیں: پس لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ وہ عورت پہلے خاوند کے لئے حلال نہیں ہوگی یہاں تک کہ دوسرا اس سے مجامعت کر لے اور میں یہ کہتا ہوں جب دوسرے خاوند نے اس کے ساتھ نکاح صحیح کر لیا کہ وہ اس سے اس کے حلالہ کا ارادہ نہ کرے تو پھر کوئی حرج نہیں کہ زوج اول اس سے نکاح کر لے۔ اور یہ قول ہے جس کے بارے ہم کسی کو بھی نہیں جانتے جس نے آپ کے ساتھ موافقت کی ہو سوائے خوارج کی ایک جماعت کے اور اس کے ماسوا کے بارے میں سنت پر اکتفا کیا گیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضرت سعید بن مسیب کے قول کے بارے میں حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے۔ اسے نحاس نے کتاب "معانی القرآن" میں ذکر کیا ہے۔ فرمایا: اہل علم کا نظریہ یہ ہے کہ یہاں نکاح سے مراد جماع ہے، کیونکہ فرمایا: زَوْجًا غَيْرَهٗ حالانکہ زوجیت مقدم ہے پس نکاح جماع کے معنی میں ہوگا۔ مگر سعید بن جبیر نے کہا ہے کہ یہاں لفظ نکاح نکاح صحیح کے معنی میں ہے جب اس نے اسے حلالہ کرنے کا ارادہ نہ کیا ہو۔

میں (مفسر) نے کہا ہے: میں ان دونوں کے بارے یہ گمان کرتا ہوں کہ حدیث عسیلہ ان تک نہیں پہنچی یا وہ ان کے نزدیک صحیح نہیں ہے، پس انہوں نے ظاہر قرآن کو لے لیا اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ واللہ اعلم۔

ائمہ کرام نے روایت کیا اور الفاظ دارقطنی کے ہیں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب آدمی اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے تو وہ اس کے لئے حلال نہ ہوگی یہاں تک کہ وہ اس کے سوا کسی اور خاوند سے شادی کر لے اور دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کا شہد چکھ لے۔" (2)

بعض علمائے احناف نے کہا ہے: جو کوئی حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کے مذہب کے مطابق عقد نکاح کر لے تو قاضی کو چاہیے کہ وہ اسے فسخ کر دے اور اس میں آپ کے اختلاف کا کوئی اعتبار نہیں ہے کیونکہ وہ علماء کے اجماع سے خارج ہیں۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: اور وہی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد سے سمجھا جاتا ہے: حتی یذوق کل واحد منهما عسیلة صاحبه (3) کہ وہ دونوں جماع کی لذت پانے میں برابر ہیں۔ اور یہی ہمارے نزدیک اس بارے میں دو قولوں میں سے ایک کے لئے حجت ہے کہ اگر اس نے اس سے وطی کی درآنحالیکہ وہ سوئی پڑی ہو یا اس پر غشی طاری ہو تو وہ طلاق دینے والے (زوج اول) کے لئے حلال نہ ہوگی، کیونکہ اس نے شہد نہیں چکھا جب اسے اس کا ادراک نہ ہوا۔

مسئلہ نمبر 3۔ امام نسائی نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بال گودنے والی اور گودوانے والی، دوسرے کے بال اپنے بالوں میں لگانے والی اور بال لگوانے والی، سود کھانے والے اور

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 196، دار الفکر بیروت

2۔ دار قطنی، کتاب الطلاق، جلد 4، صفحہ 32، دار المحاسن قاہرہ 3۔ ایضاً

کھلانے والے، حلالہ نکالنے والے اور جس کے لئے حلالہ نکالا جائے ان تمام پر لعنت کی ہے۔(1)

اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حلالہ نکالنے والے اور جس کے لئے حلالہ نکالا جائے پر لعنت کی ہے(2)۔ اور کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور یہ حدیث حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی اسناد سے مروی ہے اور اہل علم کے نزدیک حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے جن کا اس پر عمل ہے ان میں سے حضرت عمر بن خطاب، حضرت عثمان بن عفان اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم وغیرہ ہیں۔

اور تابعین میں سے فقہاء کا بھی یہی قول ہے اور اسی طرح سفیان ثوری، ابن مبارک، امام شافعی، امام مالک، امام احمد اور اسحاق رحمہم اللہ بھی کہتے ہیں اور میں نے جارود سے سنا ہے وہ وکیع سے ذکر کرتے ہیں کہ انہوں نے بھی اسی طرح کہا ہے اور فرمایا: چاہئے کہ اس باب کے بارے میں اصحاب رائے کا قول بیان کیا جائے اور حضرت سفیان رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: جب آدمی کسی عورت سے شادی کرے تا کہ وہ اسے (پہلے خاوند کے لئے) حلال کر دے پھر اسے خیال آیا کہ وہ اسے روک لے تو وہ اس کے لئے حلال نہیں ہوگی یہاں تک کہ وہ اس کے ساتھ نیا نکاح کرے۔

ابوعمر بن عبدالبر نے کہا ہے کہ حلالہ نکالنے والے کے نکاح میں علماء نے اختلاف کیا ہے اور امام مالک نے کہا ہے: حلالہ نکالنے والا اپنے نکاح پر قائم نہیں رہے گا یہاں تک کہ وہ نکاح جدید کر لے، پس اگر اس نے اس کے ساتھ مجامعت کی تو اس کے لئے مہر مثل ہوگا اور اس کی مجامعت اسے زوج اول کے لئے حلال نہیں کرے گی۔ برابر ہے دونوں کو علم ہو یا علم نہ ہو جب اس نے حلالہ کی غرض سے اس کے ساتھ شادی کی۔ اور نہ وہ اپنے نکاح پر برقرار رہے گا اور اسے فسخ کر دیا جائے گا۔ اسی طرح امام ثوری اور اوزاعی نے بھی کہا ہے اور اس میں ایک دوسرا قول بھی ہے جو نکاح خیار اور محلل کے بارے میں امام ثوری سے مروی ہے کہ نکاح جائز ہے اور شرط باطل ہے اور اس میں اور نکاح متعہ کے بارے میں ابن ابی لیلیٰ کا بھی یہی قول ہے اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ سے نکاح محلل کے بارے میں مروی ہے: کتنا برا ہے جو اس نے کیا ہے اور نکاح جائز ہے۔

اور امام اعظم ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ نے کہا ہے: نکاح جائز ہے اگر اس کے ساتھ دخول کیا گیا اور اس کے لئے اسے اپنے پاس روک لینا جائز ہے اگر وہ چاہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے: وہ عورت زوج اول کے لئے حلال نہیں ہوگی اگر اس نے اس کے ساتھ حلالہ کی غرض سے شادی کی اور ایک بار انہوں نے کہا: اس نکاح کے ساتھ وہ اس کے لئے حلال ہو جائے گی بشرطیکہ زوج ثانی اس کے ساتھ مجامعت کرے اور اسے طلاق دے دے اور اس بارے میں انہوں نے کوئی اختلاف نہیں کیا کہ اس زوج (مراد زوج ثانی) کا نکاح صحیح ہے اور یہ کہ اس کے لئے جائز ہے کہ وہ اس پر قائم رہے۔

1۔ سنن نسائی، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 101، وزارت تعلیم۔ ایضاً، مسند امام احمد، حدیث نمبر 4283

2۔ جامع ترمذی، کتاب النکاح، جلد 1، صفحہ 133، وزارت تعلیم

ایضاً، باب ماجاء فی المحل الخ، حدیث نمبر 1038-1039۔ ابوداؤد، باب فی التحلیل، حدیث نمبر 1778، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابن ماجہ، باب المحلل والمحلل لہ، حدیث نمبر 1923-1924-1925، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور اس میں ایک تیسرا قول بھی ہے: امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب آدمی نے یہ کہا کہ میں تیرے ساتھ شادی کرنے لگا ہوں تا کہ میں تجھے (زوج اول کے لئے) حلال کر دوں پھر اس کے بعد ہمارے درمیان کوئی نکاح نہیں، تو یہ نکاح متعہ کی قسم ہے اور یہ فاسد ہے، وہ اس پر برقرار نہیں رہے گا اور اسے فسخ کر دیا جائے گا اور اگر اس نے اس نکاح پر وطی کی تو وہ (زوج اول کے لئے) حلال نہ ہوگی اور اگر زوج ثانی نے اس کے ساتھ مطلقاً نکاح کیا نہ اس نے کوئی شرط لگائی اور نہ ہی اس پر حلالہ کی شرط لگائی گئی تو اس بارے میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ان کی قدیم کتاب میں دو قول ہیں۔ ان میں سے ایک امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی مثل ہے اور دوسرا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی مثل ہے اور ان کی جدید مصری کتاب میں ان کا قول مختلف نہیں کہ نکاح صحیح ہوگا جب اس نے کوئی شرط نہ لگائی اور یہی داؤد کا قول ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: الماوردی نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے کہ اگر حلالہ کی شرط عقد سے پہلے لگائی گئی تو نکاح صحیح ہوگا اور وہ اسے زوج اول کے لئے حلال کر دے گا۔ اور اگر دونوں نے عقد کے دوران حلالہ کی شرط لگائی تو نکاح باطل ہوگا اور وہ اسے پہلے کے لئے حلال نہیں کرے گا۔ فرمایا: یہی امام شافعی کا قول ہے اور حسن اور ابراہیم نے کہا ہے: جب تین میں سے کسی ایک نے حلالے کا قصد کیا تو نکاح فاسد ہوگا اور یہ بہت شدت اور سختی ہے اور سالم اور قاسم نے کہا ہے: کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ حلالہ کی غرض سے شادی کرے بشرطیکہ زوجین کو اس کا علم نہ ہو (1) اور وہ ماجور ہوگا۔ اسی طرح ربیعہ اور یحییٰ بن سعید نے کہا ہے اور داؤد بن علی نے بھی یہی کہا ہے بشرطیکہ عقد کرتے وقت اس کی شرط کا اظہار نہ ہو۔

مسئلہ نمبر 4۔ ہمارے علماء کے نزدیک حلالہ کے لئے نکاح کے جائز ہونے کا دارومدار نکاح کرنے والے زوج پر ہے۔ خواہ اس کی شرط لگائی جائے یا وہ اس کی نیت کرے اور جب اس میں سے کوئی شے ہوگی تو اس کا نکاح فاسد ہوگا اور وہ اس پر برقرار نہیں رہے گا اور اس کی وطی اس عورت کو زوج اول کے لئے حلال نہیں کرے گی۔ اور طلاق دینے والے خاوند کا اس بارے میں جاننا اور نہ جاننا برابر ہے اور کہا گیا ہے: بے شک اسے چاہئے کہ جب اسے علم ہو کہ اس کے ساتھ نکاح کرنے والے نے اس لئے اس کے ساتھ شادی کی ہے تو وہ اس کے رجوع سے احتیاط برتے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اسے حلال نہیں کرے گا مگر وہ نکاح جو رغبت کے ساتھ ہو اور اسے عورت کی حاجت اور ضرورت ہو اور اس سے حلالہ کا قصد نہ کیا جائے اور اس کا عورت کے ساتھ وطی کرنا مباح ہو (یعنی) نہ وہ روزے دار ہو، نہ حالت احرام میں ہو اور نہ ہی حیض کی حالت میں ہو اور زوج بالغ مسلمان ہو۔

اور امام شافعی نے کہا ہے: جب زوج ثانی نکاح صحیح کے ساتھ اس سے وطی کرے اور اس کی فرج میں حشفہ غائب کر دے تو تحقیق دونوں نے شہد چکھ لیا اور اس میں نکاح کرنے والے کا قوی اور ضعیف ہونا برابر ہے اور برابر ہے کہ وہ اسے داخل کرے اپنے ہاتھ کے ساتھ یا عورت کے ہاتھ کے ساتھ اور وہ بچہ ہو یا مراہق (قریب البلوغ) ہو یا مجبوب (مقطوع الذکر) ہو اس کا اتنا حصہ باقی ہو جسے وہ غائب کر سکتا ہو جیسا کہ غیر خصی آدمی غائب کرتا ہے اور برابر ہے کہ خاوند اس سے وطی کرے اس حال

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 309، دار الکتب العلمیہ

میں کہ وہ عورت احرام باندھے ہوئے ہو یا روزے دار ہو یہ سب کچھ اس بنا پر ہے جو امام شافعی نے بیان کیا ہے۔ اور امام ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب، امام ثوری، اوزاعی، حسن بن صالح کا قول بھی ہے اور بعض اصحاب مالک کا قول بھی ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ ابن حبیب نے کہا ہے: اگر وہ اس سے شادی کرے پھر اگر وہ اسے پسند آ جائے تو وہ اسے روک لے گا ورنہ اسے حلال کرنے میں اس کے لئے اجر ہوگا تو یہ جائز نہیں۔ جب اس نے اپنے نکاح کو حلالہ کی نیت سے ملا دیا تو اب اس کے ساتھ وہ زوج اوّل کے لئے حلال نہ ہوگی۔

مسئلہ نمبر 6۔ آقا کا اپنی اس لونڈی کے ساتھ وطی کرنا جس کا خاوند اسے قطعی طلاق دے دے اسے حلال نہیں کرتا، کیونکہ وہ زوج نہیں ہے۔ یہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور یہی عبیدہ، مسروق، شعبی، ابراہیم، جابر بن زید، سلیمان بن یسار، حماد بن ابی سلیمان اور ابوالزناد رحمۃ اللہ علیہم کا بھی قول ہے اور اسی موقف پر فقہائے امصار کی جماعت بھی ہے۔

اور عثمان، زید بن ثابت اور زبیر سے اس کے خلاف بھی روایت ہے وہ یہ کہ وہ اسے حلال کر دے گا جب اس کے آقا نے اس کے ساتھ وطی کی اور وہ اس سے نہ دھوکہ دہی کا ارادہ کرے اور نہ ہی حلالہ کا اور وہ اپنے زوج کی طرف نکاح اور مہر کے ساتھ لوٹ جائے گی۔ اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ اور آقا اس پر ملک یمین کی حیثیت سے مسلط ہوا ہے اور یہ واضح ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ مؤطا امام مالک میں ہے کہ انہیں خبر پہنچی ہے کہ حضرت سعید بن مسیب اور سلیمان بن یسار رضی اللہ عنہما سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جس نے اپنے غلام کی شادی اپنی ایک لونڈی سے کی، پھر غلام نے اسے طلاق البتۃ (قطع کرنے والی طلاق) دی، پھر آقا نے وہ لونڈی اسی غلام کو ہبہ کر دی تو کیا وہ ملک یمین کے طور پر اس کے لئے حلال ہوگی؟ تو دونوں نے کہا: وہ اس کے لئے حلال نہیں ہوگی یہاں تک کہ کسی اور خاوند سے شادی کرے (1)۔

مسئلہ نمبر 8۔ حضرت امام مالک سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت ابن شہاب رحمۃ اللہ علیہ سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا جس کے نکاح میں ایک مملوکہ لونڈی تھی پھر اس نے اسے خرید لیا درآنحالیکہ اس نے اسے ایک طلاق دے رکھی تھی۔ تو انہوں نے فرمایا: وہ اس کے لئے ملک یمین کی حیثیت سے حلال ہوگی جب تک وہ اس کی طلاق کو مغلظہ نہ بنائے اور اگر اس نے اسے طلاق مغلظہ دی تو پھر وہ ملک یمین کے طور پر اس کے لئے حلال نہیں ہوگی یہاں تک کہ وہ کسی اور خاوند سے شادی کرے (2)۔ ابو عمر نے کہا ہے: علماء کی جماعت اور ائمہ فتویٰ کا یہی موقف ہے، امام مالک، ثوری، اوزاعی، شافعی، ابو حنیفہ، احمد، اسحاق، ابو ثور انہی میں سے ہیں۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت عطا، طاؤس اور حسن رحمۃ اللہ علیہم کہتے ہیں: جب اس نے اسے خرید لیا جس نے اسے طلاق البتہ دی تو وہ اس کے لئے ملک یمین کے طور پر حلال ہوگی، اس لئے کہ یہ ارشاد عام ہے: او ما ملکت ایمانکم۔

ابو عمر نے کہا ہے: اس قول میں خطا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد او ما ملکت ایمانکم کا معنی ہے مائیں اور بہنیں مباح

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب النکاح، جلد 1، صفحہ 504، وزارت تعلیم
2۔ ایضاً

نہیں ہیں اور اسی طرح تمام محرمات بھی مباح نہیں ہیں۔

مسئلہ نمبر 9۔ جب مسلمان نے اپنی ذمیہ بیوی کو تین طلاقیں دے دیں پھر ایک ذمی نے اس کے ساتھ نکاح کیا اور اس کے ساتھ دخول بھی کیا اور پھر اسے طلاق دے دی تو ایک گروہ نے کہا کہ وہ ذمی اس کے لئے زوج ہے، لہٰذا اب اس کے لئے زوج اول کی طرف لوٹنا جائز ہے۔ اسی طرح حسن، زہری، سفیان ثوری، شافعی، ابوعبید اور اصحاب الرائے رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: اسی طرح ہم بھی کہتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ اور نصرانی بھی زوج ہے اور مالک اور ربیعہ نے کہا ہے: وہ اسے حلال نہیں کر سکتا۔

مسئلہ نمبر 10۔ جمہور علماء کا موقف ہے کہ نکاح فاسد تین طلاقوں والی عورت کو حلال نہیں کر سکتا۔ امام مالک، ثوری، امام شافعی، اوزاعی، اصحاب الرائے، امام احمد، اسحاق اور ابوعبید تمام یہ کہتے ہیں کہ وہ نکاح صحیح کے بغیر زوج اوّل کے لئے حلال نہیں ہو سکتی۔ اور حکم کہتے ہیں کہ وہ زوج ہے اور ابن منذر نے کہا ہے: وہ زوج نہیں ہے کیونکہ ظہار، ایلاء اور لعان میں ازواج کے احکام ان دونوں کے درمیان ثابت نہیں ہیں اور اہل علم میں سے جن سے کچھ یاد رکھا جا سکتا ہے ان تمام نے اس پر اجماع کیا ہے کہ عورت نے جب زوج اوّل کو کہا: میں نے شادی کی ہے اور میرے خاوند نے مجھ سے دخول کیا ہے اور زوج اوّل نے اس کی تصدیق کر دی تو وہ اس کے لئے حلال ہو جائے گی۔

اور امام شافعی نے کہا ہے: احتیاط اس میں ہے کہ وہ اس کی تصدیق نہ کرے جب اس کے دل میں اس کے جھوٹا ہونے کا خیال واقع ہو جائے۔

مسئلہ نمبر 11۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے اس باب میں انتہائی شدت اور تغلیظ مروی ہے اور آپ کا ارشاد ہے: میرے پاس جو حلالہ نکالنے والا اور جس کے لئے حلالہ نکالا گیا لایا گیا تو میں یقیناً ان دونوں کو رجم کر دوں گا (1)۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: حلالہ نکالنا تو زنا ہے وہ مسلسل زنا ہی کرتے رہیں گے اگرچہ وہ بیس برس تک بھی اس پر قائم رہیں۔

ابوعمر نے کہا ہے: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول فقط تغلیظ کا احتمال رکھتا ہے، کیونکہ آپ سے یہ صحیح روایت ہے کہ آپ نے حرام فرج میں وطی کرنے والے سے حد کو اٹھا لیا درآنحالیکہ وہ اس کی تحریم سے جاہل تھا اور آپ نے جہالت کے سبب اسے معذور قرار دیا۔ پس اس بارے میں تاویل اولیٰ اور بہتر ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس پر رجم نہیں ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۭ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ طَلَّقَهَا اس میں مراد زوج ثانی ہے (یعنی اگر زوج ثانی اسے طلاق دے دے) فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اس میں ھما تثنیہ ضمیر سے مراد عورت اور زوج اوّل ہے (تو ان دونوں پر کوئی حرج نہیں)۔ یہ حضرت ابن

1۔ مصنف عبد الرزاق، کتاب النکاح، جلد 2، صفحہ 211، دار الکتب العلمیہ

عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے (1)۔

ابن منذر نے کہا ہے: اہل علم نے اس پر اجماع کیا ہے کہ آزاد آدمی جب اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے پھر اس کی عدت گزر جائے اور وہ دوسرے خاوند سے نکاح کرے اور وہ اس سے مجامعت کرے پھر اسے فارغ کر دے اور اس کی عدت بھی گزر جائے، پھر وہ پہلے خاوند سے نکاح کرے تو وہ اس کے پاس تین طلاقوں کے حق کے ساتھ رہے گی (یعنی زوج اوّل کو ازسرنو تین طلاقوں کا اختیار حاصل ہوگا)۔

اور ایسے آدمی کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے جو اپنی بیوی کو ایک یا دو طلاقیں دیتا ہے پھر وہ کسی دوسرے سے شادی کرتی ہے، پھر اس سے پہلے خاوند کی طرف لوٹ کر آتی ہے تو اس کے بارے ایک گروہ نے کہا ہے: وہ اس کے پاس اپنی مابقی طلاقوں کے حق کے ساتھ رہے گی (چاہے ماقی ایک ہو یا دو)۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اکابر اصحاب نے کہا ہے: ان میں حضرت عمر بن خطاب، حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابی بن کعب، حضرت عمران ابن حصین اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم شامل ہیں اور اسی طرح حضرت زید بن ثابت، حضرت معاذ بن جبل اور حضرت عبداللہ بن عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہم سے روایت کیا جاتا ہے اور یہی قول حضرت عبیدہ السلمانی، حضرت سعید بن مسیب، حضرت حسن بصری، حضرت مالک، حضرت سفیان ثوری، حضرت ابن ابی لیلیٰ، حضرت امام شافعی، حضرت امام احمد، حضرت اسحاق، حضرت ابو عبیدہ، حضرت ابو ثور، حضرت محمد بن حسن اور حضرت ابن نصر رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔

اور اس میں دوسرا قول بھی ہے اور وہ یہ کہ یہ نکاح بھی جدید ہے اور طلاق بھی جدید ہے۔ یہ قول حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا ہے اور اسی طرح حضرات عطا، نخعی، شریح، نعمان اور یعقوب رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے اور ابو بکر بن ابی شیبہ نے ذکر کیا ہے کہ ابو معاویہ اور وکیع نے اعمش سے اور انہوں نے ابراہیم سے ہمیں بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت عبداللہ کے اصحاب کہتے ہیں: کیا زوج ثانی تین طلاقوں کو تو گرا دیتا ہے اور وہ ایک اور دو طلاقوں کو نہیں گراتا فرمایا: ہمیں حفص نے حجاج سے، انہوں نے طلحہ سے اور انہوں نے ابراہیم سے ہمیں بیان کیا ہے کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے اصحاب کہا کرتے تھے: زوج ثانی ایک اور دو طلاقوں کو اسی طرح گرا دیتا ہے جیسے وہ تین طلاقوں کو گرا دیتا ہے سوائے عبیدہ کے کیونکہ انہوں نے کہا ہے: یہ عورت اس کے پاس اپنی ماقی طلاقوں کے ساتھ رہے گی (2)۔ اسے ابو عمر نے ذکر کیا ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: میں قول اوّل کے مطابق کہتا ہوں۔

اور اس میں ایک تیسرا قول بھی ہے اور وہ یہ کہ اگر دوسرے خاوند نے اس کے ساتھ دخول کیا ہے تو طلاق بھی جدید ہے اور نکاح بھی جدید ہے اور اگر اس کے ساتھ دخول نہیں ہوا تو پھر وہ اپنی ماقی طلاقوں پر ہوگی۔ یہ ابراہیم نخعی کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اِنْ ظَنَّاۤ اَنْ یُّقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ یہ شرط ہے۔ طاؤس رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اگر دونوں کو گمان

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 309، دار الکتب العلمیہ

2۔ الکتاب المصنف لابن ابی شیبہ، باب من قال عندہ، جلد 4، صفحہ 113، مکتبۃ الزمان للثقافۃ والعلوم، المدینۃ المنورہ

ہو کہ ان میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کے ساتھ حسن معاشرت اختیار کر سکے گا۔

اور کہا گیا ہے کہ حُدُوْدَ اللّٰهِ سے مراد اس کے فرائض ہیں، یعنی جب دونوں کو علم ہو کہ ان کے درمیان دوسرے نکاح کے سبب صلح اور بہتری ہوگی اور جب خاوند کو علم ہو کہ وہ اپنی بیوی کے نفقہ یا اس کے مہر یا اس کے وہ حقوق جو اس پر واجب ہیں ان میں سے کسی شے سے وہ عاجز ہے تو اس کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ اس سے شادی کرے یہاں تک کہ وہ اسے واضح طور پر بتا دے یا وہ اپنے بارے میں عورت کے حقوق کی ادائیگی پر قدرت کے بارے جانتا ہو اور اسی طرح اگر اسے کوئی ایسی بیماری ہو جو اسے استمتاع سے روکتی ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ اسے بیان کر دے تاکہ وہ اپنی جانب سے عورت کو دھوکے میں نہ ڈالے۔ اور اسی طرح یہ بھی جائز نہیں ہے کہ وہ اسے نسب کے بارے دھوکے میں مبتلا کرے جس کا وہ دعویٰ کرتا ہے اور اس کے پاس نہ مال ہو اور نہ ہی کوئی قابل ذکر کاروبار اور اس میں جھوٹ بولنے والا ہو۔ اسی طرح عورت پر بھی لازم ہے کہ جب وہ اپنی ذات میں خاوند کے حقوق کی ادائیگی سے عجز کے بارے جانتی ہو یا اسے کوئی ایسی بیماری ہو جو استمتاع سے مانع ہو مثلاً جنون، جذام، برص یا فرج میں کوئی بیماری ہو تو اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ مرد کو دھوکے میں ڈالے اور اس پر لازم ہے کہ اسے جو کچھ بھی ہے وہ اس کی وضاحت کر دے، جس طرح کہ بائع پر سامان کے بارے واجب ہوتا ہے کہ اس کے سامان میں جو عیوب اور نقائص ہیں وہ انہیں بیان کر دے۔

اور جب زوجین میں سے کوئی اپنے شریک میں کوئی عیب پالے تو اس کے لئے اسے رد کر دینا جائز ہے، پس اگر عیب مرد کی جانب ہو تو عورت کے لئے کامل مہر ہوگا اگر اس کے ساتھ دخول کیا گیا ہو اور اگر اس کے ساتھ دخول نہیں ہوا تو پھر اس کے لئے نصف مہر ہوگا اور اگر عیب عورت کی جانب ہو تو خاوند اسے واپس لوٹا دے اور جو مہر اسے دیا ہے وہ اس سے لے لے اور تحقیق یہ روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی بیاضہ کی ایک عورت سے شادی کی تو آپ نے اس کے پہلو میں برص کا نشان پایا تو آپ نے اسے رد کر دیا اور فرمایا: ''تم نے مجھ پر اسے پوشیدہ رکھا ہے۔''

اور عنین کی بیوی کے بارے میں امام مالک سے روایت مختلف ہے جب اس نے اپنا آپ مرد کے حوالے کر دیا پھر مرد کے عنین ہونے کے سبب ان دونوں کے درمیان تفریق کر دی گئی تو آپ نے ایک بار کہا: اس کے لئے مکمل مہر ہوگا اور ایک بار کہا: اس کے لئے نصف مہر ہوگا اور اس کا انحصار اس قول کے اختلاف پر ہے کہ وہ کس کے ساتھ مہر کی مستحق ہوگی کیا اپنے آپ کو مرد کے سپرد کرنے کے ساتھ یا دخول کے ساتھ؟ اس بارے میں بھی دو قول ہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: ہمارے اصحاب نے اختلاف کیا ہے کہ کیا عورت کے ذمہ خدمت کرنا بھی ہے یا نہیں؟ تو ہمارے بعض اصحاب نے کہا ہے: عورت پر خدمت کرنا لازم نہیں ہے کیونکہ یہ عقد استمتاع (لطف اندوز ہونا) کو شامل ہے نہ کہ خدمت کو۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ یہ عقد اجارہ نہیں ہے اور نہ ہی اس سے ملک رقبہ حاصل ہوتی ہے بلکہ یہ تو فقط استمتاع پر عقد ہے اور عقد کے ذریعہ صرف استمتاع کا مستحق بنا جاتا ہے نہ کہ اس کے سوا کسی اور کا، لہٰذا اس سے زیادہ کا عورت سے مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ کیا آپ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف دیکھتے نہیں: فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ

سَبِیۡلًا۔ (النساء:34)۔

اور ہمارے بعض اصحاب نے کہا ہے: اس پر اس کی حیثیت کے مطابق خدمت ہے، پس اگر وہ عورت شریفۃ المحل ہے اس کے والدین دولتمند اور خوشحال ہیں تو اس پر گھر کی تدبیر اور خادم کا معاملہ ہوگا اور اگر وہ متوسط الحال ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ بستر وغیرہ بچھائے اور اسی طرح کے دیگر کام۔ اور اگر وہ اس درجہ سے بھی کم ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ گھر میں جھاڑو دے اور کھانا وغیرہ پکائے اور کپڑے وغیرہ دھوئے۔ اور اگر وہ کرد اور دیلم کی عورتوں میں سے ہو اور ان کے علاقے میں پہاڑ ہوں تو وہ عورت بھی اس کام کی پابند ہوگی جس کی ان کی عورتیں پابند ہوتی ہیں اور یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیۡ عَلَیۡهِنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ (البقرہ:228)

اور مسلمانوں کا عرف اور رواج ان کے شہروں میں قدیم و جدید دور سے اس کے بارے جاری ہے جو ہم نے بیان کیا ہے۔ کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات اور آپ کے صحابہ کرام کی بیویاں آٹا پیسنے، روٹیاں پکانے، ہانڈی تیار کرنے، بستر بچھانے، کھانا پیش کرنے اور اسی طرح کے دیگر کاموں کی پابند ہوتی تھیں اور ہم تو کسی عورت کو نہیں جانتے جس نے اس سے انکار کیا ہو اور نہ ہی اس کا انکار کرنا جائز ہوتا ہے بلکہ وہ تو اپنی عورتوں کو سزا دیتے تھے جب وہ کاموں میں کوتاہی اور سستی کرتیں اور وہ ان سے خدمت لیتے تھے اور اگر یہ لازم اور ضروری نہ ہوتی تو وہ ان سے اس کا مطالبہ نہ کرتے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَ تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ یُبَیِّنُهَا لِقَوۡمٍ یَّعۡلَمُوۡنَ۔ حُدُوۡدُ اللّٰهِ، وہ ہیں جن سے روکا گیا ہو اور حد فواحش کے ارتکاب کی جرأت کرنے سے مانع ہوتی ہے اور احدت المراۃ اس کا معنی ہے عورت زینت سے باز آگئی اور رَجُلٌ محدودٌ وہ آدمی جسے خیر سے روک دیا جائے اور البواب حداد یعنی دربان روکنے والا ہے اور یہ مکمل بحث پہلے ہو چکی ہے۔

اور فرمایا: لِقَوۡمٍ یَّعۡلَمُوۡنَ کیونکہ جاہل جب اس کے لئے امر اور نہی زیادہ ہو جائیں تو وہ نہ اسے یاد رکھتا ہے اور نہ اس کی پاسداری کرتا ہے اور عالم اسے یاد بھی رکھتا ہے اور اس کی پاسداری بھی کرتا ہے پس اسی وجہ سے اس نے علماء کو خطاب کیا ہے اور جاہلوں کو خطاب نہیں کیا۔

وَ اِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ سَرِّحُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ ۪ وَ لَا تُمۡسِكُوۡهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعۡتَدُوۡا ۚ وَ مَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَهٗ ؕ وَ لَا تَتَّخِذُوۡۤا اٰیٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۫ وَّ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ عَلَیۡكُمۡ وَ مَاۤ اَنۡزَلَ عَلَیۡكُمۡ مِّنَ الۡكِتٰبِ وَ الۡحِكۡمَةِ یَعِظُكُمۡ بِهٖ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۲۳۱﴾

"اور جب تم طلاق دے دو عورتوں کو اور وہ پوری کر لیں اپنی عدت پس یا تو روک لو انہیں بھلائی کے ساتھ یا چھوڑ دو انہیں بھلائی کے ساتھ اور نہ روکو انہیں تکلیف دینے کی غرض سے تاکہ زیادتی کرو اور جو کوئی کرے گا اس طرح تو وہ ظلم کرے گا اپنی ہی جان پر اور نہ بنا لو اللہ کی آیتوں کو مذاق اور یاد کرو اللہ کی نعمت کو جو تم پر ہے اور (یاد

کرو) جو اس نے نازل فرمایا تم پر قرآن اور حکمت وہ نصیحت فرماتا ہے تمہیں اس سے اور ڈرتے رہو اللہ سے اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔"

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ اس میں بلغن کا معنی قاربن ہے (یعنی جب وہ اپنی عدت پوری کرنے کے قریب ہو جائیں) اس پر علماء کا اجماع ہے، کیونکہ معنی اس کا محتاج ہے کیونکہ عدت مکمل ہونے کے بعد اسے روکنے کا کوئی اختیار نہیں ہے (1) اور اس کے بعد والی آیت میں یہ لفظ انتہا کو پہنچنے کے معنی میں ہے، کیونکہ وہاں معنی اس کا تقاضا کرتا ہے۔ پس یہ لفظ دوسری آیت میں حقیقت ہے اور پہلی میں مجاز ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ، امساک بالمعروف کا معنی ان حقوق کے ساتھ قیام ہے جو عورت کی جانب سے مرد پر واجب ہوتے ہیں۔ اسی لئے علماء کی جماعت نے کہا ہے: بے شک امساک بالمعروف میں سے ہے کہ خاوند جب وہ مال نہ پائے جسے وہ بیوی پر خرچ کرے گا تو وہ اسے طلاق دے دے اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو وہ معروف کی حد سے خارج ہو گیا۔ پھر اس کی جگہ حاکم طلاق دے دے گا اس ضرر اور اذیت کی وجہ سے جو عورت کو ایسی حالت میں اس کے پاس رہنے سے لاحق ہو رہی ہے جس میں وہ اس کے نفقہ پر قادر نہیں۔ اور بھوک ایسی شے ہے جس پر صبر نہیں۔ اسی طرح امام مالک، امام شافعی، امام احمد، اسحاق، ابو ثور، ابو عبید، یحییٰ القطان اور عبد الرحمن ابن مہدی رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے اور صحابہ کرام میں سے حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم نے اور تابعین میں سے حضرت سعید بن مسیب نے یہی کہا ہے اور کہا ہے: بے شک یہی سنت ہے اور اسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے اور ایک گروہ نے کہا ہے: ان کے درمیان تفریق نہیں کی جائے گی اور اس پر صبر کرنا عورت کے ذمہ لازم ہوگا اور حاکم کے حکم کے مطابق نفقہ مرد کے ذمہ پڑے گا۔ یہ قول حضرت عطا اور زہری رضی اللہ عنہما کا ہے اور علماء کوفہ اور ثوری رحمۃ اللہ علیہم نے بھی یہی موقف اختیار کیا ہے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ (البقرہ: 280) اور فرمایا: وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ الآیہ (النور: 32)۔

پس اللہ تعالیٰ نے فقیر کے نکاح کرنے کو مستحب قرار دیا ہے تو معلوم ہوا کہ فقر و افلاس کا سبب فرقت ہونا جائز نہیں اور اس کا اس کے باوجود نکاح کرنا مستحب ہے۔

اور یہ بھی کہ زوجین کے درمیان نکاح اجماع کے ساتھ منعقد ہوا ہے لہٰذا ان کے درمیان تفریق نہیں کی جائے گی مگر اس کی مثل اجماع کے ساتھ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی سنت کے ساتھ جس کے معارض کوئی روایت نہ ہو۔

اور پہلے قول کی دلیل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وہ ارشاد ہے جو صحیح بخاری میں ہے: "عورت کہے گی یا مجھے کھانا مہیا کرا اور یا مجھے طلاق دے دے۔ (2)" اور یہ محل خلاف میں نص ہے اور ہمارے نزدیک تنگدستی کے سبب ہونے والی فرقت طلاق

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 309، دار الکتب العلمیہ
2۔ صحیح بخاری، کتاب النفقات، جلد 2، صفحہ 806، وزارت تعلیم

رجعی ہے، بخلاف امام شافعی کے کہ ان کا کہنا ہے: وہ طلاق بائنہ ہے کیونکہ یہ بنا کے بعد فرقت ہوئی ہے اس کے ساتھ طلاق کا عدد مکمل نہیں ہوا اور نہ یہ کسی عوض کے لئے اور نہ ہی اس کا سبب خاوند کی جانب سے ضرر ہے، پس یہ رجعیہ ہوگی۔ اس کی اصل مولی (ایلاء کرنے والا) کی طلاق ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: **اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ** یعنی یا تم انہیں طلاق دے دو، یہ پہلے گزر چکا ہے۔ **وَ لَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا** امام مالک نے ثور بن زید الدیلی سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے پھر اس کی طرف رجوع کرتا ہے اور اسے اس کی حاجت اور ضرورت نہیں ہوتی اور نہ ہی اسے اپنے پاس روکنے کا ارادہ رکھتا ہے اور (صرف اس لئے) تا کہ وہ اس طرح اس پر عدت کو طویل کر دے اور اسے ضرر اور اذیت پہنچائے تو اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: **وَ لَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ**۔ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ انہیں نصیحت کر رہا ہے (1) اور زجاج نے کہا ہے: **فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ**، یعنی اس نے اپنے آپ کو عذاب کے لئے پیش کیا، کیونکہ جس کام سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے اسے کرنا اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے عذاب کے لئے پیش کرنا ہی ہے۔ اور یہ خبر اس خبر کے موافق ہے جو طلاق اور رجوع کو ترک کرنے کے بارے میں نازل ہوئی جس طریقہ پر اہل جاہلیت تھے، جیسا کہ اس کا بیان **اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ** کے تحت گزر چکا ہے۔ پس ان دونوں خبروں نے ہمیں یہ فائدہ دیا ہے کہ مذکورہ دونوں آیتوں کا نزول قریب قریب ایک ہی معنی میں ہے اور وہ مرد کا عورت کو ضرر اور اذیت پہنچانے کے ارادہ سے اسے اپنے پاس روکنا اور اس کی طرف رجوع کرتا ہے اور یہ بالکل ظاہر ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: **وَ لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا**۔ اس کا معنی ہے تم اللہ تعالیٰ کے احکام کو مذاق کے طریقہ پر نہ لو، کیونکہ یہ تمام کے تمام سنجیدہ ہیں۔ پس جس نے ان میں مذاق کیا تو یہ اسے لازم ہو جائیں گے۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: دور جاہلیت میں ایک آدمی طلاق دیتا ہے اور کہتا ہے: بلاشبہ میں نے طلاق دی ہے اور مذاق کر رہا ہوں اور وہ غلام کو آزاد کرتا اور کسی سے اپنا نکاح کرتا اور یہ کہتا: میں نے استہزا کیا ہے۔ پس یہ آیت نازل ہوئی (2) اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: ''جس نے طلاق دی یا جس نے کسی کو آزاد کیا یا اپنا نکاح کیا یا کسی کا نکاح کیا اور پھر یہ گمان کیا کہ وہ مذاق کر رہا ہے تو وہ سنجیدہ شمار ہوگا (3)'' (یعنی یہ تمام احکام نافذ ہو جائیں گے) اسے معمر نے روایت کیا ہے کہا ہے: ہمیں عیسیٰ بن یونس نے عمرو سے، انہوں نے حسن سے اور انہوں نے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے اور اسی کے معنی میں اسے ذکر کیا ہے اور موطا امام مالک میں ہے کہ ان کے پاس یہ خبر پہنچی کہ کسی آدمی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا: میں نے اپنی بیوی کو سو بار طلاق دی ہے، آپ میرے بارے میں کیا خیال کرتے ہیں؟ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اسے تیری جانب سے تین طلاقیں واقع ہوگئیں اور ستانوے طلاقوں کے ساتھ تو نے اللہ تعالیٰ کی آیت کے ساتھ استہزا کیا ہے (4)۔

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 576، دار احیاء التراث العربیۃ
2۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 1، صفحہ 399، دار الکتب العربیۃ
3۔ مجمع الزوائد، باب فمن نکح او اعتق اوطلق لاعبا، جلد 4، صفحہ 529، دار الفکر
4۔ موطا امام مالک، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 510، وزارت تعلیم

اور دار قطنی نے اسماعیل بن امیہ القرشی کی حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی آدمی کو سنا کہ اس نے طلاق البتہ دی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ناراض ہوئے اور فرمایا: ''تم اللہ تعالیٰ کی آیات کو یا اللہ تعالیٰ کے دین کو تمسخر اور مذاق کے طور پر لیتے ہو، جس نے طلاق البتہ دی ہم نے اس کے لئے تین طلاقیں لازم کر دیں اور وہ عورت اس کے لئے حلال نہیں ہوگی یہاں تک کہ وہ کسی اور خاوند سے شادی کر لے۔'' اس میں راوی اسماعیل بن امیہ کوفی ہے اور ضعیف الحدیث ہے۔(1)

اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ وہ آدمی جو اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے پھر کہتا ہے: قسم بخدا! نہ میں تجھے وارث بناؤں گا اور نہ میں تجھے چھوڑوں گا۔'' عورت نے کہا: وہ کیسے ہوگا؟ اس نے کہا: جب تیری عدت گزرنے کے قریب ہو گی تو میں تیری طرف رجوع کر لوں گا، تب یہ آیت نازل ہوئی (2): وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا الآیۃ۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: تمام اقوال آیت کے معنی میں داخل ہیں کیونکہ جو بھی اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ تمسخر کرے اسے ہی کہا جائے گا: اتخذھا ھزوا۔ اس نے اسے مذاق کے ساتھ لیا ہے اور اسے بھی کہا جائے گا جس نے اس (آیت) کے ساتھ کفر کیا اور اسے بھی کہا جائے گا جس نے اسے پرے پھینک دیا اور اسے نہ لیا اور عمل اس کے خلاف کیا، سو اس بنا پر یہ تمام اقوال آیت میں داخل ہیں اور آیات اللہ سے مراد اس کے دلائل، اس کا امر اور اس کی نہی ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ علماء کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ جس نے مذاق کے طور پر طلاق دی تو وہ طلاق اسے واقع ہو جائے گی اور اس کے سوا میں اختلاف ہے۔ اس کا بیان سورۂ براءت میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ابو داؤد نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تین کام ہیں کہ ان میں سنجیدگی بھی سنجیدگی ہے اور ان میں مذاق بھی سنجیدگی ہے (اور وہ ہیں) نکاح، طلاق اور رجعت۔''(3)

اور حضرت علی، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ ان تمام نے کہا: تین فعل ہیں جن میں کوئی مذاق اور استہزاء نہیں اور ان میں مذاق کرنے والا بھی سنجیدہ شمار ہوتا ہے اور وہ نکاح، طلاق اور عتاق ہیں۔(4)

اور کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے اوامر کو ترک نہ کرو کہ تم کوتاہی کرنے والے اور مذاق کرنے والے ہو جاؤ۔ اور اس آیت میں گناہ سے قولاً استغفار کرنا بھی داخل ہے جبکہ فعلاً اس پر اصرار ہو اور اسی طرح ہر وہ عمل جو اس معنی میں ہو پس اس کے بارے آگاہ رہ۔

1۔ دار قطنی، کتاب الطلاق والخلع والایلاء، جلد 4، صفحہ 20، دار المحاسن قاہرہ

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 306، دار الکتب العلمیہ۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب ماجاء فی طلاق المعتوہ، حدیث نمبر 1113، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 298، وزارت تعلیم۔ ایضاً، باب فی الطلاق علی الھزل، حدیث نمبر 1875، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً، ابن ماجہ، باب من طلق الخ، حدیث نمبر 2028، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، جلد 7، صفحہ 341، دار الفکر

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ، یعنی اسلام اور احکام کے بیان (کے ساتھ تم پر جو اللہ تعالیٰ کا انعام ہے اسے یاد کرو۔) وَالْحِكْمَةِ اس سے مراد سنت ہے جو رسول اللہ ﷺ کی زبان مقدس سے اس بارے میں اللہ تعالیٰ کی مراد اور مقصود کو بیان کرتی ہے جس کے بارے میں کتاب اللہ میں بیان اور وضاحت نہ ہو (1)۔ يَعِظُكُمْ بِهٖ یعنی وہ تمہیں ڈراتا ہے وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾

”اور جب تم طلاق دو عورتوں کو پھر وہ پوری کر چکیں اپنی عدت تو نہ منع کرو انہیں کہ نکاح کر لیں اپنے خاوندوں سے جب کہ رضامند ہو جائیں آپس میں مناسب طریقہ سے۔ یہ فرمان الٰہی (ہے) نصیحت کی جاتی ہے اس کے ذریعے اس کو جو تم سے یقین رکھتا ہو اللہ پر اور قیامت پر، یہ بہت پاکیزہ ہے تمہارے لئے اور بہت صاف اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔“

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ روایت ہے کہ حضرت معقل بن یسار کی بہن ابو البداح کے نکاح میں تھی تو اس نے اسے طلاق دی اور اسے چھوڑ دیا یہاں تک کہ اس کی عدت گزر گئی، پھر وہ نادم ہوا تو اسے پیغام نکاح بھیجا سو وہ راضی ہو گئی اور اس کے بھائی نے انکار کر دیا کہ وہ اس کے ساتھ شادی کرے اور کہا: میرا چہرہ تیرے لئے حرام ہے اگر تو اس سے شادی کرے۔ پس یہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت مقاتل نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے معقل کو بلایا اور فرمایا: ”اگر تو مومن ہے تو اپنی بہن کو ابو البداح سے نہ روک۔“ تو معقل نے عرض کی: امنت باللہ اور بہن کی شادی اس سے کر دی (2)۔

اور امام بخاری نے حسن سے روایت کیا ہے کہ حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کی بہن کو اس کے خاوند نے طلاق دی یہاں تک کہ اس کی عدت گزر گئی پھر اس نے اسے پیغام نکاح بھیجا تو حضرت معقل نے انکار کر دیا، پس یہ آیت نازل ہوئی (3): فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ۔

اور اسے دار قطنی نے بھی حسن سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے بیان کیا: مجھے حضرت معقل بن یسار رحمۃ اللہ علیہ نے بتایا ہے: میری ایک بہن تھی میرے پاس اس کے لئے پیغام نکاح آتے تھے اور میں اس سے لوگوں کو روکتا رہتا تھا، پھر میرے چچا کا بیٹا میرے پاس آیا اور اس نے اس کے ساتھ نکاح کی خواہش ظاہر کی تو میں نے اس کا نکاح اس کے ساتھ کر دیا، پھر جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا وہ دونوں ایک ساتھ رہے پھر اس نے اسے طلاق رجعی دے دی پھر اسے چھوڑ دیا یہاں تک کہ اس کی عدت

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 310، دار الکتب العلمیہ

2۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 803، وزارت تعلیم　　2۔ ایضاً

گزر گئی، پھر اس نے دیگر لوگوں کے ساتھ اسے پیغام نکاح دیا تو میں نے کہا: میں نے اس کے بارے لوگوں سے انکار کیا اور میں نے تیرے ساتھ اس کی شادی کر دی پھر تو نے اسے طلاق دی جس میں رجعت کا حق تھا پھر تو نے اسے چھوڑے رکھا یہاں تک کہ اس کی عدت گزر گئی اور جب میرے پاس پیغام نکاح آئے تو تو بھی دیگر خواہش رکھنے والے لوگوں کے ساتھ میرے پاس نکاح کی خواہش لے کر آیا میں تیرے ساتھ کبھی شادی نہ کروں گا۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، یا فرمایا: یہ آیت نازل کی گئی: وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ یَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ۔ پس میں نے اپنی قسم کا کفارہ ادا کیا اور میں نے اس کا نکاح اس سے کر دیا (1)۔

بخاری کی روایت میں ہے: پس حضرت معقل رضی اللہ عنہ نے اس سے ابھی تک نفرت کی اور کہا: اس نے اسے چھوڑ دیا ہے حالانکہ وہ اس پر قدرت رکھتا تھا پھر وہ اس کے ساتھ نکاح کی خواہش کر رہا ہے۔ سو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلایا اور یہ آیت پڑھ کر سنائی پھر حضرت معقل نے حمیت کو چھوڑ دیا اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت و پیروی کی (2)۔

اور کہا گیا ہے کہ یہ معقل بن سنان (یعنی نون کے ساتھ) ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: اسے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتابوں میں معقل بن یسار یا سنان سے روایت کیا ہے اور امام طحاوی نے فرمایا ہے کہ وہ معقل بن سنان ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ جب یہ ثابت ہو چکا تو پھر اس آیت میں اس پر دلیل ہے کہ بغیر ولی کے نکاح جائز نہیں ہوتا کیونکہ حضرت معقل رضی اللہ عنہ کی بہن ثیبہ تھی۔ اگر ولی کے بغیر اختیار اس کے پاس ہوتا تو وہ اپنی شادی کر لیتی اور وہ اپنے ولی معقل کی محتاج نہ ہوتی۔ پس معلوم ہوا کہ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ میں خطاب اولیاء کو ہے اور شادی کے بارے میں اختیار انہیں کے پاس ہے کہ وہ ان کی رضامندی کے ساتھ ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں خطاب ازواج کو ہے اور وہ اس طرح کہ غیر کے نکاح سے روکتے ہوئے اس کا رجوع کر لینا عورت پر عدت کے طویل ہونے کے سبب اذیت ناک اور ضرر رساں ہے۔

اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب نے اس سے اس پر استدلال کیا ہے کہ عورت اپنی شادی خود کر سکتی ہے۔ انہوں نے کہا: کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت عورت کی طرف کی ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا: فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَیْرَهٗ اور ولی کا ذکر نہیں کیا ہے اور اس مسئلہ میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے جو کہ اس کے سبب نزول کے بارے ہم نے ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ اس مقام پر بلوغ الاجل سے مراد انتہا کو پہنچنا ہے کیونکہ نکاح کی ابتدا کا تصور عدت گزرنے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے اور تَعْضُلُوْهُنَّ کا معنی ہے تحبسوھن (یعنی جب وہ اپنی عدت کی انتہا کو پہنچ جائیں تو تم انہیں نہ روکو۔)

اور خلیل نے بیان کیا ہے: دجاجۃ معقل جب مرغی اپنا انڈا روک لے (تب یہ کہا جاتا ہے)۔

1۔ سنن دار قطنی، کتاب الطلاق، جلد 3، صفحہ 224، دار المحاسن

2۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 803، وزارت تعلیم

اور کہا گیا ہے کہ العضل کا معنی التضییق والمنع ہے یعنی تنگ کرنا اور روکنا اور یہ حبس کے معنی کی طرف ہی راجع ہے۔ کہا جاتا ہے: اردت امرا فعضلتنی عنه یعنی میں نے کام کا ارادہ کیا اور تو نے مجھے اس سے روک دیا اور مجھ پر اسے تنگ اور مشکل کر دیا۔ اور اعضل الامر کہا جاتا ہے جب تجھ پر کام کے ذرائع تنگ ہو جائیں۔ اسی سے ان کا یہ قول بھی ہے: انه لعضلة من العضل جب وہ کام میں کسی قسم کے حیلہ اور ذریعہ پر قدرت نہ رکھتا ہو۔

اور الازہری نے کہا ہے: عضل کی اصل ان کے اس قول سے ہے: عضلت الناقة (1) (یہ تب کہا جاتا ہے) جب اونٹنی کا بچہ پھنس جائے اور اس کا نکلنا آسان نہ ہو اور عضلت الدجاجة، جب اس کا انڈا پھنس جائے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے معضلة ولا اباحسن یعنی مسئلہ مشکل ہے اور اس کے مخارج بہت تنگ ہیں اور حضرت طاؤس نے کہا ہے: تحقیق مشکل ترین فیصلے لائے گئے اور سوائے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے کوئی ان پر قائم نہ رہا۔ لقد وردت عُضَل اقضية ما قام بها الا ابن عباس اور عربوں کے نزدیک ہر مشکل معضل ہے اور اسی سے امام شافعی کا قول ہے:

اذا المعضِلاتُ تصدّینني کشفتُ حقائقَها بالنظر

جب مشکلات مجھے چیلنج کرتی ہیں تو میں ان کے حقائق کو نظر و فکر سے کھول دیتا ہوں

اور کہا جاتا ہے: اعضل الأمر جب معاملہ بہت سخت ہو جائے اور داء عُضال یعنی شدید بیماری جس کا درست ہونا مشکل ہے اور وہ طبیبوں کو تھکا دے اور عضل فلان ایمه یعنی فلاں نے اپنی مطلقہ منع کیا۔ یعضُلُهَا و یَعْضِلُهَا یعنی ضمہ اور کسرہ دونوں لغتیں ہیں۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ اس میں ذلکم نہیں کہا کیونکہ یہ جمع کے معنی پر محمول ہے اور اگر ذلکم ہوتا تو بھی جائز ہوتا۔ مثلاً ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَ اَطْهَرُ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تمہارے لئے اس میں صلاح اور خیر نہیں ہے۔ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ اور تم اسے نہیں جانتے ہو۔

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۭ وَ عَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۤ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۭ وَ اِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾

"اور مائیں دودھ پلائیں اپنی اولاد کو پورے دو سال (یہ مدت) اس کے لئے ہے جو پورا کرنا چاہتا ہے دودھ کی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 310، دار الکتب العلمیہ

مدت۔ اور جس کا بچہ ہے اس کے ذمہ ہے کھانا ان ماؤں کا اور ان کا لباس مناسب طریقہ سے۔ تکلیف نہیں دی جاتی کسی شخص کو مگر اس کی حیثیت کے مطابق۔ نہ ضرر پہنچایا جائے کسی ماں کو اس کے لڑکے کے باعث اور نہ کسی باپ کو (ضرر پہنچایا جائے) اس کے لڑکے کے باعث اور وارث پر بھی اسی قسم کی ذمہ داری ہے۔ پس اگر دونوں ارادہ کرلیں دودھ چھڑانے کا اپنی مرضی اور مشورہ سے تو کوئی گناہ نہیں دونوں پر اور اگر تم چاہو تو دودھ پلواؤ (دایہ سے) اپنی اولاد کو، پھر کوئی گناہ نہیں تم پر جبکہ تم ادا کر دو جو دینا ٹھہرایا تھا تم نے مناسب طریقہ سے اور ڈرتے رہو الله سے اور (خوب) جان لو کہ یقیناً الله تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے ہو اسے دیکھنے والا ہے۔"

اس میں اٹھارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَالْوَالِدٰتُ یہ مبتدا ہے۔ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ یہ محل خبر میں ہے۔ حَوْلَیْنِ کَامِلَیْنِ یہ ظرف زمان ہے جب الله سبحانہ وتعالیٰ نکاح اور طلاق کا ذکر کر چکا تو پھر اس نے اولاد کا ذکر کیا کیونکہ کبھی زوجین آپس میں جدا ہوتے ہیں اور ان کے پاس بچہ ہوتا ہے۔ پس تب یہ آیت ان مطلقہ عورتوں کے بارے میں ہے جن کی ان کے خاوندوں سے اولاد ہو۔ سدی اور ضحاک وغیرہ نے یہی کہا ہے (1)۔ یعنی وہ خود اجنبی عورتوں کی نسبت اپنی اولاد کو دودھ پلانے کا زیادہ حق رکھتی ہیں کیونکہ وہ زیادہ شفیق اور زیادہ نرم ہیں اور صغیر بچے کو چھین لینا بچے اور اس کی ماں دونوں کے لئے تکلیف دہ اور ضرر رساں ہے اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ بچے کو اگر دودھ چھڑا دیا جائے تو ماں ہی زیادہ شفیق اور مہربان ہونے کی وجہ سے اس کی پرورش کا زیادہ حق رکھتی ہے اور وہی پرورش کی زیادہ حقدار ہوتی ہے جب تک وہ شادی نہ کرے جیسا کہ آگے آرہا ہے اور اس پر یہ قول اشکال پیدا کرتا ہے: وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ کیونکہ مطلقہ عورت تو لباس کی مستحق نہیں ہوتی جب طلاق رجعی نہ ہو بلکہ وہ اجرت کی مستحق ہوتی ہے مگر یہ کہ اسے مکارم اخلاق پر محمول کیا جائے اور کہا جائے: اولیٰ اور بہتر یہ ہے کہ اجرت اس سے کم نہ ہو جو اس کی خوراک اور لباس کے لئے کافی ہوتا ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ یہ آیت عام ہے ان مطلقات کے بارے میں بھی جن کی اولاد ہو اور بیویوں کے بارے میں بھی (یعنی تمام کو شامل ہے) اور اظہر یہی ہے کہ یہ آیت ان بیویوں کے بارے میں ہے جن کا نکاح ابھی باقی ہو، کیونکہ وہ نفقہ اور لباس دونوں کی مستحق ہوتی ہیں اور زوجہ نفقہ اور لباس کی مستحق ہوتی ہے چاہے وہ دودھ پلائے یا نہ پلائے، نفقہ اور لباس دونوں تمکین (قدرت) کے مقابلے میں ہیں۔ اور جب وہ دودھ پلانے میں مشغول ہو جائے گی تو قدرت کامل نہ رہے گی اور کبھی یہ وہم کیا جاتا ہے کہ نفقہ ساقط ہو جاتا ہے، پس اس وہم کو اس ارشاد کے ساتھ زائل کر دیا: وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ مراد زوج (بچے کا باپ) ہے، رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ یعنی دودھ پلانے کی حالت میں (ان کا نفقہ اور لباس زوج پر ہے۔) کیونکہ یہ زوج کے مصالح اور منافع میں مشغول ہونا ہے تو یہ اسی طرح ہو گیا جیسا کہ اگر وہ خاوند کے کام کی غرض سے اس کی اجازت کے ساتھ سفر پر چلی جائے تو نفقہ ساقط نہیں ہوتا۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 311، دار الکتب العلمیہ

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: یُرْضِعْنَ یہ خبر ہے۔ اس کا معنی ہے کہ یہ امر بعض والدات کے لئے وجوب کے معنی پر ہے اور بعض کے لئے مستحب کے معنی پر (1)، جیسا کہ آگے آرہا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اس کے مشروع ہونے کی خبر ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اور دودھ پلانے کے بارے میں لوگوں کا اختلاف ہے کہ کیا یہ ماں کا حق ہے یا یہ اس پر لازم ہے لفظ دونوں کا احتمال رکھتا ہے کیونکہ اگر ماں پر اس کے لازم ہونے کی تصریح مراد ہوتی تو اللہ تعالیٰ فرماتا: وعلی الوالدات رضاع اولادھن (ماؤں پر اپنی اولاد کو دودھ پلانا لازم ہے) جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا: وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ لیکن یہ اس پر زوجیت کی حالت میں ہے اور یہی عرف ہے جس سے لازم آتا ہے کہ یہ شرط کی طرح ہو گیا ہے (2) مگر یہ کہ وہ شریف اور خوشحال ہو تو اس کا عرف یہ ہے کہ وہ دودھ نہ پلائے اور یہ شرط کی طرح ہے اور اس پر دودھ پلانا واجب ہے اگر بچہ کسی غیر کو قبول نہ کرے، تو دودھ پلانا اس پر واجب ہے اس کے اختصاص کی وجہ سے بشرطیکہ باپ معدوم ہو۔ اور اگر باپ فوت ہو جائے اور بچے کا کوئی مال نہ ہو تو المدونہ میں امام مالک کا یہ مذہب بیان ہوا ہے کہ دودھ پلانا ماں کے لئے لازم ہے بخلاف نفقہ کے اور ابن الجلاب کی کتاب میں ہے: اسے دودھ پلانے کا انتظام کرنا بیت المال کے ذمہ ہوگا۔

اور عبدالوہاب نے کہا ہے: وہ (بچہ) بھی مسلمان فقراء میں سے ایک فقیر ہے۔

اور رہی وہ عورت جسے طلاق بائن دی گئی ہو تو اس پر رضاع نہیں ہے، بلکہ رضاع خاوند پر لازم ہے مگر یہ کہ وہ عورت چاہے تو اجرت مثل کے عوض یہ زیادہ حقدار ہوگی اور یہ اس صورت میں ہے جبکہ خاوند خوشحال ہو اور اگر وہ تنگ دست ہو تو پھر اس مطلقہ عورت کے لئے دودھ پلانا لازم نہیں مگر یہ کہ بچہ اس کے سوا کسی کو قبول نہ کرتا ہو تو اس وقت اسے دودھ پلانے پر مجبور کیا جائے گا اور وہ تمام جو دودھ پلانا اس پر لازم کرتے ہیں (ان کا موقف ہے) کہ اگر اسے کوئی عذر لاحق ہو جائے جو اسے دودھ پلانے سے مانع ہو تو دودھ پلانے کا امر باپ کی طرف لوٹ آئے گا۔

اور امام مالک سے مروی ہے کہ باپ جب مفلس ہو اور بچے کا کوئی مال نہ ہو تو دودھ پلانا ماں پر لازم ہے (3) اور اگر اس کا دودھ نہ ہو لیکن اس کے پاس مال ہو تو پھر اپنے مال سے دودھ پلانے کا انتظام کرنا اس پر لازم ہوگا۔

امام شافعی نے فرمایا: دودھ پلانے کا اہتمام لازم نہیں ہوتا مگر باپ پر یا دادا پر اور جو بھی اس سے اوپر ہوں اس بارے میں علماء کا نظریہ اس ارشاد کے تحت آئے گا وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ۔

کہا جاتا ہے: رَضِعَ یَرْضَعُ رَضَاعَةً و رضاعا اور رَضَعَ یَرْضِعُ رِضَاعًا و رَضَاعَةً (یعنی پہلے میں را مکسور ہے اور دوسرے میں مفتوح ہے) اور دونوں میں اسم فاعل راضع ہے اور الرضاعۃ کا معنی اللؤم (بخل کرنا) بھی ہے۔ (یہ لفظ فقط راء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔)

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: حَوْلَيْنِ یعنی دو سال، یہ حال الشیء سے ماخوذ ہے جب کوئی شے پلٹ جائے، پس حول

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 310، دار الکتب العلمیہ　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 311

اوّل وقت سے دوسرے کی طرف پلٹنے والا ہے اور کہا گیا ہے کہ سال کو حول اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں اغلباً امور بدل جاتے ہیں۔ کاملین یہ کامل ہونے کے لئے قید ہے کیونکہ کبھی کوئی کہنے والا کہتا ہے: اقمت عند فلان حولین اور اس سے وہ ایک سال اور دوسرے سال کا کچھ حصہ مراد لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ یعنی جو کوئی ایک دن اور دوسرے دن کے کچھ حصے میں جلدی کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ اس پر دلیل ہے کہ دو سال دودھ پلانا حتمی نہیں ہے کیونکہ دو سال سے پہلے بھی دودھ چھڑانا جائز ہے۔ لیکن یہ حد اس لئے بیان کی گئی ہے تاکہ زوجین کے درمیان مدت رضاع کے بارے میں تنازع ختم ہو جائے۔ لہٰذا خاوند پر دو سال سے زیادہ عرصہ اجرت دینا واجب نہیں ہے اور اگر باپ اس مدت سے پہلے دودھ چھڑانا چاہے اور ماں اس پر راضی نہ ہو تو وہ ایسا نہیں کر سکتا اور دو سال میں زیادتی یا کمی تب ہو سکتی ہے جب بچے کے لئے اس میں کوئی نقصان نہ ہو اور والدین رضامند ہوں۔

حضرت مجاہد اور ابن محیصن نے لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ پڑھا ہے یعنی تاء کو فتحہ کے ساتھ اور الرضاعة کو رفع کے ساتھ۔ یعنی فعل کی نسبت اس کی طرف کی ہے۔

اور ابو حیوہ، ابن ابی عبلہ، جارود بن ابی سبرہ نے الرِّضَاعَةَ کو راء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بھی ایک لغت ہے جیسا کہ الحَضارة اور الحِضارة ہے۔

اور حضرت مجاہد سے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے الفعلة کے وزن پر الرضعة پڑھا ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے أن یکمل الرضاعة (1) قراءت کی ہے۔

نحاس نے کہا ہے کہ بصری الرَّضَاعَةَ کو صرف راء کے فتحہ کے ساتھ اور الرضاع کو صرف راء کے کسرہ کے ساتھ پڑھتے ہیں مثلاً القتال اور کوفی الرضاعة کو راء کے کسرہ کے ساتھ اور الرضاع کو راء کے فتحہ کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 5۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، آپ کے تابعین اور علماء کی ایک جماعت نے اس آیت سے یہ مسئلہ بھی نکالا ہے کہ وہ رضاعت جو حرمت میں نسب کے قائم مقام ہے وہ یہی ہے جو دو سال میں ہو، کیونکہ دو سال گزرنے کے ساتھ رضاعت کی مدت مکمل ہو گئی اور دو سال کے بعد کی رضاعت معتبر نہیں ہے (2)۔ آپ کا یہ قول مؤطا میں ہے اور یہ آپ سے محمد بن عبد الحکم کی روایت ہے اور یہی حضرت عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا قول ہے اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور یہی حضرت زہری، قتادہ، شعبی، سفیان ثوری، اوزاعی، شافعی، احمد، اسحاق، ابو یوسف، محمد اور ابو ثور رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔

اور ابن عبد الحکم نے آپ سے دو سال اور کچھ تھوڑے دن زیادہ کا قول روایت کیا ہے۔ عبد الملک نے کہا ہے کہ وہ مہینہ اور اس طرح کی مدت ہے۔

اور ابن القاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: رضاعت کی مدت دو سال اور دو مہینے ہے (3) اور ولید بن مسلم نے آپ سے بیان کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: دو سالوں کے بعد دودھ پلانے کی جو مدت ہو گی ایک مہینہ یا دو مہینے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 311، دار الکتب العلمیہ　2۔ ایضاً　3۔ المدونۃ الکبری، کتاب الرضاع، جلد 5، صفحہ 90، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر

یا تین مہینے وہ دو سالوں میں ہی شمار ہوگی اور جو اس سے زائد ہوگی وہ عبث ہوگی۔

اور حضرت نعمان سے بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا: دو سالوں کے بعد چھ ماہ تک جو مدت ہوگی وہ رضاع میں ہی شمار ہوگی۔ ان میں پہلا قول صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ۔ یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ بچے نے جو دو سال کے بعد دودھ پیا ہے اس کے لئے یہ حکم نہیں ہے۔

اور حضرت سفیان نے عمرو بن دینار سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لا رضاع الا ما کان فی الحولین (رضاع نہیں ہے مگر وہی جو دو برس میں ہو۔) دارقطنی نے کہا ہے: اسے ابن عیینہ سے ہیثم بن جمیل کے سوا کسی نے بیان نہیں کیا ہے اور یہ ثقہ اور حافظ راوی ہے۔(1)

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ یہ خبر آیت اور معنی کے ساتھ موافق ہے۔ یہ کبیر کی رضاعت کی نفی کرتی ہے اور یہ کہ اس کے لئے حرمت کا حکم ثابت نہ ہوگا۔

اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بھی اسی طرح کا قول مروی ہے اور علماء میں سے لیث بن سعد بھی یہی کہتے ہیں اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ بڑے کی رضاعت کا لحاظ رکھتے ہیں اور آپ کا اس سے رجوع بھی مروی ہے(2)۔ عنقریب سورۃ النساء میں یہ مسئلہ تفصیل سے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 6۔ جمہور مفسرین نے کہا ہے: یہ دو سال ہر بچے کے لئے ہیں اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: یہ اس بچے کے بارے میں جو چھ ماہ تک پیٹ میں رہتا ہے اور اگر وہ سات ماہ تک پیٹ میں رہے تو پھر اس کی رضاعت کی مدت تیئس ماہ ہے اور اگر آٹھ مہینے رہے تو اس کی مدت رضاعت بائیس مہینے ہے اور اگر وہ نو مہینے رہے تو پھر اس کی مدت رضاعت اکیس مہینے ہے(3) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وحملہ و فصالہ ثلاثون شھرا (اس کے حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس مہینے ہے) اس بنا پر مدت حمل اور مدت رضاعت دونوں ایک دوسرے میں داخل ہیں اور ایک دوسرے سے اپنا حصہ لے لیتی ہیں۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ یعنی باپ پر ہے اور عربی میں وعلی المولود لھم کہنا جائز ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: و منھم من یستمعون الیك۔ کیونکہ معنی ہے: و علی الذی ولد لہ اور اس پر جس کا بیٹا ہے اور الذی کے ساتھ واحد اور جمع دونوں کو تعبیر کیا جا سکتا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ اس حکم میں رزق سے مراد وہ طعام (کھانا) ہے جو کافی ہو اور اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ بچے کا نفقہ والد پر واجب ہے، چاہے وہ کمزور اور عاجز ہو اور اللہ تعالیٰ نے اسے ماں کے لئے مقرر فرمایا ہے کیونکہ رضاع کی صورت میں ماں کے واسطہ سے غذا بچے تک پہنچتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا: وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ

1۔ سنن دارقطنی، کتاب الرضاع، جلد 4، صفحہ 174، دار المحاسن قاہرہ
2۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 1، صفحہ 410، دار الکتب العربیۃ
3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 311، دار الکتب العلمیہ

فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ (الطلاق:6) (اور اگر وہ حاملہ ہوں تو تم ان پر خرچ کرو) کیونکہ انہی کے سبب غذا پہنچتی ہے۔

اور علماء کا اس پر اجماع ہے کہ آدمی پر اپنی اولاد میں سے ان بچوں کا نفقہ واجب ہے جن کا کوئی مال نہ ہو۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہند بنت عتبہ کو فرمایا اس حال میں کہ اس نے آپ سے عرض کی تھی کہ ابوسفیان انتہائی بخیل آدمی ہے وہ مجھے اتنا نفقہ نہیں دیتا جو میرے لئے اور میرے بچوں کے لئے کافی ہو تو پھر میں اسے بتائے بغیر اس کے مال سے لے لیتی ہوں، کیا مجھ پر اس میں گناہ ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خذی ما یکفیك وولدك بالمعروف(1) (تو اتنا مال لے لے مناسب طریقے سے جو تیرے لئے اور تیری اولاد کے لئے کافی ہو۔)

اور الکسوۃ کا معنی لباس ہے اور قولہ بِالْمَعْرُوْفِ کا معنی ہے جو عرف شرع میں بغیر افراط وتفریط کے متعارف ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ نفقہ خاوند کی دولت اور اس کے منصب کے مطابق ہوگا مد یا کسی اور پیمانے کے ساتھ اندازے کی ضرورت نہیں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا۔ اس کا بیان سورۃ الطلاق میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے: عورت کو اجرت میں کنجوسی پر صبر کرنے کا پابند اور مکلف نہیں کیا جائے گا اور خاوند کو اسراف (فضول خرچی) کا پابند نہیں کیا جائے گا بلکہ میانہ روی کا لحاظ رکھا جائے گا۔

مسئلہ نمبر 9۔ اس آیت میں امام مالک کی اس پر دلیل موجود ہے کہ پرورش کا حق ماں کو ہے اور یہ بچے میں اس کے بالغ ہونے تک ہے اور بچی میں نکاح تک ہے اور یہ ماں کا حق ہے اور یہی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے۔ اور امام شافعی نے کہا ہے: جب بچہ آٹھ برس کی عمر کو پہنچ جائے تو یہ وہ عمر ہے جس میں وہ تمیز کر سکتا ہے، لہٰذا اسے والدین کے درمیان اختیار دیا جائے گا کیونکہ اس کی یہ حالت قرآن کریم کی تعلیم، ادب اور دیگر وظائف عبادات کے لئے اس کی ہمت اور استعداد کو متحرک کرنے کی ہے اور اس میں بچہ اور بچی دونوں برابر ہوتے ہیں۔

اور امام نسائی وغیرہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ ایک عورت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور عرض کی: میرا خاوند چاہتا ہے کہ وہ میرا بیٹا مجھ سے لے لے تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس بچے کو فرمایا: یہ "تیرا باپ ہے اور یہ تیری ماں ہے تو ان میں سے جسے چاہے پکڑ لے" تو اس نے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ لیا(2)۔

اور ابوداؤد کی کتاب میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: ایک عورت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور میں آپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میرا خاوند چاہتا ہے کہ وہ میرا بیٹا لے جائے، حالانکہ یہ ابوعنبہ کے کنوئیں سے مجھے پانی لاکر دیتا ہے اور میرے لئے بہت نفع بخش ہے۔ تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم دونوں اس کے بارے میں قرعہ اندازی کر لو"۔ تو اس کے خاوند نے کہا: میرے بیٹے کے بارے میں کون میرے ساتھ جھگڑ سکتا ہے؟ پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بیٹے کو فرمایا: "یہ تیرا باپ ہے اور یہ تیری ماں ہے تو جس کا

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب التجارت، جلد 1، صفحہ 167، وزارت تعلیم

2۔ سنن نسائی، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 112، وزارت تعلیم۔ ایضاً، ابن ماجہ، باب تخییر الصبی ابویہ، حدیث نمبر 2341، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

چاہے ان دو میں سے ایک کا ہاتھ پکڑلے۔" تو اس نے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ اسے لے کر چلی گئی (1)۔

اور ہماری دلیل وہ ہے جسے ابوداؤد نے امام اوزاعی سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: مجھے عمرو بن شعیب نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے حدیث بیان کی ہے کہ ایک عورت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بے شک یہ میرا بیٹا ہے میرا پیٹ اس کے لئے جائے حفاظت رہا، میرے پستان اسے سیراب کرتے رہے اور میری گود اس کے لئے گھر بنی رہی اور اس کے باپ نے مجھے طلاق دے دی اور اب اس نے اسے مجھ سے چھیننے کا ارادہ کیا ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: انت احق بہ مالم تنکحی (2) تو اس کا زیادہ حق رکھتی ہے جب تک تو نکاح نہ کرے۔

ابن منذر نے کہا ہے: اہل علم میں سے جن پر اعتماد کیا جاسکتا ہے ان تمام نے اس پر اجماع کیا ہے کہ زوجین جب آپس میں علیحدہ علیحدہ ہو جائیں اور ان دونوں کا بچہ ہو تو ماں اس بچے کا زیادہ حق رکھتی ہے جب تک وہ نکاح نہ کرے۔ اسی طرح ابو عمر نے کہا ہے: میں علماء سلف میں سے کہیں بھی مطلقہ عورت کے بارے میں اختلاف نہیں جانتا کہ جب تک وہ شادی نہ کرے تو وہ باپ کی نسبت اپنے بچے کی زیادہ حقدار ہے جس وقت تک وہ چھوٹا بچہ ہے اور کسی شے کی تمیز نہیں کر سکتا بشرطیکہ اس کے پاس وہ حفاظت میں ہو اور (اخراجات کی) کفایت بھی ہو اور اس عورت میں فسق اور اجنبیوں کے سامنے زینت کا اظہار ثابت نہ ہو۔ پھر اس کے بعد اسے اختیار دینے میں اختلاف ہے جبکہ وہ اپنے باپ اور اپنی ماں کے درمیان تمیز کرسکتا ہو اور یہ عقل رکھتا ہو کہ ان میں سے کون اس کے حق میں اولی اور بہتر ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: یہ ثابت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کے بارے میں بغیر تخییر کے خالہ کے حق میں فیصلہ فرمایا۔

ابوداؤد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ گئے اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کو لے آئے تو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں اسے لوں گا اور میں ہی اس کا زیادہ حقدار ہوں، یہ میرے چچا کی بیٹی ہے اور اس کی خالہ میرے گھر ہے اور خالہ ماں ہوتی ہے اور حضرت علی نے کہا: میں اس کا زیادہ حق رکھتا ہوں کیونکہ یہ میرے چچا کی بیٹی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی میرے گھر ہے اور وہ اس کی زیادہ حقدار ہے۔ اور حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کہا: میں اس کا زیادہ حق رکھتا ہوں، میں اس کے لئے (گھر سے) نکلا اور میں نے سفر کیا اور میں اسے لے کر آیا۔ پھر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور یہ حدیث بیان فرمائی۔ فرمایا: وأما الجارية فأقضي بها لجعفر تكون مع خالتها وانما الخالة ام (3) اور رہی بچی تو میں حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے حق میں اس کا فیصلہ کرتا ہوں یہ اپنی خالہ کے پاس رہے گی،

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 310، وزارت تعلیم۔

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 310، وزارت تعلیم۔ ایضاً، باب من احق بالولد، حدیث نمبر 1938، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 311، وزارت تعلیم۔ ایضاً، باب من احق بالولد، حدیث نمبر 1940، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بلاشبہ خالہ ماں ہوتی ہے۔

مسئلہ نمبر 10۔ ابن منذر نے کہا ہے: تمام معتمد اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ بچے میں ماں کا حق نہیں ہے جب وہ شادی کر لے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی طرح انہوں نے اپنی ''کتاب الاشراف'' میں کہا ہے اور قاضی عبدالوہاب نے ''شرح الرسالہ'' میں حسن سے ذکر کیا ہے کہ شادی کے سبب پرورش میں اس کا حق ساقط نہیں ہوتا۔ اور امام مالک، امام شافعی، نعمان اور ابو ثور رحمۃ اللہ علیہم نے اس پر اجماع کیا ہے کہ نانی بچے کی پرورش کا زیادہ حق رکھتی ہے۔

اور انہوں نے اختلاف کیا ہے کہ جب بچے کی ماں نہ ہو اور اس کی دادی ہو تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب بچے کی خالہ نہ ہو تو پھر دادی زیادہ حقدار ہے (1) اور ابن القاسم نے بیان کیا ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: مجھ تک آپ سے یہ خبر پہنچی ہے کہ انہوں نے کہا: خالہ دادی سے زیادہ اولیٰ اور بہتر ہے (2)۔

اور امام شافعی اور نعمان کے قول میں ہے کہ دادی خالہ سے زیادہ حق رکھتی ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک باپ دادی کی نسبت اپنے بیٹے کے لئے زیادہ اولیٰ ہے (3)۔

ابو عمر نے کہا ہے: یہ میرے نزدیک ہے بشرطیکہ اس کی کوئی اجنبی بیوی نہ ہو۔ پھر باپ کے بعد بہن اور پھر پھوپھی کا حق ہے اور یہ تب ہے جبکہ ان میں سے ہر ایک کے پاس بچہ محفوظ و مامون ہو اور وہ اس کے پاس حفاظت و کفایت میں ہو اور جب اس طرح نہ ہو تو پھر کسی کو حق حضانت حاصل نہیں، بلکہ اس کے بارے غور و فکر کیا جائے گا جس کے پاس بچہ زیادہ محفوظ ہوگا اور وہ اس کی حفاظت اور خیر اور بھلائی کی تعلیم کے سلسلہ میں انتہائی اچھا اور حسین سلوک کرے گا اور یہ ان کے قول کے مطابق ہے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ پرورش بچے کا حق ہے اور یہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے اور آپ کے اصحاب میں سے بھی ایک جماعت نے یہی کہا ہے اور اسی طرح فاجرہ عورت، ضعیف اور بیماری یا اپاہج ہونے کی وجہ سے جو بچے کا حق ادا کرنے سے عاجز ہو وہ اسے حق حضانت نہیں دیتے۔

ابن حبیب نے مطرف سے اور ابن ماجشون نے امام مالک سے ذکر کیا ہے کہ پرورش کا حق پہلے ماں کو ہے، پھر نانی کو، پھر خالہ کو، پھر دادی کو پھر بچے کی بہن کو پھر بچے کی پھوپھی کو پھر بچے کی بھتیجی کو اور پھر باپ کو ہے۔ دادی بہن سے اولیٰ ہے اور بہن پھوپھی سے اولیٰ ہے اور پھوپھی اپنے مابعد افراد سے اولیٰ اور بہتر ہے۔ اور تمام مردوں میں سے اولیاء زیادہ ارجح اور اولیٰ ہیں اور خالہ کی بیٹی کے لئے، پھوپھی کی بیٹی کے لئے اور بچے کی بھانجیوں کے لئے اس کی پرورش میں سے کوئی حق نہیں ہے۔ اور جب پرورش کرنے والے کی جانب سے بچے پر ضائع ہونے یا فساد برپا ہونے کا کوئی اندیشہ اور خوف نہ ہو تو وہ اس کی مسلسل پرورش کرتا رہے یہاں تک کہ وہ سن بلوغت کو پہنچ جائے اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہاں تک کہ وہ بچہ ہونے کے اطلاق سے نکل جائے۔ اور یہاں تک کہ بچی شادی کر لے مگر یہ کہ باپ سفر پر نکلنے اور وطن سے منتقل ہونے کا ارادہ رکھتا ہو تو اس وقت وہ ماں

1۔ المدونۃ الکبری، کتاب الرضاع، جلد 5، صفحہ 40، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر 2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 39 3۔ ایضاً

اور کسی غیر کی نسبت اپنے بچے کا زیادہ حقدار ہے اگر وہ (بچے کی ماں) منتقل نہ ہونا چاہے اور اگر باپ نے تجارت کے لئے نکلنے کا ارادہ کیا تو پھر اس کے لئے حق حضانت نہیں اور اسی طرح بچے کے وہ اولیاء ہیں جن کے ساتھ وہ رہتا ہے جب وہ وطن بنانے کے لئے کہیں اور منتقل ہو جائیں۔ اور ماں کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بچے کو باپ کے رہنے کی جگہ سے منتقل کرے مگر اس صورت میں کہ وہ اتنی مسافت سے بھی قریب ہو جس میں نماز قصر ہو جاتی ہے اور اگر آدمی نے عورت کے شہر سے منتقل ہوتے وقت اس پر یہ شرط عائد کر دی کہ وہ اس کے پاس اپنا بچہ نہیں چھوڑے گا مگر یہ کہ اس کا نفقہ اور اس کی مشقت معین سالوں تک اس پر لازم ہوگی، تو اگر عورت نے اسے اپنے ذمہ لازم کر لیا تو وہ اس پر لازم ہو جائے گا۔ اور اگر وہ فوت ہو گئی تو پھر اس کے ترکہ میں سے اس کے لئے اس کے ورثاء کی طرف رجوع نہیں کیا جائے گا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ قرض ہے جو اس کے ترکہ میں سے لیا جائے گا۔ اور پہلا قول اصح ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ جیسا کہ اگر بچہ فوت ہو جائے یا جیسا کہ اگر وہ حمل اور رضاع کے خرچہ کی بھی اس سے صلح کر لے اور وہ اسے ساقط کر دے تو پھر اس میں سے کسی شے کے لئے اس کا پیچھا نہ کیا جائے۔

مسئلہ نمبر 11۔ جب ماں شادی کر لے تو اس سے اس کا بچہ نہ چھینا جائے یہاں تک کہ اس کا خاوند اس سے دخول کر لے(1)۔ یہ امام مالک کے نزدیک ہے۔ اور امام شافعی نے کہا ہے: جب اس نے نکاح کر لیا تو اس کا حق حضانت ختم ہو گیا۔ اور اگر اس نے اسے طلاق دے دی تو امام مالک کے نزدیک اس میں اس کے لئے رجوع کا حق نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک آپ کا مشہور مذہب یہی ہے اور قاضی اسماعیل نے ذکر کیا ہے اور اسے ابن خویز منداد نے بھی امام مالک سے ذکر کیا ہے کہ اس بارے میں آپ کا قول مختلف ہے۔ سو ایک بار کہا: وہ بچہ اس کی طرف لوٹا دیا جائے گا اور ایک بار کہا: وہ نہیں لوٹایا جائے گا۔

ابن منذر نے کہا ہے: جب ماں اس شہر سے نکل گئی جس میں اس کا بیٹا تھا، پھر اس کی طرف واپس آ گئی تو پھر یہی اپنے بچے کی زیادہ حقدار ہوگی۔ یہ امام شافعی، ابو ثور اور اصحاب الرائے کا قول ہے۔ اور اسی طرح اگر اس نے شادی کی پھر اسے طلاق ہو گئی یا اس کا خاوند فوت ہو گیا تو بچہ بھی اس کے حق میں لوٹا دیا جائے گا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی طرح قاضی ابو محمد عبد الوہاب نے کہا ہے: پس اگر خاوند نے اسے طلاق دی یا وہ فوت ہو گیا تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ بچے کو لے لے کیونکہ وہ عذر زائل ہو چکا ہے جس کے سبب بچے کو چھوڑنا جائز ہوا تھا۔

مسئلہ نمبر 12۔ اگر عورت نے اپنے بچے کی پرورش چھوڑ دی اور اس نے اسے لینے کا ارادہ ہی نہ کیا حالانکہ وہ فارغ تھی اور زوج کے سبب مشغول نہ تھی۔ پھر اس کے بعد اس نے بچے کو لینے کا ارادہ کیا تو اس کے بارے غور و فکر کی جائے گی۔ پس اگر اس کا بچے کو چھوڑنا کسی عذر کے باعث تھا تو اس کے لئے اسے لینا جائز ہے اور اگر اس کا ترک اسے چھوڑنے اور نفرت کے سبب ہو تو اب اس کے بعد اس کے لئے بچے کو لینا جائز نہیں۔

مسئلہ نمبر 13۔ اور علماء نے ایسے زوجین کے بارے اختلاف کیا ہے جو طلاق کے سبب جدا ہو جاتے ہیں اور زوجہ ذمیہ ہے تو ایک گروہ نے کہا ہے: ذمیہ اور مسلم میں کوئی فرق نہیں ہے اور یہی اپنے بچے کی زیادہ حقدار ہے۔

1۔ المدونۃ الکبریٰ، جلد 5، صفحہ 40، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر

یہ قول ابوثور، اصحاب الرائے اور ابن القاسم صاحب مالک رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: تحقیق ہم نے حدیث مرفوع روایت کی ہے جو اس قول کے موافق ہے اور اس کی اسناد میں کلام ہے۔

اور اس میں دوسرا قول یہ ہے کہ بچہ ان میں سے مسلمان کے ساتھ ہوگا۔ یہ قول امام مالک، سوار اور عبداللہ بن حسن کا ہے اور یہی حضرت امام شافعی سے بھی بیان کیا گیا ہے۔

اور اسی طرح ان کا ان زوجین میں بھی اختلاف ہے جو آپس میں جدا ہوتے ہیں اور ان میں سے ایک آزاد ہے اور دوسرا مملوک۔ پس ایک گروہ نے کہا ہے: آزاد اولیٰ ہے۔ یہ قول حضرت عطا، ثوری، امام شافعی اور اصحاب الرائے رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔ اور امام مالک نے کہا ہے: باپ جب آزاد ہو اور اس کا آزاد بیٹا ہو اور ماں مملوکہ (کنیز) ہو تو بلاشبہ ماں اس کی زیادہ حقدار ہوگی مگر یہ کہ اسے بیچ دیا جائے اور وہ کہیں اور منتقل ہو جائے تو پھر باپ کا حق زیادہ ہوگا۔

مسئلہ نمبر 14۔ قولہ تعالیٰ: لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ۔ اس کا معنی یہ ہے کہ ماں بچے کے باپ کو ضرر اور تکلیف پہنچانے کے لئے اسے دودھ پلانے سے انکار نہ کرے یا وہ اجرت مثل سے زیادہ کا مطالبہ کرے اور باپ کے لئے بھی حلال نہیں ہے کہ ماں کو دودھ پلانے میں اس کی رغبت کے باوجود اس سے منع کرے، یہ قول جمہور مفسرین کا ہے۔

نافع، عاصم، حمزہ اور کسائی نے تضار راء مشددہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ نہی کی بنا پر محل جزم میں ہے(1) اور اس کی اصل لا تضارر ہے اور پہلی راء کو دوسری میں ادغام کیا گیا اور دو ساکن ملنے کی وجہ سے دوسری کو فتحہ دے دیا گیا۔ اسی طرح مضاعف میں کیا جاتا ہے جبکہ اس سے پہلے فتحہ یا الف ہو، تو کہتا ہے: عض یا رجل (تو کاٹ اے آدمی!) اور ضار فلانا یا رجل (تو فلاں کو ضرر پہنچا اے آدمی) یعنی بچہ ماں سے نہیں چھینا جائے گا جب وہ دودھ پلانے پر راضی ہو اور بچہ اس سے مانوس ہو۔

ابوعمرو، ابن کثیر اور ابان نے حضرت عاصم اور ایک جماعت سے تضار سے رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس کا عطف تُكَلَّفُ نَفْسٌ پر کیا ہے اور یہ خبر ہے اور اس سے مراد امر ہے(2)۔

اور یونس نے حسن سے روایت کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں: لا تضار زوجها (یعنی وہ اپنے خاوند کو ضرر نہ پہنچائے) کہ وہ یہ کہے: میں اسے دودھ نہیں پلاؤں گی اور نہ خاوند اسے ضرر پہنچائے کہ وہ اس کا بیٹا چھین لے حالانکہ وہ کہہ رہی ہو: میں اسے دودھ پلاؤں گی۔ اور یہ احتمال ہے کہ یہ اصل میں تضارر ہو، اور والدۃ مفعول مالم یسم فاعلہ ہو۔ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے لا تضارر پڑھا ہے یعنی دو راء میں سے پہلی مفتوح ہے۔

اور ابوجعفر بن قعقاع نے تُضَارْ یعنی راء کو اسکان اور تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور اسی طرح لَا يُضَارْ كَاتِبٌ ہے۔ اور یہ بعید ہے کیونکہ دو ہم مثل لفظ جب جمع ہو جائیں اور وہ دونوں اصلی ہوں تو ان میں سے ایک کو تخفیف کے لئے حذف کرنا جائز نہیں۔ پس یا ادغام ہوگا یا اظہار ہوگا۔ اور آپ سے اسکان اور تشدید بھی مروی ہے اور حضرت ابن عباس اور حسن رضی اللہ عنہم سے لا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 312، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً

تُضَارِرْ پہلی راء کے کسرہ کے ساتھ مروی ہے(1)۔

مسئلہ نمبر15۔قولہ تعالیٰ: وَ عَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ یہ قول باری تعالیٰ: وَ عَلَى الْمَوْلُوْدِ پر معطوف ہے۔ اس کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے۔ پس حضرت قتادہ، سدی، حسن اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ وارث سے مراد بچے کا وارث ہے کہ اگر وہ فوت ہو جائے۔

بعض نے کہا ہے: مراد بچے کا ایسا وارث ہے جو صرف مردوں میں سے ہو کہ دودھ پلانے کا اہتمام کرنا اس کے ذمہ لازم ہوگا جیسا کہ یہ بچے کے باپ پر لازم تھا اگر وہ زندہ ہوتا اور حضرت مجاہد اور حضرت عطا نے یہی کہا ہے۔ اور حضرت قتادہ وغیرہ نے کہا ہے: مراد بچے کا وارث ہے مردوں اور عورتوں میں سے جو بھی ہو۔ اسے دودھ پلانے کا اہتمام کرنا لازم ہوتا ہے اتنی مقدار جتنا اس کی میراث میں ان کا حصہ ہے(2) اور یہی امام احمد اور اسحاق نے کہا ہے۔

اور قاضی ابو اسحاق اسماعیل بن اسحاق نے اپنی کتاب ''معانی القرآن'' میں کہا ہے: ''پس رہے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تو انہوں نے کہا ہے: صغیر کا نفقہ اور اسے دودھ پلانا ہر ذی رحم محرم پر واجب ہوتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی کی بہن کا صغیر اور محتاج بیٹا ہو اور چچا کا بیٹا صغیر اور محتاج ہو اور وہی اس کا وارث ہو، تو نفقہ ماموں پر واجب ہوگا اپنے اس بھانجے کے لئے جس کا وہ وارث نہیں ہے اور چچا کے بیٹے سے اپنے چچا کے اس بیٹے کے لئے جس کا وہ وارث ہے نفقہ ساقط ہو جائے گا''۔ ابو اسحاق نے کہا ہے: انہوں نے ایسا قول کیا ہے جو نہ کتاب اللہ میں ہے اور نہ ہم کسی کو جانتے ہیں جس نے یہ کہا ہو۔

علامہ طبری نے امام ابو حنیفہ اور آپ کے صاحبین رحمۃ اللہ علیہم سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: وہ وارث جس پر بچے کو دودھ پلانے کا اہتمام کرنا لازم ہوتا ہے وہی اس کا وارث ہوتا ہے بشرطیکہ وہ اس کا ذی رحم محرم ہو اور اگر چچا کا بیٹا وغیرہ ذی رحم محرم کے ساتھ نہیں ہے تو اس پر کوئی شے لازم نہ ہوگی(3)۔

اور کہا ہے: (الوارث) سے مراد باپ کا حصہ ہے ان پر نفقہ اور لباس دونوں واجب ہوں گے۔

ضحاک نے کہا ہے: اگر بچے کا باپ فوت ہو جائے اور بچے کا مال ہو تو اسے دودھ پلانے والا اس مال سے لے لے گا۔ اور اگر اس کا کوئی مال نہ ہو تو پھر وہ عصبہ سے لے گا۔ اور اگر عصبہ کے پاس بھی مال نہ ہو تو پھر ماں کو دودھ پلانے پر مجبور کیا جائے۔

اور قبیصہ بن ذؤیب، ضحاک اور بشیر بن نصر قاضی عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: الوارث سے مراد بچہ بذات خود ہے اور انہوں نے علی الوارث کی تاویل المولود سے ہے جیسا کہ ما علی المولود لہ ہے، یعنی اس پر اپنے مال میں سے اپنے آپ کو دودھ پلانا واجب ہے جب وہ اپنے باپ کا وارث بن جائے۔

اور سفیان نے کہا ہے: یہاں وارث سے مراد بچے کے والدین میں سے ایک کے فوت ہونے کے بعد جو باقی رہ جائے(4)، وہ ہے۔ پس اگر باپ فوت ہو جائے تو ماں پر بچے کی کفالت اور دیکھ بھال کرنا لازم ہے جبکہ بچے کا مال نہ ہو اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 312، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً
3۔ جامع البیان للطبری، جلد 1، صفحہ 600، دار احیاء التراث العربیۃ
4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 312، دار الکتب العلمیہ

عصبہ بچے کو دودھ پلانے کا اہتمام کرنے میں اس کے ساتھ اتنی مقدار شراکت کرے گا جتنا میراث میں سے اس کا حصہ ہے۔

ابن خویز منداد نے کہا ہے: اگر یتیم فوت ہو، اس کا کوئی مال نہ ہو، تو امام وقت پر بیت المال سے اس کا انتظام کرنا واجب ہے اور اگر امام ایسا نہ کرے تو پھر مسلمانوں پر ایسا کرنا واجب ہے اخص فالاخص کے طریقہ پر۔ اور ماں بچے کے ساتھ سب سے زیادہ مختص ہے لہٰذا اس پر اسے دودھ پلانا اور اس کا اہتمام کرنا واجب ہوگا نہ وہ بچے کی طرف رجوع کرے گی اور نہ کسی اور کی طرف (یعنی بچے پر اٹھنے والے اخراجات کے لئے بچے یا کسی اور طرف متوجہ نہ ہوگی) اور دودھ پلانا واجب ہے اور نفقہ مستحب ہے اور وجہ استحباب اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ اور ازواج پر ان کے ساتھ حقوق کا قیام واجب ہے اور جب خاوند کے فوت ہو جانے یا اس کے تنگدست ہو جانے کے سبب ان کے حق کا پورا ہونا متعذر اور مشکل ہو جائے تو حق ان سے ساقط نہیں ہوتا۔ کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ عدت ان (عورتوں) پر واجب ہے اور نفقہ اور سکنٰی ان کے خاوندوں پر لازم ہے اور جب ان کے لئے نفقہ متعذر ہو جائے تو ان سے عدت ساقط نہیں ہوتی۔

عبدالرحمٰن بن قاسم نے الاسدیہ میں امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: آدمی کے ذمہ بھائی، قریبی رشتہ دار اور ذورحم محرم کا نفقہ لازم نہیں ہوتا (1)۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ یہ منسوخ ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ امام مالک کے الفاظ ہیں اور آپ نے یہ بیان نہیں کیا کہ اس کا ناسخ کون ہے اور نہ ہی عبدالرحمٰن بن قاسم (نے بیان کیا ہے) اور نہ مجھے معلوم ہو سکا ہے کہ ان کے اصحاب میں سے کسی نے اسے بیان کیا ہو اور وہ جو یہ شبہ ڈالتا ہے کہ وہ ان کے نزدیک اس کا ناسخ ہو۔ واللہ اعلم، وہ یہ کہ وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے جب اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے ایک سال کا نفقہ اور سکنٰی متوفی کے مال سے واجب کیا پھر اسے منسوخ کر دیا اور اسے اٹھا لیا۔ اسی طرح وارث سے بھی اسے منسوخ کر دیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پس اسی بنا پر نفقہ بچے کی اپنی ذات پر اس کے مال سے ہوتا ہے اور وارث پر اس میں سے کوئی شے نہیں ہوتی اس بنا پر جو آ رہا ہے۔

ابن عربی نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ، ابن قاسم نے امام مالک سے بیان کیا ہے کہ یہ منسوخ ہے اور یہ ایسا کلام ہے جس میں غافلوں کے دل خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور تھوڑے لوگوں کی عقلیں اس میں حیرت زدہ ہو جاتی ہیں، حالانکہ اس میں امر قریب ہے اور وہ یہ کہ فقہاء و مفسرین میں سے علماء متقدمین تخصیص کو نسخ کا نام دیتے تھے، کیونکہ اس میں ان بعض افراد سے حکم کو اٹھانا ہوتا ہے جنہیں عموم شامل ہوتا ہے۔ یہ ان کا تسامح تھا اور وہ ان کی زبانوں پر جاری رہا یہاں تک کہ اس نے ان کے بعد والے لوگوں کو اشکال میں ڈال دیا۔ اور اس میں قول کی تحقیق یہ ہے کہ قول باری تعالیٰ: وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ یہ ماتقدم کی طرف اشارہ ہے۔ پس لوگوں میں سے وہ جنہوں نے ایجاب نفقہ اور تحریم اضرار میں سے تمام کی طرف لوٹایا ان میں فقہاء میں سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور سلف میں سے حضرت قتادہ اور حسن رحمۃ اللہ علیہما ہیں اور یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہوتا ہے۔

1۔ المدونۃ الکبری، کتاب ارخاء الستور، جلد 5، صفحہ 48، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر

اور علماء کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ کا معنی تمام ماتقدم کی طرف نہیں لوٹتا، بلکہ یہ صرف تحریم اضرار کی طرف لوٹتا ہے اور معنی یہ ہے کہ وارث پر بھی ماں کو ضرر پہنچانا اسی طرح حرام ہے جس طرح باپ پر ہے اور یہ ہی اصل ہے۔ پس جو یہ دعویٰ کرے کہ اس میں عطف جمیع ماتقدم کی طرف راجع ہے تو دلیل لانا اس پر لازم ہے (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ ان کا قول ھذا ھو الاصل اس سے مراد قریب ترین مذکور کی طرف ضمیر کو لوٹانا ہے۔ اور یہی صحیح ہے کیونکہ اگر وہ ان تمام کا ارادہ کرتا یعنی دودھ پلانا، نفقہ مہیا کرنا اور ضرر نہ پہنچانا تو یقیناً فرماتا: وعلی الوارث مثل ھؤلاء پس یہ اس پر دلیل ہے کہ اس کا عطف ضرر سے روکنے پر ہے۔

اور اسی بنا پر تمام مفسرین نے اس کی تاویل اس معنی میں کی ہے جسے قاضی عبدالوہاب نے بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے بچے کو اس طرح ضرر نہ پہنچائے کہ باپ جب اسے اجرت مثلی دے (تو وہ کہے) کہ وہ اسے دودھ نہیں پلائے گی اور نہ باپ اپنے بچے کے باعث ضرر پہنچائے۔ اس طرح کہ ماں جب تیار ہو کہ وہ اسے اجرت مثلی کے عوض دودھ پلائے گی تو پھر اسی کا وہ حق ہے۔ (باپ انکار نہ کرے) کیونکہ ماں بچے کے لئے زیادہ نرم اور زیادہ محبت و شفقت سے پیش آنے والی ہے اور اس کا دودھ کسی بھی اجنبیہ عورت کے دودھ کی نسبت زیادہ بہتر اور نفع بخش ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: امام مالک، آپ کے تمام اصحاب، شعبی، زہری، ضحاک اور علماء کی ایک جماعت رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد مِثْلُ ذٰلِكَ سے مراد ہے کہ ضرر نہ پہنچایا جائے۔ رہا رزق (نفقہ) اور لباس تو ان میں سے کوئی شے واجب نہ ہوگی۔

اور ابن قاسم نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ آیت اس معنی کو متضمن ہے کہ نفقہ اور لباس وارث پر ہے پھر اسے اجماع امت کے ساتھ اس معنی میں منسوخ کر دیا گیا ہے کہ وارث کو ضرر نہ پہنچایا جائے اور اختلاف اس میں ہے کہ کیا اس پر نفقہ اور لباس ہے یا نہیں؟

اور یحییٰ بن یعمر نے وعلی الورثۃ جمع کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ عموم کا تقاضا کرتا ہے۔ پس اگر وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے استدلال کریں لا یقبل اللہ صدقۃ و ذو رحم محتاج کہ اللہ تعالیٰ کوئی صدقہ اس حال میں قبول نہیں فرماتا کہ ذو رحم محتاج ہو۔ تو انہیں کہا جائے گا کہ الرحم ہر ذی رحم کے لئے عام ہے، چاہے وہ محرم ہو یا غیر محرم اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ذو رحم پر صدقہ خرچ کرنا اولیٰ اور ارجح ہے۔ کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: اجعلھا فی الأقربین (2) (تم صدقہ کو اقربین میں خرچ کرو) پس حدیث کو اس معنی پر محمول کیا گیا ہے اور اس میں اس پر کوئی دلیل نہیں ہے جس کا انہوں نے قصد کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

اور نحاس نے کہا ہے: رہا اس کا قول جس نے کہا: وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ کہ اسے ضرر نہ پہنچایا جائے تو یہ قول حسن اور اچھا ہے کیونکہ لوگوں کے اموال ممنوع ہیں اور اس میں کوئی شے بغیر دلیل قطعی کے نہیں نکل سکتی اور جنہوں نے علی ورثۃ الأب

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 205، دار الفکر
2۔ صحیح بخاری، کتاب الوصایا، جلد 1، صفحہ 385، وزارت تعلیم

مراد لیا ہے تو ان کی دلیل یہ ہے کہ نفقہ باپ پر لازم ہے۔ لہٰذا اس کے وارث بیٹے کے وارثوں سے اولیٰ ہوں گے اور ان کی دلیل جنہوں نے کہا: مراد بیٹے کے وارث ہیں، تو وہ کہتے ہیں: جس طرح وہ اس کے وارث ہوتے ہیں (اسی طرح) وہ اس کے حقوق کو بھی ادا کرتے ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: محمد بن جریر ان کے قول کو پسند کرتے تھے جنہوں نے کہا ہے کہ یہاں مراد بیٹے کے وارث ہیں، یہ اگرچہ قول غریب ہے لیکن اس سے استدلال صحیح ہے اور اس کی دلیل بالکل ظاہر ہے کیونکہ اس کا مال اسی کے زیادہ قریب اور اولیٰ ہے۔ اور فقہاء نے اجماع کیا ہے سوائے اس کے جو ان سے الگ ہو گیا کہ ایک آدمی کا اگر چھوٹا بچہ ہو اور بچے کا مال بھی ہو اور باپ خوشحال ہو تو باپ پر نفقہ اور رضاع واجب نہ ہوگا بلکہ وہ بچے کے مال سے ادا ہوگا۔

اور اگر کہا جائے: تحقیق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ کہا جائے گا کہ یہ ضمیر مؤنث کے لئے ہے اور اس کے ساتھ اجماع آیت کی حد ہے، اس کی وضاحت کرنے والا ہے، کوئی مسلمان اس سے نکلنے کی وسعت نہیں رکھتا۔

اور رہا وہ جس نے کہا کہ اس سے مراد وہ ہے جو والدین میں سے ایک کے مرنے کے بعد باقی رہے، تو اس کی دلیل یہ ہے کہ ماں کے لئے اپنے بچے کو ضائع کرنا جائز نہیں، حالانکہ وہ فوت ہو جائے جو بچے پر اور اس کی ماں پر خرچ کرتا تھا۔

اور امام بخاری نے اس قول کے رد میں ایک باب بیان کیا ہے اس کا عنوان ہے "باب - وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ، و هل على المرأة منه شئ" اور آگے ام سلمہ اور ہند کی حدیث بیان کی ہے۔

اس میں معنی یہ ہے کہ ام سلمہ کے حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ سے بیٹے تھے اور ان کا کوئی مال نہ تھا تو اس نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بتایا کہ اس کے لئے اس میں اجر ہے۔ پس یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ اس کے بیٹوں کا نفقہ اس پر واجب نہیں اور اگر واجب ہوتا تو وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ نہ کہتی: اور میں نے اسے چھوڑ نہیں (1)۔

اور رہی ہند کی حدیث تو اس میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے باپ کے مال سے اپنا نفقہ اور اپنے بچے کا نفقہ لینے کے لئے چھوڑ دیا اور آپ نے نفقہ اس پر واجب نہیں کیا جیسا کہ اسے باپ پر واجب کیا۔ پس امام بخاری نے اس سے اس پر استدلال کیا ہے کہ جب باپوں کی زندگی میں بیٹوں کا خرچہ ماؤں پر لازم نہیں ہے تو اسی طرح باپوں کے فوت ہو جانے کے بعد بھی ان پر لازم نہ ہوگا۔

اور رہا ان کا قول جنہوں نے کہا کہ بلاشبہ نفقہ اور لباس ہر ذی رحم محرم پر لازم ہے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ آدمی پر لازم ہے کہ وہ ہر ذی رحم محرم پر خرچ کرے جب وہ فقیر ہو۔

نحاس نے کہا ہے: اس قول کا معارض یہ ہے کہ نہ اسے کتاب اللہ سے لیا گیا ہے نہ اجماع سے اور نہ ہی سنت صحیحہ سے۔ بلکہ جو قول ہم نے ذکر کیا ہے اس کے سوا یہ کہیں معروف ہی نہیں ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب النفقات، جلد 2، صفحہ 809، وزارت تعلیم۔ ایضاً، کتاب النفقات، حدیث نمبر 4950، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پس رہا قرآن کریم تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ پس اگر وارث پر نفقہ اور لباس ہے تو انہوں نے اس کی مخالفت کی ہے اور انہوں نے کہا ہے: جب وہ اپنا ماموں اور اپنے چچا کا بیٹا چھوڑے تو نفقہ اس کے ماموں پر ہے اور اس کے چچا کے بیٹے پر کوئی شے نہیں ہے تو یہ قرآن کریم کی نص کے خلاف ہے کیونکہ ماموں چچا کے بیٹے کے ساتھ کسی کے قول کے مطابق بھی وارث نہیں بن سکتا اور نہ ہی وہ اکیلا اکثر علماء کے قول کے مطابق وارث بن سکتا ہے اور وہ جنہوں نے اس سے ہر ذی رحم محرم پر نفقہ کا استدلال کیا ہے، اکثر اہل علم اس کے خلاف ہیں۔

مسئلہ نمبر 16۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا اس میں اَرَادَا میں ضمیر والدین کے لئے ہے اور فِصَالًا کا معنی ہے دودھ چھڑانا (1)۔ یعنی ماں کے دودھ کے سوا کسی اور خوراک کو غذا بنانا اور الفصال اور الفصل کا معنی الفطام ہے اور اس کا اصل معنی التفریق ہے اور یہ بچے اور پستان کے درمیان تفریق اور جدائی کرنا ہے اور اسی سے الفصیل ہے (یعنی اونٹنی یا گائے کا بچہ) کیونکہ اسے اپنی ماں سے جدا کیا جاتا ہے۔ عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا یعنی وہ راضی ہو جائیں دو سالوں سے پہلے۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا یعنی اسی کا دودھ چھڑانے میں ان پر کوئی گناہ نہیں اور وہ یہ کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جب مدت رضاع دو سال مقرر کی تو اس نے بیان کر دیا کہ ان دونوں کا دودھ چھڑانا وہی فطام ہے اور ان دونوں کا جدا کرنا وہی فصال ہے اس سے کسی کو مفر نہیں، مگر یہ کہ والدین اس مدت سے کم پر بچے کو نقصان پہنچائے بغیر متفق ہو جائیں اور وہ اس بیان کے ساتھ جائز ہے۔

اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ دو سال دودھ پلانا واجب تھا اور اس سے پہلے دودھ چھڑانا حرام تھا، پھر اس میں تخفیف کی گئی اور دو سال سے کم مدت دودھ پلانا مباح کر دیا گیا، اس قول کے ساتھ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا الآیہ۔ اور اس میں احکام میں اجتہاد کے جائز ہونے پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے والدین کے لئے مشاورت مباح قرار دی ہے ایسے امور میں جو صغیر کی اصلاح کرنے والے ہوں اور یہ ان دونوں کے ظن غالب پر موقوف ہے نہ کہ حقیقت ویقین پر۔ اور التشاور کا معنی ہے: رائے کا اظہار کرنا۔ اسی طرح المشاورۃ اور المشورۃ ہے جیسا کہ المعونۃ اور شُرْتُ العسل کا معنی ہے میں نے اسے (شہد کو) نکالا۔ اور شُرْتُ الدابۃ و شوّرتھا یعنی میں نے اسے چلایا اس کی چال کو تیز کرنے کے لئے اور الشَّوار کا معنی ہے گھر کا سامان، کیونکہ وہ دیکھنے والے کے لئے ظاہر ہوتا ہے اور الشارۃ کا معنی ہے آدمی کی ہیئت اور الاشارۃ کا معنی ہے جو تیرے دل میں ہے اسے نکالنا اور اس کا اظہار کرنا۔

مسئلہ نمبر 17۔ قولہ تعالیٰ: وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْۤا اَوْلَادَكُمْ یعنی لاولادکم غیر الوالدۃ اگر تم چاہو تو اپنی اولاد کو دودھ پلواؤ والدہ کے علاوہ (دایہ سے) زجاج نے یہی کہا ہے۔

نحاس نے کہا ہے: عربی میں تقدیر عبارت یہ ہے اَنْ تسترضعوا اجنبیۃ لاولادکم (کہ تم اجنبی عورت سے اپنی اولاد کو دودھ پلواؤ) اس کی مثل یہ ارشاد ہے: كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ (المطففین: 3) یعنی کالوا لھم او وزنوا لھم اور لام کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتے ہیں ان میں سے ایک حرف کے ساتھ ہوتا ہے اور سیبویہ نے شعر کہا ہے:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 313، دار الکتب العلمیہ

امرتُكَ الخير فافعل ما أمرتَ به فقد تركتُكَ ذا مال و ذا نَشَبِ

میں نے تجھے خیر کا حکم دیا ہے پس تو وہ کر جس کا تجھے حکم دیا گیا ہے، تحقیق میں نے تجھے صاحب مال اور صاحب جائیداد چھوڑا ہے۔

اور یہ جائز نہیں ہے: دعوتُ زیدا، ای دعوت لزید، کیونکہ یہ تلبیس (حقیقت کو چھپانا) تک پہنچا دیتا ہے اور اس نوع میں سماع معتبر ہوتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس بنا پر اس آیت میں دایہ بنانے کے جواز پر دلیل موجود ہے جبکہ آباء اور مائیں اس پر متفق ہو جائیں اور عکرمہ نے قول باری تعالیٰ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ میں کہا ہے۔ اس کا معنی ہے دایہ۔ اسے ابن عطیہ نے بیان کیا ہے(1)۔

اور اصل یہ ہے کہ ہر ماں پر اپنے بچے کو دودھ پلانا لازم ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے۔ پس اس نے زوجات کو اپنی اولاد کو دودھ پلانے کا حکم دیا ہے اور ان کے لئے ازواج پر نفقہ اور لباس واجب کیا ہے اور زوجیت قائم رہے گی اور اگر دودھ پلانے کا انتظام کرنا باپ پر لازم ہوتا تو جب اللہ تعالیٰ نے اس پر ان کے نفقہ اور لباس کے لازم ہونے کا ذکر کیا ہے تو وہ اس کا بھی ذکر کر دیتا۔ مگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے دیگر فقہاء امصار کے سوا حسیبہ (خاندانی شرف والی عورت) کی استثنا کی ہے اور کہا ہے: اس پر دودھ پلانا لازم نہ ہوگا(2) اور اسے آیت سے نکال دیا ہے اور اصول فقہ کے ایک اصول کے ساتھ اس کی تخصیص کر دی ہے۔ اور وہ ہے العمل بالعادۃ۔ عمل عادت اور رواج کے مطابق ہوتا ہے اور یہ وہ اصول ہے جسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے سوا کوئی نہیں سمجھا۔ اور اس میں عمدہ اصول یہ ہے کہ یہ امر دور جاہلیت میں صاحب حسب وشرف لوگوں میں رائج تھا، پھر اسلام آیا اور اس نے اسے تبدیل نہیں کیا اور آپ کے زمانے تک صاحب ثروت وحسب لوگ بچوں کو دودھ پلانے والیوں کے حوالے کرنے کے ساتھ ماؤں کو استمتاع کے لئے فارغ کرنے پر مصر رہے۔ تو آپ نے یہ کہہ دیا اور رہا ہمارے زمانے کا حکم تو ہم نے اسے شرعاً ثابت کر دیا ہے۔

مسئلہ نمبر 18۔ قولہ تعالیٰ: اِذَا سَلَّمْتُمْ جب تم یعنی آباء اجرت دودھ پلانے والی دایہ کو ادا کر دو۔ سفیان نے یہی کہا ہے۔ اور مجاہد نے کہا ہے: جب تم ماؤں کو ان کی اجرت اس حساب سے ادا کر دو جس کے مطابق انہوں نے دودھ پلانے کے وقت تک دودھ پلایا(3)۔

سات قراء میں سے چھ نے ما آتیتم بمعنی ما اعطیتم پڑھا ہے اور ابن کثیر نے اَتَیْتُمْ بمعنی ما جئتم و فعلتم (جو تم لائے اور تم نے کیا) پڑھا ہے۔ جیسا کہ زہیر نے کہا ہے:

و ما كان من خير أتوهُ فانما توارثه آباءُ آبائهم قبلُ (4)

جو انہوں نے کہا ہے وہ خیر اور بھلائی نہیں ہے۔ بلاشبہ ان کے آباء کے آباء اس سے پہلے اس کے وارث بنے ہیں۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 312، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 311
3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 313، دار الکتب العلمیہ
4۔ ایضاً

حضرت قتادہ اور زہری رحمہما اللہ نے کہا ہے اس کا معنی ہے جب تم وہ ادا کر دو جو تم نے دودھ پلوانے کے ارادہ سے طے کیا ہے، یعنی والدین میں سے ہر ایک حوالے کر دے اور راضی ہو جائے اور یہ ان دونوں کے اتفاق کی بنا پر ہو اور خیر کے قصد اور امر معروف کے ارادہ سے ہو اور اس احتمال پر سَلَّمْتُمْ کے خطاب میں مرد اور عورتیں بھی داخل ہوں گے (1) اور پہلے دونوں قولوں کی بنا پر خطاب مردوں کو ہے۔

ابوعلی نے کہا ہے: اذا سلمتم ما آتیتم معنی ہے نقدہ او اعطاءہ ہے پھر مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے اور ضمیر کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے اور تقدیر کلام ہے: ما آتَیْتُمُوْهُ، پھر ضمیر کو صلہ سے حذف کر دیا گیا اور اس تاویل کی بنا پر خطاب مردوں کو ہوگا، کیونکہ وہی دودھ پلانے کی اجرت ادا کرتے ہیں۔ ابوعلی نے کہا ہے: اور یہ احتمال بھی ہے کہ ما مصدریہ ہو یعنی اذا سلمتم الاتیان اور معنی پہلے کی طرح ہی ہے، لیکن یہ مضاف کے حذف اور پھر ضمیر کے حذف کے طریقہ سے مستغنی ہو جائے گا۔

وَ الَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ یَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا یَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ فِیْمَا فَعَلْنَ فِیْۤ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ۝

''اور جو لوگ فوت ہو جائیں تم میں سے اور چھوڑ جائیں بیویاں تو وہ بیویاں انتظار کریں چار مہینے اور دس دن اور جب پہنچ جائیں اپنی (اس) مدت کو تو کوئی گناہ نہیں تم پر اس میں جو کریں وہ اپنی ذات کے بارے میں مناسب طریقے سے۔ اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو خوب واقف ہے۔''

اس میں پچیس مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ الَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ جب اللہ تعالیٰ نے طلاق کی عدت کا ذکر کیا اور اس کے ساتھ متصل مسئلہ رضاعت کا ذکر فرمایا، پھر ساتھ ہی عدت وفات کا ذکر بھی کر دیا، تاکہ یہ وہم نہ ہو کہ عدت وفات عدت طلاق کی مثل ہے۔ وَ الَّذِیْنَ یعنی وہ آدمی جو تم سے فوت ہو جاتے ہیں۔ وَ یَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا اور وہ بیویاں چھوڑ جاتے ہیں یا اور ان کی بیویاں ہوں، تو وہ بیویاں انتظار کریں گی، زجاج نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے اور نحاس نے اسے اختیار کیا ہے۔ کلام میں مبتدا کا حذف بہت زیادہ ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ اَلنَّارُ ؕ (الحج: 72)

یہ اصل میں ھو النار ہے اور ابوعلی فارسی نے کہا ہے: تقدیر کلام یہ ہے والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا یتربصن بعدھم وہ آدمی جو تم میں فوت ہو جاتے ہیں اور اپنی بیویاں چھوڑ جاتے ہیں تو وہ ان کے بعد انتظار کریں گی (2) اور یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: السمن منوان بدرھم یہ اصل میں منوان منه بدرھم ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ تقدیر کلام یہ ہے وازواج الذین یتوفون منکم یتربصن (اور وہ ازواج جو تم سے فوت ہو جاتے ہیں تو

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 313، دار الکتب العلمیہ
2۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 612، دار احیاء التراث العربیۃ

ان کی بیویاں انتظار کریں گی۔) پس عبارت میں انتہائی ایجاز اور اختصار ہے۔ اور مہدوی نے سیبویہ سے بیان کیا ہے کہ معنی ہے: و فیمایتلی علیکم الذین یتوفون۔

اور کوفہ کے بعض علمائے نحو نے کہا ہے: الذین کی خبر چھوڑ دی گئی ہے اور مقصود ان کی ازواج کے بارے خبر دینا ہے کہ وہ انتظار کریں گی۔ اور اس لفظ کا معنی ہے مشروع ہونے کی خبر دینا دو وجہوں میں سے ایک میں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت اس عورت کی عدت کے بارے میں ہے جس کا خاوند فوت ہو جائے۔ اس میں ظاہراً عموم ہے لیکن اس کا معنی خاص ہے۔ مہدوی نے بعض علماء سے بیان کیا ہے کہ یہ آیت حاملہ عورتوں کو بھی شامل تھی پھر اسے اس قول کے ساتھ منسوخ کر دیا گیا ہے: وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (طلاق: 4) (1) (اور حاملہ عورتوں کی عدت یہ ہے کہ وہ اپنے حمل وضع کرلیں۔)

اور اکثر علماء نے یہ نظریہ اختیار کیا ہے کہ یہ آیت اس ارشاد باری تعالیٰ کے لئے ناسخ ہے: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ۔ کیونکہ لوگ اسلام کا کچھ عرصہ اس پر قائم رہے جب کوئی آدمی فوت ہوتا اور اپنے پیچھے حاملہ بیوی چھوڑتا تو وہ اپنی بیوی کے لئے ایک سال کے نفقہ کی وصیت کرتا اور سکنیٰ (رہائش گاہ) کی وصیت کرتا جب تک وہ نہ نکلے اور شادی نہ کرلے، پھر اسے چار مہینے اور دس دن اور میراث کے ساتھ اسے منسوخ کر دیا۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: اس میں نسخ نہیں ہے بلکہ یہ سال کی مدت میں کمی کرنا ہے جیسا کہ صلوٰۃ مسافر کہ جب یہ چار سے کم ہو کر دو رکعتیں ہوئی تو یہ نسخ نہیں ہے اور یہ واضح طور پر غلط ہے جب اس کا حکم یہ تھا کہ وہ ایک سال تک عدت گزارے گی جب وہ نہ نکلے اور اگر وہ نکل گئی تو اسے روکا نہ جائے پھر اس حکم کو زائل کر دیا گیا ہے اور اس پر چار مہینے دس دن عدت لازم ہوگئی ہے اور یہی وہ نسخ ہے اور صلوٰۃ مسافر میں اس میں سے کوئی شے نہیں ہے۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ نماز دو دو رکعتیں فرض کی گئی، پھر مقیم کی نماز میں اضافہ کر دیا گیا اور صلوٰۃ مسافر کو اپنے حال پر برقرار رکھا گیا (2)۔ عنقریب اس کا ذکر آئے گا۔

مسئلہ نمبر 3۔ ایسی حاملہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے اس کی عدت وضع حمل ہے۔ یہ جمہور علماء کے نزدیک ہے اور حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ اس کی عدت دو مدتوں میں سے آخری مدت (طویل مدت) کو مکمل کرنا ہے۔ اور ہمارے علماء میں سے سحنون نے اسے اختیار کیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے اس سے رجوع کر لیا ہے اور اس کی دلیل جو حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے وہ ان دونوں قولوں کو جمع کرنے کا ارادہ ہے: یعنی وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا (3) اور اس قول کے درمیان: وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ اور وہ اس طرح کہ جب وہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 314، دار الکتب العلمیۃ

2۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 51، وزارت تعلیم۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، حدیث نمبر 337، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 613، دار احیاء التراث العربیۃ

دو مدتوں کی انتہا تک بیٹھی رہی تو اس نے دونوں آیتوں کے مقتضا کے مطابق عمل کیا۔ اور اگر وہ وضع حمل کے ساتھ عدت گزارے تو اس نے عدت وفات والی آیت کے ساتھ عمل ترک کر دیا۔ اور دونوں کو جمع کرنا ترجیح سے زیادہ اولی اور بہتر ہے۔ اس پر تمام اہل اصول کا اتفاق ہے۔ یہ انتہائی اچھی نظر و فکر ہے اگر اس پر حدیث سُبَیعَہ اسلمیہ (1) سے اعتراض نہ کیا جائے کہ اسے اپنے خاوند کی وفات کے بعد چند ہی راتیں گزرنے کے ساتھ نفاس آنے لگا اور اس نے اس کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا تو آپ ﷺ نے اسے شادی کرنے کی اجازت دے دی۔ انہوں نے اسے الصحیح میں نقل کیا ہے اور حدیث نے واضح کر دیا ہے کہ رب کریم کا ارشاد: وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ مطلقات اور ان عورتوں کے بارے میں جن کے خاوند فوت ہو جائیں اپنے عموم پر محمول ہے اور عدت وفات دونوں صنفوں میں سے غیر حاملہ کے ساتھ مختص ہے اور اسے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول سے تقویت حاصل ہوتی ہے اور جو چاہے میں اس سے مباہلہ کرتا ہوں کہ سورۃ النساء القصریٰ کی آیت عدت وفات کی آیت کے بعد نازل ہوئی۔

ہمارے علماء نے کہا ہے کہ اس کا ظاہر کلام بے شک اس کا ناسخ ہے لیکن وہ اس سے مراد نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

بلاشبہ یہ آیت اس کے لئے مخصصہ ہے اور اس نے اس سے اس کے بعض مشتملات کو نکال دیا ہے اور اسی طرح حدیث سُبَیعَہ عدت وفات سے متاخر ہے۔ کیونکہ سبیعہ کا قصہ حجۃ الوداع کے بعد کا ہے۔ اور اس کا خاوند سعد بن خولہ تھا اور وہ بنی عامر بن لؤی میں سے تھا۔ اور وہ غزوۂ بدر میں شامل ہونے والے صحابہ کرام میں سے تھا۔ جس وقت وہ مکہ مکرمہ میں فوت ہوا اس وقت یہ حاملہ تھی۔ اور یہ وہی ہیں جن کے لئے رسول اللہ ﷺ نے مرثیہ کہا کہ وہ مکہ مکرمہ میں فوت ہوئے ہیں اور ان کے وصال سے نصف مہینہ گزرنے کے بعد اس نے بچے کو جنم دیا۔ اور بخاری نے کہا ہے: چالیس راتیں گزرنے کے بعد (2)۔

اور مسلم نے حضرت عمر بن عبداللہ بن ارقم رضی اللہ عنہم کی حدیث سے بیان کیا ہے کہ سبیعہ نے رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں پوچھا۔ اس نے بیان کیا کہ آپ ﷺ نے مجھے فتویٰ دیا کہ میں اس وقت سے حلال ہو چکی ہوں جب سے میں نے حمل کو وضع کر لیا ہے اور آپ ﷺ نے مجھے شادی کی اجازت مرحمت فرما دی اگر میرے لئے ضرورت ہو (3)۔

ابن شہاب نے بیان کیا ہے: میں کوئی حرج نہیں دیکھتا کہ وہ اس وقت شادی کر لے جب بچے کی ولادت ہو جائے اگرچہ اس کا خون جاری ہو، مگر یہ کہ اس کا خاوند اس کے قریب نہ جائے یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائے۔ اسی نظریہ پر جمہور علماء اور ائمہ فقہاء ہیں۔

اور حسن، شعبی، نخعی اور حماد نے کہا ہے: نفاس والی عورت جب تک دم نفاس میں ہے نکاح نہیں کرے گی اور انہوں نے دو شرطیں لگائی ہیں۔ ایک وضع حمل اور دوسری نفاس سے پاک ہونا۔ اور حدیث ان کے خلاف حجت ہے اور ان کے لئے اس

1۔ صحیح بخاری، باب واولات الاحمال الخ، حدیث نمبر 4907، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

صحیح بخاری، باب والذین یتوفون الخ، حدیث نمبر 4168، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، جلد 2، صفحہ 729، وزارت تعلیم 3۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 486، وزارت تعلیم

قول میں کوئی حجت نہیں ہے۔ فلما تعلت من نفاسها تجملت للخطاب(1) (جب وہ اپنے نفاس سے پاک ہو جائے تو وہ دعوت نکاح دینے والوں کے لئے بناؤ سنگار کرے) جیسا کہ صحیح مسلم اور ابی داؤد میں ہے۔ کیونکہ تَعَلَّتْ کا اگرچہ اصلی معنی دم نفاس سے پاک ہونا ہے، جیسا کہ خلیل نے بیان کیا ہے، پھر بھی یہ احتمال رکھتا ہے کہ یہاں اس سے مراد اس کے نفاس کے دردوں اور تکلیف کا کم ہونا ہو اور اگر وہ معنی تسلیم کرلیا جائے جو خلیل نے بیان کیا ہے تو پھر اس میں کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے بلکہ دلیل سبیعہ کے لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد میں ہے ''کہ تو حلال ہو گئی جب سے تو نے وضع حمل کر لیا(2)''۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضع کے وقت حلت کو واقع کیا اور اسی پر اسے معلق کیا اور یہ نہیں فرمایا جب تیرا خون منقطع ہوا اور نہ یہ فرمایا کہ جب تو پاک ہوئی۔ لہٰذا وہ صحیح ہے جو جمہور نے کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ علماء کے درمیان اس پر کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ہر مطلقہ حاملہ کی عدت وضع حمل ہے چاہے خاوند رجعت کا مالک ہو یا نہ ہو (یعنی طلاق رجعی ہو یا بائن) وہ عورت آزاد ہو یا لونڈی، مدبرہ ہو یا مکاتبہ۔ البتہ حاملہ متوفی عنہا زوجہا کی مدت عدت میں اختلاف ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے اور تمام نے آپس میں اختلاف کیے بغیر اس پر اجماع کیا ہے کہ اگر آدمی فوت ہو جائے اور وہ حاملہ عورت پیچھے چھوڑے اور چار مہینے اور دس دن گزر جائیں تو وہ حلال نہ ہوگی یہاں تک کہ بچے کو جنم دے لے پس اس سے معلوم ہوا کہ مقصود ولادت ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: يَّتَرَبَّصۡنَ، التربص کا معنی نکاح میں تاخیر کرنا اور صبر کرنا ہے اور مسکن نکاح سے نہ نکلنا ہے وہ اس طرح کہ وہ رات کے وقت اس سے جدا اور علیحدہ نہ ہو۔ اور اللہ تعالیٰ نے متوفی عنہا زوجہا کے لئے اپنی کتاب میں سکنیٰ کا ذکر نہیں کیا ہے جیسا کہ مطلقہ کے لئے اپنے اس قول کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے اَسۡكِنُوۡهُنَّ اور کتاب اللہ میں لفظ عدت میں کوئی ایسی شے نہیں ہے جو احداد (سوگ کا اظہار کرنا) پر دلالت کرتی ہو۔ بلکہ فقط فرمایا: يَّتَرَبَّصۡنَ حدیث طیبہ نے ان تمام چیزوں کو بیان فرمایا ہے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث بالکل ظاہر ہیں کہ عدت وفات میں انتظار بلاشبہ احداد کے ساتھ ہے اور احداد سے مراد زیب وزینت سے، خوبصورت رنگے ہوئے کپڑے پہننے سے اور خوشبو وغیرہ لگانے سے رکنا اور باز رہنا ہے(3) اور یہ جمہور علماء کا قول ہے۔

حسن بن ابی الحسن نے کہا ہے: احداد کوئی شے نہیں ہے صرف زوج سے انتظار کرنا ہے اور عورت کے لئے مباح ہے کہ بناؤ سنگھار کر سکتی ہے اور خوشبو لگا سکتی ہے۔ لیکن یہ ضعیف ہے کیونکہ یہ سنت کے خلاف ہے اور یہ ثابت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فریعہ بنت مالک بن سنان کو فرمایا اور اس کا خاوند فوت ہو چکا تھا: اُمکثی فی بیتك حتّٰی یبلغ الکتاب اجله (4) (تو اپنے گھر میں ہی رکی رہ یہاں تک کہ کتاب اللہ کے مطابق عدت اپنے اختتام کو پہنچ جائے۔) اس نے بیان کیا ہے سو میں نے

1۔ سنن نسائی، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 115، وزارت تعلیم۔ سنن ابی داؤد، باب عدۃ الحامل، حدیث نمبر 1962، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 569، وزارت تعلیم

3۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 615، دار احیاء التراث العربیۃ

4۔ موطا امام مالک، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 531، وزارت تعلیم

چار مہینے اور دس دن عدت گزاری ہے۔ یہ حدیث ثابت ہے۔ اسے امام مالک نے سعید بن اسحاق بن کعب بن عجرہ سے بیان کیا ہے اور اسے ان سے امام مالک، ثوری، وہیب بن خالد، حماد بن زید، عیسیٰ بن یونس اور ایک کثیر تعداد نے، ابن عیینہ، القطان اور شعبہ رحمۃ اللہ علیہم نے روایت کیا ہے۔

اور تحقیق امام مالک نے اسے ابن شہاب سے روایت کیا ہے اور یہ تیرے لئے کافی ہے۔

الباجی نے کہا ہے: ان سے ان کے سوا کسی اور نے روایت نہیں کیا اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے بھی اسے اخذ کیا ہے۔

ابو عمر نے کہا ہے: انہوں نے اس کے ساتھ متوفی عنہا زوجہا کے لئے اپنے گھر میں عدت گزارنے کا فیصلہ کیا ہے اور علمائے حجاز و عراق کے نزدیک یہ حدیث مشہور و معروف ہے کہ متوفی عنہا زوجہا پر لازم ہے کہ وہ اپنے گھر میں عدت گزارے اور اس سے نہ نکلے۔ اور یہی قول حجاز، شام، عراق اور مصر وغیرہ امصار کے فقہاء کی جماعت کا ہے۔

اور داؤد نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے تو اس پر لازم نہیں ہے کہ وہ اپنے گھر میں ہی عدت گزارے بلکہ وہ جہاں چاہے عدت گزار سکتی ہے، کیونکہ قرآن کریم میں سکنیٰ کا ذکر مطلقات کے بارے ہے اور ان کی دلیل میں سے یہ بھی ہے کہ یہ وہ مسئلہ ہے جس میں اختلاف ہے۔

انہوں نے کہا ہے: بلاشبہ یہ حدیث ایک ایسی عورت روایت کر رہی ہے جس کا علمی مرتبہ معروف نہیں۔ اور سکنیٰ کو واجب کرنا ایک حکم کو واجب کرنا ہے اور احکام ثابت نہیں ہوتے مگر کتاب اللہ کی نص کے ساتھ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے ساتھ یا اجماع کے ساتھ۔

ابو عمر نے کہا ہے: جہاں تک سنت کا تعلق ہے تو یہ تو بحمد اللہ ثابت ہے اور رہا اجماع تو سنت کے ہوتے ہوئے اس کی ضرورت نہیں کیونکہ جب کسی مسئلہ میں اختلاف ہو تو حجت اس کا قول ہوتا ہے جس قول کی تائید اور موافقت سنت کرے۔ و باللہ التوفیق۔

اور حضرت علی، حضرت ابن عباس، حضرت جابر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم سے بھی داؤد کے قول کی مثل مروی ہے اور اسی طرح حضرت جابر بن زید، عطا اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہم نے بھی کہا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا** اور یہ نہیں فرمایا: یعتددن فی بیوتھن (وہ اپنے گھروں میں عدت گزاریں) لہٰذا عورت جہاں چاہے عدت گزار لے (1)۔ اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مروی ہے۔

اور عبد الرزاق نے بیان کیا ہے کہ معمر نے زہری سے اور انہوں نے حضرت عروہ سے ہمیں حدیث بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنی بہن ام کلثوم کے ساتھ عمرہ کی غرض سے مکہ مکرمہ کی طرف نکلیں اس وقت اس کا خاوند طلحہ بن عبید اللہ شہید ہو چکا تھا اور آپ فتویٰ دیتی تھیں کہ متوفی عنہا زوجہا اپنی عدت کے دوران نکل سکتی ہے (2)۔

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 615، دار احیاء التراث العربیۃ

2۔ مصنف عبد الرزاق، کتاب الطلاق، جلد 7، صفحہ 20، دار الکتب العلمیۃ

فرمایا: ہمیں ثوری نے عبید اللہ بن عمر سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے قاسم بن محمد کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ لوگوں نے اس بارے میں ان کا انکار کیا ہے (1)۔ مزید فرمایا: معمر نے زہری سے ہمیں بیان کیا ہے کہ وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے اس کی عدت کے بارے میں رخصت دینے والوں نے عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول کو لیا ہے اور اہل ورع و عزم لوگوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کے قول کو لیا ہے۔ (2)

اور موطا میں ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ایسی عورتوں کو مقام بیداء سے لوٹا دیتے تھے جن کے خاوند فوت ہو چکے ہوتے اور آپ انہیں حج سے منع کرتے تھے (3) اور یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جانب سے اجتہاد ہے۔ کیونکہ آپ اس گھر میں عورت کے لئے عدت گزارنے کے قائل تھے جس میں اس کا خاوند فوت ہوا، آپ عورت کے لئے اسے لازم قرار دیتے تھے اور یہی قرآن وسنت کا تقاضا ہے۔ پس عورت کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ حج اور عمرہ کے لئے نکلے یہاں تک کہ اس کی عدت گزر جائے۔

امام مالک نے کہا ہے: اسے واپس لوٹا دیا جائے گا جب تک کہ اس نے احرام نہ باندھا ہو۔

مسئلہ نمبر 6۔ جب خاوند رہائش گاہ کا ذاتی طور پر مالک ہو تو عورت کے لئے اس میں عدت گزارنا لازم ہے۔ یہی اکثر فقہاء کا موقف ہے۔ (مثلاً) امام مالک، امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ۔ اور یہ حدیث فریعہ کی وجہ سے ہے۔ کیا گھر کو فروخت کرنا جائز ہے جب کہ وہ مرنے والے کی ملکیت ہو اور ورثاء نے اس کا ارادہ کیا ہو؟ تو ہمارے جمہور اصحاب کے نزدیک ایسا کرنا جائز ہے اور اس میں عورت کے عدت گزارنے کی شرط رکھی جائے گی۔

ابن قاسم نے کہا ہے: کیونکہ عورت غرماء کی نسبت سکنی کی زیادہ حقدار ہے اور محمد بن حکم نے کہا ہے: یہ بیع فاسد ہے کیونکہ اس میں یہ شک ہوسکتا ہے کہ اس کی عدت طویل ہو جائے۔

اور ابن قاسم کے قول کی وجہ یہ ہے کہ اس میں غالب سلامتی ہے اور شک نادر ہے، لہٰذا یہ عقود کو فاسد کرنے میں مؤثر نہیں ہوسکتا اور اگر اس میں اس شرط کے ساتھ بیع واقع ہو جائے پھر عورت کو شک پڑ جائے، تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب محمد میں کہا ہے کہ وہ اس مقام کا زیادہ حق رکھتی ہے یہاں تک کہ شک ختم ہو جائے اور ہمارے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ مشتری کے لئے بیع فسخ کرنے یا اسے مکمل کرنے کا اختیار ہو اور کسی شے کے ساتھ اس کی طرف رجوع نہیں کیا جائے گا کیونکہ وہ عدت معتادہ داخل ہوا ہے۔ اور اگر بیع زوال شک کی شرط کے ساتھ واقع ہوئی تو وہ فاسد ہے۔

سحنون نے کہا ہے: مشتری کے لئے کوئی حجت نہیں ہے اگرچہ شک پانچ سال تک پھیل جائے کیونکہ وہ عدت پر داخل ہے اور عدت کبھی پانچ سال ہوتی ہے اور اسی طرح اسے ابو زید نے ابن قاسم سے روایت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ اگر خاوند کا سکنی تو ہو لیکن ذاتی ملکیت نہ ہو تو عورت کے لئے عدت کی مدت میں سکنیٰ ہوگا۔ بخلاف امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما کے۔ اور اس کی علت فریعہ کے لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے حالانکہ آپ

1۔ مصنف عبد الرزاق، کتاب الطلاق، جلد 7، صفحہ 20، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً، جلد 7، صفحہ 28
3۔ موطا امام مالک، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 531، وزارت تعلیم

جانتے تھے کہ اس کا خاوند رہائش گاہ کی ذاتی ملکیت نہیں رکھتا: امکثی فی بیتک حتی یبلغ الکتاب اجلہ (1) (تو اپنے گھر میں ہی ٹھہر یہاں تک کہ لکھی ہوئی مدت اپنے اختتام کو پہنچ جائے۔) یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ گھر اس عورت کا تھا، پس اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: امکثی فی بیتک (2) کیونکہ معمر نے زہری سے روایت کیا ہے کہ اس نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں عرض کی کہ اس کا خاوند قتل کر دیا گیا ہے اور اس نے اسے ایسے گھر میں چھوڑا ہے جو اس کا نہیں اور اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی اور آگے حدیث ذکر کی۔

اور ہمارے لئے معنی کی نوعیت یہ ہے کہ اس نے ایسا گھر چھوڑا جس کے باسی اس کے اس طرح مالک ہوتے ہیں کہ اس میں اس پر کوئی تاوان اور برائی نہیں ہوتی۔ تو لازم ہے کہ اس کی بیوی اسی میں عدت گزارے، اس کی اصل یہی ہے جبکہ وہ ذاتی طور پر اس کا مالک ہو۔

مسئلہ نمبر 8۔ اور یہ تب ہوتا ہے جب اس نے کرایہ ادا کر رکھا ہو۔ اور رہی وہ صورت جب اس نے کرایہ نہ ادا کیا ہو تو المدونہ میں ہے کہ میت کے مال میں عورت کے لئے کوئی سکنیٰ نہیں اگرچہ وہ خوشحال ہو۔ کیونکہ عورت کا حق اس کے ساتھ متعلق ہوتا ہے جس رہائش گاہ کا وہ مکمل طور پر مالک ہوتا ہے اور جس کا کرایہ اور عوض اس نے ادا نہ کیا ہو وہ اس کا کامل طور پر مالک نہیں ہوتا بلکہ وہ اس عوض کا مالک ہے جو اس کے قبضے میں ہے اور اس میں بیوی کا کوئی حق نہیں مگر میراث کے سبب نہ کہ سکنیٰ کی حیثیت سے، کیونکہ وہ مال ہے سکنیٰ نہیں ہے اور امام محمد نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ میت کے لئے اس کے مال میں کرایہ لازم ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فریعہ کے لئے ارشاد گرامی: امکثی فی بیتک حتی یبلغ الکتاب اجلہ (3) یہ احتمال رکھتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس لئے حکم دیا تھا کہ اس کے خاوند نے گھر کا کرایہ ادا کیا ہوا تھا یا یہ کہ اس میں اس کی وفات تک سکونت اختیار کی گئی تھی یا یہ کہ گھر والوں نے اس کے لئے اس میں عدت کو مباح قرار دیا تھا کرائے کے عوض یا بغیر کرائے کے یا ان میں سے جو اللہ تعالیٰ نے چاہا جس سے آپ نے یہ جان لیا کہ اس گھر میں رہنا اس کے لئے لازم ہے یہاں تک کہ اس کی عدت گزر جائے۔

مسئلہ نمبر 10۔ اس عورت کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے جس کے پاس اس کے خاوند کی موت کی خبر آتی ہے اس حال میں کہ وہ اپنے خاوند کے گھر کے سوا کسی اور گھر میں ہو۔ تو امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ نے اسے اس کے گھر اور قرار گاہ کی طرف لوٹنے کا حکم دیا ہے اور یہ حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور حضرت سعید بن مسیب اور نخعی نے کہا ہے کہ وہ وہیں عدت گزارے گی جہاں اس کے پاس خبر پہنچی۔ وہ وہاں سے نہیں جائے گی یہاں تک کہ عدت گزر جائے۔

ابن منذر نے کہا ہے: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول صحیح ہے، مگر یہ کہ خاوند نے اسے اس مکان کی طرف منتقل کیا ہو تو پھر عدت اسی مکان میں لازم ہو گی۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 144، وزارت تعلیم 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

مسئلہ نمبر 11۔ اس عورت کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی حاجات اور ضروریات کے لئے صبح کے وقت لوگوں کے عام پھیل جانے کے وقت سے لے کر شام کے بعد ان کے اپنے گھروں میں پر سکون ہونے کے وقت تک گھر سے نکل سکتی ہے اور وہ اپنے اس گھر کے سوا رات کہیں نہیں گزار سکتی۔

اور بخاری اور مسلم میں ام عطیہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی عورت کسی میت پر تین دن سے زیادہ سوگ نہیں کرے گی سوائے اپنے خاوند کے کہ وہ چار مہینے اور دس دن ہے۔ وہ نہ تو رنگا ہوا کپڑا پہنے گی سوائے یمنی کپڑے کے (یعنی عصب کا کپڑا) نہ وہ سرمہ لگا سکتی ہے اور نہ خوشبو لگا سکتی ہے مگر جب وہ پاک ہو تو قسط یا اظفار (1) (خوشبو کی دو قسمیں ہیں) میں سے تھوڑی سی لگا سکتی ہے۔

اور ام حبیبہ کی حدیث میں ہے: ''وہ عورت جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت کے ساتھ ایمان رکھتی ہے اس کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ کسی میت پر تین دنوں سے زیادہ سوگ کا اظہار کرے مگر اپنے خاوند پر چار مہینے اور دس دن (2) (سوگ کرے گی) الحدیث۔ الاحداد کا معنی ہے: عورت جب تک عدت میں ہے اس کا ہر قسم کی زیب و زینت کو ترک کر دینا مثلاً بھڑکیلا لباس، خوشبو، زیورات، سرمہ اور مہندی لگانا وغیرہ۔ کیونکہ زینت ازواج کی طرف دعوت دیتی ہے، پس سد ذرائع کے طور پر اس سے منع کر دیا گیا۔ اور اللہ تعالیٰ کی حرمات کو تار تار ہونے سے بچانے کے لئے اور عورت زیتون اور تلوں کا تیل کسی خوشبو میں ملا کر اپنے سر کو نہ لگائے۔ کہا جاتا ہے: امرأۃ حاد و مُحِدٌّ سوگ منانے والی عورت۔ اصمعی نے کہا ہے: ہم حدٌّ نہیں پہچانتے۔ اور لایحل کا فاعل وہ مصدر ہے جسے تُحِدُّ مع اَنْ سے بنانا ممکن ہے یہی مراد ہے تو گویا کہ اس نے کہا: الاحداد۔

مسئلہ نمبر 12۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عورت کو ایمان سے متصف کرنا دو قولوں میں سے ایک کے صحیح ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ ہمارے نزدیک ایسی کتابیہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے اس پر احداد نہیں ہے۔ یہ قول ابن کنانہ اور ابن نافع کا ہے۔ اور اسے اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے اور اسی طرح امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ابن منذر نے کہا ہے اور ان سے ابن القاسم نے روایت کیا ہے کہ اس پر بھی مسلمان عورت کی طرح احداد (سوگ کا اظہار کرنا) ہے۔ یہی لیث، شافعی، ابو ثور اور ہمارے عام اصحاب نے کہا ہے، کیونکہ یہ عدت کے احکام میں سے ایک حکم ہے اور یہ مسلمان کے تحت کتابیہ عورت پر اسی طرح لازم ہے جس طرح رہائش کی جگہ اور عدت لازم ہے۔

مسئلہ نمبر 13۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں: فوق ثلاث الا علی زوج (3) اس پر دلیل ہے کہ مسلمان عورتوں پر تین دنوں سے زیادہ اپنے ازواج کے سوا کسی پر احداد کرنا حرام ہے اور ان پر تین دن سوگ کا اظہار کرنا مباح ہے۔ مرنے کے بعد آنے والی رات سے لے کر تیسری رات کے اختتام تک اسے شمار کیا جائے گا۔ اگر کسی عورت کا دیور فوت ہوا اس

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 488، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب تلبس الحادۃ... الخ، حدیث نمبر 4924، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 804، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب الکحل للحادۃ، حدیث نمبر 4921، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 488، وزارت تعلیم

حال میں کہ ابھی دن یا رات کا کچھ حصہ باقی تھا تو اسے وہ لغو قرار دے گی اور آنے والی رات سے حساب لگائے گی۔

مسئلہ نمبر 14۔ یہ حدیث اپنے حکم کے عام ہونے کے سبب ان تمام زوجات کو شامل ہے جن سے ان کے ازواج فوت ہو جائیں اور اس میں لونڈیاں، آزاد عورتیں، بڑی اور چھوٹی سب داخل ہیں۔ اور یہی جمہور علماء کا مذہب ہے اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا موقف یہ ہے کہ لونڈی اور صغیرہ پر احداد نہیں ہے آپ سے اسے قاضی ابو الولید الباجی نے بیان کیا ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: لونڈی جو کسی کی بیوی ہو وہ جملہ ازواج میں اور عموم اخبار میں داخل ہے اور یہ قول امام مالک، شافعی، ابو ثور اور اصحاب الرائے رحمہم اللہ کا ہے اور مجھے اس بارے کسی کا اختلاف یاد نہیں ہے اور نہ میں انہیں جانتا ہوں کہ وہ ام ولد پر احداد ہونے کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں جب اس کا آقا فوت ہو جائے۔ کیونکہ وہ زوجہ نہیں ہوتی اور احادیث ازواج کے بارے میں وارد ہیں۔

الباجی نے کہا ہے: صغیرہ جب ان عورتوں میں سے ہو جو امر و نہی کی عقل رکھتی ہیں اور اس کے لئے جو حد بیان کی جائے اس کا وہ التزام کرتی ہو تو اسے احداد کا حکم دیا جائے گا اور اگر وہ اپنی صغرسنی کے سبب کسی شے کو نہ جانتی ہو تو ابن مزین نے عیسیٰ سے روایت کیا ہے کہ اس کے گھر والے اسے ان تمام چیزوں سے روکیں گے جن سے کبیرہ اجتناب کرتی ہے اور یہ (احداد) اس کے لئے لازم ہے اور صغیرہ پر احداد کے واجب ہونے کی دلیل وہ روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک عورت نے اپنی اس بچی کے بارے پوچھا جس کا خاوند فوت ہو چکا تھا اور اس کی آنکھیں دکھنے لگیں کہ کیا وہ سرمہ لگا سکتی ہے؟ تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "نہیں" آپ نے یہ دو بار یا تین بار پوچھا تو آپ ہر بار یہی کہتے رہے ہے "نہیں" (1) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی عمر کے بارے نہ پوچھا۔ اگر صغر اور کبر کے سبب حکم مختلف ہو جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی عمر کے بارے ضرور سوال کرتے تا کہ آپ اس کا حکم بیان فرمائیں اور اس قسم کے مسئلہ میں بیان میں تاخیر جائز نہیں ہوتی اور یہ دلیل بھی ہے کہ ہر وہ جس پر عدت وفات لازم ہے اس پر کبیرہ کی طرح احداد کرنا بھی لازم ہے۔

مسئلہ نمبر 15۔ ابن منذر نے کہا ہے: میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں جانتا کہ خضاب بھی اس زینت میں داخل ہے جس سے منع کیا گیا ہے اور انہوں نے اس پر اجماع کیا ہے کہ سوگ والی عورت کے لئے رنگے ہوئے کپڑے اور زرد رنگ کے کپڑے پہننا جائز نہیں ہے مگر ایسا کپڑا جسے سیاہ رنگ سے رنگا جائے کیونکہ حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہم نے اس کی رخصت دی ہے۔ اور زہری نے اسے مکروہ قرار دیا ہے اور زہری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اسے چاہئے کہ وہ عصب کا کپڑا نہ پہنے۔ اور یہ حدیث کے خلاف ہے۔

اور المدونہ میں امام مالک نے کہا ہے: وہ یمن کے عصب کا باریک کپڑا نہیں پہن سکتی اور آپ نے موٹے کپڑے کی گنجائش رکھی ہے۔ ابن قاسم نے کہا ہے: کیونکہ باریک کپڑا رنگے ہوئے کپڑے کے قائم مقام ہے (2) اور وہ ریشم، کتان اور

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 314، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب تحد المتوفی الخ، حدیث نمبر 4920، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المدونۃ الکبری، کتاب العدۃ و طلاق السنۃ، جلد 5، صفحہ 113، السعادۃ بجوار محافظہ مصر

روئی کا باریک اور موٹا کپڑا پہن سکتی ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: ہر اس نے رخصت دی ہے جس نے آپ سے سفید لباس کے بارے کچھ محفوظ کیا ہے۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: امام شافعی کا موقف یہ ہے کہ ہر وہ رنگ جو باعث زینت ہو سوگ منانے والی عورت اسے مس نہ کرے گی، چاہے وہ باریک ہو یا موٹا ہو۔ اسی طرح قاضی عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: رنگوں میں سے ہر وہ جس کے ساتھ عورتیں اپنے خاوندوں کے لئے زیب وزینت اور حسن کا اظہار کرتی ہیں سوگ منانے والی عورت کو چاہئے کہ وہ اس سے باز رہے۔

اور ہمارے بعض متاخرین مشائخ نے ایسا عمدہ سفید لباس پہننے سے بھی منع کیا ہے جس سے زیب وزینت کی جاسکتی ہے اور اسی طرح اعلیٰ قسم کا سیاہ لباس (پہننے سے بھی منع کیا ہے)۔

ابن المواز نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ وہ زیور نہیں پہن سکتی اگر چہ وہ لوہے کا بنا ہوا ہو، فی الجملہ ہر وہ شے جسے ایک عورت اس طور پر پہنتی ہے کہ اسے حسن وخوبصورتی کے اظہار کے لئے بطور زیور استعمال کیا جاتا ہو سوگ منانے والی عورت اسے نہیں پہن سکتی۔

اور ہمارے اصحاب نے جواہرات، یواقیت اور زمرد پر کوئی نص بیان نہیں کی حالانکہ وہ بھی زیور کے معنی میں داخل ہیں۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 16۔ وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے اس پر احداد کے واجب ہونے پر سوائے حسن کے تمام لوگوں نے اجماع کیا ہے حسن نے کہا ہے: احداد واجب نہیں۔ اور انہوں نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جسے عبداللہ بن شداد بن الہاد نے اسماء بنت عمیس سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ جب حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: ''تین دن تک سوگ کا لباس پہن لے پھر جو چاہے وہ کر (1)۔''

ابن منذر نے کہا ہے: تمام اہل علم میں سے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ احداد کے قائل نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا ہے: وہ عورت جسے تین طلاقیں ہو جائیں اور وہ جس کا خاوند فوت ہو جائے وہ دونوں سرمہ لگا سکتی ہیں، خضاب لگا سکتی ہیں اور جو چاہیں وہ کر سکتی ہیں۔ حالانکہ حضور نبی کرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے احداد ثابت ہے اور جس کے پاس بھی یہ احادیث پہنچی ہیں اس نے اسے تسلیم کیا ہے۔ شاید حسن بصری تک یہ احادیث نہیں پہنچیں یا پہنچی تو ہیں لیکن آپ نے اسماء بنت عمیس کی حدیث کے سبب ان کی تاویل کر لی ہے کہ اس نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی شہادت پر سوگ کا اظہار کرنے کی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی اور یہ ان کی بیوی تھی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے تین دن کی اجازت عطا فرمائی اور پھر تین دن گزرنے کے بعد اس کی طرف پیغام بھیجا کہ وہ طہارت کا اہتمام کرے اور سرمہ لگالے۔ ابن منذر نے کہا ہے: اہل علم نے کئی وجوہ سے اس کا رد کیا ہے اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: یہ حدیث شاذ ہے، اس کے مطابق عمل نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح اسحاق نے بھی کہا ہے۔

1۔ مسند ابن جعد، جلد 1، صفحہ 398، مؤسسہ نادر بیروت

مسئلہ نمبر 17۔ امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ طلاق والی عورت پر احداد نہیں ہے، چاہے طلاق رجعی ہو یا بائن، ایک ہو یا اس سے زیادہ۔ یہی قول ربیعہ اور عطا کا ہے۔

اور علمائے کوفہ، امام اعظم ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب، ثوری، حسن بن حی، ابوثور اور ابوعبید رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے کہ وہ عورت جسے تین طلاقیں ہو جائیں اس پر احداد ہے اور یہی حضرت سعید بن مسیب، سلیمان بن یسار، ابن سیرین اور حکم بن عیینہ کا قول ہے۔

حکم نے کہا ہے کہ احداد متوفی عنہا زوجہا کی نسبت اس پر زیادہ مؤکد اور شدید ہے اور معنی کے اعتبار سے دونوں عدت میں ہیں جس کے ساتھ نسب کی حفاظت کی جاتی ہے۔

امام شافعی، احمد اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: احتیاط اسی میں ہے کہ مطلقہ عورت کو زینت سے بچنا چاہئے۔ ابن منذر نے کہا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: وہ عورت جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہے اس کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ تین دنوں سے زیادہ کسی میت پر سوگ کا اظہار کرے مگر خاوند پر چار مہینے اور دس دن (1) (سوگ منائے)۔ یہ اس پر دلیل ہے کہ وہ عورت جسے تین طلاقیں ہو جائیں اور طلاق دینے والا زندہ ہو اس پر احداد نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 18۔ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ جس نے اپنی بیوی کو ایسی طلاق دی جس میں وہ رجوع کا مالک ہو پھر وہ عدت گزرنے سے پہلے پہلے فوت ہو جائے تو عورت پر عدت وفات ہوگی اور وہ اس کی وارث بھی ہوگی۔ اور وہ عورت جسے حالت مرض میں تین طلاقیں دی جائیں اس کی عدت میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ نے کہا ہے کہ وہ عدت طلاق گزارے گی (2)۔ یہ قول امام مالک، امام شافعی، یعقوب، ابوعبید اور ابوثور رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: یہی ہم کہتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حیض والی عورتوں کی عدت حیض قرار دی ہے اور اس پر اجماع ہے کہ وہ عورت جسے تین طلاقیں دی جائیں اگر وہ فوت ہو جائے تو طلاق دینے والا اس کا وارث نہیں ہوتا اس لئے کہ وہ اس کی بیوی نہیں رہی اور جب وہ اس کی بیوی نہیں تو پھر وہ اس کا خاوند بھی نہیں ہوگا۔

اور ثوری نے کہا ہے: دو عدتوں میں سے جو زیادہ ہوگی اس کے مطابق عدت گزارے گی اور نعمان و محمد نے کہا ہے: اس پر چار مہینے اور دس دن عدت ہوگی اور اس میں تین حیض مکمل کرے گی۔

مسئلہ نمبر 19۔ علماء کا ایسی عورت کے بارے اختلاف ہے جسے اپنے خاوند کے فوت ہونے یا اس کی طرف سے طلاق کی خبر پہنچی۔ پس ایک گروہ نے کہا ہے: طلاق اور وفات کی صورت میں عدت اس دن سے ہوگی جس دن وہ مرتا ہے یا طلاق دیتا ہے۔ یہ قول حضرت ابن عمر، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا ہے اور یہی حضرت مسروق، عطا اور تابعین کی ایک جماعت نے کہا ہے اور یہی امام مالک، امام شافعی، امام احمد، اسحاق، ابوعبید، ثوری، ابوثور، اصحاب الرائے اور ابن منذر کا موقف ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 804، وزارت تعلیم
2۔ المدونۃ الکبریٰ، کتاب الطلاق، جلد 6، صفحہ 35، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر

اور اس میں دوسرا قول یہ ہے کہ اس پر عدت اس دن سے ہوگی جس دن اس کے پاس خبر پہنچی۔ یہ قول حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اسی طرح حضرت حسن بصری، قتادہ، عطا خراسانی اور جلاس بن عمرو رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔

اور حضرت سعید بن مسیب اور حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اگر بینہ قائم ہو جائے تو اس کی عدت یوم وفات یا یوم طلاق سے ہوگی اور اگر بینہ قائم نہ ہو تو اس دن سے جس دن اس کے پاس خبر پہنچے گی۔ پہلا قول صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عدت کو وفات یا طلاق کے ساتھ معلق کیا ہے اور اس لئے بھی کہ اگر وہ اس کی موت کے بارے جان لے اور احداد چھوڑ دے تو عدت گزر جاتی ہے اور جب اس نے علم نہ ہونے کے سبب احداد چھوڑ دیا تو یہ اور زیادہ آسان ہے کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ صغیرہ کی عدت گزر جاتی ہے اور اس پر احداد نہیں ہوتا اور یہ بھی کہ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ اگر وہ حاملہ ہو اور وہ خاوند کی طلاق یا اس کی وفات کا علم نہ رکھتی ہو پھر وہ اپنا حمل وضع کر لے تو بلا شبہ اس کی عدت گزر گئی اور اس مسئلہ اور مختلف فیہا مسئلہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اور ان کی دلیل جنہوں نے یہ کہا ہے کہ اس کی عدت اس دن سے ہوگی جس دن اس کے پاس خبر پہنچے گی یہ ہے کہ زیب وزینت ترک کرنے کے سبب عدت عبادت ہے اور وہ قصد اور نیت کے بغیر صحیح نہیں ہوتی اور قصد نہیں ہو سکتا مگر علم کے بعد۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 20۔ آزاد، لونڈی، صغیرہ، کبیرہ، وہ عورت جو حیض کی عمر کو نہ پہنچے، وہ جو حائضہ ہو اور حیض سے ناامید ہو جائے اور کتابیہ عورت اس کے ساتھ دخول ہوا یا نہیں جبکہ وہ غیر حاملہ ہو ان تمام پر عدت وفات لازم ہوتی ہے اور سوائے لونڈی کے ان تمام کی عدت چار مہینے اور دس دن ہے۔ کیونکہ اس ارشاد میں آیت عام ہے: **یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا** اور وہ لونڈی جس کا خاوند فوت ہو جائے اس کی عدت دو مہینے اور پانچ راتیں ہیں۔

ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کی عدت بالاجماع آزاد عورت کی عدت کا نصف ہے مگر وہ جو اصم سے بیان کیا جاتا ہے کیونکہ اس نے آزاد اور لونڈی کو اس میں برابر قرار دیا ہے، حالانکہ اجماع اس سے پہلے ہے لیکن اپنے بہرے پن کے سبب (1) اس نے سنا نہیں۔

الباجی نے کہا ہے: اس بارے میں ہم کوئی اختلاف نہیں جانتے سوائے اس کے جو ابن سیرین سے مروی ہے اور وہ ان سے ثابت نہیں ہے کہ انہوں نے کہا ہے: لونڈی کی عدت آزاد عورت کی عدت کی مثل ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اصم کا قول من حیث النظر صحیح ہے کیونکہ وہ آیات جو مہینوں اور حیضوں کے ساتھ وفات اور طلاق کی عدت کے بارے میں وارد ہوئی ہیں وہ لونڈی اور آزاد کے حق میں عام ہیں۔ پس اس نقطۂ نظر سے آزاد اور لونڈی کی عدت برابر ہے۔ کیونکہ عمومات میں آزاد اور لونڈی کے مابین کوئی فرق نہیں ہے اور جس طرح نکاح میں لونڈی اور آزاد برابر ہیں اسی طرح وہ عدت میں بھی اس کے ساتھ برابر ہوگی۔ واللہ اعلم

ابن عربی نے کہا ہے: امام مالک سے روایت ہے کہ کتابیہ عورت تین حیضوں کے ساتھ عدت گزارے گی تب اس سے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 210، دار الفکر

براءت رحم ہوگی اور یہ آپ سے انتہائی فاسد قول منقول ہے، کیونکہ اس قول نے اسے (کتابیہ کو) آیت وفات کے عموم سے خارج کر دیا ہے حالانکہ وہ اس میں شامل ہے اور اس نے اسے آیت طلاق کے عموم میں داخل کر دیا ہے حالانکہ یہ اس میں سے نہیں ہے(1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی پر اس کی بنا ہے جو مدونہ میں ہے اس پر عدت نہیں اگر وہ غیر مدخول بہا ہو کیونکہ اس کی براءت رحم معلوم ہے اور یہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ خاوند کے فوت ہونے کے بعد کسی مسلمان یا غیر مسلم سے شادی کر سکتی ہے کیونکہ جب اس پر عدت وفات نہیں ہے اور نہ ہی دخول کے سبب استبراء رحم لازم ہے تو پھر وہ ازواج کے لئے حلال ہے۔

مسئلہ نمبر 21۔ اور علماء نے ام ولد کی عدت کے بارے اختلاف کیا ہے جب اس کا آقا فوت ہو جائے۔

پس ایک گروہ نے کہا ہے: اس کی عدت چار مہینے دس دن ہے۔ یہی تابعین کی ایک جماعت نے کہا ہے۔ ان میں سے حضرت سعید بن مسیب، حضرت زہری، حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہم اور کئی اور بھی ہیں اور یہی امام اوزاعی اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے۔

اور ابو داؤد اور دارقطنی نے قبیصہ بن ذؤیب سے اور انہوں نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہم پر ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو مشتبہ نہ بناؤ کہ متوفی عنہا زوجہا کی عدت چار مہینے دس دن ہے یعنی ام ولد کے حق میں۔ یہ لفظ ابو داؤد کے ہیں اور دارقطنی نے کہا ہے: یہ موقوف ہے۔ اور یہی درست ہے اور یہ مرسل ہے کیونکہ قبیصہ نے عمرو سے سماع نہیں کیا(2)۔

ابن منذر نے کہا ہے کہ اس حدیث کو امام احمد اور ابو عبید نے ضعیف قرار دیا ہے۔

اور حضرت علی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس کی عدت تین حیض ہے اور یہی قول حضرت عطا، ابراہیم نخعی، سفیان ثوری اور اصحاب الرائے رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔ انہوں نے کہا ہے: کیونکہ عدت آزادی کی حالت میں واجب ہو رہی ہے لہٰذا یہ واجب ہے کہ عدت کامل ہو اور اس کی اصل آزاد عورت کی عدت ہے۔

امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور ابوثور نے کہا ہے: اس کی عدت ایک حیض ہے(3) اور یہی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

اور طاؤس سے روایت ہے کہ اس کی عدت اس آزاد عورت کی عدت کا نصف ہے جس کا خاوند فوت ہو جائے اور اسی طرح حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے قول کے بارے میں یہی کہتا ہوں کہ وہ سب سے قلیل مدت ہے جو کچھ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 211، دارالفکر

2۔ سنن دارقطنی، باب المہر، جلد 2، صفحہ 310، دارالمحاسن قاہرہ۔ ایضاً سنن ابی داؤد، باب فی عدۃ ام الولد، حدیث نمبر 1964، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المدونۃ الکبری، کتاب العدۃ وطلاق السنۃ، جلد 5، صفحہ 120، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر

اس کے بارے میں کہا گیا ہے اور اس میں کوئی سنت نہیں ہے جس کی اتباع کی جائے اور نہ ہی کوئی اجماع ہے جس پر اعتماد کیا جائے۔ آزادی کی حالت میں اس کی عدت میں ان کے اختلاف کا ذکر حالت وفات میں اختلاف کی طرح برابر برابر ہے۔ مگر امام اوزاعی نے کہا ہے کہ آزادی کی حالت میں اس کی عدت تین حیض ہوگی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ان اقوال میں سے اصح قول امام مالک کا ہے، کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا ہے: **وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ**۔ پس حیضوں کے انتظار میں یہ شرط ہے کہ وہ طلاق کے سبب ہو۔ پس اس کے ساتھ کسی غیر سبب سے ہونے کی نفی ہوگئی۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا**۔ پس اس کے وجوب کو اس کے ساتھ معلق کیا ہے کہ انتظار کرنے والی بیوی ہو۔

پس یہ اس پر دلیل ہے کہ لونڈی اس کے خلاف ہے اور یہ بھی دلیل ہے کہ بے شک یہ ملک یمین کے سبب موطوءہ لونڈی ہے پس اس کا استبراء رحم ایک حیض سے ہے۔ لونڈی میں اصل یہی ہے۔

مسئلہ نمبر 22۔ جب یہ ثابت ہوگیا تو کیا ام ولد کی عدت محض استبرا ہے یا عدت ہے؟ پس اس کے بارے ابو محمد نے اپنی معونت میں ذکر کیا ہے کہ ایک حیض استبراء ہے اور عدت نہیں ہے۔ اور المدونہ میں ہے کہ ام ولد پر عدت ہے اور اس کی عدت ایک حیض ہے جس طرح کہ آزاد عورت کی عدت تین حیض ہیں۔ اور اختلاف کا فائدہ یہ ہے کہ جب ہم نے کہا: یہ عدت ہے تو امام مالک نے فرمایا: میں یہ پسند نہیں کرتا کہ وہ کسی سے وعدہ کرے جو اس سے نکاح کرلے گا مگر یہ کہ ایک حیض گزر جائے (1)۔

ابن القاسم نے کہا ہے: مجھ تک آپ سے یہ خبر پہنچی ہے کہ آپ نے کہا کہ وہ اپنے گھر میں ہی رات گزارے گی اور آپ نے اس کی مدت استبرا کے لئے عدت کا حکم ثابت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 23۔ اہل علم نے اس پر اجماع کیا ہے کہ وہ عورت جسے تین طلاقیں ہوں یا ایسی مطلقہ جس پر خاوند کو رجوع کا حق ہو درآنحالیکہ وہ حاملہ ہو اس کا خرچہ خاوند پر واجب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَاِنْ كُنَّ اُولٰتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ** (الطلاق: 6) (اور اگر وہ حاملہ ہوں تو ان پر خرچ کرتے رہیں، یہاں تک کہ وہ بچہ جنیں۔)

اور حاملہ متوفیٰ عنہا زوجہا کے نفقہ کے واجب ہونے کے بارے میں اہل علم نے اختلاف کیا ہے۔ پس ایک گروہ نے کہا ہے: اس کے لئے کوئی نفقہ نہیں ہے۔ اسی طرح حضرات جابر بن عبداللہ، حضرت ابن عباس، حضرت سعید بن مسیب، حضرت عطا، حضرت حسن، حضرت عکرمہ، عبدالملک بن یعلی، یحییٰ انصاری، ربیعہ، مالک، احمد اور اسحاق رضی اللہ عنہم و رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے اور ابو عبید نے اصحاب الرائے سے اسے بیان کیا ہے۔ اس میں دوسرا قول یہ ہے کہ اس کے لئے کل مال سے نفقہ ہوگا اور یہ قول حضرت علی اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور اسی طرح حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما، شریح، ابن سیرین، شعبی، ابو العالیہ، نخعی، جلاس بن عمرو، حماد بن ابی سلیمان، ایوب سختیانی، سفیان ثوری اور ابو عبید رحمۃ اللہ علیہم نے بیان کیا ہے۔

1۔ المدونۃ الکبری، کتاب العدۃ وطلاق السنۃ، جلد 5، صفحہ 121، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر

ابن منذر نے کہا ہے: میں پہلے قول کے مطابق کہتا ہوں، کیونکہ انہوں نے اس پر اجماع کیا ہے کہ ہر اس آدمی کا نفقہ جس کے نفقہ پر اسے زندگی میں مجبور کیا جا سکتا ہے مثلاً اس کے بچے، بیوی اور اس کے والدین وہ نفقہ اس سے ساقط ہو جاتا ہے تو اسی طرح اس کی ازواج میں سے حاملہ کا نفقہ بھی اس سے ساقط ہو جائے گا۔

اور قاضی ابو محمد نے کہا ہے: کیونکہ حمل کا نفقہ دین ثابت نہیں ہے کہ وہ اس کی موت کے بعد اس کے مال سے متعلق ہو جائے، اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ تنگدستی کے سبب اس سے ساقط ہو جاتا ہے تو موت کے سبب اس کا ساقط ہونا زیادہ اولی اور زیادہ مناسب ہے۔

مسئلہ نمبر 24۔ قولہ تعالیٰ: اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا۔ علماء نے ان چار ماہ اور دس دن میں اختلاف کیا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے متوفی عنہا زوجہا کی عدت کے لئے وقت مقرر فرمایا ہے کہ کیا ان میں سے وہ ایک بار حیض آنے کی محتاج ہوتی ہے یا نہیں؟ تو بعض نے کہا ہے: جب وہ عورت موطوءہ ہو تو اس کی براءت رحم نہ ہوگی مگر اس حیض کے ساتھ جو اسے چار مہینے اور دس دن کے دوران آئے گا ورنہ وہ مشکوک ہو جائے گی اور بعض دوسروں نے کہا ہے: اس پر چار ماہ اور دس دن سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے۔ مگر یہ کہ وہ اپنے آپ کو واضح شک میں دیکھے۔ کیونکہ اس مدت میں حیض نہیں آتا یا ان میں سے ہو جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا یا اسے پہچان لیا جائے کہ اس کا حیض اسے نہیں آئے گا مگر اس مدت سے زیادہ اور اکثر مدت میں۔

مسئلہ نمبر 25۔ قولہ تعالیٰ: وَّعَشْرًا۔ وکیع نے ابو جعفر الرازی سے، انہوں نے ربیع بن انس سے اور انہوں نے ابو العالیہ سے روایت کیا ہے کہ ان سے سوال کیا گیا کہ چار مہینوں کے ساتھ دس دن کو کیوں ملایا گیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: کیونکہ اتنی مدت میں روح پھونکی جاتی ہے۔ عنقریب سورۃ الحج میں اس کا بیان آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور اصمعی نے کہا ہے: بے شک ہر حاملہ کا بچہ اس کے حمل کی نصف مدت میں حرکت کرنے لگتا ہے۔ پس یہ بھی حرکت کرنے لگے گا (یعنی فھی مرکضتین ذکر کیا ہے) اور کسی اور نے کہا ہے: ارکضت فی مرکضۃ (اس نے حرکت دی پس یہ حرکت کرنے والی ہے) جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

و مرکضۃ صریحی ابوھا تھان لھا الغلامۃ والغلام

اس میں مرکضۃ اسی معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

اور خطابی نے کہا ہے: قولہ: وَّعَشْرًا اس سے مراد راتوں سمیت دن ہیں۔ واللہ اعلم

اور مبرد نے کہا ہے: العشر مؤنث لایا گیا ہے کیونکہ اس سے مراد مدت ہے۔ اس کا معنی ہے وعشر مدد ہر مدت ایک دن اور ایک رات کی ہے۔ پس رات اپنے دن کے ساتھ مل کر زمانے کی ایک مدت معلوم ہے اور کہا گیا ہے: عشرۃ نہیں فرمایا راتوں کے حکم کو غلبہ دیتے ہوئے کیونکہ رات دن سے پہلے ہوتی ہے اور ایام ان کے ضمن میں ہوتے ہیں۔ وَّعَشْرًا لفظ کے اعتبار سے زیادہ خفیف ہے (1)۔ پس راتوں کو دنوں پر غلبہ دیا جاتا ہے جب یہ تاریخ میں جمع ہو جائیں، کیونکہ مہینوں کی ابتدا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 314، دار الکتب العلمیہ

رات سے چاند طلوع ہونے کے وقت ہوتی ہے تو جب مہینے کی ابتدا اور پہلا حصہ رات ہے تو پھر رات کو ہی غلبہ دیا جائے گا۔ آپ کہتے ہیں: صمنا خمسا من الشھر ہم نے مہینے سے پانچ روزے رکھے۔ پس راتیں غالب ہوتی ہیں اگرچہ روزہ دن کے وقت ہوتا ہے۔ امام مالک، امام شافعی اور علمائے کوفہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد دن اور راتیں ہیں۔

ابن منذر نے کہا ہے: پس اگر کسی عقد کرنے والے نے اس سے اس قول کی بنا پر نکاح کیا درآنحالیکہ چار مہینے اور دس راتیں گزر چکی تھیں تو وہ نکاح باطل ہوگا یہاں تک کہ دسواں دن بھی گزر جائے۔

اور بعض فقہاء نے کہا ہے کہ جب اس کی مدت چار مہینے اور دس راتیں گزر گئی تو وہ ازواج کے لئے حلال ہوگئی اور وہ اس لئے کہ انہوں نے عدت کو مبہم دیکھا تو تانیث کو غلبہ دے دیا اور اسے راتوں پر محمول کر دیا۔ اور یہ موقف فقہاء میں سے امام اوزاعی اور متکلمین میں سے ابوبکر الاصم نے اختیار کیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے اربعة اشھر وعشر لیال پڑھا ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ نے اجل (مدت) کی نسبت ان (عورتوں) کی طرف کی ہے کیونکہ وہ انہیں کے معاملے کی حد بیان کی گئی ہے اور اس سے مراد ہے عدت کا گزرنا۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ۔ یہ خطاب تمام لوگوں کو ہے اور یہ اس حکم کے ساتھ متعلق ہے جو حکام اور اولیاء کے لئے ہے (1)۔ فِيْمَا فَعَلْنَ اس سے مراد شادی کرنا ہے اور جو کچھ اس سے پہلے ہوتا ہے (یعنی) بناؤ سنگھار کرنا اور احداد کو ترک کرنا وغیرہ (2)۔ بِالْمَعْرُوْفِ یعنی ایسے طریقے سے جس کی شریعت میں اجازت دی گئی ہے یعنی ازواج کو دیکھنے کا اختیار اور عقد ہونے سے پہلے مہر مقرر کرنا وغیرہ کیونکہ یہ اولیاء کا حق ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس آیت میں اس پر دلیل ہے کہ اولیاء کو اختیار ہے کہ وہ انہیں عدت کے دوران شادی کے لئے بناؤ سنگھار کرنے اور آراستہ ہونے اور حسن وخوبصورتی کا اظہار کرنے سے منع کریں۔ اس میں اسحاق کے اس قول کا رد بھی ہے کہ مطلقہ عورت جب تیسرے حیض میں داخل ہو جائے تو وہ بائنہ ہو جاتی ہے اور پہلے خاوند کے لئے رجعت کا حق منقطع ہو جاتا ہے مگر یہ کہ اس کے لئے شادی کرنا حلال نہیں ہوتا یہاں تک کہ وہ غسل کرلے اور شریک سے روایت ہے کہ اس کے خاوند کے لئے رجعت کا حق رہتا ہے جب تک وہ غسل نہ کرے اگرچہ بیس سال بعد تک ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِنَّ اور یہاں بلوغ الاجل سے مراد تیسرے حیض کے خون میں اس کے داخل ہونے کے ساتھ عدت کا گزرنا ہے اور اس میں غسل کا ذکر نہیں تو جب اس کی عدت گزر گئی وہ ازواج کے لئے حلال ہوگئی اور بناؤ سنگھار میں سے جو بھی وہ کرے اس پر کوئی گناہ نہیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو حدیث مروی ہے اگر وہ صحیح

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 314، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً

ہے تو وہ استحباب پر محمول ہوگی۔ واللہ اعلم۔

(اشارہ اس حدیث کی طرف ہے: عن ابن عباس من أن المرأة اذا طعنت فی الحیضة الثالثة بانت و انقطعت رجعة الزوج، و ھذا قول اسحاق المتقدم و ھو ضعیف) حاشیہ قرطبی

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُم بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنتُمْ فِي أَنفُسِكُمْ ۚ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَٰكِن لَّا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَن تَقُولُوا قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۚ وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿٢٣٥﴾

''اور کوئی گناہ نہیں تم پر اس بات میں کہ اشارہ سے پیغام نکاح دو ان عورتوں کو یا جو چھپائے ہو تم اپنے دلوں میں، جانتا ہے اللہ تعالیٰ کہ تم ضرور ان کا ذکر کرو گے، البتہ نہ وعدہ لینا ان سے خفیہ طور پر بھی مگر یہ کہ کہو (ان سے) شریعت کے مطابق کوئی بات اور نہ پکی کرلو نکاح کی گرہ یہاں تک کہ پہنچ جائے عدت اپنی انتہا کو اور جان لو کہ یقیناً اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے سو اس سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا حلم والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُم بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنتُمْ فِي أَنفُسِكُمْ ۚ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَٰكِن لَّا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَن تَقُولُوا قَوْلًا مَّعْرُوفًا

اس میں نو مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا جُنَاحَ یعنی کوئی گناہ نہیں، جُنَاحَ کا معنی گناہ ہے، یہی معنی شریعت میں اصح ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد شاق گزرنے والا امر ہے۔ لغت کے اعتبار سے یہ معنی اصح ہے۔ شاخ نے کہا ہے:

اذا تعلو براکبھا خلیجا	تذکر مالدیہ من الجناح

اس میں الجناح سے مراد مشقت آمیز امر ہے۔

اور قولہ تعالیٰ: عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُم اس میں خطاب تمام لوگوں کو کیا گیا ہے: اور حکما اس سے مراد وہ آدمی ہے جو اپنے دل میں معتدہ کے ساتھ نکاح کی خواہش رکھتا ہو(1)۔ یعنی عدۃ وفات میں اشارۃ پیغام نکاح دینے میں تم پر کوئی بوجھ اور گناہ نہیں۔ تعریض تصریح کی ضد ہے۔ اس سے مراد افھام المعنی بالشئ المحتمل لہ ولغیرہ ہے یعنی کسی معنی کو ایسی شے کے ساتھ سمجھا دینا جو اس معنی اور دوسرے کا احتمال رکھتی ہو اور یہ عرض الشئ سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی کسی شے کی جانب اور طرف ہے۔ گویا وہ اس طرح مطلوبہ شے کے اردگرد گھومتا رہتا ہے لیکن اس کا اظہار نہیں کرتا۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 315، دار الکتب العلمیہ

اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ یہ میرے اس قول سے ہے عرضت الرجل یعنی میں نے آدمی کو بطور تحفہ ہدیہ پیش کیا اور حدیث طیبہ میں ہے: ان رکبا من المسلمین عرضوا رسول اللہ ﷺ و ابابکر ثیابا بیضا۔ ای اھدوا لھما۔ کہ مسلمان شہسواروں نے رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو سفید کپڑے بطور تحفہ پیش کیے۔ اور کلام کے ساتھ تعریض کرنے والا وہ ہوتا ہے جو اپنے ساتھی تک بات اس طرح پہنچاتا ہے کہ وہ اس کا معنی ومفہوم سمجھ جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اس پر اجماع امت ہے کہ عدت گزارنے والی عورت کے ساتھ ایسی گفتگو کرنا جو اس کے نکاح کے بارے میں صریح نص ہو اور اس پر متنبہ کرنے والی ہو وہ جائز نہیں ہے اور اسی طرح اس پر بھی امت کا اجماع ہے کہ اس کے ساتھ ایسی کلام کرنا جو فحش ہو اور جماع کا ذکر کرنا یا ایسی گفتگو جو جماع پر ابھارتی ہو یہ بھی جائز نہیں ہے اور اسی طرح جو کلام بھی اس معنی ومفہوم کے مشابہ ہوگا وہ جائز نہیں اور اس کے سوا جو گفتگو ہے اسے جائز قرار دیا گیا ہے اور تصریح کے جو قریب تر کلام ہے وہ حضور نبی رحمت ﷺ کا وہ قول ہے جو آپ نے فاطمہ بنت قیس کے ساتھ کیا: کونی عند ام شریك ولا تسبقینی بنفسك(1) (تو ام شریک کے پاس رہ اور اپنے بارے میں مجھ سے سبقت نہ لے جا) اور وہ عورت جو طلاق رجعی کی عدت گزار رہی ہو بالاجماع اسے تعریضاً پیغام نکاح دینا جائز نہیں ہے کیونکہ وہ زوجہ کی طرح ہے اور رہی وہ عورت جو طلاق بائن کی عدت میں ہو تو صحیح قول یہی ہے کہ اسے تعریضاً پیغام نکاح دینا جائز ہے۔ واللہ اعلم۔

تعریض کی تفسیر میں بہت سے الفاظ ذکر کیے گئے ہیں۔ ان کا مجموعہ دو قسموں کی طرف لوٹتا ہے:

پہلی قسم یہ ہے کہ وہ اس کا ذکر اس کے ولی سے کرے اور اسے اس طرح کہے لا تسبقنی بھا (تو اس کے بارے مجھ سے (کسی اور کی طرف) آگے نہ بڑھنا۔) اور دوسری قسم یہ ہے کہ وہ بغیر کسی واسطہ کے اس کی طرف اس سے اشارہ کرے۔ اور اسے اس طرح کہے: بلاشبہ میں شادی کا ارادہ رکھتا ہوں یا تو بڑی خوبصورت ہے یا بلاشبہ تو صالحہ اور نیک ہے بلاشبہ اللہ تعالیٰ تجھے خیر و برکت عطا فرمانے والا ہے۔ میں تجھ سے رغبت رکھتا ہوں، کون ہے جو تجھ سے اعراض کرسکتا ہے، بے شک تجھ میں رغبت بہت زیادہ ہے، بلاشبہ مجھے کسی عورت کی حاجت وضرورت ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کوئی امر مقدر فرمائے گا تو وہ ہو جائے گا۔

یہ تمام امام مالک اور ابن شہاب کی بیان کردہ تمثیلات ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ یہ کہے: ''تو اپنے بارے میں مجھ سے تجاوز نہ کرنا(2)''۔ اور کوئی حرج نہیں کہ وہ اسے کوئی ہدیہ اور تحفہ دے اور یہ کہ عدت کے دوران اس کا کام کاج کردے جبکہ وہ اس کی شان کے مطابق ہو۔ ابراہیم نے یہی کہا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ اپنی مدح اور تعریف کرے اور وہ اپنے پسندیدہ افعال اور خاندانی شرافت کا ذکر کرے جس میں اشارۃً شادی کا تذکرہ بھی ہو۔

ابوجعفر محمد بن علی بن حسین رضی اللہ عنہم نے اسی طرح کہا ہے۔ سکینہ بنت حنظلہ نے بیان کیا ہے کہ محمد بن علی رضی اللہ عنہما میرے پاس اجازت لے کر آئے اور میرے خاوند کے فوت ہونے کے وقت سے ابھی میری عدت نہیں گزری تھی اور انہوں نے کہا: تو

1۔ [illegible] وجیز، جلد 1، صفحہ 315، دارالکتب العلمیہ

2۔ جامع البیان، جلد 2، صفحہ 619، داراحیاء التراث العربیۃ

جانتی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میری قرابت ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے میری قرابت ہے اور عرب میں میرے مقام و مرتبہ کو بھی تو جانتی ہے۔ میں نے کہا: اے ابوجعفر! اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائے، بلاشبہ تم ایسے آدمی ہو جس سے مؤاخذہ کیا جائے گا، تم مجھے میری عدت کے دوران پیغام نکاح دے رہے ہو۔ تو انہوں نے فرمایا: بلاشبہ میں نے تو تجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اپنی قرابت کے بارے بتایا ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ام سلمہ کے پاس تشریف لے گئے۔ وہ ابوسلمہ رضی اللہ عنہ سے بیوہ ہو چکی تھیں اور ارشاد فرمایا: ''یقیناً تو جانتی ہے میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں، اس کا پسندیدہ ہوں اور میری قوم میں میرے مقام سے بھی تو آگاہ ہے۔'' یہی پیغام نکاح تھا۔ اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے(1) اور معتدہ کے پاس ہدیہ بھیجنا بھی جائز ہے اور یہ بھی تعریض میں سے ہے۔ سحنون اور بہت سے علماء نے یہی کہا ہے اور ابراہیم نے بھی اسی طرح کہا ہے اور حضرت مجاہد نے یہ ناپسند کیا ہے کہ کوئی اسے یہ کہے: ''تو اپنے بارے میں مجھ سے سبقت نہ کرنا اور وہ اسے ہی خفیہ معاہدہ جان لے(2)۔

قاضی ابو محمد بن عطیہ نے کہا ہے: یہ میرے نزدیک حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تاویل کی بنا پر جائز ہے جو آپ نے فاطمہ کو فرمایا تھا کہ یہ اس کے لئے اس آدمی کے بارے میں رائے کے طور پر ہے جو اس سے شادی کرے گا نہ کہ اس طور پر کہ اس سے اس نے اپنی ذات کا ارادہ کیا ہو، کیونکہ یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد کے خلاف ہے(3)۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ الخطبہ خاء کے کسرہ کے ساتھ، اس کا معنی ہے کلام اور قصد سے پیغام نکاح دینا اور فعل یا قول سے لطف اندوز ہونا۔ کہا جاتا ہے: خطبها یخطبها خطبا و خطبة (پیغام نکاح دینا) اور رجل خطاب کثرت سے پیغام نکاح دینے والا آدمی۔ اور اس معنی میں شاعر کا قول بھی ہے

بَرَّحَ بالعَيْنَيْنِ خطاب الكُتَب   يقول انى خاطِبٌ وقد كَذَبْ

وانما يخطُبُ عُسًا مِنْ حَلَبْ(4)

اور الخطیب اس کا معنی ہے الخاطب پیغام نکاح دینے والا۔ اور الخطیبی کا معنی الخِطبة (منگنی) ہے۔

عدی بن زید نے کہا ہے، وہ جذیمہ الابرش کی طرف سے الزباء کی منگنی کے ارادہ کا ذکر کرتا ہے:

لخطّيبىَ الّتى غدرت و خانت   و هُنّ ذواتُ غائلةٍ لِحِيْنَا

اور الخِطْبُ سے مراد وہ آدمی ہے جو عورت کو پیغام نکاح دیتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے: ھی خطبه و خطبته التی یخطبها۔ یہ فلاں کی طرف منسوب ہے اور اس کی منگیتر وہ ہے جسے وہ پیغام بھیجتا ہے۔ اور الخِطبة فِعلةٌ کے وزن پر ہے جیسے جِلسة اور قِعدةٌ۔ اور الخُطبة خاء کے ضمہ کے ساتھ اس سے مراد وہ کلام ہے جو نکاح وغیرہ میں کہا جاتا ہے۔

نحاس نے کہا ہے: خُطبہ وہ ہے جو اس کے اول اور آخر میں ہو۔ اور اسی طرح وہ جو فُعْلة کے وزن پر ہو جیسے الاکلة

1۔ سنن دارقطنی، کتاب النکاح، جلد 3، صفحہ 224، دار المحاسن قاہرہ
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 315، دار الکتب العلمیہ
3۔ ایضاً
4۔ ایضاً

(خارش) اور الضَّغطۃ (تنگی، ایک دفعہ کا بھینچنا) ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اس کا معنی ہے اس کی عدت گزرنے کے بعد اس سے شادی کرنے کے بارے جو تم پوشیدہ رکھے ہوئے ہو اور چھپائے ہوئے ہو۔ الاکنان کا معنی ہے ڈھانپنا، چھپانا اور مخفی رکھنا۔

کہا جاتا ہے: کننتہ و اکننتہ دونوں کا معنی ایک ہے یعنی میں نے اسے چھپائے رکھا۔

اور کہا گیا ہے: کننتہ یعنی میں نے اسے محفوظ رکھا، یہاں تک کہ اسے کوئی آفت نہ آپہنچی، اگرچہ وہ مستور اور چھپا ہوا نہ بھی ہو۔ اور اسی سے بَيْضٌ مکنون اور دُرّ مکنون ہے (یعنی چھپایا ہوا انڈا اور موتی) اور اکننتہ کا معنی ہے میں نے اسے مخفی رکھا اور میں نے اسے ڈھانپ لیا۔

اور کہا جاتا ہے: كَنَنْتُ الشيء (من الأجرا) جب تو اسے چھپا لے کپڑے سے، یا گھر سے یا زمین وغیرہ سے اور اکننت الأمرفی نفسی: میں نے کام کو اپنے دل میں چھپائے رکھا۔ اور عربوں سے یہ جملہ نہیں سنا گیا۔

کننتہ فی نفسی اور کہا جاتا ہے: اَكَنَ البیتُ الانسان گھر نے انسان کو چھپا لیا وغیرہا۔

پس اللہ تعالیٰ نے اس سے گناہ کو اٹھا دیا ہے جس نے اخفا اور تعریض کے ساتھ معتدہ سے شادی کرنے کا ارادہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے ایسا وعدہ لینے سے منع فرمایا ہے جو شادی کے بارے صریح ہو اور اس پر اس کی بناء ہو اور وعدے پر اتفاق ہو۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے علم اور جاننے کی رخصت دی ہے، نفوس کے غلبہ اور ان کے مغرور ہونے کے سبب اور انسان کے اس کی ملکیت سے کمزور اور ضعیف ہونے کے سبب۔

مسئلہ نمبر 5۔ شوافع نے اس آیت سے اس پر استدلال کیا ہے کہ تعریض میں حد واجب نہیں ہوگی۔ اور انہوں نے کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے تعریضاً پیغام نکاح دینے میں گناہ کو اٹھا لیا ہے تو یہ اس پر دلیل ہے کہ قذف کے بارے تعریض کرنا حد کو ثابت نہیں کرتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے نکاح میں تعریض کو تصریح کے مقام پر نہیں رکھا۔ ہم نے کہا ہے: یہ (قول) ساقط (الاعتبار) ہے۔ کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے پیغام نکاح میں نکاح کے بارے تصریح کی اجازت نہیں دی۔ اور اس نے ایسی تعریض کی اجازت عطا فرما رکھی ہے جس سے نکاح کو سمجھا جا سکتا ہو۔ پس یہ اس پر دلیل ہے کہ تعریض سے قذف سمجھی جائے گی اور عزتوں کی حفاظت کرنا واجب ہوتا ہے اور یہ تعریض کرنے والے پر حد کو ثابت کر دے گا تاکہ فاسق لوگوں کو ایسی تعریض کے ذریعہ عزتوں کو ہاتھ میں لینے کا راستہ نہ مل جائے جس سے وہی سمجھا جاتا ہو جو تصریح سے سمجھا جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم ضرور ان کا ذکر کرو گے، چاہے وہ چھپا ہوا ہو تمہارے دلوں میں یا اعلانیہ ہو تمہاری زبانوں کے ساتھ۔ سو اللہ تعالیٰ نے تعریض کی رخصت دی ہے تصریح نہیں کی۔ حسن نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تم انہیں پیغام نکاح دو گے (1)۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا ای علی سِرّ یعنی تم ان سے خفیہ طور پر معاہدہ نہ کرو۔ اس میں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 315، دار الکتب العلمیہ

سِرًّا سے پہلے حرف جر کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ یہ فعل ان میں سے ہے جو دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے اور ان میں سے ایک حرف جر کے ساتھ ہوتا ہے۔

اور سِرًّا کے معنی میں علماء نے اختلاف کیا ہے: بعض نے کہا ہے اس کا معنی نکاح ہے یعنی کوئی آدمی اس معتدہ کو یہ نہ کہے ''تو مجھ سے شادی کر لے'' بلکہ تعریض کرے اگر ارادہ ہو۔ اور اس سے خفیۃً یہ عہد و پیمان نہ لے کہ وہ کسی اور سے شادی نہیں کرے گی۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابن جبیر، مالک اور آپ کے اصحاب، شعبی، مجاہد، عکرمہ، سدی اور جمہور اہل علم رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے۔ اس تاویل پر سِرًّا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے بمعنی مستسرین۔ (1)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ السر سے مراد زنا ہے۔ یعنی تم میں سے کوئی عدت کے دوران زنا اور پھر عدت کے بعد نکاح کا وعدہ نہ لے۔ اس کا یہ معنی جابر ابن زید، ابو مجلز، لاحق بن حمید، حسن بن ابی الحسن، قتادہ، نخعی اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہم نے بیان کیا ہے کہ اس آیت میں السر بمعنی زنا ہے، یعنی تم ان سے زنا کا وعدہ نہ لو (2) اور اسے طبری نے اختیار کیا ہے اور اس معنی میں اعشیٰ کا قول ہے:

فلا تقربنَّ جارةً اِنّ سرّها　　　علیك حرامٌ فانكحنْ أو تأبَّدا

تو کسی پڑوسن کے قریب نہ جا بلاشبہ اس کے ساتھ زنا کرنا تجھ پر حرام ہے پس تو اس سے نکاح کر لے ورنہ تو وحشی ہو جائے گا۔

اور حطیئہ نے کہا ہے:

و یحرم سرّ جارتهم علیهم　　　و یاکل جارُهم أنف القِصاع (3)

اور ان پر اپنی پڑوسن کے ساتھ زنا کرنا حرام ہے ورنہ ان کا پڑوسی سارے پیالے کو کھا جائے گا۔

اور یہ بھی قول ہے کہ السر کا معنی جماع ہے۔ یعنی تم انہیں نکاح کی ترغیب دینے کے لئے اپنے آپ کو کثرت جماع سے متصف نہ کرو، کیونکہ بیوی کے سوا کسی اور کے ساتھ جماع کا کرنا فحش ہوتا ہے۔ یہ امام شافعی کا قول ہے اور امرؤ القیس نے کہا ہے:

ألا زعمت بَسْباسة الیومَ أنني　　　كبِرْتُ وألّا یُحسِن السرّ أمثالي

اور رؤبہ نے کہا ہے:

فکُفَّ عن اسرارها بعد العسق

یعنی اس کے لئے اپنے کو لازم کر لینے کے بعد اس کے جماع سے رک جا۔ اور کبھی السر کا معنی عقد نکاح ہوتا ہے، چاہے وہ سراً ہو یا جہراً ہو۔

اعشیٰ نے کہا ہے:

فلن یطلبوا سرّها للغنَی　　　ولن یُسْلِموها لازهادها

مراد یہ ہے کہ وہ ہرگز اس کے مال کی کثرت کے پیش نظر اس کے نکاح کا مطالبہ نہ کریں اور نہ وہ اسے مال کم ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیں۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 316، دار الکتب العلمیہ　　2۔ ایضاً　　3۔ ایضاً

اور ابن زید نے کہا ہے: قول باری تعالیٰ: وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا کا معنی یہ ہے کہ تم ان سے نکاح نہ کرو اور پھر تم اسے چھپاتے پھرو۔ بلکہ جب وہ حلال ہو جائے تو تم اسے ظاہر کرو اور ان سے دخول کرو (1)۔ اور یہی پہلے قول کا معنی ہے۔ پس اس بنا پر ابن زید پہلے قول کے ہی قائل ہیں۔ اور بلاشبہ انہوں نے شاذ قرار دیا ہے کہ عقد کو مواعدۃ کا نام دیا جائے اور یہ پریشانی اور اضطراب ہے (2)۔ مکی اور ثعلبی نے ان سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: یہ آیت اللہ تعالیٰ کے اس قول سے منسوخ ہے: وَ لَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ۔ (3)

مسئلہ نمبر 8۔ قاضی ابو محمد بن عطیہ نے کہا ہے: امت کا اس پر اجماع ہے کہ کسی عورت کے لئے اپنے بارے میں عدت کے دوران نکاح کا وعدہ کرنا اور باپ کے لئے اپنی باکرہ بیٹی کے بارے میں اور آقا کے لئے اپنی لونڈی کے بارے میں وعدہ کرنا مکروہ ہے۔

ابن المواز نے کہا ہے: وہ ولی جو جبر کرنے کا مالک نہیں ہوتا تو میں اسے مکروہ سمجھتا ہوں اور اگر وہ نکاح کر دے تو میں اسے فسخ نہیں کرتا۔

امام مالک نے ایسے آدمی کے بارے میں جو عدت میں وعدہ کرتا ہے اور پھر عدت کے بعد شادی کرتا ہے کہا ہے: میرے نزدیک اس کی تفریق زیادہ پسندیدہ ہے چاہے اس سے دخول کیا جائے یا نہ کیا جائے اور یہ تفریق ایک طلاق ہوگی اور جب وہ حلال ہو جائے تو پھر وہ بھی دیگر لوگوں کے ساتھ اسے پیغام نکاح دے سکے گا۔ یہ ابن وہب کی روایت ہے (4) اور اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ ان کے درمیان وجوباً تفریق کر دی جائے گی۔ ابن القاسم نے یہی کہا ہے اور ابن الحارث نے ابن ماجشون سے اسی طرح بیان کیا ہے اور کچھ زائد کیا ہے جو تقاضا کرتا ہے کہ یہ تحریم ہمیشہ کے لئے ہوگی (5)۔

اور امام شافعی نے کہا ہے: اگر اس نے دعوت نکاح صراحۃً دی اور عورت نے بھی صراحۃً اس کا جواب دیا اور عقد نکاح نہ ہوا یہاں تک کہ عدت گزر گئی تو نکاح ثابت ہوگا اور دونوں کے لئے تصریح مکروہ ہوگی۔ کیونکہ نکاح منگنی کے بعد واقع ہوا ہے۔ ابن منذر نے یہی کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: اِلَّاۤ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا یہ استثنا منقطع ہے اور الا بمعنی لکن ہے (6)۔ جیسا کہ اس ارشاد میں ہے اِلَّا خَطَاً بمعنی لکن خطأ۔ اور قول معروف سے مراد ایسی تعریض ہے جو شرعاً مباح ہو اور ضحاک نے ذکر کیا ہے کہ قول معروف میں سے یہ ہے کہ وہ معتدہ کو کہے: تو میرے لئے اپنے آپ کو محبوس کر لے کیونکہ مجھے تیرے ساتھ رغبت ہے اور وہ کہتی ہے: میں بھی اسی طرح ہوں (7) تو یہ ایک دوسرے سے وعدہ کرنے کے مشابہ ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ

اس میں نو مسائل ہیں:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 316، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً
4۔ ایضاً
5۔ ایضاً
6۔ ایضاً
7۔ ایضاً

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَعْزِمُوْا عزم کے معنی میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ کہا جاتا ہے: عزم الشیء وعزم علیہ (اس نے شے کا ارادہ کیا اور اس پر پختہ ہو گیا) اور یہاں معنی ہے: ولا تعزموا علی عقدۃ النکاح (اور تم نکاح کی گرہ پر پختہ نہ ہو جاؤ) اور یہ ایک واضح امر ہے کہ قرآن کریم سب سے فصیح کلام ہے۔ پس جو اس میں وارد ہوا ہے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس کی صحت و فصاحت میں کوئی شک کیا جا سکتا ہے، تحقیق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ (البقرہ: 227) (اور اگر وہ طلاق کا پختہ ارادہ کر لیں) اور یہاں فرمایا: وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ تو اس کا معنی ہے لا تعزموا علی عقدۃ النکاح فی زمان العدۃ (تم عدت کے دوران نکاح کی گرہ پختہ نہ کرلو۔) پھر اس سے علیٰ کو حذف کر دیا گیا ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

سیبویہ نے کہا ہے: ضُرِبَ فلانٌ الظھرَ والبطنَ یعنی علی الظھر والبطنِ (فلاں کو پیٹھ اور پیٹ پر مارا گیا) سیبویہ نے کہا ہے: ان اشیاء میں حذف پر کسی اور کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

نحاس نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ یہ وَلَا تَعْقِدُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ ہو کیونکہ تَعْزِمُوْا اور تعقدوا کا معنی ایک ہے (اور تم نکاح کی گرہ کو پختہ نہ باندھ لو) اور کہا جاتا ہے: تَعْزُمُوْا یعنی زا کے ضمہ کے ساتھ۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ اس سے مراد عدت کا مکمل ہونا ہے اور الکتاب سے یہاں مراد وہ حد ہے جو مقرر کی گئی اور مدت میں سے وہ مقدار ہے جسے بیان کر دیا گیا، لکھ دیا گیا اور اس کا نام کتاب رکھا ہے کیونکہ کتاب اللہ نے اس حد کو بیان کیا ہے اور اسے مقرر کیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا: کتاب اللہ علیکم۔

اور اسی طرح فرمایا: اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا۝ (النساء) (بے شک نماز مسلمانوں پر فرض کی گئی ہے اپنے اپنے مقررہ وقت پر) پس الکتاب کا معنی الفرض (مقرر کرنا) ہے۔ یعنی یہاں تک کہ مقرر کی ہوئی مدت اپنی انتہا کو پہنچ جائے۔ (حتی یبلغ الفرض أجلہ)

کتب علیکم الصیام یعنی تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام میں حذف ہے۔ تقدیر کلام ہے حتی یبلغ فرض الکتاب أجلہ یعنی کتاب کی مقرر کی ہوئی مدت اپنی انتہا کو پہنچ جائے۔ اس تاویل کی بنا پر الکتاب سے مراد قرآن کریم ہے اور پہلی تاویل پر اس میں کوئی حذف نہیں ہے، سو وہی اولیٰ ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ نے عدت کے دوران عقد نکاح کو حرام قرار دیا ہے اپنے اس ارشاد کے ساتھ: وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ یہ محکم ہے، اس کی تاویل پر اجماع ہے کہ بلوغ اجلہ سے مراد انقضاء العدۃ (عدت کا گزرنا) ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کے ساتھ عدت میں تعریض کو مباح قرار دیا ہے: وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ الآیہ۔

اور علماء نے اس کی اباحت میں کوئی اختلاف نہیں کیا ہے، البتہ انہوں نے تعریض کے الفاظ میں اختلاف کیا ہے جیسا کہ پہلے گزر

چکا ہے۔ اور انہوں نے اس آدمی کے بارے میں بھی اختلاف کیا ہے جو کسی عورت کو اس کی عدت میں پیغام نکاح دیتا ہے درآنحالیکہ وہ جاہل ہو یا وہ اس سے وعدہ لیتا ہے اور عدت کے بعد عقد نکاح کرتا ہے اور اس سے پہلی آیت میں یہ مسئلہ گزر چکا ہے۔

اور انہوں نے اختلاف کیا ہے کہ اگر کسی نے عدت میں نکاح کی گرہ پختہ کر لی اور اس پر اطلاع پالی گئی اور حاکم نے اس کا نکاح فسخ کر دیا اور وہ دخول سے پہلے ہوا تو وہ یہ ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور علماء کی ایک جماعت کا قول ہے کہ اسے ہمیشہ کے لئے حرام قرار نہیں دیا جائے گا بلکہ وہ بھی نکاح میں دلچسپی رکھنے والے دیگر لوگوں کے ساتھ نکاح کا ایک خواہشمند ہو سکتا ہے (اور پیغام نکاح بھیج سکتا ہے) امام مالک نے یہی کہا ہے اور ابن القاسم نے المدونہ میں اس باب کے آخر میں بیان کیا ہے جس کے پیچھے ضرب اجل المفقود ہے۔

اور ابن جلاب نے امام مالک سے ایک روایت بیان کی ہے کہ عقد میں تحریم ہمیشہ کے لئے ہوگی اگرچہ نکاح کا فسخ دخول سے پہلے ہو (1)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے نکاح عدت میں کیا ہے۔ پس یہ ضروری ہے کہ اس کے ساتھ تحریم دائمی ہو۔ اس کی اصل یہ ہے کہ جب وہ اس کے پاس جائے۔ اور اگر عقد عدت میں ہوا اور وہ اس کے پاس داخل ہوا اس کی عدت گزرنے کے بعد تو پھر مسئلہ یہ ہے (2)۔

مسئلہ نمبر 5۔ پس اہل علم میں سے ایک قوم نے کہا ہے: یہ عدت میں دخول کی طرح ہے۔ لہٰذا دونوں کے درمیان تحریم ہمیشہ کے لئے ہوگی اور اہل علم میں سے ایک گروہ نے کہا ہے اس سے تحریم ہمیشہ کے لئے نہیں ہوگی۔ اور امام مالکؒ نے کہا ہے: تحریم دائمی ہوگی اور ایک بار کہا: اس سے تحریم ثابت نہیں ہوتی۔ یہ بالکل واضح ہے۔ آپ کے دونوں قول المدونہ میں طلاق سنت کے بیان میں ہیں اور اگر اس نے عدت میں دخول کیا تو پھر مسئلہ یہ ہے (3)۔

مسئلہ نمبر 6۔ امام مالک، لیث اور اوزاعی رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: ان کے درمیان تفریق کر دی جائے گی اور وہ عورت اس کے لئے کبھی حلال نہ ہوگی۔ امام مالک اور لیث نے کہا ہے: ملک یمین کے ساتھ بھی نہیں۔ اس کے باوجود کہ انہوں نے مزنی کی اس کے ساتھ شادی کو جائز قرار دیا۔ اور انہوں نے اس سے استدلال کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: وہ دونوں کبھی جمع نہ ہو سکیں گے۔ حضرت سعید نے کہا ہے: اس کے لئے اس کا وہ مہر ہوگا جس کے عوض اس کی فرج حلال سمجھی گئی (4)۔ اسے امام مالک نے مؤطا میں بیان کیا ہے۔

اور ثوری، علمائے کوفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہم نے بیان کیا ہے: ان کے درمیان تفریق کر دی جائے گی اور تحریم دائمی نہ ہوگی بلکہ ان کے درمیان فسخ نکاح کیا جائے گا پھر وہ اس کی عدت گزارے گی پھر وہ دعوت نکاح دینے والوں میں سے ایک دعوت نکاح دینے والا ہو جائے گا اور انہوں نے اس پر علماء کے اجماع سے استدلال کیا ہے کہ اگر وہ اس کے ساتھ زنا کرے تو اس پر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 317، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً
4۔ مؤطا امام مالک، صفحہ 504، وزارت تعلیم

اس سے شادی کرنا حرام نہیں ہوتا۔ تو اس طرح دوران عدت اس کا اس سے وطی کرنا بھی ہے۔ انہوں نے کہا: یہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے، اسے عبدالرزاق نے ذکر کیا ہے اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حسن رضی اللہ عنہ سے بھی اسی کی مثل ذکر کیا گیا ہے۔

اور عبدالرزاق نے ثوری عن اشعث عن الشعبی عن مسروق کی سند سے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے رجوع کرلیا اور فرمایا: وہ دونوں اکٹھے رہ سکتے ہیں، جمع ہو سکتے ہیں۔

قاضی ابوالولید الباجی نے المنتقی میں بیان کیا ہے: عدت میں نکاح کرنے والا اس سے خالی نہ ہوگا کہ جب وہ اس کے پاس گیا تو یا وہ اس کے پاس عدت میں جائے گا یا عدت کے بعد۔ پس اگر وہ عدت میں اس کے پاس گیا ہے تو پھر مشہور مذہب یہ ہے کہ تحریم دائمی ہوگی۔ یہی امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اور شیخ ابوالقاسم نے تفریع میں بیان کیا ہے کہ جب آدمی عدت میں عورت سے شادی کرتا ہے، چاہے وہ عدت طلاق ہو یا عدت وفات ہو، یہ جانتے ہوئے کہ ایسا کرنا حرام ہے تو اس کے بارے دو روایتیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس کی تحریم دائمی ہوگی (کبھی بھی وہ عورت اس پر حلال نہ ہو سکے گی) جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

اور دوسری یہ ہے کہ وہ زنا کرنے والا ہے اور اس پر حد لازم ہے اور بچہ اس کے ساتھ لاحق نہیں کیا جائے گا اور اس کے لئے جائز ہے کہ جب اس کی عدت گزر جائے تو وہ اس کے ساتھ شادی کرلے۔ یہی امام شافعی (1) اور امام ابوحنیفہ رحمہما اللہ نے کہا ہے۔

پہلی روایت کی وجہ یہ ہے اور وہی مشہور ہے کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس طرح فیصلہ کرنے اور لوگوں میں اس کے نافذ ہونے سے ثابت ہے اور آپ کے فیصلے مختلف شہروں میں منتقل ہوتے تھے اور پھیل جاتے تھے اور آپ سے اختلاف کرنے والا کوئی معلوم نہیں، پس اس سے ثابت ہوا کہ اسی پر اجماع ہے۔

قاضی ابومحمد نے بیان کیا ہے کہ اس کی مثل حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے اور اس کے مشہور ہونے اور عام منتشر ہونے کے باوجود دونوں کے ساتھ اختلاف کرنے والا کوئی نہیں۔ یہی اجماع کا حکم ہے۔

اور دوسری روایت کی وجہ یہ ہے کہ یہ ممنوع وطی ہے اور اس کی تحریم دائمی نہیں۔ جیسا کہ اگر وہ اپنی شادی خود کرے یا نکاح متعہ کرے یا زنا کرے (تو ان سے دائمی تحریم ثابت نہیں ہوتی۔)

اور قاضی ابوالحسن نے کہا ہے: اس بارے میں امام مالک کا مشہور مذہب نظر و فکر کے اعتبار سے ضعیف ہے۔ واللہ اعلم۔

اور ابوعمر نے سند بیان کی ہے: حدثنا عبدالوارث بن سفیان حدثنا قاسم بن اصبغ عن محمد ابن اسماعیل عن نعیم بن حماد عن ابن المبارک عن اشعث عن الشعبی عن مسروق کہ انہوں نے کہا: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس خبر پہنچی کہ قریش کی ایک عورت سے ثقیف کے ایک آدمی نے اس کی عدت میں شادی کی تو آپ نے ان دونوں کو بلا بھیجا اور ان کے درمیان تفریق کر دی اور ان دونوں کو سزا دی اور فرمایا: تو کبھی اس سے نکاح نہیں کرسکتا اور آپ نے اس کا مہر بیت المال سے دے دیا۔ یہ بات لوگوں میں پھیل گئی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ تک بھی پہنچی، تو انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ امیر المومنین پر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 317-318، دار الکتب العلمیہ

رحم فرمائے۔ مہر اور بیت المال کا کیا تعلق ہے۔ وہ دونوں جاہل تھے۔ پس امام کو چاہئے کہ وہ ان دونوں کو سنت کی طرف لوٹا دے۔ عرض کی گئی: آپ ان دونوں کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا: اس کے لئے مہر وہ ہے جس کے عوض اس کی فرج کو حلال سمجھا گیا اور ان دونوں کے درمیان تفریق کر دی جائے گی اور ان پر بطور حد کوڑوں کی سزا نہ ہوگی، اور وہ پہلے خاوند کی جانب سے اپنی عدت کو مکمل کرے گی، پھر دوسرے خاوند کی جانب سے کامل تین حیض عدت مکمل کرے گی، پھر اگر وہ چاہے تو اسے دعوت نکاح دے سکتا ہے (1)۔ پس یہ خبر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچی تو آپ نے لوگوں کو خطبہ ارشاد فرمایا اور فرمایا: اے لوگو! جہالتوں کو سنت کی طرف لوٹا دو۔ الکیا الطبری نے کہا ہے: فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ وہ آدمی جس نے کسی عورت کے ساتھ عقد نکاح کیا درآنحالیکہ وہ عورت کسی اور مرد کی عدت میں ہو تو وہ نکاح فاسد ہے اور حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما دونوں کا ان سے حد کی نفی پر اتفاق اس پر دلالت کرتا ہے کہ نکاح فاسد حد کو ثابت نہیں کرتا مگر اس کی جہالت کے باوجود تحریم متفق علیہ ہے اور اس کا علم ہونے کے ساتھ اس میں اختلاف کیا گیا ہے اور علماء نے اختلاف کیا ہے کیا وہ دونوں کی جانب سے اکٹھی عدت گزارے گی؟ یہ دو عدتوں کا مسئلہ ہے اور وہ یہ ہے:

مسئلہ نمبر 7۔ اہل مدینہ نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ وہ پہلے کی جانب سے بقیہ عدت مکمل کرے گی اور دوسرے کی جانب سے دوسری عدت نئے سرے سے گزارے گی۔ یہی لیث، حسن بن حیی، شافعی، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ کا قول ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔

محمد بن قاسم اور ابن وہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ دوسرے خاوند کی جانب سے اس کی عدت اس کے لئے اس دن سے کافی ہوگی جس دن مرد اور عورت کے درمیان تفریق کر دی گئی، چاہے وہ حمل کے ساتھ ہو یا حیضوں کے ساتھ ہو یا مہینوں کے ساتھ۔ یہی قول ثوری، اوزاعی اور ابو حنیفہ رحمہم اللہ کا ہے اور ان کی دلیل اس پر اجماع ہے کہ پہلا خاوند اپنی بقیہ عدت میں اس سے نکاح نہیں کر سکتا تو یہ اس پر دلیل ہے کہ وہ دوسرے کی عدت میں ہے۔ اگر اس طرح نہ ہوتا تو وہ یقیناً اس کی بقیہ عدت میں اس سے نکاح کر سکتا۔

پہلے گروہ نے جواب دیا اور کہا: یہ لازم نہیں ہے کیونکہ پہلے خاوند کو اس کی بقیہ عدت میں اس سے نکاح کرنے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ اس کے پیچھے اس پر دوسرے کی عدت واجب ہے۔ یہ دونوں حق ہیں جو دو خاوندوں کی جانب سے اس پر واجب ہیں جیسا کہ آدمیوں کے تمام حقوق واجب ہوتے ہیں اور ان دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے حق میں داخل نہیں ہو سکتا۔

امام مالک نے ابن شہاب عن سعید بن مسیب اور عن سلیمان بن یسار کی سند سے بیان کیا ہے کہ طلیحہ اسدیہ رشید ثقفی کے نکاح میں تھی تو اس نے اسے طلاق دے دی اور اس نے اپنی عدت میں نکاح کر لیا تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اسے اور اس کے خاوند کو خفیف سی ضربیں لگائیں اور ان کے درمیان تفریق کر دی۔ پھر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس عورت نے بھی اپنی عدت کے دوران نکاح کیا پس اگر اس کا خاوند ایسا ہے جس نے اس کے ساتھ شادی کی ہے اس نے اس

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 318، دار الکتب العلمیہ

کے ساتھ دخول نہیں کیا ان دونوں کے درمیان تفریق کر دی جائے، پھر وہ عورت پہلے خاوند کی جانب سے اپنی بقیہ عدت گزارے، پھر دوسرا پیغام نکاح دینے والوں میں سے ایک ہو سکتا ہے۔ اور اگر اس نے دخول کر لیا ہے تو ان کے درمیان تفریق کر دی جائے پھر وہ پہلے کی جانب سے اپنی بقیہ عدت گزارے پھر دوسرے کی جانب سے عدت گزارے پھر وہ کبھی جمع نہ ہو سکیں گے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: حضرت سعید بن مسیب نے فرمایا: اس کے لئے اس کا وہ مہر ہے جس کے عوض اس کی فرج حلال سمجھی گئی (1)۔ ابو عمر نے کہا ہے: یہ طلیحہ طلیحہ بنت عبید اللہ ہے، طلحہ بن عبید اللہ التیمی کی بہن ہے اور موطا کے بعض نسخوں میں یحییٰ کی روایت سے یہ ہے: طلیحہ الاسدیہ اور یہ خطا اور لاعلمی ہے۔ میں کسی کو نہیں جانتا کہ اس نے یہ کہا ہو۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ: فضربھا عمر بالمخفقۃ و ضرب زوجھا ضربات (2) اس سے مراد ہے کہ آپ نے بطور سزا انہیں یہ ضربیں لگائیں جب کہ ان دونوں نے ایک ممنوع عمل کا ارتکاب کیا اور وہ ہے عدت میں نکاح کرنا۔

اور زہری نے کہا ہے: میں نہیں جانتا کہ وہ کوڑے کتنی مقدار تک پہنچے۔ فرمایا: اس مسئلہ میں عبد الملک کے کوڑے دونوں میں سے ہر ایک کے لئے چالیس کوڑے تھے۔ فرمایا: اس بارے میں قبیصہ بن ذویب سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: اگر تم تخفیف بھی کرو تو بیس کوڑے لگاؤ۔ اور ابن حبیب نے ایسی عورت کے بارے میں کہا جو عدت میں شادی کرتی ہے اور مرد اسے مس کرتا ہے یا بوس و کنار کرتا ہے یا مباشرت کرتا ہے یا ہاتھ سے ٹٹولتا ہے یا شہوت کے ساتھ اس کی طرف دیکھتا ہے تو زوجین پر سزا ہوگی، ولی پر، گواہوں پر اور ان میں سے ہر اس پر جو یہ جانتا ہو کہ یہ عدت میں ہے اور ان میں سے جو نہ جانتا ہو اس پر سزا نہ ہوگی۔ اور ابن المواز نے کہا ہے: زوجین کو بطور حد کوڑے لگائے جائیں گے اگر دونوں نے عمداً کیا ہو۔ اور ابن حبیب کے قول کو اس پر محمول کیا جائے گا کہ یہ اس کے بارے ہے جسے عدت کے بارے علم ہو۔ اور شاید وہ جو تحریم سے ناواقف ہو اور اس نے فعل ممنوع کا ارتکاب جان بوجھ کر نہ کیا ہو تو وہ ہے جسے سزا دی جائے گی اور اسی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس عورت اور اس کے خاوند کو ہلکی سی شے کے ساتھ ضربیں لگائیں۔ اور اس بارے میں سزا اور تادیب اس کے حال کے مطابق ہوگی جسے سزا دی جا رہی ہے۔ اور ابن المواز کے قول کو اس پر محمول کیا جائے گا کہ ان دونوں کو تحریم کا علم ہو اور انہوں نے جرأت اور دلیری کرتے ہوئے ممنوع فعل کا ارتکاب کیا ہو۔ اور شیخ ابو القاسم نے کہا ہے: بلاشبہ یہ دونوں روایتیں عمداً کرنے کے بارے میں ہیں۔ ایک روایت کے مطابق حد جاری کی جائے گی اور دوسری کے مطابق سزا دی جائے گی اور حد جاری نہیں کی جائے گی۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ یہ تحذیر اور ڈرانے کی انتہا ہے ایسے امر کے وقوع کے بارے جس سے منع کیا گیا ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚ وَّ مَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًۢا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا

1۔ موطا امام مالک، کتاب النکاح، جلد 1، صفحہ 503-504، وزارت تعلیم
2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 503

عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ۝

''کوئی حرج نہیں تم پر اگر تم طلاق دے دو ان عورتوں کو جن کو تم نے چھوا بھی نہیں اور نہیں مقرر کیا تم نے ان کا مہر اور خرچہ دو انہیں مقدور والے پر اس کی حیثیت کے مطابق اور تنگدست پر اس کی حیثیت کے مطابق یہ خرچہ مناسب طریقہ پر ہونا چاہئے، یہ فرض ہے نیکوکاروں پر۔''

اس میں گیارہ مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ یہ بھی مطلقات کے احکام میں سے ہیں۔ جماع اور بیوی کے پاس جانے سے قبل طلاق دینے والے سے حرج کے اٹھا دینے کے بارے یہ خبر کی ابتدا ہے، چاہے مہر مقرر کیا گیا ہو یا نہ مقرر کیا جائے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذوق اور قضائے شہوت کی غرض سے شادی کرنے سے منع فرمادیا اور پاکدامنی کی طلب اور اللہ تعالیٰ سے ثواب کی التجا اور صحبت دوام کے ارادہ سے شادی کرنے کا حکم ارشاد فرمایا، تو مومنین کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جس کسی نے عورت کے پاس جانے سے قبل طلاق دی تو وہ اس مکروہ عمل کے جز میں واقع ہونے والا ہے۔ تو اس بارے میں حرج کو اٹھانے اور ختم کرنے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی۔ بشرطیکہ اصل نکاح حسین مقصد پر ہو۔

اور ایک قوم نے کہا ہے: لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اس کا معنی ہے کہ اس میں تم پر کوئی حرج نہیں کہ تم حیض کے وقت میں طلاق بھیجو، بخلاف مدخول بہا عورت کے، کیونکہ غیر مدخول بہا پر عدت نہیں ہوتی۔ (1)

مسئلہ نمبر 2۔ مطلقات چار ہیں: (۱) مطلقہ مدخول بہا جس کے لئے مہر مقرر کیا جائے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم اس سے پہلی آیت میں ذکر کیا ہے کہ اس سے مہر میں سے کوئی شے واپس نہیں لی جائے گی اور یہ کہ اس کی عدت تین حیض ہے۔ (۲) مطلقہ غیر مدخول بہا جس کے لئے مہر مقرر نہ کیا جائے۔ پس یہ آیت اسی کے بارے میں ہے اور اس کے لئے کوئی مہر نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے متعہ دینے کا حکم ارشاد فرمایا ہے اور سورۃ الاحزاب میں بیان فرمایا ہے کہ غیر مدخول بہا کو جب طلاق دی جائے تو اس پر کوئی عدت نہیں۔ عنقریب اس کا ذکر آئے گا۔ (۳) مطلقہ غیر مدخول بہا جس کے لئے مہر مقرر کیا جائے۔ اس کا ذکر اس آیت کے بعد کیا ہے جبکہ فرمایا: وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً (البقرۃ: 237) (اور اگر تم طلاق دو انہیں اس سے پہلے کہ تم انہیں ہاتھ لگاؤ اور مقرر کر چکے تھے ان کے لئے مہر۔) (۴) مطلقہ مدخول بہا جس کے لئے مہر مقرر نہ کیا جائے اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر اپنے اس ارشاد میں فرمایا ہے: فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً (النساء: 24) (پس جو تم نے لطف اٹھایا ہے ان سے تو دو ان کو ان کے مہر جو مقرر ہیں۔) پس اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اور اس کے بعد والی آیت میں ایسی مطلقہ کا ذکر کیا ہے جسے چھوئے جانے سے قبل اور مہر مقرر کیے جانے سے قبل طلاق دے دی جائے اور اس مطلقہ کا جسے چھوئے جانے سے پہلے اور مہر مقرر کیے جانے سے قبل طلاق دی جائے۔ پس پہلی کے لئے متعہ مقرر کیا ہے اور دوسری کے لئے نصف مہر، کیونکہ عورت کو گرہ کا کھلنا اور اس حلت میں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 318، دار الکتب العلمیہ

عیب اور نقص پڑنا لاحق ہوا ہے جو مرد کو عقد کے سبب حاصل ہوئی تھی اور مس مہر واجب کے بالمقابل ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ جب اللہ تعالیٰ نے مطلقہ کی حالت کو یہاں دو قسموں میں تقسیم کر دیا ایک ایسی مطلقہ جس کا مہر مقرر کیا گیا ہو اور دوسری ایسی مطلقہ جس کے لئے مہر مقرر نہ کیا جائے تو یہ اس پر دلیل ہے کہ نکاح کی تفویض جائز ہے اور اس سے مراد ہر وہ نکاح ہے جو مہر کا ذکر کیے بغیر کیا جائے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور اس کے بعد مہر مقرر کر دیا جاتا ہے۔ پس اگر وہ مقرر کر دیا جائے تو وہ عقد کے ساتھ مل جاتا ہے اور یہ جائز ہے اور اگر وہ نہ مقرر کیا جائے اور طلاق ہو جائے تو پھر بالاجماع مہر واجب نہیں ہوتا (1)۔ قاضی ابوبکر بن عربی نے یہی کہا ہے۔

اور مہدوی نے حماد بن ابی سلیمان سے نقل کیا ہے کہ جب آدمی عورت کو طلاق دے اور اس سے دخول نہ کیا ہو اور نہ ہی اس کے لئے مقررہ مہر ہو تو اسے نصف مہر مثل پر مجبور کیا جائے اور اگر عقد نکاح کے بعد اور طلاق واقع ہونے سے پہلے مہر مقرر کر دیا گیا تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: طلاق کے سبب وہ نصف نہ ہوگا کیونکہ وہ عقد کے ساتھ واجب نہیں ہوا اور یہ اس ارشاد باری کے ظاہر کے خلاف ہے: وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَ قَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِیْضَةً (البقرۃ: 237)

اور یہ خلاف قیاس بھی ہے، کیونکہ عقد کے بعد مقرر کردہ مہر عقد کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے پس یہ ضروری ہے کہ یہ طلاق کے ساتھ نصف ہو جائے۔ اس کی اصل یہ ہے کہ مقرر کردہ مہر عقد کے ساتھ ملا دیا جائے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اگر مہر مقرر کرنے سے پہلے موت واقع ہو جائے تو ترمذی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے کہ ان سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جس نے ایسی عورت سے شادی کی جس کے لئے مہر مقرر نہ کیا اور اس کے ساتھ دخول نہ کیا یہاں تک کہ مر گیا تو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس کے لئے اس جیسی عورتوں کا مثل ہوگا نہ اس میں کمی ہوگی اور نہ زیادتی اور اس پر عدت ہوگی اور اس کے لئے میراث بھی ہوگی۔ تو حضرت معقل بن سنان اشجعی کھڑے ہوئے اور کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم میں سے ایک عورت بروع بنت واشق کے بارے میں اسی طرح فیصلہ فرمایا جیسے تم نے کیا ہے۔ تو اس سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بہت خوش ہوئے۔ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے اور آپ سے کئی اسناد سے مروی ہے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے بعض اہل علم اور ان کے سوا دوسروں کا اسی پر عمل ہے اور ثوری، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ بھی اسی طرح کہتے ہیں۔

اور حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے بعض اہل علم جن میں حضرت علی ابن ابی طالب، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم شامل ہیں نے کہا ہے کہ جب آدمی کسی عورت سے شادی کرے اور اس کے ساتھ دخول نہ کرے اور نہ اس کے لئے مہر مقرر کرے یہاں تک کہ مر جائے تو انہوں نے کہا: اس کے لئے میراث ہوگی اور اس کے لئے مہر نہیں ہوگا اور اس پر عدت ہوگی۔ یہی امام شافعی کا قول ہے اور کہا ہے: اگر بروع بنت واشق کی حدیث ثابت ہے تو پھر یقیناً وہ حجت ہے جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے اور امام شافعی کے بارے میں یہ روایت بھی ہے کہ انہوں نے اس

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 218، دار الفکر

کے بعد مصر میں اپنے اس قول سے رجوع کر لیا اور بروع بنت واشق کی حدیث کے مطابق بیان کیا۔(1)

میں (مفسر) کہتا ہوں: بروع کی حدیث ثابت کرنے میں اختلاف ہے، پس قاضی ابو محمد عبد الوہاب نے ابن ابی زید کے رسالہ کی شرح میں کہا ہے کہ بروع بنت واشق کی حدیث کو حفاظ حدیث اور ائمہ اہل علم نے رد کر دیا ہے اور واقدی نے کہا ہے: یہ حدیث مدینہ منورہ میں پیش ہوئی تو علماء میں سے کسی نے اسے قبول نہیں کیا اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے جیسا کہ ہم نے آپ سے اور ابن منذر سے ذکر کیا ہے۔ ابن منذر نے کہا ہے: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول کی مثل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور اسی کے مطابق ہم کہتے ہیں اور بیان کیا کہ یہی ابو ثور اور اصحاب الرائے کا قول ہے۔

اور زہری، اوزاعی، مالک، شافعی رحمہم اللہ سے حضرت علی، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم کے قول کی مثل ذکر کیا گیا ہے۔

اور اس مسئلہ میں ایک تیسرا قول بھی ہے اور وہ یہ کہ اس کے لئے میراث نہیں ہوگی یہاں تک کہ مہر ہو (یعنی مہر کے بغیر میراث نہیں ہو سکتی) مسروق نے یہی کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو موقف امام مالکؒ نے اختیار کیا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ مہر مقرر ہونے سے پہلے نکاح میں تفریق ہے پس اس میں مہر واجب نہیں اور اس کی اصل طلاق ہے لیکن جب حدیث صحیح ہے تو اس کے مقابلے میں قیاس فاسد ہے اور ابو محمد عبد الحمید نے ایسا مذہب بیان کیا ہے جو حدیث سے موافقت رکھتا ہے۔ الحمدللہ۔

اور ابو عمر نے کہا ہے: حدیث بروع کو عبد الرزاق نے ثوری عن منصور عن ابراهیم عن علقمه عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی سند سے بیان کیا ہے اور اس میں ہے: پس معقل ابن سنان کھڑے ہوئے اور اس میں ابن مہدی نے ثوری عن فراس عن الشعبی عن مسروق عن عبد اللہ کی سند سے بیان کیا اور کہا: معقل بن یسار۔ اور میرے نزدیک صحیح اس کا قول ہے جس نے معقل بن سنان کہا ہے نہ کہ معقل بن یسار (2)۔ کیونکہ معقل بن یسار قبیلہ مزینہ کا آدمی ہے اور یہ حدیث ایسی عورت کے بارے ہے جس کا تعلق قبیلہ اشجع سے ہے نہ کہ مزینہ سے۔ اور اسی طرح اسے داؤد نے شعبی عن علقمہ سے روایت کیا ہے اور اس میں ہے۔ پس اشجع کے لوگوں نے کہا اور معقل بن سنان یوم حرہ میں شہید ہوئے اور یوم حرہ کے بارے میں شاعر کہتا ہے

ألا تلكم الأنصار تبكی سراتها و أشجع تبكی معقل بن سنان

خبردار! وہ انصار اپنے شیروں کو رو رہے ہیں اور بنی اشجع معقل بن سنان کو رو رہے ہیں۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اس میں ما بمعنی الذی ہے۔ یعنی اگر تم نے ان عورتوں کو طلاق دی جنہیں تم نے مس نہیں کیا اور تَمَسُّوْهُنَّ کو ثلاثی سے تاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور یہ نافع، ابن کثیر، ابو عمر، عاصم اور ابن عامر کی قراءت ہے اور حمزہ اور کسائی نے تماسوھن باب مفاعلہ سے پڑھا ہے کیونکہ وطی دونوں کے ساتھ مکمل ہوتی ہے اور

1۔ جامع ترمذی، کتاب النکاح، جلد 1، صفحہ 136، وزارت تعلیم

2۔ ابن ماجہ، باب الرجل یتزوج ولا یفرض لها فیموت، حدیث نمبر 1880، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کبھی باب مفاعلہ میں فاعل بمعنی فعل بھی آتا ہے۔ جیسے طارقت النعل (میں نے نعل کھٹکھٹائے) اور عاقبت اللص (میں نے چور کو سزا دی) اور پہلی قراءت اس باب میں مفاعلہ کے معنی کا تقاضا کرتی ہے اس معنی کے اعتبار سے جو مس سے سمجھا گیا ہے اور ابوعلی نے اسے ترجیح دی ہے کیونکہ اس معنی کے افعال اس وزن پر ثلاثی آئے ہیں۔ جیسا کہ نکح، سفد، قرع، دفط اور ضرب الفحل (ان تمام میں جفتی کرنے اور وطی کرنے کا معنی مشترک ہے) اور دونوں قرائتیں حسن ہیں۔

اور اَوْ تَفْرِضُوْا میں اَوْ کے بارے کہا گیا ہے کہ یہ بمعنی واؤ ہے۔ یعنی مالم تمسوھن و لم تفرضوا لھن جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآىِٕلُوْنَ۝ (الاعراف) (اور کتنی بستیاں تھیں برباد کر دیا ہم نے انہیں۔ پس آیا ان پر عذاب رات کے وقت یا جب وہ دوپہر کو سو رہے تھے۔) اور اسی طرح یہ ارشاد ہے: وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ۝ یہ و یزیدون کے معنی میں ہے۔ (الصافات) (اور ہم نے بھیجا تھا انہیں ایک لاکھ یا اس سے زیادہ لوگوں کی طرف) اور ارشاد گرامی ہے: وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا۝ بمعنی و کفورا ہے (الدہر) (اور نہ کہنا مانئے ان میں سے کسی بدکار یا احسان فراموش کا) اور یہ قول: وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآىِٕطِ (النساء: 43) یہ بمعنی و جاء احد من الغائط و انتم مرضی او مسافرون ہے۔ (اور اگر ہو تم بیمار یا سفر میں یا آئے کوئی تم میں سے قضائے حاجت سے۔)

اور یہ ارشاد: اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ (الانعام: 146) اور اسی کے مثل دیگر ارشادات۔ (مگر جو اٹھا رکھی ہو ان کی پشتوں یا آنتوں نے یا جو ملی ہوئی ہو ہڈی کے ساتھ۔)

اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس پر اس کے مہر مفروض کا عطف کیا ہے اور فرمایا ہے:

وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً

پس اگر پہلا ارشاد مس سے قبل مفروض لھا کی طلاق کے بیان کے لئے ہوتا تو اس کا وہ دوبارہ ذکر نہ فرماتا۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: وَّمَتِّعُوْهُنَّ اس کا معنی ہے تم انہیں کوئی ایسی شی دو جو ان کے لئے متعہ بن سکتی ہو۔ حضرت ابن عمر، حضرت علی بن ابی طالب، حضرت حسن بن ابی حسن، حضرت سعید بن جبیر، حضرت ابو قلابہ، حضرت زہری، حضرت قتادہ، حضرت ضحاک بن مزاحم رضی اللہ عنہم نے اسے وجوب پر محمول کیا ہے۔

اور ابو عبید، امام مالک بن انس اور ان کے اصحاب اور قاضی شریح رحمۃ اللہ علیہم وغیر ہم نے اسے ندب پر محمول کیا ہے (1)۔

پہلے قول والوں نے مقتضائے امر سے استدلال کیا ہے (یعنی الامر للوجوب) اور دوسرا قول کرنے والوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: حقا علی المحسنین اور علی المتقین اور اگر یہ واجب ہوتا تو پھر اس کا اطلاق تمام مخلوق پر ہوتا اور پہلا قول اولی اور بہتر ہے۔ کیونکہ امر کے عمومات میں ہے متعوھن کے قول میں امتاع ہے اور امتاع کی اضافت ان کی طرف لام تملیک کے ساتھ ہے۔ اس ارشاد میں و للمطلقات متاع اس میں وجوب ندب سے زیادہ ظاہر ہے اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 319، دار الکتب العلمیہ

قولہ: علی المتقین یہ اس کے ایجاب کی تاکید ہے کیونکہ ہر ایک پر واجب ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے میں اور اس کی نافرمانی اور معصیت کرنے میں اس سے ڈرے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ارشاد فرمایا ہے: هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ یہ ہدایت ہے متقی لوگوں کے لئے۔

مسئلہ نمبر 7۔ اور قول باری تعالیٰ: وَّ مَتِّعُوْهُنَّ کی ضمیر متصل میں اختلاف ہے کہ عورتوں میں سے ان سے کون مراد ہیں؟ تو حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر، حضرت جابر بن زید، حضرت حسن رضی اللہ عنہم، حضرت امام شافعی، حضرت امام احمد، حضرت عطا، حضرت اسحاق اور اصحاب الرائے رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: ایسی مطلقہ عورت کے لئے متعہ واجب ہے جس کے پاس جانے اور اس کا مہر مقرر کیے جانے سے پہلے اسے طلاق ہو جائے اور اس کے سوا دوسری عورتوں کے حق میں مستحب ہے۔

اور امام مالک اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے: ہر مطلقہ عورت کے حق میں متعہ مستحب ہے اگرچہ اس سے دخول کیا گیا ہو، مگر اس کے حق میں کہ جس کے ساتھ دخول نہ کیا گیا اور اس کے لئے مہر مقرر کیا گیا تو اس کے لئے وہی کافی ہے جو اس کے لئے مقرر کیا گیا ہے اور اس کے لئے کوئی متعہ نہ ہوگا (1)۔

اور ابوثور نے کہا ہے اس کے لئے بھی اور ہر مطلقہ عورت کے لئے متعہ ہے اور اہل علم نے اس پر اجماع کیا ہے کہ وہ عورت جس کے لئے مہر مقرر نہ کیا گیا اور اس کے ساتھ دخول بھی نہ کیا گیا تو اس کے لئے متعہ کے سوا کوئی شے نہیں ہے۔ زہری نے کہا ہے: اس کے لئے متعہ کا فیصلہ قاضی کرے گا اور جمہور لوگوں نے کہا ہے: قاضی اس کے لئے اس کے بارے فیصلہ نہیں کرے گا (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اجماع بلاشبہ صرف آزاد عورت کے حق میں ہے۔ پس رہی لونڈی جب اسے مس کیے جانے اور مہر مقرر ہونے سے قبل طلاق دے دی جائے تو جمہور کا موقف یہ ہے کہ اس کے لئے متعہ ہوگا۔ امام اوزاعی اور ثوری نے کہا ہے: اس کے لئے کوئی متعہ نہیں ہے کیونکہ وہ اس کے آقا کے لئے ہوگا اور وہ اپنی مملوکہ کو طلاق کے سبب پہنچنے والی تکلیف کے مقابلے میں کسی مال کا مستحق نہیں ہے۔ رہا امام مالک کے مذہب کا ربط تو ابن شعبان نے کہا ہے: متعہ طلاق کے غم کے بدلے ہوتا ہے، اسی لئے وطی سے پہلے یا بعد خلع لینے والی عورت، مبارات کرنے والی اور لعان کرنے والی کے لئے کوئی متعہ نہیں ہوتا، کیونکہ یہ وہ ہے جس نے خود طلاق کو اختیار کیا ہے۔

اور ترمذی، عطا اور نخعی رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: خلع لینے والی عورت کے لئے متعہ ہے اور اصحاب الرائے نے کہا ہے: لعان کرنے والی عورت کے لئے متعہ ہے۔ ابن قاسم نے کہا ہے: فسخ کئے گئے نکاح میں کوئی متعہ نہیں ہے۔ ابن المواز نے کہا ہے: ایسا نکاح جس کا عقد صحیح ہونے کے بعد اس میں فسخ داخل ہو جائے تو اس میں متعہ نہیں ہے۔ مثلاً زوجین میں سے ایک دوسرے کا مالک ہو جائے (3)۔ ابن قاسم نے کہا ہے: اس کی اصل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ لِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ پس یہ حکم طلاق کے ساتھ مختص ہے فسخ اس میں شامل نہیں۔ اور ابن وہب نے مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ وہ عورت جسے اختیار دیا گیا اس کے لئے متعہ ہے بخلاف اس لونڈی کے جو کسی غلام کے نکاح میں آزاد ہو جائے تو اسے اپنے نفس کے بارے اختیار ہوگا۔ پس اس صورت

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 319، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

میں اس کے لئے متعہ نہیں ہوگا رہی وہ آزاد عورت جسے اختیار دیا گیا یا جو مالک ہو جائے یا مرد اس پر کسی لونڈی سے شادی کرے تو وہ ان تمام صورتوں میں اپنے نفس کی مختار ہوتی ہے اور اس کے لئے متعہ بھی ہوتا ہے کیونکہ زوج فرقت کا سبب بنتا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ امام مالک نے فرمایا: ہمارے نزدیک مقدار کے قلیل اور کثیر ہونے کے اعتبار سے متعہ کی کوئی معروف حد نہیں ہے (1)۔ البتہ لوگوں نے اس میں اختلاف کیا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: کم سے کم وہ مقدار جو متعہ میں دینی جائز ہے وہ تیس درہم یا ان کے مشابہ کوئی شے ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: سب سے اعلیٰ اور ارفع متعہ خادم ہے پھر لباس ہے اور پھر نفقہ ہے۔ حضرت عطا نے کہا ہے: اوسط متعہ قمیص، دوپٹہ اور چادر ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: یہی اس کی کم سے کم مقدار ہے۔ ابن محیریز نے کہا ہے: صاحب دیوان پر تین دینار ہوں گے اور غلام پر متعہ ہوگا۔

اور حسن نے کہا ہے: ہر کوئی اپنی قدر کے مطابق متعہ ادا کرے گا کوئی خادم کے ساتھ، کوئی کپڑوں کے ساتھ، کوئی ایک کپڑے کے ساتھ اور کوئی نفقہ کے ساتھ۔ اسی طرح امام مالک بن انس بھی کہتے ہیں اور یہی قرآن کریم کا مقتضا ہے، کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے نہ اس کی مقدار مقرر کی ہے اور نہ اس کی حد بیان فرمائی ہے۔ بے شک اس نے ارشاد فرمایا ہے: عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ (مقدور والے پر اس کی حیثیت کے مطابق اور تنگدست پر اس کی حیثیت کے مطابق ہے) حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے بیس ہزار اور ایک زقاق (مشکیزہ) شہد بطور متعہ دیا۔ اور شریح نے پانچ سو درہم بطور متعہ دیئے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بلاشبہ عورت کی حالت کا بھی اعتبار کیا جائے گا۔ بعض شوافع نے یہی کہا ہے، انہوں نے کہا ہے: اگر ہم صرف مرد کی حالت کا اعتبار کریں تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اگر وہ دو عورتوں سے شادی کرے ان میں سے ایک شریف اور اعلیٰ ہو اور دوسری ادنیٰ اور گھٹیا ہو پھر وہ مس کرنے سے پہلے ہی دونوں کو طلاق دے دے اور دونوں کے لئے مہر مقرر نہ کرے کہ وہ دونوں متعہ میں برابر ہوں۔ پس گھٹیا کے لئے بھی وہی کچھ واجب ہوگا جو شریف اور اعلیٰ کے لئے واجب ہو رہا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے خلاف ہے: مَتَاعًۢا بِالْمَعْرُوْفِ (متعہ دو مناسب طریقہ کے ساتھ۔) اور اس سے یہ لازم آتا ہے کہ انتہائی دولتمند اور خوشحال آدمی جب کسی کمینی اور گھٹیا عورت سے شادی کرے کہ وہ اس کی مثل ہو جائے، کیونکہ اس نے جب اسے دخول اور مہر مقرر ہونے سے پہلے طلاق دے دی تو مرد کی حالت اور عورت کے مہر مثل کے اعتبار سے اس پر متعہ لازم ہوگا، پس اس طرح متعہ اس کے مہر مثل کا کئی گنا ہو جائے گا۔ نتیجتاً وہ دخول سے قبل اس کے اس مہر سے کئی گنا کا مستحق ہو جائے گی جس مہر مثل کا وہ دخول کے بعد مستحق ہوگی جس میں استعمال کی انتہا ہے اور وہ وطی ہے۔

اصحاب الرائے وغیرہم نے کہا ہے: وہ عورت جسے دخول اور مہر مقرر کیے جانے سے پہلے طلاق دی جاتی ہے اس کا متعہ نصف مہر مثل ہے اس کے سوا کچھ نہیں، کیونکہ مہر مثل عقد کے سبب لازم ہوا ہے اور متعہ مہر مثل کا ہی بعض ہے، پس یہ اس کے لئے اسی طرح واجب ہوگا جیسے مہر مسمی کا نصف واجب ہوتا ہے جبکہ طلاق قبل از دخول ہو اور اس کی تردید رب العالمین کا یہ ارشاد کرتا ہے: عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ اور یہ تحدید چھوڑنے پر دلیل ہے (2) اور اللہ تعالیٰ ہی حقائق الامور

1۔ موطا امام مالک، جلد 1، صفحہ 522، وزارت تعلیم
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 319، دار الکتب العلمیہ

کے بارے جاننے والا ہے۔

اور ثعلبی نے حدیث ذکر کی ہے۔ بیان کیا ہے کہ یہ آیت لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ الآیہ انصار کے ایک آدمی کے بارے نازل ہوئی۔ اس نے بنی حنیفہ کی ایک عورت سے شادی کی اور اس کے لئے مہر مقرر نہ کیا پھر اسے چھونے سے پہلے ہی طلاق دے دی۔ تب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''تو اسے متعہ دے اگرچہ وہ تیری ٹوپی ہی ہو'' متعها ولو بقلنسوتك۔(1)

اور دارقطنی نے سوید بن غفلہ سے روایت کیا ہے کہ عائشہ خثعمیہ حضرت امام حسن بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما کے نکاح میں تھی جب حضرت علی رضی اللہ عنہ شہید ہوئے اور امام حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت کی بیعت کر لی گئی تو اس نے کہا: اے امیر المومنین! تجھے خلافت مبارک ہو۔ تو آپ نے فرمایا: حضرت علی رضی اللہ عنہ شہید کر دیے گئے ہیں اور تو خوشی کا اظہار کر رہی ہے! اذھبی فأنت طالق ثلاثا تو جا تجھے تین طلاقیں ہیں۔ راوی کا بیان ہے کہ اس نے اپنا کمبل لپیٹ لیا اور بیٹھ گئی یہاں تک کہ اس کی عدت گزر گئی۔ پس آپ نے اس کی طرف بطور متعہ دس ہزار اور اس کے مہر میں سے جو ابھی باقی تھا وہ سب بھیج دیا۔ تو اس نے کہا:

متاع قليل من حبيب مُفارِق

جدا ہونے والے محبوب کی نسبت متعہ انتہائی قلیل ہے۔

پس جب آپ کے پاس اس کا یہ قول پہنچا تو آپ رونے لگے اور فرمایا: اگر میں نے اپنے جد امجد سے نہ سنا ہوتا یا میرے باپ نے مجھے بتایا ہے کہ انہوں نے میرے جد امجد سے سنا۔ آپ فرماتے ہیں: وہ آدمی جس نے اپنی بیوی کو تین مبہم یا اقراء کے وقت تین طلاقیں دیں تو وہ اس کے لئے حلال نہ ہوگی یہاں تک کہ وہ اس کے سوا کسی اور زوج سے شادی کر لے، تو میں اس کی طرف رجوع کر لیتا۔(2)

ایک روایت میں ہے کہ قاصد نے انہیں اس کی خبر دی اور وہ رونے لگے اور فرمایا: اگر میں نے اسے طلاق کے ساتھ مکمل جدا نہ کر دیا ہوتا تو میں اس کی طرف رجوع کر لیتا۔ لیکن میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: جس آدمی نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں ہر طہر کے وقت ایک طلاق یا ہر مہینے کے شروع میں ایک طلاق یا اسے اکٹھی تین طلاقیں دے دیں تو وہ اس کے لئے حلال نہ ہوگی یہاں تک کہ وہ کسی اور خاوند سے شادی کر لے (ایما رجل طلق امرأته ثلاثا عند كل طهر تطليقة او عند رأس كل شهر تطليقة او طلقها ثلاثا جميعا لم تحل له حتى تنكح زوجا غيره)(3)

مسئلہ نمبر 9۔ وہ آدمی جو متعہ سے جاہل اور ناواقف ہو یہاں تک کہ کئی سال گزر گئے تو اسے چاہئے کہ وہ اسے دے اگرچہ وہ شادی بھی کر لے۔ اور اگر وہ عورت فوت ہو جائے تو اس کے ورثاء کو دے۔ اسے ابن مواز نے ابن قاسم سے روایت کیا ہے۔ اور اصبغ نے کہا ہے: اگر عورت فوت ہو جائے تو پھر اس پر کوئی شے لازم نہیں ہے کیونکہ متعہ طلاق کی وجہ سے پہنچنے والے غم کے سبب عورت کو تسلی دینے کے لئے ہے اور وہ مقصود فوت ہو چکا ہے اور پہلے قول کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک حق ہے

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 324، دار الفکر 2۔ سنن دارقطنی، کتاب الطلاق، جلد 4، صفحہ 30، دار المحاسن قاہرہ 3۔ ایضاً

جو مرد کے ذمہ ثابت ہو چکا ہے۔ لہٰذا وہ دیگر حقوق کی طرح عورت سے اس کے ورثاء کی طرف منتقل ہو جائے گا اور یہ ان کے مذہب میں متعہ کے واجب ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 10 ۔ قولہ تعالیٰ: عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ یہ متعہ کے وجوب پر دلیل ہے۔ جمہور نے اسے الْمُوْسِعِ یعنی واؤ کے سکون اور سین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے (1) اور اس سے مراد وہ ہے جس کی حالت میں وسعت اور خوشحالی ہو۔ کہا جاتا ہے: فلان ینفق علی قدرہ یعنی فلاں اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرتا ہے۔ اور ابوحیوہ نے اسے واؤ کے فتحہ اور سین کی شد اور فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے (یعنی اَلْمُوَسَّعِ) ابن عامر، حمزہ، کسائی اور عاصم نے حفص کی روایت میں دونوں مقامات پر دال کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے (یعنی قَدَرُهٗ) اور ابن کثیر، نافع، ابوعمرو اور عاصم نے ابوبکر کی روایت میں قَدْرُهٗ یعنی دونوں جگہوں پر دال کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

ابوالحسن الاخفش وغیرہ نے کہا ہے: یہ دونوں ہم معنی ہیں، دونوں لغتیں فصیح ہیں۔

اور اسی طرح ابوزید نے بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں: خذ قَدْرَ کذا و قَدَرَ کذا۔ دونوں کا معنی ایک ہے (یعنی اتنی مقدار لے لو) اور کتاب اللہ میں پڑھتے ہیں: فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا (الرعد: 17) (پس بہنے لگیں وادیاں اپنے اپنے اندازے کے مطابق) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖۤ (الانعام: 91) (اور نہ قدر پہچانی انہوں نے اللہ کی جیسے حق تھا اس کی قدر پہچاننے کا) اگر دال کو حرکت دی جائے تو بھی جائز ہے اور الْمُقْتِرِ کا معنی ہے قلیل المال (یعنی ایسا آدمی جس کے پاس مال کم ہو، وہ تنگدست ہو۔) مَتَاعًا یہ مصدر ہونے کی بنا پر منصوب ہے (2)۔ یعنی متعوھن متاعاً۔ تم انہیں خرچہ دو بِالْمَعْرُوْفِ یعنی جس طرح شریعت میں بیان کیا گیا ہے میانہ روی وغیرہ۔

مسئلہ نمبر 11 ۔ قولہ تعالیٰ: حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ یعنی یہ نیکوکاروں کا فرض ہے۔ کہا جاتا ہے: حققت علیہ القضاء أحققت، یعنی میں نے فیصلہ اس پر لازم کر دیا۔ اس میں اس پر دلیل ہے کہ متعہ واجب ہے کیونکہ اس کے بارے حکم دیا گیا ہے اور قول باری تعالیٰ حَقًّا وجوب کی تاکید کے لئے ہے۔ اور عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ اور عَلَى الْمُتَّقِيْنَ کا معنی ہے علی المؤمنین یعنی مومنین پر لازم ہے۔ اسی لئے یہ جائز نہیں ہے کہ کوئی یہ کہے: لست بمحسن ولا متق (کہ میں محسن اور متقی نہیں) اور لوگوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ تمام کے تمام محسنین اور متقین ہوں۔ پس وہ اللہ تعالیٰ کے فرائض ادا کرنے کے ساتھ محسن ہوتے ہیں اور وہ اس کی نافرمانی سے اجتناب کرتے ہیں تاکہ وہ جہنم میں داخل نہ ہوں۔ پس تمام مخلوق پر واجب ہے کہ وہ محسنین اور متقین ہوں اور حَقًّا یہ مَتَاعًا کی صفت ہے یا پھر مصدر ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور اسے امر کی تاکید کے لئے لایا گیا ہے۔ واللہ اعلم۔

وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّاۤ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ؕ وَاَنْ تَعْفُوْۤا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؕ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۲۳۷

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 319، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً

''اور اگر تم طلاق دو انہیں اس سے پہلے کہ تم انہیں ہاتھ لگاؤ اور مقرر کر چکے تھے ان کے لئے مہر تو نصف مہر (ادا کرو) جو تم نے مقرر کیا ہے مگر یہ کہ وہ (اپنا حق) معاف کر دیں یا معاف کر دے وہ جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے۔ اور (اے مردو!) اگر تم معاف کر دو تو یہ بہت قریب ہے تقویٰ سے اور نہ بھلایا کرو احسان کو آپس (کے لین دین) میں، بے شک اللہ تعالیٰ جو تم کرتے ہو خوب دیکھنے والا ہے۔''

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ لوگوں نے اس آیت میں اختلاف کیا ہے، پس ایک جماعت نے کہا ہے، اس میں سے امام مالکؒ وغیرہ ہیں کہ یہ مہر مقرر ہونے کے بعد متعہ کے حکم سے مطلقہ کو نکالنے والی ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اسے شامل ہے **وَّمَتِّعُوْهُنَّ** اور حضرت ابن مسیب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اس آیت کو سورۃ الاحزاب کی آیت نے منسوخ کر دیا ہے، کیونکہ وہ ہر اس مطلقہ کے متعہ کو متضمن ہے جس کے ساتھ دخول نہیں ہوا اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اس آیت نے اپنے سے پہلی آیت کو منسوخ کیا ہے(1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضرت سعید اور حضرت قتادہ کا قول محل نظر ہے کیونکہ نسخ کی شروط موجود نہیں ہیں اور انہیں جمع کرنا ممکن ہے اور ابن القاسم نے المدونہ میں کہا ہے: متعہ اس ارشاد کے مطابق ہر مطلقہ کے لئے ہے: **وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ** اور غیر مدخول بہا کے لئے اس آیت کے مطابق ہے جو سورۃ الاحزاب میں ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ساتھ اس مطلقہ کو اس حکم سے مستثنیٰ کر دیا ہے جس کے لئے مہر مقرر کیا گیا اور اسے قبل از دخول طلاق ہوگئی اور اس کے لئے صرف اس مہر کا نصف ثابت کیا جو اس کے لئے مقرر کیا گیا(2)۔

اور علماء کے ایک فریق نے کہا ہے ان میں سے ابوثور ہیں کہ عموماً ہر مطلقہ کے لئے متعہ ہے اور اس آیت نے یہ بیان کیا ہے کہ جس کے لئے مہر مقرر کیا گیا وہ اس میں سے نصف بھی لے گی اور آیت سے اس کے متعہ کو ساقط کرنا مراد نہیں ہے بلکہ اس کے لئے متعہ اور نصف مہر ہے(3)۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: **فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ** یعنی جو مہر تم نے مقرر کیا اس کا نصف واجب ہے۔ یعنی بالاجماع مہر میں سے نصف خاوند کے لئے ہے اور نصف عورت کے لئے اور نصف دو میں سے ایک جز ہے۔

پس کہا جاتا ہے: **نَصَفَ الماءُ القدحَ** یعنی پانی پیالے کے نصف تک پہنچ گیا۔ اور **نصف الازار الساق** چادر پنڈلی کے نصف تک ہوگی، ہر وہ شے جو اپنے غیر کے نصف تک پہنچ جائے تو تحقیق وہ اس کا نصف ہوگئی۔

جمہور نے **فَنِصْفُ** رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور ایک جماعت نے **فَنِصْفَ** یعنی فا کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے معنی یہ ہے کہ تم نصف دو۔

حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہما نے **فَنُصْفُ** تمام قرآن میں نون کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بھی ایک لغت ہے۔ اور اسی طرح اصمعی نے ابو عمرو بن العلاء سے قراءت روایت کی ہے(4)۔ کہا جاتا ہے: **نِصف و نُصف و**

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 320، دار الکتب العلمیہ　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً　4۔ ایضاً

نَصِیْفٌ۔ یہ تینوں نصف کے بارے میں لغات ہیں اور حدیث میں ہے: لو ان احدکم انفق مثل اُحد ذھبا ما بلغ مد أحدھم ولا نصیفه۔ ای نصفه۔(1) (یعنی اگر تم میں سے کوئی احد پہاڑ کی مثل سونا خرچ کرے تو وہ ان میں سے کسی کے مد کو نہیں پہنچ سکتا اور نہ اس کے نصف کو) اور نصیف کا معنی القِناع (اوڑھنی دوپٹہ) بھی ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ جب آدمی نے عورت کو مہر دے دیا پھر اسے قبل از دخول طلاق دے دی اور مہر عورت کے قبضے میں بڑھتا رہا تو امام مالک نے فرمایا ہے: کل سامان جو مرد نے اسے بطور مہر دیا یا غلام تو دونوں کی بڑھوتری دونوں (مرد و عورت) کے لئے ہوگی اور اس کا نقصان بھی دونوں کے درمیان تقسیم ہوگا۔

اور اس کی ہلاکت بھی ان دونوں پر اکٹھی پڑے گی، اس صورت میں اس میں سے عورت پر کوئی شے نہ ہوگی۔ اور اگر اس نے اسے سونے یا چاندی کی معینہ مقدار بطور مہر دی اور اس نے اس کے ساتھ غلام یا گھر خرید لیا یا اس کے عوض ان کا کچھ حصہ خرید لیا یا اس کے سوا خوشبو یا گھر کا ساز و سامان یا اس کے علاوہ کوئی ایسی شے خریدی جس میں عورت کا تصرف ہوا اپنی حاجت و ضرورت کے لئے اور مرد کے ساتھ اس گھر میں رہنے کی خاطر اپنے معاملات کی اصلاح کے لئے، تو وہ تمام کا تمام اسی کے قائم مقام ہے کہ اگر وہ اسے وہی بطور مہر دیتا اور اس کی نمو اور کمی دونوں کے درمیان منقسم ہوگی۔

اور اگر اس نے اسے قبل از دخول طلاق دی تو پھر اس کے لئے نصف کے سوا کچھ نہیں ہے اور نہ عورت پر یہ لازم ہے کہ وہ مرد کو اس مہر کا نصف بطور قرض ادا کرے جس پر اس نے قبضہ کیا ہے۔ اور اگر عورت نے کامل مہر یا اس کے کچھ حصہ کے ساتھ کوئی شے خریدی تو وہ اس کے ساتھ مختص ہو جائے گی اور عورت پر مرد کے لئے اس مہر کا نصف بطور قرض ہوگا جس پر عورت نے قبضہ کیا ہے اور اسی طرح اگر عورت نے کسی غیر سے غلام یا گھر خرید لیا اس ہزار کے عوض جو مرد نے اسے بطور مہر دیا تھا پھر اسے دخول سے پہلے طلاق دے دی تو وہ اس پر ہزار کے نصف کے لئے رجوع کر سکتا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ جس نے اپنی بیوی کے ساتھ مجامعت کی پھر فوت ہو گیا درآنحالیکہ اس کے لئے مہر مقرر کیا گیا تھا تو اس عورت کے لئے وہ کامل مہر مسمی ہوگا اور میراث بھی ہوگی اور اس پر عدت بھی ہوگی۔

اور علماء نے ایسے آدمی کے بارے میں اختلاف کیا ہے جو عورت کے ساتھ خلوت تو اختیار کرتا ہے اور اس سے مجامعت نہیں کرتا یہاں تک کہ اسے جدا کر دیا۔ تو علمائے کوفہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس پر تمام مہر واجب ہوگا اور عورت پر عدت بھی ہوگی، کیونکہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، انہوں نے کہا: خلفائے راشدین نے اس آدمی کے بارے میں فیصلہ فرمایا جس نے دروازہ بند کر لیا یا پردہ لٹکا لیا تو اس عورت کے لئے میراث ہوگی اور اس پر عدت بھی ہوگی (2)۔ یہ مرفوع روایت ہے اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ اس کا بیان سورۃ النساء میں آئے گا۔

اور امام شافعی کامل مہر واجب نہیں کرتے اور نہ ہی عورت پر عدت ہوگی جبکہ دخول نہ ہو۔ ظاہر قرآن کریم اس کی تائید کرتا

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، جلد 1، صفحہ 518، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب قول النبی لو کنت متخذا، حدیث 3397، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ السنن الکبریٰ، جلد 7، صفحہ 255، دار الفکر

ہے۔ شریح نے کہا ہے: میں نے نہیں سنا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بابًا یا ستراً کا ذکر کیا ہو، جبکہ آپ کا خیال یہ ہے کہ چونکہ مرد نے عورت کو مس نہیں کیا لہٰذا اس کے لئے نصف مہر ہوگا۔ یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا مذہب ہے۔ اور اس بارے میں ہمارے علماء کا موقف عنقریب سورۃ النساء میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

رب کریم کے اس ارشاد کے تحت: وقد افضی بعضکم الی بعض۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: اِلَّآ اَنْ یَّعْفُوْنَ اَوْ یَعْفُوَا الَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ الآیۃ۔

اس میں اِلَّآ اَنْ یَّعْفُوْنَ استثنا منقطع ہے۔ کیونکہ ان کا نصف معاف کرنا ان کے لینے کی جنس میں سے نہیں ہے۔ اور یَّعْفُوْنَ کا معنی یترکن (وہ چھوڑ دیتی ہیں) اور تصفحن (وہ درگزر کرتی ہیں) ہے اور اس کا وزن یَفْعُلْنَ ہے۔ معنی یہ ہے مگر یہ کہ وہ اس نصف کو چھوڑ دیتی ہیں جو ان کے لئے زوج پر واجب ہوتا ہے اور اَنْ داخل ہونے کے باوجود نون ساقط نہیں ہوا، کیونکہ مضارع میں جمع مؤنث کا صیغہ رفع، نصب اور جزم کی صورت میں ایک ہی حالت پر رہتا ہے اور یہ ضمیر ہے علامت اعراب نہیں ہے۔ پس اسی وجہ سے نون ساقط نہیں ہوا، کیونکہ اگر نون ساقط ہو جائے تو پھر مذکر کے ساتھ اس کا اشتباہ لازم آئے۔

اس آیت میں معاف کرنے والیوں میں ہر وہ عورت ہے جو اپنی ذات کے معاملہ کی خود مالک ہوتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں مہر ثابت ہو جانے کے بعد اسے ساقط کرنے کی اجازت دی ہے، کیونکہ اسے خالص ان کا حق بنایا ہے۔ پس وہ اس میں قائم رکھنے اور ساقط کرنے کا تصرف کر سکتی ہیں جیسے چاہیں جبکہ وہ اپنے نفسوں کے معاملہ کی مالک ہیں اور وہ بالغ، عاقل اور ہدایت یافتہ بھی ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور فقہاء و تابعین کی ایک جماعت نے کہا ہے: اس باکرہ عورت کا معاف کرنا بھی جائز ہوتا ہے جس کا کوئی ولی نہ ہو اور اسے سحنون نے المدونہ میں ابن قاسم کے سوا کسی اور سے بیان کیا ہے اس کے بعد کہ ابن قاسم نے ذکر کیا ہے کہ اس کا نصف مہر کو ساقط کرنا جائز نہیں ہے۔ رہی وہ جو باپ یا وصی کے زیر پرورش رہی تو اس کا اپنے نصف مہر کو ساقط کرنا جائز نہیں۔

یہ ایک ہی قول ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں جسے میں جانتا ہوں۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: اَوْ یَعْفُوَا الَّذِیْ بِیَدِهٖ اس کا عطف پہلے پر ہے، وہ مبنی ہے اور یہ معرب ہے اور حسن نے اَوْ یَعْفُوْ واؤ کو ساکن پڑھا ہے (1)۔ گویا کہ انہوں نے واؤ پر فتحہ کو ثقیل سمجھا ہے۔ لوگوں نے اس ارشاد کے معنی مراد میں اختلاف کیا ہے: اَوْ یَعْفُوَا الَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ پس دارقطنی نے حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بنی نصر کی ایک عورت سے شادی کی اور پھر دخول سے پہلے ہی اسے طلاق دے دی اور اس کی طرف کامل مہر بھیج دیا اور فرمایا: میں اسے معاف کرنے کا زیادہ حق رکھتا ہوں، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اِلَّآ اَنْ یَّعْفُوْنَ اَوْ یَعْفُوَا الَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ (بقرہ: 237) اور میں اس سے معاف کرنے کا زیادہ حق رکھتا ہوں (2)۔ اور انہوں نے اس قول باری تعالیٰ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 321، دار الکتب العلمیہ
2۔ سنن دارقطنی، کتاب النکاح، جلد 3، صفحہ 279، دار المحاسن قاہرہ

کی تاویل کی: اَوْ یَعْفُوَا الَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ مراد اپنی ذات ہے ہر حال میں طلاق سے پہلے بھی اور طلاق کے بعد بھی۔ یعنی یا وہ معاف کر دے جس کے ہاتھ میں اپنے نکاح کی گرہ ہے (یعنی عبارت ہے) عقدۃ نکاحہ۔ پھر جب لام داخل کیا گیا تو ہاء کو حذف کر دیا گیا، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰی۔ ای مأواہ۔ نابغہ نے کہا ہے:

لهم شِيمَة لم يعطها اللهُ غيرَهم من الجود والاحلام غيرُ عَوَازِبِ

اس میں الأحلام اصل میں أحلامهم ہے۔ اسی طرح قول باری تعالیٰ: عُقْدَةُ النِّكَاحِ اصل میں عقدۃ نکاحہ ہے۔

دار قطنی نے حضرت قتیبہ بن سعید کی حدیث سے مرفوع روایت بیان کی ہے کہ ابن لہیعہ نے عمرو بن شعیب سے، انہوں نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے روایت ذکر کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ولی عقدة النكاح الزوج (1) کہ نکاح کی گرہ کا ولی زوج ہے۔ یہ حضرت علی، حضرت ابن عباس، حضرت سعید بن مسیب اور قاضی شریح رضی اللہ عنہم سے بھی مسند بیان کی گئی ہے۔ فرمایا: اسی طرح نافع بن جبیر، محمد بن کعب، طاؤس، مجاہد، شعبی اور سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہم نے بھی کہا ہے اور اس کے سوا نے حضرت مجاہد اور حضرت ثوری رحمۃ اللہ علیہما کا اضافہ کیا ہے۔ اسے امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا ہے اور امام شافعی کے قول سے بھی یہی صحیح ہے۔ یہ تمام کے تمام عورت کے مہر میں سے کسی شے پر ولی کے لئے کوئی حق نہیں دیکھتے، اس پر اجماع ہونے کی وجہ سے کہ ولی اگر زوج کو طلاق سے پہلے مہر سے بری کر دے تو یہ جائز نہیں اور اسی طرح طلاق کے بعد بھی ہے۔

اور اس پر بھی اجماع ہے کہ ولی اس کے مال میں سے کوئی شے ہبہ کرنے کا مالک نہیں ہوتا اور مہر بھی اس کا مال ہے۔ اس پر بھی اجماع ہے کہ اولیاء میں سے وہ بھی ہیں جن کا معاف کرنا جائز نہیں ہوتا اور وہ چچا کے بیٹے اور بھائیوں کے بیٹے ہیں۔ اسی طرح باپ بھی ہے۔ واللہ اعلم۔

اور ان میں سے وہ بھی ہے جس نے کہا وہ ولی ہے، اسے دار قطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی بیان کیا ہے (2)۔ انہوں نے کہا ہے: یہی ابراہیم، علقمہ اور حسن رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے اور اس کے سوا حضرت عکرمہ، طاؤس، عطا، ابو الزناد، زید بن اسلم، ربیعہ، محمد بن کعب، ابن شہاب، اسود بن یزید، شعبی، قتادہ، مالک اور شافعی کے قدیمی قول نے اس میں اضافہ کیا ہے۔

اور باپ کے لئے اپنی باکرہ بیٹی کا نصف مہر معاف کرنا جائز ہوتا ہے جب اسے طلاق ہو جائے، چاہے وہ حیض کی عمر کو پہنچے یا نہ پہنچے۔

عیسیٰ بن دینار نے کہا ہے: وہ اس میں سے کسی شے کے لئے اپنے باپ کی طرف رجوع نہیں کرے گی اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اس سے مراد ولی ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے آیت کے اول حصہ میں ارشاد فرمایا ہے۔ وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَ قَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِیْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ (البقرہ: 237) پس ازواج کا ذکر کیا اور اس خطاب کے ساتھ انہیں خطاب فرمایا، پھر فرمایا: اِلَّاۤ اَنْ یَّعْفُوْنَ پس عورتوں کا ذکر کیا۔ اَوْ یَعْفُوَا الَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ تو یہ تیسرا حصہ ہے اسے اس زوج کی طرف نہیں لوٹایا جائے گا جس کا ذکر پہلے ہوا مگر یہ کہ اس کے سوا کوئی موجود نہ ہو، حالانکہ وہ پایا گیا

1۔ سنن دار قطنی، کتاب النکاح، جلد 3، صفحہ 279، دار المحاسن قاہرہ
2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 280

ہے اور وہ ولی ہے اور وہی مراد ہے۔ اس کا یہ معنی مکی نے بیان کیا ہے اور اسے ابن عربی نے ذکر کیا ہے۔

اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اور یہ معلوم شدہ ہے کہ ہر عورت معاف نہیں کر سکتی، کیونکہ صغیرہ اور وہ عورت جس پر پابندی ہو ان کے لئے معاف کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے دونوں قسموں کو بیان فرما دیا اور فرمایا: اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ یعنی اگر وہ اس کے اہل ہوں اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ اور اس سے مراد ولی ہے کیونکہ اس میں اختیار اسی کے پاس ہے۔

اور اسی طرح ابن وہب، اشہب، ابن عبد الحکم اور ابن قاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ وہ اپنی باکرہ بیٹی کے حق میں باپ ہے اور اپنی لونڈی کے حق میں آقا ہے۔ اور بلاشبہ ولی کا معاف کرنا جائز ہوتا ہے جب کہ وہ صائب الرائے لوگوں میں سے ہو اور اس کا معاف کرنا جائز نہیں ہوتا جبکہ وہ بیوقوف اور احمق ہو۔

اور اگر کہا جائے: ہم تسلیم نہیں کرتے کہ اس سے مراد ولی ہے بلکہ اس سے مراد زوج ہے اور یہ اسم اس کے زیادہ قریب ہے، کیونکہ یہ ولی کی نسبت عقد کرنے کا زیادہ مالک ہوتا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

تو جواب یہ ہے کہ ہم تسلیم نہیں کرتے کہ باکرہ بیٹی کے حق میں باپ کی نسبت زوج عقد کا زیادہ مالک ہوتا ہے، بلکہ وہاں تو صرف باکرہ کا باپ مالک ہوتا ہے نہ کہ زوج، کیونکہ جس پر عقد کیا گیا ہے وہ باکرہ کی بضع ہے اور زوج اس کا عقد کرنے کا مالک نہیں ہوتا بلکہ باپ اس کا مالک ہوتا ہے۔

اور شریح نے بھائی کے نصف مہر معاف کرنے کو جائز قرار دیا ہے اور اسی طرح عکرمہ نے کہا ہے: اس کا معاف کرنا بھی جائز ہے جس نے دونوں کے درمیان عقد نکاح کیا چاہے وہ چچا ہو یا باپ ہو یا بھائی ہو۔ اگرچہ وہ ناپسند بھی کرے۔

ابونہیک اور شعبی نے اَوْ يَعْفُوْ واؤ کو الف کے مشابہ قرار دے کر اسے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کی مثل شاعر کا قول بھی ہے:

فما سوّدتني عامر عن وراثة أبى الله أن اسمو بأم ولا أب

اس میں اسمو کی واؤ کو سکون کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى یہ مبتدا اور خبر ہے۔ اور تَعْفُوْ دراصل تَعْفُوُوْا ہے پہلی واؤ کو ساکن کر دیا گیا اس پر حرکت ثقیل ہونے کی وجہ سے، پھر التقائے ساکنین کی وجہ سے اسے حذف کر دیا گیا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق یہ خطاب مردوں اور عورتوں کو ہے اور مردوں کو اس میں غلبہ دیا گیا ہے۔ اور لام بمعنی الیٰ ہے یعنی اقرب الی التقویٰ۔

اور جمہور نے اسے تعفو تاء کے ساتھ پڑھا ہے اور ابو نہیک اور شعبی نے وَاَنْ يَّعْفُوْا یاء کے ساتھ قراءت کی ہے۔ یہ ضمیر اسی کی طرف راجع ہے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے (1)۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 321، دار الکتب العلمیہ

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسے وان تعفون تاء کے ساتھ نہیں پڑھا گیا کہ یہ عورتوں کے لئے ہو۔

اور جمہور نے وَلَا تَنۡسَوُا الۡفَضۡلَ کو واؤ کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یحیٰی بن یعمر نے اسے کسرہ دیا ہے۔ اور حضرت علی، مجاہد، ابوحیوہ، ابن ابی عبلہ رحمۃ اللہ علیہم نے ولا تناسوا الفضل پڑھا ہے۔ اور یہ قراءت معنی کو پختہ کرنے والی ہے، کیونکہ یہ تناسی (بھولنے کا بہانہ کرنا) کا محل ہے نہ کہ نسیان کا مگر تشبیہ کی بنا پر۔

مجاہد نے کہا ہے: الفضل سے مراد مرد کا کل مہر کو مکمل کرنا ہے یا عورت کا اپنے نصف مہر کو چھوڑ دینا ہے (1)۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ یہ خبر اپنے ضمن میں محسن کے لئے وعدہ اور غیر محسن کے لئے محرومی لئے ہوئے ہے (2)۔ یعنی اللہ تعالیٰ پر تمہارا معاف کرنا اور تمہارا پورا پورا طلب کرنا مخفی نہیں ہے۔

حٰفِظُوۡا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الۡوُسۡطٰی ۚ وَقُوۡمُوۡا لِلّٰهِ قٰنِتِیۡنَ ﴿۲۳۸﴾

"پابندی کرو سب نمازوں کی اور (خصوصاً) درمیانی نماز کی اور کھڑے رہا کرو اللہ کے لئے عاجزی کرتے ہوئے۔"

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: حٰفِظُوۡا یہ خطاب تمام امت کو ہے اور یہ آیت نمازوں کو ان کے اوقات میں ان کی تمام شرائط کے ساتھ قائم کرنے اور اس پر ہمیشگی اختیار کرنے کا حکم ہے۔

اور محافظۃ کا معنی کسی۔۔۔ پر مداومت اور مواظبت اختیار کرنا ہے اور الوسطیٰ الاوسط کی تانیث ہے اور کسی شے کا وسط اس کا بہترین، عمدہ اور متناسب ہونا ہے۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَكَذٰلِكَ جَعَلۡنٰكُمۡ اُمَّةً وَّسَطًا اس کی تفصیلی بحث پہلے گزر چکی ہے۔ اور ایک اعرابی نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کرتے ہوئے کہا:

یا اوسط الناس طُرًّا فِي مَفَاخِرِهِم واکرم الناس أُمًّا بَرَّةً و أبا

اور وسط فلان القوم يَسِطهم یعنی فلاں ان کے وسط میں ہو گیا۔ اور الصَّلٰوةِ الۡوُسۡطٰی کا علیحدہ اور منفرد ذکر کیا گیا ہے حالانکہ الصلوٰت کے عموم میں بھی وہ داخل ہے تو اس کی عظمت اور مرتبہ کے اظہار کے لئے ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیۡثَاقَهُمۡ وَمِنۡكَ وَمِنۡ نُّوۡحٍ (الاحزاب: 7) (اور اے حبیب!) یاد کرو جب ہم نے تمام نبیوں سے عہد لیا اور آپ سے بھی اور نوح سے) (اس میں مِنۡكَ اور مِنۡ نُّوۡحٍ کا علیحدہ ذکر کیا گیا ہے حالانکہ النبیین کے عموم میں یہ داخل ہیں۔ تو یہ اظہار شرف و مرتبہ کے لئے ہے) اور اسی طرح یہ ارشاد ہے: فِیۡهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخۡلٌ وَّرُمَّانٌ ﴿۶۸﴾ (الرحمن) (ان میں میوے ہوں گے اور کھجوریں اور انار ہوں گے۔)

(فَاكِهَةٌ کے عموم میں داخل ہونے کے باوجود نخل اور رمان کا ذکر علیحدہ کیا گیا ہے۔)

ابوجعفر الواسطی نے وَالصَّلٰوةِ الۡوُسۡطٰی کو اغراء کی بنا پر نصب کے ساتھ پڑھا ہے یعنی اَلزموا الصلاۃ الوسطی (تم صلوٰۃ وسطیٰ کو لازم پکڑو) اور اسی طرح حلوانی نے بھی پڑھا ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 322، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً

اور قالون نے نافع سے الوصطی صاد کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ طاء اس کی مجاورت میں ہے کیونکہ یہ دونوں ایک ہی محل میں سے ہیں۔ اور یہ دونوں لغتیں ہیں جیسا کہ صراط وغیرہ۔

مسئلہ نمبر 2۔ لوگوں نے وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى کی تعیین میں اختلاف کیا ہے اس پر دس اقوال ہیں۔

(۱) اس سے مراد ظہر ہے، کیونکہ یہ نماز دو قولوں میں سے صحیح قول کی بنا پر دن کے وسط میں ہے کہ دن کا آغاز طلوع فجر سے ہوتا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور ہم نے ظہر سے ابتدا کی ہے کیونکہ یہی وہ پہلی نماز ہے جو اسلام میں ادا کی گئی۔ اور جنہوں نے کہا ہے کہ یہی الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ہے ان میں سے حضرت زید بن ثابت، حضرت ابوسعید خدری، حضرت عبداللہ بن عمر اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم ہیں۔

اور ان روایات میں سے جو اس پر دلالت کرتی ہیں کہ یہی صلوٰۃ وسطی ہے ایک وہ ہے جو حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما نے بیان فرمائی، جس وقت ان دونوں نے املا کرائی حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطٰى وَصَلَاةِ العصر اسے واؤ کے ساتھ بیان کیا (1)۔

اور روایت ہے کہ یہ مسلمان پر بہت زیادہ شاق گزرتی ہے کیونکہ یہ تیز گرمی کے وقت میں آتی ہے درآنحالیکہ انہیں اپنے اموال میں کاموں نے خوب تھکا رکھا ہوتا ہے۔

اور ابوداؤد نے حضرت زید رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی نماز سخت گرمی میں ادا فرماتے تھے اور کوئی ایسی نماز نہ تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب پر اس سے زیادہ شاق اور مشقت آمیز ہوتی۔ تب یہ آیت نازل ہوئی: حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى اور یہ بھی فرمایا: اس سے پہلے بھی دو نمازیں ہیں اور اس کے بعد بھی دو نمازیں ہیں (2)۔ اور امام مالک نے مؤطا میں اور ابوداؤد طیالسی نے اپنی مسند میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: صلوٰۃ وسطی صلوٰۃ ظہر ہے (3)۔

طیالسی نے یہ زیادہ کہا ہے: اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے سخت گرمی کے وقت میں ادا فرماتے تھے۔

(۲) الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى سے مراد نماز عصر ہے، کیونکہ اس سے پہلے دن کی دو نمازیں ہیں اور اس کے بعد رات کی دو نمازیں ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: اس استدلال میں سے عمدہ اور اعلیٰ یہ ہے کہ یہ نماز ہے جس کے لئے وسطیٰ کہا گیا ہے کیونکہ یہ دو نمازوں کے درمیان ہے ان میں سے ایک وہ ہے جو سب سے اول فرض کی گئی اور دوسری وہ نماز ہے جو دوسرے نمبر پر فرض کی گئی۔

اور جنہوں نے کہا ہے کہ یہی نماز صلوٰۃ وسطی ہے ان میں سے حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر، حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہم ہیں (4)، یہی امام ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب رحمہم اللہ علیہم کا مختار ہے۔ امام شافعی

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب صلوٰۃ الجماعۃ، جلد 1، صفحہ 121، وزارت تعلیم
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 59، وزارت تعلیم
3۔ مؤطا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ الجماعۃ، جلد 1، صفحہ 122، وزارت تعلیم
4۔ صحیح بخاری، باب الدعاء علی المشرکین، حدیث 5917، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر اہل الاثر نے یہی کہا ہے اور عبد الملک بن حبیب نے بھی یہی موقف اپنایا ہے اور ابن عربی نے بھی قبس میں اور ابن عطیہ نے اپنی تفسیر میں اسے ہی اختیار کیا ہے اور کہا ہے: اسی قول پر جمہور لوگ ہیں اور یہی میں بھی کہتا ہوں۔

اور انہوں نے اس باب میں وارد ہونے والی احادیث سے استدلال کیا ہے انہیں مسلم وغیرہ نے روایت کیا ہے اور میں ان میں سے حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو بیان کروں گا۔ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: الصلاۃ الوسطی صلاۃ العصر صلاۃ وسطی نماز عصر ہے۔ اسے ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے (1) اور ہم اس سے زیادہ احادیث ''القبس فی شرح مؤطا مالک بن انس'' میں لائے ہیں۔

(۳) الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى سے مراد نماز مغرب ہے۔ قبیصہ بن ابی ذویب نے ایک جماعت میں یہی کہا ہے۔ ان کی حجت یہ ہے کہ یہ رکعتوں کی تعداد میں متوسط ہے نہ رکعتوں کی تعداد بہت کم ہے اور نہ ہی بہت زیادہ ہے اور نہ ہی سفر میں اس کی قصر کی جاتی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے نہ اپنے وقت سے مؤخر کیا ہے اور نہ ہی اسے جلدی ادا فرمایا ہے اور اس کے بعد دو نمازیں جہری ہیں اور اس سے پہلے دو نمازیں سری ہیں اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک افضل ترین نماز مغرب ہے۔ اس نے اسے نہ کسی مسافر سے ساقط کیا اور نہ کسی مقیم سے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ رات کی نماز کا آغاز کیا اور اس کے ساتھ دن کی نمازوں کو ختم کر دیا۔ پس جس نے مغرب کی نماز پڑھی اور اس کے بعد دو رکعتیں پڑھیں اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں ایک محل بنائے گا اور جس نے اس کے بعد چار رکعتیں پڑھیں اللہ تعالیٰ اس کے لئے بیس سال کے گناہوں کی مغفرت فرما دے گا۔ یا فرمایا چالیس سال کے''۔

(۴) الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى سے مراد عشاء کی نماز ہے کیونکہ یہ ایسی دو نمازوں کے درمیان ہے جن کی قصر نہیں کی جاتی اور یہ نیند کے وقت میں آتی ہے اور اس میں تاخیر کرنا مستحب ہوتا ہے اور یہ شاق اور گراں ہوتی ہے، لہٰذا اس کی محافظت کی تاکید فرمائی۔

(۵) الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى سے مراد صبح کی نماز ہے، کیونکہ اس سے پہلے رات کی دو نمازیں ہیں جن میں قراءت بالجہر کی جاتی ہے اور اس کے بعد دن کی دو نمازیں ہیں جن میں سراً قراءت کی جاتی ہے اور اس لئے بھی کہ اس کا وقت داخل ہو جاتا ہے اور لوگ سو رہے ہوتے ہیں اور اس کے لئے سردی کے موسم میں سردی کی شدت کی وجہ سے اٹھنا اور گرمی کے موسم میں رات کے چھوٹا ہونے کے باعث اٹھنا شاق اور مشکل ہوتا ہے۔

اور جنہوں نے کہا کہ یہی صلوٰۃ وسطیٰ ہے ان میں سے حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم ہیں۔ اسے مؤطا نے بلاغاً ذکر کیا ہے۔ (یعنی امام مالک نے الموطا میں فرمایا کہ ان دونوں سے یہ خبر ان کے پاس پہنچی ہے) اور ترمذی نے اسے حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے تعلیقاً ذکر کیا ہے۔ (معلق ایسی روایت ہے جو غیر مسند ہو) اور حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور یہی امام مالک اور آپ کے اصحاب کا قول ہے اور اسی کی طرف امام شافعی کا میلان ہے اس میں جو آپ سے القشیری نے ذکر کیا ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے صحیح روایت یہ ہے کہ صلوٰۃ وسطیٰ نماز عصر ہے اور آپ

1۔ سنن ترمذی، باب ماجاء فی صلوٰۃ الوسطیٰ، حدیث نمبر 166، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سے یہ صحیح اور معروف سند سے مروی ہے۔(1)

اور جنہوں نے کہا ہے کہ صلوٰۃ وسطیٰ صبح کی نماز ہے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: وَ قُوۡمُوۡا لِلّٰہِ قٰنِتِیۡنَ یعنی فیھا (اور کھڑے رہا کرو اللہ کے لئے اس میں عاجزی کرتے ہوئے) (لیکن استدلال کرنے والوں نے ترجمہ کیا قنوت پڑھتے ہوئے۔) اور صبح کی نماز کے سوا کوئی فرض نماز نہیں ہے جس میں قنوت ہو۔ ابورجاء نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ہمیں بصرہ میں صبح کی نماز پڑھائی اور اس میں رکوع سے پہلے قنوت پڑھائی اور اپنے ہاتھوں کو بلند کیا اور جب فارغ ہوئے تو فرمایا: یہ وہ صلوٰۃ وسطیٰ ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم اس میں قنوت پڑھتے ہوئے کھڑے رہیں۔

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز میں رکوع کے بعد قنوت پڑھی (2)۔ قنوت کا حکم آگے آئے گا اور اس بارے میں علماء کی جو آراء ہیں سورہ آل عمران میں اس ارشاد کے تحت: لَیۡسَ لَکَ مِنَ الۡاَمۡرِ شَیۡءٌ (آل عمران:128)

(۶) الصَّلٰوۃِ الۡوُسۡطٰی سے مراد جمعہ کی نماز ہے کیونکہ اس کے لئے جمع ہونے اور اس میں خطبہ ہونے کے سبب اسے خاص کیا گیا ہے اور اسے عید بنایا گیا ہے۔ ابن حبیب اور مکی نے یہ ذکر کیا ہے۔ اور مسلم نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس قوم کے لئے جو جمعہ کی نماز سے پیچھے رہ جاتے ہیں لقد ہممت أن آمر رجلا یصلی بالناس ثم احرق علی رجال یتخلفون من الجمعۃ بیوتھم (3) میں نے یہ ارادہ کیا کہ میں کسی آدمی کو لوگوں کو نماز پڑھانے کے لئے حکم دوں پھر ان لوگوں کو ان کے گھروں میں جلادوں جو جمعہ کی نماز سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔

(۷) الصَّلٰوۃِ الۡوُسۡطٰی سے مراد صبح اور عصر کی دونوں نمازیں ہیں۔ شیخ ابوبکر الابہری نے یہی کہا ہے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے استدلال کیا ہے: یتعاقبون فیکم ملائکۃ باللیل و ملائکۃ بالنھار الحدیث (4) (تم میں رات اور دن کے فرشتے ایک دوسرے کے پیچھے ہوتے ہیں۔) اسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔

اور حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چودھویں رات کے چاند کی طرف دیکھا اور فرمایا: أما أنکم ستردون ربکم کما ترون ھذا القمر لا تضامون فی رؤیتہ فان استطعتم الا تغلبوا علی صلاۃ قبل طلوع الشمس و صلاۃ قبل غروبھا، یعنی العصر و الفجر۔ (بے شک عنقریب تم اپنے رب کو اسی طرح دیکھو گے جس طرح تم ان چاند کو دیکھ رہے ہو۔ تمہیں اس کی رؤیت میں کوئی مشقت نہ ہوگی۔ پس اگر تم

1۔ صحیح بخاری، باب الدعاء علی المشرکین، حدیث نمبر 5917، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، جلد 1، صفحہ 237، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب القنوت الخ، حدیث نمبر 946، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، جلد 1، صفحہ 232، وزارت تعلیم

4۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 79، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، فضل صلوٰۃ العصر، حدیث نمبر 522، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

استطاعت رکھو تو خبردار! اس نماز کے بارے میں تم مغلوب نہ ہو جو سورج کے طلوع ہونے سے پہلے ہے اور وہ نماز جو غروب آفتاب سے پہلے ہے) ان سے مراد عصر اور فجر کی نمازیں ہیں۔ پھر حضرت جریر نے یہ آیت پڑھی وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا (طٰہٰ: 130) (1) (اور پاکی بیان کیجئے اپنے رب کی حمد کے ساتھ طلوع آفتاب سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے۔)

اور حضرت عمارہ بن رؤیبہ نے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''ہرگز کوئی آگ میں داخل نہ ہوگا جس نے سورج کے طلوع ہونے سے پہلے اور سورج کے غروب ہونے سے پہلے نماز پڑھی (2)۔'' ان سے مراد بھی فجر اور عصر کی نمازیں ہیں۔

اور انہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من صلی البردین دخل الجنة (3) جس نے دو ٹھنڈی نمازیں پڑھیں وہ جنت میں داخل ہوگا۔ یہ تمام صحیح مسلم وغیرہ میں ثابت ہیں۔ ان دونوں نمازوں کو برذین کا نام دیا گیا ہے کیونکہ یہ دونوں نمازیں ٹھنڈک کے وقت میں پڑھی جاتی ہیں۔

(۸) الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى سے مراد عشاء اور صبح کی نمازیں ہیں۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے اپنے اس مرض کے دوران فرمایا جس میں ان کا وصال ہوا: تم سنو اور تم اپنے پیچھے آنے والوں کو بھی پہنچاؤ ان دو نمازوں پر مواظبت اختیار کرو۔ یعنی جماعت کے ساتھ ادا کرو۔ عشاء اور صبح کی نمازیں اور اگر تم جان لو جو ان دونوں میں (اجر) ہے تو تم ان دونوں کو ادا کرنے کے لئے آؤ اگرچہ تمہیں اپنی کہنیوں اور گھٹنوں کے بل گھسٹ کر آنا پڑے۔ حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما نے یہی کہا ہے۔

ائمہ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''اگر وہ جان لیں جو (اجر) عشاء اور صبح کی نمازوں میں ہے تو وہ ان دونوں کے لئے آئیں اگرچہ گھسٹ کر آنا پڑے اور فرمایا بے شک یہ دونوں نمازیں منافقین پر بہت سخت اور بھاری ہیں (4)۔'' اور صبح کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھنے والے کے لئے پوری رات قیام کرنے اور عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنے والے کے لئے نصف رات قیام کرنے کا (اجر) رکھا گیا ہے۔ اسے امام مالک نے موقوف علی عثمان ذکر کیا ہے اور مسلم نے اسے مرفوع ذکر کیا ہے اور ابوداؤد اور ترمذی نے آپ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: من شهد العشاء في جماعة كان له قيام نصف ليلة و من صلى العشاء و الفجر في جماعة كان له كقيام ليلة (5) جو آدمی عشاء کی جماعت میں حاضر ہوا اس کے لئے نصف رات کا قیام کرنے کا اجر ہے اور جس نے عشاء اور فجر کی نمازیں

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 288، وزارت تعلیم

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 288، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب فضل صلوٰۃ العصر، حدیث نمبر 521، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 288، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب فضل صلوٰۃ الفجر، حدیث نمبر 540، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 322، دار الکتب العلمیہ۔ صحیح بخاری، باب فضل العشاء الخ، حدیث نمبر 617، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ جامع ترمذی، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 30، وزارت تعلیم۔ سنن ابی داؤد، باب فضل صلوٰۃ الجماعۃ، حدیث نمبر 468، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
سنن ترمذی، باب ما جاء فی فضل العشاء و الفجر فی الجماعۃ، حدیث نمبر 205، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جماعت کے ساتھ ادا کیں تو اس کے لئے پوری رات قیام کرنے کی طرح اجر ہے۔ اور یہ اس کے خلاف ہے جسے امام مالک اور مسلم رحمۃ اللہ علیہم نے روایت کیا ہے۔

(۹) یہ پانچوں کی پانچویں نمازیں ہیں یہ حضرت معاذ بن جبل نے فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ سے فرض اور نفل کو شامل ہے پھر فرض کا خصوصاً ذکر کیا۔

(۱۰) الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى سے مراد غیر معین نماز ہے۔ حضرت نافع نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہی روایت کیا ہے اور ربیع بن خیثم نے بھی یہی کہا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے نمازوں میں صلوٰۃ وسطیٰ کو اسی طرح مخفی اور پوشیدہ رکھا ہے جیسے کہ رمضان المبارک میں لیلۃ القدر کو مخفی رکھا ہے اور جس طرح کہ جمعہ کے دن (مقبول) ساعت کو اور رات کی ان ساعتوں کو مخفی رکھا جن میں دعا مقبول ہوتی ہے، تاکہ وہ رات کے وقت اندھیروں میں عالم الخفیات کی مناجات کے لئے قیام کریں۔

اور جس سے اس کی صحت پر استدلال ہوتا ہے کہ یہ مبہم ہے غیر معین ہے وہ وہ روایت ہے جسے مسلم نے اپنی صحیح میں باب کے آخر میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: یہ آیت نازل ہوئی: حافظوا علی الصلوات وصلوۃ العصر تم نمازوں پر اور نماز عصر پر مواظبت اختیار کرو۔ پس ہم نے اسے پڑھا جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے منسوخ کر دیا اور یہ نازل ہوئی: حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى تو کسی آدمی نے کہا: کیا یہ صلوٰۃ عصر ہی ہے؟ براء نے کہا ہے: میں نے تجھے خبر دی ہے کیسے یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اسے کیسے منسوخ فرمایا؟ (1) واللہ اعلم۔ پس اس سے لازم ہوا کہ اسے معین کرنے کے بعد اس کی تعیین کو منسوخ کر دیا گیا اور اسے مبہم رکھا گیا پس تعیین اٹھ گئی۔ واللہ اعلم۔

اور یہ مسلم کی پسند ہے، کیونکہ اسے باب کے آخر میں لایا گیا ہے اور علماء متاخرین میں سے کئی ایک نے اسی طرح کہا ہے اور یہی صحیح ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ دلائل کے مابین تعارض ہونے اور ترجیح نہ ہونے کی وجہ سے (علماء متاخرین نے یہی کہا ہے۔) پس تمام نمازوں پر محافظت اور ان کے اوقات میں ان کی ادائیگی کے سوا کوئی شے باقی نہیں رہی۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 3۔ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى میں یہ اختلاف ان کے بطلان پر دلالت کرتا ہے جنہوں نے وصلوٰۃ العصر ثابت کیا ہے جو کہ ابو یونس مولیٰ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں مذکور ہے جبکہ آپ نے اسے حکم دیا کہ وہ آپ کے لئے مصحف قرآنی لکھے۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: بلاشبہ یہ الفاظ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے تفسیر کی مانند ہیں۔ اور اس پر عمرو بن رافع رضی اللہ عنہ کی حدیث دلالت کرتی ہے۔ انہوں نے بیان کیا: مجھے ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے حکم ارشاد فرمایا کہ میں ان کے لئے مصحف لکھوں۔ الحدیث۔ اور اس میں ہے: پس آپ نے مجھے اسی طرح املاء کرائی حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ---وھی العصر---وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ (2) اور فرمایا: اسی طرح میں نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھتے ہوئے سنا۔ پس آپ کا قول وھی العصر اس پر دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام اللہ میں سے الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى کی اپنے قول وھی العصر

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 227، وزارت تعلیم

2۔ موطا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ الجماعۃ، جلد 1، صفحہ 121-122، وزارت تعلیم

کے ساتھ تفسیر بیان کی ہے۔ اور نافع نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے صلاۃ العصر کے الفاظ روایت کیے ہیں (1) جیسا کہ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما سے صلاۃ العصر کے الفاظ بھی یعنی بغیر واؤ کے روایت کیے گئے ہیں (2)۔

اور ابوبکر الانباری نے کہا ہے: اس زائد لفظ میں یہ اختلاف اس کے بطلان پر اور جو کچھ تمام مسلمانوں کے مصحف الامام میں ہے اس کے صحیح ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

اور اس پر ایک دوسری دلیل بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ جنہوں نے کہا: والصلاۃ الوسطی وصلاۃ العصر انہوں نے ہی صلاۃ وسطی غیر عصر کو قرار دیا ہے۔ اور اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کا رد ہے جسے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا: غزوۂ احزاب کے دن مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عصر کی نماز سے مشغول رکھا یہاں تک کہ سورج کا رنگ زرد ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شغلونا عن الصلاۃ الوسطی ملأ اللہ اجوافهم وقبورهم نارا (3) الحدیث۔ انہوں نے ہمیں صلوٰۃ وسطیٰ سے مشغول رکھا ہے، اللہ تعالیٰ ان کے پیٹوں اور ان کی قبروں کو آگ سے بھر دے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى میں اس پر دلیل موجود ہے کہ وتر واجب (فرض) نہیں ہیں، کیونکہ مسلمانوں کا فرض نمازوں کی تعداد پر اتفاق ہے کہ وہ سات سے کم ہیں اور تین سے زیادہ ہیں اور تین سے سات کے درمیان سوائے پانچ کے اور کوئی طاق عدد نہیں ہے۔ اور جفت اعداد کا کوئی وسط نہیں تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ فرض نمازیں پانچ ہیں اور حدیث معراج میں یہی پانچ ہی وہ پچاس ہیں کیونکہ میرے نزدیک قول تبدیل نہیں ہوتا۔ ھی خمس و ھن خمسون لا یبدل القول لدی۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ اس کا معنی ہے تم اپنی نمازوں میں عجز و انکساری کرتے ہوئے کھڑے رہو۔ اور لوگوں کا قٰنِتِيْنَ کے معنی میں اختلاف ہے۔ حضرت شعبی نے کہا ہے: اس کا معنی ہے طائعین اطاعت کرنے والے اور حضرت جابر بن زید، عطا اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم نے یہی کہا ہے۔

اور ضحاک نے کہا ہے: قرآن کریم میں ہر مقام پر قنوت کا لفظ طاعت کے معنی میں ہے۔ اور ابو سعید نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی بیان کیا ہے اور بے شک ہر دین والے آج وہ نافرمانی کرتے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس امت کو کہا گیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے لئے اطاعت و پیروی کرتے ہوئے کھڑے رہو (4)۔

اور مجاہد نے کہا ہے: قٰنِتِيْنَ کا معنی ہے خاشعین خشوع کرنے والے۔ قنوت کا معنی ہے رکوع کو طویل کرنا، خشوع کرنا، آنکھوں کو جھکانا اور عجز و انکساری کرنا۔

اور ربیع نے کہا ہے: القنوت کا معنی ہے قیام کو طویل کرنا (5)۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے یہی کہا ہے اور اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ الجماعۃ، جلد 1، صفحہ 122، وزارت تعلیم
2۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 1، صفحہ 442، دار الکتاب العربیۃ بیروت
3۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، جلد 1، صفحہ 227، و۔ ت
4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 323، دار الکتب العلمیہ
5۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 324

اٰنَآءَ الَّیْلِ سَاجِدًا وَّ قَآىِٕمًا پڑھا ہے۔ (الزمر:9) (بھلا جو شخص عبادت میں بسر کرتا ہے رات کی گھڑیاں کبھی سجدہ کرتے ہوئے اور کبھی کھڑے ہوئے) اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے: افضل الصلاۃ طول القنوت (1) افضل نماز طویل قیام والی ہے۔ مسلم وغیرہ نے اسے بیان کیا ہے۔ اور شاعر نے کہا ہے:

قانتا للہ یدعو ربہ　　　و علی عمد من الناس اعتزل

اس میں بھی قانتاً طویل قیام کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اور یہ پہلے گزر چکا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: قانتین داعین۔ دعا مانگنے والے، پکارنے والے (2)۔ اور حدیث میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مہینہ تک قنوت پڑھی اور آپ رعل و ذکوان کے خلاف دعا مانگتے رہے (3)۔ ایک قوم نے کہا ہے: اس کا معنی ہے دعا۔ اس نے دعا مانگی۔ اور ایک قوم نے کہا: ہے اس کا معنی ہے طول قیامہ۔ اس نے اپنا قیام طویل کیا۔ اور سدی نے کہا ہے: قانتین کا معنی ہے ساکتین۔ خاموش رہنے والے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ آیت نماز میں کلام کرنے سے روکنے کے لئے نازل ہوئی۔ اور ابتدائے اسلام میں یہ مباح تھی اور یہی صحیح ہے اس روایت کی وجہ سے جسے مسلم وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے بیان کیا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام پیش کرتے تھے، درآنحالیکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں ہوتے اور آپ ہم پر جواب لوٹاتے تھے اور جب ہم نجاشی کے پاس سے لوٹ کر آئے، ہم نے آپ پر سلام پیش کیا تو آپ نے ہمیں جواب نہ لوٹایا، تو ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہم آپ پر نماز میں سلام عرض کرتے تھے اور آپ ہم پر جواب لوٹاتے تھے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان فی الصلوٰۃ شغلا (4) بے شک نماز میں مشغولیت ہے۔

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے روایت کیا اور کہا: ہم نماز میں کلام کرتے تھے ایک آدمی اپنے ساتھی سے گفتگو کر لیتا تھا درآنحالیکہ وہ اس کے پہلو میں حالت نماز میں ہوتا، یہاں تک کہ پھر یہ آیت نازل ہوئی: قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ۔ پھر ہمیں خاموش رہنے کا حکم دیا گیا اور گفتگو سے ہمیں روک دیا گیا (5)۔

اور کہا گیا ہے: لغوی اعتبار سے قنوت کا اصل معنی کسی شے پر دوام اختیار کرنا ہے اور اس حیثیت سے کہ لغت میں قنوت کا اصل معنی دوام علی الشیء ہے۔ یہ جائز ہے کہ طاعت و پیروی پر دوام اختیار کرنے والے کو قانت کا نام دیا جائے اور اسی طرح جس نے قیام، قراءت اور دعا نماز میں طویل کر دیے یا خشوع اور سکوت کو طویل کیا۔ یہ سب کے سب قنوت کرنے والے ہیں۔

مسئلہ نمبر 6۔ سب کے سب مسلمانوں نے اس پر اجماع کیا ہے کہ نماز میں جان بوجھ کر کلام کرنا جبکہ نمازی جانتا ہو

1۔ جامع ترمذی، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 51، وزارت تعلیم　2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 324، دار الکتب العلمیہ

3۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 237، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب القنوت قبل الرکوع و بعدہ، حدیث نمبر 948، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 204، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب ماینھی عنہ من الکلام، حدیث نمبر 1124، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ ایضاً۔ صحیح بخاری، باب ماینھی عنہ من الکلام فی الصلوٰۃ، حدیث نمبر 1125، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کہ وہ نماز میں ہے اور وہ کلام اس کی نماز کی اصلاح کے بارے میں نہ ہو تو وہ نماز کو فاسد کر دیتی ہے، سوائے اس روایت کے جو اوزاعی سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: جس نے نفس کے احیاء کے لئے کلام کی یا اسی جیسے بڑے امور کے بارے میں تو اس کے ساتھ اس کی نماز فاسد نہ ہوگی۔ یہ قول نظر وفکر کے اعتبار سے ضعیف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ۔ اور حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ہم نماز میں کلام کرتے تھے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی: وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ۔(1) الحدیث اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ نیا حکم بیان کیا ہے کہ تم نماز میں کلام نہ کرو'' (2) اور ایسا کوئی بڑا واقعہ نہیں ہے جس کے لئے نماز کو توڑنا وہ پسند کرتا ہو اور اس وجہ سے وہ استیناف سے منع کرتا ہو۔ پس جس کسی نے ایسے کام کے لئے اپنی نماز کو توڑ دیا جیسے وہ احیاء نفس یا مال یا ایسا کام جو انہی کے طریقہ پر ہو کے لئے فضیلت دیکھتا ہو تو وہ اپنی نماز نئے سرے سے پڑھے اور بناء کرے۔ اس مسئلہ میں یہی صحیح ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 7۔ نماز کے دوران بھول کر کلام کرنے کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے۔ پس امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما اور ان کے اصحاب ان تمام نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ نماز میں سہواً گفتگو کرنا اسے فاسد نہیں کرتا۔ لیکن امام مالک نے یہ بھی کہا ہے: نماز میں عمداً گفتگو کرنا بھی نماز کو فاسد نہیں کرتا بشرطیکہ وہ اس کی کیفیت اور اس کی اصلاح کے بارے ہو۔ یہی ربیعہ اور ابن القاسم کا قول ہے۔

اور سحنون نے ابن القاسم سے اور انہوں نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: اگر کسی قوم کو امام نے دو رکعتیں نماز پڑھائی اور بھول کر سلام پھیر دیا اور انہوں نے اس کے لئے تسبیح (سبحان اللہ کہا) کہی اور وہ اسے نہ سمجھا، تو ان لوگوں میں سے جو اس کے پیچھے نماز میں تھے ایک آدمی نے کہا: بلاشبہ تم نے نماز مکمل نہیں کی سو اپنی نماز مکمل کرو۔ پس وہ قوم کی طرف متوجہ ہوا اور کہا: کیا یہ حق ہے جو کچھ یہ کہہ رہا ہے؟ تو انہوں نے کہا: ہاں۔ تو فرمایا: امام انہیں وہ نماز پڑھا دے گا جو ان کی نماز میں سے باقی ہے اور وہ اس کے ساتھ اپنی بقیہ نماز پڑھیں گے ان میں سے وہ بھی جس نے کلام کیا اور وہ بھی جس نے کلام نہیں کیا اور ان پر کوئی شے نہ ہوگی اور وہ اس میں وہی کچھ کرنے والے ہوں گے جو کچھ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذوالیدین کے دن کیا۔ یہ المدونہ میں ابن القاسم کا قول ہے اور ان کی روایت امام مالک سے ہے اور یہ امام مالک کے تمام اصحاب ذوالیدین کے مسئلہ میں امام مالک کے قول کے خلاف ہیں سوائے اکیلے ابن قاسم کے، کیونکہ اس بارے میں وہی امام مالک کا قول بیان کرتے ہیں اور ان کے سوا دوسرے اس کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں: بلاشبہ یہ ابتدائے اسلام میں ہوا۔ اور آپ لوگ اپنی نماز کے بارے میں پہنچانتے ہیں۔ پس جس کسی نے اس دوران گفتگو کی تو وہ اس کا اعادہ کرے۔ اور یہی قول

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 204، وزارت تعلیم

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 133، وزارت تعلیم

ایضاً صحیح بخاری، باب قول اللہ تعالیٰ کل یوم ھو فی شان، قبل حد الحدیث 6968، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عراقیین کا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب، اور ثوری رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے کہ نماز میں گفتگو کرنا کسی بھی حال میں اسے فاسد کر دیتا ہے چاہے وہ سہواً ہو یا عمداً ہو، نماز کے بارے میں ہو یا کسی غیر کے بارے میں۔ اور یہی ابراہیم نخعی، عطا، حسن، حماد بن ابی سلیمان اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے۔

اور امام اعظم ابوحنیفہ کے اصحاب کا خیال ہے کہ ذوالیدین کے قصہ کے بارے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث حضرت ابن مسعود اور حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہما کی حدیث سے منسوخ ہے۔ انہوں نے کہا ہے: اگرچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ متاخر الاسلام ہیں لیکن انہوں نے ذوالیدین کی حدیث کو مرسل ذکر کیا ہے جیسا کہ انہوں نے اس حدیث کو مرسل ذکر کیا ہے: من ادرکه الفجر جنبا فلا صوم له (1) جسے جنبی حالت میں فجر نے پالیا تو اس کے لئے روزہ نہیں ہے۔ انہوں نے کہا ہے: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کثرت سے مرسل حدیثیں روایت کرتے ہیں۔

اور علی بن زیاد نے ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ ہمیں ابوقرہ نے بتایا کہ میں نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: جب آدمی نماز میں کلام کرے تو مستحب یہ ہے کہ وہ اس کا اعادہ کرے اور بنا نہ کرے۔ مزید کہا: اور ہمیں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گفتگو فرمائی اور اس دن آپ کے اصحاب نے بھی آپ کے ساتھ گفتگو کی، کیونکہ ان کا گمان تھا کہ نماز کم ہوگئی ہے اور آج کسی کے لئے ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔

اور سحنون نے ابن القاسم سے ایک آدمی کے بارے میں روایت کیا ہے کہ اس نے اکیلے نماز پڑھی اور اپنی طرف سے وہ چار رکعتوں سے فارغ ہوگیا، تو اس کے پہلو میں موجود ایک آدمی نے اسے کہا: بلاشبہ تو نے تو صرف تین رکعتیں پڑھی ہیں، تو وہ دوسرے کی طرف متوجہ ہوا اور پوچھا: کیا یہ درست ہے جو کچھ یہ کہہ رہا ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ فرمایا: اس کی نماز فاسد ہوگئی اور اس کو نہیں چاہئے تھا کہ وہ اس سے کلام کرتا اور نہ یہ چاہئے تھا کہ اس (دوسرے) کی طرف متوجہ ہوتا۔

ابوعمر نے کہا ہے: وہ اس مسئلہ میں جماعت کے ساتھ امام اور منفرد کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ پس وہ امام اور اس کے مقتدیوں کے لئے نماز کی حالت کے بارے کلام کرنے کو جائز قرار دیتے ہیں اور منفرد کو اس کی اجازت نہیں دیتے۔ اور ان کے سوا دوسرے اس مسئلہ میں ابن القاسم کے جواب کو منفرد اور امام اور اس کے ساتھیوں پر محمول کرتے ہیں آپ کے اس قول میں اختلاف کی بنا پر جو ذوالیدین کی حدیث کے استعمال میں ہے۔ جیسا کہ اس میں امام مالک کا قول مختلف ہے۔

اور امام شافعی اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے: جس نے عمداً کلام کیا اور وہ یہ جانتا ہو کہ اس نے نماز مکمل نہیں کی اور یہ کہ وہ نماز میں ہے تو اس نے اپنی نماز کو فاسد کر دیا اور اگر اس نے سہواً گفتگو کی یا اس نے گفتگو کی اور وہ یہ گمان کرتا ہو کہ وہ نماز میں نہیں ہے کیونکہ اس نے اپنی طرف سے اسے مکمل کر لیا ہے تو وہ بنا کر سکتا ہے۔

اس مسئلہ میں امام احمد نے اختلاف کیا ہے اور ان سے الاثرم نے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا: آدمی نے اپنی نماز کے دوران اس کی اصلاح کے لئے جو گفتگو کی تو اس سے اس کی نماز فاسد نہیں ہوئی۔ اور اگر اس کے سوا کوئی اور گفتگو کی تو اس کی

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصیام، جلد 1، صفحہ 353، وزارت تعلیم

نماز فاسد ہوگئی۔ یہی امام مالک کا مشہور قول ہے اور الحزمی نے ان سے ذکر کیا ہے کہ ان کا مذہب اس کے بارے میں جس نے عمداً کلام کیا یا بھول کر، یہ ہے کہ اس کی نماز باطل ہوگئی، سوائے صرف امام کے کیونکہ جب اس نے اپنی نماز کی اصلاح کے لئے گفتگو کی تو اس کی نماز باطل نہیں ہوئی۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب میں سے سحنون نے یہ استثنا بیان کی ہے کہ جس نے چار رکعت نماز میں دو رکعتوں پر سلام پھیر دیا اور وہاں کلام ہوئی تو نماز باطل نہ ہوگی اور اگر اس کے سوا کسی اور محل میں کلام واقع ہو تو نماز باطل ہو جائے گی۔ اور صحیح وہ ہے جو امام مالک کا مشہور قول ہے اور حدیث سے استدلال ہے اور احکام کے متعدی ہونے اور شریعت کے عموم کے بارے میں اسے اصل کلی پر محمول کرتے ہوئے اور خصوصیت کے وہم کو دور کرتے ہوئے جبکہ اس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

اور اگر کوئی کہنے والا کہے: تحقیق کلام بھی نماز میں واقع ہوئی اور سہو بھی، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''تسبیح کہنا مردوں کے لئے ہے اور تالی بجانا عورتوں کے لئے ہے'' (1) تو انہوں نے تسبیح کیوں کر نہ کہی؟ تو کہا جائے گا: شاید اس وقت میں انہیں اس کا حکم نہیں تھا اور اگر تھا جیسا کہ آپ نے ذکر کیا ہے اور انہوں نے تسبیح نہ کہی، کیونکہ انہیں یہ وہم ہوا کہ نماز کم ہوگئی ہے۔ اس کا ذکر حدیث میں آیا ہے۔ فرمایا: لوگوں میں سے ایک تیز رفتار آدمی نکل گیا تو لوگوں نے کہا: کیا نماز کم ہوگئی ہے؟ پس اس وجہ سے کلام کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ واللہ اعلم۔

اور بعض مخالفین نے کہا ہے: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول صلی بنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ احتمال رکھتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو نماز پڑھائی اور وہ (ابوہریرہ) ان میں سے نہ ہوں، جیسا کہ نزال بن سبرہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں فرمایا: ''بے شک ہم اور تم بنی عبد مناف پکارے جاتے تھے اور تم آج بنو عبد اللہ ہو اور ہم بھی بنو عبد اللہ ہیں''۔ (2) اس سے مراد یہ لیا ہے کہ آپ نے یہ اپنی قوم کو فرمایا اور یہ بعید ہے، کیونکہ یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کہیں صلی بنا آپ نے ہمیں نماز پڑھائی حالانکہ اس وقت وہ کافر تھے۔ اہل صلوٰۃ میں سے نہ تھے اور یہ کذب ہوگا، اور نزال کی حدیث وہ بھی من جملہ قوم میں سے تھے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا جو سنا۔

اور رہا وہ دعویٰ جو حنیفہ نے نسخ اور ارسال کے بارے کیا ہے تو ہمارے علماء وغیرہم نے ان کے قول کا جواب دیا ہے اور اسے باطل قرار دیا ہے۔ خاص کر حافظ ابو عمر ابن عبد البر نے اپنی کتاب ''التمہید'' میں یہ ذکر کیا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فتح خیبر کے سال اسلام لائے اور اسی سال مدینہ طیبہ میں آئے۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں چار سال تک رہے اور ذوالیدین کے قصے کو دیکھا اور اس میں حاضر تھے۔ اور یہ بدر سے پہلے کا نہیں ہے جیسا کہ انہوں نے گمان کیا ہے اور ذوالیدین بدر میں شہید ہوئے۔ فرمایا: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا ذوالیدین کے دن حاضر ہونا ثقہ حفاظ کی روایت کے مطابق محفوظ ہے اور جنہوں نے اسے جانا، اسے یاد کیا اور اس کا ذکر کیا ان کے خلاف حجت لانے سے جو باز رہے اس میں ان کی کوئی کوتاہی نہیں ہے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 180، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب التصفیق للنساء، حدیث 1128، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
ایضاً صحیح بخاری، باب تشبیک الاصابع الخ، حدیث 460، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ شرح مشکل الآثار، جلد 8، صفحہ 282، موسسۃ الرسالۃ بیروت۔

مسئلہ نمبر 8۔ القنوت: اس کا معنی قیام ہے اور یہ اس کی ان اقسام میں سے ایک ہے جو ابوبکر بن انباری نے ذکر کی ہیں۔ اور امت نے اس پر اجماع کیا ہے کہ فرض نماز میں قیام کرنا ہر تندرست اور اس پر قدرت رکھنے والے آدمی پر واجب ہے چاہے وہ منفرد ہو یا امام ہو۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ امام بنایا جاتا ہے تاکہ اس کی اقتدا کی جائے۔ پس جب کھڑے ہو کر نماز پڑھے تو تم بھی کھڑے ہو کر نماز پڑھو'' (1) الحدیث۔ اسے ائمہ حدیث نے روایت کیا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کا بیان ہے: وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ اور انہوں نے صحت مند مقتدی کے بارے میں اختلاف کیا ہے جو ایسے مریض امام کے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھتا ہے جو کھڑے ہونے کی استطاعت نہیں رکھتا تو اہل علم کے ایک گروہ نے اس کی اجازت دی ہے بلکہ جمہور اہل علم نے، کیونکہ امام کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''اور جب وہ (امام) بیٹھ کر نماز پڑھائے تو تم تمام بھی بیٹھ کر نماز پڑھو'' (2)۔ یہی اس مسئلہ میں صحیح ہے۔ ابھی ہم بیان کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور علماء کے ایک گروہ نے مریض امام کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کو جائز قرار دیا ہے کیونکہ ہر کوئی اپنی طاقت کے مطابق اپنا فرض ادا کر رہا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتے ہوئے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس مرض میں بیٹھ کر نماز پڑھائی جس میں آپ کا وصال ہوا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں کھڑے ہو کر آپ کی نماز کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے اور لوگ آپ کے پیچھے کھڑے تھے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دوسرے لوگوں کی طرف بیٹھنے کا اشارہ نہیں کیا اور اپنی نماز انہیں کے ساتھ بیٹھ کر مکمل کی اور وہ کھڑے تھے۔ اور یہ معلوم ہے کہ یہ واقعہ آپ کے اپنے گھوڑے سے گرنے کے بعد کا ہے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ آپ کا دوسرا فعل پہلے فعل کے لئے ناسخ ہے۔

ابو عمر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جنہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے اور اس سے استدلال کیا ہے ان میں سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور داؤد بن علی ہیں اور یہی ولید بن مسلم کی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا: میرے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ امام کے پہلو میں ان میں سے کوئی کھڑا ہو جائے جو لوگوں کو امام کی نماز کے بارے بتلاتا رہے (یعنی امام کی حرکات وسکنات سے آگاہ رکھے۔) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت غریب ہے۔

اور اس کے بارے اہل مدینہ کی ایک جماعت اور دوسروں نے کہا ہے اور یہی صحیح ہے ان شاء اللہ تعالیٰ، کیونکہ یہ آخری نماز ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھائی۔

اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مشہور روایت یہ ہے کہ کوئی بیٹھنے والا کھڑے ہونے والوں کی امامت نہیں کرائے گا۔ پس اگر بیٹھ کر اس نے ان کی امامت کرائی تو امام اور مقتدی تمام کی نماز باطل ہوگی، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''میرے بعد بیٹھ کر کوئی بھی امامت نہ کرائے گا (3)''۔

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1 صفحہ 89، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب انما جعل الامام لیؤتم، حدیث نمبر 647-648، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1 صفحہ 177، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب انما جعل الامام لیؤتم، حدیث نمبر 648-646، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن دارقطنی، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1 صفحہ 398، دار المحاسن قاہرہ

فرمایا: اگر امام بیمار ہو تو امام کی نماز مکمل ہوگی اور اس کے پیچھے پڑھنے والے کی نماز فاسد ہوگی۔ مزید کہا: جس نے بغیر علت کے بیٹھ کر نماز پڑھی تو وہ نماز کا اعادہ کرے۔ یہ امام مالک سے ابو مصعب نے اپنی مختصر میں روایت بیان کی ہے۔ پس جس نے بیٹھ کر نماز پڑھی اس پر وقت میں اور وقت کے بعد اعادہ واجب ہوگا۔ اور امام مالک سے اس بارے میں روایت بیان کی گئی ہے کہ وہ صرف وقت میں اعادہ کریں گے۔ اور اس بارے میں امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ کا قول امام مالک کے مشہور قول کی مثل ہی ہے۔ انہوں نے اپنے قول کے لئے اور اپنے مذہب کے لئے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جسے ابو مصعب نے بیان کیا ہے، اسے دارقطنی نے جابر سے اور انہوں نے شعبی سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا یؤمن احد بعدی جالسا دارقطنی نے کہا ہے: اسے جابر جعفی کے سوا کسی نے حضرت شعبی سے روایت نہیں کیا ہے اور وہ متروک الحدیث ہے۔ یہ روایت مرسل ہے، اس کے ساتھ حجت قائم نہیں ہوسکتی۔ ابو عمر نے کہا ہے: جابر جعفی کسی بھی شے سے حجت نہیں ہوسکتا اگرچہ وہ اسے مسند روایت کرتا ہو تو پھر اس سے کیسے استدلال ہوسکتا ہے جسے وہ مرسل روایت کرتا ہے؟

امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب مریض امام بیٹھ کر ایسی قوم کو نماز پڑھائے جن میں کچھ صحت مند اور کچھ مریض ہوں تو امام کی نماز اور اس کے پیچھے پڑھنے والوں میں سے ان کی نماز جو کھڑے ہونے کی طاقت نہیں رکھتے صحیح اور جائز ہے اور ان کی نماز جن کے لئے قیام کا حکم ہے باطل ہے۔

امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ نے کہا ہے: امام اور تمام مقتدیوں کی نماز جائز ہے اور انہوں نے کہا: اگر امام نے اشارے کے ساتھ ایسے لوگوں کو نماز پڑھائی جو رکوع و سجود کر سکتے ہیں تو تمام کے قول کے مطابق مقتدیوں کی نماز جائز نہیں اور امام کی نماز جائز ہے اور امام زفر کہتے ہیں: ان کی نماز بھی جائز ہوگی کیونکہ انہوں نے اپنے فرض ادا کیے ہیں اور ان کے امام نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ اسی طرح امام شافعی نے بھی کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو کچھ ابو عمر اور ان کے علاوہ ان سے پہلے اور بعد کے علماء نے کہا ہے کہ یہ آخری نماز ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھائی، حالانکہ میں نے ان کے سوا اس کے خلاف بھی دیکھا ہے جنہوں نے اس باب میں طرق احادیث کو جمع کیا ہے اور ان پر گفتگو کی ہے اور اس بارے میں فقہاء کا اختلاف بھی ذکر کیا ہے۔ جو کچھ انہوں نے ذکر کیا ہے ہم اسے اختصار کے ساتھ ذکر کریں گے تاکہ تیرے لئے راہ صواب واضح ہو جائے اگر اللہ تعالیٰ چاہے اور اس کے قول کی صحت واضح ہو جائے جس نے یہ کہا کہ تندرست مقتدی کا مریض امام کے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز ہے۔

پس ابو حاتم محمد بن حبان البستی نے المسند الصحیح میں اس کا ذکر کیا ہے، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کی ایک جماعت میں تھے تو آپ نے فرمایا: کیا تم جانتے نہیں ہو کہ میں تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں؟ صحابہ نے عرض کی: کیوں نہیں بلکہ ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم جانتے نہیں ہو کہ جس نے میری اطاعت کی تحقیق اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں میری طاعت ہے؟'' انہوں نے عرض کی: کیوں نہیں بلکہ ہم تو شہادت دیتے ہیں کہ جس کسی نے آپ کی اطاعت کی تحقیق اس نے

اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے آپ کی اطاعت ہے۔ پھر فرمایا: "بے شک اللہ تعالیٰ کی اطاعت یہ ہے کہ تم میری اطاعت کرو اور میری اطاعت یہ ہے کہ تم اپنے امراء کی اطاعت کرو۔ پس اگر وہ بیٹھ کر نماز پڑھائیں تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو(1)۔" اس کی سند میں عقبہ بن ابی الصہباء راوی ہے اور وہ ثقہ ہے، یحییٰ بن معین نے یہی کہا ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: اس حدیث میں یہ واضح بیان ہے کہ مقتدیوں کا بیٹھ کر نماز پڑھنا جبکہ ان کا امام بھی بیٹھ کر نماز پڑھائے اللہ تعالیٰ کی اس اطاعت میں سے ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم ارشاد فرمایا ہے۔ یہ میرے نزدیک اس اجماع کی ایک قسم ہے جس کی اجازت پر انہوں نے اجماع کیا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے چار ہیں جنہوں نے اس کے ساتھ فتویٰ دیا ہے۔ (یعنی) حضرت جابر بن عبد اللہ، حضرت ابو ہریرہ، حضرت اسید بن حضیر اور حضرت قیس بن فہد رضی اللہ عنہم اور ان صحابہ کرام میں سے کسی سے بھی ان چار کے خلاف مروی نہیں جو وحی اور قرآن کریم کے نزول کے وقت حاضر تھے اور جنہیں تحریف و تبدیل سے محفوظ رکھا گیا، نہ اسناد متصل کے ساتھ اور نہ منقطع کے ساتھ۔ تو گویا صحابہ کرام نے اس پر اجماع کیا کہ امام جب بیٹھ کر نماز پڑھائے تو مقتدیوں پر بھی لازم ہے کہ وہ بیٹھ کر نماز پڑھیں۔ اسی طرح جابر بن زید، اوزاعی، مالک بن انس، احمد بن حنبل، اسحاق ابن ابراہیم، ابو ایوب سلیمان بن داؤد الہاشمی، ابو خیثمہ، ابن ابی شیبہ، محمد بن اسماعیل اور اصحاب حدیث میں سے جو ان کے متبعین ہیں مثلاً محمد بن نصر اور محمد بن اسحاق بن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے اور اس حدیث کو حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت انس بن مالک، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت ابو ہریرہ، حضرت جابر بن عبد اللہ، حضرت عبد اللہ بن عمر بن خطاب اور حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے۔

اس امت میں سب سے اول جس نے بیٹھ کر نماز پڑھنے والے مقتدی کی نماز کو باطل قرار دیا جبکہ امام بھی بیٹھ کر نماز پڑھائے وہ مغیرہ بن مقسم صاحب النخعی ہیں اور ان سے حماد بن ابی سلیمان نے اسے لیا ہے اور پھر حماد سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسے اخذ کیا ہے اور پھر آپ کے بعد آنے والے آپ کے اصحاب نے آپ کی اتباع کی ہے اور اس بارے میں وہ اعلیٰ روایت جس سے انہوں نے استدلال کیا ہے اسے جابر جعفی نے شعبی سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لا یؤمن احد بعدی جالسا اس روایت کی اسناد اگر صحیح بھی ہو تو بھی یہ مرسل ہے اور مرسل خبر اور وہ جسے کوئی روایت نہ کرے ہمارے نزدیک حکم میں دونوں برابر ہیں، پھر امام ابو حنیفہ کہتے ہیں: جن سے میں نے ملاقات کی ان میں حضرت عطا سے افضل میں نے کوئی نہیں دیکھا اور جن سے میں ملا ان میں جابر جعفی سے زیادہ جھوٹا میں نے کوئی نہیں دیکھا اور میں کبھی اس کے پاس رائے سے کوئی شے نہیں لایا مگر وہ اس بارے میرے پاس حدیث لایا اور گمان ہوا کہ اس کے پاس اتنے اتنے ہزار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثیں ہیں جن کے بارے گفتگو نہیں۔ پس یہ امام اعظم ابو حنیفہ ہیں جو جابر جعفی پر جرح کر رہے ہیں اور اس کی تکذیب کر رہے ہیں اور یہ اس قول کی ضد ہے جس کی بنا پر آپ کے اصحاب نے آپ کا مذہب اختیار کیا ہے(2)۔

1۔ الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان، کتاب الصلوٰۃ، جلد 5، صفحہ 470، موسسۃ الرسالہ بیروت

2۔ الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان، کتاب الصلوٰۃ، جلد 5، صفحہ 417 تا 474، موسسۃ الرسالہ بیروت

ابو حاتم نے کہا ہے: رہی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ نماز جو آپ نے حالت مرض میں ادا فرمائی تو اس کے بارے مجمل اور مختصر اخبار مروی ہیں اور ان میں سے بعض مفصل اور واضح بھی ہیں، تو ان میں سے بعض میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پہلو میں آکر بیٹھ گئے۔ پس حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کر رہے تھے اور لوگ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اقتدا کر رہے تھے (1) اور بعض میں ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بائیں جانب تشریف فرما ہو گئے۔ یہ روایت مفصل ہے۔ اس میں ہے: فکان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یصلی بالناس قاعدًا و ابوبکر قائمًا پس حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ کر لوگوں کو نماز پڑھاتے رہے اور ابو بکر کھڑے ہو کر۔

ابو حاتم نے کہا ہے: جہاں تک اس خبر کے اجمال کا تعلق ہے تو بلا شبہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اس مقام پر اس نماز کو بیان کیا ہے اور آخر القصہ یہ ہے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما کے نزدیک کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نماز میں بھی انہیں بیٹھنے کا حکم ارشاد فرمایا تھا جیسا کہ آپ نے انہیں اپنے گھوڑے سے گرنے کے وقت اس کا حکم دیا تھا (2)، محمد بن الحسن بن قتیبہ نے ہمیں خبر دی ہے، انہوں نے کہا: ہمیں یزید بن موہب نے خبر دی ہے، انہوں نے کہا: مجھے لیث بن سعد نے ابو الزبیر سے اور انہوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئے تو ہم نے آپ کے پیچھے نماز پڑھی اور آپ بیٹھے ہوئے تھے اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ لوگوں تک آپ کی تکبیر کی آواز پہنچا رہے تھے۔ راوی فرماتے ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف متوجہ ہوئے اور ہمیں کھڑا دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری طرف اشارہ کیا تو ہم بیٹھ گئے اور ہم نے بیٹھ کر آپ کی نماز کے ساتھ نماز پڑھی اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیرا تو فرمایا: ''قریب ہے کہ تم اہل فارس اور روم کے عمل جیسا عمل کرو وہ اپنے بادشاہوں کے پاس کھڑے ہوتے ہیں اور وہ بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں پس تم اس طرح نہ کرو تم اپنے ائمہ کی اقتدا کرو اگر امام کھڑے ہو کر نماز پڑھائے تو تم بھی کھڑے ہو کر نماز پڑھو اور اگر وہ بیٹھ کر نماز پڑھائے تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو۔''

ابو حاتم نے کہا ہے: پس اس مفصل خبر میں واضح بیان ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بائیں جانب بیٹھے اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ مقتدی ہو گئے اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی اقتدا کرنے لگے اور آپ تکبیر کہتے اور وہ لوگوں تک تکبیر کی آواز پہنچاتے تاکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی اقتدا کریں اور اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بیٹھنے کا حکم دیا جب آپ نے انہیں کھڑے ہوئے دیکھا اور جب آپ اپنی نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے انہیں بیٹھنے کا بھی حکم فرمایا جب ان کا امام بیٹھ کر نماز پڑھائے۔ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نماز میں حاضر تھے جس وقت آپ اپنے گھوڑے سے گرے اور آپ کی دائیں جانب کچھ زخمی ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ماہ ذی الحجہ ۵ھ کے آخر میں گرے تھے اور وہ اس نماز میں بھی حاضر تھے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض کی حالت میں اس تاریخ کے علاوہ ادا فرمائی اور آپ نے ہر خبر کو اس کے الفاظ

1۔ الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان، کتاب الصلوۃ، جلد 5، صفحہ 489، موسسۃ الرسالہ بیروت
ایضاً صحیح بخاری، باب الرجل یاتم بالامام الخ، حدیث نمبر 672، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 490-491

کے ساتھ بیان فرمایا کیا آپ دیکھ نہیں رہے کہ وہ اس نماز میں ذکر کر رہے ہیں؟ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تکبیر کہتے ہوئے اپنی آواز بلند کی تا کہ لوگ آپ کی اقتدا کریں اور وہ نماز جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گھوڑے سے گرنے کے وقت اپنے گھر میں پڑھائی تھی اس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ چھوٹا ہونے کی وجہ سے آپ کو ضرورت محسوس نہ ہوئی کہ وہ تکبیر کے ساتھ اپنی آواز بلند کریں تا کہ وہ لوگوں کو آپ کی تکبیر سنوا سکیں۔ تو بلاشبہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس عظیم مسجد میں تکبیر کے ساتھ اپنی آواز بلند کی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حالت مرض میں نماز پڑھائی، پس جب صحیح ہے جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے تو پھر یہ جائز نہیں کہ ہم ان اخبار میں سے بعض کو بعض کے لئے ناسخ قرار دیں (1) اور اس نماز کی طرف حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دو آدمیوں کے درمیان سہارا لے کر تشریف لے گئے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس میں امام تھے اور آپ نے انہیں بیٹھ کر نماز پڑھائی اور انہیں بھی بیٹھنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ اور رہی وہ نماز جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی عمر مبارک کی آخری نماز پڑھی تو اس کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت بریرہ اور حضرت ثوبہ (یا ثوبیہ) رضی اللہ عنہما کے درمیان سہارا لے کر تشریف لے گئے اور اس میں آپ مقتدی تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ہی کپڑا پہن کر اس میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز ادا فرمائی (2)۔ اسے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے، فرمایا: وہ آخری نماز ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قوم کے ساتھ ایک کپڑا پہن کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے بیٹھ کر ادا فرمائی (3)، پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجد میں دو نمازیں جماعت کے ساتھ ادا فرمائیں نہ کہ ایک نماز۔ اور عبید اللہ ابن عبد اللہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا کی خبر میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دو مردوں کے درمیان سہارا لے کر تشریف لے گئے۔ ان دو میں سے ایک حضرت عباس اور دوسرے حضرت علی رضی اللہ عنہما ہیں۔ اور مسروق نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے جو خبر بیان کی ہے اس میں ہے: پھر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے آپ میں کچھ آرام اور سکون پایا تو آپ حضرت بریرہ اور حضرت ثوبہ کے درمیان سہارا لے کر تشریف لے گئے۔ بے شک میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نعلین کی طرف دیکھتی رہی وہ سنگریزوں میں لکیر ڈال رہے تھے اور میں آپ کے قدموں کے تلووں کی طرف دیکھتی رہی۔ الحدیث۔

پس یہ تیری اس پر راہنمائی کرتی ہے کہ وہ دو نمازیں تھیں نہ کہ ایک نماز (4)۔

ابو حاتم نے کہا ہے: ہمیں محمد بن اسحاق بن خزیمہ نے خبر دی ہے، انہوں نے کہا: ہمیں محمد بن بشار نے بیان کیا ہے، انہوں نے کہا ہمیں بدل بن محبر نے بیان کیا ہے، انہوں نے کہا ہمیں شعبہ نے موسیٰ بن ابی عائشہ عن عبید اللہ بن عبد اللہ کی سند سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بیان کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو نماز پڑھائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صف میں آپ کے پیچھے تھے (5)۔

1۔ الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان، کتاب الصلوٰۃ، جلد 5، صفحہ 491 تا 493، موسسۃ الرسالہ بیروت 2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 496

3۔ ایضاً۔ جامع ترمذی، باب ما جاء اذا صلی الامام قاعدا، حدیث نمبر 331، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

صحیح بخاری، باب من قام الی جنب الامام لعلۃ، حدیث 642۔ صحیح بخاری، باب الرجل یاتم بالامام، حدیث 672، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً صحیح بخاری، باب جعل الامام لیؤتم بہ، حدیث نمبر 648، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان، کتاب الصلوٰۃ، جلد 5، صفحہ 488، موسسۃ الرسالہ بیروت 5۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 483

ابو حاتم نے کہا ہے: شعبہ بن حجاج نے زائدہ بن قدامہ سے اس خبر کے متن میں موسیٰ بن ابی عائشہ سے اختلاف کیا ہے۔ پس شعبہ نے حضور نبی کریم ﷺ کو مقتدی بنایا ہے اس حیثیت سے کہ آپ ﷺ نے بیٹھ کر نماز پڑھی اور دوسرے لوگوں نے کھڑے ہو کر۔ اور زائدہ نے آپ ﷺ کو امام قرار دیا ہے اور اس حیثیت سے کہ آپ نے بیٹھ کر نماز پڑھائی اور قوم نے کھڑے ہو کر نماز پڑھی۔ اور یہ دونوں انتہائی ثقہ اور حافظ ہیں۔ تو یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ ایسی دو روایتیں جن کے ظاہر میں ایک فعل میں تضاد ہے ان میں سے ایک کو مطلق متقدم امر کے لئے ناسخ بنا دیا جائے پس جس نے دو حدیثوں میں سے ایک کو حضور نبی کریم ﷺ کے امر متقدم کے لئے ناسخ بنایا اور دوسرے کو بغیر دلیل کے چھوڑ دیا تو اس کی صحت پر ثبوت لانا اس کے ذمہ ہے اس نے اپنے خصم کے لئے جائز قرار دیا کہ وہ دو خبروں سے اسے لے لے جسے اس نے چھوڑا ہے اور اسے چھوڑ دے جسے اس نے لیا ہے۔ اور سنن میں سے اس نوع کی نظیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خبر ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کیا اور آپ حالت احرام میں تھے (1) اور حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے ان سے نکاح کیا اور وہ دونوں حلال تھے (یعنی حالت احرام میں نہ تھے۔) (2) پس یہ دونوں حدیثیں ایک فعل میں بظاہر متضاد ہیں بغیر اس کے کہ ہمارے نزدیک ان دونوں کے درمیان تضاد ہو، اصحاب حدیث کی ایک جماعت نے ان دونوں حدیثوں کو متعارض قرار دیا ہے جو حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے بارے مروی ہیں اور انہوں نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی خبر کو لے لیا ہے جو انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے۔ لا ینکح المحرم ولا ینکح (محرم نہ اپنا نکاح کر سکتا ہے اور نہ کسی کا نکاح کر سکتا ہے) تو انہوں نے اسے لے لیا۔ جبکہ یہ ان دو روایتوں میں سے ایک کے ساتھ موافقت رکھتی ہے جو حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے بارے روایت کی گئی ہے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خبر کو چھوڑ دیا ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے ان کے ساتھ حالت احرام میں نکاح کیا۔ پس جس نے یہ کہا اس کے لئے یہ کہنا لازم ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ کی حالت مرض میں نماز کے بارے دو حدیثیں متضاد ہیں، اس طریقہ پر جو اس سے پہلے ہم نے ذکر کر دیا ہے۔ پس ضروری ہے کہ وہ ایک ایسی خبر لائے جس میں مقتدیوں کو بیٹھ کر نماز پڑھنے کا حکم موجود ہو جبکہ ان کا امام بیٹھ کر نماز پڑھائے اور وہ اسے پکڑ لیں جبکہ وہ ان دو روایتوں میں سے ایک کے موافق ہو جو حضور نبی مکرم ﷺ کی حالت مرض میں نماز کے بارے روایت کی گئیں ہیں اور وہ چھوڑ دے اس خبر کو جو ان میں سے منفرد ہو، جیسا کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے معاملہ میں کیا گیا (3)۔

ابو حاتم نے کہا ہے: بعض عراقیین نے گمان کیا ہے جو کوفیوں کا مذہب اختیار کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کا یہ قول واذا صلی قاعدا فصلوا قعودا اس سے مراد یہ ہے کہ جب وہ بیٹھ کر تشہد پڑھے تو تم تمام بھی بیٹھ کر تشہد پڑھو۔ تو یہ خبر کو اس کے عموم سے

1۔ صحیح بخاری، باب التزویج المحرم، حدیث نمبر 1706، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ترمذی، باب ماجاء فی کراھیۃ تزویج المحرم، حدیث 770، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان، کتاب الصلوٰۃ، جلد 5، صفحہ 483 تا 485، موسستہ الرسالہ بیروت

پھیر دینا ہے جس کے بارے میں خبر وارد ہے بغیر کسی ایسی دلیل کے جو اس معنی کو ثابت کر سکے (1)۔

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝

''پھر اگر تم کو ڈر ہو (دشمن وغیرہ کا) تو پیادہ یا سوار (جیسے بن پڑے) پھر جب تمہیں امن حاصل ہو جائے تو یاد کرو اللہ تعالیٰ کو جس طرح اس نے سکھایا ہے تمہیں جو تم نہیں جانتے تھے۔''

اس میں نو مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ خِفْتُمْ یہ خوف سے ماخوذ ہے جس کا معنی گھبراہٹ اور ڈر ہے۔ فَرِجَالًا یعنی تم نماز پڑھو پیدل چلتے ہوئے اَوْ رُكْبَانًا یا سوار۔ یہ رجالا پر معطوف ہے۔ اور الرجال راجل یا رَجُل کی جمع ہے۔ یہ ان کے اس قول سے ہے: رَجِلَ الانسانُ یَرْجَلُ رَجَلاً جب آدمی کے پاس سواری نہ ہو اور وہ اپنے قدموں پر چلے۔ (صفت کا صیغہ ہوگا) فھو رَجِل و رَاجِل و رَجُلٌ (جیم کے ضمہ کے ساتھ) یہ اہل حجاز کی لغت ہے، وہ کہتے ہیں: مشی فلان الی بیت اللہ حافیا رَجُلاً (فلاں بیت اللہ شریف کی طرف ننگے پاؤں پیدل چلا) اسے طبری وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ و رَجْلَان و رَجِیل و رَجْل، (2) اور اس کی جمع رِجَال و رَجْلٰی و رُجَّال و رَجَّالة و رُجالی و رُجْلان و رِجْلَةٌ و رِجَلة (جیم کے فتحہ کے ساتھ) و اَرْجِلة و اَرَاجِل و اَرَاجِیل کے اوزان پر بنائی جاتی ہے اور الرَّجُل وہ جو کہ اسم جنس ہے اس کی جمع رجال بھی بنائی جاتی ہے (3)۔

مسئلہ نمبر 2۔ جب اللہ تعالیٰ نے بندے کو نماز میں قنوت کی کیفیت میں کھڑے ہونے کا حکم ارشاد فرمایا اور قنوت سے مراد وقار، سکینہ اور اعضاء کا پرسکون ہونا ہے اور یہ اغلباً امن اور طمانینت کی حالت میں ممکن ہو سکتا ہے تو پھر حالت خوف کا ذکر فرمایا جو کبھی کبھار طاری ہو سکتی ہے اور بیان فرمایا کہ یہ عبادت بندے سے کسی حال میں بھی ساقط نہیں ہوتی اور اپنے بندوں کو نماز کے بارے میں رخصت عطا فرمائی کہ وہ اپنے قدموں پر پیدل چلتے ہوئے اور گھوڑے، اونٹ اور اسی طرح کی کسی شے پر سواری کرتے ہوئے اپنے سر کے اشارے کے ساتھ جس طرف منہ کرنا ممکن ہو متوجہ ہو کر نماز پڑھ لیں۔ یہ عطاء کا قول ہے، اور یہی اس گھبراہٹ اور خوف کی نماز ہے جب خوف شدت اور سختی کے ساتھ آدمی کی ذات پر مسلط ہو جائے جنگ کی حالت میں یا ایسا درندہ جو اسے تلاش کر رہا ہو، اس سے خوف کی حالت میں یا ایسے دشمن سے خوف ہو جو اس کا پیچھا کر رہا ہو یا ایسے سیلاب کا خوف ہو جو اسے اٹھا سکتا ہو۔ بالجملہ ہر وہ شے جس سے آدمی کو اپنی جان پر خوف ہو تو وہی وہ عذر مبیح ہے جسے یہ آیت متضمن ہے (4)۔

مسئلہ نمبر 3۔ یہ رخصت اپنے ضمن میں علماء کا اجماع بھی لئے ہوئے ہے کہ انسان جہاں کہیں بھی ہو راستوں سے

1۔ الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان، کتاب الصلوٰۃ، جلد 5، صفحہ 487، موسسۃ الرسالہ بیروت

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 324، دار الکتب العلمیہ 3۔ ایضاً

4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 324، دار الکتب العلمیہ۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، حدیث نمبر 4171، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہٹ جائے اور رخ تبدیل کرلے اور اپنی عقل کے مطابق اپنی جان بچانے کے لئے ممکنہ اقدام کرے۔

مسئلہ نمبر4۔ اس خوف کے بارے میں اختلاف کیا گیا ہے جس میں نماز پیادہ اور سوار پڑھنا جائز ہو جاتی ہے۔ امام شافعی نے فرمایا ہے: مراد ایسا خوف ہے کہ دشمن ان پر بالکل قریب آچکا ہو اور وہ اکٹھے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں اور مسلمان غیر محفوظ ہوں یہاں تک کہ ہتھیار تیر وغیرہ ان تک پہنچ سکتے ہوں یا اس سے بھی زیادہ دشمن ان کے قریب ہو کہ نیزے اور تلواریں ان تک پہنچ سکتی ہوں یا اس کے پاس کوئی ایسا مخبر آئے جس کی خبر کی تصدیق کی جاسکتی ہو اور وہ اسے خبر دے کہ دشمن اس کے قریب ہے اور بڑی تیزی سے وہ اس کی طرف بڑھ رہا ہے، پس اگر ان دو معنوں میں سے کوئی ایک نہ ہو تو پھر اس کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ صلوٰۃ الخوف پڑھے اور اگر خبر کی بنا پر انہوں نے صلوٰۃ خوف پڑھی پھر دشمن چلا گیا تو وہ نماز کا اعادہ نہ کریں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ نماز کا اعادہ کریں گے۔ یہی امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔

ابو عمر نے کہا ہے: وہ حالت جس میں خوفزدہ ہونے والے کے لئے جائز ہوتا ہے کہ وہ نماز پڑھے پیادہ یا سوار، قبلہ شریف کی طرف منہ کر کے یا کسی اور طرف یہ شدت خوف کی حالت ہے اور وہ حالت جس کے بارے میں آثار وارد ہیں وہ اس کے سوا ہے۔ اور صلاۃ خوف امام کے ساتھ اور لوگوں کو تقسیم کر کے پڑھی جاتی ہے اور اس آیت میں اس کا حکم نہیں ہے اس کا بیان سورۃ النساء میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور امام مالک نے جنگجو دشمن کے خوف اور درندے کے خوف اور اس جیسی دیگر چیزیں مثلاً حملہ کرنے والا اونٹ، سیلاب یا ہر وہ شے جس میں غالب گمان ہلاکت کا ہو، کے درمیان فرق کیا ہے کہ دشمن کے خوف کے علاوہ وقت کے اندر نماز کا اعادہ کرنا مستحب ہے اگر امن اور سکون میسر آجائے اور اکثر فقہائے امصار نے کہا ہے کہ حکم برابر ہے (چاہے خوف دشمن کا ہو یا کسی درندے وغیرہ کا)

مسئلہ نمبر5۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بلاشبہ قتال نماز کو فاسد کر دیتا ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث اس کا رد کرتی ہے اور ظاہر آیت اس پر قوی دلیل ہے۔ عنقریب اس کا بیان سورۃ النساء میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

امام شافعی نے کہا ہے: جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے بعض شروط کو ترک کرنے کے جواز کی رخصت عطا فرمائی ہے تو یہ اس پر دلیل ہے کہ نماز میں قتال کرنا اسے فاسد نہیں کرے گا۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر6۔ امام مالک، امام شافعی اور علماء کی ایک جماعت رحمہم اللہ علیہم کے نزدیک خوف کی حالت میں مسافر کی نماز سے رکعتوں کی تعداد کم نہ ہوگی۔

اور حسن بن ابی الحسن اور قتادہ وغیرہما نے کہا ہے کہ وہ ایک رکعت اشارے کے ساتھ پڑھ سکتا ہے (1)۔

امام مسلم نے بکیر بن اخنس سے، انہوں نے حضرت مجاہد سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اقدس پر شہر میں چار رکعتیں، سفر میں دو رکعتیں اور خوف کے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 335، دار الکتب العلمیہ

وقت ایک رکعت نماز فرض کی ہے (1)۔

ابن عبد البر نے کہا ہے: اس روایت کو بیان کرنے میں بکیر بن اخنس منفرد ہے اور وہ روایت حجت نہیں ہوتی جس میں وہ منفرد ہوتا ہے اور نماز میں اولیٰ یہ ہے کہ اس میں احتیاط برتی جائے وہ آدمی جس نے اپنے خوف اور سفر کی حالت میں دو رکعتیں نماز پڑھ لی تو وہ اختلاف سے یقین کی طرف نکل گیا۔

اور ضحاک ابن مزاحم نے کہا ہے: وہ آدمی جسے حالت جنگ یا کسی اور حالت میں موت کا خوف ہو تو وہ ایک رکعت پڑھ سکتا ہے اور اگر اس پر بھی قادر نہ ہو تو پھر اسے چاہئے کہ دو تکبیریں کہہ لے۔

اور اسحاق بن راہویہ نے کہا ہے: اگر وہ صرف ایک تکبیر پر ہی قادر ہوا تو وہی اس کی طرف سے جائز ہوگی۔ اسے ابن منذر نے ذکر کیا ہے (2)۔

اور قولہ تعالیٰ: فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ، یعنی (جب تمہیں امن حاصل ہو جائے) تو تم اس حکم کی طرف لوٹ جاؤ جو تمہیں ارکان کی تکمیل کے بارے دیا گیا ہے۔ اور مجاہد نے کہا ہے: اَمِنْتُمْ کا معنی ہے جب تم دار السفر سے دار الاقامہ کی طرف نکل جاؤ۔ علامہ طبری نے اس کا رد کیا ہے (3) اور ایک جماعت نے کہا ہے: اَمِنْتُمْ جب تمہارا وہ خوف زائل ہو جائے جس نے تمہیں اس نماز پر مجبور کر دیا تھا۔

مسئلہ نمبر 7۔ علماء نے خائف کی بنا کے بارے اس باب میں اختلاف کیا ہے جب وہ امن میں ہو جائے، حضرت امام مالک نے کہا ہے: اگر کسی نے ایک رکعت حالت امن میں پڑھ لی پھر اسے خوف لاحق ہو گیا تو وہ سوار ہو اور اسی پہ بنا کر لے (یعنی دوسری رکعت سواری پر پڑھ لے تو نماز مکمل ہو جائے گی۔) اور اسی طرح اگر کسی نے حالت خوف میں سوای پر ایک رکعت پڑھی، پھر اسے امن ہو گیا، تو وہ اترے اور اسی پر بنا کر لے۔ یہی امام شافعی کے دو قولوں میں سے ایک ہے اور مزنی نے بھی اسی طرح کہا ہے۔

اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب کوئی امن کی حالت میں نماز شروع کرے، پھر اسے خوف لاحق ہو جائے وہ منہ قبلہ شریف کی طرف کرے اور بنا نہ کرے اور اگر اس نے حالت خوف میں نماز شروع کی پھر اسے امن حاصل ہو جائے تو وہ بنا کر لے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: سواری سے اترنے والا تو بنا کر سکتا ہے (لیکن) سوار ہونے والا بنا نہیں کر سکتا۔ اور امام ابو یوسف نے کہا ہے: وہ ان تمام صورتوں میں سے کسی میں بھی بنا نہیں کر سکتا۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: فَاذْكُرُوا اللّٰهَ کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے تم اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں ایسی نماز کی تعلیم دی ہے جو اصل نماز کے قائم مقام ہے اور تمہاری کوئی نماز فوت نہیں ہوئی اور یہ وہی ہے جسے تم نہ جانتے تھے اور قول باری كَمَا میں کاف بمعنی شکر ہے تو کہتا ہے: تو میرے ساتھ اسی طرح (سلوک) کر جیسے میں نے تیرے ساتھ کیا اسی طرح بدلہ اور شکر ہوگا اور مَا لَمْ میں ما، عَلَّمَكُمْ کا مفعول ہے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 241، وزارت تعلیم 2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 325، دار الکتب العلمیہ 3۔ ایضاً

مسئلہ نمبر 9۔ ہمارے علماء رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: صلاۃ کا اصل معنی دعا ہے اور حالت خوف میں تو بدرجہ اولیٰ دعا کے معنی میں ہوگی، اسی لئے خوف کے سبب نماز ساقط نہیں ہوتی اور جب خوف کے سبب نماز ساقط نہیں ہوئی تو پھر یہ زیادہ مناسب اور لائق ہے کہ یہ اس کے سوا حالت مرض یا کسی اور حالت میں ساقط نہ ہو۔ پس اللہ تعالیٰ نے ہر حال میں نمازوں پر مواظبت اور ان کی محافظت کا حکم ارشاد فرمایا ہے، چاہے صحت کی حالت ہو یا مرض کی، حضر ہو یا سفر، نماز کی قدرت ہو یا عجز خوف ہو یا امن، یہ کسی حال میں بھی مکلف سے ساقط نہیں ہوتی اور کسی قسم کا فساد اور خلل اس کی فرضیت میں حائل نہیں ہو سکتا، راہ نہیں پکڑ سکتا۔ مریض کا حکم سورۂ آل عمران کے آخر میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور اس سے مقصود یہ ہے کہ نماز پڑھی جائے گی جس کیفیت میں ممکن ہوگی اور یہ کسی حال میں ساقط نہ ہوگی یہاں تک کہ اگر اسے پڑھنے کا اتفاق نہ ہو مگر آنکھ کے اشارے کے ساتھ تب بھی اسے پڑھنا لازم ہے اور اسی وجہ سے یہ تمام عبادات سے ممتاز ہے، تمام کی تمام عذروں کے سبب ساقط ہو جاتی ہیں اور ان میں رخصت حاصل ہو جاتی ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: اسی لئے ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ مسئلہ عظمی ہے، بے شک نماز ترک کرنے والے کو قتل کر دیا جائے گا، کیونکہ نماز اس ایمان کے مشابہ ہے جو کسی حال میں ساقط نہیں ہوتا اور انہوں نے اس بارے میں کہا ہے: نماز اسلام کے ستونوں میں سے ایک ہے جس کی نیابت نہ بدن کے ساتھ جائز ہوتی ہے اور نہ مال کے ساتھ (یعنی نماز کا قائم مقام کوئی اور بدنی یا مالی عبادت نہیں ہو سکتی) اور اس کے تارک کو قتل کر دیا جائے گا، اس کی اصل شہادتین ہے (1)۔ تارک صلوٰۃ کے بارے میں علماء نے جو کچھ کہا ہے اس کا بیان سورۂ براءۃ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۰﴾

''اور جو لوگ فوت ہو جاتے ہیں تم میں سے اور چھوڑ جاتے ہیں بیویاں (انہیں چاہئے کہ) وصیت کر جایا کریں اپنی بیویوں کے لئے کہ انہیں خرچ دیا جائے ایک سال تک (اور) نہ نکالا جائے (انہیں گھر سے) پھر اگر وہ خود چلی جائیں تو کوئی گناہ نہیں تم پر جو کچھ وہ کریں اپنے معاملہ میں مناسب طور پر اور اللہ بہت زبردست بڑا دانا ہے۔''

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا مفسرین کی ایک جماعت نے اس آیت کی تاویل میں کہا ہے کہ وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے وہ اپنے فوت ہونے والے خاوند کے گھر میں ایک سال تک بیٹھی رہے گی اور جب تک وہ گھر سے نہ نکلی اس کے مال میں سے اس پر خرچ کیا جاتا رہے گا اور اگر وہ نکل گئی تو اس کا نفقہ ختم کرنے میں ورثاء پر کوئی حرج نہیں۔ پھر سال کی مدت کو چار مہینے اور دس دن کے ساتھ منسوخ کر دیا گیا اور نفقہ کو سورۂ نساء میں چوتھے اور آٹھویں حصے کے ساتھ منسوخ کر دیا گیا (2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت قتادہ، حضرت ضحاک، حضرت ابن زید اور

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 228، دار الفکر
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 326، دار الکتب العلمیہ

حضرت ربیع رحمۃ اللہ علیہم نے یہی کہا ہے۔ اور سکنیٰ کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو کہا: یہ آیت جو سورۃ البقرہ میں ہے: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ تحقیق اسے دوسری آیت نے منسوخ کر دیا ہے آپ نے اسے کیوں نہیں لکھایا آپ نے اسے کیوں چھوڑ دیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: اے بھتیجے! میں نے اس میں سے کسی شے کو اس کے مکان سے تبدیل نہیں کیا(1)۔

اور علامہ طبری نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے: بے شک یہ آیت محکم ہے اس میں کوئی نسخ نہیں ہے اور عدت چار مہینے اور دس دن ثابت ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے وصیت بنا دی اس میں سکنیٰ سات مہینے اور بیس راتیں ہے۔ پس اگر عورت چاہے تو اپنی وصیت میں رہے اور اگر چاہے تو نکل جائے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ (2) ابن عطیہ نے کہا ہے: اس تمام کا حکم نسخ متفق علیہ کے ذریعے زائل ہو چکا ہے مگر وہ جو طبری نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے بارے دعویٰ کیا ہے۔ اس بارے میں طبری محل نظر ہیں۔

اور حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس پر اجماع منعقد ہے کہ سال کی مدت منسوخ ہو چکی ہے اور اس کی عدت چار مہینے اور دس دن ہے۔ دوسروں نے کہا: قولہ وصیۃ کا معنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے عورتوں پر زوج کے فوت ہو جانے کے بعد ایک سال تک گھروں میں رہنا واجب ہوتا ہے۔ پھر اسے منسوخ کر دیا گیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو کچھ طبری نے حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے وہ صحیح ثابت ہے۔ بخاری نے روایت کیا ہے: ہمیں اسحاق، روح، شبل نے ابن ابی نجیح سے اور انہوں نے حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا فرمایا: یہ عدت اپنے زوج کے گھر والوں کے پاس گزارنا واجب تھی پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے تمام سال کو سات مہینے اور بیس راتیں وصیت بنا دیا، اگر وہ چاہے تو اپنی وصیت میں سکونت رکھے اور اگر چاہے تو نکل جائے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ (3) مگر پہلا قول زیادہ ظاہر اور واضح ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: ''بلاشبہ یہ مدت چار مہینے اور دس دن ہے تم میں سے کوئی زمانہ جاہلیت میں سال مکمل ہونے پر مینگنیاں پھینکتی تھی۔'' الحدیث (4)

یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے شریعت کے احکام نافذ ہونے سے پہلے ان عورتوں کی حالت کا بیان ہے جن کے

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 650، وزارت تعلیم 2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 326، دار الکتب العلمیہ

3۔ صحیح بخاری، تفسیر سورۃ بقرہ، جلد 2، صفحہ 650، وزارت تعلیم۔ ایضاً، کتاب تفسیر القرآن، حدیث نمبر 4172، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، حدیث نمبر 4167، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ جامع ترمذی، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 143، وزارت تعلیم

خاوند فوت ہو جاتے تھے۔ پس جب اسلام آیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں سال تک گھروں میں ہی رہنے کا حکم ارشاد فرمایا پھر اس مدت کو چار مہینے دس دن کے ساتھ منسوخ کر دیا گیا یہ وضاحت کے ساتھ سنت ثابتہ میں ہے جسے اخبار آحاد سے نقل کیا گیا ہے۔ اس پر علماء مسلمین کا اجماع ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ ابو عمر نے یہی کہا ہے، انہوں نے کہا اور اسی طرح پوری آیت ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی: وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚۖ وَّصِیَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَیْرَ اِخْرَاجٍ جمہور علماء کے نزدیک یہ سب منسوخ ہے۔ پھر بیویوں کے لئے سال بھر رہائش کی وصیت کرنے کو منسوخ کر دیا گیا، سوائے ایک شاذ روایت کے جسے چھوڑ دیا گیا ہے وہ ابن ابی نجیح نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی ہے اور اس پر کوئی متابع نہیں لائی گئی اور نہ صحابہ، تابعین اور ان کے بعد آنے والے علمائے مسلمین میں سے کسی نے اس کے سبب چار مہینے اور دس دن پر اضافہ کیا ہے جہاں تک میں جانتا ہوں۔

اور ابن جریج نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے اس طرح کی روایت نقل کی ہے جس پر لوگوں کا عمل ہے، پس اجماع منعقد ہو گیا اور اختلاف ختم ہو گیا۔ وباللہ التوفیق۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَّصِیَّةً حضرت نافع، ابن کثیر، کسائی، عاصم نے ایک روایت میں اور ابو بکر رحمۃ اللہ علیہم نے مبتدا ہونے کی بناء پر وَّصِیَّةٌ کو مرفوع پڑھا ہے اور اس کی خبر لِّاَزْوَاجِهِمْ ہے۔ اور یہ معنی ہونے کا احتمال بھی ہے علیهم وصیة۔ ان پر وصیت لازم ہے اور قول باری تعالیٰ لِّاَزْوَاجِهِمْ صفت ہو (1)۔ علامہ طبری نے کہا ہے کہ بعض علمائے نحو نے کہا ہے کہ معنی ہے كُتبت علیهم وصیة ان پر وصیت فرض کی گئی ہے اور قولہ لِّاَزْوَاجِهِمْ صفت ہو گا (2)۔ فرمایا: اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ہے۔ اور ابو عمرو، حمزہ اور ابن عامر رحمۃ اللہ علیہم نے وصیةً منصوب پڑھا ہے اور اسے فعل پر محمول کیا ہے۔ یعنی فلیوصُوا وصیةً پس چاہئے کہ وہ ضرور وصیت کریں پھر میت تو وصیت نہیں کر سکتی۔ لیکن اس سے مراد یہ ہے کہ جب وہ وفات کے قریب ہوں اور لِاَزْوَاجِهِمْ اس قراءت کی بنا پر بھی صفت ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی ہے اوصی اللہ وصیةً۔ اللہ تعالیٰ نے وصیت کو لازم قرار دیا ہے۔ اور مَتَاعًا۔ مَتِّعُوْهُنَّ مَتَاعًا ہے۔ یعنی تم انہیں ضرور نفقہ ادا کرو۔ یا جعل اللہ لهن ذلك متاعاً۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے وہ خرچہ مقرر فرما دیا ہے۔ کیونکہ کلام اس پر دلالت کرتا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہو یا مصدر کے سبب جو کہ الوصیة ہے، جیسا کہ یہ ارشاد گرامی ہے: اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ ۙ یَّتِیْمًا (البلد) یہاں متاع سے مراد اس کے سال کا نفقہ ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: غَیْرَ اِخْرَاجٍ اس کا معنی ہے کہ میت کے اولیاء کے لئے اور گھر کے ورثاء کے لئے عورت کو باہر نکالنا جائز نہیں ہے اور غَیْرَ اخفش کے نزدیک مصدر کی بنا پر منصوب ہے، گویا کہ یہ فرمایا لا اخراجا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ منصوب ہے کیونکہ یہ متاعا کی صفت ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ الموصین (وصیت کرنے والے) سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ یعنی متعوهنّ غیر مُخرَجاتٍ (تم انہیں نفقہ دو اس حال میں انہیں نکالا نہ جائے۔) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 325، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً

حرف جر کے حذف ہونے کے سبب منصوب ہے۔ اصل عبارت ہے: من غیر اخراج۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ خَرَجْنَ الآیہ اس کا معنی ہے اگر وہ اپنے اختیار اور مرضی سے سال سے پہلے نکل جائیں۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ تو کسی ولی پر یا حاکم پر کسی اور پر کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ اس پر پورا سال اپنے خاوند کے گھر میں ٹھہرنا واجب نہیں ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کا نفقہ منقطع کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے یا ازواج کی خواہش کے لئے ان پر بناؤ سنگھار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ اے ورثاء! ان کے بارے تمہاری نگہبانی کی ذمہ داری ختم ہو چکی ہے پھر ان پر لازم ہے کہ وہ ایک سال عدت گزرنے سے پہلے پہلے شادی نہ کریں یا عدت گزرنے کے بعد ان کی شادی کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: مِنْ مَّعْرُوْفٍ۔ مراد وہ طریقہ ہے جو شریعت سے موافقت رکھتا ہو۔ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ یہ صفت ہے جو اس کے بارے میں وعید کا تقاضا کرتی ہے جس نے اس آیت میں بیان کردہ حد کی مخالفت کی اور عورت کو نکال دیا حالانکہ وہ نکلنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ حَكِیْمٌ یعنی اپنے بندوں کے امور میں سے جس کا وہ ارادہ کرتا ہے اسے خوب پختہ کرنے والا ہے۔

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِیْنَ ﴿۲۴۱﴾ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾

"اور (اسی طرح) جن کو طلاق دی گئی ان کو خرچ دینا چاہئے مناسب طور پر یہ واجب ہے پرہیزگاروں پر۔ اسی طرح کھول کر بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنے احکام تاکہ تم سمجھ جاؤ۔"

اس آیت میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ ابو ثور رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ محکم آیت ہے اور متعہ ہر مطلقہ عورت کے لئے لازم ہے اسی طرح زہری نے کہا ہے (زہری نے کہا) یہاں تک کہ ایسی لونڈی کے لئے بھی جسے اس کا خاوند طلاق دے دیتا ہے۔ اسی طرح حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے۔ ہر مطلقہ کے لئے متعہ ہے (1) اور اس آیت کی وجہ سے یہی امام شافعی کے دو قولوں میں سے ایک ہے۔

اور امام مالک نے کہا ہے: ہر مطلقہ کے لئے متعہ ہے چاہے اسے دو طلاقیں ہوں یا ایک طلاق، وہ اس کے پاس جائے یا نہ جائے، اس کے لئے مہر مقرر کرے یا نہ کرے، سوائے اس عورت کے جس کے پاس جانے سے پہلے اسے طلاق ہو جائے اور اس کے لئے مہر مقرر ہو تو اس کے لئے نصف مہر کافی ہوگا اور اگر اس کے لئے مہر مقرر ہو تو اس کے لیے متعہ ہوگا چاہے وہ مہر مثلی سے کم ہو یا زیادہ اور اس متعہ کی کوئی حد نہیں ہے، اسے آپ سے ابن قاسم نے بیان کیا ہے اور ابن قاسم نے المدونہ سے پردے ڈالنے کے بارے میں نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے مطابق ہر مطلقہ کے لئے متعہ مقرر کیا ہے، پھر دوسری آیت میں اس کی استثنا کر دی ہے جس کے لئے مہر مقرر کیا گیا اور اس کے ساتھ دخول نہ ہوا تو اسے متعہ سے خارج کر دیا اور ابن زید نے گمان کیا ہے کہ اس آیت نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے کہ ابن قاسم نے لفظ نسخ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 326، دار الکتب العلمیہ

سے لفظ استثنا کی طرف فرار اختیار کیا ہے، اس محل میں استثنا کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی، بلکہ وہ تو صرف نسخ ہے جیسا کہ زید بن اسلم نے کہا ہے اور ابن قاسم نے لازم قرار دیا ہے کہ قولہ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ ہر مطلقہ کو شامل ہے۔ تو پھر نسخ کا قول لازم اور ضروری ہے۔

اور حضرت عطا بن ابی رباح رضی اللہ عنہ وغیرہ نے کہا ہے: یہ آیت ان ثیبہ عورتوں کے بارے میں ہے جن سے جماع کیا گیا کیونکہ اس آیت کے سوا دوسری میں ان عورتوں کے لئے متعہ کا ذکر گزر چکا ہے جن کے ساتھ دخول نہیں کیا گیا۔ پس یہ قول ایسی عورت کے بارے میں ہے جس کے لئے مس سے پہلے مہر مقرر کر دیا گیا یہ کبھی عموم میں داخل نہیں ہوئی۔ اور یہ اس بنا پر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ یہ عورتوں میں سے اس صنف کو خاص کر رہا ہے اور جب کہا گیا ہے کہ یہ عموم اس قسم کو بھی شامل ہے تو پھر یہ نسخ ہوگا تخصیص نہیں۔ (1)

اور امام شافعی نے دوسرے قول میں کہا ہے: بلاشبہ متعہ نہیں ہے مگر اس عورت کے لئے جسے قبل از دخول طلاق دی جائے اور وہاں نہ مس ہوا اور نہ مہر مقرر ہو۔ کیونکہ جو مہر میں سے کسی شے کی مستحق ہو جائے تو وہ اپنے حق میں متعہ کی محتاج نہیں رہتی۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ (الاحزاب: 28) اس پر محمول ہے کہ یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ایک احسان ہے، نہ کہ آپ کے لئے واجب ہے اور قول باری تعالیٰ: فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ (الاحزاب: 49) بھی غیر مفروضہ پر محمول ہے۔

امام شافعی نے کہا ہے: وہ عورت جس کا مہر مقرر کیا جائے اس کے لئے مہر ہوگا جب اسے قبل المسیس طلاق دی جائے، اس کے لئے کوئی متعہ نہ ہوگا، کیونکہ اس نے مجامعت کے بغیر نصف مہر لے لیا ہے۔ اور مدخول بہا کو جب طلاق دی جائے تو اس کے لئے متعہ ہوگا، کیونکہ مہر وطی کے مقابلہ میں واقع ہوتا ہے اور متعہ عقد کے ساتھ انتہائی استعمال کے سبب (لازم ہے) اور امام شافعی نے خلع اور مبارات کرنے والی کے لئے بھی متعہ واجب کیا ہے اور امام مالک کے اصحاب نے کہا ہے: فدیہ دینے والی کے لئے کیسے متعہ ہو سکتا ہے حالانکہ وہ خود دیتی ہے تو وہ متعہ کیسے لے گی اور جدائی اور فراق کو اختیار کرنے والی کے لئے کوئی متعہ نہیں ہے چاہے، وہ خلع لینے والی ہو یا فدیہ دینے والی یا مبارات کرنے والی یا صلح کرنے والی یا لعان کرنے والی یا آزاد ہونے والی فراق اور جدائی کو اختیار کرلے۔ اس کے ساتھ دخول ہو یا نہ ہو، اس کے لئے مہر مقرر ہو یا نہ ہو۔ تفصیلی بیان پہلے گزر چکا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۠ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۣ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾

"کیا نہیں دیکھا تو نے ان لوگوں کی طرف جو نکلے تھے اپنے گھروں سے اور وہ ہزاروں تھے موت کے ڈر سے تو فرمایا انہیں اللہ تعالیٰ نے کہ مر جاؤ پھر زندہ فرمایا انہیں، بے شک اللہ تعالیٰ بڑا مہربان ہے لوگوں پر لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔"

اس میں چھ مسائل ہیں:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 327، دار الکتب العلمیہ

مسئلہ نمبر 1 ۔ قولہ تعالیٰ: اَلَمْ تَرَ رؤیت قلب مراد ہے۔ اس کا معنی ہے اَلَمْ تَعْلَمْ کیا آپ نہیں جانتے اور سیبویہ کے نزدیک اس کا معنی ہے: کیا آپ آگاہ نہیں ان لوگوں کے معاملہ کے بارے۔ (یعنی الم تنتبہ) اور یہ رؤیت (یعنی اَلَمْ تَرَ) دومفعولوں کا محتاج نہیں ہے۔

ابو عبدالرحمٰن السلمی نے اَلَمْ تَرْءَ کی جزم کے ساتھ پڑھا ہے اور القائے حرکت کے بغیر ہی ہمزہ کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ اس کی اصل ہے: الم ترءَ۔

ان لوگوں کا قصہ یہ ہے کہ یہ بنی اسرائیل کی ایک قوم ہے۔ ان میں وبا پھیل گئی، یہ ایک گاؤں میں تھے جسے داوَزدان کہا جاتا ہے (یہ گاؤں واسط کے مشرقی نواح میں واقع ہے اور ان کے درمیان ایک فرسخ کا فاصلہ ہے "معجم یاقوت") پس وہ اس سے بھاگتے ہوئے نکلے اور ایک وادی میں جا اترے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر موت مسلط کر دی (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: وہ چار ہزار تھے۔ طاعون سے بھاگتے ہوئے نکلے اور انہوں نے کہا: ہم ایسی زمین پر آئے ہیں جہاں موت نہیں ہے، تو اللہ تعالیٰ نے ان تمام کو مار دیا۔ پھر ان کے پاس سے ایک نبی علیہ السلام کا گزر ہوا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ کر دیا۔

اور کہا گیا ہے کہ وہ آٹھ دن تک مرے رہے اور بعض نے کہا: سات دن تک، واللہ اعلم۔

حضرت حسن نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں بطور سزا مدت مقررہ سے پہلے مار دیا، پھر انہیں باقی ماندہ عمروں کے لئے اٹھا دیا۔ اور بعض نے کہا ہے: ان کے انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات میں سے ایک نبی علیہ السلام کے معجزہ کے اظہار کے لئے ان کے ساتھ ایسا کیا۔ کہا گیا ہے کہ ان کا اسم گرامی حضرت شمعون علیہ السلام ہے۔ اور نقاش نے بیان کیا ہے کہ وہ بخار سے بھاگے تھے (2)۔

اور بعض کا خیال ہے کہ وہ جہاد سے فرار ہوئے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے نبی حضرت حزقیل علیہ السلام کی زبان سے جہاد کے بارے حکم ارشاد فرمایا، تو وہ جہاد میں قتال ہونے کے سبب موت سے خوفزدہ ہو گئے، پس وہ اس سے بھاگتے ہوئے اپنے گھروں سے نکل گئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں موت دے دی تاکہ وہ انہیں متنبہ کر دے کہ کوئی شے انہیں موت سے نجات نہیں دلا سکتی پھر انہیں زندہ کیا اور انہیں اپنے اس ارشاد سے جہاد کے بارے حکم دیا: وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (اور تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں جنگ کرو) حضرت ضحاک نے یہی کہا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ تمام کے تمام قصص ضعیف الاسانید ہیں، البتہ آیت سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تنبیہ اور توقیف کی عبارت میں انسانوں کو ایک قوم کے بارے خبر دی ہے کہ وہ موت سے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے اپنے گھروں سے نکلے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں موت دے دی اور پھر انہیں زندہ کر دیا، تاکہ وہ اور ان کے بعد آنے والے تمام یہ جان لیں کہ موت دینا بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے کسی اور کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ لہٰذا کسی ڈرنے والے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 327، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 328

کے خوف کا اور کسی دھوکہ کھانے والے کے دھوکہ کا کوئی معنی نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو اپنے اس امر کا مقدمہ بنایا ہے جو اس نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے مومنوں کو جہاد کے بارے حکم فرمایا۔ یہ علامہ طبری کا قول ہے اور یہی آیت کے ظاہر الفاظ ہیں۔

قولہ تعالیٰ: وَهُمْ أُلُوفٌ جمہور نے کہا ہے: یہ الف کی جمع ہے۔ بعض نے کہا ہے: وہ چھ لاکھ تھے۔ بعض نے کہا ہے: وہ اسی ہزار تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: وہ چالیس ہزار تھے۔ ابو مالک نے کہا ہے: وہ تیس ہزار تھے (1)۔ سدی کا قول ہے: وہ سینتیس ہزار تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ستر ہزار تھے۔ حضرت عطا بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ نے یہی کہا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی چالیس ہزار اور آٹھ ہزار کی روایت ہے، آپ سے اسے ابن جریج نے روایت کیا ہے۔ آپ سے ہی آٹھ ہزار کی روایت بھی ہے اور آپ سے چار ہزار کی روایت بھی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ تین ہزار تھے۔ اور صحیح یہ ہے کہ وہ دس ہزار سے زائد تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهُمْ أُلُوفٌ اور یہ جمع کثرت ہے اور دس اور اس سے کم کے بارے میں أُلُوفٌ نہیں بولا جاتا۔

ابن زید نے الوف کے لفظ کے بارے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے وھم موتلفون، یعنی انہیں اپنی قوم کے افتراق نے نہیں نکالا اور نہ ان کے درمیان کوئی فتنہ برپا ہوا، بلکہ وہ تو ایک دوسرے سے محبت اور الفت رکھتے تھے اور الفت اس فرقت کے خلاف ہے۔ پس وہ موت سے فرار اختیار کرتے ہوئے اور اپنے خیال کے مطابق زندگی کی خواہش رکھتے ہوئے اپنے گھروں سے نکلے، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اسی جگہ موت دے دی جو ان کے گمان کے مطابق ان کے لئے جائے نجات تھی۔ پس اس معنی کی بنا پر الوف آلف کی جمع ہے۔ جیسا کہ جَالِسٌ کی جمع جلوس ہے۔

ابن عربی نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں سزا دینے کے لئے ایک خاص مدت تک موت دی اور پھر انہیں زندہ کر دیا اور سزا کے لئے موت دینے کے بعد زندگی ہے اور اپنی مدت مقررہ پر موت آنے کے بعد زندگی نہیں ہے (2)۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب وہ زندہ کیے گئے اور اپنی قوم کی طرف لوٹے تو وہ پہچانے جا سکتے تھے (کہ وہ مردہ تھے) اور موت کی علامات ان کے چہروں پر تھیں اور ان میں سے کوئی جو کپڑا بھی پہنتا تھا تو وہ میلا سا کفن بن جاتا یہاں تک کہ وہ اپنی اس مدت مقررہ پر فوت ہوئے جو ان کے لئے لکھی گئی تھی۔

ابن جریج نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ آج تک بنی اسرائیل کی اس نسل میں وہ بو باقی ہے۔ اور روایت ہے کہ وہ عراق کے (شہر) واسط کے پاس تھے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ بدبودار ہو جانے کے بعد زندہ کیے گئے، پس وہ بو آج تک ان کی نسل میں موجود ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: حَذَرَ الْمَوْتِ، ای لحذر الموت یعنی موت کے ڈر کی وجہ سے۔ اور یہ بھی مفعول لہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور مُوْتُوْا امر تکوین ہے اور کہا جانا بھی بعید نہیں ہے۔ انہیں ندا دی گئی اور انہیں کہا گیا: تم مر جاؤ اور یہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 328، دار الکتب العلمیہ
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 228، دار الفکر

بھی بیان کیا گیا ہے کہ دو فرشتوں نے ان کے پاس چیخ لگائی تم مرجاؤ، پس وہ مر گئے۔ پس معنی یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دو فرشتوں کے واسطہ سے کہا: مُوْتُوْا کہ تم مرجاؤ (1)۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 3۔ ان اقوال میں سے زیادہ صحیح (اور زیادہ مبین) اور زیادہ مشہور قول یہ ہے کہ وہ وبا سے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے نکلے۔ اسے سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے: وہ طاعون سے فرار اختیار کرتے ہوئے نکلے تو وہ مر گئے، پھر انبیاء علیہم السلام میں سے ایک نبی علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ وہ انہیں زندہ فرما دے تاکہ وہ اس کی عبادت کریں تو اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ فرما دیا (2) اور عمرو بن دینار نے اس آیت کے بارے کہا ہے: ان کی بستی میں طاعون پھیل گیا تو کچھ لوگ وہاں سے نکل گئے اور کچھ لوگ باقی رہ گئے اور نکلنے والوں کی تعداد باقی رہنے والوں کی نسبت زیادہ تھی، فرمایا: پس جو نکل گئے وہ محفوظ رہے اور جو وہیں مقیم رہے وہ مر گئے اور جب دوسری بار ایسا ہوا تو سوائے قلیل لوگوں کے وہ تمام کے تمام نکل گئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اور ان کے جانوروں کو بھی موت دے دی، پھر انہیں زندہ کر دیا اور وہ اپنے شہروں کی طرف لوٹ گئے اور ان کی اولاد بھی پیدا ہوئی۔ اور حسن نے کہا ہے: وہ طاعون سے ڈرتے ہوئے نکلے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اور ان کے جانوروں کو ایک ہی ساعت میں مار دیا اور وہ چالیس ہزار تھے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس پر اس آیت میں کئی احکام مرتب ہوتے ہیں۔ ائمہ نے روایت کیا ہے اور عامر بن سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما کی حدیث سے الفاظ بخاری کے ہیں کہ انہوں نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو سنا وہ حضرت سعد کو حدیث بیان کر رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وبا کا ذکر کیا اور فرمایا: ''(یہ) رجز یا عذاب ہے جس کے ساتھ بعض امتوں کو عذاب دیا گیا پھر اس سے کچھ بچ جانے والے باقی رہے اور وہ ایک بار ختم ہو جاتا ہے اور دوسری بار پھر آتا ہے۔ پس جو کوئی اس کے بارے کسی زمین میں سنے تو اسے چاہئے کہ وہ وہاں بالکل نہ آئے اور جو اس علاقے میں ہو کہ وہاں وبا پھیل جائے تو وہ اس سے فرار اختیار کرتے ہوئے نہ نکلے (3)''۔ اسے ابو عیسیٰ ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے: ہمیں قتیبہ نے بیان کیا ہے کہ ہمیں حماد بن زید نے عمرو ابن دینار عن عامر بن سعد عن اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کی سند سے خبر دی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طاعون کا ذکر کیا اور فرمایا: ''یہ باقی رہنے والا رجز یا عذاب ہے جو بنی اسرائیل کی ایک جماعت پر بھیجا گیا۔ پس جب کسی زمین میں واقع ہو اور تم وہاں ہو تو وہاں سے نہ نکلو اور جب کسی زمین میں واقع ہو اور تم وہاں نہ ہو تو تم وہاں نہ جاؤ (4)''۔ فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور اس حدیث کے مقتضا کے مطابق حضرت عمر اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عمل کیا جب وہ مقام سرغ سے اس وقت واپس لوٹے جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے انہیں حدیث کے بارے خبر دی۔ اسی بناء

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 328، دار الکتب العلمیہ
2۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 700، دار احیاء التراث العربیۃ
3۔ صحیح بخاری، کتاب الحیل، جلد 2، صفحہ 1032، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب ما یذکر فی الطاعون، حدیث نمبر 5288، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
4۔ جامع ترمذی، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 126، وزارت تعلیم۔
ایضاً سنن ترمذی، باب ما جاء فی کراہیۃ الفرار من الطاعون، حدیث نمبر 985، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
ایضاً صحیح بخاری، باب ما یذکر فی الطاعون، حدیث نمبر 5288، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پر یہ مؤطا وغیرہ میں مشہور ہے۔

اور ایک قوم نے وباء اور بیماری والی زمین سے فرار کو مکروہ قرار دیا ہے، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: ''وباء سے بھاگنا میدان جہاد سے بھاگنے کی طرح ہے (1) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ شام کی طرف نکلنے کا واقعہ معروف ہے اور اس میں ہے کہ آپ واپس لوٹ آئے۔ اور علامہ طبری نے کہا ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی حدیث میں اس پر دلیل موجود ہے کہ آدمی پر تکلیف اور اذیت ناک چیزوں کے آنے سے پہلے ان سے بچنا اور احتیاط کرنا لازم ہے اور خوف زدہ کرنے والی اشیاء کے ہجوم اور حملہ سے پہلے ان سے اجتناب کرنا ایک طرف ہو جانا لازم ہے اور ان کے آنے کے بعد اس پر صبر کرنا اور جزع فزع نہ کرنا لازم ہے اور یہ اس لئے ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے منع فرمایا ہے جو وباء والی زمین میں نہ ہو کہ وہ وباء پھیل جانے کے بعد اس میں داخل ہو اور جو وہاں ہو اسے وباء پھیل جانے کے بعد اس سے فرار اختیار کرتے ہوئے نکلنے سے منع فرمایا ہے۔ پس ضروری ہے کہ اسی طرح امور کی تکالیف و مصائب سے ہر بچنے والے کے لئے حکم ہو۔ اس میں اس کے لئے طاعون سے بچنے کی راہ بھی ہے اور یہ معنی حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے اس ارشاد کی مثل ہے: ''تم دشمن سے ملاقات کی (جنگ کرنے کی) تمنا نہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے عافیت کی التجاء کرو اور جب تمہارا ان سے آمنا سامنا ہو جائے تو پھر صبر کرو (2)۔''

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس باب میں یہی صحیح ہے اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مقتضا ہے اور اسی پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نیکوکار اور عظیم المرتبت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو اس پر بطور حجت فرمایا جبکہ انہوں نے آپ سے کہا: کیا اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے فرار ہے؟ تو آپ نے فرمایا: اے ابوعبیدہ! کاش! تیرے سوا کوئی اور یہ کہتا: ہاں، ہم اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے اللہ تعالیٰ کی تقدیر کی طرف ہی بھاگ رہے ہیں۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے اور اس کے خلاف جو مقدر فرما دیا ہے اس سے بچنے کے لئے انسان کے پاس کوئی پناہ گاہ نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں ڈرانے والی اور ہلاک کرنے والی اشیاء سے بچنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے اور وسعت و طاقت کے مطابق مکروہات سے بچنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے۔ پھر آپ نے انہیں فرمایا: تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر تیرا اونٹ ہو اور تو وادی میں اترے جس کے دو کنارے ہوں ان میں سے ایک سرسبز و شاداب ہو اور دوسرا قحط زدہ ہو، کیا یہ نہیں ہے کہ اگر تو نے سرسبز و شاداب حصہ میں چرایا تو وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے ساتھ ہے اور اگر تو نے قحط زدہ حصہ میں چرایا تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے ساتھ ہے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی اس جگہ سے مدینہ منورہ کی طرف لوٹ گئے۔

الکیا الطبری نے کہا ہے: ہم کوئی اختلاف نہیں جانتے کہ کفار یا ڈاکو جب ایک کمزور شہر کا قصد کریں اور اس کے باسیوں میں ان کے مقابلہ کی طاقت نہ ہو تو ان کے لئے جائز ہے کہ وہ ان کے سامنے سے دور ہٹ جائیں، اگرچہ موت کی مقررہ مدت

1۔ مشکوۃ المصابیح، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 139، قدیمی کتب خانہ

2۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 424، وزارت تعلیم۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2744، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں کوئی زیادتی اور کمی نہیں ہوسکتی۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ وبا سے فرار اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ وبا کی جگہ میں جو ہو رہا ہے، شاید اس سے کچھ حصہ لے لیا جائے تاکہ اس مرض عام کے سبب میں اس جگہ والے شریک ہو جائیں اور وہاں سے بھاگنے کا کوئی فائدہ نہ رہے، بلکہ وہ اسے سفر کی ان مشقتوں کی طرف منسوب کرے گا جو اسے وبا کی مبادیات میں سے پہنچیں۔ پس درد کئی گنا بڑھ جائے گا اور ضرر زیادہ ہو جائے گا اور وہ ہر راستے میں ہلاک ہو جائیں گے اور وہ ہر کشادہ اور تنگ جگہ میں گر جائیں گے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے جو کوئی وبا سے نہیں بھاگا وہ محفوظ رہا۔ اسے ابن المدائنی نے بیان کیا ہے اور اس میں الله تعالیٰ کی نصیحت کافی ہے کہ فرمایا: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ هُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۖ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا، شاید اگر وہ فرار ہو اور بچ جائے تو وہ کہنے لگے: بلاشبہ میں نے اپنے نکلنے کے سبب وبا سے نجات پالی ہے تو اس طرح اس کا اعتقاد خراب اور فاسد ہو جائے گا۔ بالجملہ اس سے فرار ممنوع ہے اس وجہ سے جو ہم نے ذکر کر دی ہے اور اس وجہ سے بھی کہ اس میں شہروں کو خالی کرنا لازم آتا ہے اور کمزور لوگ اس سے بھی بری نہیں ہوتے کیونکہ ان پر شہروں سے نکلنا مشکل ہوتا ہے اور ان کے لئے ایسا کرنا آسان نہیں ہوتا اور وہ ان سہولتوں سے شہروں کے خالی ہونے کے سبب اذیت اٹھاتے ہیں جو شہروں کا حصہ ہوتی ہیں اور کمزور لوگوں کے لئے معاون اور مددگار ہوتی ہیں۔

اور جب کسی زمین میں وبا ہو تو وہاں احتیاط، خوف اور ضرر کے مقامات سے پرہیز کرنے کے ارادہ سے کوئی نہ آئے اور ایسے وہموں کو دور کرنے کے لئے جو انسان کے دل میں تشویش پیدا کر دیتے ہیں اور وہاں داخل ہونے میں ہلاکت ہے اور وہ الله تعالیٰ کے حکم میں جائز نہیں ہوتا، کیونکہ مکروہ سے اپنے آپ کو بچانا واجب ہے اور اس پر سوء اعتقاد کا خوف کیا جا سکتا ہے کہ وہ یہ کہنے لگے: اگر میں اس جگہ میں داخل نہ ہوتا تو مجھے یہ تکلیف نہ آتی۔ پس طاعون زدہ علاقے میں داخل ہونے سے منع کرنے یا وہاں سے نکلنے سے منع کرنے میں یہی فائدہ ہے۔ والله اعلم۔

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: طاعون مقیم پر اور بھاگنے والے پر ایک آزمائش ہے۔ کیونکہ بھاگنے والا کہتا ہے: میں نے اپنے فرار کے سبب نجات پالی ہے اور مقیم کہتا ہے: میں یہاں مقیم رہا سو میں مر گیا۔ اسی قسم کی طرف امام مالک نے اس وقت اشارہ کیا جس وقت ان سے کوڑھ زدہ کی طرف دیکھنے کی کراہت کے بارے پوچھا گیا، تو آپ نے فرمایا: میں نے اس میں کوئی کراہت نہیں سنی ہے اور جو روایات اس سے نہی کے بارے وارد ہوئی ہیں وہ صرف اس خوف سے ہیں کہ وہ اسے گھبراہٹ اور اضطراب میں مبتلا کر دے گا یا اسے وہ شے (وہم) خوفزدہ کرتی رہے گی جو اس کے دل میں واقع ہو جائے گی۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وبا کے بارے میں فرمایا ہے: "جب تم کسی زمین میں اس کے بارے سنو تو تم اس کی طرف نہ آؤ اور جب وبا پھیل جائے اور تم وہاں ہو تو پھر اس سے فرار اختیار کرتے ہوئے نہ نکلو" اور اس شہر کے بارے میں بھی پوچھا گیا جس میں موتیں اور بیماریاں واقع ہو رہی ہوں کیا اس سے نکلنا بھی مکروہ ہے؟ تو فرمایا: میں کوئی حرج نہیں دیکھتا وہ نکلے یا وہیں مقیم رہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد گرامی: "جب کسی زمین میں وبا واقع ہو جائے اور تم وہاں ہو تو اس

سے فرار اختیار کرتے ہوئے نہ نکلو(1)'' اس میں اس پر دلیل ہے کہ فرار کے ارادہ کے بغیر طاعون والے شہر سے نکلنا جائز ہے، بشرطیکہ اعتقاد یہ ہو کہ جو کچھ اسے پہنچنا ہے وہ اس سے خطا نہیں ہو سکتا اور اسی طرح حکم وہاں داخل ہونے کا بھی ہے جبکہ اسے یہ یقین ہو کہ اس کا داخل ہونا اس کی طرف ایسی تقدیر کو نہیں کھینچ سکتا جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے مقدر نہیں بنائی۔ پس آدمی کے لئے وہاں داخل ہونا اور وہاں سے نکلنا اس حد کی بنا پر مباح ہے جو ہم نے ذکر کی ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 5۔ طاعون پر صبر کی فضیلت اور اس کے بیان کے بارے میں یہ ہے کہ الطاعون بروزن فاعول الطعن سے ماخوذ ہے مگر یہ کہ جب اسے اصل معنی سے پھیر دیا گیا تو اسے وبا کے سبب عام موت پر دلالت کرنے کے لئے وضع کر دیا گیا۔ جوہری نے یہی کہا ہے اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے روایت کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری امت کی فنا طعن اور طاعون سے ہے۔(2)'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی: طعن کو تو ہم نے پہچان لیا ہے پس طاعون کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ پھوڑ (گلٹی) ہے اونٹ کے پھوڑے (طاعون) کی طرح جو کہ پیٹ سے نیچے والی جگہوں اور بغلوں کے نیچے نکلتا ہے(3)۔

علماء نے کہا ہے: اس وبا کو اللہ تعالیٰ بطور عذاب اور سزا کے اپنے بندوں میں سے گنہگاروں اور کافروں میں سے جن پر چاہتا ہے بھیج دیتا ہے اور کبھی اسے صالحین کے لئے شہادت اور رحمت بنا کر بھیج دیتا ہے، جیسا کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے طاعون عمواس میں کہا: بے شک یہ تمہارے لئے شہادت اور رحمت ہے اور تمہارے نبی علیہ السلام کی دعا ہے: اے اللہ! معاذ اور اس کے گھر والوں کو اپنی رحمت سے ان کا حصہ عطا فرما۔ اور ان کی ہتھیلی میں نیزہ مارا گیا۔

حضرت ابوقلابہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: تحقیق میں نے شہادت اور رحمت کو تو پہچان لیا اور میں اسے نہ پہچان سکا کہ یہ تمہارے نبی کی دعا ہے؟ چنانچہ میں نے اس کے بارے پوچھا تو کہا گیا: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دعا فرمائی کہ آپ کی امت کی فنا طعن اور طاعون سے ہو، جس وقت آپ نے یہ دعا مانگی کہ آپ کی امت کا آپس میں لڑائی جھگڑا نہ ہو تو اس سے آپ کو روک دیا گیا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ دعا مانگی۔

اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ وغیرہ کی حدیث سے روایت کیا جاتا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''طاعون سے بھاگنے والا میدان جہاد کے لشکر سے بھاگنے والے کی طرح ہے اور اس میں صبر کرنے والا میدان جہاد میں صبر کرنے والے کی طرح ہے(4)۔'' اور بخاری میں حضرت یحییٰ بن یعمر سے روایت ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اسے خبر دی کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طاعون کے بارے پوچھا، تو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بتایا کہ یہ ایک عذاب ہے جسے اللہ تعالیٰ جن پر چاہتا ہے بھیج دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے مومنین کے لئے رحمت بنایا ہے، پس کوئی بندہ نہیں ہے جو طاعون میں مبتلا ہو جاتا ہے اور صبر کرتے ہوئے اسی شہر میں ٹھہرا رہتا ہے اور وہ یہ یقین رکھتا ہے کہ اسے ہرگز کوئی مصیبت نہیں پہنچے گی مگر وہی جو اللہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 494، وزارت تعلیم　　2۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 6، صفحہ 255، دار صادر بیروت

3۔ ایضاً　　4۔ مشکوۃ المصابیح، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 139، قدیمی کتب خانہ

تعالیٰ نے اس کے لئے لکھ دی ہے مگر اس کے لئے شہید کے اجر کی مثل اجر ہے(1)۔" اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس قول کی یہی تفسیر ہے کہ" طاعون شہادت ہے اور مطعون شہید ہے(2)۔" یعنی اس پر صبر کرنے والا کہ اس کے اجر کا حساب اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہے اور یہ جاننے والا کہ اسے ہر گز کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی مگر وہی جو اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے لکھ دی ہے، اسی لئے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے تمنا کی کہ اس میں فوت ہو جائیں کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جو مر گیا وہ شہید ہے اور جو کوئی طاعون سے خوفزدہ ہو گیا اور اسے مکروہ جانا اور اس سے بھاگ گیا تو وہ اس حدیث کے معنی میں داخل نہیں ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 6۔ ابو عمر نے کہا ہے: مجھ تک کوئی خبر نہیں پہنچی کہ اہل علم میں سے کوئی طاعون سے بھاگا ہو سوائے اس کے جو ابن مدائنی نے ذکر کی ہے کہ علی بن زید بن جدعان طاعون کی وجہ سے السیالہ (یہ مدینہ منورہ کے قریب ایک جگہ کا نام ہے اہل مدینہ کا مکہ کی طرف آتے ہوئے یہ پہلا مرحلہ ہے اور یہ قول بھی ہے کہ یہ ملل اور روحاء کے درمیان واقع ہے)۔ (شرح القاموس) کی طرف چلے گئے اور وہ ہر جمعہ کی نماز میں شریک ہونے کے لئے لوٹ آتے تھے اور جب وہ جمعہ میں شریک ہوتے تو لوگ ان کے بارے پکارتے تھے: فر من الطاعون یہ طاعون سے بھاگ گئے ہیں۔ اور وہ السیالہ میں ہی فوت ہوئے۔ ابن مدائنی نے مزید کہا: عمرو بن عبید اور رباط بن محمد رباطیہ کی طرف بھاگ گئے اور ابراہیم بن علی الفقیمی نے اس بارے میں کہا ہے:

و لما استفز الموتُ کلَّ مکذِّبٍ صبرتُ و لم یصبر رباطٌ ولا عمرو

جب موت نے ہر جھٹلانے والے کو ہلاک و برباد کر دیا (تو) میں نے صبر کیا اور رباط اور عمرو نے صبر نہ کیا۔

اور ابو حاتم نے اصمعی سے بیان کیا ہے کہ اس نے کہا: بصرہ کے بعض لوگ طاعون سے بھاگے اور ان میں سے کوئی اپنے گدھے پر سوار ہوا اور سفوان (یہ بصرہ میں باب المربد سے ایک مرحلہ کے فاصلہ پر پانی ہے) معجم یاقوت کی طرف اپنے گھر والوں کے پاس چلا گیا اور اس نے حدی گانے والے کو سنا کہ وہ اس کے پیچھے حدی گا رہا ہے:

لن یُسبقَ اللہ علی حمار ولا علی ذی مَنْعة طیّارِ
اویأتی الحَتفُ علی مقدارِ قد یُصبحِ اللہ أمام الساری

اور مدائنی نے ذکر کیا ہے: عبد العزیز بن مروان کی حکومت کے دوران مصر میں طاعون پڑا، تو وہ اس سے بھاگتے ہوئے نکل گیا اور الصعید کے دیہاتی علاقوں میں سے ایک دیہات میں جا اترا۔ اسے سُکّر یہ الصعید کے مشرق کے علاقہ میں واقع ہے۔ اس کے اور مصر کے درمیان دو دن کا فاصلہ ہے (یاقوت) کہا جاتا ہے۔ تو عبد العزیز نے اس سے پوچھا: تیرا کیا نام ہے؟ تو اس نے کہا: طالب بن مدرک۔ تو اس نے کہا: اوہ میں اپنے آپ کو فسطاط کی طرف لوٹنے والا نہیں دیکھ رہا پھر وہ اسی گاؤں میں مر گیا۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الطب، جلد 2، صفحہ 853، وزارت تعلیم

2۔ صحیح بخاری، کتاب الطب، جلد 2، صفحہ 853، و۔ت۔ ایضاً صحیح بخاری، باب ما یذکر فی الطاعون، حدیث نمبر 92-5291، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

''اور لڑائی کرو اللہ کی راہ میں اور جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔''

یہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑائی کرنے کا خطاب حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو ہے۔ یہ جمہور کا قول ہے اور اس سے ارادہ اور نیت یہ کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ ہی بلند ہے(1)۔ اور اللہ تعالیٰ کے راستے کثیر ہیں اور یہ ہر راستے کو عام ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْ (آپ فرما دیجئے: یہ میری راہ ہے)

امام مالک نے فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ کے راستے کثیر ہیں اور کوئی راستہ نہیں ہے مگر اس پر یا اس میں یا اس کے لئے قتال کیا جاتا ہے اور ان میں سب سے عظیم دین اسلام ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خطاب ان لوگوں کے لئے ہے جو بنی اسرائیل میں سے زندہ کیے گئے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے اور وَ قَاتِلُوْا میں واؤ سابقہ امر پر عطف کرنے کے لئے ہے اور کلام میں اس کی تقدیر کو چھوڑ دیا گیا ہے: وقال لھم، قاتلوا اور پہلے قول کی بنا پر یہ سارا کلام سابقہ جملہ پر معطوف ہے۔ اور کلام میں مضمر ماننے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔

نحاس نے کہا ہے: وَ قَاتِلُوْا یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مومنین کو حکم ہے کہ تم نہ بھاگو جیسا کہ وہ بھاگ گئے۔ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ یعنی وہ تمہارے قول کو بھی سن لے گا اگر تم نے اس کی مثل کہا جیسا کہ انہوں نے کہا اور اس سے تمہاری مراد کو بھی جان لے گا۔

اور علامہ طبری نے کہا ہے: اس قول کی کوئی دلیل اور وجہ نہیں ہے جس نے یہ کہا کہ لڑائی کرنے کا حکم ان لوگوں کو ہے جنہیں زندہ کیا گیا۔ واللہ اعلم

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ؕ وَ اللّٰهُ يَقْبِضُ وَ يَبْصُۜطُ ۪ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝

''کون ہے جو دے اللہ تعالیٰ کو قرض حسن، تو بڑھا دے اللہ اس قرض کو اس کے لئے کئی گنا اور اللہ تعالیٰ تنگ کرتا ہے (رزق کو) اور فراخ کرتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔''

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا۔ جب اللہ تعالیٰ نے حق کی راہ پر جہاد اور قتال کرنے کا حکم ارشاد فرمایا کیونکہ شریعت میں سے کوئی شے (حکم) نہیں ہے مگر اس کی حفاظت اور اس کے دفاع میں قتال جائز ہوتا ہے اور ان میں عظیم تر دین اسلام ہے جیسا کہ امام مالک نے کہا ہے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ نے اس میں (اپنا مال) خرچ کرنے پر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 329، دار الکتب العلمیہ

برانگیختہ کیا۔ پس اس خبر میں اللہ تعالیٰ کے راستے میں جنگ کرنے والا بھی داخل ہے (اور لشکر کی تیاری میں سامان خرچ کرنے والا بھی) کیونکہ وہ بھی ثواب کی امید پر یہ مال دیتا ہے جیسا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے جیش عسرہ (غزوۂ تبوک) میں کیا (1)۔

اور مَنْ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور ذَا اس کی خبر ہے۔ اور الَّذِیْ اس کی صفت ہے اور اگر چاہے تو بدل بنالے۔

جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت ابوالدحداح رضی اللہ عنہ نے اپنے رب سے ثواب چاہتے ہوئے اپنا مال صدقہ کرنے میں بہت تیزی اور جلدی کی۔ ہمیں شیخ الفقیہ، امام، محدث، قاضی ابوعامر یحییٰ بن عامر بن احمد بن منیع الاشعری نسباً و مذہباً قرطبہ میں۔ اللہ تعالیٰ اسے دوبارہ لوٹائے۔ ربیع الثانی ۶۲۸ھ میں میری طرف سے ان پر قراءت کے دوران انہوں نے خبر دی اور کہا: ہمیں ابواجازہ نے خبر دی، فرمایا: میں نے ابوعبداللہ بن سعدون سے سماع کرتے ہوئے ابوبکر عبدالعزیز بن خلف بن مدین الازدی پر پڑھا، اس نے کہا: ہمیں ابوالحسن علی بن مہران نے بیان کیا اور کہا: ہمیں ابوالحسن محمد بن عبداللہ ابن زکریا بن حیوہ النیشاپوری (متوفی) ۳۶۶ھ نے بیان کیا اور کہا ہمیں میرے چچا ابوزکریا یحییٰ ابن زکریا نے خبر دی اور کہا: ہمیں محمد بن معاویہ بن صالح نے بتایا کہ ہمیں خلف بن خلیفہ نے حمید الاعرج عن عبداللہ بن الحارث عن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی سند سے حدیث بیان کی ہے۔ انہوں نے کہا: جب یہ آیت نازل ہوئی: **مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا** تو حضرت ابوالدحداح رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا اللہ تعالیٰ ہم سے قرض کا ارادہ فرمارہا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں اے ابوالدحداح۔ تو انہوں نے عرض کی: اپنا دست مبارک مجھے دکھائیں اور پھر آپ نے اسے دراز کیا۔ تو انہوں نے عرض کی: بلاشبہ میں نے اللہ تعالیٰ کو وہ باغ بطور قرض دے دیا جس میں چھ سو کھجور کے درخت ہیں پھر چلتے ہوئے آئے یہاں تک کہ اس باغ کے پاس آگئے اور ام دحداح اپنے بچوں سمیت اس میں تھی، تو آپ نے اسے آواز دی: اے ام دحداح! اس نے کہا: لبیک (میں حاضر ہوں) آپ نے فرمایا: تو باہر نکل آ، میں نے اپنا وہ باغ اپنے رب کو قرض دے دیا ہے (2) جس میں چھ سو درخت ہیں۔

اور حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: جب یہ آیت نازل ہوئی: **مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا** تو حضرت ابوالدحداح نے عرض کی: میرے ماں باپ آپ پر نثار ہوں، یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ ہم سے قرض طلب فرما رہا ہے۔ حالانکہ وہ تو قرض سے غنی اور بے نیاز ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں وہ تمہیں اس کے عوض جنت میں داخل فرمانے کا ارادہ رکھتا ہے۔'' تو انہوں نے عرض کی: بلاشبہ اگر میں اپنے رب کو قرض پیش کردوں تو وہ اس کے عوض میرا ضامن ہو جائے گا اور میری بچی الدحداحہ کو بھی میرے ساتھ جنت میں پہنچا دے گا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں'' تو انہوں نے عرض کی پھر اپنا ہاتھ مجھے دیجئے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ انہیں دیا، تو انہوں نے کہا: بلاشبہ میرے دو باغ ہیں ان میں سے ایک سافلہ (نچلی زمین) میں ہے اور دوسرا عالیہ (بلند زمین) میں۔ قسم بخدا! میں ان کے سوا کسی شے کا مالک نہیں

1۔ سنن ترمذی، باب فی مناقب عثمان بن عفان، حدیث نمبر 3633، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ شعب الایمان، جلد 3، صفحہ 250، دارالکتب العلمیہ

ہوں، تحقیق میں نے وہ دونوں باغ اللہ تعالیٰ کو قرض دے دیے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تو ان میں سے ایک اللہ تعالیٰ کے لئے دے دے اور دوسرے کو اپنے اور اپنے بال بچوں کی گزراوقات کے لئے رکھ لے۔'' انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ میں آپ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں: میں نے ان میں سے زیادہ اچھا اور بہتر اللہ تعالیٰ کے لئے دے دیا اور وہ وہ باغ ہے جس میں چھ سو درخت ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تب اللہ تعالیٰ اس کے عوض تجھے جنت کی جزا عطا فرمائے گا۔'' پھر ابوالدحداح رضی اللہ عنہ چل پڑے یہاں تک کہ ام الدحداح کے پاس آپہنچے اور وہ اپنے بچوں کے ساتھ باغ میں درختوں کے نیچے گھوم پھر رہی تھی تو آپ کہنے لگے:

هداكِ ربي سُبُلَ الرشاد الى سبيل الخير و السداد
بِينِي من الحائط بالوداد فقد مضى قرضا الى التناد
اقرضته الله على اعتمادي بالطَّوع لا مَنٍّ ولا ارتداد
الا رَجاء الضِعف في المَعاد فارتحلي بالنفس والاولاد
والبِرّ لا شكّ فخيرُ زاد قدّمَه المرءُ الى المعاد

تو ام الدحداح نے کہا: تو نے نفع بخش سودا کیا ہے، اللہ تعالیٰ تجھے اس میں برکت عطا فرمائے جو تو نے خریدا ہے، پھر ام الدحداح نے آپ کو جواب دیا اس طرح کہا:

بشّرك الله بخير و فَرَح مثلُك أدّى ما لديه ونَصَح
قد مَتَّع الله عيالي و مَنَح بالعَجْوَة السَّوداء والزَّهوِ البَلَح
والعبدُ يسعىٰ وله ما قد كَدَح طول الليالي و عليه ما اجْتَرَح

پھر ام الدحداح اپنے بچوں کے پاس آئی، جو کچھ ان کے مونہوں میں تھا اسے نکالنے لگی اور جو ان کے پاس خوشوں میں تھا اسے بھی جھاڑ دیا یہاں تک کہ وہ دوسرے باغ میں منتقل ہوگئی اور حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''کتنے ہی پھلوں سے لدے ہوئے بھاری بھرکم درخت اور وسیع گھر ابوالدحداح کے لئے ہیں''۔(1)

مسئلہ نمبر 2۔ ابن عربی نے کہا ہے: مخلوق خالق کے حکم، اس کی حکمت، اس کی قدرت، اس کی مشیت اور اس کی قضا وقدر کے مطابق تقسیم ہوگئی جب انہوں نے یہ آیت سنی پس وہ تین حصوں میں بٹ گئے۔

پہلا گروہ انتہائی کمینہ اور رذیل ہے۔ انہوں نے کہا: بے شک محمد (مصطفیٰ ﷺ) کا رب فقیر اور ہمارا محتاج ہے اور ہم غنی ہیں، پس یہ ایسی جہالت ہے جو کسی بھی صاحب عقل پر مخفی نہیں۔ سو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول سے ان کا رد کیا: لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ۔ (آل عمران: 181)

اور دوسرا گروہ وہ ہے کہ جب اس نے یہ قول سنا تو اس نے بخل اور کنجوی کو ترجیح دی اور مال میں رغبت کو مقدم سمجھا اور انہوں

1۔ شعب الایمان، جلد 3، صفحہ 249، حدیث نمبر 3451، دار الکتب العلمیہ

نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں کچھ خرچ نہ کیا، نہ انہوں نے کسی قیدی کو چھڑایا اور نہ کسی کی معاونت کی۔ اطاعت و پیروی سے سستی اور کوتاہی کرتے ہوئے اور اس دنیا کی طرف میلان رکھتے ہوئے۔

اور تیسرا گروہ وہ ہے جس نے یہ قول سنا تو اس کی پیروی اور تعمیل میں جلدی کی اور ان میں سے ایک قبول کرنے والے نے تو اپنے مال کی طرف تیزی سے بڑھنے کو ترجیح دی جیسا کہ حضرت ابوالدحداح رضی اللہ عنہ وغیرہ۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: قَرْضًا حَسَنًا، القرض کا معنی ہے: اسم لکل مایلتمس علیہ الجزاء یعنی قرض ہر اس شے کا نام ہے جس پر وہ جزا کا طالب ہوتا ہے۔ اقرض فلان فلانا یعنی فلاں نے فلاں کو وہ عطا کیا جس کے بدل کا وہ اس سے تقاضا کر سکتا ہے۔ لبید نے کہا:

و اذا جُوزِيتَ قَرْضًا فَاَجْزِهٖ ... انما يَجْزِي الْفَتَىٰ ليس الجَمَلُ

جب تجھے بطور قرض جزا دی جائے تو تو اس کی جزا دے بلاشبہ جوان ہی جزا اور بدلہ دیتا ہے نہ کہ اونٹ۔

اور القرض یعنی قاف کے کسرہ کے ساتھ یہ بھی ایک لغت ہے جسے کسائی نے بیان کیا ہے اور استقرضت من فلان کا معنی ہے میں نے اس سے قرض طلب کیا پس اس نے مجھے قرض دے دیا۔ اور اقترضت منہ کا معنی ہے میں نے قرض لیا۔ اور زجاج نے کہا ہے: لغت میں قرض کا معنی ہے البلاء الحسن و البلاء السوء یعنی اچھی آزمائش اور بری آزمائش۔ امیہ نے کہا ہے:

كل امْرِئٍ سوفَ يُجْزٰى قَرْضَه حسنا ... او سيئًا و مَدِينًا مثلَ مَادَانَا

ہر آدمی کو اس کے قرض کا بدلہ دیا جائے گا چاہے وہ حسن ہو یا سیئہ ہو اور جس کو قرض دیا گیا ہے وہ قرض دینے والے کی مثل ہے۔

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے:

تُجَازٰى الْقُرُوْضُ بِاَمْثَالِهَا ... فَبِالْخَيْرِ خيرًا و بِالشَّرِّ شَرًّا

قرضوں کا بدلہ ان کی مثلوں کے ساتھ ہی دیا جائے گا پس اچھائی کا بدلہ اچھائی کے ساتھ اور شر کا بدلہ شر کے ساتھ ہوگا۔

اور کسائی نے کہا ہے: قرض سے مراد وہ اچھے یا برے اعمال ہیں جو گزر گئے اور کلمے کا اصل معنی قطع کرنا اور کاٹنا ہے اور اسی سے المقراض قینچی ہے اور اقرضتہ سے مراد یہی ہے کہ میں نے اس کے لئے اپنے مال سے ایک حصہ الگ کر دیا ہے جس پر بدلہ دیا جائے گا۔ اور انقرض القوم: اس کا معنی ہے ان کا اثر ختم ہو گیا اور وہ ہلاک ہو گئے۔ اور یہاں پر القرض اسم ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر یہاں اقراضاً ہوتا۔

اس آیت میں قرض کی استدعا کا مفہوم یہ ہے کہ یہ لوگوں کی تقریب الی الفہم اور انہیں ایسے انداز سے مانوس کرنے کے لئے ہے جسے وہ سمجھ سکتے ہیں ورنہ اللہ تعالیٰ تو الغنی الحمید ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بندۂ مومن کی وہ عطا جس کے عوض وہ آخرت میں ثواب کی امید رکھتا ہے اسے قرض کے ساتھ تشبیہ دی ہے جیسا کہ اس نے جنت کے حصول میں جان اور مال دینے کو بیع اور شرا سے تشبیہ دی ہے۔ اس کا بیان سورۂ براءت میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس آیت سے مراد صدقہ پر اور فقراء اور محتاج لوگوں پر مال خرچ کرنے اور ان پر وسعت و خوشحالی

لانے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں دین کی مدد و نصرت کرنے پر ابھارنا اور برانگیختہ کرنا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے کنایۃً فقیر کو اپنی ذات کے ساتھ ذکر کیا ہے صدقہ کی ترغیب دیتے ہوئے۔ اس کی علت یہ ہے کہ اس کی ذات حاجات سے منزہ اور پاک ہے جیسا کہ اس نے مریض، بھوکے اور پیاسے کو کنایۃً اپنی ذات سے تعبیر کیا ہے حالانکہ اس کی ذات نقائص و آلام سے پاک ہے۔

اور صحیح حدیث میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے خبر ہے (یعنی حدیث قدسی ہے) کہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اے آدم کے بیٹے! میں بیمار ہوا اور تو نے میری عیادت نہ کی اور میں نے تجھ سے کھانا طلب کیا اور تو نے مجھے کھانا نہ کھلایا اور میں نے تجھ سے پانی طلب کیا اور تو نے مجھے پانی نہ پلایا۔'' تو یہ عرض کرے گا: اے میرے رب! میں تجھے کیسے پلا سکتا تھا حالانکہ تو رب العالمین ہے؟ تو رب العالمین فرمائے گا: میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی طلب کیا اور تو نے اسے نہ پلایا۔ بلاشبہ اگر تو اسے پلا دیتا تو اسے میرے پاس پاتا (1)۔'' اور اسی طرح ان چیزوں میں بھی ہے جو اس سے پہلے ہیں۔ اسے مسلم اور بخاری نے روایت کیا ہے اور یہ سب کی سب اس کے لئے محل شرف میں واقع ہیں جس کے بارے اسے ترغیب دینے کے لئے کنایۃً ذکر کیا جس کو اس کے ساتھ خطاب کیا گیا۔

مسئلہ نمبر 4۔ قرض لینے والے پر قرض کو واپس لوٹانا واجب ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں کچھ خرچ کیا تو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ضائع نہ ہوگا بلکہ وہ بالیقین ثواب لوٹائے گا اور اس نے جزا کو مبہم رکھا ہے اور حدیث شریف میں ہے: ''اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کیا گیا (مال) سات سو گنا اور اس سے بھی زیادہ تک بڑھا دیا جاتا ہے (2)۔'' جیسا کہ اس کا بیان اس سورۃ میں اس ارشاد کے تحت آئے گا۔ **مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ** الآیہ (بقرہ: 261)۔ اور یہاں فرمایا: **فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً** (بقرہ: 245) اور اس کی نہ کوئی انتہا ہے اور نہ کوئی حد۔

مسئلہ نمبر 5۔ قرض کا ثواب بہت زیادہ ہے، کیونکہ اس میں ایک مسلمان کے لئے وسعت اور کشادگی لانا ہے۔ ابن ماجہ نے اپنی سنن میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں نے شب معراج جنت کے دروازے پر لکھا ہوا دیکھا: صدقے کا اجر اس کی دس مثل ہے اور قرض کا اجر اٹھارہ مثل۔ تو میں نے حضرت جبریل امین علیہ السلام کو کہا: قرض میں کیا ہے کہ وہ صدقہ سے افضل ہے؟ تو انہوں نے کہا: کیونکہ سائل سوال کرتا ہے اور اس کے پاس (کچھ مال موجود ہوتا ہے) اور قرض لینے والا بغیر حاجت کے قرض کا مطالبہ نہیں کرتا (3)۔''

محمد بن خلف عسقلانی، یعلی، سلیمان بن یسیر نے قیس بن رومی سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ سلیمان بن اذنان نے علقمہ کو ایک ہزار درہم ان کی عطا (وظیفہ) تک قرض دیے پھر جب ان کی عطا کا وقت نکل گیا تو انہوں نے ان سے اس کا تقاضا

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب، جلد 2، صفحہ 318، وزارت تعلیم

2۔ جامع ترمذی، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 196، بیروت۔ جامع ترمذی، باب ماجاء فی فضل النفقۃ فی اللہ، حدیث 1550، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصدقات، جلد 1، صفحہ 177، وزارت تعلیم۔ سنن ابن ماجہ، باب القرض، حدیث نمبر 2421، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کیا اور اس پر شدت اور سختی کا اظہار کیا، تو انہوں نے وہ پورا کر دیا۔ گویا علقمہ ناراض ہو گئے اور کئی مہینے ٹھہرے رہے (اور ان سے نہ ملے) پھر ان کے پاس آئے اور کہا: مجھے ایک ہزار درہم میری عطا تک قرض دیجئے۔ انہوں نے کہا: ہاں بڑی عزت و کرامت سے! اے ام عتبہ وہ تھیلا لاؤ جس پر مہر لگی ہوئی ہے اور وہ تمہارے پاس ہے۔ راوی کا بیان ہے: چنانچہ وہ لے کر آئی تو انہوں نے کہا: قسم بخدا! یہ تمہارے وہی دراہم ہیں جو تم نے مجھے دیے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک درہم بھی نہیں ہلایا۔ تو آپ نے کہا: تیرے باپ کی قسم! جو تو نے میرے ساتھ سلوک کیا کس نے تجھے اس پر ابھارا؟ تو انہوں نے کہا: میں نے تم سے سنا ہے کہ تم حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہو کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو دو بار قرض دیتا ہے تو وہ اس کے ایک بار صدقہ دینے کی طرح ہے (1)۔'' فرمایا: مجھے ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسی طرح خبر دی ہے۔

(ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ روایت اس طرح مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو مسلمان بھی کسی مسلمان کو ایک دفعہ قرض دیتا ہے وہ اس کے دو دفعہ صدقہ کے برابر ہو جاتا ہے۔'' اسے ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے اور بیہقی نے مرفوع اور موقوف روایت کیا ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 6۔ آدمی کا قرض ایک کا بدلہ ایک ہوتا ہے، یعنی وہ اس پر اتنا ہی لوٹائے گا جتنا اس نے اسے قرض دیا ہے اور اہل علم نے اس پر اجماع کیا ہے کہ دنانیر، دراہم، گندم، جو، کھجور، کشمش اور ہر وہ شے طعام میں سے جس کی مثل موجود ہے اسے قرض کے طور پر لینا جائز ہے اور مسلمانوں نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہوئے اس پر اجماع کیا ہے کہ قرض میں زیادتی کی شرط لگانا ربا ہے۔ اگرچہ وہ چارے کی ایک مٹھی ہو۔ جیسا کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے یا ایک دانہ ہو اور جو چیز قرض کے طور پر لی ہے اس سے افضل واپس لوٹانا جائز ہے، بشرطیکہ اس کی شرط نہ لگائی جائے، کیونکہ یہ احسان کے باب سے ہے۔ البکر کے بارے میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے: ''بے شک تم میں سے اچھا وہ ہے جو قضا کے اعتبار سے زیادہ اچھا ہے (2)۔'' اسے ائمہ نے روایت کیا ہے، یعنی بخاری اور مسلم وغیرہما نے۔

پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعریف کی ہے جس نے ادائیگی اچھے طریقہ سے کی اور اسے مطلق قرار دیا اور اسے کسی صفت سے مقید نہ کیا اور اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے البکر کے بارے میں فیصلہ فرمایا اور اس سے مراد عمدہ اور پسندیدہ جوان اونٹ ہے اور عمدہ اونٹ وہ ہوتا ہے جو رباعی ہو۔ اس میں خیار سے مراد مختار ہے اور رباعی سے مراد وہ ہے جو چوتھے سال میں داخل ہو، کیونکہ وہ اس میں اپنے رباعیہ دانت گرا دیتا ہے اور یہ وہ دانت ہیں جو ثنایا سے ملے ہوتے ہیں اور یہ چاروں رباعیات کہلاتے ہیں۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع کیا ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ اور یہ جائز نہیں ہے کہ جس نے قرض لیا ہے وہ قرض دینے والے کو کچھ ہدیہ وغیرہ دے اور نہ ہی قرض دینے والے کو اسے قبول کرنا حلال ہے مگر یہ کہ پہلے بھی دونوں کی عادت ہو (کہ وہ ہدیہ اور تحفہ وغیرہ دیتے رہتے ہوں) سنت اسی طرح ہے۔ ابن ماجہ نے بیان کیا ہے کہ ہشام بن عمار، اسماعیل بن عیاش، عتبہ بن حمید الضبی نے یحییٰ بن ابی اسحاق الہنائی

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصدقات، جلد 1، صفحہ 177، وزارت تعلیم 2۔ ایضاً، صفحہ 176

سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے اس آدمی کے بارے میں پوچھا جو اپنے بھائی کو مال قرض کے طور پر دیتا ہے اور وہ اسے کچھ ہدیہ دیتا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی ایک اپنے بھائی کو قرض دے اور وہ اسے ہدیہ دے یا اسے اپنی سواری پر سوار کرے تو وہ اسے نہ قبول کرے اور نہ اس کی سواری پر سوار ہو مگر یہ کہ ان دونوں کے درمیان اس سے پہلے بھی یہ عادت جاریہ ہو(1)۔''

مسئلہ نمبر 8۔ قرض مال میں سے ہوتا ہے۔ تحقیق ہم اس کا حکم بیان کر چکے ہیں۔ اور یہ عزت و آبرو سے بھی ہوتا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث مروی ہے: ''کیا ہم میں سے کوئی ابو ضمضم کی طرح ہونے سے عاجز ہوگا کہ جب وہ اپنے گھر سے نکلتا تو کہتا: اے اللہ! میں نے اپنی عزت تیرے بندوں پر صدقہ کر دی (2)۔''

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: ''تو اپنی عزت اپنے فقر و افلاس کے دن کے لئے قرض دے دے۔'' مراد یہ ہے کہ جو کوئی تجھے گالی گلوچ دے تو تو اس سے حق نہ لے اور نہ تو اس پر حد قائم کر یہاں تک کہ قیامت کا دن آ جائے جو وافر اجر دینے والا ہے۔

اور امام ابوحنیفہ نے فرمایا ہے: عزت کو صدقہ کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ اور امام مالک سے مروی ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: یہ فاسد ہے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حدیث صحیح میں کہا ہے: ''بے شک تمہارے خون اور تمہارے اموال اور تمہاری عزتیں تم پر حرام ہیں (3)۔'' الحدیث۔ اور یہ تقاضا کرتی ہے کہ یہ تینوں محرمات اس میں ایک کے قائم مقام ہیں کہ ان کا احترام کرنا آدمی کے لئے فرض اور لازم ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: حَسَنًا واقدی نے کہا ہے: جس کی ذات کو اچھا شمار کیا جائے اور عمرو بن عثمان صدفی نے کہا ہے کہ اس کے ساتھ نہ احسان جتلایا جائے اور نہ وہ اسے اذیت اور پریشانی میں مبتلا کرے۔

اور سہل بن عبد اللہ نے کہا ہے: وہ اپنے قرض میں کسی عوض کا اعتقاد نہ رکھتا ہو۔

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: فَيُضْعِفَهٗ لَهٗٓ عاصم وغیرہ نے فَيُضَاعِفَهٗ الف اور فاء کے نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن عامر اور یعقوب نے عین کو مشدد بغیر الف کے اور فاء کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔

ابن کثیر، ابوجعفر اور شیبہ نے تشدید اور فاء کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور دوسروں نے الف کے ساتھ اور فاء کو مرفوع پڑھا ہے۔ جنہوں نے اسے رفع دیا ہے انہوں نے یقرض کے ساتھ ملایا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تقدیر عبارت ھو یُضَاعِفُهٗ ہے۔ اور جنہوں نے منصوب پڑھا ہے تو انہوں نے فاء کے ساتھ استفہام کا جواب بنایا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے پہلے اَنْ مضمر ہے۔ تشدید اور تخفیف دونوں لغتیں ہیں۔ اور تشدید کی دلیل اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ہے کیونکہ تشدید کثرت بیان کرنے کے لئے ہوتی ہے اور حسن اور سدی نے کہا ہے: ہم اس تضعیف (کئی گنا) کو نہیں جانتے مگر صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ اس کا

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصدقات، جلد 1، صفحہ 177، وزارت تعلیم۔ سنن ابن ماجہ، باب القرض، حدیث نمبر 2422، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 231، دار الفکر

3۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 632، وزارت تعلیم

ارشادگرامی ہے: وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ أَجْرًا عَظِيمًا (النساء)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یہ جہاد کے نفقہ کے بارے میں ہے اور ہم حساب لگاتے تھے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان تھے کہ ایک آدمی کا خرچ اپنی ذات پر اور اپنے رفقاء پر اور اپنی سواری پر بیس لاکھ تھا۔

مسئلہ نمبر 11 ۔ قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ یہ ہر شے میں عام ہے، پس وہی تنگ کرنے والا ہے اور وہی فراخ اور کشادہ کرنے والا ہے۔ ہم نے ''شرح الاسماء الحسنی فی الکتاب الاسنیٰ'' میں ان دونوں پر بحث کی ہے۔ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ یہ وعید ہے کہ وہ ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا دے گا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَ مَا لَنَاۤ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ قَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَ اَبْنَآىِٕنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ۝۲۴۶

''کیا نہیں دیکھا تم نے اس گروہ کو بنی اسرائیل سے (جو) موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد ہوا جب کہا انہوں نے اپنے نبی سے کہ مقرر کر دو ہمارے لئے ایک امیر تا کہ لڑائی کریں ہم اللہ کی راہ میں۔ نبی نے کہا: کہیں ایسا نہ ہو کہ فرض کر دیا جائے تم پر جہاد تو تم جہاد نہ کرو وہ کہنے لگے: (کوئی وجہ) نہیں ہمارے لئے کہ ہم جہاد نہ کریں اللہ کی راہ میں حالانکہ ہم نکالے گئے اپنے گھروں سے اور اپنے فرزندوں سے مگر جب فرض کر دیا گیا ان پر جہاد تو منہ پھیر لیا انہوں نے بجز چند کے ان میں سے اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے ظالموں کو۔''

قتال اور جنگ پر برانگیختہ کرنے کے بارے میں دوسرا قصہ بیان فرمایا جو بنی اسرائیل میں پیش آیا۔ الملأ کا معنی ہے اشراف لوگ، گویا کہ وہ شرف و عزت سے بھرے ہوئے ہیں اور زجاج نے کہا ہے: انہیں یہ نام دیا گیا کیونکہ وہ ان چیزوں سے بھرے ہوئے تھے جن کی انہیں ضرورت اور احتیاج ہوتی تھی۔

اور اس آیت میں الملأ سے مراد قوم ہے، کیونکہ معنی اس کا تقاضا کرتا ہے اور الملأ اسم جمع ہے جیسا کہ قوم اور رھط وغیرہ۔ اور الملأ کا معنی حسن خلق بھی ہے اور اسی معنی میں حدیث طیبہ ہے: احسنوا الملأ فکلکم سیروی، (1) اسے مسلم نے روایت کیا ہے (تم اخلاق اچھے کرلو تو تم تمام کے تمام سیراب (خوشحال) ہو جاؤ گے)

قولہ تعالیٰ: مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وصال کے بعد۔ اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا، کہا گیا ہے کہ وہ نبی حضرت شمویل بن بال بن علقمہ تھے اور وہ ابن العجوز کے لقب سے معروف تھے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت شمعون تھے، سدی نے یہی کہا ہے اور بلاشبہ کہا گیا ہے کہ ابن العجوز لقب اس لئے تھا کہ ان کی ماں بوڑھی تھی تو اس نے

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، جلد 1، صفحہ 240، وزارت تعلیم

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بیٹے کی التجا کی حالانکہ وہ بوڑھی اور بانجھ ہو چکی تھی، تو اللہ تعالیٰ نے اسے وہ عطا فرما دیا اور انہیں سمعون بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس بڑھیا نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تھی کہ وہ اسے بیٹا عطا فرمائے تو رب کریم نے اس کی دعا سن لی اور بڑھیا نے بچے کو جنم دیا۔ پس اس نے اس کا نام سمعون رکھا، وہ کہتی: اللہ تعالیٰ نے میری دعا سن لی ہے اور سین عبرانی زبان میں شین ہو جاتی ہے اور وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔

اور مقاتل نے کہا ہے کہ وہ حضرت ہارون علیہ السلام کی نسل میں سے تھے اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ وہ حضرت یوشع بن نون تھے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ ضعیف ہے، کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام کا زمانہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہے درمیان میں لوگوں کی کئی امتیں ہیں۔ اور حضرت یوشع حضرت موسیٰ علیہ السلام کے غلام تھے (1) اور محاسبی نے ذکر کیا ہے کہ ان کا نام اسماعیل تھا۔ واللہ اعلم

یہ آیت بنی اسرائیل کی اس قوم کے بارے خبر ہے جنہیں ذلت نے آلیا اور دشمن نے ان پر غلبہ پالیا تو انہوں نے جہاد کے بارے اجازت طلب کی کہ انہیں اس کا حکم دیا جائے اور جب انہیں حکم دیا گیا تو ان میں سے اکثر نے بزدلی کا مظاہرہ کیا اور قلیل لوگ ڈٹے رہے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی نصرت سے نوازا۔ اور حدیث میں ہے کہ یہ مذکورہ لوگ وہی ہیں جنہیں موت دی گئی اور پھر وہ زندہ کر دیے گئے۔ واللہ اعلم

قولہ تعالیٰ: نُقَاتِلْ یہ نون اور جزم کے ساتھ ہے اور جمہور قراء کی قراءت جواب امر کی بنا پر ہے اور ضحاک اور ابن ابی عبلہ نے یاء کے ساتھ اور فعل کو مرفوع پڑھا ہے (یعنی يُقَاتِلُ) اور یہ الملك کی صفت کے محل میں ہے۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اور یہ عَسِيْتُمْ بھی ہے یعنی فتحہ اور کسرہ کے ساتھ دو لغتیں ہیں۔ دوسری کے مطابق حضرت نافع نے قراءت کی ہے اور باقیوں نے پہلی کے مطابق (یعنی فتحہ کے ساتھ) اور یہی مشہور ہے۔

ابو حاتم نے کہا ہے: کسرہ کی کوئی وجہ (اور علت) نہیں ہے اور اس کے ساتھ حسن اور طلحہ نے پڑھا ہے۔

مکی نے اسم فاعل میں کہا ہے: عَسٍ، اور یہ ماضی میں سین کے کسرہ پر دلالت کرتا ہے اور سین پر فتحہ یہ لغت مشہورہ ہے۔ ابو علی نے کہا ہے: کسرہ کی وجہ عربوں کا یہ قول ہے: هو عسٍ بذلك مثلاً حرٍ اور شجٍ۔ اور یہ فَعَلَ اور فَعِلَ دونوں کے وزن پر آیا ہے جیسا کہ نَقَمَ اور نَقِمَ میں ہے اور اسی طرح عَسَيت اور عَسِيت ہے، پس اگر فعل کی نسبت اسم ظاہر کی طرف کی جائے تو عسیتم میں قیاس یہ ہے کہ کہا جائے: عَسِيَ زيدٌ۔ مثلاً رَضِيَ زَيد اور اگر یہ کہا جائے تو یہ قیاس کے مطابق ہے اور اگر نہ کہا جائے تو پھر جائز ہے کہ دونوں لغتیں لے لی جائیں۔ اور دونوں میں سے ایک دوسری کی جگہ استعمال ہوتی رہے۔ اور اس کلام کا معنی یہ ہے کیا تم پیٹھ پھیرنے اور فرار اختیار کرنے کے قریب ہو؟ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا۔ (2)

زجاج نے کہا ہے: اَلَّا تُقَاتِلُوْا یہ محل نصب میں ہے، یعنی هل عسيتم مقاتلة (کیا تم لڑائی نہ کرنے کے قریب ہو) قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اخفش نے کہا ہے: اس میں اَنْ زائدہ ہے۔ اور فراء نے کہا ہے کہ یہ اپنے معنی پر محمول

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 330، دار الکتب العلمیہ　2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 331-330

ہے۔ یعنی و ما منعنا (یعنی کون سی شے ہمارے لئے رکاوٹ ہے) جیسا کہ آپ کہتے ہیں: مالك الا تصلی ؟ ما منعك یعنی کون سی شے تیرے لئے نماز پڑھنے سے رکاوٹ ہے۔

اور کہا ہے: معنی یہ ہے ہمارے لئے اس میں کون سی شے ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے راستے میں جنگ نہیں کریں گے۔ نحاس نے کہا: یہ معنی زیادہ عمدہ اور اچھا ہے۔ اور ''ان'' محل نصب میں ہے۔ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا یہ علت بیان ہو رہی ہے اور اسی طرح وَ اَبْنَآىِٕنَا بھی ہے یعنی اپنی اولادوں کے سبب سے (ہم ضرور لڑیں گے)

قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ یعنی جب ان پر فرض کر دیا گیا تَوَلَّوْا اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ جب اس نے ان پر قتال فرض کیا اور انہوں نے حقیقت کو دیکھا تو جنگ لڑنے کے بارے میں ان کے افکار تبدیل ہو گئے اور ان کی جانیں نکلنے لگیں۔ تَوَلَّوْا یعنی ان کی نیتیں مضطرب ہو گئیں اور ان کے عزائم ڈھیلے پڑ گئے۔ یہ حال ہے ان امتوں کا جو بڑی خوشحال اور متنعم تھیں اور انہوں نے خوشحالی کے اوقات میں جنگ کی تمنا کرتے ہوئے دعا کی درخواست کی اور جب جنگ چھڑ گئی تو انہوں نے بزدلی دکھائی اور اپنی طبع کی پیروی کی۔

اسی وجہ سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی دعا سے اپنے اس ارشاد کے ساتھ منع فرمایا ہے۔ ''تم دشمن سے ملاقات کی تمنا نہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے عافیت کی التجا کرو اور جب تمہارا ان سے آمنا سامنا ہو جائے تو پھر تم ثابت قدم رہو(1)۔'' اسے ائمہ نے روایت کیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان میں سے قلیل لوگوں کی خبر دی کہ وہ پہلی نیت پر ثابت اور مستحکم رہے اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں جنگ کرنے پر ان کے ارادے برقرار رہے۔

وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ۭ قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَ نَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَ لَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۭ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَ زَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَ الْجِسْمِ ۭ وَ اللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۷﴾

''اور کہا انہیں ان کے نبی نے: بے شک اللہ تعالیٰ نے مقرر فرما دیا ہے تمہارے لئے طالوت کو امیر، بولے: کیوں کر ہو سکتا ہے اسے حکومت کا حق ہم پر، حالانکہ ہم زیادہ حقدار ہیں حکومت کے اس سے اور نہیں دی گئی اسے فراخی مال و دولت میں۔ نبی نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے اسے تمہارے مقابلہ میں اور زیادہ دی ہے اسے کشادگی علم میں اور جسم میں اور اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے اپنا ملک جسے چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا یعنی تم نے جو اللہ تعالیٰ سے مانگا ہے اللہ تعالیٰ نے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 424

تمہاری دعا کو قبول کر لیا ہے اور طالوت پانی پلاتے تھے۔ بعض نے کہا: وہ چمڑا رنگنے کا کام کرتے تھے اور بعض نے کہا ہے: وہ اجرت پر کام کرتے تھے اور عالم بھی تھے۔ پس اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں بلند کر دیا جیسا کہ آگے آرہا ہے۔ وہ حضرت بنیامین کے قبیلے سے تھے اور وہ نہ تو نبوت کے قبیلے سے تھے اور نہ ہی بادشاہت کے قبیلے سے۔ اور نبوت بنی لاوی میں تھی اور بادشاہت یہودا کے قبیلے میں تھی، سو اسی وجہ سے انہوں نے انکار کیا۔

حضرت وہب بن منبہ نے کہا ہے: جب بنی اسرائیل کے گروہ نے حضرت شمویل بن بال علیہ السلام سے کہا جو کہا، تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا کی کہ وہ ان کی طرف ایک امیر اور بادشاہ بھیجے اور اس پر راہنمائی بھی فرمائے۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا: تم اپنے اس سینگ کی طرف دیکھو جس میں تمہارے گھر میں تیل پڑا ہے۔ جب کوئی آدمی تمہارے پاس آئے اور وہ تیل جوش مار کر آواز نکالنے لگے جو سینگ میں ہے، تو وہی بنی اسرائیل کا بادشاہ ہوگا اور اس تیل میں سے کچھ اس کے سر پر لگا دو اور اسے ان پر بادشاہ مقرر کر دو۔

فرمایا: طالوت چمڑے کی دباغت کا کام کرتے تھے۔ ان کا جانور گم ہو گیا اور وہ اس کی تلاش میں نکلے اور حضرت شمویل علیہ السلام کے گھر کا قصد کیا تاکہ وہ اپنے لئے جانور کے معاملہ میں دعا کرائیں یا ان کے پاس کوئی ایسا ذریعہ پالیں کہ امید لگ جائے، تو تیل میں جوش پیدا ہو گیا جیسا ان کا گمان تھا۔ بیان کیا: پس حضرت شمویل علیہ السلام اس کے پاس کھڑے ہوئے اور اسے اٹھا لیا اور اس میں سے کچھ تیل طالوت کے سر پر لگا دیا اور اسے فرمایا: تو ان بنی اسرائیل کا بادشاہ اور امیر ہے جن کے بارے اس سے قبل اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے (1)۔ پھر بنی اسرائیل کو فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ اور امیر مقرر کیا ہے۔

طالوت اور جالوت یہ دونوں عجمی اسم ہیں اور دونوں معرب ہیں۔ اسی لئے یہ دونوں منصرف نہیں (2)۔ اسی طرح داؤد بھی ہے۔ ان کی جمع طوالیت، جوالیت اور دوادید ہے۔ اور اگر کسی آدمی کا نام طاؤس اور راقوذ رکھا جائے تو یہ دونوں منصرف ہوں گے اگرچہ یہ دونوں عجمی ہیں۔

اس کے اور پہلے کے درمیان فرق یہ ہے کہ آپ کہہ سکتے ہیں: الطاؤس، پس الف لام داخل ہوتے ہیں اور یہ عربی میں غیر منصرف بنا دیتے ہیں اور یہ انہیں متمکن نہیں بنا سکتے (یعنی طالوت اور جالوت کو)

قولہ تعالیٰ: اَنّٰی یَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَیْنَا یعنی وہ کیسے ہمارا امیر بن سکتا ہے حالانکہ ہم اس سے زیادہ بادشاہت کا حق رکھتے ہیں؟ وہ انبیاء علیہم السلام کو تکلیف پہنچانے اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنے تکبر اور انکار کے بارے میں اپنے طریقے پر چلتے رہے۔ اور انہوں نے کہا: ''اَنّٰی'' یعنی کون سی جہت سے۔ پس ''انّٰی'' یہ ظرف ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے۔

حالانکہ ہم بادشاہ کے قبیلے سے ہیں اور وہ اس طرح نہیں ہے اور وہ فقیر اور مفلس ہے۔ پس انہوں نے اس اقوی سبب کو چھوڑ دیا اور وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور پہلے سے اس کا فیصلہ ہے۔ یہاں تک کہ ان کے نبی علیہ السلام نے اس قول کے ساتھ

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 719-718

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 332، دار الکتب العلمیہ

ان پر حجت اور دلیل بیان فرمائی: اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے چن لیا ہے اور یہی حجت قاطعہ ہے اور اس کے ساتھ ہی ان کے لئے طالوت کو چننے کی علت بھی بیان فرمادی اور وہ اس کی علم میں کشادگی اور وسعت ہے جو انسان کی بقا ہے اور وہ جسم ہے جو جنگ میں اس کا معاون اور مقابلے کے وقت اس کا سامان جنگ ہے۔ پس یہ آیت امام کی صفت اور امامت کے احوال کے بیان کو متضمن ہے اور بلاشبہ اس کے لئے علم، دین اور قوت کا ہونا ضروری ہے نہ کہ نسب کا۔ پس اس میں علم اور فضائل نفس کے ساتھ نسب کا کوئی حصہ نہیں ہے اور بلاشبہ یہ نسب پر متقدم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ اس نے طالوت کو ان پر علم اور اس کی قوت کی وجہ سے اختیار اور ترجیح دی ہے، اگرچہ نسب کے اعتبار سے وہ اعلیٰ اور اشرف ہیں۔ اور سورت کے پہلے حصہ میں امامت اور اس کی شرائط کا ذکر گزر چکا ہے جو کافی ہے اور دوبارہ اس کے بیان کی حاجت نہیں اور یہ آیت اس میں اصل ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے اس وقت طالوت بنی اسرائیل میں سب سے بڑا عالم تھا اور بڑا خوبصورت اور طاقتور انسان تھا اور وہ اتنا جسیم تھا کہ دشمن بھی اس سے خوف کھاتے تھے۔ کہا گیا ہے کہ اس کا نام طالوت اس کی قدوقامت طویل ہونے کی وجہ سے تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جسم کی زیادتی سے مراد خیر اور شجاعت کے اوصاف کی کثرت ہے اور اس سے جسم کا عظیم ہونا مراد نہیں ہے۔ کیا آپ شاعر کے قول کی طرف نہیں دیکھتے:

ترى الرجل النحيف فتزدَريه ... و فى اثوابِهٖ اَسَدٌ هَصُوْرُ

و يعجبك الطَّرير فتَبْتَلِيه ... فيُخْلِف ظنك الرجلُ الطَّرِيْرُ

و قد عَظُمَ البعير بغير لُبّ ... فلم يَسْتَغْنِ بالعِظَم البعيرُ

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی معنی میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی ازواج مطہرات کے لئے ارشاد ہے: ''تم میں سے زیادہ تیزی کے ساتھ مجھے وہ ملے گی جس کا ہاتھ تم میں سے زیادہ طویل ہوگا''۔ پس وہ آپس میں طوالت کو دیکھنے لگیں۔ تو ان میں حضرت زینب پہلے فوت ہوئیں، کیونکہ وہ اپنے ہاتھ سے کام کرتی تھیں اور صدقہ کرتی تھیں (1)۔ اسے مسلم نے بیان کیا ہے۔ اور بعض تاویل کرنے والوں نے کہا ہے کہ علم سے مراد جنگ کا علم ہے اور یہ بغیر دلیل کے عام کی تخصیص ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: علم کی زیادتی اس اعتبار سے تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف وحی فرمائی اور یہ اس بنا پر ہے کہ طالوت نبی ہوں۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔

قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ۔ بعض تاویل کرنے والوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ رب العالمین کا یہ ارشاد حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ شمویل علیہ السلام کے قول میں سے ہے اور یہی زیادہ ظاہر ہے۔ آپ نے انہیں یہ تب کہا جب آپ نے دلائل میں ان کی سرکشی اور ان کے جھگڑے کو دیکھا، تو ارادہ کیا کہ آپ اپنی کلام کو ایسی قطعی دلیل سے مکمل کریں جس پر کوئی اعتراض نہ ہو سکتا ہو، تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 291، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، کتاب الزکاۃ، حدیث نمبر 1331، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

(اور اللہ تعالیٰ اپنا ملک عطا فرما دیتا ہے جسے چاہتا ہے) اور دنیوی ملک کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف مملوک کی اضافت مالک کی طرف کرنے کی طرح ہے۔ پھر ان کے لئے رشک اور تنبیہ کی بنا پر ان کی طرف سے سوال کے بغیر فرمایا: اِنَّ اٰیَةَ مُلْكِهٖ یہ احتمال رکھتا ہے کہ انہوں نے آپ سے اس قول میں صدق پر دلیل طلب کی ہے: اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: پہلا قول سیاق آیت کے مطابق زیادہ ظاہر ہے اور دوسرا بنی اسرائیل کے اخلاق ذمیمہ کے زیادہ مشابہ ہے، یہ موقف طبری نے اختیار کیا ہے (1)۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَ اٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۟ؑ

''اور کہا انہیں ان کے نبی نے کہ اس کی بادشاہی کی نشانی یہ ہے کہ آئے گا تمہارے پاس ایک صندوق اس میں تسلی (کا سامان) ہوگا تمہارے رب کی طرف سے اور (اس میں) بچی ہوئی چیزیں ہوں گی جنہیں چھوڑ گئی ہے اولاد موسیٰ اور اولاد ہارون اٹھا لائیں گے اس صندوق کو فرشتے۔ بے شک اس میں بڑی نشانی ہے تمہارے لئے اگر تم ایمان دار ہو''

قولہ تعالیٰ: وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ یہ بمعنی اتیان التابوت ہے، یعنی تابوت کا آنا ان کی بادشاہی کی نشانی ہے اور تابوت (صندوق) کے بارے جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حضرت آدم علیہ السلام پر نازل فرمایا (اتارا) اور وہ آپ کے پاس رہا، یہاں تک کہ (وراثۃً) چلتے چلتے حضرت یعقوب علیہ السلام تک پہنچ گیا۔ بنی اسرائیل اس کی برکت سے ان پر غالب آتے تھے جو کوئی ان سے جنگ لڑتے حتیٰ کہ بنی اسرائیل نافرمان ہو گئے تو ان سے تابوت چھین لیا گیا اور عمالقہ نے اسے چھینا تھا۔ سدی کے قول کے مطابق وہ جالوت اور اس کے ساتھی تھے اور انہوں نے ان سے تابوت چھین لیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اس پر سب سے بڑی دلیل ہے کہ نافرمانی (گناہوں کی کثرت) ذلت و رسوائی کا سبب ہے اور یہ بالکل بین اور واضح ہے۔

نحاس نے کہا ہے کہ تابوت میں نشانی اس طور پر تھی کہ یہ مروی ہے اس میں سے رونے کی آواز سنائی دیتی تھی، پس جب وہ اسے سنتے تو وہ جنگ کے لئے چل پڑتے تھے اور جب یہ آواز پر سکون ہو جاتی تو نہ وہ چلتے اور نہ ہی تابوت چلتا۔

اور یہ قول بھی ہے کہ وہ اسے میدان جنگ میں رکھتے تھے اور وہ مسلسل غالب آتے رہے یہاں تک کہ وہ نافرمان اور گستاخ ہو گئے تو وہ مغلوب ہو گئے اور ان سے تابوت لے لیا گیا اور وہ ذلیل و رسوا ہو گئے۔ پس جب انہوں نے ہلاکت اور اپنا ذکر ختم ہونے کی علامت دیکھی، تو ان میں سے بعض نے اسے ناپسند کیا اور وہ اپنے معاملات میں مشاورت کرنے لگے یہاں تک کہ ان

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 332، دار الکتب العلمیہ

کی ایک جماعت اس پر جمع ہوگئی کہ وہ اپنے وقت کے نبی علیہ السلام کو عرض کریں کہ ہمارے لئے کوئی امیر مقرر کر دو۔ پھر جب نبی علیہ السلام نے انہیں یہ بتایا تمہارا بادشاہ طالوت ہے تو انہوں نے اس میں رجوع کرلیا (یعنی رائے بدل لی) جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں خبر دی ہے۔ پس جب انہیں دلیل کے ساتھ خاموش کرا دیا گیا تو انہوں نے اس پر بینہ طلب کرلیا۔ یہ طبری کا قول ہے اور جب انہوں نے اپنے نبی علیہ السلام سے اس پر شہادت طلب کی جو انہوں نے کہا، تو انہوں نے اپنے رب سے دعا کی تو اس کے سبب اس قوم پر بیماری نازل ہوئی جنہوں نے تابوت لے لیا تھا۔ اس میں کچھ اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ انہوں نے اسے اپنے کنیسہ (عبادتگاہ) میں رکھا۔ اس میں بت تھے تو وہ بت صبح کے وقت اوندھے پڑے تھے۔

اور ایک قول یہ ہے کہ انہوں نے اسے اپنے بت خانہ میں بڑے بت کے نیچے رکھا۔ پس انہوں نے صبح اس حال میں کی کہ وہ بت کے اوپر پڑا ہوا تھا، تو انہوں نے اسے اٹھایا اور اسے بت کی ٹانگوں کے ساتھ باندھ دیا اور پھر صبح اس حال میں کی کہ بت کے دونوں ہاتھ اور اس کی دونوں ٹانگیں کٹی ہوئی تھیں اور تابوت کے نیچے پڑی ہوئی تھیں۔ پس انہوں نے اسے اٹھایا اور ایک قوم کے گاؤں میں جا کر رکھ دیا تو اس قوم کی گردنوں میں درد ہونے لگی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہوں نے اسے ایک قوم کے پاخانہ کی جگہ رکھا تو وہ بواسیر کی بیماری میں مبتلا ہونے لگے اور جب ان کی تکلیف بہت بڑھ گئی جس حالت میں وہ تھی تو انہوں نے کہا: یہ تکلیف نہیں ہے مگر اسی تابوت کی وجہ سے۔ پس ہمیں چاہئے کہ ہم اسے بنی اسرائیل کی طرف واپس لوٹا دیں۔ چنانچہ انہوں نے اسے دو بیلوں کے درمیان ریڑھے پر رکھا اور انہیں بنی اسرائیل کے شہروں کی طرف بھیج دیا اور اللہ تعالیٰ نے فرشتے بھیجے وہ بیلوں کو ہانکتے رہے یہاں تک کہ وہ دونوں بنی اسرائیل میں داخل ہوگئے۔ یہ لوگ طالوت کی حکمرانی میں تھے تو انہیں مدد و نصرت کا یقین ہوگیا۔ اس روایت میں یہی ملائکہ کا تابوت کو اٹھانا ہے۔ یہ بھی روایت ہے کہ ملائکہ اسے اٹھا کر لائے اور حضرت یوشع بن نون نے اسے ریگستان میں رکھ دیا اور یہ روایت بھی ہے کہ انہوں نے ہوا میں تابوت دیکھا یہاں تک کہ وہ ان کے درمیان اتر گیا۔ ربیع بن خثیم نے یہی کہا ہے۔

اور وہب بن منبہ نے بیان کیا ہے کہ اس تابوت (صندوق) کی مقدار تقریباً تین ہاتھ لمبائی اور دو ہاتھ چوڑائی تھی۔ کلبی نے کہا ہے: یہ شمسار کی لکڑی سے بنا ہوا تھا جس سے کنگھیاں بنائی جاتی ہیں۔ اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے التابوہ پڑھا ہے اور یہ بھی اس کی لغت ہے اور لوگ آپ کی قراءت پر اسے تا کے ساتھ پڑھتے ہیں اور یہ گزر چکا ہے۔ اور آپ سے اتیبوت بھی مروی ہے۔ نحاس نے اسے ذکر کیا ہے۔ اور حمید بن قیس نے یحملہ یا کے ساتھ پڑھا ہے۔

قولہ تعالیٰ: فِيهِ سَكِينَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ سکینہ اور بقیہ کے بارے میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ پس سکینہ فَعِيلَةٌ کے وزن پر ہے یہ سکون، وقار اور طمانینت سے لیا گیا ہے۔ پس یہ قول فِيهِ سَكِينَةٌ یہ تمہارے دلوں کے سکون کا سبب ہے اس میں جو طالوت کے بارے تم میں اختلاف ہے۔ اور اسی کی طرح یہ ارشاد ہے: فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ یعنی اللہ تعالیٰ نے اس پر وہ نازل فرمایا جس کے سبب اس کے دل کو سکون ہوا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تابوت ان کے دلوں کے سکون کا سبب تھا، پس وہ جہاں بھی ہوئے انہیں اس کے

پاس سکون واطمینان ملا۔ جب تابوت جنگ میں ان کے ساتھ ہوتا تھا وہ اس سے قطعاً نہ بھاگتے تھے۔

وہب بن منبہ نے کہا ہے: سکینہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی جانب سے خاص روح ہے جو کلام کرتی تھی۔ جب ان کا کسی امر میں اختلاف ہو جاتا تو وہ اس کی وضاحت اور بیان کے ساتھ بولتی تھی جو وہ ارادہ رکھتے تھے اور جب وہ جنگ میں چیخ مارتی تو کامیابی وکامرانی ان کے لئے ہو جاتی تھی۔

اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے یہ بہت تیز رفتار ہوا تھی اس کا چہرہ انسان کے چہرے کی مثل تھا۔ اور آپ رضی اللہ عنہ ہی سے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے کہا کہ یہ ایسی ہوا تھی جو ناہموار جگہوں سے بڑی تیزی کے ساتھ گزرتی، اس کے دو سر تھے (1)۔

اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یہ ایک بلی کی طرح کا حیوان تھا اس کے دو پر تھے، دم تھی اور اس کی آنکھیں چمکدار تھیں اور جب یہ کسی لشکر کی طرف دیکھتا تو وہ شکست کھا جاتا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: یہ جنت سے لائی ہوئی سونے کی ایک طشتری تھی جس میں حضرات انبیاء علیہم الصلوت والتسلیمات کے دل دھوئے جاتے تھے، سدی نے یہی کہا ہے۔

اور ابن عطیہ نے کہا ہے: صحیح یہ ہے کہ تابوت میں انبیاء کرام علیہم الصلوت والتسلیمات کی باقی رہ جانے والی کچھ اشیاء (تبرکات) اور ان کی علامات اور نشانیاں تھیں۔ لوگ اس کے پاس سکون حاصل کرتے تھے، اس سے انس رکھتے تھے اور قوت وطاقت حاصل کرتے تھے (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: صحیح مسلم میں حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی سورۃ الکہف پڑھ رہا تھا اور اس کے ساتھ گھوڑا دو رسیوں کے ساتھ بندھا ہوا تھا تو اس آدمی پر بادل سا چھا گیا اور وہ گھومتا رہا اور اس کے قریب آتا گیا اور اس کا گھوڑا اس کے سبب خوف سے بدکنے اور اچھلنے کودنے لگے۔ جب صبح ہوئی تو وہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور اس کا تذکرہ کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ سکینہ ہے جو قرآن کے سبب نازل ہوا۔'' اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ ایک رات اپنے مربد (کھجوریں خشک کرنے کی جگہ) میں قرآن کریم پڑھ رہے تھے۔ الحدیث۔ اس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''وہ ملائکہ تھے جو تیری تلاوت بن رہے تھے اور اگر تو پڑھتا رہتا تو وہ صبح اس حال میں کرتے کہ لوگ انہیں دیکھ سکتے جو ان سے مخفی رہتے ہیں (3)۔'' اسے بخاری اور مسلم نے بیان کیا ہے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار سکینہ کے نزول اور ایک بار ملائکہ کے نازل ہونے کے بارے فرمایا، تو یہ اس پر دلیل ہے کہ سکینہ اس سایہ میں تھا اور وہ ہمیشہ ملائکہ کے ساتھ اترتا ہے اور اس میں ان کے لئے بھی حجت ہے جنہوں نے کہا کہ سکینہ روح ہے یا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 333، دار الکتب العلمیہ 2۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن، جلد 1، صفحہ 268، وزارت تعلیم

3۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن، جلد 1، صفحہ 269، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب فضل سورۃ کہف، حدیث نمبر 4625، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً۔ صحیح بخاری، باب فضل المعوذات، حدیث نمبر 4630، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایسی شے ہے جس کی روح ہے، کیونکہ قرآن کا سننا صحیح نہیں ہوتا مگر اس کے لئے جو عقل رکھتا ہے۔ واللہ اعلم

قولہ تعالیٰ: وَ بَقِيَّةٌ۔ بقية کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔

سو کہا گیا ہے: (اس میں) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا، حضرت ہارون علیہ السلام کا عصا اور تختیوں کے ٹکڑے تھے کیونکہ وہ ٹوٹ گئی تھیں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں پھینکا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہی بیان کیا ہے اور عکرمہ نے یہ زائد کہا ہے کہ اس میں تورات بھی تھی۔

اور ابو صالح نے کہا ہے: بقية سے مراد حضرت موسیٰ علیہ اسلام کا عصا، آپ کا لباس، حضرت ہارون علیہ السلام کے کپڑے اور تورات کی دو تختیاں ہیں۔

اور عطیہ بن سعد نے کہا ہے: اس سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام دونوں کا عصا، دونوں کے کپڑے اور تختیوں کے ٹکڑے ہیں۔

اور ثوری نے کہا ہے: لوگوں میں سے کچھ کہتے ہیں کہ البقية سے مراد سونے کی طشتری میں دو قفیز من (وہ کھانا جو بنی اسرائیل پر نازل ہوا) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا، حضرت ہارون علیہ السلام کا عمامہ شریف اور تختیوں کے ٹکڑے ہیں اور ان میں سے بعض کہتے ہیں: عصا اور نعلین مراد ہیں (1)۔

جو کچھ اس بارے روایت ہے اس کا معنی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب اپنی قوم کے پاس تختیاں لے کر آئے اور آپ نے انہیں بچھڑے کی عبادت کرتے ہوئے پایا، تو آپ نے غصے میں آ کر وہ تختیاں پھینک دیں اور وہ ٹوٹ گئیں۔ پس آپ نے ان میں سے جو صحیح تھیں انہیں نکال لیا اور جو ٹوٹ گئی تھیں ان کے ٹکڑے اٹھا لئے اور انہیں تابوت میں رکھ دیا۔

اور ضحاک نے کہا ہے: البقية سے مراد جہاد کرنا اور دشمنوں سے قتال کرنا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: تابوت کے بارے میں ان میں سے کوئی امر ہو، یا تو اس میں لکھا ہوا ہے اور یا پھر اس کی ذات کو لانا ہی اس کے بارے امر کی طرح ہے۔ اور تبرک کی نسبت آل موسیٰ اور آل ہارون علیہما السلام کی طرف اس حیثیت سے کی گئی کہ حکم ایک قوم سے دوسری قوم کی طرف لکھا ہوا تھا اور وہ تمام کے تمام آل موسیٰ اور آل ہارون علیہما السلام ہی تھے اور کسی آدمی کی آل سے مراد اس کے قرابتدار ہوتے ہیں (2)۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَ مَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْۤ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۭ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 334، دار الکتب العلمیہ

2۔ ایضاً

غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝

''پھر جب روانہ ہوا طالوت اپنی فوجوں کے ساتھ اس نے کہا کہ بے شک اللہ تعالیٰ آزمانے والا ہے تمہیں ایک نہر سے سو جس نے پانی پی لیا اس سے، وہ نہیں میرے ساتھیوں سے اور جس نے نہ پیا وہ یقیناً میرے ساتھیوں میں سے ہے مگر جس نے بھر لیا ایک چلو اپنے ہاتھ سے، پس سب نے پیا اس سے مگر چند آدمیوں نے ان سے (نہیں پیا) پھر جب عبور کیا اسے طالوت نے اور ان لوگوں نے جو ایمان لائے تھے اس کے ساتھ کہنے لگے: کچھ طاقت نہیں ہم میں آج جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ کرنے کی (مگر) کہا ان لوگوں نے جو یقین رکھتے تھے کہ وہ ضرور ملاقات کرنے والے ہیں اللہ سے کہ بارہا چھوٹی جماعتیں غالب آئی ہیں بڑی جماعتوں پر اللہ کے اذن سے اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قول تعالیٰ: فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ، فَصَلَ کا معنی ہے جب وہ ان کے ساتھ نکلا فصلت الشیء فانفصل یعنی میں نے شے کو کاٹا پس وہ کٹ گئی۔

حضرت وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب طالوت روانہ ہوا تو لشکریوں نے اسے کہا: بے شک ہم سے نہیں اٹھائے جا سکتے، لہٰذا تم اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ ہمارے لئے نہر جاری کر دے۔ تو طالوت نے انہیں کہا: بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں ایک نہر سے آزمانے والا ہے۔

سدی کے قول کے مطابق فوجوں کی تعداد اسی ہزار تھی۔ اور حضرت وہب نے کہا ہے کوئی بھی اس سے پیچھے نہ رہا تھا سوائے اس کے جو صغر سنی یا کبر سنی یا مرض کی وجہ سے معذور تھا (1)۔ اور الابتلاء کا معنی الاختبار آزمائش اور امتحان ہے۔ اور النَھَر اور النَھْر یہ دونوں لغتیں ہیں۔ اس کا معنی السعة سے ہے (یعنی وسعت، خوشحالی) اور اس سے النہار بھی ہے۔ تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

حضرت قتادہ نے کہا: وہ نہر جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں آزمایا وہ اردن اور فلسطین کے درمیان ہے (2)۔ جمہور نے بِنَهَر کو ہا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور مجاہد اور حمید الاعرج نے بِنَهْرٍ ہاء کے سکون کے ساتھ قراءت کی ہے اور اس ابتلاء کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا امتحان لیا، پس جس کی اطاعت و پیروی پانی کو ترک کرنے میں ظاہر ہوئی تو اس کے بارے یہ معلوم ہوگا کہ وہ اس کے سوا دیگر احکام میں بھی مطیع و فرمانبردار رہے گا۔ اور جس پر پانی کے بارے میں اس کی خواہش اور طلب غالب رہی اور اس نے حکم کی تعمیل نہ کی تو وہ بدرجہ اولیٰ دیگر تکالیف و مصائب میں نافرمان ہوگا۔

پس روایت ہے کہ وہ نہر پر پہنچے اس حال میں کہ پیاس انہیں لگی ہوئی تھی اور نہر کا پانی انتہائی میٹھا اور خوبصورت تھا۔ سو اس لئے اطاعت کرنے والوں کو چلو میں لینے کی رخصت دی گئی، تاکہ ان سے شدت پیاس کی اذیت کچھ نہ کچھ ختم ہو جائے اور اس

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 334، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً

حال میں وہ نفس کا جھگڑا ختم کر سکیں (1) اور یہ بیان فرمادیا کہ زندگی کی تنگی پر صبر کرنے والوں کی احتیاط کے وقت پیاس کے ضرر اور تکلیف کو ختم کرنے کے لئے ایک چلو کافی ہورہے گا جن کا قصد وارادہ آسودگی اور خوشگواری نہ ہو۔ جیسا کہ عروہ نے کہا ہے:

و أحسوا قَرَاح الماء والماءُ باردُ

اور انہوں نے خالص پانی تھوڑا تھوڑا پلایا اور پانی ٹھنڈا تھا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس معنی کے مطابق حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے: حسب المرء لُقیمات یُقِمن صلبہ، (2) آدمی کے لئے چند لقمے کافی ہیں جو اس کی صلب (ریڑھ کی ہڈی مراد پشت) کو سیدھا رکھ سکیں۔

اور بعض وہ لوگ جو معانی کی گہرائی میں غور وفکر کرتے ہیں انہوں نے کہا ہے: یہ آیت ایک مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے دنیا کے لئے بیان فرمائی ہے، پس اللہ تعالیٰ نے دنیا کو نہر سے تشبیہ دی ہے اور اس سے پانی پینے والے کو اس سے جو دنیا کی طرف مائل ہے اور اس سے حظ وافر لینے کا طالب ہے اور پانی نہ پینے والے کو دنیا سے انحراف کرنے والے اور اس میں زہد وتقویٰ اختیار کرنے والے کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ اور اپنے ہاتھ سے ایک چلو لینے والے کو دنیا میں بقدر حاجت لینے والے کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ تینوں احوال مختلف ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ کتنی حسین تعبیر ہے اگر اس تاویل میں تحریف اور ظاہر معنی سے خروج کا اندیشہ نہ ہو لیکن اس کا صحیح معنی دوسرا ہی ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ جنہوں نے یہ کہا ہے کہ طالوت نبی تھے انہوں نے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ کہ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں اس کی طرف وحی اور الہام فرمایا اور اس نے الہام کو ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے آزمائش قرار دیا۔ اور جنہوں نے کہا وہ نبی نہ تھا انہوں نے کہا: اسے ان کے نبی حضرت شمویل علیہ السلام نے وحی کے سبب اس کی خبر دی جب طالوت نے اپنی قوم کو اس کے بارے آگاہ کیا اور بلاشبہ یہ آزمائش اس لئے آئی تا کہ صادق اور کاذب کے مابین تمیز ہو سکے۔

اور ایک قوم نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں کی اطاعت و پیروی کو آزمانے کے لئے انہیں آگ روشن کرنے اور پھر اس میں کود جانے کا حکم ارشاد فرمایا، لیکن اسے اس معنی پر محمول کیا گیا کہ یہ آپ کا اس امر سے ڈرانے کے لئے مزاح ہے جس کا آپ نے انہیں مکلف اور پابند بنایا تھا، اس کا تفصیلی بیان سورۃ النساء میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ یہاں شَرِبَ بمعنی کَرَعَ ہے (یعنی پانی پر منہ رکھ کر بلا واسطہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 334، دار الکتب العلمیہ

2۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 60، وزارت تعلیم

ایضاً، جامع ترمذی، باب ما جاء فی کراھیۃ کثرۃ الأکل، حدیث نمبر 2302، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پانی پینا) اور فَلَيْسَ مِنِّيْ کا معنی ہے وہ اس جنگ میں میرا ساتھی نہیں ہے اور اس نے انہیں اس جملہ کے ساتھ ایمان سے خارج نہیں کیا۔

سدی نے کہا ہے: وہ اسی ہزار تھے اور لامحالہ ان میں مومن، منافق، محنت کرنے والے اور سست بھی تھے۔ اور حدیث طیبہ میں ہے: مَنْ غشنا فلیس منا(1) (جس نے ملاوٹ کی وہ ہم میں سے نہیں ہے) یعنی وہ ہمارے اصحاب میں سے نہیں ہے اور وہ ہمارے طریقہ اور ہماری ہدایت پر نہیں ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

اذا حاولت فی أسد فجوراً فانی لستُ منك و لستَ مِنّي

جب تو اخلاق میں فسق و فجور کا قصد کرے گا تو پھر میں تجھ سے نہیں ہوں اور تو مجھ سے نہیں ہے۔ اور کلام عرب میں یہ عام رائج ہے کہ جب کسی آدمی کا بیٹا اس کے اسلوب اور طریقہ کے خلاف چلے تو وہ بیٹے کو کہہ دیتا ہے: لستَ مِنِي تو مجھ سے نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَ مَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهٗ مِنِّيْٓ کہا جاتا ہے: طعمت الشیءَ یعنی میں نے شے کو چکھا۔ اور اطعمته الماءَ یعنی میں نے اسے پانی چکھایا۔ اور یہاں و من لم یشربه نہیں کہا کیونکہ یہ اہل عرب کی عادت ہے کہ جب وہ کسی شے کو مکرر (دوبارہ) ذکر کریں تو وہ اسے دوسرے لفظ کے ساتھ مکرر لاتے ہیں اور لغۃ القرآن تو تمام لغات سے زیادہ فصیح ہے۔ لہٰذا اس میں اس کی جرح وقدح کا کوئی اعتبار نہیں جو یہ کہتا ہے: کہ طعمت الماء (میں نے پانی کھایا) نہیں کہا جا سکتا۔

مسئلہ نمبر 5۔ ہمارے علماء نے اس سے سد ذرائع کے قول پر استدلال کیا ہے کیونکہ ذوق (چکھنا) وہ کم سے کم شے ہے جو لفظ طعم میں داخل ہے اور جب طعم سے نہی واقع ہے تو شرب کے وقوع کا اس سے کوئی امکان نہیں ہے جو طعم سے اجتناب کرے گا۔ اسی مبالغہ کی خاطر کلام و من لم یشرب منہ نہیں لائے۔

مسئلہ نمبر 6۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ تو یہ اس پر دلیل ہے کہ پانی طعام ہے اور جب وہ طعام ہے تو پھر وہ (انسان کی زندگی) باقی رکھنے کے لئے خوراک ہے اور بدنوں کی خوراک اسی سے (حاصل ہوتی ہے) تو پھر یہ واجب ہے کہ اس میں ربا جاری ہو۔ ابن عربی نے کہا ہے: یہی مذہب صحیح ہے۔(2)

ابوعمر نے بیان کیا ہے کہ امام مالک نے فرمایا: (دریا کے) کنارے پر پانی کی بیع پانی کے ساتھ کرنا متفاضل اور ایک خاص مدت تک اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہی امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ اور امام محمد بن حسن نے کہا ہے: یہ بھی ان چیزوں میں سے ہے جن کا کیل اور وزن کیا جاتا ہے۔ پس اس قول کی بنا پر ان کے نزدیک تفاضل جائز نہیں ہے۔ وہ اس لئے کہ ان کے نزدیک اس میں ربا ہے، کیونکہ ربا میں اس کی علت کیل اور وزن ہیں۔ اور امام شافعی نے کہا ہے: پانی کی بیع نہ متفاضلا جائز ہے اور نہ اس میں معینہ مدت کا ادھار جائز ہے۔ اور ربا میں اس کی علت یہ ہے کہ یہ جنس ماکول میں سے ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ ابن عربی نے بیان کیا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ نے کہا ہے: جس کسی نے کہا: اگر میرے فلاں غلام نے فرات سے پیا تو وہ آزاد ہے تو وہ آزاد نہیں ہوگا مگر یہ کہ وہ اس میں منہ لگا کر پانی پیے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 70، وزارت تعلیم

2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 323، دارالفکر

الکرع کا معنی ہے کہ آدمی دریا سے اپنا منہ لگا کر بلا واسطہ پانی پیے۔ اور اگر اس نے اپنے ہاتھ سے پانی پیا یا برتن کے ساتھ اس سے پیا تو وہ آزاد نہ ہوگا۔ کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے دریا میں منہ لگا کر پانی پینے اور ہاتھ کے ساتھ پانی پینے کے درمیان فرق کیا ہے (1)۔ فرمایا: یہ فاسد ہے، کیونکہ شرب الماء کا اطلاق لغت عرب میں ہر ہیئت اور صفت پر کیا جاتا ہے۔ ہاتھ کے ساتھ چلو بھر کر یا منہ لگا کر پینا یہ ایک ہی ہے اور جب لغۃً اور حقیقۃً وہ شرب پایا گیا جس کی قسم کھائی گئی ہے تو وہ حانث ہو گیا۔ پس اسے جان لو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ اہل لغت نے ان دونوں کے درمیان فرق کیا ہے جیسا کہ کتاب وسنت نے فرق بیان کیا ہے۔

جوہری وغیرہ نے کہا ہے: کرع فی الماء کرعاً (کہا جاتا ہے) جب کوئی اپنے منہ کے ساتھ پانی اس کے محل سے پیے نہ وہ ہتھیلی کے ساتھ پیے اور نہ کسی برتن کے ساتھ اور اس میں دوسری لغت ہے۔ کرِع یعنی را کے کسرہ کے ساتھ یکرع، کرعا۔ اور الکرع سے مراد بارش کا پانی ہے جو منہ میں پڑتا ہے۔

اور رہی حدیث طیبہ تو ابن ماجہ نے اپنی سنن میں ذکر کیا ہے کہ واصل بن عبد الاعلیٰ، ابن فضیل نے لیث عن سعید بن عامر عن ابن عمر رضی اللہ عنہ کی سند سے بیان کیا ہے کہ ہم ایک تالاب کے پاس سے گزرے اور ہم اس میں منہ لگا کر پانی پینے لگے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم منہ لگا کر نہ پیو بلکہ اپنے ہاتھوں کو دھوؤ اور پھر ان سے پانی پیو کیونکہ ہاتھ سے بڑھ کر اچھا اور پاکیزہ برتن کوئی نہیں ہے (2) اور یہ نص ہے۔ لیث بن ابی سلیم مسلم نے اس کی روایت نقل کی ہے اور اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ۔ الاغتراف کا معنی ہے: کسی شے سے ہاتھ اور کسی آلہ سے لینا۔ اور اسی سے المِغرَفۃ (چمچہ) ہے۔ اور الغرف، الاغتراف کا ہم معنی ہے۔ اور غَرفۃ غین کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور یہ مصدر ہے اور اغترافۃ نہیں کہا، کیونکہ الغرف اور الاغتراف کا معنی ایک ہے۔ اور الغَرفَۃ کا معنی ہے ایک بار۔ اور اسے غُرفَۃ غین کے ضمہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ اور اس سے مراد وہ شی ہے جس کا چلو بھرا جاتا ہے اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ الغَرفۃ ایک ہاتھ کے ساتھ چلو بھرنا اور الغُرفۃ دو ہاتھوں کے ساتھ چلو بھرنا ہے۔

اور بعض نے کہا ہے: دونوں لغتیں ایک ہی معنی میں ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہتھیلیاں صاف ترین برتن ہیں۔ اسی معنی میں حسن کا قول ہے:

لا یدلفون الی ماء بآنیۃ الا اغترافا من الغدران بالراح

الدلیف کا معنی ہے آہستہ چال۔

وہ برتن لے کر پانی کی طرف آہستہ چال نہیں چلتے مگر نہروں سے ہتھیلی کے ساتھ چلو بھرتے ہوئے (لیتے ہیں)۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 323، دار الفکر

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الاشربہ، جلد 1، صفحہ 253، وزارت تعلیم۔ ابن ماجہ، باب الشرب بالاکف والکرع، حدیث نمبر 3423، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو کوئی ان زمانوں میں بغیر شبہ، شک اور ارتیاب کے خالص حلال کا ارادہ کرے تو اسے چاہیے کہ وہ چشموں اور ان دریاؤں سے جو مسخر کیے گئے ہیں اور رات دن جاری ہیں اپنی ہتھیلیوں کے ساتھ پانی پیے، اس کے سبب اللہ تعالیٰ سے نیکیاں کمانے، بوجھ اتارنے، نیکوکار ائمہ کرام کے ساتھ ملنے کا ارادہ اور نیت کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے اپنے ہاتھ کے ساتھ پانی پیا درآنحالیکہ وہ برتن پر قدرت رکھتا ہو (اور) اس سے وہ تواضع کا ارادہ رکھتا ہو اللہ تعالیٰ اس کے لئے اس کی انگلیوں کی تعداد کے مطابق نیکیاں لکھ دیتا ہے۔ اور یہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کا برتن ہے جب انہوں نے پیالہ پھینکا تو کہا: اف! یہ دنیا کے ساتھ ہے'' اسے ابن ماجہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ ہم اپنے پیٹوں کے بل لیٹ کر پانی پئیں اور وہ منہ پانی پر رکھ کر پانی پینا ہے، اور آپ نے ہمیں منع کیا ہے کہ ہم ایک ہاتھ کے ساتھ چلو بھر کر پئیں اور فرمایا: ''تم میں سے کوئی اس طرح آواز نکال کر (پانی) نہ پیے جس طرح کتا آواز نکال کر پیتا ہے اور کوئی ایک ہاتھ کے ساتھ اس طرح نہ پیے جس طرح وہ قوم پیتی تھی جن پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوا اور کسی برتن میں رات کے وقت نہ پیے یہاں تک کہ وہ حرکت دے لے (خوب ہلا لے) مگر یہ کہ برتن ڈھانپا ہوا ہو اور جس نے اپنے ہاتھ کے ساتھ پانی پیا اور وہ برتن پر قدرت رکھتا ہو(1) '' آگے حدیث سابقہ حدیث کی طرح ہے۔ اس کی اسناد میں بقیہ بن الولید ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: اس کی حدیث لکھی جاتی ہے اور اس سے استدلال نہیں کیا جاتا۔ اور ابو زرعہ نے کہا ہے: جب بقیہ ثقہ راویوں سے حدیث بیان کرے تو وہ ثقہ ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: **فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ** حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے! انہوں نے اپنے یقین کی مقدار پر پانی پیا اور کفار نے شدت پیاس کی بیماری والے کی طرح پیا اور گنہگاروں اور نافرمانوں نے اس سے تھوڑا کم پیا اور قوم سے چھہتر ہزار واپس لوٹ آئے اور بعض مومنین باقی رہ گئے انہوں نے کچھ نہ پیا اور بعض نے ایک چلو پانی لیا، پس جنہوں نے پانی پیا وہ سیراب نہ ہوئے بلکہ ان کی پیاس مسلسل باقی رہی اور جنہوں نے پانی چھوڑ دیا ان کی حالت اچھی رہی اور وہ ان کی نسبت زیادہ مضبوط رہے جنہوں نے چلو لے لیا تھا۔

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ اس میں ہا ضمیر نہر کی طرف لوٹ رہی ہے اور ھُوَ تاکید کے لئے ہے۔ وَ الَّذِيْنَ یہ محل رفع میں ہے اور جَاوَزَهٗ میں ضمیر فعل پر اس کا عطف ہے۔ کہا جاتا ہے: جاوزت المکان مجاوزۃ و جوازا۔ (میں نے مکان سے تجاوز کر لیا) اور کلام میں مجاز وہی ہے جو استعمال میں جائز ہو اور نافذ ہو اور اپنی علت پر برقرار ہو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سدی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: اس (طالوت) کے ساتھ نہر کو چار ہزار آدمیوں نے عبور کیا، ان میں وہ بھی تھے جنہوں نے پانی پیا۔ پس جب انہوں نے جالوت اور اس کے لشکروں کی طرف دیکھا، ان کی تعداد ایک لاکھ تھی، تمام کے تمام ہتھیاروں کی شکایت کرنے لگے اور ان میں سے تین ہزار چھ سو اسی سے کچھ زائد واپس لوٹ گئے (2)۔

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطب، جلد 1، صفحہ 253۔ ایضاً، ابن ماجہ، باب الشرب والکرع، حدیث نمبر 3423، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 336، دار الکتب العلمیہ

پس اس قول کی بنا پر کہا کہ وہ مومنین جنہیں اس وقت دوبارہ اٹھائے جانے اور اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنے کا ایقان حاصل تھا ان کی تعداد اہل بدر کے برابر تھی۔ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ۔ اکثر مفسرین نے اس پر کہا ہے کہ اس کے ساتھ نہر کو عبور انہوں نے کیا جنہوں نے بالکل پانی نہ پیا اور بعض نے کہا: دشمن کی اتنی کثرت کے باوجود ہم ان کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں۔ تو ان میں سے جو صاحب عزم و ہمت تھے۔ انہوں نے کہا: كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ (اللہ کے اذن سے بارہا چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں۔)

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: ہم گفتگو کرتے رہتے تھے کہ اہل بدر کی تعداد ان اصحاب طالوت کی تعداد کی مثل تھی جنہوں نے اس کے ساتھ نہر کو عبور کیا وہ تین سو دس سے کچھ زائد آدمی تھے اور ایک روایت میں ہے: تین سو تیرہ آدمی اور اس کے ساتھ صرف مومنین نے اسے عبور کیا تھا (1)۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ یہاں ظن بمعنی یقین ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ بمعنی شک ہو یقین نہ ہو۔ یعنی ان لوگوں نے کہا جو وہم رکھتے تھے کہ انہیں طالوت کے ساتھ قتل کر دیا جائے گا اور وہ شہداء بن کر اللہ تعالیٰ سے ملاقات کریں گے۔ پس قتل میں شک پڑ گیا۔

قولہ تعالیٰ: كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً۔ الفئة کا معنی ہے لوگوں کی ایک جماعت اور ان کا ایک گروہ۔ یہ فاوتُ رأسہ بالسیف اور فأيتُه سے ماخوذ ہے یعنی میں نے اس کا سر تلوار سے کاٹ دیا۔ اور ان (صحابہ کرام) رضی اللہ عنہم کے قول میں ہے: كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ الآیہ۔ یہ قتال پر انگیخت دلانا ہے اور صبر کا شعور بیدار کرنا ہے اور ان کی اقتدا اور پیروی کرنا ہے جنہوں نے اپنے رب کی تصدیق کی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی طرح کرنا ہم پر بھی واجب ہے لیکن اعمال قبیحہ اور نیات فاسدہ اس سے مانع ہیں۔ یہاں تک کہ ہم میں سے بڑی تعداد دشمن کی قلیل تعداد کے سامنے شکست خوردہ ہو جاتی ہے جیسا کہ ہم نے کئی بار اس کا مشاہدہ کیا ہے اور ایسا ہمارے اپنے اعمال کے سبب ہے۔

اور بخاری میں ہے: حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بلاشبہ تم اپنے اعمال کے ساتھ جنگ لڑتے ہو۔ اور اس میں مسند روایت بھی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تمہارے ضعفاء کے سبب تمہیں رزق دیا جاتا ہے اور تمہاری مدد کی جاتی ہے (2)۔" پس اعمال فاسد ہو چکے ہیں، ضعفاء مہمل ہو گئے ہیں، صبر قلیل ہے، اعتماد ضعیف اور کمزور ہو چکا ہے اور تقویٰ زائل ہو گیا ہے۔

جبکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ (ال عمران: 200) (صبر کرو اور ثابت قدم رہو (دشمن کے مقابلہ میں) اور کمربستہ رہو (خدمت دین کے لئے) ہمیشہ ہی اللہ سے ڈرتے رہو)۔ اور مزید فرمایا: وَعَلَى اللّٰهِ

1۔ صحیح بخاری، باب عدة أصحاب بدر، حدیث نمبر 3663، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 405، وزارت تعلیم

فَتَوَكَّلُوْٓا (اور اللہ تعالیٰ پر ہی بھروسہ کرو) اور مزید فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ۝ (النحل) (یقینا اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہے جو (اس سے) ڈرتے ہیں اور جو نیک کاموں میں سرگرم رہتے ہیں۔) مزید فرمایا: وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ (الحج:40) (اور اللہ تعالیٰ ضرور مدد فرمائے گا اس کی جو اس (کے دین) کی مدد کرے گا) مزید فرمایا: اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (الانفال) (جب جنگ آزما ہو کسی لشکر سے تو ثابت قدم رہو اور ذکر کرو اللہ تعالیٰ کا کثرت سے تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ) پس یہی نصرت کے اسباب ہیں اور اس کی شرائط ہیں اور یہ ہمارے پاس معدوم ہیں، ہم میں موجود نہیں ہے۔ پس اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ اس پر جو مصیبت اور آفت ہم پر آئے اور ہم میں اترے بلکہ اسلام میں سے سوائے اس کے ذکر کے کوئی شے باقی نہیں رہی اور نہ ہی دین میں سے سوائے اس کی رسم کے کچھ باقی رہا ہے۔ یہ فساد کے ظہور، رعونت وسرکشی کی کثرت اور ہدایت وراہنمائی کی قلت کے سبب ہے۔ یہاں تک کہ دشمن شرق وغرب اور بحر وبر میں غالب آچکا ہے، فتنے عام ہو گئے ہیں، آزمائشیں بڑھ گئی ہیں اور کوئی بچانے والا نہیں ہے مگر وہی جو رحم فرمانے والا ہے۔

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

''اور جب سامنے آ گئے جالوت اور اس کی فوجوں کے، تو بارگاہ الٰہی میں عرض کرنے لگے: اے ہمارے رب! اتار ہم پر صبر اور جمائے رکھ ہمارے قدموں کو اور فتح دے ہمیں قوم کفار پر۔''

بَرَزُوْا جب وہ براز میں آ گئے اور براز سے مراد وسیع زمین میں سے کشادہ اور کھلا میدان ہے۔ جالوت عمالقہ کا امیر تھا اور ان کا بادشاہ تھا اس کا سایہ ایک میل تھا۔ اور کہا جاتا ہے کہ (قوم) بربر اس کی نسل سے ہے اور اس کے بارے میں روایت ہے کہ اس کی فوج میں تین لاکھ گھڑ سوار تھے اور عکرمہ نے کہا ہے: نوے ہزار تھے اور جب مومنین نے اپنے دشمن کی کثرت کو دیکھا تو انہوں نے اپنے رب کی بارگاہ میں عجز وانکساری کی اور یہ رب العالمین کے اس قول کی طرح ہے: وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا الآیہ (العمران) (اور کتنے ہی نبی گزرے ہیں کہ جہاد کیا ان کے ہمراہ بہت سے اللہ والوں نے　اور نہیں تھی ان کی گفتگو بغیر اس کے کہ کہا انہوں نے: اے ہمارے رب! بخش دے ہمارے گناہ)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن سے آمنا سامنا ہوتا تو آپ جنگ میں اس طرح دعا کرتے تھے: اللّٰھم بك أصول و أجول،(1) اے اللہ! میں تیری مدد ونصرت کے ساتھ ہی حملہ کرتا ہوں اور پلٹ کر آتا ہوں۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب دشمن کے سامنے ہوتے تو اس طرح کہتے: اللھم انی اعوذ بك من شرورھم و أجعلك فی نحورھم (2) اے اللہ! میں ان کے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور تجھے ہی ان کے مقابلے میں دیکھتا ہوں۔'' اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے دن دعا مانگی حتیٰ کہ آپ کے کندھوں سے آپ کی چادر مبارک گر گئی اور آپ اللہ تعالیٰ سے اپنا وعدہ پورا کرنے کی

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 354، وزارت تعلیم　2۔ ایضاً، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 215

التجا کرتے رہے۔ اس کا بیان سورۂ آل عمران میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ۫ وَ قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾

''پس انہوں نے شکست دی جالوت کے لشکر کو اللہ کے اذن سے۔ اور قتل کر دیا داؤد نے جالوت کو اور عطا فرمائی داود کو اللہ نے حکومت اور دانائی اور سکھا دیا اس کو جو چاہا اور اگر نہ بچاؤ کرتا اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کا بعض کے ذریعے تو برباد ہو جاتی زمین لیکن اللہ تعالیٰ فضل و کرم فرمانے والا ہے سارے جہانوں پر۔''

قولہ تعالیٰ: فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان پر مدد و نصرت نازل فرمائی۔ فَهَزَمُوْهُمْ تو انہوں نے انہیں شکست دی (ان کی کمر توڑ دی) اور الھزم کا معنی ہے توڑنا۔ اور اسی سے ہے سقاء مُتَهَزِّم یعنی ایسی مشک جو خشکی کے سبب ٹوٹ جائے اور اسی سے وہ قول ہے جو زمزم کے بارے میں کہا گیا ہے یہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کا گڑھا ہے (هَزْمَةُ جبريل) یعنی حضرت جبرائیل علیہ السلام نے زمین کو اپنے پاؤں سے نیچے دبایا، گڑھا بن گیا اور پانی نکل آیا۔ اور الھزم سے مراد وہ خشک لکڑی بھی ہے جو ٹوٹ جاتی ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ اس لئے کہ طالوت بادشاہ تھا اور جالوت کے ساتھ جنگ لڑنے کے لئے یہ اپنی قوم میں سے چنا گیا تھا۔ یہ قد و قامت کے اعتبار سے چھوٹا، زیادہ تر بیمار رہنے والا، زرد رنگ کا تھا اس کی (آنکھیں چھوٹی اور نیلی تھیں۔) اور جالوت لوگوں میں سے انتہائی مضبوط اور بہت زیادہ قوی تھا۔ اور یہ اکیلا لشکروں کو شکست دے سکتا تھا اور جالوت کو قتل کر دیا گیا، حالانکہ وہ عمالقہ کا امیر اور سردار تھا اور (قتل کرنے والے) داؤد ابن ایشی تھے۔ یہ ایشی ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور کہا جاتا ہے: وہ داؤد بن زکریا بن رشوی تھے، یہ یہوذا ابن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام کی اولاد میں سے تھے اور بیت المقدس کے رہنے والے تھے۔ ان کو نبوت اور بادشاہت دونوں چیزیں اکٹھی عطا فرما دی گئیں۔ اس سے پہلے یہ چرواہے تھے اور یہ اپنے بھائیوں میں سے چھوٹے تھے اور ریوڑ چراتے تھے اور ان کے سات بھائی اصحاب طالوت میں سے تھے۔ پس جب جنگ شروع ہوئی تو انہوں نے اپنے دل میں کہا: میں ضرور بہ ضرور اس جنگ کو دیکھنے کے لئے جاؤں گا، جب اس راستے پر چلے ایک پتھر کے پاس سے گزرے تو اس نے آپ کو آواز دی اے داؤد! مجھے اٹھا لے، اور میرے ساتھ تو جالوت کو قتل کرے گا، پھر ایک دوسرے پتھر نے انہیں آواز دی، پھر ایک اور نے آواز دی، پس آپ نے انہیں اٹھا لیا اور انہیں اپنے توبرے میں رکھ لیا اور چل پڑے۔ پس جالوت (لشکر کی صفوں سے) باہر نکلا اور دعوت مبارزت دینے لگا تو لوگوں نے اس کے مقابلے کی جرأت نہ کی اور کمزوری دکھائی یہاں تک کہ طالوت نے کہا: جو اس کا مقابلہ کرے گا اور اسے قتل کر دے گا میں اس کا نکاح اپنی بیٹی سے کروں گا اور اپنے مال میں اسے حکم بناؤں گا، چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام

آئے اور کہا: میں اس کے ساتھ مقابلہ کروں گا اور اسے قتل کر دوں گا (1)، لیکن طالوت نے جب ان کی صغرسنی اور چھوٹے قد کو دیکھا تو انہیں کمزور قرار دے کر واپس لوٹا دیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نیلگوں چھوٹے قد کے تھے۔ پھر طالوت نے دوبارہ اور سہ بارہ اعلان کیا اور پھر بھی حضرت داؤد علیہ السلام ہی باہر نکلے۔ تب طالوت نے ان سے کہا: کیا تو اپنی ذات میں کسی شے سے تجربہ رکھتا ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہاں: اس نے پوچھا: وہ کیسے؟ انہوں نے فرمایا: ایک دفعہ ایک بھیڑیا میرے ریوڑ میں داخل ہو گیا تو میں نے اسے مارا، پھر اس کے سر کو پکڑ لیا اور میں نے اسے اس کے جسم سے الگ کر دیا۔ طالوت نے کہا: بھیڑیا تو کمزور ہے، کیا اس کے علاوہ بھی تو کوئی تجربہ رکھتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ ایک دفعہ ایک شیر میرے ریوڑ میں آگیا تو میں نے اسے مارا، پھر میں نے اسے جبڑوں سے پکڑ لیا اور میں نے ان دونوں کو چیر ڈالا۔ کیا تو اسے شیر سے بھی زیادہ طاقتور جانتا ہے؟ طالوت نے کہا: نہیں۔ طالوت کے پاس ایک زرہ تھی اور وہ اسی پر پوری آسکتی تھی جو جالوت کو قتل کرے گا۔ پس اس نے اس کے بارے آپ کو آگاہ کیا اور وہ زرہ آپ پر ڈال دی تو وہ بالکل برابر ہو گئی۔ پھر طالوت نے کہا: تو میرے گھوڑے پر سوار ہو جا، میرا ہتھیار پکڑ لے (اور اس کے مقابلے میں جا)۔ چنانچہ آپ نے ایسا کر لیا، لیکن جب تھوڑا سا چلے تو واپس لوٹ آئے اور لوگوں نے کہا: یہ نوجوان تو بزدل ہو گیا ہے۔ تو حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے اسے میرے سبب قتل نہ کیا اور اس کے خلاف اس نے میری مدد نہ فرمائی تو پھر یہ گھوڑا اور یہ ہتھیار میرے لئے نفع بخش نہیں ہیں۔ البتہ میں یہ پسند کرتا ہوں کہ میں اس سے اپنی عادت کے مطابق ہی لڑوں۔

راوی کا بیان ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام مِقلاع (پتھر پھینکنے کا گوپھیا، فلاخن) کے ساتھ پتھر پھینکنے کے لوگوں کی نسبت زیادہ ماہر تھے۔ پس آپ (گھوڑے سے) اترے اور اپنے توبرے کو اٹھایا اور اسے لٹکا لیا اور اپنا گوپھیا اٹھایا اور جالوت کی طرف چل نکلے۔ وہ مکمل اپنے ہتھیار پہنے ہوئے تھا، اس کے سر پر خود تھا اس میں تین سو رطل تھے، جیسا کہ الماوردی وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ تو جالوت نے انہیں کہا: اے نوجوان! تو میری طرف نکلا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ اس نے کہا: اس طرح جیسا کہ تو کتے کی طرف نکلا ہے۔ آپ نے فرمایا: ہاں، بلکہ تو اس سے بھی آسان ہے۔ فرمایا: میں یقیناً آج تیرا گوشت پرندوں اور درندوں کو کھلاؤں گا۔ پھر وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوئے اور جالوت نے حضرت داؤد علیہ السلام کو حقیر جانتے ہوئے انہیں اپنے ہاتھ سے پکڑنے کی کوشش کی، تو حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنا ہاتھ پتھر کی طرف بڑھایا۔ اور روایت ہے کہ وہ پتھر جڑ چکے تھے اور وہ ایک پتھر بن گیا تھا۔ سو آپ نے اسے پکڑا اور اپنے گوپھیا میں رکھا اور اللہ تعالیٰ کا نام لیا اور اسے گھمایا اور پھینک دیا، پس وہ جالوت کے سر میں جا لگا اور اسے قتل کر دیا اور اس کے سر کو کاٹ کر اپنے توبرے میں رکھ لیا اور لوگوں میں مل گئے۔ اور طالوت کی فوج نے حملہ کر دیا اور یہی ہزیمت اور شکست تھی (2)۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ پتھر خود سے ناک کی جگہ پر جا لگا۔ اور بعض نے کہا ہے: اسے آنکھ پر جا کر لگا اور اس کی گدی کی جانب سے نکل گیا اور اس کے لشکر کی ایک جماعت کو جا کر لگا اور اس نے انہیں قتل کر دیا۔ یہ قول بھی ہے کہ پتھر ٹوٹ کر بکھر گیا یہاں تک کہ لشکر کے ہر فرد کو اس کا کچھ حصہ جا کر لگا اور یہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 337، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً

(سنگریزوں کی) اس مشت کی طرح تھا جو حضور نبی مکرم ﷺ نے غزوۂ حنین کے دن بنی ہوازن پر پھینکی۔ واللہ اعلم

ان آیات کے قصص میں لوگوں نے بہت زیادہ بیان کیا ہے اور میں نے تیرے لئے ان میں سے خاص مقصود کو ہی ذکر کیا ہے واللہ المحمود۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: طالوت کے اس قول کے بارے میں ہے "جو اس کا مقابلہ کرے گا اور اسے قتل کرے گا تو میں اس کی شادی اپنی بیٹی سے کروں گا اور اسے اپنے مال میں حکم بناؤں گا" یہ مفہوم ہماری شریعت میں بھی ثابت اور موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ امام وقت کہے: جو فلاں کا سر لائے گا تو اس کے لئے اتنا ہوگا، یا جو فلاں کو قیدی بنا کر لائے تو اس کے لئے اتنا انعام ہو گا۔ اس کا بیان سورۃ الانفال میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

اور اس میں اس پر دلیل ہے کہ مبارزت امام کی اجازت کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ امام احمد اور اسحاق وغیرہما اس کے بارے کہتے ہیں اور اس میں امام اوزاعی سے اختلاف منقول ہے، سو ان سے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: کوئی بھی اپنے امام کی اجازت کے بغیر حملہ نہیں کر سکتا اور یہ بھی منقول ہے کہ انہوں نے کہا: کوئی حرج نہیں ہے۔ اور اگر امام مبارزت سے روک دے تو پھر اس کی اجازت کے بغیر کوئی مبارز طلب نہ کرے گا۔

اور ایک گروہ نے مقابلے کو مباح قرار دیا ہے اور انہوں نے امام کی اجازت ہونے یا نہ ہونے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ یہ امام مالک کا قول ہے۔

امام مالک سے اس آدمی کے بارے پوچھا گیا جو دو صفوں کے درمیان کہتا ہے: کون مقابلہ کرے گا؟ تو انہوں نے فرمایا: اس کا انحصار اس کی نیت پر ہے اگر اس سے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا ارادہ رکھتا ہے تو میں امید رکھتا ہوں کہ اس کے لئے کوئی حرج نہ ہوگا۔ زمانہ ماضی میں ایسا کیا جاتا رہا ہے اور امام شافعی نے کہا ہے: مبارزت طلب کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: امام کی اجازت کے ساتھ مبارزت طلب کرنا اچھا ہے اور اس پر بھی کوئی حرج نہیں ہے جس نے امام کی اجازت کے بغیر مبارز طلب کیا یہ مکروہ نہیں ہے کیونکہ اس کے بارے میں کوئی مانع خبر نہیں جانتا۔

وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ، سدی نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو طالوت کا ملک (بادشاہی) اور شمعون کی نبوت عطا فرمائی۔ اور وہ جو اللہ تعالیٰ نے انہیں علم عطا فرمایا وہ زرہیں بنانے اور پرندوں کی گفتگو سمجھنے اور دیگر ان علوم کی انواع میں سے کئی عطا فرمائے جو اللہ تعالیٰ نے حضور نبی مکرم ﷺ کو عطا فرمائے ہیں (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک زنجیر عطا فرمایا جو کہکشاں اور فلک سے ملا ہوا تھا اور اس کا ایک سرا حضرت داؤد علیہ السلام کی عبادت گاہ کے پاس تھا اور ہوا میں جو واقعہ بھی پیش آتا زنجیر بجنے لگتا اور اس سے حضرت داؤد علیہ السلام کو اس واقعہ کا علم ہو جاتا جو وقوع پذیر ہوتا اور کوئی آفت زدہ اسے چھو لیتا تو وہ اس سے نجات پا جاتا اور یہ آپ کی قوم کے دین میں داخل ہونے کی علامت تھی کہ وہ اسے اپنے ہاتھوں کے ساتھ مس کرتے پھر اپنی ہتھیلیوں کو اپنے سینوں پر مل لیتے اور وہ حضرت داؤد علیہ السلام

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 337، دار الکتب العلمیہ

کے بعد اس کے پاس فیصلے کرتے تھے یہاں تک کہ اسے اٹھالیا گیا۔

قولہ تعالیٰ: مِمَّا يَشَآءُ یہ بمعنی مما شاء ہے اور کبھی ماضی کی جگہ مستقبل کا صیغہ رکھ دیا جاتا ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۞ اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ اسی طرح تمام کی قراءت ہے سوائے حضرت نافع کے کیونکہ انہوں نے دِفَاعُ پڑھا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ فعل کا مصدر ہو جیسا کہا جاتا ہے: حسبت الشئ حِسَاباً، آب اِيَاباً، لقیتہ لقاء، اور اسی کی مثل کتبہ کتابا ہے اور اسی سے كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ (النساء) بھی ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ اچھا ہے۔ پس دفاع اور دَفْع دونوں دَفَعَ کے مصدر ہوں گے۔ یہی سیبویہ کا مذہب ہے۔

اور ابو حاتم نے کہا ہے: دَافَعَ اور دَفَعَ دونوں کا معنی ایک ہے، جیسا طرقت النعل اور طارقت ہے یعنی میں نے جوتے کو ایک دوسرے پر سیا۔ الخصف کا معنی الخرز، سینا ہے۔

ابو عبیدہ نے جمہور کی قراءت کو اختیار کیا ہے (یعنی) وَ لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ اور انہوں نے دِفَاعُ پڑھنے سے انکار کیا ہے اور کہا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کوئی بھی غالب نہیں آسکتا۔ مکی نے کہا ہے: یہ وہم ہے باب مفاعلہ نے اس میں وہم پیدا کیا ہے اور ایسا نہیں ہے۔ اور لفظ اللّٰهِ فعل کے سبب محل رفع میں ہے یعنی لولا ان یدفع اللہُ۔ اور دفاع سیبویہ کے نزدیک مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے۔ النَّاسَ مفعول ہے اور بَعْضَهُمْ، النَّاسَ سے بدل ہے اور بِبَعْضٍ سیبویہ کے نزدیک مفعول ثانی کے محل میں ہے اور یہ ان کے نزدیک تیرے اس قول کی مثل ہے: ذهبت بزید، تو اس میں زید مفعول کے محل میں ہے۔ اسے جان لو۔

مسئلہ نمبر 2۔ علماء کا ان لوگوں کے بارے میں اختلاف ہے جنہیں فساد سے بچایا گیا ہے وہ کون ہیں؟

تو کہا گیا ہے: وہ ابدال ہیں اور وہ چالیس آدمی ہیں، ان میں سے جب بھی کوئی فوت ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ دوسرے کو اس کا بدل بنا دیتا ہے۔ اور جب قیامت قریب ہوگی تو وہ تمام فوت ہو جائیں گے ان میں سے بائیس شام میں ہیں اور اٹھارہ عراق میں ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ان الابدال یکونون بالشام وهم اربعون رجلا كلما مات منهم رجل ابدل الله مكانه رجلا يسقى بهم الغيث و ينصر بهم على الأعداء ويصرف بهم عن اهل الأرض البلاء (1) (بلاشبہ ابدال شام میں ہوں گے اور وہ چالیس آدمی ہیں جب بھی ان میں سے کوئی آدمی فوت ہو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ اور آدمی مقرر فرمادے گا، ان کے سبب اللہ تعالیٰ بارش برساتا ہے، ان کے سبب دشمنوں کے خلاف مدد فرماتا ہے اور ان کے سبب اہل زمین سے بلائیں اور مصیبتیں دور فرماتا ہے۔) حکیم ترمذی نے اسے نوادر الاصول میں ذکر کیا ہے۔ اسی طرح حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کیا ہے: انہوں نے کہا: بلاشبہ انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات زمین کے اوتاد ہیں اور جب نبوت کا سلسلہ منقطع ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، ذکر الیمن والشام، جلد 1، صفحہ 582

امت سے ایک جماعت کو ان کا بدل بنا دیا۔ انہیں ابدال کہا جاتا ہے: اور کثرت صوم وصلوٰۃ کی وجہ سے ان لوگوں کو فضیلت نہیں دی گئی، بلکہ حسن خلق، صدق وورع، حسن نیت، تمام مسلمانوں کے لئے دلوں کا صاف اور سلامت ہونا اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی چاہنے کے لئے انہیں صبر، حلم، دانشمندی اور بغیر کسی ذلت کے تواضع وانکساری اختیار کرنے کی نصیحت کرنے کے سبب انہیں فضیلت دی گئی۔ اور وہ انبیاء علیہم السلام کے خلفاء ہیں، وہ ایسی قوم ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لئے چن لیا ہے اور انہیں اپنی ذات کے بارے میں اپنے علم کے ساتھ خالص اور مختص کر لیا ہے اور وہ چالیس صدیق ہیں، ان میں سے تیس آدمی حضرت ابراہیم خلیل الرحمن کے یقین کی مثل پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے سبب اہل زمین سے مصائب اور لوگوں سے آفات اور آزمائشوں کو دور فرماتا ہے اور ان کے سبب اہل زمین پر بارش برسائی جاتی ہے اور انہیں رزق دیا جاتا ہے اور ان میں سے کوئی آدمی فوت نہیں ہوتا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ایسا آدمی پیدا فرما دے جو اس کا خلیفہ اور نائب ہوگا (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی فوجوں کے سبب دشمنوں کو دور نہ کرتا تو مشرکین غالب آجاتے اور وہ مومنین کو قتل کرتے اور شہروں اور مساجد کو برباد کر دیتے۔

اور حضرت سفیان ثوری نے کہا ہے: مراد وہ گواہی اور شہادت دینے والے لوگ ہیں جن کے سبب حقوق حاصل کیے جاتے ہیں اور مکی نے بیان کیا ہے کہ اکثر مفسرین نے یہ معنی بیان کیا ہے: اگر اللہ تعالیٰ نماز پڑھنے والوں کے سبب انہیں نہ بچائے جو نماز نہیں پڑھتے اور تقویٰ اختیار کرنے والوں کے سبب ان کی حفاظت نہ کرے جو تقویٰ اختیار نہیں کرتے تو وہ لوگوں کو ان کے گناہوں کے سبب ہلاک کر دے (2)۔

اسی طرح نحاس اور ثعلبی نے بھی ذکر کیا ہے۔ ثعلبی نے کہا ہے اور تمام مفسرین نے کہا ہے: اگر اللہ تعالیٰ نیکوکار مومنین کو فجار اور کفار سے نہ بچائے تو زمین برباد اور فاسد ہو جائے۔ اور ایک حدیث ذکر کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ میری امت کے نماز پڑھنے والوں کے سبب نماز نہ پڑھنے والوں سے اور تزکیہ اختیار کرنے والوں کے سبب تزکیہ اختیار نہ کرنے والوں سے اور روزے رکھنے والوں کے سبب روزے نہ رکھنے والوں سے اور حج کرنے والوں کے سبب حج نہ کرنے والوں سے اور جہاد کرنے والوں کے سبب جہاد نہ کرنے والوں سے عذاب دور فرماتا رہے گا اور اگر وہ ان اعمال کے ترک کرنے پر جمع ہو گئے تو اللہ تعالیٰ انہیں آنکھ جھپکنے کی بھی مہلت نہ دے گا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ۔

اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، آپ نے ارشاد فرمایا: ان للہ ملائکۃ تنادی کل یوم لولا عباد رُکَّعٌ واطفال رُضَّعٌ وبھائم رُتَّعٌ لصب علیکم العذاب صبا (بے شک اللہ تعالیٰ کے فرشتے ہیں جو ہر روز ندا دیتے ہیں: اگر عبادت گزار بندے نہ ہوتے، شیر خوار بچے نہ ہوتے اور چرنے والے جانور نہ ہوتے تو تم پر عذاب موسلادھار برسا دیا جاتا) (3)۔ اے

1۔ نوادر الاصول فی بیان عدد الابدال، جلد 1، صفحہ 69، دار صادر بیروت

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 338، دار الکتب العلمیہ

3۔ شعب الایمان، جلد 1، صفحہ 155، حدیث نمبر 9820، دار الکتب العلمیۃ

ابوبکر الخطیب نے اسی معنی میں حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ کی حدیث سے روایت کیا ہے۔

منصور نے ابراہیم عن علقمہ عن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی سند سے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر تم میں خشوع کرنے والے آدمی، چرنے والے جانور اور شیر خوار بچے نہ ہوں تو مومنین پر موسلا دھار عذاب برسا دیا جائے (1)۔

بعض نے یہ معنی لیا اور کہا:

لو لا عبادٌ لِلإلٰهِ رُكَّعٌ وَ صِبيَةٌ من اليتامى رُضَّعٌ

اگر اللہ تعالیٰ کے عبادت گزار بندے نہ ہوں اور شیر خوار یتیم بچے نہ ہوں۔

و مُهمَلاتٌ فى الفَلاةِ رُتَّعٌ صُبَّ عليكم العذابُ الأَوْجَعُ

اور جنگل میں چھوڑے گئے چرنے والے جانور نہ ہوں تو تم پر دردناک عذاب موسلا دھار برسا دیا جائے۔

اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ آدمی کے اپنے بیٹے اور پوتے کی اصلاح کرنے کے سبب اس کی اصلاح فرما دیتا ہے اس کے گھر والوں کی اور اس کے اردگرد کے گھروں کی (اصلاح فرما دیتا ہے) اور وہ مسلسل اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہتے ہیں جب تک وہ ان میں ہو''(2)

حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ مومن کو کافر کے سبب آزماتا ہے اور کافر کو مومن کے سبب عافیت عطا کرتا ہے۔

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إن الله ليدفع بالمؤمن الصالح عن مائة من اهل بيته و جيرانه البلاء بے شک اللہ تعالیٰ نیک صالح مومن کے سبب اس کے گھر والوں اور پڑوسیوں میں سے سو افراد سے مصیبت اور آفت کو دور فرماتا ہے (3)۔ پھر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے یہ آیت پڑھی: وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ۔

اور کہا گیا ہے: یہ دفاع اور بچاؤ اس شریعت کے سبب ہے جو انبیاء و رسل علیہم السلام کی زبانوں پر شریعتوں میں سے جاری ہوئیں اور اگر ایسا نہ ہوتا تو لوگ ایک دوسرے سے زبردستی اشیاء چھینتے اور ایک دوسرے کا سامان لوٹتے اور ہلاک ہو جاتے۔ یہ حسین قول ہے کیونکہ روکنے اور دفاع وغیرہ میں عموم ہے۔ پس اس میں غور کرلو۔ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۔ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا مومنین سے کفار کے شر کو دور کرنا یہ اس کا فضل اور خاص انعام ہے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

''یہ آیتیں ہیں اللہ کی ہم پڑھتے ہیں انہیں آپ پر (اے حبیب!) ٹھیک ٹھیک اور یقیناً آپ رسولوں میں سے ہیں۔''

تِلْكَ مبتدا ہے۔ اور اٰيٰتُ اللّٰهِ اس کی خبر ہے اور اگر چاہے تو بدل بنا لے اور خبر نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ بنا لے۔ وَ اِنَّكَ

1۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، صلاۃ الاستسقاء، جلد 3، صفحہ 345، دار الفکر
2۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 755
3۔ تفسیر معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 355، دار الفکر بیروت

لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ یہ اِنَّ کی خبر ہے یعنی وانك لمرسل۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ فرمایا ہے کہ یہ آیات وہ ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور انہیں نبی مرسل کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۫ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۝

''یہ سب رسول، ہم نے فضیلت دی ہے (ان میں سے) بعض کو بعض پر ان میں سے کسی سے کلام فرمایا اللہ نے اور بلند کیے ان میں سے بعض کے درجے اور دیں ہم نے عیسیٰ فرزند مریم کو کھلی نشانیاں اور مدد فرمائی ہم نے ان کی پاکیزہ روح سے اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو نہ لڑتے (جھگڑتے) وہ لوگ جو ان (رسولوں) کے پیچھے آئے بعد اس کے کہ آ گئیں ان کے پاس کھلی نشانیاں لیکن انہوں نے اختلاف کیا ان میں سے کوئی ایمان پر (ثابت) رہا اور ان میں سے کوئی کافر ہو گیا اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو نہ لڑتے (جھگڑتے) لیکن اللہ تعالیٰ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: تِلْكَ الرُّسُلُ یہاں تِلْكَ فرمایا ہے۔ ذلك نہیں فرمایا تو یہ لفظ جمع کی تانیث کی رعایت کرتے ہوئے کہا ہے۔ اور یہ مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہے اور الرُّسُلُ اس کی صفت ہے اور مبتدا کی خبر مابعد جملہ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الرسل عطف بیان ہے اور فَضَّلْنَا خبر ہے۔ یہ مشکل آیت ہے اور احادیث ثابت ہیں کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا تخيّروا ما بين الانبياء (1) (تم انبیاء علیہم السلام کے درمیان کسی کو دوسرے پر ترجیح نہ دو) اور مزید فرمایا: لا تفضلوا بين انبياء الله (2) (تم اللہ تعالیٰ کے انبیاء کے درمیان کسی کو دوسرے پر فضیلت نہ دو) انہیں ائمہ ثقات نے روایت کیا ہے۔ یعنی تم یہ نہ کہو، فلاں فلاں سے بہتر ہے اور نہ یہ کہو: فلاں فلاں سے افضل ہے۔ کہا جاتا ہے: خيّر فلان بين فلان و فلان (فلاں نے فلاں فلاں کے درمیان ایک کو بہتر قرار دیا) اور فضیلت دی جب اس نے یہ کہا تو اس میں (فضّل) مشدد ہو گا۔

اس معنی کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے۔ پس ایک قوم نے کہا ہے: یہ حکم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف تفضیل کے بارے وحی نازل ہونے سے پہلے کا ہے اور آپ کے یہ جاننے سے پہلے کا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اولاد آدم کے سردار ہیں۔ اور بلاشبہ قرآن کریم فضیلت دینے سے روکنے والے حکم کے لیے ناسخ ہے۔

اور ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد أنا سيد ولد آدم (3) (میں اولاد آدم کا سردار ہوں) سے مراد قیامت کا دن ہے (یعنی قیامت کے دن آپ اولاد آدم کے سردار ہوں گے) کیونکہ اس دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم شفاعت فرمائیں

1۔ مشکوۃ المصابیح، باب بدء الخلق وذکر الانبیاء، جلد 1، صفحہ 507۔ 2۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 485، وزارت تعلیم

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، جلد 1، صفحہ 329، و۔ت۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر سورہ بنی اسرائیل، حدیث 4343، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گے اور لواء الحمد اور حوض کوثر آپ ہی کے لئے ہوگا۔

اور آپ ﷺ نے تواضع اور انکساری کے طور پر یہ ارشاد فرمایا: لا تخیرونی علی موسٰی (1) (تم مجھے موسیٰ علیہ السلام سے بہتر اور برتر قرار نہ دو) جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس قول میں تواضع مراد ہے: وُلّیتکم و لست بخیر کم (مجھے تمہارا والی بنایا گیا ہے حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں) اور اسی طرح آپ ﷺ کے اس ارشاد کا معنی ہے لا یقل احد أنا خیر من یونس بن متی (2) (کوئی یہ نہ کہے کہ میں حضرت یونس بن متی علیہ السلام سے بہتر ہوں) یعنی یہ تواضع اور انکساری کی بنا پر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: وَ لَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ (قلم: 48) (اور تم مچھلی والے کی طرح نہ ہو جاؤ) اس پر دلالت کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان سے افضل ہیں۔ کیونکہ رب العالمین فرما رہا ہے: ولا تکن مثلہ (اور تم ان کی مثل نہ ہو جاؤ) اور یہ اس پر دلیل ہے کہ آپ کا ارشاد لا تفضلونی علیہ (3) (تم مجھے ان پر فضیلت نہ دو) یہ بطریق تواضع ہے۔ اور یہ معنی مراد لینا بھی جائز ہے کہ تم مجھے ان پر عمل میں فضیلت نہ دو، شاید وہ عملاً مجھ سے افضل ہوں اور نہ ہی آزمائش اور امتحان میں مجھے فضیلت دو کیونکہ وہ آزمائش کے اعتبار سے مجھ سے اعظم ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کو قیامت کے دن تمام انبیاء علیہم السلام پر سرداری اور فضیلت عطا فرمائی ہے وہ آپ کے عمل کے سبب نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے آپ کو فضیلت دینے کے سبب ہے اور اپنے لئے آپ کو خاص کرنے کی وجہ سے ہے۔ اس تاویل کو مہلب نے اختیار کیا ہے۔

اور بعض نے کہا ہے: اس میں گہری غور و خوض سے منع کیا گیا ہے، کیونکہ گہری غور و خوض اس میں جھگڑے تک پہنچانے کا ذریعہ ہے اور وہ یہاں تک پہنچا دیتی ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے بارے میں وہ کچھ کہے جو اسے نہیں کہنا چاہیے اور مقابلے کے وقت ان کا احترام کم ہو جاتا ہے۔

ہمارے شیخ نے کہا ہے: پس یہ نہیں کہا جائے گا: نبی مکرم ﷺ تمام انبیاء علیہم السلام سے افضل ہیں اور نہ یہ کہا جائے گا: وہ فلاں سے افضل ہیں اور نہ ہی یہ کہا جائے گا کہ وہ بہتر ہیں۔ جیسا کہ نہی کا ظاہر اس پر دلالت کرتا ہے کیونکہ اس سے مفضول میں نقص اور عیب کا وہم ہو جاتا ہے، کیونکہ نہی لفظ کے اطلاق سے روکنے کا تقاضا کرتی ہے نہ کہ اس معنی کا اعتقاد رکھنے سے روکنے کا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان کر دیا ہے کہ رسل علیہم السلام کو ایک دوسرے پر فضیلت دی گئی ہے۔ پس آپ یہ نہیں کہیں گے: ہمارے نبی ﷺ انبیاء علیہم السلام سے بہتر ہیں اور نہ یہ کہ آپ فلاں نبی علیہ السلام سے بہتر ہیں، اس سے اجتناب کرتے ہوئے جس سے منع کر دیا گیا ہے اور اس کی اقتدا کرتے ہوئے اور اس اعتقاد کے مطابق عمل کرتے ہوئے جس تفضیل کو قرآن متضمن ہے اور حقائق امور کو اللہ تعالیٰ ہی جاننے والا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ان اقوال میں سے احسن قول اس کا ہے جس نے یہ کہا ہے: بلاشبہ فضیلت دینے سے روکنا خالصۃً

1۔ مشکوۃ المصابیح، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 507

2۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 481، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، کتاب الخصومات، حدیث نمبر 2235، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ مشکوۃ المصابیح، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 507

اس نبوت کی جہت سے ہے جو ایک خصلت ہے جس میں کسی کو دوسرے پر کوئی فضیلت نہیں، بلکہ یہ فضیلت احوال وخصوصیات، کرامات والطاف میں زیادتی اور متفرق معجزات کی بنا پر ہے اور رہی نبوت فی ذاتہا تو اس میں کسی کو دوسرے پر فضیلت نہیں، بلکہ یہ تفاضل دوسرے امور کے سبب ثابت ہوتا ہے جو اس پر مستزاد ہیں۔ اسی وجہ سے ان میں سے بعض رسل اولوالعزم ہیں اور ان میں سے وہ بھی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے خلیل بنایا ہے اور وہ بھی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے شرف ہمکلامی عطا فرمایا اور ان میں سے بعض کے درجات بلند کر دیے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ وَّ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۝ (بنی اسرائیل) (اور تحقیق ہم نے بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت دی اور ہم نے داؤد علیہ السلام کو زبور عطا فرمائی۔) اور مزید فرمایا: تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (یہ سب رسول ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔)

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اچھا قول ہے، کیونکہ اس نے بغیر نسخ کے آیات اور احادیث کے درمیان تطبیق کر دی ہے اور بعض کو بعض پر فضیلت دینے کا قول ان فضائل کی بنا پر ہے جو انہیں عطا فرمائے گئے اور ان وسائل کی وجہ سے ہے جو انہیں دیے گئے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس طرف اشارہ کیا ہے اور فرمایا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء علیہم السلام پر اور اہل آسمان پر فضیلت دی ہے تو صحابہ نے پوچھا: اے ابن عباس! رضی اللہ عنہما کیونکر اللہ تعالیٰ نے آپ کو آسمان والوں پر فضیلت دی ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَ مَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ۝ (الانبیاء) (اور جو ان میں سے یہ کہے کہ میں خدا ہوں اللہ تعالیٰ کے سوا تو اسے ہم سزا دیں گے جہنم کی۔ یونہی ہم سزا دیا کرتے ہیں ظالموں کو۔)

اور اللہ تعالیٰ نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے فرمایا ہے: اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۙ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ (الفتح) (یقیناً ہم نے آپ کو شاندار فتح عطا فرمائی ہے تاکہ دور فرما دے آپ کے لئے اللہ تعالیٰ جو الزام آپ پر (ہجرت سے) پہلے لگائے گئے اور جو ہجرت کے بعد لگائے گئے۔) پھر انہوں نے کہا: انبیاء علیہم السلام پر آپ کی فضیلت کیسی ہے؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (ابراہیم: 4) (اور ہم نے نہیں بھیجا کسی رسول کو مگر اس قوم کی زبان کے ساتھ تاکہ وہ کھول کر بیان کرے ان کے لئے (احکام الٰہی کو) اور اللہ تعالیٰ نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ارشاد فرمایا: وَ مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ (السبا: 28) (اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر تمام انسانوں کی طرف) پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو جن وانس کی طرف نبی بنا کر بھیجا۔ اسے ابو محمد الدارمی نے اپنی مسند میں ذکر کیا ہے۔

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے: خیر بنی آدم نوح و ابراھیم و موسیٰ و محمد صلی اللہ علیہ وسلم (1) کہ بنی آدم میں سے افضل اور بہتر حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہی رسولوں میں سے اولوالعزم ہیں۔ پس یہ تعیین میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی جانب سے نص ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ جنہیں رسالت عطا فرمائی گئی ہے وہ ان سے افضل ہیں جنہیں رسالت نہیں دی گئی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 338، دار الکتب العلمیہ

تو بلاشبہ جنہیں رسالت دی گئی ہے انہیں رسالت کے اعتبار سے دوسروں پر فضیلت دی گئی ہے اور وہ نبوت میں برابر ہیں، یہاں تک کہ رسولوں کو بھی اپنی امتوں کی جانب سے تکذیب اور انہیں قتل کرنے جیسی اذیتیں اور تکلیفیں پہنچتی رہی ہیں اور یہ ایسی شے ہے جس میں کوئی خفا نہیں ہے مگر ابن عطیہ ابومحمد عبدالحق نے کہا ہے: بلاشبہ قرآن کریم تفضیل کا تقاضا کرتا ہے۔ اور یہ فی الجملہ ہے اس میں کسی ایک مفضول کی تعیین نہیں ہے اور اسی طرح احادیث بھی ہیں اور اسی لئے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انا اکرم ولد آدم علی ربی (1) (میں اپنے رب کے نزدیک (تمام) اولاد آدم سے زیادہ معزز ہوں) اور فرمایا: ''میں اولاد آدم کا سردار ہوں (2)'' اور آپ نے تعیین نہیں فرمائی۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: ''کسی کے لئے یہ کہنا مناسب نہیں کہ میں حضرت یونس بن متی علیہ السلام سے بہتر ہوں (3)۔'' اور فرمایا: ''تم مجھے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر فضیلت نہ دو (4)۔'' اور ابن عطیہ نے کہا ہے: اس میں مفضول کی تعیین سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے، کیونکہ حضرت یونس علیہ السلام نوجوان تھے اور آپ اعبائے نبوت کے نیچے دب گئے، تو جب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ حکم توقیفی ہے تو دوسروں کے لئے تو بدرجہ اولیٰ ہوگا (5)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو موقف ہم نے اختیار کیا ہے وہی اولیٰ ہے ان شاء اللہ تعالیٰ، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جب یہ خبر دی ہے کہ اس نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے تو وہ بعض فضیلت والے انبیاء کو بیان بھی کرتا ہے اور ان احوال کا ذکر بھی کرتا ہے جن کے سبب انہیں فضیلت دی گئی ہے۔ پس اس نے فرمایا ہے: مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَ اٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ (البقرہ: ۲۵۳) (ان میں سے کسی سے کلام فرمایا اللہ نے اور بلند کیے ان میں سے بعض کے درجے اور دیں ہم نے عیسیٰ فرزند مریم کو کھلی نشانیاں۔)

اور مزید فرمایا: وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۝ (بنی اسرائیل) اور ہم نے داؤد علیہ السلام کو زبور عطا فرمائی اور مزید فرمایا: وَ اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ (اور ہم نے اسے انجیل عطا فرمائی) وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَ ضِيَآءً وَّ ذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ (الانبیاء) (اور یقیناً ہم نے عطا فرمایا موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کو فرقان اور روشنی اور ذکر پرہیزگاروں کے لئے) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ عِلْمًا (النمل: 15) (اور تحقیق ہم نے داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو علم عطا فرمایا) اور مزید فرمایا: وَ اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَ مِنْكَ وَ مِنْ نُّوْحٍ (احزاب: 7) (اور (اے حبیب!) یاد کرو جب ہم نے تمام نبیوں سے عہد لیا اور آپ سے بھی نوح سے بھی) پس یہ عام بیان کیا پھر خاص بیان کیا اور آغاز حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا اور یہ بالکل ظاہر ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی طرح گفتگو صحابہ کرام کے بارے میں بھی ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ وہ شرف صحبت میں تمام

1۔ مشکوٰۃ المصابیح فضل سید المرسلین، جلد 1، صفحہ 514۔ ایضاً، ترمذی، باب فی فضل النبی، حدیث نمبر 3543، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، جلد 1، صفحہ 329، وزارت تعلیم　3۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 485، وزارت تعلیم

4۔ ایضاً　5۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 338، دار الکتب العلمیہ

مشترک ہیں، پھر ان فضائل میں وہ متفرق اور جدا جدا ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انہیں مواہب ورسائل میں سے عطا فرمائے ہیں۔ پس وہ ان کے سبب ایک دوسرے پر فضیلت رکھتے ہیں اس کے باوجود ان تمام کو صحابیت، عدالت اور ان کی تعریف وغیرہ سب شامل ہیں۔ اور تجھے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہی کافی ہے: مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۗ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ (الفتح:29) ((جان عالم) محمد اللہ کے رسول ہیں اور وہ (سعادتمند) جو آپ کے ساتھی ہیں کفار کے مقابلہ میں بہادر طاقتور ہیں) اور مزید فرمایا: وَ اَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَ كَانُوْۤا اَحَقَّ بِهَا وَ اَهْلَهَا (الفتح:26) (اور انہیں استقامت بخش دی تقویٰ کے کلمہ پر اور وہ اس کے حق دار بھی تھے اور اس کے اہل بھی تھے۔) پھر فرمایا: لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ (الحدید:10) (تم میں سے کوئی برابری نہیں کر سکتا ان کی جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے (راہ خدا میں) مال خرچ کیا اور جنگ کی) اور مزید فرمایا: لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ (الفتح:18) (یقیناً راضی ہو گیا اللہ تعالیٰ ان مومنوں سے جب وہ بیعت کر رہے تھے آپ کی اس درخت کے نیچے۔) پس یہ بھی عام اور خاص بیان ہے۔ اور ان سے عیب اور نقص کی نفی کی ہے۔ رضی اللہ عنہم اجمعین ونفعنا بحبهم آمین۔

قولہ تعالیٰ: مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ جس سے کلام کی گئی ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت آدم علیہ السلام کے بارے عرض کی گئی: کیا وہ نبی مرسل تھے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہاں وہ نبی مکلم تھے" (یعنی جن سے کلام کی گئی۔) ابن عطیہ نے کہا ہے: بعض لوگوں نے تاویل یہ کی ہے کہ آدم علیہ السلام کو شرف ہمکلامی جنت میں عطا ہوا، اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت باقی رہے گی (1)۔ عبارت سے اسم کے طویل ہونے کے سبب ہا ضمیر کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اصل عبارت ہے: من كلمه الله۔

قولہ تعالیٰ: وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ نحاس نے کہا ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت شعبی اور حضرت مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ کے قول کے مطابق یہاں بَعْضَهُمْ سے مراد حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "میں سرخ وسیاہ کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں اور میرے لئے ساری زمین سجدہ گاہ اور پاکیزہ بنا دی گئی اور ایک مہینے کی مسافت سے رعب کے ساتھ میری مدد کی گئی اور میرے لئے غنائم حلال کر دی گئیں (2) اور مجھے شفاعت عطا کی گئی۔" اور اسی سے قرآن کریم، چاند کا شق ہونا، درخت کا آپ سے کلام کرنا، چند کھجوروں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت بڑی مخلوق کو کھلانا اور ام معبد کی بکری کے خشک ہونے کے بعد اسے دوہنا وغیرہ تمام معجزات آپ کے متعلق ہیں۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اور زائد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم امت کے اعتبار سے تمام لوگوں سے عظیم تر ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلہ انبیاء علیہم السلام کو ختم کیا گیا۔ علاوہ ازیں وہ خلق عظیم ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا۔ اور لفظ یہ احتمال رکھتا ہے کہ اس سے مراد حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے سوا وہ ہوں جن کی آیات و معجزات بڑے بڑے ہیں۔ اور کلام کا ذکر تاکید ا ہو سکتا ہے اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد حضرت ادریس علیہ السلام کو بلند مکان

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 338، دار الکتب العلمیہ
2۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، جلد 1، صفحہ 199، وزارت تعلیم

(آسمان) کی طرف اٹھالیا ہو اور مراد آسمان میں انبیاء علیہم السلام کے مراتب ہوں جیسا کہ حدیث اسراء میں ہے۔ اس کا ذکر عنقریب آئے گا۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات یہ ہیں: مردوں کو زندہ کرنا، مادر زاد اندھوں اور برص کے مریضوں کو شفایاب کرنا اور مٹی سے پرندے بنانا وغیرہ جیسا کہ اس پر قرآن کریم میں نص موجود ہے۔ وَ اَیَّدْنٰهُ اور ہم نے اسے قوت عطا فرمائی۔ بِرُوْحِ الْقُدُسِ یعنی حضرت جبریل علیہ السلام سے۔(1)

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِیْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو نہ لڑتے وہ لوگ جو ان رسولوں کے بعد آئے۔ یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ضمیر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے ہے اور تثنیہ کو جمع سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہ قول بھی ہے: من بعد جمیع الرسل یعنی تمام رسولوں کے بعد اور یہی لفظ کا ظاہر معنی ہے۔

اور کہا گیا ہے: بے شک یہ قتال اور جھگڑا ان لوگوں کی طرف سے واقع ہوا جو ان کے بعد آئے اور معنی اس طرح نہیں ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ لوگ ہر نبی کے بعد نہ لڑتے جھگڑتے۔ اور یہ اسی طرح ہے جیسے تو کہتا ہے: اشتریت خیلا ثم بعتها (میں نے گھوڑا خریدا پھر اسے بیچ دیا۔) پس اس عبارت میں تیرے لئے جائز ہے کہ تو ایک گھوڑا خریدے اور اسے بیچ دے پھر دوسرا خرید لے اور اسے بیچ دے پھر تیسرا خریدے اور اسے بیچ دے اور اسی طرح یہ نوازل (سخت مصیبتیں) بھی ہیں کہ لوگوں کا ہر نبی علیہ السلام کے بعد اختلاف ہوا۔ پس ان میں سے وہ بھی ہیں جو ایمان لائے اور ان میں سے وہ بھی ہیں جنہوں نے دنیوی ساز وسامان کی طلب اور حسد میں کفر اختیار کیا اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور قضا وقدر کے ساتھ ہوا اور اگر اللہ تعالیٰ اس کا خلاف اور برعکس چاہتا تو وہی ہوتا لیکن وہ اس فعل کو سر حکمت کے ساتھ خاص کر لیتا ہے جس کا وہ ارادہ فرماتا ہے۔ اور وَ لٰكِنِ اخْتَلَفُوْا میں نون کو دو ساکن ملنے کی وجہ سے کسرہ دیا گیا ہے اور قرآن کے سوا اور کلام میں اس کا حذف بھی جائز ہوتا ہے اور سیبویہ نے شعر کہا ہے:

فلستُ بآتیه ولا استطیعهُ　ولاكِ اسقنی ان كان ماؤُكَ ذافَضْلِ

پس میں اس کی طرف آنے والا نہیں ہوں (جس کی طرف تو نے مجھے دعوت دی ہے) اور نہ میں اس کی استطاعت رکھتا ہوں، لیکن تو مجھے پانی سے سیراب کر اگر تیرے پاس فالتو پانی ہے۔

فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ۔ اس میں مَنْ مبتدا ہونے اور صفت کے سبب محل رفع میں ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَ لَا خُلَّةٌ وَّ لَا شَفَاعَةٌ ؕ وَ الْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

''اے ایمان والو! خرچ کرلو اس (مال) سے جو ہم نے دیا ہے تم کو اس سے پہلے کہ آجائے وہ دن جس میں نہ تو خرید وفروخت ہوگی اور نہ (کفار کے لئے) دوستی ہوگی اور نہ (ان کے لئے) شفاعت۔ اور جو کافر ہیں وہی ظالم ہیں۔''

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 339، دار الکتب العلمیہ۔ صحیح بخاری، کتاب التیمم، حدیث نمبر 323، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حسن نے کہا ہے: یہ فرض زکوٰۃ کا ذکر ہے۔ اور ابن جریج اور سعید بن جبیر رحمۃاللہ علیہما نے کہا ہے: یہ آیت فرض زکوٰۃ اور نفلی صدقات وغیرہ کو جامع ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ صحیح ہے لیکن سابقہ آیات قتال کے ذکر میں ہیں۔ اور بے شک اللہ تعالیٰ مومنین کے ساتھ اس کو رو کتا ہے جو کافروں کے سینوں میں ہے اور اس سے یہ موقف ترجیح پاتا ہے کہ اس سے مراد ندباً اور مستحباً اللہ تعالیٰ کے راستے میں مال خرچ کرنا ہے۔ اور آیت کے آخر میں یہ قول اسے مزید تقویت دیتا ہے: وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ یعنی تم ان سے اپنی جانوں کے ساتھ لڑتے ہوئے اور اموال خرچ کرتے ہوئے مقابلہ کرو۔(1)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس تاویل پر ایک بار مال خرچ کرنا واجب ہوگا اور ایک بار مستحب جہاد کے تعین اور اس کے عدم تعین کے اعتبار سے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس (مال) سے خرچ کرنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمایا اور جس کے ساتھ ان پر انعام کیا۔ اور انہیں روک کر رکھنے سے ڈرایا یہاں تک کہ وہ دن آجائے جس میں کوئی خرید و فروخت ممکن نہ ہوگی اور نہ ہی کسی نفقہ کو پانا ممکن ہوگا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ (تو (اس وقت) وہ کہنے لگے کہ اے میرے رب! تو نے مجھے تھوڑی مدت کے لئے کیوں مہلت نہ دی تاکہ میں صدقہ (و خیرات) کر لیتا۔)

اور الخُلَّة سے مراد خالص دوستی ہے۔ یہ تخلل الاسرار بین الصدیقین سے ماخوذ ہے۔ (دو دوستوں کے درمیان راز خاص ہیں۔) اور الخِلالةُ و الخَلالةُ و الخُلالةُ تمام کا معنی دوستی اور محبت ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

وكيف تواصِلُ مَنْ اَصْبَحَتْ خلالتُه كأبي مَرْحَب

تو اسے کیسے پہنچ سکتا ہے جس کی دوستی ابو مرحب کی طرح ہوگئی ہے۔

اور ابو مرحب سائے کی کنیت ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ اس عرقوب کی کنیت ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے: مواعید عرقوب (عرقوب کے وعدے۔) اور الخُلَّةُ سے مراد میٹھی اور شیریں گھاس بھی ہے جو عام بوٹی سے خالی ہو۔ کہا جاتا ہے: الخُلَّةُ خُبْزُ الإبِلِ والحُمْضُ فاكهتها (شیریں گھاس اونٹ کی روٹی ہے اور نمکین و تلخ گھاس اس کا پھل ہے۔) اور الخَلَّةُ (خاء کے فتحہ کے ساتھ) اس کا معنی حاجت اور فقر ہے اور الخَلَّةُ کا معنی ابن مخاض بھی ہے۔ (یعنی ایک سال کا اونٹ)، یہ اصمعی سے روایت ہے۔ کہا جاتا ہے: أتاهم بقُرْص كأنه فِرْسِن خَلَّة (وہ ان کے پاس ایک ٹکیہ لے کر آیا گویا کہ وہ اونٹ کا کھر ہے۔) اس کا مؤنث بھی خَلَّةٌ ہی ہے۔ اور میت کے لئے کہا جاتا ہے: اللّٰهم اصلح خَلَّتَهُ (اے اللہ! اس کے اس خلل کی اصلاح فرما دے جو اس نے چھوڑا ہے۔) اور الخَلَّةُ کا معنی ترش و نمکین گھنا پودا بھی ہے۔

اور الخِلَّةُ یہ خلل السیوف کا واحد مؤنث ہے۔ اور یہ وہ غلاف ہیں جن کے ساتھ تلواروں کی میانوں کو ڈھانپا جاتا ہے اور یہ سونے وغیرہ کے ساتھ منقش ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی ہے سُیُور تُلْبَس ظهر سيتى القوس یعنی وہ تسمے جو قوس کی دونوں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 339، دار الکتب العلمیہ

طرفوں کے ظاہر کو پہنائے جاتے ہیں اور الخلۃ کا معنی وہ شے بھی ہے جو دانتوں میں باقی رہ جاتی ہے۔ اس کا بیان سورۃ النساء میں الخلیل کے مادہ اشتقاق اور اس کے معنی کی بحث میں آئے گا۔

پس اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ آخرت میں نہ کوئی دوستی ہوگی اور نہ شفاعت مگر اللہ تعالیٰ کے اذن سے۔ اور اس کی حقیقت اللہ تعالیٰ کی جانب سے رحمت ہے جس کے ساتھ وہ اسے شرف بخشے گا جسے شفاعت کرنے کی اجازت عطا فرمائے گا۔

ابن کثیر اور ابو عمرو نے لَا بَيْعَ فِيْهِ وَلَا خُلَّةَ وَلَا شَفَاعَةَ نصب کے ساتھ بغیر تنوین کے قراءت کی ہے اور اسی طرح سورۃ ابراہیم میں لَا بَيْعَ فِيْهِ وَلَا خِلٰلَ۔

اور سورہ الطور میں ہے لَا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ۔ (1)

اور حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا ہے:

أَلَا طِعَانَ وَلَا فُرْسَانَ عادیۃٌ إِلَّا تَجَشُّؤُكُمْ عند التَّنَانِير

اس میں بھی لا طعان ولا فرسان منصوب ہیں۔

ہمزہ استفہام لَا کے عمل کو تبدیل کرنے والا نہیں ہے۔ جیسا کہ تیرا قول ہے: أَلَا رجلَ عندك۔ اور یہ بھی جائز ہے أَلَا رجلٌ ولا امرأۃٌ۔ جیسا کہ بغیر استفہام کے ایسا کہنا جائز ہے۔ پس تو اسے جان لے۔

باقی تمام نے اسے رفع اور تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ جیسا کہ الراعی نے کہا ہے:

وما صَرَمْتُكِ حتی قُلْتِ مُعْلِنَۃً لا ناقۃٌ لِیَ فی هذا ولا جَمَلُ

اور میں نے تجھے نہیں چھوڑا یہاں تک کہ تو نے اعلان کرتے ہوئے کہا اس میں نہ میری کوئی اونٹنی ہے اور نہ کوئی اونٹ ہے

اور یہ روایت بھی ہے: وما هجرتكِ پس فتحہ نفی عام پر دلالت کرتا ہے جو اس صنف کی تمام وجوہ کو مستغرق ہے۔ گویا کہ یہ جواب ہے اس کا جس نے کہا: کیا اس میں بیع ہوگی؟ پس سائل نے عام سوال کیا، تو پھر جواب بھی نفی عام کے ساتھ دیا جائے گا۔ اور لا اسم منفی کے ساتھ مل کر ایک اسم کے قائم مقام ہے جو مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہے۔ اور فِيْهِ خبر ہے۔ اور اگر چاہے تو اسے يَوْمٌ کی صفت بنالے اور جنہوں نے رفع دیا ہے انہوں نے لا کو بمنزلہ لَيْسَ قرار دیا ہے اور جواب کو خبر عام بنایا ہے اور گویا یہ اس کا جواب ہے جس نے کہا: ''کیا اس میں بیع ہوگی''؟ یعنی کلام میں بیع سے پہلے مِنْ کو ساقط کر دیا ہے۔ پس جواب ایسا لایا گیا جو رفع سے اسے تبدیل کرنے والا نہیں اور اسم مرفوع مبتدا ہے یا لَيْسَ کا اسم ہے اور فِيْهِ خبر ہے۔

مکی نے کہا ہے: بہتر اور عمدہ رفع ہے، کیونکہ اکثر قراء نے اسی طرح پڑھا ہے۔ اور قرآن کے علاوہ دیگر کلام میں الا بيعَ فيه ولا خلۃٌ پڑھنا بھی جائز ہے۔ اور سیبویہ نے بنی مذحج کے ایک آدمی کے لئے کہا ہے:

هذا لَعَمْرُ كُمُ الصغار بعينه لا أُمَّ لِي ان كان ذاك ولا أَبٌ

اس میں بھی لا اُمَّ لِي ولا أَبٌ پڑھا گیا ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 340، دار الکتب العلمیہ

اور جائز ہے کہ پہلے کو مبنی (برفتحہ) پڑھا جائے اور دوسرے کو نصب اور تنوین دی جائے۔ پس تو کہہ سکتا ہے: لا رجلَ فیہ ولا امرأۃً، جیسا کہ سیبویہ نے کہا ہے:

لا نسبَ الیوم ولا خلۃً اتسع الخرقُ علی الرّاقِعِ

اور لا دونوں مقامات میں زائدہ ہے، پہلے کا عطف محل پر ہے اور دوسرے کا لفظ پر ہے۔ اور پانچویں وجہ یہ ہے کہ پہلے کو رفع دیا جائے گا اور دوسرے کو مبنی پڑھا جائے گا۔ جیسا کہ آپ کا قول: لا رجلٌ فیہا ولا امرأۃَ، جیسا کہ امیہ نے کہا ہے:

فلا لغْوٌ ولا تأثِیمَ فیہا وما فَاھُوا بہ أبدًا مقیم

اعراب کی پانچوں وجہیں تیرے اس قول میں جائز ہیں: لا حول ولا قوۃ الا باللہ، یہ پہلے گزر چکا ہے۔ والحمد للہ۔ وَالْكٰفِرُوْنَ یہ مبتدا ہے۔ هُمْ یہ مبتدائے ثانی ہے، الظّٰلِمُوْنَ یہ دوسرے مبتدا کی خبر ہے اور اگر تو چاہے تو هُمْ ضمیر کو زائدہ بنا لے بطور ضمیر فصل کے۔ اور الظّٰلِمُوْنَ خبر ہے الْكٰفِرُوْنَ کی۔ عطا بن دینار نے کہا ہے (1): سب تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے یہ کہا ہے: وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ اور یہ نہیں کہا ہے والظَّالِمُوْنَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ (یعنی یہ کہا ہے کہ کفار ظالم ہیں یہ نہیں کہا ہے کہ ظالم کافر ہیں۔)

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ ۚ وَ لَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ ۚ وَ لَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَ هُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ۝

''اللہ (وہ ہے کہ) کوئی عبادت کے لائق نہیں بغیر اس کے زندہ ہے سب کو زندہ رکھنے والا ہے۔ نہ اس کو اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ کون ہے جو سفارش کر سکے اس کے پاس بغیر اس کی اجازت کے۔ جانتا ہے جو ان سے پہلے (ہو چکا) ہے اور جو ان کے بعد (ہونے والا) ہے اور وہ نہیں گھیر سکتے کسی چیز کو اس کے علم سے مگر جتنا وہ چاہے۔ سما رکھا ہے اس کی کرسی نے آسمانوں اور زمین کو اور نہیں تھکاتی اسے زمین و آسمان کی حفاظت اور وہی ہے سب سے بلند عظمت والا۔''

قولہ تعالیٰ: اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ۔ یہ آیۃ الکرسی ہے، یہ قرآن کی آیات کی سردار ہے اور سب سے بڑی آیت ہے، جیسا کہ سورۃ الفاتحہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ یہ رات کے وقت نازل ہوئی اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو بلایا اور یہ آیت لکھوا دی۔

حضرت محمد بن حنیفہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: جب آیۃ الکرسی نازل ہوئی دنیا میں تمام بت گر گئے اور اسی

1۔ تفسیر طبری، جلد 4، صفحہ 526

طرح دنیا میں تمام بادشاہ گر پڑے اوران کے سروں سے تاج گر گئے اور شیاطین بھاگ پڑے۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کو مارنے لگے اور ابلیس کے پاس تمام جمع ہو گئے اور اسے اس کے بارے مطلع کیا، تو اس نے انہیں کہا کہ وہ اس کے بارے تفتیش کریں۔ چنانچہ وہ مدینہ طیبہ کی طرف آئے تو انہیں یہ خبر موصول ہوئی کہ آیت الکرسی نازل ہوئی ہے۔ ائمہ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے، انہوں نے فرمایا: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے ابا المنذر! کیا تو جانتا ہے تیرے پاس قرآن کریم میں سے کون سی آیت سب سے بڑی ہے؟'' انہوں نے کہا: میں نے عرض کی: اللہ و رسولہ اعلم۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے ابا المنذر! کیا تو جانتا ہے تیرے پاس کتاب اللہ میں سے کون سی آیت سب سے بڑی ہے؟'' تو میں نے عرض کی: اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا: ''اے ابا المنذر! تجھے علم مبارک ہو(1)۔'' حکیم ترمذی ابوعبداللہ نے یہ اضافہ ذکر کیا ہے۔ ''قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے، اس آیت کی ایک زبان ہے اور دو ہونٹ ہیں ساق عرش کے پاس شہنشاہ مطلق کی پاکی بیان کرتی ہے (2)''۔

ابوعبداللہ نے کہا ہے: یہ آیت اللہ تعالیٰ جل ذکرہ نے اسے نازل فرمایا اور اس کا ثواب اس کے پڑھنے والے کے لئے دنیا اور آخرت میں رکھا ہے۔ پس دنیا میں تو یہ ہے کہ یہ اپنے پڑھنے والے کی آفات و مصائب سے حفاظت کرتی ہے۔ نوف البکالی سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: آیت الکرسی تورات میں وَلِیَّةُ اللہ کے نام سے پکاری جاتی ہے اور اس کے پڑھنے والوں کو ملکوت السموات والارض میں عزیز پکارا جاتا ہے۔ فرمایا: حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ جب اپنے گھر میں داخل ہوتے تو وہ اپنے گھر کے چاروں کونوں میں آیۃ الکرسی پڑھتے تھے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ آپ اس کے ذریعے چاروں اطراف سے اپنی حفاظت کا انتظام کرتے تھے اور یہ کہ شیطان آپ کے گھر کے کونوں سے آپ سے دور ہو جائے (3)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے ایک جن سے کشتی کی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے پچھاڑ دیا، تو جن نے آپ کو کہا: مجھ سے ذرا ہٹو یہاں تک کہ میں آپ کو وہ بتاتا ہوں جس کے ساتھ تم ہم سے محفوظ رہ سکتے ہو۔ تو آپ نے اسے چھوڑ دیا اور اس سے پوچھا، تو اس نے کہا: بلاشبہ تم ہم سے آیۃ الکرسی کے ساتھ محفوظ رہ سکتے ہو (4)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ صحیح ہے اور حدیث میں ہے: جس نے ہر نماز کے پیچھے آیۃ الکرسی پڑھی تو اس کی روح قبض کرنے کی ذمہ داری رب ذوالجلال لے لیتا ہے اور وہ اس آدمی کی طرح ہے جس نے انبیاء علیہم السلام کی معیت میں جنگ لڑی یہاں تک کہ اسے شہید کر دیا گیا۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے کہا: میں نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جس نے ہر نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھی تو اس کے لئے موت کے سوا کوئی شے جنت میں داخل ہونے کے مانع نہیں ہے اور اس پر صدیق اور عابد ہی مواظبت اختیار کرتا ہے اور جس نے اسے اس وقت پڑھا جب وہ اپنے بستر پر گیا تو اللہ تعالیٰ نے

1۔ صحیح مسلم، فضائل القرآن، جلد 1، صفحہ 271، وزارت تعلیم۔ سنن ابی داؤد، باب ماجاء فی آیۃ الکرسی، حدیث نمبر 1248، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ نوادر الاصول، جلد 1، صفحہ 337-338 3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 338 4۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 338

اسے، اس کے پڑوسیوں کو اور اس کے پڑوسیوں کے پڑوسیوں کو اور اس کے ارد گرد کے گھروں کو محفوظ فرما دیا (1)''۔

اور بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان المبارک کی زکوٰۃ (صدقہ فطر) کی حفاظت میرے سپرد کی، آگے پورا قصہ ذکر کیا۔ اور اس میں ہے: تو میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم خیال یہ ہے کہ وہ مجھے ایسے کلمات سکھا دے گا جن کے سبب اللہ تعالیٰ مجھے نفع پہنچائے گا، سو میں نے اس کا راستہ چھوڑ دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ کیا ہیں؟'' میں نے عرض کی: اس نے مجھے کہا ہے: جب تو اپنے بستر میں جائے تو اول سے آخر تک آیۃ الکرسی پڑھا کر اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ۔ اور اس نے مجھے کہا ہے: تجھ پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے مسلسل محافظ رہے گا اور صبح ہونے تک کوئی شیطان تیرے قریب نہیں آئے گا۔ اور وہ (صحابہ کرام) خیر کی چیز لینے کے بہت زیادہ حریص تھے تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلاشبہ اس نے تجھ سے سچ کہا ہے حالانکہ وہ بہت جھوٹا ہے۔ اے ابو ہریرہ! کیا تو اسے جانتا ہے جس سے تو تینوں راتیں باتیں کرتا رہا ہے؟'' عرض کی: نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ شیطان ہے (2)''۔

مسند داری ابو محمد میں ہے شعبی نے کہا ہے: حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ایک آدمی کا ایک جن سے آمنا سامنا ہو گیا تو وہ آپس میں کشتی کرنے لگے تو اس صحابی نے اسے پچھاڑ دیا۔ تو اس آدمی نے اسے کہا: بلاشبہ میں تجھے کمزور بلند غبار کی مانند دیکھ رہا ہوں گویا تیرے دونوں ہاتھ کتے کے ہاتھوں کی طرح ہیں، کیا تم اسی طرح ہوتے ہو۔ اے جنوں کے گروہ! یا تو ان میں سے اس طرح ہے؟ اس نے کہا: نہیں قسم بخدا! بلاشبہ میں ان میں سے مضبوط پسلیوں والا ہوں، البتہ تو دوبارہ میرے ساتھ کشتی کر، اگر تو نے مجھے پچھاڑ لیا تو میں تجھے ایسی شے سکھا دوں گا جو تیرے لئے نفع بخش ہو گی۔ صحابی نے فرمایا: ہاں ٹھیک ہے۔ پھر انہوں نے اسے پچھاڑ دیا، تو اس نے کہا: کیا تم آیت الکرسی پڑھتے ہو: اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ؟ انہوں نے کہا: ہاں، تو اس نے کہا کیونکہ تم جب بھی اسے اپنے گھر میں پڑھو گے تو شیطان گدھے کی مثل ہوا خارج کرتے ہوئے اس سے نکل جائے گا اور پھر صبح ہونے تک اس میں داخل نہ ہو گا۔ اسے ابو نعیم نے ابو عاصم ثقفی سے اور انہوں نے شعبی سے روایت کیا ہے۔ اور ابو عبیدہ نے اسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی غریب حدیث میں ذکر کیا ہے۔ ابو معاویہ نے اس کے بارے ہمیں ابو عاصم ثقفی سے، انہوں نے شعبی سے اور انہوں نے حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے۔ فرمایا کہ حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ کو کہا گیا: کیا وہ عمر رضی اللہ عنہ تھے؟ تو انہوں نے فرمایا: امکان یہی ہے کہ وہ عمر کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔

ابو محمد داری نے کہا ہے۔ الضئیل کا معنی ہے: باریک (کمزور)، الشخیت کا معنی ہے: انتہائی لاغر کمزور، الضلیع کا معنی ہے: پیٹ سے خارج ہونے والی ہوا۔ اور یہ لفظ حاء کے ساتھ الحبج بھی ہے۔

اور ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے حم - المؤمن - اِلَیْهِ الْمَصِیْرُ تک اور آیۃ الکرسی صبح کے وقت پڑھیں تو شام ہونے تک وہ ان دونوں کے سبب محفوظ رہے گا اور

1۔ مشکوۃ المصابیح، کتاب الذکر بعد الصلوٰت، جلد 1، صفحہ 89
2۔ صحیح بخاری، کتاب الوکالۃ، جلد 1، صفحہ 310، وزارت تعلیم

جس نے ان دونوں کو شام کے وقت پڑھا تو وہ صبح ہونے تک ان کے سبب محفوظ رہے گا(1)۔'' فرمایا: یہ حدیث غریب ہے۔

اور ابو عبداللہ الترمذی الحکیم نے کہا ہے: روایت کیا گیا ہے کہ مومنین کے لئے محافظت کی خاطر ہر نماز کے بعد انہیں پڑھنا مستحب ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی جس نے ہر نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھنے پر دوام اختیار کیا میں اسے اس سے زیادہ عطا کروں گا جو میں شکر کرنے والوں کو عطا کرتا ہوں اور انبیاء علیہم السلام کا اجر اور صدیقین کے اعمال کا اجر اور میں اس پر اپنا دست رحمت پھیلا دیتا ہوں اور اس کے لئے کوئی شے رکاوٹ نہیں ہے کہ میں اسے جنت میں داخل کروں مگر یہ کہ ملک الموت اسے لے آئے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: اے میرے پروردگار! جس نے اس کے بارے سنا وہ اس پر دوام اختیار نہیں کرے گا؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''میں یہ اپنے بندوں میں سے کسی کو عطا نہیں کروں گا سوائے نبی کے یا صدیق کے یا ایسے آدمی کے جس سے میں محبت کرتا ہوں یا ایسے آدمی کے جس کے بارے میں ارادہ کروں کہ وہ میرے راستے میں قتل ہو جائے۔''

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''اے موسیٰ! جس کسی نے ہر نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھی تو میں اسے انبیاء علیہم السلام (کے اعمال) کا ثواب عطا کروں گا۔ ابو عبداللہ نے کہا ہے: میرے نزدیک اس کا معنی ہے: میں اسے انبیاء علیہم السلام کے عمل کا ثواب عطا فرماؤں گا اور جہاں تک نبوت کے ثواب کا تعلق ہے تو وہ سوائے انبیاء علیہم السلام کے اور کسی کے لئے نہیں ہے(2)۔

یہ آیت توحید اور اعلیٰ صفات کو متضمن ہے۔ اس میں پچاس کلمے ہیں اور ہر کلمے میں پچاس برکتیں ہیں۔ اور یہ تہائی قرآن کریم کے برابر ہے۔ حدیث طیبہ میں اسی طرح وارد ہے۔ ابن عطیہ نے اسے ذکر کیا ہے۔

اور لفظ اَللّٰهُ مبتدا ہے اور لَآ اِلٰهَ مبتدا ثانی ہے اور اس کی خبر محذوف ہے اور وہ معبودٌ یا موجود ہے۔ اور اِلَّا هُوَ، لا اللہ کے محل سے بدل ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ مبتدا اور خبر ہے اور یہ مرفوع ہے اور اس معنی پر محمول ہے یعنی ما الہ الا ھو۔ (سوائے اس کے کوئی الہ نہیں ہے) اور غیر قرآن میں لا الہ الا ایاہ پڑھنا بھی جائز ہے۔ اور استثنا کی بناء پر ضمیر منصوب ہے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے اپنی طویل حدیث میں کہا ہے: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں سے کون سی سب سے بڑی آیت آپ پر نازل فرمائی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ (3) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: قرآن کریم میں اشرف اور بلند رتبہ آیت آیۃ الکرسی ہے۔ بعض علماء نے کہا ہے: کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی کا تکرار مضمراً اور ظاہراً اٹھارہ بار کیا جاتا ہے۔ (اس لئے یہ دوسری آیات

1۔ جامع ترمذی، فضائل القرآن، جلد 2، صفحہ 111
2۔ نوادر الاصول، جلد 1، صفحہ 338
3۔ صحیح مسلم، فضائل القرآن، جلد 1، صفحہ 271

سے بلند رتبہ اور اعلیٰ ہے۔)

اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ یہ الله تعالیٰ کی صفت ہے اور اگر چاہے تو اسے ھُوَ سے بدل بنا لے اور اگر چاہے تو یہ خبر کے بعد خبر بھی ہو سکتی ہے اور اگر چاہے تو اس سے پہلے مبتدا مضمر بھی ہو سکتا ہے اور غیر قرآن میں اسے مدح کی بنا پر منصوب پڑھنا بھی جائز ہے۔

اور اَلْحَیُّ الله تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک اسم ہے جس کے ساتھ اسے پکارا جاتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ الله تعالیٰ کا اسم اعظم ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام جب مردے کو زندہ کرنے کا ارادہ فرماتے تھے تو وہ انہیں اسماء کے ساتھ دعا مانگتے تھے۔ یا حَیُّ یا قیّوم۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت آصف بن برخیا نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس تخت بلقیس لانے کا ارادہ فرمایا تو اسی قول کے ساتھ دعا مانگی: یا حَیُّ یا قیّوم۔ اور یہ قول بھی ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے الله تعالیٰ کے اسم اعظم کے بارے میں پوچھا تو آپ نے انہیں فرمایا: أیاھیا أیاھیا یعنی یا حیّ یا قیّوم۔ اور کہا جاتا ہے: یہی سمندر میں سفر کرنے والوں کی دعا ہے کہ جب انہیں غرق ہونے کا خوف لگتا ہے تو انہی اسماء کے ساتھ دعا مانگتے ہیں (پکارتے ہیں)۔

علامہ طبری نے ایک قوم سے بیان کیا ہے کہ کہا جائے گا: حیّ قیّوم جیسا کہ الله تعالیٰ نے اپنا وصف خود بیان کیا ہے اور پھر اس میں کوئی غور و فکر کیے بغیر اسے اس کے سپرد کر دیا جائے گا۔

اور یہ قول بھی ہے: الله تعالیٰ نے امور کے محل میں تصرف کرنے اور اشیاء کی مقادیر مقرر کرنے کی وجہ سے اپنا نام حیّ رکھا ہے اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حیّ وہ ہوتا ہے جسے موت نہیں آتی۔

اور سدی نے کہا ہے: الحیّ سے مراد باقی رہنے والا ہے۔ لبید کا قول ہے:

فاما تریني الیوم اصبحتُ سالما   فلستُ بأحیا من کلابٍ و جَعْفَر

پس اگر تو آج مجھے دیکھ رہا ہے کہ میں نے صحیح سالم صبح کی ہے تو میں کلاب و جعفر میں سے باقی رہنے والا نہیں ہوں۔

اور کبھی کہا جاتا ہے: بلاشبہ یہی اسم الله تعالیٰ کا اسم اعظم ہے۔ اَلْقَیُّوْمُ یہ قَامَ سے ہے: یعنی مخلوق کو تدبیر کے ساتھ قائم رکھنے والا۔ یہ قتادہ سے مروی ہے۔

اور حسن نے کہا ہے: اس کا معنی ہے: ہر نفس کو اس کے ساتھ قائم رکھنے والا جو اس نے کمایا ہے تاکہ وہ اسے اس کے عمل کے مطابق جزا دے، اس حیثیت سے کہ وہ اس کے بارے میں جاننے والا ہے اور ان میں سے کوئی شے اس پر مخفی نہیں ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا معنی ہے وہ ذات جو نہ بدلتی ہے نہ ختم ہوتی ہے۔ (یعنی نہ اس کی حالت میں کوئی تغیر و تبدل ہوتا ہے اور نہ وہ زوال پذیر ہے) امیہ بن ابی الصلت نے کہا ہے:

لم تُخلَقِ السماءُ والنجوم   والشمس معها قمر یقوم

آسمان اور ستارے، سورج اور اس کے ساتھ قائم ہونے والا چاند نہیں پیدا کیے گئے۔

قدّرہ مُھَیْمِن قَیُّوْمٌ   والحشر والجنة والنعیم

جسے نگہبان قیوم نے مقرر کیا ہے۔ اور حشر اور جنت اور تمام نعمتیں (نہیں پیدا کی گئیں)

اِلَّا لِأَمرٍ شانه عظيمٌ

مگر ایسے امر کے لئے جس کی شان انتہائی عظیم ہے۔

علامہ بیہقی نے بیان کیا ہے: میں نے اسماعیل الضریر کی ''عیون التفسیر'' میں اَلْقَيُّوْمُ کی تفسیر میں دیکھا ہے۔ انہوں نے کہا ہے اور کہا جاتا ہے: وہ وہ ہے جو سوتا نہیں ہے، گویا کہ انہوں نے یہ مفہوم آیۃ الکرسی میں اس کے بعد والے ارشاد گرامی سے لیا ہے: لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ۔

اور کلبی نے کہا ہے: اَلْقَيُّوْمُ وہ ہے جس کی ابتدا نہ ہو۔ اسے ابوالانباری نے بیان کیا ہے۔

قیوم کی اصل قَيْوُوم ہے، واؤ اور یاء ایک کلمے میں جمع ہیں ان میں سے پہلا حرف ساکن ہے پس واؤ کو یاء سے بدلنے کے بعد پہلی یا کو دوسری میں ادغام کر دیا۔ قیوم فعول کے وزن پر نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ واؤ سے ہے تو یہ قیووم ہو جائے گا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت علقمہ، حضرت اعمش اور حضرت نخعی رحمۃ اللہ علیہم نے الحی القیام الف کے ساتھ پڑھا ہے اور یہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اور اہل لغت کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے کہ عربوں کے نزدیک القیوم زیادہ اعرف ہے اور بنا کے اعتبار سے زیادہ صحیح اور علت کے اعتبار سے زیادہ ثابت ہے۔ اور القیام القوام سے القیام کی طرف منقول ہے۔ الفعال کو الفیعال کی طرف پھیرا گیا ہے، جیسا کہ الصواغ کو الصیاغ کہا گیا ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

اِن ذا العرش لَلذی یرزق النا س و حیٌّ علیهم قیّوم

بلاشبہ صاحب عرش وہ ہے جو لوگوں کو رزق عطا فرماتا ہے اور وہ ان پر حی و قیوم ہے۔

پھر رب العالمین نے اس کی نفی کی ہے کہ اسے اونگھ آئے یا نیند (یعنی نہ اسے اونگھ آتی ہے اور نہ نیند)

السِنَةُ کا معنی تمام کے قول کے مطابق اونگھ ہے اور اونگھ وہ ہوتی ہے جو آنکھ میں ہوتی ہے اور جب وہ دل میں ہو جائے تو پھر نوم (نیند) ہو جاتی ہے۔ عدی بن رقاع نے ایک عورت کا فتور نظر کے ساتھ وصف بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

وسْنَانُ اقصَدَہ النُّعاسُ فَرَنَّقَتْ فی عینه سِنَةٌ و لیس بنائم

وسنان کا اونگھ نے ارادہ کر رکھا ہے۔ پس اس کی آنکھوں میں اونگھ داخل ہو چکی ہے اور وہاں نیند نہیں ہے۔

اور مفضل نے ان دونوں کے درمیان فرق کیا ہے اور کہا ہے کہ السِنۃ یہ سر کی جانب سے ہوتی ہے اور نعاس آنکھ میں ہوتی ہے اور نوم (نیند) دل میں ہوتی ہے۔

اور ابن زید نے کہا ہے: وسنان وہ ہے جو نیند سے بیدار ہوتا ہے حالانکہ وہ عقل و سمجھ نہیں رکھتا یہاں تک کہ وہ بسا اوقات اپنے گھر والوں پر تلوار ننگی کر لیتا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ جو کچھ ابن زید نے کہا ہے یہ محل نظر ہے۔ کلام عرب سے اسے نہیں سمجھا جا سکتا (1)۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 341، دار الکتب العلمیہ

اور سدی نے کہا ہے: اَلسِّنَةَ سے مراد اس نیند کی ہوا ہے جو چہرے پر لگتی ہے اور انسان اونگھنے لگتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: بالجملہ اس سے مراد وہ فتور اور ڈھیلا پن ہے جو انسان کو لاحق ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ اس کی عقل مفقود نہیں ہوتی۔ اور اس آیت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی بھی خلل واقع نہیں ہوتا اور کسی حال میں بھی اسے کوئی اکتاہٹ اور سستی لاحق نہیں ہوتی۔

سنة میں اصل وَسْنَةَ ہے اس میں واو کو حذف کر دیا گیا ہے جیسا کہ یَسِنُ سے حذف کی گئی ہے اور النوم سے مراد وہ ثقل اور بوجھ ہے جس کے ساتھ انسان کے حق میں ذہن زائل ہو جاتا ہے (یعنی عقل کام نہیں کرتی) اس میں واوٗ عطف کے لئے ہے اور لا تاکید کے لئے ہے۔

میں کہتا ہوں: لوگ اس باب میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کرتے ہیں، انہوں نے بیان کیا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور حکایت موسیٰ علیہ السلام سے منبر پر بیان کرتے ہوئے سنا ہے'' کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں خیال آیا کیا اللہ تعالیٰ جل ثناؤہ بھی سوتا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف ایک فرشتہ بھیجا اور اس نے آپ کو تین بار بیدار کیا پھر اس نے آپ کو دو بوتلیں دے دیں، ہر ہاتھ میں ایک بوتل تھی اور آپ کو حکم دیا کہ ان دونوں کی حفاظت کریں۔ فرمایا: پھر آپ سونے لگے اور قریب تھا کہ آپ کے دونوں ہاتھ آپس میں مل جاتے پھر آپ بیدار ہو جاتے اور آپ انہیں ایک دوسرے سے دور ہٹا لیتے بالآخر آپ گہری نیند سو گئے اور آپ کے دونوں ہاتھ آپس میں ٹکرائے اور دونوں بوتلیں ٹوٹ گئیں۔ فرمایا..... اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے یہ مثال بیان فرمائی کہ اگر وہ سوتا رہتا تو پھر یہ آسمان اور زمین (اپنی اپنی جگہ) مضبوطی سے ٹھہرے نہ رہتے (1)۔'' یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ اسے کئی ایک نے ضعیف کہا ہے اور ان میں سے امام بیہقی بھی ہیں۔

قولہ تعالیٰ: لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (یعنی زمین و آسمان کی ہر شے) اس کی ملکیت ہے۔ اور وہ تمام کا مالک اور رب ہے۔ عبارت میں مَا ذکر کیا گیا ہے اگرچہ ان میں وہ بھی شامل ہیں جو عقل رکھتے ہیں تو یہ اس حیثیت سے ہے کہ اس میں مراد مجموعی طور پر موجود چیزیں ہیں۔ (چاہے وہ ذوی العقول یا غیر ذوی العقول ہوں) علامہ طبری نے کہا ہے: یہ آیت نازل ہوئی جب کفار نے کہا: مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (زمر: 3) (ہم بتوں کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لئے تا کہ وہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے بہت زیادہ نزدیک کر دیں۔)

قولہ تعالیٰ: مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ اس میں مَنْ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے اور ذَا اس کی خبر ہے۔ اور الَّذِيْ، ذَا کی صفت ہے اور اگر چاہے تو بدل بنا لے اور یہ جائز نہیں ہے کہ ذَا زائدہ ہو جیسا کہ مَا کے ساتھ زائد کیا گیا ہے کیونکہ مَا مبہم ہوتا ہے اور ذَا کی اس کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے اس کے ساتھ اسے زائد کر دیا گیا ہے۔

اور اس آیت میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ شفاعت کے بارے میں جسے چاہے گا اذن عطا فرمائے گا اور وہ انبیاء علیہم السلام، علماء، مجاہدین، ملائکہ اور ان کے علاوہ وہ لوگ ہیں جنہیں رب العالمین یہ اعزاز و اکرام اور شرف عطا فرمائے گا۔

1۔ مجمع الزوائد و منبع الفوائد، کتاب الایمان، جلد 1 صفحہ 257، حدیث نمبر 273، دار الفکر

پھر وہ شفاعت نہیں کریں گے مگر انہیں کے لئے جن کے لئے وہ راضی ہوگا۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: وَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: جو ظاہر ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ علماء اور صالحین ان کے بارے میں شفاعت کریں گے جو ابھی جہنم تک نہیں پہنچے اور وہ دونوں منزلوں کے درمیان ہوں گے یا وہاں پہنچ چکے ہوں گے لیکن ان کے اعمال صالحہ بھی ہوں گے۔

اور بخاری باب بقیۃ من ابواب الرؤیۃ میں ہے: بے شک مومنین کہیں گے: اے ہمارے رب! بلاشبہ ہمارے بھائی ہمارے ساتھ نماز پڑھتے تھے اور ہمارے ساتھ روزے رکھتے تھے اور یہ شفاعت ان کے بارے میں ہے جن کا معاملہ بالکل قریب کا ہوتا ہے (1) جیسا کہ جنت کے دروازے کے ساتھ چمٹنے والا بچہ شفاعت کرے گا۔

بلاشبہ یہ ان کے قرابتداروں اور ان کے جاننے پہچاننے والوں کے بارے میں ہے اور انبیاء علیہم السلام ان کے بارے میں شفاعت کریں گے جو ان کے گنہگار امتی اپنے گناہوں کے سبب جہنم میں داخل ہو چکے ہوں گے بغیر کسی قرابت اور معرفت کے صرف نفس ایمان کے سبب (وہ شفاعت کریں گے)۔ پھر خطاؤں اور گناہوں میں مستغرق ان لوگوں کے بارے میں ارحم الراحمین کی شفاعت باقی رہ جائے گی جن کے بارے میں انبیاء علیہم السلام کی شفاعت نے کوئی عمل نہ کیا اور حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت حساب کی تعجیل کے بارے میں ہوگی اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہی خاص ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں شفاعت کی کیفیت بڑے شافی بیان کے ساتھ بیان کر دی ہے۔ شاید آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اسے نہیں پڑھا کہ شفاعت کرنے والے جہنم میں داخل ہوں گے اور وہاں سے ایسے لوگوں کو نکالیں گے جنہوں نے عذاب واجب جان لیا ہوگا۔ پس اس بنا پر یہ کہنا بعید نہیں ہے کہ مومنین کے لئے دو شفاعتیں ہوں گی: ایک شفاعت ان کے بارے میں جو ابھی جہنم تک نہیں پہنچے اور دوسری شفاعت ان کے بارے میں جو اس تک پہنچ چکے ہوں گے اور اس میں داخل ہو چکے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے پناہ عطا فرمائے۔ آمین۔

سو آپ نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ذکر کیا ہے: "پھر جہنم پر ایک پل بچھایا جائے گا اور شفاعت کھل جائے گی اور وہ کہنے لگیں گے: اللّٰھم سلّم سلّم۔ اے اللہ! سلامتی کے ساتھ گزار دے۔ سلامتی کے ساتھ گزار دے۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وہ پل کیسا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس میں پاؤں رکھنے کی جگہ پر پھسلن ہوگی (پاؤں قرار نہ پا سکیں گے) اس کے ساتھ لوہے کے ٹیڑھے کنڈے ہوں گے اور اس میں سخت جگہ پر ایسے خاردار پودے ہوں گے جن کو سعدان کہا جاتا ہے۔ پس مومنین اس سے آنکھ جھپکنے کی طرح، بعض بجلی کی طرح، بعض ہوا کی طرح، بعض پرندوں کی طرح اور بعض گھوڑوں اور اونٹوں کی تیز رفتاری کی طرح گزر جائیں گے اور وہ نجات پا جائے گا جو سلامت رہا، جسے فقط خراشیں آئیں اور جسے آتش جہنم میں گرنے سے بچا لیا گیا، یہاں تک کہ جب مومنین آگ سے خلاصی پا جائیں گے۔ پس قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! تم میں سے کوئی بھی ان مومنین سے زیادہ طاقتور نہیں جو قیامت کے دن اپنے ان بھائیوں کا حق لینے کے لئے جو جہنم میں ہوں گے اللہ کی بارگاہ میں قسم کے ساتھ عرض کریں گے۔ وہ کہیں گے: اے ہمارے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 341، دار الکتب العلمیہ۔ بخاری شریف، کتاب التوحید، حدیث نمبر 6886، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رب! وہ ہمارے ساتھ روزے رکھتے تھے، نمازیں پڑھتے تھے اور حج کرتے تھے، تو ان کو کہا جائے گا: تم انہیں نکال لو جنہیں تم پہچانتے ہو۔ پس ان کی صورتیں آگ پر حرام کر دی جائیں گی اور وہ بہت زیادہ مخلوق کو نکال کر لے آئیں گے حالانکہ آگ نے نصف پنڈلی تک اور گھٹنوں تک انہیں پکڑا ہوا ہوگا۔ پھر وہ عرض کریں گے: اے ہمارے رب! جن کے بارے تو نے ہمیں حکم دیا تھا ان میں سے کوئی باقی نہیں رہا، تو رب العالمین ارشاد فرمائے گا: تم واپس جاؤ اور جس کے دل میں ایک دینار کے برابر بھی خیر اور نیکی پاؤ تو اسے نکال لاؤ۔ پھر وہ کثیر مخلوق کو نکال لائیں گے۔ اور پھر عرض کریں گے: اے ہمارے رب! ہم نے ان میں سے کوئی ایک بھی جہنم میں نہیں چھوڑا جن کے بارے تو نے ہمیں حکم ارشاد فرمایا تھا۔ پھر رب کریم فرمائے گا تم واپس لوٹ جاؤ اور جس کے دل میں تم نصف دینار کے برابر بھی خیر اور نیکی پاؤ تو اسے بھی نکال لاؤ چنانچہ وہ خلق کثیر کو نکال کر لے آئیں گے۔ پھر عرض کریں گے: اے ہمارے رب! ہم نے اس میں ان میں سے کوئی ایک بھی نہیں چھوڑا جن کے بارے تو نے ہمیں حکم ارشاد فرمایا، پھر رب العالمین ارشاد فرمائے گا تم واپس چلے جاؤ اور جس کے دل میں تم رائی کے دانے برابر بھی خیر اور نیکی پاؤ تو اسے نکال لاؤ چنانچہ وہ کثیر مخلوق کو نکال لائیں گے۔ پھر عرض کریں گے: اے ہمارے رب! ہم نے اس میں کوئی خیر اور بھلائی نہیں چھوڑی۔'' حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: اگر تم اس حدیث کے بارے میری تصدیق نہ کرو تو پھر چاہو تو یہ پڑھ لو: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَ اِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَ يُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ (بے شک اللہ تعالیٰ ظلم نہیں کرتا ذرہ برابر بھی، (بلکہ) اگر ہو معمولی سی نیکی تو دوگنا کر دیتا ہے اسے اور دیتا ہے اپنے پاس سے اجر عظیم۔)

پس اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ملائکہ شفاعت کر چکے، انبیاء علیہم السلام شفاعت کر چکے اور مومن بھی شفاعت کر چکے اور رب ارحم الراحمین کے سوا کوئی باقی نہیں رہا۔ پس اللہ تعالیٰ جہنم سے ایک قبضہ (مشت) بھرے گا اور اس سے اس قوم کو نکال کر لے آئے گا جنہوں نے کبھی بھی خیر اور نیکی کا عمل نہیں کیا حالانکہ وہ کوئلہ بن چکے ہوں گے (1)۔ اور آگے حدیث ذکر کی۔

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ذکر ہے کہ حضور نبی کرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سو میں عرض کروں گا: اے میرے پروردگار! مجھے اس کے بارے اجازت عطا فرما جس نے کہا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ تو رب کریم فرمائے گا: وہ تیرے لئے نہیں ہے یا فرمایا: وہ تیری طرف نہیں ہے۔ مجھے اپنی عزت، کبریائی اور عظمت وجلال کی قسم ہے میں ضرور بہ ضرور اسے نکالوں گا جس نے کہا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ (2)

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا گیا ہے: ''یہاں تک کہ جب اللہ تعالیٰ بندوں کے درمیان قضا (فیصلہ فرمانے) سے فارغ ہوگا اور ارادہ فرمائے گا کہ وہ اہل جہنم میں سے جنہیں چاہے اپنی رحمت کے ساتھ نکال لے تو وہ ملائکہ کو حکم ارشاد فرمائے گا کہ وہ جہنم سے انہیں نکال لائیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی شے کو شریک نہیں ٹھہراتے تھے ان میں سے جن کے بارے اللہ تعالیٰ نے رحمت فرمانے کا ارادہ کیا ہے اور وہ کہتے ہیں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ پس وہ فرشتے انہیں جہنم

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 102، وزارت تعلیم۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب التوحید، حدیث نمبر 6886، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 110، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، حدیث نمبر 6956، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں پہچان لیں گے اور وہ انہیں سجدوں کے نشانات سے پہچانیں گے، آگ ابن آدم کو کھا جائے گی سوائے سجدوں کے اثر کے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ نے آپ پر سجدوں کے اثر (نشان) کو کھانا حرام قرار دیا ہے (1)۔'' الحدیث بطولہ۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ مومنین وغیرہم کی شفاعت بلاشبہ ان کے لئے ہے جو جہنم میں داخل ہو چکے ہوں گے اور اس میں پہنچ چکے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔ آمین۔ اور ابن عطیہ کا قول: ''ان میں سے جو نہیں پہنچے یا پہنچ چکے'' یہ احتمال رکھتا ہے کہ وہ دوسری احادیث سے لیا گیا ہو۔ واللہ اعلم۔

ابن ماجہ نے اپنی سنن میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے دن لوگوں کی کئی صفیں بنائی جائیں گی'' اور ابن نمیر نے کہا ہے: اہل جنت کی پس اہل نار میں سے ایک آدمی ایک آدمی کے پاس سے گزرے گا تو وہ کہے گا: اے فلاں! کیا تجھے وہ دن یاد نہیں ہے جب تو نے پانی طلب کیا تو میں نے تجھے خوب جی بھر کر پانی پلایا تھا؟ فرمایا: تو وہ اس کی شفاعت کر دے گا اور ایک اور آدمی ایک آدمی کے پاس سے گزرے گا اور کہے گا کیا تجھے وہ دن یاد نہیں ہے جب میں نے تجھے طہور (جس سے پاکی حاصل کی جائے) دیا تھا؟ چنانچہ وہ اس کی شفاعت کر دے گا ابن نمیر نے کہا . وہ کہے گا اے فلاں! کیا تجھے وہ دن یاد نہیں جس دن تو نے مجھے فلاں فلاں کام کے لئے بھیجا تھا اور میں تیرے لئے چلا گیا تھا؟ پس وہ اس کی شفاعت کرے گا (2)۔'' رہیں ہمارے نبی مکرم محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعتیں تو ان کے بارے میں اختلاف ہے۔

ایک قول ہے کہ وہ تین ہیں ایک قول ہے کہ وہ دو ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ پانچ ہیں۔ اس کا بیان سبحان میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور ہم نے ان پر کتاب ''التذکرہ'' میں بحث کی ہے۔ والحمد للہ۔

قولہ تعالیٰ: **يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ** دونوں ضمیریں ہر اس ذی عقل کی طرف لوٹ رہی ہیں جنہیں یہ قول متضمن ہے: **لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ** اور مجاہد نے کہا ہے: **مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ** سے مراد دنیا اور **وَمَا خَلْفَهُمْ** سے مراد آخرت ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ سب فی نفسہ صحیح ہے، اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ ما بین الید سے مراد ہر وہ شے ہے جو انسان کے سامنے ہے اور ما خلفہ سے مراد ہر وہ شے ہے جو اس کے بعد آئے گی۔ اور حضرت مجاہد کے قول کی طرح ہی سدی وغیرہ نے بھی کہا ہے۔

قولہ تعالیٰ: **وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ** یہاں علم بمعنی معلوم ہے یعنی وہ اس کی معلومات میں سے کسی شے کا احاطہ نہیں کر سکتے اور یہ حضرت خضر علیہ السلام کے اس قول کی طرح ہے جو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس وقت کہا جب چڑیا نے سمندر میں چونچ ماری، میرا اور تمہارا علم اللہ تعالیٰ کے علم سے کم نہیں ہے مگر اتنا ہی جتنی یہ چڑیا اس سمندر سے کم ہے۔ پس یہ اور جو اس کے مشابہ ہے وہ معلومات کی طرف راجع ہے، کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا علم تو وہ ہے جو اس کی ذاتی

1۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب التوحید، حدیث نمبر 6885، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الادب، جلد 1 صفحہ 270، وزارت تعلیم

صفت ہے وہ منقسم نہیں ہوتا۔ اور آیت کا معنی ہے: کسی کے لئے کوئی معلوم نہیں مگر وہی جو اللہ تعالیٰ چاہے کہ وہ اسے جان لے۔

قولہ تعالیٰ: وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ۔ ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کرسی ایک موتی ہے اور قلم بھی ایک موتی ہے اور قلم کی لمبائی سات سو برس کی ہے اور کرسی کی طوالت اتنی ہے جسے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔''

حماد بن سلمہ نے عاصم بن بہدلہ سے...... اور یہی عاصم بن ابی النجود ہیں...... اور انہوں نے زر بن حبیش کے واسطہ سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہر دو آسمانوں کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے اور ساتویں آسمان اور کرسی کے درمیان پانچ سو برس کا فاصلہ ہے اور کرسی اور عرش کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے اور عرش پانی کے اوپر ہے اور اللہ تعالیٰ (اپنی شان قدرت کے مطابق) عرش کے اوپر ہے اور وہ اسے جانتا ہے جس میں اور جس پر تم ہو۔ کہا جاتا ہے: كُرْسِيّ اور كِرْسِيّ اور جمع الكراسي ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: كرسيه کا معنی علمه (1) (اس کا علم) ہے۔

اور علامہ طبری نے اسے ترجیح دی ہے اور کہا ہے: اسی سے وہ كراسة (کاپی) بھی ہے جو علم کو جمع کرتی ہے۔ (اور محفوظ رکھتی ہے) اور اسی وجہ سے علماء کو الكراسي کہا گیا ہے، کیونکہ ان پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

يَحُفُّ بهم بِيضُ الوُجوه و عُصْبَةٌ كَراسِيُّ بالأحداث حين تَنُوبُ

اچھی شہرت رکھنے والے اور علماء کا گروہ انہیں ان امور کے ساتھ گھیر لیتا ہے (2) جب وہ پیش آتے ہیں۔

اور کہا گیا ہے: كرسيه سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ قدرت ہے جس کے ساتھ وہ آسمانوں اور زمین کو ٹھہرائے ہوئے ہے۔ جس طرح آپ کہتے ہیں: اجعل لهذا الحائط كرسيا، اس دیوار کی کرسی بنا دو یعنی وہ جس پر اس کا اعتماد اور سہارا ہو۔ اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے قریب ہے جو انہوں نے وَسِعَ كُرْسِيُّهُ میں کیا ہے۔ علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اور ہم نے حضرت ابن مسعود اور حضرت سعید بن جبیر سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد وَسِعَ كُرْسِيُّهُ میں یہ روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا علم ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے تمام روایات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ اس سے مراد وہی کرسی ہے جو عرش کے ساتھ مشہور ہے۔ اور اسرائیل نے سدی سے اور انہوں نے ابو مالک سے اس قول وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کے تحت روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: بے شک وہ چٹان جس پر ساتویں زمین ہے اور اس کی اطراف پر مخلوق کی انتہا ہے، اس پر چار فرشتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کے چار چہرے ہیں: ایک انسان کا چہرہ، ایک شیر کا چہرہ، ایک بیل کا چہرہ اور ایک گدھ کا چہرہ، پس وہ اس پر کھڑے ہیں حالانکہ وہ زمینوں اور آسمانوں کو گھیرے ہوئے ہیں اور ان کے سر کرسی کے نیچے ہیں اور کرسی عرش کے نیچے ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی کرسی کو عرش کے اوپر رکھے ہوئے ہے۔ علامہ بیہقی نے کہا ہے: اس میں اشارہ دو کرسیوں کی طرف

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 342، دار الکتب العلمیہ 2۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 16

ہے ان میں سے ایک عرش کے نیچے ہے اور دوسری عرش پر رکھی ہوئی ہے۔

اور أسباط عن السدی عن ابی مالك اور عن ابی صالح عن ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عن مرۃ الهمدانی عن ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عن مرۃ الهمدانی عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ عن ناس من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت میں ارشاد باری تعالیٰ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کے تحت موجود ہے کہ آسمان وزمین کرسی کے درمیان میں ہیں اور کرسی عرش کے سامنے ہے۔ اور ملحدین اس کو بادشاہ کی عظمت اور جلالت سلطان پر محمول کرتے ہیں اور وہ عرش وکرسی کے وجود کا انکار کرتے ہیں اور یہ کوئی شے نہیں ہے۔ اور اہل حق ان دونوں کو جائز قرار دیتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں بڑی وسعت ہے اور اس کے ساتھ ایمان لانا واجب ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: کرسی قدم رکھنے کی جگہ ہے اور اس کی کجاوے کے چرچرانے کی طرح چرچراہٹ ہے۔

علامہ بیہقی نے کہا: ہم نے اس میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی روایت کیا ہے اور ہم نے ذکر کیا ہے کہ اس کا معنی جو معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ عرش سے (نیچے) رکھی ہوئی ہے (جیسے) تخت سے قدم رکھنے کی جگہ اور اس میں اللہ تعالیٰ کے لئے مکان کا اثبات نہیں ہے۔ اور حضرت ابن بریدہ نے اپنے باپ سے روایت بیان کی ہے، انہوں نے فرمایا: جب حضرت جعفر رضی اللہ عنہ حبشہ سے آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: ''کیا تم نے کوئی انتہائی تعجب خیز شے دیکھی ہے؟'' انہوں نے کہا: میں نے ایک عورت کو دیکھا ہے اس کے سر پر کھانے کا ایک ٹوکرا ہے۔ پس ایک شہسوار گزرا اور اس نے وہ ٹوکرا گرا دیا۔ پس وہ عورت بیٹھ گئی اور اپنا کھانا (طعام) جمع کرنے لگی۔ پھر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی اور اسے کہا: تیرے لئے اس دن ہلاکت اور بربادی ہو جس دن بادشاہ اپنی کرسی رکھے گا اور وہ مظلوم کے لئے ظالم کو پکڑے گا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قول کی تصدیق کرتے ہوئے کہا: لاقُدِّسَتْ أمۃ (امت پاک کردی گئی) یا فرمایا: کیف تقدس أمۃ (امت کیسے پاکی بیان کرتی ہے) اس کا کمزور اس کے طاقتور سے اپنا حق نہیں لے سکے گا(1)۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے قول میں ہے۔ ''کرسی قدم رکھنے کی جگہ ہے'' وہ مراد یہ لیتے ہیں (کہ کرسی) عرش رحمٰن سے اس طرح ہے جیسے بادشاہوں کے تختوں سے قدم رکھنے کی جگہ ہوتی ہے اور یہ عرش کے سامنے بہت بڑی مخلوق ہے اور اس کی نسبت عرش کی طرف ایسے ہی ہے جیسے کرسی کی نسبت بادشاہ کے تخت کی طرف ہے۔

اور حسن بن ابی الحسن نے کہا ہے کہ کرسی سے مراد نفس عرش ہے۔ اور یہ قول پسندیدہ نہیں ہے اور جس کا تقاضا احادیث کرتی ہیں وہ یہ ہے کہ کرسی عرش کے سامنے پیدا کی گئی ہے اور عرش اس سے بڑا ہے(2)۔

اور ابو ادریس خولانی نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا، میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم سب سے عظیم آیت کون سی ہے جو آپ پر نازل کی گئی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آیۃ الکرسی (3) پھر فرمایا:

1۔ مجمع الزوائد، کتاب الخلافۃ، صفحہ 375، حدیث نمبر 9054
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 342، دار الکتب العلمیہ
3۔ شعب الایمان، جلد 2، صفحہ 457

اے ابوذر! (رضی اللہ عنہ) سات آسمانوں کو کرسی کے ساتھ ایسی ہی نسبت ہے جیسے وسیع زمین پر پھینکی ہوئی انگوٹھی کے حلقہ کو اس کے ساتھ ہوتی ہے اور عرش کو کرسی پر ایسی ہی فضیلت حاصل ہے جیسی وسیع زمین کو انگوٹھی کے حلقہ پر ہوتی ہے۔" اسے آجری، ابو حاتم بستی نے اپنی صحیح مسند میں اور بیہقی نے روایت کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ یہ روایت صحیح ہے۔

اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ساتوں آسمان اور زمین کرسی کے مقابلے میں وسیع زمین میں پھینکی ہوئی انگوٹھی کے حلقہ کی طرح ہیں۔ اور یہ آیت اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کے عظیم ہونے کے بارے میں آگاہ کرتی ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کی عظمت کا پتہ چلتا ہے کیونکہ اس امر عظیم کی حفاظت اسے نہیں تھکاتی۔

اور یَؤُدُہٗ کا معنی ہے وہ اسے بھاری اور بوجھل بنا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے: آدنی الشیٔ بمعنی أثقلنی۔ اس نے مجھے تھکا دیا اور میں نے اس سے مشقت برداشت کی۔ اسی کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت حسن اور حضرت قتادہ رحمہما اللہ وغیرہم نے اس لفظ کی تفسیر بیان کی ہے۔ زجاج نے کہا ہے: یہ جائز ہے کہ اس میں ہا ضمیر اللہ تعالیٰ کے لئے ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ کرسی کے لئے ہو۔ اور جب کرسی کے لئے ہوگی تو پھر یہ اللہ تعالیٰ کے امر میں سے ہے (یعنی کرسی)...... اور الْعَلِیُّ اس سے مراد قدر و منزلت کی بلندی ہے نہ کہ مکان کی بلندی، کیونکہ اللہ تعالیٰ جگہ اور مکان سے منزہ اور پاک ہے۔

اور علامہ طبری نے ایک قوم سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ وہ اپنی مخلوق سے بلند ہے کیونکہ اس کا مکان اپنی مخلوق کی جگہوں سے بلند ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ جسم ماننے والے جہلاء کا قول ہے اور اصل یہی ہے کہ اسے بیان نہ کیا جائے (1)۔

اور عبدالرحمن بن قرط سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج آسمانوں کی بلندیوں میں تسبیح سنی: سبحان اللہ العلی الأعلی سبحانہ و تعالیٰ اور العلی و العالی ان کا معنی ہے اشیاء پر بہت سخت غلبہ رکھنے والا۔ عرب کہتے ہیں: علا فلان فلانا۔ یعنی فلاں فلاں پر غالب آگیا۔ شاعر نے کہا ہے:

فلما عَلَونا و استَوَینا علیهم　　　ترکنا هم صَرْعی لِنَسْرٍ و کاسِرٍ

پس جب ہم غالب آئے اور ہم نے انہیں خوب ہلاک کیا تو ہم نے ان کے مردوں کو گدھوں اور عقابوں کے لئے چھوڑ دیا

اور اسی سے قول باری تعالیٰ ہے: اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ۔

الْعَظِیْمُ۔ یہ صفت ہے۔ اس کا معنی ہے قدر و منزلت اور شرف کے اعتبار سے عظیم۔ یہ اجسام کی عظمت کے معنی میں نہیں ہے۔ علامہ طبری نے ایک قوم سے بیان کیا ہے کہ العظیم بمعنی المعظم ہے (جس کو عظمت دی جائے) جیسے کہا جاتا ہے: عتیق بمعنی معتق ہے اور اعشی کا شعر ہے:

فکأن الخمر العَتیقَ من الإس　　　فِنطِ ممزوجةً بماءٍ زُلالٍ (2)

گویا کہ وہ شراب جو اسفنط (شراب کی ایک قسم) سے آزاد ہے درآنحالیکہ وہ میٹھے پانی سے ملی ہوئی ہو۔

اور ایک قوم سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا ہے: اگر یہ بمعنی معظم ہو تو پھر لازم آتا ہے کہ وہ مخلوق

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 342　　2۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 19-18، دار احیاء التراث العربیۃ

کو پیدا کرنے سے پہلے اور اسے فنا کرنے کے بعد عظیم نہ ہو کیونکہ اس وقت اسے عظیم بنانے والی کوئی شے نہیں (1)۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵۶﴾

''کوئی زبردستی نہیں ہے دین میں۔ بے شک خوب واضح ہوگئی ہے ہدایت گمراہی سے۔ تو جو انکار کرے شیطان کا اور ایمان لائے اللہ کے ساتھ تو اس نے پکڑ لیا مضبوط حلقہ جو ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ اس میں دو مسئلے ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ۔ اس آیت میں دین سے مراد وہ ہے جس کا اعتقاد رکھا جاتا ہے اور وہ ملت ہے اور اس پر قرینہ یہ ارشاد ہے: قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ اور اکراہ وہ جو ایمان، بیوع، ہبات وغیرہ احکام میں سے ہے یہ اس کا محل نہیں ہے، اس کی بحث اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ (مگر وہ جسے مجبور کیا جائے) کی تفسیر میں آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور ابو عبد الرحمن نے قَدْ تَبَيَّنَ الرَّشَدُ مِنَ الْغَيِّ پڑھا ہے اور اسی طرح حسن اور شعبی سے بھی روایت ہے۔ کہا جاتا ہے: رَشَدَ يَرْشُدُ رُشْدًا، اور رَشِدَ يَرْشَدُ رَشَدًا جب آدمی اس شے تک پہنچ جائے جسے وہ پسند کرتا ہے اور غوی اس کی ضد ہے۔ نحاس سے یہی منقول ہے۔ ابن عطیہ نے ابو عبد الرحمن السلمی سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے الرشاد الف کے ساتھ پڑھا ہے اور حسن سے اَلرُّشُدُ راء اور شین کے ضمہ کے ساتھ بھی مروی ہے (2)۔

اَلْغَيُّ یہ مصدر ہے غَوَى يَغْوِيْ سے۔ جب کوئی آدمی اعتقاد یا رائے میں گمراہ ہو جائے اور یہ مطلقاً نہیں کہا جا سکتا اَلْغَيُّ فِي الضلال۔ (غی گمراہی میں ہے)

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے اور اس میں چھ اقوال ہیں:

(۱) کہا گیا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے، کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے عربوں کو دین اسلام پر مجبور کیا اور ان سے لڑائیاں کیں اور آپ ان سے اسلام کے بغیر کسی پر راضی نہ ہوئے۔ سلیمان بن موسیٰ نے یہی کہا ہے۔ انہوں نے کہا: اسے اس ارشاد سے منسوخ کر دیا ہے: يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ (التوبہ: 73) (اے نبی مکرم ﷺ! جہاد کیجئے کافروں اور منافقوں کے ساتھ) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور بہت سے مفسرین سے یہی مروی ہے۔

(۲) یہ آیت منسوخ نہیں ہے۔ بلاشبہ یہ صرف اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی کہ انہیں اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا جب وہ جزیہ ادا کریں اور وہ لوگ جن پر زبردستی کی جائے گی وہ بت پرست ہیں۔ سو ان سے اسلام کے سوا کوئی شے قبول نہیں کی جائے گی اور انہیں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ۔ یہ حضرات شعبی، قتادہ، حسن اور ضحاک رحمہم اللہ کا قول ہے اور اس قول کی دلیل وہ روایت ہے جسے حضرت زید بن اسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے باپ

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 19، دار احیاء التراث العربیۃ　2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 344، دار الکتب العلمیہ

سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا: میں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو سنا، آپ بوڑھی نصرانی عورت کو کہہ رہے تھے: اے بڑھیا! تو اسلام قبول کر لے تو محفوظ ہو جائے گی، بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے۔ اس نے جواب دیا: میں انتہائی بوڑھی عورت ہوں اور موت میرے بہت قریب ہے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ! گواہ رہنا اور پھر یہ آیت تلاوت کی: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ الآیۃ۔

(۳) وہ قول ہے جو ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا: یہ آیت انصار کے بارے میں نازل ہوئی۔ ایک عورت مقلات (وہ عورت جس کا بچہ زندہ نہ رہے) ہوتی تھی، پس وہ اپنے اوپر یہ لازم کر لیتی تھی کہ اگر اس کا بچہ زندہ رہا تو وہ اسے یہودی بنائے گی۔ پس جب بنو نضیر کو جلاوطن کیا گیا تو ان سے انصار کے بہت سے بچے تھے۔ تو انہوں نے کہا: ہم اپنے بچے نہیں چھوڑیں گے۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۔ ابوداؤد نے کہا ہے: مقلات وہ عورت ہوتی ہے جس کا بچہ زندہ نہ رہتا ہو(1)۔

ایک روایت میں ہے: بلاشبہ ہم نے کیا جو ہم نے کیا اور ہم گمان کرنے لگے کہ ان کا دین اس سے افضل ہے جس پر ہم ہیں، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے دین اسلام عطا فرمایا تو ہم انہیں اس پر مجبور کرنے لگے تب لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ نازل ہوئی (یعنی) جو چاہے وہ ان کے ساتھ مل جائے اور جو چاہے وہ دین اسلام میں داخل ہو جائے۔ یہ قول حضرت سعید بن جبیر، حضرت شعبی اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہم کا ہے، مگر آپ نے یہ بھی کہا ہے: انصار کے بچوں کا بنی نضیر میں ہونے کا سبب رضاعت تھا (یعنی دودھ پلانے کے لئے بچے ان کے پاس چھوڑے گئے تھے۔)

نحاس نے کہا ہے: اس آیت کے بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول صحت اسناد کی وجہ سے تمام اقوال سے اولیٰ اور ارجح ہے اور یہ کہ اس کی مثل قول فقط رائے سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔

(۴) سدی نے کہا ہے: یہ آیت انصار میں سے ایک آدمی کے بارے میں نازل ہوئی، اسے ابوحصین کہا جاتا تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ شام سے کچھ تاجر زیتون کا تیل لے کر مدینہ طیبہ آئے اور جب انہوں نے وہاں سے جانے کا ارادہ کیا تو حصین کے دونوں بیٹے ان کے پاس آئے اور انہوں نے ان دونوں کو نصرانیت کی دعوت دی، سو وہ دونوں عیسائی ہو گئے اور ان کے ساتھ شام چلے گئے تو ان کا باپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ان کے معاملے کی شکایت لے کر حاضر ہوا اور اس نے یہ خواہش کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی ایسا آدمی بھیج دیں جو انہیں واپس لوٹا لائے۔ پس یہ آیت نازل ہوئی: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ اور اس وقت تک اہل کتاب کے ساتھ لڑنے کے بارے حکم نہیں دیا گیا تھا۔ اور آپ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو دور کر دیا ہے وہ دونوں کفر کرنے والوں میں اول ہیں۔“ پس ابوحصین کے دل میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں (کچھ ملال سا) پیدا ہوا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تلاش میں کوئی آدمی نہ بھیجا تو اللہ تعالیٰ جل شانہ نے یہ آیت نازل فرمائی: فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ الآیہ (النساء: 65) پھر اللہ تعالیٰ نے لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کو منسوخ کر دیا اور اہل

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 9

کتاب کے ساتھ لڑائی کرنے کے بارے سورۂ برأت میں حکم ارشاد فرمایا۔

اور ارشاد باری تعالیٰ: فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ کے سبب نزول کے بارے میں صحیح حضرت زبیر کا اپنے پڑوسی انصاری (1) کے ساتھ پانی والا واقعہ ہے۔ اس کا تفصیلی بیان سورۃ النساء میں آئے گا ان شاء اللہ۔

(۵) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے جو تلوار کے خوف سے اسلام لائے تم اسے مُجْبَرًا اور مُکْرَہًا نہ کہو۔ یہی ان میں پانچواں قول ہے۔

(۶) اور چھٹا قول یہ ہے کہ یہ آیت قیدیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جب وہ اہل کتاب میں سے ہوں کہ ان پر زبردستی نہ کی جائے جب وہ بڑے ہوں اور اگر وہ مجوسی ہوں چھوٹے ہوں یا بڑے یا بت پرست ہوں تو بلاشبہ انہیں اسلام پر مجبور کیا جائے گا، کیونکہ جس نے انہیں قیدی بنا رکھا ہے وہ ان سے ان کے بت پرست ہونے کے ساتھ کوئی نفع حاصل نہیں کر سکتا۔ کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ ان کا ذبیحہ نہیں کھایا جاتا اور ان کی عورتوں سے وطی نہیں کی جاسکتی اور وہ مردار کھانے اور دیگر نجاستوں کے بارے اعتقاد رکھتے ہیں۔ مالک ان کے لئے انہیں نجس سمجھے گا اور ملک کے اعتبار سے ان سے نفع اٹھانا اس پر متعذر ہو جائے گا۔ نتیجۃً اس کے لئے زبردستی کرنا جائز ہے۔ اسی طرح ابن القاسم نے مالک سے روایت کیا ہے اور رہے اشہب تو انہوں نے کہا ہے: وہ اس کے دین پر ہوں گے جس نے انہیں قیدی بنایا ہے۔ پس جب وہ انکار کریں تو انہیں اسلام پر مجبور کیا جائے اور چھوٹوں کا کوئی دین نہیں ہوتا۔ اسی لئے انہیں دین اسلام میں داخل ہونے پر مجبور کیا جائے تاکہ وہ کسی باطل دین کی طرف مائل نہ ہو جائیں۔

پس تمام کی تمام انواع کفر جب جزیہ دینے لگیں تو ہم انہیں اسلام پر مجبور نہ کریں گے چاہے وہ عربی ہوں یا عجمی، قریشی ہوں یا کوئی اور...... اس کا بیان آگے آئے گا۔ علماء نے جزیہ کے بارے میں جو کہا ہے اور جس سے جزیہ قبول کیا جائے گا اس کا بیان سورۂ برأت میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قولہ تعالیٰ: فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ۔ شرط کی وجہ سے فعل کو جزم دی گئی ہے۔ الطاغوت مؤنث ہے طَغَی یطغَی سے۔ اور علامہ طبری نے یطغو بیان کیا ہے۔ جب کوئی حد سے اس پر زیادتی کرتے ہوئے تجاوز کر جائے (2) اور اس کا وزن فعلوت ہے۔

اور سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ یہ مفرد مذکر اسم ہے گویا کہ یہ اسم جنس ہے اور قلیل و کثیر کے لئے واقع ہوتا ہے اور ابو علی کا مذہب یہ ہے کہ یہ مصدر ہے جیسا رَهَبُوت اور جَبَرُوت۔ اور اس کے ساتھ واحد اور جمع کی صفت لگائی جاسکتی ہے اور اس کے لام کلمے کو عین کلمے کی جگہ اور اس کے عین کو لام کی جگہ بدل دیا گیا ہے جیسا کہ جبذ اور جذب میں ہے۔ پھر واؤ کو متحرک ہونے اور اس کے ماقبل کے متحرک ہونے کی وجہ سے الف سے بدل دیا گیا ہے اور طاغوت کہا گیا ہے۔ اس قول کو نحاس نے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 343، دار الکتب العلمیہ۔ ایضاً صحیح بخاری، باب سکر الانہار، حدیث نمبر 2187، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 25، دار احیاء التراث العربیہ

اختیار کیا ہے اور کہا گیا ہے: طاغوت کی اصل لغت میں الطُّغیان سے ماخوذ ہے اور یہ بغیر اشتقاق کے اپنا معنی ادا کر دیتا ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے: لآل یہ اللؤلؤ سے ہے۔

اور مبرد نے کہا ہے: یہ جمع ہے اور ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ مردود ہے(1)۔

جوہری نے کہا ہے: الطاغوت سے مراد کاہن، شیطان اور ہر وہ ہے جو گمراہی میں سردار ہو اور کبھی یہ واحد ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَا کَمُوْۤا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْۤا اَنْ یَّكْفُرُوْا (النساء:60) ((اس کے باوجود) چاہتے ہیں کہ فیصلہ کرانے کے لئے (اپنے مقدمات) طاغوت کے پاس لے جائیں حالانکہ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ انکار کریں طاغوت کا۔) اور کبھی جمع ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْلِیٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ (البقرہ:257) (ان کے ساتھی شیطان ہیں۔) اور اس کی جمع طواغیت آتی ہے اور وَ یُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ یہ معطوف ہے۔ اور فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى یہ جواب شرط ہے اور الوثقی کی جمع الوُثق ہے جیسا کہ اَلفُضْلیٰ کی جمع اَلفُضَل ہے۔ اور الوُثْقٰی، فُعْلٰی کے وزن پر الوثاقۃ سے ہے اور یہ آیت تشبیہ ہے اور مشبہ بہ کے بارے میں مفسرین کی عبارت مختلف ہے۔

پس حضرت مجاہد نے کہا ہے: العروۃ سے مراد ایمان ہے اور سدی نے کہا: اسلام ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت سعید بن جبیر اور حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور یہ سب عبارات ایک ہی معنی کی طرف راجع ہیں۔ پھر فرمایا: لَا انْفِصَامَ لَهَا۔ (2) حضرت مجاہد نے کہا ہے: مراد یہ ہے اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت کو تبدیل نہیں کرے گا یہاں تک کہ وہ خود اپنے آپ کو تبدیل کر لیں یعنی ان سے ایمان کا نام زائل نہیں کرے گا یہاں تک کہ وہ کافر ہو جائیں۔

اور الانفصام کا معنی ایسا ٹوٹنا ہے جس میں جدائی اور علیحدگی نہ ہو۔ اور القصم کا معنی، ایسا توڑنا ہے جس میں جدائی اور علیحدگی بھی ہو۔ اور صحیح حدیث میں ہے: ''پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے وحی ختم ہوتی تو آپ کی پیشانی پسینے سے شرابور ہوتی(3)''۔ یعنی پیشانی پسینہ چھوڑ رہی ہوتی تھی۔

جوہری نے کہا: فصم الشئی اس نے اسے توڑ دیا اسے جدا کیے بغیر۔ آپ کہتے ہیں: فصمتہ فانفصم میں نے اسے توڑا تو وہ ٹوٹ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: لَا انْفِصَامَ لَهَا اور اس کی مثل توڑ دیا جاتا ہے، جیسا کہ ذوالرمہ نے ہرن کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے وہ اسے چاندی کے بازوبند کے ساتھ تشبیہ دیتا ہے:

كأنه دُمْلُجٌ مِن فضة نَبَهٌ … فی ملعب من جواری الحیّ مفصوم

بے شک اس نے اسے مفصوم قرار دیا ہے اس کے مڑنے اور ٹیڑھا ہونے کے سبب جب وہ سوتا ہے۔ اور مقصوم قاف کے ساتھ نہیں کہا اس لئے کہ یہ دو حصوں میں بٹ جانا ہوتا ہے۔ اور افصم المطر کا معنی ہے بارش تھم گئی۔ اور افصمت عنہ الحمی (اس سے بخار اتر گیا) اور جب کفر شیطان کے ساتھ ہے اور ایمان اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے جس کا زبان اقرار کرتی ہے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 344، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً

3۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 2، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب کیف کان بدء الوحی، حدیث نمبر 2، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور دل اعتقاد رکھتا ہے تو نطق کے سبب صفات میں سے سَمِیْعٌ اور اعتقاد کی وجہ سے صفات میں سے عَلِیْمٌ ذکر کی گئی ہے۔

اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۙ یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَوْلِیٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ یُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

''اللہ مددگار ہے ایمان والوں کا، نکال لے جاتا ہے انہیں اندھیروں سے نور کی طرف۔ اور جنہوں نے کفر کیا ان کے ساتھی شیطان ہیں، نکال لے جاتے ہیں انہیں نور سے اندھیروں کی طرف۔ یہی لوگ دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، اَلْوَلِیُّ فعیل کے وزن پر بمعنی فاعل ہے۔ علامہ خطابی نے کہا ہے: الولی الناصر ینصر عبادہ المومنین۔ یعنی الولی کا معنی مددگار ہے وہ اپنے مومن بندوں کی مدد فرماتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (اللہ تعالیٰ مددگار ہے ایمان والوں کا نکال لے جاتا ہے انہیں اندھیروں سے نور کی طرف۔) اور مزید فرمایا: ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِیْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ۝ (محمد) (یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا مددگار ہے اور کفار کا کوئی مددگار نہیں۔)

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: الظلمات سے مراد گمراہی اور نور سے مراد ہدایت ہے اور اسی معنی کو ضحاک اور ربیع نے بیان کیا ہے۔

اور حضرت مجاہد اور عبدۃ بن ابی لبابہ رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یہ ایسی قوم کے بارے میں نازل ہوا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ایمان لائے اور جب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کفر کیا۔ پس یہی انہیں نور سے اندھیروں کی جانب نکالنا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: گویا یہ اعتقاد رکھنے والے نے نور معتقد میں محفوظ رکھ دیا اور اس سے اندھیروں کی جانب نکل گیا۔ آیت کا لفظ اس تخصیص سے مستغنی ہے، بلکہ یہ تو ہر کفر کرنے والی جماعت میں مترتب ہوتا ہے جس کے بعض افراد ایمان سے آئے ہوں جیسا کہ عرب (1)، اس لئے کہ ان میں سے جو ایمان لایا اللہ تعالیٰ اس کا مددگار ہے اور اس نے اسے کفر کی تاریکی سے نور ایمان کی طرف نکال دیا اور جس نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم داعی مرسل کی تشریف آوری کے بعد کفر کیا تو اس کا شیطان اسے گمراہ کرنے والا ہے، گویا کہ اس نے اسے ایمان سے نکال دیا، جبکہ وہ اس کے لئے تیار اور اس میں داخل ہونے کا اہل تھا اور اس نے ان پر ان کے کفر کی وجہ سے جہنم میں داخل ہونے کا حکم لگا دیا، ایمان سے پھیرتے ہوئے۔ اس سے اس کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا جو وہ کرتا ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 345، دار الکتب العلمیہ

اور حسن نے اَوْلِيَآءُهُمُ الطَّوَاغِيْتُ پڑھا ہے، مراد شیاطین ہیں۔ واللہ اعلم

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۚ﴿۲۵۸﴾

''کیا نہیں دیکھا آپ نے (اے حبیب!) اسے جس نے جھگڑا کیا ابراہیم سے ان کے رب کے بارے میں اس وجہ سے کہ دی تھی اسے اللہ نے بادشاہی۔ جب کہ کہا ابراہیم (علیہ السلام) نے (اسے) کہ میرا رب وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے۔ اس نے کہا: میں بھی جلا سکتا ہوں اور مار سکتا ہوں۔ ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نکالتا ہے سورج کو مشرق سے تو تو نکال لا اسے مغرب سے۔ (یہ سن کر) ہوش اڑ گئے اس کافر کے اور اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا ظالم قوم کو۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اَلَمْ تَرَ یہ الف توقیفی ہے اور کلام میں تعجب کا معنی ہے یعنی انہوں نے اس کو تعجب میں ڈال دیا اور فراء نے کہا ہے: اَلَمْ تَرَ بمعنی ھل رأیت ہے یعنی کیا آپ نے اسے دیکھا جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جھگڑا کیا اور کیا آپ نے اسے دیکھا جو بستی کے پاس سے گزرا اور وہ نمرود بن کوش بن کنعان بن سام بن نوح اپنے زمانے کا بادشاہ اور آگ اور مچھر والا تھا۔ یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت مجاہد، حضرت قتادہ، حضرت ربیع، حضرت سدی، حضرت ابن اسحاق اور حضرت زید بن اسلم وغیرہم رحمۃ اللہ علیہم کا ہے (1) اور اسے ہلاک کرنے کا واقعہ یوں ہے کہ جب اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ جنگ لڑنے کا قصد کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس پر مچھروں کا ایک باب کھول دیا۔ پس انہوں نے سورج کو ڈھانپ لیا اور اس کے لشکر کو کھانے لگے اور انہوں نے سوائے ہڈیوں کے اور کچھ نہ چھوڑا اور ان میں سے ایک اس کے دماغ میں داخل ہو گیا اور اسے کھا ڈالا یہاں تک کہ وہ چوہیا کی مثل ہو گیا اور اس کے بعد اس کے نزدیک لوگوں میں سے سب سے معزز وہ تھا جو اس کے دماغ پر بھاری ہتھوڑے کے ساتھ مارتا تھا۔ پس چالیس دن تک وہ اس آزمائش اور مصیبت میں مبتلا رہا۔

ابن جریج نے کہا ہے: زمین میں وہ پہلا بادشاہ تھا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول مردود ہے۔

اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: وہ پہلا حکمران ہے جس نے جبر واستبداد اور رعونت وسرکشی اختیار کی اور وہی بابل میں صاحب الصرح (محل کا مالک) تھا۔ اور کہا گیا ہے کہ یہ پوری دنیا کا حکمران تھا اور یہ دو کافر بادشاہوں میں سے ایک ہے اور دوسرا بخت نصر ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 345، دار الکتب العلمیہ

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جھگڑا کیا تھا وہ نمروذ بن فالخ بن عابر بن شالح بن ارفخشد بن سام تھا۔ اس تمام کو ابن عطیہ نے بیان کیا ہے (1)۔

اور سہیلی نے بیان کیا ہے کہ وہ نمروذ بن کوش بن کنعان بن حام بن نوح تھا اور وہ سواد عراق کا بادشاہ تھا اور اسے اس ضحاک نے حکمران بنایا تھا جو ازدہاق سے معروف تھا اور اس کا نام بیوراسب بن اندراست تھا اور وہ تمام سلطنتوں کا بادشاہ تھا اور یہ وہی ہے جسے افریدون بن اثفیان نے قتل کیا تھا اور اس بارے میں حبیب کہتا ہے:

وَ کأنه الضحاك من فتكاتِه في العالمين وأنْتَ أفْرِيدُونُ

ضحاک سرکش اور جابر حکمران تھا اور اس کی حکومت ہزار برس تک رہی جس بارے میں انہوں نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ پہلا حکمران ہے جس نے سولی دی اور پہلا حکمران ہے جس نے ہاتھ اور پاؤں کاٹے اور نمروذ کا صلبی بیٹا تھا اس کا نام ''کوش'' تھا یا اس نام کی طرح کا کوئی نام تھا اور اس کا ایک بیٹا تھا جس کا نام نمروذ الاصغر تھا اور نمروذ الاصغر ایک سال تک حاکم رہا۔ اور نمروذ الاکبر کی حکومت چار سو برس تک رہی جیسا کہ اس کے بارے ذکر کیا گیا ہے۔

اس جھگڑے کے قصص میں دو روایتیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنے میلے کی طرف نکلے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے بتوں کے پاس گئے اور انہیں توڑ دیا۔ جب وہ واپس لوٹے تو آپ نے انہیں کہا: کیا تم ان کی عبادت کرتے ہو جو (ٹوٹ کر) گر جاتے ہیں؟ تو انہوں نے کہا: تو کس کی عبادت کرتا ہے؟ آپ نے فرمایا: میں اپنے اس رب کی عبادت کرتا ہوں جو جلاتا بھی ہے اور مارتا بھی ہے۔

اور بعض نے کہا ہے: بے شک نمروذ طعام (اناج) ذخیرہ کر لیتا تھا اور جب انہیں طعام کی حاجت ہوتی تھی تو وہ اس سے اسے خریدتے تھے اور جب وہ اس کے پاس آتے تھے تو اسے سجدہ کرتے تھے۔ پس حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے پاس گئے تو آپ نے اسے سجدہ نہ کیا تو اس نے کہا: تجھے کیا ہے کہ تو مجھے سجدہ نہیں کرتا؟ آپ نے فرمایا: میں اپنے رب کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتا۔ نمروذ نے آپ کو کہا: تیرا رب کون ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا: میرا رب وہ ہے جو جلاتا بھی ہے اور مارتا بھی ہے۔

حضرت زید بن اسلم رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے کہ یہ نمروذ بیٹھ گیا اور لوگوں کو اہل و عیال کے لئے طعام لے جانے کا حکم دینے لگا۔ پس جب بھی کوئی قوم آتی یہ ان سے پوچھتا: تمہارا رب اور تمہارا الہ کون ہے؟ تو وہ کہتے: تو ہے، تو یہ کہتا: تم انہیں طعام دے دو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اپنے اہل و عیال کو طعام مہیا کرنے کے لئے اس کے پاس آئے تو اس نے آپ سے کہا: تمہارا رب اور تمہارا معبود کون ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: میرا رب وہ ہے جو زندہ بھی کرتا ہے اور مارتا بھی ہے۔ جب نمروذ نے یہ سنا تو اس نے کہا: میں بھی جلا سکتا ہوں اور مار سکتا ہوں، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سورج کے معاملہ کے ساتھ اس کا معارضہ کیا تو وہ کفر اختیار کرنے والا متحیر ہو گیا اور اس نے کہہ دیا: تم اسے اناج نہ دو۔ تو حضرت ابراہیم

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 345، دار الکتب العلمیہ

علیہ السلام بغیر کسی شے کے واپس اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ گئے۔ راستے میں آپ ریت کے ٹیلے کے پاس سے گزرے جو آٹے کی مثل تھا۔ تو آپ نے اپنے دل میں کہا: اگر میں اس سے اپنا بورا بھر لوں تو جب میں اسے لے کر گھر داخل ہوں گا تو بچے خوش ہو جائیں گے یہاں تک کہ میں انہیں دیکھ لوں گا۔ پس آپ وہ لے گئے، جب آپ اپنے گھر پہنچے تو بچے خوش ہو گئے اور وہ دونوں بوروں کے اوپر کھیلنے لگے اور آپ تھکاوٹ کی وجہ سے سو گئے۔ تو آپ کی زوجہ محترمہ نے کہا: اگر میں آپ کے لئے کھانا تیار کر دوں جب آپ بیدار ہوں گے تو آپ اسے موجود پائیں گے (اور تناول فرمالیں گے۔) چنانچہ اس نے ایک بورا کھولا تو انہوں نے اسے اس سے بھی اچھا پایا جتنا سفید آٹا ہوتا ہے اور پھر اس کی روٹیاں پکا دیں اور جب آپ نیند سے بیدار ہوئے تو اس نے وہ کھانا آپ کے سامنے رکھ دیا۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا: یہ کہاں سے آیا ہے؟ اس نے جواب دیا: یہ وہی آٹا ہے جو آپ لائے ہیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام جان گئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے آسانی پیدا فرما دی ہے (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابوبکر بن ابی شیبہ نے ابو صالح سے بیان کیا ہے، انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت ابراہیم علیہ السلام طعام لانے کے لئے چلے اور آپ اس پر قادر نہ ہو سکے، تو آپ سرخ موٹی ریت کے پاس سے گزرے تو آپ نے اس سے بورے بھر لیے اور پھر اپنے گھر والوں کی طرف واپس لوٹ آئے۔ تو انہوں نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: یہ سرخ گندم ہے۔ پس انہوں نے اسے کھولا تو اسے سرخ گندم ہی پایا اور جب اس میں سے کچھ کاشت کی تو جڑ سے شاخ کے سرے تک سٹہ نکلا جو دانوں سے بھرا ہوا تھا (2)۔

اور ربیع وغیرہ نے ان قصص میں کہا ہے کہ نمرود نے جب کہا میں جلاتا بھی ہوں اور مارتا بھی ہوں تو اس نے دو آدمیوں کو حاضر کیا، ان میں سے ایک کو قتل کر دیا اور دوسرے کو چھوڑ دیا اور کہا: تحقیق میں نے اسے زندہ کر دیا اور اسے مار دیا۔ اور جب آپ نے اس پر سورج کا معاملہ لوٹایا تو وہ مبہوت اور متحیر ہو گیا (3)۔ اور الخبر میں روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم! قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ میں سورج کو مغرب سے طلوع کروں گا تا کہ وہ جان لے کہ میں اس پر قادر ہوں (4)۔ پھر نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے حکم دیا تو انہیں آگ میں پھینک دیا گیا اور اسی طرح جابر حکمرانوں کی عادت ہے کہ جب کسی شے کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا جائے اور دلیل لانے سے عاجز ہو جائیں تو وہ سزا دینے میں لگ جاتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو آگ سے نجات عطا فرمائی، جیسا کہ آگے آئے گا۔

اور سدی نے کہا ہے: جب حضرت ابراہیم علیہ السلام آگ سے نکلے تو انہوں نے آپ کو بادشاہ کے پاس پیش کر دیا اور اس سے پہلے آپ کو اس پر پیش نہیں کیا گیا تھا اور اس نے آپ سے گفتگو کی۔ اور آپ کو کہا: تیرا رب کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا: میرا رب وہ ہے جو جلاتا بھی ہے اور مارتا بھی ہے۔ نمرود نے کہا: میں بھی زندہ کر سکتا ہوں اور مار سکتا ہوں، میں چار

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 345، دار الکتب العلمیہ

2۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 6، صفحہ 330، حدیث نمبر 31819، الزمان للنشر و العلوم مدینہ منورہ

3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 346

4۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، حدیث نمبر 4269، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آدمیوں کو پکڑوں گا اور انہیں ایک کمرے میں بند کردوں گا اور وہ کوئی شے کھا پی نہیں سکیں گے یہاں تک کہ جب وہ بھوک سے نڈھال ہوجائیں گے تو میں انہیں نکال دوں گا اور دو کو کھانا وغیرہ کھلاؤں گا۔ پس وہ دونوں زندہ رہیں گے اور دو کو چھوڑ دوں گا اور وہ مرجائیں گے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بطور معارضہ سورج کا معاملہ پیش کردیا (کہ اگر وہ طاقت رکھتا ہے تو وہ سورج کو مغرب سے طلوع کرے) تو وہ متحیر و مبہوت ہوگیا۔

علمائے اصول نے اس آیت میں ذکر کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب رب کریم کا وصف بیان کیا ایک شے کے ساتھ جو اس کی صفت ہے یعنی احیاء (جلانا) اور اماتۃ (مارنا) لیکن یہ ایسا امر ہے جس کے لئے حقیقت اور مجاز دونوں ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حقیقت کا قصد کیا(1) اور نمرود نے مجاز کی پناہ لی اور اپنی قوم پر جھوٹا امر پیش کردیا۔ اور حضرت ابراہیم نے اسے بطور قیاس جدلی کے تسلیم کرلیا اور آپ اس کے ساتھ مثال سے منتقل ہوگئے اور اس کے سامنے ایک ایسا امر رکھ دیا جس میں مجاز نہیں ہے۔ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ یعنی اس کی دلیل اور حجت حکم سے کٹ گئی، ختم ہوگئی اور اس سے لئے یہ کہنا ممکن نہ رہا کہ میں سورج کو مشرق سے طلوع کرتا ہوں کیونکہ صاحب عقل و فہم اس کی تکذیب کردیں گے۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ کافر کو بادشاہ (مَلِك) کا نام دینا جائز ہے جب اللہ تعالیٰ دنیا میں اسے بادشاہی، عزت اور بلندی عطا کردے اور یہ مناظرہ، مجادلہ اور حجت قائم کرنے کے اثبات پر بھی دلالت کرتی ہے۔ قرآن و سنت میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے اس پر کثیر دلائل موجود ہیں، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ (البقرہ) (آپ (انہیں) فرمایئے لاؤ اپنی کوئی دلیل اگر تم سچے ہو)

اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ یعنی تمہارے پاس کوئی حجت نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنی قوم کے ساتھ جھگڑا اور بتوں کی عبادت کے بارے میں آپ کی جانب سے ان کا رد بھی بیان فرمایا ہے جیسا کہ سورۃ الانبیاء وغیرہ میں ہے۔ اور حضرت نوح علیہ السلام کے قصہ میں فرمایا ہے: قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝ وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْۤ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ؕ هُوَ رَبُّكُمْ ۫ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَيَّ اِجْرَامِيْ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ۝ (ہود) (وہ (برافروختہ ہوکر) بولے اے نوح! تو نے ہم سے جھگڑا کیا اور اس جھگڑے کو بہت طول دیا　اور میں بری الذمہ ہوں ان گناہوں سے جو تم کرتے ہو) اور اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کے ساتھ مجادلہ ہے اس کا کئی آیات میں ذکر ہے۔ پس یہ سب کی سب اللہ کی جانب سے دین کے بارے میں سوال و جواب اور مجادلہ کی تعلیم ہے، کیونکہ حق اور باطل کے درمیان فرق ظاہر ہی نہیں ہوتا مگر تبھی جب حق کی دلیل ظاہر اور غالب ہو اور باطل کی دلیل فاسد ہو۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب سے مجادلہ کیا اور حجت قائم کرنے کے بعد ان سے مباہلہ کیا، جیسا کہ اس کا بیان ''آل

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 346، دار الکتب العلمیہ

عمران'' میں آئے گا اور حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا آپس میں مکالمہ ہوا اور آدم علیہ السلام حجت کے ساتھ ان پر غالب آگئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب سقیفہ کے دن جھگڑتے رہے، ایک دوسرے کو دور ہٹاتے رہے، تقریر کرتے رہے اور باہم مناظرہ کرتے رہے یہاں تک کہ حق اس کے بارے میں ظاہر ہو گیا جو اس کے اہل تھا اور انہوں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لینے کے بعد مرتدین کے بارے میں مناظرہ کیا، علاوہ ازیں کثیر ایسے واقعات ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: فَلِمَ تُحَاجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ میں اس پر دلیل ہے کہ علم کے ساتھ حجت پیش کرنا، احتجاج کرنا مباح ہے اور غور و فکر کرنے والوں کے درمیان شائع ہے۔

مزنی صاحب شافعی نے کہا ہے: مناظرہ کے حقوق میں سے یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے کیا جائے اور اس سے جو شے واضح ہوا سے قبول کر لیا جائے۔

اور بعض نے کہا ہے: مناظرہ صحیح نہیں ہوتا اور مناظرہ کرنے والوں کے درمیان حق ظاہر اور واضح ہو جاتا ہے جبکہ وہ دین، عقل، فہم اور انصاف میں ایک دوسرے کے قریب ہوں یا ایک ہی مرتبہ میں مساوی اور برابر ہوں، مگر اس میں ریا کاری اور باہمی عداوت، مخالفت اور ایک دوسرے پر غلبہ پانے کی کوشش ہوتی ہے۔

قراءات: حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اَلَمْ تَرْ را کی جزم کے ساتھ پڑھا ہے اور جمہور نے اسے متحرک پڑھا ہے اور یا جزم کے لئے حذف کر دی گئی ہے۔ اور اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ محل نصب میں ہے یعنی لِأن آتاه الله، یا مِنْ اجلِ اَنْ آتاه الله۔ اور جمہور قراء نے اَنَا اُحْیِیْ یعنی وصل کلام میں اَنَا سے نون کے بعد الف کو گرا کر پڑھا ہے اور نافع اور ابن ابی اویس نے اسے ثابت رکھا ہے، جب بھی پورے قرآن میں ہمزہ اس کے ساتھ ملا ہے سوائے اس قول کے: اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ کیونکہ وہ اسے اس جگہ میں اس کی قلت کے سبب تمام قراء کی طرح گرا دیتے ہیں، کیونکہ یہ قرآن کریم میں صرف تین مقامات پر واقع ہوا ہے اور یہ اپنے قلیل ہونے کی وجہ سے اس کے قائم مقام ہے جس کے بعد ہمزہ نہ ہو لہٰذا الف کو وصل کلام میں بھی حذف کر دیا گیا۔

علمائے نحو نے کہا ہے: متکلم کی ضمیر اسم ہے اس میں ہمزہ اور نون ہے، اور جب تو کہے: أَنَا یا أَنَه تو الف اور ہاء وقف میں حرکت کو بیان کرنے کے لئے ہیں اور جب کلمہ کسی شے سے متصل ہو تو وہ دونوں ساقط ہو جاتے ہیں، کیونکہ وہ شے جس کے ساتھ کلمہ متصل ہوتا ہے وہ قائم مقام الف کے ہوتا ہے۔ پس یہ نہیں کہا جائے گا: أنا فعلت الف کے اثبات کے ساتھ مگر شعر میں یہ شاذ ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

أنا　سيف　العشيرة　فاعرفوني　حُمَيدا　قد　تذرّيتُ　السناما

نحاس نے کہا ہے: اس بنا پر کہ نافع نے الف کو ثابت رکھا ہے اور پڑھا ہے ''أَنَا أُحيي وَ أُمِيتُ'' اس کی کوئی وجہ اور علت نہیں ہے۔ مکی نے کہا ہے: بصریوں کے نزدیک الف زائدہ ہے اور ان کے نزدیک اسم مضمر ہمزہ اور نون ہیں اور الف کو تقویت کے لئے زائد کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ وقف کے لئے زائد کیا گیا ہے تاکہ نون کی حرکت ظاہر ہو۔ اور کوفیوں کے نزدیک أنا مکمل طور پر اسم ہے۔ پس نافع نے ان کے قول کے مطابق اصل کی بنا پر الف کو ثابت رکھا ہے اور

جنہوں نے الف کو حذف کیا ہے تو انہوں نے تخفیف کے لئے اسے حذف کیا ہے کیونکہ فتحہ اس پر دلالت کرتا ہے۔

جوہری نے کہا ہے: اور رہا ان کا قول أنا تو یہ اسم کنایہ ہے اور یہ اکیلا متکلم کے لئے ہے اور یہ مبنی برفتحہ ہے تاکہ اس کے اور أنّ حرف ناصب کے درمیان فرق ہو سکے اور آخر میں الف حالت وقف میں حرکت کے بیان کے لئے ہے اور اگر درمیان کلام میں ہو تو یہ گر جاتا ہے سوائے لغت رویہ کے، جیسا کہ شاعر نے کہا:

أنا سیف العشیرۃ فاعرفونی حُمیدا قد تَذَرَّیْتُ السّناما

اور بَهُتَ الرجل و بَهِتَ و بُهِتَ کا معنی ہے جب آدمی کے پاس کوئی دلیل باقی نہ رہے اور وہ متحیر ہو کر خاموش ہو جائے۔ یہ نحاس وغیرہ سے منقول ہے۔

اور علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اور انہوں نے بعض عربوں سے اس معنی میں بَهَتَ یعنی با اور ہا کے فتحہ کے ساتھ بھی بیان کیا ہے(1)۔ ابن جنی نے کہا ہے: ابو حیوہ نے فَبَهُتَ الَّذِیْ كَفَرَ یعنی با کے فتحہ اور ہا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بھی بُہِتَ میں ایک لغت ہے۔ فرمایا: اور ابن السمیقع نے فَبَهَتَ باء اور ہاء کے فتحہ کے ساتھ اس معنی پر پڑھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے متحیر کر دیا جس نے کفر کیا۔ پس الذی محل نصب میں ہے۔ فرمایا: اور یہ بھی جائز ہے کہ بَهَتَ بفتحہ کے ساتھ بَهُتَ میں ہی ایک لغت ہو۔

فرمایا: ابو الحسن اخفش نے فَبَهِتَ کی قراءت بیان کی ہے جیسا کہ غَرِقَ اور دَهِشَ۔

مزید کہا: اکثر نے ہا میں ضمہ پڑھا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: ایک قوم نے اس کی قراءت کی تاویل کی ہے، جنہوں نے اسے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے کہ یہ بمعنی سَبَّ (گالی گلوچ دینا) اور قذف (تہمت لگانا) ہے۔ اور بلاشبہ نمرود وہی ہے جس نے اس وقت گالیاں دیں جب اس کے دلائل ختم ہو گئے اور اس کے پاس کوئی حیلہ نہ رہا(2)۔

أَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰى قَرْیَةٍ وَّهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ یَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَیْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۵۹﴾

''یا (کیا نہ دیکھا) اس شخص کو جو گزرا ایک بستی پر درآنحالیکہ وہ گری پڑی تھی اپنی چھتوں کے بل۔ کہنے لگا کیونکر زندہ کرے گا اسے اللہ تعالیٰ اس کے ہلاک ہونے کے بعد۔ سو مردہ رکھا اسے اللہ تعالیٰ نے سو سال تک پھر زندہ کیا اسے۔ فرمایا: کتنی مدت تو یہاں ٹھہرا رہا؟ اس نے عرض کی: میں ٹھہرا ہوں گا ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔ اللہ نے فرمایا: نہیں، بلکہ ٹھہرا رہا ہے تو سو سال اب (ذرا) دیکھ اپنے کھانے اور اپنے پینے (کے سامان)

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 32، دار احیاء التراث العربیۃ
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 347، دار الکتب العلمیہ

کی طرف۔ یہ باسی نہیں ہوا اور دیکھ اپنے گدھے کو اور یہ سب اس لئے کہ ہم بنائیں تجھے نشانی لوگوں کے لئے اور دیکھ ان ہڈیوں کو کہ ہم کیسے جوڑتے ہیں انہیں پھر (کیسے) ہم پہناتے ہیں انہیں گوشت، پھر جب حقیقت روشن ہوگئی اس کے لئے (تو) اس نے کہا میں جان گیا ہوں کہ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰى قَرْیَةٍ وَّ هِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا۔ اَوْ معنی پر محمول کرتے ہوئے عطف کے لئے ہے اور امام کسائی اور فراء کے نزدیک تقدیر کلام یہ ہے: ھل رأیت کالذی حاج ابراھیم فی ربہ او کالذی مر علی قریۃ۔

اور مبرد نے کہا ہے: اس کا معنی ہے الم تر الی الذی حاج ابراھیم فی ربہ، الم تر من ھو! کالذی مر علی قریۃ۔ پس کلام میں مَنْ ھو کے الفاظ مضمر ہیں۔

ابوسفیان بن حسین نے اَوَ كَالَّذِیْ مَرَّ واؤ کے فتحہ کے ساتھ قراءت کی ہے اور یہ واؤ عاطفہ ہے اور اس پر الف استفہام داخل ہے جس کا معنی تقریر (1) (پختہ کرنا) ہے۔ اور القریۃ (یعنی خاص بستی) کو قریۃ (کوئی بستی) کا نام دیا گیا ہے اس لئے کہ اس میں لوگوں کا اجتماع تھا۔ یہ ان کے اس قول سے ہے: قَرَیْتُ الماء یعنی میں نے پانی جمع کیا۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

سلیمان بن بریدہ، ناجیہ بن کعب، قتادہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ربیع، عکرمہ اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے جو اس بستی کے پاس سے گزرا تھا وہ حضرت عزیر علیہ السلام تھے۔

حضرات وہب بن منبہ، عبداللہ بن عبید بن عمیر، عبداللہ بن بکر بن مضر رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: وہ ارمیاہ تھے اور وہ نبی تھے۔

ابن اسحاق نے کہا ہے: ارمیاء ہی حضرت خضر علیہ السلام ہیں۔ نقاش نے وہب بن منبہ سے اسے بیان کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے۔ اور یہ اسی طرح ہے جیسا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے مگر یہ کہ وہ ایک نام ہو جو اس نام کے موافق ہو کیونکہ حضرت خضر علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہمعصر تھے اور یہ جو اس بستی کے پاس سے گزرے وہ ان کے بعد کے زمانہ میں حضرت ہارون علیہ السلام کی نسل میں سے تھے جیسا کہ اسے حضرت وہب بن منبہ نے روایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: اگر خضر علیہ السلام ہی ارمیاء ہوں تو کوئی بعید نہیں کہ وہی ہوں کیونکہ حضرت خضر علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت سے اب تک مسلسل موجود ہیں۔ اس بارے میں صحیح روایت اسی طرح ہے۔ اس کا بیان سورۃ الکہف میں آئے گا اور اگر وہ اس واقعہ سے پہلے وصال فرما چکے ہیں تو پھر ابن عطیہ کا قول صحیح ہے۔ واللہ اعلم۔

نحاس اور مکی نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے کہ وہ بنی اسرائیل میں سے ایک آدمی تھا اس کا نام معلوم نہیں۔ نقاش نے کہا ہے: کہا جاتا ہے وہ حضرت لوط علیہ السلام کا غلام تھا (2)۔

سہیلی نے قتبی سے بیان کیا ہے وہ ان کے دو قولوں میں سے ایک کے مطابق شعیا تھے اور وہ جس نے اس بستی کو برباد ہونے کے بعد زندہ (آباد) کیا تھا وہ کوشک الفارسی ہے۔ اور حضرت وہب بن منبہ، حضرت قتادہ، حضرت ربیع بن انس وغیرہم کے قول کے مطابق وہ بستی جس کا ذکر کیا گیا ہے وہ بیت المقدس ہے۔ فرمایا: وہ مصر سے آنے والا تھا اور اس کے جس طعام و

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 347، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً

شراب کا ذکر کیا گیا ہے وہ سبز انجیر اور انگور اور چمڑے سے بنا ہوا ایک چھوٹا سا برتن شراب کا تھا اور یہ بھی ہے کہ اس میں جوس تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: پانی کا ایک مٹکا تھا یہی اس کی شراب تھی اور وہ جس نے اس وقت بیت المقدس کو خالی کرایا وہ بخت نصر تھا اور وہ عراق پر لہراسب کی طرف سے پھر یستاسب بن لہراسب والد اسبند یاد کی جانب سے والی تھا۔

نقاش نے بیان کیا ہے کہ ایک قوم نے کہا ہے: یہ ایک الٹی کی ہوئی بستی تھی۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ابو صالح کی روایت میں کہا ہے کہ بخت نصر نے بنی اسرائیل سے جنگ لڑی اور ان میں سے بہت سے لوگوں کو قیدی بنا لیا۔ وہ انہیں لے کر آیا اور ان میں عزیر بن شرخیا بھی تھے اور وہ بنی اسرائیل کے علماء میں سے تھے۔ پس وہ ان کے ساتھ بابل کی طرف آئے، وہ ایک دن اپنے کسی کام سے ہرقل کی عبادت گاہ کی طرف دریائے دجلہ کے کنارے پر نکلے۔ پس وہ درخت کے سائے میں اترے اور وہ اپنے ایک گدھے پر سوار تھے۔ انہوں نے درخت کے سائے میں گدھا باندھا پھر بستی کا چکر لگایا اور وہاں کوئی رہائشی نہ دیکھا اور یہ بستی اپنی چھتوں کے بل گری پڑی تھی تو کہا: کیونکر اللہ تعالیٰ اسے اس کی ہلاکت و بربادی کے بعد زندہ کرے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلاشبہ یہ وہ بستی ہے جس سے موت کے ڈر سے ہزاروں افراد نکلے۔

ابن زید نے یہی کہا ہے۔ اور ابن زید سے یہ بھی منقول ہے کہ وہ لوگ جو موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکلے وہ ہزاروں تھے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا: تم مر جاؤ، ان کے پاس سے کوئی آدمی گزرا درآنحالیکہ وہ خالی ہڈیاں تھے جو بالکل ظاہر تھیں۔ پس وہ آدمی کھڑے ہو کر دیکھنے لگا اور اس نے کہا: کیونکر اللہ تعالیٰ اسے اس کی موت کے بعد زندہ کرے گا، تو اللہ تعالیٰ نے اسے سو برس تک مردہ رکھا۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: ابن زید کی جانب سے یہ قول آیت کے الفاظ کے مناقض ہے، کیونکہ یہ آیت ایسی بستی کو متضمن ہے جو گری پڑی ہے اور اس میں کوئی انیس و غمخوار نہیں ہے اور ھذہٖ کے ساتھ اشارہ اسی بستی کی طرف ہے اور اسے زندہ کرنے سے مراد اسے آباد کرنا ہے اور اس میں عمارتوں اور رہنے والوں کا موجود ہونا ہے(1)۔

حضرت وہب بن منبہ، حضرت قتادہ، حضرت ضحاک، حضرت ربیع اور حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: وہ بستی بیت المقدس ہے جبکہ اسے بخت نصر بابلی نے تباہ و برباد کر دیا تھا۔

اور طویل حدیث میں ہے کہ جس وقت بنی اسرائیل ایسے واقعات سے دوچار ہوئے تو ارمیاء یا عزیر اس بستی کے پاس ٹھہرے اور وہ بہت بڑے ٹیلے کی مانند تھی بیت المقدس کے وسط میں، کیونکہ بخت نصر نے اپنے لشکر کو اس کی طرف مٹی منتقل کرنے کا حکم دیا تھا یہاں تک کہ اس نے اسے پہاڑ کی طرح بنا دیا اور ارمیاء نے گھروں کو دیکھا، ان کی دیواریں ان کی چھتوں پر گری پڑی ہیں۔ تو انہوں نے کہا: کیونکر اللہ تعالیٰ اسے اس کی موت کے بعد زندہ کرے گا۔

اور العریش کا معنی ہے: مکان کی چھت۔ اور ہر وہ شے جو اس لئے تیار کی جاتی ہے کہ وہ سایہ دے یا وہ چھپا لے تو وہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 347، دار الکتب العلمیہ

عریش ہے اور اسی سے عریش الدالیہ بھی ہے (کنویں کی من) اور اسی سے رب کریم کا ارشاد بھی ہے: وَ مِمَّا یَعْرِشُوْنَ۔ سدی نے کہا ہے: کہتے ہیں ھی ساقطۃ علی سقفھا، یعنی چھتیں گریں پھر ان پر دیواریں گر پڑیں۔ اسے طبری نے اختیار کیا ہے اور سدی کے علاوہ دوسروں نے کہا ہے: اس کا معنی ہے وہ بستی لوگوں سے خالی ہے اور گھر قائم ہیں۔ اور خاویۃ کا معنی خالیۃ (خالی ہونا) ہے۔ اور الخَواء کا اصل (معنی) الخلو ہے۔ کہا جاتا ہے: خَوَالدار و خَوِیَتْ تَخْوَی خَواء (یہ الف ممدودہ کے ساتھ بھی ہے) و خَوِیًا: أَقْوَت یعنی گھر کا ساکنین سے خالی ہونا (1)۔ اور اسی طرح جب وہ ساقط ہو جائے، گر جائے اور اسی معنی میں رب کریم کا یہ ارشاد ہے: فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا (نمل: 52) اس میں خَاوِيَةً بمعنی خالیہ ہے۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خَاوِيَةٌ بمعنی ساقطۃ ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا یعنی وہ گرنے والی ہے اپنی چھتوں پر۔

الخَواء الجوع پیٹ کے غذا سے خالی ہونے کے لئے بولا جاتا ہے اور خَوَت المرأۃ اور خَوِیت بھی ہے خَوًی یعنی عورت کا پیٹ ولادت کے وقت خالی ہو گیا۔ اور خویت لھا تخویۃ کہا جاتا ہے جب تو اس کے لئے کھانا تیار کرے جسے وہ کھائے گی اور اس سے مراد طعام ہے۔ اور الخَوِیُّ فَعِیل کے وزن پر ہے اور اس سے مراد زمین کا نشیبی ہموار حصہ ہے۔ اور خَوَّی البعیرُ جب اونٹ کے بیٹھنے کے وقت اس کا پیٹ زمین سے دور ہو اور اسی طرح آدمی اپنے سجدے کی حالت میں ہوتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا اس کا معنی ہے: کونسے طریقے اور کون سے سبب سے اللہ تعالیٰ اسے موت کے بعد زندہ کرے گا؟ ظاہر لفظ اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ بستی کو آبادی اور مکینوں کے ساتھ زندہ کرنے کے بارے سوال ہے، جیسا کہ اب ان خراب و برباد شہروں کے بارے کہا جاتا ہے جو آباد ہونے اور مکینوں سے دور ہوتے ہیں کہ یہ کیونکر اپنی بربادی کے بعد آباد ہوں گے۔ گویا کہ یہ وہاں کھڑے ہونے والے کی طرف سے اظہار افسوس ہے جو اس شہر پر عبرت کی نظر ڈال رہا ہے جس میں اس کے گھر والے اور اس کے دوست احباب موجود تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے اس کی ذات میں ایسی شے سے مثال بیان فرمائی جو اس سے عظیم تر ہے جس کے بارے اس نے سوال کیا ہے اور وہ مثال جو اس کے لئے اس کی ذات میں بیان کی گئی ہے وہ احتمال رکھتی ہے کہ اس کا سوال بنی آدم کے مردوں کو زندہ کرنے کے بارے ہو، یعنی اللہ تعالیٰ کیونکر اس کے مردوں کو زندہ کرے گا (2)۔

علامہ طبری نے بعض سے بیان کیا ہے کہ اس نے کہا: یہ قول احیاء کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شک ہے اور اسی لئے اس کی ذات میں اس کی مثال بیان کی گئی ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اس پر اللہ تعالیٰ کی قدرت میں کوئی شک داخل نہیں ہو سکتا کہ وہ بستی کو دوبارہ آباد کر کے اسے زندہ کر دے۔ بلا شبہ دوسری وجہ میں شک کا تصور صرف جاہل کی طرف سے کیا جا سکتا ہے اور درست یہ ہے کہ آیت میں شک کی کوئی تاویل نہ کی جائے (3)۔

قولہ تعالیٰ: فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ، مِائَةَ یہ ظرف کی بناء پر منصوب ہے اور عام بمعنی سال ہے۔ کہا جاتا ہے: سنون

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 39، دار احیاء التراث العربیۃ 2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 348، دار الکتب العلمیہ 3۔ ایضاً

عُوَّم یہ پہلے کی تاکید کے لئے ہے، جیسے کہا جاتا ہے: بینھم شُغْلٌ شَاغِلٌ۔ اور عجاج نے کہا ہے: مِن مرّ أعوامِ السنین العُوَم اس میں العوم السنین کی تاکید کے لئے ہے۔

اور یہ تقدیر میں عائم کی جمع ہے، مگر یہ مفرد مذکور نہیں ہوتا کیونکہ یہ اسم نہیں ہے بلکہ یہ تو تاکید ہے۔ جوہری نے یہی کہا ہے۔ اور نقاش نے کہا ہے: العام مصدر ہے جیسا کہ عوم مصدر ہے اور اس کے ساتھ سال بھر کے زمانے کا نام رکھا گیا ہے کیونکہ یہ سورج کے فلک میں گھومنے اور چکر لگانے سے پیدا ہوتا ہے۔

اور العوم، السَّبح کی طرح ہے (یعنی تیرنا) اور رب العالمین نے ارشاد فرمایا ہے: كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ۞ (الانبیاء) (سب (اپنے اپنے) مدار میں تیر رہے ہیں۔) ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ نقاش کے قول کے معنی میں ہے اور العام اس بنا پر القول اور القال کی طرح ہے اور اس اماتت (مارنے) کا ظاہر معنی جسم سے روح کو نکالنا ہے اور اس آیت کے قصص میں مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ اس کے لئے بھیجا جو اسے آباد کرے گا اور اس بارے میں اہتمام اور کوشش کرے گا، یہاں تک کہ اس کی آبادی کا کمال کہنے والے کو دوبارہ اٹھانے (زندہ کرنے) کے ساتھ ہوگا (1)۔ اور کہا گیا ہے کہ جب اس کی موت کو ستر برس گزر گئے تو اللہ تعالیٰ نے ملوک فارس میں سے ایک عظیم بادشاہ بھیجا اسے کوشت کہا جاتا ہے تو اس نے اسے تیس سال میں آباد کر دیا۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ بَعَثَهُ اس کا معنی ہے: پھر اس نے اسے زندہ کر دیا۔ اس کے بارے میں کلام ہو چکی ہے۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ كَمْ لَبِثْتَ۔ یہ قول کہنے والے کے بارے میں اختلاف ہے۔ کہا گیا ہے کہ رب العالمین ہے اور اس نے اسے یہ نہیں کہا ''اگر تو سچا ہے'' جیسا کہ ملائکہ کو فرمایا تھا جیسا کہ پہلے بحث گزر چکی ہے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ اس نے آسمان کی جانب سے ہاتف غیبی سے سنا وہ اسے یہ کہہ رہا ہے اور یہ بھی ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام اس سے مخاطب ہوئے۔ اور یہ بھی ہے کہ نبی علیہ السلام نے کہا۔ اور یہ بھی ہے کہ ایک مومن آدمی جو اس کی قوم میں سے تھا اور اس نے اسے مرتے وقت دیکھا تھا اور وہ اس کے زندہ ہونے کے وقت تک زندہ تھا تو اس نے اسے کہا: كَمْ لَبِثْتَ (کتنی مدت تو یہاں ٹھہرا رہا۔)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اظہر بات یہ ہے کہ کہنے والا خود اللہ تعالیٰ ہے اور اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: وَانْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا۔ واللہ اعلم۔

اہل کوفہ نے كَمْ لَبِثّ پڑھا ہے یعنی ثا کو تا میں قریب المخرج ہونے کی وجہ سے ادغام کر دیا ہے کیونکہ ان دونوں کا مخرج طرف لسان اور ثنایا علیا کی جڑیں ہیں اور اس اعتبار سے بھی کہ یہ دونوں حروف مھموسہ میں سے ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: ثا اور تا کا مخرج جدا جدا ہونے کی وجہ سے اظہار احسن اور بہتر ہے اور کہا جاتا ہے: یہ سوال علی جہتہ تقریر فرشتے کے واسطہ سے تھا۔ اور کم ظرف کی بنا پر محل نصب میں ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 349، دار الکتب العلمیہ

قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ۔ اس نے یہ قول اس بنا پر کیا جو اس کے نزدیک تھا اور جو اس کے گمان میں تھا اور اس بنا پر وہ اپنی خبر دینے میں جھوٹا نہیں ہو سکتا اور اسی کی مثل اصحاب کہف کا قول ہے: قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ (الکہف:19) (بعض نے کہا ہم ٹھہرے ہوں گے ایک دن یا دن کا کچھ حصہ) بلاشبہ وہ تین سو نوے برس تک ٹھہرے رہے ..... جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا اور وہ جھوٹے نہیں تھے کیونکہ انہوں نے اس مدت کی خبر دی جو ان کے نزدیک تھی، گویا کہ انہوں نے کہا: جو ہمارے نزدیک ہے اور جو ہمارے گمان میں ہے (وہ یہ ہے) کہ ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرے۔ اور اس کی نظر ذوالیدین کے قصہ میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول بھی ہے: لم أقصر ولم أنس (1) (یعنی نہ نماز کم ہوئی اور نہ میں بھولا۔)

اور لوگوں میں سے جو کہتے ہیں کہ یہ جھوٹ ہے وہ اس بنا پر ہے کہ اس میں جھوٹ حقیقتاً موجود ہے لیکن اس کے سبب اس کا مواخذہ نہیں، ورنہ جھوٹ سے مراد کسی شے کے بارے میں ایسی خبر دینا ہے جو اس کی حقیقت کے خلاف ہو اور یہ علم اور جہالت کے سبب مختلف نہیں ہوتا اور یہ اصول کی نظر میں واضح اور بین ہے اور اس بنا پر جائز ہے کہ یہ کہا جائے: بے شک انبیاء علیہم السلام کسی شے کے بارے ایسی خبر دینے سے معصوم نہیں ہیں جو خلاف واقعہ ہو بشرطیکہ وہ بالقصد اور بالارادہ نہ ہو، جیسا کہ وہ سہو ونسیان سے معصوم نہیں ہیں۔ اور یہ وہ ہے جو اس آیت سے تعلق رکھتا ہے اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ ابن جریج، قتادہ اور ربیع نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اسے ایک دن صبح کو موت دی پھر اسے غروب آفتاب سے پہلے زندہ کر کے اٹھا دیا گیا تو اس نے اسے ایک دن گمان کیا اور کہا: میں ایک دن ٹھہرا، پھر اس نے سورج کو باقی دیکھا اور اسے جھوٹا ہونے کا خوف لاحق ہوا تو اس نے کہہ دیا: ''یا دن کا کچھ حصہ'' تو اسے کہا گیا: ''بلکہ تو سو سال تک ٹھہرا رہا۔'' اور بستی کی آبادی، اس کے درخت اور اس کی ان عمارتوں کو دیکھا جو اس پر دال تھیں (2)۔

قولہ تعالیٰ: فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ۔ طعام سے مراد وہ انجیر ہے جو اس نے اس بستی کے درختوں سے جمع کیا تھا جس کے پاس سے گزرا تھا۔ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس طرح قراءت کی ہے وهذا طعامك و شرابك لم يتسنه (اور یہ تیرے کھانے اور تیرے پینے کا سامان ہے، یہ باسی نہیں ہوا) اور طلحہ بن مصرف وغیرہ نے اس طرح پڑھا ہے: وانظر لطعامك و شرابك لمائة سنة (3) اور جمہور نے وصل کلام میں ہا کو ثابت رکھا ہے مگر اخوان (حمزہ اور کسائی) اسے حذف کرتے ہیں اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اس پر وقف ہا کے ساتھ ہے اور طلحہ بن مصرف نے بھی لم يَسَّنَّ۔ وانظر پڑھا ہے سین میں تا کو مدغم کیا گیا ہے (4)۔ اور جمہور کی قراءت کے مطابق ہا اصلیہ ہے اور ضمہ کو جزم کے سبب حذف کر دیا گیا ہے اور یہ يَتَسَنَّهُ ہو جاتا ہے یہ السَّنہ سے ہے یعنی سالوں نے اسے تبدیل نہیں کیا۔ جوہری نے کہا ہے: اور کہا جاتا ہے سُنون اور السَّنَة یہ السِّنین کی واحد ہے۔ اور اس کے ناقص ہونے میں دو قول ہیں۔ ان میں سے ایک کے مطابق یہ واوی ہے اور آخر میں ہا ہے۔ اور اس کی اصل سَنْهَة، جَبْهَة کی مثل ہے کیونکہ یہ سَنُهَتِ النخلةُ و تسنَّهت سے ہے جب اس پر کئی

1۔ سنن نسائی، کتاب الصلوۃ، جلد 1، صفحہ 181۔ ایضاً صحیح بخاری، باب هل یاخذ الامام الخ، حدیث نمبر 673، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 348، دار الکتب العلمیہ 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 350

سال گزر جائیں۔ اور نخلة سَنَاءیعنی درخت ایک سال بارآور ہوتا ہے اور دوسرا سال بارآور نہیں ہوتا۔ اور سَنْهَاء بھی ہے۔ جیسا کہ انصار میں سے کسی نے کہا ہے:

فَلَيْسَتْ بِسَنْهَاءٍ وَلَا رُجَبِيَّةٍ ولكن عَرَايَا فى السِّنين الجَوَائِح (1)

اور اَسْنهت عند بنی فلان تو اس کے پاس مقیم رہا، و تَسَنَّيت بھی ہے۔ اور استأجرته مساناة و مُسانهة بھی ہے اور اس کی تصغیر سُنَيّة اور سُنَيْهَةٌ ہے۔

نحاس نے کہا ہے: جس نے لم يتسنّ اور انظر پڑھا ہے اس نے تصغیر میں سُنَيّة کہا ہے اور الف کو جزم کے سبب حذف کر دیا ہے اور وقف ہا پر کرتے ہیں اور کہتے ہیں: لم يتسنه یہ ہا بیان حرکت کے لئے ہوتی ہے۔

مہدوی نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ اس کی اصل سانَيْتُه مساناة سے ہے یعنی میں نے اس کے ساتھ یکے بعد دیگرے کئی سال معاملہ کیا۔ یا یہ سانهت (ہا کے ساتھ) سے ہے۔ پس اگر یہ سانیت سے ہو تو اس کی اصل يتسنى ہے اور الف جزم کی وجہ سے گر گئی۔ اور یہ اصل میں واوی ہے اور اس کی دلیل ان کا یہ قول ہے سنوات اور اس میں ہا برائے سکتہ ہے اور اگر یہ سانهت سے ہو تو پھر ہا فعل کے لام کلمہ کی جگہ ہے اور سنة کی اصل اس بنا پر سَنْهَة ہے اور پہلے قول کی بنا پر سَنَوَة ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ أسِنَ الماء سے ماخوذ ہے۔ (یہ تب کہا جاتا ہے) جب پانی متغیر ہو جائے اور اس بنا پر اس کا يتأسن ہونا لازم آتا ہے۔ ابو عمرو الشیبانی نے کہا ہے: یہ اس ارشاد سے ہے حَمَإٍ مَّسْنُوْنٍ (الحجر) پس معنی ہے کہ وہ متغیر نہ ہوا۔ زجاج نے کہا ہے: اس طرح نہیں ہے، کیونکہ قول باری تعالیٰ مَّسْنُوْنٍ کا معنی متغیر (تبدیل شدہ) نہیں ہے بلکہ اس کا معنی زمین کی سبزی اور طراوت پر انڈیل دیا جانا ہے۔ مہدوی نے کہا ہے: شیبانی کے قول کے مطابق اس کی اصل يتسنن ہے۔ دونوں میں سے ایک کو یا سے بدل دیا گیا ہے کیونکہ اس میں تضعیف (مضاعف ہونا) مکروہ ہے تو یہ يتسنى ہو گیا۔ پھر حالت جزمی میں الف کو گرا دیا گیا اور سکتہ کے لئے ہا داخل کر دی گئی۔

اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: لَمْ يَتَسَنَّهْ کا معنی ہے: وہ بدبودار نہیں ہوا۔

نحاس نے کہا ہے: اس کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں اصح یہ ہے کہ یہ السَّنَةِ سے ہے یعنی سالوں نے اسے تبدیل نہیں کیا۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ السَّنَة سے ہو اور اس کا معنی قحط سالی ہے۔ اور اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَلَقَدْ اَخَذْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ (الاعراف: 130) (اور بے شک ہم نے پکڑ لیا فرعونیوں کو قحط سالی سے) اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے: اَللّٰهُمَّ اجعلها عليهم سِنِيْنَ كَسِنِي يوسف (2) (اے اللہ! ان پر قحط سالی مسلط کر دے حضرت یوسف علیہ السلام (کے زمانے) کے قحط کی طرح) اسی سے کہا جاتا ہے: أَسْنَتَ القومُ یعنی قوم قحط میں مبتلا ہو گئی۔ پس معنی یہ ہوگا: قحطوں اور خشک سالیوں نے تیرے طعام کو تبدیل نہیں کیا یا سالوں اور برسوں نے اسے متغیر نہیں کیا

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 46، دار احیاء التراث العربیۃ

2۔ صحیح بخاری، کتاب الاستسقاء، جلد 1، صفحہ 136، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب تسمیۃ الولید، حدیث نمبر 5732، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یعنی وہ اپنی طراوت اور عمدگی پر باقی رہا۔

قولہ تعالیٰ: وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ۔ حضرت وہب بن منبہ وغیرہ نے کہا ہے: اس کی ہڈیوں کے جڑنے اور اس کے ایک ایک عضو کے زندہ ہونے کی طرف دیکھ۔ اور بیان کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اسی طرح زندہ کیا یہاں تک کہ وہ جڑی ہوئی ہڈیاں ہو گیا، پھر اس پر گوشت پیدا کر دیا یہاں تک کہ وہ کامل گدھا بن گیا۔ پھر اس کے پاس ایک فرشتہ آیا اور اس نے اس میں روح پھونک دی تو گدھا کھڑا ہو کر ہینگنے لگا۔ یہی مؤقف اکثر مفسرین کا ہے۔

حضرت ضحاک اور حضرت وہب بن منبہ سے بھی یہ روایت کیا گیا ہے کہ ان دونوں نے کہا، بلکہ اسے کہا گیا: تو اپنے گدھے کی طرف دیکھ درآنحالیکہ وہ اپنے باندھنے کی جگہ میں کھڑا ہے، سو برس میں اسے کوئی شے (آفت، تکلیف) نہیں پہنچی۔ اور وہ ہڈیاں جن کی طرف اس نے دیکھا ہے وہ اس کی اپنی ہڈیاں تھیں، اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی آنکھوں اور اس کے سر کو پہلے زندہ کر دیا اور ابھی اس کا سارا جسم مردہ تھا۔ ان دونوں نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے ارمیاء اور اس کے گدھے کی طرف اتنی طویل مدت تک دیکھنے سے اندھا کیے رکھا (1)۔

قولہ تعالیٰ: وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ۔ فراء نے کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ وَلِنَجْعَلَكَ میں واؤ داخل کی گئی ہے اس پر دلالت کرنے کے لئے کہ یہ اپنے مابعد فعل کے لئے شرط ہے۔ اس کا معنی ہے: وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ، و دلالة على البعث بعد الموت جعلنا ذالك۔ (اور یہ سب اس لئے) (کہ ہم بنائیں تجھے لوگوں کے لئے نشان) اور ہم نے بعث بعد الموت پر بطور دلیل اسے بنایا ہے۔ اور اگر تو چاہے تو واؤ کو مقحمہ زائدہ بنا لے۔ اور اعمش نے کہا ہے: اس کے نشانی ہونے کا محل یہ ہے کہ وہ اپنی اسی حالت پر نوجوان اٹھا جس حالت پر وہ اس دن تھا جس دن فوت ہوا اور اس نے بیٹے اور پوتے بڑھاپے کی حالت میں پائے۔ حضرت عکرمہ نے کہا ہے: جس دن وہ فوت ہوا اس وقت اس کی عمر چالیس برس تھی (2)۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عزیر اپنے گھر والوں سے نکلے اور پیچھے اپنی حاملہ بیوی چھوڑی۔ آپ کی عمر پچاس سال تھی اور اللہ تعالیٰ نے سو برس آپ کو مردہ حالت میں رکھا، پھر آپ کو اٹھایا اور آپ لوٹ کر اپنے گھر والوں کی طرف گئے اس حال میں کہ آپ پچاس سال کے جوان تھے اور آپ کا بیٹا سو برس کا تھا۔ پس آپ کا بیٹا آپ سے پچاس برس بڑا تھا۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیر کو زندہ کیا تو وہ اپنے گدھے پر سوار ہوئے اور اپنے محلہ میں آئے، تو نہ وہ لوگوں کو پہچان سکے اور نہ ہی لوگ انہیں پہچان سکے۔ اور انہوں نے اپنے گھر میں ایک نابینی بڑھیا کو پایا وہ ان کی کنیز تھی۔ جب حضرت عزیر ان سے نکلے تھے اس وقت اس کی عمر بیس برس تھی۔ تو آپ نے اسے فرمایا: کیا یہ عزیر کا گھر ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ پھر وہ رونے لگی اور کہنے لگی: عزیر اتنے برس سے ہم سے جدا ہو گئے ہیں۔ آپ نے فرمایا: میں عزیر ہوں، اس نے کہا: بلاشبہ عزیر تو سو برس سے ہم سے گم اور مفقود ہیں۔ آپ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے سو برس تک مجھے موت دیئے رکھی پھر اس نے مجھے زندہ فرما دیا ہے۔ بڑھیا نے کہا: عزیر تو مریض کے لئے مستجاب

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 350، دار الکتب العلمیہ　2۔ ایضاً

الدعوات تھے اور کسی مصیبت ولذیت میں مبتلا آدمی افاقہ پالیتا تھا تو آپ الله تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ میری بصارت مجھے لوٹا دے۔ سو آپ نے الله تعالیٰ سے دعا کی اور اس کی آنکھوں پر اپنا ہاتھ پھیرا تو وہ اسی جگہ صحت یاب ہوگئی، گویا اسے بیڑیوں سے آزاد کر دیا گیا۔ تو وہ کہنے لگی: میں شہادت دیتی ہوں بلاشبہ تو عزیر ہے۔ پھر وہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت کی طرف چل پڑی اور ان میں حضرت عزیر کا بوڑھا بیٹا بھی تھا اس کی عمر ایک سو اٹھائیس برس تھی اور اس کے بیٹوں کے بیٹے بھی بوڑھے تھے۔ تو بڑھیا نے کہا: اے قوم! قسم بخدا! یہ عزیر ہے۔ تو آپ کا بیٹا لوگوں کے ساتھ آپ کی طرف آیا تو ان کے بیٹے نے کہا: میرے باپ کے دونوں کندھوں کے درمیان ہلال کی مثل سیاہ نشان تھا، سو اس نے اسے دیکھا تو وہ عزیر ہی تھے۔ اور کہا گیا ہے: آپ اس حال میں آئے کہ آپ کو پہچاننے والے تمام ہلاک ہو چکے تھے تو آپ ان کے لئے ایک نشانی تھے جو آپ کی قوم میں سے زندہ تھے کیونکہ آپ کے احوال سننے کے سبب وہ یقین رکھتے تھے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اتنی مدت آپ کو موت دینے میں اور پھر اس کے بعد آپ کو زندہ کرنے میں بہت عظیم نشانی ہے اور آپ کا سارا معاملہ آنے والے زمانے کے لئے علامت ونشانی ہے۔ بعض کو چھوڑ کر بعض کی تخصیص کی کوئی حاجت اور ضرورت نہیں (1)۔

قولہ تعالیٰ: **وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا**۔ علمائے کوفہ اور ابن عامر نے زا کے ساتھ قراءت کی ہے اور باقیوں نے را کے ساتھ اور اَبان نے حضرت عاصم رحمۃ اللہ علیہ سے نَنْشُرُهَا یعنی نون کے فتحہ، شین کے ضمہ اور را کے ساتھ روایت کیا ہے اور اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حسن اور ابوحیوہ نے قراءت کی ہے اور کہا گیا ہے: یہ دونوں لغتیں احیاء (زندہ کرنے) کے معنی میں ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے: رَجَعَ وَرَجَعْتُهُ اور غاض الماء وغضته، خسرت الدابۃ وخسرتھا، مگر لغت میں معروف یہ ہے: أنشر الله الموتى فنشروا، یعنی الله تعالیٰ نے انہیں زندہ کیا پس وہ زندہ ہو گئے۔ الله تعالیٰ نے فرمایا: ثُمَّ إِذَا شَاءَ أَنْشَرَهُ ۝ (عبس) (پھر جب چاہے گا اسے زندہ کر دے گا) اور اس کا اٹھنا کپڑے کے اٹھنے (لپیٹنے) کی مثل ہوگا۔ نشر الميتُ ينشرُ نُشُوْرًا یعنی مرنے والا موت کے بعد زندہ ہو گیا۔

اعشیٰ نے کہا ہے:

حتی یقولَ الناسُ مما رأوْا ۔۔۔ یا عَجَبًا للمیتِ الناشِرِ (2)

یہاں تک کہ لوگ کہنے لگے جو کچھ انہوں نے دیکھا موت کے بعد زندہ ہونے والے میت کا واقعہ کتنا عجیب ہے۔

گویا موت ہڈیوں اور اعضا کو لپیٹنے کا نام ہے اور احیاء اور اعضاء کو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ جمع کرنا نشر ہے۔

اور رہی نُنْشِزُهَا کی قراءت زا کے ساتھ تو اس کا معنی ہے: "ہم انہیں اٹھاتے ہیں" اور النَّشَز کا معنی ہے: زمین کی بلند اور اٹھی ہوئی جگہ ... جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

تری الثعلب الحَوْلِیّ فیها کأنه ۔۔۔ اذا ما علا نَشَزًا حصانٌ مجلّلُ

اس میں نشزًا بلند جگہ کے معنی میں ہی مذکور ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 350، دار الکتب العلمیہ
2۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 55، دار احیاء التراث العربیہ

مکی نے کہا ہے: معنی یہ ہے تو ہڈیوں کی طرف دیکھ ہم کیسے زندہ کرنے کے لئے ان میں سے بعض کو اٹھا کر بعض پر ترکیب کے ساتھ رکھتے ہیں، کیونکہ النشز کا معنی الارتفاع (بلند ہونا) ہے اور اسی سے المرأة النشوز ہے اس سے مراد ایسی عورت ہے جو اپنے خاوند کے ساتھ موافقت کرنے سے بلند ہوتی ہے۔ (یعنی اس کے ساتھ موافقت نہیں کرتی) اور اسی سے رب العالمین کا یہ ارشاد ہے: وَ اِذَا قِیْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا (المجادلہ:11) (اور جب کہا جائے کہ اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہوا کرو) یعنی تم اٹھو اور مل جاؤ۔ اور یہ بھی ہے کہ را کے ساتھ قراءت ہو تو معنی احیاء (زندہ کرنا) ہے۔ اور ہڈیاں انفرادی طور پر زندہ نہیں ہوتیں یہاں تک کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں۔ اور زا اس معنی کے زیادہ قریب ہے۔ کیونکہ بمعنی انضمام (ملنا) ہے نہ کہ بمعنی احیاء۔ پس احیاء کے ساتھ آدمی متصف ہے نہ کہ انفرادی طور پر ہڈیاں اور یہ نہیں کہا جا سکتا: ھذا عظم حی (یہ زندہ ہڈی ہے)۔ لہٰذا معنی یہ ہوا: پس تو دیکھ ہڈیوں کی طرف ہم کیسے انہیں زمین میں ان کی جگہوں سے جسم کی طرف اٹھاتے ہیں (جس) جسم والے کو زندہ کرنا مقصود ہے۔

اور نخعی نے نَنْشُزُھَا نون کے فتحہ، شین کے ضمہ اور زا کے ساتھ قراءت کی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے یہی مروی ہے اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے ننشیھا یا کے ساتھ قراءت کی ہے۔

اور کسوہ سے مراد وہ کپڑے ہیں جو ڈھانپ لیں۔ اور گوشت کو ان کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور لبید نے اسلام کے لئے بطور استعارہ اسے استعمال کیا ہے۔ اور کہا ہے:

حتی اکتسبتُ من الاسلامِ سِربالا (1)

(یہاں تک کہ میں نے اسلام سے لباس پہن لیا، یعنی میں نے اسلام قبول کر لیا۔) اور یہ سورت کی ابتدا میں گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ (اَعْلَمُ) میں ہمزہ قطعی ہے اور یہ روایت ہے کہ اللہ جل ذکرہ نے اس کے بعض (حصے) کو زندہ فرمایا پھر اسے دکھایا کہ اس نے اس کے بقیہ حصہ کو کیسے زندہ کیا ہے۔

حضرت قتادہ نے کہا ہے: بلاشبہ وہ دیکھنے لگا اللہ تعالیٰ کیسے بعض ہڈیوں کو بعض کے ساتھ جوڑتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سب سے اول اس کے سر کو تخلیق فرمایا اور اسے کہا گیا: تو دیکھ، تو اس وقت اس نے کہا: أعلم الف قطعی کے ساتھ، یعنی أعلم ھذا میں اسے جان گیا۔

اور علامہ طبری نے کہا ہے: فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗ میں معنی یہ ہے: جب اللہ تعالیٰ کی قدرت میں سے وہ شے اس کے لئے بالکل عیاں اور واضح ہو گئی جس سے وہ ناواقف تھا تو اس نے اپنے بالعین دیکھنے کو قبول کر لیا اور اس پر اعتماد کرتے ہوئے کہا: أعلم۔ (میں جان گیا)

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ خطا ہے، کیونکہ اس نے ایسی شے کو لازم کیا ہے لفظ جس کا تقاضا نہیں کرتا اور اس نے شاذ قول اور ضعیف احتمال کے مطابق تفسیر بیان کی ہے۔ یہ میرے نزدیک اس شے کے بارے میں اقرار نہیں ہے جس کا وہ اس سے پہلے

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 55، دار احیاء التراث العربیۃ

انکار کرتا تھا جیسا کہ علامہ طبری نے گمان کیا ہے، بلکہ یہ ایسا قول ہے جس پر اعتبار نے ابھارا ہے، جیسا کہ ایک بندہ مومن جب اللہ تعالیٰ کی قدرت میں سے کوئی عجیب وغریب شے دیکھے تو کہتا ہے: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ اور اسی طرح کے الفاظ۔

ابو علی نے کہا ہے: اس کا معنی ہے میں علم کی اس قسم کو جان گیا جس کا علم میرے پاس نہ تھا (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ہم نے یہ معنی حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا ہے اور اسی طرح مکی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ مکی نے کہا ہے: بلاشبہ جب اس نے مردوں کو زندہ کرنے کے بارے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا مشاہدہ کر لیا تو اس نے اپنے بارے میں خبر دی، اور اسے مشاہدہ کے ساتھ اس کا یقین ہو گیا اور اس نے اقرار کر لیا کہ وہ جانتا ہے اللہ تعالیٰ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے، یعنی میں علم کی اس قسم کو جان گیا ہوں معائنہ کی بنا پر جسے میں پہلے نہ جانتا تھا اور یہ ان کی قراءت کے مطابق ہے جنہوں نے أَعْلَمُ الف قطعی کے ساتھ پڑھا ہے اور وہ اکثر قراء ہیں۔ اور حمزہ اور کسائی نے ہمزہ وصل کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دو وجہوں کا احتمال رکھتا ہے: ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسے فرشتے نے کہا: اعلم (تو جان لے) اور دوسری یہ کہ وہ اپنی ذات کو اجنبی اور منفصل مخاطب کے قائم مقام رکھے، تو معنی یہ ہوگا کہ جب اس کے لئے حقیقت روشن ہو گئی تو اس نے اپنے آپ کو کہا: اے نفس! تو جان لے یہ وہ علم یقینی ہے جسے تو بالعین نہ جانتا تھا اور اس معنی کی مثل میں ابو علی نے کہا ہے:

ودِّعْ هريرةَ ان الركب مرتحل   ألم تغتمِض عيناك ليلة أرمدا

تو ہلی کو چھوڑ دے۔ بے شک قافلہ کوچ کرنے والا ہے۔ کیا تیری آنکھیں آشوب چشم والی رات بند نہیں ہوئیں

ابن عطیہ نے کہا ہے: ابو علی اس معنی میں شاعر کے قول سے مانوس ہوئے ہیں:

تذكّر من أنّى و من أين شُرْبُه   يُؤامِرُ نفْسَيْه كذِى الهَجْمَة الابل (2)

مکی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اور یہ بعید ہے کہ یہ اس کے لئے اللہ جل ذکرہ کی جانب سے علم کے بارے حکم ہو۔ کیونکہ اس نے تو اس پر اپنی قدرت ظاہر فرما دی ہے اور اسے ایسا امر دکھا دیا ہے جس کی صحت کا اسے یقین حاصل ہو گیا اور اس نے قدرت کا اقرار کر لیا۔ لہٰذا اس کا کوئی معنی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اس کے علم کے بارے حکم دے بلکہ اس کے بارے وہ اپنے آپ کو حکم دے رہا ہے اور یہ جائز اور حسن ہے۔

اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے حرف میں جو اس پر دلالت ہو رہی ہے کہ یہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے علم کے بارے میں حکم ہے اس معنی میں کہ تو اس کے بارے میں علم کو لازم پکڑ لے اور یقین کر لے جب تو نے معائنہ کر لیا اور یقین کر لیا۔ اس لئے کہ ان کی قراءت میں ہے: قیل اعلم۔ اور یہ بھی کہ یہ اپنے ماقبل امر کے موافق ہے جو اس قول میں ہے: فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ اور وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ اور وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ پس اسی طرح ہے۔ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما پڑھتے تھے قیل اعلم اور کہتے تھے: کیا وہ بہتر ہے یا ابراہیم؟ کیونکہ انہیں کہا گیا: وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ پس یہ واضح کرتا ہے کہ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا قول ہے جب اس نے احیاء (زندہ کرنے) کا معائنہ کر لیا۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 351، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 352

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَ لَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَ لٰكِنْ لِّیَطْمَىِٕنَّ قَلْبِیْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا ؕ وَ اعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۶۰﴾

''اور یاد کرو جب عرض کی ابراہیم نے اے میرے پروردگار! دکھا مجھے کہ تو کیسے زندہ فرماتا ہے مردوں کو۔ فرمایا: (اے ابراہیم) کیا تم اس پر یقین نہیں رکھتے؟ عرض کی: ایمان تو ہے لیکن (یہ سوال اس لئے ہے) تاکہ مطمئن ہو جائے میرا دل۔ فرمایا: تو پکڑ لے چار پرندے پھر مانوس کر لے انہیں اپنے ساتھ پھر رکھ دے ہر پہاڑ پر ان کا ایک ایک ٹکڑا پھر بلا انہیں چلے آئیں گے تیرے پاس دوڑتے ہوئے اور جان لے یقیناً اللہ تعالیٰ سب پر غالب بڑا دانا ہے۔''

لوگوں نے اس سوال کے بارے میں اختلاف کیا ہے کہ کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جانب سے یہ شک کے سبب صادر ہوا یا نہیں؟ تو جمہور نے کہا ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے مردوں کو زندہ کرنے کے بارے میں کبھی شک لاحق نہیں ہوا۔ بلاشبہ آپ نے معائنہ کا مطالبہ کیا، وہ اس لئے کہ نفوس ہر اس شے کو دیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں جس کے بارے انہیں خبر دی جائے۔ اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: لیس الخبر کالمعاینۃ (1) (خبر معائنہ کی طرح نہیں ہے) اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے آپ کے سوا کسی نے اسے روایت نہیں کیا، ابو عمر نے یہی کہا ہے۔

امام اخفش نے کہا ہے: اس سے دل کی رؤیت مراد نہیں لی گئی بلکہ آپ نے آنکھ کے ساتھ دیکھنے کا ارادہ کیا ہے۔

اور حضرت حسن، قتادہ، سعید بن جبیر اور ربیع رحمۃ اللہ علیہم نے بیان کیا ہے: آپ نے سوال کیا تاکہ آپ کے یقین میں مزید اضافہ ہو جائے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں عنوان بنایا اور کہا: وقال آخرون سال ذالك ربه، لأنه شك فی قدرة الله تعالیٰ (اور دوسروں نے کہا: آپ نے اپنے رب سے یہ سوال کیا کیونکہ آپ کو اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شک تھا۔) اور انہوں نے اس عنوان کے تحت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول ذکر کیا ہے آپ نے فرمایا: میرے نزدیک قرآن کریم میں کوئی آیت اس سے زیادہ امید افزا نہیں۔

اور حضرت عطا بن ابی رباح رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں وہ بعض داخل ہو گیا جو لوگوں کے دلوں میں داخل ہو جاتا ہے تو آپ نے عرض کی: اے میرے پروردگار! مجھے دکھا تو مردوں کو کیسے زندہ فرماتا ہے؟ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نحن أحق بالشك من ابراهيم، الحدیث۔ (ہم ابراہیم علیہ السلام کی نسبت شک کے زیادہ حقدار ہیں)۔ پھر علامہ طبری نے اس قول کو ترجیح دی ہے (2)۔

میں کہتا ہوں: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو امام بخاری اور امام مسلم نے ان سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

1۔ المستدرک علی الصحیحین، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 315، حدیث نمبر 3250
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 352، دار الکتب العلمیہ

نے فرمایا: ہم ابراہیم علیہ السلام کی نسبت شک کرنے کا زیادہ حق رکھتے ہیں جبکہ انہوں نے کہا: اے میرے رب! مجھے دکھا تو مردوں کو کیسے زندہ فرماتا ہے؟ تو رب کریم نے فرمایا: کیا تم اس پر یقین نہیں رکھتے؟ عرض کی: ایمان تو ہے لیکن سوال اس لئے ہے تاکہ میرا دل مطمئن ہو جائے اور اللہ تعالیٰ لوط علیہ السلام پر رحم فرمائے وہ رکن شدید (مضبوط شے) کی طرف پناہ لیتے تھے اور اگر میں قید میں رہتا جتنا یوسف علیہ السلام رہے ہیں تو میں دعوت دینے والے کی دعوت کو قبول کر لیتا (1)۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: جو علامہ طبری نے عنوان بنایا ہے میرے نزدیک وہ مردود ہے اور جو عنوان کے تحت انہوں نے ذکر کیا ہے اس کی تاویل کی گئی ہے۔ پس جہاں تک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس قول کا تعلق ہے: ھی أرْجٰی آیۃ تو یہ اس حیثیت سے ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ پر اور دنیا میں مردوں کے زندہ کرنے کے سوال پر رہنمائی موجود ہے اور یہ اس وہم میں ڈالنے والی نہیں ہے اور آپ کا یہ کہنا جائز ہے: ھی أرجی آیۃ (یہ زیادہ امید دلانے والی آیت ہے) یعنی بلاشبہ ایمان کافی ہے یہ اپنے ساتھ کسی چھان بین اور بحث و تمحیص کا محتاج نہیں ہوتا۔

اور رہا حضرت عطا کا یہ قول: دخل قلبَ ابراھیم بعضُ مایدخل قلوب الناس تو اس کا معنی یہ ہے کہ اگر وہ شک کرنے والے ہوتے تو یقیناً ہم ان کی نسبت اس کا زیادہ حق رکھتے اور ہم شک نہیں کرتے ہیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے یہ زیادہ مناسب ہے کہ وہ شک نہ کریں (2)۔ پس حدیث طیبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شک کی نفی پر مبنی ہے اور وہ حدیث جس میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ذالك محض الایمان (3) (وہ خالص ایمان ہے) تو یہ ایسے خطرات (کھٹکنے والی چیزوں) کے بارے میں ہے جو ثابت نہیں رہتے اور رہا شک تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ دو امروں کے درمیان توقف کرنا ہے جس میں ایک کو دوسرے پر فوقیت حاصل نہ ہو۔ اور اس کی حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام سے نفی کی گئی ہے اور مردوں کو زندہ کرنا تو دلیل سمعی سے ثابت ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے بارے زیادہ جانتے تھے اور اس پر آپ کا یہ قول تیری رہنمائی کرتا ہے: رَبِّیَ الَّذِیۡ یُحۡیٖ وَ یُمِیۡتُ اور اس پر شک کرنا اس کے لیے بعید ہے جس کا قدم فقط ایمان میں ثابت ہو تو جو مرتبہ نبوت اور خلت پر فائز ہو اس کے بارے شک کیسے ہو سکتا ہے اور انبیاء علیہم السلام تو کبائر سے معصوم ہیں اور بالاجماع ان صغیرہ گناہوں سے بھی جن میں رذالت ہوتی ہے اور جب تو آپ علیہ السلام کے سوال اور آیت کے تمام الفاظ میں غور و فکر کرے گا تو وہ قطعاً شک پیدا نہیں کرتے اور وہ اس طرح کہ سوال کیف کے ساتھ ہے اور اس کے ساتھ سوال کسی شے کی حالت کے بارے ہوتا ہے جو موجود ہو اور سائل اور مسئول دونوں کے نزدیک اس کا وجود متقرر اور ثابت ہو۔ مثلاً تیرا یہ قول: کیف علمُ زیدٍ (زید کا علم کیسا ہے؟) کیف نسج الثوب (کپڑے کی بنائی کیسی ہے) اور اسی طرح کی دیگر مثالیں۔ اور جب تو نے کہا: کیف ثوبك؟ (تیرا کپڑا کیسا ہے) اور کیف زید؟ (زید کیسا ہے) تو بلاشبہ سوال ان کے احوال میں سے کسی حال کے بارے ہے اور کبھی کیف کسی شی کے بارے خبر دینے کے لئے ہوتا ہے جس کی شان یہ ہو

1۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 477، وزارت تعلیم۔ ایضاً، حدیث نمبر 3121، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ ایضاً
3۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 79، وزارت تعلیم۔

کہ اس کے بارے کیف سے سوال کیا جائے۔ جیسے تیرا یہ قول: کیف شئت فکن۔ (جس حالت میں تو چاہے تو ہو جا) اور اسی طرح امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے: کیف کان بدء الوحی (وحی کا آغاز کیسے ہوا؟) اور اس آیت میں کَیْفَ زندہ کرنے کی ہیئت کے بارے سوال کرنے کے لئے ہے اور احیاء (زندہ کرنا) متقرر اور ثابت شدہ امر ہے۔

لیکن جب ہم نے کسی شے کے وجود کا انکار کرنے والے بعض لوگوں کو پایا ہے کہ وہ اس کے انکار کو اس شے کی حالت کے بارے سوال سے تعبیر کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ صحیح نہیں ہے، تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ شے فی نفسہٖ صحیح نہیں ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک دعویٰ کرنے والا یہ کہے: انا ارفع ھذا الجبل، میں اس پہاڑ کو اٹھا سکتا ہوں۔ تو اسے جھٹلانے والا کہتا ہے: مجھے دکھا تو اسے کیسے اٹھا سکتا ہے؟ تو عبارت میں یہی طریقہ مجاز ہے اور اس کا معنی ہے ایک بار بطور قیاس جدلی کے تسلیم کرنا۔ گویا کہ وہ کہہ رہا ہے: میں فرض کرتا ہوں کہ تو اسے اٹھا سکتا ہے سو تو مجھے دکھا تو اسے کیسے اٹھائے گا۔

پس جب حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کی عبارت اس اشتراک مجازی کے مطابق تھی، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے اسے خالص کر دیا اور اسے اس پر محمول کیا کہ آپ کے لئے حقیقت بیان فرمادی اور آپ کو فرمایا: اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰی تو اس سے امر مکمل ہو گیا اور ہر قسم کے شک سے پاک ہو گیا پھر آپ علیہ السلام نے راحت و طمانینت کے ساتھ اپنے سوال کی علت بیان کی (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ جو ابن عطیہ نے ذکر کیا ہے وہ اپنی (انتہا کو) پہنچا۔ اور انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کے بارے میں اس طرح کا شک جائز نہیں ہوتا کیونکہ یہ کفر ہے اور انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات دوبارہ اٹھائے جانے کے ساتھ ایمان لانے پر متفق ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دے رکھی ہے کہ اس کے انبیاء علیہم السلام اور اس کے اولیاء رحمۃ اللہ علیہم پر شیطان کو کوئی راہ اور غلبہ نہیں ہے۔ ارشاد فرمایا ہے: اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ (الحجر: ۴۲) (بے شک میرے بندوں پر تیرا کوئی بس نہیں چلتا۔) اور اس لعین نے کہا تھا: اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ۝ (ص) یعنی تیرے مخلص بندوں پر میرا تسلط نہیں ہو سکتا) اور جب شیطان کے لئے ان پر کوئی غلبہ اور تسلط نہیں ہے تو پھر وہ انہیں شک میں کیسے ڈال سکتا ہے؟ بلا شبہ آپ نے سوال کیا کہ آپ مردوں کے اجزاء بکھر جانے کے بعد ان کے جمع ہونے کی کیفیت اور پٹھوں اور جلدوں کو پھاڑنے اور بکھیرنے کے بعد انہیں جوڑنے کی کیفیت کا مشاہدہ کریں۔ اور ارادہ یہ کیا کہ آپ علم یقین سے مزید علم یقین کی طرف ترقی کریں۔ پس آپ کا قول: اَرِنِيْ كَيْفَ یہ کیفیت کے مشاہدہ کی طلب پر دال ہے۔

اور بعض علمائے معانی نے کہا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب سے یہ ارادہ کیا کہ وہ آپ کو دکھائے وہ کیسے دلوں کو زندہ کرتا ہے۔ یہ رائے فاسد اور مردود ہے اس بیان کے سبب جو اس کے پیچھے ہے۔ اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے اور اس ارشاد اَوَلَمْ تُؤْمِنْ میں الف برائے استفہام نہیں ہے، بلکہ یہ الف برائے ایجاب و تقریر ہے۔ جیسا کہ جریر نے کہا ہے:

السْتم خیر من رکب المطایا

کیا تم ان سے بہتر نہیں ہو جو سواریوں پر سوار ہوئے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 353، دار الکتب العلمیہ

(یعنی ان سے بہتر ہو۔ تو گویا الف برائے ایجاب ہوا)

اور دتُؤمِنْ میں واؤ حالیہ ہے۔ اس کا معنی ایمان مطلق ہوا اور اس میں مردوں کو زندہ کرنے کی فضیلت داخل ہے۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَىِٕنَّ قَلْبِیْ یعنی میں نے تجھ سے سوال کیا ہے تا کہ میرا دل برہان (دلیل) کے ساتھ معلوم اور مشاہدہ کے مابین فرق حاصل ہونے سے مطمئن ہو جائے۔

اور طمانینت کا معنی اعتدال اور سکون ہے اور اعضاء کی طمانینت تو معروف ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ثم ارکع حتی تطمئن راکعا۔(1) الحدیث (پھر تو رکوع کر یہاں تک کہ تو پورے اطمینان سے رکوع کرے) اور دل کی طمانینت یہ ہے کہ کسی شے معتقد میں اس کی فکر پر سکون ہو جائے (اور راحت میں بدل جائے۔) اور احیاء کے بارے میں فکر کرنا ممنوع نہیں ہے، جیسا کہ آج ہمارے لئے ہے کہ ہم اس میں فکر کریں کیونکہ اس فکر میں ہی عبرت ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تو مشاہدہ اور معائنہ کا ارادہ کیا تو احیاء کی صورت میں ان کی فکر ختم ہو جائے گی۔

اور علامہ طبری نے کہا ہے: لِّيَطْمَىِٕنَّ قَلْبِیْ کا معنی ہے تا کہ میرا دل محفوظ ہو جائے اور اسی طرح حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے بیان کیا گیا ہے۔ اور ان سے یہ بھی بیان کیا گیا ہے تا کہ یقین میں اضافہ ہو جائے۔ ابراہیم اور قتادہ نے یہی کہا ہے اور بعض نے کہا ہے: تا کہ وہ میرے ایمان کے ساتھ مزید ایمان کا اضافہ کرے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: اس معنی میں کوئی زیادتی ممکن نہیں ہوتی مگر فکر سے سکون حاصل کرنے کے ساتھ، ورنہ یقین منقسم نہیں ہوتا (2)۔

سدی اور ابن جبیر نے بھی کہا ہے: کیا تم یقین نہیں رکھتے اس کے ساتھ کہ تم میرے خلیل ہو؟ آپ نے عرض کی: کیوں نہیں بلکہ (سوال اس لئے ہے) تا کہ میرا دل خلت کے ساتھ مطمئن ہو جائے۔

اور یہ قول بھی ہے: آپ نے دعا کی کہ وہ آپ کو دکھائے وہ کیسے مردوں کو زندہ کرتا ہے تا کہ وہ جان لے کہ اس کی دعا قبول کی جاتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو فرمایا: کیا تمہیں یقین نہیں ہے کہ میں تمہاری دعا قبول کرتا ہوں؟ آپ نے عرض کی: ایمان تو ہے (لیکن سوال اس لئے کیا ہے) تا کہ میرا دل مطمئن ہو جائے کہ تو میری دعا قبول کرتا ہے۔

آپ کو اس پر برانگیختہ کرنے والے کے بارے میں اختلاف ہے۔ پس کہا گیا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے آپ سے وعدہ کیا کہ وہ آپ کو خلیل بنائے گا، تو آپ نے اس پر کسی نشانی (کے حصول) کا ارادہ کیا۔

سائب بن یزید نے یہی کہا ہے اور یہ قول بھی ہے: (کہ وہ) نمروذ کا یہ قول تھا: میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں اور حسن نے کہا ہے: انہوں نے ایک مردار دیکھا اس کا نصف حصہ خشکی میں پڑا تھا اسے درندے چیر پھاڑ کر کھا رہے تھے اور نصف حصہ سمندر میں تھا اسے سمندری جانور چیر پھاڑ رہے تھے، تو جب آپ نے اسے متفرق ہوتا اور بکھرتا دیکھا تو آپ نے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاذان، جلد 1 صفحہ 105، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، کتاب ابواب صلاۃ الجماعۃ، حدیث نمبر 715، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1 صفحہ 353، دار الکتب العلمیہ

پسند کیا کہ اسے جڑتا اور ملتا بھی دیکھیں تو آپ نے سوال کر دیا تاکہ آپ کا دل اس کے جمع ہونے کی کیفیت دیکھ کر مطمئن ہو جائے جیسا کہ اس نے تفریق اور تقسیم کی کیفیت کو دیکھا ہے: سو آپ کو کہا گیا: فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ کہا گیا ہے کہ وہ چار پرندے مرغ، مور، کبوتر اور کوا تھے۔ اسے ابن اسحاق نے بعض اہل علم سے ذکر کیا ہے اور مجاہد، ابن جریج، عطاء بن یسار اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہم نے یہی کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کوے کی جگہ سارس کا ذکر کیا ہے(1) اور آپ ہی سے یہ بھی ہے کہ آپ نے کبوتر کی جگہ گدھ کا ذکر کیا ہے۔ پس آپ نے حسب حکم یہ پرندے پکڑ لئے اور انہیں ذبح کیا اور انہیں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ دیا اور بعض کا گوشت بعض کے ساتھ خون اور پروں سمیت خلط ملط کر دیا یہاں تک کہ آپ بہت تعجب کرنے لگے، پھر اس ملے جلے مجموعہ میں سے ایک ایک جز ہر پہاڑ پر رکھ دیا اور آپ ایسی جگہ پر ٹھہر گئے جہاں سے آپ ان اجزاء کو دیکھ سکتے تھے اور آپ نے پرندوں کے سر اپنے ہاتھ میں ہی روک لئے۔ پھر کہا: تعالین باذن اللہ (تم اللہ تعالیٰ کے اذن سے آجاؤ) پس وہ اجزاء اڑنے لگے اور خون خون کی طرف اور پر پروں کی طرف اڑے یہاں تک کہ پہلے کی طرح وہ سب جڑ گئے اور بغیر سروں کے وہ باقی رہ گئے۔ پھر آپ نے دوبارہ آواز دی تو وہ آپ کے پاس اپنی ٹانگوں پر دوڑتے ہوئے آئے۔ اور پرندے کے لئے سعی کا لفظ نہیں بولا جاتا جب وہ اڑے مگر تمثیل کی بنا پر۔ نحاس نے یہی کہا ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب ان میں سے ایک کی طرف اس کے سر کے بغیر اشارہ کیا تو پرندہ دور ہو گیا اور جب اس کی طرف اس کے سر کے ساتھ اشارہ کیا تو وہ قریب ہوا یہاں تک کہ ہر پرندہ اپنے سر کے ساتھ مل گیا اور وہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے اڑ گیا۔

زجاج نے کہا ہے: معنی یہ ہے پھر ہر پہاڑ پر ہر ایک کا ایک ایک جز رکھ دے۔

ابوبکر نے عاصم اور ابو جعفر سے جُزُؤًا بروزن فُعُل پڑھا ہے اور ابو جعفر نے جُزًّا زاء مشددہ کے ساتھ بھی پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے مہموز مخفف پڑھا ہے یہ اس کی لغات ہیں اور اس کا معنی ہے: نصیب اور حصہ۔

يَأْتِينَكَ سَعْيًا۔ سَعْيًا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور صُرْهُنَّ کا معنی ہے: تو انہیں کاٹ دے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت مجاہد، ابو عبیدہ اور ابن انباری رحمۃ اللہ علیہم نے یہی کہا ہے۔ کہا جاتا ہے: صار الشیٔ یصورہ۔ یعنی اس نے شے کو کاٹ دیا۔ اور ابن اسحاق نے یہی کہا ہے۔ اور ابو الاسود الدؤلی سے ہے، اور یہ سریانی زبان کے ساتھ تقطیع ہے، توبہ بن الحمیر نے اس کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

فلما جذبت الحبل أطّت نُسوعُه بأطراف عیدان شدید سیورها

فأدنت لی الأسباب حتی بلغتُها بنهض و قد کاد ارتقائی یصورها

یعنی وہ اسے کاٹ دے گا اور الصَّوْر بمعنی القطع (کاٹنا) ہے۔ ضحاک، عکرمہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنی کسی روایت میں کہا ہے جو ان سے روایت کی گئی ہے کہ یہ لفظ نبطی زبان کا ہے اور اس کا معنی ہے: قَطِّعْهُنَّ تو انہیں کاٹ دے۔ اور کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے: أَمِلْهُنَّ إِلَيْكَ، یعنی تو انہیں ملا دے اور انہیں اپنے پاس جمع کر لے۔ کہا جاتا ہے: رجل أصور جب

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 353، دار الکتب العلمیہ

وہ گردن کو جھکانے والا ہو۔ اور آپ کہتے ہیں: انی الیکم لأصور، یعنی بلاشبہ میں تمہاری طرف مشتاق اور راغب ہوں۔ اور امرأۃ صَوْراء (جھکنے والی عورت) اور اس کی جمع صُوْرٌ ہے جیسا کہ أسوکی جمع سُوْدٌ ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

اللهُ یعلم أنّا فی تلفُّتِنا یومَ الفِراق الی جیراننا صُوَرُ

اور قولہ اِلَیۡکَ تقطیع کی تاویل پر متعلق خذ کے ہے اور کسی مضمر کی حاجت نہیں۔ اور امالہ اور ضم کی تاویل پر یہ صُرْھُنَّ کے متعلق ہے اور کلام میں یہ چھوڑ دیا گیا ہے: فَأَمِلْھُنَّ الیك ثم قطعھن (تم انہیں اپنے پاس جمع کرلو اور پھر انہیں ٹکڑے ٹکڑے کردو) اور اس میں پانچ قراءتیں ہیں۔ سات میں سے دو یہ ہیں: صاد کا ضمہ، صاد کا کسرہ اور را کی تخفیف۔ اور ایک قوم نے فصُرّھن یعنی صاد کے ضمہ اور را مفتوحہ کی شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ گویا کہ وہ کہہ رہا ہے پس تو انہیں باندھ دے۔ اور اسی سے صُرّۃ الدنانیر ہے۔ اور ایک گروہ نے فصِرّھُنَّ صاد کے کسرہ اور را مفتوحہ کی شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس کا معنی ہے تو انہیں چیر پھاڑ دے۔ یہ تیرے اس قول سے ہے: صرّ البابُ و القلمُ اذا صوّت۔ (دروازہ اور قلم پھٹ گئے جب تو نے آواز لگائی۔) اسے نقاش نے بیان کیا ہے۔ ابن جنی نے کہا ہے: یہ قراءت غریب ہے اور وہ اس لئے کہ مضاعف متعدی بکسر عین بہت قلیل آتا ہے بلکہ اس کا باب یفعل عین کلمہ کے ضمہ کے ساتھ ہے جیسے شَدَّ یَشُدُّ وغیرہ۔ لیکن کبھی کبھی اس سے یہ بھی آتا ہے نَمّ الحدیثَ ینُمّہ وینِمّہ۔ اس نے چغلخوری کی۔ اور ھرّ الحرب یھُرّھا ویھِرّھا، جنگ چھڑ گئی۔

اور اسی سے اعشیٰ کا شعر ہے:

لیَعْتَوِرَنْكَ القولُ حتی تھِرّہٗ

علاوہ ازیں بھی قلیل حروف میں سے ہے۔

ابن جنی نے کہا ہے: پس عکرمہ کی قراءت صاد کے ضمہ کے ساتھ تو یہ را میں ضمہ، فتحہ اور کسرہ تینوں کا احتمال رکھتی ہے۔ (جیسے مد اور شد) کے را پر ضمہ اس کے بعد ہا پر ضمہ کی وجہ سے ہے۔

پانچویں قراءت فَصَرِّھِنَّ صاد کے فتحہ اور را مکسورہ کی شد کے ساتھ ہے۔ اسے مہدوی وغیرہ نے عکرمہ سے بیان کیا ہے، یہ بمعنی فاحبسھن (اور تو انہیں روک لے) ہے۔ یہ ان کے اس قول سے ہے: صَرّیٰ یُصَرِّی جب کوئی قید کر لے، روک لے۔ اور اسی سے الشاۃ المُصَرّاۃ ہے۔

اور یہاں ایک اعتراض ہے جسے ماوردی نے ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا آخرت کی نشانیوں کے بارے میں کیسے قبول کر لی گئی جبکہ موسیٰ علیہ السلام کی قبول نہیں کی گئی جو اس قول میں ہے: رَبِّ اَرِنِیۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَیۡكَ (الاعراف: 143) (اے میرے رب! مجھے دیکھنے کی قوت دے تاکہ میں تیری طرف دیکھ سکوں) تو ان سے دو جواب منقول ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ جو سوال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کیا تھا وہ مکلف باقی رہتے ہوئے صحیح نہیں ہے اور جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوال کیا تھا وہ خاص ہے اور اس کے ساتھ مکلف باقی رہنا صحیح ہے۔ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ احوال مختلف ہوتے ہیں پس بعض اوقات اصلح قبولیت ہوتی ہے اور بعض دوسرے اوقات میں اس بارے میں منع کرنا اور روکنا

اصلح ہوتا ہے جس میں پیشگی اذن نہ ہو۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس کے بارے حکم دیا تھا اس سے پہلے کہ آپ کی اولاد ہو اور اس سے پہلے کہ آپ پر وہ صحف نازل کرے۔ واللہ اعلم۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۭ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾

''مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں ایسی ہے جیسے ایک دانہ جو اگاتا ہے سات بالیں (اور) ہر بال میں سو دانہ ہو اور اللہ تعالیٰ (اس سے بھی) بڑھا دیتا ہے جس کے لئے چاہتا ہے اور اللہ وسیع بخشش والا جاننے والا ہے۔''

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ جب اللہ تعالیٰ نے وہ قصے بیان کر دیئے جن میں دلائل ہیں، تو اس نے جہاد پر برانگیختہ کیا اور تو جان لے کہ جس نے اس برہان اور دلیل کے بعد جہاد کیا جسے نبی کے بغیر کوئی نہیں لا سکتا تو اس کے لئے اس جہاد میں ثواب عظیم ہے۔

البستی نے اپنی صحیح مسند میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، انہوں نے بیان فرمایا: جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کی: ''اے رب! میری امت کے لئے اور اضافہ فرما۔'' تو پھر یہ آیت نازل ہوئی، مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً (البقرہ:245) (کون ہے جو دے اللہ تعالیٰ کو قرض حسن، تو بڑھا دے اللہ اس قرض کو اس کے لئے کئی گنا۔) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر عرض کی: ''اے میرے رب! میری امت کے لئے اور اضافہ فرما'' تو یہ آیت نازل ہوئی اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۱۰﴾ (الزمر)

اس آیت کے الفاظ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے شرف اور اس کے حسن کی مثال بیان کرنے کے لئے ہیں اور یہ اس پر انگیخت دلانے کو متضمن ہیں۔ اور کلام میں مضاف محذوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے: مثل نفقۃ الذین ینفقون اموالھم فی سبیل اللہ کمثل حبۃ۔ ان کے نفقہ کی مثال جو اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ایسی ہے جیسے ایک دانہ۔ اور دوسرا طریقہ یہ ہے: مثل الذین ینفقون اموالھم کمثل زارع زرع فی الأرض حبۃ فأنبتت الحبۃ سبع سنابل یعنی ان کی مثال جو اپنے مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس کسان کی مثل ہے جس نے زمین میں ایک دانہ کاشت کیا اور اس دانے نے سات بالیں اگائیں۔ یعنی سات بالیں نکالیں اور ہر بال میں سو دانہ ہو۔ پس صدقہ کرنے والے کو کاشت کرنے والے کے ساتھ تشبیہ دی اور صدقہ کو بیج کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ اسے ہر صدقہ کے عوض سات سو نیکیاں عطا فرمائے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ یعنی اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہتا ہے سات سو پر بڑھا دیتا ہے۔ پس صدقہ کرنے والے کی مثل کاشت کرنے والے کی مثل ہو جائے گی، (جیسا کہ) اگر وہ اپنے عمل میں حاذق (ماہر) ہو اور بیج عمدہ ہو، زمین آباد ہو تو پیداوار زیادہ ہو جاتی ہے۔ پس اسی طرح اگر صدقہ کرنے والا جب صالح ہو، مال طیب اور پاک ہو اور وہ اسے اپنے محل میں خرچ کرتا ہو تو ثواب بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ بخلاف اس کے جس نے کہا ہے: آیت میں سات

سو گنا پر زیادتی کا ذکر نہیں ہے، جیسا کہ ہم اسے بیان کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 2۔ روایت کی گئی ہے کہ یہ آیت حضرت عثمان بن عفان اور عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ وہ اس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب لوگوں کو صدقہ پر ابھارا جس وقت آپ نے غزوہ تبوک کی طرف نکلنے کا ارادہ کیا، تو حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ چار ہزار لے کر حاضر ہوئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس آٹھ ہزار تھے تو میں نے اپنے لئے اور اپنے اہل و عیال کے لئے چار ہزار رکھے ہیں اور چار ہزار میں نے اپنے رب کو بطور قرض پیش کر دیئے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بارك الله لك فيما امسكت و فيما أعطيت (اللہ تعالیٰ تجھے برکت عطا فرمائے اس میں بھی جو تو نے (گھر والوں کے لئے) روک لیا اور اس میں بھی جو تو نے پیش کر دیا) اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تیاری کا سامان میرے ذمہ ہے جس کے پاس تیاری کا سامان نہیں ہے، تو ان دونوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ آیت نفلی صدقہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور یہ قول بھی ہے: یہ آیت آیت زکوٰۃ نازل ہونے سے پہلے نازل ہوئی پھر آیت زکوٰۃ کے ساتھ یہ منسوخ ہو گئی اور نسخ کے دعویٰ کی کوئی حاجت نہیں، کیونکہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا مستحب ہے اور اللہ تعالیٰ کے راستے کثیر ہیں اور ان میں عظیم تر جہاد ہے تاکہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: كَمَثَلِ حَبَّةٍ اس میں الحبة اسم جنس ہے ہر اس شے کے لئے جسے انسان کاشت کرتا ہے اور اس سے خوراک حاصل کرتا ہے اور اس سے زیادہ مشہور گندم ہے اور اکثر حب سے مراد یہی لی جاتی ہے اور اسی معنی میں المتلمس کا قول ہے:

آليتُ حَبَّ العراقِ الدهرَ أطعمه والحَبُّ ياكُله فى القرية السُّوسُ

اور حبة القلب سے مراد دل کی سیاہی ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد ثمرة القلب (دوستی، الفت) ہے اور وہ وہی ہے۔ اور الحِبة حاء کے کسرہ کے ساتھ، اس سے مراد سبزیوں کا وہ بیج ہے جو خوراک (غذا) نہیں ہوتا اور حدیث شفاعت میں ہے: فينبتون كما تنبت الحِبة فى حِميل السَّيل (1) (پس وہ اس طرح اگ پڑیں گے جس طرح سیلاب کے لائے ہوئے کیچڑ میں بیج اگتے ہیں۔ اور جمع حِبب آتی ہے اور الحُبَّةُ (حاء کے ضمہ کے ساتھ) اس کا معنی حُب ہے۔ کہا جاتا ہے: نَعَمْ و حُبَّة و كرامة۔ (وہ محبت و کرامت کے اعتبار سے اچھا ہے۔) اور الحُب کا معنی محبت ہے اور اسی طرح الحِب (بالکسر) کا معنی بھی ہے اور الحِب سے مراد حبیب (گہرا دوست) بھی ہے۔ جیسے خِدْن اور خَدِيْنٌ (گہرا دوست) اور سُنبلة یہ فُنعلةٌ کے وزن پر أسبل الزرع سے ماخوذ ہے جب کھیتی میں بالیں ظاہر ہو جائیں یعنی وہ بالیں چھوڑ دے جس طرح پردے کو لٹکا کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے: اس میں چھپے ہوئے دانے ہیں جس طرح کہ کسی شے پر پردہ لٹکانے سے وہ چھپ جاتی

1۔ صحیح بخاری، باب تفاضل اهل الایمان فى الاعمال، حدیث نمبر 21، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے اور اس کی جمع سَنَابِلَ ہے، پھر کہا گیا ہے کہ اس سے مراد سنبل الدخن (باجرے یا کنگنی کی بال) ہے۔ وہی وہ شے ہے جس کی ایک بال میں اتنی تعداد میں دانے ہوتے ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے کیونکہ باجرے کی بالیں میں سے ایک بال میں اس تعداد سے دوگنا زیادہ بلکہ اس سے بھی زیادہ دانے ہوتے ہیں۔ ہم نے خود اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: گندم کی بالیں ایسی پائی جاتی ہیں جن میں سو دانے ہوتے ہیں۔ اور رہے تمام دانے تو وہ کہیں زیادہ ہوتے ہیں، لیکن مثال اس مقدار کے ساتھ بیان کی ہے۔ اور علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت میں کہا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی: فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ اس کا معنی ہے اگر وہ اسے پائے، ورنہ اس بنا پر کہ وہ اسے فرض کرے۔ پھر انہوں نے ضحاک سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا: اس کا معنی ہے ہر بال نے سو دانے اگائے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: علامہ طبری نے حضرت ضحاک کے قول کو اسی طرح رکھا ہے جیسے انہوں نے کہا ہے اور یہ ضحاک کے قول سے لازم نہیں آتا اور ابو عمرو الدانی نے بیان کیا ہے کہ بعض نے مائۃ کو اس تقدیر پر منصوب پڑھا ہے۔ انبتت مائۃ حبۃ۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یعقوب حضرمی نے کہا ہے: اور بعض نے پڑھا ہے: فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ یہ اس بنا پر ہے کہ یہ انبتت مائۃ حبۃ ہے۔ اور اسی طرح بعض قراء نے پڑھا ہے: وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ اور یہ وَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ کی بنا پر ہے، یعنی واعتدنا للذین کفروا عذاب جھنم۔ (اور ہم نے جہنم کا عذاب تیار کیا ہے ان کے لئے جنہوں نے کفر کیا) اور ابو عمرو، حمزہ اور کسائی نے انبتت سَبْعَ سَنَابِلَ میں تا کو سین میں ادغام کر کے پڑھا ہے کیونکہ یہ دونوں حروف مہموسہ میں سے ہیں۔ کیا تم جانتے نہیں کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے پیچھے آتے ہیں اور ابو عمرو نے شعر بیان کیا ہے:

یا لعنَ اللہ بنی السِّعلاۃِ عمرو بنَ میمون لئام النات

مراد لوگ (الناس) لئے ہیں اور سین کو تا میں بدل دیا ہے اور باقی قراء نے اصل کی بنا پر دونوں کو ظاہر کر کے پڑھا ہے کیونکہ یہ دونوں دو کلمے ہیں۔

مسئلہ نمبر 4۔ قرآن کریم اس بارے میں وارد ہوا ہے کہ نیکی کے جملہ اعمال میں ایک نیکی کا بدلہ اس کی مثل دس کے ساتھ ہے اور یہ آیت تقاضا کرتی ہے کہ جہاد پر خرچ کرنے کی نیکی کا عوض سات سو گنا ہے اور علماء نے اس قول وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ کے معنی میں اختلاف کیا ہے۔ ایک گروہ نے کہا ہے کہ یہ سابقہ سات سو کے ذکر کے بیان اور تاکید کے لئے ہے۔ لہٰذا اس میں سات سو گنا سے بڑھانے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

اور علماء کے ایک گروہ نے کہا ہے: بلکہ یہ اس پر اطلاع دینا اور آگاہ کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہتا ہے اس کے لئے عوض سات سو گنا سے بھی زیادہ کر دیتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: آیت کی ابتدائی تفسیر میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی جو حدیث بیان کی گئی ہے اس کے مطابق یہ قول زیادہ صحیح ہے۔ اور ابن ماجہ نے روایت بیان کی ہے: حدثنا ھارون بن عبد اللہ الحمال حدثنا ابن ابی فدیک عن

الخلیل بن عبد اللہ عن الحسن عن علی بن ابی طالب و ابی الدرداء و عبد اللہ بن عمرو ابی امامہ الباھلی و عبد اللہ بن عمرو و جابر ابن عبد اللہ و عمران بن حصین یہ تمام کے تمام صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث بیان کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچہ بھیج دیا اور خود اپنے گھر میں ہی رہا تو اس کے لئے ایک درہم کے بدلے سات سو درہم ہیں۔ اور جو بذات خود بھی اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد میں شریک ہوا اور اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر خرچ کیا تو اس کیلئے ایک درہم کے بدلے سات لاکھ درہم ہوں گے، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی: وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنۡ يَّشَآءُ۔ (1)

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہتا ہے اس عوض کو بڑھاتے بڑھاتے بیس لاکھ تک کر دیتا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ روایت آپ سے ثابت الاسناد نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ زراعت کا پیشہ ان پیشوں میں سے اعلیٰ ترین پیشہ ہے جنہیں لوگ اختیار کرتے ہیں اور ان کمائیوں میں سے اعلیٰ ہے جن کے ساتھ کام کرنے والے (مزدور) مشغول ہوتے ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ مثال بیان فرمائی ہے اور ارشاد فرمایا ہے: مَثَلُ الَّذِيۡنَ يُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ الآیہ۔

اور صحیح مسلم میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت موجود ہے: ''جو مسلمان بھی کوئی درخت لگاتا ہے یا فصل کاشت کرتا ہے اور اس سے پرندے، انسان یا جانور کھاتے ہیں تو وہ اس کے لئے صدقہ ہے (2)۔'' اور ہشام بن عروہ نے اپنے باپ کے واسطہ سے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''زمین کی تہوں میں رزق تلاش کرو'' مراد زراعت ہے۔ اسے ترمذی نے بیان کیا ہے۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کے درخت کے بارے فرمایا ہے: ''یہ کیچڑ میں گڑھے ہوتے ہیں (اور) محلات میں خوراک باہم پہنچاتے ہیں'' یہ مدح کے محل میں بیان ہوا ہے۔

اور زراعت فروض کفایہ میں سے ہے اور امام وقت پر لازم ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو اس پر مجبور کرے اور اس پر جو اس کی مثل ہے مثلاً درخت لگانا وغیرہ۔ (یعنی باغبانی)

عبد اللہ بن عبد الملک نے حضرت ابن شہاب زہری رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی اور کہا: میری ایسے مال پر رہنمائی کیجئے جس کے لئے میں محنت و مشقت کروں۔

تو ابن شہاب رضی اللہ عنہ نے یہ اشعار کہے:

اقول لعبد اللہ یوم لقیتہ و قد شدّ أخلاس المطیّ مُشَرِّقًا
تتبّع خبایا الأرض وادع ملیکھا لعلّك یوما ان تُجاب فتُرزقا
فیؤتیك مالا واسعا ذا مَثَابة اذا ما میاہ الأرض غارت تدفّقا

1۔ سنن ترمذی، باب ماجاء فی النفقۃ فی الاھل، حدیث نمبر 1889۔ ابن ماجہ، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2749-2750، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب المزارعۃ، باب فضل الزرع، حدیث نمبر 2152، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور معتضد سے بیان کیا گیا ہے کہ اس نے کہا: میں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا۔ آپ مجھے بیلچہ (یا کدال) عطا فرما رہے ہیں اور آپ نے فرمایا: اسے پکڑ لو کیونکہ یہ زمین کے خزانوں کی چابیاں ہیں۔ (خذھا فانھا مفاتیح خزائن الأرض)

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّ لَاۤ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝۲۶۲

''جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں پھر جو خرچ کیا اس کے پیچھے نہ احسان جتاتے ہیں اور نہ دکھ دیتے ہیں، انہیں کے لئے ثواب ہے ان کا ان کے رب کے پاس نہ کوئی خوف ہے ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ کہا گیا ہے کہ یہ آیت حضرت عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ حضرت عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ جیش العسرہ (غزوہ تبوک) کی تیاری کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایک ہزار دینار لے کر حاضر ہوئے اور انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں ڈال دیا، تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، آپ نے اپنا دست مبارک ان میں داخل کرتے ہیں اور انہیں الٹ پلٹ کر رہے ہیں اور فرما رہے ہیں: ما ضر ابن عفان ما عمل بعد الیوم اللھم لا تنس ھذا الیوم لعثمان آج کے بعد ابن عفان نے جو عمل بھی کیا وہ ان کے لئے نقصان دہ نہیں۔ اے اللہ! تو آج کے دن عثمان کو نہ بھولنا۔'' اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لئے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے دیکھا ہے۔ آپ کہہ رہے تھے: یا رب عثمان انی رضیت عن عثمان فارض عنہ (اے عثمان کے رب! میں عثمان سے راضی ہوں تو بھی اس سے راضی رہ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل دعا مانگتے رہے یہاں تک کہ فجر طلوع ہوگئی۔ اور یہ آیت نازل ہوئی: اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّ لَاۤ اَذًى الآیہ(1)۔

مسئلہ نمبر 2۔ بالعموم اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کا ذکر جب پہلی آیت میں گزر چکا، تو اس آیت میں یہ بیان کیا کہ وہ حکم اور ثواب بلاشبہ اس کے لئے ہے جو خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتلاتا ہے اور نہ وہ دکھ دیتا ہے کیونکہ احسان جتلانا اور اذیت دینا یہ صدقہ کے ثواب کو باطل کر دیتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد والی آیت میں بیان کر دیا ہے۔ بلاشبہ آدمی پر یہ لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور منفق علیہ پر خرچ کرنے سے اللہ تعالیٰ سے ثواب کے حصول کا ارادہ کرے اور وہ منفق علیہ سے کسی شے کی امید نہ رکھے اور سوائے اپنے استحقاق کی رعایت کرنے کے اس کے احوال میں سے کسی حال پر نظر نہ رکھے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: لَا نُرِیْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّ لَا شُكُوْرًا ۝ (الدہر) (نہ ہم تم سے کسی اجر کے خواہاں ہیں اور نہ شکریہ کے)

1۔ اسباب النزول للواحدی، صفحہ 81

اور جب اس نے اس ارادے سے مال خرچ کیا کہ وہ کسی بھی وجہ سے متفق علیہ سے جزا حاصل کرے تو اس طرح اس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کا ارادہ نہ کیا اور یہ تب ہے جب اس کے اس گمان کے پیچھے خرچ کرنے سے مقصود احسان جتلانا اور اذیت پہنچانا ہو۔ اور اسی طرح جس نے کسی مضطر اور مجبور آدمی سے مشقت اور تکلیف دور کرنے کے لئے خرچ کیا یا تو اس پر احسان جتلانے کے لئے جس پر خرچ کیا گیا ہے یا مشقت کے کسی دوسرے قرینہ کے سبب اذیت پہنچانے کے لئے تو اس طرح اس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کا ارادہ نہیں کیا۔ بلاشبہ اس کا یہ عمل قبول کیا جائے گا جب اس کی یہ عطا اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ہو اور اس کا زیادہ سے زیادہ ارادہ اس (اجر و ثواب) کی خواہش ہو جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، جیسا کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے بیان کیا گیا ہے کہ ایک اعرابی آپ کے پاس آیا اور اس نے کہا:

يا عُمَر الخير جُزيت الجنه اُكْسُ بُنَيَّاتِي و اُمَّهُنَّه

اے عمر! بھلائی اور نیکی کیجیے آپ کو جنت کی جزا دی جائے میری بیٹیوں اور ان کی ماں کو لباس پہنایئے۔

و كُنْ لنا من الزمان جُنَّه أقسم بالله لتفعلَنَّه

تو ہمارے لئے (مصائب) زمانہ سے ڈھال بن جا۔ میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھاتا ہوں آپ ضرور ایسا کریں گے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر میں نہ کروں تو کیا ہوگا؟ اس نے عرض کی:

إذًا ابا حفص لأذهبَنّه

اے ابا حفص! تب میں چلا جاؤں گا۔

پھر آپ نے فرمایا: جب تو چلا گیا تو کیا ہوگا؟ اس نے عرض کی:

تكون عن حالى لَتُسْأَلَنّه يوم تكون الأعطيات هَنّه

میرے حال کے بارے میں تم سے سوال کیا جائے گا جس دن عطیات کی آرزو ہوگی۔

و مَوقِفُ المسئول بَيْنَهُنَّهْ امّا الى نارٍ واما جَنّه

اور ان کے درمیان مسئول کا موقف (ٹھہرنے کی جگہ) یا جہنم ہوگی یا جنت۔

پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ رونے لگے یہاں تک کہ آپ کی ریش مبارک تر ہوگئی۔ پھر آپ نے فرمایا: اے غلام! اس دن کے لئے اسے میری یہ قمیص دے دو نہ کہ اس کے شعر کے لئے۔ قسم بخدا! میں اس کے سوا کسی کا مالک نہیں ہوں۔ ماوردی نے کہا ہے: جب عطا اس ارادہ پر ہو کہ وہ جزا اور شکر کی طلب سے خالی ہو اور احسان جتلانے اور شہرت سے بھی پاک ہو تو وہ خرچ کرنے والے کے لئے انتہائی اشرف و اعلیٰ ہے اور قبول کرنے والے کے لئے باعث مبارک ہے، لیکن جب عطا کرنے والا اپنی عطا سے جزا کا خواہشمند ہو اور اس کے عوض شکر اور ثنا کا طالب ہو تو وہ شہرت کا طالب اور ریاکاری کرنے والا ہے۔ اور ان دونوں میں ایسی ذم اور برائی ہے جو سخاوت کے منافی ہوتی ہے اور اگر اس نے جزا کا مطالبہ کیا تو وہ ایسا نفع کمانے والا تاجر ہے جو حمد اور مدح کا مستحق نہیں ہوتا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس قول باری تعالیٰ میں کہا ہے: وَ لَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝

(المدثر) یعنی آپ کسی کو ایسا عطیہ نہ دیں کہ آپ اس کے عوض اس سے افضل واعلیٰ کی خواہش رکھتے ہوں۔

اور ابن زید نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں ہے جو خود جہاد میں نہیں نکلتے بلکہ وہ خرچ کرتے ہیں اس حال میں کہ خود بیٹھے ہوتے ہیں اور اس سے پہلی آیت ان کے بارے میں ہے جو بنفس نفیس جہاد کے لئے نکلتے ہیں۔ فرمایا: اسی لئے ان پر شرط لگائی گئی ہے اور پہلوں پر کوئی شرط نہیں۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول محل نظر ہے، کیونکہ اس میں اپنی رائے سے فیصلہ دینے کا اظہار ہو رہا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: مَنًّا وَّلَاۤ اَذًى، المن کسی نعمت واحسان کا ذکر کرنا ہے اس کو شمار کرنے اور گننے کے لئے اور اس کے سبب (دوسرے کو) پریشان کرنے کے لئے۔ مثلاً وہ یہ کہے: قد احسنت الیك و نعشتك میں نے تجھ پر احسان کیا اور تجھے ہلاک ہونے سے بچالیا۔ اور اسی کے مشابہ اور الفاظ۔

اور بعض نے کہا ہے: المن کا مفہوم ہے اس کے بارے میں گفتگو کرنا جو اس نے دیا یہاں تک کہ وہ گفتگو اس تک پہنچ جائے جسے دیا گیا اور وہ اس کے لئے باعث تکلیف ہو اور احسان جتلانا کبیرہ گناہوں میں سے ہے اور یہ صحیح مسلم وغیرہ میں ثابت ہے (1)۔ اور یہ بھی ان تین میں سے ایک ہے جن کی طرف اللہ تعالیٰ نظر رحمت نہیں فرمائے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔

اور نسائی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تین آدمی ہیں جن کی طرف اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نظر رحمت نہیں فرمائے گا: اپنے والدین کی نافرمانی کرنے والا، مرد کی طرح بننے والی عورت جو کہ مردوں کے ساتھ مشابہت اختیار کرتی ہو اور دیوث (بے غیرت انسان۔) اور تین ہیں جو جنت میں داخل نہیں ہوں گے: اپنے والدین کا نافرمان، ہمیشہ شراب پینے والا اور اس کے ساتھ احسان جتلانے والا جو کسی کو عطا کرے (2)۔'' اور مسلم کی بعض اسناد میں ہے: المنان (احسان جتلانے والا) وہ ہے جو کسی کو بغیر احسان جتلائے کوئی شے نہیں دیتا۔'' اور الاذی سے مراد گالیاں دینا اور شکایت کرنا ہے اور یہ مَن سے اعم ہے۔ کیونکہ مَنّ، الاذی کا جز ہے لیکن اس کے کثیر الوقوع ہونے کے سبب اس پر نص وارد ہے۔

اور ابن زید نے کہا ہے: اگر تجھے گمان ہو کہ تیرا سلام اس پر ثقیل اور گراں ہوگا جس پر تو نے اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر کچھ خرچ کیا ہے تو تو اس پر سلام نہ کر اور آپ کو ایک عورت نے کہا: اے ابو اسامہ! میری ایسے آدمی پر رہنمائی کیجئے جو خالصتاً اللہ تعالیٰ کی راہ میں نکلتا ہے کیونکہ وہ تو نکلتے ہیں (اور) وہ پھل کھاتے ہیں بلاشبہ میرے پاس تیر اور ترکش ہیں۔ تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تیروں اور تیرے ترکش میں تیرے لئے برکت نہ رکھے تحقیق تو نے انہیں دینے سے پہلے انہیں اذیت اور تکلیف دی ہے۔

ہمارے علماء رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: جس نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا اور اس کے پیچھے نہ احسان جتلایا اور نہ دکھ پہنچایا جیسا کہ اس کا یہ قول: تیرا اصرار اور تیری احتیاج کتنی شدید تھی! تیری جانب سے اللہ تعالیٰ ہمیں اخلاص عطا فرمائے۔ اور اسی

1۔ سنن ابی داؤد، باب ماجاء فی اسبال الازار، حدیث نمبر 3565، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ مسند امام احمد، حدیث 6180

طرح کی دیگر مثالیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے اجر کی ضمانت دی ہے اور وہ اجر جنت ہے اور اس کی موت کے بعد مستقبل کے لئے اس سے خوف کی نفی کر دی اور اس حزن اور غم کی نفی کر دی جو اسے اس پر ہوا جو دنیا میں سے گزر چکا ہے کیونکہ وہ تو اپنی آخرت کے ساتھ خوش اور مسرور ہوتا ہے۔ سو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے یہ فضل وشرف کافی ہے۔ اور اس میں ان کے لئے دلیل ہے جنہوں نے غنی کو فقیر پر فضیلت دی ہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ۗ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾

''اچھی بات کرنا اور (غلطی) معاف کر دینا بہتر ہے اس صدقہ سے جس کے پیچھے دکھ پہنچایا جائے اور اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے بڑے حلم والا ہے۔''

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ۔ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے، یعنی قول معروف أولی و أمثل (اچھی بات کرنا اولیٰ اور عمدہ ہے) اس کا ذکر نحاس اور مہدوی نے کیا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ خبر ہو اور مبتدا محذوف ہو۔ یعنی الذی أمرتم بہ قولٌ معروف۔ (وہ جس کا تمہیں حکم دیا گیا ہے وہ اچھی بات کرنا ہے) اور قول معروف سے مراد دعا کرنا، انس اور غمخواری کا اظہار کرنا اور جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اس کی آرزو کرنا ہے، یہ صدقہ سے بہتر ہے، کیونکہ یہ ظاہر میں صدقہ ہے اور اپنے باطن میں کوئی شی نہیں ہے اور قول معروف کے ذکر میں اجر ہے اور ایسے صدقہ میں کوئی اجر نہیں ہے۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پاکیزہ کلمہ صدقہ ہے (1) اور بلاشبہ تیرا اپنے بھائی کو خندہ پیشانی سے ملنا بھی نیکی میں سے ہے۔'' اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

پس چاہیے کہ آدمی سائل کو خوشی سے اور مرحبا کہتے ہوئے ملے اور کشادہ روئی اور انتہائی قرب اور فرحت کے ساتھ اس کا سامنا کرے، تاکہ وہ مشکور ہو اگر کچھ عطا کرے اور معذور ہو اگر کچھ نہ دے۔ اور بعض حکماء نے کہا ہے: تو حاجتمند کے ساتھ خندہ پیشانی اور خوش روئی سے ملاقات کر۔ پس اگر تو اس کے شکر سے محروم رہا تو اس کے عذر سے محروم نہ رہے۔

اور ابن لنکک نے کہا ہے کہ ابوبکر بن درید نے ایک حاجت کے بارے میں کسی وزیر کا قصیدہ لکھا جس نے اسے پورا نہ کیا اور اس کے لئے اس کی جانب سے تنگی کا اظہار ہوا تو اس نے کہا:

لا تدخلنك ضجرة من سائل   فلَخيرُ دهرِك أن تُرى مسئولا

کسی سائل سے کوئی تنگی تجھ میں نہ آنے پائے۔ پس تیرے زمانے کی خیر اور بھلائی اس میں ہے کہ تیرے سامنے دست سوال دراز کیا جاتا رہے۔

لا تَجْبَهَن بالردِ وجه مُؤمِّلٍ   فبقاءُ عِزِّك أن تُرى مأمولا

1۔ صحیح بخاری، باب من اخذ بالرکاب، حدیث نمبر 2767، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تو کسی آرزومند کی حاجت لوٹا کر اس کے چہرے پر نہ مار۔ پس تیری عزت کی بقا اس میں ہے کہ تجھ سے آرزو اور امید وابستہ کی جاتی رہے۔

تلقَی الکریمَ فتستدلّ ببِشرِہٖ ۔۔۔ و تَری العُبُوس علیٰ اللّئیم دَلیلا

تو کسی کریم اور سخی سے ملے تو تیرے لئے اس کی دلیل اس کی خندہ پیشانی ہے اور لئیم کی دلیل اس کے چہرے کی یبوست اور تیوری چڑھانا ہے۔

وَاعلَمْ بأنّك عن قليل صائرٌ ۔۔۔ خبرا فكُن خبراً يَروق جميلا

تو اس کے بارے میں جان کہ تو قلیل کی طرف سے خبر دینے والا ہے۔ پس تو ایسی خبر بن جا جو حسن و جمال کے اعتبار سے خوش کرنے والی ہو۔

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب سائل سوال کرے تو تم اس پر اس کا سوال کاٹ نہ دو یہاں تک کہ وہ اس سے فارغ ہو جائے، پھر بڑے وقار اور نرمی کے ساتھ یا تھوڑے سے بدل کے ساتھ یا حسین انداز میں رد کے ساتھ اس پر جواب لوٹاؤ۔ تحقیق تمہارے پاس وہ آتے ہیں جو نہ انسانوں میں سے ہیں اور نہ جنات میں سے ہیں، وہ اس بارے میں تمہارے احسانات کو دیکھتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا فرمائے ہیں۔''

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس کی دلیل ابرص (برص کا مریض) اَقرع (گنجا) اور اعمیٰ (اندھا) والی حدیث ہے(1)، اسے مسلم وغیرہ نے بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک فرشتے نے مختلف صورتیں اختیار کیں۔ ایک بار برص کے مریض کی، دوسری بار گنجے آدمی کی اور تیسری بار اندھے آدمی کی مسئول (جس سے سوال کیا جائے) کا امتحان لینے کے لئے۔

اور حضرت بشر بن حارث نے کہا ہے: میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا اور عرض کی: اے امیر المؤمنین! مجھے کوئی ایسی شے بتائیے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ مجھے نفع عطا فرمائے، تو انہوں نے فرمایا: اغنیاء کا فقراء پر اللہ تعالیٰ سے ثواب کی رغبت اور آرزو رکھتے ہوئے لطف و مہربانی کرنا بہت اچھا ہے اور اس سے اچھا فقراء کا اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر اعتماد اور یقین کرتے ہوئے اغنیاء پر سرگشتہ پھرنا ہے، پھر میں نے کہا: اے امیر المؤمنین! کچھ اضافہ فرمائیے تو آپ نے پیٹھ پھیری اور آپ یہ کہنے لگے:

قد كنتَ ميتا فصرتَ حيّا ۔۔۔ وعن قليل تصير ميتاً

تحقیق تو مردہ تھا اور تو زندہ ہو گیا اور پھر قلیل کے سبب تو مردہ ہو جائے گا۔

فاخرب بدار الفناء بيتا ۔۔۔ و ابن بدار البقاء بيتا

پس تو دار الفنا (دنیا) میں گھر گرا دے اور دار البقاء (آخرت) میں گھر بنا لے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَّمَغْفِرَةٌ۔ یہاں مغفرت سے مراد محتاج کی بری حالت اور خصلت کو چھپانا ہے۔ اور اسی

1۔ صحیح بخاری، باب ما ذکر عن بنی اسرائیل، حدیث نمبر 3205، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سے اعرابی کا قول ہے تحقیق اس نے فصیح کلام کے ساتھ ایک قوم سے سوال کیا تو کہنے والے نے اسے کہا: تو کس (خاندان کا) آدمی ہے؟ تو اس نے اسے کہا: اللہ تعالیٰ مغفرت کرے! بری کمائی نسب ظاہر کرنے سے مانع ہوتی ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے: سائل کو معاف کر دینا جب وہ اصرار کرے، اکھڑپن اور خشکی کا مظاہرہ کرے اس پر ایسا صدقہ کرنے سے بہتر ہے جس کے ساتھ وہ احسان جتلائے اور اسے دکھ پہنچائے۔

نقاش نے یہ معنی بیان کیا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ مشکل ہے اعراب (ترکیب) اس کی وضاحت کرے گا۔ وَ مَغْفِرَةٌ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور اس کی خبر خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ ہے اور معنی اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ اور وہ فعل جو مغفرت تک پہنچا دیتا ہے وہ اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ پہنچانا ہو۔ اور عربی میں تقدیر عبارت یہ ہے: و فعل مغفرۃ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ تیرے اس قول کی مثل ہو: تفضُّلُ اللہ علیك اکبر من الصدقة التی تَمُنُّ بھا (تجھ پر اللہ تعالیٰ کا فضل اس صدقہ سے بڑا ہے جس کے ساتھ تو احسان جتلاتا ہے) یعنی اللہ تعالیٰ کی مغفرت تمہارے اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے ساتھ تم احسان جتلاتے ہو۔ (ای غفران اللہ خیر من صدقتکم هذه التی تَمُنُّوْنَ بھا)

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے غنائے مطلق کی خبر دی ہے کہ وہ بندوں کے صدقہ سے مستغنی ہے اور اس کا حکم صرف اس لئے دیا ہے تا کہ وہ انہیں ثواب عطا کرے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے حلم کے بارے خبر دی ہے کہ وہ اسے سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا جو احسان جتلائے اپنے صدقہ کے ساتھ اور دکھ پہنچائے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰي شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶۴﴾

''اے ایمان والو! مت ضائع کرو اپنے صدقوں کو احسان جتلا کر اور دکھ پہنچا کر اس آدمی کی طرح جو خرچ کرتا ہے اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لئے اور یقین نہیں رکھتا اللہ پر اور دن قیامت پر۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی چکنی چٹان ہو جس پر مٹی پڑی ہو پھر برسے اس پر زور کی بارش اور چھوڑ جائے اسے چٹیل صاف پتھر۔ (ریاکار) حاصل نہ کر سکیں گے کچھ بھی اس سے جو انہوں نے کمایا اور اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا کفر اختیار کرنے والوں کو۔''

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى۔ ان کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عدم قبول اور ثواب سے محروم ہونے کو ابطال سے تعبیر کیا ہے اور مراد وہ صدقہ ہے جس کے ساتھ وہ احسان جتلاتا ہے اور دکھ پہنچاتا ہے، جو اس کے سوا ہو وہ مراد نہیں۔ اور عقیدہ یہ ہے کہ گناہ (سیئات) نیکیوں (حسنات) کو نہ باطل کرتے ہیں اور نہ ہی انہیں بالکل بے کار بنا دیتے

ہیں۔ پس صدقہ میں احسان جتلانا اور دکھ پہنچانا بھی اس صدقہ کے سوا کسی صدقہ کو باطل نہیں کرتا۔

جمہور علماء نے اس آیت میں کہا ہے: بے شک وہ صدقہ جس کے دینے والے کے بارے میں اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ احسان جتلائے گا یا اس کے سبب دکھ پہنچائے گا تو وہ قبول نہیں کیا جاتا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلکہ کبھی اس پر بطور اَمارہ فرشتہ کو مقرر کر دیتا ہے اور وہ اسے لکھتا ہی نہیں۔ اور یہ قول حسن اور اچھا ہے۔ اور عرب اس کے بارے کہتے ہیں جس کے ساتھ احسان جتلایا جاتا ہے: یَدٌ سوداء (سیاہ ہاتھ (یعنی ایسی نعمت جس کو ضائع کر دیا گیا) اور جو کسی کو بغیر سوال کے عطا کرتا ہے اسے یَدٌ بیضاء (روشن ہاتھ) کہتے ہیں اور جو سوال کرنے پر عطا کرتا ہے اسے یَدٌ خضراء (سبز ہاتھ) کہتے ہیں۔ اور بعض بلغاء نے کہا ہے: جس نے اپنی نیکی کے ساتھ احسان جتلایا اس کا شکر ساقط ہو گیا۔ اور جس نے اپنے عمل کے ساتھ تکبر کیا اس کا اجر ضائع ہو گیا اور بعض شعراء نے کہا ہے:

و صاحب سلفتْ منه الیّ ید أبطا علیه مُکافاتي فعاداني

میرا وہ ساتھی جس کی طرف سے مجھ پر پہلے احسان ہوتا رہا ہے اس پر میری طرف سے بدلہ موخر ہوا تو اس نے میرے ساتھ عداوت اختیار کر لی۔

لما تیقن ان الدھر حاربني أبدَی الندامة فیما کان أولاني

جب یقین ہو گیا کہ زمانے نے مجھ سے جنگ شروع کر دی ہے تو جو شے میرے قریب آئی اسی میں اس نے ندامت ظاہر کر دی۔

اور ایک دوسرے شاعر نے کہا:

أفسدتَ بالمنّ ما اسدیت من حَسَن لیس الکریم اذا اسدی بمنّان

تو نے احسان جتلانے کے ساتھ اس نیکی کو ضائع کر دیا جس کا تو نے احسان کیا اور کریم (سخی آدمی) جب احسان کرتا ہے تو وہ احسان نہیں جتلاتا۔

اور ابو بکر وراق نے کہا اور خوب اچھا کہا:

أحسن من کل حَسَنٍ فی کل وقت و زَمَنٍ

ہر اچھائی اور نیکی سے بڑھ کر اچھائی ہر وقت اور ہر زمانے میں

صنیعةٌ مَرْبُوبَةٌ خالیة من المنن

وہ احسان ہے جو بڑھایا جائے درآنحالیکہ وہ احسان جتلانے سے خالی ہو۔

ابن سیرین نے ایک آدمی کو سنا وہ دوسرے کو کہہ رہا ہے: فعلتُ الیك و فعلت (میں نے تیرے ساتھ ایسا کیا اور ایسا کیا) تو آپ نے اسے کہا: تو خاموش رہ نیکی کو جب شمار کر لیا جائے تو پھر اس میں کوئی خیر اور بھلائی نہیں ہے۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایاکم و الامتنان بالمعروف فانه یبطل الشکر و یمحق الأجر تم نیکی کے ساتھ احسان جتلانے سے بچو کیونکہ یہ شکر کو باطل کر دیتا ہے اور اُجر کو مٹا ڈالتا ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت

فرمائی لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰى الآیۃ۔

مسئلہ نمبر 2۔ ہمارے علماء رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: اس آیت کی وجہ سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مکروہ قرار دیا ہے کہ آدمی اپنا واجب صدقہ اپنے اقارب کو دے تا کہ وہ ان سے تعریف وثنا کی صورت میں عوض کا طالب نہ ہو۔ وہ ان پر اپنے احسان کا اظہار کرے گا اور وہ اسے اس پر بدلہ اور عوض دینے کی کوشش میں ہوں گے۔ نتیجتاً وہ صدقہ خالصۃ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے نہ ہو گا۔ اور مستحب یہ ہے کہ وہ صدقہ اجنبی لوگوں کو دے۔ اور یہ بھی مستحب ہے کہ وہ کسی غیر کو اس کی تقسیم پر مقرر کرے جبکہ امام وقت عادل نہ ہو، تا کہ احسان جتلانے اور دکھ پہنچانے کے ساتھ یا جس کو دیا گیا ہے اس کی طرف سے شکر، تعریف یا خدمت کی صورت میں عوض دینے کے سبب وہ ضائع نہ ہو جائے۔ اور یہ اس نفلی صدقہ کے خلاف ہے جو سرًّا دیا جاتا ہے کیونکہ اس کا ثواب جب ضائع ہو جائے تو وہ وعید سے محفوظ رہتا ہے اور وہ ایسے آدمی کے حکم پر ہو جاتا ہے جس نے وہ کام نہیں کیا لیکن واجب صدقہ کا جب ثواب ضائع ہو جائے تو اس کی طرف وعید متوجہ ہو جاتی ہے کیونکہ وہ اس کے حکم میں ہو چکا ہے جس نے وہ ادا ہی نہیں کیا۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ۔ یہاں کاف محل نصب میں ہے۔ ای ابطال كَالَّذِيْ اور یہ مصدر محذوف کی صفت ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ حال کے محل میں ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی مثال بیان فرمائی ہے جو احسان جتلاتا ہے اپنے صدقہ کے ساتھ اور دکھ پہنچاتا ہے اس آدمی کے ساتھ جو اپنا مال خرچ کرتا ہے لوگوں کو دکھانے کے لئے نہ کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اور اس کافر کے ساتھ جو مال خرچ کرتا ہے تا کہ اسے سخی کہا جائے اور طرح طرح سے اس کی تعریف کی جائے۔ پھر اس خرچ کرنے والے کی مثال بیان فرمائی ایسی چٹان کے ساتھ جس پر مٹی پڑی ہوئی ہو اور گمان کرنے والا اسے اچھی اگانے والی زمین گمان کر رہا ہو اور جب اس پر موسلا دھار بارش پڑے تو وہ اس سے ساری مٹی بہا کر لے جائے اور وہ صاف چٹیل پتھر باقی رہ جائے۔ پس یہ ریاکاری کرنے والا بھی اسی طرح ہے۔

پس احسان جتلانا، دکھ پہنچانا اور ریاکاری آخرت میں نیت کو ظاہر کر دیں گے اور صدقہ باطل ہو جائے گا جیسا کہ موسلا دھار بارش چٹان کو ظاہر کر دیتی ہے۔ صفوان سے مراد وہ بڑا پتھر ہے جو چکنا ہو۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آیت سے مراد فضل (اضافی ثواب) کو باطل کرنا ہے نفس ثواب کو باطل کرنا نہیں۔ اپنے نفقہ سے ریاکاری کا ارادہ کرنے والا نہ کہ ثواب کا وہ کافر کی طرح ہے، کیونکہ اس نے اس سے اللہ تعالیٰ کی رضا کا قصد نہیں کیا کہ وہ ثواب کا مستحق ہو۔ اور یہ اس احسان جتلانے والے اور دکھ پہنچانے والے کے خلاف ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کا قصد کرتا ہے وہ اس کے ثواب کا مستحق ہو گا اگرچہ اس نے بار بار کسی کو عطا کیا اور اس نے اس کے فضل اور زیادتی کو باطل کر دیا۔

اور یہ قول بھی ہے کہ وہ اپنے احسان جتلانے اور اس کو دکھ پہنچانے کے وقت سے اپنے صدقہ کے ثواب سے محروم ہوتا ہے اور جو اس سے پہلے ہے وہ اس کے لئے لکھ دیا جاتا ہے اور اسے بڑھایا جاتا ہے اور جب وہ احسان جتلاتا ہے اور دکھ پہنچاتا ہے تو اس کی تضعیف (کئی گناہ زیادتی) منقطع ہو جاتی ہے کیونکہ صدقہ دینے والے کے لئے صدقہ بالتدریج بڑھایا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ بہت بڑے پہاڑ کی مثل ہو جاتا ہے اور جب وہ اپنے مالک کے ہاتھ سے خالصۃ علیٰ وجہ المشروع نکلے تو وہ کئی گنا بڑھ

دیا جاتا ہے اور جب اس کے ساتھ احسان جتلانا اور اذیت پہنچانا شامل ہو جائے تو اس کے سبب ذہ وہیں رک جاتا ہے اور اس سے تضعیف کی زیادتی منقطع ہو جاتی ہے۔ پہلا قول اظہر ہے۔ واللہ اعلم

صَفْوَانٍ جمع ہے اور اس کی واحد صَفْوَانَۃ ہے۔ اخفش نے یہی کہا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: صفوان واحد ہے جیسا کہ حجر اور کسائی نے کہا ہے: صَفْوان واحد ہے اور اس کی جمع صِفْوان، صُفِیّ اور صِفِیّ ہے۔ مبرد نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا ہے: بلاشبہ صُفِیّ صَفَا کی جمع ہے جیسا کہ قفا کی جمع قُفِیّ ہے اور اسی معنی سے الصَّفْواء اور الصَّفَا ہیں۔ یہ پہلے گزر چکا ہے اور حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ اور زہری نے صَفَوَان فاء کو متحرک پڑھا ہے اور یہ ایک لغت ہے۔ اور قطرب نے صِفْوان بیان کیا ہے۔

نحاس نے کہا ہے: صَفْوان اور صَفَوان یہ بھی جائز ہے کہ یہ جمع ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ واحد ہو۔ مگر اولیٰ یہ ہے کہ یہ واحد ہو۔ اور دلیل یہ ارشاد گرامی ہے } عَلَیْہِ تُرَابٌ فَاَصَابَہٗ وَابِلٌ اگرچہ جمع کے لئے مذکر ضمیر لانا جائز ہوتا ہے مگر کوئی شے دلیل قاطع کے بغیر اپنے باب سے نہیں نکل سکتی۔ اور رہا وہ جو امام کسائی نے جمع کے بارے میں بیان کیا ہے تو وہ فی الحقیقت صحیح نہیں ہے۔ البتہ صِفْوان صَفا کی جمع ہے اور صفا بمعنی صَفْوان ہے۔ اور اس کی نظیر وَرَلٌ (گوہ کی مانند ایک جانور) اور وِرْلَانٌ، اَخٌ اور اخوان اور کَرٌ اور کِروان (بھورے رنگ اور لمبی چونچ کا ایک پرندہ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ رات کو نہیں سوتا ہے۔) ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

لنا یوم و لِلکِروان یومٌ تطیر البائسات و لا نطیر

اور عربی میں کَرَوان کی جمع کِرْوان ضعیف ہے اور صُفِیّ اور صِفِیّ صَفا کی جمع بھی جیسا کہ عَصَا اور الوابل کا معنی ہے: شدید اور موسلا دھار بارش اور (کبھی کہا جاتا ہے) وَبَلَت السماء تَبِل (آسمان موسلا دھار برسا) اور الارض مَوْبُولَۃ (اور زمین خوب تر ہو گئی) اخفش نے کہا ہے اور اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَخْذًا وَّبِیْلًا یعنی ہم نے اسے انتہائی سختی کے ساتھ پکڑ لیا۔ اور ضرب وَبِیل (سخت مار) اور عذاب وبیل (شدید عذاب) اور الصَّلْد کا معنی ہے: چکنا پتھر۔ امام کسائی نے کہا ہے: صَلِدَ یَصْلَدُ صَلَدًا اس میں لام متحرک ہے فھو صَلْدٌ اس میں لام ساکن ہے۔ مراد ہر وہ شے ہے جو کسی شے کو نہ اگائے۔ اور اسی سے جَبِیْنٌ اَصْلَد (روشن پیشانی) ہے۔ اصمعی نے رؤبہ کے لئے شعر کہا ہے:

بَرَّاقُ أَصْلادِ الجَبِینِ الأَجْلَہ

نقاش نے کہا ہے: ہذیل کی لغت کے مطابق اصلد کا معنی اجرد (خالی ہونا) ہے۔

اور لَا یَقْدِرُوْنَ کا معنی ہے: ریاکار، کافر اور احسان جتلانے والا کچھ بھی حاصل نہ کر سکیں گے۔ عَلٰی شَیْءٍ یعنی اپنے خرچ کرنے سے کسی شے کے ثواب کا نفع اٹھانے پر (وہ قادر نہیں ہو سکیں گے) اور یہی ان کی کمائی ہے انہیں اس کی ضرورت اور حاجت ہونے کے وقت، کیونکہ یہ غیر اللہ کے لئے (صدقہ) تھا۔ اور نفقہ کو کسب سے تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ انہوں نے اس سے کسب (کمائی) کا ارادہ کیا ہے۔

اور کہا گیا ہے: یہ ریاکار کے لئے اس کا ثواب باطل کرنے کی مثال بیان کی گئی ہے اور احسان جتلانے والے اور اذیت

دینے والے کے لئے اس کی فضل و زیادتی کو باطل کرنے کی مثال ہے۔ اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

''اور مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی خوشنودیاں حاصل کرنے کے لئے اور اس لئے تاکہ پختہ ہو جائیں ان کے دل ان کی مثال اس باغ جیسی ہے جو ایک بلند زمین پر ہو، برسا ہو اس پر زور کا مینہ تو لایا ہو وہ باغ دوگنا پھل اور اگر نہ برسے اس پر بارش تو شبنم ہی کافی ہو جائے اور اللہ تعالیٰ جو تم کر رہے ہو سب دیکھ رہا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ۔ اس میں اِبْتِغَاءَ مفعول من اجلہ ہے۔ اور وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ اس پر معطوف ہے۔ اور مکی نے المشکل میں کہا ہے: یہ دونوں مفعول من اجلہ ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ مردود ہے اور تَثْبِيْتًا کو مفعول من اجلہ بنانا صحیح نہیں ہے، کیونکہ انفاق (خرچ کرنا) تثبیت (پختہ ہو جانا) کی وجہ سے نہیں ہے۔ اور ابْتِغَآءَ کو حال کے محل میں مصدر ہونے کی بنا پر نصب دی گئی ہے اور اس میں نصب مفعول من اجلہ کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن مصدر کی بنا پر نصب دینا اس وجہ سے درست ہے کہ اس پر تَثْبِيْتًا مصدر کا عطف ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس قوم کے صدقات کا حال بیان کیا جن کے صدقات کا خیر و بھلائی میں کوئی بڑا حصہ نہیں اور مومنین کو ان مواقع سے منع فرمایا جو من وجہ اس سے مشابہت رکھتے ہیں تو اس کے بعد اس آیت میں اس قوم کے نفقات کا ذکر فرما رہا ہے جنہوں نے اپنے صدقات کو پاک کیا کیونکہ وہ شریعت کے موافق اور اس کی طرز پر تھے۔

اور ابْتِغَآءَ کا معنی طلب ہے اور مَرْضَاتِ یہ رَضِيَ يَرْضٰى سے مصدر ہے۔ اور وَتَثْبِيْتًا کا معنی ہے کہ وہ پختہ ہو جائیں جہاں وہ اپنے صدقات کو رکھیں۔ یہ مجاہد اور حسن رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے۔ حسن نے کہا ہے: آدمی جب صدقہ کا قصد کرے تو وہ ثابت ہو جاتا ہے۔ پس اگر وہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے ہو تو وہ اسے ادا کر دے اور اگر اس میں شک کی آمیزش ہو جائے تو اسے روک لے۔

اور بعض نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تصدیق اور یقین کرتے ہوئے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے: اپنے دلوں میں ثواب کی نیت کرتے ہوئے۔ اور حضرات شعبی، سدی، قتادہ نے بھی، ابن زید اور ابو صالح رحمۃ اللہ علیہم وغیرہم نے کہا ہے: وَتَثْبِيْتًا کا معنی وَتَيَقُّنًا ہے یعنی کہ ان کے دلوں کو بصیرت حاصل ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں خرچ کرنے پر ان کے پختہ ہونے کا یہی مفہوم ہے۔ یہ تینوں اقوال حضرت حسن اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہما کے قول کی نسبت زیادہ صحیح اور درست ہیں، کیونکہ وہ معنی جسے ان دونوں نے اختیار کیا ہے اس کی عبارت میں وَتَثْبِيْتًا مصدر غیر مصدر پر محمول ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے اور یہ جائز نہیں ہوتا مگر مصدر کے

ذکر کے ساتھ اور فعل متقدم کی فصاحت و بیان کے ساتھ، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ اللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۝ (نوح) (اور اللہ نے تم کو زمین سے عجب طرح اگایا ہے) اور وَ تَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا ۝ (المزمل) (اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو رہو) لیکن جب فعل کے ساتھ وضاحت نہ ہو تو ایسا مصدر لانا جائز نہیں ہوتا جو اس کا ہم معنی نہ ہو۔ پھر تو کہے گا: میں اسے فلاں فلاں معنی پر محمول کرتا ہوں اس فعل کے لئے جن کا ذکر پہلے نہیں ہوا۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ کلام عرب کا وسیع راستہ ہے جس کے بارے تو نے جان لیا ہے۔

اور نحاس نے کہا ہے: اگر ایسا ہوتا جیسا کہ حضرت مجاہد نے کہا ہے تو پھر وَتَثْبِیْتًا تثبت سے ہوتا جیسا کہ تکرمت تکرما ہے۔ اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول کہ یہ اِحْتِسَابًا کے معنی میں ہے، یہ نہیں پہچانا جا سکتا مگر اس طرح کہ اس سے مراد یہ لیا جائے کہ ان دلوں نے احتساب کرتے ہوئے ان کی خوب چھان بین کی اور یہ بعید ہے اور حضرت شعبی کا قول اچھا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں خرچ کرنے پر اپنے دلوں کو پختہ رکھتے ہوئے۔ کہا جاتا ہے: ثَبَّتُّ فلانا فی هذا الامر میں نے فلاں کو اس کام میں پختہ کر دیا۔ یعنی میں نے اس کے عزم اور ارادہ کی تصحیح کی اور میں نے اس میں اس کی رائے کو قوی کر دیا، اثبتہ تثبیتا اور میں نے اسے بہت پختہ کر دیا۔ یعنی ان کے دل اللہ تعالیٰ کے وعدے کے ساتھ یقین رکھتے ہوئے اس میں بہت پختہ ہو گئے۔

اور بعض نے کہا ہے: وَّ تَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ یعنی وہ اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس پر پختہ کر دے گا ای و تثبیتا من انفسهم لثوابها۔ یعنی تاکہ اس کے ثواب کے بارے ان کے دل پختہ ہو جائیں بخلاف اس منافق کے جو ثواب کا گمان بھی نہیں رکھتا۔

قولہ تعالیٰ: كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اس میں جنة کا معنی باغ ہے اور یہ وہ قطعہ زمین ہوتا ہے جس میں درخت اگائے جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ اسے ڈھانپ لیتے ہیں۔ اور یہ لفظ جِنّ اور جنین سے ماخوذ ہے کیونکہ یہ چھپے ہوتے ہیں اور اس کی وضاحت پہلے ہو چکی ہے۔ اور رَبْوَةٍ کا معنی ہے: ایسی بلند جگہ جس میں بلندی تھوڑی ہو اور اغلباً اس کے ساتھ مٹی کی کثافت اور کثرت بھی ہو۔ اور جو زمین اس طرح ہوتی ہے اس کی پیداوار اور نباتات اچھی ہوتی ہے۔ اسی لئے خاص طور پر ربوۃ کا ذکر کیا گیا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: اور ریاض الحزن اس میں سے نہیں ہے جیسا کہ طبری نے گمان کیا ہے۔ بلکہ یہ وہ ریاض ہے جو نجد کی طرف منسوب ہے کیونکہ یہ تہامہ کے ریاض سے بہتر ہے اور نجد کی نباتات زیادہ معطر اور خوشبودار ہوتی ہیں۔ اور اس کی ہوا زیادہ ٹھنڈی اور راحت بخش ہوتی ہے اور نجد کو ہی حزن کہا جاتا ہے۔ اور تہامہ کی ہوا سوائے رات کے بہت کم صحتمند اور نفع بخش ہوتی ہے۔ اسی لئے ایک اعرابیہ عورت نے کہا ہے: زوجی کلیل تھامة (میرا خاوند تہامہ کی رات کی مثل ہے) (1) اور سدی نے کہا: بِرَبْوَةٍ بمعنی برباوۃ ہے یعنی زمین کا وہ حصہ جو پست ہو۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قَلَقَة (دشواری، پریشانی) سے عبارت ہے اور ربوۃ کا لفظ رَبَا یَرْبُو سے ماخوذ ہے جب وہ بڑھ جائے اس میں اضافہ ہو جائے۔

1۔ صحیح بخاری، باب حسن المعاشرة مع الاهل، حدیث نمبر 4790، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں (مفسر) کہتا ہوں: سدی کی عبارت کوئی شے نہیں ہے کیونکہ رَبَ وَکی بناء کا معنی کلام عرب میں زیادتی اور اضافہ کرنا ہے اور اسی سے الربو بلند نفس کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ رَبَایَرْبُوْ جب ربوٌ (زیادتی) اسے آلے اور ربا الفرس جب دوڑنے یا گھبراہٹ کے سبب گھوڑے کی سانس پھول جائے۔ اور فراء نے اس قول باری تعالیٰ میں کہا ہے: اَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً کہ یہ بمعنی زائدہ ہے۔ (یعنی اس نے انہیں سخت مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا) جیسے کہ تیرا یہ قول ہے: اَرْبَيْتُ جب تو اس سے زیادہ لے جو تو نے دیا ہو۔ اور رَبَوْتُ فی بنی فلان و رَبِيت ای نشأت فيهم۔ (میں نے ان میں نشوونما پائی) اور خلیل نے کہا ہے: الرَّبْوَۃُ بلند زمین جو اچھی ہو۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس زمین کو ذکر کے ساتھ خاص کیا ہے جس میں بلاد عرب میں عرف کے اعتبار سے پانی جاری نہیں ہوتا اور ان کے لئے اس کی مثال بیان فرمائی جسے وہ محسوس کر سکتے ہیں اور اس کا ادراک کر سکتے ہیں اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ربوۃٌ سے مراد وہ بلند جگہ ہے جس میں نہریں جاری نہیں ہو سکتیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَصَابَهَا وَابِلٌ آخر آیت تک اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس میں جاری پانی نہیں ہے اور نہ ہی اس زمین کی جنس کا ارادہ کیا ہے، جس میں نہریں جاری ہو سکتی ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ربوۃ ذات قرار و معین کا ذکر کیا ہے اور کلام عرب میں معروف یہ ہے کہ ربوۃ سے مراد وہ جگہ ہے جو اپنے آس پاس سے بلند ہو چاہے اس میں پانی جاری ہو یا نہ جاری ہو۔ اور اس میں پانچ لغات ہیں، رُبْوَۃٌ راء کے ضمہ کے ساتھ، ابن کثیر، حمزہ، کسائی، نافع اور ابو عمرو رحمۃ اللہ علیہم نے پڑھا ہے۔ اور رَبْوَۃٌ عاصم، ابن عامر اور حسن رحمۃ اللہ علیہم نے راء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور رِبْوَۃٌ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابو اسحاق سبیعی نے را کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور رَبَاوَۃٌ ابو جعفر اور ابو عبد الرحمن نے اس طرح پڑھا ہے۔ اور شاعر نے کہا ہے:

مَن مُنْزِلِي فی رَوْضة بِرَبَاوة　　بين النخيل الى بقيع الفَرْقَدِ؟

اور رِبَاوَۃٌ اشہب نے اسے را کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ فراء نے کہا ہے: اور کہا جاتا ہے: بِرَبَاوَۃ اور بِرِبَاوَۃ، اور یہ سب الرابیہ سے ہیں اور اس کا فعل رَبَايَرْبُوْ ہے۔

قولہ تعالیٰ: اَصَابَهَا اس میں ھا ضمیر کا مرجع ربوۃ ہے۔ وَابِلٌ اس کا معنی ہے: شدید بارش۔ شاعر نے کہا ہے:

ما رَوْضَةٌ من رِياض الحَزْن مُعْشِبَةٌ　　خضراء جَادَعليها وَابِلٌ هَطِلٌ

اس میں وابل ھَطِل موسلا دھار بارش کے معنی میں ہی مذکور ہے۔

فَاٰتَتْ، ای اعطت تو لایا ہو اُکُلَهَا ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ۔ مراد وہ پھل ہے جو کھایا جاتا ہے اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ (ابراہیم: 25)

ہر شے میں سے کھائی جانے والی شے کو اُکُل کہا جاتا ہے اور الاکلۃ سے مراد لقمہ ہے۔ اور اسی معنی میں حدیث طیبہ ہے: فان كان للطعام مشفوها قليلا فليضع في يده منه أكلة أو أكلتين (اگر کھانا بہت تھوڑا رہ جائے تو چاہیے کہ اپنے ہاتھ میں اس سے ایک یا دو لقمے رکھ لے۔) اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔(1)

1۔ صحیح بخاری، باب اذا اتاہ خادمہ بطعامہ، حدیث نمبر 2370، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور اس کی اضافت باغ کی طرف یہ اضافت اختصاص ہے۔ جیسا کہ سرج الفرس اور باب الدار میں اضافت اختصاص ہے ورنہ پھل اس میں سے نہیں ہے جسے باغ کہا جاتا ہے۔

نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے اُكُلَهَا ہمزہ کو ضمہ اور کاف کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اسی طرح ہر وہ جو مؤنث کی طرف مضاف ہو۔ اور ابو عمرو نے ان دونوں کا فرق بیان کیا ہے کہ جب اسے مذکر کی طرف مضاف کیا جائے مثلاً اُكُلُهٗ یا کسی بھی شے کی طرف مضاف نہ ہو مثلاً اُكُلٍ خَمْطٍ (سبا: 16) تو ابو عمرو نے اسے مثقل پڑھا ہے اور دوسرے دونوں نے مخفف پڑھا ہے۔

اور عاصم، ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے ان تمام صورتوں میں جو ہم نے ذکر کی ہیں اسے مثقل پڑھا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اُكْلٌ اور اُكُلٌ دونوں ہم معنی ہیں۔

ضِعْفَيْنِ یعنی وہ دوسری زمین کے مقابلہ میں دوگنا پھل لایا۔ اور بعض اہل علم نے کہا ہے کہ وہ سال میں دو بار پھل لایا۔ اور پہلا قول زیادہ ہے۔ یعنی اس نے اپنی پیداوار ایک سال میں دی جتنی پیداوار دوسری زمین دو سالوں میں دیتی ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَإِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس بلند زمین کی مدح کی تاکید کے لئے ہے۔ اس طرح کہ اگر اسے موسلا دھار بارش نہ بھی پہنچے تو اسے شبنم ہی کافی ہو جاتی ہے۔ اور یہی دوگنا پھل نکالنے میں شدید بارش کے قائم مقام ہو جاتی ہے اور یہ زمین کے زرخیز اور طیب ہونے کی وجہ سے ہے۔ مبرد وغیرہ نے کہا ہے: تقدیر کلام میں فطلٌ یکفیھا۔ (پس شبنم ہی اسے کافی ہو جائے) اور زجاج نے کہا ہے: فالذی یصیبھا طل (اور وہ جس پر شبنم برسے) اور طلّ سے مراد کمزور سی بارش ہے جس کے قطرے باریک اور بالکل خفیف سے ہوں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے یہی کہا ہے اور یہ اس کی مشہور لغت ہے۔

اور ایک قوم نے کہا ہے جن میں سے حضرت مجاہد ہیں کہ الطّل کا معنی شبنم ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ مجاز اور تشبیہ ہے۔ نحاس نے کہا ہے اور اہل لغت نے بیان کیا ہے: وَبَلَتْ اور اَوْبَلَت، طَلَّتْ اور أَطَلَّتْ۔ اور الصحاح میں ہے: الطلّ سے مراد انتہائی ضعیف اور کمزور بارش اور اس کی جمع الطِلال ہے۔ اسی سے آپ کہتے ہیں: طُلَّت الارض و اطلها الندی زمین پر شبنم پڑی فھی مَطْلولة۔

ماوردی نے کہا ہے: شبنم کی کھیتی بارش کی کھیتی سے دگنی ہوتی ہے اور پیداوار کے لحاظ سے کم ہوتی ہے اور اس میں ہے ...... اور اگرچہ پیداوار اور نفع کم ہے۔

بعض نے کہا ہے: آیت میں تقدیم و تاخیر ہے اور اس کا معنی ہے: کمثل جنة بربوة أصابھا و ابل فان لم یصبھا و ابل فطل فأتت اکلھا ضِعفین۔ یعنی باغ کے اوراق (پتے) سبز ہو گئے اور اس کا پھل دوگنا نکلا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پہلی تاویل زیادہ صحیح ہے اور تقدیم و تاخیر کی کوئی حاجت نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان مخلص بندوں کے خرچ کئے ہوئے مال کے بڑھنے کو جن کے صدقات کو اللہ تعالیٰ بڑھاتا رہتا ہے جیسا کہ گھوڑے اور اونٹ کے بچے کو بڑھانا وغیرہ ایسے باغ کے پودوں کے بڑھنے کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو بلند جگہ پر واقع ہو بخلاف اس چکنی چٹان کے جس کی مٹی بہہ گئی

اور وہ خالص پتھر باقی رہ گیا۔

اور مسلم وغیرہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی آدمی بھی جو اپنی پاکیزہ کمائی سے ایک کھجور صدقہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اپنے دست قدرت کے ساتھ لے لیتا ہے اور پھر اس کی نشوونما کرتا ہے جیسا کہ تم میں سے کوئی اپنے گھوڑے کے بچے اور اونٹ کے بچے کی پرورش کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ پہاڑ کی مثل یا اس سے بھی بڑی ہو جاتی ہے'' اسے مؤطا نے بھی روایت کیا ہے۔(1)

قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ یہ وعدہ اور وعید ہے۔ زہری نے یَعْمَلُوْنَ یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ گویا وہ اس سے تمام لوگ مراد لیتے ہیں یا پھر صرف خرچ کرنے والے مراد لیتے ہیں تو اس صورت میں یہ صرف وعدہ ہے۔

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَ اَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۶۶﴾

''کیا پسند کرتا ہے کوئی تم میں سے کہ ہو اس کا ایک باغ کھجوروں اور انگوروں کا بہتی ہوں اس کے نیچے ندیاں (کھجور اور انگور کے علاوہ) اس کے لئے اس میں ہر قسم کے اور پھل بھی ہوں اور آلیا ہو اسے بڑھاپے نے اور اس کی اولاد بھی کمزور ہو (تو کیا وہ پسند کرتا ہے کہ) پہنچے اس باغ کو بگولہ جس میں آگ ہو پھر وہ باغ جل بھن جائے۔ ایسے ہی کھول کر بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے (اپنی) آیتیں تاکہ تم غور و فکر کرو۔''

قولہ تعالیٰ: اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ الآیہ۔ طبری نے سدی سے بیان کیا ہے کہ یہ آیت ریا کے نفقہ کی دوسری مثال ہے اور آپ نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی روایت ہے، آپ نے بیان فرمایا: یہ مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے ریا کاروں کے اعمال کے بارے بیان فرمائی ہے جنہیں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ باطل کر دے گا جن کی طرف وہ زیادہ محتاج ہوگا، جیسا کہ اس آدمی کی مثال جس کا ایک باغ ہو اور اس کے بچے ہوں اور وہ اسے کوئی نفع اور فائدہ نہ دیں اور وہ بوڑھا ہو جائے اور باغ کو بگولہ آپہنچے یعنی ایسی تیز آندھی جس میں آگ ہو اور وہ جل جائے اور وہ اسے گم کر دے اس وقت جب وہ اس کا زیادہ محتاج ہوا۔ اور ابن زید سے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کا ارشاد پڑھا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى الآیہ (بقرہ: 264) پھر فرمایا: پھر اس بارے میں مثال بیان فرمائی اور فرمایا: اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ الآیہ۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ اس سے واضح اور زیادہ مبین ہے جسے طبری نے ترجیح دی ہے اور یہ آیت ریا کے نفقہ کی دوسری مثال نہیں ہے۔ یہی سیاق کلام کا تقاضا ہے۔ اور رہا وہ معنی جو اس سیاق کے سوا میں ہے تو وہ ہر منافق یا کافر کے حال کے مشابہ ہے جو ایک عمل کرتا ہے اور وہ گمان رکھتا ہے کہ وہ خوب اچھا کر رہا ہے اور جب وہ حاجت کے وقت وہاں آئے گا تو وہ کوئی شے نہ پائے گا۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، حدیث نمبر 1321، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہ مثال اس آدمی کی ہے جس نے غیر اللہ کے لیے عمل کیا چاہے وہ منافق ہو یا کافر ہو۔ جیسا کہ آگے آئے گا۔ مگر بخاری میں آپ سے اس کے خلاف ثابت ہے۔ امام بخاری نے حضرت عبید بن عمیر سے روایت بیان کی ہے (1)، انہوں نے بیان کیا کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کو ایک دن کہا: تم کیا رائے رکھتے ہو یہ آیت کس کے بارے میں نازل ہوئی اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ؟ انہوں نے جواب دیا: اللہ و رسولہ اعلم۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ غصے ہو گئے اور فرمایا: تم کہو: ہم جانتے ہیں یا ہم نہیں جانتے۔ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: اے امیر المومنین! میرے دل میں اس کے بارے ایک شے آ رہی ہے۔ آپ نے فرمایا: اے میرے بھتیجے! کہو اور اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھو، تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ ایک عمل کی مثال بیان کی گئی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: وہ کون سا عمل ہے؟ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: غنی اور سخی آدمی کے عمل کی جو وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و پیروی میں کرتا ہے پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ایک شیطان بھیج دیا اور اس نے گناہ کے عمل کیے یہاں تک کہ اس نے پہلے عمل کو جلا دیا (2) اور ایک روایت میں ہے: جب وہ بڑھاپے کی عمر کو پہنچ گیا اور اس کی موت قریب آ گئی تو بدبختی کے اعمال میں سے کسی عمل پر اس کا خاتمہ ہوا۔ پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس سے خوش ہوئے (اور اس رائے کو پسند فرمایا) اور ابن ابی ملیکہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اور فرمایا: یہ ایک مثال ہے جو ایسے انسان کی بیان کی گئی ہے جو عمل صالح کرتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنی آخری عمر کو پہنچتا ہے اور زیادہ اس کا محتاج ہوتا ہے تو اس وقت برائی اور گناہ کا عمل کر لیتا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ ایک نظر اور رائے ہے جس کے ساتھ آیت کو ہر اس شے پر محمول کیا جا سکتا ہے جو اس کے الفاظ کے تحت داخل ہو۔ اور اسی طرح مجاہد، قتادہ اور ربیع وغیرہم نے بیان کیا ہے۔ کھجور اور انگور کو ذکر کے ساتھ خاص کیا ہے کیونکہ ان دونوں کو تمام درختوں پر فضل و شرف حاصل ہے۔

اور حسن نے جنات جمع کے ساتھ قراءت کی ہے۔ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ یہ ماضی کا مستقبل پر عطف ہے اور وہ تَكُوْنَ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ يَوَدُّ ہے۔ اور کہا گیا ہے: تقدیر عبارت ہے: وقد اصابہ الکبر۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ معنی پر محمول ہے، کیونکہ معنی یہ ہے: اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ ان لو کانت لہ جنۃ۔ (کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اگر اس کا ایک باغ ہو۔) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ واؤ حالیہ ہے اور اسی طرح وَلَهٗ میں بھی ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَاَصَابَهَاۤ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ۔ حسن نے کہا ہے: اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ ایسی ہوا جس میں شدید سردی ہو۔ زجاج نے کہا ہے: لغت میں الاعصار سے مراد ایسی شدید اور سخت ہوا ہے جو زمین سے آسمان کی طرف عمود (خط عمودی) کی طرح چلتی ہے اور یہی وہ ہے جسے الزوبعہ کہا جاتا ہے۔

جوہری نے کہا ہے: الزوبعۃ جنات کے سرداروں میں سے ایک سردار ہے اور اسی سے الاعصار کا نام زوبعہ رکھا گیا

1۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، حدیث نمبر 4174، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ ایضاً

ہے۔ اور کہا جاتا ہے: اعصار زوبعہ اور یہ وہ ہوا ہے جو غبار اڑاتی ہے اور آسمان کی طرف بلند ہوتی ہے گویا وہ عمود ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے۔ الاعصار سے مراد وہ ہوا ہے جو بادلوں کو چلاتی ہے جن میں گرج اور چمک ہوتی ہے۔ اور مہدوی نے کہا: اس کو اعصار کہا گیا ہے کیونکہ یہ لپٹ جاتی ہے کپڑے کی طرح جب اسے نچوڑا جائے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول ضعیف ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: بلکہ یہ صحیح ہے، کیونکہ یہی محسوس مشاہدہ ہے کیونکہ یہ عمودی شکل میں لپٹے ہوئے اوپر چڑھتی ہے اور کہا گیا ہے: بلاشبہ ہوا کو اعصار کہا گیا ہے، کیونکہ یہ بادلوں کو نچوڑ دیتی ہے اور بادل مُعْصِرات کہلاتے ہیں یا تو اس لئے کہ یہ (بارش) اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ پس یہ عورتوں میں سے معصر کی طرح ہیں یا اس لئے کہ یہ ہواؤں کے سبب نچڑ جاتے ہیں۔

ابن سیدہ نے بیان کیا ہے کہ ایک قوم نے معصرات کی تفسیر ریاح (ہوائیں) سے کی ہے نہ کہ بادلوں سے۔

ابن زید نے کہا ہے کہ اعصار سے مراد سخت آندھی اور گرم ہوا ہے اور اسی طرح سدی نے بھی کہا ہے کہ اعصار سے مراد ہوا اور سخت گرم آگ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: ایسی ہوا جس میں شدید گرمی اور تپش ہو۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ سخت گرمی میں بھی ہوتی ہے اور سخت سردی میں بھی ہوتی ہے اور یہ سب جہنم کی گرمی اور اس کی سانس لینے سے ہوتی ہے۔ جیسا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اسے متضمن ہے: اِذَا اشتدّ الحرّ فأبردوا عن الصلواۃ فَإِنَّ شدّۃ الحرّ من فیح جھنم جب گرمی شدید ہو جائے تو نماز کو ٹھنڈا کرو کیونکہ گرمی کی شدت جہنم کی گرمی میں سے ہے۔ اوران النار اشتکت الی ربھا الحدیث (1)۔ (اور بے شک آگ نے اپنے رب کے پاس شکایت کی۔) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ سے مروی ہے، یہ ایک مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے کافروں اور منافقین کے لئے بیان فرمائی ہے، جیسا کہ اس آدمی کی حالت جس نے ایک باغ لگایا اور اس میں کثرت سے پھل اگائے پھر اسے بڑھاپا آ پہنچا اور اس کی اولاد بھی کمزور ہو اولاد سے مراد بچے، بچیاں اور غلام ہیں پس اس کا گزارا اور اس کی اولاد کا گزارا اسی باغ سے ہو، تو اللہ تعالیٰ اس باغ پر ایسی ہوا چلا دے جس میں آگ ہو اور وہ اسے جلا کر بھسم کر دے اور اس کے پاس کوئی اور قوت و طاقت نہ ہو کہ وہ دوبارہ اسے لگا سکے اور نہ ہی اس کے بیٹوں کے پاس خیر و نفع ہو کہ وہ اپنے باپ کی طرف رجوع کریں۔ اسی طرح کافر اور منافق ہے جب وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے پاس پیش ہوں گے تو اس کے لئے (بھاگنے کا) کوئی ذریعہ نہ ہوگا، اسے اٹھایا جائے گا اور وہ دوسری بار حاضر ہو جائے گا۔ جیسا کہ اس کے پاس کوئی قوت نہیں کہ وہ اپنا باغ دوسری بار لگا سکے۔ اور نہ اس کے پاس وہ ہے جس کا وہ اپنی کبرسنی کے وقت محتاج ہے اور اس کی اولاد کمزور ہے اور اس سے مستغنی ہے۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ اس سے مراد ہے تا کہ تم میری عظمت اور میری ربوبیت کی طرف رجوع کرو اور میرے سوا کسی کو دوست نہ بناؤ۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی کہا ہے: تا کہ تم دنیا کے زوال اور اس کی فنا اور آخرت کے آنے اور اس کی بقا میں غور و فکر کرو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ

1۔ صحیح بخاری، باب الابراد بالظھر فی شدۃ الحر، حدیث نمبر 502-504، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

الْاَرْضِ ۪ وَ لَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَ لَسْتُمْ بِاٰخِذِیْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِیْهِ ؕ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ ۝۲۶۷

''اے ایمان والو! خرچ کیا کرو عمدہ چیزوں سے جو تم نے کمائی ہیں اور اس سے جو نکالا ہے ہم نے تمہارے لئے زمین سے اور نہ ارادہ کرو ردی چیز کا اپنی کمائی سے کہ (تم اسے) خرچ کرو حالانکہ (اگر تمہیں کوئی ردی چیز دے تو) تم نہ لو اسے بجز اس کے کہ چشم پوشی کر لو اس میں اور (خوب) جان لو کہ اللہ تعالیٰ غنی ہے ہر تعریف کے لائق ہے۔''

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا۔ یہ خطاب حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام امت کو ہے اور یہاں انفاق سے جو معنی مراد ہے اس میں علماء کا اختلاف ہے۔

حضرت علی بن ابی طالب، عبیدہ سلمانی اور ابن سیرین رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: اس سے مراد وہ زکوٰۃ ہے جو فرض کی گئی ہے۔ اس میں عمدہ شے کی بجائے ردی اور گھٹیا چیز خرچ کرنے سے لوگوں کو منع کیا گیا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: حضرت براء بن عازب، حسن اور قتادہ رضی اللہ عنہم کے قول سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت نفلی صدقہ کے بارے میں ہے اور لوگوں پر مستحب قرار دیا گیا ہے کہ وہ نفلی صدقہ و خیرات نہ کریں مگر عمدہ اور جید چیز کے ساتھ۔ اور آیت دونوں وجہوں کو شامل ہے لیکن صاحب زکوٰۃ کا تعلق اس اعتبار سے ہے کہ اس آیت کے ساتھ زکوٰۃ کا حکم دیا گیا ہے اور امر وجوب پر دلالت کرتا ہے اور یہ کہ اسے ردی شے دینے سے منع کیا گیا ہے اور یہ فرض زکوٰۃ کے ساتھ مخصوص ہے اور رہا نفلی صدقہ تو جس طرح آدمی کے لئے نفلی صدقہ میں قلیل شے دینا جائز ہوتا ہے تو اسی طرح اس کے لئے کم درجے کی شے نفلی صدقہ میں دینا جائز ہوگا اور درہم کھجور سے بہتر اور اچھا ہے۔

اور ندب والوں نے اس طرح استدلال کیا ہے کہ اِفْعَلْ کا لفظ (مراد صیغہ امر ہے) ندب و استحباب کی صلاحیت رکھتا ہے جس طرح وہ فرض کی صلاحیت رکھتا ہے اور ردی اور گھٹیا شے دینے سے نفلی صدقہ میں بھی اسی طرح منع کیا گیا ہے جس طرح فرض میں اس سے منع کیا گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کسی کی نسبت زیادہ حق رکھتا ہے کہ اس کے لئے عمدہ اور اچھی شے دی جائے۔

اور حضرت براء رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ کسی آدمی نے ردی کھجوروں کا ایک خوشہ لٹکایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دیکھا تو فرمایا: بئسما علق کتنی ردی شے ہے جو اس نے لٹکائی ہے۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے(1)۔ عنقریب یہ مکمل روایت آئے گی۔ اس قول کی بنا پر امر ندب و استحباب پر دلالت کرتا ہے، لہٰذا انہوں نے مستحب قرار دیا کہ وہ نفلی صدقہ میں اچھی اور عمدہ شے کے سوا کوئی نہ دیں۔

اور جمہور متاولین نے کہا ہے: مِنْ طَیِّبٰتِ کا معنی ہے: عمدہ اور پسندیدہ شے میں سے جو تم نے کمائی ہیں۔ اور ابن زید نے

1۔ ابن ماجہ، باب النهى أن يخرج فى الصدقة شر ماله، حدیث نمبر 1811، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کہا ہے: حلال چیزوں میں سے جو تم نے کمائی ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ کسب (کمائی) وہ ہوتا ہے جو بدن کی مشقت اور محنت سے حاصل ہو۔ اور یہی اجرہ ہے اس کا حکم آگے آئے گا یا تجارت میں باہم گفتگو ہوتی ہے اور وہ بیع ہے اس کا بیان آگے آئے گا اور میراث اس میں داخل ہے کیونکہ غیر وارث نے اسے کمایا ہے، (حاصل کیا ہے)۔

حضرت سہل بن عبداللہ نے بیان کیا ہے کہ ابن مبارک سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جو کچھ کمانے کا ارادہ رکھتا ہو اور اپنی کمائی سے ارادہ اور نیت یہ کرتا ہو کہ وہ اس سے صلہ رحمی کرے گا، جہاد کرے گا اور وہ نیکی اور خیر کا کام کرنے لگتا ہے اور اس غرض سے کسب کی آفات اور مشقتوں میں داخل ہو جاتا ہے تو انہوں نے کہا: اگر اس کے پاس زندگی گزارنے کے لئے اتنی مقدار میں سامان اور قوت موجود ہو جس کے ساتھ وہ اپنے آپ کو لوگوں سے روک سکتا ہو (یعنی کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت اسے نہ پڑے) تو پھر اس کسب کو ترک کرنا افضل ہے، کیونکہ جب اس نے حلال طلب کیا اور حلال میں ہی خرچ کیا تو اس سے اس کی کمائی کے بارے اور اس کے خرچ کرنے کے بارے سوال کیا جائے گا اور اسے چھوڑنا زہد ہے کیونکہ زہد حلال چھوڑنے میں ہی ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: اس آیت کے مطابق والد کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی اولاد کی کمائی سے کھا سکتا ہے اور اس لئے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ''تمہاری اولاد تمہاری عمدہ اور اچھی کمائی میں سے ہے۔ پس تم اپنی اولاد کے اموال میں سے خوشی خوشی کھاؤ۔''(1)

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ یعنی نباتات، معادن اور رکاز (زمین میں قدرتی طور پر گڑی ہوئی دھاتیں) یہ تین ابواب ہیں۔ یہ آیت ان تینوں کو متضمن ہے۔

پس رہی نباتات، دارقطنی نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: رسول اللہ ﷺ سے سنت جاریہ یہ ہے'' کہ پانچ وسق سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے۔'' اور ایک وسق ساٹھ صاع کا ہے اور وہ گندم، جو، کھجور اور کشمش میں سے تین سو صاع ہیں۔ اور زمین جو سبزہ وغیرہ اگاتی ہے اس میں زکوٰۃ نہیں ہے اور ایک قوم نے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے لئے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ۔ بے شک یہ آیت عام ہے اور زمین سے قلیل یا کثیر مقدار میں پیدا ہونے والی تمام اقسام کی چیزوں کو شامل ہے اور انہوں نے امر کے ظاہر کو دیکھا کہ وہ وجوب کے لئے ہے۔ اس کا مکمل بیان سورۂ انعام میں آئے گا۔

اور جہاں تک معدن کا تعلق ہے تو ائمہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جانوروں کا زخم رائیگاں ہے، کنواں ہدر ہے، معدن بھی ہدر ہے اور رکاز میں خمس ہے(2)۔'' تو یہ اس پر دلیل ہے کہ معادن کا

1۔ ابوداؤد، باب فی الرجل یاکل من مال ولدہ، حدیث نمبر 3061، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب فی الرکاز الخمس، حدیث نمبر 1403، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حکم رکاز کے حکم کے سوا ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معادن اور رکاز کے مابین واؤ فاصلہ کے ساتھ فرق بیان کیا ہے۔ اگر دونوں میں حکم ایک جیسا ہوتا تو آپ فرماتے: معدن ہدر ہے اور اس میں خمس ہے۔ اور جب آپ نے یہ فرمایا: وفی الرکاز الخمس تو اس سے معلوم ہوا کہ رکاز کا حکم معدن کے حکم کے سوا ہے اس بارے میں جو اس سے لیا جائے گا۔ واللہ اعلم۔

رکاز دراصل لغت میں اس سے مراد وہ سونا، چاندی اور جواہرات ہیں جو زمین میں گڑے ہوئے ہوں۔ تمام فقہاء کے نزدیک اسی طرح ہے، کیونکہ وہ سونے چاندی کے ان ٹکڑوں کے بارے میں کہتے ہیں جو معدن میں پائے جاتے ہیں وہ زمین میں گڑے ہوئے ہیں وہ عمل، محنت اور مشقت سے نہیں پائے جاتے، ان میں خمس ہے: کیونکہ وہ رکاز ہے اور امام مالک سے روایت ہے کہ معدن میں سونے اور چاندی کے ٹکڑوں کا حکم اس شے کا حکم ہے جس میں عمل اور محنت کی مشقت کی جاتی ہے جو کچھ معدن سے نکالا جاتا ہے وہ رکاز میں داخل ہے۔ پہلا قول ہی آپ کے مذہب کا حاصل ہے اور اسی پر جمہور فقہاء کا فتویٰ ہے۔

اور عبداللہ بن سعید ابن ابی سعید مقبری نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے اور انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رکاز کے بارے پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ سونا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے زمین میں اس دن پیدا فرمایا جس دن آسمانوں اور زمین کو تخلیق فرمایا۔'' یہ عبداللہ بن سعید متروک الحدیث ہیں۔ اسے ابن ابی حاتم نے ذکر کیا ہے۔ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک دوسری سند سے بھی یہ مروی ہے اور وہ صحیح نہیں ہے، اسے دارقطنی نے ذکر کیا ہے۔ علماء کی جماعت کے نزدیک دور جاہلیت میں لوگوں کے دفن کئے ہوئے اموال بھی رکاز ہیں وہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کرتے بشرطیکہ اس کا دفن اسلام سے پہلے اموال عادیہ (پرانے اموال) میں سے ہو۔ اور وہ جو زمانہ اسلام کے اموال میں سے ہو تو ان کے نزدیک اس کا حکم لقطہ کے حکم کی مثل ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ رکاز جب پایا جائے تو اس کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک نے بیان کیا ہے: زمانہ جاہلیت کے دفینوں میں سے جو سرزمین عرب میں یا اس ہموار اور جنگلی زمین میں پایا جائے جو بغیر جنگ کے مسلمانوں کی ملکیت میں آئی ہو تو وہ دفینہ اسی کے لئے ہوگا جس نے اسے پایا اور اس میں خمس ہوگا اور جو مسلمانوں کی زمین میں پایا جائے تو وہ لقطہ کی مثل ہوگا۔ مزید فرمایا: اور جو دفینہ جنگ کے علاقے میں پایا جائے تو وہ اس پوری جماعت (لشکر) کے لئے ہوگا جس نے اسے فتح کیا نہ کہ صرف پانے والے کے لئے اور جو کچھ صلح والے علاقے سے پایا جائے تو وہ اس شہر والوں کے لئے ہوگا نہ کہ عام لوگوں کے لئے اور اس میں پانے والے کے لئے کوئی شے نہ ہوگی مگر یہ کہ وہ اہل دار میں سے ہو تو پھر وہ ان کے سوا اس کے لئے ہوگا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلکہ وہ تمام صلح کرنے والوں کے لئے ہوگا۔

اسماعیل نے کہا ہے: بلاشبہ رکاز کا حکم مال غنیمت کے حکم کے ساتھ ہے کیونکہ وہ کافر کا مال ہے جسے مسلمان نے پالیا ہے۔ پس اسے اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے جو کافر کو قتل کرے اور اس کا مال لے لے۔ پس اس کے لئے کل مال کے چار خمس ہوں گے۔

ابن القاسم نے کہا ہے: امام مالک ساز و سامان، جواہرات، لوہا، تانبہ اور اسی طرح کی دیگر چیزوں میں جو بطور رکاز پائی جاتی ہیں ان کے بارے کہتے تھے کہ ان میں خمس ہے۔ پھر آپ نے اس سے رجوع کر لیا اور فرمایا: میں اس میں کوئی شے نہیں

دیکھتا۔ پھر آخری بار جب ہم آپ سے جدا ہوئے تو آپ نے کہا: اس میں خمس ہے۔ اور عموم حدیث کی بنا پر یہی صحیح ہے اور اسی پر جمہور فقہاء ہیں۔

امام اعظم ابوحنیفہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہما نے ایسے رکاز کے بارے میں جو گھر میں پایا جاتا ہے کہا ہے: بلاشبہ یہ گھر کے مالک کے لئے ہے نہ کہ پانے والے کے لئے اور اس میں خمس بھی ہے اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے برعکس کہا ہے کہ وہ پانے والے کے لئے ہے نہ کہ صاحب خانہ کے لئے اور یہی ثوری کا قول ہے اور اگر وہ جنگل میں پایا جائے تو پھر تمام کے قول کے مطابق وہ پانے والے کے لئے ہوگا اور اس میں خمس ہوگا اور ان کے نزدیک صلح اور جنگ کی زمین کے مابین کوئی فرق نہیں ہے اور اسی طرح ان کے نزدیک عرب کی زمین اور دوسری زمین سب برابر ہے اور ان کے نزدیک پانے والے کے لئے جائز ہے کہ وہ اس کا خمس اپنے لئے روک لے جبکہ وہ خود محتاج ہو اور اس کے لئے وہ مساکین کو دینا بھی جائز ہے۔

اہل مدینہ اور اصحاب مالک میں سے کچھ ہیں جو ان میں سے کسی شے کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے اور انہوں نے کہا ہے: برابر ہے رکاز جنگ والی زمین یا صلح کی زمین میں پایا جائے یا سرزمین عرب میں ہو یا علاقہ حرب میں جب وہ کسی ایک کی ملکیت نہ ہو اور نہ کسی ایک نے اس کا دعویٰ کیا ہو تو وہ اپنے پانے والے کے لئے ہوگا اور اس میں ظاہر حدیث کے عموم کی بنا پر خمس ہوگا اور یہی لیث، عبداللہ بن نافع، شافعی اور اکثر اہل علم کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ اور جہاں تک ان چیزوں کا تعلق ہے جو معادن سے حاصل کی جاتی ہیں اور کانوں سے نکلتی ہیں ان میں اختلاف کیا گیا ہے۔ پس امام مالک اور ان کے اصحاب نے کہا ہے: سونا یا چاندی میں سے جو کچھ کانوں سے نکلتا ہے اس میں کوئی شے واجب نہیں ہوتی یہاں تک کہ سونا بیس مثقال یا چاندی پانچ اوقیہ ہو جائے۔ پس جب یہ دونوں چیزیں اس مقدار کو پہنچ جائیں تو ان میں زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔ اور جو مقدار اس سے زائد ہو اس کے حساب سے اس کی زکوٰۃ بھی ہوگی جب تک وہ معدن میں پائی جائے اور اگر ایک بار وہ ختم ہو جائے اور پھر دوبارہ اس کے بعد پائی جائے تو پھر اس میں زکوٰۃ شروع کر دی جائے گی اور ان کے نزدیک رکاز کھیتی کی طرح ہے کہ جب کوئی شے نکلے گی تو اسی وقت اس سے زکوٰۃ لے لی جائے گی اور اس پر سال گزرنے کا انتظار نہیں کیا جائے گا۔

سحنون نے ایسے آدمی کے بارے میں کہا ہے جس کی کئی کانیں ہوں کہ وہ ان میں سے ایک میں جو کچھ ہے اسے دوسری سے حاصل ہونے والی شے کے ساتھ نہیں ملائے گا اور نہ ہی زکوٰۃ ادا کرے گا مگر تبھی جب ان میں سے ہر ایک میں سے دو سو درہم یا بیس دینار حاصل ہوں۔ اور محمد بن مسلمہ نے کہا ہے: وہ بعض کو بعض کے ساتھ ملا دے گا اور تمام کی اکٹھی زکوٰۃ ادا کرے گا جیسا کہ زمین سے حاصل ہونے والی پیداوار میں کیا جاتا ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: معدن رکاز کی مثل ہے۔ پس سونے یا چاندی میں سے جو کچھ معدن میں پایا گیا خمس نکالنے کے بعد دونوں میں سے ہر ایک کا اعتبار کیا جائے گا۔ پس جس نے اپنے ہاتھ سے محنت کے ساتھ وہ شے حاصل کی جس میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے تو سال مکمل ہونے پر وہ اس کی زکوٰۃ ادا کرے۔ اگر اس پر سال گزر جائے اور

وہ نصاب اس کے پاس ہو۔ یہ تب ہے جب اس کے پاس اتنا سونا یا چاندی نہ ہو جس میں زکوٰۃ واجب ہو۔ اور اگر اس کے پاس اس میں سے اتنا ہو جس میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے تو وہ اسے اس کے ساتھ ملالے اور اس کی زکوٰۃ ادا کرے۔ اسی طرح ان کے نزدیک سال کے دوران جو نفع حاصل ہوگا اسے اپنی جنس کے نصاب کے ساتھ ملایا جائے گا اور اصل نصاب پر سال گزرنے پر زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ یہی ثوری کا قول ہے۔

اور مزنی نے امام شافعی سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا: وہ شے جس میں میں شک کرتا ہوں وہ وہی ہے جو معادن سے نکلتی ہے۔ مزنی نے کہا ہے: ان کی اصل کی بنا پر اولیٰ یہ ہے کہ جو کچھ معدن سے نکلتا ہے وہ فائدہ اور نفع ہو وہ اسے نکالنے کے بعد سال گزرنے پر اس کی زکوٰۃ ادا کرے گا۔

اور لیث بن سعد نے کہا ہے: سونا اور چاندی میں سے جو کچھ بھی معادن سے نکلتا ہے وہ بمنزلہ نفع اور فائدہ کے ہے وہ نئے سرے سے اس پر سال پورا کرے گا۔ اور یہی امام شافعی کا اس بارے میں قول ہے جسے مزنی نے ان کے مذہب سے حاصل کیا ہے۔

اور اس کے بارے میں داؤد اور ان کے اصحاب نے کہا ہے: جب اس پر ایسے مالک کے پاس پورا سال گزر جائے جس کی ملکیت صحیح ہو (تو اس پر زکوٰۃ لازم ہوگی) کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے" جس نے مال حاصل کیا اس پر زکوٰۃ نہیں ہے یہاں تک کہ اس پر سال گزر جائے" اسے ترمذی اور دارقطنی نے بیان کیا ہے۔ (1)

اور انہوں نے اس روایت سے بھی استدلال کیا ہے جسے عبدالرحمٰن بن انعم نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مؤلفۃ قلوب میں سے ایک قوم کو کچھ سونا عطا فرمایا جو ابھی اپنی مٹی میں ملا ہوا تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وہ یمن سے بھیجا تھا۔ (2)

حضرت امام شافعی نے کہا ہے: مؤلفۃ قلوب کا حق زکوٰۃ میں ہے، تو اس سے یہ واضح ہو گیا کہ معادن کا طریقہ وہی ہے جو زکوٰۃ کا طریقہ ہے۔ (یعنی ان کے احکام ایک جیسے ہیں۔)

امام مالک کی دلیل حضرت ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن کی حدیث ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال بن حارث رضی اللہ عنہ کو معادن قبلیہ (☆) عطا فرمائیں اور یہ الفرع (☆☆) کی طرف میں واقع ہیں اور ان معادن سے آج تک صرف زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے۔ یہ حدیث منقطع الاسناد ہے۔ محدثین اس قسم کی حدیث سے استدلال نہیں کرتے لیکن آپ نے عمل کیا ہے اور ان کے نزدیک مدینہ منورہ میں اس کے مطابق عمل کیا جاتا ہے اور اسے دراوردی نے ربیعہ سے، انہوں نے حارث بن بلال المزنی

1۔ سنن ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، حدیث نمبر 572، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، حدیث نمبر 3095، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

☆ القبلیہ (بالتحریک) یہ منسوب ہے قبل کی طرف جو ساحل سمندر پر ایک جگہ کا نام ہے اور مدینہ طیبہ سے پانچ دنوں کے فاصلے پر ہے۔

☆☆ الفرع: یہ السقیا سے بائیں جانب ربذہ کے نواح میں ایک گاؤں ہے۔ اس کے اور مدینہ طیبہ کے درمیان مکہ کی راہ پر آٹھ برید کا فاصلہ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ چار راتوں کی مسافت ہے۔

سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے۔ اسے بزار نے ذکر کیا ہے اور اسے کثیر بن عبد اللہ بن عمرو بن عوف نے اپنے باپ کے واسطے سے اپنے دادا سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال بن حارث رضی اللہ عنہ کو قبلیہ کی ساری کانیں عطا فرمائیں جو وہاں کی بلند زمین میں تھیں اور پست زمین میں تھیں۔ اور قُدْس (مشہور پہاڑ) سے وہ زمین عطا فرمائی جو کاشت کی صلاحیت رکھتی تھی اور آپ نے انہیں کسی مسلمان کا حق نہیں دیا۔ اسے بزار نے بھی ذکر کیا ہے اور بہت سے لوگوں نے اس کے ضعف پر اجماع کیا ہے۔ یہ حکم ان چیزوں کا ہے جنہیں زمین نکالے اور عنقریب سورۃ النحل میں ان چیزوں کا حکم آئے گا جو سمندر سے نکلیں کیونکہ وہ بھی زمین کا قسیم ہے اور سورۃ الانبیاء (1) میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا معنی بیان ہوگا: العجماء جرحها جُبار ہر ایک کا بیان اپنے محل میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ۔ تَيَمَّمُوا کا معنی تقصدوا ہے۔ یعنی تم قصد وارادہ نہ کرو۔ عنقریب سورۃ النساء میں عرب اشعار سے اس پر شواہد ذکر ہوں گے کہ التیمم بمعنی القصد ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

آیت اس پر دلیل ہے کہ کمائی ہوئی شے طیب اور عمدہ بھی ہوتی ہے اور گھٹیا اور ردی بھی۔ امام نسائی نے حضرت ابوامامہ بن سہل بن حنیف سے اس آیت کے بارے روایت کیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ فرمایا: وہ جُعرور اور لون حُبَیق (یہ دونوں کھجور کی انتہائی ردی اور گھٹیا اقسام میں سے ہیں)۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو صدقہ میں لینے سے منع فرمایا ہے اور دار قطنی نے حضرت ابوامامہ بن سہل بن حنیف سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کے بارے حکم ارشاد فرمایا، تو ایک آدمی ایسی کچی کھجوروں کا خوشہ لے کر آیا (جن کے پکنے اور مکمل ہونے کی صلاحیت ابھی ظاہر نہ ہوئی تھی)... سفیان نے کہا: یعنی بالکل ناکارہ اور ردی کھجوریں ... تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: ''یہ کون لے کر آیا ہے؟'' اور کوئی کوئی شے بھی نہیں لاتا ہے مگر وہ اس کی طرف منسوب ہوتی ہے جو اسے لے کر آتا ہے۔ تب یہ آیت نازل ہوئی: وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ۔ راوی نے بیان کیا اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جُعرور اور لون الحبیق سے منع فرمایا کہ ان دونوں (قسموں) کو صدقہ میں لیا جائے زہری نے کہا ہے: یہ دونوں قسمیں مدینہ کی کھجوروں میں سے ہیں (2)۔ اور اسے ترمذی نے حضرت براء رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے (3) اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔ عنقریب اس کا ذکر آئے گا۔

علامہ طبری اور نحاس نے بیان کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی قراءت میں وَلَا تَأَمَّمُوا ہے۔ اور یہ دونوں لغتیں ہیں اور حضرت مسلم بن جندب نے وَلَا تُيَمِّمُوا تاء کے ضمہ اور میم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابن کثیر نے تَّيَمَّمُوا یاء کو مشدد پڑھا ہے اور اس لفظ میں کئی لغات ہیں ان میں سے أَمَمْتُ الشَّيْءَ پہلی میم مخفف اور آمَمْتُهُ پہلی میم مشدد، اور يَمَّمْتُهُ اور تَيَمَّمْتُهُ

1۔ ابوداؤد، باب اقطاع الارضین، حدیث نمبر 2661، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ابوداؤد، باب ما لایجوز من الثمرۃ فی الصدقۃ، حدیث نمبر 1369، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ترمذی، باب ومن سورۃ البقرہ، حدیث نمبر 2913، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہیں۔ اور ابوعمرو نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے وَلَا تُؤَمِّمُوْا تاء مضمومہ کے بعد ہمزہ سے پڑھا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ علامہ جرجانی نے کتاب ''نظم القرآن'' میں کہا ہے کہ لوگوں میں سے ایک فریق نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد الْخَبِیْثَ پر کلام مکمل ہے۔ پھر خبیث کے وصف میں دوسری خبر کی ابتدا کی اور فرمایا: مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ اور تم ردی چیز نہ لو بجز اس کے کہ تم نرمی کا برتاؤ کرو، گویا یہ معنی لوگوں کے لئے عتاب اور ڈانٹ ہے۔ اور مِنْهُ کی ضمیر الْخَبِیْثَ کی طرف راجع ہے۔ اور الْخَبِیْثَ سے مراد انتہائی گھٹیا اور ردی ہے۔ علامہ جرجانی نے کہا ہے: دوسرے فریق نے کہا ہے کہ کلام قول باری تعالیٰ مِنْهُ تک متصل ہے اور مِنْهُ میں ضمیر مَا كَسَبْتُمْ کی طرف راجع ہے۔ اور تُنْفِقُوْنَ گو حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں واقع ہے اور یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: أنا أخرج أجاهد في سبيل الله۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِیْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِیْهِ یعنی تم اپنے قرضوں اور اپنے حقوق میں سے لوگوں سے نہیں لیتے مگر یہ کہ تم اس بارے میں نرمی کا برتاؤ کرو اور اپنے حقوق میں سے کچھ چھوڑ دو، حالانکہ تم اسے ناپسند کرتے ہو اور اس پر راضی نہیں ہوتے۔ یعنی تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ وہ برتاؤ نہ کرو جو تم اپنے لئے پسند نہیں کرتے ہو۔ اس کا یہ معنی حضرت براء بن عازب، حضرت ابن عباس اور حضرت ضحاک رضی اللہ عنہم نے بیان کیا ہے۔

اور حسن نے کہا ہے: آیت کا معنی ہے اور تم اسے (ردی کو) نہ لو اگرچہ تم اسے بازار میں پاؤ کہ اسے بیچا جا رہا ہے مگر یہ کہ وہ تمہارے لئے اس کے ثمن کم کر دے۔ اور اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ دونوں قول آیت کے زکوٰۃ فرضیہ کے بارے میں ہونے کا شبہ دلاتے ہیں۔

ابن عربی نے کہا ہے: اگر یہ آیت فرض زکوٰۃ کے بارے میں ہوتی تو اللہ تعالیٰ یہ نہ فرماتا: وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِیْهِ کیونکہ ردی اور عیب ناک چیز فرض میں کسی بھی حال میں لینا جائز نہیں ہوتا، نہ چشم پوشی کے طریقہ پر اور نہ اس کے سوا کسی طریقہ پر، البتہ چشم پوشی کے بغیر بھی نفل میں لی جا سکتی ہے۔

اور حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اس کا معنی ہے: وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِیْهِ اگر تمہیں ہدیہ دیا جائے (تو تم ردی شے نہ لو) اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِیْهِ مگر یہ کہ تم ہدیہ دینے والے سے حیاء کرو اور اس سے وہ شے قبول کر لو جس کی نہ تمہیں حاجت ہے اور نہ وہ شے فی نفسہ کوئی قدر و منزلت رکھتی ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ آیت کے نفلی صدقہ کے بارے میں ہونے کا شبہ دلاتا ہے اور ابن زید نے کہا ہے: اور تم حرام چیز نہ لو مگر یہ کہ تم اس کے مکروہ ہونے کے بارے میں اغماض برتو۔

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِیْهِ۔ جمہور کی قراءت اسی طرح ہے۔ یہ اغمض الرجل في امر كذا سے ہے۔ جب آدمی کسی کام میں تساہل اور نرمی برتے اور اپنے بعض حق کے ساتھ راضی ہو جائے اور بعض سے درگزر کر لے اور اسی معنی میں طرماح کا قول ہے:

لم يَفُتْنَا بالوتر قومٌ وللذُّ　　لِّ أناسٌ يَرْضَوْنَ بالإغماضِ

کسی قوم نے وتر کے بارے میں ہمیں فتویٰ نہیں دیا اور سہولت کے لئے لوگ بعض حق کے ساتھ راضی ہو جاتے ہیں۔

اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ تغمیض العین سے لیا گیا ہو کیونکہ جو مکروہ اور ناپسندیدہ شے پر صبر کا ارادہ رکھتا ہے وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے.... جیسا کہ شاعر نے کہا:

الی کَمْ وکَمْ اشیاءَ منك تُرِیْبُنی أُغَمِّضُ عنها لستُ عنها بذی عَمَی

کتنے تک اور تیری طرف سے کتنی اشیاء مجھے شک میں ڈالتی ہیں میں ان سے آنکھیں بند کر لیتا ہوں میں ان سے اندھا نہیں ہوں۔

اور یہ مکروہ کے وقت اِغضاء (آنکھ بند کرنا) کی طرح ہے۔ اور نقاش نے یہی معنی اس آیت میں ذکر کیا ہے اور اس کی طرف مکی نے اشارہ کیا ہے۔

اور یا یہ عربوں کے اس قول سے ہے: أغمض الرجل اذا أتی غامضا من الأمر۔ (یعنی جب کوئی کسی کام میں نرمی برتے و کہا جاتا ہے: اغمض الرجل۔ (آدمی نے نرمی کا سلوک کیا۔) جیسا کہ تو کہتا ہے: أَعْمَنَ یعنی وہ عُمان آیا۔ اور أعرق یعنی وہ عراق آیا اور انجد و اغور، یعنی وہ نجد اور غور آیا اور غور سے مراد تہامہ ہے، یعنی وہ اسے لینے کے لئے کوئی تاویل تلاش کرتا ہے۔

زہری نے اسے تاء کے فتحہ اور میم کے کسرہ کے ساتھ مخفف پڑھا ہے اور ان ہی سے تُغَمِّضُوْا بھی مروی ہے۔ یعنی تاء کے ضمہ، غین کے فتحہ اور میم کے کسرہ اور اس کی شد کے ساتھ۔ پس پہلی قراءت اس معنی کی بناء پر ہے تم اپنے بائع سے اس کا سودا ختم کر دو کہ وہ تمہارا بھاؤ کم کر دے۔

اور دوسری قراءت اور یہی حضرت قتادہ کی قراءت ہے جو کہ نحاس نے ذکر کی ہے۔ یہ معنی ہے کہ تم نقصان اور کمی کے ساتھ لے لو۔ ابو عمرو الدانی نے کہا ہے کہ زہری کی دونوں قراءتوں کا معنی ہے: ''یہاں تک کہ تم نقصان اور کمی کے ساتھ لے لو۔'' اور مکی نے حسن سے بیان کیا ہے: اِلَّاۤ اَنْ تُغَمِّضُوْا یعنی میم مشدد اور مفتوح ہے اور قتادہ نے تُغْمَضُوْا بھی قراءت کی ہے یعنی تا کے ضمہ، غین کے سکون اور میم مخفف مفتوح کے ساتھ۔ ابو عمرو الدانی نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تمہارے لئے اس کی قیمت کم کر دی جائے۔

اسے نحاس نے حضرت قتادہ سے بیان کیا ہے اور ابن جنی نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تم اس حال میں پائے جاؤ کہ تم نے تاویل کے سبب یا نرمی کے سبب معاملے میں چشم پوشی کر لی ہے اور تم نے ادنیٰ چیز اپنے لئے لینے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اور یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: احمدت الرجل وجدته محمودا۔ (میں نے آدمی کی تعریف کی اور میں نے اسے محمود پایا) اسی طرح کی کئی مثالیں ہیں۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: جمہور کی قراءت تجاوز (درگزر کرنے) اور آنکھیں بند کرنے کے معنی دیتی ہے، کیونکہ اَغْمَضَ غَمَضَ کے قائم مقام ہے۔ اور اسی بنا پر معنی یہ ہے یہاں تک کہ تم اسے لینے میں غور و فکر اور تاویل سے آنکھیں بند کرتے ہوئے آؤ۔ یا تو اس کے حرام ہونے کی وجہ سے ابن زید کے قول کے مطابق اور یا پھر اس لئے کہ ایک ہدیہ ہے یا اسے قرض میں لیا گیا ہے۔

دوسروں کے قول کے مطابق۔

اور مہدوی نے کہا ہے جنہوں نے تُغْمِضُوْا پڑھا ہے تو معنی یہ ہے تم اسے لینے سے اپنی بصیرت کی نگاہیں بند رکھتے ہو۔ جوہری نے کہا ہے: غَمَّضْتُ عن فلان کا معنی ہے جب بیع یا شرا کے معاملہ میں تو اس پر نرمی کرے۔ اور چشم پوشی کرے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ کہا جاتا ہے: أَغْمِضْ لی فیما بعتنی۔ (میرے لئے چشم پوشی اور نرمی کی گئی اس میں جو تو نے مجھے بیچی) گویا تو اس سے زیادتی کا ارادہ رکھتا ہے اس کے ردی ہونے کے سبب اور اس کے ثمن میں سے کم کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اور أَنْ محل نصب میں ہے اور تقدیر کلام ہے اِلَّا بِاَنْ۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ۔ اللہ تعالیٰ نے صفت غنی پر متنبہ فرمایا کہ تمہارے صدقات کی اسے کوئی حاجت نہیں۔ پس جو قرب حاصل کرنا چاہے اور ثواب کا طالب ہو تو اسے چاہیے کہ وہ صدقہ ادا کرے ایسی شے کے ساتھ جو قدر و منزلت والی ہو اور مہتم بالشان ہو کیونکہ وہ اسے اپنے لئے آگے بھیجتا ہے۔

اور حَمِيْدٌ کا معنی ہے: محمود فی کل حال ہر حال میں تعریف کیا ہوا۔ ہم نے ان دونوں اسموں کے معنی الکتاب الاسنی میں ذکر کر دیئے ہیں۔ والحمد للہ۔

اور زجاج نے قول باری تعالیٰ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ کے تحت کہا ہے: اس نے تمہیں حکم نہیں دیا ہے کہ تم حاجت اور تنگی کے باوجود صدقہ کرو البتہ اس نے تمہارے اخیار اور نیک لوگوں کا امتحان لیا ہے اور وہ ان تمام نعمتوں پر تعریف کیا گیا ہے۔

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۸﴾

''شیطان ڈراتا ہے تمہیں تنگ دستی سے اور حکم کرتا ہے تم کو بے حیائی کا اور اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے تم سے اپنی بخشش کا اور فضل (و کرم) کا اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے۔''

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اَلشَّيْطٰنُ شیطان اور اس کے مادۂ اشتقاق کا معنی پہلے گزر چکا ہے دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور يَعِدُكُمْ کا معنی ہے: وہ تمہیں ڈراتا ہے۔ الْفَقْرَ تنگدستی سے تاکہ تم خرچ نہ کرو۔

یہ آیت ماقبل سے متصل ہے اور یہ کہ شیطان کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے سے انسان کو باز رکھنے میں خاصہ دخل ہے اور وہ اس کے ساتھ ساتھ فحشاء (بے حیائی) کا حکم دیتا ہے اور فحشاء سے مراد معاصی اور ان میں خرچ کرنا ہے اور کہا گیا ہے یعنی اس طرح کہ تم صدقہ نہ کرو تم گنہگار ہو جاؤ گے اور آپس میں جدا جدا ہو جاؤ گے اور الفُقْرَ فاء کے ضمہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور یہ ایک لغت ہے۔

جوہری نے کہا ہے: الفَقْرَ میں ایک لغت الفُقْرَ ہے۔ مثلاً الضُّعف اور الضَّعف۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا۔ کلام عرب میں الوعد کا لفظ جب مطلق ہو تو وہ خیر اور بھلائی کے لئے ہوتا ہے اور جب اسے موعود (وہ شے جس کا وعدہ کیا گیا) کے ساتھ مقید کر دیا جائے تو پھر وہ خیر اور شر دونوں کے لئے مقدر ہو سکتا ہے، جیسا کہ البشارۃ تو اس آیت میں لفظ الوعد اکٹھا دو معنوں کے ساتھ مقید کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اس آیت میں دو وعدے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں اور دو شیطان کی طرف سے۔

اور امام ترمذی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بے شک شیطان کی جانب سے ایک وسوسہ یہ ہے کہ وہ شر کے ساتھ خوفزدہ کرتا ہے اور حق کی تکذیب کی طرف راغب کرتا ہے اور فرشتے کا القاء یہ ہے کہ وہ خیر کا وعدہ دلاتا ہے اور حق کی تصدیق کی رغبت دلاتا ہے۔ پس جو کوئی اسے پائے تو اسے جان لینا چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور جو کوئی دوسرا انہیں پائے تو اسے چاہیے کہ وہ شیطان کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرے۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے(1) اور غیر قرآن میں باء کو حذف کرنا بھی جائز ہے۔ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ سیبویہ نے شعر کہا ہے:

امرتُك الخير فافعل ما امرتَ به　　فقد تركتك ذا مال و ذا نسب

میں نے تجھے خیر کا حکم دیا ہے پس تو وہی کر جس کا تجھے حکم دیا گیا ہے۔ تحقیق میں نے تجھے صاحب مال اور صاحب نسب چھوڑا ہے۔

اور المغفرۃ سے مراد اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر دنیا اور آخرت میں پردہ ڈالنا ہے اور فضل سے مراد دنیا میں رزق ہے اور آخرت میں وسعت اور نعمتیں ہیں۔ تمام کے بارے اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ نقاش نے ذکر کیا ہے کہ بعض لوگ اس بارے میں اس آیت سے مانوس ہوئے ہیں کہ فقر (تنگدستی) غنیٰ (دولتمندی، خوشحالی) سے افضل ہے، کیونکہ شیطان بندے کو نیکی اور خیر سے دور ہٹاتا ہے اور وہ اسے فقر کا خوف دلا کر اس سے دور کرتا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: آیت میں کوئی حجت قاطعہ نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ معارضہ قوی ہے اور روایت ہے کہ تورات میں ہے۔ ''میرے بندے میرے رزق سے خرچ کر میں تجھ پر اپنا فضل وسیع کر دوں گا کیونکہ میرا ہاتھ ہر کشادہ ہاتھ سے زیادہ کشادہ ہے۔'' اور قرآن کریم میں اس کا مصداق یہ ارشاد گرامی ہے: وَمَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ (سبا) (اور جو چیز تم خرچ کرتے ہو تو وہ اس کی جگہ اور دے دیتا ہے اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے۔)

اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ذکر کیا ہے۔ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے اور یہاں مراد یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ خوشحالی اور وسعت عطا فرماتا ہے اور وہ اسے جانتا ہے جہاں اسے رکھتا ہے اور وہ غیب و شہادۃ کا علم رکھتا ہے۔ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے دو اسم ہیں ہم نے ان دونوں کا ذکر بھی تمام اسماء میں الکتاب الاسنیٰ میں کیا ہے۔

1۔ سنن ترمذی، باب ومن سورۃ البقرہ، حدیث نمبر 2914، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

والحمد للہ۔

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾

''عطا فرماتا ہے دانائی جسے چاہتا ہے اور جسے عطا کی گئی دانائی تو یقیناً اسے دے دی گئی بہت بھلائی اور نہیں نصیحت قبول کرتے مگر عقلمند''

قولہ تعالیٰ: يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے حکمت عطا فرما دیتا ہے۔ یہاں حکمت کے مفہوم کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ سدی نے کہا ہے: اس سے مراد نبوت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: حکمت سے مراد قرآن کریم کی معرفت ہے یعنی اس کی فقاہت، نسخ، محکم، غریب اور مقدم و مؤخر آیات کا علم۔ حضرت قتادہ اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: حکمت سے مراد قرآن کریم کی سمجھ اور فقاہت ہے۔ حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اس سے مراد قول و فعل میں صائب اور درست ہونا ہے۔ ابن زید نے کہا ہے: حکمت سے مراد دین میں عقل و فہم کا رکھنا ہے۔ امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: حکمت سے مراد اللہ تعالیٰ کی اطاعت و پیروی، دین میں فقاہت اور اس کے مطابق عمل کرنا ہے۔ حضرت ربیع بن انس رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حکمت سے مراد خشیت ہے۔

حضرت ابراہیم نخعی کا قول ہے: حکمت سے مراد قرآن کریم میں فہم اور سمجھ رکھنا ہے اور حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ نے بھی یہی کہا ہے اور حسن نے کہا ہے: حکمت سے مراد ورع ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ تمام اقوال ماسوائے سدی، ربیع اور حسن کے اقوال کے آپس میں ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں، کیونکہ حکمت مصدر ہے الاحکام سے اور اس کا معنی ہے: قول یا فعل میں پختہ اور مضبوط ہونا۔ پس کتاب اللہ حکمت ہے اور اللہ تعالیٰ کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت بھی حکمت ہے اور فضیلت میں سے جو کچھ ذکر کیا گیا ہے وہ سب حکمت ہے۔ دراصل حکمت وہ شے ہے جس کے سبب انسان سفاہت اور بے وقوفی سے باز رہے، پس علم کو حکمت کہا گیا ہے کیونکہ اس کے سبب اس سے روکا جاسکتا ہے اور اس کے ساتھ سفاہت سے باز رہنے کو جانا جاسکتا ہے اور سفاہت سے مراد ہر وہ فعل ہے جو قبیح ہو۔ اور اسی طرح قرآن کریم، عقل اور فہم و فراست (یہ سب حکمت ہیں کیونکہ ان کے سبب سفاہت کے ارتکاب سے باز رہا جاتا ہے۔)

اور بخاری شریف میں ہے: مَنْ يُرِدِ اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین (اللہ تعالیٰ جس کے بارے خیر اور بھلائی چاہتا ہے اسے دین میں فقاہت عطا فرما دیتا ہے۔) اور یہاں ارشاد فرمایا: وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (اور جسے دانائی عطا کی گئی یقیناً اسے بہت بھلائی دے دی گئی۔ (1)) اور دوبارہ حکمۃ کا لفظ ذکر فرمایا اس کے لئے ضمیر ذکر نہیں فرمائی، اس کا اہتمام کرتے ہوئے اور اس کے شرف و فضل پر تنبیہ کرتے ہوئے جیسا کہ اس کا بیان اس قول باری تعالیٰ کے تحت گزر چکا ہے:

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا (البقرہ: 59)

1۔ صحیح بخاری، باب من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین، حدیث نمبر 69، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور دارمی ابو محمد نے اپنی مسند میں ذکر کیا ہے۔ مروان بن محمد، رفدہ الغسانی نے بیان کیا ہے کہ ہمیں ثابت بن عجلان انصاری نے خبر دی ہے اس نے کہا: بیان کیا جاتا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ اہل زمین کو عذاب دینے کا ارادہ فرماتا ہے اور جب وہ معلم کو بچوں کو حکمت کی تعلیم دیتے ہوئے سنتا ہے تو وہ اسے ان سے پھیر دیتا ہے۔ مروان نے کہا ہے: حکمت سے مراد قرآن کریم ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَنْ یُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا كَثِیْرًا ؕ وَ مَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾ کہا جاتا ہے: بے شک جسے حکمت اور قرآن عطا کر دیئے گئے تحقیق اسے اس سے افضل و اعلیٰ عطا کر دیا گیا جسے پہلی کتابوں اور صحف وغیرہ کا جمیع علم عطا کیا گیا، کیونکہ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَ مَاۤ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۸۵﴾ (الاسراء)

اور اسے خَیْرًا كَثِیْرًا کا نام دیا گیا ہے، کیونکہ یہ جوامع الکلم ہے۔

اور بعض حکماء نے کہا ہے: جسے علم اور قرآن عطا کیا گیا اسے چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو پہچانے اور اہل دنیا کے سامنے ان کی دنیا کی وجہ سے نہ جھکے، کیونکہ جو اسے عطا کیا گیا ہے وہ اس سے بہت افضل ہے جو اصحاب دنیا کو دیا گیا ہے (من اعطی العلم والقرآن ینبغی ان یعرف نفسه ولا یتواضع لاهل الدنیا لأجل دنیاهم فانها أعطی افضل اصحاب الدنیا) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو متاع قلیل کا نام دیا ہے اور فرمایا ہے: قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ ۚ (النساء: 77)

اور علم اور قرآن کو خَیْرًا كَثِیْرًا کا نام دیا ہے (2)۔

جمہور نے وَ مَنْ یُّؤْتَ فعل مجہول کی صورت میں پڑھا ہے اور زہری اور یعقوب نے وَ مَنْ یُّؤْتِ تا کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ (یعنی فعل معروف) اس معنی کی بناء پر و من یؤتِ اللہُ الحکمۃ اور جسے اللہ تعالیٰ دانائی عطا فرما دے۔ اس میں فاعل اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی ہے۔ اور مَنْ مفعول اول مقدم ہے اور الحکمۃ مفعول ثانی ہے اور الالباب کا معنی عقول ہیں اور اس کا واحد لب ہے اس کا ذکر بھی پہلے گزر چکا ہے۔

وَ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُهٗ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾

"اور جو تم خرچ کرتے ہو یا منت مانتے ہو تو یقیناً اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے اور نہیں ہے ظالموں کیلئے کوئی مددگار۔"

یہ شرط اور جواب شرط ہے۔ عربوں کے رواج میں منتیں کثرت سے مانی جاتی تھیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے دو قسمیں بیان کی ہیں، ایک وہ جو آدمی بطور نفل اور تبرع فعل کرتا ہے اور ایک وہ جو آدمی اپنے لئے اسے لازم کرنے کے بعد وہ فعل کرتا ہے۔ اور آیت میں وعدہ اور وعید کا معنی موجود ہے، یعنی وہ آدمی جس کی نیت میں اخلاص ہو اسے ثواب دیا جائے گا اور جس نے ریا کاری یا کسی اور معنی مثلاً احسان جتلانے اور دکھ پہنچانے کے لئے خرچ کیا تو وہ ظالم ہوگا۔ اس کا عمل باطل ہو جائے گا اور وہ اپنے لئے اس میں کوئی معاون و مددگار نہیں پائے گا اور یَعْلَمُهٗ کا معنی ہے وہ اسے شمار کرتا ہے اور سمجھتا ہے، یہ مجاہد نے کہا ہے (ای یُحْصِیْهِ) اور ضمیر واحد ذکر کی حالانکہ پہلے دو چیزوں کا ذکر کیا، تو نحاس نے کہا ہے: تقدیر عبارت ہے وَ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ

1۔ تفسیر ابو لیث، جلد 1، صفحہ 232

نَفَقَةٍ۔ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهَا (یعنی جو تم خرچ کرتے ہو یقینا اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے) اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ پھر اسے حذف کر دیا گیا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ تقدیر عبارت اس طرح ہو: وما انفقتم فان اللہ یعلمہ۔ اور اس میں ھا ضمیر ''ما'' کی طرف لوٹ رہی ہو۔ جیسا کہ سیبویہ نے (امرء القیس کے لئے) کہا ہے:

فَتُوضِحَ فَالمِقْرَاةِ لم يَعْفُ رَسْمُها　　لِما نَسَجَتْها من جَنُوبٍ و شَمْأَلِ

اس میں نسجتھا میں ہا ضمیر ما کی طرف لوٹ رہی ہے۔

اور اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ اس پر معطوف ہو۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: يَعْلَمُهٗ میں واحد ضمیر ذکر کی ہے حالانکہ دو چیزوں کا ذکر کیا ہے تو یہ اس حیثیت سے ہے کہ ارادہ اس کا کیا ہے جسے ذکر کیا گیا ہے یا جسے بیان کیا گیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ حسین اور اچھا ہے کیونکہ کبھی ضمیر سے مراد وہ تمام ہوتے ہیں جو مذکور ہوتے ہیں اگرچہ وہ کثیر ہوں۔ نذر کی حقیقی تعریف یہ ہے: ھو ما اوجبہ المکلف علی نفسہ من العبادات مما لو لم یوجبہ لم یلزمہ (ان عبادات میں سے وہ عبادت جو مکلف نے اپنے اوپر لازم کی ہو کہ اگر وہ اسے لازم نہ کرتا تو وہ اس پر لازم نہ ہوتی۔) لہٰذا جب کوئی فعل آدمی اپنے ذمہ لازم کر لے تو تو کہتا ہے: نذر الرجل، ینذر ذال کے ضمہ کے ساتھ بھی ہے اور ذال کے کسرہ کے ساتھ بھی۔ اس کے کئی احکام ہیں جن کا بیان کسی اور جگہ آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۷۱﴾

''اگر ظاہر کرو (اپنی) خیرات تو بہت اچھی بات ہے اور اگر پوشیدہ رکھو صدقوں کو اور دو انہیں فقیروں کو تو یہ بہت بہتر ہے تمہارے لئے اور (صدقہ کی برکت سے) مٹا دے گا تم سے تمہارے بعض گناہ اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے ہو خبردار ہے۔''

جمہور مفسرین کا موقف یہ ہے کہ یہ آیت نفلی صدقہ کے بارے میں ہے کیونکہ اس میں اظہار کی نسبت اخفاء افضل ہے اور اسی طرح تمام نفلی عبادات میں اخفا افضل ہوتا ہے کیونکہ اس طرح ریا ان سے دور رہتا ہے اور واجبات میں اس طرح نہیں ہے۔ حسن نے کہا ہے: زکوٰۃ میں اظہار احسن ہے اور نفل میں اخفا افضل ہے کیونکہ یہ اس پر زیادہ دلالت کرتا ہے کہ اس سے ارادہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کا کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نفل میں سری صدقہ کو اعلانیہ صدقہ پر فضیلت دی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ستر گنا ہے اور فرضی صدقہ میں اعلانیہ کو سری پر فضیلت دی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پچیس گنا ہے۔ فرمایا: تمام اشیاء میں جمیع فرائض اور نوافل اسی طرح ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس طرح کا قول رائے سے نہیں کہا جا سکتا۔ بالیقین وہ امر توقیفی ہے۔

اور صحیح مسلم میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''فرض نماز کے سوا آدمی کا اپنے گھر میں نماز پڑھنا افضل ہے۔'' اور یہ اس لئے ہے کہ فرائض میں ریا داخل نہیں ہوتا اور نوافل اس کے نشانے پر ہیں۔

اور امام نسائی نے حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک وہ آدمی جو قرآن بالجہر پڑھتا ہے وہ اس کی طرح ہے جو صدقہ بالجہر دیتا ہے اور جو قرآن سراً پڑھتا ہے وہ اس کی طرح ہے جو صدقہ سرا دیتا ہے۔'' اور حدیث میں ہے۔ سراً صدقہ دینا رب العالمین کے غضب کو ٹھنڈا کر دیتا ہے (1)۔''

ابن عربی نے کہا ہے: اعلانیہ صدقہ کی سری صدقہ پر فضیلت کے بارے میں اور نہ ہی سری صدقہ کی اعلانیہ صدقہ پر فضیلت کے بارے میں کوئی صحیح حدیث ہے۔ البتہ اس کے بارے میں اجماع ثابت ہے۔ پس رہا نفلی صدقہ تو اس کے بارے صراحۃً قرآن کریم میں موجود ہے کہ یہ سراً دینا جہراً دینے سے افضل ہے۔ اس کے بارے ہمارے علماء نے کہا ہے: بے شک اس کا اطلاق غالب کیفیت پر ہے اور اس بارے میں تحقیق یہ ہے کہ صدقہ میں حالات مختلف ہوتے ہیں صدقہ دینے والے کی حالت کے ساتھ، جس کو صدقہ دیا جائے اس کی حالت کے سبب اور ان لوگوں کی حالت کے ساتھ جو صدقہ کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ رہا صدقہ دینے والا تو اس کے لئے اس میں سنت کے اظہار اور پیشوائی کا ثواب ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اس کے لئے ہے جس کی حالت قوی ہو اور اس کی نیت نیک اور اچھی ہو اور وہ اپنے بارے میں ریا سے محفوظ اور مامون ہو۔ اور رہا وہ آدمی جو اس مرتبہ سے ضعیف اور کمزور ہو تو اس کے لئے سراً صدقہ دینا افضل ہے۔

اور جہاں تک اس کا تعلق ہے جسے صدقہ دیا گیا ہے تو اسے سری صدقہ لوگوں کے اسے حقیر سمجھنے سے محفوظ کرنے والا ہے اور اس شے کی نسبت سے کہ اس نے غنی اور غیر محتاج ہونے کے باوجود صدقہ لیا ہے اور پاکدامنی کو ترک کر دیا ہے اور رہا لوگوں کا حال تو ان کے اعتبار سے بھی سری صدقہ اعلانیہ سے افضل ہے، اس جہت سے کہ وہ کبھی دینے والے کو ریاکاری کا طعنہ دیتے ہیں اور صدقہ لینے کو اس کا مستحق قرار نہیں دیتے اگرچہ ان کے لئے جہری صدقہ میں دلوں کو صدقہ کی طرف مائل اور راغب کرنے کا سامان بھی ہے لیکن آج کے دور میں یہ بہت قلیل ہے۔

یزید بن حبیب نے کہا ہے: یہ آیت یہود و نصاریٰ پر صدقہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ پس وہ سراً زکوٰۃ کی تقسیم کا حکم دے رہا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ مردود ہے بالخصوص سلف صالحین کے نزدیک اور علامہ طبری نے کہا ہے: لوگوں نے اس پر اجماع کیا ہے کہ واجب صدقہ میں اظہار افضل ہے۔

میں کہتا ہوں: الکیا الطبری نے ذکر کیا ہے کہ اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ مطلقاً صدقات میں اخفا اولیٰ ہے اور یہ فقیر کا حق ہے اور صاحب مال کے لئے جائز ہے کہ وہ صدقات بذات خود تقسیم کرے۔ جیسا کہ حضرت امام شافعی کا ایک قول ہے اور ان کے دوسرے قول کے مطابق انہوں نے یہ ذکر کیا ہے کہ یہاں صدقات سے مراد نفلی صدقات ہیں نہ کہ وہ فرض جسے ظاہر کرنا اولیٰ ہے تاکہ اسے کوئی تہمت لاحق نہ ہو۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ نفلی نماز انفرادی طور پر پڑھنا افضل ہے (یعنی بغیر جماعت کے) اور فرض نماز میں جماعت تہمت سے دور رکھنے والی ہے۔

اور مہدوی نے کہا ہے: آیت سے مراد فرض زکوٰۃ بھی ہے اور نفلی صدقات بھی۔ پس حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ

1۔ طبرانی، الکبیر، حدیث 8014

مقدس میں اخفا افضل تھا پھر اس کے بعد لوگوں کے خیالات اور گمان غلط ہو گئے تو علماء نے فرائض میں اظہار کو مستحسن قرار دیا تا کہ کسی کے بارے عدم ادائیگی کا گمان نہ کیا جائے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول آثار و روایات کے خلاف ہے اور یہ ہمارے زمانے میں فرض صدقہ میں اخفا کے مستحسن ہونے کو مشتبہ کرتا ہے اور اس کے مانع کثیر ہیں اور اسے اعلانیہ نکالنا ریا کے لئے پیش کرنا ہوگا۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے کہ یہ بھی جائز ہے کہ آیت سے فرض زکوٰۃ اور نفل صدقہ مراد لیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اخفا کا ذکر کیا ہے اور اس کی مدح کی ہے اور اظہار کا ذکر کیا ہے اور اس کی بھی مدح کی ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ دونوں کی طرف اکٹھا متوجہ ہوا جائے۔

اور نقاش نے کہا ہے: بے شک اس آیت کو اس قول باری تعالیٰ نے منسوخ کر دیا ہے: اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً الآیہ (البقرہ:274) (جو لوگ خرچ کیا کرتے ہیں اپنے مال رات میں اور دن میں چھپ کر اور علانیہ (تو ان کے لئے ان کا اجر ہے اپنے رب کے پاس)

قولہ تعالیٰ: فَنِعِمَّا هِیَ۔ یہ اظہار صدقہ پر تعریف ہے۔ پھر اس پر یہ حکم لگایا کہ اظہار سے اخفا بہتر ہے اسی لئے بعض حکماء نے کہا ہے جب تو نیکی کرے تو اسے مخفی رکھ اور جب تیرے ساتھ نیکی کی جائے تو تو اسے پھیلا'' (اذا اصطنعت المعروف فاسترہ و اذا اصطنع الیك فانشرہ)

دعبل الخزاعی نے کہا ہے:

اذا انتقموا اعلنوا امرهم وان انعموا انعموا باکتتام

جب وہ انتقام لیتے ہیں تو اپنے معاملے کا اعلان کرتے ہیں۔ اور اگر وہ نیکی اور احسان کریں تو وہ نیکی خاموشی اور پوشیدہ طور پر کرتے ہیں۔

اور سہل بن ہارون نے کہا ہے:

خل اذا جئته یوما لتسأله اعطاك ماملکت کفاہ و اعتذرا

تو چھوڑ دے جب تو کسی دن مانگنے اور سوال کرنے کے لئے اس کے پاس آئے اس نے تجھے وہ عطا کر دیا ہے جس کا تو مالک ہے تو اسے کافی سمجھ اور اس کا عذر قبول کر لے۔

یخفی صنائعه واللهُ یُظْهِرها ان الجمیل اذا اخفیته ظَهَرَا

وہ اپنے کارناموں کو چھپاتا ہے اور اللہ تعالیٰ انہیں ظاہر کرتا ہے۔ بلاشبہ نیکی کو جب تو مخفی رکھے تو وہ ظاہر ہو جاتی ہے۔

حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: کوئی نیکی تین خصلتوں کے سوا مکمل نہیں ہوتی: اسے جلدی کرنا، اسے صغیر سمجھنا اور اسے مخفی رکھنا، جب تو نے اسے جلدی کر لیا تو تو نے اسے حاصل کر لیا اور جب تو نے اسے چھوٹا سمجھا تو تو نے اسے عظیم بنا دیا اور جب تو نے اسے مخفی رکھا تو تو نے اسے مکمل کر دیا اور بعض شعراء نے کہا ہے اور خوب اچھا کہا ہے:

زاد معروفُك عندی عِظَما انه عندك مستور حقیر

تیری نیکی میرے نزدیک بہت عظیم اور بڑی ہے بلاشبہ وہ تیرے نزدیک چھپی ہوئی اور حقیر ہے۔

تتناساہ کأن لم تأتہ و ھو عند الناس مشھور خطیر

تو اسے بھلا دیتا ہے گویا تو نے اسے کیا ہی نہیں حالانکہ وہ لوگوں کے نزدیک بہت زیادہ مشہور ہوتی ہے۔

قراء نے قول باری تعالیٰ فَنِعِمَّا هِیَ میں اختلاف کیا ہے۔ پس ابوعمرو اور نافع نے ورش کی روایت میں، عاصم نے روایت حفص میں اور ابن کثیر نے فَنِعِمَّا هِیَ کو نون اور عین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور ابوعمرو نے بھی اور نافع نے ورش کی روایت کے سوا میں اور عاصم نے ابوبکر اور مفضل کی روایت میں فَنِعِمَّا نون کے فتحہ اور عین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور تمام نے میم کو ساکن کیا ہے۔

اور قرآن کے علاوہ دوسرے کلام میں فَنِعْمَ مَاھِیَ پڑھنا بھی جائز ہے۔

نحاس نے کہا ہے لیکن چونکہ یہ سواد میں متصل ہے اس لئے ادغام لازم ہے۔

علمائے نحو نے نِعْمَ میں چار لغات بیان کی ہیں: نَعِمَ الرجلُ زیدٌ، یہ اصل ہے اور نِعِمَ الرجل یعنی عین کے کسرہ کی وجہ سے نون کے کسرہ کے ساتھ اور نَعْمَ الرجل یعنی نون کے فتحہ اور عین کے سکون کے ساتھ۔ یہ اصل میں نَعِمَ تھا کسرہ کو ثقیل ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا گیا اور نِعْمَ الرجلُ اور یہ افصح اللغات ہے، اس میں بھی اصل نَعِمَ ہے۔ اور یہ ہر مدح اور تعریف کے محل میں واقع ہوتا ہے پھر اس میں تخفیف کی گئی اور عین کا کسرہ نون کو دے دیا گیا اور عین کو ساکن کر دیا گیا۔

اور جنہوں نے فَنِعِمَّا هِیَ پڑھا ہے تو اس کی دو تقدیریں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ ان کی لغت کے مطابق ہو جو نِعِم کہتے ہیں اور دوسری تقدیر یہ ہے کہ یہ جید اور عمدہ لغت پر ہو۔ پس اصل نِعْمَ ہوگا۔ پھر التقائے ساکنین کی وجہ سے عین کو کسرہ دے دیا گیا۔ نحاس نے کہا ہے کہ ابوعمرو اور نافع سے عین کے ساکن ہونے کے بارے جو قول بیان کیا گیا ہے وہ محال ہے۔ محمد بن یزید سے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ اگر عین ساکن ہو اور میم مشدد ہو تو کوئی بھی اسے بولنے کی قدرت نہیں رکھتا بلکہ وہ دو ساکنوں کو جمع کرنے کا قصد کرے گا اور حرکت دے گا اور اس کا کوئی بھی انکار نہیں کرتا۔

اور ابوعلی نے کہا ہے: جس نے عین کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے اس کا قول صحیح نہیں ہے کیونکہ اس نے دو ساکنوں کو جمع کر دیا ہے اور ان میں سے پہلا حرف مد ولین نہیں ہے اور وہ نحویوں کے نزدیک تب جائز ہوتا ہے جب کہ پہلا حرف مدہ ہو، کیونکہ مد حرکت کے عوض ہوتی ہے اور یہ اسی طرح ہے جیسا کہ دابّة اور ضَوّال وغیرہ، شاید ابوعمرو نے حرکت کو مخفی رکھا ہے اور اسے پر کئے بغیر پڑھا ہے۔ جیسا کہ انہوں نے بَارِئِکُمْ...... اور یَأْمُرُکُمْ میں اخفا کیا ہے اور سامع نے سمع اور خفا میں لطف کے سبب اخفا کو اسکان گمان کر لیا ہے۔ ابوعلی نے کہا ہے اور جنہوں نے نَعِمَّا نون کے فتحہ اور عین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے تو وہ کلمہ کو اپنے اصل پر لائے ہیں۔ اور اسی سے شاعر کا یہ قول ہے:

ما أقلّتْ قدمایَ اِنھُمْ نَعِمَ الساعون فی الأمر المُبِر

میرے قدم کمزور نہیں ہیں بلاشبہ وہ نیکی کے معاملہ میں کوشش اور سعی کرنے والے بہت اچھے ہیں۔

ابو علی نے کہا ہے: قول باری تعالیٰ: نِعِمَّا میں ما محل نصب میں ہے اور قولہ ھِیَ یہ اس فاعل کی تفسیر ہے جو اس سے پہلے مضمر مذکور ہے۔ اور تقدیر عبارت نعم شیئا ابداؤہ (اسے ظاہر کرنا کتنی اچھی شے ہے) اور الابداء ہی مخصوص بالمدح ہے، مگر مضاف کو حذف کر دیا گیا اور مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھ دیا گیا اور اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ دلالت کرتا ہے یعنی الاخفاء خیر۔ پس جس طرح یہاں ضمیر اخفا کے لئے ہے صدقات کے لئے نہیں ہے۔ پس اسی طرح پہلا فاعل وہ الابداء ہے اور وہی ہے جس کے ساتھ ضمیر متصل ہے، پھر الابداء کو حذف کر دیا گیا اور صدقات کی ضمیر کو اسی کی مثل اس کی جگہ رکھ دیا گیا۔

وَ اِنْ تُخْفُوْهَا یہ شرط ہے، اسی لئے نون کو حذف کر دیا گیا ہے اور وَ تُؤْتُوْهَا کو اس پر عطف کیا گیا ہے اور جواب شرط فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ يُكَفِّرُ قراء نے اس کی قراءت میں اختلاف کیا ہے۔ پس ابو عمرو، ابن کثیر اور عاصم نے ابو بکر کی روایت میں، قتادہ اور ابن ابی اسحاق تمام نے وَ نُكَفِّرُ نون اور را کے رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور (نافع)، حمزہ اور کسائی نے نون کے ساتھ اور را کو جزم کے ساتھ پڑھا ہے اور اسی طرح حضرت عاصم سے بھی مروی ہے اور حسین بن علی الجعفی نے اعمش سے روایت کیا ہے يُكَفِّرَ یعنی را کو منصوب پڑھا ہے۔ ابن عامر نے یا کے ساتھ اور را کو مرفوع پڑھا ہے اور اسے حفص نے عاصم سے روایت کیا ہے اور اسی طرح حسن سے بھی مروی ہے اور ان سے یا اور جزم کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے وَ تُكَفِّرْ یعنی تا کے ساتھ، فا کو کسرہ کے ساتھ اور را کو جزم کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور عکرمہ نے وَ تُكَفَّرْ پڑھا ہے یعنی تا کے ساتھ اور فا کو مفتوح اور را کو مجزوم۔ اور مہدوی نے ابن ہرمز سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے وَ تُكَفِّرُ تا کے ساتھ اور را کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور عکرمہ اور شہر بن حوشب سے بیان کیا گیا ہے کہ ان دونوں نے تا کے ساتھ اور را کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ پس یہ نو قراءتیں ہیں میں انہیں بیان کرتا ہوں۔ وَ نُكَفِّرُ یعنی نون اور رفع کے ساتھ۔ یہ امام خلیل اور سیبویہ کا قول ہے۔ نحاس نے بیان کیا ہے کہ سیبویہ نے کہا ہے کہ یہاں رفع کی ایک ہی وجہ ہے اور وہی جید اور عمدہ ہے کیونکہ فا کے بعد کلام غیر جزا کے قائم مقام ہوتا ہے اور معنی پر محمول کرتے ہوئے انہوں نے جزم کو جائز قرار دیا ہے کیونکہ معنی یہ ہے: وان تخفوھا و تؤتوھا الفقراء یکن خیرا لکم و نکفر عنکم (اور اگر تم صدقوں کو پوشیدہ رکھو اور انہیں فقیروں کو دو تو وہ تمہارے لئے بہتر ہوگا اور ہم تم سے بعض گناہ مٹا دیں گے۔)

اور ابو حاتم نے کہا ہے: اعمش نے پڑھا ہے يُكَفِّرْ یا کے ساتھ پڑھا ہے اور اس سے پہلے واؤ نہیں ہے۔

نحاس نے کہا ہے: وہ جو ابو حاتم نے اعمش سے بغیر واؤ کے جزم کے ساتھ بیان کیا ہے تو وہ بدل کے طور پر ہے گویا وہ فا کے محل میں ہے اور وہ جو عاصم سے وَ يُكَفِّرُ یا اور رفع کے ساتھ مروی ہے اس کا معنی ہے: وَ يُكَفِّرُ اللہ (اور اللہ تعالیٰ مٹا دے گا) اور ابو عبید کا قول ہے۔ اور ابو حاتم نے کہا ہے: اس کا معنی ہے يُكَفِّرُ الاعطاء (یعنی صدقہ دینا مٹا دے گا) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے وَ تُكَفِّرْ پڑھا ہے۔ اس کا معنی ہوگا اور صدقات مٹا دیں گے۔ المختصر یہ کہ ان قراءتوں میں سے جو نون کے ساتھ ہیں تو

وہ نوان نون عظمت ہے اور جو تا کے ساتھ ہیں تو ان سے مراد صدقہ ہے۔ پس تو اسے یاد کر لے۔ سوائے اس کے جو عکرمہ سے فی کے فتحہ کے ساتھ مروی ہے کیونکہ اس قراءت میں تا دہ سیئات کے لئے ہے اور ان میں سے جو قراءت یا کے ساتھ ہے تو اس میں مٹانے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ اور خفیۃً صدقہ دینا بھی انہیں مٹانے والا ہے اسے مکی نے بیان کیا ہے۔

اور رہا را کا رفع تو اس کی دو وجہیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ فعل مبتدا کی خبر ہو اور تقدیر کلام ہو: و نحن نکفر یا وھو تکفر۔ یعنی صدقہ مٹا دے گا۔ یا واللہ یکفر (اور اللہ تعالیٰ مٹا دے گا) اور دوسری وجہ قطع اور استئناف ہے واو عطفا اشتراک کے لئے نہ ہوگی بلکہ جملہ کلام کو جملہ پر عطف کیا جائیگا۔ اور ہم نے جزم کی قراءت کا معنی ذکر کر دیا ہے اور جہاں تک نصب کا تعلق ہے وَنُكَفِّرَ تو یہ ضعیف ہے اور یہ ان مضمرہ کی بنا پر ہے اور یہ بعد کی بنا پر جائز ہے۔ مہدوی نے کہا ہے: یہ جواب استفہام میں نصب کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے، کیونکہ جزا کے ساتھ غیر کے وجوب کے سبب شے واجب ہوتی ہے جیسا کہ استفہام۔ ان قراءتوں میں را پر جزم افصح ہے، کیونکہ یہ تکفیر کے جزا میں داخل ہونے کی خبر دیتی ہے اور اس کے مشروط ہونے کی (اس شرط کے ساتھ) کہ اگر اخفا واقع ہو اور جہاں تک رفع کا تعلق ہے تو اس میں یہ معنی نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ وہ اختلاف ہے جسے خلیل اور سیبویہ نے اختیار کیا ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ میں مِّنْ صرف تبعیض کے لئے ہے۔ اور علامہ طبری نے ایک جماعت سے بیان کیا ہے کہ یہ زائدہ ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ ان سے خطا ہوئی ہے۔ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ۔ یہ وعدہ بھی ہے اور وعید بھی۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝

"نہیں ہے آپ کے ذمہ ان کو سیدھی راہ پر چلانا ہاں اللہ سیدھی راہ پر چلاتا ہے جسے چاہتا ہے اور جو کچھ تم خرچ کرو (اپنے) مال سے تو (اس میں) تمہارا اپنا فائدہ ہے۔ اور تم تو خرچ ہی نہیں کرتے ہو سوائے اللہ تعالیٰ کی رضا طلبی کے اور جتنا کچھ تم خرچ کرو گے (اپنے) مال سے پورا ادا کر دیا جائے گا تمہیں اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔"

قولہ تعالیٰ: لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ۔ اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ۔ یہ کلام صدقات کے ذکر کے ساتھ متصل ہے، تو گویا اس میں مشرکین کو صدقہ دینے کے جواز کو بیان کیا ہے۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے سبب نزول کے بارے میں مرسل روایت بیان کی ہے کہ مسلمان ذمی لوگوں میں سے فقراء کو صدقہ دیتے رہتے تھے۔ جب مسلمان فقراء زیادہ ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا تتصدقوا الا على أهل دينكم تم اپنے اہل دین کے سوا کسی کو صدقہ نہ دو۔ تو یہ آیت نازل ہوئی جو ان کے لئے صدقہ مباح کر رہی ہے جو دین اسلام پر نہیں ہیں۔

اور نقاش نے ذکر کیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صدقات لائے جاتے تھے۔ پس ایک یہودی آپ صلی اللہ علیہ وسلم

کے پاس آیا اور اس نے کہا: مجھے کچھ عطا فرمائیے تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لیس لك من صدقة المسلمین شئ (تیرے لئے مسلمانوں کے صدقہ میں سے کوئی شے نہیں ہے۔) پس وہ یہودی ابھی تھوڑی دور ہی گیا تھا تو یہ آیت نازل ہو گئی: لَیْسَ عَلَیْكَ هُدٰىهُمْ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلایا اور اسے مال عطا فرما دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے آیت صدقات کے ساتھ منسوخ کر دیا۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا: انصار میں سے کچھ لوگوں کی بنی قریظہ اور بنی نضیر کے ساتھ رشتہ داریاں تھیں اور وہ انہیں اس تصور اور رغبت کے تحت صدقات نہیں دیتے تھے کہ جب وہ محتاج ہوں گے تو اسلام قبول کریں گے۔ پس یہ آیت ان کے سبب سے نازل ہوئی۔

اور بعض مفسرین نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیٹی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے ارادہ کیا کہ وہ اپنے دادا ابو قحافہ کو کچھ دے پھر وہ اس سے رک گئیں اس لئے کہ وہ کافر ہیں۔ تب اس بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

اور علامہ طبری نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا صدقہ روکنے سے مقصود یہ تھا تا کہ وہ لوگ اسلام قبول کر لیں اور دین میں داخل ہو جائیں، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو فرمایا: لَیْسَ عَلَیْكَ هُدٰىهُمْ (ان کو سیدھی راہ پر چلانا آپ کے ذمہ نہیں ہے۔)

اور یہ قول بھی ہے کہ لَیْسَ عَلَیْكَ هُدٰىهُمْ ماقبل سے متصل نہیں ہے۔ پس یہ صدقات کے بارے میں اور انہیں کفار پر خرچ کرنے کے بارے میں ظاہر ہے بلکہ یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا معنی ابتدائے کلام ہو۔

مسئلہ نمبر 2۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ صدقہ جو ان کے لئے مباح کیا گیا ہے جیسا کہ مذکورہ آثار اسے متضمن ہیں یہ نفلی صدقہ ہے اور جہاں تک فرض زکوٰۃ کا تعلق ہے تو وہ کسی کافر کو دینا جائز نہیں ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا ارشاد گرامی ہے: "مجھے حکم فرمایا گیا ہے کہ میں تمہارے اغنیاء اور خوشحال لوگوں سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کروں اور اسے تمہارے فقراء کی طرف لوٹا دوں (1)۔" ابن منذر نے کہا ہے: اہل علم میں سے وہ تمام جن سے روایات محفوظ کی جاتی ہیں ان تمام نے اس پر اجماع کیا ہے کہ ذمی کو مالوں کی زکوٰۃ میں سے کوئی شے نہ دی جائے گی، پھر انہوں نے ان میں سے ایک جماعت کا ذکر کیا ہے جنہوں نے اسے بیان کیا ہے اور کوئی اختلاف ذکر نہیں کیا۔

اور مہدوی نے بیان کیا ہے: مسلمانوں کو رخصت دی گئی ہے کہ وہ اس آیت کے تحت اپنے مشرک قرابتداروں کو فرض زکوٰۃ میں سے دیں۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ بالا جماع مردود ہے۔ واللہ اعلم۔

اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: انہیں صدقہ فطر دیا جا سکتا ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: یہ ضعیف ہے اس کی کوئی اصل نہیں ہے اور ہماری دلیل یہ ہے کہ یہ صدقہ پاک کرنے والا اور واجب ہے لہٰذا کسی کافر کو نہیں دیا جائے گا جیسا کہ چوپائے اور عمدہ مال کا صدقہ۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اغنوھم عن سوال ھذا الیوم تم انہیں اس دن یعنی عید الفطر کے دن سوال کرنے سے غنی کر دو۔ (یعنی تم انہیں اتنا دے دو کہ وہ اس دن سوال کرنے کے محتاج نہ رہیں۔)

1۔ صحیح بخاری، باب ماجاء فی العلم، حدیث نمبر 61، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ ان کے عید اور نماز عید میں مشغول ہونے کے سبب ہے اور یہ مشرکین میں ثابت نہیں ہوتا۔ اور صدقہ فطر غیر مسلم کو دینا ان کے قول کے مطابق جائز ہے جنہوں نے اسے سنت قرار دیا ہے اور ہمارے نزدیک دو قولوں میں سے ایک یہی ہے۔ اور یہی امام ابوحنیفہ کا قول ہے جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے وہ آیت کو نیکی، کھانا کھلانے اور صدقات کے اطلاق میں عام قرار دیتے ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ حکم ان مسلمانوں کے لئے متصور ہے جو اہل ذمہ کے ساتھ اور اہل حرب میں سے جنہیں غلام بنایا گیا ہے ان کے ساتھ ہیں۔

میں کہتا ہوں: قرآن کریم میں ہے: وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝ (الدہر) (اور جو کھانا کھلاتے ہیں اللہ کی محبت میں مسکین، یتیم اور قیدی کو۔)

اور اسیر (قیدی) دارالاسلام میں ہوتا ہے اور وہ مشرک ہی ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ (الممتحنہ: 8) (اللہ تعالیٰ تمہیں منع نہیں کرتا کہ جن لوگوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کی اور نہ انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا کہ تم ان کے ساتھ احسان کرو اور ان کے ساتھ انصاف کا برتاؤ کرو۔)

پس ان آیات کا ظاہر انہیں جملہ صدقات دینے کے جواز کا تقاضا کرتا ہے، مگر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرض زکوٰۃ کو خاص کر دیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ''ان کے اغنیاء اور خوشحال لوگوں سے صدقہ لو اور ان کے فقراء پر لوٹا دو (1)۔'' اور اس پر علماء نے اتفاق کیا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ پس جب وہ محتاج ہوں تو انہیں نفلی صدقات میں سے دیا جائے گا۔ واللہ اعلم۔

ابن عربی نے کہا ہے: رہا گنہگار مسلمان تو اس بارے کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اسے صدقہ فطر دیا جائے گا مگر جب وہ ارکان اسلام نماز، روزہ وغیرہ کو چھوڑ دے تو پھر اسے صدقہ نہیں دیا جائے گا یہاں تک کہ وہ توبہ کر لے۔ اور تمام گنہگار جو کہ گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں انہیں مسلمانوں میں سے شامل ہونے کی وجہ سے صدقہ دیا جائے گا اور صحیح مسلم میں ہے (2) کہ وہ آدمی جس نے کسی غنی، چور اور زانی کو صدقہ دیا اور اس کا صدقہ قبول کر لیا گیا۔ اس کا بیان آگے آیۃ الصدقات میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ یعنی اللہ تعالیٰ رہنمائی فرماتا ہے جس کی چاہتا ہے۔ اس میں قدریہ اور معتزلہ کے گروہوں کا رد ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۔ یہ شرط اور اس کا جواب ہے۔ اور اس آیت میں خَيْرٍ سے مراد مال ہے، کیونکہ یہ انفاق کے ذکر سے مقترن ہے اور یہ قرینہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس سے مراد مال ہے اور جہاں ایسے قرینہ سے مقترن نہ ہو جو اس سے مراد مال ہونے پر دلالت کرتا ہو تو پھر یہ لازم نہیں ہے کہ یہ مال کے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الزکاۃ، حدیث نمبر 1308، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب اذا تصدق علی غنی وھو لایعلم، حدیث نمبر 1332، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

معنی میں ہو۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: خَیْرٌ مُّسْتَقَرًّا (الفرقان: 24) اور مزید ارشاد ہے: مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ ۝ (الزلزلة) الی غیر ذالك۔ اور یہ عکرمہ کے اس قول سے پرہیز اور احتیاط کرتا ہے کہ کتاب اللہ میں جہاں کہیں لفظ خیر ہے وہ مال کے معنی میں ہے۔

اور بیان کیا جاتا ہے کہ بعض علماء بہت سی نیکیاں کرتے ہیں پھر حلف اٹھا دیتے ہیں کہ اس نے کسی کے ساتھ خیر (نیکی) نہیں کی۔ تو اس بارے میں اسے کہا جائے تو وہ کہتا ہے: بلاشبہ میں نے اپنے ساتھ یہ عمل کیا ہے اور یہ آیت تلاوت کرتا ہے: وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ وہ نفقہ جو قبولیت کے ساتھ شمار کیا جاتا ہے وہ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا چاہنے کے لئے ہو۔ اور ابْتِغَآءَ یہ مفعول لہ ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لئے شہادت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی چاہنے کے لئے خرچ کرتے ہیں اور یہ آیت ان کی فضیلت اور مدح کے محل میں وارد ہوئی ہے اور پہلی تاویل کی بنا پر یہ ان پر شرط عائد کرنا ہے اور پھر یہ شرط ان کے علاوہ پوری امت کو شامل ہوگی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو ارشاد فرمایا: انك لن تنفق نفقة تبتغی بها وجه الله تعالیٰ الا اجرت بها حتی ما تجعل فی فی امرأتك(1) (بلاشبہ تو ہرگز کوئی نفقہ خرچ نہیں کرے گا جس سے تو اللہ تعالیٰ کی رضا چاہے گا مگر تجھے اس کے عوض اجرت دی جائے گی یہاں تک کہ جو کچھ تو اپنی بیوی کے منہ میں بھی ڈالے گا۔)

قولہ تعالیٰ: وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ یُّوَفَّ اِلَیْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ. یُوَفَّ اِلَیْكُمْ یہ قول باری تعالیٰ: وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ کے لئے تاکید اور بیان ہے اور یہ کہ خرچ کرنے والوں کو خرچ کرنے کا ثواب پورا پورا دیا جائے گا اور اس سے کوئی شے کم نہیں کی جائے گی۔ پس یہی کمی ان کے لئے ظلم ہوگی۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ ۫ یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمٰهُمْ ۚ لَا یَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ۝

"(خیرات) ان فقیروں کے لئے جو روکے گئے ہیں اللہ کی راہ میں نہیں فرصت ملتی انہیں (روزی کمانے کے لئے) چلنے پھرنے کی زمین میں۔ خیال کرتا ہے انہیں ناواقف (کہ یہ) مالدار (ہیں) بوجہ ان کے سوال نہ کرنے کے۔ (اے حبیب! صلی اللہ علیہ وسلم) آپ پہچانتے ہیں انہیں ان کی صورت سے۔ یہ نہیں مانگا کرتے لوگوں سے لپٹ کر اور جو کچھ تم خرچ کرو گے (اپنے) مال سے پس یقیناً اللہ تعالیٰ اسے خوب جاننے والا ہے۔"

اس میں دس مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: لِلْفُقَرَآءِ۔ اس میں لام وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ کے متعلق ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، حدیث نمبر 54، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ محذوف کے متعلق ہے اور تقدیر عبارت ہے: الانفاق او الصدقة للفقراء۔ سدی، مجاہد وغیرہما نے کہا ہے: ان فقراء سے مراد فقراء مہاجرین ہیں جو قریش اور دوسرے قبائل سے تعلق رکھتے تھے، پھر یہ آیت ہر اس کو شامل ہے جو مستقبل میں فقراء کی صفت کے تحت داخل ہوگا اور مہاجرین فقراء کو ذکر کے ساتھ خاص اس لئے کیا گیا ہے کیونکہ وہاں ان کے سوا کوئی (فقیر) نہ تھا۔ اور یہ فقراء اہل صفہ تھے اور تقریباً چار سو افراد تھے، وہ فقر و افلاس کی حالت میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آتے تھے نہ ان کے اہل و عیال تھے اور نہ ہی ان کے پاس کوئی مال تھا۔ پس ان کے لئے رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں ایک صفہ (سایہ دار چبوترہ) تعمیر کیا گیا۔ پس ان کو اہل صفہ کہا گیا۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے: میں اہل صفہ میں سے تھا جب شام ہوتی تھی تو ہم رسول اللہ ﷺ کے دروازے پر حاضر ہوتے تھے تو آپ ﷺ ہر آدمی کو حکم ارشاد فرماتے تھے اور وہ ایک آدمی کو ساتھ لے جاتا تھا۔ اور اہل صفہ میں سے جو باقی رہ جاتے وہ دس یا اس سے کم افراد ہوتے تو حضور نبی مکرم ﷺ اپنا شام کا کھانا لے آتے اور ہم آپ ﷺ کے ساتھ کھانا تناول کر لیتے اور جب ہم فارغ ہوتے تو رسول اللہ ﷺ فرماتے: ناموا فی المسجد مسجد میں جا کر سو جاؤ۔''

اور ترمذی نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: (یہ آیت) وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ ہم گروہ انصار کے بارے میں نازل ہوئی، ہم کھجوروں کے مالک تھے، فرمایا: ہر آدمی اپنے درخت سے اپنی حیثیت کے مطابق زیادہ یا کم کھجوریں لاتا تھا اور کوئی آدمی ایک خوشہ اور دو خوشے لے کر آتا تھا اور انہیں مسجد میں لٹکا دیتا تھا اور اہل صفہ کے لئے کوئی کھانے کی شے نہ ہوتی تھی تو ان میں سے جب کسی کو بھوک ستاتی تھی تو وہ اس خوشے کے پاس آتا، اسے اپنا عصا مارتا، تو اس سے خشک اور پکی کھجوریں گر پڑتی اور وہ کھا لیتا تھا اور کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اچھی اور عمدہ شے میں رغبت نہ رکھتے تھے اور وہ ایسا خوشہ لے آتے جس میں ردی اور گھٹیا قسم کی کھجوریں ہوتی تھیں۔ اور کوئی ایسا خوشہ لے کر آتا جو ٹوٹا ہوا ہوتا اور وہ اسے مسجد میں لٹکا دیتا۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: يَاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۖ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ

فرمایا: اگر تم میں سے کسی کو ایسا ہدیہ دیا جائے جیسا اس نے دیا ہے تو وہ اسے نہ لے گا مگر چشم پوشی کرتے ہوئے اور حیاء کرتے ہوئے۔ فرمایا: پس اس کے بعد ہم میں سے ہر آدمی وہی لاتا تھا جو اس کے پاس عمدہ اور اچھی شے ہوتی تھی۔ فرمایا: یہ حدیث حسن، غریب، صحیح ہے۔

ہمارے علماء نے بیان کیا ہے کہ وہ مسجد میں ضرورت کے تحت رہتے تھے اور ضرورت کے تحت ہی صدقہ وغیرہ کھاتے تھے۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر خوشحالی کے دروازے کھول دیئے وہ اس حالت سے مستغنی ہو گئے اور نکل گئے پھر وہ مالک بن گئے اور حاکم بن گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان فقراء مہاجرین کے وہ احوال بیان کئے جو ان پر واپس مڑنے کو واجب کرتے ہیں اور فرمایا: الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اور معنی ہے وہ جو روک دیئے گئے۔ حضرت قتادہ اور ابن زید نے کہا ہے: اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کا معنی ہے: جنہوں نے اپنے آپ کو دشمن کے خوف سے اپنے کاروبار میں تصرف کرنے

سے روک لیا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ وہ زمین میں چلنے پھرنے کی استطاعت نہیں رکھتے کیونکہ تمام شہر مکمل طور پر کفر کے زیر تسلط ہیں اور یہ ابتدائے اسلام میں تھا اور انہیں اکتساب دولت سے باز رکھنے کی علت جہاد تھا اور کفار کا اسلام قبول کرنے سے انکار کرنا کاروبار تجارت میں تصرف کرنے سے مانع تھا۔ نتیجتاً وہ فقراء ہی باقی رہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ کا معنی ہے یعنی کیونکہ انہوں نے جہاد کو لازم پکڑ لیا ہے اور پہلا معنی زیادہ واضح اور ظاہر ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ یعنی بے شک ان کے سوال کرنے اور مانگنے کو چھوڑنے اور ترک کرنے کے سبب اور ان کے اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے کے سبب ناواقف لوگ انہیں مالدار اور اغنیاء گمان کرتے ہیں۔ اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ لفظ فقر کا اطلاق اس پر بھی کرنا جائز ہے جس کا لباس بہت قیمتی ہو اور وہ اسے زکوٰۃ دینے سے مانع نہیں ہوتا۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو زکوٰۃ دینے کا حکم ارشاد فرمایا ہے اور وہ ان مہاجرین میں سے تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں جہاد کرتے تھے نہ وہ مریض تھے اور نہ ہی اندھے۔ اور التَّعَفُّفِ یہ تفعل کے وزن پر ہے اور یہ عفّ من الشئ سے مبالغہ کا وزن ہے جب کوئی اس شے سے رکا رہے اور اس کی طلب سے احتیاط برتے۔ اس معنی کے ساتھ حضرت قتادہ وغیرہ نے تفسیر بیان کی ہے اور یحسبھم میں سین کو فتحہ اور کسرہ دونوں دیئے گئے ہیں اور یہ دو لغتیں ہیں۔ ابو علی نے کہا ہے: فتحہ زیادہ قیاس کے مطابق ہے کیونکہ اس کی ماضی میں عین کلمہ مکسور ہے۔ پس اس کا باب مضارع میں مفتوح آتا ہے اور کسرہ کے ساتھ پڑھنا اچھا اور حسین ہے۔ کیونکہ سماع اسی طرح ہے۔ اگرچہ یہ قیاس کے مقابلہ میں شاذ ہے اور مِنَ التَّعَفُّفِ میں مِنَ ابتدائے غایت کے لئے ہے اور بعض نے کہا ہے: یہ بیان جنس کے لئے ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمٰهُمْ اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ شکل وصورت سے کسی پر جو آثار ظاہر ہوتے ہیں ان کا اعتبار میں خاصا اثر ہوتا ہے، یہاں تک کہ جب ہم کسی میت کو دار الاسلام میں دیکھیں اور اس پر زنار ہو (مراد وہ دھاگا سا ہے جو ذمی لوگ اپنی کمر میں باندھتے ہیں) اور وہ غیر مختون ہو تو اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کیا جائے گا۔ اور اکثر علماء کے قول کے مطابق اسے دار کے حکم پر آگے کر دیا جائے گا اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے: وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِیْ لَحْنِ الْقَوْلِ (محمد: ۳۰) (اور آپ ضرور پہچان لیا کریں گے انہیں ان کے انداز گفتگو سے)

پس یہ آیت ایسے آدمی کو صدقہ دینا جائز ہونے پر دلیل ہے جس کے پاس اپنے وقار کو برقرار رکھنے کے لئے لباس، کپڑے وغیرہ موجود ہوں۔ اور علماء نے اس پر اتفاق کیا ہے۔ اگرچہ اس کے بعد اس مقدار میں انہوں نے اختلاف کیا ہے جو ضرورت مند ہونے کی صورت میں وہ لے سکتا ہے۔ پس امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اتنی مقدار کا اعتبار کیا ہے جس میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک سال کی خوراک کا اعتبار کیا ہے اور امام مالکؒ نے چالیس درہم کا اعتبار کیا ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کمانے والے کو زکوٰۃ کا مصرف قرار نہیں دیتے۔

اور السیمیا (الف مقصورہ کے ساتھ) اس کا معنی علامت، نشانی ہے اور کبھی اسے مد کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے اور کہا جاتا

ہے: السیماء۔ اور یہاں اس کے معنی کی تعیین میں علماء کا اختلاف ہے۔

حضرت مجاہد نے کہا ہے: اس سے مراد خشوع اور تواضع ہے۔ سدیؒ نے کہا ہے: ان کے چہروں پر حاجت اور فاقہ کشی اور تنگدستی کا اثر مراد ہے۔ ابن زید نے کہا ہے: ان کے کپڑوں کا پھٹا پرانا ہونا مراد ہے اور ایک قوم نے کہا ہے اور اسے مکی نے بیان کیا ہے کہ اس سے مراد سجدوں کا اثر ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول اچھا ہے اور یہ اس لئے کہ وہ فارغ اور توکل کرنے والے لوگ تھے ان کا زیادہ تر نماز کے سوا کوئی شغل نہ تھا۔ لہٰذا ان پر سجدوں کے نشانات تھے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: وہ سیما جس سے مراد سجدوں کا اثر ہے اس میں تو تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین مشترک ہیں اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفتح کے آخر میں ارشاد فرمایا ہے: سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ (الفتح: ۲۹) (ان (کے ایمان وعبادت) کی علامت ان کے چہروں پر سجدوں کے اثر سے نمایاں ہے۔)

لہٰذا اس معنی میں تو ان کے اور دوسروں کے درمیان کوئی فرق نہ رہا۔ پس کوئی معنی باقی نہ رہا مگر یہ کہ سیما سے مراد فقر و افلاس اور حاجت مند ہونے کا اثر ہو یا پھر سجدوں کے نشانات دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہوں، وہ رات کے قیام اور دن کے روزوں کی وجہ سے چہروں کی زردی سے پہچانے جاتے تھے۔ واللہ اعلم۔

اور رہا خشوع! تو اس کا محل دل ہے اور اس میں غنی اور فقیر سب مشترک ہوتے ہیں، نتیجتاً جو معنی ہم نے اختیار کیا ہے اس کے سوا کوئی باقی نہیں رہا۔ والموفق الالٰہ۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا۔ الحاف مصدر ہے جو حال کے محل میں واقع ہے، یعنی معنی ولحفین۔ کہا جاتا ہے: اَلحفَ، اَحْفٰی اور اَلَحَّ سوال میں اصرار کرنے کے معنی میں برابر ہیں اور کہا جاتا ہے۔ و لیس لِلْمُلْحِف مِثْلُ الرَّد۔

اور الالحاف اللحاف سے مشتق ہے۔ سوال کرنے اور مانگنے میں وجوہ طلب پر مشتمل ہونے کی وجہ سے اسے یہ نام دیا گیا ہے جیسا کہ اللحاف ڈھانپنے کے معنی کو شامل ہوتا ہے۔ یعنی یہ سائل عوام الناس سے اپنا سوال کرتا ہے اور اپنے سوال میں خوب اصرار کرتا ہے (گویا وہ ان کے ساتھ لپٹ کر سوال کر رہا ہے) اسی معنی میں ابن احمر کا یہ قول ہے:

فَظَلَّ يَحُفُّهُنَّ بِقَفْقَفَيْهِ و يَلْحَفُهُنَّ هَفْهَافًا ثَخِيْنَا

شاعر شتر مرغ کا ذکر کر رہا ہے کہ وہ انڈوں کو اپنے پیروں کے نیچے چھپا لیتے ہیں اور وہ ان پر اس طرح پر ڈال لیتا ہے جیسا کہ لحاف اور وہ اپنے سخت ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا باریک ہوتا ہے۔

نسائی اور مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے (1) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مسکین وہ نہیں ہے جسے ایک یا دو کھجوریں اور ایک یا دو لقمے دیئے جاتے ہیں بلکہ مسکین تو پاکدامن بننے والا (سوال کے لئے ہاتھ نہ پھیلانے والا) ہے اگر چاہو تو یہ پڑھ لو لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا۔

1۔ صحیح بخاری، باب لا یسئلون الناس الحافا، حدیث نمبر 4175، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مسئلہ نمبر 5۔ علماء نے قول باری تعالیٰ: لَا یَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا کے معنی میں دو مختلف قول بیان کئے ہیں: پس ایک گروہ نے کہا ہے جن میں طبری اور زجاج ہیں کہ اس کا معنی ہے: وہ قطعاً سوال نہیں کرتے اور یہ اس بنا پر ہے کہ وہ سوال سے کلی طور پر بچتے اور پاکدامن رہتے ہیں۔ یہی موقف جمہور مفسرین کا ہے اور پاکدامنی کی صفت ان کے لئے ثابت ہوتی ہے یعنی وہ لوگوں سے سوال نہیں کرتے نہ اصرار کے ساتھ اور نہ بغیر اصرار کے۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: اس سے مراد الحاف کی نفی ہے، یعنی وہ اصرار اور لپٹے بغیر تو سوال کرتے رہتے ہیں اور یہ فہم کے زیادہ قریب اور اس میں جلدی آنے والی شے ہے اور اس میں اس کی بری حالت پر تنبیہ ہے جو لوگوں سے لپٹ کر سوال کرتا ہے۔

ائمہ نے روایت کیا ہے اور الفاظ امام مسلم کے ہیں کہ حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم سوال میں اصرار نہ کرو قسم بخدا! تم میں سے کوئی بھی مجھ سے کسی شے کا سوال نہیں کرتا تو اس کا سوال اس کے لئے مجھ سے کوئی شے نکال لاتا ہے اور میں اسے ناپسند کرتا ہوں، پس اس کے لئے اس میں برکت رکھ دی جائے گی جو کچھ میں نے اسے عطا کیا۔''

اور مؤطا میں ہے، حضرت زید بن اسلم نے حضرت عطاء بن یسار سے اور انہوں نے بنی اسد کے ایک آدمی سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں اور میرے گھر والے بقیع غرقد میں اترے تو میرے گھر والوں نے مجھے کہا: تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا اور آپ سے ہمارے لئے کوئی چیز لے آتا کہ ہم اسے کھائیں اور وہ اپنی حاجت اور ضرورت ذکر کرنے لگے۔ پس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی کو سوال کرتے ہوئے پایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے فرما رہے تھے: لا أجد ما أعطيك میں کوئی ایسی شے نہیں پاتا جو میں تجھے دوں۔ وہ آدمی آپ سے پیٹھ پھیر کر لوٹا اس حال میں کہ وہ بڑے غصے میں تھا اور کہہ رہا تھا مجھے اپنی عمر کی قسم بلاشبہ آپ جسے چاہتے ہیں عطا فرماتے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بے شک یہ مجھ پر غصے ہو رہا ہے کہ میں نے اسے دینے کے لئے کوئی شے نہیں پائی۔ تم میں سے جس نے اس حال میں سوال کیا کہ اس کے پاس ایک اوقیہ (چاندی) یا اس کے برابر (سامان) ہو تو تحقیق اس نے بالاصرار اور لپٹ کر سوال کیا۔''

اسدی نے کہا ہے: پس میں نے کہا ہمارے لئے تو دودھ دینے والی ایک اونٹنی اوقیہ سے بہتر ہے۔

امام مالک نے کہا ہے: ایک اوقیہ میں چالیس درہم ہوتے ہیں.... اس آدمی نے بیان کیا تو میں واپس لوٹ گیا اور میں نے آپ سے کچھ نہ مانگا، پھر اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو اور کشمش لائے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ہمارے لئے تقسیم فرما دیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں غنی فرما دیا۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے اسی طرح اسے مالک نے روایت کیا ہے اور ہشام بن سعد وغیرہ نے ان کی اتباع کی ہے اور یہ حدیث صحیح ہے اور علماء کے نزدیک جب صحابی کا نام نہ لیا جائے تو اس کا حکم کسی دوسرے آدمی کے حکم کی طرح نہیں ہے جب اس کا نام نہ لیا جائے، کیونکہ تمام صحابہ کرام سے جرح اٹھ چکی ہے اور ان کے لئے عدالت ثابت ہے۔ یہ حدیث اس پر دلالت

کرتی ہے کہ اس کے لئے سوال کرنا مکروہ ہے جس کے پاس ایک اوقیہ چاندی ہو۔ پس جس نے سوال کیا اس میں کہ اس کے پاس یہ حد ہو اور اتنی مقدار اور تعداد میں چاندی یا وہ شے ہو جو اس کے قائم مقام ہوتی ہے اور وہ اس کے مساوی ہو تو وہ مُلْحِف ہے (یعنی لپٹ کر سوال کرنے والا ہے) اور میں اہل علم میں سے کسی کو نہیں جانتا مگر ہر کوئی اس کے لئے سوال کو مکروہ قرار دیتا ہے جس کے پاس اتنی مقدار میں چاندی ہو یا اس کے مساوی سونا ہو۔ یہ حکم اس حدیث کے ظاہر کی بنا پر ہے اور جو شے بغیر سوال کے کسی کے پاس آ جائے تو اس کے لئے اسے کھانا جائز ہے اگر وہ زکوٰۃ میں سے نہ ہو۔ اور یہ ان (مسائل) میں سے ہے جس میں میں کسی اختلاف سے واقف نہیں اور اگر وہ شے مال زکوٰۃ میں سے ہو تو اس میں اختلاف ہے اس کا بیان آیۃ الصدقات میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 6۔ ابن عبدالبر نے کہا ہے: سوال کے معانی اور اس کی کراہیت کے بارے میں فقہاء کے جوابات اور اہل ورع کا مذہب بیان کیا گیا ہے اس میں سے احسن ترین وہ ہے جسے اثرم نے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے۔ آپ سے سوال کرنے کے بارے میں پوچھا گیا کہ یہ کب حلال ہوتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: جب اس کے پاس اتنی شے بھی نہ ہو جس سے وہ اپنی صبح اور شام کا کھانا تیار کر سکے۔ یہ حضرت سہل بن حنظلیہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مطابق ہے (1)۔ ابوعبداللہ (یہ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی کنیت ہے) کو کہا گیا اگر وہ سوال کرنے پر مجبور ہو جائے، تو آپ نے فرمایا: جب وہ مجبور ہو جائے تو اس کے لئے مانگنا مباح ہے پھر کہا گیا: اور اگر وہ مانگنے سے باز رہے تو؟ آپ نے فرمایا: یہ اس کے لئے بہت بہتر ہے۔ پھر آپ نے فرمایا: میں کسی کے بارے یہ گمان نہیں رکھتا کہ وہ بھوک سے مر جائے گا! اللہ تعالیٰ اسے اس کا رزق ضرور عطا فرمائے گا۔ (ما اظن أحدا یموت من الجوع! اللہ یاتیہ برزقہ) پھر آپ نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر فرمائی: مَن استعف اعفہ اللہُ (2) جو پاکدامنی کا طالب ہو اللہ تعالیٰ اسے پاکدامن کر دے گا (یعنی جو سوال سے رکا رہا اللہ تعالیٰ اسے اس سے محفوظ کر دے گا۔)

اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: تَعَفَّفْ تو پاکدامن رہ (یعنی کسی سے نہ مانگ) ابوبکر نے بیان کیا ہے: میں نے آپ کو سنا۔ آپ سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا جا رہا تھا جس کے پاس کوئی شے نہیں ہوتی کیا وہ لوگوں سے سوال کر سکتا ہے یا مردار کھا سکتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: کیا وہ مردار کھا سکتا ہے جو ایسے آدمی کو پائے جس سے وہ کچھ مانگ سکتا ہو، یہ بہت شنیع اور برا ہے۔ مزید بیان کیا اور میں نے آپ سے یہ بھی سنا کہ آپ سے سوال کیا گیا کیا آدمی کسی دوسرے کے لئے مانگ سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں، البتہ وہ تعریض کر سکتا ہے۔ (یعنی اشارۃً توجہ اس کی طرف دلوا سکتا ہے) جیسا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت فرمایا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک قوم آئی وہ ننگے پاؤں تھے، بدن پر کپڑے نہ تھے اور اپنے جسموں کو اونی دھاری دار چادروں سے ڈھانپے ہوئے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

1۔ ابی داؤد، باب من یعطی من صدقۃ وحد الغناء، حدیث نمبر 1388، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب الاستعفاف عن المسالۃ، حدیث نمبر 1376، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابوعمر نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا: اعطوھم۔ تم انہیں دو تصدقوا (اے صحابہ!) تم صدقہ کرو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اشفعوا توجروا تم مدد کرو تم اجر دیئے جاؤ گے (1) تو اس میں دوسرے کے لئے سوال کا اطلاق ہے۔ واللہ اعلم۔ اور فرمایا: ألا رجل یتصدق علی ھذا کیا کوئی آدمی نہیں جو اس پر صدقہ کر سکتا ہو۔؟ ابوبکر نے بیان کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو کہا گیا ایک آدمی اس آدمی کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے: بے شک وہ محتاج ہے؟ تو آپ نے فرمایا: یہ تعریض ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بے شک سوال تب بنتا ہے کہ وہ کہے: أعطہ تو اسے دے۔ پھر فرمایا: میرے نزدیک یہ پسندیدہ نہیں ہے کہ آدمی اپنی ذات کے لئے سوال کرے تو پھر کسی دوسرے کے لئے یہ کیسے پسندیدہ ہو سکتا ہے؟ البتہ میرے نزدیک تعریض کرنا پسندیدہ ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابوداؤد اور نسائی وغیرہما نے روایت کیا ہے کہ فراسی (بنی فراس بن مالک کا کوئی آدمی) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا میں سوال کر سکتا ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں اور اگر تو سائل ہے تو پھر ضروری ہے کہ تو صالحین سے مانگ۔'' پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حاجت و ضرورت کے وقت اہل فضل و صلاح کے سوال کو مباح قرار دیا ہے اور اگر وہ اپنی حاجت اللہ تعالیٰ کے پاس پیش کرے تو یہ اور اعلیٰ ہے۔

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: لوگوں سے حاجات کا مطالبہ کرنا یہ تیرے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان حجاب ہے۔ پس تو اپنی حاجت اس کے پاس پیش کر جو ہر قسم کے نفع اور نقصان کا مالک ہے اور چاہیے کہ تیرا بھاگ کر جانا اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اللہ تعالیٰ تجھے اپنے ماسویٰ سے کافی ہو جائے گا اور تو خوشحال اور مسرور زندگی گزارے گا۔

مسئلہ نمبر 7۔ اگر بغیر مانگے کسی کے پاس کوئی شے آ جائے تو اس کے لئے جائز ہے وہ اسے قبول کر لے اور اسے رد نہ کرے کیونکہ وہ رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا فرمایا ہے۔ امام مالک نے حضرت زید بن اسلم سے اور انہوں نے حضرت عطا بن یسار سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی طرف کچھ عطا (ہدیہ تحفہ) بھیجی تو آپ نے اسے واپس لوٹا دیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو فرمایا: ''تم نے اسے کیوں لوٹا دیا ہے؟'' تو آپ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ نے ہمیں بتایا نہیں ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ کوئی شے نہ لے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ وہ سوال کے بارے میں ہے اور رہی وہ شے جو بغیر مانگے مل جائے تو یقیناً وہ رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے تجھے عطا فرمایا ہے۔'' تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: قسم ہے مجھے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! میں کسی سے کسی شے کے بارے سوال نہیں کروں گا اور بن مانگے جو شے بھی میرے پاس آئے گی میں اسے لے لوں گا۔

یہ نص ہے۔ مسلم نے اپنی صحیح میں اور نسائی نے اپنی سنن میں (2) اور ان کے علاوہ دوسروں نے بھی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم

1۔ صحیح بخاری، کتاب الزکاۃ، حدیث نمبر 1342، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب الاحکام، حدیث نمبر 6630، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مجھے عطیات عطا فرماتے رہتے تھے تو میں عرض کرتا: آپ اسے عطا فرما دیجئے جو مجھ سے زیادہ اس کا محتاج ہے، حتیٰ کہ ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے مال عطا فرمایا تو میں نے عرض کی: آپ مجھ سے زیادہ محتاج اور حاجت مند کو عطا فرما دیجئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسے لے لو اور اس مال میں سے جو تمہارے پاس آئے اور تو نہ اس پر جھانکنے والا ہے اور نہ سوال کرنے والا، پس اسے اور اس مال کو لے لو اور تم اس میں اپنے نفس کی اتباع و پیروی نہ کرو۔'' نسائی نے خذہ کے قول کے بعد یہ اضافہ نقل کیا ہے۔ ''پس تم اسے اپنے پاس جمع کر لو یا اسے صدقہ کر دو۔''

اور مسلم نے حضرت عبداللہ بن سعدی مالکی سے حدیث نقل کی ہے(1) کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: **اذا اعطیت شیئا من غیر ان تسأل فکل و تصدق** (کہ جب تمہیں کوئی شے بغیر سوال کے دی جائے تو اسے کھاؤ اور صدقہ کرو) یہ روایت تمہارے لئے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی مرسل حدیث کو صحیح بناتی ہے۔

الاثرم نے کہا ہے: میں نے ابو عبداللہ احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ان سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے بارے میں سوال کیا گیا: ''جو شے تیرے پاس بغیر سوال اور بغیر اشراف کے آجائے۔'' اس میں اشراف سے آپ نے کون سا ارادہ کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ تو اس پر جھانکتا رہے اور اپنے دل میں یہ کہتا رہے۔ شاید یہ شے میری طرف بھیج دی جائے۔ آپ سے کہا گیا: اگرچہ وہ تعرض نہ بھی کرے؟ آپ نے فرمایا: ہاں بلاشبہ وہ (اشراف) دل کے ساتھ ہوتا ہے پھر آپ سے کہا گیا: یہ تو بہت سختی ہے آپ نے فرمایا: اگرچہ یہ شدید ہے لیکن یہ اسی طرح ہے۔ آپ سے کہا گیا: اگر کوئی آدمی مجھے عادی نہ بنائے کہ وہ میری طرف کوئی شے بھیجے مگر یہ کہ اس کا خیال میرے دل میں آئے اور میں کہوں: قریب ہے کہ وہ میری طرف کوئی شے بھیجے۔ تو آپ نے فرمایا: یہ اشراف ہے۔ پس اگر وہ تیرے پاس آئے اس کے بغیر کہ تو اس کا تصور کرے اور نہ ہی وہ تیرے دل میں کھٹکے تو یہ وہ شے ہے جس میں اشراف نہیں ہے۔

ابو عمر نے کہا ہے: لغت میں الاشراف سے مراد اس شے کی طرف سر اٹھانا ہے جو اس آدمی کے پاس ہو جس کی حرص ہو اور اس شے میں بھی حرص اور طمع ہو۔ اور یہ کہ وہ انسان کو خوش کرے اور یہ تعرض کرنے لگے۔ اور امام احمدؒ نے اشراف کی تاویل میں جو کچھ کہا ہے وہ تضییق اور تشدید ہے اور وہ میرے نزدیک بعید ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے اس سے درگزر فرمائی ہے جو کچھ ان کے دلوں میں پیدا ہو، نہ زبان اس کے ساتھ بولے اور نہ ہی اعضاء اس کے مطابق عمل کریں۔ کفر کے سوا گناہوں میں سے دل جن کا اعتقاد رکھے وہ کوئی شے نہیں ہیں یہاں تک کہ وہ اس کے مطابق عمل کرے اور دل میں کھٹکنے والے خیال اور وہم سے بالاجماع درگزر کر لیا گیا ہے۔ (یعنی ان پر کوئی مواخذہ نہیں جب تک انہیں عملی جامہ نہ پہنایا جائے۔)

مسئلہ نمبر 8۔ کسی سے کچھ مانگنے میں اصرار کرنا اور اس سے مستغنی ہونے کے باوجود اس سے لپٹ جانا حرام ہے حلال نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کثرت مال کے باوجود لوگوں سے ان کے مالوں کے بارے سوال کیا تو وہ (آگ کے) انگارے مانگ رہا ہے چاہے وہ قلیل طلب کرے یا زیادہ مانگے۔'' اسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاحکام، حدیث نمبر 6630، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

روایت کیا ہے اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی مسلسل (بھیک) مانگتا رہے گا یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ سے جا ملے گا اور اس کے چہرے میں گوشت (☆) کا ٹکڑا تک نہ ہوگا۔'' اسے مسلم نے بھی روایت کیا ہے۔ (1)

مسئلہ نمبر 9۔ سائل جب محتاج ہو تو کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ تین بار تک عذر پیش کرتے ہوئے اور ڈراتے ہوئے اپنا سوال بار بار کرے۔ اور ایسا نہ کرنا افضل ہے اور اگر وہ آدمی جس سے سوال کیا گیا ہے وہ اس کے بارے جانتا ہو اور وہ اس پر قادر بھی ہو جو شے اس نے مانگی ہے تو اس پر اسے عطا کرنا واجب ہے اور اگر وہ اس کے بارے ناواقف ہو تو وہ اسے اس خوف سے دے دے کہ ہو سکتا ہے وہ اپنے سوال میں سچا ہو اور وہ اسے واپس لوٹانے میں کامیاب نہ ہوگا۔

مسئلہ نمبر 10۔ اور اگر وہ ایسی شے کا محتاج ہو جس کے ساتھ وہ سنت کو قائم کر سکتا ہے مثلاً ایسے کپڑے کے ساتھ آراستہ ہونا جسے وہ عید اور جمعہ (کی نمازوں) میں پہنتا ہو۔ تو ابن عربی نے ذکر کیا ہے: ''میں نے خلیفہ بغداد کی جامع مسجد میں ایک آدمی کو یہ کہتے ہوئے سنا۔ یہ تمہارا بھائی ہے جو تمہارے ساتھ جمعہ کی نماز میں حاضر ہوتا ہے اور اس کے پاس کپڑے نہیں ہیں جن کے ساتھ یہ جمعہ کی سنت کو قائم کر سکتا ہو۔ پس جب دوسرا جمعہ آیا تو میں نے اس پر دوسرا لباس دیکھا۔ تو مجھے بتایا گیا۔ ابو الطاہر البرسی نے اسے یہ لباس پہنایا ہے اور مدح و تعریف حاصل کی ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

''جو لوگ خرچ کیا کرتے ہیں اپنے مال رات میں اور دن میں چھپ کر اور علانیہ تو ان کے لئے ان کا اجر ہے اپنے رب کے پاس اور نہ انہیں کچھ خوف ہے اور نہ غمگین ہوں گے۔''

اس میں ایک مسئلہ ہے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت ابوذر، حضرت ابوامامہ، حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہم، حضرت عبداللہ بن بشر غافقی اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ یہ آیت ان گھوڑوں کے چارے کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں باندھے گئے ہوں۔ اور ابن سعد نے طبقات میں ذکر کیا ہے اور کہا ہے: مجھے محمد بن شعیب بن شابور سے خبر دی گئی ہے کہ انہوں نے کہا ہمیں سعید بن سنان نے یزید بن عبداللہ بن عریب عن ابیہ عن جدہ عریب کی سند سے خبر دی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قول باری تعالیٰ کے بارے پوچھا گیا: اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ

1۔ صحیح بخاری، باب من سأل الناس تکثرا، حدیث نمبر 1381، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

☆ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ وہ قیامت کے دن ذلیل و خوار ہو کر آئے گا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کی کوئی حیثیت نہ ہوگی اور یہ بھی کہا گیا ہے یہ حدیث اپنے ظاہر پر ہی محمول ہے اسے اس حال میں اٹھایا جائے گا کہ اس کے چہرہ میں فقط ہڈیاں ہوں گی گوشت نہ ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ھم اصحاب الخیل کہ ان سے مراد گھوڑوں والے ہیں۔

اور اسی اسناد کے ساتھ انہوں نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گھوڑے پر خرچ کرنے والا صدقے کے ساتھ اپنا ہاتھ پھیلانے والے کی طرح ہے۔ (یعنی کثرت سے صدقہ دینے والے کی طرح ہے۔) کہ وہ اسے بند نہیں کرتا۔ ان کا پیشاب اور ان کی لید قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک کستوری کی پاکیزگی کی طرح ہوگی۔"

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: یہ آیت حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ان کے پاس چار درہم تھے تو آپ نے ایک درہم رات کے وقت اور ایک درہم دن کے وقت، ایک درہم سرا اور ایک درہم جہرا صدقہ کر دیئے۔ اسے عبد الرزاق نے ذکر کیا ہے اور کہا ہے ہمیں عبد الوہاب بن مجاہد نے اپنے باپ کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی خبر دی ہے۔

ابن جریج نے کہا ہے: یہ ایک آدمی کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس نے اس طرح عمل کیا اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ یا کسی اور آدمی کا نام ذکر نہیں کیا۔

حضرت قتادہ نے کہا ہے: یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو اسراف اور کنجوسی کے بغیر خرچ کرتے ہیں اور بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ کا معنی ہے فی اللیل والنھار (رات اور دن میں) اور فَلَهُمْ میں فا داخل ہے کیونکہ کلام میں جزا کا معنی ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے اور زید فمنطلق کہنا جائز نہیں ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۭ فَمَنْ جَاۗءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ۭ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۝

"جو لوگ کھایا کرتے ہیں سود وہ نہیں کھڑے ہوں گے مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے وہ جسے پاگل بنا دیا ہو شیطان نے

چھوکر۔ یہ حالت اس لئے ہوگی کہ وہ کہا کرتے تھے کہ سوداگری بھی سود کی مانند ہے حالانکہ حلال فرمایا اللہ تعالیٰ نے تجارت کو اور حرام کیا سود کو۔ پس جس کے پاس آئی نصیحت اپنے رب کی طرف سے تو وہ (سود سے) رک گیا تو جائز ہے اس کے لئے جو گزر چکا اور اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے اور جو شخص پھر سود کھانے لگے تو وہ لوگ دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ مٹاتا ہے اللہ تعالیٰ سود کو اور بڑھاتا ہے خیرات کو اور اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا ہر ناشکرے گنہگار کو۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور کرتے رہے اچھے عمل اور صحیح صحیح ادا کرتے رہے نماز اور دیتے رہے زکوٰۃ کو ان کے لئے ان کا اجر ہے ان کے رب کے پاس نہ کوئی خوف ہے انہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اے ایمان والو! ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو جو باقی رہ گیا ہے سود سے اگر تم (سچے دل سے) ایمان دار ہو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اعلان جنگ سن لو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اور اگر تم توبہ کر لو تو تمہیں (مل جائیں گے) اصل مال نہ تم ظلم کیا کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔"

تین آیات سود کے احکام، بیع کی عقود کے جواز اور اس کے لئے وعید کو متضمن ہیں جو کوئی سود کو حلال سمجھے اور اس پر عمل کرنے پر مصر ہو۔ اس میں اڑتیس مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا یہاں يَاْكُلُوْنَ بمعنی یاخذون ہے (یعنی وہ جو سود لیتے ہیں) اور اخذ (لینے) کو اکل (کھانے) کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ سود کھانے کے لئے ہی لیا جاتا ہے اور ربا کا لغوی معنی مطلق زیادتی ہے۔ کہا جاتا ہے: ربا الشیء یربو۔ جب کوئی شے زیادہ ہو جائے اور اس معنی میں حدیث طیبہ بھی ہے: **فلا واللہ ما اخذنا من لقمۃ الا ربا من تحتھا** (قسم بخدا! ہم نے جو لقمہ بھی لیا تو وہ اپنے نیچے سے اور زیادہ ہو گیا) مراد وہ کھانا ہے جس میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے برکت کی دعا فرمائی۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ (1)

قیاس یہ ہے کہ یہ یاء کے ساتھ لکھا جائے کیونکہ اس کے اول میں کسرہ ہے، حالانکہ انہوں نے اسے قرآن کریم میں واؤ کے ساتھ لکھا ہے۔

پھر شریعت نے اس اطلاق میں تصرف کیا اور اسے بعض مواقع کے ساتھ محصور کر دیا۔ پس ایک بار اس کا اطلاق حرام کمائی پر کیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے یہود کے بارے میں فرمایا: وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ (النساء: 161) (اور بوجہ اس کے سود لینے کے حالانکہ منع کئے گئے تھے اس سے) اور اس سے وہ شرعی ربا مراد نہیں لیا جس کے حرام ہونے کا ہم پر حکم لگایا، بلکہ اس سے حرام مال مراد لیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ (المائدہ: 42) (قبول کرنے والے ہیں جھوٹ کو بڑے حرام خور ہیں) اس سے مراد مال حرام ہے رشوت وغیرہ۔ اور وہ جسے انہوں نے اُمِّيّٖن کے اموال میں سے حلال سمجھ لیا تھا جہاں انہوں نے کہا: لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ (العمران: 75) (کہ نہیں ہے ہم پر ان پڑھوں کے معاملہ میں کوئی گرفت) اس بنا پر اس میں نہی ہر مال حرام کو شامل ہے جس طریقہ سے بھی مال کمایا جائے اور وہ ربا جس پر شرعی

1۔ صحیح بخاری، باب السمر مع الضیف والاھل، حدیث نمبر 567، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اصطلاح ہے وہ دو چیزیں ہیں: نَسَاء کو حرام قرار دینا اور عقود اور مطعومات میں تفاضل (زیادتی) جیسا کہ ہم اسے بیان کریں گے اور اس میں غالب وہی ہے جو عرب کرتے تھے، قرض دینے والے کے لئے ان کا یہ قول ہے: أتقضی ام تُربی؟ (کیا تو ادا کرے گا یا تو اضافہ کرے گا) پس وہ (قرض دینے والا) مال کی تعداد میں اضافہ کر دیتا اور قرض لینے والا اس پر صبر کرتا اور یہ سب حرام کر دیا گیا ہے اس پر پوری امت کا اتفاق ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اکثر وہ بیعیں جنہیں ممنوع قرار دیا گیا ہے ان میں ممنوع ہونے کی علت زیادتی کے معنی کا پایا جانا ہے یا تو عین مال میں زیادتی یا پھر (بائع اور مشتری میں سے) کسی ایک کے لئے تاخیر کے سبب منفعت میں زیادتی وغیرہ اور بیوع میں سے وہ جس میں زیادتی کا معنی نہ ہو، جیسا کہ پھل کی بیع کرنا اس کے پکنے کی صلاحیت ظاہر ہونے سے پہلے اور اسی طرح وہ بیع جو جمعہ کے دن اذان کے وقت ہو، اگر ان کے کرنے والے کو کہا جائے، سود کھانے والا تو یہ مجازاً اور تشبیہاً ہوگا۔

مسئلہ نمبر 3۔ ائمہ نے روایت کیا ہے اور الفاظ مسلم شریف کے ہیں۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سونے کی بیع سونے کے عوض، چاندی کی بیع چاندی کے عوض، گندم کی بیع گندم کے عوض، جو کی بیع جو کے عوض، کھجور کی بیع کھجور کے عوض اور نمک کی بیع نمک کے عوض برابر برابر اور ہاتھوں ہاتھ ہے۔ پس جس نے زیادتی کی یا زیادتی کا مطالبہ کیا تو اس نے سود لیا لینے اور دینے والا اس میں برابر ہیں۔''

اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: ''جب یہ اصناف مختلف ہوں تو پھر ان کی بیع کرو جیسے تم چاہو بشرطیکہ دست بدست ہو۔'' اور ابو داؤد نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سونے کی بیع سونے کے عوض اس کی پتریاں ہوں اور اس کا عین ہو، چاندی کی بیع چاندی کے عوض اس کی پتریاں ہوں اور اس کا عین ہو، گندم کی بیع گندم کے عوض (یعنی) مد کی بیع مد کے عوض، جو کی بیع جو کے عوض (یعنی) مد کی بیع مد کے عوض، کھجور کی بیع کھجور کے عوض (یعنی) مد کے بدلے مد اور نمک کی بیع نمک کے عوض (یعنی) مد کے بدلے مد۔ پس جس نے زیادہ دیا یا زیادتی کا طالب ہوا تحقیق اس نے سود لیا اور سونے کو چاندی کے عوض بیچنے میں کوئی حرج نہیں ہے جبکہ ان میں سے چاندی کی مقدار زیادہ ہو درآنحالیکہ بیع دست بدست ہو اور رہی نسیہ (ادھار) تو یہ جائز نہیں ہے اور گندم جو کے عوض بیچنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور جو ان دونوں میں زیادہ ہوں درآنحالیکہ بیع دست بدست ہو اور رہی ادھار تو یہ جائز نہیں (1)۔'' علماء نے اس سنت کے تقاضا کے مطابق قول پر اجماع کیا ہے اور اسی طریقہ پر مسلمان فقہاء کی جماعت ہے مگر گندم اور جو میں، کیونکہ امام مالکؒ نے ان دونوں کو ایک صنف قرار دیا ہے۔ پس ان دونوں میں سے دو کی بیع ایک کے عوض جائز نہیں ہے۔ اور یہی قول لیث، اوزاعی اور مدینہ اور شام کے عظیم علماء کا ہے۔ اور امام مالک نے ان دونوں کی طرف السلت (جو کی ایک قسم جس پر چھلکا نہیں ہوتا) کی اضافت کی ہے اور لیث نے کہا ہے: السلت (جو)، باجرہ اور مکئی یہ ایک ہی صنف ہے اور ابن وہب نے یہی کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جب حدیث طیبہ ثابت ہے تو اس کے ساتھ کسی قول کی کوئی حیثیت نہیں اور حضور علیہ الصلوٰۃ

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی الصرف، حدیث نمبر 2907، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

والسلام نے فرمایا ہے: ''جب یہ اصناف مختلف ہوں تو تم جیسے چاہو انہیں بیچو بشرطیکہ بیع دست بدست ہو۔'' اور آپ کا یہ ارشاد بھی ہے: ''کہ گندم کی بیع گندم کے عوض اور جو کی بیع جو کے عوض'' تو یہ اس پر دلیل ہے کہ یہ دونوں دو مختلف قسمیں ہیں جیسا کہ گندم اور کھجور مختلف ہیں کیونکہ دونوں کی صفات مختلف ہیں اور دونوں کے نام بھی مختلف ہیں۔ اور اگانے والے اور کاٹنے والے کا کوئی اعتبار نہیں کیونکہ شریعت نے اس کا اعتبار نہیں کیا، بلکہ جدائی اور فرق بالکل واضح اور بین ہے اور امام شافعی، امام ابوحنیفہ، ثوری اور اصحاب حدیث کا یہی مذہب ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ یہ موقف اختیار کرتے تھے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے نہی اور تحریم ڈھلے ہوئے دینار اور ڈھلے ہوئے درہم کے بارے میں وارد ہے نہ کہ سونے کی پتریوں اور ڈھالی گئی چاندی کے بارے میں اور نہ ہی اس کے بارے میں جو ڈھلی ہوئی (چاندی) سے شے بنائی گئی ہو۔ اور کبھی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ نہی صرف اس کے بارے میں ہے جو اس سے خاص نمونہ پر تیار کی گئی ہو۔ یہاں تک کہ ان کی ملاقات حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوگئی، جسے مسلم وغیرہ نے بیان کیا ہے، بیان فرمایا: ہم جہاد میں شریک ہوئے اور لوگوں پر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ حکمران تھے۔ پس ہم نے بہت زیادہ مال غنیمت اکٹھا کیا اور ہمارے اس مال غنیمت میں چاندی کے برتن بھی تھے۔ تو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو لوگوں کے عطیات میں انہیں بیچ ڈالنے کا حکم دیا۔ تو اس بارے میں لوگوں کے مابین تنازع شروع ہوگیا۔ پس اس کی اطلاع حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچی، آپ کھڑے ہوئے اور فرمایا: بلاشبہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سونا سونے کے عوض، چاندی چاندی کے عوض، گندم گندم کے عوض، جو جو کے عوض، کھجور کھجور کے عوض اور نمک نمک کے عوض بیچنے سے منع کرتے ہوئے سنا ہے مگر (اس صورت میں کہ وہ) برابر برابر ہو اور عین کے عوض عین ہو۔ جس نے زیادہ کیا یا زیادتی کا طالب ہوا تو تحقیق اس نے سود لیا۔ پس لوگوں نے جو لیا تھا وہ واپس لوٹا دیا ... پس یہ خبر جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ تک پہنچی تو آپ خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے اور فرمایا: خبردار! سنو کیا حال ہے ان لوگوں کا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث بیان کرتے ہیں حالانکہ ہم آپ کے پاس حاضر رہتے تھے اور آپ کی صحبت و معیت میں رہتے تھے اور ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی احادیث نہیں سنیں، تو حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور دوبارہ وہی حدیث بیان فرمائی۔ پھر فرمایا: ہم ضرور بہ ضرور اس کے بارے حدیث بیان کریں گے جو ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے، اگرچہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اسے ناپسند کریں۔ مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے کہ میں نے سیاہ رات میں آپ کے لشکر میں آپ کی صحبت اختیار نہیں کی۔ حماد نے یہی یا اسی طرح کہا ہے۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے: یہ بھی روایت ہے کہ یہ قصہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آیا اور یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ دونوں کا آپ کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ہو لیکن عرف میں حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث محفوظ رہی۔ اور یہی وہ اصل ہے جس پر علماء نے رِبا کے باب میں اعتماد اور بھروسہ کیا ہے اور انہوں نے اس بارے میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے فعل کے جائز نہ ہونے میں کوئی اختلاف نہیں کیا ہے اور اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ یہ معاملہ حضرت امیر معاویہ

رضی اللہ عنہ پر مخفی رہا ہو حالانکہ حضرت ابو الدرداء اور حضرت عبادہ رضی اللہ عنہما دونوں نے اسے جان لیا ہو کیونکہ یہ دونوں فقہاء اور کبار صحابہ کرام میں سے جلیل القدر صحابی ہیں، کبھی حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما پر کوئی ایسی شے مخفی رہی جو ان کے سوا دوسرے صحابہ کرام سے پالی گئی جو درجہ اور رتبہ میں ان سے کم ہیں۔ پس حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بھی دوسرے ہیں اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ ان کا مذہب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے مذہب کی طرح ہو۔ اس کے باوجود کہ وہ علم کا سمندر تھے وہ ایک درہم کی بیع دو درہم کے ساتھ کرنے میں کوئی حرج نہ دیکھتے تھے یہاں تک کہ حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ نے انہیں اس سے پھیر دیا۔ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ بھی حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ اسی طرح ہے اور یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں پیش آیا۔ قبیصہ بن ذؤیب نے کہا ہے: بے شک حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو کسی شے سے منع کیا تو انہوں نے کہا: میں تجھے اس زمین پر نہیں رہنے دوں گا جہاں تو رہ رہا ہے تو وہ مدینہ میں داخل ہو گئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: کون سی شے تجھے لے آئی ہے؟ تو انہوں نے آپ کو سارا واقعہ بیان کر دیا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تو اپنی جگہ کی طرف لوٹ جا، اللہ حالی اس زمین کو فاسد کرے جس میں تم اور تمہاری مثل لوگ نہ ہوں! اور ساتھ ہی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف لکھ دیا لا امارۃ لك علیه (تجھے اس پر کوئی ولایت حاصل نہیں ہے۔)

مسئلہ نمبر 5۔ ائمہ نے روایت کیا ہے اور الفاظ دار قطنی کے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دینار دینار کے عوض ہے اور درہم درہم کے عوض ہے ان کے درمیان کوئی فضل اور زیادتی نہیں ہے جسے چاندی کی حاجت ہو اسے چاہیے کہ وہ اسے سونے کے عوض بدل لے اور اگر سونے کی ضرورت ہو تو پھر اسے چاہیے کہ وہ چاندی کے عوض اسے بدل لے دست بدست (یعنی ایک ہاتھ سے لے اور دوسرے سے دے)

علماء نے بیان کیا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد گرامی: الدینار بالدینار والدرھم بالدرھم لا فضل بینھما یہ اس اصل کی جنس کی طرف اشارہ ہے جو ڈھلی ہوئی ہو۔ اور اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: الفضة بالفضة والذھب بالذھب الحدیث۔ چاندی چاہے سفید ہو یا سیاہ اور سونا سرخ ہو یا زرد کسی کی آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ بیع جائز نہیں ہوتی مگر یہ کہ دونوں ہم مثل ہوں اور ہر حال میں برابر ہوں۔ اسی پر علماء کی ایک جماعت ہے جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے۔

اور حضرت امام مالک سے فلوس کے بارے میں روایت مختلف ہے۔ سو آپ نے انہیں دراہم کے ساتھ ملحق کیا ہے اس حیثیت سے کہ یہ اشیاء کے ثمن ہیں اور ایک بار انہیں ان کے ساتھ ملانے سے منع بھی کیا ہے اس اعتبار سے کہ یہ ہر شہر میں ثمن نہیں ہیں بلکہ بعض شہران کے ساتھ مختص ہیں۔

مسئلہ نمبر 6۔ اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے بہت سے اصحاب سے مروی ہے۔ ان میں سے بعض اسے امام مالک سے تاجر کے بارے میں روایت کرتے ہیں درآنحالیکہ خروج (گھر سے نکلنا) اسے دھوکہ دے رہا ہو۔ اور اس کے سبب اسے ڈھالے گئے دراہم یا دنانیر کی حاجت پڑ جائے۔ پس وہ اپنی چاندی یا اپنا سونا لے کر ٹکسال میں آتا ہے اور ڈھالنے والے کو کہتا ہے، میری یہ چاندی یا یہ سونا تو لے لے اور اپنی محنت بھی لے لے اور تو مجھے میرے سونے کے بدلے

ڈھلے ہوئے دنانیر یا میری اس چاندی کے بدلے ڈھلے ہوئے دراہم مجھے دے دے۔ کیونکہ مجھے خروج کے وقت دھوکا دیا گیا ہے اور مجھے خوف ہے کہ وہ مجھے چھوڑ دے گا جس کے ساتھ میں نکلا ہوں۔ تو ضرورت کے تحت اس کے لئے ایسا کرنا جائز ہے اور بعض لوگوں نے اس کے مطابق عمل کیا ہے۔ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی قبس میں امام مالک سے تاجر کے سوا دوسروں کے بارے میں بھی اسے بیان کیا ہے کہ امام مالک نے اس میں تخفیف فرمائی ہے...... اور یہ اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی وہ چاندی بیچے جس کا وزن ایک سو پانچ درہم تھا اور وہ اس کے بدلے اسے سو درہم دے اور یہ خالص ربا ہے۔ اور جس نے اس کے جواز کو ثابت کیا ہے کہ اگر وہ اسے اس طرح کہے: یہ چاندی مجھے ڈھال دے اور اس پر تو اس سے اجرت کاٹ لے۔ پس جب وہ اسے ڈھال لے اور یہ اسے اس سے لے لے اور یہ اسے اس کی اجرت ادا کر دے۔ پس جو امام مالک نے پہلے کہا ہے وہ وہی ہے جو آخر میں ہوگا۔ امام مالک نے مال کی طرف دیکھا ہے اور اس پر حال کا حکم مرتب کیا ہے اور تمام فقہاء نے اس کا انکار کیا ہے، ابن عربی نے کہا ہے: اس میں امام مالک کی حجت واضح ہے۔

ابو عمر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ وہ عین ربا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس قول سے حرام کیا ہے: مَنْ زاد او ازداد فقد اربی (جس نے زیادہ دیا یا زیادہ لیا تحقیق اس نے سود لیا)

ابن وہب نے اس مسئلہ میں امام مالک کا رد کیا ہے اور اس کا انکار کیا ہے۔

اور علامہ ابہری نے یہ گمان کیا ہے کہ یہ تجارت کے فروغ کے لئے نرم رویہ اپنایا گیا ہے تاکہ تجارتی منڈی ختم ہی نہ ہو جائے اور ربا (سود) نہیں ہے مگر اس پر جو اس سے زیادہ لینے کا ارادہ کرے جو اس کا قصد کرتا ہو اور اسے چاہتا ہو۔ اور ابہری بھول گئے اس کی اصل سد ذرائع میں ہے اور ان کا قول اس آدمی کے بارے میں ہے جس نے کپڑا ادھار بیچا اور وہ اسے خریدنے کی نیت اور ارادہ نہ رکھتا ہو پھر وہ اسے بازار میں پاتا ہے کہ اسے بیچا جا رہا ہے۔ بے شک اس کے لئے اس سے کم قیمت کے ساتھ اسے خریدنا جائز نہیں ہے جتنے کے ساتھ اس نے اسے بیچا تھا، اگرچہ وہ اس کا قصد نہ بھی کرے اور نہ اسے چاہے اور اس کی کثیر مثالیں ہیں۔ اور اگر ربا نہیں ہے مگر اسی پر جو اس کا قصد کرے تو پھر (ہر شے) فقہاء پر ہی حرام کی گئی ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: ہمارے بازار میں کوئی تجارت نہیں کرے گا مگر وہی جو اس کی خوب سمجھ بوجھ رکھتا ہو ورنہ وہ ربا کھائے گا۔ یہ اس کے لئے بالکل واضح ہے جسے انصاف عطا کیا گیا اور اسے رشد و ہدایت عطا فرمائی گئی۔ (1)

میں (مفسر) کہتا ہوں: امام مالکؒ نے زیادتی (لینے دینے) سے روکنے میں انتہائی مبالغہ کیا ہے یہاں تک کہ انہوں نے متوہم (موہومہ) کو متحقق (ثابت شدہ) کی مثل قرار دیا ہے۔ سو آپ نے ایک دینار اور ایک درہم کی بیع ایک دینار اور ایک درہم کے بدلے کرنے سے منع کیا ہے۔ یہ سد ذرائع کے لئے اور توہمات کی جڑ کاٹنے کے لئے کیا ہے کیونکہ اگر زیادتی کا وہم نہ ہوتا تو وہ آپس میں تبادلہ نہ کرتے اور تقسیم کے وقت مماثلت متعذر ہونے کو اس منع کی علت قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس سے سونے اور چاندی کا تبادلہ سونے کے عوض لازم آتا ہے اور اس سے زیادہ واضح یہ ہے کہ انہوں نے تفاضل معنوی سے بھی منع

1۔ جامع ترمذی، باب ماجاء فی فضل الصلوٰۃ علی النبی، حدیث نمبر 449، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کیا ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے اس سے منع کیا ہے کہ کوئی اعلیٰ اور عمدہ سونے کے ایک دینار اور گھٹیا سونے کے ایک دینار کی بیع اعلیٰ کے مقابلہ میں کرے اور گھٹیا پن کو لغو قرار دے۔ اور یہ آپ کی دقت نظر کی علامت ہے۔ پس یہ اس پر دلیل ہے کہ آپ سے وہ روایت منکر ہے اور وہ صحیح نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 7۔ خطابی نے کہا ہے: تبر سے مراد سونے اور چاندی کا وہ ٹکڑا ہے جسے ابھی تک ڈھالا نہ گیا ہو اور نہ ہی اس سے دراہم یا دنانیر بنائے گئے ہوں۔ اس کی واحد تِبْرَۃٌ ہے۔ اور العین سے مراد وہ ہے جس سے دراہم یا دنانیر بنا لئے گئے ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام قرار دیا ہے کہ ایک مثقال عین سونا بیچا جائے مثقال اور ایسی پتریوں کے ساتھ جو ڈھلی ہوئی نہ ہوں۔ اور اسی طرح مضروب چاندی اور غیر مضروب چاندی کے درمیان تفاوت کو بھی حرام قرار دیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد تِبْرُھَا وَعَيْنُھا سواء کا یہی معنی ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ کھجور کی بیع کھجور سے کرنا جائز نہیں ہوتی مگر برابر برابر۔ اور انہوں نے ایک کھجور کی بیع دو کھجوروں کے ساتھ کرنے میں اور گندم کے ایک حب (دانہ یا دو جو کے برابر وزن) کی بیع دو جوں کے ساتھ کرنے میں اختلاف کیا ہے۔ اور امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور ثوری رحمۃ اللہ علیہم نے اس سے منع کیا ہے۔ یہی امام مالک کے قول کا قیاس ہے اور یہی صحیح ہے، کیونکہ وہ شے جس میں ربا جاری ہوتا ہے اس کی کثیر مقدار میں تفاضل کے سبب تو قیاساً اور نظراً اس کی قلیل مقدار بھی اس میں داخل ہے۔ اور جنہوں نے اس بیع کو جائز قرار دیا ہے انہوں نے اس سے استدلال کیا ہے کہ ایک یا دو کھجوریں ضائع کرنے والے پر قیمت واجب نہیں ہوتی، فرمایا: کیونکہ اس کا کوئی ماپ اور وزن نہیں ہے لہٰذا اس میں تفاضل (زیادتی) جائز ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ تو جان! اللہ تعالیٰ تجھ پر رحم فرمائے کہ اس باب کے مسائل کثیر ہیں اور اس کی فروع پھیلی ہوئی ہیں، وہ شے جو تیرے لئے مضبوط ہو وہ یہ ہے کہ تو ربا کی اس علت میں غور و فکر کرے جس کا علماء میں سے ہر ایک نے اعتبار کیا ہے۔ پس امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کی علت جنس کے اعتبار سے کیلی یا وزنی ہونا ہے۔ پس ہر وہ شے جس میں کیل یا وزن داخل ہوگا آپ کے نزدیک وہ ایک جنس میں سے ہے اور اس کے بعض کی بعض کے ساتھ متفاضلاً یا نسیئاً بیع کرنا جائز نہ ہوگا۔ پس آپ نے مٹی کی مٹی کے ساتھ بیع متفاضل سے منع کیا ہے، کیونکہ اس میں کیل داخل ہوتا ہے اور ایک روٹی کی بیع دو روٹیوں کے ساتھ کرنے کو جائز قرار دیا ہے، کیونکہ آپ کے نزدیک یہ اس کیل میں داخل نہیں ہیں جو اس کی اصل ہے۔ پس یہ اس جنس سے خارج ہوگئی جس میں ربا داخل ہوتا ہے۔

اور امام شافعی نے کہا ہے: اس کی علت جنس کے اعتبار سے اس شے کا مطعوم (وہ شے جو کھائی جائے) ہونا ہے۔ یہ آپ کا جدید قول ہے۔ پس آپ کے نزدیک آٹے کی بیع روٹی کے ساتھ کرنا جائز نہیں ہے اور نہ ہی روٹی کی بیع روٹی کے ساتھ کرنا جائز ہے نہ متفاضلاً اور نہ نسیئاً، چاہے روٹی خمیری ہو یا تازہ ہو۔ اور آپ کے نزدیک ایک انڈے کی بیع دو انڈوں سے کرنا جائز نہیں ہے، ایک انار کی بیع دو اناروں سے کرنا جائز نہیں ہے، ایک تربوز کی بیع دو تربوزوں سے کرنا جائز نہیں ہے نہ

دست بدست اور نہ ہی ادھار کیونکہ یہ سب کھایا جانے والا طعام ہے۔

اور آپ نے اپنے پرانے قول میں کہا ہے کہ اس کی علت کیلی یا وزنی ہونا ہے۔

اور اس بارے میں ہمارے اصحاب مالکیہ کی عبارات مختلف ہیں اور ان میں سے جو سب سے اچھی اور حسین ہے وہ یہ ہے کہ وہ شے ایسی جنس سے ہو جو خوراک بن سکتی ہو اور اغلباً زندگی گزارنے کے لئے ذخیرہ کی جا سکتی ہو۔ جیسا کہ گندم، جو، کھجور اور نمک جن پر نص بیان کی گئی ہے اور وہ چیزیں جو ان کے معنی میں ہیں جیسا کہ چاول، مکئی، باجرہ اور تل اور وہ دانے جو ہانڈی میں پکائے جاتے ہیں مثلاً لوبیا، دالیں، سیم اور چنے وغیرہ۔ اور اسی طرح گوشت، دودھ، سرکہ اور تیل وغیرہ۔ اور پھل مثلاً انگور، کشمش اور زیتون وغیرہ اور انجیر میں اختلاف کیا گیا ہے اور شہد اور شکر اس کے ساتھ ملحق کیے جاتے ہیں۔ پس یہ تمام وہ چیزیں ہیں جن میں نساء کی جہت سے ربا داخل ہوتا ہے اور ان میں تفاضل جائز ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے: ''جب یہ اصناف مختلف ہوں تو تم جیسے چاہو ان کی بیع کرو بشرطیکہ وہ دست بدست ہو۔'' اور ان تازہ پھلوں میں ربا نہیں ہے جو باقی نہیں رہتے مثلاً سیب، تربوز، انار، ناشپاتی، ککڑی، کھیرا، بینگن اور اس کے علاوہ دیگر سبزیاں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: انڈے کی بیع انڈے کے ساتھ متفاضلاً جائز نہیں ہوتی، کیونکہ یہ ان میں سے ہیں جو ذخیرہ کئے جا سکتے ہیں اور ان کے نزدیک برابر برابر بیع جائز ہوتی ہے۔

اور محمد بن عبداللہ بن عبدالحکم نے کہا ہے: ایک انڈے کی بیع دو انڈوں سے اور زیادہ سے کرنا بھی جائز ہے کیونکہ یہ ان چیزوں میں سے ہیں جو ذخیرہ نہیں کی جا سکتیں۔ اور یہی امام اوزاعی کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 10۔ الرِّبَا کے لفظ میں علماء نحو نے اختلاف کیا ہے۔ بصریوں نے کہا ہے یہ واوی الفاظ میں سے ہے کیونکہ تو اس کے تثنیہ میں کہتا ہے: رِبَوان۔ سیبویہ نے یہی کہا ہے اور کوفیوں نے کہا ہے: یہ یا کے ساتھ لکھا جائے گا اور اس کا تثنیہ یا کے ساتھ ہے، کیونکہ اس کے اول میں کسرہ ہے۔

زجاج نے کہا ہے: میں نے کوئی خطا نہیں دیکھی جو اس سے زیادہ قبیح اور زیادہ شنیع ہو اور لکھنے میں خطا انہیں کافی نہ ہوتی یہاں تک کہ انہوں نے تثنیہ میں غلطی کی، حالانکہ وہ یہ پڑھتے ہیں: وَ مَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ۔ محمد بن یزید نے کہا ہے: مصحف میں الرِّبَا واؤ کے ساتھ لکھا گیا ہے تاکہ اس کے درمیان اور زنا کے درمیان فرق ہو جائے۔ رِبَا واؤ کے ساتھ لکھنا اولیٰ ہے کیونکہ یہ ربا یربو سے ہے۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ۔ یہ جملہ مبتدا کی خبر ہے اور وہ اَلَّذِيْنَ ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ وہ اپنی قبروں سے نہیں اٹھیں گے مگر جس طرح وہ کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر پاگل بنا دیا ہو۔ حضرت ابن عباس، حضرت ابن جبیر، قتادہ، ربیع، ضحاک، سدی اور ابن زید رضی اللہ عنہم و رحمۃ اللہ علیہم نے یہی کہا ہے۔

اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اس کے ساتھ شیطان رکھا جائے گا وہ اس کا گلا دباتا رہے گا۔ اور تمام نے کہا ہے: اسے بطور سزا

اور تمام اہل محشر کے نزدیک ناپسندیدہ قرار دینے کے لئے مجنون کی طرح اٹھایا جائے گا۔ اور اس تاویل کو جس پر اجماع کیا گیا ہے یہ بات قوی اور پختہ کرتی ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ہے: لا یقومون یوم القیامة الا کما یقوم (کہ قیامت کے دن وہ کھڑے نہیں ہوں گے مگر جس طرح وہ کھڑا ہوتا ہے۔)

ابن عطیہ نے کہا ہے: جہاں تک آیت کے الفاظ کا تعلق ہے وہ دنیوی تجارت کی طرف انتہائی حرص و لالچ کے ساتھ کھڑے ہونے والے کی حالت کو پاگل کے کھڑے ہونے کے ساتھ تشبیہ دینے کا احتمال رکھتے ہیں کیونکہ طمع اور رغبت اسے مضطرب کر دیتی ہے یہاں تک کہ اس کے اعضاء مضطرب ہو جاتے ہیں اور یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ تو تیز رفتار چلنے والے کے بارے کہتا ہے کہ وہ اپنی حرکات کی ہیئت میں پاگل لگتا ہے یا تو گھبراہٹ کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے اسے پاگل کہا گیا ہے اور اعشیٰ نے اپنی ناقہ کو اپنے اس قول میں اس کی چستی اور تیزی میں جنون کے ساتھ تشبیہ دی ہے:

و تُصبِح عن غِبِّ السُّرَی و کانّما أَلَمَّ بها من طائِفِ الجِنّ أولَقُ

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے:

لَعَمْرُكَ بِی من حُبِّ أسماءَ أَوْلَقُ

لیکن وہ جس کے مطابق حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت ہے اس کے مطابق مفسرین کے اقوال ظاہر ہیں۔ وہ اس تاویل کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔

اور **یَتَخَبَّطُهُ** یہ یتفعله کے وزن پر ہے، خَبَط یخبِط سے ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں تملّکه و تَعبّدَہ۔ اللہ تعالیٰ نے اسے سود کھانے والوں کے لئے علامت قرار دیا ہے اور وہ یہ کہ وہ اسے ان کے پیٹوں میں بڑھا دے گا اور انہیں خوب بوجھل کر دے گا، پس وہ جب اپنی قبروں سے نکلیں گے تو وہ کھڑے ہوں گے اور گر پڑیں گے۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے۔ بے شک انہیں قیامت کے دن اس حال میں اٹھایا جائے گا کہ ان کے پیٹ حاملہ عورتوں کی طرح پھولے ہوئے ہوں گے اور جب بھی وہ اٹھیں گے تو گر جائیں گے اور لوگ ان کے اوپر چلتے رہیں گے۔ اور بعض علماء نے کہا ہے بلاشبہ یہ ان کی علامت اور نشانی ہوگی اس سے وہ قیامت کے دن پہچانے جائیں گے پھر عذاب اس کے پیچھے ہوگا۔ جیسا کہ کینہ رکھنے والا قیامت کے دن اس شے کی شہرت کے ساتھ آئے گا جس کے ساتھ اس نے کینہ رکھا اس کے ساتھ اسے مشہور کیا جائے گا پھر اس کے پیچھے اسے عذاب دیا جائے گا۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **یَأْكُلُوْنَ** اس سے مراد یہ ہے کہ وہ سود کھاتے ہیں اور اس کا کاروبار کرتے ہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اَکَل (کھانے) کا ذکر کیا ہے اس لئے کہ انسان کا مال میں سب سے قوی مقصد یہی ہوتا ہے۔ اور اس لئے کہ یہ انتہائی رغبت اور حرص پر دلالت کرتا ہے۔ الجشع کا معنی شدید حرص ہے۔ کہا جاتا ہے: رجل جشع بیّن الجَشَع و قوم جشعون (یعنی انتہائی شدید حرص رکھنے والا آدمی اور قوم) المجمل میں یہی ہے۔ اور کسب (کمائی) کے توابع میں سے اس بعض کو کل کسب کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔ پس لباس، رہائش، ذخیرہ اور اہل و عیال پر خرچ کرنا سب اس ارشاد میں داخل

ہے۔ اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ

مسئلہ نمبر 12۔ اس آیت میں ان کے انکار کے فاسد ہونے پر دلیل ہے جنہوں نے جن کی جانب سے گرا دینے کا انکار کیا ہے اور یہ گمان کیا ہے کہ یہ طبائع کے فعل میں سے ہے اور یہ کہ شیطان نہ انسان میں چل سکتا ہے اور نہ اس کی جانب سے چھوا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں پہلے ان کا رد گزر چکا ہے۔

نسائی نے ابوالیسر سے روایت بیان کی ہے انہوں نے بیان کیا ہے: رسول اللہ ﷺ اس طرح دعا مانگتے تھے: اللھم انی اعوذبك من التردی والھدم والغرق والحریق واعوذبك ان یتخبطنی الشیطان عند الموت وأعوذبك أن اموت فی سبیلك مُدبِرا وأعوذ بك أن اموت لدیغا (اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں (کنویں میں) گرنے سے اور (اس سے کہ مجھ پر کوئی عمارت) گر پڑے اور (پانی میں) غرق ہونے سے اور (آگ میں) جلنے سے اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ شیطان موت کے وقت مجھے پاگل بنا دے اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ میں تیرے راستے میں (میدان جہاد سے) پیٹھ پھیرتے ہوئے مروں اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ مجھے کسی شے کے ڈسنے سے موت آئے۔)

اور محمد بن مثنی کی حدیث سے مروی ہے کہ ابوداؤد نے ہمام سے انہوں نے حضرت قتادہ سے اور انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ دعا مانگتے تھے: اللّٰھم انی اعوذبك من الجنون والجذام والبرص و سیّئ الاسقام (اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں جنون سے، جذام سے، برص سے اور بیماریوں کی شدت اور تلخی سے)

اور مس کا معنی جنون ہے۔ کہا جاتا ہے مُسَّ الرجل وأُلِسَ، فَھُوَ ممسوس و مألوس جب وہ آدمی مجنون ہو، اور یہ آخرت میں ربا کی علامت ہوگی۔ اور حدیث اسراء میں روایت کیا گیا ہے۔ "جبرائیل امین علیہ السلام مجھے لے کر چلے تو میں بہت سے لوگوں کے پاس سے گزرا ان میں سے ہر آدمی کا پیٹ بہت بڑے گھر کی مثل ہے درآنحالیکہ وہ آل فرعون کے راستے پر پڑے ہوئے ہیں۔ اور آل فرعون کو صبح و شام آگ پر پیش کیا جاتا ہے پس وہ شدید پیاسے اونٹوں کی مثل آتے ہیں وہ پتھروں اور درختوں سے ٹکراتے ہیں نہ وہ کچھ سنتے ہیں اور نہ عقل رکھتے ہیں پس جب ان بڑے پیٹوں والوں نے انہیں محسوس کیا تو وہ کھڑے ہوئے اور ان کے پیٹ ان پر غالب آگئے اور وہ گرنے لگے پھر ان میں سے کوئی کھڑا ہوتا تو وہ اس کا پیٹ اس پر بھاری ہو جاتا اور وہ گر پڑتا۔ پس وہ واضح استطاعت اور قدرت نہ رکھتے تھے، یہاں تک کہ آل فرعون نے انہیں ڈھانپ لیا اور وہ انہیں آتے جاتے ہوئے روندنے لگے۔ پس دنیا اور آخرت کے درمیان برزخ میں یہی ان کا عذاب ہے۔ اور آل فرعون کہتے ہیں اے اللہ! کبھی قیامت قائم نہ کر، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۛ اَدْخِلُوْۤا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۞ (الغافر) (اور جس روز قیامت قائم ہوگی (حکم ہوگا) داخل کر دو فرعونیوں کو سخت تر عذاب میں) میں نے پوچھا اے جبریل! یہ کون لوگ ہیں؟ تو اس نے کہا: "یہ وہ لوگ ہیں جو سود کھاتے ہیں وہ کھڑے نہیں ہوں گے مگر جس طرح وہ کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر پاگل بنا دیا ہو۔" اور مس سے مراد جنون ہے اور اسی سے اَوْلَق، اَلْس اور الزود کے الفاظ بھی اسی معنی میں ہیں۔

مسئلہ نمبر 13۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا تمام متاولین کے نزدیک اس کا معنی ہے کہ یہ کفار کے بارے میں ہے اور ان کو کہا گیا ہے: فَلَهٗ مَا سَلَفَ (تو جائز ہے اس کے لئے جو گزر چکا ہے) اور کسی گنہگار مومن کو یہ نہیں کہا جاتا، بلکہ اس کی بیع ٹوٹ جاتی ہے اور اس کا فعل رد کر دیا جاتا ہے اگر چہ وہ ناواقف ہو۔ سو اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مَنْ عمل عملا لیس علیه امرُنا فهو رَدٌّ (جس نے کوئی ایسا کام کیا جس کے بارے ہمارا حکم نہیں ہے تو وہ کام مردود ہے) لیکن نافرمان اور معصیت کا ارتکاب کرنے والے اس آیت کی وعید سے ایک طرف ہو کر سود لیتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 14۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا یعنی بے شک قرض کی مدت پوری ہونے کے بعد آخر میں زیادتی اسی طرح ہے جس طرح عقد کی ابتدا میں اصلی ثمن تھے۔ اور عربوں میں صرف یہی ربا معروف تھا۔ پس جب ان کے قرض کی ادائیگی کا وقت آپہنچتا تو وہ مقروض کو کہتے: کیا تو پورا ادا کرے گا یا اسے بڑھائے گا۔ یعنی قرض میں اضافہ کرے گا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اسے حرام قرار دیا ہے اور اپنے اس قول حق کے ساتھ ان کے قول کو رد کر دیا ہے: وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا اور واضح کر دیا ہے جب مدت گزر جائے اور اس کے پاس ادائیگی کے لئے کچھ نہ ہو تو اسے آسانی اور خوشحالی آنے تک مہلت دی جائے اور یہی وہ ربا ہے جسے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نویں ذی الحجہ کے دن اپنے قول کے ساتھ منسوخ کر دیا۔ جب آپ نے فرمایا: ''خبردار! سنو بلاشبہ تمام سود ختم کر دیا گیا ہے اور وہ پہلا سود جسے میں ختم کر رہا ہوں وہ حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کا سود ہے وہ سارے کا سارا ختم کر دیا گیا ہے۔'' پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا سے اور لوگوں میں سے خاص ترین آدمی سے اس کا آغاز کیا۔ اور یہی امام وقت کے عدل کے طریقوں میں سے ہے کہ وہ عدل کو اپنی ذات پر اور اپنے خواص پر نافذ کرتا ہے اور پھر وہ تمام لوگوں میں پھیل جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 15۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا یہ قرآن کریم کے عمومات میں سے ہے۔ اور اس پر الف لام جنس کیلئے ہے، عہد کے لئے نہیں ہے، کیونکہ اس سے پہلے بیع کا ذکر نہیں ہوا جس کی طرف رجوع کیا جائے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَ الْعَصْرِ ۙ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۙ (قسم ہے زمانے کی بے شک انسان خسارے میں ہے) پھر استثنیٰ فرمائی: اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (سوائے ان کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کئے) (اس میں الانسان پر الف لام جنسی ہے) اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ بیع عام ہے تو پھر اسے اس کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے جس ربا وغیرہ کا ذکر ہم نے کر دیا ہے کہ اس سے منع کر دیا گیا ہے اور ان کا عقد کرنے سے روکا گیا ہے، جیسا کہ خمر، مردار اور کسی حاملہ جانور کا حمل وغیرہ ذالک اور اس بارے میں یہی سنت ہے اور اجماع امت سے ثابت ہے اور اس کی نظیر یہ بھی ہے: اُقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ۔

اور وہ تمام کے تمام ظواہر جو عمومات کا تقاضا کرتے ہیں اور ان میں تخصیص داخل ہو سکتی ہے اور یہ اکثر فقہاء کا مذہب ہے۔

اور بعض نے کہا ہے یہ قرآن کریم کی وہ مجمل آیت ہے جس کی تفسیر بیع کی اس قسم کے ساتھ کی گئی ہے جو حلال کی گئی ہے اور اس کے ساتھ جو حرام کی گئی ہے اور یہ ممکن نہیں ہے کہ اسے بیع کو حلال کرنے اور اسے حرام کرنے کے بارے میں استعمال کیا جائے مگر تب جب اس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں سے کوئی بیان مقترن ہو　اگر چہ یہ تفصیل کے بغیر فی الجملہ

بیوع کی اباحت پر دال ہے اور یہ عموم اور مجمل کے درمیان فرق ہے۔ پس عموم فی الجملہ اور تفصیل کے ساتھ بیوع کی اباحت پر دلالت کرتا ہے جب تک وہ کسی دلیل کے ساتھ مخصوص نہ ہو۔ اور مجمل ان کی اباحت پر تفصیل سے دلالت نہیں کرتا یہاں تک کہ اس کے ساتھ بیان مقترن ہو۔ اور پہلا زیادہ صحیح ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 16۔ البیع لغت میں مصدر ہے باع کذا بکذا۔ یعنی اس نے عوض دیا اور معوض لیا۔ اور یہ بائع (بیچنے والا) کا تقاضا کرتی ہے اور وہ مالک ہوتا ہے یا اس کا نائب ہوتا ہے اور بیع مشتری (خریدار) کا تقاضا کرتی ہے اور یہ وہ ہے جو ثمن ادا کرتا ہے۔ اور مبیع کا تقاضا کرتا ہے۔ اور مبیع وہ شے ہوتی ہے جس کے ثمن لگائے جائیں یعنی جس کے مقابلے میں ثمن دیئے جاتے ہیں۔ اور اس بنا پر بیع کے چار ارکان ہوئے۔ بائع (بیچنے والا) مشتری (خریدار) ثمن (قیمت) اور مثمن (مبیع وہ شے جو بیچی جا رہی ہو) پھر عربوں کے نزدیک معاوضہ اپنے مضاف الیہ کے اختلاف کے سبب مختلف ہوتا رہتا ہے۔ پس اگر معاوضہ رقبہ یعنی ذات کے مقابلہ میں ہو تو اسے بیع کا نام دیا گیا ہے اور اگر رقبہ کی منفعت کے مقابلہ میں ہو تو اگر وہ منفعت بضع ہو تو اسے نکاح کا نام دیا گیا ہے اور اگر اس کے سوا کسی اور منفعت کے مقابلہ میں ہو تو اس کا نام اجارہ ہے اور عین (دراہم و دنانیر) کی بیع عین کے عوض ہو تو وہ بیع النقد ہے اور وہی بیع الصرف ہے اور اگر بیع دین موجل کے ساتھ ہو تو وہ بیع سلم ہے۔ اس کا بیان آگے آیۃ الدین میں آئے گا۔ اور بیع الصرف کا حکم گزر چکا ہے اور اجارہ کا حکم سورۃ القصص میں آئے گا اور نکاح میں مہر کا حکم سورۃ النساء میں آئے گا ہر ایک کا ذکر اپنے اپنے محل میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 17۔ بیع قبول اور ایجاب (کا نام) ہے یہ مستقبل اور ماضی کے الفاظ کے ساتھ منعقد ہوتی ہے۔ اس میں ماضی حقیقۃً ہوتی ہے اور مستقبل کنایۃً ہوتا ہے اور یہ ایسے لفظ صریح اور کنایہ سے واقع ہو جاتی ہے جس سے ملکیت کا منتقل ہونا سمجھا جائے۔ چاہے وہ یہ کہے: بعتك هذه السلعة بعشرة میں نے تجھے یہ سامان دس کے عوض بیچا اور خریدنے والا کہے: اشتریتھا۔ میں نے اسے خرید لیا۔ یا خریدنے والا پہلے کہے: اشتریتھا۔ میں نے اسے خرید لیا اور پھر بیچنے والا کہے: بعتکھا۔ میں نے اسے تجھے بیچ دیا یا بائع کہے: میں تجھے دس کے عوض بیچوں گا اور پھر مشتری کہے۔ میں خرید لوں گا یا میں نے خرید لیا۔ اور اسی طرح ہے اگر وہ کہے تو اسے دس کے عوض لے لے یا میں نے تجھے یہ دے دیا یا تو اسے لے لے یا تجھے اس میں برکت دی جائے دس کے عوض یا میں نے اسے تیرے حوالے کر دیا اور وہ دونوں بیع کا ارادہ رکھتے ہوں۔ تو ان تمام الفاظ کے ساتھ بیع لازم ہو جائے گی۔ اور اگر بائع نے کہا: میں نے تجھے دس کے عوض بیچ دی پھر وہ مشتری کے قبول کرنے سے پہلے رجوع کر لے تو امام مالکؒ نے کہا ہے: اس کے لئے رجوع کرنا جائز نہیں ہے یہاں تک کہ وہ مشتری کے قبول یا اس کے رد کو سن لے، کیونکہ اس نے اپنی جانب سے اسے دے دیا ہے اور اسے اس پر ثابت کر دیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ وہ اس کے لئے جائز ہے کیونکہ ابھی اس پر عقد مکمل نہیں ہوا۔

اور اگر بائع کہے: میں نے تو مذاق کیا تھا تو اس بارے میں روایت مختلف ہے۔ پس آپ نے ایک بار کہا: بیع لازم ہو جائے گی اور اس کے قول کی طرف توجہ نہیں کی جائے گی۔ اور ایک بار فرمایا: سامان کی قیمت کی طرف دیکھا جائے گا۔ پس اگر ثمن اس

کی قیمت سے موافقت رکھتے ہوں تو بیع لازم ہوگی اور اگر متفاوت ہوں جیسا کہ غلام ایک درہم کے عوض اور گھر ایک دینار کے بدلے، تو اس سے یہ معلوم ہوگیا کہ اس نے اس سے بیع کا ارادہ نہیں کیا۔ بلاشبہ وہ مذاق کرنے والا ہے نتیجتاً بیع لازم نہیں ہوئی۔

مسئلہ نمبر 18۔ قولہ تعالیٰ: وَحَرَّمَ الرِّبٰوا یہاں الف لام عہدی ہے اور اس سے مراد وہی ربا ہے جس کا کاروبار عرب کرتے تھے جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے، پھر یہ شامل ہوگا اسے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام کیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ایسی بیع سے منع کیا گیا ہے جس میں ربا داخل ہوسکتا ہے اور جو بھی اس کے معنی میں بیوع ہیں ان سے منع کر دیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 19۔ عقد ربا کو فسخ کر دیا گیا ہے وہ کسی حال میں بھی جائز نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ ائمہ نے اسے روایت کیا ہے اور الفاظ مسلم کے ہیں۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان فرمایا کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ سرخ کھجوریں لے کر آئے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''یہ کہاں سے لائے ہو؟'' حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ہمارے پاس کچھ ردی کھجوریں تھیں، تو میں نے ان میں سے دو صاع ایک صاع کے عوض بیچ دیں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کھانے کے لئے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت فرمایا: ''اوہ! یہی تو عین ربا ہے تو اس طرح نہ کر۔ البتہ جب تو کھجوریں بیچنے کا ارادہ کرے تو تو پہلے ایک بیع کے ساتھ انہیں بیچ دے پھر ان (کے ثمن) کے عوض وہ خرید لے۔'' اور ایک روایت میں ہے۔ ''یہ ربا ہے پس تم اسے لوٹا دو پھر تم ہماری کھجوریں بیچو اور ان کے (ثمن کے) عوض ہمارے لئے کھجوریں خرید لو۔''(1)

ہمارے علماء نے کہا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد: اوہ عین الربا سے مراد وہ ربا ہے جو فی نفسہ حرام ہے نہ کہ وہ جو اس سے مشابہت رکھتا ہے اور آپ کے قول: فردوہ عقد ربا کو فسخ کرنے کے واجب ہونے پر دلالت کرتا ہے اور یہ بیع کسی اعتبار سے بھی صحیح نہیں ہوسکتی اور یہی جمہور کا قول ہے، بخلاف امام اعظم ابوحنیفہ کے کہ وہ فرماتے ہیں: بلاشبہ ربا کی بیع اپنے اصل کے اعتبار سے جائز ہے اس حیثیت سے کہ وہ بیع ہے اور اپنے وصف کے اعتبار سے ممنوع ہے اس اعتبار سے کہ وہ ربا ہے۔ پس ربا ساقط ہو جائے گا اور بیع صحیح ہو جائے گی اور اگر اس طرح ہوتا جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس عقد کو فسخ نہ کرتے اور آپ ایک صاع پر جو زیادتی تھی اسے واپس لوٹانے کا حکم ارشاد فرماتے۔ اور یقیناً ایک صاع کے مقابلہ میں صفقہ کو صحیح قرار دیتے۔

مسئلہ نمبر 20۔ ہر وہ عقد جو واضح طور پر حرام ہو اور اسے فسخ کر دیا جائے تو مشتری پر سامان بعینہ واپس لوٹانا واجب ہے اور اگر مشتری کے ہاتھ سے وہ ضائع ہوگیا تو وہ اس سامان میں قیمت لوٹائے گا جس کی قیمت ہو اور وہ یہ ہیں مثلاً زمین، سامان اور حیوان وغیرہ۔ اور جن کی مثل موجود ہو اس کی مثل واپس لوٹائے گا وزنی چیزوں میں سے ہو یا کیلی چیزوں میں سے طعام ہو یا عرض (سامان) ہو۔

امام مالک نے کہا ہے: جس کا حرام ہونا بین ہو وہ واپس لوٹایا جائے گا چاہے وہ ضائع ہو یا نہ ہو۔ اور وہ جو اس میں سے ہو جسے لوگوں نے مکروہ جانا ہو تو اسے رد کر دیا جائے مگر یہ کہ سامان ضائع ہو جائے تو پھر اسے چھوڑ دیا جائے۔ (یعنی رد نہ کیا جائے۔)

مسئلہ نمبر 21۔ قولہ تعالیٰ: فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ حضرت امام جعفر بن محمد صادق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اللہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الوکالۃ، حدیث نمبر 2145، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تعالیٰ نے سود حرام کر دیا ہے تا کہ لوگ ایک دوسرے کو قرض دیں اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دو بار قرض دینا ایک بار صدقہ دینے کے مساوی ہوتا ہے۔'' اسے بزار نے نقل کیا ہے اور اس کا مکمل معنی پہلے گزر چکا ہے۔

اور بعض لوگوں نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اسے حرام قرار دیا ہے کیونکہ یہ مالوں کے لئے باعث ضیاع اور لوگوں کے لئے باعث ہلاکت ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد فَمَنْ جَآءَهٗ میں فعل کے آخر سے علامت تانیث ساقط ہے کیونکہ الموعظة مونث غیر حقیقی ہے اور یہ بمعنی وعظ ہے اور حسن نے علامت تانیث کو ثابت رکھتے ہوئے فَمَنْ جَاءَتْهُ پڑھا ہے۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو جب حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کے فعل کی خبر دی گئی تو آپ نے یہ آیت پڑھی۔ دارقطنی نے عالیہ بنت انفع سے روایت کیا ہے کہ اس نے کہا کہ میں اور ام محبہ مکہ کی طرف نکلیں اور ہم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس داخل ہوئیں اور آپ پر سلام عرض کیا تو آپ نے ہم سے پوچھا تم کن میں سے ہو؟ ہم نے عرض کی۔ ہم اہل کوفہ میں سے ہیں، اس نے کہا گویا آپ نے ہم سے اعراض کر لیا۔ پھر ام محبہ نے آپ سے عرض کی: اے ام المومنین! میری ایک کنیز تھی اور میں نے اسے حضرت زید بن ارقم انصاری رضی اللہ عنہ کو آٹھ سو درہم کے عوض انہیں عطیہ ملنے تک فروخت کر دیا۔ اور پھر انہوں نے اسے بیچنے کا ارادہ کیا تو میں نے ان سے اسے نقد چھ سو درہم کے عوض خرید لیا ہے۔ وہ کہتی ہیں۔ پس آپ رضی اللہ عنہا ہماری طرف متوجہ ہوئیں اور فرمایا: تیری خرید بہت بری ہے اور وہ بھی جو تو نے خریدی ہے۔ اور زید رضی اللہ عنہ کو یہ پیغام پہنچا دے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں کئے جانے والے اپنے جہاد کو باطل کر دیا ہے مگر یہ کہ وہ توبہ کر لے۔

پھر اس نے آپ سے عرض کی: آپ کی کیا رائے ہے اگر میں ان سے اپنے راس المال کے سوا اور کچھ نہ لوں؟ تب آپ نے کہا: فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ (پس جس کے پاس اس کے رب کی طرف سے نصیحت آئی اور وہ (سود سے) رک گیا تو اس کے لئے جائز ہے جو گزر چکا ہے۔) عالیہ ابو اسحاق ہمدانی کوفی السبیعی کی بیوی اور یونس بن ابی اسحاق کی ماں ہے۔ اور یہ حدیث امام مالک نے بیوع الآجال کے بیان میں نقل کی ہے جو آپ سے ابن وہب نے روایت کی ہے۔ پس اگر بیوع میں ایسی شے ہو جو ممنوع میں پڑنے تک پہنچاتی ہو تو آپ (امام مالک) نے اس بیع سے منع کیا ہے اگرچہ ظاہراً وہ جائز ہو۔ اور جمہور فقہاء نے اس اصل (بنیاد) میں امام مالک سے اختلاف کیا ہے اور انہوں نے کہا ہے: احکام کا دار و مدار ظاہر پر ہے نہ کہ ظنون پر۔ اور ہماری دلیل سد ذرائع کے بارے قول ہے۔ پس اگر اسے تسلیم کر لیا جائے (تو فبہا) ورنہ ہم نے اس کی صحت پر استدلال بیان کیا ہے۔ اور وہ گزر چکا ہے۔ اور یہ حدیث نص ہے۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا یہ نہ فرماتیں: أبلغی زیدًا أنه قد ابطل جهاده الا آن یتوب یہ ارشاد توقیفی ہے۔ کیونکہ فقط رائے سے ایسا قول نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اعمال کو باطل کرنے کی معرفت بغیر وحی کے حاصل نہیں ہو سکتی، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور صحیح مسلم (1) میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''بے شک حلال واضح اور بین

1۔ صحیح بخاری، باب فضل من استبرأ لدینه، حدیث نمبر 50، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے اور حرام بھی واضح اور بین ہے اور ان دونوں کے درمیان امور مشتبہات ہیں۔ لوگوں میں سے بہت سے انہیں نہیں جانتے پس جو کوئی شبہات سے بچتا رہا اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو محفوظ کر لیا اور جو کوئی شبہات میں پڑ گیا تو وہ حرام میں واقع ہو گیا، اس چرنے والے کی طرح جو چراگاہ کے اردگرد چرتا ہے۔ قریب ہے کہ وہ اس میں واقع (داخل) ہو جائے۔ خبردار! سنو بلاشبہ ہر مالک کے لئے ایک چراگاہ ہے۔ خبردار! سنو اللہ تعالیٰ کی چراگاہ اس کی حرام کردہ چیزیں ہیں''۔

اور وجہ دلالت یہ ہے کہ آپ نے محرمات میں واقع ہونے کے خوف سے متشابہات میں پڑھنے سے منع کیا ہے۔ اور یہی ذریعہ کو بند کرنا اور ختم کرنا ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک کبائر میں سے یہ ہے کہ آدمی اپنے والدین کو گالیاں دے۔'' صحابہ نے عرض کی: آدمی اپنے والدین کو گالیاں کیسے دے سکتا ہے؟'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ دوسرے آدمی کے باپ کو گالیاں دیتا ہے تو وہ اس کے باپ کو گالیاں دیتا ہے اور وہ اس کی ماں کو گالیاں دیتا ہے اور وہ اس کی ماں کو گالیاں دیتا ہے ☆۔'' پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعریضاً کسی کے والدین کو گالیاں دینے کو اپنے والدین کو گالیاں دینے کی طرح قرار دیا ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود پر لعنت فرمائی جب انہوں نے ان (چیزوں کے ثمن کھائے جن) کے کھانے سے انہیں منع کیا گیا تھا۔ (1)

اور ابوبکر نے اپنی کتاب میں کہا ہے: صدقہ کے خوف سے متفرق اشیاء کو جمع نہیں کیا جائے گا اور مجتمع کو متفرق نہیں کیا جائے گا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے دراہم کی بیع دراہم کے ساتھ کرنے سے منع کیا ہے جبکہ ان کے درمیان گناہ ہو۔ اور علماء نے بیع اور قرض کو جمع کرنے سے روکنے پر اتفاق کیا ہے اور اس پر کہ شراب کی قلیل مقدار حرام ہے اگرچہ وہ نشہ نہ بھی لائے اور اس پر کہ اجنبیہ عورت سے خلوت اختیار کرنا حرام ہے اگرچہ وہ عنین ہو اور اس پر کہ نوجوان عورت کے چہرہ کی طرف دیکھنا حرام ہے، علاوہ ازیں بہت سی چیزیں ہیں اور ان کے بارے قطعی اور یقینی علم ہے کہ شریعت نے ان سے باز رہنے کا حکم دیا ہے، اس لئے کہ وہ محرمات تک پہنچنے کے ذرائع ہیں۔ اور ربا اس کا زیادہ حق رکھتا ہے کہ اس کی چراگاہ کی حفاظت کی جائے اور اس کے راستوں کو بند کیا جائے۔

اور جنہوں نے ان اسباب کو مباح قرار دیا ہے تو انہیں چاہئے کہ مسلمان مردوں اور عورتوں کو ہلاک کرنے کے لئے کنواں کھودنے اور پھندے گاڑنے کو بھی مباح قرار دیں۔ اور اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے اور یہ بھی کہ ہم نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ آدمی کو زیادہ قیمت کے ساتھ ادھار شے بیچنے کو منع کیا جائے گا، بشرطیکہ یہ معروف ہو اور اس کی عادت ہو۔ اور یہ اسی باب کے معنی میں ہے۔ واللہ الموفق للصواب۔

مسئلہ نمبر 22۔ ابوداؤد نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جب تم زیادہ قیمت کے ساتھ ادھار چیزیں بیچنے لگو اور بیلوں کی دمیں پکڑنے لگو اور کھیتی پر ہی راضی ہو جاؤ اور جہاد چھوڑ دو، اللہ تعالیٰ تم پر ایسا رعب اور خصلت مسلط کر دے گا وہ اسے تم سے دور نہیں کرے گا یہاں

1۔ صحیح بخاری، باب لا یجمع بین متفرق ولا یفرق بین مجتمع، حدیث نمبر 1358، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

☆ مسند امام احمد، حدیث نمبر 6529

تک کہ تم اپنے دین کی طرف واپس لوٹ آؤ(1)۔'' اس کی اسناد میں ابوعبدالرحمٰن خراسانی ہے۔ وہ مشہور راوی نہیں ہے۔

ابوعبید ہروی نے العینہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ آدمی اپنا سامان ثمن معلوم کے عوض کسی آدمی کو ایک مقررہ مدت تک ادھار بیچ دے اور پھر اسے اس سے ان ثمنوں سے کم کے عوض خرید لے جتنے کے عوض اسے بیچا تھا۔ فرمایا: اگر کسی نے عینہ کے طالب کی موجودگی میں ایک سامان دوسرے آدمی سے ثمن معلوم کے عوض خریدا اور اس پر قبضہ کر لیا پھر اسے عینہ کے طالب کو اس سے زیادہ ثمن کے عوض مقررہ مدت تک ادھار بیچ دیا جتنے کے عوض اسے خریدا تھا پھر وہ مشتری پہلے بائع سے نقد اس سے کم ثمن کے ساتھ بیچ دے تو یہ بھی عینہ ہے اور یہ پہلے سے زیادہ آسان ہے اور یہ بعض کے نزدیک جائز ہے اور صاحب عینہ کے پاس نقد موجود ہونے کی وجہ سے اسے عینہ کا نام دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ العین سے مراد مال حاضر ہے اور مشتری بلاشبہ اسے خرید رہا ہے تاکہ وہ اسے حاضر مال کے عوض بیچے جو اسے جلدی مل جائے گا۔

مسئلہ نمبر 23۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: جس نے کچھ سامان ایک خاص مدت تک ثمن کے عوض فروخت کیا پھر اسے خرید لیا ایسے ثمن کے عوض جو اس ثمن کی جنس میں سے تھے جن کے عوض اسے بیچا تھا تو وہ اس سے خالی نہیں ہے کہ وہ اسے نقد ثمن کے عوض خریدے گا یا اتنی مدت تک ادھار جو اس مدت سے کم تھی جس تک اس نے اسے بیچا تھا یا اس تک جو اس مدت سے زیادہ تھی، ثمن مثلی کے عوض یا اس سے کم کے عوض یا اس سے زیادہ کے عوض۔ پس یہ تین مسائل ہیں۔ جہاں تک پہلے اور دوسرے کا تعلق ہے تو اگر وہ مثل ثمن یا اکثر ثمن کے عوض خریدے تو یہ جائز ہے اور کم ثمن کے عوض ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کے مقتضا کے مطابق جائز نہ ہوگا، کیونکہ اس نے چھ سو دیئے ہیں تاکہ وہ آٹھ سو لے لے اور سامان لغو ہو گیا۔ اور یہ ہی خالص ربا ہے۔ اور رہا تیسرا مسئلہ کہ وہ اس سے زیادہ مدت تک ادھار لے لے، پس اگر اس نے صرف اسے ہی خریدا یا کچھ اور بھی، تو مثل ثمن یا اقل ثمن کے ساتھ یہ جائز ہوگی، البتہ زیادہ ثمن کے عوض جائز نہ ہوگی۔ اور اگر اس نے اس میں سے بعض حصہ خرید لیا تو پھر کسی حال پر بھی یہ خرید جائز نہ ہوگی نہ مثل ثمن کے ساتھ، نہ اقل کے ساتھ اور نہ ہی اکثر کے ساتھ۔ اس باب کے مسائل کو ہمارے علماء نے ستائیس مسائل میں محصور کیا ہے اور ان کا دارومدار اسی پر ہے جو ہم نے ذکر کر دیا ہے۔ پس تو جان لے۔

مسئلہ نمبر 24۔ قولہ تعالیٰ: فَلَهٗ مَا سَلَفَ یعنی سود کے معاملہ میں سے جو گزر چکا ہے اس پر نہ دنیا میں کوئی مواخذہ ہوگا اور نہ آخرت میں، سدی وغیرہ نے یہی کہا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کے لئے حکم ہے جس نے کفار قریش میں سے اسلام قبول کیا اور بنی ثقیف اور ان میں سے جو وہاں تجارت کرتے تھے (ان میں سے جس نے اسلام قبول کیا) اور سلف کا معنی ہے وہ زمانہ جو پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 25۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ اس میں چار تاویلات ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ضمیر ربا کی طرف لوٹ رہی ہے، معنی یہ ہے کہ سود کا معاملہ اس کی یا دوسری چیزوں کی تحریم کو جاری رکھنے میں اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے۔ اور

1۔ سنن ابیداؤد، باب فی النہی من العینۃ، حدیث نمبر 3003، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

دوسری یہ کہ ضمیر ما سَلَفَ کی طرف لوٹ رہی ہو یعنی جو کچھ گزر چکا ہے اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے اسے معاف کرنے کے بارے میں اور اس میں تاوان اور سزا کو ساقط کرنے کے بارے میں۔ اور تیسری یہ ہے کہ ضمیر سود لینے والے (ذی الربا) کی طرف لوٹ رہی ہے، اس معنی میں کہ اس کا معاملہ اس بارے میں اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے کہ وہ اسے اس سے رکنے پر ثابت قدم رکھے یا اسے دوبارہ ربا میں گناہ کی طرف لوٹا دے۔

اس قول کو نحاس نے اختیار کیا ہے اور کہا ہے: یہ قول اچھا اور واضح ہے۔ یعنی مستقبل میں اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے اگر وہ چاہے تو اسے تحریم پر ثابت رکھے اور اگر چاہے تو اسے مباح قرار دے۔ اور چوتھی تاویل یہ ہے کہ ضمیر رکنے والے اور باز رہنے والے کی طرف لوٹ رہی ہو لیکن اسے مانوس کرنے اور خیر اور بھلائی میں اس کی آرزو اور امید پھیلانے کے معنی میں، جیسا کہ تو کہتا ہے: اس کا معاملہ اطاعت اور خیر کے سپرد ہے اور جیسا کہ تو کہتا ہے: اس کا معاملہ نمو اور توجہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کی اطاعت کے سپرد ہے۔

مسئلہ نمبر 26۔ قولہ تعالیٰ: وَمَنْ عَادَ یعنی جو فعل ربا کی طرف لوٹ آیا (یعنی دوبارہ سود کھانے لگا) یہاں تک کہ وہ مر گیا۔ حضرت سفیان نے یہ کہا ہے۔ اور ان کے سوا دوسروں نے کہا: جو لوٹا اور اس نے کہا بے شک بیع ربا کی مثل ہے تو وہ کافر ہو گیا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے اگر ہم کہیں کہ یہ آیت کافر کے بارے میں ہے تو پھر خلود سے مراد حقیقی طور پر ہمیشہ رہنا ہے۔ اور اگر ہم اسے گنہگار مسلمان کے بارے قرار دیں تو پھر خلود کا لفظ مجازاً مبالغہ کے معنی میں ہو گا، جیسا کہ عرب کہتے ہیں: ملک خالد یہ ایسے دوام سے عبارت ہے جو حقیقی طور پر ہمیشہ باقی نہیں رہے گا۔

مسئلہ نمبر 27۔ قولہ تعالیٰ: یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا یعنی دنیا میں اللہ تعالیٰ سود کو مٹا دے گا یعنی اس کی نمو ختم ہو جائے گی اگرچہ وہ زیادہ ہی ہو۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ان الربا وان کثر فعاقبته الی قل (بلاشبہ سود اگرچہ بہت زیادہ ہو اس کا انجام قلیل ہی ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا یعنی آخرت میں اللہ تعالیٰ سود کو مٹا دے گا۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا کے بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس سے کوئی صدقہ، حج، جہاد اور صلہ رحمی قبول نہیں کرے گا۔

المَحْقُ کا معنی النقص والذھاب۔ کم ہونا یا گھٹانا اور ختم ہونا ہے اور اسی سے مُحَاق القمر یعنی چاند کا گھٹنا بھی ہے۔ وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ یعنی وہ دنیا میں خیرات کو برکت کے ساتھ بڑھاتا ہے اور آخرت میں ان کا ثواب کئی گناہ کر کے بڑھا دے گا۔ اور صحیح مسلم میں ہے: "بے شک تم میں سے کسی کا صدقہ اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہوتا ہے اور وہ اسے اس کے لئے بتدریج بڑھاتا رہتا ہے جس طرح تم میں سے کوئی گھوڑی اور گائے کے بچوں کی نشوونما کرتا ہے، یہاں تک کہ قیامت کا دن آ جائے گا اور بے شک ایک لقمہ احد پہاڑ کی مثل ہو جائے گا۔"(1)

1۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی فضل الصدقۃ، حدیث نمبر 598، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔
صحیح بخاری، کتاب الزکاۃ، حدیث نمبر 1321، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابن زبیر نے یُمَحِّقُ یا کے ضمہ اور حاء کے کسرہ کو مشدد اور یُرَبِّیْ را کو فتحہ کے ساتھ اور با کو مشدد پڑھا ہے اور حضور نبی مکرم ﷺ سے اسی طرح مروی ہے۔

مسئلہ نمبر 28۔ قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ اس میں کفار کی صفت اَثیم مبالغہ کے لئے لگائی گئی ہے، اس حیثیت سے کہ دونوں لفظ مختلف ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کفار میں اشتراک کے معنی کو زائل کرنے کے لئے یہ صفت لگائی گئی ہے کیونکہ کبھی اس کا اطلاق اس کسان پر بھی ہوتا ہے جو زمین میں دانا چھپاتا ہے۔ (یعنی کاشت کرتا ہے) ابن فورک نے یہی کہا ہے۔

اور قول باری تعالیٰ: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ اور نماز اور زکوٰۃ کو خاص طور پر اس لئے ذکر کیا ہے حالانکہ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ انہیں متضمن اور شامل ہے۔ تو یہ ان دونوں کے شرف وعظمت اور ان کی قدر ومنزلت پر آگاہ کرنے کے لئے ہے کیونکہ یہ دونوں اعمال کی اصل ہیں، نماز بدنی اعمال کی اصل ہے اور زکوٰۃ مالی اعمال کی اصل ہے۔

مسئلہ نمبر 29۔ قولہ تعالیٰ: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۝ ظاہر یہ ہے کہ وہ اس سود کو باطل کردے جس پر قبضہ نہیں ہوا ہے، اگرچہ آیت تحریم کے نازل ہونے سے پہلے اس کا عقد ہو چکا ہو۔ اور جب اس پر قبضہ ہو چکا ہو تو پھر اس کے فسخ کے پیچھے نہ پڑے۔

تحقیق کہا گیا ہے کہ یہ آیت بنی ثقیف کے سبب نازل ہوئی۔ انہوں نے حضور نبی مکرم ﷺ کے ساتھ اس پر معاہدہ کیا تھا کہ ان کے سود کا مال جو لوگوں پر ہے تو وہ انہیں کے لئے ہے اور جو لوگوں کا ان پر ہے تو وہ ان سے ختم کر دیا گیا ہے، پھر جب ان کے سود کی مقررہ مدتیں آپہنچیں تو انہوں نے اہل مکہ کی طرف تقاضا کے لئے (پیغام) بھیجا۔ قرضے بنی عبدہ کے تھے اور وہ بنو عمرو بن عمیر ثقیف میں سے تھے اور یہ بنی مغیرہ مخزومیوں پر تھے۔ اور بنو مغیرہ نے کہا: ہم کوئی شے نہیں دیں گے کیونکہ ربا ختم کر دیا گیا ہے۔ اور انہوں نے اپنا معاملہ حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا اور انہوں نے یہ معاملہ رسول اللہ ﷺ کی طرف لکھا۔ اور یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے اسے حضرت عتاب رضی اللہ عنہ کی طرف لکھ بھیجا اور ثقیف نے بھی اس کے بارے جان لیا اور وہ (سود کا مطالبہ کرنے) سے رک گئے۔ یہی آیت کا سبب نزول ہے اور یہ اس مجموعے کا اختصار ہے جو ابن اسحاق، ابن جریج اور سدی وغیرہم نے روایت کیا ہے اور اس کا معنی یہ ہے تم اپنے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کے درمیان کوئی آڑ اور رکاوٹ بنالو اپنے باقی ربا کو چھوڑ کر اور اس سے درگزر کر کے۔

مسئلہ نمبر 30۔ قولہ تعالیٰ: اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ یہ اس بنا پر ثقیف کے حق میں شرط محض ہے کیونکہ یہ حکم ان کے اسلام میں داخل ہوتے ہی پہلے پہل نازل ہوا۔ اور جب ہم آیت کو ان کے بارے میں مقدر قرار دیں جن کا ایمان پختہ ہو چکا تھا تو پھر یہ مبالغہ کی جہت پر شرط مجازی ہے جیسا کہ تو اس کے بارے میں کہتا ہے جس کی ذات کو تو ابھارنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ ''اگر تو مرد ہے تو اس طرح کر۔'' اور نقاش نے مقاتل بن سلیمان سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ اس آیت میں اِنْ بمعنی

اِذٗ ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ مردود ہے اور لغت میں معروف نہیں ہے۔ اور ابن فورک نے کہا ہے: یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا سے مراد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے دیگر انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ایمان لانا ہو اور ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لانا مراد ہو، کیونکہ اس کے بغیر پہلا ایمان نفع نہیں دے گا اور یہ اس کے سبب مردود ہے جو آیت کے سبب نزول میں بیان کیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 31۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ یہ وعید ہے اگر انہوں نے سود نہ چھوڑا اور جنگ قتل کی دعوت دیتی ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے کہ قیامت کے دن سود کھانے والے کو کہا جائے گا: جنگ کے لئے اپنے ہتھیار لے لے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی کہا ہے: جو کوئی سود پر قائم رہے اور اس سے باز نہ آئے تو مسلمانوں کے امام پر لازم ہے کہ وہ اس سے سود کا مال واپس لے لے، پس اگر وہ باز آ جائے (تو فبہا) ورنہ وہ اسے قتل کر دے۔

اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے سود لینے والوں کو قتل کی دھمکی دی ہے اور انہیں مباح قرار دیا ہے جہاں بھی وہ پکڑے جائیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے: اگر تم باز نہ آئے تو تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ کرنے والے ہو، یعنی تم ان کے دشمن ہو۔

ابن خویز منداد نے کہا ہے: اگر کسی شہر والوں نے سود پر اسے حلال سمجھتے ہوئے صلح کر لی تو وہ مرتد ہو گئے اور ان کے بارے میں حکم مرتدین کے حکم کی طرح ہوگا۔ اور اگر وہ اسے حلال نہ سمجھیں تو امام وقت کے لئے ان سے جنگ لڑنا جائز ہے۔ کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں اعلان فرمایا ہے فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ (پھر وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی جانب سے اعلان جنگ سن لیں) اور ابو بکر نے حضرت عاصم رحمۃ اللہ علیہ سے "فَاٰذِنُوْا" پڑھا ہے۔ اس معنی کی بنیاد پر کہ تم اپنے سوا کو بتا دو کہ تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے حالت جنگ میں ہو۔

مسئلہ نمبر 32۔ ابن بکیر نے بیان کیا ہے کہ ایک آدمی حضرت امام مالک بن انس رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور کہا: اے ابا عبداللہ! میں نے ایک آدمی کو نشہ کی حالت میں دیکھا، وہ گالی گلوچ کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ چاند کو پکڑ لے، سو میں نے کہا میری بیوی کو طلاق اگر ابن آدم (انسان) کے پیٹ میں شراب سے بڑھ کر کوئی بری شے داخل ہوتی ہو۔ تو آپ نے اسے فرمایا: تو واپس چلا جا یہاں تک کہ میں تیرے مسئلہ میں غور و فکر کر لوں۔ پھر وہ دوسرے دن آیا، تو آپ نے اسے پھر فرمایا: تو واپس لوٹ جا یہاں تک کہ میں تیرے مسئلہ میں غور و فکر کر لوں۔ وہ پھر تیسرے دن آیا تو آپ نے اسے فرمایا: تیری بیوی کو طلاق ہو چکی ہے میں نے کتاب اللہ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں خوب چھان بین کی، گہری غور و فکر کی تو میں نے سود سے بڑھ کر کوئی بری شے نہ دیکھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس میں جنگ کا اعلان کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 33۔ یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ سود کھانا اور اس کے مطابق کاروبار کرنا گناہ کبیرہ میں سے ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے ہم اسے بیان کریں گے۔

حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یأتی علی الناس زمان لا یبقی أحد الا أکل الربا ومن لم یأکل الربا أصابه غباره (لوگوں پر ایسا زمانہ آئے گا کہ کوئی باقی نہیں رہے گا مگر وہ سود کھائے گا اور جس نے نہ کھایا تو اس کا غبار اس تک پہنچ جائے گا۔)

اور دار قطنی نے حضرت عبد اللہ ابن حنظلہ غسیل الملائکہ رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَدرهمُ ربًا اشد عند الله تعالیٰ من ست وثلاثین زنية فی الخطيئة (سود کا ایک درہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک گناہ میں چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے زیادہ شدید ہے۔)

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الرِّبا تسعة وتسعون بابا أدناها کاتیأن الرجل بأمه(1) (سود کے ننانوے دروازے ہیں اور ان میں سے ادنیٰ آدمی کا اپنی ماں کے ساتھ زنا کرنے کی مثل ہے) اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: سود کھانے والا، کھلانے والا، اسے لکھنے والا اور اس کی شہادت دینے والا سب پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے لعنت کی گئی ہے۔

اور امام بخاری نے ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے(2) کہ انہوں نے بیان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خون کے ثمن (قیمت) کتے کے ثمن اور بدکاری کی کمائی سے منع فرمایا ہے اور سود کھانے اور کھلانے والے پر (بال) گودنے اور گدوانے والی پر اور تصویر بنانے والے پر لعنت کی ہے۔ نهی رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم عن ثمن الدم وثمن الکلب وکسب البغی ولعن آکل الربا ومؤکله والواشمة والمستوشمة والمصور اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو اور ان میں ہے...... و آکل الربا اور سود کھانے والا۔

اور مصنف ابی داؤد میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے(3) انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے، کھلانے والے، اسے لکھنے والے اور اس پر شاہد بننے والے سبھی پر لعنت کی ہے۔

مسئلہ نمبر 34۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ الآیہ۔ ابو داؤد نے سلیمان بن عمرو سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت بیان کی ہے(4) کہ انہوں نے کہا: میں نے حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''خبردار! سنو بے شک دور جاہلیت کے سودوں میں سے تمام سود ختم کر دیئے گئے ہیں تمہارے لئے تمہارے اصل مال ہوں گے نہ تم ظلم کرو اور نہ ہی تم پر ظلم کیا جائے گا۔'' اور آگے پوری حدیث بیان کی۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں توبہ کے ساتھ اپنے رأس الاموال کی طرف لوٹا دیا اور انہیں فرمایا: سود لینے میں ''تم ظلم نہ کرو'' ''اور تم پر یہ ظلم نہیں کیا جائے گا''۔ کہ تمہارے رأس

1۔ ابن ماجہ، باب التغلیظ فی الرباء، حدیث نمبر 2264، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب ثمن الکلب، حدیث نمبر 2084، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ جامع ترمذی، کتاب البیوع، حدیث نمبر 1127، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن ابی داؤد، باب فی وضع الرباء، حدیث نمبر 2896، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

الاموال میں سے کوئی شے روک لی جائے اور تمہارے اموال ختم ہو جائیں۔

اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ تم پر ٹال مٹول کر کے ظلم نہیں کیا جائے گا، کیونکہ غنی کا ٹال مٹول کرنا بھی ظلم ہے (1)۔ پس معنی یہ ہوا کہ فیصلہ سود ختم کرنے کے ساتھ ہی ہو گا اور اسی طرح صلح کا طریقہ ہے اور یہی صلح کے زیادہ مشابہ شے ہے۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کعب بن مالک کی طرف ابن ابی حدرد کے قرض میں نصف ختم کرنے کے بارے اشارہ کیا اور کعب نے کہا: جی ہاں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے کو فرمایا: ''اٹھ اور اسے ادا کر دے'' پس علماء نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے امر بالقضاء کو مصالحات میں سنت کے طور پر لیا ہے۔ عنقریب سورۃ النساء میں صلح کا بیان آئے گا اور ان کا جن میں صلح جائز ہوتی ہے اور جن میں جائز نہیں ہوتی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 35۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِنۡ تُبۡتُمۡ فَلَكُمۡ رُءُوۡسُ اَمۡوَالِكُمۡ یہ تاکید ہے اس (ربا) کو باطل کرنے کی جس پر قبضہ نہیں کیا گیا اور اس رأس المال کو لینے کی جس میں سود نہیں۔ پس بعض علماء نے اس پر استدلال کیا ہے کہ ہر وہ شے جو بیع پر قبضہ کرنے سے پہلے ان چیزوں میں سے طاری ہو جو عقد کی تحریم کو ثابت کرتی ہیں تو وہ عقد کو باطل کر دے گی، جیسا کہ جب کوئی مسلمان شکار خریدے پھر مشتری یا بائع قبضہ سے پہلے اسے حرام کر دے تو بیع باطل ہو جائے گی، کیونکہ اس پر قبضہ سے پہلے وہ شے طاری ہو چکی ہے جس نے عقد کے حرام ہونے کو ثابت کر دیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس (ربا) کو باطل قرار دیا ہے جس پر قبضہ نہیں ہوا، کیونکہ اس پر وہ طاری ہو چکی ہے جس نے قبضہ سے پہلے اس کی تحریم کو ثابت کر دیا ہے اور اگر اس پر پہلے قبضہ کر لیا گیا ہو تو پھر اس پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔ یہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے اور یہی امام شافعی کے اصحاب کا بھی قول ہے اور اس کے ساتھ اس پر استدلال کیا جاتا ہے کہ قبضہ سے پہلے بائع کے ہاتھ میں مبیع کا ہلاک ہو جانا اور مبیع میں قبضہ کا ساقط ہو جانا عقد کے باطل ہونے کو واجب کرتا ہے۔ بخلاف بعض سلف کے اور یہ اختلاف امام احمد سے روایت کیا جاتا ہے۔

اور اس کے قول کے مطابق جاری ہو سکتا ہے جو یہ کہتا ہے: بے شک ربا میں عقد فی الاصل منعقد ہو چکا تھا اور پھر وہ قبضہ سے پہلے طاری ہونے والے اسلام کے سبب باطل ہو گیا۔ اور رہے وہ جنہوں نے اصل میں ربا کے انعقاد کا انکار کیا ہے تو (ان کے نزدیک) یہ کلام صحیح نہیں ہے وہ یہ کہ سود (تمام) ادیان میں حرام کر دیا گیا ہے اور وہ جو دور جاہلیت میں اس کا کاروبار کرتے تھے تو وہ مشرکین کی عادت تھی اور ربا میں سے جس پر انہوں نے قبضہ کر لیا ہے وہ ان مالوں کے جمع ہونے کی جگہ میں ہے جو ان تک غصب اور سلب کے ذریعہ پہنچے ہیں تو اس پر کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔ پس اس بنا پر استشہاد صحیح نہیں ہو گا ان مسائل میں جو انہوں نے ذکر کیے ہیں اور ہم سے پہلے انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں کا ربا کی تحریم پر مشتمل ہونا مشہور ہے اور کتاب اللہ میں مذکور ہے، جیسا کہ اس قول باری تعالیٰ میں یہودیوں کے بارے بیان کیا گیا ہے: وَّ اَخۡذِهِمُ الرِّبٰوا وَ قَدۡ نُهُوۡا عَنۡهُ (النساء: 161) (اور بوجہ ان کے سود لینے کے حالانکہ منع کیے گئے تھے اس سے)

اور حضرت شعیب علیہ السلام کے قصہ میں مذکور ہے کہ ان کی قوم نے ان کا انکار کیا اور کہا: اَصَلٰوتُكَ تَاۡمُرُكَ اَنۡ نَّتۡرُكَ مَا

1۔ صحیح بخاری، باب الحوالۃ، حدیث نمبر 2125، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (ہود: 87) (کیا تمہاری نماز تمہیں حکم دیتی ہے کہ ہم چھوڑ دیں انہیں جن کی عبادت کرتے تھے ہمارے باپ دادا یا نہ تصرف کریں اپنے مالوں میں جیسے ہم چاہیں)

پس اس بنا پر اس سے استدلال درست نہ ہوگا۔ ہاں اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ عقود جو دار الحرب میں واقع ہوں جب امام وقت ان پر غالب آئے تو وہ فسخ کے احکام جاری نہیں کرے گا اگرچہ وہ عقود فاسدہ ہی ہوں۔

مسئلہ نمبر 36۔ ارباب ورع وزہد میں سے بعض غلو کرنے والوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ حلال مال میں جب حرام مال اس طرح مل جائے کہ تمیز ممکن نہ رہے پھر وہ ملے جلے مال میں سے حرام مال کی مقدار مال نکال دے تو پھر بھی (باقی مال) حلال اور پاک نہ ہوگا، کیونکہ یہ ممکن ہے کہ جو مال نکالا گیا ہے وہ حلال ہو اور جو باقی ہے وہ حرام ہو۔ ابن عربیؒ نے کہا ہے: یہ دین میں غلو ہے۔ کیونکہ ہر وہ مال جس میں تمیز کرنا (اور اسے علیحدہ علیحدہ کرنا) ممکن نہ رہے تو پھر اس سے مقصود اس کی مالیت ہوتی ہے نہ کہ اس کا عین۔ اور اگر مال ضائع ہو جائے تو پھر اس کی مثل مال اس کے قائم مقام ہوتا ہے۔ دونوں قسم کے مالوں کا مخلوط ہو جانا اس کی تمیز اور علیحدگی کے اعتبار سے اتلاف اور ضیاع ہی ہے جیسا کہ ہلاک کر دینا اس کے عین (ذات) کے لئے اتلاف اور ضیاع ہے اور مثل ضائع ہونے والے مال کے قائم مقام ہوتی ہے اور یہ حسنؒ اور معنیٰ بین اور واضح ہے۔ واللہ اعلم۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ہمارے علماء نے کہا ہے اموال حرام میں سے جو آدمی کے قبضہ میں ہو اگر وہ سود کا مال ہے تو اس سے توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اسے اس کے پاس واپس لوٹا دے جس پر سود لگایا تھا اور اگر وہ حاضر نہ ہو تو اسے تلاش کرے اور اگر اسے پانے سے مایوس ہو جائے تو پھر چاہیے کہ وہ اسے صدقہ کر دے اور اگر اس نے وہ مال ظلماً لیا ہو تو جس کے ساتھ اس نے ظلم کیا ہے اس کے ساتھ بھی اسے اسی طرح معاملہ کرنا چاہئے۔ اور اگر اس پر معاملہ مشتبہ ہو جائے اور وہ یہ نہ جان سکے کہ جو مال اس کے قبضے میں ہے اس حلال میں سے حرام کتنا ہے، تو جو مال اس کے قبضے میں ہے اس میں سے وہ مقدار تلاش کرے جس کا لوٹانا اس پر واجب ہے، یہاں تک کہ اسے اس میں کوئی شک نہ رہے کہ جو مال باقی ہے وہ خالص اس کا اپنا ہے۔ پس جو مال اس نے اپنے قبضے سے زائل کیا اسے وہ ان لوگوں کو واپس لوٹائے گا جن کے بارے یہ معروف ہو کہ اس نے اس پر ظلم کیا ہے یا اس سے بطور سود مال لیا ہے اور اگر وہ ایسے آدمی کو پانے سے مایوس ہو جائے تو پھر اس کی طرف سے وہ مال صدقہ کر دے۔

اور اگر مظالم اس کے ذمہ کا احاطہ کئے ہوئے ہوں اور وہ یہ جانتا ہو کہ اس پر جو کچھ واجب الادا ہے وہ اسے کثیر ہونے کے سبب کبھی بھی ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھے گا تو اس کی توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ جو کچھ اس کے پاس موجود ہے وہ سب اپنی ملکیت سے زائل کر دے، چاہے مساکین کو دے دے اور چاہے تو ایسے کاموں میں خرچ کر دے جو عام مسلمانوں کی منفعت اور صلاح کے لئے ہوں، یہاں تک کہ اس کے پاس کوئی شے باقی نہ رہے، سوائے اس کم سے کم لباس کے جس میں نماز جائز ہوتی ہے اور وہ اتنا کپڑا ہے جو شرمگاہ کو ڈھانپ سکے اور وہ ناف سے لے کر گھٹنوں تک ہے۔ اور ایک دن کی خوراک (باقی رہ جائے) کیونکہ یہ وہ مقدار ہے جو اضطراری حالت میں دوسرے کے مال سے لینا واجب ہوتی ہے، اگرچہ وہ اسے ناپسند کرے جس سے وہ لے رہا ہے۔ اور اکثر علماء کے قول کے مطابق یہاں مفلس علیحدہ اور جدا ہو گیا، کیونکہ مفلس کے پاس لوگوں کے

اموال کسی زیادتی یا ظلم کی وجہ سے نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے وہ مال اس کے حوالے کر رکھے ہوتے ہیں۔ پس اس کے لئے اتنا مال چھوڑ دیا جائے گا جو اسے چھپالے گا اور وہ وہ ہے جو اس کے لباس کی ہیئت و کیفیت میں ہو۔

اور ابو عبید وغیرہ یہ کہتے ہیں کہ وہ مفلس کے لئے لباس نہ چھوڑے مگر وہ کم سے کم مقدار جو نماز میں اسے کافی ہو اور وہ وہ ہے جو اسے ناف سے گھٹنے تک ڈھانپ لے، پھر جب بھی کوئی شے اس کے ہاتھ میں آئے اسے وہ اپنے ہاتھ سے نکال دے اور اس سے وہ کچھ روک کر نہ رکھے سوائے اس مقدار کے جو ہم نے ذکر کر دی ہے، یہاں تک کہ وہ جان لے، اور کون اس کی حالت کو جان سکتا ہے کہ اس نے وہ ادا کر دیا ہے جو اس کے ذمہ واجب الادا ہے۔

مسئلہ نمبر 37۔ یہ وہ وعید ہے جس کے سبب اللہ تعالیٰ نے سود کھانے کی صورت میں جنگ سے ڈرایا دھمکایا ہے اور اسی کی مثل حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے بٹائی پر کھیتی کرنے کے بارے میں بھی وارد ہے۔ ابو داؤد نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یحییٰ بن معین اور ابن رجا نے ہمیں خبر دی ہے اور ابن رجا نے کہا ہے کہ مجھے ابن خیثم نے ابو الزبیر سے اور انہوں نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جس نے بٹائی پر کھیتی کرنے کو نہ چھوڑا تو اسے چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اعلان جنگ سن لے۔'' پس یہ بٹائی پر کھیتی کرنے سے روکنے پر دلیل ہے اور مخابرہ سے مراد زمین کو نصف یا تہائی یا چوتھائی پیداوار کے عوض لینا ہے اور اسے مزارعت کہا جاتا ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے تمام اصحاب، امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور ان کے متبعین اور داؤد رحمۃ اللہ علیہم نے اس پر اجماع کیا ہے کہ زمین ثلث اور ربع پر دینا جائز نہیں ہے اور نہ ہی اس پیداوار کے جز پر جو زمین سے حاصل کی جائے گی، کیونکہ وہ مجہول ہے۔ مگر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ زمین کو اناج کے عوض کرائے پر دینا جائز ہے بشرطیکہ مقدار معلوم ہو، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پس جو شے معلوم ہو اس کی ضمانت ہو سکتی ہو تو اس کے عوض کوئی حرج نہیں ہے۔''

اسے مسلم نے بیان کیا ہے اور محمد بن عبد اللہ بن عبد الحکم نے یہی موقف اپنایا ہے اور امام مالک اور آپ کے اصحاب نے اس سے منع کیا ہے کیونکہ مسلم نے حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے یہ بھی روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں زمین کی کھیتی پکنے سے پہلے فروخت کر دیتے تھے اور ہم زمین ثلث، ربع اور مقررہ اناج کے عوض کرائے پر دیتے تھے۔ پس ایک دن میرے چچاؤں میں سے ایک آدمی ہمارے پاس آیا اور اس نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایسے معاملے سے منع کیا ہے جو ہمارے لئے باعث نفع تھا اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و فرمانبرداری ہمارے لئے زیادہ نفع بخش ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس سے منع کیا ہے کہ ہم زمین کی کھیتی پکنے سے پہلے فروخت کر دیں اور ہم زمین ثلث، ربع اور مقررہ اناج کی شرط پر کرائے پر دیں اور آپ نے زمین کے مالک کو حکم دیا ہے کہ وہ خود کاشت کرے یا اسے مزارعت پر دے دے۔ اور آپ نے اس کے کرائے کو اور جو کچھ اس کے سوا ہے اسے ناپسند کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے: پس زمین کا کرایہ اناج میں سے کسی شے کے ساتھ جائز نہیں ہے کسی بھی حال میں چاہے وہ شے کھائی جانے والی ہو

یا پی جانے والی، کیونکہ یہ طعام کے بدلے طعام ادھار بیچنے کے معنی میں ہے اور اسی طرح زمین کا کرایہ ان کے نزدیک اس شے سے دینا بھی جائز نہیں ہے جو زمین سے نکلے گی اگر چہ وہ کھایا اور پیا جانے والا طعام نہ بھی ہو، سوائے لکڑی، کانے اور ایندھن کی لکڑی کے، کیونکہ ان کے نزدیک یہ بیع مزابنہ کے معنی میں ہے۔ (بیع مزابنہ سے مراد بغیر کیل اور وزن کے صرف اندازے کے ساتھ کسی شے کی بیع کرنا ہے) یہی وہ ہے جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب سے محفوظ ہے۔

اور ابن سحنون نے مغیرہ بن عبدالرحمٰن مخزومی مدنی سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ زمین کو اس اناج کے عوض کرائے پر دینے میں کوئی حرج نہیں ہے جو اس سے نہ پیدا ہوتا ہو اور یحییٰ بن عمر نے مغیرہ سے روایت کیا ہے کہ وہ جائز نہیں ہے، جیسا کہ تمام اصحاب مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔

اور ابن حبیب نے ذکر کیا ہے کہ ابن کنانہ کہتے تھے: زمین کو ایسی شے کے عوض کرائے پر نہیں دیا جائے گا کہ جب وہ شے زمین میں لوٹائی جائے تو وہ اگ پڑے۔ اور اس کے سوا تمام ایسی اشیاء کے عوض کرائے پر دینے میں کوئی حرج نہیں ہے جو کھائی جاتی ہوں اور ان کے عوض جو نہ کھائی جاتی ہوں چاہے وہ زمین سے پیدا ہوں یا نہ ہوں۔ اور اسی طرح یحییٰ بن یحییٰ نے بھی کہا ہے اور کہا ہے: بے شک یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول میں سے ہے۔ (ابن حبیب نے) کہا ہے اور ابن نافع کہا کرتے تھے: زمین کو طعام وغیرہ میں سے ہر شے کے عوض کرائے پر دینے میں کوئی حرج نہیں ہے جو زمین سے پیدا ہو یا نہ پیدا ہو، ماسوائے گندم اور اس جیسی اجناس کے، کیونکہ یہ محاقلہ ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔ (اور محاقلہ سے مراد کھیتی کو پکنے سے پہلے فروخت کر دینا ہے۔)

اور امام مالکؒ نے الموطا میں کہا ہے وہ آدمی جو اپنی سفید زمین اس سے حاصل ہونے والی پیداوار کے ثلث اور ربع کے عوض دے دیتا ہے تو یہ اس میں سے ہے جس میں دھوکہ داخل ہے کیونکہ پیداوار ایک بار کم ہوتی ہے اور دوسری بار زیادہ ہوتی ہے اور بسا اوقات بالکل کچھ بھی نہیں ہوتا تو زمین کا مالک مقررہ کرایہ ترک کرنے والا ہو جائے گا، بے شک اس کی مثال اس آدمی کی مثل ہے جس نے کسی مزدور کو معین شے کے عوض سفر کے لئے اجرت پر لیا پھر مستاجر نے اجیر کو کہا: میں اپنے اس سفر سے جو نفع حاصل کروں گا اس کا دسواں حصہ تجھے دوں گا وہی تیرے لئے اجرت ہوگی۔ تو نہ یہ حلال ہے اور نہ اسے ایسا کرنا چاہیے۔

امام مالک نے کہا ہے کسی آدمی کو نہیں چاہیے کہ وہ اپنی ذات کو، اپنی زمین کو، اپنی کشتی اور اپنے جانور کو اجرت پر دے مگر ایسی معلوم شے کے عوض جو زائل اور ہلاک نہ ہو اور امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور ان دونوں کے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم بھی یہی کہتے ہیں۔

امام احمد بن حنبل، لیث، ثوری، اوزاعی، حسن بن حی، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: کوئی حرج نہیں ہے کہ کوئی آدمی اپنی زمین کسی کو اس سے حاصل ہونے والی پیداوار کے ایک خاص جز مثلاً ثلث اور ربع وغیرہ کی شرط پر دے دے، یہی ابن عمر رضی اللہ عنہما اور طاؤس رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ اور انہوں نے خیبر کے واقعہ سے استدلال کیا ہے اور وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہاں کے باسیوں کو ہی اپنی زمینوں پر ان سے حاصل ہونے والی پیداوار اور پھلوں میں سے نصف کی شرط پر عامل مقرر کیا۔ امام احمد نے کہا ہے کہ کھیت کے کرائے سے نہی کے بارے میں حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کی حدیث مضطرب

الالفاظ ہے اور وہ صحیح نہیں ہے اور قصہ خیبر کے بارے قول اولیٰ اور ارجح ہے اور وہ حدیث صحیح ہے۔(1)

تابعین کی ایک جماعت اور ان کے بعد آنے والوں نے اسے جائز قرار دیا ہے کہ آدمی اپنی کشتی اور اپنی سواری کسی کو دے جس طرح کہ وہ اپنی زمین اس جز کے بدلے دیتا ہے جو اس پیداوار میں سے ہو جو اللہ تعالیٰ اسے محنت کے سبب عطا فرمائے گا۔ اور انہوں نے اس میں اپنی اصل اور بنیاد اس مضاربت کو بنایا ہے جس پر اجماع ہے۔ اس کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ سورۃ المزمل میں اس ارشاد کے تحت آئے گا: وآخرون یضربون فی الارض یبتغون من فضل اللہ۔

اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے قول کے بارے کہا ہے کہ ہم بٹائی پر کھیتی کرتے تھے اور ہم اس میں کوئی حرج نہ دیکھتے تھے یہاں تک کہ ہمیں حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ نے خبر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے، یعنی ہم زمین اس سے حاصل ہونے والی پیداوار کے بعض کے عوض کرائے پر دیتے تھے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا: اس میں قصہ خیبر والی حدیث کا نسخ ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو شے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نسخ کے بارے قول کو صحیح قرار دیتی ہے وہ وہ روایت ہے جسے ائمہ نے روایت کیا ہے اور الفاظ دارقطنی کے ہیں۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے محاقلہ (پکنے سے پہلے کھیتی فروخت کر دینا) مزابنہ (اندازے سے بیع کرنا) مخابرہ (بٹائی پر کھیتی کا کام کرنے) اور الثنایا (عقد بیع کے وقت مبیع میں سے مجہول شے کی استثنا کر دینا) سے منع فرمایا ہے مگر یہ کہ (جس شے کی استثنا کی گئی ہے) وہ معلوم ہو۔ یہ روایت صحیح ہے۔ اور ابوداؤد نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے(2) کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مخابرہ سے منع فرمایا ہے۔ میں نے پوچھا۔ مخابرہ کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ تو زمین نصف یا تہائی یا چوتھائی پیداوار کے عوض لے لے۔

مسئلہ نمبر 38۔ یہ قراءتوں کے بیان میں ہے۔ جمہور نے مَا بَقِیَ میں یا کو متحرک پڑھا ہے اور حسن نے اسے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور اسی کی مثل جریر کا قول ہے:

هو الخليفة فارضَوا ما رَضِي لكم ماضي العزيمةِ ما في حكمه جَنَفُ

اور عمر بن ربیعہ نے کہا ہے:

كم قد ذكرتُكِ لو أُجزى بذكرِكُم يا أشبهَ النّاسِ كُلِّ الناسِ بالقمرِ
إنّي لأَجْذَلُ أن أُمسِي مُقابِلَهُ حُبًّا لرؤية مَنْ أشبهت في الصُّوَرِ

اس کی اصل ما رَضِیَ اور اَنْ اُمْسِیَ ہے۔ اور انہوں نے انہیں سکون دیا ہے اور شعر میں ایسا کثرت سے ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں یا کو الف کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے تو جس طرح الف پر حرکت نہیں آسکتی تو اسی طرح یہاں یا پر بھی حرکت نہیں آسکتی۔ اور اس لغت میں سے جس کی طرف دعوت دینا میں پسند کرتا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ میں تجھے اس کی نصیحت

1۔ صحیح بخاری، باب اذا لم یشترط السنین فی المزارعة، حدیث نمبر 2161، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، باب فی المخابرة، حدیث نمبر 2958، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کروں وہ واؤ اور یا کو ساکن کرنا ہے۔ حسن نے مابَقِیَ الف کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ لغت طی ہے۔ وہ جاریہ کے لئے جاراۃ اور ناصیۃ کے لئے ناصاۃ بولتے ہیں۔ اور شاعر کا قول ہے:

لعمرکَ لا أخشی التَّصَعْلُکَ مابَقِی علی الأرض قَیْسِیٌ یسوق الأباعرا

ابو السمال نے تمام قراء کے درمیان سے مِنَ الرِّبُوا مشددہ کے کسرہ، با کے ضمہ اور واؤ کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور ابو الفتح عثمان بن جنی نے کہا ہے: دو اعتبار سے یہ حرف شاذ ہے، ایک تو اس اعتبار سے کہ اس میں کسرہ سے ضمہ کی طرف خروج ہے اور دوسرا اس اعتبار سے کہ اس میں اسم کے آخر میں ضمہ کے بعد واؤ واقع ہے اور مہدوی نے کہا ہے: اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے الف کو پر پڑھا ہے تو وہ اس سے اس واؤ کی طرف جھک گئی جس سے الف ہے اور سوائے اس وجہ کے کسی پر اسے محمول نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ کلام میں کوئی اسم نہیں جس کے آخر میں واؤ ساکن ہو اور اس سے پہلے ضمہ ہو۔ کسائی اور حمزہ نے الربا میں ۔ امیں کسرہ کے محل کی وجہ سے امالہ کیا ہے۔ اور باقیوں نے با کے فتحہ کی وجہ سے اسے تفخیم کے ساتھ پڑھا ہے۔

ابو بکر نے عاصم اور حمزہ سے فَاْذَنُوْا پڑھا ہے یعنی تم آگاہ ہو جاؤ۔ (ای کونوا علی اذن) یہ تیرے اس قول سے ہے: انی علی علم (میں جانتا ہوں) اسے ابو عبید نے اصمعی سے بیان کیا ہے۔ اور اہل لغت نے بیان کیا ہے کہ کہا جاتا ہے: أذنت بہ اذنا، ای علمت بہ یعنی میں نے اس کے بارے جان لیا۔ اور مفسرین میں سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے: فَاْذَنُوْا کا معنی ہے تم اللہ تعالیٰ کی جانب سے جنگ یقینی سمجھو۔ اور یہ بمعنی الاذن ہے اور ابو علی وغیرہ نے قراۃ المد کو ترجیح دی ہے اور کہا ہے: کیونکہ جب انہیں ان دوسروں کو خبردار کرنے کے بارے حکم دیا گیا ہو اس سے آگاہ نہیں تو لامحالہ انہوں نے انہیں بتایا۔ مزید کہا: پس ان کے بتانے میں ان کا علم ہے اور ان کے علم میں ان کا اعلام (بتانا) نہیں ہے۔ اور علامہ طبری نے قراۃ القصر کو ترجیح دی ہے، کیونکہ یہ ان کے ساتھ مختص ہے۔ بے شک انہیں مد کی قراءت پر اپنے سوا کو آگاہ کرنے کے بارے حکم دیا گیا ہے اور تمام قراء نے لَا تَظْلِمُوْنَ تا کے فتحہ کے ساتھ اور وَلَا تُظْلَمُوْنَ تا کے ضمہ کے ساتھ قراءت کی ہے اور مفضل نے عاصم سے لَا تُظْلَمُوْنَ۔ وَلَا تَظْلِمُوْنَ یعنی پہلی میں تا کو ضمہ کے ساتھ اور دوسرے میں تا کو فتحہ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اور ابو علی نے کہا ہے۔ جماعت کی قراءت ترجیح یافتہ ہے کیونکہ یہ وَاِنْ تُبْتُمْ کے قول سے مناسبت رکھتی ہے اس میں کہ دونوں فعلوں کی اسناد فاعل کی طرف ہے اور تَظْلِمُوْنَ تاء کے فتحہ کے ساتھ بھی آتا ہے اور یہ اپنے ماقبل سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۭ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۲۸۰

''اور اگر مقروض تنگ دست ہو تو مہلت دو اسے خوشحال ہونے تک، اور بخش دینا اسے (قرض) بہت بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم جانتے ہو''۔

اس میں نو مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1 ۔ قولہ تعالیٰ: وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ جب اللہ تعالیٰ نے سود لینے والوں کو ان کے اصل اموال کے

بارے حکم فرمایا درآنحالیکہ وہ ان کے پاس ہو جو مال کو پانے والے ہوں، تو تنگدستی کی حالت میں خوشحال ہونے تک مہلت دینے کا ارشاد فرمایا اور وہ یہ کہ ثقیف نے جب اپنے ان اموال کا مطالبہ کیا جو بنی مغیرہ پر قرض تھے تو بنی مغیرہ نے تنگدستی کا عذر پیش کیا اور کہا: ہمارے پاس کوئی شے نہیں ہے اور انہوں نے اپنے پھلوں کے تیار ہونے کے وقت تک مہلت کا مطالبہ کیا، تب یہ آیت نازل ہوئی۔ وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ۔(1)

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ اس ارشاد کے ساتھ وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ صاحب قرض کے اپنے مدیون (مقروض) سے مطالبہ کے ثبوت اور اس کی رضا کے بغیر اس کا مال لینے کے جائز ہونے پر دلالت کرتا ہے اور اس پر بھی دلالت کرتا ہے کہ غریم جب امکان کے باوجود قرض ادا کرنے سے رکا رہے تو وہ ظالم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ پس اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے اپنے رأس المال کے مطالبہ کو جائز قرار دیا ہے تو جب اس کے لئے مطالبہ کا حق ہے تو پھر وہ جس پر قرض ہے لامحالہ اسے ادا کرنا اس پر واجب ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ مہدوی اور بعض علماء نے کہا ہے یہ آیت اس طریقہ اور رواج کے لئے ناسخ ہے جو زمانہ جاہلیت میں تنگدست کو بیچنے کے بارے میں تھا اور مکی نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدائے اسلام میں اس کے بارے حکم فرمایا تھا۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: پس اگر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل ثابت ہے تب تو یہ نسخ ہے ورنہ یہ نسخ نہیں ہے (2)۔

امام طحاوی نے کہا ہے: ابتدائے اسلام میں قرض میں آزاد آدمی کو بیچ دیا جاتا تھا جب اس کے پاس اتنا مال نہ ہوتا جسے وہ اپنے قرض میں ادا کر سکتا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسے منسوخ کر دیا اور ارشاد فرمایا: وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ اور انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جسے دارقطنی نے مسلم بن خالد زنجی کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے بیان کیا ہمیں زید بن اسلم نے ابن البیلمانی سے اور انہوں نے سرق سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: ایک آدمی کا مجھ پر کچھ مال تھا یا کہا مجھ پر قرض تھا... پس وہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گیا اور آپ نے میرے لئے کوئی مال نہ پایا تو آپ نے مجھے اس سے یا فرمایا اس کے لئے فروخت کر دیا۔ بزار نے اسے اس سے طویل سند کے ساتھ بیان کیا ہے اور مسلم ابن خالد الزنجی اور عبدالرحمن بن البیلمانی دونوں قابل حجت نہیں ہیں اور اہل علم کی ایک جماعت نے کہا ہے: ارشاد باری تعالیٰ: فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ تمام لوگوں کے لئے عام ہے، پس ہر وہ جو تنگدست ہو اسے مہلت دی جائے۔ اور یہی قول حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، حسن اور عام فقہا رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔

نحاس نے کہا ہے: اس آیت کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں سے سب سے اچھا قول حضرت عطاء، ضحاک اور ربیع بن خثیم کا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ یہ آیت ہر تنگدست کے لئے ہے کہ اسے ربا اور تمام قرضوں میں مہلت دی جائے گی اور یہ قول تمام اقوال کو جامع ہے کیونکہ یہ جائز ہے کہ یہ آیت عام ناسخ ہو ربا کے بارے میں نازل ہوئی ہو پھر دوسرے قرضوں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 376　　2۔ ایضاً

کا حکم بھی اس کے حکم کی طرح ہو گیا ہو۔ اور اس لئے بھی کہ رفع کے ساتھ قرأت اس معنی میں ہے وان وقع ذو عسرۃ من الناس اجمعین (اور اگر تمام لوگوں میں سے مقروض تنگدست واقع ہو۔)

اور حضرت ابن عباس اور شریح رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: یہ آیت ربا کے بارے میں خاص ہے اور رہے قرضے اور دیگر تمام معاملات تو اس میں مہلت نہیں ہے بلکہ وہ یا تو ان کے مالکوں کو ادا کرے گا یا اس سے اسے محبوس کر دیا جائے گا یہاں تک کہ وہ اسے پورا کر دے اور یہی ابراہیم کا قول ہے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا الآیہ (النساء: 58) (بے شک اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے تمہیں کہ (ان کے) سپرد کرو امانتوں کو جو ان کے اہل ہیں)۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول اس پر مرتب ہوتا ہے جب فقر و افلاس شدید اور ذلیل و رسوا کرنے والا نہ ہو اور اگر وہ اس کے فقدان اور فقر کی حالت بالکل صریح اور واضح ہو تو پھر بالضرور اس کے لئے مہلت کا حکم ہو گا (1)۔

مسئلہ نمبر 4۔ جس آدمی کے قرض زیادہ ہوں اور اس کے قرض خواہ اپنے مال کا مطالبہ کریں تو حاکم کے لئے جائز ہے کہ وہ اسے اپنے کل مال سے فارغ کر دے اور اس کے لئے اتنا مال چھوڑ دے جو اس کی حاجت اور ضرورت کو پورا کر سکے۔ ابن نافع نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ وہ اس کے لئے نہیں چھوڑے گا مگر صرف اتنا جو اسے ڈھانپ سکتا ہو۔ اور مشہور یہ ہے کہ وہ اس کے لئے اتنا مروجہ لباس چھوڑ دے گا جس میں کوئی شے فالتو اور اضافی نہ ہو اور اس سے اس کی چادر نہیں چھینی جائے گی بشرطیکہ وہ اسے بطور تہبند پہنتا ہو۔ اور اس کی بیوی کا لباس چھوڑنے میں اور اگر وہ عالم ہے تو اس کی کتابیں فروخت کرنے میں اختلاف ہے۔ اس کے لئے نہ گھر چھوڑا جائے گا اور نہ خادم اور نہ ہی جمعہ کا لباس چھوڑا جائے گا جبکہ اس کی قیمت کم نہ ہو اور اس وقت اسے محبوس کرنا حرام ہوتا ہے اور اس میں اصل اور بنیاد اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ائمہ نے روایت بیان کی ہے اور الفاظ مسلم شریف کے ہیں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مقدس میں ایک آدمی کو ان پھلوں میں نقصان ہو گیا جو اس نے خریدے تھے تو اس کا قرض بہت بڑھ گیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تصدقوا علیہ تم اس پر صدقہ کرو پس لوگوں نے اس کے لئے صدقہ دیا لیکن وہ اس مقدار کو نہ پہنچ سکا جس سے اس کا قرض پورا ہو سکتا ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے قرض کا مطالبہ کرنے والوں کو فرمایا: خذوا ما وجدتم ولیس لکم الا ذالك (تم جو پاؤ وہ لے لو اور تمہارے لئے اس کے سوا اور کچھ نہیں۔) اور مصنف ابی داؤد میں ہے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے غرماء (قرض کا مطالبہ کرنے والے) کے لئے یہ زائد نہیں کہا کہ ''وہ ان کے لئے اپنا مال چھوڑ دے'' اور یہ نص ہے، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آدمی کو محبوس کرنے کا حکم ارشاد نہیں فرمایا: اور وہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ تھے جیسا کہ شریح نے کہا ہے اور نہ ہی اسے لازم پکڑنے (یعنی اس کے ساتھ ساتھ رہنے) کا حکم فرمایا، بخلاف امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے کیونکہ انہوں نے کہا ہے: وہ اس کے ساتھ ساتھ رہیں گے کیونکہ ممکن ہے اس کا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 377

مال ظاہر ہو جائے اور قرض خواہ اسے مال کمانے کا پابند نہیں کرے گا اس وجہ سے جو ہم نے ذکر کر دی ہے۔ وباللّٰہ توفیقنا۔

مسئلہ نمبر 5۔ امام مالک، شافعی، ابوحنیفہ وغیرہم رحمۃ اللہ علیہم کے قول کے مطابق مفلس کو محبوس کیا جائے گا یہاں تک کہ اس کے پاس مال کا نہ ہونا ظاہر ہو جائے اور امام مالک کے نزدیک اسے محبوس نہ کیا جائے گا اگر اس پر یہ وہم نہ ہو کہ اس نے اپنا مال غیب کر دیا ہے اور اس کا جھگڑالو ہونا بھی ظاہر نہ ہو اور اسی طرح اسے محبوس نہ کیا جائے گا اگر اس کی تنگدستی درست ہو جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ اور اگر مفلس کا مال جمع کر لیا جائے پھر وہ قرض کا مطالبہ کرنے والوں تک پہنچنے سے پہلے اور بیع سے پہلے ضائع ہو جائے، تو مفلس پر اس کی ضمانت ہو گی اور قرض خواہوں کا قرض اس کے ذمہ ثابت رہے گا اور اگر حاکم نے اس کا مال فروخت کر دیا اور اس کے ثمن پر قبضہ کر لیا پھر قرض خواہوں کے قبضہ سے پہلے وہ ثمن ضائع ہو گئے تو اس کی ضمانت ان پر ہو گی اور مفلس اس سے بری الذمہ ہو گا اور محمد بن عبدالحکم نے کہا ہے اس کی ضمانت ہمیشہ مفلس سے لی جائے گی یہاں تک کہ وہ غرماء تک پہنچ جائے۔

مسئلہ نمبر 7۔ العسرۃ کا معنی ہے مال نہ ہونے کی جہت سے حال کا تنگ ہونا اور اسی سے جیش عسرہ ہے۔ (یعنی وہ لشکر جس کے پاس مالی حالت تنگ تھی۔) اور النظرۃ کا معنی التاخیر (مہلت دینا) ہے۔ اور المیسرۃ مصدر بمعنی الیسر (خوشحال ہونا) ہے۔ اور ذُو اس کَانَ تامہ کی وجہ سے مرفوع ہے جو بمعنی وجد اور حدث ہے۔ یہ سیبویہ اور ابو علی وغیرہما کا قول ہے۔ اور سیبویہ نے کہا ہے:

فِدًى لبني ذُهل بن شَيبان ناقتي　　　اذا كان يوم ذو كواكب أشهب

اور نصب بھی جائز ہے۔ مصحف ابی بن کعب رضی اللہ عنہ میں ہے وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ اس معنی کی بنا پر " کہ اگر مطلوب (مقروض) تنگ دست ہو اور اعمش نے وَاِنْ كَانَ مُعْسِرًا فَنَظِرَةٌ پڑھا ہے۔ ابو عمرو الدانی نے احمد بن موسیٰ سے روایت کیا ہے اور اسی طرح حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے مصحف میں ہے۔ نحاس، مکی اور نقاش نے کہا ہے: اس قرأت پر آیت کا لفظ اہل ربا کے ساتھ مختص ہو جائے گا اور جمہور نے ذُوْ پڑھا ہے ان کی قرأت کے مطابق یہ آیت ان تمام کے بارے میں عام ہے جن پر قرض ہو اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور مہدوی نے بیان کیا ہے کہ مصحف عثمان رضی اللہ عنہ میں فَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فا کے ساتھ ہے اور معتمر نے حجاج الوراق سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا مصحف عثمان رضی اللہ عنہ میں وَاِنْ كَانَ ذَا عُسْرَةٍ ہے۔ اسے نحاس نے ذکر کیا ہے اور جماعت کی قرأت نَظِرَةٌ ظا کے کسرہ کے ساتھ ہے اور مجاہد، ابو رجا اور حسن نے فَنَظْرَةٌ ظاء کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بنی تمیم کی لغت ہے اور وہی ہیں جو کہتے ہیں قَدْ کُرِمَ زیدٌ بمعنی کَرُمَ زیدٌ اور وہ کہتے ہیں کَبْدٌ بمعنی کَبِدٌ۔ اور اکیلے نافع نے مَيْسُرَةٍ سین کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور جمہور نے اسے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

نحاس نے حضرت مجاہد اور حضرت عطا سے فَنَاظِرَةٌ اِلٰى مَيْسُرِهٖ یعنی صیغہ امر اور مَیْسُرِہٖ میں سین کو ضمہ، راء کو کسرہ اور درج

کلام میں یاء کو ثابت رکھتے ہوئے بیان کیا ہے۔ اور فَنَاظِرَۃٌ بھی پڑھا گیا ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: فناظرۃٌ جائز نہیں ہے، وہ سورۃ النمل میں ہے، کیونکہ وہ ایک عورت ہے جس نے اس کے ساتھ اپنی ذات کے بارے کلام کیا ہے۔ یہ نظرت تنظر فھی نَاظِرَۃٌ سے ہے اور جو سورۃ البقرہ میں ہے وہ التاخیر بمعنی مہلت دینا سے ہے۔ یہ تیرے اس قول سے ہے۔ انظرتك بالدین۔ یعنی میں نے تیرا قرض موخر کردیا ہے اور اسی سے یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَاَنْظِرْنِیْۤ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ (الحجر) (پھر مہلت دے مجھے اس دن تک جب مردے (قبروں سے) اٹھائے جائیں گے) ابو اسحاق الزجاج نے اسے جائز قرار دیا ہے اور کہا ہے: یہ مصادر کے اسماء میں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: لَیْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ (واقعہ) (نہیں ہوگا جب یہ برپا ہوگی (اسے) کوئی جھٹلانے والا) اور اسی طرح یہ ارشاد ہے۔ تَظُنُّ اَنْ یُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ (القیامہ) (خیال کرتے ہوں گے کہ ان سے ساتھ کمر توڑ سلوک ہوگا) اور اسی طرح خَآئِنَةَ الْاَعْیُنِ وغیرہ ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: وَاَنْ تَصَدَّقُوْا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر خَیْرٌ ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ کے ساتھ تنگدست پر صدقہ کرنے کو مستحب قرار دیا ہے اور اسے مہلت دے کر اسے بہتر بنا دیا ہے۔ سدی، ابن زید اور ضحاک نے یہی کہا ہے۔

اور علامہ طبری نے کہا ہے اور دوسروں نے کہا ہے: آیت کا معنی یہ ہے کہ تمہارا غنی اور فقیر پر صدقہ کرنا تمہارے لئے بہتر ہے۔ اور پہلا قول صحیح ہے اور آیت میں غنی داخل نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ ابو جعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت بریدہ بن خصیب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے تنگدست مقروض کو مہلت دی اس کے لئے ہر دن کے عوض صدقہ (کا ثواب) ہے۔'' پھر میں نے عرض کی (کیا) ہر دن کے عوض اس کی مثل صدقہ (کرنے کا ثواب) ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہر دن کے عوض صدقہ ہے جب تک قرض کی ادائیگی کا وقت نہ آپہنچے اور ادائیگی کا وقت آجانے کے بعد اگر اس نے اسے مؤخر کر دیا تو اس کے لئے ہر دن کے عوض اس کی مثل صدقہ (کرنے کا ثواب) ہے۔''

اور مسلم نے حضرت ابو مسعود سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم سے پہلے لوگوں میں سے ایک آدمی کا محاسبہ کیا گیا تو اس کے لئے خیر اور نیکی میں سے کوئی شے نہ پائی گئی سوائے اس کے کہ وہ لوگوں کے ساتھ معاملات کرتا تھا اور خوشحال تھا تو وہ اپنے غلاموں کو حکم دیتا تھا کہ وہ تنگدست سے چشم پوشی کریں، اسے معاف کریں۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ عزوجل نے فرمایا: ہم اس سے زیادہ اس کا حق رکھتے ہیں کہ ہم اسے معاف کردیں۔''

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے مقروض کو تلاش کیا تو وہ آپ سے چھپ گیا پھر آپ نے اسے پالیا تو اس نے کہا: بلاشبہ میں تنگدست ہوں۔ آپ نے پوچھا: کیا اللہ تعالیٰ کی قسم۔ اس نے کہا: (ہاں) اللہ کی قسم۔ آپ نے بیان کیا: بلاشبہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ بیان فرماتے ہوئے سنا ہے: من سرہ ان ینجیه الله من کرب یوم القیامة فلینفس عن معسر او یضع عنه (جسے یہ شے خوش کرے کہ اللہ تعالیٰ اسے یوم قیامت کی تکالیف سے نجات عطا فرمائے تو

اسے چاہیے کہ وہ تنگدست مقروض کو مہلت دے یا اس سے قرض بالکل ساقط کردے (یعنی معاف کردے)۔

ابو الیسر الطویل کی حدیث میں ہے ...... اور ان کا نام کعب بن عمرو ہے ...... کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جس نے کسی تنگدست کو مہلت دی یا اس سے قرض ساقط کردیا تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے (عرش کے) سایہ میں جگہ عطا فرمائے گا۔ مَنْ انظر معسرا أو وضع عنه أظلّه الله فی ظلِّه ان احادیث میں اس کے بارے ترغیب موجود ہے جس کے بارے نص بیان کی گئی ہے اور حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ قرض کا مالک جب اپنے مقروض کی تنگدستی کا علم رکھتا ہو یا اسے اس کا گمان ہو تو اس پر اس کا مطالبہ حرام ہے، اگرچہ حاکم کے پاس اس کی تنگدستی ثابت نہ بھی ہو۔

اور انظار المعسر کا معنی ہے اسے مہلت دینا یہاں تک کہ وہ خوشحال ہوجائے اور الوضع عنه سے مراد اس کے ذمہ سے قرض کو ساقط کرنا ہے اور دونوں معنوں کو ابو الیسر نے اپنے مقروض کے لئے اس طرح جمع کیا کہ اس کے بارے تحریر مٹادی اور اسے کہہ دیا: اگر تو ادائیگی کی وسعت پائے تو تو اسے ادا کردے ورنہ تو بری الذمہ ہے۔

وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾

''اور ڈرتے رہو اس دن سے لوٹائے جاؤ گے جس میں اللہ کی طرف پھر پورا پورا دے دیا جائے گا ہر نفس کو جو اس نے کمایا ہے اور ان پر زیادتی نہ کی جائے گی۔''

کہا گیا ہے: بے شک یہ آیت حضور نبی کریم ﷺ کے وصال سے نو راتیں قبل نازل ہوئی پھر اس کے بعد کوئی شے نازل نہ ہوئی، ابن جریج نے یہی کہا ہے۔ ابن جبیر اور مقاتل نے کہا ہے: سات راتیں پہلے نازل ہوئی۔ اور تین راتوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے اور یہ بھی روایت ہے کہ یہ آیت آپ ﷺ کے وصال سے تین ساعتیں قبل نازل ہوئی اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اسے آیۃ الربا اور آیۃ الدین کے درمیان رکھ دو۔'' اور مکی نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ''میرے پاس حضرت جبرائیل امین علیہ السلام آئے اور کہا اسے دوسو اسی نمبر آیت کے بعد رکھ دو۔''

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ حضرت ابی بن کعب، حضرت ابن عباس اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ آخر میں جو آیت نازل ہوئی وہ یہ ہے: لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ الی آخر الآیۃ۔ اور پہلا قول زیادہ معروف، بہت زیادہ اصح اور زیادہ مشہور ہے۔ اور اسے ابو صالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا ہے: قرآن کریم میں سے جو آخر میں نازل ہوا وہ یہ آیت ہے: **وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾** اور حضرت جبریل امین علیہ السلام نے حضور نبی مکرم ﷺ کو کہا: اے محمد! ﷺ اسے سورۃ البقرہ میں دوسو اسی آیت کے آخر پر رکھو۔'' اسے ابوبکر انباری نے ''کتاب الرد'' میں ذکر کیا ہے۔ اور یہی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ یہ آیت آخر میں نازل ہوئی۔ اور حضور نبی مکرم ﷺ اس کے بعد اکیس دن تک باحیات رہے۔ اس کا بیان سورہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ کے آخر میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور یہ آیت تمام لوگوں کے لئے نصیحت ہے اور ایسا حکم ہے جو ہر انسان کے ساتھ خاص ہے اور یوماً مفعول ہونے کی بنا پر منصوب ہے نہ کہ ظرف ہونے کی بناء پر۔ تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ یہ اس کی صفت ہے۔

ابو عمرو نے اسے تا کے فتحہ اور جیم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اسی کی مثل یہ ارشاد ہے: اِنَّ اِلَيْنَاۤ اِيَابَهُمْ ﴿ (الغاشیہ) (بے شک انہیں (آخر) ہمارے پاس ہی لوٹ کر آنا ہے۔) اور حضرت ابی رضی اللہ عنہ کی قرأت پر قیاس کرتے ہوئے یوما تصیرون فیه الی الله (یعنی وہ دن جس میں تم اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹو گے۔) اور باقیوں نے اسے تا کے ضمہ اور جیم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ مثلاً رُدُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ (انعام: ٦٢) (پھر لوٹائیں جائیں گے اللہ تعالیٰ کی طرف) وَلَىِٕنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ (اور اگر مجھے اپنے رب کی طرف لوٹایا گیا) اور یہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی قرأت کے اعتبار سے ہے۔ یومًا تردُّون فیه الی الله (یعنی وہ دن جس میں تم اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔)

اور حسن نے یرجعون یا کے ساتھ پڑھا ہے یہ اس معنی کی بنا پر ہے کہ تمام لوگ لوٹائیں جائیں گے۔

ابن جنی نے کہا ہے: گویا اللہ تعالیٰ نے مومنین کے ساتھ اس بنا پر نرمی اور مہربانی فرمائی کہ وہ ان کی طرف رجعت کے ذکر کے ساتھ متوجہ ہوا، کیونکہ یہ ان میں سے ہے جس کے ساتھ دل پھٹنے لگتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا: وَاتَّقُوْا يَوْمًا پھر رجعت کے ذکر میں ان کے ساتھ انتہائی نرمی فرماتے ہوئے غیب کی طرف رجوع فرمایا اور جمہور علماء نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ یہ دن جس سے ڈرایا گیا ہے یہ قیامت قائم ہونے، حساب و کتاب اور پوری پوری جزا ملنے کا دن ہے۔ ایک قوم نے کہا ہے: اس سے مراد موت کا دن ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: آیت کے الفاظ کے حکم کے مطابق پہلا قول زیادہ صحیح ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: اِلَى اللّٰهِ میں مضاف محذوف ہے۔ اس کی تقدیر عبارت ہے الی حکم الله و فصل قضائه (یعنی تم لوٹائے جاؤ گے اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی تقدیر کے فیصلے کی طرف) وَهُمْ یعنی جمع ضمیر کُلٌّ کے معنی پر محمول ہے نہ کہ لفظ پر۔ مگر حسن کی قرأت میں یُرْجَعُوْنَ ہے تو اس کے مطابق وَهُمْ میں ضمیر یرجعون میں جمع ضمیر کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور اس آیت میں اس پر نص ہے کہ ثواب اور عقاب کسب اعمال کے متعلق ہیں اور یہ جبریہ کا رد ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ

وَ لَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَ لَا تَسْـَٔمُوْۤا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰۤى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَرْتَابُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَ اَشْهِدُوْۤا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪ وَ لَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّ لَا شَهِيْدٌ ؕ۬ وَ اِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ يُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾

''اے ایمان والو! جب تم ایک دوسرے کو قرض دو مدت مقررہ تک تو لکھ لیا کرو اسے اور چاہیے کہ لکھے تمہارے درمیان لکھنے والا عدل و انصاف سے۔ اور نہ انکار کرے لکھنے والا لکھنے سے جیسے سکھایا ہے اس کو اللہ نے پس وہ بھی لکھ دے اور لکھوائے وہ شخص جس کے ذمہ حق (قرضہ) ہے اور ڈرے اللہ تعالیٰ سے جو اس کا پروردگار ہے۔ اور نہ کمی کرے اس سے ذرہ بھر پھر اگر وہ شخص جس پر قرض ہے بے وقوف ہو یا کمزور ہو یا اس کی طاقت نہ رکھتا ہو کہ خود لکھا سکے تو لکھائے اس کا ولی (سرپرست) انصاف سے اور بنا لیا کرو دو گواہ اپنے مردوں سے اور اگر نہ ہوں دو مرد تو ایک مرد اور دو عورتیں ان لوگوں میں سے جن کو پسند کرتے ہو تم (اپنے لئے) گواہ تاکہ اگر بھول جائے ایک عورت تو یاد کرائے (وہ) ایک دوسری کو اور نہ انکار کریں گواہ جب وہ بلائے جائیں اور نہ اکتایا کرو اسے لکھنے سے خواہ (رقم قرضہ) تھوڑی ہو یا زیادہ اس کی میعاد تک۔ یہ تحریر عدل قائم کرنے کے لئے بہت مفید ہے اللہ کے نزدیک اور بہت محفوظ رکھنے والی ہے گواہی کو اور آسان طریقہ ہے تمہیں شک سے بچانے کا مگر یہ کہ سودا دست بدست ہو جس کا تم لین دین آپس میں کرو (اس صورت میں) نہیں تم پر کچھ حرج اگر نہ بھی لکھوا سے اور گواہ ضرور بنا لیا کرو جب خرید و فروخت کرو اور ضرر نہ پہنچایا جائے لکھنے والے کو اور نہ گواہ کو۔ اور اگر تم ایسا کرو گے تو یہ نافرمانی ہوگی تمہاری اور ڈرا کرو اللہ سے اور سکھاتا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ (آداب معاشرت) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔''

اس میں باون مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ الآیہ۔ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ قرآن کریم نے آیۃ الدین عرش کے پاس سے حاصل کی ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: یہ آیت خاص کر بیع سلم کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اہل مدینہ کا بیع سلم کرنا اس آیت کے نازل ہونے کے سبب ہے پھر یہ بالاجماع ان عقود کو شامل ہوگئی ہے جن میں قرض اور دین وغیرہ ہوتا ہے (1)۔

ابن خویز منداد نے کہا ہے: یہ آیت تیس احکام کو متضمن ہے اور اس سے ہمارے بعض علماء نے قرضوں میں مدت مقرر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 378

کرنے کے جواز پر استدلال کیا ہے، جیسا کہ امام مالک نے کہا ہے، کیونکہ انہوں نے قرض اور تمام عقود مداینات میں کوئی فرق نہیں کیا۔ اور شوافع نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہے اور انہوں نے کہا ہے: اس آیت میں تمام قرضوں میں تاجیل کے جواز پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ بلاشبہ اس میں گواہ بنا لینے کا حکم ہے جب وہ دین مؤجل ہو، پھر دین میں تاجیل کے جواز اور اس کے ممتنع ہونے کے بارے دوسری دلیل سے جانا جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: بِدَیْنٍ یہ تاکید ہے۔ جیسا کہ یہ قول ہے وَلَا طٰٓئِرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ (انعام:۳۸) (اور نہ کوئی پرندہ جو اڑتا ہے اپنے دو پروں سے) فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۝ (الحجر) (پس سربسجود ہو گئے فرشتے سارے کے سارے) اور دین کی حقیقت یہ ہے کہ یہ عبارت ہے ہر اس معاملہ سے جس میں دو عوضوں میں سے ایک نقد ہو اور دوسرا دوسرے کے ذمہ ادھار ہو، کیونکہ عربوں کے نزدیک عین وہ ہے جو حاضر ہو اور دین وہ ہے جو غائب ہو جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

وَعَدتُنَا بِدِرهَمَينَا طِلَاءً   وشواءً معجّلا غَيْرَ دَيْنِ

اور ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے:

لِترم بی المنایا حیثُ شاءتُ   اذا لم ترمِ بی فی الحُفرتَیْنِ

اِذَا ما اَوْقَدُوْا حطبا و نارًا   فذاك الموتُ نقداً غَيْرَ دَيْنِ

تحقیق اللہ تعالیٰ نے اس معنی کو اپنے اس قول حق کے ساتھ بیان کیا ہے اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ابن منذر نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کا ارشاد اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى اس پر دلیل ہے کہ بیع سلم کرنا مجہول مدت تک جائز نہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت بھی کتاب اللہ کے معنی کی مثل پر دلیل ہے۔ یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے اور وہ پھلوں میں قرض دو، تین سال کے لئے لے لیا کرتے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جو کوئی کھجوروں کے عوض قرض کسی کو دے تو اسے چاہیے کہ وہ معین کیل اور وزن، معین مدت تک قرض دے'' (1)۔

اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے۔ اسے بخاری، مسلم وغیرہما نے نقل کیا ہے۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: دور جاہلیت کے لوگ اونٹوں کے گوشت کی بیع اونٹنی کے حمل کے حاملہ ہونے تک کرتے تھے حبل الحبلہ کا معنی ہے کہ اونٹنی بچہ جنے پھر وہ حاملہ ہو جو جنا گیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں اس سے منع فرمایا (2)۔ اہل علم میں سے وہ تمام جن پر اعتماد کیا جا سکتا ہے ان کا اس پر اجماع ہے کہ جائز بیع سلم وہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے ساتھی کے ساتھ ایسے طعام (اناج) کی بیع سلم کرے جس کی مقدار معلوم ہو اور وصف بھی معلوم ہو، وہ عام زمین کے اناج میں سے ہو جس کی مثل میں وہ غلطی اور خطا نہ کرے، معین کیل کے ساتھ، مدت معلومہ تک معلوم دنانیر یا دراہم کے عوض، جو وہ اسے مسلم فیہ کے بدلے دے گا دونوں

1۔ صحیح بخاری، کتاب السلم، باب السلم فی کیل معلوم، حدیث نمبر 2085، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، باب السلم الی تنتج الناقۃ، حدیث نمبر 2096، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

(رب السلم اور مسلم الیہ) کے اس مقام سے جدا ہونے سے پہلے پہلے جہاں انہوں نے آپس میں بیع کی ہے اور دونوں اس جگہ کا تعین بھی کریں گے جس میں اس طعام پر قبضہ کیا جائے گا۔ پس جب دونوں نے ایسا کرلیا تو یہ امر جائز ہوگیا اور بیع سلم صحیح ہوگئی۔ میں اہل علم میں سے کسی کو بھی نہیں جانتا جو اسے باطل قرار دیتا ہو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور ہمارے علماء نے کہا ہے: بے شک بیع سلم کرنا فصل کی کٹائی، پھل توڑنے اور نیروز اور مہرجان کے دنوں تک یہ جائز ہے کیونکہ یہ وقت اور معلوم زمانے کے ساتھ مختص ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ ہمارے علماء نے بیع سلم کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے (1) یہ معلوم شے کی بیع ہے جو دوسرے کے ذمہ لازم ہو جائے اور اس کا وصف معلوم ہو ایسے دراہم و دنانیر کے عوض جو موجود ہوں یا ایسی شے کے عوض جو ان کے حکم میں ہو مدت معلومہ تک۔ پس اسے معلوم فی الذمۃ کے ساتھ مقید کرنا مجہول سے بچنے کا فائدہ دیتا ہے اور اعیان معینہ میں سلم کرنے سے (بچنے کا فائدہ دیتا ہے) مثلاً وہ جو مدینہ طیبہ کے باسی اس وقت قرض لیتے تھے جب حضور نبی مکرم ﷺ تشریف لائے، کیونکہ وہ کھجور کے پھلوں میں ان کے اعیان کے بدلے قرض لیتے تھے تو آپ ﷺ نے انہیں اس سے منع فرمادیا کیونکہ اس میں دھوکے اور نقصان کا امکان ہے، کیونکہ کبھی وہ درخت خراب ہو جاتے ہیں اور وہ بالکل ثمر بار نہیں ہوتے اور ان کا قول محصور بالصفۃ یہ اس معلوم سے بچنے کے لئے ہے جس کے بارے مجمل علم تو ہو لیکن تفصیلی علم نہ ہو۔ جیسا کہ اگر کوئی کھجوروں، یا کپڑوں یا مچھلیوں میں بیع سلم کرے اور ان کی نوع بیان کرے اور نہ ان کی کوئی معین صفت بیان کرے۔

اور ان کا قول بِعَيْنٍ حَاضِرَةٍ یہ دین کے عوض دین کی بیع کرنے سے بچنے کے لئے ہے اور ان کا قول أو ما هو فى حكمها یہ ان دو اور تین دنوں سے بچنے کے لئے ہے جن میں مسلم الیہ کو رأس المال میں تاخیر کرنا جائز ہوتا ہے، کیونکہ ہمارے نزدیک اتنی مقدار اسے موخر کرنا جائز ہوتا ہے، شرط کے ساتھ بھی اور بغیر شرط کے بھی کیونکہ یہ بالکل قریب ہے اور اسے اس پر مشروط کرنا جائز نہیں ہے۔

امام شافعی اور امام ابوحنیفہ نے بیع سلم میں رأس المال کو عقد اور افتراق (رب السلم اور مسلم الیہ کا مجلس عقد سے جدا ہونا) سے مؤخر کرنا جائز قرار نہیں دیا۔ اور انہوں نے یہ جانا ہے کہ یہ بیع صرف کی طرح ہے اور ہماری دلیل یہ ہے کہ یہ دونوں باب مختلف ہیں اور اپنے اپنے اوصاف کے ساتھ مختص ہیں، کیونکہ بیع صرف اس کا باب تنگ ہے اور اس میں شروط زیادہ ہیں بخلاف سلم کے کیونکہ اس پر معاملات کے عیوب بہت زیادہ ہیں۔ واللہ اعلم۔

اور قولہم، الی أجل معلوم یہ سلم حال سے بچنا ہے کیونکہ یہ مشہور قول کے مطابق جائز نہیں ہے اور اس کا ذکر آگے آئے گا اور اجل کو معلوم کی صفت سے متصف کرنا اس مجہول مدت سے بچنا ہے جس پر وہ زمانہ جاہلیت میں بیع سلم کرتے تھے۔

مسئلہ نمبر 5۔ سلم اور سلف دونوں لفظ ایک ہی معنی سے عبارت ہیں اور یہ دونوں حدیث میں آئے ہیں مگر اس باب سے خاص اسم سلم ہے کیونکہ سلف قرض پر بولا جاتا ہے اور سلم بالاتفاق جائز بیوع میں سے ایک بیع ہے اور حضور علیہ الصلوۃ

1۔ (بیع معلوم فی الذمۃ محصور بالصفۃ بعین حاضرۃ او ما هو فی حکمها الی اجل معلوم)

والسلام نے اس شے کی بیع کرنے سے جو تیرے پاس نہ ہو منع فرمایا ہے(1) یہ اس سے مستثنیٰ ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلم میں رخصت دی ہے کیونکہ سلم جب ذمہ میں معلوم شے کی بیع ہے تو یہ ایک غائب شے کی بیع ہے جس کی طرف متبایعین میں سے ہر ایک کی ضرورت دعوت دیتی ہے، کیونکہ رأس المال کا مالک اس کا محتاج ہے کہ وہ پھل خریدے اور پھل کا مالک اسے توڑنے اور علیحدہ کرنے سے پہلے اس کے ثمن کا محتاج ہے تاکہ وہ اسے اس پر خرچ کر سکے، پس یہ ظاہر ہوا کہ بیع سلم ضروری مصالح میں سے ہے۔ اور فقہاء نے اس کا نام بیع المحاویج رکھا ہے۔ اور اگر یہ حالاً (یعنی ثمن اور مبیع کا موجود ہونا) ہی جائز ہو تو یہ حکمت باطل ہو گئی اور یہ مصلحت اٹھ گئی اور جو شے تیرے پاس موجود نہیں اس کی بیع سے اس کی استثنا کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 6۔ بیع سلم کی وہ شرائط جن پر اتفاق کیا گیا ہے اور جن میں اختلاف کیا گیا ہے وہ نو ہیں: چھ شرائط مسلم فیہ میں ہیں اور تین بیع سلم کے رأس المال میں ہیں۔

پس وہ چھ جو مسلم فیہ میں پائی جاتی ہیں وہ یہ ہیں: مسلم فیہ اس کے ذمہ لازم ہو جائے، اس کا وصف بیان ہو، اس کی مقدار معلوم ہو، وہ مؤجل ہو، اس کی مدت معلوم ہو اور وہ مدت پوری ہونے کے وقت محل معین پر موجود ہو۔

اور رہیں وہ تین شرطیں جو رأس المال میں پائی جاتی ہیں وہ یہ ہیں: اس کی جنس معلوم ہو، مقدار معلوم ہو، اور نقد ہو۔ اور یہی وہ تین شرائط ہیں جو رأس المال میں پائی جاتی ہیں اور یہ نقد کے سوا متفق علیہ ہیں، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

ابن عربی نے کہا ہے: جہاں تک پہلی شرط کا تعلق ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلم فیہ اس کے ذمہ ہو جائے تو اس میں کوئی اشکال نہیں ہے کہ اس سے مقصود اس کا ذمے میں ہونا ہے، کیونکہ یہ عقد مداینہ ہے (یعنی یہ اس کے ذمہ قرض ہو جاتی ہے) اور اگر ایسا نہ ہو تو از روئے دین کے یہ مشروع نہ ہو اور نہ ہی ربح ورفق کے طور پر لوگ اس کا قصد کریں۔ اور اس قول پر لوگوں کا اتفاق ہے۔ مگر امام مالک نے کہا ہے: کسی معین شے میں بیع سلم جائز نہیں ہوتی مگر دو شرطوں کے ساتھ۔ ان میں سے ایک یہ کہ وہ بستی محفوظ و مامون ہو اور دوسری یہ کہ وہ اس کے لینے میں شروع ہو جائے مثلاً بکری سے دودھ اور کھجور کے درخت سے تر کھجوریں اور ان کے سوا کسی نے یہ قول نہیں کیا ہے۔ اور یہ دونوں مسئلے دلیل میں صحیح ہیں، کیونکہ بیع سلم میں تعیین ممتنع ہے مزابنہ اور غرر کے خوف سے تاکہ (ادائیگی کے) محل کے وقت وہ متعذر نہ ہو اور جب جگہ مامون ہو تو اغلباً جو شے اس میں ہوتی ہے اس کا پایا جانا متعذر نہیں ہوتا (لہٰذا) وہ جائز ہے۔ کیونکہ مسائل فقہ میں عواقب اور انجام کی ضمانت کے قطعی ہونے پر یقین نہیں کیا جا سکتا اور ان میں تھوڑے سے دھوکے کا احتمال ضرور ہوتا ہے اور فرعی مسائل میں ایسا بہت زیادہ ہے۔ ان کی تعداد کتب مسائل میں ہے۔

اور رہی بیع سلم دودھ میں اور ایسی کچی کھجوروں میں جنہیں لینا شروع کر دیا ہو تو یہ مدینہ طیبہ کا مسئلہ ہے اور اس پر اہل مدینہ کا اجماع ہے اور اس کی بناء مصلحت کے قاعدہ پر ہے کیونکہ آدمی دودھ اور کھجوریں یومیہ مزدوری اور اجرت کے طور پر لینے کا محتاج ہے اور ہر روز ابتداءً اس کے لئے لینا شاق ہوتا ہے، کیونکہ نقد کبھی موجود نہیں ہوتے اور اس لئے بھی کہ بھاؤ مختلف ہوتا رہتا ہے اور کھجوروں اور دودھ والا نقد کا محتاج ہوتا ہے کیونکہ اس کے پاس تو سامان ہے وہ اپنے لئے کوئی تصرف نہیں کر سکتا۔

1۔ مسند امام احمد، حدیث 6628

پس جب دونوں ہی حاجت میں مشترک ہیں تو دونوں کے لئے اس معاملہ میں رخصت دی گئی ہے عرایا اور دیگر اصول حاجات ومصالح پر قیاس کرتے ہوئے۔

اور رہی دوسری شرط تو وہ یہ ہے کہ اس کی صفت بیان کی گئی ہو۔ یہ متفق علیہ ہے اور اسی طرح تیسری شرط بھی ہے اور اندازہ تین وجہوں سے ہوسکتا ہے۔ کیل (ماپ) وزن اور عدد۔ اور اس کا دارومدار عرف پر ہوتا ہے اور وہ یا تو لوگوں کا عرف ہوگا یا عرف شرع ہوگا۔

اور رہی چوتھی شرط! تو وہ یہ کہ مسلم فیہ مؤجل ہو اور اس میں اختلاف ہے، پس امام شافعی نے کہا ہے: سلم حال جائز ہوتی ہے اور اکثر علماء نے اس کا انکار کیا ہے۔

ابن عربی نے کہا ہے: مدت مقرر کرنے میں مالکیہ مضطرب ہیں یہاں تک کہ انہوں نے اسے ایک دن کی طرف لوٹا دیا ہے، یہاں تک کہ ہمارے بعض علماء نے کہا ہے: سلم حال جائز ہے اور صحیح یہ ہے کہ اس میں تاجیل (مدت مقررہ) کا ہونا ضروری ہے، کیونکہ مبیع کی دو قسمیں ہیں: معجل اور وہ معین ہے اور دوسری مؤجل، پس اگر یہ سلم حال ہو اور مسلم الیہ کے پاس اس وقت موجود نہ ہو تو یہ بیع مالیس عندك کے باب سے ہو جائے گی۔ پس مدت کا مقرر ہونا اور مہلت ہونا ضروری ہے تا کہ ہر عقد اپنی صفت اور اپنی شرائط کے مطابق خالص ہو۔ اور اس میں احکام شرعیہ جاری ہو سکتے ہوں۔

اور ہمارے علماء کے نزدیک اس کی حد اتنی مدت ہے جتنی مدت میں منڈیاں متغیر ہوتی رہتی ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی: اِلی اجل معلوم یہ ہر کہنے والے کے قول سے غنی اور بے نیاز کر دیتے ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: سلم حال میں سے ہمارے علماء نے جسے جائز قرار دیا ہے وہ وہ ہے جس کا بھاؤ شہروں میں مختلف ہوتا رہتا ہے۔ پس سلم ان چیزوں میں جائز ہوتی ہے جن میں اور اس کے درمیان ایک دن یا دو دن یا تین دن باقی ہوں۔ اور رہا ایک ہی شہر تو اس میں جائز نہیں ہوتی، کیونکہ اس کا بھاؤ ایک ہی ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

اور رہی پانچویں شرط اور وہ یہ ہے کہ اجل معلوم ہو تو امت کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی معظم ﷺ نے اس اجل (مدت کے تعین) کے بارے فرما دیا ہے۔

اور امام مالک فقہائے امصار میں سے اس میں منفرد ہیں کہ باغ توڑنے اور فصل کاٹنے کے وقت تک بیع سلم جائز ہے۔ کیونکہ انہوں نے اسے مدت معلوم ہی قرار دیا ہے۔ اور اس بارے میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: یسالونك عن الاهلة کے تحت بحث گزر چکی ہے۔

اور رہی چھٹی شرط! تو وہ یہ ہے کہ ادائیگی کے وقت وہ موجود ہو تو اس میں بھی امت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں اور اگر مدت پوری ہونے پر امر الٰہی سے مبیع ناپید ہو جائے تو تمام علماء کے نزدیک عقد فسخ ہو جائے گا۔

مسئلہ نمبر 7۔ بیع سلم کی شرائط میں سے یہ نہیں ہے کہ مُسْلَم الیہ مسلم فیہ کا مالک ہو بخلاف بعض سلف کے

کیونکہ امام بخاری نے محمد بن مجالد سے روایت بیان کی ہے، انہوں نے کہا ہے کہ عبداللہ بن شداد اور ابو بردہ نے مجھے حضرت عبداللہ بن ابی اوفی کی طرف بھیجا اور ان دونوں نے کہا: ان سے پوچھو کیا حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب آپ کے زمانہ میں گندم میں بیع سلم کرتے تھے؟ تو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم شام کے رہنے والے کسانوں سے گندم، جو اور زیتون میں معلوم کیل کے ساتھ معلوم مدت تک بیع سلم کرتے تھے۔ میں نے کہا کون ہے جس کے پاس اس کی اصل ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہم اس کے بارے ان سے سوال کرتے رہے پھر ان دونوں نے مجھے عبدالرحمن بن ابزی کی طرف بھیجا، سو میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب آپ کے عہد مقدس میں بیع سلم کرتے تھے اور ہم ان سے نہ پوچھتے کیا ان کی کھیتی ہے یا نہیں (1)؟ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے عقد کے وقت سے لے کر مدت مقررہ تک مسلم فیہ کا پایا جانا شرط قرار دیا ہے، اس خوف کی وجہ سے کہ مسلم فیہ کا مطالبہ کیا جائے اور وہ نہ پائی جائے تو وہ دھوکہ اور نقصان ہوگا۔ اور تمام فقہاء نے آپ کی مخالفت کی ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ مدت مقررہ مکمل ہونے کے وقت اس کے موجود ہونے کا لحاظ رکھا جائے گا۔

علمائے کوفہ اور ثوری نے یہ شرط لگائی ہے کہ اگر مسلم فیہ ایسی شے ہو جس کا بوجھ ہو اور اسے اٹھانے میں مشقت ہو تو پھر محل قبض کا ذکر کیا جائے۔ اور انہوں نے کہا ہے: جب مسلم فیہ سپرد کرنے کی جگہ کا ذکر نہ کیا گیا تو بیع سلم فاسد ہوگی۔ اور اوزاعی نے کہا ہے: وہ مکروہ ہوگی۔ اور ہمارے نزدیک اگر وہ اس کے ذکر سے خاموش رہے تو عقد فاسد نہ ہوگا اور محل قبض متعین ہو جائے گا۔ امام احمد، اسحاق اور محدثین کی ایک جماعت نے یہی کہا ہے، کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں اس جگہ کا ذکر موجود نہیں ہے جس میں مسلم فیہ پر قبضہ کیا جائے گا۔ اگر یہ بیع سلم کی شرائط میں سے ہوتی تو یقیناً حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسے اسی طرح بیان فرما دیتے جس طرح آپ نے کیل، وزن اور اجل (مدت) کے بارے بیان فرما دیا ہے اور اسی کی مثل حضرت ابن ابی اوفیٰ کی حدیث ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ ابوداؤد نے سعد الطائی سے، انہوں نے عطیہ بن سعد سے اور انہوں نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کسی نے کسی شے میں بیع سلم کی تو اسے چاہیے کہ وہ اسے کسی اور کی طرف نہ پھیرے (2)۔'' ابومحمد عبدالحق بن عطیہ نے کہا ہے: وہ عوفی ہے (یہ عطیہ بن سعد کا لقب ہے) اور کسی نے بھی اس کی حدیث سے استدلال نہیں کیا ہے، اگرچہ بزرگ اور اجلہ راویوں نے اس سے روایت نقل کی ہے۔

امام مالک نے کہا ہے: ہمارے نزدیک اس آدمی کے بارے میں حکم یہ ہے جس نے معلوم قیمت کے ساتھ مقررہ مدت تک کسی اناج میں بیع سلم کی۔ پس مدت گزر گئی اور خریدنے والے نے بائع کے پاس اس شے میں سے ادا کرنے کے لئے کوئی شے نہ پائی جسے اس نے اس سے خریدا تھا تو وہ اس سے اقالہ کر لے اور اسے چاہیے کہ وہ اس سے چاندی یا سونے یا بعینہٖ اس ثمن کے سوا جو اس نے اسے دیئے تھے نہ لے اور نہ اس ثمن کے عوض وہ اس سے کوئی اور شے خریدے، یہاں تک کہ وہ ان پر

1۔ صحیح بخاری، کتاب السلم، حدیث نمبر 2088، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، باب السلف لا یحول، حدیث نمبر 3008، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

قبضہ کرلے اور وہ اس لئے ہے کہ جب اس نے ان ثمنوں کے علاوہ لے لئے جو اس نے دیئے تھے یا اس نے انہیں ایسے سودے کی طرف پھیر دیا جو اس طعام کے سوا ہو جو اس نے اس سے خرید اتھا تو یہ طعام کو پورا کرنے سے پہلے اسے بیچنا لازم آتا ہے۔ امام مالک نے کہا ہے: تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طعام کو پورا کرنے سے پہلے اس کی بیع کرنے سے منع فرمایا ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: فَاكْتُبُوْهُ یعنی تم قرض اور مدت کو لکھ لو...... اور کہا جاتا ہے: کتابت کا حکم دیا گیا ہے لیکن مراد لکھنا اور گواہ بنانا ہے کیونکہ تحریر گواہوں کے بغیر حجت نہیں ہوتی۔ اور کہا جاتا ہے: ہمیں کتابت کا حکم دیا گیا ہے تاکہ ہم بھول نہ جائیں۔

ابوداؤد طیالسی نے اپنی مسند میں حماد بن سلمہ سے، انہوں نے علی بن زید سے انہوں نے یوسف بن مہران سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں فرمایا ہے: اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ الی آخر الآیۃ بلاشبہ جس نے سب سے اول انکار کیا وہ حضرت آدم علیہ السلام تھے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ان کی اولاد دکھائی تو آپ نے ایک آدمی کو دیکھا جس کا نور انتہائی روشن اور پھیلا ہوا تھا، تو آپ نے عرض کی اے میرے رب! یہ کون ہے؟ رب کریم نے فرمایا یہ تیرا بیٹا داؤد علیہ السلام ہے۔ عرض کی اے میرے پروردگار اس کی عمر کتنی ہے؟ فرمایا: ساٹھ برس۔ عرض کی: اے میرے رب! اس کی عمر میں اضافہ فرمادے۔ تو رب کریم نے فرمایا: نہیں مگر یہ کہ تو اپنی عمر میں سے اس میں اضافہ کردے۔ عرض کی: میری عمر کتنی ہے؟ فرمایا: ہزار برس۔ آدم علیہ السلام نے عرض کی: میں نے چالیس برس اسے عطا کردیئے۔ بیان فرمایا: پس اللہ تعالیٰ نے اس پر تحریر لکھ لی اور اس پر اپنے ملائکہ کو گواہ بنالیا۔ پس جب وفات کا وقت آپہنچا اور ملائکہ حاضر خدمت ہوئے تو آپ نے فرمایا ابھی میری عمر سے چالیس برس باقی ہیں۔ ملائکہ نے کہا: بلاشبہ آپ نے وہ اپنے بیٹے داؤد علیہ السلام کو ہبہ کردیئے تھے تو آپ نے فرمایا: میں نے کسی کو کوئی شے ہبہ نہیں کی۔ آپ نے فرمایا: سو اللہ تعالیٰ نے وہ تحریر نکالی اور اس پر ملائکہ گواہ تھے اور ایک روایت میں ہے: اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کے لئے سو برس اور آدم علیہ السلام کے لئے ان کی عمر ہزار برس مکمل کردی (1)۔" اسے ترمذی نے بھی نقل کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: فَاكْتُبُوْهُ میں اس طرف واضح اشارہ ہے کہ وہ (قرض کے بارے) تحریر لکھے اس طرح جو اس کی مکمل وضاحت کرنے والی ہو اور اس سے ہر قسم کے وہم کو دور کرنے والی ہو ایسے اختلاف کے بارے میں جس کا وہم دو باہم معاملات کرنے والوں کے درمیان ہوسکتا ہے اور اگر وہ دونوں اپنا معاملہ حاکم کے سامنے پیش کریں تو وہ تحریر حاکم کی ایسی راہنمائی کرنے والی ہو جس کے مطابق وہ فیصلہ کرسکے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 10۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ قرضوں کا لکھنا ان کے مالکوں پر واجب ہے، اسی آیت کے ساتھ وہ فرض کیا گیا ہے، چاہے وہ بیع کے سبب ہو یا قرض کی صورت میں ہو، تاکہ اس میں بھول یا انکار ممکن نہ ہوسکے۔ اور یہی علامہ طبری

1۔ جامع ترمذی، حدیث نمبر 3002-3250، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کا اختیار ہے اور ابن جریج نے کہا ہے: جس کسی کو کوئی قرض دے اسے چاہیے کہ وہ لکھ لے اور جو کوئی شے فروخت کرے تو اسے چاہئے کہ وہ گواہ بنا لے۔

اور علامہ شعبی نے کہا ہے: وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ارشاد باری تعالیٰ: فَاِنْ اَمِنَ یہ حکم تحریر کے لئے ناسخ ہے اور اسی طرح ابن جریج نے بیان کیا ہے اور ابن زید نے یہی کہا ہے اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے اور ربیع نے یہ موقف اپنایا ہے کہ وہ ان الفاظ کے ساتھ واجب ہے پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد کے ساتھ اس میں تخفیف فرمائی: فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا۔

اور جمہور نے کہا ہے: اموال کی حفاظت اور شک کو زائل کرنے کے لئے لکھ لینا مستحب ہے۔ اور جب مقروض متقی ہو تو تحریر اس کے لئے ضرر رساں نہیں اور اگر وہ ایسا نہ ہو تو تحریر اس کے قرض کے بارے اور صاحب حق کی حاجت کے بارے ایک اعتماد اور یاد دہانی ہے، بعض نے کہا ہے: اگر تو گواہ بنا لے تو یہ احتیاط ہے اور اگر تو امین بن جائے تو یہ بھی حلال ہے اور اس کی گنجائش ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہی قول صحیح ہے اور اس میں نسخ مرتب نہیں ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آدمی کے لئے اس شے کے بارے میں لکھنا مستحب قرار دیا ہے جسے وہ ہبہ کرے اور اسے چھوڑ دے یہ اجماع سے ثابت ہے اور اس کا مستحب ہونا بلاشبہ لوگوں کے اعتماد اور بھروسہ کی بناء پر ہے۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ حضرت عطا وغیرہ نے کہا ہے: کاتب پر واجب ہے کہ وہ لکھے، شعبی نے یہی کہا ہے اور یہ اس وقت ہے جب اس کے سوا کوئی کاتب موجود نہ ہو تو پھر اس پر واجب ہے کہ وہ لکھے۔ سدی نے کہا ہے: اس پر لکھنا واجب ہے جب وہ فارغ ہو۔ پہلے سے لام کو حذف کر دیا گیا ہے اور دوسرے میں اسے ثابت رکھا گیا ہے کیونکہ دوسرا غائب کے لئے ہے اور پہلا مخاطب کے لئے ہے۔ اور کبھی یہ مخاطب میں ثابت ہوتی ہے اور اس سے منہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَلْتَفْرَحُوْا یہ تاء کے ساتھ ہے اور غائب میں حذف ہو جاتی ہے اور اسی سے شاعر کا یہ قول ہے:

محمد تفد نفسك كلُّ نَفْسٍ　　　إذَا ما خِفْتَ من شيْءٍ تَبَالا

اس میں تُفْدِ سے لام محذوف ہے یہ مونث غائب کا صیغہ ہے۔

مسئلہ نمبر 12۔ قولہ تعالیٰ: بِالْعَدْلِ یعنی حق اور انصاف کے ساتھ، یعنی صاحب حق کے لئے نہ اس سے زیادہ لکھا جائے گا اور نہ اس سے کم۔ اور فرمایا: بَّيْنَكُمْ یہ نہیں کہا أحد کم، کیونکہ جب وہ آدمی جس کا قرض ہے وہ اس کی کتابت میں شک کر سکتا ہے جس پر قرض ہے اور اسی طرح اس کا برعکس بھی ہے تو اللہ تعالیٰ نے کاتب ایسے آدمی کو قرار دیا ہے جو ان دونوں کے سوا ہو وہ عدل کے ساتھ لکھے، اس کے دل میں اور نہ اس کے قلم میں دونوں میں سے ایک کی دوسرے پر ترجیح ہو۔ (یعنی ایک جانب اس کا جھکاؤ نہ ہو)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بے شک لوگ جب معاملات کرتے ہیں تو کوئی بھی معاملہ سے جدا نہیں ہوتا اور ان میں سے وہ بھی ہیں جو لکھ سکتے ہیں اور وہ بھی جو نہیں لکھ سکتے، اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے کہ ان کے درمیان ایک کاتب عدل و انصاف کے

ساتھ لکھ دے۔

مسئلہ نمبر 13۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد بِالْعَدْلِ میں باء وَلْيَكْتُبْ کے متعلق ہے كَاتِبٌ کے متعلق نہیں ہے، کیونکہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ کوئی معاہدہ (یادستاویز) نہ لکھے مگر اپنی ذات میں عدل کے ساتھ، حالانکہ اسے بچہ، غلام اور حفاظت و نگرانی کرنے والا سب اسے لکھ سکتے ہیں جبکہ وہ اس کی سمجھ اور فقاہت رکھتے ہوں۔ وہ لوگ جو لکھنے کے لئے مقرر ہوتے ہیں والیوں کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ انہیں چھوڑ دیں مگر جب کہ وہ اپنی رضامندی کے ساتھ کنارہ کش ہو جائیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: لوگوں کے درمیان معاہدے کوئی نہیں لکھ سکتا مگر وہی جو انہیں جاننے والا ہو، فی نفسہ عادل ہو اور مامون ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ۔(1)

میں (مفسر) کہتا ہوں: پس اس بنا پر با کاتب کے متعلق ہے یعنی چاہیے کہ ان کے درمیان عادل کاتب لکھے، پس بِالْعَدْلِ محل صفت میں واقع ہے۔

مسئلہ نمبر 14۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ اس میں اللہ تعالیٰ نے کاتب کو انکار کرنے سے منع کیا ہے۔ لوگوں نے کاتب پر کتابت کے وجوب اور شاہد پر شہادت کے وجوب میں اختلاف کیا ہے، پس طبری اور ربیع نے کہا ہے۔ ''کاتب پر واجب ہے جب اسے لکھنے کا حکم دیا جائے اور حسن نے کہا ہے: یہ اس پر ایسی جگہ واجب ہے جہاں اس کے سوا اور کوئی کاتب میسر نہ ہو، کیونکہ اس کے انکار سے صاحب قرض کا نقصان ہو جائے گا　...پس اگر صورت حال اس طرح ہو تو پھر یہ فرض ہے اور اگر اس کے سوا دوسرے کاتب پر قدرت ہو تو پھر اس کے لئے وسعت اور گنجائش ہے جبکہ وہ دوسرا اس ذمہ داری کو ادا کرے۔ سدی نے کہا ہے: کاتب پر فارغ ہونے کی حالت میں لکھنا واجب ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ مہدوی نے ربیع اور ضحاک سے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَلَا يَاْبَ اس ارشاد کے ساتھ منسوخ ہے وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ ان کے نظریہ پر جاری ہوتا ہے جن کا یقین یا ظن یہ ہے کہ پہلے متابعین میں سے جو بھی لکھنا پسند کرے اس پر لکھنا واجب تھا اور اس کے لئے انکار کرنا جائز نہ تھا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد نے اسے منسوخ کر دیا: وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ اور یہ بعید ہے۔ کیونکہ اس کا واجب ہونا ہر اس پر ثابت نہیں جو بھی متابعین میں سے اس کا ارادہ کرے وہ جو بھی ہو۔ اگر کتابت واجب ہوتی تو اس کے عوض اجرت لینا صحیح نہ ہوتا، کیونکہ فرائض میں سے کسی فعل پر اجرت لینا باطل ہے اور اس دستاویز کے لکھنے پر اجرت لینے کے جواز میں علماء کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: صحیح یہ ہے کہ یہ امر ارشاد ہے پس وہ لکھتا ہے اور اپنا حق لے لیتا ہے اور اَبَى يَاْبَى شاذ ہے، اور یہ نہیں آتا مگر اس طرح قَلَى يَقْلَى، اَبَى يَاْبَى، غَسَى يَغْسَى اور جَبَى الخراج يَجْبَى اور یہ بھی پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 15۔ قولہ تعالیٰ: كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ، كَمَا میں کاف اَنْ يَّكْتُبَ کے متعلق ہے معنی یہ ہے كتبا كما علمه الله، یعنی لکھنا اس طرح ہو جس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے سکھایا ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ اس کے متعلق ہو جو اس قول

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 379

میں ہے وَلَا يَأْبَ معنی کے اعتبار سے، یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس پر علم کتابت کے ساتھ انعام و احسان فرمایا ہے پس وہ انکار نہ کرے اور چاہیے کہ اسے اسی طرح فضیلت دے جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس پر (اسے) فضیلت دی ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ کلام اس معنی پر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد اَنْ يَّكْتُبَ کے پاس مکمل ہو پھر کَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ یہ نیا کلام ہو اور کاف قول باری تعالیٰ فَلْيَكْتُبْ کے متعلق ہو۔

مسئلہ نمبر 16۔ قولہ تعالیٰ: وَلْيُمْلِلِ الَّذِیْ عَلَيْهِ الْحَقُّ اور املا کرانے والا وہ مقروض اور مطلوب ہے جو اپنے بارے میں اپنی زبان سے اقرار کرتا ہے تاکہ جو اس کے ذمہ واجب الاداء ہے وہ اس کے بارے آگاہ کرے۔ املا اور املال دو لغتیں ہیں۔ اَمَلَّ اور اَمْلٰی، پس اَمَلَّ اہل حجاز اور بنی اسد کی لغت ہے اور بنی تمیم کہتے ہیں: اَمْلَيْتُ۔ اور قرآن میں دونوں لغتیں موجود ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: فَهِیَ تُمْلٰی عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا ۝ (الفرقان) (پھر یہ پڑھ کر سنائے جاتے ہیں اسے ہر صبح و شام (تاکہ از بر ہو جائیں)) اصل اَمْلَلْتُ ہے اس میں لام کو یا سے بدل دیا گیا ہے کیونکہ یہ زیادہ خفیف ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اسے املا کا حکم دیا ہے جس پر حق ہے، کیونکہ شہادت اس کے اقرار کے سبب ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں تقویٰ کا حکم دیا ہے جس میں وہ املا کرائے اور حق میں سے کوئی شے کم کرنے سے منع کیا ہے۔ اور البخس کا معنی کم کرنا اور گھٹانا ہے۔ اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِیْٓ اَرْحَامِهِنَّ (البقرہ:228)
(اور جائز نہیں ان کے لئے کہ چھپائیں جو پیدا کیا ہے اللہ نے ان کے رحموں میں)

مسئلہ نمبر 17۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ كَانَ الَّذِیْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا بعض لوگوں نے کہا ہے: ضعیف سے مراد صغیر ہے اور یہ غلطی ہے کیونکہ سفیہ (بے وقوف) کبھی بڑا بھی ہوتا ہے اس کا بیان آگے آئے گا۔ اَوْ ضَعِيْفًا یعنی ایسا کبیر جس کی عقل نہ ہو۔ اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ وہ جس پر قرض ہو اللہ تعالیٰ نے ان کی چار قسمیں قرار دی ہیں: ایک مستقل بنفسہٖ ہو خود املا کرائے۔ اور تین قسموں کے وہ ہیں جو خود املا نہیں کرا سکتے اور ہر وقت ان کی تکلیفیں اور اعذار باقی رہتے ہیں، معاملات کے سوا کئی جہتوں میں ان کا حق اس طرح مترتب ہوتا ہے جس طرح کہ میراث جب وہ تقسیم کی جائے وغیرذالك اور وہ بے وقوف، کمزور اور وہ آدمی ہے جو املا کرانے کی قدرت نہیں رکھتا۔ پس سفیہ وہ ہے جس کی رائے اس مال کے بارے میں عمدہ ہو جسے نہ تو اپنی ذات کے لئے لینا اچھا ہوتا ہے اور نہ اس میں سے کوئی شے دینا (حسین ہوتا ہے) اسے اس گھٹیا کپڑے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جس کی بنائی باریک اور ہلکی ہو۔ اور بدزبان کو سفیہ کا نام دیا جاتا ہے کیونکہ بدزبانی لوگوں میں سے جاہلوں اور کمزور عقل والے لوگوں میں داخل کر دیتی ہے اور عرب کبھی عقل کی کمزوری پر سفہ کا اطلاق کرتے ہیں اور کبھی بدنی کمزوری پر۔

شاعر نے کہا ہے:

نَخَافُ أَنْ تَسْفَهَ أَحلامُنا و يجهلِ الدَّهرُ مع الحالِم

اس میں عقل کی کمزوری کے لئے استعمال ہو رہا ہے۔

اور ذوالرمۃ نے کہا ہے:

مَشْيَنَ كما اهتزَّتْ رِماحٌ تَسَفَّهَتْ أعالِيَها مَرُّ الرياحِ النَّواسِمِ

اس میں بدنی کمزوری اور ضعف کے معنی میں مذکور ہے۔

یعنی اس نے اسے کمزور اور نرم پایا تو اس نے اسے حرکت دی۔

تحقیق انہوں نے کہا ہے: الضعف ضاد کے ضمہ کے ساتھ بدن کی کمزوری کے لئے اور ضاد کے فتحہ کے ساتھ رائے میں کمزوری کے لئے آتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ دونوں لغتیں ہیں اور پہلی زیادہ صحیح ہے۔

جبکہ ابوداؤد نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایک آدمی خریداری کرتا تھا اور اس کی عقل میں ضعف (کمزوری) تھی۔ پس اس کے گھر والے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کی یا نبی اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم فلاں کو روک دیجئے کیونکہ وہ خرید و فروخت کرتا ہے اور اس کی عقل میں ضعف ہے، چنانچہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلایا اور اسے بیع کرنے سے روک دیا، تو اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں تو ایک ساعت بھی خرید و فروخت کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر تو خرید و فروخت کو چھوڑ نہیں سکتا تو پھر یہ کہہ کرلے کہ ایک دوسرے کے ساتھ کوئی دھوکہ نہیں (1)۔'' اسے ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ سلمی ترمذی نے حدیث انس سے بیان کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث صحیح ہے اور کہا ہے: بے شک ایک آدمی کی عقل میں ضعف تھا اور آگے حدیث ذکر کی (2) اور امام بخاری نے اسے تاریخ میں ذکر کیا ہے اور اس میں یہ کہا ہے۔'' جب تو بیع کرے تو یہ کہا کر دھوکہ نہیں ہے اور تو ہر سامان تین راتوں کے خیار کے ساتھ خریدا کر۔'' یہ آدمی حبان بن منقذ بن عمرو انصاری تھا اور یحییٰ اور واسع ابن حبان کا والد تھا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ منقذ یحییٰ اور واسع کا دادا تھا۔ یہ دونوں امام مالک کے شیخ تھے اور منقذ کا والد حبان تھا۔ اس کی عمر ایک سو تیس برس تھی۔ وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں ایک غزوہ میں زخمی ہو گئے اور زخم ان کے دماغ میں لگا جس سے ان کی عقل اور زبان میں وہم اور خلل پیدا ہو گیا۔

اور دارقطنی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: حبان بن منقذ کمزور آدمی تھا اور اس کی قوت بصارت بھی کمزور تھی اس کے سر میں طمانچہ مارا گیا درآنحالیکہ اس کے سر میں زخم ہو گیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے ہر اس شے میں تین دن کا خیار رکھ دیا جو وہ خریدے گا اور اس کی زبان بھی بوجھل تھی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: تو خرید و فروخت کر اور یہ کہہ کوئی دھوکہ وغیرہ قبول نہیں۔'' پس میں اسے یہ کہتے ہوئے سنا کرتا تھا: لا خِذَابةَ لا خِذَابةَ اسے حضرت ابن عمرو رضی اللہ عنہما کی حدیث سے نقل کیا ہے، الخلابۃ کا معنی الخديعة (دھوکہ دہی) ہے۔ اور اسی سے ان کا یہ قول ہے: اذا لم تغلب فاخلُب (3) (جب تو غالب نہ آسکے تو پھر حیلے اور چال سے مقصد تلاش کر۔)

مسئلہ نمبر 18۔ علماء کا اس آدمی کے بارے میں اختلاف ہے جسے تجربہ کی قلت اور عقل کے ضعف کی وجہ سے خرید و فروخت میں دھوکہ دیا جاتا ہو کیا اس پر پابندی عائد کی جائے یا نہیں؟ تو امام احمد اور اسحاق نے اس پر پابندی کا قول کیا ہے۔ اور

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی الرجل یقول فی البیع لا خلابۃ، حدیث نمبر 3038، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، کتاب البیوع، باب ماجاء فیمن یخدع فی البیع، حدیث نمبر 1171، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً، حدیث 1171

دوسروں نے کہا ہے اس پر پابندی نہیں لگائی جائے گی۔ دونوں قول ایک ہی مذہب میں ہیں۔ اور صحیح پہلا قول ہے، اس آیت کی بنا پر۔ اور حدیث طیبہ میں اس قول کی بناء پر۔ یا نبی اللہ أحجر علی فلان (اے اللہ تعالیٰ کے نبی! صلی اللہ علیہ وسلم فلاں پر پابندی لگا دیجئے) البتہ اس قول کی بنا پر پابندی کا ترک کرنا ثابت ہوتا ہے۔ یا نبی اللہ إنی لا أصبر عن البیع (اے اللہ تعالیٰ کے نبی! صلی اللہ علیہ وسلم میں بیع سے رک نہیں سکتا۔) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے بیع کو مباح قرار دیا اور اسے اس کے ساتھ خاص کر دیا، کیونکہ وہ جسے خرید و فروخت میں دھوکہ دیا جاتا ہو چاہیے کہ اس پر پابندی لگا دی جائے بالخصوص جب اس کی عقل ناقص اور فاسد ہو۔ اور جو شے اس کی خصوصیت پر دلالت کرتی ہے وہ وہ روایت ہے جسے محمد بن اسحاق نے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا ہے، محمد بن یحییٰ بن حبان نے مجھے بیان کیا ہے: وہ میرے دادا منقذ بن عمرو تھے اور وہ وہ آدمی تھے جن کے سر میں زخم آ لگا، تو ان کی زبان میں لکنت آ گئی اور ان کی عقل چھن گئی (یعنی کمزور ہوگئی) وہ تجارت نہیں چھوڑتے تھے اور انہیں ہمیشہ دھوکہ دیا جاتا تھا۔

پس وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور آپ کے سامنے اس کا ذکر کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تو بیع کرے تو یہ کہا کر کوئی دھوکہ (قبول) نہیں پھر تو جو سامان بھی خریدے گا تیرے لئے تین راتوں کا خیار ہوگا پس اگر تو اس پر راضی ہو جائے تو اسے اپنے پاس رکھ لے اور اگر راضی نہ ہو تو اسے اس کے مالک کے پاس لوٹا دے۔'' اور انہوں نے طویل عمر پائی ہے، وہ ایک سو تیس برس تک زندہ رہے ہیں اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب لوگ پھیل گئے اور تعداد میں کثیر ہو گئے تو وہ بازار میں خرید و فروخت کرتے تھے اور شے لے کر اپنے گھر والوں کی طرف لوٹتے حالانکہ انہوں نے غبن فاحش کھایا ہوتا، پھر گھر والے انہیں ملامت کرتے تھے اور کہتے کس کے لئے خریدتے ہو؟ تو وہ کہتے: مجھے خیار حاصل ہے اگر میں پسند کروں تو لے لوں اور اگر نہ پسند کروں تو واپس لوٹا دوں، تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تین دن کا خیار عطا فرمایا ہے، پس وہ دوسرے دن یا تیسرے دن سامان اس کے مالک پر واپس لوٹا دیتے، تو وہ کہتا: قسم بخدا! میں اسے قبول نہیں کروں گا، تحقیق تو نے میرا سامان لے لیا ہے اور مجھے دراہم دے دیئے ہیں، تو وہ کہتے: بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تین دنوں کا اختیار عطا فرمایا ہے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے کوئی آدمی ادھر سے گزرتا تو وہ تاجر کو کہتا: تجھ پر افسوس ہے! بلاشبہ یہ سچ بول رہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے تین دنوں کا خیار عطا فرمایا تھا۔ اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ ابو عمر نے الاستیعاب میں اس کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے: بخاری نے تاریخ میں عیاش بن ولید عن عبد الاعلی عن ابن اسحاق کی سند سے اسے ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 19۔ قولہ تعالیٰ: اَوْ ضَعِیْفًا ضعیف سے مراد وہ آدمی ہے جس کی عقل میں نقص اور فساد داخل ہو چکا ہو، لکھوانے سے اس کی فطرت اور طبیعت عاجز ہو یا تو اس کے بولنے میں رکاوٹ ہونے کی وجہ سے یا اس کے گونگا ہونے کی وجہ سے یا ادائے کلام سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اور یہ بھی کہ کبھی اس کا ولی باپ ہوتا ہے یا وصی۔ اور وہ جو املا کرانے کی استطاعت ہی نہیں رکھتا وہ صغیر ہے اور اس کا ولی اس کا وصی ہوگا یا اس کا باپ ہوگا۔ اور وہ غائب ہے جو محل اشہاد سے غائب ہو یا تو بیماری کی وجہ سے یا اس کے علاوہ کسی عذر کی وجہ سے اور اس کا ولی اس کا وکیل ہوگا اور رہا گونگا تو یہ جائز ہے کہ وہ بھی ضعفاء میں سے ہو۔ اور اولیٰ یہ ہے کہ وہ ان میں سے ہو جو استطاعت نہیں رکھتے۔ پس یہی وہ اصناف ہیں جو ممتاز ہو سکتی ہیں، ان کا

تفصیلی بیان سورۃ النساء میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 20۔ قولہ تعالیٰ: فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ طبری نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ وَلِيُّهٗ میں ضمیر الحق کی طرف عائد ہے اور انہوں نے اس بارے میں ربیع سے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ضمیر الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ کی طرف لوٹ رہی ہے اور یہی صحیح ہے۔ اور جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ صحیح نہیں ہے اور کس طرح گواہ اس شے پر شہادت دے سکتے ہیں اور سفیہ کے ذمہ اس کی املا کے سبب مال ڈال سکتے ہیں جس کا قرض ہو! یہ شے شریعت میں جائز نہیں ہے مگر اس کا قائل ارادہ رکھتا ہے۔ بے شک وہ جو املا کرانے کی استطاعت نہیں رکھتا بیماری کی وجہ سے یا عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے املا کرانے سے اس کی زبان لڑکھڑا جائے یا گونگا ہونے کی وجہ سے اور جب صورتحال اس طرح ہو تو مریض پر اور جس کی زبان گونگا ہونے کی وجہ سے املا کرانے سے عاجز ہو تو علماء میں سے کسی کے نزدیک کوئی ولی نہیں، مثلاً جو بچے پر اور سفیہ پر ان کے نزدیک جو اس پر پابندی لگاتے ہیں کچھ ثابت نہیں۔ پس جب صورتحال اس طرح ہو تو صاحب حق (قرض کا مالک) عدل و انصاف کے ساتھ املا کرائے اور اسے سنائے جو اس سے عاجز ہے اور جب املا مکمل ہو جائے تو وہ اس کا اقرار کرائے۔ اور یہ معنی آیت سے مراد نہیں ہے اور نہ یہ صحیح ہو سکتا ہے مگر صرف اس کے بارے میں جو بیماری کی وجہ سے املا کرانے کی استطاعت نہ رکھتا ہو اور جن کا اس کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے (1)۔

مسئلہ نمبر 21۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ یہ اس پر دلیل ہے کہ بے شک اسے اس بارے میں امین بنایا گیا ہے جسے وہ شروع کر رہا ہے اور جسے وہ پورا کر رہا ہے اور یہ راہن کا قول قسم کے ساتھ قبول ہونے کا تقاضا کرتا ہے جبکہ راہن اور مرتہن کا قرض کی مقدار میں اختلاف ہو جائے اور رہن موجود ہو۔ اور یہی اکثر فقہاء کا مذہب ہے، یعنی سفیان ثوری، امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور اصحاب الرائے رحمۃ اللہ علیہم۔ اور اسے ہی ابن منذر نے پسند کیا ہے اور کہا ہے: کیونکہ مرتہن زیادتی کا دعویٰ کرنے والا ہے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: البينة على المدعى واليمين على المدعى عليه (گواہ لانا مدعی پر لازم ہے اور قسم مدعی علیہ پر ہے) اور امام مالک نے کہا ہے: اس صورت میں قول مرتہن کا قبول کیا جائے گا جبکہ وہ (راہن کے) قول اور رہن کی قیمت کے درمیان ہو اور اس سے زیادہ پر اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی، تو گویا آپ یہ دیکھ رہے ہیں کہ رہن اور اس کی قسم مرتہن کے لئے شاہد ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ آپ کے اس نظریہ کا رد ہے۔ بے شک وہ جس پر حق ہے وہ راہن ہے اور یہ مسئلہ عنقریب آئے گا۔

اور اگر کوئی کہنے والا کہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے رہن کو شہادت اور کتاب (تحریر) کا بدل بنایا ہے اور شہادت مشہود لہ کے صدق پر دال ہے اس قول میں جو اس کے دعویٰ اور رہن کی قیمت کے درمیان ہو جب وہ اس کی قیمت کو پہنچ جائے اور زیادتی کے بارے میں کوئی دستاویز نہ ہو، تو اسے کہا جائے گا رہن اس پر دلالت نہیں کرتا کہ اس کی قیمت کا قرض کی مقدار کے برابر ہونا واجب ہوتا ہے بسا اوقات مرہونہ شے قلیل اور کثیر کے عوض ہوتی ہے۔ ہاں اکثر اوقات رہن قرض کی مقدار سے کم

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 380

نہیں ہوتی اور یہ کہ وہ اس کے مطابق ہوتی ہے تو ایسا بھی نہیں۔

اور یہ کہنے والا کہتا ہے: قرض کی مقدار میں قسم کے ساتھ مرتہن کے قول کی تصدیق کی جائے گی یہاں تک کہ وہ رہن کی قیمت کے مساوی ہو۔ اور عرف اس پر نہیں ہے بسا اوقات قرض رہن سے کم ہوتا ہے اور یہی اس میں غالب ہے، پس ان کے اس قول کا کوئی نتیجہ نہیں۔

مسئلہ نمبر 22۔ اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ مراد ولی ہے تو اس میں اس پر دلیل ہے کہ اس کا اقرار اپنے یتیم کے خلاف جائز ہے کیونکہ جب اس نے اسے املا کرایا تو اس کا قول اس پر اس بارے میں نافذ ہو گیا جو اس نے اسے لکھوایا۔

مسئلہ نمبر 23۔ اور وہ سفیہ جس پر پابندی عائد کی گئی ہو اس کا اپنے ولی کی اجازت کے بغیر تصرف کرنا فاسد ہے اس پر اجماع ہے یہ ہمیشہ کے لئے فسخ کر دیا گیا ہے نہ یہ کوئی حکم ثابت کرے گا اور نہ کسی شے میں موثر ہو گا۔ پس اگر سفیہ تصرف کرے اور اس پر کوئی پابندی نہ ہو تو اس بارے میں اختلاف ہے اس کا بیان سورۃ النساء میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 24۔ قولہ تعالیٰ: وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ۔ الاستشھاد کا معنی ہے شہادت طلب کرنا (یعنی شاہد بنانا) اور لوگوں کے مابین یہ اختلاف ہے کہ کیا یہ فرض ہے یا مستحب؟ اور صحیح یہ ہے کہ یہ مستحب ہے، جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 25۔ قولہ تعالیٰ: شَهِيْدَيْنِ اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص حکمت کے ساتھ شہادت کو حقوق مالیہ، بدنیہ اور حدود میں مرتب فرمایا ہے اور سوائے زنا کے ہر شے میں دو گواہ مقرر کئے ہیں، جیسا کہ اس کا بیان سورۃ النساء میں آئے گا۔ اور شہید مبالغہ کا وزن ہے اور اس میں اس پر دلالت ہے جو شہادت دے اور وہ اس کی طرف سے بار بار ہو، تو گویا یہ اس کے عادل ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 26۔ قولہ تعالیٰ: مِنْ رِّجَالِكُمْ یہ کفار، بچوں اور عورتوں کو چھوڑنے کے بارے نص ہے اور رہے غلام! تو لفظ انہیں شامل ہے اور مجاہد نے کہا ہے مراد آزاد مرد ہیں اور قاضی ابو اسحاق نے اسے ہی اختیار کیا ہے اور اس میں مبالغہ کی حد تک بحث کی ہے اور علماء نے غلاموں کی شہادت کے بارے میں اختلاف کیا ہے، پس شریح، عثمان البتی، احمد، اسحاق اور ابو ثور رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: غلام کی شہادت جائز ہے بشرطیکہ وہ عادل ہو اور انہوں نے آیت کے لفظ کو غلبہ دیا ہے اور امام مالک، ابو حنیفہ، شافعی اور جمہور علماء رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: غلام کی شہادت جائز نہیں ہوتی اور انہوں نے غلامی کے نقص کو غلبہ دیا ہے اور علامہ شعبی اور نخعی نے تھوڑی سی شے میں اسے جائز قرار دیا ہے اور صحیح جمہور کا قول ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اور خطاب مِنْ رِّجَالِكُمْ تک جاری ہے۔ پس ظاہر خطاب ان لوگوں کو شامل ہو گا جو آپس میں قرض کا لین دین کرتے ہیں اور غلام اپنے آقاؤں کی اجازت کے بغیر کسی شے کے مالک نہیں ہوتے۔

اور اگر وہ کہیں کہ آیت کے اول حصہ کا خاص ہونا اس کے آخر کے عموم کے ساتھ تعلق کے مانع نہیں ہے تو انہیں کہا جائے گا اسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد خاص کر رہا ہے: وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد مِنْ رِّجَالِكُمْ اس پر دلیل ہے کہ اندھے اہل شہادت میں سے ہیں لیکن تب جب انہیں یقینی علم ہو۔ مثلاً وہ جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے انہوں نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شہادت کے بارے پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو اس سورج کو دیکھ رہا ہے پس تو اس کی مثل پر شہادت دے یا چھوڑ دے'' اور یہ ارشاد اس پر دلالت کرتا ہے کہ شاہد کا اس شے کو دیکھنا شرط ہے جس کے بارے وہ شہادت دے رہا ہے نہ کہ وہ ایسے استدلال کے ساتھ شہادت دے جس میں اس کے خطا کرنے کا احتمال اور امکان ہو۔ البتہ اس کا اپنی بیوی کے ساتھ وطی کرنا جائز ہوتا ہے جب وہ اس کی آواز پہچان لے، کیونکہ وطی کا عمل کرنا غلبہ ظن کے ساتھ جائز ہے، پس اگر شب زفاف کوئی عورت اس کی طرف بھیج دی گئی اور اسے کہا گیا، یہ تیری بیوی ہے اور وہ اسے نہ پہچانتا ہو تو اس کے لئے اس سے وطی کرنا جائز ہے اور اس کے لئے ہدیہ قبول کرنا حلال ہوتا ہے قاصد کے قول کے ساتھ جو اس کے پاس آئے۔ اور اگر کوئی خبر دینے والا اسے زید کے بارے میں اقرار یا بیع یا قذف یا غصب کی خبر دے تب اس کے لئے مخبر عنہ کے خلاف شہادت دینا جائز نہیں ہے، کیونکہ شہادت کا راستہ یقین ہے اور ان کے سوا میں ظن غالب کا استعمال جائز ہوتا ہے اور اسی لئے امام شافعی، ابن ابی لیلیٰ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: جب اسے نابینا ہونے سے پہلے اس کا علم ہو تو اندھا ہونے کے بعد اس کی شہادت جائز ہے۔ اور اس کے اور مشہود علیہ کے درمیان حائل ہونے والا اندھا پن مشہود علیہ میں غیبت اور موت کے طاری ہونے کی طرح ہے اور یہ ان کا مذہب ہے اور وہ جو اندھے کو اس بارے میں ادائے شہادت سے روکتے ہیں جو شہادت اس نے بصارت کے ساتھ لی ہو اس کی کوئی وجہ اور علت نہیں ہے اور اس کی شہادت اس نسب کے بارے میں صحیح ہوگی جو خبر مشہور سے ثابت ہوتا ہے، جیسا کہ وہ ایسی شے کے بارے خبر دے جس کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تواتر کے ساتھ ثابت ہو۔

اور علماء میں سے وہ بھی ہیں جنہوں نے اندھے کی شہادت کو ان چیزوں میں قبول کیا ہے جن کی شہادت کا ذریعہ آواز ہے کیونکہ انہوں نے اس کے ساتھ استدلال کو حد یقین تک پہنچنے والا خیال کیا ہے اور یہ گمان کیا ہے کہ آوازوں کا مشتبہ ہونا شکلوں اور رنگوں کے مشتبہ ہونے کی طرح ہی ہے۔ یہ استدلال ضعیف ہے، کیونکہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ آنکھ والے کے لئے بھی آواز پر اعتماد کرنا جائز ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ نابینے آدمی کا طلاق وغیرہ میں آواز پر شہادت دینا جائز ہے بشرطیکہ وہ آواز کو پہچانتا ہو۔ ابن القاسم نے بیان کیا ہے کہ میں نے امام مالک سے کہا: ایک آدمی دیوار کے پیچھے سے اپنے پڑوسی کی آواز کو سنتا ہے اور اسے دیکھتا نہیں، وہ یہ سنتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے رہا ہے (کیا) وہ اس پر شہادت دے سکتا ہے درآنحالیکہ اس نے اس کی آواز پہچان لی ہو؟ تو امام مالک نے فرمایا: اس کی شہادت جائز ہے اور یہی حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، قاسم بن محمد، شریح الکندی، شعبی، عطا بن ابی رباح، یحییٰ ابن سعید، ربیعہ، ابراہیم نخعی، امام مالک اور لیث رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 27۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ لَّمْ یَكُوْنَا رَجُلَیْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ معنی یہ ہے کہ اگر طالب دو مرد گواہ نہ لا سکے تو اسے چاہیے کہ وہ ایک مرد اور دو عورتیں لے آئے، یہ جمہور کا قول ہے۔ فَرَجُلٌ یہ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے اور

وَّامْرَاَتٰنِ اس پر معطوف ہے اور خبر محذوف ہے۔ (تقدیر کلام یہ ہے) فرجل و امرأتان یقومان مقامهما۔ یعنی ایک مرد اور دو عورتیں دو مردوں کے قائم مقام ہو جائیں گے۔ اور غیر قرآن میں نصب بھی جائز ہے (یعنی) فاستشهدو ا رجلا و امرأتین۔ پس تم گواہ بناؤ ایک مرد اور دو عورتیں۔ اور سیبویہ نے بیان کیا ہے: ان خنجرًا فخنجرًا (اگر وہ خنجر لے کر آئے تو تم بھی خنجر لے کر آؤ) اور ایک قوم نے کہا ہے: بلکہ معنی یہ ہے پس اگر دو مرد نہ ہوں، یعنی وہ نہ پائے جائیں تو دو عورتوں کو گواہ بنانا جائز نہ ہوگا مگر مرد نہ ہونے کی صورت میں۔ ابن عطیہ نے کہا ہے (1): یہ ضعیف ہے اور آیت کے الفاظ یہ معنی نہیں دیتے، بلکہ اس سے ظاہر جمہور کا قول ہے، یعنی اگر گواہ بنانے والے کے پاس دو مرد نہ ہوں یعنی اگر صاحب حق اسے چھوڑ دے یا کسی عذر کے سبب اس کا قصد کرے تو اسے چاہیے کہ وہ ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنا لے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دو مردوں کی موجودگی کے باوجود ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کی شہادت کو جائز قرار دیا ہے اور اس کے سوا کسی اور میں اس کا ذکر نہیں فرمایا اور جمہور کے قول کے مطابق اسے صرف اموال میں جائز قرار دیا گیا ہے بشرطیکہ ان دونوں کے ساتھ ایک مرد بھی ہو۔ بلاشبہ یہ اموال میں ہو سکتا ہے ان کے سوا میں نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اموال کو پختہ کرنے اور ان کی توثیق کرنے کے اسباب کثیر بنائے ہیں کیونکہ انہیں حاصل کرنے کی جہتیں کثیر ہیں اور ان کے ساتھ عموم بلوی ہونے اور ان کا کاروبار بار بار ہونے کی وجہ سے۔ پس ان میں مضبوطی اور توثیق کو کبھی لکھوانے کے ساتھ، کبھی گواہ بنا لینے کے ساتھ، کبھی رہن کے ساتھ اور کبھی ضمان کے ساتھ رکھ دیا۔ اور ان تمام میں عورتوں کی شہادت کو مردوں کے ساتھ داخل کر دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ سے یہ وہم نہیں ہوتا کہ یہ بضع کے ساتھ مہر کے قرض پر اور دم عمد کی صلح پر مشتمل ہے، کیونکہ وہ شہادت شہادت علی الدین نہیں ہے، بلکہ وہ شہادت علی النکاح ہے اور علماء نے ان معاملات میں اکیلی عورتوں کی شہادت جائز قرار دی ہے جن پر ضرورت کے وقت ان کے سوا کوئی اور مطلع نہیں ہو سکتا اور اسی طرح ضرورت کے وقت بچوں کی شہادت کی اجازت دی گئی ہے ان زخموں اور جھگڑوں میں جو ان کے آپس کے درمیان ہوں۔

تحقیق علماء نے زخموں میں بچوں کی شہادت کے بارے اختلاف کیا ہے اور وہ یہ ہے:

مسئلہ نمبر 28۔ امام مالک نے اسے جائز قرار دیا ہے جب تک وہ مختلف اور متفرق نہ ہوں۔ اور ان میں سے دو سے کم کی شہادت جائز نہیں ہے نہ بڑے کی چھوٹے پر اور نہ چھوٹے کی بڑے پر۔ اور علماء میں سے جو بچوں کے آپس کے جھگڑوں میں ان کی شہادت کے ساتھ فیصلے کرتے تھے وہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ہیں اور امام مالک نے کہا ہے: ہمارے نزدیک اس پر اجماع کیا گیا ہے۔

اور امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم نے بچوں کی شہادت کو جائز قرار نہیں دیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مِنْ رِّجَالِكُمْ اور مِمَّنْ تَرْضَوْنَ اور ذَوَىْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ اور یہ صفات بچوں میں موجود نہیں ہوتیں۔

مسئلہ نمبر 29۔ جب اللہ تعالیٰ نے دو عورتوں کی شہادت کو ایک آدمی کی شہادت کا بدل قرار دیا ہے تو پھر یہ ضروری

1۔ المحرر الوجیز

ہے کہ ان دونوں کا حکم ایک مرد کے حکم کی طرح ہو، پس اسی طرح ہمارے نزدیک آدمی کے لئے جائز ہے کہ وہ شاہد کے ساتھ قسم کھائے اور امام شافعی کے نزدیک بھی اسی طرح ہے، لہٰذا یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ دو عورتوں کی شہادت کے ساتھ بھی قسم کھا سکتا ہے کیونکہ مطلقاً دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کی شہادت کا عوض ہے۔ اور اس میں امام اعظم ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے اختلاف کیا ہے اور وہ شاہد کے ساتھ قسم کے قائل نہیں اور انہوں نے کہا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے شہادت کو تقسیم کیا اور اسے متعدد شمار کیا، لیکن شاہد اور یمین کا ذکر نہیں کیا، لہٰذا اس کے ساتھ فیصلہ کرنا جائز نہیں، کیونکہ جو تقسیم اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے یہ قسم اس پر زائد ہے اور یہ نص پر زیادتی ہے اور یہ نسخ ہے اور جنہوں نے یہ قول کیا ہے ان میں سے ثوری، اوزاعی، عطا، حکم بن عتبہ اور ایک جماعت ہے۔

بعض نے کہا ہے: شاہد کے ساتھ قسم لے کر فیصلہ کرنا قرآن کے ساتھ منسوخ ہے اور عطا نے یہ گمان کیا ہے کہ سب سے پہلے عبد الملک بن مروان نے اس کے مطابق فیصلہ کیا۔ اور حکم نے کہا ہے: قسم اور شاہد کے ساتھ فیصلہ کرنا بدعت ہے اور سب سے پہلے اس کے ساتھ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فیصلہ کیا اور یہ سب غلط اور وہم ہے جو حق میں سے کسی شے کا فائدہ نہیں دیتا اور جو نفی کرے اور ناواقف ہو وہ اس کی طرح نہیں جو ثابت کرے اور جانتا ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ الآیہ۔ میں وہ نہیں ہے جس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شاہد کے ساتھ قسم کے بارے میں فیصلہ رد ہو سکتا ہو۔ اور نہ اس میں یہ ہے کہ اسے حقوق کے ساتھ نہیں ملایا جا سکتا اور نہ یہ کہ شہادت کے ساتھ صرف انہی چیزوں میں حق حاصل ہوتا ہے جن کا ذکر آیت میں کیا گیا ہے کسی اور کا نہیں، کیونکہ وہ مطلوب کے انکار اور طالب کی قسم کے ساتھ باطل ہو جاتا ہے۔ بے شک وہ اس کے ساتھ بالاجماع مال کا مستحق ہو جاتا ہے اور اس کا ذکر کتاب اللہ میں نہیں ہے اور یہ ان کے خلاف قطعی رد ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جنہوں نے یہ قول کیا ہے ان کے خلاف حجت یہ ہے کہ انہیں کہا جائے گا: آپ کا کیا خیال ہے کہ اگر ایک آدمی دوسرے آدمی کے خلاف مال کا دعویٰ کرے تو کیا مطلوب اس کے بارے قسم نہیں دے گا جو حق اس پر ہے؟ پس اگر وہ قسم کھالے تو وہ حق اس سے باطل ہو جائے گا اور اگر قسم سے انکار کر دے تو پھر صاحب حق (مدعی) قسم دے گا کہ اس کا حق یقینی ہے اور اس کا حق مدعیٰ علیہ پر ثابت ہو جائے گا۔ پس یہ ایسی شے ہے جس میں لوگوں میں سے کسی کے نزدیک اور نہ ہی شہروں میں سے کسی شہر میں کوئی اختلاف ہے۔ پس کون سی شے ہے جسے انہوں نے لیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی کون سی کتاب میں اسے پایا ہے؟ پس جس نے اس کا اقرار کیا تو اسے چاہیے کہ وہ شاہد کے ساتھ قسم کا بھی اقرار کرے۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: پھر تعجب ہے کہ مشہور اور صحیح احادیث کے باوجود انہوں نے اسے بدعتی قرار دیا جس نے ان کے مطابق عمل کیا، یہاں تک کہ اس کے فیصلے کو توڑ دیا اور اس کی رائے کو حقیر سمجھا، اس کے باوجود کہ اس کے مطابق خلفائے اربعہ، ابی بن کعب، معاویہ، شریح، عمر بن عبد العزیز ...... اور آپ نے اس کے بارے اپنے عمال کی طرف لکھا　ایاس بن معاویہ، ابو سلمہ بن عبد الرحمن، ابو الزناد اور ربیعہ رضی اللہ عنہم ورحمۃ اللہ علیہم نے عمل کیا ہے اور اسی لئے امام مالک نے کہا ہے۔ اس بارے میں وہی کافی ہے جو سنت کے عمل میں سے گزر چکا ہے۔ کیا آپ ان کے بارے رائے رکھتے ہیں کہ ان کے احکام توڑ دیئے جائیں

گے اور ان کی بدعت کے مطابق فیصلے کئے جائیں گے؟ یہ شدید عدم توجہ اور غفلت ہے اور ایسی رائے ہے جو پختہ اور مضبوط نہیں۔ ائمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمین مع الشاہد کے ساتھ فیصلہ فرمایا۔

حضرت عمرو بن دینار رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یہ صرف اموال میں ہے، اسے سیف بن سلیمان نے قیس بن سعد سے انہوں نے عمرو بن دینار سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے

ابو عمر نے کہا ہے: اس حدیث کی یہ سند اصح الاسناد ہے اور یہ حدیث ہے جس کی اسناد میں کسی کے لئے کوئی طعن نہیں ہے اس حدیث کے بارے اہل معرفت کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اس کے رجال ثقہ ہیں۔ یحییٰ القطان نے کہا ہے: سیف بن سلیمان ثابت اور مضبوط راوی ہیں میں نے ان سے زیادہ حافظ کوئی نہیں دیکھا اور نسائی نے کہا ہے: یہ اسناد جید ہے، سیف ثقہ راوی ہے اور قیس ثقہ راوی ہے اور مسلم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس حدیث کو نقل کیا ہے۔

ابو بکر البزار نے کہا ہے: سیف بن سلیمان اور قیس بن سعد دونوں ثقہ راوی ہیں اور جو ان دونوں کے بعد ہیں وہ ثقاہت اور عدالت میں اپنی شہرت کے سبب ذکر سے مستغنی ہیں اور صحابہ کرام میں سے کوئی ایک بھی نہیں جس نے شاہد کے ساتھ قسم کا انکار کیا ہو، بلکہ اس کے بارے ان سے قول مروی ہیں اور مدینہ طیبہ کے جمہور اہل علم اسی موقف پر ہیں اور اس میں حضرت عروہ بن زبیر اور ابن شہاب رضی اللہ عنہم سے اختلاف مروی ہے۔ معمر نے کہا ہے: میں نے زہری سے یمین مع الشاہد کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: یہ ایسی شے ہے جسے لوگوں نے ایجاد کیا ہے۔ دو شاہدوں کا ہونا ضروری ہے اور آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ جب قضا کے والی بنے تو پہلا فیصلہ ایک شاہد اور قسم کے ساتھ کیا اور امام مالک اور آپ کے اصحاب، امام شافعی اور آپ کے متبعین، امام احمد، اسحاق، ابو عبید، ابو ثور، داؤد بن علی اور محدثین کی ایک جماعت رحمۃ اللہ علیہم نے یہی کہا ہے اور وہ یہ ہے کہ میرے نزدیک اس کے خلاف کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے متواتر آثار ہیں اور کئی صدیوں سے اہل مدینہ کا اس پر عمل ہے۔ اور امام مالک نے فرمایا ہے: ہر شہر میں ایک شاہد اور قسم کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا۔ اور آپ نے الموطا میں اس کے سوا کسی مسئلہ کے لئے حجت اور دلیل بیان نہیں فرمائی اور آپ کے ساتھ یمین مع الشاہد کے ساتھ فیصلہ کرنے میں اختلاف نہیں کیا گیا اور نہ ہی مدینہ طیبہ اور مصر وغیرہما میں آپ کے اصحاب میں سے کسی سے اختلاف کیا گیا ہے اور ہر شہر میں مالکی اس کے سوا اپنے مذہب سے نہیں پہچانے جاسکتے سوائے ہمارے پاس اندلس میں، کیونکہ یحییٰ [بن یحییٰ] نے گمان کیا ہے کہ انہوں نے لیث کو اس کے مطابق فتویٰ دیتے نہیں دیکھا اور نہ انہوں نے یہ موقف اپنایا ہے۔ اور اس مسئلہ میں یحییٰ نے امام مالک سے اختلاف کیا ہے باوجود اس کے کہ یہ ان کی سنت اور دار الہجرت کے عمل سے مخالفت ہے۔

پھر یمین مع الشاہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ایک حکم کی زیادتی ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو اپنی پھوپھی اور اپنی خالہ پر نکاح کرنے سے منع فرمایا ہے (1) (یعنی پہلے کسی آدمی کے نکاح میں پھوپھی ہو اور پرے دوسرا نکاح بھتیجی یا پہلے

1۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب لاتنکح المرأۃ علی عمتہا، حدیث نمبر 4718، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

خالہ ہو اور پھر بھانجی آجائے تو یہ دونوں ایک آدمی کے نکاح میں جمع نہیں ہوسکتیں۔) اس کے باوجود کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ (النساء: 24) (اور حلال کردی گئی ہیں تمہارے لئے ماسوا ان کے) اور جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھریلو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمادیا اور درندوں میں سے ہر ذی ناب کا، باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ لَّاۤ اَجِدُ (الانعام: 145) (آپ فرمایئے میں نہیں پاتا) اور اسی طرح مسح علی الخفین کا حکم ہے حالانکہ قرآن کریم میں صرف پاؤں کو دھونے یا ان کا مسح کرنے کے بارے وارد ہے اور اس قسم کی مثالیں کثیر ہیں۔

اور اگر یہ کہا جانا جائز ہو کہ قرآن کریم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یمین مع الشاہد کے ساتھ فیصلے کو منسوخ کر دیا ہے تو پھر یہ کہنا بھی جائز ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے یہ ارشاد: وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا (بقرہ: 275) اور اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (النساء: 29) (مگر یہ کہ تجارت ہو تمہاری باہمی رضامندی سے۔) بیع مزابنہ، بیع الغرر، ان چیزوں کی بیع جو ابھی تک پیدا نہیں ہوئیں، یہاں تک کہ وہ تمام بیوع جو ممنوع ہیں ان کی نہی کے لئے ناسخ ہیں اور یہ کسی کے لئے بھی جائز نہیں، کیونکہ سنت کتاب اللہ کے لئے مبین اور وضاحت کرنے والی ہے۔

اور اگر کہا جائے: بے شک جو حدیث میں وارد ہے اور وہ ایک معین فرد کے بارے فیصلہ ہے اور اس میں عموم نہیں ہے تو ہم کہیں گے، بلکہ وہ اس قاعدہ کی تقعید (روک دینا) سے عبارت ہے، گویا کہ انہوں نے یہ کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ایک شاہد اور قسم کے ساتھ حکم ثابت کیا ہے اور جو اس تاویل کی شہادت دیتی ہیں ان میں سے ایک وہ روایت ہے جسے ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حقوق میں ایک گواہ اور قسم کے ساتھ فیصلہ فرمایا اور قیاس اور نظر و فکر کے اعتبار سے ہم قسم کو دو عورتوں کی نسبت زیادہ قوی پاتے ہیں، کیونکہ ان دونوں کا لعان میں کوئی دخل نہیں ہے اور قسم لعان میں داخل ہوتی ہے۔ اور جب حدیث صحیح ہے تو پھر اس کے ساتھ کلام کرنا واجب ہے اور سنت ان کی محتاج نہیں ہوتی جو اس کی پیروی کرنے والے ہوتے ہیں کیونکہ جو اس سے مخالفت کرے گا وہی اس کے خلاف حجت بن جائے گی۔ وباللہ التوفیق۔

مسئلہ نمبر 30۔ اور جب یہ بات پختہ ہوگئی اور یمین مع الشاہد کے ساتھ حکم ثابت ہوگیا، تو قاضی ابومحمد عبدالوہاب نے کہا: یہ اموال اور ان کے متعلقات کے بارے ہے بدنی حقوق کے بارے نہیں، جو بھی یمین مع الشاہد کے ساتھ فیصلہ کرنے کا قائل ہے ان تمام کی طرف سے اس پر اجماع ہے۔ فرمایا: کیونکہ اموال کے حقوق ابدان کے حقوق سے پست اور ہلکے ہوتے ہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ ان میں عورتوں کی شہادت قبول ہے۔ اور عمداً زخم لگانے کے بارے میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول مختلف ہے، کیا اس میں ایک گواہ اور قسم کے ساتھ قصاص ثابت ہوسکتا ہے؟ اس میں دو روایتیں ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے ساتھ قصاص اور دیت کے درمیان اختیار ثابت ہو جائے گا اور دوسری یہ ہے کہ اس سے کوئی شے بھی ثابت نہ ہوگی کیونکہ یہ بدنی حقوق میں سے ہے۔ فرمایا: اور یہی صحیح ہے۔

امام مالک نے المؤطا میں کہا ہے: وہ (یمین مع الشاہد کے ساتھ فیصلہ) صرف اموال میں ہوسکتا ہے اور عمرو بن دینار نے بھی یہی کہا ہے اور مازری نے کہا ہے: بغیر کسی اختلاف کے اسے صرف مال میں قبول کیا جائے گا اور محض نکاح اور طلاق میں

بغیر کسی اختلاف کے اسے قبول نہیں کیا جائے گا اور اگر شہادت کا مضمون مال نہ ہو، لیکن وہ مال تک پہنچانے والی ہو، جیسا کہ وصیت اور موت کے بعد نکاح کے بارے شہادت دینا، یہاں تک کہ اس کے ثابت ہونے سے صرف مال وغیرہ کا مطالبہ کیا جائے گا تو اس کی قبولیت میں اختلاف ہے۔ پس جنہوں نے مال کا لحاظ رکھا ہے انہوں نے اسے قبول کیا ہے جیسے وہ اسے مال میں قبول کرتے ہیں اور جنہوں نے حال کا لحاظ رکھا ہے انہوں نے اسے قبول نہیں کیا۔

اور مہدوی نے کہا ہے: عام فقہاء کے قول کے مطابق حدود میں عورتوں کی شہادت جائز نہیں اور اسی طرح اکثر علماء کے قول کے مطابق نکاح اور طلاق میں بھی (ان کی شہادت جائز نہیں) اور یہی امام مالک اور امام شافعی وغیرہما کا مذہب ہے، وہ صرف اموال میں شہادت دے سکتی ہیں اور ہر وہ معاملہ جس میں وہ خود شہادت نہیں دے سکتیں وہ اس میں اپنے سوا کسی اور کی شہادت پر بھی شہادت نہیں دے سکتیں، چاہے ان کے ساتھ کوئی مرد ہو یا نہ ہو اور وہ شہادت نقل نہیں کر سکتیں مگر مرد کے ساتھ (جبکہ انہوں نے مرد اور عورت سے شہادت نقل کی ہو۔ اور ان تمام معاملات میں دو عورتوں کی شہادت کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا جن میں ان کے سوا کوئی حاضر نہ ہو سکتا ہو، جیسا کہ ولادت اور ولادت کے وقت بچے کا رونا وغیرہ۔ یہ سب امام مالک کا مذہب ہے اور بعض مسائل میں اختلاف ہے۔

مسئلہ نمبر 31۔ قولہ تعالیٰ: مِمَّنۡ تَرۡضَوۡنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ یہ رجل و امرأتان کی صفت ہونے کی بنا پر محل رفع میں ہے۔ ابن بکیر وغیرہ نے کہا ہے: یہ حکام کو خطاب کیا گیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ عمدہ قول نہیں ہے، بلکہ یہ خطاب تمام لوگوں کو ہے لیکن جن کا اس قضیہ کے ساتھ تعلق ہے وہ صرف حکام ہیں اور یہ کتاب اللہ میں بہت زیادہ ہے کہ ان احکام میں خطاب عام ہوتا ہے جن کے ساتھ تعلق بعض کا ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 32۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مِمَّنۡ تَرۡضَوۡنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ تو یہ اس پر دلیل ہے کہ گواہوں میں سے وہ بھی ہیں جو پسند نہیں کئے جاتے تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لوگوں کو عدالت پر محمول نہ کیا جائے یہاں تک کہ وہ ان کے لئے ثابت ہو جائے اور یہ معنی اسلام پر زائد ہے اور یہ جمہور کا قول ہے۔ امام ابو حنیفہ نے کہا ہے: ہر وہ مسلمان جس کا اسلام ظاہر ہو اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ظاہری فسق سے سلامت اور محفوظ ہو تو وہ عادل ہے، اگرچہ وہ مجہول الحال ہو۔

اور شریح، عثمان البتی اور ابو ثور نے کہا ہے: وہ مسلمانوں میں سے عادل لوگ ہیں اگرچہ وہ غلام ہوں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں . پس انہوں نے حکم کو عام قرار دیا ہے اور اس سے شہری کے خلاف بدوی (جنگل میں رہنے والا) کی شہادت کا قبول ہونا لازم آتا ہے، بشرطیکہ وہ عادل اور پسندیدہ ہو اور یہی امام شافعی اور ان کی موافقت کرنے والوں نے کہا ہے اور وہ (بھی) ہمارے مردوں اور ہمارے اہل دین میں سے ہے۔ اور اس کا بدوی ہونا اس کے دوسرے شہر سے ہونے کی طرح ہے اور قرآن کریم میں آیات عمومات عادلوں کی شہادت قبول کرنے پر دال ہیں اور وہ بدوی اور شہری کو مساوی قرار دیتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: مِمَّنۡ تَرۡضَوۡنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اور مزید ارشاد فرمایا: وَّ اَشۡهِدُوۡا ذَوَىۡ عَدۡلٍ مِّنۡكُمۡ (اور تم اپنے میں سے عدل کرنے والوں کو گواہ بنالو) پس مِنۡكُمۡ میں خطاب مسلمانوں کو ہے اور یہ یقیناً اس کا تقاضا کرتا ہے کہ عدالت کا

معنی بالضرور اسلام پر زائد ہو (یعنی وہ مسلمان ہونے کے ساتھ عادل بھی ہو) کیونکہ صفت موصوف پر زائد ہوتی ہے اور اسی طرح وَمِمَّنْ تَرْضَوْنَ بھی اسی کی مثل ہے، بخلاف اس کے جو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے پھر اس کا پسندیدہ ہونا معلوم نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ اس کی حالت کو آزما لیا جائے، پس اس سے لازم آتا ہے کہ فقط ظاہر اسلام پر اکتفاء نہ کیا جائے۔ امام احمد بن حنبل، امام مالک نے ان سے ابن وہب کی روایت میں شہری کے خلاف بدوی کی شہادت رد ہونے کا موقف اپنایا ہے، اس لئے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بدوی کی شہادت شہر میں رہنے والے کے خلاف جائز نہیں ہوتی (1)۔" اور صحیح یہ ہے کہ اس کی شہادت جائز ہے جبکہ وہ عادل اور پسندیدہ ہو، جیسا کہ اس کا بیان سورۃ النساء اور سورۃ البرأۃ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں سفر یا حضر میں شہری کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے اور جب وہ سفر میں ہو تو اس کی شہادت قبول ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: عدالت سے مراد احوال دینیہ میں اعتدال ہے اور یہ تب مکمل ہوتا ہے کہ وہ گناہ کبیرہ سے اجتناب کرنے والا ہو، اپنی مروت کی حفاظت کرنے والا ہو اور گناہ صغیرہ کو ترک کرنے کا محافظ ہو اور امانت کا ظاہر یہ ہے کہ اسے چھپایا نہ جائے (غفلت نہ برتی جائے) اور کہا گیا ہے: عادل قرار دینے والے کے گمان میں باطن صاف ہو اور سیرت مستقیم ہو اور یہ معنی باہم متقارب ہیں۔

مسئلہ نمبر 33۔ جب شہادت ولایت عظیمہ اور مرتبہ بلند ہے اور یہ غیر کے قول کو غیر کے خلاف قبول کرنا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس میں رضا اور عدالت کی شرط لگائی ہے۔ پس شاہد کے حکم میں سے یہ ہے کہ وہ اپنے اخلاق و اوصاف کے ساتھ منفرد ہو اور فضائل و کمالات سے آراستہ اور مزین ہو، یہاں تک کہ اسے دوسروں پر فضیلت و برتری حاصل ہو اور وہی فضیلت اس کا قول قبول کرنے کے بارے اس کے لئے رتبہ اختصاص ثابت کرتی ہو اور اس کی شہادت کے ساتھ مطلوب کے ذمہ کے مشغول ہونے کے بارے حکم لگایا جا سکتا ہو۔ ہمارے علماء کے نزدیک اجتہاد اور امارات و علامات کے ساتھ استدلال کرنے کے جواز پر اسی شے میں جس کے معانی اور احکام مخفی اور پوشیدہ ہوں یہ بہت بڑی دلیل ہے۔ اس کا بیان سورۂ یوسف میں تفصیل کے ساتھ آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور اس میں ایسی دلیل موجود ہے جو امر کو حکام کے اجتہاد کے سپرد کرنے پر دلالت کرتی ہے اور بسا اوقات وہ شاہد میں غفلت یا شک کو دیکھ لیتا ہے اور اس وجہ سے اس کی شہادت رد کر دیتا ہے۔

مسئلہ نمبر 34۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اموال میں ظاہر اسلام پر اکتفا کیا جائے گا لیکن حدود میں نہیں۔ اور یہ مناقضہ ہے جو آپ کے کلام کو ساقط کر دیتا ہے اور آپ پر اس کے مقاصد فاسد کر دیتا ہے، کیونکہ ہم کہتے ہیں: یہ حقوق میں سے ایک حق ہے۔ پس شہادت میں فقط ظاہر دین پر ہی اکتفا نہ کیا جائے گا جیسا کہ حدود میں۔ ابن عربی نے یہی کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 35۔ جب اللہ تعالیٰ نے عقود مداینہ میں شاہد کے لئے عدالت اور رضا کی شرط عائد کی ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں تو پھر نکاح میں ان کا شرط ہونا بدرجہ اولیٰ ہے، بخلاف امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے جہاں انہوں نے فرمایا: بے شک

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الاحکام، باب من لا تجوز شہادتہ، حدیث نمبر 2357، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نکاح دو فاسق آدمیوں کی شہادت کے ساتھ منعقد ہو جاتا ہے۔ سو آپ نے اموال میں جس احتیاط کا حکم دیا ہے اس کی نکاح سے نفی کر دی ہے حالانکہ یہ زیادہ اولیٰ اور ضروری ہے کیونکہ اس کے ساتھ حل وحرمت اور حد ونسب تعلق رکھتے ہیں (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس باب میں امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول انتہائی ضعیف ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے رضا اور عدالت کی شرط عائد کی ہے اور اس کا پسندیدہ ہونا خالی اسلام سے معلوم نہیں ہو سکتا بلکہ یہ تو اس کے احوال میں غور وفکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور فقط اس کے اس قول سے دھوکہ نہیں کھایا جائے گا کہ میں مسلمان ہوں۔ بسا اوقات اس میں ایسی چیزیں جمع ہو جاتی ہیں جو اس کی شہادت کو رد کرنے کا موجب ہوتی ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَ هُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝ وَ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝ (البقرہ) (اور اے (سننے والے) لوگوں سے وہ بھی ہے کہ پسند آتی ہے تجھے اس کی گفتگو دنیاوی اور وہ گواہ بناتا رہتا ہے اللہ کو اس پر جو اس کے دل میں ہے...... (اور اللہ تعالیٰ) فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا) اور مزید فرمایا: وَ اِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ الآیہ (المنافقون: 4) (اور جب آپ انہیں دیکھیں تو ان کے جسم آپ کو بڑے خوشنما معلوم ہوں گے......)

مسئلہ نمبر 36۔ قولہ تعالیٰ: اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا ابو عبید نے کہا ہے: تَضِلَّ بمعنی تنسی ہے (کہ ان میں سے ایک بھول جائے) اور شہادت میں ضلال کا مفہوم یہ ہے کہ اس کا کچھ حصہ بھول جانا اور کچھ یاد ہو اور آدمی اس کے درمیان حیران باقی رہ جاتا ہے یہی ضال ہے اور جو پوری شہادت بھول جائے تو اس کے لئے یہ نہیں کہا جاتا: ضل فیھا۔ (وہ اس میں بھول گیا) حمزہ نے جزا کے معنی کی بنا پر ان میں ہمزہ کو مکسور پڑھا ہے اور فَتُذَكِّرُ میں فا کو اس کا جواب قرار دیا ہے۔ اور شرط اور جواب شرط رَجُلٌ وَّ امْرَاَتٰنِ کی صفت ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہیں۔ اور تُذَكِّرُ استیناف کی بنا پر مرفوع ہے۔ جیسا کہ یہ قول مرفوع ہے وَ مَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ (المائدہ: 95) (اور جو (اب) پھر گیا تو انتقام لے گا اللہ تعالیٰ اس سے) یہ سیبویہ کا قول ہے۔

اور جنہوں نے ان میں ہمزہ کو مفتوح پڑھا ہے تو یہ مفعول لہ ہے اور اس میں عامل محذوف ہے اور جماعت کی قرأت کے مطابق فَتُذَكِّرَ منصوب ہے اور اس فعل پر معطوف ہے جس کو اَنْ کے ساتھ نصب دی گئی ہے۔

نحاس نے کہا ہے: تَضَلَّ تا اور ضاد کے فتحہ کے ساتھ پڑھنا جائز ہے اور تِضَلَّ تا کے کسرہ اور ضاد کے فتحہ کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے۔ پس جس نے کہا: تضل یہ ان کی لغت پر ہے جنہوں نے کہا ہے: ضَلِلْتَ تَضَلُّ۔ اور اسی پر آپ تِضَلُّ کہتے ہیں اور تا کو کسرہ دیا جاتا ہے تاکہ وہ ماضی فَعِلْت ہونے پر دلالت کرے۔ اور جحدری اور عیسیٰ ابن عمر نے اَنْ تُضَلَّ تا کو ضمہ، ضاد کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ بمعنی تُنْسٰی (یعنی اگر ان میں سے ایک بھلا دی جائے) اور اسی طرح ان دونوں سے ابو عمرو الدانی نے بیان کیا ہے۔ اور نقاش نے جحدری سے تا کے ضمہ اور ضاد کے کسرہ کے ساتھ نقل کیا ہے بمعنی اَنْ تُضِلَّ الشَّهَادَةَ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 255

(کہ وہ شہادت کو بھلا دے) جیسا کہ آپ کہتے ہیں: أَضْلَلْتُ الفرس والبعیر (میں نے گھوڑے اور اونٹ کو گم کر دیا۔) جب وہ دونوں تجھ سے ضائع ہو جائیں اور چلے جائیں سو تو انہیں نہ پا سکے۔ (تب یہ جملہ کہا جاتا ہے)

مسئلہ نمبر 37۔ قولہ تعالیٰ: فَتُذَكِّرَ ابن کثیر اور ابو عمرو نے ذال اور کاف کو مخفف پڑھا ہے اور اس پر معنی یہ ہوگا کہ تو اسے شہادت میں مذکر کی طرف لوٹا دے، کیونکہ عورت کی شہادت نصف شہادت ہے اور جب دو عورتوں نے شہادت دی تو دونوں کا مجموعہ ایک مرد کی شہادت کی طرح ہوگا۔ سفیان بن عیینہ اور ابو عمرو بن العلاء نے یہی کہا ہے۔ اور اس میں بہت بعد اور دوری ہے، کیونکہ وہ ضلال جس کا معنی نسیان ہے اس کے مقابلہ میں صرف ذکر (یاد دلانا) ہی آ سکتا ہے اور یہی جماعت کی قرأت کا معنی ہے۔ فَتُذَكِّرَ یعنی وہ دوسری اسے آگاہ کرے جب وہ غافل ہو جائے اور بھول جائے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابو عمرو کی قرأت اس کی طرف راجع ہے، یعنی اگر ان میں سے ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے، کہا جاتا ہے: تذکرت الشئ و اذکرتہ غیری و ذکرتہ (میں نے اسے یاد دلایا) ان تمام کا معنی ایک ہے الصحاح میں اس طرح ہے۔

مسئلہ نمبر 38۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ إِذَا مَا دُعُوْا حسن نے کہا ہے یہ آیت دو امروں کو جمع کئے ہوئے ہے اور وہ دونوں یہ ہیں کہ تو انکار نہ کرے جب تجھے تحصیل شہادت کے لئے بلایا جائے اور نہ تب جب تجھے ادائے شہادت کی طرف بلایا جائے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہی کہا ہے اور حضرت قتادہ، ربیع اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: یعنی (تو انکار نہ کرے جب تجھے بلایا جائے) تاکہ تو شہادت اخذ کرلے اور اسے کتاب میں ثابت اور محفوظ کرلے۔ اور مجاہد نے کہا ہے: آیت کا معنی ہے جب تجھے ادائے شہادت کے لئے بلایا جائے درآنحالیکہ وہ شہادت تجھے حاصل ہو چکی ہو۔ اور نقاش نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کی ہے کہ آپ نے آیت کی اس طرح تفسیر بیان فرمائی ہے۔ حضرت مجاہد نے کہا ہے پس جب تجھے بلایا جائے تاکہ تو پہلے شہادت دے تو تو اگر چاہے تو جا اور اگر چاہے تو نہ جا۔ ابو مجلز، عطا، ابراہیم، ابن جبیر، سدی، ابن زید وغیرہم نے یہی کہا ہے۔ اور اس بنا پر متعاقدین کے پاس گواہوں کا حاضر ہونا واجب نہیں ہے، البتہ قرض لینے دینے والے دونوں افراد پر لازم ہے کہ وہ گواہوں کے پاس حاضر ہوں۔ پس جب وہ دونوں ان کے پاس حاضر ہوں اور دونوں انہیں کتاب میں اپنی شہادت ثبت اور محفوظ کرنے کی درخواست کریں تو یہی وہ حالت ہے جو اس ارشاد سے مراد لینا جائز ہے: وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ إِذَا مَا دُعُوْا یعنی گواہ انکار نہ کریں جب انہیں شہادت کے اثبات کے لئے بلایا جائے اور جب ان کی شہادت ثابت ہو جائے، پھر انہیں حاکم کے پاس شہادت ادا کرنے کے لئے بلایا جائے تو یہ وہ دعوت ہے جس کے سبب حاکم کے پاس ان دونوں کی حاضری ہوگی، جیسا کہ آگے آئے گا۔

اور ابن عطیہ نے کہا ہے جیسا کہ حسن نے کہا ہے: آیت ندب کے اعتبار سے دو امروں کو جمع کئے ہوئے ہے۔ پس مسلمانوں پر اپنے بھائیوں کی معاونت کرنا مستحب ہے۔ پس جب گواہوں کی کثرت کے سبب وسعت ہو اور حق معطل ہونے اور مٹنے سے محفوظ و مامون ہو تو یہ دعوت مستحب ہے اور جسے بلایا گیا ہے اس کے لئے معمولی عذر کے سبب پیچھے رہ جانا جائز ہے

اور اگر وہ بغیر عذر کے بھی پیچھے رہ جائے تو نہ اس پر گناہ ہے اور نہ اس کے لئے ثواب ہے۔

اور جب ضرورت ہو اور حق کے معطل ہونے کا تھوڑا سا بھی خوف ہو تو ندب قوی ہو جائے گا اور یہ وجوب کے قریب ہو جائے گا اور جب اسے یہ علم ہو کہ شاہد کے شہادت سے پیچھے ہو جانے کے سبب حق ضائع اور تلف ہو جائے گا تو پھر اس پر شہادت دینا واجب ہے، بالخصوص جب شہادت اسے حاصل ہو چکی ہو اور دعوت اسے ادا کرنے کے لئے ہو، کیونکہ یہ ظرف زیادہ پختہ کرنے والی ہے، کیونکہ یہ گردن میں قلادہ ہے اور امانت ادا کرنے کا تقاضا کرتی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس آیت سے اس پر دلیل ظاہر ہوتی ہے کہ امام کے لئے جائز ہے کہ وہ لوگوں کے لئے گواہوں کا انتظام کرے اور بیت المال سے ان کے لئے ان کی ضروریات پوری کرے اور ان کا لوگوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے تحمل شہادت کے بغیر اور کوئی کام نہ ہو۔ اور اگر اس طرح نہ ہوا تو حقوق ضائع اور باطل ہو جائیں گے سو معنی یہ ہوگا: گواہ انکار نہ کریں جب وہ لوگوں کے حقوق اخذ کریں کہ وہ انہیں ادا کریں گے۔ واللہ اعلم۔

اور اگر کہا جائے: یہ شہادت تو بالاجرت ہے، تو ہم کہیں گے: یہ خالصۃً ایسی قوم کی شہادت ہے جنہوں نے اپنے حقوق بیت المال سے پورے کئے اور یہ قاضیوں اور والیوں کی تنخواہوں اور ان جمیع مصالح کی طرح ہے جو مسلمانوں کے لئے معاون ہوتے ہیں۔ اور یہ (شہادت) بھی من جملہ انہی میں سے ہے، واللہ اعلم۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا پس ان کے لئے مقرر کر دیئے۔

مسئلہ نمبر 39۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ شاہد وہ ہے جو حاکم کے پاس چل کر جاتا ہے اور یہ ایسا امر ہے جس پر شریعت کی بنیاد رکھی گئی ہے اور اس کے مطابق ہر زمانے میں عمل کیا گیا ہے اور ہر امت نے اسے سمجھا ہے۔ اور ان کی امثال میں سے یہ ہے: فِيْ بَيْتِهٖ يُؤْتَى الْحَكَمُ (اس کے گھر میں حَکَم (فیصلہ کرنے والا ثالث) کو لایا جائے گا۔

مسئلہ نمبر 40۔ اور جب یہ ثابت ہو گیا تو غلام گواہوں کی جماعت سے خارج ہو گیا اور یہی مِنْ رِّجَالِكُمْ کے عموم کو خاص کر رہا ہے، کیونکہ اس کے لئے اسے قبول کرنا ممکن نہیں ہے اور نہ ہی اس کے لئے (شہادت کے لئے) آنا صحیح ہے، کیونکہ وہ بذات خود مستقل بالحکم نہیں ہے۔ بلاشبہ وہ غیر کی اجازت سے تصرف کرتا ہے، نتیجتاً وہ منصب شہادت سے اسی طرح گر گیا جیسا کہ وہ ولایت کے مرتبہ سے گر گیا ہے۔ ہاں بلکہ! جیسا کہ وہ جمعہ، جہاد اور حج کے فرض کی ادائیگی سے گرا ہوا ہے (1)۔ اس کا بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 41۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ شہادت کی طرف بلانے کی حالت میں ہے۔ رہا وہ جس کے پاس کسی آدمی کے حق میں شہادت ہو اور اس کا وہ مستحق جو اس سے نفع حاصل کر سکتا ہے وہ اسے نہ جانتا ہے، تو ایک قوم نے کہا ہے اس شہادت کو ادا کرنا مستحب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا اور بلانے کے وقت اللہ تعالیٰ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 257

نے ادائے شہادت کو فرض قرار دیا ہے اور جب نہ بلایا جائے تو پھر شہادت دینا مستحب ہے کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''گواہوں میں سے بہترین وہ ہے جو اپنی شہادت دینے کے لئے آئے اس سے قبل کہ اسے اس کے لئے کہا جائے'' اسے ائمہ نے روایت کیا ہے۔

اور صحیح یہ ہے کہ شہادت دینا فرض ہے اگرچہ اس کے بارے درخواست نہ کی جائے جبکہ حق کے ضائع یا فوت ہونے کا خوف ہو یا اس پر طلاق یا عتق کا خوف ہو جسے بیوی ہونے کے اعتبار سے اس سے استمتاع کرنے اور غلام سے خدمت لینے کا تصرف حاصل تھا وغیر ذالک۔ پس جس نے اس میں سے کوئی شی اخذ کر رکھی ہو تو اس شہادت کو ادا کرنا اس پر واجب ہوتا ہے اور وہ اس کی ادائیگی کو اس پر موقوف نہیں کرے گا کہ اسے شہادت کے لئے کہا جائے اور وہ اس طرح حق کو ضائع کر دے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَ اَقِیْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ (الطلاق: 2) (گواہی ٹھیک ٹھیک اللہ کے واسطے دو) اور مزید فرمایا: اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ ۝ (الزخرف) (ہاں شفاعت کا حق انہیں ہے جو حق کی گواہی دیں اور وہ (اس کو) جانتے بھی ہیں) اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح روایت میں ہے: انصر اخاك ظالما او مظلوما (تو اپنے بھائی کی مدد کر چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو) تو اس پر اس کی مدد کرنا متعین ہو گیا اس شہادت کی ادائیگی کے ساتھ جو اس کے پاس ہو اس حق کو زندہ کرنے کے لئے جسے انکار مار دے (ضائع کر دے)۔

مسئلہ نمبر 42۔ اس میں کوئی اشکال نہیں ہے کہ وہ آدمی جس پر شہادت دینا واجب ہو ان وجوہ میں سے کسی ایک کی بنا پر جو ہم نے ذکر کی ہیں اور وہ اسے ادا نہ کرے تو یہ شاہد اور شہادت میں عیب ہے اور اس میں حقوق اللہ اور حقوق العباد میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ ابن القاسم وغیرہ کا قول ہے۔ اور بعض نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ اگر وہ شہادت حقوق العباد میں سے کسی حق کے بارے ہو تو وہ خاصۃً اس نفس شہادت میں عیب ہو گا اور اس کے بعد اسے ادا کرنا اس کے لئے مناسب نہ ہو گا۔ پہلا قول صحیح ہے کیونکہ وہ شے جو اس کے عیب کو ثابت کر رہی ہے وہ اس کا اس امر کو ادا نہ کرنے کے سبب فاسق ہو جانا ہے جس امر کی ادائیگی بغیر عذر کے اس پر واجب تھی اور فسق مطلق شہادت کی اہلیت کو سلب کر لیتا ہے اور یہ واضح ہے۔

مسئلہ نمبر 43۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد: خیر الشهداء الذی یاتی بشهادته قبل ان یُسالها اور اس ارشاد کے درمیان جو حدیث عمران بن حصین میں ہے کوئی تعارض نہیں (وہ ارشاد یہ ہے) اِن خیر کم قرنی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم (بے شک تم میں سے بہتر میرا زمانہ ہے پھر وہ لوگ جو ان کے ساتھ ملے ہوئے ہیں پھر وہ جو ان کے ساتھ ملنے والے ہیں پھر وہ جو ان کے ساتھ ملنے والے ہیں) پھر عمران نے کہا: میں نہیں جانتا کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے کے بعد دوبار ذکر فرمایا یا تین بار ... پھر ان کے بعد قوم ہو گی جو شہادت دیں گے اور انہیں شاہد نہیں بنایا جائے گا وہ خیانت کریں گے اور انہیں امین نہیں بنایا جائے گا، وہ نذریں مانیں گے اور پوری نہیں کریں گے اور ان میں موٹاپا ظاہر ہو جائے گا (1)۔'' دونوں کو صحیحین نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث تین وجوہ پر محمول ہے: ان میں سے ایک یہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب مایحذر من زهرة الدنیا، حدیث نمبر 5948، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے کہ اس سے مراد جھوٹا گواہ ہو کیونکہ وہ ایسی شے کے بارے گواہی دیتا ہے جس پر اسے شاہد نہ بنایا گیا ہو۔ یعنی ایسی شے کے بارے میں جسے نہ اس نے خود اخذ کیا ہو اور نہ ہی اس جانب اس کی توجہ کرائی گئی ہو۔

اور ابو بکر بن ابی شیبہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے باب الجابیہ پر خطبہ ارشاد فرمایا اور فرمایا: بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں اسی طرح قیام فرماتے تھے جیسے میں تم میں کھڑا ہوں پھر آپ نے فرمایا: یایھا الناس اتقوا اللہ فی اصحابی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم ثم یفشو الکذب شھادۃ الزور (اے لوگو! میرے اصحاب کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو پھر ان کے بارے میں جو ان کے پیچھے آئیں گے پھر ان کے بارے میں جو ان کے پیچھے آئیں گے پھر جھوٹ اور جھوٹی شہادت پھیل جائے گی) اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سے مراد وہ ہو جسے حرص اور طمع اس شے کے نافذ کرنے پر برانگیختہ کرے جس کے ساتھ وہ شہادت دے گا لہٰذا وہ درخواست سے قبل ہی شہادت دینے میں جلدی کرتا ہے۔ پس یہ شہادت مردود ہے کیونکہ یہ ایسی خواہش پر دلالت کرتی ہے جو شاہد پر غالب ہوتی ہے اور تیسری وجہ یہ ہے جسے ابراہیم نخعی نے بیان کیا ہے جو کہ اس حدیث کے بعض طرق کے راوی ہیں: وہ ہمیں عہد اور شہادت سے منع کرتے تھے اور ہم ابھی بچے تھے۔

مسئلہ نمبر 44۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ۔ تَسْـَٔمُوْٓا کا معنی ہے تملوا اور تم اکتاؤ نہیں۔

اخفش نے کہا ہے: کہا جاتا ہے سَئِمْتُ اَسْاَمُ سَاْمًا و سَاٰمَةً و سَاٰمًا [وسَاْمَةً] و سَاْمًا (اکتا جانا) جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

سَئِمْتُ تکالیف الحیاۃ و مَنْ یَعِشْ ثمانین حولا - لا أبالك - یَسْأَمِ

میں زندگی کی تکالیف سے اکتا گیا اور جو اسی برس تک زندہ رہا ..... تیرا باپ نہ ہو وہ اکتا ہی جاتا ہے۔

اَنْ تَكْتُبُوْهُ یہ فعل کے سبب محل نصب میں ہے صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا یہ دونوں تکتبوہ کی ضمیر سے حال ہیں۔ اور صغیر کو اس کے خاص اہتمام کے سبب مقدم ذکر کیا گیا ہے اور یہ نہی اکتانے سے ہے۔ بلاشبہ یہ اس لئے وارد ہوئی ہے کیونکہ ان کے درمیان قرضوں کا لین دین کثرت سے تھا لہٰذا ان کے بارے یہ خوف ہونے لگا کہ وہ لکھنے سے اکتا جائیں (1) اور کوئی یہ کہنے لگے: قرضے کی یہ مقدار تو بالکل قلیل اور تھوڑی ہے مجھے اسے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے قلیل و کثیر میں لکھنے کی انگیخت دلا کر تاکید فرمائی۔ ہمارے علماء نے کہا ہے مگر وہ شے جو اپنی کمی اور اقرار و انکار میں نفس کے اس کی طرف جھکاؤ نہ ہونے میں وہ قیراط اور اسی کی طرح کی ہو (تو اس میں لکھنے کی ضرورت نہیں)۔

مسئلہ نمبر 45۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ۔ اَقْسَطُ بمعنی اعدل (یہ تحریر زیادہ عدل کرنے والی ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک) یعنی یہ کہ قلیل و کثیر مقدار کو لکھ لیا جائے اور اس پر گواہ بنا لئے جائیں۔ (2)

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 383، جلد 1، دار الکتب العلمیہ بیروت 2۔ احکام القرآن، صفحہ 257، جلد 1، دار الفکر لبنان

وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ یعنی یہ شہادت کو صحیح کرنے والی اور اسے محفوظ بنانے والی ہے۔ وَ اَدْنٰۤی اس کا معنی ہے اَقرب۔ زیادہ قریب ہے۔ اور تَرْتَابُوْٓا تم شک کرو۔ (یعنی یہ تحریر تمہیں شک سے بچانے کا بہت آسان اور قریب ترین طریقہ ہے۔)

مسئلہ نمبر 46۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ یہ اس پر دلیل ہے کہ شاہد جب کتاب دیکھے اور اسے شہادت یاد نہ ہو تو وہ اسے ادا نہیں کرے گا کیونکہ اس پر اس میں شک داخل ہو چکا ہے اور وہ شہادت نہیں دے سکتا مگر اسی شے کی جسے وہ جانتا ہو، لیکن وہ یہ کہہ سکتا ہے: یہ میری تحریر ہے اور اب مجھے وہ یاد نہیں جو میں نے اس میں لکھا۔(1)

ابن منذر نے کہا: اہل علم میں سے اکثر وہ جن سے روایات محفوظ کی جاتی ہیں وہ اس سے منع کرتے ہیں کہ کوئی شاہد اپنے خط پر شہادت دے جب اسے شہادت یاد نہ ہو۔

اور امام مالک نے اس کے جواز پر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: وَ مَا شَهِدْنَاۤ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا۔

اور بعض علماء نے کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے کتابت کی نسبت عدالت کی طرف کی ہے تو اس میں اس کے لئے وسعت اور گنجائش ہے کہ وہ اپنے خط پر شہادت دے اگرچہ اسے یاد نہ بھی ہو۔

ابن مبارک نے معمر عن ابن طاؤس عن ابیہ کی سند سے ایک آدمی کے بارے میں ذکر کیا ہے کہ وہ شہادت پر شہادت دیتا ہے اور پھر اسے بھول جاتا ہے۔ فرمایا: کوئی حرج نہیں کہ وہ شہادت دے، بشرطیکہ وہ تحریری معاہدہ میں اپنی علامت یا اپنے ہاتھ کی تحریر کو پالے۔ ابن مبارک نے کہا: میں نے یہ بہت اچھا سمجھا ہے اور اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی اخبار و روایات مروی ہیں کہ آپ نے کئی ایک اشیاء میں دلائل و شواہد کے ساتھ فیصلہ کیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے آنے والے رسل عظام علیہم السلام سے بھی ایسی روایات ہیں جو اس مذہب کے صحیح ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ واللہ اعلم۔ اس کے بارے مزید بیان سورۃ الاحقاف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 47۔ قولہ تعالیٰ: اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ اس میں اَنْ استثنا ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے یہ اول کلام سے نہیں ہے(2)۔ اخفش (ابو سعید) نے کہا ہے: ای الا ان تقع تجارۃ (مگر یہ کہ تجارت واقع ہو)۔ پس کان بمعنی وقع اور حدث کے ہے۔ اور ان کے سوا کسی اور نے کہا ہے: وَ تُدِيْرُوْنَهَا یہ خبر ہے۔ اور اکیلے عاصم نے کان کی خبر ہونے کی بنا پر تجارۃً پڑھا ہے(3) اور اس کا اسم اس میں مخفی ضمیر ہے اور حَاضِرَةً یہ تجارۃ کی صفت ہے۔ اور تقدیر عبارت یہ ہے الا ان تکون التجارۃُ تجارۃ حاضرۃ۔ یا الا ان تکون المبایعۃ تجارۃ حاضرۃ (مگر یہ کہ سودا دست بدست ہو) کی اور ابو علی فارسی نے اسے اسی طرح مقدر کیا ہے اس کی نظائر اور اس پر استشہاد پہلے گزر چکا ہے۔

اور جب اللہ تعالیٰ نے ان پر لکھنے کی مشقت کو ملاحظہ فرمایا تو اس کے ترک پر نص بیان فرمائی اور ہر اس بیع میں حرج کو اٹھا دیا جو نقد و نقد ہو اور اغلباً یہی بیع ہوتی ہے جبکہ وہ قلیل شے میں ہو مثلاً کھانے پینے کی اشیاء وغیرہ نہ کہ کثیر میں جیسا کہ املاک وغیرہ (یعنی املاک کی خرید و فروخت میں چونکہ عوض کثیر ہوتا ہے اس لئے اسے لکھنا لازم ہے۔) سدی اور ضحاک نے کہا ہے:

1۔ احکام القرآن، صفحہ 258، جلد 1، دار الفکر لبنان　2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 383، جلد 1، دار الکتب العلمیہ بیروت　3۔ ایضاً

یہ (رخصت) اس سودے میں ہے جو دست بدست ہو۔(1)

مسئلہ نمبر 48۔ قولہ تعالیٰ: تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ یہ ارشاد باہم قبضہ کرنے اور مقبوض کے ساتھ مجلس عقد سے جدا ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔ جب گھر، زمین اور حیوانوں میں سے کثیر جدائی اور علیحدگی کو قبول نہیں کرتے اور نہ انہیں چھوڑا جا سکتا ہے تو ان کے سودے میں لکھ لینا اچھا ہے اور اس میں قرضے کا لین دین ملحق ہو جائے گا(2) تو گویا تحریر اس کے لئے اعتماد اور مضبوطی کا باعث ہوگی جبکہ یہ قریب ہے کہ احوال بدلنے اور دلوں کی کیفیت میں تغیر آنے سے نزاع وہاں طاری ہو جائے۔ پس جب وہ معاملہ میں ایک دوسرے سے جدا ہوں گے اور دونوں اپنے اپنے عوض پر قابض ہوں گے اور دونوں میں سے ہر ایک اس شے کے ساتھ مجلس عقد سے جدا ہوگا جو اس نے اپنے ساتھی سے خریدی ہے تو عرفاً و عادۃً تنازع کا خوف کم ہوگا مگر مخفی اور پوشیدہ اسباب کے ساتھ شریعت نے نقد اور ادھار دونوں حالتوں میں ان مصالح پر آگاہ کیا ہے(3) اور جس پر غائب ہوا جا سکتا ہے اور جس پر غائب نہیں ہوا جا سکتا تحریر، شہادت اور رہن کے ساتھ۔

امام شافعی نے کہا ہے: بیوع تین ہیں: ایک وہ بیع جو کتابت اور گواہوں کے ساتھ ہو اور دوسری وہ بیع جو رہن کے عوض ہو اور تیسری وہ بیع جو امانت کے ساتھ ہو اور پھر آپ نے یہ آیت پڑھی۔

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جب نقد کے عوض بیع کرتے تھے تو گواہ بنا لیتے تھے اور جب ادھار کوئی شے بیچتے تھے تو اسے لکھ لیتے تھے۔(4)

مسئلہ نمبر 49۔ قولہ تعالیٰ: وَاَشْهِدُوْٓا علامہ طبری نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اور تم گواہ بنا لیا کرو چھوٹے سودے پر بھی اور بڑے سودے پر بھی(5)۔ اور لوگوں نے اس کے واجب ہونے یا مستحب ہونے کے بارے اختلاف کیا ہے(6)، پس حضرات ابو موسیٰ اشعری، ابن عمر، ضحاک، سعید بن مسیب، جابر بن زید، مجاہد، داؤد بن علی اور ان کے بیٹے ابو بکر رضی اللہ عنہم و رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: بیع کے وقت گواہ بنانا واجب ہے(7)۔ اور اس بارے میں ان میں سے زیادہ شدت حضرت عطا نے کی ہے انہوں نے کہا ہے: تو گواہ بنا لے جب تو کوئی شے فروخت کرے اور جب تو کوئی شے خریدے درہم کے عوض یا نصف درہم کے عوض یا چوتھائی درہم کے عوض یا اس سے بھی کم کے عوض، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ (اور گواہ ضرور بنا لیا کرو جب خرید و فروخت کرو)

اور ابراہیم نے کہا ہے: گواہ بنا لے جب کوئی شے فروخت کرے اور جب کوئی شے خریدے اگرچہ وہ سبزی کی گانٹھ ہی ہو۔ اور جنہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے اور اسے ترجیح دی ہے ان میں سے علامہ طبری بھی ہیں اور انہوں نے کہا ہے: کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں ہے جب وہ کوئی شے فروخت کرے اور جب کوئی شے خریدے مگر یہ کہ اس پر گواہ بنا لیا جائے، ورنہ وہ

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 383، جلد 1، دار الکتب العلمیہ بیروت 2۔ ایضاً

3۔ احکام القرآن، صفحہ 258، جلد 1، دار الفکر بیروت 4۔ ایضاً

5۔ جامع البیان، صفحہ 158، جلد 3-4، دار احیاء التراث العربیہ 6۔ المحرر الوجیز، صفحہ 384، جلد 1، دار الکتب العلمیہ لبنان 7۔ ایضاً

کتاب اللہ کی مخالفت کرنے والا ہوگا اور اسی طرح اگر وہ مقررہ مدت تک ادھار ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ لکھوالے اور گواہ بنالے اگر وہ کوئی کاتب پالے۔

اور علامہ شعبی اور حسن نے یہ موقف اپنایا ہے کہ اس امر کا اطلاق معنی ندب (1) اور ارشاد پر ہے وجوب پر نہیں ہے اور بیان کیا جاتا ہے کہ یہی قول امام مالک، امام شافعی اور اصحاب الرائے رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔ اور ابن عربی نے یہ گمان کیا ہے کہ یہ تمام کا قول ہے، فرمایا: اور یہی صحیح ہے۔ اور ضحاک کے سوا کسی سے بھی یہ بیان نہیں ہوا کہ یہ وجوب کے لئے ہے۔ فرمایا تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع کی اور اسے تحریر کیا۔ فرمایا: اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریر کا نسخہ یہ ہے: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ هذا ما اشترى العداء بن خالد بن هوذة من محمد رسول الله صلى الله عليه وسلم، اشترى منه عبدا۔ او امة۔ لا داء ولا غائلة ولا خبثة بيع المسلم المسلم (بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ یہ وہ ہے جسے عداء بن خالد بن ہوذہ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خریدا ہے، اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے غلام یا کنیز خریدی۔ اس میں کوئی بیماری نہیں، کوئی شر اور فساد نہیں، اور کوئی پلیدی اور نجاست نہیں اور یہ مسلمان کی بیع مسلمان کے ساتھ ہے۔) تحقیق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع کی اور کسی کو گواہ نہیں بنایا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ خریدا اور اپنی زرہ یہودی کے پاس رہن رکھی اور آپ نے کوئی گواہ نہیں بنایا۔ اگر گواہ بنانا امر واجب ہوتا تو جھگڑے کے خوف کی وجہ سے رہن کے ساتھ بھی واجب ہوتا۔ (2)

میں (مفسر) کہتا ہوں: تحقیق ہم نے ضحاک رحمۃ اللہ علیہ کے سوا دوسروں سے وجوب ذکر کیا ہے۔ اور عداء کی اس حدیث کو دار قطنی اور ابوداؤد رحمہما اللہ نے نقل کیا ہے۔ اور انہوں نے فتح مکہ اور غزوہ حنین کے بعد اسلام قبول کیا۔ اور وہ کہتے ہیں ہم نے حنین کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ لڑی، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں غلبہ نہیں دیا اور نہ ہماری مدد کی، پھر وہ اسلام لائے اور اپنے اسلام کو خوب اچھا کیا۔ اسے ابوعمر نے ذکر کیا ہے اور انہوں نے راوی کی اس حدیث کو ذکر کیا ہے اور اس کے آخر میں کہا ہے: ''اصمعی نے کہا ہے: میں نے سعید بن ابی عروبہ سے غائلہ کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: اس سے مراد بھاگ جانا، چوری کرنا اور زنا کرنا ہے اور میں نے ان سے الخبثہ کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: مسلمانوں کے عہد میں رہنے والوں کی خرید و فروخت کرنا (یعنی جو مسلمانوں کے ساتھ کسی معاہدہ کے تحت رہ رہا ہو)۔

اور امام ابومحمد بن عطیہ نے کہا ہے: اس میں وجوب تو باعث قلق و اضطراب ہے اور رہا دقائق میں تو وہ بہت مشکل اور شاق ہے اور جو کچھ اکثر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ بسا اوقات ایک تاجر گواہ بنانے کو ترک کر کے دوستی کا ارادہ اور قصد کرتا ہے اور کبھی بعض شہروں میں اس کی عادت اور رواج ہوتا ہے (کہ گواہ نہیں بنایا جاتا) اور کبھی وہ عالم اور باعزت بڑے آدمی سے حیا محسوس کرتا ہے لہٰذا اس پر گواہ نہیں بنایا جاتا، پس یہ سب ائتمان (امین بنانا) میں داخل ہیں اور امر بالاشہاد مستحب باقی رہ جاتا ہے، کیونکہ اس میں اغلباً مصلحت ہوتی ہے جب اس سے مانع کوئی عذر موجود نہ ہو جیسا کہ ہم نے ذکر کر دیا ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 384، جلد 1، دار الکتب العلمیہ لبنان

2۔ احکام القرآن، صفحہ 259، جلد 1، دار الفکر بیروت۔ ابن ماجہ کتاب التجارات حدیث 2241، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مہدوی، نحاس اور مکی نے ایک قوم سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا ہے: وَاَشْهِدُوْۤا اِذَا تَبَايَعْتُمْ اس ارشاد کے ساتھ منسوخ ہے فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا (1) اور نحاس نے اسے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے اور یہ کہ انہوں نے یہ آیت تلاوت فرمائی: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ۭ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۠ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـــًٔا ۭ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ۭ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاۗءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ۭ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَاۗءُ اِذَا مَا دُعُوْا ۭ وَلَا تَسْــَٔـمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ۭ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۠ وَلَا يُضَاۗرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ڛ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰي سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ۭ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ اور کہا اس آیت نے اپنے ماقبل کو منسوخ کر دیا ہے۔ (2)

نحاس نے کہا ہے: یہ حسن، حکم اور عبدالرحمٰن بن زید کا قول ہے۔

علامہ طبری نے کہا ہے اس کا کوئی معنی نہیں کیونکہ یہ حکم پہلے کا مغایر اور اس کے سوا ہے۔ اور بلاشبہ یہ حکم اس کے بارے ہے جو لکھنے والا کاتب نہ پائے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰي سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ۭ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا یعنی پھر وہ اس سے رہن کا مطالبہ نہ کرے فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ (البقرۃ:283) (اور اگر تم سفر میں ہو اور نہ پاؤ کوئی لکھنے والا تو کوئی چیز گروی رکھ لیا کرو اور اس کا قبضہ دے دیا کرو۔ پھر اگر اعتبار کرے کوئی تم میں سے دوسرے پر پس چاہیے کہ ادا کر دے وہ جس پر اعتبار کیا گیا اپنی امانت کو۔) فرمایا: اگر اس کا پہلے کے لئے ناسخ ہونا جائز ہے تو پھر یہ بھی جائز ہے کہ یہ ارشاد گرامی: وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰي سَفَرٍ اَوْ جَاۗءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَاۗىِٕطِ الآیۃ (النساء:43) (اور اگر ہو تم بیمار یا سفر میں یا آئے کوئی تم میں سے قضائے حاجت سے .....) یہ اس ارشاد کے لئے ناسخ ہو: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ الآیۃ (المائدہ:6) (اے ایمان والو! جب تم نماز کا ارادہ کرو۔) اور پھر یہ بھی جائز ہے کہ یہ ارشاد گرامی: فمن لم یجد فصیام شهرین متتابعین (پس جو (غلام کو) نہ پائے تو وہ دو ماہ لگاتار روزے رکھے۔) اس ارشاد کے لئے ناسخ ہو: فتحریر رقبة مومنة (پس ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہے۔)

اور بعض علماء نے کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ: فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا کا ابتدائے آیت سے جو کہ امر بالاشہاد پر مشتمل ہے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 384، جلد 1، دار الکتب العلمیہ بیروت

2۔ جامع البیان، صفحہ 141، جلد 3-4، دار احیاء التراث العربیہ۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب الاحکام، حدیث نمبر 2355، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نزول میں متاخر ہونا واضح اور ظاہر نہیں ہے، بلکہ یہ دونوں ایک ساتھ نازل ہوئے۔ اور ایک حالت میں اکٹھے نازل ہونے والے دو حکموں کو ناسخ و منسوخ قرار دینا جائز نہیں ہوتا۔ فرمایا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب ان سے کہا گیا آیۃ الدین منسوخ ہے تو آپ نے فرمایا: نہیں قسم بخدا! آیۃ الدین محکم ہے اس میں کوئی نسخ وغیرہ نہیں۔ فرمایا: اشہاد یعنی گواہ بنا لینے کا حکم طمانینت کے لئے فرمایا گیا ہے اور وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے دین کی توثیق اور پختگی کے لئے کئی طرق اور ذرائع بیان فرمائے ہیں ان میں سے ایک لکھوانا ہے، ایک رہن رکھنا ہے اور ایک گواہ بنا لینا ہے۔ اور علمائے امصار کے مابین کوئی اختلاف نہیں کہ رہن بطریق ندب مشروع ہے نہ کہ بطریق وجوب۔ پس گواہ بنانے میں بھی حکم اسی کی مثل سمجھا جائے گا اور لوگ ہمیشہ سفر و حضر، برو بحر اور صحراء و پہاڑ میں بغیر گواہ بنائے خرید و فروخت کرتے رہتے ہیں باوجود اس کے کہ لوگ اسے جانتے ہیں لیکن کوئی انکار نہیں کرتا تو اگر گواہ بنانا واجب ہوتا تو وہ اس واجب کو ترک کرنے والے پر اعتراض کرنا قطعاً ترک نہ کرتے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ تمام خوبصورت استدلال ہے اور اس سے حسین تر وہ ہے جو ترک اشہاد کے بارے میں صریح سنت میں وارد ہے اور وہ وہ روایت ہے جسے دارقطنی نے طارق بن عبداللہ محاربی سے روایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا: ''ہم ربذہ اور جنوب ربذہ سے ایک قافلہ کی صورت میں آئے اور مدینہ طیبہ کے قریب آ کر ہم نے پڑاؤ ڈالا اور ہمارے ساتھ ہماری ایک عورت پالکی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ پس اس اثنا میں کہ ہم وہاں بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ہمارے پاس ایک آدمی آیا اس پر دو سفید کپڑے تھے اور اس نے سلام کیا اور ہم نے بھی اس پر سلام کا جواب لوٹایا، تو اس نے پوچھا: یہ قافلہ کہاں سے آیا ہے؟ تو ہم نے کہا: ربذہ سے اور ربذہ کے جنوب سے۔ راوی کہتے ہیں: اور ہمارے ساتھ ایک سرخ اونٹ تھا، تو اس نے پوچھا کیا تم مجھے اپنا یہ اونٹ بیچتے ہو؟ تو ہم نے کہا: ہاں۔ انہوں نے پوچھا: کتنے کے عوض؟ ہم نے کہا: کھجور کے اتنے اتنے صاع کے عوض۔ اس نے کہا: ہم اس میں سے کوئی شے کم نہیں کرائیں گے (یعنی پورا پورا ادا کریں گے) اور کہا: میں اسے پکڑ لوں، پھر اس نے اونٹ کو سر سے پکڑا یہاں تک کہ وہ مدینہ طیبہ میں داخل ہو گیا اور ہم سے اوجھل ہو گیا اور ہم آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے اور ہم نے کہا: تم نے اپنا اونٹ ایسے آدمی کو دے دیا ہے جسے تم پہچانتے ہی نہیں! تو اس پالکی میں بیٹھی ہوئی عورت نے کہا: تم ایک دوسرے کو ملامت نہ کرو میں نے اس آدمی کا چہرہ دیکھ لیا ہے وہ نہیں ہے کہ وہ تمہارے ساتھ بے وفائی کرے، میں نے کسی آدمی کا چہرہ اس کے چہرہ سے بڑھ کر چودھویں رات کے چاند سے زیادہ مشابہ نہیں دیکھا۔ تو جب شام ہوئی تو ہمارے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے کہا: السلام علیکم، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد کی حیثیت سے تمہارے پاس آیا ہوں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں حکم فرمایا ہے کہ تم اس سے کھاؤ یہاں تک کہ تم خوب سیر ہو جاؤ اور تم اپنا کیل کر لو یہاں تک کہ تم اپنا حق پورا کر لو۔ اس نے بیان کیا: پس ہم نے کھایا یہاں تک کہ ہم سیر ہو گئے۔ اور ہم نے کیل کیا یہاں تک کہ ہم نے اپنا حق پورا کر لیا۔ (1)

اور زہری نے عمارہ بن خزیمہ رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ ان کے چچا نے انہیں بتایا اور وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے تھے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اعرابی سے گھوڑا خریدا۔ الحدیث۔ اور اس میں ہے: پس اعرابی نے

1۔ سنن الدارقطنی، کتاب بیوع، صفحہ 45، حدیث 186، جلد 3، دار المحاسن قاہرہ

کہنا شروع کر دیا: گواہ لاؤ جو یہ شہادت دے کہ میں نے تمہیں (گھوڑا) فروخت کیا ہے..... تو حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا: میں شہادت دیتا ہوں کہ تو نے (گھوڑا) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیچا ہے۔ پھر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ''تو کیونکر شہادت دیتا ہے؟'' تو انہوں نے عرض کی: آپ کی تصدیق کرنے کے ساتھ یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم۔ راوی کہتے ہیں: تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خزیمہ کی شہادت کو دو آدمیوں کی شہادت کے برابر قرار دیا۔ فجعل رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم شهادة خزیمة بشهادة رجلین اسے نسائی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔(1)

مسئلہ نمبر 50۔ قولہ تعالیٰ: **وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيدٌ** اس میں تین اقوال ہیں۔

(1) کاتب نہ لکھے جب تک اسے لکھوایا نہ جائے اور شاہد اپنی شہادت میں کوئی کمی وبیشی نہ کرے۔ حسن، قتادہ، طاؤس اور ابن زید وغیرہم نے یہی کہا ہے۔

اور حضرت ابن عباس، مجاہد اور عطاء رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ معنی یہ ہے کہ کاتب لکھنے سے اور شاہد شہادت دینے سے انکار نہ کرے (2)۔ ان دونوں قولوں کی بنا پر **وَلَا يُضَآرَّ** اصل میں **يُضَارِرَ** را کے کسرہ کے ساتھ ہے، پھر ادغام ہوا اور حالت جزمی میں فتحہ کے خفیف ہونے کی وجہ سے را کو فتحہ دے دیا گیا(3)۔ نحاس نے کہا ہے: میں نے ابو اسحاق کو اس قول کی طرف مائل ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ فرمایا: کیونکہ اس کے بعد **وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ** ہے۔ پس اس طرح ہونا اولیٰ ہے کہ جس نے بغیر حق کے شہادت دی یا لکھنے میں کوئی تغیر وتبدل کیا اسے فاسق کہا جائے اور یہ اس کے بارے میں اس سے بھی زیادہ اولیٰ ہے کہ آدمی شاہد کو شہادت دینے کے لئے کہے اور وہ مشغول ہو۔ (یعنی شہادت کے لئے فارغ نہ ہو تو اسے فاسق کہا جائے۔)

حضرت عمر بن خطاب، ابن عباس اور ابن ابی اسحاق رضی اللہ عنہم نے **يُضَارِرَ** پہلی را کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

حضرت مجاہد، ضحاک، طاؤس اور سدی رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا گیا ہے کہ آیت **وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيدٌ** کا معنی یہ ہے کہ شاہد کو شہادت کی طرف اور کاتب کو کتابت کی طرف بلایا جائے اور وہ دونوں مشغول ہوں (4)۔ اور جب وہ دونوں اپنے عذر پیش کر دیں تو وہ ان دونوں کو نکالے اور انہیں اذیت پہنچائے اور ستائے اور کہے: تم دونوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کی ہے اور اسی طرح کی باتیں ان سے کرے اور انہیں ضرر پہنچائے۔ اس قول کی بنا پر **يُضَآرَّ** کی اصل **يُضَارَرَ** ہے۔ اور اسی طرح حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے **يُضَارَرَ** پہلی را کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے(5)۔ سو اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا ہے کیونکہ اگر وہ اسے مطلق قرار دیتا تو پھر اس میں ان دونوں کے لئے اپنے دین اور اپنی معاش کے امر سے شغل اور مصروفیت ہے اور لفظ المضارۃ چونکہ دو سے متعلق ہے یہ ان معانی کا تقاضا کرتا ہے۔ اور

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاقضیہ، حدیث نمبر 3130، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً، سنن نسائی، کتاب بیوع، صفحہ 228، جلد 2، وزارت تعلیم، اسلام آباد

2۔ احکام القرآن، صفحہ 259، جلد 1، دار الفکر بیروت

3۔ المحرر الوجیز، صفحہ 384، جلد 1، دار الکتب العلمیہ بیروت

4۔ سنن دار قطنی، کتاب البیوع، صفحہ 145، حدیث نمبر 186، جلد 3، مطبوعہ دار المحاسن قاہرہ

5۔ المحرر الوجیز، صفحہ 385، جلد 1، دار الکتب العلمیہ بیروت لبنان

کاتب اور شہید پہلے دونوں قولوں کی بنا پر اپنے فعل کے سبب مرفوع ہیں اور تیسرے قول کی بنا پر نائب الفاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہیں۔

مسئلہ نمبر 51۔ قولہ تعالیٰ: وَاِنْ تَفْعَلُوْا یعنی اگر تم ستانے کا عمل کرو گے۔ فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ تو یہ تمہاری طرف سے نافرمانی ہوگی، یہ سفیان ثوری سے مروی ہے۔ پس کاتب اور شاہد زیادتی یا کمی کے ساتھ نافرمانی کرتے ہیں اور یہ وہ جھوٹ ہے جو اموال وابدان میں اذیت پہنچانے والا ہے اور اس میں حق کو باطل کرنا لازم آتا ہے اور اسی طرح ان دونوں کا ستانا اور اذیت دینا یہ بھی ہے کہ جب وہ دونوں نافرمانی میں مشغول ہوں اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کرنے کے اعتبار سے راہ صواب سے نکل جائیں اور قولہ بِکم میں تقدیر عبارت یہ ہے: فسوقٌ حالٌ بکم۔

مسئلہ نمبر 52۔ قولہ تعالیٰ: وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے وعدہ ہے کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ سے ڈرا وہ اسے سکھا دے گا۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس کے دل میں نور پیدا فرما دے گا جس کے ساتھ وہ سمجھ جائے گا جو اس کی طرف القا کیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ اس کے دل میں ابتداءً فرقان رکھ دے گا یعنی ایسی قوت عطا فرما دے گا جس کے ساتھ وہ حق اور باطل کے درمیان فرق کر سکے گا۔ اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا (الانفال: 29) (اے ایمان والو! اگر تم ڈرتے رہو گے اللہ سے تو وہ پیدا کر دے گا تم میں حق وباطل میں تمیز کی قوت۔) واللہ اعلم۔

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰي سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ۭ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ۭ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۭ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝

''اور اگر تم سفر میں ہو اور نہ پاؤ کوئی لکھنے والا تو کوئی چیز گروی رکھ لیا کرو اور اس کا قبضہ دے دیا کرو۔ پھر اگر اعتبار کرلے کوئی تم میں سے دوسرے پر، پس چاہیے کہ ادا کر دے وہ جس پر اعتبار کیا گیا ہے اپنی امانت کو اور ضروری ہے کہ ڈرتا رہے اللہ سے جو اس کا رب ہے۔ اور مت چھپاؤ گواہی کو اور جو شخص چھپاتا ہے اسے تو یقیناً گنہگار ہے اس کا ضمیر۔ اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو خوب جاننے والا ہے۔''

اس میں چوبیس مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ جب اللہ تعالیٰ نے اموال و دیون کی حفاظت کی مصلحت کے لئے لکھوانے اور گواہ بنا لینے کے مستحب ہونے کا ذکر فرمایا، تو اس کے بعد ایسے عذروں کا تذکرہ کیا جو لکھوانے سے مانع ہیں اور ان کی صورت میں رہن (گروی رکھنا) کا حکم بیان فرمایا اور عذر کے احوال میں سے سفر پر نص بیان فرمائی جو سفر تمام عذروں پر غالب ہے، بالخصوص اس وقت میں کثرت غزوات کی وجہ سے اور معنوی طور پر اس میں ہر عذر داخل ہے۔ بسا اوقات سفر کے بغیر حضر میں بھی کاتب کا ملنا متعذر اور مشکل ہو جاتا ہے جیسا کہ لوگوں کی مشغولیت کے اوقات اور رات کا وقت اور یہ بھی کہ مقروض کی ذمہ داری کے فساد کا خوف

ہوتو یہ بھی ایک ایسا عذر ہے جو رہن کے مطالبہ کو ثابت کرتا ہے۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زرہ ایک یہودی کے پاس رہن رکھی جس سے آپ نے جو ادھار لینے کا مطالبہ کیا، تو اس نے کہا: بلاشبہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میرا مال لے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس نے جھوٹ بولا ہے بلاشبہ میں زمین میں بھی امین ہوں اور آسمان میں بھی امین ہوں اگر وہ مجھ پر اعتبار کرتا تو میں یقیناً اسے ادا کر دیتا تم میری زرہ اس کے پاس لے جاؤ (1)۔'' پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا درآنحالیکہ آپ کی زرہ اس کے پاس گروی پڑی ہوئی تھی۔ ابھی اس کا بیان آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 2۔ جمہور علماء نے کہا ہے: سفر میں گروی رکھنا نص قرآن سے ثابت ہے اور حضر میں گروی رکھنا سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور یہ صحیح ہے اور ہم نے حضر میں آیت سے معنوی طور پر اس کے جائز ہونے کو بیان کیا ہے، کیونکہ کبھی اعذار حضر میں بھی مترتب ہوتے ہیں اور سوائے حضرت مجاہد، ضحاک اور داؤد کے کسی سے بھی حضر میں اس کا ممنوع ہونا مروی نہیں ہے، اس حال میں کہ وہ آیت سے استدلال کرتے ہیں اور آیت میں کوئی حجت نہیں ہے، کیونکہ یہ کلام اگرچہ شرط کے مخرج میں نکلا ہے سو اس سے مراد غالب احوال ہیں۔ اور آیت میں حالت سفر میں رہن کا ہونا ان چیزوں میں سے نہیں ہے جو حالت سفر کے بغیر ممنوع ہوتی ہیں۔ صحیحین وغیرہ میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت مذکور ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی سے ایک معین مدت تک اناج خریدا اور اس کے پاس لوہے کی زرہ گروی رکھی (2)۔ اسے نسائی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے نقل کیا ہے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا اور آپ کی زرہ یہودی کے پاس گھر والوں کے لئے تیس صاع جو کے عوض گروی پڑی ہوئی تھی (3)۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا جمہور نے كَاتِبًا پڑھا بمعنی وہ آدمی جو لکھتا ہے۔

حضرت ابن عباس، حضرت ابی، حضرت مجاہد، حضرت ضحاک، حضرت عکرمہ اور حضرت ابو العالیہ رضی اللہ عنہم نے وَلَمْ تَجِدُوْا كِتَابًا پڑھا ہے (4)۔ ابو بکر انباری نے کہا ہے: حضرت مجاہد نے اس کی تفسیر بیان کی ہے اور فرمایا ہے: اس کا معنی ہے پس اگر تم دوران سفر سیاہی نہ پاؤ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے كُتَّابًا بھی مروی ہے (5)۔ نحاس نے کہا ہے: یہ قراءت شاذ ہے اور قراءت عامہ اس کے خلاف ہے۔ اور بہت کم ہی کوئی شے قراءت عامہ سے خارج ہوتی ہے مگر اس میں طعن ہوتا ہے اور کلام تو کاتب کے بارے چل رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے ارشاد فرمایا ہے: وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ (اور چاہیے کہ تمہارے درمیان لکھنے والا عدل و انصاف کے ساتھ لکھے) اور كُتَّابٌ پوری جماعت کا تقاضا کرتا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: کتاب اس اعتبار سے حسین ہے کہ ہر مصیبت کے لئے ایک کاتب ہو، پس یہ جمع کے لئے کہا گیا ہے: ولم تجدوا كتابا۔ (اور تم لکھنے والے نہ پاؤ) مہدوی نے ابو العالیہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے كُتُبًا پڑھا ہے اور یہ کتاب کی جمع ہے اس

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 386، دار الکتب العلمیہ۔ ایضاً سنن ترمذی، حدیث نمبر 1134، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ روایت بالمعنی
2۔ صحیح مسلم، کتاب البیوع، جلد 2، صفحہ 31، وزارت تعلیم۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب البیوع، صفحہ 1926، جلد 1، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ سنن نسائی، کتاب البیوع، جلد 2، صفحہ 229	4۔ الکشاف، جلد 1، مکتب الاعلام الاسلامی	5۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 386

حیثیت سے کہ نوازل (مصائب) مختلف ہیں۔ اور رہی حضرت ابی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کی قرأۃ کُتَّابًا تو نحاس اور مکی نے کہا ہے: یہ کاتب کی جمع ہے جیسے قائم وقیام ہے۔ مکی نے کہا ہے معنی یہ ہے: "اور اگر دوات، قلم اور قرطاس موجود نہ ہوں اور لکھنے والے کے وجود کی نفی اس آلہ کے معدوم ہونے کے ساتھ ہوتی ہے جو متفق علیہ ہے اور کاتب کی نفی بھی کتاب کی نفی کا تقاضا کرتی ہے، پس دونوں قراءتیں حسین اور اچھی ہیں مگر مصحف کے خط کی جہت سے (1)۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ابو عمرو اور ابن کثیر نے فَرُهُنٌ را اور ہا کے ساتھ پڑھا ہے اور ان دونوں سے ہا کی تخفیف بھی مروی ہے اور طبری نے کہا ہے: ایک قوم نے یہ تاویل کی ہے کہ رُهُن را اور ہا کے ضمہ کے ساتھ رہان کی جمع ہے۔ اور وہ جمع الجمع ہے، اسے زجاج نے فراء سے بیان کیا ہے (2) اور مہدوی نے کہا ہے: فَرِهَانٌ مبتدا ہے اور خبر محذوف ہے اور معنی ہے فرهان مقبوضة یکفی من ذالك (تو کوئی چیز گروی رکھ لیا کرو اور اس پر قبضہ دے دیا کرو اس میں یہ کافی ہو جائے گا) نحاس نے کہا ہے: عاصم بن ابی النجود نے فَرُهْنٌ ہا کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور وہ اہل مکہ سے روایت کرتے ہیں اور اس میں باب رِهَانٌ ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: بغل وبغال، (خچر) کبش وکباش (مینڈھا) اور رُهُنٌ اس کا طریقہ یہ ہے کہ یہ رِهان کی جمع ہو، مثلاً کتاب اور کُتُب ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ رَهْنٌ کی جمع ہے، جیسا کہ سَقْفٌ اور سُقُفٌ، حَلْقٌ اور حُلُقٌ، فَرْشٌ اور فُرُشٌ، نَشْرٌ اور نُشُرٌ اور ان کے مشابہ دیگر الفاظ۔ اور رُهْنٌ ہا کے سکون کے ساتھ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ضمہ ثقیل ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہو اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ رَهْنٌ کی جمع ہے، مثلاً سَهْمٌ حَشْرٌ یعنی باریک اور تیز تر۔ اور سِهام حُشْرٌ اور پہلا زیادہ اولیٰ ہے، کیونکہ پہلا نعت (صفت) نہیں ہے اور یہ صفت ہے۔

اور ابو علی فارسی نے کہا ہے اور رَهْنٌ کی جمع مکسر جمع قلت کے وزن پر میں نہیں جانتا کہ آئی ہو۔ اور اگر آئے تو اس کا قیاس أَفْعُلٌ ہے جیسے کَلْبٌ اور أَكْلُبٌ ہے۔ گویا کہ وہ قلیل کے سبب کثیر سے مستغنی ہیں، جیسا کہ جمع کثرت کے وزن کے ساتھ جمع قلت کے وزن سے اس قول میں مستغنی ہیں: ثلاثة شُسُوع اور وہ رَسَن اور أَرْسَان میں جمع قلت کے وزن کے ساتھ جمع کثرت سے مستغنی ہیں۔ پس رَهْنٌ دونوں وزنوں پر جمع بنائی جاتی ہے اور وہ دونوں فُعُل اور فِعَال ہیں۔ اخفش نے کہا ہے: فَعْل کی جمع فُعُل کے وزن پر قبیح ہے اور یہ قلیل اور شاذ ہے۔ فرمایا: اور کبھی رهانٌ کی جمع رُهُنٌ آئی ہے، گویا کہ رُهُنٌ کی جمع رِهَان بنائی جاتی ہے اور رِهَانٌ کی جمع رُهُنٌ بنائی جاتی ہے جیسا کہ فراش اور فُرُش ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ رَهن کا معنی ہے کسی حق کے عوض توثیق اور اعتماد کے لئے کسی خاص چیز کو روک لینا تا کہ اس کے ثمن سے یا اس کے منافع کے ثمن سے وہ حق پورا کر لیا جائے جبکہ اسے مقروض سے لینا متعذر اور مشکل ہو، اسی طرح علماء نے اس کی تعریف بیان کی ہے اور یہ عرب کلام میں بمعنی دوام اور استمرار ہے۔ ابن سیدہ نے کہا ہے: ورهنه ای أدامه یعنی اس نے اسے ہمیشہ رکھا۔ اور یہ رهن بمعنی دام سے ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 386، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 387

جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

الخُبزُ والَلَّحْمُ لهم راهِنٌ وقَهْوَةٌ راؤوقها ساكِبُ (1)

اس میں راہن ہمیشہ رہنے والا کے معنی میں استعمال ہو رہا ہے۔

جوہری نے کہا ہے: رَهَن الشيئُ رَهْناً۔ ای دام۔ یعنی شے ہمیشہ رہی اور أرْهنتُ لهم الطعام و الشراب اور میں نے ان کے لئے طعام وشراب ہمیشہ رکھا، و هو طعام راهن اور الراهن کا معنی الثابت (یعنی ثابت رہنے والا، ہمیشہ رہنے والا) اور الراهن کا معنی ہے اونٹوں اور لوگوں میں سے کمزور ہونے والا۔

شاعر کا قول ہے:

اما تَرَی جِسْمِیَ خَلًّا قد رَهَن هَزْلًا وما مَجْدُ الرجالِ فی السِّمَنْ

اس میں رہن کمزور کے معنی میں مستعمل ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: وہ رہن جو کہ وثیقہ اور اعتماد کے معنی میں ہے کہا جاتا ہے وہ أرْهَن سے ہے۔ أرهنتُ ارهانا (میں نے شے گروی رکھی) اسے ان میں سے بعض نے بیان کیا ہے۔

اور ابو علی نے کہا ہے: أرهنتُ فی المُغَالاۃ (میں نے مہنگائی میں اضافہ کر دیا) اور رہی قرض اور بیع کی صورت تو اس میں ہے فرهنتُ۔ (2) (پس میں نے قرض اور بیع کے عوض شے گروی رکھی۔)

اور ابو زید نے کہا ہے: أرهنت فی السلعة أرهانا (میں نے سامان کی قیمت خوب چڑھا دی) اور یہ مہنگائی کے معنی میں خاص ہے۔

کسی شاعر کا قول ہے:

عِیدِيَّةٌ أُرْهِنَتْ فِيها الدَّنَانِيرُ

عیدیہ میں دنانیر بڑھا دیئے گئے ہیں۔

شاعر اونٹنی کا وصف بیان کر رہا ہے اور العید مہرہ کا ایک قبیلہ ہے اور مہرہ کے اونٹ بڑے عمدہ اور اعلیٰ نسل کے ہوتے ہیں۔

اور زجاج نے کہا ہے: گروی رکھنے کے معنی میں کہا جاتا ہے: رَهَنْتُ اور أرْهنتُ (میں نے گروی رکھی)

ابن اعرابی اور اخفش نے یہی کہا ہے۔ عبد اللہ بن ہمام السلولی نے کہا ہے:

فلما خَشِيتُ أظَافِيرَهم نَجَوتُ و أرْهَنْتُهُم مالكا (3)

اس میں أرهنتهم گروی رکھنے کے معنی میں ہے۔

ثعلب نے کہا ہے: تمام رواۃ نے أرهنتهم کہا ہے اس بنا پر کہ رَهَنْتُهٗ اور أرْهَنْتُهٗ دونوں جائز ہیں سوائے اصمعی کے کیونکہ انہوں نے اسے وأرْهَنُهُمْ روایت کیا ہے، اس بنا پر کہ انہوں نے فعل مضارع کا عطف فعل ماضی پر کیا ہے اور اسے ان

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 386، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 387 3۔ ایضاً

کے اس قول کے مشابہ قرار دیا ہے: قمتُ و أصُكُّ وجهه اور یہ مذہب حسن اور اچھا ہے، کیونکہ یہ واؤ حالیہ ہے اور أصك کو پہلے فعل کے لئے حال بنایا گیا ہے اس معنی کی بنا پر قمت صاكا وجهه، یعنی میں نے اسے چھوڑ اور آنحالیکہ وہ ان کے پاس مقیم تھا، کیونکہ یہ نہیں کہا جاتا: أرْهَنْتُ الشَّيْءَ، بلکہ یہ کہا جاتا ہے: رهنته (میں نے شے گروی رکھی) اور آپ کہتے ہیں رهنت لسانی بكذا، (میں نے اپنی زبان اتنے کے عوض گروی رکھ دی) اور اس میں یہ نہیں کہا جا سکتا، أرهنت، اور ابن السکیت نے کہا ہے: اس میں ارهنت بمعنی أسلفت ہے۔ (یعنی میں نے قرض دیا) اور مرتَهِن وہ ہوتا ہے جو گروی کے طور پر شے لیتا ہے اور وہ شے جو گروی رکھی جائے وہ مرهون اور رهين کہلاتی ہے اور اس کی مؤنث رهينة ہے اور راهنت فلانا علی کذا مُراهنة کا معنی ہے میں نے فلاں کو اتنے کی شرط پر خطرے میں ڈال دیا (ای خاطرتُه) اور أرهنت به ولدی ارهانا ای اخطرتهم به خطرا۔ یعنی میں نے اس کے عوض اپنی اولاد کو خطرے میں ڈال دیا۔ (یعنی شرط پر رکھ دیا) اور الرهينة الرهائن کی واحد ہے۔ یہ تمام جوہری سے منقول ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: بیع اور قرض کے معاملہ میں بلا اختلاف کہا جائے گا: رهنت رهنا۔ پھر اسی مصدر سے اس شے کا نام رکھ دیا گیا ہے جو دی جاتی ہے۔ تو کہتا ہے: رهنت رهنا، جیسا کہ یہ کہا جاتا ہے رهنت ثوبا۔ (1)

مسئلہ نمبر 6۔ ابوعلی نے کہا ہے جب رہن بمعنی ثبوت اور دوام ہے تو اسی وجہ سے فقہاء کے نزدیک رہن باطل ہو جاتی ہے جب وہ کسی وجہ سے مرتہن کے قبضے سے نکل کر راہن کے پاس چلی جائے، کیونکہ وہ اس سے نکل چکی ہے جو اختیار مرتہن کو اس کے بارے دیا گیا تھا (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ہمارے نزدیک اس بارے میں یہی معتمد علیہ ہے کہ رہن جب راہن کی طرف مرتہن کے اختیار سے لوٹ جائے تو رہن باطل ہو جائے گی اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے مگر انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر وہ عاریۃً یا ودیعۃً (امانت کے طور پر) لوٹے تو پھر رہن باطل نہ ہوگی۔

اور امام شافعی نے کہا ہے: اس کا راہن کے قبضہ کی طرف لوٹنا مطلق سابقہ حکم کو باطل نہیں کرتا اور ہماری دلیل **فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ** ہے۔ پس جب مرهونہ شی قابض کے ہاتھ سے نکل جائے تو یہ الفاظ نہ لغۃً اس پر صادق آتے ہیں اور نہ ہی حکماً اس پر صادق آتے ہیں اور یہ واضح ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ جب کوئی قولاً گروی رکھے اور فعلاً اس پر قبضہ نہ کرے تو وہ حکماً ثابت نہ ہوگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ**

امام شافعی نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے صرف اس رہن کا حکم ارشاد فرمایا ہے جو موصوف بالقبض ہو اور جب صفت نہ پائی جائے تو پھر ضروری ہے کہ حکم بھی نہ پایا جائے (3) اور یہ بالکل عیاں اور ظاہر ہے۔

اور مالکیہ نے کہا ہے: رہن عقد کے ساتھ لازم ہو جاتی ہے اور راہن کو رہن دینے پر مجبور کیا جائے گا تاکہ مرتہن اسے خاص کر سکے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ** (المائدہ: 1) (پورا کرو (اپنے) عہدوں کو) اور یہ بھی ایک عقد ہے اور مزید

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 387، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 386 3۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 260

ارشاد ہے: اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ (الاسراء: 34) (وعدہ پورا کرو) اور یہ بھی ایک عہد ہے۔ اور حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: المؤمنون عند شروطهم (1) (مومنین اپنی شروط کے ساتھ ہوتے ہیں) اور یہ بھی ایک شرط ہے۔ پس ہمارے نزدیک قبضہ کمال فائدہ کے لئے شرط ہے اور ان دونوں ائمہ کے نزدیک قبضہ اس کے صحیح ہونے اور لازم ہونے کے لئے شرط ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: مَّقْبُوْضَةٌ یہ لفظ مرتہن کی رہن کے ساتھ بینونت اور علیحدگی کا تقاضا کرتا ہے اور لوگوں نے مرتہن کے قبضہ کے صحیح ہونے پر اجماع کیا ہے اور اسی طرح اس کے وکیل کے قبضہ پر (بھی اجماع ہے) اور عادل آدمی کے قبضہ کے بارے اختلاف ہے جو رہن کو اس کے ہاتھوں پر رکھے گا۔ پس امام مالک، آپ کے تمام اصحاب اور جمہور علماء نے کہا ہے: عادل کا قبضہ کرنا قبضہ ہے اور ابن ابی لیلیٰ، قتادہ، حکم اور عطا رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: وہ قبضہ نہیں ہے اور رہن مقبوض نہیں ہوگی مگر تب جب وہ مرتہن کے پاس ہو اور انہوں نے اسے تعبداً دیکھا ہے۔ اور جمہور کا قول معنی کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے، کیونکہ جب وہ عادل کے پاس ہو گیا تو وہ لغۃً اور حقیقۃً مقبوض ہو گیا، کیونکہ عادل آدمی صاحب حق کا نائب ہے اور وہ قائم مقام وکیل کے ہے اور یہ ظاہر ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ اور اگر رہن کو عادل آدمی کے قبضہ میں رکھ دیا جائے اور وہ ضائع ہو جائے تو نہ مرتہن ضامن ہوگا اور نہ وہ جس کے قبضہ میں اسے رکھا گیا، کیونکہ مرتہن کے قبضہ میں تو کوئی شے نہیں آئی جس کا وہ ضامن ہوگا اور جس کے قبضہ میں وہ شے دی گئی ہے وہ امین ہے اور امین ضامن نہیں ہوتا۔

مسئلہ نمبر 10۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَّقْبُوْضَةٌ تو ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ لفظ اپنے ظاہر اور مطلق ہونے کے ساتھ تقاضا کرتا ہے کہ مشترک شے کو رہن رکھنا جائز ہے، بخلاف امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم کے (2)۔ ان کے نزدیک یہ جائز نہیں ہے کہ کوئی گھر کا تیسرا حصہ، اپنے غلام اور تلوار کا نصف حصہ بطور رہن رکھے، پھر انہوں نے کہا ہے: جب دو آدمیوں کا ایک آدمی پر مال (قرض) ہو اور وہ دونوں اس میں شریک ہوں اور وہ آدمی اس کے عوض دونوں کے پاس زمین رہن رکھ دے تو وہ جائز ہے بشرطیکہ دونوں اس پر قبضہ کر لیں۔

ابن منذر نے کہا ہے: یہ مشترک شے کو رہن رکھنے کی اجازت ہے، کیونکہ ان دونوں میں سے ہر ایک نصف گھر کا مرتہن ہے۔ ابن منذر نے کہا ہے: مشترک شے کو رہن رکھنا جائز ہے جیسا کہ اسے بیچنا جائز ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 11۔ ہمارے علماء کے نزدیک جو شے ذمہ میں ہو اس کو گروی رکھنا بھی جائز ہے، کیونکہ وہ بھی مقبوض ہے بخلاف ان کے جنہوں نے اس سے منع کیا ہے اور اس کی مثال یہ ہے دو آدمی مل کر کاروبار کریں ان میں سے ایک کا دوسرے کے ذمہ قرض ہو۔ پس اس نے اپنا وہی قرض اس کے پاس رہن رکھ دیا جو اس کے ذمہ واجب الادا ہو۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: ہر وہ سامان جس کی بیع کرنا جائز ہے اس کو رہن رکھنا بھی جائز ہے اور اسی علت کی وجہ سے ہم نے اس شے کو رہن رکھنا جائز

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاجارۃ، جلد 1، صفحہ 303، وزارت تعلیم۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاقضیہ، حدیث 3120، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 261

قرار دیا ہے جو مرتہن کے ذمہ واجب الادا ہو، کیونکہ اس کی بیع جائز ہے اور اس لئے بھی کہ وہ مال ہے اس کے ساتھ توثیق واقع ہو سکتی ہے تو پھر اس کا رہن ہونا بھی جائز ہے (تو گویا اسے) موجود سامان پر قیاس کیا گیا ہے۔

اور جنہوں نے اس سے منع کیا ہے انہوں نے کہا ہے: کیونکہ اس پر قبضہ کرنا متحقق نہیں ہوتا اور رہن کے لازم ہونے میں قبضہ کرنا شرط ہے اور اس لئے بھی کہ قرض کی میعاد مکمل ہونے کے وقت اس سے حق پورا کرنا ضروری ہوتا ہے اور حق کا استیفا اس کی مالیت سے ہوتا ہے نہ کہ اس کے عین سے اور دین میں تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

مسئلہ نمبر 12۔ امام بخاری نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''سواری پر اس کے نفقہ کے عوض سوار ہوا جا سکتا ہے جبکہ وہ رہن رکھی ہوئی ہو اور دودھ دینے والے جانور کا دودھ اس کے نفقہ کے عوض پیا جا سکتا ہے جب مرہونہ ہو اور جو سوار ہو گا اور دودھ پئے گا اسی پر نفقہ ہو گا (1)۔'' اسے ابوداؤد نے بھی نقل کیا ہے اور دونوں جگہوں پر یشرب کی بجائے یحلب (2) (دودھ دوہنا) کا لفظ ذکر کیا ہے۔

خطابی نے کہا ہے: یہ کلام مبہم ہے نفس لفظ میں اس کا بیان نہیں ہے جو سوار ہو گا اور دودھ دوہے گا کیا وہ راہن ہے یا مرتہن ہے یا وہ عادل آدمی ہے جس کے قبضہ میں مرہونہ شے دی گئی؟

میں (مفسر) کہتا ہوں: دو حدیثوں میں مبین مفسر ذکر آیا ہے اور انہیں کے سبب علماء نے اس میں اختلاف کیا ہے۔ دارقطنی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: ''جب کوئی جانور گروی رکھا جائے تو اس کا چارہ مرتہن پر ہو گا اور وہ دودھ دوہ کر پی سکتا ہے اور اسی پر اس کا نفقہ ہو گا جو دودھ پئے گا (3)۔''

آپ نے اسے احمد بن علی حدثنا زیاد بن ایوب حدثنا ہشیم حدثنا زکریا عن الشعبی عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ کی سند سے روایت کیا ہے۔ اور یہی احمد اور اسحاق کا قول ہے کہ مرتھن بقدر نفقہ مرہونہ جانور کا دودھ دوہ کر اور اس پر سواری کر کے اس سے نفع اٹھا سکتا ہے۔

اور ابوثور نے کہا ہے: جب راہن اس پر خرچ کرتا ہے تو پھر مرتہن اس سے نفع نہیں اٹھا سکتا اور اگر راہن اس پر خرچہ نہ کرے اور اسے مرتہن کے قبضہ میں چھوڑ دے اور وہی اس پر خرچہ کرے تو اس کے لئے اس پر سوار ہونا اور غلام سے خدمت لینا جائز ہے۔ اور امام اوزاعی اور لیث نے بھی یہی کہا ہے اور دوسری حدیث بھی دارقطنی نے روایت کی ہے اور اس کی اسناد میں کلام ہے اس کا بیان آگے آئے گا۔

اسماعیل بن عیاش کی حدیث میں سے ہے کہ ابن ابی ذئب نے زہری سے انہوں نے مقبری سے اور انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''رہن ملکیت میں نہیں آئے گی اور اس کے مالک کے

1۔ صحیح بخاری، کتاب البیوع، جلد 1، صفحہ 341، وزارت تعلیم۔ ایضاً، کتاب الرہن، جلد 1، صفحہ 2329، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب البیوع، جلد 2، صفحہ 141، وزارت تعلیم۔ ایضاً، کتاب الاجارہ، جلد 2، صفحہ 3059، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن دارقطنی، جلد 3، صفحہ 34، حدیث نمبر 135، وزارت تعلیم

لئے اس کے منافع ہیں اور اس پر اس کا تاوان ہے(1)''۔

اور یہی امام شافعی، شعبی اور ابن سیرین کا قول ہے اور یہی امام مالک اور ان کے اصحاب کا قول ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: رہن کے منافع راہن کے لئے ہیں اور اس کا نفقہ بھی اسی پر ہے اور مرتہن رہن سے کسی قسم کی منفعت حاصل نہیں کر سکتا سوائے وثیقہ کی حفاظت کرنے کے۔

خطابی نے کہا ہے: یہی اقوال میں سے اولیٰ اور زیادہ صحیح ہے اس کی دلیل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے: ''رہن ملکیت میں نہیں آئے گا وہ اپنے اس مالک کے لئے ہوگا جس نے اسے رہن رکھا ہے۔ (اسی کے لئے اس کے منافع ہیں اور اسی پر اس کا تاوان (خرچہ) ہے)'' [خطابی نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول: من صاحبه، لصاحبه کے معنی میں ہے۔] عرب لام کی جگہ من استعمال کرتے رہتے ہیں۔

جیسا کہ ان کا قول ہے:

أَمِنْ أُمِّ أَوْفَى دِمْنَةٌ لم تُكَلَّمِ

میں (مفسر) کہتا ہوں: لصاحبه صراحۃً موجود ہے لہٰذا تاویل کی ضرورت نہیں۔ اور امام طحاوی نے کہا ہے: یہ اس وقت تھا جبکہ ربا مباح تھا اور منفعت لانے والے قرض سے منع نہیں کیا گیا تھا اور نہ ایک شے کے بدلے دوسری شے لینے سے منع کیا گیا تھا اگرچہ وہ دونوں غیر متساوی ہوں، پھر اس کے بعد ربا حرام کر دیا گیا۔ اور امت نے اس پر اجماع کیا ہے کہ مرہونہ لونڈی کے ساتھ راہن کے لئے وطی کرنا جائز نہیں اور اسی طرح اس کا اس سے خدمت لینا بھی جائز نہیں۔ اور علامہ شعبی نے کہا ہے: وہ رہن سے کسی بھی اعتبار سے نفع حاصل نہیں کرے گا اور یہی شعبی ہیں جنہوں نے حدیث روایت کی ہے اور اس کے خلاف فتویٰ دیا ہے اور ان کے نزدیک وہ جائز نہیں مگر وہ منسوخ ہو چکا ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا ہے: اس پر اجماع ہے کہ مرہونہ شے کا دودھ اور اس کی پشت راہن کے لئے ہے اور وہ اس سے خالی نہیں ہوگا کہ مرتہن کا اپنے لئے دودھ دوہنا راہن کی اجازت کے ساتھ ہوگا یا اس کی اجازت کے بغیر ہوگا، پس اگر اس کی اجازت کے بغیر ہو تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے: ''کوئی بھی کسی کے جانور کا دودھ نہ دوہے مگر اس کی اجازت کے ساتھ(2)'' یہ اس کا رد کرتی ہے اور اس کے نسخ کا تقاضا کرتی ہے اور اگر اجازت کے ساتھ ہو تو پھر مجہول، غرر، اس شے کی بیع جو تیرے پاس نہ ہو اور اس کی بیع جو ابھی پیدا نہیں کی گئی کی تحریم کے بارے میں مجمع علیہ اصول ہے، چنانچہ یہ بھی اسے رد کر دے گا کیونکہ ایسا ربا کے حرام ہونے کا حکم نازل ہونے سے پہلے تھا۔ واللہ اعلم۔

ابن خویز منداد نے کہا ہے: اگر مرتہن نے رہن سے نفع اٹھانے کی شرط لگائی تو اس کی دو حالتیں ہیں: اگر وہ قرض کے عوض ہو تو پھر جائز نہیں ہے اور اگر وہ بیع یا اجارہ کی وجہ سے ہو تو جائز ہے، کیونکہ وہ مذکور ثمن کے عوض سامان کو بیچنے والا ہو جائے گا اور

1۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 1، صفحہ 528

2۔ صحیح مسلم، کتاب اللقطہ، جلد 2، صفحہ 80، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، کتاب اللقطہ، حدیث نمبر 2255، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رہن کے منافع مدت معلوم تک ہیں گویا کہ وہ بیع اور اجارہ ہے اور جہاں تک قرض کا تعلق ہے تو وہ ایسا قرض ہو جائے گا جو منفعت کو لایا ہے۔ اور اس لئے بھی کہ قرض دینے کا مقصود تو یہ ہے کہ وہ باعث قربت ہو اور جب اس میں نفع داخل ہو جائے گا تو وہ جنس میں زیادتی ہو جائے گی اور وہی ربا ہے۔

مسئلہ نمبر 13۔ رہن کا ملکیت میں آنا جائز نہیں اور وہ یہ کہ مرتہن شرط لگا لے کہ مرہونہ شے اس کے حق کے عوض ہو جائے گی اگر اس نے مقررہ مدت تک وہ حق ادا نہ کیا اور یہ جاہلیت کے افعال میں سے تھا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنے اس ارشاد کے ساتھ باطل کر دیا: لا یغلق الرھن (1) رہن ملکیت میں نہیں آئے گی۔ اسی طرح ہم نے اسے قاف کو رفع دینے کے ساتھ خبر پر مقید کر دیا ہے، یعنی لیس یغلقُ الرھن۔ آپ کہتے ہیں: أغلقت الباب فھو مُغْلَقٌ۔ (میں نے دروازہ بند کیا پس وہ بند ہو گیا) اور غَلِقَ الرھنُ فی ید مرتھنہ یہ تب کہا جاتا ہے جب اسے اس کے قبضہ سے چھڑایا نہ جا سکے جیسا کہ شاعر نے کہا:

أجارَتَنا مَنْ یجتمِع یَتَفَرّق و مَنْ یكُ رھنا للحوادث یُغْلَقِ

اور زہیر نے کہا ہے:

و فارَقَتْك بِرَھن لا فكاك له یوم الوداع فأمسى الرَّھْنُ قد غَلِقَا (2)

مسئلہ نمبر 14۔ دارقطنی نے سفیان بن عیینہ کی حدیث روایت کی ہے کہ انہوں نے زیاد بن سعد سے، انہوں نے زہری سے، انہوں نے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''رہن ملکیت میں نہیں آئے گی اسی کے لئے اس کے منافع ہوں گے اور اسی پر اس کا تاوان (اخراجات) ہو گا (3)۔'' زیاد بن سعد ثقہ حفاظ میں سے ایک ہیں اور یہ اسناد حسن ہے۔ اور اسے مالک نے ابن شہاب سے اور انہوں نے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے مرسل روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''رہن ملکیت میں نہیں آئے گی (4)''۔

ابو عمر نے کہا ہے: اسی طرح اسے روایت کیا ہے ہر اس راوی نے جس نے امام مالک سے الموطا روایت کی ہے جہاں تک میں جانتا ہوں، مگر معن بن عیسیٰ نے اسے متصل بیان کیا ہے اور معن ثقہ راوی ہے، مگر مجھے یہ خدشہ ہے کہ اس میں علی بن عبد الحمید غضائری عن مجاھد بن موسیٰ عن معن بن عیسیٰ سے خطا ہوئی ہے۔ اور اس میں ابو عبد اللہ عمروس نے ابہری سے اپنی اسناد کے ساتھ ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے: له غنمه و علیه غرمه (5) اور راویوں نے ان الفاظ کے رفع میں اختلاف کیا ہے۔ سو ابن ابی ذئب اور معمر وغیرہما نے انہیں مرفوع قرار دیا ہے اور اسے ابن وہب نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یونس نے کہا ابن شہاب نے بیان کیا ہے اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کہتے تھے: رہن اسی کے لئے ہے جس نے اسے رہن رکھا ہے، اسی کے لئے اس کے منافع ہیں اور اسی پر اس کا خرچ ہے۔

1۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 1، صفحہ 528 2۔ ایضاً 3۔ سنن دارقطنی، کتاب البیوع، جلد 3، صفحہ 33
4۔ مؤطا امام مالک، کتاب الاقضیہ، صفحہ 637 5۔ سنن دارقطنی، کتاب البیوع، جلد 3، صفحہ 33

اور ابن شہاب نے خبر دی ہے کہ یہ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کا قول ہے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی نہیں ہے(1)، مگر معمر نے اسے ابن شہاب سے مرفوع ذکر کیا ہے اور معمر ابن شہاب سے روایت کرنے میں تمام لوگوں سے بڑھ کر مضبوط اور ثقہ ہے۔ اور اس کے مرفوع ہونے پر یحییٰ بن ابی انیسہ نے ان کی اتباع کی ہے۔ اور یحییٰ قوی راوی نہیں ہے۔ دراصل اہل علم کے نزدیک یہ حدیث مرسل منقول ہے اگرچہ کثیر جہتوں سے یہ متصل بھی ہے لیکن وہ اسے معلل قرار دیتے ہیں۔ اور اس کے باوجود یہ حدیث ہے جسے ان میں سے کسی نے مرفوع بیان نہیں کیا اگرچہ اس کی تاویل اور اس کے معنی میں اختلاف ہے۔

اور اسے دار قطنی نے بھی اسماعیل بن عیاش عن ابن ابی ذئب عن الزهری عن سعید عن ابی هریرة رضی اللہ عنہ کی سند سے مرفوع بیان کیا ہے۔ ابو عمر نے کہا ہے: اسماعیل نے ابن ابی ذئب سے اس کا سماع نہیں کیا ہے، بلکہ اس نے اسے عباد بن کثیر عن ابن ابی ذئب سے سنا ہے اور عباد ان کے نزدیک ضعیف ہے، قابل حجت نہیں ہے اور اسماعیل بھی ان کے نزدیک حدیث میں غیر مقبول ہے جب وہ اپنے شہر والوں کے علاوہ کسی اور سے حدیث بیان کرے۔ اور جب وہ شامیوں سے حدیث بیان کرے تو اس کی حدیث صحیح ہوتی ہے اور جب وہ اہل مدینہ وغیرہم سے حدیث بیان کرے تو اس کی حدیث میں بہت زیادہ خطا اور اضطراب ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 15۔ رہن کی نمو اور بڑھوتری اس کے ساتھ داخل ہوتی ہے اگر وہ ایسی ہو جسے الگ نہ کیا جاسکتا ہو جیسا کہ اس کا موٹا تازہ ہونا یا وہ نسل ہو جیسا کہ ولادت اور جنین اور وہ جو اس معنی میں ہو جیسا کہ کھجور کے پودوں کو ایک جگہ سے اکھیڑ کر دوسری جگہ لگانا اور جو ان کے سوا ہو مثلاً غلہ، پھل، دودھ اور اون وغیرہ یہ اس میں داخل نہ ہوں گے مگر یہ کہ وہ (مرتہن) اس کی شرط لگا لے۔ اور ان دونوں قسموں کے درمیان فرق یہ ہے کہ اولاد زکوٰۃ میں ماؤں کے تابع ہوتی ہے اور اون، دودھ اور درختوں کا پھل اس طرح نہیں ہیں، کیونکہ یہ زکوٰۃ میں اصل کے تابع نہیں ہیں اور نہ ہی یہ اس کی صورت میں ہیں اور نہ اس کے معنی میں اور نہ یہ اس کے ساتھ قائم رہ سکتے ہیں۔ پس ان کا اپنا حکم ہے ان کے لئے اصل کا حکم نہیں ہے بخلاف بچے اور جنین کے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مسئلہ نمبر 16۔ اور اس آدمی کا رہن رکھنا جائز ہے جس کے مال کو قرض محیط ہو جب تک کہ وہ اسے مفلس قرار نہ دے اور مرتہن قرض خواہوں کی نسبت رہن کا زیادہ حق رکھتا ہے۔ امام مالک اور لوگوں کی ایک جماعت نے یہی کہا ہے اور امام مالک سے اس کے خلاف بھی مروی ہے.... اور عبدالعزیز بن ابی سلمہ نے یہ کہا ہے کہ قرض خواہ مرتہن کے ساتھ اس میں داخل ہوں گے اور یہ کوئی شے نہیں ہے، کیونکہ وہ جس پر پابندی عائد نہ کی گئی ہو تو اس کے تصرفات بیع وشراء میں سے تمام احوال میں صحیح ہوتے ہیں اور قرض خواہوں نے اس شرط پر اس کے ساتھ معاملہ کیا ہے کہ وہ خرید و فروخت کرے اور (قرض) ادا کرے۔ اس باب میں امام مالک کا قول مختلف نہیں ہے اور رہن بھی اسی طرح ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 17۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا الآیہ یہ شرط ہے اور اس کے ساتھ اس کی وصیت کو مربوط کیا

1۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 1، صفحہ 528

گیا ہے جس پر ادا کرنے اور ٹال مٹول ترک کرنے کا حق ہے، یعنی اگر وہ جس پر حق ہے صاحب حق کے نزدیک امین اور ثقہ ہو تو جس پر اعتبار کیا گیا ہے اسے چاہیے کہ وہ اپنی امانت اسے ادا کردے۔ اور قولہ فَلْيُؤَدِّ یہ الاداسے ماخوذ ہے اور مہموز ہے۔ (اور یہی جواب شرط ہے) اور ہمزہ کی تخفیف بھی جائز ہے۔ اور ہمزہ کو واؤ کی صورت میں نقل کیا گیا ہے اور اسے الف سے نہیں بدلا گیا اور نہ ہی بین بین بنایا گیا ہے، کیونکہ الف کا ماقبل صرف مفتوح ہوسکتا ہے اور یہ امر وجوب کے معنی میں ہے اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ قرضوں کی ادائیگی واجب ہونے پر اجماع ہے اور اس بارے میں حاکم کے حکم کے ثبوت پر اور اس کے مقروضوں کو اس پر جبر کرنے پر اجماع ہے اور مزید قرینہ غیر کا مال حرام ہونے میں صحاح کی احادیث ہیں۔ (1)

مسئلہ نمبر 18۔ قولہ تعالیٰ: اَمَانَتَهٗ الأمانة مصدر ہے اور اس کے ساتھ اس شے کا نام رکھا گیا ہے جو کسی کے ذمہ میں ہو۔ اور اس کی اضافت اس کی طرف ہے جس پر قرض ہے۔ اس حیثیت سے اس کی اس کی طرف ایک نسبت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ (النساء: 5) (اور نہ دے دو نادانوں کو اپنے مال۔)

مسئلہ نمبر 19۔ قولہ تعالیٰ: وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ اور اسے چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرے جو اس کا رب ہے اس بارے میں کہ وہ حق میں سے کوئی شے نہ چھپائے۔ اور قولہ: وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ یہ قول باری تعالیٰ: ولا یضار، عین کلمہ کے کسرہ کے ساتھ کی تفسیر ہے اور شاہد کو اس سے منع کیا گیا ہے کہ وہ شہادت چھپانے کے ساتھ ضرر پہنچائے اور یہ نہی متعدد قرائن کے ساتھ وجوب پر دلالت کرتی ہے۔ اور ان میں سے ایک وعید ہے اور نہی کا محل وہاں ہے جہاں شاہد کو حق کے ضائع ہونے کا خوف ہو۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: شاہد پر شہادت دینا لازم ہے جہاں اسے شہادت دینے کے لئے کہا جائے اور وہاں وہ خبر دے جہاں اس سے خبر کا مطالبہ کیا جائے، فرمایا: اور تو یہ نہ کہہ أخبر بها عند الامیر (میں اس کے بارے امیر کے پاس خبر دوں گا) بلکہ (یہ کہہ) اخبرہ بها (میں اسے اس کے بارے خبر دوں گا) شاید وہ رجوع کرلے اور واپس لوٹ آئے۔)

ابو عبدالرحمٰن نے ولا یکتموا یا کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے نہی للغائب بنایا ہے۔

مسئلہ نمبر 20۔ جب حق پر گواہ موجود ہوں تو ان پر اس کی ادائیگی کفایۃً متعین ہے پس اگر دو اسے ادا کردیں اور حاکم انہیں دو پر اکتفا کرلے تو باقیوں سے فرض ساقط ہو جائے گا اور اگر وہ اس کے ساتھ اکتفا نہ کرے تو اسے جاری رکھنا متعین ہے، یہاں تک کہ اثبات واقع ہو جائے۔ اور یہ صاحب حق کی دعوت کے ساتھ معلوم ہوسکتا ہے پس جب وہ اس کو کہے: تو میرا حق زندہ (ثابت) کردے اس شہادت کو ادا کرکے جو میرے لئے تیرے پاس ہے تو وہ اس پر متعین ہو گیا۔

مسئلہ نمبر 21۔ قولہ تعالیٰ: وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ اس میں دل کو خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے کیونکہ چھپانا اس کے افعال میں سے ہے اور کیونکہ وہ ایک ایسا گوشت کا ٹکڑا ہے جس کی اصلاح سے سارے کا سارا بدن اصلاح پا لیتا ہے جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے (2)۔ پس یہاں کل بدن کو بعض کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ (اور یہ اول سورۃ میں گزر چکا ہے۔ اور الکیا نے کہا ہے: جب اس نے اس کا قصد کیا کہ وہ اسے ادا نہیں کرے گا اور شہادت کی ادائیگی زبان سے

1۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، حدیث نمبر 6891، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ 2۔ صحیح بخاری، کتاب ایمان، جلد 1، صفحہ 13، وزارت تعلیم

ترک کر دی تو گناہ اکٹھا دونوں وجہوں کی طرف راجع ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اٰثِمٌ قَلْبُهٗ یہ مجاز ہے اور یہ حقیقۃً وعید پر دلالت کو پختہ کرنے والا ہے اور یہ معانی کے اعتبار سے بیان کی عمدگی اور اعراب کی لطافت میں سے ہے۔ کہا جاتا ہے: دل کا گناہ اسے مسخ کرنے کا سبب ہے اور اللہ تعالیٰ جب دل کو مسخ کر دیتا ہے تو وہ اسے منافق بنا دیتا ہے اور اس پر مہر لگا دیتا ہے۔ نعوذ باللہ منہ۔

(اور اس کا بیان سورت کی ابتدا میں آچکا ہے) اور قَلْبُهٗ، اٰثِمٌ کی وجہ سے مرفوع ہے اور اٰثِمٌ، اِنَّ کی خبر ہے اور اگر چاہے تو آثم کو مبتدا ہونے کے سبب رفع دے لے اور قَلْبُهٗ فاعل سَدَّ مسد الخبر بن جائے گا اور پھر جملہ اِنَّ کی خبر ہوگا۔ اور اگر چاہے تو آثم کو رفع دے اس بنا پر کہ یہ مبتدا مؤخر کی خبر ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قَلْبُهٗ، اٰثِمٌ سے بدل بعض من الکل ہو۔ اور اگر چاہے تو اسے آثم کی ضمیر سے بدل بنا لے۔

چوبیس مسائل کی تکمیل اور تتمہ کے طور پر میں نے یہاں تین مسائل بیان کیے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ یہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ نے شہادت اور کتابت کا جو حکم فرمایا ہے یہ دونوں فریقوں کی اصلاح اور منافع کے لئے ہے اور ایسے فساد اور تنازع کی نفی کے لئے ہے جو دونوں کو باہمی فساد اور خرابی تک پہنچانے والا ہے، تا کہ شیطان اسے حق کا انکار کرنے اور شریعت نے اس کے لئے جو حد مقرر کی ہے اس سے تجاوز کرنے یا مقدار مستحق پر اقتصار کو ترک کرنے پر نہ اکسائے اور اسی وجہ سے شریعت نے ان مجہول چیزوں کی بیع کرنے کو حرام قرار دیا ہے جن میں عادت اور رواج یہ ہو کہ وہ فریقین کو فساد اور اختلاف تک پہنچا دیتی ہوں اور وہ باہمی کینہ اور ایک دوسرے سے جدائی واقع کرنے والی ہوں۔ اور انہی میں سے وہ چیزیں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کے ساتھ حرام قرار دیا ہے جوا اور شراب نوشی وغیرہ: اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ الآیہ (المائدہ: 91) (یہی تو چاہتا ہے شیطان کہ ڈال دے تمہارے درمیان عداوت اور بغض شراب اور جوئے کے ذریعہ)

پس جس نے اللہ تعالیٰ کے اوامر و زواجر کے بارے میں اس کے ادب سکھانے کے ساتھ ادب سیکھ لیا اس نے دین اور دنیا کے منافع جمع کر لئے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ الآیہ۔ (النسا: 66) (اور اگر وہ کرتے جس کی انہیں نصیحت کی گئی تھی تو ان کے لئے بہتر ہوتا۔)

مسئلہ نمبر 2۔ امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے لوگوں کے اموال اس ارادہ سے لئے کہ وہ انہیں ادا کر دے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف سے ادا کر دے گا (یعنی ادائیگی کے اسباب مہیا فرما دے گا) اور جس نے انہیں ضائع کرنے کے ارادہ سے لئے تو اللہ تعالیٰ اسے ضائع کر دے گا (1)۔'' اور نسائی نے حضرت میمونہ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے قرض لیا، تو انہیں کہا گیا: اے ام المومنین! آپ قرض لے رہی ہیں اور آپ کے پاس اسے ادا کرنے کے وسائل نہیں ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا: میں نے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاستقراض، جلد 1، صفحہ 321۔ ایضاً، حدیث نمبر 2212، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے ''جس نے قرض لیا اور وہ اسے ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو اللہ تعالیٰ اس پر اس کی معاونت فرمائے گا(1)۔'' اور طحاوی، ابوجعفر طبری اور حارث بن ابی اسامہ نے اپنی مسند میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے یہ روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم نفسوں کو ان کے امن کے بعد خوفزدہ نہ کرو۔'' صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وہ کیا ہے؟ فرمایا: ''وہ قرض ہے(2)'' اور بخاری نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا میں اس طرح ذکر کیا: اللھم انی اعوذ بک من الھم والحزن والعجز والکسل والجبن والبخل وضلع الدین وغلبۃ الرجال(3) (اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں غم اور حزن سے، عجز اور سستی، غفلت سے، بزدلی اور بخل سے، قرضے کے بوجھ اور لوگوں کے غلبے سے۔) علماء نے کہا ہے: ضَلَعِ الدَّیْن سے مراد یہ ہے کہ مقروض ایسے وسائل نہ پائے کہ وہ قرض ادا کر سکے۔ اور یہ عربوں کے اس قول سے بنایا گیا ہے: حِمل مُضلِع یعنی بہت بھاری اور ثقیل بوجھ اور دابۃ مُضلِع یعنی ایسا جانور جو بوجھ اٹھانے کی قوت نہ رکھتا ہو۔ صاحب العین نے یہی کہا ہے۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الدَّینُ شینُ الدِّین(4) (قرض دین کے لئے عیب ہے۔) اور آپ سے ہی روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الدَّینُ ھَمٌّ بالليل و مَذَلَّۃٌ بِالنَّھَارِ(5) (قرض رات کا غم ہے اور دن کی ذلت ہے۔) ہمارے علماء نے کہا ہے بلاشبہ یہ عیب اور ذلت ہے کیونکہ اس میں دل و دماغ مشغول رہتے ہیں اور ادائیگی کا غم اور فکر لازم رہتا ہے۔ اور مقروض کے لئے ملاقات کے وقت ذلت اور پستی کا سامنا ہوتا ہے اور اسے اپنے وقت تک مؤخر کر کے اس کا احسان برداشت کرنا ہے۔ اور بسا اوقات وہ اپنی طرف سے اسے پورا کرنے کا وعدہ کرتا ہے اور پھر اس کے خلاف کرتا ہے یا مقروض اس کے سبب سے گفتگو کرتا ہے اور جھوٹ بولتا ہے یا وہ اس کے لئے قسم کھاتا ہے اور اسے توڑ دیتا ہے۔ وغیر ذالک۔ اسی وجہ سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام گناہ اور قرض سے پناہ مانگتے تھے۔

اور المغرم سے مراد قرض ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیونکر آپ قرض سے اس قدر پناہ مانگتے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک آدمی جب قرض ادا کرتا ہے تو وہ گفتگو کرتا ہے اور جھوٹ بولتا ہے اور وہ وعدہ کرتا ہے اور اس کا خلاف کرتا ہے(6)۔'' اور یہ بھی کہ بسا اوقات وہ مر جاتا ہے اور وہ قرض ادا نہیں کر چکا ہوتا۔ پس وہ اس کے عوض گروی ہو جاتا ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بندہ مومن کی روح اپنی قبر میں اس کے قرض کے عوض گروی ہوتی ہے یہاں تک کہ اس کی طرف سے اسے ادا کر دیا جائے(7)۔'' اور یہ تمام کے تمام اسباب دین میں عیب ہی ہیں۔ ان سے دین کا حسن و جمال ضائع ہو جاتا ہے اور اس کا کمال کم ہو جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

1۔ سنن نسائی، کتاب البیوع، جلد 2، صفحہ 232 | 2۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 4، صفحہ 146

3۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 942۔ ایضاً، حدیث نمبر 5005، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ کنز العمال، جلد 6، صفحہ 231 | 5۔ ایضاً | 6۔ صحیح بخاری، کتاب الاستقراض، جلد 1، صفحہ 322

7۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصدقات، جلد 1، صفحہ 176۔ ایضاً، حدیث 2403، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مسئلہ نمبر 3۔ جب اللہ تعالیٰ نے لکھنے، گواہ بنانے اور کوئی شے بطور گروی لینے کا حکم ارشاد فرمایا تو یہ اموال کی حفاظت اور انہیں بڑھانے کا لحاظ رکھنے پر نص قطعی ہے۔ اور یہ جاہل متصوفہ اور ان کی رعایت کرنے والے وہ لوگ جو اس کا لحاظ نہیں رکھتے ان کا رد ہے کہ وہ اپنے تمام اموال سے فارغ ہو جاتے ہیں (یعنی وہ غربا و مساکین وغیرہ کو دے دیتے ہیں) اور وہ اپنے اور اپنے اہل وعیال کی کفایت اور حاجت کے لئے بھی کچھ نہیں چھوڑتے، پھر جب وہ محتاج ہوتے ہیں اور ان کے گھر والے فقیر ہوتے ہیں تو پھر یا تو وہ بھائیوں کے احسانات یا ان کے صدقات کا طالب ہوتا ہے یا پھر وہ دنیا داروں اور ان میں سے ظلم کرنے والوں سے کچھ لیتا ہے اور یہ فعل مذموم اور ممنوع ہے۔

ابوالفرج جوزی نے کہا ہے: مجھے ان زہد وورع اختیار کرنے والوں سے زیادہ تعجب نہیں جنہوں نے اپنی کم علمی کے سبب ایسا کیا، بلکہ زیادہ تعجب ان اقوام کے بارے ہے، جو صاحب علم وعقل ہیں انہوں نے اس پر کیسے برانگیختہ کیا۔ اور انہوں نے اس کے بارے حکم دیا باوجود اس کے کہ شرع اور عقل اس کے خلاف ہیں۔ پس محاسبی نے اس بارے میں بہت زیادہ کلام کیا ہے اور ابو حامد طوسی نے اسے پختہ اور مضبوط کیا ہے اور ان کی مدد کی ہے اور میرے نزدیک حارث ابو حامد کی نسبت زیادہ معذور ہے، کیونکہ ابو حامد زیادہ فقیہ ہے مگر ان کے تصوف میں داخل ہونے نے ان پر ان کی مدد ونصرت لازم کر دی جو اس میں پہلے داخل ہو چکے ہیں۔

محاسبی نے اپنے طویل کلام میں کہا ہے: تحقیق مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا وصال ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اصحاب میں سے کچھ لوگوں نے کہا: بلاشبہ ہم عبدالرحمٰن پر اس مال کے بارے میں خوف کھا رہے ہیں جو انہوں نے چھوڑا، تو حضرت کعب نے فرمایا: سبحان اللہ! کیا تم عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ پر خوف کھا رہے ہو؟ انہوں نے پاکیزہ مال کمایا، پاکیزہ اور طیب مال خرچ کیا اور حلال وطیب مال چھوڑا۔ پس یہ خبر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچی، تو وہ حضرت کعب کو تلاش کرنے کے ارادہ سے غصے کی حالت میں نکلے اور اونٹ کے جبڑے کی ہڈی کے پاس سے گزرے تو اسے اپنے ہاتھ میں اٹھا لیا اور پھر حضرت کعب کی تلاش میں نکل پڑے، تو حضرت کعب کو بتایا گیا کہ ابوذر رضی اللہ عنہ آپ کو تلاش کر رہے ہیں تو وہ بھاگتے ہوئے نکل گئے یہاں تک کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچ گئے ان سے مدد لینے لگے اور انہیں صورت حال سے آگاہ کیا۔ پس حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ حضرت کعب کی تلاش میں نشانات کی اتباع کرتے ہوئے آئے یہاں تک کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دار پر آکر رک گئے، جب اندر داخل ہوئے تو حضرت کعب اٹھے اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے بھاگتے ہوئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پیچھے جاکر بیٹھ گئے، تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: اے یہودیہ کے بیٹے! تو یہ گمان رکھتا ہے کہ جو کچھ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے چھوڑا ہے اس کے بارے کوئی حرج نہیں ہے۔ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ایک دن باہر تشریف لائے اور فرمایا: ''کثیر مال و دولت والے ہی قیامت کے دن قلیل مال و دولت والے ہوں گے سوائے ان کے جنہوں نے اس اس طرح خرچ کیا(1) (یعنی نیکی اور صدقہ میں وافر مال خرچ کیا)۔ محاسبی نے کہا ہے: پس یہ عبدالرحمٰن اپنی فضیلت کے باوجود قیامت کے دن

1۔ مسند احمد حنبل، جلد 5، صفحہ 152۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب الاستقراض واداء الدیون والحجر والتفلیس، حدیث نمبر 2213

میدان حشر میں روک لئے جائیں گے اس حلال مال کے سبب جو انہوں نے پاکدامنی اور نیکی کرنے کے لئے کمایا اور انہیں فقراء کے ساتھ جنت کی طرف دوڑ کر جانے سے روک دیا جائے گا اور وہ ان کے نشانات پر گھسٹنے لگیں گے، علاوہ ازیں بھی انہوں نے کلام کیا ہے (☆)۔

ابو حامد نے اس کا ذکر کیا ہے اور حدیث ثعلبہ کے ساتھ اسے پختہ اور قوی کیا ہے۔ وہ یہ کہ اسے مال عطا کیا گیا تو اس نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ ابو حامد نے کہا ہے: جس نے انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات اور اولیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم کے احوال اور ان کے اقوال میں گہری غور و فکر کی ہے تو اسے اس میں کوئی شک نہیں کہ مال کا نہ ہونا اس کے وجود سے افضل ہے۔ اگرچہ وہ صدقہ و خیرات میں خرچ ہو، کیونکہ وہ کم سے کم شے جو اس میں حاصل ہوتی ہے وہ مال کی اصلاح کے لئے ہمت و کوشش ہے جو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے مشغول رکھتی ہے۔ پس مرید کو چاہئے کہ وہ اپنا مال نکال دے یہاں تک کہ بقدر ضرورت کے سوا کچھ بھی اس کے پاس باقی نہ رہے۔ پس جو ایک درہم بھی اس کے پاس باقی ہوگا اس کا دل اس کی طرف متوجہ ہوگا اور وہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے حجاب اور پردہ بن جائے گا۔

علامہ جوزی نے کہا ہے: یہ سب کا سب خلاف شرع اور خلاف عقل ہے اور کوتاہ فہمی ہے اس میں جو مال سے مراد لیا گیا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اسے شرف عطا فرمایا ہے، اس کی قدر و مرتبہ کو عظمت عطا فرمائی ہے اور اس کی حفاظت کا حکم ارشاد فرمایا ہے، کیونکہ اسے آدمی کے لئے باعث قوت و طاقت بنایا گیا ہے اور وہ شے جو شریف آدمی کے لئے باعث قوت و طاقت بنائی گئی ہے تو وہ یقیناً شریف ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا (النساء: 5) اور نہ دے دو نادانوں کو اپنے مال جنہیں بنایا ہے اللہ تعالیٰ نے تمہاری (زندگی کے لئے) سہارا۔) اور اللہ تعالیٰ نے مال احمق اور بے وقوف انسان کے حوالے کرنے سے منع فرمایا ہے اور فرمایا: فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ (النساء: 6) (پس اگر محسوس کرو تم ان میں دانائی تو لوٹا دو انہیں ان کے مال)

اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مال ضائع کرنے سے منع فرمایا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو فرمایا: بے شک تیرا اپنے ورثاء کو غنی اور دولتمند چھوڑنا اس سے بہتر ہے کہ تو انہیں اس حالت میں چھوڑے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے رہیں (1)"۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ما نفعنی مال کمال ابی بکر (2) (مجھے کسی مال نے اتنا نفع نہیں دیا جتنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مال نے دیا) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو فرمایا: "صالح آدمی کے لئے صالح اور پاکیزہ مال نعمت ہے (3)"۔ اور آپ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے لئے دعا فرمائی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کے آخر میں یہ تھا۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 943

2۔ سنن ابن ماجہ، مقدمہ، جلد 1، صفحہ 10۔ ترمذی شریف، حدیث 3594، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 4، صفحہ 197

☆ یہ محاسبی کی رائے ہو سکتی ہے ورنہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔

اللھم اکثر مالہ وولدہ وبارک لہ فیہ (1) (اے اللہ! اس کے مال واولاد میں کثرت فرما اور اس کے لئے اس میں برکت عطا فرما۔) اور حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، بلاشبہ میری توبہ یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اپنا سارا مال صدقہ کردوں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنے لئے کچھ مال روک لے یہ تیرے لئے بہتر ہے (2)''۔

علامہ جوزی نے کہا: یہ احادیث کتب صحاح میں نقل کی گئی ہیں اور یہ اس عقیدہ اور نظریہ کے خلاف ہیں جو متصوفہ رکھتے ہیں کہ مال کی کثرت حجاب اور سزا ہے اور یہ کہ اسے محفوظ رکھنا توکل کے منافی ہے اور کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اس کے فتنہ اور آزمائش سے ڈرا جاتا ہے اور بلاشبہ خلق کثیر نے اس کے خوف کی وجہ سے اس سے اجتناب کیا ہے۔ اور یہ کہ اسے جمع کرنا من وجہ کمزور کر دیتا ہے اور یہ کہ دل بہت کم فتنوں سے سلامت اور محفوظ رہتا ہے اور اس کے ہوتے ہوئے دل کا ذکر آخرت میں مشغول ہونا نایاب ہو جاتا ہے سو اسی وجہ سے اس کے فتنہ سے ڈرایا گیا ہے۔

اور جہاں تک مال کمانے کا تعلق ہے تو اگر کوئی صرف گزر اوقات کے لئے حلال کمانے پر اکتفا کرلے تو یہ ایک ایسا امر ہے جس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں اور رہا وہ جس نے مال جمع کرنے اور حلال مال کثرت سے طلب کرنے کا قصد کیا تو اس کے مقصود اور مدعیٰ میں دیکھا جائے گا۔ پس اگر اس نے فخر ومباہات کا قصد کیا تو یہ مقصود بہت برا ہے اور اگر اس نے اپنی ذات اور اپنے گھر والوں کی پاکدامنی کا قصد کیا اور اس نے حوادثات زمانہ کے لئے مال ذخیرہ کیا اور اس نے بھائیوں کی خوشحالی، فقراء کو غنی بنانے اور نیکی کے کام کرنے کا قصد کیا تو اسے اس ارادہ پر ثواب واجر عطا کیا جائے گا اور اس نیت کے ساتھ مال جمع کرنا کثیر طاعات و ریاضات سے افضل ہے اور صحابہ کرام میں سے کثیر مخلوق کی نیتیں مال جمع کرنے میں سلیم اور حسین تھیں کیونکہ مال جمع کرنے سے ان کے مقاصد حسین تھے، پس وہ اس کے حریص ہوئے اور انہوں نے اس میں زیادتی اور کثرت کی دعائیں کیں۔ اور جب ایک مضبوط آدمی کو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیز رفتار گھڑ دوڑ میں پیچھے چھوڑ دیا۔ اس نے گھوڑا دوڑایا یہاں تک کہ وہ کھڑا ہو گیا پھر اس نے اپنا کوڑا اچھینک دیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اسے اتنی (جگہ) دے دو جہاں اس کا کوڑا پہنچا ہے (3)''۔

اور حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ اپنی دعا میں کہا کرتے تھے: اے اللہ! مجھے وسعت وخوشحالی عطا فرما، اور حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے کہا: وَ نَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ (یوسف: 65) (اور ہم زیادہ لیں گے ایک اونٹ کا بوجھ) اور حضرت شعیب علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہا: فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ (القصص: 27) (پھر اگر تم پورے کرو دس سال تو یہ تمہاری اپنی مرضی) اور حضرت ایوب علیہ السلام کو جب صحت عطا فرمادی گئی تو ان پر سونے کی مکڑیوں کا بہت بڑا گلہ اڑایا گیا تو آپ پکڑ کر اپنے کپڑے میں ڈالنے لگے اور ان میں کثرت وزیادتی کی طلب کرنے لگے تو آپ کو کہا گیا: کیا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 298۔ صحیح بخاری، حدیث نمبر 5868، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب التوبہ، جلد 2، صفحہ 362۔ صحیح بخاری، تفسیر سورۃ البراۃ، حدیث نمبر 4308، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 2، صفحہ 156۔ ابی داؤد، باب فی اقطاع الارضین، حدیث نمبر 2670، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آپ سیر نہیں ہوئے ہیں؟ تو آپ نے عرض کی: اے میرے پروردگار! کیا فقیر بھی تیرے فضل سے سیر ہو سکتا ہے؟ یہ ایک ایسا امر ہے جس کا انحصار طبائع اور مزاجوں پر ہے۔

اور جہاں تک محاسبی کے کلام کا تعلق ہے تو وہ غلط ہے وہ علم سے نابلد ہونے پر دلالت کرتا ہے اور انہوں نے حضرت کعب اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہما کی جو حدیث ذکر کی ہے وہ محال ہے۔ وہ جہال کی وضع کردہ ہے۔ اور متصوفہ کے ساتھ ان کے ملنے کی وجہ سے حدیث کی عدم صحت ان پر مخفی رہی ہے اور بعض نے اس کے بارے روایت کیا ہے کہ اگرچہ اس کی سند ثابت نہیں ہے، کیونکہ اس کی سند میں ابن لہیعہ ہے اور وہ مطعون راوی ہے۔

یحییٰ نے کہا ہے اس کی حدیث سے استدلال نہیں کیا جا سکتا اور تاریخ میں صحیح یہ ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا وصال ۲۵ھ میں ہوا۔ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا وصال ۳۲ھ میں ہوا۔ تحقیق وہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے وصال کے بعد بھی سات برس تک زندہ رہے۔ پھر وہ لفظ جو انہوں نے اپنی حدیث میں ذکر کئے ہیں وہ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ ان کی حدیث موضوع ہے، پھر صحابہ کرام یہ کیسے کہہ سکتے ہیں: ہم عبدالرحمٰن پر خوف کھا رہے ہیں! کیا حلال مال جمع کرنے کی اباحت پر اجماع منعقد نہیں ہوا ہے پھر اباحت کے ساتھ خوف کی کیا وجہ ہے؟ کیا شریعت ایک شے کے بارے میں اجازت دیتی ہے پھر اسی پر سزا دیتی ہے؟ یہ فہم وادراک کی قلت کی وجہ سے ہے، پھر کیا حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ پر اعتراض کر سکتے ہیں، حالانکہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ایسی چیزوں کے سبب بہتر اور افضل ہیں جن کے سبب وہ ایک دوسرے کے قریب بھی نہیں ہو سکتے؟ پھر ان کا اکیلے عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے ساتھ تعلق ہونا اس پر دلیل ہے کہ انہوں نے سیرت صحابہ کو آزمایا اور اس کا تجربہ کیا ہی نہیں، کیونکہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے تین سو بہار چھوڑے تھے اور ہر بہار میں تین قنطار تھے! اور البھار کا معنی بوجھ ہے۔

اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا مال دو لاکھ پچاس ہزار تھا اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے نوے ہزار ترکے میں چھوڑے۔ اور اکثر صحابہ کرام نے مال کمایا اور اسے پیچھے چھوڑا اور ان میں سے کسی نے بھی کسی پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اور رہا یہ قول: ان عبدالرحمٰن یحبو حبوًا یوم القیامۃ تو یہ اس پر دلیل ہے کہ انہوں نے حدیث کو پہچانا اور سمجھا ہی نہیں۔ اور میں تو اللہ تعالیٰ کی اس سے پناہ مانگتا ہوں کہ عبدالرحمٰن قیامت کے دن گھسٹ کر چلیں، کیا آپ انہیں جانتے نہیں ہیں جو (اسلام قبول کرنے میں) سبقت لے جانے والے ہیں اور آپ ان دس صحابہ کرام میں سے ایک ہیں جن کے لئے جنت کی بشارت دی گئی ہے اور آپ اہل بدر میں سے ہیں اور مجلس شوریٰ کے ممبر ہیں تو کیا آپ گھسٹ کر چلیں گے؟ پھر حدیث عمارہ ابن زاذان روایت کرتے ہیں اور امام بخاری نے کہا ہے: بسا اوقات ان کی حدیث مضطرب ہوتی ہے۔ اور امام احمد نے کہا ہے: یہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منکر احادیث روایت کرتا ہے اور ابوحاتم رازی نے کہا ہے: یہ قابل حجت نہیں ہے اور دارقطنی نے کہا ہے: یہ ضعیف ہے۔ اور آپ کا یہ قول: ترک المال الحلال افضل من جمعه (مال حلال کو چھوڑ دینا اسے جمع کرنے سے افضل ہے) اس طرح نہیں ہے اور جب نیت وقصد صحیح ہو تو بلا اختلاف علماء کے نزدیک اسے جمع کرنا افضل ہے۔ اور حضرت سعید بن مسیب

رضی اللہ عنہ کہتے تھے: اس میں کوئی خیر اور بھلائی نہیں ہے جو مال طلب نہیں کرتا وہ اس کے ساتھ اپنا قرض ادا کر سکتا ہے اور اس کے ساتھ اس کی عزت محفوظ ہو سکتی ہے اور اگر وہ مر جائے تو وہ اسے اپنے بعد والوں کے لئے بطور میراث چھوڑ دے اور حضرت ابن مسیب رضی اللہ عنہ نے چار سو دینار پیچھے چھوڑے اور حضرت سفیان ثوری نے دو سو دینار پیچھے چھوڑے اور وہ کہتے تھے: المال فی ھذا الزمان سلاح اس زمانے میں مال ہتھیار ہے اور اسلاف ہمیشہ مال کی تعریف کرتے رہے اور حوادثات زمانہ اور فقراء کی امداد کے لئے اسے جمع کرتے رہے، البتہ ان میں سے ایک گروہ نے عبادات میں مشغول ہونے اور یکسوئی کو ترجیح دیتے ہوئے مال سے پرہیز کی ہے۔ پس انہوں نے تھوڑے مال پر ہی قناعت کی۔ پس اگر قائل یہ کہے: بے شک مال کو کم کرنا قرب امر کے لئے اولی ہے لیکن وہ مرتبہ اثم کو اس کے ساتھ تنگ کرنے والا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اموال کی حفاظت اور ان کا لحاظ رکھنے پر جو روایات دلالت کرتی ہیں ان میں سے گھٹیا مال اور اعلیٰ مال کے لئے قتال کو مباح قرار دینا بھی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من قتل دون مالہ فھو شھید (1) (جو اپنے حقیر اور گھٹیا مال (کی حفاظت) میں قتل کر دیا گیا تو وہ شہید ہے) اس کا بیان سورۃ المائدہ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

''اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اگر تم ظاہر کرو جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے یا تم اسے چھپائے رہو حساب لے گا تم سے اس کا اللہ تعالیٰ پھر بخش دے گا جسے چاہے گا اور عذاب دے گا جسے چاہے گا اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔''

قولہ تعالیٰ: لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اس میں دو مسئلے ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ لوگوں کا اس ارشاد باری تعالیٰ کے معنی میں اختلاف ہے اور اس بارے میں چار اقوال ہیں۔

(ا) کہ یہ ارشاد منسوخ ہے۔ حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم، حضرت شعبی، حضرت عطا، حضرت محمد بن سیرین، حضرت محمد بن کعب، حضرت موسیٰ بن عبیدہ رحمۃ اللہ علیہم اور صحابہ کرام اور تابعین میں سے ایک جماعت نے یہی کہا ہے۔ اور یہ کہ یہ تکلیف اور پابندی ایک سال تک باقی رہی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کے ساتھ کشادگی اور وسعت نازل فرمائی: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (اور یہ حضرت ابن مسعود، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت عطا، حضرت محمد بن سیرین اور حضرت محمد بن کعب رضی اللہ عنہم وغیرہم کا قول ہے)۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ انہوں نے فرمایا: جب یہ آیت نازل ہوئی وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ فرمایا: ان میں سے کوئی شے ان کے دلوں میں داخل ہو (یا) شے میں سے کوئی ان کے دلوں میں داخل نہ ہو، تو حضور نبی

1۔ جامع ترمذی، کتاب الدیات، جلد 1، صفحہ 170۔ صحیح بخاری، باب من قاتل دون مالہ، حدیث نمبر 2300، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم کہو ہم نے سنا، ہم نے اطاعت کی اور ہم نے تسلیم کر لیا۔ فرمایا: پس اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایمان ڈال دیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۗ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا (فرمایا: ''میں نے کر دیا'') رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا (فرمایا: ''میں نے کر دیا'') رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۗ وَاغْفِرْ لَنَا ۗ وَارْحَمْنَا ۗ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (فرمایا: ''میں نے کر دیا۔'') (1) اور ایک روایت میں ہے۔ پس جب انہوں نے ایسا کہا تو اللہ تعالیٰ نے اسے منسوخ کر دیا پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا عنقریب اس کا ذکر آئے گا۔

(۲) حضرت ابن عباس، حضرت عکرمہ، حضرت شعبی اور حضرت مجاہد رحمہم اللہ نے فرمایا: یہ آیت محکم مخصوص ہے اور یہ اس شہادت کے معنی میں ہے جسے چھپانے سے منع کیا گیا ہے، پھر اس آیت میں بتایا کہ شہادت کو چھپانے والا اسے چھپانے والا ہے جو اس کے دل میں ہے اس کا محاسبہ کیا جائے گا۔

(۳) یہ آیت اس شک و یقین کے بارے ہے جو نفوس پر طاری ہوتے ہیں، حضرت مجاہد نے بھی یہی کہا ہے۔ (2)

(۴) یہ آیت محکم ہے اور عام ہے منسوخ نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کا ان اعمال پر بھی حساب لے گا جو انہوں نے کیے اور ان پر بھی جو انہوں نے کیے تو نہیں مگر ان کے دلوں میں ثابت اور پختہ ہو گئے اور انہوں نے انہیں مخفی رکھا اور ان کی نیت اور ارادہ کر لیا۔ پس اللہ تعالیٰ مومنوں کی مغفرت فرمادے گا اور اس کے ساتھ اہل کفر و نفاق کو پکڑ لے گا (3)، علامہ طبری نے ایک قوم سے اسے ذکر کیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے (اس میں) وہ داخل کیا ہے جو اس سے مشابہ ہے۔

علی بن ابی طلحہ سے روایت ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ آیت منسوخ نہیں ہوئی، لیکن جب اللہ تعالیٰ مخلوق کو جمع فرمائے گا تو ارشاد فرمائے گا: ''میں تمہیں اس کے بارے بتاتا ہوں جو تم اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہو۔'' پس مومن کو اللہ تعالیٰ اس کے بارے بتائے گا اور پھر ان کی مغفرت فرمادے گا۔ اور رہے شک کرنے والے تو اللہ تعالیٰ اس کے بارے انہیں بتائے گا جس تکذیب وغیرہ کو انہوں نے چھپائے رکھا تھا، پس اسی لئے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۖ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ اور اسی طرح یہ ارشاد ہے: وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ (البقرہ: 225) یعنی شک اور نفاق میں سے جو تمہارے دلوں نے کمایا اس پر تمہارا مواخذہ کیا جائے گا (4)۔

اور حضرت ضحاک نے کہا: اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن اس کے بارے آگاہ فرمائے گا جسے وہ چھپاتا تھا تاکہ وہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی شے مخفی نہیں۔ اور حدیث میں ہے: ''اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا یہ وہ دن ہے جس میں مخفی رازوں کو ظاہر کر دیا جائے گا اور چھپی ہوئی باتیں باہر نکل آئیں گی۔ میرے لکھنے والے فرشتوں نے نہیں لکھے مگر تمہارے وہی

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 78
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 389، دار الکتب العلمیہ
3۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 173
4۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 174

اعمال جو ظاہر ہوئے اور میں ان پر بھی مطلع ہوں جن پر وہ مطلع نہیں ہوئے، نہ انہوں نے ان کی خبر دی اور نہ ہی انہیں لکھا۔ پس میں ان کے بارے تمہیں خبر دوں گا اور ان پر تمہارا محاسبہ بھی کروں گا اور پھر جسے میں چاہوں گا اسے بخش دوں گا اور جسے چاہوں گا اسے عذاب دوں گا (1)۔ "پس وہ مومنوں کو بخش دے گا اور کافروں کو عذاب دے گا" اس باب میں یہ اصح روایت ہے۔ اور اسی پر حدیث نجویٰ بھی دلالت کرتی ہے جس کا بیان آگے آ رہا ہے۔ (نہیں کہا جائے گا) تحقیق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے "بے شک اللہ تعالیٰ نے میری امت کی ان چیزوں کو معاف فرما دیا ہے جو ان کے دلوں میں پیدا ہوں گی جب تک کہ وہ ان کے ساتھ کلام نہ کریں یا ان کے مطابق عمل نہ کریں (2)۔" چنانچہ ہم کہتے ہیں: یہ ارشاد احکام دنیا پر محمول ہے۔ مثلاً طلاق، عتاق اور وہ بیع جس کا حکم ثابت نہیں ہوتا جب تک اس کے ساتھ کلام نہ ہو اور جو آیت میں ذکر کیا گیا ہے کہ بندے کا اس پر مواخذہ ہو گا وہ بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان آخرت میں ہو گا۔

حسن نے کہا ہے: یہ آیت محکم ہے منسوخ نہیں ہے (3)۔ علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اور دوسروں نے اس معنی کی طرح بیان کیا ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مذکور ہے، مگر انہوں نے یہ کہا ہے: بے شک وہ عذاب جو اس کی جزا ہوتا ہے جو دلوں میں کھٹکے اور اس کے بارے فقط غور و فکر ہو وہ دنیوی مصائب و آلام اور دنیا کی تمام تکالیف کے ساتھ ہے پھر اسی معنی کی طرح حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بیان کیا گیا ہے۔ اور یہی (پانچواں قول ہے) اور علامہ طبری نے اس کو ترجیح دی ہے کہ آیت محکم ہے منسوخ نہیں ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہی درست ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: **وَإِنْ تُبْدُوا مَا فِيٓ أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ** اس کا معنی ہے ان چیزوں میں سے جو تمہاری وسعت اور تمہارے کسب کے تحت ہیں۔ اور یہ ان چیزوں کے ساتھ ہیں جن کا اعتقاد رکھا جاتا ہے اور جن کے بارے فکر کی جاتی ہے۔ پس جب لفظ ایسے ہیں جن میں دلوں میں کھٹکنے والی چیزیں داخل ہو سکتی ہیں تو صحابہ کرام اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم خوفزدہ ہو گئے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے دوسری آیت کے ساتھ اس کی وضاحت فرمائی جس کا اس نے ارادہ کیا اور اسے خاص کر دیا اور اس کے حکم پر نص بیان فرما دی کہ وہ کسی نفس کو مکلف نہیں بنائے گا مگر (اس کا) جو اس کی وسعت میں ہو گا۔ اور دلوں میں پیدا ہونے والے خیالات ایسے نہیں ہیں اور نہ ہی ان کا دفاع وسعت میں ہے، بلکہ وہ امر غالب ہے اور وہ ان امور میں سے نہیں ہے جو کمائے جاتے ہیں۔ پس اس بیان اور وضاحت سے مقصود ان کے لئے کشادگی پیدا کرنا اور ان کی پریشانی کا ازالہ کرنا ہے۔ اور باقی آیت محکم ہے اس میں کوئی نسخ نہیں ہے اور جس سے نسخ کا حکم دور کیا جا سکتا ہے اس میں سے یہ بھی ہے کہ یہ آیت خبر کے انداز میں ہے اور اخبار میں نسخ داخل نہیں ہو سکتا اور اگر کوئی نسخ کا قول کرے تو وہ اس حکم پر مترتب ہوتا ہے جو صحابہ کرام کو اس وقت لاحق ہوا جب وہ اس آیت سے گھبرائے اور اس کی دلیل ان کے لئے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: **قولوا سمعنا و اطعنا** اس سے یہ حکم ثابت ہو رہا ہے کہ وہ اس ارشاد پر ثابت

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 174　2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 78

3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 389، دار الکتب العلمیہ

قدم ہو جائیں اور اسے لازم پکڑ لیں اور بخشش و غفران کے بارے اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم کا انتظار کریں۔ پس جب یہ حکم پختہ کر دیا گیا تو پھر اس میں نسخ کا واقعہ ہونا صحیح ہے۔ اور اس وقت آیت اس قول باری تعالیٰ کے مشابہ ہوگی: اِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ (الانفال: 65) پس یہ الفاظ بھی الفاظ خبر ہی ہیں لیکن اس کا معنی ہے: التزموا ھذا و اثبتوا علیہ و اصبروا بحسبہ، تم اسے لازم پکڑ لو اور اس پر ثابت قدم ہو جاؤ اور اس کے مطابق صبر کرو۔ پھر اس کے بعد اسے منسوخ کر دیا گیا۔ اور اس بارے میں جو میں جانتا ہوں اس پر لوگوں کا اجماع ہے کہ یہ آیت جہاد کے بارے میں ہے اور یہ منسوخ ہے دو سو کے مقابلے میں ایک سو کے صبر کرنے (والے حکم) کے ساتھ۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: سورۃ البقرہ میں یہ آیت اس کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتی ہے۔ (1)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام میں اضمار اور تقیید ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے یحاسبکم بہ اللہ ان شاء اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ تمہارا حساب لے گا اگر اس نے چاہا۔ اور اس بنا پر کوئی نسخ نہیں ہے۔

اور نحاس نے کہا ہے: اس آیت میں جو احسن قول کیا گیا ہے اور وہ ظاہر سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ یہ آیت عام ہے، پھر نجوی کے بارے میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث (اس میں) داخل کر دی گئی ہے جسے بخاری، مسلم وغیرہما نے روایت کیا ہے اور الفاظ مسلم کے ہیں۔ انہوں نے بیان فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''مومن کو قیامت کے دن اپنے رب سے قریب کیا جائے گا یہاں تک کہ رب کریم اپنا دست قدرت اس پر رکھ دے گا اور وہ اسے اس کے گناہوں کے بارے اقرار کرائے گا اور فرمائے گا کیا تو (اپنے ان گناہوں کو) پہچانتا ہے؟ تو وہ مومن عرض کرے گا اے میرے رب! میں پہچانتا ہوں۔ رب کریم فرمائے گا: کیونکہ میں نے دنیا میں تجھ پر پردہ ڈالے رکھا ہے اور بلاشبہ آج کے دن بھی میں تیرے لئے انہیں بخش دوں گا اور پھر نیکیوں کا نامہ عمل اسے عطا فرما دے گا اور رہے کفار اور منافقین! تو انہیں ساری مخلوق کے سامنے بلایا جائے گا یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو جھٹلایا (2)''۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت مومنین میں سے ان کے بارے نازل ہوئی ہے جو کافروں کو ولی مقرر کرتے تھے۔ یعنی اے مومنین! کفار کی ولایت کے بارے میں جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے تم اس کا اعلان کرو یا تم اسے چھپاؤ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ تمہارا حساب لے گا۔ واقدی اور مقاتل نے یہ کہا ہے۔ اور انہوں نے اس ارشاد سے جو کہ آل عمران میں ہے استدلال کیا ہے۔ قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ یَعْلَمْهُ اللّٰهُ یعنی کفار کی ولایت میں سے جو تمہارے سینوں میں ہے اگر تم اسے چھپاؤ یا تم اسے ظاہر کرو اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے اور اس پر اس کا ماقبل قول دلالت کرتا ہے: لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ (آل عمران: 28) (نہ بنائیں مومن کافروں کو اپنا دوست مومنوں کو چھوڑ کر۔)

میں (مفسر) کہتا ہوں اس میں (حقیقت سے) بعد اور دوری ہے، کیونکہ آیت کا سیاق اس کا تقاضا نہیں کرتا اور جو سورۂ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 389، دار الکتب العلمیہ

2۔ صحیح مسلم، کتاب التوبۃ، جلد 2، صفحہ 360۔ صحیح بخاری، باب ستر المومن علی نفسہ، حدیث نمبر 5609، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آل عمران میں ہے وہ بین اور واضح ہے۔ واللہ اعلم۔

اور حضرت سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ انبیاء علیہم السلام اس آیت کے ساتھ اپنی قوم کے پاس تشریف لاتے تھے لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ابن کثیر، نافع، ابو عمرو، حمزہ اور کسائی نے فیغفر اور و یعذب کو جزم کے ساتھ پڑھا ہے اس کا عطف جواب شرط پر کیا گیا ہے اور ابن عامر اور عاصم نے دونوں میں رفع کے ساتھ قطعی طور پر پڑھا ہے۔ یعنی فھو یغفرُ و یعذبُ۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، اعرج، ابو العالیہ اور عاصم جحدری سے دونوں میں نصب کے ساتھ مروی ہے اس بنا پر کہ ان سے پہلے اَنْ مضمر ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس کا عطف معنی پر ہے، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: فیضاعفه له (1) اور یہ پہلے گزر چکا ہے اور باہم مشاکلہ کی وجہ سے لفظ پر عطف عمدہ ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

و متی مایع منك كلاماً　　يتكلم فيجبك بعقل

نحاس نے کہا ہے اور طلحہ بن مصرف سے روایت ہے یحاسبکم به الله یغفر یعنی بغیر فا کے بدل کی بنا پر۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: جعفی اور خلاد نے اسی طرح پڑھا ہے اور یہ بھی روایت ہے کہ یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں اسی طرح ہے۔ ابن جنی نے کہا ہے یہ یُحَاسِبْكُمْ سے بدل ہونے کی بنا پر ہے اور یہی محاسبہ کی تفسیر ہے۔ اور یہ شاعر کے اس قول کی طرح ہے:

رُوَيْدًا بني شيبان بعضَ وعيدِكم　　تُلاقوا غَدًا خيلي على سفوان

تلاقوا جيادًا لا تحيد عن الوَغَى　　اذا ما غَدَتْ في المأزِق المتَدَانِي

اور یہ بدل کی بنا پر ہے۔ شاعر نے فعل کو مکرر ذکر کیا ہے، کیونکہ فائدہ اس قول میں ہے جو اس کے پیچھے آرہا ہے (2)۔ نحاس نے کہا ہے: اگر بغیر فا کے ہو تو جزم کی نسبت رفع زیادہ عمدہ ہے۔ وہ حال کے محل میں ہو جائے گا، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

متی تأتِہ تعشو الی ضَوْءِ نارہ　　تجدْ خیرَ نارٍ عندھا خیرُ مُوقِدِ

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۗ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۟ وَاغْفِرْ لَنَا ۟ وَارْحَمْنَا ۟ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 302، دار الکتب العلمیہ　　2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 390، دار الکتب العلمیہ

''ایمان لایا یہ رسول (کریم) اس (کتاب) پر جو اتاری گئی اس کی طرف اس کے رب کی طرف سے اور (ایمان لائے) مومن۔ یہ سب دل سے مانتے ہیں اللہ کو اور اس کے فرشتوں کو اور اس کی کتابوں کو اور اس کے رسولوں کو (نیز کہتے ہیں) ہم فرق نہیں کرتے کسی میں اس کے رسولوں سے اور انہوں نے کہا ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی ہم طالب ہیں تیری بخشش کے اے ہمارے رب! اور تیری طرف ہی ہمیں لوٹنا ہے۔ ذمہ داری نہیں ڈالتا اللہ تعالیٰ کسی شخص پر مگر جتنی طاقت ہو اس کی۔ اس کو اجر ملے گا جو (نیک عمل) اس نے کیا اور اس پر وبال ہوگا جو (برا عمل) اس نے کمایا۔ اے ہمارے رب! نہ پکڑ ہم کو اگر ہم بھولیں یا خطا کر بیٹھیں اے ہمارے رب! نہ ڈال ہم پر بھاری بوجھ جیسے تو نے ڈالا تھا ان پر جو ہم سے پہلے گزرے ہیں اے ہمارے پروردگار! نہ ڈال ہم پر وہ بوجھ جس کے اٹھانے کی ہم میں قوت نہیں اور درگزر فرما ہم سے اور بخش دے ہم کو اور رحم فرما ہم پر، تو ہی ہمارا دوست (مددگار) ہے۔ تو مدد فرما ہماری قوم کفار پر''۔

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ حضرت حسن، مجاہد اور ضحاک سے روایت ہے کہ یہ آیت قصہ معراج میں عطا ہوئی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بعض روایات میں اسی طرح مروی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: تمام قرآن سوائے اس آیت کے حضرت جبرائیل امین علیہ السلام لے کر حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت شب معراج سماعت فرمائی۔ اور بعض نے کہا ہے اس کا واقعہ معراج سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ لیلۃ المعراج تو مکہ مکرمہ میں تھی اور یہ ساری سورت مدنی ہے۔

پس جنہوں نے یہ کہا ہے کہ اس کا تعلق شب معراج سے ہے انہوں نے فرمایا کہ جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم بلندیوں کی جانب چڑھے اور آسمانوں میں بلند مقام پر پہنچے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت جبرائیل امین علیہ السلام بھی تھے یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سدرۃ المنتہٰی سے آگے گزر گئے تو جبرائیل امین علیہ السلام نے آپ سے عرض کی: بلاشبہ میں اس جگہ سے آگے نہیں بڑھ سکتا اور نہ ہی آپ کے سوا کسی کو اس مقام سے تجاوز کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم آگے گزر گئے یہاں تک کہ اس مقام تک پہنچے جہاں تک اللہ تعالیٰ نے چاہا، تو جبرائیل امین علیہ السلام نے آپ کی طرف اشارہ کیا کہ اپنے رب کریم کو سلام عرض کیجیے، تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: التحیات للہ والصلوٰت والطیبات۔ (قولی عبادات، بدنی عبادات اور مالی عبادات سب اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں۔) تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: السلام علیك ایھا النبی و رحمۃ اللہ و برکاتہ (اے نبی مکرم تجھ پر سلام ہو اور اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور اس کی برکتیں ہوں۔) تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ آپ کی امت کے لئے بھی سلام میں حصہ موجود ہو۔ چنانچہ عرض کی: السلام علینا و علی عباد اللہ الصّٰلحین (1) (سلام ہو ہم پر اور اللہ تعالیٰ کے صالح بندوں پر۔) تو حضرت جبرائیل امین علیہ السلام اور آسمانوں میں رہنے والے تمام ملائکہ نے کہا:

1۔ صحیح بخاری، باب التشہد فی الآخرۃ، حدیث نمبر 788، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

أشهد أن لا إله إلا الله و أشهد أن محمدا عبده و رسوله۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اٰمَنَ الرَّسُوْلُ یہ معنی شکر کی بنا پر ہے یعنی رسول نے تصدیق کی۔ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ (اس (کتاب) کی جو اس کی طرف اس کے رب کی طرف سے اتاری گئی۔) پس حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو بھی کرامت وفضیلت میں شریک کرنے کا ارادہ فرمایا تو کہا: وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ یعنی وہ کہتے ہیں ہم تمام رسل علیہم الصلوٰت والتسلیمات کے ساتھ ایمان لائے اور ہم ان میں سے کسی کے ساتھ کفر نہیں کرتے اور نہ ہی ان کے درمیان کوئی فرق کرتے ہیں جس طرح کہ یہود و نصاریٰ نے فرق کیا...... تو آپ کے رب نے آپ کو فرمایا اس آیت کے بارے ان کی قبولیت کیسی ہے جسے میں نے نازل کیا ہے؟ اور وہ یہ قول باری تعالیٰ ہے: اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کی وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۗ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَیْكَ الْمَصِیْرُ ۝ (انہوں نے کہا ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی ہم طالب ہیں تیری بخشش کے اے ہمارے رب! اور تیری طرف ہی ہمیں لوٹنا ہے۔) یعنی الْمَصِیْرُ بمعنی المرجع (لوٹنے کی جگہ) ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس وقت فرمایا: لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا یعنی طاقتها۔ (اللہ تعالیٰ کسی شخص پر ذمہ داری نہیں ڈالتا مگر جتنی اس کی طاقت ہو۔)

اور یہ بھی کہا جاتا ہے: الا دون طاقتها مگر اس کی طاقت سے کم۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ یعنی اس کے لئے اس خیر اور نیکی کے عمل کا اجر ہوگا جو اس نے کیا۔ وَعَلَیْهَا مَا اكْتَسَبَتْ اور اس پر اس برے عمل کا وبال ہوگا جو اس نے کمایا۔ تو اس وقت حضرت جبرائیل امین علیہ السلام نے کہا: مانگئے آپ کو عطا کیا جائے گا۔ تب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَاۤ اِنْ نَّسِیْنَاۤ اے ہمارے رب! ہم کو نہ پکڑ اگر ہم بھولیں یعنی لاعلم رہیں اَوْ اَخْطَاْنَا یا ہم خطا کر بیٹھیں یعنی اگر ہم ارادۃً کریں۔

اور کہا جاتا ہے: اگر ہم عمل کر بیٹھیں بھول کر اور خطاءً۔ تو حضرت جبرائیل امین علیہ السلام نے آپ سے کہا: آپ کو یہ عطا کر دیا گیا، تحقیق آپ کی امت سے خطا اور نسیان اٹھا لئے گئے ہیں۔(1)

پس آپ کسی دوسری شے کی التجا کیجئے۔ تو آپ نے کہا: رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَاۤ اِصْرًا، اِصْرًا سے مراد ثقل اور بوجھ ہے۔ (یعنی اے ہمارے رب! ہم پر بھاری بوجھ نہ ڈال) كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِنَا (جیسے تو نے ڈالا تھا ان پر جو ہم سے پہلے گزرے ہیں۔) اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ان کے ظلم کے سبب پاکیزہ چیزیں بھی حرام قرار دیں۔ اور وہ جب رات کے وقت گناہ کرتے تھے تو وہ اسے اپنے دروازے پر لکھا ہوا پاتے تھے اور ان پر نمازیں پچاس تھیں، پس اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے تخفیف کر دی اور ان سے پچاس نمازیں فرض کرنے کے بعد کم کر دیں (2)۔ پھر عرض کی: رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ وہ کہہ رہے ہیں: ایسے عمل کا بوجھ ہم پر نہ ڈال جسے کرنے کی طاقت ہم نہیں رکھتے کہ پھر تو ہمیں عذاب دے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایسا عمل جو ہم پر گراں اور مشکل ہو، کیونکہ اگر انہیں پچاس نمازوں کا حکم دیا گیا تو وہ اس کی طاقت رکھتے

1۔ السنن ابن ماجہ، باب طلاق المکرہ والناس، حدیث نمبر 2034، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، ذکر الملائکۃ، حدیث نمبر 2968، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہیں، لیکن وہ ان پر شاق اور مشکل ہوگا اور وہ اس پر دوام اور ہمیشگی اختیار کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ وَاعْفُ عَنَّا اور ہمارے ہر قسم کے (گناہوں کو) معاف فرما وَاغْفِرْ لَنَا اور ہم سے درگزر فرما اور کہا جاتا ہے: وَاعْفُ عَنَّا اور ہمیں مسخ (شکل بدلنے) سے معاف فرما وَاغْفِرْ لَنَا اور ہمارے خسف (زمین میں دھنسا) سے درگزر فرما۔ وَارْحَمْنَا اور ہم پر قذف (پتھر برسانا) سے رحم فرما، کیونکہ سابقہ امتوں میں سے بعض کی شکلیں مسخ کر دی گئیں، بعض کو زمین میں دھنسا دینے کا عذاب دیا گیا اور بعض پر پتھر برسائے گئے۔ پھر کہا اَنْتَ مَوْلٰىنَا یعنی تو ہمارا ولی ہے اور تو ہمارا محافظ ہے۔ فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ سو آپ کی دعا قبول کر لی گئی۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: ''میری ایک مہینے کی مسافت سے رعب کے ساتھ مدد کی گئی ہے۔ نصرت بالرعب مسیرۃ شھر(1) اور کہا جاتا ہے کہ لشکری جب اپنے گھروں سے خالص نیت کے ساتھ نکلتے اور جنگ کا طبل بجاتے تو کفار کے دلوں میں رعب اور ہیبت ایک مہینہ کی مسافت سے واقع ہو جاتی۔ انہیں ان کے نکلنے کا علم ہوتا یا علم نہ ہوتا۔ پھر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب (معراج سے) لوٹے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات وحی فرمائیں تاکہ آپ اپنی امت کو اس کے بارے آگاہ کریں۔ اور اس آیت کی ایک دوسری تفسیر بھی ہے۔

زجاج نے کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں نماز اور زکوٰۃ کے فرض ہونے کا ذکر فرمایا اور حج کے احکام اور حیض، طلاق، ایلا کا حکم اور انبیاء علیہم السلام کے قصص بیان فرمائے اور ربا کا حکم بیان فرمایا، (تو) اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد کے ساتھ اپنی عظمت وشان کا ذکر فرمایا: لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ پھر نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کا ذکر فرمایا اور پھر ان تمام کے بارے مومنین کی تصدیق کا ذکر فرمایا اور ارشاد فرمایا: اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام اشیاء کی تصدیق کی جن کا ذکر جاری ہے۔ اور اسی طرح تمام مومنین نے اللہ تعالیٰ، اس کے ملائکہ، اس کی کتب اور اس کے رسولوں کی تصدیق کی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا سبب نزول اس کی ماقبل آیت ہے اور وہ یہ ہے لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۤءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۤءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ کیونکہ جب یہ آیت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تو یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب پر انتہائی گراں اور شدید ثابت ہوئی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئے اور عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں ایسے اعمال کا مکلف بنایا گیا ہے جن کی ہم طاقت رکھتے ہیں: نماز، روزہ، جہاد (اور صدقہ) اور تحقیق اللہ تعالیٰ نے آپ پر یہ آیت نازل کی ہے اور ہم اس کی طاقت نہیں رکھتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم ارادہ رکھتے ہو کہ تم اس طرح کہو جس طرح تم سے پہلے اہل کتاب نے کہا تھا۔ سمعنا و عصینا (ہم نے سنا اور ہم نے نافرمانی کی) بلکہ تم یہ کہو سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ڭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ (ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی اے ہمارے رب ہم تیری بخشش کے طالب ہیں اور تیری طرف ہی ہمیں لوٹنا ہے۔) تو انہوں نے کہا: سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ڭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ پس جب قوم نے اسے پڑھا تو اس کے ساتھ

1۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب الصلوٰۃ، جلد 2، صفحہ 433

ان کی زبانیں پست ہوگئیں۔ تو اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ڭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝

... لیکن جب انہوں نے یہ کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے منسوخ کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا فرمایا ''ہاں'' رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَي الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا فرمایا: ''ہاں'' رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ فرمایا: ''ہاں'' وَاعْفُ عَنَّا ۪ وَاغْفِرْ لَنَا ۪ وَارْحَمْنَا ۪ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ فرمایا: ''ہاں'' اسے مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے (1)۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: پہلی روایت میں یہ قول قد فعلت اور اس روایت میں کہا: نعم یہ اس پر دلیل ہے کہ حدیث بالمعنی نقل کی گئی ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے اور جب اس پر امر پختہ ہو گیا کہ انہوں نے کہا: سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان کی تعریف اور مدح کی اور اس مشقت کو دور کر دیا جو انہیں دلوں میں کھٹکنے والی چیزوں کے سبب ہوئی۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کی طرف کامل متوجہ ہونے کا ثمرہ ہے۔ جیسا کہ بنی اسرائیل کے لئے اس کا برعکس ظاہر ہوا، ان کی مذمت کی اور انہیں ذلت، محتاجگی، اور جلاوطنی جیسی مشقتوں میں ڈال دیا جب انہوں نے یہ کہا تھا۔ سمعنا وعصینا ہم نے سنا اور ہم نے نافرمانی کی۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور سرکشی اختیار کرنے کا ثمرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے احسان اور مہربانی سے اس عذاب اور سزا سے پناہ عطا فرمائے۔ (آمین)

اور حدیث میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عرض کی گئی کہ حضرت ثابت بن قیس بن شماس کا گھر ہر رات چراغوں کے ساتھ روشن ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا: شاید وہ سورۃ البقرہ پڑھتا ہو، سو حضرت ثابت رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: میں نے سورۃ البقرہ میں سے اٰمَنَ الرَّسُوْلُ پڑھی ہے (2)۔ یہ تب نازل ہوئی جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب پر وہ دھمکی شاق گزری جو اللہ تعالیٰ نے ان تصورات پر حساب لینے کے بارے انہیں فرمائی جنہیں ان کے دل مخفی رکھے ہوئے ہوں گے، تو انہوں نے اس کے بارے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں شکوہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''شاید تم یہ کہہ رہے ہو سمعنا وعصینا جیسا کہ بنی اسرائیل نے کہا تھا۔'' تو انہوں نے عرض کی: (نہیں) بل سمعنا واطعنا۔ بلکہ ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف میں اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ نازل فرمائی۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اور ان کے لئے فرض ہے کہ وہ ایمان لائیں (3)۔''

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اٰمَنَ اس کا معنی صدق ہے یعنی تصدیق کی اور یہ پہلے گزر چکا ہے اور وہ جو نازل کیا گیا وہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 77
2۔ فضائل القرآن، سور القرآن وآیاتہ، صفحہ 229، دار ابن کثیر دمشق بیروت
3۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 178-179

قرآن کریم ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس طرح پڑھا ہے۔ وآمن المومنون کل امن باللہ یہ لفظ پر (عطف کی بنا) پر ہے(1)۔ اور غیر قرآن میں معنی پر (عطف کرتے ہوئے) آمنوا پڑھنا بھی جائز ہے۔

نافع، ابن کثیر، عاصم ابوبکر کی روایت میں اور ابن عامر رحمۃ اللہ علیہم نے وَ کُتُبِهٖ صیغہ جمع کے ساتھ قرأت کی ہے۔ اور انہوں نے سورۃ التحریم میں کتابہ صیغہ واحد پڑھا ہے۔ اور ابو عمرو نے یہاں اور سورۃ التحریم میں وَ کُتُبِهٖ صیغہ جمع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور حمزہ اور کسائی نے دونوں میں کتابہ واحد کے ساتھ قرأت کی ہے۔ پس جنہوں نے جمع پڑھا ہے انہوں نے کتاب کی جمع کا ارادہ کیا ہے اور جنہوں نے مفرد پڑھا ہے انہوں نے اس مصدر کا ارادہ کیا ہے جو ہر لکھی ہوئی شے کو جامع ہوتا ہے جس کا نزول اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہو(2)۔ اور جنہوں نے واحد پڑھا ہے ان کی قرأت میں بھی یہ جائز ہے کہ اس سے مراد جمع لیا جائے، اس اعتبار سے کہ کتاب اسم جنس ہے۔ پس دونوں قرأتیں مساوی طور پر برابر ہو گئیں، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ ۪ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ (البقرہ:213) (تو بھیجے اللہ نے انبیاء خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے اور نازل فرمائی ان کے ساتھ کتاب۔)

جماعت نے وَ رُسُلِهٖ سین کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اسی طرح رسُلنا و رسُلکم و رسُلک میں ہے سوائے ابو عمرو کے اور ان سے رسْلنا و رسْلکم کی تخفیف مروی ہے۔ اور ان سے رسلک میں تثقیل اور تخفیف دونوں مروی ہیں۔ ابو علی نے کہا ہے: جنہوں نے رسلک کو تثقیل کے ساتھ پڑھا ہے تو وہ کلمہ کی اصل ہے اور جنہوں نے تخفیف کی ہے تو اسی طرح احاد میں تخفیف کی جاتی ہے، مثلاً عُنْق و طُنْب۔ اور جب احاد میں تخفیف کی جائے تو یہ اس جمع میں زیادہ مناسب ہے جو زیادہ ثقیل ہے۔ فرمایا اس کا (یہ) معنی کلی ہے۔ اور جمہور لوگوں نے لَا نُفَرِّقُ نون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور معنی یہ ہے یقولون لا نفرق(3) (وہ کہتے ہیں ہم فرق نہیں کرتے) اور قول حذف کر دیا گیا۔ اور قول کا حذف کرنا کثیر اور زیادہ ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ علیہم من کل باب سلام علیکم یعنی یقولون سلام علیکم۔ (وہ کہیں گے تم پر سلام ہو) اور مزید فرمایا: و یتفکرون فی خلق السموات والارض ربنا ما خلقت ھذا باطلا، ای یقولون ربنا (وہ کہیں گے اے ہمارے رب!) اور اسی طرح (ان میں ہے) جو اس کی مثل ہیں۔ سعید بن جبیر، یحییٰ بن یعمر، ابو زرعہ بن عمرو بن جریر اور یعقوب نے لا یفرق یا کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ لفظ کل کی بنا پر ہے۔

ہارون نے کہا ہے: اور یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں لا یفرقون (4) ہے۔ اور بَيْنَ اَحَدٍ مفرد پڑھا ہے آحاد نہیں کہا ہے، کیونکہ احد واحد اور جمع تمام کو شامل ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ۝ (الحاقہ) اس میں حٰجِزِيْنَ احد کی صفت ہے، کیونکہ اس کا معنی جمع ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ما احلت الغنائم لاحد سود الرؤس غیرکم (5) (تمہارے سوا بڑے سرداروں میں سے کسی کے لئے غنائم حلال نہیں کی گئیں۔) اس میں سود

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 391، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، صفحہ 392 4۔ ایضاً

5۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 134۔ جامع ترمذی، باب سورۃ الانفال، حدیث نمبر 3010، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

الرؤس، احد کی صفت ہے۔ اور روبہ نے کہا ہے:

اذا أمور الناس دِينَتْ دينكا لا يرهبون أحدا مِنْ دونكا

جب لوگوں کے امور تیرے دین کے تابع بنا دیئے گئے ہیں تو وہ تیرے سوا کسی سے خوف نہیں کھاتے۔

اس آیت کا معنی ہے: بے شک مومنین یہود و نصاریٰ کی طرح نہیں ہیں اس میں کہ وہ بعض کے ساتھ ایمان لاتے ہیں اور بعض کے ساتھ کفر کرتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا اس میں حذف ہے، یعنی سمعنا سماع قابلین ہم نے قبول کرنے والوں کے سماع کی طرح سنا۔ اور کہا گیا ہے: سَمِعَ بمعنی قَبِلَ ہے (یعنی قبول کرنا) جیسا کہ کہا جاتا ہے: سمع اللہ لمن حمدہ، تو اس میں حذف نہ ہوگا۔ المختصر یہ قول اپنے کہنے والے کی مدح کا تقاضا کرتا ہے اور اطاعت کا معنی حکم کو قبول کرنا ہے۔ اور قولہ تعالیٰ: غُفْرَانَكَ یہ مصدر ہے جیسا کہ کفران اور خسران ہیں اور اس میں عامل فعل مقدر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے: اغفر غفرانک، (تو اپنی بخشش عطا فرما۔) زجاج نے یہی کہا ہے اور اس کے سوا دوسروں نے کہا ہے: نطلب او أسال غفرانک (ہم یا میں تیری بخشش کے طالب ہیں۔) وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ یہ دوبارہ زندہ کئے جانے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے کا اقرار ہے اور کہا جاتا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب یہ آیت نازل ہوئی تو جبرائیل امین علیہ السلام نے آپ کو کہا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے آپ پر اور آپ کی امت پر غنائم کو حلال کیا ہے سو آپ مانگئے آپ کو عطا کیا جائے گا''۔ پس آپ نے آخر سورت تک التجا کی (1)۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا...... تکلیف سے مراد وہ امر ہے جس کے ساتھ کسی کو آزمایا جائے اور تَكَلَّفْتُ الْاَمْرَ کا معنی ہے میں نے اسے کام کرنے کی تکلیف دی، اسے جوہری نے بیان کیا ہے اور اَلْوُسْعُ کا معنی ہے طاقت اور کوشش۔ اور یہ یقینی خبر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر نص بیان فرمائی ہے کہ وہ آیت نازل ہونے کے وقت سے بندوں کو دل یا دیگر اعضاء بدن کے اعمال میں سے کسی عبادت کا پابند اور مکلف نہیں بنائے گا مگر اسی کا جو مکلف کی وسعت اور طاقت میں ہوگی اور اس کے ادراک اور اس کی فطرت کے تقاضا کے مطابق ہوگی تو اس سے مسلمانوں سے وہ غم اور پریشانی دور ہوگئی جو دلوں میں آنے والے تصورات کا حساب لینے کے حکم سے انہیں لاحق ہوئی تھی (2)۔ اور اس آیت کے معنی میں وہ روایت ہے جسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے۔ انہوں نے کہا: میں نے جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے سوا کسی سے محبت نہیں کی جسے اس کی ماں نے جنم دیا ہے، کیونکہ میں ایک دن ان کے پیچھے پیچھے گیا اور مجھے سخت بھوک لگی ہوئی تھی وہ اپنے گھر پہنچے تو انہوں نے گھی کی مشک کے سوا کچھ نہ پایا، اس میں گھی کے کچھ اثرات تھے، چنانچہ انہوں نے اسے ہمارے سامنے پھاڑ دیا اور ہم نے اسے چاٹنا شروع کر دیا جو اس میں گھی اور کھجوروں کا اثر تھا۔ اور وہ کہنے لگے:

ما كلّف الله نفسًا فوق طاقتها ولا تجود يَدٌ الا ما تجدُ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 392، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً

اللہ تعالیٰ نے کسی نفس کو اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلف نہیں بنایا اور ہاتھ وہی شے سخاوت کرتا ہے جو وہ پاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ دنیوی احکام میں تکلیف مالایطاق کے جائز ہونے کے بارے میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے جبکہ اس پر ان کا اتفاق ہے کہ شریعت میں تکلیف مالایطاق واقع نہیں ہے اور اس آیت نے اس کے معدوم ہونے کے بارے آگاہ کیا ہے۔ ابوالحسن اشعری اور متکلمین کی ایک جماعت نے کہا ہے: تکلیف مالایطاق عقلاً جائز ہے۔ اور یہ عقائد شرعیہ میں سے کسی شے کو ساقط نہیں کرتی اور یہ مکلف کو عذاب دینے پر علامت ہے اور اس کے بارے یہی (حکم) قطعی ہے گویا کہ یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ کسی مصور کو جَو پر گرہ لگانے کا پابند کیا جائے۔(1)

اور اس کے جواز کے قائلین نے اختلاف کیا ہے کہ کیا یہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت میں واقع ہے یا نہیں ہے؟ پس ایک جماعت نے کہا ہے: یہ ابولہب کے بارے میں نازل ہونے والی سورت میں واقع ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے تمام شریعت کے ساتھ ایمان لانے کا مکلف بنایا اور من جملہ یہ بھی ہے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا، کیونکہ اس پر دونوں ہاتھوں کے ٹوٹنے اور آتش جہنم میں پھینکے جانے کا حکم لگایا گیا ہے اور یہ اس پر مطلع کرتا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا۔ تحقیق اسے ایمان لانے کا مکلف بنایا باوجود اس کے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا۔

اور ایک جماعت نے کہا ہے۔ یہ کبھی واقع نہیں ہوئی۔ اور اس پر اجماع بیان کیا ہے۔ اور قول باری تعالیٰ سَيَصْلٰى نَارًا کا معنی یہ ہے: اگر وہ اس میں پہنچا(2) اسے ابن عطیہ نے بیان کیا ہے۔

اور یُکَلِّفُ یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے ان میں سے ایک محذوف ہے اور وہ عبادۃً یا شیئًا ہے(3)۔ پس اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہم پر اپنا لطف وانعام فرمایا۔ اگر وہ چاہتا تو ہمیں ایسے امور کا مکلف بنا دیتا جو مشقت آمیز اور اذیت رساں ہوتے ہیں جیسا کہ دس کے مقابلہ میں ایک کا ثابت قدم رہنا، انسان کا ہجرت کرنا اور اپنے وطن سے نکلنا اور اپنے گھر والوں، اپنے وطن اور اپنے کاروبار سے کلیۃً علیحدگی اختیار کرنا، لیکن اس نے ہمیں ایسے کاموں کا جو سخت مشقت آمیز ہوں اور ایسے امور جو اذیت اور تکلیف پہنچانے والے ہوں ان کا مکلف اور پابند نہیں بنایا۔ جیسا کہ اس نے ہم سے پہلے لوگوں کو مکلف بنایا مثلاً اپنے نفسوں کو قتل کرنا اور اپنے کپڑوں اور جسم پر پیشاب لگ جانے والی جگہ کا ٹنا وغیرہ۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں سہولت عطا فرمائی اور نرمی فرمائی اور ہم سے اس بوجھ اور طوق کو دور فرما دیا جو ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے ہوئے تھا۔ فللہ الحمد والمنۃ والفضل والنعمۃ۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ اس سے وہ نیکیوں اور برائیوں کا ارادہ فرما رہا ہے۔ (یعنی اس کے لئے اجر ہوگا جو (نیک عمل) اس نے کیا اور اس پر وبال ہوگا جو (برا عمل) اس نے کمایا۔) سدی نے یہی کہا ہے۔ اور مفسرین کی جماعت میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں، ابن عطیہ نے یہ کہا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی مثل ہے: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (الانعام: 164) (اور نہ اٹھائے گا کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ) اور

1۔ بخاری حدیث، باب من کذب فی حلمہ، حدیث نمبر 6520، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 393، دار الکتب العلمیہ

3۔ ایضاً

وَ لَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا (انعام: 164) (اور نہیں کماتا کوئی شخص (کوئی چیز) مگر وہ اسی کے ذمہ ہوتی ہے) اور دل میں پیدا ہونے والے تصورات اور اس طرح کے دیگر وساوس انسان کی کمائی اور کسب میں سے نہیں ہیں۔ اور نیکیوں کے ذکر میں لَهَا ذکر ہوا ہے اس لئے کہ یہ ان میں سے ہیں جنہیں کرنے سے آدمی خوش ہوتا ہے اور ان کے ساتھ مسرت محسوس کرتا ہے لہٰذا انہیں اس کی ملکیت کی طرف منسوب کیا جارہا ہے اور سیئات کے ذکر میں عَلَيْهَا ذکر ہوا ہے اس لئے کہ وہ بھاری بوجھ ہیں اور انہیں اٹھانا انتہائی مشکل اور تکلیف دہ ہے، اور وہ اسی طرح ہے جیسے تو کہتا ہے: لی مال وعلی دین (میرے لئے مال ہے اور مجھ پر قرض ہے یعنی مال میری ملکیت ہے اور قرض مجھ پر بوجھ ہے۔)

فعل کسب کو مکرر (دوبار) لایا گیا ہے اور باب مختلف ذکر کیا ہے تاکہ نوع کلام حسین ہو جائے جیسا کہ فرمایا: فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ۝ (الطارق) (پس آپ کفار کو (تھوڑی سی) مہلت اور دے دیں کچھ وقت انہیں کچھ نہ کہیں)

ابن عطیہ نے کہا ہے: اس میں میرے لئے جو ظاہر ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ نیکیاں وہ ہیں جو بغیر تکلف کے کمائی جاتی ہیں کیونکہ انہیں کمانے والا اللہ تعالیٰ کے حکم کے راستہ پر اور طریقہ شریعت پر ہوتا ہے اور برے اعمال تکلف اور مبالغہ کی بنیاد پر کئے جاتے ہیں، کیونکہ انہیں کمانے والا اللہ تعالیٰ کی نہی کے حجاب کو پھاڑ کر ان کے بارے میں تکلف کرتا ہے اور ان کی طرف خطا اور غلطی کے ساتھ قدم اٹھاتا ہے۔ لہٰذا آیت میں اس فعل کا دو بابوں سے آنا اس معنی کی حفاظت کے لئے انتہائی حسین ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ اس آیت میں اس پر دلیل ہے کہ بندوں کے افعال پر ائمہ نے جو کسب اور اکتساب کا اطلاق کیا ہے وہ صحیح ہے۔ اور اسی لئے انہوں نے ان پر خلق اور خالق کا اطلاق نہیں کیا ہے، بخلاف ان کے جنہوں نے بدعتی گروہوں میں سے اس کا اطلاق کرنے کی جرأت کی ہے۔ اور ہمارے ائمہ میں سے جنہوں نے بندے پر اس کا اطلاق کیا ہے اور یہ کہ وہ فاعل (کام کرنے والا) ہے تو وہ خالصۃً مجاز ہے۔ اور مہدوی وغیرہ نے کہا ہے: آیت کے معنی میں یہ کہا گیا ہے کہ کسی کو دوسرے کے گناہ کے عوض نہیں پکڑا جائے گا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: فی نفسہ یہ صحیح ہے لیکن یہ اس آیت کے سوا سے ثابت ہے(1)۔

مسئلہ نمبر 8۔ الکیا طبری نے کہا ہے: قولہ تعالیٰ: لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ اس سے اس پر استدلال کیا جاتا ہے کہ جس نے کسی دوسرے کو قتل کر دیا بھاری ہتھیار کے ساتھ یا گلا گھونٹ کر یا پانی میں غرق کر کے تو اس پر قصاص یا دیت کی صورت میں اس کی ضمان ہوگی، بخلاف اس کے جس نے اس کی دیت عاقلہ پر قرار دی ہے اور یہ ظاہر کے خلاف ہے۔ اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ باپ سے قصاص کا ساقط ہونا اس کے شریک سے اس کے ساقط ہونے کا تقاضا نہیں کرتا اور یہ قول عاقلہ پر حد واجب ہونے پر دلالت کرتا ہے جب وہ مجنون کو اپنی ذات پر قدرت دے۔

اور قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا: ''ہمارے علماء نے اس آیت کے ضمن میں کہا ہے کہ قصاص باپ کے شریک پر واجب ہے بخلاف امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اور خطا کرنے والے کے شریک پر واجب ہے بخلاف امام شافعی اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہما کے، کیونکہ ان دونوں میں سے ہر ایک نے قتل کا کسب کیا ہے۔ اور انہوں نے کہا ہے: جس پر قصاص واجب نہیں ہوتا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 393، دارالکتب العلمیہ

اس کا ایسے آدمی کے ساتھ شریک ہونا جس پر قصاص واجب ہوتا ہے اس حکم کے سقوط میں شبہ نہیں بن سکتا جسے شبہ کے سبب ساقط کر دیا جاتا ہے (1)۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِیْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا اس کا مفہوم یہ ہے اس گناہ سے درگزر فرمالے جو ہم سے ان دونوں طریقوں پر یا ان میں سے ایک طریقہ پر صادر ہوتا ہے جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے رفع عن امتی الخطأ والنسیان وما استکرھوا علیہ (2) (میری امت سے خطا، نسیان اور اس (گناہ) کو جس پر انہیں مجبور کیا جائے اٹھا لیا گیا ہے۔ یعنی ایسے گناہ پر مواخذہ نہ ہوگا۔) اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ گناہ اٹھا لیا گیا ہے۔ البتہ ان احکام میں اختلاف ہے جو اس سے متعلق ہوتے ہیں۔ کیا وہ اٹھا لئے ہیں اور اس سے کوئی شے لازم نہ آئے گی یا اس کے سارے احکام لازم آئیں گے؟ اس میں اختلاف ہے اور صحیح یہ ہے کہ واقعات مختلف ہونے سے یہ بھی مختلف ہوتے ہیں، پس ایک قسم وہ ہے کہ وہ بالاتفاق ساقط نہیں ہوتی مثلاً تاوان، دیات اور فرض نمازیں۔ اور ایک قسم وہ ہے جو بالاتفاق ساقط ہو جاتی ہے۔ مثلاً قصاص اور کلمہ کفر زبان پر لانا۔ اور تیسری قسم وہ ہے جس میں اختلاف ہے مثلاً وہ آدمی جس نے رمضان المبارک میں بھول کر کھا لیا یا بھول کر حانث ہو گیا (یعنی قسم توڑ دی) اور وہ کام جو ان کی مثل ہوں اور خطا اور بھول کر واقع ہو سکتے ہوں اور وہ فروع میں معروف ہوں۔

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَآ اِصْرًا۔ اِصْرًا کا معنی ثقل اور بوجھ ہے۔ امام مالک اور ربیع نے کہا ہے: اصر سے مراد انتہائی سخت اور مشکل امر ہے (3) اور حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے۔ اصر سے مراد عمل کی شدت اور سختی ہے اور وہ جو بنی اسرائیل پر انتہائی شدید اور سخت تھے مثلاً پیشاب وغیرہ کے مسائل۔ اور ضحاک نے کہا ہے: وہ انتہائی تکلیف دہ اور شدید امور برداشت کرتے تھے اور یہ امام مالک اور ربیع رحمہما اللہ تعالیٰ کے قول کی طرح ہی ہے۔ اور اسی سے نابغہ کا قول ہے:

یا مانِعَ الضیم ان یَغشی سَرَاتَہم	والحامل الإصر عنهم بعد ما عرفوا

حضرت عطا نے کہا ہے: الاصر سے مراد شکل مسخ کر کے بندر یا خنزیر بنا دینا ہے۔ اور ابن زید نے بھی یہی کہا ہے اور ان سے یہ بھی منقول ہے کہ اس سے مراد وہ گناہ ہے جس میں نہ توبہ ہو اور نہ ہی کفارہ ہو (4)۔ اور لغت میں اصر کا معنی عہد ہے۔ اور اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِکُمْ اِصْرِیْ اور الاصر کا معنی تنگی، گناہ اور بوجھ ہے اور الاصار سے مراد وہ رسی ہے جس کے ساتھ بوجھ وغیرہ باندھے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: اَصَرَ یَاْصِرُ اَصْرًا بمعنی حبسہ یعنی اس نے اسے روک لیا۔ اور الاصر ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ اسی سے ہے، جوہری نے کہا ہے: اسم ظرف مَاْصِر اور مَاْصَر ہے اور جمع مَآصِر ہے اور عام طور پر تو کہتا ہے معاصر۔

1۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 264

2۔ کنز العمال، جلد 4، صفحہ 233، حدیث نمبر 10307۔ ایضاً، ابن ماجہ، باب طلاق المکرہ والناسی، حدیث نمبر 2034، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 394، دار الکتب العلمیہ	4۔ ایضاً

ابن خویز منداد نے کہا ہے اور ممکن ہے کہ اس کے ظاہر سے ہر اس عبادت میں استدلال کیا جائے جس کے بوجھ اور ثقیل ہونے کا خصم دعویٰ کرے، پس یہ اس قول باری تعالیٰ کی طرح ہے: وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (الحج: 78)

اور اسی طرح حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: الدین یسر فیسروا ولا تعسروا (1) (دین آسان ہے پس تم آسانی پیدا کرو اور تنگی اور مشکل نہ بناؤ)۔ اللھم شق علی من شق علی امۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ (اے اللہ اس پر مشقت ڈال دے جس نے امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر مشقت ڈالی ہے)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور اسی طرح الکیا الطبری نے کہا ہے: اس سے حرج اور تنگی کی نفی میں استدلال کیا جاتا ہے اور جس کا ظاہر بخشش اور نرمی کے میلان کے منافی ہو۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تو ہم پر شدت اور سختی نہ کر جس طرح تو نے ان پر سختی کی جو ہم سے پہلے تھے۔ حضرت ضحاک نے کہا ہے: ہم پر ایسے اعمال کا بوجھ نہ ڈال جنہیں کرنے کی ہم طاقت نہیں رکھتے اور اسی طرح ابن زید نے کہا ہے۔ ابن جریج نے کہا ہے: تو ہماری شکلیں بندروں اور خنزیروں میں مسخ نہ کر دے۔ اور سلام بن سابور نے کہا: وہ جن کی ہم طاقت نہیں رکھتے۔ وہ شہوت پرستی ہے۔ اسے نقاش نے حضرت مجاہد اور حضرت عطا سے بیان کیا ہے اور روایت ہے کہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ اپنی دعا میں کہا کرتے تھے: واعوذبك من غُلْمَۃ لیس لھا عدۃ (میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس شہوت پرستی سے جس کی عدت نہ ہو۔) سدی نے کہا ہے: اس سے مراد وہ سختی اور پیاس ہے جو بنی اسرائیل پر مسلط تھی (2)۔

قولہ تعالیٰ: وَاعْفُ عَنَّا اور ہمارے گناہوں سے درگزر فرما۔ عفوت عن ذنبہ (یہ تب کہا جاتا ہے) جب تو اسے چھوڑ دے اور اسے سزا نہ دے۔ وَاغْفِرْ لَنَا ہمارے گناہوں کو ڈھانپ دے (ان پر پردہ ڈال دے) اور الغفر کا معنی پردہ ہے۔ وَارْحَمْنَا اور رحمت فرما جس کا آغاز تیری جانب سے ہم پر ہو۔ اَنْتَ مَوْلٰىنَا یعنی تو ہمارا ولی اور ہمارا مددگار ہے۔ اور یہ آیات مخلوق کی تعلیم کے لئے بیان کی گئی ہیں کہ وہ کیسے دعا مانگیں گے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ جب اس سورت کی قرأت سے فارغ ہوتے تو کہتے۔ آمین۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اس کے بارے یہ گمان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے اسے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہو، پس اگر ایسا ہے تو یہ کمال ہے اور اگر یہ سورۃ الحمد پر قیاس کے سبب ہے اس حیثیت سے کہ وہاں دعا ہے اور یہاں بھی دعا ہے تو یہ اچھا ہے۔

اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: میں گمان نہیں رکھتا کہ کسی نے اسلام کو سمجھا ہو اور اس کا ادراک کیا ہو اور وہ ان دونوں (آیات) کو پڑھے بغیر سو جائے (3)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: امام مسلم نے اس معنی میں حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ

1۔ کشف الخفا للعجلونی، جلد 1، صفحہ 498، بحوالہ موسوعہ اطراف الحدیث 2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 394، دار الکتب العلمیہ

3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 395

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے رات کے وقت سورۃ البقرہ کی یہ دونوں آیتیں پڑھ لیں تو یہ اسے کافی ہیں (1)۔'' کہا گیا ہے: یہ اسے قیام اللیل سے کافی ہیں (یعنی یہ اس طرح ہے گویا اس نے رات کو عبادت کرتے ہوئے گزارا۔) جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''اللہ تعالیٰ نے مجھ پر جنت کے خزانوں میں سے دو آیتیں نازل فرمائی ہیں، ان کے ساتھ سورۃ البقرہ کو ختم کیا ہے رحمٰن نے مخلوق کو پیدا کرنے سے ایک ہزار برس پہلے اپنے دست قدرت سے انہیں تحریر فرمایا۔ جس نے عشاء کے بعد ان دونوں کو دو بار پڑھا وہ دونوں اس کے لئے قیام اللیل سے کافی ہوں گی۔ اور وہ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ سے آخر سورۃ البقرہ تک ہیں (2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ دونوں اسے شیطان کے شر سے (محفوظ رکھنے کے لیے) کافی ہوں گی اور اسے اس پر کوئی غلبہ نہ ہو سکے گا۔ اور ابو عمرو الدانی نے حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو تخلیق کرنے سے دو ہزار برس پہلے ایک کتاب لکھی پس اس سے یہ تین آیات نازل فرمائیں جن کے ساتھ سورۃ البقرہ کو ختم کیا گیا جس نے انہیں اپنے گھر میں پڑھا تین راتوں تک شیطان اس کے گھر کے قریب نہیں آئے گا (3)۔

اور روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: أُوتیتُ هذه الآیات من آخر سورة البقرة من کنز تحت العرش لم یوتهن نبی قبلی (4) (مجھے سورۃ البقرہ کی یہ آخری آیات عرش کے نیچے والے خزانے سے عطا کی گئی ہیں اور یہ مجھ سے پہلے کسی نبی علیہ السلام کو عطا نہیں کی گئیں۔) اور یہ حدیث صحیح ہے۔ اور سورۃ الفاتحہ میں فرشتے کا سورۃ الفاتحہ کے ساتھ انہیں لے کر نازل ہونے کا ذکر گزر چکا ہے۔ والحمد للہ۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن، جلد 1، صفحہ 271۔ ایضاً صحیح بخاری، باب فضل سورۃ البقرہ، حدیث نمبر 4624، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ الکشاف، جلد 1، صفحہ 333

3۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 112۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب ماجاء فی آخر سورۃ البقرہ، حدیث نمبر 2807، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 5، صفحہ 151